# گرداب

اسماء قادری

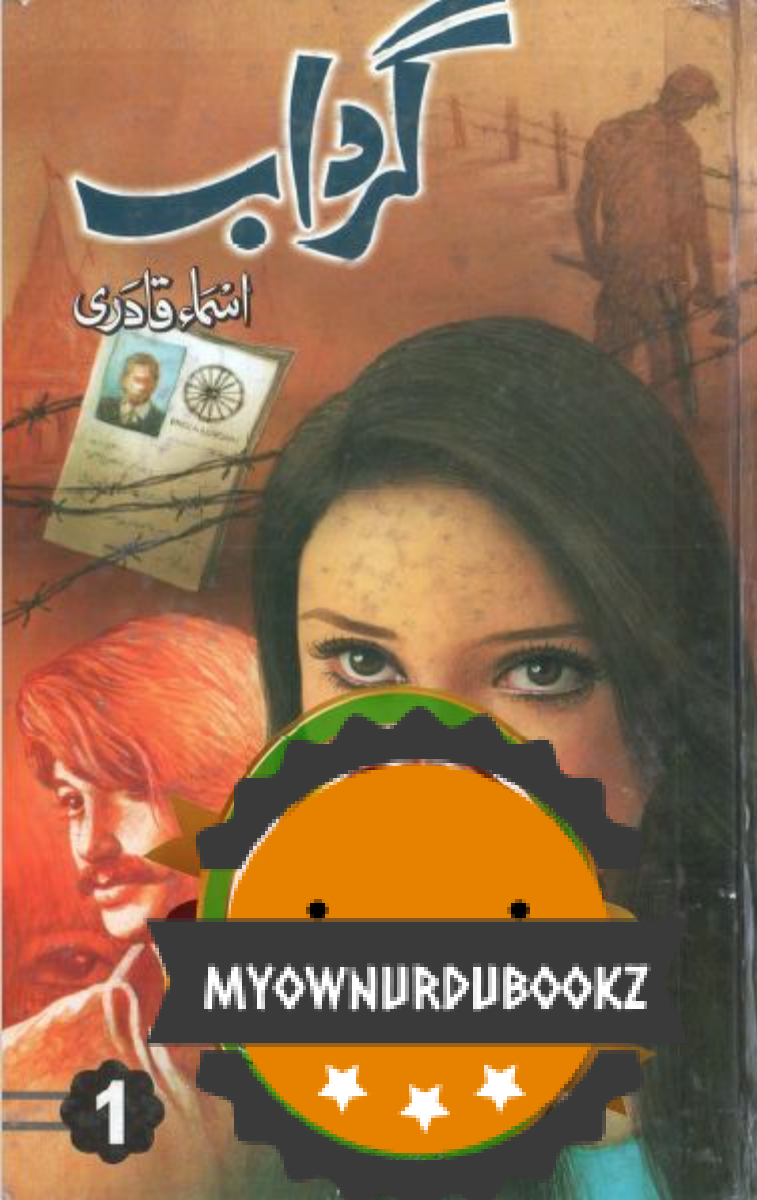

MYOWNURDUBOOKZ

1

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....

جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

اوّل

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ

ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے

## انتساب

اپنی محبت بھری تحریروں سے امر ہو جانے والے
جناب علیم الحق حقی کے نام

# پیش لفظ

''گرداب'' اب تک شائع ہونے والی میری سب سے طویل تحریر ہے جو اٹھاون (58) ماہ تک مسلسل جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہی اور اب برادرم محمد علی قریشی کے تعاون سے کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ لگ بھگ پانچ برس پر محیط اس عرصے میں کہانی کے ساتھ ساتھ میں خود بھی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی اور صورتِ حال یہاں تک رہی کہ میں نے ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر بھی اسے آپ کے لیے لکھا۔ خطوط کی صورت میں موصول ہونے والی تعریف و تنقید دونوں نے اس کہانی کو جاری رکھنے میں میری مدد کی۔ تعریف نے اگر میری پیٹھ تھپکنے کا کام کیا تو تنقید نے اپنی خامیوں پر نظر ڈالنے کا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس پورے عرصے میں تنقید کرنے والوں سے ذہنی طور پر زیادہ قریب رہی۔

اس ناول کی اتنی طوالت کا سہرا جاسوسی ڈائجسٹ سے تعلق رکھنے والے جناب ثمر عباس صاحب کے سر ہے۔ انہوں نے اس ناول کو جاری رکھنے میں میری بہت مدد اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ البتہ اس سے پہلے میں اپنے محسن جناب علیم الحق حقی کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مختصر تحریروں کو پڑھنے کے بعد مجھے بتایا کہ تم میں طویل کہانی لکھنے کا پوٹینشل ہے۔ یہ ایک طرح سے میری صلاحیت کو دریافت کرنے کا عمل تھا ورنہ اس سے قبل میں یہی سمجھتی رہی تھی کہ طویل تحریر لکھنا میرے عجلت پسند مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں اپنی اس طویل تحریر کو کتابی شکل میں ان کی خدمت میں

پیش کرنے کی خواہش پوری نہیں کرسکی اور دنیائے ادب ایک عظیم مصنف اور مہربان رہنما سے محروم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے۔ (آمین)

''گرداب'' کا بنیادی موضوع تو معاشرے کے ناسور اور وطن دشمن عناصر سے جاری جنگ ہے لیکن ممکن ہے کہ تحریر کی روانی میں کہیں میرا قلم خطا کھا گیا ہو اور میں کچھ ایسا لکھ جانے کی غلطی کر بیٹھی ہوں جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنا ہو۔ چنانچہ اپنی ایسی ہر لغزش کے لیے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں اور امید کرتی ہوں کہ ایک ناتجربہ کار مصنفہ کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آپ کشادہ دلی سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور اس قلمی سفر کو جاری رکھنے میں آپ کی دعائیں میرے لیے زادِ راہ ثابت ہوں گی۔

دعاؤں کی طلب گار

اسماء قادری

سامان سے لدا ہوا ٹرک اور سلور گرے مرسڈیز آگے پیچھے دوڑتے ہوئے، دُھول مٹی کے غبار سے نکل کر ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے آ ٹھہرے۔ یہ ایک سرکاری بنگلہ تھا۔ لیکن دیگر سرکاری عمارتوں کے مقابلے میں اس کی ظاہری حالت اور رنگ و روغن نمایاں طور پر کافی بہتر نظر آ رہے تھے۔ لاہور کی جانب سے آنے والی یہ گاڑیاں جوں ہی بنگلے کے گیٹ کے آگے رکیں، بنگلے کا گیٹ کھٹ سے وا ہو گیا۔ کھلے گیٹ کے دونوں اطراف کئی افراد قطار بنائے ہوئے استقبالیہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان افراد کو گاڑی میں بیٹھے افراد باہر سے ہی دیکھ سکتے تھے۔ مرسڈیز کی پچھلی نشست پر موجود اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل نے بھی بہ خوبی اس منظر کو دیکھا اور وہ جو اپنے تئیں قبل از وقت پہنچ کر دوسروں کو حیرت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا، اس منظر کو دیکھ کر حیرت کی شدت سے کچھ یوں ساکت ہوا کہ ڈرائیور کے مرسڈیز کا دروازہ کھول دینے کے باوجود بھی کئی لمحے تک نیچے نہیں اُترا۔

''خوش آمدید..... خوش آمدید شہریار صاحب! بڑی دیر سے ہم آپ کی ہی راہ تک رہے تھے۔'' شہریار کے گاڑی سے برآمد ہوتے ہی کلف لگے شلوار قمیض میں ملبوس، سر پر سفید ہی شملہ سجائے، بڑی بڑی مونچھوں والا لگ بھگ پچپن چھپّن سالہ ایک شخص آگے بڑھا اور پیچھے کھڑے شخص کے ہاتھ سے گلاب اور موتیے کے پھولوں کا بنا بھاری بھرکم ہار لے کر شہریار کے گلے میں ڈال دیا۔

''ویلکم سر!'' پینٹ شرٹ میں ملبوس، گلے میں ٹائی اور آنکھوں پر عینک لگائے سنجیدہ صورت شخص نے شہریار کے ہاتھوں میں ایک بُکے تھمایا۔ ''میں آپ کا پی اے عبدالمنان ہوں اور یہ اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار جناب چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔'' سنجیدہ صورت شخص نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ حلیے سے ہی روایتی چودھری نظر آنے والے شخص کا بھی تعارف کروایا۔

شہریار نے اس تعارف پر سر کو محض ایک ہلکی سی جنبش دینے پر اکتفا کیا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ پی اے عبدالمنان اور چودھری افتخار عالم شاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ کھلے گیٹ سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دونوں اطراف کھڑے افراد نے گلاب کی پتیوں کی برسات اور تالیوں کے ساتھ شہریار کا سواگت کیا۔ اس صورتِ حال پر شہریار عادل نے شدید کوفت محسوس کی۔ یوں بھی وہ اچانک پہنچ کر دوسروں کو حیران کر دینے کے اپنے منصوبے کے ناکام ہونے پر پہلے ہی کافی جھنجلاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

''مسٹر منان! میں فریش ہونا چاہتا ہوں۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنے ساتھ چھوٹے سے جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے افراد میں سے کسی ایک کی طرف بھی نظر ڈالے بغیر شہریار نے خشک لہجے میں اپنے پی اے کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی خواہش ظاہر کی۔

PAKISTANIPOINT

اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے بے یہ شک یہ اس کی پہلی پوسٹنگ تھی لیکن وہ حکمرانی کے انداز سے بہر حال ناواقف نہیں تھا۔ لہجے کی اکڑ، گردن کا کلف اور آنکھوں کی بے نیازی، ان سب چیزوں کی تربیت اسے اپنے گھر کے ماحول سے ملی تھی۔

وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے بیشتر افراد بیوروکریسی یا سیاست کی بساط پر اہم ترین مہروں کی حیثیت سے پھیلے ہوئے تھے۔ جو ابھی اس کھیل میں شامل نہیں ہوئے تھے، وہ اپنے بڑوں سے کھیل کے قوانین و اصول سیکھ رہے تھے۔ شہریار بھی بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کے بعد ہی اس میدان میں اُترا تھا۔ چنانچہ اس نے حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے نکل کر خود کو سنبھالنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ حیرت کا سبب بھی اپنے استقبال کا انداز نہیں بلکہ یہ بات بنی تھی کہ بنا اطلاع دیئے، قبل از وقت یہاں پہنچنے کے باوجود استقبال کا اہتمام کیونکر ممکن ہوا۔

''شیور سر!'' عبدالمنان نے شہریار کی فرمائش پر نپے تلے لہجے میں جواب دیا اور لاؤنج سے آگے اس کی راہنمائی کرنے لگا۔

''اے سی صاحب کے تازہ دم ہونے تک چائے تیار کر کے میز پر لگاؤ۔ خبردار! کہیں کوئی کمی نہیں رہنی چاہئے۔'' عبدالمنان کی رہنمائی میں لاؤنج سے نکلتے ہوئے شہریار عادل نے اپنے پیچھے چودھری افتخار کی تحکمانہ آواز سنی۔ یہ سرکاری بنگلہ تھا جہاں موجود خانساماں اور بٹلر بھی یقیناً سرکاری ملازم تھے لیکن چودھری افتخار کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس کے ذاتی ملازمین ہوں۔

''یہ آپ کا بیڈروم ہے سر! اس کے ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ بھی موجود ہے۔ آپ فریش ہو جائیں تو گھنٹی کا بٹن دبا کر مجھے انفارم کر دیجئے گا۔ لاؤنج میں چودھری افتخار صاحب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ آج شام کی چائے کا اہتمام انہوں نے ذاتی طور پر کروایا ہے۔'' تمام ضروری سہولیات سے مزیّن ایک کمرے میں پہنچ کر عبدالمنان نے شہریار عادل کو باتھ روم اور گھنٹی کے بٹن کی نشان دہی کرواتے ہوئے چودھری افتخار کی بابت یاد دہانی کروانا بھی ضروری سمجھا۔

شہریار نے اس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور چودھری افتخار کا پہنایا گیا ہار جو وہ لاؤنج میں ہی گلے سے اتار کر ہاتھ میں لے چکا تھا اور عبدالمنان کا پیش کیا ہوا بکے، بے پروائی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ڈال دیا۔

''باہر ٹرک پر میرا فرنیچر، دیگر آرائشی اشیاء لوڈ ہیں۔ آپ اپنی نگرانی میں سارا سامان اتروا کر بنگلے میں سیٹ کروانا شروع کر دیں۔ کل تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہئے۔'' تحکمانہ انداز میں پی اے سے کہتے ہوئے شہریار نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

''لیکن سر! وہ چودھری صاحب.....'' عبدالمنان اس حکم پر کچھ متذبذب سا نظر آیا۔

''وھاٹ چودھری صاحب؟'' موجودہ صورتِ حال کی روشنی میں کچھ کچھ معاملے کو سمجھتے ہوئے شہریار نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب تھا سر! چودھری صاحب نے آپ کے آنے سے قبل خود اپنے ذاتی خرچے پر بنگلے کی ساری تزئین و آرائش کروائی ہے۔ آپ کا لایا ہوا سامان سیٹ کرنے کے لیے ہمیں چودھری صاحب کے ان تحائف کو ہٹانا پڑے گا اور شاید یہ بات انہیں ناگوار گزرے۔'' بیڈروم میں موجود فرنیچر اور دیگر اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالمنان نے جلدی جلدی اپنی ادھوری بات کا مفہوم بیان کیا۔

''سو وہاٹ؟ چودھری صاحب نے یہ سب کچھ مجھ سے پوچھ کر یا میری فرمائش پر تو نہیں کروایا۔ یہ بنگلہ



فی الحال میرے زیرِ استعمال ہے اور اسے کس طرح اور کن چیزوں سے ڈیکوریٹ کروانا ہے، یہ طے کرنے کا حق چودھری افتخار صاحب کو نہیں بلکہ مجھے حاصل ہے۔'' شہریار نے رکھائی سے جواب دیا تو عبدالمنان نے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ اس کے بشرے سے بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔ دو صاحبِ اختیار افراد کے درمیان پھنسا اس وقت وہ یقیناً خود کو کافی مشکل میں محسوس کر رہا تھا۔

''اور آپ یہ تو بتائیں کہ یہ میرے استقبال کا سارا ڈراما کس طرح ایکٹ کیا گیا؟..... آفیشلی تو مجھے دو دن بعد یہاں آنا تھا۔ آپ کو اور باقی سب لوگوں کو میرے اس وقت یہاں پہنچنے کی اطلاع کیسے ملی؟'' پی اے کو دباؤ میں دیکھ کر شہریار نے بہت دیر سے ذہن میں مچلتا سوال بھی کر ڈالا۔

''چودھری صاحب نے لاہور فون کر کے رانا صاحب سے معلوم کر لیا تھا۔ رانا صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ آج کسی وقت پہنچنے والے ہیں۔ وقت کا اندازہ چودھری صاحب نے لاہور سے آپ کی روانگی کا حساب کر کے خود ہی لگا لیا۔ آپ کے استقبال کے سارے انتظامات انہوں نے ہی کیے ہیں۔ وہ تو بضد تھے کہ بینڈ باجے والے بھی بلوائے جائیں لیکن میں نے سمجھا بجھا کر کہ آج کے دور میں ان چیزوں کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا، انہیں ان کے اس ارادے سے باز رکھا۔''

عبدالمنان نے بتایا تو شہریار بے ساختہ ہی ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رانا کے نام سے پہچانے جانے والے اس کے ایم این اے ماموں کے ایک دور دراز گاؤں کے چودھری سے اتنے قریبی مراسم ہوں گے کہ وہ صرف ایک فون کال کے ذریعے بھی ان سے شہریار کے ذاتی پروگرام کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکے۔ چودھری افتخار کا سورس آف انفارمیشن جاننے کے بعد اس نے عبدالمنان سے مزید کوئی سوال کیے بغیر غسل خانے کا رخ کر لیا۔ وہ غسل خانے سے نکلا تو اس کا استری شدہ سوٹ سامنے والے ہینگر پر لٹکا ہوا تھا۔ شہریار کے ہونٹوں پر سوٹ دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تجربہ کار لوگوں کی دی ہوئی انفارمیشنز درست ثابت ہو رہی تھیں۔ اس کی طرف سے کوئی ہدایت نہ دیئے جانے کے باوجود اس کے سوٹ کیس میں سے یہ سوٹ برآمد کروا کر، استری کروانے کا یہ کارنامہ یقیناً عبدالمنان نے ہی انجام دیا تھا۔ عبدالمنان کو اس کارکردگی پر دل ہی دل میں سراہتے ہوئے شہریار نے تیزی سے لباس تبدیل کیا اور عبدالمنان کا بتایا ہوا گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

چودھری افتخار کو اب مزید انتظار کی کوفت میں مبتلا کرنا مناسب نہیں تھا۔ شہریار کو اندازہ تھا کہ وہ جس بے نیازی سے چودھری افتخار سے پیش آیا ہے، وہ چودھری کے مزاج پر کافی گراں گزری ہوگی۔ ہر وقت اپنے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہنے والے لوگوں میں گھرے رہنے والے چودھری افتخار کی یقیناً اس قسم کے رویّے سے آشنائی نہیں ہوگی اور اس نے بہت مشکل سے ہی شہریار کے اس انداز کو ہضم کیا ہوگا۔

''یس سر!'' گھنٹی کا بٹن دباتے ہی عبدالمنان کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

''چلو بھئی چل کر چودھری صاحب سے ملاقات کر لیں۔'' شہریار نے قدرے خوشگوار لہجے میں کہا اور عبدالمنان کی معیت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''مجھے افسوس ہے چودھری صاحب! کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ لیکن آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ بائی روڈ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد آدمی کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں بڑا اَن ایزی فیل کر رہا تھا۔ چنانچہ بہتر سمجھا کہ پہلے فریش ہو جاؤں پھر آپ سے ملاقات کروں۔'' لاؤنج میں آ کر چودھری افتخار کے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری سے لہجے میں افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت لاؤنج میں صرف چودھری افتخار ہی

موجود تھا۔ وہ سارے لوگ جو شہریار نے اپنی آمد کے وقت دیکھے تھے اور جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ چودھری افتخار کے حواری ہیں، اس وقت وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں شہریار صاحب! ہم نے اپنا آج کا سارا دن آپ کے لیے ہی وقف کر رکھا ہے۔ دوپہر سے آپ کے دیدار کا انتظار کرتے ہوئے ہم نے ہمت نہیں ہاری تو پھر شرفِ گفتگو کے حصول کے لیے یہ آدھے گھنٹے کا انتظار کیا حقیقت رکھتا ہے۔ آپ رانا صاحب کے بھانجے ہیں تو سمجھیں ہم سے بھی آپ کا یہی رشتہ بنتا ہے۔ اپنوں میں بھلا کسی شکایت یا تکلف کی کیا گنجائش؟'' چودھری افتخار جو شہریار کے بے نیازانہ انداز پر اب تک اندر ہی اندر بہت تلملا رہا تھا، منافقت سے لتھڑی ہوئی وسعت قلبی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرنے لگا۔

شہریار نے چودھری افتخار کی بات سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ چائے تیار ہے۔ چلیں، چل کر پہلے چائے پیتے ہیں۔'' ایک باوردی بیرے نے لاؤنج میں داخل ہو کر چپکے سے چودھری افتخار کو اشارہ دیا تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ شہریار بھی بے چون و چرا.... چودھری کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''یہ سارا اہتمام کروا کر آپ نے بہت تکلف سے کام لیا چودھری صاحب! میں تو بہت ناپ تول کر اور حساب کتاب سے کھانے والا بندہ ہوں۔ شام کی چائے کے ساتھ اگر کبھی کچھ کھانے کا دل چاہے بھی تو ایک آدھ بسکٹ سے زیادہ کچھ نہیں لیتا۔ اچھی صحت اور فٹنس کے لیے اس چیز کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔'' شہریار نے ٹیبل پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آنے والے لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چودھری افتخار کو ٹوکا۔

''ارے بھئی ہم تو اس احتیاط کو نہیں مانتے۔ جوانی میں کیسی احتیاط؟ یہ تو ہوتی ہی موج مستی کی عمر ہے۔ اس عمر میں جو بھی لکڑ پتھر کھاؤ، ہضم ہو جاتا ہے۔ ہم تو جوانی میں سالم بکرا اور کئی کئی مرغیاں ایک وقت میں ہضم کر جاتے تھے۔'' چودھری افتخار نے مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے فخر سے بتایا۔

''سارا طرزِ زندگی کا فرق ہے چودھری صاحب! طرزِ زندگی مختلف ہو تو انسان کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، پسند ناپسند سب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔'' شہریار نے چائے کا گھونٹ لے کر کپ واپس ساسر میں رکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

''درست کہا آپ نے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ ہمارے اتنے محبت سے سجائے گئے تحائف کی جگہ اپنے ساتھ لائے ہوئے ساز و سامان کو اس بنگلے کی رونق بنانے پر مُصر ہیں۔'' پی اے عبدالمنان یقیناً درمیانی وقفے میں چودھری افتخار کو شہریار کے حکم کی بابت اطلاع فراہم کر چکا تھا۔ چنانچہ موقع ملتے ہی چودھری نے اس موضوع کو چھیڑ دیا۔

''اس سلسلے میں، میں آپ کی دل آزاری کے لیے معذرت خواہ ہوں چودھری صاحب!..... لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا تعلق جس فیملی سے ہے، اس کی وجہ سے میری عادتیں کافی مختلف ہیں۔ مجھ سے پہلے آپ کے علاقے میں جو اے سی صاحب تعینات ہوتے رہے تھے، وہ یقیناً آپ کے تحائف کو پسند کرتے ہوں گے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے ٹیسٹ کے مطابق ہی چیزیں استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ البتہ میں آپ کی عنایات کے لیے آپ کا مشکور ضرور ہوں۔ اور ماموں جان سے بھی آپ کی اس محبت کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔''

شہریار کا انداز بظاہر معذرت خواہانہ تھا۔ لیکن وہ چودھری افتخار پر اپنی حیثیت کو جتانا بھی نہیں بھولا تھا۔ یہ اس کی چودھری افتخار سے پہلی ملاقات تھی جسے متوازن رکھنے کے لیے یہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا۔ وہ نہ تو



چودھری سے کوئی بے کار و بے مقصد عناد قائم کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے خود پر حاوی ہونے دینے کی اجازت دینے کو تیار تھا۔ چودھری خود اچھا خاصا گھاگ آدمی تھا جو شہریار کے انداز کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اطمینان سے بیٹھا چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔

⊛----✪----⊛

کچے راستے پر دندناتی لینڈ کروزر بہت تیزی سے گزر گئی۔ لیکن اس کے ٹائروں کی رگڑ سے اٹھنے والے گرد و غبار نے یکدم ہی پورے ماحول کو ڈھانپ لیا۔ راستے پر پیدل چلنے والے وہ دو مسافر جن کے حلیے پہلے ہی سفر کے باعث کافی خراب ہو رہے تھے، اس گرد و غبار کے طوفان میں گھر کر بالکل ہی بھوت لگنے لگے۔

''کمبخت کیسے فرعون بن کر دندناتے پھرتے ہیں۔ اللہ کی زمین کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔'' مسافروں میں سے ایک جو کم عمر سی لڑکی تھی، اس صورتِ حال پر بھنّا کر بڑبڑانے لگی۔

''باپ کی جاگیر سمجھتے نہیں ہیں، یہ سچ مچ ہے ہی ان کے باپ کی جاگیر۔ جدی پشتی مالک چلے آ رہے ہیں یہ لوگ اپنی ان زمینوں کے۔'' لڑکی کے ساتھ چلتے ادھیڑ عمر مرد نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''رہنے دو ابا! مجھے سب معلوم ہے کہ ان کی جاگیرداری کی کیا حقیقت ہے۔ اپنی قوم سے غداری کے انعام میں انگریزوں نے انہیں یہ جائیدادیں بخشی تھیں۔ اور اب یہ قوم کے لیڈر اور خیر خواہ بنے پھرتے ہیں۔ اگر خیر خواہ ہوتے نا تو گاؤں آنے والے اس کچے راستے پر اب تک پکی سڑک بن چکی ہوتی۔ مگر نہ جی..... یہ کیوں بنوانے لگے پکی سڑک۔ ان کے پاس تو بڑی بڑی گاڑیاں اور جیپیں ہیں۔ ان کو بھلا یہ کچا راستہ کیا کہتا ہے۔ مشکل تو ہم جیسوں کو ہوتی ہے۔ جو پہلے بس کے لمبے سفر میں ادھ موئے ہوتے ہیں، پھر اس راستے پر چل کر اپنی ٹانگیں تڑواتے ہیں۔ اوپر سے حویلی کا کوئی مکین اگر ایسے وقت میں اپنی گاڑی میں یہاں سے گزرے تو اس کی اُڑائی ہوئی دھول مٹی میں بھی غرق ہو جاتے ہیں۔'' وہ اس سفر سے کافی کوفت میں مبتلا نظر آتی تھی۔ چنانچہ چڑ کر ایک لمبی تقریر کر ڈالی۔

''مجھے معلوم ہے سارا پیدل چلنے کا غصہ ہے میری دِھی کو..... پر میں نے تو کہا تھا کہ تھوڑا رک جاؤ۔ کرمو کا تانگہ گاؤں کا پھیرا لگا کر واپس آتا ہے تو اس میں چلتے ہیں۔ اس وقت تُو نے میری بات نہیں مانی۔'' مرد نے یاد دہانی کروائی۔

''وہاں اڈے پر رُک کر تانگے کا انتظار کرنے میں کون سی کم خواری ہے؟ کرمو چاچا کے تانگے میں جو مریل گھوڑا جتا ہے نا، وہ تو جانے اپنا بوجھ ہی کیسے اٹھاتا ہے۔ بے چارے کو بس اڈے سے گاؤں کا ایک پھیرا لگا کر واپس اڈے پہنچنے میں گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ اور یہ بھی میں اپنا دو سال پہلے کا تجربہ بتا رہی ہوں۔ ان دو سالوں میں تو وہ گھوڑا اور بھی مریل ہو گیا ہوگا۔ اچھا ہی ہے کہ ہم نے اس تانگے کا انتظار نہ کیا اور پیدل ہی چل پڑے۔'' لڑکی نے ناک سکیڑ کر نخوت سے جواب دیا۔

''اچھا بس اب غصہ تھوک دے۔ گھر آنے والا ہے..... تیری ماں کیا کہے گی کہ حوراں اور صفدر نے اس کی ماہ بانو کو خوش نہیں رکھا۔ جب ہی وہ ایسے انگارے چباتی ہوئی آئی ہے۔'' مرد نے جس کا نام صفدر تھا، ماہ بانو کو ٹوکا۔ مگر اُس کے اس ٹوکنے کا ماہ بانو پر اُلٹا ہی اثر ہوا اور وہ راستہ چلنا چھوڑ کر صفدر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کیا کہا تم نے ابا؟..... میں کس کی ماہ بانو ہوں؟''

''غلطی ہو گئی دِھی رانی! میں یوں ہی نوراں بہن کے خیال سے ایسی بات بول گیا۔ ورنہ تُو تو میری اور

حوراں کی آنکھوں کا نور ہے۔'' صفدر نے گھبرا کر فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس موضوع پر ماہ بانو کتنی حساس ہو جاتی تھی۔

اصل میں ماہ بانو اُس کی اور حوراں کی سگی بیٹی نہیں تھی۔ وہ اور حوراں بے اولاد تھے اور اپنی بے اولادی کے باعث انہوں نے ماہ بانو کو گود لے لیا تھا۔ ماہ بانو، حوراں کی چھوٹی بہن نوراں کی بیٹی تھی۔ نوراں کی ماہ بانو سے پہلے بھی دو بیٹیاں اور تھیں۔ ماہ بانو ایسے وقت میں نوراں کی گود میں آئی جب وہ اور اس کا شوہر غیاث شدت سے بیٹے کی پیدائش کے متمنی تھے۔ ماہ بانو کی پیدائش نے انہیں شدید مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ اُس وقت اولاد کو ترسے ہوئے صفدر اور حوراں نے ماہ بانو کے لیے اپنی جھولی پھیلا دی۔ نوراں اور غیاث نے اپنے شانوں پر پڑنے والے اس تیسرے بوجھ کو حوراں کی خالی جھولی میں ڈالنے میں ذرا تردّد نہ کیا۔ اور یوں ماہ بانو حوراں اور صفدر کی بیٹی بن کر فیصل آباد چلی گئی۔

ان دونوں نے ہمیشہ ماہ بانو کو ناز و نعم میں رکھا۔ لیکن ماہ بانو کے اپنے دل سے یہ ملال نہیں جاتا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے ایک ناکارہ شے کی طرح خود سے الگ کر دیا تھا۔ اپنے دل میں پلنے والے اس دکھ اور شکوے کا ردِعمل وہ اس طرح ظاہر کرتی تھی کہ خود کو نوراں اور غیاث کی بیٹی پکارے جانے پر ناراض ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے صفدر کے سامنے اسی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

''آئندہ ایسا مت کہنا۔ ورنہ میں سچ مچ ناراض ہو جاؤں گی۔'' ماہ بانو نے صفدر کو دھمکی دی اور قدم دوبارہ آگے بڑھا دیئے۔

''نہیں کہوں گا۔ پر تُو اس بات کو سن کر اتنا ناراض نہ ہوا کر۔ بہن نوراں کو کبھی معلوم ہوا تو دکھی ہو گی۔ آخر اس نے تجھے جنم دیا ہے۔ وہ تجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔ جبھی تو بار بار تجھے اپنے پاس گاؤں بلواتی ہے۔'' صفدر نے بظاہر ہتھیار ڈال دیئے مگر ماہ بانو کو سمجھانے کا فریضہ انجام دینا نہیں بھولا۔

''ہاں تو آ گئی ہوں نا اس کی محبت کا خیال کر کے اس مصیبت گاؤں میں۔ حالانکہ میرا تو یہاں دل بھی نہیں لگتا۔ عجیب عجیب سی تو لڑکیاں ہیں یہاں کی۔ کوئی کام کی بات تک کرنا نہیں جانتیں۔'' ماہ بانو حقیقتاً اتنی نخریلی نہیں تھی۔ لیکن گاؤں آتے وقت ہمیشہ اسی کوفت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

''تجھے کیا کرنا ہے یہاں کی لڑکیوں سے؟ جب تک دل چاہے بات کرنا۔ ورنہ اپنی کتابیں لے کر الگ بیٹھ جانا۔ اتنی ڈھیر کتابیں ساتھ لے کر تو آئی ہے۔ ان کتابوں میں تو خوب دل لگتا ہے نا تیرا۔'' صفدر جانتا تھا کہ ماہ بانو کا یہ سارا نخرہ بس اُس کے سامنے موجود ہونے تک ہے۔ اس کے جاتے ہی وہ آہستہ آہستہ یہاں کے ماحول میں رچ بس جائے گی۔ کیونکہ وہ بظاہر نخریلی لیکن حقیقت میں ایک مفاہمت پسند لڑکی تھی۔ اس وقت بھی اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور صفدر کے ساتھ قدم اٹھاتی ان راستوں پر چلتی رہی، جہاں شاید اس کا بچپن گزرنا چاہئے تھا۔ لیکن اب یہ راستے کبھی کبھار ہی اس کے قدموں سے آشنا ہوتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''ماموں جان! آپ نے یہ کس مصیبت کو میرے پیچھے لگا دیا ہے؟'' شہریار عادل نے ٹیلی فون پر اپنے ماموں لیاقت رانا سے شکوہ کیا۔

''کس کی بات کر رہے ہو بیٹا جی؟'' لیاقت رانا نے تعجب سے پوچھا۔

''وہی پیر آباد کے چودھری افتخار عالم کی جو آپ سے معلومات حاصل کر کے میرے یہاں پہنچنے سے قبل



ہی سارے بنگلے پر قابض ہوئے بیٹھے تھے۔ میرا خاموشی سے یہاں پہنچ کر چھاپہ مارنے کا پروگرام اُن کی وجہ سے دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اچھی خاصی بھیڑ بھاڑ لگا لی تھی انہوں نے یہاں۔ میرا خیال ہے ان کا بس چلتا تو اکیس توپوں کی سلامی کا بھی انتظام کر رکھتے۔ مگر بس ہی نہیں چلا ہو گا۔ اس لیے اس معاملے میں پیچھے رہ گئے۔'' شہریار نے جلے بھنے انداز میں بتایا۔ لیاقت رانا اُس کے انداز پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

''آپ ہنس رہے ہیں اور یہاں میرا کھول کھول کر برا حال ہے۔ موصوف کل سارا دن مجھ پر اور میرے بنگلے پر قبضہ کیے بیٹھے رہے۔ ملازمین کو احکامات تو بالکل اس طرح دے رہے تھے، جیسے وہ میرے نہیں، اُن کے ملازمین ہوں۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھے اپنا اچھا خاصا ہدایت نامہ بھی سنا دیا ہے۔ مجھے کس زمیندار سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں، کس سے نہیں۔ کس مقامی افسر کو گھاس ڈالنی چاہئے، کن معاملات میں دخل دینا چاہئے اور کن میں ٹانگ اڑانے سے گریز کرنا چاہئے۔ یہ سب کچھ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھا دیا ہے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ضلعے کے تمام کام مجھے اپنی صوابدید یا حکامِ بالا کی ہدایت کے بجائے اُن کے مشورے کے مطابق کرنے ہوں گے۔ آپ سے ان کے تعلقات کا خیال کر کے مجھے یہ ساری بکواس سننی پڑی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے بنگلے سے رخصت کیا۔ ورنہ وہ جس اطمینان و فرصت سے بیٹھے تھے، اس سے لگتا تھا کہ شاید مجھے لوریاں سنا کر سلانے کا موڈ بھی رکھتے ہیں۔''

شہریار عادل کو اپنے ماموں لیاقت رانا کی ہنسی ایک آنکھ نہ بھائی، سو وہ اُنہیں چودھری افتخار سے متعلق مزید تفصیلات سنانے لگا۔ جنہیں سن کر لیاقت رانا کے حلق سے ایک اور بلند قہقہہ برآمد ہوا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو کر شہریار کو سمجھانے لگے۔

''سمجھا کرو بیٹا جی! ان چودھریوں اور زمینداروں وغیرہ کو بھگتانا بھی تمہاری جاب کا ایک حصہ ہے۔ ان سے بنا کر رکھو گے، تو ہی کامیاب رہو گے۔ کمیشن کا امتحان پاس کر کے اے سی لگ جانا اتنا بڑا کارنامہ نہیں، جتنا ان مگرمچھ جیسے چودھریوں سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ چودھری افتخار تو تمہارے علاقے کا سب سے بڑا اور طاقتور ترین مگرمچھ ہے۔ تمہیں اس کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا۔''

''میں کوئی کمزور سی مچھلی تو نہیں ہوں جو چودھری افتخار مجھے نگل جائے گا۔'' اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے زعم میں شہریار نے لیاقت رانا کی بات پر اعتراض کیا۔

''بے شک تمہارا شمار بھی مگرمچھوں کی کیٹگری میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن سسٹم کو چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود مگرمچھوں میں آپس میں بیر نہ ہو۔ تمہاری تو ویسے بھی یہ پہلی پوسٹنگ ہے۔ بہت زیادہ احتیاط سے، پھونک پھونک کر قدم اٹھاؤ۔ آگے تو خیر تجربے سے بہت کچھ خود ہی سیکھ لو گے۔ مگر ابھی احتیاط لازم ہے۔ چودھری افتخار کے معاملے میں خاص طور پر احتیاط کرنی ہے۔ میں خود بھی اس سے بگاڑنے کے حق میں نہیں ہوں۔ جب ہی تو تمہارے پروگرام کا مقصد سمجھنے کے باوجود چودھری افتخار کے فون آنے پر اُسے ٹال نہیں سکا اور اسے تمہارے بارے میں اطلاع فراہم کر دی۔'' لیاقت رانا نے شہریار کو سمجھایا۔

''آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے معاملات میں کسی سے ڈکٹیشن لینا پسند نہیں کرتا۔ اگر چودھری افتخار نے مجھے ڈکٹیشن دینے اور مجھ پر تسلط جمانے کی کوشش کی تو ہمارا اختلاف لازمی ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم کس مزاج کے ہو۔ تمہارے جیسا مزاج تمہاری ماں کا بھی تھا۔ ہم بھائیوں نے ساری زندگی اس کے نخرے اٹھائے تھے۔ اب بھی میں تمہارے نخرے اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ بلکہ میں نے سجاد سے بھی کہہ دیا ہے کہ تمہارا خاص طور پر خیال رکھے۔ وہ خود تمہیں بہت چاہتا ہے۔ تمہیں اس کی سپورٹ

حاصل رہے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی چھٹی والے دن سجاد سے ملاقات ضرور کر لینا۔ اس کے تجربے سے تمہیں کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔'' سجاد، لیاقت رانا کا اپنا بیٹا تھا جو ان دنوں ڈی آئی جی کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔

''مشورے کا شکریہ ماموں جان! میں کوشش کروں گا کہ اس مشورے پر عمل کر سکوں۔ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ میں کسی کو خود پر مسلط ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور چودھری افتخار جس چھچھورے انداز میں یہ کوشش کر رہا تھا وہ تو میرے لیے بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ جانتے ہیں اس شخص نے میرے یہاں آنے سے قبل ہی بنگلے کا سارا فرنیچر اور پردے وغیرہ تک خود اپنی مرضی سے چینج کروا دیئے تھے۔ میں نے آج تک کسی اور کی پسند سے ایک ٹائی پن تک استعمال نہیں کی، یہ کیسے برداشت کرتا؟ جس ٹرک میں، میں اپنا سامان لے گیا تھا، اسی پر چودھری افتخار صاحب کی ساری عنایتوں کو لوڈ کروا کر آج صبح ان کی حویلی روانہ کر دیا ہے۔ اب یہ بات انہیں بری لگی ہو تو بھی میں ان کی خوشنودی کے لیے وہ سب قبول نہیں کر سکتا تھا۔'' شہریار عادل نے اپنا کارنامہ سنایا تو لیاقت رانا بے ساختہ کراہ کر رہ گئے۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے مزاج دار بھانجے اور تسلط پسند چودھری افتخار کے درمیان مستقبل میں تعلقات کس نہج پر پہنچ سکتے ہیں۔

''تم نے جو کچھ کیا شہریار! میں اسے تمہارے لیے اچھا تو نہیں کہوں گا لیکن اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اصل میں چودھری افتخار ضلع میں آنے والے اکثر اعلیٰ افسران کو اپنی عنایتوں کے زیرِ اثر لینے کا عادی ہے۔ عموماً مڈل کلاس سے ان پوسٹوں پر آنے والے لوگ چودھری کی ان عنایات کو پا کر خوش ہوتے ہیں۔ اپر کلاس سے تعلق رکھنے والے بھی معمول کا ایک حصہ سمجھ کر ان عنایات کو قبول کر لیتے ہیں۔ تمہارے سامنے بھی کئی بار یہ قصے دہرائے تو گئے ہیں لیکن تم چونکہ ایک بالکل مختلف پلان ذہن میں رکھ کر وہاں پہنچے تھے اس لیے تمہیں چودھری افتخار کے روّیے سے یک دم ہی جھٹکا سا لگا۔ بہر حال، جو بھی ہوا اب میری یہ بات کان کھول کر سن لو کہ حتی الامکان تمہیں چودھری افتخار اور اردگرد کے دوسرے زمینداروں سے بنا کر رکھنی ہے۔ بے شک سپورٹ کے لیے میں اور سارا خاندان تمہاری بیک پر موجود ہے۔ لیکن کوشش کرو کہ معاملات اس رخ پر جانے ہی نہ پائیں کہ کسی قسم کی بدمزگی کا سامنا کرنا پڑے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' لیاقت رانا نے شہریار کو سمجھانے کے بعد آخر میں اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' شہریار نے مختصر جواب دیا۔ جوش و ولولے سے بھرے اس نوجوان کے لیے احتیاط اور سمجھوتوں کی یہ راہ کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں تھی۔

⊛----✪----⊛

''ماہ بانو! یہ نچھی اور شادو تجھ سے ملنے آئی ہیں۔'' ماہ بانو آنگن میں رکھی چارپائی پر بیٹھی سرما کی نرم دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ اپنی بہن زہرہ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ تقریباً زہرہ کی ہی عمر کی دو لڑکیاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے شوخ رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑیوں کے علاوہ کانوں اور ناک میں بھی سستا سا نقلی زیور نظر آ رہا تھا۔

''ہم دونوں بڑی بے چین تھیں تجھ سے ملنے کے لئے۔ کتنا عرصہ ہو گیا تُو گاؤں آئی ہی نہیں۔ ہم بس زہرہ سے ہی تیرے ٹھاٹ باٹ کے قصے سنتے رہے۔'' وہ دونوں بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں اور ان میں سے ایک ماہ بانو کو بتانے لگی۔ ماہ بانو نے سوالیہ نظروں سے اپنی بہن زہرہ کو دیکھا۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کو پہچان نہیں سکی تھی۔



''یہ نچھی ہے اور یہ شادو۔ ماسی رحمتے کی بیٹیاں۔ وہی جن کے گھر کے سامنے پیپل کے دو درخت بالکل ایک ساتھ لگے ہوئے ہیں۔'' زہرہ نے ماہ بانو کی نظروں کا سوال سمجھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''اچھا، اچھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہ نسرین اور شاداب ہیں۔ کیسی ہو تم لوگ؟'' ماہ بانو نے اپنی یادداشت کے تازہ ہوتے ہی خوش اخلاقی سے ان دونوں سے پوچھا۔

''ہم تو ٹھیک ہیں۔ تُو سنا کیسی ہے؟ اور اس واری کتنے دنوں کے لیے آئی ہے؟'' نچھی نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ بانو سے پوچھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ رہی کتنے دن رہنے کی بات تو بس ہفتہ دس دن سے زیادہ نہیں رُکوں گی۔ ابا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آنے والے اگلے اتوار کو مجھے لینے آ جائے۔'' ماہ بانو نے اپنے پروگرام کے بارے میں انہیں اطلاع دی۔

''صرف ہفتہ دس دن بعد۔ دو برس بعد آئی ہے۔ کم سے کم دو مہینے کے لیے تو آتی۔'' شادو نے اعتراض کیا۔

''اتنے دنوں کے لیے کیسے آ سکتی ہوں؟ مجھے کالج بھی تو جانا ہوتا ہے۔ ابھی تو سردیوں کی چھٹیاں تھیں تو میں آ بھی گئی۔'' ماہ بانو نے اسے سمجھایا۔

''تو چھٹیاں کوئی صرف دس دن کی تو نہیں ہوں گی۔ تُو زیادہ بھی رک سکتی ہے۔'' شاداب نے اصرار کیا۔

''چھٹیاں تو زیادہ ہیں پر مجھے اپنی پڑھائی بھی کرنی ہے۔ ابا نے وعدہ کیا ہے کہ اگر میرے نمبر اچھے آئے تو مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔'' ماہ بانو نے مسکرا کر بتایا۔

''ہائے ماہ بانو! تُو ڈاکٹر بنے گی؟ مگر سنا ہے کہ ڈاکٹر کی تلیم (تعلیم) تو وڈی مہنگی ہوتی ہے۔ تیرے ابا کی پھلوں کی ریڑھی سے اتنی کمائی ہو جاتی ہے کیا..... کہ وہ تجھے ڈاکٹری پڑھا سکے؟'' نچھی نے حیرت سے منہ کھول کر پوچھا۔ زہرہ سوال جواب کے اس سیشن کو چھوڑ کر باورچی خانے میں جا چکی تھی۔ اسے نوراں کی حویلی سے واپسی سے قبل دوپہر کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا تھا۔

''کیوں نہیں۔ بے بے اور ابا کبھی میری کوئی فرمائش نہیں ٹالتے۔ میری فرمائش پر انہوں نے مجھے کالج میں داخل کروایا ہے۔ بے بے کہہ رہی تھی کہ وہ کمیٹی ڈال کر اتنے پیسے جوڑ لے گی کہ میرا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے۔''

''تیرے تو مزے ہیں۔ زہرہ بتا رہی تھی کہ وہاں کالج میں تُو نے بندوق چلانی بھی سیکھ لی ہے۔ کیا سچ مچ تُو بندوق چلا لیتی ہے؟'' شاداب نے کچھ اس انداز میں سوال کیا جیسے اسے زہرہ کی فراہم کردہ معلومات پر شبہ ہو۔

''صحیح بتا رہی تھی زہرہ۔ اصل میں کالج میں ایف ایس سی کے اسٹوڈنٹس کو این سی سی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بس تم اسے ہلکی پھلکی فوجی ٹریننگ سمجھ لو۔ اس ٹریننگ میں پریڈ کرنا بھی سکھاتے ہیں اور رائفل لوڈ کر کے چلانا بھی۔ ہماری تو اس ٹریننگ کے دوران شہری دفاع کی بھی کلاسیں ہوئی تھیں۔ اس میں ہمیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، انجکشن لگانا اور دوسری چھوٹی چھوٹی باتیں سکھائی گئی تھیں۔ اس ٹریننگ کے بعد تو مجھے اور بھی شوق ہو گیا ہے ڈاکٹر بننے کا۔''

''ہائے اللہ! یہ سب کتنا اچھا لگتا ہو گا تجھے۔ یہاں گاؤں میں تو بڑی رُوکھی پھیکی زندگی ہے۔ روزانہ وہی ایک جیسے کام کرو، ایک جیسے لوگوں سے ملو اور رات کو پڑ کر سو جاؤ۔ کچھ بھی تو الگ نہیں ہوتا۔ گھر میں ٹی وی تک نہیں ہے کہ چلو اس سے دل بہلا لیں۔ پورے گاؤں میں چودھری کی حویلی کے سوا صرف تین ٹی وی ہیں۔ ایک تیرے چاچا کے گھر، دوسرا ماموں ظہور کے گھر جن کا بیٹا فوج میں ہے اور تیسرا ماسٹر آفتاب کے پاس۔ ہم تینوں

میں سے ایک بھی جگہ نہیں جاسکتے۔ ابے کی اجازت ہی نہیں ہے۔'' نچھی نے بڑی حسرت سے بتایا۔

''تُو تو ایسے بول رہی ہے جیسے گاؤں کی باقی لڑکیوں کو اجازت ہو۔ مولوی صاحب نے کتنی سختی سے منع کیا تھا ٹی وی دیکھنے سے..... یاد نہیں۔ ایسے ایسے عذابوں کے بارے میں بتایا تھا کہ میں آج تک کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔'' زہرہ ہانڈی چڑھا کر باورچی خانے سے نکل آئی تھی، نچھی کی بات سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''بس بس رہنے دے۔ تیرے چاچا کا گھر تو تیرا ہونے والا سسرال ہے۔ تیرے منگیتر نے دبئی کی کمائی سے یہ ٹی وی خرید کر بھیجا ہے۔ جب تُو بیاہ کر اُس گھر میں جائے گی تو سارے عذاب وثواب بھول کر ٹی وی دیکھا کرے گی۔'' نچھی فوراً چمک کر بولی۔

''نہ بابا نہ..... میں تو نہیں ٹی وی دیکھنے والی۔ جس کو شوق ہے وہ خود ہی اکیلا دیکھتا پھرے۔'' زہرہ نے ایک بار پھر کان پکڑے۔

''بھئی میرے خیال میں تو ٹی وی دیکھنے میں اتنا کوئی حرج نہیں۔ بندہ اُلٹے سیدھے ناچ گانے کے پروگرام دیکھنے کے بجائے معلوماتی پروگرام دیکھے تو ٹی وی سے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے ذریعے تو گھر بیٹھے وہ مقامات اور ایجادات دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن تک ہماری پہنچ ہی نہیں ہوتی۔ دنیا جہان کی خبریں مل جاتی ہیں ٹی وی سے۔ ابا نے تو پچھلے سال ہی نیا رنگین ٹی وی خریدا ہے۔''

''تم اپنا تو ذکر ہی نہیں کرو۔ تمہیں تو بہت کچھ حاصل ہے۔'' شادو حسد بھرے انداز میں بولی۔

''ہاں یہ تو اللہ کا شکر ہے۔ مگر تم لوگ بھی اپنے لیے بہت کچھ کرسکتی ہو۔ کچھ نہیں تو کم از کم تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا ہی سیکھ لیتیں۔ کتابوں کے ذریعے بھی آدمی دنیا جہان کی سیر کرسکتا ہے۔ لیکن تم لوگوں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ گاؤں میں جیسا بھی سہی، ایک سکول ہے تو۔ اگر تم لوگ وہاں پر ہی جاتی رہتیں تو اس لائق تو ہو جاتیں کہ اردو ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتیں۔'' ماہ بانو نے موقع غنیمت جان کر ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''صاف بات ہے بھئی۔ ہمیں تو پڑھنے لکھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ جنہیں تھا، وہ بھی دو چار جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکیں۔ اسکول میں کوئی استانی تو ہے نہیں۔ اب لڑکیاں مرد استاد سے تو پڑھنے سے رہیں۔'' نچھی نے جواب دیا۔

''یہ مسئلہ تو ہے۔ گورنمنٹ کو چاہئے کہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔ اگر ایک لیڈی ٹیچر یہاں آجائے تو گاؤں کی بہت لڑکیوں کا بھلا ہوجائے گا۔'' ماہ بانو نے پُرخیال لہجے میں تبصرہ کیا۔

''رہنے بھی دو۔ پڑھ لکھ کر ہم لڑکیوں نے کیا کرنا ہے؟ ہانڈی روٹی، سلائی کڑھائی، چنائی سارے کام بغیر تعلیم کے بھی آرام سے ہوجاتے ہیں۔'' نچھی نے گویا ناک پر سے مکھی اُڑائی۔

''ایسا کرو ماہ بانو! تم اِدھر آجاؤ۔ تم اِدھر ہمارے ساتھ رہنا اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا۔'' زہرہ نے اچانک ہی تجویز پیش کی۔

''مم..... میں..... مگر مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے۔'' ماہ بانو پہلے اس تجویز پر بوکھلائی، پھر پُرخیال لہجے میں بولی۔

''ہمیشہ کے لیے تو نہیں پر ایسا ہوسکتا ہے کہ جب گرمیوں میں کالج کی لمبی چھٹی پڑے تو یہاں رہنے آجاؤں اور جن لڑکیوں کو شوق ہو، انہیں پڑھنا لکھنا سکھا دوں۔''

''بس، بس..... رہنے دو یہ شیخ چلی کے منصوبے۔ چودھری صاحب کو معلوم ہوگیا نا کہ کوئی ایسا سوچ رہا ہے تو وہ اس کے ٹوٹے ٹوٹے کرڈالیں گے۔ اُنہیں نہیں پسند لڑکیوں کا اسکول میں پڑھنا۔'' نچھی نے اپنی گول گول آنکھوں کو گھماتے ہوئے تیز لہجے میں ماہ بانو کو ٹوکا۔ ماہ بانو اُس کے اس انداز پر کچھ ناگواری محسوس کرتی



ہوئی دوبارہ اس کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی جس کے مطالعے میں وہ ان دونوں بہنوں کی آمد سے قبل مصروف تھی۔ اپنی اس مصروفیت میں اسے معلوم بھی نہیں ہوسکا کہ نچھی اور شادو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا تبادلہ خیال کیا اور کب وہاں سے روانہ ہوگئیں۔

⊛----✪----⊛

''بڑی چودھرائن نے کہلوایا ہے کہ کام پر آتے ہوئے ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ حویلی لے کر آنا۔'' نوراں صبح تڑکے اُٹھ کر جلدی جلدی گھر کا کام کاج نمٹا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور آنے والی نے نوراں کا منہ دیکھتے ہی اسے پیغام پہنچایا۔

''ماہ بانو کو بلایا ہے..... پر کس لئے؟'' نوراں حیران ہوئی۔ خود اس کا تو برسوں سے معلوم تھا کہ صبح سے دوپہر تک کا وقت حویلی والوں کی خدمت کرتے ہوئے گزارتی تھی لیکن چار دن کی مہمان آئی ماہ بانو کو حویلی سے بلائے جانے کا مقصد اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''مجھے تو خبر نہیں۔ تُو جا کر آپ ہی سوال جواب کر لینا وڈی چودھرائن سے کہ انہوں نے کیوں تیری دِھی کو بلایا ہے۔'' پیغام لانے والی حویلی کی ملازمہ نے طنزیہ لہجے میں نوراں کو جواب دیا۔

''نہ نہ..... میں بھلا کون ہوتی ہوں وڈی چودھرائن سے سوال جواب کرنے والی۔ انہوں نے حکم دیا ہے تو ماہ بانو کو لے کر ہی آؤں گی۔'' نوراں نے گھبرا کر خوشامدی لہجہ اختیار کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس ملازمہ نے جا کر بڑی چودھرائن سے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیا تو اس کی مصیبت ہی آجائے گی۔ گاؤں کے بیشتر گھروں کی طرح اس کے گھر کا رزق بھی حویلی سے ہی وابستہ تھا اور حویلی والے خفا ہوتے تو اپنے مجرم کی پیٹ پر لات سب سے پہلے مارتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ تُو ماہ بانو کو لے کر ٹیم (ٹائم) پر پہنچ جانا۔'' ملازمہ نخوت سے کہتی ہوئی پلٹ گئی مگر نوراں کے اندر ہول اُٹھنے لگے۔ ماہ بانو پہلے بھی کئی بار گاؤں آکر رہی تھی لیکن اس سے پہلے تو کبھی چودھرائن کو اسے حویلی بلوانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ نوراں کے تجربے کی روشنی میں بڑی چودھرائن کا خاص طور پر پیغام بھیج کر ماہ بانو کو حویلی میں طلب کرنا کسی مصیبت کا پیش خیمہ تھا لیکن حکم کی تعمیل تو بہرحال کرنی ہی تھی۔ انہی سوچوں میں گھری ہوئی وہ دروازے سے اندر کی طرف پلٹی۔ آنگن میں زہرہ تنکوں والی جھاڑو سے نیم پختہ فرش پر بکھرے نیم کے گرے ہوئے پتوں کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر رہی تھی۔

''نی زہرہ! جا کر ذرا ماہ بانو کو تو جگا۔'' زہرہ کو حکم دے کر نوراں باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

''وہ نہیں اُٹھتی اماں! لگتا ہے مُردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد ہی زہرہ نے آکر بے زاری سے اطلاع دی۔

''اچھا تُو ادھر آکر یہ دودھ بلو۔ میں آپ ہی اسے دیکھتی ہوں۔'' نوراں اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ زہرہ نے فوراً ہی اس کی جگہ سنبھال لی۔ زہرہ صبح اس کے ساتھ ہی جاگ جاتی تھی اور گھر کے کاموں میں دوڑ دوڑ کر نوراں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آج بھی اس نے غیاث کے کھیتوں پر روانگی سے پہلے اس کا اور چھوٹے بھائی الیاس کا ناشتہ تیار کر کے دیا تھا اور اب گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ نوراں کی بڑی بیٹی نگار بھی اپنے بیاہ سے قبل اسی طرح اُس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لیکن ماہ بانو اپنی بڑی دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ شہری زندگی اور گاؤں سے دُوری نے اس کا مزاج اور معمولات بدل دیئے تھے۔ اب بھی نوراں آنگن سے گزر کر کمرے میں پہنچی تو اسے ماہ بانو

لحاف میں دبکی دنیا و مافیہا سے بے خبر سوتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی بے حد گہری نیند کو دیکھ کر قطعی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل کسی نے اسے جگانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

''ماہ بانو! اُٹھ جا۔ دیکھ کتنا دن نکل آیا ہے۔'' نوراں نے نرمی سے ماہ بانو کا بازو ہلاتے ہوئے اسے آواز دی لیکن وہ اس پکار پر ذرا سا کسمسا کر دوسری طرف کروٹ بدل کر دوبارہ سو گئی۔ نوراں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنی آسانی سے بستر چھوڑنے والی نہیں۔ خود اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ بیٹھی ماہ بانو کے ناز نخرے اُٹھاتی رہتی۔ اسے وقت پر حویلی پہنچنا تھا، وہ بھی ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر۔ چنانچہ اس بار اس نے نرمی اور مروّت سے کام لینے کے بجائے ماہ بانو کے اوپر سے لحاف گھسیٹا اور اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ ماہ بانو نے اس دہری افتاد سے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہے اماں! کیوں اتنے سویرے پیچھے پڑ گئی ہو؟ ابھی تو سورج بھی پوری طرح نہیں نکلا۔'' ماہ بانو نے بستر پر بیٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے احتجاج کیا۔

''کوئی اتنی سویر نہیں ہے۔ اچھا خاصا دن چڑھ آیا ہے۔ اب سورج کمرے کے اندر آ کر تو نکلنے سے رہا۔ تُو باہر نکل کر دیکھ، اچھا خاصا اُجالا ہو رہا ہے۔ زہرہ نے گھنٹہ بھر پہلے اُٹھ کر آدھا کام کاج بھی نبیڑ لیا ہے لیکن تُو ابھی تک پوستیوں کی طرح بستر پر پڑی ہے۔ حوراں نے تیرا دماغ زیادہ ہی خراب کر دیا ہے۔ صبح اتنی دیر تک پڑی سوئی رہتی ہے۔'' نوراں نے لحاف تہہ کر کے رکھتے ہوئے اسے پھٹکارا۔

''تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے اماں! رہنا تو مجھے بے بے کے ساتھ ہی ہے۔ اگر تمہیں میرا یہ چند دن کا رہنا بھی اچھا نہیں لگتا تو میں ابا کو بلوا لیتی ہوں کہ آ کر مجھے واپس لے جائیں۔'' ماہ بانو نے خفگی دکھائی۔

''اچھا، اب زیادہ اُلٹی سیدھی باتیں نہ کر۔ باہر نکل کر منہ ہاتھ دھو۔ زہرہ نے تیرا ناشتہ تیار کر دیا ہوگا۔ جا کر کھا لے۔'' نوراں اچھی طرح جانتی تھی کہ ماہ بانو کے دل میں اس کے خلاف شکوہ ہے۔ مگر اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ بانو کو گھر کا۔ ماہ بانو چپل پیر میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلی۔ باورچی خانے سے مدہانی کی گھر گھر سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیدھی غسل خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے نکل کر برآمدے میں بچھے پلنگ پر واپس آ کر بیٹھی تو زہرہ ناشتہ لے آئی۔

''چل چھیتی کھا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تجھے میرے ساتھ حویلی چلنا ہے۔'' نوراں نے اسے حکم دیا۔

''کیوں؟..... میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ حویلی؟'' ماہ بانو بدکی۔

''وڈی چودھرائن نے پیغام بھیجا ہے کہ تجھے ساتھ لے کر آؤں۔ تُو میرے ساتھ چل کر انہیں سلام کر لینا، پھر واپس آ جانا۔'' نوراں نے اسے پھسلانے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں جانا وڈی چودھرائن کو سلام ولام کرنے۔'' ماہ بانو نے صاف انکار کیا۔

''دیکھ ماہ بانو! مجھے تنگ نہ کر۔ وڈی چودھرائن نے خود سے تجھے بلوایا ہے۔ اگر تُو نہیں گئی تو وہ برا مانے گی۔ اور پھر تجھے وہاں جا کر کرنا ہی کیا ہے؟ سلام کر کے ایک طرف بیٹھ جانا۔ میں موقع دیکھ کر تھوڑی ہی دیر میں تجھے کسی کے ساتھ واپس گھر بھجوا دوں گی۔'' نوراں نے ماہ بانو کو سمجھایا۔ ماہ بانو پر اس کے سمجھانے بجھانے کا تو خیر کیا اثر ہوتا لیکن ماں کی مجبوری کا خیال کر کے چپ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ حویلی والے کتنے نازک مزاج لوگ ہیں۔ ماہ بانو کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر وہ لوگ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں پر گاؤں کی زمین تنگ کر سکتے تھے۔ ماہ بانو اپنے اس چند روزہ قیام کو اپنے گھر والوں کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنانا چاہتی تھی، چنانچہ دل میں ناگواری محسوس کرنے کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں چادر اوڑھ کر نوراں اس کے ساتھ حویلی



جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

''سلام کر کے ایک طرف چپکی کھڑی ہو جانا۔ زیادہ پٹر پٹر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حویلی کی طرف جاتے ہوئے نوراں راستے بھر ماہ بانو کو ہدایات دیتی رہی۔ دراصل وہ خود بڑی چودھرائن کے ماہ بانو کو بلوا بھیجنے پر گھبرائی ہوئی تھی اور کسی انہونی کے ہونے کے ڈر سے پہلے سے پیش بندیاں کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

''سلام وڈی چودھرائن!'' حویلی پہنچ کر نوراں نے سب سے پہلے بڑی چودھرائن کے سامنے حاضری دی اور اس کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ ساتھ ہی اس نے ماہ بانو کو بھی کہنی مار کر سلام کرنے کا اشارہ کیا۔

''السلام علیکم جی!'' ماہ بانو نے دھیمی آواز میں سلام کیا۔ چودھرائن جو چودھری افتخار کی بیویوں میں پہلے نمبر پر اور عمر میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے وڈی چودھرائن کہلاتی تھی، سلام کا جواب دینے کے بجائے بہ غور ماہ بانو کا جائزہ لینے لگی۔ ماہ بانو اپنی بہنوں کے مقابلے میں لاکھ کھلے ماحول میں اور آزادی سے پلی بڑھی تھی لیکن بڑی چودھرائن کی خود پر بھی تنقید بھری، کاٹ دار نگاہوں سے سہمنے لگی۔

''شہری کُڑیوں کی طرح فیشنی لگتی ہے۔ تُو نے تو بہن کو اپنی کُڑی دے کر اس کا ناس مار دیا ہے نوراں!'' ماہ بانو کے سادہ سے کاٹن کے سوٹ اور بڑی سی چادر کے باوجود بڑی چودھرائن نے فتویٰ صادر کیا۔

''کیا کرتی جی۔ ماں جائی کے آنسو اور اکیلا پن بھی تو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اُس نے جھولی پھیلائی تو منع نہیں کر سکی۔'' نوراں نے خوشامدی لہجے میں بڑی چودھرائن کے سامنے عذر پیش کیا۔ ماہ بانو اپنی جگہ کھڑی چپ چاپ ہونٹ کاٹتی رہی۔

''سنا ہے وہاں شہر میں رہ کر بڑی اونچی اُڑان بھر رہی ہے تیری بیٹی۔ شہری لڑکیوں کی طرح پڑھنے کے لیے کالج بھی جاتی ہے۔'' بڑی چودھرائن نے قہر زدہ لہجے میں فردِ جرم عائد کی۔ اس بار نوراں سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ وہ تو خود ماہ بانو کے کالج میں پڑھنے سے زیادہ خوش نہیں تھی۔ چنانچہ بڑی چودھرائن کی بات سن کر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔

''بھلے سے تم نے کُڑی اپنے بہن بہنوئی کو گود دے دی ہے لیکن ہے تو یہ تمہاری اپنی دِھی۔ لڑکی ذات کے اس طرح آزاد پھرنے پر تم لوگوں کو غیرت نہیں آتی؟ تمہیں چاہئے تھا کہ اس کے خالہ خالو کو اسے کالج بھیجنے سے منع کرتیں اور اگر وہ لوگ نہ مانتے تو اسے واپس اپنے پاس یہاں گاؤں لے آتیں۔ جہاں ہم تمہارے سارے کنبے کو پال رہے ہیں، وہاں یہ بھی ایک پل جاتی۔'' بڑی چودھرائن نے تقریر کرتے ہوئے نوراں پر کفالت کا احسان جتایا۔ حالانکہ یہ وہ احسان تھا جس کو اُتارتے اُتارتے نوراں اور غیاث کی ہڈیاں تک گھسنے لگی تھیں لیکن ظاہر ہے بڑی چودھرائن کو یہ بات جتائی نہیں جا سکتی تھی۔ یوں بھی برسوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ذہن اپنے کسی حق کو پہچانتے ہی کہاں تھے۔

اس وقت بھی بڑی چودھرائن کی کسی بات پر برا ماننے کے بجائے نوراں کا ذہن مسلسل اس فکر میں اٹکا ہوا تھا کہ جانے کس بدخواہ نے چودھرائن کے کان بھر کر اسے نوراں اور ماہ بانو کے خلاف بھڑکایا ہے۔ ورنہ حویلی کی بڑی چودھرائن کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی کہ وہ برسوں پہلے فیصل آباد میں حوراں اور صفدر کو گود دے دی جانے والی ماہ بانو کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ ہوتی۔

''صفدر اسے لینے آئے گا تو میں اس سے بات کروں گی جی۔ وہ میرے کہنے سے ماہ بانو کو کالج سے اُٹھوا لے گا۔'' بڑی چودھرائن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے نوراں نے اسے تسلی دی لیکن ماہ بانو اس بات کو سن کر تڑپ اُٹھی۔

''میں ہرگز بھی کالج جانا نہیں چھوڑوں گی۔'' جذبات میں آ کر وہ نوراں کی طرف سے عائد کردہ حکمِ زباں بندی کو فراموش کر چکی تھی۔

''تُو چپ کر۔'' نوراں گھبرا کر ماہ بانو پر اُلٹی۔

''نہ..... بولنے دے اسے نوراں! ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ تعلیم (تعلیم) نے اس کی زبان کے کتنے ٹانکے کھول دیئے ہیں۔'' بڑی چودھرائن نے طنز کیا۔

''بچی ہے جی۔ اِدھر کے طور طریقوں کو نہیں جانتی۔ آپ معافی دے دیں۔'' نوراں نے ہاتھ جوڑے۔

''تو پھر سکھا اسے طور طریقے۔ بلکہ ایسا کر کہ جب تک یہ یہاں ہے، اسے پابندی سے روز اپنے ساتھ حویلی لے کر آ۔ یہاں دوسری عورتوں کے ساتھ اُٹھے بیٹھے گی، تب ہی تو کچھ سیکھے گی اور دماغ میں بات بیٹھے گی۔'' چودھرائن نے جابرانہ انداز میں حکم دیا۔ نوراں اور ماہ بانو دونوں ہی اس افتاد پر ہراساں سی ہو گئیں۔

''اسے جانے دیں جی۔ یہ تو ادھر تھوڑے دن کی مہمان ہے۔ پھر تو فیصل آباد واپس چلی جائے گی۔ ویسے بھی اسے کوئی کام کاج کہاں آتا ہے؟ اس کے حویلی آنے سے کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں ہوگا۔'' نوراں نے عاجزی سے بڑی چودھرائن کو اس کا حکم واپس لینے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

''یہ تھوڑے دن کی مہمان ہے، پر تمہیں تو ادھر ہی رہنا بسنا ہے..... یا تمہارا بھی ارادہ ہے دِھی کے ساتھ اس گاؤں کو چھوڑ جانے کا؟'' چودھرائن کے تند لہجے میں جو دھمکی پوشیدہ تھی، اس نے نوراں کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا۔ ماہ بانو بھی اپنی جگہ ہکا بکا اور سہمی ہوئی کھڑی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''سر! چودھری افتخار کا منشی اللہ رکھا آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔'' شہریار عادل ایک فائل کے مطالعے میں منہمک تھا کہ پی اے عبدالمنان نے انٹرکام پر اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہریار کو شدید کوفت کا احساس ہوا۔ پرانے اے سی سے چارج لینے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ ضلع کو درپیش مسائل اور دیگر معاملات کو جلد از جلد سمجھ لے تاکہ فرائض کی ادائیگی میں آسانی رہے۔ لیکن یہ وقت بے وقت کے ملاقاتی اسے ڈھنگ سے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مہلت ہی نہیں دے رہے تھے۔ اوّل روز تو خیر چودھری افتخار کا اس پر مکمل طور پر قبضہ رہا اور صرف وہی لوگ شہریار سے مل سکے جو چودھری افتخار کے ساتھ اس کے بنگلے پر آئے تھے۔ یہ سارے لوگ کسی نہ کسی حوالے سے چودھری کے رشتے دار تھے اور شاید اسی وجہ سے چودھری افتخار کی موجودگی میں شہریار سے ملاقات کی رعایت حاصل کر پائے تھے۔ لیکن ان افراد کے سوا کوئی اور شخص اس دن شہریار کے قریب پَر مارنے کی کوشش بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ سارے محروم رہ جانے والے افراد وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ ان افراد میں زیادہ تر اردگرد کے دیہاتوں میں رہنے والے چھوٹے زمیندار شامل تھے جو ملاقات کے لیے آتے ہوئے شہریار کے لیے تحفے تحائف بھی ساتھ لاتے تھے۔ رانا لیاقت کی ہدایات کے پیشِ نظر شہریار نے ان تحائف کو واپس لوٹانے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی، البتہ وہ خود انہیں استعمال کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے اسٹاف کے مزے آئے ہوئے تھے اور وہ موجیں اُڑا رہے تھے۔ ملاقاتیوں کی دوسری قسم ضلعے میں تعینات مختلف سرکاری افسران کی تھی جو نئے اے سی سے بنا کر رکھنے کے خواہش مند نظر آتے تھے لیکن ان کے انداز میں نسبتاً کم چھچھورا پن تھا۔ خود شہریار بھی ان افراد سے ملاقات کو انتظامی نقطہ نظر سے بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ پہلے گروپ سے مصلحتاً اور دوسرے گروپ سے ضرورتاً ملاقات کا فریضہ انجام دیتا رہتا تھا۔ اس وقت چودھری افتخار کے منشی کی آمد اسے نہ صرف ناگوار گزری تھی



بلکہ اس کے کام میں حرج کا بھی سبب بنی تھی۔ لیکن گلے میں پڑے مصلحت کے طوق نے اس ناگواری کے اظہار کا موقع نہیں دیا اور بادل ناخواستہ اسے عبدالمنان کو منشی کو اندر بھیجنے کی اجازت دینی پڑی۔

''سلام اے، ہی صاحب!'' منشی نے اندر داخل ہوتے ہی زوردار آواز میں سلام جھاڑا۔

''بیٹھئے۔'' اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے شہریار نے منشی سے کہا تو وہ بڑے ٹھسے سے سامنے پڑی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ وہ چودھری افتخار کا منشی تھا۔ اسے چودھری کے دستِ راست اور رازداں ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس نے منشی کی گردن میں سریا فٹ کر کے اس کی گردن میں چودھری افتخار جتنی تو نہیں مگر اچھی خاصی اکڑ پیدا کر دی تھی۔ سر پر رکھے اونچے شملے، سفید کلف لگے کُرتے اور چوخانوں والے تہ بند کے ساتھ وہ خود بھی کوئی چھوٹا موٹا زمیندار ہی دکھائی دیتا تھا۔

''کیسے آنا ہوا اللہ رکھا؟'' منشی کو کسی طویل تمہیدی گفتگو کا موقع دینے سے بچنے کے لیے شہریار نے فوراً ہی اُس سے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

''اس جمعے کو چودھری صاحب کے دادا حضور جناب مراد عالم شاہ صاحب کا سالانہ عرس مبارک منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ضلعے کے علاوہ لاہور، فیصل آباد، سیالکوٹ اور دوسرے شہروں سے بھی خاص خاص احباب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ آپ کے لیے بھی چودھری صاحب جناب نے اس موقعے پر خصوصی دعوت نامہ ارسال کیا ہے۔ چودھری صاحب خود تشریف لاتے لیکن گوناگوں مصروفیات کے باعث آ نہیں سکے۔ پر انہوں نے مجھ سے آپ کی شرکت! کے لیے خصوصی اصرار کہلوایا ہے۔ آپ کی عرس میں آمد ان کے لیے باعثِ خوشی ہوگی۔''

اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منشی اللہ رکھا نے دعوت نامہ شہریار کی طرف بڑھایا۔ سرخ مخملیں کپڑے پر سنہری حروف سے تحریر کردہ یہ دعوت نامہ مغلیہ عہد کے ان پیغامات کی یاد تازہ کر رہا تھا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ چودھری افتخار کی حیثیت بھی اس علاقے میں کسی مطلق العنان بادشاہ سے کم نہیں تھی، چنانچہ اس کی طرف سے آنے والے دعوت نامہ کو اتنا ہی شاندار ہونا ضروری تھا۔

شہریار نے دعوت نامے کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے بعد اسے لپیٹ کر ایک جانب رکھ دیا۔

''آپ عرس شریف میں تشریف لائیں گے نا جناب؟'' شہریار کا انداز دیکھتے ہوئے منشی اللہ رکھا نے اس کی شرکت سے متعلق یقین دہانی کرنا ضروری سمجھا۔

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' شہریار نے بے نیازی سے جواب دیا۔ جانا تو اُسے پڑے گا، وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن چودھری افتخار یا اس کے کسی نمائندے کے سامنے بالکل ہی سپر ڈال دینے پر تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی شخصیت کا وقار اور برتری بہر حال قائم رکھنی تھی۔ شہریار کے اس انداز پر منشی اللہ رکھا اپنا پورا زورِ بیان خرچ کر کے اس کی شرکت پر اصرار کرتا رہا لیکن شہریار نے اس کی روانگی تک بھی اپنا انداز مبہم ہی رکھا۔

''یہ کیا سلسلہ ہے بھئی؟'' منشی کے روانہ ہو جانے کے بعد شہریار نے عبدالمنان کو طلب کیا اور اسے دعوت نامہ دکھاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''چودھری صاحب کے دادا حضور کا عرس مبارک..... آپ اس قسم کے سلسلوں سے واقف نہیں ہیں سر؟'' عبدالمنان نے مسکراتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

''واقف ہوں۔ لیکن یقین نہیں آتا کہ چودھری افتخار کے خاندان میں بھی ایسا کوئی مردِ مومن گزرا ہوگا، جس سے لوگ اتنی عقیدت رکھیں گے کہ باقاعدہ اس کا عرس منایا جائے۔'' شہریار نے صاف گوئی سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ اس بار عبدالمنان کی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔ یقیناً اگر اسے اور شہریار کے درمیان حفظِ مراتب

کا خیال نہ ہوتا تو یہ مسکراہٹ ایک زوردار قہقہے کا روپ دھار لیتی۔ مسکراہٹ پر بھی اس نے لمحوں میں قابو پا لیا اور نہایت متانت سے شہریار کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اسے بتانے لگا۔

''چودھری افتخار کے خاندان میں کافی عرصے سے پیری مریدی کا یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ رہی لوگوں کی عقیدت کی بات تو یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں اور نہ ہی اس کے لیے پیر صاحب کے مردِ مومن ہونے کی کوئی شرط ہے۔ جہالت اور غربت کے مارے یہ لوگ جن کے پاس وسائل کے مقابلے میں مسائل کا ڈھیر لگا رہتا ہے، ہمیشہ کسی ایسے معجزاتی یا جادوئی سہارے کے متلاشی رہتے ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے نہ حل ہونے والے مسائل و مصائب سے نجات حاصل کر سکیں۔ ان لوگوں کے لیے پیر صاحب کی کرامات کے چند قصوں کے ساتھ انکار کرنے والوں کے دہشت ناک انجام سے متعلق واقعات کا چرچا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ بس یہی ہتھکنڈے ہوں گے جو چودھری افتخار کے دادا حضور نے استعمال کیے ہوں گے۔ بعد میں تو سلسلہ چل نکلا۔ اب یہ حال ہے کہ دُور دُور تک ان کے عقیدت مند پائے جاتے ہیں۔ دادا کی موت کے بعد چودھری افتخار کے والد نے پیری کی یہ گدی سنبھالی اور اب چودھری صاحب خود گدی پر براجمان ہیں۔ ایک طرف آبائی زمینیں ہیں تو دوسری طرف آباء کی قبروں پر بنائی گئی درگاہ۔ زمینیں سونے جیسی فصلیں اُگلتی ہیں اور قبروں پر سونے چاندی کے نذرانے چڑھائے جاتے ہیں۔ چودھری افتخار دونوں طرف سے مزے میں ہے۔''

عبدالمنان کی تجربہ کار نگاہوں نے مختصر عرصے میں ہی شہریار کی شخصیت کی راست بازی کو بھانپ لیا تھا، اس لیے اس وقت وہ بہت کھل کر شہریار کو کافی کچھ بتا گیا تھا۔ عبدالمنان سے حاصل کردہ معلومات پر اندر ہی اندر حیرت میں مبتلا شہریار نے ان معلومات پر بنا کوئی تبصرہ کیے عبدالمنان سے مشورہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، مجھے چودھری افتخار کی دعوت پر عرس میں شرکت کے لیے جانا چاہئے یا نہیں؟''

''بالکل جانا چاہئے سر! تعلقات کو بہتر رکھنے اور اردگرد کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے اس قسم کی دعوتوں میں شرکت کرنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔'' عبدالمنان نے فوراً جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ پھر یہ معاملہ تو طے ہو گیا۔ اب تم ایک کام یہ کرو کہ آنے والی درخواستوں میں سے ان افراد کی درخواستیں جو پہلے بھی اپنے مسائل کے لیے یہاں رجوع کرتے رہے ہیں، الگ کر کے اور ساتھ ہی ریکارڈ میں موجود پچھلی درخواستیں بھی نکلوا کر مجھے دے دو۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے معاملات جو برسوں سے اٹکے ہوئے ہیں انہیں ترجیحی بنیادوں پر پہلے دیکھ لوں۔ پھر باقی چیزیں بھی انشاء اللہ ایک ایک کر کے روٹین میں آ جائیں گی۔''

''او کے سر!'' شہریار کے حکم پر عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا۔ پھر یک دم ہی کوئی خیال آنے پر کمرے سے باہر جاتے ہوئے پلٹا۔ ''سر! چودھری صاحب کا منشی اپنے ساتھ پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکرے لایا تھا۔ ان کا کیا کرنا ہے؟''

''کسی قریبی بستی میں بھجوا کر ضرورت مندوں میں تقسیم کروا دو۔ میرے لیے میری اور میرے باپ دادا کی کمائی کافی ہے۔ چودھری افتخار کے بزرگوں کی ''برکت'' سے فیض یاب ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔'' شہریار نے جواب دیا تو عبدالمنان سر کو تفہیمی جنبش دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس بار اس کا واسطہ ایک مختلف مزاج رکھنے والے اے، سی سے پڑا تھا۔ اور عبدالمنان کا تجربہ بتا رہا تھا کہ آنے والے وقت میں بہت کچھ مختلف ہونے والا ہے۔

⊛----✪----⊛



بڑی چودھرائن کا حکم ناگوار گزرنے کے باوجود ماہ بانو اگلی صبح نوراں کے ساتھ حویلی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ پہلے پہل تو اس نے بڑی چودھرائن کے حکم کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن نوراں اسے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی۔ نوراں کی ان کوششوں پر بے زار ہو کر ماہ بانو نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آج شام ہی واپس فیصل آباد چلی جائے گی۔ اُس کے اس اعلان پر نوراں باقاعدہ منت سماجت پر اُتر آئی تھی۔ اس نے ماہ بانو کے آگے ہاتھ جوڑ کر اُسے اُس کے ارادے سے باز رہنے کی استدعا کی تھی۔ ماہ بانو لاکھ اپنے سگے ماں باپ کے خلاف دل میں شکوہ رکھتی تھی اور حوراں اور صفدر کو ان پر ترجیح دیتی تھی لیکن تھی تو بہرحال نوراں کی ہی اولاد۔ اس سے ماں کے اپنے آگے بندھے ہاتھ نہ دیکھے گئے اور وہ اپنے دل پر جبر کر کے اس کی بات ماننے پر آمادہ ہو گئی۔ نوراں خود بھی جانتی تھی کہ ماہ بانو کے لیے حویلی کی چاکری ایک نہایت ناقابل برداشت کام ثابت ہو گا لیکن وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ یہ اس کے پورے خاندان کی بقا کا مسئلہ تھا۔ ماہ بانو کا انکار حویلی والوں کا عتاب بن کر ان سب پر نازل ہوتا۔ بڑی چودھرائن کی دھمکی سے صاف ظاہر تھا کہ اگر اس کی بات نہیں مانی گئی تو گاؤں کی زمین نوراں کے گھرانے کے لیے تنگ کر دی جائے گی۔ یہ زمین تنگ ہو جاتی تو وہ لوگ کہاں جاتے؟ اس زمین سے ان کا روزگار اور رشتے ناتے جڑے تھے۔ یہاں ان کے بزرگوں کی ہڈیاں گڑی تھیں۔ بڑی بیٹی نگار اسی گاؤں میں ماسی ممتاز کے بیٹے انور سے بیاہی ہوئی تھی۔ زہرہ کا رشتہ بھی اپنے چاچا کے بیٹے رب نواز سے طے تھا۔ رب نواز کمانے کے لیے دبئی گیا ہوا تھا۔ اگلے ماہ اس کی آمد متوقع تھی۔ وہ مختصر چھٹی پر گاؤں آ کر واپس دوبارہ دبئی چلا جاتا۔ اس عرصے میں انہیں زہرہ کی شادی کی تیاری کر کے اسے بیاہنا تھا۔ شادی کے اخراجات کے لیے رقم چودھری ہی مہیا کرتا۔ رقم کی یہ فراہمی پہلے ہی نوراں اور غیاث کے نزدیک مشکوک تھی۔ وہ لوگ ابھی تک نگار کی شادی پر لیا جانے والا قرض بھی نہیں اُتار پائے تھے۔ ایسے میں زہرہ کی شادی کے لیے مزید قرض طلب کرنا ویسے ہی اچھا خاصا مشکل اور پریشان کن مرحلہ تھا۔ ان حالات میں اگر ماہ بانو بڑی چودھرائن کا حکم ماننے سے انکار کر دیتی تو وہ لوگ کیا کرتے؟ چنانچہ نوراں نے اپنی مجبوریوں اور مشکلوں کا واسطہ دے کر بالآخر ماہ بانو کو راضی کر ہی لیا اور اب حویلی جاتے ہوئے ماہ بانو، نوراں کے ساتھ تھی۔

''سلام وڈی چودھرائن!'' حسب معمول نوراں نے حویلی پہنچ کر سب سے پہلے بڑی چودھرائن کی خدمت میں حاضری دی۔ کہنے کو اس حویلی میں چودھری افتخار کی دوسری بیوی بھی رہتی تھی لیکن حویلی پر حکمرانی بڑی چودھرائن ہی کی تھی۔ حویلی کے اندرونی امور میں اسی کے احکامات کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی تھی۔ چنانچہ ملازمائیں بھی سب سے زیادہ اُس کی چاکری کرتی تھیں۔

''آ گئی تیری لاڈو تیرے ساتھ۔ چل یہ اچھا ہوا۔'' بڑی چودھرائن نے ماں کی تقلید میں دھیرے سے سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو جانے والی ماہ بانو کو تیز نظروں سے گھورا اور پھر اس کا بہ غور جائزہ لینے لگی۔ آج ماہ بانو نے نوراں کی ہدایت پر حویلی آنے کے لیے اپنے کپڑوں کے بجائے زہرہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دو عدد پیوند لگے، یہ پرانے سے کپڑے بڑی چودھرائن کی آنکھوں میں اطمینان کے رنگ لے آئے تھے۔

''اسے پچھلے دالان میں چاول صاف کرنے والی عورتوں کے ساتھ لگا دے۔ کسی اور کام جوگی تو یہ مجھے لگتی نہیں ہے۔'' بڑی چودھرائن نے نخوت سے نوراں کو حکم دیا تو وہ فوراً ہی ماہ بانو کا بازو تھام کر حکم کی تعمیل کے لیے پلٹی۔

''سن!'' بڑی چودھرائن نے پیچھے سے آواز دے کر روکا۔

''حکم وڈی چودھرائن!'' نوراں فوراً متوجہ ہوئی۔

''کسی کو بھیج کر زہرہ کو بھی بلوا لے۔ چار دن رہ گئے ہیں عرس میں۔ حویلی میں کرنے والے بہت کام

پڑے ہیں۔ لیکن تم نمک حراموں کو تو کبھی خود سے اس بات کا خیال نہیں آتا کہ کام کے وقت آپ ہی اپنی مہارانیوں کو حویلی لے آؤ۔ ویسے اپنے مطلب کے لیے جب دیکھو حویلی کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ اب بھی مجھے خبر ہے کہ لنگر کے وقت سارا ٹبر مر بھکنوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا لیکن کام کرنے سے تم لوگوں کو موت آتی ہے۔''

''معاف کر دیں وڈی چودھرائن! بس میری مت ماری گئی تھی کہ سامنے کی بات کا خیال نہیں آیا۔ میں ابھی کسی کو بھیج کر زہرہ کو بلوا لیتی ہوں۔'' چودھرائن کے بے نقط سنانے پر نوراں کے ماتھے پر ایک بل تک نمودار نہیں ہوا اور اس نے بڑی عاجزی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی چودھرائن کو تسلی دی کہ جلد زہرہ بھی اس کی خدمت میں حاضر ہو گی۔ بڑی چودھرائن نے نوراں کی اس عاجزی کے جواب میں ایک نخوت بھری ''اونہہ'' کی اور کسی دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ نوراں، ماہ بانو کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ پچھلے دالان کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں رک کر حویلی میں ہی کام کرنے والے بارہ تیرہ سال کے لڑکے کو زہرہ کو بلوانے کے لیے گھر کی طرف روانہ کیا اور پھر ماہ بانو کو ساتھ لے کر پچھلے دالان میں پہنچ گئی۔ یہاں گاؤں کی کئی عورتیں چاولوں کے ڈھیر کے سامنے ایک قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے بڑے بڑے سوپ تھے جن میں چاول ڈال کر وہ بڑی پھرتی سے انہیں پھٹک پھٹک کر صاف کر رہی تھیں۔ نوراں نے ماہ بانو کو بھی اس قطار میں بٹھا کر ایک سوپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے ذمے برتنوں کی دُھلائی کا کام تھا۔ کئی افراد پر مشتمل اس حویلی میں جہاں ہر وقت کی مہمان داری بھی لگی رہتی تھی، برتن دھونے کا کام بڑے تسلسل سے جاری رہتا تھا۔ نوراں کے علاوہ بھی کچھ دوسری عورتیں اس کام پر مامور تھیں۔

''چل چل چھیتی کر اور شروع ہو جا۔ خالی بیٹھ کر ٹیم (ٹائم) خراب کرنے کی نہیں ہو رہی ادھر۔'' نوراں کے جاتے ہی وہاں کام کی نگرانی پر مامور ایک عورت نے ماہ بانو کو ڈپٹا۔ ماہ بانو نے اس ڈانٹ پر فوراً سوپ اُٹھایا اور دیگر عورتوں کی تقلید میں سوپ میں چاول ڈال کر پھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔ حوراں نے اسے گھریلو کام کاج کی تربیت دے رکھی تھی لیکن تین افراد پر مشتمل کنبے میں کام ہی کتنا ہوتا تھا۔ دوسرے ماہ بانو کی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے بھی حوراں اس پر کام کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی تھی۔ اس لیے ماہ بانو بہت زیادہ محنت اور کام کاج کی عادی نہیں تھی۔ پھر یہاں جس انداز سے چاول صاف کیے جا رہے تھے، اس فن میں تو اسے قطعی مہارت نہیں تھی۔ نتیجتاً اسے اپنی کوشش میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

''اے لڑکی! یہ کیا کر رہی ہے؟ سارے چاول نیچے گر رہے ہیں۔'' نگرانی پر مامور عورت اُس کے اناڑی پن کو دیکھ کر چلائی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ماہ بانو کو کچھ دبے دبے قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ یقیناً وہاں موجود کچھ خواتین اُس کی اس طرح درگت بننے پر حظ اُٹھا رہی تھیں۔ ماہ بانو جو پہلے ہی دل پر بڑا جبر کر کے حویلی آئی تھی، اس تذلیل کو سہہ نہ سکی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بڑا سا سوپ جو پہلے ہی اس سے نہیں سنبھالا جا رہا تھا، نیچے رکھ کر وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

''اونہہ! نخرے تو دیکھو۔ ایسے بن رہی ہے جیسے کسی مزارعے کی نہیں، لاٹ صاحب کی دِھی ہے۔'' کہیں سے یہ طنزیہ فقرہ آ کر ماہ بانو کے کانوں سے ٹکرایا۔ اس کے رونے میں کچھ اور بھی شدت آ گئی۔ اسے حوراں اور صفدر شدت سے یاد آنے لگے جنہوں نے اسے واقعی کسی مہارانی کی طرح رکھا ہوا تھا۔

''اچھا چل، چھڈ یہ کام اور وہاں بیٹھ کر چاولوں میں سے کنکر چن۔'' نگران عورت کو اس کے رونے پر



ترس آ گیا اور اس نے ماہ بانو کو اٹھا کر دوسری طرف بیٹھی عورتوں کی جانب جانے کا حکم دیا۔ یہ عورتیں پھٹکے ہوئے چاولوں میں رہ جانے والے چند ایک کنکر اور دھان احتیاط سے چن رہی تھیں۔ ماہ بانو دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر کے ان عورتوں کے درمیان جا بیٹھی۔ یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ باقی عورتوں جیسی پھرتی نہ ہونے کے باوجود وہ سہولت سے یہ کام کرنے لگی۔

''یہ نچھی اور شادو ہیں ہی بڑی جل ککڑی۔ جہاں کسی کو ذرا خوش دیکھتی ہیں فوراً آگ لگا دیتی ہیں۔'' ماہ بانو کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے ترچھی نظروں سے چاول پھٹکتی ہوئی نچھی اور شادو کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ماہ بانو کے اندازے کے مطابق اس پر ہنسنے والی بھی یہی دونوں تھیں۔

''میری اماں نے مجھے بتایا تھا کہ وڈی چودھرائن کے کان بھرنے والی بھی نچھی اور شادو کی ماں ہے۔ اسی نے چودھرائن کا دھیان تیری طرف لگایا ہے۔'' ماہ بانو کے چہرے پر چھائے ناسمجھی کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے لڑکی نے ایک بار پھر سرگوشی میں اسے بتایا۔

''مگر کیوں؟..... میری بھلا ان دونوں سے کیا دشمنی ہے؟ ابھی دو دن پہلے تو یہ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اس وقت تو یہ مجھ سے بڑا پیار جتا رہی تھیں۔ پھر بعد میں کیا ہوا کہ یہ میری دشمن بن گئیں؟'' ماہ بانو نے اُلجھ کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''پاگلے!..... ان کی میٹھی زبان پر مت جا۔ یہ سامنے بیٹھ کر ایسے ہی پیار جتاتی ہیں اور پھر پیچھے سے بندے کی کاٹ کرتی ہیں۔ تجھ سے تو ان کا پرانا جلاپا ہے۔ زہرہ کی زبانی تیری پڑھائی اور ٹھاٹ باٹ کے قصے سن کر ان دونوں کو بڑی آگ لگا کرتی تھی۔ ان کی ماں بھی ان جیسی ہی ہے۔ کہنے کو رحمتے نام ہے ان کی ماں کا۔ پر ہم سب اسے ماسی مصیبتے ہی بولتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کب کسی پر مصیبت آ جائے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ بیٹیوں کے کہنے پر اس نے ہی وڈی چودھرائن کے خوب کان بھرے تھے۔ شاید تُو نے نچھی، شادو کے سامنے کوئی بات کر دی تھی۔ ماسی نے وڈی چودھرائن کو خوب بھڑکایا کہ غیاث کی دِھی ماہ بانو گاؤں آ کر اسکول کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کہتی ہے، گاؤں کی لڑکیوں کو تعلیم دے کر حویلی کی چاکری سے بچاؤں گی۔ بس، وڈی چودھرائن بھڑک گئی۔ اس نے فوراً تجھے حویلی بلوا بھیجا کہ تجھے تیری اوقات بتا سکے۔ اب دیکھ لے ان ماں بیٹیوں کی سازش کتنی کامیاب رہی۔ تُو بھی گاؤں کی اور عورتوں کی طرح کمی کمینیوں میں بیٹھی حویلی کے کام نپٹا رہی ہے۔ تجھے یہاں اپنے ساتھ دیکھ کر ان شودیوں کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ہو گی۔'' لڑکی کی معلومات اور تجزیہ دونوں حیرت انگیز تھے۔ اس نے بہت دھیمی آواز میں ماہ بانو کو ساری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ ماہ بانو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دماغ نے دو سال پہلے دیکھے گئے تحت الشعور میں چلے جانے والے نقوش کو دہرانا شروع کر دیا۔

''تُو رانی ہے نا؟..... تیرا گھر نچھی اور شادو کے گھر کے سامنے ہی تھا۔'' ماہ بانو کی یادداشت کام کرنے لگی۔ دو سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوتا لیکن اپنی گاؤں میں عدم دلچسپی کے باعث ان دو سالوں میں وہ بہت کچھ بھول چکی تھی۔

''پچھلی بار میں آئی تھی تو تُو اکثر مجھ سے کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔ اب کی دفعہ تُو نے چکر ہی نہیں لگایا۔'' پہچان کا مرحلہ طے کرنے کے بعد ماہ بانو نے شکوہ کیا۔

''اب کی واری وقت ہی کہاں ملا عرس کی وجہ سے۔ روز حویلی آ کر دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔ میں بس سوچتی ہی رہ گئی کہ تیرے پاس آؤں۔ ویسے تُو نے یہ بات خوب یاد رکھی کہ میں نچھی اور شادو کے گھر کے پاس

رہتی ہوں۔ ساری مشکل ہی یہ ہے۔ گھر پاس ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو میرے پل پل کی خبر رہتی ہے اور جب چاہے میرے کاموں میں رولا ڈال دیتی ہیں۔ ماسی مصیبتے کی لگائی بجھائی کی وجہ سے تو وڈی چودھرائن نے مجھے بھی تیسری جماعت کے بعد اسکول سے اٹھانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاتی تو میں نے پانچ جماعتیں تو پاس کر ہی لینی تھیں۔'' رانی نے غصے اور افسردگی کی ملی جلی کیفیت میں بتایا تو ماہ بانو کو خود سے اُس کی ہمدردی کی وجہ سمجھ آنے لگی۔ وہ بھی وہیں سے ڈسی گئی تھی جہاں سے ماہ بانو پر حملہ ہوا تھا۔

''نی کُڑیو! باتوں میں لگ کر کام چوری نہ دکھاؤ۔ ورنہ ابھی ایک ایسا ہاتھ لگاؤں گی کہ پرنانی یاد آ جائے گی۔'' ماہ بانو اور رانی کی مستقل سرگوشیاں یقیناً نگران عورت کی برداشت سے باہر ہوگئی تھیں چنانچہ وہ ان کے سر پر کھڑی ہو کر چلّانے لگی۔ ماہ بانو اور رانی گھبرا کر جلدی جلدی چاولوں میں ہاتھ چلانے لگیں۔

⊛----✪----⊛

شہریار اپنے سامنے موجود درخواستوں میں سے اس وقت جس درخواست کو پڑھ رہا تھا، وہ کسی ماسٹر آفتاب احمد نے لکھی تھی۔ درخواست گزار کا تعلق پیر آباد سے تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے استدعا کی تھی کہ پیر آباد میں قائم واحد پرائمری اسکول جو کہ فقط ایک کمرے پر مشتمل ہے، اس کی عمارت میں کم از کم ایک کمرے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ طالب علموں کو کچھ سہولت مل سکے۔ ماسٹر آفتاب احمد پچھلے دو سال سے تواتر سے یہ درخواستیں بھیج رہا تھا۔ ریکارڈ میں اس کی طرف سے بھیجی گئی پانچ درخواستیں موجود تھیں۔ آخری درخواست شہریار کی جوائننگ کے دو دن بعد ہی دی گئی تھی، جس سے ظاہر تھا کہ ماسٹر آفتاب نے اے، سی کی آمد کے ساتھ نئی امید باندھ کر ایک بار پھر گورنمنٹ کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ شہریار نے انٹرکام پر عبدالمنان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

''یس سر!'' عبدالمنان فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

''یہ ماسٹر آفتاب کی درخواستیں اتنی بار موصول ہوئی ہیں، اس کے باوجود اب تک اس سلسلے میں کوئی ایکشن نہیں لیا گیا..... کیوں؟'' شہریار نے عبدالمنان سے پوچھا۔

''میں نے ذاتی طور پر کوشش کی تھی سر! کہ اس سلسلے میں کچھ ہو سکے۔ لیکن چودھری افتخار عالم کے آگے میری ایک نہ چل سکی۔ چودھری صاحب کا دعویٰ ہے کہ جس زمین پر ہم اسکول کے لیے کمرے تعمیر کروانا چاہتے ہیں، وہ ان کی ملکیت ہے۔ پچھلے اے، سی صاحب چودھری افتخار کے اس دعوے سے متفق تھے اس لیے میں باوجود چاہنے کے کچھ نہیں کر سکا۔'' عبدالمنان نے سادگی سے مسئلے کا خلاصہ پیش کر دیا۔

''چودھری صاحب کے دعوے کے مقابلے میں سرکاری ریکارڈ کیا کہتا ہے؟'' شہریار نے دریافت کیا۔

''ریکارڈ کے مطابق زمین سرکار کی ہے۔ چودھری افتخار کی بنجر زمین کا، زمین کے اس ٹکڑے سے اتصال ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی ملکیت کا دعویٰ سراسر غلط ہے۔'' عبدالمنان نے بتایا تو شہریار سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اگر چودھری افتخار کی مرضی کے خلاف اسکول کے لیے کمرے یا کمروں کی تعمیر کی کوشش کی گئی تو چودھری اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لے گا۔ لیکن اسکول کا معاملہ ٹالنا بھی اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار اس نے درخواست پر اپنی منظوری کا نوٹ لکھ کر دستخط کر دیئے۔ متعلقہ محکمے سے بھی منظوری آ جاتی تو تعمیری کام شروع کیا جا سکتا تھا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے عبدالمنان! کہ لوگوں کے مسائل پوری طرح ہم تک پہنچ نہیں رہے ہیں۔ لوگ ہماری بے توجہی سے نالاں ہو کر ہم سے رابطہ کرنا چھوڑ چکے ہیں یا پھر کوئی خوف ہے جو رکاوٹ بن کر اُنہیں ہم تک آنے نہیں دیتا۔'' پین کو ہولڈر میں رکھتے ہوئے شہریار نے اپنے دل میں پنپتا خیال



عبدالمنان سے بانٹا۔

''دونوں ہی باتیں ہیں سر! لوگ عام طور پر اپنے مسائل لے کر اس لیے نہیں آتے کہ یہاں ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسے کیسز جن کا تعلق کسی طاقتور ہستی سے ہو، اس لیے سامنے نہیں لائے جاتے کہ سنی تو طاقتوروں کی ہی جاتی ہے۔ اُلٹا شکایت کرنے کے جرم میں غریب بے چارہ عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔'' عبدالمنان نے شہریار کے خیال کی تصدیق کی۔

''پھر..... تمہارا کیا خیال ہے، اس مسئلے کے حل کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' شہریار اور عبدالمنان میں باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی اس لیے شہریار اس سے مشورہ کرنے میں حرج نہیں سمجھتا تھا۔

''اس سلسلے میں کھلی کچہری کا طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ محض تحریری درخواستیں وصول کرنے کے بجائے ہفتے میں ایک دن ایسا مقرر کر دیں جب ضرورت مند براہِ راست آپ سے ملاقات کر کے اپنا مسئلہ بیان کر سکیں۔ اس طرح لوگوں کی جھجک ختم ہوگی اور ان کا آپ پر اعتماد قائم ہوگا۔'' عبدالمنان نے تجویز پیش کی جو شہریار کو پسند آئی۔

''ویری گڈ۔ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔'' اس نے عبدالمنان کو سراہا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے یہاں ملاقاتیں کرنے کے علاوہ لوگوں سے ان کے علاقے میں جا کر بھی ملتے ہیں۔ ہفتے میں کسی بھی دن اچانک کسی علاقے میں جا نکلیں گے اور وہاں کیمپ لگا کر مساجد وغیرہ سے اعلان کروا دیں گے کہ آپ کے ضلع کا اے، سی آپ کے مسائل سننے اور حل کرنے کے لیے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس طرح میرے اور لوگوں کے درمیان جو دُوری ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور میں علاقے کی صحیح صورتِ حال کا جائزہ بھی لے سکوں گا۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی سر!'' عبدالمنان جسے اب تک شہریار جیسا کوئی اے، سی میسر نہیں آیا تھا، شہریار کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

''یہ پروگرام تو چلو فائنل ہو گیا۔ اب ایک کام اور کرو۔ ماسٹر آفتاب کو کسی سے پیغام بھجواؤ کہ وہ یہاں آ کر مجھ سے ملاقات کر لے۔ اس کی درخواست یوں تو میں نے منظور کر لی ہے لیکن آگے بھیجنے سے پہلے صورتِ حال کو مزید اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں۔''

''او کے سر! میں آج ہی یہ کام کرواتا ہوں۔'' عبدالمنان، شہریار کا حکم سن کر مستعدی سے بولا۔ کئی سال کی ملازمت میں پہلی بار یہ موقع آیا تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ کوئی کام کر رہا ہے۔ ورنہ اب سے پہلے تو صرف ڈیوٹی بھگتانے والی بات تھی۔ شہریار خود بھی خوش تھا کہ اسے ایک مستعد اور روشن ضمیر پی اے کا ساتھ ملا ہے جو اس کے کاموں میں حقیقی معاون ثابت ہو رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

''اس واری میں نے بھی وڈے شاہ جی کی درگاہ پر نذر چڑھانی ہے۔'' رات کا کھانا کھاتے ہوئے نوراں نے غیاث کو اطلاع دی۔

''وہ کس لئے؟'' غیاث نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''لو، ہور پوچھو..... پوچھتے ہو کس لیے تمہیں نہیں خبر کہ کتنی مشکلیں پڑی ہیں سر پر۔ زہرہ کا ویاہ کرنا ہے اور پاس کوئی پائی دھیلا نہیں۔ ادھر اس نگار کو ویاہ کر بھی چھ مہینے نہیں۔ دو برس ہونے کو آئے بیاہ کو، ابھی تک گود سُونی ہے۔ ممتاز نے طعنے مار مار کر جان آدھی کر دی ہے میری بچی دی۔ وہ انور بھی ماں کی ہی زبان بولتا ہے۔ صاف

دھمکی دے چکا ہے نگار کو کہ اگر ایک برس اور اس کے بچہ نہیں ہوا تو اسے فارغ کر کے دوسرا ویاہ کر لے گا۔ اب اتنے ترلے کر کے، اپنی جان پر ہزاروں کا قرض چڑھا کر اس لیے تو دِھی نہیں بیاہی تھی کہ اگلے اسے دوبارہ پیکے میں دھکا دے دیں۔ دِھی کا گھر بسائے رکھنے کے لیے کچھ تو ہاتھ پیر مارنے ہوں گے۔ میری مت میں تو یہی آ ہے کہ وڈے شاہ جی کی درگاہ پر جا کر جھولی پھیلاؤں۔ شاید ان کی برکت سے ہی یہ مصیبت ٹل جائے۔''

''پر تیرے پاس چڑھانے کو ہے ہی کیا؟ وہاں تو لوگ بڑے بڑے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔'' نوراں کی بتائی ساری تفصیل سننے کے بعد غیاث نے تشویش سے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں اپنا یہ چھلا چڑھا دوں۔ شاہ جی کی دعا سے زہرہ کے ویاہ کا بندوبست ہو گیا اور نگار کی گو بھر گئی تو سمجھو اس چھلے کی قیمت وصول ہو جائے گی۔'' نوراں نے اپنی انگلی میں موجود سونے کے ہلکے سے چھلے کی طرف اشارہ کیا۔

''چل، کر دیکھ یہ تدبیر بھی۔ بڑے لوگوں کی جھولیاں بھری ہیں شاہ جی کی برکت سے۔ شاید ہم پر بھی ان کا کرم ہو جائے۔'' غیاث نے گویا نوراں کے فیصلے کی توثیق کی۔

''پر مشکل یہ ہے کہ میں عرس کے روز درگاہ پر منت ماننے جاؤں کیسے؟ اُس روز تو حویلی میں اتنا کام ہو ہے کہ میں قدم بھی باہر نہیں نکال سکوں گی۔ اور منت میں نے عرس والے دن ہی ماننی ہے۔ کہتے ہیں اس روز جو منت مانو وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔'' نوراں پوری طرح اپنی ضعیف الاعتقادی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔

''یہ تو ہے..... خیر تُو نے کیا حل سوچا؟'' غیاث پوری سنجیدگی سے نوراں کی پریشانی میں شریک تشویش کا شکار تھا۔

''میرے دماغ میں تو یہی ترکیب آئی ہے کہ میری جگہ تُو جا کر نذر چڑھا دے اور منت مان لے۔ کام تو اس روز تجھے بھی دس ہوں گے، پر تُو پھر بھی بیچ میں سے موقع نکال سکتا ہے۔'' نوراں نے حل بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ فیر میں ہی کر لوں گا یہ کام۔'' غیاث محمد نے آمادگی ظاہر کی۔

''کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو؟ کیسے کچے عقیدے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ مزاروں پر نذر وزر چڑھانا سب بے کار باتیں ہیں۔ جو کچھ مانگنا ہے، اللہ سے مانگیں۔ وہ سب کچھ دینے والا ہے۔'' ماہ بانو جو بہت دیر سے خاموشی سے ساری گفتگو سن رہی تھی، آخر ٹوک بیٹھی۔

''توبہ کر لڑکی! توبہ کر۔ بزرگوں کے لیے ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ بڑی برکت ہوتی ہے ان کی۔'' نوراں نے فوراً ماہ بانو کو ٹوکا۔

''مان لیا کہ بزرگوں کی برکت ہوتی ہے لیکن یہ حویلی والوں کے پُرکھوں سے تو کسی کو کوئی فیض نہیں مل سکتا۔ جیسے ظالم اور مغرور لوگ یہ ہیں، ویسے ہی ان کے بزرگ بھی ہوں گے۔ جو لوگ جیتے جی اپنی ذات سے کسی کو فائدہ نہ دیں، وہ مرنے کے بعد خاک کسی کے کام آئیں گے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''بند کر اپنی یہ فضول بک بک۔ تیری تعلیم نے تجھے یہ الٹے سبق پڑھائے ہوں گے۔ پر ہم تیری ان الٹی سیدھی باتوں میں نہیں آنے والے۔'' نوراں اچھی خاصی غضب ناک ہو چکی تھی۔

''میرا کیا ہے، مت مانو میری بات۔ میرا کام تو سمجھانا تھا۔'' ماہ بانو نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے تھے۔

''تُو چھوڑ دے اپنا یہ سمجھانے بجھانے کا کام۔ چار جماعتیں کیا پڑھ گئی ہے، خود کو زیادہ ہی قابل سمجھنے لگی ہے۔ اس بے لگام زبان کی وجہ سے تو تجھ پر یہ وقت آیا ہے کہ اچھا بھلا آرام چھوڑ کر آج حویلی والوں کی



ا لری کرنی پڑ رہی ہے۔ ذرا زبان کو قابو میں رکھتی اور تیرے میرے آگے اُلٹی سیدھی بکواس نہیں کرتی تو یہ ا ر دن سُکھ سے گزار کر واپس چلی جاتی۔ اب بھگتتی رہ اپنے کیے کو۔'' نوراں کا حویلی روز کا آنا جانا تھا، ا ا اسے بھی ماہ بانو پر ٹوٹنے والی افتاد کی وجہ بالآخر معلوم ہو گئی تھی۔ اور اب وہ اسی حوالے سے اسے طعنے ے رہی تھی۔

''مجھے میری زبان نے نہیں پھنسایا اماں! مجھے تم لوگوں کی بے زبانی نے پھنسایا ہے۔ اگر تم لوگ اس طرح چپ حویلی والوں کا ہر ظلم برداشت کرنے کے بجائے ان کے سامنے احتجاج کرنے کے عادی ہوتے تو ں کے ظلم کرنے کی عادت اتنی پختہ نہیں ہوتی۔ انہیں تو عادت ہو گئی ہے انسانوں کے ساتھ بے زبان جانوروں ا ک کرنے کی۔ اب اگر ان بے زبان جانوروں کے بیچ میں سے انہیں کوئی انسانی آواز سنائی دیتی ہے تو ں سے برداشت نہیں ہو پاتا کہ کون ہے جو ان کے مقابل بول سکتا ہے؟ حویلی والوں کو ظالم بنانے والے تم ا ک ہو اماں! تم لوگوں نے ان کی عادت بگاڑی ہے۔'' نوراں کا طعنہ سن کر ماہ بانو کافی جذباتی ہو گئی تھی۔

''کیا بکواس کیے جا رہی ہے؟ ابھی دوں گا ایک اُلٹے ہاتھ کی تو بولتی بند ہو جائے گی۔'' لڑکی ذات اور اتنا لے یہ کہاں ان کی رِیت تھی، چنانچہ غیاث محمد مہمان بن کر آئی بیٹی پر آنکھیں نکالنے لگا۔

''چل چھڈ۔ جانے دے اس کو۔ اس کا تو دماغ ہی خراب ہے۔ صفدر آ کر اسے واپس لے جائے گا تو ا ری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔'' نوراں نے غیاث محمد کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو جو پہلے ہی ھانے سے ہاتھ روک چکی تھی، اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ زہرہ اور ان کا دس سالہ اکلوتا بھائی الیاس اس ا ری بحث سے بے نیاز اپنی پلیٹوں پر جھکے کھانے میں اسی طرح مصروف رہے۔

⊛----✪----⊛

''مجھے ماسٹر آفتاب احمد کہتے ہیں۔'' کھدر کے کُرتے اور قدرے بوسیدہ نیلی جینز میں ملبوس وہ شخص شہریار ے تصور سے کافی مختلف تھا۔ ماسٹر آفتاب کے نام کے ساتھ اس نے کسی عمر رسیدہ شخص کا تصور باندھ رکھا تھا ان سامنے موجود شخص نہ صرف جوان تھا بلکہ اپنے انداز سے صاف پہچانا جاتا تھا کہ وہ کسی دیہات یا گاؤں کا ا ندہ نہیں بلکہ اس کی پرورش کسی شہری ماحول میں ہوئی ہے۔

''تشریف رکھئے۔'' شہریار نے ایک نظر جائزے کے بعد اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں آج ایک پبلشر سے ملنے کے لیے لاہور روانہ ہو رہا تھا۔ پیغام ملا کہ نئے اے، سی صاحب مجھ سے ا ا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرتا ہوا جاؤں۔'' ماسٹر آفتاب نے کرسی پر ا بیٹھتے ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''کس سلسلے میں بات کرنی ہے آپ کو پبلشر سے؟'' شہریار جو ماسٹر آفتاب کو دیکھ کر ہی چونک سا گیا تھا، ا ں کی بات سن کر مزید متجسس ہوا۔

''میرے لکھے کالمز کو کتابی شکل میں شائع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں موصوف۔ بس اسی سلسلے میں ا ری میٹنگ ہے۔'' شہریار نے دیکھا کہ یہ بات بتاتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی ذہانت سے پُر آنکھوں میں ا یلا پن چھلکنے لگا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کی خصوصیات دوسروں کے سامنے بیان کرنے ے جھجکتے ہیں۔

''اچھا تو آپ کالم نگار ہیں۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا آپ کا لکھا کوئی کالم پڑھنے کا..... حالانکہ میں مختلف

اخبارات کا بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔'' شہریار نے ماسٹر آفتاب کو جس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا، اس وقت اس سے بہت ہٹ کر گفتگو ہونے لگی تھی۔

''میں اے۔ اے منشا کے نام سے لکھتا ہوں۔ شاید یہ نام کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو۔''

''اوہ آئی سی۔ اے اے منشا یعنی آفتاب احمد منشا۔ آپ کے کالمز تو میں نے اکثر پڑھے ہیں اور مجھے پسند بھی آتے ہیں۔ کیونکہ آپ کسی پارٹی یا گروپ کے حسبِ منشا لکھنے کے بجائے اپنے حسبِ منشا لکھتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں ایک حق گو آدمی سے ملاقات کر رہا ہوں۔'' شہریار نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ماسٹر آفتاب سے بطورِ خاص ایک بار پھر ہاتھ ملایا۔

''بس سر! اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے حق پر ڈٹے رہنے کی توفیق عطا کی ہے۔ ورنہ میری کیا اوقات ہے؟'' ماسٹر آفتاب کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''یہ تو واقعی درست ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ پیر آباد میں کیا کر رہے ہیں؟ اتنے بڑے اخبار میں لکھنے والا شخص اور ایک پرائمری سکول میں ٹیچنگ کر رہا ہے، بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔''

''یہ بھی ایک داستان ہے۔ اصل میں پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا مجھے اپنے والد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار تھے۔ ساتھ ہی مختلف اخبارات کے لیے بھی لکھتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ زمانۂ طالب علمی میں، میں نے لکھنے کا آغاز یونیورسٹی میگزین سے کیا اور پھر کچھ ڈائجسٹوں وغیرہ میں لکھنے لگا۔ ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد مجھے شوق ہوا کہ تعلیم کے میدان میں کچھ کروں۔ میں نے ایک ایسے اشاعتی ادارے کو جوائن کر لیا جو نصابی کتب پبلش کرتے تھے۔ میں نے اس ادارے کے لیے کئی کتابیں ترتیب دیں۔ میرے آئیڈیاز کو کافی پسند کیا گیا۔ سیلری بھی بہت اچھی مقرر ہوئی۔ لیکن پھر ایک پوائنٹ پر آ کر ہمارا اختلاف ہو گیا۔ میرا مؤقف تھا کہ ادارے کو اپنی کتابوں پر رائٹرز کے نام بھی دینے چاہئیں۔ مگر وہ لوگ صرف اپنے ادارے کی تشہیر چاہتے تھے۔ اصل محنت کرنے والوں کا کہیں کوئی نام ہی نہیں تھا۔ بس پھر میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ پبلشنگ کمپنی کے مالک کا خیال تھا کہ میں جوانی کے جوش میں ایک جذباتی فیصلہ کر رہا ہوں اور جب دال روٹی کے حصول کے لیے زمانے کی ٹھوکریں کھاؤں گا تو خود ہی پلٹ کر آؤں گا۔ میرے نزدیک میرا اصولی مؤقف تھا، وہ ان کے نزدیک انا کا معاملہ تھا۔ بہرحال، وہاں سے جاب چھوڑنے کے بعد مجھ پر نئی راہیں کھلیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس پہلے استحصال نے مجھے اُکسایا کہ معاشرتی مسائل پر لکھوں اور پھر میں لکھتا چلا گیا۔ جہاں جہاں جس کسی کے ساتھ حق تلفی اور استحصال ہوتے دیکھتا، اپنے قلم کے ذریعے اس کی نشان دہی کرتا رہا۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے عزت بھی دی اور شہرت بھی۔ پیسے کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ہم کبھی رہے نہیں، اس لیے جتنا پیسہ ملتا ہے وہ بہت ہے۔''

''مگر اس قصے میں پیر آباد آنے کا تو کہیں ذکر نہیں۔'' ماسٹر آفتاب کی بیان کردہ تفصیلات سننے کے بعد شہریار نے اپنا سوال دہرایا۔

''اس قصے کی طرف بھی آتا ہوں۔ اصل میں میرا ایک کلاس فیلو تھا، بڑا ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ ماسٹرز کے بعد اس نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا۔ کوئی مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھنے والا شخص پوزیشن کے ساتھ امتحان کلیئر کرے تو اس کی ذہانت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ سو کلومیٹر کی ایک ایسی دوڑ ہوتی ہے جس میں آپ جیسا بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگ پہلے ہی ساٹھ ستر کلومیٹر آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے



حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جانا اور ریس جیت لینا آسان نہیں ہوتا۔ میرے دوست نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ صلے میں وہ بیوروکریسی کا حصہ بنا دیا گیا۔ ابتدا میں اس میں بڑا جوش تھا۔ یہاں اس علاقے میں پوسٹنگ ہوئی تو معلوم ہوا پیر آباد میں چند سال پہلے ایک اسکول ہوا کرتا تھا جو اب ختم کر دیا گیا ہے۔ میرے دوست کو شوق ہوا کہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن کوئی شخص یہاں آ کر کام کرنے پر راضی ہی نہیں تھا۔ میرے دوست نے ایک دن میرے سامنے ذکر کیا۔ میرے اندر کا ٹیچر اس ذکر کو سن کر جاگ اُٹھا اور میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر پیر آباد میں آ بیٹھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں نامساعد حالات کے باوجود جما بیٹھا ہوں۔ البتہ میرے دوست کی چھ ماہ کے اندر اندر ہی کسی دور دراز علاقے میں پوسٹنگ کر دی گئی ہے۔ سنا ہے اب وہ ''سدھر'' گیا ہے اور حکمراں طبقے سے غیر ضروری ''پنگے'' لینے کی غلطی نہیں کرتا۔ ضرورت بھی کیا ہے ایسے پنگے لینے کی۔ اس بے چارے نے اتنی محنت کر کے سی ایس ایس کا امتحان اس لیے پاس کیا تھا کہ اپنے اور اپنے گھر کے حالات بدلے گا۔ اگر حکمرانوں کی ناراضگی کی وجہ سے اس کی ''بدلیاں'' ہوتی رہتیں تو اس کا یہ خواب تو ادھورا رہ جاتا۔ اب امید ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ صاحبِ اختیار و اقتدار بھی خوش رہیں گے۔ ہر طرف بے کار کی چپقلش اور جھگڑوں کے بجائے امن و امان اور باہمی تعاون کی فضا قائم ہو گی۔ اس سب کے بیچ میں اگر عوام بے چارے پستے ہیں تو پستے رہیں۔ وہ تو عادی ہی ہیں یہ سب سہنے کے۔'' ماسٹر آفتاب بات اگرچہ لمبی کرتا تھا مگر شہریار کو اس سے گفتگو کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

''بہت خوب۔ آپ کافی دلچسپ آدمی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کی درخواست منظور کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ انشاء اللہ جلد اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ جلد بازی کے بجائے حکمتِ عملی سے کام لیا جائے۔ چودھری افتخار کو ناراض کیے بغیر ان کی رضامندی سے بھی اسکول کی عمارت میں توسیع کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس سلسلے میں ان کو منانے کی کوشش کروں گا تو کامیاب رہوں گا۔ بس کچھ وقت لگے گا۔ کیا آپ تھوڑے عرصے کے لیے انتظار کر سکیں گے؟''

''بالکل سر! جہاں دو سال انتظار کیا ہے، وہاں تھوڑا سا مزید انتظار کرنے میں یقیناً کوئی قباحت نہیں۔ مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے کم از کم میری اس درخواست کا سنجیدگی سے نوٹس تو لیا ورنہ اس سے پہلے تو کسی کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی۔'' ماسٹر آفتاب نے جھٹ جواب دیا۔

''او کے آفتاب صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ آپ سے کچھ دیر اور گفتگو ہوتی لیکن آپ بھی لاہور کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں اور میرے پاس بھی چند ایک ملاقاتی اور بیٹھے ہیں تو بہتر ہے، میں آپ کو اجازت دے دوں مگر اس امید کے ساتھ کہ انشاء اللہ ہماری دوبارہ بہت جلد ملاقات ہو گی۔'' شہریار کے لفظوں میں موجود خلوص اس کے چہرے سے بھی جھلک رہا تھا۔ ماسٹر آفتاب نے گرم جوشی کے ساتھ شہریار سے ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

⊛----✪----⊛

''تھکن سے برا حال ہو گیا ہے۔ جانے یہ شہری عورتیں پورا پورا دن بازاروں میں کیسے گزار لیتی ہیں۔ ہم تو بس کوئی گھنٹہ بھر ہی رہے ہوں گے وہاں، پر سارا پنڈا اس بری طرح دکھ رہا ہے کہ اب رات کو بدن دبوائے بغیر نیند نہیں آئے گی۔'' سیاہ شیشوں والی گاڑی پکی سڑک چھوڑ کر گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر آئی تو پچھلی نشست پر بیٹھی تاجور نے اپنے ساتھ موجود کشور کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''شہری عورتوں کو ہماری طرح صبح تڑکے گھروں سے نکل کر بازار کے لیے روانہ نہیں ہونا پڑتا۔ یہ جو تھکن چڑھی ہوئی ہے ہمارے بدنوں پر، یہ بازار میں خریداری کے لیے گھومنے سے نہیں چڑھی۔ یہ اس سفر کی وجہ سے چڑھی ہے جو ہم نے لاہور سے خریداری کے شوق میں کیا ہے۔'' کشور کا جوابی تبصرہ بہت تلخ تھا۔

''تُو تو ہر وقت بس انگارے ہی چباتی رہتی ہے۔ اگر صنوبر آج کل دُوجے جی سے نہ ہوتی تو مجھے تجھے ساتھ لانے کا احسان نہیں اُٹھانا پڑتا۔'' تاجور کو کشور کے انداز پر غصہ آیا۔

''نہ اُٹھاتیں یہ احسان۔ کیا ضروری تھا کہ لاہور جا کر لبرٹی سے ہی خریداری کرتیں۔ ادھر فیصل آباد چلی جاتیں۔ وہ قریب بھی پڑتا اور اتنی تھکن بھی نہ ہوتی۔'' کشور نے دوبدو جواب دیا۔

''اونہہ! فیصل آباد میں بھلا کیا ملتا ہے؟ عرس پر ابا جی کتنے مہمان بلاتے ہیں شہر سے۔ افسروں کی بیویوں نے ایسے نئے نویلے ڈیزائنوں والے کپڑے پہن رکھے ہوتے ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تو لاہور سے ہی خریداری کرنی پڑتی ہے۔ اب دیکھ، میں ہم تینوں بہنوں کے لیے کیسے شان دار سلے سلائے جوڑے لے کر آئی ہوں۔ گاؤں کی درزن کو تو ایسی سلائی آتی ہی نہیں۔''

''آپ کو ضرورت کیا ہے افسروں کی بیویوں سے مقابلہ کرنے کی؟ وہ اپنی جگہ ہیں، ہم اپنی جگہ۔'' تاجور کی بات سن کر کشور نے اعتراض کیا مگر تاجور جواباً کچھ نہ بولی۔ اس کی توجہ کشور سے ہٹ کر کچے راستے پر چلتے نیلی جینز اور کھدّر کے کُرتے میں ملبوس شخص کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

''یہ شہری مُنڈا کون ہے؟'' اس نے اگلی نشست پر موجود ملازمہ سے پوچھا۔

''یہ تو ماسٹر آفتاب ہے۔ شاید شہر سے واپس آ رہا ہے۔ کرمو چاچا مغرب کے بعد اپنے تانگے کو ہور پھیرا نہیں لگواتا، اسی لیے وچارے کو پیدل آنا پڑ رہا ہے۔'' ملازمہ جواب تک ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر گونگی بہری بنی بیٹھی تھی، تاجور کو معلومات فراہم کرنے لگی۔

''مجھ کو بھی یہی شک تھا۔ بڑے عرصے سے سن رہی ہوں کہ یہ شہری مُنڈا گاؤں کے اسکول میں جم کر بیٹھا ہوا ہے۔ دیکھنے میں تو اچھا پڑھا لکھا لگتا ہے۔ سوچ رہی ہوں منور کے ابا سے کہوں کہ منور کو گھر پر پڑھانے کے لیے اسی ماسٹر کی ڈیوٹی لگا دیں۔ ابھی تو منور چھوٹا ہے، اسے پڑھنے کے لیے شہر نہیں بھیج سکتے۔ میرا اپنا دل نہیں کرتا اسے خود سے دور کرنے کو۔ ابھی دو تین برس ادھر ہی رہ کر پڑھنا لکھنا سیکھ لے گا، پھر بعد میں اسے شہر بھجوا دیں گے۔ تیرا کیا خیال ہے کشور! میں بات کروں نا منور کے ابا سے اس ماسٹر آفتاب کو منور کو پڑھانے پر لگانے کی؟'' اپنا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد تاجور نے کشور کی رائے بھی جاننی چاہی۔ کشور جو گاڑی کے بیک ویو مرر میں لحہ بہ لحہ دور ہوتے ماسٹر آفتاب کو دیکھ رہی تھی، خود کو مخاطب کیے جانے پر بری طرح چونک گئی۔

''کیا کہا آپ نے مجھ سے؟''

''میں پوچھ رہی تھی کہ منور کو پڑھانے کے لیے اس ماسٹر آفتاب کو رکھوا لوں۔ پر تُو نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میری بات ہی نہیں سنی۔'' تاجور نے خفگی سے اپنی بات دہرائی۔

''یہ تو بہت اچھا خیال ہے آپا! آپ ضرور بھا اشرف سے بات کریں۔'' کشور نے تاجور کی بھرپور تائید کرتے ہوئے دوبارہ بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ وہاں ماسٹر آفتاب کا عکس غائب ہو چکا تھا۔ مگر وہ اب بھی اس عکس کو دیکھ سکتی تھی۔ یہ عکس بیک ویو مرر سے ہٹ کر اس کی آنکھوں کی پُتلیوں میں جم چکا تھا۔

⊛----✪----⊛



پردوں کا ایک ڈھیر تھا جسے استری کرنے کے لیے وہ گھنٹہ بھر سے استری اسٹینڈ کے آگے کھڑی تھی لیکن وہ ڈھیر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ چودھری افتخار کی وسیع و عریض حویلی میں بے تحاشا کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ اسی حساب سے پردوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ عرس کے موقع پر جب حویلی میں بہت بڑی تعداد میں مہمان مدعو کیے جاتے تھے، اس وقت حویلی کی تزئین و آرائش پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ شہر سے چل کر آنے والے یہ نئے پردے بھی اسی آرائش کا ایک حصہ تھے جنہیں استری کرنے کی ذمے داری ماہ بانو کے سر لگائی گئی تھی۔ استری اسٹینڈ کے آگے کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں اور کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارا کام ایک طرف ڈال کر خود گھر کی راہ لے لیکن ایسا کرنے کا وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ عمل کی راہ میں ماں باپ اور بھائی بہنوں کی التجا کرتی ہوئی نظریں حائل ہو جاتی تھیں۔ یہ نظریں اس سے کہتی تھیں کہ اگر تم نے وڈی چودھرائن کے حکم سے سرتابی کی کوشش کی تو ہماری زندگی جو پہلے ہی اچھی خاصی سخت ہے اور بھی مشکل میں پڑ جائے گی۔ نظروں کی اس التجا نے ماہ بانو کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد اس کی زبان پر بھی مُہر لگا دی تھی۔ اب وہ خود کو ملنے والے ہر حکم کی خاموشی سے تعمیل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ البتہ پہلے دن ضرور اس نے حویلی سے گھر واپس جانے کے بعد حویلی میں خود سے روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کی شکایت کرتے ہوئے دوبارہ حویلی جانے سے انکار کی کوشش کی تھی لیکن اس موقع پر نوراں نے اپنی منت سماجت اور مجبوریوں کی داستان سے اسے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماہ بانو اپنے ماں باپ کی مجبوریوں کو سمجھتی تھی لیکن اسے ان کی اس غلامانہ روش سے سخت اختلاف تھا۔ ان کی اس غلامانہ روش نے اسے اس مشکل میں پھنسایا تھا، اس کے بعد وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے کچھ بددل ہوگئی تھی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس سلسلے میں مزید زبان نہیں کھولے گی۔ وہ مشقت کے یہ چند بھاری دن خاموشی کے ساتھ گزار کر کبھی نہ واپس پلٹنے کے لیے گاؤں سے فیصل آباد واپس جانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

''ماہ بانو! تجھے تاجور بی بی بلا رہی ہیں۔'' رانی کی آواز نے ماہ بانو کو سوچوں کے سمندر سے نکالا۔

''کون تاجور بی بی؟'' استری شدہ پردہ ایک ملازمہ کو تھماتے ہوئے ماہ بانو نے بے زاری سے پوچھا۔ وہاں کام ایک چین کی شکل میں ہو رہا تھا۔ ماہ بانو پردہ استری کر کے دیتی تو دوسری ملازمہ استری شدہ پردے میں ہُک لگانا شروع کر دیتی۔ ہُک لگانے کے بعد پردے کو اس مقام پر پہنچا دیا جاتا جہاں اسے لگایا جانا تھا۔ اس کام کے لیے لمبے قد کی ایک چھریرے بدن والی ملازمہ کو ذمے داری سونپی گئی تھی۔ وہ ملازمہ اونچے سے اسٹول پر چڑھ کر پردوں کو ریلنگ میں لگانے کا کام بہ خوبی انجام دے رہی تھی۔ استری کا کام چونکہ سب سے زیادہ دقت طلب تھا، اس لیے اس کام پر ماہ بانو کے علاوہ بھی ایک اور ملازمہ مقرر کی گئی تھی۔ اس ملازمہ نے ایک دوسرا استری اسٹینڈ سنبھال رکھا تھا۔ حویلی میں بجلی کی سپلائی بڑے زبردست طریقے سے ہوتی تھی۔ دراصل بجلی کا اصل استعمال ہوتا ہی حویلی میں تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر گھروں میں تو ساٹھ وولٹ کے دو تین ٹمٹماتے ہوئے بلبوں اور ایک آدھ پنکھے کے سوا بجلی کے استعمال کی کوئی اور شے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ بے چارے اپنی محدود آمدنی میں اس سے زیادہ بجلی خرچ کر کے اس کے بل کی ادائیگی کے متحمل ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ شاید چودھری افتخار اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنے گاؤں میں اس سہولت کے فراہم کیے جانے پر کوئی روڑا اٹکانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ بہر حال، اس سہولت کا اصل فائدہ تو اسی کو پہنچنا تھا۔

''چودھری صاحب کی سب سے وڈی دِھی۔ تیری اماں نے انہیں بتایا ہے کہ تجھے بڑی اچھی ڈیزین (ڈیزائن) والی مہندی لگانی آتی ہے۔ تاجور بی بی نے یہ بات سنی تو مجھے تجھے بلانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ کل ہی

شہر سے کون مہندی لے کر آئی ہیں۔ تُو چھوڑ اب اس استری کے کام کو۔ اس کام پر بی بی نے مجھ سے نچھی کو لگانے کا کہا ہے۔ تُو چل کر بی بی کی بات سن لے۔'' رانی کا لایا ہوا پیام ماہ بانو کے لیے نجات بن کر آیا تھا۔ وہ جھٹ استری بند کر کے رانی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

''چودھری صاحب کی کتنی اولادیں ہیں رانی؟'' رانی کے ساتھ چلتے ہوئے ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔ اسے تجسس تھا کہ تین تین شادیاں کرنے والا چودھری افتخار، اولادیں کتنی رکھتا ہوگا۔

''کُل پانچ بچے ہیں چودھری صاحب کے۔ وڈی چودھرائن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی، منجھلی سے دو بیٹیاں اور چھوٹی سے صرف ایک بیٹا۔'' رانی نے بتایا۔

''مگر میں نے تو یہاں صرف ایک کشور بی بی کے سوا کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ باقی سارے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟'' ماہ بانو نے تعجب سے سوال کیا۔ وہ اور رانی بات مکمل کرنے کے لیے ایک ستون کے پاس جا رُکی تھیں۔

''تاجور بی بی اور صنوبر بی بی کی شادی کو تو کئی برس بیت گئے۔ دونوں بیاہ کر اپنے ماما کے گھر گئی ہیں۔ کشور بی بی کا خاندان میں کوئی جوڑ نہیں اس لیے وہ ابھی تک اسی حویلی میں بیٹھی ہیں۔ مشکل ہی ہے کہ ان کا کہیں بیاہ ہو۔ چودھری صاحب کے خاندان میں لڑکیوں کا بیاہ باہر کرنے کا رواج نہیں۔ مردوں کو بھی ایک شادی ضرور خاندان میں ہی کرنی ہوتی ہے۔ اب بے چاری کشور بی بی کی قسمت کہ دور نزدیک میں ان کے جوڑ کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔ تینوں بہنوں سے وڈے مراد چودھری ہیں۔ وہ کئی برس سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو بھی وہیں اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں یہاں اس ملک میں تعلیم کا کوئی اچھا انتظام نہیں اس لیے وہ اپنے بچوں کے ساتھ وہیں امریکہ میں رہیں گے۔ کبھی کبھی ملنے کے لیے حویلی آ جاتے ہیں۔ ویسے ان کا خرچہ یہاں سے چودھری صاحب بھجواتے رہتے ہیں۔ سب سے چھوٹے بہزاد چودھری تو سمجھو اللہ لوک ہیں۔ کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا ان بے چاروں کو۔ حویلی کی اوپر والی منزل پر سب سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے اُنہیں۔ اُن کے خادم اور ملازمائیں بالکل الگ ہیں۔ ان کی ماں، سب سے چھوٹی چودھرائن عصمت بی بی کو چودھری صاحب شہر سے بیاہ کر لائے تھے۔ سنا ہے یہ بیاہ ان کی مرضی کے بغیر کیا تھا ان کے گھر والوں نے۔ وہ لوگ چودھری صاحب کی دولت اور طاقت کے رعب میں آ گئے تھے۔ عصمت بی بی بے چاری شہر کی پڑھی لکھی، خوب صورت لڑکی تھیں۔ انہیں چودھری صاحب کی بیوی بننا منظور نہیں تھا لیکن ظاہر ہے لڑکی ذات کہاں تک اپنے گھر والوں سے لڑتیں۔ بیاہ کر آخر کار حویلی آ گئیں۔ پر اُن کا یہاں دل نہیں لگا۔ لوگ بتاتے ہیں بڑی اچھی طبیعت کی تھیں۔ سب سے بہت اچھی طرح بات کرتی تھیں لیکن خود بڑی اُداس اور پریشان رہتی تھیں۔ شاید ان کی اس کیفیت کی وجہ سے ہی جب بیاہ کے دو سال بعد بہزاد چودھری دنیا میں آئے تو ذہنی طور پر ٹھیک نہیں تھے۔ خود عصمت بی بی ان کی پیدائش کے وقت جان سے چلی گئیں۔ اپنی کشور بی بی کی ان سے بڑی دوستی تھی۔ انہوں نے کشور بی بی کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ ان کی اس مہربانی کی وجہ سے اب کشور بی بی کا وقت کچھ اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ سارا وقت کتابیں اور رسالے پڑھ کر اپنا دل بہلاتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھار اوپر جا کر بہزاد چودھری کا حال بھی دیکھ لیتی ہیں۔ کشور بی بی کا ہی دم ہے کہ ملازمائیں بہزاد چودھری کا خیال رکھتی ہیں ورنہ اور تو حویلی میں کسی کو بھی ان کا خیال نہیں۔ خود چودھری صاحب بھی کبھی بیٹے کا حال معلوم کرنے نہیں جاتے۔'' ماہ بانو کے پوچھنے پر رانی نے ساری تفصیل کہہ سنائی پھر ذرا سٹپٹاتے ہوئے بولی۔

''تُو نے مجھے باتوں میں لگا لیا۔ وہاں بی بی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ تیری وجہ سے میری بھی شامت آ جائے گی۔ ویسے بھی سب یہی کہتے ہیں کہ رانی کو باتیں بنانے کا بہت شوق ہے۔ ابھی بھی سب یہی سمجھیں گے



کہ میں تجھے لے کر باتیں کرنے کھڑی ہوگئی تھی۔'' تیز تیز بولتی وہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ یہاں اس وقت چودھری افتخار کی دونوں بیویوں کے ساتھ اس کی تینوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔

''کہاں مر گئی تھی تُو؟ اتنی دیر لگا دی واپس آنے میں۔'' رانی کو دیکھتے ہی تاجور نے اسے ڈانٹا۔

''وہ بی بی! اس کو فارغ کروا کر نچھی کو کام پر لگانے میں تھوڑا وقت لگ گیا اس لیے دیر ہوگئی۔'' رانی نے کچھ دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''چل، زیادہ بکواس نہ کر۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تُو کتنی ہڈ حرام ہے۔ موقع ملتے ہی کہیں باتیں بنانے کھڑی ہوگئی ہوگی۔'' رانی نے صحیح کہا تھا کہ تاخیر پر اس کی باتونی فطرت کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا۔ تاجور واقعی اس کے بنائے بہانے کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ رانی نے بھی مزید صفائی پیش کر کے اس کے غصے کو مزید بھڑکانے کے بجائے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

''لا، وہ کون لا کر دے اسے تاکہ یہ مہندی لگانا شروع کرے۔'' تاجور نے سخت لہجے میں رانی کو حکم دیا جس کی اس نے فوراً تکمیل کی۔ ماہ بانو اس کے ہاتھ سے کون تھام کر تاجور کی ہتھیلی پر نقش و نگار بنانے لگی۔ دوسری طرف رانی نے بھی ایک بڑے کٹورے میں بھگوئی ہوئی مہندی بڑی چودھرائن کے تلووں پر لگانی شروع کر دی۔ موسم اچھا خاصا سرد تھا۔ تلووں پر لگی مہندی کی ٹھنڈک کا تصور کر کے ماہ بانو کو پھریری سی آ گئی لیکن بڑی چودھرائن مزے سے گاؤ تکیے سے کمر لگائے نیم دراز تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ مسلسل اپنے پہلو میں رکھی خشک میووں کی بھری ہوئی پلیٹ سے اس کے منہ تک کا سفر طے کر رہا تھا۔ شاید یہ ان میووں ہی کی طاقت اور گرمی تھی جس نے بڑی چودھرائن کو اتنا جان دار بنا دیا تھا کہ اس پر سردی کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں یہ سب سوچتی ماہ بانو بڑی جانفشانی سے تاجور کے ہاتھوں پر مہندی کے گُل بوٹے بناتی رہی۔ تاجور کے ہاتھ پیروں پر مہندی لگا کر فارغ ہوئی تو صنوبر کا نمبر تھا۔

تخلیق کے مراحل سے گزرنے کے باعث صنوبر کا جسم اچھا خاصا بے ڈھب ہو رہا تھا۔ وہ اپنی حالت کی وجہ سے خوب پیر پسار کر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی اس آرام طلبی کا خیال رکھتے ہوئے اس کے پیروں پر مہندی کا ڈیزائن صفائی کے ساتھ لگانا ماہ بانو کے لیے اچھا خاصا دشوار مرحلہ ثابت ہوا۔ صنوبر خود کو ذرا بھی تکلیف میں مبتلا کرنے یا ہلنے جلنے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن فرمائش اس کی یہی تھی کہ ڈیزائن بہت عمدگی اور صفائی سے بنایا جائے۔ ماہ بانو بہ مشکل اس مرحلے سے گزری تو آگے تاجور اور صنوبر کی بیٹیاں مہندی لگوانے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ بظاہر آرام سے بیٹھے بیٹھے کیا جانے والا یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا، جتنا دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا۔ پوری توجہ اور عرق ریزی سے اس کام کو نمٹاتی ماہ بانو کی آنکھیں دُکھنے لگیں۔ البتہ رانی کبھی کی دونوں چودھرانیوں، تاجور اور صنوبر کے تلووں پر مہندی کا لیپ کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ اسے بڑی چودھرائن نے کسی اور کام کا بتا کر کمرے سے باہر بھیج دیا تھا۔ اب دونوں سوتنیں اور ان کی بیٹیاں آنے والی متوقع مہمان خواتین کے کپڑوں اور زیورات وغیرہ کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ ماہ بانو کو ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ تمام خواتین اپنی رشتے دار خواتین اور دیگر مہمانوں سے زیور اور کپڑوں کے مقابلے میں سبقت لے جانے کے لیے بھرپور تیاری کر کے بیٹھی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی تشویش کا شکار ہیں۔ تاجور اور صنوبر بھی میکے کی آزادی کا فائدہ اٹھا کر دل کھول کر اپنی مامی کی جو کہ ان کی ساس بھی تھی، برائیاں کرنے اور مذاق اُڑانے میں مصروف تھیں۔ البتہ افسران کی بیویوں کی طرف سے وہ بھی کچھ فکرمندی کا شکار تھیں کہ کہیں ان کے اعلیٰ ذوق کے سامنے وہ خود ماند نہ پڑ جائیں۔ کمرے میں موجود واحد ہستی جو خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کرتی ہوئی ان سارے

معاملات سے لاتعلق نظر آ رہی تھی، وہ چودھری افتخار کی سب سے چھوٹی بیٹی کشور تھی۔

''کشور دیکھ! کتنا سوہنا ڈیزائن بنایا ہے نوراں کی بیٹی نے۔ تُو بھی اس سے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگوا لے۔'' صنوبر نے اپنے مہندی لگے ہاتھ کشور کو دکھاتے ہوئے اسے ترغیب دی۔

''آپ ہی لگوائیں آپا! مجھے ایسا کوئی ارمان نہیں۔'' کشور نے پل کی پل میں صنوبر کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر نظریں واپس رسالے پر جما کر رُکھائی سے جواب دیا۔ کم عمر اور ناتجربہ کار ماہ بانو نے محسوس کیا کہ ''مجھے ارمان نہیں'' کہنے والی کشور کی نگاہ جب صنوبر کے مہندی لگے ہاتھوں پر پڑی تو ان آنکھوں میں بڑی تپش تھی اور اس تپش کے پیچھے ارمان ہی ارمان کروٹیں لے رہے تھے۔ لیکن اس نے اپنے ان ارمانوں پر بند باندھ رکھا تھا۔ ماہ بانو کو یک دم ہی رانی کی تھوڑی دیر پہلے بتائی گئی بات یاد آئی کہ کشور بی بی کے لیے خاندان میں کوئی جوڑ نہیں۔ اس لیے مشکل ہی ہے کہ ان کا بیاہ ہو سکے۔ حویلی والوں نے ان کے حاکمانہ اور ظالمانہ رویّے کی وجہ اچھی خاصی بددل ماہ بانو اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے کشور کا دُکھ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی۔ وہ خود ابھی صرف سترہ سال کی تھی، فی الحال اس کی زندگی میں کوئی نہیں آیا تھا لیکن کسی آنے والے کی راہ تو دل نے چپکے چپکے دیکھنا شروع کر دی تھی۔ پھر وہ کیسے مان سکتی تھی کہ بھرپور جوان کشور بی بی کے دل میں کوئی ارمان نہیں تھا۔ ارمان تو ہر دل میں ہوتے ہیں، چاہے وہ دل کسی غریب کسان یا مزارعے کی بیٹی کا ہو یا چودھری افتخار کی بیٹی کے سینے میں دھڑکتا ہو۔ بس کچھ تلخ اور کڑوی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ان ارمانوں، خوابوں اور خواہشوں کو پنپنے نہیں دیتیں۔ کشور کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

''ذرا میرے ہاتھ پر بھی تو تاجور جیسی مہندی لگا دے ماہ بانو!'' بڑی چودھرائن کی آواز سوچوں میں غلطاں ماہ بانو کو کمرے کے ماحول میں واپس کھینچ لائی۔ بڑی چودھرائن کی فرمائش سن کر تاجور اور صنوبر کی بچیاں منہ نیچے کر کے دبی دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔ ان ہنسنے والوں میں اس کی سوتن ناہید بھی شامل تھی۔ لیکن اس نے اپنی ہنسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ حویلی کی کرتا دھرتا بڑی چودھرائن کا کھل کر مذاق اُڑانے کی جرأت نہیں تھی اس میں۔ ایک تو وہ بڑی ہونے کی وجہ سے سبقت رکھتی تھی، دوسرے اسے حویلی کے وارث کی ماں ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ ہاں اگر ناہید کے ہاں صنوبر اور کشور کے علاوہ ایک بیٹا بھی ہو جاتا یا عصمت کا بیٹا بہزاد ذہنی معذوری کا شکار نہ ہوتا تو صورتِ حال قدرے مختلف ہو سکتی تھی۔ لیکن اب تو بڑی چودھرائن کے سامنے سر جھکائے رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ماہ بانو کو ن ہاتھ میں لیے بڑی چودھرائن کے قریب جا بیٹھی اور چودھرائن کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے کر اس پر نقش و نگار بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ چودھرائن جس کے بارے میں سنا تھا کہ عمر میں چودھری افتخار سے کئی برس بڑی ہے، تمام تر جدوجہد کے باوجود اس کے جسم پر عمر کے اثرات ظاہر تھے۔ وہ تاجور اور صنوبر کی طرح بھرا بھرا اور کسی ہوئی جلد والا ہاتھ نہیں رکھتی تھی کہ ماہ بانو آسانی سے اس کے ہاتھ پر اپنی کاریگری کا ہنر دکھا سکتی۔ جھریوں زدہ ہاتھ، جس پر جابجا نسیں اُبھری ہوئی تھیں، ماہ بانو کے فن کو مات دے کر اسے ناکام بنا رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ نک چڑھی بڑی چودھرائن خود یہ بات ماننے اور سمجھنے پر ہرگز تیار نہیں ہوگی۔ اس لیے پوری تندہی سے کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس کوشش میں اسے اپنے تن بدن اور اردگرد کا بھی ہوش نہیں تھا۔ جب ہی اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی آواز پر بری طرح چونک گئی۔

''ادھر کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' ماہ بانو نے پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھا۔ وہ چودھری افتخار تھا جو سوال تو جانے کس سے کر رہا تھا لیکن نظریں ماہ بانو کے وجود پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں نے ماہ بانو کو احساس دلایا



کہ اس کی اوڑھنی سر اور بائیں شانے سے سرک جانے کے باعث بڑی بے پروائی سے صرف دائیں شانے پر پڑی ہوئی ہے۔ اُس نے پھرتی سے اوڑھنی کو اپنے گرد لپیٹا۔ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار تھی لیکن نسوانی جبلّت اُسے چودھری افتخار کی نظر کا زاویہ سمجھا سکتی تھی۔

''ہم لوگ مہندی لگوا رہے تھے ابا جی!'' تاجور نے کھڑے ہو کر ادب سے چودھری افتخار کے سوال کا جواب دیا تو چودھری جو ماہ بانو کے نوخیز و پُرکشش حُسن کی رعنائیاں اوڑھنی کے پیچھے چھپ جانے کے باعث محویت سے نکل آیا تھا، تاجور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اچھی بات ہے بیٹا! پر یہ بتاؤ کہ تمہاری ماں کو اس بڈھے ویلے یہ کُڑیوں والا شوق کیوں چرایا ہے؟'' چودھری افتخار نے بڑی چودھرائن کا تمسخر اُڑایا جس کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ خود بڑی چودھرائن بھی بس برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

''میں تم لوگوں کو یہ بات یاد دلانے آیا تھا کہ سارے انتظامات پر کڑی نگاہ رکھنی ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ مردانے میں تو میں خود رہوں گا اس لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں آپ ہی وہاں کے سارے معاملات خود دیکھ لوں گا۔ پر تم لوگ دھیان رکھنا۔ ہر بار تم لوگوں کی بے پروائی سے زنان خانے میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے اور پھر زنانیاں اپنے گھروں کو واپس جا کر نام دھرتی ہیں۔ اس بار ایسی کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے مجھے۔'' چودھری افتخار نے گفتگو کا موضوع بدل کر سخت لہجے میں اپنے گھر کی خواتین کو حکم سنایا۔

''آپ فکر ہی نہ کریں چودھری صاحب! سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہوگا۔ اس واری میں نے پہلے سے ہی بڑی سختی کر رکھی ہے نوکرانیوں پر۔ اس واری وہ کوئی غلطی کرنے کی جرأت نہیں کریں گی۔'' بڑی چودھرائن کا سکہ ساری حویلی پر چلتا تھا لیکن چودھری افتخار کے سامنے وہ ہمیشہ آواز دبا کر بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے دھیمی آواز میں چودھری کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اس یقین دہانی پر چودھری افتخار نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن ایک طنز و نخوت بھری ''اونہہ'' کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''چل ہٹ پرے۔ لے کر میرے ہاتھوں کا ناس مار دیا۔'' بڑی چودھرائن نے چودھری افتخار کی ماہ بانو پر پڑنے والی نظریں بھی دیکھی تھیں اور اسے ایک مزارعے کی بیٹی کے سامنے اپنی بے عزتی کا بھی احساس تھا، اس لیے چودھری کے باہر نکلتے ہی ماہ بانو کو زور سے دھکا دے کر خود سے دور ہٹاتے ہوئے اپنے اندر کا غصہ نکالا۔ دھکے کے زور سے ایک طرف جا گرنے والی ماہ بانو، چودھرائن کے غصے کا سبب اور اپنا قصور ہی سوچتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''صاحب! میری مدد کرو۔'' شہریار لنچ ٹائم کے بعد اپنے آفس سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک بوڑھا مفلوک الحال شخص اس کے راستے میں آ کر کھڑا ہوا۔ شہریار نے رک کر اچانک راستے میں آ کھڑے ہونے والے اس بوڑھے کا جائزہ لیا۔ بوڑھے نے چار خانوں والی تہ بند پر ایک پھٹا ہوا بوسیدہ سا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ یہ بوسیدہ کُرتہ سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھا اور شہریار بوڑھے کے جسم میں موجود لرزش کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن یہ لرزش و کپکپاہٹ صرف سردی کی وجہ سے نہیں تھی، اس کے پیچھے بوڑھے کا مسلسل گریہ بھی موجود تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آنسو اُس کے جھریوں زدہ چہرے سے بہتے ہوئے اس کے بوسیدہ کُرتے میں جذب ہو رہے تھے۔

''صاحب! میری مدد کرو۔'' شہریار کی طرف سے فوری کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر بوڑھے نے اسے

دوبارہ مخاطب کیا۔

''اندر چلو بابا! پھر بات کرتے ہیں۔شہریار باہر جانے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ اپنے آفس کی طرف پلٹ گیا۔ بوڑھا آدمی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''ایک گلاس پانی لاؤ۔'' بوڑھے کو اپنے آفس میں بٹھا کر شہریار نے چپڑاسی کو حکم دیا۔

''پانی پیو بابا! پھر آرام سے بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟'' چپڑاسی پانی لے کر آیا تو شہریار نے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

بوڑھے نے چپ چاپ شہریار کی یہ بات مان لی اور ایک سانس میں سارا پانی چڑھا گیا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے اور وہ بائیں ہاتھ کی مدد سے اپنے رخساروں پر ٹھہرے آنسوؤں کے قطروں کو صاف کرنے لگا۔ چہرے پر آنسوؤں کے قطرے صاف کرتے ہوئے ان ہاتھوں کا کھردرا پن، اُبھری ہوئی رگیں اور سیاہ پڑتی ہوئی کھال گواہی دے رہی تھی کہ بوڑھے کی ساری زندگی ان تھک محنت اور مشقت میں گزری ہے۔ زندگی بھر کی یہ محنت و مشقت گویا اس کے ہاتھوں پر انمٹ نقش بن کر ثبت ہو گئی تھی۔

''ہاں بابا! اب بولو کیا مسئلہ ہے؟ تمہیں مجھ سے کیا مدد چاہئے؟'' بوڑھے کو سنبھلتے دیکھ کر شہریار نے نرمی سے اس کا مسئلہ پوچھا۔

''میں لٹ گیا صاحب! میں برباد ہو گیا۔ میری زندگی بھر کی کمائی اور عزت لوٹ کر لے گئے ظالم۔'' بوڑھے کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چلے آئے۔

''کس نے لوٹ لیا تمہیں؟ کون ہے یہ ظلم کرنے والا؟ ذرا آرام سے اور تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔'' شہریار یہ تو محسوس کر سکتا تھا کہ وہ شخص کسی نہایت اندوہ ناک حادثے سے گزرا ہے لیکن ان جملوں سے پوری تفصیل اخذ کرنا مشکل تھا اس لیے اس نے بوڑھے کو کریدا۔

''کیا بتاؤں صاحب! کہ وہ کون ہیں؟ ان کا کوئی نام اور پتہ تو ہے نہیں۔ وہ تو بس کسی آندھی کی طرح آتے ہیں اور ہم غریبوں کو برباد کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے کتنی مشکل سے اپنی دِھی کے جہیز کے لیے زیور، کپڑا جوڑا تھا۔ برات کو کھانا کھلانے کے لیے رقم جمع کی تھی۔ ظالم سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ساتھ میری دِھی کو بھی لے گئے۔ میں نے کتنی منت کی ان کی۔ سر پیروں پر رکھ دیا، پر وہ میرے سفید چونڈے کا لحاظ کیے بغیر اس پر ٹھوکر مار کر چلے گئے۔'' بوڑھے کی بات سن کر شہریار نے پہلی بار نوٹ کیا کہ اس کے ماتھے پر بائیں جانب اچھا خاصا بڑا گومڑ اُبھرا ہوا تھا۔ یہ گومڑ یقیناً بوڑھے کو لگائی جانے والی ٹھوکر ہی کا شاخسانہ تھا۔

''تم نے تھانے میں رپورٹ کروائی اس واقعے کی؟'' بوڑھے کا خاندان واقعی ایک قیامت سے گزرا تھا۔ شہریار نے اپنے دل میں اس کے لیے حقیقی دکھ محسوس کرتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

''پہلے ادھر ہی گیا تھا۔ تھانے دار بولتا ہے، پہلے دو سو روپیہ دو، پھر پرچہ کاٹے گا۔ میں اس کو دو سو روپیہ کہاں سے دیتا؟ ڈاکو پائی پائی لوٹ کر لے گئے ہیں میرے گھر سے۔ میرے پاس تو یہاں آنے کے لیے تانگے کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ اپنے گاؤں سے پیدل یہاں تک آ رہا ہوں۔ صبح فجر کے بعد کا چلا ہوا تھا۔ پہلے تھانے گیا تھا، وہاں کسی نے نہیں سنی پھر کسی نے کہا، نیا اے، سی آیا ہے اور اچھا آدمی ہے۔ اس سے جا کر شکایت کرو۔ وہ تمہاری عرض سنے گا۔ اس لیے میں یہاں دوڑا آیا۔''

بوڑھے کی بتائی گئی تفصیلات سن کر شہریار کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑنے لگی تھی۔ کیسا ستم تھا کہ ایک شخص پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اپنی کُل پونجی کے ساتھ اپنی عزت سے بھی محروم ہو گیا تھا اور کوئی اس کے ساتھ



ہوئے اس ظلم کی رپورٹ لکھنے والا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ رپورٹ لکھوانے کے لیے دو سو روپے تھانے دار کو رشوت میں نہیں دے سکتا تھا۔

''تھانے دار کون ہوتا ہے رپورٹ لکھنے کے دو سو روپے مانگنے والا؟ تم پر ظلم ہوا ہے، تمہارا حق ہے کہ تم اس ظلم کی رپورٹ لکھواؤ۔''

''تھانے دار بولتا ہے، تُو نے اپنے پاس بڑا مال دبا رکھا ہے۔ تیرے پاس مال تھا، جب ہی تو ڈاکو تیرے گھر آئے تھے۔ اب اس مال میں سے تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے۔'' بوڑھے نے تھانے دار کا مؤقف بتایا۔

اس بار شہریار نے بوڑھے سے کچھ نہیں کہا اور انٹرکام پر عبدالمنان کو اندر آنے کا حکم دیا

''عبدالمنان! گاڑی نکلواؤ۔ ہمیں ابھی اس شخص کے ساتھ اس کے گاؤں جانا ہے۔'' عبدالمنان کے اندر آتے ہی شہریار نے اسے ہدایت جاری کی۔

''او کے سر! میں ابھی پانچ منٹ میں بندوبست کرتا ہوں۔'' عبدالمنان نے جواب دیا اور واقعی ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ لوگ گاڑی میں سوار بوڑھے کے گاؤں جا رہے تھے۔ بوڑھا گاڑی کی اگلی نشست پر ڈرائیور مشابرم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ عبدالمنان، شہریار کے ساتھ پچھلی نشست پر تھا۔ راستے میں شہریار نے عبدالمنان کو بوڑھے کے ساتھ بیتے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا اور پھر اس سے پوچھا۔

''کیا اس سے پہلے بھی اس قسم کے کیسز سامنے آئے ہیں؟''

''یقین سے تو نہیں بتا سکتا سر! لیکن بعض اوقات اُڑتی اُڑتی یہ خبر مل جاتی ہے کہ ڈاکوؤں کے گروہ نے کسی گاؤں پر حملہ کیا اور ان کا مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ کوئی لڑکی بھی اٹھا کر لے گئے۔'' عبدالمنان نے محتاط الفاظ میں شہریار کے سوال کا جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر شہریار نے خاموشی اختیار کر لی۔ باقی کا راستہ اسی خاموشی میں گزرا۔

راستہ کچھ طویل تھا لیکن اس طوالت کو مضبوط ٹائروں اور طاقتور انجن والی گاڑی نے بہت تیزی سے طے کر لیا تھا۔ اس کے باوجود شہریار، بوڑھے شخص کی اس تکلیف کو محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا جو اس نے کئی گھنٹوں کی مسافت پیدل طے کرنے میں اٹھائی ہو گی۔ بالآخر راستوں پر دھول اُڑاتی گاڑی نے انہیں بوڑھے کے گاؤں پہنچا دیا۔ شہریار چاہتا تو اس دور دراز گاؤں تک کا سفر کرنے کے بجائے براہِ راست متعلقہ تھانے پہنچ کر وہاں کے تھانے دار سے باز پرس کر سکتا تھا لیکن اس نے مناسب یہی سمجھا کہ پہلے خود معاملے کی تحقیق کر لے، پھر تھانے دار کی کلاس لے۔ چنانچہ اب اس کا ڈرائیور مشابرم خان بوڑھے کی راہنمائی میں گاڑی کو اس کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑا رہا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا یہ بلتی ڈرائیور بڑا مستعد اور فرض شناس تھا۔ جلد ہی اس نے کچے پکے اور اونچے نیچے راستوں پر مہارت سے گاڑی دوڑاتے ہوئے ان لوگوں کو بوڑھے کے گھر تک پہنچا دیا۔ گھر کیا تھا، بس دو تین کمروں پر مشتمل ایک کچا سا کوٹھا ہی تھا جس کے سامنے اس وقت بھی چار پانچ افراد کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''کہاں چلا گیا تھا دین محمد! تیری بیوی کو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں اور چھوٹا لڑکا غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ اس کے غصے سے ڈر کر ہم نے ابھی تک کمرے کی کنڈی بھی نہیں کھولی۔'' جوں ہی بوڑھے نے ان لوگوں کے ساتھ گاڑی سے باہر قدم رکھا، تقریباً اسی کی عمر اور حلیے والا ایک شخص لپک کر اس کے قریب آیا اور اسے بتانے لگا۔

''انصاف کی تلاش میں گیا تھا بھرا! یہ نئے اے، سی صاحب ہیں۔ یہ میری عرض سن کر خود یہاں تک مجھے

اپنی گڈی میں بٹھا کر لائے ہیں۔ اب یہی کچھ کریں گے میرے لئے۔'' بوڑھے نے جسے دین محمد کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، خود سے مخاطب ہونے والے کو بتایا۔ پھر وہ شہریار اور عبدالمنان کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا۔ مشابرم خان باہر گاڑی میں ہی ان لوگوں کا منتظر رہا۔ بوڑھے کے گھر کے در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ اس ویرانی میں دین محمد کی بیوی کے رونے اور واویلا کرنے سے ذرا دیر کو ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر وہ دوبارہ غشی میں چلی جاتی تو ماحول پر خاموشی چھا جاتی۔ گاؤں کی دو چار عورتیں دین محمد کی بیوی کو سنبھالنے کے لیے وہاں موجود تھیں لیکن ان پر بھی موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہ گھر جہاں سے ایک جوان لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہو، اس طرح موت کا منظر ہی پیش کر سکتا تھا۔ شہریار نے اپنے پیچھے ہی گھر کے اندر آ جانے والے افراد سے واقعے کے بارے میں تفصیلات پوچھنا شروع کر دیں۔ لوگوں سے اسے جو کچھ معلوم ہوا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دین محمد کی اکلوتی بیٹی کی شادی دوسرے گاؤں کے ایک لڑکے سے دو دن بعد ہونے والی تھی۔ شادی کی تیاریاں مکمل تھیں اور لڑکی کو مایوں بٹھایا جا چکا تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے دین محمد نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کے لیے جہیز کا انتظام کیا تھا۔ لڑکی کے جہیز کے لیے زیور، کپڑے، برتن اور دوسری ضروری اشیاء تیار تھیں۔ دین محمد نے دوسرے گاؤں سے آنے والی بارات کے لیے پانی اور کھانے کے لیے بھی رقم جوڑ رکھی تھی۔ اس کام میں دین محمد کے دونوں نوعمر بیٹوں نے بھی خوب ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ بھی بہن کے جہیز کی تیاری کے لیے دن رات محنت مزدوری کرتے رہے تھے۔ غرض شادی کا انتظام مکمل تھا اور گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ لڑکی کی سہیلیاں اور گاؤں کی دوسری عورتیں ہر شام دین محمد کے گھر پر جمع ہو کر شادی بیاہ کے گیت گاتیں اور ہنسی مذاق کرتیں۔ ان عورتوں کی بھی دین محمد کے گھر میں حسب استطاعت خوب تواضع کی جاتی۔ کل بھی اس کے گھر پر عورتوں اور لڑکیوں کی یہ محفل جمی تھی اور حسب معمول وہ لوگ رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئی تھیں۔ پھر جانے کیا ہوا کہ آدھی رات کو دین محمد کے گھر سے اس کی اور اس کی بیوی کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گاؤں والے دوڑ کر وہاں پہنچے تو خوشی کے گھر کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ دین محمد اپنا سر پیٹ رہا تھا اور اس کی بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے اس کے بیٹوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں کے پوچھنے پر دین محمد بہ مشکل گاؤں والوں کو بتا پایا کہ پانچ ڈاکو اسلحہ لے کر اس کے گھر میں گھس آئے تھے اور مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ اس کی بیٹی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دونوں لڑکے اس صورتِ حال پر بہت گرم ہو گئے تھے اور انہوں نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ جواب میں ڈاکوؤں نے اپنی رائفلوں کے بٹ سے ان کی تواضع کی۔ دین محمد ڈر گیا کہ بیٹوں کا یہ جوش ان سے ان کی زندگی نہ چھین لے۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ یہ کنڈی ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دین محمد اکیلا ہی خوار ہوتا پھر رہا تھا۔ وہ صبح سورج نکلتے ہی گھر سے نکل گیا تھا تاکہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی رپورٹ لکھوا سکے لیکن تھانے میں اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دین محمد کسی کے مشورے پر شہریار کے دفتر جا پہنچا تھا۔ ساری تفصیلات سن کر شہریار کو شدید افسوس ہوا۔ اس کے سامنے ہی کمرے کی کنڈی کھول کر دین محمد کے بیٹوں کو باہر نکالا گیا۔ ان میں سے ایک لڑکا اٹھارہ سال کا اور دوسرا تقریباً چودہ پندرہ سال کا تھا۔ لڑکوں کے چہرے پر تھکن، دُکھ اور غصہ صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

''سارے بے ایمان اور لالچی لوگ بیٹھے ہیں حکومت کی سیٹوں پر۔ ڈاکوؤں کے لوٹ کے مال میں افسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے اسی لیے کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔'' چھوٹے لڑکے نے شہریار کو دیکھتے ہی چیخنا اور الزام لگانا شروع کر دیا۔ شہریار نے تحمل سے اُس کا یہ الزام سنا مگر لڑکا بہت غضب ناک ہو رہا تھا اور شاید



ڈاکوؤں کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی سبکی کا بدلہ شہریار کی اچھی طرح بے عزتی کر کے لینا چاہتا تھا۔ لڑکے کے تیور دیکھ کر گاؤں کے دو تین افراد نے اسے سنبھالا اور پھر واپس اسی کمرے میں بند کر دیا۔

شہریار نے اس صورتِ حال پر کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر دین محمد کو ایک بار پھر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مشابرم خان کو قصبہ نور کوٹ میں واقع تھانے چلنے کا حکم دیا۔ وہ لوگ تھانے پہنچے تو تھانے کا عملہ بے حد مستعد اور فعال نظر آیا۔ یقیناً کسی ذریعے سے انہیں شہریار کے دین محمد کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی خبر مل گئی تھی اور ان کے لیے شہریار کی تھانے میں آمد سو فیصد یقینی تھی، اس لیے انہوں نے اس کے تھانے پہنچنے سے پہلے سارا سیٹ اپ تیار کر لیا تھا۔ تھانے دار نے ان کے تھانے پہنچنے پر بہت ادب اور جوش سے شہریار کا استقبال کیا۔ اُس کے اس جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہریار نے اپنے انداز کو سرد ہی رکھا اور دین محمد کے کیس کے متعلق باز پرس شروع کر دی۔

''توبہ سر جی! توبہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں رپورٹ درج کرنے کے لیے کسی سے دو سو روپے طلب کروں۔ میں تو رات تھانے میں تھا ہی نہیں جی۔ میرے پیٹ میں سخت گڑبڑ تھی اس لیے اپنے کوارٹر میں ہی آرام کر رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے جی کہ یہ پیٹ کی گڑبڑ بندے کو کیسا نڈھال کر دیتی ہے۔ پر میں آدمی بڑا فرض شناس ہوں۔ بیوی نے بہت روکا کہ آج ڈیوٹی پر نہ جاؤں پر رُکا نہیں اور طبیعت ذرا سی سنبھلتے ہی تھانے پہنچ گیا۔ بس یہ ہے کہ مجھے پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ بندہ مجھ پر الزام لگاتا ہے کہ میں نے رپورٹ لکھنے کے اس سے دو سو روپے مانگے تھے تو جناب! جب میں صبح سے بلکہ رات سے تھانے میں تھا ہی نہیں تو روپے کیسے مانگتا؟ اس بابا جی کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شہریار کی بات سن کر تھانے دار نے فوراً اپنے کلّے پیٹنے شروع کر دیئے اور باتیں بنانے لگا۔

''ممکن ہے تمہارے کسی ماتحت نے یہ حرکت کی ہو۔ فی الحال میں اس معاملے کی تحقیق میں پڑ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم خود ہی طے کر لو کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے آئندہ ایسی کوئی شکایت نہیں ملنی چاہئے۔ ورنہ اس تھانے کا سارا عملہ معطل ہو سکتا ہے۔'' شہریار سمجھ رہا تھا کہ تھانے دار نری ڈرامے بازی کر رہا ہے لیکن فی الحال کوئی سخت ایکشن لینے کے بجائے زبانی تنبیہہ کرنا ہی کافی سمجھا۔

''میں خیال رکھوں گا سر! بس آپ یہ بتائیں کہ اس بابے کا مسئلہ کیا ہے؟ ہم اپنی جان لگا کر اس کا مسئلہ حل کریں گے۔ آخر ہم یہاں بیٹھے ہی عوام کی خدمت کے لیے ہیں۔'' تھانے دار ضرورت سے کچھ زیادہ ہی فرض شناسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس کی اس مصنوعی فرض شناسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہریار نے دین محمد کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر دین محمد اپنے ساتھ بیتے حادثے کی تفصیل تھانے دار کو سنانے لگا۔ تھانے دار نے بڑی ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی بات سنی اور اپنے ہاتھ سے رپورٹ لکھنے لگا۔

''بڑا افسوس ہوا سر جی! اس بابے کے ساتھ ہونے والے ظلم کا سن کر۔ واقعی بڑا گہرا صدمہ پہنچا ہے اس بے چارے کو۔ جوان بیٹی کا اغوا ہونا تو اس کی موت سے بھی بڑی بات ہے۔ شاید اسی لیے اس بابا جی کی مت ماری گئی اور یہ اپنے حواس کھو کر اُلٹی سیدھی شکایت لگانے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے تو پورا یقین ہو چلا ہے کہ یہ بابا میرے تھانے میں آیا ہی نہیں اور بدحواسی میں سیدھا آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ میرے عملے میں کون ایسا رشوت خور نکل آیا جو میری اتنی سختی کے باوجود اس بابا جی سے رشوت مانگ بیٹھا۔ پر اب میں سمجھ گیا ہوں کہ گڑبڑ میرے عملے کی نہیں، بابا جی کے دماغ کی ہے۔''

تھانے دار رپورٹ لکھ کر فارغ ہوا تو ایک بار پھر اپنی زبان کے جوہر دکھانے لگا۔ شہریار دیکھ سکتا تھا کہ

دین محمد میں تھانے دار کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں۔ شاید یہ تھانے دار کی ان نظروں کا اثر تھا جو دین محمد کی طرف اُٹھتی تھیں تو ان میں قہر بھرا ہوتا تھا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ بہرحال، اصل مسئلہ اس شخص کی دماغی حالت کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کی تحقیق کرنے کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس رپورٹ کو صرف تھانے کے ریکارڈ کے طور پر سجا کر نہیں رکھیں گے بلکہ اس پر آپ کو ایکشن بھی لینا ہوگا۔ آپ فوری طور پر ایکشن لیں اور مغویہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے بازیاب کروانے کے سلسلے میں پیش رفت کریں۔ چار دن کے اندر اندر اس کیس کی رپورٹ میرے سامنے پیش ہونی چاہئے۔'' تھانے دار کے بیان کو کوئی اہمیت دیئے بغیر شہریار نے اسے حکم دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہونے لگا۔

''پلیز سر! یہ چائے تو پیتے جائیں۔ جلدی میں ہم سے فی الحال یہی انتظام ہو سکا۔ کسی روز آپ اطلاع دے کر آئیں تو ہم آپ کی اچھی طرح خاطر تواضع کریں گے۔'' شہریار کو کھڑے ہوتے دیکھ کر تھانے دار نے میز پر سجے چائے کے برتنوں اور دیگر لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشامد بھرے لہجے میں درخواست کی۔ چائے اور اس کے ساتھ موجود یہ لوازمات ابھی ابھی دو سپاہی مل کر میز پر سجا کر گئے تھے۔

''نو تھینکس۔ میں بے وقت کھانے پینے سے گریز کرتا ہوں۔ آپ بھی احتیاط کیا کریں۔ پولیس کی نوکری کرنے والے شخص کو چاق و چوبند اور اسمارٹ ہونا چاہئے۔ ورنہ پولیس والا اپنی توند پر پینٹ ہی سنبھالتا رہ جاتا ہے اور مجرم بھاگ جاتے ہیں۔'' شہریار نے تھانے دار کی دعوت قبول کرنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی توند کی طرف اشارہ کر کے طنز کیا۔ تھانے دار خود پر کی جانے والی اس چوٹ پر جھینپ گیا اور پھر شاید اسی لیے دوبارہ شہریار سے چائے پینے پر اصرار نہیں کیا۔ تھانے سے نکل کر شہریار نے مشابرم خان کو ہدایت کی کہ پہلے دین محمد کو اس کے گاؤں کے قریب اتار دیا جائے پھر واپس چلا جائے۔ مشابرم خان نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

''دین محمد! میں نے تمہارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا مدرسہ دیکھا تھا۔ وہ مدرسہ کس نے بنوایا ہے وہاں؟''

گاڑی روانہ ہوئی تو شہریار کو دین محمد کے گاؤں میں دیکھی گئی اس عمارت کا خیال آیا جو تقریباً سو گز کے رقبے پر تعمیر کی گئی تھی۔ عمارت چھوٹی تھی لیکن پسماندہ سے گاؤں کے کچے گھروں کے مقابلے میں اس کی تعمیر کافی اچھی تھی۔ شہریار نے اس عمارت کے گیٹ پر کسی مدرسے کا بورڈ آویزاں دیکھا تھا لیکن اس وقت دین محمد سے اس بارے میں استفسار کرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے تجسس کے باوجود چپ رہا تھا۔ اب اسے دوبارہ اس مدرسے کا خیال آیا تو دین محمد سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''وہ مدرسہ شاہ نواز صاحب نے بنوایا ہے صاحب! شاہ نواز صاحب بڑا نیک آدمی ہے۔ اس کے آنے سے ہمارے گاؤں کی قسمت جاگ گئی ہے۔ پہلے بچے اِدھر اُدھر آوارہ پھرنے میں اپنا وقت برباد کرتے تھے، اب مدرسے جا کر دین کی باتیں سیکھتے ہیں۔ شاہ نواز صاحب انہیں اپنے پلّے سے ایک وقت کی روٹی بھی کھلاتے ہیں۔ بڑے ہی سخی دل والے ہیں شاہ نواز صاحب۔'' شہریار کے سوال کرتے ہی دین محمد نے کسی شاہ نواز کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔

''یہ شاہ نواز صاحب اصل میں ہیں کون دین محمد؟.....اور یہ آئے کہاں سے ہیں؟'' دین محمد کے جواب نے شہریار کے اشتیاق کو بھڑکایا کہ وہ شاہ نواز کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

''یہ سب تو نہیں معلوم صاحب! پر اتنا معلوم ہے کہ شاہ نواز صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔'' دین محمد کے



لہجے میں عقیدت تھی۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ شاہ نواز بھی کوئی ماسٹر آفتاب کی کیٹیگری کا آدمی ہے جو آرام اور آسائش کی زندگی چھوڑ کر گاؤں کے ان پسے ہوئے لوگوں کی بھلائی کے خیال سے ان کے درمیان آ بسا ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی ذات کا آرام تج دینے والے ایسے لوگ شہریار کو بہت اچھے لگتے تھے۔ شہریار کی خواہش تھی کہ وہ شاہ نواز سے ملاقات کرے اور اس کے مدرسے کو دیکھے لیکن آج وہ پہلے ہی طے شدہ شیڈول سے بہت ہٹ کر مصروف رہا تھا اور اب اس کے پاس قطعی وقت نہیں تھا کہ شاہ نواز سے ملاقات کے لیے جا سکے۔ آج اسے چودھری افتخار کے دادا کے عرس میں شرکت کے لیے پیر آباد بھی پہنچنا تھا۔ وہ اگر شاہ نواز سے ملاقات کی کوشش کرتا تو چودھری افتخار کے گاؤں پہنچنے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ ناچار اپنی اس خواہش کو دبا کر بیٹھا رہا اور مشابرم خان نے دین محمد کو اس کے گاؤں کی حدود کے قریب اتارنے کے بعد گاڑی موڑ لی۔

⊛----✪----⊛

شہریار وقتِ مقررہ پر پیر آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں بھی اپنے راستوں اور مکانوں کی حالت کے اعتبار سے کافی پسماندہ دکھائی دیتا تھا۔ البتہ رقبے کے اعتبار سے یہ اس ضلعے کا سب سے بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کی بیشتر زمین چودھری افتخار اور اس کے خاندان کے افراد کی ملکیت تھی۔ گاؤں کے نام کے بارے میں اسے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پہلے اس گاؤں کا نام کچھ اور تھا لیکن چودھری افتخار کے دادا پیر مراد عالم شاہ کی وفات کے بعد پرانا نام بدل کر گاؤں کا نام پیر آباد رکھ دیا گیا۔ اسی پیر آباد میں آج چودھری مراد عالم شاہ کا عرس منایا جا رہا تھا۔ درگاہ کا احاطہ عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہریار کی گاڑی گیٹ پر جا کر رُکی تو اس کے گاڑی سے اُترنے سے پہلے ہی منشی اللہ رکھا استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ اس نے شہریار کے ڈرائیور مشابرم خان کو موقع دیئے بغیر خود گاڑی کا دروازہ کھولا اور پھر لوگوں کے ہجوم سے ہٹ کر ایک صاف ستھرے اور کشادہ راستے سے شہریار کو اس مقام تک لے گیا جہاں چودھری افتخار کے مدعو کیے گئے خاص خاص مہمانانِ گرامی تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ دراصل ایک طویل و عریض، بلند چبوترا تھا جس پر ایک طرف کرسیاں لگا کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا جبکہ دوسری طرف سفید براق چاندنیوں پر قوالوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس ٹولی کے ہر فرد نے سفید ململ کے کُرتوں پر آڑھے پاجامے پہن رکھے تھے اور ان کے سروں پر سبز منقش ٹوپیاں جمی ہوئی تھیں۔ یہ قوال چودھری افتخار عالم کے دادا کی شان میں لکھی منقبتیں گا رہے تھے۔ منقبت کے اشعار میں کہیں کہیں پیر صاحب کے علاوہ ان کی آل اولاد کی بھی تعریف و توصیف آ جاتی تھی۔ شہریار نے غور سے منقبت کے الفاظ سنے۔ ان الفاظ کو سن کر لگتا تھا کہ پیر مراد عالم شاہ سے بڑھ کر نیک و صالح ہستی رُوئے زمین پر کوئی اور نہ گزری ہو۔ یقیناً تعریفوں کے یہ پُل بندھوانے کے لیے پیشہ ور شعراء کو بھاری قیمت ادا کی گئی تھی۔

چبوترے پر سب سے نمایاں جگہ پر ایک بلند اور سنہری کرسی رکھی گئی تھی۔ فی الحال یہ کرسی خالی تھی۔

شہریار کی نظر ان مناظر سے بھٹکتی ہوئی چبوترے کے دائیں طرف موجود اسٹال پر پڑی۔ یہ اسٹال محرم میں جا بجا لگائی جانے والی سبیلوں سے مشابہ تھا۔ اسٹال رنگ برنگے کاغذی پھولوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا اور میزوں پر سرخ کپڑا بچھا کر مٹی کے بڑے بڑے مٹکے رکھے گئے تھے۔ ان مٹکوں پر گلاب اور موتیے کے پھولوں کی لڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی مٹی کے چھوٹے چھوٹے کوزے بھی رکھے تھے۔ عقیدت مندوں کی بڑی تعداد کا رخ اس اسٹال کی طرف تھا۔ اسٹال پر موجود کارندے مٹی کے کوزوں میں مٹکوں سے پانی بھر بھر کر عقیدت مندوں میں تقسیم کر رہے تھے جسے بڑی عقیدت کے ساتھ پیا جا رہا تھا۔ اسٹال پر

مٹکوں کے ساتھ ہی ایک صندوقچی بھی رکھی تھی۔ اکثر عقیدت مند پانی پینے سے پہلے اس صندوقچی میں کچھ نہ کچھ ڈال رہے تھے جبکہ شہریار نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ مٹی کے کوزوں میں تقسیم ہونے والے پانی سے وہی لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں جو صندوقچی میں کچھ ڈالتے ہیں۔ اس عقدے کو حل کرنے کے لیے اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ایس پی کو ٹٹولا۔

''بڑے پیر صاحب چودھری مراد عالم شاہ کی قبر کو کل عرقِ گلاب اور کیوڑا ملے پانی سے غسل دیا گیا تھا۔ یہ اس غسل کا ہی پانی ہے جسے لوگ تبرک کے طور پر پیتے ہیں۔'' ایس پی نے جو گزشتہ کئی سالوں سے اس تقریب میں شرکت کرتا آ رہا تھا، شہریار کی معلومات میں اضافہ کیا اور پھر آواز کو مزید دھیما کر کے بتانے لگا۔ ''تھوڑی دیر بعد پیر صاحب کی قبر پر وہ خصوصی چادر چڑھائی جائے گی جو اردگرد کے زمیندار مل کر ہر سال تیار کرواتے ہیں۔ اس چادر کی تیاری میں بہت قیمتی کپڑا استعمال ہوتا ہے۔ چادر پر لکھی عبارت اور نقوش کے لیے سونے چاندی کے تاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قبر کو غسل دینے سے پہلے پرانی چادر اُتار کر محفوظ کر لی جاتی ہے اور عرس والے دن نئی چادر چڑھائی جاتی ہے۔''

شہریار، ایس پی کی فراہم کردہ ان معلومات کو سن کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ پرانی چادر جس پر سونے چاندی کے تاروں سے کام ہوتا تھا کس طرح اور کن ہاتھوں میں محفوظ ہوتی ہو گی۔ وہ چودھری افتخار اور اس کے باپ دادا کو ان کی چالاکی پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ لوگوں کی اندھی عقیدت سے مستقل بنیادوں پر فائدہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بڑی عیاری سے، بہت شاندار سیٹ اپ تیار کر رکھا تھا۔ ابھی شہریار، چودھریوں کی اس چالاکی پر غور کر ہی رہا تھا کہ فضا پر سناٹے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے گھومتے لوگ مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر شہریار نے وہ سجی ہوئی ڈولی دیکھی جسے کئی افراد نے اٹھا رکھا تھا۔ ڈولی چبوترے پر رکھی بلند سنہری کرسی کے مقابل لا کر رکھی گئی اور پھر اس میں سے چودھری افتخار عالم شاہ برآمد ہوا۔ آج تو چودھری کی چھب ہی نرالی تھی۔ اس نے ایک سبز رنگ کا قیمتی عبا پہن رکھا تھا۔ اس عبا کی لمبائی اتنی زیادہ تھی کہ وہ پیچھے سے فرش کو چھو رہا تھا۔ عبا پر کیا گیا سنہری کام بھی یقیناً سونے کے تاروں سے ہی کیا گیا تھا۔ چودھری کے سر پر رکھی دستار بھی سبز اور سنہری رنگ کے امتزاج سے تیار کی گئی تھی۔ چودھری کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں پتھر جڑی قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔ انہی انگلیوں کے درمیان اس نے ایک چمکتی ہوئی لمبی سی تسبیح پھنسا رکھی تھی۔ چودھری ڈولی سے اتر گیا تو ڈولی لے کر آنے والے اسے اٹھا کر واپس لے گئے۔ چودھری افتخار نپے تلے قدموں سے چلتا کرسی تک پہنچا اور پورے کروفر سے اس پر براجمان ہو گیا۔ پھر اس نے دائیں جانب کی نشستوں پر بیٹھے خاص مہمانوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور سر کو ہلکا سا خم دینے کے بعد عقیدت مندوں کے اس ہجوم کی طرف متوجہ ہو گیا جو چبوترے کے نیچے سروں کے ایک ڈھیر کی صورت میں بالکل اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے کھیت میں موجود کسی کھڑی فصل کے پھول نظر آتے ہیں۔ چبوترے سے نیچے جانے والی سیڑھیوں پر چودھری کے کارندے کھڑے تھے جنہوں نے عقیدت اور وفورِ شوق سے بے حال ہوتے ہوئے زائرین کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ چودھری نے اپنے کارندوں کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ کارندوں نے زائرین میں سے اِکا دُکا کو سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آنے کی اجازت دینی شروع کر دی۔ اوپر آنے والا ہر زائر دونوں ہاتھ باندھ کر، ادب سے اس کرسی کے قریب پہنچتا جس پر چودھری افتخار عالم شاہ رونق افروز تھا۔ قریب پہنچنے کے بعد وہ دوزانو بیٹھتا اور چودھری کے تسبیح والے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت بھرا بوسہ دے کر الٹے قدموں جھکا جھکا، تمتماتے چہرے کے ساتھ چبوترے سے اُتر جاتا۔ یہ خوشی کہ وہ ان گنے چنے چند لوگوں میں سے ہے، جسے



ی افتخار عالم شاہ کے ہاتھ کا بوسہ لینے کا شرف حاصل ہوا ہے، اس کی آنکھوں سے پھوٹی پڑتی تھی۔

شہریار خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے اور لوگ بھی یہی کام کر رہے تھے۔ عقیدت ں کو اس سعادت سے کچھ دیر نوازنے کے بعد چودھری افتخار نے ہاتھ کے اشارے سے کارندوں کو مزید ا لوگوں پر بھیجنے سے روک دیا۔ اب پیر صاحب کی قبر پر پہنچ کر چادر چڑھانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ چودھری افتخار ا تمام خصوصی مہمانوں کے جلو میں درگاہ کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اس کے دادا حضور کی قبر تھی۔ قبر پر ے بعد زمینداروں کے باہمی تعاون سے تیار کی گئی سبز منقش چادر ایک بڑے سے تھال میں رکھ کر ی افتخار کی خدمت میں پیش کی گئی۔ چودھری نے یہ چادر بڑی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ی قبر پر چڑھا دی۔ اس موقع پر کئی افسران نے چودھری کی معاونت کی، خصوصاً ایس پی اس کام میں پیش ہا۔ خود شہریار نے اس موقع پر ذرا پیچھے رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ چادر چڑھانے کی رسم کی ادائیگی کے بعد ی افتخار تمام خصوصی مہمانوں کو بہ صد اصرار اپنے ساتھ لے کر حویلی روانہ ہو گیا۔

درگاہ سے روانگی کے وقت شہریار نے لنگر کی تقسیم کا نظارہ کیا۔ بلندی پر کھڑے چودھری افتخار کے کارندے اور زردے کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہجوم کی طرف اچھال رہے تھے۔ ہجوم میں شامل افراد ان تھیلیوں کے ول کے لیے ایک دوسرے پر چڑھتے، دھکے لگاتے اور شور مچاتے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ صاف ا تھا کہ اس خصوصی لنگر کا حصول صرف انہی لوگوں کے لیے ممکن ہو سکے گا جو زیادہ طاقتور، چست اور تیز و ا تھے۔ بوڑھے، کمزور اور ناتواں لوگوں کا محروم رہ جانا بالکل یقینی تھا۔

شہریار نے اپنے دل میں سخت تاسف محسوس کیا۔ کیا تھا جو چودھری کے بے شمار کارندے ذرا سا نظم و نسق ام کرتے ہوئے لوگوں کو قطار میں کھڑا کر کے لنگر کی تقسیم کر دیتے۔ کم از کم انسان چند لقموں کے حصول کے لیے ں جانوروں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، انسانیت کی تذلیل کرتے ہوئے تو نظر نہ آتے۔ ان شاید چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے آپس میں لڑائے رکھنے میں ہی تو حکمرانی کو مستحکم رکھنے کا رمز پوشیدہ تھا۔

⊛----✪----⊛

مہمانوں کی درگاہ سے حویلی کی طرف روانگی سے قبل ہی چودھری کے ہرکارے ان کی آمد کی اطلاع لے کر لی پہنچ گئے۔ اس اطلاع کے حویلی پہنچتے ہی حویلی میں ہر طرف متحرک خادماؤں کی سرگرمیاں کچھ اور بھی تیز ئیں۔ حویلی میں اس وقت رشتے دار خواتین کے علاوہ اردگرد کے زمینداروں کے گھروں کی عورتیں اور کئی ان و تاجران کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ اعلیٰ افسران اور تاجروں کی بیویوں کو دیگر خواتین پر ترجیح دی جا رہی ی۔ بڑی اور چھوٹی چودھرائن خاص طور پر خود ان خواتین کی خاطر مدارات کا دھیان رکھ رہی تھیں۔ کھانا تو مالوں کو کھلایا ہی جانا تھا لیکن اس سے پہلے بھی لذتِ کام و دہن کے لیے بڑا معقول انتظام تھا۔ موسم کی ابت سے چائے، کافی، کشمیری چائے ہر شے دستیاب تھی۔ شہری خواتین کے ذوق کا خیال کرتے ہوئے کولڈ لس اور جوسز وغیرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن مہمانوں کی اکثریت گرم مشروبات کو ہی ترجیح دے رہی تھی۔ ہات کے ساتھ ساتھ خشک میوے بھی مہمانوں کی تواضع کے لیے گردش میں تھے۔ غرض حویلی میں کچھ جنت ا سامان تھا۔ ہر شخص کو اس کی حسبِ خواہش لوازمات میسر تھے اور مستعد ملازماؤں کی دست بستہ حاضری کی سے ہر ایک خود کو کسی ریاست کا والی تصور کر سکتا تھا۔ البتہ کہیں کہیں چودھری افتخار کے خاندان سے تعلق والی خواتین سرگوشی میں اعلیٰ افسران اور تاجروں کی بیویوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ترجیحی سلوک

کے بارے میں آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ حویلی کی خواتین ان چہ میگوئیوں سے ناواقف نہیں تھیں۔ انہوں نے ملازماؤں کو کڑی ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی عورت کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہئے۔ لیکن بہر حال ان کی ذاتی توجہ کا مرکز وہ باحیثیت خواتین ہی تھیں جن کے شوہروں کے عہدوں اور حیثیت کے ساتھ چودھری افتخار کے مفادات جڑے ہوئے تھے۔ حویلی کی یہ خواتین اَن پڑھ ہونے کے باوجود نفع نقصان کا حساب کتاب رکھنا خوب جانتی تھیں۔

درگاہ سے آنے والے ہرکاروں نے جونہی مہمانوں کی درگاہ سے روانگی کی اطلاع حویلی پہنچائی، مردانے میں فوراً دستر خوان بچھنا شروع ہو گئے۔

مہمانوں کے دستر خوان کے گرد بیٹھتے ہی ملازمین سلفچیاں لا کر ان کے ہاتھ دھلوانے لگے۔ ذرا سی دیر میں گرم گرم، اشتہا انگیز کھانا دستر خوان پر چن دیا گیا۔ کھانا معیار اور مقدار دونوں ہی اعتبار سے بہت خوب تھا۔ مہمانوں کا دل خوش ہو گیا۔ اندر زنان خانے میں خواتین بھی اس خوش رنگ و خوش ذائقہ کھانے سے خوب انصاف کر رہی تھیں۔ ملازمائیں ایک ڈش کا کھانا ختم ہونے سے قبل ہی تیزی سے دوسری ڈش لا رکھتی تھیں۔ حویلی کی مالکان بہ اصرار مہمان خواتین کو کھانا کھلوا رہی تھیں۔ خواتین کے اس ہجوم میں چھوٹی چودھرائن ناہید نے دیکھا کہ ایس پی کی بیوی کھانا کھانے والیوں میں شامل نہیں۔ وہ دستر خوان سے ہٹ کر سب سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ چھوٹی چودھرائن لپک کر اس کے پاس پہنچی اور پوچھا۔

''کیا بات ہے بہن جی! تسی کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو؟''

''میں شوگر پیشنٹ ہوں۔ کھانے سے پہلے مجھے انسولین استعمال کرنی پڑتی ہے۔ آج اتفاق سے میری دوا ایس پی صاحب کے بریف کیس میں رہ گئی ہے۔ انجکشن لگائے بغیر میرے لیے کھانا کھانا ممکن نہیں۔ اسی لیے سب کے ساتھ کھانے میں شامل نہیں ہوئی۔'' ایس پی کی بیوی نے اپنا مسئلہ بتایا۔

''یہ تو کوئی گل ہی نہیں ہے جی۔ میں ابھی تہاڈی دوا منگوا دیتی ہوں۔'' چودھرائن ناہید نے جواب دیا اور پھر جھٹ قریب سے گزرتی ماہ بانو کو آواز لگائی۔

''جی چھوٹی چودھرائن!'' ماہ بانو جو صبح سے کام کرتے کرتے شل ہو چکی تھی، دونوں خواتین کے قریب آئی۔

''مردانے میں ایس پی صاحب کو پیغام بھجوا کہ بی بی کا ٹیکہ اندر بھجوا دیں۔'' چھوٹی چودھرائن نے حکم دیا تو ماہ بانو ہاتھ میں موجود مٹھائی سے بھرا تھال دستر خوان پر رکھنے کے لیے مڑی تا کہ اسے رکھ کر مردانے کا رخ کر سکے۔

''چھیتی کر۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں ہے کیا تیرے؟'' چودھرائن سے اپنے حکم کی تعمیل میں آنے والا یہ معمولی وقفہ بھی برداشت نہیں ہوا اور اس نے ماہ بانو کو پھٹکارا۔ ماہ بانو بنا کوئی ردِعمل ظاہر کیے خاموشی سے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''سارے ہڈ حرام نوکر بھرے ہیں یہاں۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔'' دروازے سے قدم باہر رکھنے سے پہلے چھوٹی چودھرائن کی آواز ماہ بانو کے کان میں پڑی۔ وہ خود پر بے حسی طاری کر کے مردانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرہ جہاں اس وقت مرد حضرات بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے، اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ ماہ بانو نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ کوئی بھی مرد ملازم اس وقت دروازے کے قریب موجود نہیں تھا۔ ماہ بانو کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اگر کسی کے دروازے کے قریب آنے کا انتظار کرتی تو جانے کتنا وقت لگ جاتا اور جواب میں چھوٹی چودھرائن اس کی مجبوری سمجھے بغیر اس پر تاخیر کا الزام دھر کر باتیں سنانے لگتی۔ اس



صورت حال سے بچنے کے لیے ماہ بانو ناچار دروازے سے گزر کر دو قدم کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس بار منشی اللہ رکھا نے اسے دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ ملازم لپک کر ماہ بانو کے قریب آیا اور اس سے مردانے میں آمد کی وجہ پوچھی۔ ماہ بانو نے ایس پی صاحب کو بھجوایا گیا پیغام اسے دیا اور خود تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل کر ایک بار پھر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ وہ پردہ دار لڑکی نہیں تھی لیکن یوں کبھی اتنے ڈھیر سارے مردوں کے سامنے جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ کمرے کے اندر کھڑی تھی تو کئی نگاہوں نے اس کا جائزہ لیا تھا۔ کچھ نگاہوں میں بے باکی تھی اور کچھ میں بے نیازی..... البتہ ایک نگاہ ایسی بھی تھی جو بہ ظاہر بے نیازی سے پلٹ گئی تھی لیکن لفظاً وہ ہوس سے بھری ہوئی تھی۔ ماہ بانو نے اس نگاہ کو نہیں دیکھا تھا لیکن نگاہ ڈالنے والے نے اسی وقت بہت کچھ طے کر لیا تھا۔ غافل ماہ بانو، ایس پی صاحب سے انجکشن لا کر دینے والے ملازم سے انجکشن لے کر واپس زنان خانے میں چلی آئی اور ایس پی کی بیوی کو انجکشن تھما کر خود دوبارہ کام کرنے والیوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔

مہمانوں کی تعداد بھی کافی تھی اور کھانا بھی کچھ ایسا لذیذ تھا کہ دستر خوان سمٹتے سمٹتے اچھا خاصا وقت لگ گیا۔

جب مہمان حویلی سے رخصت ہونا شروع ہوئے تو اس وقت تک ملازماؤں کے جسم تھکن سے ٹوٹنے لگے تھے اور ابھی کام سے خلاصی ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ قریبی رشتے دار اور دور دراز شہروں سے آئے ہوئے مہمان ایسے بھی تھے جو آج رات حویلی میں ہی قیام کرنے والے تھے۔ ان مہمانوں کا قیام پہلے سے ہی متوقع تھا اس لیے سارے انتظامات پہلے سے کیے جا چکے تھے۔ مہمانوں کو ان کے کمروں میں پہنچانے کے بعد کہیں جا کر ملازماؤں کو موقع مل سکا کہ گھنٹوں سے اپنے ہاتھوں میں گردش کرتے ہوئے کھانے میں سے چند لقمے اپنے حلق سے نیچے اُتار سکیں۔ وہ کھانا جو گرم گرم بھاپیں اُڑاتا اتنی دیر تک ان کی بھوک کو چمکا تا رہا تھا، اب ٹھنڈا ہو کر بالکل مٹی ہو چکا تھا۔ لیکن کسی میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے لیے کھانا گرم کر کے کھانے کا تردد کر سکے۔ پچھلے کئی روز کی مصروفیت اور آج پورے دن ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے والی کیفیت نے انہیں نڈھال کر دیا تھا اور اب ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ سونے کے لیے گرم بستر میسر آ جائے تو تھکے ہوئے جسموں کو کچھ سکون ملے۔ کھانے کے بعد ان ملازماؤں کے سوا جن کا دن رات حویلی میں ہی قیام رہتا تھا، باقی عورتیں اپنے گھروں کو روانہ ہونے کے لیے بڑی چودھرائن سے اجازت لینے اس کے سامنے حاضر ہوئیں۔

''رانی، ماہ بانو، شادو اور کبریٰ کو چھوڑ کر باقی سب چلی جاؤ۔ حویلی میں مہمان رُکے ہوئے ہیں، کام زیادہ ہے اس لیے آج ان لڑکیوں کو یہیں رُکنا ہوگا۔'' چودھرائن نے حکم سنایا تو جن کے نام لیے گئے تھے اُنہیں وہیں رُکنا پڑا۔ ماہ بانو جس نے زندگی میں پہلی بار اتنی مشقت اٹھائی تھی، شکوہ کناں نظروں سے نوراں کو دیکھنے لگی۔ نوراں خود بے بس تھی، کیا کرتی۔ بیٹی سے نظر چرا کر باہر نکل گئی۔ بڑی چودھرائن نے روکی گئی لڑکیوں کے ذمے مختلف کام لگا دیئے۔ ماہ بانو کے ذمے اس نے باورچی خانے میں ماسی نذیراں کی مدد کا کام لگا دیا تھا۔ ماہ بانو قدم گھسیٹتی ہوئی ماسی نذیراں کے پاس باورچی خانے میں جا پہنچی۔ وہاں دو تین عورتیں اور بھی موجود تھیں۔

''ماسی! مجھے کیا کرنا ہے، بتا دو۔'' تھکے تھکے انداز میں اس نے ماسی نذیراں سے پوچھا۔ ماسی، نوراں کی اچھی سہیلیوں میں سے تھی اور اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو اس مشقت بھری زندگی کی عادی نہیں۔ اب جو اس نے ماہ بانو کی ابتر حالت دیکھی تو اسے ماہ بانو پر رحم آ گیا۔ وہ ہمدردی سے بولی۔

''تُو بس ایک کام کر دے۔ یہ دودھ کے گلاس سب کے کمروں میں پہنچا دے۔ اس کے بعد تیری ڈیوٹی ختم۔ تو آرام سے کہیں بھی دبک کر سو جانا۔ میں ان عورتوں کے ساتھ مل کر باقی سارا کام آپ ہی سنبھال لوں گی۔''

ماہ بانو، ماسی کی ہدایت پر دودھ سے بھرے گلاس ٹرے میں رکھ کر سب کے کمروں میں پہنچانے لگی۔ ویسے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ناک تک ٹھونس کر کھانے والے یہ لوگ اب اس گلاس بھر دودھ کے لیے گنجائش کہاں سے نکالیں گے؟ وہ سب کے کمروں میں دودھ پہنچا چکی تو ماسی نے ایک خصوصی گلاس چودھری افتخار کے کمرے میں پہنچانے کے لیے دیا۔ اوڑھنی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر ماہ بانو گلاس طشتری میں رکھ کر چودھری افتخار کے کمرے کے سامنے پہنچی اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ماہ بانو نے ایک بار پھر دستک دی لیکن اب بھی اندر خاموشی ہی رہی۔ ماہ بانو نے بائیں ہاتھ سے کمرے کے دروازے کو ہلکے سے دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ سامنے کمرا خالی پڑا تھا اور وہاں چودھری افتخار کا نام نشان نہیں تھا۔ ماہ بانو آہستہ سے کمرے میں داخل ہوگئی۔

حویلی میں آنے جانے کے اس عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جو اسے چودھری افتخار عالم شاہ کے کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر وہ کچھ پل کے لیے ساکت سی رہ گئی۔ یوں تو پوری حویلی ہی بڑی خوبصورتی سے سجائی گئی تھی لیکن چودھری افتخار کے کمرے کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس کا کمرا کوئی طلسم کدہ تھا جہاں ماہ بانو اچانک آ نکلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں فلموں اور ڈراموں میں دکھائے جانے والے کسی شہنشاہ کے کمرے کا سیٹ لگا ہو۔ بلکہ کمرہ اُن سیٹس کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ کمرے میں الیکٹرک ہیٹر کی وجہ سے خوشگوار سی گرمی تھی۔ ماہ بانو اس خوب صورتی میں گم ہو کر بھول گئی کہ یہ چودھری افتخار کا کمرہ ہے اور وہ وہاں چودھری افتخار کے لیے دودھ پہنچانے آئی ہے۔ سحر زدہ سی کیفیت میں اس نے اپنے ہاتھ میں موجود دودھ کا گلاس ایک تپائی پر رکھا اور خود بڑے سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بیڈ پر بچھا گدا بہت نرم اور آرام دہ تھا۔ ماہ بانو کو اس پر بیٹھ کر بہت لطف آیا۔ اُس نے اس لطف کو مزید محسوس کرنے کے لیے اپنا سر پشت پر موجود تکیے پر رکھ دیا۔ تکیہ بھی بے حد نرم ملائم تھا۔ ماہ بانو کو یوں لگا جیسے وہ بادلوں پر سر رکھے لیٹی ہو۔ اس خوشگوار کیفیت میں کتنے لمحے گزرے اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ تھکن اور نیند سے نڈھال جسم اتنا آرام پا کر خود کار انداز میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ غفلت کے یہ لمحات کتنے طویل تھے، وہ اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ اس کی آنکھ دوبارہ اپنے جسم پر محسوس ہونے والے لمس کی وجہ سے کھلی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی مگر وہ اپنی نظروں کے بالکل سامنے موجود چودھری افتخار کا چہرہ بہ خوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے گھبرا کر بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ چودھری نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اُس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور اُسے پچکارتے ہوئے بولا۔

''کہاں جاتی ہے؟ لیٹی رہ۔ بہت تھک گئی ہے نا..... یہاں میرے بستر جیسا آرام کہیں اور نہیں ملے گا۔''

''مم..... مجھے جانا ہے۔'' ماہ بانو نے خوف زدہ سے انداز میں ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

''چلی جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' چودھری نے ایک بار پھر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔

''معاف کر دیں چودھری صاحب! میں غلطی سے ادھر سو گئی تھی۔ آپ مجھے جانے دیں۔'' خوف ماہ بانو کے پورے جسم میں سرائیت کر چکا تھا۔ وہ اپنی ساری ضد مزاجی بھول کر چودھری کے سامنے لجاجت سے گڑگڑانے لگی۔

''تیری غلطی تو ہماری خوش نصیبی ہے۔ آج ہی تو ہم نے خواہش کی تھی تیری۔ ابھی تو سوچ ہی رہے تھے کہ کیسے تیرے حصول کو ممکن بنائیں، پر تیری غلطی نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم وہاں اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے ہیں اور یہاں تجھ جیسی نشیلی شے ہمارے بستر پر پڑی ہے۔ ہمیں تو کمرے میں داخل ہونے کے بعد تجھے اپنے بستر پر دیکھ کر یقین ہی نہیں آیا۔ ہم سمجھے کہ شراب کا نشہ



زیادہ ہی چڑھ گیا ہے۔ لیکن چھو کر دیکھا تو تُو سچ مچ یہاں تھی۔ اب بتا ہم ہاتھ آئے اس انعام کو کیسے جانے دیں؟'' چودھری نے چٹخارے لیتے ہوئے ماہ بانو کو اپنی خوش نصیبی کی داستان سنائی۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' ماہ بانو اب تک بے حد خوف زدہ تھی، اچانک بھڑک اُٹھی اور دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر چودھری کو دور دھکیلنے کی کوشش کی۔ مگر اس جیسی نازک لڑکی کی یہ کوشش چودھری کے طاقتور وجود کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایک دم ہی ماہ بانو پر چھا گیا۔ اُس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں ماہ بانو کا جسم پھڑک کر رہ گیا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے زور سے چلانے کے لیے منہ کھولا لیکن چودھری پوری طرح چوکنا تھا۔ وہ ہاتھ آئے اس شکار کو آزاد کرنے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ چیخنے کے لیے کھلے ماہ بانو کے منہ پر اپنا بڑا سا ہاتھ رکھ کر اس نے ماہ بانو کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کمرے میں اس سے قبل بھی جانے کتنی لڑکیوں کی چیخوں کا دم گھونٹا گیا تھا۔ ماہ بانو کا آزادی کی کوشش میں پھڑکتا جسم اپنے انجام کے خوف سے سرد پڑتا جا رہا تھا اور حلق سے آزاد نہ ہو سکنے والی چیخوں نے اُبلتی ہوئی آنکھوں میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ لیکن چودھری افتخار ہر بات سے بے پروا فقط اپنی ہوس کا پیٹ بھرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ ہوس ماہ بانو کو برباد کیے بغیر نہیں مٹ سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

حویلی کے سب سے شان دار کمرے میں موجود دونوں نفوس دو مختلف انتہاؤں پر کھڑے تھے۔ ماہ بانو کے لیے یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔

سترہ سال کی عمر میں وہ ایک بھیانک ترین تجربے سے گزرنے جا رہی تھی۔ خوف کی شدت نے اسے کچھ اس طرح مفلوج کر دیا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے ذرا سی حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنے بچ جانے کے لیے اس کے پاس اگر کوئی اُمید تھی تو وہ صرف یہ کہ کوئی بیرونی امداد آ جائے۔ لیکن چودھری افتخار کی اس راج دھانی میں قدم رکھنے کی جرأت کس میں ہو سکتی تھی؟ خود چودھری افتخار کا حال اس سپاہ سالار کا سا تھا جو اپنی فتح کے یقینی ہونے کے خیال سے کسی شہر کی فصیل کے باہر کھڑا ہو اور جانتا ہو کہ بس ایک زوردار حملہ حفاظتی دروازے کو توڑ ڈالے گا اور وہ لمحہ بھر کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ رہا ہوگا۔ شراب کی ترنگ اور طاقت کے نشے نے اسے بالکل مدہوش کر ڈالا تھا۔ اس کی سماعتیں اس شور کو سننے سے عاری تھیں جو اس کی حویلی کے کسی گوشے میں سے اُٹھ رہا تھا۔ اُس کی اس مدہوشی کو دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے توڑا۔

چودھری اس دخل اندازی پر تھوڑا سا ڈسٹرب ہوا لیکن ماہ بانو کو آزاد کرنے پر بہر حال وہ راضی نہیں تھا۔ ماہ بانو جو بالکل سُن پڑ چکی تھی، اس دستک کو سن کر چونکی۔ اس کے اندر نئے سرے سے توانائی پیدا ہوئی کہ وہ چودھری افتخار کے خلاف مزاحمت کر سکے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پوری قوت سے چودھری کے منہ پر مارا۔ چودھری نے جواب میں ایک گالی دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بری طرح موڑا۔ ماہ بانو تکلیف کی شدت سے تڑپ اُٹھی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ دستک پہلے سے زیادہ زوردار اور مسلسل تھی۔

''اس وقت کس کی موت آئی ہے جو مجھے پریشان کرنے چلا آیا ہے۔'' چودھری جو دستک اور ماہ بانو کی مزاحمت کی وجہ سے اچھا خاصا بدمزہ ہو چکا تھا، بری طرح دھاڑا اور ڈولتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"چودھری صاحب! باہر آئیں۔ غضب ہوگیا ہے۔" باہر سے بڑی چودھرائن کی پریشان اور خوف زدہ آواز سنائی دی۔

"بڑھیا کو چین نہیں ہے۔ اس پہر بھی تنگ کرنے آگئی ہے۔" چودھری افتخار بڑبڑایا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنا حلیہ بھی جلدی جلدی ٹھیک کرلیا تھا۔

"چودھری صاحب! غضب ہوگیا ہے۔ حویلی کے مہمان خانے میں ایک کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بڑی زوردار لگی ہے۔ نوکر اسے بجھانے کی کوشش میں لگے ہیں لیکن ابھی تک بجھا نہیں سکے ہیں۔ منشی نے مجھے کہلوایا ہے کہ آپ کو اطلاع کردوں۔ مہمان بڑا ہی خاص بندہ ہے، کسی موتی والا کے بیٹے کا نام لے رہی تھی نچھی۔" چودھرائن جانتی تھی کہ چودھری اپنے آرام میں اس طرح بے وقت مخل ہونے پر سخت ناراض ہوگا اس لیے دروازہ کھلتے ہی جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی۔ کمرے کا دروازہ کچھ ایسے رخ پر تھا کہ وہاں سے چودھری کا بیڈ نظر نہیں آتا تھا۔ ماہ بانو ابھی تک اسی بیڈ پر تھی اس لیے چودھرائن کو خبر بھی نہیں ہوسکی کہ اس کا شوہر اپنے بند کمرے میں کون سا کھیل کھیل رہا ہے۔

"یہ تو واقعی غضب ہوگیا ہے۔ میں خود چل کر دیکھتا ہوں۔" بڑی چودھرائن کی دی ہوئی اطلاع نے چودھری افتخار کا سارا نشہ ہرن کردیا اور وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اپنے کمرے میں موجود ماہ بانو کی طرف سے اس کا دھیان مکمل طور پر ہٹ چکا تھا۔ موتی والا سے اس کے بہترین کاروباری مراسم تھے۔ اگر اس کے بیٹے کو حویلی میں کچھ ہوجاتا تو چودھری افتخار کو بڑی مشکل پڑ جاتی۔ یوں بھی ماہ بانو کا کیا تھا، اسے تو وہ پھر کسی وقت دوبارہ حاصل کرسکتا تھا۔ چودھری اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو ماہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ چودھری کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ پھرتی سے کھڑی ہوئی۔ چودھری اپنی منہ زوری میں اس کے لباس کو تار تار کرچکا تھا۔ ماہ بانو نے بستر پر بچھی بڑی سی چادر گھسیٹ کر اپنے پورے وجود کو اس میں لپیٹا اور کمرے سے باہر نکلی۔ کمرے میں دھیما دھیما سنائی دینے والا شور اب بہت واضح سنائی دے رہا تھا۔ ماہ بانو نے چپکے سے بیرونی حصے کا رخ کیا۔ حویلی کے مکینوں کے رہائشی حصے سے قدرے ہٹ کر بنائے گئے مہمان خانے میں اس وقت کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آگ کے شعلے اور دھواں دور سے بھی نظر آرہے تھے۔ ملازمین پانی کی بالٹیوں اور چارپائیوں کی مدد سے آگ بجھانے کی جدوجہد کررہے تھے۔ متاثرہ کمرے کے علاوہ دوسرے کمروں میں موجود مہمان بھی باہر نکل چکے تھے اور ہراساں سے کھڑے کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ عمدہ سوٹوں میں ملبوس نک سک سے تیار رہنے والے ان معزز مہمانانِ گرامی کو اس وقت اپنے حلیوں کا ہوش نہیں تھا۔ وہ شب خوابی کے آدھے ادھورے کپڑوں میں اپنی جان بچانے کے خیال سے اپنے کمروں سے نکل بھاگے تھے کہ کہیں ایک کمرے میں لگی ہوئی آگ ان کے کمروں تک بھی رسائی حاصل نہ کرلے۔ ان کی یہ تشویش اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ براہِ راست آگ کی زد میں موجود کمرے کے دائیں بائیں موجود دونوں کمرے بھی اب جزوی طور پر آگ سے متاثر ہونے لگے تھے۔ ماہ بانو نے اس سارے منظر پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور حویلی سے باہر کی راہ لی۔ لوگوں کے ہجوم میں اس نے چودھری افتخار عالم شاہ کو بھی دیکھا تھا جو چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو آگ بجھانے کے سلسلے میں ہدایات دے رہا تھا۔ مہمان خانے میں لگی آگ کے مقابلے میں ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کا وجود زیادہ بڑا اہمیت رکھتا تھا۔ اگر حویلی میں یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو چودھری افتخار، ماہ بانو کو برباد کرچکا ہوتا۔ ماہ بانو کی بربادی، حویلی کے اس مہمان خانے کی بربادی سے زیادہ بڑی بات ہوتی۔ حویلی کے مہمان خانے کو اس تباہی کے بعد دوبارہ سے استعمال کے قابل بنایا جاسکتا تھا۔ ماہ بانو برباد ہوتی تو اس نقصان کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔



اپنے بچ جانے کی خوشی کو تو فی الحال ماہ بانو پوری طرح محسوس نہیں کرسکتی تھی لیکن بہرحال اسے اس بات کا احساس تھا کہ دستِ قدرت نے بالکل عین موقع پر اس کی مدد فرمائی ہے۔ وہ وحشت زدہ سی حویلی سے اپنے گھر کی طرف جانے والے ٹیڑھے میڑھے، اونچے نیچے اور اندھیرے راستوں پر دوڑتی جارہی تھی۔ یہ رات کا بالکل آخری پہر تھا۔ عام حالات میں وہ اس وقت گھر سے باہر قدم رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اب اسے اندھیرے اور راستے میں جگہ جگہ بھونکتے کتوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ دونوں چیزیں چودھری افتخار سے کم خطرناک تھیں۔

⊛----✪----⊛

نوراں اور زہرہ بستروں میں دبکی بے خبر سو رہی تھیں۔ تھکن اور سردی کے باعث ان کی نیند بہت گہری تھی۔ مگر دروازے پر اُبھرنے والی دستک اتنی زوردار تھی کہ ان دونوں ہی کی آنکھ کھل گئی۔ حقیقتاً دستک دینے والے نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں بلکہ دھڑ دھڑایا تھا۔

"تیرا ابا آگیا ہے شاید۔" نوراں نے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا اور بہ مشکل بستر سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ غیاث محمد کو بھی اور بہت سے مزارعوں کی طرح اس عرس کے خاتمے کے بعد درگاہ کے کاموں کے لیے روک لیا گیا تھا۔ دن بھر موجود رہنے والے لوگوں کے جم غفیر کی وجہ سے وہاں اچھا خاصا پھیلاوا ہوگیا تھا۔ وہاں ہونے والے اس پھیلاوے اور کوڑے کرکٹ کو رات بھر میں ہی سمیٹ کر درگاہ کو پہلے والی صاف ستھری حالت میں لانے کی ذمے داری ان مزارعوں کے سر تھی۔ برسوں سے یہی معمول تھا کہ عرس کے خاتمے کے بعد درگاہ کی صفائی کے لیے اگلے دن کا سورج نکلنے کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ رات ہی رات میں کئی مزارعے مل کر یہ کام انجام دے دیتے تھے۔ اگلے روز دور دراز کے گاؤں سے آنے والے ان معتقدین کی بھی روانگی ہوجاتی تھی جو رات ہوجانے کے باعث فوری طور پر روانہ ہونے کے بجائے درگاہ کے احاطے میں ہی رک جاتے تھے۔ ان معتقدین کی روانگی کے بعد درگاہ کی ایک بار پھر تفصیلی صفائی کی جاتی تھی جس کے لیے مزارعوں کی دوسری کھیپ کام کرتی تھی۔ دروازہ بجنے کی آواز پر نوراں نے یہی خیال کیا تھا کہ غیاث کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس گھر آگیا ہے۔ لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے احساس ہوا، غیاث نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھا، چادر میں لپٹا ایک ڈھیر کی صورت دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ نوراں نے جھک کر اس ڈھیر کا جائزہ لیا۔ اسے چادر میں سے ماہ بانو کا چہرہ نظر آیا۔ ماہ بانو بے ہوش نہیں تھی لیکن نیچے گری کچھ اس انداز میں سانسیں لے رہی تھی جیسے اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت باقی نہ رہی ہو۔

"زہرہ! جلدی سے بھاگ کر ادھر آ۔" نوراں نے پہلے تو خود ماہ بانو کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑا ہوا تھا اس لیے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی اور گھبرا کر زہرہ کو آواز دی۔ زہرہ ماں کی آواز میں موجود گھبراہٹ کو محسوس کرکے تیزی سے اُٹھ کر آئی۔ ماہ بانو کو اس وقت دروازے پر گرے دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"چھیتی کر۔ ادھر آکر اسے میرے ساتھ اُٹھوا۔" نوراں نے زہرہ کو ٹوکا تو وہ آگے بڑھی اور نوراں کے ساتھ مل کر اسے اٹھانے لگی۔ دونوں نے مل کر ماہ بانو کو کمرے تک پہنچایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ دروازے سے بستر تک منتقلی کے اس عمل میں ماہ بانو کے جسم پر لپٹی چادر گر گئی اور اس کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لباس عیاں ہوگیا۔

"یہ کیا؟" نوراں نے گھبرا کر ماہ بانو کا جسم ٹٹولنا شروع کردیا اور پھر کسی نقصان کو محسوس نہ کرکے اطمینان

کی سانس لیتے ہوئے اس کے جسم پر لحاف ڈھانپ دیا۔ ماہ بانو جو سردی اور خوف کے باعث کپکپا رہی تھی، گرم بستر کی فرحت اور گھر کے تحفظ کا احساس ہونے پر کچھ مطمئن سی ہو کر غشی میں چلی گئی۔ نوراں اور زہرہ البتہ پریشان سی اس کے قریب ہی بیٹھی رہیں۔ ماہ بانو حویلی میں تھی اور اب جس حال میں گھر واپس آئی تھی، اس کا ذمے دار حویلی سے وابستہ کوئی فرد ہی ہو سکتا تھا۔ وہ فرد کون تھا؟ اس کا جواب صرف ماہ بانو ہی دے سکتی تھی۔ لیکن وہ اس وقت تقریباً بے ہوش تھی۔

اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ نوراں کی توقع کے خلاف غیاث محمد صبح بہت دیر سے گھر واپس آیا۔ اس دوران زہرہ، الیاس کو ناشتہ کروا کر مسجد کے لیے روانہ کر چکی تھی۔ الیاس کو سکول میں داخل کروانے کے بجائے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ غیاث محمد کے خیال کے مطابق الیاس کو بھی اس کی طرح کھیتوں میں ہل چلانے اور حویلی کی خدمت کے کام سرانجام دینے تھے اور ان کاموں کے لیے سکول کی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ مولوی صاحب کے پاس جانے کا معاملہ الگ تھا۔ الیاس کے وہاں جانے سے انہیں اس کی اور اپنی آخرت سنوارنے کی اُمید تھی۔ پھر وہاں جانے میں چودھری افتخار کی ناراضگی کا بھی کوئی خدشہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو چودھری افتخار کی حمایت حاصل تھی۔ سکول کی مخالفت بھی وہ بہت کھل کر نہیں کرتا تھا لیکن اس کے وہ سرسری سے اقوال مزارعوں کے کان میں پڑتے رہتے تھے جن کا لبِ لباب یہی تھا کہ اسکول کی تعلیم گاؤں کے ان بچوں کی دنیا اور آخرت سنوارنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ کھیتوں میں ہل چلانے کا کام وہ بغیر تعلیم کے بھی بہ خیر و خوبی انجام دے سکتے تھے۔ جبکہ آخرت سنوارنے کے لیے مولوی صاحب کے پاس جانا مناسب تھا۔ چنانچہ الیاس کو سکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا۔

''رات حویلی میں بڑا ہنگامہ رہا۔ جانے کیسے ایک مہمان کے کمرے میں آگ لگ گئی۔ سنا ہے وہ مہمان شہر کے ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ بے چارہ آگ میں جھلس کر خاک ہو گیا۔ صبح سے پولیس کے بڑے بڑے افسر حویلی پہنچے ہوئے ہیں۔ لڑکے کی لاش کو لوگوں نے شہر بھجوا دیا ہے۔ چودھری صاحب بڑے پریشان اور غصے میں ہیں۔ میں تو خیر دوسرے لوگوں کے ساتھ درگاہ پر ہی تھا لیکن حویلی سے خبر لے کر آنے والے نے بتایا کہ مہمان خانے کے تین چار کمرے جل گئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے ملازموں نے بڑی کوشش کی تھی آگ بجھانے کی۔ دو تو خود اس کوشش میں اچھے خاصے جل گئے ہیں لیکن پھر بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے۔ سب سے بڑی بات بندہ جان سے چلا گیا ہے۔ چودھری صاحب کا پریشان ہونا تو بنتا ہے کہ ان کی حویلی میں ان کا مہمان جان سے گزر گیا۔'' غیاث نے گھر آتے ہی نوراں کو حویلی میں ہونے والے حادثے کے بارے میں خبر دی۔

''پر آگ لگی کیسے؟'' نوراں نے حیرت سے سوال کیا۔

''مجھے کیا معلوم؟ پولیس والے آئے ہوئے ہیں، وہی چھان بین کر کے کچھ بتائیں گے۔ ابھی تو تُو بس یہ کر کہ مجھے جلدی سے ناشتہ پانی دے۔ رات بھی منّت مانگنے کے چکر میں، میں لنگر سے اپنا حصہ نہیں لے سکا تھا۔ اب بھی بڑی مشکلوں سے نظر بچا کر وہاں سے نکلا ہوں کہ پیٹ کی آگ بجھا کر دوبارہ ادھر جاؤں۔ آج تو سارا دن ادھر ہی خدمت میں رہنا پڑے گا۔ ورنہ چودھری صاحب کا غصہ تو کسی پر بھی نکل سکتا ہے۔'' پچھلے پورے دن کی تھکن اور رات کی جگار نے غیاث کا حال بھی برا کر رکھا تھا لیکن ان نازک لمحات میں وہ گھر بیٹھ کر آرام کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ نوراں نے جلدی جلدی اسے ناشتہ بنا کر دیا اور اس کے گھر سے نکلنے سے پہلے زہرہ کو ماہ بانو کے متعلق چند ہدایات دے کر خود بھی حویلی کے لیے روانہ ہو گئی۔ اسے آج معمول سے بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اُسے اس دیر کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ لیکن حویلی کی ساری کرتا دھرتا



خواتین خود اتنی شدید پریشانی میں تھیں کہ انہیں نوراں کے دیر سے آنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ نوراں خاموشی سے اپنے حصے کا کام نمٹا کر واپس گھر آ گئی۔ ماہ بانو ابھی تک بستر پر ہی تھی البتہ زہرہ نے اس کا لباس تبدیل کروا دیا تھا۔ ماہ بانو کا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ نوراں، زہرہ کو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کر کے خود حکیم سے دوا لینے چلی گئی۔ دوا لا کر اس نے ماہ بانو کو کھلائی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیوں اور دوا کے اثر سے ماہ بانو کے بخار کی شدت کم ہو گئی۔ اگلے دن اتوار تھا۔ ماہ بانو سے طے شدہ معاہدے کے مطابق صفدر علی الصباح اسے واپس لے جانے کے لیے گاؤں پہنچ گیا۔ ماہ بانو کی اُتری ہوئی شکل دیکھ کر اسے سخت تشویش ہوئی۔ نوراں نے ماہ بانو کی بیماری کا بہانہ بنا کر صفدر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو البتہ خاموش رہی اور اسی خاموشی کے عالم میں صفدر کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے روانہ ہو گئی۔ نوراں کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ ماہ بانو سے اس کے ساتھ بیتے حادثے کے بارے میں تفصیلات پوچھ سکے۔

⊛----✪----⊛

''ایکسپرٹس نے حادثے سے متعلق اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق آگ لگنا ایک اتفاقی حادثہ تھا جو مرنے والے کی اپنی غفلت سے پیش آیا۔ حادثے سے پہلے اس نے شراب نوشی کرتے ہوئے شاید کچھ شراب اپنے بستر پر بھی گرا دی تھی۔ پھر مدہوشی کے عالم میں اس نے سگریٹ کا ٹوٹا یا جلتی ہوئی دیا سلائی بھی بستر پر ہی پھینک دی، نتیجتاً آگ بھڑک اُٹھی۔ اس آگ نے تیزی سے بستر سے کارپٹ اور پردوں تک کا سفر طے کر لیا۔ تحقیقاتی ٹیم کی اس رائے کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی تقویت مل رہی ہے۔ میڈیکل ایکسپرٹس کے مطابق لڑکے نے بے تحاشا شراب پی رکھی تھی۔ اس کے معدے میں الکحل کی بڑی مقدار موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایکسپرٹس نے یہ بھی بتایا ہے کہ لڑکے نے شراب کے ساتھ ساتھ چرس کا استعمال بھی کیا تھا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شخص جو بیک وقت شراب اور چرس کے نشے میں مدہوش ہو۔ ذہنی طور پر کس حال میں ہو گا۔ ایسے شخص کے ساتھ کسی حادثے کا پیش آ جانا قطعی منطقی سی بات ہے۔''

چودھری افتخار عالم شاہ کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھا شہریار اسے حادثے کے بارے میں ماہرین کی رائے سے آگاہ کر رہا تھا جبکہ چودھری کے چہرے پر پچھلے تین دن سے چھایا تناؤ اب بھی موجود تھا۔ شہریار کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ غصے سے بولا۔

''کرتوت دیکھو لڑکے کے۔ کم بخت عادی نشے باز تھا اور موتی والا مجھ سے یوں اُکھڑا ہوا ہے جیسے میں نے اُس کے پُتر کی جان لی ہو ٹھیک ہے، مجھے بھی حادثے کا افسوس ہے۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ اُس کا پُتر میری حویلی میں اپنی جان سے گیا۔ لیکن اس کی جان جانے میں میری تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ میرے نوکروں نے اپنی جان پر کھیل کر آگ بجھائی۔ میں نے خود فون کر کے شہر سے فائر بریگیڈ والوں کو بلایا لیکن لڑکے کی موت آ گئی تھی تو اسے کون بچا سکتا تھا؟ کسی کے مرنے جینے پر تو میرا اختیار نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ موتی والا کا غم بانٹ سکوں۔ میں خود میت کے ساتھ اس کے گھر گیا، افسوس بھی کیا کہ میری حویلی میں اس کے پُتر کو ایسا جان لیوا حادثہ پیش آ گیا۔ لیکن اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ پھر میں نے لڑکے کے سوئم پر اپنی طرف سے کھانے کی دیگیں بنا کر بھیجیں تو اس نے وہ بھی واپس کرا دیں۔ اتنا شاندار کھانا، لاکھ سے اوپر خرچ کیا تھا میں نے اس پر۔ سارا کا سارا یتیم خانوں میں بھجوانا پڑا۔'' چودھری افتخار کو اپنی رقم ضائع ہونے کا شدید دکھ تھا۔ وہ رقم جو اس نے اپنے کاروباری مراسم کو مضبوط بنائے رکھنے کے لیے موتی والا کے بیٹے کے سوئم پر خرچ کی

تھی، یتیم خانے میں لگ گئی تھی تو یہ اس جیسی ذہنیت رکھنے والے بندے کے حساب سے تو اچھا خاصا نقصان تھا۔ موتی والا اس کا بزنس پارٹنر تھا، وہ اس کے بھجوائے ہوئے کھانے کو بیٹے کے سوئم میں آئے ہوئے لوگوں کو کھلاتا تو چودھری کو تسلی ہو جاتی کہ موتی والا سے اس حادثے کے بعد بھی اس کے مراسم بگڑے نہیں ہیں۔ دوسرے سوئم میں آنے والے معززین کو بھی جب یہ علم ہوتا کہ سوئم کا اتنا شان دار کھانا چودھری افتخار کی طرف سے آیا ہے تو وہ اس کی دریا دلی سے متاثر ہوتے۔ لیکن موتی والا کے ٹیڑھے پن کی وجہ سے کھانا پہنچ گیا تھا یتیم خانے۔ اب یتیم خانے میں موجود بھوکے ننگے بچوں کے اس دعوتِ شیراز سے فائدہ اٹھانے سے چودھری افتخار کو کیا مل سکتا تھا؟ وہ بے چارے بچے اس کھانے کو کھانے کے بعد زیادہ سے زیادہ چودھری افتخار کو دعائیں ہی دے سکتے تھے اور ان کی دعاؤں کی انتہا یہی ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعد از مرگ چودھری افتخار کو جنت الفردوس میں جگہ دے..... تو بھلا چودھری کو جنت کی کیا آرزو ہوگی۔ وہ تو دنیا میں بھی جنت میں ہی رہ رہا تھا۔

''جانے دیں چودھری صاحب! آپ نے جو اپنا فرض سمجھا وہ ادا کیا۔ اب موتی والا پر ہے کہ وہ حقائق کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں تو ابھی اسے صدمے سے نکل کر حقائق کا تجزیہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آخر اس کا اکلوتا بیٹا مرا ہے۔ وہ اپنے اس غم کی وجہ سے تقریباً پاگل ہو رہا ہے۔ غم میں اسے بھائی نہیں دے رہا کہ کس کس کو اس حادثے کا ذمے دار ٹھہرائے۔ مجھ سے بھی اور ماموں جان سے بھی کافی شکوے شکایات کر رہا تھا۔ اب وہ بے چارہ جس کیفیت میں تھا، ہم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جناب! آپ کا بیٹا خود اپنی موت کا ذمے دار ہے۔ اگر نشے نے اس کی مت نہ ماری ہوتی تو وہ اس حادثے کا شکار ہی کیوں ہوتا؟ نہ ہی ہم اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اکلوتے بیٹے کو دنیا جہاں کی آسائشیں فراہم کر کے اسے عیاشی کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ ٹھیک ہے، اکلوتا بیٹا تھا، آدمی کا بس نہیں چلتا کہ اکلوتی اولاد کے لیے کیا کچھ کر ڈالے۔ مگر اولاد پر چیک تو رکھنا چاہیے۔ وہ جس لت میں مبتلا تھا، اس کا انجام تو کسی نہ کسی حادثے کی شکل میں ہی سامنے آنا تھا۔ وہ یہاں حویلی میں لگنے والی آگ سے نہیں مرتا تو شہر میں کسی زیادہ رش والی سڑک پر ایکسیڈنٹ سے مر جاتا۔ مگر ظاہر ہے، میں اور ماموں جان، موتی والا سے اس کے دکھ پر تعزیت کرنے گئے تھے، ہم اس سے یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ صرف افسوس کر کے واپس آ گئے۔'' شہریار، چودھری افتخار کے اندازِ فکر کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر اس پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس انداز میں بات کرنے لگا جیسے وہ خود چودھری افتخار کا حمایتی ہو۔ ویسے اس نے موتی والا کے بیٹے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل حقیقی تھے۔

''اصل بات یہ ہے اے، سی صاحب! کہ یہ موتی والا جیسے نو دولتیے پیسہ کمانا تو جانتے ہیں لیکن ان میں اور ان کی اولادوں میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ اس پیسے کو سہار سکیں۔ ورنہ پُتر تو میرا بھی اکلوتا ہی ہے۔ ہم نے اس کے لاڈ بھی بہت اٹھائے ہیں لیکن بگڑنے نہیں دیا۔ آج دیکھیں، امریکہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ تعلیم کا بڑا شوق ہے اسے۔ اس شوق کی وجہ سے واپس یہاں نہیں آتا۔ مگر فرماں برداری اتنا ہے کہ میں نے کہا پُتر! بیاہ اپنے خاندان میں ہی کرنا ہے تو اس نے میرے حکم پر ذرا سی چوں نہیں کی اور یہاں آ کر خاندان کی لڑکی بیاہ کر ساتھ لے گیا۔ ایک بار نہیں کہا کہ ابا جی! میں امریکہ کا پڑھا لکھا بندہ گاؤں کی اَن پڑھ لڑکی کے ساتھ کیسے گزارہ کروں گا؟ اور تو اور اگر وہ چاہتا تو میری بات رکھنے کو صرف بیاہ کر لیتا اور وہ ہنی کو یہیں چھوڑ کر خود امریکہ میں اپنی پسند کی کسی لڑکی سے بیاہ کر لیتا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بیوی اپنے معیار اور مزاج سے الگ ہے پھر بھی اسے پوری عزت سے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بچے اس کے وہاں امریکہ کے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میں یہاں سے خرچہ پانی بھیجتا رہتا ہوں۔ لیکن خود بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا۔ وہاں کی ایک بہت بڑی فرم میں اچھی



پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ تو بات یہ ہے اے سی صاحب! کہ خاندانی لوگ الگ ہی پتہ چلتے ہیں۔ یہ موتی والا نو دولتیے تو اپنی اولادوں کا حشر خراب کر دیتے ہیں۔ موتی والا کی حیثیت ہی کیا تھی؟ چھوٹی سی فرنیچر کی دکان لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ تھاما تو شہر میں یہ بڑے بڑے شوروم کھول ڈالے۔ اب اس کے کارخانے میں کام ہوتا ہے کہ آئے دن نئے کاریگر بھرتی کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ سب میری وجہ سے ہی ہے نا؟ مجھے اکڑ دکھاتے ہوئے یہ نہیں سوچ رہا کہ میں ہاتھ کھینچ لوں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ میں فی الحال اس لیے برداشت سے کام لے رہا ہوں کہ جوان پُتر گیا ہے بے چارے کا۔ تھوڑا اسے سنبھلنے کا موقع دے دوں۔ دماغ ٹھکانے پر آئے گا تو اسے خود اپنے سلوک کا احساس ہوگا۔ اگر احساس نہیں ہوا تو میں خود اس کا دماغ ٹھکانے لے آؤں گا۔ مجھ سے اڑی لگا کر وہ اپنے کاروبار کو چلا نہیں سکے گا۔'' چودھری افتخار کے انداز میں جہاں اپنے خاندانی ہونے کا غرور اور بیٹے کی قابلیت و فرماں برداری کا فخر تھا، وہاں اس فرعونیت کا بھی اظہار تھا کہ جس نے اس کے سامنے سر نہ جھکایا میں اسے نیست و نابود کر ڈالوں گا۔

''آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں خود بیچ میں پڑ کر اس معاملے کو سیٹل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اصل میں موتی والا کو آپ سے شکایت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کے خیال میں آپ نے اپنے علاقے کا حکمراں ہونے کے باوجود یہاں ترقی کے کام بہت کم کیے ہیں۔ اگر آپ کوشش کرتے تو یہاں کوئی فائر اسٹیشن نہ سہی مگر پکی سڑکیں تو ہوتیں کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بروقت پہنچ کر آگ بجھانے کا کام کر سکتیں۔ ایک تو آگ لگنے کے بہت دیر بعد آپ کا فون گیا۔ پھر جو دو گاڑیاں آگ بجھانے کے لیے آئیں ان میں سے بھی ایک کچے میں پھنس کر ناکارہ ہو گئی۔'' شہریار بہ ظاہر دوست اور ہمدرد بن کر چودھری افتخار کو رگڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس نے موتی والا کے نام سے چودھری افتخار کو جتا دیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کا حکمراں اور سیاسی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مؤثر کردار ادا کرنے میں ناکام ہے اور اس کا علاقہ نہایت غیر ترقی یافتہ ہے۔ مگر چودھری افتخار بھی کوئی اتنی آسانی سے رگڑائی میں آنے والا بندہ نہیں تھا۔ اپنی کوتاہی کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے بولا۔

''فضول بکواس کرتا ہے سالا۔ اگر فائر بریگیڈ والے جلدی بھی پہنچ جاتے تو اُس کا پُتر تو کسی حال میں نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ تو بستر کے ساتھ پہلے ہی جل کر بھسم ہو گیا ہوگا۔ نوکروں کو تو بہت بعد میں آگ لگنے کا معلوم ہوا۔ اگر دیر ہونے سے کسی کا نقصان ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔ میرا مہمان خانہ اس مردود نشے باز کی بے احتیاطی کی وجہ سے برباد ہو کر رہ گیا۔ میرے مہمان الگ بے آرام اور خوف زدہ ہوئے۔ میرے اپنے دو بندے اچھے خاصے جل گئے آگ بجھانے کے چکر میں۔ لیکن میرے ان سارے نقصانات کو نظر انداز کر کے وہ موتی والا صرف اپنے پُتر کو روئے جا رہا ہے۔ مجھے تو چاہیے کہ موتی والا پر ہرجانے کا دعویٰ کروں کہ اس کے پُتر کی وجہ سے میرا جو اتنا مالی نقصان ہوا ہے، وہ پورا کرے۔ لاکھوں روپے لگے تھے مہمان خانے پر۔ آگ میں سب کچھ جل کر برباد ہو گیا۔ اب نئے سرے سے وہاں پر کام کروانا پڑے گا۔ حویلی میں تو آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ مہمان خانہ تو مجھے فوری طور پر درست کروانا پڑے گا۔ ٹھیکے دار سے میری بات بھی ہو گئی ہے لیکن کام اس لیے شروع نہیں کروایا کہ پولیس والے اپنی کارروائی پوری کر کے کلیئرنس دے دیں۔''

''مجھے اندازہ ہے چودھری صاحب! کہ آپ کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہوا ہے۔ میں نے خود ایس پی کے ساتھ آپ کے مہمان خانے کا جائزہ لیا ہے۔ مگر دیکھیں سامنے والے کے پاس آپ کی کچھ کمزوریاں ہیں نا جن کو دلیل بنا کر وہ آپ پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ آپ کوشش کریں کہ ان چھوٹے موٹے مسائل کو حل کر دیں تاکہ لوگوں کے پاس انگلیاں اٹھانے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اب تو ویسے ہی میڈیا نے اچھی خاصی ترقی کر لی

ہے۔ پہلے الیکٹرانک میڈیا پر صرف پی ٹی وی کا راج تھا۔ اب نئے نئے چینل کھل گئے ہیں۔ آنے والے دو چار سالوں میں یہ چینلز ملک میں طوفان برپا کر دیں گے۔ چوبیس گھنٹے کی نشریات جاری رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہئے ہوتا ہے۔ جب انہیں کچھ نہیں ملے گا تو اس طرح کے ایشوز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ میڈیا کے اس طوفان کی زد میں آنے سے پہلے کچھ پیش بندیاں کر لی جائیں تو بہتر ہوگا۔ ہم سرکاری ملازموں کا کیا ہے، آج یہاں کام کر رہے ہیں کل کسی دوسرے علاقے میں ہوں گے۔ لیکن آپ کو تو اپنے علاقے میں ہی رہنا بسنا ہے۔ اس سے قبل کہ آپ پر میڈیا کا حملہ ہو، مستقبل کی منصوبہ بندی کر لیں۔'' شہریار نے لیاقت رانا کے مشوروں پر کافی غور کیا تھا چنانچہ اب وہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے چودھری افتخار سے براہِ راست متصادم ہونے کے بجائے دوست بن کر اسے خوف زدہ کرنے اور اپنی مرضی کی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ کی بات غلط نہیں ہے۔ میں خود بھی یہ ساری باتیں محسوس کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میرے علاقے میں میڈیا کا اتنا اثر نہیں ہے۔ اکثر لوگ اَن پڑھ ہیں، اس لیے اخبار وغیرہ یہاں بہت کم آتا ہے۔ ٹی وی بھی فی الحال اِکا دُکا گھروں میں ہی ہے اور اس پر بھی ابھی صرف پی ٹی وی کی نشریات ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اگلے چند سالوں میں یہ بولنے والا تصویری ڈبہ سب کے گھروں میں پہنچ جائے گا اور اَن پڑھ مزارعوں کے دماغ خراب ہو جائیں گے۔ مگر بہر حال ابھی تو وہ وقت دور ہے..... جب آئے گا تو پھر میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گا۔ آپ کے خلوص اور مشورے کے لیے البتہ بہت بہت شکریہ۔'' چودھری افتخار نے جس طرح شہریار سے اتفاق کرتے ہوئے گفتگو شروع کی تھی، شہریار خوش ہو گیا تھا کہ وہ چودھری کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن چودھری تو ایک بار پھر چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! جو آپ مناسب سمجھیں۔ میرا کام تو آپ کو مشورہ دینا ہی تھا۔ آپ بہر حال مجھ سے زیادہ تجربہ اور سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہی ہوگا۔ فی الحال مجھے اجازت دیں۔ کافی دیر ہو گئی مجھے یہاں آئے ہوئے۔ کئی دوسرے کام بھی میری توجہ کے انتظار میں ہیں۔ مجھے انہیں دیکھنا ہے۔'' اپنی اتنی لمبی میٹنگ کے بعد بھی چودھری افتخار کو راہ پر نہ آتے دیکھ کر شہریار نے میٹنگ کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے وہ اس معاملے میں قطعی ناامید نہیں تھا۔ چودھری کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ اور طریقے بھی موجود تھے۔ وقت آنے پر وہ اپنی چال چل کر چودھری کو کسی حد تک تو سدھار ہی سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آج میری چودھری افتخار عالم شاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ موتی والا کے بیٹے کی موت پر بہت ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ شاید کاروباری نقصان کا خدشہ ہے انہیں۔ موتی والا اپنے بیٹے کی موت پر ان سے سخت ناراض ہے۔ لگتا ہے چودھری افتخار اور اس کے درمیان پارٹنر شپ مزید چل نہیں سکے گی۔'' شہریار نے ملاقات کے لیے آئے ہوئے ایس پی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''میرے خیال میں موتی والا پارٹنر شپ ختم کر کے اپنے ہی حق میں برا کرے گا۔ چودھری افتخار کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ان کے پاس بے تحاشا دولت ہے۔ ایک جگہ سے معاملہ خراب ہوا تو وہ دوسری جگہ انویسٹمنٹ کر دیں گے۔ وہ ڈسٹرب صرف اس لیے ہیں کہ موتی والا کے بیٹے کی موت ان کی حویلی میں ہوئی ہے۔ چودھری افتخار کا جو بیک گراؤنڈ ہے اس میں مہمانوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ مہمان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ اب جو لڑکے کی ان کی حویلی میں موت ہو گئی ہے تو انہیں لگتا ہے



کہ ان کی ساکھ اس حادثے سے متاثر ہوئی ہے۔ موتی والا کے نخرے بھی وہ اپنی اسی روایت کی پاسداری کی خاطر اٹھا رہے ہیں۔ ورنہ اس کے واویلا کرنے یا چودھری افتخار پر الزام دھرنے سے چودھری افتخار کا کچھ بگڑنے والا تو نہیں ہے۔ میں نے تو موتی والا کے بیٹے کے بارے میں مکمل معلومات کروائی ہیں۔ لڑکا بے حد بگڑا ہوا اور بری صحبت کا شکار تھا۔ شراب اور چرس کے نشے میں مبتلا ہونے کی تصدیق تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی ہوئی ہے۔ معلومات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صاحب زادے تعلیم کے میدان میں بھی سخت ناکامی کا شکار تھے۔ موتی والا پیسے کے زور پر اپنے بیٹے کو زبردستی آگے بڑھا رہا تھا۔ لڑکے کی ریڈ لائٹ ایریا میں بھی آمد و رفت تھی۔ موتی والا اگر چودھری افتخار کے خلاف زبان کھولے گا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے بھی سارے کچے چٹھے کھل جائیں گے۔ ابھی تو سب نے اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی ہے کہ بے چارہ موتی والا صدمے کا شکار ہے، ابھی اسے چھوڑ دو۔'' ایس پی کے اندازِ گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چودھری افتخار کے حق میں ہے۔

''آپ کی بات میں وزن ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے اس کیس پر بڑی تیزی اور چابک دستی سے کام کیا ورنہ لوگ پولیس کے محکمے سے ہمیشہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کام یا تو ہوتا نہیں یا بہت سست روی سے ہوتا ہے۔'' شہریار نے تعریف کی آڑ میں ایس پی کی کھنچائی کی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر! میرا اسٹاف بہت محنتی اور دیانت دار ہے۔ اور آپ یہ مت سمجھئے گا کہ کارکردگی کا یہ مظاہرہ دو بڑی شخصیات کے انوالو ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس وقت میری آمد کا مقصد آپ کو ایک دوسرے کیس کے سلسلے میں بریف کرنا تھا۔ ابھی کچھ دن قبل آپ نے اپنی نگرانی میں دین محمد نام کے ایک شخص کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ اس شخص نے الزام لگایا تھا کہ وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے تھانے گیا تھا لیکن تھانے دار نے رشوت طلب کی اور نہ دینے پر رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ بے چارے تھانے دار نے اس وقت بھی آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی تھی لیکن اسے خدشہ ہے کہ آپ نے اس کی پیش کی گئی صفائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بہر حال، آپ کے حکم کے مطابق اس نے معاملے کی تحقیق کر کے رپورٹ بھجوا دی ہے۔ آپ کو ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ رپورٹ خود آپ تک پہنچاؤں۔'' ایس پی نے ایک بند لفافہ شہریار کے سامنے رکھا۔ شہریار لفافہ کھول کر اس میں موجود رپورٹ پڑھنے لگا۔

اس رپورٹ کے مندرجات کے مطابق درخواست گزار دین محمد کا بیان قطعی جھوٹ پر مبنی تھا۔ اس رات اس کے گھر پر کوئی ڈاکا نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی اغوا کی گئی تھی۔ دین محمد نے بیٹی کے اغوا ہونے کی صرف کہانی بنائی تھی تاکہ گاؤں والوں کے سامنے بیٹی کے شادی سے پہلے اچانک غائب ہو جانے کا بہانہ بنا سکے۔ حقیقت میں اس کی بیٹی اپنے ماں باپ کے طے کردہ رشتے سے خوش نہیں تھی اور اس جگہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لڑکی کے کسی دوسرے گاؤں کے لڑکے سے مراسم تھے۔ لڑکا چونکہ دین محمد کی ذات برادری کا نہیں تھا اس لیے دین محمد اس لڑکے سے بیٹی کا رشتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لڑکی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس نے زبردستی اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر دیا لیکن شادی ہونے سے پہلے ہی لڑکی اُسے جُل دے گئی۔ اس نے اپنے آشنا لڑکے کو گھر بلایا۔ لڑکے کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے۔ ان لوگوں نے مل کر لڑکی کے بھائیوں کو ایک کمرے میں بند کیا اور دین محمد اور اس کی بیوی کے سامنے جہیز کے سامان اور روپوں سمیت لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔ بعد میں دین محمد اور اس کی بیوی نے واویلا مچایا کہ ان کے گھر ڈاکو گھس آئے تھے اور لڑکی سمیت سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ مگر اس بیان میں بالکل بھی سچائی نہیں تھی۔ خود درخواست گزار دین محمد کا کردار ماضی میں

کافی مشکوک رہا ہے۔ دین محمد کی موجودہ بیوی اس کی دوسری بیوی ہے جو پہلی بیوی کی حقیقی بہن ہے۔ بیس بائیس سال پہلے اس کی دوسری بیوی جو کہ اُس وقت اس کی سالی تھی، اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد اکیلی رہ جانے کے باعث اپنی بڑی بہن کے گھر رہنے آ گئی تھی۔ دین محمد اور اس کی بہن کی شادی کو کئی سال گزر جانے کے باوجود ان کے گھر اولاد نہیں تھی۔ دین محمد جو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بیوی سے اچھا خاصا بے زار ہو چکا تھا، جوان العمر سالی کو دیکھ کر پھسل گیا۔ اس نے جانے اپنی بیوی کو کیا کھلایا پلایا کہ اچھی خاصی ہٹی کٹی صحت مند عورت چند مہینوں میں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ دین محمد نے اپنی اور اپنی سالی کی تنہائی کا بہانہ کر کے فوراً ہی اس سے نکاح کر لیا۔ اب وہ اپنے سے کئی برس چھوٹی بیوی کے ساتھ مزے سے رہتا ہے۔ اس کے بچے بھی ہیں لیکن ظاہر ہے بچوں میں باپ کی خصلت تو آنی ہی تھی۔ چنانچہ بیٹی نے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مقصد برآری کے لیے دھوکا دہی سے کام لیا اور سب کچھ سمیٹ کر اپنے آشنا کیساتھ بھاگ گئی۔ اب دین محمد حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹی کہانی بنا رہا ہے۔

رپورٹ میں ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کے بجائے ذاتی خیالات اور تجزیے بھی پیش کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ شہریار نے رپورٹ پڑھنے کے بعد اسے واپس لفافے میں رکھا اور ایس پی کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو بہت ہی حیرت انگیز انکشافات ہیں۔ میں خود دین محمد کے ساتھ اس کے گاؤں گیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں نے بھی تصدیق کی تھی کہ دین محمد کے گھر ڈاکا پڑا ہے۔ لیکن اب یہ رپورٹ تو ان کی ساری باتوں کی قطعی نفی کر رہی ہے۔''

''آپ گاؤں والوں کی سادہ لوحی کو نہیں جانتے سر! اصل میں وہ بے چارے تو دین محمد کے بیان پر یقین کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ دین محمد ان سے جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ان میں سے کسی نے بھی آپ سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ اس نے ڈاکوؤں کو دیکھا تھا یا ان کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ سب تو دین محمد اور اس کی بیوی کے شور مچانے پر اس کے گھر پہنچے تھے اور جو کچھ انہوں نے کہا، اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔''

ایس پی کی دی ہوئی دلیل میں جان تھی۔ واقعی دین محمد کے پڑوسیوں میں سے کسی نے بھی ڈاکوؤں کو دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ دین محمد کے اپنے کردار کے بارے میں جن شکوک کا اظہار کیا گیا تھا وہ بھی غلط محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ دین محمد کی بیوی واقعی اس سے عمر میں کافی چھوٹی تھی۔ شہریار کو خود بھی دین محمد کے بچوں کی عمریں دیکھ کر تھوڑا سا تعجب ہوا تھا۔ دین محمد عمر کے جس حصے میں تھا، اس اعتبار سے اس کے بچے کافی چھوٹے تھے۔ لیکن اب باپ اور بچوں کی عمروں میں اس قدر تفاوت کی وجہ سمجھ رہی تھی۔

''میں تو خود گاؤں کے لوگوں کی سادہ لوحی پر بہت یقین رکھتا ہوں تارڑ صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرد تو مرد یہاں کی کم عمر لڑکیاں بھی اتنی چالبازی سے کام لے سکتی ہیں کہ سگے ماں باپ کو ہی لوٹ لیں۔'' شہریار کے لہجے میں حیرت اور افسوس دونوں شامل تھے۔

''آج کے دور میں ہر جگہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ دین محمد کی بیٹی تو صرف روپے اور زیور وغیرہ لے کر فرار ہوئی ہے لیکن لاہور اور کراچی کے اخباروں میں کئی بار آپ نے ایسی خبریں پڑھی ہوں گی جن کے مطابق لڑکیاں اپنے آشناؤں کے ساتھ مل کر ماں باپ سمیت پورے پورے گھرانے کو ہلاک کرنے کے بعد سارا مال و دولت سمیٹ کر فرار ہو گئیں..... تو بات یہ ہے جناب! کہ اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کی اس نوکری



ں رہتے ہوئے میں نے جتنے انوکھے واقعات دیکھے ہیں اس کے بعد کچھ بھی ناممکن نہیں لگتا۔ ان دیہی علاقوں ں تو اس طرح کے جرائم کی شرح کافی زیادہ ہے۔ بس یہ ہے کہ میڈیا کی پہنچ نہ ہونے کے باعث ان معاملات ی شہرت نہیں ہو پاتی۔ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جو پولیس کے علم میں ہی نہیں لائے جاتے اور پنچایت املہ کر دیتی ہے۔'' شہریار کی حیرت کے جواب میں ایس پی نے دلائل دیئے۔ شہریار ان دلائل کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایس پی معظم تارڑ عہدے کے اعتبار سے بھلے اس سے نیچے تھا لیکن اس کی عمر اور ملازمت کا ربہ بہت زیادہ تھا۔ مگر ابھی اس کے شکوک و شبہات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔

''میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں تارڑ صاحب! لیکن میرے ذہن میں ایک خیال یہ آ رہا ہے کہ ین محمد نے ڈاکوؤں والی کہانی کیوں بنائی؟ اس علاقے میں ڈاکو اپنی سرگرمیاں دکھاتے رہتے ہوں گے جب ی تو دین محمد کے ذہن میں خیال آیا کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ڈاکوؤں کے ساتھ تھی کر دے۔''

''ڈاکو کہاں نہیں ہوتے سر! کیرتھر کی پہاڑیاں مشہور ہیں ڈاکوؤں کو پناہ گاہ فراہم کرنے کے معاملے میں۔ الی اور مغربی کوہستانی سلسلوں میں بھی جرائم پیشہ افراد پناہ لیتے ہیں۔ چن جی، لال سوہانرا سب جگہ ڈاکوؤں کی ریں ملتی ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں کا کیا حال ہے؟ سرِ عام لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ آئے دن بینکوں ، بازاروں میں ڈاکے پڑتے رہتے ہیں۔ ڈاکو بیچ شہر میں رہتے ہیں اور کوئی انہیں پکڑ نہیں پاتا۔ پھر اس علاقے میں ڈاکوؤں کا ہونا کون سی انہونی بات ہے؟ یہاں تو بڑی سہولت ہے اُنہیں..... اتنا بڑا جنگل موجود ہے جس میں وہ پناہ لے سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک بات ہے اُن کے اس علاقے میں سرگرم ہونے کی تو ڈاکو یہاں اتنے ایکٹیو نہیں ہیں۔ یہاں عام آدمی کے پاس اتنا زیادہ مال و دولت نہیں ہے کہ ڈاکو اپنی جان جوکھوں ں ڈال کر کسی گاؤں، دیہات پر حملہ کریں تو ریٹرن میں انہیں بہت زیادہ فائدہ مل سکے۔ وڈیروں کے پاس الت ہے لیکن اوّل تو وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ سب کچھ اپنی حویلیوں میں رکھ کر بیٹھے رہیں کہ ڈاکو آئیں اور انہیں کنگال کر ڈالیں۔ دوم وڈیروں کے پاس اپنی حفاظت کا معقول انتظام ہے۔ مسلح اور غیر مسلح دونوں طرح ے افراد ان کی حویلیوں کی حفاظت پر مامور رہتے ہیں۔ ڈاکو ان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں تو فائدہ کم اور نقصان زیادہ اٹھانا پڑے گا۔ اب جہاں تک دین محمد کے ذہن میں آنے والی کہانی کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی اس نے ان اِکا دُکا واقعات کی بنیاد پر بنائی ہے جن میں ڈاکوؤں کی انوالومنٹ کا ذکر آتا ہے۔ ایک عہ ایک چھوٹے زمیندار کے بیٹوں کی بارات پر اس وقت حملہ ہوا تھا جب وہ لوگ دُلہنیں لے کر واپس آ رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں دُلہنوں کے علاوہ دیگر خواتین کے زیورات وغیرہ لوٹ لیے گئے تھے۔ مردوں سے بھی ان کی نقدی، گھڑیاں اور گلے کی چینیں وغیرہ اُتروا لی گئی تھیں۔ پولیس کافی تحقیقات کے باوجود اس واردات ے مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرا واقعہ ایک دیہات میں پیش آیا تھا۔ ایک دیہاتی کی ہاہتا بیوی کو رات کے وقت کچھ لوگ زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے عورت کے ساتھ گھر کا مال اسباب بھی سمیٹ لیا تھا اور جاتے جاتے دیہاتی کو جان سے مار گئے تھے۔ پولیس نے جب اس معاملے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اغوا شدہ عورت کے بیاہ سے پہلے اس کے گاؤں کا ایک آوارہ مزاج شخص اس پر فریفتہ تھا۔ اس نے شادی کے لیے پیام بھی بھیجا تھا لیکن ظاہر ہے اسے انکار کر دیا گیا تھا۔ گھر والوں نے اپنی بیٹی کی شادی ایک مناسب جگہ کر دی۔ اس شادی کے بعد اس کا عاشق غائب ہو گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے اپنا انتقام اس طرح لیا کہ عورت کو اغوا کر لیا اور اس کے شوہر کی جان لے لی۔ وقوعہ کے چوتھے روز ہی اس اغوا شدہ عورت کی کٹی پھٹی لاش گاؤں کے باہر پڑی مل گئی تھی۔ لیکن دین محمد کی بیٹی کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ابھی تک

کہیں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی ہے۔ حالات و واقعات بھی یہی بتاتے ہیں کہ لڑکی خود اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس کیس میں انتقام یا لالچ دونوں ہی نظر نہیں آتے۔ دین محمد کی کسی سے دشمنی نہیں اور اپنی طرف سے چاہے اس نے بیٹی کا جتنا بھی اچھا جہیز جوڑا ہو، لیکن بہرحال وہ اتنا نہیں ہوسکتا کہ اس کے لالچ میں ڈاکوؤں کا کوئی گروہ اپنی سرگرمی دکھائے۔'' ایس پی نے شہریار کو مطمئن کرنے کے لیے جواب میں ایک لمبی تقریر جھاڑ دی جس سے شہریار کچھ متاثر بھی ہوا۔

''او کے تارڑ صاحب! بہت بہت شکریہ اس معاملے میں بریف کرنے کا۔ میں واقعی دین محمد کے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکا تھا۔ لیکن بہرحال، آپ اس ڈاکوؤں والے معاملے پر نظر رکھیں۔ اگر ہماری حدود میں اس طرح کے مجرم ہیں تو ہمیں ان کے خلاف ایکشن لینا چاہئے۔ ہم یہ کہہ کر کہ ڈاکو سب جگہ ہوتے ہیں، بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔''

''آپ فکر مت کریں سر! ہمارا ضلع بالکل محفوظ ہے۔ یہاں ڈاکوؤں کی ایکٹویٹیز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کبھی وہ ایکٹیو ہوئے تو میرا محکمہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔'' شہریار کی ہدایت کے جواب میں ایس پی نے اسے یقین دہانی کروائی۔ فی الحال شہریار اس یقین دہانی پر یقین کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آپ کو چودھری اشرف شاہ نے اپنی حویلی میں یاد فرمایا ہے۔'' اپنے دروازے پر کھڑے شخص کے اس پیغام نے ماسٹر آفتاب کو حیرت میں مبتلا کردیا۔ چودھری اشرف شاہ، چودھری افتخار کے سالے کا بیٹا اور اس کا بڑا داماد ہے، یہ بات آفتاب کے علم میں تھی۔ لیکن چودھری افتخار سمیت اس کے اہل خانہ میں سے کبھی بھی کسی نے براہِ راست اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ براہِ راست تو وہ اس کے اسکول کی بھی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اسکول کو غیر مؤثر بنانے کے لیے وہ دوسری طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے جن میں سے اوّل اسکول کی عمارت کی توسیع میں رکاوٹ ڈالنا اور دوسرے اپنے مزارعوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا تھا کہ اسکول کی تعلیم ان لوگوں کے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔ ان حالات میں چودھری اشرف کی طرف سے بلاوا آنے پر آفتاب احمد کا ذہن سب سے پہلے نئے اے سی کو بھجوائی گئی اپنی درخواست کی طرف گیا۔ اسے خیال آ کہ کہیں کسی ذریعے سے چودھری اشرف کو اس درخواست کی اطلاع مل گئی ہے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ نئے اے سی نے اس درخواست کی منظوری کا فیصلہ لے لیا ہے۔ اس لیے وہ اسے ڈرا دھمکا کر اپنی درخواست واپس لینے کی کوشش کرے گا۔ ویسے تو اس معاملے کا تعلق براہِ راست چودھری افتخار سے بنتا تھا لیکن آفتاب کے علم میں تھا کہ آج کل چودھری اپنی حویلی میں پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے اُلجھا ہوا ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آفتاب احمد جیسے معمولی اسکول ماسٹر سے براہِ راست بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہو اس لیے بھی اس نے اپنے داماد کو یہ ذمے داری سونپی ہو کہ ذرا اس اسکول ماسٹر کا دماغ تو درست کر دو..... اور داماد صاحب نے دماغ درست کرنے کے لیے اسے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم بھیج ڈالا ہو۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ماسٹر صاحب! میں نے آپ سے کچھ عرض کیا ہے۔'' چودھری اشرف کے پیامبر نے آفتاب احمد کو سوچوں میں گم دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''نہیں، بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ آج چودھری صاحب کو میری یاد کیسے آ گئی؟''

''یہ تو آپ ان سے ملیں گے تو ہی پتہ چلے گا۔'' ملازم نے بے نیازی سے جواب دیا۔



''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کس ٹائم بلوایا ہے چودھری صاحب نے؟'' ملازم نے اتفاق کرتے ہوئے آفتاب سے پوچھا۔

''ٹیم ویم کی کوئی بات نہیں۔ میں گڈی لے کر آیا ہوں۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔'' ملازم نے جواب دیا تو آفتاب کو احساس ہوا کہ معاملہ یقیناً سیریس ہے ورنہ چودھری اشرف اسے یوں ایمرجنسی میں کال نہیں کرتا۔

''اچھا تم ٹھہرو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' آفتاب نے ملازم سے کہہ کر اپنے رہائشی کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی۔ اس کا ساتھی ماسٹر کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ یعنی صورتِ حال یہ تھی کہ اگر وہ چودھری اشرف کے بھیجے کارندے کے ساتھ اس کی حویلی چلا جاتا اور وہاں کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس پر چودھری اشرف برہم ہو کر اسے جان سے مار دیتا یا قید میں ڈال دیتا تو کسی کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ ماسٹر آفتاب احمد کہاں چلا گیا۔ ذہن میں گردش کرتے ان خیالات کے ساتھ آفتاب احمد نے تیزی سے لباس بدلا اور پھر کمرے میں موجود اپنی بوسیدہ سی رائٹنگ ٹیبل کے قریب آیا۔ رائٹنگ ٹیبل پر اس کا وہ کالم جو چودھری اشرف کے نمائندے کی آمد سے قبل وہ لکھ رہا تھا، ادھورا پڑا ہوا تھا۔ آفتاب احمد نے ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر مارکر سے بڑا بڑا ''میں چودھری اشرف سے ملنے اس کی حویلی جا رہا ہوں۔'' لکھا اور کاغذ کو کلپ بورڈ میں پھنسا کر خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب اسے کم از کم یہ تسلی تھی کہ اگر وہ غائب بھی ہوا تو ڈھونڈنے والوں کو اس کا سراغ تو مل سکے گا۔

باہر چودھری اشرف کا نمائندہ گاڑی میں بیٹھا منتظر نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ آفتاب احمد کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی چلا دی۔ گاڑی چودھری اشرف کی رہائش گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ چودھری اشرف کی رہائش، چودھری افتخار کی حویلی سے کافی فاصلے پر تھی۔ پیر آباد کی بیشتر زمین چودھری افتخار کی ملکیت تھی۔ ان زمینوں کے ساتھ ہی اس کے سالے اور سمدھی کی زمینیں تھیں۔ اپنی زمینوں کی حدود میں ہی اس کی رہائش گاہ بھی تھی جہاں وہ اپنے دونوں بیٹوں اشرف، اختر، ان کی بیویوں اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ چودھری اشرف کا نمائندہ ماسٹر آفتاب کو اسی جانب لے جا رہا تھا۔

منزل پر پہنچنے کے بعد اسے لے جانے والے نے ماسٹر آفتاب کی آمد کی اطلاع اندر بھجوائی۔ فوراً ہی ایک ملازم اسے اپنے ساتھ اندر ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ملازم کے انداز میں احترام تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک نے آفتاب کے اس خدشے کو کم کردیا کہ وہاں اسے دماغ درست کرنے کی نیت سے بلایا گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چودھری اشرف ایک تقریباً چار سالہ بچے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو آفتاب کے باقی ماندہ خدشات بھی ختم ہوگئے۔

''یہ میرا بیٹا منور ہے۔ بہت ذہین بچہ ہے۔ اللہ نے تین بیٹیوں کے بعد مجھے یہ بیٹا دیا ہے۔ اس لیے اس میں ہم سب کی جان اٹکی رہتی ہے۔ بچے کی ماں اسے نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ابتدائی چند سال اسے گھر پر ہی تعلیم دی جائے۔ میں چاہتا تو اس مقصد کے لیے شہر سے کسی استاد کو بلوا سکتا تھا لیکن سننے میں آیا ہے کہ تم بھی اچھے خاصے لائق آدمی ہو، اس لیے سوچا پہلے تمہیں ہی آزما کر دیکھ لیں۔ کل سے بچے کو پڑھانے آ جانا۔ میرا ڈرائیور تمہیں لینے اور چھوڑنے چلا جائے گا۔ اگر ہم تم سے مطمئن ہو گئے تو تمہاری ملازمت پکی ورنہ پھر شہر سے کسی دوسرے استاد کو بلوا لیں گے۔'' چودھری اشرف نے ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتے ہوئے آفتاب کو حکم سنا ڈالا۔ اس کا یہ تحکمانہ انداز آفتاب

کو بہت برا لگا۔ اوّل تو وہ گھروں پر جا کر بچوں کو ٹیوشن دینا پسند نہیں کرتا تھا، دوسرے بہ حیثیت استاد اس کی نظر میں اس کا اپنا ایک مقام تھا۔ اس مقام اور عزت کو خاطر میں لائے بغیر چودھری اشرف اس پر یوں حکم چلائے اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ غصے اور جوش کی کیفیت میں اس کے ہونٹ اس حکم پر انکار کرنے کے لیے کھلے لیکن پھر اچانک ہی اسے ہوش آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ نئے اے سی شہریار نے چودھری افتخار سے براہِ راست تصادم کے بجائے مصالحانہ حکمت عملی سے کام لینے کی بات کی تھی۔ چودھری اشرف، چودھری افتخار کا داماد تھا، چنانچہ مصلحت پسندی کا تقاضا یہ تھا کہ آفتاب، چودھری اشرف کو انکار نہ کرے۔ چودھری اشرف کی بات مان لینے سے اس کی حویلی تک رسائی ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ وہ چودھری اشرف کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور کچھ نہیں ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ اسے منور نام کے اس پیارے سے بچے کی تعلیم و تربیت کا موقع مل جاتا۔ آفتاب احمد استاد کے کردار کی اہمیت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اپنی کوشش سے اس کچے ذہن کے معصوم بچے کی سوچوں کا رخ اس طرف موڑ سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں وہ اپنے باپ دادا اور نانا کی روش سے ہٹ کر چل سکے۔ اس چھوٹی سی امید کے سہارے اس نے انکار کے لفظ کو اپنے ہونٹوں پر نہ آنے دیا اور چودھری اشرف سے ہامی بھر لی۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ ڈرائیور کے ساتھ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کا ساتھی استاد اس کا لکھا ہوا کاغذ ہاتھ میں پکڑے حیران پریشان کھڑا تھا۔

''یہ کیا ہے آفتاب؟'' آفتاب احمد کو دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ میں خوامخواہ وہم کا شکار ہو گیا تھا۔'' آفتاب احمد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور توڑ موڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکنے کے بعد ہنسنے لگا۔

''اچھا، وہم تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اگر تم اس وقت نہیں آتے تو میں تھوڑی دیر میں کہیں پر بھیک مانگنے نکل کھڑا ہوتا۔'' اس کا ساتھی خفا ہوا۔

''جانے دو یار! کیا کروں، میں بھی ایک عام سا آدمی ہوں اس لیے کبھی کبھی ڈر جاتا ہوں۔'' آفتاب احمد نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر قلم سنبھال لیا۔ اسے اپنا ادھورا کالم آج ہی مکمل کرنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''چودھری صاحب! صنوبر کے دن قریب آ رہے ہیں۔ لاہور والی کوٹھی میں اس کے رہنے کا بندوبست کروا دیں۔'' چودھری افتخار کو فارغ دیکھ کر بڑی چودھرائن اس کے پاس چلی آئی اور مدعا بیان کیا۔ چودھری افتخار کے خاندان میں رواج تھا کہ جس عورت کی ڈیلیوری کے دن قریب آتے اسے لاہور میں واقع چودھری افتخار کی کوٹھی میں منتقل کر دیا جاتا تاکہ بروقت ہسپتال پہنچ کر طبی سہولتوں سے فیض یاب ہوا جا سکے۔ اس طرح حویلی کے مکینوں کو کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے لیے یہ بندوبست کرنے کے بعد وہ لوگ اس فرض سے غافل ہو گئے تھے کہ گاؤں میں مناسب طبی سہولیات فراہم کی جائیں۔ اسکول کی طرح ہسپتال کی تعمیر میں بھی کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے برسوں پہلے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کی گئی تھی لیکن اس ڈسپنسری میں نزلے زکام کی چند گولیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ کئی سالوں سے کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر نے اس ڈسپنسری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ایک کمپاؤنڈر تھا جو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ضرورت پڑنے پر لوگوں کو دوائیں دے دیتا تھا۔ کچھ گاؤں کے لوگوں میں ڈاکٹری علاج کے لیے اتنی زیادہ پسندیدگی بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے مقابلے میں وہ حکیم سے علاج کروانا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن بعض نازک معاملات میں ڈسپنسری کا کمپاؤنڈر اور



گاؤں کا مقبول حکیم دونوں ہی کوئی مدد نہیں کر پاتے تھے۔ خصوصاً عورتوں کے کیسز میں گاؤں میں موجود دو عدد دائیاں ہی سارے معاملات سنبھالتی تھیں۔ لیکن جہاں معاملہ ایسا ہوتا کہ آپریشن ضروری ہوتا، وہاں یہ دائیاں بے بس ہو جاتیں اور انجام عورت کی بے کس و دردناک موت پر ہوتا جسے ان کے ورثا تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے۔ گاؤں کی تقدیر بدلنا جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس سلسلے میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کے گھر کی عورتیں اور ان کی ہونے والی اولادیں محفوظ ہیں۔ گاؤں ضروری سہولیات سے عاری تھا تو کیا تھا، وہ خود اپنے لیے تو ہر طرح کی سہولت حاصل کرنے پر قادر تھے..... جیسے اس وقت بڑی چودھرائن نے صنوبر کے سلسلے میں بات کی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں کوٹھی فون کر دوں گا۔ وہاں ملازم سارا بندوبست کر دیں گے۔ یہاں سے کون جائے گا صنوبر کے ساتھ؟''

''ابھی تو میں رانی اور اس کی ماں کو بھجوا رہی ہوں۔ دونوں ماں بیٹی بڑی خدمت گزار ہیں۔ صنوبر کا اچھی طرح خیال رکھیں گی۔ میں اور ناہید ایک آدھ دن پہلے چلے جائیں گے۔ یہاں حویلی چھوڑ کر زیادہ دن تک باہر رہی تو نہیں رہا جا سکتا۔ ان کمی کمینوں کے سر پر سوار نہ رہو تو رپڑھا پیٹ ڈالتے ہیں ذرا سے دنوں میں۔'' بڑی چودھرائن نے جواب دیا۔

''ہوں..... اچھی بات ہے۔ تم لوگوں کو واقعی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ عرس والی رات دیکھا نہیں تھا کہ ذرا سی بے خبری نے کتنی تباہی مچا دی۔ مجھے علم ہوتا کہ وہ لڑکا اس خصلت کا ہے تو نوکروں کو منع کر دیتا کہ اسے شراب وراب نہ پہنچائیں۔ ذرا سی بات تھی لیکن اس کی وجہ سے اچھی خاصی مشکل پڑ گئی۔'' چودھری افتخار کو رہ رہ کر حویلی میں ہونے والا حادثہ یاد آتا تھا۔

''بس جی چودھری صاحب! اس دن کسی کی نظر ہی لگ گئی حویلی کو۔ سارے کام اتنے اچھے طریقے سے ہوئے تھے کہ حاسدوں کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کا یہ حسد ہی کھا گیا موتی والا کے بیٹے کو..... بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں کسی نے جان بوجھ کر آپ کو مشکل میں ڈالنے کے لیے ہی تو اس لڑکے کے کمرے میں آگ نہیں لگوا دی؟ کچھ معلوم تھوڑی ہوتا ہے کسی کا۔ سجن بن کر پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے ہیں لوگ۔'' چودھری کی بات سن کر بڑی چودھرائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''منہ بند رکھو بے وقوف عورت! ابھی تک جو بات کہنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی، وہ تم لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دو گی۔ حادثے کا الزام لڑکے کے سر رہے، اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ اگر موتی والا کو یہ خیال آ گیا کہ اس کا بیٹا میری کسی دشمنی کی بھینٹ چڑھا ہے تو وہ اور بھی زیادہ بدکے گا۔'' چودھری افتخار نے بڑی چودھرائن کو جھاڑا۔

''برا نہ مانیں چودھری صاحب! میں تو بس بے خیالی میں ہی ایسی بات کہہ گئی تھی۔'' بڑی چودھرائن نے چودھری افتخار کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر فوراً معذرت کی۔

''جب کھوپڑی کے اندر بھیجا نہیں ہے تو کیوں ہر معاملے میں دخل دیتی ہو؟ منہ بند کر کے کیوں نہیں بیٹھا جاتا تم سے؟ ویسے بھی عورت ذات کو کیا ضرورت ہے مردوں کے ان معاملات میں بولنے کی؟ تم بس بیٹھ کر حویلی کے اندر کے معاملات دیکھا کرو۔ تم سے یہ معاملات ہی سنبھل جائیں بہت ہے۔ باقی سب دیکھنے کے لیے میں آپ موجود ہوں۔'' بڑی چودھرائن کی معذرت کے باوجود چودھری افتخار نے اس کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کر دی۔

''غلطی ہو گئی چودھری صاحب! آئندہ دھیان رکھوں گی۔'' بڑی چودھرائن نے ایک بار پھر معذرتی الفاظ

ادا کیے۔

''ٹھیک ہے۔ آئندہ زبان کو قابو میں رکھنا۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

چودھری افتخار نے پُر رعونت انداز میں بڑی چودھرائن کی معذرت قبول کرتے ہوئے اس کو حکم دیا۔ بڑی چودھرائن اس حکم کو سن کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی لیکن وہاں سے گئی نہیں۔

''اب کیا ہے؟'' چودھری افتخار نے اس کے وہاں رکے رہنے پر غصے سے پوچھا۔

''ایک بات اور کرنی تھی چودھری صاحب!'' بڑی چودھرائن منمنائی۔

''کیا بات کرنی تھی؟'' چودھری تھوڑا دھیما ہوا۔

''ناہید نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے کشور کے بھی لاہور جانے کی اجازت لے لوں۔ بے چاری بچی کے لیے زندگی میں اور تو کوئی رونق نہیں۔ ذرا حویلی سے نکل کر کچھ دنوں کے لیے لاہور چلی جائے گی تو اس کا دل بہل جائے گا۔ پھر صنوبر کو بھی بہن کا سہارا ہو جائے گا۔ ملازمائیں لاکھ خیال رکھیں پر بہن کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ دونوں بہنیں ایک جگہ رہیں گی تو دونوں کا ہی دل بہلا رہے گا۔'' بڑی چودھرائن نے مسئلہ پیش کیا۔

''دل بہلانے کا کیا مسئلہ ہے۔ حویلی کوئی چھوٹی ہے جو اسے دیکھ کر بندے کا دل اوب جائے۔ ضرورت کی کسی چیز کی بھی کمی نہیں۔ کبھی تم لوگ خواہش کرو تو تمہاری مرضی کی خریداری کے لیے تم لوگوں کو شہر بھی بھجوا دیتا ہوں۔ لیکن پھر بھی شکوے ختم نہیں ہوتے تم لوگوں کے۔ ویسے بھی کشور سے کہو کہ حویلی میں ہی دل لگانے کی عادت ڈال لے۔ اسے ساری حیاتی، اپنی آخری ساہ تک اسی حویلی میں ہی رہنا ہے۔ یہاں دل نہیں لگائے گی تو بہت پچھتائے گی۔'' چودھری افتخار نے بڑی چودھرائن کی درخواست میں تقریر جھاڑی۔

''وہ سب سمجھتی ہے چودھری صاحب! اس کا ایسی ویسی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ بڑے فقیروں والے مزاج کی لڑکی ہے۔ کپڑے لتے، زیور مہندی کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔ بس اپنی کتابوں میں مگن رہتی ہے۔ جو اس کے لاہور جانے کا قصہ میں نے آپ کے سامنے چھیڑا ہے، اس کی فرمائش بھی صنوبر نے ناہید سے کی تھی۔ اصل میں اتنے دن اکیلی رہنے کے خیال سے گھبرا رہی ہے۔ پچھلی بار بھی جب بچے کی پیدائش پر لاہور گئی تھی تو یہی شکوہ کر رہی تھی کہ گاؤں سے اتنی دُور، انجان جگہ پر رہنے سے طبیعت گھبراتی ہے۔ اب اگر کشور ساتھ چلی گئی تو اس کی یہ پریشانی دور ہو جائے گی۔ ویسے ہی اس بار اس کے دل کو گھبراہٹ زیادہ ہے۔ کچھ کم ہمت سی ہو رہی ہے۔'' بڑی چودھرائن کو سوتن کی بیٹیوں سے محبت اتنی نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے یہ کام اس کے ذمے لگایا تھا تو اس کے پورا ہونے میں ہی اس کی عزت تھی۔ اگر وہ چودھری افتخار سے یہ فرمائش نہ منوا پاتی تو اس کی اپنی سوکن اور اس کی بیٹیوں کے سامنے ناک نیچی ہو جاتی اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح چودھری افتخار قائل ہو جائے۔

''ٹھیک ہے۔ اگر صنوبر کی طبیعت کا معاملہ ہے تو بھجوا دو کشور کو ساتھ۔ لیکن دھیان سے سمجھا بجھا کر بھیجنا۔ یہ نہ ہو کہ شہر جا کر خود کو بالکل آزاد سمجھنے لگیں۔'' چودھری افتخار نے آخر کار ہامی بھر لی۔

''آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں سب سمجھا دوں گی لڑکیوں کو۔'' بڑی چودھرائن، چودھری افتخار کا جواب سن کر جوش سے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کا انداز فاتحانہ تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ حویلی اور چودھری دونوں پر اس کا راج سب سے مستحکم ہے۔ بند کمرے کے اندر جو بے عزتی ہوئی تھی اس کی کسے بھنک پڑ سکتی تھی۔ موجودہ فیصلے کی روشنی میں تو وہ فاتح تھی۔

⊛----✪----⊛



''سر! پیر آباد سے ماسٹر آفتاب آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' شہریار اپنے دفتر میں بیٹھا کسی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے انہیں اندر بھیج دو۔'' شہریار نے جواب دیا۔

''السلام علیکم۔'' ایک منٹ کے وقفے کے بعد ماسٹر آفتاب اس کے کمرے میں تھا۔

''وعلیکم السلام۔ تشریف رکھیے۔'' شہریار نے خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''بغیر ٹائم لیے آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں میرے پاس فون کی سہولت نہیں ہے ورنہ آنے سے پہلے فون پر آپ سے اجازت لے لیتا۔ آج لاہور کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو سوچا آپ سے بھی ملاقات کرتا چلا جاؤں۔ ویسے مجھے اندازہ ہے کہ اس طرح بے وقت آنے سے آپ ڈسٹرب ہوئے ہوں گے۔'' آفتاب نے معذرت خواہانہ انداز میں شہریار سے بغیر وقت لیے آنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے آفتاب صاحب! میں اس سیٹ پر افسری دکھانے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خدمت کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔ یوں بھی بے وقت کے ملاقاتیوں سے نمٹنے کی اب عادت سی ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کا بلا مقصد صرف اپنے علاقے کے اے سی سے تعلقات بڑھانے کے لیے بھی یہاں چلے آتے ہیں۔ آپ کی آمد کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ یہ بے مقصد نہیں۔ آپ جس مسئلے کے حل کے لیے اتنے عرصے سے درخواستوں پر درخواستیں بھیجتے رہے ہیں، اب اس کے حل کی کچھ امید نہیں ہے تو آپ کا یہاں آنا اور اس بارے میں پوچھنا بالکل جائز ہے۔'' شہریار نے مسکراتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا۔

''آپ نے میری آمد کے بارے میں کافی درست اندازہ لگایا ہے۔ اصل میں اسکول کو ترقی دینا اور علاقے کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا میرا خواب ہے۔ ہمارے ملک کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہاتوں میں آباد ہے اور بے شمار دیہاتوں میں تعلیم کا کوئی معقول بندوبست ہی نہیں۔ جب بچے پڑھیں گے نہیں تو ملک کا مستقبل کیسے سنورے گا؟ یہ علم سے دُوری ہی تو ہے کہ ہم پاکستان کے قیام کے اتنے عرصے بعد بھی اتنی ترقی نہیں کر پائے جتنی ہمیں کرنی چاہیے تھی۔ بہ حیثیت ایک پاکستانی میری خواہش ہے کہ میں کم از کم اس علاقے میں تو علم کی روشنی پھیلا دوں۔ چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ خود ہی شروع ہو جائے گا۔'' ماسٹر آفتاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''مجھے آپ کا طرزِ فکر بہت پسند آیا۔ آپ کی اس اسپرٹ کا میں نے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ ان دنوں کی بات ہے کہ میں چاہتا ہوں براہِ راست تصادم کے بغیر بات بن جائے۔ سرکاری حکم جاری کرنا اتنا مشکل نہیں لیکن میرے ڈائریکٹ ایکشن لینے کو چودھری افتخار طبل جنگ سمجھے گا۔ فی الحال تو میں نے اس معاملے میں انہیں اس لیے بھی زیادہ نہیں چھیڑا کہ ابھی وہ اپنی حویلی میں موتی والا کے بیٹے کی موت کی وجہ سے پریشان ہیں۔ لیکن آپ فکر نہیں کریں، آپ کا اسکول ضرور ترقی کر کے رہے گا۔'' شہریار نے ماسٹر آفتاب کو تسلی دی۔

''بس یہ کام ہو جائے تو مجھے سکون مل جائے گا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں، مجھے آپ کی پالیسی پر کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ میں خود بھی اس پر عمل پیرا ہو گیا ہوں۔ چودھری افتخار کے داماد چودھری اشرف نے مجھ سے اپنے بیٹے کو پڑھانے کا کہا ہے۔ ذاتی طور پر گھر جا کر ٹیوشن دینے کو ناپسند کرنے کے باوجود میں نے چودھری اشرف کی بات اس لیے مان لی کہ میرے انکار کو بغاوت سمجھتے ہوئے وہ مجھ سے دشمنی نہ پال لے۔ اپنی ذات کے نقصان کے لیے مجھے کوئی پروا نہیں لیکن اسکول کی مجھے بہت فکر ہے۔ میں درمیان سے ہٹ گیا تو دوسرا کوئی یہاں ٹکنے والا مشکل سے ہی آئے گا۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ فی الحال ہمیں اسی طرح کی مصلحت پسندی سے کام لینا ہوگا۔'' ماسٹر آفتاب کی بات سن کر شہریار نے اس کے فیصلے کی حمایت کی پھر پُرسوچ انداز میں پوچھا۔ ''آپ صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ صحافی حلقے میں آپ کی دوستیاں وغیرہ تو ہوں گی۔''

''بہت زیادہ تو نہیں ہیں۔ اصل میں، میں ذرا الگ تھلگ رہ کر، خاموشی سے کام کرنے والا بندہ ہوں لوگوں سے ملتا ہوں لیکن بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا۔ صحافیوں کی گروپ بندیاں اور خاص افراد، اداروں کی چوعتوں سے ہمدردیاں مجھے پسند نہیں آتیں۔ لوگ صحافت کے مقدس پیشے میں رہ کر بھی منافقانہ رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اس لیے میرے بس گنے چنے چند ایک افراد سے ہی قریبی تعلقات ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے جواب دیا۔

''ان چند ایک افراد میں سے کوئی ایک تو ایسا ہوگا جو آپ کے کہنے پر پیر آباد کی صورتِ حال پر قلم اٹھا سکے؟'' ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہریار نے دوسرا سوال اٹھایا۔

''ہاں، میرا ایک دوست ایسا ہے جو میرے کہنے پر یہ کام کر دے گا۔ لیکن میں کسی اور سے کیوں کہوں میں خود بھی یہ کام کر سکتا ہوں۔ پہلے بھی ڈھکے چھپے انداز میں یہاں کے مسائل کی نشان دہی کرتا رہا ہوں۔''

''آپ کے پچھلے کالمز میں نے دیکھے ہیں لیکن میں چاہ رہا ہوں کہ اب آپ یہ کام نہ کریں۔ آپ صحافت کے ساتھ یہاں رہ کر بھی کام کرنا ہے۔ بار بار اگر آپ ہی اس سلسلے میں لکھتے رہے تو چودھری افتخار آپ کی کھوج میں لگ جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ اتنے قیمتی شخص کا نقصان برداشت کروں۔ آپ بے شک کالم کے لیے قلمی نام استعمال کرتے ہیں لیکن جب کوئی کھوج لگانے پر اُتر آئے تو اس کے لیے اصل بندے تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا۔ اب تو یوں بھی آپ کی کتاب چھپنے والی ہے۔ کتاب کے بعد آپ لوگوں کے لیے اور بھی زیادہ فیمیلیار ہو جائیں گے۔'' ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہریار نے اپنی کہی بات کی وضاحت دی۔

''اگر آپ کی یہی رائے ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اپنے صحافی دوست سے بات کر لوں گا۔ وہ کافی منجھا ہوا صحافی ہے اور سچ لکھنے سے گھبراتا نہیں ہے۔ اپنے سچ کی وجہ سے بے چارے کو اکثر دھمکیوں اور کبھی کبھی پابندیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ میں پیر آباد کے سلسلے میں کالم لکھنے کی فرمائش کروں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ ہم آپ یہ بتا دیں کہ کالم کس نوعیت کا ہونا چاہئے اور اس میں کن نکات پر زیادہ زور دینا ہے تاکہ میں اپنے دوست کو بریف کر دوں۔'' ماسٹر آفتاب کے پوچھنے پر شہریار دھیمی آواز میں اسے اپنے ذہن میں موجود تجاویز کے متعلق سمجھانے لگا۔ شہریار کی ہر ہر بات کو غور سے سنتے ماسٹر آفتاب کا سر جواباً مسلسل اثباتی انداز میں حرکت کرتا رہا۔

⊛----✪----⊛

''سلام چودھری صاحب!'' غیاث محمد اور نوراں نے ہاتھ جوڑ کر چودھری افتخار کو سلام کیا جس کا جواب دینے کے بجائے چودھری افتخار بے نیازی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ شہر کی محفلوں میں اور سفر کے دوران وہ زیادہ تر سگار کا استعمال کرتا تھا لیکن حویلی میں ہونے کی صورت میں اسے حقہ ہی سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس وقت بھی اپنے محبوب حقے کے ساتھ مصروف وہ نوراں اور غیاث محمد کو باریابی کی اجازت دینے کے باوجود ہاتھ فراموش کیے بیٹھا تھا۔ نوراں اور غیاث محمد جو پہلے ہی بہت ڈرتے ڈرتے وہاں آئے تھے، چودھری کے اس انداز کو دیکھ کر سلام کے بعد زبان سے ایک لفظ بھی مزید ادا نہیں کر سکے تھے۔ وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے اس کو بیان کرنے میں ویسے ہی ان کی زبانیں تالو کے ساتھ لگی جا رہی تھیں مگر ضرورت ایسی تھی کہ یہاں آئے



بغیر کوئی چارہ بھی نہیں بنتا تھا۔ زہرہ کے سسرال والوں نے بتا دیا تھا کہ رب نواز دس دن بعد گاؤں آنے والا ہے۔ رب نواز بہت کم دن کی چھٹیوں پر آ رہا تھا اس لیے اس کے آتے ہی شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جانا چاہئے تھا۔ ادھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس تیاری کے لیے کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ان کا سارا انحصار چودھری افتخار سے قرض کی فراہمی پر تھا۔ رب نواز کے گاؤں پہنچنے کی تاریخوں کا انہیں پہلے ہی اندازہ تھا اور وہ سوچتے تھے کہ عرس کے فوراً بعد چودھری افتخار کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے قرض طلب کریں گے۔ عرس کے بعد کے عرصے میں چودھری افتخار کا مزاج خاصا خوش گوار ہو جاتا تھا۔ پھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس حویلی کے لیے انجام دی گئی خدمات کا حوالہ بھی موجود ہوتا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چودھری افتخار کو اس کے قرض کی ادا کا واسطہ دے کر اس سے قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن عرس کے بعد تو صورتِ حال بدل گئی تھی۔ حویلی میں ہونے والے حادثے نے چودھری افتخار کا مزاج اتنا برہم کر دیا تھا کہ نوراں اور غیاث محمد اس کے پاس آنے کی ہمت ہی نہیں کر سکے تھے۔ لیکن اب شادی بالکل ان کے سر پر آ کھڑی ہوئی تھی حویلی میں ہوئے حادثے کو بھی کافی دن گزر گئے تھے اس لیے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، وہ چودھری افتخار کے پاس آنے کی ہمت کر بیٹھے تھے۔ لیکن اب جیسے ساری ہمت سلب ہو گئی تھی اور وہ دونوں بس ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے چودھری افتخار کی نظرِ التفات کے منتظر بیٹھے تھے۔

''ہاں بھئی غیاث محمد! بول کیا بات ہے؟'' آخر چودھری نے حقے کی نے ہونٹوں سے جدا کر کے بائیں ہاتھ باندھ کر حکم کے منتظر کھڑے مؤدب غلام کو تھمائی اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کی رعایا ہوں سرکار! مشکل میں ہوں اس لیے مدد مانگنے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' غیاث محمد نے بہت عاجزی سے اپنی بات شروع کی۔ چودھری افتخار بنا کچھ بولے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میری دِھی کا بیاہ سر پر کھڑا ہے سرکار! دِھی بیاہنے کے لیے چار پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں۔ میں تو اس لائق بھی نہیں کہ دِھی کو جہیز میں دو جوڑے دے سکوں۔ دِھی کی بارات آنے پر آئے گی تو باراتیوں کی خاطر مدارات کیسے کروں گا؟ اب آپ ہی کا آسرا ہے۔ آپ اپنا ہاتھ رکھ دیں میرے سر پر تو میں عزت سے دِھی بیاہ دوں گا۔'' غیاث محمد نے ہاتھ جوڑے جوڑے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

''تجھے کیا کمی ہے غیاث محمد! تیرا بھتیجا تو آپ دبئی سے کمائیاں کر کے بھجوا رہا ہے۔ اس کے ماں پیو نے گھر میں رنگین ٹی وی اور فریج بھی لا رکھا ہے۔ تیرے بھائی کا گھر تو بھرا پڑا ہے چیزوں سے۔ تجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنی کو جہیز دینے کی؟ خالی ہاتھ بھی بھیجے گا تو وہاں جا کر عیش کرے گی۔'' چودھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''وہ الگ بات ہے سرکار! پر ہمیں تو زمانے کی ریت نبھانی ہے۔ دِھی کو بالکل خالی ہاتھ بھیج کر میں اس کا سسرال میں نہیں جھکا سکتا۔ بھلے وہ میرے سگے بھرا کا گھر ہے لیکن میری دِھی کے لیے تو اس کا سسرال ہی ہو گا۔ بہت نہ سہی پر دو چار چیزیں تو میں نے اسے جہیز کے نام پر دینی ہی ہوں گی۔ پھر بارات پر پروہنوں کی خاطر مدارات کے لیے بھی تو کچھ چاہئے ہوگا۔ آپ ہم پر کرم کریں سرکار! آپ تھوڑی رقم مجھے قرض دے دیں تاکہ میں عزت سے اپنی دِھی بیاہ سکوں۔'' غیاث محمد گڑگڑایا۔

''تھوڑی سی رقم قرض دے دوں؟ میرے پاس کوئی نوٹوں کے درخت لگے ہیں جن سے نوٹ توڑ توڑ کر تمہاری ہر وقت پھیلی ہوئی جھولیوں میں ڈالتا جاؤں؟ بڑی بیٹی کے بیاہ پر بھی تم نے اسی طرح رو دھو کر قرض مانگا تھا۔ دو سال ہو گئے، ابھی تک آدھا قرض بھی ادا نہیں کیا اور اب دوبارہ مزید قرض مانگنے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو۔ تم بے غیرتوں کی آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے پچھلے حساب کتاب کو

دیکھ کر شرم کرو، منہ اٹھا کر مزید مانگنے کے لیے چلے آتے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔ پہلے پچھلا حساب بے باق کر اور قرضے کی بات کرنا۔'' چودھری نے رعونت سے غیاث محمد کو پھٹکارتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

''مجھ پر رحم کریں مائی باپ! میں آپ کی پائی پائی اُتار دوں گا۔ میں اس قرضے کے بدلے ساری آپ کی غلامی کروں گا۔ بس ابھی آپ میری مدد کریں۔'' غیاث محمد نے چودھری افتخار کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

''پرے ہٹ۔ میرے پاس تیری یہ نوسر بازیاں دیکھنے کا وقت نہیں۔'' چودھری افتخار نے غیاث محمد کو پراپنے پیر سے ٹھوکر لگاتے ہوئے اسے دور ہٹایا۔

''آپ کو پیر سرکار کا واسطہ چودھری صاحب! آپ ہم کو خالی ہاتھ واپس نہ لوٹائیں۔ میں نے عرس والے دن اپنا چھلا پیر سرکار کی قبر پر چڑھا کر منت مانی تھی کہ پیر سرکار میری دِھی کے بیاہ کے لیے بندوبست کروا دیں۔ آپ تو پیر سرکار کا خون ہیں چودھری صاحب! آپ ان کے نام کی لاج رکھ لیں۔ ہم نے تو سنا ہے کہ پیر کی درگاہ پر مانی گئی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ ان کے دربار سے سب کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ وہاں سے اپنی جھولیاں بھر کر اُٹھتے ہیں۔ پھر ہم پیر سرکار کے ماننے والے اور آپ کی رعایا ہو کر کیسے نامراد رہ سکتے ہیں۔'' نوراں جواب تک خاموش بیٹھی رہی تھی، دہائیاں دینے لگی۔ اس کی ان دہائیوں کو سن کر چودھری افتخار کے کان کھڑے ہو گئے۔ نوراں کا دیا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ یہ عقیدت مندی کے استحکام کا معاملہ تھا۔ اگر نوراں اور غیاث محمد نے ایسی کوئی منت مانی تھی تو اب اس کا پورا ہونا ضروری تھا ورنہ ان کی عقیدت مندی میں کمی آ سکتی تھی۔ ویسے بھی چودھری افتخار، غیاث محمد کی درخواست کو رد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ بس اسے اپنے دباؤ میں لے رہا تھا۔ منہ کھولتے ہی مزارعوں کی حاجت پوری کر دینے میں اس کی چودھراہٹ کا رعب قائم نہیں ہوتا تھا۔ حکمرانی کا لطف تو اسی وقت آتا تھا جب اپنے زیرنگیں افراد کو پوری طرح خاک میں ملا دیا جائے اور ان کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کی لاش پر سینہ تان کر چہل قدمی کی جائے۔

''ٹھیک ہے۔ تم نے پیر دادا کا واسطہ دیا ہے تو اب ہم تمہیں خالی نہیں لوٹا سکتے۔ کل آ کر منشی سے رقم لے جانا۔ وہ کاغذ پر تمہارا انگوٹھا لگوا لے گا۔'' آخر چودھری افتخار نے نوراں اور غیاث محمد کو مژدہ سنایا۔

''مہربانی سرکار!..... بڑی مہربانی۔ اللہ پاک آپ کی نسلوں پر اپنا کرم کرے۔ پیر سرکار کا نام رہتی تک قائم رہے۔ پیر سرکار کی چھاؤں میں آپ سدا پھلتے پھولتے رہیں۔'' درخواست کی منظوری کی خوش خبری سنتے ہی نوراں نے دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ غیاث محمد جو چودھری کی ٹھوکر سے فرش پر گر گیا تھا، دوبارہ اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔

''بس بس ٹھیک ہے، زیادہ چاپلوسی نہ کرو۔ پیر دادا کے نام پر قرض مل رہا ہے لیکن تم لوگوں کو اس کی پائی پائی چکانی ہو گی۔ یہ نہ ہو کہ اس قرض کی ادائیگی سے پہلے تیسری بیٹی کے لیے دامن پھیلا کر میرے سامنے بیٹھو۔'' چودھری افتخار نے بے زاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہانے سے ماہ بانو کا ذکر نکالا۔ اس رات ماہ بانو کے بچ نکلنے کا اسے بڑا ملال تھا۔ اچھا خاصا وہ اسے قابو میں کر چکا تھا کہ حادثے کی خبر سن کر بدحواس ہو کر جلدی میں اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ماہ بانو کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنے کا بندوبست کر کے جاتا۔ اس غفلت کا فائدہ اٹھا کر ماہ بانو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ بعد میں بھی وہ دو تین دن تو شہر میں ہی مصروف رہا اور اس مصروفیت میں اسے ماہ بانو کا دھیان نہیں آ سکا۔ ذرا فرصت ملی تو ماہ بانو گاؤں سے باہر جا چکی تھی۔ چودھری افتخار ہاتھ ملتا رہ گیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو کا حصول اتنا مشکل نہیں۔ وہ چاہتا تو اُسے فیصل آباد سے بھی اُٹھوا سکتا تھا مگر ابھی دوسرے معاملات زیادہ توجہ طلب تھے اس لیے اس نے وقتی طور پر ماہ بانو کا



ے نکال دیا تھا۔ اس وقت نوراں اور غیاث محمد کو اپنے سامنے پا کر اسے ماہ بانو ایک بار پھر یاد آ گئی اور وہ ا کر چھیڑ بیٹھا۔

''تیسری کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کو اس کے خالہ خالو نے پالا ہے، وہی اس کے بیاہ کی فکر کریں ۔ میرے ذمے تو بس ان دو بیٹیوں کا ہی بوجھ تھا۔ ایک کو آپ کی مہربانی سے پہلے ہی نمٹا چکا ہوں، اب ی بھی آپ کے ہی کرم سے اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو بس بیٹا ہے، وہ اپنے زورِ بازو پر ی کی خدمت کر کے اپنے لیے خود بندوبست کر لے گا۔'' غیاث محمد نے عاجزی سے جواب دیا۔

''تیری سالی اور اس کا شوہر تو شہر میں رہتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیری کُڑی کو کسی شہری لڑکے سے ا یں۔'' چودھری افتخار نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ہم نے اپنی دِھی انہیں دے دی چودھری صاحب! اب چاہے وہ اس کے لیے جو بھی بندوبست کریں۔'' اں نے چودھری افتخار کی بات کا مبہم سا جواب دیا۔

''ایسے کیسے کوئی بھی فیصلہ کر لیں گے وہ لوگ؟ اس گاؤں کی کُڑی واپس یہیں آنی چاہیے۔'' چودھری افتخار نوراں ہی اعتراض کیا۔

''اگر یہ آپ کا حکم ہے سرکار! تو سمجھ لیں ماہ بانو واپس یہیں آئے گی۔ ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی ں ہونے دیں گے۔'' چودھری افتخار کا موڈ دیکھ کر غیاث محمد نے فوراً خوشامدانہ رویہ اپنایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ھری ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑ جائے۔

''تم ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔ ماہ بانو کو گاؤں واپس آنا ہو گا۔ وہ خود نہ آئی تو ہم اسے زبردستی لے آئیں گے۔'' چودھری افتخار، ماہ بانو کے معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے ا ہے، غیاث محمد اور نوراں کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ لیکن جب نوراں نے چودھری کے چہرے کی طرف دیکھا تو ں کی آنکھوں میں نظر آتی شیطانی چمک کو دیکھ کر دھک سی رہ گئی۔ اسے یک دم ہی ماہ بانو کا عرس والی رات ابتر ال میں آخری پہر گھر لوٹنا یاد آیا۔ بہت دنوں سے جو سوال اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا، اس کا جواب اس ے چودھری افتخار کی آنکھوں میں پا لیا۔ اس جواب کو پا کر وہ کانپ اُٹھی۔ چودھری کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک ا ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کو دوبارہ اپنے پنجوں میں دبوچنے کے لیے بے تاب ہے۔

⊛----✪----⊛

''آپا! مجھے بازار جانا ہے۔ نجمی کی بچی سے میں نے کہا تھا کہ میری کتابیں خیال سے گاڑی میں رکھوا دینا ان اس کام چور نے کتابیں رکھی ہی نہیں۔ کتابوں کے بغیر تو میرا گزارہ ہونا مشکل ہے۔ ویسے ہی یہاں اتنی ت ہے۔'' ریموٹ ہاتھ میں لیے بستر پر دراز ٹی وی کے چینل پر چینل بدلتی صنوبر کے قریب بیٹھتے ہوئے ور نے اسے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''چھوڑو کتابوں کو۔ ہر وقت فضول کتابیں چاٹنے میں وقت برباد کرتی رہتی ہو۔ ٹی وی دیکھو، اتنے مزے ے کے پروگرام آتے ہیں ٹی وی پر۔ ادھر گاؤں میں تو اس سوتے ہوئے پی ٹی وی کے علاوہ کچھ دیکھنے کو ہی ں ملتا۔ یہاں دیکھو کتنے ڈھیر سارے چینل آتے ہیں۔ ہمیں کوئی فلمی دیکھنی ہو تو وی سی آر پر کیسٹ لگا کر ل پڑتی ہے۔ یہاں ایک وقت میں چھ چھ جگہ سے فلمیں آ رہی ہوتی ہیں۔ ڈرامے بھی اتنے مزے مزے ے ہیں۔ میں تو ان ڈراموں کی عورتوں کے کپڑے اور زیورات اچھی طرح ذہن میں بٹھا رہی ہوں۔ ذرا فارغ

ہو جاؤں تو بعد میں یہاں آ کر اپنی پسند کی ساری چیزیں خریدوں گی۔ تم بھی ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر کپڑوں کے ڈیزائن وغیرہ اچھی طرح دیکھ لو تا کہ اگر میں کچھ بھول بھی جاؤں تو تم یاد دلا دو۔'' کشور کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے صنوبر نے اس سے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے آپا! کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ مجھے کپڑوں اور زیور کا شوق ہے اور نہ ہی مجھے یہ ڈرامے اور فلمیں کچھ خاص اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔'' صنوبر کے مشورے پر کشور نے بے زاری کا اظہار کیا۔

''تمہارے نزدیک تو تمہاری کتابوں کے سوا دنیا میں سب کچھ بے کار ہے۔ ابا جی کی شہری بیوی مرتے مرتے تمہیں اچھا مرض لگا کر گئی ہے۔'' صنوبر اس کی بے زاری پر چڑی۔

''مرض نہیں لگایا انہوں نے مجھے۔ وہ تو مجھے پاگل ہونے سے بچانے کا انتظام کر کے گئی ہیں۔ میں اللہ سے بہت دعائیں کرتی ہوں ان کی بخشش کے لئے۔ اگر آج میرے پاس ان کتابوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟''

''اچھا چل، زیادہ اُداس نہ ہو۔ ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے نئی کتابیں منگوا لے۔'' کشور کی بات سن کر صنوبر کو فوراً ہی بہن کی محرومی کا خیال آیا اور وہ نرم پڑ گئی۔

''ڈرائیور کو نہیں بھیجنا۔ میں خود جا کر اپنی پسند سے کتابیں خریدوں گی۔'' کشور نے ضد کی۔

''پر کہیں ابا جی کو برا نہ لگے۔ آنے سے پہلے انہوں نے سخت تاکید کی تھی سنبھل کر رہنے کی۔'' صنوبر ہچکچائی۔

''ابا جی پسند کے کپڑے لتے لینے کے لیے بھی تو ہم لوگوں کو بازار جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر میں اپنی پسند کی کتابیں خرید نے کیوں نہیں جا سکتی؟ اس سے پہلے بھی تو میں جب کبھی آپ لوگوں کے ساتھ بازار گئی ہوں، ہمیشہ کتابیں خرید کر لائی ہوں۔ ابا جی نے کبھی کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔ اور ویسے بھی مجھے کون سا دُور جانا ہے۔ یہاں سے لبرٹی مارکیٹ دور ہی کتنی ہے؟'' کشور نے فوراً ہی دلیل دی تو صنوبر کو قائل ہونا پڑا۔

''اچھا چلی جا۔ ساتھ میں رانی کو بھی لے لینا۔ اور ہاں، جلدی آنا۔''

''ٹھیک ہے آپا! آپ فکر ہی نہ کریں۔'' کشور خوش خوش باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رانی کے ساتھ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر تھی۔ شیلف میں لگی کتابوں کو منتخب کر کے وہ رانی کو تھماتی رہی۔ اچھا خاصا ڈھیر ہونے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر کتابوں کی قیمت ادا کی اور باہر نکل گئی۔

''بی بی! اس میں سے جو کتابیں آسان الفاظ میں لکھی ہوں، آپ وہ مجھے پڑھنے کے لیے ضرور دیجئے گا۔ مجھے بڑا شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔ کتابوں کا ڈھیر اٹھا کر اس کے پیچھے آنے والی رانی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرمائش کی۔

''تمہارا جو دل چاہے، وہ کتاب پڑھ لینا۔ آخر میں بھی تو پڑھتی ہوں۔ میں نے کون سا کالج یونیورسٹی سے پڑھا ہوا ہے۔ بس مسلسل پڑھتے پڑھتے خود ہی بہت کچھ سمجھ آنے لگا ہے۔'' کشور فراخ دلی سے رانی کو اجازت دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رانی نے بھی ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ڈرائیور اس دوران گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی آگے بڑھاتا، کشور کی نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی۔ جینز کی پینٹ اور کھدر کا کُرتہ پہنے اپنے مخصوص حلیے میں وہ یقیناً ماسٹر آفتاب ہی تھا۔

''نذیر! یہ سامنے ماسٹر آفتاب کھڑا ہے نا؟'' پہچان لینے کے باوجود کشور نے ڈرائیور سے تصدیق چاہی۔

''جی بی بی! یہ تو اپنے گاؤں والا ماسٹر آفتاب ہی ہے۔ شاید یہاں کسی کام سے آیا ہوا ہے۔''



''جاؤ، اسے یہاں بلا کر لے آؤ۔ کہنا جہاں جانا ہے وہاں چھوڑ دو گے۔'' کشور نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''لیکن بی بی!.....اس کے ساتھ.....؟'' ڈرائیور کشور کا حکم سن کر گڑبڑایا۔

''جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ اور ہاں، ماسٹر صاحب کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں حویلی کا کوئی اور موجود ہے۔'' کشور ڈرائیور کی جھجک کا سبب سمجھ چکی تھی چنانچہ ذرا رعب سے اسے حکم دیا۔ ساتھ ہی دوسری ہدایت بھی دے دی۔ ورنہ اسے خدشہ تھا کہ ماسٹر آفتاب لفٹ کی اس پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔

''تم پیچھے آ جاؤ رانی!'' اگلی نشست پر بیٹھی رانی کو حکم دے کر کشور، ڈرائیور کو ماسٹر آفتاب سے بات کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ماسٹر آفتاب نے ذرا سی پس و پیش کے بعد ڈرائیور کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اب اس کے ساتھ گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک آ کر اس نے جیسے ہی اگلی نشست پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا، عقبی نشست پر موجود کشور اور رانی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ یک دم ٹھٹک گیا۔

''معاف کیجئے گا..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی میں خواتین موجود ہیں ورنہ میں یہ آفر قبول نہیں کرتا۔'' کشور جانتی تھی کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ گاڑی کے سیاہ شیشوں کی وجہ سے وہ دُور سے ان لوگوں کی گاڑی میں موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور ڈرائیور کو خود کشور نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے سے منع کر دیا تھا۔

''بیٹھ جایئے ماسٹر صاحب! آپ کو ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا لیکن میں نے خود ڈرائیور کو بھیج کر آپ کو لفٹ دینے کی آفر کی تھی۔ یہ بے چارہ اپنی مرضی سے تو آپ کو آفر نہیں کر سکتا تھا۔''

''آپ کی پیشکش کے لیے شکریہ.....لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو نہ جانے کہاں جانا ہے۔ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہو گی۔'' ماسٹر آفتاب نے شائستگی سے انکار کیا۔

''زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ہمارے بھانجے کے استاد ہیں۔ آپ کا ایک مقام ہے۔ اس لیے تھوڑی بہت زحمت ہوئی بھی تو ہمیں ناگوار نہیں گزرے گی۔'' کشور کو ماسٹر آفتاب سے گفتگو کرنا اچھا لگ رہا تھا اس لیے وہ مسلسل اصرار کر رہی تھی۔

''عزت افزائی کے لیے شکریہ.....لیکن پلیز! آپ لوگ جائیں۔ میں کسی رکشے وغیرہ سے چلا جاؤں گا۔'' ماسٹر آفتاب نے اس بار بھی انکار ہی کیا۔

''دیکھیں ماسٹر صاحب! ہمارے ہاں پیشکش کر کے پیچھے ہٹنے کا رواج نہیں۔ آپ کے انکار کرتے رہنے سے ہمیں یہاں زیادہ دیر ہو جائے گی لیکن بہر حال، آپ کو یہاں چھوڑ کر جانے کا قطعی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہمیں لیٹ کرواتے ہیں یا ہماری پیشکش قبول کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔'' کشور کے اٹل انداز پر ماسٹر آفتاب نے پہلی بار نظر اٹھا کر براہِ راست اس کی طرف دیکھا۔ چادر نے اس کے چہرے کے بیشتر حصے کو ڈھانپ رکھا تھا لیکن دو سیاہ آنکھیں بالکل نمایاں تھیں۔ ان آنکھوں میں اصرار اور ضد دونوں تھے۔ ماسٹر آفتاب کو اندازہ ہوا کہ حویلی والوں میں شمار ہونے والی یہ لڑکی بھی اپنے خاندانی مزاج کے مطابق اچھی خاصی ہٹ دھرم ہے جو بغیر اپنی بات منوائے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس ضد سے ہار مانتے ہوئے بالآخر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''مجھے بس کے اڈے پر چھوڑ دو۔ مجھے واپس پیر آباد جانا ہے۔'' نشست سنبھالنے کے بعد ماسٹر آفتاب نے ڈرائیور کو بتایا اور پھر اس طرح چپ سادھ کر بیٹھا کہ گردن کو ذرا جنبش بھی نہ دی کہ مبادا کوئی خیال کرے کہ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی حویلی کی ایک خاتون کی طرف دیکھنے کی جرأت کر رہا ہے۔ خود کشور نے بھی پورے راستے اسے دوبارہ طلب نہیں کیا۔ اس کی یہ خاموشی ماسٹر آفتاب کے لیے باعث سکون تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کشور

کے اندر جو طوفان کروٹیں لے رہا ہے، وہ زیادہ عرصہ اس کے اس سکون کو برقرار نہیں رہنے دے گا۔

⊛----✪----⊛

''سر! چودھری افتخار لائن پر ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔'' شہریار نے عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع کے جواب میں کہا۔

''کیا حال ہے شہریار صاحب! آپ کو تو فرصت ہی نہیں ملتی، ہم نے سوچا ہم ہی آپ کی خیر خبر لے لیں۔'' لمحے بھر بعد ہی چودھری افتخار کی آواز شہریار کو سنائی دی۔

''آپ کی مہربانی ہے چودھری صاحب! کہ آپ میرا اتنا خیال کرتے ہیں۔ آپ کا شکوہ بھی سر آنکھوں پر ہے لیکن بس کیا کروں، کئی معاملات میں اتنا اُلجھا ہوا ہوں کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ جیسے ہی فرصت ملی، ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' شہریار نے اپنی طے کردہ حکمت عملی کے مطابق چودھری افتخار کے شکوے کا بہت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

''فرصت ملنے کا انتظار چھوڑیں اے سی صاحب! اے سی کی کرسی پر بیٹھنے والے کو کبھی بھی فرصت نہیں ملتی۔ ایسے بندوں کو اپنی مصروفیت میں سے زبردستی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اور اس وقت میں نے آپ کو زحمت دی ہی اس لیے ہے کہ آپ کے بے حد مصروف وقت میں سے کچھ وقت مانگ سکوں۔''

''وہ کس سلسلے میں؟'' چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار کا تجسس جاگا۔

''شکار پر جانے کا پروگرام ہے۔ ایس پی معظم تارڑ اور فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے علاوہ ایک آدھ اور دوست بھی ہوگا۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ شکار پر، بہت لطف آئے گا۔''

''پروگرام تو واقعی دلچسپ ہے مگر بڑا اچانک بنا لیا آپ نے۔ آپ پچھلے دنوں جتنے ٹینس رہے ہیں، اس کے بعد ایسی کسی ایکٹیوٹی کو ایکسپکٹ نہیں کر رہا تھا۔'' چودھری افتخار کا پروگرام سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرانے والے نہیں۔ ایسے مسائل تو آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر زندگی کے لطف کو تھوڑا ہی گنوایا جا سکتا ہے۔ اور سچ کہوں، زندگی کا جو لطف شکار میں ہے وہ اور کسی شے میں نہیں۔'' چودھری افتخار بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کہنے کو وہ ایک وڈیرا، سجادہ نشین اور کاروباری فرد تھا لیکن اس کے ہر روپ کے پیچھے ایک شکاری چھپا بیٹھا تھا جو صرف جنگلی جانوروں کا شکار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے شکار کی فہرست میں انسانی جان، مال و دولت اور لوگوں کی عزت سمیت سب کچھ شامل تھا۔ اپنے ہر شکار کے لیے وہ بھرپور منصوبہ بندی کرتا تھا اور اسے کبھی اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

''چلیں، میں کوشش کروں گا کہ زندگی کے اس سب سے بڑے لطف میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہو سکوں۔ آپ دن اور وقت وغیرہ بتا دیں تاکہ میں اپنا شیڈول چیک کر کے آپ کو کوئی حتمی جواب دے سکوں۔''

''دن ہم نے ہفتے کا طے کیا ہے۔ ہفتے کی شام کو نکلیں گے۔ رات جنگل میں ہی قیام ہوگا۔ پھر اگلے روز اتوار کو شام تک واپسی۔ لیکن آپ یہ مشروط قسم کی ہامی نہ بھریں۔ اگر آپ کو اس روز آنے میں مشکل پیش آئے تو ہم اپنے پروگرام میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اصل میں تو یہ پروگرام آپ کے لیے ہی ترتیب دیا گیا ہے، باقی افراد تو کئی بار پہلے بھی میرے ساتھ جا چکے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کی اس قدر خیال داری کے بعد تو انکار کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔'' چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار نے فوراً اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔



''بس تو پھر آپ ہفتے کی دوپہر کو ہی پیر آباد پہنچ جائیے گا۔ دوپہر کا کھانا حویلی میں ساتھ کھائیں گے اور پھر شام تک نکل پڑیں گے۔ آپ کو صرف وہاں پہنچنا ہے۔ باقی کے انتظامات ہماری طرف سے ہوں گے۔'' شہریار کے ہاں کرتے ہی چودھری افتخار کا مزاج اور بھی خوش گوار ہو گیا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں بالکل صحیح وقت پر پہنچ جاؤں گا۔'' شہریار نے اسے تسلی دی۔

''بس تو پھر ہمیں انتظار رہے گا۔'' چودھری افتخار اب گفتگو سمیٹنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔

شہریار نے ذرا سا گلا کھنکھارا اور آواز میں گہری سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی چودھری صاحب! پہلے ارادہ تھا کہ بہ نفسِ نفیس آ کر اس موضوع پر بات کروں لیکن اب تو ہماری ایک بہت ہی خوش گوار سی ملاقات طے ہو گئی ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ میں اس موقعے پر کوئی بہت سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ چھیڑوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اس وقت فون پر ہی آپ سے بات کر لوں۔''

''بہت شوق سے اے سی صاحب! ویسے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیا معاملہ ہے جس پر آپ اتنے سنجیدہ ہو رہے ہیں؟'' چودھری افتخار چونکا۔

''بظاہر ابھی معاملہ اتنا سنجیدہ نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ معاملہ کافی گمبھیر ہو سکتا ہے۔ اصل میں کل کے اخبار میں ایک کالم چھپا ہے۔ کالم نگار نے براہِ راست تو کسی گاؤں یا اس کے کسی نمائندہ شخص کا نام نہیں لکھا لیکن اس نے دیہی علاقوں کی ابتر حالت پر کافی تنقید کی ہے اور اس تنقیدی تبصرے میں اس نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو براہِ راست پیر آباد سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ کئی دیہی آبادیوں میں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے اور اگر کوئی سہولت موجود ہے تو بھی اس کے ثمرات صرف بڑے لوگوں تک محدود ہیں۔ بڑے وڈیروں اور زمینداروں نے مزارعوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ان غریب مزارعوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ایک طرف باقاعدہ جسمانی تشدد کیا جاتا ہے تو دوسری طرف مزارعوں کو اتنی کم اُجرت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ شادی بیاہ، بیماری اور غمی کے موقع پر غریب مزارعے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وڈیروں اور زمینداروں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور غریب اور اَن پڑھ لوگوں کو یہ قرض اتنی زیادہ سودی شرح پر دیا جاتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے غلام بن کر رہ جاتے ہیں.....''

''جانے دیں اے سی صاحب! یہ کون سی نئی باتیں ہیں؟ ایسا تو اکثر ہی لکھا جاتا رہتا ہے۔ میں اس کے سچ یا جھوٹ ہونے پر تبصرہ نہیں کرتا۔ اگر یہ سچ ہے بھی تو اس سے مجھ اکیلے کی ذات پر ضرب نہیں پڑتی۔ میرے ساتھ سارے ہی اس الزام کی زد پر آتے ہیں۔'' چودھری افتخار نے درمیان سے شہریار کی بات کاٹ کر کان پر سے مکھی اُڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے چودھری صاحب! لیکن میں نے کہا نا کہ کالم نگار نے اپنا کالم یوں تو دیہی علاقوں کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں لکھا ہے لیکن کچھ پوائنٹس ایسے آتے ہیں جن سے واضح طور پر پیر آباد کی طرف اشارہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔''

''اچھا، وہ کون سے پوائنٹ ہیں؟ کچھ ہم بھی تو سنیں۔'' چودھری افتخار کے انداز میں اب بھی بے نیازی تھی۔

''کالم نگار نے لکھا ہے کہ کچھ وڈیرے تو ایسے بھی ہیں جو اپنے علاقے کے حکمراں کے علاوہ مذہبی پیشوا بھی بن بیٹھے ہیں۔ ان وڈیروں نے پیری مریدی کی آڑ میں سادہ لوح عوام کے ذہنوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ وہ ڈراتے ہیں کہ ان وڈیروں کی مرضی کے خلاف کچھ کریں گے تو ان پر کوئی آسمانی مصیبت آ پڑے گی۔ یہ

ہ ہرے اس جاہلانہ سوچ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے علاقے میں تعلیم کو عام نہیں ہونے دیتے۔ کیونکہ جا
ہیں کہ اگر مزارع پڑھ لکھ کر سمجھ دار ہو گیا تو ان کی غلامی کے شکنجے سے نکل جائے گا۔ انہوں نے طرح طرح کے
ھانڈوں سے اپنے علاقوں میں تعلیم کا راستہ روک رکھا ہے۔ پھر سب سے اہم اور کاری ضرب جو کالم نگار
اکالی ہے، وہ آپ کے دادا صاحب کے عرس کے حوالے سے ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ایک نام نہاد سجادہ نشی
اور گدی پیر، مزارعوں کے خون پسینے کی کمائی ہڑپ کر کے اس سے اپنے بزرگوں کا شان دار عرس منعقد کر
ہیں۔ ایک علاقے کے بارے میں تو یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ وہاں چھوٹے زمینداروں سے زبردستی ہر سال عر
ے موقع پر سونے کے تاروں سے نقش چادر وصول کی جاتی ہے۔ اس چادر کو مُردہ پیر کی قبر پر چڑھایا جاتا ہے ا
بعد میں زندہ پیر اس کے سونے کو بیچ باچ کر دام کھرے کر لیتا ہے۔ کالم نگار نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک
چھوٹے زمینداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زبردستی کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔ بھینٹ لینے والے کو پہلے
ان نے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے ان زمینداروں کا دماغ ٹھیک کرنے
انتظام کر دیا۔ اتفاق سے جس نہر کے پانی سے اردگرد کے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں کو فصل کے لیے پانی سپلا
ایا جاتا ہے، اس نہر کی لوکیشن کچھ ایسی ہے کہ سجادہ نشین زمیندار کا اس پر تسلط ہے۔ پھر محکمہ انہار و آب پاشی میں
بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔ اس لیے چھوٹے زمینداروں کی سرکشی کا جواب اس طرح دیا گیا کہ ان کے علاقے
میں پانی کی سپلائی بند ہو گئی۔ پانی نہ ملے تو کیسی فصلیں اور کہاں کے کھیت۔ چھوٹے زمینداروں نے سمجھ لیا کہ
پانی روک کر انہیں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ بس پھر وہ لائن پر آ گئے اور آئندہ کبھی سرتابی حکم کی جرأت نہیں کی۔''

یہ ساری وہ معلومات تھیں جو شہریار کو اتنے عرصے میں مختلف لوگوں سے ملاقاتوں میں حاصل ہوئی تھیں
معلومات فراہم کرنے والوں میں متاثرہ زمیندار بھی شامل تھے اور کچھ سرکاری افسران بھی۔ شہریار نے اپنے طور
تحقیق کر کے ان معلومات کی تصدیق بھی کر لی تھی اور پھر یہی معلومات ماسٹر آفتاب کے ذریعے اس کے صحا
تک پہنچا کر کالم کی شکل میں چھپ گئی تھیں۔

''کون اُلّو کا پٹھا ہے جس نے یہ ساری بکواس لکھی ہے؟ میں دماغ درست کروا دوں گا اس کا۔'' چودھری
الطاف اب تک بڑا ریلیکس تھا، براہِ راست خود پر چوٹ پڑی تو پھٹ پڑا۔

''کہنے والا کوئی بھی ہو چودھری صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کچھ اس طرح سے جواب دیں کہ
کہنے والے کا اعتراض ختم ہو جائے۔ کسی ایک کو ڈرا دھمکا کر اس کا منہ بند کروا دینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو گا
ایک کا منہ بند کریں گے تو دوسرا بول پڑے گا۔ آج کے دور میں صحافی اتنا کمزور نہیں رہا ہے۔ آپ تو شا
ہیں کہ یہ سب صرف ایک اخبار میں چھپا ہے۔ کل اگر کسی پرائیویٹ چینل کی ٹیم اپنے کیمرے لے کر پہنچ گئی
آپ کیا کریں گے؟ وہ تو سب کچھ دکھا دیں گے دنیا کو۔ ہسپتال، سکول، سڑکیں، سارے ہی تو مسئلے ہیں پیر آ
ہیں۔'' شہریار نے چودھری افتخار کی رگڑائی کی۔

''آ کر تو دیکھیں یہ ٹی وی والے میرے علاقے میں۔ قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا میں انہیں یہاں۔ اپنا
کیمروں کا نقصان ہی کر کے جائیں گے وہ یہاں سے۔'' چودھری افتخار مزید طیش میں آیا۔

''وہ اس بات کو اور بھی زیادہ ایشو بنائیں گے۔ آپ کا نام بدنام ہو کر رہ جائے گا۔ ابھی جو آپ کے حما
ہیں، وہ بھی عوام میں اپنی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے ٹی وی کے نمائندوں کے سامنے آپ کی مخالفت کریں
گے۔ آپ کے فعل کو قابلِ مذمت قرار دیں گے۔ اگر آپ میری بات مانیں تو ذرا تحمل اور مصلحت پسندی سے کا
لیں۔ ایک دو ایسے کام کروا دیں اپنے علاقے میں جن سے میڈیا میں آپ کی نیک نامی ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ اگ



آپ ایسا کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو ٹی وی کوریج کا انتظام میں خود کرواؤں گا۔'' شہریار کی کوشش تھی کہ کسی طرح
چودھری افتخار کو قائل کر لے۔

''آپ فرمائیے کہ میں کیا کروں؟'' چودھری افتخار نے ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک معاملہ تو پکی سڑک کا ہے۔ آپ چاہیں تو حکومت سے اس کے لیے منظوری اور فنڈز حاصل کیے جا
سکتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ اسکول کی توسیع کا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ریکارڈ میں کئی درخواستیں موجود ہیں۔ اگر
آپ اسکول کے ساتھ والی زمین پر اپنی ملکیت کے دعوے سے دستبردار ہو جائیں تو ہم وہاں اسکول کے لیے چند
مزید کمرے تعمیر کر سکتے ہیں۔ ویسے آپ چاہیں تو میرے پاس ایک دوسرا آئیڈیا یہ ہے کہ آپ خود اپنی طرف
سے وہ زمین اسکول کے لیے وقف کر دینے کا اعلان کر دیں۔ بنجر سی زمین ہے، آپ کے کسی کام کی نہیں.....
لیکن آپ نے اگر اس کام کے لیے دے دی تو آپ کی نیک نامی کی شہرت ہو جائے گی اور آپ پر سے یہ الزام
بھی ہٹ جائے گا کہ آپ خود اپنے علاقے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔'' شہریار بہت دھیرے دھیرے،
بڑے سبھاؤ سے چودھری افتخار کو اس موضوع کی طرف لایا تھا اور اب کسی خاطر خواہ نتیجے کا منتظر تھا۔

''میں آپ کے ان مشوروں پر غور کروں گا۔ ویسے اتنی ہمدردی سے میرے مسائل پر غور و فکر کرنے کے
لیے شکریہ۔'' چودھری افتخار نے جس لہجے میں یہ جملے کہہ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا، شہریار فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ
سچ مچ اس کے مشوروں پر غور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یا پھر اصل بات کو پا کر اس پر طنز کر گیا ہے۔

⊛----✪----⊛

شام کے وقت جنگل میں داخل ہونے کا خیال بظاہر احمقانہ لگتا تھا لیکن وہ لوگ جن انتظامات کے ساتھ
وہاں گئے تھے، ان کی موجودگی میں خوف کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا بلکہ اچھا خاصا تھرل محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ
جیپوں کی مدد سے ہاں پہنچے تھے۔ شکار میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے علاوہ شب بسری کا بھی بے حد
معقول انتظام تھا۔ کئی ملازم بھی خدمت کے لیے موجود تھے جنہوں نے جنگل میں ایک مناسب جگہ پر پہنچتے ہی
خیموں کی تنصیب کا کام شروع کر دیا تھا، طاقتور بیٹری لائٹس نے جنگل کی تاریکی کو اچھا خاصا بے معنی کر دیا تھا اور
وہاں پر ہر کام بے حد سہولت سے انجام دیا جا رہا تھا۔ روشنی کے لیے ایک دوسرا انتظام ایک بڑے الاؤ کی
صورت میں بھی کیا جا رہا تھا۔ چودھری افتخار کے کارندے پھرتی سے لکڑیاں اکٹھی کر کے اس الاؤ کو روشن کرنے
کی تیاری کر رہے تھے۔ جنگل میں اس الاؤ کی موجودگی، روشنی کے علاوہ دوسری دو اہم ضروریات کی وجہ سے
بھی لازمی تھی۔ الاؤ روشن ہوتا تو جنگلی جانوران کے پڑاؤ کے قریب آنے سے پرہیز کرتے۔ پھر موسم کی خنکی کو
شکست دینے کے لیے بھی اس الاؤ کی ضرورت تھی۔ الاؤ روشن ہو گیا تو ملازمین نے ساتھ لائی ہوئی کم وزن کی
فولڈنگ چیئرز اس کے گرد رکھ کر معزز مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔ اس قدرتی ماحول میں ایک روشن الاؤ
کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ تاپنا شہریار کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ تکلفات ضرورت سے
کچھ زیادہ تھے۔ جیسے ان فولڈنگ چیئرز کی موجودگی ہی تھی جو شہری زندگی کی علامت بنی اسے جنگل کے ماحول
کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہونے دے رہی تھی۔ پھر ٹن بند مشروبات کی فراہمی تھی جو احساس دلاتی
تھی کہ وہ جدید معاشرے کے نمائندے ہیں اور اس جنگل کے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''کیسا لگ رہا ہے شہریار صاحب؟'' چودھری افتخار جو اب تک فاریسٹ آفیسر کے ساتھ گفتگو میں
مصروف تھا، کچھ الگ تھلگ اور خاموش بیٹھے شہریار کے قریب آ کر پوچھنے لگا۔

''بہت شاندار.....اگر میں آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتا تو ایک بہت ہی خوب صورت منظر سے محروم رہ جاتا۔'' شہریار نے بے ساختہ جواب دیا۔

''ہاہا.....'' چودھری نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور پھر بڑے تفاخر سے بولا۔ ''ہماری بات ماننے والے ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں۔ ہم تو اپنے علاقے میں آنے والے ہر نئے افسر کو اپنا دوست بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوستی کے لیے ایک دوسرے کی بات ماننا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جو ہماری بات مان لیتے ہیں، ان کی ہماری دوستی بھی خوب چلتی ہے اور ساتھ ہی افسری بھی قائم رہتی ہے۔ جو ہمارا دوست نہ بنے، وہ خود اپنے آپ سے دشمنی مول لینے کے سوا کچھ نہیں کر پاتا۔'' چودھری افتخار کی یہ پُر رعونت باتیں جن میں ایک چھپی ہوئی دھمکی بھی تھی، شہریار کو سخت ناگوار گزر رہی تھیں لیکن وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر چودھری کے کارندوں کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک سالم بکرے کو آگ پر بھوننے کی تیاری کر رہے تھے۔

''بہت خوب چودھری صاحب! آپ تو خود اپنے ساتھ بکرا اٹھا لائے۔ اس بکرے کے ہوتے ہوئے ہمارا جنگل آپ کی میزبانی کا حق کیسے ادا کرے گا؟'' فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ جو ذرا دیر کے لیے خیمے کے اندر گیا تھا، باہر آ کر چودھری افتخار سے مخاطب ہوا۔

''آپ فکر نہ کریں باجوہ صاحب! کل ہم آپ کے جنگل کو میزبانی کا پورا پورا موقع دیں گے۔ ابھی تو یہ انتظام اس لیے کیا ہے کہ ہمارے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔'' چودھری افتخار نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے اقبال باجوہ کو جواب دیا۔

''آپ کن سوچوں میں گم ہیں اے سی صاحب؟'' اس بار اقبال باجوہ خاموش بیٹھے شہریار سے مخاطب ہوا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ بے چارے بکرے کی کھال اتار کر اسے آگ پر بھوننے کے لیے لٹکا دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ شیر ہوتا تو کوئی اس پر ہاتھ ڈالنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔ شیر کو شکار کرنے سے پہلے بڑے سے بڑا گھاگ شکاری بھی دس بار سوچتا ہے کہ کہیں خود اپنی ذات کو ہی نقصان نہ پہنچ جائے۔'' شہریار نے بہت سلیقے سے چودھری افتخار کی تھوڑی دیر پہلے کہی بات کا جواب دیا۔

''اوہو.....لگتا ہے اپنے اے سی صاحب پر جنگل کے ماحول کا اثر ہو گیا ہے اس لیے جنگل کا بادشاہ یاد آ رہا ہے۔ لیکن بے فکر رہیں..... یہاں شیر نہیں پایا جاتا، یعنی یہ جنگل بغیر بادشاہ کے ہی چل رہا ہے۔ یہاں اگر کوئی بادشاہ ہے بھی تو وہ میں ہوں۔ اس جنگل پر میرا حکم چلتا ہے۔''

اقبال باجوہ چونکہ گفتگو کی ابتدا میں یہاں موجود نہیں تھا اس لیے شہریار کے جملوں کا پس منظر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے شہریار کی بات کو ایک عام بات کے طور پر لیتے ہوئے اپنا تبصرہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی دماغوں میں بھی حکمرانی کا خناس بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں پر اپنے اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور شگفتگی سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب! کل جب ہم شکار کے لیے نکلیں گے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر لائن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کا دل چاہے شکار کر لیجیے۔''

''یہ کان پکڑ کر لائن حاضر کرنا اور بندے کی کھال گرا دینا تو دراصل تارڑ صاحب کے محکمے کا کام ہے۔ دیکھیں اس وقت بھی کس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے لٹکنے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔'' اقبال باجوہ پہلے



شہریار کی بات پر ہنسا اور پھر ایس پی معظم تارڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ معظم تارڑ واقعی ان لوگوں سے ہٹ کر بیٹھا بہت شوق سے بکرے کو بھنتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اقبال باجوہ نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے قریب آیا۔

''کیا بات ہے تارڑ صاحب! کیا زیادہ بھوک لگ رہی ہے؟'' اقبال باجوہ نے ایس پی کو قریب پا کر اسے چھیڑا۔

''زیادہ سے بھی کہیں بہت زیادہ۔ مجھے تو ڈر ہے کہ یہ بکرا تو اکیلا میں ہی کھا لوں گا۔ آپ حضرات کو جانے کچھ ملے بھی نہ ملے۔'' اقبال باجوہ کے مذاق کو محسوس کرتے ہوئے معظم تارڑ نے بھی مذاق کیا۔

''سچ کہتے ہیں بھئی۔ پولیس والوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اب کوئی بتائے کہ اس جنگل میں یہ اکیلے سارا بکرا ہضم کر لیں گے اور ہم بے چارے کہیں انصاف کے لیے دہائی بھی نہیں دے سکیں گے۔'' اقبال باجوہ نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''چودھری صاحب کا مہمان ہوتے ہوئے کیسا ڈر باجوہ صاحب! چودھری صاحب کی میزبانی کا تو سب ہی دم بھرتے ہیں۔ اگر آپ خواہش کریں گے تو ہر ایک کے لیے الگ الگ سالم بکرا بھی حاضر ہو جائے گا۔'' ایس پی نے خوشامدانہ لہجے میں یہ جملے کہے تو چودھری افتخار جو شہریار کی بات سننے کے بعد ایک پُرتفکر سی خاموشی میں مبتلا ہو گیا تھا، خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے بعد وہاں ماحول مسلسل بے حد خوشگوار رہا۔ زیادہ تر گفتگو چودھری افتخار اور اقبال باجوہ ہی کر رہے تھے۔ ایس پی معظم تارڑ بھی کبھی کبھی گفتگو میں حصہ لے لیتا تھا۔ اصل میں وہ شہریار کی موجودگی کے باعث کچھ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اپنی عمر اور تجربے کی زیادتی کی باوجود اسے شہریار کے بڑے عہدے اور حیثیت کا احساس تھا۔ شہریار خود اس لیے زیادہ نہیں بول رہا تھا کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دے کر ان کے مزاج کو اچھی طرح پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور ملازموں نے ان کے سامنے کھانا چن دیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ وہ سب ہی شوق سے کھانے لگے۔

ابھی کھانا اختتام پذیر نہیں ہوا تھا کہ ایک بند جیپ ان کے پڑاؤ کے قریب آ کر رکی۔ وہ سب اس جیپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیپ سے نکلنے والے چہروں نے انہیں مبہوت کر دیا۔ وہ دو انتہائی حسین اور طرح دار لڑکیاں تھیں جنہوں نے چمک دار مہین کپڑے سے بنا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ یہ لباس ان لڑکیوں کے حُسن کی قلعیوں کو چھپانے کے بجائے اسے کچھ اور نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

''دیکھیے چودھری صاحب! آپ کے حکم پر ہم یہاں بھی چلے آئے۔ اب تو ہماری وفاداری پر کسی شک کی گنجائش نہیں نکلتی۔ آخر ہم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے اس وفاداری کو ثابت کرنے کے لئے۔'' ان میں سے ایک جو عمر میں نسبتاً بڑی لگتی تھی، چودھری افتخار کے قریب آ کر بڑی ادا سے بولی۔ اس کی چال اور بولنے کے انداز میں جو ناز و ادا تھی، وہ صاف بتاتی تھی کہ اس کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ اور اس قبیل کی عورتوں کی وفاداری جس شے کے ساتھ مشروط تھی، اس کی چودھری افتخار کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ اگر اس جنگل میں چودھری افتخار کی دعوت پر آئی تھیں تو بھی خوب جانتی تھیں کہ یہاں حفاظت کا اتنا معقول انتظام ہو گا کہ ان کے لیے خطرے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور واپسی پر وہ جو جھولی بھر بھر کر نوٹ اپنے ساتھ لے جاتیں، ان کی تو بات ہی الگ تھی۔ چودھری افتخار نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دے دی جو انہوں نے قبول ضرور کی لیکن بہت کم مقدار میں بس سونگھنے جتنا ہی کھایا۔ خوش خوراکی اور شکم سیری ان کی

پرفارمنس پر برا اثر ڈال سکتی تھی۔

کھانے کے بعد دونوں لڑکیاں فارم میں آگئیں۔ ان کے جسم الاؤ کے گرد تھرکنا شروع ہوئے تو گویا جنگل میں منگل کا سماں طاری ہوگیا۔ لڑکیاں ہر طرح کے رقص میں ماہر تھیں۔ پہلے انہوں نے کلاسیکل ڈانس پیش کیا، پھر کسی ڈسکو ڈانسر کی طرح پرفارمنس دینے لگیں۔ اس پرفارمنس سے لطف اندوز ہوتے حضرات کے لطف میں مزید اضافہ کرنے کے لیے چودھری افتخار کے ملازمین نے شیمپین اور وہسکی کی سپلائی شروع کر دی۔ ایک ملازم شہریار کے قریب بھی آیا لیکن شہریار نے انکار کر دیا۔

''کیا بات ہے اے سی صاحب! کسی مولوی کے وعظ سے ڈر کر تو اس سے پرہیز نہیں فرما رہے؟ ورنہ آپ کے ماموں لیاقت رانا بہت شوق سے نوش کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے کو بھی ہم نے کئی محفلوں میں شغل کرتے دیکھا ہے۔ یہ آپ کیسے انگور کی بیٹی سے پرہیز کرنے والے نکل آئے؟'' اس کے انکار کرتے ہی چودھری افتخار نے تفتیش شروع کر دی۔

''بات ڈرنے یا پرہیزگاری کی نہیں۔ بس میں ان چیزوں سے دور رہتا ہوں جو مجھ پر حاوی ہو کر مجھے بے بس کر دیں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے چودھری افتخار کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنستے ہوئے ایک بار پھر محو رقص لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اب وہ لڑکیاں بیلے ڈانس کر رہی تھیں۔ اس ڈانس میں پیٹ کو مخصوص انداز میں دی جانے والی حرکات نے اس کی ہوش ربائیوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ رقص کے لیے موسیقی کی تال ضروری ہوتی ہے۔ یہاں موسیقی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے آڈیو ریکارڈز کا معقول بندوبست تھا۔ لیکن موسیقی سے وہاں کسی کو غرض تھی تو صرف ان دونوں ناچتی ہوئی لڑکیوں کو۔ تاکہ تال میل کے ساتھ ایک ردھم میں ناچ سکیں۔ اور ان کے جسموں کی حرکات بے ترتیب نہ ہونے پائیں۔ باقی لوگوں کے لیے موسیقی اور لفظی شاعری بے معنی ہو چکی تھی اور وہ صرف اور صرف اعضاء کی شاعری سے لطف اندوز ہونے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مگر پھر ماحول پر چھایا یہ سحر ٹوٹ گیا۔ دونوں لڑکیوں نے رقص کرنا بند کیا اور کرسیوں پر بیٹھ کر ستانے لگیں۔ حاضرین کا خیال تھا کہ وہ ستانے کے بعد دوبارہ اپنے فن کے مظاہرے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی لیکن پھر ان کی وہاں سے روانگی کے آثار نظر آنے لگے۔

''معذرت چاہتا ہوں دوستو! مجھے معلوم ہے کہ ابھی آپ لوگ مزید لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں گے لیکن چونکہ ہماری یہاں آمد کا اصل مقصد شکار کرنا ہے اس لیے اس پروگرام کو ذرا محدود رکھا گیا ہے۔ رات اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ ہم لوگوں کو اب آرام کرنا چاہئے تاکہ صبح تازہ دم ہو کر شکار کیا جا سکے۔'' چودھری افتخار نے چہروں پر چھائی مایوسی دیکھی تو کھڑے ہو کر معذرت خواہانہ وضاحت پیش کی۔ لڑکیاں اس دوران سب کو اپنی مسکراہٹ سے نوازتی اور بائے بائے کرتی واپس گاڑی میں جا بیٹھی تھیں۔

''اگر آپ کہیں تو ان میں سے کسی ایک کو جو آپ کو پسند ہو، آپ کے لیے روک لیا جائے۔ ہم چار بندے ہیں۔ اگر آپ کل کچھ سست بھی رہے تو کام چل جائے گا۔'' شہریار بھی سب کی طرح لڑکیوں والی جیپ کی طرف دیکھتا اس کی روانگی کا منتظر تھا کہ چودھری افتخار نے جھک کر سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''بہت شکریہ چودھری صاحب! لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں جو مجھ پر حاوی ہو کر مجھے بے بس کر سکیں۔ مجھے زاہد خشک ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن اس طرح کی چیزیں بس دور سے ہی اچھی لگتی ہیں۔'' شہریار، چودھری کی سرگوشی پر ذرا سا چونکا اور پھر مسکراتے ہوئے اسے جواب دے کر دوبارہ جیپ کی طرف متوجہ ہوگیا جو اب چل پڑی تھی اور لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔



''چلیں جناب! اب چل کر سونے کے سوا کیا چارہ رہ گیا ہے؟'' جیپ نظروں سے بالکل اوجھل ہوگئی تو اقبال باجوہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے با آوازِ بلند کہا۔ سب لوگ اس کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور پھر آرام کے لیے خیموں میں چلے گئے۔

⊛----✪----⊛

''پھر گاؤں..... میں ہرگز نہیں جانے والی وہاں۔ ابھی تھوڑے عرصے پہلے ہی تو گئی تھی۔'' حوراں کی اماں گاؤں چلنے کا ذکر سن کر ماہ بانو پر بدکی۔

''پاگلے! اُس جانے کی بات الگ تھی اور اِس جانے کی بات الگ ہے۔ اب کی بار تو ہمیں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے جانا ہے۔ اس موقعے کو تھوڑی ٹالا جا سکتا ہے؟'' حوراں نے اسے سمجھایا۔

''جب ابھی بیاہ رکھنا تھا تو پہلے کیا ضرورت تھی مجھے بلوانے کی؟ میرے پاس کیا فالتو وقت ہے کہ ہر دوسرے دن بعد دوڑ دوڑ کر گاؤں جاتی رہوں؟'' ماہ بانو نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ ایک تو اس کا پہلے ہی گاؤں میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا، اوپر سے اپنے وہاں آخری قیام میں اسے جس قسم کی صورتِ حال کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا، اس کی وجہ سے وہ اچھی خاصی خوف زدہ بھی تھی۔

''تب میں نے نوراں کے خیال سے تجھے وہاں بھجوایا تھا۔ بے چاری تجھے یاد کر رہی تھی۔ لیکن اب تو بیاہ کا معاملہ ہے۔ زہرہ میری بھانجی ہے تو رب نواز بھی کوئی غیر نہیں، برادری ہی کا لڑکا ہے۔ ویسے ہی سب کہتے ہیں کہ حوراں شہر میں رہ کر برادری سے کٹ گئی ہے۔ اب بیاہ میں شرکت کے لیے نہیں جاؤں گی تو برادری والے سو سو نام دھریں گے۔''

''تو ٹھیک ہے بے بے! تم چلی جاؤ اپنی برادری والوں سے رشتے نبھانے۔ میں تو اِدھر ہی رہ کر اپنی پڑھائی کروں گی۔'' حوراں کی بات سن کر ماہ بانو نے رُوٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''پگلی ہوئی ہے کیا؟ یہاں اکیلی کیسے رہے گی؟ میں اور تیرے ابا دونوں ہی جائیں گے بیاہ میں شرکت کے لیے۔ ویسے تُو زیادہ فکر نہ کر۔ ہمارا کوئی لمبا چوڑا رُکنے کا ارادہ نہیں ہے وہاں۔ جمعہ کو نماز کے بعد نکلیں گے، اس دن زہرہ کا مایوں ہے۔ ہفتے کو مہندی ہوگی اور اتوار کو بارات۔ پیر کے دن دوپہر کو ولیمے کا کھانا کھا کر شام سے پہلے ہی واپس آ جائیں گے۔ تُو جمعے کی صبح اپنے کالج ہو آنا۔ اتوار کو تو ویسے ہی چھٹی ہوتی ہے، بس ایک ہفتہ اور پیر کے دن ہی تجھے کالج سے ناغہ کرنا پڑے گا۔ اب سگی بہن کی شادی پر اتنی قربانی تو دینی ہی پڑے گی تجھے اپنی پڑھائی کی۔'' حوراں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''بڑے آئے کہیں سے سگے۔ اگر مجھے سگا سمجھتے تو یوں خود سے الگ کرتے؟'' ماہ بانو نے خفگی دکھائی۔

''اچھا چل، اپنی بہن کا نہیں، میری بھانجی کا بیاہ سمجھ کر شرکت کر لے۔ ان سے نہیں، مجھ سے تو اپنا رشتہ بنتا ہے نا تُو؟'' حوراں نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا، اس لیے اسے منانے کے سارے گر جانتی تھی۔ ماہ بانو کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ بے دلی سے ہی سہی لیکن راضی ہو چکی ہے۔

''اچھا یہ دیکھ! جب تُو گاؤں گئی ہوئی تھی تو میں نے تیرے لیے گہنے بنائے تھے۔ وہ جو میں نے شیخ صاحب کے ہاں ایک لاکھ کی کمیٹی ڈالی تھی، وہ نکل آئی تھی پچھلے مہینے۔ میں نے تھوڑے روپے اور ملا کر تیرے گہنے بنوا لئے۔ زہرہ کے بیاہ پر جائے گی تو یہ گہنے ساتھ لے چلنا۔ ان میں سے جو تیرا من کرے، وہ بیاہ پر پہن لینا۔'' اب حوراں اسے بہلانے کے لیے دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔

''گہنے بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے ابا سے کہا تھا کہ میرے میڈیکل میں داخلے کے لیے روپے سنبھال کر رکھیں۔'' ماہ بانو نے خوش ہونے کے بجائے اعتراض کیا۔

''اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ وہ تیرا اور تیرے ابا کا معاملہ ہے۔ میں تو ماں ہوں، مجھے تیری پڑھائیوں سے زیادہ تیرے بیاہ کے لیے جہیز جوڑنے کی فکر ہے۔'' حوراں نے جواب دیا اور زیورات زبردستی ماہ بانو کو پکڑا دیئے۔ ''لے..... انہیں سنبھال کر اپنے بیگ میں رکھ لے۔ اور ہاں، یاد سے بیگ کو تالا بھی لگا لینا۔ راستے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کوئی چور اُچکا ہاتھ صاف کر جائے۔'' ان آخری ہدایات کے بعد واضح تھا کہ ماہ بانو کو ہر حال میں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے پیر آباد جانا ہے۔ پیر آباد جانا اس بار اسے ہمیشہ سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کہ وہاں چودھری افتخار کا راج تھا۔ وہ تو یہاں فیصل آباد میں رہتے ہوئے بھی چودھری سے اچھی خاصی خوف زدہ تھی۔ پیر آباد سے واپس آنے کے بعد اس نے اکیلے کالج آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا کہ کہیں چودھری کوئی وار نہ کر جائے۔ اس جیسی پہنچ رکھنے والے بندے کے لیے فیصل آباد کوئی ایسا دور بھی نہیں تھا لیکن شاید ماہ بانو اس کے ذہن سے اُتر گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ پیر آباد جاتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ چودھری کو دوبارہ اس کا دھیان نہیں آتا؟ مگر وہ یہ سب باتیں حوراں کو نہیں سمجھا سکتی تھی اس لیے مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق وہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

⊛----✪----⊛

اگلی صبح، رات سے بہت مختلف تھی۔ رات کی تاریکی اور جانوروں کی آوازیں مل کر ماحول کو ہولناک بناتی تھیں لیکن صبح بہت خوب صورت تھی۔ صبح کا آغاز پرندوں کی چہچہاہٹ پر آنکھ کھلنے سے ہوا تھا۔ شہریار نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا تو سورج کی کرنوں کے گھنے درختوں سے چھن کر آنے کے باعث جنگل کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ مصنوعی روشنیوں کے مقابلے میں اس قدرتی روشنی میں وہاں موجود گل بوٹے الگ ہی رنگ دکھا رہے تھے۔ پھر جنگل کی ایک مخصوص مہک تھی جو صبح کی تازہ ہوا کے ساتھ شامل ہو کر نتھنوں میں داخل ہوتی تو اندر تک فرحت اور سرشاری کا احساس ہوتا۔

''گڈ مارننگ!'' اقبال باجوہ نے قریب آ کر کہا تو شہریار چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' شہریار کے متوجہ ہونے پر اقبال نے پوچھا۔

''شاید اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت صبح۔'' شہریار نے بہت سچائی سے جواب دیا۔

''ہاں، یہاں صبح بہت خوب صورت لگتی ہے۔ خاص طور پر ساری زندگی شہروں میں گزارنے والوں کو یہاں آ کر الگ ہی مزہ آتا ہے۔'' اقبال باجوہ، شہریار کی زبان سے تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ وہ یہاں فاریسٹ آفیسر تھا اور جنگل کی تعریف اسے اپنی ہی تعریف لگی تھی۔ چنانچہ وہ شہریار کو جنگل کے بارے میں مزید معلومات بھی فراہم کرنے لگا۔

''یہ جنگل اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد ہے۔ یہاں صحرائی علاقے بھی ہیں، گھنے جنگل بھی اور آبی ذخائر بھی۔ پیر آباد سے جو نہر گزرتی ہے، وہ یہیں سے تو ہو کر جاتی ہے۔ ماحول کے اس تنوع کی وجہ سے یہاں کا حیوانیہ اور نباتیہ بھی بڑا متنوع ہے۔ یہاں بے شمار قسم کے درخت، پودے اور جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جانوروں میں چنکارہ، غزال، پاڑہ، نیل گائے، جنگلی سؤر، جنگلی بلی، ریتیلی بلی، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، نیولا، چیتل سب ملتے ہیں۔ ساتھ کئی قسم کی بطخیں، Herons, Egrets، تیتر، تلور، شاہین، شکرے، گِدھ، ہدہد، مرغ



ابابیل، عقاب، چیل اور کنگ فشر بھی پائے جاتے ہیں۔ ابھی ہم شکار کریں گے تو آپ کو مزہ آ جائے گا۔ تیتر تو یہاں بہت ہے اور ہم زیادہ تر اسی کا شکار کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جانوروں جیسے چنکارہ، غزال اور پاڑہ کی تعداد ذرا کم ہے اس لیے ان کے شکار پر پابندی عائد کر رکھی ہے حکومت نے۔ سال میں ایک بار مشکل سے پرمٹ دیتے ہیں اس کے لئے۔ ویسے میں اس جنگل پر مزید ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ یہاں جو چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ ہے اس میں Homonoids جیسے چمپینزی اور Apes وغیرہ کے فاسلز مل سکتے ہیں۔''

''اچھا، پھر تو اس جنگل کو نیشنل پارک کا درجہ ملنا چاہئے۔'' شہریار کو اندازہ تھا کہ اقبال باجوہ جنگل کی خصوصیات بیان کرنے میں کچھ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ خصوصاً یہ فاسلز ریکارڈ والی بات تو کہیں سے صحیح سے نہیں لگتی تھی۔ اس سلسلے میں چن جی نیشنل پارک کا نام سامنے آتا تھا اور اس کی خصوصیات کے پیش نظر 1989ء میں اسے نیشنل پارک کا درجہ دیا جا چکا تھا۔

''ملنا تو چاہئے۔ مگر اقوام متحدہ کی کچھ شرائط ایسی ہیں جن کے مطابق یہ جنگل نیشنل پارک کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔ کچھ رقبے وغیرہ کا مسئلہ ہے۔'' اقبال باجوہ نے بات کو ٹالا۔ اسی وقت ان لوگوں کو ناشتے کے لیے پکارا جانے لگا تو وہ دونوں ناشتے کے لیے چلے گئے۔ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد وہ لوگ شکار کے لیے تیار ہوئے۔ انہوں نے جنگل کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اقبال باجوہ کے مطابق تیتروں کی بہتات تھی۔ شہریار کو تیتر شکار کرنے کے مقابلے میں فشنگ میں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے وہ ایک فشنگ راڈ لے کر نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ چودھری افتخار کا ایک ملازم اس کے ساتھ تھا۔ جنگل میں خطرناک جانوروں کی بہتات نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ فکرمند نہیں تھے لیکن پھر بھی اردگرد کے ماحول سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ نہر میں اقبال باجوہ کی دی گئی اطلاع جتنی تو مچھلیوں کی بہتات نہیں تھی لیکن پھر بھی وقفے وقفے سے کوئی مچھلی کانٹے میں پھنس ہی جاتی تھی۔

''سر جی! ادھر دیکھیں۔'' شہریار بہت دیر سے کوئی مچھلی نہ پھنسنے کے باعث کچھ بے چین ہونے لگا تھا، تب اس کے ساتھ موجود چودھری افتخار کے ملازم نے تقریباً سرگوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ شہریار نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر نہر کے پانی میں پھولے ہوئے جسم کا، بھوری رنگت والا جانور تیرتا ہوا کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ جانور کے سینگوں کی لمبائی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن وہ شاخ دار اور مضبوط نظر آتے تھے۔ شہریار مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔

''یہ پاڑہ ہے۔ عموماً شام کے بعد یا بہت صبح سویرے غذا کی تلاش میں اپنی پناہ گاہ سے نکلتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے اس وقت نکل آیا؟'' ملازم نے ایک بار پھر سرگوشی میں شہریار کی معلومات میں اضافہ کیا۔ شہریار اسے کوئی جواب دیئے بغیر پاڑہ کو دیکھتا رہا جو اب نہر کے پانی سے نکل کر کنارے پر اُگی لمبی گھاس کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ گھاس میں چھپے ہونے کے باعث اب شہریار اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی موجودگی بہر حال محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت کہیں قریب ہی سے دھائیں کی آواز گونجی اور گھاس میں چھپا بیٹھا پاڑہ بری طرح اچھلا۔ شہریار نے دیکھا کہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ ہی فشنگ راڈ ہاتھ سے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگا۔ دوسری طرف سے چودھری افتخار کا ایک ملازم بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار کی چھری تھی جو اس نے تڑپتے ہوئے پاڑہ کے قریب پہنچ کر اس کی گردن پر پھیر دی۔ شہریار صدمے کی سی حالت میں اس خوب صورت جانور کے ذبح ہونے کا منظر دیکھتا رہ گیا۔

''شان دار چودھری صاحب! بہت ہی پرفیکٹ نشانہ لگایا آپ نے۔'' ایس پی معظم تارڑ کی آواز شہریار کے کانوں میں پہنچی تو وہ اپنی گم صم کیفیت سے باہر آیا۔ چودھری افتخار بندوق ہاتھ میں لیے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ معظم تارڑ، اقبال باجوہ اور ملازمین بھی تھے۔ ملازمین مل کر ذبح شدہ جانور کو سنبھالنے لگے۔

''کیوں شہریار صاحب! کیسا لگا آپ کو ہمارا نشانہ؟'' شہریار کو متوجہ ہوتے دیکھ کر چودھری افتخار نے اس سے پوچھا۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہاں چنکارہ اور پاڑہ کے شکار پر ان دنوں پابندی ہے۔'' چودھری افتخار کو نظرانداز کر کے شہریار، اقبال باجوہ سے مخاطب ہوا۔

''جی ہاں پابندی تو ہے۔ لیکن چودھری صاحب دور سے اندازہ نہیں کر پائے کہ یہ پاڑہ ہے۔ بس انہوں نے گھاس میں اس کی جھلک دیکھ کر فائر کر دیا۔'' اقبال باجوہ فاریسٹ آفیسر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے جانور کی ہلاکت پر جس کے شکار پر پابندی عائد تھی، بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' شہریار کو سخت تاسف تھا۔

''آپ فکر مت کریں شہریار صاحب! پاڑہ کوئی اتنی نایاب نسل کا جانور نہیں۔ پاکستان کے تقریباً چاروں صوبوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہاں پابندی اس لیے ہے کہ یہاں یہ ذرا کم تعداد میں ہے۔ لیکن بہرحال، ایک جانور کی ہلاکت سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔'' اقبال باجوہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔

''فرق کیسے نہیں پڑتا باجوہ صاحب؟ آپ فاریسٹ آفیسر ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے کہ اس ''فرق نہیں پڑتا'' کی گردان نے ہمیں ماضی میں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ بلیک بک (کالا غزال) کے قصے سے کون واقف نہیں۔ کسی زمانے میں چولستان کے علاقے میں ان کی کثرت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہم لوگوں نے انہیں اتنی کثرت سے شکار کیا کہ ہمارے ہاں سے ہرنوں کی یہ نسل ہی معدوم ہو گئی۔ وہ تو نواب آف بہاولپور نے امریکہ کو تحفے میں دیئے گئے 35 کالے ہرنوں کی وجہ سے بات بنی۔ ہم نے اپنے جس قیمتی جانور کو ختم کر ڈالا تھا اس کی امریکیوں نے اتنی اچھی طرح افزائش کی کہ بعد میں ہمیں ہی دس ہرن بھجوا دیئے۔ اب ہم انہیں سنبھالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ہمارا یہ غیر سنجیدہ رویہ کیوں ختم نہیں ہوتا کہ ہم پہلے اپنی چیزوں کی قدر نہیں کرتے بعد میں ان کے حصول کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔'' شہریار کو پاڑہ کی ہلاکت اور اقبال باجوہ کے بے پروا انداز پر اتنا افسوس ہوا کہ وہ اچھی خاصی تقریر کر گیا۔

''اب جو ہو گیا سو ہو گیا اے سی صاحب! میں اپنی اس غلطی کے لیے حکومت کو جرمانہ ادا کر دوں گا۔'' شہریار خاموش ہوا تو چودھری افتخار نے رعونت سے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔ اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے شہریار کی یہ تقریر بہت بری لگی ہے۔ شہریار نے زیادہ پروا نہیں کی اور ان لوگوں کے ساتھ واپس اپنے پڑاؤ پر آ گیا۔ یہاں ملازمین نے پاڑہ کی کھال اتار کر اسے بھوننے کے انتظامات شروع کر دیئے۔ دو چار تیتر اور شہریار کی شکار کی گئی مچھلیاں بھی دوپہر کے کھانے کے مینیو میں شامل تھیں۔ کھانا تیار ہونے کے بعد لگایا گیا تو شہریار نے بھنے ہوئے پاڑہ پر نگاہِ غلط تک نہیں ڈالی۔ اگرچہ معظم تارڑ اور اقبال باجوہ کوشش کر رہے تھے کہ فضا خوشگوار رہے لیکن شہریار اور چودھری افتخار کے آف موڈ کی وجہ سے فضا مکدر ہو گئی تھی۔ شام سے قبل ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹ کر واپسی کی تیاری کر لی۔ شہریار جس جیپ میں بیٹھا تھا اس میں چودھری افتخار بھی موجود تھا۔



''آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے اے سی صاحب! میں نے آپ کے مشورے پر غور کرتے ہوئے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے کچھ اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ایک موبائل کمپنی والوں سے بات ہوئی ہے۔ وہ چار دن میں وہ ہمارے علاقے میں اپنا ٹاور بنانا شروع کر دیں گے۔ آپ دیکھیں نا، یہاں اردگرد کے علاقے میں ابھی تک موبائل سروس شروع نہیں ہوئی ہے۔ میں یہ کام کرنے والا پہلا بندہ ہوں گا۔'' جیپ علاقے کی حدود سے نکلنے والی تھی جب چودھری افتخار نے شہریار کو یہ اطلاع دی۔ شہریار اس اطلاع پر اس کا منہ تکتا رہا۔ اسکول، ہسپتال اور سڑک جیسی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر چودھری افتخار کو ترقی کے نام پر اگر کچھ کرنے کا خیال آیا بھی تھا تو اپنے علاقے میں موبائل سروس شروع کروانے کا۔ وہ واقعی ایک بے حد ہوشیار شخص تھا جو امن پر لگے الزامات کے داغ ایک ایسے طریقے سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے محکوم افراد اس علاقے سے ہرگز نہ نکلنے پائیں اور کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہوا بھی نظر آئے۔

⊛----✪----⊛

خدا خدا کر کے زہرہ کی شادی نمٹ گئی۔ ماہ بانو نے بہت ڈرتے ڈرتے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ اس وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حویلی سے بلاوا نہ آ جائے۔ مگر خیر گزری تھی کہ اس موقع پر بڑی چودھرائن کو مہمانی جتانے کے لیے ماہ بانو کو بلانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ شاید شادی والے گھر کا سوچ کر کچھ لحاظ کر گئی تھی۔ ماہ بانو ڈرتی تھی کہ بڑی چودھرائن نے اگر بلایا تو حویلی جانا پڑے گا اور حویلی میں چودھری افتخار بھی ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی دوبارہ ماہ بانو کو شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ شادی والے دن ماہ بانو کو اطلاع ملی کہ چودھری افتخار پر گیا ہوا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر اُس کا دل پُرسکون ہو گیا۔ اُس نے آرام سے شادی اور ولیمے کی تقریبات میں شرکت کی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ولیمے کی دعوت سے واپس آنے کے بعد واپسی کے لیے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

''وہیے! اِدھر آ ذرا..... میری ایک بات تو سن۔'' حوراں نے اس کی مصروفیات دیکھ کر ہی گلا کھنکھارتے ہوئے اسے آواز دی۔

''آتی ہوں بے بے! بس یہ آخری دو جوڑے بھی بیگ میں رکھ لوں۔'' ماہ بانو نے مصروف سے انداز میں جواب دیا اور جلدی جلدی کپڑوں کی تہہ لگا کر انہیں بیگ میں رکھ کر زِپ بند کرنے کے بعد اس میں وہ چھوٹا سا تالا بھی لگا دیا جو وہ گاؤں آتے وقت حوراں کی ہدایت پر سامان کی حفاظت کے خیال سے لگا کر لائی تھی۔

''ہاں بے بے! اب بولو کیا بات ہے؟ ابا نے کیا بتایا ہے، کب تک نکلنا ہے؟ اب تو ویسے بھی شام سر پر آ گئی ہے۔ زیادہ دیر ہو گئی تو پھر ہمیں کل تک رُکنا پڑے گا۔'' ماہ بانو حوراں کے قریب آ بیٹھی۔ اس وقت کمرے میں وہ دونوں ہی موجود تھیں۔ نوراں باہر آنگن میں ولیمے میں شرکت کرنے کے بعد ساتھ گھر آ جانے والے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ حوراں اور صفدر کے سوا وہاں گاؤں سے باہر کا تو کوئی فرد نہیں آیا ہوا تھا اس لیے ان کے وہاں شب بسری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بس گاؤں میں ہی رہنے والے برادری کے کچھ لوگ تھے جو ان کے ساتھ آ گئے تھے اور آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔

''بات یہ ہے وِہیے! کہ میں اور تیرے ابا تو ابھی تھوڑی دیر بعد فیصل آباد کے لیے نکلنے والے ہیں لیکن تیرے ابا نے کہا ہے کہ ماہ بانو سے کہو دو چار دن یہیں ٹھہر جائے۔ تیرے کالج میں وہ چھٹی کی درخواست پہنچا دیں گے۔''

''مگر کیوں؟..... میں کس لیے رُکوں یہاں؟ میں تو نہیں رُکوں گی۔ مجھے واپس جانا ہے۔ آج اور ابھی
ماہ بانو کا ردِعمل حوراں کی توقع کے مطابق تھا۔

''ضد مت کرو میری اچھی دِھی! بھا غیاث نے خود تیرے ابا سے کہا ہے کہ ماہ بانو کو دو چار دن کے
گاؤں چھوڑ جاؤ۔ دو چار دنوں کے بعد بھا غیاث خود تجھے واپس فیصل آباد لا کر چھوڑ دے گا۔ ابھی اصل
ادھر کسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ سارا گھر پھیلا ہوا ہے۔ اکیلی نوراں بے چاری یہ سب کیسے سنبھالے گی؟ ا
حویلی کے کام سے بھی جانا ہوتا ہے۔ بیاہ کے دنوں میں یہ تین دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے منت سماجت
بعد ملی تھی۔ کل سے اسے کام پر جانا ہوگا۔ ایسے میں تیرا فرض بنتا ہے نا کہ ماں کا ساتھ دے۔ اگر نگار کی طبی
ٹھیک ہوتی تو وہ ہی رک جاتی دو چار دن میکے میں۔ لیکن اس کا جی اچھا نہیں۔ بڑی مرادوں کے بعد تو اسے
وقت دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اللہ خیر سے اس کا یہ وقت نکالے۔ اس کی ساس تو ایک دن بھی اسے یہاں رہ
کے لیے نہیں بھیجے گی۔ دیکھا نہیں کہ شادی کی تقریبات میں بھی اپنے ساتھ لاتی لے جاتی رہی ہے۔ اب
دے کر ایک تُو ہی ہے جو نوراں کا ساتھ دے سکتی ہے۔'' حوراں، ماہ بانو کو سمجھانے لگی۔

''مگر بے بے! میرا یہاں اکیلے دل نہیں لگتا۔ تم بھی رک جاؤ نا یہاں میرے ساتھ۔'' ماہ بانو
فرمائش کی۔

''میرا اپنا دل چاہتا ہے کہ رک جاؤں لیکن تیرے ابا کو مشکل ہو جائے گی۔ وہ وہاں اکیلا ہوگا تو کون ا
کے کھانے پینے کا خیال کرے گا۔ اور تُو جانتی ہے کہ تیرا ابا اب مزید یہاں نہیں رک سکتا۔ جتنے دن کا ناغہ ہ
ہے اس سے ہی کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ناغے سے اچھے بھلے بندھے ہوئے گاہک ٹوٹ جاتے ہیں
حوراں بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ صفدر بازار میں جہاں پھلوں کی ریڑھی لگاتا تھا، وہاں دوسرے بھی کئی
فروشوں کی ریڑھیاں ہوتی تھیں۔ صفدر ان سب میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا مال رکھتا تھا اور قی
بھی مناسب لگاتا تھا اس لیے اس کا کام زیادہ اچھا چلتا تھا۔ بڑی بڑی کاروں میں آنے والے بھی صفدر
ٹھیلے پر سے پھل خریدنا پسند کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے یہ سارے لوگ صفدر کے انتظار میں پھل خریدنا اور کھا
نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ صفدر نہ ہوتا تو وہ کسی اور ٹھیلے یا دکان سے خریداری کر لیتے۔ نقصان تو صفدر ہی کا تھا
لیے وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا۔

''تم نے اور ابا نے مجھے دھوکا دیا ہے بے بے! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ویسے والے دن مجھے اپنے سا
ہی واپس لے جاؤ گے اور اب مجھے زبردستی یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' ماہ بانو کا کچھ اور بس نہ چلا تو حوراں
شکوہ کرتے ہوئے رونے لگی۔

''میری مجبوری کو سمجھ میری پگلی دِھی! میں اور تیرا ابا بھا غیاث کو انکار نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے اس کی با
نہیں مانی تو اس کا کچھ بھروسہ نہیں کہ صاف بول دے کہ ماہ بانو میری بیٹی ہے، اسے میں تم لوگوں کے ساتھ
جانے دیتا۔ اب یہ ہمیشہ یہیں رہے گی۔ ذرا سوچ اگر بھا غیاث نے ایسی کوئی بات کر دی تو ہم کیا کریں گے
حوراں اسی خوف میں مبتلا تھی جس میں لے پالک بچوں کے ماں باپ سدا مبتلا رہتے ہیں۔

''ایسے کوئی زبردستی روک سکتا ہے مجھے؟ میں تو نہیں رُکوں گی۔'' ماہ بانو رونا چھوڑ کر چمک کر بولی۔

''تُو ابھی نادان ہے۔ تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں۔ پھر تُو نے بھا غیاث کو صحیح سے دیکھا بھی کہا
ہے۔ غصے میں اس کی آنکھ سے ساری مروّت اور لحاظ ختم ہو جاتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ اس کی بات
لی جائے۔'' حوراں نے ماہ بانو کو جواب دیا۔ ماہ بانو نے مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولے لیکن حوراں



بولنے نہیں دیا۔

''بس میری دِھی! اب کچھ نہیں بولنا۔ بس جو میں نے کہہ دیا اسے مان لے۔'' اب ماہ بانو بالکل مجبور تھی۔
ھوڑی دیر بعد حوراں اور صفدر اسے پیار کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ گھر میں پھیلا
ھر اوا سمیٹنے لگی۔ مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی تھی لیکن چند افراد ابھی تک بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے۔ اِدھر
اِدھر حرکت کرتی ماہ بانو کے کانوں میں بھی ان کی آواز پڑ رہی تھی۔

''پیر سرکار کی برکت سے ہماری تو ساری مشکلیں دور ہو گئیں۔ نگار کی طرف سے فکر تھی، پیر سرکار کی قبر پر
منتے ہی اس کی طرف سے خوش خبری مل گئی۔ ادھر اپنی زہرہ کے بیاہ کے لیے کون سی تیاری تھی لیکن اس
لیے بھی وسیلہ بن گیا۔ چودھری صاحب نے پچھلا قرض باقی ہونے کے باوجود زہرہ کے بیاہ کے لیے قرض
دیا۔ میرا تو ایمان پکا ہو گیا ہے پیر سرکار کی کرامت پر۔ اگلے برس عرس ہوگا تو خوب نذر چڑھاؤں گی ان
ل درگاہ پر جا کر۔'' ماہ بانو باورچی خانے میں برتنوں کے ڈھیر سے اُلجھ رہی تھی جب اس نے نوراں کو نہایت
عقیدت سے کہتے سنا۔ ماہ بانو کو اپنی جنم دینے والی ماں کی ضعیف الاعتقادی پر افسوس ہونے لگا۔ بجائے اس
کہ وہ اپنی مشکلات حل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتی، بیٹھی پیر سرکار کے گُن گا رہی تھی۔ اس کی یہ عقیدت مندی
ال سننے والوں کا ایمان مزید کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔

''پیر سرکار کی تو کیا ہی بات ہے۔ وہ مہربان ہو جائیں تو کالا چور بھی آدمی کا ہمدرد بن جائے۔ وہ قصہ سنا
تم لوگوں نے کہ ایک کمہار بے چارے کا ہاتھ کسی حادثے میں ٹوٹ گیا۔ اب ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے بے
ارہ کیا کام کرتا اور کیسے کماتا۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اس پر اکلوتی بیٹی کا بیاہ سر پر آ کھڑا ہوا۔ کمہار کو کچھ
سمجھ نہیں آیا تو پیر سرکار کی درگاہ پر آ کر ان کے سامنے گڑگڑایا اور رویا پیٹا کہ اب آپ ہی مجھ غریب کی مدد
کریں۔ خدا کا کرنا دیکھو اسی رات کمہار کے گھر پر ایک مسافر آ کر رکا۔ اس بے چارے کے پاس اپنے اور اپنے
گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں تھا، مسافر کو کیا کھلاتا؟ لیکن ظاہر ہے مہمان کو بھوکا بھی نہیں رکھا جا
سکتا تھا۔ کمہار جس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، مہمان کی خاطر آس پڑوس والوں کے پاس گیا اور
تھوڑا تھوڑا کھانا مانگ لایا۔ رنگ برنگا کھانا دیکھ کر مسافر کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ اس نے کمہار سے تفصیل
پوچھی۔ اس نے سارا سچ بتا دیا۔ اس وقت تو مسافر خاموش ہو گیا لیکن صبح اذانوں سے بھی پہلے کمہار کو جگا کر بتایا
کہ وہ جا رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ کمہار کو ایک چھوٹی سی پوٹلی تھما گیا۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ ایک نامی گرامی
الو ہے۔ اس کے جانے کے بعد کمہار نے پوٹلی کھول کر دیکھی تو اس میں گہنے اور روپے تھے۔ بس اس کے دن
پھر گئے۔ بیٹی کا بیاہ بھی خوب اچھی طرح ہوا اور آگے کی پریشانی بھی دور ہو گئی۔ کمہار نے سمجھ لیا کہ یہ ساری
پیر سرکار کی کرامت ہے جنہوں نے دوسروں کو لوٹنے والوں کے ہاتھ اس کا دامن بھر دیا۔'' نوراں کے عقیدت
مندی کا اظہار کرنے کی دیر تھی، فوراً ہی وہاں موجود ایک بزرگ نے ایک قصہ پیر سرکار کی کرامت کے بارے
میں سنا دیا۔ ایسے اور بھی کئی قصے تھے جو لوگ سناتے رہتے تھے۔ ماہ بانو کو کبھی ان واقعات پر یقین نہیں آیا تھا۔
وہ سمجھتی تھی کہ یہ قصے جان بوجھ کر اپنی طرف سے گھڑ کر پھیلائے گئے ہیں۔ لیکن عقیدت مندی کے جال میں
پھنسے ہوئے لوگوں کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل تھا۔

''اپنے چودھری صاحب پر بھی ان کے دادا حضور کی بڑی نظرِ کرم ہے۔ دیکھا نہیں ہے کہ کیسے پھل پھول
رہے ہیں۔ خیر، کمی تو پہلے بھی کوئی نہیں تھی لیکن پیر سرکار کے کرم سے ان کا نصیب اتنا بلند ہے کہ جس کام میں
ہاتھ ڈالتے ہیں فائدہ ہی پاتے ہیں۔ اب شکار کا ہی قصہ سنو۔ چودھری صاحب اپنے دوستوں کو لے کر شکار پر

گئے تھے۔ گھر سے نکلے تھے کہ بس ذرا جنگل میں گھومنے پھرنے کی تفریح رہے گی اور تیتروں وغیرہ کا شکار کر
واپس آ جائیں گے لیکن اُدھر تو ان کے ہاتھ پاڑہ لگ گیا۔ اب بتاؤ..... پاڑہ دن کی روشنی میں کبھی باہر نکلتا
لیکن چودھری صاحب کے ساتھ جانے والوں نے بتایا کہ ایک موٹا تازہ پاڑہ دن دیہاڑے چودھری صا
کے سامنے ایسے آ گیا جیسے کسی نے اسے ان کی خدمت میں بھیجا ہو کہ لو، اس سے اپنے مہمانوں کی دعوت کر
کل رات ہی وہ لوگ واپس آئے ہیں شکار سے۔ ساتھ جانور کی کھال اور اس کی مُنڈی بھی ہے۔ چودھ
صاحب دونوں چیزوں کو محفوظ کروا کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' یہ قصہ سنانے وا
عقیدت مندی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ماہ بانو کے ہاتھ پاؤں سُن پڑنے لگے۔ وہ جو ایک اطمینان تھا کہ چودھ
افتخار گاؤں میں موجود نہیں، اس قصے کو سن کر رخصت ہو گیا اور وہ اپنے اردگرد منڈلاتے خطرے کو محسوس کر
لگی۔ چودھری افتخار شکاری تھا اور شکاری کبھی بھی اپنے شکار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ دبے قدموں
اس کے تعاقب میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک اسے شکار نہ کر لے۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھ
افتخار چپکے سے گھات لگائے اسے شکار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہ
مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد حتی الامکان کام سمیٹنے کے بعد جب سب گھر والے بستر پر لیٹے تو ماہ بانو
رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ہونے والی وہ آواز سنی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کُودا
ماہ بانو کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ خدشوں اور اندیشوں نے اس کی نیند پہلے ہی اُڑا رکھی تھی۔ شد
تھکن کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب جو اس نے دھک سنی تو پوری جان سے کانپ گئی۔ لیکن وہ
ہی طے کر چکی تھی کہ چودھری کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہو گی۔ سنائی دینے والی آواز واقعی کسی انسان
کُودنے کی ہے یا کسی بلی وغیرہ نے چھلانگ لگائی ہے؟ پہلے یہ تصدیق کرنا ضروری تھا۔ ماہ بانو چپکے سے ا
بستر سے نیچے رینگ گئی۔ بستر چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے گرد بڑی سی سیاہ چادر لپیٹ لی تھی۔ وہ ر
ہوئی بنا آہٹ کیے کمرے کے دروازے تک گئی اور اندھیرے میں ڈوبے آنگن کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا
پہلی نظر میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا مگر پھر اس نے قدموں کی آہٹ سے دیوار پھلانگنے والے کو پا لیا۔ وہ د
قدموں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماہ بانو سمجھ گئی کہ باہر کچھ اور افراد بھی موجود
جنہیں وہ دروازہ کھول کر اندر بلانا چاہتا ہے۔ وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور کمرے سے نکل کر باورچی خا
کی طرف بڑھ گئی۔ سیاہ چادر کی وجہ سے اس کا وجود اندھیرے کا جزو بنا ہوا تھا اور یوں بھی دیوار پھلانگ کر آ
والے کا رخ اس کے بجائے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے اسے باورچی خانے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پ
نہیں آئی۔ بغیر دروازے کا یہ باورچی خانہ اسے ہرگز پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ وہاں پناہ لینے آئی بھی نہیں تھی
چودھری افتخار کے گاؤں میں موجود ہونے کا سن کر اس نے اس قسم کی صورتِ حال میں گھرنے کی صورت م
پہلے ہی اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل طے کر لیا تھا اور اب وہ بہت خاموشی سے اس پر عمل پیرا تھی۔ اپنی ا
مصروفیت کے دوران اس کے کان باہر کی طرف بھی لگے ہوئے تھے۔ آنے والے اندر آ چکے تھے اور ان کے
قدموں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تین چار سے کم نہیں۔ ذرا دیر میں ماہ بانو نے نوراں، غیاث اور ا
چھوٹے بھائی الیاس کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں۔ پھر ان آوازوں میں اس نے کچھ اجنبی آوازیں بھی سنیں
یقیناً وہ لوگ اسی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ انہیں اس تک پہنچنے میں زیادہ وقت
نہیں لگے گا۔ اسے اب پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ کرنا تھا، وہ کر چکی تھی اور اب اطمینان سے باورچی خانے کی
دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آخر ان میں سے ایک وہاں پہنچ گیا۔



''یہ رہی..... یہاں چھپی ہوئی ہے۔'' ماہ بانو کو دیکھتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ دو بندے
گئے ہوئے تیزی سے وہاں آئے۔ ان سب نے اپنے چہروں کو ڈھاٹوں سے چھپا رکھا تھا۔ ''اٹھا لو اسے اور
میں ڈالو۔'' آنے والوں میں سے ایک نے حکم دیا اور دو بندے ماہ بانو کی طرف بڑھے۔
''وہیں رک جاؤ۔ خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں خود تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔'' ماہ بانو نے
کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آنے والے اُس
اس انداز پر حیران رہ گئے۔ مگر پھر وہ بھی چل پڑے۔ آنگن میں نوراں، غیاث اور دس سالہ الیاس ہراساں
ے تھے۔ بندوق تانے ایک شخص ان کے سروں پر سوار تھا۔
''خبردار! اگر اپنی بیٹی کی زندگی چاہتے ہو تو منہ بند رکھنا۔ صبح تمہیں تمہاری بیٹی زندہ مل جائے گی۔ اگر
ان کھولی تو پھر اس کی لاش ہی پا سکو گے۔'' جس شخص نے ماہ بانو کو اٹھانے کا حکم دیا تھا، اس نے ہی بارُعب
میں ان تینوں کو دھمکی دی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ ماہ بانو کو انہوں نے جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھایا تھا اور
ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا جا رہا تھا اور وہ بغیر کوئی
واویلا کیے ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی تھی۔
''شاید پٹرول کی بوتل کا ڈھکن ڈھیلا ہو کر اس سے پٹرول گر گیا ہے۔ مجھے جیپ میں پٹرول کی بُو آ رہی
ہے۔'' تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی جیپ ڈرائیو کرنے والے نے خیال ظاہر کیا۔
''بُو تو ہمیں بھی آ رہی ہے۔ لیکن ابھی رُکے بغیر چلتے رہو۔ بعد میں آرام سے دیکھیں گے۔'' پچھلی
ت سے جواب دیا گیا۔ ماہ بانو ان سے بے نیاز بنی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر اندھیرا تھا لیکن پھر بھی
اندازہ ہو گیا کہ جیپ کا رخ حویلی کی طرف نہیں۔ وہ حویلی کے راستے سے ہٹ کر نہر کے ساتھ ساتھ دوڑ
ی تھی۔ یعنی اسے اغوا کروانے والا چودھری افتخار کے سوا بھی کوئی اور ہو سکتا تھا۔ ماہ بانو کے ذہن میں یہ خیال
ا اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ چودھری افتخار کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا
س کی اس پر نظر ہوتی۔ اس رات تو اتفاقاً اسے حویلی کے اندر ہی ماہ بانو سے دست درازی کا موقع مل گیا تھا
لیکن یقیناً عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حویلی میں اپنی بیویوں اور دیگر اہلِ خانہ کی موجودگی میں ایک لڑکی
اغوا کروا کر اس کے ساتھ دادِ عیش دیتا۔ اپنے اس قسم کے مذموم مقاصد کے لیے یقیناً اس نے کوئی دوسرا
ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچے تو ماہ بانو کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ڈھاٹا
ں نے اسے جس کمرے میں پہنچایا، وہاں چودھری افتخار اس کا منتظر تھا۔ ماہ بانو کو سامنے پا کر وہ کھِل اٹھا۔
''بہت تڑپایا تُو نے ہمیں۔ اُس رات چکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ لیکن دیکھ! ہم پھر
ے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔'' اپنے ہاتھ میں موجود شراب کا جام لہراتے ہوئے اس نے ایک خوشی بھرا
قہقہہ لگایا۔ ماہ بانو کوئی جواب دیئے بغیر خاموش کھڑی رہی۔ اس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی اور بے پروائی
تھی۔ چودھری افتخار ٹھٹکا اور غور سے اسے دیکھا۔
''کیا بات ہے؟ آج بڑی چپ ہے۔ نہ کوئی شور نہ گالی گلوچ۔ میں تو سمجھا تھا، میرے بندے تیرے
ہاتھ پیر باندھ کر تجھے میرے سامنے لا کر پھینکیں گے۔ لیکن تُو تو خود اپنے قدموں پر چل کر آئی ہے۔''
ماہ بانو اس بار بھی خاموش رہی۔
''چل اچھی بات ہے کہ تجھے خود ہی عقل آ گئی۔ خاموشی سے میری بات مان لینے میں ہی تیرا فائدہ ہے۔
یہ تو بتا کہ اب اس چادر میں لپٹی ہمارے ضبط کو کیوں آزما رہی ہے؟ دور پھینک اس چادر کو یہاں میرے پاس

آ۔'' چودھری افتخار کی اس فرمائش پر ماہ بانو نے اپنے گرد مضبوطی سے لپٹی چادر کو سرکایا۔ سامنے سے چادر ہٹی اس کی گریبان سے دامن تک کچھ نم نم سی قمیض ظاہر ہوگئی۔ لیکن چودھری افتخار کی نظر اس کی قمیض کے بجائے اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کو ٹٹول رہی تھی۔ چادر سرکانے کے بعد ماہ بانو نے چودھری افتخار کے دوسرے حکم کی پیروی نہیں کی تھی۔

''اب آجانا..... کیوں تڑپاتی ہے؟'' چودھری نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ ماہ بانو بے حس وحرکت اپنی جگہ کھڑی رہی۔

''چل اگر تُو نہیں آتی تو ہم خود تیرے پاس آجاتے ہیں۔ اتنا نخرہ دکھانا تو تیرا حق بنتا ہے۔'' چودھری اٹھا لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔

''وہیں رک جاؤ چودھری!'' ماہ بانو نے کڑکتی ہوئی آواز میں اسے تنبیہہ کی اور اپنی بند مٹھی کھولی۔ اس کی مٹھی میں ماچس کی ایک ڈبیہ صاف نظر آرہی تھی۔

''اگر شراب نے تمہارے اندر کوئی حس باقی چھوڑی ہے تو وہیں رک جاؤ اور اس بُو کو سونگھو جو میرے پاس سے آرہی ہے۔ میں اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر یہاں آئی ہوں۔ اگر تم نے مجھے اُنگلی بھی لگانے کی کوشش کی تو میں اس ماچس سے خود کو آگ لگالوں گی۔ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر زبردستی میرے قریب آنے کی کوشش کروگے تو خود بھی جل کر مروگے۔'' ماہ بانو کا لہجہ اتنا بھیانک تھا کہ چودھری کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم سا گیا۔ جس بُو کی طرف ماہ بانو نے اس کی توجہ دلائی تھی، وہ اس نے اس کی آمد کے ساتھ ہی محسوس کی تھی لیکن شراب کے نشے اور ماہ بانو کو پانے کی ترنگ میں نظر انداز کر گیا تھا۔ مگر اب اس کو حقیقت اسے سمجھ آرہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اپنے ارادے میں نہایت غیر متزلزل نظر آتی تھی۔ اس کا اور چودھری افتخار کا درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ وہ جب تک اس کے قریب پہنچ کر ماچس کی ڈبیہ چھیننے کی کوشش کرتا، وہ خود کو آگ لگا چکی ہوتی۔ ماچس کی ڈبیہ اور اس سے نکالی ہوئی ایک تیلی اس کے ہاتھ میں بالکل تیار تھی۔ چودھری افتخار نشے میں ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ اگر یہ تیلی جل گئی تو ماہ بانو کا مٹی کا تیل میں ڈوبا وجود اتنی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آئے گا کہ وہ لمحوں میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔ وہ شکست خوردہ سا پیچھے ہٹا۔

''ٹھیک ہے۔ اس روز بھی ایک آگ نے بھڑک کر تجھے بچالیا تھا اور آج بھی تُو نے ایک آگ کی دھمکی دے کر درمیان میں لاکر ہمارے قدموں کو روک دیا ہے۔ لیکن تُو نہیں جانتی کہ ایک آگ ہمارے اندر بھی بھڑک رہی ہے جو تجھے حاصل کیے بغیر نہیں بجھے گی۔ ابھی تو تُو واپس چلی جا لیکن یاد رکھ کہ تجھے صرف اور صرف چودھری افتخار کا ہی بننا ہے۔ اس بار میں اس راستے سے آؤں گا کہ تُو مجھے روک نہیں سکے گی۔'' کچھ دیر خاموشی سے ہلکے کے بعد اس نے ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے کسی ملازم کو آواز دے کر بلایا۔

''اسے واپس اس کے گھر چھوڑ آ۔'' ملازم کے حاضر ہونے پر چودھری افتخار نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی ماہ بانو کو بھی ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ ماہ بانو غیر یقینی کی کیفیت میں اپنے گرد دوبارہ چادر لپیٹتی باہر کی طرف بڑھی۔ لیکن اس کا انداز اُس ہراساں ہرنی کا سا تھا جو ذرا سی آہٹ پر بھی چونک اٹھتی ہے کہ جانے شکاری اب کہاں سے حملہ کرے گا۔

⊛----✪----⊛



غیاث محمد اور نوراں حیرت کی تصویر بنے ایک ٹک اپنے گھر کے آنگن میں بکھرے اس سامان کو دیکھ رہے تھے جس کی وجہ سے ان کے لیے اپنے آنگن کا منظر اجنبی ہوگیا تھا۔ رات سے مسلسل وہ اسی طرح کی حیرتوں کی زد میں تھے۔ پہلے ماہ بانو اغوا کی گئی۔ نوراں نے پچھلی بار ماہ بانو کے ابتر حالت میں حویلی سے واپس آنے والے واقعے کی روشنی میں بھانپ لیا کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے۔ اس نے غیاث محمد کو بھی اپنے خیال میں شریک کرلیا۔ غیاث محمد پوری بات سن کر اس پر بے حد خفا ہوا تھا کہ نوراں نے اسے اس واقعے سے بے خبر کیوں رکھا؟ اگر وہ اسے بتا دیتی تو وہ ماہ بانو کو کبھی یہاں نہ روکتا۔ ابھی ان لوگوں میں اس موضوع پر بحث چل رہی تھی کہ ماہ بانو صحیح سلامت واپس لوٹ آئی۔ نوراں اور غیاث محمد کے سوالوں کے جواب میں کچھ بتانے کے بجائے اس نے صرف ایک بات کہی کہ صبح اسے فیصل آباد بھجوا دیا جائے۔

لیکن صبح ان کے لیے ایک اور حیرت منتظر تھی۔ چودھری افتخار کا منشی اللہ رکھا، پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ صبح صبح ہی وہاں آدھمکا تھا اور اس نے ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کے رشتے کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ خود ہی یہ بھی طے کر دیا تھا کہ آنے والے جمعے کو عصر کے بعد چودھری افتخار اور ماہ بانو کا نکاح ہوگا۔ پے در پے پیش آنے والے ان واقعات نے نوراں اور غیاث محمد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اور وہ ایک ٹک آنگن میں رکھے پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اتنی ڈھیر ساری نعمتیں ایک ساتھ پہلے کبھی ان کے آنگن میں نہیں اُتری تھیں۔

''کیسے ویاہ دوں میں اتنی سوہنی کُڑی کو اس کے باپ سے بھی زیادہ عمر کے چودھری سے۔ چودھری تو پہلے ہی تین تین بیاہ پھڑکا کر بیٹھا ہے۔ ایک تو چلو اللہ کو پیاری ہوگئی، پر وہ جو دو بیٹھی ہیں وہ تو ایک سے بڑھ کر ایک ظالم اور داغ دار ہیں۔ وہ تو کھا ہی جائیں گی میری معصوم دِھی کو۔'' آخر نوراں کی ممتا بلبلائی تو اس نے لب کھولے۔

''ہمت ہے تو انکار کردے۔ دُوجا ساہ بھی نہیں لینے دے گا چودھری ہم ساروں کو۔'' غیاث محمد اس پر اُلٹا۔ نوراں خود بھی یہ بات سمجھتی تھی سو جواب دیئے بنا اوڑھنی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر سسکنے لگی۔ غیاث محمد کچھ دیر خاموش رہا اسے آنسو بہاتا دیکھتا رہا پھر کھسک کر اس کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایک بات سن نوراں!'' نوراں اُس کے اس انداز پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے متوجہ دیکھ کر غیاث محمد اسی سابقہ انداز میں بولا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ چودھری کی بات تو ہمیں ماننی ہی پڑے گی۔ کیوں نہ خوشی سے مان لیں۔ چودھری سے اپنی دِھی بیاہ کر ہم نقصان میں نہیں رہیں گے۔ ہماری تو شان ہی الگ ہو جائے گی۔ چودھری کا رشتے دار بن کر سارے ہماری عزت کریں گے۔'' غیاث محمد کی آنکھوں میں حرص تھی، اس عزت اور مقام کے لیے جو ساری زندگی اسے کبھی میسر نہیں آئے تھے۔ نوراں نے اس پر ایک ملامتی نظر ڈالی۔

''شرم کر غیاث محمد! جسے کبھی باپ بن کر پالا نہیں، آج اس کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی عزت کمانے کا سوچ رہا ہے۔ تُو کون ہوتا ہے ماہ بانو کے بارے میں فیصلہ کرنے والا؟ اس کے ماں پیو حوراں اور صفدر ہیں۔ پہلے ان سے پوچھ کہ وہ چودھری سے اپنی دِھی بیاہنے کو راضی بھی ہیں یا نہیں؟ پھر گاؤں میں اپنی ٹور بنانے کا سوچنا۔'' نوراں جو اس سے پہلے اپنی مجبوریوں کے قصے سنا کر ماہ بانو کو حویلی میں چاکری پر مجبور کرتی رہی تھی۔ غیاث محمد کو لعن طعن کرنے لگی۔ لیکن غیاث محمد بھی دبنے والا نہیں تھا۔ نوراں کی بات سن کر فوراً بھڑک اُٹھا۔

''پالا کسی نے بھی ہو، دِھی تو وہ میری ہی ہے۔ تیرے بہن بہنوئی کون ہوتے ہیں میری دِھی کے بارے میں فیصلہ کرنے والے؟ میں نے احسان کیا تھا جو اُن کی سُونی گود کو دیکھ کر اپنی دِھی دے دی تھی۔ اب مرضی کہ میں جہاں چاہوں اپنی دِھی کو بیاہوں۔ ویسے بھی چودھری کو انکار کرنے کا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ چاہے تو

کھڑے کھڑے ہمیں گاؤں سے نکلوا دے۔ پھر سوچ کہاں جائیں گے ہم سارے؟ ہمارا تو بیٹا بھی ابھی کسی لا
نہیں ہے۔ کہاں رُلتے پھریں گے ہم اپنی مٹی کو چھوڑ کر؟'' غیاث محمد جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ مبنی بر حقیقت تھا۔ ا
حقیقت کو نوراں بھی سمجھتی تھی چنانچہ ایک بار پھر اوڑھنی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔

''کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتی ہے؟ شکر کر کہ ہمارے منہ پر کالک ملنے سے رہ گئی۔ مجھے تو لگتا
کہ یہ سب پیر سرکار کی کرامت سے ہوا ہے۔ انہوں نے پہلے بھی ہماری بگڑی بنائی ہے۔ اب بھی ان کا ہی کر
ہوا ہوگا کہ ماہ بانو خیریت سے گھر آ گئی اور چودھری نے بیاہ کا پیام بھیج دیا۔ ورنہ ہماری حیثیت ہی کیا
چودھری کے آگے۔ میری مان، ناشکری مت کر اور ہنسی خوشی راضی ہو جا۔ منشی اللہ رکھا جاتے جاتے اشارہ د
گیا ہے کہ اس بیاہ کے بعد ہم پر چڑھا قرض بھی معاف ہو سکتا ہے۔'' غیاث محمد نوراں کو سمجھانے لگا۔ پیر سرکار
کرامت، عزت کا محفوظ رہنا اور قرض سے نجات وہ حوالے تھے جنہیں سن کر نوراں بھی قائل ہو گئی اور چھ
آنسو پونچھ ڈالے۔

''بات تو تیری جی کو لگتی ہے غیاث محمد! پر دیکھ، حوراں اور صفدر کو بھی اس ویاہ پر بلا لینا۔ انہوں نے اتنی
سے ماہ بانو کو پالا ہے، ان کے دل میں بھی ارمان ہوں گے اس کے ویاہ کے لئے۔''

''ہاں ہاں، ان کو بھی بلائیں گے۔ تُو فکر ہی نہ کر۔ میں ایک دن پہلے کسی کو بھیج کر ان دونوں کو بلوا لوں گا
بس اب ماہ بانو کو سمجھانے کی فکر کر۔ اس کا مزاج ذرا ٹیڑھا ہے، آسانی سے نہیں مانے گی۔'' نوراں کے را
ہوتے ہی غیاث محمد نے پُر جوش انداز میں اسے یقین دہانی کروانے کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ سب سے ا
مسئلے کی طرف مبذول کروائی۔

''فکر نہ کر، میں اسے راضی کر لوں گی۔'' نوراں نے اطمینان سے جواب دیا۔ جبکہ کمرے کے دروازے
کھڑی ماہ بانو اپنے سگے ماں باپ کے کیے اس بے رحمانہ فیصلے کو سن کر ساکت سی رہ گئی۔ اپنے مفادات پر
بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کرنے والوں نے ایک بار بھی اس سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ اس قربانی
راضی بھی ہے یا نہیں۔

⊛----✪----⊛

شہریار کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک ہی پیر آباد کے دورے کا فیصلہ کر لیا۔ اصل میں اب تک ا
کا جتنی بار بھی پیر آباد جانا ہوا تھا، وہ وہاں چودھری افتخار کے مہمان کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس حیثیت میں ا
ایک بار بھی موقع نہیں ملا تھا کہ وہ گاؤں کے حالات اور مسائل کا جائزہ لے پاتا۔ آج کے اس دورے کا مقص
گاؤں کا جائزہ لینا اور وہاں کے مسائل کو سمجھنا تھا۔ پھر وہ اسکول والے معاملے کو بھی اب حتمی طور پر نمٹا دینا چا
تھا۔ چودھری افتخار کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دلائل سے قائل ہونے والا بندہ نہیں
اس کے سامنے اپنے اختیارات کا استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ اب وہ پیر آباد کی حدود میں تھا۔ اس
ساتھ حسب معمول صرف ڈرائیور مشابرم خان اور عبدالمنان ہی موجود تھے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی شہر
نے سب سے پہلے اسکول کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک کسان سے اسکول کی لوکیشن معلوم کر
مشابرم خان نے گاڑی اسکول جانے والے راستے پر ڈال دی۔ اسکول کیا تھا، بس ساتھ ساتھ بنے دو کمر
تھے جن پر پرائمری اسکول پیر آباد کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے گاڑی روکی تو شہریار اور عبدالمنان ا
کمرے کی طرف بڑھ گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے تختہ سیاہ پر کچھ لکھتا ماسٹر آفتاب صا



ظر آ رہا تھا۔ گاڑی کی آواز پر ماسٹر آفتاب بھی متوجہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے شہریار اور عبدالمنان کو
دیکھا، لپک کر باہر آیا۔

''السلام علیکم سر! آپ یوں اچانک؟'' وہ شہریار کی آمد پر حیرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے
صاف ظاہر تھا کہ اسے شہریار کو وہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

''اچانک آنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے جو اطلاع دے کر آنے کر صورت میں
چھپا لیے جانے کا خدشہ ہو۔'' شہریار نے ماسٹر آفتاب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''موسٹ ویلکم سر!..... لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اسکول کی صورتِ حال ہر دو صورتوں میں آپ کو ایک
جیسی ہی نظر آئے گی۔'' ماسٹر آفتاب کے پُر اعتماد جواب پر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا
کہ ماسٹر آفتاب ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ کوئی زبردستی نوکری بھگتانے والا بندہ تو تھا نہیں کہ دوسروں کو دکھانے کے
لیے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ورنہ تساہل برتتا۔ وہ تو مشنری جذبے کے ساتھ پیر آباد کے اس برائے نام
اسکول میں نوکری کر رہا تھا۔ بلکہ نوکری بھی کیا، پیر آباد کے بے شعور لوگوں میں آگہی کے دیے روشن کرنے کی
جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہو گیا۔ بچے اسے نہیں پہچانتے تھے
البتہ انہوں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔ بچوں کے سلام کا جواب دے کر شہریار کمرے کا جائزہ لینے
لگا۔ اُکھڑے ہوئے فرش، چٹخی ہوئی دیواروں اور اُڑے اُڑے رنگ والا یہ کمرہ اپنی ٹین کی چھت کے ساتھ بے
حد سرد ہو رہا تھا۔ دو دیواروں پر مخالف سمتوں میں تختۂ سیاہ موجود تھے جبکہ کچھ ہاتھ سے بنے چارٹس وغیرہ بھی نظر
آ رہے تھے۔ بچے نیچے دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دریوں پر بیٹھ کر پڑھتے مختلف عمر کے ان بچوں کی تعداد
گاؤں کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ لیکن پورے اسکول کے ایک کمرے میں سمانے کی وجہ سے جگہ کے
اعتبار سے وہ تعداد زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ماسٹر آفتاب کے کہنے پر دو ذرا بڑی عمر کے بچے کمرے
سے ایک کرسی اٹھا لائے۔ دو کرسیاں پہلے ہی وہاں موجود تھیں جو ماسٹر آفتاب نے شہریار اور عبدالمنان کے بیٹھنے
کے لیے پیش کیں اور خود تیسری کرسی آنے پر اس پر براجمان ہو گیا۔

''ابھی ہمارا اسکول صرف تیسری جماعت تک ہے۔ تمام بچے اس ایک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔
سردی میں تو پھر بھی گزارہ ہو جاتا ہے لیکن گرمی میں یوں جڑ جڑ کر ساتھ ساتھ بیٹھنے میں بچوں کو بڑی مشکل ہوتی
ہے۔ اسی لیے میں بار بار درخواست دیتا ہوں کہ اسکول کی عمارت میں اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک دو کمروں کا
اضافہ کر دیا جائے تاکہ ہم کلاس آگے بڑھنے پر نئے بچوں کے بیٹھنے کے لیے گنجائش نکال سکیں۔ ابھی تو یہ حال
ہے کہ نہ یہاں مزید بچوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی پہلے سے موجود بچے ڈھنگ سے پڑھ پاتے ہیں۔
آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ الگ الگ سبق پڑھنے والے بچوں کے ایک ہی جگہ مل کر پڑھنے سے کیا صورتِ حال
پیش آتی ہوگی۔ اکثر ان کے اسباق آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔ مگر بہر حال، فی الحال تو میں اور میرا ساتھی
ٹیچر مل کر یہ سب مینج کر لیتے ہیں لیکن آگے کی مجھے بہت فکر ہے۔ اچھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے
الگ الگ بیٹھنے کا انتظام کیا جائے اور ایک آدھ نئے استاد کا بھی تقرر ہو تاکہ بچے کو مناسب توجہ مل سکے۔''
شہریار کو سامنے پا کر ماسٹر آفتاب نے فوراً اسکول کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس سے اس کے
اسکول کے لیے خلوص کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ واقعی اسکول کی ترقی کا دل سے خواہش مند تھا۔

''آپ کے ساتھی استاد نظر نہیں آ رہے؟'' اساتذہ کے ذکر پر شہریار کو خیال آیا تو ماسٹر آفتاب سے اس
کے ساتھی ٹیچر کے بارے میں پوچھا۔

''اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے، وہ انہیں دیکھنے گیا ہوا ہے۔ وہ ہوتا ہے تو ہم دونوں مل کر آدھے آدھے بچوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ [illegible] برابر والا کمرہ ہے وہ ہم دونوں کے ہی زیر استعمال ہے۔ ہم مل کر [illegible] رہتے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے شہریار کے پوچھنے پر بتایا۔

''گاؤں میں اسکول کے بارے میں کیا رائے ہے؟ لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کا رجحان ہے نہیں؟'' ''ابھی یہاں کے لوگوں کے ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے اسکول کی تعلیم کو اپنے بچوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً لڑکیاں تو بہت ہی کم داخل ہوتی ہیں یہاں پھر بھی ہم لوگوں نے [illegible] والدین کو راضی کیا ہے کہ بچوں کو اسکول بھیجیں۔ بچوں کی کاپیاں، کتابیں دیگر چیزیں میں اپنی طرف سے [illegible] کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ والدین کم از کم اخراجات کے بوجھ سے [illegible] کر بچے کو اسکول بھیج [illegible] ہیں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ایک دن ہمارا اسکول بہت ترقی کرے گا گاؤں کے [illegible] یہاں [illegible] میں گے۔'' ماسٹر آفتاب پُرعزم تھا۔

''[illegible] تعلیم مفت کر دی ہے اور اسکولوں میں بچوں کے لیے مفت کورس [illegible] آپ کے اسکول کو یہ سب نہیں ملتا؟'' شہریار، ماسٹر آفتاب کی کاپیاں [illegible]

''[illegible] میں نے اس سلسلے میں بھی ایک دو درخواستیں بھیجی تھیں۔ شاید وہ آپ [illegible] نے جواب دیا تو شہریار نے عبدالمنان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا [illegible] غائب کر لی جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ماسٹر صاحب کی ان درخواستوں [illegible] شرمندگی سے جواب دیا۔

''[illegible] ہمیں یہ معاملہ بھی دیکھنا ہوگا۔'' شہریار نے عبدالمنان کو حکم دیا اور [illegible]

''گاؤں میں [illegible] اسکول چلتا تھا۔ اس وقت جن طلباء نے یہاں سے پڑھا تھا، کیا ہمیں اسکول کے استاد کے لیے ان میں سے [illegible]؟''

''اس وقت صورت حال [illegible] اچھی تھی۔ دو چار لڑکے ہی ان میں سے ایسے تھے جنہوں نے پانچویں جماعت پاس کی۔ ان میں سے [illegible] رشتے دار کے پاس شہر چلا گیا تھا اور وہاں رہ کر میٹرک کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ [illegible] بازی میں لگ گئے۔ میں نے کوشش کر کے ان میں سے دو کو مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے [illegible] امتحان دے دیں۔ اب وہ لڑکے شام میں میرے پاس الگ سے پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انشاء اللہ [illegible] امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے پھر میں انہیں میٹرک کا راضی کروں گا۔ لیکن فی الحال [illegible] باہر سے ہی کوئی ٹیچر بھرتی کرنا پڑے گا۔'' ماسٹر آفتاب نے تفصیل بتائی۔ شہریار نے اس کے لیے اپنے دل میں پہلے سے زیادہ عزت محسوس کی۔ اس شخص کی بے لوث خدمتوں کا کوئی صلہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ شہریار کا دل چاہا کہ باہر جا کر گاؤں کے ان سارے لوگوں کو پکارے جو عرس والے دن چودھری افتخار کے دادا کی قبر پر اپنی حاجتیں پوری کروانے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جو چودھری افتخار کے ہاتھ کو بوسہ دینے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم جو مٹی کے ڈھیر کو پوجتے ہو اور اپنا استحصال کرنے والے کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہو، اس شخص کے عقیدت مند بن جاؤ جو تمہارا سچا ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ باتیں جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والی اندھی عقیدت کا کچھ نہیں [illegible]



[illegible]۔ اپنی اس خواہش کو دبا کر وہ ماسٹر آفتاب سے پورے خلوص سے بولا۔

''میں نے آپ کی ہر بات اچھی طرح سن لی ہے۔ اب عمل کا وقت آ چکا ہے۔ آئندہ دو تین دنوں میں یہاں کلسٹر کشن شروع ہو جائے گی۔ نئے اساتذہ کا بھی میں جلد انتظام کرا دوں گا۔ بس آپ اسی لگن سے اپنا کام کرتے رہیں۔''

''تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ سر!..... یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔'' ماسٹر آفتاب اس خبر کو سن کر خوش ہو گیا۔

''احسان کی کوئی بات نہیں۔ یہ میرا فرض ہے جسے میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' شہریار نے سادگی سے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا اور پھر عبدالمنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عبدالمنان! مشابرم خان کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مسجد سے میری گاؤں میں آمد کا اعلان کروا دے تاکہ لوگ ملاقات کے لیے آ سکیں۔''

''مشابرم خان لوکیشن دیکھ رہا ہے سر! تاکہ آپ کے بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ کا انتظام ہو سکے۔'' عبدالمنان نے شہریار کو بتایا۔

''کوئی اور جگہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسکول کی چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ لوگ یہاں بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے عبدالمنان کی بات سن کر فوراً ہی پیشکش کی جو شہریار کو پسند آئی۔ اس نے عبدالمنان کو باہر بھیج دیا کہ مشابرم خان کو جگہ تلاش کرنے سے روک کر شہریار کی اسکول میں موجودگی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ لوگ براہِ راست اپنے علاقے کے اے سی سے مل کر اپنے مسائل پیش کر سکیں۔ عبدالمنان حکم کی پیروی کے لیے باہر نکل گیا جبکہ شہریار وہیں بیٹھ کر ماسٹر آفتاب کو دیکھنے لگا۔ وہ اتنی دیر سے سکون سے بیٹھ کر اپنے اپنے کام میں مصروف بچوں کے بیگ بند کروانے کے بعد انہیں مشترکہ طور پر چند دعائیں زبانی پڑھوا رہا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اس کارروائی کے بعد اس نے چھٹی کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور بچے قطار بنا کر باآوازِ بلند سلام کرتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ بچوں کی ان آوازوں کے درمیان شہریار نے مسجد سے اے سی کی آمد کے سلسلے میں ہونے والا اعلان بھی سنا۔ اعلان ہونے کے تھوڑی دیر بعد عبدالمنان اور مشابرم خان واپس لوٹ آئے۔ ماسٹر آفتاب جو شہریار سے اجازت لے کر بچوں کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گیا تھا، ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کی پیالیاں اور بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' شہریار نے اسے ٹوکا۔

''آپ نے یہاں آنے کی جو تکلیف کی ہے، اس کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں۔''

''میں ایک بار پھر آپ کو یہی جواب دوں گا کہ یہ میرے فرائض کا حصہ ہے۔'' ماسٹر آفتاب کی بات کے جواب میں شہریار نے کہا اور پھر چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ عبدالمنان نوٹ کر رہا تھا کہ شہریار کا انداز ماسٹر آفتاب کے ساتھ قدرے مختلف ہے۔ وہ جو ایک اکڑ سی اس کے اندر نظر آتی تھی، اس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا اور وہ بہت نرم خو نظر آتا تھا۔ عبدالمنان، شہریار کے اس انداز کو پہچاننے لگا تھا۔ وہ لوگ جو اسے ملنے آتے تھے، ان کے ساتھ اس کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا۔

''چائے بہت اچھی بنائی ہے آپ نے۔''

''شکریہ سر!'' شہریار کی تعریف پر ماسٹر آفتاب یہی کہہ سکا۔ ابھی ان لوگوں نے مشکل سے آدھی پیالی چائے ہی پی تھی کہ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ایک لڑکی دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ لڑکی کا چہرہ

نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے بی بی! آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' عبدالمنان فوراً ہی الرٹ ہوا اور لڑکی سے پوچھا۔

''مجھے اے سی صاحب سے ملنا ہے۔'' لڑکی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''فرمایئے محترمہ! میں ہوں اے سی شہریار عادل۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' شہریار فوراً لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکی کسی مشکل میں مبتلا نظر آتی تھی اور یقیناً شہریار کی آمد کا اعلان سن کر وہاں آئی تھی۔

''م..... میں بہت مشکل میں ہوں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ لیکن میں اکیلے میں آپ کو اپنا مسئلہ بتاؤں گی۔'' لڑکی نے جواب دیا اور اپنی نقاب سے جھانکتی بڑی بڑی آنکھوں میں امید لیے شہریار کی طرف دیکھنے لگی۔ شہریار نے دیکھا کہ عبدالمنان اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شہریار نے اپنے سر کی جنبش سے اشارہ کیا جسے سمجھتے ہوئے عبدالمنان نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مشابرم خان اور ماسٹر آفتاب نے بھی اس کی پیروی کی اور سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی لڑکی نے جھٹ کمرے کا دروازہ بند کیا اور شہریار کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تشریف رکھیں۔'' شہریار نے اس سے کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب وہ قدرے مطمئن لگ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والا اس کا بھولا بھالا شفاف چہرہ چند پل کے لیے اے سی شہریار عادل کو مبہوت کر گیا۔ وہ اس چہرے کو اس سے قبل چودھری افتخار کی حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس وقت اس نے اسے صرف ایک نظر ہی دیکھا تھا لیکن پھر بھی اس کی یادداشت میں وہ چہرہ محفوظ تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس چہرے میں کشش محسوس کی تھی اور آج بھی وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل ملاقات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس نے تعلیم بھی زیادہ تر مخلوط تعلیمی اداروں میں حاصل کی تھی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور طرح دار لڑکی نظر آتی تھی۔ شہریار کبھی کسی چہرے کی طرف دیکھ کر یوں ساکت نہیں ہوا تھا لیکن اس کم عمر اور سادہ سی لڑکی کے حسن میں کچھ الگ سی بات تھی جس نے شہریار کی نظر کو باندھ لیا تھا۔ لڑکی اس کو خود پر یوں نظریں جمائے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی تو شہریار کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔

''جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ لیکن پلیز پہلے آپ مجھے اپنا نام بتا دیں۔'' وہ فوراً ہی اپنے فرض کی طرف پلٹ آیا۔

''میرا نام ماہ بانو ہے اور مجھے چودھری افتخار عالم شاہ کے چنگل سے بچنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔'' اس کی بات سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کر سکا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور ماسٹر آفتاب تیزی سے اندر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

''چودھری افتخار کی جیپ اسی طرف آ رہی ہے۔ یقیناً مسجد سے ہونے والے اعلان کی اطلاع ان تک پہنچ گئی ہے اور اب وہ آپ سے ملنے یہاں آ رہے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع نے کسی خون آشام بلا کی طرح ماہ بانو کے چہرے کا سارا خون چوس کر پل میں اسے زرد کر ڈالا۔ وہ جس سے بچنے کے لیے یہاں آئی تھی وہ خود یہاں آ رہا تھا۔ چند کرسیوں کے سوا ہر طرح کے فرنیچر سے عاری اس خالی کمرے میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اوپر دیوار میں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا لیکن اس میں بھی سلاخیں موجود تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی تو چودھری سے سامنا لازمی تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ خود شہریار بھی



پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس لڑکی ماہ بانو کی یہاں آمد کا مقصد سن چکا تھا۔ پوری بات تو اس کے علم میں نہیں آئی تھی لیکن یہ طے تھا کہ اسے چودھری سے کوئی شدید قسم کا خطرہ درپیش ہے اور اس صورتِ حال میں چودھری افتخار کا ماہ بانو کو یہاں دیکھنا اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اسے یہاں دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ وہ اس کے خلاف مدد مانگنے شہریار کے پاس آئی ہے۔ یعنی ماہ بانو اس وقت پوری طرح خطرے میں گھری ہوئی تھی لیکن شہریار بھی کیا کر سکتا تھا؟ نہ تو ماہ بانو کو چھپانے کی کوئی صورت تھی اور نہ ہی چودھری افتخار کو اندر آنے سے روکا جا سکتا تھا۔

لمحے بہت تیزی سے بیت رہے تھے۔ چودھری افتخار کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ پہنچ جاتا تو ماہ بانو کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ اپنے بچاؤ کی آخری امید کے طور پر اس نئے اے سی تک پہنچی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اے سی براہِ راست چودھری سے اس کے لیے ٹکر نہیں لے سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کا چودھری سے سامنا نہ ہو اور کوئی جائے فرار بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''پلیز سر! کچھ کریں۔ اگر چودھری نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔'' ماہ بانو کو اور کچھ سجھائی نہیں دیا تو شہریار سے ہی مدد مانگنے لگی۔ مگر شہریار خود اچھی طرح پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ یہاں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کے پیچھے ماہ بانو کو چھپایا جا سکتا۔

''آپ ادھر آ جائیں۔'' ماسٹر آفتاب جو چودھری افتخار کے آنے کی اطلاع دینے کے بعد خاموش کھڑا تھا، ماہ بانو کا جملہ سن کر فوراً ہی مستعد ہو گیا۔ اس نے تختہ سیاہ کے قریب جا کر اس کو نچلے سرے سے پکڑ کر اٹھایا۔ تختہ سیاہ دیوار میں مکمل طور پر فکس نہیں تھا۔ اس کے صرف اوپری حصے کو اسکرو کی مدد سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا۔ اس لیے جب ماسٹر آفتاب نے نچلے سرے کو اٹھایا تو وہ اچھا خاصا اوپر اٹھ گیا۔ اس اُٹھے ہوئے حصے سے دیوار میں موجود کھڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کھڑکی کو دیکھ کر ماہ بانو کے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ شہریار بھی کھڑکی کو دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا پٹ کھول دیا۔ دوسری طرف ایک رہائشی کمرا نظر آ رہا تھا جو یقینی طور پر ماسٹر آفتاب اور اس کے ساتھی ٹیچر کے تصرف میں تھا۔ کھڑکی زمین سے قدرے بلند تھی۔ شہریار نے ماہ بانو کو سہارا دیا اور وہ اس کے سہارے سے دوسری طرف کود گئی۔ شہریار نے پھرتی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دی۔ اس کے کانوں نے باہر جیپ رکنے کی آواز سن لی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے تختہ سیاہ کے نچلے سرے کو احتیاط سے دوبارہ دیوار پر ٹکا دیا۔ ماہ بانو کو فرار کا راستہ فراہم کرنے والی کھڑکی غائب ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ماسٹر آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی چودھری افتخار اپنے منشی اللہ دتا کے ساتھ کھڑا تھا۔

''السلام علیکم چودھری صاحب!'' ماسٹر آفتاب نے چودھری کو سلام کیا جسے اَن سنی کر کے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر آفتاب نے مناسب سمجھا کہ وہ خود باہر چلا جائے۔

''آیئے آیئے چودھری صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی؟ میں خود یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی حویلی پر ملاقات کے لیے آتا۔'' شہریار نے تپاک سے چودھری افتخار کا استقبال کیا۔

''اصولاً تو آپ کو پہلے وہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ پیر آباد آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمارے مہمان ہیں۔ مگر آپ نے نہ جانے کیوں ہماری حویلی چھوڑ کر اس پھٹیچر اسکول کو عزت دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ مجھے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کارندے سے اطلاع ملی ہے کہ اے سی صاحب پیر آباد آئے ہیں اور مسجد سے اپنی آمد کا اعلان کروایا ہے۔ میں فوراً دوڑا آیا کہ جانے ہم سے آپ کو کیا شکایت ہو گئی ہے جو آپ نے پیر آباد آنے کے باوجود ہماری طرف آنا پسند نہیں کیا۔'' چودھری نے خفگی آمیز انداز میں تفصیلی جواب دیا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! آپ سے بھلا کیسی شکایت؟ میں نے تو صرف اس
حویلی کا رخ نہیں کیا کہ پہلے گاؤں والوں سے مل کر ان کی شکایات سن لوں پھر بعد میں اطمینان سے آپ
ملاقات کروں گا۔ لیکن یہ آپ کا خلوص ہے کہ گاؤں کے کسی فرد کے پہنچنے سے قبل ہی آپ یہاں پہنچ گئے۔''
چودھری افتخار کی شکایت کے جواب میں شہریار نے خوشگوار لہجے میں وضاحت کی۔

''گاؤں کا کوئی بندہ اپنی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے، یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔ ان لوگوں کو برسوں
سے عادت ہے کہ یہ اپنے مسئلے مسائل لے کر حویلی آتے ہیں اور وہاں ان کے مسئلے حل بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن
یہ ماسٹر آفتاب باہر سے آیا ہوا بندہ ہے اس لیے حویلی کا رخ نہیں کرتا۔ پڑھے لکھے بندوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ
ہوتا ہے کہ وہ کسی علاقے اور ماحول کی روایات کو سمجھے بغیر اپنی عقل کے مطابق کام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔
ابھی بند کمرے میں بھی وہ یقیناً آپ سے میرے ہی خلاف شکایت کر رہا ہوگا۔'' ماسٹر آفتاب کے لیے چودھری
افتخار کے لہجے میں واضح ناراضگی محسوس ہو رہی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! ماسٹر آفتاب کو میں نے خود یہاں روکا تھا۔ اصل میں،
اس ساتھ والی زمین پر اسکول کے لیے مزید کمرے تعمیر کروانا شروع کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ پہلے ماسٹر
آفتاب سے اسکول میں بچوں کا اعداد و شمار معلوم کر لوں، پھر کام شروع کرواؤں۔ بس اسی سلسلے میں میری اس
سے گفتگو ہو رہی تھی۔'' شہریار نے نرمی سے ماسٹر آفتاب کی صفائی پیش کی۔

''میرے خیال میں تو اسکول کے لیے مزید کمروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ
لوگوں کے لیے تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نسلوں سے کھیتی باڑی کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی روزی
روزگار کھیتی باڑی سے وابستہ ہے اور اس ہنر کو سیکھنے کے لیے انہیں گاؤں کے اس اسکول میں آنے کے بجائے
کھیتوں میں اپنے بڑوں کے ساتھ رہ کر کام سیکھنے کی ضرورت ہے۔'' چودھری نے ناگواری سے شہریار کی بات کا
جواب دیا۔

''مجھے آپ کی بات سے زیادہ اختلاف نہیں چودھری صاحب! لیکن تعلیم کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ تعلیم
صرف روزگار کے حصول کے لیے ہی نہیں، شعور کی بیداری کے لیے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں
تو یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں گے تو زیادہ بہتر طریقوں سے اپنے آباؤ اجداد کی زمینوں کو آباد کرنے کا سوچیں
گے۔ جدید دور کے تقاضے نبھانے کے لیے ہمارے کاشت کاروں کا بھی جدید تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر
ایسا نہ ہوتا تو زرعی یونیورسٹیوں کا قیام کیوں عمل میں آتا؟ حکومت نے زرعی یونیورسٹیاں اسی لیے تو بنائی ہیں کہ
لوگ وہاں سے پڑھ لکھ کر اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ اور بہترین پیداوار حاصل کریں۔'' شہریار نے
چودھری افتخار کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''آپ اس بات کو نہیں سمجھتے اے سی صاحب! پڑھ لکھ کر یہ لڑکے اپنی زمینوں پر کام کرنا پسند نہیں کرتے
بلکہ میز کرسی والی نوکری کی تلاش میں شہر چلے جاتے ہیں۔'' چودھری نے شہریار کی مخالفت کی۔

''میرا نہیں خیال کہ گاؤں کے تمام کے تمام لڑکے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں سے شہروں کا رخ
لیں گے۔ شہر اتنی بڑی تعداد میں دیہاتوں سے آنے والے تمام افراد کو روزگار فراہم نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں
اپنی جگہ پر رہ کر اپنی ہی زمینوں سے روزی حاصل کرنا ہوگی۔ اگرچہ چند فیصد لوگ شہروں میں منتقل ہو بھی جاتے
ہیں تو اس سے کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔''

''میں جانتا ہوں، آپ میری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ آپ اس ماحول کو ہی نہیں سمجھتے۔ بہرحال



آپ سے اسکول کے مسئلے پر بحث کرنے آیا بھی نہیں ہوں مگر یہ بات نکل ہی آئی ہے تو میں آپ کو یہ اطلاع
دوں کہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر میں نے موبائل کمپنی والوں کو اپنا ٹاور نصب کرنے کی اجازت دے
دی ہے۔ وہ جلد یہاں آ کر اپنا کام شروع کر دیں گے۔'' چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ اس
نے کتنی گہری چال چلی تھی۔ وہ شہریار پر یہ احسان پہلے ہی جتا چکا تھا کہ وہ اس کے کہنے پر اپنے علاقے کی
بہتری اور ترقی کے لیے یہاں موبائل سروس شروع کروانے والا ہے۔ اب اس نے اپنا دوسرا کارڈ بھی شو کر دیا
تھا کہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر موبائل کمپنی کا ٹاور نصب کروا کر اس مسئلے کا مستقل حل نکالنے کی کوشش کر
کے اس کا کہ اسکول میں توسیع کی دوبارہ کوشش ہی نہ کی جا سکے۔ چودھری افتخار کی اس عیاری پر شہریار کے لیے اپنے
غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''دیکھیں چودھری صاحب! اسکول کے سلسلے میں، میں اوپر سے منظوری لے چکا ہوں۔ یہ زمین گورنمنٹ
کی ملکیت ہے اس لیے اسے کس کام میں لایا جائے، یہ فیصلہ کرنا گورنمنٹ کا کام ہے۔ اور فیصلہ ہو چکا ہے البتہ
میں آپ کو یہ آفر ضرور کر سکتا ہوں کہ اسکول کے لیے کمرے تعمیر ہونے کے بعد جو جگہ باقی بچ جائے آپ وہاں
موبائل کمپنی والوں کو کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔''

''چلیں جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہو جائے گا۔ آخر دونوں ہی کام میرے گاؤں کی بھلائی کے لیے ہو رہے
ہیں۔ مجھے دونوں میں سے کسی پر بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' شہریار کا خیال تھا کہ اس کا لہجہ چودھری افتخار کو
ناگوار گزرے گا لیکن اس نے تو فوراً ہی پینترا بدل لیا تھا اور یوں مسکرا کے شہریار کی بات کی تائید کر رہا تھا جیسے
اسے کبھی بھی اسکول کے معاملے میں کوئی اختلاف نہ رہا ہو۔ اُس کے انداز کی اس تبدیلی کے بعد شہریار کے
لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے انداز کو بدستور خشک رکھتا، چنانچہ وہ بھی ایک جوابی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر چودھری
افتخار کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''چلیں پھر یہ معاملہ تو طے ہو گیا۔ اب آپ میرے ساتھ حویلی چلیں۔ اتنی دیر میں آپ یہ اندازہ تو کر ہی
چکے ہوں گے کہ گاؤں کا کوئی فرد اپنی شکایت سنانے آپ کے پاس نہیں آئے گا۔''

وہ اتنی دیر میں واقعی اندازہ کر چکا تھا کہ گاؤں کا کوئی فرد اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا چودھری
کے رعب و دبدبے کی وجہ سے تھا۔ لوگ اس سے اتنا ڈرتے تھے کہ شہریار کے پاس آ کر اپنی کوئی شکایت نوٹ کروانے
کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن برابر والے کمرے میں ایک لڑکی موجود تھی جو نہ صرف یہاں آئی تھی بلکہ صاف
طور پر یہ بھی کہا تھا کہ اسے چودھری سے خطرہ ہے۔ شہریار کے لیے اس لڑکی کی شکایت سننا ضروری تھا لیکن وہ
چودھری کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ یک دم ہی اسے ایک درمیانی راہ سوجھ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر چودھری صاحب! لیکن آپ کو اگر میری میزبانی کرنی ہے تو ذرا زحمت اٹھانا
پڑے گی۔ اصل میں، میں یہاں مختصر سے دورے پر آیا تھا۔ دفتر میں اس وقت کئی کام ایسے ہیں جنہیں فوری توجہ
کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے یہاں رکنے کی صورت میں میرا پی اے عبدالمنان دفتر جا کر وہ کام
کر لے۔ اب ظاہر ہے عبدالمنان یہاں سے جائے گا تو میں اپنی گاڑی اور ڈرائیور سے محروم ہو جاؤں گا اس
لیے آپ کو یہ زحمت کرنی ہوگی کہ مجھے اپنی گاڑی سے میرے دفتر واپس چھڑوا دیں۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ بے شک اپنی گاڑی واپس بھجوا دیں۔ یہاں ہم موجود ہیں نا آپ کی
خدمت کے لئے۔'' چودھری افتخار کا جواب حسب توقع تھا۔ اس جواب کے بعد شہریار نے مزید وہاں رکنا غیر
ضروری سمجھا اور باہر آ کر عبدالمنان کو سرگوشی میں ہدایات دینے کے بعد چودھری کے ساتھ اس کی حویلی روانہ ہو

گیا۔ حویلی پہنچ کر روایتی خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چودھری افتخار، شہریار کو اپنے آباؤ اجداد کی برتری، بہادری اور تعلقات سے متعلق قصے سناتا رہا۔ آ گھنٹے بعد انہیں کھانا لگنے کی اطلاع دی گئی۔ شہریار چودھری افتخار کے ساتھ اس کے شان دار ڈائننگ روم آیا۔ صرف عرس والے دن حویلی میں مہمانوں کو فرشی دستر خوان لگا کر کھانا کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا ا شاید مہمانوں کی بڑی تعداد اور موقع کی مناسبت کے اعتبار سے ہوا تھا ورنہ حویلی کا ڈائننگ روم کافی دیدہ اور جدید انداز میں آراستہ تھا۔ اس سے پہلے شکار پر جانے کے موقع پر بھی وہ اس ڈائننگ روم میں آ چکا تھا بھی ڈائننگ ٹیبل پر لذتِ کام و دہن کے لیے بہت سے لوازمات موجود تھے۔ چودھری کے اصرار پر وہ اس سلوٰی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کھانا ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ منشی اللہ رکھا کچھ پریشان سا ڈائننگ روم داخل ہوا۔

''کیا بات ہے منشی؟'' چودھری نے ناگواری سے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چودھری صاحب! غیاث محمد آیا ہے۔'' منشی اللہ رکھا نے آہستہ سے بتایا۔

''کیوں؟..... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ اور اس کی گھر والی یہاں سے گئے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ نہیں کوئی کمی لگ رہی ہے تو تم اس معاملے کو نمٹا دو۔ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہو؟'' چودھری کا لہجہ کچھ ا سخت ہو گیا۔''

''مسئلہ کچھ اور ہے چودھری صاحب!'' منشی سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور پھر چودھری افتخار کے قریب جا کر اسے سرگوشی میں کچھ بتایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سب طرف اپنے بندے دوڑا دو۔ بس کے اڈے سے معلوم کرو۔ اور اگر معلوم نہ ہو تو غیاث محمد سے فیصل آباد کا پتہ لے کر اُدھر آدمی بھجواؤ۔ اسے اگر یہاں سے نکلنے میں کامیابی گئی تو زیادہ سے زیادہ فیصل آباد تک ہی جا سکتی ہے۔'' منشی کی سرگوشی کے جواب میں چودھری افتخار غضب ہو کر ہدایات دینے لگا۔ منشی اس کی ہدایات پر سر ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ خود چودھری افتخار کا یہ عالم پورا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے ساتھ رکھے کھانے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

''خیریت تو ہے چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟'' شہریار جو کچھ کچھ معا نوعیت سمجھ رہا تھا، لہجے میں تشویش سمو کر اس سے پوچھنے لگا۔

''خیریت ہی ہو گی۔ چودھری افتخار کو دھوکا دے کر نکل جانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ کسی سا پھنکار سے مشابہ تھا۔

''اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' شہریار نے پیشکش کی۔

''شکریہ اے سی صاحب! معاملہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے۔ بہر حال، میں اس سے نمٹ لوں گا۔'' اس انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مشکل سے خود پر ضبط کر کے بیٹھا ہے۔ شہریار نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور اپنی میں باقی رہ جانے والا کھانا جلدی جلدی ختم کر کے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈائننگ روم سے باہر نکلنے کے اس نے چودھری افتخار سے واپسی کی درخواست کی۔ چودھری شاید خود بھی یہی چاہتا تھا اس لیے اس نے کے مزید رکنے پر اصرار نہیں کیا اور فوری طور پر اس کی واپسی کے لیے گاڑی مہیا کر دی۔

⊛----✪----⊛



''ہاں عبدالمنان! کیا بتایا اس لڑکی نے اپنے بارے میں؟'' شہریار نے واپس پہنچنے کے بعد عبدالمنان سے پہلے ماہ بانو کے متعلق ہی استفسار کیا۔

''اس نے مجھے زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں سر! اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے چودھری افتخار کی طرف خطرہ درپیش ہے اور وہ ہمارے پاس اس لیے آئی ہے کہ ہم گاؤں سے نکلنے میں اس کی مدد کریں۔ وہ ایک بیگ بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ زیادہ دیر پیر آباد میں نہ رکوں اس لیے میں اس ساتھ یہاں لے کر آ گیا ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اسے فیصل آباد جانے والی کسی بس میں سوار لیکن میں آپ کی مرضی کے بغیر اس کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے اسے روک لیا'' عبدالمنان نے شہریار کو بتایا۔

''تم نے بہت اچھا کیا۔ چودھری کو بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی پیر آباد سے نکلنے کے بعد فیصل آباد کرے گی۔ کچھ دیر پہلے اس نے میرے سامنے ہی اپنے بندوں کو فیصل آباد جانے کا حکم دیا ہے۔'' نے پُرسوچ انداز میں عبدالمنان سے کہا۔ چودھری افتخار کی دعوت پر حویلی جانے سے اسے کم از کم یہ فائدہ تھا کہ اتفاقاً ہی سہی، چودھری افتخار کے خلاف مدد مانگنے آنے والی لڑکی کی اس بات کی تصدیق ضرور ہو کہ وہ چودھری کی طرف سے خطرے کا شکار ہے۔

''لڑکی کہاں ہے عبدالمنان؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ اسے تمہارے ساتھ یہاں ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا؟''

''نو سر! پیر آباد میں ماسٹر آفتاب اور یہاں میرے اور مشاہرم خان کے علاوہ کسی کو لڑکی کے بارے میں علم گیٹ پر چوکیدار نے اگر دیکھا بھی ہو گا تو یہ اندازہ نہیں کر پایا ہو گا کہ ہمارے ساتھ آنے والی لڑکی کون'' شہریار کے سوال پر عبدالمنان نے اسے تسلی دی اور خود باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو ماہ بانو ساتھ تھی۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی لگ رہی تھی اور اس نے چادر کو بہت مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

''بیٹھو!'' شہریار نے نرمی سے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس انداز سے پر لگ گئی کہ لگتا تھا اگلے ہی لمحے اُٹھ کر باہر نکل جائے گی۔

''آرام سے بیٹھو اور مجھے تفصیل سے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ تم جو کچھ بتاؤ گی، وہ میرے علاوہ کسی اور کے علم میں آئے گا۔ اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے۔'' شہریار نے اس کا انداز دیکھتے ہوئے نرمی سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شہریار کی بات سے اشارہ پاتے ہوئے عبدالمنان کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' شہریار نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

''چودھری افتخار بہت بری فطرت کا آدمی ہے۔ میں آپ سے بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس سے بچا کر فیصل آباد میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔''

''تو کیا تم پیر آباد کی رہنے والی نہیں ہو؟'' شہریار، ماہ بانو کی بات سن کر چونکا۔

''نہیں۔'' ماہ بانو نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ پیر آباد میں اپنی بہن کی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ میرے ابا نے شادی کے بعد زبردستی مجھے روک لیا کہ دو چار دن رک کر ماں ابا دو پھر میں خود تمہیں فیصل آباد چھوڑ آؤں گا۔ میں چودھری افتخار کے خوف سے رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ سب کے اصرار پر رُکنا پڑا۔ پر میرا خوف صحیح تھا۔ چودھری نے موقع دیکھ کر مجھے پانے کی کوشش شروع کر اب تو میرے اپنے ماں باپ بھی مجھے اس بدنیت انسان کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ بس

مجھے فیصل آباد پہنچا دیں۔ وہاں بے بے اور ابا میرے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔'' رُندھی ہوئی آواز اپنا مسئلہ بتاتے ہوئے ماہ بانو نے ایک بار پھر شہریار سے اصرار کیا۔

''دیکھو تم بالکل شروع سے اور ذرا تفصیل سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تمہاری باتوں سے میں پوری سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ فیصل آباد اور پیر آباد میں سے اصل میں کون سی جگہ تمہارے ماں باپ رہتے ہیں اور تم سے ہی چودھری افتخار سے کیوں خوف زدہ تھیں؟'' شہریار نے ماہ بانو کے جواب پر کچھ اُلجھ کر اس سے دریافت کیا۔

''پوری طرح میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو میرا بیک گراؤنڈ سمجھنا پڑے گا۔'' ماہ بانو نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

''آج چودھری نے میرے ماں باپ کو حویلی بلوایا ہوا تھا۔ وہ لوگ میری بہن زہرہ کو میری نگرانی پر کر گئے تھے۔ زہرہ نے میری حالت دیکھی تو نہ رہ سکی اور کہنے لگی کہ تم مجھے غسل خانے میں بند کر کے یہاں نکل جاؤ۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نہانے گئی تھی، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب ماہ بانو باہر سے غسل خانے کی کنڈی لگا کر گھر سے نکل گئی۔ میں نے بہن کے کہنے پر عمل کیا۔ ابھی میں گھر سے نکلی ہی تھی کہ مسجد سے اعلان ہوا کہ اے سی صاحب گاؤں میں موجود ہیں، اگر گاؤں کے کسی فرد کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو وہ اسکول آ کر اے سی صاحب سے مل سکتا ہے۔ اس اعلان کو سن کر مجھے خیال آیا کہ جو اے سی از خود گاؤں آ کر گاؤں والوں کے مسائل سننے میں دلچسپی رکھتا ہے وہ یقیناً اچھا انسان ہوگا۔ بس اسی لیے میں اسکول پہنچ گئی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہیں بس کے اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی کوئی مجھے راستے میں ہی نہ دھر لے۔ اس لیے آپ کی مدد لینا مناسب معلوم ہوا۔ میں نے آپ کے پی اے سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے فیصل آباد جانے والی بس میں بٹھا دے لیکن جانے کیوں انہوں نے میری بات نہیں سنی اور مجھے یہاں لے آئے۔'' ماہ بانو نے شہریار کے سامنے تفصیل سے سارا معاملہ بیان کرتے ہوئے آخر میں شکوہ کیا۔

''میرا پی اے ایک عقل مند اور تجربہ کار آدمی ہے۔ اس نے بہت اچھا کیا کہ تمہیں بس اڈے پر نہیں لے گیا۔ چودھری افتخار نے سب سے پہلے اپنے بندوں کو اسی طرف دوڑایا تھا۔ اس نے فیصل آباد بھی اپنے بندے روانہ کر دیئے ہیں تاکہ تم جیسے ہی وہاں پہنچو، ان کی گرفت میں آ جاؤ۔''

''آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' ماہ بانو نے شہریار کی فراہم کردہ معلومات پر متوحش ہو کر پوچھا۔

''اتفاق سے چودھری افتخار نے یہ سارے احکامات میرے سامنے ہی دیئے تھے۔ اس کے منشی نے وہاں موجودگی کے دوران کسی غیاث محمد نامی شخص کے آنے کی اطلاع دے کر چپکے سے چودھری کو کچھ بتایا۔ یقیناً اس نے تمہارے غائب ہونے کی اطلاع ہی دی تھی۔ کیونکہ چودھری ایک دم بہت غصے میں آ گیا تھا۔ اس نے منشی کو بس اڈے اور فیصل آباد کی طرف بندے دوڑانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سارے احکامات تمہارے سلسلے میں دیئے جا رہے ہیں۔ اب تم سے بات کرنے کے بعد تو میرا فیصد بھی اپنے اندازے کی درستگی پر شک نہیں رہا ہے۔'' شہریار نے ماہ بانو کو جواب دیا۔

''اُف خدا! میں اب کہاں جاؤں گی؟ فیصل آباد کے سوا تو میرا دوسرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں۔'' ماہ بانو پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ وہ اپنے اس پریشان روپ میں بھی بہت دلکش لگ رہی تھی۔ شہریار نے اسے ایک بار چودھری افتخار کے دادا کے عرس کے موقع پر دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی اس کے چہرے پر قدرے پریشانی کے باوجود تروتازگی اور شادابی تھی۔ وہ تروتازگی اور شادابی آج کچھ ماند نظر آتی تھی۔ شاید مسلسل ڈپریشن اور خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ اس کے باوجود شہریار خود سے اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ اب بھی



اتنی خوبصورت ہے۔ چودھری افتخار یوں بلاوجہ ہی تو اس کے لیے پاگل نہیں ہوا تھا کہ اپنی ابتدائی کوششوں کی ناکامی کے بعد سیدھے سیدھے شادی کی بات پر آ گیا تھا۔ حیثیت کے اعتبار سے تو ماہ بانو، چودھری کے پاسنگ بھی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا حُسن اتنا بھرپور تھا کہ چودھری نے اپنے سے بے حد نچلی حیثیت کے خاندان میں شادی کرنا منظور کر لیا تھا۔ اس کیس نے چودھری کی شخصیت کا ایک اور رنگ شہریار پر ظاہر کر دیا تھا۔ وہ شخص اپنے ہمسروں کے معاشی اور معاشرتی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کی عزتوں کا بھی دشمن تھا۔ حکمرانی کے زعم، دولت کے نشے اور ہوس نے اسے اس بری طرح جکڑ رکھا تھا کہ دو دو بیویاں رکھنے کے باوجود اس پر خود سے بے حد کم عمر اس لڑکی کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ شہریار ان سارے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے اس کی خاموشی پر گھبرا کر باقاعدہ سسکنا شروع کر دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سن کر شہریار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مت رو۔ تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ اب تک تم نے سارے حالات کو بہت بہادری سے فیس کیا ہے۔ اب بھی ہمت سے کام لو۔ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو آنسوؤں کی نہیں بلکہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' شہریار کو اس کا رونا بے چین کر رہا تھا اس لیے وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس کی تسلیوں پر ماہ بانو نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور چادر کے پلّو سے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔ شہریار نے اپنی ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ماہ بانو نے گلاس تھام لیا اور دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ اب وہ خود کو سنبھال چکی تھی لیکن نم نم سی آنکھوں میں اُتر آنے والے سرخ ڈوروں نے اس کی آنکھوں کو اور بھی پُرکشش بنا دیا تھا۔ شہریار نے اس کی آنکھوں کی کشش سے نظریں چراتے ہوئے انٹرکام پر عبدالمنان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

''عبدالمنان! فوری طور پر اس لڑکی کے کسی محفوظ جگہ رہنے کا بندوبست کرنا ہے۔ کسی ایسی جگہ جہاں یہ امان خاموشی سے رہ سکے۔ پھر میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ اس کے لیے کسی محفوظ مقام کی فراہمی ہے۔''

عبدالمنان کے اندر آتے ہی شہریار نے اس سے کہا۔

''میں خود بھی اس معاملے پر سوچتا رہا ہوں سر! اگر اس کیس میں چودھری افتخار ملوث نہیں ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن چودھری کی وجہ سے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میرے خیال میں تو ہمارے علاقے میں کوئی بھی جگہ ان محترمہ کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ اس پورے ضلع میں چودھری کا اچھا خاصا اثر و رسوخ ہے۔ اس کے بندے آرام سے ان صاحبہ کو تلاش کر لیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم انہیں فوری طور پر لاہور کسی دارالامان میں منتقل کر دیں۔ بعد میں کسی این جی او وغیرہ کی مدد سے اس معاملے کو اٹھایا جا سکتا ہے۔''

عبدالمنان نے شہریار کو مشورہ دیا جو اسے مناسب معلوم ہوا۔

''ٹھیک ہے عبدالمنان! ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن اسے لاہور کس کے ساتھ بھجواؤ گے؟ اس کام کے لیے ہمیں تو کسی اعتماد کے بندے کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''مشاہرم خان ہے نا سر! اس پر آپ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں اس کو صورتِ حال اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ ساتھ ہی دارالامان کی انتظامیہ کے نام ایک خط بھی لکھ دوں گا تاکہ وہ لوگ ان محترمہ کی موجودگی کو مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھیں۔'' شہریار کی تشویش کے جواب میں عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم جس طرح مناسب سمجھو اس کیس کو ہینڈل کر لو۔'' شہریار نے عبدالمنان کو جواب دیا۔

''آیئے محترمہ!'' عبدالمنان نے ماہ بانو کو پکارا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے

باہر نکلتے ہی شہریار کو کمرے کے بے حد خالی ہونے کا احساس ہوا لیکن اس نے فوراً ہی اس احساس کو اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے ایک فائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

⊛----✪----⊛

غیاث محمد، چودھری افتخار کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چودھری کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتا غضب اس کے اوسان خطا کیے دے رہا تھا۔

''قسم لے لیں سرکار! میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اور نوراں تو اسے گھر چھوڑ کر آپ کے حکم پر حویلی آ رہے تھے۔ وہ پیچھے سے کیسے نکل بھاگی، ہمیں خبر نہیں۔ ہمیں تو گھر جا کر ہی معلوم ہوا اور میں سب سے پہلے آپ کو اطلاع کرنے دوڑا ہوا آیا۔'' کپکپاتی آواز میں اس نے بڑی مشکل سے اپنی صفائی پیش کی۔

''زیادہ معصوم نہ بن غیاث محمد! تیرا کام تھا کہ تُو اپنی دِھی کو قابو میں رکھتا۔ میں دو ملاقاتوں میں اس کی فطرت پہچان گیا تھا۔ تُو اُس کا باپ ہو کر کیسے نہیں جان سکا کہ تیری دِھی کسی اَتھری گھوڑی کی طرح ہے جسے لگام ڈال کر رکھنا ضروری ہے۔ تُو نے اپنی ذمے داری پہچانی ہی نہیں۔ بجائے اس کے کہ حویلی آتے ہوئے اس کا بندوبست کر کے آتا، تُو اُلٹا مجھ پر احسان جتانے بیٹھ گیا ہے کہ میرے بلاوے پر تُو اور تیری گھر والی یہاں آ رہے تھے اور پیچھے جو کچھ ہو گزرا، تُو اس کا ذمے دار نہیں۔'' غیاث محمد کی بات پر چودھری غضب ناک ہو کر چنگھاڑا۔

''معاف کر دیں سرکار! میری نسلیں آپ پر قربان ہو جائیں۔ میں بھلا یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ پر کوئی الزام دھروں؟'' غیاث محمد فوراً ہی چودھری کے قدموں میں گر گیا۔

''تیرا جرم معاف کرنے کے لائق نہیں غیاث محمد! ماہ بانو تیرے پاس ہماری امانت تھی۔ تُو نے ہماری امانت کی حفاظت نہیں کی۔ کیسے اس نے تیرے گھر کی دہلیز پار کی؟ تُو اُسے گھر میں چھوڑ کر آتے وقت کوئی بندوبست کر کے کیوں نہیں آیا؟'' چودھری، ماہ بانو کے اس طرح ہاتھ سے نکل جانے پر بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ اس تلملاہٹ کا اظہار کرنے کے لیے فی الحال اسے غیاث محمد ہی میسر تھا۔

''میں اُسے بہن کی نگرانی پر چھوڑ کر آیا تھا سرکار! وہ بے چاری ہمارے کہنے پر اس کے پاس رُکی ہوئی تھی، پر ماہ بانو نے اسے دھوکا دیا۔ زہرہ بتا رہی تھی کہ وہ ماہ بانو کو سوتا سمجھ کر غسل خانے میں گئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ماہ بانو سونے کا مکر کر رہی ہے اور اسے غسل خانے میں بند کر کے چلتی بنے گی۔ اس بے چاری کو تو خود خبر نہیں ہوئی کہ کب ماہ بانو نے باہر سے غسل خانے کی کنڈی چڑھا دی۔ وہ تو جب اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا تو پتہ چلا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ ہمارے گھر پہنچنے تک وہ خود غسل خانے کا دروازہ اندر سے پیٹ پیٹ کر ہلکان ہو گئی تھی۔'' غیاث محمد نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''بند کر یہ ساری بکواس۔ مجھے تیرے یہ دُکھڑے نہیں سننے ہیں۔

تیرا کیا ہے، تیری کون سی عزت ہے جو بیٹی کے اس طرح بھاگ جانے سے خراب ہو گی۔ پگ تو میری اُچھلے گی نا کہ چودھری افتخار کی ہونے والی بیوی نکاح سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔'' چودھری نے غیاث محمد کو لتاڑا۔

''نہ سرکار! پگ اُچھلے آپ کے دشمنوں کی۔ ہم نے تو ابھی تک کسی کو یہ بات بتائی بھی نہیں تھی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ آپ کی طرف سے بیاہ کا جوڑا اور زیورات لے کر جائیں گے تو سارے گاؤں کو اکٹھے خبر کریں گے۔ ابھی تو یہ بات صرف میری بیٹیوں اور دامادوں تک تھی۔ ابھی تو میں نے حوراں اور صفدر کو بھی خبر نہیں بھجوائی تھی۔ آپ سے



اس سرکار! ہم میں سے جس جس کو یہ بات معلوم ہے، وہ بھولے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ آپ کی عزت ہمیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ آپ پر تو ہم اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہیں۔ ماہ بانو یہاں سے نکل بھی گئی تو آپ کی پہنچ سے باہر کہاں جائے گی؟ آپ اس کے ہاتھ آ جانے پر اگر اس کی کھال بھی کھنچوا لیں تو وہ اپنے اس نمک خوار کی زبان سے ''اُف'' تک نہیں سنیں گے۔ میں نے دِھی آپ کو دینے کی ہامی بھر لی تھی، تو وہ اس پر سے حق ختم ہو گیا۔ وہ آپ کی چیز ہے۔ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ وہ سلوک کیجیے گا۔'' غیاث محمد اپنی چاپلوسیوں سے اس بات کا پکا انتظام کر رہا تھا کہ ماہ بانو کے اٹھائے ہوئے قدم کا نتیجہ اسے خود نہ بھگتنا پڑے اور وہ چودھری کے عتاب سے محفوظ رہے۔

''بس اڈے پر جانے والے آدمی واپس آ گئے ہیں چودھری صاحب! انہوں نے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ دو گھنٹے پہلے جو بس وہاں سے نکلی تھی، اس میں کوئی تنہا لڑکی نہیں تھی۔ ابھی جو بس فیصل آباد جانے کے لیے نکلی ہے، اس کی بہت اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ اس میں بھی غیاث محمد کی دِھی نہیں ہے۔'' اس وقت منشی اللہ رکھا وہاں آ گیا اور چودھری افتخار کو اطلاع دی۔

''پھر کہاں جا سکتی ہے وہ؟ تم اسے گاؤں میں تلاش کرو، ہو سکتا ہے کسی رشتے دار کے گھر چھپی بیٹھی ہو۔'' منشی کی اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے چودھری نے اسے ہدایت دی۔

''میں نے یہ کام پہلے ہی شروع کروا دیا تھا۔ غیاث محمد کی دونوں بیٹیوں کے گھروں کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ اب میں اس کی زنانی کے ساتھ اپنے اعتبار کی دو ایک عورتوں کو لگا کر بہانے سے ان کے سارے گھروں کی تلاشی کروا رہا ہوں جن پر شک کیا جا سکتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ اگر اس کی دِھی گاؤں میں ہی ہے تو یہاں سے نکل کر کہیں نہیں جا سکے گی۔ دوسری صورت میں، میں نے فیصل آباد کی طرف تو بندے دوڑا ہی دیئے ہیں۔ وہاں سے نہ سہی، وہاں سے اس کا پتہ مل جائے گا۔'' منشی اللہ رکھا نے چودھری افتخار کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی دی۔

''یہ اچھا کام کیا تُو نے۔ پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ اگر وہ بس میں سوار نہیں ہوئی تو پھر فیصل آباد کیسے پہنچے گی؟'' چودھری افتخار، ماہ بانو کو پانے کے لیے جتنا بے چین تھا، اس کے غائب ہونے سے اتنا ہی باؤلا ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن چل رہا تھا کہ کسی طرح گھڑی کی چوتھائی میں ماہ بانو کو تلاش کر کے اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے۔

''ہو سکتا ہے وہ کسی خاندان کے ساتھ مل کر بیٹھ گئی ہو، اس لیے کسی کو اندازہ نہ ہو سکا ہو۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے بس میں جانے کے بجائے سڑک پر سے گزرنے والی کسی پرائیویٹ گاڑی یا لوڈر وغیرہ سے لفٹ لے لی ہو۔ بہرحال، جو بھی صورت بنی ہو، آپ اس بات کی تسلی رکھیں کہ ہمارے بندے اسے تلاش کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے۔'' منشی اللہ رکھا نے ایک بار پھر چاپلوسانہ انداز میں چودھری افتخار کو تسلی دلا دیا۔ چودھری افتخار فی الحال اس تسلی پر ہی بھروسہ کر سکتا تھا، چنانچہ منشی کی بات پر ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟'' غیاث محمد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری افتخار سے پوچھا۔

''تُو جا اور جا کر کہیں سے اپنی دِھی کو تلاش کر۔ اگر وہ نہیں ملی تو سمجھ لینا کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہو گا۔'' چودھری افتخار نے قہرناک لہجے میں فیصلہ سنایا۔ غیاث محمد اس فیصلے کو سن کر کانپ اٹھا اور لرزتا ہوا چودھری افتخار کے قدموں میں گر گیا۔

''رحم سرکار، رحم! میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ میری بدبخت اولاد کی کرنی کی سزا مجھے نہ دیں۔ وہ بدنصیب تھی جو آپ کی بخشی عزت کی قدر نہیں کر سکی۔ میں اور اس کی ماں تو بڑے شوق سے آپ کے دیئے ہوئے

کپڑے اور زیور لے کر گھر گئے تھے کہ وہ اتنی قیمتی چیزیں دیکھے گی تو اپنے نصیبوں پر ناز کرے گی لیکن کرموں جلی نے تو اپنے نصیب کو ٹھوکر مارنے کے ساتھ ساتھ ہمارے بخت پر بھی سیاہی پھیر دی۔ پر آپ پر رحم کریں سرکار! اگر آپ کا ہاتھ میرے سر سے اٹھ گیا تو میں کہاں جاؤں گا؟'' غیاث محمد عورتوں کی دہائیوں پر دُہائیاں دے رہا تھا لیکن چودھری افتخار نے کان نہ دھرے اور غیاث محمد کو وہیں خاک چاٹتا چھوڑ کر اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

⊛----✪----⊛

''جانے کیا بات ہے؟ بھا غیاث نے ماہ بانو کو واپس لا کر نہیں چھوڑا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا دن سے زیادہ میری دِھی کو مت روکنا، پر دیکھو آج تیسرا دن بھی گزر گیا ہے اور بھا غیاث کا کوئی نام و نہیں۔'' فیصل آباد میں اپنے گھر بیٹھی حوراں نے صفدر سے پریشانی کا اظہار کیا۔

''تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اپنے بھا غیاث کا مزاج جانتی نہیں ہے؟ جب اُس کا من کرے گا، ماہ بانو کو لا کر چھوڑے گا۔''

''پر مجھے تو ماہ بانو کی فکر ہو رہی ہے۔ کتنی بددلی سے وہ وہاں رکنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کی شکل کر میرا اپنا جی نہیں مان رہا تھا کہ میں اسے وہاں چھوڑ کر آؤں۔ اتنی سی صورت نکل آئی تھی میری دِھی کی حوراں کا دل حقیقتاً ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔

''جی تو میرا بھی نہیں مان رہا تھا، پر میں خود پر جبر کر گیا۔ اگر ماہ بانو کو واپس لانے پر ضد کرتا تو بھا اپنی اصلیت پر اُتر آتا اور خوامخواہ کی بدمزگی ہو جاتی۔ خوشی کے موقع پر بدمزگی پھیلانا مجھے اچھا نہیں لگا۔'' اس صفدر نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا کرنا کہ کل تم اب پیر آباد جا کر ماہ بانو کو واپس لے آنا۔ پتہ نہیں کیوں میرا جی اس کی طرف سے پریشان ہو رہا ہے۔ پچھلی بار بھی جب وہاں رکنے گئی تھی تو بیمار ہو کر واپس آئی تھی۔ آنے کے بعد بھی کئی دن تک کچھ پریشان پریشان سی لگی۔ اصل میں گاؤں کا ماحول اس کے جی کو بھاتا نہیں ہے۔ زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے جانے پر بھی بڑی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ حالانکہ کہنے کو زہرہ اس کی سگی بہن ہے، پر وہاں گاؤں میں کوئی میری دِھی کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آتا۔ اس لیے وہ گاؤں جا کر رہنے کے نام سے بدکتی ہے۔''

''اچھا چل، زیادہ اپنا دل میلا نہ کر۔ آخر وہ لوگ کیوں اسے پیار نہیں کریں گے؟ کچھ بھی سہی، ماہ بانو ان کی سگی ہی ہے۔'' حوراں کی تشویش پر صفدر نے اسے سمجھایا۔

''ان لوگوں نے اسے کبھی اپنا سمجھا ہی کب ہے؟ جیسے پیدائش پر بوجھ سمجھا۔ اب تک ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ اتنے سالوں میں کبھی ایک بار بھی توفیق نہیں ہوئی کہ کسی عید برات کے موقع پر اسے ایک جوڑا بنا کر دے دیں۔'' حوراں ویسے ماہ بانو کو سمجھاتی رہتی تھی لیکن آج خود سارے شکوے لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''چل جانے بھی دے۔ ان لوگوں کے حالات ہی کہاں ہیں ایسے کہ وہ کچھ کر سکیں۔ اللہ کا کرم ہے میری دِھی کے نصیب سے اس نے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں خود اس کے سارے شوق پورے کر دیتا ہوں اب بھی بس یہ فکر لگی ہے کہ اتنے روپے جوڑ لوں کہ اس کو ڈاکٹری پڑھانے کا انتظام ہو جائے۔'' صفدر نے حوراں کو ٹوکتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔



''ہاں، پڑھنے کا تو اسے بڑا شوق ہے۔ میں نے اس کے لیے جو گہنے بنائے تھے، وہ اسے دیئے تو مجھ سے لڑنے لگی کہ بے بے! یہ گہنے کیوں بنوائے؟ میرے داخلے کے لیے روپے سنبھال کر رکھ لیتیں۔ میں نے بھی ماں کہہ دیا کہ یہ تیرا اور تیرے ابّے کا معاملہ ہے۔ داخلے واخلے کا انتظام وہ خود کرے گا، میرے ذمے تو تیرا بیاہ رچانا ہے۔'' حوراں کا دھیان بٹ گیا اور وہ ہنس کر صفدر کو بتانے لگی۔

''انشاء اللہ میں اُس کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میرے لیے تو ماہ بانو ہی بیٹی بھی ہے اور بیٹا بھی۔ میرے بس میں جتنا ہوا میں اس کے لیے اتنے ارمان تو ضرور ہی پورے کروں گا۔''

''اللہ تمہیں ہمت دے۔'' صفدر کی محبت کو محسوس کر کے حوراں مسکرائی، پھر چونک کر پوچھنے لگی۔ ''تم نے ماہ بانو کے کالج میں اس کی چھٹی کی درخواست نہیں دی تھی کیا؟ آج شام کے وقت ایک لڑکی آئی تھی ماہ بانو سے ملنے کے لئے۔ میں نے بتایا کہ ابھی ماہ بانو گاؤں سے واپس نہیں آئی تو حیران ہو کر کہنے لگی کہ اچھا! میں تو سمجھی تھی ماہ بانو آج واپس آ گئی ہے۔ تھوڑی دیر اندر آ کر بھی بیٹھی اور سارے میں یوں نظر گھما گھما کر دیکھنے لگی جیسے اس نے ماہ بانو کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجھے اس کی بے تابی پر ہنسی آنے لگی۔ یہ لڑکیاں بالیاں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے من لگا لیتی ہیں کہ پھر دو چار دن بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' حوراں اپنی بات کے اختتام پر ہولے سے ہنسی۔

''میری دِھی ہے ہی ایسی کہ سب اس سے پیار کریں۔ ویسے یہ کون سی سہیلی تھی اس کی جو بے تاب ہو کر گھر تک چلی آئی۔ ورنہ میں نے تو کالج میں اطلاع کر دی تھی کہ شاید ماہ بانو ابھی ایک دو دن اور نہ آئے۔''

''کوئی نئی سہیلی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ کوثر نام بتا رہی تھی۔'' صفدر کے پوچھنے پر حوراں نے اسے بتایا۔

''چل ہو گی کوئی۔ کل میں ماہ بانو کو واپس لے کر آؤں گا تو اسے بتانا، وہ آپ ہی پہچان لے گی۔ بس اب بتی بند کر دے۔ مجھے نیند آنے لگی ہے۔ سویرے اٹھ کر پہلے منڈی سے پھل لے کر آؤں گا، پھر ماہ بانو کو لینے کے لیے گاؤں جاؤں گا تاکہ گاؤں سے واپس آ کر شام کے وقت اپنا ٹھیلا لگا سکوں۔ میری اصل بکری کا وقت تو شام کو ہی ہوتا ہے۔'' صفدر، حوراں کو گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کا اشارہ دیتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

''الٰہی خیر! یہ اس وقت کون آ گیا؟'' حوراں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائی۔

''تُو تو بس ہر وقت اسی طرح ہولتی رہا کر۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے پاس پڑوس میں کسی کو کوئی کام پڑ گیا ہو۔'' صفدر نے حوراں کو ٹوکا اور خود بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس محلے میں اس کا ایک زمانے سے قیام تھا۔ اردگرد سب اعتبار کے لوگ بستے تھے اور امن و امان کی صورتِ حال بھی تشویش ناک نہیں تھی۔ اس لیے بنا کوئی تحقیق کیے کھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کی دوسری طرف موجود لوگ تو بالکل تیار کھڑے تھے، دروازہ کھلتے ہی وہ صفدر کو دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آئے۔

''کک..... کون ہو تم؟'' صفدر نے ان کے اس انداز پر گھبرا کر پوچھا۔

''کہاں ہے تیری دِھی؟..... کہاں چھپایا ہے تُو نے اُسے؟'' صفدر کے سوال کو نظرانداز کر کے آنے والوں میں سے ایک نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تم کون ہو جو میری دِھی کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟'' ایک اجنبی کی زبان سے بیٹی کا ذکر سن کر صفدر کے خون نے جوش مارا اور اس نے بجائے جواب دینے کے کڑے تیوروں سے پوچھا۔ جواباً اس کے منہ پر ایک

زوردار تھپڑ آ کر لگا۔ حوراں جو اس طرح اجنبیوں کے اچانک گھر میں آ گھسنے سے دم بہ خود کھڑی رہ گئی تھی، صفدر کا تھپڑ لگتے ہی زور سے چیخی۔

''اس کی آواز بند کرو۔ یہاں گھروں کی دیوار سے دیوار جڑی ہے، کہیں آس پاس والے آوازیں سن کر اِدھر نہ آ جائیں۔'' وہ شخص جو شروع سے سوال جواب کر رہا تھا، اپنے ایک ساتھی سے بولا تو اس نے آگے بڑھ کر حوراں کا دوپٹہ گھسیٹا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

''آخر تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے صفدر نے اس سے قدرے بے بسی سے سوال کیا۔

''ہم یہاں تیری دِھی کا پتہ معلوم کرنے آئے ہیں۔ اسے ہمارے حوالے کر دے اور اپنی جان چھڑا لے۔'' اس شخص نے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ لیکن تم لوگ کون ہو؟ اور تمہارا میری دِھی سے کیا تعلق ہے؟'' صفدر نے اس شخص کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے اس کے سوال کا جواب تو ضرور دیا لیکن خود کو استفسار کرنے سے بھی نہیں روک سکا۔

''جھوٹ بولتا ہے۔ گاؤں سے تو وہ آج دوپہر کو ہی بھاگ نکلی تھی۔ وہاں سے بھاگنے کے بعد وہ تیرے علاوہ اور کس کے پاس جا سکتی ہے؟ یقیناً وہ یہیں آئی ہوگی۔ تُو سیدھی طرح ہمیں بتا دے کہ اسے کہاں چھپایا ہے؟'' اس دفعہ اس شخص نے صفدر کے پیٹ میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس سے ماہ بانو کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ صفدر پیٹ میں لگنے والی اس لات کی تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ حوراں جس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے گئے تھے، صفدر کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہونے لگی۔

''بول، پتہ اُگلتا ہے اپنی بیٹی کا یا نہیں؟..... اگر تُو نے سیدھی طرح سے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر پیٹ سے انتڑیاں کھینچ لوں گا۔'' صفدر کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس شخص نے پے در پے اسے کئی مکے اور لاتیں رسید کیں اور اپنا سوال دہرایا۔

''میں سچ سچ نہیں جانتا کہ میری دِھی کہاں ہے۔ میں اسے گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تم لوگ کہتے ہو کہ وہ گاؤں سے بھاگ گئی ہے، یقیناً اس نے ایسا تمہاری وجہ سے ہی کیا ہوگا۔ اب کان کھول کر میرا جواب سن لو۔ اوّل تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو میں ہرگز تم جیسے ظالموں کو اس کا پتہ نہیں بتاتا۔'' صفدر جو ابتدا میں ذرا خوف زدہ ہو گیا تھا، اس بار بے جگری سے بولا۔

''تُو میری نرمی کی وجہ سے اتنا زور دکھا رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ تجھ میں کتنا زور ہے اور تُو کب تک میرے سامنے جم سکتا ہے؟'' اس شخص کا لہجہ اچانک ہی بہت بھیانک ہو گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے صفدر کو دبوچ لیا اور ایک چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے صفدر کو اس کے ساتھ باندھ دیا۔

''اس کا منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دو۔ یہ اگر زبان بند رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی شوق نہیں اس کی چیخوں سے محلے والوں کو جمع کرنے کا۔''

صفدر کو چارپائی کے ساتھ باندھنے والوں نے اس حکم کی بھی پھرتی سے تعمیل کی۔ اب کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو چاقو کھلنے کی کڑکڑاہٹ نے توڑا۔ یہ چاقو اس شخص نے اپنی جیب سے برآمد کیا تھا اور اب آنکھوں میں حد درجے سفاکی لیے صفدر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صفدر ایک عام سا آدمی تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس



کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ حوراں بھی رحم طلب نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگی لیکن وہ تو جیسے اپنا ہی من پسند کھیل شروع کرنے جا رہا تھا چنانچہ ان دونوں کی کیفیت کو نظرانداز کر کے صفدر کے قریب پہنچا اور اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے چاقو صفدر کے بازو میں گھونپ دیا۔ تکلیف کی شدت کے باعث صفدر کا جسم بری طرح تڑپا اور بازو سے پھوٹتے خون کے دھارے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے۔ اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت کرب ناک چیخ بلند ہوتی۔ چیخ کا راستہ تو بند تھا لیکن چہرے پر چھائے تاثرات اس کے کرب کی داستان بیان کر رہے تھے۔ صفدر کی یہ حالت دیکھ کر حوراں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

''اس بڑھیا کا منہ کھولو۔ اگر یہ اپنے شوہر کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے تو پھر اسے اپنی دِھی کا پتہ بتانا ہوگا۔'' حوراں کی کیفیت نے اس کی صفدر سے محبت کو عیاں کر دیا تھا اس لیے اس سفاک انسان نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اب اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ہدایت پر حوراں کے سر پر کھڑا آدمی اس کے منہ میں ٹھونسا دوپٹہ نکالنے لگا۔

''خبردار جو منہ کھلنے کے بعد اپنی آواز ذرا بھی بلند کی تو..... اگر تمہاری آواز نکلی تو میں اس کی جان نکال دوں گا۔'' حوراں کا منہ کھلنے سے پہلے اسے دھمکی دی گئی۔

''یہ سچ کہہ رہا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ماہ بانو کہاں ہے۔ ہم اسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر آئے تھے۔'' منہ میں کپڑا ٹھونسے جانے کے باعث حوراں کا حلق بری طرح خشک ہو گیا تھا پھر بھی اس نے ہمت کر کے آواز نکالی اور اس شخص کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ردِعمل میں اس شخص نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر بلند کیا۔ اس بار صفدر کا دوسرا بازو اس کا نشانہ بنا تھا۔ صفدر اس دوسرے وار پر اس بری طرح تڑپا کہ چارپائی اس کا بوجھ سہار کر کھڑی نہ رہ سکی۔ نتیجتاً صفدر اس حالت میں زمین پر گرا کہ چارپائی کا پورا بوجھ اس کے اوپر تھا۔

''اللہ کے واسطے رحم کرو۔ میں اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم لوگوں کو ماہ بانو کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔'' حوراں نے صفدر کی حالت دیکھ کر بلک بلک کر روتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کی۔ اس بار اس کی کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔ وہ شخص فرش پر چارپائی کے نیچے پڑے صفدر پر مشقِ ستم کرنے کے بجائے حوراں کی طرف متوجہ ہوا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر وہ تمہارے پاس نہیں آئی تو اس جگہ کا پتہ بتاؤ جہاں وہ جا سکتی ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ ہماری ساری برادری گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ یہاں میں اور صفدر تنہا ہیں۔ اس گھر کے سوا وہ کہیں نہیں جا سکتی۔'' حوراں نے پوری سچائی سے جواب دیا تھا جس پر یقین نہیں کیا گیا۔

''بڑھیا ہمیں چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ چارپائی سیدھی کر کے کھڑی کرو۔ یہ لوگ خود اپنا بھلا نہیں چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اس شخص نے دھیمی آواز میں غرّا کر حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ چارپائی سے بندھے ہوئے صفدر کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور اس پر ایک بڑا سا گومڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ گومڑ یقیناً چارپائی سمیت منہ کے بل گرنے سے آیا تھا۔ وہ نہ تو کوئی عادی مجرم تھا اور نہ ہی مجرموں سے مقابلہ کرنے کی استطاعت رکھنے والا آدمی۔ چنانچہ ذرا دیر کے اس بدترین تشدد نے اس کی حالت تباہ کر دی تھی۔ خون کے بے تحاشا اخراج اور تکلیف کی شدت نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

''رحم کرو اس پر۔ تمہارا ظلم اس کی جان لے لے گا۔'' صفدر کی حالت دیکھ کر حوراں بلبلائی۔

''اگر میں تم لوگوں کی زبان کھلوا کر تمہاری دِھی کا پتہ نہیں معلوم کر سکا تو چودھری صاحب ہماری جان لے

لیں گے۔'' حوراں کی التجا کا بے حد رُکھائی سے جواب دیا گیا۔

''کون چودھری صاحب؟..... کیا چودھری افتخار عالم شاہ؟'' حوراں چونکی۔

''ہاں وہی۔ تیری دِھی نے گاؤں سے بھاگ کر ان کے غضب کو للکارا ہے۔'' حوراں کے سوال کا جواب اثبات میں آیا۔

''ماہ بانو کا کیا تعلق چودھری افتخار عالم شاہ سے؟'' حوراں حیرت سے بڑبڑائی۔

''چودھری صاحب کا دل آ گیا تھا اس پر۔ لیکن وہ تو خود کو کوئی اونچی شے سمجھتی ہے۔ اب اپنے ماں پیو کا حال دیکھے گی تو تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔''

''ماں پیو قربان اپنی دِھی پر۔ اس کی عزت کے بدلے اگر ہمارے جسم کے ٹوٹے ٹوٹے بھی ہو جائیں تو ہمیں دُکھ نہیں ہوگا۔'' حوراں نے بے ساختہ ہی جواب دیا جو یقینی طور پر سننے والے کو پسند نہیں آیا۔ وہ غرا کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری خواہش پر تمہارے جسم کے ٹوٹے ٹوٹے کر ہی ڈالتا ہوں۔'' وہ حوراں کے قریب آیا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے اچھی طرح دبوچنے کے بعد چاقو اس کے دائیں کان پر رکھ کر ہاتھ کو جنبش دی۔ تیز دھاری چاقو نے لمحہ بھر میں حوراں کے کان کا پتا اُڑا دیا۔ منہ اچھی طرح گرفت میں ہونے کے باوجود اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہوئیں۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔ اب بڑھیا دِھی سے محبت کا ثبوت دے گی اور یہ ہمارے سوالوں کا جواب دے گا۔'' صفدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا اور خود حوراں کا دوپٹہ دوبارہ سے اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ کٹے ہوئے کان کی تکلیف سے حوراں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کان سے بہہ کر آنے والا خون اس کی گردن پر سے گزرتا ہوا گریبان میں جذب ہو کر اسے بھگو رہا تھا۔

''ہاں بھئی بڈھے! بول کچھ بتائے گا یا میں اس بڑھیا کا بھی تیری طرح حال کروں؟'' صفدر کے منہ پر پانی ڈال کر اسے ہوش میں لانے کے بعد پوچھا۔ صفدر جو خود پر کیے گئے تشدد کی وجہ سے ہی تباہ حال ہو رہا تھا حوراں کی حالت دیکھ کر بالکل ہی ڈھے گیا۔

''مت کرو اتنا ظلم۔ ہمیں سچ مچ تمہارے سوال کا جواب نہیں معلوم۔'' صفدر باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ رو پڑا۔

''بالے! مجھے لگتا ہے ان لوگوں کو سچ مچ کچھ معلوم نہیں۔ تُو ایسا کر کہ اس سے لڑکی کی سہیلیوں وغیرہ کے بارے معلوم کر۔ ہوسکتا ہے وہ ڈر کر یہاں آنے کے بجائے اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی ہو۔'' اب تک کی ساری کارروائی کے دوران بالے نامی شخص کے احکامات کی پیروی کرنے والے دونوں افراد میں سے ایک نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے بالے نے یہی سوال صفدر کے سامنے دہرایا۔

''ماہ بانو کی ایک سہیلی تو اسی گلی کے آخری مکان میں رہتی ہے۔ باقی کے پتے مجھے زبانی یاد نہیں۔ ماہ بانو کی ڈائری سے مل جائیں گے۔ لیکن میرے خیال میں تو ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں جا سکتی۔ اس کی اپنی کسی سہیلی سے اتنی بے تکلفی نہیں کہ وہ زیادہ دیر کسی کے گھر رک سکے۔'' صفدر، حوراں کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اسے واقعی یقین تھا کہ ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں جا سکتی اس لیے اس نے شرافت سے بالے کے سوال کا جواب دے دیا لیکن جواب کے ساتھ جو اظہارِ خیال کیا تھا، اس نے بالے کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا۔ وہ صفدر کے سر ہو گیا کہ اگر ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں گئی ہوگی تو پھر ایسی کسی جگہ کا پتہ بتاؤ جہاں وہ مل سکے۔ صفدر کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ نتیجتاً بالا اس پر اور حوراں پر مسلسل تشدد کرتا گیا۔ حوراں اس



تشدد کی تاب نہ لا کر دم توڑ گئی۔ نیم جان صفدر سے بھی جب کچھ ملنے کی اُمید نہیں رہی تو بالے نے اس کی شہ رگ پر چاقو چلا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ان دونوں حرماں نصیب میاں بیوی کی لاشیں اگلی صبح محلے والوں نے دریافت کر کے پولیس کو خبر کر دی۔

⊛-----✪-----⊛

''مجھے اور ناہید کو آج لاہور بھجوانے کا انتظام کر دیں چودھری صاحب!''

''وہ کس لئے؟'' چودھری افتخار اپنی سوچوں میں گم تھا۔ بڑی چودھرائن نے آ کر یہ مطالبہ کیا تو بے خیالی میں پوچھ بیٹھا۔

''صنوبر کو آج ہسپتال میں داخل ہونا ہے۔ اس موقعے پر میرا اور ناہید کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ اب کنوارلڑکی ذات ہو کر تو یہ معاملات سنبھال نہیں سکتی۔'' بڑی چودھرائن نے ذرا تنک کر چودھری کے سوال کا جواب دیا۔

''اچھا اچھا..... میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ تم مجھے پہلے یاد دلا دیتیں۔ اب بالکل عین موقعے پر وہاں پہنچو گی۔''

''آپ کو فرصت ہی کہاں ہے جو آپ سے کوئی گل کی جائے۔ ویسے بھی میں نے سوچا تھا کہ اب آپ کے نکاح میں شرکت کر کے ہی لاہور روانہ ہوں گی۔ نئی چودھرائن کے استقبال کے لیے بھی تو یہاں کسی کو ہونا چاہیے تھا، پر افسوس کُڑی بھاگ نکلی۔''

بڑی چودھرائن کے لہجے میں بڑی کاٹ اور استہزاء تھا۔ چودھری افتخار تلملا اٹھا اور دہاڑ کر بولا۔ ''منہ بند رکھا اپنا۔''

''ہمیشہ منہ بند ہی رکھا ہے چودھری صاحب! آپ مجھ پر سوتن پر سوتن لا کر بٹھاتے رہے لیکن میں نے کبھی زبان سے اُف نہیں کیا۔ میں جانتی تھی آپ ایک عورت پر گزارہ کرنے والے آدمی نہیں۔ پھر میری بڑی عمر کی وجہ سے بھی آپ کا دل میرے ساتھ نہیں لگا۔ اس لیے جب آپ نے ناہید سے بیاہ کیا تو میں خود خوشی خوشی اسے بیاہ کر حویلی لائی۔ عصمت کی بار بھی میں نے زبان نہیں کھولی۔ ناہید اور عصمت سوتنیں تھیں لیکن ان کے آنے سے کم از کم یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ آپ نے کسی کم تر عورت کو سوتن بنا کر مجھ پر لا بٹھایا ہے۔ عصمت کے میکے والے زیادہ اونچی حیثیت کے نہیں تھے لیکن عزت دار لوگ تو تھے، پر اس بار آپ نے جو فیصلہ کیا اس نے بڑا جی کو ماٹھا کیا۔ دنیا میں عورتوں کی کمی ہو گئی تھی جو آپ نے کمی کمینوں کو اولاد کی حویلی کی مالکن بنانے کی کوشش کی۔ اگر جی آ بھی گیا تھا اس لڑکی پر تو یہ نکاح کا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں نہیں جانتی کہ آپ اس سے پہلے بھی بغیر نکاح کے ہی بہت کچھ کرتے رہے ہیں، اس بار بھی وہی کچھ کرتے۔ میری زبان پر کوئی شکوہ نہیں آتا۔ اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ وہ کم ذات کیسے آپ کی عزت رول کر جانے کس کے ساتھ بھاگ نکلی؟ کوئی تو ہوگا اُس کا ایسا عاشق جو اُسے آپ کے نکاح میں آنے سے پہلے ہی لے کر بھاگ نکلا۔'' بڑی چودھرائن کو آج شاید زندگی میں پہلی بار اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع ملا تھا، چنانچہ وہ چودھری افتخار کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر بولتی چلی گئی۔

''جا..... جا کر سفر کی تیاری کر۔ میں ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہلواتا ہوں۔'' بڑی چودھرائن کی کسی بھی بات کا جواب دیئے بغیر چودھری افتخار نے قدرے نرمی سے اسے حکم دیا۔ اس بار بڑی چودھرائن نے اس

کی حکم عدولی نہیں کی اور واپس پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد چودھری افتخار اس کی کہی باتوں کو سوچنے لگا۔ بڑی چودھرائن نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اس اعتراض کو کرنے میں بھی حق بہ جانب تھی کہ چودھری افتخار نے ایک مزارعے کی بیٹی کو اس کی سوتن بنانے کا فیصلہ کر کے اس کی توہین کی تھی۔ خود چودھری افتخار نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی معمولی حیثیت کی لڑکی کو اپنی بیوی کا درجہ دے گا لیکن اس روز ڈیرے پر ماہ بانو کی خود پر تیل چھڑک کر آنے اور آگ لگا لینے کی دھمکی دینے والی ادا چودھری افتخار کے دل کو بھا گئی۔ وہ جسے ایک کمزور لڑکی سمجھ کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اتنی جی دار نکلی کہ بلا خوف وخطر جان دینے پر تُل گئی تھی۔ چودھری افتخار کا اس سے قبل ایسی کسی لڑکی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ نکاحی بیویوں کے علاوہ اس کی خلوت میں آنے والی عورتیں تو بکاؤ مال ہوتی تھیں یا وہ خوف زدہ اور بے بس عورتیں جو چودھری کے سامنے ڈھنگ سے احتجاج بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ چودھری کے سامنے گڑگڑا کر اس سے رحم کی درخواست کرتی تھیں۔ چودھری افتخار کسی درخواست پر کان نہیں دھرتا تھا اور آخر کار عورت ہار مان لیتی تھی۔ پہلی بار اسے ماہ بانو بھی ان ہی عورتوں میں سے ایک محسوس ہوئی تھی لیکن دوبارہ ڈیرے پر اس نے جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر چودھری افتخار حیران رہ گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حویلی میں ماہ بانو کا تقریباً ہتھیار ڈال دینا فوری صدمے کے باعث تھا۔

اس رات وہ بہت گہری نیند سے جگائی گئی تھی اس لیے چودھری افتخار کے سامنے ڈٹ کر کھڑی نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن تب بھی موقع ملتے ہی اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور چودھری افتخار کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔ دوسری بار وہ چودھری کی طرف سے ہوشیار تھی اور اس بات کا بندوبست کر کے آئی تھی کہ چودھری اس کے قریب بھی آ نہ سکے۔ چودھری اگلی بار کوشش کرتا تو وہ پھر کوئی ترکیب لڑا لیتی لیکن چودھری نے اگلی بار ایسی کوئی کوشش کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی کہ ماہ بانو کے پاس احتجاج کی گنجائش ہی نہ رہے۔ دراصل چودھری کا دل مچل گیا تھا کہ یہ کم عمر، حسین اور جی دار لڑکی ہمیشہ اس کے تصرف میں رہے۔ ہمیشہ کے اس ساتھ کے لیے شادی کا جال سب سے موزوں تھا۔ لیکن ماہ بانو بہت تیز نکلی اور اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی پھر سے اُڑ گئی تھی۔ اب چودھری افتخار غضب ناک شکاری کی طرح اسے کھوج نکالنے کے لیے باؤلا ہوا جا رہا تھا لیکن ابھی تک اسے اپنی کسی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''چودھری صاحب! فیصل آباد سے بالا واپس آ گیا ہے۔ اگر آپ کہیں تو اسے آپ کی خدمت میں حاضر کروں؟'' چودھری افتخار اپنی سوچوں میں ہی گھرا بیٹھا تھا کہ منشی اللہ رکھا دستک دے کر اندر آیا اور اسے بالے کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

چودھری، منشی اللہ رکھا کے انداز سے ہی جان چکا تھا کہ بالا ناکام واپس آیا ہے، پھر بھی وہ بالے کی کوششوں سے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ منشی کو بالے کو اندر بھیجنے کی اجازت دے دی۔

''اور ہاں سن منشی! ذرا لاہور کے لیے گڈی تیار کروا دے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وڈی اور چھوٹی چودھرائن لاہور کے لیے روانہ ہوں گی۔'' چودھری افتخار کی طرف سے اجازت ملنے پر منشی تیزی سے پلٹ کر باہر جا رہا تھا کہ چودھری نے اسے روک کر حکم دیا۔

منشی ''جی اچھا سرکار!'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بالے کے ساتھ اندر تھا۔ بالے نے ہاتھ جوڑ کر چودھری کو سلام کیا اور چپ چاپ نظر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے اس مؤدبانہ انداز کو دیکھ کر کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی بالا ہے جو منٹوں میں لوگوں کی کھال اُتار کر رکھ دیتا ہے۔ چودھری کے سامنے کھڑے ہو کر اُس کی ساری سفاکی، عاجزی میں ڈھل گئی تھی۔ شاید یہ بھی قدرت کا کوئی اصول ہے کہ ہر زور



آور ظالم اپنے سے زیادہ زور آور شخص کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔

''ہاں بول بالے! کیا کیا تُو نے فیصل آباد میں؟'' چودھری افتخار نے ترش لہجے میں بالے سے دریافت کیا۔

''میں نے اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی سرکار! منشی اللہ رکھا کی طرف سے حکم ملتے ہی میں اپنے چار بندوں کے ساتھ فوراً فیصل آباد پہنچ گیا تھا۔ دو بندے میں نے بس کے اڈے پر بٹھائے کہ اگر غیاث محمد کی دھی بس سے اُترے تو وہ اسے قابو کر کے واپس گاؤں پہنچا دیں۔ دو بندوں کے ساتھ میں خود صفدر کے گھر کی گلی کرتا رہا لیکن پورے دن کوئی نہیں آیا۔ شام کے وقت میں نے چاند بائی کے کوٹھے سے ایک لڑکی بلوا کر اسے سادے کپڑوں میں اسے صفدر کے گھر کے اندر بھجوایا کہ وہ بہانے سے اندر کی سُن گُن لے کر آئے۔ لڑکی غیاث محمد کی دھی کی سہیلی ہونے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ واپس لوٹ کر اس نے بتایا کہ اندر ایک عورت کے سوا کوئی نہیں۔ رات کو صفدر کے گھر لوٹنے کے بعد اندھیرے میں، میں خود اپنے بندوں کو لے کر اندر جا گھسا۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی اور صفدر اور حوراں کا بھی ریشہ ریشہ الگ کر کے دیکھ لیا لیکن لڑکی کا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صفدر سے میں نے اُس کُڑی کی سہیلیوں کے پتے لے لیے تھے۔ آج سارا دن چاند بائی کے کوٹھے کی لڑکیاں بہانے بہانے سے ان کے گھروں میں جا کر کھوج لگاتی رہیں لیکن کہیں سے ذرا سی بھی سُن گُن نہیں ملی۔ اب بھی میں اپنے بندے فیصل آباد چھوڑ کر آیا ہوں کہ کُڑی کی سہیلیوں پر نظر رکھیں اور جیسے ہی کچھ معلوم ہو، حرکت میں آ جائیں۔'' بالے نے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔

''اور صفدر اور حوراں کا کیا کیا؟..... اُن پر بندے نہیں لگائے؟'' چودھری افتخار نے پوچھا۔

''بڑھیا ذرا سی مار پر ہی جان سے گزر گئی تھی، مجبوراً مجھے بعد میں صفدر کا بھی کام تمام کرنا پڑا۔ ورنہ وہ بیوی کی موت پر بعد میں شور مچا کر سب کے سامنے آپ کا اور میرا نام لے دیتا۔ آپ فکر نہ کریں جی چودھری صاحب! میں نے بہت اچھی طرح دونوں کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا تھا، انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔'' بالے نے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''انہیں کچھ معلوم نہیں تھا..... تُو کچھ معلوم نہیں کر سکا۔ تو اب کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر صبر کر کے بیٹھ جاؤں؟ تم مسٹنڈوں کی اتنی بڑی فوج کیا میں نے اس لیے پال رکھی ہے کہ کام دکھانے کے وقت تم لوگ منہ لٹکا کر اپنی ناکامی کی رپورٹ سنانے میرے پاس چلے آؤ۔'' چودھری افتخار، بالے کی تسلی پر غصے سے دھاڑا۔

''نہیں جی چودھری صاحب! ہم نے ابھی اپنی ہار نہیں مانی ہے۔ میرے بندے اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ میں بس اس لیے آ گیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔ ساتھ یہ فوٹو بھی لے کر آیا ہوں۔ صفدر کے گھر کی تلاشی میں ملے تھے۔ میں نے سوچا یہ فوٹو تلاش کے کام میں مدد دے سکتے ہیں۔'' بالے نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک لفافہ باہر نکالا اور ادب سے چودھری افتخار کو پیش کیا۔

چودھری افتخار نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ یہ کُل پانچ تصویریں تھیں۔ دو تصویریں کسی فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر کھنچوائی گئی تھیں۔ ان میں ماہ بانو صفدر اور حوراں کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ ایک تصویر کسی شادی کے موقع پر لی گئی تھی۔ ماہ بانو سبز کپڑوں میں ڈھولک بجاتے ہوئے بڑی پُر جوش سی نظر آ رہی تھی۔ ایک پورٹ سائز تصویر نیلے بیک گراؤنڈ کے ساتھ صرف چہرے کی تھی۔ اس تصویر میں ماہ بانو نے سر اور گردن کے گرد سفید اسکارف خوب [illegible] طرح لپیٹ رکھا تھا۔ شاید یہ تصویر کالج کے فارمز وغیرہ کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے کھنچوائی گئی تھی۔ آخری تصویر میں بھی ماہ بانو کالج یونیفارم میں ہی تھی۔ یہ تصویر کالج کے لان میں لی گئی تھی۔ پس منظر میں کالج کی عمارت اور نام صاف نظر آ رہا تھا۔ سبزے کے درمیان سفید لباس میں کھڑی کھلکھلا

کر ہنستی ہوئی ماہ بانو نے قدرے بے پروائی سے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ کالج کے آزادانہ ماحول میں بے فکری تاثرات والی ماہ بانو کی یہ تصویر سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر چودھری افتخار کے سینے نئے سرے سے آگ بھڑک اُٹھی۔

''وہاں اور تصویریں بھی تھیں سرکار! لیکن وہ ساری اتنی صاف نہیں تھیں۔ میں چن کر کام کی تصویریں آیا ہوں۔'' بالے کی آواز نے چودھری افتخار کو تصویر سے نظر اٹھانے پر مجبور کیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اپنی کوشش جاری رکھو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تصویروں سے کیا کام لیا جا ہے۔'' چودھری افتخار نے بالے کو حکم سنایا۔ بالا ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہوا اُلٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔ منشی رکھانے بھی اس کی پیروی کی۔ اب چودھری اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ اسے جی بہلانے کے لیے ماہ بانو کی تصو میسر آ گئی تھی لیکن سچ یہ تھا کہ تصویر دل کو بہلانے کے بجائے اُکسانے کا کام زیادہ کر رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''ایک بری خبر ہے سر!''

''خیریت، کیا ہوا ہے؟'' عبدالمنان کے پُرتفکر چہرے کو دیکھتے ہوئے شہریار نے تشویش سے پوچھا۔

''وہ..... جس لڑکی کو چودھری افتخار سے بچانے کے لیے ہم نے دارالامان میں پناہ دلوائی ہے، اس ماں باپ کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''کس نے اطلاع دی ہے؟ کیا پیر آباد سے کوئی آیا ہے؟'' عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع پر شہریار چونکا

''نو سر! قتل پیر آباد والے ماں باپ کا نہیں، فیصل آباد میں مقیم لڑکی کی پرورش کرنے والے ماں باپ کا ہے۔ اصل میں لڑکی کو بہت فکر تھی کہ اُس کے اس طرح غائب ہو جانے سے اس کے ماں باپ بہت پریشان ہوں گے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ فیصل آباد میں اطلاع کروا دی جائے کہ وہ خیریت سے ہے چودھری افتخار سے بچنے کے لیے لاہور کے ایک دارالامان میں پناہ گزین ہے۔ میں نے لڑکی سے وعدہ کر لیا کہ یہ کام کروا دوں گا۔ لیکن فوری طور پر عمل نہیں کر سکا۔ اصل میں معاملہ ایسا ہے کہ اس کام کو کروانے کے لیے ہر ایک پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مشابرم خان اس معاملے سے واقف بھی ہے اور آدمی اعتماد کا ہے، اس لیے اسی سے فیصل آباد پیغام پہنچانے کا کام لوں گا۔ مشابرم خان یہاں بھی بہت مصروف ہے اس لیے اسے میں فوری طور پر فیصل آباد نہیں بھیج سکا۔ آج صبح میں نے اسے اس کام کے لیے بھیجا تھا، وہ واپس آیا ہے تو اس اطلاع کے ساتھ کہ اس لڑکی [redacted] الدین حوران اور صفدر قتل کیے جا چکے ہیں۔'' عبدالمنان نے بتایا۔

''قتل کا محرک کیا تھا؟''

''واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ قتل سے پہلے دونوں میاں بیوی پر بے تحاشا تشدد کیا گیا تھا۔ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔ صبح اہلِ محلّہ میں سے کسی نے لاشیں دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ مقتولین کے آس پڑوس والے شدید حیرت کا شکار ہیں کہ اتنی سنگین کارروائی کا انہیں ذرا بھی علم نہیں ہو سکا۔ نہ تو کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور نہ ہی تشدد کے نتیجے میں میاں بیوی کی چیخیں ان تک پہنچیں۔ پولیس کا اندازہ ہے کہ قاتل کوئی بہت منجھے ہوئے مجرم تھے جنہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس آبادی والے محلے میں کسی کو ان کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔ عورت کی لاش اس حالت میں ملی ہے کہ اس



ل حلق تک کپڑا اٹھنسا ہوا تھا، یعنی مجرموں نے تشدد کرنے سے پہلے ہی چیخوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا ے کی ایک عورت نے بتایا ہے کہ مقتولہ حوراں کی کچھ عرصہ پہلے ایک لاکھ کی کمیٹی نکلی تھی۔ حوراں نے کمیٹی رقم میں اپنی طرف سے کچھ اور رقم ملا کر اپنی بیٹی ماہ بانو کے لیے زیور خریدا تھا۔ محلے دار عورت کو یہ بات معلوم ہے کہ کمیٹی اسی کے گھر ڈالی گئی تھی اور حوراں نے زیور کی خریداری بھی اسی کے ساتھ جا کر کی تھی۔ ے اس بیان کے بعد پولیس نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ڈاکا زنی کی واردات تھی۔ ڈاکوؤں کو کہیں سے ال گئی تھی کہ اس گھر میں زیور اور روپیہ ہے اس لیے انہوں نے موقع دیکھ کر واردات کر دی۔'' عبدالمنان تفصیل بتائی۔

''مجھے تو پولیس کا یہ اندازہ درست نہیں لگ رہا۔ زیور اتنی بڑی مالیت کا نہیں تھا کہ اس کے لیے اتنی منظم ال کی جاتی۔ پھر جس طرح کے تشدد کا ذکر کیا جا رہا ہے، ذرا سے زیور کو بچانے کے لیے ایسا تشدد کوئی نہیں کرتا۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے عموماً فوری طور پر خود ہی سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔'' عبدالمنان کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر شہریار نے خیال آرائی کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! لیکن پولیس کی رائے کو اس وجہ سے تقویت مل رہی ہے کہ جائے واردات ں قسم کا زیور اور روپیہ پیسہ برآمد نہیں ہوا ہے اور گھر کی حالت بھی ایسی ہے جیسے کسی نے وہاں کی تلاشی لی اس صورتِ حال سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کو قتل کرنے والے واقعی ڈاکو تھے۔ ہو میاں بیوی نے زیور اور روپیہ ان کے حوالے کرنے میں مزاحمت سے کام لیا ہو جس کے جواب میں ں نے ان پر تشدد کیا اور آخر میں دونوں کو قتل کرنے کے بعد روپیہ اور زیور لے کر فرار ہو گئے۔''

''پولیس کی رائے ٹھیک بھی ہو سکتی ہے لیکن میں اس کیس میں چودھری کی انوالومنٹ کا خدشہ محسوس کر رہا خاص طور پر منظم طریقے سے کیا جانے والا تشدد مجھے شک میں ڈال رہا ہے۔ واردات کا انداز ایسا ہے م پہلے سے یہ سوچ کر آئے ہوں کہ انہیں دونوں میاں بیوی سے کچھ اُگلوانا ہے اور اس طرح سے اُگلوانا ر بھی نہ ہو۔ انہوں نے اپنے تشدد کے جواب میں پیدا ہونے والی چیخوں کو روکنے کا خصوصی انتظام کیا۔ ں کو عموماً اتنا تشدد سے کام نہیں لینا پڑتا۔ وہ تشدد کرتے بھی ہیں تو اس میں فوری اشتعال کا دخل ہوتا ہے اور اشتعال کے اظہار میں یقیناً احتیاطی تدابیر اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر حوراں نے زیورات کا پتہ بتانے میں مزاحمت سے کام لیا تھا تو ڈاکوؤں کے لیے سب سے آسان حل یہ تھا کہ میاں بیوی کو باندھ کر ڈالتے اور گھر کی تلاشی لے لیتے۔ آخر ایک پھل فروش کا گھر کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور میں کتنے خفیہ مقامات ہو سکتے ہیں جنہیں ڈھونڈنا ڈاکوؤں کے لیے مشکل ہو۔ میرے خیال میں تو اس تشدد کے پیچھے کوئی اور بات ہے۔ مجرم ان دونوں میاں بیوی سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے تھے اور اب وہ نہیں دے سکے اور شدید ترین تشدد کو سہتے رہے۔ وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ موجودہ حالات میں ال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ میں نے بتایا تھا کہ چودھری افتخار نے ماہ بانو کی تلاش ے ہندوں کو فیصل آباد بھی روانہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو یقین ہو گا کہ پیر آباد سے نکل کر ماہ بانو فیصل آباد ہی جا ں گی۔ پہلے انہوں نے گھر میں اسے تلاش کیا ہو گا اور جب وہ انہیں وہاں نہیں ملی ہو گی تو انہیں لگا ہو گا کہ ں اور صفدر نے اسے کسی دوسری جگہ چھپا کر رکھا ہوا ہے، اس دوسری جگہ کا پتہ معلوم کرنے کے لیے ہی ں نے دونوں پر اتنا ظلم کیا ہو گا۔''

''لیکن ظاہر ہے وہ بے چارے کچھ جانتے ہی نہیں تھے تو انہیں کیا بتا سکتے تھے؟ میں اس سلسلے میں اس لیے

بھی شک وشبے کا اظہار کر رہا ہوں کہ ڈاکو عموماً بلاوجہ قتل کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان سے کسی وا
کے دوران اگر قتل ہوتا ہے تو اس کا محرک فوری اشتعال، اپنا بچاؤ یا پھر واردات کے بعد اپنے پہچان لیے جا
ڈر ہوتا ہے۔ فوری اشتعال تو اس واردات میں کہیں نظر ہی نہیں آ رہا۔ بچاؤ والا نظریہ اس لیے غلط ہے کہ
عمر میاں بیوی میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ڈاکوؤں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کریں۔ آخری
کا امکان ہے کہ مجرموں نے اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے میاں بیوی کو قتل کیا ہو لیکن یہاں ہم
سوچ سکتے ہیں کہ مجرموں نے یہ قتل اس لیے کیا کہ مقتولین اگر زندہ رہ جاتے تو وہ پولیس کو اپنے ساتھ
والی واردات کی اصلیت سے آگاہ کر سکتے تھے۔'' شہریار نے بہت گہرائی میں جا کر پوری واردات کا
تھا۔ اُس کے تجزیے کے بعد عبدالمنان کو بھی یقین ہو گیا کہ واقعی، ہو نہ ہو حوراں اور صفدر کے بہیمانہ
پیچھے چودھری افتخار کا ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے واردات کو ڈاکے کا رنگ دینے کی کوشش
گئی ہے۔

''میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں سر! لیکن بات وہی ہے کہ صرف تھیوری کی بنیاد پر ہم
افتخار پر الزام عائد نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کے خلاف ثبوت بھی درکار ہیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ چودھری افتخار جیسے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ہم اگر کوشش کر کے کوئی
تلاش بھی کر لیں تو زیادہ سے زیادہ چودھری کے کسی بندے تک ہی پہنچ سکیں گے اور وہ بندہ اتنا نمک خوار
اپنی جان کے بدلے بھی چودھری کا نام کسی عدالت میں نہیں لے گا۔ اب ہمارے پاس یہی صورت بچتی
ماہ بانو کو سامنے لے کر آئیں اور کم از کم چودھری کے ان کرتوتوں کو تو سامنے لے کر آئیں کہ کیسے وہ
افراد کی عورتوں کی عزت کو تماشا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔'' عبدالمنان کی بات کا جواب دیتے ہوئے شہر
چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''اس سلسلے میں، میں نے ایک این جی او کو اپروچ کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کیس کے
آنے سے چودھری افتخار کو بہت زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ میڈیا پر کچھ دن شور رہے گا
خاموشی چھا جائے گی۔ چودھری صاف کہہ دے گا کہ اس پر بے بنیاد الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ زیادہ
زیادہ وہ تسلیم کرے گا تو اتنا کہ اس نے ماہ بانو کے لیے شادی کا پیغام بھیجا تھا۔ ظاہر ہے، اس قسم کا پیغام
کوئی جرم نہیں۔ اگر عمر کے تفاوت کو بنیاد بنا کر چودھری کو لعن طعن کیا جائے تو بھی وہ کہہ دے گا کہ میں
صرف رشتہ بھیجا تھا، کوئی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ لڑکی کو اگر کوئی اعتراض تھا تو اپنے والدین کے سامنے
کرتی۔'' عبدالمنان نے شہریار کو معاملے کا ایک اور رخ دکھایا۔

''میں اس بات کو سمجھتا ہوں عبدالمنان! ہم ماہ بانو کے کیس
کر سکتے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ چودھری کے امیج پر ایک ضرب تو ضرور لگائی جائے۔ دوسرے
سامنے ماہ بانو کے تحفظ کا بھی مسئلہ ہے۔ میں نے ابتدا میں اسے فیصل آباد اسی لیے نہیں جانے دیا تھا کہ
معلوم تھا کہ چودھری افتخار وہاں پہنچ کر اسے آسانی سے دوبارہ ٹریپ کر لے گا۔ میں اس لڑکی کی بیک مضبوط
چاہتا تھا۔ اگر کوئی بڑی این جی او اس کے پیچھے کھڑی ہو جاتی تو چودھری افتخار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑتا۔ لیکن
کہ اب تو اس بے چاری سے اس کا ٹھکانہ ہی چھن گیا ہے۔ دارالامان میں وہ کب تک رہ سکتی ہے؟ خیر،
سو ہو گیا۔ لیکن اب ہمیں اس مظلوم لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ اسے کسی ایسے شخص یا ادارے
سرپرستی مل جائے جو چودھری افتخار کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہو سکے تو اس لڑکی کے حق میں بہتر ہو گا۔ کسی این



کے ذریعے میڈیا کی انوالومنٹ کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ چودھری افتخار براہِ راست لڑکی پر ہاتھ ڈالنے سے
گریز کرے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ اگر اُس نے ایسی کوئی کوشش کی تو الزام اس کے سر پر ہی آئے گا۔'' شہریار کو
اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ماہ بانو کے کیس میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے اور کیوں اس کے تحفظ کے لیے
اتنا پریشان ہے؟

''میں کسی حد تک آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں سر! آپ بے فکر رہیں۔ میں جلد از جلد اس سلسلے میں کارروائی
شروع کرواتا ہوں۔'' شہریار کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے عبدالمنان نے اسے یقین دلایا۔

''پلیز! تم اس معاملے کو تیزی سے نمٹاؤ۔ ان دارالامانوں کا بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں پر حفاظت
کے خیال سے بھیجی جانے والی خواتین محفوظ رہتی ہیں یا نہیں۔'' شہریار نے ایک اور نکتے کی طرف عبدالمنان کی
توجہ دلوائی۔

''اس طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر بہت اچھی ساکھ رکھنے والے
دارالامان کا انتخاب کیا ہے۔ اوّل تو وہاں لڑکی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا بھی ہے تو وہاں
کا ایک چوکیدار خیال رکھے گا۔ وہ چوکیدار مشابرم خان کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مشابرم خان کی اس سے
دوستی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوست کو لڑکی کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے آیا ہے۔'' عبدالمنان نے اطلاع دی
تو شہریار نے کافی حد تک خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ یہ سکون ماہ بانو کے محفوظ ہونے کے خیال سے تھا..... مگر سوال
یہی تھا کہ آخر اسے شہریار عادل ایک اجنبی لڑکی کے تحفظ کے لیے اتنا پریشان تھا ہی کیوں؟

⊛----✪----⊛

''کیا سوچا ہے چاچا! اب کیا کرو گے؟ ماہ بانو کا تو کہیں سے کوئی اتہ پتہ نہیں ملا۔ وہ مل جاتی تو اس کے
چودھری کے ساتھ دو بول پڑھوا کر تمہاری جان چھوٹ جاتی۔ پر اب تو ساری برادری مشکل میں ہے۔ کچھ معلوم
نہیں کہ کب چودھری کا ضبط جواب دے جائے اور وہ ہم پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے۔'' غیاث محمد کے دونوں داماد
اور بیٹیاں اس کے گھر پر جمع تھے۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ اس وقت بھی غیاث محمد کے بڑے داماد
انور نے سوال اٹھاتے ہوئے اسے حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔

''کیا کروں پُتر!..... کچھ پلّے نہیں پڑ رہا کہ کیا کروں اور کہاں سے اس بدبخت کو ڈھونڈوں؟ اپنے طور پر
کوشش کی تھی کہ فیصل آباد میں صفدر اور حوراں کے جان پہچان والوں سے ماہ بانو کا پتہ معلوم کر سکوں، پر اُدھر بھی
کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میری جان تو دہری مشکل میں پڑ گئی ہے۔ ادھر چودھری کا خوف ہے تو دوسری طرف لڑکی
ذات کے غائب ہونے سے عزت پر بن آئی ہے۔ ساری برادری میں کہیں سر اٹھا کر بات کرنے کے لائق نہیں
رہا۔ حوراں اور صفدر کے جنازے پر سب ہی پوچھ رہے تھے کہ ماہ بانو کہاں ہے؟ میرے پاس کوئی جواب ہوتا تو
دیتا۔ سر نیہوڑائے بیٹھا رہا۔ پر اس طرح کوئی لوگوں کی زبانیں بند ہوتی ہیں؟ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا
رہے تھے۔ ایک دو کو تو میں نے یہ تک کہتے سنا کہ ماہ بانو سارا روپیہ اور زیور لے کر اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ
گئی ہے۔ جاتے جاتے اس نے اپنے یار کے ساتھ مل کر صفدر اور حوراں کو قتل کر دیا ہے۔ اب بتاؤ، یہ سب سن کر
میں کیا کرتا؟ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ بدبخت میرے سامنے آ جائے تو اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا
گھونٹ دوں۔ کیا ضرورت تھی ایسی اولاد کا جو جان بھی مشکل میں ڈالے اور عزت بھی مٹی میں رول دے۔'' غیاث محمد
خود اچھا خاصا بھرا بیٹھا تھا، داماد کے چھیڑتے ہی پھٹ پڑا۔

''تم اپنی جان کو رو رہے ہو چاچا! مجھے تو ساروں کی فکر پڑی ہے۔ چودھری کی خاموشی کو معمولی نہ جانو۔ اس کی خاموشی کسی بھی وقت طوفان بن کر ہمیں تباہ کر سکتی ہے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ ماسی حوراں اور خالو صفدر کے قتل کے پیچھے بھی کوئی اور بات ہے۔ اگر زیور وغیرہ کے چکر میں ڈاکا پڑنا تھا تو پہلے کیوں نہیں پڑا؟ وہ جس عورت نے کمیٹی اور زیور کی کہانی سنائی تھی، اس نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ ماسی حوراں نے زہرہ کے بیاہ سے پہلے ماہ بانو کے لیے زیور خریدا تھا، پر ڈاکا پڑا ماہ بانو کے یہاں سے بھاگنے کے بعد۔ کوئی میری مانے یا نہ مانے پر میں تو کہوں گا کہ گل کچھ ہو رہی ہے۔'' انور نے ایک بار پھر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''پر ماسی کے گھر سے زیور اور روپیہ غائب تو تھا۔ اگر ماسی اور خالو صفدر کو قتل کرنے والے ڈاکو نہیں تھے تو انہوں نے زیور وغیرہ کیوں نہ تھما لیا؟'' انور کی بات پر زہرہ نے اعتراض کیا اس حادثے نے اسے اندر سے سہما دیا تھا۔ بے شک اس نے سب کے سامنے یہ کہانی بنا دی تھی کہ ماہ بانو اسے دھوکے سے غسل خانے میں بند کر کے فرار ہو گئی ہے لیکن حقیقت تو وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کو فرار کروانے میں اس نے خود مدد کی تھی۔ وہ بہن کی حالت دیکھ کر پسیج گئی تھی مگر اب جو حالات تھے، ان کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ خاص طور پر حوراں اور صفدر کے قتل کا بوجھ وہ اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی اور اس الزام سے خود کو بری رکھنے کے لیے صفدر اور حوراں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ڈاکا زنی کی واردات ہی قرار دینا چاہتی تھی۔

''تو چپ کر۔ تجھے کیا معلوم کہ دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا بھروسہ کہ ماسی اور خالو صفدر کو قتل کرنے کے بعد زیور اور روپیہ اس لیے غائب کر دیا گیا ہو کہ کسی دوسرے کی طرف شک نہ جائے۔ اور کیا معلوم کہ جس محلے دار نے دونوں کی لاشیں دیکھیں، پہلے اس نے ہی سب کچھ اُڑا لیا ہو پھر بعد میں پولیس کو خبر دی ہو۔'' رب نواز نے زہرہ کو ڈانٹ کر اپنا خیال پیش کیا۔

''میرے خیال میں تو ڈاکا واکا کچھ نہیں پڑا۔ زیور میں نے زہرہ کے بیاہ کے موقع پر ماہ بانو کے پاس دیکھا تھا۔ رات والے روز اس نے کانوں میں سونے کے بُندے پہنے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حوراں واپس جاتے وقت اپنے ساتھ زیور لے کر ہی نہ گئی ہو۔ ویسے بھی ماہ بانو اپنے بیگ کو بڑی حفاظت سے تالا لگا کر رکھتی تھی۔ سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو گی، تب ہی تو وہ حفاظت کرتی تھی۔ نصیبوں جلی جاتے جاتے وہ بیگ بھی اپنے ساتھ اکا لے گئی۔'' اب تک خاموش بیٹھی نوراں نے ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے دہائی دی اور سر پیٹنا شروع کر دیا۔

''خیر، جو بھی معاملہ ہے اور ماہ بانو نے جو بھی کچھ کیا، میں صاف بتا رہا ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر اس بات کی کوئی ذمے داری نہیں۔ میں دبئی واپس جا کر زہرہ کو بھی تھوڑے عرصے میں وہیں بلوا لوں گا۔ ماہ بانو کے بعد چار دن بھی سکھ کے دیکھنے کو نہیں ملے۔ پہلے سے خبر ہوتی تو میں اماں ابا کو منع کر دیتا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں رشتہ جوڑنے کی۔ اب دبئی واپس جاؤں گا تو سارا وقت یہی فکر لگی رہے گی کہ پیچھے کچھ ہو نہ جائے۔'' رب نواز نے بگڑے تیوروں کے ساتھ نہایت بدلحاظی سے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

''رب نواز ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا! اس مصیبت کو تم اکیلے ہی بھگتنا۔ ہم میں ہمت نہیں ہے چودھری صاحب کے غضب کو برداشت کرنے کی۔ اگر چودھری صاحب نے تمہارے لیے خفگی دکھائی تو میں تو صاف اعلان کر دوں گا کہ میرا اور میرے گھر والوں کا تمہارے گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' رب نواز نے سگا بھتیجا ہوتے ہوئے ہری جھنڈی دکھا دی تھی تو انور کس بات کا لحاظ کرتا؟ اس نے بھی صاف بتا دیا کہ مشکل وقت میں وہ نوراں اور غیاث محمد کا ساتھ دینے والوں میں سے نہیں ہو گا۔



''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟ اماں ابا کوئی ہم سے الگ تو نہیں ہیں جو مشکل وقت میں ہم انہیں اکیلے چھوڑ دیں گے۔'' زہرہ نے شوہر اور بہنوئی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاج کیا۔

''جو سچ تھا، وہ بتا دیا۔ اگر نگار کو شوق ہو تو بے شک یہاں رک جائے۔ پر میں تو اب دوبارہ یہاں نہیں آنے والا۔'' انور نے اپنی بات کہہ کر فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ رب نواز بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا۔ زہرہ اور نگار دونوں ہراساں و پریشان اپنے اپنے شوہروں کو دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرنے میں ذرا لحاظ نہ کریں گے۔

''نی گڈیو! جاؤ، اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔ ہم اپنے سر پر پڑی بھگتیں گے یا تم دونوں کا بوجھ سنبھالیں گے؟'' نوراں نے جو دامادوں کے تیور دیکھے تو جلدی سے بیٹیوں سے بولی۔ ماں کا رویہ دیکھ کر نگار اور زہرہ نے جلدی سے اپنی اوڑھنیاں اچھی طرح لپیٹیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انور اور رب نواز باہر نکلے تو وہ دونوں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔ اس میکے کی محبت میں رُکتیں بھی کیسے جہاں انہیں صرف بوجھ ہی سمجھا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''شہریار! تمہارا فون ہے۔'' وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا ہی تھا کہ اس کی ممانی مسز آفرین رانا نے اسے اطلاع دی۔ شہریار جو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کے خیال سے اپنے بیڈروم کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس اطلاع پر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

''موتی والا بات کر رہا ہوں شہریار صاحب!'' شہریار کی ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری طرف سے اپنا تعارف کروایا گیا۔

''جی موتی والا صاحب! فرمائیے کیسے مزاج ہیں؟'' موتی والا کی کال پر تھوڑا سا حیران ہونے کے باوجود شہریار نے خوش دلی سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہی سمجھ لیں۔'' موتی والا نے اُداس سے لہجے میں جواب دیا، پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ''بے وقت زحمت دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں تو میں نے آپ کے دفتر ہی فون کیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ لاہور آئے ہوئے ہیں، اس لیے میں نے سوچا رانا ہاؤس کے نمبر پر ٹرائی کر لوں، ممکن ہے یہاں پر آپ سے بات ہو جائے۔ خوش قسمتی سے میرا خیال درست ہی ثابت ہوا اور آپ یہاں مل گئے۔''

''اصل میں بہت دن ہو گئے تھے گھر والوں سے ملاقات ہوئے۔ جب سے پوسٹنگ ہوئی تھی، لاہور آنا ہی نہیں ہوا تھا۔ آج بڑی مشکل سے فرصت نکالی ہے یہاں آنے کے لئے۔ آپ بتائیے، آپ نے کس سلسلے میں مجھے یاد کرنے کی زحمت فرمائی ہے؟'' شہریار آج عبدالمنان کی اپروچ کی ہوئی این جی او کے نمائندے سے ملاقات کے لیے خاص طور پر لاہور آیا تھا۔ لیکن موتی والا کے سامنے اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کا لاہور کا یہ دورہ قطعی نجی نوعیت کا ہے۔ موتی والا کو اس کی بات ماننے میں یوں تامل نہیں ہو سکتا تھا کہ ظاہر ہے لاہور میں شہریار کا ایک مستقل گھر موجود تھا۔ اے سی کی حیثیت سے وہ کتنے ہی گھاٹوں کا پانی چکھتا لیکن لوٹ کر ہر بار اسے لاہور ہی آنا تھا۔ البتہ شہریار تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا کہ موتی والا کو آخر اس سے ایسا کون سا کام آ پڑا ہے جو وہ جگہ جگہ فون گھما کر اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

''مجھے افسوس ہے شہریار صاحب! کہ آپ کو کافی عرصے بعد گھر آنے کا موقع ملا ہے اور آپ کی خواہش ہو

گی کہ اس مختصر وقت کو مکمل طور پر فیملی کے افراد کے ساتھ ہی گزاریں۔ لیکن مجھے آپ سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں جن کے لیے میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ملاقات کے لیے رانا ہاؤس آ جاؤں؟ اصل میں، میں چاہ رہا ہوں کہ آپ لاہور میں موجود ہیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھایا جائے ورنہ دوسری صورت میں بھی میں آپ سے یہی درخواست کرتا کہ آپ کو جب بھی لاہور آنا ہو، پہلی فرصت میں مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ آنے کو تو میں وہاں آپ کے دفتر میں بھی آ کر آپ سے ملاقات کر لیتا لیکن میری وہاں آمد کچھ لوگوں کو چونکا دے گی۔ اس لیے میں وہاں ملاقات سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔''

موتی والا کے اندازِ گفتگو نے شہریار کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ موتی والا سے ملاقات کے لیے انکار کرتا۔ چنانچہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اتنے تکلف سے کام لے رہے ہیں موتی والا صاحب!..... آپ کے لیے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ مجھ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتے ہیں۔''

''عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ یہ فرمائیے کہ کتنے بجے تک حاضر ہو جاؤں؟'' شہریار کا جواب سن کر موتی والا نے پوچھا۔

''اگر فوری طور پر آ سکیں تو مناسب رہے گا۔ اصل میں شام سے پہلے ہی میرا واپسی کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں پچیس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔'' شہریار کے بتانے پر موتی والا جھٹ بولا۔ شہریار ظاہر ہے جواباً ''خوش دلِ ماشاد'' ہی کہہ سکتا تھا سو اُس نے بہ زبان انگریزی ''یو آر موسٹ ویلکم'' کہا اور فون بند کر کے اپنے سابقہ ارادے کے مطابق آرام کے لیے اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے موتی والا کے انتظار میں اپنی فیملی سے گپ شپ لگانے لگا۔

ٹھیک بائیس منٹ بعد ملازم نے اسے موتی والا کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہریار، ممانی سے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ موتی والا عام سے شلوار قمیض میں ملبوس ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ شہریار کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے پر اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر شہریار سے ہاتھ ملایا۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' شہریار نے خود بھی ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ موتی والا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شہریار نے آخری بار اسے اس کے بیٹے کی موت کے دن بعد دیکھا تھا اور اس کے بعد آج دیکھ رہا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں ہی موتی والا کی صحت پر اثر پڑا تھا۔ یقیناً اکلوتے بیٹے کی موت کا غم اس نے اپنی جان سے لگا لیا تھا۔

''کیا لینا پسند فرمائیں گے؟..... ٹھنڈا یا گرم؟ ویسے میرے خیال میں موسم کی مناسبت سے کافی یا چائے مناسب رہے گی۔'' ملازم اور حال احوال کے بعد شہریار نے موتی والا سے دریافت کیا۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں بس آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔ آپ میری وہ بات توجہ سے سن لیں۔ باقی کچھ لینے کی خواہش نہیں۔''

''باتیں بھی ہوتی رہیں موتی والا صاحب! لیکن ساتھ میں کچھ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ میرے خیال میں، میں کافی منگوا لیتا ہوں۔'' موتی والا کا جواب سن کر شہریار نے اصرار کیا۔

''میں تکلف نہیں کر رہا شہریار صاحب! واقعی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ اب خواہش ہوتی ہی نہیں ہے۔ بس سانسوں کے چلنے کے لیے ضرورتاً تھوڑا بہت زہر مار کر لیتا ہوں۔'' بے بسی سے کہتے



موتی والا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی تھی۔ اس نمی کو لہجے میں گھلنے سے بچانے کے لیے وہ کچھ پل خاموش بیٹھا رہا۔ شہریار نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اکلوتے جوان بیٹے کو گنوانے والا باپ اپنی زندگی کے کس انتہائی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہوگا۔

''یہ دنیا عجیب جگہ ہے شہریار صاحب! آدمی جانتا ہے کہ ایک روز اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے، پھر بھی اُس لالچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اپنی اولاد کے لیے آدمی کا بس نہیں چلتا کہ کون کون سے خزانے جمع کرے۔ میں بھی برسوں سے اسی ہوس میں مبتلا تھا لیکن اب حال یہ ہے کہ دولت کے انبار لگے ہیں لیکن جس کے لیے یہ سب کچھ جمع کیا تھا، وہ دنیا سے جا چکا ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی غلطیوں کو سدھار لوں۔ اسی سلسلے میں، میں نے آج آپ کو ملاقات کی زحمت دی ہے۔'' موتی والا نے افسردہ لہجے میں اتنا کہا اور ایک بار پھر چپ سادھ لی۔

''میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں موتی والا صاحب! آپ کو جو کچھ کہنا ہے، بلا تکلف کہتے رہیں۔'' شہریار نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر بولنے پر اُکسایا تو وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

''آپ جانتے ہوں گے کہ میرے اور چودھری افتخار عالم کے درمیان کاروباری شراکت ہے۔ میرے کاروبار کی نوعیت اور وسعت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے۔ پہلے میں ایک چھوٹا سا بزنس مین تھا لیکن چودھری افتخار کے ساتھ پارٹنرشپ کی تو دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے کاروبار کی یہ ترقی چودھری افتخار کی بھاری سرمایہ کاری کے مرہونِ منت ہے لیکن حقیقت سے مجھ سمیت چند ہی لوگ واقف ہیں۔ چودھری افتخار نے میرے ساتھ پارٹنرشپ کرنے کے بعد سرمائے سے زیادہ لکڑی فراہم کی۔ ہمارے ساتھ جو جنگل لگتا ہے، اس جنگل میں بڑی تعداد میں شیشم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں سے حاصل ہونے والی لکڑی بہت اعلیٰ پائے کی ہوتی ہے اور فرنیچر سازی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چودھری افتخار اور اقبال باجوہ کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں عرصے سے مجھے یہ لکڑی تقریباً مفت مل رہی ہے۔ بس مجھے پرافٹ میں سے ان دونوں کو حصہ دینا پڑتا ہے۔ حصہ بھی آپ سمجھیں کہ چودھری افتخار لیتا ہے، اقبال باجوہ کو تو ہم اس کی خاموشی اور چشم پوشی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔''

''آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' شہریار نے موتی والا کو بہ غور دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بار جب جنگل سے لکڑی چرا کر منتقل کی جا رہی ہو تو آپ اپنی ٹیم کے ساتھ چھاپہ ماریں اور اس جرم میں ملوث افراد کو بے نقاب کریں۔''

''اس صورت میں آپ بھی زد میں آئیں گے۔ جب بات نکلے گی تو ظاہر ہے پھر دور تک جائے گی۔'' موتی والا کے جواب پر شہریار نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے احساس دلایا۔

''میں جانتا ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔'' موتی والا کا جواب حیران کن تھا۔

''کیا ایسا آپ چودھری افتخار سے انتقام لینے کے چکر میں کر رہے ہیں؟ چودھری صاحب شکوہ کرتے ہیں کہ آپ کا اُن کے ساتھ ایسا رویہ ہے جیسے انہوں نے آپ کے بیٹے کو قتل کیا ہو۔''

''میں جانتا ہوں کہ چودھری افتخار نے میرے بیٹے کو قتل نہیں کیا۔ کم از کم براہِ راست تو اس نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ میں اسے اپنے بیٹے کا قاتل ٹھہرا سکوں۔ لیکن میں حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے بیٹے کی موت

میں اسی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ جب تک میری چودھری افتخار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں ایک ایمان
تھا۔ میرا کاروبار چھوٹا تھا لیکن اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گھر میں خوش حالی تھی۔ میں بیوی اور بچے کو
وقت دیتا تھا۔ میرا بیٹا بہت ذہین تھا۔ اُس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میرے اباجی نے خواہش ظاہر کی تھی
اُسے حافظِ قرآن بناؤں۔ اباجی کے مرنے کے بعد بھی میں اُن کی اس خواہش پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا
پھر میری چودھری افتخار سے ملاقات ہوگئی۔ بس پھر تو میں دولت جمع کرنے کی دُھن میں مبتلا ہو گیا۔ نہ
بی کی خواہش یاد رہی نہ بیٹے کو دینے کے لیے وقت بچا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنے بچے کی تربیت
کی جو ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی، اس کو میں اپنے طور پر نوٹوں کی گڈیاں لُٹا لُٹا کر ادا کرتا رہا۔
فراوانی اور تربیت کے فقدان نے اثر دکھایا۔ میرا بیٹا اپنے دادا کی خواہش کے مطابق حافظِ قرآن
جائے ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ بن گیا۔ اُس کے کرتوتوں سے متعلق خبریں میرے کان میں پڑتی رہتی
ایک بار وہ شراب پی کر غل غپاڑہ کرنے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا۔ میں نے تھانے دار کو رشوت دے
چھڑا لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں تھا کہ میرے بیٹے کو میری دولت پر یہ سارے عیش کرنے کی آزادی
لیکن جب وہ مرا تو مجھے احساس ہوا کہ اس بے جا آزادی کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کی
مارٹم رپورٹ دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کن حالات میں مرا۔ مگر میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ حالات
افکار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اگر وہ مجھے حرام ذرائع سے دولت کمانے کی دھن میں نہیں لگاتا تو میں
چھوٹا سا بزنس مین ہوتا جس کے پاس اپنے بیٹے کی تربیت کرنے کی فرصت ہوتی۔ جس کی کمائی میں حرام
قدر آمیزش نہیں ہوتی کہ اس کی اولاد حرام وحلال کی تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی۔ آپ یہ مت سمجھئے
ہر برائی کی ذمے داری چودھری افتخار کے سر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دینا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں
اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں اور اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ اگر میری درخواست پر غور کرتے ہوئے آپ
کارروائی کرتے ہیں تو میں ازخود اعترافِ جرم کرلوں گا لیکن فی الحال میرا منظر پر رہنا ضروری ہے۔ میں
آپ میں موجود رہوں گا، تب ہی آپ کو بتا سکوں گا کہ اگلی کھیپ کب اسمگل کی جائے گی۔ اس مقصد کو سامنے
کر میں نے ابتدائی جذباتی پن کو چھوڑ کر چودھری افتخار سے اپنے مراسم دوبارہ استوار کر لیے ہیں۔ اب
دوبارہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میں اس کا کاروباری حلیف ہوں لیکن جو سچ ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔

شہریار کے سوال کے جواب میں موتی والا نے ایک جذباتی اور تفصیلی بیان دیا۔ شہریار سمجھ رہا تھا کہ
والا کی یہ کایا پلٹ بیٹے کی موت کے شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔ قدرت کے کارخانے میں ایسے واقعات کا
کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اولاد کے صدمے سے بڑے بڑوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے
ہوتے ہیں جو ایسے کاری زخم کھا کر بھی اپنی غلط روش پر قائم رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگوں کی اس قسم سے
رکھتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہو۔ موتی والا کی کایا اس لیے پلٹ گئی تھی کہ وہ بنیادی طور پر
انسان تھا جس نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ایمان داری سے کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ بعد میں دولت
چمک نے اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ورنہ جو شخص اپنے باپ کی خواہش پر اپنے بیٹے کو حافظِ قرآن
ارادہ رکھتا ہو، وہ فطرتاً بے ایمان اور برا نہیں ہو سکتا۔

''میں آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں گا موتی والا صاحب! آپ مجھ سے مسلسل رابطے میں
گا۔ آپ کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق میں لکڑی کے ان اسمگلرز کو چھاپنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔
کوشش ہوگی کہ آپ کے تعاون کے صلے میں آپ پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً ہلکی فردِ جرم



ڈالے۔'' شہریار خوش تھا کہ ایک ایسے موقعے پر جبکہ وہ چودھری افتخار کی شخصیت کا ایک بھیانک روپ لوگوں کے
سامنے لانے والا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ چودھری افتخار کا ایک دوسرا روپ بھی سامنے لا
سکے۔ ماہ بانو والے معاملے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ بھی سامنے آ جاتا تو چودھری افتخار کے لیے آسانی سے اپنی
جان چھڑانا ممکن نہیں رہتا۔ اسے یہ موقع موتی والا فراہم کرنے والا تھا اس لیے جواباً اسے بھی کوئی ریلیف ملنا
چاہیے تھا مگر موتی والا کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ اس نے کہا۔

''آپ کا شکریہ شہریار صاحب! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی نرمی کا خواہش مند نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا
ہوں، اپنے جرم کا کفارہ سمجھ کر کر رہا ہوں اور کفارہ ادا کرنے کے خواہش مند نرمی اور آسانی تلاش نہیں کرتے۔''
اپنی اس بات کو کہنے کے بعد موتی والا مزید وہاں رکا نہیں اور شہریار سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے
جانے کے بعد شہریار بڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ آدمی کا دماغ ٹھکانے پر لانے کے لیے کیا کچھ نہیں
کرتا مگر کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔ عموماً لوگوں کو عقل اسی وقت آتی ہے
جب وہ خود ٹھوکر کھاتے ہیں اور بعض بدنصیب تو ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سنبھلتے۔

⊛----✪----⊛

''تم سوئیں نہیں ابھی تک؟'' سرد اور نیم روشن برآمدے میں ٹہلتی ماہ بانو اپنے خیالات میں اتنی غرق تھی کہ
اسے خبر نہیں ہو سکی کہ کب دارالامان کی منتظمہ اس برآمدے میں داخل ہو کر اس کے قریب آ پہنچی۔ منتظمہ یقیناً
اپنے معمول کے مطابق رات کو سونے سے قبل دارالامان کا آخری چکر لگا رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک عام سی
شکل وصورت کی عورت تھی جو مزاجاً ہمدرد ہونے کے باوجود کافی اصول پرست تھی اور اس اصول پرستی کی وجہ
سے اسے اکثر سختی سے بھی کام لینا پڑتا تھا مگر اس وقت ماہ بانو سے سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''نیند نہیں آ رہی۔ طبیعت بہت بے چین ہے۔'' ماہ بانو نے جھکی نظروں کے ساتھ منتظمہ کے سوال کا
جواب دیا۔ آج شام ہی تو اسے منتظمہ سے سخت ڈانٹ سننے کو ملی تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم بہت پریشان ہو۔ اپنے گھر سے الگ کسی دارالامان جیسی جگہ پر رہنا واقعی بہت
مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب بندہ جانتا ہو کہ اس کے گھر میں اس سے محبت کرنے والے
لوگ اس کے منتظر ہیں۔ مجھے تمہارے حالات کے بارے میں مکمل علم نہیں مگر مجھے تمہارے سلسلے میں بہت سختی
سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی کو بھی تمہاری یہاں موجودگی کے بارے میں خبر نہ ہو سکے۔ آج شام تم نے جو
حرکت کی تھی، وہ بہت خطرناک تھی۔ جانتی ہو شام سے پہلے میرے پاس کئی دفعہ مختلف نمبروں سے فون آ چکے
ہیں کہ ہماری ماہ بانو سے بات کروا دیں۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی ماہ بانو نہیں رہتی۔ یہ کسی کی
رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک ہسپتال ہے۔ ایک لڑکی نے تو مجھ سے اچھی خاصی بحث کی کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔
ماہ بانو یہاں موجود ہے۔ اس نے خود مجھے اس نمبر سے فون کیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ بی بی! یہ پبلک پلیس
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماہ بانو نام کی کسی خاتون نے ہسپتال کے فون سے آپ کو فون کیا ہو۔ وہ کسی کام سے یہاں
آئی ہوں گی تو فون کر لیا ہوگا لیکن اب وہ یہاں نہیں ہیں تو میں ان سے کس طرح آپ کی بات کرواؤں؟ بڑی
مشکل سے اس لڑکی نے میری بات پر یقین کیا۔'' لہجہ نرم ہونے کے باوجود ماہ بانو محسوس کر سکتی تھی کہ منتظمہ اس
کی حرکت پر ناراض ہے۔ منتظمہ مجموعی طور پر ایک اچھی عورت تھی اور ماہ بانو کو اس کی ناراضگی اتنی غلط بھی نہیں
لگ رہی تھی، چنانچہ شرمندگی کے گہرے احساس کے ساتھ وہ بولی۔

''سوری میڈم! مجھے احساس ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اصل میں میری طبیعت دو تین دن سے بے چین تھی کہ میں رہ نہیں سکی۔''

''مجھے خود بھی تمہاری کیفیت کا اندازہ ہے۔ اس وقت میں تمہیں سختی سے ڈانٹ کر اندر سونے کے لیے بھیجنے کے بجائے تمہارے پاس رُکی ہی اس لیے ہوں کہ تمہیں سمجھا سکوں۔ میں برسوں سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی ہوں۔ یہاں رہنے والی عورتیں کسی نہ کسی مجبوری یا مشکل کا شکار ہوتی ہیں۔ لیکن تم دیکھ لو کہ ہم سب نے کس طرح حالات کے ساتھ سمجھوتا کر رکھا ہے۔ وہ آپس میں ہنستی بولتی بھی ہیں اور لڑتی جھگڑتی بھی ہیں، ساتھ ساتھ روٹین کے کام بھی چلتے رہتے ہیں۔ تم بھی اپنی کسی مشکل کی وجہ سے یہاں آئی ہو۔ اُمید رکھو کہ تمہاری مشکل جلد دور ہو جائے گی اور تم یہاں سے واپس اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ لیکن جب تک یہاں ہو، تم کو تو تمہیں ہمت اور برداشت سے کام لینا ہی ہوگا۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر ٹہلنے سے کیا حاصل ہوگا؟ ہاں شاباش! جا کر سو جاؤ۔''

ماہ بانو کی معذرت کے جواب میں منتظمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے حکم دیا تو وہ اس حکم کی پیروی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا قیام تھا۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ چند دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ تمام عورتیں سکون سے گہری نیند سو رہی ہیں۔ اسے ان عورتوں کی اس قدر پُرسکون نیند پر حیرت ہوئی۔ دارالامان میں اپنے چند روزہ قیام کے عرصے میں ہی وہ اپنی ساتھی عورتوں کے حالات سے اچھی خاصی واقف ہو گئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک عورت پچھلے پندرہ سال سے یہاں رہ رہی تھی۔ اس عورت کے ماں باپ مر چکے تھے۔ کسی عزیز نے کچھ عرصہ اپنے گھر میں پناہ دی اور پھر جان چھڑانے کے لیے بغیر دیکھ بھال کیے شادی کر دی۔ سسرال والے نہایت جاہل لوگ تھے جو بغیر جہیز کے آنے والی لاوارث بہو پر ہر طرح کا ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ بے چاری روزانہ کی مار پیٹ اور گالی گلوچ خاموشی سے سہتی رہتی۔ شکایت کرتی بھی تو کس سے؟ میکے کے نام پر کوئی آسرا نہیں تھا اور شوہر بھی اپنے گھر والوں کا ہم نوا تھا۔ اس عورت نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا مرنا جینا اسی ظالم سسرال میں ہے لیکن مرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ اسے اس وقت پتہ چلا جب اس کی ساس اور نندوں نے مل کر اسے جلانے کی کوشش کی۔ وہ کسی طرح ان سے جان بچا کر گھر سے بھاگ نکلی اور ایسی نکلی کہ پھر پلٹ کر کبھی واپس جانے کی ہمت نہیں کی۔

اب وہ پندرہ سال سے اس دارالامان میں تھی اور اپنے [illegible] کے معاملے میں یہاں بہت خوش تھی۔ غرض ہر عورت کے پیچھے اسی طرح کی کہانی تھی جو وہ ہر نئے آنے کو شاید اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سنا دیتی تھی۔ ماہ بانو سے بھی ان لوگوں نے اس کے حالات جاننے کی کوشش کی تھی لیکن ماہ بانو کو پی اے عبدالمنان کی ہدایات یاد تھیں۔ اسے یہاں بھجوانے سے قبل اس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ ماہ بانو پوری طرح سے اس کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ لیکن وہ دارالامان میں مقیم دوسری عورتوں کی طرح یہاں رچنے بسنے میں ناکام تھی۔ اسے ہر وقت بے بے اور ابا کی یاد آتی رہتی تھی اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی بے قراری تھی۔ اس بے قراری کے ہاتھوں ہی مجبور ہو کر اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ یوں تو اس نے عبدالمنان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ فیصل آباد میں اس کی بے بے اور ابا کو اس کے بارے میں مطلع کر دے گا لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ خود ان دونوں سے بات کر لے۔ منتظمہ سے اس سلسلے میں اس نے ایک بار اجازت بھی مانگی تھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج ماہ بانو بہت بے چین ہوئی تو اس نے



[illegible] کی ایک ملازمہ کو چند روپے دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے موقع دیکھ کر فون پر گھر بات کروا [illegible]۔ ماہ بانو کے اپنے گھر میں تو فون نہیں تھا۔ اس نے پڑوسیوں کے گھر فون کیا کہ بے بے کو وہاں بلوا کر [illegible] لے گی لیکن ہوا یہ کہ ابھی اس نے لائن ملنے کے بعد صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ میں ماہ بانو بول رہی ہوں تو [illegible] وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ماہ بانو کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر لائن کاٹی اور پھر اسے ٹھیک ٹھاک [illegible] لا دیں۔ ماہ بانو کا ساتھ دینے والی ملازمہ کی تو اس سے کئی گنا بڑھ کر شامت آئی تھی۔ ابھی برآمدے [illegible] والی ملاقات میں منتظمہ نے اسی فون کال کے حوالے سے اسے دوبارہ سمجھایا تھا۔ ماہ بانو کافی حد تک [illegible] سمجھ گئی تھی لیکن دل کی بے قراری اپنی جگہ تھی۔ وہ کمرے میں موجود دوسری عورتوں کی طرح بے فکری [illegible] میں ناکام تھی۔ اسے رہ رہ کر اے سی شہریار عادل اور اس کے پی اے پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اسے اس [illegible] میں پہنچانے کے بعد بھول ہی گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، اس وقت وہ ان پر آئے غصے کو کسی صورت [illegible] سکتی تھی چنانچہ بے بس سی ہو کر منتظمہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش [illegible] کی۔

[illegible] دیر کی کوشش کے بعد بھی اسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ذہن کچھ غنودگی میں چلا گیا۔ غنودگی کی اس [illegible] میں اس نے باہر برآمدے میں قدموں کی آوازیں سنیں۔ قدموں کی یہ آوازیں اسی کمرے کے [illegible] پر آ کر رُکیں جس میں ماہ بانو موجود تھی۔ یک دم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ماہ بانو ہڑبڑا کر [illegible] اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھلے دروازے سے دو ڈھاٹا پوش اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دارالامان کی [illegible] منتظمہ بھی تھی۔ منتظمہ کو ایک ڈھاٹا پوش نے اپنے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا۔ ماہ بانو کو یہ سمجھنے میں [illegible] نہیں لگا کہ آنے والے ڈھاٹا پوش چودھری افتخار کے کارندے ہیں جو اس کی تلاش میں یہاں تک آ [illegible]۔ ماہ بانو تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی گرفت میں آنے سے پہلے کہیں بھاگ [illegible] لیکن اس کمرے میں فرار کا واحد راستہ وہ دروازہ تھا جس پر دونوں ڈھاٹا پوش ڈٹے ہوئے تھے۔

⊛----✪----⊛

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شہریار اپنے بیڈ روم میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اسے دروازے پر [illegible] والی دستک سنائی دی۔ شہریار نے چونک کر سرہانے رکھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر مزید حیران [illegible] ہوئے ''یس کم اِن'' کہا۔ اگلے لمحے اس کا بٹلر سامنے موجود تھا۔

''سوری سر! اس وقت آپ کی نیند خراب کرنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں عبدالمنان صاحب [illegible] ہوئے ہیں اور آپ سے فوری ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاملہ بہت سنجیدہ اور فوری [illegible] کا ہے۔'' بٹلر نے شہریار سے معذرت کرتے ہوئے رات کے اس پہر اُسے ڈسٹرب کرنے کی وجہ بتائی۔ [illegible] کر شہریار پریشان ہو گیا۔ عبدالمنان ایک سمجھ دار اور ذمے دار آدمی تھا جو بلاوجہ اس وقت اسے ڈسٹرب [illegible] کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو میں آ رہا ہوں۔'' عبدالمنان کی آمد کی وجہ کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش [illegible] ہوئے شہریار نے بٹلر کو حکم دیا اور پھر خود سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہننے کے بعد ہاتھوں سے بال سنوارتا ہوا [illegible] سے باہر نکل گیا۔ عبدالمنان نیچے لاؤنج میں ہی اس کا منتظر تھا۔

''سوری سر! معاملہ بہت اہم تھا ورنہ میں اس وقت آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔'' شہریار کو دیکھتے ہی

عبدالمنان نے اس سے معذرت کی۔ خود اس کے چہرے سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی گہری
جگایا گیا ہے۔

''کیا پرابلم ہے؟'' عبدالمنان کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''لاہور کے دارالامان کی منتظمہ کا فون آیا تھا سر! اس نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے ماہ بانو کو
اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش تو ناکام ہو گئی لیکن ماہ بانو اس وقت علاقے کے تھانے میں
ایس ایچ او اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' عبدالمنان کی دی ہوئی
شہریار کو یک دم ہی مضطرب کر دیا لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو قابو
سپاٹ لہجے میں عبدالمنان سے بولا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟.....ذرا تفصیل سے بتاؤ؟''

''زیادہ تفصیلات تو مجھے خود بھی نہیں معلوم سر! منتظمہ کے مطابق رات کے وقت دارالامان کے
چوکیدار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوکیدار ضرورت کے تحت باتھ روم گیا ہوا تھا، اس وقت
دیوار پھلانگ کر دارالامان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پھر
کمرے میں گھس کر اسے اسلحے کے زور پر مجبور کیا کہ اسے ماہ بانو تک پہنچا دیا جائے۔ ظاہر ہے، منتظمہ
جان بچانے کے لیے ان کا حکم ماننا پڑا۔ وہ ماہ بانو کو زبردستی اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ وہ چوکیدار جو باہر
ہوا تھا، واپس لوٹ آیا۔ اس نے دور سے ہی صورتِ حال بھانپ لی اور اپنی رائفل کے زور پر حملہ آور
مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے لیکن اس اچانک حملے کی وجہ سے سنبھل نہیں سکے
نے سب سے پہلے اس شخص کی ٹانگ پر گولی ماری جس نے ماہ بانو کو اٹھایا ہوا تھا۔ ایک اور شخص بھی
مجبوراً باقی بچ جانے والے افراد کو اپنے دونوں زخمی ساتھیوں کو لے کر راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ افراتفری
ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کی جوابی فائرنگ نے بے چارے
اچھا خاصا زخمی کر دیا ہے۔ اس کے جسم میں تین گولیاں لگی ہیں اور منتظمہ کے مطابق اس کی حالت نازک
اگر چوکیدار کے زخمی ہونے کا معاملہ نہیں ہوتا تو منتظمہ شاید اس واقعے کو چھپا لیتی لیکن فائرنگ اور زخمی
وجہ سے قریبی تھانے میں اطلاع پہنچ گئی۔ ایس ایچ او کو منتظمہ نے یہی بتایا کہ حملہ آور نامعلوم تھے اور
زبردستی دارالامان میں گھس کر عورتوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ منتظمہ نے ایس ایچ او پر ظاہر نہیں
حملہ آور، ماہ بانو کے لیے وہاں آئے تھے لیکن ایس ایچ او بہت کائیاں آدمی ہے۔ اس نے ماہ بانو کے سا
دوسری عورتوں کا بھی بیان لیا اور ان عورتوں میں سے کسی نے بتا دیا کہ آنے والوں نے صرف ماہ
کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب ایس ایچ او، ماہ بانو کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا ہے کہ اُس سے اصل صو
کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ منتظمہ نے پریشان ہو کر مجھے یہاں فون کیا اور میں آپ کے
آیا کہ آپ سے صورتِ حال کو ڈسکس کر کے کوئی قدم اٹھایا جائے۔''

عبدالمنان نے شہریار کو تفصیل سنائی تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ قدرتی طور پر وہ سوچ رہا تھا
کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے چودھری افتخار کے ہی بندے ہو سکتے ہیں۔ انہیں ماہ بانو کے لاہور
دارالامان میں ہونے کی خبر کس طرح ملی تھی، یہ سوال اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود اس وقت سب
ضرورت یہ تھی کہ ماہ بانو کو تھانے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا جائے، ورنہ چودھری افتخار کے
وہاں بھی ڈھونڈ لینا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ماہ بانو کی تھانے سے رہائی کا کام بھی بہت رازداری



اس کام کے لیے سجاد رانا سب سے موزوں تھا۔ وہ ایک فون کرتا تو ایس ایچ او بے چون و چرا نہ
ماہ بانو کو چھوڑ دیتا بلکہ اس بارے میں بھی زبان بند رکھتا کہ ماہ بانو کی رہائی کس کے حکم پر عمل میں آئی
عبدالمنان سے متعلقہ تھانے کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد شہریار نے سجاد رانا کا نمبر ڈائل کیا۔
تین چار گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی۔

''السلام علیکم سجاد بھائی! میں شہریار بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے سجاد رانا کی ''ہیلو'' سنتے ہی
نے جلدی سے کہا۔

''وعلیکم السلام! لیکن برادر عزیز! فون کرنے کے لیے یہ وقت کچھ نامناسب نہیں؟ کہاں تو آپ دن کے
زحمت نہیں فرماتے، کہاں رات کے اس آخری پہر فون کھڑکا دیا۔ پہلے ہی شہر میں ہر وقت ہونے
واردات کی وجہ سے مشکل سے ہی سونا نصیب ہوتا ہے۔ ویسے مجھے تمہارا فون کرنا بھی کچھ مشکوک لگ رہا
خیریت تو ہے؟'' سجاد رانا، شہریار سے عمر میں کافی بڑا تھا اور اس سے بہت محبت کرتا تھا، چنانچہ اپنی
محبت کی وجہ سے پہلے تو جو جی میں آیا بولتا چلا گیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یوں رات کے اس پہر
بندے کا فون بلاوجہ نہیں آ سکتا۔ چنانچہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''جی ہاں سب خیریت ہے۔ میں نے ایک اہم کام کے سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے۔ لاہور کے ایک
سے ماہ بانو نام کی لڑکی کو اتنی خاموشی سے چھڑوانا ہے کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ لڑکی کو کس نے
وہ کہاں گئی۔'' شہریار نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''خیریت.....کون ہے یہ لڑکی اور تمہیں اپنے علاقے میں بیٹھے بیٹھے لاہور کے کسی تھانے کا احوال کہاں
معلوم ہوا؟'' سجاد رانا، شہریار کا مطالبہ سن کر چونکا۔

''یہ ساری تفصیلات میں بعد میں بتا دوں گا، فی الحال لڑکی کی فوری رہائی ضروری ہے۔ آپ اسے رہا کروا
کسی محفوظ مقام پر منتقل کریں۔ میں اس دوران لڑکی کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے برادر! تم مجھے تھانے کے بارے میں بتاؤ، میں ابھی تمہارا یہ کام کرتا ہوں۔'' شہریار کا جواب
سجاد رانا نے اس سے پوچھا۔ شہریار نے اسے تھانے کے بارے میں بتایا اور فون بند کر دیا۔ ''یہ کام تو ہو
لیکن یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس موتی والا کا فون نمبر ہے؟ میرے خیال میں اگر ہم موتی والا سے درخواست
کریں تو وہ ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتا ہے۔'' شہریار کی بات پر کچھ کہے بغیر عبدالمنان نے اپنے بریف
میں سے ایک ٹیلی فون ڈائری نکالی اور اسے موتی والا کا فون نمبر نوٹ کروانے لگا۔ عبدالمنان بیوروکریسی
ایسا تربیت یافتہ شخص تھا جس نے رات کے اس پہر بہت ایمرجنسی میں ہونے کے باوجود اس بات کا
رکھا تھا کہ اپنا بریف کیس ساتھ لے کر نکلے۔ شہریار کی کال پر موتی والا بھی حیران ہوا کہ اس وقت شہریار
زحمت کی۔ شہریار نے اسے زیادہ تفصیل میں کچھ بتانے کے بجائے براہِ راست ماہ بانو کو اپنے گھر میں
قیام کرنے کی بات کی۔ موتی والا بھی بغیر کسی حیل و حجت کے فوراً راضی ہو گیا۔

شہریار کے اگلے تیس سے پینتیس منٹ فون پر اِدھر اُدھر بات کرتے ہوئے ہی گزرے۔ کبھی وہ سجاد رانا
بات کرتا اور کبھی موتی والا کو ہدایات دیتا۔ بالآخر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ماہ بانو تھانے سے موتی والا
بخیریت منتقل ہو چکی ہے تو اسے سکون ملا اور وہ عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوا۔

''سمجھ نہیں آ رہا کہ چودھری افتخار کو اچانک کیسے ماہ بانو کے لاہور والے دارالامان میں ہونے کی خبر مل گئی۔
تو یہ سارا معاملہ بہت راز میں رکھا تھا۔''

''فی الحال کیا کہا جا سکتا ہے سر! ہمیں اس سلسلے میں تحقیق کرنی پڑے گی۔'' عبدالمنان کے پاس سوال کا جواب نہیں تھا۔

''کہیں اس این جی او کے نمائندے نے تو مخبری نہیں کر دی جس سے میں نے لاہور جا کر ماہ کیس کے سلسلے میں ملاقات کی تھی؟ وہی ایک ایسا بندہ ہے جو ابھی اس کیس میں انوالو ہوا ہے اور جسے کہ ماہ بانو کہ کہاں رکھا گیا ہے۔'' شہریار نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔

''ذاتی طور پر تو مجھے اس پر شک نہیں لیکن کسی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہو عبدالمنان کا جواب محتاط تھا۔

''چلو جو بھی معاملہ ہے سامنے آ جائے گا۔ فی الحال تو یہ اطمینان کافی ہے کہ ماہ بانو کو محفوظ مقام پر دیا گیا ہے۔ تم اب جا کر آرام کرو۔ صبح دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' شہریار نے یک دم ہی بات تو عبدالمنان بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ خود شہریار البتہ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر وہیں لا بیٹھا فکرمندی سے اس معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔

⊛----✪----⊛

''یہ اچھا ہے۔ اماں سے یہ کہہ کر رُکی تھیں کہ ابھی مُنے کو دل بھر کر نہیں دیکھا۔ کچھ دن اس کے سا لوں، پھر حویلی واپس آؤں گی..... اور اب یہ حال ہے کہ سارا وقت کتاب آنکھوں کے سامنے رکھ کر اس بیٹھی رہتی ہو۔ مُنے کو تو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔'' کشور حسبِ عادت کسی کتاب کے مطالعے میں تھی کہ تاجور نے آ کر اسے ٹوکا۔

''مُنے کے لیے رُکنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سارا وقت اس پر ہی نظریں جما کر بیٹھی رہوں۔ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ابھی صنوبر آپا کے کمرے سے ہی آ رہی ہوں۔ وہ اور ان کے ولی مزے سے سو رہے ہیں۔ میں نے سوچا اُنہیں ڈسٹرب کرنے کے بجائے تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ ہی کشور نے مسکرا کر بڑی بہن کی بات کا جواب دیا۔ ویسے تاجور غلط نہیں کہہ رہی تھی، بچے کی پیدائش کے صنوبر گاؤں واپس لوٹی تھی تو کشور بچے کے بہانے سے ہی اپنے ماموں کے گھر رک گئی تھی۔ البتہ اس پیچھے اس کے دل میں اصل خواہش کیا تھی، وہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

''تُو تھکتی نہیں ہے کشور!..... سارا وقت ان کتابوں میں سر دے کر بیٹھے رہنے سے تیرا دل نہیں تاجور نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''تھک تو میں اس زندگی سے بھی جاتی ہوں آپا!..... تو کیا سانس لینا چھوڑ دوں؟ بس آپ یہ یہ کتابیں بھی زندگی کی طرح کی کوئی چیز ہیں۔ جیسے اس ایک جیسی زندگی میں کبھی کبھی نئے موڑ اور چھو تبدیلیاں آ کر اس میں جی لگانے کا سامان پیدا کر دیتی ہیں، ویسے ہی ان کتابوں میں بھی بندے کو کچھ مل جاتا ہے جو اس کا جی اچاٹ نہیں ہونے دیتا۔'' کشور نے رسانیت سے بہن کی بات کا جواب دیا۔

''توبہ! تُو تو بات بھی کتاب کی زبان میں کرتی ہے۔ کسی بھی بات کا آسان لفظوں میں جواب نہیں تجھ سے۔'' تاجور نے ناک چڑھائی تو کشور ہنس پڑی اور ہنس کر بولی۔

''آدمی کبھی کتاب کی زبان میں بات نہیں کرتا اصل میں کتاب آدمی کی زبان میں بات کرتی ہے۔''

''چل چھوڑ اس کتاب کے قصے کو۔ یہ بتا تجھے معلوم ہوا کہ ابا جی آج کل ایک اور بیاہ رچانے کے



لیے؟'' تاجور نے بور ہو کر موضوع بدل دیا۔

''بھئی جیسے لوگوں کو شوق ہوتا ہے گاڑیوں کے نئے نئے ماڈل جمع کرنے کا، ویسے ہی ہمارے ابا جی کو ل ہے ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئے ماڈل کی عورت ان کے پاس آئے۔ اس بار تو انہوں نے کافی وقت لیا ورنہ پہلی تین تو بڑے کم کم وقفے سے ان کی زندگی میں آئی تھیں۔'' تاجور کی دی ہوئی اطلاع پر کشور نے بیزاری سے تبصرہ کیا۔

''تُو بھی نا، کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ اب بھی دیکھ، یہ تک نہیں پوچھا کہ کون ہے وہ جس سے ابا جی ارنے کے چکر میں ہیں؟'' کشور کی بے نیازی پر تاجور نے خفگی ظاہر کی۔

''چلیں، میں نے نہیں پوچھا تو آپ بتا دیں۔ ویسے بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ سے بغیر بتائے رہا نہیں ے گا۔''

''وہ جو کُڑی نہیں تھی ماہ بانو..... جس سے ہم نے عرس پر مہندی لگوائی تھی۔ اس چھٹانک بھر کی لڑکی پر ابا کا دل آ گیا ہے۔'' تاجور نے قدرے ناگواری سے اطلاع دی۔

''ماہ بانو..... وہ نوراں کی بیٹی نا؟ وہ تو بہت کم عمر ہے۔ اس کا اور ابا جی کا بھلا کیا میل؟'' کشور حیران ہوئی۔

''میل تو کوئی نہیں ہے۔ اماں کو تو سارا غصہ ہی اس بات کا ہے کہ ابا جی کمی کمینوں کی اولاد کو ان کی سوتن ا برابری پر لانے پر تُلے ہیں۔'' ماہ بانو اور چودھری افتخار کے مابین فرق کا تاجور کو بھی احساس تھا لیکن اس کی ف مختلف تھی۔

''ماہ بانو تو شہر کی رہنے والی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ راضی ہو گئی اس بیاہ پر؟'' تاجور کی بات پر کوئی تبصرہ بغیر کشور نے دوسرا سوال پوچھا۔

''کہاں؟..... دیکھا نہیں تُو نے اُسے کہ کیسی نخریلی سی تھی۔ بھاگ نکلی ساروں کو جُل دے کر۔ آج کل ابا ں اس کی تلاش میں بولائے ہوئے ہیں۔'' تاجور کو کچھ خبریں تو بڑی چودھرائن نے دی تھیں اور کچھ ان ملازمین ں مرہونِ منّت تھیں جو چودھری افتخار کی حویلی میں رہ کر یہاں والوں کے لیے باقاعدہ جاسوسی کا فریضہ انجام تے تھے۔

''ابا جی کو یہ ظلم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بھلا ان کا اور ماہ بانو کا کیا میل تھا؟ اب ان سے بچنے کے لیے بے چاری ں جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھر رہی ہو گی۔'' کشور کو شدید افسوس تھا۔

''تجھے ماہ بانو کی فکر کھائے جا رہی ہے، ادھر میں اور صنوبر پریشان ہیں کہ ابا جی کی ان حرکتوں کا ہمارے گھر کیا اثر پڑے گا؟ کل کو ہمارے شوہر بھی کھڑے ہو جائیں گے دوسرا بیاہ کرنے۔ تمہارا بھا اشرف تو ویسے ہی آج ل ہر وقت مجھے طعنے مارتا رہتا ہے کہ کیسی موٹی بھدی عورت ہو تم؟ انڈین فلموں کی چھیل چھبیلی، بالشت بھر کپڑا ان کر نمائش کرنے والی ہیروئنوں کو دیکھ دیکھ کر دماغ خراب ہوا جا رہا ہے اُس کا۔'' تاجور کی اپنی پریشانیاں تھیں، اسے ماہ بانو کا غم کیا خاک ستاتا۔

''اس بات کے لیے تو آپ کو ہمیشہ تیار ہی رہنا چاہئے۔ ہمارے ہاں کے مردوں کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تو ہے۔''

''تُو اتنے آرام سے اس لیے کہہ رہی ہے کہ تجھے معلوم نہیں کہ سوتن کا جلاپا کیا ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے بانٹنے کا خیال ہی عورت کو آدھا کر دیتا ہے۔'' کشور کی بات کے جواب میں تاجور نے اس قدر جلبلا کر کہا کہ کشور کے سارے چہرے پر کرب کے آثار چھا گئے۔ تاجور کو اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا مگر

اب تو تیر، کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر کشور کے سامنے سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ''ذرا جا کر دیکھوں تو کہ کسی نے منور کو تیار بھی کیا ہے کہ نہیں۔ وہ ماسٹر صاحب سے پڑھانے کے لیے آنے ہی والا ہوگا۔''

منور تیار ہو گیا ہو آپا! تو اسے میرے پاس بھیجنا۔ مجھے ایک کتاب منگوانی ہے۔ ماسٹر صاحب شہر جا رہے ہیں، انہیں نام لکھ کر دوں گی تو وہ لا دیں گے۔'' کشور نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا تھا اور اب بہت عام سے لہجے میں تاجور سے کہہ رہی تھی۔

''توبہ ہے کشور! پھر وہی کتاب۔ ابھی تو تُو شہر سے اتنی ڈھیر کتابیں خرید کر لائی ہے۔'' تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

''یہ کتاب جو مجھے منگوانی ہے، اس وقت ملی نہیں تھی اس لیے اب ماسٹر صاحب سے منگوانے کی سوچ رہی ہوں۔'' کشور نے بہت تحمل سے تاجور کے اعتراض کا جواب دیا تو وہ شانے اچکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

ذرا دیر بعد نک سک سے تیار منور، کشور کے سامنے کھڑا تھا۔ کشور نے ایک صاف ستھرے کاغذ پر کچھ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ اسی وقت ایک ملازمہ نے ماسٹر آفتاب کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ منور کاغذ ہاتھ میں پکڑے بھاگتا ہوا وہاں سے اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں ماسٹر آفتاب اس کا منتظر تھا۔ جاتے ہی اس نے کاغذ ماسٹر آفتاب کے ہاتھ میں پکڑایا اور بولا۔

''یہ چھوٹی خالہ نے دیا ہے۔ کہتی ہیں شہر سے ان کے لیے یہ کتاب لا دیجئے گا۔''

منور کا پیغام سن کر ماسٹر آفتاب سمجھ گیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔ شہر میں زبردستی اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دینے والی چودھرائن کے برابر نشست پر رکھی ڈھیروں کتابیں اس نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کی تھیں۔ کتابوں کی رسیا اس ضدی چودھرائن نے اس سے کون سی کتاب منگوائی ہے، یہ دیکھنے کے لیے ماسٹر آفتاب نے تہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔

خاک اُڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
تُو ہے موجود اس قدر مجھ میں

کاغذ پر کسی کتاب کے نام کے بجائے بہت صاف ستھری لکھائی میں یہ چند اشعار لکھے تھے۔ ماسٹر آفتاب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ چودھری افتخار کی صاحب زادی نے جو پیغام بھیجا تھا، وہ اسے مستقبل کا بھیانک نقشہ دکھا رہا تھا۔ فی الحال ماسٹر آفتاب نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور کاغذ دوبارہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے منور کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن منور کو پڑھانے کے دوران بھی اس کا ذہن مسلسل الجھا رہا۔ اس نے شہر میں ہونے والی مختصر ملاقات میں کشور کی ضدی فطرت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اپنی روایات اور ماسٹر آفتاب کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ماسٹر آفتاب کو اپنی گاڑی میں لفٹ دے کر رہی تھی۔ ایسی ضدی طبیعت کی لڑکی اپنے جذبات کے اظہار پر اُتر آئی تھی تو ماسٹر آفتاب کے خاموش رہنے کی حکمتِ عملی نہ جانے کس حد تک کامیاب ہو پاتی؟

⊛----✪----⊛



''کچھ معلوم ہوا عبدالمنان! کہ کل کا واقعہ کیسے پیش آیا؟''

''یس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ میرا خیال صحیح تھا۔ اس معاملے میں این جی او کے ورکرز کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ ماہ بانو کی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے ہوا۔''

''کیسی غلطی؟'' عبدالمنان کا جواب سن کر شہریار چونکا۔

''دارالامان کی منتظمہ نے بتایا ہے کہ کل شام ماہ بانو نے اس کی اجازت کے بغیر ایک ملازمہ کی مدد سے اپنے لیل آباد اپنے والدین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق سے منتظمہ عین موقعے پر وہاں پہنچ گئی اور اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔ لیکن اتنی دیر میں ماہ بانو اپنا نام تو بتا ہی چکی تھی۔ فون اس نے اپنے پڑوسیوں کے گھر پر کیا تھا۔ منتظمہ نے لائن منقطع کی تو تھوڑی دیر بعد اسی نمبر سے ایک لڑکی کا فون آ گیا کہ ماہ بانو سے بات کرنی ہے۔ منتظمہ نے صاف کہہ دیا کہ اس نمبر پر کوئی ماہ بانو نہیں ہوتی۔ ساتھ اس نے یہ بہانہ بھی کر دیا کہ یہ نمبر ایک ہسپتال کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نمبر سے کسی وزیٹر خاتون نے جس کا نام ماہ بانو ہو کال کی ہو لیکن یہاں کوئی خاتون یہاں موجود نہیں۔ منتظمہ کے اس انکار کے باوجود ایک دو فون اور آئے پھر سلسلہ رک گیا۔ اس لیے کہ ہر بار کسی لڑکی نے کیا تھا، اس لیے منتظمہ زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے ہمیں اس کی اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ لیکن رات کو جب ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو اسے احساس ہوا کہ شہریار کے ذریعے دارالامان کا پتہ معلوم کر کے ساری کارروائی کی گئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے ماہ بانو کے پڑوسیوں نے چودھری افتخار کے لیے مخبری کا کام انجام دیا۔'' عبدالمنان کی حال ہوئی تفصیلات سن کر شہریار نے خیال ظاہر کیا۔

''نو سر! ایسا نہیں ہے۔ میں نے اپنے بندوں کے ذریعے پوری تحقیقات کروائی ہیں۔ چودھری افتخار کو ماہ بانو کی لاہور میں موجودگی کی خبر تو بے شک اس کے پڑوسیوں کی وجہ سے ہوئی لیکن ایسا نادانستگی میں ہوا۔ وہ بے چارے ماہ بانو کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ماہ بانو نے فون کیا تو اس کی آواز سن کر ہاتی ہو گئے۔ ادھر منتظمہ نے کوئی بات ہونے سے قبل ہی لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔ کال ریسیو کرنے والی خاتون نے سی ایل آئی پر آنے والا نمبر دیکھ کر خود کال ملا لی۔ پرانے پڑوسی ہونے کی وجہ سے انہیں ماہ بانو کی فکر تھی اور وہ اس سے بات کر کے اس کا حال احوال معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے، منتظمہ نے سرے سے ماہ بانو کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا تو وہ مایوس ہو گئیں۔ اب جیسا کہ چھوٹے علاقوں کے محلّوں کا رواج ہوتا ہے کہ کوئی بھی بات خود تک محدود رکھنے کے بجائے سارے محلے کو اس بارے میں اطلاع دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، ویسا ہی ان خاتون نے کیا۔ جوش میں انہوں نے اپنے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی سامنے والے گھر کی خاتون کو اس کال کے بارے میں بتایا پھر محلے کی دو چار اور خواتین کو بھی اطلاع دی۔ یوں سمجھیں کہ ماہ بانو کی کال نے سارے محلے میں ہلچل سی مچا دی۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے کہ چودھری افتخار کے آدمی ابھی تک ماہ بانو کے بارے میں سُن گُن لینے کے لیے اس کے محلے کے چکر کاٹ رہے تھے، چنانچہ انہیں بھی اس کال کی خبر ہو گئی۔ پڑوسی خاتون سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ ماہ بانو کی کال کے ایک گھنٹے بعد ہی لڑکی ان کے گھر آئی تھی اور خود کو ماہ بانو کی دوست اور کلاس فیلو ظاہر کر کے اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ طے کیا تھا۔ اب جیسا کہ عموماً خواتین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر بات ہر ایک کو بتانا ضروری سمجھتی ہیں، پڑوسن صاحبہ نے بھی اپنے گھر آنے والی لڑکی کو ماہ بانو کی سہیلی جان کر اس کے سامنے ماہ بانو کے سلسلے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ اس کے غائب ہونے کے سلسلے میں اپنے قائم کردہ مفروضوں کو ڈسکس کیا اور

ساتھ [illegible] دیا کہ آج ماہ بانو نے کہیں سے اُنہیں کال کی تھی لیکن بات نہیں ہو سکی۔ انہوں نے خود [illegible] کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نمبر کسی ہسپتال کا ہے اور وہاں کوئی ماہ بانو کو جاننے والا نہیں۔ لڑکی نے [illegible] وہ نمبر دے دیں۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ انہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ [illegible] ان خاتون پر یہ رعب بھی ڈالا کہ اس کا ایک کزن پولیس میں اچھے عہدے پر ہے اور وہ [illegible] کزن [illegible] اس کال کے بارے میں مکمل تحقیقات کروا سکتی ہے۔ خاتون نے لڑکی کو نمبر دے دیا اور [illegible] اس [illegible] اس کہ ماہ بانو کی سہیلی جلد اُنہیں ماہ بانو کے بارے میں کوئی خبر دے گی لیکن رات دارالامان [illegible] بعد تو صاف ظاہر ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو کی کوئی دوست نہیں بلکہ چودھری افتخار کی کوئی [illegible] تھی [illegible] سے ماہ بانو کے سلسلے میں ایک اہم سراغ حاصل کر کے لے گئی اور اس کے بعد جو کچھ [illegible] ہم [illegible] جانتے ہیں۔"

[illegible] کی حاصل کردہ معلومات بہت ٹھوس تھیں۔ وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا جو وقتِ ضرورت [illegible] تعلقات [illegible] استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔ رات اگر وہ ماہ بانو کو تھانے سے نکلوانا چاہتا تو خود بھی تھوڑے بہت [illegible] کر سکتا تھا لیکن شہریار کی اس کیس میں ذاتی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اس نے خود [illegible] اقدام [illegible] کے بجائے اسے اطلاع دینا مناسب سمجھا تھا اور جس طرح شہریار نے اس کی رات گئے آمد [illegible] پر بہت تیزی سے ماہ بانو کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے تھے، اس سے عبدالمنان کو اپنے [illegible] کی [illegible] طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

"[illegible] ماہ بانو سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار جرأت مندی سے کام نہ [illegible] ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کروانے میں کامیاب ہو [illegible] نے بتایا تھا کہ اس چوکیدار کو گولیاں [illegible] ہیں۔ [illegible] اس چوکیدار کے بارے میں؟ اس کی حالت اب کیسی ہے؟" عبدالمنان کی بات پر تبصرہ کر [illegible] اچانک چوکیدار کے بارے میں خیال آیا تو اُس نے اُس کی بابت دریافت کیا۔

"[illegible] بیچارہ تو صبح کے قریب چل بسا۔ اصل میں ایک گولی دل کے قریب لگی تھی، اُس نے کام دکھا [illegible] اس [illegible] خون بھی بہت زیادہ بہہ گیا تھا، اس لیے ڈاکٹر اُسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" عبدالمنان نے [illegible] اس سے جواب دیا۔

"[illegible] چوکیدار وہی تو نہیں تھا جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ وہ مشابرم خان کا دوست ہے [illegible]"

"[illegible] یہ وہی تھا۔ مشابرم خان خود بھی بہت بہادر اور وفادار آدمی ہے۔ اس کا دوست بھی اسی کی [illegible]" عبدالمنان نے شہریار کے اندازے کی تصدیق کی۔

"[illegible] برا ہوا۔ چودھری افتخار کی ہوس نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ چودھری افتخار کو بچانا [illegible] دارالامان! ہمیں اس فتنے کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تم موتی والا سے رابطہ کر کے معلوم [illegible] کہ [illegible] کی ڈیلیوری کب ہو رہی ہے؟ اس کام میں شامل بندوں کو گرفتار کر کے ان سے چودھری [illegible] کا نام [illegible] ہے۔ چودھری کے جرائم تو جانے کتنے ہوں گے لیکن ہم کسی نہ کسی مقام پر تو اُس کی پکڑ کریں [illegible] کچھ تو [illegible] اور آوری کم ہو سکے۔" چوکیدار کی ناحق موت نے شہریار کو بہت افسردہ کر دیا تھا، چنانچہ اس شدید غم [illegible] کیفیت میں عبدالمنان کو حکم دیا۔ عبدالمنان نے اُس کے مزاج کی اس برہمی کو محسوس کر [illegible] مستعدی [illegible] "یس سر" کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

⊛----✪----⊛



چودھری افتخار اِدھر سے اُدھر ٹہلتا بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اُس کے سامنے مؤدب کھڑے بالے [illegible] ہمت نہیں تھی کہ اپنے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھ سکے۔ خود چودھری بھی فی الحال بالے کی [illegible] نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہو رہی تھی، جس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر ٹہلتے ٹہلتے وہ مخملیں چادر پر بچھے تخت پر بیٹھا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اپنے دائیں ہاتھ کو [illegible] پشت پر موجود مزاج آشنا ملازم نے مستعدی سے حقے کی نَے اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ چودھری افتخار [illegible] پھنکارنے کے انداز میں ذرا دیر حقہ گڑگڑایا اور پھر ناک اور منہ سے دھواں خارج کرنے لگا۔ اس کی حالت [illegible] کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ سارا کا سارا دھواں حقے کے کش کے نتیجے میں خارج ہو رہا ہے یا پھر اس کے اندر دہکتی [illegible] کی آگ نے اس دھوئیں کو اُگلا ہے۔

"کیسے نکل گئی وہ تم لوگوں کے ہاتھ سے؟..... تم اتنے مسٹنڈے مل کر بھی ایک معمولی سی لڑکی کو اٹھا کر [illegible] میں ناکام رہے۔ اس کارکردگی کے لیے میں تم لوگوں پر اپنا روپیہ لُٹاتا ہوں؟" آخر کار چودھری افتخار نے [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہم نے سب کام بڑے طریقے سے کیا تھا سرکار! فون نمبر حاصل کر کے اس دارالامان کا پتہ معلوم کرنے [illegible] پھر لڑکی تک پہنچنے میں ہم سے کہیں کوئی چُوک نہیں ہوئی تھی۔ بس واپسی میں اچانک وہ بندہ نہ جانے کہاں [illegible] ٹپک پڑا۔ اُس کے پاس رائفل تھی، جس سے فائر کر کے اس نے دو بندوں کو زخمی کر دیا۔ اس اچانک حملے [illegible] ہم لوگ ہڑبڑا گئے اور مجبوراً زخمی ساتھیوں کو لے کر فرار ہونا پڑا۔" بالے نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بہت شان دار..... کیا مردانگی دکھائی تم لوگوں نے۔ ایک اکیلا آدمی رائفل لے کر آ گیا، تم سے اُسے [illegible] نا مشکل ہو گیا۔ میں پوچھتا ہوں اس کے پاس رائفل تھی تو تم کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر گئے تھے؟ تمہارے پاس اُس اکیلے بندے سے مقابلہ کرنے کے لیے اسلحہ نہیں تھا؟" بالے کی وضاحت نے چودھری [illegible] کو مزید چراغ پا کر دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے سرکار! ہم بھی اپنا اسلحہ ساتھ لے کر گئے تھے لیکن بدقسمتی سے ہمیں اندازہ نہیں ہوا کہ گیٹ پر موجود چوکیدار کے علاوہ بھی وہاں کوئی بندہ موجود ہے۔ اس بندے نے سب سے پہلے تاک کر قادر پر [illegible] کیا۔ قادرے نے ہی لڑکی کو اٹھایا ہوا تھا۔ گولی کھا کر وہ خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکی اُس کی گرفت سے آزاد [illegible] کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔ ہم پر فائر کرنے والا بندہ محفوظ پوزیشن میں تھا۔ ہم سنبھلتے، اس سے پہلے اُس کے [illegible] نے مولا بخش کو بھی نشانہ بنا لیا۔ ہم نے بھی جوابی فائر کیے لیکن اس بندے کا کچھ نہیں بگڑا۔ علاقے کا تھانہ دارالامان سے قریب ہی تھا۔ فائرنگ کی خبر سن کر وہاں سے فوراً ہی پارٹی پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے پاس موقع نہیں تھا کہ ہم اندر جا کر دوبارہ سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اس چکر میں ہم پھنس بھی سکتے تھے۔ اپنے پھنسنے کی تو خیر ہمیں پروا نہیں تھی لیکن اس بات کا خیال تھا کہ کہیں ہمارے پیچھے پولیس آپ تک نہ پہنچ جائے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے زخمی بندوں کو اٹھا کر بھاگ نکلیں۔ رائفل والا بندہ الگ پیچھے پڑا تھا۔ ہم وہاں سے نکلنے [illegible] تو جوش میں آ کر وہ اپنی پوزیشن سے نکل کر ہمارے پیچھے بھاگا۔ اس وقت میں نے اُس کو نشانہ بنایا۔ اس [illegible] کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ ہسپتال میں گزر گیا ہے۔" بالے نے ایک بار پھر ذرا تفصیل سے سارا واقعہ بتاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تُو بس بندے پھڑکا کر خوش ہوتا رہا کر۔ اصل کام تجھ سے نہیں ہوتا ہے۔" بالے کی سنائی تفصیل سے متاثر ہونے کے بجائے چودھری افتخار دہاڑا۔ اس بار بالے نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔

''آگے کچھ معلوم کیا تُو نے؟.....کُڑی کے بارے میں کیا خبر ہے؟.....کہاں ہے وہ؟'' چودھری [illegible] پوچھا۔

''میں نے دارالامان سے معلومات حاصل کی ہیں۔لڑکی اب وہاں نہیں ہے۔علاقے کے تھانے میں بھی اس [illegible] کو غنڈہ گردی کی ایک واردات قرار دے کر رپورٹ لکھی گئی ہے۔رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ [illegible] دارالامان میں گھس کر وہاں سے عورتوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔دارالامان کے چوکیدار کی [illegible] سے اُنہیں ناکامی ہوئی۔رپورٹ میں خاص طور پر ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں۔مجھے ایک کانسٹیبل [illegible] معلوم ہوا ہے کہ فائرنگ کے بعد [illegible] کا ایس ایچ او، پولیس پارٹی لے کر دارالامان گیا تھا اور واپسی میں [illegible] ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ابھی وہ لڑکی سے پوچھ تاچھ کر ہی رہا تھا کہ کہیں اُوپر سے فون پر حکم دیا گیا [illegible] کو چھوڑ دو۔پھر باہر سے کوئی بندہ آ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو ہی تھی [illegible] سے واپس دارالامان آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ چلی گئی۔میں نے اس کانسٹیبل سے اچھی طرح [illegible] معلوم کیا تھا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے تو کیا، خود ایس ایچ او صاحب کو بھی نہیں معلوم کہ لڑکی کو کہاں [illegible] جا رہا ہے۔''

''آخر ایسا کون ہمدرد پیدا ہو گیا ہے غیاثے کی دِھی کا؟.....وہ یہاں سے بھاگ کر فیصل آباد کے بجائے [illegible] ایک دارالامان میں پہنچ گئی ہے۔میں نے یہ سنا تو حیرت نہیں ہوئی بلکہ یہی سوچا کہ کُڑی ہوشیار تھی اس [illegible] مندی سے کام لیتے ہوئے فیصل آباد میں اپنے گھر کا رخ کرنے کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان [illegible] پہنچی۔لیکن جس طرح وہ تھانے سے غائب ہوئی ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ کوئی پہنچ والا بندہ اس کے [illegible] اور اس کی مدد کر رہا ہے۔'' بالے کی بتائی ہوئی تفصیل سن کر چودھری افتخار نے پُرتفکر انداز میں تبصرہ کیا۔

''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں چودھری صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کا کوئی دشمن ہے جو اس لڑکی کا [illegible] رہا ہے۔'' بالے نے فوراً ہی چودھری افتخار کے خیال کی تائید کی۔اس تائید کے پیچھے چودھری کی [illegible] علاوہ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ چودھری کا دھیان اپنے کسی دشمن میں اُلجھ جائے تو وہ بالے اور اس [illegible] کی ناقص کارکردگی بھول جائے۔

''دارالامان سے کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کس نے ماہ بانو کو بھجوایا تھا؟'' بالے کی توقع کے مطابق اب [illegible] افتخار اسی لائن پر سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کے پیچھے اس کے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اب وہ اس دشمن تک [illegible] حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

''تھانے میں دارالامان کی منتظمہ نے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تو ماہ بانو خود سے وہاں آئی تھی۔اس [illegible] لیا تھا کہ وہ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔جس کے ساتھ بھاگی تھی، اس نے دھوکا دیا اور اب وہ [illegible] واپس نہیں جانا چاہتی اس لیے اس دارالامان میں آ گئی ہے۔'' بالے نے چودھری افتخار کو بتایا۔

''میرے خیال میں منتظمہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔وہ لڑکی بڑی چالاک اور ذہین ہے۔اس کے لیے اپنی مرضی [illegible] منانا کچھ مشکل نہیں۔'' چودھری افتخار کو وہ رات یاد آ گئی تھی جب ماہ بانو اپنے آپ پر مٹی کا تیل چھڑک کر [illegible] ابرو پہنچی تھی۔اس وقت چودھری افتخار اس کی جی داری سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس سے زبردستی کرنے [illegible] اسے اپنی عزت بنانے پر تُل گیا تھا لیکن اب اُسے لگ رہا تھا کہ ماہ بانو نے چالاکی اور منصوبہ بندی [illegible] اپنا تھا اور اپنی چالاکی کے سہارے وہ کسی کو بھی بے وقوف بنا سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے، تُو جا۔پر آنکھیں کھلی رکھنا۔مجھے لگتا ہے کہ ماہ بانو کو ابھی حوراں اور صفدر کی موت کی خبر نہیں



ہوئی ہے۔اپنے ان لاڈلے ماں پیو کی چاہت میں وہ فیصل آباد رابطے کی دوبارہ کوشش ضرور کرے گی۔تم اس طرف اپنے بندے لگائے رکھنا تاکہ جیسے ہی کوئی بھنک ملے، اسے پکڑ سکو۔اور ہاں، یاد رکھنا اس بار کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ورنہ میں تم سب کی کھال اُدھڑوا دوں گا۔مجھے ماہ بانو ہر حال میں چاہیے۔'' چودھری افتخار نے بالے کو حکم دیتے ہوئے ساتھ میں دھمکایا بھی۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار! اس واری ہم سے کوئی چُوک نہیں ہو گی۔'' بالے نے چودھری افتخار کو یقین دلایا اور فی الحال اپنی بچت ہو جانے پر دل ہی دل میں شکر ادا کرتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔اس کے باہر نکلنے کے بعد چودھری نے اپنے پیچھے کھڑے ملازم کو بھی ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ملازم باہر نکل گیا تو چودھری افتخار نے تخت پوش کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک لفافہ برآمد کیا۔اس لفافے میں ماہ بانو کی وہ تصویر تھی جس میں وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کالج کے لان میں کھڑی تھی۔چودھری افتخار کچھ دیر تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر [illegible] کچا کر بولا۔

''جتنا بھاگ سکتی ہے، بھاگ کر دیکھ لے.....آخر ایک دن تجھے میرے پاس آنا ہی ہو گا۔چودھری افتخار اپنی پسند کی کسی چیز کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔'' چودھری کی بلبلاہٹ اور غصے سے بے خبر ماہ بانو اپنی تصویر میں مسکراتی رہی مگر یہ مسکراہٹ اب صرف تصویر تک ہی محدود رہ گئی تھی۔وہ خود تو حالات کی زد میں آ کر اِدھر اُدھر ڈولتی پھر رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''یہ ان مشکوک لوڈرز کے نمبر ہیں تارڑ صاحب! جن کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ آج رات ان کے ذریعے غیر قانونی طور پر کچھ مال علاقے سے باہر لے جایا جائے گا۔ اطلاع بہت قابلِ اعتماد ذریعے سے ملی ہے اس لیے مجھے کوئی شک تو نہیں ہے کہ جن نمبروں کے لوڈرز کی میں نے نشان دہی کی ہے، وہ اسمگلر ثابت ہوں گے لیکن احتیاطاً آپ اتنی سختی سے ناکہ بندی کیجیے گا کہ کوئی بھی گاڑی یا لوڈر وغیرہ بغیر چیکنگ کے سڑک سے نہ گزر سکے۔ اپنے علاقے سے کسی قسم کی غیر قانونی نقل وحمل کو روکنے کے لیے ہمیں بہت سختی سے ایکشن لینا ہوگا ورنہ جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔''

''میں سارا انتظام کرلوں گا سر! بلکہ میں خود اس سارے پراسس کی نگرانی کروں گا۔ مگر آپ یہ تو بتائیں کہ کون سا مال لے جایا جارہا ہے اور آپ کو کن ذرائع سے اطلاع ملی ہے؟'' معظم تارڑ نے شہریار کو بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''سوری تارڑ صاحب! اپنا سورس آف انفارمیشن تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی مخبری کرنے والے شخص کے اپنے بھی کچھ تحفظات ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اس کا نام لیک آؤٹ نہیں ہونے دوں گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی چیز غیر قانونی طور پر علاقے سے باہر لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے تو یہ تو جب آپ ناکہ بندی کریں گے تو آپ کو خود بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ کے محکمے کے افراد اتنی اہلیت تو رکھتے ہیں ناکہ قانونی اور غیر قانونی نقل وحمل کے درمیان فرق کرسکیں؟'' شہریار نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کرتے ہوئے آخر میں طنز سے سوال کیا۔

''اوکے سر! جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں تو صرف اس لیے اسمگل ہونے والے آئٹم کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے لوگ ایک خاص حوالے کو ذہن میں رکھ کر چیکنگ کا کام کریں۔ لیکن اگر آپ کو ان کی ذہانت کا امتحان ہی لینا مقصود ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس حساب سے بھی سارا مینجمنٹ کرواسکتا ہوں۔'' شہریار کا جواب معظم تارڑ کو برا لگا تھا لیکن عہدے کا پاس رکھتے ہوئے اس نے برداشت سے کام لیا اور غصے کے باوجود اپنے لہجے کو نرم ہی رکھا۔

''وِش یو بیسٹ آف لک۔'' شہریار کو بھی معظم تارڑ کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن وہ اس کے جذبات کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے بولا۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشان دہی تھا کہ شہریار، معظم تارڑ کے ساتھ اپنی گفتگو مکمل کر چکا ہے۔ معظم تارڑ نے بھی اس اشارے کو سمجھ لیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اوکے! میں جا کر اپنے محکمے کے لوگوں کو ہدایات دیتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ میرا عملہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گا اور کل صبح آپ کو مکمل رپورٹ مل جائے گی۔'' معظم تارڑ، شہریار کے دفتر سے رخصت ہوگیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد شہریار نے عبدالمنان کو اندر بلایا۔



''کیا خیال ہے تمہارا..... معظم تارڑ ٹھیک طرح سے کارروائی کرے گا؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتے سر! معظم تارڑ کے چودھری افتخار سے قریبی مراسم تو ضرور ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس معاملے میں چودھری افتخار کے ساتھ شریک ہے یا نہیں۔ عام طور پر اس قسم کے معاملات سارے افسران مل جائے نچلے عملے سے ہی طے کر لیے جاتے ہیں۔'' عبدالمنان نے شہریار کے سوال کا محتاط جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال تھا، اس لیے میں نے براہِ راست معظم تارڑ سے اس کارروائی کے لیے بات کی ہے۔ البتہ میں نے اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ ہم اس ناکہ بندی کے ذریعے کس چیز کو اسمگل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگر محکمے میں چودھری افتخار کا کوئی مخبر ہے بھی تو وہ اس کارروائی کا مقصد نہیں سمجھ سکے گا۔ مجبوری یہ ہے کہ ہم سو فیصد رازداری کے ساتھ یہ کام نہیں کر سکتے۔ جگہ جگہ ناکہ بندی کرنے کے لیے ہمیں مال میں پولیس کے محکمے سے مدد لینی ہوگی۔ بس یہ ہوسکتا ہے کہ میں خفیہ طور پر اس ساری کارروائی کو خود کنٹرول کروں..... اگر محکمے میں موجود کوئی کالی بھیڑ موقعے پر چشم پوشی سے کام لینا چاہے تو اُس کی اسی وقت پکڑ ہو جائے۔''

''یہ آئیڈیا اچھا ہے سر!'' عبدالمنان نے شہریار کے فیصلے کی تائید کی اور پھر بولا۔ ''میں آپ کے ساتھ رہوں گا سر! آپ بتا دیں کہ آپ کس وقت تک گشت پر نکلنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ میں اسی وقت آپ کی رہائش گاہ پر حاضر ہو جاؤں گا۔''

''موتی والا کی اطلاع کے مطابق لوڈرز آدھی رات کے بعد گزریں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم احتیاطاً اسی رات سے پہلے ہی نکل پڑیں تاکہ اگر ٹائم کچھ آگے پیچھے ہو بھی جائے تو ہم وہاں موجود ہوں۔'' شہریار نے جواب دیا تو عبدالمنان بولا۔

''اوکے سر! میں اسی حساب سے آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

اس کے بعد شہریار کا سارا دن دفتر میں معمول کے کاموں کو نمٹاتے ہوئے گزرا۔ کام کے دوران اُسے رات کو ہونے والی کارروائی کا خیال آتا تو سارے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ فطرتاً وہ ایک مہم جو شخص تھا اور یہ خیال کہ وہ چودھری افتخار جیسے زور آور اور مطلق العنان شخص کو زک پہنچانے جارہا ہے، اسے بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

شام کو دفتر سے اپنی رہائش گاہ پر لوٹنے کے بعد بھی اس کا ذہن اسی بات میں اٹکا رہا۔ اس نے ایک بار معظم تارڑ کو فون کر کے اس کے انتظامات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ رازداری کے خیال سے اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ پولیس فورس کے افراد اپنی اپنی جگہ تیار رہیں اور پھر رات کے ابتدائی حصے میں انہیں اچانک ان مقامات پر بھیج دیا جائے جہاں چیک پوسٹس بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ معظم تارڑ نے شہریار کو یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ سارے کام اس کی ہدایات کے عین مطابق انجام دیئے گئے ہیں۔ معظم تارڑ کی اس یقین دہانی کو صحیح سمجھنا شہریار کی مجبوری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عہدے کے حساب سے اے سی کی پوسٹ بے شک بڑی ہے لیکن ضلع کی اصل حکمرانی ایس پی کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے۔ ایس پی وہ شخص ہوتا ہے جو عملاً ضلع کے سارے اہم معاملات کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کا اپنے آفس سے باہر نکل کر ان معاملات میں دخل دینا اُسے اپنے اختیارات میں دخل دینے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ شہریار کو معظم تارڑ کے اختیارات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن وہ اس شخص پر سو فیصد اعتماد بھی نہیں کرسکتا تھا اس لیے آج کی کارروائی کو کنٹرول کرنے کے لیے اچانک ان لوگوں کے سروں پر پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

رات کا ہلکا پھلکا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت اس نے کوئی
ا ف لباس پہننے کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اس عام سی جینز اور ٹی شرٹ میں وہ
ا ارٹ لگ رہا تھا۔ اس لباس نے اُس کے ورزشی جسم اور دراز قامت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ لباس
ا ھ اُس نے جو اضافی شے اپنے ساتھ لی تھی، وہ ایک جدید طرز کا پسٹل تھا۔ یہ پسٹل اُس کی ذاتی ملکیت
ں کا اُس کے پاس لائسنس بھی موجود تھا۔

عبدالمنان اپنے کہے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے طور پر تو مشابرم خان کے سوا کہیں
جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کارکردگی شروع سے ہی قابل ستائش اور قابل اعتماد تھی۔ اس
دوست کی ماہ بانو کے تحفظ کے لیے دی جانے والی قربانی نے شہریار کے دل میں اُس کی قدر و منزلت
بڑھا دی تھی۔ جس شخص کی بات کا پاس رکھنے کے لیے اس کا دوست جان سے گزر گیا تھا، خود اس شخص کے
کردار پر تو کسی قسم کا شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مشابرم خان کی معیت میں شہریار اور عبدالمنان گھر سے
ہوئے۔ منصوبے کے مطابق چیک پوسٹس اس سڑک پر بنائی گئی تھیں جس پر سے ضلع سے باہر جانے
گاڑی کو لامحالہ گزرنا پڑتا تھا۔ شہریار کی ہدایت پر مشابرم خان نے جس چیک پوسٹ کی طرف گاڑی کا
اس کے بعد اس سڑک پر بس ایک ہی چیک پوسٹ رہ جاتی تھی۔ یہ آخری چیک پوسٹ اس جگہ قائم کی
جہاں ضلع سے جانے والی سڑک کا اختتام ہو جاتا تھا اور مین ہائی وے شروع ہو جاتی تھی۔

''بس یہیں روک دو۔'' اپنی مطلوبہ چیک پوسٹ سے کافی فاصلے پر ہی شہریار نے مشابرم خان کو حکم
اس نے گاڑی روک لی اور شہریار کے کہنے پر گاڑی کی لائٹیں بھی بند کر دیں۔ ترقیاتی کاموں کے اعتبار
علاقہ کافی پیچھے تھا اور ابھی تک ڈھنگ سے اسٹریٹ لائٹس کا بھی انتظام نہیں کیا گیا تھا اس لیے رات کا
پہر اچھی خاصی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہریار اور اس کے ساتھی اپنی گاڑی سمیت اس تاریکی کا حصہ بنے
چیک پوسٹ پر البتہ روشنی کا انتظام نظر آ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہاں موجود پولیس والوں کی نقل و حرکت
دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ مستعد نہیں تھے۔ اصل میں اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑیوں کا
ہی کم گزر ہوتا تھا اس لیے پولیس والوں کو بھی زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
نے خود نوٹ کیا کہ پون گھنٹے میں صرف ایک سوزوکی پک اپ گزری تھی اور اس پک اپ کی پولیس والوں
بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے آگے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اعتبار سے ان کی کارکردگی
ناقص قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انہیں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی بڑی گاڑی آ رہی ہو۔ پھر انہوں نے اس کی
ہیڈ لائٹس بھی دیکھ لیں۔ وہ ایک بڑا لوڈر تھا۔ شہریار سمیت وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چیک پوسٹ پر
اور پولیس والوں کے اشارے پر رک گیا۔ لوڈر کو بڑی بڑی ترپالوں سے اس طرح کور کیا گیا تھا کہ باہر
اس پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔ پولیس والے اس لوڈر کے گرد پھیل گئے
انہوں نے اسے چیک بھی کیا لیکن جس رخ سے انہوں نے ترپال ہٹا کر لوڈر میں موجود سامان کا جائزہ لیا
شہریار اور اس کے ساتھی اس کی مخالف سمت میں تھے لہٰذا انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ لوڈر پر کیا سامان لوڈ
پولیس والوں میں سے ایک نے لوڈر ڈرائیور سے اس کے کاغذات وغیرہ بھی نکلوا کر چیک کیے تھے۔ یہ
کارروائی مشکل سے پانچ منٹ میں انجام پائی اور پھر پولیس والوں نے اوکے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کو
آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ لوڈر چیک پوسٹ سے آگے نکلا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک پولیس والا



کیبن میں موجود سرچ لائٹ کی تیز روشنی اس کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ شہریار فوراً چونک اٹھا۔ یہ نمبر اس کے
ذہن میں بہت اچھی طرح محفوظ تھا۔ موتی والا کی اطلاع کے مطابق اس لوڈر پر جنگل سے غیر قانونی طور پر
کاٹے گئے درختوں کے تنے موجود ہونے چاہئیں تھے۔ لیکن پولیس والوں نے نہایت آسانی سے اسے آگے
جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یعنی شہریار کا خدشہ درست تھا۔ اتنے انتظام کے باوجود بھی بہت آرام سے قیمتی
لکڑی اسمگل کی جا رہی تھی۔

''خان! گاڑی اس لوڈر کے پیچھے لو۔'' شہریار نے مشابرم خان کو حکم دیا۔ وہ تو منتظر ہی بیٹھا تھا، فوراً گاڑی
اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال دی۔ چیک پوسٹ پر ان کی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ مشابرم خان نے گاڑی
روکنے کے بجائے رفتار ذرا کم کی اور با آواز بلند گاڑی میں اے سی صاحب کی موجودگی کا اعلان کیا۔ اس اطلاع
پر پولیس والے فوراً الرٹ ہو گئے اور گاڑی کو آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ مگر اس ذرا سی دیر کے فرق میں وہ
لوڈر کافی آگے نکل چکا تھا۔ مشابرم خان نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی لیکن سڑک اتنی چوڑی
نہیں تھی کہ وہ عین درمیان میں چلتے لوڈر کی سائیڈ میں سے اپنی گاڑی آگے نکال لے جاتا۔ مشابرم خان نے کئی
بار ہارن بھی دیا لیکن لوڈر ڈرائیور کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب آخری چیک پوسٹ نزدیک تھی۔ شہریار کو اپنی
گاڑی کے بیک ویو مرر میں پیچھے سے آتی ایک پولیس جیپ صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ پولیس جیپ کس کی مدد کے
لیے آ رہی ہے، اس وقت شہریار اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی شک تھا کہ لوڈر کو چیک پوسٹ پر
روکا جائے گا۔ مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چیک پوسٹ پر لوڈر کو رکنے کا اشارہ کیا گیا اور لوڈر ڈرائیور نے
ان اشارے پر فوراً بریک لگا دیے۔ مشابرم خان نے اپنی گاڑی بالکل لوڈر کے قریب لے جا کر روکی۔ ان کے
پیچھے آنے والی پولیس جیپ بھی رک گئی۔ شہریار اور عبدالمنان اپنی گاڑی سے باہر نکلے تو انہوں نے اپنے پیچھے
آنے والی جیپ سے ایس پی معظم تارڑ کو نکلتے ہوئے دیکھا۔

''سر! آپ یہاں؟'' شہریار کو دیکھ کر معظم تارڑ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اس لوڈر کی چیکنگ کروائیں۔'' معظم تارڑ کے حیرت بھرے سوال کا کوئی جواب دینے کے بجائے
شہریار نے اسے حکم دیا۔

''میں اس لوڈر کے پیچھے ہی یہاں آیا ہوں۔ آج میں خود سارا وقت گشت پر رہا ہوں۔ ابھی پچھلی چیک
پوسٹ پر جب یہ لوڈر کھڑا تھا تو میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تھی۔ میں کچھ فاصلے پر تھا، میری جیپ پہنچنے سے
پہلے ہی یہ لوڈر آگے بڑھ گیا۔ پھر درمیان میں آپ کی گاڑی آ گئی۔ بہرحال، آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس لوڈر پر
کیا موجود ہے؟'' معظم تارڑ نے شہریار کو جلدی جلدی بتاتے ہوئے لوڈر پر پڑے ترپال ہٹانے کا اشارہ کیا۔
اور ابھی وہاں موجود افراد حرکت میں آ گئے۔ لوڈر پر سے ترپال ہٹی تو شہریار کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ لوڈر پر
صرف بھوسا لدا ہوا تھا۔

''اس بھوسے کو ہٹا کر دیکھو۔'' ایک امید کے سہارے شہریار نے حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی جانے لگی
لیکن لوڈر پر واقعی صرف بھوسا ہی لدا ہوا تھا۔ ناچار انہیں اس لوڈر کو آگے جانے کی اجازت دینی پڑی۔

''اس میں تو کچھ نہیں نکلا سر!'' معظم تارڑ نے شہریار سے کہا۔ اس کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا پھر بھی شہریار کو یوں
محسوس ہوا جیسے وہ اس پر طنز کر رہا ہے۔

''ممکن ہے دوسرے لوڈر پر ہماری مطلوبہ چیز موجود ہو اور اس لوڈر کو دھوکا دینے کے لیے بھوسے سے بھر کر
بھیجا گیا ہو۔ ہمیں دوسرے لوڈر کا انتظار کرنا ہوگا۔'' شہریار کی امید اب بھی برقرار تھی۔ اس امید کے سہارے وہ

لوگ صبح تک انتظار کرتے رہے لیکن انتظار لاحاصل ثابت ہوا۔

''میرے خیال میں آپ کے مخبر سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔'' معظم تارڑ جو مستقل شہریار کے ساتھ ہی رہا تھا، طنز سے بولا۔ اس بار اس نے اپنے لہجے کے طنز کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''شاید..... ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ میرے لیے مخبری کرنے والے کے مقابلے میں مجرموں کے لیے کرنے والے زیادہ مستعد ثابت ہوئے ہوں۔'' شہریار نے بھی ایک جوابی طنز کا تیر چلایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ حقیقتاً اس ناکامی نے اسے کافی مایوس کیا تھا۔ اس ناکامی سے رات بھر کی بھاگ دوڑ کی محنت پر پانی پ تھا، وہ الگ، دوسری طرف چودھری افتخار کے جرائم کو منظر عام پر لانے کا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''اُس اے سی کے بچے کو آخر کس نے اطلاع دی تھی ہمارے مال کی سپلائی کی؟ اور اطلاع بھی اتنی پکی اسے ان لوڈرز کے نمبر تک معلوم تھے جن پر مال جانا تھا۔'' چودھری افتخار بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ا کے سامنے بیٹھے اقبال باجوہ اور معظم تارڑ کے چہروں پر بھی فکرمندی کے آثار تھے۔

''اس بات کی کھوج لگانا تو بہت ضروری ہے چودھری صاحب! کیونکہ مخبر جو بھی ہے، وہ بہت قریبی ہے۔ مال کب سپلائی ہو رہا ہے اور کب نہیں، یہ بات تو عموماً میرے علم میں بھی نہیں ہوتی۔ میرے بندے جانے پہچانے مخصوص ڈرائیوروں کو دیکھ کر خود ہی انہیں کلیئرنس دے دیتے ہیں۔ کل کی سپلائی کے بارے میں مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ مجھے اے سی صاحب نے بلا کر نا کہ بندی کا حکم دیا، تب بھی فوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ لکڑیوں کی سپلائی کے معاملے سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے لوڈرز کے نمبرز نوٹ کروائے تو میرا دھیان گیا اور میں نے سوچا کہ احتیاطاً باجوہ صاحب سے معلوم کرلوں۔ اس سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان نمبرز کے لوڈرز پر تو سپلائی جانے والی ہے اور لوڈرز بالکل تیار کھڑے ہیں۔ میں نے اور باجوہ صاحب نے مل کر صورتِ حال پر غور کیا۔ پہلے سوچا کہ جانے دیتے ہیں لوڈرز۔ چیکنگ ہو بھی تو چیک پوسٹس پر میرے اپنے ہی بندے ہوں گے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی اے سی صاحب کا مخبر ہو اور آگے کہیں جا کر پکڑ ہو جائے۔ باجوہ صاحب نے ایمرجنسی میں ایک لوڈر کو اَن لوڈ کروا کر اس پر بھوسے کی ڈھیریاں لوڈ کروائیں۔ دوسرا لوڈر ویسے ہی کھڑا رہنے دیا کہ سچویشن دیکھ کر اس کو نکالیں گے۔ اس احتیاط نے ہی بچت کروا دی۔ مجھے تو صرف مخبری کا ڈر تھا، ادھر اے سی صاحب خود تاک میں بیٹھے تھے۔ خود اپنے سامنے لوڈر چیک کروایا۔ بھوسا دیکھ کر بڑے مایوس ہوئے پھر بھی صبح تک دوسرے لوڈر کا انتظار کرتے رہے۔ صبح واپس بھی گئے تو اس شک کے ساتھ کہ کسی نے مخبری کر دی تھی اس لیے مال نہیں پکڑا گیا۔ میں نے بہت اُگلوانے کی کوشش کی کہ کون سا مال اسمگل ہونے والا تھا لیکن کچھ نہیں بتایا۔ مگر لوڈرز کے نمبرز دینے سے ہم پر تو بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے کیا چیز لے جائی جانے والی ہے۔'' معظم تارڑ نے تفصیل سے ساری صورتِ حال بیان کی۔ اس کے چہرے پر موجود فکرمندی اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

''تم نے اپنے بندوں کو ٹٹولا باجوہ! کہیں ان بندوں میں سے تو کوئی اے سی کا مخبر نہیں بن گیا؟'' چودھری افتخار نے رُوئے سخن اقبال باجوہ کی طرف کیا۔

''سارے بندے بہت اعتبار کے ہیں چودھری صاحب! برسوں سے ہم انہی بندوں سے کام لے رہے



ہیں کسی کی طرف سے شکایت نہیں ملی۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ان بندوں کے بارے میں۔ ان میں سے زیادہ تر آپ کے ہی نمک خوار ہیں اور آپ کے نمک خواروں کو میں نے جان سے گزرتے دیکھا ہے، غداری کرتے نہیں۔'' اقبال باجوہ کے جواب پر چودھری افتخار کے ہونٹوں پر فخریہ سی مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنے بندوں پر اعتبار ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں سے تو مخبری ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان کوئی نہ کوئی بھیڑ موجود ہے۔ ہمیں اُس کالی بھیڑ کو ڈھونڈنا ہے۔ ابھی تو تارڑ کی وجہ سے بچت ہو گئی لیکن ہوسکتا ہے وہ اے سی، تارڑ کو بھی ہوا نہ لگنے دے اور خود ہی اچانک کارروائی کر ڈالے۔ تارڑ نے بتایا تو ہے کہ وہ باہر گیا ہے کہ کسی نے مخبری کر دی اس وجہ سے مال نہیں پکڑا گیا۔''

''میرے ذہن میں ایک بندے کا نام آ رہا ہے چودھری صاحب! میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ یہ مخبری اسی نے کی ہے۔'' اقبال باجوہ کا انداز پُرسوچ تھا۔

''وہ کون؟'' چودھری افتخار نے بے چینی سے پوچھا۔

''موتی والا..... میرے اور آپ کے سوا جس تیسرے بندے کو ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ موتی والا ہے۔ آپ اور میں تو مخبری کرنے سے رہے اس لیے ایک موتی والا ہی رہ جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اے سی سے مل گیا ہے۔''

''پر اسے بھی کیا ضرورت ہے مخبری کرنے کی؟ وہ تو خود شریک ہے۔'' چودھری افتخار اُلجھا۔

''میرے خیال میں باجوہ صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے چودھری صاحب! ذرا سارے حالات پر غور کر کے دیکھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد پہلے پہل موتی والا آپ سے بالکل بدک گیا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ اب وہ آپ سے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتا لیکن پھر بعد میں اس نے اپنا رویہ ٹھیک کر لیا تو ہم سمجھے کہ صدمے کا اثر کم ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ بزنس کی طرف دھیان دے رہا ہے۔ پر اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ ساتھی بن کر آپ کو پھنسوانے کے چکر میں تھا۔ ورنہ اسے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں یہ بات وثوق سے اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ موتی والا بہت بڑی رقم لگا کر بیٹے کے نام سے ایک ہسپتال کھولنے والا ہے۔ یہ ساری باتیں انوکھی نہیں ہیں۔ بہت بار دیکھنے میں آیا ہے کہ اولاد کی خاطر ماں باپ کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ موتی والا کا بیٹا تو تھا بھی اکلوتا۔ اکلوتے بیٹے کے صدمے نے اس کا دماغ بالکل اُلٹ دیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس سارے مال و متاع کا کیا کرنا ہے، جو کچھ ہے اسی کاموں میں لگا دے تاکہ بیٹے کے لیے ایصالِ ثواب کا بھی کچھ بندوبست ہو اور خود اپنے دل کو بھی چین ملے۔ ممکن ہے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہی اس نے یہ راہ بھی ڈھونڈی ہو کہ درختوں کی غیر قانونی سپلائی کو رُکوانے کا بندوبست کرے۔ اب اسے تو کوئی فکر نہیں ہے کہ آگے بال بچوں کا مستقبل دیکھنا ہے اس لیے وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' اقبال باجوہ کی تائید کرتے ہوئے معظم تارڑ نے دلائل دیئے۔

''یہ تو سوچو ہے کھا کر بلی کے حج پر جانے کا معاملہ ہے چودھری صاحب! آپ مانیں یا نہ مانیں، لیکن میرا تو یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔'' اقبال باجوہ نے ایک بار پھر چودھری افتخار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہے؟ مجھے خود بھی اب یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس معاملے کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔'' چودھری افتخار پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔

''میں اس معاملے میں اس لیے بھی شیور ہوں کہ موتی والا کو اس سارے سیٹ اپ میں میری کے بارے میں پکا معلوم نہیں ہے۔ وہ شک تو کر سکتا ہے کہ اس علاقے سے مال نکلتا ہے تو شاید میں لوگوں کے ساتھ ہوں گا لیکن کبھی ڈائریکٹ ہماری اس حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا صاحب مجھے رات ہونے والی کارروائی سے الگ رکھنے کا بندوبست کرتے۔ کچھ نہ کچھ شک تو انہیں اس لیے مجھے پورا معاملہ کھل کر نہیں بتایا لیکن شک کے بجائے اگر یقین ہوتا تو وہ کچھ اور ہی انتظام چودھری افتخار کو قائل ہوتے دیکھ کر معظم تارڑ نے ایک اور دلیل دی۔

''اے سی نے بہت پَر پھیلانے شروع کر دیئے ہیں۔ پہلے اسکول والے معاملے میں مجھ سے اس دوسرے معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ موتی والا نے مخبری کی ہے تو ساتھ یہ بھی تو بتایا بھی اس کام میں شریک ہوں۔'' چودھری کے لہجے میں غصہ تھا۔

''تو پھر کوئی انتظام کریں نا اُس اے سی کا چودھری صاحب!..... اگر یہ پیچھے پڑ گیا تو ہم کہاں ہر دفعہ ہمیں خبر مل جائے یہ ضروری تو نہیں۔'' اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو اُکسایا۔

''اس اے سی کا انتظام کرنا اتنا آسان نہیں باجوہ صاحب! یہ آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے اپنے معاملے میں دخل اندازی کرنے والے جس اے سی کی تبدیلی کروائی تھی اس میں اور اے سی شہر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ اے سی مڈل کلاسیا تھا، جس کا کوئی آگا پیچھا نہیں تھا۔ شہریار عادل کو سپورٹ کرنے والوں کی پوری فوج بیٹھی ہے۔ ماموں اُس کا ایم این اے، کزن اُس کا ڈی آئی جی، سالا آئی جی اور اس کے علاوہ بھی جانے کہاں کہاں اس کے خاندان کے افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اتنا سر چڑھا رہا ہوں تو یہ بلاوجہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی تک وہ کھل کر میرے سامنے نہیں آیا۔ بڑے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے جوانی کے جوش میں کر رہا ہو اور اسے خیال ہو کہ اس کے اقدامات سے براہِ راست مجھے نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیاقت رانا صاحب میرے بڑے اچھے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو سمجھا بجھا کر بھیجا ہوگا۔'' افتخار، شہریار کے اقدامات پر ناراض ہونے کے باوجود ابھی تھوڑی بہت خوش فہمی میں مبتلا تھا۔

''میرے خیال میں تو چودھری صاحب! آپ کو رانا صاحب سے بات کرنی چاہئے۔ اگر وہ اپنے کو کچھ سمجھانا بھول گئے ہیں تو اب سمجھا دیں گے۔'' اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو مشورہ دیا۔

''نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی معاملات اس حد تک نہیں آئے کہ میرے قابو سے باہر البتہ ہم اِن ڈائریکٹلی شہریار عادل کو سنبھل جانے اور ایک طرف ہو جانے کا پیغام دے سکتے ہیں۔ میرے میں ایک تدبیر ہے جس کے ذریعے ہم خود سے غداری کرنے والے کو سبق بھی سکھا دیں گے اور شہریار کو بھی مل جائے گا کہ ہم سے پنگا لینا ٹھیک نہیں۔''

''وہ کیا چودھری صاحب؟'' چودھری افتخار کے ذومعنی انداز پر اقبال باجوہ اور معظم تارڑ دونوں اُٹھے۔

''بس دیکھتے جاؤ۔ بالا ابھی لاہور میں ہی ہے، وہ ہمارا کام کر دکھائے گا۔'' چودھری افتخار کی آنکھوں وہی چمک تھی جو اپنے شکار پر گولی چلانے سے پہلے کسی شکاری کی آنکھوں میں اُترتی ہے۔

⊛----✪----⊛



بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ چودھری افتخار کی نظروں میں آنے کے بعد سے اس سے سکون کی نیند خارج ہو گئی تھی۔ پہلے چودھری نے اپنی حویلی میں اُس پر دست درازی کی کوشش سے اس رات وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کا گاؤں میں جو ایک شدید خوف میں گزرا کہ کہیں چودھری اسے اس کے باپ کے گھر سے نہ اُٹھوا لے۔ لیکن اس وقت اپنے معاملات میں اُلجھے ہونے کی وجہ سے خیر گزری۔ فیصل آباد لوٹ جانے کے بعد بھی ماہ بانو کو بتاتا تھا کہ چودھری کے ہاتھ وہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ وہ زہرہ کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں صرف چودھری کی وجہ سے ہی گریزاں تھی کہ اس کی گاؤں میں موجودگی کی خبر دوبارہ سے چودھری کی یاد دلا دے گی اور اس کا یہ اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ چودھری نے اسے موقع دیکھتے ہی اُٹھوا لیا اس روز ماہ بانو اپنی جان کی بازی نہ لگاتی تو چودھری کے پنجوں سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا۔ چودھری کی شادی کی خواہش نے بھی ماہ بانو کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ رشتہ جو نوراں اور غیاث محمد کے نزدیک ان کی اضافے کا باعث بنتا، ماہ بانو کے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھری اُس کے شدید خواہش میں اُس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔ شادی ہو جاتی اور ماہ بانو اسے حاصل ہو جاتی تو حویلی کے کسی کونے میں ڈال دیتا۔ چودھری کی اس ہوس کو مٹانے میں ماہ بانو کے سارے خواب ہو جاتے۔ چودھری کی بیوی بن کر نہ تو اس کے دل کو خوشی ملتی اور نہ ہی اس کے ڈاکٹر بننے کی خواہش ہو پاتی۔

ماہ بانو نے اپنی زندگی کے لیے جو خواب دیکھے تھے اس میں ادھیڑ عمر، ظالم اور عیاش چودھری کا تو کوئی گزر نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ خود کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے روپ میں کسی پڑھے لکھے اور نیک فطرت شخص کی معیت میں دیکھتی تھی۔ چنانچہ زہرہ کا تعاون ملتے ہی اس نے چودھری کی پہنچ سے نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ قسمت سے اسے مدد مل گئی اور وہ لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچا دی گئی۔ خود کو دارالامان پہنچائے جانے کا فیصلہ کتنا تھا، اس کا اندازہ ماہ بانو کو اس رات ہوا تھا جب اسے دارالامان سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ اتنی دور لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچ گئے تھے، ان کے لیے فیصل آباد پہنچنا کیا مشکل تھا۔ دارالامان کی چوکیداری کی وجہ سے ماہ بانو کی بچت ہو گئی تھی لیکن فیصل آباد میں اگر یہی صورتِ حال پیش آتی تو بے چارے اور صفدر کیا کر پاتے؟ ماہ بانو تو بڑی آسانی سے دوبارہ چودھری کے چنگل میں جا پھنستی۔ اب بھی وہ اس آزاد نہیں ہوئی تھی۔ موتی والا کے بڑے سے گھر کے آرام دہ بستر پر لیٹنے کے باوجود بھی اسے سکون کی لینے نہیں آ پاتی تھی کہ اسے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جانے کب چودھری کے بندے اس کے پیچھے آ جائیں۔ آج رات بھی وہ اسی بے چینی کی وجہ سے نہیں سو پا رہی تھی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے یک دم ہی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس احساس کا سبب نہ جاننے کے باوجود وہ بے چین سی ہو کر اپنے بستر پر اٹھی۔ پھر کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو چادر اپنے گرد لپیٹ کر باہر نکل آئی۔ موتی والا نے اسے اپنی کوٹھی کے جس میں ٹھہرایا تھا، وہ کوٹھی کی انیکسی تھی۔ اس انیکسی اور موتی والا کے رہائشی حصے کے درمیان ایک خوب صورت باغ تھا۔ ماہ بانو انیکسی سے نکل کر باہر لان میں آئی تو چادر اوڑھے ہوئے ہونے کے باوجود اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سردی کا موسم اپنے اختتام پر تھا۔ لیکن رات کے اس پہر کھلے میں ہونے کی وجہ سے خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ ماہ بانو ایک منٹ تک اس کھلی فضا میں ساکت کھڑی رہی پھر یک دم ہی اُسے ادراک ہوا کہ اندر لیٹے ہوئے اسے کس غیر معمولی پن کو محسوس کیا تھا۔ موتی والا کی کوٹھی میں حفاظت کے لیے تربیت یافتہ کتے رات بھر

گھومتے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ماہ بانو نے ان کتوں کے بھونکنے کی معمولی سی آوازیں سنی تھیں اور
بعد یک دم ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ کتوں کا بھونکنا اور خاموش ہو جانا دونوں ہی باتیں معنی خیز تھیں۔ مو
بوی نے ماہ بانو کے خوف کو دیکھتے ہوئے جہاں اسے نگراں کتوں کے حوالے سے تسلی دی تھی، وہاں کتو
خصوصیت بھی بتائی تھی کہ یہ کتے کبھی بلا جواز نہیں بھونکتے۔ ماہ بانو نے ان چند دنوں میں موتی والا کی
کہی ہوئی بات کی صداقت کو پرکھ لیا تھا۔ کتے واقعی اس عرصے میں ایک بار بھی نہیں بھونکے تھے۔ اس
دیر قبل ماہ بانو نے جو اُن کے بھونکنے کی آواز سنی تھی وہ صرف لمحہ بھر کے لیے تھی۔ اس کے بعد پھر خاموشی
تھی۔ اگر ماہ بانو جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے کتوں کے بھونکنے کا قطعی احساس نہیں ہو پاتا۔ اب بھی وہ
پر نوٹس نہیں لے پائی تھی لیکن اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا۔ اپنے اندر اُبھرنے والے
کے اس احساس کو وہ خود کو دلیلیں دے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہوسکتا ہے کتوں کے بھونکنے کی
میں نے سنی تھی، وہ کہیں باہر سے گزرنے والے کسی آوارہ کتے کی آواز ہو۔ اگر کوٹھی میں کوئی خطرہ ہوتا تو
یا بھونک کر چپ ہو جانے کے بجائے آسمان سر پر اٹھا دیتے۔ لیکن اس دلیل کے باوجود اس کی تسلی نہیں ہو
تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ لان کا ایک چکر لگا کر کتوں پر نظر ڈالے۔

وہ اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے دبے پاؤں لان میں چلنے لگی۔ لان میں نیم تاریکی
اس نے بھی انیکسی کی لائٹیں روشن نہیں کی تھیں۔ اس لیے اگر کوئی دور سے دیکھ بھی رہا ہوتا تو فوری طور
لان میں ماہ بانو کی موجودگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ دس قدم چلنے کے بعد ہی ماہ بانو کو ٹھٹک کر رک جانا
رکنے کا سبب وہ بڑے سیاہ رنگ کے کتے تھے جن کو پہلی بار دیکھنے والا لازماً دہشت زدہ ہو جا
ماہ بانو کے ٹھٹکنے کا سبب ان کی دہشت نہیں تھی۔ کتوں سے تو وہ ان دنوں میں مانوس ہو چکی تھی۔ اس
اس لیے ٹھٹکی تھی کہ اس نے دونوں کتوں کو ایک دوسرے کے قریب لان کی گھاس پر گرا ہوا دیکھا تھا۔ ماہ
بھانپ کر ان دونوں کا جائزہ لیا۔ اسے ان کے وجود میں زندگی کی رمق محسوس نہیں ہوئی۔ کتوں کے قریب
ماہ بانو کو گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا۔ یک دم ہی سارا معاملہ ماہ بانو کی سمجھ میں آ گیا۔
کا الاثر زہر ملا ہوا گوشت کا ٹکڑا کوٹھی کے لان میں پھینک کر کتوں سے بچنے کا انتظام کیا تھا۔ تر
کوٹھی کے قریب ان کی موجودگی کو محسوس کر کے ذرا سا بھونکے تو تھے لیکن پھر گوشت کے اس ٹکڑے
اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ گوشت کا یہ لالچ ان کی زندگی کا چراغ گل کر گیا تھا اور ساتھ ہی ان
وہاں بھی خطرے کی گھنٹی بج گئی تھیں جن کی حفاظت پر وہ مامور تھے۔ ماہ بانو کے علم میں یہ بات تھی کہ
کوٹھی کی حفاظت کے لیے صرف ایک چوکیدار اور تھا۔ باقی ملازمین رات گیارہ بجے چھٹی کر
کوٹھی کو لوٹ جاتے تھے۔ صرف باورچی خانے کی ذمے داری سنبھالنے والے ایک میاں بیوی
کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں قیام تھا لیکن وہ بھی دو دن سے اپنے خاندان کی کسی شادی میں شر
لے کر اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ماہ بانو اندازہ کر سکتی تھی کہ جن لوگوں نے کتوں کو خاموش
کر دیا ہے وہ خاموش کر چکے ہوں گے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خاموشی عارضی تھی یا
ماہ بانو کا دل چاہا کہ پلٹ کر بھاگتی ہوئی، کوٹھی سے کہیں دور بھاگ جائے۔ لیکن اس بے سروسا
کہاں؟ اس کا بیگ یتیم خانے میں رہ گیا تھا۔ فی الحال وہ موتی والا کی
کر رہی تھی۔ پھر اس اجنبی شہر میں اس کے پاس کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ رات
باقی بھی تو جانے کس مصیبت میں پھنس جاتی۔ ایک دوسرا خیال اسے موتی



کی بیوی کے بارے میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو لوگ موتی والا کی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں، وہ اس کی
میں آئے ہیں۔ وہ اپنی وجہ سے موتی والا اور اس کی بیوی کو مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی
چنانچہ اس نے کوٹھی سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کیا اور کوٹھی کے اس مرکزی حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں
والا اور اس کی بیوی رہائش پذیر تھے۔ انیکسی اس رہائشی حصے کے عقبی جانب تھی۔ ماہ بانو نے سامنے کے
جانے کے بجائے عقبی سمت موجود اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ یہ موتی والا
اس کی بیوی کے بیڈروم میں کھلتی ہے۔ کھڑکی کے قریب جا کر ماہ بانو کو مایوسی ہوئی۔ کھڑکی بند تھی اور اندر سے
کے گرد پردے کھنچے ہوئے تھے۔

مایوسی کے اس عالم میں وہ پلٹنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ کھڑکی کی ایک جانب سے پردہ
ہٹا ہوا ہے۔ ماہ بانو اس حصے پر اپنی ناک چپکا کر اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے میں روشنی
تھی اور اس روشنی میں ماہ بانو بہت واضح طور پر اس شخص کو دیکھ سکتی تھی جو پورے انہماک سے کھلی تجوری
سے زیور اور روپے سمیٹ کر اپنے بیگ میں بھر رہا تھا۔ اس شخص کی حرکت دیکھ کر ماہ بانو مخمصے میں پڑ گئی۔
ماہ بانو کی تلاش میں یہاں تک آنے والا چودھری افتخار کا کوئی بندہ تھا تو اسے مال سمیٹنے کے بجائے ماہ بانو کو
کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ شخص اکیلا لوٹ مار میں لگا ہو اور اس نے اپنے
ساتھیوں کو ماہ بانو کی تلاش پر مامور کر رکھا ہو اور وہ لوگ کوٹھی کے مختلف کمروں میں ماہ بانو کو تلاش کرتے پھر
ہوں۔ اس خیال نے ماہ بانو کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر
میں مصروف شخص پر سے نظریں ہٹا کر موتی والا اور اس کی بیوی کو دیکھنے کی سعی کی لیکن وہ جس زاویے
اور جھانک رہی تھی اس زاویے سے اسے پورا کمرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظر کی حد بیڈ کے ایک حصے پر جا
ختم ہو جاتی تھی اور وہاں اس موتی والا اور اس کی بیوی کے وجود نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن پھر کچھ اور تھا جو
نظر آ گیا۔ بیڈ کی چادر پر لمحہ بہ لمحہ پھیلتا ہوا وہ دھبہ یقینی طور پر سرخ رنگ کا تھا اور ایسی سرخی صرف انسانی
ہی ہو سکتی تھی۔ وہ خون کس کا ہو سکتا تھا؟ یہ سمجھنے میں ماہ بانو کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ بیڈ کی چادر یقیناً ان دو
کے خون سے ہی رنگی ہوئی تھی جو ہر رات اس بیڈ پر محوِ خواب ہوتے تھے۔ آج شاید انہیں اپنے ہی بستر پر
نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ماہ بانو کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خیال
نے تھوڑی دیر پہلے اس کے قدم کوٹھی سے باہر جانے سے روک لیے تھے، یک دم ہی اس کے ذہن سے
گیا تھا اور اب وہ ہر حال میں یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اپنے نکل بھاگنے کی اس خواہش پر عمل کرنے
لیے اس نے کھڑکی کے شیشے پر چپکا اپنا چہرہ ہٹا کر جیسے ہی پلٹنا چاہا، کسی نے یک دم اس کے وجود کو مضبوطی
اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ماہ بانو نے اضطراری طور پر چیخنے کی کوشش کی لیکن اسے دبوچنے والے نے
کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ دھان پان سی ماہ بانو ایک مضبوط مردانہ گرفت
میں جکڑی سوائے پھڑکنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟

⊛----✪----⊛

ماہ بانو پورا زور لگا رہی تھی کہ کسی طرح خود کو جکڑنے والے کی گرفت سے آزاد کروا سکے لیکن گرفت بہت
مضبوط تھی۔

''شش..... شور مت مچانا۔ آرام سے رہو۔ میں تمہارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔'' پیچھے سے اسے گرفت

میں لینے والے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹا لیا۔ اس نے پلٹ کر جکڑنے والے کو دیکھا۔ تاریکی کے باوجود وہ اسے شناخت کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ موتی والا کا ڈرائیور لیکن رات کے اس پہر اُس کی یہاں کوٹھی میں موجودگی کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ماہ بانو نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

''یہ وقت سوال جواب کا نہیں۔ ہمیں پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے ماہ بانو کا ہاتھ تھاما اور اسے سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا رخ بیرونی گیٹ کی جانب تھا۔ ماہ بانو کے حواس موتی والا کے بیڈ روم کا منظر کے بعد ابھی تک مختل تھے اس لیے وہ بنا کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی وقت ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ جو اس وقت کوٹھی میں گھسے لوٹ مار کر رہے تھے، وہ بھی اندرونی حصے میں تھے۔ گیٹ پر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں ذیلی گیٹ سے گزر کر آرام سے باہر نکل گئے۔

باہر نکلنے کے بعد ڈرائیور نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ اسے بھی ڈرائیور کی پیروی کرنی پڑی۔

''اس علاقے میں رہنے والے تمام افراد کے پاس اپنی ذاتی گاڑیاں موجود ہیں۔ اس لیے یہاں دن وقت بھی پبلک ٹرانسپورٹ مشکل سے ہی ملتی ہے۔ رات کے اس پہر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمیں سواری مل جائے۔ سواری کے لیے ہمیں مین روڈ تک جانا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی رکشہ یا ٹیکسی مل جائے۔'' چلتے اس نے ماہ بانو کو اطلاع دی۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ جب اس کے ساتھ کوٹھی سے نکل ہی پڑی تھی تو اس پیروی بھی کرنی تھی۔ اس کی رات کے اس پہر کوٹھی میں موجودگی کی وجہ سمجھ نہ آنے کے باوجود اسے اس بات یقین تھا کہ وہ کوٹھی میں موجود افراد کے مقابلے میں اسے کم از کم کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے، وہ یقیناً عادی جرائم پیشہ لوگ تھے اور اسے یقین تھا کہ انہوں نے موتی والا اور اس کی بیوی کو قتل کیا ہے۔ موتی والا کے بیڈ روم میں موجود شخص جس طرح اس کی تجوری سے مال سمیٹ رہا تھا، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ کوٹھی میں گھس آیا ہے۔ اسے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ چودھری کے بندے نہ ہوں۔ جس طرح چودھری نے اس کی دارالامان موجودگی کا پتہ چلا لیا تھا اسی طرح یہاں موجودگی کا بھی چلا سکتا تھا۔ لیکن اس خیال کو کوٹھی میں موجود افراد کا طرزِ عمل کمزور بنا رہا تھا۔ اگر وہ چودھری کے بندے اور اس کی تلاش میں آئے تھے تو انہیں لوٹ مار میں ملوث ہونے کے بجائے پوری کوٹھی میں پھیل کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ حقیقت جو بھی تھی، فی الحال اس کے ساتھ تو یہ معاملہ تھا کہ وہ ایک بار پناہ گاہ سے محروم ہوگئی تھی اور ایک ایسے شخص پر بھروسہ کر کے جو اس کے لیے فقط صورت آشنا تھا، اس کے ساتھ جانے پر مجبور تھی۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے ساتھ ساتھ چلتے مین روڈ پر آئے تو وہاں بھی کافی سناٹا تھا۔ سڑک سے گزرنے والی اِکا دُکا ٹیکسیوں میں پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں کسی خالی ٹیکسی کے انتظار میں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد انہیں ایک چوک پر خالی ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور اگلی نشست پر اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے سواری کے انتظار میں اونگھ رہا تھا۔

''خان! بھاٹی گیٹ تک جانا ہے..... چلو گے؟'' ڈرائیور نے ٹیکسی ڈرائیور کو پکار کر پوچھا۔

''چلے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟ اَم یہاں اس وقت سواری کے انتظار میں ہی تو خوار ہو رہا ہے۔'' وہ جھٹ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ چادر سے آدھے چہرے کو چھپائے کھڑی ماہ بانو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز سا رشک اُتر آیا تاہم زبان سے کچھ بھی کہے بغیر اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی جھک کر ٹیکسی کے دونوں عقبی دروازوں کے لاک کھول دیئے۔ وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ دوران



[illegible] نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ ماہ بانو کے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے تھے مگر [illegible] کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال خاموش رہا جائے۔

''اب کس طرف لینا ہے؟'' اس دبیز خاموشی کو ایک طویل وقفے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے ہی توڑا۔ وہ [illegible] مطلوبہ علاقے میں پہنچ گیا تھا اور اب حتمی منزل کی نشان دہی چاہتا تھا۔

''بس یہیں اُتار دو۔'' اسے جواب دیا گیا۔ ٹیکسی رکنے پر ٹیکسی والے کو منہ مانگا کرایہ دینے کے بعد وہ [illegible] ایک بار پھر پیدل چل پڑے۔ ذرا سی دیر میں وہ کشادہ علاقے کو چھوڑ کر تنگ اور پُر پیچ گلیوں والے ایک [illegible] میں چل رہے تھے۔ ان پُر پیچ گلیوں سے گزرتا ہوا وہ ماہ بانو کو لے کر ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے [illegible] گیا۔ لکڑی کے دروازے پر کنڈی بجا کر دی جانے والی دستک کافی زوردار تھی۔ پھر بھی اندر سے تیسری [illegible] کے بعد ردِعمل ظاہر ہوا۔

''اس وقت کون ہے بھائی؟'' نیند میں ڈوبی مردانہ آواز نے بے زاری سے پوچھا۔

''دروازہ کھول عامر! میں سرمد ہوں۔'' اس جواب پر فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

''تو اس وقت کیسے؟..... سب خیر تو ہے؟'' دروازہ کھولتے ہی عامر نام کے اس شخص نے اپنی تشویش کا اظہار [illegible] کر دیا لیکن پھر پیچھے کھڑی ماہ بانو کو دیکھ کر اسے حیرت کا اتنا شدید جھٹکا لگا کہ وہ مزید کوئی سوال نہ کر سکا۔

''پہلے اندر آنے دے۔ بعد میں تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔'' سرمد نے اسے ہاتھ سے پرے کرتے [illegible] اپنے اور ماہ بانو کے اندر جانے کا راستہ بنایا۔ وہ بے چارہ حیران پریشان سا دروازہ بند کرنے لگا۔ اتنی دیر [illegible] سرمد، ماہ بانو کو لے کر ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ عامر بھی وہیں آ گیا۔

''کیا چکر ہے یار! یہ تُو آج اپنی نیلم پری کے بجائے کس کو ساتھ لے کر گھوم رہا ہے؟ کیا پٹری بدل لی [illegible]؟'' سرگوشی میں کیا گیا یہ سوال اس چھوٹے سے کمرے میں موجود ماہ بانو کے کانوں میں بھی پہنچا۔ اندر ہی [illegible] ملامت محسوس کرنے کے بجائے وہ ایسی بن گئی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پٹری میری ابھی تک وہی ہے۔ بس یوں سمجھ لے کہ اس پٹری پر دوڑتے رہنے [illegible] اس نے میرا پٹرا کر دیا ہے۔ اپنی نیلم پری کو پانے کے لیے ہی ایک کوشش کرنے نکلا تھا لیکن حالات کچھ [illegible] ہو گئے کہ اسے اپنے ساتھ لے کر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اسے کہاں رکھوں؟ [illegible] گھر کا تو تجھے معلوم ہے کہ وہاں کی آبادی کتنی زیادہ..... اور خطرناک ہے۔ میری ماں بہنیں سوال کر کر [illegible] میرا متھا خراب کر دیں گی اس لیے میں تیرے پاس آ گیا کہ تو اسے اپنے گھر میں رکھ لے۔''

''میں..... میں کیسے رکھ لوں؟'' اس مطالبے پر عامر اُچھلا۔

''کیسے کیا؟..... بس میری خاطر رکھ لے۔ آس پڑوس والوں سے بول دینا کہ رشتے کی بہن ہے جسے تُو [illegible] اپنی ماں کی خدمت کے لیے بلوایا ہے۔ خالہ جی اتنی بیمار ہیں، کسی کو تیری بات پر شک نہیں ہوگا۔''

''اور اماں سے کیا بہانہ کروں گا؟ وہ تو اسے میری رشتے کی بہن نہیں مانے گی نا؟'' خود کو ملنے والے [illegible] پر عامر نے طنز سے سوال کیا۔

''خالہ جی کو جو تیرا من کرے، وہ بہانہ گھڑ کر سنا دینا۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرے لیے انہیں بے وقوف بنانا [illegible] مشکل نہیں۔ چاہے تو میرا نام لے لینا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ [illegible] کل کسی وقت موقع ملا تو آ کر بتاؤں گا۔ تُو اس کے سونے دونے کا انتظام کر دے۔'' وہ عجلت میں بولتا [illegible] اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ عامر نے اسے روک کر کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں ہوا اور تیزی

ے باہر نکل گیا۔ عامر کے ساتھ ساتھ ماہ بانو بھی ہکا بکا سی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''لاہور سے ایک بری خبر ہے سر!'' شہریار کی دفتر میں آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی عبدالمنان نے ا
طلاع لیا۔

''کیا خبر ہے؟'' اس نے عبدالمنان کی سنجیدہ شکل کی طرف دیکھتے ہوئے حتی الامکان خود کو پُرسکون
ے پوچھا، ورنہ عبدالمنان کے الفاظ نے اسے بے حد تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں سب
پہلا اندیشہ ماہ بانو کے حوالے سے ہی سر سرایا تھا۔ وہ لاہور میں موتی والا کے گھر پناہ گزین تھی۔ ابھی
لوں اسے لاہور کے اس دارالامان سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی جہاں عبدالمنان نے اسے اس وثوق
ساتھ بھجوایا تھا کہ وہاں وہ بالکل محفوظ رہے گی۔ ماہ بانو کی اپنی ہی غلطی کی وجہ سے سہی لیکن اس محفوظ دارالا
میں اُس کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اگر مشاہرم خان کا دوست اپنی جان کی بازی لگا کر اس کے ا
کوشش ناکام نہ بنا دیتا تو وہ چودھری افتخار تک پہنچ چکی ہوتی۔ اب ایک بار پھر عبدالمنان اسے اطلاع دے
کہ لاہور سے کوئی بری خبر تھی۔ اس بری خبر کا تعلق ماہ بانو سے ہونے کے خدشے نے اسے بے چین کر دیا تھا

''موتی والا کے گھر ڈاکہ زنی کی واردات میں اُسے اور اُس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ واقعہ کل
رات کے بعد پیش آیا ہے۔ زیادہ تفصیلات کافی الحال مجھے علم نہیں ہو سکا۔''

''اور ماہ بانو.....؟ اُس کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا؟ وہ بھی تو موتی والا کے گھر پر تھی؟'' عبدال
کی اطلاع نے اس کے خدشات کو درست ثابت کر دیا تھا۔ موتی والا کے گھر ہونے والی واردات میں ماہ
کے متاثر ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا۔

''نہیں..... ابھی ماہ بانو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ماہ بانو کی وہاں موجودگی کیونکہ آف
ریکارڈ ہے اور ہم اس سے اپنا کوئی تعلق شو بھی نہیں کر سکتے، اس لیے میں نے اس سلسلے میں کسی بھی قسم کے
جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم وہاں پہنچ کر صورتِ حال دیکھنے کے بعد ہی اس کے سلسلے میں کوئی اقدام
سکتے ہیں۔ ممکن ہے ماہ بانو، موتی والا کے گھر پر موجود ہو اور اس نے پولیس کو وہاں اپنی موجودگی کے سلسلے
کوئی وجہ بھی بتائی ہو۔ بہر حال، لاہور پہنچنے سے پہلے کوئی بھی لائحہ عمل طے کرنا ممکن نہیں۔'' عبدالمنان کا جواب
دو ٹوک تھا۔

''او کے۔ تم لاہور چلنے کی تیاری کرو۔ ہم نے ماہ بانو کو موتی والا کے گھر نہ بھی ٹھہرایا ہوتا تو بہر حال
سے میرے ٹرمز ایسے تھے کہ اس موقع پر میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔'' اس نے عبدالمنان کو حکم دیا۔ تھوڑی
بعد وہ لوگ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ طویل راستہ بالکل خاموشی کے ساتھ کٹا۔ جس وقت وہ لوگ موتی
کی رہائش گاہ پر پہنچے، وہاں جنازوں کو روانہ کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ انتظامات موتی والا کے ایک
نے سنبھال رکھے تھے۔ موتی والا کا شمار بڑے کاروباری افراد میں ہونے کی وجہ سے اس کی رہائش گاہ پر شہر
تقریباً ہر قابل ذکر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔ بزنس کمیونٹی کے افراد کے علاوہ کئی محکموں
اعلیٰ افسران اور سیاست دان بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ موتی والا کے کزن سے تعزیت کرنے کے بعد شہر
مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ اپنے ماموں لیاقت رانا اور کزن سجاد رانا سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ چودھری
بھی وہاں پر موجود تھا اور سب سے زیادہ سرگرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنازے کے انتظامات کرنے



کزن سارے کام اسی کے مشورے پر کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ ایسا یقیناً چودھری افتخار کے دبدبے اور
موتی والا کے کاروباری شریک ہونے کی وجہ سے کر رہا تھا۔ شہریار بظاہر دوسرے لوگوں کے ساتھ
تھا لیکن اس کی نظریں چودھری افتخار کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اس کے چہرے پر چھائے افسردہ
بالکل مصنوعی لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چودھری افسردہ ہونے کی اداکاری کر رہا ہو۔ جنازہ روانہ
چودھری ہی سب سے آگے آگے تھا۔ گھر کی قریبی مسجد سے ملحقہ عیدگاہ میں نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے
افراد رخصت ہونے لگے۔ وہ سب مصروف ترین لوگ تھے جنہوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کا
یقیناً بڑی مشکل سے نکالا تھا۔ مرنے والوں کی تدفین کے لیے قبرستان روانہ ہونے والوں میں
والا کے قریبی عزیز، دوست اور چند ملازمین شامل تھے۔

''میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے ملنا چاہتا ہوں سجاد بھائی!'' سجاد، شہریار سے ہاتھ ملا کر وہاں سے
رہا تھا، تب اس نے دھیمی آواز میں اس سے فرمائش کی۔

''کیوں؟'' سجاد چونکا۔

''ابھی کچھ دن قبل میں نے آپ کے ذریعے جس لڑکی کو تھانے سے چھڑوایا تھا، وہ لڑکی موتی والا کے گھر
ملازمہ تھی۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔'' شہریار نے آواز مزید دھیمی کرتے
بتایا۔ وہاں اردگرد اور بھی لوگ موجود تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کے کان میں بھنک پڑے۔

''تم نے اس رات بھی مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر کون ہے وہ لڑکی جس کے لیے تم
پریشان ہو؟'' سجاد رانا نے پوچھا۔

''میں بعد میں آپ کو ساری تفصیلات بتا دوں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے جسے میری مدد
ضرورت ہے۔ اس وقت بھی میں انکوائری آفیسر سے مل کر اس کے تحفظ کے بارے میں ہی یقین دہانی کرنا
چاہتا ہوں۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ وہ موتی والا کے گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔''

''او کے! میں انکوائری آفیسر کو آرڈر دیتا ہوں کہ وہ تم سے ملاقات کر لے۔ بلکہ تم ایسا کرو کہ رانا ہاؤس پہنچ
انکوائری آفیسر وہیں آ کر تم سے ملاقات کر لے گا۔'' سجاد کو شروع سے اس کی فرمائشیں پوری کرنے کی عادت تھی۔ اس
اس سے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

''تھینک یو سجاد بھائی!'' شہریار اس سے ایک گرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے بولا اور اپنی گاڑی میں آ کر
کے بعد مشاہرم خان کو رانا ہاؤس چلنے کا حکم دیا۔ عبدالمنان اس کے ساتھ تھا۔ رانا ہاؤس میں حسبِ معمول
اس کی ممانی آفرین ہی موجود تھیں۔ لیاقت رانا کی بیرونی سرگرمیاں اتنی زیادہ تھیں کہ وہ دن کی روشنی میں کم
گھر پر دکھائی دیتے تھے۔ سجاد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا اس لیے آفرین رانا کا بیشتر وقت گھر پر تنہا
گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لیاقت رانا کے ساتھ کسی فنکشن میں شرکت کرنے چلی جاتی تھیں لیکن مزاجاً محفل پسند نہ
ہونے کے باعث وہ عموماً گھر پر رہنے کو ہی ترجیح دیتی تھیں۔

''بڑی ٹریجڈی ہوئی موتی والا کی فیملی کے ساتھ۔ پہلے جوان بیٹا حادثے کا شکار ہو کر مر گیا اور اب دونوں
میاں بیوی بھی قتل ہو گئے۔ ذرا سے عرصے میں سارا خاندان ختم ہو گیا۔'' وہ شہریار سے حالیہ واقعے کو ڈسکس
کرنے لگیں۔

''ہاں، واقعی بات تو بڑی افسوس ناک ہے۔'' اس نے غائب دماغی سے آفرین رانا کی بات کی تائید کی۔
دل میں تو اُس کا ذہن ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے

اور کس حال میں ہے؟ موتی والا کے گھر میں جو ہجوم لگا ہوا تھا، اس ہجوم میں وہ کسی سے ماہ بانو کی بابت
نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں چودھری افتخار کے ساتھ اس کے کئی کارندے بھی موجود ہوں گے،
لوگ اس کی یا عبدالمنان کی کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھ لیتے تو ضرور چونک پڑتے۔

''تمہارا کیا خیال ہے، قتل کی اس واردات کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ویسے تو کہا جا رہا ہے کہ
ڈاکہ پڑا ہے۔ اور ڈاکو بہت سارو پیہ اور زیور لوٹنے کے ساتھ موتی والا اور اس کی بیوی کو قتل کر گئے ہیں
مجھے لگ رہا ہے کہ معاملہ کوئی اور ہے۔ پہلے بیٹے کی حادثاتی موت اور اب دونوں میاں بیوی کے قتل کی
سے تو ایسا ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی کی موتی والا سے دشمنی تھی۔ ہو سکتا ہے خاندان کا کوئی فرد انوالو ہو۔ اکیلے
دولت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔'' آفرین رانا کو مشکل
سامع دستیاب ہوتا تھا۔ اب شہریار ہاتھ لگا تھا تو وہ دل کھول کر خیال آرائیاں ظاہر کر رہی تھیں۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے سجاد بھائی سے کہا تھا کہ اس کیس کے انکوائری آفیسر سے
ملاقات کروا دیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آفیسر یہاں آتا ہوگا۔'' شہریار نے انہیں جواب دیا۔ اس کی پروا
زیادہ تر ذمے داری انہوں نے ہی نبھائی تھی اس لیے وہ ان کا بہت ادب و لحاظ کرتا تھا۔ اس وقت بھی
موڈ نہ ہونے کے باوجود وہ ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

''یعنی تم اس آفیسر سے ملاقات کے لیے یہاں رُکے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ملاقات کے فوراً بعد ہم لوگ فوراً روانہ ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ تو میرا بالکل اتفاقی
ہے ورنہ مجھے وہاں اتنے معاملات دیکھنے ہیں کہ فی الحال کہیں آنے جانے کی فرصت نہیں۔ لیکن آپ
کریں۔ میں کسی دن اطمینان سے صرف آپ سے ملنے کے لیے لاہور آؤں گا۔'' شہریار نے انہیں تسلی دی۔

''مجھے اس قسم کے وعدوں کی حقیقت بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارے ماموں کے ساتھ
گزارے ہیں میں نے۔ سجاد کی مصروفیت کا عالم بھی دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے علم ہے کہ ہمارے خاندان کے
مرد کے پاس گھر اور گھر والوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔'' ان کے لہجے میں شکوہ تھا مگر اس سے قبل کہ شہریار
کوئی تسلی دیتا، وہ خود ہی بات بدلتے ہوئے بولیں۔ ''ذرا کچن کا چکر لگا کر آتی ہوں۔ صابر سے کہا تو تھا کہ
لگا دے۔ پتہ نہیں وہ اب تک کیا کر رہا ہے؟'' وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد صابر کھانا
اطلاع کے ساتھ وہاں آ گیا۔ گیسٹ روم میں موجود عبدالمنان کو بھی ڈائننگ روم میں بلوا لیا گیا۔ مشاہدہ
کے کھانے کا انتظام صابر اور دیگر ملازمین کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے تھوڑی
بعد ہی انکوائری آفیسر پہنچ گیا۔

''میں رفیق کھوکھر ہوں سر! موتی والا کیس کا انکوائری آفیسر۔ ڈی آئی جی صاحب کا حکم ملا تھا کہ آپ
کیس کے سلسلے میں مجھ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اس لیے میں پہلی فرصت میں رانا ہاؤس
جاؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آپ فرمائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
والوں کے عمومی تاثر کے برخلاف اس کی شخصیت میں نرمی اور تہذیب کی جھلک تھی۔ وہ دراز قد، اسمارٹ
جوان العمر آدمی تھا جس کے صرف اُٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کے انداز سے ہی شہریار نے اس کے مستعد
چست ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''سب سے پہلے تو مجھے موتی والا کے کیس پر اب تک کی گئی تحقیقات کے بارے میں بتاؤ۔'' شہریار
اس سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ ابتدائی تحقیقات میں ہی انکوائری آفیسر کو ماہ بانو کے بارے میں ضرور کچھ



ہوگا۔

قتل تقریباً آدھی رات کے وقت کیا گیا۔ موتی والا کے بیڈ روم میں موجود کھلی ہوئی خالی تجوری کو دیکھ کر
سکتا ہے کہ یہ ڈاکا زنی کی واردات تھی۔ شاید موتی والا صاحب اور ان کی مسز نے ڈاکوؤں کے خلاف
کرنے کی کوشش کی ہو، اس لیے انہیں قتل کر دیا گیا۔ مگر مجھے اس تھیوری پر بہت زیادہ یقین نہیں ہے۔
میں بیڈ پر اس طرح پائی گئی ہیں جیسے کسی نے سوتے میں ان پر وار کیا ہو۔ دونوں کے جسم پر چاقو کے کئی
کے بعد ان کے گلے کاٹ دیئے گئے ہیں۔'' انکوائری آفیسر کی اس بات پر شہریار کے علاوہ ملاقات
عبدالمنان بھی چونک پڑا۔ قتل کا یہ انداز کچھ عرصہ پہلے کیے جانے والے صفدر اور حوراں کے قتل سے
رکھتا تھا۔ ان دونوں کے چونکنے کو محسوس کیے بغیر رفیق کھوکھر نے اپنی بات جاری رکھی۔

''میرا خیال ہے کہ اگر قتل کسی مزاحمت کی وجہ سے کیا گیا ہوتا تو لاشوں کو بستر کے بجائے نیچے فرش پر یا
کے قریب پایا جانا چاہئے تھا۔ اگر قتل بلا جواز تھا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکو فطرتاً تشدد پسند
تھے جنہوں نے صرف تفریحاً قتل کیے۔ موتی والا کا چوکیدار بھی اپنے کیبن میں مُردہ پایا گیا ہے۔ اسے
کی ہڈی توڑ کر قتل کیا گیا۔ نگرانی پر مامور کتے گوشت میں شامل سریع الاثر زہر کی وجہ سے مارے گئے۔
ہے کہ واردات بہت سوچ سمجھ کر اور منظم طریقے سے کی گئی ہے۔ آنے والے مجرم اچھی طرح جانتے تھے
کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہیں۔ اسی لیے انہوں نے سب سے پہلے کتوں کو ہلاک کرنے کا
کیا۔ آتشیں ہتھیار استعمال نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا شور شرابا بھی نہیں ہوا۔ میں نے کوٹھی میں سے
مقامات پر سے..... خصوصاً موتی والا کے بیڈ روم سے فنگر پرنٹس اُٹھوائے ہیں۔ ممکن ہے اس سے ہمیں
مدد مل جائے۔ ویسے مجھے اس سلسلے میں زیادہ امید نہیں ہے۔ یہ لوگ تو بہت منظم معلوم ہوتے ہیں اور اب
عام مجرم کو بھی اس بات کا شعور آ چکا ہے کہ جائے واردات پر اپنے فنگر پرنٹس نہ چھوڑے۔''

''پولیس کو واردات کی اطلاع کس نے دی؟'' رفیق کھوکھر نے اب تک جو کچھ بتایا تھا، اس میں ماہ بانو کا
ذکر نہیں تھا۔ شہریار نے اسے مزید کریدنے کے لیے یہ سوال کیا۔

''اطلاع وہاں کام کرنے والے مالی نے دی تھی۔ وہ صبح سات بجے سب سے پہلے ڈیوٹی پر آتا ہے۔ وہ
اس نے دیکھا کہ کوٹھی کا ذیلی گیٹ کھلا ہوا ہے۔ اسے کچھ تشویش ہوئی اور اس نے چوکیدار کے کیبن میں
وہاں اسے چوکیدار کی لاش نظر آئی تو وہ اُلٹے قدموں باہر نکل گیا اور قریبی کوٹھی کے چوکیدار کو صورتِ
حال بتائی۔ اس چوکیدار نے اپنے مالک کو بتایا اور انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ باقی دو لاشیں پولیس نے
دریافت کی تھیں۔

''کیا کوٹھی میں چوکیدار کے علاوہ کوئی دوسرا مستقل ملازم نہیں تھا؟''

''نہیں۔ ڈرائیور اور مالی سمیت تمام ملازمین کو رات گیارہ بجے چھٹی دے دی جاتی تھی۔ صرف دو میاں
مستقل کوٹھی میں رہتے تھے لیکن وہ چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے پیچھے بندہ بھیجا ہے۔ وہ انہیں
کے گاؤں سے لے آئے گا۔ پہلے مرحلے میں ہم نے تمام ملازمین کو تفتیش میں شامل کر لیا۔ عموماً ایسی
واردات میں ملازمین کی شمولیت کا امکان ہوتا ہے۔ رشتے داروں میں سے کسی پر اس لیے شک نہیں کیا جا سکتا
موتی والا کے قتل سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کے مرنے کے فوراً بعد اس
کا اعلان کر چکے تھے کہ انہوں نے اپنی کُل جائیداد اپنے بیٹے کے نام سے ٹرسٹ قائم کرنے کے لیے وقف
کر دی ہے۔ واردات کرنے والے کو موتی والا کے گھر سے زیور اور کیش کے سوا کچھ نہیں ملا ہوگا اور ظاہر ہے

موتی والا جیسے عقل مند آدمی نے تمام زیور اور کیش تو گھر پر رکھنے کی غلطی نہیں کی ہوگی۔ ان دونوں چیزوں کا حصہ تو بینک میں ہی محفوظ ہوگا۔''

''یعنی آپ کو شک ہے کہ یہ اصل میں ڈاکا زنی کی واردات نہیں تھی بلکہ موتی والا اور ان کی مسز کے واردات کو ڈاکا زنی کی واردات کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے؟'' شہریار نے آفیسر کی بات پکڑی۔

''جی ہاں۔'' آفیسر نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ؟..... کیا آپ کے علم میں کوئی غیر معمولی بات آئی ہے؟'' شہریار نے سنجیدہ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''جی ہاں۔ ملازمین سے ہمیں علم ہوا کہ موتی والا کی کوٹھی کی انیکسی میں ایک مہمان لڑکی ٹھہری ہوئی تھی لیکن اب اس لڑکی کا کچھ اتا پتا نہیں۔ وہ کوٹھی سے غائب ہے۔ ملازمین اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے انہیں صرف اتنا علم ہے کہ موتی والا صاحب خود اس لڑکی کو لے کر آئے تھے۔ ملازمین کے متفقہ بیان کے مطابق لڑکی رات کو ان کے روانہ ہونے کے وقت تک انیکسی میں موجود تھی لیکن صبح وہ کسی کو نہیں ملی۔ اب یہ نہیں کہ وہ لڑکی واردات میں ملوث تھی یا خوف زدہ ہو کر کوٹھی سے بھاگ گئی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ملازمین سے لڑکی کا اسکیچ بنوا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔''

''لیکن آپ اس اسکیچ کو کسی اخبار وغیرہ میں شائع مت کروائیے گا۔'' شہریار نے بے ساختہ ہی اسے اور پھر اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرتی دیکھ کر وضاحت کے لیے بولا۔ ''میں آپ کو اسکیچ چھپوانے سے اس لیے منع کر رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ لڑکی کہیں چھپ جائے یا اگر وہ مجرم نہیں تو خوامخواہ مجرموں کی نظر میں آ کر مشکل میں پڑ جائے۔ جیسا کہ آپ نے بتایا ہے کہ موتی والا صاحب اسے خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے جانتے تھے اور وہ ان کے لیے قابل اعتماد تھی، تب ہی انہوں نے اسے اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں سر! میں اس لڑکی کا اسکیچ چھپوانے سے گریز کروں گا۔'' رفیق کھوکھر نے یقین دلایا۔

''تھانے یو آفیسر! میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس کیس کی انکوائری سے باخبر رکھیں۔ اصل میں موتی والا صاحب سے میرے نجی نوعیت کے تعلقات تھے اور وہ ایک اہم کیس کے سلسلے میں میری مدد بھی کر رہے تھے اس لیے میں اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہا ہوں۔'' شہریار نے اپنی بات کہہ کر یک دم ہی معاملے کے لیے ہاتھ جھاڑ دیا۔ یہ رفیق کھوکھر کے لیے ملاقات ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ بے چارہ اگر کچھ پوچھنے کی خواہش بھی رکھتا تھا تو نہ پوچھ سکا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔

⊛----✪----⊛

سرمد کا دوسرے دن کی شام ہو جانے کے باوجود کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ عامر نے اپنی ماں سے ماہ بانو کا تعارف سرمد کی کزن کی حیثیت سے کرواتے ہوئے یہ کہانی سنائی تھی کہ یہ سرمد کے مرحوم چچا چچی کی بے آسرا بیٹی ہے جو سال سے کسی اپنے کے سہارے کی خاطر یہاں آئی تھی لیکن سرمد کی والدہ نے اس مظلوم لڑکی کو گھر سے صاف انکار کر دیا۔ مجبوراً سرمد اسے یہاں چھوڑ گیا کہ تم اسے رکھ لو یہ گھر کے کام اور اماں کی خدمت کرے گی ساتھ اسے رہنے کا ٹھکانا بھی مل جائے گا۔ سرمد کی والدہ چونکہ اپنی تیزی طراری اور تند خوئی کی وجہ



سے اہل خاصی مشہور تھیں اس لیے عامر کا یہ بہانہ چل گیا۔ عامر کی والدہ نے نہ صرف ماہ بانو کو گلے لگا لیا بلکہ عامر کی یہ تجویز بھی قبول کر لی کہ وہ اسے محلے داروں کے سامنے اپنی عزیزہ ظاہر کریں گی۔ ان کی طویل بیماری کے باعث لوگوں کے لیے یہ بہانہ قابل قبول بھی ہوتا۔ ماہ بانو نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سچ مچ اماں کی طور پر گھر کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ عورت کی توجہ سے محروم گھر کافی ابتر حالت میں تھا۔ ظاہر ہے، اماں کی ملازمت کی ذمے داریوں کے ساتھ گھر کی دیکھ بھال کا کام مناسب طریقے سے نہیں کر پاتا ہوگا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے بس حوائج ضروریہ کے لیے ہی اپنے بستر سے اُترتی تھیں۔ ماہ بانو نے گھر کی صفائی ستھرائی کر کے کھانا تیار کرنے کے بعد اُنہیں کھلایا تو وہ بہت دیر تک اسے دعائیں دیتی رہیں۔ اُن کی اِن محبت بھری باتوں کو سن کر اسے بے بے یاد آ گئی۔ وہ بھی اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات پر اسی طرح خوش ہو کر دعائیں دیتی تھی۔ بہت دنوں بعد ایک چھوٹے سے گھر میں، عام گھریلو لڑکی کی طرح کام کاج نمٹاتے اور کسی بزرگ کی دعائیں سمیٹتے ہوئے اس کو اپنا فیصل آباد والا گھر بری طرح یاد آتا رہا۔ وہ اچھی بھلی ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی۔ اس زندگی میں چودھری افتخار کیا آیا، وہ ایک گرداب میں پھنستی چلی گئی۔ اسے لگتا تھا کہ اُسے اس گرداب سے نکل کر دوبارہ اپنے گھر جا کر رہنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ کبھی گھر نہ لوٹنے کا یہ خیال بہت ہلاک ناک اور افسردہ کر دینے والا تھا۔ اس افسردگی اور وحشت میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب عامر شام کا اخبار لے کر گھر آیا۔ اخبار میں موتی والا اور اس کی بیگم کے قتل کی خبر چھپی تھی۔ اس خبر کو پڑھ کر وہ بہت دیر تک پریشان رہی۔ ان لوگوں نے اسے پناہ دی تھی۔ خصوصاً موتی والا کی بیوی کا رویہ اس کے ساتھ بہت مہربان تھا اور اب وہ دونوں قتل کر دیئے گئے تھے۔ اخباری اطلاع کے مطابق قتل کی یہ واردات دراصل ڈاکا زنی کی واردات کے ساتھ جڑی ہوئی تھی لیکن جانے کیوں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ چھپ چھپ کر روتے اور گھر کے کام نمٹاتے ہوئے شام کا وقت گزر گیا۔ رات کے تقریباً دس بجے سرمد وہاں پہنچا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔

''اب جلدی سے مجھے بتا دے کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟ میں پورا دن پریشان رہا ہوں۔ لڑکی سے کوئی سوال کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ تیرے مجبور کرنے پر ہی سہی لیکن میں اسے یہاں پناہ دے چکا ہوں اور کسی کو کزن کو دباؤ میں لینا مجھے گوارا نہیں تھا۔'' عامر نے فوراً ہی اسے گھیر لیا۔ وہ جو صحن میں تھی، خود بھی بیٹھک میں آ گئی تھی تاکہ اپنے ذہن میں موجود بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر سکے۔

''مجھے تیری پریشانی کا خیال تھا یار! اسی لیے شدید تھکن کے باوجود گھر جانے کے بجائے تیرے پاس آیا ہوں۔ سارا دن گاڑی دوڑا دوڑا کر کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کو بھی بھگتایا ہے۔ ان کا سارا زور اس پر ہی چلتا ہے۔ اس لیے ہم سارے ملازمین کو گھیر کر بیٹھے رہے کہ کسی طرح کچھ اُگلوا لیں۔ شاکر اور اس کی بیوی کو تو شادی والے گھر سے واپس بلوا لیا کہ کہیں وہ لوگ ڈاکوؤں کو ساری مخبری کرنے کے بعد شادی میں شرکت کے بہانے سے تو منظر سے نہیں ہٹ گئے۔ ایک فکر انہیں مہمان لڑکی کی طرف سے بھی تھی کہ وہ کیسے اور کہاں غائب ہوگئی؟ میرا اندر سے گھبراہٹ کے مارے کیا حال تھا، میں بتا نہیں سکتا۔ بس ہمت کر کے سب کے سامنے یہی بولتا رہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اگر پولیس والوں کو یہ بتا دیتا کہ لڑکی کو میں نے وہاں سے نکالا ہے تو وہ اغوا اور قتل کا شک بھی مجھ پر ہی کرتے۔''

''شک تو اُنہیں کرنا ہی چاہئے تھا۔ میں خود پریشان ہوں کہ تُو ڈاکے کے وقت وہاں کوٹھی میں کیا کر رہا تھا اور یہ میری ڈیوٹی تو ٹھیک گیارہ بجے ختم ہو جاتی ہے۔'' سرمد کی پریشانی کے جواب میں عامر نے اس سے پوچھا۔

''تُو تو جانتا ہے یار! میرے اور نیلم کے معاملے کے بارے میں۔ میں کتنی بار اس کے گھر رشتہ
ہوں۔ ہر بار اُدھر سے انکار ہو جاتا ہے۔ میری نیلم سے بات ہوئی تو اس نے کہا تم یہ ڈرائیوری کا کام
کوئی دوسرا عزت والا کام کرو تو میں اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کروں گی۔ اب عزت والے کام
آدمی کے پاس یا تو تعلیم ہو یا پیسہ۔ وقت پر تعلیم حاصل کی ہوتی تو یہ ڈرائیوری کا کام ہی کیوں کرنا پڑتا۔
ہماری سات نسلوں میں سے بھی کبھی کسی کے پاس نہیں رہا تو میرے پاس کہاں سے آتا؟ لیکن میں نیلم کو
کھو سکتا تھا۔ میرے ذہن نے مجھے راستہ دکھایا کہ کہیں سے اتنا پیسہ حاصل کر لوں کہ اپنا کوئی ذاتی کا
سکوں۔ موتی والا صاحب کے ہاں ملازمت کرتے ہوئے مجھے چار پانچ سال ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کے
میں بہت سی باتوں کا علم ہے۔ گھر میں حفاظت کا کیا انتظام ہے اور روپیہ، زیور وغیرہ کہاں رکھا جاتا
کچھ علم تھا۔ بس پھر میں نے منصوبہ بنایا کہ ان کی تجوری میں نقب لگائی جائے۔ شاکر اور اس کی بیوی کے
جانے سے مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں اور بھی سہولت ہو گئی۔ اپنے طے کردہ منصوبے کے مطابق
روز میں ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کے بعد کوٹھی سے روانہ ہونے کے بجائے شاکر کے کوارٹر میں چھپ کر
تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں نے ایک زمانے میں اپنے ایک بدمعاش ٹائپ کے دوست سے تار کی مدد
وغیرہ کھولنا سیکھ لیا تھا۔ اس فن نے میری مدد کی۔ میں شاکر کے کوارٹر کا تالا کھول کر آرام سے اندر چلا گیا
اُمید تھی کہ اسی فن کے سہارے میں کوٹھی کے اندرونی حصے میں بھی گھس جاؤں گا اور تجوری بھی کھول لوں
تجوری سے نکالا ہوا مال میں شاکر کے کوارٹر میں کہیں چھپا دیتا اور بعد میں مناسب وقت پر نکال لیتا
صاحب اور ان کی بیگم کو واردات سے پہلے بے ہوش کرنے کے لیے میں نے بے ہوشی کی دوا ایک اسپر
میں بھر لی تھی۔ چوری کے بعد میں رات کا باقی حصہ آرام سے شاکر کے کوارٹر میں چھپ کر گزارتا اور صبح
کے مطابق ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والا چوکیدار زیادہ مستعد نہیں تھا۔ اس لیے مجھے
کہ وہ میرے رات کو کوٹھی سے نہ جانے اور صبح اندر ہی نظر آنے پر کوئی نوٹس نہیں لے گا۔ بلکہ اسے یہی
گزرے گا کہ میری آمد و رفت ان اوقات میں ہوئی ہے جب وہ گیٹ سے غائب تھا۔ میں اپنی طرف سے
اس منصوبے کو بالکل مکمل سمجھ رہا تھا۔ پہلے مرحلے کی کامیابی نے میرے اس یقین کو اور مضبوط کر دیا تھا لیکن
سب کچھ اُلٹ ہوتا چلا گیا۔ میں آدھی رات کے بعد جب شاکر کے کوارٹر سے نکلا تو عین اسی وقت کسی
سے گوشت کے ٹکڑے کوٹھی کے لان میں اُچھال دیئے۔ کتے جو آہٹ پر چونک گئے تھے، وہ گوشت کے
کی طرف لپکے اور بے تابی سے انہیں اپنے دانتوں سے نوچنے لگے۔ میرے لیے یہ منظر حیرت انگیز تھا
میری معلومات کے مطابق کتے تربیت یافتہ تھے اور مخصوص خوراک کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھاتے تھے مگر باہر
پھینکے جانے والے گوشت کے لیے ان کی بے تابی دیدنی تھی۔ شاید اس گوشت میں کوئی ایسی خوشبو شامل
تھی جو کتوں کو مرغوب تھی۔ بے چارے کتے اس گوشت کا ذرا سا حصہ کھا کر ہی گر پڑے۔ میں نے اندازہ
کہ باہر سے کوئی کوٹھی میں نقب لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس نے سب سے پہلے نگرانی پر مامور کتوں
بندوبست کیا ہے۔ نقب تو میں بھی لگانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن کتے مجھ سے مانوس تھے اس لیے مجھے ان کی طرف
سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کتوں کے مرتے ہی میں کوٹھی کی طرف بھاگا۔ چوکیدار حسبِ معمول گیٹ سے غائب
تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نقاب پوش گیٹ پھلانگ کر اندر آیا اور اس نے ذیلی گیٹ کھول دیا۔ مزید
اور نقاب پوش اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو چوکیدار کے کیبن کی طرف چلے گئے اور ایک نے کوٹھی کی مرکزی
عمارت کے دروازے پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ وہ یقیناً میرے والے فن میں ماہر تھا۔ جب تک اس



کھولا، چوکیدار کے کیبن میں جانے والے باہر نکل آئے۔ انہوں نے کتوں کی طرح اس کے بھی خاموش
کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب چونکہ انہیں اطمینان تھا کہ وہاں انہیں دیکھنے والا یا ان کے کام میں رکاوٹ
والا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے، اس لیے وہ چاروں کے چاروں اندر چلے گئے۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ اس
کوٹھی سے بھاگ جانے کے بجائے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ صاحب کے بیڈروم کی کھڑکی عقبی لان
میں کھلتی ہے، اس بات کا مجھے علم تھا۔ میں نے کھڑکی سے ان کے بیڈروم میں جھانکا۔ کوٹھی میں گھسنے والے بھی
اس وقت وہاں پہنچ چکے تھے۔ میری نظروں کے سامنے دو افراد اپنے چاقو کھول کر بیڈ کی طرف لپکے۔ میں جس
سے دیکھ رہا تھا، وہاں سے بیڈ پر سوئے ہوئے لوگ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن چاقو کے وار سے اُچھل کر
والا خون میں نے صاف دیکھا۔ ساتھ ہی مجھے اندر سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ قتل کی اس
واردات کو دیکھ کر میں گھبرا گیا اور خود پر قابو پانے کے لیے کھڑکی سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں
نے کسی کو وہاں آتے دیکھا۔ پہلے میں ڈرا کہ شاید یہ کوٹھی میں گھسنے والوں کا کوئی ساتھی ہے لیکن پھر مجھے فوراً ہی
اندازہ ہو گیا کہ سیاہ شال میں لپٹی وہ ایک لڑکی ہے۔ لڑکی نے بھی میری طرح ہی کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر
کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں پہچان چکا تھا کہ یہ موتی والا صاحب کی مہمان لڑکی ہے۔ یہ جب کھڑکی سے
ہٹی تو اس کے چہرے پر اتنا خوف تھا کہ مجھے لگا کہ یہ خوف سے چیخیں مارنے لگے گی۔ اور ظاہر ہے چیخوں کی یہ
آواز اندر بھی جاتی۔ اسی لئے میں نے اس کی حفاظت کے خیال سے پیچھے جا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس
کے بعد ہم دونوں کوٹھی سے نکل بھاگے۔ میں جب اسے اپنے ساتھ کوٹھی سے لا رہا تھا، تب بھی مجھے احساس تھا
کہ میں اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رہا ہوں۔ لیکن ایک لڑکی کو اتنے بڑے خطرے میں گھر اچھوڑ کر فرار ہو جانا
میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ شاید تم دونوں سوچو کہ اپنے مالک کے گھر میں نقب لگانے کا ارادہ رکھنے والا شخص بھلا
کہاں کا باضمیر ہے؟ لیکن سچ یہی ہے کہ میری اس نمک حرامی کے ارادے کے پیچھے میری بے ضمیری سے زیادہ
میری مجبوری تھی۔ میں نیلم کے لیے دیوانہ ہوں اور اسے پانے کی جو راہ مجھے سجھائی دی، میں اس پر چل پڑا۔''
سرمد نے ایک ہی سانس میں سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ اپنی بے بسی کا بھی اعتراف کیا۔

''حماقتیں تو تم نے بہت کی ہیں لیکن یہ وقت ان حماقتوں پر تمہیں برا بھلا کہنے کا نہیں ہے۔ اب اصل
بات جو ہمیں سوچنی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان محترمہ کے سلسلے میں کیا کریں؟ ظاہر ہے پولیس کے لیے ان کا غائب
ہونا ایک معمہ ہو گا اور اس معمے کے حل کے لیے وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر ماریں گے۔ ایسی صورت میں تیرے ساتھ
ساتھ میرے پھنسنے کا بھی امکان ہے۔'' عامر نے سرمد کو احساس دلایا۔

''میں سمجھتا ہوں یار! لیکن اب جو کچھ ہو گا، اس لڑکی کے مشورے کے بعد ہی ہو گا۔ کیونکہ مجھے تو نہیں
معلوم کہ یہ کون ہے اور صاحب نے کیوں اسے اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا؟''

''آپ نے سرمد کی بات سن لی محترمہ! اب آپ ہمیں اپنے بارے میں بتائیے تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں۔''
عامر نے ماہ بانو کی طرف رخ کیا۔ وہ اس ساری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی اپنی اُنگلیاں مروڑتی رہی تھی۔ خود
کو مخاطب کیے جانے پر اس نے بہ مشکل اپنے لب کھولے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''موتی والا صاحب سے میری کوئی رشتے داری یا ذاتی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ صرف کسی کے کہنے پر
میری مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کوٹھی میں پناہ دے رکھی تھی۔ مجھے پوری طرح یقین نہیں لیکن تھوڑا سا
شک ضرور ہے کہ موتی والا صاحب کی کوٹھی میں گھسنے والے لوگ میری ہی تلاش میں آئے تھے۔ لیکن وقتی طور پر
لالچ کا شکار ہو کر لوٹ مار میں اُلجھ گئے اور مجھے سرمد کی مدد سے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ مجھے

یہاں نہ لاتے تو کوٹھی سے نکل جانے کے باوجود میں بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ اکیلی لڑکی کے لیے یوں بھی
محفوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھ تو یہ بھی مسئلہ ہے کہ میرے دشمن مسلسل میری بُو سونگھ
رہے ہیں۔ آپ لوگوں سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ اس وقت تک مجھے پناہ دے دیں جب تک میں
ہمدردوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مجھے مشکل میں دیکھیں
ضرور میری مدد کریں گے۔ ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے پولیس بھی آپ لوگوں پر کوئی الزام عائد کرنے
گریز کرے گی۔ بس میرا ایک بار ان سے رابطہ ہو جائے۔

''اگر تمہارے وہ ہمدرد اتنے ہی اثر و رسوخ والے ہیں تو چلو ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ پولیس
تمہارا ان سے رابطہ کروا دے گی۔'' عامر چٹکی بجاتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں..... میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ مجھے پولیس والوں پر اعتبار نہیں ہے۔'' وہ فوراً ہی بدکی۔

''تو تم ہمیں اپنے اس ہمدرد کا نام اور فون نمبر وغیرہ بتا دو تاکہ ہم ان سے رابطہ کر کے تم سے اپنی جان
لیں۔'' سرمد کچھ چڑا ہوا تھا۔ ایک تو اُسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی، دوسرے وہ ایک مصیبت بھی
اپنے گلے سے باندھ کر لے آیا تھا۔

''اُن کا نام شہریار ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار..... لیکن میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے۔ فون نمبر
لیے آپ ایک دارالامان کی منتظمہ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو دارالامان کا پتہ سمجھا دیتی ہوں۔'' وہ
دونوں کو پتہ سمجھانے لگی۔ اگر وہ دونوں پڑھے لکھے ہوتے تو دارالامان کی منتظمہ سے فون نمبر حاصل کرنے
مشورے پر عمل کرنے کے بجائے سیدھے سیدھے شہریار کے انڈر میں موجود ضلعے کا نام پوچھ کر ڈائریکٹری
اس کے دفتر کا فون نمبر حاصل کر سکتے تھے۔ خود ماہ بانو کا دماغ بھی ان حالات میں درست سمت میں سوچنے
معذور تھا۔

⊛----✪----⊛

ماسٹر آفتاب بڑے اشتیاق سے مزدوروں کو دیوار کھڑی کرتا دیکھ رہا تھا۔ دیوار میں چنی جانے والی ای
ایک اینٹ اُسے خوشی فراہم کر رہی تھی۔ کیونکہ ہر چنی جانے والی اینٹ کے ساتھ وہ اپنے خواب کو تعبیر
مرحلے سے گزرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شہریار نے اس کے سکول کی توسیع کا جو وعدہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد شر
ہو گیا تھا۔ خلافِ توقع ابھی تک چودھری افتخار کی طرف سے اس کام میں کوئی روڑا نہیں اٹکایا گیا تھا اور اسکو
کے لیے کمروں کی تعمیر کا کام سکون سے جاری تھا۔ دوسری طرف موبائل کمپنی والے بھی اپنا کام شروع کر
تھے۔ اسے موبائل کمپنی کے ٹاور کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس علاقے میں موبائل سروس شروع ہو جاتی
اسے کافی سہولت ہو جاتی۔ ابھی تو لاہور رابطے کے لیے ڈاک خانے تک جانا پڑتا تھا۔ موبائل کام کرنے لگتا
یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

''سلام ماسٹر صاحب!'' وہ اپنے خیالوں میں گم تعمیر کے کام پر نظر جمائے کھڑا تھا کہ عقب سے سلا
دینے والی نسوانی آواز نے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو رانی؟'' سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے رانی کا حال بھی پوچھا۔ رانی
چھوٹا بھائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا اور وہ اس کی شکایتیں کرنے اکثر اسکول آتی رہتی تھی۔ اس لیے وہ اسے
طرح پہچانتا تھا۔



''رب کا شکر ہے۔ آپ اپنا حال بتائیں۔ آج کل تو بڑے خوش ہوں گے۔ آپ کا اسکول جو ترقی کر رہا
ہے۔''

''ہاں بھئی! میں تو سچ مچ بڑا خوش ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''اللہ سائیں آپ کو سدا خوش رکھے۔ ہمارے پنڈ کے بچے پڑھ لکھ کر ترقی کر گئے تو اس میں سارا ہاتھ آپ
ہوا ہو گا۔ کاش! میرے ٹائم میں بھی کوئی آپ جیسا استاد ہوتا۔ مجھے بڑا شوق تھا جی پڑھنے کا۔ لیکن دو چار
جماعتوں سے آگے پڑھ ہی نہیں سکی۔'' رانی نے کچھ اُداسی سے بتایا۔

''تو کیا ہوا؟ اب پڑھ لینا۔ میں تمہاری مدد کر دوں گا۔'' اس نے پیشکش کی۔

''سچ ماسٹر صاحب؟'' وہ خوش ہوئی لیکن پھر اُداسی سے بولی۔ ''مجھے بھلا کون اسکول آ کر آپ سے پڑھنے
دے گا؟''

''آدمی ہمت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں بھی تو کتنے عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اسکول
کی عمارت میں توسیع ہو جائے۔ لیکن کہیں میری سنوائی ہی نہیں ہوتی تھی۔ پر اب دیکھو! میں نے ہمت نہیں
ہاری اور کوشش جاری رکھی تو کام شروع ہو ہی گیا نا۔ میرا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ دوپہر کو اسکول کی چھٹی کے بعد
یہاں پر دستکاری کا کام شروع کر دیا جائے۔ پنڈ کی عورتیں اتنی ہنرمند ہیں۔ ہم ان سے کپڑوں پر کڑھائیاں
کڑھوا کر لاہور اور دوسرے بڑے شہروں میں لے جا کر بیچیں گے تو اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔ تم تھوڑا
بہت لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب کرنا تو جانتی ہی ہو۔ میں ایسا کروں گا کہ اس کام کے لیے تمہیں انچارج بنا
دوں گا۔ تم کام کرنے والی عورتوں کی نگرانی بھی کرتی رہنا اور ساتھ میں اپنی پڑھائی بھی شروع کر دینا۔ میں تو
ویسے ہی یہیں ہوں۔ تم جب چاہو گی آسانی سے میری مدد لے سکو گی۔''

''تہاڈی وڈی مہربانی ماسٹر صاحب! میرا پڑھنے لکھنے کا خواب پورا ہو گیا تو میں آپ کو بڑی دعائیں دوں
گی۔ بلکہ آپ کی غلام بن جاؤں گی۔'' اس کی تجویز سن کر وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔

''غلام ولام بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جب تم پڑھ لکھ جانا تو گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی پڑھانا۔''

''بالکل جی۔ میں تو بڑے شوق سے یہ کام کروں گی۔'' اس نے فوراً وعدہ کیا پھر اچانک کچھ یاد آ جانے پر
ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی بس ایویں ہوں جی۔ جس کام سے آئی تھی، وہ تو بھول ہی گئی اور
دوسری باتیں لے کر بیٹھ گئی۔''

''کس کام سے آئی تھیں؟ کیا تمہارے بھائی نے پھر تمہیں ستانا شروع کر دیا ہے اور گھر پر پڑھنے نہیں
دیتا؟ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، تمہارا بھائی بڑا ذہین بچہ ہے اور اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھتا ہے۔''
اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں رانی کی آمد کے مقصد کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''مجھے معلوم ہے جی کہ میرا بھرا بڑا چنگا اور بیبا بچہ ہے۔ وہ تو بس میں اس پر رعب شوب رکھنے کے لیے
آپ کے پاس اس کی شکایتیں لے کر آ جاتی ہوں، پر اس وقت میں اپنے کام سے نہیں آئی، مجھے کشور بی بی نے
بھیجا ہے۔'' یہ بات بتاتے ہوئے رانی کی آواز بہت مدھم ہو گئی تھی۔

''کیوں؟'' وہ بری طرح چونکا۔

''انہوں نے آپ کے لیے یہ بھجوایا ہے۔'' رانی نے اوڑھنی میں چھپا اپنا ہاتھ باہر نکال کر ایک ہلکے نیلے
رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ لفافہ تھام کر کچھ دیر گم صم سی کیفیت میں کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''اپنی بی بی کو سمجھاؤ رانی! کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح تو وہ اپنے لیے بھی مصیبت مول لیں گی اور

ابھی راستہ کھوٹا ہوگا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ اور میں ان سارے جھمیلوں میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"میں بی بی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی ماسٹر صاحب! ویسے بھی معاملات میں کوئی کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھتا۔ اور بی بی کو تو میں نے اتنے عرصے میں پہلی بار کسی میں دلچسپی لیتے دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی ہیں، ان کا دل دُکھے گا تو مجھے بڑا دُکھ ہوگا۔" رانی دبے لفظوں میں کشور کی وکالت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اچھے لوگوں کو تو دوسروں کی اور بھی فکر ہونی چاہئے۔ اگر چودھری صاحب کو اس معاملے کی ذرا بھی بھنک مل گئی تو وہ مجھ پر یہاں کی زمین تنگ کر دیں گے۔ میں یہاں رہ کر لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے کام آنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی بی بی سے کہو کہ وہ میرے اس کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے اوزار جوں کا توں رانی کو لوٹا دیا اور رخ موڑ کر دوبارہ مزدوروں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سب اپنے کام میں مصروف تھے اور ان دونوں کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ رانی اس کا انداز دیکھ کر واپس پلٹ گئی، پھر کچھ فاصلے سے آتی شادو اور نسرین کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکی۔

"خیر تو ہے رانی! اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی تُو؟" نسرین عرف نچھی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ماسٹر صاحب سے منے کی شکایت کرنے آئی تھی۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"اچھا..... ہمیں ایسا لگا کہ ماسٹر صاحب تمہیں کچھ دے رہے ہیں۔" شادو مکاری سے بولی۔

"تُو اپنی آنکھوں کا علاج کرو۔ ہر وقت غلط سلط دیکھتی رہتی ہے۔" رانی اندر سے گھبرائی لیکن اس گھبراہٹ کو ظاہر کیے بغیر تڑاخ سے جواب دے کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ نچھی اور شادو جیسی لگائی لتری لڑکیوں کا کوا بنانے والی لڑکیوں سے تو وہ یوں بھی ہمیشہ فاصلے پر ہی رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت تو پھر معاملہ کشور بی بی کا تھا جس کی اگر کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو جاتی تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا۔

⊛----✪----⊛

کوریئر آفس سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ماہ بانو کا دارالامان میں رہ جانا بیگ اس کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ وہ ایک ایمان دار عورت تھی اس لیے اپنے ہر فرض کو پوری ایمان داری اور دیانت داری سے انجام دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ماہ بانو کا بیگ اس کے لیے ایک امانت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس امانت کے بوجھ کو اپنے سر سے اُتارنے کے لیے اس نے بیگ عبدالمنان کے نام سے کوریئر کر دیا۔ ویسے بھی اس رات دارالامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ ماہ بانو کے دارالامان سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے لیے فون آتے رہے تھے۔ اسے فون پر دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کہ اگر وہ ماہ بانو کے بارے میں کچھ جانتی ہے تو شرافت سے بتا دے ورنہ اس کا بہت برا انجام ہوگا۔ دھمکیوں سے ڈر کر اس نے کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج ہی اس کی ڈیوٹی سے رخصت منظور ہوئی تھی۔ اور یہ ڈیڑھ ماہ راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ روانگی سے قبل اس نے ماہ بانو کی امانت کو مناسب جگہ بھجوا دینا ضروری سمجھا تھا۔ بیگ کو کوریئر کرنے کا بندوبست کر کے وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی اور اب اطمینان سے چلتی قریبی مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ راولپنڈی جانے سے قبل بہن اور اس کے بچوں کے لیے کچھ خریداری کرنا چاہتی تھی۔ خود اس کی اپنی شادی تو ہوئی نہیں تھی اور اس نے اپنی زندگی کے اتنے سال دارالامان کی منتظمہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزار دیئے تھے۔ ان فرائض کی



ادائیگی کے دوران آج وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کی اپنی ذات کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بندی کر لی تھی اور اب کچھ مطمئن سی خراماں خراماں بازار کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کوریئر آفیسر سے کافی آگے نکلنے کے بعد وہ ایک موڑ پر پہنچی تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا لمبی مونچھوں والا آدمی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس نے خود بھی اس آدمی کا ٹھٹکنا محسوس کر لیا اور کچھ خوف زدہ سی ہو کر تیز تیز چلنے لگی۔ خوف زدہ ہونے کی وجہ صرف اس آدمی کا ٹھٹکنا نہیں تھا بلکہ وہ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی سرد بے جذبات آنکھیں دیکھ کر بھی ڈر گئی تھی۔ یہ آنکھیں اس کے لیے آشنا تھیں اور پچھلے کئی دن سے اس کے دماغ میں گھومتی رہی تھیں۔ ماہ بانو کو اغوا کرنے کے لیے آنے والے ڈھاٹا پوشوں کے لیڈر کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔ نہ جانے یہ وہی شخص تھا یا نہیں لیکن وہ خوفزدہ ہو چکی تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔

"اے رُکو۔" اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی یہ پکار بھی۔ وہ رکنے کے بجائے تیز تیز چلنے لگی۔

"رُک جا سالی! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" وہ پیچھے سے دھاڑا۔ لیکن وہ رُکے بغیر دوڑتی چلی گئی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی، اچھی خاصی ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن ساری زندگی ملازمت کرنے اور خود کو مصروف رکھنے کی وجہ سے اس کی ایکٹیویٹی اس لیے اپنی عمر کی دیگر عورتوں کے برخلاف کافی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ کچھ خود کو خطرے سے دور رکھنے کی جبلی خواہش نے بھی اسے مہمیز کر دیا تھا۔ بغیر ہیل کے سپاٹ تلوے والے جوتے بھی اس کے لیے کافی معاون ثابت ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک گلی پار کر کے دوسری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے تعاقب میں آنے والا شخص بھی مسلسل پیچھے تھا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے گلیوں میں سناٹا تھا اور کوئی چوہے بلی کی اس دوڑ کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ پھولتی سانسوں کے ساتھ دوڑتی اس کوشش میں تھی کہ جلد از جلد یہ گلی پار کر لے۔ اسے علم تھا کہ اس گلی کے اختتام پر مین روڈ موجود ہے۔ وہ ایک بار مین روڈ پر آ جاتی تو وہاں سے کوئی سواری حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری امید اسے یہ بھی تھی کہ رش والی جگہ پر پہنچ کر یہ شخص کھلے عام اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ مگر تعاقب کرنے والا بھی شاید یہ سب باتیں جانتا تھا۔ ابھی وہ گلی کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے کوئی سنسناتی ہوئی چیز آئی اور اس کی بائیں ٹانگ میں کھب گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے حلق سے ایک بے اختیار سی چیخ نکلی اور اسے لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی۔ گر جانے میں موت تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ اس میں ایک لمبے پھل والا چاقو گڑا ہوا تھا اور زخم سے خون نکلنے لگا تھا۔ اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس نے رُکے بغیر گلی کا اختتام کر دینے کا فیصلہ کیا اور زخم کی کھولتی ہوئی تکلیف کے ساتھ بھاگتی ہوئی گلی سے باہر نکل آئی۔ تعاقب میں آنے والا جو اس دوران بے حد قریب پہنچ گیا تھا، اُس کی اس جرأت مندی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس گلی سے باہر نکلنے کے بعد سڑک کے کنارے کنارے کئی موٹر میکینکس کی دکانیں ہیں۔ اگر اسے ایک زخمی عورت کے پیچھے آتا دیکھتے تو شاید اسے پکڑنے کی کوشش کرتے اور اس وقت اس کے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا۔ وہ آگے جانے یا نہ جانے کی کشمکش میں وہیں ٹھٹک کر رُکا رہا۔ وہ اُس کے رُکنے کو محسوس نہیں کر سکی اور اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ خوف اور دہشت نے اس کے حواس مختل کر دیا تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ گلی پار کرنے کے بعد مین روڈ پر آ چکی ہے اور اب اسے قدم روک دینے چاہئیں۔ وہ اسی طرح دوڑتی رہی لیکن یہ دوڑ چند قدم سے زیادہ نہیں تھی۔ سڑک پر دائیں

جانب سے آنے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کی ٹیکسی کی زد میں آ کر بری طرح اُچھلی اور پھر سڑک پر لڑھکتی چلی گئی۔ ٹیکسی کے ساتھ ہی ایک دیو قامت ٹرک بھی پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ سڑک پر لڑھکتے اس کے جسم کو کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں نے بریکیں لگانا شروع کر دیں اور دکانوں سے میکینکس بھی نکل کر سڑک کی طرف دوڑنے لگے۔ وہ جو ابھی تک کے سرے پہ کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا، کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے پہلے پلٹا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا۔

⊛----✪----⊛

''ہاں بھئی بالے! کیا خبر ہے؟ اتنے دنوں سے تُو یہاں پڑا اینڈ رہا ہے۔ ایک موتی والا کو ٹھکانے لگانے کے سوا تُو نے کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اور اس کام میں بھی تُو نے لاکھوں کمائے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس لوٹ مار میں ہی تجھے اس بات کی خبر نہیں ہو سکی کہ کوٹھی میں کوئی مہمان لڑکی بھی ٹھہری ہوئی ہے۔ تُو نے بس دونوں میاں بیوی کا گلا کاٹا اور مال سمیٹ کر واپس ہو لیا۔''

چودھری افتخار آج کل اپنی لاہور والی کوٹھی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ موتی والا سے اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وہ ہر روز اس کی کوٹھی پر جا کر کچھ وقت اس کے عزیزوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ پولیس افسران سے بھی اس نے موتی والا کے قاتلوں کو پکڑنے کا پُر زور مطالبہ کیا تھا۔ اپنے اس آنے جانے اور میل ملاقاتوں میں اسے کوٹھی میں مقیم مہمان لڑکی اور اُس کے پُر اسرار غیاب کی خبر ہو گئی تھی۔ ملازموں سے پوچھ تاچھ کے نتیجے میں لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا اور یہ حلیہ ماہ بانو سے بہت مشابہ تھا۔ خصوصاً نچلے ہونٹ کے قریب پائے جانے والے تل کی نشان دہی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ مہمان لڑکی ماہ بانو ہی تھی۔ اسے موتی والا پر اور بھی شدت سے غصہ آتا تھا۔ وہ شخص اس سے پوری طرح دشمنی نبھاتا رہا تھا مگر اس مزید غصے کے اظہار کے لیے اسے موتی والا دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر بالے کی جان کھانا شروع کر دی تھی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش میں سرگرم دکھائے۔ اور اب بالا اس حکم کی تعمیل میں کی گئی اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

لیکن پہلے خود پر عائد کردہ الزامات کی تردید کرنا ضروری تھا اس لیے وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''قسم لے لو سرکار! میں نے یا میرے آدمیوں نے کوئی بے پروائی نہیں کی۔ پیسہ ہمیں آپ سے بھی بہت ملتا ہے۔ پیسے کے چکر میں ہم اپنے فرض کو بھول جاتے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم نے موتی والا کی تجوری خالی کرنے سے پہلے پوری کوٹھی کا چکر لگایا تھا۔ اگر وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو ہمیں ضرور ملتی۔ میرے خیال میں تو وہ لڑکی رات ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اگر وہ بعد میں بھاگتی تو اس کا کوئی سامان وغیرہ تو پولیس کو ملتا۔ لیکن انکوائری میں سے پولیس والوں کو جو ایک دو جوڑے کپڑے ملے، وہ بھی موتی والا کی بیوی کے تھے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ لڑکی پہلے ہی اپنے سامان سمیت وہاں سے جا چکی تھی۔'' وہ جانتا تھا کہ چودھری کے پاس اس کا مہمان پکڑنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے آرام سے دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ ورنہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تو کوٹھی کی قیمتی چیزیں سمیٹنے کے سوا وہاں کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔

''چل میں نے مان لیا کہ تُو سچ کہہ رہا ہے۔ پر یہ بتا کہ تُو نے اب کیا کارنامہ انجام دیا..... کون سے کھوکھنگالے لڑکی کی تلاش میں؟'' چودھری اُس پر بگڑا۔



''وہی بتانے کے لیے آیا تھا سرکار! اتنے دنوں لاہور میں رہ کر میں نے ٹیم ضائع نہیں کیا ہے۔ میں لڑکی کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ آخری بار اس کے تھانے میں رہنے کی خبر ملی تھی اس لیے میں تھانے کے پیچھے لگا رہا کہ کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اسے تھانے سے کس نے چھڑایا۔ پر نیچے والوں کو کوئی صحیح معلوم ہی نہیں تھی۔ بس یہی کہتے تھے کہ اوپر سے کہیں سے فون آیا تھا۔ میں نے سوچا، ایس ایچ او کو ہی پکڑا جائے۔ اس کی تھوڑی پھینٹی شینٹی لگائی اور کچھ مال پانی کا لالچ دیا تو اس نے اُگلا کہ لڑکی کو ڈی آئی جی کے فون پر چھوڑا گیا تھا۔ اب ان کے بندوں نے لڑکی کو کہاں پہنچایا، کوئی خبر نہیں۔ میں کوشش میں لگا ہوں کہ کسی طرح ان بندوں کی کوئی خبر مل جائے تو آپ کو خوشخبری سناؤں لیکن کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ پھر میں نے دارالامان کی منتظمہ سے پوچھ تاچھ کرنے کا سوچا۔ پہلے اسے فون پر ڈراتا رہا کہ اسے کوئی خبر ہے تو بتا دے۔ پھر ایک دن اس تک پہنچ کر کچھ معلوم کرنا اس کے لیے مشکل تھا کہ اغوا کی کوشش کے بعد دارالامان کی نگرانی سخت ہو گئی ہے۔ پولیس والے بھی چکر لگا کر دیکھتے رہتے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ عورت مجھے باہر نظر آ گئی۔ میں نے چاہا کہ اسے پکڑ لوں لیکن وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے ایک گاڑی کے سامنے آ کر جان سے چلی گئی۔ مجھے لگتا ہے اُسے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا اسی لیے وہ اتنا گھبرا گئی تھی۔''

''معاملہ کچھ نہ کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ ہو نہ ہو، ماہ بانو کو گاؤں سے نکالنے میں اُس اے سی کے بچے کا ہاتھ ہے۔ اپنے ماموں کی شہ پر بڑا اسمارٹ بنتا ہے وہ۔ سامنے سے مجھ سے دوستی جتا کر پیچھے سے ایسے کام کرتا ہے جس سے مجھے پریشانی ہو۔ ماہ بانو کو اسی نے دارالامان بھجوایا ہو گا اور پھر تھانے سے اغوا کر موتی والا کے گھر رکھوانے میں بھی اس کا ہی ہاتھ ہو گا۔ آج کل بڑی گھٹنے لگی تھی اس کی اور موتی والا کی۔ اسی کی مخبریوں پر تو وہ ہمارے مال کو پکڑنے کے چکر میں تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہو جائے گا کہ چودھری افتخار اس جیسا کل کا لونڈا چکر نہیں دے سکتا۔'' سجاد رانا کا نام سامنے آتے ہی اس نے سارے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

''آپ کہیں تو ہم اُس اے سی کو اُٹھا لیں سرکار! آپ کے قدموں میں اس کا سر رکھ کر اُس کی ایسی پھینٹی لگائیں گے کہ خود لڑکی کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ہامی بھر لے گا۔''

''بند کر اوئے اپنی یہ بڑھکیں۔ تیرے جیسے بے عقل آدمی کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ شکل سے ہی تُو نے اپنی جو اُسے اُٹھا کر لانے کی باتیں کر رہا ہے۔ اس کے خاندان والوں کو جانتا ہوتا تو ایسی گل کرتے نہ نکالتا۔ تُو اسے اُٹھائے گا اور وہ سارے قیامت اُٹھا دیں گے۔ اُس اے سی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ویسے اٹھائی گیرے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہے۔ اب میں اپنی عقل سے ایسی ترکیب لڑاؤں گا کہ اس کمینے کو ایک سبق تو مل ہی جائے گا۔'' بالے کی بات پر اُسے ڈپٹتے ہوئے چودھری نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ شہر یار پہلے ہی اسکول کی تعمیر شروع کروانے اور سپلائی کو پکڑنے کی کوشش کرنے کی وجہ سے اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ اب جو ماہ بانو والے معاملے کے ڈانڈے بھی اس سے ملتے نظر آئے تو وہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔ اس بھڑکنے میں بھی اس نے عقل کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور براہِ راست تصادم کے بجائے حکمتِ عملی سے کام لینے کی ٹھانی تھی۔

⊛----✪----⊛

''آج کا شیڈول کیا ہے عبدالمنان! آج ہمیں کس گاؤں کا وزٹ کرنا ہے؟''

''آج نور پور جانا ہے سر! وہاں کے زمیندار کی طرف سے درخواست ملی تھی کہ اس کے گاؤں میں بجلی کی

فراہمی کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھایا جائے۔'' شہریار کے سوال پر عبدالمنان نے اسے بتایا تو اسے یاد آ
اس نے خود ہی یہ درخواست پڑھنے کے بعد نور پور کے دورے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس گاؤں جا کر وہاں
حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ زمیندار سے مل کر اس کے مزاج کا بھی اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ تقرری کے
دنوں میں اردگرد کے بہت سے دیہاتوں کے زمینداروں نے اس کے دفتر آ کر ملاقات کی تھی لیکن
زمیندار ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا۔

''او کے! تم وہاں جانے کا انتظام کرواؤ۔ ویسے اندازاً ہمیں وہاں جا کر واپس آنے میں کتنا وقت
جائے گا؟''

''نور پور یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس لیے ٹائم تو اچھا خاصا لگے گا۔ ہم ابھی نکلیں گے تو سہ پہر
بعد ہی کہیں جا کر واپسی ہوگی۔''

''نو پرابلم۔ جب جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر چاہے کتنا ہی وقت صرف ہو، جانا ضرور ہے۔'' ا
سامنے رکھی فائل پر کوئی نوٹ لکھتے ہوئے اس نے فیصلہ سنایا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں موتی والا کے وکیل کو آج سہ پہر کے بعد ملاقات کا ٹائم دے دوں؟ صبح
اس کا فون آیا تھا کہ وہ موتی والا صاحب کی وِل کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتا
عبدالمنان نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ موتی والا کی وِل کے سلسلے میں اس کے وکیل کا اس کے پاس آنا معنی خیز

''بالکل ٹائم دے دو۔ بلکہ ایسا کرنا کہ یہ ملاقات میرے بنگلے پر رکھنا۔ وہ وکیل اتنی دور سے یہاں
آئے گا تو اس کی خاطر مدارات بھی تو ڈھنگ سے ہونی چاہئے۔'' اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اس
ہدایت بھی جاری کی پھر لہجے کو سرسری سا بناتا ہوا پوچھنے لگا۔

''ماہ بانو کی کوئی خبر ملی؟''

''نو سر! انکوائری آفیسر رفیق کھوکھر سے میں مسلسل رابطے میں ہوں لیکن اس کے پاس ماہ بانو کے
میں کوئی خبر نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر موتی والا کے قتل کے کیس میں چودھری افتخار انوالو ہے تو پھر اس
کا بھی امکان ہے کہ ماہ بانو کو وہاں سے اس کے بندے اغوا کر کے لے گئے ہوں۔'' شہریار کے سوال کا
دیتے ہوئے عبدالمنان نے خیال آرائی کی۔

''تو پھر کسی ذریعے سے چودھری کی طرف کی سُن گُن لو۔ ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک مظلوم
کو برباد ہونے کے لیے اس کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' اس نے تیز لہجے میں حکم دیتے ہوئے ہاتھ
پکڑا قلم فائل پر پٹخا۔

''یس سر! میں کچھ کرتا ہوں۔ اس کا مزاج بگڑتا دیکھ کر عبدالمنان نے مستعدی سے یقین دلایا۔ اسی
دروازے پر دستک اُبھری اور ایک چپراسی اجازت لے کر اندر آیا۔

''یہ کوریئر والا دے گیا ہے جناب! اس نے ایک بیگ اور لفافہ عبدالمنان کی طرف بڑھایا۔ بیگ
شناسا سا تھا لیکن عبدالمنان اور شہریار دونوں ہی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر پائے۔ لفافے پر
عبدالمنان کا نام تھا اس لیے اس نے لفافہ کھول کر اس میں موجود کاغذ نکال لیا۔ یہ دارالامان کی منتظمہ کی ط
سے لکھا جانے والا ایک مختصر خط تھا جس میں اس نے اپنے دھمکیوں سے گھبرا کر چھٹی پر جانے کی اطلاع
کے ساتھ ماہ بانو کے بیگ کی بابت بھی لکھا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے شہریار کی طرف بڑھا دیا۔ چپ
اس دوران اس کے اشارے پر واپس جا چکا تھا۔



دارالامان فون کرو۔ ممکن ہے ابھی منتظمہ چھٹی پر نہ گئی ہو۔ بیگ بھیجنے پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے
دھمکی آمیز ٹیلی فون کالز کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم کر لینا۔'' خط پڑھنے کے بعد اس نے حکم
عبدالمنان وہیں اس کی میز پر موجود فون سیٹ پر دارالامان کا نمبر ملانے لگا۔

تھوڑی دیر میں اس کا وہاں رابطہ ہو گیا۔ رابطے کے بعد اس نے مختصر سی گفتگو کی اور ریسیور واپس کریڈل پر
رکھتے اُداسی سے بولا۔ ''منتظمہ تو نہیں ملی۔ اُس بے چاری کا دوپہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ سارے لوگ جو ماہ بانو کے ہمدرد ہیں، کسی نہ کسی طرح مارے جا رہے ہیں۔
عامر اور صفدر، پھر مشاہد برم خان کا دوست، پھر موتی والا اور ان کی مسز اور اب یہ دارالامان کی منتظمہ۔ اتنے
لوگوں کی ایک کے بعد ایک ہلاکت کو اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ تم تفصیلات معلوم کرواؤ کہ منتظمہ کا
کب اور کن حالات میں ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ ایکسیڈنٹ کے پیچھے بھی یقیناً کوئی نہ کوئی سازش ہوگی۔''
عبدالمنان کی دی اطلاع سن کر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے حکم دیا۔ عبدالمنان کو اس حکم پر ایک
فرماں برداری سے ''یس سر!'' ہی کہنا تھا، سو اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ حسب پروگرام نور پور کے
روانہ ہوئے تو ان کے ذہن میں نور پور کے دورے سے زیادہ ماہ بانو سے جڑے واقعات چکرا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

''شش..... شش.....'' ماہ بانو باورچی خانے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے سنائی دینے
اس آواز پر چونک کر پلٹی۔ اس کے پلٹتے ہی کاغذ کی ایک گولی اس کے شانے سے ٹکرائی اور فرش پر گر گئی۔
لے نیچے جھک کر کاغذ کی اس گولی کو اُٹھایا اور آواز کی سمت دیکھا۔ پچھلی جانب واقع مکان کی چھت پر ایک
والوں والا لڑکا ہاتھ میں کبوتر لیے کھڑا تھا۔ اسے متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے لوفرانہ انداز میں اپنی بائیں آنکھ کو
وہ لڑکے کی اس حرکت پر جھینپ کر تیزی سے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اندر عامر کی بیمار ماں چارپائی پر
ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی میں دبی کاغذ کی گولی کو کھول کر اس پر ناپختہ لکھائی میں تحریر کردہ مضمون پڑھا۔ وہ
الفاظ پر مشتمل ایک ایسا خط تھا جس کی پچھلی چھت پر موجود کبوتر باز سے امید کی جا سکتی تھی۔ اس نے خط کا
مضمون پڑھے بغیر کاغذ کے کئی پُرزے کیے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر ان پُرزوں کو باہر گلی میں پھینک
میں پہلے سے موجود ڈھیروں کوڑے کرکٹ میں کاغذ کے وہ چند پُرزے فوراً ہی مدغم ہو گئے۔ وہ کھڑکی
ٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ سرمد دارالامان گیا تھا لیکن
سے منتظمہ کے مرنے کی خبر لے کر مایوس لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد یہی طے ہوا تھا کہ سرمد یا عامر میں سے
ایک جا کر براہِ راست شہریار سے ملاقات کر کے اسے ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے گا لیکن فوری طور
ان میں سے کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ سرمد کو خدشہ تھا کہ پولیس والوں کی نظریں اس پر ہوں گی جبکہ عامر جس
میں پیون کے فرائض انجام دیتا تھا، وہاں سے اُسے آسانی سے چھٹی ملنا مشکل تھا۔ اس صورتِ حال میں وہ
ل یہاں رہنے پر مجبور تھی۔ عامر کی والدہ کی خدمت کر کے اسے دلی سکون ملتا تھا لیکن بے بے اور ابا کی یاد
بے طرح آتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ کسی طرح معاملات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ وہ پہلے کی طرح
ن زندگی کا آغاز کر سکے۔ لیکن حالات نے جس طرح اسے جکڑ لیا تھا، ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔
قبل میں غلطاں و پیچاں بیٹھے ابھی اُسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر زوردار دستک اُبھری۔
کے ان اوقات میں عموماً کوئی ہمسائی، اماں کی خیر خیریت معلوم کرنے آ جاتی تھی۔ اس نے کمرے سے

نکل کر بے دھڑک بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی اور خود ہی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا بھئی.....کون ہو تم؟ اور اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' اس نے لڑکی سے دریافت کیا۔

''میں جمیلہ ہوں جی۔ اس پیچھے والے گھر میں رہتی ہوں۔ خالہ جی کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔'' اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں سے اس کبوتر باز لڑکے نے کچھ دیر قبل رقعہ پھینکا تھا۔ اپنا تعارف کروایا اور اپنی اوڑھنی سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھنے لگی۔ اس کے چہرے پر موجود گھبراہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماہ بانو نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً اسی جیسے قد و قامت کی اس کی ہم عمر لڑکی اس میں نسوانی کشش برائے نام ہی تھی۔ چوڑے چوڑے ہاتھ کسی عورت کے بجائے مرد کے معلوم ہو بالائی ہونٹ سے اوپر اور ٹھوڑی اور رخساروں کی جلد پر کھردرے پن کا احساس ہوتا تھا۔ یہ کھردرا پن جمائی گئی پاؤڈر کی تہہ کے باوجود نمایاں تھا۔

''لے جائیں گے، لے جائیں گے، دل والے دُلہنیا لے جائیں گے۔ رہ جائیں گے، رہ جائیں گے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔'' ابھی اس کا جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے تالیوں اور ڈھول کی تھاپ ساتھ بھونڈی آوازوں میں گانا گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس انداز میں گانا گانے والے کون لوگ ہیں، وہ بہ خوبی جانتی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ لوگ اس دروازے پر رک کر کیوں گا رہے ہیں؟ یہ کوئی گھر تو نہیں تھا جہاں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بدلے میں انہیں روپے پیسے سے نوازا جاتا۔

''اللہ کے نام پر دے دے۔'' گانے کی آواز کے درمیان ہی کسی نے دروازے پر دستک دے کر لگائی۔

''دروازہ مت کھولنا۔'' جمیلہ نامی لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر خوف زدہ انداز میں اسے روکا۔

''تم اندر چل کر خالہ کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس اور خود باورچی خانے میں چلی گئی۔ آٹے کے کنستر سے ایک پیالہ آٹا لے کر وہ واپس دروازے پر آئی تو اور صداؤں کا سلسلہ جاری تھا، البتہ جمیلہ اندر کمرے میں جا چکی تھی۔ اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر زرق برق کپڑوں میں چہروں پر میک اپ کی موٹی موٹی تہہ جمائے وہ تین ہیجڑے تھے جن کے اردگرد بچے جمع ہو گئے تھے۔ کچھ عورتیں بھی دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے باہر جھانکتی تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''یہ لے لو۔'' اس نے آٹے سے بھرا پیالہ آگے بڑھایا تو دستک دینے والا ہیجڑا بدک کر پیچھے ہٹا۔

''مجھے نہیں چاہئے یہ پیالہ بھر آٹا۔''

''تو پھر کیا چاہئے؟ میرے پاس تو اس وقت دینے کے لیے بس یہی ہے۔'' اسے عجیب سی بے احساس ہوا۔ خود اس کا سارا سامان تو دارالامان میں رہ گیا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر اس کر کسی کی کیا مدد کر سکتی تھی۔

''تیرے پاس تو بڑا قیمتی ہیرا ہے، پر جانے دے.....آج نہیں دیتی تو کوئی بات نہیں۔ میں پھر آ جاؤں گی۔'' ہیجڑے نے جواب دیا اور پھر وہ تینوں گاتے بجاتے واپس پلٹ گئے۔ وہ ان کی بات کا مفہوم بغیر اُلجھی ہوئی واپس اندر پلٹ گئی۔ کمرے میں جمیلہ اور عامر کی اماں باتیں کر رہی تھیں۔ شاید شور کی آواز ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''اچھا ہوا خالہ جی! آپ اُٹھ گئیں۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔'' انہیں جاگتے دیکھ کر اس نے کہا اور



جا کر ایک ٹرے میں کھانے کے برتن اور دیگر چیزیں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ جمیلہ کو بھی ان لوگوں نے اکر کے کھانے میں شامل کر لیا۔

''یہ جمیلہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہر تیسرے چوتھے دن چکر لگا کر میرے کئی کام کر جاتی ہے۔'' کھانے کے ان خالہ جی اُس سے جمیلہ کی تعریفیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر ان پر دوبارہ غنودگی طاری ہونے لگی تو وہ جمیلہ کو لے کر بیٹھک میں آ گئی۔ جمیلہ کے سوالات کے جواب میں اس نے اپنے بارے میں وہی کچھ بتایا جو وہ پہلے سے طے کر چکے تھے۔ جمیلہ ہمدردی سے اس کی مظلومیت بھری داستان سنتی رہی۔ موقع دیکھ کر اس جمیلہ سے اس کبوتر باز لڑکے کی بھی شکایت کر دی جس پر اس نے یقین دلایا کہ وہ ابا سے شکایت کر کے اپنے کو سیدھا کروا دے گی۔ کھردری جلد اور مردانہ سی ساخت رکھنے والے ہاتھ پیروں کی مالکہ جمیلہ طبیعتاً بڑی اور معصوم لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

''ارے جمیلہ! یہ تو بتاؤ کہ تم جب آئی تھیں تو اتنی ڈری ہوئی کیوں تھیں؟ کیا باہر کوئی تمہیں تنگ کر رہا تھا؟'' کرتے کرتے اس جمیلہ کی آمد کے وقت کی گھبراہٹ یاد آئی تو اس نے اس سے پوچھ لیا۔

''نہیں۔ میں گھبرائی ہوئی تو نہیں تھی۔ بس پچھلی گلی سے یہاں تک تیز تیز چل کر آئی تھی، اس لیے سانس گیا تھا۔'' وہ صاف مکر گئی اور پھر فوراً ہی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ بڑی دیر ہے۔ تم میرے بھائی کی طرف سے فکر مت کرنا۔ اس کے میں ابا سے اچھی طرح کان کھنچواؤں گی۔'' اپنی کہنے کے بعد وہ رُکی نہیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ماہ بانو حیران سی اُس کا یہ ردِعمل دیکھتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

نور پور کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں خوشگوار سا احساس ہوا۔ چھوٹے سے اس گاؤں کے مکانات لیے کر بے شک مکینوں کی خستہ حالی کا احساس ہوتا تھا لیکن اس احساس کے ساتھ ہی گلیوں کی ترتیب اور صفائی ستھرائی بھی فوراً نظر میں آ جاتی تھی۔ ان ترتیب دار گلیوں سے گزر کر زمیندار کے پختہ مکان تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کے دروازے پر ایک نوکر نے ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں ایک بیٹھک میں لے گیا۔ تھوڑی دیر میں نوکر نے لسی اور دیگر لوازمات ان کے سامنے رکھ دیئے۔ دونوں بغلوں کے نیچے دبائے زمیندار بھی وہیں آ گیا۔ ان بیساکھیوں کو دیکھ کر یہ بات سمجھ آ گئی کہ دیگر زمینداروں کی طرح وہ شہریار سے ملنے اس کے دفتر کیوں نہیں آیا تھا۔

''وڈی مہربانی جی، اے سی صاحب! کہ آپ اِدھر آئے۔ میں تو بڑے دنوں سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آپ کے دوسرے گاؤں میں جانے کی خبریں تو ملتی رہتی تھیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیں، میرے گاؤں کا مقدر کب جاگتا ہے۔ رب کا شکر ہے آج آپ کو اِدھر آنے کا خیال بھی آ گیا۔'' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میری کوشش تو یہی ہے کہ اپنے علاقے میں موجود ہر گاؤں کا کم از کم ایک دورہ تو کر ہی لوں۔ لیکن کوئی کوئی ایسی مصروفیت آڑے آ جاتی ہے کہ میں اپنے اس ارادے پر مکمل طور پر عمل نہیں کر پا رہا۔ آپ کے گاؤں کا دورہ بھی شروع سے ہی ہماری فہرست میں شامل تھا لیکن آج بڑی مشکل سے ہم اس میں کامیاب ہو پائے۔ آپ نے گاؤں میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی، وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکے۔ آپ بتائیں کہ اس مسئلے کے علاوہ اور کون سے مسائل ہیں

جن کے حل میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' نور پور کا زمیندار وہ واحد شخص تھا جس نے اپنے کس ان کے بجائے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے درخواست دائر کی تھی، اس لیے شہریار کا روّیہ اس سے بہت مختلف اور وہ بجائے گاؤں کے لوگوں کے پاس جانے کے براہِ راست اسی سے گاؤں کے مسائل پوچھ رہا تھا۔

''یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ تو غربت ہی ہے۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کچھ کمہار جولاہے ہیں۔ آبادی کے حساب سے روزگار کے ذرائع بہت کم ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ گاؤں میں بجلی آ جائے کسی چھوٹی موٹی گھریلو صنعت کی بنیاد ڈال دوں۔ لوگوں کو روزگار ملے گا تو گاؤں خود ہی ترقی کرنے لگے۔'' زمیندار نے جواب دیا۔

''آپ کے خیالات سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے ملنے والے افراد میں آپ واحد شخص جنہیں اپنے ذاتی مفادات کے بجائے اپنے گاؤں کی ترقی عزیز ہے۔'' اس نے زمیندار کو سراہا۔

''ذاتی مفادات میں پڑنے کی میرے پاس گنجائش ہی نہیں۔ میری بیوی برسوں پہلے ایک حادثے میں مر گئی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگیں اسی حادثے میں گنوائی تھیں۔ اولاد ہماری کوئی تھی ہی نہیں۔ اب مجھ جیسا معذور اور ادھیڑ عمر کا آدمی دولت جمع کرے گا بھی تو اس کے کس کام آئے گی؟ بس ایک چھوٹی بہن ہے، اسے عزت سے اس کے گھر کا کر دوں تو میری ساری فکریں ختم ہو جائیں گی۔ مجھے جو کچھ سوچنا ہے اپنے گاؤں کے بارے میں ہی سوچنا ہے۔'' زمیندار نے سادگی سے اپنے روّیے کی وضاحت کرتے ہوئے نوکر کو مزید لسی لانے کے لیے آواز لگائی۔

''مزید تکلف کی ضرورت نہیں زمیندار صاحب! بس آپ یہ بتائیں کہ آپ کے گاؤں میں تعلیم اور صحت کی کیا صورتِ حال ہے؟ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں؟'' شہریار نے اسے روکتے ہوئے سوال کیا۔

''صرف دلچسپی سے کیا ہوتا ہے جناب! ان بے چاروں کے پاس تو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ حکومت نے بھی کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہی حال صحت کا بھی ہے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو خود ہی کچھ ٹونے ٹوٹکے کر کے علاج کر لیتے ہیں۔ کسی کی حالت بہت بگڑ جائے تو اُسے منجی پر ڈال کر نورکوٹ تک لے جاتے ہیں۔ اب بندے کی قسمت کہ اگر زندگی ہو تو وہاں جانے تک بچ جاتا ہے ورنہ اسے واپس لا کر یہاں دفنا دیتے ہیں۔'' دیگر دیہاتوں کی طرح وہاں بھی صورتِ حال بہت خراب تھی۔ بس واحد حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ گاؤں کا سب سے زیادہ بااثر شخص ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔

''آپ کے تعاون کے لیے شکریہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کے مسائل کے حل کے لیے میں ترجیحی بنیادوں پر کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ تعلیم، صحت اور روزگار ان تینوں ایشوز پر میری نظر رہے گی۔'' زمیندار کو یقین دہانی کروا کر وہ لوگ واپسی کے لیے اُٹھ گئے۔ گھر کے بڑے سے صحن سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیاری میں موجود پھول دار پودوں پر ایک لڑکی کو جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ یقیناً زمیندار کی چھوٹی بہن تھی جو ان لوگوں کو دیکھ کر فوراً بھاگ کر ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔

زمیندار کے گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے گاؤں کا چکر لگا کر حالات کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ آج شہریار کی موتی والا کے وکیل سے بھی ملاقات طے تھی۔ گھر پہنچ کر اسے بس اتنی ہی مہلت مل سکی کہ وہ غسل کر کے اپنے وجود پر سے دن بھر کی گرد و غبار کو اتار سکے۔ غسل کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا کہ بٹلر نے اسے عبدالمنان کی موتی والا کے وکیل کے ساتھ آمد کی



اطلاع دی۔

''اوکے! تم اُنہیں بٹھاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' بٹلر کو جواب دے کر وہ تیار ہونے لگا۔ سات منٹ میں اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ نچلی منزل پر موجود ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس کی تربیت یافتہ ملازمین لوازمات کے ساتھ چائے سرو کر چکے تھے۔

''حفیظ شیرازی..... مسٹر موتی والا کے قانونی مشیر۔'' اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے پر عبدالمنان نے رسمی رسم نبھائی۔ اس نے حفیظ شیرازی سے ہاتھ ملا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''لاہور سے یہاں تک پہنچنے میں آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں اٹھانی پڑی؟'' حفیظ شیرازی کی آمد کا اصل مقصد پوچھنے سے پہلے اس نے ایک رسمی سا سوال کیا۔

''تکلیف کیسی؟ میں تو اپنی ایک ذمے داری پوری کرنے آیا تھا۔ اگر آپ موتی والا کی تدفین کے بعد یہاں ایک دو روز قیام کرتے تو میں آپ سے وہیں ملاقات کر لیتا۔ لیکن اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے تو بہرحال اپنا فرض پورا کرنا ہی تھا اس لیے میں یہاں تک چلا آیا۔'' شہریار کے سوال کا جواب دے کر وہ اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔ بریف کیس میں سے اس نے ایک خاکی لفافہ نکال کر شہریار کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''اپنے بیٹے کی وفات کے کچھ دن بعد ہی موتی والا صاحب نے اپنی نئی وِل (وصیت نامہ) تیار کروائی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ رانا صاحب کے حوالے سے شاید آپ کو پہلے سے جانتے تھے۔ پھر یہاں کے اسسٹنٹ کمشنر بننے کے بعد بھی انہوں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ آپ ایک اولوالعزم اور ایمان دار آدمی ہیں جو کم از کم اپنے کیریئر کے ابتدائی حصے میں تو ہرگز بھی کسی کرپشن میں ملوث نہیں ہو سکتے۔'' شہریار نے خاموشی سے حفیظ شیرازی کے یہ الفاظ سنے اور خاکی لفافہ کھول کر اس میں موجود کاغذات نکال کر ان کا جائزہ لینے لگا ان کاغذات کے مندرجات حفیظ شیرازی کے الفاظ کی تصدیق کر رہے تھے۔ موتی والا نے اپنے اس وصیت نام میں اسے اپنی جائیداد کا وارث قرار دیتے ہوئے اپنے بیٹے کے نام سے فلاحی ہسپتال کے قیام کی خواہش کے ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ شہریار یہ ہسپتال اپنے علاقے میں تعمیر کروائے۔ شاید وہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا جو اس نے چودھری افتخار کے ساتھ مل کر جنگل سے لکڑی کی اسمگلنگ کی شکل میں کیا تھا۔ جنگل کے درختوں سے حاصل ہونے والی یہ دولت جس پر یقیناً اس علاقے کے لوگوں کا سب سے زیادہ حق تھا، اسی صورت میں واپس لوٹائی جا سکتی تھی۔ موتی والا نے ایک عقل مندی یہ بھی کی تھی کہ شہریار کو مختارِ کُل نہیں بنایا تھا بلکہ حفیظ شیرازی سمیت وکلا کا ایک سہ رکنی بورڈ بھی مقرر کیا تھا جو اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہتا اور کسی طرح کی کرپشن کی صورت میں اس کی روک تھام کا بندوبست کرتا۔

''یہ میرے لیے بڑے آنر کی بات ہے کہ موتی والا صاحب نے مجھے اس لائق سمجھا۔ اُن کی اس وِل نے میرے ہاتھ بہت مضبوط کر دیے ہیں۔ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے میرے ذہن میں بہت سے منصوبے ہیں لیکن ظاہر ہے میں فوری طور پر حکومت سے ان تمام منصوبوں کے لیے مراعات حاصل نہیں کر سکتا۔ موتی والا صاحب کی اس وِل کے بعد میں کم از کم اس لائق ہو جاؤں گا کہ ہیلتھ کے مسائل کے حل کے لیے کچھ کر سکوں۔ مگر اس سلسلے میں میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے وہ موتی والا کی خواہش سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ میں ایک بڑے ہسپتال کے قیام کے بجائے صحت کے چھوٹے چھوٹے مگر جدید مراکز کے قیام میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر

ہم بڑا ہسپتال بنائیں گے تو وہ یقیناً کسی ایک قصبے میں قائم کیا جائے گا اور لوگوں کے لیے اس ہسپتال تک بروقت پہنچنے کا مسئلہ اپنی جگہ رہے گا۔ اس کے برخلاف اگر ہم مختلف دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے یونٹس قائم کر دیں تو لوگوں کو زیادہ آسانی رہے گی۔ ایک آپریشن تھیٹر، ادویات اور چھوٹی موٹی مشینوں کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر، جنرل فزیشن اور پیرا میڈیکل اسٹاف پر مشتمل ان یونٹس سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ خدانخواستہ کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا تو ان یونٹس میں مریض کو فرسٹ ایڈ دے کر کسی بڑے شہر تک پہنچانے کی مہلت مل جائے گی۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ کہیں کہیں ہی حکومت کی قائم کردہ ڈسپنسریاں نظر آتی ہیں اور وہاں بھی ڈاکٹر زاور دوائیں ندارد ہیں۔'' لفافے میں کاغذات واپس رکھنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ وہ مختلف منصوبے جو مسلسل اس کے ذہن میں پلتے رہتے تھے، اس وقت ان میں سے ایک کی تکمیل کے لیے راہ نکل آئی تھی۔

''تجویز تو آپ کی بہت اچھی ہے۔ مجھے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں بورڈ کے باقی دو ممبران سے بھی اس تجویز کو ڈسکس کر کے آپ کو حتمی جواب دے دوں گا۔ میرے خیال میں تو وہ لوگ بھی اس تجویز کو پسند کریں گے۔'' حفیظ شیرازی کا جواب بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن سی چمکتی نظر آنے لگی۔ ورنہ ماہ بانو کے غیاب کے بعد جو اندھیرا سا چھا گیا تھا اس سے وہ اپنے اندر بڑی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

بیرونی دروازے پر دی جانے والی زوردار دستک پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ موجودہ حالات میں اسے بہت گہری نیند نہیں آ پاتی تھی اور وہ ذرا سی آہٹ پر ہی چونک کر اُٹھ جاتی تھی۔ دروازے پر دی جانے والی یہ دستک تو بہت زوردار تھی اور مسلسل یوں دی جا رہی تھی کہ جیسے دروازہ نہ کھولنے کی صورت میں توڑ دیا جائے گا۔ خوف اور اندیشوں سے گھرا اُس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے ساتھ سوئی ہوئی خالہ جی کو ایک نظر دیکھا۔ دستک کی اس آواز پر ڈسٹرب ہو کر وہ بھی کسمسا رہی تھیں لیکن دواؤں کے زیر اثر ان کا ذہن فوری طور پر بیدار ہونے سے قاصر تھا۔ وہ بستر سے اُتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران عامر بھی جاگ چکا تھا اور بیٹھک سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

''آ رہا ہوں بھائی! کون ہے؟ ذرا صبر سے تو کام لو۔'' اس کے بالائی جسم پر کپڑے موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر موسم میں ایک جیسے حلیے میں سونا پسند کرتے ہیں۔

''کیا بھنگ پی کر سو رہا تھا جو اتنی دیر بعد آنکھ کھلی ہے۔ اور اب بھی دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا۔'' باہر سے کسی کی بلند اور غصیلی آواز سنائی دی۔

''اچھا اچھا، یہ تُو ہے۔ لے کھول دیا میں نے دروازہ۔'' باہر سے بولنے والا یقیناً اس کے لیے شناسا تھا۔ اس نے اطمینان سے بولتے ہوئے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی چار پانچ لڑکے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

''کیا بات ہے یار! تم لوگ اس وقت اس طرح کیوں آئے ہو؟'' وہ سب اُس کے لیے آشنا تھے لیکن اُن کا انداز اور چہرے کا تاثر قطعی اجنبی تھا۔

''دیکھو تو ذرا کیسا معصوم بن رہا ہے۔ حالانکہ اس کا حلیہ دیکھ کر ہی سب سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کون سے گل چھرے اُڑا رہا تھا۔'' کٹیلے لہجے میں یہ جملہ بولنے والے کو ماہ بانو نے شناخت کر لیا۔ وہ پچھلے گھر میں رہنے والا جمیلہ کا



لڑاز بھائی تھا جس نے اس کے لیے رُقعہ پھینکا تھا۔

''کون سے گل چھروں کی بات کر رہے ہو تم؟ میں سارا دن کا تھکا ہارا گہری نیند سو رہا تھا کہ تم لوگوں کی آواز سے جاگنا پڑا اور اب تم اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔ میں کوئی تم لوگوں کی طرح باپ کی کمائی پر نہیں پل رہا کہ راتوں کو جاگ کر تمہارے ساتھ مغز ماری کروں۔ سویرے مجھے اپنی ڈیوٹی پر بھی جانا ہے۔'' عامر بگڑا۔

''دیکھ رہے ہو یارو! کیسے بگڑ رہا ہے۔ ہاں بھئی، آدمی کے عیش میں خلل پڑے تو اسے برا ہی لگتا ہے۔'' لڑاز نے ایک اور طنز کا تیر چلایا۔ عامر کی طرح کمرے کے دروازے کی آڑ میں کھڑی ماہ بانو بھی حیران تھی کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اس کے انداز سے تو صاف لگتا تھا کہ وہ جھگڑا کرنے کی نیت سے ہی یہاں آیا ہے۔

''زبان سنبھال کر بات کر پرویز! تجھ جیسا آئے روز لڑکیوں کو چھیڑ کر ان کے باپ بھائیوں سے پٹنے والا اس برتے پر مجھ پر الزام تراشی کر رہا ہے؟'' عامر نے تند لہجے میں اسے ٹوکا۔

''میں تو صرف لڑکیوں کو چھیڑتا ہی ہوں، پر تُو نے تو دیدہ دلیری کی حد ہی کر دی۔ جوان جہان لونڈیا گھر پر لا ڈالی ہے اور اب مزے سے عیاشی کر رہا ہے۔''

''تیری تو میں.....'' پرویز کے اس الزام پر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ آنے والے لڑکے فوراً اس کی مدد کو لپکے۔ عامر جاندار لڑکا تھا۔ اس نے پرویز کے حمایتیوں میں سے ایک کے پہلو میں کہنی ماری اور دوسرے کی طرف دیکھے بغیر یوں ہی اپنی ٹانگ پیچھے کی جانب چلا دی۔ اگلے مقابل کے جسم کے نازک حصے پر پڑی اور وہ بری طرح بلبلایا۔ اس ساری کارروائی کے دوران پرویز کا گریبان اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ موقع پاتے ہی اس نے گریبان کو جھٹکا دے کر پرویز کو پچھلی طرف دھکیل دیا۔ اس کا سر پیچھے موجود دیوار کے ساتھ جا کر لگا اور حلق سے زوردار چیخ نکلی۔ اس دوران عامر خود بھی زد میں آ گیا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے جھپٹ لیا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ پر مکے برسا رہا تھا۔ مکوں کی یہ ضرب یقیناً بے حد تکلیف دہ تھی۔ عامر کراہتا ہوا دہرا ہو گیا اور یوں لگا کہ نیچے فرش پر بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر مکے برسانے والے کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر دائیں جانب سے حملہ آور ہوتے ہوئے لڑکے پر دے مارا۔ پیچھے سے اسے جکڑنے والا اسے دہرا ہوتا دیکھ کر غیر ارادی طور پر اسے چھوڑ چکا تھا اس لیے اب وہ کسی کی گرفت میں نہیں تھا۔ اس نے لپک کر دیوار کے ساتھ ٹکی چارپائی کی بلی اٹھائی اور ان چاروں کی مرمت کرنے لگا۔ اس ساری کارروائی میں اچھا خاصا شور پیدا ہوا تھا اور قریب قریب واقع گھروں میں لوگ جاگنے لگے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' خالہ جی بھی اس دوران جاگ گئی تھیں اور ساکت و صامت ماہ بانو کے عقب میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''معلوم نہیں۔ جانے یہ کون لڑکے ہیں جو اچانک ہی اندر گھس کر عامر بھائی سے لڑنے لگے ہیں۔'' اس نے خالہ جی کی بات کا جواب ضرور دیا لیکن اس کی نظریں اپنے سامنے ہوتے معرکے سے نہیں ہٹیں۔ عامر کے ہاتھ میں بلی آ جانے کے بعد پست ہوتے ہوئے لڑکوں نے ایک بار پھر سنبھالا لے لیا تھا۔ ان میں سے دو نے مل کر بلی کو پکڑ لیا تھا اور دو پیچھے سے اسے جکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو؟ میں کہتی ہو رک جاؤ۔'' ماہ بانو کی طرح وہیں رک کر لڑائی

دیکھنے کے بجائے خالہ جی باہر نکلیں اور سب کو پکارا لیکن لڑائی کے جوش میں ان کی کمزور سی آواز دب گئی۔ اسی وقت آس پاس کے گھروں کے جاگ جانے والے لوگوں میں سے چند لوگ کھلے دروازے اندر چلے آئے۔

''روکو ان لوگوں کو۔ ورنہ یہ لڑ لڑ کر ایک دوسرے کی جان لے لیں گے۔'' پڑوسیوں کو سامنے پا کر خالہ کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ پانچ چھ افراد مل کر لڑتے ہوئے لڑکوں کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر وہ لوگ کچھ دیر کی کوشش کے بعد لڑائی رُکوانے میں کامیاب ہو گئے لیکن دوران عامر سمیت تمام لڑکوں کا حلیہ اچھا خاصا بگڑ چکا تھا۔ عامر کی بلی کی زد میں آ کر دو لڑکوں کے سر پھٹے تھے، ایک کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور ایک اپنے بازوؤں پر لگنے والی چوٹوں کو سہلا رہا تھا۔ خود عامر کا بھی ابتر تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور دائیں آنکھ کے نیچے بھی زخم آیا تھا۔ جسم کے بالائی عریاں حصے بھی کئی چوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بے شک وہ بہت بے جگری سے لڑا تھا لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اس کو مار بھی سب سے زیادہ کھائی تھی۔ محلے والوں نے تمام لڑکوں کے زخم دُھلوائے اور پھر انہیں بیٹھک میں بٹھا کر جھگڑے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

''ساری غلطی عامر کی ہے۔ ہم تو صرف اس کی غلطی کا احساس دلانے آئے تھے۔ اس نے بلاوجہ ہم سے ہاتھا پائی شروع کر دی۔'' پرویز کے ساتھ آنے والے کوتاہ قامت لڑکے نے الزام لگایا۔

''اُلّو کے پٹھو! ایک تو تم لوگوں نے مجھ پر بے کار کی الزام تراشی کی، اس پر سے غلطی بھی میری ہی بتا رہے ہو۔'' عامر اُس کی بات سن کر بھڑکا۔ وہ یوں بھی محلے داروں کی وجہ سے جھگڑے سے تائب ہو گیا تھا اور دل کے اندر غصہ اب بھی بھڑک رہا تھا۔

''دھیرج پُتر! آرام سے بات کرو۔ ہم تم سب کی بات آرام سے سنیں گے۔'' ایک عمر رسیدہ پڑوسی نے عامر کے شانے تھپتھپاتے ہوئے اسے ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں چاچا جی! یہ آپ لوگوں کے سامنے بھی کس طرح بھڑک رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو بھی یہ اسی طرح بھڑک کر ہم سے اُلجھنے لگا تھا۔ ورنہ ہم نے اس سے صرف یہی تو کہا تھا کہ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ یہاں سب ماں بہنوں والے ہیں۔ تم اس محلے میں رہتے ہو تو شریفوں کی طرح رہو اور اپنی ماں کی بیماری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔''

''کیا مطلب؟..... کیا، کیا ہے عامر نے؟'' ایک لڑکے کے دیئے بیان پر صلح صفائی کروانے والے بھی اُلجھ گئے۔

''کیا کہوں چاچا جی! بات ایسی ہے کہ کچھ کہتے ہوئے زبان رُکتی ہے۔ پر میں اپنی آنکھوں کا دیکھا جھوٹ بھی نہیں سکتا۔ پر آپ تو عقل مند آدمی ہو۔ اس کا حال دیکھ کر بھی بہت کچھ سمجھ سکتے ہو۔ میں نے اسے اور اس کی مہمان لڑکی کو باہر آنگن میں بڑی بے شرمی والی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔'' پرویز نے عامر کے بالائی عریاں حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ایسا بیان دیا جس پر سب کے منہ کھلے رہ گئے۔

''جھوٹ بولتا ہے نامراد۔ میرا بچہ بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کی تو بچپن کی عادت ہے کہ سردی گرمی موسم میں اسی طرح قمیض اُتار کر سوتا ہے۔ یہ بچی بہت شریف ہے۔ روزانہ میرے ساتھ میرے گھر میں سوتی ہے۔'' خالہ جی جہاندیدہ عورت تھیں وہ فوراً سمجھ گئیں کہ پرویز بات کو کس رخ پر لے جا رہا ہے اس لیے تڑپ کر بیٹے کی صفائی میں صدا بلند کی۔



''آپ تو دوائیں کھا کر مدہوش سوتی ہو خالہ جی! آپ کو کیا پتہ چلتا ہوگا کہ کب لڑکی اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔'' پرویز نے ان کی بات اڑائی۔

''نہ تو تُو بتا کہ اگر یہ لوگ اتنے ہی ہوشیار ہیں تو اچھی بھلی بیٹھک ہوتے ہوئے شرم ناک حرکتیں دکھانے باہر آنگن میں کس لیے جائیں گے؟ اور تُو کہاں کا شریف زادہ ہے جو آدھی آدھی رات کو دوسروں کے کمروں میں جھانکتا ہے؟'' وہ اس سے دبے بغیر تیز لہجے میں دلیل کے ساتھ بولیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

''پھر بھی بہن جی! کوئی تو بات دیکھی ہوگی پرویز نے جو ایسا الزام لگایا۔'' صلح صفائی کروانے والے بزرگوار خود معاملہ ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور چسکے لینے کے لیے بات کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

''کوئی بھی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ بچی اور عامر دودھ شریک بہن بھائی ہیں۔ اس کی بڑی بہن کے ساتھ اس کی ماں نے عامر کو بھی دودھ پلایا تھا۔ ماں کے دودھ کے رشتے سے عامر اس کی بہن کے ساتھ ساتھ اس کا بھی بھائی ہوا۔ وہ بے چاری بڑی والی تو دو چار برس کی ہو کر ہی مر گئی تھی، اب یہی بچی ہے۔ اس کی ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے کے لیے اگر کڑے وقت میں ہم نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تو کیا برا کیا؟ میں بوڑھی اور بیمار ہوں، پر بے عقل نہیں کہ جوان جہان لڑکی کو یوں ہی گھر میں رکھنے کا خطرہ مول لوں۔'' خالہ جی نے ایک جھوٹ کے سہارے ساری صورت حال اُلٹ کر رکھ دی۔ اب کسی کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ عامر کی ماں اور ان کے بیان کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کر کے سب لوگ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ پرویز نے جاتے جاتے ماہ بانو کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے لگا وہ اسے دھمکا رہا ہو۔

''یہ پرویز ہے تو سارے زمانے کا آوارہ گرد اور بدکردار۔ پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ اس نے عامر پر ایسا الزام کیوں لگایا؟'' خالہ جی اتنی دیر میں اچھی خاصی نڈھال ہو گئی تھیں۔ سب لوگوں کے رخصت ہوتے ہی انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکایا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولیں۔

''اس کا اصل نشانہ عامر بھائی نہیں، میں تھی خالہ جان! اصل میں وہ مجھے بے عزت کرنا چاہتا تھا۔'' ماہ بانو اس عرصے میں اپنے ہونٹ سی کر بیٹھی رہی تھی، تھکے ہوئے لہجے میں بول اُٹھی۔

''پر کیوں؟'' عامر چونکا۔ اس نے پرویز کے رقعہ پھینکنے اور جمیلہ سے شکایت کرنے کا قصہ سنا دیا۔

''بالکل صحیح..... میں سمجھ گیا۔ تمہاری شکایت پر جمیلہ نے اپنے ابا سے اس کی شکایت کی ہوگی۔ وہ بے چارے پہلے ہی اُس کے کرتوتوں پر پریشان ہیں۔ انہوں نے غصے میں اسے دو چار ہاتھ ٹکا دیئے ہوں گے اور اس نے انتقام لینے کے لیے یہ سارا ڈرامہ رچا ڈالا۔ اگر اماں ہمارے دودھ شریک بہن بھائی ہونے کا بہانہ نہ گھڑتیں تو محلے والوں نے پرویز کو جھوٹا مان لینے کے باوجود اس بات پر زور دینا تھا کہ فساد کی جڑ اس لڑکی کو باہر نکالو۔'' سارا قصہ سننے کے بعد عامر نے نتیجہ اخذ کیا۔

''میں پہلے ہی اس کی بدمعاشی کو سمجھ گئی تھی۔ پھر مجھے یقین تھا کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی ایسا گندا کام نہیں کر سکتا اس لیے ذرا سا جھوٹ بول ڈالا۔ رب میرے اس جھوٹ کو معاف کرے، پر تم دونوں یاد رکھنا کہ اب تمہیں ہمیشہ میرے اس جھوٹ کی لاج رکھنی ہے۔'' خالہ جی نے ان دونوں کو نصیحت کی۔

''بالکل اماں! یہ میرے لیے آج سے چھوٹی بہن کی طرح ہی ہے۔'' عامر نے ماہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''چلو اب چل کر سو جاتے ہیں۔ کل میں پرویز کی ماں کو بلا کر اس سے کہوں گی کہ بیٹے کو ذرا نرمی سے قابو کرے۔ باپ کی سختی نے اسے زیادہ ہی اتھرا کر دیا ہے۔ اس وقت بھی باپ نائٹ ڈیوٹی پر ہوگا جو اس نے یہ

ا کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اگر اس وقت اس کا باپ موجود ہوتا تو سب کے سامنے چار چوٹ کی لگاتا۔" ہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں تو ماہ بانو نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا ن یہ نحیف ونزار عورت اس کے لیے بہت مضبوط ڈھال ثابت ہوئی تھی۔ ورنہ وہ ایک آوارہ گرد کے انتقام میں آ کر آدھی رات کو بے سائباں ہو جاتی۔

⊛----✪----⊛

''پیر آباد سے ماسٹر آفتاب آیا ہے سر!'' عبدالمنان کی اس اطلاع پر اس کے دل میں امید کی کرن جا ے علم تھا کہ عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے ذمے حویلی میں کسی ذریعے سے ماہ بانو کا کھوج لگانے کا کا تھا۔ اس وقت ماسٹر آفتاب کی آمد کا مطلب تھا کہ اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی اہم خبر ہے ا وہ یہاں آیا ہے۔

''اسے اندر بھیج دو۔'' اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا۔

''السلام علیکم سر!'' اگلے لمحے ماسٹر آفتاب اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو آفتاب؟'' اس نے مصافحہ کرنے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پ

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اسکول کی کنسٹرکشن کا کام کیسا چل رہا ہے؟ کہیں کوئی رکاوٹ وغیرہ تو کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی ے پاس زیادہ بندے نہیں ہیں ورنہ میں کام کی نگرانی کے لیے ٹھیکیدار کے ساتھ اپنا کوئی آدمی بھجوا دیتا۔''

''نگرانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کام میں اور میرا ساتھی ٹیچر مل جل کر کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل رم سے اب تک سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں ڈر تھا کہ چودھری صاحب طرف سے کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تک تو ان کے کسی بندے نے اس طرف آ کر جھانکا بھی نہیں۔ لگتا ہے اس معاملے میں انہوں نے ہار مان لی ہے۔'' وہ بہت خوش لگ تھا۔ خود شہریار کو بھی بنا کسی رکاوٹ کے اسکول کی تعمیر کا کام جاری رہنے پر خوشی تھی لیکن وہ چودھری کی طرف ے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھا۔ اُس کی فطرت کے بارے میں اس نے اب تک جو اندازہ لگایا تھا، اس کے مطابق وہ ایک منتقم مزاج اور کینہ پرور شخص تھا جو موقع ملتے ہی اپنے مخالف کو ڈسنے سے نہیں چوکتا تھا۔ حوراں صفدر، موتی والا اور دارالامان کی منتظمہ کے قتل کی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ ان سارے حادثات چودھری کے ملوث ہونے کا ثبوت نہ ملنے کے باوجود اس کا وجدان کہتا تھا کہ ان اموات کے پیچھے اسی کا ہے۔ اسی نے ماہ بانو کو تحفظ فراہم کرنے اور اس سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں ان سارے لوگوں کو لگوایا ہے اور اب شاید ماہ بانو خود بھی اس کے ہتھے چڑھ چکی تھی جس سے وہ اپنی بے عزتی کا انتقام نہ جانے انداز میں لیتا یا لے رہا ہوگا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد مجھے اس کی جو رائلٹی ملے گی اس سے میں اسکول میں فرنیچر ڈلواؤں گا۔ بچے بہت خوش ہوں گے جب انہیں بیٹھنے کے لیے پھٹی پرانی دریوں کے بجائے ڈیسکیں ملیں گی۔'' اس کی کیفیات سے بے خبر ماسٹر آفتاب جوش وخروش سے اپنے مستقبل کے پلان سنا رہا تھا۔

''ویری نائس۔ تمہاری یہ اسپرٹ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ نور گاؤں میں اپنے خرچے پر ایک اسکول بنواؤں گا۔ مختلف دیہاتوں میں صحت کے مراکز قائم کرنے کا ایک منصوبہ



ا رہے۔ اس سلسلے میں جلد کام شروع ہو جائے گا۔'' شہریار نے اسے سراہتے ہوئے خوشخبری سنائی۔

''یہ تو بہت ہی زبردست نیوز ہے سر! مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ اگر آپ اس سیٹ پر موجود رہے تو یہ ضلع ترقی کرے گا۔'' حسبِ توقع ماسٹر آفتاب خوش ہو گیا۔

''میں نے تو ساری زبردست نیوز تمہیں سنا دیں۔ تم سناؤ تمہارے پاس مجھے سنانے کے لیے کون سی نیوز ہے؟'' شہریار بہت سلیقے سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف لے گیا جس کے بارے میں جاننے کے لیے وہ بری طرح بے چین تھا۔

''مجھے عبدالمنان صاحب کا پیغام مل گیا تھا۔ اتفاق سے حویلی میں کام کرنے والی ایک لڑکی رانی سے میری واقفیت ہے۔ میرے کہنے پر اس نے سُن گُن لینے کی کوشش کی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ ماہ بانو، ال النار کے ہاتھ نہیں لگی.....''

''اسے یہ یقین کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ چودھری، ماہ بانو کو حویلی لے کر آئے، وہ اسے کہیں اور بھی تو ا ہے۔'' اس نے ماسٹر آفتاب کی بات کاٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

''ارے پر رانی کے منگیتر کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اپنے منگیتر کے ذریعے اس نے یہ بات کنفرم کروالی ر ماہ بانو کو ڈیرے پر نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی اُس کے اس یقین کے پیچھے ایک دوسری وجہ ہے۔ اس نے ی اس کے خاص بندوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنی ہے۔ رانی کے مطابق چودھری اپنے بندوں پر ہا رہا تھا کہ وہ لوگ ابھی تک ماہ بانو کو نہیں ڈھونڈ سکے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر دو چار دن اور ے بندے ماہ بانو کو ڈھونڈنے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ انعام کے لالچ کے ساتھ ماہ بانو کی تصویر اخباروں ا دے گا۔ تصویر اخبار میں چھپنے کے بعد وہ اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور کوئی نہ ی میں آ کر اطلاع ضرور دے دے گا۔''

''چودھری کے پاس ماہ بانو کی تصویریں کہاں سے آئیں؟'' ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع پر وہ چونکا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے؟ لیکن رانی نے خود چودھری کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کے تکیے کے نیچے ی تین چار تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ تصویریں کالج کے یونیفارم میں اور کسی تقریب وغیرہ کے موقع کی ہیں اور کوئی بھی تصویر گاؤں میں کھنچی ہوئی نہیں لگتی۔ شاید چودھری نے نوراں اور کے ذریعے فیصل آباد سے یہ تصویریں منگوائی ہوں۔'' ماسٹر آفتاب کے پیش کردہ اس خیال کی اُس نے کی لیکن اُس کا ذہن حوراں اور صفدر کے قتل کی واردات میں اُلجھا رہا۔ اُسے ملنے والی اطلاعات کے صفدر کا گھر واردات کے بعد بری طرح بکھری ہوئی حالت میں ملا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ے وہاں کی تلاشی لی ہو۔ اگر اس واردات میں چودھری کے بندے ملوث تھے تو اس بات کا سو فیصد امکان انہوں نے ہی وہاں سے ماہ بانو کی تصویریں حاصل کر کے چودھری کو پہنچائی ہوں۔ ماسٹر آفتاب کی فراہم معلومات نے جہاں اسے یہ تسلی دی تھی کہ ماہ بانو ابھی تک چودھری کے ہاتھ نہیں لگی، وہیں وہ اس پریشانی گیا تھا کہ آخر وہ کہاں ہے اور کس مشکل میں پھنسی ہوئی ہے؟ آزاد ہونے کی صورت میں اسے یہاں کی کوشش کرنی چاہئے تھی لیکن اس سوچ کے ساتھ اسے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے اس نے ڈر کر کا رخ نہ کیا ہو۔ اس علاقے میں آنے کی صورت میں چودھری کی نظروں میں آ جانے کا زیادہ ڈر تھا۔ چودھری اخبار میں اس کی تصویریں شائع کروانے کا جو کام کرنے جا رہا تھا، اس سے ماہ بانو کے لیے بڑھ جاتا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر تو اس نے رفیق کھوکھر کو اخبار میں اس کا اسکیچ چھاپنے سے روک

دیا تھا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے اور وہ اپنی پناہ گاہ میں غیر محفوظ ہو جائے۔ اب چودھری انعام کے ساتھ باقاعدہ تصویر چھپواتا تو خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا۔ کوئی دارالامان، فلاحی ادارہ یا کسی ہمدرد کا گھر بھی جگہ جہاں وہ چھپی ہوئی تھی، ایسا کوئی فرد ہوسکتا تھا جو لالچ میں آ کر چودھری کو اس کا ٹھکانا بتا دے۔

''آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ماسٹر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس میں کچھ معاملات پر غور کر رہا تھا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمارے تعاون کیا۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی تمہارا تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔''

''اس بات کا تو آپ سو فیصد یقین رکھیں۔ آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں اس لیے نہیں کہ میں آپ کی مدد سے بھی انکار کروں۔'' وہ شہریار کے جملوں سے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا بھانپ گیا تھا۔ اس لیے خود بھی گفتگو کو اختتامی رخ دیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرنے کے روانہ ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''کچھ کھانے کو دو نا اماں! بڑی بھوک لگ رہی ہے۔'' نوراں، الیاس کا منہ ہاتھ دُھلا کر اُسے اب مدرسے کی طرف دھکیلنے کے چکر میں تھی لیکن وہ رات کو بھی بھوکے پیٹ سویا تھا اس لیے اس وقت کسی سمجھوتے پر راضی نہیں تھا۔

''ابھی ایسے ہی چلا جا۔ دیر ہو رہی ہے۔ واپس آ کر کھانا کھا لینا۔ اگر مدرسے دیر سے پہنچا تو ماسٹر صاحب کی مار کھانی پڑے گی۔'' نوراں نے اسے سمجھا بجھا کر اور ڈرا دھمکا کر ایسے ہی مدرسے جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

''میں کھالوں گا مار۔ پر تم مجھے کچھ کھانے کو دو۔'' وہ بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

''کہاں سے دوں تجھے کھانے کو؟ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ جا، جا کر اپنے ابا سے بول۔ وہ کرے گا تیرے دوزخ کا بندوبست۔'' وہ خود بھی بھوکی تھی اس لیے بچے کی مسلسل ضد پر چڑ گئی۔

''میں کیا اپنی بوٹیاں کاٹ کر تیرے لاڈلے کو کھلاؤں؟ کہتی ہے تو کھلا دیتا ہوں۔ تیری جنی ہوئی اولاد میرا نصیب تو پہلے ہی کھا گئی ہے، اس دوسرے کو میں اپنا آپ کھلا دیتا ہوں۔'' غیاث محمد صحن میں چارپائی پر سیدھا لیٹا تھا۔ نوراں کی بات اس کے کان میں پڑی تو بلند آواز میں اپنے چڑچڑے پن کا اظہار کرنے لگا۔ ماہ بانو کے غائب ہو جانے سے اس کا عزت دار بننے کا خواب جو ٹوٹا سو ٹوٹا تھا، ساتھ ہی لالچ کی نوبت بھی آ گئی تھی۔ کئی دن ہوئے چودھری نے اس کے کام پر آنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ نوراں کا حویلی میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ان کا دال دلیہ آخر کس طرح چلتا؟ چودھری کے عتاب کا بننے والے شخص کے تو سائے سے بھی گاؤں کا ہر فرد بدکتا تھا اس لیے کسی یار دوست سے بھی مدد کی توقع نہیں تھی۔ یار دوستوں کا کیا ذکر، یہاں تو اپنے سگے بھائی اور برادری والوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں مجبور بیٹھی تھیں۔ غیاث محمد کے گھر میں فاقے نہ اُترتے تو کیا ہوتا۔

''جا میرا پتر! ابھی چپ کر کے پڑھنے چلا جا۔ پڑھنے کے بعد اللہ سے دعا کرنا کہ وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ بندوبست کر دے۔ اللہ تیری دعا ضرور سنے گا۔'' غیاث محمد کا از حد بگڑا ہوا مزاج دیکھ کر نوراں نے ایک بار پھر بیٹے کو ہی سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر قبل وہ لوگوں کے گھروں کے باہر پڑے سبزیوں اور پھلوں



کی چھلکوں کو اکٹھا کر لائی تھی اور رات بھر سے ''میں، میں'' کرتی بھوکی بکری کے آگے وہ چھلکے ڈال کر اُس کی ''میں، میں'' کا انتظام کیا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ بکری کا پیٹ بھرے گا تو اس کے سوکھے ہوئے تھن سے ایک بار پھر دودھ کی دھار نکل کر ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست کرے گی۔ کھیتوں کی طرف ان میاں بیوی کا داخلہ بالکل ممنوع ہونے کی وجہ سے وہ اس معصوم جانور کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر رہتے اور یہ تو شاید ساری دنیا کا اصول ہے کہ کسی سے کچھ پانے کے لیے پہلے اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ وہ بکری کو پیٹ بھرنے کا سامان مہیا نہیں کر پائے تھے تو وہ ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنا دودھ کیسے دیتی۔ پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے جمع کر کے اسے کھلانے کا خیال نوراں کو صبح گلی میں جھانکنے کے بعد آیا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے سامنے پڑے چھلکے سمیٹنے کا یہ کام بہت ذلت آمیز تھا لیکن وہ پاپی پیٹ کی خاطر سب کچھ برداشت کر کے یہ کام کر گزری تھی اور اب بکری کی طرف سے اُمید باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن فی الحال تو اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ الیاس کو کھلا پلا سکتی۔ بالآخر وہ اسے بہلا پھسلا کر مدرسے روانہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

''چودھری صاحب نے صاف کہا ہے کہ جب تک ماہ بانو زندہ یا مردہ نہیں مل جاتی، وہ ہرگز ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ اب تو رب سے دعا کر کہ وہ نصیبوں جلی کہیں سے مر پڑ کر ہی سہی، مل جائے تو ہماری جان اس سے چھوٹے۔'' الیاس کے بسورتے ہوئے گھر سے روانہ ہونے کے بعد غیاث محمد نے جلے ہوئے انداز میں نوراں کو مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ سنا اور خاموشی سے گھر کے کام نمٹانے میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اس کو کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ صفائی ستھرائی کے بعد وہ بالکل فارغ تھی۔ کچھ پکانے کو تھا نہیں جو ہانڈی پکاتی اور جب کچھ پکایا کھایا ہی نہیں گیا تھا تو دُھلنے والے برتن بھی کہاں سے آتے۔ حویلی کی مشقت اور اس کی عادی نوراں اندر باہر کے چکر لگا کر وقت کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ لمحے آگے سرکیں گے تو الیاس کھانے کے مطالبے کے ساتھ ایک بار پھر گھر آ دھمکے گا۔ دو مختلف کیفیات میں گھری وہ بھی اس وقت غیاث محمد کی طرح یہی تمنا کر رہی تھی کہ زندہ یا مردہ کسی بھی حال میں ماہ بانو مل جائے تو اس کی جان پر سے ٹلے۔ اس ایک کی قربانی دے کر وہ سب امن میں آ سکتے تھے اور اب تو وہ سوچ رہی تھی کہ اس میں بھی کیا بات تھی۔ اگر ماہ بانو زندہ حالت میں چودھری کو مل جاتی تو اس کی زندگی حویلی میں عیش کرتے ہی گزرتی۔ کم از کم فاقوں سے مر جانے کے مقابلے میں تو اس کے نزدیک ہر طرح کی زندگی بہتر تھی۔ انہی سوچوں کے درمیان بالآخر وقت گزر ہی گیا اور الیاس مدرسے سے واپس آ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کھانے کے لیے ہانک لگائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سپارہ طاق پر رکھنے کے بعد آرام سے نلکے سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھویا اور بکری کے ساتھ چہلیں کرنے لگا۔

''الیاس پتر! تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' نوراں نے ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔

''نہیں اماں! میں نے تو کھانا کھا لیا۔ مدرسے میں سپارہ پڑھنے کے بعد میں نے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ کھانے کے لیے کچھ دے دو۔ میں دعا مانگ کر آ رہا تھا تو مولوی صاحب نے روک لیا کہ کھانا کھا کر جا۔ آج مزے کا گوشت کا سالن تھا ان کے پاس کھانے کے لئے۔'' الیاس نے یوں چٹخارہ لیا جیسے ابھی تک اس گوشت کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ نوراں جانتی تھی کہ مولوی صاحب کے لیے حویلی سے کھانا آتا تھا۔ حویلی کی اکلوتی مسجد کا مولوی غلام محمد، چودھری کا منظورِ نظر تھا اس لیے خوب مزے میں رہتا تھا۔

''اور ہاں اماں! میں مدرسے سے واپس آ رہا تھا تو مجھے نگار آپا کے گھر کے باہر لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی

تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ آپا کی طبیعت خراب ہے، اسے شہر کے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔'' الیاس کو پ
آیا تو اس نے نوراں کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہوگئی۔ نگار کی طرف سے خوش خبری
اطمینان ہوا تھا، اب اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بے چینی میں ڈھل گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ
گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہاں اب بھی تین چار عورتیں کھڑی ہوئی تھیں البتہ نگار کو ہسپتال لے جایا جا
''دو دن سے بڑی بری حالت تھی بے چاری کی۔ درد رُک ہی نہیں رہا تھا۔ دائی بے چاری نے
سارے ٹوٹکے اور دوائیں آزما کر دیکھیں، پھر تھک ہار کر کہہ دیا ماسی ممتاز سے کہ اپنی نوں کو شہر کے ہسپتال
جاؤ۔ بڑی مشکل سے بھا انور نے شہر جانے کے لیے گڈی کا بندوبست کیا ہے۔ اب رب کرے کہ وہ
کی جان اور اس کا بچہ بچ جائے۔ جاتے وقت وہ جس بری طرح درد سے بے حال تھی مجھے تو ڈر ہی لگ
''ہاں، اللہ جانے اچانک ہی کُڑی کو کیا ہوگیا۔ اتنی مشکل سے تو گود ہری ہونے کی خوشی ملی تھی
کہوں تو ممتاز اپنی نوں کا خیال بھی بڑا رکھ رہی تھی۔ پھر جانے اچانک کیا ہوگیا کہ چنگی بھلی کُڑی کو درد
گیا۔'' وہ عورتیں اُس سے براہِ راست مخاطب نہیں ہو رہی تھیں لیکن ان کے تبصروں کے نتیجے میں
معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ وہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے وہ واپس گھر چلی آئی اور غیاث
تفصیل سنائی۔

''تُو اطمینان رکھ۔ نگار کو یہ خوشی پیر سرکار کے در سے ملی ہے۔ اس خوشی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' غیاث
اسے تسلی دی۔

''پر جب پیر سرکار کی آل اولاد ہی ہم سے خوش نہیں تو وہ ہمیں کوئی خوشی کیوں دیں گے؟ مجھے تو لگتا
یہ کوئی سزا ہے۔'' نوراں بے حد خوف زدہ تھی۔ شرک کے اندھیروں میں جڑے ذہن اسی طرح کے
اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ شام ڈھلے جب نگار کی لاش گاؤں واپس آئی تو اس کا وہم حقیقت میں
میڈیکل سائنس سے ناواقف اوہام اور شکوک میں مبتلا عورت کو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ جس خوشخبری کو
دین سمجھ رہی تھی، اُس کا اوّل روز سے ہی نگار کا
ب نہ بننا طے تھا۔ ایمبریو کی ڈویلپمنٹ یوٹیرس کے
فلوپین ٹیوب میں ہوئی تھی جہاں گروتھ کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر نگار کو کوئی باسہولت ہسپتال میسر ہوا
میں ہی الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے یہ بات سامنے آجاتی اور بچے کی قربانی دے کر اس کی جان بچالی جاتی
وہ بے چاری شدید تکلیف سہنے کے بعد ٹیوب کے برسٹ ہو جانے کے نتیجے میں اپنی جان سے چل
دوسری طرف اس کی اندھی عقیدت کا شکار ماں کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوگیا تھا کہ ایسا پیر سرکار
غضب کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس غیظ وغضب کی وجہ سے جو چودھری افتخار کی ناراضی کی وجہ سے پیدا ہوا

⊛----✪----⊛

''کون ہے؟'' رات کافی گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ بڑے
سے لکھنے میں مصروف تھا۔ دروازے پر اُبھرنے والی غیر متوقع دستک نے اُس کے انہماک میں خلل
پر دائیں جانب رکھے ٹائم پیس کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے بلند آواز میں سوال کیا۔

''میں ہوں ماسٹر صاحب! رانی۔'' جواب میں باہر سے سرگوشی سے کچھ بلند آواز سنائی دی۔

''رانی! اس وقت.....'' حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا اور چنچنی گرا
ہی بڑی سی چادر میں لپٹی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور پلٹ کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے



میں وہ لڑکی کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ لڑکی رانی نہیں تھی۔

''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا بی بی!'' پہچان کا مرحلہ طے ہوتے ہی اس نے آنے والی کو ٹوکا۔

''میں شاید نہ آتی لیکن آپ نے مجبور کر دیا۔'' وہ دھیرے سے بولتی ہوئی اس کرسی پر جا ٹکی جس پر کچھ دیر
وہ بیٹھا ہوا تھا۔

''میں نے..... میں نے کب آپ کو مجبور کیا یہاں آنے پر؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی کی بات کا جواب نہ دیا جائے تو پھر اسے جواب لینے کے لیے خود چل کر آنا ہی پڑتا ہے۔'' وہ اپنے
کے جواب میں اختیار کی ہوئی خاموشی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے ایک گہرا سانس لے
اس کی طرف دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی اچھی خاصی خوش شکل اور خوش بدن لڑکی تھی۔ خاندانی مرتبے کی
نے لاشعوری طور پر اس میں ایک پُرغرور تمکنت پیدا کر دی تھی۔ وہ سوالی بن کر آئی تھی لیکن اس کا انداز
ایں کا سا تھا۔

''جواب تو میں نے دے دیا تھا۔ کیوں اس راہ پر چلتی ہیں جس پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہیں؟ اس راہ پر
گی تو پیروں کو زخموں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''دل کو جو روگ لگا ہے، اس کے بعد لگتا ہے کہ ہر زخم بے معنی ہے۔''

''آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟ اگر کسی نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ آپ نے تو یہاں
آتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا کہ میں یہاں تنہا نہیں رہتا۔ اگر اس وقت میرا ساتھی ٹیچر یہاں ہوتا تو آپ کیا
کرتیں؟'' وہ اس کا جواب سن کر جھنجلایا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آج آپ تنہا ہیں اور آپ کا ساتھی اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا ہے۔ میں نے رانی
سے سب کچھ معلوم کروالیا تھا۔'' اس نے اعترافِ جرم کرنے والے انداز میں بتایا۔

''آپ اس وقت آئی کیسے ہیں؟ کیا رانی آپ کو لے کر آئی ہے؟'' آفتاب نے چونک کر سوال کیا۔

''ہاں۔ رانی نے ہی میری خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔ باہر وہ اور اس کا منگیتر تانگے میں بیٹھے ہیں۔'' اس
نے بتایا۔

''مجھے بڑی حیرت ہے۔ آخر آپ نے رات کے اس پہر اپنی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان
سے یہاں آنے کی راہ نکالی کیسے؟ آپ کو اپنے پکڑے جانے کا خوف محسوس نہیں ہوا؟'' وہ پریشان سا کمرے
میں ٹہلنے لگا۔

''حیرت کی بھلا کیا بات ہے؟ آپ نے سنا نہیں کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ ویسے بھی دیواریں جتنی بلند اور
مضبوط ہوں، ان کی قید سے گھبرا کر اتنے ہی چور راستے بنائے جاتے ہیں۔ رہی ڈرنے کی بات تو اب کسی بات
سے ڈر نہیں لگتا۔ دل آج کل جس لے پر دھڑکتا ہے، وہ اتنی خوب صورت ہے کہ کسی بدصورتی کا خیال ہی نہیں
آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کیفیت میں اگر موت بھی آگئی تو وہ بھی بہت خوب صورت ہوگی۔'' وہ بڑے جذب سے
بول رہی تھی۔

''لیکن پھر بھی آپ کو ایسا.....'' وہ اب بھی اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی
اور اس کے قریب آکر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔

''ساری نصیحتیں، سارے ڈر اور سارے اندیشوں کو اس وقت بھول جائیں آفتاب! بس یہ سوچیں کہ میں
کتنی مشکل سے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کر یہاں آئی ہوں۔ میری اس ساری جدوجہد کو اپنے وہم اور اندیشوں کی

نہ کریں۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اس بات پر خوش ہونے دیں کہ میں آپ کے ساتھ، آپ کے پاس ہوں۔ ان کی انگلیاں اب بھی آفتاب کے ہونٹوں پر تھیں۔ نرم و گداز اُن چھوئی اِن انگلیوں کے لمس نے اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا تھا۔

''میری زندگی کی حقیقتیں اتنی تلخ ہیں کہ میں سوچتی تھی میرا کسی خواب پر کوئی حق نہیں۔ میں تو صرف لفظوں کی دنیا میں رہ کر اپنی زندگی گزار رہی تھی لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ جس دن سے آپ کو دیکھا، خواب خود ہی میری آنکھوں میں اُترنے لگے۔ میں نے کوشش بھی کی، پر ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینکنے کی ہمت نہ کر سکی۔'' وہ دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی تھی اور سر جھکائے اپنی کیفیات بتا رہی تھی۔

''محبت بڑی چیز ہے۔ یہ یک وقت آدمی کو بہت بزدل اور بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ مجھے میرے خوابوں سے دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے۔ دوسری طرف مجھے کسی شے کا خوف نہیں آتا۔ مجھے اس بات سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ میں اس جرم میں جان سے ماردی جاؤں۔ ہاں میں اس بات سے ضرور ڈرتی ہوں کہ آپ میری محبت کو ٹھکرا دیں گے۔ میں آپ کو اس قابل نہیں لگوں گی کہ آپ میری محبت کو قبول کر سکیں۔ مگر پھر بھی میں آپ سے یہ سوال کرنے یہاں آ گئی ہوں۔ کیا آپ میری محبت کو قبول کریں گے آفتاب؟'' جھکے سر کے ساتھ سوال کرتی کشور کے چہرے پر اتنی سچائی تھی کہ وہ جواب تک ساکت رہ گیا تھا، نفی میں جواب نہیں دے سکا۔ ایک لڑکی جو بہت کمزور تھی، صرف اس کی خاطر، اس کی چاہت میں سارے پہرے توڑ کر، اپنی جان کی پروا کیے بغیر رات کے اس پہر اپنی محبت کا انمول تحفہ لے کر اس کے در پر آئی تھی۔ وہ اسے مایوس لوٹانا بھی چاہتا تو اتنی ہمت کہاں سے لاتا؟ وہ تو خود اس شدت کے سامنے ہارنے لگا تھا۔

''میں ناشکرا نہیں ہوں کشور بی بی! کہ بن مانگے خود چل کر اپنے در پر آنے والے خدا کے سب سے بڑے تحفے کو ٹھکرانے کی ہمت کر سکوں۔ میں آپ کے جذبے کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ کبھی خود کو یوں خطرے میں مت ڈالیے گا۔ آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔'' جانے کون سا سحر تھا جس کے زیر اثر اُس نے کشور کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر یہ جملے ادا کیے۔ کشور اس کے الفاظ سن کر کھل اُٹھی۔

''آپ کی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے آفتاب! آئندہ میں کبھی اس طرح یہاں نہیں آؤں گی۔ میں حویلی کی بلند دیواروں کے بیچ سانس لیتے ہوئے اس وقت کا انتظار کروں گی جب محبت اپنا کوئی مقام بنا پائے گی۔'' اس نے بہت جذب سے یہ جملے کہے اور اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھے آفتاب کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر واپسی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آفتاب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ طرح طرح سے ایک سبک رو جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ باہر تاریکی میں وہ تانگہ کھڑا تھا جس میں رانی اور اس کا منگیتر منتظر تھے۔ بڑی سی چادر میں چہرے سمیت اپنا سارا وجود چھپائے وہ تانگے کے قریب پہنچی اور تانگے میں سوار ہونے سے پہلے پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ آفتاب کا ہاتھ بھی خود بہ خود ہی اُٹھ گیا۔ وہ پردہ لگے تانگے میں سوار ہوئی تو تانگہ حرکت میں آ گیا۔ حرکت کرتا ہوا تانگہ تاریکی کا حصہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو گیا، تب بھی وہ بہت ہی دیر تک یونہی کواڑ تھامے ساکت و صامت کھڑا رہا۔ کچھ دیر قبل جو کچھ ہوا تھا، خود اُس کی اپنی سمجھ سے بھی باہر تھا۔

⊛----✪----⊛



خط کا مضمون پڑھنے کے بعد اس نے خط والے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ ہلکے نیلے رنگ کا مقامی خط و کتابت کے لیے استعمال ہونے والا عام سا لفافہ تھا۔ لفافے پر اس کے آفس کا پتہ لکھا ہوا تھا لیکن خط بھیجنے والے کا پتہ موجود نہیں تھا۔ لفافے پر لگی ڈاک خانے کی مُہر ذرا سی کوشش کے بعد آرام سے پڑھی جا سکتی تھی اور اس مہر سے ظاہر تھا کہ یہ خط نور کوٹ کے ڈاک خانے سے بھیجا گیا ہے۔ عام ڈاک سے آنے والے اس خط نے اسے اچھی خاصی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ معمول کے مطابق دفتر کے پتے پر آنے والی ڈاک کو پہلے اسسٹنٹ نے دیکھا تھا۔ عام نوعیت کی ڈاک کو ہمیشہ وہی دیکھتا تھا اور پھر وہ خطوط جن میں کئی توجہ طلب مسئلہ ہوتا، انہیں فائل کر کے شہریار کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ لیکن آج صبح کی ڈاک سے آنے والا یہ خط اتنا عجیب تھا کہ وہ چونک گیا تھا اور باقی خطوط کے ساتھ اسے فائل کرنے کے بجائے فوری طور پر شہریار کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ خط کے مضمون نے اسے بھی اُلجھن میں ڈال دیا تھا اور وہ ایک بار اسے پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ شکستہ لکھائی میں املا کی لاتعداد غلطیوں کے ساتھ دیہاتی طرزِ گفتگو میں لکھے گئے اس خط کے مضمون سے ظاہر تھا کہ خط لکھنے والا بہت معمولی تعلیمی استعداد کا مالک ہے۔ خط بچوں کے اسکولوں میں استعمال ہونے والی سنگل لائن کی کاپی کے صفحات پر لکھا گیا تھا۔ نیلے بال پوائنٹ سے لکھے گئے اس خط کو پڑھنے کے لیے تھوڑی جدوجہد سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدا میں باقاعدہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کا تخاطب استعمال کیا تھا لیکن املا کی غلطی کی وجہ سے اسسٹنٹ کمشنر کا لفظ اسٹینٹ کمشنیر پڑھا جا رہا تھا۔ املا کی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیہاتوں کے معمولی پڑھے لکھے کسی فرد کے ہاتھوں لکھے گئے خطوط میں اس طرح کی غلطیاں عام ہوتی تھیں مگر جو خط اس کے ہاتھ میں تھا، وہ اس اعتبار سے مختلف نوعیت کا تھا کہ اسے بھیجنے والے نے نہ تو لفافے کے اوپر اور نہ ہی خط کے آخر میں اپنا نام لکھا تھا۔ یہ خط کسی ذاتی ضرورت یا مسئلے کی بنا پر اسی کے لیے بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں ایک اطلاع فراہم کی گئی تھی اور وہ اطلاع اس نوعیت کی تھی کہ خط لکھنے والے کا اپنا نام چھپانا سمجھ آتا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدائی سطور میں اپنا جو مختصر سا تعارف لکھا تھا، اس کے مطابق وہ چودھری افتخار کے لیے کام کرنے والے کارندوں میں سے ایک تھا لیکن دراصل وہ چودھری کے ہاں رہ کر موتی والا کے لیے کام کرتا تھا۔ موتی والا سے اُسے اپنی اس وفاداری کی باقاعدہ قیمت ملتی تھی۔ موتی والا کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس نے شک ظاہر کیا تھا کہ اس کے قتل میں چودھری کے بندے ملوث ہیں۔ خط لکھنے والے کے مطابق وہ جنگل میں کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک تھا اور شہریار کو جنگل سے لکڑی کی اسمگلنگ سے متعلق دی جانے والی اطلاع کے لیے اسی نے معلومات فراہم کی تھیں۔ اس کے بعد جذباتی انداز میں لکھا تھا کہ اب تک وہ معاوضہ لے کر ہر کام کرتا رہا تھا لیکن اس بار جذبۂ حب الوطنی نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ جنگل سے لوٹی جانے والی قومی دولت کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے اپنے خط میں واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک غریب اور بے حیثیت آدمی ہے اس لیے خود سامنے آنے کی کبھی ہمت نہیں کر سکتا لیکن دل سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ ملک کے ساتھ دشمنی کرنے والے اور دولت لوٹنے والوں کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اس نے اطلاع دی تھی کہ چوبیس تاریخ کو شب بارہ بجے کے بعد سفید رنگ کی ایک بڑی سوزوکی پک اپ دالی پروسس سے گزرتی ہوئی جانوروں کی کھالیں لے کر ضلع سے باہر جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو اس سوزوکی پک اپ کو روک کر اسمگلنگ کے اس مال کو پکڑ لیں اور ساتھ ہی اصل مجرموں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

''تمہارا کیا خیال ہے اس خط کے بارے میں؟'' دوبارہ پورا خط پڑھنے کے بعد اس نے دو تین صفحات پر مشتمل اس خط کو تہہ کر کے واپس لفافے میں رکھتے ہوئے عبدالمنان سے پوچھا۔

''حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا سر! لیکن پچھلی بار کے حوالے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ لکھنے والا یہ بندہ موتی والا کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ یقیناً چودھری افتخار جیسے بندے کے ساتھ کام کرتے ہوئے موتی والا مکمل طور پر اس پر اعتبار نہیں کرتا ہوگا اور اس نے اپنے کچھ مخبر وغیرہ اس کام پر لگائے ہوں گے کہ وہ کبھی غیر معمولی بات کی اطلاع اسے پہنچا دیں۔ شاید پچھلی بار موتی والا نے ہمیں جو لوڈرز کے نمبر وغیرہ فراہم کیے تھے، وہ اپنے اس آدمی کے ذریعے ہی حاصل کیے ہوں گے۔ چودھری کے ساتھ رہ کر اس کے مظالم برداشت کرنے والے کسی بندے کے لیے موتی والا مقابلتاً ایک مہربان آدمی رہا ہوگا۔ موتی والا کی موت پر صدمے کا شکار ہونے والا شخص حق نمک ادا کرنے کے لیے اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ اس کے مشن کو سمجھتے ہوئے چودھری کو زک پہنچانے کا ایک موقع فراہم کرنے کی کوشش کرے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ کم از کم اس اطلاع پر کوئی کارروائی کرنے میں، میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ اطلاع صحیح اور غلط دونوں ہونے کے چانسز برابر ہیں۔ ہم صحیح کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی کارروائی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں کامیابی ہو جائے۔ اگر ناکامی بھی ہوئی تو کوئی حرج نہیں۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کر کے ناکام ہونا بہتر ہوتا ہے۔'' عبدالمنان کی تائید کرتے ہوئے اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن ہم اس مسئلے کا کیا کریں گے جس کی وجہ سے پچھلی بار بھی ناکامی اُٹھانی پڑی تھی؟ اس کام کے لیے ہمیں پولیس سے مدد تو لینی ہی ہوگی۔ اور پچھلے تجربے نے ہم پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایس پی معظم ملک چودھری کے گروپ کا بندہ ہے۔ اس کی ہمدردیاں چودھری کے ساتھ ہیں۔ وہ اس بار بھی ایسا کوئی بندوبست کر دے گا کہ صورتِ حال پلٹ جائے گی۔'' عبدالمنان نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''اس بار ہم ایس پی کو انوالو ہی نہیں کریں گے۔ میرے ذہن میں جو پلان آ رہا ہے اس کے مطابق چوبیس تاریخ کو اچانک ہی ایک ایس آئی اور چار پانچ کانسٹیبلز کو سکیورٹی کے بہانے سے بلوا لیں گے۔ میرا خیال میں یہ بہانہ کہ مجھے رات کے وقت سفر کرنا ہے اور اس کے لیے سکیورٹی درکار ہے، کافی معقول رہے گا۔ بس تم یہ یقینی بنا لینا کہ ہمیں جو بندے بھیجے جائیں، وہ ایکٹیو ہوں اور فوری طور پر ایکشن لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس ساری کارروائی کو میں خود ہینڈل کروں گا۔ پولیس والوں کو عین موقع پر یہ بات سمجھائی جائے گی کہ ہمیں ایک سوزوکی پک اپ کو روک کر اس کی تلاشی لینا ہے اور غیر قانونی اسمگلنگ کو روکنا ہے۔ میرے خیال میں پک اپ والوں کے ساتھ ایک دو مسلح افراد ہی ہوں گے اور ہم آسانی سے انہیں گھیر لیں گے۔'' وہ مسرت فطرت جوش میں آ چکا تھا اور منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

''میرے خیال میں یہ سب بہت رِسکی ہو جائے گا سر! اس قسم کی مہم جوئی آپ کو سوٹ نہیں کرتی۔ یہ پولیس کا ہے اور انہیں ہی کرنا چاہیے۔'' عبدالمنان نے زمانے کے بہت اُتار چڑھاؤ دیکھ رکھے تھے، چنانچہ اس کے جوش میں ساتھ دینے کے بجائے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''پولیس کی کارکردگی ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ میں دوبارہ ان لوگوں پر اعتبار کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح کے مواقع بار بار نہیں مل سکتے۔ یہ دوسرا موقع ہے کہ ہمیں چودھری اور اس کے ساتھیوں کو بے نقاب کرنے کا چانس مل رہا ہے۔ اگر یہ بھی ضائع ہو گیا تو ہمارے لیے اس پر گرفت کرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ ویسے بھی ہم اس ساری کارروائی کو کسی ویل پلانڈ پروگرام کے بجائے اتفاق کے کھاتے میں ڈال دیں



گے۔ پریس اور پبلک کے سامنے یہی شو کیا جائے گا کہ یہ معاملہ بالکل اتفاق سے سامنے آ گیا۔ اس سلسلے میں ہم اسٹوری بنا سکتے ہیں کہ جس وقت میں سفر کر رہا تھا، اسی وقت سوزوکی پک اپ بھی سڑک سے گزر رہی تھی۔ پولیس والوں کے اشارہ کرنے کے باوجود بھی پک اپ نے راستہ نہیں دیا۔ پک اپ کا ڈرائیور بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے، اس لیے پولیس کی گاڑی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اب اس کے بعد کی کہانی حالات کے مطابق بنائی جا سکتی ہے۔ اگر پک اپ والوں نے خاموشی سے گرفتاری دے دی تو بہت اچھی بات ہے، اگر انہوں نے مزاحمت کی تو پھر پولیس کے پاس جوابی کارروائی کا آپشن موجود ہوگا۔ ہمارے ساتھ جو پولیس والے ہوں گے، اس کارکردگی کو دکھانے پر انہیں تھوڑے سے انعام یا ترقی وغیرہ کے لیے اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر آسانی سے راضی کیا جا سکتا ہے۔'' وہ لمحوں میں سب کچھ طے کر چکا تھا اور انداز اتنا اٹل تھا کہ عبدالمنان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ سوچ چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنا ہرگز بھی پسند نہیں کرے گا۔

''ٹھیک ہے سر! جیسا آپ کہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟'' نیم دلی سے راضی ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''تم یہیں رہنا۔ میرے ساتھ صرف مشابرم خان جائے گا۔ وہ اسلحے کے استعمال سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے اس کارروائی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ تھوڑی بہت شوٹنگ وغیرہ تو مجھے بھی آتی ہے۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ تمہیں میں جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھ رہا ہوں۔ تم اپنے گھر پر ہی رہنا۔ گھر سے فون کر کے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ایمبولینس بلوا لینا۔ اس ایمبولینس کو تم ضرورت کے وقت کسی موقع پر لاتے ہو، یہ تمہاری صوابدید پر ہے۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی ٹکراؤ ہو اور دونوں اطراف میں سے کوئی بھی بندہ زخمی ہو تو اسے فوری طور پر طبی امداد مل سکے۔'' عبدالمنان کی پیشکش کو رد کرتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں موجود منصوبہ بتایا۔

''مجھے یہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے سر! خدانخواستہ اس کارروائی میں آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مجھے ہر ایک سے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔'' عبدالمنان کچھ گھبرا رہا تھا۔ معاملہ بے حد نازک تھا۔ اس کی اس قسم کی کسی ایکٹیوٹی میں شمولیت کسی طور مناسب نہیں تھی اس لیے اپنے طور پر اس نے ایک بار پھر اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''وہ زندگی ہی کیا، جس میں خطرہ نہ ہو۔ آدمی کو جو بڑے سے بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ اپنی جان جانے کا ہوتا ہے..... تو جان بہرحال ایک نہ ایک دن جانی ہے۔ کسی بہتر کام کو کرتے ہوئے چلی جائے تو کیا برائی ہے؟ البتہ اگر تم گھبرا رہے ہو تو میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ تم اس سارے معاملے سے الگ ہو کر آرام سے ایک طرف بیٹھ سکتے ہو۔ جب کوئی تم سے سوال کرے گا تو تم صاف کہہ سکو گے کہ اے سی صاحب نے مجھ سے کچھ کیا، اپنی مرضی سے کیا اور تمہیں اس معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔''

''آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی اپنی فیملی کے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔'' شہریار کی بات پر وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اس لیے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ایک اور دلیل دی۔

''میری فیملی کے لوگ جانتے ہیں کہ میں سر پھرا ہوں۔ اگر تم ایک سر پھرے کا ساتھ دے سکتے ہو تو ٹھیک

ہے، اگر نہیں دینا چاہتے تو کوئی زبردستی یا شکوہ نہیں۔ میں تو بہرحال وہی کچھ کروں گا جو طے کر چکا ہوں۔ شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''میں آپ کا ہر ممکن ساتھ دوں گا۔'' اس بار عبدالمنان کا لہجہ بھی اٹل اور مضبوط تھا۔

⊛----✪----⊛

شہریار کی مرسڈیز سبک رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ مرسڈیز کے پیچھے پولیس جیپ تھی جس میں ایک اے ایس آئی اور چار کانسٹیبل سوار تھے۔

''بس یہیں روک لو۔'' ایک ایسے موڑ پر پہنچنے کے بعد جس سے گزرنا ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کے لیے ناگزیر ہوتا تھا، اس نے مشاہرم خان کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھا اور کافی مستعد اور چوکنا نظر آتا تھا۔ مرسڈیز کے رُکتے ہی پیچھے آنے والی پولیس جیپ بھی رک گئی۔

''خیریت ہے سر؟'' فوراً ہی اے ایس آئی جیپ سے اُتر کر مرسڈیز کے قریب آیا۔

''ہاں۔ تم اندر آ کر بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' بہت سنجیدگی سے دیئے گئے اس حکم پر اے ایس آئی کچھ حیران نظر آیا تاہم اس نے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی اور دروازہ کھول کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ شہریار نے جانچنے والی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کی عائد کردہ شرائط کے مطابق کافی چاق و چوبند بھی نظر آتا تھا۔ البتہ اس اچانک پیش آنے والی صورتِ حال کے باعث اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر رہی تھی مگر وہ اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے میں کامیاب تھا۔

''اگر تمہارے شولڈر پر ایک پھول کا اضافہ ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' اس کی ظاہری شخصیت سے اس کی فطرت کا کسی حد تک اندازہ لگانے کے بعد شہریار نے اس سے سوال کیا۔

''ظاہر ہے سر! بہت اچھا۔'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

''میرے خیال میں میرے پاس تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک موقع ہے۔ کچھ دیر میں اس جگہ سے ایک سفید سوزوکی پک اپ گزرے گی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سوزوکی کو روک کر تمہیں اس میں موجود بندوں کو گرفتار کرنا ہے۔ سوزوکی میں سے جو مال برآمد ہوگا اس کی برآمدگی پر تمہیں بہت سراہا جائے گا۔ ساتھ میں ترقی بھی پکی۔'' سوزوکی پر لوڈ مال کی نوعیت اور اس سے چودھری افتخار کا تعلق ظاہر کیے بغیر عبدالمنان سے طے کیے ہوئے منصوبے کے چیدہ چیدہ نکات اسے سمجھاتا گیا۔ اے ایس آئی نے اس کی ساری بات بہت توجہ سے سنی۔

''میں سمجھ گیا ہوں سر! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔'' تفصیلات سننے کے بعد اے ایس آئی نے دبے دبے جوش کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

''میں اور میرا ڈرائیور پیچھے رہ کر ساری کارروائی پر نظر رکھیں گے۔ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہوئی تو ہماری طرف سے مداخلت ہوگی ورنہ تم اور تمہارے ساتھی مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔ ہر دو صورتوں میں کریڈٹ تمہیں ہی ملے گا۔ میرا بیان یہی ہوگا کہ اتفاقی طور پر مجرم نظر میں آئے اور تم نے اپنی ٹیم کے ساتھ بہادری سے کارروائی کرتے ہوئے انہیں گرفتار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔'' شہریار نے اسے مزید یقین دہانی کروائی۔ اس کا چہرہ کھل اُٹھا اور وہ جوش سے بولا۔

''آپ فکر ہی نہ کریں سر! اِنشاء اللہ آپ لوگوں کو زحمت کرنی ہی نہیں پڑے گی۔ میں اور میرے ساتھی



سنبھال لیں گے۔''

''یاد رکھنا کہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔ ان کے ذریعے ہم اصل بندے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

''رائٹ سر! جیسا آپ کہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔'' اے ایس آئی نے یقین دلایا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر تم جا کر اپنے سپاہیوں کو سمجھاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔'' شہریار کے اس حکم پر وہ گاڑی سے اُتر کر پولیس جیپ کی طرف چلا گیا۔ مشاہرم خان نے طے شدہ حکمت عملی کے تحت مرسڈیز کو ایک سے کچے میں اُتار لی۔ اب سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی سے مرسڈیز کو دور سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف اے ایس آئی اپنے بندوں سے بات کر رہا تھا۔ شہریار دور سے ہی ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ ذرا دیر کی گفت و شنید کے بعد وہ لوگ حرکت میں آ گئے تھے۔ پولیس جیپ کے ڈرائیور نے جیپ ایک پر بائیں جانب بالکل کنارے پر لے جا کر کھڑی کر دی تھی۔ رات کے اس پہر حسبِ معمول اس سڑک پر ایک برائے نام تھا۔ اگر کوئی گاڑی گزرتی بھی تو پولیس جیپ کی وجہ سے اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پولیس جیپ اسی وقت رکاوٹ بنتی جب مطلوبہ سفید سوزوکی پک اپ وہاں سے گزرتی۔ اے ایس آئی دو سپاہیوں کے ساتھ جیپ میں ہی بیٹھا ہوا تھا جبکہ دو سپاہیوں نے سڑک پر دائیں جانب ذرا نیچے آ کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شہریار کی گاڑی ان سے ذرا فاصلے پر کچھ اور پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ تاہم یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیاں ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتیں۔ انتظار کے سنسنی خیز لمحات آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ ایک گم نام خط پر کی جانے والی یہ کارروائی ٹوٹل رِسک تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور سرے سے ایسی کوئی گاڑی سڑک پر نمودار ہی نہیں ہوتی جس کا خط میں ذکر کیا گیا تھا۔ مگر امکان تو اس بات کا بھی تھا کہ خط میں فراہم کی جانے والی اطلاع درست ہو۔ وہ خود کو ملنے والے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے موہوم سی امید کے سہارے ہی یہ سارا کھٹ راگ پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ ناکامی کی صورت میں اے ایس آئی اور سپاہیوں کو تھوڑی بہت رقم دے کر خاموش رہنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ آف دی ریکارڈ تھا اس لیے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تو بھی بات چند لوگوں کے درمیان ہی ختم ہو جاتی۔ حسبِ خواہش نتیجہ نکلنے کی صورت میں اتفاق والا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھاتے میں مطلوبہ کارروائی ڈال کر کام بھی ہو جاتا اور اے ایس آئی کے بھی مزے آ جاتے۔

انتظار کے بوجھل لمحے گزرتے چلے گئے۔ آخر تاریک سڑک پر سوزوکی پک اپ کی سفیدی جھلکی۔ شہریار کو اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی لوگ بھی اسی کیفیت سے گزرے ہوں گے۔ البتہ اس کی بے چینی اس لیے سوا تھی کہ چاہنے کے باوجود وہ خود ایکشن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اعلیٰ عہدے اور اونچے مقامات بھی کسی گرداب کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے بیچ پھنسا آدمی اَن دیکھے دائروں میں قید خود ہی اپنے باحیثیت ہو کر بے بس ہونے کی اذیت سے گزرتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ اسی اذیت سے دوچار تھا۔ اس کی مہم جو فطرت کہتی تھی کہ میدانِ عمل میں اُتر کر خود کچھ کر گزرے۔ لیکن عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ خود پر بند باندھے رکھے۔ فی الحال اس نے یہی کیا اور ہونٹ بھینچے سڑک کا منظر دیکھتا رہا۔ سوزوکی پک اپ کو دیکھ کر پولیس جیپ کا انجن ایک دم ایکٹ کے ساتھ جاگ گیا تھا اور پولیس جیپ بہت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی سڑک کے وسط میں آ رُکی تھی۔ سامنے سے آنے والی سوزوکی پک اپ کو لامحالہ رُکنا پڑا۔ پک اپ کے رُکتے ہی اس میں سے شلوار قمیض میں

ئس ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والا دروازہ کھلول کر باہر نکلا۔ اے ایس آئی بھی جیپ سے اُتر آیا۔ ا
بعد سوزوکی ڈرائیور اور اے ایس آئی کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ ان دونوں کی آوازیں زیادہ بلند
اس لیے وہ لوگ اس گفتگو کو صرف بھنبھناہٹ کی صورت میں سن سکتے تھے۔ تاہم گفتگو کی نوعیت کا شہر
تھا۔ اے ایس آئی نے یقیناً سوزوکی ڈرائیور سے تلاشی کی بات کی تھی۔ ذرا سی پس و پیش کے بعد وہ
انظر آیا۔ اس کی رضامندی اور سکون نے شہریار کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک تو وہ شخص اکیلا
ے اس بات پر فکرمند بھی نظر آتا تھا کہ سوزوکی کی تلاشی کی صورت میں وہاں سے کوئی قابل اعتراض
ہو سکتی ہے۔ اے ایس آئی کے ساتھ موجود کانسٹیبل اس کے اشارے پر تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھ
تاہم دائیں طرف موجود دونوں سپاہی بدستور اپنی پوزیشن پر جمے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں سپاہیوں
لی پک اپ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ خاموش انجن والی وہ جیپ پیچھے سے کب نمودار ہوئی، انہیں اندازہ
ں ہو سکا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس آف تھیں اور ان لوگوں کی نگاہوں نے اسے اس وقت فوکس کیا تھا جب
ل قریب آ چکی تھی۔ اس جیپ کو سڑک پر سے گزرنے والے معمول کے ٹریفک کا حصہ قرار دے کر
گزرنے کا راستہ دیا جا سکتا تھا لیکن جیپ کے ڈرامائی انداز میں نمودار ہونے پر ہر شخص اپنی جگہ ٹھٹک گیا
پک اپ سے کافی پیچھے رک گئی تھی۔ تلاشی کے لیے آگے بڑھنے والے کانسٹیبلز بھی اپنی جگہ رک کر
رہے تھے۔ جیپ میں سوار لوگوں کے بارے میں جانے بغیر کوئی ردِعمل نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ اے
لی کے اشارے پر ایک کانسٹیبل شاید یہی جاننے کے لیے اس طرف بڑھنے لگا تھا لیکن دیکھتے ہی
صورتِ حال یک دم ہی بدل گئی۔ جیپ کی پچھلی نشستوں پر سوار افراد نے دائیں اور بائیں دونوں جانب
چھلانگیں لگائیں اور جیپ جس کا انجن ابھی تک بند نہیں کیا گیا تھا، تیزی سے متحرک ہو کر سڑک پر اس انداز
اڑی کھڑی کر دی گئی کہ جیپ سے چھلانگ لگا کر اُترنے والوں کو آڑ سی مل گئی۔ پھر فضا میں کلاشنکوف کا
چلنے کی آواز گونجی اور جیپ کی طرف بڑھنے والا سپاہی ایک جھٹکے سے اُلٹ کر پیچھے کی طرف گرا۔ یہ
کارروائی لمحہ بھر میں ہوئی تھی اور کوئی شخص بھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر پھر اے ایس آئی اور اس کے ساتھ
کانسٹیبل نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے خود کو پک اپ کی آڑ میں کر لیا تھا۔ پک اپ کا ڈرائیور بھی
دوران کہیں پناہ لے چکا تھا۔ اب پولیس والوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دونوں طرف
فائر بے سود جا رہے تھے اور کوئی بندہ ان فائروں کی زد میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں آگے جا کر پولیس والوں کی مدد کرتا ہوں سر!'' مشابرم خان کے پاس رائفل تھی اور وہ اسے استعمال
کرنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رُکا نہیں اور اپنی جانب موجود کانسٹیبلز کے
پہنچ کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ شہریار ابھی تک میدانِ عمل میں نہیں اُترا تھا لیکن اس کی نظریں ہر طرف
جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جذبات میں آ کر وہ ایک غلط قدم اٹھا چکا ہے۔ اسے ملے
گمنام خط اس کے کسی ہمدرد نے نہیں بلکہ دشمن نے لکھا تھا۔ اسے باقاعدہ منصوبہ بنا کر گھیرا گیا تھا۔ وہ
تیں بہت اچانک مجرموں کے سر پر پہنچ کر انہیں زک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا، خود گھر چکا تھا اور ایک
نقصان بھی اُٹھا چکا تھا۔ سڑک پر پڑی کانسٹیبل کی لاش اس کے نقصان کا ثبوت تھی۔ پھر ایک نقصان اور سامنے
آیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بیچ اُبھرنے والی انسانی چیخ بہت بھیانک تھی۔ قاتل اور مقتول دونوں اس
پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ گولی کھا کر گرنے والا جواں سال اے ایس آئی تھا۔ اس پر گولی پک اپ کے
نے چلائی تھی۔ وہ نہ جانے کس طرح پولیس جیپ کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پشت پر سے فائر کر



ں نے اے ایس آئی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس دوسرے نقصان کے بعد شہریار کے لیے میدانِ عمل سے دور رہنا
ممکن نہیں رہا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رینگ کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پک اپ ڈرائیور کی
طرف ریوالور کا رخ کر کے گولی چلائی۔ اس کی چلائی گولی ضائع نہیں گئی اور پک اپ ڈرائیور کی چیخ فضا میں
ابھری لیکن وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ گولی نے صرف پک اپ ڈرائیور کے بازو کو نقصان پہنچایا ہے۔ گولی کھا کر بھی
پک اپ ڈرائیور نے اپنی حرکت نہیں روکی تھی۔ غم اور غصے سے بے حال شہریار اسے نشانہ بنانے کے لیے جوش
میں اندھا دھند آگے بڑھا۔ اپنے اس جوش میں وہ اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں کو فائر
کرنا پڑا۔

''نیچے لیٹ جائیں سر!'' وہ ہاتھ سیدھا کر کے پک اپ ڈرائیور پر دوسرا فائر کرنا چاہتا تھا کہ مشابرم خان
کی آواز ایک جھٹکے سے اسے ہوش میں لائی۔ اس نے تیزی سے خود کو نیچے گرایا لیکن اس دوران کہیں سے وہ
ہو چکا تھا جو یقیناً اس کے جسم کے کسی حصے کو نشانہ بنا کر ہی کیا گیا تھا۔ لیکن اس فوری حرکت کی وجہ سے گولی
کے کسی حصے میں پیوست ہونے کے بجائے اس کے دائیں شانے کو رگڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس رگڑ کا نتیجہ بھی
تھیں درد کی صورت میں تھا۔ تاہم اسے اندازہ تھا کہ حماقت کے باوجود اچھی خاصی بچت ہو گئی ہے۔ اس
نے والے اس فائر کے بعد صورتِ حال تیزی سے بدلنے لگی۔ یوں لگا کہ سامنے والی پارٹی مقابلہ ختم کر
کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگلے دو منٹوں میں یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ مجرموں کی جیپ کا انجن زوردار
انداز میں غرایا اور پھر فضا میں ٹائروں کی چرچراہٹ گونجی۔ ان لوگوں کی طرف سے جیپ پر فائر کیے گئے لیکن
حرکت جیپ کا ڈرائیور بڑی مشاقی سے اسے موڑ کر واپس پیچھے کی طرف لے گیا۔ جیپ لمحہ بہ لمحہ ان کی نظروں
سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجرموں کی پک اپ اور پولیس
کی جیپ دونوں کے ٹائر فائرنگ کے نتیجے میں برسٹ ہو چکے تھے اور شہریار کی مرسڈیز کافی پیچھے کھڑی تھی۔ ویسے
بھی اب وہ مفرور مجرموں سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی فکر میں مبتلا تھا۔ کانسٹیبل کے بارے میں تو اسے یقین تھا
کہ وہ زندہ نہیں ہوگا۔ چیک کرنے پر اس یقین کی تصدیق ہو گئی۔ اے ایس آئی کی طرف سے جو موہوم سی اُمید
تھی، وہ بھی اس کی خاموش نبض نے توڑ دی۔ وردی پر ایک اور پھول سجانے کے شوق میں اس بے چارے کی
وردی گل رنگ ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ موجود کانسٹیبل البتہ زخمی ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اسے کوئی
جان لیوا زخم نہیں لگا تھا۔ گولیوں نے اس کے بازو اور ایک ٹانگ کو نشانہ بنایا تھا۔ ان زخموں سے خون کا اخراج
تھا لیکن امید کی جا سکتی تھی کہ طبی امداد ملنے پر وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

''اس کے زخموں پر کچھ باندھو مشابرم خان!'' اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے مشابرم خان کو حکم
دیا۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر وہ عبدالمنان کو جس ایمبولینس کے لیے کہہ کر آیا تھا، اب اسے اس کا انتظار تھا۔ اگر
ایمبولینس نہ آتی تو وہ وقت ضائع کیے بغیر اپنی گاڑی میں بھی زخمی کو لے کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن
ایمبولینس آ جاتی تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ایمبولینس میں ہی زخمی کو فوری طبی
امداد دے دی جاتی۔

''سر! آپ کو بھی زخم لگا ہے۔ میں آپ کے زخم کو دیکھ لیتا ہوں۔'' مشابرم خان سے پہلے کانسٹیبلز خود اپنے
ایک ساتھی کی مدد کے لیے پہنچ گئے تھے اس لیے وہ شہریار کے قریب آ کر اس سے بولا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تم ایسا کرو گاڑی لاؤ۔ اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر
ہسپتال کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ ایمبولینس کا تو کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔'' وہ اندر ہی اندر اپنی حماقت

اور ناکامی پر جھنجلایا ہوا تھا اس لیے شانے سے مسلسل ہونے والے خون کے اخراج کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں مشابرم خان کو حکم دیا۔ وہ بے چارہ تو حکم کا بندہ تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کے لیے میں کھڑی مرسڈیز کی طرف بڑھ گیا۔ مگر پھر مرسڈیز کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مخصوص سائرن بجاتی ہوئی ایمبولینس سڑک پر نمودار ہوئی اور ان لوگوں کے قریب آ کر رک گئی۔ ایمبولینس میں عبدالمنان موجود تھا۔ جائے وقوعہ کا منظر دیکھ کر کافی کچھ سمجھ چکا تھا۔

''سر! آپ زخمی کانسٹیبل اور مشابرم خان کو ساتھ لے کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو جائیں۔ میں یہاں کے معاملات نمٹاتا ہوں۔'' عبدالمنان کے اس مشورے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور چپ چاپ خود ایمبولینس میں جا بیٹھا۔ شدید قسم کا احساسِ شکست تھا جس نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اس لائق بھی نہیں پا رہا تھا کہ کچھ سوچ سمجھ سکے۔ البتہ اس کیفیت میں بھی اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ عبدالمنان سمجھ داری سے اس ساری صورتِ حال کو سنبھال لے گا۔

⊛----✪----⊛

جوتوں کی کھٹا کھٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور سجاد رانا اندر داخل ہوا۔ وہ سویلین ڈریس میں تھا لیکن ظاہر ہے، باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہی کے لیے بہ حیثیت ڈی آئی جی اس کی تکریم فرض تھی۔ سجاد رانا کی آمد سے لمحہ بھر پہلے سنائی دینے والی جوتوں کی کھٹا کھٹ یقیناً سپاہی کے زوردار سیلوٹ کا نتیجہ تھی۔

''کیا حال ہے؟'' بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے شہریار سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں۔ گولی بس چھو کر گزر گئی تھی اس لیے کچھ زیادہ گہرا زخم نہیں آیا۔ یہ تو ڈاکٹرز نے زبردستی روک رکھا ہے ورنہ میرے خیال سے تو میں بالکل فٹ ہوں اور گھر جا سکتا ہوں۔''

''ہر معاملے میں اپنی ذاتی رائے کے مطابق عمل کی کوشش مت کیا کرو۔ جو کام جس کا ہو، وہی کرے تو مناسب رہتا ہے۔'' سجاد رانا کا موڈ کچھ خراب تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''کیا ہوا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے حد درجہ سنجیدگی سے سوال کیا۔

''تفصیل تو کچھ خاص نہیں، بس میں ایک جگہ کا دورہ کرنے کے بعد واپس آ رہا تھا تو راستے میں کچھ نامعلوم لوگوں سے تصادم ہو گیا۔ وہ تو اتفاق ہی تھا کہ میں واپسی میں دیر ہو جانے کے امکان کے پیشِ نظر سکیورٹی کے خیال سے پولیس والوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اس لیے بچت ہو گئی۔ ان لوگوں نے بڑی جانفشانی سے حملہ آوروں کو مقابلہ کر کے انہیں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ شاید وہ مجھے ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ آپ پلیز خیال رکھئے گا کہ محکمے کی طرف سے ان لوگوں کو اس کارکردگی پر کوئی انعام وغیرہ دے دیا جائے۔ خاص طور پر ہلاک ہونے والے اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے لواحقین کے لیے مالی اعانت کا بندوبست ضرور ہونا چاہئے۔ میں نے ماموں جان سے بھی اس سلسلے میں بات کی تھی۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ کوشش کریں گے۔ پھر بھی چونکہ معاملہ آپ کے محکمے کا ہے، اس لیے میں آپ سے خاص طور پر درخواست کر رہا ہوں۔''

''حملہ آوروں نے تمہیں ٹارگٹ بنانے کی کیوں کوشش کی؟ تم سے انہیں کیا دشمنی تھی؟'' سجاد رانا نے اس کی بات توجہ سے سنی ضرور لیکن اس پر کسی قسم کا اظہارِ رائے کیے بغیر تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر سن کر فوری طور پر ہسپتال نہیں پہنچ سکا تھا اور فون پر



بات کر کے اپنی تسلی کر لی تھی لیکن اب فرصت میں اس کے پاس بیٹھا بال کی کھال نکال رہا تھا۔

''دشمنی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے میں اپنے ضلع میں جو کام کر رہا ہوں، اس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے..... بلکہ ہے۔ انہی لوگوں میں سے کسی نے مجھے تنبیہہ کرنے کے لیے یہ کارروائی کی ہو۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، حملہ آوروں کا مقصد مجھے قتل کرنا نہیں بلکہ صرف ڈرانا تھا۔ ورنہ وہ مجھ پر صرف گولی چلانے پر اکتفا نہیں کرتے۔'' وہ سجاد رانا سے حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اپنے اس خیال پر خود بھی یقین تھا کہ اس پر کیا جانے والا فائر ہلاکت خیز نہیں تھا۔ وہ جس بے دھڑک انداز میں باہر نکل گیا تھا، لوگ چاہتے تو آسانی سے اسے ختم کر سکتے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک گولی چلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''اب وہ بات بھی بتا دو جو تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتائی ہے۔'' سجاد رانا نے اسے گھورتے ہوئے حکم دیا۔

''سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔ آپ کس بات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ انجان بنا۔

''دیکھو شہریار! میں کوئی میڈیا کا بندہ نہیں ہوں کہ تمہاری بنائی ہوئی کہانی پر یقین کر لوں۔ بہت سے معاملات پہلے ہی میرے علم میں ہیں۔ تم مسلسل ایسی ایکٹیویٹیز میں انوالو ہو جو تمہیں سوٹ نہیں کرتیں۔ کبھی تم گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی کو سپورٹ کرنے کے لیے خوار ہوتے ہو تو کبھی لکڑیوں کی اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے میدان میں اُتر آتے ہو۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ اس قسم کا کوئی معاملہ تمہارے علم میں آئے تو تم اسے پولیس کے سپرد کر کے خود ایک طرف ہٹ جاؤ۔ اس طرح خود ہر معاملے میں بھاگ دوڑ کرنا اور اپنی جان خطرے میں ڈالنا کسی بھی طرح ہوش مندی کی بات نہیں۔ مجھے شک ہے کہ تمہارے ساتھ پیش آنے والا حادثہ بھی تمہاری اپنی کسی ایکٹیویٹی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ تو تمہارے آدھی رات کو کسی دورے سے آنے کی کوئی تک ہی نہیں بنتی۔ تم یہ مت سمجھو کہ میں تمہارے بے خبر رکھنے پر بے خبر رہ جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی سی کوشش سے سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔''

سجاد رانا کا لہجہ غصیلا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس غصے کے پیچھے ان کی گہری محبت چھپی ہوئی ہے اس لیے ذرا برا نہ مانا مگر ایس پی معظم تارڑ کے لیے جو غصہ اس کے اندر دبا ہوا تھا، وہ اس وقت باہر نہیں نکلتا، یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے رکھے تکیوں سے ٹکی اپنی پشت کو سیدھا کر کے بیٹھتے ہوئے قدرے تلخی سے بولا۔

''آپ کی پولیس اس لائق ہے ہی کب کہ میں کسی معاملے میں اس پر اعتبار کر سکوں۔ جنگل سے لکڑیوں کی اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے ایک اتنا زبردست موقع مجھے ملا تھا لیکن اس ایس پی کی نمک حرامی کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔ وہ خبیث شخص، پولیس کی وردی پہن کر مجرموں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی میں رِسک لینے پر مجبور ہوا تھا۔'' وہ سجاد رانا کو ساری تفصیلات سناتا چلا گیا۔

''اس طرح ایک گمنام خط پر کارروائی کے لیے دوڑ پڑنا بھی تمہاری حماقت تھی۔ تمہارے مخالفین تمہاری نفسیات کو سمجھ چکے ہیں اسی لیے انہوں نے تمہارے جذباتی پن کا فائدہ اٹھا کر تمہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ وہ تمہیں مار بھی دیتے اگر تم ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہوتے۔ انہیں معلوم ہے کہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم سب مل کر ان کا ناطقہ بند کر دیتے۔ لیکن انہوں نے تمہیں یہ پیغام ضرور دیا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے تم کچھ ہونے سے پہلے سنبھل جاؤ۔'' اس کے خاموش ہونے کے بعد سجاد رانا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''مگر میں انہیں بتا دوں گا کہ میں ان کے ہتھکنڈوں سے ڈر کر پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے انہیں کھل کھیلنے کا موقع ہرگز نہیں مل سکے گا۔''

''پھر وہی جذباتیت..... تم جس سیٹ پر ہو، وہاں اس جذباتیت سے کام نہیں چلتا۔ کچھ نہیں تو اوپر والے

اعتراض کر سکتے ہیں اس لیے میری مانو تو کچھ عرصہ خاموش رہ کر سکون سے کام کرو۔ میں اور پاپا مل کر
یں گے کہ تمہارے ضلع میں کچھ ایسی انتظامی تبدیلیاں کر دی جائیں کہ تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے والے
ادن مل جائے۔ یا پھر اگر تم کہو تو تمہارا کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کروا دیتے ہیں۔'' سجاد رانا نے اسے تسلی
کے ساتھ تسلی بھی دی اور ایک تجویز بھی پیش کی۔

''ہرگز نہیں۔ ٹرانسفر تو میں کسی صورت نہیں کرواؤں گا۔ میرے مخالفین کی تو سب سے بڑی خواہش
گی کہ مجھے کہیں اور ٹرانسفر کر دیا جائے لیکن آپ سب اس بات کو دھیان میں رکھئے گا کہ میری مرضی کے
ہر اکہیں ٹرانسفر نہ ہو سکے۔ میں واضح تبدیلی وقوع پذیر ہونے تک اپنی سیٹ پر جما رہنا چاہتا ہوں۔''

''او کے! نہیں ہوگا ٹرانسفر۔ لیکن تمہیں بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ سنبھل کر اور خود کو بچا کر کام کرو۔ بے
با اثر لوگوں سے براہِ راست ٹکر لینے سے جتنا بچ سکتے ہو، بچنے کی کوشش کرو۔ ورنہ وہ لوگ بھی اپنے تعلقات
ڈوریاں ہلا کر تمہارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ طاقت اور اختیار کے اس
میں کب کس طرف کا پلڑا جھک جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔'' سجاد رانا نے اسے یقین دہانی کروائی لیکن
تجربے کی روشنی میں نصیحت کرنے سے بھی باز نہیں آیا۔

''میں کوشش کروں گا۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔ تاہم جب وہ ہسپتال سے روانہ ہوا تو اسے
کہ شہریار نے کوشش بھی کی تو اپنے مزاج کی وجہ سے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

⊛----✪----⊛

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ویسے تو دن کا وقت ہے، اس لیے کسی پریشانی کی بات نہیں۔ پھر بھی تم
سے دروازہ بند کر کے رہنا۔ آنگن میں بھی زیادہ نکلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خبیث پرویز سارا وقت اپنے گھر
چھت پر چڑھا کبوتر بازی کرتا رہتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر خوامخواہ چھیڑ خانی کی کوشش کرے گا۔ میں نے
کہہ دیا ہے، اگر اسے موقع ملا تو اس طرف کا چکر لگا لے گا۔ ورنہ میں تو انشاء اللہ رات تک تمہارا کام نمٹا کر
آ ہی جاؤں گا۔'' چھوٹا سا سفری بیگ شانے سے لٹکائے عامر، ماہ بانو کو ہدایات اور تسلیاں ساتھ ساتھ
تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اپنے دفتر سے چھٹی لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب ماہ بانو کے کام سے جا رہا
پرویز کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس دن کی جانے والی حرکت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بے
سے اس کا مقابلہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ پرویز اپنی اس شکست پر آرام سے نہیں بیٹھے گا اور مسلسل
کوشش میں لگا رہے گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے یا ماہ بانو کو زک پہنچائی جائے۔ پرویز کی ایسی کسی حرکت سے
وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت اس کے گھر میں ایک امانت کی سی تھی اور وہ نہیں
تھا کہ اس کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ سرمد کو بھی وہ رات ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر چکا تھا۔ اس نے بھی اس
فیصلے کی تائید کی تھی بلکہ وہ عامر سے بھی زیادہ بے چین تھا کہ جلد از جلد خوامخواہ مول لی ہوئی اس ذمے داری
نجات حاصل کر لی جائے۔

''آپ میری طرف سے بالکل فکر نہ کریں۔ میں خالہ جی کے پاس ان کے کمرے میں ہی رہنے کی
کروں گی۔ ویسے بھی دن دن ہی کی تو بات ہے۔ دن بھر تو ویسے بھی آپ دفتر میں رہتے ہیں اور اللہ کا شکر
کہ سارا دن آرام سے بغیر پریشانی کے گزر جاتا ہے۔'' اس نے عامر کو تسلی دی تو وہ اپنی ماں کے کمرے میں
کر ان سے ملاقات کرنے لگا۔ انہیں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے کچھ اہم کاغذات وغیرہ



ایک دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ انہوں نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

''دھیان رکھئے گا، وہاں جا کر اے سی شہریار صاحب یا اُن کے پی اے کے سوا کسی سے نہیں ملنا۔ ان
سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیے گا۔'' عامر کے پیچھے دروازے تک جاتے
اس نے کئی بار کی ہوئی نصیحت ایک بار پھر دہرائی۔ عامر یا سرمد کو اس نے اپنے تمام حالات تفصیل سے
سنائے تھے۔ ان لوگوں کو بس اتنا علم تھا کہ وہ اپنے کچھ دشمنوں سے چھپتی پھر رہی ہے اور اس سلسلے میں اسے
شہریار وغیرہ کی سپورٹ حاصل ہے۔

''مجھے تمہاری ہدایت اچھی طرح یاد ہے۔ تم بے فکر رہو اور دروازہ بند کر کے اندر بیٹھنے کے بعد آرام سے
میرا واپسی کا انتظار کرو۔'' وہ اسے جواب دے کر باہر نکل گیا۔ اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی بسوں کے
اڈے کی طرف تھا۔ اڈے پر پہنچ کر اس نے پہلے ٹکٹ خریدا پھر ایک کیبن سے سگریٹ کا پیکٹ خریدنے کے بعد
اس کے سامنے لگے اسٹال سے آج کا اخبار بھی لے لیا۔ وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھار
کسی اہم خبر کے لیے اخبار خرید لیتا تھا۔ اس وقت اس نے راستے کی بوریت سے بچنے کے لیے اخبار لیا تھا لیکن
بس میں بیٹھنے کے بعد اسے بور ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر بے انتہا باتونی تھا جو
بے تکلفی سے اس سے باتیں کرتے ہوئے قصوں پر قصے سناتا جا رہا تھا۔ مسافر کا اندازِ گفتگو اتنا سادہ اور
تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ خود بھی اسے اپنے دفتر اور دوستوں کے متعلق کئی باتیں
سناتا رہا۔ اپنے خوش اخلاق ہم سفر کی وجہ سے اسے احساس بھی نہیں ہوا اور سفر تمام ہو گیا۔ ساتھی مسافر سے ایک
گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد وہ بس سے اُتر آیا اور اڈے پر موجود رکشوں میں سے ایک میں سوار ہو کر اُسے
ایم ایس صاحب کے دفتر پہنچانے کا کہا۔ لاہور کے بس اڈے سے خریدا ہوا اخبار رول کی شکل میں اب بھی اس
کے ہاتھ میں تھا۔ رکشے میں بیٹھے بیٹھے اس نے اخبار کو کھولا اور اس کا یونہی سرسری سا جائزہ لینے لگا۔ سرسری
انداز میں لیتی اس کی نظریں ایک تصویر پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہ تلاشِ گمشدہ کا اشتہار تھا جس میں تصویر میں موجود لڑکی
کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لیے ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اعلان کے ساتھ ایک
موبائل نمبر بھی موجود تھا جس پر لڑکی کے متعلق جاننے والا رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں اچھی
طرح جانتا تھا کیونکہ وہ اس کے گھر میں ہی مقیم تھی۔

''بھائی! ذرا تیز چلاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔'' اشتہار پڑھ کر وہ خود لالچ میں مبتلا نہیں ہوا تھا لیکن اسے
اندازہ تھا کہ وہ سارے لوگ جنہوں نے ماہ بانو کو اس کے گھر میں دیکھا تھا، ان میں سے کسی کی بھی نظر اگر اس
اشتہار پر پڑ گئی تو ایک لاکھ کے لالچ میں اس فون نمبر پر ضرور اطلاع دیں گے۔ اخبار میں گمشدگی کا اشتہار
اپنے والے لوگ اس کے خیر خواہ تھے یا دشمن، اس بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ
جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچ جائے جن کے بارے میں ماہ بانو کو حتمی یقین تھا کہ وہ اس کے سچے ہمدرد
اور خیر خواہ ہیں۔

⊛----✪----⊛

پھول کی پتیوں سے بھرا تھیلا گاڑی میں رکھنے کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کی طرف روانہ
ہو گیا۔ موتی والا کی موت کے باوجود ابھی اس کی ملازمت جاری تھی۔ موتی والا کے کزن نے کسی طرح اس
بات کی اجازت لے لی تھی کہ کوٹھی کے ایک دو کمرے اس کے چالیسویں تک کھلے رکھے جائیں اور اب وہ اپنے

عقیدے اور مسلک کے مطابق وقتاً فوقتاً ان کمروں میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کرواتا رہتا تھا جو اس کے بقیہ مطابق موتی والا اور اس کی بیوی کی مغفرت کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ مرنے والا اپنے ساتھ اپنے نامے میں جو لکھوا کر لے گیا تھا، اس کی بنیاد پر اللہ کے ہاں اس کا معاملہ ہوگا۔ اس حقیقت سے نظر مرنے والے کے لواحقین اپنے طور پر اس کوشش میں لگے ہی رہتے ہیں کہ کسی طرح جانے والے کے کوئی بندوبست کردیں کہ وہ جہنم کے شعلوں سے بچ کر جنت کے باغات میں جا نکلے۔ اس خواہش میں لوگ اپنی حد سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسے ایسے کام کرنے لگتے ہیں جو صریحاً خلافِ شرع ہوتے بعض اوقات ان ساری رسوم کے پیچھے مرنے والے سے محبت یا ہمدردی کے بجائے دنیا داری کے تقاضے بھی مقصود ہوتا ہے۔ موتی والا کا کزن اس دوسری کیٹگری کا بندہ تھا۔ آج بھی اس نے ایصالِ ثواب کے جانے کن کن مدرسوں اور مسجدوں کے مولویوں کو جمع کر کے ان کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے لوگ قبرستان بھی جانے والے تھے۔ پھول کی یہ پتیاں قبر پر ڈالنے کے لیے ہی منگوائی گئی تھیں۔

''میں پتیاں لے کر آ گیا ہوں۔ تُو بتا کہ اندر کا کیا حال ہے؟ کھانا وانا ہو گیا یا نہیں؟'' کوٹھی پہنچنے شاکر سے سامنا ہونے پر اس نے اس سے پوچھا۔

''کھانا اتنی جلدی کیسے ختم ہوگا؟ ایسی شان دار مرغی کی بریانی اور کڑاہی پک کر آئی ہے کہ جب تک نہیں ٹھونس لیں گے، کسی کا ہاتھ نہیں رکے گا۔'' شاکر نے جواب دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''چل جو بھی ہے، فی الحال تو ہماری نوکری چل رہی ہے۔ چالیسویں تک ہم بھی بھاگ دوڑ کر لیے کوئی نئی نوکری تلاش کر لیں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر ایک جگہ انٹرویو کے لیے جاؤں ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک سیٹھ صاحب کو اپنی بیوی کی گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور کی ضرورت ہے۔''

''ہاں بھئی۔ اب تو یہی کرنا ہے۔ کاش! صاحب کی مہمان لڑکی کا ہی کچھ پتہ معلوم ہوتا تو عیش ہو جاتے۔''

''کیا مطلب؟ کیا فائدہ ہونا تھا اس کا پتہ معلوم ہونے سے؟'' وہ شاکر کی بات پر چونکا۔

''آج کے اخبار میں اس لڑکی کی فوٹو آئی ہے۔ لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے لاکھ کا انعام ہے۔''

''کہاں ہے اخبار؟ مجھے بھی دکھا۔'' وہ بے چین ہوا۔

''میں نے سامنے گرل میں ہی اٹکا دیا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں ہی کبھی کبھی مار لیتا ہوں۔ پہلے خیال آیا تھا کہ صاحب کے کزن سے کہوں کہ اخبار بند کروا دیں۔ پھر سوچا کہ جس طرح بھر کے لیے ہماری روزی لگی ہوئی ہے، بے چارے اخبار والے کا بھی کچھ روز اور بھلا ہو جائے۔'' شاکر اور کچھ بول رہا تھا لیکن اس کی توجہ شاکر کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر تیزی سے گرل انٹکے ہوئے اخبار کی طرف بڑھ چکا تھا اور اب اخبار کھولے شاکر کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق کرنے کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اشتہار تلاش کر لیا۔ انعام کی رقم اور فون نمبر دونوں دیکھ کر اس کی آنکھیں لگیں۔ نیلم تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ کھلتا نظر آ رہا تھا۔

''یار شاکر! یہ گاڑی کی چابی رکھ۔ پھولوں کی پتیاں گاڑی میں ہی رکھی ہیں۔ مجھے نوکری کے لیے انٹرویو دینے جانا ہے۔ تُو صاحب سے بہانہ بنا دینا کہ میری طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اس لیے میں جلدی گھر گیا۔'' اخبار کا اشتہار والا صفحہ رول کر کے اپنے قبضے میں کرتے ہوئے اس نے عجلت میں گاڑی کی چابیاں شاکر کو تھمائیں اور کوٹھی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔



''یار! کہیں صاحب اس طرح جانے سے ناراض نہ ہوں۔'' شاکر نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ میرا جانا ضروری ہے۔'' وہ مڑے بغیر جواب دے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس علاقے میں کوئی پی سی او بھی نہیں تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں والے علاقے سے چل کر نکلتے ہوئے اس نے قریب واقع کمرشل ایریا کا رخ کیا۔ اس علاقے میں لگژری فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ ان فلیٹس کے سامنے مختلف شاپنگ اسٹور اور دیگر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اسے امید تھی کہ وہاں کسی سے پبلک کال کی سہولت مل جائے گی۔ اس کا یہ یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ ایک میڈیکل اسٹور پر اسے فون مل گیا۔ اس نے اخبار کھول کر اشتہار نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں دیا ہوا فون نمبر ملایا۔

''ہیلو!'' رابطہ ملنے پر ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔

''آج کے اخبار میں ایک لڑکی کی گمشدگی سے متعلق جو اشتہار چھپا ہے، وہ آپ نے ہی چھپوایا ہے؟'' کسی ہمدرد کی اطلاع فراہم کرنے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

''ہاں ہاں اشتہار ہم ہی نے دیا ہے۔ تم بولو، تمہیں لڑکی کے بارے میں کیا معلوم ہے؟'' دوسری طرف بے چینی سے پوچھا گیا۔

''کچھ نہیں۔ بہت کچھ معلوم ہے مگر کوئی بھی اطلاع دینے سے پہلے میں انعام کی رقم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ موتی والا کی کوٹھی سے یہاں تک کا فاصلہ طے کرنے تک مسلسل اپنا دماغ دوڑاتا رہا تھا اور اب طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق گفتگو کر رہا تھا۔

''انعام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ انعام تمہیں ضرور ملے گا۔ مگر پہلے تم کچھ بتاؤ تو۔'' وہاں لگتا تھا کہ صبر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

''انعام تو تمہیں دینا ہی ہوگا لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں انعام میں ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ روپے لوں گا۔'' اس نے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

''دو لاکھ..... یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' کرخت آواز والے نے اعتراض کیا۔

''زیادہ ہے تو رہنے دو۔ میں بھی اطلاع نہیں دوں گا۔''

''اچھا اچھا رُکو۔ ایسا کرو پانچ منٹ صبر کرو۔ میں مشورہ کرنے کے بعد تمہیں جواب دیتا ہوں۔'' اس کی بات پر وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم مشورہ کر لو۔ میں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا اور ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ کا وقت اتنا زیادہ نہیں ہوتا لیکن اسے زیادہ لگ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ پانچ منٹ کے اس وقفے میں کوئی دوسری کال آ جائے جو ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دیدے۔ آخر سرمد کے محلے میں کئی لوگ ماہ بانو کے صورت آشنا تھے۔ ان میں سے بھی تو کوئی یہ اشتہار دیکھ کر فون کر سکتا تھا۔ کسی اور کے اس مختصر وقفے میں فون کرنے کے خدشے کو وہ اس تسلی کے سہارے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب صبح سے اب تک کسی نے اشتہار دیکھ کر فون نہیں کیا تو اب کون اتنی سی دیر میں فون کر دے گا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ پانچ منٹ گزرے۔ اس بار اس نے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا فون استعمال کیا۔ دوسری طرف سے کال اسی پہلے والے نے ریسیو کی۔

''پھر کیا فیصلہ کیا تم لوگوں نے؟'' اس کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے لہجے کو ذرا رعب دار بناتے ہوئے کہا۔

''ہم راضی ہیں۔تم لڑکی کا پتہ بتاؤ۔''

''پتہ جاننے کے لیے تم پون گھنٹے بعد بھاٹی گیٹ پہنچ کر مجھ سے ملو۔ساتھ میں دولاکھ کی رقم بھی لانا۔''

''ٹھیک ہے۔لیکن ہم تمہیں پہچانیں گے کیسے؟'' اس کی بات سنتے ہی دوسری طرف سے بے چینی پوچھا گیا۔

''میں نے خاکی رنگ کی پتلون پر سفید قمیض پہن رکھی ہوگی اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی ہوگا۔''

خود پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنا حلیہ بیان کیا اور فون بند کر کے کال کی ادائیگی کرنے کے سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے بھاٹی گیٹ پہنچنے کے لیے اس کا لگایا ہوا اندازہ بالکل درست تھا۔ٹیکسی نے پون گھنٹے سے بس ایک آدھ منٹ اوپر ہی اسے وہاں پہنچایا۔ٹیکسی کا کرایہ دے کر وہ جیسے ہی نیچے اُترا، دو بندے لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ بیگ تھا۔

''تم ہی ہو نا ہمیں فون کر کے اطلاع دینے والے؟ تمہاری فرمائش پر ہم دولاکھ روپے لے کر آ گئے ہیں اب تم ہمیں لڑکی کا پتہ بتاؤ۔''

''پہلے رقم۔'' اس نے مطالبہ کیا۔ جواباً اس کے ہاتھ میں بیگ تھما دیا گیا۔اس نے بیگ کی زپ کھولی اندر جھانکا۔اندر رقم موجود تھی اور خاصی محسوس ہوتی تھی۔رقم گننے کا موقع نہیں تھا اس لیے اسے اندازے پر یقین کرنا تھا۔

''اب چلو.....اور ہاں، یاد رکھنا کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمارے بندے اردگرد موجود ہیں تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں لگنے والی گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے۔'' رقم سے بھرا بیگ دینے والے کا لہجہ بہت سرد تھا۔اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی لیکن رقم کے لیے اتنا رِسک تو لینا ہی تھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' خود کو بااعتماد ظاہر کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرتے ہی اسے احساس ہونے لگا کہ علاقے میں کچھ کشیدگی سی ہے۔جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے آپس میں باتیں کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس صورتِ حال کو نظرانداز کر گیا۔اسے اس علاقے میں رہنے والوں کے مزاج کے بارے میں واقفیت تھی۔ ذرا ذرا سے مسئلوں پر وہ لوگ اسی طرح ٹولیاں بنا کر گھنٹوں آپس میں تبصرے اور بحث کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ موجود بندوں کو لے کر آگے بڑھتا گیا۔ وہ چوکنے سے اس کے پیچھے چلتے رہے۔راستے میں انہوں نے ایک پولیس موبائل کو بھی دیکھا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے.....؟'' اس کے پیچھے چلتے ہوئے بندوں میں سے ایک نے غراہٹ آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

''میری طرف سے تو نہیں ہے۔اگر تم پولیس موبائل دیکھ کر کہہ رہے ہو تو غلطی پر ہو۔ پولیس تو کہیں بھی جا سکتی ہے۔لیکن کم از کم میں پولیس کو اس معاملے میں انوالو کر کے دولاکھ کی رقم سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا۔'' اس کا جواب مبنی برحقیقت تھا اس لیے وہ لوگ خاموشی اختیار کر گئے۔مگر عامر کی گلی کے کونے میں پہنچ کر وہ خود بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہاں پولیس والوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آ رہی تھی۔لوگوں کا بھی کافی ہجوم تھا۔ ہر چہرے پر خوف کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

''کیا ہوا بھائی؟.....کیا معاملہ ہے؟'' ہجوم میں نظر آنے والے ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر وہ اس سے



پوچھنے لگا۔ وہ عامر کی گلی کے کونے والے گھر میں رہنے والا ایک سبزی فروش تھا۔

''تم عامر کے دوست ہو نا؟'' بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے، اس شخص نے اس سے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔ میں عامر کا دوست ہوں۔لیکن آپ بتاؤ کہ یہاں کیا ہوا ہے؟ یہ اتنی پولیس کیوں جمع ہے؟ تم لوگوں کو گلی کے اندر کیوں نہیں جانے دے رہے؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''بہت برا حادثہ ہوا ہے بھائی! تمہیں شاید معلوم ہو کہ عامر کے پڑوس والے گھر میں پٹاخے، پھلجھڑیاں، دوسری بارود والی چیزیں بنتی تھیں۔ پتہ نہیں وہاں کس طرح آگ لگی اور سارا بارود لپیٹ میں آ گیا۔ دھماکے کی آواز اتنی زوردار تھی کہ ہمارے گھروں کی کھڑکیاں دروازے ہل کر رہ گئے۔ وہ کمبخت گلو خود تو مارا ہی گیا ساتھ میں دوسروں کو بھی لے ڈوبا۔ بے چارے عامر کے گھر کی دیوار تو اس کے بارود والے کمرے سے ملی ہوئی تھی۔گلو کے گھر کے ساتھ وہاں بھی تباہی آ گئی۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی لاشیں بھی ابھی ابھی پولیس والوں نے ملبے سے نکال کر ہسپتال بھجوائی ہیں۔تمہیں اگر عامر کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو اس قیامت کی خبر کر دو۔ بے چارے کی ایک ماں ہی تو تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔ گھر بھی تباہ ہو گیا۔ یہ پتہ نہیں معلوم ہوگا تو اسے بڑا صدمہ ہوگا۔صدمہ تو خیر سارے محلے کو ہے۔ اکٹھے تین بندے مر گئے۔لوگوں کا مال نقصان ہوا، وہ الگ ہے۔ پیچھے پرویز کے گھر کی دیوار بھی چیخ گئی ہے۔ برکت خالہ کے باورچی خانے کی چھت اڑ گئی ہیں۔کئی لوگوں کے گھروں میں شیشے کے برتن وغیرہ گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔'' وہ جانے کون کون سے نقصانات گنوا رہا تھا لیکن سرمد کا ذہن تو اپنے ہی نقصان میں اٹکا ہوا تھا۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی لاشیں ملبے سے نکلنے والی لاشوں کی اطلاع نے خود اس کے اپنے خوابوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ ملبے میں دبے ہوئے خوابوں کا ملبہ اس پر دھڑا دھڑ گرتا اسے کسی گہری قبر میں دفن کرتا جا رہا ہے۔ بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ جس میں دولاکھ کی رقم موجود تھی اس کی گرفت سے پھسلتا جا رہا تھا۔ وہ جس کا سودا کر کے اس دولاکھ کی رقم کا مالک بنا تھا، جب وہی نہیں رہی تھی تو یہ دولاکھ بھی کیسے اس کے رہ سکتے تھے؟ رقم لے کر فرار ہو جانے کا پلان بھی بے کار تھا کہ وہ دونوں منکر نکیر بنے سر پر ہی سوار تھے۔

دولاکھ کی رقم سے اس نے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر کے نیلم کے گھر والوں کو رشتے کے لیے راضی کر لے گا۔انہیں اس کے رشتے پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ تھا کہ وہ ایک ڈرائیور ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس نوکری کے مقابلے میں وہ اگر پرچون کی چھوٹی سی دکان بھی کھول لیتا تو روایتی سی سوچ رکھنے والے نیلم کے والدین کے لیے قابل قبول ہو جاتا لیکن اس ناگہانی حادثے نے اس کی ساری امیدیں توڑ دی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے وہاں پھرنے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ پولیس والوں کے علاوہ وہاں پر امدادی کارکن بھی نظر آ رہے تھے۔ایک چھوٹا سا گروپ میڈیا کے افراد کا بھی تھا جنہوں نے پولیس کے ایک آفیسر کو گھیر رکھا تھا۔ حادثے کو کسی بھی قسم کی دہشت گردی کی واردات کے بجائے اتفاقی حادثہ ثابت کرنے میں زور و شور سے مصروف اس پولیس آفیسر کو اس نے آسانی سے شناخت کر لیا۔ وہ رفیق کھوکھر تھا۔موتی والا کے کیس کا تفتیشی افسر۔ اگر وہ اسے یہاں دیکھ لیتا تو اس کے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ رفیق کھوکھر سے بچنے کے لیے وہ ہجوم سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس کے سر پر سوار منکر نکیر فوراً ہی ہوشیار ہو گئے۔

''کدھر.....؟'' ان میں سے ایک نے غراہٹ آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

''یہاں سے نکلو، پھر میں تم لوگوں کو ساری بات بتاتا ہوں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور قدم آگے بڑھا

دیئے۔

وہ دونوں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ عامر کے گھر سے کافی دور آنے کے بعد وہ ایک کر رک گیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

''معاملہ کیا ہے؟ کچھ منہ سے پھوٹو۔ تم تو ہمیں لڑکی تک پہنچانے والے تھے۔ لڑکی کہاں ہے؟ صاف بتاؤ۔'' ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ یقیناً لبریز ہو چکا تھا چنانچہ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں

''میں تمہیں لڑکی کے پاس ہی پہنچا رہا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ہے۔ اب میں تمہیں اس کے میں صرف خبر دے سکتا ہوں۔ تم نے اپنے اشتہار میں لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لاکھ کا اعلان کیا تھا۔ میں ان روپوں میں سے تمہیں ایک لاکھ واپس کر کے ایک لاکھ رکھ لیتا ہوں اور لڑکی بارے میں خبر دے دیتا ہوں۔'' عامر کی گلی کے کونے سے یہاں تک پہنچنے میں اس کے دماغ نے تیزی کیا تھا اور پوری کی پوری رقم سے محروم ہو جانے کے بجائے اس نے سوچا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ لگ ہی اس لیے اب وہ ان لوگوں سے نیا سودا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کیا ناٹک لگا رکھا ہے سالے! ہمیں تُو نے کیا سمجھا ہے جو اپنے اشاروں پر نچانے کی کوشش ہے؟'' اس کے مقابل موجود لوگ کوئی شریف قسم کے کاروباری بندے تو تھے نہیں کہ اس کی مرضی اور کے مطابق سودے بازی کرتے چلے جاتے۔ وہ فوراً ہی ہتھے سے اُکھڑ گئے اور ان میں سے ایک نے گدّی کو اپنے شکنجے جیسی انگلیوں میں جکڑ لیا۔

''چل، سیدھی طرح ہمیں لڑکی تک پہنچا دے۔'' وہ جہاں کھڑے تھے۔ اس طرف لوگوں کی آمد نہیں تھی اس لیے سامنے کھڑے بندے نے بلا تکلف اس کے منہ پر اپنا ہتھوڑے جیسا ہاتھ دے مارا۔

''اب میں تمہیں لڑکی تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں ایک لاکھ کا نقصان کیوں کرتا؟ میں ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ایک لاکھ واپس لے لو اور ایک لاکھ چھوڑ دو۔ بدلے میں، میں تمہارے کام کی بات بتا دیتا ہوں۔'' اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ خطرناک لوگ ہیں لیکن پھر بھی ایک لاکھ خاطر خطرہ مول لے کر ان سے کسی نہ کسی طرح معاملہ پٹانے کے چکر میں تھا۔

''تجھ سے کیا لینا ہے اور کیا دینا ہے، یہ فیصلہ ہم خود کریں گے۔ تُو سیدھی طرح یہ بتا کہ لڑکی کہاں ہے۔'' بڑی بڑی مونچھوں والے نے اپنی سرد آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو باہر نکال کر اسے کھولنے لگا۔ کڑکڑاہٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ چاقو کھل گیا اور اس کا چمک دار پھل اس نظروں کے سامنے لہرانے لگا۔ اس چاقو کے نظارے کے بعد سرمد کی ساری ہمت جواب دے گئی۔ اسے ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے مزید نہیں ٹِک سکے گا چنانچہ سہمے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''تمہیں جس لڑکی کی تلاش تھی، وہ میرے ایک دوست عامر کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں تمہیں دوست کے گھر ہی لے جا رہا تھا لیکن ابھی میرے ساتھ تم لوگوں نے بھی سنا ہوگا کہ بارود فروش پڑوسی میں ہونے والے دھماکے سے میرے دوست کا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے اور میرے دوست کی ماں کے ساتھ وہ لڑکی بھی اس حادثے میں مر گئی ہے۔'' اس کی دی گئی اس اطلاع پر وہ لوگ ایک ثانیے کے لیے دم بہ گئے پھر بڑی مونچھوں والے نے خود کو سنبھالا اور سختی سے پوچھا۔

''لڑکی وہاں کیسے پہنچی تھی؟''

''میں نے خود اسے وہاں پہنچایا تھا۔ میں موتی والا صاحب کا ڈرائیور ہوں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا



اپنے گھر میں لڑکی کی جان کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس لیے میں اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کے حکم پر ہی میں نے اس رات جب ان کا قتل ہوا، تب لڑکی کو اپنے دوست کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اتنے دنوں ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے کہ اب لڑکی کا کیا کریں؟ میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تو پیسوں کے لالچ اگر آپ کو فون کر بیٹھا۔ لیکن اب وہ بے چاری ہی زندہ نہیں رہی تو آپ کو کہاں پہنچاؤں؟'' سچ میں جھوٹ کرتے ہوئے اس نے ان لوگوں کو بتایا۔ یہ سب کہنے میں اسے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ کے شہریار سے ملاقات کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ لوگ یہ کہانی تیار کر چکے تھے۔ سرمد اس کو کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ موتی والا اور اس کی بیوی کے قتل والی رات وہ ان کی کوٹھی کی نیت سے موجود تھا۔ اس لیے یہ کہانی تیار کی گئی تھی۔ ماہ بانو نے بھی اس کہانی کی منظوری دیتے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو اصل حقیقت نہیں بتائے گی۔ چنانچہ اس وقت یہی کہانی اس کے کام آ رہی تھی۔

''تو ہمیں کہیں نہیں پہنچا سکتا۔ تُو چل پھُٹ کھا یہاں سے..... ان روپوں میں سے تجھے ایک پیسہ بھی نہیں ملے۔'' یہ جان لینے کے بعد کہ مرنے والی لڑکی ماہ بانو ہے اور سرمد اب مزید ان کے کام نہیں آ سکتا، انہوں نے کمر پر ایک زوردار لات مار کر اسے پرے دھکیلا اور نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ سنبھال کر وہاں سے چل سرمد کے اندر ہمت نہیں تھی کہ ان خوں خوار لوگوں کے پیچھے جا سکتا۔

⊛----✪----⊛

ملبے سے نکلنے والی دونوں عورتوں کی لاشیں بری طرح مسخ ہو گئی تھیں۔ ایک تو دیوار اور چھت کے گرنے ملبے نے دونوں کے جسم بری طرح توڑ پھوڑ ڈالے تھے، دوسرے رہی سہی کسر بارود کی وجہ سے لگنے والی نے پوری کر دی تھی۔ لاشیں تقریباً ناقابل شناخت ہو گئی تھیں۔ ان کی پہچان کے لیے قد و قامت اور کہیں لباس کے بچ جانے والے چیتھڑوں سے مدد لی گئی تھی۔ شناخت کا مرحلہ اتنا زیادہ دشوار اس لیے نہیں تھا تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ گھر میں موجود خواتین کون تھیں۔ بس ان دونوں خواتین کی لاشوں میں سے ایک عورت اور ایک جوان لڑکی کی لاش کو الگ الگ کرنا تھا۔ تو یہ کام باآسانی کر لیا گیا تھا۔ عامر نے واپس پہنچنے کے بعد دونوں لاشوں کی شناخت کے سلسلے میں تصدیق کر دی تھی۔ ماہ بانو کی لاش کی سب سے بڑی اس کی سیاہ چادر کے وہ چیتھڑے تھے جو وہ ہر وقت اوڑھے رہتی تھی۔ اور مرتے وقت بھی وہ اس کے جسم کا کر رہ گئے تھے۔ اپنے گھر پر گزرنے والی اس قیامت کی اطلاع عامر کو عبدالمنان سے ملی تھی۔ عبدالمنان کر اس نے ماہ بانو کی اپنے گھر موجودگی کی اطلاع دی تھی تو وہ اس اطلاع پر فوراً متحرک ہو گیا تھا۔ سب پہلے اس نے لاہور رانا ہاؤس میں مقیم شہریار کو اس بارے میں بتایا تھا اور پھر اس کے مشورے پر رفیق کھوکھر اسے داری سونپی تھی کہ وہ عامر کے گھر جا کر ماہ بانو کو اپنی تحویل میں لے لے۔ لیکن جو اباً پون گھنٹے بعد کھوکھر نے جو اطلاع دی تھی، وہ بہت اندوہناک تھی۔ غیر قانونی طور پر آبادی کے عین درمیان میں بیٹھ کر اشیاء کا کاروبار کرنے والے گلو کے بارودی ذخیرے میں لگنے والی آگ نے گلو سمیت عامر کی ماں اور سال ماہ بانو کی زندگیاں بھی چھین لی تھیں۔

اس حادثے کے بارے میں اطلاع ملتے ہی عبدالمنان نے مشابرم خان کے ساتھ عامر کو لاہور بھجوانے کا ہت کر دیا تھا۔ عامر، مشابرم خان کے ساتھ سیدھا مردہ خانے پہنچا تھا اور ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس مین سامنے اس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ لاشیں اس کی ماں اور ماہ بانو ہی کی ہیں۔ شناخت کا مرحلہ

طے ہونے کے بعد لاشیں ورثاء کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش کو عامر اپنے ساتھ
تھا جبکہ ماہ بانو کی لاش کو ایمبولینس میں پیر آباد روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے مر جانے کے بعد اب اس
چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ گاؤں سے نکلنے کے بعد موتی والا کی کوٹھی میں چھپی ہوئی
موتی والا نے ازخود اسے اپنے ڈرائیور سرمد کی مدد سے کسی خطرے کے پیش نظر اُس کے دوست کے گھر
دیا تھا۔ موتی والا کی اسی رات موت سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ واقعی اس کوٹھی میں کوئی خطرہ
لیکن یہیں سے بہت سی کہانیاں اور قیاس آرائیاں بھی جنم لے رہی تھیں۔ ماہ بانو کا موتی والا سے کیا تعلق
اپنے گاؤں سے کیوں بھاگی تھی؟ وہ موتی والا کی کوٹھی تک کیسے پہنچی تھی؟ اُس کی جان کو کس سے خطرہ در
موتی والا اور اس کی بیوی کو کس نے قتل کیا؟ ماہ بانو کی جس حادثے میں موت ہوئی، وہ واقعی کوئی حادثہ
نے اس کے قتل کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی؟..... بے شمار سوالات تھے جو اٹھائے جا رہے تھے
تمام افراد جن کو اس معاملے کی ذرا بھی بھنک تھی، اپنے ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ ان افراد میں شہریار بھی شامل
رفیق کھوکھر کی، کی گئی تحقیقات کے نتیجے میں اسے اس بات کا تو یقین ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کی موت کے
دشمن کا ہاتھ نہیں اور اس کی موت یقینی طور پر ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے۔ لیکن اس کی
نے اسے بہت رنجیدہ کیا تھا۔ وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد ان دنوں رانا ہاؤس میں کچھ عرصہ آرام
غرض سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسے ہی اسے حادثے کی اطلاع ملی، اس نے اپنی ممانی مسز آفرین کے روکنے
باوجود واپسی کا فیصلہ کر لیا اور اب ماہ بانو کی لاش کو لے جانے والی ایمبولینس کے ساتھ ساتھ اس کی گاڑی
دوڑ رہی تھی گاڑی کو مشابرم خان چلا رہا تھا۔ وہ خود اس حادثے پر بہت رنجیدہ تھا۔ وہ لڑکی جس کی زندگی
کے لیے اس کے دوست نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، وہ اس طرح مر گئی تھی تو یہ اس کے لیے بھی دکھ
تھا۔ شہریار کے چہرے سے البتہ اس کی اندرونی کیفیت کا صحیح طرح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ بالکل چپ
اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لاش کی شناخت بتانے والے نیلے پھولوں والی
چادر کے ٹکڑوں کو ضرور ملاحظہ کیا تھا لیکن لاش کا چہرہ دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ شاید وہ بھی یہ بات
کہ یہ خواہش بے سود ہے۔ گرنے والی اینٹوں کی ضرب اور آگ کے شعلوں سے مسخ ہو جانے والے
دیکھ کر سوائے تکلیف کے حاصل بھی کیا ہونا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتی اس کی گاڑی اور ایمبولینس اس کے
قریب پہنچ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ وہ اپنے دفتر پر رک گیا تھا جبکہ ایمبولینس کو ابھی پیر آباد تک
طے کرنا تھا۔ دفتر میں عبدالمنان نے اس کا استقبال کیا۔ وہ خود بھی اس حادثے سے متاثر لگ رہا تھا۔

''کیا حال ہے؟..... سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟'' اپنے دفتر میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس
عبدالمنان سے دریافت کیا۔

''یس سر! ایوری تھنگ اِز فائن۔ یہاں کے معاملات کے بارے میں، میں آپ کو فون پر مطلع کرتا
ہوں۔ ایس پی نے کوشش کی تھی کہ اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے قتل والے معاملے پر کوئی ایشو کھڑا کرے
زخمی سپاہیوں کے بیانات کی وجہ اسے موقع نہیں مل سکا۔ کچھ ڈی آئی جی صاحب کی مداخلت کی وجہ
اسے دبنا پڑا۔ آپ بتائیں، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ زخم ٹھیک تو ہے نا؟'' عبدالمنان نے بھانپ لیا
شہریار کی خاموشی کے پیچھے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے۔ لیکن ازخود اسے چھیڑنے کے بجائے گفتگو کو اس
سوال کا جواب دینے اور اس کی خیریت پوچھنے تک محدود رکھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اسی لیے چھٹی ختم کرا کے فوراً واپس آ گیا ہوں۔ اب ہمیں بہت تیزی سے



منصوبوں پر عمل کرنا ہوگا۔ میں اس بات کا بندوبست کر کے آیا ہوں کہ کم از کم اسکول اور صحت کے مراکز
میں ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پیر آباد والے اسکول کا کام تو بس مکمل ہی ہونے والا
اسکول مکمل ہو جائے تو اس کے افتتاح اور مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے کام ایک ساتھ انجام دے
جائیں گے۔'' اس نے تفصیل سے اپنے منصوبے کو بیان کیا۔

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے سر! ان منصوبوں پر جتنی جلدی عمل درآمد کیا جا سکے، اچھا ہوگا۔ ابھی حال ہی میں
میں ایک لڑکی کی بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے مری ہے۔ لڑکی کا نام نگار تھا۔ وہ ماہ بانو کی بڑی بہن
بے چارے غریب لوگوں پر آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ آگے پیچھے دو جوان لڑکیاں اپنی جان سے چلی گئیں
روانی میں عبدالمنان غلطی سے ماہ بانو کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ یہ ذکر سن کر شہریار پل بھر کو چپ ہوا اور پھر میز کی
میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

''اس طرف کی خیر خبر لے لینا عبدالمنان! تدفین کے سلسلے میں یا کسی اور معاملے میں ان لوگوں کو کوئی
ضرورت ہو تو ان کی مدد کر دینا۔''

''او کے سر! میں خیال رکھوں گا۔ اور کوئی حکم؟'' ہدایت کے جواب میں اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے
سے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے موتی والا کے وکیل سے بات کر لی ہے۔ بورڈ کے تینوں وکلاء
بڑے ہسپتال کے بجائے چھوٹے ہیلتھ یونٹس کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کل تم ہمارے منصوبے کی
تفصیلات کا ڈرافٹ تیار کر لینا۔ میں ایک آدھ دن میں بورڈ کے ممبران، انجینئرز اور کنٹریکٹر وغیرہ کی ایک
ارینج کروانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اخراجات کا تخمینہ لگا کر باقاعدہ کام کا آغاز کیا جا سکے۔'' وہ ایک بار
گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں کل دوپہر تک یہ کام نمٹا لوں گا۔'' اس بار عبدالمنان نے بھی احتیاط سے کام لیا اور ایسا
لفظ منہ سے نہ نکالا جو اس موضوع کو چھیڑنے کا سبب بنے جس سے وہ واضح طور پر گریز کرتا ہوا محسوس ہو
تھا۔

⊛----✪----⊛

چودھری افتخار اپنی حویلی میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ ماہ بانو کی موت نے ساری بازی ہی اُلٹ دی تھی۔ وہ
سیمیں بدن کو اپنی دسترس میں دیکھنے کا خواہش مند تھا اسے اس سے پہلے موت نے اپنے شکنجے میں دبوچ لیا
وہ جو خود موت کا ہرکارہ بنا لوگوں میں موت بانٹتا پھرتا تھا، جس کے حکم سے اس کے کارندے لمحوں میں اس
دشمنوں کی زندگی کا چراغ گُل کر دیتے تھے، خود موت کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا۔ اب چاہے وہ دنیا اُلٹ
کر رکھ دیتا لیکن ماہ بانو اس کے ہاتھ نہیں آنے والی تھی۔ ماہ بانو کو حاصل کرنے کے لیے اس کے سارے دعوے
دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوگا۔ بالے کی طرف
سے یہ اطلاع ملنے پر کہ اشتہار کے نتیجے میں ایک شخص کی طرف سے کال آئی ہے کہ وہ لڑکی کے ٹھکانے سے
واقف ہے اور وہ شخص دو لاکھ کے عوض انہیں اس ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہے، وہ خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔ اور فوری
پر دو لاکھ کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ دو لاکھ اس کے لیے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور
اس لیے بھی کہ اس معمولی رقم کے بدلے اسے نہ صرف ماہ بانو مل جاتی بلکہ وہ شہریار کو بھی شکست سے دوچار کر

دیتا۔ لیکن جب بالے کی طرف سے اگلی خبر آئی کہ ماہ بانو ایک حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہوگئی ہے تو اس
دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ وہ فون پر ہی بہت دیر تک بالے پر گرجتا اور اسے گالیاں دیتا رہا۔ لیکن اس سب سے
حاصل ہونا تھا؟ حقیقت تو بہرحال اپنی جگہ موجود تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''غیاثے کی کُڑی کی کی لاش پہنچ گئی ہے سرکار! ابھی ابھی ایک بندہ خبر لے کر آیا ہے کہ لاہور
ایمبولینس لاش لے کر آئی ہے۔ کہتے ہیں لاش کی حالت بڑی خراب ہے۔ ایک آدھ بندے نے ہی چہرہ
ہے اور دیکھ کر کان پکڑ لیے ہیں۔ غیاثے کی برادری کے بزرگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کسی کو لاش کا چہرہ
دیکھنے دیں گے۔ سنا ہے نوراں بڑی تڑپ رہی تھی اپنی دِھی کے چہرے کو دیکھنے کے لیے لیکن عورتوں نے
پکڑ کر قابو میں کر رکھا ہے اور اسے لاش کے قریب نہیں جانے دے رہیں۔ لاش کو کفن تو لاہور سے ہی پہنا
بھیجا گیا ہے، یہاں قبر تیار ہوتے ہی اسے دفنا بھی دیں گے۔'' منشی اللہ رکھا اجازت لے کر اندر آیا اور چودھری
کو مفصل رپورٹ سنائی۔

''تدفین کے بعد حویلی سے غیاث محمد کے گھر کھانا بھجوا دینا اور اس سے کہنا کہ مجھ سے آ کر ملے۔'' ساری
ساری بات سننے کے بعد اس نے اسے حکم دیا۔

''بہتر چودھری صاحب! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ غیاث محمد تو خوش ہو جائے گا کہ آپ نے
معاف کر دیا ہے۔'' منشی خوشامدی لہجے میں بولا۔

''میں نے غیاثے سے کہا تھا کہ اس کی دِھی زندہ یا مردہ کسی بھی صورت میں مجھے ملے گی، تب ہی اس
خلاصی ہوگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی بات پوری کروں۔ ویسے بھی اس معاملے میں مجھے اصل حساب
غیاث محمد سے نہیں، دوسروں سے لینا ہے۔ غیاث محمد کی کیا حیثیت ہے کہ میرا اس سے کوئی حساب کتاب ہو
حساب تو ان کو دینا ہوگا جو دوست بن کر پیچھے سے دشمنی نبھاتے رہے ہیں۔ موتی والا کا معاملہ تو بالکل کھل
سامنے آ گیا ہے۔ جس بندے نے بالے کو ماہ بانو کے بارے میں خبر دی تھی، اس نے بھی یہی بتایا ہے کہ
اتنے دنوں سے موتی والا کے گھر چھپی ہوئی تھی۔ وہاں اسے کس نے پہنچایا، میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔
والا تو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، اب میرے اس دوسرے دشمن کو بھی حساب دینا ہوگا۔ میں اسے چھوڑوں
ہرگز نہیں۔ اسے پتہ چل جائے گا کہ اس نے چودھری افتخار عالم شاہ سے بیر لیا تھا۔'' چودھری بہت غضب میں
منشی جانتا تھا کہ اس کے غصے کا رخ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اپنی نمک خواری جتانے کو بڑے جوش سے بولا

''آپ فکر نہ کریں سرکار! آپ کی آن پر ہم سب اپنی جانیں نچھاور کر دیں گے۔ آپ بس صرف اشارہ
دیں، پھر دیکھئے گا کہ آپ کے دشمن کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

''ابھی کچھ نہیں کرنا۔ ابھی جو میں نے اس بچونگڑے کو پہلا سبق دیا ہے، اس کا نتیجہ سامنے آنے دے
میرے خیال میں تو جس مامے کی گود میں بیٹھ کر وہ مجھ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ ماما خود ہی اسے سمجھا
گا کہ چودھری افتخار سے کھیلنا بچوں کے بس کی بات نہیں۔ اگر وہ اپنے مامے کی بات سمجھ گیا تو اس کے حق
بہتر ہوگا۔ میں تھوڑی بہت چوٹ دے کر اسے معاف کر دوں گا۔ لیکن اگر وہ نہیں سمجھا تو پھر سارے اگلے
حساب دینا ہوں گے۔'' چودھری کا عجیب حال تھا۔ ایک طرف اس کا دل چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو خود سے چھین
کے جرم میں شہریار کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مگر پھر اس غصے پر مصلحت پسندی حاوی ہونے لگتی تھی اور
سوچتا کہ براہِ راست تصادم کے بغیر ہی کسی طرح بات بن جائے تو اچھا ہے۔ شدید غصے کے ساتھ ساتھ
مفادات کے تحفظ کا خیال اسے کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔



''جیسا آپ حکم دیں گے، ویسا ہی ہوگا سرکار! ہم تو آپ کے نمک خوار اور حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خوشی
میں ہوگی، ہم وہی کریں گے۔'' مزاج شناس منشی نے ایک بار پھر اسے مکھن لگایا۔

''ٹھیک ہے اوئے! مجھے معلوم ہے تم لوگوں کی وفاداری کا۔ اب جا یہاں سے اور جو میں نے کہا ہے وہ
میں بھی اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔'' منشی کی خوشامد کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے اُس نے
پھٹکار سے نوازا۔ اس کا موڈ دیکھ کر منشی چپ چاپ باہر نکل گیا۔

چودھری اپنے شان دار بستر پر آ لیٹا۔ تکیے کے نیچے اب بھی ماہ بانو کی تصویریں رکھی تھیں۔ اس نے
یں نکالیں اور ایک نظر دیکھنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ وہ کوئی اس کے عشق میں مبتلا نہیں تھا کہ
ات ان تصویروں کو اپنے سینے سے لگا کر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔ یہ تصویریں تو اس نے اپنا آتشیں شوق
انے کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔ تصویروں کو دیکھ کر وہ اس تصور سے خود کو بہلاتا رہتا تھا کہ جب یہ ہرنی کی
ح قلانچیں بھرتی، چاندنی جیسی رنگت اور ترشے ہوئے بدن والی لڑکی اس کی خلوت میں آئے گی تو وہ کس
ح اسے برتے گا۔ اب جبکہ یہ امکان ہی سرے سے ختم ہو گیا تھا تو تصور کی دنیا سجا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت
؟ دل بہلانے کے لیے اس کے پاس اور بھی بہت ذرائع تھے۔ تصویروں کے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ ٹیلی
ن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی انگلیاں حُسن کی دکان چلانے والی اس نائیکہ کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں جو اس
ارا اسے اشارے پر ایک سے بڑھ کر ایک ہیرا چن کر اس کے ڈیرے پر بھجوا دیتی۔ ماہ بانو کا غم غلط کرنے
لیے اس کی عیاش فطرت نے اسے یہی راہ دکھائی تھی۔

⊛----✪----⊛

شہریار نے طائرانہ نظروں سے مصروفِ عمل مزدوروں کا جائزہ لیا۔ وہ بہت تن دہی سے اسکول کے نو تعمیر
کمروں میں رنگ و روغن کا کام کر رہے تھے۔ کام کی رفتار بے حد تسلی بخش تھی اور اسے امید تھی کہ دو دن بعد
اسکول کی افتتاحی تقریب منعقد کی جائے گی تو نہ صرف سارا کام مکمل ہو چکا ہوگا بلکہ کاٹھ کباڑ سمیٹ کر
ائی وغیرہ بھی کر دی جائے گی۔ اپنے اسی خیال کا اظہار اس نے ساتھ کھڑے ماسٹر آفتاب سے بھی کیا۔

''کام تو بہت اچھے طریقے سے ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں دو دن تک سارا کام مکمل ہو جائے گا۔''

''دو دن نہیں سر! اِن شاء اللہ کل شام تک رنگ و روغن اور صفائی کا کام مکمل ہو جائے گا۔ پرسوں صبح یہاں
ل کے لیے ڈیسکیں اور میزیں کرسیاں بھی پہنچ جائیں گی۔ بچے نئی کلاسوں اور فرنیچر وغیرہ کے خیال سے
ے خوش ہیں۔ اس وقت ان میں اتنا جوش بھرا ہوا ہے کہ باقی کے سارے کام ہم ان کی مدد سے ہی مکمل کروا
گے۔'' ماسٹر آفتاب کی اپنی آواز میں بڑا جوش تھا۔

''فرنیچر؟..... میں نے تو اس سلسلے میں کوئی آرڈر نہیں دیا تھا۔ کیا عبدالمنان نے اسکول کے لیے فرنیچر کا
م کیا ہے؟''

''نہیں سر! اصل میں، میں نے خود ہی فرنیچر کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔ اپنی کتاب کی اشاعت کے
ے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی تھا۔ بس اسی کی رائلٹی کا چیک ملا تھا تو میں نے سوچا کہ اس رقم سے اسکول
لیے فرنیچر کا انتظام کر دیا جائے۔'' ماسٹر آفتاب نے شرماتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو آفتاب! اتنے سارے بے ایمانوں اور لٹیروں کے درمیان تم جیسے شخص کو دیکھتا
تو میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور کچھ کر دکھانے کی اُمنگ نئے سرے سے جاگ اُٹھتی ہے۔'' اس نے بے ساختہ

ہی آفتاب کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''میں تو اپنے حصے کا فرض انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں سر! بس خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کا قدردان شخص کا ساتھ میسر آ گیا ہے۔ افتتاحی تقریب کے لیے میں نے اپنے ساتھی ٹیچر کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کی ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ اس پر آپ سے رائے لے لوں تاکہ کوئی کمی محسوس نہ ہو۔'' آفتاب نے عاجزی سے جواب دیتے ہوئے گفتگو کا رخ دو دن بعد ہونے والی تقریب کی طرف موڑ دیا۔

''مجھے اس سلسلے میں تمہاری صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے، بطور صحافی تمہارا مشاہدہ بہت وسیع اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسے مواقع پر کس قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اپنی تسلی کے لیے چاہو مجھے بتا بھی سکتے ہو۔''

''میرا مشاہدہ اور تجربہ اپنی جگہ لیکن یہاں جو انتظامات کیے گئے ہیں، وہ اپنے بجٹ کو اور دستیاب سہولیات کو سامنے رکھتے ہوئے محدود پیمانے پر کیے گئے ہیں۔ میں نے اس بات کا انتظام کر لیا ہے کہ اسکول کی عمارت، ڈسپنسری کے اردگرد کے علاقے اور پیرآباد کے داخلی راستے پر کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جائیں۔ عام اور خاص راستوں پر ہم چونا ڈال کر اسے صاف کرنے کا انتظام بھی کر لیں گے۔ بچوں کی مدد سے چھوٹا سا ورائٹی بھی ارینج کر لیا جائے گا۔''

''مخالفت اپنی جگہ، نام بنانے کا موقع اپنی جگہ۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں چودھری کی حویلی جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ازخود ہمیں پیشکش کرے گا کہ آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات اس کی حویلی میں کی جائے۔ باقی اخراجات کی طرف سے بھی تم فکرمند مت ہونا۔ آرام سے خرچہ کرو اور سارا حساب کتاب بنا کر مجھے دے دو۔ اس خرچے کی وصولیابی میں اس موبائل کمپنی کے مالکوں سے کروں گا۔ سرکاری زمین پر اپنی کمپنی کا ٹاور نصب کرنے کے سلسلے میں ان پر جو حساب کتاب بنتا ہے وہ الگ ہے۔ میں ایک دوسرا کھاتہ اسٹیج پر ان کی کمپنی کا بینر لگوا کر کھلوا لوں گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ کمرشل ازم کا زمانہ ہے۔ موبائل کمپنی والے خوشی سے اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ اپنے بینرز لگوا کر بدلے میں ہمیں ٹھیک ٹھاک رقم ادا کر دیں۔ اس تقریب کی کوریج پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں طرح کے میڈیا پر ہونی ہے۔ موبائل کمپنی والے اپنی پبلسٹی کا یہ موقع ہرگز بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔'' شہریار کے جواب سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کا ہوم ورک بالکل مکمل ہے۔ کیوں نہ ہوتا۔ آخر کو وہ ایک بیوروکریٹ تھا جس کی پرورش بیوروکریسی اور سیاست کے دوآتشہ ماحول میں ہوئی تھی۔

''یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے سر! اب آپ دیکھئے گا کہ تقریب کا کتنا اچھا انتظام کرواتا ہوں میں۔'' وہ حسبِ عادت پُرجوش ہو گیا۔ پھر ایک طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیجئے، وہ لوگ بھی واپس آ گئے۔'' شہریار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کچے راستے پر اسی جانب ہی دوڑتی ہوئی آنے والی گاڑی اس کے اپنے دفتر کی تھی۔ اس گاڑی میں عبدالمنان، آفتاب کا ساتھی ٹیچر منیب اور وہ ٹھیکیدار سوار تھا جس سے مرکزِ صحت کی تعمیر کے سلسلے میں ان لوگوں کا کنٹریکٹ ہوا تھا۔ وہ لوگ اس پرانی ڈسپنسری کا جائزہ لینے گئے تھے جسے وسعت دے کر مرکزِ صحت کی نئی اور جدید عمارت تعمیر کی جانی تھی۔

''ڈسپنسری کی عمارت تو بڑی خراب حالت میں ہے۔ ایک تو دیکھ بھال صحیح طرح نہیں ہوئی، دوسرے عمارت میں میٹریل بھی اچھا نہیں لگا ہوا اس لیے جگہ جگہ دیواروں میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ چھت کی حالت بھی ایسی ہے کہ مجھے یقین ہے بارشوں کے موسم میں چھت بری طرح ٹپکتی ہو گی۔ اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو



اس عمارت کو بلڈوز کر کے مکمل نئی عمارت بنائی جائے تاکہ کام پکا ہو۔'' گاڑی ان کے قریب آ کر رُکی تو ڈرائیور گاڑی سے اُترتے ہی بولنا شروع ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ تھا۔ اسی لیے میں نے آپ کو خاص طور پر اس رپورٹ کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی نظروں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے، اب اس کے مطابق تیاری شروع کر دیں۔ جنرل صاحب کے ہاتھوں سنگِ بنیاد رکھے جانے کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز کرنا ہو گا اور تیزی سے مکمل بھی کرنا ہو گا۔ آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تو ہم اپنے اگلے کنٹریکٹس بھی آپ کے ساتھ کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ بات تو میں نے آپ پر پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ یہ کوئی سرکاری کنٹریکٹ نہیں ہے اس لیے سارے کام کا بہت سختی سے جائزہ بھی لیا جائے گا اور پورا حساب کتاب بھی رکھا جائے گا۔''

''بالکل جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنا کام ایمان داری سے کر کے حلال روزی کمانے والا بندہ ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شہریار کی بے حد سختی سے کہی گئی بات پر ٹھیکے دار نے زور و شور سے یقین دلایا۔

''عبدالمنان! تم اس کی روانگی کا انتظام کر دو۔ ہمیں یہاں ابھی کافی وقت لگے گا۔ ٹھیکے دار صاحب مصروف آدمی ہیں، انہیں واپسی کی جلدی ہو گی۔'' ٹھیکے دار کی یقین دہانی پر کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس نے عبدالمنان کو ہدایت دی۔

''میں چائے تیار کرتا ہوں سر! آپ لوگ چائے پی کر جائیے گا۔'' ان لوگوں کو جانے کے لیے پَر تولتے دیکھ کر ماسٹر آفتاب نے جلدی سے پیش کش کی۔

''نہیں بھئی۔ فی الحال ان تکلفات میں پڑنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔ ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ اگر ٹھیکے دار صاحب چاہیں تو تم انہیں چائے پلا سکتے ہو۔''

''نہیں، نہیں۔ میں بھی اب چلوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے ٹھیکے دار کی طرف دیکھا تو اس نے بھی جلدی سے معذرت کر لی اور وہاں موجود لوگوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ان لوگوں نے بھی ماسٹر آفتاب اور منیب سے رخصت لی۔ حسبِ پروگرام ان کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ چودھری سے لاکھ اختلافات اور عداوت کے باوجود اس موقع پر اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ علاقے کا سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والا بندہ تھا۔ پیرآباد میں کچھ کیا جاتا اور اس میں چودھری کی شرکت نہ ہوتی، یہ ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں دو دن بعد ہونے والی تقریب کے سلسلے میں لازماً اسے باقاعدہ اطلاع دینی تھی۔

''ذرا یہاں روک لو۔'' وہ لوگ اسکول سے حویلی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھے کہ راستے میں دکھائی دینے والی گاؤں کی اکلوتی مسجد کو دیکھتے ہوئے شہریار نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ وہ کافی عرصے سے اس امام کا خواہش مند تھا کہ مسجد کے پیش امام سے ملاقات کر سکے لیکن ہمیشہ پیرآباد آنے پر دیگر معاملات میں اس طرح الجھ جاتا تھا کہ اس ملاقات کا موقع ہی نہیں نکل پاتا تھا۔ اپنے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اس وقت اس نے امام مسجد سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مسجد کے قریب لے جا کر روکی تو شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔ مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور اس سمت بڑھ گئے جہاں سے بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ مسجد بہت زیادہ بڑی

نہیں تھی لیکن اس کی تعمیر اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔ آوازوں کے تعاقب میں وہ جس دروازے تک پہنچا ایک ہال نما کمرے میں کھل رہا تھا۔ دروازے پر ہی رک کر انہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔ فرش پر بچے ایک میں بیٹھے ہل ہل کر اپنے سامنے رکھے سپاروں سے سبق پڑھ رہے تھے۔ نسبتاً اونچی مسند پر ایک صحت مند بیٹھا ہوا تھا۔ آدمی کا رخ بچوں کی طرف تھا اور دروازے سے جھانکنے پر ان لوگوں کو اس کی صرف پشت نظر آ تھی۔ اس آدمی کے بائیں جانب ایک بچہ کھڑا اس کا بازو دبا رہا تھا۔

''الیا سا نہیں آیا آج بھی۔ جا کر بول دینا اس کے ماں پیو کو..... اگر اب اس نے ایک دن بھی اور تو میں چھتر سے اس کی وہ دھنائی کروں گا کہ کھال اُتر جائے گی سالے کی۔ جس دن سے بہن مری نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ لگتا ہے بہن کے ساتھ خود بھی قبر میں جا کر دفن ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے اپنے گھر میں ہی تر نوالے مل رہے ہیں، اس لیے ادھر کا رخ نہیں کر رہا۔ جب گھر میں فاقے پڑ رہے تو دوڑ دوڑ کر میرے پاس آتا تھا۔'' وہ بہت قہر ناک لہجے میں بول رہا تھا مگر پھر شاید اس نے اپنے سامنے بچوں کی توجہ دروازے کی طرف محسوس کر لی اور خود بھی پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ باقاعدہ ملاقات نہ ہونے باوجود شہریار اور عبدالمنان کے چہرے اس کے لیے نامانوس نہیں تھے۔ عرس کے موقع پر وہ ان لوگوں کو دیکھ تھا۔ اب جو اس نے انہیں وہاں موجود پایا تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''آیئے آیئے، تشریف لایئے۔ میری خوش قسمتی کہ آج آپ لوگوں نے اس جگہ کو رونق بخشی۔'' اس انداز اتنا فدویانہ تھا کہ لگتا تھا، اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔ ہاتھ ملانے کے لیے اس نے شہریار کا ہاتھ تھاما تو پھر چھوڑا ہی نہیں اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنی مسند تک لے گیا۔

''تشریف رکھیے۔'' شہریار کا ہاتھ تھامے تھامے ہی اس نے زبردستی اسے مسند پر بٹھانے کی کوشش کی۔

''نہیں مولوی صاحب! میں نیچے ہی بیٹھوں گا۔ بچے قرآن لے کر نیچے بیٹھے ہوئے ہیں، میرا اوپر مناسب نہیں۔'' وہ مولوی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کے قریب ہی نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کی اس حرکت پر کسمسا ہوئے مولوی نے بھی پیروی کی اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے زحمت دی ہوتی جناب! میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔''

''نہیں مولوی صاحب! آنا تو مجھے ہی تھا۔ بس وقت کی قلت کی وجہ سے اب تک آ نہیں سکا تھا۔ لیکن بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں آپ سے ملاقات کر لوں۔'' مولوی کا خوشامدانہ انداز اسے کوفت میں مبتلا کر لیکن پھر بھی وہ اسے عزت دے کر ہی بات کر رہا تھا۔ خاص طور پر یہاں آتے ہی اس نے مولوی کی جس کی زبان سنی تھی اور اسے جس انداز میں بیٹھے دیکھا تھا، یہ دیکھ کر اس کا دل بہت خراب ہوا تھا لیکن وہ اس سے بھی واقف تھا کہ اس قسم کے دیہی ماحول میں مولویوں وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے میں خود بہ خود ہی ذرا سا تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔

''آپ حکم کیجیے جناب! آپ کے حکم کی تعمیل کر کے مجھے دلی خوشی ہو گی۔''

''حکم نہیں۔ بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دو دن بعد گاؤں میں اسکول کے افتتاح اور مرکزِ صحت کے بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ تقریب کا آغاز اللہ کے بابرکت نام سے ہو لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ تقریب میں تشریف لا کر تلاوت قرآن پاک کر دیجیے گا۔'' یہ کوئی ایسا کام نہیں جس کے لیے وہ خود چل کر مولوی کے پاس آتا لیکن مسجد کے مولوی کی گاؤں کے ماحول میں اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اس سے تعلقات بہترین رکھنے کا خواہش مند تھا۔ دوسرے اسکول اور مدرسے کے درمیان پائی جانے



والی تلخی کو بھی اس موقع پر ختم کرنا ضروری تھا اس لیے وہ خود سے چل کر یہاں آیا تھا۔

''آپ کہتے ہیں تو میں آ جاؤں گا۔ ویسے ذاتی طور پر میں اسکول کو پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کون ہیں یہ لوگ جو انگریزی تعلیم کے ذریعے گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' مولوی صاحب نے فوراً ہی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے مولوی صاحب! اسکول میں ایسی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی جس سے بچوں کے ایمان کو کوئی خطرہ ہو۔ آج کے دور میں بچوں کو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ سرسید کے دور کی کیا بات ہے، سرسیّد احمد خان جیسے لیڈر نے تو برسوں پہلے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنی ہے تو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرنی ہو گی۔'' اس نے انہیں قائل کرنے کے لیے دلیل دی لیکن مولوی اتنی آسانی سے قائل ہونے والا بندہ نہیں تھا، اس کی دلیل سن کر فوراً بولا۔

''اس وقت کی بات چھوڑیں جناب! وہ وقت الگ تھا۔ تب ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ لیکن اب تو ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے ملک میں اپنی مرضی کی تعلیم اپنے بچوں کو دیں۔''

''وقت ابھی بھی نہیں بدلا مولوی صاحب! ابھی ہماری آزادی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی ہمیں اپنے لوگوں کے ذہنوں کو آزاد کروانا ہے۔ لیکن اس وقت آپ اس ساری بحث کو جانے دیجیے اور مجھ سے تعاون کیجیے کہ مدرسے کے اوقات کچھ اس طرح طے کر لیں کہ مدرسے اور اسکول کے اوقات کے درمیان تصادم نہ ہو اور بچے دونوں کر سکیں۔'' شہریار نے بحث کے بجائے برسرِ مطلب آنا زیادہ مناسب سمجھا۔

''مدرسے کے اوقات بدلنا تو بہت مشکل ہے۔ آپ اسکول کے اوقات میں ہی کچھ تبدیلی کر لیں۔'' مولوی کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جتنی فرماں برداری اور تابعداری کا مظاہرہ کر رہا تھا، درحقیقت اتنا نہیں۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پیٹ میں داڑھی رکھتے ہیں۔

''اس معاملے کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال ہم چلتے ہیں۔ ابھی چودھری افتخار صاحب سے بھی ملاقات کرنی ہے۔'' مولوی کا انداز دیکھ کر اس نے مزید اسے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ عبدالمنان نے بھی اس کی پیروی کی۔

''ارے بھئی، ایسے کیسے جا سکتے ہیں آپ؟ کچھ چاء، پانی تو پیتے جائیں۔'' مولوی زیرک آدمی تھا۔ اس کے مزاج کی برہمی کو بھانپ گیا اور اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں مولوی صاحب! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ باوجود اصرار کے ایک منٹ بھی وہاں مزید ٹھہرنے پر راضی نہ ہوا۔

⊛----✪----⊛

''آپ نے تو بالا ہی بالا سارا پروگرام طے کر لیا۔ آخر میں اس علاقے کا نمائندہ ہوں۔ پیر آباد میری ملکیت ہے۔ یہاں کچھ بھی کرنے سے پہلے آپ کو مجھے اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔'' چودھری افتخار کی حویلی پہنچنے کے بعد اس نے اسے تقریب کے حوالے سے دعوت دی تو اس کا منہ بن گیا اور شکوہ کرنے لگا۔

''ہم آپ کو اطلاع دینے ہی تو آئے ہیں چودھری صاحب! اصل میں سارا پروگرام بڑی عجلت میں طے ہوا۔ اس لیے پہلے سے آپ سے باقاعدہ کوئی میٹنگ کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ بہرحال، ہمیں آپ کی اس

علاقے میں اہمیت کا احساس ہے اس لیے تو میں خود آپ کو دعوت دینے کے لیے آیا ہوں۔ بے شک اسکول مرکز صحت کی تعمیر سرکاری زمین پر ہو رہی ہے اور فنڈز بھی ہمیں کہیں اور سے ملے ہیں لیکن آپ کی اہمیت انکار تھوڑی کیا جا سکتا ہے۔ آپ تشریف لائیں گے تو تقریب میں چار چاند لگ جائیں گے۔ آپ کی تقریب میں مہمان کے بجائے میزبان کی ہوگی۔ آخر آپ پیر آباد کے چودھری ہیں۔''

اس نے بہت نرم لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا۔ اس کی اہمیت بھی تسلیم کی لیکن یہ جتانا نہیں کہ بے شک پیر آباد کی بیشتر زمین اس کی ملکیت ہے لیکن جن مقامات پر وہ اپنے منصوبوں پر کام کر رہا زمین سرکاری ملکیت ہے اور اسے اس سلسلے میں چودھری کی اجازت لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ چودھری میں بدعنوان افسروں کی مدد سے اسکول والی زمین پر اپنی ملکیت جتا کر بہت عرصے تک اسکول کی توسیع روکتا رہا تھا لیکن وہ اچھی طرح واقف تھا کہ حقیقت میں زمین سرکار کی ہی ہے اور شہریار یہ بات ثابت کر اس لیے اس زمین پر سے اپنی ملکیت کے دعوے سے چپ چاپ دست بردار ہو گیا تھا۔ اگر اسے ماضی میں بات کا خیال آ جاتا کہ آنے والے وقت میں کوئی آفیسر اس کے خلاف بھی چل سکتا ہے تو وہ کسی طرح اس بندوبست کر لیتا کہ زمین اس کے نام منتقل ہو جائے۔ مگر اب تو وہ صرف اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا تھا۔

''اپنی جلد بازی کی عادت پر قابو پانے کی کوشش کیجئے۔ جوانی کے زور میں آپ ذرا ضرورت سے ہی جوش سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جوش میں کبھی کبھی آدمی کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی اچھے خاصے زخمی ہوئے ہیں۔ خدانخواستہ اس واقعے میں آپ کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ چلیں خیر کی تو بچت ہو گئی لیکن بے چارے غریب پولیس والے مارے گئے۔ مجھے تو بڑا افسوس ہوا ان بے چاروں موت کا سن کر۔'' تلملاہٹ کو چھپا کر چہرے پر مربیانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے شہریار کو کچوکا لگا کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جیسے وہ شہریار کو جتا رہا ہو کہ دیکھو بچو! بڑے طرم بنتے تھے۔ کیسا بے وقوف بنایا میں نے تمہیں۔

''پولیس والوں کے مارے جانے کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن میرے نزدیک وہ لوگ قابلِ فخر ہیں کہ دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اُن کی اس قربانی بھلایا نہیں جائے گا اور قاتلوں کو ایک دن عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔'' وہ خود پر بڑا جبر کر وہاں آیا تھا اور ایسی کوئی بات چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا جس سے اس کی قلبی کیفیت کا اظہار ہو۔ چودھری خود ہی بات کو اس رخ پر لے گیا تھا کہ گفتگو میں تلخی کا عنصر در آیا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں کسی تکلیف دہ موضوع پر بات کرنے کے بجائے فی الحال تقریب کے حوالے سے بات کرنی چاہئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پیر آباد میں ایسی کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے افسران عرس میں شرکت کی غرض سے یہاں آتے رہے ہیں لیکن ان کی وہ آمد ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اس ایک سرکاری مقصد سامنے ہے۔ جنرل توحید کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا ہے۔ بے شک موجودہ حکومت ان کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلی حکومت میں وہ صوبائی اطلاعات ونشریات تھے۔ اب بھی ان کے حکومتی حلقوں میں گہرے تعلقات و روابط ہیں۔ میڈیا والے بھی اہم موقع پر ان کی رائے لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ وزیر خزانہ سے ان کی قریبی رشتے داری ہے۔ اگر یہاں سے خوش ہو کر گئے تو ہم کم از کم پیر آباد کے لیے تو کافی مراعات حاصل کر سکتے ہیں۔'' معاملات کو تلخی طرف جاتا دیکھ کر عبدالمنان نے گفتگو میں مداخلت کی اور جلدی جلدی بولتے ہوئے ان دونوں کو موقع



احساس دلانے لگا۔

ہم تو پہلے بھی کسی کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ جنرل صاحب بے شک سرکاری دعوت پر لیکن پیر آباد آنے کے بعد ان کی حیثیت سرکاری مہمان کے بجائے ہمارے ذاتی مہمان کی ہوگی۔ آپ لوگ جیسے چاہے انتظام کر لیں لیکن مہمانوں کا کھانا حویلی میں ہی ہوگا۔ آپ بس مجھے مہمانوں کی تعداد دیں، باقی انتظامات ہو جائیں گے۔'' شہریار کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اپنی اہمیت اور اعلیٰ عہدے داروں سے تعلقات بڑھانے کا یہ موقع چودھری کسی طرح ضائع نہیں کر سکتا تھا اس لیے کی ذمے داری خود قبول کر لی۔

''ایسی آپ کی مرضی چودھری صاحب! ویسے تو ہم نے اس سلسلے میں انتظامات کر لیے تھے لیکن آپ کا تو آپ ہی اس موقع پر میزبانی کر لیں۔'' اپنا موڈ بحال کرتے ہوئے اس نے فوراً ہی چودھری کی قبول کر لی۔

''میری پیشکش قبول کرنے کا شکریہ اے سی صاحب! اگر آپ انکار کر دیتے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ اصل مہمان نوازی ہماری روایت ہے اور چاہے کوئی دشمن بھی چل کر ہمارے پاس آئے تو ہم اس کی خاطر ضرور کرتے ہیں۔'' چودھری جس وقت یہ جملے کہہ رہا تھا، عین اسی وقت ایک ملازم لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس ملازم کو نظر انداز کرتا ہوا شہریار ایک دم سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اچھا چودھری صاحب! اب اجازت دیجئے۔'' شہریار نے چودھری کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عبدالمنان بھی اس کی پیروی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

''اس طرح اچانک کہاں چل دیئے اے سی صاحب؟ کچھ چاء، پانی تو پیتے جایئے۔''

''بہت شکریہ چودھری صاحب! آج بالکل فرصت نہیں آپ کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہونے کی۔ پلیز ہمیں اجازت دیجئے۔'' چودھری کے روکنے کے باوجود وہ مزید وہاں بیٹھنے پر راضی نہیں ہوا۔ یہ تو پسندی تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی ورنہ دل قطعی راضی نہ ہوتا تھا اس شخص سے بات کرنے پر۔ کے باعث وہ یہاں آ گیا تھا لیکن کچھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے چودھری کے روکتے بھی باہر نکل گیا۔ باہر مشابرم خان گاڑی لیے ان کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کے بیٹھتے ہی اس نے اسٹارٹ کر دی۔ حویلی سے نکل کر وہ لوگ گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف گامزن ہو گئے۔

''مشابرم خان! ذرا گاڑی قبرستان کی طرف لے لو۔'' اس نے اچانک ہی یہ حکم دیا جس کی تعمیل کی گئی۔ پہنچنے کے بعد وہ گاڑی سے اُتر کر قبرستان میں داخل ہوا تو عبدالمنان اور مشابرم خان بھی چپ چاپ ساتھ ہو لئے۔ قبرستان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند پکی قبروں کے سوا وہاں زیادہ تر قبریں کچی ہی تھیں۔ ان کے درمیان ان لوگوں کو فوراً ہی قریب بنی دو نئی قبریں نظر آ گئیں۔ قبروں پر کتبے موجود نہیں تھے لوگ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ قبریں تھوڑے دنوں کے وقفے سے مرنے والی ان دو سگی بہنوں کی ہیں جو سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کیے بغیر ہی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ دونوں میں سے ایک قبر کی مٹی زیادہ جس سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ ماہ بانو کی قبر ہوگی۔ شہریار نے اس قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر دعائے کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے۔ عبدالمنان اور مشابرم خان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک طرح ہاتھ بلند کر کے بند آنکھوں کے ساتھ دعا مانگتا رہا۔ دعا کے اختتام پر اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر کھولیں تو ملگجے کپڑوں میں ملبوس دُبلا پتلا اور سانولی رنگت والا ایک شخص دوسری قبر کے پاس کھڑا اپنی

طرف دیکھتا نظر آیا۔ اس شخص کے چہرے پر گہرے رنج اور دکھ کے تاثرات تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ
وہ شخص جھجکتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

''آپ اس ضلع کے اے سی صاحب ہو نا؟'' اس کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے اس نے استفسار
جس کا جواب اس نے محض سر ہلا کر دیا۔ اس وقت وہ خود گہرے دکھ کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کچھ عرصہ
کی درخواست لے کر اپنے پاس آنے والی نوعمر لڑکی کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا
کرنے کا تجربہ بہت تکلیف دہ تھا۔ ابھی تو وہ اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والی بے نام سی
تجزیہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ گئی تھی۔ وہ یک دم ہی بہت سرگرم ہو کر اس دکھ کے ازالے کی
میں لگ گیا تھا اور سب سے پہلے پیر آباد میں اپنے منصوبوں پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔

''سنا ہے کہ آپ ہمارے پنڈ میں ہسپتال بنوا رہے ہیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بڑا احسان ہو گا۔''
طرف سے تصدیق ہو جانے پر وہ شخص اس کا ہاتھ تھام کر بڑی عاجزی سے بولا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر
لگا۔ شہریار کے اشارے پر مشاہرم خان نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

''تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟'' وہ شخص سنبھلا تو اس نے اس سے پوچھا۔

''میں انور ہوں جی۔ یہ میری گھر والی کی قبر ہے۔ ویاہ کے دو برس بعد ہمیں خوشی کی خبر ملی تھی، پر جا
اچانک کیا ہوا کہ اس وچاری کی طبیعت بگڑ گئی۔ ادھر پنڈ میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں، دائی ہی ٹونے ٹوٹکے
رہی۔ پر جب کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ اپنی گھر والی کو شہر کے ہسپتال لے جاؤ۔
لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے منشی جی کی بہت خوشامد کی کہ حویلی کی کسی
میں میری گھر والی کو ہسپتال پہنچا دیں، پر غریبوں کی کون سنتا ہے جی۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے بڑی مشکل
جب تک سواری کا بندوبست کیا، تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وچاری میری گھر والی رستے میں ہی تڑپ تڑپ
گئی۔'' اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو جاری ہو گئے۔

''مجھے ان حالات کے بارے میں معلوم ہے انور! مجھے معلوم ہے کہ علاج کی سہولت نہ ہونے کی
اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پیر آباد سمیت
دیہاتوں میں بھی جلد از جلد ایسے ہسپتال بنائے جائیں جہاں لوگوں کا بروقت علاج ہو سکے۔ تمہاری
موت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ بس اب تم دعا کرو کہ جلد یہاں ہسپتال بن جائے تا کہ تمہاری
تکلیف کسی دوسرے کو نہ اٹھانی پڑے۔'' شہریار نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا تو اس نے خود پر قابو
ہوئے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور ذرا جوش سے بولا۔

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں صاحب!''

''ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تم یہ بتاؤ کہ کام کیا کرتے ہو؟'' اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''کام مجھے سارے آتے ہیں۔ بڑا دم ہے میرے بازوؤں میں۔ منشی مجھے جس کام پر بھی لگا دے
آرام سے کر لیتا ہوں۔ آپ کو کبھی ضرورت ہو تو آزما کر دیکھ لینا۔'' وہ سینہ تان کر فخر سے بولا تو شہریار
پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ دُکھی آدمی جو چودھری کے منشی کے خلاف دل میں شکوہ بھی رکھتا
اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے انور! ابھی تو نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر میں تمہیں ضرور آزماؤں گا۔ تم ذہنی طور پر
رہنا۔'' وہ انور کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے قبرستان سے نکلنے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ بہت سے کام



ہونے کے باوجود اس کا ذہن انور کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اگر اپنے دعوے کے مطابق واقعی
کارآمد آدمی تھا تو اس سے کئی اہم کام لیے جا سکتے تھے۔

⊛----✪----⊛

آخری جملہ تحریر کرنے کے بعد اس نے قلم بند کر کے قلم دان میں رکھا تو بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ آج کی
بہت شاندار رہی تھی۔ مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد جنرل توحید اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول
گئے۔ انہوں نے اسکول کی چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور یقین دہانی کروائی تھی کہ
جلد میں اس اسکول کی عمارت میں توسیع کے سلسلے میں وہ بھرپور کردار ادا کریں گے اور ایک دن یہ چھوٹا سا
ہائی اسکول اور کالج کے درجے تک پہنچ جائے گا۔ انہوں نے بہت مؤثر الفاظ میں گاؤں کے لوگوں کو
طرف راغب کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ تقریب میں شریک گاؤں والوں کے پُرجوش ردِعمل نے ظاہر
کہ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

تقریب میں چودھری افتخار کے علاوہ اردگرد کے دوسرے زمینداروں نے بھی شرکت کی تھی اور ناچار ہی
اس تعلیمی پروگرام کو سراہا تھا۔ موبائل کمپنی والے بھی اس تقریب میں بڑے سرگرم رہے تھے۔ میڈیا کوریج
اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی پبلسٹی مہم بھرپور طریقے سے چلائی تھی۔ لوگوں کو موبائل کے استعمال کی
راغب کرنے کے لیے انہوں نے اپنی موبائل کمپنی کی سم کے ساتھ چند موبائل سیٹ مفت تقسیم کیے تھے۔
اور منیب کو بھی ایک ایک سیٹ دیا گیا تھا۔ مجموعی طور پر تقریب بہت کامیاب رہی تھی اور اس وقت
نے اس تقریب سے متعلق رپورٹ بھی لکھ کر مکمل کی تھی۔ اس رپورٹ کو اتوار کی اشاعت میں شامل ہونا
رپورٹ اس نے ایک فیچر کی شکل میں لکھی تھی جس میں پیر آباد کے ساتھ ساتھ اردگرد کے دیگر دیہاتوں
مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ان علاقوں میں فروغِ تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مخیّر حضرات کو اس
میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اخبار بین طبقے میں اے اے منشا کا نام معتبر تھا اور وہ اسے ایک حق
قلم کار کی حیثیت سے پسند کرتے تھے اس لیے اس بات کا اچھا خاصا امکان تھا کہ وہ اس کی اپیل پر ضرور
ہوتے۔

اس معاملے میں اتنا پُرجوش تھا کہ پچھلے دو دن کی مسلسل محنت اور آج کی تقریب کی مصروفیت کی وجہ
ہونے والی تھکن کو قطعی نظرانداز کر کے قلم تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ منیب کی نیند خراب نہ ہو، اس خیال سے اس
کمرے کی ٹیوب لائٹ بند کر کے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اپنا کام مکمل کیا تھا۔ مسلسل جھکے جھکے لکھتے رہنے کی
اکڑ جانے والی گردن کا تناؤ ذرا کم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جو باہر کی طرف کھلتی
کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ باہر رات کا مخصوص اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بس صرف چاند کی
روشنی جس میں وہ اسکول کا ہیولا اور اردگرد کا دُھندلا سا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اردگرد کے منظر سے تو اسے اتنی
دلچسپی نہیں تھی لیکن اسکول اس کے خوابوں کی شاہراہِ تعبیر پر آنے والا پہلا سنگِ میل تھا، اس لیے وہ اسے بہت
پیش نظروں سے دیکھنے میں منہمک تھا۔

مشکل سے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ منظر میں پیش آنے والی ایک متحرک تبدیلی نے اسے چونکا دیا۔ وہ
والی تھے جو آس پاس محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آفتاب نے کھڑکی تک
سے قبل ٹیبل لیمپ بجھا نہ دیا ہوتا تو وہ کھلی کھڑکی سے آنے والی روشنی کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو سکتے

تھے۔ لیکن اس وقت وہ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ رات کے اس پہر مشکوک انداز میں اسکول کی طرف
والے ان دو افراد کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں
آئے ہیں۔ ان دونوں افراد میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں کچھ تھاما ہوا تھا۔ اندھیرے میں اُبھر
اس شے کے خاکے سے وہ یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ وہ کوئی کین نما شے ہے۔ وہ دونوں افراد ساتھ
ہوئے نئے تعمیر شدہ اسکول کے کمروں میں سے ایک کے دروازے پر رُکے۔ دروازے کے قریب
میں کین تھامے ہوئے شخص زمین پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا کھڑا رہا۔ کھڑے ہونے والے کی پوزیشن ایسی تھی
پر بیٹھنے والا شخص آفتاب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ اس شخص نے کمرے کے دروازے
قریب بیٹھ کر کیا کارروائی کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ اس کے بعد
دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اب آفتاب کے لیے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں
دونوں جو بھی تھے اور جس انداز میں بھی کارروائی کر رہے تھے لیکن یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ان کا
نہیں ہے۔ وہ اندھیرے میں ہی تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ان دونوں کو للکارا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور کیا کر رہے ہو؟''

اس کی للکار پر وہ دونوں تیزی سے پلٹے۔ اسی وقت اس نے فضا میں پھیلی پٹرول کی بُو محسوس کی
میں ہی اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں۔

''رک جاؤ۔'' چیخنے کے انداز میں بولتا ہوا آفتاب تیزی سے ان کی طرف لپکا لیکن اس سے
تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کے ان لوگوں تک پہنچنے سے قبل ہی فضا میں ایک شعلہ سا اُبھرا۔ یہ ننھا سا شعلہ ماچس
ہوئی تیلی کا تھا جس نے تیلی جلانے والے کے ہاتھ سے تیزی سے نیچے کا سفر طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے
خوفناک شعلے بھڑکنے لگے۔

ان شعلوں کو بھڑکانے کے ذمے داروں نے ہاں رک کر آفتاب کا مقابلہ کرنے کے بجائے پھرتی
فرار اختیار کر لی لیکن وہ اس سارے منظر کو دیکھ کر خود
بری طرح بھڑک اُٹھا تھا کہ انہیں بھاگنے کا موقع
کے لیے تیار نہیں تھا۔ پوری قوت سے دوڑتا ہوا وہ ان لوگوں کی طرف لپکا اور بھاگنے والوں میں سے
گردن دبوچ لی۔ اپنے ساتھی کو پکڑا جاتا دیکھ کر دوسرا شخص جو ذرا آگے نکل گیا تھا، واپس پلٹا اور آفتاب
میں لات رسید کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت اس پر جنون سوار تھا اور
لات سے ہرگز بھی قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔ پہلے شخص کی گردن بائیں ہاتھ میں جکڑے جکڑے اس نے
کرنے والے دوسرے شخص کی ناک پر دائیں ہاتھ سے ایک زوردار مُکا مارا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع
اس پر اس کے ساتھی کو اس انداز میں دھکیلا کہ دونوں کے سر ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور
حلق سے زوردار چیخیں نکلیں۔ مگر پھر وہ دونوں سنبھل گئے اور خونخوار انداز میں اس کی طرف لپکے۔ انہوں
دونوں پہلوؤں سے اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ بیک
دونوں کے مُکے اپنے چہرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ یک دم نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی
استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم کے نچلے حصے پر نازک مقامات پر ضرب لگائی۔ اس کے ایک دم
جانے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے مُکوں کی زد پر آ گئے تھے۔ اس پر سے یہ ضرب لگی تو بلبلا
نیچے بیٹھے ہوئے آفتاب کو اُٹھنے کا موقع دیئے بغیر اس پر پل پڑے۔

''کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟..... آفتاب! کیا یہ تم ہو؟'' اسی وقت فضا میں منیب کی گھبرائی



گہری۔ بہت گہری نیند میں ہونے کے باعث اس کی آنکھ ذرا مشکل سے کھلی تھی اور ارد گرد کی صورتِ حال
وہ گھبرا گیا تھا۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے ساری فضا پر ہیبت سی طاری کر دی تھی اور ان شعلوں کی
میں تین افراد ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر سیاہ نقاب تھے
نے جس تیسرے فرد کو اپنی زد پر لیا ہوا تھا، وہ ان کے درمیان گھرا ہونے کی وجہ سے واضح طور پر نظر
آ رہا تھا لیکن کپڑوں کی وجہ منیب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ آفتاب ہے۔

''خبردار! قریب مت آنا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' لڑنے والوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ روک کر
کرتے کی جیب میں سے ریوالور نکالا اور اسے منیب کی طرف لہراتے ہوئے دھمکی دی۔ وہ جہاں تھا، وہیں
رہا۔

''بس، اب تم بھی سیدھے ہو جاؤ۔ ہمیں خون خرابے کا حکم نہیں اس لیے اب تک تمہیں بخشا ہوا ہے۔ لیکن
اگر راستہ روکنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' منیب کو آسانی سے پسپا ہوتا دیکھ کر اس نے اپنے ریوالور کا
آفتاب کی طرف کیا۔ وہ اب بھی ہاتھ پیر چلاتا ہوا اپنے مقابل کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریوالور
کی دھمکی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کی طرف توجہ دیئے بغیر اس نے ایک زوردار پنچ اپنے حریف
آنکھوں کے نیچے دے مارا۔ اُس کی اس حرکت پر ریوالور بردار شخص بری طرح تلملایا اور لات گھما کر زور
اس کی کنپٹی پر ماری۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی۔ آفتاب اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔

''چل یار! نکل بھاگیں۔ گاؤں والے لوگ جاگ گئے ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں۔'' فضا میں اُبھرتے
شور کی آواز سن کر ریوالور بردار نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کرتے ہوئے
سمت دوڑ لگانے کی کوشش کی۔ فضا میں اُبھرتے شور کی بھنبھناہٹ آفتاب نے بھی سن لی تھی۔ اسے امید تھی
اگر وہ کچھ دیر اور ان دونوں کو روکنے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ لوگ پہنچ
جاتے تو پھر ان دونوں کا وہاں سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔ وقت کی یہ چھوٹی سی مہلت حاصل کرنے کے لیے
نے اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کیں اور اُلٹ کر گرنے کے بعد کسی نوکیلے پتھر کی زد میں آ کر پھٹ جانے والے
سر کی تکلیف پر قابو پاتا ہوا ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں، چنانچہ اس بار
ریوالور بردار نے اپنے لیے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اور ریوالور کا رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے
گولی چلا دی۔ جوش میں آگے بڑھتے ہوئے آفتاب کو ایک جھٹکا لگا اور اپنی دائیں ٹانگ کی ران میں دہکتے
انگارے کی اذیت محسوس کرتا ہوا وہ نیچے گر گیا۔ حملہ آور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر فاصلے پر بندھے
گھوڑوں تک پہنچے اور لپک کر ان پر سوار ہوتے ہوئے برق کی طرح نکل بھاگے۔ ان کے یہ گھوڑے پہلے اس
کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ آ بھی جاتے تو وہ کیا کر لیتا؟ جتنی کوشش وہ کر سکتا تھا، اپنی جان کی بازی لگا کے کر
چکا تھا اور اب بے بسی سے زمین پر گرا بلند سے بلند تر ہوتے آگ کے شعلوں کی رقص کرتی روشنی میں ان کو
جانے والوں کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ان شعلوں میں کیا کچھ جلا تھا، یہ حساب تو بعد میں ہی ہوتا لیکن اپنے
گھروں کو یوں جلتا دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس آگ کی جلن اپنے روم روم میں محسوس کرتا وہ کب ہوش و حواس
سے بیگانہ ہو گیا، خود اسے بھی علم نہیں ہو سکا۔

⊛----✪----⊛

کل تک جو عمارت رنگوں سے مزیّن تھی، آج ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں کھڑی تھی۔ آگ نے اس
کی ساری خوب صورتی کو چاٹ لیا تھا۔ کمروں میں ڈالا گیا نیا فرنیچر، دیواروں پر لگے سافٹ بورڈز، چارٹس اور

وہ آرائشی جھنڈیاں جو کل کی تقریب کے اہتمام کے لیے بطورِ خاص لگائی گئی تھیں، سب جل کر خاک تھیں۔ وہ گمبھیر خاموشی کے ساتھ ہونٹ بھینچے ساری تباہی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس تباہی کے پیچھے کس ہے، اس معاملے میں اسے کوئی شک نہیں تھا۔ پیر آباد کے اس اسکول کی ترقی میں سب سے زیادہ تکلیف ہی شخص کو تھی اور وہ شخص چودھری افتخار تھا۔ اپنی منافقانہ خصلت سے کام لیتے ہوئے اس نے ماتھے پر شکن بغیر کل کی تقریب میں شرکت بھی کی تھی۔ اسکول کی توسیع پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور آنے والے معزز مہمانوں ضیافت کا بھرپور انتظام بھی کیا لیکن موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں اپنی چال چل گیا تھا۔ آگ اتنی خوفناک اس نے نئے تعمیر شدہ کمروں کے ساتھ ساتھ پرانے کمروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ پٹرول کی آگ خطرناک ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس جگہ تک کوئی ہنگامی امداد پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ابتدا میں تو گاؤں نے ہی بالٹیوں وغیرہ سے پانی ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش سے آگ اور بھی بھڑک ان حالات میں بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ منیب نے اپنے موبائل فون سے ہنگامی امداد کے لیے دی۔ چودھری کی بدولت قائم ہونے والے موبائل کمپنی کے نیٹ ورک نے اس برے وقت میں بڑا ساتھ فون کال پر آگ بجھانے والی گاڑیاں اور ایمبولینس فوری طور پر پیر آباد روانہ کر دی گئیں۔ ایمبولینس زخمی آفتاب کو گاؤں کے لوگوں نے اپنے طور پر ابتدائی طبّی امداد دے دی تھی لیکن سر پر لگنے والی چوٹ اور گولی کے باعث آنے والا زخم مہلک تھا۔ ان زخموں سے اس کا کافی خون بہہ گیا تھا۔

شہریار کو صبح سے قبل ہی اس حادثے کی خبر ہوگئی تھی لیکن فوری طور پر پیر آباد آنے کے بجائے اس نور کوٹ کے اس چھوٹے سے ہسپتال جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا جہاں آفتاب کو لے جایا گیا تھا۔ اس میں طبّی سہولیات بہت کم تھیں۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے جو کچھ بن پڑا تھا، وہ اس نے اپنے طور پر کر اور پھر اس کے حکم پر آفتاب کو فوری طور پر لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ آفتاب کی زندگی اس کے لیے قیمتی تھی۔ اس لیے اسے بچانے کے لیے وہ اپنے تمام تر اختیارات کو بروئے کار لے آیا تھا۔ نور کوٹ ایمبولینس کی روانگی کے ساتھ ہی ایک ایمبولینس لاہور سے بھی روانہ ہوئی تھی۔ اس ایمبولینس میں جدید سہولیات کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور میل نرس بھی موجود تھا۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ یہاں سے جانے اور لاہور آنے ایمبولینس جس مقام پر بھی آپس میں ملیں، آفتاب کو لاہور والی ایمبولینس میں منتقل کر کے راستے میں ہی بہتر امداد کی فراہمی شروع کر دی جائے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی بہت کامیاب رہی تھی اور صبح یہاں کے لیے روانہ ہونے سے قبل اسے اطلاع مل گئی تھی کہ آفتاب کی جان اب خطرے سے باہر ہے۔

''آگ نے اسّی فیصد عمارت کو نقصان پہنچایا ہے۔ دوبارہ سے اس عمارت کو مرمت کرنے اور قابل استعمال کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ کے مطابق آگ پٹرول ڈال کر لگائی گئی تھی۔ اس کس نے اور کیوں لگائی، اس سلسلے میں ابھی حقائق سامنے نہیں آسکے تھے۔ وقوعہ کے ایک گواہ ماسٹر منیب ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق رات کے آخری پہر اس کی آنکھ عجیب و غریب شور آوازوں سے کھلی تھی۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور ماسٹر آفتاب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ منیب نے باہر آکر دیکھا تو اسے ماسٹر آفتاب دو نقاب پوشوں سے لڑتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے اس لڑائی میں دخل دینا تو حملہ آوروں میں سے ایک نے ریوالور دکھا کر اسے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر آفتاب کو بھی اس نے فائر مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ جوش میں اس دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا اور حملہ آوروں کے فرار کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی۔ طیش میں آکر دھمکی دینے والے نے اس پر گولی چلا دی۔ لڑائی کے دوران وہ پہلے ہی



زخمی ہو چکا تھا، گولی لگنے کے بعد بالکل ہی حواس کھو بیٹھا۔ حملہ آور اسے گولی مارنے کے بعد اپنے ساتھیوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔ کھوجی کے ذریعے گھوڑوں کے سموں کا کھوج لگانے کی کوشش بھی بے کار گئی۔ لوگوں نے فرار کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا کہ کھوج مل ہی نہیں سکا۔ اب ہمارے پاس واحد آپشن یہ ہے کہ ماسٹر آفتاب ہوش میں آنے کے بعد کوئی ایسی بات بتا دے جس سے حملہ آوروں کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ اس نے حملہ آوروں سے براہِ راست مقابلہ کیا تھا، اس مقابلے کے دوران ہو سکتا ہے اس نے لوگوں کو شناخت کر لیا ہو۔ ان لوگوں سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔'' اس کے ساتھ وہاں موجود ایس پی اسے واقعے کے بارے میں بریف کرتے ہوئے اپنی رائے بھی دے رہا تھا۔ اس کے آخری جملے نے شہریار کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ایس پی اس حادثے اور اس کے ذمے داروں سے لاعلم ہے لیکن پھر بھی معاملے کو ایسا رخ دینے کی کوشش کر رہا تھا جس سے کسی حد تک واقعے کی ذمے داری اس پر تھوپی جا سکے۔

''ماسٹر آفتاب نہ تو کوئی لٹیرا ہے، نہ جاگیردار اور نہ ہی کوئی اعلیٰ عہدیدار..... اس لیے اس کی کسی سے اتنی شدید ذاتی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی واقعہ جس انداز میں پیش آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجرم اسکول کی عمارت کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ اگر انہیں آفتاب سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی تو وہ اتنا لمبا راگ پالنے کے بجائے سیدھے سیدھے اسے گولی مار کر ختم کر سکتے تھے۔ اس لیے پلیز، آپ اپنی تفتیش کا رخ یہ کہیں کہ ماسٹر آفتاب کی ذات کو فوکس کرنے کے بجائے واقعے کی نوعیت کو فوکس کریں اور ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں جنہیں یہاں اسکول کے وجود پر اعتراض ہے۔'' بے حد رُکھائی سے ایس پی کو جواب دے کر وہ اپنے ساتھ ہی موجود عبدالمنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عبدالمنان! سارے نقصان کا تخمینہ لگواؤ اور ساتھ ہی فوری طور پر یہ بھی حساب لگاؤ کہ اسکول کی عمارت کو کم عرصے میں دوبارہ اسٹیبلش کرنے میں کتنے اخراجات آئیں گے۔ میں زیادہ دن تک اس اسکول کو بند نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور ہاں، اس بار سکیورٹی کے لیے بھی کوئی معقول انتظام کر لینا۔ جنہوں نے ایک بار یہ حرکت کی ہے، وہ دوبارہ بھی ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔ ان سازشی عناصر کی کوئی اور کوشش دوبارہ ہرگز کامیاب نہیں ہونی چاہیے۔'' سخت لہجے میں احکامات جاری کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''پھر کیا کہتے ہو انور! تم یہ کام کر لو گے؟''

''کیوں نہیں سر جی! میں نے خود آپ سے کہا تھا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔ اب بھلا میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟''

''کام ذرا خطرناک ہے۔ بات کھل جانے کی صورت میں تم چودھری کے عتاب کا بھی شکار ہو سکتے ہو۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس سلسلے میں تم پر کوئی زبردستی کروں۔''

''میں سوچ سمجھ کر ہی آپ کا کام کرنے پر راضی ہوا ہوں سر جی! میری سمجھ میں یہ گل آگئی ہے کہ بندے کے نصیب میں اگر کوئی نقصان لکھا ہو تو پھر وہ بچ نہیں سکتا۔ چودھری صاحب جب میرے سسرال والوں سے ناراض (ناراض) تھے تو میں نے اسی لیے ان لوگوں سے ناتا توڑ لیا تھا کہ کہیں چودھری کا غصہ مجھے اور میرے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے..... پر کیا ہوا؟ گھر بیٹھے بیٹھے ہی اتنا بڑا نقصان ہو گیا۔ میری گھر والی بھی جان گئی اور میں اپنے بچے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکا۔ جب بھی اس نقصان کا خیال آتا ہے تو منشی جی کی بے مروّتی

یاد آجاتی ہے۔ اگر وہ اُس دن گڈی دے دیتے تو شاید میری گھر والی بچ جاتی۔ میرا دل کھٹا ہو گیا ہے ان کی طرف سے۔ جن کی خاطر ہم اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں، انہیں ہمارا کوئی خیال ہی نہیں۔ آپ کم از کم گاؤں کی بھلائی کے لیے تو سوچ رہے ہیں۔ گاؤں میں اسکول اور ہسپتال بن جائیں گے تو گاؤں ترقی کرے گا۔ ہمارے لوگوں کے لیے روزگار کا بندوبست ہوگا۔"

انور نے بہت جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری افتخار کی دوائیوں پر قابو پانے کے لیے کچھ نہ کچھ ایسا انتظام کرنا پڑے گا جس کے ذریعے اس کی چالوں کا توڑ کیا جا اب تک اس نے چودھری کے خلاف جو بھی کارروائی کی تھی، اس کے نتیجے میں ناکامی ہی ملی تھی۔ انور قبرستان میں ہونے والی ملاقات کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ چودھری کے کارندوں میں کسی کو استعمال کیا جائے تو کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکول میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد اس میں مزید مضبوطی آ گئی تھی اور اس نے انور کو کچھ رقم کی آفر کے ساتھ یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ چودھری خلاف ثبوت فراہم کرنے میں ان کی مدد کرے۔ انور جو بیوی کی موت کے بعد اچھا خاصا دل برداشتہ ہو گیا اس کام کے لیے فوراً ہی راضی ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر تم سارے معاملات پر نظر رکھنا۔ خاص طور پر یہ جاننے کی ضرور کوشش کرنا کہ جنگل لکڑی یا کھالیں کس دن اور کس وقت اسمگل کی جائیں گی۔ تمہارے لیے موبائل فون کا انتظام ہو گیا عبدالمنان سے موبائل سیٹ لے لینا اور اس کا استعمال بھی سیکھ لینا۔ موبائل سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم فوری ہمیں ہر بات کی اطلاع دے سکو گے۔ مگر خیال رکھنا کہ تمہارا موبائل کسی کی نظروں میں نہ آئے ورنہ تم میں پڑ جاؤ گے۔ میں نے تمہیں نظروں میں آنے سے بچانے کے لیے خاص طور پر دفتر کے بجائے یہاں گھر پر تم سے ملاقات رکھی تھی۔ تم بھی احتیاط کرنا اور کسی کو معلوم نہ ہونے دینا کہ تم کہاں گئے تھے۔" اُسے اس کا کام اچھی طرح سمجھا چکا تھا۔ یہ آخری ہدایات اس نے صرف حفظ ماتقدم کے طور پر دی تھیں۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر جی! کہ آپ نے اتنا خیال کیا۔ میں آپ کی بتائی ہر بات یاد رکھوں گا۔" نے عاجزی سے جواب دیا لیکن جانے کے لیے اُٹھا نہیں۔

"کیا بات ہے انور! کیا کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟" اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے شہریار نے پوچھا۔

"نہیں سر جی! پوچھنا تو کچھ نہیں۔ پر ایک عرض کرنی ہے۔"

"کہو، کیا بات ہے؟" اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے شہریار نے حوصلہ دیا۔ "کوئی مسئلہ ہے تو میں تمہاری مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"وہ جی میرا سالا ہے نا، الیاسا۔ وہ دو دن سے غائب ہے۔ گھر سے تو مدرسے کے لیے نکلا تھا، صاحب کہتے ہیں کہ وہ مدرسے آیا ہی نہیں۔ ہر طرف اُسے ڈھونڈ لیا ہے۔ پُلس (پولیس) میں بھی (رپورٹ) لکھوائی ہے لیکن کچھ خبر ہی نہیں مل رہی اس کی۔ آپ بڑے افسر ہیں، اگر پُلس والوں پر زور گے تو وہ الیاسے کو ٹھیک طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو انہوں نے رپٹ لکھنے کے بھی نہیں کیا۔ وچارے چاچا چاچی کی بری حالت ہے۔ پہلے ہی وہ دو جوان بیٹیوں کا صدمہ کھا کر بیٹھے ہیں۔ اس پر الیاس بھی غیب (غائب) ہو گیا ہے۔ ایک ہی تو پُتر ہے وہ ان کا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہیں وچاروں پر اُس کی گم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔" انور کی دی ہوئی اطلاع نے اسے بری طرح چونکا گاؤں سے کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ شہروں میں تو پھر بھی امکان ہوتا ہے کہ



اتفاقاً اِدھر اُدھر ہو جائیں، لیکن گاؤں کے محدود ماحول میں جہاں ہر فرد دوسرے فرد سے اچھی طرح ہوتا ہے، کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا بہت غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس واقعے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بچہ حادثے سے دوچار ہوا ہے اس لیے دو دن گزر جانے کے باوجود اس کا کوئی اتا پتا نہیں مل سکا ہے۔"

"میں تھانے فون کر کے ہدایت کر دوں گا۔ تم اس بارے میں فکرمند مت ہو۔" انور پر اپنی پریشانی ظاہر اس نے اسے تسلی دی تو وہ شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ انور کے روانہ ہوتے ہی اس نے متعلقہ فون کر کے تھانے دار کو الیاس کے سلسلے میں سختی سے ہدایت دی اور فون کرنے کے بعد غیاث محمد کے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان لوگوں نے خود کو کسی مصیبت سے بچانے کے لیے ماہ بانو کا بیاہ چودھری کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن چودھری تو کیا اُنہیں نقصان پہنچاتا، وہ ویسے ہی پے در پے نقصانات کی زد جا رہے تھے۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے انور نے صحیح کہا تھا کہ جو نقصان آدمی کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہو، اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ غیاث محمد بھی مسلسل ایسے ہی نقصانات کی زد پر تھا۔

⊛----✪----⊛

"آپ.....؟" ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوتی کشور کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا اور اپنی جگہ سے اُٹھنے کی۔ اس کوشش میں اس کے منہ سے ایک زوردار کراہ نکل گئی۔

"پلیز! آپ لیٹے رہیں۔" وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اُٹھنے سے روکا۔

"آپ یہاں کیسے آئیں؟"

"مجھے آپ کے زخمی ہونے اور لاہور کے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر مل گئی تھی۔ خبر ملتے ہی میرا دل پریشان ہو گیا کہ کسی طرح آپ کو دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے رو دھو کر اماں کو راضی کیا کہ حویلی میں دل گھبرا رہا ہے۔ دو دنوں کے لیے لاہور چل کر رہیں۔ آپ کی پریشانی میں ویسے ہی میرا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اوپر سے بھی چھوٹ گیا تھا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر اماں نے ابا جی کو راضی کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ ہم کو لاہور بھیج دیں۔ کل رات ہی ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ صبح صبح میں نے اماں سے بہانہ کیا کہ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو گھر بلوا لیا۔ ڈاکٹر نے کھانے کے لیے دوا دی ہے میں نے نہیں کھائی لیکن اماں پر یہی ظاہر کیا کہ دوا کھانے کے باوجود میرا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ رانی اماں سے میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس نے اماں کو مشورہ دیا کہ بی بی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ اب ساری اماں نیچے انتظار گاہ میں بیٹھی ہیں اور میں ڈاکٹر کو دکھانے اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بہانے آئی ہوں۔ رانی میرے ساتھ ہی ہے اور باہر کھڑی ہے۔" وہ بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے ابھی کھڑی ہوئی تھی اور مزے سے اپنا کارنامہ سنا رہی تھی۔

"آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس طرح آنے میں کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔" ساری بات سن کر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

"سوری آفتاب! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ لیکن آپ کے زخمی ہونے کا سن کر میں رہ نہیں سکی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے جب مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے رانی نے بتایا تھا کہ آپ کو کہاں کہاں چوٹیں لگی ہیں اور یقین جانیں میں نے اپنے جسم پر ان ساری جگہوں پر درد محسوس کیا ہے۔ پھر سب سے

بڑھ کر آپ کو گولی لگنے کی خبر نے میرے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ بھلے سے ٹانگ میں ہی لگی ہو لیکن گولی گولی چیز تو نہیں ہوتی جو میں سن کر آرام سے بیٹھی رہتی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں مگر میں جن اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوں ان سے نجات حاصل کرنا بھی تو آسان نہیں۔ اب کوشش کے بعد یہ چند پل ہی حاصل کر پائی ہوں۔ ورنہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ سارا وقت یہاں آپ کے رہوں، آپ کی خدمت کروں اور آپ کے ہر درد کو چن لوں۔'' جذبات سے بھیگی آواز میں کہتی ہوئی وہ انگلیوں سے اس کی آنکھ کے قریب پڑے ہوئے نیل کے نشان کو سہلا رہی تھی۔ اس کی جذبات سے بھیگی اور نم آنکھیں دیکھ کر آفتاب کا دل پسیج گیا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔

''اب تو آپ نے مجھے دیکھ لیا نا۔ آپ کو تسلی ہوگئی ہوگی۔ دیکھیں، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''خاک ٹھیک ہیں۔ اتنے ڈھیروں زخم لگے ہیں۔'' اس کی آنکھوں کی نمی تیزی سے آنسوؤں کی روانی میں بدل گئی۔

''زخم لگے ہیں لیکن اب درد بالکل نہیں ہو رہا۔ آپ نے مجھے چھو کر میرا سارا درد اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیا ہے۔'' آفتاب کے اس جملے پر وہ تھوڑی سی محجوب ہوگئی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی، سو کامیاب نہ ہوسکی۔

''یہ میرا موبائل فون ہے۔ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرا پہلے والا سیٹ تو اُس دن کی لڑائی میں ہی پھوٹ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے یہ نیا سیٹ منگوایا ہے۔ اس کا نمبر ابھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ اسے رکھیں۔ میں اپنے لیے دوسرا سیٹ اور سم منگوا کر آپ کو اس پر کال کروں گا۔ آپ فون پر مجھ سے بات کریں گی تو آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی اور اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہوگا۔'' آفتاب نے اپنے سرہانے سے موبائل چارجر سمیت اُس کی طرف بڑھایا۔ اس نے دونوں چیزیں اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیں۔ دایاں ہاتھ بدستور آفتاب کی گرفت میں ہی تھا۔

''بس اب آپ جائیں۔'' آفتاب نے اس سے کہا اور اپنے ہاتھ کی گرفت میں موجود اس کے ہاتھ کی پشت پر آہستہ سے بوسہ دیا۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شہریار کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب نے پھرتی سے کشور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سر سے سرک جانے والی اپنی چادر درست کرتی ہوئی تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ وہاں رانی افتاں و خیزاں کھڑی تھی۔ یقیناً شہریار دیکھ کر وہ اتنی حواس باختہ ہوگئی تھی کہ بروقت اطلاع نہیں کرسکی۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ میں پرسنل وزٹ پر لاہور آیا تھا۔ سوچا تمہاری خیریت بھی پوچھتا جاؤں۔'' وہاں پھیلنے والی ہلچل لمحاتی تھی۔ کشور کے روانہ ہوتے ہی کمرے میں سکون ہوگیا۔ شہریار نے سارے منظر سے قطعی بے نیازی برتتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھتے ہوتے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''اللہ کا شکر ہے اب تو کافی بہتر ہوں۔ انشاء اللہ جلد یہاں سے نجات پا کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔''

''تم پہنچو گے تو تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ملے گا۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے کہ مجھے اسکول جلد از جلد ورکنگ کنڈیشن میں چاہئے۔ وہاں کام جاری ہے۔ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے ایک نئے ٹیچر بھی ارینج منٹ کر لیا ہے۔ اب اسکول شروع ہوگا تو وہ ٹیچر بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔ میں گاؤں کا ایک مکان لوگوں کے لیے ٹھیک کروا رہا ہوں۔ اب تمہارے استعمال والا کمرہ بھی اسکول میں ہی شامل ہوگا۔ اسکول کے اوپر کے کام کاج، صفائی اور نگرانی کے لیے میں نے ایک چوکیدار کا انتظام کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دشمنوں



کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔'' اس نے آفتاب کو خوشخبری سنائی۔

''تھینک یو سر! مجھے اسکول کی طرف سے بہت فکر تھی۔'' اس خبر کو سن کر اس نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

''اتنی فکر مت کیا کرو۔ اسکول تمہارے اکیلے کا مسئلہ نہیں۔ میں خود بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تھوڑا سا مالی نقصان برداشت کرنا بھی میرے لیے مشکل نہیں۔ لیکن تم جیسے قیمتی اور مخلص شخص کو کھونا میں پسند نہیں کروں گا۔ سو پلیز! بی کیئر فل۔''

''میں خیال رکھوں گا سر!'' شہریار کی نصیحت کے جواب میں اس نے وعدہ کیا۔

''لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو میرے اندازے سے بڑھ کر خطروں میں ڈال رکھا ہے باہر جو لڑکی تھی، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ چودھری افتخار کی ملازمہ ہے اور میں نے کئی بار اسے حویلی میں دیکھا ہے۔ اس ملازمہ کی موجودگی سے مجھے یہی سمجھ آیا ہے کہ کچھ دیر قبل جو خاتون یہاں موجود تھیں، ان کا حویلی سے کوئی تعلق ہے۔''

''وہ چودھری افتخار کی سب سے چھوٹی بیٹی کشور ہے۔'' شہریار کے گمبھیر لہجے کے جواب میں اس نے آہستہ سے بتایا۔

''اوہ! آئی سی۔'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''پھر تو واقعی معاملہ میرے اندازے سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے اور میں کسی کی ذاتیات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے میں پھر بھی خبردار کہوں گا کہ تم نے اپنے آپ کو بہت زیادہ خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ چودھری ٹائپ کے لوگ خود تو بالکل دوسروں کی عزتوں سے کھیلتے پھرتے ہیں لیکن اپنے گھر کی خواتین کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔'' اسے آفتاب سے اتنی زیادہ اُنسیت ہوگئی تھی کہ خلافِ طبیعت اسے نصیحت کر بیٹھا۔

''میں جانتا ہوں سر! لیکن یہ بات آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ بعض معاملات میں انسان خود اچھا خاصا مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ لیکن آپ یہ مت سمجھیں کہ میری اور کشور کی روٹین میں ملاقاتیں چلتی رہتی ہیں۔ وہ بے چاری میری حالت کا سن کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچی تھی۔ پھر بھی میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کریں۔'' وہ وضاحت دینے لگا۔

''اوکے! تم جیسے مناسب سمجھو یہ معاملہ ہینڈل کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔ میں نے ہسپتال والوں کو تو ہدایت کر دی ہے لیکن اگر پھر بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو تو فون پر مجھے اطلاع دے دینا۔ ٹیک کیئر!'' حسبِ عادت اس نے اچانک ہی بات ختم کر دی اور آفتاب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔

⊛----✪----⊛

''میں کوشش کر رہا ہوں بختیار صاحب! کہ آپ کے گاؤں کے مسائل جلد از جلد حل کروا سکوں۔ آج میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا، انہوں نے آپ کے علاقے کا سروے کر کے مرکزِ صحت کے لیے جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ اب اس کے مطابق یہ لوگ نقشہ وغیرہ بنائیں گے تو پھر کام شروع ہوگا۔ میں نے سوچا ہے کہ اس مرکزِ صحت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے پانی و بجلی کے وفاقی وزیر کو دعوت دوں۔ وہ اگر یہاں آنے پر راضی ہو گئے تو میں میڈیا کے لوگوں کے سامنے ہی ہم ان سے نور پور میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں درخواست کریں گے۔ میڈیا والوں کی موجودگی میں وہ یہاں بجلی فراہم کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک بار انہوں نے وعدہ کر لیا تو پھر میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سیاسی نمائندے اپنا کردار بالکل بھی ادا نہیں کر رہے۔'' آج وہ سروے

ٹیم کے ساتھ نور پور پہنچا ہوا تھا۔ عبدالمنان کو اس نے پیر آباد میں اسکول کی مرمت کے کام کا جائزہ
ذمے داری سونپی تھی اور خود یہاں آ گیا تھا۔ پھر انہیں روانہ کر کے خود نور پور کے چودھری بختیار
کے لیے چلا آیا تھا۔ پیروں سے معذور مگر کھلے دل کا چودھری بختیار اسے پسند آیا تھا۔

''سیاسی نمائندوں کی تو بات ہی نہ کریں جی۔ سارے کے سارے کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ چودھری
جیسے لوگوں نے مڈل کلاس کے پڑھے لکھے بندوں کو پکڑ کر الیکشن میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان بندوں کو کوئی
نہ پہچانتا تھا۔ لیکن ہماری عوام کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان پر حکومت کرنے والے جس کی طرف
دیں، یہ بنا سوچے سمجھے اسے ووٹ دے دیتے ہیں۔ جو بندے یہاں سے ایم این اے اور ایم پی اے
ہیں، وہ تو سرے سے یہاں ملتے ہی نہیں۔ شہروں میں جا کر انہوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں اور مزے
بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اِدھر کا چکر لگا لیتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے حکم کے مطابق کام کر
ہیں۔ حکومت خوش ہے کہ اس کی شرط کے مطابق پڑھے لکھے بندوں کے پاس سیاسی نمائندگی ہے۔
افتخار جیسے مطمئن ہیں کہ بھلے سے نام کسی کا بھی ہو لیکن اصل آقا وہی ہیں اور ان کے اشاروں پر نا
سیاسی نمائندوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں کہ نقصان انہیں بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ عیش کر رہے ہیں۔''
نے اس کی بات کے جواب میں جو تبصرہ کیا، وہ تلخ سہی لیکن مبنی بر حقیقت تھا۔ وہ خود اپنی ملازمت
عرصے میں یہ بات بھانپ گیا تھا اسی لیے اس نے ان نمائشی نمائندوں سے کچھ خاص تعلق بھی نہیں رکھا
خود اپنی مرضی سے آزادانہ کام کر رہا تھا۔

''میں نے خود بھی یہ سارے حالات بھانپ لیے ہیں بختیار صاحب! مجھے پوری طرح سے احساس
یہاں کوئی بھی شخص عوام کے ساتھ مخلص نہیں ہے اور جو کچھ کرنا ہے، مجھے خود ہی کرنا ہے۔ اسی لیے میں سارا
بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ جلد اپنے گاؤں سمیت سارے ضلع میں بہت سی تبدیلیاں
گے۔'' چودھری بختیار کی بات سن کر اس نے اسے تسلی دی اور پھر رخصت کی اجازت لے کر وہاں سے
گیا۔ حسبِ معمول اس کی گاڑی مشابرم خان ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چودھری بختیار کے گھر سے وہ لوگ
جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی کہ ایک
انہیں چونکا دیا۔ ایک جیپ بہت تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ جیپ
چار پانچ آدمی سوار تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی توجہ ان کی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب ان کے
ہی دیکھتے چھلانگیں مار کر جیپ سے اُترے اور ایک طرف دوڑنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود
کلہاڑیاں بہت نمایاں تھیں۔ جیپ جس رخ سے آتی نظر آئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ
سواروں کا تعلق نور پور سے نہیں ہے، وہ کہیں باہر سے آئے ہیں۔ ان کے تیور بھی کافی خطرناک لگ رہے
ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی کے تعاقب میں ہیں۔ ان سے آگے ایک لڑکا اور لڑکی تھے جو تیزی سے
کے جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے۔

''گاڑی روک لو مشابرم خان!'' یہ محسوس کر کے کہ ان دونوں کی جان خطرے میں ہے، اس نے
اس عرصے میں ان کی گاڑی جیپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مشابرم خان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً
کو بریک لگا دیئے۔ وہ اور شہریار بیک وقت گاڑی سے باہر نکلے۔ اس وقت اگر عبدالمنان ساتھ ہوتا تو
انہیں اس معاملے میں ملوث ہونے سے روکتا لیکن مشابرم خان ایک تو حکم کا غلام تھا، دوسرے خود بھی
فطرت کا مالک تھا، سو فوراً اس کا ساتھ دینے چل پڑا۔



وہ لوگ بھی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں انہوں نے پہلے لڑکا لڑکی اور بعد
تعاقب کرنے والوں کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس جگہ کی زمین بہت نرم تھی اس لیے بھاگنے میں
آ رہی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ لوگ اس
گاڑی لانے کی کوشش کرتے تو گاڑی کے ٹائر پھنس سکتے تھے۔ وہ دونوں ممکنہ رفتار سے دوڑتے
درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے تو کچھ آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرا گئیں۔ ان آوازوں کا تعاقب
ہوئے وہ دبے قدموں آگے بڑھے۔ جھنڈ میں ذرا ہی آگے انہیں لڑکا لڑکی اور جیپ میں آنے والے
آ گئے۔

''دیکھ قربان! میں کہہ رہا ہوں کہ تُو سامنے سے ہٹ جا۔ تُو اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا نہیں رہ سکتا
بندے تجھے ایک جھٹکے میں ہٹا سکتے ہیں۔ لیکن میں صرف اس لیے لحاظ کر رہا ہوں کہ اپنے ہی نوکروں
تیری پستی (بے عزتی) نہ ہو۔'' قربان کے نام سے پکارا جانے والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا
ایک سہمی ہوئی لڑکی کو اپنی پشت کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ لڑکی کی پیٹھ چوڑے تنے والے ایک درخت
ہوئی تھی اس لیے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ نوجوان کو سامنے سے ہٹائے بغیر لڑکی تک پہنچ سکے اور
کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ہرگز بھی لڑکی کے سامنے سے نہیں ہٹے گا۔ شہریار نے لڑکی کو شناخت کر
چودھری بختیار کی چھوٹی بہن تھی۔ پچھلی بار وہ لوگ نور پور آئے تھے تو انہوں نے اس لڑکی کو چودھری
کے گھر میں دیکھا تھا۔

''تُو سامنے سے ہٹ رہا ہے یا میں ان لوگوں سے کہوں کہ تجھے گھسیٹ کر سامنے سے ہٹائیں اور باندھ کر
میں ڈال دیں؟'' نوجوان کو سامنے سے ہٹتے نہ دیکھ کر اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بھرا! میں نہیں ہٹوں گا۔ فریدہ تک پہنچنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ یہ میرے
پر یہاں تک آئی تھی، اس کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔'' قربان نامی نوجوان نے مضبوط لہجے میں
دیا۔

اس کے جواب سے شہریار کو اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان اور اسے دھمکی دینے والا آپس میں بھائی ہیں لیکن دو
بھائیوں میں سے ایک فریدہ کی جان کا دشمن اور دوسرا اُس کا محافظ کیوں بنا ہوا تھا، یہ بات اسے سمجھ نہیں
تھی۔

''لاشیں ہم صرف اپنے دشمنوں کی گراتے ہیں۔ اس بے شرم کُڑی تک پہنچنے کے لیے مجھے تیری لاش
کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے بندے ایسے ہی تجھے قابو کر لیں گے۔'' اس شخص نے اطمینان سے کہا اور
بندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ لوگ قربان کی طرف بڑھنے لگے۔ فریدہ جو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی، اور بھی
خوف زدہ ہو گئی اور پشت پر سے ہی لڑکے سے اس بری طرح چمٹ گئی جیسے اس کے وجود میں سما کر خود کو
دشمنوں کی نظر سے چھپا لینا چاہتی ہو۔

''ٹھہرو۔'' شہریار جواب تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا، یک دم ہی درخت کے پیچھے سے نکل کر ان لوگوں
سامنے آ گیا۔ کسی قسم کی ہاتھا پائی شروع ہونے سے قبل اس نے مداخلت ضروری سمجھی۔ اس کے ساتھ ساتھ
رم خان بھی منظر پر آ گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ شخص چونکا۔ اس کے ساتھی بھی بھڑکے ہوئے نظر آنے لگے۔

''میں شہریار عادل ہوں۔ اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

ان لوگوں کے تیوروں کو خاطر میں لائے بغیر اس نے اطمینان سے اپنا تعارف کروایا اور سخت لہجے میں
''دیکھیں سر جی! یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ ہم آپ اس
نکال لیں گے۔'' وہ شخص اس کا تعارف سن کر کچھ دبا تو ضرور لیکن اپنے طور پر اڑی بازی کرنے کی
کی۔ یقیناً ان لوگوں کی اس غیر متوقع مداخلت نے اسے بدمزہ کر دیا تھا۔ البتہ فریدہ اور قربان کے
اپنے لیے مدد آ جانے پر رونق دوڑ گئی تھی۔

''گھر کا مسئلہ تھا تو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر حل کرتے۔ ہتھیاروں کے زور پر ان دونوں
ویرانے میں گھیر کر کھڑے ہو اور کہتے ہو کہ گھر کا مسئلہ ہے۔ میں ابھی فون کر کے پولیس کو بتاتا ہوں
میں رہ کر پولیس کے ڈنڈے کھاؤ گے تو ساری بدمعاشی نکل جائے گی۔ اسے اس شخص کی خصلت کا اندا
تھا اس لیے اس سے اسی زبان میں بات کر رہا تھا جو اس کی سمجھ میں آ سکے۔ اس کے پیچھے کھڑے مشا
نے حفظِ ماتقدم کے تحت اپنا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ اس صورتِ حال نے سناٹا ساطاری کر دیا۔

''پولیس تک بات نہ پہنچائیں سر! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے وڈے بھرا ہیں۔ پولیس تک بات
بڑی بدنامی ہو گی۔ آپ نے ابھی دیکھا ہی ہو گا کہ میں فریدہ کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے بھی تیار
کی عزت اور جان کی حفاظت میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں اس لیے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ
میں بات نہ جانے دیں۔ اس سے فریدہ کی بدنامی ہو جائے گی۔'' شہریار کو موبائل پر نمبر پنچ کرتے دیکھ کر
نے آگے بڑھ کر اس سے درخواست کی۔

''ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں اس معاملے میں پولیس کو انوالو نہیں کرتا لیکن یہ بتاؤ کہ اب آگے
ہے؟'' اسے خود بھی اندازہ تھا کہ پولیس میں بات جاتی تو بدنامی تو لازماً ہی ہوتی اور چودھری بختیار
فطرت شخص کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوتی۔ اس لیے قربان کی درخواست پر اس نے فوراً موبائل جیب
لیا۔ اس جگہ ویسے ہی سگنلز بہت کم آ رہے تھے اور اسے امید نہیں تھی کہ کسی تھانے سے رابطہ ہو سکے گا۔

''میں اپنے بھرا کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ آپ فریدہ کو اس کے گھر تک حفاظت سے پہنچا دیں۔
سمجھیں کہ بات ختم۔'' شہریار کے ساتھ مذاکرات کی ذمے داری نوجوان قربان نے سنبھال لی تھی ا
پھنے خان بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ چپ چاپ کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہے، اس لڑکی کی عزت کی خاطر میں یہ بات مان لیتا ہوں ورنہ جو کچھ میں نے پہلے دیکھا
کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں تم سب کو تھانے میں بند کروا کر تمہارے دماغ درست کروا دوں۔'' ا
میں کہتے ہوئے اس نے معاملہ ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ درختوں کے جھنڈ سے وہ لوگ اس طرح باہر نکلے
اس کے ساتھ تھی اور قربان اپنے بھائی اور اس کے آدمیوں کے ساتھ جا رہا تھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ جی۔ اگر آپ نہ پہنچتے تو جانے آج میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔'' وہ لو
میں آ کر بیٹھے تو اب تک خاموش کردار بنی فریدہ نے اپنے لب کھولے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہو
پھوٹ کر رونے لگی۔

''کسی تنہا جوان لڑکی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے، یہ تو تمہیں اپنے گھر سے اتنی دور اس ویرانے
سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا تو اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں البتہ
سلسلہ اب بھی ہلکی ہلکی سسکیوں کی صورت میں جاری تھا۔

''یہ کون لوگ تھے؟ اور کیا معاملہ تھا؟..... کیا تم مجھے بتاؤ گی؟'' ذرا سے توقف کے بعد اس نے



وہ لوگ ابھی تک اسی جگہ موجود تھے اور اس نے مشابرم خان کو گاڑی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا
پہنچنے سے پہلے فریدہ خود کو سنبھال لے۔

''قربان ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کا پتر ہے۔ اس کے اور ہمارے خاندان کے بیچ ہمیشہ سے لڑائی
ہے۔ بھائی جی کی ٹانگیں جس حادثے میں ٹوٹیں، اس کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس حادثے
قربان کے باپ کا ہاتھ ہے۔ پر بھائی جی کو تو آپ نے دیکھا ہے کہ کیسے ٹھنڈے دماغ کے آدمی ہیں۔
نے کبھی یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کہی۔ شاید اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ کمزور پڑ گئے ہیں۔ خیر جو
ہو، میں آپ کو اپنے اور قربان کے بارے میں بتا رہی تھی۔ قربان سے میری ملاقات ایک ویاہ پر ہوئی
اس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر مر مٹا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگا۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے خاندان ایک
سرے کے بیری ہیں۔ دشمنی کی وجہ سے ملنا جلنا نہیں تھا تو ہم ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ پیار کا
ہندسے کے بعد خبر ہوئی تو دشمنی پیچھے چلی گئی۔ پر دوسرے لوگ تو ہماری طرح اس دشمنی کو نہیں بھول سکتے
ابھی آپ نے جس آدمی کو دیکھا تھا، وہ قربان کا وڈا بھرا سبحان تھا۔ اسے ہمارے بارے میں خبر ہوئی تو وہ
کے پیچھے پڑ گیا کہ فریدہ کا خیال دل سے نکال دو۔ پر قربان نہیں مانا۔ وہ بہانے سے چھپ چھپ کر مجھ
ملنے آتا رہا۔ سبحان کو اس کا پتہ چل گیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر تو نے فریدہ سے ملنا نہیں چھوڑا تو میں
اٹھا کر لے جاؤں گا اور اس کی عزت خراب کر کے لاش چودھری بختیار کے گھر کے سامنے پھنکوا دوں گا۔
قربان پچھلی واری مجھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین تھا کہ سبحان
صرف دھمکی دے رہا ہے، کرے گا کچھ نہیں اس لیے آج بھی وہ مجھ سے ملنے آ گیا۔ جہاں آپ نے آج
میں دیکھا ہے، ہم ہمیشہ ادھر ہی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شاید سبحان بھرا کو بھی یہ بات معلوم تھی، جب ہی
قربان کے پہنچتے ہی وہ خود بھی پیچھے پہنچ گیا۔ وہ تو رب کا کرم ہے کہ آپ آ گئے اور میری جان بچ گئی۔'' اس کے
پر فریدہ نے سارا قصہ سنا دیا۔

''چودھری بختیار کو اس معاملے کا کچھ علم ہے؟''

''نہ جی۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتہ۔ آپ بھی انہیں کچھ نہ بتانا۔'' اس کا سوال سن کر وہ جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گا۔'' شہریار نے اس سے وعدہ کیا اور مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے
بولا۔ ''گاڑی موڑ لو۔ پہلے ہم انہیں چودھری بختیار کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''نہ جی..... گھر تک چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ ہی چلی جاؤں گی۔ جن سے خطرہ تھا، وہ تو
چلے گئے۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ یہ میرا اپنا پنڈ ہے۔ یہاں کے سارے لوگ بھی میرے اپنے ہیں۔ یہاں
والوں میں سے کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پر اگر میں آپ کی گڈی میں گھر تک گئی تو بھائی جی کو کھوج لگ
جائے گی کہ میں آپ کے ساتھ کیوں آئی ہوں۔''

فریدہ اس کی پیشکش سے صاف انکار کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ اس نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا
تھا کہ فریدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے واقعی یہاں سے اپنے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی البتہ اس کے
ساتھ جانے پر وہ بات کھلنے کا اندیشہ تھا جسے وہ چھپانا چاہتی تھی۔ خود شہریار اس معاملے کو کھولنے میں کوئی دلچسپی
نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کی کئی کہانیاں اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہوں گی اور وہ ایسی ہر کہانی میں
خود کو ملوث کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''السلام علیکم سر جی! میں ایس ایچ او بشیر کاکڑ بات کر رہا ہوں جی۔''

''وعلیکم السلام۔ کہو کاکڑ! اس بچے الیاس کے سلسلے میں تم نے کیا، کیا؟..... میں نے تم سے کہا تھا جلد بچے کا پتہ کر کے اس کے ماں باپ تک پہنچاؤ۔ پر ابھی تک تم نے کوئی رپورٹ ہی نہیں دی۔'' بشیر کی آواز سن کر اس نے فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''اسی بارے میں تو رپورٹ دینے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے سر جی! آپ کے حکم پر ہم الیاس کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔ سارا گاؤں چھان مارا تھا۔ بسوں کے اڈے پر بھی جا کر پوچھ گچھ کی کہ کہیں بچہ گاؤں سے باہر تو نہیں نکلا۔ مگر کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن آج دوپہر ہمیں سب پتہ چل گیا۔ بڑے سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں جی۔ اتنے سالوں کی سروس میں، میں نے اتنا گھناؤنا معاملہ کبھی نہیں دیکھا۔ لوگوں کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا، سامنے سے اتنے نیک نظر آتے ہیں اور اندر سے پورے شیطان ہیں۔ جو اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی ایسی گھناؤنی حرکتیں کرے، اسے شیطان کیا، شیطان سے بھی بڑھ کر کہنا کم ہے جی۔''

''تفصیل اور ترتیب سے ساری بات بتاؤ۔ مگر اپنے ذاتی خیالات اور تبصروں کے بغیر۔ میرے پاس فالتو ٹائم نہیں کہ تمہاری بے سروپا باتیں سنتا رہوں۔'' اس نے کاکڑ کو ٹوکا۔

''میں الیاس کے کیس کے سلسلے میں بتا رہا تھا جی۔ اس کے بارے میں خبر مل گئی ہے، پر اچھی خبر نہیں ہے۔ آج دوپہر سے پہلے گاؤں کا ایک لڑکا میرے پاس آیا تھا۔ لڑکے کا نام ادریس ہے۔ الیاس سے یہی کوئی چار سال بڑا ہوگا۔ ادریس میرے پاس آیا اور زور دینے لگا کہ اگر مجھے الیاس کی تلاش ہے تو میں مسجد کی صفائی کرنے والوں اور مولوی غلام محمد سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کروں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لڑکا مولوی پر الزام لگانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ میں نے اس سے اس کے اس شک کی وجہ پوچھی تو پہلے تو وہ کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوا پھر میں نے ذرا ڈرایا دھمکایا اور تھانے میں بند کرنے کی دھمکی دی تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کی بتائی ہوئی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ مولوی کتنا گندا آدمی ہے۔ ادریس نے رو رو کر مجھے مولوی کے اس ظلم کے بارے میں بتایا جو وہ اس کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ الیاس کے بارے میں اس نے خیال ظاہر کیا کہ مجھے شک ہے کہ مولوی نے اسے بھی اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اسی وقت شک ہو گیا تھا، جب چودھری افتخار کی ناراضگی کی وجہ سے غیاث محمد کے گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور الیاس مدرسے میں مولوی کے پاس کھانا کھا کر آتا تھا۔ بھوک سے بے حال الیاس کو یقیناً اس نے اپنے مطلب کے لیے رام کر لیا تھا لیکن جب غیاث محمد کے حالات سدھر گئے تو اس نے مدرسے کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بار مولوی غلام محمد نے بچوں کے ذریعے پیغام بھیج کر الیاس کو بلوایا، پر وہ مدرسے جانے پر راضی نہیں ہوا۔ جس دن وہ غائب ہوا اس روز غیاث محمد نے مار پیٹ کر اسے مدرسے بھیجا تھا۔ بس پھر اس کے بعد وہ نہیں ملا۔ ادریس شک کے باوجود کسی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ لیکن آج جب اس نے نوراں کو روتے پیٹتے دیکھا تو اس سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی اور وہ میرے پاس تھانے آ گیا۔ ادریس کی رپورٹ پر میں فوراً اپنے بندے لے کر مسجد پہنچا۔ پر معلوم ہوا کہ مولوی غلام محمد آج صبح ہی اپنے کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہے اور اس وقت موجود نہیں۔ مسجد میں دو تین بچے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مولوی صاحب کے حکم پر مسجد کی صفائی کر رہے ہیں۔ ان بچوں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس روز الیاس غائب ہوا، اس روز وہ مدرسے آیا تھا لیکن مولوی صاحب اسے دیکھ کر بہت غصہ ہوئے اور غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر مدرسے کے لیے استعمال ہونے



والے کمرے سے باہر لے گئے کہ اب تجھے یہاں پڑھنے آنے کی ضرورت نہیں۔ بچوں نے بتایا کہ مولوی صاحب نے الیاس کو مارا بھی تھا اور انہوں نے اس کے رونے کی آواز بھی سنی تھی۔ لیکن پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی اور مولوی صاحب واپس آ کر انہیں پڑھانے لگے۔ یہ سارا واقعہ ہمیں پہلے بھی معلوم تھا لیکن ادریس کے بیان کی روشنی میں دوبارہ سوچا تو معاملہ مشکوک لگا۔ ہم نے مسجد کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ ساری مسجد کھلی ہوئی تھی سوائے اس کمرہ جس میں مولوی غلام محمد رہتا تھا، اس میں تالا پڑا تھا۔ ہم نے تالا توڑ کر کمرے کی تلاشی لی تو وہاں سے ایسی کئی چیزیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ مولوی واقعی مشکوک کردار کا بندہ تھا۔ انگریزی رسالوں سے کاٹی ہوئی گندی تصویریں، عجیب عجیب دوائیں اور کلوروفام کی بوتل اس کے کپڑوں کے صندوق سے ملی، پر الیاس نہیں ملا تھا۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا مولوی نے ساری مسجد کی صفائی کا کام بچوں کے ذمے لگایا تھا تو اپنے کمرے کی صفائی کیوں نہیں کرائی؟ اس پر کیوں تالا مار کر چلا گیا؟ ساری مشکوک چیزیں تو اس کے کپڑوں کے صندوق میں بند تھیں اور صندوق پر تالا لگا تھا۔ اگر وہ صفائی کے لیے اپنا کمرہ کھلا چھوڑ کر چلا بھی جاتا تو کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ کیا ہمیشہ مولوی صاحب اپنا کمرہ خود صاف کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں، ہمیشہ تو ہم ہی صفائی کرتے ہیں۔ بس آج ہی مولوی صاحب تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ اس بات کو سن کر میرا شک بھی پکا ہو گیا۔ میں نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ کمرے کے فرش پر بچھی چٹائی اُٹھا دیں۔ سپاہیوں نے چٹائی اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ فرش سے چپکی ہوئی تھی۔ انہوں نے زور لگا کر چٹائی کو فرش سے اُکھاڑ دیا۔ چٹائی ہٹی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ کمرے کا فرش کھدا ہوا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے کھودنے کے بعد دوبارہ مٹی ڈال کر برابر کیا گیا ہے۔ میں نے کدال اور پھاوڑا وغیرہ منگوا کر دوبارہ کھدائی کروائی تو ذرا سی دیر میں مولوی کا جرم سامنے آ گیا۔ الیاس کی لاش وہاں موجود تھی اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ لاش کو دفنائے پندرہ سولہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اپنے تجربے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اصل بات پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد سامنے آ جائے گی۔''

بشیر کاکڑ اس کے حکم پر تفصیل سے ساری رپورٹ سناتا گیا اور وہ دم سادھے اس بھیانک واردات کا قصہ سنتا رہا۔ اس ساری تفصیل کو سنتے ہوئے اس کا اپنا ذہن بھی واقعات کا تجزیہ کرتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غلام محمد جب الیاس کا ہاتھ پکڑ کر بہ ظاہر اسے مسجد سے باہر نکال آیا تھا تو دراصل اس وقت وہ اسے باہر نہیں لے گیا تھا بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد قوم لوط کا وہ لائق مذمت اپنی ہوس پوری کرتا رہا۔ لیکن دو تین دن گزر جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ الیاس کی اتنے دن کی گمشدگی کے بعد اس کا منظر پر آنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے تو اس نے اس معصوم بچے کو ختم کر کے اپنے ہی کمرے میں اس کی قبر کھود کر اُسے دفنا دیا۔ مولوی غلام محمد پہلی ملاقات میں ہی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے یہ اندازہ ہرگز بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے مکروہ کردار کا مالک ہوگا۔ جو کچھ ایس ایچ او نے اسے بتایا تھا، اسے سن کر تو اس کے اندر شعلے سے بھڑک اُٹھے تھے اور بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ غلیظ آدمی سامنے آ جائے تو اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

''مولوی کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟..... وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟'' خوفناک سنجیدگی کے ساتھ اس نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

''مولوی کسی کو کچھ بتا کر تو نہیں گیا۔ پر میں نے اس کے بارے میں جو تفتیش کروائی ہے اس سے پتہ چلا

ہے کہ وہ اردگرد کے کسی گاؤں ہی گیا ہے۔ جس بس میں وہ بیٹھا تھا، اس کے کنڈیکٹر نے بتایا ہے کہ اس میرو میں سے کسی ایک گاؤں کے قریب اُترا تھا۔ صحیح جگہ اُسے یاد نہیں تھی۔ میں نے دونوں جگہ اپنے بندے ہیں۔ وہ واپس آ جائیں تو پھر پتہ چل سکے گا کہ مولوی کہاں ہے؟ وہ جہاں بھی ہوا، میرے سپاہی اسے لگا کر لے آئیں گے۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں آپ کو خبر کر دوں گا۔ ابھی تو اس لیے فون کیا تھا کہ آپ تک کی رپورٹ دے دوں۔'' ایس ایچ او نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے۔ وہ گرفتار ہو جائے تو مجھے خبر دینا۔ میں اس شخص کو اس کے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دوں گا۔ اور ہاں، سنو! کوشش کرنا کہ الیاس کے ورثاء کو اس کی لاش کارروائی کے بعد بغیر کسی پریشانی کے مل جائے۔ وہ بے چارے پہلے ہی دُکھی ہوں گے، انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔'' ایس ایچ او کو ہدایت دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور عبدالمنان کو اپنے کمرے میں بلا کر واقعے کے بارے میں آگاہ کیا۔ تعزیت کے لیے پیر آباد جانے کا فیصلہ بھی سنایا۔

جب وہ لوگ پیر آباد پہنچے تو غیاث محمد کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک تو معصوم بچے کی بھیانک موت پھر اس شخص کے بارے میں ہونے والا انکشاف جسے وہ بہت نیک سمجھتے تھے اور جس کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ لوگوں میں سخت اشتعال اور غم و غصے کے جذبات پائے جاتے تھے۔ شہریار کو دیکھ کر وہ لوگ زور زور سے مطالبہ کرنے لگے کہ مجرم کو فوراً گرفتار کر کے اسے سخت سزا دی جائے۔ اس نے لوگوں کو تسلی دی اور انہیں دلایا کہ مجرم کو کسی حال میں معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ غیاث محمد سے ملا۔ اکلوتے بیٹے کی موت نے اسے بالکل گم صم کر دیا تھا۔ شدتِ غم سے وہ رونے کے لائق بھی نہیں رہا تھا، البتہ نوراں خوب پچھاڑیں کھا رہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی افسردہ تھے اور اس کے ساتھ آنسو بہا رہے تھے۔ عرصے میں تیسری بار نوراں کی کوکھ اُجڑی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جو تعزیت کے خیال سے وہاں آیا تھا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کو کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔ چند رسمی جملے بہ مشکل ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ البتہ ایک خیال بہت شدت سے اس کے ساتھ تھا۔ خود کو تباہی سے بچانے کے لیے نوراں نے غیاث محمد نے ماہ بانو کو داؤ پر لگانے کا سوچا تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ چودھری افتخار کی ذات کے علاوہ بھی ایک ذات ہے جو طاقت رکھتی ہے۔ جو رحمٰن ہے اور رحیم بھی۔ لیکن جب لوگ اس کی رحمت پر بھروسہ کرنے کے بجائے زمینی خداؤں کے خوف میں مبتلا ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے قہار اور جبار ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اب یہ بندوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ خود کو کی جانے والی اس تنبیہہ پر سنبھل کر اپنے رب کائنات سے توبہ و استغفار کر لیں یا سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلے شکووں پر اُتر آئیں۔

⊛----✪----⊛

''کیا خیال ہے باجوہ صاحب! اس ہفتے مال سپلائی کر دیا جائے؟ چمڑے کے کارخانے والے کا مسلسل فون آ رہا ہے کہ مال کی شارٹیج کی وجہ سے اسے مشکل ہو رہی ہے۔ جن پارٹیوں کے ساتھ وہ بزنس کرتا ہے پارٹیاں تقاضا کر رہی ہیں۔ لکڑی کے سلسلے میں بھی میری ایک نئی پارٹی سے بات ہو گئی ہے۔ موتی والا کی طرح اس پارٹی کے ساتھ شراکت کے بجائے صرف مال سپلائی کر کے رقم پکڑنے کا معاملہ طے کیا ہے میں نے شراکت داری میں لوگوں کو راز مل جاتے ہیں اور بندے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کس کا دماغ پھر جائے۔ موتی والا بھی اتنے برسوں تک ہمارے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر میں جا کر غداری پر اُتر آیا۔ بے کار میں



اموت چڑھ گیا تھا سالے پر۔ اب بھی دیکھ لیں، کیسے اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اے سی کا بچہ اس کی سے اسکول و ہسپتال بنواتا پھر رہا ہے۔''

''مال تو بالکل تیار ہے چودھری صاحب! جب سے شہریار عادل اے سی بن کر آیا ہے، سپلائی ہو ہی نہیں رہی۔ ضلع سے باہر جانے والی گاڑیوں کی وقت بے وقت چیکنگ ہونے لگتی ہے۔ ایسے حالات میں مال کرنے کا رِسک نہیں لیا جا سکتا۔ تارڑ صاحب کی موجودگی سے بھی ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ شہریار اکثر کے علم میں لائے بغیر ہی کوئی بھی کارروائی کر ڈالتا ہے۔ ایسے میں مجھے تو مال سپلائی کرتے ہوئے بہت خطرہ ہوتا ہے۔ اگر مال پکڑا گیا تو میری ہی گردن پھنسے گی۔ سب سے پہلے مجھ سے ہی سوال کیا جائے گا کہ سے غیر قانونی طور پر لکڑی اور کھالیں نکلیں کیسے؟'' چودھری افتخار کی بات سن کر اقبال باجوہ نے اپنے ات کا اظہار کیا۔

''آپ کے تحفظ کا مجھے پورا خیال ہے باجوہ صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے آپ ارے میں نہ سوچیں۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی سپلائی کی بات کی ہے۔ میرے بندے طرح دیکھ بھال چکے ہیں کہ آج کل سڑک پر کہیں چیکنگ نہیں ہو رہی۔ شہریار آج کل رفاہی کاموں میں ہے۔ ہسپتالوں اور سکولوں کی تعمیر کے چکر میں اسے دوسری باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت ل رہی اور اب وہ مولوی غلام محمد والے معاملے میں بھی اُلجھ گیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کیسے جگہ جگہ ں کے اسکیچ والے پوسٹر لگا کر اسے گرفتار کروانے میں مدد دینے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ ں کو گرفتار کروانے کے لیے شہریار دیوانہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں ضلعی پولیس اس چکر میں پھنسی جگہ جگہ مولوی کو ال کرتی پھر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ال سپلائی کر سکتے ہیں۔'' چودھری نے اسے حوصلہ دیا۔

''بات تو آپ کی صحیح ہے۔ واقعی ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ایک بار مال یہاں سے نکل گیا تو ل ہو جائے گا۔ آگے تو پھر ہماری وہی پرانی سیٹنگ بنی ہوئی ہے۔ آگے کوئی ہمارے مال کو روکنے والا نہیں ا۔'' وہ قائل ہونے لگا پھر اس کا دھیان مولوی غلام محمد کی طرف گیا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ویسے یہ آپ مولوی غلام محمد تو بڑی اونچی چیز نکلا۔ اس سے ایسے کام کی امید نہیں تھی مجھے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتا ایک ٹھاک مشکل میں پڑ جاتا۔ اب بھی جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے کہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے اب کے علاوہ بھی اسے کسی کی سپورٹ حاصل تھی اور اب وہ اسی شخص کی پناہ میں چھپا بیٹھا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ آدمی وہ خبیث ہے۔ اس بات کو میں نے سمجھ لیا تھا اس لیے تھوڑی سی رقم اور یں دے کر اس سے اپنے مطلب کے کام لیتا رہا۔ اس کی وجہ سے مجھے بڑی آسانی تھی۔ گاؤں والے اس ات بہت مانتے تھے اس لیے مجھے لوگوں کو جس چیز سے دور رکھنا ہوتا، اس کے لیے مولوی سے کہہ دیتا۔ ہاں، اللہ کے عذاب اور جہنم کے ڈراوے دے کر لوگوں کو قابو میں کر لیتا تھا لیکن اب اس کا جو کارنامہ کھل کر سامنے آیا ہے، اس کے بعد تو مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس کی سکھائی پڑھائی ساری باتیں بھول کر اپنی من مانی کرنے لگیں گے۔'' چودھری نے بھی اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

''یہ تو زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے چودھری صاحب! غلام محمد کے بعد مسجد ہمیشہ خالی تو نہیں رہے گی۔ اس کی ہ جو نیا مولوی آئے گا، آپ اسے اپنا بنا لیجیے گا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے ا ڈگمگا جاتے ہیں۔'' باجوہ نے مشورہ دیا۔

''خیر، جانے دیں اس معاملے کو۔ یہ معاملہ تو میں وقت پر خود ہی دیکھ لوں گا۔ اس وقت جو اصل مسئلہ وہ مال کی سپلائی کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لکڑی اور کھالیں دونوں ایک ساتھ ہی سپلائی کر دی جائیں۔''

''یہ تو بہت زیادہ رِسک والی بات ہو جائے گی چودھری صاحب! بے شک آپ کو اطمینان ہے کہ آج کل اس معاملے کی طرف دھیان نہیں لیکن اگر اتفاق سے اسے کچھ بھنک پڑ گئی اور وہ عین وقت پر پہنچ بیٹھا تو ہمیں تو بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔'' چودھری کی تجویز سن کر اس نے فوراً اعتراض کیا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس بارے میں ساری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ کہیں اور اس طرح سے مصروف ہو جائے کہ اسے ہوش ہی نہ رہے۔'' چودھری نے گہرے اطمینان کے ساتھ جواب دیا اور اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اس منصوبے کو سن کر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''نور پور کی تقریب کے سلسلے میں کیا تیاری ہے عبدالمنان؟ اس موقع پر ہر کام بالکل پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ میں نے وزیر صاحب سے بڑی مشکل سے وقت لیا ہے۔ کوشش کرنا کہ تقریب کا انتظام ایسا ہو کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس دورے کا پورا پورا فائدہ حاصل کیا جائے۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! میں سب انتظامات کا ذاتی طور پر جائزہ لے رہا ہوں۔ نور پور میں تقریب کے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔ مرکزِ صحت اور اسکول کے نقشے تیار ہیں۔ وزیر صاحب کے سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے انہیں یہ نقشے دکھا کر اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بریف کیا جائے گا۔ میڈیا والوں اور دوسری اہم شخصیات کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ اِن شاء اللہ اس تقریب کا پیر آباد کی تقریب سے زیادہ اچھا رسپانس سامنے آئے گا۔'' عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

''پیر آباد میں کام کیسا چل رہا ہے؟ الیاس کی لاش ڈسکور ہونے کے بعد میں دوبارہ وہاں کا چکر نہیں لگا سکا۔ وزیر صاحب کو راضی کرنے، ان سے تقریب میں شرکت کا وقت لینے کے لیے ہی اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔''

''وہاں کا کام بالکل اے ون طریقے سے چل رہا ہے۔ اسکول کی مرمت کا کام تو تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ بس دو چار دن اور لگیں گے، پھر عمارت استعمال کے قابل ہو جائے گی۔ ماسٹر آفتاب بھی اس دوران ہسپتال سے فارغ ہو کر واپس پہنچ جائے گا۔ ویسے آدمی بڑے کام کا ہے وہ۔ ہسپتال میں بستر پر لیٹے لیٹے بھی اسے چین نہیں ہے۔ کل کے اخبار میں اسکول والے حادثے پر اُس کا ایسا کاٹ دار کالم شائع ہوا ہے کہ میں پڑھ کر عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے کسی کا نام لیے بغیر اس انداز میں حادثے کا ذکر کیا ہے کہ ذمے داران سمجھ بھی جائیں کہ کس کی طرف اشارہ ہے اور کوئی اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ تم نے میرا نام کیوں لیا؟'' پیر آباد کے بارے میں رپورٹ دیتے دیتے عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے بارے میں بھی رپورٹ دے دی۔ ماسٹر آفتاب کے لئے اس کے لہجے میں گہری ستائش تھی۔

''آفتاب بہت ذہین آدمی ہے لیکن مسلسل خطروں سے کھیل رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔'' وہ اپنوں کے سمجھانے کے باوجود کسی بھی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہی کچھ کرتا تھا جو مناسب سمجھتا لیکن آفتاب کی طرف سے اسے سچ مچ فکر رہنے لگی تھی۔ خصوصاً کشور والا معاملہ سامنے آنے کے بعد اسے مزید تشویش تھی کہ اگر کسی کو اس بات کی بھنک پڑ گئی تو آفتاب کی خیریت سو فیصد خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ اس



اور کام کے آدمی کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''خطرہ تو ہم سب کے لیے ہی ہے سر! ہم جن لوگوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں بے شک نہیں ہیں لیکن اس لیے زیادہ خطرناک ہیں کہ ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انہوں کی جان سے کھیلنا اور انہیں نقصان پہنچانا ان کے لیے کوئی بات نہیں۔ آپ کو بھی ایک پیغام تو مل چکا ہے اب چاپ راستے سے ہٹ جائیں ورنہ اگلی بار بات مزید بڑھ سکتی ہے۔'' اس کا اشارہ اس حادثے کی طرف تھا جس میں شہریار کو باقاعدہ ٹریپ کر کے زخمی کیا گیا تھا۔

''میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور اچانک یاد آنے پر پوچھا۔ ''تم نے اُس اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے گھر والوں کو بھی تقریب میں آنے کی دعوت دے دی ہے نا؟ میں چاہتا ہوں کہ اس تقریب میں ان دونوں خاندانوں کے لیے مالی مدد کا اعلان کیا جائے۔ ان کا جو نقصان ہوا ہے، اسے تو پورا نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی عزت افزائی اور مالی معاونت کے ذریعے دوسرے لوگوں کو یہ پیغام تو دیا جا سکتا ہے کہ فرض کے لیے جان قربان کرنے والوں کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔''

''یس سر! میں نے ان لوگوں کو دعوت بھجوا دی ہے۔ تقریب والے دن دفتر کی گاڑی انہیں لینے جائے گی۔'' عبدالمنان نے اطلاع دی۔ اسی وقت میز پر رکھا فون بجنے لگا۔ اس نے ایک فائل کو کھولتے ہوئے سلطان کو کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ایک منٹ کے لیے بات کی اور پھر ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایس پی تارڑ صاحب لائن پر ہیں سر! آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے اپنی ناپسندیدگی کے احساس کو چھپاتے ہوئے ریسیور تھام لیا۔ اس شخص کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود وہ اس سے بات کرنے پر مجبور تھا۔ ایک ہی ضلع میں رہ کر وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ رابطے میں رہنے پر مجبور تھے۔ سجاد رانا کی یقین دہانی کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی انتظامی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی کہ اسے نجات مل جاتی۔ اس شخص کی جڑیں بھی یقیناً مضبوط تھیں اس لیے سجاد اسے ابھی تک وہاں سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''السلام علیکم اے سی صاحب! کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے معظم تارڑ کی پُرجوش آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام! فرمائیے کیسے یاد فرمایا آپ نے؟'' ایس پی کی گرم جوشی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے اس سے کال کرنے کا مقصد دریافت کیا۔

''آپ کو ایک اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ ویسے تو یہ پولیس کا معاملہ ہے لیکن چونکہ آپ پہلے ہی اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کر چکے ہیں، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے یہ معاملہ شیئر کر لیا جائے۔ آپ پر مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ اس ٹاپ سیکرٹ معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیں گے۔''

''کیسا معاملہ؟'' معظم تارڑ کی ادھوری باتوں نے اس کے تجسس کو بھڑکایا۔

''میں ڈاکوؤں والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ نے جب مجھ سے اس معاملے پر بات کی تھی، تب سے ہی میں نے اس پر خصوصی نظر رکھی ہوئی تھی۔ آج ہی ایک مخبر یہ اطلاع لے کر آیا ہے کہ ڈاکو آج رات کارروائی کرنے والے ہیں۔ ان کا نشانہ پیر آباد، میرو یا اللہ آباد میں سے کوئی ایک گاؤں ہو سکتا ہے۔ مخبر کو گاؤں کے بارے میں کنفرم معلوم نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کارروائی آج رات ہی کی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ آپ

سے بھی مشورہ کرلوں۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر پولیس فورس کے جوانوں کو ہدایات دے دی ہیں تینوں ہی مقامات پر پولیس فورس موجود رہے گی۔ ڈاکوؤں نے جس طرف کا بھی رخ کیا، اُنہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔ لیکن آپ بھی اس سلسلے میں اگر کوئی ہدایت دینا چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں۔ میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔'' معظم تارڑ کی دی ہوئی اطلاع واقعی بڑی زوردار تھی۔ اگر ڈاکو اس اطلاع کے مطابق سچ مچ کارروائی کرنے والے تھے تو یہ بہت اچھا موقع تھا کہ انہیں گھیر کر گرفتار کرلیا جائے۔

''آپ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں، ذرا مجھے اس کی تفصیل بتا دیں تارڑ صاحب! اب میں آپ کو کوئی مشورہ دینے کے قابل ہوسکوں گا۔'' معاملہ ایسا تھا کہ وہ سارے اختلافات بھلا کر سنجیدگی سے ایس پی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بھی بلا تامل مختصراً اپنے منصوبے کی وضاحت کردی۔ اس کی حکمتِ عملی بہت اچھی تھی اور اس کے پیچھے اس کا برسوں کا تجربہ صاف نظر آرہا تھا۔

''ویری نائس تارڑ صاحب!'' شہریار نے فوراً اسے سراہا۔ ''آپ کی حکمتِ عملی بہت اچھی ہے۔ بس اس بات کا خاص خیال رکھئے گا کہ پولیس فورس کے لوگ سادہ لباس میں اور بہت خاموشی سے ان تینوں جگہوں پر اپنی پوزیشن سنبھالیں۔ جس طرح ہمیں خبر ملی ہے، اسی طرح کوئی ڈاکوؤں کے لیے بھی مخبری کرسکتا ہے۔ اگر انہیں پولیس والوں کی موجودگی کی بھنک بھی مل گئی تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے انہیں گرفتار کرنے کا سنہری موقع نکل جائے گا۔''

''میں خیال رکھوں گا سر! بس تھوڑی پریشانی یہ ہے کہ تین تین گاؤں کور کرنے کی وجہ سے ہمیں تھوڑی کمی کا سامنا ہے۔ لیکن یہ ایڈوانٹیج بھی ہے ہمارے پاس کہ ڈاکو بے خبری میں آئیں گے اس لیے ہمارے جوان ان پر کم تعداد کے باوجود بھی قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

''یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے تارڑ صاحب! بے خبری میں کم فورس کے ساتھ بھی آپ ڈاکوؤں کی بڑی تعداد پر قابو پاسکتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ پوری کوشش کیجئے گا کہ کسی کو کانوں کان آپ کی کارروائی کا علم نہ ہوسکے۔'' شہریار نے زور دے کر کہا۔

''یہ بات تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں سر! بس آپ دعا کیجئے گا کہ ہمیں کامیابی ملے۔''

''وِش یُو بیسٹ آف لک تارڑ صاحب!'' اس نے تارڑ کی جذباتی درخواست کے جواب میں کہا اور فون بند کرکے متجسس نظروں سے اپنی طرف دیکھتے عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوکر اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''کہیں ان لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی نیا پلان نہ بنایا ہو۔'' ساری بات سن کر عبدالمنان نے شک کا اظہار کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہریار حسبِ عادت پُرجوش ہوچکا ہے اور اس سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ خود اس کارروائی میں حصہ لینے کے لیے پَر تول رہا ہو۔

''ہوسکتا ہے تمہارا شک صحیح ہو۔ اسی لیے میں نے ایس پی کے سامنے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا جس سے اسے لگے کہ میں اس کارروائی میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ البتہ اس معاملے کی تصدیق کے لیے میں دُور رہ کر ہی سہی لیکن ان لوگوں پر نظر ضرور رکھوں گا۔ رہی نقصان پہنچنے کی بات تو تم فکر مت کرو۔ اس بار میں ساتھ رہوں گا اور پہلے سے اپنی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کرکے جاؤں گا کہ مجھے نقصان پہنچانے کی خواہش رکھنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکیں۔'' اُس کے اس جواب پر عبدالمنان ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس جذباتی جوان کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

⊛----✪----⊛



رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جارہی تھی۔

اپنی گاڑی میں ڈی ایس پی منظور کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی گاڑی حسبِ معمول مشابرم خان ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک پولیس جیپ بھی موجود تھی۔ اس نے عین وقت پر اپنا یہ فیصلہ بدل دیا تھا کہ اس بار اپنی انوالومنٹ کو ایس پی تارڑ سے پوشیدہ رکھے گا۔ شام کے وقت خود فون کرکے اس نے ایس پی سے ظاہر کی تھی کہ وہ اس کے کیے ہوئے انتظامات کا جائزہ لینے تینوں گاؤں کا دورہ کرنا چاہتا ہے۔ ایس پی کی خواہش پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا، البتہ یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ اُس کا یہ اقدام خود اُس کے لیے مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ حالات کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ڈاکو کسی بھی وقت تینوں میں سے کسی بھی گاؤں پر حملہ کرسکتے تھے اور اگر وہ کسی ایسے گاؤں میں داخل ہوجاتے جہاں وہ موجود ہوتا تو اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ایس پی کے اس خدشے کو خاطر میں نہیں لایا تھا اور اپنی خواہش پر قائم رہتے ہوئے علاقہ ڈی ایس پی کو اس بھیجنے کے احکامات دے دیئے تھے۔ اب ڈی ایس پی اس کے ساتھ تھا اور وہ لوگ پیر آباد اور میرو کا چکر لگا چکے تھے۔ وائرلیس پر ایس پی مسلسل ان لوگوں سے رابطے میں تھا۔ موبائل فونز ہر جگہ کام نہیں کرتے تھے اس لیے وائرلیس اس موقع پر زیادہ کارآمد تھا۔ وہ لوگ میرو سے نکلے تو ایک بار پھر ایس پی نے ان لوگوں سے رابطہ کرلیا۔ وائرلیس سیٹ ڈی ایس پی منظور کے پاس تھا۔ پہلے اس نے ایس پی سے بات کی اور اسے بتایا کہ وہ میرو سے نکل کر اب اللہ آباد کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایس پی کی خواہش پر اس نے شہریار کی اس کی بات کروا دی۔ شہریار نے اس سے بات کرتے ہوئے پیر آباد اور میرو میں اس کے کیے گئے انتظامات پر مکمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے اپنے اللہ آباد جانے کے بارے میں بتایا اور ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بنگلے پر واپس چلا جائے گا۔ البتہ ایس پی جب چاہے فون کرکے اس کے پی اے عبدالمنان سے رابطہ کرسکتا ہے۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر عبدالمنان آج کی رات دفتر میں ہی گزارنے والا تھا۔ ایس پی نے اس پیشکش پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان ظاہر کیا کہ پولیس فورس آرام سے اس معاملے کو ہینڈل کرلے گی۔ اس نے شہریار کو یہ احساس بھی دلایا تھا کہ رات زیادہ ہوگئی ہے اور اب اسے جلد از جلد خطرے کے ان علاقوں سے نکل جانا چاہئے۔ جواباً اس نے ایس پی سے کہا تھا کہ دورے کی اصل وجہ کو چھپانے کے لیے اسے دونوں گاؤں میں علاقے کے مسائل سننے پر کچھ وقت صرف کرنا پڑا تھا، اس لیے اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ لیکن اب اللہ آباد میں وہ زیادہ وقت لگانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس ساری گفتگو کے بعد ایس پی اور ان کے درمیان رابطہ منقطع ہوگیا اور وہ گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ مشابرم خان سے بولا۔

''اللہ آباد جانے کی ضرورت نہیں مشابرم خان! گاڑی ضلع سے باہر جانے والی سڑک پر لے لو۔''

اس کے ساتھ بیٹھا ڈی ایس پی اس حکم پر چونکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اللہ آباد میں پولیس فورس کے لوگ موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ باقی دونوں جگہوں کی طرح وہاں بھی اچھا انتظام ہوگا۔ اس وقت ہم اللہ آباد کے بجائے وہاں جائیں گے، جہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔''

''تو پھر میں ایس پی صاحب کو پروگرام کی اس تبدیلی کے بارے میں انفارم کردیتا ہوں۔ انہیں آپ کی طرف سے بہت فکر تھی اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی ساری موومنٹ سے انہیں باخبر رکھوں۔'' ڈی ایس پی نے وائرلیس سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''لیکن میں اسے اپنی موومنٹ سے بے خبر رکھنا چاہتا چاہوں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو بہت فائدے

میں رہیں گے۔ آخر آپ کو بھی تو ایسے کسی کارنامے کی ضرورت ہوگی نا جس کے بعد آپ کا ڈی ایس پی ایس پی بننے کا سفر آسان ہو جائے۔ اگر آپ ایس پی صاحب کے احکامات کی تعمیل میں لگے رہے تو ریکارڈ ایسے کارناموں سے خالی ہی رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ میری بات مان لیں۔'' ڈی ایس وائرلیس کی طرف بڑھتا ہاتھ تھام کر وہ معنی خیز لہجے میں اس سے بولا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سر!'' وہ اس کی بات پر مزید اُلجھا ہوا نظر آنے لگا۔

''میرا مطلب بہت واضح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو ڈرامہ آپ کے ایس پی صاحب نے رچایا ہوا ہے میں اور آپ اس سے بے قوف نہ بنیں اور اس جگہ پہنچ جائیں جہاں اصل کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اب تک میں آپ کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومنے میں وقت برباد کرتا رہا ہوں، وہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے اس ڈرامے کا انوالو کرنے والوں کو یقین آ جائے کہ میں ان کے بنائے ہوئے پلان سے بے وقوف بن گیا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جلد پتہ چل جائے گا۔ بس اس کے لیے آپ کو تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے اور یقین جانئے اس تعاون کے نتیجے میں آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔'' وہ دھیرے دھیرے ڈی ایس پی کو سارا پلان سمجھانے لگا۔

آج شام ہی انور نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ دو بڑے لوڈرز کے ذریعے لکڑی اور کھالیں باہر جا رہی ہیں۔ اپنے دعوے کے مطابق وہ واقعی کارآمد ثابت ہوا تھا اور عین وقت پر ایک اطلاع فراہم کر کے ایس پی کی چال میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ انور کی کال کے بعد وہ اچھی طرح سارا معاملہ سمجھ گیا تھا لیکن انور کو بدستور یہ تاثر دیتا رہا تھا کہ وہ اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکا ہے۔ اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ پیر آباد اور میرو کا دورہ بھی کر ڈالا تھا۔ لیکن اب اللہ آباد جانے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب رات کا وہ حصہ شروع ہو چکا تھا جب اس کا اس مقام پر پہنچنا ضروری تھا جہاں لوڈرز کو روکا جا سکے۔

''میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں سر! مجھے آپ کا ساتھ دینے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کے لیے ہمارے پاس نفری بہت کم ہے۔ ان دونوں لوڈرز کے ساتھ مسلح افراد ہو سکتے ہیں۔ لوڈرز کو روکنے ان افراد سے نمٹنے کے لیے ہمیں زیادہ نفری کی ضرورت ہوگی۔'' ساری بات سن کر اپنی رضامندی ظاہر کر کے ساتھ ڈی ایس پی نے ایک اہم مسئلے کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ اسے معلوم تھا کہ ڈی ایس پی راضی ہو جائے گا۔ حالانکہ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اب تک وہاں جو کچھ ہوتا رہا تھا، اس سے ڈی ایس پی مکمل ناواقف نہیں ہوگا۔ وہ جانتا ہوگا کہ یہاں سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے لیکن کچھ نہ کچھ حصہ لے کر چشم پوشی اختیار کر لیتا ہوگا۔ پر اب اس نے اسے جو آفر دی تھی، وہ زیادہ بڑی تھی۔ اس پشت پناہی میں وہ یہ کارروائی کرتا تو خود اپنے اوپر والوں کے عتاب سے بھی محفوظ رہتا اور مفت میں کارنامہ بھی اس کے حصے میں لکھ دیا جاتا۔ محکمے کی طرف سے اس کارنامے کو سراہے جانے کے ساتھ مہکمہ کی طرف سے جو پذیرائی ملتی، وہ اس کارروائی کا ایک اور پلس پوائنٹ ہوتی۔

''نفری کی طرف سے آپ فکر نہ کریں۔ نورکوٹ کے تھانے میں کچھ عملہ کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے میں نے تھانے میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔ وہاں ایک آدھ کانسٹیبل کو چھوڑ کر ہم باقی بندوں کو ساتھ لے سکتے ہیں۔ بس اتنا انتظام کرنا ہوگا کہ کسی کو ان بندوں کے ہمارے ساتھ جانے کا فوری طور پر علم نہ ہو سکے۔ اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ وقتی طور پر تھانے کے فون کے تار کاٹ کر ناکارہ کر دیا جائے۔ جب وہاں سے کسی کا رابطہ ہی نہیں ہوگا تو یہ بھی نہیں پتہ چل سکے گا کہ ہمارے ساتھ کوئی گیا ہے۔'' وہ بولا۔



لے کر چکا تھا۔ ڈی ایس پی اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا چلا گیا۔ جلد وہ لوگ سارے انتظامات کے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں لوڈرز کو روکنا تھا۔ اس بار وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُر امید تھا، اس وجہ بھی زیادہ تھا۔ ان کے ساتھ موجود پولیس کے جوانوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اب کوئی گاڑی بغیر چیکنگ کے وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران ایک بار پھر ایس پی کی کال آئی اور ڈی ایس پی نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اے سی صاحب تھک گئے تھے اس لیے اللہ آباد کا چکر لگائے بغیر ہی اپنے بنگلے پر واپس چلے گئے۔ خود اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اردگرد کے کسی تھانے میں موجود رہے گا اور جیسے ہی کہیں ڈاکوؤں کی آمد کی اطلاع ملی، اپنے ساتھ موجود سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ اس بات کے بعد دوبارہ ایس پی نے رابطے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ لوگ پورے اطمینان سے اپنا کام کر رہے تھے۔ انہیں بہت زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور سڑک پر دو قوی ہیکل لوڈرز آگے پیچھے اس طرف آتے نظر آئے۔ آگے والے لوڈر نے رکاوٹ کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد بریک لگائے۔ یقیناً سڑک پر موجود یہ رکاوٹ ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ انہیں تو یہی کہہ کر بھیجا گیا ہوگا کہ جاؤ، راستہ بالکل صاف ہے۔ معمول کے مطابق ڈیوٹی پر رہنے والے بھی آج موجود نہیں کہ انہیں نفری کی کمی کا بہانہ بنا سکیں۔ آج رات کسی نہ کسی جگہ کھپا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اچانک راستے میں آنے والی یہ رکاوٹ ان کے لیے ناممکن ہی ثابت ہوئی ہوگی۔ آگے والے لوڈر کے رُکنے کے بعد پچھلے لوڈر کو بھی خود بہ خود ہی رُکنا پڑا تھا۔

''کیا بات ہے سنتری بادشاہ! یہ راستہ کیوں بند کر کے کھڑے ہو؟'' اگلے ٹرک ڈرائیور نے کھڑکی سے سر کر قریب آنے والے سپاہی سے پوچھا۔

''ہمیں ان لوڈرز کی تلاشی لینی ہے۔ تم لوگ نیچے اُترو تاکہ ہم اپنا کام کر سکیں۔''

''او یار! چھڈ اس تلاشی ولاشی کو..... ہم لوگ جلدی میں ہیں۔ کچھ لے کر معاملہ ختم کر۔ کیوں بے کار میں اپنا اور ہمارا وقت برباد کرتا ہے۔'' اس بار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے آدمی نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے اس کو لالچ دیا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ اس پیشکش کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ جواباً سختی سے بولا۔

''بکواس بند کراوئے..... ہمیں خبر ملی ہے کہ ان ٹرکوں پر غیر قانونی مال جا رہا ہے۔ ہمیں ہر حال میں ان کی تلاشی لینی ہے۔''

''تیرے باپ میں بھی دم نہیں کہ زبردستی تلاشی لے سکے۔ ہم ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیں گے تم لوگوں کی۔'' اس پھنکارتا ہوا ہاتھ میں ریوالور لے کر نیچے اُترا۔ لیکن فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سامنے نظر آنے والے دو سپاہیوں کے علاوہ بھی پولیس کے بہت سے جوان ان کے گرد موجود ہیں جنہوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔

''تم لوگ گھیرے جا چکے ہو۔ بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔'' فوراً ہی بلند آواز میں کہا گیا۔ اعلان بھی سنائی دیا جس کے بعد کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ وہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ ان ڈرائیوروں سمیت وہ کُل چار تھے اور جس انداز میں پولیس والوں نے اُنہیں گھیرا تھا، اس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں باخبر تھے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پولیس کی نفری کم ہوتی۔ وہ اپنے پھنس جانے کا شدت سے احساس ہوا لیکن وہ ہتھیار ڈال کر خود کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتے تھے اس لیے گھبراہٹ میں فوری طور پر فائر کھول دیا۔ فوراً ہی پولیس کی طرف سے بھی جوابی فائر ہوا لیکن وہ لوگ احتیاط فائرنگ کر رہے تھے۔ شہریار نے اس سلسلے میں خاص ہدایت کر دی تھی۔ وہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے ذریعے اصل افراد تک پہنچا جا سکے۔ اس احتیاط پسندی نے مجرموں کو موقع دے دیا کہ وہ

موقع سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ دو افراد اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ فائر کرتے ہو
نے پہلے آہستہ آہستہ سڑک چھوڑی، پھر کچے میں اُتر کر اندھیرے کا حصہ بن گئے۔ تیسرے نے
ساتھیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ دو رائفلز سے بہ یک وقت فائر
ایک گولی اس کے پیر میں لگی اور دوسری پشت میں گھس گئی۔ گولیاں کھا کر وہ ایک جھٹکے سے گرا تو پھر
کی۔ شاید پشت پر لگنے والی گولی نے دل تک رسائی حاصل کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر
صورتِ حال دیکھ کر چوتھے بندے نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیئے۔

فوراً ہی پولیس کے جوانوں نے اسے گھیر کر ہتھکڑی ڈال دی۔ زخمی شخص کا معائنہ کیا گیا تو وہ مر
دونوں لوڈرز کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد ہی یہ بات سامنے آ گئی کہ انور کی دی گئی اطلاع بالکل درست
لوڈرز پر وہی مال لدا ہوا تھا جس کو اتنے دنوں سے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کامیابی پر شہر
جگمگانے لگا۔ ڈی ایس پی منظور بھی بہت خوش تھا۔ اس ساری کارروائی میں اسے بھاگ دوڑ کچھ خاص
پڑی تھی لیکن کریڈٹ پورا پورا اسے ہی ملتا۔ شہریار اس پورے کیس میں خود سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ ساری
پولیس کے حصے میں ہی آنی تھی۔

''اسے کسی محفوظ جگہ رکھنا۔ یہ بڑے کام کا بندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے ہم اصل مجرموں
سکتے ہیں۔'' گرفتار شدہ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہدایت دی جس کے جواب میں ڈی ایس
نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت وہاں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گرفتار شخص کو
مقام پر پہنچانا، مُردہ آدمی کے لیے ایمبولینس کا انتظام اور مقامی میڈیا کو پولیس کی اس کارکردگی سے آگاہ
کے مسائل درپیش تھے۔ مختصر نفری کے ساتھ یہ سارے معاملات نمٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مفرور افراد
پیچھے جانے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر آ چکے تھے۔ ان افراد کے فرار ہو جانے کا اسے
لیکن جتنی بڑی کامیابی ملی تھی، اس کے مقابلے میں یہ چھوٹا سا نقصان برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم
آپریشنز میں ایسی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کا مارجن رکھنا ہی پڑتا ہے۔

''سر! وائرلیس پر کال آ رہی ہے۔'' وہ لوگ ابھی ان معاملات کو دیکھ ہی رہے تھے کہ مشابرم خان
کر اطلاع دی۔ ڈی ایس پی کا وائرلیس سیٹ اسی کی گاڑی میں تھا۔ اس اطلاع پر اس نے سوالیہ نظروں
شہریار کی طرف دیکھا اور اس کی طرف سے کال ریسیو کرنے کا اشارہ ملنے پر خود گاڑی کی طرف چلا گیا۔
دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے۔ وہ کچھ پریشان بھی لگتا تھا۔

''خیریت؟'' شہریار نے پوچھا۔

''ایس پی صاحب تھے۔ نور پور گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے وہاں پر کافی لوٹ مار مچائی ہے اور
ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ڈاکوؤں کی وہاں آمد کی اطلاع بہت دیر سے ملی۔ اطلاع ملنے کے بعد بھی
طور پر کارروائی نہیں کی جا سکی۔ ضلع کی زیادہ تر پولیس پیر آباد، میرو اور اللہ آباد کی حفاظت پر مامور تھی۔ نور
تھانے میں موجود نفری کو بھی ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ پھر تھانے کا فون بھی ناکارہ تھا اس لیے کوئی
نہیں ہو سکا۔ دوسری جگہوں پر موجود پولیس کے جوان جب تک نور پور پہنچے، وہاں سارا کھیل ختم ہو چکا
ایس پی صاحب خود نور پور میں ہیں اور مجھے بھی وہیں کال کیا ہے۔'' اس نے اطلاع دی تو شہریار بھی ششدر
گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا ہوّا کھڑا کر کے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹا
کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہاں تو سچ مچ ڈاکوؤں نے کارروائی ڈال دی تھی۔ البتہ جن جگہوں کے بارے



گئی تھی، ان سے ہٹ کر بالکل مختلف جگہ پر یہ کام ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ ان ڈاکوؤں کو پولیس
میں بیٹھے ہونے کی خبر مل گئی تھی اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا یا اصل ڈرامہ ہی اس طرح پلان
تھا۔ یہ بات کوئی بعید از امکان نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کے حملے کا ڈرامہ سچ مچ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے ہی
ہو اور اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے نور پور کو ٹارگٹ بنایا گیا ہو۔ اس طرح ڈرامے پر حقیقت
گمان ہوتا اور ڈاکو بھی محفوظ رہتے جیسا کہ ہوا بھی تھا۔ زمینداروں، پولیس اور ڈاکوؤں کا آپس کا گٹھ جوڑ
بات تو نہیں تھی۔ تینوں گروہوں کے لوگ آپس کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی مدد بہ وقت ضرورت
رہتے تھے۔

''آپ نے ایس پی صاحب کو یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کیا تھا؟'' لمحہ بھر میں یہ ساری
سوچنے کے بعد اس نے ڈی ایس پی سے پوچھا۔

''نو سر! وہ اتنی جلدی میں تھے کہ اپنی بات کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''انہیں آپ کے بتائے بغیر بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بہتر ہے اس تھوڑی سی مہلت سے
اٹھا کر آپ اپنا کام مکمل کر لیں۔ میں خود اپنے ڈرائیور کے ساتھ نور پور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ
اس بارے میں کسی بھی قسم کی جواب دہی کی جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بھی کیا گیا، اے سی م کروں گا
پر کیا گیا۔ آپ کے نور پور نہ پہنچنے کی وجہ میں خود ایس پی صاحب کو بتا دوں گا۔'' ڈی ایس
اس نے اس سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے
نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی جس تیزی سے نور پور کی طرف
اس کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا ہے، اس
طرح تلملائیں گے۔ بہر حال، وہ انہیں زک تو پہنچا ہی چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ گرفتار
ناموں کی نشان دہی کرتا ہے اور اس شخص کے بیان کی بنیاد پر اس جرم میں ملوث کن افراد
ہے؟ اپنی اس کامیابی کے ساتھ ساتھ اسے نور پور کی بھی فکر ستا رہی تھی۔ اس چھوٹے
نے جانے کتنی تباہی مچائی ہو گی؟ غریب دیہاتیوں کو پہنچنے والے نقصان کے خیال
کامیابی کی خوشی کو ماند کر دیا تھا۔

اس لڑکوں میں سب
تو اس نے بہت
ہا۔ اور پھر ان کے
تے تھے۔ اس رات
جلتے بلتے سینے میں

⊛----✪----⊛

''میرے بچو! یہ حربے نہیں ہیں۔ یہ حربے یہود و نصاریٰ بھی ہم پر آزماتے رہے ہیں۔
اس دی۔'' بڑی
اک، تعلیم اور صحت کے نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں اور انسانی ہمدردی کی آڑ میں معصوم لوگوں کے
وقت وہ
ابو میں کر کے انہیں اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ ان کفار کا مقصد ہمارے لوگوں کے عقائد بدل کر انہیں
ب میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ایک اور چال چلی ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ بے شک مسلمان
مذہب نہ چھوڑیں لیکن ان کے عقیدے اس طرح بدل جائیں کہ وہ بس نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ اس
م کے لیے وہ ایسے روشن خیالی کا راگ الاپنے والے مسلمانوں کا استعمال کر رہے ہیں جنہیں تم اپنے علاقے
آج کل سرگرم دیکھ رہے ہو۔ ہمارے علاقے کا نیا اے سی بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ بھولے بھالے
بڑے متاثر ہو رہے ہیں کہ اے سی ان کی بھلائی کے کام کر رہا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے بنائے
ئے اسکولوں میں جو تعلیم دی جائے گی، اس سے مسلمان بچوں کا ذہن خراب ہو جائے گا۔ وہ اپنے دین کو

بھول جائیں گے۔ اس چال باز اے سی کا اپنا تعلق ایسے گھرانے سے ہے، جہاں کوئی اللہ رسول سے ا
نہیں۔ ان کی محفلوں میں کھلے عام شراب پی جاتی ہے، عورتوں کو نچایا جاتا ہے، جوا کھیلا جاتا ہے۔ ان
اکاؤنٹ حرام کی کمائی سے بھرے ہیں۔ ایسے بے دین شخص سے کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس کا
مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہوگا۔'' کھچڑی داڑھی والا وہ شخص اپنے سامنے بیٹھے چار پانچ لڑکوں سے
لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ان لڑکوں میں سے کسی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بہت توجہ
شخص کی باتیں سن رہے تھے۔

''مگر مولانا صاحب! آج کل تو پورے ضلع میں نئے اے سی کی بڑی دھوم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ
ایمان دار اور بہادر افسر ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں سے ہونے والی لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کا
ہے۔'' تقریباً چودہ سال کے ایک گورے چٹے لڑکے نے جس کی مسیں ابھی بھیگنی شروع ہوئی تھیں
شخص ایسے انداز میں مسکرایا جیسے کسی بچے کی نادانی پر مسکرایا جاتا ہے۔ اور پھر پہلے سے بھی زیادہ پُر
میں بولا۔

''یہی تو وہ ہتھکنڈے ہیں میرے بچے! جن سے وہ لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ سارے میں اس
واہ ہو گئی۔ لیکن دیکھو! ابھی تک کھل کر کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ یقیناً اندر ہی اندر اس نے اور
اسمگلروں سے مک مکا کرلیا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مال پکڑا بھی اسی لیے گیا ہوگا کہ اسمگلرز اسے اس
کا بھتا نہیں دے رہے ہوں گے۔ تم لوگ دیکھ لینا کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''میرے بس میں ہو تو میں ایسے مکار لوگوں کو جان سے مار دوں۔ ایسے دو چار مارے جائیں
کے باقی ساتھیوں کے دماغ خود بخود ہی ٹھکانے آجائیں گے۔'' جذبات کی شدت سے سرخ پڑتے چہرے
ساتھ تیز لہجے میں یہ جملہ بولنے والا لڑکا یہی کوئی چودہ پندرہ برس کا تھا۔

''تحمل سے، میرے بچے! تحمل سے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ان لوگوں سے نمٹنا ہوگا۔ یہ بڑے
لوگ ہیں۔ تمہاری ہی طرح خود میرا دل بھی غصے سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں نے مولوی غلام
رکیک الزام لگایا ہے، اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو سینہ جل اٹھتا ہے۔ ایک معلم اور مسجد کے امام پر
الزام انہوں نے لگایا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا دل مذہبی ذہن رکھنے والے افراد کی طرف سے
جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ پولیس جو چاہے کرسکتی ہے۔ جانے انہوں نے کب، کس طرح اس معصوم
کر کے اسے جان سے مارا اور پھر لاش مولوی صاحب کے کمرے سے دریافت کرلی۔ بے چارے مولوی
محمد سید نے سادے سے آدمی تھے۔ وہ اس سازش سے کیسے نمٹتے؟ بے چارے اپنی جان اور عزت بچانے
لیے نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہوں گے؟ وہ جو پیر آباد میں کافی عرصے سے ماسٹر لوگوں کے دماغ
کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی تو بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ مسجد والا مدرسہ بند ہو جائے۔ اب
سازش کے بعد تو ظاہر ہے اس کا مقصد پورا ہی ہوگیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو وہ ماسٹر بھی اس سازش
اسسٹنٹ کمشنر کے ساتھ شامل ہوگا۔ بہرحال جس نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور بھگتے گا۔ یوں سمجھ لو کہ
ان کفار کے آلۂ کاروں کی رسّی دراز ہے۔ جس دن رسّی کھنچ گئی، سب کا دم ناک میں آجائے گا۔'' وہ
بڑی حلاوت لیے ان معصوم ذہنوں میں زہر بھر رہا تھا۔

''کیا ہم ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے مولانا صاحب؟ اپنے دین کے خلاف سازش کرنے والے
ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا تو ہم سب پر فرض ہے۔'' وہی لڑکا ایک بار پھر جوش سے بولا۔



''اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ جہاد جہاد پکارنا الگ بات ہے لیکن وقت پڑنے
کی بازی لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے جانچنے والی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکوں کو دیکھا۔

''وقت پڑنے پر ہم اس بات کو ثابت کرسکتے ہیں۔ ہمارا جذبہ صرف زبانی نہیں ہے، ہم عمل کی بھی ہمت
رکھتے ہیں۔'' ان میں سے دو تین لڑکے ایک ساتھ بول اٹھے۔

''شاباش میرے بچو! ہمارے دین کو تمہارے ہی جیسے جانبازوں اور دلیروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فخر ہے
تمہارے اندر یہ ہمت اور جذبہ میری تربیت نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے میری آخرت بھی سنور جائے
لوگوں کے اس جذبے پر وہ آبدیدہ سا ہوگیا۔

''پھر آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں مولانا صاحب؟ ہم جلد سے جلد کچھ کرنا چاہتے ہیں۔'' لڑکوں نے
کہا۔

''ابھی نہیں میرے بچو! ابھی حوصلے اور تحمل کا وقت ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ
کرنا ہے۔ ابھی تم لوگ انتظار کرو۔'' اس نے لڑکوں کو ٹالا پھر کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے
بولا۔

''وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ اب تم لوگ گھر جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے آرام کروں گا
فجر کے لیے اُٹھ سکوں۔'' اس حکم پر لڑکے فرماں برداری سے اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور عقیدت سے
کے ہاتھ کی پشت چوم کر رخصت لینے لگے۔ اس نے بھی ہر لڑکے کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر ہر
کے لیے انفرادی طور پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

''عبدالمتین پُتر! آج تم یہیں رُک جاؤ۔ آج میرے ساتھ ہی تہجد اور فجر پڑھنا۔'' ان لڑکوں میں سب
زیادہ پُرجوش نظر آنے والا لڑکا جب آخر میں اس سے رخصت لینے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے بہت
سے اسے حکم دیا۔ وہ فوراً راضی ہوگیا۔ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کرنا تو اس پر فرض تھا۔ اور پھر ان کے
عبادت میں شریک ہونا بھی ایک سعادت تھی جس سے وہ کبھی کبھی کسی لڑکے کو نوازتے تھے۔ اس رات
متین کو نہ صرف یہ سعادت نصیب ہوئی بلکہ ایسا بہت کچھ سننے کو ملا جس کو سن کر اس کے جلتے بلتے سینے میں
ان سا اُتر آیا۔

⊛----✪----⊛

''اور سنا رحمتے! پنڈ کی کیا خبریں ہیں؟ بڑے دنوں سے تُو نے کہیں کی کوئی خبر ہی نہیں دی۔'' بڑی
بھرائن نے فرش پر ایک طرف بیٹھی، اپنے دوپٹے کے کنارے پر بیل ٹانکتی رحمتے سے پوچھا۔ اس وقت وہ
دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹی ہوئی تھی اور نچھی اس کے پیر دبا رہی تھی۔

''پنڈ کی کیا کوئی نئی خبر ہونی ہے جی۔ جب سے غیاثے کے پُتر والا مامله (معاملہ) ہوا ہے، ہر طرف چپ
ہے۔ نوراں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے۔ غیاثا بھی گپ چپ سا ہوگیا ہے۔ زہرہ کبھی کبھی آکر ماں پیو کو دیکھ
لیتی ہے، پر اصل میں اسے میاں کی باہر کی کمائی کی ہوا لگ گئی ہے۔ اس لیے پیکے میں زیادہ دل نہیں لگتا۔ میں
سنا ہے کہ اس نے وہ بغیر تار والا فون بھی لے لیا ہے۔ اس پر روز میاں سے بات کرتی ہے۔''

''اسے موبائل کہتے ہیں اماں!'' چودھرائن کے پیر دباتی نچھی نے درمیان میں لقمہ دیا۔

''اے ہاں، وہی موبیل۔ اسی پر لگی رہتی ہے یا پھر ٹی وی دیکھتی رہتی ہے۔ اب ایسے مزے چھوڑ کر بھلا وہ
روز پیکے کیوں جانے لگی؟ چھوڑا ہوا ہے ماں پیو کو ان کے حال پر۔''

''چھوٹے لوگوں کو کچھ مل جائے تو وہ ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے ملنے والے روپے کی چمک آپے میں نہیں رہنے دیتی۔ زہرہ کو بھی میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے ویاہ ہوا ہے، حویلی میں آ کر نہیں۔'' بڑی چودھرائن نے جھلسے ہوئے لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

''آہو جی! یہ تو آپ سولہ آنے ٹھیک دس رہی ہیں۔ میں تو زہرہ کا حال دیکھ کر شکر کرتی ہوں کہ ویاہ کر اِدھر حویلی میں نہیں آ سکی۔ زہرہ تو اتنے سے روپے پا کر ہی آپے سے ایسی باہر ہوگئی ہے کہ سیدھے نہیں کرتی۔ اگر جو وہ دوسری مالکن بن کر حویلی آ جاتی تو جانے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتی؟'' چودھرائن ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے رحمتے نے ایک ایسی بات چھیڑ دی جس کو چودھرائن، ماہ بانو کی موت کے بعد بھلا سکی تھی۔ کہنے کو تو اس معاملے کو سب لوگوں سے چھپا لیا گیا تھا لیکن حویلی میں کام کرنے والے خود اس قصے سے واقف ہو گئے تھے اور رحمتے اور اس کی بیٹیاں تو تھیں بھی ذرا بڑی چودھرائن کی سرچڑھی کے بہت سے راز وہ خود انہیں بتا دیتی تھی۔ لیکن اس وقت اسے یہ ذکر برا لگا تھا۔ اپنی ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے وہ پیر دباتی نچھی پر چڑھ دوڑی۔

''دم نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں؟ ایسے پولے پولے ہاتھوں سے پیر داب رہی ہے جیسے چار دن کی فاقے پر ہے۔'' اس نے اپنی ٹانگ اس زور سے نچھی کے پہلو میں ماری کہ وہ جھٹکے سے دور جا گری۔

''ٹھیک سے پیر دبا کم بخت! ورنہ میں تیرے ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گی۔ جن کا کھاتی ہے، ان کی خدمت نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ دیکھا نہیں غیاثے کے خاندان کا حال۔ ماہ بانو نے سرکشی دکھائی تھی، اس کا پورے خاندان پر پیر سرکار کا قہر نازل ہو گیا۔'' رحمتے نے نمک حلالی دکھانے کے لیے فوراً بیٹی کو دو ہتڑ لگاتے ہوئے بے بھاؤ کی سنائی۔ وہ دونوں طرف کی مار کھا کر منہ بنائے بغیر ایک بار پھر چودھرائن کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔ اس بار وہ زیادہ زور لگا رہی تھی۔

''ماف (معاف) کر دیجئے گا اسے چودھرائن جی! اصل میں آج کل ان بہنوں پر کام بھی تو بہت ہے۔ نوراں نے جب سے حویلی آنا چھوڑا ہے، اس کے حصے کا کام بھی میری دِھیاں ہی نبیڑتی (نمٹاتی) ہیں۔ وہ رانی کی بچی تو کسی کام جوگی ہے ہی نہیں۔ سارا وقت کشور بی بی کے کمرے میں گھسی چاپلوسی کرتی رہتی ہے۔ اور تو اور اب تو اس نے ان کی کتابیں بھی لے کر پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ میری نچھی اور شادو سیدھی سادی ہیں۔ انہیں کام سے بچنے کے لیے یہ چالاکیاں کرنی نہیں آتیں کہ کشور بی بی کے آگے پیچھے گھومتی رہیں۔ پر جی! ہم تو آپ کو ہی حویلی کا اصل مالک سمجھتے ہیں اس لیے سب سے زیادہ آپ کی ہی خدمت کرنے کو جی چاہتا ہوتے ہیں۔'' رحمتے اب اپنی بیٹی کی صفائی دیتے ہوئے بڑی چالاکی سے دوسروں کے خلاف چودھرائن کے کان بھر رہی تھی۔ ان پڑھ اور مغرور چودھرائن فوراً اس کی باتوں میں آ گئی اور غصے سے بولی۔

''اس رانی کی بچی کا تو میں ایک منٹ میں دماغ ٹھیک کر دوں گی۔ پر پہلے مجھے کشور کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ مظلوم کہہ کہہ کر اس کا دماغ بھی آسمان پر چڑھا دیا ہے سب نے۔ اس کا جو جی چاہتا ہے، وہی کرتا ہے۔ ناہید بھی ہر وقت دِھی کی سفارشی بنی رہتی ہے۔ مجھے بھی خوشامدیں کر کے راضی کر لیتی ہے کہ میں پیر صاحب سے اس کی دِھی کی ضدیں منوانے کے لیے سفارشیں کروں۔ پر میں نے بھی اب سوچ لیا ہے کہ کڑی کو اب ذرا قابو میں کرنا ہے ورنہ یہ زیادہ ہی سر چڑھ جائے گی۔'' بڑی چودھرائن کا سوتیلا پن اس وقت اس کے لہجے سے جھانک رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں وڈی چودھرائن! یوں تو میں نوکر ذات ہوں اور میرا کچھ کہنا چھوٹے منہ بڑی



بات ہے، پر یہ تو زمانے کا دستور ہے جی کہ دِھیوں کو ذرا باندھ کر رکھو، تب ہی خاندان کی عزت سلامت رہتی ہے۔ اب جو آپ لوگوں نے کشور بی بی کو موبیل بھی لے کر دے دیا ہے تو یہ انہیں وڈی آزادی دینے والی بات ہے جی۔''

''کیا کہا تُو نے؟..... کیا ہے کشور کے پاس؟'' بڑی چودھرائن چونک کر جلدی سے سیدھی ہوئی۔

''موبیل جی۔ وہی بغیر تار والا فون۔ کیا آپ کو نہیں معلوم؟ مجھے لگتا ہے چھوٹی چودھرائن نے آپ سے چھپا کر اپنی دِھی کو موبیل دلوایا ہے۔'' نچھی اور شادو کی جاسوسی کے نتیجے میں کشور کے پاس موبائل کی موجودگی سب لوگوں پر کھل گیا تھا۔ ساتھ ہی اسے چوری چھپے موبائل پر بات کرتے دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ اس موبائل کی موجودگی سب کے علم میں نہیں ہے۔ ہر وقت ٹوہ میں رہنے والی بیٹیاں کشور کے بدلے ہوئے انداز پر ویسے ہی ٹھٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس موبائل کی موجودگی کا علم ہوتے ہی ان کے پیٹ میں مروڑ ہونے لگی۔ آج موقع دیکھتے ہی رحمتے فوراً اس بات کو بڑی چودھرائن کے علم میں لے آئی۔ اس قسم کی بھلائی یوں بھی اس کی فطرت میں شامل تھی اور یہاں تو اس کے نتیجے میں مالکان سے قربت بڑھانے کا پھل رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بہت چالاکی سے اس بات کو بڑی چودھرائن کے گوش گزار کر دیا۔ نتیجہ حسبِ توقع تھا۔ چودھرائن لیٹے سے اُٹھ بیٹھی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس نے اس اطلاع میں گہری دلچسپی لی ہے۔

''گل سن رحمتے! کسی اور کو یہ مت بتانا۔ بس تُو اور تیری بیٹیاں مل کر چپکے سے نظر رکھنا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھری صاحب سے بھی چھپا کر یہ کام کیا گیا ہے۔ وہ تو عورتوں کو فون کے پاس بھی نہیں جانے دیتے، بھلا کشور کو موبائل کیسے دلا سکتے ہیں؟ یقیناً ناہید نے چھپ چھپا کر اپنی دِھی کو موبائل دلایا ہے۔ یا پھر ہو سکتا ہے اسے بھی خبر نہ ہو۔ کشور اتنی بار کتابیں شتابیں خریدنے کے بہانے شہر جاتی ہے، وہیں چپکے سے اس نے موبائل بھی خرید لیا ہوگا۔ تُو بس کسی طرح اصل گل معلوم کر لے اور نظر رکھ کہ کشور کس سے گل کرتی ہے۔'' اس نے فوراً رحمتے کو ذمے داری سونپی جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

⊛----✪----⊛

''نور پور میں ساری تیاریاں مکمل ہیں نا عبدالمنان؟ خیال رکھنا کہ اس موقع پر کوئی بدمزگی نہ ہو۔ ڈاکے کی واردات کے بعد ویسے ہی میڈیا والے بڑی تنقیدیں کر رہے ہیں۔ ایس پی بھی کھنچا کھنچا سا ہے۔ اس رات نور پور تھانے میں موجود نفری کو بغیر اس کے علم میں لائے اسمگلرز کے خلاف استعمال کرنے کے معاملے کو اس نے خراب ہوا دی ہے۔ اس کی باتوں سے میڈیا نے یہی تاثر لیا ہے کہ اگر تھانے میں موجود نفری کو وہاں سے نہ ہٹایا جاتا تو نور پور میں بروقت ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ممکن ہوتی۔ اس کے واویلے کی وجہ سے لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کو روکنا کتنا بڑا کارنامہ ہے۔''

''آپ ایس پی کی باتوں پر کان نہ دھریں سر! اس کا معاملہ اس کھسیانی بلی کا سا ہے جو صرف کھمبا ہی نوچ سکی ہے۔ اپنی طرف سے تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بڑی اچھی چال چلی تھی کہ ڈکیتی کی واردات کے معاملے میں کسی کا اسمگلنگ کی طرف دھیان ہی نہیں جائے گا لیکن انور کی بروقت اطلاع نے ان لوگوں کی یہ سازش ناکام کر دی۔ میڈیا والے بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ اسمگلنگ کے تدارک کے لیے کی جانے والی کارروائی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے ایس پی کی بکواس کو صرف اس لیے اہمیت دی ہے کہ انہیں آپ سے اور اس کے درمیان چپقلش کی بُو آ گئی ہے۔ اور اب وہ اس آگ کو ہوا دے کر اپنے اخبارات کے لیے چٹ

پٹی خبریں حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ نور پور کی غریب عوام کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ جانے کی بھی انہوں نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھاپی ہیں لیکن میرے خیال میں آج جب متاثرین میں امدادی چیکس تقسیم کیے جائیں گے تو ایسی کسی شکایت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہے گی۔

نور پور میں ڈاکوؤں نے جو واردات کی تھی، اس میں لوگوں کا بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس لیے لوگ تھے جو متاثر ہوئے تھے۔ واردات کے انداز سے لگتا تھا کہ ڈاکو بہت عجلت میں اپنی کارروائی کر کے گئے ہوں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کی جانے والی ڈاکا زنی میں عموماً اس قدر عجلت دیکھنے میں نہیں آتی۔ بڑی تفصیل سے کارروائی کرتے ہیں۔ لیکن نور پور میں معاملہ مختلف تھا۔ جس سے شہریار کو اپنے اس شک پر بھی یقین ہو گیا کہ یہ سارا مصنوعی سیٹ اپ تھا اور ڈاکا زنی کی واردات صرف ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کروائی گئی تھی۔

ڈاکا زنی کی اس واردات کو ایشو بناتے ہوئے کچھ لوگوں نے وزیر بجلی و پانی کے نور پور جانے کو رسک کے حساب سے رِسک قرار دیتے ہوئے دبے لفظوں میں اس تقریب کو ڈِیلے کرنے کی بھی تجویز پیش کی۔ اس سلسلے میں اس نے وزیر صاحب سے ذاتی طور پر بات کر کے ان سے تقریب وقت پر ہی منعقد کرنے کی تائید حاصل کر لی تھی۔ وہ خود اس بات پر متفق تھے کہ ایک عام سی واردات کو اہمیت دے کر تقریب ملتوی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شہریار سے بات ہونے کے اگلے ہی دن اخبارات میں ان کا یہ بیان شائع ہوا تھا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ اس بیان پر وزیر صاحب کی خوب واہ واہ ہوئی تھی۔

شہریار کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی تھا کہ وزیر صاحب نے آنے سے انکار نہیں کیا تھا اور تقریب اسی ہی منعقد ہو رہی تھی۔ ایک دن پہلے وہ خود نور پور کا چکر لگا کر تقریب کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات کے بارے میں ہدایات دے کر آیا تھا۔ ڈاکے کے بعد خوف زدہ ہو جانے والے نور پور کے باشندوں سے اس نے خاص طور پر بات چیت کی تھی اور انہیں سمجھایا تھا کہ جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں اور اسے یاد رکھیں کہ ان کے آنے والے کل کو روشن و تابناک بنا سکتا ہے۔ گاؤں والے اس نکتے کو سمجھ گئے تھے اور اسے امید تھی کہ ان کے تعاون سے منعقد کی جانے والی تقریب بہت کامیاب رہے گی۔

''میں ایس پی کی زبانی کلامی باتوں کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتا ہوں۔ لیکن جہاں تک مجھے اس کی فطرت کا اندازہ ہوا ہے، وہ بڑا کینہ پرور آدمی ہے۔ ایسے آدمی موقع ملنے پر بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ اگر اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی تو آج کا دن اس کے لیے بہترین ہے۔ سکیورٹی پلان عملی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے ایسا موقع تلاش کر سکتا ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کیا جا سکے کہ وزیر صاحب کا نور پور جانا سکیورٹی کے لحاظ سے سچ مچ خطرناک تھا اور میں نے پروگرام کو برقرار رکھنے پر اصرار کر کے حماقت کی ہے۔'' پیشانی کو انگلی سے رگڑتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''آپ فکر نہ کریں سر! میرے خیال میں وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ کیونکہ کسی بھی بدمزگی کی صورت میں اس پر بھی ذمے داری عائد ہو گی بلکہ زیادہ ذمے داری اسی پر ہو گی۔ پھر بھی اگر آپ کہیں تو میں وزیر صاحب کی آمد سے پہلے نور پور کا چکر لگا کر ایک دفعہ اور جائزہ لے لیتا ہوں تاکہ اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو اسے دور کر سکے۔'' عبدالمنان نے اسے تسلی دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا۔'' اس کا یہ چھوٹا سا جملہ عبدالمنان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ فوراً ہی نور پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار دوسرے امور کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔



پروگرام کے مطابق وزیر صاحب کو لاہور سے یہاں پہنچنے کے بعد کچھ دیر اس کے بنگلے پر رُکنا تھا۔ یہاں وہ دیر رک کر آرام کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے پھر اس کے بعد نور پور جا کر تقریب میں شرکت کرتے۔ واپسی میں ایک بار پھر انہیں اس کے بنگلے پر رک کر شام کی چائے پینی تھی۔ یہ انتظام لاہور سے نور پور کی طویل مسافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔

وزیر صاحب کی آمد کے پیش نظر بنگلے میں بھی خوب رونق اور ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بارہ بجے تک اس ہلچل میں وہ کرسی کا مخصوص لبادہ اوڑھ لیا۔ بنگلے کے ملازمین اور انتظامی عملے کے تحرک کے باوجود وہاں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہاں مصروفِ عمل لوگ کسی خاص قسم کے مادے سے تخلیق کیے گئے ہیں جن کے کرنے اور بات چیت کرنے کے نظام میں کوئی ایسی ترکیب کارفرما ہے کہ ہر کام انجام تو پاتا ہے لیکن آواز ابھرنے پاتی۔ پونے ایک بجے تک عبدالمنان بھی نور پور سے واپس آ گیا۔ اس نے وہاں کے انتظامات پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اطلاع دی کہ اسٹیج کے چاروں طرف لگائی جانے والی رسیوں کو، جو لوگوں کو دور رکھنے کے لیے ایک باؤنڈری لائن کے طور پر لگائی جاتی ہیں، کھلوا کر اس نے دوبارہ مزید فاصلے پر لگوا دیا ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص ان حد بندی کرنے والی رسیوں کو پھلانگ کر اسٹیج پر پہنچنے کی کوشش بھی کرے تو اسے موقع نہ ملتا اور وہ درمیان میں ہی دھر لیا جاتا۔ شہریار نے اُس کی اس کارکردگی کو سراہا۔ ایک بج کر دس منٹ پر کال موصول ہوئی کہ وزیر صاحب سوا ایک بجے تک ضلع کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کال کے موصول ہوتے ہی وہ لوگ پہلے سے تیار گاڑیوں میں ان کے استقبال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے انہوں نے اپنے ضلع کی حدود میں وزیر صاحب کا استقبال کیا پھر ایک مشترکہ قافلے کی صورت میں بنگلے پر آ گئے۔ اس موقع پر ایس پی معظم تارڑ بھی موجود تھا اور وہ نام نہاد ایم این اے اور ایم پی اے بھی جنہیں اس کے عوام کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ لنچ بالکل نارمل ماحول میں کیا گیا۔ لنچ کے بعد وہ لوگ نشست میں آ کر بیٹھے تو وزیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی اور وہ شہریار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''یو آر سو ینگ مسٹر شہریار! پہلی بار جب میں نے رانا صاحب سے آپ کا ذکر سنا تھا، تب ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی ینگ پرسن ہی ہوں گے۔ آپ کے کام میں جس قسم کا جوش اور تیزی نظر آتی ہے اس کی ایک نوجوان سے ہی امید کی جا سکتی ہے۔''

''میرے خیال میں سر! یہ آدمی کے اندرونی احساسات کی بات ہوتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر جذبہ زندہ ہو تو عمر سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری ایج گروپ کے فرد نہیں لیکن پھر بھی اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں نا۔'' موقع کی مناسبت سے وزیر صاحب کو تھوڑا سا خوش کر دینے میں اس نے حرج نہیں سمجھا۔ وہ یہاں سے خوش واپس جاتے، تب ہی یہاں کے لوگوں کے لیے خوش حالی کے در کھل سکتے تھے۔

وزیر صاحب کی گہری ہوتی مسکراہٹ نے ظاہر کیا کہ اس کا جملہ کارگر ثابت ہوا ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میڈیا کے افراد کو پانچ منٹ کا ٹائم دیا اور اپنے اتنے لمبے سفر کو جذبہ حب الوطنی سے نتھی کرتے ہوئے دو چار مخصوص جذباتی جملے ادا کیے۔ اس کارروائی کو بھگتانے کے بعد وہ لوگ نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس بار وہ اور شہریار ایک ہی گاڑی میں تھے۔ راستے میں وہ انہیں ضلع میں کیے جانے والے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں کی تفصیلات سناتا رہا۔ وہ خاموشی سے بلاتبصرہ سب کچھ سنتے رہے۔ اپنے پراجیکٹس کی تفصیل سناتے ہوئے جب اس نے اپنے کام میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا تذکرہ چھیڑا تو وہ

بے حد توجہ سے سنتے رہے پھر یک دم ہی بولے۔

''جس طرح آپ کو شکایات ہیں، اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی آپ سے کچھ شکایات ہیں مسٹر ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات سے تجاوز کی کوشش کرتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ جن لوگوں کے لیے وہ رکاوٹ بن رہا ہے نے اوپر اقتدار کے ایوانوں میں اپنی فریاد پہنچا دی ہے۔ وزیر بجلی و پانی کا بظاہر ان معاملات سے کوئی تھا لیکن انہیں موقع دیکھ کر مذاکرات کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا تھا۔

''میرے خیال میں، میں نے ایسی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے مجھے احساس ہے کہ میں اپنے ضلع میں ہونے والے ہر کام پر نظر رکھوں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام اُٹھاؤں کے خیال میں اسکولز اور صحت کے مراکز قائم کرنے یا لوگوں کو بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کرنا ایسا کون سا کام ہے جسے اختیارات سے تجاوز کرنا قرار دیا جا سکے؟'' اس کا لہجہ نرم لیکن لفظوں میں کا وزیر صاحب ذرا سا پہلو بدل کر رہ گئے پھر گلا کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''میرا اشارہ پچھلے دنوں کی جانے والی اس کارروائی کی طرف ہے جس کے ذریعے لکڑی اور کا اسمگلنگ کو روکا گیا ہے۔ بہ ظاہر تو یہی کہا گیا کہ سارا کارنامہ ڈی ایس پی منظور کا تھا اور آپ نے صرف دی تھی لیکن حقیقت سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی کہ آپ اس ساری کارروائی میں براہِ راست رہے تھے۔ ایس پی تارڑ صاحب کو شکایت ہے کہ اس بے وقت کارروائی کی وجہ سے وہ نور پور میں ہو ڈکیتی کی واردات کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کر سکے۔ آپ کو کچھ کرنے سے پہلے کم از کم انہیں میں لینا چاہیے تھا۔

''میں انہیں اعتماد میں لے کر ایک بار پہلے بھی کارروائی کرنے کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اس تجربے کی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس تجربے کو دہرانے کی غلطی نہ کروں۔'' شہریار نے بہت سادگی سے وزیر صاحب بات کا جواب دیا۔

''آپ کا یہ جملہ براہِ راست الزام کے زمرے میں آتا ہے۔'' انہوں نے بہ غور اس کا چہرہ دیکھا۔

''میں نے آپ کو صرف اپنے تجربے کے بارے میں بتایا ہے۔''

''کیا گرفتار ہونے والے شخص نے اس طرح کا کوئی اشارہ دیا ہے؟'' انہوں نے اسے ٹٹولنے والی سے دیکھا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ اگلی نشست پر ان کا پی اے بھی بیٹھا تھا۔ لیکن ان افراد کا راز لوگوں میں ہوتا تھا اس لیے وہ کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔

''نہیں، اس نے ایک دوسرے فرد کا نام لیا ہے۔ لیکن وہ شخص جس تکون کا حصہ ہے، اس میں صاحب بھی شامل ہیں۔ گرفتار ملزم کے ساتھ آپ اس شخص کو بھی جلد عدالت میں دیکھیں گے۔ اگر پولیس شخص کا ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو باقی دو کے گلے میں پھندا ڈالنا بھی زیادہ مشکل ثابت گا۔'' وہ جانتا تھا کہ یہ سب باتیں ویسے بھی چھپنے والی نہیں اس لیے خود سے بتا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا سمجھا۔ گفتگو کے اس موڑ پر آنے کے بعد ان کی گاڑی نور پور کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ وزیر کے والہانہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ گفتگو کو مزید آگے جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ لوگ وزیر کے لیے زوردار نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کے درمیان کوئی نعرہ شہریار کے لیے بھی سنائی دے جاتا نعرے لگاتے اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتے لوگوں کے درمیان گھری گاڑیاں بڑی مشکل سے رینگتی ہوئی



ں۔ پروگرام کے مطابق پہلے وزیر صاحب کو یہاں مرنے والے اے ایس آئی اور کانسٹیبل کے لواحقین اسناد اور امدادی چیکس دینے تھے۔ چودھری بختیار اور وزیر صاحب کی تقاریر تو لازمی ہی تھیں۔ میں ڈکیتی سے متاثر ہونے والے نور پور کے باشندوں کے لیے چھوٹی مالیت کے امدادی چیکس کی تقسیم کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی سے وزیر صاحب کو پیشگی آگاہ کر دیا گیا تھا جس پر انہوں نے کوئی نہیں کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ تبدیلی بھی ان کے لیے مفید ہی تھی۔ آج کا دن تو پیسے ہی وہ اس تقریب واقف کر چکے تھے۔ اگر آٹھ دس منٹ اس کام میں خرچ بھی ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا بلکہ میڈیا کی ج کی وجہ سے انہیں مزید شہرت ہی ملنی تھی۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ اسکول اور مرکزِ صحت کا ار رکھتے اور پھر اس کے بعد واپسی ہو جاتی۔

ں وہاں پنڈال تک پہنچیں تو پولیس اور وزیر صاحب کے ذاتی اسکواڈ نے مل کر انسانی جسموں کی ایک ی دیوار سی بنا دی۔ اس دیوار کے حصار میں وزیر صاحب اور دیگر وی آئی پیز کو بہ حفاظت اسٹیج تک پہنچا دیا ں پر چودھری بختیار پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اپنی بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہو کر وزیر صاحب ال کیا۔ وزیر صاحب نے بھی جواباً اسے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اس سے کیا۔ پھر تمام حضرات نے اپنی مخصوص نشستیں سنبھال لیں۔

تقریب کا آغاز روایتی طور پر تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ کمپیئرنگ کی ذمے داری سنبھالنے کے لیے ے ماسٹر منیب کو بلوایا گیا تھا۔ آفتاب اگرچہ ہسپتال سے فارغ ہو کر آ چکا تھا لیکن ابھی اس کے لیے اتنی ذمے داری سنبھالنا تکلیف دہ ثابت ہوتا اس لیے اسے زحمت نہیں دی گئی تھی۔ تلاوت کے بعد منیب ور کے زمیندار چودھری بختیار کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ڈائس تک بڑے مؤثر انداز میں وزیر صاحب کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے آہستہ ات کو نور پور کے مسائل کی طرف لے گیا۔ اسٹیج کے پیچھے رکھے جنریٹرز کے شور پر معذرت کرتے ہوئے نور پور میں بجلی کی فراہمی کے لیے بھی درخواست کر ڈالی۔ وہ تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر واپس آ کر نے وزیر صاحب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھ کر ڈائس ے۔ ان کے ڈائس پر آنے پر لوگوں نے ایک بار پھر نعرے بازی شروع کر دی۔ کچھ جذباتی قسم کے نعرے لگاتے ہوئے حفاظتی حصار کے طور پر لگائی جانے والی رسّی کے بالکل قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک پندرہ سالہ نوجوان جوش میں یک دم ہی رسّی پھلانگ کر اسٹیج اور رسّی کے درمیان موجود پر آ کودا۔ اس نوجوان نے گھیر دار شلوار کے ساتھ ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی کود کر کے درمیان میں سے اس طرف آیا، حفاظت پر مامور افراد فوراً حرکت میں آ گئے۔ انہیں اس جذباتی کو پکڑ کر واپس رسّی کے اس طرف موجود عوام کے درمیان پہنچا دینا تھا۔ دوسری طرف وہ اسٹیج تک پہنچنے کا مند نظر آتا تھا۔ نوجوانوں کی اس حرکت پر اسٹیج پر بیٹھا شہریار بے چینی محسوس کرنے لگا۔ نوجوان کا چہرہ ے لیے شناسا تھا اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات بھی کچھ نئے نہیں تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ نوجوان اسٹیج پر پہنچ کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ سکیورٹی والوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا اور اسے اسٹیج تک نے دے رہے تھے جس پر وہ زور زور سے چیختا ہوا کچھ بول رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسٹیج پر افراد اس کے الفاظ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ مگر سب ہی اس صورتِ حال پر اپنی جگہ جز بز سے ہو رہے تھے۔ پر کھڑے وزیر صاحب نے ابھی تک اپنی تقریر شروع نہیں کی تھی۔ ماتھے پر ناگواری کی ہلکی سی لکیر لیے وہ

خاموشی سے اس ہنگامے کے نمٹ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی باڈی گارڈز ان کے دائیں بائیں کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہنگامہ کرنے والا نوجوان نہتا تھا اس لیے صورتِ حال زیادہ تشویش ناک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور وہ لوگ یہی قیاس کر رہے تھے کہ وہ وزیر صاحب کے قریب پہنچ کر ذاتی طور پر ان سے اپنا کوئی مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری لمحوں کی کہانی تھی اور سب لوگوں کو امید تھی کہ سکیورٹی والے ایک آدھ منٹ میں اس مسئلے سے نمٹ لیں گے۔ لیکن یہ اطمینان بس چند لمحوں کا ہی تھا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ نہ صرف غیر متوقع تھا۔ جوش سے بھرے نوجوان کو سکیورٹی والے گھسیٹ کر پنڈال سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ تو سب نے دیکھا لیکن اس کے بعد جو کان پھاڑ دھماکا سنائی دیا اور آگ کے شعلے بلند ہوئے، اس کو کچھ سمجھنے کی مہلت نہیں دی۔ دھماکے نے زمین کو لرزا کر رکھ دیا تھا اور لکڑی کا اسٹیج اس لرزش کو برداشت کرتے ہوئے اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکا تھا۔ تباہ ہوتے اسٹیج پر موجود میزوں، کرسیوں، ڈائس، مائیکس اور پھولوں سمیت انسانی وجود بھی تتر بتر ہو کر رہ گئے تھے۔ اس تباہی میں کس پر کیا گزری تھی، کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک طرف مرتے ہوئے اور زخمی انسانوں کی کراہوں کے ساتھ بلند خوف زدہ چیخیں تھیں جو سنائی دے رہی تھیں۔ دیکھنے کے لیے آگ کے شعلوں کا رقص تھا۔ اس رقص میں نور پور کے عوام کی خوشیاں اور اُمیدیں ان کے توڑتے جسموں کے ساتھ ہی دم توڑ رہی تھیں۔

⊛----✪----⊛

وہاں گویا قیامت کا سماں تھا۔ دم توڑتے اور زخمی انسانوں کی کراہوں اور چیخوں نے ان لوگوں کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا جو اس حادثے میں بالکل محفوظ رہے تھے۔ اس آفت زدہ مقام سے دور جانے کی خواہش میں وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور کچلتے وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اپنے حواس کو مختل نہیں ہونے دیا تھا اور اس آفت کے نتیجے میں پھیلنے والی بدنظمی سے نمٹنے کے لیے متحرک ہو گئے تھے۔ انہی میں ایک شہریار بھی تھا۔ حادثے کے وقت وہ اسٹیج پر ایک کرسی پر براجمان تھا۔ دھماکے کے باعث اسٹیج ٹوٹ پھٹ کا شکار ہوا تو وہ کرسی سمیت اسٹیج کے پچھلے حصے میں جا گرا۔ گرنے سے اس کی کہنیوں اور گھٹنوں سمیت جسم کے کئی حصوں پر چوٹیں آئیں لیکن اس وقت اسے اپنی چوٹوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ گرنے کے ساتھ ہی وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے زخموں کی طرف توجہ دیے بغیر اس طرف لپکا جہاں اسے ڈی ایس پی منظور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالکل صحیح سلامت تھا اور چیخ چیخ کر اپنے ماتحتوں کو احکامات جاری کر رہا تھا۔ شہریار اس کے قریب پہنچا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''فوراً نور کوٹ تھانے سے رابطہ کرو اور وہاں سے مزید نفری بلوانے کے ساتھ ساتھ امدادی کام کرنے والی ٹیموں کو بھی کال کرو۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی پولیس پارٹی کو اللہ آباد کی طرف روانہ کرو۔ ان سے انہیں دین محمد نامی ایک شخص کو اس کی پوری فیملی سمیت اریسٹ کر کے تھانے پہنچانا ہو گا۔ خیال رہے کہ گرفتاری بہت خاموشی سے ہونی چاہئے اور جب تک میں وہاں نہ پہنچوں، ان لوگوں کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دینی ہے۔'' تیز تیز بولتے ہوئے اس نے احکامات جاری کیے۔

''او کے سر!'' ڈی ایس پی اگرچہ دین محمد کی گرفتاری والے حکم کا سبب نہیں سمجھ سکا تھا لیکن اس نے بھی سوال کیے بغیر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا اور اس طرف چل پڑا جہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھیں۔ شہریار خود بھی فوراً پلٹ گیا اور اسٹیج کی طرف چل پڑا۔ وزیر صاحب کا ذاتی حفاظتی عملہ اس دھماکے کے



نے حصار میں لے چکا تھا۔ دھماکے کے اثر سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے تھے اور اپنی جگہ سے اُچھل کر گر گئے۔ لیکن ان کے سکیورٹی گارڈز نے اس وقت بڑی مستعدی سے اپنے فرائض نبھائے تھے۔ وزیر صاحب کے گرنے کے بعد وہ ان کی ڈھال بن گئے تھے۔ چنانچہ وہ دھماکے کے اثر سے اِدھر اُدھر اُڑ کر لوگوں کو زخمی کرنے والی کسی شے کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے باڈی گارڈز نے ان کے حصے کا ہر زخم اپنے جسم پر سہہ لیا تھا۔ وہ اسٹیج کی طرف بڑھا تو اِدھر اُدھر بکھرا وزیر صاحب کا حفاظتی عملہ اس دوران ان کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے اس طرح وزیر صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ وہ دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ اسے بہ مشکل اس حفاظتی گھیرے میں سے گزر کر ان تک پہنچنے کی اجازت ملی۔ انہیں دیکھ کر اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ مکمل طور پر محفوظ ہیں اور انہیں کوئی زخم نہیں آیا۔ لیکن ان کے چہرے پر موجود شدید پریشانی اور غصے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''آئی ایم سوری سر! آپ کو یہاں اتنی ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس معاملے کی مکمل تحقیقات کراؤں گا۔ فی الحال تو موجودہ پچویشن سے نمٹ لوں۔ پلیز! آپ فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ آپ کی سکیورٹی اس وقت میرے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے۔'' ان تک پہنچنے کے بعد اس نے یہ چند جملے جو انہوں نے شدید ناگواری کے تاثرات کے ساتھ سنے اور اسے جواب دیئے بغیر اپنے پی اے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے پی اے کی سفید شرٹ پر خون کے چند دھبے نظر آ رہے تھے جس سے ظاہر تھا کہ چوٹیں آئی ہیں لیکن یقیناً یہ چوٹیں معمولی نوعیت کی رہی ہوں گی اس لیے وہ بہت زیادہ تکلیف میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''گاڑیاں ریڈی ہیں سر! ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' وزیر صاحب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے مستعدی سے بتایا۔ فی الفور ہی وزیر صاحب کی وہاں سے روانگی عمل میں آ گئی۔ اپنے محافظوں کے حصار میں وہ اپنی شان دار گاڑی تک پہنچے۔ میڈیا کے نمائندوں نے جو اس ساری ہنگامہ آرائی کی کوریج کر رہے تھے۔ اس منظر کو اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیا۔ وہاں موجود افراد میں سے جن افراد نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا ہوا تھا، ان میں سے نمایاں تعداد میڈیا کے افراد ہی کی تھی۔ وہ صرف ایک تقریب کی کوریج کے لیے آئے تھے لیکن دھماکے کے بعد پیدا ہونے والی سنسنی خیز صورتِ حال نے ان کی دلچسپی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ وہ یہاں سے جاتے تو ایک تقریب کی معمولی رپورٹ کے بجائے ان کے پاس سنسنی خیز خبروں کا ڈھیر ہوتا۔ اور میں بھی آج ایک ایسا ہی حادثہ برپا ہوا تھا جسے یقیناً اس تقریب سے بہت زیادہ توجہ حاصل ہوتی جس کے لیے یہاں یہ سارا مجمع جمع کیا گیا تھا۔ وزیر برائے بجلی و پانی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مرکزِ صحت اور اس کے سنگِ بنیاد رکھے جانے کی خبر کتنے شوق سے پڑھتے؟ شوق سے پڑھنا تو دور کی بات اکثریت تو سرخی پر نظر ڈال کر ہی آگے بڑھ جاتی۔ لیکن اب ایسا نہیں ہونا تھا۔ وہاں لوگوں کو متوجہ کرنے والا ایک خونی حادثہ پیش آ چکا تھا۔ اس حادثے کے ذمے دار اس جوشیلے نوجوان کا اب وہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے جسم پر خودکش جیکٹ پہن کر وہاں آیا تھا۔ اس کا ارادہ ہو گا کہ کسی طرح اسٹیج تک پہنچ جائے اور وہاں پہنچ کر کچھ کرے لیکن اسے موقع نہیں مل سکا۔ وہاں سکیورٹی پر مامور پولیس کے افراد نے اسے اس طرح جکڑا کہ وہ آگے بڑھا ہی نہیں سکا۔ بظاہر وہ نہتا تھا لیکن اسے جکڑنے والے اہلکاروں نے یقیناً اس کے لباس کے نیچے خودکش جیکٹ کی موجودگی کو محسوس کر لیا ہو گا اور جب اس نے دیکھا ہو گا کہ وہ لوگ اسے چھوڑنے کے تیار نہیں اور وہ کسی طرح اسٹیج پر نہیں پہنچ سکتا تو اس نے اسی مقام پر خود کو دھماکے سے اُڑا دیا۔ دھماکے کے

نتیجے میں اس کا جسم کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا۔ یہی حشر ان پولیس اہلکاروں کا بھی ہوا جو اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب وہاں اس خودکش حملہ آور نوجوان اور فرض کی خاطر جان قربان کر دینے والے پولیس اہلکاروں کے جسم کے ٹکڑے اور خون آپس میں خلط ملط پڑے اس طرح نظر آ رہے تھے کہ ظالم و مظلوم کے خون کو الگ شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن خون کا وہ تالاب بہ زبانِ خاموشی یہی سوال کر رہا تھا۔

''آخر یہ سب کیوں ہوا؟ اس چھوٹے سے گاؤں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں سے آخر کس کو تکلیف تھی کہ آگ و خون کی ہولی کھیل کر اس خوشی کی تقریب کو نالۂ غم میں تبدیل کر دیا گیا؟''

فی الحال ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے۔ یہ وقت ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا بھی نہیں۔ ابھی تو اس سب کو بچانے کا مرحلہ درپیش تھا جو اس حادثے میں مکمل طور پر تباہ نہیں ہوا تھا۔ شہر کے علاوہ وہاں موجود دیگر ذمے داران بھی اس وقت اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو جائے حادثہ سے ہٹایا جا رہا تھا۔ ایس پی معظم تارڑ بھی اس وقت پوری طرح متحرک تھا اور اس کی ہدایت پر پولیس والے دوڑے پھر رہے تھے۔ اس موقع پر اس نے عبدالمنان کے حُسنِ انتظام کو پوری طرح محسوس کیا۔ اس کا اسٹیج اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھانے کا فیصلہ اس وقت بہت کارآمد ثابت ہوا تھا۔ خودکش حملہ آور اس درمیانی فاصلے کی وجہ سے حد بندی کرنے والی رسّی پھلانگ لینے کے باوجود اسٹیج کے قریب پہنچ جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور کسی وی آئی پی کی موت واقع نہیں ہو سکی تھی۔ پولیس والے اور قریب موجود عوام میں سے جو لوگ زخمی آئے تھے، ان کی موت بھی یقیناً افسوس ناک تھی۔ لیکن خودکش حملہ آور اپنے اصل ٹارگٹ یعنی اسٹیج پر موجود وی آئی پیز کو نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس اعتبار سے انتظامی خوبی کو سراہا جا سکتا تھا۔ اس خوبی کی دوسری مثال وہاں موجود ایمبولینسیں اور ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی کی صورت میں بھی موجود تھی۔ اگر ایسی کوئی سن گن یا خطرہ موجود نہیں تھا کہ تقریب کے دوران اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے، اس کے باوجود یہ سارا انتظام صرف اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے اتنے بڑے مجمعے میں اگر خدانخواستہ ناخوشگوار صورتِ حال پیش آ جائے تو اس سے فوری طور پر نمٹا جا سکے۔ اس وقت یہ انتظام کام آ رہا تھا۔ شدید زخمی افراد کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کام کے لیے پولیس کی گاڑیاں بھی استعمال کی جا رہی تھیں۔ دھماکے کے نتیجے میں جو آگ بھڑکی تھی، اس پر بھی فائر بریگیڈ والوں نے قابو پا لیا تھا۔ اگر یہ آگ فوری طور پر نہ بجھائی جاتی تو بڑا مسئلہ ہو جاتا۔

''سر! اب یہاں سے نکل چلیں۔ یہاں اب آپ کے مزید ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' کافی دیر بعد جب صورتِ حال پر کسی حد تک قابو پایا جا چکا تھا، عبدالمنان نے اس کے قریب آ کر اس سے کہا۔ وہ بھی دوران متحرک رہا تھا۔ حالانکہ اس کی پیشانی پر کسی شے کا اُڑتا ہوا ٹکڑا آ لگنے کے باعث اچھا خاصا گہرا زخم لگ گیا تھا جس پر اس نے اپنا رومال تہ کر کے رکھنے کے بعد اس پر اپنی ٹائی کی پٹی کو اچھی طرح باندھ لیا تھا۔ اس سے اب بھی خون کا معمولی سا رساؤ جاری تھا۔

''میری گاڑی واپس آ گئی ہے کیا؟'' اس نے چونک کر عبدالمنان سے پوچھا۔ دیگر گاڑیوں کی طرح اس کی گاڑی سے بھی زخمیوں کو ہسپتال تک پہنچانے کا کام لیا گیا تھا۔

''یس سر! مشابرم خان واپس آ چکا ہے۔ ڈی ایس پی منظور کی طرف سے بھی یہ پیغام ملا ہے کہ آپ نے جن لوگوں کی گرفتاری کے احکامات دیئے تھے، وہ گرفتار کیے جا چکے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ..... پھر تو ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔'' وہ فوراً جانے کے لیے راضی ہو گیا لیکن عین اس



وقت میڈیا کے کچھ نمائندوں نے گھیر لیا۔

''آپ اس حادثے کے بارے میں کیا کہیں گے اے سی صاحب؟ یہ دوسری بار ہوا ہے کہ آپ کی طرف سے جانے والے ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ کھڑی کی گئی ہے۔ پہلے پیر آباد والے اسکول کو آگ لگائی گئی اور یہاں سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر بھی اتنا بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، ان واقعات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہیں چاہتے کہ اس ضلع میں ترقی ہو؟'' تیز طرار اور ذہین نظر آنے والے میڈیا کے ایک نمائندے نے دو مختلف واقعات کو جوڑ کر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ویسے یہ سوال غلط بھی نہیں تھے۔ واقعی حالات ایسے ہی تھے کہ لگتا تھا، کوئی اسے ان ترقیاتی کاموں سے روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پیر آباد والے واقعے کے پیچھے موجود شخص کو تو اس نے شناخت بھی کر لیا تھا کہ چودھری افتخار کے علاوہ کسی اور کی حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن نور پور میں پیش آنے والے حادثے نے اسے اُلجھا دیا تھا۔ اتنی بڑی سازش کسی باقاعدہ ایک وفاقی وزیر اور کئی ممتاز شخصیات کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اسے تیار کرنے اور اس پر عمل درآمد ہونے کی جرأت کرنا چودھری کے قد سے کچھ بڑا کام محسوس ہوتا تھا۔

''اس حادثے کے پیچھے کون ہے، یہ تو فی الحال میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اس سمیت میں ہر کسی کو یہ پیغام ضرور دینا چاہتا ہوں کہ پیر آباد والا اسکول جس طرح تباہ ہونے کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے، اسی طرح کوئی دوسرا پروجیکٹ بھی ہرگز ختم نہیں کیا جائے گا۔ سازشیں کرنے والے سازشیں کرتے رہیں، تعمیر کرنے والے ہاتھ تعمیر کرنے سے تھکیں گے نہیں۔ ہمارا مشن اس ضلع کی ترقی تک جاری رہے گا۔''

''لیکن سر! پھر بھی، آپ یہ تو بتائیں.....''

ایک اور نمائندے نے اس سے سوال کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے اسے روک دیا اور بولا۔ ''آپ کو اس حادثے کے بارے میں جو کچھ جاننا ہے، وہ ایس پی صاحب سے معلوم کریں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا پی اے اچھا خاصا زخمی ہے۔ خود مجھے بھی چوٹیں آئی ہیں۔ باقی دوسرے بھی بہت سے معاملات دیکھنے ہیں۔ اس لیے پلیز آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔'' اس کے بعد وہ وہاں نہیں رکا اور عبدالمنان کے ساتھ اس جانب بڑھ گیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

⊛----✪----⊛

''کہاں چلنا ہے سر! آپ کے بنگلے یا آفس؟'' وہ لوگ نور کوٹ کی حدود میں داخل ہو رہے تھے جب مشابرم خان نے یہ سوال کیا۔

''تھانے چلو۔ لیکن اس سے پہلے گاڑی کسی میڈیکل اسٹور کے سامنے روک کر زخم کی ڈریسنگ کے لیے کچھ خرید لینا۔'' عبدالمنان کی پیشانی پر لگنے والے زخم سے خون کا کافی اخراج ہوا ہے، اس کا ثبوت اس کے رومال پر پٹی کی شکل میں بندھی ہوئی ٹائی سے ہو رہا تھا۔ زخم پر رکھے رومال میں یقیناً مزید خون جذب کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اس لیے اوپر سے باندھی گئی ٹائی بھی خون سے تر ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ اپنے زخم کی طرف سے بے پروا ہو کر اس نے نور پور میں بھی بھرپور کارکردگی دکھائی تھی اور واپسی کے دوران بھی اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس وقت اس نے مشابرم خان کو جو ہدایت دی تھی، وہ عبدالمنان کی حالت کے پیش نظر تھی۔ مشابرم خان نے اس ہدایت پر عمل کیا اور پہلے نظر آنے والے میڈیکل اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر نیچے اُتر گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل

پر کال آنے لگی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ وہ سجاد رانا کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کر لی۔

''ہیلو شہریار! کیا حال ہے؟ میں بہت دیر سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کال مل رہی تھی۔'' اس کے ہیلو کہنے سے بھی پہلے سجاد رانا نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ ان تک حادثے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ ایسا ہونا بھی تھا۔ وزیر صاحب کی سواری نور پور سے تشریف لے جا چکی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے راستے میں ہی لاہور فون کر کے اس حادثے کی دی ہو گی۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ میڈیا کے افراد میں سے کچھ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ اپنے چینل اخبار سے ہر خبر کو پہلے منظرِ عام پر لانے کی جو دوڑ لگی ہوئی تھی، اس میں سبقت لے جانے کے لیے آؤٹ آف دی وے جا کر بھی کام کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں سجاد بھائی! میں جس گاؤں میں تھا وہاں موبائل سروس کام نہیں کرتی اس لیے کا مجھ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب ہم لوگ نور کوٹ پہنچ گئے ہیں اس لیے آپ کی کال مل گئی ہے۔ آپ رہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آفرین ممانی کو بھی میری طرف سے تسلی دیجئے گا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے میں ان کے سوال کا جواب دیا۔

''ممی کو تو ابھی اس حادثے کے بارے میں خبر ہی نہیں ہوئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ٹی وی کم ہی ہیں اور میں نے اور ڈیڈی نے جان بوجھ کر انہیں کچھ نہیں بتایا کہ پہلے تم سے رابطہ ہو جائے، تب ہی اطلاع دیں گے ورنہ وہ پریشان ہوتی رہیں گی۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا۔ ابھی میں ویسے بھی بہت مصروف ہوں۔ فی الحال مجھے نور کوٹ تھانے کچھ لوگوں سے نمٹنا ہے۔ امید ہے کہ میں اس حادثے کے ذمے داران تک پہنچ جاؤں گا۔'' مشابرم میڈیکل اسٹور سے مطلوبہ چیزیں خریدنے کے بعد واپس پلٹ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے رانا سے یہ جملے کہے۔

''کیا مطلب..... تمہیں کوئی کلیو ملا ہے کیا؟'' سجاد رانا چونکا۔

''جی ہاں، ایسا ہی سمجھ لیں۔'' اس نے تفصیلی جواب دینے سے گریز کیا۔

''بی کیئر فل شہریار! پہلے بھی تم پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ آج کے حادثے میں بھی میں نے تمہیں کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ جو کچھ کرنا، احتیاط سے کرنا اور مجھ سے مشورہ لے لینا۔ ہم تمہارا نقصان ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔'' سجاد رانا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں خیال رکھوں گا۔ آپ میری فکر مت کریں۔ مجھے جو زخم لگے ہیں وہ بہت معمولی نوعیت کے ہیں البتہ مجھے اس حادثے میں زخمی ہونے والے معصوم دیہاتیوں کی بہت فکر ہے۔ یہاں کے ہسپتال میں طبی سہولیات بہت کم ہیں۔ ہمیں زخمیوں کو لاہور کے کسی بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنا ہو گا۔ میں نے درخواست کی تو ہے شدید زخمی افراد کی منتقلی کے لیے ہیلی کاپٹر فراہم کیا جائے۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ ہیلی کاپٹر آ رہا ہے۔ آپ ذرا ذاتی طور پر اس معاملے کو دیکھ لیں۔'' شہریار نے سجاد رانا سے درخواست کی۔

''اوکے، میں دیکھ لیتا ہوں۔ ویسے تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ اس طرح کی کارروائی میں کچھ وقت تو لگ جاتا ہے۔ بہرحال، میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میری کوشش ہو گی کہ ہیلی کاپٹر کے ساتھ کچھ ڈاکٹرز اور ضروری میڈیسنز بھی بھجوا دی جائیں۔''



''تھینک یو ویری مچ۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔'' وہ خوش ہو گیا اور سجاد رانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس گفتگو کے دوران مشابرم خان نے اس کے اشارے پر گاڑی کا رخ نور کوٹ تھانے کی طرف کر دیا تھا اور اب وہ لوگ تھانے پہنچنے ہی والے تھے۔

''مجھے تھانے ڈراپ کرنے کے بعد تم عبدالمنان صاحب کے زخم کی ڈریسنگ کر دینا اور پھر انہیں لے کر چلے جانا۔'' اس نے پہلے مشابرم خان کو ہدایات دیں پھر عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''احساس ہے کہ تم کافی تکلیف میں ہو لیکن اس موقع پر کسی ذمے دار فرد کا ہسپتال کا دورہ کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو تسلی دی جا سکے۔ وہاں اس وقت کہرام مچا ہوا ہو گا۔ میڈیا والے الگ تنقید کے مواقع ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اگر مجھے اس وقت تھانے پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی تو میں خود ہسپتال جاتا۔''

''میں چلا جاؤں گا سر! آپ مجھے شرمندہ نہیں کریں۔ میں اتنا زیادہ زخمی بھی نہیں ہوں۔ بلکہ آپ کو شاید زیادہ ہی چوٹیں آئی ہیں۔ مناسب ہو گا کہ مجھ سے پہلے آپ زخموں کی ڈریسنگ کروا لیں۔''

''میں فی الحال اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ معمولی نوعیت کی خراشیں ہیں جنہیں بعد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت مجھے خود سے زیادہ اس معاملے کو ہینڈل کرنے کی فکر ہے۔ اس وقت تو میں اس بات کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ماسٹر آفتاب کو پیش آنے والے حادثے کے بعد میں نے نور کوٹ ہسپتال میں طبی سہولیات کو بہتر بنانے کے لیے فوری طور پر چند اقدامات کرنے کا آرڈر دے دیا تھا، اس لیے امید ہے کہ زخمیوں کو فوری طور پر کچھ مناسب طبی امداد مل گئی ہو گی۔ ورنہ جو صورتِ حال پہلے تھی، موجودہ حالات میں تو اس کے بہت بھیانک نتائج نکلتے۔'' اپنی طرف سے تسلی دیتے ہوئے اس نے ہسپتال کی بہتری کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر شکر ادا کیا۔ اسی وقت گاڑی نور کوٹ تھانے کے سامنے جا رکی۔ مشابرم خان نے تیزی سے گاڑی سے اتر کر پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں تھانے کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ خون کے دھبوں اور مٹی کے نشانات نے اس کے لباس کو اچھا خاصا خراب کر دیا تھا لیکن اس ابتر حالت کے باوجود اس کی شخصیت کا وقار قائم تھا۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے دیکھ کر سیلوٹ مارا۔ گردن کی خفیف سی جنبش سے اسے جواب دیتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ ایس ایچ او کے کمرے کے باہر بھی ایک سپاہی کھڑا تھا جس نے اسے سلام کرنے کے ساتھ دروازے پر پڑی چق اٹھا کر اسے اندر جانے کا راستہ دیا۔ کمرے میں ایس ایچ او کے بجائے ڈی ایس پی منظور موجود تھا جس نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

''آیئے سر! مجھے یقین تھا کہ آپ پہلی فرصت میں یہاں کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں خود یہاں موجود ہوں۔ ایس ایچ او کی عملے کے ساتھ میں نے ہسپتال پر ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے۔''

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے براہِ راست سوال کیا۔

''اندر ایک کمرے میں بند ہیں۔ آپ کہیں تو انہیں یہاں بلواؤں؟'' ڈی ایس پی نے مستعدی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں، انہیں یہاں لانا مناسب نہیں۔ میں ان لوگوں کی گرفتاری کو منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتا۔ ہمیں خود اس کمرے میں جانا چاہئے جہاں ان لوگوں کو رکھا گیا ہے۔''

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ڈی ایس پی بولا۔ ''مجھے اندازہ ہے سر! کہ یہ کچھ خاص افراد ہیں۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق ایس ایچ او کو سخت تاکید کر دی تھی کہ کسی کو ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر نہیں ملنی چاہئے۔ تھانے کے تھوڑے سے عملے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ کون لوگ گرفتار کر کے یہاں لائے گئے ہیں۔

عملے میں سے بھی بس انہی افراد کو معلوم ہے جو ریڈ کے وقت ایس ایچ او کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں
کے منہ چادر میں لپیٹ کر انہیں لایا گیا ہے۔'' ڈی ایس پی نے پولیس کی ملازمت میں ایک مدت گزار
وہ کیسے اندازہ نہیں لگاتا کہ دھماکے کے فوراً بعد جس خاندان کی گرفتاری کا حکم دیا گیا تھا، اس کا حادثے
نہ کوئی گہرا تعلق ہے۔ شہریار کی وجہ سے اسے پچھلے دنوں اسمگلنگ کی ایک کوشش کو روکنے کا موقع ملا تھا
کامیاب چھاپے میں ایک مجرم ہاتھ آ جانے کی وجہ سے جو سب سے اہم انکشاف ہوا تھا، وہ فاریسٹ
اقبال باجوہ کے اس جرم میں شریک ہونے کا تھا۔ درونِ خانہ اقبال باجوہ کی گرفتاری کا فیصلہ ہو چکا تھا
آدھ دن میں یہ کام نمٹا لیا جاتا۔ وہ جو اس کیس کے بعد ہی اچھا خاصا مشہور ہو گیا تھا اور اس کے فیصلہ کن
سے اپنی ترقی کی امید باندھے بیٹھا تھا، ایک اور کیس کی کامیاب تحقیق کا سہرا بھی اپنے سر بندھتے دیکھ رہا
جس کے بعد اس کی ترقی یقینی تھی۔ شہریار سے اس قدر تعاون کے پیچھے بھی اپنی ترقی کا لالچ ہی کارفرما
جانتا تھا کہ ان کامیابیوں کے ساتھ شہریار کی حمایت اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کے اس کمرے تک پہنچے جہاں دین محمد اور اس کے اہلِ خانہ
تھے۔ کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی منظور نے لاک کھول کر دروازے کو دھکیلا
تاریک سیلن زدہ کمرے میں اس کے پیچھے داخل ہوتے ہی شہریار کو اندازہ ہو گیا کہ تھانے کا یہ کمرہ دراصل
عقوبت خانہ تھا جسے عرفِ عام میں ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ کمرے میں تشدد کے کئی آلات دیواروں پر
آ رہے تھے جن میں نائیلون کی رسّی، پلاس اور برمے سمیت کئی اشیاء موجود تھیں۔ چھت میں دو آنکڑے
موجود تھے جن سے یقیناً ملزمان کو اُلٹا لٹکا کر ان سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ اسی کمرے میں دین محمد، اس کا
اور اس کی بیوی سہمے ہوئے ایک دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں پیروں میں
نظر آ رہی تھیں۔ یعنی اس بند کمرے میں جہاں اس دروازے کے سوا جس کے باہر تالا لگا ہوا تھا، کوئی
کا کا راستہ نہ ہونے کے باوجود اس قدر احتیاط کی گئی تھی کہ وہ تینوں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے
شاید ڈی ایس پی منظور زیادہ ہی ایفی شینسی دکھانے کے چکر میں تھا۔ ایفی شینسی دکھانے کے چکر میں ہی وہ
سے پہلے نور پور سے نکل کر اس تھانے میں آ بیٹھا تھا اور گرفتاری کا کام کرنے والے ایس ایچ او کو اس طرح
ایا تھا کہ انویسٹی گیشن سیل کی چابی بھی خود اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔

''تھینک یو ڈی ایس پی صاحب! آپ نے میرے مطلوبہ بندے مجھ تک پہنچا دیئے۔ اب میں خود
ے بات کر لوں گا۔'' کمرے میں موجود تینوں خوف زدہ نفوس کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اس
ڈی ایس پی سے یہ جملہ کہا تو وہ اس کا اشارہ سمجھ کر ٹھٹک گیا۔ لیکن ظاہر ہے، حکم سے صاف انحراف تو نہیں کر
تھا اس لیے کچھ مایوس سا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

ڈی ایس پی نے کہا۔ ''اگر یہ لوگ سیدھی طرح آپ کے سوالوں کا جواب نہ دیں تو مجھے بلوا لیجئے گا سر!
پولیس والوں کی زبان ایسے لوگوں کو زیادہ اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے۔ میں ایک سپاہی کو اس کمرے
دروازے کے باہر کھڑا کر رہا ہوں۔ آپ جیسے ہی اشارہ کریں گے، وہ مجھے آپ کا پیغام پہنچا دے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں پلیز! جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیجئے گا۔'' قدرے رُکھائی سے
جواب دے کر اُس نے وہاں موجود دو کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھا کر دیوار کے ساتھ بیٹھے ان تینوں افراد
مقابل رکھی اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ ڈی ایس
باہر نکل چکا ہے۔



''تمہارا چھوٹا بیٹا کہاں ہے؟'' دین محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں اس سے
سوال کیا۔

''کون..... عبدالمتین؟ اُس کی تو ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ جب سے ہمارے ساتھ وہ حادثہ ہوا ہے،
وہ عجیب سا ہو گیا ہے۔ کئی کئی دن گھر نہیں آتا۔ کام پر جانا بھی چھوڑ چکا ہے۔ میں کچھ کہوں تو غصہ کرنے
لگتا ہے۔ وڈّا اثر ہوا ہے اس کے دماغ پر بہن کے اغوا اور قتل کا۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔''
دین محمد کی آنکھوں سے یہ جواب دیتے ہوئے گہرا دکھ چھلک رہا تھا۔

''قتل.....؟'' وہ دین محمد کی بات سن کر چونکا۔

''جی ہاں قتل۔ اس کے اغوا کے چار دن بعد ہی اس کی نوچی کھسوٹی ہوئی لاش جنگل کے باہر پڑی مل گئی
پولیس والوں کے پاس رپورٹ کرنے گئے تو انہوں نے اُلٹا میری معصوم دِھی پر ہی الزام لگا دیا کہ وہ اپنے
عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اسی عاشق نے اپنا مطبل (مطلب) پورا کرنے کے بعد اسے ٹھکانے لگا
دیا۔ کہتے تھے، تجھے یہ سارا چکر پتہ ہے اور تُو جان بوجھ کر خوامخواہ پولیس کا ٹیم (ٹائم) برباد کر رہا ہے۔ انہوں
نے دھمکی دی کہ اب بھول کر بھی اے سی صاحب کے پاس مت جانا ورنہ تجھے اور تیرے دونوں بیٹوں کو پکڑ
کر لاک اپ میں بند کر دیں گے۔'' وہ جو کچھ بتا رہا تھا، اسے سن کر اس کا دماغ گھومنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا
کہ اس کیس کے معاملے میں ایس پی تارڑ نے اسے کیا بریفنگ دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ دین محمد نے خود اپنی
بیٹی کے اغوا اور ڈاکے کا ڈرامہ رچایا ہے ورنہ اس کی بیٹی زبردستی کی شادی سے بچنے کے لیے اپنے ایک آشنا کے
ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس نے ہی اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے ماں باپ کو لوٹ لیا تھا۔ ایس پی نے تو خود
دین محمد کے کردار پر بھی شک کا اظہار کیا تھا اور یہ الزام لگایا تھا کہ دین محمد نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کرنے کے بعد
اس کی چھوٹی بہن سے بیاہ رچا لیا تھا لیکن اب دین محمد ایک بالکل مختلف بات بتا رہا تھا۔ اس کے بیان سے تو یہ
ظاہر تھا کہ اس غریب کا اتنا بڑا نقصان بھی ہوا اور اُلٹا اسے ڈرا دھمکا کر شکایت کرنے سے بھی روک دیا گیا۔
دین محمد کے اس بیان کو غلط بھی سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس کے جھریوں زدہ چہرے پر جو دکھ کی تحریر تھی، وہ اس پر
گزرنے والے ظلم کی داستان بہت صاف طور پر سنا رہی تھی۔ اگر وہ اس وقت اپنی چہرہ شناسی کے ہنر پر اعتبار نہ
بھی کرتا تو بہت سی باتیں ایسی تھیں جن کی بنیاد پر خود پولیس مشکوک ٹھہرتی۔ ایس پی نے تو یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ
علاقے میں ڈاکوؤں کا کچھ خاص عمل دخل نہیں اور ابھی کچھ دن قبل ایک ایسا ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا جس میں
ان کے حملے کی نہ صرف قبل از وقت اطلاع ملی تھی بلکہ نور پور کو نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ اس وقت اس نے یہ
اس لیے نظر انداز کر دی تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکے کا ڈرامہ جنگل سے کی جانے والی اسمگلنگ کی طرف
اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کھیلا گیا ہے لیکن اب یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ ڈرامے بھی تو کسی نہ کسی حقیقت
کی بنیاد پر ہی لکھے اور بنائے جاتے ہیں۔ یہ سارے واقعات اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہے تھے کہ
پولیس اور ڈاکوؤں کا گٹھ جوڑ بہت مضبوط ہے اور وقت ضرورت ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے رہتے ہیں۔

''جس دن میری دِھی کی لاش ملی، عبدالمتین پاگل سا ہو گیا۔ آپ نے خود دیکھا ہے اسے کہ وہ کتنے تیز
بخار کا منڈا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی تو دِھی کا غم بھول کر اسے ہی سنبھالنے میں لگ گئے۔ وہ کسی طرح کچھ
کھانے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت مرنے مارنے کی گل کرتا تھا۔ پولیس والوں کے لیے تو اس کے جی میں ایسی
نفرت بیٹھ گئی تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح تھانے پہنچ کر ان سب کو جان سے مار دے۔ اس کی یہ
حالت دیکھ کر میں نے امین کو شاہنواز صاحب کے پاس بھیجا کہ کسی طرح وہی آ کر عبدالمتین کو سنبھالیں۔ ہم

غریب لوگ ہیں۔ اگر وہ پولیس والوں سے جا کر بھڑ جاتا تو ان کا کیا بگاڑ پاتا، اُلٹا ہمیں ہی نقصان
شاہنواز صاحب وڈے چنگے آدمی ہیں۔ میری گزارش پر انہوں نے عبدالمتین کو سمجھایا بجھایا پھر اسے ا
ہی لے گئے۔ وہ ان کے پاس سے واپس آیا تو سنبھل چکا تھا لیکن پھر اس کے بعد اس نے بولنا چالنا
کمانا سب چھوڑ دیا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنے لگا۔ اب بھی کئی دن گزرے، وہ گھر نہیں آیا۔ کیا آ
پاس اس کی کوئی شکایت آئی ہے؟ کہیں وہ یہاں تھانے تو نہیں پہنچ گیا تھا؟ اگر اسی نے پولیس والوں
کوئی بدتمیزی کی ہے تو میں اس کی طرف سے آپ سے مافی (معافی) مانگتا ہوں۔ جوان خون ہے، بہن کی
بھری موت کا غم بھول نہیں پاتا۔ اگر اپنی اس دیوانگی میں وہ کوئی غلط کر بیٹھا ہے تو آپ لوگ اسے
(معاف) کر دیں۔ اب کی واری میں اسے تالے میں بند کر کے رکھوں گا۔ وہ گھر سے نکل ہی نہیں
یہاں کس طرح پہنچے گا۔ بس آپ ایک واری اُسے ماف کر دیں۔'' اپنے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو باندھ کر
ہوئے وہ شہریار سے درخواست کرنے لگا۔ وہ اسے کیا جواب دیتا؟ ابھی چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے عبدالمتین
صحت مند و توانا جسم کو ایک دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جس کو تا
قید کر کے رکھنے کی بات کر رہا تھا، وہ تو زندگی کی قید سے بھی نجات پا چکا تھا۔ اب چاہے یہ بوڑھا
باندھ کر کسی کے سامنے کتنا ہی گڑگڑاتا، اس کا بیٹا لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ذہن میں پیدا ہونے والی
اُلجھنوں کے ساتھ روتے ہوئے دین محمد کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی بھی رونے کے اس عمل میں
ساتھ دے رہی تھی جبکہ سترہ اٹھارہ سالہ امین سر جھکائے افسردہ سا بیٹھا تھا۔ وہ پورا منظر ایک لٹے پٹے خا
تھا اور اس خاندان سے کسی طرح یہ اُمید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے فعل میں اس کے شریک
ہوں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر عبدالمتین کیسے یہ حرکت کر بیٹھا؟ یقیناً کوئی ایسا تھا جس نے اس
اندر پلتے نفرت کے زہر کو مزید اُبھار کر اسے اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ دین محمد
کے اغوا ہونے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا تو عبدالمتین اس وقت بھی بہت برافروختہ ہو رہا تھا
نے اس کے منہ پر اس سمیت حکومت کے تمام افراد کو لالچی اور بے ایمان قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک
ڈاکوؤں کے ساتھ شامل تھے۔ اس کے اس الزام کو اس لیے غلط نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پولیس کی حد تک تو
صاف نظر آ ہی رہی تھی۔ ایک نوعمر، جذباتی لڑکے کے دل میں پلتی بدگمانی اور نفرت سے فائدہ اٹھا کر
خودکش حملے پر راضی کر لینا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا۔ اسے اس کام کی ترغیب دینے والے نے اس سے
کہ تم جو کچھ سوچتے ہو، بالکل درست ہے۔ یہ حکمراں ہی ہیں جو تم پر گزرے ظلم کے ذمے دار ہیں۔ جاؤ
ان میں سے جتنوں کو تم اُڑا سکتے ہو، اُڑا دو۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بھڑکانے والے نے اسے یہ بھی اُمید دلائی
کہ موجودہ ظالم حکمرانوں سے نجات پا لو گے تو ان کی جگہ نئے اچھے حکمران آنے کی امید ہے۔ گاؤں کے
ماحول میں زندگی گزارنے والا نوعمر لڑکا تھوڑی سی ہی برین واشنگ کے بعد اس کام کے لیے قائل ہو گیا
خاص طور پر اس لیے بھی کہ خود اس کے اندر غصے اور نفرت کا جو الاؤ بھڑک رہا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا
اُس کی اس کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر اُسے آلۂ کار بنانے والا کون تھا؟ وہ کوئی ایسا ہی شخص ہو سکتا تھا جس کی
اس کے لیے اہم اور قابل احترام ہو۔ کیونکہ بہرحال، اپنی جان سے گزر جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔
میں جذبۂ شہادت لے کر جانے والا سپاہی بھی اس اُمید کے ساتھ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے کہ اس
کے بعد اسے ہمیشگی کی زندگی عطا کی جائے گی۔ ہو سکتا تھا عبدالمتین کو بھی کسی نے ایسا ہی لالچ دیا ہو اور کہا
ظالموں کو قتل کرنا عین ثواب کا کام ہے اور اس کام میں اپنی جان دے کر وہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کر



میں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ یہاں اس کے پاس نہ تو اچھا کھانا پینا ہے، نہ اچھا لباس اور رہائش۔
کی کوئی نہیں۔ تو بہتر ہے کہ وہ اس سسکتی ہوئی زندگی کی جگہ نعمتوں سے بھری جنت کے حصول کے لیے
کرے۔ اس ترکیب سے صدیوں سے لوگ معصوم ذہنوں کو استعمال کر کے ان سے اپنے مقاصد حاصل
رہے ہیں۔ تاریخ کے صفحوں میں حسن بن صباح سمیت ایسے کئی کردار ملتے ہیں۔ عبدالمتین کو بھی ایسا ہی
پرور آدمی ٹکرا گیا ہو گا جس نے زمین نرم دیکھ کر آرام سے اس میں فتنے کا بیج بو دیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ
ان تھا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے ان تینوں کے چہروں کو ٹٹولا اور پھر اس کی نظریں
چہرے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ اس کی اور عبدالمتین کی عمروں میں تین سال سے زیادہ کا فرق نہیں تھا۔ اتنے
عموماً بہن بھائیوں کے تعلقات پر زیادہ فرق نہیں پڑتا اور وہ ایک دوسرے کے قریب ہی ہوتے ہیں۔
اور عبدالمتین تو تھے ہی کُل دو بھائی۔ مزاج کے فرق کے باوجود ان دونوں کی آپس میں دوستی ہونی
۔ بہت زیادہ نہ سہی مگر اتنی دوستی کا تو ان دونوں کے درمیان امکان موجود تھا کہ والدین کے مقابلے
عبدالمتین کی سرگرمیوں سے زیادہ واقف ہوتا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک فیصلہ کیا اور
کے باہر کھڑے سپاہی کو آواز دے کر اندر بلایا۔

''یس سر!'' وہ کسی بوتل کے جن کی طرح فوراً حاضر ہو گیا۔

''ان تینوں کی ہتھکڑیاں وغیرہ کھول کر انہیں پانی پلاؤ اور اس کے بعد ان دونوں میاں بیوی کو ایس ایچ او
کمرے میں لے جا کر بٹھاؤ۔ مجھے کچھ دیر اس لڑکے سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔''

''چابیاں تو ڈی ایس پی صاحب کے پاس ہیں سر!''

''تو ان سے لے کر آؤ۔'' سپاہی کے عذر پر اس نے جھلا کر حکم دیا۔ اس بار وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔
ان دیر بعد وہ آیا تو اس کے پاس چابیاں تھیں۔ وہ پانی بھی ساتھ لایا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق اس نے
ان تینوں کے ہاتھ پیر آزاد کیے اور پھر تینوں کو باری باری پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ تینوں کافی پُرسکون نظر
۔ جانے کتنی دیر سے وہ اس طرح پیاسے تھے۔ خوف اور گریہ نے حلق میں مزید کانٹے اُگا دیئے ہوں
۔ اب جو پانی ملا اور ان کے خوف کے برعکس شہریار نے ان سے نرم لہجے میں بات کی تو ان کی تھوڑی سی
بندھی ہو گی کہ صورتِ حال اتنی سنگین بھی نہیں جتنی وہ اپنی گرفتاری کے بعد سے محسوس کر رہے تھے۔

''آپ دونوں اس سپاہی کے ساتھ جائیں۔ میں امین سے تھوڑی دیر بات کر کے پھر آپ سے ملتا ہوں۔''
نرم لہجے میں دیئے ہوئے حکم پر وہ دونوں تھوڑے سے متذبذب تو نظر آئے تاہم انہوں نے اس کی حکم
نہیں کی۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد وہ امین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی، اب تم بتاؤ کہ عبدالمتین کہاں ہے؟'' امین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''مم..... مجھے نہیں معلوم۔'' وہ ہکلایا۔

''یہ تو معلوم ہو گا کہ اس کی کن لوگوں کے ساتھ زیادہ دوستی تھی؟ گاؤں کے کن لڑکوں کے ساتھ اس کا
اُٹھنا بیٹھنا تھا؟'' اس نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

''اس کی کسی سے بھی زیادہ دوستی نہیں تھی۔ وہ زیادہ تر اکیلا ہی رہنا پسند کرتا تھا اور اب تو اُس نے سب
ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ بس کبھی کبھی شاہنواز صاحب کے پاس چلا جاتا تھا لیکن اب وہ ادھر بھی نہیں
میں گیا تھا ان کے پاس عبدالمتین کے بارے میں معلوم کرنے، پر انہوں نے بتایا کہ وہ کئی روز سے ان
بھی ملنے نہیں آیا۔''

''یہ شاہنواز صاحب کیسے آدمی ہیں؟'' بار بار اس شخص کا گفتگو میں ذکر آنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''وڈے چنگے آدمی ہیں جی۔ پنڈ کے کئی لڑکے ان کے پاس پڑھنے جاتے ہیں۔ اللہ نے انہیں زبان دی ہے کہ اتھرے سے اتھرا منڈا بھی ان کی گل چپ کر کے سنتا ہے۔ عبدالمتین بھی ان کی گل جانے اب وہ کہاں چلا گیا ہے؟ اس نے شاہنواز صاحب کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' امین سے بتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یک دم ہی جھماکا سا ہوا۔ اس بات کا بھی تو امکان تھا کہ عبدالمتین والا شاہنواز ہی ہو۔ شاہنواز وہ شخص تھا جس کا وہ احترام کرتا تھا اور اس کی بات خاموشی سے سن لیتا شخص کے لیے اس کی برین واشنگ کر کے اسے غلط راہ پر چلانا بہت آسان تھا۔ اس کے ذہن میں والے اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت مل رہی تھی کہ شاہنواز کا تاثر ایک بہت ہی نیک اور ہمدرد لیکن وہ ایسا شخص تھا جسے گاؤں والے اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ ان کے درمیان کہیں باہر سے آ کر اور پھر اپنی سخاوت، ہمدردی اور نرم خوئی کی وجہ سے یک دم ہی تمام لوگوں میں مقبول ہو گیا تھا۔ اس بات امکان تھا کہ اس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ لوگوں پر اپنا یہ تاثر قائم کیا ہو۔ اس کے پیچھے اس کا مقصد تھا، وہ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ گاؤں میں ایک مدرسہ کھول کر بیٹھا تھا۔ اس مدرسے سے گاؤں کے کچی عمر کے لڑکے پڑھنے جاتے تھے جنہیں وہ جس طرح چاہتا ہوگا، اپنی لچھے دار باتوں لیتا ہوگا۔ اس سے متاثر یہ لڑکے اس کی ہر بات کو درست سمجھتے ہوں گے۔ شاید عبدالمتین کے ساتھ بھی کچھ ہوا تھا۔ اس کے ذہن نے یہ سارا تجزیہ لمحوں میں کیا اور وہ مضطرب سا ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رُکا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا تھانے کے اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ڈی ایس منظور موجود تھا۔ دین محمد اور اس کی بیوی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ سب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ان دونوں کو واپس اس کمرے میں پہنچا دو۔ لیکن ہتھکڑیاں وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور دو تین سپاہیوں کے ساتھ ایک گاڑی فوری طور پر تیار کرواؤ۔ ہمیں ابھی اللہ آباد کے لیے نکلنا ہے۔''

''او کے سر!'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً جواب دیا اور اس کی ہدایت کے مطابق احکامات صادر کرنے لگا۔ جب تک گاڑی تیار ہونے کی اطلاع نہیں ملی، شہریار ایک کرسی پر بظاہر پُرسکون لیکن اندر سے مضطرب رہا۔ اگر اس کا خیال درست تھا تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ آباد پہنچنے کے بعد انہیں کچھ حاصل نہ ہو۔ دین محمد کے اہلِ خانہ سمیت خاموشی سے گرفتاری کی تائید کے باوجود اسے یقین تھا کہ گاؤں والوں سے یہ بات نہیں رہی ہوگی۔ گاؤں دیہاتوں کے ماحول میں ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہا جاتا۔ وہاں بڑے شہروں کی طرح اس بات کا امکان نہیں تھا کہ ساتھ والے پڑوسی کو بھی اس بات کی خبر نہ ہو سکے کہ ان کے پڑوسی پر کیا گئی۔ اب تک تو شاید سارے گاؤں کو علم ہو چکا ہو کہ دین محمد کو پولیس لے گئی ہے۔ ایسے میں وہ لوگ بے خبر رہ سکتے تھے جنہوں نے عبدالمتین کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ بہرحال، یہ سب کچھ ابھی اس کا اندازہ ہی ممکن تھا کہ اصل صورتِ حال اس کے برعکس ہو لیکن اس کی پڑتال تو ضروری تھی۔ سو اب وہ اللہ آباد جانے کے لیے تیار تھا۔ تھانے سے گاڑی روانہ ہو کر کچھ ہی دور گئی تھی کہ انہیں ایس پی کی گاڑی آتی نظر آئی۔ ڈی ایس پی منظور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے رُکے بغیر آگے بڑھ جانے کا اشارہ دیا۔ جیپ فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اللہ آباد پہنچنے تک وہ ایک طرح سے فارغ تھا اس لیے اس نے موبائل نکال کر عبدالمنان سے رابطہ کیا۔



''ہاں عبدالمنان! کیا پوزیشن ہے؟'' رابطہ ہوتے ہی اس نے سوال کیا۔

''خبر ملی ہے کہ شدید زخمی افراد کو یہاں سے ٹرانسفر کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر روانہ کر دیا گیا ہے۔ ہسپتال کا عملہ مستعدی سے زخمیوں کی ٹریٹ منٹ میں مصروف ہے۔ کچھ ایسے لوگ جنہیں ان کاموں کی شد بد ہے، آس پاس کے علاقوں سے جمع کر لیے گئے ہیں۔ بلڈ دینے کے لیے بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ نقصان اٹھائے بغیر معاملہ سیٹ ہو جائے گا۔'' عبدالمنان نے رپورٹ دی جو کسی حد تک اطمینان بخش تھی۔

''میڈیا کے افراد کا کیسا رویہ ہے؟'' ایک دوسرا خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

''وہی معمول کے مطابق۔ کسی اسٹوری کا کھوج نکالنے کے چکر میں وہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں دخل دے رہے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے گھیر لیا تھا کہ اس حادثے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ان سے انہیں یہ اطلاع بھی مل گئی ہے کہ آپ کے حکم پر چند لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ کن لوگوں کو گرفتار کیا ہے؟ ان کا اس حادثے سے کیا تعلق تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' اس نے بتایا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

فوراً پور میں خودکش حملہ آور کے طور پر عبدالمتین کو شناخت کرتے ہی اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال آیا تھا کہ اس کے گھر والوں کو تفتیش کے لیے پولیس کسٹڈی میں لے لیا جائے۔ اس وقت اس نے ڈی ایس پی منظور کو فوری طور پر اس گرفتاری کے احکامات بھی دے دیئے تھے۔ جب وہ اسے یہ حکم دے رہا تھا تو یقیناً کسی کی سماعت کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہوگی یا ہو سکتا ہے کہ نور کوٹ تھانے میں ہی کسی سپاہی وغیرہ نے مخبری کر دی ہو۔

''تم ان کے سوالوں کے جواب میں فی الحال بالکل خاموش رہو۔ میں اس معاملے میں کسی بہت بڑی گڑبڑ کی بُو سونگھ رہا ہوں اس لیے ہمیں پوری احتیاط کرنی ہوگی کہ ذرا سی بھی کوئی بات منہ سے نہ نکلے جسے میری غیر ذمہ داری قرار دیا جا سکے۔ میں واپس آ کر تمہیں تفصیل سے ساری بات بتاؤں گا۔ ابھی میں پولیس کے ساتھ اللہ آباد جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہمارا موبائل پر رابطہ ممکن نہیں رہے گا۔ تم اپنے طور پر سارے حالات سے نمٹ لینا۔ اگر زخم زیادہ تکلیف دے رہا ہو تو گھر جا کر ریسٹ بھی کر سکتے ہو۔ ایس پی صاحب کی ساری تشریف لا چکی ہے۔ انہیں بھی یہ ذمے داری سونپی جا سکتی ہے۔'' وہ دھماکے سے خود بھی متاثر ہوا تھا لیکن اسے عبدالمنان کی طرف سے فکر تھی۔ اصل میں اس بے چارے کے زخم سے اچھا خاصا خون بہہ گیا تھا جبکہ اسے اندرونی چوٹیں لگی تھیں جو فی الحال تو کچھ نہیں کہہ رہی تھیں لیکن اسے علم تھا کہ ذرا سا آرام ملتے ہی یہ بے چین احتجاج کرنے لگیں گی۔

''میں ٹھیک ہوں سر! آرام کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ مشابرم خان نے بڑی مہارت سے ڈریسنگ کی ہے۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے اجازت لے کر طبی امداد دینے والے عملے کی مدد کرنے میں مصروف ہے۔''

''او کے! جیسا تم مناسب سمجھو۔'' اس نے مختصر جواب دے کر سلسلۂ کلام قطع کر دیا۔ موبائل بند کرتے ہی اس کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر آنے والا نمبر سجاد رانا کا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو شہریار! ہیلی کاپٹر روانہ ہو گیا ہے، اس بات کی تو تمہیں اطلاع مل گئی ہو۔ اس وقت میں نے تمہیں اس لیے کال کی ہے کہ ممی سے بات کر لو۔ انہیں کہیں سے حادثے کے بارے میں خبر مل گئی ہے اور اب تمہارے لیے پریشان ہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود انہیں تسلی دے دو۔'' سجاد رانا نے کہا اور پھر اسے فوراً ہی موبائل پر ممانی اقرین کی آواز سنائی دی۔

''کہاں ہو شہریار بیٹا!.....تم ٹھیک تو ہو؟'' وہ سگی ماں جیسی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ممانی! آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں۔'' شہریار نے انہیں تسلی دی۔

''کیسے فکرمند نہ ہوں؟ تم نے تو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا ہے۔ سجاد پولیس کی نوکری میں ہو کر ہنگاموں میں نہیں گھرا رہتا جتنا تم پریشان کرتے ہو۔ چھوڑ دو یہ سب اور واپس یہاں آ جاؤ۔ میں تمہارے ماموں سے کہہ کر تمہارے لیے کوئی بزنس سیٹ کروا دیتی ہوں۔'' وہ غصے اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں لہجے میں بول رہی تھیں اس لیے آواز کچھ بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ روئی بھی ہوں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں، اس لیے برا مانے بغیر دھیمے لہجے میں بولا۔

''اس موضوع پر ہم بعد میں اطمینان سے بات کریں گے۔ فی الحال آپ یہ تسلی رکھیں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' جواب میں وہ پھر شاید کچھ بولی تھیں لیکن اب ان کی آواز کٹ کٹ کر آ رہی تھی اس لیے وہ ان کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''یہاں سگنلز آنے بند ہو گئے ہیں ممانی جان! میں آپ سے بعد میں بات کروں گا۔'' ذرا بلند آواز میں بات کہتے ہوئے اس نے لائن کاٹ دی۔ اب پتہ نہیں ان تک اس کی بات صحیح طرح پہنچی بھی تھی یا نہیں لیکن مزید ان سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پولیس پارٹی موجود تھی۔ بے شک وہ لوگ بات سمجھتے تھے کہ نجی زندگی میں سب ہی اس طرح کے رشتوں اور جذبات سے جڑے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے سامنے اس طرح کے اظہار سے بچنا چاہتا تھا۔ بعض عہدے اور ذمے داریاں اسی بات کی متقاضی ہوتی ہیں کہ انسان اپنے جذبات کو پس پشت رکھ کر کام کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس لڑکی کو اپنے ذہن سے جھٹک کر، جس نے پہلی بار اس کے دل پر دستک دی تھی، یوں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کوشاں ہوتا؟ فرائض اور مصروفیات کے اُلجھاوؤں میں اسے تو اتنی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ کبھی خود سے اس لڑکی کی محبت کے اعتراف کی فرصت ہی نکال پاتا۔ وہ جس گرداب میں پھنسا ہوا تھا، اس نے اسے نازک جذبات کو پوری طرح سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ منوں مٹی تلے دفن ہو جانے والی لڑکی اس کے خون میں چپکے سے سرایت کر چکی ہے اور ہر پل، ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر متحرک رہنے پر تحریک دیتی رہتی ہے۔ وہ تبدیلی کا خواہاں تھا مگر اس خواہش کو دیوانگی میں مبتلا کر دینے کا سبب ماہ بانو تھی، یہ بات فی الحال سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

لایعنی خیالات میں گھرے آخر کار وہ لوگ اللہ آباد پہنچ گئے۔ اس کی نشان دہی پر جیپ کا رخ اس طرف کر دیا گیا جہاں اس نے شاہنواز کا مدرسہ دیکھا تھا۔ جیپ مدرسے کے دروازے پر جا کر رکی تو اس نے دیکھا وہاں بڑا سا تالا پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق تو شاہنواز کی رہائش یہیں پر تھی۔ اگر وہ یہاں رہتا تھا تو بیرونی دروازے پر تالا لگا ہونے کی اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خطرہ بھانپ کر پہلے ہی فرار ہو چکا ہے۔

''تالا توڑ دو۔'' اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ اس کے حکم پر سپاہی تالے پر رائفل کے بٹ مارنے لگا۔ بٹ سے لگنے والی ضرب نے لوہے کے دروازے کے ساتھ مل کر اچھا خاصا شور برپا کر دیا تھا۔ وہ سب گھنٹوں سے مسلسل مصروف تھے۔ مسلسل پریشانی اور بھاگ دوڑ میں انہیں دن کے رات میں تبدیل ہو جانے کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن گاؤں کی خاموش رات میں اپنے بستروں میں دبکے افراد تو ان کی شوریدہ سری سے واقف نہیں تھے۔ تالا توڑے جانے کا شور ان کے کانوں تک پہنچا تو وہ صورتِ حال جاننے کے لیے



ان سے باہر آنے لگے۔ پہلا آدمی جب وہاں پہنچا تو وہ لوگ دروازہ کھول کر مدرسے کے اندر داخل ہو چکے۔

''تم باہر ہی رُکو۔ کسی فرد کو اندر نہیں آنے دینا۔'' ڈی ایس پی منظور نے ایک سپاہی کو حکم دیا اور پھر مدرسے میں داخل ہو گئے۔ اللہ آباد میں بجلی کی سہولت موجود تھی ڈی ایس پی کی ہدایت پر ایک سپاہی نے سوئچ بورڈ تلاش کیا اور بٹن دبایا تو وہاں موجود بلب روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں جو منظر ان کے سامنے تھا، وہ بظاہر ایک مدرسے کے کمرے کا ہی تھا۔ فرش پر ایک صاف ستھرا قالین بچھا کر اس پر پڑھنے والے بچوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ دیوار گیر الماری میں بہت سی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ شہریار نے الماری کے قریب جا کر اس کے شیشے کے پٹ کھولے اور ان کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ قرآن مجید کے نسخے، احادیث و فقہ کے مسائل پر مشتمل کتب..... بظاہر تھا اس الماری میں جسے کسی طرح مشکوک قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس سادہ سے کمرے میں اس کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ الماری دوبارہ بند کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈی ایس پی منظور پہلے ہی اپنے ماتحتوں کے ساتھ باہر نکل چکا تھا اور اسے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کسی اور کمرے کا تالا توڑا جا رہا ہو۔ باہر نکلتے ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ عمارت میں اس کمرے کے علاوہ تین کمرے اور تھے اور ہر کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ آپ دوسرے کمرے کی تلاشی لے کر کسی مشکوک شے کو اپنے قبضے میں کر لیں۔'' اس نے ڈی ایس پی سے کہا اور خود اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ ابھی ابھی توڑا گیا تھا۔ کمرے میں سامان نہیں تھا، مگر جو کچھ تھا وہ خاصا قیمتی تھا۔ روم ریفریجریٹر، بہترین لکڑی سے بنی رائٹنگ ٹیبل اور کرسی..... ٹیبل پر موجود لیمپ، فرش پر بچھے میٹرس سمیت ہر شے اپنی اعلیٰ کوالٹی کی گواہی دے رہی تھی۔ ٹیبل پر جو دو تین کتابیں رکھی ہوئی تھیں، ان کا تعلق بھی مذہبی علوم ہی سے تھا۔ لیکن ان میں سے صرف ایک کتاب اُردو میں جبکہ باقی انگریزی میں تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاہنواز اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ بہرحال اس بنیاد پر اسے مشکوک نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ شاہنواز کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر دیکھا۔ پانی کی بوتلوں، جوس کے ڈبوں اور سافٹ ڈرنکس کے ٹنز (Tins) کے درمیان اسے کچھ ایسی چیزیں نظر آئیں جس نے اسے چونکا دیا۔ ہاتھ بڑھا کر ان میں سے دو بوتلوں کو اس نے باہر نکالا۔ اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ ان بوتلوں میں بیئر اور شیمپین بھری ہوئی تھی۔ ایک مذہبی ذہن کا تاثر رکھنے والے آدمی کی شخصیت سے یہ دونوں چیزیں قطعی متصادم تھیں۔ اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ شاہنواز وہ نہیں تھا جو خود کو لوگوں پر ظاہر کرتا تھا۔ بوتلوں کو واپس اسی جگہ رکھنے کے بعد اس نے ریفریجریٹر بند کیا اور فرش پر بچھے میٹرس کے قریب جا کر اس پر رکھے ملائم تکیے کو ہٹا کر دیکھا۔ وہاں ایک کتاب رکھی تھی۔ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔ ٹائٹل پر ایک حسینہ کے چہرے اور پس منظر میں ڈوبتے سورج کی تصویر سے یہ تو سمجھ آ رہا تھا کہ یہ کوئی ناول ٹائپ کی کتاب ہے لیکن وہ اس کتاب کا نام نہیں پڑھ سکتا تھا۔ البتہ جس رسم الخط میں وہ لکھا تھا، اسے پہچان سکتا تھا۔ وہ ہندی زبان تھی۔ یعنی وہ ہندی کا کوئی ناول تھا جس پڑھنے والا یقینی طور پر شاہنواز ہی ہو گا۔ اگرچہ کسی کا ہندی زبان سے واقف ہونا کوئی اتنے اچنبھے کی بات نہیں، زبانیں سیکھنے کے شوقین افراد کوئی بھی زبان سیکھ لیتے ہیں لیکن شاہنواز کی شخصیت شک کی زد میں تھی..... اسی وجہ سے اس کے تکیے کے نیچے کسی ہندی ناول کی موجودگی کو بھی مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔

''سر! ایک عجیب سی بات سامنے آئی ہے۔'' ابھی وہ شاہنواز کی شخصیت کے تانے بانے میں ہی اُلجھا ہوا

تھا کہ ڈی ایس پی منظور ذرا جوش کی کیفیت میں وہاں آ پہنچا۔ ''آپ میرے ساتھ چلیں، میں آ
ہوں۔'' اس کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ چل پڑا وہ اسے اپنے ساتھ سب سے آخری کمرے میں لے
کمرے میں بھی فرش پر ایک ویسا ہی میٹرس بچھا ہوا تھا جیسا اس نے پچھلے کمرے میں دیکھا تھا۔
ساتھ بہت سی کتابوں کا بھی ڈھیر موجود تھا لیکن اس کمرے میں سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی جو
ایک کونے میں موجود راکھ کا ڈھیر تھا۔ لگتا تھا کسی نے بہت سی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے انہیں آگ
اور اب آگ میں جل جانے والی اشیاء راکھ کے ڈھیر کی صورت وہاں پڑی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ
نظروں سے اس راکھ کا جائزہ لیا۔ راکھ دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کاغذوں کا کافی بڑا ڈھیر
ہے۔ اس کے علاوہ کچھ تار وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی شے جو مکمل طور
جانے کے باوجود اپنی ہیئت کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھی، ایک وائرلیس سیٹ تھا کسی مدرسے میں وائرلیس
کی موجودگی باعثِ حیرت تھی۔ ڈی ایس پی بھی یقیناً اسی بات سے چونکا تھا۔

''یہ تو کوئی بہت بڑا چکر معلوم ہو رہا ہے سر! لگتا ہے مدرسے کی آڑ میں یہاں کوئی اور ہی کھیل
تھا۔'' اس کے چہرے پر پھیلے سوچوں کے جال کو دیکھتے ہوئے ڈی ایس پی منظور نے خیال ظاہر کیا تو وہ
سی ''اونہہ'' کر کے میٹرس کے ساتھ پڑے کتابوں کے ڈھیر کی طرف آ گیا اور ایک ایک کر کے ان
جائزہ لینے لگا۔ وہ زیادہ تر مختلف مسالک کے اختلافات پر مبنی کتب تھیں۔ ویسی ہی کتب جو ایک مسلک
خود کو درست اور دوسرے مسالک سے تعلق رکھنے والے کو غلط ثابت کرنے کے لیے لکھتا ہے..... یہ
کہ اس قسم کی کتاب لکھنے سے اس کی علمیت تو بے شک ثابت ہو جائے گی لیکن اس سے کہیں بڑھ کر
سامنے آئے گی، وہ مسلمانوں کے درمیان پایا جانے والا اختلاف ہے۔ اپنے تئیں تو وہ بے چارہ دین کی
ہی کر رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کی کتب کا وہاں پایا جانا معنی خیز تھا۔ اس کے علاوہ اسے ان کتابوں میں وہ
مزید ملے۔ کتابوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہوئے وہ سب سے نیچے رکھی کتاب تک پہنچا تو اس
دھچکا سا لگا اور بہت تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ قرآن
انگریزی ترجمے والا نسخہ تھا جسے فرش پر ڈھیر ساری کتابوں کے نیچے یوں بے پروائی سے پڑا دیکھنا اچھا
نہیں لگا تھا۔ یہ کمرہ کس کے زیر استعمال تھا، یہ بات نہ جاننے کے باوجود اتنا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ
علوم میں دلچسپی رکھنے والا شخص تھا جو اس کمرے میں رہ رہا تھا۔ اگر وہ مسلمان تھا تو اس سے ایسی بے
نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس کے ذہن میں یہاں مقیم افراد کے مسلمان ہونے سے متعلق شکوک وہاں
اشیاء کی وجہ سے بھی پیدا ہو رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں، وائرلیس سیٹ، ہندی ناولز..... یہ وہ اشیاء تھیں
خاص سمت میں اشارہ کر رہی تھیں۔

''اسے لے جا کر کتابوں والی الماری میں رکھ دو۔'' اپنے ساتھ کمرے میں موجود سپاہی کے
قرآن کا وہ نسخہ تھماتے ہوئے اس نے اسے حکم دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سپاہی نے پورے احترام
نسخہ تھاما اور حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہاں کچھ ایسا ہی معاملہ نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دین داری کی آڑ لے کر کسی اور مقصد کے
لیے یہ مدرسہ قائم کیا گیا ہو۔ موجودہ حالات میں کچھ کچھ وہ مقصد سمجھ بھی آ رہا تھا لیکن ابھی کوئی حتمی نتیجہ
جا سکتا تھا۔

''دوسرے کمرے میں کیا ہے؟'' اپنی سوچوں کو پرے دھکیلتے ہوئے اس نے ساتھ کھڑے ڈی



خاص نہیں۔ بس تین چار عام سے بستر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ پورا کمرہ خالی ہے۔'' اس
سے بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈی ایس پی منظور اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے
کمرے کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ اندر کا منظر ڈی ایس پی کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔
نے کچن وغیرہ بھی چیک کروا لیا تھا۔ وہاں عام استعمال کے برتنوں اور دوسری ضرورت کی چیزوں
اور نہیں ہے۔'' اس کے پیچھے چلتے ہوئے ڈی ایس پی نے رپورٹ دی جو اس نے بنا کسی تاثر کے
ساتھ سنی۔ وہ لوگ اب دوبارہ اس کمرے میں آ چکے تھے جس کا انہوں نے سب سے پہلے جائزہ لیا
بیرونی گیٹ سے قریب ترین تھا اس لیے وہاں باہر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ آوازوں
رہا تھا کہ اب مدرسے کے باہر گاؤں کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو چکی ہے اور وہ اتنی رات کو
وہاں آنے اور مدرسے کا تالا توڑ کر اس میں داخل ہونے پر آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔
گاؤں کے افراد میں سے دو تین ذرا سمجھ دار اور باخبر افراد کے بارے میں معلوم کر کے انہیں اندر بلواؤ۔
ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈی ایس پی کو حکم دیتے ہوئے وہ خود وہیں بیٹھ گیا۔ اسے شدت
اس ہو رہا تھا کہ وہ شاہنواز کو کھو چکا ہے اور اب وہ شخص یہاں واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ''کسی ایسے
کو بلوا لینا جو اس مدرسے میں پڑھتا ہو اور جس کا شاہنواز کے پاس زیادہ آنا جانا ہو۔'' ڈی ایس پی باہر
رہا تھا کہ اس نے اسے ایک اور ہدایت دی۔

ڈی ایس پی کے باہر نکلنے کے بعد ایسی آوازیں سنائی دیتی رہیں جیسے لوگ اس سے حالات کے بارے میں
کر رہے ہوں۔ لیکن پھر ڈی ایس پی کے رعب نے انہیں زیادہ سوالات کرنے کی مہلت نہیں دی۔ کچھ
واپس آیا تو اس کے ساتھ تین مرد اور ایک نوعمر لڑکا موجود تھا۔ وہ لوگ کچھ خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔
بیٹھیے۔'' اس نے انہیں اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کچھ سکڑ کر وہاں بیٹھ گئے۔

اس مدرسے کے مالک شاہنواز صاحب کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ لوگ؟''

وڈے چنگے آدمی ہیں سر جی! ہر اِک سے وڈی چنگی طرح گل کرتے ہیں۔ دل کے بھی وڈے کھلے
شخص فوراً ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا۔ یہ وہی رائے تھی جو اس سے پہلے وہ دین محمد کی
سن چکا تھا۔

آج وہ کہاں گئے ہیں؟ تم میں سے کسی نے انہیں یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ وہ کب گئے
علاقوں کے اس سلسلے کو روکنے کے لیے اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔

اج (آج) ہی تھوڑا گئے ہیں سر جی! وہ تو دو دن سے گئے ہوئے ہیں۔ شاہنواز صاحب کہہ رہے
پتر وڈے ذہین ہیں۔ انہیں لہور (لاہور) کے وڈے مدرسے میں داخلہ دلانے کے لیے لے گئے
نے بھی کہا کہ اس سے چنگی گل بھلا کیا ہو گی۔ ادھر تو وہ دونوں پنڈ کے دوجے منڈوں کے ساتھ
تے ہی پھرتے تھے۔ اب لہور میں رہ کر تعلیم ہی حاصل کر لیں گے۔ سارا خرچہ شاہنواز صاحب نے
کا وعدہ کیا ہے۔ وڈے چنگے آدمی ہیں وہ..... اللہ ان کو لمبی حیاتی دے۔'' وہ شخص شاہنواز کو دعائیں
تی دو افراد کے چہرے پر بھی ایسے تاثرات تھے جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ہم خیال ہیں۔
نے ان کے ذہنوں کو بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا جب ہی تو وہ اپنے بیٹوں کو اس کے
بھیجتے ہوئے ذرا متردد نہیں ہوئے تھے۔

''شاہنواز صاحب دو دن سے لاہور گئے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ دو دن سے مدرسہ بھی
گا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔ مدرسے کی جو حالت تھی، اس سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دو دن
پڑا ہوا ہے۔ گاؤں کی اس دھول اُڑاتی فضا میں دو دن کے عرصے میں عمارت کے اندر اچھی خاصی دھول
ہو جانی چاہئے تھی جبکہ ابھی جب وہ لوگ اندر کا جائزہ لے رہے تھے تو انہیں کسی شے پر گرد کی تہ نظر نہیں آئی
یوں لگتا تھا کہ آج ہی کسی نے صفائی کی ہو۔

''مدرسہ تو بند نہیں تھا جی۔ دو دن سے بچے برابر یہاں پڑھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ بچوں سے
کہ آج کل شاہنواز صاحب کا کوئی پروہنا (مہمان) آیا ہوا ہے، وہی ان لوگوں کو پڑھا رہا تھا۔ میں ان
کے لیے بھی آیا تھا، پر انہوں نے کہلوا دیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے کسی سے مل نہیں سکتے۔ میں
برا نہیں مانا اور گھر واپس آ گیا کہ بعد میں مل لوں گا۔ لیکن آج شام میں میرا چھوٹا پُتر جو زیادہ تر ادھر مدرسے
ہی رکا رہتا تھا، گھر واپس آ گیا کہ شاہنواز صاحب کے دوست واپس جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا
مدرسے کو تالا لگا کر جائیں گے اور چابیاں لہور میں ہی شاہنواز صاحب کو دے دیں گے۔'' وہ شخص جس
کے ساتھی نے بطور عظمت علی نشان دہی کی تھی، اس کے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ اس کے جواب
اسے اندازہ ہوا کہ مدرسہ کیوں صاف ستھرا تھا۔ ساتھ ہی اس اندازے کی بھی تصدیق ہو گئی کہ وہاں شاہنواز
علاوہ بھی کوئی شخص مقیم تھا۔ تیسرا کمرہ جس میں معمولی بستر لگے ہوئے تھے، یقیناً گاؤں کے ان لڑکوں کے
مخصوص ہوگا جو وقتاً فوقتاً مدرسے میں قیام کرتے رہتے تھے۔

''دین محمد کا بیٹا عبدالمتین بھی تو سنا ہے کافی ذہین اور محنتی ہے۔ اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئے
صاحب؟'' دین محمد اور امین سے اسے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق عبدالمتین عقیل
مالک ہونے کے باوجود شاہنواز کی بہت سنتا تھا۔ اب اسے شاہنواز کے ساتھ لاہور جانے والے جن
کے بارے میں بتایا گیا تھا، ان کی بھی یہ خصوصیت سامنے آئی تھی کہ وہ کچھ جھگڑالو فطرت کے مالک
شاہنواز کی خصوصی توجہ کا مرکز وہ بچے تھے جن کی فطرت میں سرکشی، جذباتی پن اور غصہ موجود تھا۔ اس قسم
بچوں کو اس نے یقیناً کسی خاص مقصد کے تحت ہی سے قریب کیا ہوگا۔ وہ مقصد کیا تھا، یہ تو عبدالمتین
انجام سے بھی ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ عبدالمتین کو اس کام پر اُکسانے والا شاہنواز
نہیں؟ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا تھا کہ عبدالمتین اسی کے ساتھ کہیں گیا ہو۔

''عبدالمتین سے وڈا پیار کرتے تھے شاہنواز صاحب! اگر وہ ادھر ہوتا تو شاید اسے بھی اپنے ساتھ
جاتے۔ پر وہ تو کئی دنوں سے غائب تھا۔ دین محمد وچارہ تو خود اُسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔'' عظمت علی نے
دیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ عبدالمتین کو کئی دن پہلے منظر سے اس لیے ہٹا دیا گیا ہو کہ اس
ایک بڑا کام لیا جانا تھا شاہنواز نہیں چاہتا ہوگا کہ بعد میں اس کی شناخت ہونے کے بعد کوئی اس سے
عبدالمتین سے متعلق پوچھ گچھ کرنے آئے۔ کوئی آتا بھی تو وہ صاف کہہ سکتا تھا کہ مجھے خبر نہیں، میں تو
جب عبدالمتین غائب ہو گیا تھا۔ وہ جن دو لڑکوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، انہیں کسی جگہ پہنچانے کے بعد
واپس یہاں آنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن دین محمد اور اس کے گھر والوں کے پولیس کی حراست میں جانے
کر اس کا یہاں مقیم ساتھی ٹھٹک گیا اور جلدی جلدی تمام مشکوک چیزوں کو آگ لگا کر یہاں سے بھاگ
جلدی کی وجہ سے اسے شراب کی بوتلوں کو ٹھکانے لگانے یا اس بے ترتیبی کو درست کرنے کا موقع نہیں مل
جس سے اس کی بدعقیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔



''شاہنواز صاحب کے جو دوست یہاں ٹھہرے ہوئے تھے ان کا نام معلوم ہے تمہیں بیٹا؟'' اب وہ ان
کے ساتھ موجود نوعمر لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔

''نام تو نہیں معلوم۔ شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ ان کے بہت اچھے دوست ہیں۔ وڈے عالم ہیں اور
ادھر تھوڑے دنوں کے لیے رہنے آئے ہوئے ہیں۔ ہم تو انہیں مولانا صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔

''ان کا حلیہ کیسا تھا؟..... کچھ بتا سکتے ہو؟''

لڑکے نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''وڈے اونچے پورے آدمی تھے، رنگ سانولا تھا۔ آنکھیں بھوری تھیں۔ سر
گنجا تھے اور داڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ بھی لگاتے تھے۔''

''یہ میرا چھوٹا پُتر ہے جی۔ اس نے بالکل صحیح حلیہ بتایا ہوگا۔ دو دن سے یہی ان کی خدمت کے لیے
میں رکا ہوا تھا۔'' عظمت علی نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''وہ کس کمرے میں رکے ہوئے تھے اور کب سے یہاں رہ رہے تھے؟'' عظمت علی کی طرف توجہ دیئے
اس نے لڑکے سے ایک اور سوال کیا۔

''رہ تو بڑے دنوں سے رہے تھے، پر اندر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ ہمارے سامنے نہیں آتے
وہ جو آخری والا کمرہ ہے، اُدھر رہتے تھے۔ ہمیں تو ان سے شاہ صاحب نے اپنے لہور جانے سے ایک دن
ملوایا تھا۔''

یہ بات کافی غور طلب تھی۔ ایک شخص جو کئی دنوں سے شاہنواز کا مہمان تھا، مسلسل کئی دن وہاں قیام پذیر
کے بعد کسی کے سامنے نہیں آیا۔ دو دن پہلے شاہنواز نے اسے اپنے لاہور جانے سے قبل بچوں سے ملوایا
صرف بچوں تک ہی محدود رہا اور ملاقات کی خواہش لے کر آنے والے عظمت علی کو اس نے یہ کہلوا کر ٹال
میری طبیعت خراب ہے۔ اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہو جو لوگوں سے
رہا ہو اور اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے شناخت نہ کر لے۔ اس کا جو حلیہ سامنے آیا تھا، اس سے بھی یہ ظاہر ہو رہا
لیکن ہے کسی نے اپنا حلیہ بدلنے کی کوشش کی ہو۔ سر کے بال چھوٹے کروانے کے بعد اگر کوئی شخص اپنی
بھی مونڈ ڈالے تو ایک نظر ڈالنے پر جان پہچان والے بھی اسے شناخت کرنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔
کانٹیکٹ لینس اور چشمے کے استعمال سے اور بھی واضح تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس تبدیل شدہ حلیے کے
وہ شخص آزمائشی طور پر بچوں کے سامنے آیا ہوگا کہ آیا وہ اسے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ بچوں میں سے کسی نے
شناخت نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ کسی بڑے کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ بہرحال، یہ سارے
اندیشے تھے جن کی تصدیق یا تردید کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ جو بات سب سے زیادہ واضح تھی وہ یہ کہ وہ
پہنچنے میں دیر کر بیٹھے تھے اور اس مشکوک شخص کو فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ شاہنواز تو دو دن پہلے ہی
گیا تھا اور اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دو نوعمر لڑکے بھی تھے
شاید وہ عبدالمتین ہی کی طرح استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ خیال بہت دہشت ناک اور روح کو لرزا
والا تھا۔

''ٹھیک ہے، آپ لوگ جا سکتے ہیں۔'' اپنے ذہن میں کلبلاتے ان اندیشوں کا عکس اس نے اپنے چہرے
آنے دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو حکم دیا۔ وہ لوگ شاید اس سے صورتِ حال جاننے کے
مند تھے لیکن اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکے اور چپ چاپ باہر نکل
ان کے باہر نکلنے کے بعد وہ ڈی ایس پی منظور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑی گمبھیرتا تھی اور

پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ شروع سے اس تفتیش میں اس کے ساتھ ساتھ تھا اور یقیناً اس نے بھی
نتائج اخذ کیے تھے جو وہ اخذ کر چکا تھا۔

''اس گاؤں کے تھانے دار کو بلواؤ۔ یہ عمارت فی الحال سیل کروانی پڑے گی۔ کل میں لاہور سے ایک
کو بلوا کر یہاں سے فنگر پرنٹس وغیرہ اُٹھوالوں گا۔ ان لوگوں نے کتنی ہی احتیاط کی ہو لیکن یہاں ان کا
قیام تھا۔ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے فنگر پرنٹس ضرور چھوڑے ہوں گے۔ خصوصاً ان کمروں میں جہاں شاہ
اور اس کا ساتھی قیام پذیر تھے۔ ممکن ہے فنگر پرنٹس کی مدد سے ہمیں ان تک پہنچنے میں کامیابی ہو جا
اس کے اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے دار اور اس کے دو سپاہی وہاں پہنچے تو انہوں نے
بے شک پہن رکھی تھی، پھر بھی ان کی آنکھوں کی سرخی اور یونیفارم کی بے ترتیبی گواہی دے رہی تھی کہ
نیند سے جگائے گئے ہیں۔ تین چار افراد کے اسٹاف پر مشتمل اس گاؤں میں موجود تھانہ حقیقتاً بس خانہ پُری
لیے ہی تھا۔ پولیس کی وہاں کارکردگی کا معیار دین محمد کی بیٹی کے اغوا والے کیس سے ہی لگایا جا سکتا تھا۔ تھا
عملہ اپنی تنخواہیں وصول کرنے اور گاؤں والوں کو اپنے رعب میں رکھنے کو ہی بس اپنی ڈیوٹی تصور کرتا تھا۔
کے علاوہ راوی ان کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ انہیں اوپر سے کسی احتساب کا
تھا بلکہ ایک طرح سے انہیں اپنے اعلیٰ افسران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کی مثال بھی دین محمد کی بیٹی
کیس سے ہی ملتی تھی۔ ایس پی نے ایک معمولی تھانے دار کی اس طرح حمایت کی تھی کہ کیس کا رخ ہی بدل
گیا تھا اور وہ دین محمد کو ہی غلطی پر سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر کے بیٹھ گیا تھا۔ تھانے دار نے اس طرح
صاحب کو جُل دے دینے پر یقیناً خود کو بڑی داد دی ہوگی۔ مگر اب رات کے اس پہر وہ اے سی، پولیس کے
آفیسر کے ساتھ وہاں نظر آ رہا تھا تو گہری نیند سے جگائے ہوئے تھانے دار کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ
کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے؟ اس نے اپنی پولیس کی ملازمت کے عرصے میں یقیناً کھا کھا کر توند کی پرورش
کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا، ورنہ کم از کم دین محمد کی اس کے اہلِ خانہ سمیت گرفتاری پر ہی کچھ چونکتا اور
غیر معمولی صورتِ حال کے لیے اپنے عملے کو الرٹ کر دیتا۔ لیکن اس کی غفلت کا تو یہ عالم تھا کہ اس کے تھانے
حدود میں ایک مدرسے میں ضلع کا اے سی، ڈی ایس پی اور پولیس کے سپاہی اتنی دیر سے موجود تھے پھر بھی
کوئی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ گاؤں کے جاگ جانے والے افراد نے بھی یقیناً اس کی مستقل قسم کی بے اعتنائی
دیکھتے ہوئے اسے یہ اطلاع پہنچانی ضروری نہیں سمجھی اور اب وہ آنکھیں پھاڑے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا
ان لوگوں کے پاس اسے سمجھانے کا وقت نہیں تھا۔ ڈی ایس پی منظور نے اسے مدرسے کی عمارت کو سیل کر
دو سپاہیوں کو وہاں تعینات کرنے اور اندر موجود اشیاء کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کا حکم دیا۔ شہریار اس
کارروائی سے الگ تھلگ گاڑی میں جا بیٹھا۔ آخر کار رات کے آخری پہر ان کی اللہ آباد سے روانگی ممکن ہو
واپسی کے اس سفر کے دوران اسے اپنی جسمانی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ مسلسل بھاگ دوڑ، سفر اور زخموں کی
سے اس کا جسم کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور اب اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ چاہے قلیل وقت
لیے ہی سہی، اسے دوا اور غذا کے ساتھ تھوڑے سے آرام کا موقع مل جائے۔

⊛----✪----⊛

وہ مشکل سے دو گھنٹے کی نیند لے سکا تھا۔ اپنی رہائش گاہ پر واپس پہنچنے کے بعد بھی اسے کئی اہم
نمٹانے پڑے تھے۔ پہلا کام تو سجاد رانا کو فون کر کے شاہنواز کے مدرسے کے متعلق بتانے اور ایکسپرٹس کو



بلوانے کی درخواست کرنے کا تھا۔ پھر اس نے ہسپتال کی صورتِ حال کے بارے میں جاننے کے
عبدالمنان کو فون کیا۔ یہ جان کر کہ شدید زخمیوں کو لاہور روانہ کر دیا گیا ہے، اسے خاصا سکون ملا تھا۔ زخمی
سے کچھ کی موت بھی واقع ہو گئی تھی۔ اندازاً اس حادثے میں پولیس والوں سمیت تیس سے پینتیس
ہو گئے تھے۔ اتنے ہی زخمی بھی تھے۔ مرنے والوں کے لیے افسوس اور ان کے ورثاء کی اشک شوئی
مالی امداد کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ زخمیوں کو بروقت طبی امداد ملنا بہت ضروری تھی۔ وزیراعلیٰ
سے مرنے والوں کے ورثاء اور زخمیوں کے لیے مالی امداد کا اعلان سامنے آ چکا تھا۔ صدر اور وزیراعظم
اس واقعے کی مذمت کی تھی۔ ان ساری اطلاعات کے ساتھ اسے یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ اس کے منظر
ہو جانے کا کافی برا مانا گیا تھا۔ میڈیا والوں نے اس ایشو کو لے کر قیاس آرائیاں کی تھیں حادثے کے
کی گرفتاری کی خبر بھی گردش کر رہی تھی اور میڈیا والے اسی اسٹوری کی تلاش میں بُو سونگھتے پھر رہے
اعلیٰ نے اس صورتِ حال پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس اطلاع کو زیادہ خاطر میں نہیں لایا۔ وزیراعلیٰ
سنبھالا جا سکتا تھا مگر وہ جن کاموں میں مصروف رہا تھا، وہ فوری توجہ کے طالب تھے۔ اب بھی اسے
تاخیر کی وجہ سے ایک اہم شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ورنہ شاہنواز نہ سہی، اس کا وہ مہمان
ہی جاتا۔ بہرحال ہونے والی اس غلطی پر افسوس کرتے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل بات
اس غلطی کی تلافی کی کوئی صورت نکالی جاتی اور یہ تلافی صحیح رخ پر تحقیقات کرنے سے ہی ہو سکتی تھی۔
کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ ڈی ایس پی منظور کو بھی اس نے چند ہدایات راستے میں ہی دے دی تھیں۔ یہ
ضروری کام نمٹانے کے بعد ہی اسے اپنے زخموں پر مرہم لگا کر ایک گلاس دودھ کے ساتھ پین کلر لینے
اور دل کر بستر پر لیٹنے کی مہلت مل گئی تھی اور یہ مہلت صرف دو گھنٹے کے لیے تھی۔ دو گھنٹے بعد ہی وہ بستر
فریش ہونے کے بعد ناشتے کی میز پر آ گیا تھا۔ ناشتہ بھی اس نے برائے نام ہی کیا تھا۔ کل کے
حادثے کے بعد جس میں اس نے اپنی آنکھوں سے انسانی جسموں کے اُڑتے ہوئے ٹکڑے اور
بہتا خون دیکھا تھا، کچھ کھانا پینا آسان نہیں تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ ان حالات میں اپنے
کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے جسمانی توانائی کے لیے
ضرورت پوری کی تھی اور اب تیار ہوتے ہوئے عبدالمنان سے رابطہ کرنے کی کوشش کے بارے میں سوچ
کہ بیٹ مین نے اسے ڈی ایس پی منظور کی آمد کی اطلاع دی، ڈی ایس پی کی اس وقت آمد خالی از
ہو سکتی تھی۔ اسے انتظار کے لیے سٹنگ روم میں بٹھانے کا حکم دینے کے بعد وہ جلدی جلدی تیار ہوا
روم میں پہنچ گیا۔ سٹنگ روم میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر ڈی ایس پی کے چہرے پر پڑی تو اسے کسی
صورتِ حال کا احساس ہوا۔ تاہم خود سے کوئی سوال جواب کیے بغیر وہ اس کے سلام کا جواب دیتے
سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

کی ہدایت کے مطابق میں نے اللہ آباد کے مدرسے سے فرار ہونے والے بندے کا حلیہ اپنے
ٹ کروا کے انہیں بس اڈے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ایک بس کے کنڈیکٹر نے
ری ہے کہ اس حلیے کا ایک بندہ اللہ آباد سے اس کی بس میں سوار ہوا تھا تاہم اسے یہ یاد نہیں کہ وہ
بس یہاں سے لاہور تک کے روٹ پر چلتی ہے۔ لاہور میں جب بس خالی ہوئی تو اس کے بچے
روں میں وہ شخص شامل نہیں تھا، یہ بات کنڈیکٹر کو اچھی طرح یاد ہے۔ اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ
ہی کسی دوسرے شہر کے بس اڈے پر اُتر گیا ہوگا۔ بس لاہور پہنچنے سے پہلے اپنے طے شدہ شیڈول

کے مطابق دو مقامات پر ٹھہری تھی۔ ہمارے ضلع سے جتنی بھی بسیں لاہور کے روٹ پر جاتی ہیں ا
یہی شیڈول ہوتا ہے۔ اصل میں روز روز لاہور تک زیادہ مسافر نہیں جاتے زیادہ تر کی منزل کوئی
ہوتا ہے۔ اس لیے کنڈیکٹر اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ شخص کہاں اُترا۔''

ڈی ایس پی نے خود ہی اسے رپورٹ دینی شروع کر دی جسے سننے کے بعد وہ بولا۔ ''جن د
ٹھہری تھی، آپ وہاں اپنے بندے بھیج کر معلومات کروالیں۔ ہوسکتا ہے وہ شخص وہاں سے کسی د
بیٹھ کر آگے گیا ہو اور اس بس کے کنڈیکٹر یا ڈرائیور کو اس کا حلیہ یاد ہو تو ہمیں اندازہ ہو سکے کہ
نکلنے کے بعد کہاں پہنچا ہے۔''

''میں اس کام کے لیے ہدایات دے چکا ہوں۔ اب تک بندے روانہ بھی ہو چکے ہوں گے
کہ چار چھ گھنٹے بعد وہ واپس آئیں گے تو ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی اطلاع موجود ہوگی۔'' ڈی ا
فوراً اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا تاہم اس کے چہرے پر موجود پریشانی کے تاثرات بدستور مو

''کوئی اور بات؟'' اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سوال کیا اور کلائی
واچ میں وقت دیکھا۔ اسے اب تک روانہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن ڈی ایس پی کی موجودگی کی وجہ

''ایک بیڈ نیوز ہے سر! دین محمد اور اس کی فیملی غائب ہے۔ میں اللہ آباد سے آنے کے بعد تھا
لوگ وہاں موجود نہیں تھے۔'' ڈی ایس پی نے دھیمے الفاظ میں بتایا تو وہ چونک گیا۔ تھانے کے
کمرے میں، پولیس کے سپاہیوں کی نگرانی میں موجود دو افراد آخر کہاں اور کیسے غائب ہو سکتے تھے؟

''وہ لوگ وہاں سے کس طرح غائب ہو سکتے ہیں؟ وہ بالکل نہتے تھے۔'' ان کا ایک مقفل کمر
کر نگرانی پر موجود سپاہیوں کو جُل دے کر فرار ہو جانا کس طرح ممکن ہوا؟'' اپنے ذہن میں اُٹھنے والے
نے ڈی ایس پی کے سامنے بھی رکھ دیئے۔

''وہ خود سے فرار یا غائب نہیں ہوئے بلکہ انہیں غائب کیا گیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم ا
لیے روانہ ہو رہے تھے، اسی وقت ایس پی صاحب تشریف لے آئے تھے۔ ان کی تشریف آوری کے
ہوا، اس کی اطلاع مجھے تھانے میں موجود اپنے ایک مخبر کے ذریعے ملی ہے۔ اس نے مجھے بتایا
صاحب کے تھانے پہنچتے ہی ایس ایچ او بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے ہم نے ساری تحقیق سے الگ
آپ کے حکم پر دین محمد اور اس کے گھر والوں کو اللہ آباد سے گرفتار کرنے کا کام تو میں نے اسی سے
نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس گرفتاری کا نور پور والے حادثے سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس
ملتے ہی ایس پی صاحب کے کان میں ساری بات پھونک دی۔ وہ تو یقیناً پہلے ہی آپ سے اور
تھے۔ ہم نے اسمگلنگ میں ملوث بندے کو جس طرح ان کے علم میں لائے بغیر خاموشی سے خفیہ
کر دیا تھا، یہ بات انہیں بھولی تو نہیں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور دین
بیوی، بیٹے کو کسی اور جگہ منتقل کروا دیا۔ یہ کام انہوں نے اپنے بہت ہی اعتماد کے بندوں سے لیا
میرے مخبر کو نہیں معلوم کہ وہ جگہ کون سی ہے؟ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تھانے کے ریکارڈ میں تو ان
گرفتاری شو ہی نہیں کی گئی، عملہ کسی طور ایس پی صاحب کے خلاف گواہی نہیں دے گا کہ گرفتار شدہ افراد
نے غائب کروایا ہے۔ یوں سمجھیں کہ جو کچھ مجھے اپنے مخبر کے ذریعے معلوم ہوا ہے، وہ آف دی ریکارڈ
کے بارے میں ایس پی صاحب سے کچھ نہیں پوچھا جا سکتا۔ ان کی طرف سے صاف جواب مل جا
جب کسی کو گرفتار ہی نہیں کیا گیا تو اس کے رہا اور غائب ہونے کا کیا سوال؟'' ڈی ایس پی کی دی ہو



ایش ناک تھی۔ دین محمد اور اس کے اہلِ خانہ کا دھماکے سے کوئی تعلق ہونے کے شک کا مطلب تھا کہ
سے ہر ممکن طریقے سے یہ جرم قبول کروانے کی کوشش کروائی جاتی۔ عموماً خودکش حملہ آور کا سر دھماکے
محفوظ رہ جاتا ہے۔ عبدالمتین کا سر بھی موقع پر مل گیا تھا۔ اس کے چہرے کی تصاویر کی مدد سے جب اس
ے میں تحقیق کی جاتی تو یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ دین محمد کا بیٹا تھا۔ اس حقیقت کے معلوم ہونے کے
ے چارہ مزید عتاب میں آ جاتا۔ لیکن ڈی ایس پی کی بات صحیح تھی کہ ایس پی مکر جاتا تو کسی طرح یہ ثابت
کیا جا سکتا تھا کہ وہ مظلوم خاندان اس کی تحویل میں ہے اور اس کو یقیناً مکرنا ہی تھا۔ اگر اس کی نیت میں
اہ ہوتی تو وہ انہیں غائب ہی کیوں کرتا؟

''اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آپ اپنے اسٹاف سمیت زبان بالکل بند رکھئے گا۔ فوری کارروائی کی ضرورت
ں کرتے ہوئے میں نے رِسک لیتے ہوئے اتنے عام طریقے سے اس کیس پر کام شروع کر دیا تھا۔ ورنہ یہ
معاملہ ہے جس کی تحقیق بہت اعلیٰ سطح پر ہونی چاہئے۔ لاہور سے ٹیم آ جانے کے بعد یہ کیس اسے ریفر کر دیا
ے گا۔ ایس پی صاحب ایفی شینسی دکھانے کے چکر میں جو کچھ کر رہے ہیں، انہیں کرنے دو۔ انہیں جلد معلوم
ے گا کہ دین محمد ان کے کسی کام کا نہیں۔'' ابتدائی طور پر لگنے والے جھٹکے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا
ای ایس پی کو ہدایت دی۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا سر!'' ایفی شینسی تو ڈی ایس پی بھی دکھانا چاہتا تھا چنانچہ
صت ہونے سے پہلے اس نے استدعا کی۔

''ہاں، پر کام کرنے کے لیے جو ٹیم آئے گی، اس کے ساتھ آپ ہی کو رہنا ہوگا۔ کچھ بریفنگ تو میں خود
ں دے دوں گا لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کے جوابات دینے کے لیے ظاہر ہے کوئی ایسا آدمی ہونا چاہئے جو
ہی ہو۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے آپ ہی سب سے مناسب آدمی ہوں گے۔''

اُس کے اس جواب نے ڈی ایس پی کا چہرہ کھلا دیا۔ وہ خود جان بوجھ کر اس شخص کو ایسے مواقع فراہم کر رہا
لا کہ اسے اپنے کیریئر کو اوپر لے جانے کے لیے کارکردگی دکھانے کا موقع ملے۔ ایس پی کی طرف سے مایوس
ونے کے بعد اس کے ماتحت آفیسر کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ انتظامی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔
ہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ بے شک ڈی ایس پی اپنی ترقی کے لالچ میں مبتلا ہے لیکن فطرتاً اتنا برا آدمی نہیں کہ
ارت بکنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ اس طرح کے آدمی کو ذرا سی اہمیت دے کر روشن مستقبل کی جھلک دکھائی
ے تو وہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ابھی تک اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہو رہا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ
ای ایس پی منظور کو ہی ہر معاملے میں فرنٹ پر رکھنا ہے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ ہسپتال کے لیے روانہ
ہو گیا۔ اب تک اسے وہاں جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اسے علم تھا کہ میڈیا اس بات کو اُچھال رہا ہے۔ اس
ہمانده سے ضلع میں اسسٹنٹ کمشنر ہی سب سے بڑا افسر تھا اور اس کا مسلسل منظر سے غائب رہنا واضح طور پر
نظروں میں آیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے مخالفین نے بھی میڈیا کی توجہ چپکے سے اس طرف مبذول کروا دی ہو،
اب ہی وہ لوگ زیادہ شور مچا رہے تھے۔ وہ جیسے ہی ہسپتال پہنچا، وہاں موجود دو تین صحافیوں نے اسے گھیر لیا۔

''آپ کے ضلع کے ایک گاؤں کے افراد پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کئی لوگ یہاں ہسپتال میں دم توڑ گئے اور
آپ اب ان کی مزاج پُرسی کے لیے تشریف لا رہے ہیں؟'' ایک صحافی نے نوکیلے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میں ان لوگوں کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میرا پی اے زخمی ہونے کے باوجود مسلسل یہاں موجود تھا اور
میرا اس سے فون پر رابطہ تھا۔ میں زخمیوں کو بہترین طبی امداد پہنچانے کے لیے جو اقدامات کر سکتا تھا، وہ میں نے

کیے۔ میری ذاتی کوششوں سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ زیادہ متاثرہ افراد کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاہور کے سہولیات والے ہسپتال میں منتقل کیا جا سکے۔ مزاج پرسی کی فارمیلٹی نبھانے کے لیے یہاں بہت لوگ موجود تھے لیکن میں کچھ ایسے کاموں میں مصروف تھا جو مجھے ہی کرنے تھے۔'' بہت تحمل سے صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا جس کا نوٹس لیتے ہوئے اس صحافی نے تیز لہجے میں فوراً ایک اور سوال داغ دیا۔

''کیا آپ ان مظلوم افراد کی مزاج پُرسی کے لیے آنے کو محض فارمیلٹی سمجھتے ہیں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' وہ فوراً سنبھلا۔ میں اس حادثے کا شکار ہونے والے تمام افراد سے ہمدردی رکھتا ہوں اس لیے پہلی فرصت میں ان سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی کتنی فکر ہے، اس کا اندازہ تو آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ خود زخمی ہونے کے باوجود میں جائے حادثہ پر مصروف عمل ہوں۔ اگر مجھے ان لوگوں کی فکر نہیں ہوتی تو میں اس طرح انہیں اپنی ذات پر ترجیح نہیں دیتا۔'' اس طرح سے سیاست دانوں کی طرح اپنی کارکردگی کو جتانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ صحافی برادری بات کا بتنگڑ نہ بنا لے، اس احتیاط کے پیش نظر اسے یہ جملے بولنے پڑے۔

''سنا ہے کل آپ کے حکم سے کچھ افراد کو گرفتار بھی کیا گیا ہے..... کیا ان کا تعلق نور پور میں ہونے والے دھماکے سے ہے؟'' ایک دوسرے صحافی نے نیا سوال داغا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی پولیس تحقیق کر رہی ہے۔ اور یہ تحقیقات بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔ کوئی واضح بات سامنے آ جانے کے بعد میڈیا کے افراد کو آگاہ کر دیا جائے گا۔'' بہت سنجیدگی سے اس سوال کا جواب دینے کے بعد اس نے اپنے قدم ہسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ صحافی ابھی اس کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اسے مزید کسی جواب کے لیے آمادہ نہ دیکھ کر انہیں اس کی جان چھوڑنی ہی پڑی۔

⊛----✪----⊛



''ہاؤ آر یو عبدالمنان؟'' وہ دوپہر کے قریب اپنے دفتر پہنچ سکا۔ ہسپتال میں زخمیوں کی مزاج پرسی سے فارغ ہوتے ہی اسے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لاہور سے تحقیقاتی ٹیم پہنچ چکی ہے۔ اس ٹیم سے اس نے اپنے بنگلے پر ملاقات کی اور دھماکے سے متعلق اپنی معلومات کو شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شکوک وشبہات بھی ان کے سامنے بیان کر دیے۔ اس ملاقات کے دوران ڈی ایس پی منظور بھی وہاں موجود رہا۔ ٹیم کے ارکان سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے انہیں تجویز دی کہ ابتدا سے اس کیس پر اس کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ ان کے لیے ایک کارآمد فرد ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ ٹیم کے ارکان نے اس کی تجویز کو قبول کر لیا۔ چائے پینے کے بعد وہ لوگ ڈی ایس پی منظور کی راہنمائی میں اللہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ اب کہیں جا کر اسے اپنے آفس پہنچنے کا موقع مل سکا۔ عبدالمنان کو اس نے اس ملاقات میں اس لیے اپنے ساتھ رکھا تھا کہ وہ دفتر میں ہی رہ کر باقی معاملات سنبھالتا رہے۔ کل نور پور سے واپس آنے کے بعد اب جا کر ان دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو رہی تھی اس لیے اس نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

''مچ بیٹر سر! مشابرم خان نے بہت اچھی ڈریسنگ کی تھی۔ بعد میں، میں نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے ایک مرہم بھی لے لی تھیں اس لیے اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا پھر ایک لسٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ مرنے والے افراد کے ناموں کی لسٹ ہے۔ میں نے بہت اصرار کر کے ایس پی صاحب سے منگوائی ہے۔ ان کے ورثاء کے لیے امدادی چیکس کی تقسیم کے وقت اس لسٹ کی خاص طور پر ضرورت پڑے گی۔ اس لیے میں نے یہ لسٹ منگوالی ہے۔ ہسپتال میں داخل زخمیوں کی لسٹ اس کے علاوہ ہے۔

''یہ تم نے ٹھیک کیا۔ امدادی چیکس کی صحیح حق داروں میں تقسیم کے لیے اس لسٹ کی بڑی اہمیت رہے گی، بعد میں یہ ہوتا ہے کہ موقع شناس لوگ خوامخواہ مظلوم بن کر حق داروں کا حصہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔'' اس لسٹ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھنے لگا۔ ''جائے حادثہ کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟ پولیس وہاں اپنی ابتدائی کارروائی تو مکمل کر لی ہو گی؟ مرنے والوں کی لاشوں کی تدفین اور خودکش حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر محفوظ کرنے کے سلسلے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟''

''اس سلسلے میں میرے پاس بہت سالڈ رپورٹ نہیں ہے سر! ایس پی صاحب ضرورت سے زیادہ مصروف ہوئے ہیں۔ وہ اور ان کا عملہ دونوں تعاون پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ تاہم اپنے ذرائع سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ خودکش حملہ آور کا سر پولیس کو کافی بہتر حالت میں مل گیا ہے اور پولیس فوٹو گرافر نے اس کی مختلف زاویوں سے فوٹو گرافس بھی بنا لی ہیں۔ مرنے والوں کی تدفین کے لیے میں نے اپنے طور پر رضا کاروں کی ٹیم کفن وغیرہ کے ساتھ نور پور روانہ کر دی ہے مگر ظاہر ہے یہ کام شام تک ہی ممکن ہو سکے گا۔''

''تدفین کا صحیح وقت معلوم کرلو۔ نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے ہم نور پور چلیں گے۔''

''او کے سر!'' اس کے حکم پر عبدالمنان فوراً بولا پھر مزید بتانے لگا۔ ''ہسپتال میں موجود دواؤں کا ا
کل ہی اچھا خاصا استعمال ہوگیا تھا۔ میں نے مزید دوائیں فوری طور پر منگوانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ ا
کہ دو گھنٹے بعد دوائیں ہسپتال پہنچ جائیں گی۔ لاہور سے آنے والے ڈاکٹرز کی رہائش کا ریسٹ ہاؤ
انتظام کروادیا گیا ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح ہر چھوٹے بڑے معاملے پر نظر رکھو۔ ایس پی کا موڈ بگڑا ہوا ہے
بھی مقام پر اگر ہمارے کسی وِیک پوائنٹ کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا تو بہت اودھم مچائے گا۔ اب بھی
ایک ہاتھ دکھا چکا ہے لیکن میں جان بوجھ کر خاموش ہوں۔'' عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے ا
مزید ہدایت دینے کے ساتھ اسے ہوشیار کیا۔

''اس موقع پر ایس پی صاحب کا یہ روّیہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس وقت تو اس بات کی ضرورت
ہم سب متحد ہوکر کام کریں تاکہ ان ہنگامی حالات سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ مجرموں تک رسائی بھی ممکن ہو

''ایس پی صاحب ہم جیسوں کے ساتھ نہیں بلکہ چودھری افتخار اور اقبال باجوہ جیسے لوگوں کے سا
قائم کرنے کے قائل ہیں کیونکہ اس اتحاد کے نتیجے میں انہیں مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت تو وہ
اپنی پلاننگ کے باوجود اسمگل کردہ لکڑی اور کھالوں کے ساتھ اپنا بندہ پکڑے جانے کا غم سینے سے لگا
ہیں۔ بڑے ہاتھ پیر مارے انہوں نے کہ کسی طرح انہیں پتہ چل جائے کہ بندہ کہاں ہے؟ اب ناکامی
لینے کا موقع مل رہا ہے انہیں۔ اپنے تئیں وہ بدلے میں میرے کام کے کچھ اہم بندوں کو غائب کر
کامیاب ہوگئے ہیں۔ تمہیں اللہ آباد میں پیش آنے والا وہ واقعہ تو یاد ہوگا جب دین محمد نام کے ایک شخص
بیٹی کے اغوا اور ڈکیتی کی شکایت لے کر آنے پر ہم اس کے ساتھ اس کے گھر گئے تھے اور وہاں اس کے
میرے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی تھی۔ کل جس لڑکے نے وہ خودکش حملہ کیا، وہ دین محمد کا وہی بیٹا عبدالمتین
میں نے اسی وقت اسے پہچان لیا تھا اور حادثے کے فوراً بعد دین محمد کی فیملی کو حراست میں لے کر تھانے
کے احکامات جاری کردیئے تھے۔ وہ لوگ بے چارے خود تو بے قصور تھے لیکن ان کے ذریعے مجھے
معلومات حاصل ہوئیں جس سے پتہ چلا کہ اللہ آباد میں موجود مدرسے کا مالک کچھ مشکوک شخصیت رکھتا
میں پولیس والوں کے ساتھ وہاں گیا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ بندہ تو فرار ہو چکا تھا لیکن مدر
تلاشی لینے پر کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے مجھے یہ شبہ ہو رہا ہے کہ شاید اس بندے کا تعلق ہمارے پڑو
سے تھا۔ ایکسپرٹس کی رائے سامنے آنے کے بعد یہ بات تو خود بہ خود واضح ہو جائے گی مگر ایس پی صاحب
میرے اللہ آباد سے واپس آنے تک جو کارنامہ انجام دیا، وہ دین محمد کو اس کے خاندان سمیت تھانے سے
کرنے کا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ سب مجھے پریشان کرنے کے لیے کیا یا وہ خود کوئی ایل
دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کی جو بھی خواہش ہو، مجھے ذاتی طور پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اتنی تشویش ضرور
بے چارے مظلوم لوگ خوامخواہ ان کے عتاب کا شکار ہوں گے۔'' اس نے مختصراً ساری بات بتاتے
ایس پی کے موجودہ روّیے پر روشنی ڈالی۔ عبدالمنان توجہ سے یہ سب سنتا رہا۔ اب اسے سمجھ آ رہا تھا کہ کل
شہریار کن چکروں میں پھنسا ہوا تھا جو اسے ہسپتال آنے کی فرصت نہیں مل سکی تھی۔ اس کی مہم جو فطرت نے
زخمی ہونے کے باوجود اسے نچلا نہیں بیٹھنے دیا تھا اور ایک بار پھر غیر روایتی طریقے سے کام کرتے ہوئے
قابل قدر کارکردگی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی یہ ساری بھاگ دوڑ اسسٹنٹ کمشنر



ے میچ نہیں کرتی تھی اور اصولاً اسے یہ سب خود کرنے کے بجائے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے صرف رپورٹس
نے پر اکتفا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ تو تھا ہی سر پھرا، سو وہی کرتا جو من میں سما جائے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! ایس پی صاحب کی نیچر میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ آپ پر آیا غصہ بھی
ں پر نکال دیں گے۔'' اس نے شہریار کی آخری بات کی تائید کی۔

''فی الحال میں ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ ایس پی صاحب اپنی ایسی کسی حرکت کو تسلیم کریں گے
اس لیے میرا اُن سے اس معاملے میں بات کرنا بھی بے کار ہے۔'' اس نے ایک بڑی حقیقت بیان کی
المنان بھی سمجھتا تھا اس لیے سر ہلا کر خاموش ہوگیا۔

''فی الحال ہمیں اس معاملے کو ہی زیادہ فوکس کرنا ہے اور اپنے وسائل بھی زیادہ تر اس معاملے سے نمٹنے
ے استعمال کرنے ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ پیر آباد میں مرکزِ صحت کی تعمیر کا جو کام چل رہا ہے،
رہے۔ نور پور میں تو ظاہر ہے کہ کام شروع ہونے میں کچھ وقت لگ جائے گا لیکن میں پوری کوشش
کہ اس میں بہت زیادہ وقت نہ لگے۔ باقی پروجیکٹس کا پیپر ورک بھی اس عرصے میں جاری رہنا
''اس نے موضوعِ گفتگو ذرا سا بدلتے ہوئے عبدالمنان کو ہدایت دی۔ یہ اس کا اپنے ضلع کی ترقی کے
اخلاص ہی تھا جو وہ ان ہنگامی حالات میں بھی اس بات کو نہیں بھولا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! انشاء اللہ یہ سب جاری رہے گا۔'' عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔ اسی وقت اس کی
فون بجنے لگا۔ عبدالمنان نے اس کے اشارے پر فون اٹھایا۔

''آئی جی صاحب کے دفتر سے فون ہے سر! ان کے پی اے بات کریں گے۔'' آپریٹر نے اسے اطلاع
اس نے کال ملانے کا کہا۔ اس طرح کی کالز وہی اٹینڈ کرتا تھا۔ اگر دوسری طرف سے شہریار سے بات
ے پر اصرار کیا جاتا تو وہ کال اسے منتقل کردی جاتی تھی۔ آپریٹر کے علم میں ہوگا کہ اس وقت وہ شہریار کے
میں ہے اس لیے اس نے کال یہاں ٹرانسفر کردی۔ کال بے حد مختصر تھی جس کے آخر میں عبدالمنان کو
''او کے'' کا ایک لفظ کہنے کا موقع مل سکا۔

''آئی جی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ پہلے وہ شام پانچ بجے نور پور میں ادا کی جانے والی نمازِ جنازہ
شرکت کریں گے اور پھر جائے حادثہ کا معائنہ کریں گے۔'' فون رکھنے کے بعد اس نے شہریار کو اطلاع دی۔
ایس نمازِ جنازہ کا وقت کسی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے جو انہیں کسی بھی
کی معلومات فراہم کرنے سے کترا رہے تھے، آئی جی صاحب کو یہ اطلاع فراہم کی تھی۔ ان کی اس بچگانہ
پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ کھسیانی بلی کتنا ہی کھمبے کو نوچ لیتی، اسے اُکھاڑ کر تو نہیں پھینک سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے آئی جی صاحب اکیلے نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ ڈی آئی جی سجاد رانا
تھا۔ مقامی افسران، اردگرد کے دیہاتوں کے چودھری حضرات اور ضلع کے سیاسی نمائندگان نے بھی نمازِ
ازہ میں شرکت کی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر پولیس کو متحرک ہونا پڑا تھا۔ اس موقع پر کسی ناخوشگوار واقعہ سے بچنے
کے لیے پولیس کی نفری پوری طرح چوکس تھی۔ نور پور کے لوگوں نے بھی اس موقع پر بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا
وہ اپنے جدا ہو جانے والے پیاروں کے غم میں دھاڑیں مار مار کے رو ضرور رہے تھے لیکن ان کے غم نے
اشتعال کی راہ نہیں دکھائی دی۔ شاید ایک ترقی یافتہ گاؤں میں رہنے اور محدود زندگی گزارنے کی وجہ سے

انہیں احتجاج کے طریقوں کا علم نہیں تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے جو اپنا غم بس اشکوں کی
مناتے رہے تھے اور پولیس کو کوئی زحمت نہیں دی تھی۔ غم زدہ خود پولیس والے بھی تھے۔ اس حا
پولیس اہلکار بھی ہلاک ہوئے تھے۔ وقت کی قلت کے باعث عام دیہاتیوں اور پولیس اہلکاروں کی ا
جنازہ ادا کی گئی تھی لیکن پولیس والوں کی باقیات پر مشتمل تابوت سبز ہلالی پرچم میں لپٹے ہونے کی ا
شناخت کیے جا رہے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد آئی جی صاحب نے ایک مختصر خطاب بھی کیا جس میں
اس حادثے پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ مجرموں کو
پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ انہوں نے صدر، وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کے تعزیتی پیغامات
کے باشندوں تک پہنچائے۔ اس مختصر خطاب کے بعد پولیس اہلکاروں کے تابوتوں کو پورے اعزاز
نورکوٹ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ سوائے ان اہلکاروں کے جن کا تعلق دوسرے علاقوں سے تھا، ان
تدفین نورکوٹ کے قبرستان میں ہی ہونی تھی۔ نور پور کے باشندوں کے لیے ان کے اپنے گاؤں کا
جنازوں کی روانگی کے بعد آئی جی صاحب جائے حادثہ کے معائنے کے لیے تشریف لے گئے تو ان
صرف سرکاری اہلکار موجود تھے۔ چودھری افتخار جیسے لوگ جو نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے آئے
تھے کہ آئی جی صاحب سے ملاقات رہے گی، اس صورتِ حال پر پیچ وتاب کھا کر رہ گئے۔ انہیں بھلا
غریب باشندوں یا پولیس کے معمولی اہلکاروں سے کیا دلچسپی تھی کہ وہ ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے
دور آنے کی زحمت اُٹھاتے۔ وہ تو اسی لیے آئے تھے کہ آئی جی صاحب کی نظروں میں آسکیں۔ مگر ان کی
سے یہ اعلان ہونے پر کہ فی الحال ان کے پاس ملاقاتوں کے لیے وقت نہیں ہے، ان کے ارمانوں پر
تھی۔ صرف نور پور کے چودھری بختیار سے شہریار نے آئی جی صاحب کو کھڑے کھڑے ملوایا تھا۔ اس
میں اتنا بڑا حادثہ پیش آیا تھا۔ آئی جی صاحب ذاتی طور پر اس سے براہِ راست افسوس کے چند کلمات
اس کا حق تھا۔ مگر شاید کچھ لوگوں کو یہ بات بری لگی تھی، انہیں نظرانداز کر کے نسبتاً ایک چھوٹے زمیندار
دی گئی تھی۔ وہ آسانی سے اس بے عزتی کو ہضم نہیں کر سکتے تھے۔

''لنگڑا، اے سی کا منظورِ نظر ہے۔'' کہیں کہیں سے یہ طنز بھی کیا گیا۔ چودھری بختیار کی معذوری کا
اُڑانے والے لوگوں نے اس کی بلند ہمتی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے چارہ معذور شخص بم دھماکے کے وقت
حادثہ پر موجود تھا۔ دھماکے کے اثر سے اسٹیج لرزا تو وہ بھی اپنی کرسی سمیت گر گیا تھا۔ لیکن ان حالات میں
بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہوا اور اپنی بیساکھی خود ڈھونڈ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس
ملازمین نے پولیس والوں کی اس موقع پر بھرپور مدد کی۔ بعد میں بھی وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی اشک
اور انہیں پُرسکون رکھنے میں مصروفِ عمل رہا تھا مگر دولت کے پجاریوں کے لیے تو انسان کی بڑائی کا بس ایک
پیمانہ تھا کہ اس کی تجوریاں مال وزر سے بھری پڑی ہوں۔ چودھری بختیار اس پیمانے کے اعتبار سے ان
نچلے نمبر پر آتا تھا۔

چودھری بختیار سے ہونے والی اس بے حد مختصر ملاقات کے بعد آئی جی صاحب اور سرکاری اہلکاروں
مشتمل قافلہ جائے حادثہ پر جا پہنچا۔ وہاں اب مرنے والوں کی لاشیں اور ان کے جسم کے ٹکڑے تو موجود
تھے لیکن مٹی میں جذب ہو کر سوکھ جانے والے خون کے دھبے ضرور نظر آ رہے تھے۔ اس پورے ایریا کو
نے زرد رنگ کے فیتے سے کور کر کے حد بندی قائم کر دی تھی۔ ثبوت اکٹھے کرنے اور ابتدائی تحقیقات ہو جانے
کے باوجود فی الحال وہاں پولیس کے چند جوان تعینات تھے۔ ایس پی، آئی جی صاحب کو حادثے کے بارے



میں بریفنگ دینے لگا۔ خودکش حملہ آور کس عمر کا تھا، اس نے کس طرح کارروائی کی..... اس کا اصل ہدف کیا
تھا..... پولیس والوں نے کس طرح اپنی جان پر کھیل کر اسے روکا..... جائے حادثہ کے معائنے کے دوران وہ
آئی جی صاحب کو تفصیل سے بتاتا رہا۔ خودکش حملہ آور کی شناخت کے معاملے میں البتہ اس نے اپنی زبان سے
کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ دین محمد کے تحویل میں آ جانے کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ عبدالمتین کی
شناخت سے ناواقف رہا ہوگا۔ مگر پھر بھی خاموش تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ چل
رہا ہے۔

جائے وقوعہ کے معائنے کے بعد وہ لوگ نور پور سے روانہ ہو گئے۔ آئی جی صاحب نے واپسی میں کچھ دیر
شہریار کے بنگلے پر رکنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بہ ظاہر یہ غیر طے شدہ اور نجی نوعیت کا پروگرام تھا، چنانچہ ڈی آئی جی
سجاد رانا کے علاوہ کسی اور کے ان کے ساتھ شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ لوگ اس کے
بنگلے پر پہنچے تو ان کے ساتھ کوئی چوتھا فرد نہیں تھا جو ان کی گفتگو میں شامل ہوتا۔ ڈنر سرو کیے جانے سے پہلے ملنے
والی مہلت میں وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

''وزیراعلیٰ تم سے بہت ناراض ہیں برخوردار! صبح میرے پاس ان کا فون آیا تھا اور وہ بڑی دیر تک تمہاری
بے پروائی کا شکوہ کرتے رہے تھے۔ کل حادثے کی اطلاع ملنے کے بعد وہ مسلسل تم سے رابطہ کرنے کی کوشش
کرتے رہے لیکن انہیں ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ اے سی صاحب کسی ضروری کام میں مصروف ہیں اور فی الحال
ان سے رابطہ ممکن نہیں۔ میڈیا نے بھی تمہارے منظرِ عام سے غائب ہونے کی خبر دے کر ان کی ناراضی کو مزید
بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔'' نور پور کے دورے کے دوران وہ ایک سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے
ان کے ساتھ کافی باتکلف طریقے سے پیش آئے تھے لیکن اب بالکل ریلیکس موڈ میں صوفے کی پشت سے ٹیک
لگائے بیٹھے تھے۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ اچانک اس کے بنگلے پر کچھ دیر ٹھہرنے کا بظاہر غیر طے شدہ نظر
آنے والا پروگرام درحقیقت پہلے سے طے شدہ تھا۔ وہ اپنے طور پر یا وزیراعلیٰ کی ہدایت پر کسی بھی دو صورتوں
میں اس سے اس کی سرگرمیوں کی بابت پوچھ گچھ کرنے کے لیے وہاں رکے تھے۔ سجاد رانا کو انہوں نے اس
دورے میں خاص طور پر اُسے ساتھ رکھا ہوگا کہ اپنے کزن کی موجودگی میں وہ زیادہ کھل کر بات کرے گا۔ سجاد
رانا کو اس وقت دراصل بھائی اور سسر کے درمیان ایک ایسے رابطہ کار کا کردار ادا کرنا تھا جس کی کارکردگی بہ ظاہر
نظر نہ آئے لیکن جس کی موجودگی ہی کافی ہو۔

''میں سجاد بھائی کو جو رپورٹس بھیجتا رہا ہوں، وہ یقیناً آپ کو بھی ملی ہوں گی۔ ان رپورٹس کی روشنی میں
آپ بہ خوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کل میں جن کاموں میں مصروف رہا، وہ وزیراعلیٰ صاحب کی کال وصول کرنے
سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ انہوں نے فون پر مجھ سے کیا کہنا تھا؟ ان کی ہدایات کے بغیر بھی یہاں سارے کام
انجام دیئے جا رہے تھے۔ سیاسی طور پر اپنی اہمیت جتانے کے لیے اگر وہ کچھ کہنا چاہتے تھے تو اس کے لیے میڈیا
سب سے موزوں ہے اور آج کے اخبارات اور نیوز چینلز سے ان کے جو بیانات سامنے آئے ہیں، ان سے پتہ
چل رہا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کر چکے ہیں۔ بیانات جاری کرنے کے سوا ان سیاست دانوں کو اور کون سا کام
کرنا ہوتا ہے؟'' اس نے تلخ لہجے میں ان کی باتوں کا جواب دیا۔

''تمہاری یہی جذباتیت تمہارے مخالفین کو تمہارے خلاف بولنے اور اُلٹی سیدھی رپورٹیں پہنچانے کے
مواقع دیتی ہے۔ تم اس طریقے سے کیوں کام نہیں کرتے جس طرح اور لوگ کرتے ہیں؟'' سجاد رانا نے ہلکی سی
خفگی کا اظہار کیا۔

''میرے خیال میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح دوسرے لوگ بغیر کچھ کیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، اسی طرح مجھے بھی کرنا چاہئے۔'' اس بار اس کا لہجہ نرم لیکن انداز طنزیہ تھا۔

''کم از کم تمہیں وہ سب نہیں کرنا چاہئے جسے دوسرے محکمے کے افراد اپنے اختیارات میں دخل اندازی تصور کریں۔ تمہارے علاقے کے ایس پی کو تم سے اس سلسلے میں بہت زیادہ شکایت ہے۔ تم کسی پولیس آفیسر کی طرح اچانک کوئی مہم سر کرنے چل پڑتے ہو۔ پچھلے دنوں لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کی جو کھیپ پکڑی گئی ہے اس کا سہرا بے شک ڈی ایس پی منظور کے سر باندھا گیا ہے، لیکن اس حقیقت سے درونِ خانہ سب ہی واقف ہیں کہ تم اس مہم میں ذاتی طور پر شریک تھے۔ اگر اسمگلنگ سے متعلق تمہیں کہیں سے خبر ملی تھی تو تمہیں معلومات ایس پی سے شیئر کرنی چاہئے تھیں لیکن تم نے اسے مکمل اندھیرے میں رکھا۔ اس کے بعد بھی اسے بہت سی باتوں کا علم نہیں ہونے دیا گیا۔ اپنے علاقے میں پولیس کا سب سے بڑا افسر ہونے کی حیثیت سے سب جاننا اس کا حق تھا لیکن جب اسے کچھ نہیں بتایا گیا تو اس نے سبکی محسوس کی۔

''اور اس سبکی پر انہیں اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اپنے رشتے کے بہنوئی وزیراعلیٰ صاحب کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔'' آئی جی کی بات سن کر وہ بے حد اطمینان سے بولا۔ اسے معلوم تھا کہ وزیراعلیٰ کی بیگم ایس پی کی کزن ہیں اس لیے وزیراعلیٰ صاحب اس کے خلاف زیادہ شور مچا رہے ہیں۔''

''بالکل۔ وہ ایسا کر سکتا تھا اس لیے اس نے ایسا ہی کیا یہاں سب ہی ایسا کرتے ہیں اگر تمہاری بیک پر ہم سب لوگ نہیں ہوتے تو کیا تم اتنی بے باکی سے کام کر سکتے تھے؟'' آئی جی صاحب کی یہ بات واقعی لاجواب کر دینے والی تھی۔ وہ فطرتاً مہم جو اور بہادر تھا۔ یہ الگ بات تھی لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ وہ بے خوف و خطر کوئی قدم اس لیے بھی آسانی سے اٹھا لیتا تھا کہ اسے مضبوط سپورٹ حاصل تھی۔

''تم ایس پی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط پوزیشن کے مالک ہو، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ایس پی کے پاس صرف ایک وزیراعلیٰ کا سہارا ہے جو سیاسی اُتار چڑھاؤ کا شکار ہو کر کمزور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن فی الحال اس کا بہنوئی اقتدار میں ہے اور وہ شخص گٹھ جوڑ کرنے میں کتنا ماہر ہے، تم نہیں جانتے۔ اس وقت بھی تمہارے خلاف ایک رپورٹ تیار ہو چکی ہے جس کے مطابق تمہاری بطور اسسٹنٹ کمشنر اس ضلع میں تعیناتی کے بعد یہاں کرائم ریٹ بڑھ گیا ہے۔ تمہارے تقرر کے بعد پیش آنے والے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بھی تمہارے ساتھ نتھی کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے کہ تم ہر معاملے میں بے جا مداخلت کرتے ہو اس لیے پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع نہیں ملتا، ورنہ پہلے حالات ان کے قابو میں تھے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ کرائم ریٹ بڑھا نہیں ہے بلکہ پہلے پولیس کے ڈر اور بے پروائی کی وجہ سے ہی واقعات کی رپورٹ درج نہیں ہوتی تھی، اب میری دخل اندازی کے باعث پولیس والے انہیں درج کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسری وجہ میرا برسرِ اقتدار لوگوں کی خواہشات کے خلاف کام کرنا بھی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے زیرنگیں افراد کو ہر سہولت سے محروم رکھ کر ان پر اپنا قبضہ جمائے رکھنا چاہتے ہیں، وہ میرے ترقیاتی منصوبے کو تباہ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔'' اس نے آئی جی صاحب کی بات کا جواب دیا۔

''یہ سب مجھے معلوم ہے بلکہ باقی لوگ بھی جانتے ہیں لیکن جب کسی پر کوئی الزام ثابت کرنا ہو تو اصل پس منظر اور وجوہات کو نظرانداز کر کے صرف اعداد و شمار کی بنیاد پر فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ تم ذرا احتیاط سے کام لو۔''



''مختار انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شہریار! یہ تمہاری پہلی پوسٹنگ ہے۔ تم ابھی سے اتنے اسکینڈلز کی زد پر آ گئے تو تمہارے کیریئر کا کیا بنے گا؟'' سجاد رانا نے بھی آئی جی کی حمایت کی۔

''اوکے۔ میں فی الحال پولیس کے کرنے والے کاموں سے الگ ہو جاتا ہوں۔ لیکن کیا اس کے بعد آپ یہ یقین دہانی کروا سکتے ہیں کہ سارے کام بالکل طریقے سے انجام دیئے جائیں گے؟ اللہ آباد والے معاملے میں کیا ہو رہا تھا؟ وہاں کون لوگ مقیم تھے؟ پولیس ان کی طرف سے اتنا عرصہ غافل کیوں رہی؟ ان سارے سوالات کے جواب ڈھونڈنے کے ساتھ اسمگلنگ کے کھیل میں اقبال باجوہ کے شریک ہونے اور اس مہم میں ڈاکوؤں کے سرگرم ہونے کے سلسلے میں قابل اطمینان تحقیقات کی جائیں گی؟'' اس نے گویا اپنے ہٹنے کی شرائط بیان کیں۔

''بالکل۔ نور پور دھامکے اور اللہ آباد کے مدرسے کا معاملہ تو ویسے بھی اب بہت اعلیٰ سطح پر دیکھا جائے گا۔ اس میں ہاتھ ملوث ہونے کا جو امکان تم نے بیان کیا ہے، ہم اس پوائنٹ کو خاص طور پر فوکس کریں گے۔ اقبال باجوہ کے سلسلے میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس بات کی تسلی تمہیں اس بات سے ہی ہو جانی چاہئے کہ اس کا نام ای سی ایل میں ڈلوا دیا گیا ہے۔ وہ اگر اس کیس سے بچ کر ملک سے باہر بھاگنے کی کوشش کرے گا تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ مگر اس کیس کو ظاہر ہے، تمہیں مقامی پولیس کے ذریعے ہی عدالت میں پیش کرنا ہو گا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ گرفتار شدہ بندہ سامنے لایا جائے۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی والا معاملہ البتہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ اس کے لیے بہت اچھی منصوبہ بندی، بھاری نفری اور زیادہ وسائل کی ضرورت ہے جن کا فوری طور پر انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ میں تم سے یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ یہ معاملہ میرے مستقبل کے منصوبوں میں شامل رہے گا اور میں اس سلسلے میں بھرپور کارروائی ضرور کراؤں گا۔'' آئی جی صاحب اسے یقین دہانی کروانے لگے۔

''اوکے..... میں راضی ہوں۔ مگر ان سب کاموں سے پہلے آپ کو ایک چھوٹا سا کام اور کرنا ہو گا۔ خودکش حملہ آور عبدالمتین کی فیملی ایس پی صاحب کے قبضے میں ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بے چارے لوگ بے قصور ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ایس پی صاحب سے ان کی رہائی کے لیے بات کریں۔'' اس نے اپنی رضامندی دینے کے ساتھ ایک اور شرط بیان کی تو آئی جی صاحب چونک پڑے اور سجاد رانا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''بھئی سجاد! پچھلے سترہ سال سے میری دامادی میں ہونے کے باوجود تم نے کبھی اتنی شرائط پیش نہیں کیں، جبکہ تمہارے ان بھائی صاحب نے اس چھوٹی سی ملاقات میں پیش کر دی ہیں۔''

''پلیز انکل! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھابی سے آپ کے رشتے کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ میرا اصولی مؤقف ہے۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا، میں تب بھی یہی سب کہتا اور منواتا۔ اگر کہنے اور منوانے کی ہمت نہیں رکھتا تو استعفیٰ دے کر اپنی جاب سے الگ ہو جاتا۔'' سجاد رانا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے صفائی دیتے ہوئے اپنا مؤقف واضح کیا۔

''میں سمجھتا ہوں برخوردار! میں نے اتنے سال کی سروس میں بھاڑ نہیں جھونکی ہے کہ بندے کو نہ پہچان سکوں۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم محتاط رہو۔ باقی معاملات پر ہم نظر رکھیں گے۔ عبدالمتین کی فیملی کے بارے میں ایس پی سے معلوم کر لیا جائے گا لیکن فوری رہائی شاید ممکن نہ ہو۔ عبدالمتین سے تعلق کی وجہ سے وہ بہرحال مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل ہیں جنہیں اچھی طرح کھنگالنے کے بعد ہی رہا کیا جا سکے گا۔'' انہوں نے بہت سادگی سے شہریار کی بات کا جواب دیا تو وہ مزید اصرار نہیں کر سکا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ صرف اس کے ان

لوگوں کو بے قصور قرار دے دینے پر پولیس انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا اپنا طریقہ
جس پر بہر حال انہیں عمل کرنا تھا۔

''میں آپ کی اس مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ فی الحال ان باتوں کو جانے دیتے ہیں۔ کھانا لگ چکا ہے
چل کر کھانا کھاتے ہیں۔'' گفتگو میں انہیں وقت کے گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ وہ مہمان داری
تقاضے نبھاتا ہوا انہیں بااصرار اپنے ساتھ ڈائننگ روم میں لے گیا۔

⊛----✪----⊛

''کتنا افسوس ناک حادثہ ہوا ہے نا آفتاب! سچ میں نے سنا تو کانپ کر رہ گئی۔ پہلے کبھی کراچی اور
سے اس طرح کی خبریں سننے میں آتی تھیں، پر اب تو ہمارا چھوٹا سا ضلع بھی محفوظ نہیں رہا۔ نور پور تو پیر آباد
مقابلے میں بہت چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں کے سیدھے سادے لوگوں نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا تھا کہ
خوشیوں کو یوں برباد کر کے انہیں موت کا تحفہ دے دیا گیا۔ میرا دل بہت اُداس ہے ان لوگوں کے لئے۔''
تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت تک حویلی کی چہل پہل ماند پڑ جاتی تھی۔ زنان خانے میں تو تقریباً
ہی سرگرمیاں دم توڑ دیتی تھیں اور سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے تھے۔ کشور کے لیے
سے بات کرنے کا سب سے مناسب وقت ہوتا تھا۔ آفتاب کا دیا ہوا موبائل اس نے بہت حفاظت سے
کر رکھا ہوا تھا اور صرف اسی وقت اس سے بات کرنے کے لیے نکالتی تھی۔ ٹیچرز کے لیے علیحدہ گھر مخصوص
دیئے جانے کے باعث آفتاب کو بھی اس سے بات کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ انہیں جو گھر الاٹ
گیا تھا، اس میں تین کمرے تھے۔ دو کمروں کو اس کے ساتھی ٹیچر رزمل کرشیئر کرتے تھے جبکہ تیسرا نسبتاً چھوٹا
الگ کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس کی حیثیت اب اسکول کے پرنسپل کی سی تھی، دوسرے
کے لکھنے پڑھنے اور رات گئے تک کام کرنے کی عادت کے پیش نظر بھی دوسرے اساتذہ نے فراخ دلی کا
دیتے ہوئے اس کے لیے الگ کمرے کو ضروری قرار دیا تھا۔ اس طرح اسے نہ صرف اپنا کام زیادہ ارتکاز
کرنے کا موقع مل جاتا تھا بلکہ کشور سے گفتگو کا سلسلہ بھی کسی کے علم میں آنے سے بچا ہوا تھا۔

تقریباً روزانہ ہی ہونے والی اس گفتگو میں وہ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ آفتاب کی
قابلیت اور لیاقت تو تھی ہی مسلمہ لیکن وہ خود بھی کشور کی شائستگی، وسیع مطالعے اور ہمدرد طبیعت سے واقف ہوتا
رہا تھا۔ پہلے اگر وہ اپنے جذبے کی شدت کی وجہ سے اس سے اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہوئی تھی تو اب اس
خوش اطواری کے باعث اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ اپنے مصروف شیڈول میں سے اس کے لیے روزانہ وقت
نکالنا اسے ہرگز بھی ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے اپنے دل کی آواز تھی
وہ خود تو اپنی طبیعت کی وجہ سے نور پور نہیں جا سکا تھا لیکن وہاں جانے والے اس کے ساتھی ٹیچر نے جو کچھ
تھا، اس کو سن لینا ہی ایک حساس دل کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ کشور کی بات کے جواب میں وہ خود بھی دُکھی
میں بولا۔

''واقعی درست کہا آپ نے۔ بہت افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے نور پور میں۔ ایسے حادثات جہاں
پیش آئیں، قابل مذمت ہوتے ہیں۔ کیونکہ زد میں آنے والے چاہے کراچی اور لاہور جیسے بڑے بڑے شہروں
کے باشندے ہوں یا نور پور جیسے چھوٹے سے گاؤں کے، ہوتے بہر حال بے گناہ ہیں۔ البتہ نور پور کے حساب
سے یہ واقعہ اس اعتبار سے زیادہ افسوس ناک ہے کہ اتنے برسوں میں پہلی بار وہاں کسی کو کچھ ترقیاتی منصوبہ



کرنے کا خیال آیا تھا لیکن اس دہشت گردی کے بعد یقیناً وہ منصوبے پینڈنگ میں چلے گئے ہوں گے۔
اے سی صاحب کا بھی خیال آ رہا ہے کہ انہوں نے کتنی بھاگ دوڑ اور محنت کی تھی اس سلسلے میں۔ وہ ساری
محنت رائیگاں گئی۔''

''ارے ہاں، اے سی صاحب کے حکم پر یاد آیا، کل ٹی وی پر ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کی جا
رہی تھیں۔'' کروٹ بدلتے ہوئے اس نے موبائل کو دائیں سے بائیں کان پر لگایا اور بولی۔

''کیسی باتیں؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''کوئی پرائیویٹ چینل تھا، جہاں سے دھماکے کے متعلق رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا گیا
کہ اس اہم موقع پر ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر صاحب پراسرار طور پر منظر سے غائب رہے۔ کافی تنقید کی جا رہی
ہے اے سی صاحب پر کہ انہوں نے اس اہم موقع پر قطعی غیر ذمے داری کا ثبوت دیا اور موقع پر زخمیوں کی مزاج
پرسی کے لیے ہسپتال تک نہیں پہنچے۔'' اس نے ٹی وی پر پیش کی جانے والی رپورٹ کے الفاظ اختصار کے ساتھ
بتائے۔ ایک پرائیویٹ چینل سے نشر ہونے والی اس رپورٹ کو وہ چودھری افتخار کی خصوصی اجازت پر دیکھ سکی
تھی۔ حویلی میں ڈش ریسیونگ سسٹم موجود تھا لیکن اس سے استفادہ صرف چودھری ہی کر سکتا تھا۔ حویلی میں
پاکستان ٹی وی سیٹس پی ٹی وی کی نشریات دیکھنے کے لیے ہی کارآمد تھے۔ ایسا حویلی کی خواتین کو زمانے کی
ہوا سے بچائے رکھنے کے لیے کیا گیا تھا۔ جو زمانے کو بگاڑنے میں مصروف ہے، انہیں کھلی آزادی تھی۔
حویلی پر تو حسبِ معمول دھماکے سے متعلق بہت نپی تلی اور مختصر خبریں ہی دی گئی تھیں اس لیے اس نے
اماں سے اجازت لے کر ایک پرائیویٹ چینل سے خبریں دیکھی اور سنی تھیں۔

''اس بارے میں مجھے بھی علم ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ شہریار صاحب ایک بہت ذمے دار آدمی ہیں۔
اور اس کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے ہوں گے۔ یقیناً انہیں کوئی بہت ہی زیادہ اہم کام درپیش ہوگا اس
وقت پر ہسپتال نہیں پہنچ سکے ہوں گے۔ آپ پرائیویٹ چینلز پر پیش کی جانے والی خبروں پر بہت زیادہ
اعتماد مت کیا کیجئے۔ پی ٹی وی پر اگر سچ کو چھپایا جاتا ہے تو پرائیویٹ چینلز پر سچ کے ساتھ اتنا مرچ مسالا لگا کر
پیش کی جاتی ہیں کہ اصل حقائق ہی مسخ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ شور بہت مچاتے ہیں کہ ہم میڈیا کے ذریعے
سچ کو سامنے لا رہے ہیں اور عوام کی خدمت کر رہے ہیں لیکن وہاں بھی کچھ الگ کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ جو
سنسنی خیز چٹ پٹی اور سنسنی خیز خبریں نشر کرے گا، اسے اتنے ہی زیادہ ویورز میسر آئیں گے اور زیادہ ویورز کا
مطلب ہے اشتہارات۔ یعنی جتنا ہنگامہ اور بھاگ دوڑ ہے، اس کے پیچھے پیسے کی ہوس زیادہ کارفرما ہے۔''
اس کی ساری بات سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''غلطی ہو گئی بابا! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اے سی صاحب آپ کی فیورٹ پرسنالٹی ہیں اور آپ ان کے
بارے میں کچھ نہیں سن سکتے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''فیورٹ پرسنالٹی کوئی یوں ہی نہیں بن جاتا۔ میں نے شہریار صاحب کی راست بازی اور کچھ کر دکھانے
کی لگن دیکھی ہے، اس لیے انہیں پسند کرتا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سوری جناب آفتاب احمد صاحب! آئندہ میں آپ کے اے سی صاحب کی شان میں کوئی گستاخی کرنے
کی جرأت نہیں کروں گی۔'' وہ اسے چھیڑنے والے انداز میں بولی مگر پھر باہر سے سنائی دینے والی ایک آہٹ
سے ٹھٹکا دیا۔

''میں بعد میں آپ سے بات کرتی ہوں۔'' سرگوشی میں یہ جملہ بول کر اس نے جلدی سے موبائل آف کر

کے اپنے تکیے کے نیچے چھپایا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے کی چٹخنی گرا کر دروازہ کھولا بعد اس نے باہر جھانکا۔ نیم تاریک برآمدہ خالی پڑا تھا لیکن آخری سرے پر تیزی سے غائب ہوتے کسی کے ہیولے کی جھلک اسے نظر آ گئی۔ وہ عورت کون تھی، ناکافی روشنی کے باعث وہ شناخت نہیں کر سکی لیکن یہ دھڑکا ضرور لگ گیا تھا کہ کسی نے اس کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی یہ اس کا واہمہ بھی ہو سکتا تھا اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ کوئی ملازمہ یونہی برآمدے سے گزر کر کسی کام ہو لیکن پھر بھی یہ اندیشہ تو اپنی جگہ تھا کہ کسی نے اس کی موبائل پر آفتاب سے ہونے والی گفتگو نہ سن لی ہو۔

⊛----✪----⊛

''میری جان اچھی مصیبت میں آئی ہوئی ہے۔ حصہ سب کا ہے مال میں لیکن پکڑا میں اکیلا ہی جاؤں فاریسٹ آفیسر جو ہوا۔'' اقبال باجوہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب سے اسمگل شدہ لکڑی اور کھالیں گئی تھیں، اس کا برا حال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بطور فاریسٹ آفیسر اس پر ذمے داری عائد ہوتی ہے اور جلد اس سے اس سلسلے میں سوال کیا جائے گا۔ اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ فرار ہو جائے لیکن ایس پی نے اس ارادے پر عمل کرنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معاملات کو کتنا ہی چھپایا جاتا لیکن وہ جس میں تھا، اسے کچھ نہ کچھ خبریں تو مل ہی جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ اقبال باجوہ کی خفیہ طور پر نگرانی رہی ہے اور اگر اس نے فرار کی کوشش کی تو پکڑا جائے گا۔ اس طرح اس کی ذات مزید مشکوک قرار دی تھی۔ اب ایس پی کے ذریعے ہی انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ کیس عدالت میں پیش کیا جانے والا ہے اور عدالت میں پیش کرنے سے پہلے کسی اہم شخص کی گرفتاری کا امکان ہے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ اہم شخص باجوہ ہی ہوگا۔ اس لیے وہ اپنی پریشانی سے گھبرا کر چودھری افتخار کی حویلی میں آ گیا تھا اور شکوے کر رہا تھا۔

''کیوں فکر کر رہے ہیں باجوہ صاحب؟ ہم آپ کو کلا (اکیلا) تھوڑی چھوڑیں گے؟ اگر وہ گرفتاری ہیں تو ڈال لینے دیں۔ ہم نے پکا بندوبست کر رکھا ہے کہ وہ کسی طرح آپ پر الزام کو ثابت نہیں کر سکیں جس روز پولیس نے مال پکڑا تھا، اس روز کے ۔ ارڑ نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی کسی اور جگہ کے گواہ تیار کر لیں۔ آپ نے یہ کام کر لیا کہ نہیں؟''

''وہ تو میں نے انتظام کر لیا ہے۔ میرے دو دوست گواہی دینے کے لیے تیار ہیں کہ نہ صرف اس رات اس سے پہلے کے دو دن بھی میں ان کے ساتھ جہلم میں تھا۔'' چودھری کی بات کے جواب میں اس نے فوراً

''بس تو فیر کیا مسئلہ ہے؟ آپ صاف بول سکتے ہو کہ کسی نے میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر حرکت کر ڈالی۔ اگر میں موجود ہوتا تو لکڑی اور کھالیں تو ایک طرف، جنگل سے ایک تنکا یا بال بھی اِدھر سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

''مگر وہ جو کم بخت گرفتار ہوا ہے وہ میرے گلے میں اٹکا ہوا ہے۔ وہ تو تھا ہی میرا بندہ۔ اسے اچھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے میری مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ اتنے دنوں سے پولیس کی تحویل میں ہے، اب پولیس والوں نے اسے مار مار کر اس سے سب کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ اس کا بیان مجھے پھنسوا سکتا ہے۔'' تشویش اپنی جگہ تھی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس کا بندوبست تارڑ صاحب خود کر لیں گے۔ آپ ہمارے مخالفین کھیلنے کا موقع دے دیں، فیر دیکھئے گا کہ ہم کیسے آپ کو مکھن میں سے بال کی طرح اس کیس سے نکا



ہیں۔ ساری محنت مٹی میں نہ مل گئی اُس اے سی اور اس کے پٹھوؤں کی تو میرا نام بدل کر رکھ دیجئے گا۔'' چودھری نے اسے اطمینان دلایا۔

''اس اے سی کی وجہ سے تو میں پریشان ہوں۔ بڑی پہنچ والا بندہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ کیسے اس کے اشارے پر میرا نام ای سی ایل میں ڈال دیا گیا۔ یعنی میں چاہوں تو یہاں سے بچ کر ملک سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ اپنے طور پر تو میں نے انتظام کر لیا تھا کہ اگر کسی طرح مجھے مجرم ثابت کر دیا گیا تو میں ملک سے باہر نکل جاؤں گا مگر اس نے یہ راستہ بھی بند کر دیا۔''

''چھوڑیں بھی باجوہ صاحب ان فکروں کو۔ آپ دیکھئے گا کہ اس بات کی نوبت ہی نہیں آنے پائے گی کہ آپ کو کہیں نکلنے کا سوچنا پڑے۔ آپ یوں بچ نکلیں گے اس کیس سے اور اپنی جگہ پر کام کرتے رہیں گے۔'' چودھری نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے تسلی دی اور پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''چلئے چل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر شطرنج کھیلیں گے تاکہ آپ کا ذہن بٹ جائے۔'' اس کا یہ حد سے زیادہ اطمینان اقبال باجوہ کے لیے بھی تسلی کا باعث تھا۔ چودھری کے اتنے مطمئن ہونے کا مطلب تھا کہ واقعی اسے بچانے کے لیے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ پھنستا تو چودھری اور ایس پی بھی پھنس جاتے۔ وہ تینوں ایک ایسی کشتی میں سوار تھے کہ اگر کوئی ڈوبتا تو باقی دو افراد کو بھی ساتھ ہی لے کر ڈوبتا۔

''اس کیس سے نمٹ لیں تو پھر اس بات کی بھی چھان بین کرنی ہوگی کہ مال پکڑا کس کی مخبری پر گیا؟ پہلے تو چلو موتی والا کی وجہ سے خبر لیک آؤٹ ہو گئی تھی لیکن اب کس نے یہ مخبری کی؟ ہماری تمام تر پلاننگ کے باوجود جس طرح اے سی شہریار نے ڈی ایس پی کے ساتھ مل کر کارروائی کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس بالکل پکی خبر تھی کہ مال کب لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم نے اسے ڈاکوؤں والے معاملے میں الجھا لیا ہے لیکن حالات سے تو یہی ظاہر ہوا کہ وہ ہماری چال میں آیا ہی نہیں تھا اور ایسا اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس بالکل سالڈ انفارمیشن موجود ہو۔ ہمیں اس انفارمر کو ڈھونڈنا ہوگا ورنہ آگے بھی ہمیں مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' وسیع ڈائننگ ٹیبل پر سجے ڈھیروں لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اقبال باجوہ نے دوسرا اہم مسئلہ اٹھایا۔

''اس پر تو پہلے ہی کام شروع ہو گیا ہے۔'' مرغی کی ٹانگ بھنبھوڑتے ہوئے چودھری نے جواب دیا۔ ''میں نے بالے کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ آج کل وہ فارغ ہی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ ان بندوں پر نظر رکھو جو درختوں کی کٹائی اور لوڈنگ وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ جانوروں کا شکار کر کے ان کی کھالیں اتارنے اور محفوظ کرنے والوں پر تو ایسا کوئی شک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ تو سارا وقت جنگل میں ہی گزارتے ہیں۔ ان کا باہر کے کسی بندے سے رابطہ ہی نہیں رہتا کہ وہ ایسی کوئی ساز باز کر سکیں۔ بالا میرے حکم پر اس کام پر لگ گیا ہے۔ وہ ڈھونڈ نکالے گا اس نمک حرام کو۔ فیر اس کا جو حشر ہوگا۔ اس کو دیکھنے کے بعد کسی کی ہمت نہیں پڑے گی کہ ایسی نمک حرامی کا سوچ بھی سکے۔'' غصے کے باعث اس کا چہرہ بگڑ سا گیا تھا اور اس کی طرف دیکھنے پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جنگلی کتا اپنے ہاتھ آئے شکار کو بھنبھوڑ رہا ہو۔ اس کا ساتھی ہونے کے باوجود اس کے اس انداز پر اقبال باجوہ کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ وہ دانستہ موضوع بدل کر اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ لوگ دوبارہ بیٹھک میں واپس آ گئے اور شطرنج کی بازی جمالی۔ شطرنج کھیلتے ہوئے ان دونوں کا وقت خوش گوار ماحول میں بہت تیزی سے گزرا۔ اقبال باجوہ جب حویلی سے روانہ ہوا تو بہت مطمئن تھا۔ اطمینان کے باعث وہ بہت خوش گوار موڈ میں گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا جنگل کے قریب ہی واقع اپنے بنگلے تک

پہنچا۔ وہاں پہنچے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ملازم نے اسے پولیس کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر اسے اپنے اعصاب میں کشیدگی سی محسوس ہوئی مگر پھر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں آیا۔ یہاں پولیس کا ایک آفیسر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور دو سپاہی اس کے پیچھے کھڑے تھے۔

''مجھے ڈی ایس پی منظور کہتے ہیں۔ میں جنگل سے ہونے والی لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کے کیس پر کام کر رہا ہوں۔'' اس کے لاؤنج میں پہنچنے پر پولیس آفیسر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے تعارف کروایا۔

''اوہ، آپ..... میں تو بہت دنوں سے منتظر تھا کہ آپ میرے پاس تشریف لائیں لیکن نہ جانے کیوں آپ نے اس کیس پر کام کرتے ہوئے مجھ سے ملاقات کرنا پسند نہیں کی۔ میں نے اپنے طور پر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے آپ کے محکمے کو ایک خط بھیج دیا تھا کہ اس افسوس ناک واقعے کے وقت اگرچہ میں یہاں موجود نہیں تھا لیکن بہ طور فاریسٹ آفیسر اور محبِ وطن شہری میں اس جرم کی شدید مذمت کرتا ہوں اور اگر پولیس کو اس کیس کی تحقیقات کے لیے کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' نہایت معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ڈی ایس پی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے والی نشست سنبھال لی۔

''آپ کا خط مجھے مل گیا تھا مگر درمیان میں نور پور میں دھماکے والا واقعہ پیش آ گیا اور ہمیں اس طرف مصروف ہونا پڑا۔ اس لیے وقتی طور پر اسمگلنگ کیس پر کام رک گیا تھا۔ اب وہ کیس ایجنسیز کے پاس چلا گیا ہے اس لیے ہم نے رُکا ہوا کام دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے خدمت لینے نہیں بلکہ آپ کی خدمت کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اسی لیے میں یہ دعوت نامہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' معنی خیز لہجے میں بولتے ہوئے ڈی ایس پی نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ فوراً ہی اس کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں۔ وہ اس کی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقبال باجوہ نے کاغذ اپنے ہاتھ سے پھینکا تو وہ ڈی ایس پی کے قدموں میں آ گرا۔

''یہ بکواس نہیں، آپ کا اریسٹ وارنٹ ہے۔ جنگل سے ہونے والی اسمگلنگ میں آپ کا نام شریکِ جرم کے طور پر سامنے آیا ہے۔ گرفتار شدہ ملزم کے بیان کی روشنی میں یہ اریسٹ وارنٹ جاری کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے میں آپ کو گرفتار کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہوں۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عزت کے ساتھ خود چل کر گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں یا میرے ساتھ موجود سپاہیوں کو زبردستی کرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر آپ کو زبردستی لے جانا پڑتا ہے۔'' اس نے جھک کر اپنے قدموں میں آ گرنے والے وارنٹ کو اٹھایا اور بے حد ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

اس کے الفاظ اقبال باجوہ کو اشتعال میں مبتلا کر رہے تھے لیکن پھر اسے کچھ دیر قبل دیا ہوا چودھری کا مشورہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس گرفتاری ڈالے تو گرفتاری دے دینا۔ تمہیں بچانے کا انتظام پورا ہے۔ اس بات کے یاد آتے ہی وہ قدرے پُرسکون ہو گیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں خود چلنے پر راضی ہوں۔ لیکن یاد رکھنا کہ جلد پولیس کو اپنے اس رویّے کے لیے مجھ سے معافی مانگنی پڑے گی۔''

''یہ تو وقت خود بتا دے گا کہ کس کو کیا کرنا پڑے گا؟ ابھی تو مجھے اس پر عمل کرنا ہے جو اس وارنٹ میں لکھا ہے۔'' ڈی ایس پی منظور نے جواب دیا تو اقبال باجوہ منہ بناتے ہوئے اس کے ساتھ جانے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے اس تعاون کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئیں مگر پولیس کے



گنا انداز میں اس کے دائیں بائیں ضرور آ کر کھڑے ہو گئے۔ تین صاحبِ اختیار اور بظاہر عزت دار نظر والے مجرموں کی تکون میں سے ایک فرد کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لے جایا جا رہا تھا، یہ کوئی معمولی بات تھا۔

❀----✪----❀

ای گڑبڑ ہو گئی ہے سر! آپ کی دی ہوئی انفارمیشن پر میں پولیس پارٹی کے ساتھ جنگل میں گیا تھا۔ جس کی آپ نے نشان دہی کی تھی، وہ تو مل گئی ہے لیکن وہاں سے کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ نہ تو وہاں کوئی بندہ تھا ایسا کوئی سامان جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہاں شکار کیے ہوئے جانوروں کی کھالیں اُتار کر انہیں کسی سے گزارا جاتا تھا۔ بس صرف ایسے آثار ملے ہیں جن سے پتہ چل رہا ہے کہ وہاں کچھ لوگ رہتے تھے۔ کی بُو بھی موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ واقعی وہاں کوئی کام کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ ثبوت ناکافی ہوں گے۔ اگر ہم کسی بندے کو گرفتار کرنے اور کچھ سامان پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمارا کیس ہو سکتا تھا۔ اب تو بس لوڈر کے ڈرائیور خدا بخش کے بیان پر ہی پورے کیس کا انحصار ہے اور وہ بھی خیال میں اس لیے زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوگا کہ اقبال باجوہ کے بیان کے مطابق وہ تو اس عرصے میں سے لکڑی اور کھالیں اسمگل کی گئیں، یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اس نے جہلم میں رہنے والے اپنے دو کے نام پتے بھی ہمیں لکھوا دیئے ہیں کہ جاؤ اور جا کر ان سے تصدیق کر لو۔'' اس نے آئی جی مختار مراد کو کر لیا تھا کہ وہ پولیس کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرے گا لیکن یہ کیس تو شروع سے اسی سے چل رہا تھا۔ انور کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ اسے پولیس کے سامنے لانے کا رِسک نہیں لے سکتا تھا۔ لیے ظاہری طور پر نہ سہی لیکن پس پردہ رہ کر پولیس کی مدد کرنا اس کی مجبوری تھی۔ مال پکڑے جانے کے بعد نے انور کی یہ ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ کسی طرح کھوج لگائے کہ جانوروں کی کھالوں کو محفوظ کرنے کا کام کیا جا رہا ہے؟ انور کو اس کام میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ اس دوران آئی جی صاحب کے حکم پر اُنہیں مجبوراً عدالت میں لے جانا پڑا تھا اور کل اس کیس کی پہلی پیشی ہونے والی تھی کیونکہ گرفتار ملزم نے اقبال باجوہ کا تھا اس لیے اسے بھی عدالت سے وارنٹ لے کر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ انور کی طرف سے کام کی اطلاع باجوہ گرفتاری کے بعد ہی ملی تھی۔ اور اس اطلاع پر پولیس متحرک بھی ہو گئی تھی۔

''اطلاع ملنے اور پولیس کے حرکت میں آنے کے درمیان صرف ایک رات کا وقفہ آیا تھا، وہ بھی اس کی وجہ کہ گھنے جنگل میں رات کی تاریکی میں مناسب تیاری کے بغیر داخل ہونا خود پولیس پارٹی کے لیے وہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقفے نے پولیس کو ناکامی کا منہ دکھا دیا تھا۔

''میرے خیال میں باجوہ کی گرفتاری کے بعد ان لوگوں نے احتیاطاً اپنا سیٹ اپ ختم کر دیا ہوگا۔ انہیں ڈر کہیں پولیس اس سے کوئی ایسا اعتراف کروانے میں کامیاب نہ ہو جائے جس کے بعد اس طرف چڑھائی ہے۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر سب کچھ غائب کر دیا۔'' اس نے ڈی ایس پی منظور کی پوری بات کے بعد خیال ظاہر کیا۔

''مگر اتنی اچانک؟..... اقبال باجوہ گرفتار ہوگا، اس بات کا تو انہیں پہلے ہی اندازہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے کھل جانے کا انہیں اندیشہ تھا تو یہ ساری کارروائی پہلے ہی ہو جانی چاہئے تھی جبکہ آپ کے انفارمر کی سے ظاہر ہے کہ کل تک سب کچھ موجود تھا پھر اتنی تیزی سے انہوں نے جگہ کیوں خالی کر دی؟ ہم باجوہ

سے کچھ اُگلوانے میں کامیاب ہوتے بھی اس وقت جب عدالت سے اس کا جسمانی ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ یعنی مجرموں کے پاس اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے کافی وقت تھا جبکہ انہوں نے جس طرح رات کارروائی کی ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ کسی طرح پولیس کی ریڈ سے واقف تھے۔'' ڈی ایس پی نے ایک تکنیکی نقطہ پیش کیا تھا جس پر وہ سوچ میں پڑ گیا اور جو پہلی بات ذہن میں آئی یہی تھی کہ کہیں انور تو کسی کے ہتھے نہیں چڑھ گیا؟

''آپ ویٹ کریں۔ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو کال کرتا ہوں۔'' اس نے فوراً ڈی ایس پی کی کال بند کی اور اپنے موبائل سے انور کے موبائل کا نمبر ملانے لگا۔ انور کو موبائل اسی نے فراہم کیا تھا۔ اسے استعمال کا طریقہ بھی سکھا دیا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ موبائل کو بہت احتیاط سے نظروں سے چھپا کر رکھے۔ انور موبائل کو سیاہ ڈوری میں باندھ کر اپنے گلے میں ڈالے رکھتا تھا۔ دیکھنے والا اس کے گلے میں پڑی سیاہ ڈوری ہی نظر آتی تھی۔ چھوٹا سا موبائل سیٹ اس کے گریبان سے گزرنے والی سے لٹکا قمیض کے نیچے اس کے سینے سے لگا رہتا تھا۔ موبائل پر آنے والی کال کا احساس اُسے اس قرعہ سے ہوتا تھا جو موبائل کے وائبریٹ کرنے پر اُسے اپنے سینے پر محسوس ہوتی تھی۔ اگر وہ محفوظ پوزیشن میں ہوتا تو کال وصول کر لیتا۔ ورنہ اَن جان بن جاتا۔ دیکھنے والے اندازہ ہی نہیں کر پاتے تھے کہ وہ جس ڈوری میں تعویذ وغیرہ باندھ کر گریبان کے اندر چھپائے رکھتے ہیں، انور اس ڈوری سے ایک موبائل سیٹ لٹکا کر گھومتا اور چودھری کے خلاف مخبری کا کام کرتا۔ لیکن اب جس طرح مسلسل کال کرنے کے باوجود اس کا موبائل خاموش تھا، اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا یہ راز کسی کے علم میں آ گیا ہے۔ راز سے واقف ہونے والا چودھری کا کوئی بندہ تھا تو یہ امر یقینی تھا کہ اب انور، چودھری کی گرفت میں ہوگا۔ شاید وہ اسے انفارمر کے بعد فوراً ہی گرفت میں آ گیا تھا۔ اسے پکڑنے کے بعد وہ یہ جان لینے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے کہ کتنے وہاں ریڈ کرنے والی ہے، چنانچہ رات بھر میں وہ جگہ خالی کر دی گئی۔

متعدد بار کال ملانے کے بعد بھی جب مایوسی کا ہی سامنا ہوا تو اس نے تھک ہار کر موبائل رکھ دیا۔ اس بار پھر ڈی ایس پی منظور کا نمبر ملایا۔

''آپ کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے ڈی ایس پی صاحب! میرا اپنے انفارمر سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ پکڑا گیا ہے۔'' اُس نے رابطہ اپنوں سے

''یہ اچھا نہیں ہوا سر! ملزمان کی پوزیشن مسلسل مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے باجوہ کے جہلم میں دوستوں کے ساتھ تین دن گزارنے والے بیان کی تحقیق کے لیے جو بندے لگائے تھے، انہوں نے رپورٹ دے دی ہے۔ یہاں سے جہلم کے راستے میں آنے والی متعدد چیک پوسٹس پر باجوہ کی گاڑی کے ایک کا ریکارڈ ملا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ واقعی جہلم گیا تھا اور ہم عدالت میں اس کے لیے گواہی دینے والے اس کے دوستوں کے بیان کو چیلنج نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے اپنے طور پر وہ شخصی گواہیاں جمع کر لی ہیں۔ باجوہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ وہ ہرگز بھی جہلم نہیں گیا تھا اور یہیں اپنے بنگلے میں موجود تھا۔ گواہ کے بنگلے کے دو ملازمین تھے۔ لیکن اب ان کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ یہی کہا جائے گا کہ پولیس نے ملازمین کو ڈرا دھمکا کر ان سے بیان لیا ہے۔ وہ ملازمین کی گواہی کے مقابلے میں باجوہ کے دوستوں کا بیان اور چیک پوسٹس ملنے والا ریکارڈ زیادہ مضبوط ثبوت ہیں۔ ہمیں ان ثبوتوں کے سامنے ہار ماننی پڑے گی۔'' ڈی ایس پی کے لہجے میں کافی مایوسی تھی۔ اس کیس پر کام کرتے ہوئے وہ جتنا پُرجوش تھا، اب مسلسل ناکامیوں پر اتنا



مایوس تھا۔ وہ عرصے سے پولیس میں تھا اور جانتا تھا کہ ایسے ثبوت کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ باجوہ کی پشت پر ڈی ایس پی صاحب کر رہے تھے اس لیے اس کے لیے ایسے ثبوت حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

''آپ اتنے مایوس نہ ہوں۔ ہمارے پاس خدا بخش کی صورت میں ایک اہم گواہ تو موجود ہے۔ اس کے بیان سے عدالت ضرور متاثر ہوگی۔ پھر باجوہ کو اس بات کا بھی جواب دینا پڑے گا کہ جنگل میں موجود کھوہ کس کے استعمال میں تھی اور وہ کیوں اس سے لاعلم رہا؟ میں کم از کم اس شخص کو معطل تو ضرور ہی کروا کر رہوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور کل کی عدالتی کارروائی کے لیے تیار رہیں۔'' حالات واقعی اس کے مخالف تھے لیکن وہ ہار ہو کر ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ اس لیے ڈی ایس پی کو سمجھانے لگا۔ اس وقت وہی تھا جو اس کے لیے عملی طور پر کام کر رہا تھا۔ اس لیے اس کا حوصلہ بلند رہنا بہت ضروری تھا۔

⊛----✪----⊛

''میں نے کچھ نہیں کیا جی۔ مجھے تو کچھ ملوم (معلوم) ہی نہیں۔ میں تو اس روز سویرے اپنے پنڈ سے گدھا گاڑی پر سبزی لے کر نکلا تھا کہ پاس کے شہر میں کسی آڑھتی کو بیچ دوں گا۔ پُلس (پولیس) نے مجھ گریب (غریب) کو اچانک گھیر لیا۔ فیر مجھے اپنے ساتھ جانے کدھر لے گئے۔ میں اتنے دنوں سے ان کی قید میں تھا۔ پُلس والوں نے مجھے بہت مارا پیٹا اور کہنے لگے کہ بیان دے دو کہ تم اس لوڈر کے ڈریور (ڈرائیور) ہو جس پر پُلس سے لکڑی اور کھالیں اِدھر سے اُدھر کی جا رہی تھیں۔ شروع شروع میں، میں نے اُن کی گل ماننے سے انکار کر دیا۔ پر پُلس کی مار کے آگے میں گریب آدمی کب تک ٹھہرتا؟ میں راضی ہو گیا کہ جو تم لوگ کہتے ہو میں مان لیتا ہوں۔ مجھ چٹے اَن پڑھ آدمی سے انہوں نے کاگذ (کاغذ) پر انگوٹھا لگوا لیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں سرکار! میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' لوڈر ڈرائیور جس کی گواہی پر اب اس کیس کا انحصار تھا، عدالت میں بیان دیتے ہوئے قطعی بدل گیا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت کے سامنے سچ بولنے پر راضی تھا مگر اب اُس کے اس بدلے ہوئے بیان نے صورتِ حال بالکل بدل کر رکھ دی تھی۔ اس بیان نے کمرۂ عدالت میں سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ ڈی ایس پی منظور بے بسی کے عالم میں کٹہرے میں میسنی سی شکل بنا کر کھڑے لوڈر کے ڈرائیور کو گھور رہا تھا۔ عدالت میں پیش ہونے کے بعد بیان بدل لینا اکثر مجرموں کا وتیرہ ہوتا ہے لیکن اس شخص کے بیان بدل لینے کا مطلب تھا، کیس کا بے حد کمزور ہو جانا۔

''گواہ نے اپنا بیان بدل لیا ہے جناب! ورنہ سچ یہ ہے کہ پولیس نے اسمگلنگ کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے جن دو لوڈرز کو پکڑا، ان میں سے ایک لوڈر میں یہ سوار تھا اور اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس کے خلاف باقاعدہ مسلح مزاحمت کی تھی۔ ملزم کے قبضے سے ملنے والے ہتھیار پر اور لوڈر کے اندر سے جا بجا اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں اور یہ نشانات پولیس ریکارڈ میں موجود ہیں۔ چنانچہ میں فاضل عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ اس شخص کو مزید ایک ہفتے کے ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں دے دیا جائے تاکہ اس سے حقیقت اُگلوائی جا سکے۔'' اس موقع پر سرکاری وکیل نے مداخلت کرتے ہوئے درخواست کی۔

''یہ ظلم ہے سرکار! پُلس والوں نے زبردستی مجھے ہتھیار پکڑایا تھا اور لوڈر میں بھی یہ خود مجھے لے گئے تھے۔ آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں گے تو یہ مجھ پر اور ظلم کریں گے۔'' لوڈر ڈرائیور چیخا۔

''عدالت ملزم کو چار دن کے ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں دیتی۔ سرکاری وکیل کے پاس اگر مزید کوئی گواہ ہے تو اسے عدالت کے سامنے پیش کرے۔'' اس شخص کے واویلے پر کان دھرے بغیر جج نے اپنا فیصلہ سنایا اور

PAKISTANIPOINT

سرکاری وکیل کو حکم دیا۔

''شکریہ یور آنر! مجھے مزید کوئی گواہ پیش نہیں کرنا۔ وکیلِ صفائی اپنے گواہان کو پیش کر سکتے ہیں۔'' سرکاری وکیل پیچھے ہٹ گیا۔ ملزمان کے کٹہرے میں کھڑے اقبال باجوہ نے اس صورتِ حال کو انجوائے کیا۔ وہ اس میں یہ کیس پیش کرتے ہوئے ڈی ایس پی منظور نے جو بیان دیا تھا، اس میں اسی لوڈر ڈرائیور کے بیان کی بنا پر اسے موردِ الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جنگل میں دریافت ہونے والی مشکوک کھوکا بھی حوالہ دیا گیا مگر سب سے زیادہ اہمیت اس گواہ ہی کی تھی اور جب وہ مُکر گیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ پولیس بے بس تھی کم از کم اب پولیس کے لیے اسے مزید اپنی حراست میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا وکیل آج ہی عدالت سے اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جاتا۔ گواہ نے اپنا بیان کیسے بدلا ہوگا، یہ بات وہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کے سامنے دار چودھری اور ایس پی نے ہی کوئی ایسی چال چلی ہوگی کہ گرفتار ملزم کو وعدہ معاف گواہ بنانے میں کی گئی پولیس کی ساری محنت اکارت چلی گئی۔ وہ جو عدالت میں پیش ہوتے ہوئے تھوڑا سا گھبرایا ہوا تھا، اب بالکل مطمئن اور ملزمان کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کے باوجود اتنے مزے سے عدالتی کارروائی دیکھ رہا تھا جیسے کسی اسٹیڈیم میں موجود ہو اور اپنے سامنے کھیلا جانے والا کوئی میچ دیکھ رہا ہو۔ وکیل صفائی نے اس کے دونوں دوستوں کو باری باری عدالت کے سامنے پیش کیا جنہوں نے گواہی دی کہ اقبال باجوہ تین دن تک مسلسل ان کے ساتھ جہلم میں تھا۔ چیک پوسٹس سے حاصل کردہ ریکارڈ کی کاپیاں بھی ثبوت کے طور پر عدالت کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان گواہیوں اور ثبوت کے بعد صورتِ حال یوں ہوگئی کہ بے شک اقبال باجوہ بطور فاریسٹ آفیسر اپنے فرائض سے کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔ جنگل میں جاری سرگرمیوں سے اسے واقف ہونا چاہئے تھا لیکن اس کے براہِ راست کسی جرم میں شریک ہونے کے شواہد موجود نہیں تھے اس لیے عدالت نے اس کی درخواست ضمانت منظور کر لی۔ عدالت کے اس فیصلے پر اقبال باجوہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے یقین تھا کہ ضمانت کی طرح اُسے جلد اس کیس سے باعزت بری ہونے کی خوشخبری بھی سننے کو مل جائے گی۔ جیسے ہی جج نے دونوں طرف کے افراد کو اگلی پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دے کر عدالت برخاست کی، کمرۂ عدالت میں موجود چودھری افتخار گلاب کے پھولوں کا ایک موٹا سا ہار لے کر اس کے قریب پہنچ گیا اور ہار اس کے گلے میں ڈال کر گرم جوشی سے اسے مبارکباد دیتے ہوئے اس سے معانقہ کیا۔ اقبال باجوہ خود بھی ایسے خوش تھا جیسے واقعی بے قصور ہو۔ جہلم سے گواہی کے لیے آئے ہوئے اس کے دوست بھی اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان سے مبارکبادیں وصول کرتا ہوا اب وہ اس صحافی کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا جو اس کیس پر اُس کا مؤقف جاننے کا خواہش مند تھا۔ اس تماشے سے بے نیاز بنے پولیس اہلکار لوڈر ڈرائیور کو اپنے گھیرے میں لیے عدالت سے باہر نکل گئے۔ چند قدموں کے فاصلے پر وہ پولیس وین کھڑی تھی جس میں اس شخص کو لے جایا جانا تھا۔ اس سے قبل کہ چند قدموں کا فاصلہ طے ہوتا، فضا میں ایک فائر کی آواز گونجی اور پولیس کے گھیرے میں موجود لوڈر ڈرائیور نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ اس صورتِ حال پر یک دم بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ پولیس والے یہ کھوج لگانے کے لیے بھاگے کہ فائر کس طرف سے کیا گیا ہے اور کچھ فرش پر تڑپتے ہوئے زخمی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور کھوپڑی کا ایک حصہ اُڑ جانے کے باعث دماغ باہر نکل آیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ لمحوں کا ہی مہمان ہے۔ پھر بھی رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے اسے ہسپتال لے جانے کی تگ و دو کی جانے لگی۔ جس وقت اُسے زمین سے اُٹھا کر ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، وہ اپنی آخری سانس لے چکا تھا۔ غریب کو ہسپتال پہنچنے تک کی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ مل بھی جاتی تو کیا ہو جاتا؟ وہاں موجود واحد سرکاری ہسپتال میں اتنی سہولیات



موجود تھیں کہ اتنے شدید زخمی شخص کی جان بچانے کے لیے کچھ کیا جا سکتا۔

⊛----✪----⊛

''مان گئے بھئی۔ کیا خوب انتظام کیا آپ لوگوں نے۔ وہ بے چارہ ڈی ایس پی تو حسرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا کہ میں کتنے آرام سے ضمانت پر رہا ہو کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہوں۔ اسے تو گمان بھی نہیں ہوگا کہ یہ گواہ عدالت میں آ کر یوں بیان بدل لے گا۔'' اقبال باجوہ نے کسی بچے کی طرح قلقاری مارتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں تھامے جام سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ جہلم سے اُس کی خاطر گواہی دینے کے لیے آنے والے اس کے دونوں دوست کاروباری حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس کے ایک دو دن رک جانے کی دعوت کے باوجود اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے رکنے کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے اور واپس جہلم لوٹ گئے تھے۔ انہیں رخصت کر کے فارغ ہوا تو چودھری افتخار کی طرف سے پیغام ملا کہ حویلی پہنچ جاؤ۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اب وہ تینوں جھاگ اُڑاتی شیمپین کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔

''ویسے اُس نے اپنا بیان بدلا کیسے؟ مجھے یقین ہے کہ اس کے پیچھے آپ ہی کی مہربانی ہوگی۔'' اب اس کا مخاطب ایس پی معظم تارڑ تھا۔

معظم تارڑ اُس کے انداز سے پر زور سے ہنسا اور پھر ایک آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ ''ماشاءاللہ آپ بڑے سمجھ دار ہو باجوہ صاحب! ہم کیا اور ہماری مہربانی کیا؟ بس ذرا سا حقِ دوستی نبھانے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے کرنا بھی کیا پڑا؟ بس اس بندے کے عدالت روانہ ہوتے ہوئے اسے اتنا پیغام بھجوا دیا تھا کہ باجوہ صاحب پر ذرا سی آنچ آئی تو تیرا گھر بیوی بچوں سمیت جل کر بھسم ہو جائے گا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ کیا بولنا چاہئے، خود سمجھ گیا۔''

''پر آپ لوگوں نے تو اس کا سمجھ داری دکھانے والا بھیجا ہی نکال باہر کیا۔''

''وہ اس بات کی سزا تھی کہ اس کے بھیجے میں ہم سے غداری کرنے کا خیال آیا ہی کیسے؟ غداروں کا انجام ہم ہمیشہ بڑا عبرت ناک کرتے ہیں۔ وہ انور بھی ہمیں ہاتھ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حرام زادے اے سی کا ایس (جاسوس) بنا ہوا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے پہلے ہی بالے کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ اپنے بیچ موجود نمک حرام کو ڈھونڈ نکال۔ بالے نے بھی عین اس وقت اس کو چھاپا جب وہ چھپ کر مخبریاں کر رہا تھا۔ حال دیکھو سالے کا..... ڈھنگ سے کھانے پہننے کو نہیں ملتا اور گلے میں موبائل لٹکا کر پھر رہا تھا۔ بالا موبائل سمیت اسے پکڑ کر منشی کے پاس لے گیا۔ منشی نے اس سے سب اُگلوا لیا کہ کدھر سے موبائل آیا اور کس کے لیے اس نے کون کون سی مخبریاں کیں؟ منشی سے بڑی تڑی سے گل کی اُس انور نے۔ کہتا تھا کہ تمہاری وجہ سے میری بیوی اور بچے کی جان گئی۔ میں اس واسطے تم سب کی جان مشکل میں ڈالنے کے لیے اے سی سے مل گیا۔ اس کے کہنے پر میں نے تمہیں جنگل میں درخت کاٹنے پر اپنی ڈیوٹی لگانے کو کہا۔ منشی کا تو یہ سب سن کر متھا گھوم گیا۔ ایسی کٹ لگی ہے اس نمک حرامی کی کہ اپنی جگہ سے ہلنے جوگا بھی نہیں رہا۔ ڈیرے پر اپنی موت کے انتظار میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے بھی کہا کہ پڑا رہنے دو۔ پہلے میں ضروری کاموں سے نمٹ لوں، پھر اس کا فیصلہ کروں گا۔''

چودھری افتخار کا لہجہ یہ سب بتاتے ہوئے بے حد سنگین تھا۔

''آپ نے اچھا کیا چودھری صاحب! غداروں کو تو واقعی عبرت ناک سزا ملنی چاہئے تاکہ پھر کسی میں غداری کی جرأت ہی پیدا نہ ہو سکے۔'' ایس پی نے اس کے فیصلے کی تائید کی۔

''غداری کا انجام سب جانتے ہیں، اسی لیے ہمارے تابعدار بنے رہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ان کا دماغ پھر

بھی جاتا ہے۔ جن کا دماغ پھر جائے، انہیں تو ہم بد دماغی دکھانے کے لیے زندہ ہی نہیں چھوڑتے۔ ہاں انہیں کو بھی نصیحت ہو جاتی ہے کہ ایسی کوئی گل سوچنی بھی نہیں ہے۔ لوڈر کے ڈریور کا انجام تو سب دیکھ ہی چکے ہیں اب انورے کا بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے ڈریور کا تو ہم نے یوں بھی ہر حال میں کام تمام کرنا تھا۔ وہ پولیس کی زد میں آ گیا تھا۔ خامخاہ (خوامخواہ) اس کے ذریعے پولیس ہمیں تنگ کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اب یہ جب بانس ہی نہیں رہا تو بانسری کدھر سے بجے گی۔ آپ پر پولیس نے جو کیس بنایا ہے اس میں تو سمجھ لیں کہ دم نہیں رہا۔ ڈریور کے بیان بدلنے پر وہ لوگ پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے۔ سوچا ہوگا دوبارہ اس پر کام کریں گے اور عدالت میں اپنی مرضی کا بیان دلوائیں گے۔ لیکن اب تو ان کی ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی ہوگی۔'' دورانِ گفتگو کئی جام خالی کر چکا تھا۔ نشے کے باعث اس کی سرخ پڑ جانے والی آنکھوں پر کسی کبوتر کی آنکھوں کا گمان ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہر وقت چھائی رہنے والی سختی کے ساتھ یہ سرخ آنکھیں اسے بہت خوفناک بنا رہی تھیں۔

''باجوہ صاحب کی ضمانت کی خوشی میں، میں نے آپ لوگوں کو جو دعوت دی ہے، اس دعوت کا اصل لطف لینے کے لیے آپ دونوں کو میرے ساتھ ڈیرے پر چلنا ہوگا۔ ڈیرے پر چل کر ہی آپ کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوگا کہ ہم دشمنوں کے کیسے دشمن اور سجنوں کے لیے کیسے سجن ہیں۔'' اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ مزید شراب نوشی کا ارادہ ترک کر چکا ہے اور فوری طور پر ڈیرے کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہے۔ ان دونوں نے اس کے ارادے کو سمجھتے ہوئے جلدی جلدی اپنے جام خالی کیے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کی منزل چودھری کا وہ ڈیرا تھا جسے وہ اپنی من پسند سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ڈیرا گاؤں کی آبادی سے کافی فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی سرگرمیوں کے لیے بالکل محفوظ تھا۔ گاؤں والوں کو بھنک بھی نہیں پڑتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور اگر کسی کو تھوڑی بہت بھنک پڑ بھی جائے تو وہ جان بوجھ کر انجان بن جاتا۔ چودھری کے معاملات کی طرف سے آنکھیں اور کان بند رکھنا ہی ان کے حق میں بہتر تھا۔ آنکھیں اور کان بند رہتے تھے تو زبان کے پاس بولنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہتا تھا۔ آدمی جب بھی پھنستا ہے، اپنی زبان سے پھنستا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زبان بندی کا اچھی طرح اہتمام کیا جائے۔ سو گاؤں والے اس اصول پر عمل پیرا رہتے تھے۔

''ہاں بھئی، کیا حال ہے میرے شیروں کا؟ کام کے لیے تیار ہیں؟'' ڈیرے پر پہنچ کر وہ لوگ جیسے ہی گاڑی سے اُترے، منشی اللہ رکھا ان کے استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ منشی کے پیچھے ہی ایک بندہ دو تنومند کتوں کی زنجیریں تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ کتے جسیم ہونے کے علاوہ بہت خوں خوار بھی لگ رہے تھے۔ ان کے انداز سے ایسی بے چینی اور خوں خواری جھلک رہی تھی کہ صاف لگتا تھا اگر ان کے منہ پر تسموں سے بندھی چمڑے کی کپی نما وہ شے موجود نہیں ہوتی تو وہ اپنے رکھوالے کو ہی چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔ منشی سے سوال کرتے ہوئے چودھری کی نظر ان کتوں پر ہی جمی رہی۔

''بالکل تیار ہیں سرکار!..... بلکہ بے چین ہیں کہ کب انہیں کام دکھانے کا موقع ملے۔'' منشی نے خوشامدانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بس تو پھر چل، انہیں زیادہ انتظار کروانا بھی اچھا نہیں۔ میرے لاڈلے اتنی دیر سے بھوکے ہیں تو ہم نے میری بھی بھوک اُڑ گئی ہے۔ ان کے پیٹ میں کچھ جائے گا تو ہی میں بھی لقمہ توڑ سکوں گا۔'' اس کا انداز بے حد معنی خیز تھا۔ اقبال باجوہ اور ایس پی تارڑ پوری طرح سے اس صورتِ حال کو سمجھ نہیں پا رہے تھے مگر چودھری کے انداز میں کچھ ایسا تھا جس سے انہیں اپنے جسم میں پھریری سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چودھری



[illegible] میں چلتے ہوئے خاموشی سے اس کے ساتھ ڈیرے میں داخل ہو گئے۔ چودھری نے ڈیرے کے شان [illegible] بجائے کمروں کے بجائے نیچے تہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا تو بھی انہوں نے اس کا [illegible] دیا۔ منشی اور کتوں کی زنجیریں تھامے ہوئے رکھوالا بھی پیچھے پیچھے تھے۔ تہ خانے کی فضا میں سیلن کی مخصوص [illegible] مگر روشنی کا معقول انتظام تھا۔ اس روشنی میں وہ دیکھ سکتے تھے کہ اس وسیع و عریض تہ خانے میں کئی کمرے [illegible] ہوئے تھے۔ شاید اوپر جتنے حصے پر کمرے تعمیر کیے گئے تھے، نیچے بھی اتنا ہی رقبہ استعمال ہوا تھا۔ منشی نے [illegible] بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ سب اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس [illegible] دیوار کے ساتھ تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان تین کرسیوں کے علاوہ کمرے میں کسی قسم کا فرنیچر نظر نہیں آ [illegible]۔ یہ تینوں کرسیاں بھی شاید ان تینوں کے بیٹھنے کے لیے خاص طور پر وہاں رکھوائی گئی تھیں۔ چودھری نے [illegible] دونوں کو اشارہ کیا تو اس کے ساتھ وہ دونوں بھی ان کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ منشی اللہ رکھا ان کے ساتھ [illegible] نہیں آیا تھا، بلکہ کتوں کا رکھوالا ان کی زنجیریں تھامے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ذرا دیر [illegible] منشی بھی وہاں آ گیا۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور تھے۔ ایک سرد آنکھوں والا خرانٹ صورت بالا اور دوسرا [illegible] الحال انور جسے بالتقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں لایا تھا۔

''ہاں بھئی انور! بول کیا سزا دوں تجھے تیری نمک حرامی کی؟'' تھر تھر کانپتے انور کو چودھری کے سامنے پیش [illegible] کیا تو اس نے سرد لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''مجھے معاف کر دیں سرکار! میں غصے میں سب کچھ کر بیٹھا۔ میری گھر والی کی حالت بہت خراب تھی۔ میں [illegible] منشی جی سے کہا کہ وہ گڈی پر اسے ہسپتال بھجوانے کا بندوبست کر دیں۔ یہ نہ مانے اور میری گھر والی مر گئی تو [illegible] بہت غصہ آیا۔ اس غصے میں ہی میں بلا سوچے سمجھے ایسی غلطی کر بیٹھا۔'' انور کو پہلے ہی ٹھیک ٹھاک مار لگائی جا [illegible] تھی اور اب اسے اپنی جان بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی، اس لیے وہ اپنے سارے دعوے اور وہ بڑی بڑی [illegible] بھول کر جو اس نے شہریار کے سامنے کی تھیں، چودھری سے معافی طلب کر رہا تھا۔

''غلطی کی سزا تو بندے کو بھگتنا ہی پڑتی ہے۔ تجھے بھی سزا تو ضرور ملے گی۔'' چودھری کے لہجے میں [illegible] کی تھی۔

''اس بار معاف کر دیں سرکار! میں ساری حیاتی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ غم کی وجہ سے میں بھٹک گیا [illegible] اب دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔'' چودھری کے لہجے کی سفاکیت سے وہ اپنے انجام کو بھانپ رہا تھا [illegible] لیے گڑگڑاتے ہوئے اس کے قدموں میں گر گیا۔

''ہم تجھے دوبارہ غلطی کے لائق ہی نہیں چھوڑیں گے۔ بھٹکے ہوؤں کو رستہ دکھانا ہمیں ڈڈی چنگی طرح آتا [illegible]۔ تجھ پر تو ہم ایک طرح سے مہربانی ہی کرنے جا رہے ہیں۔ جس گھر والی کی جدائی میں تیری مت ماری گئی [illegible] تجھے اس تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا ہے ہم نے۔'' چودھری نے اطمینان سے اسے جواب دیا۔ اس جواب پر [illegible] کے چہرے پر کھنڈی زردی کچھ اور بھی گہری ہو گئی اور وہ مزید زور و شور سے گڑگڑانے لگا۔ چودھری اُس کی [illegible] گڑگڑاہٹ اور منتوں پر قطعی بے نیاز بنا بیٹھا تھا۔ باجوہ اور تارڑ تو تھے ہی خاموش تماشائی۔

''جا، زیادہ ٹائم نہ خراب کر میرا۔ پہلے ہی میرے شیر بڑی دیر سے بھوکے ہیں۔ اب ان سے ہور [illegible] اشت نہیں ہوگی۔ تُو اگر خود کو میرے کام کا بندہ ثابت کرنا چاہتا ہے تو خود کو ان سے زیادہ طاقت ور اور بہادر [illegible] ت کر کے دکھا۔ ان سے مقابلہ جیت لے۔ تُو جیت گیا تو میں تجھے اپنے خاص بندوں میں شامل کر لوں گا۔ [illegible] نہ تو مجھے تیری کوئی ضرورت ہی نہیں۔ تیرے جیسے سینکڑوں پڑے ہیں میرے پاس۔'' چودھری نے اسے

جواب دیا اور پیر کی ٹھوکر سے خود سے دور دھکیل دیا۔ اسی وقت کتوں کے رکھوالے نے ان کے منہ آ
کے بعد ہاتھ سے ان کی زنجیریں چھوڑ دیں۔ اسے ایسا کرنے کا اشارہ یقیناً چودھری کی طرف سے
لیکن باجوہ اور تارڑ دیکھ نہیں سکے۔ وہ تو اپنی اپنی نشستوں پر منجمد سے ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک کمزور انسان
خوں خوار بھوکے کتوں کی لڑائی کا کیا انجام ہو سکتا تھا؟..... یہ کسی کو بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی۔

کتے آزاد ہو کر انور کی طرف لپکے تو اس کے حلق سے دہشت ناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ مگر
کتے نے اس کی ٹانگ پر منہ مار کر اسے بھنبھوڑنا شروع کیا تو شاید اسے احساس ہو گیا کہ صرف چیخنے
درخواست کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ بقا کی جبلی خواہش نے اس کے ناتواں جسم میں جوش کی ایک لہر
ٹانگ سے چمٹے کتے کے منہ پر اپنی آزاد ٹانگ کا وار کرتے ہوئے اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔
اس بھرپور ضرب کو کھا کر کتا کچھ پیچھے کی طرف جا گرا مگر اس عرصے میں دوسرا کتا بھی اس پر حملہ آور ہو
اس کتے نے یقیناً اس کے نرخرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن انور کا جسم متحرک ہونے کی وجہ سے
طرح کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کے دانت انور کی گردن پر ایک گہری خراش ہی ڈال سکے۔ انور نے
اس کتے کے جبڑے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر چیر ڈالے۔ اس نے کتے کے جبڑوں کو گرفت
لے لیا لیکن پھر پہلے والے کتے کے سنبھل کر دوبارہ حملہ کرنے کی وجہ سے گرفت کو قائم رکھنے میں کامیاب
ہو سکا۔ اس کتے نے پشت کی جانب سے اس پر حملہ کیا تھا اور اس کے دائیں مونڈھے کو نشانہ بنایا۔ انور
جواب دے گیا اور حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ پھر یہ چیخیں تسلسل اختیار کر گئیں۔ دونوں کتے مل کر
توڑ حملے کر رہے تھے اور وہ کسی بھی طرح کی مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اب
ہی کھیل باقی ہے، پھر انور کی چیخیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائیں گی۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس
بڑوں کا پتا پانی ہو جائے مگر چودھری اور اس کے کارندے کسی معمول کی طرح یہ سب دیکھ رہے تھے۔
چودھری اور بالے کی آنکھوں میں تو اس منظر سے لطف اندوز ہونے کی مسرت جھانک رہی تھی مگر باجوہ اور
کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ بالکل دم سادھے ہوئے تھے۔ باجوہ کی تو بات کیا تھی، خود ایس پی جس
ہاتھوں کئی انسانوں کو کسی نہ کسی تھانے کے ڈرائنگ روم میں ٹھیک ٹھاک تشدد کا نشانہ بنایا تھا، اس منظر کو دیکھ کر
سا گیا تھا۔ چودھری نے ان دونوں کی کیفیت محسوس کر لی اور یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے

''چلیے، اوپر چلتے ہیں۔ یہ مردود تو اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا ہے۔''

وہ دونوں جیسے منتظر ہی تھے، فوراً کھڑے ہو گئے۔ تہ خانے سے نکلتے ہوئے بھی انور کی گھٹی گھٹی چیخیں
کے تعاقب میں تھیں۔ چودھری کی سفاکیت کا اتنے عرصے کی دوستی میں آج پہلی بار انہیں صحیح معنوں میں
ہوا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ شخص کن حربوں سے اتنے لوگوں کو اپنا مطیع بنائے ہوئے ہے۔ کہیں عقیدت کا
بچھا تھا تو کہیں کسی کو قرض کے طوق میں جکڑا ہوا تھا۔ عام لوگ تو چھوٹی موٹی سزاؤں سے ڈر کر ایک طرف
خاموش ہو کر بیٹھ جاتے تھے..... جو ان میں سے کوئی سرکش نکل آئے تو اس کو یقیناً انور جیسے انجام سے ہی
پڑتا ہوگا۔

''شاید آپ لوگوں کی طبیعت پر کچھ بوجھ سا آ گیا ہے۔ یہ پیجئے، طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اس کے
آپ کی تفریح کے لیے ایسا زبردست انتظام ہے کہ کچھ ناگوار گزرا بھی ہے تو آپ کو یاد نہیں رہے گا۔''
موجود ایک کشادہ کمرے میں آ کر اس نے اپنے ہاتھ سے جام بنا کر ان دونوں کو پیش کرتے ہوئے کہا۔
دونوں نے ہی فوراً جام ہونٹوں سے لگا لئے۔ دو چار گھونٹ لینے کے بعد ہی انہیں اپنے اعصاب سنبھلتے



ہوئے۔ چودھری سرسری انداز میں ان سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ جیسے
قبل جو کچھ انہوں نے دیکھا، گویا وہ کوئی حقیقت نہیں بلکہ فلمی سین تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دونوں بھی اس گفتگو
حصہ لینے لگے۔

''آپ کے خاص مہمان آ گئے ہیں سرکار!'' انہیں باتیں کرتے ہوئے آدھے گھنٹے سے کچھ اوپر وقت گزرا
کہ منشی نے آ کر اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، انہیں بھیج دو۔'' چودھری نے حکم دیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ بجلیاں ان کے سامنے تھیں جو شکار
موقع پر جنگل میں بھی منگل کا سماں پیدا کرنے کا سبب بنی تھیں اور چمک دمک کر ان پر گرتی رہی تھیں۔ حسب
ت و تربیت انہوں نے جھک کر ان لوگوں کو آداب کہا۔ آج ان کے ساتھ ان کے سازندے بھی آئے تھے۔
لندوں نے فوراً مناسب جگہ سنبھال کر اپنے ساز و سامان کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ ذرا دیر میں وہاں محفل
ں و سرود سج گئی۔ چودھری کے ملازمین نے اشتہا انگیز کھانوں سے بھرے خوان بھی اسی دوران وہاں پہنچا دیے
رع کر دیئے۔ شباب و شراب کی اس فراوانی میں بھلا کس کو وہ موت کا بھیانک رقص یاد کرنے کی فرصت تھی
کچھ دیر قبل نیچے تہ خانے میں دیکھا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آپ کسی طرح چیمہ صاحب سے میری ملاقات کا بندوبست کروا دیں۔ ان سے مل کر میں انہیں قائل کر
لوں گا کہ انہیں نور پور والے معاملے میں قدم پیچھے نہیں ہٹانے چاہئیں۔''

''میں بات کروں گا۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ چیمہ صاحب کچھ خفا ہیں۔ بال بال بچے ہیں وہ اس حادثے
میں۔ انہیں تو یہی شکوہ ہے کہ سکیورٹی کا مکمل انتظام نہیں تھا۔''

''میں اس سلسلے میں ان سے معذرت کر لوں گا لیکن یہ تو انہیں خود بھی سمجھنا چاہئے کہ اس قسم کی دہشت گردی
کے واقعات وہاں بھی پیش آ جاتے ہیں جہاں اس سے کہیں زیادہ سکیورٹی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک
کی تاریخ تو بھری پڑی ہے ایسے واقعات سے۔ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان سے لے کر اب تک کتنے ہی
سیاست دان ہیں جو کسی نہ کسی سازش کے نتیجے میں لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ لیکن سیاست والوں نے ان واقعات
سے ڈر کر جلسے جلوسوں میں شرکت کرنا تو نہیں چھوڑ دی۔ سیاست میں رہنا ہے تو عوام کے درمیان بھی جانا
پڑے گا اور خطروں سے بھی نمٹنا پڑے گا۔ یہاں تو لوگ اپنوں کی سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں، نور پور والے
واقعے کے پیچھے تو پھر غیر ملکی ہاتھ نظر آ رہا ہے۔ چیمہ صاحب کے لیے تو اچھا موقع ہے کہ اس موقع پر بہادری کا
مظاہرہ کریں اور عوام پر ثابت کر دیں کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔
آخر انہیں اپنا ووٹ بینک بھی بڑھانا ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے کچھ تلخ ہو گیا تھا۔ آئی جی مختار صاحب کے حکم
پر فی الحال اس نے خود کو تمام ایسے معاملات سے الگ رکھا ہوا تھا جو پولیس کے انڈر میں آتے تھے۔ لیکن جو
حالات سامنے آ رہے تھے، ان پر اندر ہی اندر تاؤ تو ضرور ہی کھاتا رہتا تھا۔ خود کو تمام معاملات سے الگ ظاہر
کرنے کے لیے وہ جان بوجھ کر باجوہ والے کیس کی سماعت کے دن عدالت بھی نہیں گیا تھا اور معاملہ مقامی جج
پر چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ بطور اے سی اُسے اس سماعت میں شریک ہونے کا حق تھا۔ گواہ کے بیان بدلنے، باجوہ کے
ضمانت پر رہا ہو جانے اور پھر گواہ کے قتل نے اسے بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ لیکن اس نے ان سب باتوں کو پارٹ
آف دی گیم سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ اس کے لیے پریشان کن بات انور کا غائب ہونا بھی تھا۔ اُس کا موبائل

مسلسل آف جا رہا تھا۔ جس بندے کو پیر آباد بھیج کر انور کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس نے بھی یہی اطلاع دی تھی کہ انور کچھ دن سے کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے چودھری کے دوسرے کارندے موجود ہیں لیکن سب یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے انور کو کئی دن سے نہیں دیکھا۔ انور اس طرح غائب ہو جانا تشویش ناک تھا اور صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہی اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ چودھری کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ لیکن چودھری سے کون باز پرس کر سکتا تھا؟ ایک پریشان کُن بات یہ بھی تھی کہ اللہ آباد سے شاہنواز کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہونے والے لڑکوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ ان لڑکوں کے ماں باپ اُس کے پاس درخواست لے کر آئے تھے کہ کسی طرح ان کے بچوں کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ اُس نے اس سلسلے میں لاہور پولیس سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن ابھی تک لڑکوں کا کوئی کھوج نہیں لگایا جا سکا تھا۔ اللہ آباد سے فرار ہونے والے شاہنواز کا دوست بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ پولیس کے جو بندے اس کی تلاش میں گئے تھے، انہوں نے یہی اطلاع دی تھی کہ ان مقامات پر شک تھا کہ وہاں وہ آدمی اُترا ہے، وہاں سے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا اور نہ ہی وہاں سے روانہ ہونے والی کسی دوسری بس میں اس حلیے کے آدمی کو دیکھا گیا ہے۔ اس مفرور آدمی کے بارے میں اسے پہلے ہی شک تھا کہ وہ حلیہ بدلنے میں ماہر ہے۔ اس اطلاع کے بعد مزید یقین ہو گیا کہ وہ اللہ آباد سے نکلنے کے بعد راستے میں جہاں بھی ٹھہرا تھا، وہاں پر رک کر اس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا ہو گا اور پھر آگے کے سفر پر روانہ ہوا ہو گا۔ بہر حال، اس کیس سے بھی اس کا تعلق تقریباً ختم ہو چکا تھا اس لیے اس نے وقتی طور پر اپنی توجہ وہاں سے بھی ہٹا لی تھی۔ ان سارے مسئلوں کو چھوڑ کر وہ اب اپنے ترقیاتی منصوبوں کو بھرپور توجہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ نور پور میں بجلی کی فراہمی کا جو مسئلہ پہلے ہی اس کی فہرست میں ترجیحی بنیاد پر کیے جانے والے کاموں میں شامل تھا، اب سرفہرست آ گیا تھا۔ نور پور کے غریب اور مظلوم باسیوں کی اشک شوئی کے لیے اس قسم کا کوئی فوری اقدام اٹھانا ضروری تھا اسی لیے اس نے اس وقت لیاقت رانا سے رابطہ کیا تھا کہ وہ رُوٹھے ہوئے وہاں پانی و بجلی، چیمہ صاحب سے اس مسئلے پر گفتگو کے لیے اس کی ملاقات کا انتظام کروا سکیں۔

''تمہارے مزاج کی اسی تلخی سے میں ڈرتا ہوں۔ میں چیمہ صاحب کو ملاقات پر راضی کر بھی لوں گا لیکن تم نے یہ سب کچھ اسی لہجے میں ان کے سامنے بھی کہہ دیا تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے، یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ اس اندازِ گفتگو پر قائل ہونا تو دور کی بات، وہ اُلٹا تمہارے مخالفین میں شامل ہو جائیں گے۔'' لیاقت رانا نے فکر کا اظہار کرتے ہوئے اسے احساس دلایا۔

''سوری ماموں جان! لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں چیمہ صاحب کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو انہیں ناگوار گزرے۔ آخر میں آپ کا بھانجا ہوں۔ کچھ سیاسی داؤ پیچ مجھے بھی آتے ہیں۔ ان کی مدد سے میں چیمہ صاحب کو سنبھال لوں گا۔'' لیاقت رانا کے ٹوکنے پر اسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اس لیے فوراً ہی موڈ بدل کر بولا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ آج مجھے اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا ہے، وہاں چیمہ صاحب سے بھی ملاقات ہو گی۔ میں موقع دیکھ کر خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ملنے اور ان کو سمجھانے کی نوبت ہی نہ آئے۔'' انہوں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور پھر چند ایک رسمی باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ خفا ہیں لیکن اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ وہ اس کا کہا ہوا کام ضرور کروائیں گے، اس لیے مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے اپنے کام کی طرف



ہو گیا۔ اس کے سامنے پیر آباد والے اسکول کے ساتھ ہی انڈسٹریل ہوم کے قیام کا منصوبہ تھا۔ فی الحال اسکول میں بچوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ماسٹر آفتاب اور اس کے ساتھی سے خالی کروائے گئے کمرے کی فوری طور پر ضرورت پڑتی۔ اس کمرے میں ایک چھوٹا سا انڈسٹریل ہوم قائم کیا جا سکتا تھا جس کے لیے بس چند مشینوں کی ہی ضرورت تھی۔ بعد میں اسکول میں بچوں کی تعداد بڑھتی تو موجودہ کمروں کے اوپر ہی مزید کمرے تعمیر کیے جا سکتے تھے۔ اس منصوبے کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ دیگر دیہاتوں میں بھی اسکولوں کی تعمیر کا منصوبہ طے پا چکا ہے، اسی طرح اسکول کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ہوم کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح گاؤں کی ہنر مند عورتوں کے ہنر سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے بھی حلال آمدنی کا اچھا بندوبست ہو جاتا۔

''سر! ڈی ایس پی منظور آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' ابھی وہ عبدالمنان کو اپنے کمرے میں بلا کر اس سے اس منصوبے کو ڈسکس کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انٹرکام پر عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ انہیں اندر بھیج دو۔'' اس نے اجازت دی۔ لیکن اسے حیرت تھی کہ ڈی ایس پی اس کے پاس کیوں آیا ہے؟ باجوہ والے کیس میں اب کوئی جان نہیں رہی تھی۔ کم از کم اسے مجرم ثابت کرنا بہت مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے اس کی نااہلی کی وجہ سے معطل کیا جا سکتا تھا تو اس سلسلے میں وہ اوپر بات کر چکا تھا۔ دشمن میں باجوہ پر مقدمہ بھی دائر کیا جا چکا تھا اس لیے یہ کام عنقریب ہو جاتا۔ لیکن ظاہر ہے ڈی ایس پی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے تھی۔ دھماکے والے کیس میں بھی وہ صرف ابتدائی تحقیقات کے موقع پر شامل رہا تھا، اس کے بعد اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یعنی جن دونوں کیسز سے اس نے اپنی ترقی کی اُمید باندھ رکھی تھی، وہ ایسی نوعیت اختیار کر گئے تھے کہ اس کی کارکردگی حسبِ توقع اُبھر کر سامنے نہیں آ سکی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' وہ ڈی ایس پی کی آمد کے مقصد کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے میں کامیاب ہوتا، اس سے پہلے وہ اس کے کمرے میں آ پہنچا۔

''وعلیکم السلام..... بیٹھیے۔'' اس نے اسے اشارہ کیا اور سامنے رکھی فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ ڈی ایس پی کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ بہت مصروف آدمی ہے۔ اور اگر وہ یونہی اس سے تعلقات بڑھانے اور اس کی حیثیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے..... صرف ملنے کی غرض سے آیا ہے تو اسے اندازہ ہو جائے کہ یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

ڈی ایس پی نے اُس کے اس انداز کو اچھی طرح پہچان لیا چنانچہ گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ''بے وقت زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں سر! مگر معاملے کی نوعیت ایسی تھی کہ میں نے مناسب سمجھا کہ براہِ راست آپ سے ملاقات کر کے تصدیق کر لوں۔''

''کیسا معاملہ؟'' شہریار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''پیر آباد کے قریب جنگل کی حدود میں ایک لاش ملی ہے۔ لاش کی حالت بہت بری ہے۔ جنگلی جانوروں نے لاش کو بری طرح نوچا کھسوٹا ہے۔ موت کی وجہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی سامنے آئے گی لیکن ابتدائی تحقیق کے بعد جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ کچھ چونکا دینے والی ہیں۔ مرنے والے کی کلائیوں اور پیروں پر ایسے نشانات ہیں جیسے اسے کافی دیر تک رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا ہو۔ جسم کا اچھا خاصا گوشت نوچ لینے کے باوجود چہرے کا آدھا حصہ صحیح سلامت ہے، اس لیے پیر آباد کے کچھ لوگوں نے لاش کو شناخت کر لیا

ہے۔ ان کے مطابق لاش انور نامی ایک آدمی کی ہے جو کچھ دنوں سے لاپتہ تھا۔ لاش کے جسم پر لباس چیتھڑے موجود تھے، انہیں انور کی ماں ماسی ممتاز کو دکھا کر اس بات کی تصدیق کروالی گئی ہے۔ آخری بار انور اپنے کام پر روانہ ہونے کے لیے گھر سے نکلا تھا تو اس نے اسی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ ماسی خراب حالت کی وجہ سے لاش دکھانا مناسب نہیں سمجھا گیا لیکن اس کے کپڑوں کے بارے میں تصدیق کرا سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ لوگوں نے مرنے والے کو انور کی حیثیت سے صحیح شناخت کیا ہے۔ لیکن اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ انور تنہا جنگل میں کیوں گیا تھا؟..... اور پھر جانوروں کا نشانہ کیسے بنا؟ کیونکہ اس کی لاش کے جس حصے میں ملی ہے، وہ پیر آباد سے بہت قریب ہے اور اس حصے میں جنگلی درندوں کی آمد و رفت نہیں لیے لوگ بے خطر اس حصے تک چلے جاتے ہیں۔ انور بھی شاید اسی وجہ سے چلا گیا تھا۔ اُس کی لاش دریافت کرنے والا بھی ایک چرواہا ہے جو اپنی بکریوں کو چرانے کے لیے وہاں گیا تھا۔ چرواہا روز وہاں جاتا ہے۔ انور کے غائب ہونے کے فوراً بعد اس کی موت واقع ہوگئی ہوتی تو چرواہا پہلے ہی لاش دیکھ لیتا۔ پولیس کا یہی اندازہ ہے کہ اسے مرے ہوئے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ بہرحال، موت کا سبب اور وقت تعین تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہوجائے گا لیکن جو باتیں اُلجھن کا سبب ہیں، ان میں سے ایک انور کے پر ملنے والے بندشوں کے نشانات ہیں جن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ کسی کی قید میں رہا دوسری چیز اس کے گلے میں تعویذ کی طرح لٹکا موبائل سیٹ ہے۔ سیٹ کو کسی نے ناکارہ کردیا ہے یا کسی اور سے وہ خود ہی خراب ہوگیا ہے۔ مگر ہمارے لیے تو انور کے پاس موبائل کی موجودگی ہی حیرت کی بات ہے ماسی ممتاز اور انور کے جاننے والے اُس کے پاس موبائل کی موجودگی سے ناواقف ہیں۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ موبائل کب، کس نے اور کہاں سے خریدا اور اس میں موجود سم کس کے رجسٹرڈ ہے۔ لیکن یہ ساری بھاگ دوڑ کرنے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ سے مل لوں۔ کے پاس موبائل کی موجودگی سے مجھے شک گزر رہا ہے کہ کہیں انور ہی تو وہ بندہ نہیں جو آپ کے لیے مخبری کا کام رہا تھا۔ کیونکہ آپ نے پیچھے بتایا تھا کہ آپ کا اپنے مخبر سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ پھر غیاث محمد کے خاندان سے انور کا قریبی تعلق بنتا ہے اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ وہ ان لوگوں کی محبت میں چودھری کے خلاف کے لیے کام کرنے پر راضی ہوگیا ہو۔'' ڈی ایس پی منظور کا سارا تجزیہ اس کے تجربے کا نچوڑ تھا جس میں کوئی اندازے کی کوئی غلطی نہیں تھی۔

''آپ کا اندازہ ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب! انور واقعی میرے لیے کام کر رہا تھا اور یقیناً اسے جرم کی سزا دی گئی ہے۔'' شہریار نے اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ انور کا نام بطور مخبر چھپانے کا مقصد اسے تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اب جب وہ بے چارہ اپنی جان سے ہی چلا گیا تھا تو کچھ بھی چھپانے کا حاصل تھا۔

''اوہ!..... اس کا مطلب ہے کہ مجھے اس کیس کو دبانا پڑے گا۔'' ڈی ایس پی نے ہونٹ سکیڑے۔

''کیوں دبانا پڑے گا؟ آپ اس سلسلے میں تحقیقات کروائیں۔ اگر ہم انور کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے تو یہ کوئی جرم تو نہیں تھا۔ وہ شخص ایک طرح سے قانون کی مدد کر رہا تھا اور قانون کا فرض بنتا ہے کہ اس کے قتل کی تحقیق و تفتیش کرکے مجرموں کو انجام تک پہنچائے۔'' اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''میرا یہ مقصد نہیں تھا سر! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ کا نام سامنے نہ آئے۔'' وہ گڑبڑایا۔

''میرا نام جن کے سامنے نہیں آنا چاہئے تھا، وہ تو اسے پہلے ہی انور سے اُگلوا چکے ہوں گے۔ خیر،



ات کی زیادہ پروا بھی نہیں۔ سرکاری سطح پر نام سامنے آجاتا ہے تو بھی آپ بے فکر رہیں۔ کوئی میرا کچھ نہیں لے گا۔'' اس کے لہجے میں وہی رعونت اور کروفر تھا جس کا خاص خاص مواقع پر وہ سامنے والے پر اپنی جتانے کے لیے اظہار کرتا تھا۔ ڈی ایس پی جس نے ہمیشہ اسے اپنے ساتھ تعاون کرتے دیکھا تھا، اس زیادہ دیر وہاں ٹک نہیں سکا اور فوراً رخصت کی اجازت لے کر کھسک گیا۔

⊛----✪----⊛

''کتنے دن ہوگئے اماں! تاجور آپا اور صنوبر آپا سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ آج ان سے ملنے چلتے ہیں۔ آپا کا مُنّا بھی بڑا یاد آرہا ہے۔''

کشور کا دل بڑا مچل رہا تھا آفتاب کو دیکھنے کے لئے۔ ہسپتال میں اس سے چوری چھپے ہونے والی ملاقات دوبارہ اُس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ زخمی ہونے کے باعث وہ تاجور کے بیٹے منور کو نے بھی نہیں جا رہا تھا مگر کل رات فون پر بات کرتے ہوئے اس نے کشور کو بتایا تھا کہ آج سے وہ منور کو نے کے لیے جائے گا۔ اس اطلاع کو سنتے ہی کشور کا دل مچل گیا تھا کہ کسی طرح بہنوں سے ملنے کے ان کے گھر جائے اور آفتاب کی ایک جھلک ہی سہی، دیکھ لے۔ چنانچہ ناشتے کے فوراً بعد اس نے اپنی چودھرائن سے فرمائش شروع کردی۔

''میں وڈی آپا سے گل کرتی ہوں۔ وہ راضی ہوں تو فیر چلتے ہیں۔'' اس کی فرمائش کے جواب میں ناہید وہ کچھ چپ سی ہوگئی۔ جس دن سے اسے یہ شک ہوا تھا کہ کوئی اس کے اور آفتاب کے درمیان ہونے گفتگو کی سن گن لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کچھ کھٹک سی گئی تھی۔ اس نے رانی سے بھی اس واقعے کا ذکر کیا اور رانی نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ نچھی یا شادو میں سے کوئی ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ نچھی اور شادو کا نام سامنے ی یہ اندیشہ ذہن میں اُبھرتا تھا کہ کہیں وڈی چودھرائن کو ساری بات معلوم نہ ہوگئی ہو کیونکہ نچھی اور شادو اں ماسی رحمتے، وڈی چودھرائن کی سب سے منہ چڑھی ملازمہ تھی۔ اس نے آفتاب کو اس بارے میں کچھ تایا تھا کہ کہیں وہ احتیاطاً اسے فون کرنے سے نہ منع کردے۔ لیکن خود اپنے طور پر ہوشیار رہنے لگی تھی اور طرح دیکھنے بھالنے کے بعد ہی موبائل اپنی الماری سے نکال کر اس سے رابطہ کرتی تھی۔ اس ساری احتیاط وجود اس کے دل میں ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ حویلی کی کرتا دھرتا وڈی چودھرائن اُسے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو ے۔ اس وقت بھی چودھرائن ناہید نے وڈی چودھرائن کو ساتھ لے کر چلنے کی جو بات کی تھی، اس پر وہ کچھ ی ہوگئی تھی۔ وڈی چودھرائن کی ہر طرف نگراں آنکھوں کی وجہ سے تو آدمی کو اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا تھا۔ بھلا اس کی موجودگی میں وہ آفتاب کی طرف متوجہ ہونے کی غلطی کیسے کرسکتی تھی؟ لیکن یہ بھی مجبوری تھی اس سے پوچھے بغیر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ تاجور، صنوبر کی سسرال سے پہلے تو وہ اس کا میکہ تھا اور اس کے میکے ے وقت اس سے ہی نہ پوچھا جاتا تو وہ یقیناً برا مانتی۔

''کدھر چلنے کی گل ہو رہی ہے؟'' وڈی چودھرائن خود وہاں آگئی تھی۔ اس نے ناہید کا جملہ سن لیا تھا اس پوچھنے لگی۔

''یہ اپنی کشور کہہ رہی تھی کہ بہنوں سے ملے بہت دن ہوگئے۔ بچے بھی یاد آرہے ہیں تو میں نے کہا کہ چلو سے ملنے چلتے ہیں لیکن پہلے وڈی آپا سے پوچھ لیتے ہیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔'' چودھرائن ناہید نے مدی لہجے میں جواب دیا۔

''آج تو وڈے بکھیڑوں سے نمٹنا ہے مجھے۔ پر ہماری وِھی کہتی ہے تو چلو ایسا کرتے ہیں کہ رات تک
ہیں۔ رات رک کر کل سویرے لوٹ آئیں گے۔'' وڈی چودھرائن نے بڑے میٹھے لہجے میں جواب دیا۔ لیکن
کی تیز نظریں کشور کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں جیسے گہرائی میں جا کر اس کے اندر کا بھید جاننا چاہتی ہوں۔

''اگر آپ کے پاس فرصت نہیں تو آج رہنے دیں وڈی ماں! ہم کل وہاں چلے جائیں گے۔'' اس
نظروں سے گھبراتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔ یوں بھی جو پروگرام وڈی چودھرائن نے ترتیب دیا تھا اس
اسے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آفتاب تو ان اوقات میں وہاں ملتا ہی نہیں۔

''کیوں رہنے دیں؟..... جب تیرا دل اَج جانے کو چاہ رہا ہے تو اَج ہی چلیں گے۔ اس بہانے میں
اپنے پیکے میں ایک رات رک جاؤں گی۔ پر دیکھ کل سویرے ہمارے ساتھ ہی واپس آ جانا۔ ہورُکنے کی
مت کرنا ورنہ تیرے اباجی خفا ہوں گے۔ وہ پہلے ہی ناراض (ناراض) ہو رہے تھے کہ کشور کا من حویلی میں
نہیں لگتا؟ بہانے بہانے سے حویلی سے باہر جانے کے موقعے ڈھونڈتی ہے۔'' اب اس کے لہجے میں
واضح تنبیہہ تھی۔

کشور کچھ جھنجلا سی گئی اور خفگی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں کہیں نہیں جاتی۔ پڑی رہتی ہوں یہیں حویلی
قیدیوں کی طرح۔'' اپنی ناراضی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے باہر نکلنے
لیے قدم بھی دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

''اپنی وِھی کو ذرا سنبھال کر رکھنا ہید! اَج کل اس کے نخرے بہت بڑھ گئے ہیں۔ مجھے تو یہ ہو رہی ہوا
میں اُڑتی دکھائی دے رہی ہے۔'' اپنے پیچھے اسے بڑی چودھرائن کی کاٹ دار لہجے میں کہی ہوئی بات سنائی
یوں لگا جیسے خون رگوں میں منجمد ہونے لگا ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کے راز سے آگاہ ہو گئی تھی یا یونہی ایک بات
رہی تھی۔ لیکن اس کا اندیشوں میں گھرا ہوا دل تو مزید خوف کا شکار ہو گیا تھا۔ اس خوف کو ذہن سے جھٹکنے
کوشش کرتے ہوئے وہ حویلی کی بالائی منزل کی طرف بڑھ گئی جہاں مرحومہ عصمت کا ذہنی معذور بیٹا بلال
کسی فالتو سامان کی طرح پڑا رہتا تھا۔ صرف وہ تھی جو اس کا ایک بہن کی طرح خیال رکھنے کی کوشش کرتی
اسے وہ اپنی ہی طرح مظلوم لگتا تھا کیونکہ اس کی طرح اس بے چارے پر بھی خوشیوں کے سارے در بند
بس وہ اس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اس کا ذہن اس ناانصافی کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا اور
اذیت سے بچا رہتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''سر! آپ کے گھر سے فون ہے۔'' وہ بڑے انہماک سے ٹی وی پر نشر کیا جانے والا نو بجے کا خبرنامہ
رہا تھا کہ بٹلر نے اسے اطلاع دی۔ گھر سے فون ہونے کا مطلب تھا کہ کال ممانی آفرین نے کی ہے۔

''ہیلو شہریار بیٹا! یہ میں بول رہی ہوں تمہاری ممانی۔'' اس کے ہیلو کے جواب میں فوراً ہی دوسری
سے سنائی دینے والے جملے نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی مگر ممانی آفرین کے لہجے میں جو
تھی، اس نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

''خیریت تو ہے ممانی جان؟'' اس نے فوراً ان سے پوچھا۔

''نہیں، خیریت نہیں ہے۔ شینا آج صبح سے لاپتہ ہے۔'' اُن کی دی ہوئی اطلاع پر وہ ہل کر رہ گیا۔

''کیا مطلب؟..... کہاں گئی وہ؟'' لفظ ''لاپتہ'' نے اس کے ذہن میں بھونچال بپا کر دیا۔ ایک پند



کی کے لاپتہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں لیا جا سکتا کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح گھر کا راستہ بھول گئی تھی یا
کہیں بھیڑ بھاڑ میں گم ہو گئی ہو۔ اس کے لاپتہ ہونے کا مطلب تھا کہ اسے کسی نے غائب کر دیا ہے یا پھر وہ
اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں ہی صورتیں نہایت تشویش ناک تھیں۔

ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو اگر کسی نے غائب کیا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی گہری سازش تھی۔ سجاد رانا
کسی کام سے روکنے یا اس سے کوئی مطالبہ منوانے کے لیے ایسی حرکت کی جا سکتی تھی۔ جبکہ دوسری صورت بھی
ناممکن نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، بھولی بھالی شینا عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی، وہ بہت نازک تھا۔ اس
عمر کی لڑکیوں کو راستے سے بھٹکا دینے والے بہت ہوتے ہیں۔

''وہ کہاں گئی، کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ مجھے تو خود ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بارے میں بتایا گیا ہے ورنہ
تمہارے ماموں اور سجاد دونوں نے ہی مجھ سے یہ بات چھپائی تھی۔ اب بھی انہوں نے مجھے مریم کی وجہ سے
اطلاع دی ہے۔ شینا کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشانی میں اس کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ میں اس وقت سجاد
کے گھر میں مریم ہی کے پاس ہوں۔ مریم کو ڈاکٹر کوئی دوا دے کر گیا ہے جس کی وجہ سے وہ سو گئی ہے۔ میرا دل
اکیلے میں بہت گھبرا رہا تھا اس لیے میں نے تمہیں فون کر لیا۔'' اسے ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش صاف
محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا، آپ پریشان مت ہوں۔ میں خود وہاں آتا ہوں، پھر مل کر اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔'' اس نے
انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' ان پر اس کی بات کا فوری اثر ہوا۔ اس سے ان کی جذباتی
وابستگی اتنی شدید تھی کہ وہ سجاد رانا سے بھی زیادہ اس پر بھروسہ کرتی تھیں۔ اس نے دو تین مزید تسلی آمیز جملے کہے
اور پھر فون بند کر کے سجاد رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین کوششوں کے بعد انہوں نے اس کی
کال ریسیو کر لی۔

''میں یہ کیا سن رہا ہوں سجاد بھائی! شینا کیسے لاپتہ ہو گئی؟ آپ کہاں ہیں اور مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' ان
کی آواز سن کر اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

''تمہیں یقیناً ممی نے فون کیا ہو گا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اطلاع نہیں دی تھی کہ تم پریشان ہو جاؤ
گے۔'' وہ یقیناً پریشان تھے لیکن اپنے لہجے کو سنبھالا ہوا تھا۔

''مجھے پریشان ہونا بھی چاہئے۔ میری بھتیجی صبح سے غائب ہے اور مجھے خبر بھی نہیں دی آپ نے۔'' اس
وقت وہ اے سی شہریار نہیں بلکہ ایک چچا تھا جو اپنی بھتیجی کے غائب ہونے پر بری طرح پریشان تھا۔ ''مجھے تفصیل
سے یہ بتائیں کہ ہوا کیا تھا؟ آخر اس طرح شینا کیسے غائب ہو سکتی ہے؟'' سجاد رانا نے اس کی بات کا جواب
دینے میں کچھ توقف کیا تو اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کر ڈالا۔

''میری سمجھ میں خود بھی کچھ نہیں آ رہا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ صبح وہ ساڑھے دس بجے کے قریب
ڈرائیور کے ساتھ اسکول کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ آج اُس کے اسکول میں کوئی فنکشن تھا اس لیے اُسے اسکول
ٹائمنگ سے ہٹ کر دیر سے وہاں پہنچنا تھا۔ میں تو صبح ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ مریم گھر پر تھی۔ پونے بارہ بجے
کے قریب اس کا مجھے فون آیا کہ فوراً گھر پہنچیں، ایمرجنسی ہے۔ میں گھر پہنچا تو مریم، ڈرائیور پر چیخ چلا رہی تھی۔
اس نے دوسرے ملازموں سے اس کے ہاتھ پیر بندھوا دیئے تھے۔ میں نے اس سے اس صورتِ حال کے
بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ شینا کہیں غائب ہو گئی ہے اور یہ اطلاع لے کر آنے والا ڈرائیور ہے۔ میں

نے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ صبح جب وہ شینا کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں اس
سے اس کی بیوی کا فون آ گیا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے اور
اس کی دوا موجود نہیں۔ ڈرائیور کے مطابق اس کی ماں دمے کی مریضہ ہے جس کی حالت کسی بھی وقت
بگڑ جاتی ہے۔ پچھلے روز اس کی بیوی نے اسے یاد دلایا تھا کہ ماں کی دوائیں ختم ہو چکی ہیں مگر وہ تھکا ہوا
کی وجہ سے جلدی سو گیا اور ماں کی دوا نہیں لا سکا۔ اب جو اسے فون پر یہ اطلاع ملی کہ ماں کی طبیعت خراب
رہی ہے اور گھر پر دوا بھی موجود نہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔ شینا نے اُس کی پریشانی بھانپ لی اور جب
معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے تو اس نے اصرار کیا کہ ڈرائیور اسے اسکول پہنچانے سے
ماں کو اس کی دوائیں پہنچائے۔ پریشانی کی وجہ سے اس نے شینا کی بات مان لی اور راستے میں پڑنے
ایک میڈیکل اسٹور سے دوائیں اور انہیلر خرید کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر لاہور
علاقے میں ہے، وہاں گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ کوئی گاڑی اندر نہیں لے جائی جا سکتی۔ چنانچہ اسے شینا
گاڑی کو اپنے گھر سے دُور چھوڑنا پڑا۔ گھر پہنچ کر ماں کو انہیلر دینے اور اس کی حالت سنبھلنے میں اسے
منٹ کا وقت لگ گیا۔ دس بارہ منٹ بعد وہ واپس اس جگہ آیا جہاں گاڑی کھڑی کی تھی تو اس نے دیکھا
گاڑی میں نہیں۔ اس نے اردگرد کے علاقے میں اسے تلاش کیا لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں
سکتی۔ میں نے خود جا کر اس علاقے کا معائنہ کیا ہے۔ واقعی وہاں تو کوئی دکان وغیرہ تک نہیں کہ یہ
کہ شینا کسی چیز کی خریداری کے لیے ہی گاڑی سے اُتری ہو۔ بہرحال، ڈرائیور کے مطابق اس نے
شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر مزید دس پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ اگر شینا کسی ضرورت
گاڑی سے اُتر کر کہیں گئی ہے تو اس دوران واپس آ جائے۔ لیکن جب وہ نہیں آئی تو وہ اس کی گم شدگی کی اطلاع
لے کر گھر پہنچ گیا۔ مریم نے اسے اس کی بے پروائی پر پہلے خوب ڈانٹا ڈپٹا، پھر اسکول فون کر کے معلوم
شینا وہاں تو نہیں پہنچی ہے۔ مریم کو یقین تھا کہ شینا ضرور اسکول پہنچ چکی ہو گی۔ اس نے دیکھا ہو گا کہ
دیر ہو رہی ہے تو اس نے کسی ٹیکسی وغیرہ کے ذریعے اسکول پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا لیکن جب اسکول سے
گیا کہ شینا وہاں نہیں آئی ہے تو مریم کو صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی اور اس نے مجھے فون کر کے گھر بلوا لیا۔
وقت کے بعد سے اب تک میں مسلسل شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کہیں سے کچھ بھی
چل رہا۔'' سجاد رانا نے اسے پوری تفصیلات سے آگاہ کر ڈالا۔

''میں ابھی نکل رہا ہوں یہاں سے۔ جلد ہی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' ان کی پوری بات
بعد اس نے انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''رہنے دو شیری! تم کہاں رات کے وقت پریشان ہو گے۔ یہاں ہم سب مل کر کوشش کر تو رہے ہیں
کو ڈھونڈنے کی۔'' سجاد رانا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''میں یہاں رہ کر اور بھی زیادہ پریشان رہوں گا۔ ویسے بھی صبح مجھے لاہور پہنچنا ہی تھا۔ دھماکے کے
کی عیادت کے لیے لاہور آنا میرے شیڈل میں شامل تھا۔ وقت سے کچھ پہلے پہنچ جاؤں گا تو اس میں کوئی
نہیں ہو گا۔'' وہ واقعی صحیح کہہ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو وہ شینا کے غائب ہونے کی اطلاع سن کر یہاں
سے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ شینا، سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے سب ہی کی آنکھ کا تارا تھی اور وہ
اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ یہ شدید محبت ہی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنا لاہور جانا بہت ضروری محسوس
تھا۔ ورنہ جس لڑکی کا باپ ڈی آئی جی، نانا آئی جی اور دادا ایم این اے ہوں، اس کی تلاش میں کون سی



ئی ہو گی..... یہ بات وہ خود بھی خوب سمجھتا تھا۔

ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ تمہارے آنے سے مریم اور ممی کو تھوڑا سا حوصلہ مل جائے گا۔'' اسے اپنے
میں اٹل دیکھ کر سجاد رانا نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے بیٹ مین کو اپنا سامان پیک کرنے
اور عبدالمنان کو فون کر کے اپنی فوری طور پر لاہور روانگی سے متعلق اطلاع دینے کے بعد چند ضروری
دینے لگا۔ عبدالمنان کو یقیناً پروگرام کی اس تبدیلی پر حیرت ہوئی ہو گی تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا
سے اس کی ساری ہدایات سنتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اس
کا ضروری سامان پیک کیا جا چکا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ لاہور کی جانب رواں دواں تھا۔

⊛----✪----⊛

دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ چپ چاپ ان تینوں کو تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ ملکہ، رانی اور نگار کے نام سے
جانے والی تینوں ہستیاں آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے تیار ہو رہی تھیں۔ تینوں نے خوب بھڑکیلے،
اور قدرے فننگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قسم کے کپڑے پہننے کا ایک ہی سبب تھا کہ لوگوں کو
متوجہ کیا جائے، سو وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور انتظام کرتی تھیں یا شاید کرتے تھے۔
سمجھ نہیں آتا تھا کہ ان کے لیے کون سا صیغہ استعمال کیا جائے۔ وہ معاشرے کے اس تیسرے طبقے
رکھنے والی ہستیاں تھیں جنہیں اللہ نے مرد یا عورت کی واضح پہچان عطا کرنے کے بجائے ایک درمیانی
میں پیدا کر دیا تھا۔ اور اب اس تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے وہ افراد اپنی تخلیق کے مقصد پر
پریشان زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے اپنی ذات کو تماشا بنا کر پھرتے تھے۔ صرف جنس کا تعین نہ ہو سکنے
وہ اچھے خاصے صحت مند، ہاتھ پیروں سے سلامت، عقل و شعور رکھنے کے باوجود معاشرے میں ایک
کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ انہیں نہ تو اپنوں کے درمیان رہنے کا حق حاصل تھا، نہ تعلیم و
کرنے کا اور نہ ہی رزقِ حلال کمانے کے سیدھے راستوں پر چلنے کا۔ وہ سارے حقوق جو بطور انسان
حاصل تھے، معاشرے نے صرف اس وجہ ان سے چھین لیے تھے کہ قدرت نے انہیں ایک واضح شناخت
کے بجائے آزمائش بنا کر دنیا میں اُتارا تھا۔ وہ تیسرا طبقہ معاشرے کے ان افراد کے لیے جو ہر طرح سے
ایک آزمائش ہی تو تھا لیکن معاشرے نے ان سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ
پر پورا معاشرہ اس آزمائش میں ناکام ہو چکا ہے۔ انہیں معاشرے سے کچھ ملتا تھا تو وہ تضحیک، تحقیر اور
لوگ انہیں روزگار کے مواقع دینے کو رضامند نہیں ہوتے لیکن چند سکے بھیک میں دینے کے بعد خود کو
نے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں بھی ہمدردی اور دردمندی کے احساس کے ساتھ بھیک دینے والے کم
زیادہ تر تو ان کی بھونڈی آوازوں، بے لوچ جسموں کی حرکت، تالیوں کی پٹاپٹ اور ڈھول کی ڈھپا
سے تیار کردہ بے ہودہ تماشے سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہی نوازتے تھے۔ ایک مختصر تعداد ان شوقین
کی بھی تھی جنہیں دادِ عیش دینے کے لیے یہی آدھے ادھورے، معمہ جسم ہی بھاتے تھے۔ اپنے ساتھ
والی اس زیادتی پر آوازِ احتجاج بلند کرنے کے بجائے اس تیسرے طبقے کے زیادہ تر افراد نے معاشرے
پر ڈال دینا ہی مناسب سمجھا تھا اور اپنی ایک الگ دنیا بسا کر سارا درد دل میں چھپائے ہنسی خوشی رہنے
کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اس تنگ و تاریک گھر میں موجود افراد بھی ایسے ہی تھے جن کے ماں باپ
جانے کیا نام دیئے تھے لیکن وہ خود کو ملکہ، رانی، نگار کہلا کر خوش ہوتے تھے۔ اسے بھی یہاں شہزادی

کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ ایسی شہزادی کے عہدے پر جس کے پاس کوئی اختیار و سہولت نہیں تھی اور
کے ساتھ جا کر ڈھول پیٹتی تھی، تب کہیں جا کر وہ چند روپے ہاتھ آتے تھے جن کے سہارے زندگی کی گا
گھسیٹا جا سکے۔

''اے شہزادی! تُو کیا کاہلوں کی طرح بیٹھی منہ تک رہی ہے۔ اُٹھ کر تیار کیوں نہیں ہوتی؟ اسے
سے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر ملکہ نے اسے ٹوکا۔ وہ خود آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اپنی گردن
نیچے تک آئے بالوں میں اس نے نقلی بالوں کی چٹیا گوندھی تھی اور اب اس چٹیا میں زرد اور سنہری رنگ کا
ڈال رہی تھی۔

''ہاں ہاں، جلدی اُٹھ جا۔ دیکھ آج میں نے تیرے لیے یہ سرخ جوڑا نکالا ہے۔ تُو جلدی سے ا
کپڑے بدل لے۔ پھر مجھے تیرا میک اپ بھی کرنا ہوگا۔'' رانی نے بھی ملکہ کا ساتھ دیتے ہوئے اسے ٹوکا
یونہی دیوار سے ٹیک لگائے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

''چل اُٹھ جانا۔ کیوں نخرے سوجھ رہے ہیں آج تجھے؟ خوامخواہ ہمیں بھی دیر کروائے گی۔ اچھی خاص
پڑ گئی ہے۔ میں نے صبح راؤنڈ لگا کر دو شادی والے گھر تاڑ لیے تھے۔ اب تیار ہو کر سیدھے وہیں جانا ہے۔
تیار تو ہو۔'' رانی اسے لیکچر سناتے ہوئے تھوڑا سا جھنجلا کر بولی۔

''شہزادی کو رہنے دو۔ آج یہ میرے ساتھ رہے گی۔'' اس سے قبل کہ شہزادی ان لوگوں کے اصرار
جگہ چھوڑ کر تیار ہونے کے لیے اُٹھتی، کمرے میں ایک آواز گونجی۔ یہ آواز ان سب کے گرو الماس کی تھی۔

''لے جانے دیں نا گرو جی! شہزادی کو ہمیں اپنے ساتھ۔ آج بڑی کمائی کا چانس ہے۔ شہزادی سا
ہوئی تو زیادہ پیسے ملیں گے۔'' رانی نے ٹھنک کر فرمائش کی۔

''کیوں، تُو اپنا سارا ہنر بھول گئی ہے کیا جو لوگوں نے تجھ پر نوٹ نچھاور کرنے چھوڑ دیئے ہیں؟ اگر
بات ہے تو میں تجھے اپنے ڈیرے سے چلتا کرتی ہوں۔ تیری جگہ کوئی اور آ جائے گا۔'' گرو نے فوراً اسے
''ایسی کوئی بات نہیں گرو جی! رانی میں ابھی بڑا دم باقی ہے۔ میں تو بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ شہزادی
اچھا ڈھول بجاتی ہے۔ اس کے ڈھول کی تھاپ پر میں دل سے ناچتی ہوں۔'' رانی نے جلدی سے اپنی
پیش کی۔

''کوئی بات نہیں۔ آج نگار ڈھول بجا لے گی۔ پہلے بھی تو یہی بجاتی رہی ہے۔ اور تم لوگ اسی کے
پر ناچ گا کر کماتی رہی ہو۔ آج شہزادی سے مجھے کام ہے اس لیے اسے روک رہی ہوں۔ اگر تم کچھ کم بھی
لائیں تو میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' گرو نے گویا سارا مسئلہ ہی حل کر دیا پھر شہزادی سے مخاطب ہوتے ہوئے
''تُو تیار ہو جا..... آج تجھے میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔'' حکم صادر کرنے کے بعد اس نے کمرے میں
رکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

شہزادی کو گرو سے سخت نفرت تھی اور اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی حکم مانے۔ مگر ان
وجودوں کے درمیان گرو کی حیثیت ایک ظالم حکمران کی تھی جو اپنے حکم سے ذرا سی بھی سرتابی برداشت نہ
سکتا تھا۔ وہ اپنی یہاں آمد کے ابتدائی عرصے میں گرو کے بڑے مظالم سہہ چکی تھی اس لیے اب بھی دل نہ
ہوئے اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نگار نے اس کی تیاری میں مدد دی۔ اس نے
میں اپنا جائزہ لیا۔ نگار کے کیے میک اپ نے اسے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا اور آئینے میں نظر آتا عکس اسے
بجائے کسی اور کا محسوس ہو رہا تھا۔



''ہاں بھئی شہزادی! تیار ہو گئی تُو؟'' ابھی وہ آئینے میں اپنا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ گرو نے پیچھے سے آ کر
ا۔ اس نے محض اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''چل تو پھر نکل چلیں۔ ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔'' گرو نے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی مگر یہ پوچھنے کی
ورت محسوس نہیں کی کہ انہیں کہاں جانا ہے اور کون ان کا انتظار کر رہا ہے؟ اس کا یہی خیال تھا کہ گرو بھی اسے
ی خوشی کے گھر میں کمائی کے خیال سے لے جا رہا ہے۔ ویسے یہ بات کچھ خلافِ معمول تھی۔ گرو عموماً گھر میں
رہتا تھا۔ کمانے دھمانے کی ذمے داری اس کے سر پر نہیں تھی۔ ہاں اگر کہیں کوئی بڑا فنکشن ہو رہا ہو تو وہ خود
یم کے ساتھ نگرانی کے لیے ضرور جاتا تھا۔ آج نہ جانے اسے کہاں جانا تھا کہ اس نے باقی ٹیم کو ساتھ لینا
ری نہیں سمجھا تھا۔ دل ہی دل میں اُلجھتی وہ گرو کے پیچھے چلتی رہی۔ پتلی پتلی گلیوں میں سے گزر کر جہاں
جگہ گندگی کے ڈھیر لگے تھے، وہ دونوں کھلی جگہ پر پہنچے۔ یہ جگہ مین روڈ تو نہیں تھی لیکن یہاں سے رکشہ اور
ی وغیرہ آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس وقت بھی گرو نے ہاتھ دے کر ایک خالی ٹیکسی کو روکا۔

''کدھر جانا ہے سوہنڑیو؟'' ان کے قریب رکنے کے بعد ٹیکسی والے نے معنی خیزی سے پوچھا۔ یقیناً ان
ی سواریوں کو دیکھ کر اسے تفریح سوجھ رہی تھی۔

''تم چلو تو سہی، جگہ کا بھی بتا دیں گے۔'' گرو نے اس کے لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے خود ہی ٹیکسی کا
ا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا اور نروس سی کھڑی شہزادی کو بھی ٹیکسی میں بیٹھنے کا
ارہ کیا۔ اس وقت وہ عمر کے جس حصے میں تھا اُسے اس طرح کے روّیے سہنے کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ان
یوں کو کسی خاطر میں لانا غیر ضروری سمجھتا تھا۔

''اب تو بتا دو کہ کہاں جانا ہے؟ یا میں خود ہی اپنی مرضی سے کہیں لے چلوں؟'' ٹیکسی مین روڈ پر پہنچی تو
ائیور نے ایک بار پھر شوخی سے پوچھا۔

''ماڈل ٹاؤن چلو۔'' گرو نے جواب دیا۔

''اوہو، لگتا ہے کسی اونچی جگہ پروگرام ہے آج۔ جب ہی بڑے نخرے سے بات کر رہی ہو۔'' گرو کے
ے کی مسلسل بے نیازی کو محسوس کرتے ہوئے ڈرائیور نے اسے چھیڑا۔

''ہمارے اونچی نیچی جگہ پروگرام کرنے سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔ جب ہم
تمہاری ٹیکسی سے اُتریں تو اس وقت اپنا منہ کھولنا۔ تمہیں تمہارا منہ مانگا کرایہ مل جائے گا۔'' گرو نے اس بار سختی
سے اس کی بات کا جواب دیا لیکن وہ کافی ڈھیٹ انسان تھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ پھر بیک ویو مرر میں شہزادی کی طرف دیکھ کر اسے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے تیرا گرو تیرا سودا کرنے جا رہا ہے، جب ہی اتنا مغرور ہو رہا ہے۔ ہاں بھئی، آج کل تو تمہاری
م کے بھی بڑے دام چڑھے ہوئے ہیں۔ اور تُو تو ہے بھی زبردست مال۔'' اُس کی یہ بے حجابانہ باتیں سن کر
ہزادی نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی وقت ان کی ٹیکسی کے قریب
سے ایک گاڑی گزری۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ اس کے لیے شناسا تھا لیکن اس سے قبل
ہ وہ شناسا چہرے والے اس شخص کو آواز دیتی، گاڑی ٹیکسی کو اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل چکی تھی۔ دوسری
رف یہاں ٹیکسی میں بھی صورتِ حال بدل گئی تھی۔ گرو کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کا روّیہ ناقابل برداشت ہو چکا تھا
وہ نہایت غصے میں اسے ٹیکسی روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

''اتنا غصہ اچھی بات نہیں۔ غصہ کرنے سے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تم تو پہلے ہی اچھی خاصی عمر کی

ہوگئی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اتنی زیادہ جھریاں پڑ جائیں کہ یہ سرخی پاؤڈر کی تہ بھی بے کار ہو جائے۔'' وہ ہنوز ان مستی کے موڈ میں تھا اس لیے گرو کے غصے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ لیکن گرو بھی کوئی معمولی شے نہیں، اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ اپنے بھدّے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے رکھنے کے باوجود اس میں عورتوں والی کمزوری کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پیچھے سے ہاتھ ڈال کر ٹیکسی ڈرائیور کی گردن کو اپنی سخت اور کھردری انگلیوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''شرافت سے گاڑی روک دے ورنہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔'' خرمستیوں میں مصروف ڈرائیور کو انگلیوں کی گرفت اور لہجے کی سنگینی نے سمجھا دیا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے اس لیے مزید بغیر کسی حیل وحجت کے ٹیکسی روک دی۔

''تُو اس لائق تو نہیں کہ تجھے کچھ دیا جائے لیکن میں تجھے یہاں تک کا کرایہ دے ہی دیتی ہوں۔'' ٹیکسی رکنے کے بعد گرو نے فوراً نیچے اُترتے ہوئے ڈرائیور سے کہا اور کھڑے کھڑے اپنے بڑے سے پرس کو ٹٹول کر اس میں سے کرائے کے پیسے ڈھونڈنے لگا۔ شہزادی ابھی تک حیران پریشان سی ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن اس صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔

''اے شہزادی! اُتر نیچے۔ کیا اس مسٹنڈے کے ساتھ جانے کا ارادہ ہے؟'' اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر گرو نے اسے ڈپٹا تو اس نے لاک کھول کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا لیکن ابھی نیچے اُتر نہیں پائی تھی کہ ڈرائیور نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف جھک کر تیزی سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ شہزادی کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کا درمیان میں رکھا ہوا ہاتھ دروازہ بند کرنے کی وجہ سے بری طرح کچل گیا۔ ڈرائیور جو یقیناً دروازہ بند کرنے کے بعد اس سمیت ٹیکسی کو بھگا لے جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اس چیخ پر ذرا سا بوکھلا گیا۔ گرو کے لیے یہ ذرا سا وقفہ ہی کافی تھا۔ اس نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے گھسیٹا اور دونوں ہاتھوں سے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ ڈرائیور اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کے قریب سے گزرنے والی گاڑیاں اور اردگرد موجود لوگ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ایک ہیجڑے کے ہاتھوں پٹنے کا نظارہ کرنے سے زیادہ دلچسپ کام بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

''میں ہیجڑا ہوں مگر تجھ جیسے پھوس کے بنے مردوں سے نمٹنا خوب آتا ہے مجھے۔ میں تو تیرا خون پی جاؤں گی۔'' ٹیکسی ڈرائیور کو مارنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کرخت آواز میں اس سے بولتا بھی جا رہا تھا۔

''چھوڑ دو بھئی۔ اسے جانے دو۔ دیکھو تمہاری ساتھی کے ہاتھ سے کتنا خون نکل رہا ہے۔ پہلے اسے دیکھو۔'' آخر ایک سمجھ دار بڑے میاں نے آگے بڑھ کر مداخلت کی اور ڈرائیور کی جان چھڑاتے ہوئے گرو کا شہزادی کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ سے واقعی بہت خون نکل رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا حال دیکھتے ہوئے گرو نے ڈرائیور کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھر اس کی طرف لپکا۔ اپنے دوپٹے کو اس کے ہاتھ کے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور ایک دوسری ٹیکسی روک کر اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ٹیکسی والا سنجیدہ مزاج اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔ اس نے نہ تو ان دونوں کو گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اُلٹے سیدھے سوالات کر کے دماغ خراب کیا۔ بس خاموشی سے انہیں ماڈل ٹاؤن کی اس پرانی سی کوٹھی تک پہنچا دیا جس کا پتہ گرو نے دیا تھا۔ انہیں وہاں پہنچانے کے بعد وہ اپنا کرایہ وصول کر کے روانہ ہو گیا۔ گرو نے کوٹھی کے دروازے کے ساتھ لگا گھنٹی کا بٹن دبایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔



''کیا ہوا الماس! یہ بچی زخمی کیسے ہو گئی؟'' گیٹ کھولنے والے نے جو اُنہی جیسا تھا، شہزادی کے ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر فوراً پوچھا۔

''بس ایک خبیث آدمی ٹکرا گیا تھا، اس کی وجہ سے یہ مصیبت آ گئی۔'' گرو خود شہزادی کے زخمی ہونے پر بے حد رنجیدہ تھا چنانچہ اس طرح دانت کچکچاتے ہوئے بتایا جیسے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے دانتوں تلے پیس رہا ہو۔

''تم اسے لے کر اندر چلو تاکہ اس کی مرہم پٹی کی جا سکے۔'' اس کے مشورے پر گرو نے عمل کیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر گرو نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پر بندھا ہوا دوپٹہ کھولنے لگا۔ دوپٹہ کھلتے ہی ایک بار پھر خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اس دوران انہیں یہاں بھیجنے والا فرسٹ ایڈ بکس لے کر آ گیا تھا۔ اس نے اور گرو نے مل کر شہزادی کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سامان سمیٹ کر واپس فرسٹ ایڈ بکس میں رکھ رہے تھے کہ ایک لمبا چوڑا ادھیڑ عمر ہیجڑا کمرے میں داخل ہوا۔

''نمستے مہا گرو جی!'' گرو ہر کام چھوڑ کر فوراً اس کی قدم بوسی کے لیے پہنچا۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھی شہزادی نے کچھ چونک کر گرو کی طرف دیکھا۔

''جیتی رہ..... میں نے جیسا ہی سنا کہ الماس پہنچ گئی ہے، میں فوراً تجھ سے ملنے چلی آئی۔'' گرو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مہا گرو نے کہا اور پھر شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ شہزادی ہے؟..... جس کا تُو نے مجھ سے ذکر کیا تھا؟''

''ہاں مہا گرو جی! مگر بدقسمتی سے ایک بدمعاش ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے یہاں آتے ہوئے اس کا ہاتھ شدید زخمی ہو گیا۔'' گرو الماس اپنے مہا گرو کو سارا قصہ تفصیل سے سنانے لگا۔ یہ سب سناتے ہوئے اس کے لہجے میں جو دکھ اور غصہ تھا، وہ شہزادی کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس نے گرو کو ہمیشہ خود پر غصہ کرتے ہوئے ہی دیکھا تھا، اب اپنے زخمی ہونے پر اس کے افسردہ اور غضب ناک ہونے کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''چل جانے دے..... غصہ تھوک دے۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔'' مہا گرو نے ساری بات سننے کے بعد الماس کو پچکارا اور فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے اپنے دوسرے چیلے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اری او سونی! جا دودھ میں گلوکوز گھول کر لے آ۔ دیکھ تو بچی کی رنگت کیسی پیلی پڑ گئی ہے۔ گلوکوز والا دودھ پی کر اس میں ذرا جان شان آ جائے گی۔''

''ابھی لائی مہا گرو جی!'' سونی کے نام سے پکارا جانے والا ہیجڑا پھرتی سے کمرے سے باہر نکلا۔

''اب تُو اس کی طرف سے بے فکر ہو جا الماس! سونی اس کا خیال رکھے گا۔ تُو چل کر دوسرے کام دیکھ۔ میری شہزادی آج رات اس کمرے میں مہمان بن کر رہے گی۔ سویرے واپس جاتے ہوئے تُو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔'' مہا گرو، الماس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا تو تھوڑی ہی دیر میں سونی دودھ کے گلاس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ شہزادی نے اس کے ہاتھ سے دودھ لے کر پی لیا۔ دودھ پینے سے اسے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔

''تم اسی صوفے پر آرام سے لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں گی۔ کھانا کھا کر تم آرام سے سو جانا۔'' سونی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہزادی کو محسوس ہوا کہ اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی بھی لگا دی ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے اس بات کی تصدیق کی۔ واقعی دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ اسے کھول کر نہیں نکل سکتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسا گرو کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ گرو کو اس کے فرار ہونے کا خطرہ تو بہرحال لگا ہی رہتا تھا اس لیے وہ کسی بھی موقع پر احتیاط کرنے

سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی جب بھی وہ باہر نکلتی تو ملکہ، رانی اور نگار اس پر خصوصی نظر رکھتی تھیں۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابلِ اعتبار تھی جسے وہ اپنی نظروں کے پہروں میں رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے فرار کی راہ مسدود تھی چنانچہ وہ واپس صوفے پر آ بیٹھی اور پھر سونی کے مشورے کے مطابق اسی پر لیٹ کر آرام کرنے لگی۔ لیٹے لیٹے اس پر ہلکی سی غنودگی چھانے لگی لیکن اس غنودگی کے عالم میں بھی وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کمرے سے باہر اچھی خاصی چہل پہل ہے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی میں بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شاید وہاں کوئی دعوت تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گرو الماس اسے یہاں لانے کے بعد بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے کسی دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا تو اسے اس طرح ایک کمرے میں بند کیوں کر دیا تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یونہی سوتی جاگتی حالت میں سوچوں کے درمیان تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ آہٹ کی آواز پر وہ چونک کر اُٹھی۔ سونی ٹرے اُٹھائے کمرے میں آ رہی تھی۔ ٹرے لا کر اس نے میز پر رکھی اور بولی۔

"یہ تمہارا کھانا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد برتن ایسے ہی رہنے دینا اور خود آرام سے سو جانا۔ میں بعد میں آ کر برتن لے جاؤں گی۔ اس کمرے کے ساتھ اٹیچڈ باتھ روم بھی ہے۔ تمہیں اپنی کسی ضرورت کے لیے باہر نہیں نکلنا پڑے گا۔ پانی بھی اس بوتل میں بھر کر لے آئی ہوں۔ برف جما ہوا پانی ہے، بہت دیر تک ٹھنڈا ہی رہے گا۔"

اسے یہ ساری باتیں بتا کر وہ عجلت میں کمرے سے باہر نکل گئی اور حسبِ سابق دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سونی کے جانے کے بعد اس نے ٹرے میں رکھے کھانے کا جائزہ لیا۔ چکن بریانی، مٹن کڑاہی اور فرنی پر مشتمل اس کھانے کے ساتھ سلاد اور رائتے کا بھی اہتمام تھا۔ کھانا دیکھ کر اسے مزید یقین ہو گیا کہ کوٹھی میں کوئی دعوت ہو رہی ہے۔ ٹائم اچھا خاصا ہو چکا تھا اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ چنانچہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی اور ہاتھ دھو کر آنے کے بعد اللہ کا نام لے کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر ہاتھ دھونے غسل خانے میں گئی۔ اس وقت اس نے بہ غور باتھ روم کا جائزہ لیا۔ سفید ٹائلز والے باتھ روم میں صرف پانی کی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز دیوار پر موجود روشن دان تھا جس میں کوئی سلاخ وغیرہ نہیں لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ اگر وہ کسی طرح اس روشن دان تک پہنچ گئی تو اپنے دُبلے پتلے وجود کو اس میں سے گزار کر باہر کود سکتی ہے۔ فرار کا ایک امکان نظر آنے کے بعد اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ باتھ روم سے باہر آئی اور کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن گن لینے لگی۔ اس وقت باہر بالکل سناٹا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کوٹھی میں اس کے سوا کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر مزید سن گن لینے کے بعد وہ واپس باتھ روم پہنچی۔ روشن دان کی صورت میں نظر آنے والا فرار کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو اس روشن دان تک رسائی کا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس روشن دان کی دوسری طرف کیا ہے؟ وہاں سے کودنے کی کوشش میں وہ کسی کی نظر میں بھی آ سکتی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کی مشکلات مزید بڑھ جاتیں۔ گرو الماس کا ظلم اس نے صرف دیکھا ہی نہیں، سہا بھی تھا اس لیے پکڑے جانے سے بے حد خوف زدہ تھی لیکن پھر آزادی کی خواہش ہر خوف پر غالب آ گئی اور اس نے ایک کوشش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے روشن دان تک پہنچنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ روشن دان فلیش ٹینکی کے عین اوپر تھا۔ یعنی وہ فلیش ٹینکی پر چڑھ کر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ لیکن فلیش ٹینکی سے روشن دان کا فاصلہ دیکھتے ہوئے اسے یہ کام مشکل لگ رہا تھا۔ مگر وہ کوشش کیے بغیر ہار نہیں ماننا چاہتی تھی۔ چنانچہ عمل کے لیے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے



غسل خانے میں موجود بالٹی کو اُلٹ کر رکھا۔ پھر اس پر پیر رکھ کر فلیش ٹینکی پر چڑھ گئی۔ اس مختصر سی جگہ پر کھڑا ہونا آسان نہیں تھا۔ دوسرے یہ ڈر بھی تھا کہ فلیش ٹینکی اس کا وزن سہارنے سے انکار کر کے زمین بوس نہ ہو جائے۔ لیکن خیر گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹینکی کی سطح پر بہت احتیاط سے پیر جماتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ ٹکا کر آہستہ آہستہ بلند کیے۔ جلد ہی اس کی انگلیوں نے روشن دان کے چوکھٹے کو چھو لیا۔ یہاں چوکھٹے سے چھوئیں تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ہاتھوں کو پوری طرح بلند کر کے چوکھٹ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

اب اس کے پاس روشن دان تک پہنچنے کی واحد صورت یہی تھی کہ اپنے بازوؤں کی قوت آزمائے اور اچھل کر روشن دان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے یہی کیا۔ اس کی یہ پہلی کوشش بس جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ اس کا جسم ذرا سا اوپر اٹھا لیکن وہ اتنا اپنے جسم کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ روشن دان تک پہنچ پاتی۔ اب اس کی پوزیشن کچھ یوں تھی کہ وہ روشن دان کی چوکھٹ سے لٹکی تھی اور اس کے پیر دیوار پر جمنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اتنی عقل مندی ضرور کی تھی کہ اپنی سینڈلیں کمرے میں ہی اتار آئی تھی۔ پیروں میں سینڈلیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے پنجوں کو موڑ کر دیوار کا سہارا لینے میں کافی مدد مل رہی تھی۔ کچھ بچپن میں درختوں پر چڑھنے کی پریکٹس کا بھی فائدہ تھا کہ وہ اس سخت جدوجہد سے کسی نہ کسی طرح گزار رہی تھی۔ اگر سپاٹ دیوار کے بجائے یہ کوئی درخت ہوتا تو وہ اب تک اس کی چوٹی پر پہنچ چکی ہوتی۔ فی الحال تو روشن دان تک پہنچنا بھی خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ جسم کا زیادہ تر بوجھ بازوؤں پر آ جانے کی وجہ سے وہ شل ہو گئے تھے لیکن آزادی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی اور مسلسل اپنے جسم کو اچھال کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ آخر کار اس کی یہ محنت رنگ لائی اور وہ روشن دان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ اس حصے میں زیادہ روشنی نہیں تھی تاہم یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوٹھی کے باہر کا نہیں بلکہ ایک اندرونی حصہ ہے۔ بہرحال، اس حصے تک پہنچ جانے میں بھی اس بات کا امکان تھا کہ اسے باہر جانے کا موقع مل جائے گا۔

سانس درست کر لینے کے بعد اس نے دوسری طرف اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے ایک دم چھلانگ لگانے کے بجائے اس نے وہی ترکیب استعمال کی جو روشن دان پر چڑھنے کے لیے استعمال کی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ روشن دان کی چوکھٹ پر جما کر وہ اس سے لٹک گئی تھی اور پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ بلی کی طرح پنجوں کے بل زمین پر گرے تاکہ چوٹ نہ آئے۔ لیکن ظاہر ہے، اسے اس کی مشق نہیں تھی اس لیے دھپ سے زمین پر آ رہی۔ خوش قسمتی سے اس طرف دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بہ خیر و عافیت یہاں تک پہنچ جانے کا دل میں شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ لاؤنج کا کھلا حصہ تھا جہاں بید کی کرسیاں اور میز وغیرہ رکھی تھیں۔ سناٹے اور نیم تاریکی کے باعث وہ بے حد احتیاط سے دیوار کے ساتھ لگ کر آگے کی طرف بڑھی تاکہ گھوم کر اس کے سامنے والے حصے کی طرف آ سکے جہاں اس کمرے کا دروازہ تھا جس میں وہ تھوڑی دیر پہلے قید تھی۔ اس حصے میں پہنچ کر اسے کوٹھی سے باہر جانے کا راستہ ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتی ہوئی جب وہ اس مقام پر پہنچی جہاں دیوار ختم ہو رہی تھی تو ایک دم سامنے آنے کے بجائے اس نے احتیاطاً ذرا سا سر نکال کر جھانکا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ وہاں اسے سونی کے علاوہ دو تین

افراد اور نظر آئے لیکن ان میں سے کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی۔ اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر بھاگنا
سب اس سے بے نیاز ایک ایسی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ان کے اس کی طرف متوجہ ہونے کا امکان ہی
تھا۔ وہ حیران پریشان سی اس منظر کو دیکھتی رہی اور پھر ان کے دائیں طرف مڑنے کے بعد خود بھی دبے قدموں
سے اس طرف چل پڑی۔ تجسس اور حیرت نے اسے فی الوقت اپنے فرار کا خیال بھلا دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟ نہ جانے شینا کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے۔ کہیں سے
کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی۔ پوری پولیس فورس الرٹ ہے۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں
ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ لڑکیوں کے بزنس میں انوالو تمام گروہوں کو کھنگالا جا چکا ہے۔ پولیس کے مخبر
سرگرم تمام جرائم پیشہ گروہوں کی سرگرمیوں کے بارے میں چھان بین کر چکے ہیں لیکن کہیں سے بھی ایک
سا کلیو تک نہیں ملا۔'' سجاد رانا کے ڈرائنگ روم میں اس وقت وہ چار افراد جمع تھے جن کا شینا سے بے حد
رشتہ تھا۔ وہ چاروں ہی ملک کے بااختیار افراد میں شمار ہوتے تھے لیکن اس وقت چاروں ہی بڑے بے بس
رہے تھے۔

''میرے لیے تو مریم کو فیس کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شینا کے بارے میں سوال
شروع کر دیتی ہے کہ پاپا! شینا کا کچھ پتہ چلا؟ اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ آئی جی پنجاب ہونے کے
اتنا بے بس ہوں کہ اپنی نواسی کے بارے میں اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔'' مختار مراد کے چہرے پر
بے بسی تھی۔

''میرے خیال میں یہ کسی عام جرائم پیشہ گروہ کا کام ہے بھی نہیں۔ ڈرائیور کو آپ لوگ اچھی طرح
چکے ہیں۔ تفتیش کا ہر طریقہ آزمانے کے باوجود وہ اپنے بیان پر قائم ہے۔ معلومات کروانے پر اس کی
باتوں کی تصدیق بھی ہو گئی ہے۔ اس لیے یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ کسی نے اس سے ساز باز کر کے شینا کو
کیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے..... ہو سکتا ہے کہ کوئی پہلے سے
تاک میں لگا ہو کہ موقع ملے اور شینا کو غائب کر دے۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہا
اور کل صبح جب اسے شینا ایک سنسان جگہ پر تنہا گاڑی میں بیٹھی نظر آئی تو اسے اغوا کر لیا گیا۔'' شہریار نے
آرائی کی۔

''ایکسپرٹس نے بہت اچھی طرح گاڑی کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں دروازے کے ہینڈل پر شینا کے سوا
انگلیوں کے نشانات نہیں ملے بلکہ پوری گاڑی پر کہیں کسی اجنبی کے فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔ گاڑی میں کسی قسم
ابتری بھی نظر نہیں آئی جس سے خیال کیا جاتا کہ شینا کو کسی نے زبردستی گاڑی سے اُتارا ہے۔ اس کا ہینڈ
فلاور بکے اور کیک کا ڈبہ جو وہ پارٹی کے لیے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، بالکل جوں کے توں پائے گئے ہیں
''کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسی بات ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ سوچ سکیں کہ شینا کو اغوا نہیں کیا گیا
اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے؟'' سجاد رانا کی بات سن کر اس نے جھکی نظروں سے ایک نازک سوال کیا۔ و
سے یہاں آیا ہوا تھا اور شینا کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں سب کے ساتھ تھا لیکن
سے ایسا کوئی کلیو نہیں مل سکا تھا جس سے یہ گمان کیا جاتا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ ایسے میں شینا کے اپنے
سے کہیں چلے جانے والی بات خود بہ خود ہی ذہن میں آ رہی تھی۔ لیکن ایک تو وہ خود جانتا تھا کہ شینا کتنی



طبیعت کی لڑکی ہے، دوسرے ایسے کسی سوال کو زبان پر لانا بہت تکلیف دہ بھی تھا اس لیے اب تک لب نہیں
کھول سکا تھا۔ مگر ہر طرف سے ہونے والی مایوسی نے اسے اب یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''شینا کو ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سب ہی کی لاڈلی ہے اور اس کی ہر بات ہر
صورت میں مانی جاتی ہے۔ اگر وہ ہم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرتی بھی تو ہم بہت نرمی سے اسے ہینڈل کرتے۔
مگر ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ پھر بھی احتیاطاً میں اس کے تمام ملنے جلنے والوں، دوستوں اور کلاس فیلوز کو چیک
کروا چکا ہوں۔ وہ سب اس کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر ہیں۔'' سجاد رانا باپ تھے، چنانچہ یہ سمجھنے کے
باوجود کہ وہ خود بھی شینا سے ایسی ویسی کسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا ہے، اس کے سوال کے جواب میں رُکھائی
سے بولے۔

''سوری سجاد بھائی! میرے اس سوال کا کوئی غلط مطلب مت لیجئے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری شینا بہت
معصوم اور تمیز دار لڑکی ہے۔ میں نے صرف امکانات کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوال کیا تھا۔'' اس نے فوراً ہی ان
سے معذرت کی اور اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''شینا کو غائب ہوئے چھتیس گھنٹے سے زیادہ کا
وقت گزر گیا ہے۔ اگر اس اغوا کے پیچھے ایسے افراد ہوتے جو اس کو یرغمال بنا کر تاوان میں آپ سے، ماموں
جان سے یا مختار انکل سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہتے تو انہیں اس عرصے میں رابطہ کر کے اپنا مطالبہ پیش کر دینا
چاہیے تھا۔ اگر اس اغوا کے پیچھے کسی بلیک میلنگ کا امکان ختم کر دیا جائے تو دوسرا سبب انتقام ہی سمجھ آتا ہے۔
اب ہم سب کو مل کر اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارا کون سا ایسا دشمن ہے جو شینا کو اغوا کر کے ہمیں تکلیف
پہنچانا چاہتا ہے؟''

''ہمارے دشمنوں کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ اپنے پورے سیاسی کیریئر میں، میں نے بے شمار دوست
اور دشمن بنائے ہیں۔ یہی حال مختار صاحب اور سجاد کا ہے۔ ان کی فیلڈ ہی ایسی ہے جس میں دوست سے زیادہ
دشمن بنتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حد تک دشمنی میں آگے جا نکلنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بہرحال، اس
امکان کو ہم نے نظرانداز تو نہیں کیا ہے اور ہمارے بندے ہمارے مخالفین کی ٹوہ لینے کی کوششوں میں لگے
ہوئے ہیں۔ اگر کہیں سے کوئی معمولی سی بات بھی پتہ چلی تو ہمیں معلوم ہو جائے گی۔ لیکن اپنے طور پر مجھے یہ
امکان ذرا کمزور ہی لگتا ہے۔ ہمارا کوئی بھی دشمن ایسی حرکت کرتے وقت سو بار یہ ضرور سوچے گا کہ اگر ہم اپنے
بھرم تک پہنچ گئے تو اس کا اتنا برا حال کریں گے کہ نسلوں تک یہ بات یاد رکھی جائے گی۔'' لیاقت رانا جواب تک
خاموش بیٹھے تھے، نہایت سنگین لہجے میں بولے۔ ان کی یہ بات واقعی درست تھی۔ شینا کوئی معمولی لڑکی نہیں
تھی۔ ننھیال اور ددھیال، دونوں طرف کے لوگ بے حد بااختیار تھے اس لیے کسی کے لیے بھی اس پر ہاتھ ڈالنا
آسان نہیں تھا۔

''آپ نور پور بم بلاسٹ والے کیس کو بھی تو دیکھ رہے تھے انکل! کہیں اس کیس میں تو ایسی کوئی بات
سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو دباؤ میں لے کر خاموش رکھنے کی کوشش کرے؟'' اسے اچانک خیال
آیا تو اس نے مختار مراد سے پوچھا۔

''اس کیس کی تحقیقات کے نتیجے میں تمہارے ظاہر کیے شکوک کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ہمیں ایسے شواہد ملے
ہیں جن سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ واقعی اللہ آباد سے وائرلیس کے ذریعے مشکوک پیغامات بھیجے گئے ہیں اور اس
معاملے میں پڑوسی ملک کا ہاتھ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے میں مجھے دباؤ میں لینے کی کوشش کی جا سکتی
ہے۔ یہ بہت اپر لیول کا معاملہ ہے جسے اگر چھیڑا گیا تو پھر سربراہانِ مملکت کے لیول پر ہی جا کر بات ہو گی۔''

انہوں نے اس بات کا جواب دیا پھر جیسے اچانک کچھ یاد آ جانے پر چونک کر بولے۔

''ایک اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ تم نے پیر آباد کی مسجد سے مولوی غلام محمد کے ہو بہو پرنٹس اُٹھوائے تھے، وہ اللہ آباد کے مدرسے سے ملنے والے فنگر پرنٹس سے میچ ہو گئے ہیں۔ البتہ دوسرے بندے کے فنگر پرنٹس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مولوی غلام محمد بھی شاہنواز کا ہی ساتھی تھا اور اسی مشن پر کام کر رہا تھا جس پر شاہنواز تھا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ پیر آباد سے غلام محمد کے غائب ہونے کے بعد جب ہم نے اس کے بارے میں تحقیقات کروائی تھیں تو ہمیں یہی پتہ چلا تھا کہ وہ اردگرد کے کسی گاؤں تک گیا ہے لیکن گاؤں کا نام واضح طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب سمجھ آ رہا ہے کہ وہ شاہنواز سے ملنے اللہ آباد گیا ہوگا اور یہ پتہ چل جانے پر کہ اس کا شرم ناک کردار کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے، وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا اس لیے وہاں آنے پر وہاں سے نکل جانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر انکل! آپ خیال رکھیں کہ کسی طرح اسے اور شاہنواز کو تلاش کیا جا سکے۔ اللہ آباد کے دولڑکے شاہنواز اپنے ساتھ لے کر گیا ہے جن کا کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ ان لڑکوں کی طرح جانے اور بھی کتنے لڑکوں کے ذہن میں اس نے زہر بھر کر انہیں نیکی کے نام پر اس قسم کے بھیانک کاموں پر آمادہ کر لیا ہوگا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک اور سازشی ہے۔ وہ ہمارے ملک کو کھوکھلا کرنے کے لیے ہمارے ہی نوجوانوں کو استعمال کر رہا ہے۔ گاؤں دیہاتوں کے مولویوں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنا کوئی نیا ہتھکنڈا نہیں۔ جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تھا اس وقت بھی اسی طرح کی چالیں چلی گئی تھیں۔ اس میں کتنے ہی ایسے ثبوت ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ مسجدوں کے امام کے بھیس میں بھارتی جاسوس ایسی کارروائیاں کرتے رہے۔ سادہ لوح ذہنوں کو بھٹکا کر اپنے وطن اور اپنے مذہب کے خلاف کام کروا لینا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ ہندوؤں کا چالباز ذہن تو اس معاملے میں بہت ہی زرخیز ہے۔ اب جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس وقت بھی اسی طرح لوگوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔ ان کا انتخاب پسماندہ گاؤں دیہات ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے کم علم لوگوں کو تھوڑی سی ہمدردی، غلط معلومات اور خوش حالی کے خوابوں کے ذریعے آسانی سے بہکایا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ ہائی لیول پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اپنے ضلع میں تو میں خود اب بطورِ خاص اس معاملے پر نظر رکھوں گا اور کسی مذہب اور وطن کے دشمن کو مقدس شخصیت کے بھیس میں وہاں ٹِک کر کام نہیں کرنے دوں گا۔'' مختار مراد کی دی ہوئی اطلاع پر سرعت سے سارے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ حسبِ عادت جذباتی ہو چکا تھا۔ جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت جانے کیوں ایسے ہر موقع پر پس پشت چلی جاتی تھی۔

''اس معاملے کو بھی دیکھ لیں گے۔ لیکن پہلے شینا والے مسئلے کا تو کوئی حل نکلے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ مریم کے ساتھ ساتھ اب آفرین کی بھی حالت خراب ہونے لگی ہے۔ ابھی تک تو ہم ان دونوں کو تسلیاں دیتے رہے ہیں کہ جلد شینا کے بارے میں معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں جس طرح ناکامی کا سامنا ہے، اس سے تو یہی لگ رہا ہے کہ ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔'' لیاقت رانا نے اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

''اس مسئلے پر سوچتے ہوئے جو بات میری سمجھ میں آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر طرف بھاگ دوڑ کر لینے کے باوجود ہمیں ناکامی کا سامنا ہو رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم جن لوگوں پر انحصار کر رہے ہیں، ان میں سے کسی نے کوتاہی کی ہو۔ شینا کوئی سُوئی تو ہے نہیں کہ اس کے ایک بار ہاتھ سے پھسل جانے پر سراغ



ناممکن نہ رہے۔ وہ جس جگہ سے غائب ہوئی ہے وہاں بے شک کوئی دکان وغیرہ نہیں ہے لیکن چار پانچ مکانوں کے دروازے تو اسی طرف کھل رہے ہیں۔ ان مکانوں میں سے کسی کے مکین نے تو شینا کو گاڑی میں جاتا دیکھا ہوگا۔ میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور مجھے تفتیشی ٹیم کی پیش کردہ اس رپورٹ کو ماننے میں تامل ہے کہ کسی شخص نے شینا کو وہاں نہیں دیکھا۔ ڈرائیور کے مطابق اسے اپنے گھر جا کر واپس آنے میں دس بارہ منٹ لگے تھے۔ دس بارہ منٹ میں ان پانچ مکانوں میں سے ایک کے بھی مکین کا باہر نکلنے یا جھانکنے کا اتفاق نہ ہونا یہ بات ذرا مشکل ہی لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں ایک بار پھر وہیں سے شینا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''آج بھی تو ہم وہاں گئے تھے۔ تفتیشی ٹیم کے علاوہ ہم نے خود بھی تو لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا، یہ تم بھی جانتے ہو۔'' اُس کی بات سن کر سجاد رانا نے اسے یاد دلایا۔

''ہم اپنے ساتھ پولیس پارٹی لے کر گئے تھے۔ لوگ اگر کچھ جانتے بھی ہوں تو پولیس والوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں تو ہمیں سچ جاننے کے لیے کوئی غیر روایتی طریقِ کار استعمال کرنا پڑے گا۔ میں خود اس علاقے میں جاؤں گا اور اپنے طور پر لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' لیاقت رانا نے اپنا فیصلہ سنایا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ کسی بھی طریقے سے سہی، انہیں تو بس شینا کے بازیاب ہونے کی فکر تھی۔

⊛----✪----⊛

وہ بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے دبے قدموں ان لوگوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ طویل برآمدے طے کرنے کے بعد وہ آخری سرے پر موجود ایک دروازے کے قریب پہنچ کر رکے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اس کھلے دروازے سے گزر کر اندر پہنچے اور پھر دروازہ برابر کر دیا۔ وہ جوان کافی فاصلے پر تھی، دروازہ بند ہو جانے کے بعد تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی درمیانی فاصلہ طے کرنے لگی۔ وہاں میں سینڈل نہ ہونے کے باعث فرش پر اس کے قدموں کی چاپ نہیں اُبھر رہی تھی اس لیے وہ اس طرف سے بے فکر تھی کہ کوئی آواز سن کر متوجہ ہو جائے گا۔ البتہ یہ فکر ضرور تھی کہ اگر اندر جانے والوں میں سے کوئی ایک باہر نکل آیا تو وہ دھر لی جائے گی۔ لیکن خیر گزری کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ برآمدہ عبور کر کے اس دروازے تک پہنچ گئی جس کے پیچھے وہ سب غائب ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے جھری سے اندر جھانکا۔ اندر اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس بات پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا چنانچہ اس کے دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ جگہ کوئی اسٹور معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہاں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، ایک پرانی سی الماری اور دوسرا بے شمار سامان رکھا نظر آ رہا تھا۔ یہاں داخل ہونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی دوسرا دروازہ بھی ہوگا جس سے گزر کر وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے ہوں گے۔ لیکن سپاٹ دیواروں کو دیکھ کر جن میں کوئی کھڑکی موجود نہیں تھی، وہ دنگ رہ گئی۔ نکاسی کا کوئی اور راستہ نہ ہونے کی صورت میں آخر وہ سب لوگ کہاں غائب ہو سکتے تھے؟ ان کے پاس کوئی سلیمانی چادر تو تھی نہیں کہ اس میں خود کو چھپا کر غائب ہو جاتے۔ حیران پریشان نظروں سے در و دیوار کو تکتے ہوئے یک دم ہی اس کی نظر فرش پر پڑی۔ چوکور ٹائلز والے فرش پر اسے سنہری رنگ کے گوٹے، جسے کرن کہا جاتا ہے کے چند تار نظر آ رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سونی نے اسی طرح

کی کرن لگا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ کمر کے بل جھکی اور ان سنہری تاروں کو اپنی انگلیوں کی مدد سے اٹھانا چاہا
اس کی انگلیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود فرش سے یوں جڑے رہے جیسے ان کا دوسرا سرا کہیں
ہو۔ وہ حیران ہوتی ہوئی پنجوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور بہ غور اس جگہ کا جائزہ لینے لگی۔ فوراً ہی اسے اندازہ
کہ تار دو ٹائلز کے درمیان خلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دور سے دیکھنے پر اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ
ٹائلز والے اس فرش پر نظر آنے والی لکیروں میں سے ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں ٹائلز کے درمیان
لکیریں محض لکیریں نہیں بلکہ ایک معمولی سا جھری نما خلا ہے۔ اُس نے اس درمیانی خلا میں اُنگلیاں ڈال کر
لگایا تو فرش کا وہ حصہ کسی ڈھکن کی طرح اُٹھ گیا اور نیچے کی طرف جاتی ہوئی لوہے کی سیڑھی نظر آنے لگی۔
سیڑھیاں اُترتے ہوئے سونی کا دوپٹہ ڈھکن کے خلا میں اٹک گیا تھا۔ اس نے زور لگایا تو دوپٹہ تو نکل آیا
دوپٹے پر لگی کرن کے چند تار ٹوٹ کر وہیں پھنس گئے۔ ان تاروں نے اس کی خفیہ راستے تک راہنمائی کر
تجسس کی ماری وہ فرش میں ظاہر ہونے والے اس چوکھٹے خلا سے گزر کر سیڑھیاں طے کرتی نیچے اُتر
سیڑھیوں کے فوراً بعد ہی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا۔
ہال نما کمرہ تھا جس میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر بیس کے قریب افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان
کی اس کی طرف پشت تھی لیکن لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ کی جو جھلک نظر آ رہی تھی، اس سے صاف
تھا کہ وہ سب کے سب تیسری جنس کے ہی افراد ہیں۔ ان سب افراد کی توجہ اپنے سامنے موجود بڑے
چبوترے کی طرف تھی۔ اس چبوترے پر نمایاں طور پر جو چیزیں نظر آ رہی تھیں، ان میں مہا گرو، گرو الماس
ہندوؤں کی ایک دیوی کا بڑا سا مجسمہ اور اس دیوی کے قدموں میں پڑی دلہن کی طرح سرخ لباس
زیورات سے سجی ایک لڑکی شامل تھی۔ اس لڑکی کو سونی اور اس کے ساتھی اس کی نظروں کے سامنے اٹھا کر
لائے تھے۔ لڑکی بے ہوش تھی۔ اور وہ صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہی ان کے تعاقب میں اس جگہ تک آنے
مجبور ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ دُلہن بنی اس لڑکی کو کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ لڑکی نوعمر اور
تھی اور اس کے نقوش کی نرمی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ ان لوگوں کا باراتوں
میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا لیکن کسی شادی کے گھر سے سجی سنوری دُلہن کو اُٹھا لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔
وہ لوگ کس طرح اس بے چاری کو اٹھا لائے تھے اور اب اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اندر کے کمرے
منظر دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہاں کوئی اہم کارروائی ہو رہی ہے۔ گرو الماس تمام حاضرین کی طرف منہ کیے دو
ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر اسے فوراً وہ منظر یاد آیا جب اس نے گرو الماس کو نمستے کہتے
مہا گرو کے قدموں میں جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اسے اس انداز پر حیرت ہوئی تھی لیکن اپنی
کی وجہ سے وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکی تھی۔ اب جو دوبارہ اس نے اس طرح کا منظر دیکھا تو اسے یقین
کہ گرو الماس ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے ساتھیوں کو اندھیرے میں رکھ کر خود کو مسلمان ظاہر
ہے۔ چبوترے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا گرو الماس کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس تک واضح آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس
بات سننے کے لیے اس نے اپنی آنکھ چابی کے سوراخ سے ہٹا کر کان اس جگہ لگا دیا۔ اس کے کان تک گرو الماس
کی آواز پہنچنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''دیوی ماں کی کرپا سے آج میں آپ لوگوں کے سامنے شرمسار ہونے سے بچ گئی۔ اگر اتنا کشٹ اٹھا
یہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں کو نراش لوٹنا پڑتا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔ میں مہا گرو کو دیئے گئے وچن کے مطابق
یہاں خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، پر راستے میں ایک گھٹنا (حادثہ) ہو گئی اور مجھے لگا کہ ہمارا آج کا جمع ہونا بے کار



ہو گیا۔ پر دیوی ماں نے کرپا کی اور مہا گرو نے مجھے بتایا کہ دیوی ماں کو دی جانے والی بھینٹ کا انتظام ہو گیا
اب ہم دیوی ماں کے چرنوں میں بھینٹ دے کر اس سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ اپنے پجاریوں کو اس
سے بچا لے جو ہمیں اور ہمارے ماتا پتا کو اُٹھانا پڑا۔ پھر دوبارہ ہمارے دھرم کے ماننے والے کسی گھر میں
کی اولاد جنم نہ لے۔'' یہ جملہ بولتے ہوئے گرو الماس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ اس کے حساس دل نے اس
کی شدت سے محسوس کیا۔ ادھر گرو الماس کی بات جاری تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

''اب میں مہا گرو سے بنتی کروں گی کہ وہ دیوی ماں کے چرنوں میں ہم سب کی طرف سے بھینٹ
میں اور دیوی ماں کی پوجا کروائیں۔'' گرو الماس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اسے اندر سے ''اوم ہری اوم''
دیوی کی'' کے نعرے سنائی دیئے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموشی چھا جانے پر اس نے اپنا کان چابی کے
سے ہٹا کر دوبارہ سے آنکھ وہاں لگا دی۔ اسے تجسس تھا کہ مہا گرو، دیوی ماں کو کیا بھینٹ چڑھاتا ہے۔
آتے ہی اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ مہا گرو ہاتھ میں بڑا سا چھرا لیے دیوی کی مورتی کی طرف
رہا تھا۔ پھر وہ مورتی کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ میں موجود چھری وہاں بے ہوش پڑی لڑکی کے گلے پر
دی۔ فوراً ہی اس کے گلے سے خون کا فوارہ سا بلند ہوا اور مہا گرو اور دیوی کی مورتی اس خون میں نہا گئے۔
نے گھبرا کر اپنی آنکھ وہاں سے ہٹا لی۔ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر اصولاً اس کے حلق سے بلند چیخیں نکل
چاہئے تھیں لیکن وہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اُس کی آواز اندر ہی کہیں گھٹ گئی اور وہ دیوانہ وار سیڑھیاں
ہوئی واپس اوپر پہنچ گئی۔ خوف کی شدت کے باوجود اسے اس بات کا احساس تھا کہ ان لوگوں کو اُس کے
سے واقف ہو جانے کا علم نہیں ہونا چاہئے اس لیے اوپر پہنچنے کے بعد اس نے تہہ خانے میں جانے والا
راستہ بند کیا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ اب اسے کسی طرح اس کوٹھی سے بھاگ نکلنا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس
دروازے کی طرف بڑھی جس سے گزر کر وہ لوگ کوٹھی کی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا اور اس کی
مدد کوشش کے باوجود کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ یقیناً کسی بیرونی مداخلت سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے
دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ دروازے کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگی۔
کھڑکیوں کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔ اس جالی کو توڑ کر باہر نکلنا اس
کے بس میں نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ واپس اس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں اسے بظاہر
آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے قید کر دیا گیا تھا۔ کمرے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ اس نے کنڈی کھولی اور
کمرے میں چلی گئی۔ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ ان کے
راز سے واقف ہو گئی ہے۔ اگر انہیں اس کے واقفِ راز ہونے کا علم ہو جاتا تو وہ اس کی جان بھی لے سکتے تھے۔

کمرے میں آ کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا اور جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارنے لگی۔ چھپاکے
مارتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کا زخم کھل گیا ہے اور اس میں سے خون رِس رِس کر پٹی کو
بھگو چکا ہے۔ اب تک وہ ذہنی اور جسمانی طور پر جس مشقت میں مبتلا رہی تھی، اس میں اپنے ہاتھ کی چوٹ کو
بھول کر چکی تھی لیکن اب یہ تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پٹی کھول کر ہاتھ نل کے تیزی سے بہتے
ہوئے پانی کے نیچے رکھا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد خون بہنا بند ہو گیا، البتہ درد کا کوئی علاج نہیں تھا۔ گیلی پٹی
اس لائق نہیں تھی کہ اسے دوبارہ ہاتھ پر باندھا جا سکتا۔ پٹی کو وہیں پھینک کر وہ باتھ روم سے باہر نکلنے لگی تھی
الٹی رکھی ہوئی بالٹی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے جلدی سے بالٹی کو سیدھا کر کے اس کی جگہ پر رکھا اور واپس
کمرے میں آ گئی۔ اب اس کی ٹانگوں میں بالکل بھی جان نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے کی طرف

بڑھی اور اس پر ڈھیر ہوگئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن میں لڑکی کو ذبح کیے جانے کا منظر ا
تک تو وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں تھی اس لیے اس منظر کی اصل ہیبت نا کی کو پوری طرح محسوس نہیں
لیکن اب جو یہ منظر آنکھوں میں دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے پورے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی۔ کپکپاتے
ساتھ گھٹنوں کو پیٹ سے لگائے اسے کتنا وقت گزر گیا، وہ اندازہ نہیں کرسکی۔ بس اسے صرف اتنا احساس
کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اندر داخل ہونے والا بولا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ گرو الماس ہے جو سونی
رہا ہے۔

''میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دینا لیکن تُو نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ اگر
فائدہ اُٹھا کر بھاگ جاتی تو کیا ہوتا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب اسے کھانا دے کر گئی تھی تو میں نے دروازے کی باہر سے کنڈی
دی تھی۔ پتہ نہیں کیسے کھل گئی؟'' الماس کی ڈانٹ سن کر سونی نے اُلجھن زدہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''جن بھوت آئے ہوں گے یہاں کنڈی کھولنے۔ ایک تو تُو ڈھنگ سے کام نہیں کرتی، اوپر
صفائیاں بھی دیتی ہے۔'' الماس نے بگڑے ہوئے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

''جانے دے الماس! کیا ہوا جو کنڈی باہر سے کھلی رہ گئی۔ پوری کوٹھی اچھی طرح بند تو تھی۔ اگر
شہزادی اس کمرے سے نکل بھی جاتی تو یہاں سے بھاگ تو نہیں سکتی تھی۔'' اس بار مہا گرو کی آواز سنائی
اس کی مداخلت کے بعد گرو الماس کے مزید کچھ بولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ سونی کی جان
وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''یہ شہزادی اس طرح کیوں لیٹی ہوئی ہے؟ اس کا سارا بدن بری طرح کپکپا رہا ہے۔''

''ارے ہاں، دیکھو تو لڑکی کو۔ اس کی حالت تو واقعی صحیح نہیں لگ رہی۔'' الماس کے بولنے پر مہا گرو
اس طرف متوجہ ہوا۔ پھر وہ لوگ اسے چھو کر دیکھنے لگے۔

''اسے تو بڑا تیز بخار ہے، جب ہی تو اتنی بری طرح کانپ رہی ہے۔''

''جا سونی! میرا پرس لے کر آ۔ اس میں بخاری گولیوں کا پتا رکھا ہے۔ اتنی رات گئے ڈاکٹر کو تو نہیں
سکتے۔ ابھی وہی گولیاں کھلا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ صبح الماس خود ہی اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی
الماس کی بات سن کر مہا گرو نے سونی کو حکم دیا۔ سونی فٹافٹ دوا لے کر حاضر ہوگئی۔ اس نے اور الماس نے
اسے سہارے سے بٹھایا اور زبردستی دو گولیاں حلق سے نیچے اتارنے پر مجبور کر دیا۔ گولیاں کھانے کے
ایک بار پھر صوفے پر گر گئی۔ شاید ان گولیوں کا ہی اثر تھا کہ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ آرام محسوس ہونے لگا
آ گئی۔ لیکن یہ نیند بہت بے چین اور بے سکون تھی۔ بار بار چونک کر اس کی آنکھ کھلتی اور ایک خونی نظارہ
کرنے لگتا۔

⊛----✪----⊛

حسبِ پروگرام صبح وہ اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں سے شینا غائب ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے لیے
نے ایک ڈرائیور کے علاوہ کسی اور کو ساتھ نہیں لیا تھا حالانکہ سجاد رانا اور مختار مراد نے اصرار کیا تھا کہ وہ ایک
پولیس مین کو بھی اپنے ساتھ لے جائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور اب وہاں پہنچ کر لکڑی کے
پینٹ والے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک درمیانی عمر کا آدمی باہر



آدمی نے سفید رنگ کی دھوتی اور ہاف آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔ دونوں ہی چیزوں کی سفیدی کو مدھم
ہوئی پیلاہٹ سے ظاہر تھا کہ انہیں بہت کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود وہ شخص اپنے چہرے سے
ایک ایسا مزدور لگ رہا تھا جس کی مشقت، اس کی بدحالی کو خوشحالی میں تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہو۔

''مجھے شہریار عادل کہتے ہیں۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے اور آپ کے گھر والوں سے
چاہتا ہوں۔'' اس نے اس شخص سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیسا ضروری کام؟'' وہ شخص حیران ہوا۔

''دو دن پہلے یہاں سے ایک لڑکی غائب ہوئی تھی۔ میں اس کے بارے میں آپ لوگوں سے کچھ
مات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بے حد نرم لہجے میں بتایا۔ بحیثیت انسان اگر کسی کم حیثیت شخص سے
اور عزت سے مخاطب ہو تو اس کی بات زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح
سمجھتا تھا۔

''ہم لوگ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو ہم پہلے ہی پولیس
کو بتا چکے ہوتے مگر جانے کیوں آپ لوگوں کو یقین نہیں آتا۔'' اس شخص نے اس کی بات کے جواب میں
لہجے سے بے بسی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''میں یقین کر لوں گا مگر اس صورت میں کہ آپ مجھے ایک بار اپنے تمام گھر والوں سے مل کر بات کرنے
اجازت دے دیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ اندر آ جائیں۔'' وہ شخص اس کے اصرار پر بادل ناخواستہ پیچھے ہٹ کر اسے اندر کا راستہ
دیتے ہوئے بولا۔ جس شد و مد سے پولیس وہاں پوچھ گچھ کرتی رہی تھی اور مختلف باحیثیت افراد کا آنا جانا لگا رہا
اس سے علاقہ مکینوں کو اس بات کا تو بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ غائب ہونے والی لڑکی کسی بڑی
حیثیت کی بیٹی ہے۔ اب وہ اس بارے میں معلوم کرنے وہاں پہنچا تو اس کی شخصیت اور عقب میں باوردی
ڈرائیور کے ساتھ کھڑی بیش قیمت گاڑی کو دیکھ کر بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی بااثر شخصیت ہے،
اس لیے اس شخص نے اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اجازت ملنے پر وہ اس شخص کے
ساتھ گھر میں داخل ہوگیا۔ گھر کافی چھوٹا تھا جس کے مختصر سے صحن میں پڑے تخت پر بیٹھے افراد ناشتہ کرنے میں
مصروف تھے۔ ان افراد میں مرد سے چار پانچ برس چھوٹی ایک عورت، دو نوجوان لڑکیاں اور ایک سات آٹھ
سال کا لڑکا شامل تھے۔ وہ سب افراد اسے اندر آتا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''میرے سارے گھر والے اس وقت یہیں ہیں۔ آپ کو جو بھی گل کرنی ہے، کر لیں۔'' مرد نے ایک سال
خوردہ سی لکڑی کی کرسی اسے بیٹھنے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ان لوگوں پر ایک نظر
ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی۔ مگر میری مجبوری ایسی ہے کہ میں
آپ لوگوں کو زحمت دیئے بغیر وہ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری بہت معصوم اور کم عمر بھتیجی آپ کے گھر کے قریب سے
غائب ہوگئی ہے۔ میری اور میرے گھر والوں کی تکلیف کا آپ لوگ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تقریباً میری
بھتیجی ہی کی عمر کی لڑکیاں اس گھر میں بھی موجود ہیں۔ اگر آپ اپنی بیٹیوں کو سامنے رکھیں تو آپ کو ہماری
تکلیف اور پریشانی کا احساس ہو جائے گا۔ بے شک پولیس آپ لوگوں سے پوچھ گچھ کر چکی ہے اور آپ انکار کر
چکے ہیں کہ آپ کو کچھ خبر نہیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پولیس والوں کو کچھ بھی بتاتے ہوئے شریف لوگ

گھبراتے ہیں کہ کہیں خوامخواہ تھانے کچہری کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔ اس وقت میری یہاں آمد کا اس
مقصد ہے کہ آپ لوگوں سے انسانیت کے نام پر اپیل کرسکوں کہ اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دیں۔ میرا
ہے کہ آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ جو کچھ آپ مجھے بتائیں گے، میں بس وہ یاد رکھوں گا
قطعی بھول جاؤں گا کہ مجھے یہ سب بتانے والا کون ہے۔''

وہ دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں پر اس کے لہجے کا اثر ہو رہا ہے او وہ سب ہمدردی سے اس کی بات سن
ہیں۔ ایک پل کے لیے اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے
کیے ہوں مگر پھر وہ لب بھینچ گئی اور سر جھکا لیا۔ وہ بہ غور اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ اس
نظر کے زاویے کو محسوس کرتے ہوئے عورت جو کہ یقیناً ان بچوں کی ماں تھی، زور سے کھنکھاری اور ذرا بلند
میں بولی۔

''صاحب! میں نے پہلے بھی بتایا تھا اور اب پھر بتا رہی ہوں کہ یہاں کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا
والا مزدوری کرتا ہے اور سویرے ہی گھر سے نکل پڑتا ہے۔ تینوں بچے بھی سویرے ہی اسکول چلے جاتے ہیں
پیچھے میں اکیلی گھر کے کام کاج کرنے کو رہ جاتی ہوں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھے فرصت ہی نہیں
کہ دروازے سے باہر جھانک بھی سکوں۔ اگر آپ دس پندرہ منٹ بعد یہاں آتے تو آپ کو گھر پر میرے
کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ بتائیں کہ جس وقت آپ کی بھتیجی اس جگہ سے غائب ہوئی، یہاں کون بیٹھا تھا کہ
دیکھ سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کون اسے لے گیا؟''

''ٹھیک ہے محترمہ! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرا یہ کارڈ
رکھ لیں۔ اس پر میرا فون نمبر درج ہے۔ اگر کسی وقت آپ کو میری انسانیت کے نام پر کی گئی اپیل کا خیال
جائے تو اس نمبر پر فون کر کے مجھے اطلاع دے سکتی ہیں۔'' اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر عورت کے قریب
تخت پر رکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ واپس لوٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پر لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی،
وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو وہ جلدی سے چہرے کا رخ موڑ گئی۔ اسے شدت سے احساس
ہوا کہ شاید یہ لڑکی کچھ جانتی ہے لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ زبردستی تو اس سے کچھ نہیں اُگلوا سکتا تھا۔ چنانچہ ان
لوگوں سے زحمت دینے پر ایک بار پھر معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا اور دوسرے مکان کا رخ کیا۔ ایک در
مایوس ہو جانے کے باوجود وہ ہمت چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس دوسرے مکان میں ایک سبزی فروش اپنی
نوجوان بیوی، چند ماہ کے جڑواں بچوں اور شدید بیمار ماں کے ساتھ مقیم تھا۔ سبزی فروش صبح نور کے تڑکے سبزی
منڈی روانہ ہو چکا تھا اور اس کی نوجوان بیوی جڑواں بچوں اور بیمار ساس کو سنبھالنے میں جس بری طرح ہلکان
ہوئی جا رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے واقعی یقین کیا جا سکتا تھا کہ اسے گھر سے باہر جھانکنے کی تو کیا، سر کھجانے کی
بھی فرصت نہیں ملتی ہو گی۔ تیسرے گھر میں ڈھیر سارے افراد مقیم تھے۔ اس گھر میں اڈے پر کپڑوں پر زری،
ستاروں، کلابتو اور سلمے وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا۔ گھر کا چھوٹا بڑا ہر فرد اس کام میں حصہ ڈالتا تھا۔ وہ جب اس گھر
میں داخل ہوا تو تب بھی وہاں کام جاری تھا اور سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ ایک بار پھر مایوسی کا منہ
دیکھنے کے بعد وہ اس گھر سے باہر نکلا۔ اب بس ایک ہی گھر رہ گیا تھا جہاں سے کچھ معلوم ہونے کا موہوم سا
امکان تھا۔ البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ جس پہلے گھر میں گیا تھا، ان لوگوں کو یا کم از کم اس لڑکی کو تو ضرور
کچھ نہ کچھ معلوم تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اپنے لب سی لیے تھے۔ اگر آخری مکان سے بھی اسے کچھ معلوم نہ
ہو پاتا تو پھر اس کے پاس یہی چارہ رہ جاتا تھا کہ پہلے گھر کے مکینوں سے سختی سے باز پرس کر کے وہ سب اُگلوا



چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چوتھے گھر کی طرف قدم بڑھانے سے قبل اس نے مڑ کر پہلے گھر کی
دیکھا۔ اسے وہی لڑکی مکان کی چھت پر نظر آئی۔ چھت پر تقریباً چار فٹ کی دیوار اُٹھی ہوئی تھی اور وہ لڑکی
کے پیچھے کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے ہاتھ سے اسے رکنے کا
اور دیوار کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تیس پینتیس سیکنڈز بعد اس کا چہرہ دوبارہ دیوار کے پیچھے سے اُبھرا اور
ہاتھ گھما کر اس کی طرف کچھ پھینکا۔ پھینکی گئی وہ شے اس کے قدموں کے قریب آ کر گری۔ جبکہ لڑکی فوراً
ہو گئی۔ اس کے لیے یہ بہت آکورڈ سچویشن تھی۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا تھا اور بظاہر اس سے بے نیاز
وہ جانتا تھا کہ وہ اچھی طرح اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بہرحال، اس وقت اسے اپنی پوزیشن سے
کے بارے میں جاننے کی فکر تھی۔ اگر یہ فکر نہ ہوتی تو وہ اس طرح ایک ایک گھر کے دروازے کو کھٹکھٹا
لوگوں سے تعاون کی درخواست کیوں کرتا؟ اپنے خاندان کے تمام تر اختیارات کے باوجود ہاتھ آنے
نے تو اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ لوگوں پر حکم صادر کرنے کے بجائے ان سے درخواستیں
رہا تھا۔ اس وقت پیش آنے والی آکورڈ سچویشن کو بھی اس نے شینا کی خاطر قبول کر لیا اور جھک کر اپنے
میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر سے بندھے تہ شدہ کاغذ کو اٹھا لیا۔ کاغذ کو کسی تعویذ کے مانند بہت
سائز میں فولڈ کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ پتھر باندھ دیا گیا تھا جو یقیناً اس لیے تھا کہ کاغذ اپنی بے وزنی
سے مطلوبہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہ پہنچ جائے۔ پتھر سے بندھے اس کاغذ کو اٹھانے کے بعد اس نے
سمجھا کہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ یہاں کھڑے کھڑے اس کاغذ کو کھول کر پڑھنا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کہیں
کوئی شخص نکل کر آ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور پتھر علیحدہ کرنے کے بعد کاغذ کی
کھولنے لگا۔ ڈرائیور کو اس نے گاڑی چلانے کا اشارہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ اس کے حکم کا منتظر ہونے کے
بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

کاغذ پوری طرح کھل گیا تو اس پر نیلی روشنائی سے لکھی تحریر نظر آنے لگی۔ لکھنے والی کی لکھائی خراب نہیں تھی
کہیں کہیں سے بگڑ جانے والے الفاظ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے بہت عجلت میں یہ سب لکھا
بغیر کسی القاب کے شروع ہونے والی اس تحریر کا متن کچھ یوں تھا۔

''مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ اماں نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا
زبان نہ کھولنا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں گھر بتاؤں اور پولیس والوں کے سوال جواب کا سامنا کروں۔ لیکن
آپ نے جس دکھ بھرے انداز میں تعاون کی درخواست کی، اسے سن کر میرا دل تڑپ اُٹھا۔ پولیس والے تو
بدتمیزی اور سختی سے پوچھتے تھے اس لیے میں نے ڈر کر ان کے سامنے کچھ نہیں کہا۔ اب بھی آپ کو اس
کے ساتھ سب کچھ بتا رہی ہوں کہ میرا کہیں ذکر نہیں ہو گا۔ دو دن پہلے جب آپ کی بھتیجی اغوا ہوئی تھی،
دن میں نے اتفاق سے اسکول کی چھٹی کی تھی اور کپڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی۔ کپڑے پھیلاتے
میں نے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے ایک شاندار سی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس گاڑی میں ایک لڑکی بھی
ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ اتنی اچھی سی گاڑی اور لڑکی یہاں کہاں سے آ گئی؟ میں چھت پر کھڑی
گردن دیکھتی رہی کہ دیکھوں تو یہ گاڑی کس کے گھر آئی ہے۔ اسی وقت مجھے دو تین وہ افراد اس طرف آتے نظر
جو نہ ''ہی'' میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ''شی'' میں۔ ان لوگوں نے گاڑی کے قریب آ کر بھیک مانگی۔ اب
نہیں معلوم کہ کیوں مگر گاڑی میں بیٹھی وہ لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور ان لوگوں سے کوئی بات کرنے
لگی۔ ان میں سے ایک فرد نے بات کرتے کرتے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر آس پاس کسی کو نہ پا کر اپنے تھیلے

میں سے ایک بڑا سا چھرا نکال لیا۔ پھر چھرے کے زور پر وہ اس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ کہیں لے گئے۔ چھت پر سے یہ سب دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہیں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی اور بھاگتی ہوئی نیچے آ گئی۔ اماں کو میں نے ساری تفصیل بتائی۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا لیکن گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے مجھے سمجھایا کہ میں اس بارے میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ ہم لوگ بھی کسی چکر میں پھنس سکتے ہیں۔ اماں کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن اب آپ کو بتا رہی ہوں۔ جو لوگ آپ کی بیٹی کو لے گئے ہیں، میں انہیں نہیں پہچانتی۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، وہ سب میں نے آپ کو بتا دیا۔ ان معلومات کی روشنی میں آپ اپنی بھتیجی کو ڈھونڈ سکتے ہیں تو ڈھونڈ لیں۔ مگر برائے مہربانی دوبارہ میرے گھر کا رخ مت کیجیے گا۔ یہاں آ کر آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گی۔'' ان الفاظ پر آ کر تحریر ختم ہو گئی تھی۔ جس طرح تحریر کے شروع میں القابات موجود نہیں تھے، اسی طرح اختتام پر بھی کسی کا نام موجود نہیں تھا۔

''گھر چلو۔'' پوری تحریر پڑھنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو حکم دیا اور خود صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ اس نے بتایا تھا کہ شینا گاڑی سے اُتر کر ان لوگوں سے گفتگو کرنے لگی تھی، تب اسے چھرا دکھا کر اغوا کر لیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ شینا گاڑی سے اُتری ہی کیوں تھی؟ اسے ان لوگوں میں کیا دلچسپی تھی؟ ان ہی سوچوں میں گم وہ سجاد رانا کے گھر پہنچ گیا۔

''کیا ہوا؟..... کچھ معلوم ہوا شینا کے بارے میں؟'' وہ لاؤنج تک ہی پہنچا تھا کہ مریم اسے دیکھ کر سوال کرنے لگی۔ وہ بہت نک سک سے رہنے والی خاتون تھیں لیکن شینا کے دکھ نے انہیں اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ انہیں لباس بدلنے کا ہوش تھا اور نہ ہی بال سنوارنے کا۔ ان چند دنوں میں ہی ان کے چہرے کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی اور وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھیں۔

''ایک کلیو تو ہاتھ آیا ہے۔ انشاء اللہ اس کی مدد سے ہم جلد شینا کو کھوج نکالیں گے۔'' اس نے اپنی جیب سے کاغذ نکال کر وہیں پر موجود سجاد رانا کے حوالے کیا۔ وہ کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگے۔ مریم بھی ان کے قریب ہی بیٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگی۔

''اوہ گاڈ!..... میں سمجھ گئی کہ شینا کیسے ان لوگوں کے ہتھے چڑھی۔ اسے اپنے اسکول کے اینول فنکشن میں ایک پلے میں خواجہ سرا کا رول پرفارم کرنا تھا۔ وہ یقیناً اسی سلسلے میں انفارمیشن حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں سے بات چیت کرنے کے ارادے سے گاڑی سے اُتری ہو گی اور وہ بدبخت اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سجاد! آپ فوراً آرڈر دیں کہ ان لوگوں کے قبضے سے میری بچی کو برآمد کیا جائے۔'' تحریر پڑھنے کے بعد مریم جوش سے بولی تو اُس کی اس اُلجھن کا جواب مل گیا کہ شینا گاڑی سے کیوں اُتری تھی۔

''میں ابھی آرڈر کرتا ہوں کہ شہر میں خواجہ سراؤں کے جو گروہ مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، فوری طور پر ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے اور مشکوک گروہوں کے خلاف ایکشن لیا جائے۔'' کلیو ہاتھ آنے پر سجاد رانا خود بھی جوش میں آ گئے اور اپنے ارادے پر عمل درآمد کے لیے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر فوری طور پر فون ڈائل کرنے کے بجائے شہریار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''کیا خیال ہے شیری! میں اس خط والی لڑکی کو بھی تھانے بلوا لوں؟ اُس نے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو نہیں پہچانتی۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ ان کے حلیے تو بتا سکتی ہے۔''

''نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہو گا۔ میری انسانیت کے نام پر کی گئی درخواست کے نتیجے میں اس لڑکی کا گھر



والوں سے چھپ کر مجھے یہ اطلاع دی ہے اور اطلاع دینے کے ساتھ یہ وعدہ بھی چاہا ہے کہ اس کے بارے میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہو گا۔ اس لڑکی کا احسان تسلیم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ ہمارا اسے تھانے بلوانا اس کے لیے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی ہے، وہاں لڑکیوں کو پہلے ہی بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ ہم اس کے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیں، یہ کچھ مناسب نہیں ہو گا۔'' اس نے ان کی تجویز کی مخالفت کی۔

''اوکے! اگر تم کہتے ہو تو رہنے دیتے ہیں۔'' انہوں نے فوراً اس کی بات مان لی۔ شاید اپنی بیٹی کی جدائی میں ان کے دل کو زیادہ نرم کر دیا تھا جو وہ کسی اور لڑکی کی مشکل کو آسانی سے سمجھ گئے۔ ورنہ پولیس کی ملازمت کرتے وہ خود اچھے خاصے سخت مزاج ہو چکے تھے۔

⊛----✪----⊛

کروٹ کے بل لیٹی وہ ایک ٹک نگار کو دیکھ رہی تھی۔ میک اپ، ہار بُندوں اور چمکیلے بھڑکیلے کپڑوں سے عاری اس وقت وہ بہت ہی سادہ حلیے میں بڑی سی سفید چادر اوڑھے نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہاں رہنے والی وہ واحد ہستی تھی جو اتنی باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھی۔ اگر کسی مصروفیت کی وجہ اس کی کوئی نماز رہ بھی جاتی تو وہ بعد میں قضا نماز ضرور ادا کرتی تھی۔ ابھی ظہر کا وقت تھا اور اس وقت عموماً وہ لوگ گھر میں ہی رہتے تھے اس لیے وہ بہت اطمینان سے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز مکمل کرنے کے بعد اس نے دعا کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر اُٹھنے والی جائے نماز تہ کر رہی تھی کہ اس پر نظر پڑ گئی۔ جائے نماز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب آئی اور اس پر پھونک مارنے کے بعد پوچھنے لگی۔

''اب کیسی طبیعت ہے میری شہزادی کی؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر خود ہی بولتی رہی۔ ''تُو نے تو ڈرا کر ہی رکھ دیا تھا۔ اتنا تیز بخار، اوپر سے بار بار ڈر کر اُٹھ جانا۔ ہم لوگ تو گھبرا ہی گئے کہ جانے کیا ہو گیا تجھے؟ شکر ہے اللہ کا کہ آج تیری طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ ہسپتال جا کر دوا لانا کوئی آسان کام ہے ہم لوگوں کے لئے؟ لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں جیسے مذاق اُڑاتے ہیں جیسے ہم انسان ہی نہیں کہ ہمیں بھی بیمار پڑنے پر دوا دارو کی ضرورت پڑے۔'' اس کے لہجے میں وہی دُکھ تھا جو ازل سے ان جیسے لوگوں کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔

''تم تو مجھے کسی بہت اچھے گھر کی لگتی ہو نگار! تم کیسے یہاں پہنچ گئیں؟'' اس نے نگار سے پوچھا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ میرا گھرانہ بڑا اچھا تھا۔ سارے نمازی پرہیزگار، خیرات زکوٰۃ دینے والے لوگ تھے۔ میں بھی بچپن میں ہی نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن بچپن تو کسی خواب کی طرح فوراً ہی گزر گیا اور پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے شرمندگی اور مشکلات کا سبب بن رہی ہوں۔ بس پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دل پر جبر کر کے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور میں یہاں گرو کے پاس پہنچ گئی۔'' اس نے اپنی بے بسی اور بے کسی کی داستانِ حیات چند جملوں میں کہہ سنائی۔

''تمہیں گرو کے ساتھ رہنے میں مشکل نہیں ہوئی؟..... میرا مطلب ہے وہ اتنا سخت، اکھڑ اور بے دین سا ہے۔ تم اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرتی ہو؟''

''مجبوری انسان سے سب کچھ کروا لیتی ہے۔ اگر میں گرو کے ساتھ گزارہ نہ کروں تو پھر کہاں جاؤں؟ سر چھپانے کا ٹھکانہ ملا ہوا ہے، یہ بہت ہے۔'' اس کے لہجے میں قناعت پسندی تھی۔

''گرو نے تمہیں کبھی نماز پڑھنے سے روکا نہیں؟ وہ خود تو ہندو ہے، ایسے لوگ کب پسند کرتے ہیں کہ
کے سامنے کوئی نماز روزہ کرے۔'' نگار کے لیے یہ انکشاف تھا۔ وہ حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی اور
ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا کہا تم نے؟ گرو ہندو ہے..... تمہیں کیسے معلوم ہوئی یہ بات؟''

''اس دن جب وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا، تب میں نے اس کا اصل روپ دیکھا۔ وہ جتنا بھیانک
آتا ہے، اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور ظالم ہے۔'' یہ جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز بری طرح کپکپا گئی
جسم بھی ہلکے ہلکے لرزنے لگا۔

''مجھے پوری طرح بتا شہزادی! کہ اس روز جب تُو گرو کے ساتھ گئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ گرو تجھے کہاں لے
تھا؟ تُو نے وہاں کیا دیکھا جو تیری ایسی حالت ہوگئی؟'' نگار نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''گرو انسان نہیں، شیطان ہے۔ وہ سارے شیطان ہیں۔ انہوں نے اس معصوم لڑکی کو.....'' وہ
اور سسکیوں کے درمیان وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی جو اس نے ماڈل ٹاؤن کی اس پرانی سی کوٹھی کے تہ خانے
دیکھا تھا۔ نگار آنکھیں پھاڑے یہ داستان سنتی رہی۔ داستان کے اختتام تک اس کی حالت بہت بری ہو
تھی۔ نگار کو لگا کہ اس کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہوش کر شہزادی! سنبھال خود کو۔ تیری آواز سن کر کہیں وہ لوگ یہاں نہ آ جائیں۔'' اس نے اسے احساس
دلایا پھر لپک کر ایک گلاس میں پانی بھر لائی اور اسے سہارا دے کر بٹھانے کے بعد گلاس اس کے ہونٹوں سے
دیا۔ دو تین گھونٹ پینے کے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلنے لگی۔

''چل آرام سے لیٹ جا۔ میں یہیں ہوں تیرے پاس۔ تیرا سر دبا دیتی ہوں۔ ملکہ اور رانی، باورچی
خانے میں کھانا پکا رہی ہیں۔ کھانا پک جائے تو پھر میں تجھے لا کر کھلاتی ہوں۔ اتنی کمزور ہوگئی ہے تُو۔ ڈھنگ
سے کچھ کھائے گی، پیئے گی، تب ہی جسم میں جان آئے گی۔'' نگار مسلسل بول رہی تھی اور اس کا دھیان بٹانے کی
کوشش کر رہی تھی۔

''گرو کہاں ہے؟'' وہ تھوڑی دیر خاموش لیٹی رہی پھر نگار سے پوچھا۔

''سویا پڑا ہے۔'' نگار کے لہجے میں گرو کے لیے واضح نفرت اور بے زاری تھی۔ ایک تو اس کا اپنی شناخت
چھپا کر ان لوگوں کو دھوکے میں رکھنا اور اس پر سے شہزادی کا بیان کردہ واقعہ..... گرو کے لیے اس کے دل میں
نفرت پیدا ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ اس کا سر دباتے ہوئے وہ اپنی گرو کے لیے نفرت کا اظہار کرنے لگی۔

''گرو کے کرتوت تو مجھے شروع سے پسند نہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ وہ ملکہ اور رانی کو گانے بجانے کے
دوسرے دھندے کے لیے بھیجتا ہے۔ یہ جو دونوں کبھی کبھی پوری رات گھر واپس نہیں آتیں تو اسی دھندے
ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے بدبخت اور حرام کاریاں کرنے والے پڑے ہوئے ہیں یہاں اور گرو جیسے لوگ ان
مدد کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس نے اس لائن پر لانے کی کوشش کی تھی لیکن میں مار کھا کر بھی راضی نہیں ہوئی تو
میرے حال پر چھوڑ دیا۔ پر اب اس کا اصل روپ جان کر میرا بھروسہ اُٹھ گیا ہے۔ ہندوؤں کے سازشی ذہن
کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کیا کر جائیں۔ مجھے تو رہ رہ کر اس معصوم لڑکی کا خیال آ رہا ہے جسے ان ظالموں
اپنی دیوی ماں کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا۔ معلوم نہیں کس کے جگر کا ٹکڑا ہوگی بے چاری۔ کیسے
ہیں..... انسان کہلانے کے تو لائق ہی نہیں یہ لوگ۔''

''کیا کر رہی ہو تم دونوں؟ کیا باتیں چل رہی ہیں تمہارے درمیان؟'' اچانک ہی گرو وہاں چلا آ



لہجے میں ان دونوں سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں گرو! شہزادی کے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے میں اس کا سر دبا رہی تھی۔'' نگار نے جواب دیا۔

''بس بہت نخرے اٹھا لیے اس کے۔ اس سے کہو کہ اب پلنگ کی جان چھوڑے اور کچھ کمانے دھمانے کی
کرے۔ ہم نے کوئی اس کے ناز نخرے اُٹھانے کے لیے اسے یہاں نہیں رکھا ہوا۔'' گرو بولتا رہا اور وہ دونوں
کرسنتی رہیں۔

⊛----✪----⊛

''کیا اطلاع ہے سجاد بھائی! کچھ معلوم ہوا شینا کے بارے میں؟'' وہ اپنی آفیشل مجبوریوں کی وجہ سے
سے واپس آ گیا تھا۔ اس کے ضلع میں کئی مسائل تھے جن پر توجہ دینا ضروری تھا اس لیے اس کا مزید لاہور
رُکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''کہاں یار! کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا۔ اتنے دنوں میں بس اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ خواجہ سراؤں کا ایک
گروہ مسلسل اپنے ٹھکانے سے غائب ہے۔ شینا کے اغوا اور اس گروہ کے غائب ہونے کا عرصہ ایک ہی ہے۔
اس لیے مجھے یقین ہے کہ شینا کے اغوا میں یہی گروہ انوالو ہے لیکن پورا کا پورا گروہ اُٹھ کر کہاں چلا گیا، کچھ
معلوم نہیں ہو رہا۔ اب میرے پاس یہی چارہ رہ گیا ہے کہ ایسے تمام گروہوں کے ٹھکانوں پر چھاپے پڑواؤں۔''
انہوں نے افسردہ انداز میں اسے بتایا۔

''دیر کس بات کی ہے؟ آپ فوراً اس پروگرام پر عمل شروع کر دیں۔'' اس نے مشورہ دیا

''مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے۔ لیکن تم اندازہ کرو کہ پورے لاہور میں خواجہ سراؤں کے کتنے گروہ
کام کر رہے ہیں۔ ان کی اکثریت ایسے علاقوں میں رہتی ہے جو پیچ در پیچ گلیوں پر مشتمل ہیں۔ ایسے گروہ تک
پہنچنا، اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور پھر کوئی ایکشن لینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک باپ کی
حیثیت سے مجھے جتنی پریشانی ہے، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ لیکن پولیس فورس کو جو مشکلات درپیش ہیں، وہ
بھی میرے علم میں ہیں۔ مگر اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے شہر کی ایک ایک اینٹ بھی اُکھاڑنی پڑی تو میں
اس سے گریز نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی بیٹی ہر حال میں چاہئے۔'' وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہے تھے مگر آخر
میں تھوڑے جذباتی ہو گئے۔

''انشاء اللہ ہمیں ہماری شینا ضرور ملے گی۔ آپ پُر امید رہیں اور مریم بھابی کو حوصلہ دیتے رہیں۔ میں
فرصت ملتے ہی جلد لاہور کا چکر لگاؤں گا۔''

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی فوراً گھنٹی بجنے لگی۔

''پیر آباد کے ماسٹر آفتاب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں سر!'' ریسیور اٹھانے پر دوسری طرف سے
اطلاع دی گئی۔

''ٹھیک ہے۔ بات کرواؤ۔'' اس نے اجازت دی۔

''السلام علیکم سر!'' دوسری طرف سے ماسٹر آفتاب کی آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام!..... کیا حال ہے آفتاب؟ کیسے یاد کیا؟'' اگرچہ اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا اور وہ کوئی غیر ضروری
کال سننے کے موڈ میں نہیں تھا پھر بھی ماسٹر آفتاب جیسے پُرخلوص شخص سے بداخلاقی سے پیش نہیں آ سکتا تھا۔

''الحمدللہ میں بہت بہتر ہوں۔ بس آپ کو انڈسٹریل ہوم والے پروجیکٹ کے سلسلے میں یاد دہانی کروانے

کے لیے زحمت دی تھی۔ آپ نے اس کا تذکرہ تو کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی۔''

''ساری تیاری ہو چکی ہے۔ مشینوں وغیرہ کے ساتھ آج میں خود پیر آباد آؤں گا۔ مجھے چودھری افتخار سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ انڈسٹریل ہوم کا افتتاح میں حویلی کی کسی خاتون کے ہاتھ سے کرانا چاہ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں چودھری صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

''یہ تو آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے سر! اس طرح انڈسٹریل ہوم کو مضبوط بیک مل جائے گی۔ یہ چودھری کا چوکیدار بنانے والی بات ہے۔ حویلی کے کسی فرد کے ہاتھوں افتتاح ہونے کا مطلب ہوگا کہ پھر اس طرف سے کوئی مخالفت سامنے نہیں آئے گی۔'' آفتاب نے فوراً ہی اس کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اس کے فیصلے کو سراہا۔ مزید بولا۔ ''اب تو آپ پیر آباد آ ہی رہے ہیں، ملاقات ہونے پر مزید گفتگو ہوگی۔''

''نہیں بھئی۔ میں تمہاری طرف نہیں آسکوں گا۔ میرے لوگ سامان پہنچا دیں گے۔ تم اپنی نگرانی میں سیٹنگ کروالینا۔ میں حویلی میں چودھری افتخار سے ملاقات کر کے واپس آجاؤں گا۔''

''چلیں، آج نہ سہی پھر دوبارہ کسی موقع پر ملاقات ہو جائے گی۔'' آفتاب کو اس کا پروگرام سن کر تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی لیکن وہ خوش دلی سے بولا۔ اس نے جواباً مسکراتے ہوئے ''انشاء اللہ'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ شیڈول کے مطابق ایک گھنٹے بعد اس کی پیر آباد کے لیے روانگی تھی۔ یہ ایک گھنٹہ ضروری نوعیت کے کام نمٹاتے ہوئے گزر گیا۔

⊛----✪----⊛

چودھری افتخار کی حویلی میں اس کا استقبال ذرا سی حیرت کے ساتھ کیا گیا۔ اسمگلنگ والا معاملہ منظر عام پر آنے کے بعد سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ دو الگ الگ کیمپس کے افراد ہیں۔ اگرچہ اس معاملے میں چودھری کا نام کھل کر نہیں لیا گیا تھا لیکن حقیقت تو دونوں ہی طرف کے افراد سمجھتے تھے۔

''آیئے جناب اے سی صاحب! آپ کو کیسے فرصت ملی ہمارے غریب خانے کو رونق بخشنے کی؟'' چودھری نے طنزیہ لہجے میں اس کا خیر مقدم کیا۔

''فرصت تو واقعی نہیں ہے میرے پاس مگر آپ سے ملاقات کے لیے آنا بھی اس بے تحاشا مصروفیت کا ایک حصہ ہے۔'' اس نے رسان سے چودھری کے طنز کا جواب دیا۔ چودھری کی اس علاقے میں حیثیت مسلمہ تھی۔ اس کو ساتھ لے کر چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ عوامی بھلائی کی خاطر اپنی چودھری کے لیے تمام ناپسندیدگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے ملنے آ گیا تھا۔

''زہے نصیب..... فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کا جواب سن کر چودھری نے اسی طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم اسکول کے ساتھ انڈسٹریل ہوم کا آغاز کر رہے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم ظاہر ہے خواتین کے لیے کھولا جا رہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اس کا افتتاح علاقے کی ہی کسی معزز خاتون کے ہاتھوں سے کرایا جائے۔ اس سلسلے میں ایس پی صاحب کی بیگم کا نام زیر غور آیا تھا لیکن پھر اس خیال سے رد کر دیا کہ علاقے میں آپ کے گھرانے سے زیادہ با اثر کوئی اور نہیں ہے..... اس لیے یہ کام حویلی ہی کی کسی خاتون کے ہاتھوں انجام پانا چاہئے۔'' وہ فوراً ہی مطلب پر آ گیا۔

''حویلی کی خواتین پردہ دار ہیں۔ وہ کیسے اس طرح کا کوئی کام کر سکتی ہیں؟'' چودھری نے ناگواری سے



جواب دیا تو اس کے ذہن میں بے ساختہ ہی وہ منظر اُبھر آیا جب اس نے کشور کو لاہور کے ایک ہسپتال میں آفتاب کے ساتھ اس طرح پایا تھا کہ اس کا ہاتھ آفتاب کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ چودھری کے سامنے اس بات کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''پردے کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم پردے کا پورا خیال رکھیں گے۔ سمجھیں کہ کلی طور پر یہ خواتین ہی کی تقریب ہوگی اور کسی مرد کو تقریب میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ تقریب کی کوریج کے لیے اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ، میں خود اپنے کسی جاننے والے صحافی سے لکھوا کر چھپوا دوں گا۔ رپورٹ میں یہ بات آنے دی کہ مسز چودھری افتخار نے انڈسٹریل ہوم کا افتتاح کیا، آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آپ کی مسز کے ہاتھوں اس افتتاح کا یہی مطلب لیا جائے گا کہ آپ عوام کی بھلائی کے لیے کیے جانے والے ایسے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔''

وہ چودھری کے گرد وہی جال بُن رہا تھا، جس سے وہ ہمیشہ ہی دھوکا کھا جاتا تھا۔

چنانچہ اس بار ذرا نرمی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے اے سی صاحب! اگر آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے پروگرام کا شیڈول بھجوا دیجئے گا۔ میں خواتین سے کہہ دوں گا کہ وہ مقررہ وقت پر تیار رہیں۔'' بالآخر اس نے ہامی بھر لی پھر موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔

''یہ اپنے باجوہ صاحب مفت میں پھنس گئے۔ پہلے ان پر اسمگلنگ کا الزام لگا کر پولیس نے بے جا انہیں گرفتار کیا۔ اپنے طور پر شاید پولیس والے سمجھ رہے تھے کہ جھوٹا گواہ پیش کر کے باجوہ کو مجرم ثابت کر دیں گے لیکن اللہ بندے کی عزت رکھنے والا ہے۔ گواہ عدالت میں پولیس کی مرضی کے مطابق بولا ہی نہیں اور باجوہ بے قصور ثابت ہو گیا۔'' چودھری کے یہ ذکر چھیڑنے پر اس کے سینے میں کوئی آگ سی دہکنے لگی۔ اسے گواہ کا عین وقت پر بیان بدلنا اور پھر عدالت سے باہر نکلتے ہی قتل ہو جانا بھولا تو نہیں تھا۔ ایسے میں چودھری کا دھڑلے سے کہنا کہ اللہ نے باجوہ جیسے شخص کی عزت رکھ لی تھی، صریحاً ڈھٹائی تھی۔ اس بات کو تو یوں سمجھانا چاہئے کہ اللہ ظالم کی رسّی دراز کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب ایک مقررہ وقت پر وہ رسّی کھینچے گا تو پھر ایسے افراد کو کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔

''مجھے یقین ہے کہ جیسے باجوہ پر یہ الزام ثابت نہیں ہو سکا، اسی طرح اس پر نااہلی اور کوتاہی کا جو الزام لگا کر اسے اس کے عہدے سے معطل کیا گیا ہے، ایک دن وہ الزام بھی غلط ثابت ہو جائے گا۔'' اس کی اندرونی کیفیت کو چودھری بھی سمجھتا تھا لیکن انجان بنا اپنے خیالات کا اظہار کیے جا رہا تھا۔

''ان سب باتوں کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ قبل از وقت کسی بھی قسم کی قیاس آرائیاں کرنا بے کار ہے۔ وقت خود سب سے بڑا منصف ہے، وہ خود ہی سچ اور جھوٹ کو کھول کر سامنے لے آئے گا۔'' چودھری کی بات کے جواب میں وہ سنجیدگی سے بولا پھر یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اب اجازت دیجئے چودھری صاحب! مجھے کچھ دوسرے اہم کام بھی نمٹانے ہیں۔''

''کچھ دیر تو رکیے۔ رات کے کھانے کا وقت ہونے ہی والا ہے۔ کھانا کھا کر جایئے گا۔'' چودھری نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''نو تھینکس۔ کھانے کی کوئی خواہش نہیں۔ یہاں سے جا کر بھی میں مشکل ہی سے کھانا کھاؤں گا۔'' اس نے رسان سے انکار کیا۔

''میں سمجھتا ہوں..... جس خاندان کی جوان لڑکی غائب ہو گئی ہو، اس کے افراد کی بھوک پیاس اُڑ جاتا تو

بالکل فطری سی بات ہے۔ آپ کی پھر بھی ہمت ہے کہ خود کو سنبھال کر سارے دھندوں میں لگے ہو
اللہ نہ کرے ہمارے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہو جاتا تو ہم زمین آسمان ایک کر ڈالتے۔'' بے حد ہمدردی
چودھری کے ان الفاظ نے اسے ایک پل کے لیے سُن سا کر دیا۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ بات راز میں
کی پوری کوشش کی تھی لیکن تلاش کے سلسلے میں اتنے لوگ انوالو تھے کہ مکمل طور پر رازداری کا امکان ہی نہیں
کسی ذریعے سے چودھری تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی اور وہ ہمدردی کی آڑ میں اس پر طنز کا ایک تیر چلایا گیا تھا
تیر سے گھائل ہونے کے باوجود اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

❀----✪----❀

''سیٹھ سندر رام۔'' کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا یہ نام پڑھنے کے بعد انہوں نے ذرا
اشارہ کیا تو اس نے فوراً زوردار آواز میں گاڑی کا ہارن بجایا۔ ردِعمل میں ذیلی دروازہ کھول کر چوکیدار باہر
''ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب تشریف لائے ہیں۔ سیٹھ سندر رام سے ان کی اس وقت ملاقات
ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا تو چوکیدار پھرتی سے بڑا گیٹ کھولنے لگا۔ یقیناً اسے سیٹھ سندر رام کی طرف سے پہلے
ڈی آئی جی سجاد رانا کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ گیٹ سے گزر کر ان کی گاڑی پورچ
داخل ہوئی تو سیٹھ سندر رام ان کے استقبال کے لیے خود وہاں آ پہنچا۔ یقیناً گیٹ کھولنے کے بعد چوکیدار
سب سے پہلے انٹرکام پر اندر اطلاع کر دی تھی۔ سندر رام ایک مشہور صنعت کار تھا جس کی کئی ٹیکسٹائل ملز
رہی تھیں۔ اس کی دولت کے سامنے ماڈل ٹاؤن میں واقع یہ پرانی سی کوٹھی بہت معمولی تھی اور جاننے والوں
حیرت میں مبتلا کرتی تھی کہ اس جیسی حیثیت کا مالک اتنی عام سی کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟

''آپ کی طرف سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی گئی تو بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی فیملی کا تو بڑا نام ہے۔
نامور فیملی کی ایک شخصیت مجھ سے ملنا چاہتی ہے یہ سننے کے بعد میں نے اپنی ساری مصروفیات ملتوی کر دیں
آپ کا انتظار کرنے لگا۔'' بہت جوش و خروش سے ان کا استقبال کرنے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ اندر
جاتے ہوئے بولا۔

ہندو ہونے کے باوجود اس کی اُردو بہت صاف تھی اور ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ وہ پشت ہا پشت سے یہاں
رہ رہا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس کے بزرگوں نے اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے ہجرت کر کے بھارت
چلے جانے کے بجائے یہیں رہنا مناسب سمجھا تھا اور ان کا یہ فیصلہ اس حساب سے بہت سودمند تھا کہ وہ پاکستان
میں رہ کر خوب پھل پھول رہے تھے۔

''تھینک یو سندر رام صاحب! مجھے احساس ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ میری طرف سے ملاقات
اس اچانک خواہش کی وجہ سے آپ کا شیڈول ڈسٹرب ہوا ہوگا لیکن معاملہ ہی ایسا تھا کہ میرا فوری طور پر آپ
سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔'' سندر رام کے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ خود
ان کے مقابل ایک دوسرے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

''کیوں غیروں جیسی بات کر رہے ہیں رانا صاحب! آپ کے لیے تھوڑا سا ڈسٹرب ہونا مجھے بالکل
نہیں لگا۔ میں نے پورے من سے آپ کو اپنے غریب خانے پر خوش آمدید کہا ہے۔''

''اپنی کوٹھی کے لیے غریب خانے کی اصطلاح خوب استعمال کی آپ نے۔ ویسے تو یہ کوٹھی کافی
ٹھاک ہے لیکن آپ جیسے انڈسٹریلسٹ کے اعتبار سے تو یہ واقعی غریب خانہ ہی لگتی ہے۔'' سجاد رانا پولیس کا ایک



بیت یافتہ اور سینئر آفیسر تھا۔ ایک چھوٹی سی بات کا سرا تھام کر بہت خوب صورتی سے گفتگو کو اپنے مطلب کے
رخ پر موڑ دیا۔

''یہ بات بہت لوگ کہتے ہیں مجھ سے۔ لیکن میں اس کوٹھی میں ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ اصل میں یہ کوٹھی
میرے بزرگوں نے اس وقت بنائی تھی جب یہاں اردگرد کوئی اور عمارت نہیں تھی۔ پُرکھوں کی نشانی، اس کوٹھی کو
چھوڑنے پر میرا من راضی نہیں ہوتا۔ اگر بال بچے ساتھ ہوتے تو اس کوٹھی کو چھوڑ کر کہیں جانے پر غور کرتا۔ پتنی
برسوں گزرے، پرلوک سدھار گئی۔ بیٹی بیاہ کر کینیڈا چلی گئی۔ بیٹا آسٹریلیا میں ہے۔ وہاں سے پڑھ لکھ کر واپس
آئے گا تو اپنے لیے اپنی مرضی سے پسند کے مطابق کوئی اور کوٹھی دیکھ لے گا۔ تب تک میں اپنے پُرکھوں کی اس
نشانی کے ساتھ خوش ہوں۔'' اس نے ذرا تفصیل سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

''یہ آپ کے مزاج کی سادگی ہے جو آپ اس طرح سوچتے ہیں۔ ورنہ دنیا کا تو یہ چلن ہے کہ ذرا سا روپیہ
ہاتھ میں آیا نہیں اور سب بھول بھال کر اونچے سے اونچا اُڑنے کی فکر میں ماضی سے جان چھڑا لی۔'' انہوں نے
بھی رواداری میں ایک بات کہی۔ اسی وقت ٹرالی دھکیل کر اندر آتی ہوئی ملازمہ کی وجہ سے ان کی توجہ بٹ گئی۔
ملازمہ سندر رام کے اشارے پر ٹرالی چھوڑ کر فوراً ہی باہر چلی گئی۔

''یہ میری ملازمہ سونی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی ہمارے ہاں ہی ملازمت کرتے تھے۔ وہ دونوں چند
برس گزرے، آگے پیچھے مر گئے۔ یہ چونکہ یہیں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہے اس لیے میرے مزاج کو خوب سمجھتی
ہے۔ میں ملازموں کی بھیڑ بھاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ گیٹ پر چوکیدار رہتا ہے اور اندر کے سارے کام یہ خود اکیلی ہی
سنبھال لیتی ہے۔ باہر کی دنیا میں اس بے چاری کے لیے کچھ رکھا بھی نہیں تھا۔ آپ خود بھی جانتے ہوں کہ اس
جنس کے افراد کے ساتھ لوگ کیسا برا سلوک کرتے ہیں۔'' ان کی آنکھوں میں تیرتی اُلجھن کو دیکھ کر سندر رام
نے خود ہی سونی کا تعارف کروا دیا۔

''جی ہاں، مجھے اندازہ ہے۔'' انہوں نے سرسری لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور پھر ذرا سا
کھنکھارتے ہوئے بولے۔ ''میری اس وقت آپ کے پاس آمد کا تعلق کچھ انہی افراد سے متعلق ہے۔ معاملہ ایسا
ہے کہ پولیس پارٹی آپ کے پاس تفتیش کے لیے آتی یا کم از کم آپ کی ملازمہ کو تھانے بلوایا جاتا۔ لیکن آپ کی
حیثیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ کسی چھوٹے آفیسر کو آپ کے پاس بھیجنے کے بجائے میں
خود آ کر آپ سے بات کروں۔''

''ایسا کیا معاملہ ہے ڈی آئی جی صاحب! کیا سونی سے کوئی جرم ہوا ہے؟ لیکن وہ بے چاری تو کوٹھی سے
باہر جاتی ہی نہیں۔'' سندر رام نے تشویش سے پوچھا۔

''سندر کوٹھی سے باہر نہیں جاتی، یہ تو میرے علم میں ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق اٹھارہ تاریخ کی
شام آپ کی کوٹھی پر سونی جیسے کئی افراد کا اجتماع ہوا تھا۔ میں سونی سے ان افراد کے بارے میں جاننے کے علاوہ
اس اجتماع کی نوعیت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''اٹھارہ تاریخ.....'' سندر رام نے سوچنے کے انداز میں اپنی کنپٹی پر انگلی کی مدد سے دو تین ہلکی سی ضربیں
لگائیں اور پھر بولا۔ ''اٹھارہ تاریخ کو میں کراچی میں تھا۔ اس دن کے لیے سونی نے مجھ سے اجازت لے رکھی
تھی کہ وہ اپنی چند سہیلیوں کو دعوت پر بلانا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں ظاہر ہے، اس جیسی ہی ہوں گی۔ لیکن اس
بات سے پولیس کو کیا پریشانی ہے؟ اس طرح کے لوگوں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا اور مل بیٹھنا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔''

''میں نے اسے جرم کہا بھی نہیں ہے۔ لیکن میں ایک جرم کی کھوج میں ضرور ہوں۔ سترہ تاریخ کی صبح ایک

لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس نے اپنی تحقیق کے ذریعے اس گروہ کے بارے میں کچھ کلیوز تو حاصل کر لیے ہیں لیکن وہ گروہ غائب ہوگیا ہے۔ میں سونی سے مل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ٹھیک ہے، میں سونی کو بلوا لیتا ہوں۔ لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ سونی کی کسی جرائم پیشہ گروہ کے افراد کے ساتھ دوستی نہیں ہوسکتی۔'' سندر رام نے انہیں جواب دیا اور گھنٹی کا بٹن دبا کر سونی کو طلب کیا۔

''مجھے سیٹھ صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ اٹھارہ تاریخ کو تم نے اپنی کچھ سہیلیوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا۔ اپنی ان سہیلیوں کی تعداد اور نام پتے لکھوا دو۔'' سونی کے حاضر ہوتے ہی انہوں نے اسے حکم دیا۔

''تعداد اور نام تو میں بتا سکتی ہوں صاحب! لیکن سب کے پتے مجھے نہیں معلوم۔ اصل میں، میں خود تو آتی جاتی نہیں ہوں اس لیے مجھے کسی کا پتہ لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''پھر تمہاری ان لوگوں سے دوستی کیسے ہوئی؟'' انہوں نے سختی سے سوال کیا۔

''آپ کو تو معلوم ہے صاحب! کہ ہم جیسوں کا زیادہ تر گزارہ بھیک مانگ کر ہی ہوتا ہے۔ بس ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے دو تین افراد ایک بار مانگنے کے لیے آئے تو چوکیدار کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خود گیٹ پر جانا پڑا۔ اپنے جیسی ایک ہستی کو ایک گھر میں دیکھ کر ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ پھر ہفتے پندرہ دن میں جب بھی ان کا چکر لگتا، وہ مجھ سے مل کر ضرور جاتے۔ سیٹھ صاحب بڑے دیالو ہیں۔ مجھے اجازت ہے کہ میں دروازے پر آنے والے فقیر کو جو چاہے دے دوں۔ اس لیے میرے بھائی بند جب بھی آتے، خوش ہو کر جاتے۔ انہی کی وجہ آہستہ آہستہ میری گھر بیٹھے دو چار اور سے بھی دوستی ہو گئی۔'' سونی نے وضاحت پیش کی جس پر سر ہلاتے ہوئے انہوں نے اپنی چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اٹھارہ تاریخ کی دعوت میں شریک افراد کے نام لکھوانے کو کہا۔ سونی نے چھ افراد کے نام لکھوائے۔ ساتھ ہی علاقوں کے نام بھی بتا دیے۔ مکمل پتے اسے نہیں معلوم تھے لیکن بقول اس کے بات چیت میں رہائشی علاقوں کا ذکر تو نکل ہی آتا تھا۔

''اچھا، ذرا یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کسی کو تم پہچانتی ہو؟'' انہوں نے کارڈ سائز کی ایک تصویر اس کے سامنے کی۔ اس تصویر میں تین خواجہ سرا ناچتے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ مشکوک گروہ کے افراد کی یہ تصویر بڑی تگ و دو کے بعد ان کے ہاتھ آئی تھی۔ سونی نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی پھر فوراً ہی واپس کر دی۔

''نہیں صاحب! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔'' تصویر انہیں پکڑاتے ہوئے اس نے یہ جملہ بولا۔ اس نے جس سپاٹ انداز میں تصویر کو دیکھا تھا، اس کے بعد وہ اسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' انہوں نے مایوس ہوتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں ڈی آئی جی صاحب! کہ اغوا ہونے والی لڑکی کون ہے؟ آپ کی پریشانی سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت بااثر گھرانے سے ہے۔'' سندر رام نے ان سے سوال کرتے ہوئے خود ہی ایک خیال بھی پیش کر دیا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔ زیادہ تفصیلات بتانے سے میں معذور ہوں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سندر رام نے بھی فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی اور خلوص سے بولا۔ ''اگر میرے لائق کوئی



خدمت ہو تو ضرور بتائیے گا۔ سونی بھی ہر وقت آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار رہے گی۔''

''تھینک یو۔'' اس کی پیش کش کے جواب میں انہوں نے فقط اتنا ہی کہا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے۔ ڈرائیور کم باڈی گارڈ نے انہیں دیکھتے ہی پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی پورٹیکو سے نکل کر مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ مگر ان کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی گیٹ سے باہر لے جانے کے بجائے درمیان میں ہی روک دی اور چوکیدار کو اشارے سے گاڑی کے قریب بلوایا۔

''کیا حکم ہے صاحب؟'' چوکیدار سمجھ گیا تھا کہ گاڑی رُکوا کر اسے بلوانے والا کون ہے اس لیے پچھلی نشست پر بیٹھے سجاد رانا سے کھڑکی میں جھک کر پوچھا۔

''یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کوئی اٹھارہ تاریخ کو سونی کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شرکت کے لیے آیا تھا یا نہیں؟'' انہوں نے وہی تصویر جو کچھ دیر قبل سونی کو دکھائی تھی، اس کے آگے لہرائی۔

''مجھے نہیں معلوم صاحب! دعوت والے دن میں ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ چھٹی لے کر اپنی بہن سے ملنے گیا تھا۔ ویسے میرے خیال میں ان میں سے کوئی دعوت میں نہیں آیا ہوگا۔ میں نے سونی کی سہیلیوں کو دیکھ رکھا ہے۔ اس تصویر میں ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔'' چوکیدار نے جواب دیا تو انہوں نے تصویر واپس رکھتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دے دیا۔

اس وقت ان پر شدید مایوسی اور جھنجلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ شینا کے بارے میں جو واحد کلیو ملا تھا، وہ بھی بے کار چلا گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں ہنوز ناکام تھے۔ آج پہلی بار انہیں ایسے افراد کا خیال آ رہا تھا جو عوام میں شمار ہونے کے باعث اپنی جان، مال اور عزت میں سے کچھ بھی گنوانے پر پولیس اسٹیشن کے چکر ہی کاٹتے رہ جاتے تھے لیکن انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتنے بارسوخ ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے میں ناکام تھے اور ناکامی بے بسی کا احساس دلاتی ہے۔ بس آدمی امیر ہو یا غریب، بالآخر ایک ہی سطح پر کھڑا نظر آنے لگتا ہے۔

⊛----✪----⊛

چن سجنا وے نیڑے نیڑے ہو
ڈھول جانیا وے نیڑے نیڑے ہو

بے سُری آوازوں میں گائے جانے والے گانے کے بولوں کا ساتھ نبھانے کے لیے پیشانی تک دوپٹہ اوڑھے وہ سر جھکائے مشینی انداز میں ڈھول بجا رہی تھی۔ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود ڈھول پر پڑنے والی ہر تھاپ بڑی نپی تلی تھی جس کی دھمک ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر سکتا تھا۔ ملکہ، رانی اور نگار ٹھمکے لگاتی، ڈھول کی لے پر اپنی بھونڈی آواز میں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ان کے گرد موجود عورتوں، بچوں اور مردوں کا مجمع خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تالیاں بجا بجا کر بلند آواز میں داد دی جا رہی تھی لیکن یہ داد ایسی تھی جس میں تمسخر کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ تینوں تو شاید عادی تھے ایسے بے ہودہ فقرے اور مذاق برداشت کرنے کے..... لیکن وہ جو جبراً ان کے ساتھ شامل کی گئی تھی، ہر بار بڑی اذیت کے ساتھ یہ سب سہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر غصے اور ذلت کی سرخی تھی لیکن چہرے پر بے ہنگم طریقے سے تھپی میک اپ کی موٹی تہ کے باعث اس سرخی کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ان تینوں کے ساتھ شامل ہو کر ڈانس کرنے والے دو منچلوں نے چاہا بھی کہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ

کر کے اسے کچھ بولنے پر مجبور کر سکیں مگر وہ لب سیے ڈھول بجاتی رہی۔ خدا خدا کر کے گانے اور ناچنے کا
ختم ہوا تو حاضرین کی طرف سے نچھاور کیے گئے نوٹ سمیٹے جانے لگے۔ وہ اس کام میں بھی شامل نہیں ہوئی
ڈھول کی ڈوریاں کستی ایک طرف بیٹھی رہی۔

''خالہ! آج رات اسے ڈھول بجانے کے لیے یہیں روک لیں۔ ہم لوگوں کا آج رت جگا کر
پروگرام ہے، پر ڈھنگ سے ڈھول بجانا کسی کو نہیں آتا۔ یہ اتنا اچھا ڈھول بجاتی ہے، آپ اس کو روک لیں
ہمارا کام بن جائے گا۔'' وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھی کہ اسے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟..... رات بھر اس ہیجڑے کو یہاں روک کر مجھے لوگوں کی باتیں سننی
کیا؟'' خالہ کہہ کر مخاطب کی جانے والی عورت نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی نہیں سنائے گا باتیں۔ آپ کے سامنے کسی کی کیا مجال کہ کچھ کہہ سکے۔'' اس بار خوشامد
لیا گیا۔

''بالکل خالہ! انیسہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ایک اور آواز سنائی دی اور پھر تو جیسے ساری ہی لڑکیاں
عورت کے پیچھے لگ گئیں۔ لڑکے بھی لڑکیوں کی حمایت کرنے لگے۔ شاید انہیں تفریح کا ایک عمدہ موقع ہاتھ
نظر آ رہا تھا۔ آخر کار اس عورت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کرخت آواز میں بولی۔

''چپ کر جاؤ کم بختو! سن لی ہے میں نے تمہاری بات۔ پر مجھے ان لوگوں سے تو پوچھ لینے دو۔'' وہ
اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں بھئی! کیا ارادہ ہے تیرا؟ رُکے گی رات یہاں؟ پورے
دوں گی۔'' وہ چپ رہی۔

''اس اکیلی کو ہم رات بھر کے لیے یہاں نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ یہ بڑی سیدھی ہے، اکیلی گھبرا جائے گی
ملکہ جو گرو کی غیر موجودگی میں اپنی سنیارٹی کی وجہ سے گروہ میں سب سے زیادہ مقام رکھتی تھی، خود جواب
کے لیے آگے بڑھی۔

''تو تم میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ رک جائے حفاظت کے لئے۔'' عورت نے نخوت
جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، پر صرف پانچ سو روپے پر بات نہیں بنے گی۔ ساتھ ایک جوڑا، مٹھائی کا ڈبہ اور تھوڑا
بھی دینا ہوگا۔'' ملکہ نے فوراً سودے بازی شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دے دوں گی۔ میری بھانجیوں بھتیجیوں نے فرمائش کی ہے۔ اب میں ہاں
کے بعد ان معمولی چیزوں کے پیچھے ان کا دل تو نہیں توڑ سکتی۔'' عورت نے بے حد شاہانہ انداز میں جواب
جس پر وہاں موجود لڑکے لڑکیوں نے زوردار نعرے لگائے۔

''میں رک جاتی ہوں شہزادی کے ساتھ۔'' عورت کے ہامی بھرتے ہی نگار نے از خود پیش کش کی
نے قبول کر لیا اور دھیمے مگر سخت لہجے میں نگار سے بولی۔ ''دھیان رکھنا۔ اگر یہ اِدھر اُدھر ہوئی تو گرو تیری
کھینچ لے گا۔''

''مجھے معلوم ہے سب..... تُو زیادہ ہدایتیں نہ دے۔'' اس نے رعب میں آئے بغیر جواب دیا۔
جواب پر ملکہ نے اسے گھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ پھر وہ اور رانی کچھ دیر بعد وہاں سے روانہ
گئیں۔

''گڈیو! پہلے کھانا وانا کھا لو..... پھر بعد میں آرام سے گانے بجانے بیٹھنا۔'' کرخت آواز والی



دیا تو ان کے گرد موجود ہجوم چھٹنے لگا اور کھانے کے لیے ایک دوسرے کو آوازیں دی جانے لگیں۔ صحن میں
لڑکے جو وہیں رکے ان پر جملے کس رہے تھے، وہ بھی کسی کے پکارنے پر اندر چلے گئے۔ ایک لڑکی نے پلاؤ
دو پلیٹیں ان دونوں کو بھی لا تھمائیں۔

''یہ اچھی مصیبت ہے۔ پیسے کے لالچ میں وہ لوگ ہمیں رات بھر ذلت سہنے کے لیے یہاں چھوڑ گئے۔''
ملتے ہی اس نے دھیمی آواز میں نگار کے سامنے اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

''بے وقوف! اچھا ہے کہ وہ لوگ لالچ میں تجھے یہاں چھوڑ گئے۔ سمجھ لے کہ ان کے لالچ کی وجہ سے
آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔ ویسے تو سب تجھ پر نظریں گاڑ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ تُو اِدھر اُدھر
جائے۔'' ایک بڑا سا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے نگار نے اسے جواب دیا تو وہ حیران رہ گئی اور اسی حیرانی
الم میں بولی۔

''کیا مطلب؟ تم مجھے یہاں سے گرو کے اڈے کے علاوہ کہیں اور جانے دو گی؟''

نگار نے زبان سے جواب نہیں دیا، اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''میں ہاتھ سے نکل گئی تو گرو تمہارا بہت برا حال کرے گا۔ یاد نہیں ابھی ملکہ جاتے جاتے کیا بول کر گئی
؟'' وہ خود بھی اس ماحول سے فرار کی خواہش مند تھی۔ خصوصاً گرو کا اصل روپ دیکھنے کے بعد تو اس کی نفرت
گنا بڑھ گئی تھی لیکن اپنی وجہ سے نگار کو مصیبت میں ڈالنا اسے گوارا نہیں تھا۔ نگار نے اس کی تشویش سن کر کان
سے مکھی اُڑانے والے انداز میں سر ہلایا اور جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے نوالہ حلق سے نیچے اُتار کر بولی۔

''گرو کی ایسی کی تیسی۔ اُس کافر کے ڈر سے اب میں تجھ پر مزید ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے سمجھ نہیں آیا
میں سمجھ چکی ہوں کہ اس دن گرو تجھے کس لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اگر تُو زخمی نہ ہو گئی ہوتی تو اُس لڑکی کی
رح تجھے بھی وہ لوگ بلی چڑھا دیتے۔ اللہ سائیں کا کرم ہو گیا تجھ پر کہ تُو ٹیکسی والے کی وجہ سے زخمی ہو گئی۔
وہ مردود، زخمی لڑکی کو تو اپنی دیوی کے آگے بھینٹ چڑھا نہیں سکتے تھے، اس لیے تجھے چھوڑ دیا۔ پر جب تُو
طرح ٹھیک ہو جائے گی تو گرو پھر دوبارہ تجھے وہاں لے جائے گا۔''

نگار کی باتیں سن کر وہ بری طرح کانپ اُٹھی اور نظریں بے ساختہ اپنے زخمی ہاتھ کی طرف اُٹھ گئیں۔
موجود زخم مندمل ہونے لگا تھا۔ اس زخم نے اسے بہت تکلیف دی تھی لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ
سی تکلیف اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی تھی

''میں نے سوچ لیا ہے، ہم صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان لوگوں
روپے میں رات میں ہی وصول کر لوں گی۔ تجھے جہاں جانا ہو، چلی جانا۔ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ تجھے
میں اپنے ساتھ ہی لے جاتی، مگر مجھے معلوم ہے کہ گرو ہماری تلاش میں سب سے پہلے وہیں پہنچے گا۔ میری تو
ہے۔ آخر کو میرے سگے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ میری جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں
لیکن تجھے وہاں پناہ نہیں ملے گی۔ میرا اپنے گھر والوں پر بس چلتا ہوتا تو میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر
پر میں خود مجبور ہوں۔ ورنہ اللہ گواہ ہے کہ میرے دل میں تیرے لیے سگی بہنوں جیسا پیار پیدا ہو گیا
'' وہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتی ہوئی نم سے لہجے میں بولی۔

''تم میرے لیے جو کچھ کر رہی ہو، وہ بھی بہت ہے۔ تمہاری اس قربانی نے تو مجھے میری اپنی بہن کی یاد دلا
ہے۔'' اس نے نگار کا ہاتھ تھام کر گلوگیر لہجے میں جواب دیا تو وہ دوسرے ہاتھ سے پیار بھرے انداز میں اس
تھپتھپانے لگی پھر یک دم ہی اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

''چل ہٹ، خود تو کچھ کھاتی نہیں۔ لے کر میرا پلاؤ بھی ٹھنڈا کروا رہی ہے۔'' یہ کہنے کے ساتھ اس
گفتگو کے دوران ایک طرف رکھ دی جانے والی اپنی پلیٹ دوبارہ اٹھالی۔ شہزادی بھی مسکراتی ہوئی اپنی پلیٹ
طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ لڑکیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ صحن میں
سی دری پر چارپائیاں بچھا کر محفل سجالی گئی۔ پنجابی ٹپوں، انڈین اور پاکستانی فلمی گانوں اور پاپ سنگرز
گانے، مشہورِ زمانہ گیتوں سمیت ہر شے کی ٹانگ توڑی جانے لگی۔ نگار ان لڑکیوں کا ساتھ دینے میں پیش پیش
تھی۔ البتہ اس نے حسبِ معمول ہونٹ سی لیے تھے۔

''اے چلو، اندر چل کر گاتے ہیں۔ جس کی خاطر ہم اپنا گلا پھاڑ رہے ہیں، وہ محترمہ تو آرام سے
ہیں۔ ذرا اس کے سر پر بھی تو جا کر ہنگامہ کیا جائے تاکہ اسے پتہ چلے کہ بیاہ کرنا کوئی ایسی آسان بات نہیں۔
گاتے گاتے ایک لڑکی نے آئیڈیا دیا جسے سب نے پسند کیا مگر چارپائیوں پر ذرا فاصلے پر بیٹھے لڑکے احتجاج
کرنے لگے۔ انہیں مایوں بیٹھی دلہن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور لڑکیوں کے اندر چلے جانے
کی صورت میں ان کی تفریح ختم ہو جاتی۔

''ٹھیک ہے، تم سب اندر جاؤ مگر ان دونوں کو یہیں رکنا پڑے گا۔'' ذرا سی بحث کے بعد شہزادی اور نگار کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک لڑکے نے شرط پیش کی۔

''انہیں تو تم نہیں روک سکتے۔ انہیں تو ہمارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ہم نے خالہ سے کہہ کر انہیں
ہے۔'' ایک لڑکی نے چمک کر جواب دیا۔

''لیکن خالہ نے عورتوں اور لڑکیوں کے سوا کسی اور کو دلہن کے کمرے میں جانے سے بھی تو منع کیا ہے۔
اسی لڑکے نے اعتراض کیا۔

''ہاں تو یہ کون سا مرد ہیں؟'' لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''عورت بھی تو نہیں۔'' فوراً اعتراض ہوا جس پر سب نے زوردار قہقہہ مارا۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کے
ہنسی ٹھٹھول پر کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے۔

''تم جو بھی کہو، ہم انہیں اپنے ساتھ اندر لے جائیں گے۔'' ہنسی کا طوفان تھما تو لڑکیوں نے سراسر زیادتی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے نرغے میں لے کر اندرونی حصے کا رخ کیا۔ وہ سب انہیں لے کر
کمرے میں داخل ہوئیں، وہاں ایک لڑکی زرد لباس میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ لباس کے ساتھ ساتھ اس کے
چہرے کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کو کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چارپائی پر اُٹھ بیٹھی اور حیرت سے انہیں
سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''بہت سو لیں بی بتو! اب کچھ دیر ہمارے ساتھ جاگو۔ ہم پاگل نہیں کہ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ
بنے رہیں۔ تمہیں بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔'' اس کی نظروں کے سوال کا جواب فوراً دیا گیا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں، سونا چاہتی ہوں۔'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

''کل دن بھر سو لینا۔ ویسے بھی ابھی تو تمہارے مہندی بھی لگنی ہے۔ اس کے لیے تو تمہیں جاگنا ہی پڑے
گا۔'' اس کی بے زاری کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے کسی نے کہا اور پھر جس کو جہاں جگہ ملی، وہ وہاں بیٹھ گیا۔ ایک
بار پھر گانے بجانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، تیسری بار ڈھول سنبھالا تھا۔ ماں
حالات میں وہ رات بھر یہ کام کر سکتی تھی لیکن اب ہاتھ کا زخم بے حد تکلیف دینے لگا تھا اس لیے ڈھول بجانا
روک دیا۔



''کیا ہوا؟..... کیوں ڈھول نہیں بجا رہیں؟'' لڑکیوں نے فوراً شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ
سامنے کر دیا۔

''اُوئی اللہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تیرا ہاتھ زخمی ہے۔ لا مجھے دے ڈھول، میں بجاتی ہوں۔'' نگار سب
سے پہلے اس کا مسئلہ سمجھی اور فوراً اس سے ڈھول لے لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کئی دن بیمار رہی تھی، اس
ابھی تک کمزوری بہت تھی۔ اتنی دیر کی محنت نے اور بھی تھکا دیا تھا۔ تھکن سے اکڑ جانے والی پیٹھ کو آرام
دینے کے لیے اس نے چارپائی کے پائے سے پشت ٹکا دی۔ اسی وقت اس کی نظر چارپائی کے نیچے پڑی ایک
پورٹ سائز تصویر پر پڑی۔ تصویر میں موجود چہرہ اسے کچھ آشنا لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تصویر کو چپکے سے
اس سے اٹھا لیا۔ تصویر میں موجود شخص سے وہ واقعی واقف تھی۔ اس شخص کی شناخت ہوگئی تو اس نے سر موڑ کر
اس کا جائزہ لیا۔ زرد رنگت والی بے زار صورت دُلہن یقیناً اس شادی پر خوش نہیں تھی اور اس کے ناخوش ہونے
کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

''اے گڑیو! پارلر والی کا فون آیا ہے کہ اس کی پھوپھی فوت ہوگئی ہے، اس لیے وہ مہندی لگانے نہیں آ
سکتی۔ اب تم لوگ خود ہی کچھ کر لو۔'' اسی وقت وہی کرخت آواز والی عورت کمرے میں آئی اور اپنی مخصوص آواز
میں اطلاع دی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ لگانے کو تو کوئی بھی مہندی لگا دے، پر دُلہن کے ہاتھوں پیروں پر تو بڑی اچھی
مہندی لگنی چاہیے۔'' لڑکیاں فوراً شور مچانے لگیں۔

''میں لگا دوں دُلہن کو مہندی۔ مجھے بڑی اچھی مہندی لگانی آتی ہے۔'' ان کی پریشانی دیکھ کر اس نے
ہلکی آواز میں پیش کش کی۔

''ہیں..... تم بولتی بھی ہو؟ ہم تو سمجھے تھے تم گونگی ہو۔'' اس کی زبان سے نکلنے والا یہ پہلا فقرہ سن کر ایک
لڑکی نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ جواباً ذرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''چلو تم ہی لگا دو..... پر یاد رکھو! مہندی لگانے کے صرف سو روپے دوں گی۔ زیادہ منہ مت کھولنا۔''
اس کا تو جیسے مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی پیش کش قبول کرتے ہوئے ساتھ ہی اپنی شرط بھی سنا دی
اس نے فوراً ہی منظور کر لی۔ ایک لڑکی نے اسے کون مہندی لا کر دے دی۔ وہ اوپر چارپائی پر دُلہن کے مقابل
بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر پھیلی ہوئی ہتھیلی پر تصویر رکھی۔ تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی اور جلدی سے اردگرد نظر
ڈالی۔ عورت باہر جا چکی تھی اور لڑکیاں دوبارہ سے گانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر دھری تصویر
کو اپنے تکیے کے غلاف میں چھپا دی۔

''تم نیلم ہو؟'' کون مہندی دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر پہلی لکیر ڈالتے ہوئے اس نے دھیمی آواز
میں پوچھا۔ اس سوال پر اسے بہت زوردار جھٹکا لگا۔

''تم..... تم کون ہو؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''میں جو بھی ہوں، اتنا جانتی ہوں کہ یہ سرمد ہے اور نیلم سے محبت کرتا ہے۔ کیا تم سرمد کی محبت، نیلم نہیں
ہو؟'' ڈھول اور گانوں کے درمیان ان کی بے حد دھیمی آواز میں کی گئی گفتگو کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''ہاں، میں نیلم ہی ہوں..... سرمد کی نیلم۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

''یقیناً سرمد تمہارے ماں باپ کی شرط کے مطابق کسی باعزت نوکری یا کاروبار کا انتظام نہیں کر سکا اس
لیے اب تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟'' اس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''ماں باپ کی شرط نہیں، صرف سوتیلی ماں کی شرط۔ یہ عورت جو ابھی اندر آئی تھی، میری سوتیلی ماں ہے اسی نے میرے ابا کو بہکا کر سرمد کا رشتہ قبول نہیں ہونے دیا۔ شروع سے اس کی خواہش تھی کہ میری شادی ان کے بڈھے لنڈورے، چار بچوں کے باپ مگر دولت مند پھوپھی زاد سے ہو جائے۔ وہ خبیث میرے ابا کی اس عورت سے شادی کے بعد سے ہی مجھ پر نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ جانے میری سوتیلی ماں نے میرے باپ سے کس طرح کان بھرے کہ وہ بھی اس رشتے پر راضی ہو گیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ عورت میرے ابا کو کوئی نشے والی چیز پلاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سارا سارا دن یا تو سوتے رہتے ہیں یا گم صم بیٹھے رہتے ہیں اور اس کا جو جی چاہے، وہ من مانی کرتی پھرتی ہے۔ شروع میں تو اس نے مجھے بھی بہت بے وقوف بنایا اور یہی لارے لپے دیتی رہی کہ سرمد کوئی باعزت کام کر لے تو تجھے اس سے بیاہ دوں گی۔ اس کی باتوں میں آ کر سرمد پر ڈرائیونگ چھوڑنے کے لیے زور ڈالتی رہی اور پیچھے سے اس نے چپکے سے میرا رشتہ بھی کر دیا۔ جس دن سے شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے، میں گھر سے قدم نہیں نکال سکی۔ ہر وقت اس کا کوئی نہ کوئی بھانجا، بھتیجا باہر دروازے پر پہرہ دیتا رہتا ہے کہ میں گھر سے باہر قدم نہ رکھ سکوں۔ ایسے میں بھلا میں سرمد سے کیسے رابطہ کرتی؟'' اس نے سارا حال کہہ سنایا۔

''میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں۔'' کچھ دیر غور و خوض کے بعد وہ بولی تو نیلم چونک پڑی۔

''وہ کیسے؟''

جواب میں وہ اس کے ہاتھوں پر نقش و نگار بناتے ہوئے دھیمی آواز میں سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگی۔ اس کا منصوبہ سن کر نیلم کی آنکھوں کی بجھی ہوئی چمک لوٹنے لگی۔

''تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''اس احسان کے بدلے میں تمہیں بھی ایک کام کرنا ہو گا۔''

''وہ کیا؟'' نیلم نے پوچھا۔

''تم مجھے کاغذ پنسل دے دینا، میں سرمد کے نام ایک پیغام لکھوں گی۔ وہ پیغام تم اس تک پہنچا دینا۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' کام کی نوعیت جان کر نیلم کو اطمینان ہو گیا کہ اسے کوئی مشکل کام نہیں کرنا۔

اس گفتگو کے بعد ان دونوں نے آپس میں مزید بات نہیں کی اور خاموشی سے مہندی لگانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کام کے مکمل ہونے تک گانے والی لڑکیاں بھی تھک چکی تھیں اور اب سونے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ محفل برخاست ہونے لگی۔ ان دونوں کو باہر صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر جانے کا حکم دیا گیا۔ موقع پر نگار نے عورت سے طے شدہ معاوضہ یہ کہہ کر وصول کر لیا کہ صبح وہ لوگ جلدی واپس چلے جائیں گے۔ عورت نے روپے تو تھما دیئے لیکن جوڑے اور مٹھائی کے لیے صاف کہہ دیا کہ کل دن میں آ کر لے جانا۔ دونوں ہی نے اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اصل میں روپوں کی ہی ضرورت تھی، باقی چیزیں بے کار تھیں۔ صحن میں آ کر جب وہ دونوں ایک ہی چارپائی پر لیٹیں تو اس نے نگار کو نیلم کے ساتھ طے کیے گئے اپنے تازہ منصوبے کے بارے میں بتا دیا۔

''اس طرح تو تُو پھنس جائے گی شہزادی! یہ لوگ تجھ پر اپنی لڑکی کے اغوا کا الزام لگا کر تجھے تھانے میں بند کروا دیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس سے پہلے گرو ہی یہاں پہنچ جائے۔ تیرے ہاتھ اس کے ہاتھ سے آزاد ہونے کا جو سنہری موقع آیا ہے، وہ اس مصیبت میں پھنسنے پر ضائع چلا جائے گا۔'' نگار نے اس کا منصوبہ سن کر اعتراض کیا۔



''اللہ مالک ہے۔ میں نیلم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اس بے چاری کے پاس بھی یہی ایک موقع ہے یہاں سے نکلنے کا۔ میرے پاس پھر بھی چانس ہے کہ پولیس کے ہاتھ لگنے کے بعد کسی ایسی جگہ رابطہ کر سکوں جہاں سے مدد مل سکے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''میں تو یہی کہوں گی کہ تُو اچھی طرح سوچ لے۔ کہیں اس ہمدردی کی وجہ سے تجھے خود لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' نگار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسی کا نام انسانیت ہے نگار! تم خود بھی تو میری خاطر رسک لینے کے لیے تیار تھیں۔ بس اسی طرح میں بھی اس کی خاطر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ نیلم میری کچھ نہیں لگتی لیکن سرمد کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کا موقع مل رہا ہے مجھے تو میں پیچھے کیسے ہٹ سکتی ہوں؟'' اس کی یہ بات سن کر نگار نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ سمجھ گئی کہ شہزادی کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ خاموشی کی چادر اوڑھے وقت آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ صبح سے ذرا پہلے شہزادی چارپائی سے اتر کر دبے قدموں نیلم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ انداز بے حد محتاط تھا۔ گھر میں موجود تمام لوگ اگرچہ نیند میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن یہ ذرا اپنی جگہ تھا کہ ذرا سی آہٹ پر کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مگر خیر گزری کہ کسی کے بھی علم میں آئے بغیر وہ آرام سے نیلم کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بے حد دھیمی آواز میں دستک دی۔ فوراً دروازہ کھل گیا۔ یقیناً نیلم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''میں نے اندر سے کنڈی اس لیے لگا لی تھی کہ کہیں کوئی مہمان لڑکی یہاں سونے کے لیے نہ آ جائے۔'' اس کے ٹوکنے سے پہلے ہی نیلم نے دروازہ اندر بند کرنے کی توجیح پیش کی تو اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولی۔

''اب جلدی کرو۔ مجھے اپنے کپڑے دے دو اور خود میرے کپڑے پہن لو۔ میں نے نگار سے بات کر لی ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائے گی۔ کچھ وقت گزرے گا تو دکانیں وغیرہ کھل جائیں گی۔ پی سی او سے سرمد کے موبائل پر کال کر لینا۔ نمبر تو اچھی طرح یاد ہے نا تمہیں؟''

جواباً نیلم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نیم تاریک کمرے میں ان دونوں نے آپس میں لباس تبدیل کیے۔ اب وہ مایوں کے زرد لباس میں اور اس کے بے ڈھنگے پن سے سلے چمکیلے نیلے لباس میں تھی۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے نیلم کے فراہم کردہ کاغذ پر بال پین سے ایک مختصر سا پیغام سرمد کے نام لکھا۔ کمرے میں روشنی بے حد کم تھی اس لیے اسے یہ پیغام لکھنے میں بھی کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بلب روشن کرنے کا خطرہ اس نے خود نہیں مول لیا تھا کہ روشنی کسی کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔

پیغام والا کاغذ تہ کر کے اس نے نیلم کے حوالے کیا جسے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر رکھ لیا۔ اس کی آمد سے پہلے وہ اپنے پاس موجود تھوڑی سی رقم کو بھی اسی جگہ رکھ چکی تھی۔ کمرے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے وہ شہزادی سے گرم جوش انداز میں گلے ملی اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو۔ بس اسے میری خود غرضی سمجھو کہ میں یہاں پہنچنے کا یہ موقع کھونا نہیں چاہتی اس لیے جانتے بوجھتے تمہیں اس مصیبت میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ہو سکے تو میری اس خود غرضی کے لیے معاف کر دینا۔''

''ایسا مت سوچو۔ اگر تم انکار کرتیں تو بھی میں زبردستی تمہیں راضی کر لیتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے

پاس بس یہی ایک موقع ہے، نجات حاصل کرنے کا۔ اپنے لیے مجھے یقین ہے کہ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال
دے گا۔ وہ مالک اس سے پہلے بھی مجھے بڑی بڑی مصیبتوں سے نکالتا رہا ہے۔ بس تم میرے لیے دعا کرنی
اور میرا پیغام یاد سے سرمد کے حوالے کر دینا۔'' اس نے نیلم کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی اور ہدایات دیں
اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''جاؤ..... اب اور دیر مت کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ سب
اُٹھ گئے تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

نیلم باہر نکل گئی اور وہ خود دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان جھری سی بنا کر اسے دیکھتی رہی،
کے صحن میں قدم رکھتے ہی چارپائی پر لیٹی نگار بھی اُٹھ بیٹھی تھی۔ وہ قریب پہنچی تو اس نے سرہانے رکھا
اسے تھما دیا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈھول کو کسی بچے کی طرح تھام کر اس نے اس پوزیشن میں رکھ لیا کہ ہونٹ
ناک اس کی آڑ میں چھپ گئے۔ دوپٹہ پہلے ہی خوب پیشانی تک اوڑھا گیا تھا۔ اس حلیے میں اگر کوئی
نظر ڈالتا تو بالکل بھی اندازہ نہ کر پاتا کہ وہ شہزادی کے بجائے نیلم ہے۔

''بھایا جی! ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں راستہ دے دو۔'' بیرونی دروازے کے ساتھ چارپائی لگا کر
ہوئے نیلم کی سوتیلی ماں کے بھانجے سے کہا گیا نگار کا یہ جملہ اسے کمرے میں بھی سنائی دیا۔

''کیا مصیبت آئی ہے تم لوگوں کو جو اتنی صبح جانے کے لیے بے تاب ہو گئے ہو۔'' لڑکا یقیناً گہری
سے جگائے جانے پر جھنجلا گیا تھا۔

''ہمیں یہاں نیند نہیں آ رہی۔ اپنے گھر جا کر آرام سے سوئیں گے۔ ویسے بھی ہماری رات ہی بات
تھی کہ ہم سویرے جلدی نکل جائیں گے۔'' نگار نے اپنی کرخت آواز میں جواب دیا۔

''اوئے جانے دے شیدے! کیوں بحث میں پڑ کر سب کی نیند خراب کر رہا ہے؟'' صحن میں ہی
ہوئے افراد میں سے کسی نے ہانک لگا کر لڑکے کو ٹوکا تو اس نے بڑبڑاتے ہوئے انہیں باہر جانے کا راستہ
دیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئیں تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کیا اور نیلم کی چارپ
لیٹی۔ نہایت کشیدہ لمحات کے گزر جانے کے بعد ملنے والے اس عارضی سکون کے دوران اس نے پہلی با
جسم پر موجود زرد لباس سے اُٹھتی اُبٹن کی مہک کو محسوس کیا۔ یہ مہک یقیناً مایوں بیٹھی دُلہن کے جذبات میں
مچا کر اسے آنکھوں میں خوب صورت سپنے سجانے پر اُکساتی ہوگی۔ خود اُس کے اپنے احساسات بھی عجیب
ہونے لگے۔ لیکن فی الحال کوئی سپنا ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی آنکھوں میں سجا سکتی۔ وہ چند چھوٹے چھوٹے
جو اس نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کبھی دیکھے بھی تھے تو حالات کے گرداب میں پھنس جانے کے
تعبیر کے مراحل میں داخل ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تقدیر کے اس کھیل کے بارے میں سوچتے
کب اس کی آنکھ لگ گئی، اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ باہر سے سنائی دینے والے شور پر اس کی آنکھ کھلی۔
میں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال
کہ ابھی اسے ایک نہایت مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا ہے مگر اس سے پہلے باہر سے سنائی دیتے شور
جاننا ضروری تھا۔ بستر چھوڑ کر وہ دبے قدموں دروازے کے قریب پہنچی اور کنڈی کھول کر دروازے کے
ذرا سی جھری بناتے ہوئے باہر جھانکا۔ صحن میں دو تین پولیس والے، ملکہ اور نیلم کے رشتے دار نظر آ رہے

''میں بتا چکی ہوں کہ وہ ہیجڑے جو اس کے ساتھی تھے، سویرے ہی یہاں سے نکل کر چلے گئے
تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟'' نیلم کی سوتیلی ماں کی کرخت آواز اس تک پہنچی۔

''دیکھو بی بی! میں بھی بتا چکا ہوں کہ ہمارے آدمی ان کے اڈے پر آدھی رات سے موجود ہیں۔ و



پہنچا۔ اس مردود نے رات بھر مار کھانے کے بعد یہ سچ اُگلا ہے کہ ہیجڑوں کے نام پر یہ جن دو بندوں کو
ارے گھر چھوڑ گئے تھے ان میں سے ایک ہیجڑا نہیں بلکہ لڑکی ہے جسے انہوں نے ہیجڑا بنایا ہوا تھا۔ ہمیں اس
کی تلاش ہے۔ بہت اوپر سے لڑکی کی بازیابی کے آرڈر آئے ہیں۔ ہم تمہاری زبانی کلامی بات پر یقین نہیں
سکتے۔ ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہوگی۔'' ملکہ کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے پولیس والے نے
جواب دیا۔ ملکہ کی حالت سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت ہوئی ہے۔ شاید اس مرمت
نتیجے میں ہی وہ اپنی راہنمائی میں پولیس والوں کو یہاں تک لے کر آئی تھی۔ دروازے کے پیچھے کھڑی
ادی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پولیس والے کی زبانی اوپر سے آرڈر آنے کا سن کر وہ سمجھ گئی کہ کون
ہیں جن کی وجہ پولیس اس کا سراغ لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

''شریفوں کے گھروں کی تلاشی ایسے نہیں لی جاتی صاحب! پہلے وارنٹ دکھاؤ، پھر تلاشی لینا۔'' نیلم کی
لی والدہ نے اپنی قانون دانی بگھاری۔

''کیوں بے کار میں روڑے اٹکا رہی ہے رشیدہ! لینے دے انہیں تلاشی۔ تیرا کیا جا رہا ہے؟ بس بے کار
ہر بات میں اپنی قابلیت جھاڑنے کا شوق ہے تجھے۔'' اسی وقت ایک مرد نے مداخلت کرتے ہوئے تیز و
رشیدہ کو جھڑکا۔ وہ مرد شاید نیلم کا باپ تھا۔

''تم چپ رہو۔ معلوم بھی ہے، شادی والا گھر ہے۔ بری کے زیور، کپڑوں کے علاوہ دسیوں قیمتی چیزیں
رکھی ہیں۔ ان پولیس والوں کا کیا بھروسہ کہ تلاشی کے بہانے کیا کچھ پار کر لیں۔ کوئی چیز کم ہو گئی تو ہم
ان کو کیا جواب دیں گے کہ اس کی بھجوائی ہوئی چیزیں کہاں گئیں؟'' وہ عورت یقیناً بدلحاظی میں اپنی مثال
تھی جو پولیس والوں سے بھی دبنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ عورت کے الفاظ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ اب
والے بری طرح طیش میں آ جائیں گے اور جھگڑا مزید بڑھ جائے گا۔ چنانچہ اس نے خود ہی باہر نکل کر ان
ں کے سامنے آ جانا مناسب سمجھا۔

''یہ دیکھو..... یہ رہی شہزادی۔ ان لوگوں نے نگار کو بھی کہیں اندر ہی چھپایا ہوا ہوگا۔'' سب سے پہلے ملکہ
اس پر نظر پڑی اور وہ زور سے چیخی۔

''نگار اندر نہیں ہے۔ وہ صبح نیلم کو لے کر گھر سے جا چکی ہے۔'' اس نے پولیس آفیسر کے بالکل برابر میں
رے ہوتے ہوئے نہایت اطمینان سے بتایا۔ اُس کے اس انکشاف پر وہاں ہلچل سی مچ گئی۔

''کیا بک رہی ہے تُو؟ کہاں لے کر چلا گیا وہ ہیجڑا نیلم کو؟'' رشیدہ نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی جسے ایک
ں والے نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈنڈا درمیان میں اڑا کر ناکام بنا دیا۔

''وہاں، جہاں وہ اس ظلم سے محفوظ رہ سکے..... جو تم اس کی شادی لالچ میں ایک بوڑھے سے کر کے اس
ھانا چاہتی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہائے ربا! ہم لٹ گئے..... برباد ہو گئے۔ دیکھو نیلم کے ابا! تمہاری بیٹی تمہارے منہ پر کالک مل کر چلی
ا۔'' وہ سر پیٹ پیٹ کر واویلا کرنے لگی۔

''یہ کیا مسئلہ ہے بی بی؟'' پولیس والا اس سے مخاطب ہوا۔

''مسئلہ بہت صاف ہے آفیسر! یہ عورت نیلم کی سوتیلی ماں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی
دستی ایک بڈھے سے کر رہی تھی۔ رات میرا نیلم سے سامنا ہوا تو وہ میری جاننے والی نکلی۔ میں نے اس سے
ہ کر لیا کہ میں اسے یہاں سے نجات دلا دوں گی۔ وہ میرے کپڑے پہن کر نگار کے ساتھ یہاں سے نکل

گئی۔ اب تک امید ہے کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوگی۔'' اس نے مختصراً سارا قصہ سنایا۔

''گرفتار کرلیں اسے انسپکٹر صاحب! اس پر اغوا کا پرچہ کاٹیں۔ اس نے میری بچی کو ورغلا کر گھر سے بھگا دیا۔'' رشیدہ نے شور مچایا۔

''پرچہ تو تمہارے خلاف کٹنا چاہئے۔ تم ایک عاقل و بالغ لڑکی کو حبسِ بے جا میں رکھ کر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کررہی تھیں۔ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' اس نے دوبدو جواب دیا۔ پولیس کا تحفظ مل جانے کے باعث اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا تھا اور وہ اپنی سابقہ جون میں لوٹ رہی تھی۔

''اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے بی بی! ابھی آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمیں اوپر والوں کو آپ کے مل جانے کی رپورٹ بھی دینی ہے۔'' انسپکٹر نے مداخلت کرتے ہوئے بحث کو بڑھنے سے روکا تاہم اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ اس نے انسپکٹر کی بات مان لی۔ فوراً ہی ان لوگوں کی وہاں سے روانگی عمل میں آگئی۔ پیچھے نیلم کے خاندان والے شور کرتے رہ گئے۔

''ان لوگوں کے ساتھ گرو الماس بھی گرفتار ہوا یا نہیں؟'' راستے میں اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ ہمارے پہنچنے سے قبل ہی اڈے سے بھاگ گیا تھا۔ آپ بتائیں، آپ کیسے ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئیں؟'' اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انسپکٹر نے اس کے بارے میں جاننا چاہا۔

''یہ ساری تفصیلات میں صرف انہی کو بتا سکتی ہوں جن کے حکم پر آپ نے مجھے تلاش کیا ہے۔'' اس نے انسپکٹر کو کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ وہ اصرار نہیں کرسکا۔ جتنی اوپر سے آرڈر ملے تھے، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے ہے۔ ایسے لوگوں کے معاملات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ کھوج لگانے سے اجتناب ہی اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کا تجسس اس کے لیے کسی مصیبت کا در کھول دیتا۔ اس کے مقابلے میں یہی مناسب تھا کہ وہ خاموش رہے اور لڑکی کی بازیابی کا کارنامہ انجام دینے کے صلے میں ملنے والے انعام یا ترقی کا انتظار کرے۔ تھانے پہنچ کر ملکہ کو حوالات میں میں دھکیلا گیا اور اسے احترام سے اپنے کمرے میں بٹھا کر انسپکٹر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

''میں نے اوپر اطلاع کردی ہے۔ وہاں سے آرڈر آجائے تو ہم آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔ تب تک آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ اگر کہیں تو ناشتہ منگوا لوں؟''

''نہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر ہی ناشتہ کروں گی۔'' اتنی غیر متوقع رہائی نے اسے ہیجان میں مبتلا کردیا تھا۔ خالی پیٹ ہونے کے باوجود اس کیفیت میں اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ صرف چائے منگوا لیتا ہوں۔'' بے انتہا خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سنتری کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبایا مگر سنتری کی آمد سے قبل ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا اور دسری طرف کی بات سن کر ''یس سر..... یس سر'' کی ہی گردان کرتا رہا۔ فون بند ہوا تو وہ گھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے سنتری کو اپنے پہلے ارادے کے مطابق حکم دینا بھول چکا تھا۔

''سب کو الرٹ کردو۔ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب خود ان خاتون کو لینے یہاں آرہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔'' اس حکم پر تھانے کی حدود میں تھرتھری سی پھیل گئی۔ پندرہ منٹ کے وقفے میں دوڑ دوڑ کر سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ انتظار کے پندرہ منٹ پولیس والوں کے ساتھ اس کے لیے بھی بڑے ہیجان خیز تھے۔ آخر یہ پندرہ منٹ گزر ہی گئے اور باہر سے جوتوں کی مخصوص



کھٹک سنائی دینے لگی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ آنے والے آچکے ہیں اور ماتحت افراد سے سیلوٹ وصول کرتے ہوئے انسپکٹر اپنے اعلیٰ افسران کے استقبال کے لیے خود کمرے سے باہر نکل کر جا چکا تھا۔

''آیئے سر پلیز! آپ کی مطلوبہ خاتون اندر موجود ہیں۔'' باہر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر چق ہٹا کر وہ دو افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی خاطر وہاں آنے والے آئی جی اور ڈی آئی جی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان دونوں کے چہروں پر بہ یک وقت حیرت اور مایوسی کے تاثرات اُبھرے۔

''تم..... تم کون ہو؟'' ڈی آئی جی سجاد رانا نے سرسراتی آواز میں بہ مشکل یہ سوال کیا۔

⊛----✪----⊛

''اماں! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے بالکل بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں حویلی میں واپس جاؤں گی۔'' کشور نے منہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی چھوٹی چودھرائن ناہید سے کہا۔ اس سمیت حویلی کی تمام خواتین اس وقت انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ بنیادی طور پر تو اس تقریب کو بہت سادگی سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا لیکن وہ پروگرام چودھری افتخار کو اپنے شایانِ شان محسوس نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑی چودھرائن اس افتتاح کے لیے خاص طور پر حویلی سے باہر نکلے گی، اس لیے تقریب بھی زوردار ہونی چاہئے۔ اس زوردار تقریب کا انتظام اس نے اپنے پلّے سے کردیا تھا۔ اس وقت بڑے سے پنڈال میں پورے گاؤں کی عورتیں جمع تھیں۔ ان عورتوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں بچھائی گئی تھیں جبکہ حویلی کی معزز خواتین اوپر اسٹیج پر رکھی شان دار کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

اسکول کی افتتاحی تقریب کے موقع پر پیش کیے جانے والے ورائٹی پروگرامز کی خبر حویلی تک بھی پہنچی تھی۔ اس تقریب کو بھی وہی رنگ دینے کے لیے بڑی چودھرائن نے فرمائش کی تھی کہ وہ عورتیں جن کی آواز اچھی ہے یا وہ ناچنا جانتی ہیں، اسٹیج پر آکر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ عورتوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ بہت سے تحائف بھی اپنے ساتھ پیک کروا کر لائی تھی۔ کشور کی مدد سے اس نے اس موقع کے لیے ایک تقریر کی بھی تیاری کرلی تھی۔ یعنی اچھا خاصا لمبا پروگرام تھا جس میں کافی وقت لگتا جبکہ کشور نے دس منٹ سے بھی کم عرصے میں سر درد کی شکایت کرتے ہوئے حویلی واپس جانے کی فرمائش کردی تھی۔ اس کی یہ فرمائش سن کر چھوٹی چودھرائن پریشان ہوگئی اور آہستہ سے بولی۔

''ایسے کیسے واپس چلی جائے گی؟ وڈی چودھرائن کو برا لگے گا۔ فیر گڈی بھی تو ایک ہی کھڑی ہے باہر۔ دوسری تو چودھری صاحب نے واپس حویلی بلوالی تھی۔''

''اوہو اماں! گاڑی کا کیا ہے؟ مجھے چھوڑ کر واپس آجائے گی۔ باقی کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دو۔ میرا درد سے برا حال ہو رہا ہے۔ دوسروں کی ناراضگی کا خیال کرکے کیا میں اپنی جان سے گزر جاؤں؟'' وہ جھنجلائی اور پھر ماں کا جواب سننے سے قبل ہی اشارے سے کچھ فاصلے پر کھڑی رانی کو بلا کر اس سے بولی۔ ''ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی قریب لے کر آئے۔ میں حویلی واپس جاؤں گی۔ اسے مجھے چھوڑ کر واپس یہیں آنا ہوگا۔ اور ہاں تم میرے ساتھ ہی چلو گی۔''

''جی اچھا بی بی!'' رانی جھٹ پٹ حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

''تو روز بہ روز بڑی ضدی ہوتی جا رہی ہے کشور! ہر وقت اپنی مرضی کرتی ہے اور مشکل مجھے ہوتی ہے۔

ناہید نے دبی آواز میں اسے گھرکا۔ وہ دونوں اسٹیج کی بالکل کونے والی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اس
دوسروں تک ان کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ کشور ماں کی ڈانٹ سننے کے بعد بھی بے نیاز بیٹھی رہی۔ ڈرائیور
پاس پیغام لے کر جانے والی رانی لمحوں میں واپس آ گئی۔

''گاڑی تیار ہے بی بی!'' قریب آ کر اس نے اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سنتے ہی کشور اپنی چادر
کرتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اُتر آئی۔ بڑی چودھرائن اور دونوں بہنیں اُس کی اس طرح روانگی پر حیران ہو رہی
گی، اسے خبر تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر ان میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی
سب کے سوالوں کے جواب دینے کا فریضہ بہ خوبی نبھا لے گی۔ اس وقت اُس پر جو دُھن سوار تھی، اس
سامنے اسے کسی کی ناراضگی کی فکر نہیں تھی۔ آج تو وہ اس کے کہنے پر بھی رکنے والی نہیں تھی جس کی خاطر
مول لے رہی تھی۔ قسمت سے جو موقع ہاتھ آیا تھا، وہ پھر ملتا تو بھی وہ بات نہ ہوتی جو آج ملنے جانے میں تھی

پنڈال کے باہر ڈرائیور نے اس طرح گاڑی لگائی تھی کہ اسے کھلے آسمان تلے دو قدم بھی نہیں چلنا
جیسے ہی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر پچھلی نشست پر بیٹھی، رانی نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا اور
ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جا بیٹھی۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچے پکے راستے
سے گزرتے ہوئے وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچی تو رانی نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے تحکم
لہجے میں کہا۔

''گاڑی یہیں روک دو شریف!''

ڈرائیور نے اس کے حکم کی تعمیل کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حکم دینے والی زبان بے شک ایک ملازمہ کی
لیکن حکم مالکہ کی طرف سے ہی جاری ہوا ہوگا۔

''تم یہیں رک کر ہمارا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر بعد ہم یہیں واپس آئیں گے۔'' دروازہ کھول کر گاڑی
نیچے اُترتے ہوئے رانی نے اسے دوسری ہدایت دی۔

''مم..... مگر..... میں دوسروں کو کیا جواب دوں گا؟ کسی کو معلوم ہو گیا تو میری کھال اُتر جائے گی
ڈرائیور سمجھ سکتا تھا کہ اس طرح چوری چھپے راستے میں اُترنے کا کیا مطلب ہے۔ جہاں بہت زیادہ پابندیاں
ہوں، وہاں اس طرح کے چور راستے تلاش کر ہی لیے جاتے ہیں۔ رانی یقیناً اپنی مالکن کی رازدار اور دست
راست تھی جو اس کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال رہی تھی۔ لیکن وہ کیوں خوامخواہ اپنی گردن پھنساتا؟ اس
پیچھے بیٹھی مالکن کے لحاظ کے باوجود اپنے خدشے کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

''کہہ دینا گاڑی خراب ہو گئی تھی، اسے ٹھیک کرنے میں دیر ہو گئی۔ کسی نے اگر تمہیں یہاں کھڑا دیکھ لیا
اس سے گاڑی خراب ہونے کا بہانہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا کہ بی بی کا یوں بیچ راستے میں کھڑا
مناسب نہیں تھا اس لیے رانی انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی ہے۔'' وہ یقینی طور پر ایک طے شدہ منصوبے
عمل کر رہی تھی اس لیے اس کے پاس سارے حل موجود تھے۔ سب سے زوردار اور طاقتور حل وہ نوٹ تھے
اس نے اپنی بات کے اختتام پر ڈرائیور کی ہتھیلی پر رکھے تو وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود تعاون کے لیے آمادہ
ہو گیا۔ اس کو آمادہ دیکھ کر کشور گاڑی سے نیچے اُتر آئی۔

انہیں جہاں جانا تھا، وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ اردگرد کوئی کھیت نہ ہونے اور گاؤں کی تمام
عورتوں کے تقریب میں شرکت کے لیے چلے جانے کے باعث یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ کوئی کشور کو دیکھ کر پہچان
لے گا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ دونوں ایک مکان کے سامنے جا کر رُکیں۔ یہ وہی مکان تھا جو آفتاب اور اس



ی ٹیچرز کو رہائش کے لیے دیا گیا تھا۔ رانی نے دستک دینے کے لیے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہاتھ لے
ے کھلتا چلا گیا۔ کھلے دروازے کے دوسری طرف صحن میں ٹہلتا ماسٹر آفتاب صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں
سے اندر داخل ہو گئیں۔ آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر کشور کی طرف رخ کرتے ہوئے
ی ناراضی سے بولا۔

''آخر آپ اپنی ضد پوری کر کے ہی رہیں۔''

''کبھی کبھی ہمیں بھی اپنی ضد منوانے کی اجازت ملنی چاہیے۔ ہمیشہ تو ہم آپ کے کہے پر عمل کرتے
'' اس کی طرف دیکھتی ہوئی وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو وہ پل بھر کے لیے اسے گھورتا رہا اور پھر
ادیا۔

''مان لیا میں نے آپ کا یہ حق۔ چلیں اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ اپنے کمرے
لے گیا۔ رانی تو اندر قدم رکھنے کے بعد فوراً ہی اندھی بہری اور گونگی بن گئی تھی کہ یہی مالکن سے حقِ وفاداری
انے کا طریقہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کشور کی نظر سب سے پہلے میز پر رکھے بڑے سے کیک اور اس
ساتھ ہی رکھی دو کتابوں پر پڑی۔

''مجھے آنے سے اتنی سختی سے منع کر رہے تھے اور یہاں پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اگر میں نہ آتی تو آپ کا
ارتو رائیگاں چلا جاتا نا۔'' ان چیزوں کو دیکھ کر وہ آفتاب کی طرف رخ کرتے ہوئے ناز سے بولی۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گی۔'' وہ یقین سے بولا۔

''وہ کیوں بھلا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''محبت کرنے والوں کو یہاں سے خبر مل جاتی ہے کشور بی بی! اپنے محبوب کے ارادوں کی پختگی پرکھنے کے
لیے یہ کافی ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کشور کا ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب عین دل کے اوپر
ا۔ وہ اپنے ہاتھ کے نیچے اس کے دل کی دھڑکن کو سننے لگی۔ اسے لگا کہ اس کے ہاتھ کے نیچے موجود دل کی ہر
ڑکن اس کا نام لے رہی ہو۔ وہ محجوب سی ہو گئی۔ آفتاب کے قریب آنے کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے دل
دھڑکن سن سکے۔ اس کا شرمانا اور گھبرانا فطری تھا۔ اسی کیفیت کے باعث اس نے ذرا سا زور لگا کر اپنا ہاتھ
ں کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔

''اونہوں..... اب ایسی کوئی کوشش بے کار ہے۔ ایک ضد آپ نے کی تھی، میں نے اس کا احترام کیا۔ اب
ک ضد میرے دل کی ہے کہ اس کی مسیحا کا ہاتھ کچھ دیر یہیں رکھا رہے تاکہ اسے قرار ملے۔ آپ کو میرے دل
ی اس ضد کا احترام کرنا ہوگا۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت کرتے ہوئے اس نے اسے ٹوکا۔

''تو اب آپ بدلہ لیں گے ہم سے؟'' اس نے شکوہ کیا لیکن دوبارہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

''اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو لیجیے میں اپنی ضد سے دست بردار ہو جاتا ہوں۔'' آفتاب نے فوراً اس کا ہاتھ
چھوڑ دیا۔

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' اس طرح ہاتھ چھوڑ دیئے جانے پر اسے دھچکا لگا اور وہ فوراً صفائی دینے لگی۔

''میں بھی مذاق کر رہا تھا۔ ہاتھ تو میں نے اس لیے چھوڑا ہے کہ آپ اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ سکیں۔ صبح
صبح آپ کی خاطر نور کوٹ جا کر بڑی مشکل سے یہ کیک لایا ہوں۔ آج اپنے اصول کے خلاف مجھے اسکول کی
چھٹی بھی کرنی پڑی ہے۔'' اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلا کر اسے میز کے قریب لے جاتے ہوئے اس
نے بتایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر ذرا اتراتے ہوئے بولی۔

''محبت اسی کا نام ہے ماسٹر صاحب! محبت اپنے اصول خود طے کرتی ہے۔ اس کے اصولوں کے
آدمی کے ذاتی اصول بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اپنے اصول کے خلاف آپ کو سکول کی چھٹی کرنی پڑی،
مجھے افسوس ہوا لیکن سچ جانئے کہ اس سے بھی بڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ ایسا آپ نے میری خاطر
اس اہمیت پر میں بڑی نازاں ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی باہر جاؤں اور سب کو بتا دوں کہ آفتاب
مجھ سے محبت ہے۔ اتنی ڈھیر ساری محبت کہ وہ میری خواہش کی تکمیل کے لیے اپنا ایک اصول قربان کر گئے
''جی ہاں۔ بالکل، ضرور جا کر اپنا یہ شوق پورا کیجئے تاکہ آپ کے ابا حضور دھائیں دھائیں میرے
میں گولیاں اُتار کر مجھے یہیں دفن کروا دیں۔ بعد میں آپ میری قبر پر مجاورن بن کر بیٹھ جایئے گا۔'' اس کی بات
کر وہ چڑانے والے انداز میں بولا تو اس نے فوراً ہی دہل کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور خفگی سے بولی
''اللہ نہ کرے..... کیوں ایسی بری باتیں منہ سے نکالتے ہیں؟''
''میں نہ بھی کہوں تو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ چودھری صاحب کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئی، وہ
ساتھ کم سے کم بھی یہی سلوک کریں گے۔'' اپنے ہونٹوں پر رکھے اس کے ہاتھ کو چوم کر اپنے ہاتھ میں لیتا
سنجیدگی سے بولا۔
''میں ایسے کسی سچ کو نہیں سننا چاہتی۔ کم از کم آج کے دن تو ہرگز بھی نہیں۔ میں آپ کی کتاب
ہونے اور اپنی سالگرہ کی خوشی سارے خدشے اور واہمے بھول کر منانا چاہتی ہوں۔ میں نے اتنا خطرہ مول
یہاں تک آنے کی راہ اس لیے نہیں نکالی کہ میں ایسی بدشگونی کی باتیں سنوں۔'' اس کے لہجے کی خفگی قائم
''ٹھیک ہے بابا! اب نہیں کروں گا ایسی باتیں۔ آپ کیک تو کاٹیں۔'' اس نے فوراً ہی معذرت
ہوئے اس کے ہاتھ میں چھری تھمائی اور کیک پر لگی موم بتیاں روشن کرنے لگا۔ کشور نے کیک کاٹا اور ایک
سا پیس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ذرا سا کھا کر وہی پیس اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا۔ وقت کے ان لمحا
میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مگن ہر طرح کے اندیشوں سے آزاد اور بے فکر ہو گئے تھے۔
''لایئے اب میرا تحفہ دیجئے۔'' کشور نے اس سے فرمائش کی تو اس نے کیک کے قریب رکھی کتابوں
سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔
''اپنی زندگی کی سالگرہ پر اس کے لیے یہ چھوٹا سا تحفہ!'' پہلے ہی صفحے پر خوب صورت سنہری حروف میں
تحریر لکھی ہوئی تھی۔ کل رات فون پر گفتگو کے دوران اس نے کشور کو بتایا تھا کہ اس کے کالمز پر مشتمل کتاب
چھپ کر آ چکی ہے۔ فی الحال کتاب کی رونمائی کی تقریب ہونا باقی تھی لیکن پبلشر نے اسے کتاب کی چند جلد
بھجوا دی تھیں۔
کشور اس کی زبانی یہ اطلاع سن کر بے چین ہو گئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ کل اس کی سالگرہ ہے اور اس
پر اسے یہ کتاب آٹوگراف سمیت تحفے میں دی جائے۔ مطالبے کے ساتھ ہی اس نے سارا منصوبہ بھی طے
کہ وہ کیسے انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب سے بہانہ کر کے نکلے گی اور اس تک پہنچ جائے گی۔ آفتاب
بڑی کوشش کی کہ اُسے اس ارادے سے باز رکھ سکے لیکن اس پر دھن سوار ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنی سالگرہ
موقع پر اس سے اپنا من پسند تحفہ، اپنی من پسند جگہ پر آ کر وصول کرنا اس کا حق ہے۔ آفتاب اس کے اس
چیلنج نہیں کر سکا اور اب وہ نتیجتاً یہاں تھی۔
''یقین جانیے آفتاب! پوری زندگی میں نہ تو کبھی میری سالگرہ کا دن اتنا خوب صورت گزرا اور نہ ہی
اتنا شاندار تحفہ ملا۔ شکریہ کہنا اگر محبت کے اصولوں کے خلاف نہ ہوتا تو میں آپ کا شکریہ ضرور ادا کرتی۔''



''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ جواباً آپ بھی مجھے اس خوب صورت موقع پر ایک تحفہ دے
ی ہیں۔'' اس کی بات سن کر اس نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔
''میں تو اپنے ساتھ کچھ لائی ہی نہیں۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔
''مجھے ساتھ لائی ہوئی کوئی چیز چاہئے بھی نہیں۔ بس اپنے ہاتھ سے چند لفظ لکھ کر میری اس کتاب کی
لت بڑھا دیں۔'' اس نے کتاب کی دوسری جلد کھول کر اس کے سامنے رکھی اور اپنی جیب میں اٹکا پین نکال کر
اسے تھمایا۔ وہ پین تھام کر لمحے بھر کے لیے کچھ سوچتی رہی پھر کتاب کے کھلے صفحے پر لکھنے لگی۔ وہ سامنے کھڑا
اسے انہماک سے دیکھتا رہا۔ بہت سلیقے سے اوڑھی گئی چادر اب کچھ بے ترتیب ہو گئی تھی اور چادر کے نیچے سے
جھانکتا اس کا ہلکے سبز رنگ کا لباس اسے متوجہ کر رہا تھا۔
''اگر آج کی تیاری میرے لیے کی گئی تھی تو پھر مجھے ہی کیوں محروم رکھا گیا؟'' وہ کتاب پر اس کے حسب
فرمائش لکھنے کے بعد فارغ ہوئی تو اس نے شکوہ کیا۔ وہ فوراً ہی اس کا مطلب سمجھ گئی اور چہرے پر سرخی سی دوڑ
گئی۔ تاہم اس نے آفتاب کی فرمائش رد نہیں کی اور بڑی سی چادر اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ چادر کے نیچے اس
نے جارجٹ کے لباس کا ہم رنگ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ دوپٹے کے کناروں پر بہت خوب صورت سی بیل لگی ہوئی
تھی۔ جارجٹ کا یہ دوپٹہ چادر کی طرح اس کے جسمانی خطوط کی پردہ پوشی کرنے میں ناکام تھا اور اس کے وجود
کی رعنائیاں خوب خوب اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔ آفتاب نے پہلی بار اسے یوں بغیر چادر کے دیکھا تھا چنانچہ
اپنی نظریں اس کے وجود سے ہٹانے میں ناکام رہا۔
''بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے چلنا چاہئے۔'' وہ عورت تھی۔ اس کی نظروں کی زبان پڑھ لینا اس کے لیے
بہت آسان تھا۔ چنانچہ کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھتی ہوئی گھبراتی، شرماتی ہوئی بولی اور ایک جانب رکھی
اپنی چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''مت جاؤ..... یہیں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔'' وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور اسے اپنی بانہوں کے
حصار میں لے لیا۔ کشور کسی مجسمے کی طرح ساکت ہو گئی۔ آفتاب کے ہونٹ اس کے چہرے کے خدوخال سے
گفتگو کرنے لگے۔ یہ برسوں سے پیاسی زمین پر بارش کے چند چھینٹے پڑنے والی بات تھی جن کے سبب زمین
سیراب ہونے کے بجائے مزید دہک اُٹھتی ہے۔ وہ بھی جذبات کی شورش سے دہک رہی تھی۔ اس پر برسنے والا
بادل بھی ایسا تھا جو وادی وادی گھوم کر آنے کے باوجود کسی سرزمین پر نہیں برسا تھا۔ یہ بادل کھل کر برس جاتا تو
زمین سیراب ہو جاتی لیکن اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دونوں اپنی اُلجھی سانسوں کو
سنبھالتے یک دم ہوش میں آ گئے۔
''اجازت ہے؟'' وہ جانتی تھی کہ دستک دینے والی رانی ہے جس نے اسے وقت کا احساس دلانے کی
کوشش کی ہے اس لیے پھرتی سے چادر اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹی اور جھکی نظروں سے آفتاب سے سوال کیا۔
''بالکل۔'' اس نے جواب دیا تو کشور نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔
''میری گستاخی ناگوار گزری ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' وہ پیچھے سے آہستہ آواز میں بولا تو
وہ تڑپ کر مڑی اور شکوہ کناں انداز میں بولی۔ ''آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں کہ محبت میں شکریے کی طرح معذرت کرنا
بھی اصول کے خلاف ہوتا ہے۔''
''بہت اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ چھوٹی سی معذرت آپسی تعلق کو اور بھی مضبوط کر دیتی
ہے۔ محبت میں انا نہیں ہوتی اور صرف آدمی کی انا ہی ہوتی ہے جو اسے اپنے قصور پر معذرت کرنے سے روک

دیتی ہے۔ انا نہ ہو اور صرف محبت ہو تو آدمی بے قصور بھی بلا جھجک معذرت کر لیتا ہے۔'' اس نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا جسے سن کر وہ مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی۔

''تو جناب کا خیال ہے کہ درحقیقت آپ سے کوئی گستاخی نہیں ہوئی اور آپ بس یونہی ہم سے تعلق منقطع رکھنے کے لیے معذرت کر رہے ہیں۔''

''آپ تو سچ مچ بہت ذہین ہیں۔ میرا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ گئیں۔'' وہ بلند آواز میں ہنسا۔ کشور نے بھی دھیمی آواز میں اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رانی چہرے پر پریشانی لیے سامنے کھڑی تھی۔

''اب ہمیں چلنا چاہئے بی بی!'' اُس نے اُس کی شکل دیکھ کر فقط اتنا سا ہی جملہ کہا لیکن کشور کو احساس تھا کہ وہ اتنی دیر لگ جانے کے باعث پریشان ہو اُٹھی ہے۔

''تھینک یو رانی! تمہاری وجہ سے آج مجھے اپنی زندگی کی بڑی انمول خوشیاں ملی ہیں۔'' رانی کا ہاتھ تھام کر اس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے باہر نکل کر اس راستے پر چل پڑیں جو درختوں کے اس جھنڈ تک جا رہا تھا جہاں انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی سمیت چھوڑا تھا۔ دُور ہی سے انہوں نے دیکھ لیا کہ گاڑی کا بونٹ اٹھا ہوا ہے اور قریب کھڑا ڈرائیور تشویش سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا۔ بونٹ گرا کر اس نے پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان دونوں کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس تیز رفتاری سے وقت کے فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ڈرائیور کا اضطراری عمل تھا کہ وہ لاشعوری طور پر ایسی کوشش کر رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیا پوزیشن ہے عبدالمنان! سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟'' گاڑی پیر آباد کی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے عبدالمنان کا نمبر ملا کر اس سے پوچھا پیر آباد میں جاری افتتاحی تقریب کے انتظامات سنبھالنے کے لیے عبدالمنان صبح سے وہاں پہنچا ہوا تھا جبکہ وہ خود نور پور کے دورے پر چلا گیا تھا۔ ایک تو اسے وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لینا تھا، دوسرے وہ پیر آباد میں زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ تقریب میں شرکت کے باعث اسے اپنا وقت چودھری کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ جبکہ چودھری اور وہ دو مختلف دنیاؤں کے بندے تھے۔ چنانچہ چودھری کو برداشت کرنا اس کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ خود کو اس امتحان میں زیادہ دیر مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا آج کا شیڈول اس طرح ترتیب دیا تھا کہ پیر آباد میں مختصر وقت کے لیے ہی ٹھہرنا پڑے اور اب طے شدہ شیڈول کے مطابق وہ مقررہ وقت پر پیر آباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

''ایوری تھنگ اِز آل رائٹ سر! تقریب ابھی جاری ہے۔ میرے ساتھ آنے والی خاتون صحافی اندر پنڈال میں موجود ہیں اور تقریب کی کوریج کر رہی ہیں۔ حویلی کی خواتین کے علاوہ جن خواتین کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں سے ایس پی صاحب اور ڈاکٹر مسعود کی مسز بھی کچھ دیر قبل یہاں پہنچ گئی ہیں۔ اندازہ ہے کہ آدھے گھنٹے میں تقریب ختم ہو جائے گی اور ہم فارغ ہو جائیں گے۔''

''اصولاً تو اب تک تقریب کو ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ چھوٹے سے انڈسٹریل ہوم کے افتتاح کے لیے اتنا زیادہ وقت خرچ کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔'' وہ عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ کو سن کر جھنجلایا۔



''آپ چودھری صاحب اور ان کی فیملی کے مزاج کے بارے میں تو جانتے ہی ہیں سر! کہ کس قدر شوباز ٹائپ ہیں۔ پہلے چودھری صاحب نے تقریب کو اپنی بیگمات کے شایانِ شان منعقد کرنے کے چکر میں پھیلایا اور اب ان کی بیگم باقی کی کسر پوری کر رہی ہیں۔ میرا اندر موجود خاتون صحافی سے رابطہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بڑی چودھرائن تقریب ختم کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ پہلے ورائٹی شو کے نام پر اچھا خاصا وقت لگایا گیا اور اب تصویریں کھنچوانے کا سلسلہ جاری ہے۔ چودھری صاحب کی طرف سے اخبارات میں حویلی کی خواتین کی تصویریں شائع کرنے پر پابندی ہے لیکن چودھرائن اپنا ذاتی کیمرہ لے کر آئی ہیں اور اب انہوں نے ہماری بھیجی ہوئی خاتون صحافی کو اپنا فوٹو گرافر بنا رکھا ہے۔'' عبدالمنان نے بے بسی سے بتایا۔

''او کے! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو جائے۔ میں پیر آباد پہنچ چکا ہوں اور اب حویلی پہنچنے ہی والا ہوں۔ تم فارغ ہوتے ہی وہاں آ جانا۔'' عبدالمنان کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پایا اور اسے ہدایات دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگلے دو منٹ میں وہ حویلی پہنچ چکے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی حویلی کے بڑے سے پھاٹک سے اندر داخل کی ہی تھی کہ ایک دوسری گاڑی بھی پیچھے سے چلی آئی۔ اس کے گاڑی سے اُترنے سے قبل ہی پچھلی گاڑی سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے پوری طرح چادر میں چھپی ہوئی تھی لیکن دوسری کو اس نے پہچان لیا۔ وہ وہی ملازمہ تھی جس کو اس نے لاہور کے ہسپتال میں آفتاب کے کمرے کے باہر دیکھا تھا۔ اس ملازمہ کو دیکھ کر وہ یہی قیاس کر سکتا تھا کہ یہ چادر پوش لڑکی آفتاب کی محبوبہ کشور ہے۔ وہ گاڑی سے اُترنے کے بعد جب تک اندر نہیں چلی گئی، وہ احتیاطاً اپنی گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ چودھری افتخار کی دختر کا اتنا احترام لازمی تھا۔

''تو خالی کشور بی بی کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے..... باقی بیبیاں میری اکیلی گڈی میں کیسے واپس آئیں گی؟'' مشابرم خان نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا، تب ہی اس کے کان میں پچھلی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا گیا یہ جملہ پڑا۔

''میں بھی دوبارہ واپس جاؤں گا۔ بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ جلدی اُٹھ آئی تھیں۔ پر نصیب کی خرابی کہ راستے میں گڈی ہی خراب ہو گئی۔ وڈی مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا، تب کہیں جا کر ہم ادھر پہنچ سکے۔ مجھے تو خود فکر ہو رہی ہے کہ اُدھر گڈی کا انتظار ہو رہا ہو گا۔ وڈی چودھرائن تو سخت خفا ہوں گی کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگائی..... پر میں کیا کرتا؟ ان مشٹیوں کا کوئی بھروسہ تھوڑی ہوتا ہے۔ اچانک سے آدمی کو دھوکا دے جاتی ہیں۔'' اندر جاتے ہوئے ڈرائیور کی بیان کردہ صورتِ حال اس کے کانوں میں بھی پڑی جس کو سن کر وہ سمجھ گیا کہ تقریب ختم نہ ہونے کے باوجود کشور کیوں جلدی واپس آ گئی ہے۔ اس کا استقبال کرنے والے ملازم نے اسے حویلی کے شان دار ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔ وہاں چودھری کے ساتھ ایس پی معظم تارڑ پہلے سے موجود تھا۔ وہ دونوں شطرنج کی بازی جمائے ہوئے بیٹھے تھے۔

''آیئے اے سی صاحب! ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بڑی دیر لگا دی آپ نے۔'' اسے دیکھتے ہی چودھری نے پُرجوش انداز میں استقبال کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

''جی ہاں۔ اصل میں آج مجھے نور پور کے دورے پر بھی جانا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہاں بھی ہمارے پروجیکٹس پر کام ہو رہا ہے۔ بس وہاں سے واپس آتے آتے کچھ تاخیر ہو گئی۔'' چودھری اور ایس پی دونوں سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

''اتنی سی عمر میں آپ کن جھمیلوں میں پڑ گئے ہیں اے سی صاحب! ابھی تو یہ آپ کے کھیلنے کھانے کی عمر

ہے۔ابھی آپ لائف کو انجوائے کریں۔ بہت وقت پڑا ہے اس طرح کے سوشل ورکس کرنے کے لئے
کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چودھری نے اسے مشورہ دیا۔

''چودھری صاحب! میں ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں جو وقت پر بھروسہ کر کے اپنی عمریں
یتے ہیں۔ ویسے بھی ہم ''کھانے والوں'' میں سے نہیں ہیں اور ''کھیل'' بھی فیئر طریقے سے کھیلنا پسند
ہیں۔ ہاں اگر سامنے والا بے ایمانی پر اُتر آئے تو اُس کی چالوں کا ہمارے پاس یہی توڑ رہ جاتا ہے کہ
چال اسی پر اُلٹ دیں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں چودھری کی بات جواب دیا اور بساط پر بکھرے مہ
جائزہ لینے لگا۔ مہروں کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ ایس پی کو مات ہونے ہی والی ہے۔

''کیا ایس پی صاحب کو مات ہونے سے بچانے کے لیے غور کر رہے ہیں، اے سی صاحب؟'' ا
نے اسے چھیڑا۔

''جی نہیں۔ آپ میں سے کسی کو بھی مات ہو، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ آپ کھیل جاری رکھئے
دیکھتا ہوں کہ ایس پی صاحب خود کو مات سے بچانے کے لیے کیا ترکیب لڑاتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر ا
خیز لہجے میں جواب دیا جسے نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں ایک بار پھر کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس سے
ڈرائنگ روم میں بھونچال سا آ گیا۔ بھونچال بن کر وہاں آنے والا اچھے تن و توش کا ایک نوجوان لڑکا تھا
کے چہرے پر موجود مخصوص وحشت اس کی ذہنی معذوری کا اعلان کر رہی تھی۔

''میں یہاں کھیلوں گا۔ تم گندی ہو، مجھے کہیں بھی نہیں جانے دیتیں۔'' وہ ہانپتی ہوئی ملازمہ سے مخاط
جو اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ملازمہ سے کہتا ہوا ہاتھ میں پلاسٹک کے بلّے سے ڈرائنگ رو
سجے قیمتی ڈیکوریشن پیسز کو بال کی طرح ہٹ کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار ڈیکوریشن پیس اس کے بلّے
میں آ کر زمین بوس ہونے کے بعد چکنا چور ہو گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہر ٹوٹنے والے ڈیکوریشن پیس کے
ساتھ ملازمہ کے چہرے پر چھائے خوف اور بے بسی کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

''آپ اوپر چلئے چھوٹے شاہ جی! وہاں آپ کے بہت سارے کھلونے ہیں۔ اوپر جا کر میں آپ
ساتھ کھیلوں گی۔'' ملازمہ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس ابنارمل نوجوان کو بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے اس
پیچھے چل رہی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اسے نیچے پڑی کرچیوں سے زخمی ہو جانے والے پیروں کا
ہوش نہیں تھا۔ مہمانوں کے سامنے پیش آنے والی اس صورتِ حال پر چودھری کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا
وہ جلال میں بھرا ملازموں کو پکارنے لگا۔ فوراً ہی تین چار ملازم وہاں آ پہنچے اور اس کے اشارے پر نوجوان کو
میں کر کے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئے۔

''ماف کر دیں سرکار! مالوم نہیں کیسے چھوٹے شاہ جی میری آنکھ بچا کر نیچے اُتر آئے۔ دوبارہ ایسی غلطی
ہو گی۔'' زخمی پیروں والی ملازمہ فوری طور پر باہر جانے کے بجائے وہیں رک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہو
چودھری سے معافی مانگنے لگی۔

''تیرا تو میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔ ابھی اپنی شکل گم کر میرے سامنے سے۔'' چودھری غضب ناک
دھاڑا۔ وہ بے چاری اس کی بات سن کر اور بھی زیادہ بری طرح لرزنے لگی تاہم اس میں مزید کچھ کہنے کی
نہیں تھی اس لیے چپ چاپ باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسری ملازمہ آ کر وہاں موجود کچھ
سمیٹنے لگی۔

چودھری کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس کا مزاج بری طرح برہم ہو چکا ہے اور اسے اپنا



کرنے میں سخت دشواری پیش آ رہی ہے۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔'' بالآخر وہ برداشت نہ کر سکا اور یہ
ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

''کون تھے وہ صاحب زادے؟'' شہریار یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ لڑکے کا تعلق چودھری کے خاندان سے
بس اس نے چودھری سے اس کا رشتہ معلوم کرنے کے لیے یہ سوال کیا۔

''چودھری صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا بہزاد شاہ تھا۔ بے چارہ ذہنی طور پر معذور ہے۔'' ایس پی نے
تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد چودھری بھی واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے
ات قدرے پُرسکون تھے۔

''میں نے ملازموں کو کھانا لگانے کا کہہ دیا ہے۔ ہم لوگ چل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ خواتین تھوڑی دیر میں
آ جائیں گی تو ان کے لیے الگ دسترخوان لگ جائے گا۔ میں نے چودھرائن کو ہدایت کر دی تھی کہ تمام
خواتین کو اپنے ساتھ حویلی لے کر آئیں۔ مہمان صحافی خاتون سے ان کی تقریب کے بارے میں رائے بھی
م کر لی جائے گی تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اخبار کے لیے کیسی رپورٹ تیار کریں گی۔''

ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کھانا لگوانے کی اطلاع دینے کے ساتھ آگے کا پروگرام بھی بتایا۔
ل میں کھانے کا ذکر اب شہریار کی طبیعت پر ناگوار گزرنے لگا تھا۔ پچھلی ایک دو ملاقاتوں میں تو اس نے
کچھ بھی کھانے پینے سے سخت اجتناب کیا تھا لیکن آج ایسی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اندرونی
ت کو چھپائے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی وائبریشن سے اسے
لا کہ کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ سجاد رانا کی کال آ
ی۔ ''یس'' کا بٹن دباتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

''کہاں تھے شیری؟ میں کافی دیر سے تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفس سے معلوم ہوا کہ تم
ے پر ہو اور موبائل پر کال کرنے پر کوئی رسپانس ہی نہیں مل رہا تھا۔''

''فی الحال تو میں پیر آباد میں ہوں۔ اس سے پہلے نور پور میں تھا۔ شاید آپ نے اس وقت مجھے کال کی ہو
، اسی لیے رابطہ نہیں ہو سکا۔ نور پور میں موبائل سروس کام نہیں کرتی ہے۔ آپ بتائیں کہ سب ٹھیک تو ہے؟
ئی خبر.....؟'' اپنے بارے میں وضاحت دینے کے بعد اس نے ان سے سوال کیا۔ اس وقت ان کی کال
نے پر لامحالہ اس کے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ وہ شینا کے حوالے سے کوئی خبر دینا چاہتے ہیں مگر انہوں
اسے جو اطلاع دی، اسے سن کر وہ بہ مشکل خود کو اُچھل پڑنے سے روک سکا۔ سجاد رانا جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ
انہونی بات تھی۔

''آپ فی الحال اسے اپنے پاس رکھیں۔ میں فوری طور پر پہنچتا ہوں۔'' مکمل تفصیلات جاننے کا یہ موقع
نہیں تھا اس لیے اس نے ان سے کہا اور موبائل آف کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''خیریت اے سی صاحب؟'' چودھری اور ایس پی جو اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی سمجھنے میں
م رہے تھے، اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''ایک ایمرجنسی ہے۔ مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ کھانے پر آپ لوگوں کا ساتھ
ں دے سکتا۔'' اس نے مختصر الفاظ میں بتایا اور دونوں سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر
گاڑی تک جاتے ہوئے اس کے حساس کانوں نے کسی عورت کی گھٹی گھٹی چیخیں سنیں۔

''چھوڑ دو.....معاف کر دو مجھے.....اب کبھی ایسی بھول نہیں ہو گی۔'' وہ روتے ہوئے کسی سے التجا
رہی تھی۔ اس آواز پر اس کا دھیان فوراً اس ملازمہ کی طرف گیا جس کی غفلت کی وجہ سے بہزاد شاہ، ڈرائنگ
روم میں پہنچ گیا تھا اور وہاں توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ یقیناً اس ملازمہ کو اس کی کوتاہی پر سزا دی جا رہی تھی۔ چودھ
تھوڑی دیر کے لیے ڈرائنگ روم سے شاید اسی کام کے لیے باہر نکلا تھا کہ ملازمہ کے لیے سزا کا تعین کر
تب ہی جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ انسانیت کے ساتھ روا اس ناانصافی پر جلتا کڑ
وہ اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

''بنگلے پر چلو۔ وہاں سے ہم لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے مشا
خان کو حکم دیا۔ لاہور جانے کے لیے اپنے ذاتی سامان کو لینے کے علاوہ گاڑی کو بھی ایک بار چیک کرنا ضروری
اس لیے یہیں سے براہِ راست روانگی کے بجائے کچھ دیر نور کوٹ میں اپنے بنگلے پر رُکنا لازمی تھا۔

''میں ایک ضروری کام سے فوری طور پر لاہور جا رہا ہوں۔ تم یہاں کے سارے معاملات خود ہی سنبھال
لینا۔'' گاڑی کے چلتے ہی اس نے عبدالمنان کو فون کر کے اسے ہدایت دی۔ تجربہ کار مشا برم خان، لوگوں کے
مزاج کو سمجھنے میں ماہر تھا۔ اس وقت بھی اس نے اندازہ لگا لیا کہ شہریار عجلت میں ہے اس لیے بہت مشاقی کے
ساتھ فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑا دی۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی پیر آباد کے قبرستان کے قریب سے گزری تو
کسی معمول کی طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس قبرستان میں ایک قبر ایسی بھی تھی جس پر ماہ بانو کے نام کا کتبہ
لگا ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس قبر میں دفن ہستی کے لیے دعائے مغفرت کی اور راستے کی طرف تو
مبذول کر لی۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی اس کی گاڑی بنگلے پر پہنچ گئی۔

''دفتر سے فون آیا تھا۔ کوئی سرمد صاحب آپ سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاید کوئی بہت ا
معاملہ تھا۔ انہوں نے آپریٹر کو اپنا نمبر دے کر ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی آپ آئیں، ان سے رابطہ کر لیں۔ آپر
نے احتیاطاً فون کر کے مجھے بھی نمبر نوٹ کروا دیا تھا کہ اگر آپ آفس کے بجائے یہاں پہنچیں تو آپ کو پیغا
دے دیا جائے۔'' بنگلے میں داخل ہوتے ہی بیٹ مین نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے پیغام دیا
وہ تھوڑا سا اُلجھ گیا۔ فوری طور پر اسے بالکل بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ سرمد نامی شخص کون ہے؟

''میں لاہور جا رہا ہوں۔ تم میرا سامان ریڈی کر دو۔'' سرمد کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرتے
ہوئے اس نے بیٹ مین کو حکم دیا اور ٹیلی فون کے ساتھ رکھے نوٹ پیڈ پر درج سرمد کے نمبر کو دیکھنے لگا۔
موبائل نمبر تھا۔ بیٹ مین کے سامان پیک کرنے تک ملنے والی مہلت میں اُس نے اس نمبر پر کال کر کے اپنی
اُلجھن کو دور کر لینا مناسب سمجھا۔

''میں اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل بات کر رہا ہوں۔ آپ یقیناً سرمد صاحب بات کر رہے ہیں۔ فرمائیے
آپ کو کس سلسلے میں مجھ سے فوری طور پر بات کرنی تھی؟'' رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے
اس سے دریافت کیا۔ جواباً وہ بہت پُرجوش انداز میں اپنے فون کرنے کی وجہ بتانے لگا۔

❁----✪----❁

مُردے زندہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ ہو گئی تھی۔ وہ، جس کے نام کی قبر پیر آباد کے قبرستان میں موجود تھی
اس کے سامنے زندہ سلامت جیتی جاگتی حالت میں بیٹھی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں اگر اس میں کوئی فرق آیا تھا
صرف یہ کہ اس کی صحت کافی گر گئی تھی اور چہرے پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی۔



''یہ سب کیا ہے ماہ بانو؟.....تم زندہ ہو تو وہ کون تھی جسے تمہارے نام پر دفنایا گیا؟ تم اتنا عرصہ کہاں
غائب رہیں؟''

''آپ کے ان سارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات
سناتی ہوں۔'' اس نے پے در پے کیے گئے اس کے سوالوں کے جواب میں کہا اور پھر ذرا کھنکھارتی ہوئی روانی
سے شروع ہو گئی۔

''آپ کو موتی والا صاحب اور ان کی بیوی کا تو علم ہو گا ہی۔ اس واقعے کی رات موتی والا صاحب کے
ڈرائیور سرمد نے مجھے اپنے ایک دوست عامر کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ میں عامر کے گھر اس کی بوڑھی ماں کے
ساتھ رہنے لگی۔ اسی محلے میں جمیلہ نامی ایک لڑکی رہتی تھی۔ اللہ کی مصلحت کہ اُس نے اس بے چاری کو مکمل
فضیحت نہیں دی تھی۔ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کی اس پر نظر پڑی تو وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے جانے کے
چکر میں پڑ گئے۔ ایک روز وہ عامر کی امی کی مزاج پرسی کے لیے آئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے
مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ کیا۔ وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ واپس اپنے گھر جانے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔
میں نے یہ ترکیب نکالی کہ اس کا اور اپنا لباس آپس میں بدل لیا اور اس سے کہا کہ میں گلی کے نکڑ تک جاتی ہوں۔
جو لوگ تمہارے پیچھے لگے ہیں، وہ دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ تم اتنے میں چپکے سے اپنے گھر چلی
جانا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ جمیلہ کا پیچھا کرنے والے کپڑوں سے دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ گئے۔ میرا ارادہ تھا
کہ نکڑ پر پہنچنے کے بعد میں اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دوں گی تاکہ وہ لوگ یہ جاننے کے بعد کہ میں جمیلہ نہیں
ہوں، میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مگر یہاں مجھ سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پتلی سی لمبی گلی
کے نکڑ پر پہنچتی، ان لوگوں نے مجھ پر ایک بڑی سی چادر ڈال کر مجھے قابو کر لیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر
لے گئے۔ وہاں جا کر ان پر یہ بات کھلی کہ وہ جمیلہ کے بجائے کسی اور کو اغوا کر لائے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے
ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ غصے میں ان کے گرو نے مجھے بری طرح مارا پیٹا اور رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال
دیا کہ جب ہمیں جمیلہ ملے گی، تب ہی تجھے چھوڑیں گے۔ دوسرے دن وہ لوگ دوبارہ اس محلے میں گئے اور
انہیں پتہ چلا کہ عامر کا گھر دھماکے سے اُڑ چکا ہے اور اس حادثے میں اس کی ماں اور مہمان لڑکی ماری گئی
ہیں۔ میں تو ان کے قبضے میں تھی اس لیے انہوں نے سمجھ لیا کہ مرنے والی لڑکی جمیلہ تھی۔ ان کا گرو ایک ظالم اور
غصہ ور شخص تھا۔ جمیلہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا اس نے مجھ سے پورا پورا انتقام لیا۔ اس کی مار پیٹ اور تشدد
سے گھبرا کر میں اس کا یہ مطالبہ ماننے پر راضی ہو گئی کہ میں جمیلہ کے بدلے میں ان کے ساتھ رہ کر کام کروں
گی۔ وہ لوگ اُلٹے سیدھے کپڑوں اور میک اپ کے ذریعے میرا حلیہ بگاڑ کر مجھے اپنے ساتھ اپنے دھندے پر
لے جاتے۔ ان لوگوں کی سخت نگرانی اور تشدد سے خوف زدہ ہو کر میرا ذہن اس بری طرح ماؤف ہوا کہ مجھ میں
فرار کی ہمت ہی نہیں رہی۔ مگر کچھ دن قبل میں نے آپ لوگوں کو لاہور میں دیکھا، اسی دن مجھ پر یہ حقیقت بھی
کھلی کہ گرو الماس ایک ہندو ہے۔ ان دونوں باتوں نے میرے کھو جانے والے حواس کو بحال کر دیا۔ گرو نے
اپنے گروہ سے بھی اپنی حقیقت چھپا رکھی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو اس راز سے آگاہ کر دیا اور یوں مجھے
اس کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔ پچھلی رات وہ اور میں ایک شادی والے گھر میں رُکے ہوئے تھے۔ ہم نے
منصوبہ بنایا کہ وہاں سے فرار ہو جائیں گے لیکن اتفاق سے مجھے معلوم ہو گیا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے، وہ
سرمد کی محبوبہ نیلم ہے اور اسے مجبور کر کے زبردستی اس کی شادی ایک بوڑھے سے کی جا رہی ہے۔ میں نے نیلم کو
نگار کے ساتھ وہاں سے فرار کروا دیا اور خود اس کی جگہ لے لی۔ میں نے نیلم کے ہاتھ سرمد کو یہ پیغام بھی بھیجا تھا

کہ وہ کسی طرح آپ سے رابطہ کر کے میرے بارے میں اطلاع دے دے۔ صبح پولیس نیلم کے گھر آ پہنچی۔ انہیں خواجہ سراؤں کے قبضے میں موجود ایک اغوا شدہ لڑکی کی تلاش تھی۔ میں یہی سمجھی کہ سرمد کا آپ سے رابطہ ہو گیا ہے اور آپ نے پولیس کو بھیجا ہے لیکن بعد میں جب ڈی آئی جی صاحب تھانے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور لڑکی تھی جسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ڈی آئی جی صاحب آپ کے کزن ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کو میرے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ بس پھر اس کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ لیکن معلوم نہیں سرمد نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ مجھے فکر ہو رہی ہے کہ نیلم اس کے پاس خیریت سے پہنچی بھی ہے یا نہیں؟'' ساری داستان اختصار سے سنانے کے بعد اس نے آخر میں نیلم کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔

''سرمد کا مجھ سے رابطہ ہو گیا تھا۔ نیلم اس کے پاس پہنچ چکی ہے اور ان دونوں نے نکاح بھی کر لیا ہے۔'' اس کی تسلی کے لیے شہریار نے اسے اطلاع دی اور پھر سجاد رانا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ شینا کے ملنے کی اُمید بندھنے کے بعد ملنے والی مایوسی نے انہیں بے حد رنجیدہ کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

''خواجہ سراؤں کا وہ گروہ گرفتار ہو چکا ہے۔ فرار ہونے والے خواجہ سرا نگار کو بھی اس کے گھر سے اُٹھوا لیا گیا ہے۔ ان کا گرو البتہ ہاتھ نہیں آ سکا۔ گرو اصل مجرم ہے لیکن ان تینوں کو بھی اعانتِ جرم میں سزا دی جائے گی۔'' سجاد نے اسے اپنی طرف رخ کرتے دیکھ کر خود ہی بتایا۔

''ان افراد کی گرفتاری کے علاوہ انسپکٹر رفیق کھوکھر سے بھی پوچھ گچھ ضروری ہے۔ وہ ماہ بانو کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ آخر اس سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی کہ اس نے جمیلہ کو ماہ بانو تسلیم کر لیا؟ مرنے والوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ جو لڑکی مری، وہ ماہ بانو نہیں تھی۔'' اس نے ایک لوجیکل نکتہ اٹھایا تھا۔ ایک نارمل لڑکی اور تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے فرد کا فرق تو سرسری جائزے میں ہی فوراً ہو جاتا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ رفیق کھوکھر نے بے پروائی دکھائی ہے۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔'' سجاد رانا نے اس کی تائید کی اور فوراً ہی فون پر کسی سے رابطہ کر کے حکم دیا کہ رفیق کھوکھر سے بات کروائی جائے۔ دو منٹ بعد ہی رفیق کھوکھر کا فون آ گیا۔

''فرمایئے سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں ان سے پوچھا۔

''بھاٹی گیٹ کے قریبی محلے میں بلاسٹ میں ماہ بانو نامی جو لڑکی ہلاک ہوئی تھی، تم نے اس کا پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟''

''یس سر۔'' اس نے فوراً اثبات میں جواب دیا مگر لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''پندرہ منٹ میں وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس لے کر آؤ۔'' سجاد نے اسے حکم دیا۔

''اتنی جلدی سر؟..... رپورٹ تو ریکارڈ میں ڈھونڈنی پڑے گی۔ ویسے خیریت تو ہے سر؟'' وہ اس کا حکم سن کر کچھ اور گھبرا گیا۔ اس کی یہ گھبراہٹ چغلی کھا رہی تھی کہ شہریار کا اندازہ درست ہے اور پوسٹ مارٹم کی کارروائی سرے سے کی ہی نہیں گئی۔

''میری طرف سے تو سب خیریت ہے لیکن تمہاری خیریت مشکوک ہے۔ مجھے شک بلکہ یقین ہے کہ اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں کا پوسٹ مارٹم سرے سے کروایا ہی نہیں گیا تھا۔'' سجاد رانا نے سرد لہجے میں



کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں سر!'' اس کا لہجہ کمزور تھا پھر بھی وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''ایسی ہی بات ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس لاش کو ماہ بانو نامی لڑکی کے نام سے شناخت کیا گیا تھا، اصل میں وہ میرے سامنے زندہ حالت میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

''م..... مگر لڑکی کے کپڑوں وغیرہ سے تو اس کی شناخت ہو گئی تھی۔'' وہ صحیح معنوں میں گھبرا گیا اور کمزور سی آواز میں بولا۔

''تمہاری اس نااہلی نے ثابت کر دیا ہے کہ تم پولیس کے محکمے میں کام کرنے کے لائق نہیں۔ تم اسی وقت اپنے آپ کو فارغ سمجھو۔ تحریری آرڈرز بھی جلد تم تک پہنچ جائیں گے۔'' اس نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

''میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تھی تو مجھے کافی ایفی شنٹ بندہ لگا تھا لیکن نااہلی کے اس مظاہرے کے بعد پتا چلا ہے کہ میرا اندازہ غلط تھا۔'' شہریار نے تبصرہ کیا۔

''اب اسے اپنی اس نااہلی کی سزا بھگتنی پڑے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ پولیس کی جاب کوئی مذاق نہیں۔ ایسے نااہلوں کی وجہ سے ہی تو پولیس کا محکمہ بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔'' وہ شدید غصے میں تھا۔

''ریلیکس سجاد بھائی! اس طرح اپنا ٹیمپر لوز کریں گے تو معاملات کیسے سنبھالیں گے؟'' اس نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر خاموش تماشائی بنی ماہ بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم گیسٹ روم میں جا کر آرام کرو۔''

وہ اس حکم پر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے لاہور پہنچنے تک بھی وہ گیسٹ روم میں ہی تھی اس لیے وہاں کا راستہ معلوم تھا۔

''سجاد! دیکھیں میں نے شینا کی یہ تصویریں نکالی ہیں۔ آپ بدنامی کا خیال چھوڑیں اور یہ تصویریں اخبارات میں چھپوا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ تصویریں اخبارات میں چھپیں تو کوئی ہمیں شینا کے بارے میں اطلاع دے دے۔'' اس کے باہر نکلنے سے پہلے مریم دگرگوں حالت میں ہاتھ میں بہت سی تصویریں لیے وہاں آئی اور وہ ساری تصویریں سینٹر ٹیبل پر اس انداز میں رکھیں کہ وہ بکھری گئیں۔ ماہ بانو کی جس کی توجہ خود بہ خود اس طرف مبذول ہو گئی تھی، تصویروں پر نظر پڑنے پر بری طرح چونکی اور پھر ایک تصویر ہاتھ میں لے کر بہ غور جائزہ لینے لگی۔ جیسے جیسے وہ تصویر کا جائزہ لے رہی تھی، اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

''مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے سر! کیا آپ میرے ساتھ گیسٹ روم تک چل سکتے ہیں؟'' بالآخر فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ کر اس نے شہریار سے درخواست کی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس کے لہجے کی سنجیدگی محسوس کر کے اس کی بات ماننے پر راضی ہو گیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گیسٹ روم تک پہنچے۔

''ہاں بولو..... کیا کہنا چاہتی تھیں تم؟''

''میں اس تصویر والی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی کون ہے؟''

''وہ سجاد بھائی کی بیٹی شینا ہے۔ کچھ روز پہلے اسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ لیکن اب ہم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مگر تم کیوں اس بارے میں پوچھ رہی ہو؟'' اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ اور مجھے یہ شک ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔'' اس

نے یہ مشکل اسے یہ اطلاع دی۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں کھیلا جانے والا خونی کھیل اس کی یادداشت سے بھی محو نہیں ہوا تھا اور اب شینا کی تصویر دیکھ کر تو اور بھی شدت سے اس پورے واقعے کی یاد آ گئی تھی۔

''تم کس وجہ سے یہ سب کہہ رہی ہو؟ مجھے تفصیل سے پوری بات بتاؤ۔'' شہریار نے اس سے کہا تو وہ اٹک اٹک کر سارا قصہ سنانے لگی۔ ساری بات سن کر وہ تیر کی مانند تیزی سے گیسٹ روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کے اندر قہر و غضب کی ایک آگ سی بھڑک رہی ہے جس میں وہ سب کچھ جلا کر رکھ دے گا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان گاڑی کو اُڑاتا ہوا ماڈل ٹاؤن کی طرف لے جا رہا تھا پھر بھی اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ بے قراری اس قدر تھی کہ دل چاہتا تھا، پلک جھپکتے میں یہ راستہ طے ہو جائے۔ ماہ بانو سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اس نے خود سیٹھ سندر رام کی کوٹھی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ سجاد رانا کو اس بات بتانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور چاہتا تھا کہ پہلے خود تصدیق کر لے۔ ان کی زبانی اسے سندر رام کے بارے میں معلومات تو پہلے ہی حاصل ہو گئی تھیں لہٰذا یہ اطمینان تھا کہ وہ اور مشابرم خان مل کر وہاں موجود ہوں گے تو آرام سے سنبھال لیں گے۔ سندر رام جیسے معروف شخص کا تو اس وقت کوٹھی پر موجود ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اسے بھی اصل میں سونی نام کے اس کردار سے دو دو ہاتھ کرنے تھے جس کا تذکرہ سجاد رانا نے بھی کیا تھا اور ماہ بانو نے بھی۔

گاڑی سندر رام کی کوٹھی کے سامنے جا کر رکی تو مشابرم خان نے اس کے اشارے پر ہارن دیا۔ دو بار ہارن دینے کے باوجود اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

''اُتر کر بیل بجاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔ مشابرم خان نے حکم کی تعمیل کی مگر بٹن دبانے پر اسے اندر سے بجنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ جانے گھنٹی خراب تھی یا بند کر دی گئی تھی۔ اس نے لوہے کے دروازے کے کنڈے کو بجایا۔ یہ زوردار دستک بھی بے کار گئی۔ دوسری طرف ایسی خاموشی تھی گویا کوٹھی خالی پڑی ہو۔

''دوسری طرف کُود کر اندر سے کنڈی کھولو۔'' وہ جو گاڑی میں بیٹھا ہوا اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا، مضطرب ہو کر نیچے اُتر آیا اور حکم دیا۔ مشابرم خان نے حکم کی تعمیل کی اور گیٹ کے دوسری طرف کُود کر ذیلی دروازہ کھول دیا۔ وہ فوراً کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اسی وقت اس کی نظروں نے نسوانی کپڑوں کی جھلک دیکھی۔ یقیناً کوئی عورت تھی جو کوٹھی کی اندرونی عمارت سے نکل کر بائیں جانب کی پتلی سی گلی میں دوڑتی ہوئی کوٹھی کے عقبی حصے میں جا رہی تھی۔

''تم اندر دیکھو، میں پیچھے جاتا ہوں۔'' اس نے مشابرم خان کو جو اپنی پشت کا منظر نہیں دیکھ سکا تھا، اس سے حکم دیا اور خود بھی اسی گلی کی طرف دوڑ گیا۔ گلی پار کر کے وہ کوٹھی کے عقب میں پہنچا تو وہ عورت پچھلی دیوار پھلانگ کر سندر رام کی کوٹھی کی عقب سے جڑی ہوئی دوسری کوٹھی میں اُترنے کے چکر میں تھی۔ اس نے بھاگ کر اس کی بائیں ٹانگ پکڑ کر کھینچی۔ ردِعمل میں عورت نے اپنی دائیں ٹانگ چلائی۔ شہریار کے چہرے پر اس کی ٹانگ کی ضرب لگی لیکن چونکہ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے دیوار سے لٹکی ہوئی تھی اور اس کی ایک ٹانگ بھی اس کی گرفت میں تھی اس لیے ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ جھنجلا گیا اور پورا زور لگا کر عورت کو کھینچا۔ اس بار وہ دیوار پر اپنے ہاتھوں کی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور دھپ سے زمین



پر گری۔ لیکن نیچے گرتے ہی اس نے خود کو حیرت انگیز پھرتی سے سنبھالا اور اچھل کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شہریار کو ادراک ہوا کہ وہ کوئی عورت نہیں بلکہ ہیجڑا ہے جس کا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہو گا۔ سیدھے کھڑے ہونے کے بعد وہ بس پل بھر کے لیے ہی رُکا ہو گا پھر فوراً ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا کہ شہریار نے فوراً جانچ لیا کہ وہ جوڈو کے فن میں ماہر ہے۔ دائیں جانب جھک کر اس نے خود کو اس کے وار سے بچانے کی کوشش کی لیکن یہاں اس سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔ حملہ آور نے بائیں طرف حملے کا ڈاج دے کر اس کے دائیں شانے پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا تھا۔ دائیں شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اسے لگا کہ اس کے شانے پر لگنے والی یہ ضرب انسانی ہتھیلی کے بجائے لوہے کی کسی مضبوط راڈ سے لگائی گئی ہو۔ وہ افراد جنہیں اس نے ساری زندگی سڑکوں پر تالیاں بجا بجا کر بھیک مانگتے دیکھا تھا، ان میں سے کوئی لڑائی بھڑائی کے فن میں اتنا ماہر بھی ہو سکتا ہے، اسے یہ جان کر حیرت سی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت اس حیرت کا اظہار کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اپنے شانے پر لگنے والی ضرب سے فوراً سنبھلتے ہوئے اس نے اپنی بائیں ٹانگ چلائی جو حملہ آور کے پہلو میں لگی۔ ضرب زوردار ہونے کے باوجود وہ اسے آرام سے سہہ گیا اور خود بھی اپنی بائیں ٹانگ سے ایک بار پھر اس کے شانے کو نشانہ بنایا۔ دوبارہ اسی جگہ چوٹ کھا کر شہریار ذرا سا لڑکھڑا گیا۔ اس نے خود ایک زمانے میں مارشل آرٹ سیکھا تھا لیکن عملی زندگی میں اس آرٹ کو آزمانے کی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جبکہ سامنے والے کی پھرتی، قوت اور مشاقی سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ شانے پر ضرب لگانے کے بعد بھی وہ رُکا نہیں بلکہ منہ سے ایک زوردار آواز نکالتے ہوئے ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں پہلوؤں میں اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے ضرب لگائی۔ برچھی کی طرح کاٹ دینے والی یہ ضرب کھا کر اس کے منہ سے ''اوغ'' کی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر گیا۔ گرتے گرتے البتہ اس نے حملہ آور کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر زمین پر مارنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن نتیجے میں اس کے بال اس کے ہاتھ میں رہ گئے اور وہ بچ نکلا۔ شہریار کے ہاتھوں میں آ جانے والے بال دراصل ایک وِگ تھی جس کے سر سے الگ ہو جانے کے بعد حملہ آور کا مردانہ ہیئر اسٹائل دیکھا جا سکتا تھا۔ کرخت چہرے پر عورتوں والے میک اپ اور لباس کے ساتھ یہ مردانہ ہیئر سٹائل بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس کی جنس ایک بار پھر مشکوک ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً خواجہ سرا کے روپ میں کوئی مرد تھا جو سر سے وِگ الگ ہو جانے پر ذرا سا ٹھٹکا ضرور مگر پھر رکے بغیر گرے ہوئے شہریار کے پیٹ میں ایک زوردار ضرب لگائی اور ایک بار پھر عقبی دیوار کی طرف دوڑ گیا۔ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف پھلانگنے میں اس نے بندر کی سی پھرتی دکھائی۔ جب تک شہریار سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑتا، وہ دوسری طرف کُود چکا تھا۔ اس کی پیروی میں وہ بھی دیوار پر چڑھا مگر اس دوران وہ دوڑتا ہوا عقبی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ جب اس کوٹھی میں کُودا تو وہ گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے تعاقب میں اس نے بھی گیٹ کا رخ کیا۔ آدھے راستے میں ہی اسے باہر سے کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ گیٹ پر پہنچا تو اسے باہر سے بند پایا۔ جب تک اس نے گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگائی۔ گاڑی بہت دور جا چکی تھی۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ سلور گرے کلر کی آلٹو تھی۔ اس آلٹو کا تعاقب کرنے کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور اس کی گاڑی سندر رام کی کوٹھی کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے اس تک پہنچنے کے لیے پوری گلی پار کر کے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ اس راستے کو اختیار کرنے کے بجائے وہ جس راستے سے آیا تھا، اسی پر واپس پلٹا اور عقبی دیوار پھلانگ کر سندر رام کی کوٹھی میں پہنچ کر مین گیٹ کی طرف بھاگا۔ اس دوران

البتہ اس نے یہ نوٹ کرلیا تھا کہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شاید مشابرم خان اس آگ کی وجہ سے ہی مصروف ہوگیا تھا جو اس کی طرف پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ خود اس آگ کو نظرانداز کر کے گیٹ پر کھڑی اپنی گاڑی تک پہنچا۔ وہ لوگ ایسی صورتِ حال میں کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تھے کہ مشابرم خان کو گاڑی لاک کرنے یا چابی نکالنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ لپک کر گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اس نے اسے اسٹارٹ کیا اور فل اسپیڈ میں اس جانب دوڑا دیا جس طرف سلور گرے آلٹو گئی تھی لیکن تمام تر پھرتی کے باوجود اسے دیر ہوچکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ آلٹو کی دھول کو بھی نہیں پاسکا اور تھوڑی دیر ارد گرد کی سڑکوں پر بھٹکنے کے بعد واپس سندر رام کی کوٹھی کا رخ کرلیا۔ وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں کوٹھی کے گیٹ کے سامنے کھڑی صاف نظر آرہی تھیں اور اس کا عملہ کوٹھی میں لگی آگ بجھا رہا تھا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے سر؟ میں آپ کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن آپ نے کال ہی ریسیو نہیں کی۔'' اسے دیکھتے ہی مشابرم خان لپک کر اس کے قریب آیا۔ اس کی بات سن کر اس نے اپنی جیبیں تھپتھپائیں۔ موبائل موجود نہیں تھا۔ شاید وہ عقبی جانب اس شخص سے لڑائی کے دوران اس کی جیب سے نکل گیا تھا۔

''کوٹھی کے اندر چھ لاشیں ہیں۔ پانچ افراد کو تو لگتا ہے کہ کوئی زہریلی شے دے کر مارا گیا ہے۔ جس کمرے میں لاشیں پائی گئی ہیں، وہیں شراب کی بوتلیں اور گلاس بھی موجود ہیں۔ جبکہ چھٹے شخص کو سر پر کوئی بھاری ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا ہے۔ میں آپ کو فوری طور پر ان لاشوں کے بارے میں اطلاع دیتا لیکن وہاں ایک کمرے میں زبردست آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ پہلے اس آگ کو بجھا دوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی اور آگ مزید بھڑک اُٹھی۔ مجھے مجبوراً فائر بریگیڈ والوں کو فون کرنا پڑا۔ آپ سے تو رابطہ ہی نہیں ہورہا تھا ورنہ میں پہلے آپ سے اجازت لیتا۔ اب بھی میں نے اس کمرے کا دروازہ بند کردیا ہے جس میں لاشیں ہیں تاکہ آگ بجھانے والے عملے کی ان لاشوں پر نظر نہ پڑ سکے۔ اب آگے آپ بتائیں کہ کیا حکم ہے؟'' مشابرم خان نے اسے مکمل رپورٹ دی۔

''تم ذرا پچھلی طرف جا کر چیک کرو کہ وہاں میرا موبائل تو نہیں گرا ہوا؟ میں اس دوران لاشوں کو دیکھتا ہوں۔ کس کمرے میں ہیں لاشیں؟'' اس نے اسے حکم دینے کے بعد اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جو دائیں ہاتھ پر پہلا کمرہ ہے۔'' مشابرم خان نے بتایا جسے سن کر وہ سر ہلاتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ اپنا کام کررہا تھا۔ ان پر توجہ دیئے بغیر وہ اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''اے بھائی! اندر کہاں جارہے ہو؟ اندر آگ لگی ہے، باہر ہی رہو۔'' ایک آدمی نے بلند آواز میں اسے ٹوکا۔

''شٹ اپ۔ اپنے کام سے کام رکھو۔'' جواباً وہ غرّایا اور قدموں کو روکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اسے ٹوکنے والا دبک کر چپ ہورہا۔ اس نے مشابرم خان کے بتائے ہوئے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے کا لٹو گھما کر دروازہ کھولا۔ وہ ایک ڈرائنگ روم نما کمرہ تھا جس میں سچ مچ چھ عدد لاشیں موجود تھیں۔ لاشوں کی صورت میں وہاں موجود افراد میں سے چار خواجہ سرا تھے جن کی لاشیں صوفوں پر ہی آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ انہی لاشوں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی بھی لاش تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق قیمتی لباس میں ملبوس وہ شخص سیٹھ سندر رام ہوسکتا تھا۔ ان افراد کے آس پاس لڑھکے ہوئے شراب کے جام نظر آرہے تھے جبکہ میز پر چوتھائی سے بھی کم بھری ہوئی شراب کی بوتل کے علاوہ ایک بھرا ہوا جام بھی موجود تھا۔ اس



منظر کو دیکھ کر سب سے پہلا خیال یہی آتا تھا کہ کسی نے ان افراد کو زہریلی شراب پلا کر ہلاک کیا ہے۔ یہ شخص ہی ہوسکتا ہے جس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا ٹاکرا ہوا تھا۔

چھٹی لاش دروازے کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی پیچھے سے بری طرح مجروح تھی اور اس مجروح حصے سے خون اور مغز کا ملغوبہ سا بہہ کر قالین میں جذب ہورہا تھا۔ لاش کے قریب ہی سنگِ مرمر کا ایک خون آلود بھاری گلدان پڑا ہوا تھا جو یقینی طور پر آلۂ قتل تھا۔ کمرے کا نقشہ دیکھ کر جو بات اسے سمجھ آرہی تھی، وہ یہ تھی کہ کچھ دیر قبل کوٹھی سے فرار ہونے والا شخص یقیناً ان تمام افراد کے لیے شناسا تھا جس نے بہت آرام سے ان لوگوں کو دھوکے سے شراب میں زہر ملا کر پلا دیا تھا۔ چھٹا مرنے والا شخص اپنے حلیے سے چوکیدار لگتا تھا جسے یقیناً بہانے سے کمرے میں بلایا گیا تھا اور پھر پیچھے سے وار کر کے اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کردیا گیا۔ قتل کا محرک یقیناً ان افراد کے سینوں میں موجود رازوں کو پوشیدہ رکھنا تھا۔ وہ سارے ایک تھیلی کے چٹے بٹے تھے جو ایک ساتھ ہی دوسرے جہان پہنچا دیئے گئے۔

''فائر بریگیڈ والوں نے آگ بجھا دی ہے سر! ان کے ذریعے علاقے کی پولیس کو بھی علم ہوگیا ہے کہ اس کوٹھی میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ لوگ یہاں پہنچ چکے ہیں۔'' اس نے ابھی کمرے کا سرسری سا جائزہ ہی لیا تھا کہ مشابرم خان اس کے موبائل سمیت واپس آگیا اور اطلاعات فراہم کیں۔

''تم ان سے جا کر بات کرو۔ میں سجاد بھائی کو فون کرتا ہوں۔'' اس نے مشابرم خان کا اپنی طرف بڑھایا ہوا موبائل تھام کر اسے حکم دیا تو وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ وہ خود سجاد رانا سے رابطہ کرنے لگا۔

''شہریار! تم اچانک کہاں چلے گئے ہو یار؟'' رابطہ ملتے ہی سجاد رانا نے اس سے پوچھا۔

''میں ماڈل ٹاؤن میں سیٹھ سندر رام کی کوٹھی پر ہوں سجاد بھائی! پلیز آپ بھی فوراً یہاں آجائیں۔''

''لیکن تم وہاں کیا کررہے ہو؟'' وہ حیران ہوئے۔

''مجھے شینا کے سلسلے میں ایک کلیو ملا تھا اسی لیے میں یہاں آیا تھا مگر یہاں تو معاملہ بہت ہی گڑبڑ ہے۔ میں آپ کو فون پر زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ بس آپ آجائیں اور ساتھ ہی اپنے اعتماد کے کسی آفیسر کو بھی یہاں آنے کا کہہ دیں۔ میں فون بند کررہا ہو۔ مجھے یہاں موجود پولیس والوں سے بھی نمٹنا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی کہنے کے بعد فون بند کردیا۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او کمرے کا بند دروازہ کھول کر اندر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی مشابرم خان بھی تھا۔

''یہ کیا؟ یہ تو سیٹھ سندر رام ہیں اور یہ ان کی ملازمہ سونی۔ انہیں کس نے قتل کیا؟'' وہ جو اپنے علاقے کے ایک صاحبِ حیثیت شخص کی کوٹھی میں لگنے والی آگ کی اطلاع سن کر یہاں تک آیا تھا، لاشیں دیکھ کر بوکھلا گیا اور شہریار سے پوچھنے لگا۔

''یہ معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے۔ ویسے میں آپ کو بتادوں کہ اس معاملے کو دیکھنے کے لیے آپ کے ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب خود یہاں آرہے ہیں۔'' اس نے ایس ایچ او کو بے نیازی سے جواب دیا مگر خود اس کے اندر بڑا شدید انتشار اور بے چینی تھی۔ یہاں کے حالات دیکھ کر ماہ بانو کی شینا کے متعلق دی گئی اطلاع کافی حد تک درست لگنے لگی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اگر اس کے خاندان پر سچ مچ اتنا بڑا سانحہ گزر چکا ہے تو وہ سارے لوگوں کو اس بارے میں کس طرح اطلاع دے گا؟ ابھی تو اسے سجاد رانا سے سامنا کرنے کے خیال سے ہی پریشانی ہورہی تھی لیکن ان سے کچھ چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔

''میں ایکسپرٹس کو کال کرتا ہوں تاکہ وہ جائے وقوعہ سے ثبوت وغیرہ جمع کرلیں۔'' یقیناً باہر مشابرم خان

نے ہی اسے آگاہ کر دیا ہوگا کہ اندر موجود شخص کی کیا حیثیت ہے۔ مشابرم خان کی اطلاع پر شاید اس نے بھروسہ نہ کیا ہو لیکن اب ڈی آئی جی صاحب کے وہاں پہنچنے کی اطلاع سن کر بالکل الرٹ ہو گیا تھا چنانچہ اپنی پینٹ سنبھالتا ہوا تیزی سے باہر لپکا۔

''تم میرے ساتھ آؤ۔'' ایس ایچ او کمرے کے دروازے پر اپنے ایک سپاہی کو کھڑا کر گیا تھا چنانچہ یہاں کے رہنے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے اور ساتھ ہی مشابرم خان کو بھی اپنے ساتھ آنے کا حکم دیا۔ اب اسے اس اسٹور روم کی تلاش تھی جہاں سے ماہ بانو کی اطلاع کے مطابق تہ خانے کے لیے راستہ جاتا تھا۔ جلد ہی وہ اسٹور روم اس کی نظروں میں آ گیا۔ بہ غور دیکھنے پر اسے ٹائلز کے درمیان معمولی سا فرق بھی نظر آ گیا جو دراصل تہ خانے تک پہنچنے کے لیے بنائے گئے خفیہ راستے کی نشان دہی کرتا تھا۔ اس کے اشارے پر مشابرم خان نے درز میں انگلیاں ڈال کر اس جگہ کے ٹائلز کو زور لگا کر اوپر کی طرف کھینچا تو اس حصے کے ٹائلز کسی ڈھکن کی طرح اوپر کی طرف اُٹھتے چلے گئے۔ فرش میں پیدا ہونے والے اس خلا سے نیچے کی طرف جاتی سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ اور مشابرم خان آگے پیچھے ان سیڑھیوں سے گزرتے نیچے پہنچ گئے۔ سیڑھیوں کے قریب ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے اس دروازے کو کھولا تو ماہ بانو کی بتائی باتوں میں سے ایک اور بات کی تصدیق ہو گئی اس ہال نما کمرے میں بہت ساری کرسیاں موجود تھیں اور ایک چبوترے پر سچ مچ ایک بڑی سی مورتی رکھی تھی۔ وہ کرسیوں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا چبوترے کے قریب پہنچا اور اس مورتی کا جائزہ لینے لگا۔ بھیانک خدوخال والی وہ مورتی بے حد سجی سنوری ہونے کے باوجود دل میں کراہیت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ مورتی کے گلے میں اور کانوں میں موجود سونے کا زیور اس کے لیے اس کے پجاریوں کی عقیدت کا ثبوت تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس بھیانک مٹی کی مورتی کے قدموں میں شوخ و چنچل، زندگی سے بھرپور شینا کو بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا، اس کا دل کانپ اٹھا اور آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ اسی وقت اس کے موبائل کی تھرتھراہٹ نے کوئی کال آنے کا اشارہ دیا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر آنے والا سجاد رانا کا نام پڑھا اور خود کو سنبھالتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

''تم کہاں ہو شیری؟ میں پہنچ گیا ہوں مگر تم نظر نہیں آ رہے۔''

''میں یہیں ہوں۔ ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور پھر واپس اوپر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ مشابرم خان اس کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ لاشوں والے کمرے تک پہنچے تو دیکھا ایکسپرٹس کی ٹیم بھی پہنچ چکی ہے۔ وہ لوگ لاشوں کی تصویریں لینے، ایف بی اٹھانے اور موقع پر موجود تمام اہم اشیاء اپنی کسٹڈی میں لینے کا کام کر رہے تھے۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او وہاں موجود نہیں تھا اور ایک دوسرے شخص کی زیر نگرانی یہ سارا کام ہو رہا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا وہ سجاد رانا کا بندہ ہے۔

''ان پانچوں آدمیوں کے منہ سے کڑوے باداموں کی سی بُو آ رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں سائنائیڈ دے کر مارا گیا ہے۔ حتمی رپورٹ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے آنے کے بعد ہی کہی جا سکے گی۔'' نگرانی کرنے والے آفیسر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس رائے کو سن کر وہ لوگ چونک گئے۔ ان افراد کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے، یہ تو سمجھ آ ہی گیا تھا لیکن سائنائیڈ کا استعمال معاملے کو مزید گمبھیر کر رہا تھا۔ اس سریع الاثر زہر کا استعمال اتنا عام نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ قاتل کوئی معمولی شخص نہیں۔

''یہ تین افراد وہی ہیں جن کے بارے میں شک تھا کہ انہوں نے شینا کو اغواء کیا ہے۔ ان تینوں افراد کو پولیس شہر بھر میں ڈھونڈتی رہی اور یہ یہاں چھپے بیٹھے ہوں گے، ذرا اندازہ نہیں تھا۔'' وہ سجاد رانا کے قریب جا



ہوا تو اس نے تین خواجہ سراؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں بتایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اس کے لہجے کا ہیجان محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے سندر رام کی حیثیت دیکھتے ہوئے اس کی بات پر اعتبار کر لیا اگر میں اسی سے اور اس کی ملازمہ کو اُٹھوا کر ان سے پوچھ گچھ کرتا تو شینا کا پتہ معلوم ہو جاتا۔'' اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا اور نفرت بھری نگاہ سے سندر رام کی لاش کو دیکھا۔

''میں سپاہیوں کو کوٹھی کی تلاشی لینے کا حکم دیتا ہوں۔ جس طرح اس شخص کی لاش ان خواجہ سراؤں کے درمیان ملی ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بہت قریبی مراسم تھے۔ جب یہ لوگ اس کوٹھی میں موجود ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ شینا بھی یہیں کہیں ہوگی۔'' وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جوش میں باہر کی طرف لپکا۔

''ایک منٹ سجاد بھائی! آپ رک جائیں۔ میں یہ کام کرتا ہوں۔'' اس نے فوراً لپک کر سجاد کا بازو پکڑتے ہوئے اسے روکا تو وہ ٹھٹک سا گیا مگر اس کی بات مان لی۔

''میرے خیال میں آپ دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں خود بھی وہیں آتا ہوں۔'' اسے امید نہیں تھی لیکن سجاد نے یہ بات بھی خلافِ توقع مان لی اور کچھ گم صم سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آفیسر! یہاں سے فارغ ہو کر تم اپنی ٹیم کو نیچے تہہ خانے میں لے جانا۔ ہاں سے تم لوگوں کو خصوصاً خون کا کوئی نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہاں موجود چبوترے یا مورتی پر سے تمہیں یہ مل سکتی ہے۔'' سجاد رانا کے باہر نکلنے کے بعد وہ پولیس آفیسر سے مخاطب ہوا اور اسے حکم دینے کے ساتھ ساتھ تہہ خانے تک پہنچنے کا راستہ بھی سمجھا دیا۔

''جس کمرے میں آگ لگی ہے، اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کیا تھا؟ وہ کمرہ کس مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا؟'' باہر نکلتے نکلتے اس نے پلٹ کر آفیسر سے پوچھا۔

''یس سر! میں نے معلوم کیا ہے۔ آگ اصل میں ایک نہیں، دو کمروں میں لگی تھی اور باقاعدہ پٹرول چھڑک کر لگائی گئی تھی۔ ویسے تو آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا ہے لیکن کمروں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کمرہ بیڈ روم اور دوسرا اسٹڈی روم تھا۔'' آفیسر نے بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ اطلاع بھی بڑی معنی خیز تھی۔ عموماً لوگ اپنی پرسنل اشیاء خصوصاً ڈائریز اور کاغذات وغیرہ انہی دو جگہوں پر رکھتے ہیں۔ ان دونوں جگہوں پر آگ لگائے جانے کا مطلب تھا کہ سندر رام کی زندگی میں کوئی ایسا راز تھا جس کو چھپانے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس واقعے نے اسے اللہ آباد کے مدرسے کی یاد دلا دی تھی۔ وہاں بھی کچھ مشکوک چیزوں کو اسی طرح آگ لگا کر ان کا وجود چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ ایک سپاہی کی نشان دہی پر اس کمرے میں پہنچا جس میں سجاد رانا اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ ایک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور دکھ کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ضبطِ گریہ کی کوشش کرتا رہا ہو۔

''مجھے شینا کے بارے میں بتاؤ شہریار! اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ وہ..... وہ ہے بھی یا نہیں؟'' آخری سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ سجاد رانا نے پولیس کی ملازمت میں برسوں گزارے تھے اور اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس لیے اس کے روّیہ سے یہ بھانپ لینا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا ہے، اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ شاید شہریار کے مشورے پر وہ سب کے درمیان سے ہٹ کر اس

الگ تھلگ کمرے میں آ کر بیٹھنے پر بھی اس لیے راضی ہو گیا تھا کہ اسے خود کو کمپوز کرنے کے لیے تھوڑی
مہلت درکار تھی۔

''فی الحال کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ کوٹھی میں ابھی تک ایسا کوئی سرا نہیں ملا ہے کہ شینا کی موجودگی
ثبوت مل سکے۔ البتہ اس ماہ بانو کی جس اطلاع کو سن کر یہاں پہنچا تھا، اس اطلاع کے ساتھ جڑی بہت سی
کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ ہمارے بدترین خدشات درست ثابت ہوں گے۔'' وہ آہستہ
سارے حقائق ان کے علم میں لاتا چلا گیا۔

''میری بیٹی کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ میں اس کے قاتلوں کو زمین کی تہ سے بھی کھینچ لوں گا۔''
بات سن کر وہ ایک جوش کے عالم میں بولا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ اس کے کمرے
باہر نکلنے سے قبل شہریار نے اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرخ ہو گئی تھیں اور
لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے ان آنکھوں سے خون چھلک پڑے گا۔

⊛----✪----⊛

''بی بی! کھانا تیار ہے۔ آپ کے لیے یہیں لے آؤں یا ڈائننگ ٹیبل پر لگا دوں؟'' وہ ایک کتاب کا
سرسری سا مطالعہ کر رہی تھی کہ ملازمہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے پوچھا۔ وہ سجاد رانا کے گھر
ہی تھی۔ یہاں اس کا ایک مہمان کی طرح خیال رکھا جا رہا تھا لیکن یہ عزت اور مہمان نوازی اسے کسی
طرح ڈولتے اپنے مستقبل سے بے فکر نہیں کر سکتی تھی۔ اسے نہ تو گاؤں کے بارے میں کچھ خبر تھی اور
بے بے اور ابا کے بارے میں۔ دارالامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی کہ فون پر
لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس وقت بھی وہ صرف ایک فون کال کرنے کے نتیجے میں بری طرح
پھنس گئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار اپنی جان پر کھیل کر اس کے اغوا کے لیے آنے والوں کو نہ روکتا تو
چودھری افتخار کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ دولت کے نشے میں چور، ہوس کے اس پجاری سے بچنے کے لیے
اپنوں سے دور اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ آبلہ پائی کے اس سفر میں گرد و الماس کے ٹھکانے پر گزرے تکلیف
اور ذلت آمیز شب و روز بھی شامل تھے۔ قسمت اُسے اس قید سے تو نکال لائی تھی لیکن اپنوں تک پہنچنے کی
اب بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شہریار سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بھی اسے دستیاب نہیں تھا
جب سے اس نے اسے شینا کے بارے میں اطلاع دی تھی، اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ
ساتھ سجاد رانا بھی گھر سے غائب تھا۔ کل رات نہ جانے کس وقت ان دونوں کی گھر واپسی ہوئی تھی اور آج پھر
علی الصباح ہی روانہ ہو گئے تھے۔ ان حالات میں وہ شہریار سے اپنے متعلق کوئی بات کرنے کا موقع کہاں
نکالتی؟ چنانچہ فی الحال یہیں رہنے پر مجبور تھی۔

''آپ نے بتایا نہیں بی بی! آپ کھانا کہاں کھائیں گی؟'' ملازمہ نے اپنا سوال دہرایا تو وہ اپنے خیالات
سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ایسا کرو، ڈائننگ ٹیبل پر ہی کھانا لگا لو۔ بیگم صاحبہ نے بھی تو کھانا نہیں کھایا ہو گا۔ ہم دونوں ساتھ مل
ہی کھا لیں گے۔''

''مگر بیگم صاحبہ تو منع کر چکی ہیں۔ میں ان سے پوچھ کر آئی ہوں۔'' اس کی بات سن کر ملازمہ نے اطلاع
دی۔



''تم کھانا لگاؤ۔ میں خود انہیں لے کر آتی ہوں۔'' وہ پیر میں چپل ڈالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور
مریم کے بیڈروم کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔

''یس، کم اِن۔'' اندر سے مریم کی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔
وہ شینا کی ایک فریم شدہ تصویر پر نظریں جمائے اپنے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اسے مریم پر بہت شدت سے رحم آیا۔
اس کی بیٹی کو چند ظالموں نے اپنی اندھی عقیدت کی بھینٹ چڑھا کر چھین لیا تھا اور وہ اب تک آس کی ڈوری
سے بندھی اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

''خیریت..... کوئی کام ہے کیا تمہیں مجھ سے؟'' وہ اس کی آہٹ پر تصویر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف
متوجہ ہوئی اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

''میں آپ کو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ میرا اکیلے کھانا کھانے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔'' اس
نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''اچھا، چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔'' حیرت انگیز طور پر وہ فوراً ہی راضی ہو گئی۔ ''میری بیٹی شینا کو
بھی اکیلے کھانا کھانا بالکل پسند نہیں تھا۔ کبھی میرا موڈ نہ بھی ہو تو اس کی وجہ سے مجھے زبردستی تھوڑا بہت کھانا پڑتا
تھا۔'' ڈائننگ ٹیبل پر پہنچنے کے بعد جب اس نے خود اپنے ہاتھ سے مریم کی پلیٹ میں کھانا نکالا تو اس نے
بے ساختہ ہی یہ بات بتائی۔ مریم کی اس بات کو سن کر وہ سمجھ گئی کہ اس نے اس کے ساتھ کھانا کھانے کی ہامی
کیوں بھر لی تھی۔ وہ اس کے وجود سے اپنی پیاسی ممتا کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''شینا گھر واپس آ جائے تو میں ایک بہت بڑی پارٹی کروں گی۔ تم بھی اس پارٹی میں ضرور آنا۔ اللہ نے
چاہا تو اس وقت تک تمہارے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ شہریار بہت اچھا اور ہمدرد لڑکا ہے۔ اس کی زبانی
مجھے تمہارے حالات کا تھوڑا بہت علم ہوا ہے۔ تم فکر نہ کرو، وہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا
کر رہے گا۔''

وہ شاید اپنے اندر کی تنہائی سے گھبرا کر اس سے مسلسل باتیں کر رہی تھیں جبکہ کھانے کی طرف اس کا دھیان
بہت ہی کم تھا۔

''پارٹی پر میں تمہیں اپنے فادر اور اِن لاز سے بھی ملواؤں گی۔ میری مدر کی تو ڈیتھ ہو گئی ہے لیکن سجاد کی
ممی کی وجہ سے مجھے ان کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ آفرین آنٹی بہت کائنڈ اور سوفٹ ہیں۔ وہ میرے پاس
ہی رہ رہی تھیں لیکن انکل کا بی پی بہت شوٹ کر گیا تھا اور ان کے انجائنا کی تکلیف بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے
ان کی وجہ سے آفرین آنٹی کو گھر واپس جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں ٹینشن والے ماحول سے دور رکھا
جائے۔'' وہ خود ہی اسے سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس وقت اسے
اس پڑھی لکھی ماڈرن عورت اور اپنی اَن پڑھ سیدھی سادی بے بے میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یقین تھا
کہ بے بے بھی اس کی جدائی میں اسی کیفیت سے گزر رہی ہو گی۔

''ارے! تم تو کچھ کھاؤ۔ صرف میری باتیں سننے میں لگی ہوئی ہو۔'' باتیں کرتے کرتے مریم کا دھیان
اس کی پلیٹ کی طرف گیا تو اس نے اسے ٹوکا اور خود سالن کی ڈش اس کی پلیٹ کے قریب کرتے ہوئے اس کی
پلیٹ میں سالن ڈالنے لگی۔

اسی وقت فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ اس آواز کو سن کر وہ دونوں ہی بری طرح چونکی۔ پھر مریم
نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔ ماہ بانو بھی اس کے پیچھے لپکی مگر ان دونوں کے

ڈائننگ روم سے نکلنے سے قبل ہی ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''پتہ نہیں کون لوگ ہیں بیگم صاحبہ! دیوار پھلانگ کر چپکے سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گارڈز نے دیکھ لیا اور فائر کھول دیا۔ جواب میں وہ لوگ بھی فائرنگ کر رہے ہیں۔'' ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں انہیں اطلاع دی۔

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہاں گھسنے کی کوشش کرنے کے لیے بڑی جرأت چاہیے۔'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اس کی نظر گھبرائی ہوئی ماہ بانو کے چہرے پر پڑی۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی کی خبر لیک ہوگئی ہے اور اسی چکر میں وہ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' مریم نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور تیزی سے ڈائننگ روم میں موجود فون کی طرف لپکی مگر اگلے ہی لمحے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیلی فون لائن بے جان تھی۔ دوسری طرف باہر سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رک رہی تھی۔

''میرا موبائل شاید بیڈروم میں ہی رہ گیا ہے۔ میں وہاں جا کر سجاد کو کال کرتی ہوں۔'' فون کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد مریم کو اپنے موبائل کا دھیان آیا لیکن اس سے قبل کہ وہ ڈائننگ روم سے باہر نکلتی، اسے کھلے دروازے کی طرف ایک ڈھاٹا پوش شخص نظر آیا۔ اس نے لپک کر دروازے کو بند کیا اور آٹومیٹک لاک لگانے کے ساتھ ساتھ اوپر کی چٹخنی بھی چڑھا دی۔ ڈھاٹا پوش جو اس طرف متوجہ نہیں تھا، دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر متوجہ ہوا۔

''وہ یہاں ہے۔ اس کمرے میں چھپی ہے شاید۔'' اس کی آواز بند دروازے کے پیچھے سے ان لوگوں کو سنائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازے کے لاک پر فائر کیا گیا۔ یہ رپیٹر سے کیا گیا فائر تھا جس نے لاک کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے۔ ایک گولی اطلاع لے کر آنے والی ملازمہ کے پہلو میں بھی گھس گئی۔ وہ بری طرح چیختی ہوئی فرش پر گری اور تڑپنے لگی۔ مریم کی قسمت اچھی تھی کہ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گئی تھی ورنہ ملازمہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی گولی کی زد میں آسکتی تھی۔ لاک ٹوٹنے کے بعد اب باہر سے دھکا دے کر دروازے کی چٹخنی اُکھاڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ چٹخنی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی۔

''آؤ، ادھر سے باہر نکلتے ہیں۔'' مریم نے سلائیڈنگ ونڈو کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زمین سے چند فٹ بلند اس سلائیڈنگ ونڈو کی طرف کوٹھی کا لان تھا۔ وہ دونوں باری باری اس طرف کود گئیں۔ خود اس کے لیے تو کوئی مسئلہ نہ تھا کہ ہلکے پھلکے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی چلبلی فطرت کی وجہ سے اسے اس طرح کی اُچھل کود کرنے کی مشق تھی لیکن مریم قدرے بھرے ہوئے جسم کی مالک تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنی بے حد آرام دہ زندگی کی وجہ سے ایسی کسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے اسے دوسری طرف کودنے میں تھوڑی سی دقت پیش آئی تھی اور ماہ بانو کو اسے سہارا دینا پڑا۔ جس لمحے ان دونوں نے لان میں قدم رکھے ڈائننگ روم کے دروازے کی چٹخنی ٹوٹ گئی اور دھکا دینے والے اندر داخل ہوگئے۔

''اُدھر دیکھو۔ وہ اُدھر سے نکلی ہیں شاید۔'' وہ مریم کے ساتھ دوڑتی ہوئی عقبی جانب بنے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جا رہی تھی، تب ہی کسی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

''اے! رُک جاؤ..... ورنہ گولی مار دوں گا۔'' لمحے بھر میں ہی دوبارہ سنائی دینے والی اس آواز پر ان دونوں کو احساس ہوا کہ انہیں دیکھ لیا گیا ہے۔ بند کمرے میں موجود کھلی ہوئی سلائیڈنگ ونڈو کو دیکھ کر ظاہر ہے



اسے فرار کی سمت کا اندازہ لگانا حملہ آوروں کے لیے ذرا مشکل ثابت نہ ہوا ہوگا۔ ماہ بانو نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک نقاب پوش ہاتھ میں خطرناک گن لیے ونڈو سے لان میں کود رہا تھا۔ اسی نے یقیناً گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ دونوں ہی اس دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر بھاگتی چلی گئیں۔ سرونٹ کوارٹر اب بس دو چار قدم کے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہوتا، اس سے قبل ہی ان کے پیچھے آنے والے شخص نے لگاتار دو تین فائر کیے۔ گولیاں سائیں سائیں کرتی ان کے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ مگر گولی کی اپنی ایک علامت ہوتی ہے۔ محفوظ رہنے کے باوجود مریم اپنے اتنے قریب سے گزرنے والی گولیوں سے اتنی بری طرح علامت زدہ ہوئی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ عین سرونٹ کوارٹر کے دروازے پر گر پڑی۔

ماہ بانو نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا۔ دو نقاب پوش ہاتھوں میں گنز لیے اسی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ وہ ان کے نشانے پر تھیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے دوبارہ فائر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یکایک ادراک ہوا کہ حملہ آور جو بھی ہیں، ان کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ انہیں زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ جو فائر ان پر کیے گئے تھے، اس کا مقصد بھی صرف انہیں دہشت زدہ کرنا تھا ورنہ اس کھلی جگہ پر وہ دونوں ہی واضح طور پر ان کے نشانے پر تھیں کہ وہ لوگ چاہتے تو آسانی سے انہیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ جان کی طرف ملنے والی بے فکری کے احساس نے اسے حوصلہ دیا اور وہ سہارا دے کر مریم کو اُٹھنے میں مدد دینے لگی۔ اسی دو فائر مزید ہوئے اور گولیاں مریم کے بالکل قریب زمین پر آ کر لگیں۔ ان گولیوں کے زمین پر لگنے کی وجہ اس جگہ کی تھوڑی سی مٹی اُکھڑی اور مریم اور اس کے چہرے کو خاک آلود کر دیا۔ مریم کے حلق سے ایک بار دہشت زدہ چیخیں بلند ہوئیں۔ خود اس کے اپنے چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ خوف کے اس عالم میں وہ چاہتی تو سرونٹ کوارٹر میں داخل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اسے مریم کو یوں چھوڑ دینا گوارا نہیں تھا۔ مریم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اس نے اسے کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس بار خود مریم نے بھی ہمت سے کام لیا اور کھڑی ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ کھڑے ہونے کے بعد سرونٹ کوارٹر میں داخل ہونے کے لیے باقی رہ جانے والا ایک قدم کا فاصلہ طے کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر اس قدم کو اٹھانے میں اتنی تاخیر ضرور ہوگئی تھی کہ تعاقب میں آنے والے نقاب پوش ان کے سر پر پہنچ چکے۔ ماہ بانو کو پورا یقین تھا کہ جب اس نے کوارٹر کا دروازہ بند کیا تو وہ لازماً آگے موجود آدمی کی ناک سے ٹکرایا

یہ چھوٹا سا کوارٹر کوٹھی میں کام کرنے والے کُک کے زیر استعمال تھا اور اس کا دروازہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ زیادہ دیر کے لیے اپنے تعاقب میں آنے والوں سے محفوظ رہ سکتیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق باہر دروازے کو توڑنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسی آواز بھی سنی جس نے حوصلہ دیا۔ یہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''پلیز! آپ میرے ساتھ مل کر اسے دروازے کے سامنے رکھنے میں مدد کریں۔'' کوارٹر میں موجود سائز کے ایک جستی صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مریم سے درخواست کی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ کر فوراً ہی مدد کے لیے آگے بڑھی۔ اس جستی صندوق کی چوڑائی اتنی تھی کہ وہ پورا کا پورا دروازے کے آگے فٹ ہو جاتا۔ بلندی کے اعتبار سے بھی صندوق اتنا اونچا ضرور تھا کہ نصف دروازے کی بلندی تک پہنچ جاتا۔ یہ صندوق بند دروازے کے بالکل ساتھ ملا کر رکھ دیا جاتا تو قبضے اُکھڑنے کے باوجود دروازہ گرنے سے محفوظ رہتا اور انہیں تھوڑی سی مہلت مل جاتی۔ اس بڑے صندوق میں یقیناً لحاف، گدّے دوسرا کوئی بھاری

سامان رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے انہیں اسے دھکیلنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ صرف یہ [illegible] رکھنے کی جبلی خواہش تھی جو وہ دونوں، خواتین والی مخصوص نازک مزاجی کو فراموش کیے یہ سخت کام کر رہی [illegible] دروازے کے کمزور پڑتے قبضے بھی انہیں مہمیز کر رہے تھے۔ کسی بھی لمحے یہ قبضے مکمل طور پر اُکھڑ جاتے [illegible] دروازہ اندر آ گرتا۔ پسینہ پسینہ ہوتے ان دونوں نے اپنی تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے بالآخر اس بڑے صندوق کو دروازے کے سامنے پہنچا دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دروازے کے قبضے مکمل طور پر اُکھڑ چکے [illegible] صندوق سامنے آ جانے کے باعث دروازہ گرا نہیں۔

''سالیوں نے دروازے کے سامنے کوئی بھاری چیز رکھ دی ہے۔'' انہیں باہر سے کسی کی جھنجلائی [illegible] آواز سنائی دی۔

''چھوڑ دو، جانے دو۔ پولیس پہنچ گئی ہے۔ یہاں سے نکلنے کی کرو ورنہ ہم بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔'' ایک دوسرے شخص نے بلند آواز میں یہ حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ ہی دروازے پر جاری کارروائی بند ہو [illegible] اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ ان سے دُور جا رہی تھیں۔ [illegible] آوازوں کو سن کر ان دونوں ہی نے سکون کا سانس لیا اور تھکے تھکے انداز میں صندوق کے ساتھ ہی اپنی پشت [illegible] کر فرش پر بیٹھ گئیں۔

⊛----✪----⊛

پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود وہ کمرہ انسانی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ یہ چیخیں اس شخص کے حلق سے برآ [illegible] رہی تھیں جو چھت میں لگے آنکڑے سے رسّی کی مدد سے اُلٹا لٹکا کسی پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ ایک تو [illegible] لٹکنے کی اذیت، دوسرے قریب کھڑے سادہ لباس پولیس والے کے ہاتھ میں موجود بید کی مسلسل حرکت [illegible] نشانہ اس کی پیٹھ تھی..... وہ چیخیں نہ مارتا تو کیا کرتا؟ لیکن اس کی چیخیں سن کر کمرے میں موجود کسی شخص کا دل [illegible] کانپ رہا تھا۔ وہ شخص اس لائق ہی نہ تھا کہ اس پر رحم کیا جاتا۔ اس کی گردن پر تو اتنی معصوم زندگیوں کو [illegible] کرنے کا بوجھ تھا کہ اگر ان لوگوں کو اس سے چند اہم معلومات حاصل نہ کرنی ہوتیں تو اس وقت وہ پیروں کی بجائے گردن کے بل ہی اس آنکڑے کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا۔

وہ شخص الماس گرو تھا جسے وہ لوگ بڑی جدوجہد کے بعد ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ سندر رام [illegible] کوٹھی سے نکلتے ہی سجاد رانا نے اپنے سسر آئی جی مختار مراد کے ساتھ مل کر شہر بھر کے خواجہ سراؤں پر ہلّا بول [illegible] تھا۔ شینا کے اغوا کے سلسلے میں خواجہ سراؤں کے ملوث ہونے کا معلوم ہونے پر پہلے ہی ان لوگوں کی شامت [illegible] ہوئی تھی اور اب تو گویا ان لوگوں پر مصیبت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ کئی مظلوم اور بے قصور لوگ بھی اس کارروائی [illegible] کی زد میں آئے تھے۔ جو بھی شخص ذرا مشکوک لگا تھا، اسے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا گیا تھا اور اس [illegible] بے حد سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ پولیس کی یہ کارروائی میڈیا کی نظر میں بھی آ گئی تھی اور وہ لوگ خواجہ سراؤں کے ہمدرد بن کر پولیس کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ کل شام بھی شہر کے بہت سے خواجہ سراؤں [illegible] میڈیا کے افراد کے ساتھ مل کر پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا تھا۔ کئی رپورٹرز آئی جی اور ڈی آئی جی [illegible] سے رابطہ کر کے اس صورتِ حال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں [illegible] بہت واضح جواب نہیں دیا گیا تھا۔ سجاد رانا اور مختار مراد دونوں پر ہی ایک جنون سا سوار تھا جس کے باعث وہ [illegible] تنقید اور مخالفت کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ یہاں تک کہ صبح وزیراعلیٰ کی طرف سے آنے والی کال کو [illegible]



[illegible]راز کر دیا گیا تھا اور انہیں یہ کہہ کر تسلی دے دی گئی تھی کہ بہت اہم اور ٹاپ سیکرٹ معاملے کی چھان بین [illegible]لیے یہ کارروائی ناگزیر ہے۔ مسلسل تحقیقات کے نتیجے میں جو حالات سامنے آ رہے تھے، اس سے یہ بات [illegible] ہوتی دکھائی دے رہی تھی کہ واقعی معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ اس گمبھیر معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے وہ سب [illegible]طرح سرگرم تھے۔ ذاتی دکھ نے ان کی سرگرمی کو مہمیز کر کے بہت تیز کر دیا تھا۔ مفرور گرو الماس تک رسائی [illegible]ی سرگرمی کی وجہ سے ممکن ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے نگار کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اسے خواجہ [illegible]ں کے کئی ایسے ٹھکانوں کا علم تھا جن کے بارے میں پولیس بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کی مدد سے وہ ان [illegible]ں پر گرو الماس کو ڈھونڈتے رہے تھے۔ نگار کی نگرانی اور مدد کے لیے دو پولیس والے بھی خواجہ سرا کا روپ [illegible]لر اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ بالآخر اندرونِ شہر کی گلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ لوگ اس جگہ پہنچنے میں [illegible]ب ہو گئے جہاں گرو الماس اپنے ٹھکانے سے بھاگنے کے بعد روپوش تھا۔ پولیس والوں نے دو گھنٹے قبل [illegible]ے اس نئے ٹھکانے کو گھیر کر ریڈ کیا تھا اور اسے گرفتار کر کے یہاں لے آئے تھے اور اب وہ اُلٹا لٹکا ان [illegible]والوں کے جواب دے رہا تھا۔ جہاں کسی سوال کا جواب دینے میں اس کی زبان اٹکتی، وہاں اس کے سر [illegible] سادہ لباس شخص کا ہاتھ متحرک ہو جاتا اور اس وقت تک متحرک رہتا جب تک اُس کی زبان دوبارہ نہ [illegible]پڑتی۔

''کتنی لڑکیوں کو قتل کر چکے ہو تم اپنی دیوی کو بھینٹ دینے کے نام پر؟''

''صرف تین۔'' اس نے سسکاری بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''صرف تین..... تیرے نزدیک تین انسانی جانیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں؟'' سوال کرنے والے سجاد رانا [illegible]اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا پھر لگاتار مارتا ہی چلا گیا۔

''آخری بار تم لوگوں نے جس لڑکی کو قتل کیا تھا، اس کی لاش کہاں ہے؟'' شہریار نے آگے بڑھ کر سجاد رانا [illegible]ازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ اس سوال کے جواب میں خاموش رہا۔ لیکن پھر بید [illegible]پے در پے ضربوں نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا اور اس جگہ کا پتہ بتانے لگا جہاں شینا کو مارنے کے [illegible]ں کی لاش کو دفن کیا گیا تھا۔

''پارٹی تیار کرواؤ۔ اس کی بتائی ہوئی جگہ پہنچ کر ہمیں لاش ڈس کور کرنی ہے۔'' سادہ لباس پولیس آفیسر کو [illegible]دیتے ہوئے سجاد رانا کی آواز کانپ گئی اور وہ تیزی سے پلٹ کر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہریار اور مختار [illegible]بھی اس کے پیچھے لپکے۔ وہ اپنے آفس میں گیا تھا اور میز پر سر رکھے کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا [illegible]ہی میز پر ایک فائل میں وہ رپورٹس بھی موجود تھیں جن میں سیٹھ سندر رام کی کوٹھی پر قتل ہونے والے افراد کی [illegible] مارٹم رپورٹس اور موقع پر پائی جانے والی دیگر شہادتوں کی تفصیل موجود تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹس نے [illegible]یق کر دی تھی کہ قتل ہونے والے پانچوں افراد کی موت سائنائیڈ کی وجہ سے ہوئی ہے جو شراب کے ذریعے [illegible]کے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ چوکیدار کی موت کا سبب اس پر لگائی جانے والی مہلک ضرب تھی۔ شراب کی [illegible]اور گلاسوں پر مرنے والوں کے سوا کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے اور شہریار کو اچھی طرح یاد [illegible]کوٹھی میں اس کی جس شخص سے مڈبھیڑ ہوئی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں میں نائیلون کے باریک دستانے [illegible]رکھے تھے۔ ان رپورٹس میں سب سے اہم رپورٹ خون کے اس نمونے کی تھی جسے تہ خانے میں موجود [illegible]پر سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نمونے کا جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس بات کا قوی امکان تھا [illegible]شینا ہی کا خون ہے مگر پھر بھی انہیں موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ مری نہ ہو اور صرف زخمی ہوئی ہو۔ لیکن

الماس سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد یہ موہوم سی اُمید بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس کی زبانی شینا کی موت
تصدیق کے علاوہ دیگر بھی کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ الماس کے مطابق ہندو خواجہ سراؤں پر
ان لوگوں کی ایک تنظیم تھی جو سال بھر سے کام کر رہی تھی۔ اس تنظیم میں ملک کے ہر حصے کے افراد شامل
لیکن ان افراد کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی کُل تعداد بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان
کو مہا گرو کی حیثیت سے پہچانے جانے والے ایک شخص نے منظم کیا تھا۔ لاہور میں سونی اس کی مددگار تھی
اسی کے ذریعے وہ لوگ اس تنظیم میں شامل ہوئے تھے۔ الماس سے انہیں تنظیم کے دیگر افراد کے بارے
کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے مطابق مہا گرو کی طرف سے انہیں آپس میں گھلنے ملنے اور ایک دوسرے
بارے میں جاننے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی پکڑا جائے تو
افراد محفوظ رہیں اور ان کے نزدیک شروع کیا جانے والا مقدس مشن جاری رہے۔ الماس کے بیان سے یہ
آیا تھا کہ مہا گرو کوئی نہایت شاطر اور منصوبہ ساز شخص ہے جو اپنے کسی خاص مقصد کے لیے ان لوگوں
ذہنوں کو مسمرائز کر کے اپنا اُلو سیدھا کر رہا تھا۔ اس خیال کو تقویت الماس کی بتائی ہوئی بات سے ملی تھی
اپنے گروہ میں شامل خوب صورت اور جوان خواجہ سراؤں کو شوقین افراد کی دل بستگی کے لیے بھی بھیجتے تھے
لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ جب بھی کسی ایسے شخص کے پاس جائیں تو خلوت و جلوت دونوں میں پیش
والی معمولی سے معمولی بات کا دھیان رکھیں اور اس کی تفصیلی رپورٹ دیں۔ ہر گروہ کا گرو یہ رپورٹس مہا گرو
پہنچاتا تھا۔ مہا گرو ان معلومات کا کیا کرتا تھا، انہیں علم نہیں تھا۔ مہا گرو کی شخصیت بڑی پراسرار تھی۔ وہ اپنی
سے اس سے ملاقات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس وہ کسی خاص اجتماع کے موقع پر ہی ان کے سامنے آتا تھا
کے علاوہ باقی دنوں میں وہ لوگ سونی سے ہی رابطے میں رہتے تھے۔

الماس کے کیے گئے ان انکشافات نے ان سب کے ذہنوں کو بری طرح اُلجھا دیا تھا۔ ان باتوں سے
اشارہ مل رہا تھا کہ بظاہر چند مذہبی جنونی خواجہ سراؤں پر مشتمل یہ تنظیم درحقیقت کسی اور مشن پر کام کر رہی تھی
خود تنظیم کے ممبران کو بھی صحیح طرح اندازہ نہیں تھا کہ دراصل انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے
کٹھ پتلیوں کی طرح مہا گرو کے اشاروں پر ناچتے رہے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کرتے تھے۔ ان لوگوں کو
سندر رام جیسے نامور شخص کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ اس کی پشت پناہی کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان
ملازمہ اس کی کوٹھی پر اس قسم کے اجتماعات کروا سکتی۔ اس کی لاش جس طرح ان خواجہ سراؤں کے ساتھ پائی
تھی، اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی تھی کہ اس کے ان لوگوں کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ تب ہی
ان کے ساتھ مل کر شراب نوشی کر رہا تھا اور یقینی طور پر اسی وجہ سے موت کے گھاٹ بھی اُتارا گیا تھا۔ جو بھی
افراد ان سب لوگوں کے پیچھے تھے، انہوں نے یہ جان لینے کے بعد کہ سندر رام کی کوٹھی اور وہ خود پولیس
نظروں میں آ چکا ہے، اسے ٹھکانے لگانے میں دیر نہیں کی۔ شینا کا انجانے میں کیا جانے والا اغوا ان کے
میں اٹک گیا تھا۔ خواجہ سراؤں کے جس گروہ نے اسے اغوا کیا تھا، انہیں خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ ڈی آئی جی کی
کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں اور یہ اغوا ان کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ ہر حال، منظر پر موجود سارے
افراد صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے۔ مفرور الماس کے ذریعے انہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ نا
تھیں جن کے ذریعے کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔ سندر رام کی کوٹھی سے بھی انہیں کوئی کلیو نہیں مل سکا
اگر کچھ ہوگا بھی تو وہ آگ میں جل کر بھسم ہو گیا ہوگا۔

''حوصلے سے کام لو سجاد! اگر تم اس طرح سے ہمت ہار بیٹھے تو مریم کو کیسے حوصلہ دو گے؟'' وہ دونوں



رانا کے پیچھے کمرے میں آنے کے بعد کچھ دیر تو بالکل خاموش کھڑے رہے پھر آخر کار مختار مراد نے ہی آگے
بڑھ کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ البتہ اس کوشش میں وہ خود بھی نڈھال نظر آ رہے تھے۔ خود ان کا اپنا غم بھی
تو الگ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی اپنی اکلوتی نواسی کو کھویا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں مریم کو کیسے حوصلہ دوں گا؟ میں ہر روز اسے یہ تسلی دے کر گھر سے نکلتا تھا کہ جا
شینا کو ڈھونڈ کر اس کے پاس لے آؤں گا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے اپنی بیٹی ایک لاش کی صورت میں لے
گی۔ میں مریم کے سامنے اس کی بیٹی کی لاش لے کر کیسے جاؤں گا؟'' یہ وہ سوالات تھے جو ان میں سے ہر ایک
کے ذہنوں میں تھے۔ اسے تسلی دینے والے مختار مراد کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ پولیس
ملازمت ایسی تھی جس میں ان لوگوں کا دن رات لاشوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح خود ان کا
بھی یہی خیال تھا کہ وہ اتنی موتیں، اتنے حادثات دیکھ چکے ہیں کہ ان کا دل سخت ہو گیا ہے اور اب اس پر
بات کا اثر نہیں ہونے والا۔ لیکن اس وقت جو دھچکا پہنچا تھا، اس نے ان کے خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا اور
اپنے دل میں ویسی ہی تکلیف محسوس کر رہے تھے جیسی یقیناً اپنے پیاروں کو کھونے والا کوئی بھی شخص محسوس کر سکتا
تھا بلکہ ان کی تکلیف دوسروں سے دوچند ہی تھی۔ طاقت اور بہت سا اختیار ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اتنے
بڑے نقصان سے کیسے دوچار ہو گئے تھے، انہیں سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔

''مختار انکل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سجاد بھائی! دکھ بے شک بہت بڑا ہے لیکن اب حوصلے سے اسے سہنے
کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں رہا ہے۔ ہم خود حوصلہ کریں گے تو دوسروں کو بھی سنبھال سکیں گے۔ پھر
اس وقت ہمارے شانوں پر جو سب سے بڑی ذمے داری ہے، وہ شینا کے اصل قاتلوں تک رسائی اور انہیں کیفر
کردار تک پہنچانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی ہم اس خواجہ سرا الماس کی زبان مکمل طور پر کھلوانے میں کامیاب
نہیں ہو سکے ہیں۔ اس پر ہمیں مزید کام کرنا ہوگا تاکہ مکمل معلومات حاصل ہو سکیں۔ شینا کی ڈیڈ باڈی ڈِس
ہو جائے تو پھر اس معاملے کو اچھی طرح دیکھتے ہیں۔'' شہریار خود بھی شینا کی موت سے بری طرح متاثر ہوا
لیکن اس نے نسبتاً جلد خود پر قابو پا لیا تھا۔ اصل میں تو وہ ماہ بانو سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد ہی سمجھ
گیا تھا کہ شینا قتل کی جا چکی ہے۔ اس کی اب تک کی ساری بھاگ دوڑ بس اسی بات کی تصدیق کے لیے تھی
جبکہ سجاد رانا ایک باپ کی حیثیت سے سب کچھ جانتے بوجھتے بھی امید کا دامن ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا اس
لیے اسے خود کو سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

''میں ماموں جان کو فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ اور آفرین ممانی، آپ کے گھر پہنچ جائیں۔ ہم شینا کو لے کر
گھر پہنچیں، اس سے پہلے مریم بھابی کے پاس کسی کا ہونا ضروری ہے۔'' اس نے دیکھا کہ اس کی باتوں کا ان
خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور انہوں نے خود کو کمپوز کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ دوسری طرف توجہ دی اور اپنے موبائل
سے آفرین رانا کا نمبر ملایا۔

''کہاں ہو تم شیری! لاہور میں رہ کر تمہارا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ اپنے ماموں جان کی طبیعت تک معلوم
کرنے نہیں آئے'' اس کی آواز سن کر انہوں نے فوراً شکوے شروع کر دیے۔

''سوری ممانی جان! میں بہت مصروف رہا اس لیے نہیں آ سکا۔ آپ ایسا کریں کہ ماموں جان کے ساتھ
ایک آدھ گھنٹے میں سجاد بھائی کے گھر پہنچ جائیں۔ دو تین دن رہنے کے اہتمام کے ساتھ آئیے گا۔ میں بھی تھوڑی
دیر میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔''

''سب ٹھیک تو ہے نا شہریار؟'' اس نے اگرچہ اپنا لہجہ نارمل ہی رکھا تھا لیکن آج کل وہ لوگ جن حالات

سے گزر رہے تھے، ان کے باعث آفرین رانا کا کھٹک جانا کچھ غلط نہیں تھا۔

''ابھی میں آپ کو تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ بس آپ میری بات پر عمل کریں اور سجاد بھائی کے گھر چلی جائیں۔ وہاں آپ لوگوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے بہ مشکل یہ چند جملے کہہ کر کال منقطع کر دی۔ اسی وقت میز پر رکھا انٹرکام بجا۔ سجاد رانا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسری طرف وہی پولیس آفیسر تھا جس کے ذمے انہوں نے پولیس پارٹی تیار کرنے کا کام لگایا تھا۔ وہ انہیں ٹیم کے تیار ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔ کئی دن قبل دفن کی جانے والی لاش کو قبر کھود کر نکالنے کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان انتظامات کو کرنے میں ہی یہ تھوڑا سا وقت لگ گیا تھا۔

''اوکے! ہم لوگ آتے ہیں۔'' سجاد رانا نے اسے مختصر جواب دیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

اب وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال چکا تھا۔ اس کے ردِعمل سے شہریار اور مختار مراد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف کون ہو گا اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ ہی حرکت میں آئے۔ ابھی وہ لوگ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ سجاد رانا کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے موبائل نکال کر چیک کیا۔ گھر سے کال آ رہی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ اگنور کر دے مگر پھر مریم کی پریشانی کا خیال کر کے کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سے اسے جو کچھ بتایا گیا، اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ ابھی کال سن ہی رہا تھا کہ مختار مراد کا پی اے ایک پولیس آفیسر کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ان لوگوں کے قریب آیا اور مختار مراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''سر! اطلاع آئی ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کے گھر پر حملہ ہوا ہے۔ پولیس کے بروقت پہنچ جانے کے باعث گھر کے افراد تو محفوظ رہے لیکن گارڈز اور دیگر ملازمین مارے گئے ہیں۔ حملہ آور، پولیس والوں کے پہنچنے سے قبل ہی فرار ہو گئے تھے اس لیے کوئی گرفتار نہیں ہو سکا۔'' پی اے کی دی گئی اطلاع سن کر ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ سجاد رانا کو فون پر کیا بتایا جا رہا ہے جسے سن کر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی ہے۔

''ہمارے لیے کیا حکم ہے سر؟'' پی اے کے ساتھ آنے والے آفیسر نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختار مراد سے پوچھا۔

آئی جی اور ڈی آئی جی کی وہاں بہ یک وقت موجودگی کے علاوہ اس اندازے نے کہ وہ اپنے کسی نجی معاملے کی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہیں، پولیس ہیڈ کوارٹر میں اچھی خاصی کھلبلی مچا رکھی تھی۔ کئی افراد تو اس بات سے واقف بھی تھے کہ سجاد رانا کی مغوی بیٹی شینا کے بارے میں تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ شینا کی بازیابی کے سلسلے میں اب تک جتنی بھی کوششیں ہوتی رہی تھیں وہ دیگر افسران کو شریکِ راز بنائے بغیر ممکن نہیں تھیں۔

''میں اور میرا پی اے، پولیس پارٹی کے ساتھ ڈیڈ باڈی کی ڈس کوری کے لیے جائیں گے جبکہ ڈی آئی جی صاحب اور شہریار گھر جائیں گے۔ تم ڈرائیورز کو اطلاع دے دو۔'' انہوں نے حکم دیا تو پولیس آفیسر ''یس سر!'' کہتا ہوا پلٹ گیا۔ اس دوران سجاد رانا کال سے فارغ ہو چکا تھا۔

''آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو فوری طور پر گھر پہنچنا ہو گا۔ مریم بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ حملہ آور اس لڑکی ماہ بانو کی تلاش میں آئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔'' مختار مراد کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے اس نے بتایا تو شہریار چونک گیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں کسی کا سجاد رانا کے گھر پر دھاوا بولنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی ذریعے سے چودھری افتخار کو اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو گیا ہے کیونکہ وہی وہ واحد شخص تھا جسے اس کی تلاش تھی۔ البتہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بے



جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تو نہیں ہو گا کہ اس حملے کے بعد وہ ان لوگوں سے براہ راست دشمنی مول لے گا۔

⊛----✪----⊛

''ایک بار پھر ناکامی۔ اُس نے اس لڑکی کے پیچھے اتنا بڑا خطرہ مول لیا کہ تجھے ڈی آئی جی کے گھر میں گھس کر اسے لانے کی اجازت دے دی اور تُو اتنا ہنگامہ مچانے کے بعد بھی خالی ہاتھ آیا۔ اب تیرے پیچھے کتوں کی طرح بُو سونگھتے ہوئے وہ لوگ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ کڑی ہاتھ آ جاتی تو میں یہ دشمنی بھی ہنسی خوشی مول لیتا۔ لیکن اب تو بالکل بے کار کی مصیبت اٹھانی پڑے گی۔'' کمرے میں ٹہلتا ہوا چودھری افتخار، بالے پر برس رہا تھا۔ ایک بار پھر محروم رہ جانے کے احساس نے اس کو اس قدر مایوس کیا تھا کہ مایوسی کی وجہ سے چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی پیر آباد سے لاہور پہنچا تھا۔ لیکن جس کے لیے پہنچا تھا، وہی نہیں ملی تھی۔ وہ تو ماہ بانو کو مردہ تسلیم کر کے صبر بھی کر چکا تھا لیکن جب یہ اطلاع ملی کہ وہ مردہ سمجھی جانے والی لڑکی زندہ ہے تو ایک بار پھر اسے پانے کے لیے بے چین ہو گیا اور اپنی بے چینی میں سجاد رانا کے گھر پر حملے کا حکم دینے سے بھی نہیں چوکا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کی اطلاع اسے انسپکٹر رفیق کھوکھر سے ملی تھی۔ اپنی معطلی کے احکامات صادر ہو جانے کے بعد پہلے تو وہ کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح سجاد رانا اسے معاف کر دیں لیکن پھر ان کے انداز سے یہ سمجھنے کے بعد کہ وہ نرم نہیں پڑیں گے، اس نے پینترا بدل لیا۔ تفتیش کے دوران اس پر یہ بات تو کھل ہی چکی تھی کہ موتی والا کے گھر سے غائب ہونے والی اور پھر بلاسٹ میں مردہ سمجھی جانے والی لڑکی کے پیچھے کون شخص پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ جب سجاد رانا کے سامنے دال نہ گلی تو چودھری سے ساز باز کر بیٹھا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کے علاوہ اس کی سجاد رانا کے گھر میں موجودگی کی اطلاع دینے پر اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک نفع حاصل ہوا تھا۔ ملنے والی رقم سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری سے ہونے والا یہ عہد و پیمان اپنی جگہ تھا کہ اب وہ دونوں ساتھی ہیں اور وقتِ ضرورت ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔ لیکن ابھی تو اصل مسئلہ ماہ بانو کے نہ ملنے کا تھا۔ چودھری جو اس کے خوابوں میں کھویا ہوا یہاں تک پہنچا تھا، اسے نہ پا کر بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اپنی ناکامی کی اطلاع اسے بالے سے بھی پہلے ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے نیوز بلیٹن سے مل گئی تھی۔ تقریباً سارے ہی نیوز چینلز سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر پر مسلح افراد کے حملے کی خبر نشر کی جا رہی تھی۔ خبر کے ساتھ ہی اسکرین پر ان کے گھر کے مناظر بھی دکھائے جا رہے تھے۔ ان مناظر میں مرنے والے گارڈز اور ملازمین کے خون کے دھبوں کے علاوہ گھر کی مختلف دیواروں اور دروازوں پر گولیوں کے نشانات بھی شامل تھے۔ خبروں میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی خبر سجاد رانا کی کم سن بیٹی کے فائرنگ کی زد میں آ کر ہلاک ہونے کی تھی۔ چودھری جو کہ شینا کے اغوا والی بات سے باخبر تھا، سمجھ گیا تھا کہ سجاد رانا نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بہر حال، فی الحال اسے اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ماہ بانو کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور خبروں میں اس کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا۔

''میں نے پوری احتیاط کی تھی سرکار! آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ احتیاط کی وجہ سے میں خود اپنے بندوں کے ساتھ ڈی آئی جی کی کوٹھی پر نہیں گیا تھا بلکہ اپنے کھوکھر صاحب نے کسی ذریعے سے بندوں کا انتظام کروا دیا تھا۔ ان بندوں کو رقم دے کر کام کروایا گیا تھا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اور کھوکھر صاحب بھی سامنے نہیں آئے۔ اس لیے آپ اطمینان رکھیں، آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' بالے

نے چودھری کو تسلی دی۔

''تیرا بڑا احسان ہے مجھ پر کہ تُو نے اپنی عقل مندی سے مجھے بچالیا۔'' بالے کی تسلی کا چودھری پر اُلٹا اثر ہوا اور اس نے قریب رکھا ایک آرائشی گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان اچھا خاصا بھاری تھا لیکن بالے کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا سر زد پر نہیں آیا تھا اور گل دان اس کے بازو سے ٹکرا کر نیچے فرش پر گر گیا۔

''اُلو دے پٹھے! میں تجھے حلق تک نوٹ اس لیے ٹھنساتا ہوں کہ تُو میرا کام پورا کرنے کے بجائے مجھے تسلیوں پر رکھے؟ تیری وجہ سے کُڑی ایک بار پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہا تُو کہ کیسے اُس کے ہمدردوں نے اس کے بارے میں خبر کو اپنے پیٹ میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ کہیں کسی نے معمولی سی بھاپ بھی نکالی ہے کُڑی کے بارے میں اپنے منہ سے؟ اب تک وہ لوگ اسے کسی دوسری جگہ پہنچا چکے ہوں گے۔ مجھے ٹھکانا معلوم تھا، وہاں سے تو کُڑی کو لا نہیں سکا، دوسری جگہ کا پتہ کہاں سے لائے گا؟'' بالے کو گل دان کی ضرب سے مجروح کرنے کے باوجود اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا اور وہ مسلسل منہ سے کف اُڑاتا اس پر برس رہا تھا۔

''کُڑی کا پتہ مل جائے گا سرکار! خبر یہی ہے کہ وہ ابھی تک ڈی آئی جی کے گھر میں ہی چھپی ہوئی ہے۔ جن بندوں کے ذمے ہم نے اسے اٹھانے کا کام لگایا تھا، وہ ڈی آئی جی کے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اُن کو کُڑی کو کسی دوسری جگہ لے جایا گیا تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ان کا ہم سے وعدہ ہے کہ وہ ہر حال میں کُڑی کو حاصل کر کے رہیں گے۔ کُڑی کے ملنے کے بعد ہی انہیں پوری رقم ملے گی۔'' چوٹ کھا کر بھی اُف کیے بغیر بالے نے ایک بار پھر چودھری کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے۔ اِک واری ہور تیری کارکردگی کو دیکھ لیتے ہیں۔ ملوم (معلوم) پڑ جائے گا کہ تُو کتنے پانی میں ہے۔'' نگرانی والی بات سن کر اسے کچھ تسلی ہوئی تو وہ تھوڑا سا ٹھنڈا پڑا اور کمرے میں ٹہلنے کا سلسلہ ختم کر کے ایک کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ اب اس کی توجہ ایک بار پھر ٹی وی کی طرف تھی جہاں ڈی آئی جی کے گھر پر حملے کی خبر کو بار بار نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کی مذمتی اور تعزیتی بیان بھی نشر کیے جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

''آج رات بارہ بجے کے بعد میں انڈسٹریل ہوم میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' اپنے موبائل پر موصول ہونے والے کشور کے اس میسج کو پڑھ کر وہ پریشان ہو اُٹھا۔ اُس کا اس طرح بار بار حویلی سے نکل کر چوری چھپے اس سے ملاقات کے لیے آنا بہت خطرناک تھا۔ کسی کو خبر ہو جاتی تو دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اسے اپنی ذات کے لیے تو وہ اتنا فکر مند نہیں تھا لیکن کشور کو کوئی نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ خود اس کی اپنی زندگی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ وہ کسی بھی وقت زد پر آ سکتا تھا۔ گاؤں والوں کی فلاح کے لیے جاری اس کا مشن اخبار میں چھپنے والے نکیلے کالمز ہی اس کے لیے کسی بھی وقت کوئی بڑا خطرہ بن سکتے تھے۔ اپنے اس بالکل مختلف طرزِ زندگی کے باعث ہی اس نے ابتدا میں کشور کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا لیکن پھر اس کی محبت نے کسی تند ندی کی طرح اسے اپنے ساتھ بہہ جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی وہ خواہش مند تھا کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ لیکن کشور اپنی شوریدہ سری سے اس کے ہر ارادے کو ڈھا دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے میسج بھیجنے کے بعد اس نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔ میسج اسے آٹھ بجے کے کچھ بعد ملا تھا اور اس کے بعد وہ مسلسل کشور کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا۔ لیکن ہر بار سنائی دینے والی ریکارڈنگ اسے بتا رہی تھی کہ اس کا مطلوبہ نمبر



آف ہونے کی وجہ سے رابطہ ممکن نہیں۔ اس نے کال کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد کشور کو دو تین میسج بھی بھیجے تھے کہ اگر وہ کسی لمحے اپنا موبائل آن کرے تو اسے وہ میسجز مل جائیں۔ لیکن بھیجے گئے میسجز کی ڈیلیوری رپورٹ نہ آنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ کشور نے ایک منٹ کے لیے بھی اپنا موبائل دوبارہ آن نہیں کیا ہے۔ یقینی طور پر وہ جانتی تھی کہ اس کا پیغام ملنے پر آفتاب کی طرف سے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ اس کی ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی ہوگی، اس لیے رابطے کی واحد صورت ہی ختم کر دی تھی۔ اتنا یقین تو اسے بھی ہوگا کہ وہ لاکھ جھنجلائے، مخالفت کرے مگر اس کا پیغام ملنے کے بعد آئے گا ضرور۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر حویلی کی اونچی دیواروں کو خاطر میں لائے بغیر رات کے اندھیرے میں اس سے ملاقات کے لیے پہنچتی اور وہ خود وہاں نہ جا کر اسے مایوس کر دیتا۔ دماغ کے مشورے اور عقل کی سکھائی ہوئی احتیاطیں اپنی جگہ لیکن جب معاملہ دل کا ہو تو اہلِ دل کو پاسبانِ عقل کو رخصت کر کے یا ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروانے کے بعد اپنے دل کی ہی ماننی پڑتی ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک جب اس کا کشور سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تو وہ اس سے ملاقات کے لیے جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ لباس کے معاملے میں بہت سادہ مزاج ہونے کے باوجود اس وقت اس نے ذرا تکلف سے کام لیا تھا اور اپنا ایک بہترین لباس زیب تن کرنے کے ساتھ ساتھ پرفیوم کا اسپرے بھی کیا۔ اس کے ساتھی رات کو جلدی سو جانے کے عادی تھے، چنانچہ جب وہ بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے روانہ ہوا تو ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ اسے پیدل ہی گھر سے اسکول سے ملحقہ انڈسٹریل ہوم تک کا سفر طے کرنا تھا۔ یہ پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ بارہ بجنے میں دس منٹ قبل گھر سے نکلا تھا۔ اس حساب سے بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا۔ کشور نے بارہ بجے کے بعد ہی اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ ٹھیک بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ انڈسٹریل ہوم کے دروازے پر جا پہنچا اور اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے چابی برآمد کی۔ لیکن جب وہ تالا کھولنے کے لیے جھکا تو احساس ہوا کہ دروازے پر تالا موجود نہیں ہے۔

''اندر تشریف لے آئیں عالی جاہ! ہم دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔'' ابھی وہ سیدھا ہی ہوا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھل گیا اور کشور کی مدھم مگر شوخ آواز سنائی دی۔ دروازے کھولنے کے بعد وہ یقیناً خود آڑ میں ہو کر کھڑی ہو گئی تھی اس لیے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کی آواز کی ڈور سے بندھا کھلے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ فوراً ہی دوبارہ بند ہو گیا۔ بند دروازے سے پشت ٹکائے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے التجا نہ انداز میں دیکھ رہی تھی، یوں جیسے اسے بے بس کر کے وہاں بلا لینے پر بہت خوش ہو۔ روشنی بہت کم ہونے کے باوجود وہ اس کے انگ انگ میں دوڑتی سرشاری اور خوشی کو محسوس کر سکتا تھا۔ بجلی ہونے کے باوجود وہاں روشنی کے لیے صرف ایک موم بتی روشن کی گئی تھی اور وہ بھی ایک کونے میں اس زاویے سے گتے کے ایک ٹکڑے کی آڑ میں رکھی تھی کہ اس کی روشنی باہر نہ جا سکے۔ یہ احتیاطی تدابیر تھیں جو یقیناً اس نے اپنی وہاں موجودگی کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے اپنائی تھیں۔

''بہت ضدی ہیں آپ..... مجھے بہت تنگ کرتی ہیں۔'' اسے مسکراتے دیکھ کر اس نے شکوہ کیا۔

''تو اب میں حاضر ہوں۔ آپ کا جتنا جی چاہے مجھے تنگ کر لیں۔'' اس کی شوخ آواز میں بلاوا تھا۔

''آپ کو ذرا احساس نہیں کہ اس طرح چھپ کر حویلی سے نکلنا آپ کے لیے کتنا خطرناک ہے۔ کسی کو پتا ہو گیا تو نتیجہ آپ مجھ سے بڑھ کر جانتی ہیں۔'' اس کی شوخی کو نظر انداز کر کے آفتاب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید میں اپنی خواہش کے پیچھے آپ کی زندگی کو داؤ پر لگا دیتی ہوں۔''

یک دم ہی اُداس ہوگئی۔

''غلط رخ پر مت سوچیں۔ میں یہ سب اپنی نہیں، آپ کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ میں تو پہلے ہی آپ کے ا
جی کی نظر میں معتوب ہوں لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ اپنے ہاں کی روایات کے مطابق محبت کے جرم میں
سزا کی حق دار ٹھہرا دی جائیں۔ کسی کو ذرا بھی علم ہوگیا تو آپ کے ساتھ کتنا بدترین سلوک کیا جا سکتا ہے، میں
بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ کبھی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر
چوری چھپے مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔ لیکن آپ نے تو اس وعدے کا بھی پاس نہیں رکھا۔''

''آپ صحرا میں بھٹکتے پیاسے مسافر کی کیفیت سمجھتے ہیں آفتاب!..... ایسے مسافر کے سامنے اگر ٹھنڈے
میٹھے پانی کا چشمہ آ جائے تو کیا وہ خود کو اس پانی سے سیراب کیے بغیر رہ سکے گا؟ ہرگز بھی نہیں۔ میرا بھی یہی حال
ہے۔ میں بہت پیاسی تھی۔ لگتا تھا ایک دن اسی پیاس کے ساتھ مر جاؤں گی۔ لیکن پھر آپ میری زندگی میں چلے
آئے۔ کسی کی محبت کو ترسے میرے پیاسے بدن میں اُمید کی ایک کونپل پھوٹ پڑی۔ اس نئی پھوٹنے والی کونپل
نے مجھے حوصلہ دیا کہ زندگی پر میرا بھی کوئی حق ہے۔ میں اپنے اندر پھوٹنے والی امید اور خوشی کی اس ننھی کونپل کو
آپ کی محبت سے سیراب کرنے کے لیے آپ کے پاس آتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا راز بہت عرصے تک
راز نہیں رہے گا۔ اس راز کے کھلنے کے بعد مجھے اپنی جان چلے جانے کا بھی خطرہ ہے اس لیے میں چاہتی ہوں
کہ اس تھوڑی سی مہلت میں ہی آپ کا ڈھیر سارا پیار پالوں تاکہ جب مروں تو میرے اندر کوئی تشنگی نہ ہو۔''
اس کی آواز بھرّانے لگی جس سے آفتاب کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ فوراً نرم پڑ گیا۔

''اچھا آئیں، اِدھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یوں کھڑے کھڑے تو آپ تھک جائیں گی۔'' کشور ابھی تک
دروازے سے پشت لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر فرش پر بچھی دری کی طرف لے گیا۔ انڈسٹریل
ہوم کی حیثیت رکھنے والے اس کمرے میں دو دیواروں کے ساتھ پائیدان والی سلائی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔
ان مشینوں پر کام کرنے والوں کے لیے بیٹھنے کی نشستیں اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ انہیں وہاں سے الگ نہیں
کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے کشور کے ساتھ ہاتھ کی کڑھائی وغیرہ کرنے والی خواتین کے بیٹھ کر کام کرنے کے
لیے بچھائی گئی دری کا رخ کیا تھا۔ اس دری پر وہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتے تھے۔ دری پر بیٹھنے کے
بعد اس نے پہلی بار کشور کو ٹھیک سے دیکھا۔ دروازے کے قریب موم بتی کی روشنی بہت کم پہنچ رہی تھی اس لیے
اسے بہت کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اب وہ جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں ان دونوں پر ہی روشنی اچھی طرح پڑ رہی تھی۔
اس روشنی میں وہ کشور کا گلابی رنگ کا خوب صورت لباس دیکھ سکتا تھا۔ اس لباس کے ساتھ اس نے میچنگ کا
مہین سا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ دوپٹہ اگرچہ سر پر اور سینے پر پھیلا کر اوڑھا گیا تھا لیکن یہ صاف چھپتے بھی نہیں
اور سامنے آتے بھی نہیں والی صورتِ حال تھی۔ اس دوپٹے کے پار اس کی کھلی سیاہ زلفیں بھی نظر آ رہی تھیں اور
کانوں اور گلے میں پہنا زیور بھی۔ زیور اور لباس کے اس اہتمام کے علاوہ آنکھوں میں موجود کاجل اور
ہونٹوں پر چمکتی لپ اسٹک بھی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ آج کی اس ملاقات کے لیے اس نے خصوصی
تیاری کی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' وہ جو اس کی نظر میں جچنے کے لیے ہی یہ سارا اہتمام کر کے آئی تھی، اسے
مستقل اپنی طرف دیکھتا پا کر کچھ محجوب سی ہو کر پوچھنے لگی۔

''اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ سب پہلے کبھی نہیں کیا ہوگا اور اب میرے
لیے کیا ہے تو مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' آفتاب نے اس کی تیاری کی طرف اشارہ کیا۔



''خود کی تیاری کون سی کم ہے؟ اتنی خوشبو لگا رکھی ہے کہ مجھے دُور سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ آپ آ رہے
ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے اس پر نظر ڈالی اور پھر جھکی نظروں کے ساتھ اسے جتایا۔

وہ اُس کی بات سن کر ہنس پڑا پھر بولا۔ ''بھئی تیاری تو لازمی تھی۔ کوئی ہمارے لیے اتنا کشٹ اٹھائے تو کیا
ہمارا دل نہیں چاہے گا اس کی نظر میں جچنے کو؟''

''آپ تیاری نہ کرتے، تب بھی مجھے اچھے لگتے۔ جو دل میں بستے ہوں، وہ نظر کو بھی ہمیشہ اچھے لگتے
ہیں۔'' اس نے اپنا سر آفتاب کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کی خوشبو آفتاب کے وجود میں سرایت کرنے لگی۔

''آج کی اس ملاقات کا انتظام بھی یقیناً آپ نے اپنی اس ملازمۂ خاص کے تعاون سے کیا ہوگا..... کہاں ہے وہ؟ مجھے باہر کہیں نظر نہیں آئی۔'' وہ جانتا تھا کہ اس خوشبو کی گرفت سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنے منگیتر کے ساتھ اس کے تانگے میں بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہے۔'' اس نے سرسری جواب دیا اور اس کے مزید قریب کھسک آئی۔ اب صرف حواس پر چھاتی خوشبو ہی نہیں تھی بلکہ ایک میٹھی سی آنچ بھی تھی جو اس کے وجود میں پھیلتی جا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ہاتھ بڑھایا اور کشور کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔ اس کے سر پر موجود دوپٹہ تو نہ جانے کب کا ڈھلک چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے اس کی فکر بھی نہ ہو۔

''چلیں، ایک خواب بُنتے ہیں آفتاب!..... ایک ایسا خواب جس میں ہم دونوں ہوں، ایک چھوٹا سا گھر ہو اور اس گھر میں ہماری محبت کی پیاری پیاری سی نشانیاں ہوں۔ تصور کریں کہ ہم ہر خوف اور اندیشے سے آزاد جب ایسے کسی گھر میں ہوں گے تو زندگی کتنی خوب صورت ہوگی۔ میری زندگی میں اگر کبھی وہ وقت آ گیا تو مجھے یقین ہے میرے قدم زمین پر نہیں ٹِک سکیں گے۔ میں تو بادلوں کے سنگ اُڑتی پھروں گی۔'' اس کے شانے سے سر ٹکا کر آنکھیں موندے وہ خوابیدہ سے لہجے میں بولتی اس وقت بھی زمین کے بجائے آسمانوں میں اُڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف ایک خواب نے اس کے چہرے پر اتنے رنگ بکھیر دیئے تھے کہ وہ خود اپنا آپ ان رنگوں میں بھیگتا محسوس کر رہا تھا۔

''ہم ایسا کریں گے کہ اپنا گھر ہی زمین کے بجائے بادلوں کے درمیان بنالیں گے۔'' وہ خود بھی چپکے سے اس کے خواب میں شامل ہوگیا۔ عورت خوب صورت ہو، من پسند ہو اور مائل بہ کرم بھی..... تو مرد کا خود کو قابو میں رکھنے کا عہد کتنی دیر تک قائم رہ سکتا ہے؟ خوابوں کی دنیا کی سیر کرتے کب انہوں نے ایک نیا جہان دریافت کر لیا، انہیں خبر بھی نہیں ہو سکی۔ بادل ٹوٹ کر برستا رہا۔ پیاسی زمین سیراب ہوتی رہی۔ خوابوں کے گھروندے میں رنگ بھرتے رہے اور پھر ایک کلی کھل کر مکمل پھول بن گئی، تب کہیں جا کر انہیں ہوش آیا۔ ہوش میں آنے کے بعد ان دونوں کی عجیب ہی کیفیت تھی۔ احساسِ ندامت تھا جو ایک دوسرے سے نظر نہ ملانے دیتا تھا مگر ساتھ ہی ایسی سرشاری بھی تھی کہ تن من میں پھول کھلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس ملی جلی سی کیفیت میں مبتلا جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ان کے لب بالکل خاموش تھے۔ لبوں کو اب کچھ کہنے کی حاجت ہی کہاں رہ گئی تھی؟ سب کچھ تو کسی اور زبان میں کہا جا چکا تھا۔ اس سب کے بعد بھی اگر زبان کو زحمتِ گفتگو دی جاتی تو یہ ایک اضافی سی بات محسوس ہوتی۔ چنانچہ وہ دونوں کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

⊛----✪----⊛

''تمہارا بیگ عبدالمنان نے کل تمہارے حوالے کر دیا ہوگا۔ تم نے اپنا سارا سامان چیک کر لیا ہے نا؟'' لوگ ناشتے کی ٹیبل پر تھے جب اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔ یہ سوال اس بیگ کے متعلق تھا جو دارالامان میں گیا تھا اور بعد میں دارالامان کی منتظمہ نے کوریئر کمپنی کے ذریعے ان لوگوں کو بھجوا دیا تھا۔ ماہ بانو کے غیاب عرصے میں وہ بیگ یونہی رکھا رہا تھا۔ کسی کو دھیان ہی نہیں آیا کہ اس کی یہ امانت اس کے ورثاء کے حوالے دی جائے کہ اسے مردہ قرار دے دیئے جانے کے بعد وہی حق دار تھے۔ لیکن ایک طرح سے یہ کوتاہی اس حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی۔ اب وہ خود اپنی امانت وصول کرنے کے لیے موجود تھی۔

''جی۔'' ماہ بانو کا جواب بے حد مختصر تھا۔ وہ دونوں کافی افسردہ نظر آ رہی تھیں۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرا فیصلہ زیادہ اچھا نہیں لگا ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے دور ایک بالکل اجنبی جگہ پر جا کر رہنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے لیکن سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ لاہور میں تمہاری موجودگی عام پر آ چکی ہے اور اس کے نتیجے میں اتنا خون ریز واقعہ بھی پیش آ گیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس تمام واقعے کا ذمے دار چودھری افتخار ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں۔ اس میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے مشابرم خان کے گاؤں میں رہو۔ وہاں تم سکون سے امتحان کی تیاری کر سکتی ہو۔ جب امتحان شروع ہو جائیں تو فیصل آباد جا کر پیپرز دے دینا۔ تب تک حالات میں بھی تبدیلی آ جائے گی۔ ابھی تو تمہیں خود بھی اندازہ ہوگا کہ ہم سب شینا والے حادثے کے بعد کتنی بری طرح ڈسٹرب ہیں۔ تھوڑے سے حالات سنبھل جائیں تو پھر تمہارے مسئلے کا بھی کوئی بہتر حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔'' سجاد رانا کے گھر پر حملے کے بعد وہ لوگ ہل کر رہ گئے تھے۔ حملہ آور کون تھے، باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ خیال یہی تھا کہ چودھری نے اپنے بندوں کے ذریعے ہی یہ کارروائی کروائی ہوگی لیکن بغیر ثبوت کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر اس حملے کے ساتھ ہی شینا کی موت کی خبر بھی جاری کیے جانے کی وجہ سے مصروفیت بے پناہ بڑھ گئی تھی۔ اعلیٰ حکام، سیاست دانوں اور کاروباری افراد سمیت ہر نمایاں شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیات مسلسل تعزیت کے لیے سجاد رانا سے ملنے آ رہی تھیں۔ مختار صاحب اور لیاقت رانا بھی مستقل وہیں موجود تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کے پاس فرصت ہی نہیں تھی کہ اس معاملے پر زیادہ توجہ دی جا سکے۔ فی الحال تو خواجہ سرا الماس سے بھی دوبارہ ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ اس سے مزید معلومات حاصل کی جا سکیں اسے جس آفیسر کے حوالے کیا گیا تھا، وہ اپنے طور پر کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی طرف سے یہی اطلاع تھی کہ الماس نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے اور اب کچھ بھی اُگلنے پر راضی نہیں۔ ان حالات میں جب مشابرم خان نے یہ تجویز پیش کی کہ ماہ بانو کو بلتستان میں واقع اس کے گاؤں کاندے منتقل کر دیا جائے تو شہریار کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ کل رات ہی اس نے ماہ بانو کو اپنا یہ فیصلہ سنایا تھا لیکن اس وقت زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں مل سکا تھا اس لیے اب وہ روانگی سے قبل ناشتے کی میز پر یہ موضوع چھیڑ بیٹھا تھا۔ خود اسے بھی آج ہی واپس جانا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے واپس جائے گا جبکہ مشابرم خان، ماہ بانو کو اپنے گاؤں پہنچا کر واپس ڈیوٹی پر آ جائے گا۔

''مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ظاہر ہے، آپ یہ سب میری خاطر ہی کر رہے ہیں اور آپ کا مجھ پر احسان ہے۔ بس میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ جانے سے پہلے میری ایک بار اپنے ابا اور بے سے ملاقات ہو جائے یا کم از کم میں ان سے فون پر ہی بات کر لوں۔'' وہ اپنے دل کی خواہش ہونٹوں پر لے آئی۔

''سوری..... موجودہ حالات میں تو یہ ممکن نہیں۔ اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔'' صاف انکار



کرتے ہوئے وہ ایک دم ہی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھا سجاد بھائی! اب میں چلتا ہوں۔ ابھی نکل گیا تو جلدی پہنچ جاؤں گا۔'' اب تک خاموشی سے بیٹھے ہوئے گفتگو سے بے نیاز سجاد رانا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے ان سے کہا تو انہوں نے بھی جواباً اپنا ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ آج کل وہ بہت زیادہ چپ رہنے لگے تھے۔ مریم کی حالت ان سے بھی زیادہ خراب تھی اور وہ اپنے بیڈروم سے بھی باہر آنے کے لیے راضی نہ ہوتی تھی۔

''تم بھی ذرا جلدی نکلنے کی کوشش کرو۔ مشابرم خان باہر تیار بیٹھا ہے۔ جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔'' سجاد رانا نے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

''میری تیاری مکمل ہے۔ بس میں ذرا مریم باجی سے مل لوں، پھر روانہ ہو جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا تو وہ سر ہلاتا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔

باہر مشابرم خان کھڑا اس کی پہلے سے چمچماتی ہوئی گاڑی کو مزید چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے اسے سلام کیا پھر بولا۔ ''صاحب! گاڑی بالکل اے ون کنڈیشن میں ہے۔ ہم نے اچھی طرح سب چیک کر لیا ہے۔ آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے خان! اب اسی فرض شناسی اور ذمے داری سے کام لیتے ہوئے تمہیں ماہ بانو کو کاندے پہنچانا ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ اس لڑکی کے لیے کتنا خطرہ ہے یہاں؟'' کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ہدایت دی۔

''آپ فکر ہی نہ کریں صاحب! ہم نے ذمے داری اٹھائی ہے تو پھر چاہے اپنی جان سے گزرنا پڑے، ہم پیچھے ہٹنے والا بندہ نہیں ہے۔ جیسا دارالامان میں ہمارے دوست نے لڑکی کی جان بچانے کے لیے اپنا جان دیا تھا، ویسا ہی ہم بھی کر سکتا ہے۔'' اس کی ہدایت پر خان نے سینہ پھلا کر دعویٰ کیا۔ اُس کے اس دعوے پر زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی گیٹ پر موجود گارڈ الرٹ ہو گیا اور اس کے وہاں تک پہنچنے سے قبل ہی پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ کھلے گیٹ سے گاڑی باہر نکالنے کے بعد بھی اس نے گاڑی کی رفتار نہیں بڑھائی بلکہ اطمینان سے ڈرائیو کرتا رہا۔ چہرے کے بے نیازانہ تاثرات کے برعکس اس کا ذہن اس وقت پوری طرح الرٹ تھا اور نظریں مسلسل بیک ویو مرر کے ذریعے پیچھے کے منظر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس علاقے میں یوں بھی پبلک ٹرانسپورٹ کا گزر نہیں تھا، دوسرے بہت صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے بھی کافی سناٹا ہو رہا تھا اس لیے اگر کوئی مشکوک فرد یا گاڑی عقب میں ہوتی تو فوراً ہی نظر میں آ جاتی۔ فی الحال ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی یہ احتیاط اس خیال کے پیش نظر تھی کہ جن لوگوں نے ماہ بانو کو سجاد رانا کے گھر سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ وہ ابھی تک انہی کے گھر میں ہے۔ دوبارہ حملہ کرنے کی تو خیر وہ لوگ جرأت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اب سکیورٹی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھائی جا چکی تھی۔ مگر انہیں یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ ماہ بانو مستقل وہاں نہیں رہ سکتی۔ اسے کہیں اور شفٹ ضرور کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ لوگ اس تاک میں ہوں گے کہ باہر کسی مقام پر اسے گھیرا جا سکے۔ وہ چونکہ ماہ بانو کے معاملات سے براہِ راست منسلک ہو چکا تھا، اس لیے اسے شک تھا کہ اگر کوئی فرد نگرانی پر مامور ہوا تو اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا ایک ایسے موڑ پر جا رُکا جہاں سے مشابرم خان کا گزرنا ناگزیر تھا۔ ایک تو وہ گاڑی بہت سست روی سے چلاتا ہوا لایا تھا، دوسرے نکلنے سے پہلے ماہ

بانو کو جلد روانگی کے لیے خصوصی ہدایت بھی دی تھی اس لیے موڑ پر رکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور کرائے کی اس جیپ میں، جو بطورِ خاص بلتستان تک کا طویل سفر کرنے کے لیے منتخب کی گئی تھی، مشابرم خان آتا ہوا نظر آیا۔ جیپ کی پچھلی نشست پر حسبِ پروگرام برقعے میں ملبوس ماہ بانو بیٹھی تھی۔ جیپ تیزی سے اس موڑ پر سے گزر گئی۔ اس نے چونکہ اپنی گاڑی ایسے زاویے سے کھڑی کی تھی کہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے اس لیے وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکے۔ ان کے موڑ پر سے گزر جانے کے بعد اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ ان کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی ان لوگوں کے پیچھے ہوا تو وہ لاہور میں ہی انہیں گھیرنے کی کوشش کرگا اور شہر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں دے گا۔ ابھی تک ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی اس لیے اسے کچھ کچھ اطمینان ہو چلا تھا لیکن اپنا ارادہ بہرحال اس نے تبدیل نہیں کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے دوبارہ سفر کا آغاز کرنے سے قبل ہی جیپ کے تعاقب میں آنے والی ایک موٹر سائیکل کو دیکھ کر اسے اپنے فیصلے کی درستگی کا احساس ہوا۔ اب سفر اس انداز میں جاری تھا کہ سب سے آگے مشابرم خان کی جیپ تھی، درمیان میں موٹر سائیکل سوار اور پیچھے کافی فاصلے پر وہ خود تھا۔ ملتان روڈ شروع ہونے سے قبل موٹر سائیکل کی رفتار یک دم تیز ہوگئی اور وہ جیپ کو اوور ٹیک کرتے ہوئے تیزی سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ موٹر سائیکل سوار کی اس حرکت پر اُس کا جسم اکڑ سا گیا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ چلتی جیپ میں مشابرم خان یا ماہ بانو کو نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے خود بھی جھٹ اپنا پسٹل نکال لیا لیکن خیر گزری اور اس کے اندیشوں کے برعکس موٹر سائیکل سوار تیزی سے آگے نکل گیا۔

اب ملتان روڈ کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس روڈ پر مشہورِ زمانہ شاہ نور اسٹوڈیو کے علاوہ کئی ڈانس اکیڈمیاں، ایکٹنگ اکیڈمیاں اور کچھ ورکشاپس بھی تھیں۔ ظاہر ہے، صبح کے اس دھندلکے میں یہ سارے مقامات سنسان پڑے تھے۔ ان سارے مقامات پر رونق لگانے والے اتنی صبح اُٹھنے کی زحمت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ چنانچہ فی الحال ملتان روڈ پر عجیب و غریب ناموں والی اکیڈمیوں کے اشتہاری بورڈز کی ہی اجارہ داری تھی۔ ملتان روڈ پر سفر کا آغاز کرنے والی پہلی سواری موٹر سائیکل تھی، اس کے پیچھے مشابرم خان کی جیپ تھی اور اصولاً تیسری گاڑی اس کی ہونی چاہئے تھی لیکن اس سے قبل ایک سرخ شیراڈ نے بازی مار لی۔ اب وہ سرخ شیراڈ اس کی گاڑی اور مشابرم خان کی جیپ کے درمیان سفر کر رہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سڑک پر کسی ایک فرد یا گاڑی کی اجارہ داری نہیں ہوتی کہ اس کی جگہ کوئی دوسری گاڑی نہیں لے سکتی۔ جب کوئی شخص سفر پر نکلتا ہے تو خود دسیوں گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتا ہے اور دسیوں ہی گاڑیاں اسے اوور ٹیک کرتی ہیں۔ چنانچہ اس نے سرخ شیراڈ کے اچانک وارد ہو جانے کا خاص نوٹس نہیں لیا اور خود محتاط فاصلے سے تعاقب کرتا رہا۔ اس کا یہ اطمینان لمحے بھر کا ہی تھا۔ موٹر سائیکل سوار جو بظاہر سڑک پر سیدھا جا رہا تھا، اس نے اچانک ہی اپنی رفتار کم کر لی۔ ساتھ ہی سرخ شیراڈ کی رفتار یک دم بڑھ گئی۔ موٹر سائیکل سوار نے اپنی موٹر سائیکل سڑک پر ترچھی کھڑی کرتے ہوئے پھرتی سے مشابرم خان والی جیپ کے ٹائر کو نشانہ بنایا۔ فضا میں ٹائر پھٹنے کی زوردار آواز گونجی اور جیپ سی گئی۔ لیکن مشابرم خان نے مہارت سے اسے بے قابو ہونے سے بچا لیا۔ اس دوران موٹر سائیکل سوار دو فائر بھی کر چکا تھا جس نے جیپ کے دوسرے ٹائر کو بھی ناکارہ بنا دیا۔ جیپ رُکی تو مشابرم خان نے اپنی جانب دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی اور دائیں ہاتھ میں موجود گن سے موٹر سائیکل سوار پر فائر کیا۔ گولی اس کے سینے پر دائیں جانب جا کر لگی لیکن بے اثر گئی۔ یقیناً اس نے اپنے پیراشوٹ کے سرخ اور نیلے کنٹراسٹ والے اوپر کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے گولی کھا کر بھی اطمینان سے کھڑا تھا۔



''گن پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' سرخ شیراڈ والے اس دوران اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائفل مشابرم خان پر تانتے ہوئے اسے یہ دھمکی دی تھی۔ دھمکی سننے کے باوجود اس نے گن نہیں پھینکی اور تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔

''ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہمیں صرف لڑکی چاہئے۔ ہمیں لڑکی لے جانے دو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اسی شخص نے ایک بار پھر زبان کھولتے ہوئے جیپ کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ دور سے اب وہاں برقع پوش ماہ بانو نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مشابرم خان کی ہدایت پر سیٹ کے نیچے دبک کر بیٹھ گئی تھی مگر مطالبہ کرنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوگی اسی لیے انہوں نے مشابرم خان سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ ان مذاکرات کے کسی بھی مرحلے میں داخل ہونے سے قبل شہریار اپنی گاڑی سمیت ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ایک فائر کیا۔ گولی رائفل بردار شخص کے ہاتھ میں جا کر لگی اور اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔ شہریار کو دیکھ کر مشابرم خان جو ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگیا تھا، ایک بار پھر اپنی جون میں لوٹ آیا۔ اس نے بھی اپنی گن سیدھی کی اور ایک فرد پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے بازو میں لگی اور وہ نہتا ہوگیا۔ دو افراد کے زخمی ہونے کے باوجود حملہ آوروں کو اب بھی عددی برتری حاصل تھی۔ موٹر سائیکل سوار سمیت ان کے دو آدمی اب بھی بالکل صحیح سلامت تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے پھرتی سے شیراڈ کی آڑ میں پناہ لے لی جبکہ موٹر سائیکل سوار نے اپنے ہتھیار سے مشابرم خان کو نشانہ بنایا۔ وہ اس وقت شیراڈ کے پیچھے چھپنے والوں کی طرف لپک رہا تھا، چنانچہ موٹر سائیکل سوار کا نشانہ خطا گیا اور گولی سائیں کی آواز کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس دوران شیراڈ کے پیچھے چھپنے والوں نے شہریار کی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی۔ اگر وہ گاڑی میں بیٹھا رہتا تو گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ پہلا فائر کرتے ہی اسے معلوم تھا کہ جوابی فائرنگ ضرور کی جائے گی۔ چنانچہ وہ فائر کرنے کے ساتھ ہی فوراً دروازہ کھول کر اپنی سیٹ سے اُتر کر رینگتا ہوا گاڑی کے عقبی حصے میں چلا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیراڈ والوں پر جوابی فائرنگ کی۔ اس ساری پچویشن میں شیراڈ والے اور مشابرم خان ہی زیادہ نازک پوزیشن میں تھے بلکہ ایک طرح سے ان کی پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ وہ لوگ پھنسے ہوئے بھی تھے اور دوسروں کو بھی پھنسایا ہوا تھا۔ شہریار اور موٹر سائیکل سوار قدرے بہتر پوزیشن میں تھے۔ وہ چاہتے تو وہاں سے فرار بھی ہو سکتے تھے لیکن ظاہر ہے، وہ فرار ہونے کے لیے تو اس لڑائی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ دونوں نے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر کار موٹر سائیکل سوار کو کامیابی حاصل ہوئی اور عین اس وقت جب مشابرم خان دونوں مجروح افراد کے ہتھیار اپنے قبضے میں لینے کے بعد انہیں اپنی جیپ کی عقبی نشست پر پھینک کر پلٹ رہا تھا، دو گولیاں سائیں سائیں کرتی ہوئی آئیں اور اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ وہ ایک جھٹکا کھا کر سڑک پر گرا مگر اس عالم میں اس نے نہ تو اپنی گن ہاتھ سے چھوڑی اور نہ ہی ہمت ہاری۔ اور بے پناہ قوتِ برداشت سے کام لیتا ہوا جیپ کے نیچے رینگ گیا۔ اب وہ قدرے محفوظ پوزیشن میں تھا لیکن اس درمیانی وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں مجروح افراد شیراڈ کی آڑ میں چھپے اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے تھے۔ ان لوگوں کے پاس یقینی طور پر اضافی ہتھیار بھی موجود تھے، چنانچہ ان کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوتے ہی یک دم ہی فائرنگ میں تیزی آ گئی۔ وہ لوگ اپنی دونوں جانب فائرنگ کر رہے تھے۔ ان حالات میں نہ تو مشابرم خان جیپ کے نیچے سے نکل سکتا تھا اور نہ ہی شہریار اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ بس دو طرفہ فائرنگ کا سلسلہ تھا جو جاری و ساری تھا اور اس فائرنگ سے ملتان روڈ گونج رہا تھا۔ شاہی بینڈ باجا، ملٹری بینڈ سروس اور بانگو ڈرم جیسی اکیڈمیوں سے اُبھرنے والے ساز و آواز کے عادی ملتان روڈ پر بالکل الگ ہی

موسیقی کا راج تھا۔ اس موسیقی کی وجہ سے ہی یقیناً ملتان روڈ پر سفر کرنے کا ارادہ رکھنے والے ڈرائیور حضرات کئی کاٹ کر گزرے جا رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ موسیقی روح کی بالیدگی کے بجائے اس کے جسم سے پرواز کر جانے میں زیادہ معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اب بھلے سے لوگ زندگی کو کتنا ہی برا بھلا کہیں، اس سے بے زاری کا اظہار کریں مگر حقیقت میں زندگی سب ہی کو اتنی پیاری ہوتی ہے کہ جہاں ذرا سا خطرہ نظر آیا، وہاں سے رخ پھیر لیا۔ چنانچہ وہاں گونجتی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہتھیار بند موسیقاروں کے سوا کوئی بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ انوکھے موسیقار تن دہی سے اپنی پرفارمنس دینے میں مصروف تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جس کا ہاتھ رکا، اس کی زندگی کا راگ بھی وہیں دم توڑ دے گا۔

شیراڈ والے چاروں افراد کے دوبارہ متحد ہو جانے کی وجہ سے ان کا زور بڑھ گیا تھا۔ شہریار کا ساتھ دینے کے لیے مشابرم خان بھی انہی کی طرف توجہ دے رہا تھا۔ شدید زخمی حالت میں اس کی یہ کارکردگی بھی قابل تحسین تھی اور اگر وہ اپنے عقب میں موجود موٹر سائیکل سوار کی طرف سے غافل ہو گیا تھا تو یہ ایسی قابل گرفت بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل والے نے اس کی اس غفلت کا فائدہ اٹھایا اور جیپ کی طرف بڑھا۔ یقیناً وہ عقبی حصے میں موجود ماہ بانو کو قابو میں کر کے اس لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بلٹ پروف جیکٹ اور سر پر پہنے ہیلمٹ نے اس کا اعتماد بہت بڑھایا ہوا تھا چنانچہ وہاں چلتی گولیوں کی زد میں آنے کی پروا کیے بغیر وہ جیپ کے عقبی حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُسے امید ہوگی کہ نشست کے نیچے دبکی ہوئی ماہ بانو کی گھگھی بندھی ہوئی ہوگی اور وہ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قابو پا لے گا لیکن اس کی یہ غلط فہمی اور خود اعتمادی اسے لے ڈوبی۔ وہ جیسے ہی جیپ کے قریب پہنچا، ایک رائفل کی نال اس کے پیٹ کے بالکل نچلے حصے پر آ کر ٹکی اور اگلے ہی پل وہ بری طرح چیختا ہوا اُچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ بلٹ پروف جیکٹ کی حفاظت سے محروم اس حصے میں رائفل کی گولی نے داخل ہو کر ایک بہت بڑا سوراخ کر دیا تھا اور اس سوراخ سے فوارے کی طرح خون اُچھل کر باہر نکل رہا تھا۔ ماہ بانو کی کالج میں حاصل کی گئی این سی سی کی ٹریننگ زندگی کے ان نازک لمحات میں اس کے کام آئی تھی۔ اس ہلکی پھلکی ٹریننگ کے ذریعے اگرچہ کوئی بھی طالب علم ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر تو نہیں ہو سکتا لیکن اس لائق تو بہرحال ہو جاتا ہے کہ فلی لوڈڈ رائفل کی لبلبی دبا کر فائر کر سکے۔ اس نے بھی یہی کیا تھا۔ مشابرم خان نے حملہ آوروں سے چھین کر جیپ کے عقب حصے میں جو رائفلز پھینکی تھیں، ان میں سے ایک اس نے اپنے قبضے میں لے لی تھی اور وقت پڑنے پر اس کا بڑی تدبیر سے استعمال بھی کر لیا تھا۔ اپنی اس کامیابی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا اور وہ برقعے کا اُوپری حصہ اپنے سر سے اتار کر ایک دوسری طرف رکھتے ہوئے باقاعدہ طور پر معرکے میں شامل ہونے کے ارادے سے نشست پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ موٹر سائیکل سوار سڑک پر کسی حقیر جانور کی طرح پڑا لوٹ پوٹ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھی اب بھی شیراڈ کی آڑ لیے ہوئے فائرنگ میں مصروف تھے۔ مشابرم خان اور شہریار کے مقابلے میں وہ ایسی پوزیشن میں تھی کہ اسے وہ لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے رائفل کو مخصوص انداز میں اپنے دائیں شانے کے ساتھ ٹکایا اور سانس روک کر ان کی طرف فائر کر دیا۔ اس جیسی اناڑی سے امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اتنے فاصلے سے درست نشانہ لے سکتی ہے لیکن وہاں چار چار ہدف موجود تھے اور ایک دوسرے سے قریب بھی تھے۔ اس نے جس شخص کا نشانہ باندھ کر فائر کیا، اسے تو گولی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر بیٹھا اس کا ساتھی زد میں آ گیا۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور بھیجا نکل کر اس کے کئی ٹکڑے اس کے ساتھی کے لباس پر جا گرے۔ جس شخص کو اس نے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف جوابی فائر کیا مگر خوش قسمتی سے وہ اپنے کیے ہوئے فائر کے جھٹکے



سے سنبھلنے میں ناکام ہونے کے باعث نشست پر جا گری، چنانچہ بال بال بچ گئی۔ موت کو اتنے قریب سے گزرتے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے مگر پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس طرح ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جانے سے زندگی کی بقا ممکن نہیں۔ وہ جس گرداب میں پھنس چکی ہے اس سے نکلنے کے لیے اسے خود بھی ہمت کرنی پڑے گی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آ جائے کہ اس کے حمایتی بھی ہمت ہار کر پسپائی اختیار کر لیں۔ پسپائی میں ذلت اور موت دونوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کی اور احتیاط سے سر اٹھاتے ہوئے پیچھے کی جانب دیکھا۔ اسے گرتے دیکھ کر اس پر فائر کرنے والا شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن چکی ہے اس لیے اس طرف متوجہ نہیں تھا اور پیٹ کے بل لیٹ کر دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگتا ہوا مشابرم خان کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کی اور پوری احتیاط سے اس شخص کا نشانہ باندھا۔ اس بار اس کا نشانہ اپنے ہدف سے چُوک کر کسی دوسری طرف نہیں نکلا بلکہ گولی سڑک پر اوندھے لیٹے شخص کے پیٹ میں جا گھسی۔ تین ساتھیوں کی موت نے جہاں حملہ آوروں کے اوسان خطا کیے وہیں شہریار اور مشابرم خان کو بھی سہولت ہو گئی۔ مشابرم خان تو خیر زخمی ہونے کی وجہ سے زیادہ تیزی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن شہریار نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ باقی بچ جانے والے دو افراد جواب تک اس کی طرف فائرنگ کر رہے تھے، عقب سے ہونے والے فائرز سے گھبرا کر پلٹ کر اندھا دھند جیپ کی طرف فائر کرنے لگے۔ ماہ بانو اپنے پہلے فائر کا ردِعمل دیکھ چکی تھی اس لیے اس بار وہ فائر کرنے کے بعد خود ہی نیچے دبک گئی تھی۔ یہ حکمتِ عملی سودمند ثابت ہوئی اور وہ کسی گولی کی زد میں نہ آ سکی۔ اس دوران شہریار اپنی گاڑی کی آڑ سے نکل کر اس پوزیشن میں پہنچ چکا تھا کہ ان دونوں کو نشانہ بنا سکے مگر اس نے کوئی ہلاکت خیز فائر کرنے کے بجائے ان کے پیروں کو نشانہ بنانا ہی کافی سمجھا۔ ان دونوں کی چیخوں کے ساتھ ہی ملتان روڈ پر جاری فائرنگ کی گونج بھی ختم ہو گئی اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ ان سائرنز پر کان دھرے بغیر وہ اپنی گاڑی کی طرف لپکا اور ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا موبائل اٹھا کر سجاد رانا کا نمبر ڈائل کیا۔ جب تک انہوں نے کال ریسیو کی، پولیس کی سائرن بجاتی ہوئی گاڑیاں ان کے قریب آ کر رک چکی تھیں۔

''زیادہ تفصیلات بتانے کا وقت نہیں ہے سجاد بھائی! بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ راستے میں کچھ افراد نے ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان افراد سے اچھا خاصا معرکہ ہوا اور میرے خیال میں تین بندے مارے گئے ہیں۔ میرا ڈرائیور مشابرم خان بھی زخمی ہوا ہے۔ آپ کے محکمے کے لوگ حسب روایت سارا معاملہ نمٹنے کے بعد موقع پر پہنچ گئے ہیں اور یقیناً یہ لوگ کارروائی کے نام پر وقت ضائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ میری آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کا انتظام کر دیں۔'' اس نے جلدی جلدی خلاصہ بیان کرتے ہوئے مطالبہ پیش کیا۔

''تم کس جگہ پر ہو؟'' انہوں نے بھی زیادہ تفصیلات میں جانے کے بجائے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ملتان روڈ پر..... شاہ نور اسٹوڈیو کے بالکل قریب۔'' اس نے بتایا۔

''او کے۔ میں ابھی تمہاری جان چھڑانے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' انہوں نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ زخمی مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جیپ کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو پر گولیاں لگی تھیں جن سے خون کی بہت بڑی مقدار نکلنے کے باعث اس کے کپڑے سرخ رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''اے مسٹر! یہ سب کیا ہوا ہے؟..... کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں؟'' اس کی گاڑی اور لباس سے اس کی اصل حیثیت کا نہ سہی مگر اس بات کا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی صاحبِ ثروت آدمی ہے، اس لیے ایس ایچ او کی پی جیپ پر لگائے پولیس والے نے اس سے نسبتاً اچھے انداز میں سوال کیا۔

''اے سی شہریار عادل۔'' خود کو پکارے جانے کے انداز پر قدرے برا مانتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا اور دوبارہ مشابرم خان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کیا ہوا ہے، یہ تو تھوڑی دیر میں آپ کو محکمے کے ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب خود بتا دیں گے۔ فی الحال آپ سب سے پہلے زخمیوں اور لاشوں کو ہسپتال پہنچانے کے لیے ایمبولینس کا بندوبست کریں۔'' اس کا اپنا تعارف، اوپر سے ڈی آئی جی کے حوالے کے ساتھ تحکمانہ لہجے سے ایس ایچ او سٹپٹا سا گیا۔ بے چارے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات پر یقین کرے بھی یا نہیں۔ ایک آدھ منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے کم از کم ایمبولینس تو بلا لے۔ جس بندے کے بارے میں وہ تذبذب کا شکار تھا، وہ کہیں بھاگتا ہوا تو نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ایک طرح سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیان میں سچا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے موبائل پر ایمبولینس کے لیے کال کرنے لگا۔ اس کال سے فارغ ہو کر اس نے اپنے سپاہیوں کو بلند آواز میں ایک دو احکامات ہی دیئے تھے کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے محتاط انداز میں کال ریسیو کی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس طرح اٹین شین کھڑا تھا کہ جیسے ڈی آئی جی صاحب فون پر اس سے مخاطب نہ ہوں بلکہ بہ نفسِ نفیس سامنے کھڑے ہوں۔ ''یس سر'' کی گردان کے ساتھ اس نے ان کی تمام ہدایات سنیں اور فون بند ہونے کے بعد ایک گہرا سانس لیتا ہوا شہریار کی طرف بڑھا۔ وہ مشابرم خان کے قریب بیٹھا اس سے کوئی بات کر رہا تھا۔

''ایمبولینس ابھی تک نہیں پہنچی ایس ایچ او صاحب؟'' اسے اپنے قریب پا کر اس نے پلٹ کر پوچھا۔

''میں نے کال کر دی ہے سر! بس پہنچتی ہی ہو گی۔'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ اسی وقت ایمبولینس کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا۔

''تم میری گاڑی میں جا کر بیٹھو۔'' اس کا یہ جملہ سن کر ایس ایچ او، برقع پوش ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ پولیس کی گاڑی کا سائرن سن کر وہ جیپ میں ہی دبک گئی تھی اور دوبارہ صحیح طریقے سے برقع پہن لیا تھا۔ برقع پہننے کے بعد وہ ابھی جیپ سے برآمد ہوئی تھی اس لیے ایس ایچ او کی پہلی بار اس پر نظر پڑی تھی۔ شہریار کی ہدایت کے مطابق وہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھی تو ایس ایچ او سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ضرور رہا لیکن زبان پر کوئی سوال لانے کی جرأت نہیں کر سکا۔

''یہ میرا خاص بندہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹرز کو خصوصی ہدایت دینی ہو گی آپ کو۔ باقی بندوں کے بارے میں بھی مناسب بندوبست کر کے رپورٹ براہِ راست ڈی آئی جی کو بھیج دیجئے گا۔ آگے وہ جو ہدایات دیں، ان پر عمل کیجئے گا۔'' مشابرم خان کو ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا، تب اس نے ایس ایچ او کو یہ ہدایات دیں اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر ماہ بانو بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟..... کیوں رو رہی ہو؟'' اس نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

''میں نے تین تین بندوں کو مار ڈالا۔ اب پولیس مجھے ان کے قتل کے الزام میں پکڑ لے گی۔'' اس نے مزید بلند سسکیوں کے درمیان بہ مشکل اپنے رونے کی وجہ بتائی۔

''اپنے ڈیفنس میں کسی کو مارنے پر قانون کی طرف سے کافی چھوٹ ہے..... پھر تم سے تو کسی نے اب



تک ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تو تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے؟ اس سارے معاملے کو ہم لوگ اپنے طریقے سے ہینڈل کر لیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اسے سمجھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''اب ہم لوگ کہاں جائیں گے؟..... کیا واپس ڈی آئی جی صاحب کے گھر؟'' اس کی تسلی پر ذرا مطمئن ہوتے ہوئے اس نے آگے کا پروگرام جاننے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ تمہیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا اب اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ تم پروگرام کے مطابق اب بھی کاندے ہی جاؤ گی۔ البتہ اب مشابرم خان تمہیں وہاں تک نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ اس کے مشورے سے یہ طے پایا ہے کہ میں خود تمہیں بشام تک پہنچاؤں گا۔ وہاں سے تمہیں مشابرم خان کا بھائی آگے لے جائے گا۔ اس کا بھائی پورٹر ہے اور اسکردو آتا جاتا رہتا ہے۔ مشابرم خان نے بتایا ہے کہ اگر ہم ''کے ٹو موٹیل'' فون کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش کریں تو بات ہو جائے گی۔ ورنہ وہ نہ بھی ہوا تو پیغام ضرور ہی پہنچ جائے گا۔'' اس نے بتایا اور پھر اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو ماہ بانو کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ''کے ٹو موٹیل'' کے فون پر بات کر رہا ہے اور اسے وہاں مشابرم خان کا بھائی مل گیا ہے۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سجاد رانا کو فون کیا اور انہیں سارے واقعے کی تفصیل سنانے کے بعد مشابرم خان کا خصوصی خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ معاملے کی تحقیقات کروانے کی درخواست کی۔ موٹروے پر سفر کا آغاز ہونے کے بعد اس نے موبائل کو واپس ڈیش بورڈ پر ڈالتے ہوئے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر لی۔

''چاہو تو اب تم اپنا برقع اُتار سکتی ہو۔ موسم کافی گرم ہو رہا ہے، کہیں تمہیں تکلیف نہ ہو۔'' گاڑی کلر کہار کی ڈھلوانوں پر رینگتی، موٹروے کے لیے تراشے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہی تھی، تب اس نے ماہ بانو سے یہ بات کہی۔ گاڑی میں چلتے ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے اگرچہ اندر کا موسم خاصا خوشگوار تھا پھر بھی اس نے شہریار کی بات پر عمل کیا۔ عادت نہ ہونے کے باعث وہ برقعے میں خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔ اب اجازت ملی تو جھٹ برقع اتار کر اس کی جگہ اپنے بیگ سے ایک دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ یہ نیلے رنگ کا ایک بڑا سا سوتی دوپٹہ تھا جسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹنے کے بعد وہ سیٹ سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی۔ پچھلے دو تین دن بہت زیادہ ٹینشن میں گزرے تھے اور وہ صحیح طرح سو بھی نہیں سکی تھی۔ اب جو سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تو اسے خود بھی اندازہ نہ ہوا اور وہ نیند کی وادی میں جا اُتری۔ گاڑی ڈرائیو کرتے شہریار نے بیک ویو مرر میں یہ منظر دیکھا۔ نیلے دوپٹے کے ہالے میں نیم وا ہونٹوں کے ساتھ نیند میں ڈوبی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن پھر بھی ایک کمی سی تھی۔ یہ کمی نیلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کی تھی جس میں وہ اوّل روز سے اسے دیکھتا آ رہا تھا اور جو عامر کے گھر پر بلاسٹ میں مرنے والی جمیلہ کے ساتھ ہی نیست و نابود ہو گئی تھی۔ جمیلہ کی میت کے ساتھ چادر کے باقی ماندہ ٹکڑے دیکھ کر ہی تو اسے خود بھی ماہ بانو کی موت کا یقین آ گیا تھا۔ اب وہ چادر نہیں رہی تھی لیکن ماہ بانو موجود تھی اور اس چادر کے بغیر کچھ ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''تم فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ۔ میں بالکونی میں ہوں۔'' ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ لوگ بشام موٹیل پہنچے تو شام سر پر آ پڑی تھی۔ ہوٹل کے ریسیپشن پر رک کر اس نے دو سنگل بیڈز والے ایک کمرے کی

بکنگ کروائی اور کمرے میں آنے کے بعد ماہ بانو سے بولتا ہوا بالکونی میں چلا گیا تا کہ وہ بغیر کسی جھجک کے سہولت کے ساتھ خود کو سفر کی تکان اور دھول مٹی سے نجات دلانے کا بندوبست کر سکے۔ ویسے تھکن اور حلیے کی خرابی کی ذمے داری طویل سفر سے زیادہ ملتان روڈ پر پیش آنے والے خونی تصادم پر عائد ہوتی تھی۔ ورنہ سفر تو ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بڑے آرام اور سہولت کے ساتھ کٹا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر اس نے نیچے بہتے دریائے سندھ پر ایک نظر ڈالی۔ قدیم تاریخ رکھنے والے دریائے سندھ کے بہاؤ کا ہلکا سا شور شام کے اس دھندلے منظر میں کسی آرکسٹرا سے نکلتی مترنم موسیقی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اس انوکھی موسیقی میں گم ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ تبت کی جھیل مانسروز سے بہہ کر آنے والے دریائے سندھ میں کچھ ایسی ہی انوکھی بات ہے کہ آدمی سحر زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی کچھ لمحوں کے لیے اس سحر کا شکار ہو گیا لیکن پھر جلد ہی اس کام کی طرف اس کا دھیان گیا جسے کرنے کے ارادے سے وہ بالکونی تک آیا تھا۔ اسے لاہور فون کر کے سجاد رانا سے وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم کرنا تھا، چنانچہ ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر اگلا پل مایوس کن تھا۔ موبائل کی بیٹری بالکل ڈاؤن ہو چکی تھی اور اسے ری چارج کیے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چارجر اس کی گاڑی میں پڑا تھا۔ کوفت کے عالم میں وہ چارجر لانے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلا۔ ریسیپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ لینڈ لائن پر ہی بات کر لی جائے۔ موبائل کو ری چارج کر لینے کے بعد بھی صورتِ حال جانے کیا ہوتی؟ اس علاقے میں سگنلز بھی ٹھیک طرح سے آتے ہیں یا نہیں، اسے علم نہیں تھا۔ وہ ریسیپشن پر ہی رک کر ان غیر ملکیوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا جو اپنے لب و لہجے سے امریکی لگ رہے تھے۔ چار پانچ افراد پر مشتمل وہ گروپ شاید ایکسپی ڈیشن پر جا رہا تھا اور بشام میں اسٹے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ریسپشنسٹ نے انہیں کمروں کی چابیاں پکڑائیں تو وہ وہاں سے ہٹ گئے اور اس نے آگے بڑھ کر مدعا بیان کیا۔ استقبالیہ کلرک نے مسکراتے ہوئے فون اس کی جانب کھسکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سجاد رانا سے بات کر رہا تھا۔

''ہم لوگ بشام پہنچ گئے ہیں۔ آپ بتائیں وہاں کی کیا صورتِ حال ہے؟'' اس نے محتاط الفاظ میں گفتگو کا آغاز کیا۔ پبلک پلیس پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے میں یہ احتیاط لازمی تھی۔

''یہاں تو صورتِ حال بہت پیچیدہ رخ اختیار کر چکی ہے۔ ملتان روڈ پر جن لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑا تھا، ان کی شناخت ہو گئی ہے۔ وہ ایک ایسے گینگ سے تعلق رکھتے ہیں جو رقم کے عوض اغوا، قتل، دنگا فساد سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان افراد کی کھنچائی کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ہی میرے گھر پر بھی حملہ کیا تھا۔ مقصد دونوں دفعہ ایک ہی تھا۔ وہ لوگ ماہ بانو کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے عوض انہیں بہت بڑی رقم ادا کی جا رہی تھی اس لیے خطرے کے باوجود وہ راضی ہو گئے۔'' سجاد رانا نے بتایا۔

''وہ کس کے لیے کام کر رہے تھے، یہ نہیں بتایا انہوں نے؟''

''بتایا ہے اور نام سن کر میں حیران ہو رہا ہوں کہ اتنے معمولی آدمی کی کیا بساط کہ وہ اتنی بڑی رقم ادا کر سکے۔ پھر اس کا ماہ بانو سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ انسپکٹر رفیق کھوکھر کا نام سامنے آیا ہے اس سلسلے میں۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے لیکن وہ منظر سے غائب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ خود کو معطل کیے جانے کے بعد اس نے انتقاماً چودھری افتخار سے ساز باز کر لی ہے اور چودھری نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے ذریعے یہ کام کروایا ہے۔''

''آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں بھی اسی رخ پر سوچ رہا ہوں۔'' اس نے فوراً ان کے خیال کی تائید کی۔

''بہر حال، تم فکر نہ کرو۔ میں رفیق کھوکھر کو تلاش کروا رہا ہوں۔ باقی معاملات بھی میں نے سنبھال لیے



ہیں۔ جائے وقوعہ پر کچھ اخباری رپورٹرز وغیرہ پہنچ گئے تھے۔ انہیں یہی بتایا گیا ہے کہ کچھ مشتبہ افراد کہیں سے ڈکیتی کی واردات کر کے فرار ہو رہے تھے کہ پولیس سے تصادم ہو گیا اور نتیجے میں تین افراد ہلاک اور دو زخمی ہو گئے ہیں۔ تمہارے ڈرائیور کے زخمی ہونے کی خبر منظر پر نہیں لائی گئی۔ پولیس رپورٹ میں بھی تمہارا یا ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔'' اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے سارا معاملہ بالکل اسی طرح سیٹ کر دیا تھا جس طرح وہ چاہتا تھا۔ اس واردات میں جو افراد مارے گئے تھے، ان کی ہلاکت ماہ بانو کے ہاتھوں ہوئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ حالات کے گرداب میں پھنسی وہ لڑکی مزید کسی مشکل میں پڑے۔ جو افراد مارے گئے تھے، وہ قطعی طور پر مجرم تھے اور یہ بھی طے تھا کہ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ اسے اور مشابرم خان کو قتل کر کے ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

''تھینک یو سجاد بھائی! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔'' اس نے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر پوچھنے لگا۔ ''الماس کی کیا خبر ہے؟''

''بہت بری خبر ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔'' انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے بتایا۔

''کب؟..... کیسے؟'' وہ بری طرح چونکا۔

''رات کو کسی وقت۔ اسے پانی پینے کے لیے جو اسٹیل کا گلاس فراہم کیا گیا تھا، اس کا کنارہ کافی پتلا اور تیز تھا۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ لیں۔ صبح ہونے کے بعد ہی اس کی موت کا پتہ چل سکا۔ میرے پاس اطلاع تمہارے روانہ ہونے کے بعد پہنچی تھی۔ بس سمجھو، صبح سے ہی میرے پاس بری اطلاعات آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سارا دن میں انہی معاملات میں اُلجھا رہا۔ سیٹھ سندر رام کے بارے میں بھی تفتیش جاری ہے۔ کئی مشکوک باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس کوٹھی کے پیچھے والی کوٹھی بھی اسی کی ملکیت نکلی۔ اسے وہ اپنے گودام کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ خاص بات جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ اس گودام میں جو کپڑا رکھا جاتا تھا، وہ مختلف کھیپوں کے ذریعے انڈیا اسمگل کیا جاتا رہا ہے۔ ایک کھیپے سے معلوم ہوا ہے کہ کپڑے کے کچھ خصوصی تھان ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں بارڈر پر آرمی کے افراد ہی خریدتے تھے۔ مجھے شک ہے کہ کپڑوں کے ان تھانوں کے درمیان کوئی خاص شے رکھ کر انڈین آرمی تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ وہ ہمارے ملک کے قیمتی راز بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سندر رام کا جو کردار اب تک سامنے آیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں رہ کر بھارت کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے بچوں تک اس کے مرنے کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی لیکن انہوں نے پاکستان آنے یا باپ کی جائیداد میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ سندر رام کے بزنس کے بارے میں بھی جو معلومات سامنے آئی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ بے تحاشا کمانے کے باوجود وہ شخص بینکوں کا بے حد مقروض ہے۔ یعنی وہ کمائی ساری کی ساری بیرونِ ملک مقیم اپنے بچوں کو پہنچا دیتا تھا اور یہاں جو کچھ ہے، اس کی نیلامی کے بعد اتنا مل سکتا ہے جس سے بینکوں کا قرض ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔'' وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ ساری معلومات صرف آج کے ہی دن میں حاصل نہیں کی گئی تھیں۔ اس کا اسٹاف سندر رام اور خواجہ سراؤں کی ہلاکت کے بعد مسلسل کام کرتا رہا تھا لیکن درمیان میں وہ شینا کی لاش کی بازیابی اور پھر اس کی تدفین کے سلسلے میں اتنی بری طرح مصروف ہوا کہ یہ ساری معلومات لینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ آج کئی دن بعد اس کا دوبارہ اپنے دفتر جانا ہوا تھا تو یہ ساری معلومات بھی اس تک پہنچ گئی تھیں اور اب وہ انہیں اس سے شیئر کر رہا تھا۔

''صورتِ حال واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ ذمے دار افراد کو سختی سے کوئی ایکشن لینا چاہئے۔'' شہریار نے تبصرہ

کیا اور پھر استقبالیہ کلرک کی بار بار خود پر اُٹھتی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''کال بہت لمبی ہوگئی ہے۔ میں واپس پہنچنے کے بعد آپ سے دوبارہ اطمینان سے بات کروں گا۔ فی الحال آپ مجھے اجازت دیں۔'' اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اس کال کے چارجز میرے بل میں شامل کر دینا۔'' کلرک سے مختصراً کہتا ہوا وہ تیز تیز قدموں سے چلتا وہاں سے ہٹ گیا۔ پہلے باہر جا کر اپنی گاڑی سے موبائل کا چارجر نکالا پھر واپس کمرے میں آ گیا۔ ماہ بانو اس دوران غسل سے فارغ ہو چکی تھی اور اب بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی اپنے کپڑے نکالے اور فریش ہونے چلا گیا۔ وہ فریش ہو کر واپس کمرے میں آیا، تب بھی ماہ بانو بالکونی میں ہی کھڑی تھی۔ وہ خود بھی وہاں جا پہنچا۔ دریائے سندھ پر رات اُتر آئی تھی اور اس کی سلیٹی چادر پر ان روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا جن کا منبع اس کے پار واقع پہاڑوں پر موجود جھونپڑیوں میں جلنے والے دیے یا لالٹینیں وغیرہ تھیں۔ دریائے سندھ پر اُتری رات اس کی دھندلی شام سے زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ خاموشی سے ماہ بانو کے ساتھ اس سحر انگیز منظر کا نظارہ کرنے لگا۔ دریا کے پانیوں سے ٹکرا کر آنے والے ہوا کے جھونکوں کی خنکی نے بتایا کہ وہ لاہور سے بہت دور ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے آگے کی دنیا بہت مختلف ہے۔ کل وہ ماہ بانو کو اس دنیا کی طرف روانہ کر کے خود واپس پہلے والے ماحول میں لوٹ جاتا۔ لیکن ابھی تو وہ اس کے نظارے میں محو لڑکی کی سنگت میں کھڑا یہیں ٹھہر جانے کی، وقت کو روک لینے کی خواہش کر رہا تھا۔

''اچھی خاصی ٹھنڈک ہو رہی ہے۔ اندر چلتے ہیں۔ کھانا کھا کر آرام سے سو جانا۔ مجھے واپس بھی جانا ہے اور تمہیں بھی لمبا سفر کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم اچھی طرح آرام کر لیں۔'' اس سحر میں جکڑے رہنے کے خوف نے اسے ماہ بانو کی محویت توڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ تحکمانہ لہجے میں کہتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ وہ چونکی اور پھر تابعداری سے اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں پہنچ گئی۔

⊛----✪----⊛

PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے

''بالا بتا رہا تھا کہ تم ہم سے ملنا چاہتے ہو..... کوئی کام تھا کیا؟'' سامنے کھڑے رفیق کھوکھر سے چودھری نے پُر رعونت لہجے میں سوال کیا۔

''کام آپ بھی سمجھ سکتے ہیں چودھری صاحب! اس لڑکی ماہ بانو کو اغوا کرنے کے چکر میں میرے ہائر کیے ہوئے بندے پکڑے گئے ہیں اور میرا نام سامنے آ چکا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب پہلے ہی مجھ سے خفا تھے اب پھر میرا نام سامنے آنے پر ان کی خفگی کا کیا عالم ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پولیس پورے شہر میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اگر مجھے بروقت ملتان روڈ والے واقعے کی اطلاع نہ ملتی تو میں دھر لیا جاتا۔ یہ اطلاع ملتے ہی کہ تصادم کے بعد دو بندے زخمی حالت میں زندہ گرفتار کر لیے گئے ہیں، میں نے فوراً اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں کہ آپ مجھے پناہ فراہم کر دیں۔ آخر آپ کا کام کرتے ہوئے ہی تو میں اس مشکل میں پھنسا ہوں۔'' رفیق کھوکھر نے جتایا۔

''تم بھول رہے ہو انسپکٹر! کہ تم نے ہمارا کام کرنے کے عوض منہ مانگی رقم لی تھی۔ ہم نے رقم ادا کر دی، ہماری ذمے داری ختم۔ اب یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم اپنی حفاظت کے لیے کیا کرتے ہو۔'' چودھری کے اس کورے جواب پر پل بھر کے لیے رفیق کھوکھر کا چہرہ فق پڑ گیا مگر پھر وہ پینترا بدلتے ہوئے بولا۔

''سوچ لیں چودھری صاحب! میرا محفوظ رہنا آپ کے مفادات کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اگر میں



پکڑا گیا تو آپ بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ میں خود پولیس کی نوکری کرتا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب پولیس والے کسی سے کچھ اُگلوانے آ جائیں تو پھر بندے کے لیے زبان بند رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ آپ نے مجھے تحفظ فراہم نہیں کیا اور میں پکڑا گیا تو کتنی دیر تک آپ کا نمک حلال کرنے کے لیے اپنی زبان بند رکھ سکوں گا؟ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پر مجھے افسوس بڑا ہوگا کہ آپ میری وجہ سے پریشانی میں پڑ گئے۔''

''تم مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' چودھری اس کی بات سن کر دہاڑا۔

''نہیں جناب! میری ایسی مجال کہاں؟ میں تو آپ کو صرف ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔'' اس نے عیاری سے جواب دیا۔

''سنا ہے ابھی سال بھر پہلے ہی تمہاری شادی ہوئی ہے۔ گھر والی بڑی خوب صورت ہے۔ گھر پر بوڑھی ماں اور جوان خوب صورت بیوی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں عورتوں کی جان و عزت خطرے میں ہو تو کیا تب بھی تم اپنی زبان کو بند رکھنے سے انکار کرو گے؟'' چودھری نے اس کی عیاری کے جواب میں اپنا جو کارڈ شو کیا، اس نے اس کی ساری تیزی و طراری کو جھاگ کی طرح بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

''کک..... کک..... کیا مطلب؟ میری ماں اور بیوی کا اس معاملے سے کیا تعلق؟'' وہ ہکلایا۔

''بھئی ان کا تم سے تعلق ہے تو تمہارے معاملات سے بھی تعلق ہوگا۔ ہم سے وصول کی گئی رقم سے انہیں بھی تو عیش کرواؤ گے۔ سنا ہے تم نے اپنی ماں اور بیوی کو اچھی خاصی موٹی رقم دے کر رحیم یار خان بیوی کے میکے بھجوا دیا ہے کہ کچھ دن دونوں وہاں رہیں اور خوب عیش کریں۔ اب بتاؤ، جب وہ تمہاری کمائی پر عیش کریں گی تو کیا تمہارے اعمال کی ذمے دار نہیں ہوں گی؟'' چودھری کی باتوں نے رفیق کھوکھر کے ہونٹوں پر تالا ڈال دیا۔ اس وقت پہلی بار صحیح معنوں میں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اونچا اُڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اچھی بھلی عزت کی نوکری تھی۔ پہلے اس نے اپنے فرائض سے کوتاہی برتی۔ جب اس کوتاہی کی سزا ملی تو بجائے معافی تلافی کے ذریعے وہ اس سزا کو ختم کرنے کی کوشش کرتا، چودھری سے مل بیٹھا۔ خیال یہی تھا کہ چودھری سے رقم بھی ملے گی اور ضرورت پڑنے پر وہ تحفظ بھی فراہم کر دے گا۔ لیکن اس نے تو صاف ہری جھنڈی دکھا دی تھی اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ اگر اس نے زبان کھولنے کی غلطی کی تو ماں اور بیوی کی خیر نہیں۔ وہ اتنا باخبر شخص تھا کہ اسے یہ تک معلوم تھا کہ اس وقت وہ خواتین کہاں موجود ہیں۔ ایسے شخص کے لیے اپنی دھمکی پر عمل کرنا کتنا سہل ہوگا، وہ سمجھ سکتا تھا۔

''تم کچھ پریشان ہو گئے انسپکٹر! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنے خدمت گزاروں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ جتنی باتیں ہوئی ہیں، انہیں بھول جاؤ اور آرام سے یہاں رہو۔ ہم آج اپنے گاؤں واپس جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی یہاں سے آج ہی کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ ہماری اس کوٹھی کے بارے میں سب کو علم ہے۔ اس لیے تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں بالے سے کہہ دوں گا، وہ تمہیں کسی دوسری محفوظ جگہ پر جہاں تمہارے محکمے کے آدمی نہ پہنچ سکیں، پہنچا دے گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اب تم ہمارا مسئلہ ہو۔'' رفیق کھوکھر ابھی پریشانی کے عالم میں گم صم سا ہی کھڑا تھا کہ چودھری نے ایک بار پھر تیزی سے پینترا بدلا اور اپنا موڈ قطعی بدلے ہوئے خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اسے تسلی دی۔

''شکریہ چودھری صاحب! بہت مہربانی آپ کی۔'' اس کے تنِ مردہ میں گویا جان سی پڑ گئی تھی۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے اتنے کام آئے ہو تو ہم تمہارا خیال کیسے نہیں رکھیں گے۔'' چودھری نے اسے جواب دیا اور پھر اس کے پیچھے بالکل خاموش کھڑے بالے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا

''انسپکٹر صاحب کو ساتھ لے جا بالے! اور ان کا اچھی طرح بندوبست کر دے۔ یہ ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں، تُو اچھی طرح جانتا ہے۔''

''بالکل سرکار!'' بالے نے اسے جواب دیا اور پھر رفیق کھوکھر کو باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی چودھری کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ بہت اپنی من چاہی مرادیں پوری ہوتے دیکھنے کا عادی تھا لیکن ماہ بانو کے سلسلے میں اسے مسلسل ناکامی کا سامنا تھا وہ ہر بار اس کے ہاتھ میں آتے آتے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتی تھی اور اب اس کے پیچھے جو لوگ کھڑے ہوئے تھے، ان کی وجہ سے ان تک رسائی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ وہ ہار ماننے والا بندہ نہیں تھا، نہ ہی اس کی انا اجازت دیتی تھی کہ کسی اور کو خود سے بڑھ کر با اختیار تسلیم کرتے ہوئے مقابلے سے پیچھے ہٹ جائے وہ شینا کی موت پر تعزیت کرنے سجاد رانا کے گھر گیا تھا اور اس سے گہرے دکھ کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ جو جنگ شروع ہو چکی ہے، وہ جاری رہنی چاہئے۔ اس جنگ میں کتنے مُہرے کام آ جاتے، اسے غرض نہیں تھی۔ رفیق کھوکھر جیسے معمولی مُہرے کو بھی اس نے پٹوا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کھوکھر کو زندہ رہنے دیا تو آگے جا کر وہ خود اسے مروا دے گا۔ وہ اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کھوکھر پولیس کے ہاتھ نہ لگے، اس بات کی اہمیت کا اسے خود بھی اندازہ تھا اور صبح سے اس کے بندے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ تو اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے حق جتانے خود ہی یہاں آ پہنچا اور ان لوگوں کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اس کی فرمائش پر اسے ملاقات کا شرف بخشتے ہوئے اس نے اس سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، وہ محض دل لگی کے لیے تھی۔ ورنہ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس وقت بالا اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے ہی کھوکھر کو ایک ایسی جگہ منتقل کرنے لے گیا تھا جہاں تک نہ تو پولیس کی رسائی تھی اور نہ ہی وہ خود واپس لوٹ سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''میں نے ایسے مناظر صرف ٹیلی ویژن پر دیکھے تھے۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی میں اتنی قریب سے یہ سب دیکھ سکوں گی۔'' دریائے سندھ کے کنارے پر موجود اس بڑے پتھر پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سادگی سے بتایا۔

''تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے؟'' وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے قدم جما کر پتھر پر براجمان ہونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی، چنانچہ سہارا دے کر اس کی کوشش کو کامیاب بناتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس وقت وہ لوگ اس کی فرمائش پر ہی موٹیل سے باہر نکل کر یہاں تک آئے تھے۔ صبح کے اس پہر جبکہ ابھی سورج کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی، دریائے سندھ کے کنارے پر بیٹھ کر اس کا نظارہ کرنا واقعی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

''اچھی چیزیں تو ہر ایک کو اچھی لگتی ہیں۔ مجھے بھی یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے اسی سادگی سے جواب دیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جب تم مشابرم خان کے بھائی کے ساتھ یہاں سے آگے جاؤ گی تو اور بھی کئی خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا جتنا بھی وقت یہاں گزرے گا، تم بور نہیں ہو گی۔'' وہ خود بھی اس کے قریب ہی پتھر پر ٹِک گیا۔



''مناظر کی خوب صورتی اپنی جگہ لیکن اس سے بڑھ کر خوب صورت وہ رشتے ہیں جو مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر آنے پڑے ہیں۔ اتنے بہت سارے دن گزر گئے، میں نے ابا اور بے بے کی شکل تک نہیں دیکھی۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں۔ اگر آپ مجھ سے میری خواہش پوچھیں تو میں ان سارے خوب صورت مناظر کے مقابلے میں اپنے آباد میں موجود اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے ابا اور بے بے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کروں گی۔'' وہ جو ابھی اتنی پُر جوش لگ رہی تھی، یک دم ہی اُداس ہو گئی۔ وہ بے اختیار اس سے نظر چرا گیا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ وہ شہر اور گھر اسے دوبارہ مل بھی جائے تو وہاں اس کے پیارے تو نہیں مل سکتے تھے۔

''انسان کی ساری خواہشیں پوری ہونا تو ممکن نہیں ہوتا۔ اپنی ادھوری خواہشوں پر یہ سوچ کر صبر کر لینا کہ جو ہمارے لیے زیادہ بہتر تھا، وہ اللہ نے ہمیں عطا کر دیا۔ میری کامیاب زندگی کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے۔ میرے پیرنٹس جب میں بہت کم عمر تھا، تب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بعد ماموں جان، ممانی اور سجاد بھائی نے اتنا خیال رکھا کہ میں سمجھتا ہوں، اتنا خیال دنیا میں بہت کم لوگوں کا رکھا جاتا ہے۔ خصوصاً آفرین ممانی تو مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ ان کی تربیت کی وجہ سے میری شخصیت میں کئی ایسے رنگ ہیں جنہوں نے مجھے دوسروں سے کچھ بہتر بنا دیا ہے۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں بھی ان سارے لوگوں کی طرح ہوتا جو اختیار ہاتھ میں آ جانے پر برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے مجھ سے ماں باپ جیسی نعمت لے کر بدلے میں انسانیت کا شعور عطا کیا ہے اور میں اُس کے اس فیصلے پر راضی ہوں۔ کیا تم میں حوصلہ ہے کہ تم اللہ کے فیصلوں کو بہتر سمجھ کر ان کے آگے اپنا سر جھکا سکو؟'' وہ بات جو اتنے دنوں سے وہ اسے بتا نہیں سکا تھا، یک دم ہی بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اس کے ضبط کو جانچنے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میری بے بے اور ابا ٹھیک تو ہیں؟'' وہ اس کے سوال پر بری طرح چونکی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں۔'' اس نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ اسے سارے معاملات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔

''اتنے دن گزر گئے اس حادثے کو اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ دونوں مجھ پر اپنی جان چھڑکتے تھے اور میری ہی خاطر اپنی جان سے چلے گئے۔ کتنی بدنصیب ہوں۔'' وہ بری طرح سسکنے لگی۔

''ایسی باتیں مت کرو۔ بدنصیب صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کریں اور اس کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ تم پر ایک مشکل وقت پڑا ہے۔ کون جانے کہ جب تم اس آزمائش سے نکلو تو تمہارے ہاتھوں اللہ کتنے بڑے بڑے کام انجام دلوائے۔ ایسے کام جو تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بے بے اور ابا کی بھی بخشش کا ذریعہ بنیں۔'' وہ اسے سمجھانے لگا اور وہ حیرت زدہ سی اس کی باتیں سنتی رہی۔ افسرانہ شان کے ساتھ رہنے والا اور ناپ تول کر گفتگو کرنے والا وہ شخص ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے، اسے قطعی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تصویرِ حیرت بنی اس کی صورت تکتی رہ گئی۔

''چلو، واپس چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد چاہو تو دوبارہ یہاں آ جانا۔ مشابرم خان کا بھائی شام سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ تم سارا دن آرام سے یہاں کا نظارہ کر سکتی ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کے رخسار پر ٹھہرا ہوا آنسو اُنگلی کی پور سے صاف کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے موٹیل کے قریب پہنچے تو کل شام ریسپشن پر نظر آنے والے غیر ملکی اپنی جیپ میں روانہ ہوتے ہوئے نظر آئے۔

ان میں سے ایک نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے ہوائی بوسہ اُچھالا۔ اُس کی اس حرکت پر وہ خفت زدہ سی ہو گئی۔ شہریار کے ماتھے پر بھی ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ ممکن تھا کہ وہ ان سے اُلجھ جاتا لیکن ان کی جیپ حرکت میں آ کر وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی، سو یہ ممکن نہ ہو سکا۔

وہ دونوں واپس موٹیل پہنچ گئے اور ناشتے کا آرڈر دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر بیرا ناشتہ لے کر کمرے میں پہنچ گیا۔

''صاحب! کڑھی ہوئی چادریں خریدو گے؟ میری بیوی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔'' ناشتے کے برتن لگانے کے بعد بیرے نے اس سے پوچھتے ہوئے ترغیب دی۔

''لا کر دکھا دو۔ اگر پسند آئیں تو لے لیں گے۔'' اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد بیرا جب ناشتے کے برتن لینے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔ تھیلے میں سے چادریں نکال نکال کر وہ ان دونوں کو دکھانے لگا۔ اس کے دعوے کے برخلاف وہ چادریں بالکل بھی اچھی نہیں تھیں۔ کچھ کی کڑھائی بھدی تھی تو کسی کے رنگ نامناسب تھے۔ وہ بے زار ہو کر اس سے یہ سب سمیٹ لینے کا کہنے ہی والا تھا کہ ایک سیاہ چادر پر نظر پڑ گئی۔ اس چادر پر نیلے ریشم سے چھوٹے چھوٹے پھول کاڑھے گئے تھے۔ اسے دیکھ کر اسے بے ساختہ ماہ بانو کی وہ چادر یاد آ گئی جس کے بغیر وہ ادھوری لگتی تھی۔ اس نے فوراً وہ چادر خرید لی۔ کپڑے کی کوالٹی اور کڑھائی کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ جب بیرا ناشتے کے برتن اور اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل گیا تو اس نے وہ چادر ماہ بانو کو تھما دی۔

''یہ میرے لیے ہے؟ میں تو سمجھی آپ اپنے گھر کے کسی فرد کے لیے لے رہے ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''میں نے یہ تمہارے لیے ہی لی ہے۔ تمہاری چادر عامر کے گھر پر ہونے والے حادثے میں خراب ہو گئی تھی نا، اس لئے۔'' اس نے جواب دیا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شام تک کا وقت ایسے گزرا کہ وہ زیادہ تر باہر ہی رہا۔ سامنا ہوا بھی تو زیادہ گفتگو نہیں کی۔ شام کو مشاہرم خان کا بھائی اسے لینے پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ روانہ ہوتے ہوئے وہ عجیب ادھیڑ بُن کی کیفیت میں تھی۔ نہ شہریار کا رویہ سمجھ آ رہا تھا اور نہ ہی اپنی قلبی کیفیات۔ کوئی نیا سا احساس تھا جو وہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''پیر آباد والے مرکزِ صحت کی کنسٹرکشن کا کام مکمل ہو گیا ہے سر! فرنیچر، ضروری آلات اور دوائیں وغیرہ بھی دو دن کے اندر وہاں پہنچا دی جائیں گی۔ اسٹاف کے اپائنمنٹ کا پروسس بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے، بس لیڈی ڈاکٹر کے سلسلے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر فی الحال وہاں جا کر کام کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم مستقل اشتہار شائع کروا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن میں یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔''

وہ کل ہی اپنے طویل سفر سے واپس لوٹا تھا اور آج دفتر میں موجود تھا۔ پچھلے کئی دن کی مصروفیات کی وجہ سے اسے علاقے میں جاری کاموں کے بارے میں جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ آج پہلی فرصت میں اس نے عبدالمنان سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔

''اچھی پروگریس ہے۔ لیڈی ڈاکٹر والا مسئلہ بھی انشاء اللہ جلد حل ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ اشتہار میں بھی یہ مینشن کر دو کہ اس جاب کے لیے اہل قرار پانے والی خاتون کو ان کی فیملی سمیت رہائش کی سہولت دی جائے گی۔ عموماً خواتین دور دراز علاقوں میں جاب کرنے کے لیے تنہائی اور رہائشی مسائل کی وجہ سے ہی راضی نہیں



ہوتیں۔ ہم یہ سہولت پروائیڈ کرنے کی یقین دہانی کروائیں گے تو انشاء اللہ جلد اچھا رزلٹ سامنے آئے گا۔''

اب تک کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ایک مشورہ بھی دیا جو عبدالمنان نے نوٹ کر لیا۔

''نور پور میں کیا صورتِ حال ہے؟ وہاں کا کام کیسا چل رہا ہے؟''

''وہاں بھی تیزی سے کام جاری ہے۔ چودھری بختیار کے تعاون کی وجہ سے ہمیں بھی بڑی سہولت ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی وہاں کا کام مکمل ہو جائے گا۔''

''گڈ!'' اس اطلاع پر اس نے خوشی کا اظہار کیا پھر پوچھنے لگا۔ ''چودھری، باجوہ اور تارڑ کے ٹرائیکا نے تو میرے پیچھے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کی؟ ضلع سے باہر جانے والے مال پر اچھی طرح نظر تو رکھی جا رہی ہے نا؟ اس معاملے پر چیک رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہم ذرا بھی لوز پڑے تو یہ لوگ پھر سے ایکٹیو ہو جائیں گے۔''

''آپ بے فکر رہیں سر! میں اس سلسلے میں مسلسل ڈی ایس پی منظور سے رابطے میں ہوں۔ جب تک وہ ہم سے بھرپور تعاون کر رہا ہے، سخت نگرانی کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں کہ یہاں سے کچھ اسمگل کرنے کی کوشش کر سکے۔ ویسے بھی باجوہ معطل ہے اور چودھری بھی پچھلے دنوں زیادہ تر لاہور میں رہا ہے۔ اس لیے ان کا ٹرائیکا یہاں بالکل بھی ایکٹیو نظر نہیں آیا۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے ذرا سا ریلیکس ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور پوچھنے لگا۔ ''اور کوئی اہم بات؟.... کوئی خاص مسئلہ؟''

''آپ کی غیر موجودگی میں اللہ آباد سے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ لوگ شاہ نواز کے ساتھ غائب ہو... والے لڑکوں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں دین محمد اور اس کی فیملی کے بارے میں ... تشویش تھی کہ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ پولیس ان لوگوں کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی۔ یہ با... گاؤں والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر دین محمد کا خاندان کسی جرم میں ملو... بھی ہے، تب بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر تو ملنی چاہئے۔''

''اللہ آباد والوں کے مطالبات اپنی جگہ بالکل درست ہیں لیکن وہ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ معاملہ زیادہ گمبھیر ہے۔ اس معاملے میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہونے کے جو شواہد سامنے آئے ہیں، اس کے بعد صورت حال یکسر مختلف ہو چکی ہے۔ خفیہ ایجنسیز اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں لیکن فی الحال مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ملی... میں غائب ہونے والے لڑکوں کے سلسلے میں کچھ بتا سکوں۔ دین محمد کی فیملی والے معاملے کے بارے میں ا... میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ انہیں تو تارڑ صاحب نے ایفی شینسی دکھانے کے چکر میں بلا... پھانس رکھا ہے۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ ان بے چاروں کی جان بخشی ہو جائے۔ وہ بے چارے تو اپنے... کی حماقت کو بھگت رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکا، شاہ نواز کے بہکاوے میں آ کر بم بلاسٹ میں ملوث نہ ہوتا تو خو... زندہ رہتا اور اپنے گھر والوں کو بھی مشکل میں نہ ڈالتا۔'' عبدالمنان کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ تھو... اُداس ہو گیا۔

اس وقت اس کی نظروں میں جذباتی سے چودہ پندرہ سالہ عبدالمتین کی شکل گھوم گئی تھی۔ اپنی بہن کے آبروریزی اور پھر بے دردی سے قتل کر دیئے جانے کے الم ناک حادثے نے اس کم عمر لڑکے کو اس حد... مشتعل کر دیا تھا کہ وہ شاہنواز جیسے شخص کے بہکانے پر اپنی ذات سمیت دوسرے بھی کئی افراد کی موت کا... بن گیا۔ نور پور میں ہونے والا وہ بم بلاسٹ جس میں عبدالمتین خودکش حملہ آور کے طور پر سامنے آیا تھا، اسے... بھی کسی حالیہ دیکھی گئی فلم کے مناظر کی طرح یاد تھا۔ پل بھر کی ہی تو بات تھی وہ..... لیکن اس ایک پل میں

جیتے جاگتے وجود لقمۂ اجل بن گئے تھے اور کتنوں ہی کے حصے میں عمر بھر کی معذوری آ گئی تھی۔ اُداس کر دینے والے ان بوجھل لمحوں میں انٹرکام بجنے سے ارتعاش پیدا ہوا۔ عبدالمنان نے ریسیور اٹھا کر دوسری طرف کہی جانے والی بات سنی پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ ''چودھری افتخار صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں سر!''

اس اطلاع کو سن کر اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں پھیل گئیں۔ اس شخص سے ملنا اسے ہمیشہ ہی طبیعت پر گراں گزرتا تھا لیکن پھر بھی ملنا پڑتا تھا۔ شینا کے انتقال پر بھی وہ سجاد رانا کی کوٹھی پر تعزیت کے لیے آیا تھا وہاں بھی اسے دھکے دے کر باہر نکال دینے کی خواہش کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے برداشت کرنا پڑا تھا اور اب پھر وہ اس کے ضبط کو آزمانے کے لیے اس کے دفتر میں موجود تھا۔

''بلوا لو..... دیکھتے ہیں کہ کس سلسلے میں چودھری صاحب کو ہماری یاد آئی ہے۔'' عبدالمنان کی خود پر اٹھی سوالیہ نظروں کے جواب میں بالآخر اس نے ملاقات کے لیے رضامندی دے ہی دی مگر لہجے کی تلخی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ رضامندی خود پر بڑا جبر کرتے ہوئے طوعاً و کرہاً ہی دے رہا ہے۔ بہرحال، چودھری کے اندر آنے تک وہ خود کو کمپوز کر کے چہرے کے تاثرات کو سپاٹ بنا لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''کیا حال چال ہے اے سی صاحب؟ سنا ہے کل ہی واپسی ہوئی ہے۔ یہ تو غلط بات ہے جناب! آپ کی غیر موجودگی میں بھلا ہمارے ضلع کا انتظام کیسے چل سکتا ہے؟ اب تو آپ ہی یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔ زیادہ دنوں کے لیے یہاں سے دور نہ رہا کریں۔ آپ کے پیچھے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو کون دیکھے گا؟''

''مجھے خود بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہے چودھری صاحب! لیکن آپ سے بڑھ کر کس کو خبر ہو گی کہ پچھلے دنوں میں کس قدر کرائسز میں رہا۔ بس ان کرائسز سے نمٹ کر یہاں پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ آپ سنائیں، آپ کی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟..... سنا ہے آپ بھی پچھلے دنوں زیادہ تر گاؤں سے باہر ہی رہے ہیں؟''

چودھری کی فضول بکواس کے جواب میں اس نے اشاروں کنایوں میں اسے جتا دیا کہ وہ جانتا ہے کہ بہت سارے گھپلوں کی ذمے داری چودھری پر عائد ہوتی ہے مگر چودھری ڈھیٹ بندہ تھا۔ اس کے جتانے کا برا مانے بغیر مسکراتے ہوئے بولا۔

''اللہ کا کرم ہے کہ میری طرف سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ جو نہیں ہے، اسے بھی میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس وقت تو میں آپ کے پاس دو خوشخبریوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے آپ سن کر خوش ہوں گے۔''

''کیسی خوشخبریاں؟'' وہ ذرا سا چونکا۔ چودھری افتخار جیسے شخص کی طرف سے ملنے والی کوئی خبر سچ مچ خوشخبری ہی ہو گی، اس بات پر یقین کرنا تھوڑا مشکل ہی تھا۔

''میرے لیے تو بھئی دونوں ہی خوشخبریاں بہت اہم ہیں۔ لیکن پہلے میں آپ کو وہ خبر سناتا ہوں جسے سن کر آپ محسوس کریں گے کہ ہم نے آپ کا ایک اہم مسئلہ حل کر دیا اور ہمیں بھی اپنے علاقے کی اتنی ہی فکر ہے جتنی آپ کو۔'' سیدھی طرح جواب دینے کے بجائے اس نے تمہید باندھ کر شہریار کے تجسس کو بھڑکانے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ آنے دیا جس سے چودھری کو اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو سکے۔ اُس کے اس بے نیازانہ انداز پر وہ تھوڑا سا جز بز تو ہوا لیکن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''سنا تھا کہ ہسپتال کے لیے لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست نہیں ہو پا رہا۔ ہم نے سوچا ہم یہ مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔ آخر کو یہ ہمارے علاقے کا ہی مسئلہ تھا۔ آپ چار دن کی نوکری میں یہاں کے مسائل حل کرنے کے لیے



اتنے ہلکان رہتے ہیں تو ہم تو خیر یہاں کے جدّی پشتی حکمرانوں میں سے ہیں۔'' وہ یقیناً یہ ساری باتیں اسے اشتعال دلانے کے لیے کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ شہریار کو اندازہ تھا کہ ماہ بانو کے ایک بار پھر ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کتنا تلملایا ہوا ہے اور اب اس تلملاہٹ کے اظہار میں خود کو اس کے مقابلے میں زیادہ بااختیار اور عزت دار ثابت کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ وہ کمال ضبط سے کام لیتا رہا اس کی ساری موشگافیاں سنتا رہا۔

''ہم نے آپ کے ہسپتال کے لیے ایک قابل لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کر دیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام اور تنخواہ وغیرہ میرے ذمے ہو گی۔''

''یہ تو آپ نے بہت زیادہ تکلف کیا چودھری صاحب! رہائش اور خوامخواہ کا انتظام تو موتی والا صاحب کی جائیداد سے قائم کردہ ٹرسٹ کے ذریعے بھی ہو سکتا تھا..... آخر ہسپتال کی تعمیر بھی تو اسی ٹرسٹ کے ذریعے ہو رہی ہے۔'' چودھری کے اس قدر جتانے پر اس سے برداشت نہیں ہوا تو خود بھی بہت سلیقے سے اسے جتا دیا کہ یہاں اتنے بڑے بڑے اخراجات اس کے تعاون کے بغیر ہو رہے ہیں، وہاں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔

''تکلف کی کیا بات ہے جناب! اس بہانے کچھ ثواب ہم بھی کما لیں گے۔ ساری نیکیاں آپ کے حصے میں ہی چلی جائیں، یہ تو ہم سے برداشت نہیں ہو گا۔ کچھ نہ کچھ حصہ تو ہمارا بھی ہونا چاہیے اس کارِ ثواب میں۔'' اس کا جتانا محسوس کر کے وہ فوراً ہی منافقت بھری عاجزی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

''چلیں جس میں آپ کی خوشی۔ اگر آپ نیکی کمانا ہی چاہتے ہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ آپ مہربانی کر کے ذرا جلدی سے دوسری خوشخبری بھی سنا دیں۔ آپ کو تو علم ہے کہ میں کتنے دنوں بعد آج واپس آیا ہوں۔ مجھے کئی معاملات پر توجہ دینی ہے۔ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے ملاقات کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔

''دوسری خوشخبری ذاتی نوعیت کی ہے۔ لیکن آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ آپ کے دوست چودھری بختیار اور ہمارے درمیان رشتہ داری قائم ہے۔ ہم اپنے پتر کی شادی چودھری بختیار کی بہن سے کر رہے ہیں۔'' چودھری کی دی ہوئی یہ اطلاع ذرا چونکا دینے والی تھی۔ اسے علم تھا کہ چودھری بختیار کی اکلوتی بہن فریدہ اپنے چچازاد قربان میں دلچسپی رکھتی ہے۔ خود چودھری افتخار اور چودھری بختیار کے درمیان تعلقات کی نوعیت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب چودھری بختیار نے روایت سے انحراف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری افتخار کے دادا کے عرس کے موقع پر سونے کے تاروں والی چادر چڑھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں اسے پانی کے مسئلے کی وجہ سے چودھری افتخار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے۔ حالات میں یہ رشتے داریاں قائم ہونا کچھ انوکھی بات تھی۔ فریدہ کی پسند والا معاملہ تو خیر اس لیے نظرانداز کیا جا سکتا تھا کہ جس شخص کو وہ پسند کرتی تھی، اس کی فیملی سے اس کے بھائی کے تعلقات بے حد خراب تھے۔ لڑکیوں کی پسند ناپسند کو تو ابھی تک کئی شہری گھرانوں میں بھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تو ایسے میں فریدہ جیسی گاؤں کی پروردہ لڑکی کی پسند کون پوچھتا؟ لیکن دو مخالف چودھریوں کے درمیان رشتے داری حیرت کی تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ چودھری بختیار حیثیت کے اعتبار سے چودھری افتخار سے بہت کمتر تھا۔

''یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ آپ کے صاحب زادے امریکہ سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اچھا ہے، مجھے ان سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔'' اپنی حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے چودھری کو مبارکباد دی۔

''خیر مبارک۔ لیکن آپ کا یہ اندازہ غلط ہے کہ چودھری مراد یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ تو امریکہ میں ہی

اور بہت مصروف ہے۔ پھر شادی ہو بھی اتنی جلدی رہی ہے کہ اس کا پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ بس آس پاس کے ہی خاص خاص لوگ ہیں جن کو دعوت نامے دیے جا رہے ہیں۔ آپ کا دعوت نامہ میں بطورِ خاص خود لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔'' چودھری نے دعوت نامہ اس کے سامنے رکھا تو اس نے بے ساختہ ہی اسے فوراً کھول لیا۔ دعوت نامے پر دولہا کا نام چودھری بہزاد عالم شاہ تحریر تھا۔ وہی بہزاد عالم شاہ جسے اس نے چودھری کی حویلی میں ایک ایب نارمل لڑکے کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ ایک اچھی بھلی لڑکی کے دولہا کے طور پر اس ایب نارمل لڑکے کا نام دیکھنا اس کے لیے ایک شدید ذہنی جھٹکا ثابت ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین آ گیا کہ چودھری افتخار سے کسی بھی وقت کوئی بھی غیر معمولی اور غیر انسانی کارنامہ سرانجام دیے جانے کی اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ جس شخص میں انسانیت نہ ہو، بھلا اس سے انسانیت کے احترام کی امید رکھی بھی کیسے جا سکتی ہے؟ چودھری کے اندر ذرا بھی انسانیت ہوتی تو آج ماہ بانو یوں دربدر کیوں ہوتی؟ اور جواں سالہ رفیق کھوکھر اپنی جان سے کیوں جاتا؟ بشام سے واپسی میں شہریار تھوڑی دیر کے لیے لاہور میں سجاد رانا کے گھر رک کر آیا تھا۔ وہاں اسے رفیق کھوکھر کے قتل کی اطلاع سننے کو ملی تھی اور اس اطلاع کو سننے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس بے وقوف انسپکٹر کی موت کا ذمے دار کون ہو سکتا ہے؟ رفیق کھوکھر ایک ایسا فرد تھا جو پولیس کے ہاتھ آ جاتا تو چودھری کے خلاف ایک مضبوط گواہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ بات چودھری بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے خود کو بچانے کے لیے اس کا کام تمام کروا دیا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سارے حقائق جانتے تھے لیکن کوئی ٹھوس ثابت نہ ہونے کے باعث چودھری پر ہاتھ ڈالنے سے معذور تھے اور وہ ان کی بے بسی کا تماشا دیکھتا اپنے مظالم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے آزادی سے گھوم رہا تھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کے دعوت نامے کی صورت اس کے ظلم کا ایک اور مظہر اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ حیران تھا کہ افتخار عالم شاہ کے اس ظالمانہ فعل میں چودھری بختیار جیسا اچھی فطرت رکھنے والا بندہ کیونکر شامل ہوا؟

⊛----✪----⊛

''ایسا کر رانی! میرے یہ کپڑے استری کر دے۔ میں تاجور آپا کے ساتھ شہر گئی تھی، تب انہوں نے زبردستی مجھے یہ جوڑا دلوایا تھا کہ تجھ پر بہت اچھا لگے گا..... پر تب میرا جی ہی نہیں چاہا تھا ایسا شوخ رنگ پہننے کو۔ اتنے عرصے سے ایسے ہی اَن چھوا پڑا ہے یہ جوڑا۔ پر آج جی کر رہا ہے اسے پہننے کو۔ بس تُو جلدی سے اسے اچھی طرح استری کر دے۔'' الماری سے سرخ رنگ کا موتیوں کے کام والا ایک ریڈی میڈ سوٹ نکال کر رانی کے ہاتھ میں تھماتی کشور کی آواز میں بڑی کھنک تھی۔ رانی نے اس کا تھمایا ہوا جوڑا ہاتھ میں تو لے لیا لیکن اپنی جگہ متذبذب سی کھڑی رہی۔

''کیا ہے؟..... ہل کیوں نہیں رہی اپنی جگہ سے؟ ابھی موقع ہے۔ اماں کی وہ جاسوس نوکرانیاں، اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ تُو جلدی سے یہ کپڑے استری کر کے میری الماری میں ٹانگ دے۔ اگر ان جاسوسنیوں کی نظر پڑ گئی تو ٹوہ میں لگ جائیں گی کہ میں نے آج یہ کپڑے کیوں استری کروائے ہیں۔'' رانی کو اپنی جگہ جمے دیکھ کر اس نے اسے ٹوکا۔ ''میرا جی ہول رہا ہے بی بی! بار بار اس طرح حویلی سے نکل کر جانے میں بڑا خطرہ ہے۔ کسی کو خبر ہو گئی تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔'' وہ اپنے اندر کا وسوسہ زبان پر لے آئی۔

''تجھے اپنی جان جانے کا ڈر لگ گیا ہے کیا؟''



''نہ بی بی نہ..... اپنی جان کی فکر نہیں ہے مجھے۔ آپ کی خاطر اگر جان چلی بھی جائے تو پروا نہیں۔ پر آپ کا سوچ کر دل ہولتا ہے۔ مجھے خبر ہے کہ یہاں سب آپ کی چھوٹی موٹی خواہشیں تو آسانی سے پوری کر دیتے ہیں، پر اس معاملے کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو آپ کو معافی نہیں ملے گی۔'' کشور کے کڑے لہجے میں پوچھنے پر وہ بوکھلا کر وضاحت پیش کرنے لگی۔

''تجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھے یہ بات معلوم ہے، پر سوچتی ہوں کہ اب جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔ یوں گھٹ گھٹ کر جینے سے ایک بار ہی مر جانا اچھا ہے۔ کم سے کم مرتے وقت یہ سکون تو ہو گا کہ اپنی مرضی اور خوشی سے کھلی ہوا میں چند سانسیں لینے کو مل گئیں۔'' محبت نے اسے اتنا نڈر بنا دیا تھا کہ اب موت کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

''پھر بھی بی بی! میری اوقات تو نہیں آپ کو مشورہ دینے کی۔ پر میں یہی کہوں گی کہ آج آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ آج تو وڈے چودھری صاحب بھی حویلی میں ہیں۔ ان کے ہوتے سارے نوکر چاکر زیادہ ہی ہوشیار رہتے ہیں۔ ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔'' وہ مقدور بھر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آج نہ روک رانی! آج میں اپنی خواہش پر نہیں، ان کے بلاوے پر جا رہی ہوں۔ آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے خود مجھے بلایا ہے، ورنہ اب سے پہلے ہمیشہ میں ہی ضد کر کے ان سے ملنے جاتی تھی۔ اب انہوں نے بلایا ہے تو کیسے انکار کر دوں؟ آج تو میں رک ہی نہیں سکتی۔ آج تو مجھے ہر حال میں جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے بی بی! جیسی آپ کی مرضی۔'' اس کے ارادے کی مضبوطی دیکھتے ہوئے بالآخر رانی نے ہار مان لی اور کپڑے لے کر پلٹنے لگی۔

''کپڑے لے کر باہر مت جانا، یہیں میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر ان پر استری پھیر دے۔'' کشور نے اسے ٹوکا۔

''جی اچھا بی بی!'' اس نے تابعداری سے جواب دیا لیکن لہجہ پژمردہ ہی تھا۔

''کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہے؟ اس سے پہلے بھی تو جا چکے ہیں ہم..... تب کسی کو خبر ہوئی تھی جو اب ہو جائے گی؟ پچھلی بار کی طرح آج بھی تُو سب کو دودھ میں نیند کی دوا ملا کر پلا دینا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی اور ہم واپس بھی آ جائیں گے۔ دوا تو ہو گی نا تیرے پاس؟'' اس کا انداز دیکھ کر کشور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی بی بی! دوا تو ہے، اس کا مسئلہ نہیں۔ پر مجھے رات سے پہلے جا کر اُلّو سے بھی ملنا ہو گا تاکہ وہ تیار رہے اور چوکیدار کو بھی اِدھر اُدھر کرنے کا بندوبست کر دے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ادھر اسکول کی دیکھ بھال کے لیے چوکیدار ہوتا ہے۔ آپ وہاں جائیں اور وہ وہاں ہو تو کچھ اچھی گل نہیں ہو گی یہ۔'' اس نے ذرا تفصیلی جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تُو اپنے سارے کام نمٹا لے۔ میری طرف سے رات تک تیری چھٹی ہے۔ مغرب کے بعد لوٹ جانا۔'' کشور نے اسے اجازت دی۔ جب سے انڈسٹریل ہوم کا آغاز ہوا تھا، رانی سہ پہر کے بعد حویلی آنے لگی تھی۔ کشور نے اپنی سفارش سے اسے انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے کی اجازت دلوائی تھی وہاں سے فارغ ہو کر وہ حویلی آتی اور پھر باقی کا وقت وہیں گزارتی۔ اپنے گھر اس کا دن میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہی جانا ہو پاتا تھا لیکن یہ معمول اسے اس لیے زیادہ گراں نہ گزرتا کہ حویلی میں اس کی حیثیت کشور کی خاص ملازمہ کی سی ہو چلی تھی اور کشور کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے تمام تر اندیشوں اور

وسوسوں کے باوجود کشور کے احکامات کی پیروی کرنے کے لیے راضی ہوگئی۔ اکّو کو رات گئے چوری چھپے اسکول تک چھوٹی بی بی کو لے جانے کے لیے راضی کرنے کا مرحلہ ہمیشہ سب سے دشوار ثابت ہوتا تھا لیکن وہ کچھ اپنی محبت کے واسطے دے کر اور کچھ کشور کی بھجوائی گئی رقم کے زور پر اسے تیار کر ہی لیتی تھی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ حسبِ حکم مغرب کے بعد اس کی حویلی میں واپسی ہوئی تو سب کچھ سیٹ ہونے کی خوشخبری ساتھ تھی۔ رات گہری ہونے کے بعد سب کے اپنے کمروں میں چلے جانے تک کا وقت کشور نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ حسبِ معمول جب رانی سب کو ان کے کمروں میں دودھ کے گلاس پہنچانے گئی تو وہ اپنا کمرہ بند کر کے تیار ہونے لگی۔ ایک تو سرخ رنگ کا اپنا بانکپن دوسرے اس کی دل سے خود کو سنوارنے کے لیے کی گئی جدوجہد..... مکمل طور پر تیار ہونے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود اس کی اپنی نظریں بھی اسے سراہے بغیر نہ رہ سکیں۔ رانی اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس آئی تو اس نے بھی برملا اس کی تعریف کی۔ پھر وہ دونوں کچھ دیر بعد یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب لوگ نشہ آور دودھ پی کر گہری نیند سو چکے ہیں، روانگی کے لیے تیار ہوگئیں۔ کشور کی مسہری اور نیچے کارپٹ پر اس انداز سے گاؤ تکیے رکھ کر ان پر چادریں پھیلا دی گئیں جیسے وہ اور رانی دونوں سو رہی ہوں۔ رانی نے بندوبست کیا تھا کہ حویلی کے مکینوں کے علاوہ مچھی اور شادو بھی خواب آور گولیاں ملا دودھ پی لیں اس لیے راستے میں انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دبے قدموں چلتی وہ دونوں حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئیں۔ یہاں عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو حویلی کے پچھلے حصے سے متصل چودھری کے آبائی قبرستان میں کھلتا تھا۔ اس دروازے پر ہر وقت تالا پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی حویلی کی خواتین اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے قبرستان جاتیں تو تب یہ تالا کھولا جاتا۔ تالے کی چابیاں چوکیدار کے پاس ہوتی تھیں۔ رانی نے ایک دن ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چابیوں کے گچھے سے اس دروازے کے تالے کی چابی اُڑا لی تھی اور پھر ڈپلی کیٹ بنوانے کے بعد واپس گچھے میں پہنچا دی تھی۔ اب قبرستان کی طرف کھلنے والا یہی دروازہ خفیہ آمدورفت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ دونوں اسی دروازے سے گزر کر قبرستان میں پہنچیں اور رات کے ہولناک سناٹے اور قبرستان کی مخصوص وحشت کی پروا کیے بغیر قبروں کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھنے لگیں۔ عام حالات میں کوئی لڑکی یقیناً تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رات کے اس پہر کسی قبرستان سے گزرتی لیکن محبت کی شوریدہ سری نے کشور کو ہر خوف سے آزاد کر دیا تھا۔ رانی حقِ وفاداری نبھانے کے لیے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس وقت بھی ایک ہاتھ میں ٹارچ تھامے وہ بڑی مستعدی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ٹارچ کو مستقل جلائے رکھنے کے بجائے وہ وقفے وقفے سے بس لمحہ بھر کے لیے روشن کرتی تھی تاکہ آگے کا راستہ واضح ہو جائے۔ مستقل روشنی کیے رکھنے میں کسی کے متوجہ ہو جانے کا خطرہ تھا، چنانچہ سیاہ چادروں میں اپنے اپنے وجود چھپائے انہوں نے تقریباً تاریکی میں قبرستان کو پار کیا اور اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں اکّو تانگے سمیت ان کا منتظر تھا۔ کشور کو دیکھ کر اس نے سلام کیا جس کا اس نے سر کی جنبش سے محض اشارے میں جواب دیا اور تانگے میں سوار ہوگئی۔ رانی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں کے سوار ہوتے ہی اکّو نے تانگے کو حرکت دے دی۔ تاریک اور سنسان راہوں سے گزرتا تانگا طے شدہ منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ سفر اتنا طویل نہیں تھا جتنا خوف اور اندیشوں میں گھرے ہونے کے باعث محسوس ہوا لیکن یہ احساس صرف اکّو اور رانی کے لیے تھا۔ کشور تو ہر خوف سے آزاد، آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آفتاب سے باتیں کرنا، ملنا اور اسے دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ ایسی خوشی جس کے سامنے زندگی کی اپنی حیثیت بھی گھٹ جاتی تھی۔ جس کی خاطر زندگی قربان کر دینا بھی مہنگا سودا نہیں تھا۔ اور



پچھلی بار کی ملاقات نے تو اس کے انگ انگ میں نشہ سا بھر دیا تھا۔ اس نشے کا سرور وہ اب تک اپنے اندر محسوس کرتی تھی اور اس وقت بھی ایک سرور کی کیفیت میں ہی اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ چنانچہ اسے خبر بھی نہ ہو سکی کہ راستہ کیسے اور کب طے ہوا۔ وہ تو رانی کی آواز پر چونکی جو اسے منزل پر پہنچ جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس اطلاع پر وہ چونک کر تانگے سے نیچے اُتری۔ انڈسٹریل ہوم کے دروازے پر تالا نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ آج آفتاب ان سے پہلے پہنچ چکا ہے۔ رانی نے آگے بڑھ کر ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور آفتاب کا چہرہ نظر آیا۔ اسے سامنے پا کر کشور بلا جھجک اندر داخل ہوگئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ فوراً بند ہوگیا۔

آج بھی اندر وہی پہلے والا ماحول تھا۔ موم بتی اس دن کی طرح ایک ہی آڑ میں رکھی جل رہی تھی اور کمرے میں بس اتنی روشنی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے دُھندلے دُھندلے سے نقش و نگار دیکھ سکتے تھے۔ البتہ محسوس کرنے کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی کیفیت سمجھ سکتے تھے۔ وہ گویا کسی ساگر اور ندی کی مانند تھے۔ ندی بڑی بے قراری سے چل کر ساگر سے ملنے آئی تھی تو ساگر بھی اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کو بے قرار تھا۔ مگر اس سے قبل کہ ان کی یہ بے قراری کوئی رنگ دکھاتی، باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کشور دروازے کے قریب کھڑی تھی اس لیے اس نے پہلے یہ آوازیں سنیں۔ آوازوں سے لگتا تھا کہ تین چار افراد مل کر اس طرف آ رہے ہیں۔ وہ ایک دم شکاری کی آہٹ پا جانے والی کسی ہرنی کی طرح سراسیمہ ہوگئی۔ قدموں کی چاپیں عین دروازے کے قریب آ کر رُکیں اور اگلے ہی لمحے سناٹے یں اُبھرنے والی دستک کی آواز نے اسے یوں ہراساں کیا جیسے دستک کے بجائے کسی زوردار بم کی آواز سنائی دے گئی ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرتا پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے قرار ہونے لگا۔ آفتاب نے اس کی یہ وحشت زدہ حالت دیکھی اور شاید دروازہ کھولنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔

''نن..... نہیں۔'' دروازے کی کنڈی کی طرف اس کا ہاتھ بڑھنے سے قبل ہی کشور نے لپک کر اس کا بازو دبوچ لیا اور یوں خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی جیسے دوسری طرف موت کا فرشتہ منتظر کھڑا ہو۔

''دروازہ مت کھولیں اور اگر یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے تو آپ چپکے سے یہاں سے باہر نکل جائیں۔'' آفتاب کا بازو پکڑے پکڑے ہی اس نے سرگوشی میں اسے مشورہ دیا۔ آفتاب نے اس مشورے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ناچتی وحشت، خوف سے تھر تھر کانپتا بدن، دہشت زدہ دل کی بے ترتیب دھڑکن کا پتہ دیتا سینے کا مدوجزر..... ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ اس نے کسی آنے والے طوفان کی آہٹ سنی ہے پھر بھی وہ اسے یہاں سے بھاگ نکلنے کا مشورہ دے رہی تھی اور اسے طوفان سے بچا کر خود اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس ایثار، قربانی یا دیوانگی کو فقط ایک ہی نام دیا جا سکتا تھا..... محبت.....!

⊛----✪----⊛

وقت گویا تھم سا گیا۔ آفتاب ایک ٹک اپنے قریب کھڑی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس پر اپنی جان تک لٹا دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ ہمیشہ اس لڑکی کی شدتوں سے ہارتا آیا تھا لیکن وہ اس سے کس انتہا درجے کی محبت کرتی تھی، اس بات کا حقیقی ادراک وقت کے ان نازک لمحوں میں ہی ہو سکا۔ کسی پر اپنی جان لٹا دینا آسان نہیں ہوتا اور جو محبت میں اس حد کو چھو لے، اس سے بڑھ کر انمول کون ہو سکتا ہے؟ وہ اس انمول لڑکی کے قریب کھڑا

باہر موجود لوگوں سے غافل ہو چکا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک دی گئی تو وہ چونکا۔ دستک بہت زور سے نہیں دی گئی تھی لیکن رات کے سناٹے میں زوردار محسوس ہو رہی تھی۔

''پلیز آفتاب! میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا کہ آپ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔'' ہراساں وخوف زدہ کشور نے اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے سرگوشی میں اس سے التجا کی مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھپکا اور دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولا۔

''پانچ منٹ انتظار کرو منیب! میں بی بی کو ساری صورتِ حال سمجھا دوں، پھر تم لوگوں کو اندر بلاتا ہوں۔ پریشان مت ہو، باہر کوئی دشمن نہیں بلکہ میرے دوست ہیں اور میرے بلانے پر ہی یہاں آئے ہیں۔'' اُلجھی اُلجھی نظروں سے اپنی طرف دیکھتی کشور کو اس نے تسلی دی اور اس کا ہاتھ تھام کر فرش پر بچھی دری کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر چل کر بیٹھیں۔ میں آپ کو سب کچھ سمجھاتا ہوں۔''

اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی مگر اس کی سوالیہ نظریں مسلسل آفتاب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''آپ یقیناً حیران ہو رہی ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟'' اس کی نظروں کا سوال پڑھتے ہوئے آفتاب نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بغیر ہنوز پہلے والی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں قبل وہ جس کیفیت سے گزری تھی، اس کے بعد دوسری عجیب وغریب صورتِ حال سمجھنے میں اسے کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس پر کیسی قیامت گزری تھی، یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ اسے لگا تھا کہ رانی کے سارے واہمے سچ ثابت ہونے والے ہیں۔ وہ ڈر گئی تھی کہ شاید حویلی سے کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آ پہنچا ہے۔ اتنی جلدی اپنی محبت کے چھن جانے کے خوف سے اس کے وجود سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں اور وہ ابھی تک اس خوف کے زیرِ اثر دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

''میں معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔'' آفتاب نے اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے معذرت کی۔

''خدارا! مجھے گناہ گار نہ کریں۔'' اسے آفتاب کا معافی مانگنا ہرگز بھی گوارا نہ ہو سکا اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

''اصل میں بات کچھ ایسی تھی کہ میں چاہتا تھا، فون پر کرنے کے بجائے روبرو ہی کروں۔ آپ پر اعتماد تھا کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گی اس لیے باقی کے انتظامات پہلے ہی کر لیے تھے۔ بس ذرا سی ٹائمنگ غلط ہو گئی۔ آپ میرے اندازے کے برخلاف کچھ تاخیر سے یہاں پہنچیں ورنہ یہ صورتِ حال پیش ہی نہیں آتی۔'' وہ تمہید باندھنے لگا لیکن اس تمہید سے کشور کے لیے اصل معاملے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

''آج اباجی حویلی میں ہی موجود تھے اس لیے ہم بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہاں تک آنے کی راہ نکال سکے۔ احتیاط کی وجہ سے ہی دیر بھی ہو گئی۔'' خود اُلجھن میں ہونے کے باوجود اس نے فوراً اپنے تاخیر سے آنے کی وضاحت پیش کی۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں تک آنے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہوگا اسی لیے ہمیشہ آپ کو روکتا رہا۔ لیکن آج کی ملاقات بے حد ضروری تھی اس لیے میں نے آپ کو خطرے میں ڈالنا بھی گوارا کر لیا۔''

''ایسی کیا بات ہے آفتاب؟ آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟'' اس بار وہ اپنے ہونٹوں پر سوال آنے سے نہ روک سکی۔ کپکپا دینے والے خوف کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد وہ اس کے رویے سے اُلجھن میں پڑ گئی تھی۔ جواباً آفتاب نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔



''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی طلب بھی ہوتی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات میں جو کچھ ہوا، وہ اس محبت اور طلب کی کارستانی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ لمحے میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے تھے لیکن آپ سے جدا ہونے کے بعد ایک ایسا سچ میرے سامنے آ کھڑا ہوا کہ میں اس مور کی طرح ہوں جو بے خودی میں ناچتے ناچتے اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔'' وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا، اس کے لیے سمجھنا مشکل تھا۔ ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے جس میں سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں آفتاب کی زندگی میں کوئی اور عورت تو نہیں؟ کوئی ایسی عورت جو اس کی ان محبتوں کی حق دار ہو اور وہ اس کا حق کشور پر لٹانے کے بعد شرمندہ ہو رہا ہو۔

''محبت کے ساتھ طلب کا ہونا گناہ نہیں۔ لیکن اس طلب کے ساتھ قانونی اور شرعی رشتے میں بندھے بغیر بہہ جانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ پھر محبت، محبت کہلانے کی حق دار نہیں رہتی، ہوس کہلانے لگتی ہے اور مجھے اپنی محبت کے دامن پر یہ داغ گوارا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محبت کے دامن پر لگے اس داغ کو دھونے کے لیے ہم نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اگر آپ میری یہ بات ماننے کے لیے راضی ہیں تو میں ابھی منیب اور اپنے دوسرے دوستوں کو اندر بلوا لیتا ہوں ورنہ آپ کے لیے باہر کا راستہ کھلا ہے۔ میں آپ کو یہاں سے جانے سے روکوں گا نہیں۔ مگر پھر کبھی آپ کے بلانے پر آؤں گا بھی نہیں۔'' اس کے اندیشوں سے بے نیاز اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے آخر میں دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی نظروں میں کوئی سوال نہیں بلکہ بے انتہا عقیدت تھی۔ یہ عقیدت دھیرے دھیرے آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔

''تھینک یو آفتاب! آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے کتنا معتبر کر دیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میری اندھی محبت میں اتنی بصیرت نہیں تھی کہ میں آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی۔ اب آپ نے کہا ہے تو احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلطی میں مبتلا تھی۔ محبت کرنے والے مرد وعورت کے درمیان اگر نکاح کے دو بول نہ ہوں تو وہ سب کچھ پانے کے بعد بھی ہمیشہ سچی خوشی سے محروم رہتے ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے یہ سچی خوشی عنایت کرنے کا سوچا۔'' رندھی ہوئی آواز میں اس نے آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''او کے! آپ ٹھیک سے چادر اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ میں ان لوگوں کو اندر بلواتا ہوں۔'' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کشور کے بہتے ہوئے اشکوں کو اپنی انگلی کی پوروں پر چن لے لیکن باہر کھڑے منیب اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ باہر وہ لوگ نکاح پڑھوانے کے منتظر کھڑے تھے اور جن کا نکاح ہونا تھا، وہ ایک بند کمرے میں تنہا مذاکرات میں مصروف تھے تو یہ اچھی خاصی معیوب صورتِ حال تھی۔ چنانچہ کشور کا عندیہ پاتے ہی فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر اس نے منیب، شہر سے آئے اپنے دوستوں اور نکاح خواں کو اندر بلایا۔ نکاح خواں کو علم تھا کہ نکاح کس صورتِ حال میں پڑھایا جانا ہے۔ اسے لانے والے آفتاب کے دوستوں نے پہلے ہی سوائے اس بات کے کہ دلہن گاؤں کے مالک چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی ہے، سب کچھ بتا دیا تھا۔ لاہور کے رہائشی اس نکاح خواں کو نہ تو اس دُور دراز گاؤں کے چودھری کے نام کا علم تھا اور نہ ہی دولہا دلہن کو اصلیت جاننے سے دلچسپی۔ وہ فقط اس رقم کی کشش میں یہاں آیا تھا جو اسے آفتاب کے دوستوں نے دی تھی اور جو نکاح کی عام فیس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی۔ بعد میں کوئی مشکل پڑتی بھی تو اسے یہی کہنا تھا کہ مجھے کیا معلوم لڑکی کس گاؤں کی رہنے والی ہے۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں اور میرے پاس لڑکا لڑکی مع

گواہان خود چل کر نکاح کے لیے آئے تھے، سو میں نے یہ نیک کام کر دیا۔ نیکی کا بدلہ روزِ جزا پر اُٹھا کر رکھنے کے بجائے اس نے یہیں کڑک نوٹوں کی صورت میں وصول کر لیا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے، وہ کسی کو نہیں بتاتا۔

آفتاب نے کشور کی سہولت کے لیے رانی کو بھی اندر بلوا لیا تھا اور اب وہ خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں اپنی مالکن کے نکاح میں شریک تھی۔ ایجاب وقبول کے مراحل طے ہونے کے بعد نکاح خواں نے مختصر دعا کروائی، پھر منیب نے اپنے ساتھ لایا ہوا مٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب کا منہ میٹھا کروایا۔

''بھابی! ابھی تو ہم نے آپ لوگوں کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس مٹھائی پر گزارہ کر لیا ہے لیکن یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ ولیمے کی دعوت آپ لوگوں پر ڈیو ہے اور وہ آپ نے ہمیں ضرور کھلانی ہے۔ وقت کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اگر آپ ہمیں اتنی لیٹ دعوتِ ولیمہ کھلائیں کہ اس دعوت میں ہمارا کوئی بھتیجا یا بھتیجی بھی شرکت کے لیے دنیا میں آ پہنچے تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' مٹھائی کھاتے ہوئے آفتاب کے ایک دوست نے شوخ لہجے میں براہِ راست، گھونگھٹ کی آڑ میں بیٹھی کشور سے مطالبہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر محجوب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے آفتاب کے دوست کا خود کو بھابی کہہ کر مخاطب کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ نکاح کے دو بولوں نے اس کی اور آفتاب کی محبت کو ہی مضبوط نہیں کیا تھا بلکہ وہ رشتے بھی اس کی جھولی میں لا ڈالے تھے جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اسے کبھی مل پائیں گے۔

''وقت کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔'' آفتاب جسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا مگر گزرتے وقت کا خیال کر کے وہ خود پر جبر کرتا ہوا کشور سے بولا تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور گھونگھٹ کے طور پر لی گئی چادر کو نقاب کے انداز میں چہرے پر سیٹ کرنے لگی۔

''کتنا بے چارہ دولہا ہے۔ بجائے دلہن رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے کے اسے رخصت کرنے جا رہا ہے۔'' وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جب آفتاب کے دوست نے ایک آہ بھرتے ہوئے پیچھے سے یہ کمنٹس دیئے۔ وہ اَن سنی کرتا ہوا کشور کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد ان دونوں کے ہی قدم خود بخود رک گئے جبکہ رانی بے خیالی میں یا پھر شا[illegible]ان بوجھ کر انہیں تنہائی فراہم کرنے کے خیال سے تانگے کی طرف بڑھ گئی۔

''کہتے تو سچ ہی ہیں میرے دوست۔ واقعی میں کتنا بے چارہ سا دولہا ہوں جو اپنی دلہن کو روک بھی نہیں سکتا۔ نہ سرخ جوڑے میں سجے اس کے حُسن کو سراہ سکتا ہوں۔ ویسے سچ بتائیں، یہ سرخ جوڑا محض اتفاق تھا یا آپ کے دل کو خبر ہو گئی تھی کہ آج کچھ خاص ہونے جا رہا ہے؟'' اس نے کشور کو چھیڑا۔

''میرے لیے تو یہ بھی خاص بات تھی کہ آج پہلی بار آپ نے خود مجھے بلایا تھا۔ آج کی رات مجھے اتنا معتبر کرنے والی ہے، یہ معلوم ہوتا تو جانے کتنا اہتمام کرتی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اہتمام اہتمام میں ہی سارا وقت گزر جاتا اور آپ نکاح خواں اور گواہان کے ساتھ یہاں بیٹھے میرا راستہ ہی تکتے رہ جاتے۔'' جذباتی لہجے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آخر وہ ایک دم شوخ ہو گئی تو آفتاب ہنس پڑا۔

''چلیں، آج نہ سہی پھر کبھی آپ کو یہ موقع مل جائے گا۔ اب تو آپ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں گی، مسز آفتاب احمد کی حیثیت سے ہی آئیں گی۔ پھر دیکھیں گے کہ ہماری بیگم صاحبہ ہمیں زیر کرنے کے لیے کن کن کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آتی ہیں۔ پر دھیان رکھئے گا، اب آپ کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ اب جو ملاقات ہوگی، اس میں ہمارا کوئی اور ہی رنگ دیکھنے کو ملے گا آپ کو۔'' اس نے دھیرے سے کشور کا ہاتھ دبایا۔ وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کچھ فاصلے پر وہ تانگا کھڑا تھا



جس میں بیٹھ کر اسے واپس حویلی جانا تھا۔ تانگے کی طرف بڑھتے اس کے قدموں کے برخلاف اس کا شریر دل ہمک ہمک کر پیچھے کی طرف لپک رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی کہ اس وقت وہ دل کی بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں تھی چنانچہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تانگے پر چڑھنے سے پہلے البتہ اس نے پیچھے مڑ کر ضرور دیکھا۔ آفتاب اپنی جگہ کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہا تو جواب میں اس کا ہاتھ بھی الوداعی انداز میں اٹھ گیا۔ البتہ یہ تو دونوں ہی جانتے تھے کہ الوداع کا استعارہ بنے یہ ہاتھ وصل کے لمحوں کے لیے کس شدت سے منتظر ہیں۔

⊛----✪----⊛

لکڑیوں کا چولہا جلا کر اس نے توا رکھا اور پرات میں گوندھے ہوئے آٹے کا پیڑا بنا کر روٹی بیلنے لگی۔ مشابرم خان کے گھر پہنچنے کے بعد دوسرے دن سے ہی اس نے گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کی بوڑھی ماں نے جو اٹک اٹک کر اُردو بولتی تھی، ابتدا میں اسے روکنا چاہا، پھر اس کی ضد کے آگے ہار مان لی۔ اب وہ گھر کے تقریباً سارے ہی کام کرتی تھی پھر بھی دن مشکل سے گزرتا تھا۔ ہزار افراد سے بھی کم آبادی پر مشتمل اس گاؤں میں زندگی بہت محدود تھی اور مشابرم خان کے گھر میں تو محدود ترین۔ اس کا بھائی اکرم خان اسے یہاں اپنی ماں کے پاس چھوڑنے کے بعد اسکردو واپس چلا گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ کر جو اس کی بات بھی پوری طرح نہیں سمجھ پاتی، کس طرح وقت گزارے؟ بس گھر کے کام کاج میں کچھ وقت اچھا گزر جاتا تھا ورنہ سارا دن وہ ہوتی تھی اور ذہن پر سوار فکریں اور پریشانیاں۔ کبھی بے بے اور ابا کی موت کا غم رُلاتا تو کبھی اپنے مستقبل کا سوچ کر طبیعت گھبرانے لگتی۔ اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں گم روٹی پکا رہی تھی۔ پہلی روٹی توے سے اُتری تو سیاہی مائل رنگت دیکھ کر طبیعت کچھ اور مکدّر سی ہو گئی۔

''گیاؤس'' نامی گندم کے آٹے کی روٹیاں ایسی ہی پکتی تھی۔ ان روٹیوں کو پکاتے اور کھاتے ہوئے اسے وہ سنہری مائل روٹیاں یاد آ جاتیں جنہیں وہ ساری زندگی کھاتی رہی تھی اور جنہیں کھاتے ہوئے اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر سے بہت دور کاندے نامی اس بستی میں بیٹھی ہوگی۔

سست روی سے دوسری روٹی بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے اسے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ پھر ذرا دیر بعد ایک مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ وہ یقیناً اکرم خان تھا جو اپنے گھر آیا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے اور اس کے حصے کی روٹیاں بھی پکا ڈالیں۔ روٹی پکانے کے بعد وہ کھانے کے برتن وغیرہ لے کر اندر کمرے میں گئی۔ اکرم خان اپنی ماں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔

''جیو ہمارا بہن! ہم ہمیشہ سوچتا تھا کہ ہمارا کوئی بہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج تم کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اللہ نے ہمارا تمنا پورا کر دیا۔'' اسے کھانا لگاتا دیکھ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ اسے اس طرح خوش ہوتا دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔

''تمہارے لیے شہریار صاحب نے کچھ سامان بھجوایا ہے۔ یہ ادھر رکھا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم دیکھ لینا اور اس کو کوئی خط شط لکھنا ہو تو وہ بھی بعد میں لکھ لینا۔ ابھی ہم ایک ٹیم کے ساتھ ہوشے تک جاتا ہے۔ وہ لوگ اِدھر رُکا تھا تو ہم تھوڑی دیر کے لیے گھر آ گیا تھا۔ ٹیم کو ہوشے میں چھوڑ کر واپس آئے گا، تب بھی تھوڑی دیر

رک کر واپس اسکردو جائے گا۔'' اس کی اطلاع پر ماہ بانو کی نظر ایک طرف رکھے گتے کے بڑے سے کارٹن کے قریب پہنچی۔ اس پر چپکی سفید رنگ کی چٹ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ''اکرم خان پورٹر۔ گاؤں کاندے، ڈاک خانہ تھاگس، تحصیل مشابرم، ضلع گھانچے، اسکردو، بلتستان۔ پاکستان۔''

''اس پر تو آپ کا نام لکھا ہے اکرم بھائی!''

''وہ تو اس لیے لکھا ہے کہ ادھر سب ہم کو جانتا ہے۔ پر صاحب نے اُدھر کے ٹو موٹیل میں ہم کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ماہ بانو بی بی کے لیے سامان بھجوا رہا ہوں۔ ویسے بھی وہ ہمیں کیوں کچھ بھجوائے گا؟ آپ کو ہی بھیجا ہے یہ سب۔'' اکرم خان نے ہنستے ہوئے اسے یقین دلایا تو اسے قائل ہونا پڑا۔ پھر اس تجسس نے کہ اس کارٹن میں کیا ہے، اسے فوراً ہی کارٹن کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامان کے اوپر ہی ایک سفید رنگ کا لفافہ رکھا تھا جس پر اس کا نام موجود تھا۔ اس نے بے تابی سے لفافہ کھولا۔

''امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گی۔ لاہور سے عجلت میں روانہ ہونے کی وجہ سے تمہاری ضرورت کا سامان نہیں لیا جا سکا تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق کچھ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔ اگر ان کے علاوہ بھی کسی اور شے کی ضرورت ہو تو اکرم خان کو لکھ دینا۔ میں اس سے فون پر معلوم کر لوں گا۔'' بے حد مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کے علاوہ لفافے میں کچھ رقم بھی موجود تھی۔ وہ لفافہ بند کر کے کارٹن میں موجود سامان کا جائزہ لینے لگی۔ گرم ملبوسات، اس کے کورس کی کتابیں، موسم سرما میں استعمال ہونے والے لوشنز کے علاوہ کچھ تفریحی رسائل وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس نے بے حد خیال سے اس کی ضرورت کی تمام اشیاء بھیجی تھیں اور فی الحال اسے اس سامان میں کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی دل کچھ اُداس سا ہو گیا۔ دل میں خواہش سی مچلی کہ کاش اس سارے سامان کے بجائے وہ خود اس کی خیریت معلوم کرنے یہاں تک آ گیا ہوتا۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی کہ اے سی شہریار عادل جیسے اونچی حیثیت والے شخص کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس جیسی معمولی لڑکی سے ملنے اس دور دراز گاؤں تک آتا۔ اس نے انسانیت کے ناتے اسے یہ سب چیزیں بھجوا دی تھیں تو یہ بھی اس کا بہت بڑا احسان تھا۔

''اماں کہہ رہی تھی کہ تم صحیح سے روٹی نہیں کھاتا ہے۔ ہم اس بار آئے گا تو ساتھ میں دوسرا آٹا لے کر آئے گا۔ یہ گاؤں کا روٹی کھانا واقعی بڑا مشکل ہوتا ہے، پر کیا کرے..... جب سے اِدھر سیلاب نے تباہی مچایا ہے، بڑا مشکل پڑ گیا ہے۔ کتنا لوگ نے اِدھر سے دور کینداس تھنگ میں جا کر بستی آباد کر لیا ہے حالانکہ اُدھر ان کو پانی کا بڑا پریشانی ہے۔ خیر، ہم آئے گا تو اسکردو سے اچھا والا گندم کا آٹا لے کر آئے گا۔'' وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی اس لیے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کب اکرم کھانے سے فارغ ہوا اور اماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اکرم خان بولا تو وہ چونکی پھر شرمندہ سی ہو کر بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں بھائی اکرم! بس ابھی عادت نہیں ہے اس لیے مشکل ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی۔ تم بتاؤ، مشابرم خان کا کیا حال ہے؟ اے سی صاحب نے اس کی خیریت کے بارے میں کچھ بتایا ہے کہ نہیں؟''

''وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا نام ہمارے باپ نے مشابرم کی چوٹی سے واپس آنے کے بعد مشابرم خان رکھا تھا۔ ہمارا بھائی کسی پہاڑ کی طرح ہی مضبوط اور طاقتور ہے۔ چھوٹا موٹا زخم اسے کچھ نہیں کہتا۔ وہ مرد کا بچہ ہے، ہر تکلیف بہادری سے سہہ سکتا ہے۔ اگر اماں کی دی قسموں کا خیال نہ ہوتا تو وہ شیر جوان، گورا لوگ کے ساتھ بڑی بڑی چوٹیاں سر کرنے جاتا۔ شل کھی (نانگا پربت) تو اس کو بہت اچھا لگتا تھا، پر اماں نے ہم دونوں



بھائیوں کو قسم دیا کہ ہم اُدھر جانے کا سوچے گا بھی نہیں تو بس پھر وہ شہر چلا گیا۔ کہتا تھا کہ اِدھر رہوں گا تو پہاڑوں سے دُور نہیں رہ سکوں گا اور ماں کی دی قسم توڑ دوں، یہ بھی گوارا نہیں۔''

''مگر اماں نے ایسی قسم دی ہی کیوں؟'' اکرم خان کی بات سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اصل میں ہمارا باپ ہماری پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی ایک ٹیم کے ساتھ کلائمبنگ کے لیے گیا تھا تو اُدھر ایوالانچ میں دب کر مر گیا۔ باپ پر اماں نے صبر کر لیا لیکن جب ہمارا سب سے بڑا بھائی اجمل خان برالڈو دریا میں گر کر مرا تو اماں نے ہم دونوں سے وعدہ لیا کہ ہم خود کو ایسے خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ بس پھر مشابرم خان اُدھر چلا گیا اور ہم اِدھر رہتا ہے لیکن اسکردو سے لے کر بس ہوشے تک کا ہی سفر کرتا ہے۔ آگے پہاڑوں کا سفر نہیں کرتا۔ پیسہ کم ملتا ہے، پروا نہیں..... اماں تو خوش ہے۔'' اکرم خان نے اداس لہجے میں بتایا اور پھر یک دم ہی عجلت کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اب ہم چلتا ہے، بہت دیر ہو گیا ہے۔ اُدھر صاحب لوگ ناراض ہو رہا ہو گا کہ پورٹر کدھر چلا گیا ہے۔'' اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکے بغیر باہر نکل گیا۔ ماہ بانو عقیدت سے ان لوگوں کے بارے میں سوچتی رہی جو پہاڑوں کے باسی تھے اور پہاڑ جیسا ہی ظرف رکھتے تھے۔ اکرم خان نے ایک بار بھی تو اسے نہیں جتایا تھا کہ اس کا بھائی جسے ماں نے اس کی سلامتی کے خیال سے پہاڑوں کے سفر سے روک دیا تھا، اس کی خاطر شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔ بس اس نے یہاں آتے ہوئے اتنی گزارش کی تھی کہ ماں کو مشابرم خان کے زخمی ہونے کے بارے میں نہ بتانا۔ اس کے بعد جیسے وہ سب بھول گیا تھا اور کچھ یاد تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر مہمان ہے جس کا اس نے ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔ بقا کی جدوجہد میں بھٹکتی وہ کچھ اور لوگوں کے خلوص کی مقروض ہو گئی تھی اور جانے ابھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہنا تھا۔

⊛----✪----⊛

صبح صبح کا وقت تھا۔ کشور اپنے کمرے سے نکلی اور اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ حویلی کے مکینوں میں سے وہی تھی جو اکثر و بیشتر وہاں جاتی رہتی تھی۔ جانے کا مقصد اپنے سوتیلے بھائی چودھری بہزاد کی خیر و عافیت سے آگاہ ہوتا تھا۔ چودھری بہزاد کی مری ہوئی ماں نے اسے علم کی روشنی عطا کرنے کا جو احسان کیا تھا، وہ اس احسان کا بدلہ اس کے ایب نارمل بیٹے کی وقتاً فوقتاً خبر گیری کے ذریعے اُتارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن آج سیڑھیاں طے کر کے اوپری منزل تک پہنچنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتی تھی جو کل رات چودھری بہزاد کی دُلہن بن کر حویلی میں آئی تھی۔ حویلی کی خواتین کو یہ تو معلوم تھا کہ چودھری بہزاد کی شادی نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کی بہن سے ہو رہی ہے لیکن یہ بات کسی کے پلے نہیں پڑی تھی کہ چودھری بختیار نے اپنی بہن کی شادی ایک ایب نارمل لڑکے سے کرنا کیسے منظور کر لیا۔ تاجور اور صنوبر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہو نہ ہو، لڑکی میں ضرور کوئی عیب تھا جب ہی یہ بیاہ ممکن ہو سکا۔ وڈی چودھرائن کے خیال میں لڑکی خود بھی پگلی ہی تھی۔ کشور کی ماں ناہید کا خیال تھا کہ چودھری بختیار، چودھری افتخار کا مقروض تھا اور اس نے قرض معاف کروانے کے لیے بہن کو بلی چڑھا دیا۔ غرض ہر فرد نے ہی اپنے اپنے طور پر اس شادی کے بارے میں کوئی نہ کوئی خیال آرائی ضرور کی تھی۔ حقیقت کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بارات کے ساتھ بھی حویلی کی کسی عورت کو نہیں لے جایا گیا تھا۔ چودھری کے ساتھ اس کے چند خاص ملازمین، آس پاس کے دیہاتوں کے ایک زمیندار اور چودھری بہزاد کے ذاتی کاموں کے لیے مختص ملازمہ نے ہی بارات میں شرکت کی تھی۔ اسی

ملازمہ نے دلہن کو رخصت کر کے لانے کے بعد اوپری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچانے کا فرض بھی ادا کیا تھا۔ جب تک چودھری افتخار کو اجازت نہیں ملتی، کسی کی مجال نہیں تھی کہ خود سے چند سیڑھیوں کا فاصلہ طے کر کے اوپری منزل تک چلا جاتا لیکن کشور کے تجسس نے اسے زیادہ صبر نہیں کرنے دیا اور وہ صبح ہی صبح جبکہ ابھی سارے لوگ سوئے ہوئے تھے، اوپری منزل پر جا پہنچی۔ اس وقت وہاں بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے چودھری بہزاد کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے بہزاد اپنے پلنگ پر گہری نیند میں ڈوبا نظر آیا۔ بستر پر اس کے ساتھ اس کا چہیتا بھالو بھی موجود تھا اور وہ اس بڑے سے بھالو کی گردن میں اپنی بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ نیچے قالین پر اس کی ملازمۂ خاص بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں دلہن کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی اہتمام نظر آتا تھا جو کسی نئی نویلی دلہن کے استقبال کا پتہ دیتا۔ نہ کوئی سجاوٹ تھی اور نہ ہی پھول پتیوں کا وجود۔ وہ ذرا اُلجھی ہوئی سی وہاں سے ہٹ گئی۔ یہ تو سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ دُلہن وہاں لائی ہی نہیں گئی۔ تجسس کی ماری وہ رات گئے تک بارات کے واپس لوٹنے کے انتظار میں جاگتی رہی تھی اور اس نے خود اپنے کمرے کی کھڑکی سے بڑی سی چادر میں لپٹی دُلہن کو حویلی میں اُترتے دیکھا تھا لیکن وہ جس کی دُلہن بنا کر لائی گئی تھی، اس کے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور کمرے میں ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آنے پر وہ تیزی سے دوسرے کمروں کے دروازے کھول کر جھانکنے لگی۔ کمرے حسب معمول خالی تھے۔ اوپری منزل چودھری بہزاد کے سوا کسی کے استعمال میں نہیں رہتی تھی اور ان کمروں کے استعمال کی نوبت صرف اسی وقت آتی تھی جب حویلی میں بے تحاشا مہمان ہوتے تھے۔ عموماً ایسا سالانہ عرس کے موقع پر ہی ہوتا تھا۔

کشور ایک ایک کمرے کو دیکھتی چوتھے کمرے میں پہنچی تو اسے بستر پر ایک سرخ رنگ کی گٹھڑی سی پڑی نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس ایک لڑکی ہے جو گھٹنے پیٹ سے لگائے بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے اس لڑکی کے قریب پہنچی۔ قریب سے جائزہ لینے پر اسے اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ بستر پر پڑے مسلے ہوئے پھول، ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیاں اور مزید کچھ نشانیاں ایسی تھیں جو گزری رات کا افسانہ سنا رہی تھیں۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ اپنے کمرے میں بھالو کی گردن میں بانہیں ڈال کر سونے والے اس پگلے چودھری بہزاد سے یہ افسانہ کیسے رقم ہو گیا؟ حیرت میں ڈوبے ڈوبے ہی اس نے لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر پڑا اس کا آنچل سرکایا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں حالانکہ وہ یوں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی کہ اسے لمحے بھر کو گمان گزرا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہے۔ اب جو آنکھوں کے حرکت کرتے ہوئے ڈیلے دیکھے تو یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ ہوش میں ہے۔

''میں کشور ہوں۔ چودھری بہزاد شاہ کی بہن۔'' اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرے پر موجود آنسوؤں کے نشانات کا بھی جائزہ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک روتی رہی ہے۔

''میرا تماشا دیکھنے آئی ہو؟'' اس کا تعارف سن کر وہ قہر آلود لہجے میں بولی تو پہلی بار کشور کی نظر اس کے نچلے ہونٹ پر موجود زخم پر پڑی۔ اسے شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے سامنے موجود لڑکی بے شک عروسی لباس میں تھی لیکن سہاگن والی ذرا سی بھی رمق اس کے وجود میں نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ تو کوئی لٹی پٹی، برباد ہو جانے والی عورت نظر آ رہی تھی۔ اگر اسے آفتاب کی قربت کا تجربہ نہ ہوا ہوتا تو وہ اتنی باریک بینی سے اس لڑکی کا جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ آفتاب کو پانے کے بعد اس نے جب بھی آئینے



میں اپنا چہرہ دیکھا تھا، اسے وہاں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ لیکن یہ لڑکی تو ایسا لگتا تھا کہ قبر سے نکلا ہوا کوئی مردہ ہو۔ شاید اس کا یہ حال اس لیے تھا کہ اسے رفیقِ حیات کے طور پر چودھری بہزاد کا ساتھ ملا تھا اور یقینی طور پر یہ ساتھ کسی بھی ہوش مند لڑکی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے شدت سے لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے بکھرے ہوئے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بہزاد کسی طور تمہارے لائق نہیں تھا۔ ابا جی کو تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''تمہیں کیا خبر کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟..... اس ظلم کا بدلہ ایک دن اسے کیا، اس کے پورے خاندان کو چکانا پڑے گا۔'' نہایت تلخی سے کہتے ہوئے اس نے کشور کا ہاتھ جھٹکا اور اپنی جگہ پر اُٹھ بیٹھی۔

''قصور صرف ابا جی کا تو نہیں۔ تمہارے گھر والوں نے بھی تو جانتے بوجھتے تمہیں بہزاد سے بیاہا ہے۔ تمہیں بددعا دینی ہے تو انہیں بھی دو۔'' اسے اپنے خاندان کو بددعا دینا برا لگا تھا اس لیے اسے ٹوک بیٹھی۔

''جانتے بوجھتے نہیں، مجبوری میں اپنی عزت بچانے کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ ورنہ میرے بھاجی تو سخت ناپسند کرتے ہیں تمہارے ابا جی کو۔ عام حالات میں تمہارے اس پاگل بھائی کے بجائے اگر ولایت سے ڈگری لانے والے بھائی کا پیغام بھی آتا تو میرے بھاجی صاف انکار کر دیتے۔ پر ابھی تو وہ مجبور ہو گئے تھے۔''

''وہ کیسے؟'' کشور نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے نصیب کی خرابی ان کی مجبوری بن گئی۔'' اس نے اُداسی سے جواب دیا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ تم اس طرح پہیلیاں بجھوانے کے بجائے ذرا کھل کر تفصیل سے سب کچھ نہیں بتا سکتیں؟'' وہ تھوڑا سا جھنجلائی۔

''میں تمہیں کچھ بتاؤں ہی کیوں؟ تم کون لگتی ہو میری؟'' وہ ہتھے سے اُکھڑنے لگی۔

''لگنے لگانے کو چھوڑو۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے کی سہیلیاں بن سکتی ہیں۔ سمجھو میں بھی تمہاری طرح اس حویلی میں تنہا ہوں اور تمہاری طرح میرے بھی بہت سے حقوق پامال کرتے ہوئے زندگی کی حقیقی خوشیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔'' اس کی تلخی کا برا مانے بغیر وہ نرمی سے بولی تو وہ کچھ دیر تو اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''تم کہتی ہو تو میں تمہاری گل کا یقین کر لیتی ہوں۔ اگر تمہارا کہا جھوٹ بھی نکلا تو میرا کیا بگڑے گا؟ میرا تو جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا۔''

کشور نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس منتظر منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے بتانا شروع کیا۔

''میں فریدہ ہوں۔ نور پور کے چودھری بختیار کی چھوٹی اور اکلوتی بہن۔ میں اپنے چچا زاد قربان سے محبت کرتی تھی۔ قربان ساتھ والے پنڈ میں ہی رہتا تھا لیکن رشتے داری کے باوجود کچھ دشمنیوں کی وجہ سے ہمارا آپس میں ملنا جلنا نہیں تھا۔ اتفاق سے میں اور قربان ایک ویاہ پر ایک دوجے سے ملے تو فیر ایک دوجے کی محبت میں مبتلا ہو گئے اور دشمنی کے باوجود آپس میں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ قربان سے بڑے بھائی سبحان کو یہ گل پتہ چلی تو وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا اور قربان کو مجبور کرنے لگا کہ وہ مجھ سے ناتا توڑ لے۔ قربان نہ مانا تو وہ پہلے دھمکیوں پر اُترا، فیر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم نے فیر بھی ایک دوجے سے ملنا نہیں چھوڑا۔

کچھ دن گزرے، میں اور قربان ایک دوجے کے ساتھ تھے کہ سبحان نے ہمیں گھیر لیا۔ اس روز قربان اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سبحان پرخون سوار ہے تو اس نے مجھے اپنے ساتھ گھوڑی پر بٹھایا اور گھوڑی دوڑا دی۔ پر ہم جاتے کہاں؟ دونوں میں سے کسی کے بھی گھر والے ہمارے ساتھ کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ایسے میں قربان کے ذہن میں آیا کہ پیر آباد چلتے ہیں اور وہاں پیر سرکار کے مزار میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے مزار میں پناہ لے لی تو پھر چودھری افتخار بھی ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔ علاقے کے سب سے وڈے چودھری کی حمایت مل جاتی تو کسی بھی مخالفت کی جرأت نہیں رہتی، پر چودھری نے تو ہمارے ساتھ عجیب ہی چال چلی۔ اس نے قربان کے گھر والوں کو بلا کر اسے ان کے حوالے کیا اور مجھے اپنے ڈیرے پر قید کرنے کے بعد میرے بھاجی کو پیغام بھجوا دیا کہ اگر اپنی پگ بچانا چاہتے ہو تو اپنی بہن کا نکاح میرے چھوٹے پتر سے پڑھانے کو تیار ہو جاؤ ورنہ لڑکی تو ہمارے ہی قبضے میں ہے، ہم جو چاہیں گے اس کے ساتھ وہ سلوک کریں گے اور پھر تماشا بھی لگائیں گے۔ بھاجی وچارے اس دھمکی کو سن کر ڈر گئے۔ مجھے بچانا تو ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا، سوانہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنی پگ بچالیں۔ میں نے بھی ان کی خاطر ہتھیار ڈال دیئے ورنہ سچ یہ ہے کہ تمہارے اباجی کا کوئی فیصلہ ماننا تو دُور کی گل ہے۔ میں تو اس شخص پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی اور کشور کے خیال میں وہ اس نفرت کے لیے حق بجانب بھی تھی۔ جس نے اس کی محبت چھین کر اس کا وجود کسی ایب نارمل انسان کے حوالے کر دیا گیا ہو، اس لڑکی کے پاس خود سے زیادتی کرنے والے کے لیے نفرت کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں فریدہ! کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا۔ لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ میں تو خود روایتوں اور پابندیوں میں جکڑی ایک کمزور لڑکی ہوں جسے خود ہر پل کسی ایسے روزن کی تلاش رہتی ہے جہاں سے کچھ تازہ ہوا اور روشنی اندر آسکے۔''

''میں جانتی ہوں، تب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہو جانے کی خواہش کرنے لگو گی۔'' اپنی بات کے جواب میں کہی گئی فریدہ کی بات نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب رہنے دو۔ میں نہا کر آتی ہوں۔ تم اتنی دیر میں میرے لیے ناشتے پانی کا تو انتظام کرواؤ۔ ملازمہ سے کہنا کہ اسے رات کو آنکھیں بند کر کے رکھنے کا حکم ہے، اب دن میں تو آنکھیں کھول لے اور کچھ ہاتھ پیر چلائے۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور انداز بھی یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک لٹی پٹی سی عورت دکھائی دیتی تھی، اب کوئی چوٹ کھائی ہوئی ناگن لگ رہی تھی جس کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح خود کو چوٹ لگانے والے سے انتقام لے۔ اس سے یہ سب کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گئی لیکن کشور کچھ بھی نہ سمجھنے والے انداز میں اس اُلجھی پہیلی کے حل کے لیے ہی بیٹھی کوئی سرا کھوجتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

ولیمے کی تقریب میں شریک شہریار مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے اردگرد کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ تقریب میں بہت زیادہ لوگ شریک نہیں تھے۔ صرف مقامی افسران، زمینداروں اور رشتے داروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ ایسا یقیناً وقت کی قلت اور دولہا کی ذہنی معذوری کی وجہ سے ہوا تھا۔ ورنہ چودھری افتخار جیسا بندہ تو



موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ کس طرح اہم شخصیات سے تعلقات اور رسم و راہ بڑھائے۔ مگر آج کی اس تقریب کا رنگ پھیکا تھا۔ یہاں تک کہ دلہن کا بھائی چودھری بختیار بھی دعوت میں شریک نہیں تھا۔ اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے جاتا اور اس بے جوڑ شادی کے بارے میں اظہار کرتا۔ خود چودھری بختیار کی طرف سے بھی شادی کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ولیمے کی تقریب میں ملاقات ہو گی تو وہ چودھری سے اس ظلم کی بابت دریافت کرے گا لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ چودھری بختیار نے اپنی معذوری اور بیماری کا عذر پیش کر کے تقریب میں شرکت سے انکار کہلا دیا تھا۔

شہریار کے گرد سے لوگوں کا ہجوم چھٹا تو اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔ وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ ایک ملازم سے کہہ کر اس نے اسے اپنی ٹیبل پر بلوالیا۔

''کیا حال ہے آفتاب؟ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو سکے گی۔'' آفتاب کے قریب آنے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اس سے کہا۔

''جی ہاں، امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ حویلی کی کسی تقریب میں مجھے مدعو کیا جائے گا لیکن شاید وزیروں، سفیروں کی کمی کی وجہ سے ہماری گنجائش نکل آئی۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''وزیروں، سفیروں کو بلا کر چودھری افتخار کو اپنے لیے مصیبت بلوانی تھی؟ وزیر، سفیر آتے تو ساتھ میڈیا والے بھی آتے اور یہ بات خوب اُچھلتی کہ چودھری صاحب نے اپنے ذہنی معذور بیٹے کا نکاح ایک چھوٹے زمیندار کی صحت مند لڑکی سے کیا ہے۔ وہ لوگ اصل اسٹوری بھی کھوجنے کی کوشش کرتے کہ یہ نکاح ہوا کیسے؟ ویسے میرے خیال میں تمہیں تو علم ہو گا اس اسٹوری کا؟'' اس نے بڑے یقین سے آفتاب سے سوال کیا تو وہ انکار نہیں کر سکا اور کشور کی زبانی علم میں آنے والی تمام معلومات فراہم کر دیں۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چودھری بختیار عرصے سے چودھری افتخار کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا اس نے موقع دیکھ کر اس بے چارے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا لیا۔'' ساری تفصیل سن کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ اور آفتاب ٹیبل پر تنہا تھے اور گفتگو بھی دھیمی آواز میں ہو رہی تھی اس لیے کسی اور کے کچھ سن لینے کا احتمال نہیں تھا۔

''چودھری کی شقی القلبی کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں سر! ہم لوگ تو خود اُس کی اس فطرت کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔'' آفتاب دھیمے لہجے میں بولا۔ اسی وقت ملازمین نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔ ان کی میز پر کھانا لگ چکا تو چودھری خود لپک کر ان کی طرف آیا۔

''بسم اللہ کیجئے، اے سی صاحب! آج اس خوشی کے موقع پر تکلف بالکل بھی نہیں چلے گا۔'' آفتاب کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے شہریار سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ایکسکیوزمی! میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہیں، میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔'' آفتاب خود ہی معذرت کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے چودھری کی ناگواری بھانپ لی تھی کہ اسے ایک معمولی اسکول ٹیچر کا اس جگہ بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''شروع کیجئے جناب! میں دو چار لقمے آپ کے ساتھ لینے کے بعد باقی مہمانوں کا ساتھ دینے ان کے درمیان جا کر بیٹھوں گا۔ میری ذاتی خواہش تو یہی تھی کہ آپ سب معززین ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کرتے لیکن باجوہ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ آپ ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کریں گے۔ ایس پی صاحب سے بھی آپ کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ حضرات کو ایک میز پر جمع

ہونے کی زحمت نہ دی جائے۔ ناگواری کے ساتھ بھلا کیا خاک کچھ کھایا جاتا ہے۔'' اسے کھانے کی ترغیب دیتے ہوئے چودھری نے خود بھی اپنے لیے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا۔ شہریار نے البتہ چاول لینا پسند کیا۔ یہ چند لقمے چاول بھی وہ بمشکل ہی کھا سکا۔ ایک تو چودھری کی کمائی میں حرام کی آمیزش کا خیال، دوسرے احساس کہ ایک معصوم لڑکی کے ارمانوں کی راکھ پر خوشی کی یہ محفل برپا کی گئی ہے، اسے بری طرح کچوکے لگا رہا تھا۔ دُلہن اندر زنان خانے میں تھی لیکن دولہا کے طور پر اِدھر اُدھر پھرتے چودھری بہزاد کو دیکھا تو اندازہ لگایا ہی جا سکتا تھا کہ اس شادی سے اس بے چاری پر کیا گزری ہوگی۔

''آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں۔ ذرا سا چکھ کر ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ کچھ اور بھی لیجئے نا۔'' اسے ہاتھ کھینچتے دیکھ کر چودھری نے ٹیبل پر موجود انواع واقسام کی ڈشز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصرار کیا۔

''بس چودھری صاحب! مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''اچھا تو یہ ذرا سا میٹھا ہی چکھ لیں۔'' اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چودھری نے زبردستی اس کی پلیٹ میں کھیر ڈال دی۔ ناچار اسے دو تین چمچے کھیر کھانی پڑی۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا اس طرح سونگھنے کے انداز میں کھانا کھانا۔ بہرحال، میں آپ سے زبردستی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ بیٹھئے، میں ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھ لوں۔'' چودھری وہاں سے اٹھ کر اس دوسری میز پر چلا گیا جہاں باجوہ اور تارڑ کے علاوہ کچھ دوسرے مقامی افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ملازم شہریار کی میز پر سے کھانے کے برتن سمیٹنے لگا۔ ابھی برتن مکمل طور پر سمیٹے بھی نہیں گئے تھے کہ اسے پیٹ میں ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔

''لگتا ہے چودھری کا حرام مال مجھے ہضم نہیں ہوا۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فارمیلٹی پوری ہو گئی تھی اور اب مزید یہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر چودھری دیگر مہمانوں کو چھوڑ کر لپک کر اس کی طرف آیا۔

''ارے یہ کیا اے سی صاحب! آپ اتنی جلدی جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہمارا ارادہ تو آج کی رات آپ کو یہیں روکنے کا تھا۔ دوستوں کی تفریح کے ساتھ کچھ خاص انتظام کیا تھا ہم نے۔ آپ ہماری درخواست پر رک جائیں تو بڑے لطف اندوز ہوں گے۔'' ایک آنکھ دباتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں اسے ترغیب دی۔

''میری طرف سے معذرت چودھری صاحب! میرا ایسی کسی تفریح کا موڈ نہیں اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' پیٹ میں اُٹھنے والی درد کی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

''اگر آپ کی مرضی نہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ آیئے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ دوں۔'' اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے چودھری نے پیش کش کی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لیکن شہریار محسوس کر رہا تھا کہ ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اب تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید چکر اور متلی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑانے سے لگے۔

''آپ کی طبیعت تو زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ ایسا کریں آج رات یہیں حویلی میں آرام کر لیں۔ میں ڈاکٹر کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔ آرام آ جائے تو کل صبح واپس چلے جایئے گا۔'' اس کی حالت دیکھتے ہوئے چودھری نے پیشکش کی۔

''نہیں، میں واپس جاؤں گا۔'' تکلیف کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا لیکن پھر زوردار ابکائی آئی اور



اسے قے ہو گئی۔ چودھری فوراً ہی اپنے ملازمین کو آوازیں دینے لگا۔ ملازمین اس کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے۔ مہمان بھی متوجہ ہو گئے۔ متوجہ ہونے والوں میں آفتاب بھی شامل تھا۔

''اے سی صاحب کو اندر لے چلو اور ہسپتال سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔'' چودھری نے ہدایات جاری کیں جن پر فوراً عمل درآمد کیا جانے لگا۔ شہریار پر اتنی نقاہت طاری ہو چکی تھی کہ وہ اپنی کوئی رائے دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور کسی اور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چودھری کی رائے کے سامنے اپنی رائے دے سکتا۔ یوں بھی صورتِ حال کے مطابق اس نے جو احکامات جاری کیے تھے، وہ مناسب ہی معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب البتہ تشویش میں مبتلا تھا کہ اچانک شہریار کی اتنی زیادہ طبیعت کیسے خراب ہو گئی۔ کھانے سے قبل تو وہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی یہ حالت ہو جانا اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا کہ کہیں کھانے میں تو کوئی گڑبڑ نہیں تھی؟..... لیکن اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کھانے میں چودھری خود بھی شہریار کے ساتھ شریک تھا۔ اگر کھانے میں کچھ ملا ہوا تھا تو اس پر بھی اثر ہونا چاہئے تھا جبکہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ ملازمین شہریار کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اس قدر نڈھال ہو چکا ہے کہ تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے۔

''آپ یہیں رُکو ماسٹر صاحب! سرکار کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ بھیڑ بھاڑ سے مریض کو پریشانی ہوگی۔'' آفتاب جو بے اختیار ہی شہریار کو اٹھا کر لے جانے والوں کے پیچھے لپکا تھا، اسے ایک ملازم نے روک کر یہ حکم نامہ سنایا۔ اس حکم کو سن کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چودھری کی اجازت کے بغیر زبردستی اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی بات ایک طرح سے معقول ہی تھی۔ مریض کے گرد موجود تیمارداروں کا ہجوم بسا اوقات اس کے لیے باعثِ تسلی بننے کے بجائے زحمت بن جاتا ہے۔ وہ پریشان سا واپس ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ چودھری کے بندے فوری طور پر مرکزِ صحت سے ڈاکٹر کو لے کر آ گئے۔ یہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی جو دو دن قبل ہی پیر آباد پہنچی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پیچھے چودھری کا ایک ملازم بڑا سا میڈیکل باکس اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پہنچ جانے سے آفتاب کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ لوگوں کے درمیان سے نکل کر باہر کھلے حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں آنے والے مہمانوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ ان گاڑیوں میں شہریار کی گاڑی شناخت کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ ٹہلتا ہوا اس گاڑی تک چلا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مشاہرم خان کے بجائے کوئی اور ڈرائیور موجود تھا جو سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے مزے سے سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے کھلے شیشے سے ہاتھ اندر ڈال کر ڈرائیور کا شانہ ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔

''تمہارے صاحب کی طبیعت خراب ہے اور تم یہاں مزے سے سو رہے ہو۔'' ڈرائیور کے آنکھ کھولنے پر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''کیا ہوا صاحب کو؟'' وہ پریشانی کے عالم میں گاڑی سے اُترا۔

''معلوم نہیں۔ بس کھانا کھا کر باہر نکل رہے تھے کہ اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔ چودھری صاحب انہیں اپنے بندوں کے ذریعے اندر لے گئے ہیں۔ ہسپتال سے ڈاکٹر کو بھی بلوا لیا ہے۔ ڈاکٹر بھی اندر ہی ہے۔ آگے مجھے نہیں معلوم کہ کیا حال ہے؟'' اس نے بتایا۔

''میرے خیال میں ہمیں پی اے صاحب کو اس بات کی اطلاع دینی چاہئے۔'' ڈرائیور پریشانی سے بولا تو آفتاب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ پریشانی میں اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ عبدالمنان کو فون کر دے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو شہریار کا سچا بہی خواہ بھی تھا اور جسے روکنا چودھری کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنا موبائل نکال

کر عبدالمنان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

''پی اے صاحب کال ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔'' اس نے ڈرائیور کو بتایا۔

''آج ان کی سالی کی شادی ہے۔ وہ اُدھر گئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے شادی کے ہنگامے میں انہیں فون بجنے کا پتہ ہی نہ چلا ہو۔ آپ دوبارہ کوشش کر کے دیکھیں۔'' ڈرائیور نے اسے معلومات فراہم کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کرنے لگا۔ ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاع نے شہریار کی یہاں اکیلے موجودگی پر بھی روشنی ڈال دی تھی۔ ورنہ عموماً تو عبدالمنان اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

دوسری بار کوشش کرنے پر بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ آفتاب نے کچھ مایوس ہوتے ہوئے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ موبائل جیب میں رکھتے ہی بجنے لگا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو اسکرین پر عبدالمنان کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''خیریت آفتاب صاحب! آپ اس وقت کیسے کال کر رہے ہیں؟..... میں اصل میں اپنی سسٹر ان لا کی شادی میں آیا ہوا ہوں۔ یہاں رخصتی کا سلسلہ چل رہا تھا اس لیے ہنگامے میں مجھے آپ کی کال ریسیو کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' وہ بہت شائستہ لہجے میں اس سے دریافت کر رہا تھا۔ جواباً اس نے شہریار کی طبیعت کے بارے میں اسے آگاہ کر دیا۔

''بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے اطلاع دے دی۔ اب میں خود اس معاملے کو ہینڈل کر لوں گا۔'' ساری بات سن کر عبدالمنان نے کہا تو اس کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی لیکن بہرحال وہ تجربہ کار آدمی تھا جو ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ آفتاب اس سے بات کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہو گیا اور واپس اندر پنڈال میں چلا گیا۔

مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی تھی۔ صرف ایس پی معظم تارڑ اور چند ایک دوسرے افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ ان افراد کو یقینی طور پر شہریار سے دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ اپنے ضلع کے اے سی کو یہ باور کرانے کے لیے کہ انہیں اس کی بہت فکر ہے، ابھی تک یہاں رکے ہوئے تھے۔

''تسی فکر نہ کرو جی۔ اے سی صاحب یہاں بڑے آرام نال ہیں۔ ڈاکٹرنی نے چنگی طرح ان کو دیکھ لیا ہے، کہہ رہی تھی فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے۔ اس نے کچھ انجکشن وغیرہ لگایا ہے۔ اب اے سی صاحب کی حالت سنبھل گئی ہے۔ وہ آرام سے سو رہے ہیں۔ پھر بھی میں نے ڈاکٹرنی کو رات یہیں روک لیا ہے۔ وہ رات بھر یہیں رہ کر اے سی صاحب کی دیکھ بھال کرے گی۔ صبح پھر میں انہیں واپس بھجوانے کا بندوبست کر دوں گا۔'' آفتاب ان بڑے لوگوں کی ٹیبل سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس نے چودھری افتخار کی آواز سنی۔ یقیناً اس کے موبائل پر عبدالمنان کی کال آئی ہوئی تھی جسے وہ یہ تسلیاں دے رہا تھا۔

''آپ آنا چاہتے ہیں تو شوق سے آئیں۔ میں تو صرف اس لیے منع کر رہا ہوں کہ کہاں رات کے وقت اتنا لمبا سفر کر کے بے آرام ہوں گے۔ ہم یہاں شہریار صاحب کا خیال رکھ ہی رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف ضلع کے اے سی کا معاملہ تھوڑی ہے، ہمیں تو رانا صاحب کو بھی جواب دینے کی فکر ہے۔ ان کا بھانجا ہمارا مہمان بن کر کسی تکلیف میں مبتلا ہو، ہمارے لیے یہ کوئی اچھی گل تو نہیں ہے نا۔'' وہ اپنی مخصوص چرب زبانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے عبدالمنان کو یہاں آنے سے روکنا چاہتا ہو۔

''چلیں، اگر آئے بغیر آپ کی تسلی نہیں ہو سکتی تو پھر تشریف لے آئیں۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں۔ آپ کے استقبال کے لیے بھی تیار رہیں گے۔'' عبدالمنان نے یقیناً اس کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا، جب ہی اس



نے مایوسانہ انداز میں اسے یہ جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ اسی وقت اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔

''اوئے ماسٹر! تُو ابھی تک یہیں ہے؟ کیا بات ہے، کیا روٹی شوٹی نہیں ملی تجھے اب تک؟''

''میں اے سی صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکا ہوا ہوں۔'' چودھری کے توہین آمیز لہجے پر خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

''یہ بول نا کہ تجھے چمچہ گیری کا اچھا موقع ملا ہے۔ ابھی تیرا کوئی اور مطلب اٹکا ہوا ہوگا اے سی سے، جب ہی ادھر چکرا رہا ہے۔'' چودھری نے ایک اور طنز کیا۔

''میرا کیا مطلب اٹکنا ہے ان سے چودھری صاحب! میں نہ سرکاری افسر ہوں اور نہ ہی کوئی جاگیردار۔ علاقے کے چھوٹے موٹے مسائل کے حل کے لیے ضرور کوشش کرتا ہوں..... پر اللہ کا شکر ہے، یہ نئے اے سی صاحب خود ہی بہت اچھے آدمی ہیں۔ کسی کے توجہ دلائے بغیر بھی بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں حاسدوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ انشاء اللہ آنے والے وقت میں بہت کچھ بدل کر رہ جائے گا۔'' آفتاب بے باکی سے چودھری کو یہ جواب دے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بیرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں مزید رُکنا سودمند نہیں تھا۔ شہریار تک وہ لوگ اسے جانے نہیں دیتے اور یہاں رُکنے سے فضول مزید کوئی بدمزگی ہو جاتی تو یہ کسی بھی اعتبار سے اچھا نہیں ہوتا۔

''بالے! ڈاکٹرنی لو جا کر بول کہ تھوڑی دیر بعد اے سی کا پی اے ادھر آ رہا ہے۔ وہ چنگی طرح سب دیکھ بھال لے۔'' باہر نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں چودھری کی آواز پڑی۔ اپنے کارندے کو یہ عام سی ہدایت دیتے ہوئے اس کے لہجے میں جو طیش تھا، وہ یقیناً آفتاب کی باتوں کے ردِعمل میں پیدا ہوا تھا۔ چودھری کے اس طیش پر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل طیش تو اسے کل کا اخبار پڑھ کر آئے گا۔ مقامی اخبارات اگر اُس کے ایب نارمل بیٹے کی شادی پر خاموش تھے تو کیا ہوا؟ کل لاہور کے اخبارات میں تو یہ خبر آنی ہی آنی تھی۔

⊛----✪----⊛

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟'' اس کے اشارے پر ایک کرسی پر ٹکتے ہوئے آفتاب نے دریافت کیا۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اگر عبدالمنان آرام پر اتنا زیادہ اصرار نہ کرتا تو میں آج آفس چلا جاتا۔ معمولی سا فوڈ پوائزن تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کے ٹریٹمنٹ سے فوراً کنٹرول میں بھی آ گیا۔ کل سارا دن کچھ کمزوری کا احساس ضرور ہوا لیکن آج تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر بھی آرام کرنا مناسب تھا۔ عبدالمنان صاحب نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ پرسوں رات آپ کی جو حالت ہوئی تھی، اسے دیکھ کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔''

''مجھے تمہاری پریشانی کا علم ہے۔ تمہاری فون کال پر عبدالمنان کو آدھی رات کو دوڑ لگانی پڑی۔ بے چارہ صبح تک جاگتا رہا، پھر مجھے واپس لے کر یہاں آیا۔ یہاں بھی میں اس کی کڑی نگرانی میں ہوں۔ میرے آرام کے خیال سے وہ کسی کو مزاج پرسی کے لیے نہیں آنے دے رہا۔ کل چودھری افتخار کو بھی باہر ہی سے ٹال چکا ہے۔ تمہیں تو میری خصوصی سفارش پر اجازت ملی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''جی ہاں، مجھے علم ہے۔ کل میں نے فون پر خیریت معلوم کی تھی، تب ہی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ فی الحال آپ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتی۔ اسی لیے تو میں آج آیا ہوں۔'' آفتاب نے مسکراتے لبوں کے ساتھ کہا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ کی اس طرح اچانک طبیعت خراب ہو کیسے گئی؟

آپ نے واپس آنے کے بعد کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا؟''

''یقیناً کھانے پینے میں کوئی بداحتیاطی ہوگئی ہوگی۔ شاید میں نے دوپہر کو جو کھانا کھایا تھا، وہ صحیح سے ہضم نہیں ہوا تھا۔ اس پر میں نے دعوت کا کھانا بھی کھالیا تو معدہ برداشت نہیں کرسکا۔ رہی کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کی بات تو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر مارا یہ اچھی ڈاکٹر ہے۔ میں اس کی تجویز کردہ میڈیسن لے رہا ہوں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے سر! کہ گڑبڑ دعوت والے کھانے میں ہی ہو۔ چودھری افتخار جیسے شخص سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔'' آفتاب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''ارے نہیں، میرے خیال میں وہ اپنے گھر پر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی مجھے یہ تکلیف پہنچا کر اسے کیا فائدہ مل سکتا تھا؟ ویسے عبدالمنان احتیاطاً اہم معاملات کی چیکنگ کروا چکا ہے۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ جس سے یہ شک گزرے کہ مجھے غافل کر کے ان لوگوں نے علاقے سے مال اِدھر اُدھر کرنے کی کوشش کی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب ایک اتفاق ہی تھا۔''

''ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہو۔ ورنہ چودھری افتخار پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے چودھری جیسا موقع پرست آدمی نہیں دیکھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کی مثال سامنے ہی ہے۔ چودھری بختیار سے بدلہ لینے اور اس کا سر اپنے آگے جھکائے رکھنے کے لیے اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی کس طرح داؤ پر لگائی ہے، یہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔'' آفتاب اب بھی مشکوک ہی تھا۔

''واقعی یہ معاملہ ہے تو بہت افسوس ناک۔ لیکن ورثاء کی موجودگی میں ہونے والے اس نکاح کو چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں، اگر لڑکی خود اس سلسلے میں کوئی احتجاج کرے تو ہم اس کی مدد کرسکتے ہیں۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''میں کشور کے ذریعے فریدہ کو یہ پیغام بھیجوں گا کہ وہ آپ کے پاس انصاف کے لیے تحریری درخواست بھجوادے۔ فریدہ نے جو درخواست بھیجنی چاہی تو کشور اس کام میں اس کی بھرپور مدد کریں گی۔ میں تو بہرحال اس ظلم کے خلاف اپنے طور پر جس طریقے سے احتجاج کرسکتا تھا، وہ کر چکا ہوں۔ آپ نے لاہور سے نکلنے والے کل کے اخبارات تو دیکھ ہی لیے ہوں گے؟''

''اوہ ہاں، اچھا تو یہ تم تھے جس نے چودھری بہزاد کی تصویر کے ساتھ خبر اخبار کے دفتر تک پہنچائی تھی؟'' آفتاب کے سوال پر وہ چونک کر بولا۔ دولہا والی تیاری کے ساتھ کسی تین چار سالہ بچے کی طرح روتے مچلتے چودھری بہزاد کی وہ تصویر یقینی طور پر ایسی تھی کہ کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔

''جی ہاں، یہ میرا ہی کام تھا۔ میں دعوت میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا ہی تھا کہ میری نظر چودھری بہزاد پر پڑی۔ حویلی کے دو تین ملازمین اسے لے کر اپنے ساتھ پنڈال میں داخل ہونے والے تھے کہ وہ اچانک اس بات پر پھیل گیا کہ دلہن کو بھی وہاں بلایا جائے۔ ملازم اسے سمجھاتے رہے کہ دلہن زنان خانے میں ہے اور اسے باہر مردوں میں نہیں لے جایا جاسکتا مگر وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ضد میں آکر اس نے نیچے زمین پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑنی شروع کردیں۔ میرے پاس موبائل تو موجود ہی تھا، موقع کا فائدہ اٹھا کر میں نے چودھری بہزاد کی تین چار یادگار تصویریں کھینچ لیں اور جس اخبار کے لیے لکھتا ہوں، اس کے ایڈیٹر کو تصویریں مع خبر Send کردیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ خبر میں چودھری افتخار کا کھل کر نام نہیں لیا گیا۔ صرف یہ لکھا گیا ہے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں کے چودھری کے بیٹے کے ولیمے کے موقع پر لیا گیا دولہا کا خصوصی پوز۔ تفصیل



میں بھی اتنا ہی درج ہے کہ ایک بااختیار جاگیردار نے اپنے ایب نارمل بیٹے کی شادی زبردستی ایک صحت مند لڑکی سے کروادی۔ دولہا ایک صحت مند یا کسی بھی قسم کی لڑکی سے شادی کرنے کا کتنا اہل ہے، اس کا اندازہ اس تصویر کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔''

آفتاب نے تفصیلات بتائیں تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر ایک ذرا سی تشویش میں بولا۔ ''کہیں تمہاری یہ جرأت تمہیں مہنگی نہ پڑ جائے۔ چودھری اخبار کے ایڈیٹر سے یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گا کہ اس کے خلاف یہ خبر کس نے لگوائی ہے؟''

''کر دیکھے کوشش۔ ایڈیٹر سب سے پہلے تو اسے یہ جواب دے گا کہ جناب! ہمیں نہیں معلوم کہ یہ خبر آپ کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک فری لانسر صحافی نے ہمیں بغیر کسی حوالے کے یہ خبر بھیجی تھی، سو ہم نے چھاپ دی۔ معلوم ہوتا کہ اس خبر کا تعلق آپ سے ہے تو آپ سے تصدیق کر لیتے۔ ویسے تو خبر مع ثبوت تھی لیکن اگر آپ کے مطابق جھوٹی ہے تو ہم اپنی اس غلطی کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایک عدد تردیدی بیان دے دیں، ہم اسے بھی اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔''

''اور بے چارہ چودھری یہ کر نہیں سکتا۔ اس کے تردیدی بیان دینے کا مطلب ہوگا کہ جن لوگوں کو علم نہیں، انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ خبر چودھری افتخار کے متعلق ہے۔ بہت خوب..... زبردست زک پہنچائی تم نے چودھری کو۔ دیکھنے میں کتنے شریف اور سیدھے سادے لگتے ہو لیکن ہو نا جرنلسٹ..... کہیں نہ کہیں اپنی اصلیت دکھا ہی جاتے ہو۔'' وہ بے حد محظوظ ہوا۔

''دوسرے لفظوں میں آپ مجھے چالاک اور چالباز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو حقیقت تھی، میں نے لوگوں کو وہی بتایا۔ دھوکا تو چودھری افتخار جیسے لوگ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بہزاد چودھری کے بکھر جانے پر ملازمین اسے واپس لے گئے تھے اور پھر وہ تقریباً تقریب کے اینڈ میں ہی دوبارہ نظر آیا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ میرا خیال ہے اسے کوئی خاص میڈیسن دی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل گم صم ہوگیا تھا اور چپ چاپ وہی کر رہا تھا جو اس کے ساتھ موجود ملازم اُس کے کان میں کہتا جا رہا تھا۔''

کچھ احتجاجی انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے شہریار کی توجہ ایک اہم نکتے کی طرف مبذول کروائی۔

''واقعی یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چودھری نے یہ بہانہ تو پہلے ہی بنا دیا تھا کہ دولہا کی طبیعت کچھ ناساز ہے اس لیے جو لوگ حقیقت سے واقف ہیں، انہیں چھوڑ کر باقی لوگ یہی سمجھے ہوں گے کہ خرابیٔ طبیعت کی وجہ سے دولہا بے چارہ کچھ سست سست نظر آرہا ہے۔'' اس نے داد دینے والے انداز میں آفتاب کے تجزیے سے اتفاق کیا۔

اسی وقت ایک ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ چائے پیش کرنے کے ساتھ اس نے ایک خاکی لفافہ بھی شہریار کے سامنے رکھا۔ ملازم کی اس حرکت پر وہ چونک گیا۔ کسی ملاقاتی کی موجودگی میں کسی بھی قسم کی ڈاک کا اس طرح پیش کیا جانا معمول کے خلاف تھا۔ وہ لفافہ اٹھائے بغیر نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ قریبی شہر کے ڈاک خانے کی مہر لگا یہ عام سا لفافہ تھا لیکن اس پر لکھے اس کے نام کے ساتھ پرسنل اور موسٹ ارجنٹ کے الفاظ اسے خاص بنا رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور اُلٹ کر دوسری طرف بھیجنے والے کا نام دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی نام موجود نہیں تھا۔ اس نے کسی قدر اُلجھن محسوس کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور ہاتھ ڈال کر اس کے اندر سے کارڈ سائز کی ایک تصویر باہر نکالی۔ اگلا لمحہ اس کے لیے بے حد دھماکا خیز تھا۔ وہ اس بری طرح شاکڈ ہوا تھا کہ اپنے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت بھی چھپانے میں

کامیاب نہ ہوسکا۔

''خیریت ہے سر؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' آفتاب کی آواز کانوں میں پڑی تو اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ پر تنہا نہیں ہے۔ اس نے چونک کر تصویر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ملازم واپس جا چکا تھا جبکہ آفتاب کرسی پر بیٹھا اسے پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی آفتاب! آپ چائے پئیں۔ میں مزید آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا۔'' حیران پریشان آفتاب سے کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ خاکی لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا، البتہ لفافے سے نکلنے والی تصویر اس نے واپس اندر ڈال دی تھی۔

⊛----✪----⊛

''گڈ ایوننگ سر!..... معاف کیجیے گا، مجھے آپ کے پاس آنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ اصل میں جب آپ کا ڈرائیور پیغام لے کر پہنچا تو کافی مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں فارغ کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اچھا نہیں لگتا تھا نا کہ کسی بڑے آدمی کی کال پر بے چارے غریبوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا جائے۔ ویسے بھی مجھے تسلی تھی کہ آپ کو کوئی ایمرجنسی نہیں ہوسکتی۔ ایمرجنسی کی صورت میں آپ اتنی دور سے مجھے بلانے کے بجائے یہیں پر کسی ڈاکٹر سے رابطہ کرتے۔ یقیناً آپ نے مجھے صرف اپنی تسلی کے لیے چیک اپ کروانے بلایا ہوگا۔'' یہ ڈاکٹر ماریہ تھی جسے شہریار کے حکم پر پیرآباد سے بلوایا گیا تھا۔ اس کے پہنچنے تک وہ گویا دہکتے انگاروں پر چلتا رہا تھا اور اب انگاروں جیسی ہی سرخی اس کی آنکھوں میں اُتری ہوئی تھی جس سے مکمل طور پر بے خبر ڈاکٹر ماریہ اپنے دیر سے آنے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے بڑی مگن سی اپنے شولڈر بیگ سے اسٹیتھ اسکوپ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کی نبض چیک کرنی چاہی۔

''خبردار! دُور رہو مجھ سے اور آرام سے اس کرسی پر جا کر بیٹھو۔'' اس کے کلائی پکڑنے سے پہلے ہی شہریار نے بے حد سرد لہجے میں حکم جاری کیا۔

''لے..... لیکن سر!..... میں آپ کا چیک اپ کیسے کروں گی؟'' وہ ہکلائی۔

''کیسا چیک اپ؟..... کیا ویسا ہی جیسا تم نے پیرآباد میں چودھری افتخار کی حویلی میں کیا تھا؟'' شہریار نے طنز سے پوچھا۔

''میں سمجھی نہیں سر! کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟ میں نے تو اپنی طرف سے آپ کو بہترین ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ آپ کی طبیعت چند گھنٹوں میں ہی سنبھل گئی تھی۔ اب بھی آپ مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں پھر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ کیا آپ کے خیال میں مجھ سے آپ کی خدمت میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے؟'' وہ اس کے حکم پر کرسی پر ٹک تو گئی لیکن خوفزدہ سے انداز میں اس نے ایک ہی سانس میں کئی وضاحتیں اور سوالات کر ڈالے۔

''میری خدمت.....'' شہریار کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''خدمت تو تم نے چودھری افتخار کی، کی ہے۔ مجھے تو تم اب یہ بتاؤ گی کہ اس خدمت کے صلے میں چودھری نے تمہیں کتنی رقم ادا کی ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تو پھر یہ دیکھ لو۔ شاید انہیں دیکھ کر تمہیں بہت کچھ سمجھ میں آجائے۔'' اس نے سائیڈ میں رکھے لفافے سے تصویریں نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینکیں۔ ان تصویروں کی تعداد تین تھی۔ اس وقت اس نے آفتاب



کے سامنے محض ایک ہی تصویر نکال کر دیکھی تھی اور وہ تصویر اتنی شرم ناک تھی کہ وہ لفافے میں دوبارہ کی تصویریں نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ تصویر میں اسے اور ایک لڑکی کو جس شرم ناک انداز میں دکھایا گیا تھا، اس کے بعد تو اسے اپنا دماغ ہی بھک سے اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جب ہی اس نے آفتاب کو بھی بے حد سرد مہری کے ساتھ نظرانداز کر دیا تھا۔ کوایجوکیشن میں پڑھنے، مکس گیدرنگز میں شرکت کرنے اور کئی خواتین سے دوستی ہونے کے باوجود اسے اپنے کردار پر ہمیشہ ناز رہا تھا۔ نہ خود اس نے کبھی حدود پار کی تھیں اور نہ ہی کسی اور کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ اس کے شفاف کردار پر بدنما داغ بن سکے۔ لیکن یہ تصویریں کہہ رہی تھیں کہ وہ تصویر میں موجود لڑکی کے ساتھ ہر حد پار کر گیا تھا۔ تصویریں اتنی بے باک اور شرم ناک تھیں کہ اس جیسے شفاف کردار کے مالک شخص کے بجائے کوئی کرپٹ آدمی بھی ہوتا تو حواس کھو بیٹھتا۔ کیونکہ بہرحال تصویروں کے حقیقی یا غیرحقیقی ہونے سے قطع نظر انہیں کھینچے جانے کا مقصد صرف ایک ہوسکتا تھا..... وہ تھا تصویر میں موجود بندے کو بلیک میل کرنا..... اور وہ جانتا تھا کہ اپنے کیریئر کے اس پہلے مرحلے پر ہی وہ کس کے گلے میں اٹک گیا تھا؟ اور کون تھا جو اس کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر سکتا تھا؟ یہ سب کب اور کیسے ہوا؟ یہ سمجھنا بھی اس کے لیے دو جمع دو چار کی طرح سیدھا سادہ حساب تھا۔ آفتاب نے ٹھیک کہا تھا کہ چودھری کسی صورت بھی اعتبار کے لائق نہیں لہٰذا طبیعت بگڑنے پر طبی امداد کے بہانے اسے حویلی کے اندر لے جایا گیا اور علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر ماریہ کو بلایا گیا۔ حالانکہ مرکزِ صحت میں تو میل ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ بے ہوشی کے اس عالم میں اس کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا، اس وقت اسے خبر نہیں ہوسکی لیکن اب تصویریں دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر دشمن غضب کی چال چل گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کی صورت میں اس کے سامنے دشمن کا جو اہم ترین مہرہ موجود تھا، اس نے سب سے پہلے اسی سے نمٹنے کا سوچا تھا اس لیے اب وہ اس کی رہائش گاہ پر اس کے سامنے موجود تھی۔

''یہ کیا ہے؟..... آپ یہ بے ہودہ تصویریں مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟'' تصویروں پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر ماریہ کا چہرہ سفید ہوگیا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا، تو یہ تصویریں بے ہودہ ہیں؟ کمال ہے، اس بات کا خیال آپ کو تصویریں اُتروا تے وقت کیوں نہ آیا؟''

''آپ مجھ پر کس قسم کی الزام تراشی کر رہے ہیں؟ میں آپ کی یہ فضول الزام تراشیاں سننے کے لیے کسی صورت بھی یہاں نہیں رک سکتی۔'' اس کے طنز پر وہ تنتناتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''آرام سے تشریف رکھیں خاتون! میری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے کہیں نہیں جاسکتیں۔'' اس نے سرد لہجے میں حکم دیا۔

''آپ کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں؟ میرا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ان سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تصویروں میں جو لڑکی نظر آ رہی ہے، وہ آپ ہی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟ ان تینوں میں سے کسی بھی تصویر میں لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ صرف آپ کا چہرہ واضح ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل پیش کی۔ لیکن لہجے کا کھوکھلا پن اس دلیل کو کمزور ثابت کر رہا تھا۔

''میرے یقین کے پیچھے دو بڑی وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تصاویر دو دن پہلے اس وقت چودھری افتخار کی حویلی میں کھینچی گئیں جب میں بے ہوش تھا۔ نمبر دو یہ کہ تصویر میں آپ کی شکل نہ سہی، مگر شانوں تک کٹے ہوئے براؤن اور گولڈن بال صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس ہیئر اسٹائل اور ہیئر کلر والی کوئی دوسری خاتون میں نے چند دنوں میں اپنے آس پاس بالکل نہیں دیکھی۔'' اس نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

''آپ بہت ذہین ہیں۔''

''تعریف کے لیے شکریہ۔ لیکن بہرحال میں نے آپ سے یہ تعریفی کلمات سننے کے لیے آپ کو زحمت نہیں دی۔ میں جاننا چاہتا ہوں بلکہ جانتا تو ہوں مگر یوں سمجھئے کہ آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس کی ایما پر یہ کام کیا؟ اور اس کے لیے کیا قیمت وصول کی؟ یقیناً اس کام کی قیمت تو اس سیلری کے مقابلے میں اور بھی زیادہ اچھی ہوگی جس کے لالچ میں آپ نے شہری زندگی چھوڑ کر ایک گاؤں میں آ کر رہنا اور جاب کرنا منظور کر لیا۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولتے ہوئے خود کو بہت قابو میں رکھے ہوئے تھا لیکن درحقیقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسیحا کے روپ میں اس کرپٹ لڑکی کے ساتھ کس بری طرح پیش آئے۔ ڈاکٹر ماریہ نے اس کی ہر بات خاموشی سے سنی پھر منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آپ کے سامنے جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں آپ جتنا چاہیں مجھے برا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آپ کی طرح ٹریپ کیا گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے اس مکروہ کام کے لیے راضی نہیں ہوئی۔'' ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس نے یہ چند جملے کہے تو شہریار چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والد میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری ممی نے خود جاب کر کے بڑی جدوجہد سے مجھے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ مجھے پریکٹس شروع کیے صرف تین سال گزرے ہیں۔ اپنی ملازمت کے بعد میں نے ممی سے جاب چھڑوا دی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک مصیبت نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ ایک روز میں اپنی جاب سے واپس آ رہی تھی کہ ایک آدمی نے مجھے روک کر ضروری بات کے لیے قریبی ریسٹورنٹ چلنے کو کہا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو اس نے چائے پینے کے دوران مجھے پیر آباد کے مرکزِ صحت میں رہائش اور اچھی سیلری کے ساتھ جاب کی آفر کی۔ اس شخص کی پیشکش پُرکشش تھی لیکن میں شہر چھوڑ کر گاؤں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں جس پرائیویٹ ہسپتال میں جاب کر رہی تھی، وہ بہت نامور تھا اور وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ اپنی وہ جاب چھوڑ کر میں پیر آباد آ جاتی تو تجربہ کار ڈاکٹرز کی راہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ میری ممی کا تھا۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے ممی بہت سوشل تھیں۔ جاب چھوڑنے کے باوجود ان کا دوستوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں پیر آباد آتی تو انہیں بھی یہاں آنا پڑتا اور یقینی بات ہے کہ گاؤں کی محدود زندگی میں وہ بور ہو جاتیں۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے اس شخص کی بہت اچھی آفر کے باوجود اس ملازمت کے لیے انکار کر دیا۔'' اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اب اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔

''میرے انکار کے باوجود وہ شخص مسلسل میرے پیچھے پڑا رہا۔ سیلری کی آفر بھی ڈبل کر دی لیکن مجھے اُس



کے اس طرح پیچھے پڑنے سے کچھ چڑ ہو گئی اس لیے میں نے پھر انکار کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اصرار دھمکیوں میں تبدیل ہو گیا۔ جب میں ان دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لائی تو میرے ساتھ وہ گھٹیا چال چلی گئی جس کے بعد میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

''کیسی چال؟'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو کر اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو کھوجنے لگی تو شہریار کو اسے ٹوکنا پڑا۔

''ایک دن ہسپتال جاتے ہوئے مجھے راستے میں اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے کون تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں چند گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں ان کے قبضے میں رہی، پھر ہوش آنے کے بعد مجھے واپس میرے گھر پہنچا دیا گیا۔ چونکہ یہ سب چند گھنٹوں میں میرے ڈیوٹی آورز میں ہوا تھا، اس لیے ممی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ خود میں نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ میرے اندازے کے مطابق کڈنیپرز سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن اگلے ہی دن ڈاک سے موصول ہونے والی شرم ناک تصویروں نے مجھے بتایا کہ مجھے کس طرح ٹریپ کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد میں پیر آباد آنے سے انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔ خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے مجھے یہ مطالبہ ماننا پڑا۔''

''اور شاید اسی بلیک میلنگ سے ڈر کر آپ نے میرے خلاف کھیلے جانے والے ڈرامے کا حصہ بننا بھی منصور کر لیا؟'' شہریار نے نتیجہ اخذ کیا۔

''جی ہاں۔'' اس کا سر جھک گیا۔ ''میں واقعی مجبور ہو گئی تھی۔ بدنامی کے خوف سے میں نے وہ دوا فراہم کر دی جس کو کھا کر آپ کی حالت بگڑ گئی اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر آپ کی بے ہوشی کے دوران ہی یہ شرمناک تصویریں کھینچ لی گئیں۔ میں نے اپنے طور پر احتجاج ضرور کیا لیکن میری اپنی تصویروں نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں نے مجھے تسلی دی کہ آپ کے ساتھ کھینچی جانے والی تصویروں میں میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ وعدہ پورا بھی کیا گیا لیکن آپ اپنی ذہانت کی وجہ سے حقیقت سمجھ گئے۔''

''ذہانت کی بات نہیں، یہ بالکل سیدھا سادہ معاملہ ہے جو ذرا غور کرنے پر کسی بھی شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اتنا لمبا کھٹ راگ ان لوگوں نے صرف مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تو کھڑا نہیں کیا ہوگا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ وہ آئندہ بھی آپ کو اس قسم کے کاموں کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ آپ چند تصویروں کی وجہ سے کب تک ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہیں گی؟''

''میری خود سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟'' اس کے پوچھنے پر وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بے بسی سے بولی

''تھوڑی سی ہمت کریں۔ آپ ہمت کر کے بیان ریکارڈ کروانے پر راضی ہو جائیں تو ہم دونوں مل کر چودھری کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔''

''یہ کسی صورت ممکن نہیں۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کسی ریکارڈ پر لانا تو دور کی بات، میں چودھری کے سامنے بھی اسے نہیں دُہرا سکتی۔'' ڈاکٹر ماریہ نے صاف انکار کیا۔

''لیکن کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ اب تصویروں سے بھی بڑھ کر میری ایک کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پیر آباد آتے ہوئے اپنی ممی کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ مجھے یہاں ارجنٹ آنا پڑتا تھا جبکہ ممی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے تمام احباب سے الوداعی ملاقات کر کے اور گھر کا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں آئیں۔

لیکن وہ نہیں پہنچیں۔ آج صبح میں نے ان سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے کسی اجنبی نے میری کال ریسیو کی اور مجھے بتایا کہ میری ممی اس کے قبضے میں ہیں۔ اگر میں نے کسی بھی معاملے میں زبان کھولی تو میری ممی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے، وہ انسانیت کے ناطے صرف یہ سوچ کر بتایا ہے کہ آپ اپنے تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر لیں۔ میں بہرحال، آپ سے اس کے سوا مزید کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔'' وہ ایک دم ہی رُوڈ ہوگئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ کھل کر میرے ساتھ تعاون نہیں کر سکتیں لیکن کچھ سوالات کے جواب تو دے سکتی ہیں؟''

''کیسے سوالات؟ آپ پوچھ کر دیکھ لیں۔ اگر مجھے لگا کہ ان سوالات کے جواب دینا میرے اور میری ممی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے تو میں آپ سے تعاون کروں گی۔'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''آپ تسلی رکھیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' شہریار نے اسے یقین دلایا پھر اگلے پندرہ منٹ ان دونوں کے درمیان سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران وہ اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڈ پر کچھ ضروری نوٹس لیتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے مطمئن ہوتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی اور خود فون پر مصروف ہوگیا۔

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لیے جلد دوم کا مطالعہ کیجئے۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....
افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

دوم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے



''آئی جی صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کا محکمہ آخر کیا کرتا پھر رہا ہے؟''
''میں سمجھا نہیں جناب کہ آپ کس بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟'' وزیر اعلیٰ کے نہایت غصے کے ساتھ پوچھے گئے سوالات کے جواب میں اس نے ٹھنڈے لہجے میں بے نیازی کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔
''خواجہ سراؤں کی گرفتاری کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ کیا محکمۂ پولیس کے پاس کرنے کے لیے کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہے جو آپ لوگ ان مظلوم افراد کے پیچھے لگ گئے ہیں؟'' وزیر اعلیٰ کو یقیناً اس کی بے نیازی ناگوار گزری تھی چنانچہ اس کا لہجہ کچھ اور خراب ہو گیا۔
''یہ ایک ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے سر! جس پر محکمۂ پولیس پوری جاں فشانی سے کام کر رہا ہے۔'' اس بار آئی جی مختار مراد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔
''ٹاپ سیکرٹ معاملہ.....'' وزیر اعلیٰ نے ایک استہزائیہ سا ہنکارا بھرا۔ ''آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ ایک نجی معاملہ ہے جس کے پیچھے آپ محکمۂ پولیس کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے اور آپ کے داماد نے پولیس اور پبلک کو بتایا ہے، مجھے بھی بس اتنا ہی معلوم ہے؟''
''مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے محکمے میں ایسے کئی لوگ ہیں جو ملازمت تو پولیس کی کرتے ہیں لیکن خدمت سیاست دانوں کی انجام دیتے ہیں۔ آپ کو بھی آپ کے کسی نمک خوار نے بہت کچھ بتا دیا ہو گا لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ ملکی مفادات میں ہی ہو رہا ہے۔'' مختار مراد نے سپاٹ سے لہجے میں وضاحت دی۔
''سیاست داں ہونے کا طعنہ نہ دیں آئی جی صاحب! سیاست داں تو آپ کے سمدھی صاحب بھی ہیں اور شاید اسی وجہ سے آپ کے داماد من مانی کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں تو دو طرفہ سپورٹ مل گئی ہے لیکن یاد رکھیں کہ سجاد رانا کا یہ پاگل پن اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر اس کی بیٹی کے اغوا اور موت کے پیچھے خواجہ سراؤں کا کوئی گروپ تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شہر بھر کے خواجہ سراؤں کا جینا دوبھر کر دے۔ پریس نے پہلے ہی اس سلسلے میں اچھا خاصا طوفان اُٹھایا ہوا ہے۔ خواجہ سرا الماس کے پولیس کسٹڈی میں مارے جانے کا میڈیا نے بڑی شدت سے نوٹس لیا ہے۔''
''ایکسکیوزمی سر! خواجہ سرا کو پولیس کسٹڈی میں مارا نہیں گیا بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔'' مختار مراد نے فوراً دخل دے کر انہیں ٹوکا۔
''یہ تو آپ کا مؤقف ہے نا جس پر پبلک یقین نہیں کرتی۔ پولیس کسٹڈی میں ملزمان پر کیے جانے والے غیر انسانی تشدد کے نتیجے میں ان کی جان چلی جانا اور اس واقعے کو خودکشی قرار دے دینا آپ کے محکمے کی بہت

PAKISTANIPOINT

پرانی روایت ہے جس سے اب سب ہی واقف ہو چکے ہیں۔"

"میں آپ کے اس الزام کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الماس کی موت واقعی خودکشی کے نتیجے میں ہوئی تھی ورنہ ہم اس سے جو معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے حصول کے لیے اس کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ میرے اس بیان پر یقین کریں یا نہ کریں۔ بہرحال، میں آپ سے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس وقت آپ کے کال کرنے کا کیا سبب ہے؟ ظاہر ہے آپ نے ان گزرے ہوئے واقعات پر گفتگو کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔" مختار مراد نے چبا چبا کر بولتے ہوئے دریافت کیا۔

وزیراعلیٰ کے اختیارات اور پہنچ اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ خود بھی کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں تھا کہ ایک ایسا شخص جو اپنی پارٹی کے حکومت میں ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر عروج و زوال کے دور سے گزرتا رہتا ہو، ان پر مکمل طور پر حاوی ہو سکتا۔

"میرے پی آر او نے مجھے اطلاع دی ہے کہ لاہور کے سارے خواجہ سرا مل کر وزیراعلیٰ ہاؤس کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ کیونکہ کل رات پولیس نے پھر کسی خواجہ سرا کو گرفتار کیا ہے۔ اور ویسے بھی پولیس مسلسل ان لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ تفتیش کے نام پر ان لوگوں کو کئی کئی گھنٹے تھانوں میں بٹھا کر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا کام دھندا متاثر ہوتا ہے۔"

"اور شاید وہ لوگ بھی جو ان کی خدمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" مختار مراد نے یہ بات صرف دل میں سوچی مگر کہی نہیں۔ پچھلے عرصے کی تحقیقات کے نتیجے میں ایسے چند افراد کے نام سامنے آئے تھے جو سرکاری طور پر بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان افراد کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جس دوسری قسم کا شوق رکھتے ہیں اس کی تسکین کے لیے انہیں اس قسم کے افراد کی ہی حاجت ہوتی ہے۔ ان کے محکمے کو ثبوت تو نہیں ملے لیکن انہیں شک سا تھا کہ خواجہ سراؤں میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ان شوقین افراد کا دل بہلانے کے عوض قیمتی معلومات حاصل کر کے پڑوسی ملک تک منتقل کر رہے تھے۔ سندر رام کی ٹیکسٹائل مل میں تیار کردہ کپڑے کے چند مخصوص تھانوں کا انڈین آرمی کے ہاتھ ہی فروخت کیا جانا ایک بہت ہی قابل غور بات تھی۔ یقیناً کپڑے کے یہ تھان معلومات کی خفیہ ترسیل کا ذریعہ بنے رہے تھے۔ سندر رام کی موت کے بعد چونکہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس سلسلے میں حتمی ثبوت تو کوئی نہیں تھا، بس واقعات کی ترتیب کو سامنے رکھ کر ہی قیاس آرائی کی جا سکتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ محکمۂ پولیس کی طرف سے آپ مجھے اس سلسلے میں یقین دہانی کروائیں کہ اب شہر کے کسی خواجہ سرا کو تنگ نہیں کیا جائے گا تاکہ میں احتجاج کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر سکوں۔ ورنہ یاد رکھئے کہ آپ کا محکمہ میڈیا کی زبردست تنقید کی زد میں آ جائے گا۔" اس کی سوچ اور پریشانیوں سے بے خبر وزیراعلیٰ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کر لیں وعدہ۔" مختار مراد نے جان چھڑائی۔

"آپ نے اور آپ کی پارٹی نے اس سے پہلے کب عوام سے کیا ہوا کوئی وعدہ وفا کیا ہے جو اس ایک وعدے کے پورا نہ ہونے پر کسی کو حیرت ہوگی۔" یہ اس کے ذہن میں اُبھرنے والی وہ سوچ تھی جس کا اس نے وزیراعلیٰ کے سامنے اظہار نہیں کیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہو جانے کو غنیمت جانتے ہوئے ریسیور واپس رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ابھی مشکل سے پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ ریسیور اٹھانے پر اسے دوسری طرف سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے آن لائن ہونے کی اطلاع ملی۔



"ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔" اس نے مصروف سے انداز میں اجازت دی۔

"ایک بیڈ نیوز ہے انکل!" اس کی ہیلو کے جواب میں سجاد رانا کی کچھ پریشان سی آواز سنائی دی۔

"کیا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کل رات جس خواجہ سرا کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ پولیس کسٹڈی میں مر گیا ہے۔"

"کیسے؟" اس اطلاع پر وہ بھونچکے رہ گئے۔

"حتمی طور پر تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ موت کا سبب زہر خورانی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد اس شخص کی مکمل تلاشی لی گئی تھی اور اس کے پاس معمولی سے معمولی شے بھی قبضے میں لے لی گئی تھی اس لیے یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ اس نے اپنے پاس زہر رکھا ہوا تھا جسے کھا کر خودکشی کر لی۔ یقیناً اس کی موت کا سبب بننے والا زہر باہر سے ہی آیا تھا اور یہ بات ہمارے محکمے کے لیے بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔"

"یہ تو تم نے بہت تشویش ناک بات بتائی ہے۔ اس ایشو کو لے کر تو میڈیا بہت طوفان برپا کرے گا۔ پہلے ہی ہم پر مسلسل تنقید ہو رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری وزیراعلیٰ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بری طرح برہم ہو رہے تھے کہ ہمارا محکمہ کیوں ہاتھ دھو کر خواجہ سراؤں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔" وہ سجاد رانا کو وزیراعلیٰ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

"یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ شینا کی ڈیتھ کے بعد ڈیڈی خود کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ ان کی صحت فی الحال اس لائق نہیں کہ کسی سیاسی محاذ آرائی میں اُلجھ سکیں۔ ان حالات میں اگر وزیراعلیٰ بھی میڈیا کے ساتھ مل گئے تو ہمیں بہت مشکل ہو جائے گی۔" ساری بات سن کر سجاد رانا نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اگر کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ وزیراعلیٰ ہر حال میں میڈیا کے ساتھ ہی کھڑے ہوں گے۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ بہرحال، تب فی الحال سب سے پہلے تو ملزم کی موت کے وقت ڈیوٹی پر موجود عملے کی معطلی کے احکامات جاری کرواؤ تاکہ پبلک کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ غفلت کے مرتکب ہونے والے افراد کے خلاف انکوائری کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی کوشش کرنا کہ وہ بندہ پکڑا جائے جس کے ذریعے زہر دیا گیا۔ یقیناً یہ نچلے عملے میں سے ہی کوئی فرد ہو گا۔ میں اس دوران اوپر بات کرتا ہوں۔ ہم اپنے طور پر جو کوشش کر سکتے تھے وہ کر لیں، اب انٹیلی جنس کے افراد کو اس معاملے میں اعتماد میں لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔" مختار مراد نے ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اگلا پروگرام بھی بتایا جس کی سجاد رانا موجودہ حالات میں مخالفت نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کے قتل میں ملوث ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچائے۔

⊛----✪----⊛

"اور سنایئے چودھری صاحب! اپنے اے سی صاحب کے کیا حال ہیں؟ کچھ دماغ ٹھکانے آیا محترم کا نہیں؟" صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر بیٹھتے ہوئے معظم تارڑ نے پوچھا۔

"حال تو پتلا ہے بے چارے اے سی کا۔ کل بلایا تھا اس نے ڈاکٹر ماریہ کو پوچھ گچھ کے لئے۔" تارڑ کی بات کا جواب دے کر چودھری نے حقے کی نے منہ سے لگائی اور بے حد لطف اندوز ہونے والے انداز میں

ایک نیا کش لگایا۔

''پھر کیا بتایا اسے ڈاکٹر ماریہ نے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہم پریشانی میں پڑ جائیں۔ ان عورتوں کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب بندے کو پھنسا دیں۔'' ایس پی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ارے نہیں تارڑ صاحب! تسی فکر نہ کرو۔ ڈاکٹر نی پوری طرح ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گی کہ ہمیں مشکل پڑ جائے۔ آپ تو بس اب اطمینان سے اس دن کا انتظار کرو جب اے سی ہمارے سامنے ناک سے لکیریں نکالے گا۔ اس واری ایسا وار کیا ہے ہم نے کہ اس سے بچ نکلنا ممکن ہی نہیں۔ بڑے نام والے خاندان کا سپوت ہے۔ ہم سے اڑی لگا کر اپنے خاندان کی عزت رولنے کا خطرہ نہیں مول لے سکے گا۔'' چودھری بے حد مطمئن تھا۔

''بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیں کہ کب اس سلسلے میں اے سی سے مذاکرات شروع کریں گے؟''

''دو چار دن گزرنے دیں پھر بات بھی کر لیں گے۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو ہم چند دن اس اے سی کے بچے کے تڑپنے کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وڈی نیندیں اُڑائی ہیں اس نے ہماری، اب کچھ دن وہ بھی تو رت جگا منائے۔ ابھی تو بے چارہ اس اُلجھن میں پھنسا ہوگا کہ تصویریں ہم نے بھجوائی ہیں یا کسی اور نے؟ اُس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے ہی تو میں نے ان تصویروں کے ساتھ کوئی خط پتر نہیں بھیجا تھا۔ شک بے شک اسے ہم پر ہی ہے لیکن خود سے گل چھیڑنے کی ہمت تو نہیں کر سکتا۔'' چودھری کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شہریار جس کے ہاتھوں اس نے ہمیشہ زک اٹھائی تھی، اب اپنے داؤ میں پھنسا نظر آ رہا تھا تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان تصویروں کے ذریعے شہریار کو بلیک میل کر کے اس سے اپنے کئی مطالبات پورے کروائے جا سکتے ہیں۔

''اصل میں بات یہ ہے چودھری صاحب!'' ایس پی سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا ذرا سا کھنکھارا۔ ''اپنے باجوہ صاحب کچھ پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹا لیا جائے تاکہ ان کی بھی بحالی ہو سکے۔''

''ایک تو باجوہ نے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔ ذرا حوصلہ نہیں اس آدمی میں۔ مجھے بھی بار بار فون کر کے میرے کان کھاتا رہتا ہے۔ اب آپ کو سفارشی بنا کر بھیج دیا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں جان چھڑاؤں اس بندے سے۔ ویسے ہی سالا سب کی نظروں میں آ گیا ہے۔ بحال ہوگا تو بھی پریشانی ہی رہے گی ہمیں۔'' چودھری نے ناگواری سے کہا۔

''باجوہ کا یہی خیال ہے کہ آپ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ چودھری صاحب کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے اس سارے سیٹ اپ سے الگ کرنے کے چکر میں ہوں؟''

''تو آپ اسے بتا دیں کہ اس کا خیال ٹھیک ہے۔ فاریسٹ آفیسر کا کیا ہے، اس کی جگہ جو نیا بندہ آئے گا، ہم اسے پارٹنر بنائیں گے۔ خوامخواہ ایک شک کی زد میں آئے بندے کو اپنے ساتھ نتھی رکھنے کی کیا ضرورت ہے ہمیں؟ بہت کما لیا اس نے ہمارے ساتھ رہ کر..... اب کسی اور کو موقع دے۔''

''یہ اتنا آسان بھی ثابت نہیں ہوگا چودھری صاحب! باجوہ بکھر جائے گا۔ ہو سکتا ہے غصے میں آ کر وہ کوئی ایسا قدم اٹھا لے جس کے بعد ہمارے نام بھی سامنے آ جائیں۔ ابھی تو جو کچھ ہے، صرف شک کی حد تک ہے۔ ہاں وہ نے کوئی اقبالی بیان دے دیا تو ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔'' تارڑ نے اس معاملے کی نزاکت کا



اس دلایا۔

''میرے خیال میں آپ یہ گل اپنی طرف سے نہیں کر رہے۔ باجوہ نے اپنی تشویش کے ساتھ یہ دھمکی بھی کے کانوں تک پہنچائی ہے۔'' چودھری نے غصے سے بولتے ہوئے تارڑ کی شکل دیکھی تو وہ نظر چرا گیا۔ یہ طرح سے اس کی طرف سے اعتراف تھا کہ واقعی باجوہ نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے۔

''تسی یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ایس پی صاحب! میں آپ باجوہ سے نمٹ لوں گا۔ تسی ریلیکس کرو۔''

ھری نے یک دم ہی موڈ بدل لیا اور نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کے بعد ایک ملازم کو پکارا۔

''اوشیدے! ایس پی صاحب کے لیے کھانا شانا لگوا۔ بڑے دن گزر گئے، ہم نے اپنے بجن کے ساتھ یٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔'' اس کے انداز سے تارڑ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں رے گا اور واقعی اس کمرے سے اُٹھ کر ڈائننگ روم تک لے جانے اور کھانا کھانے کے دوران چودھری اِدھر اُدھر کے موضوعات پر ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا لیکن باجوہ والا معاملہ دوبارہ نہیں چھیڑا۔ ایس پی بھی انجان بن گیا اور خوشگوار ماحول میں شان دار کھانا تناول کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری نے بالے کو بلوایا۔

''حکم چودھری صاحب!'' وہ فوراً ہی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''سنا ہے اپنے باجوہ صاحب کی زبان بڑی کھجلا رہی ہے۔ ان کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔ بس ہیں چل رہا کہ جو کچھ اندر ہے، باہر نکال دیں۔ اور تُو جانتا ہے کہ ہم ایسی حرکتوں کو پسند نہیں کرتے۔''

''آپ حکم کریں چودھری صاحب! باجوہ کا علاج ہو جائے گا۔ اگر لاعلاج ہوا تو اسے وہاں بھی پہنچایا جا سکتا ہے جہاں ہر لاعلاج مریض کو پہنچنا ہوتا ہے۔'' بالے کو گویا اس کا من پسند مشغلہ ہاتھ لگنے والا تھا جس کے بارے میں سن کر اس کی چھوٹی چھوٹی سرد آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ابھی تُو ایسا کر کہ اُس پر نظر رکھ۔ آگے کیا کرنا ہے، میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔'' کوئی بھی انتہائی حکم صادر کرنے کے بجائے اس نے بالے کو صرف نگرانی کا کام سونپا۔ عین وقت پر اسے خیال آ گیا کہ باجوہ کو کوئی نقصان پہنچا تو ایس پی کھٹک جائے گا کہ یہ اسی کا کام ہے اور فی الحال وہ ایس پی کی پارٹنر شپ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باجوہ کے مقابلے میں وہ اب بھی اس کے لیے کارآمد تھا۔ پھر وزیراعلیٰ سے اس کی رشتے داری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ باجوہ کو کچھ ہوتا تو اس کے آگے پیچھے کوئی ایسا بڑا آدمی نہیں تھا جو چودھری کے گلے پڑتا لیکن ایس پی اُسے پھنسا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! جیسا آپ کا حکم۔'' بالے کو کچھ مایوسی ہوئی لیکن ظاہر ہے، وہ چودھری کے سامنے اس کے فیصلے پر اعتراض تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرماں برداری سے بولا۔

''ایک کام اور کرنا۔ ڈاکٹر ماریہ سے کہنا کہ تیار رہے۔ آج رات ہم اسے اپنے ڈیرے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! میں خود اُسے رات کو آپ کی خدمت میں لے آؤں گا۔'' بالے نے جواب دیا اور پھر اس کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ چودھری مسرور سا آنے والی رات کے تصور میں کھو گیا جو اسے اپنی کسی موٹی بھدی بیوی یا بازاری عورت کے بجائے ڈاکٹر ماریہ جیسی بھرپور عورت کی قربت میں گزارنی تھی۔

⊛----✪----⊛

خوف سے تھر تھر کانپتے اس شخص پر سجاد رانا نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ وہ کل رات ڈیوٹی پر موجود سپا
میں سے ایک تھا۔ پولیس کسٹڈی میں زہر خورانی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے خواجہ سرا کی ہلاکت
بارے میں یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ اس کی موت کا سبب کھانے میں شامل زہر تھا، فوری طور پر ڈیو
موجود اہلکاروں کی طرف ہی دھیان گیا تھا۔ خواجہ سرا کی موت کا انکشاف صبح اس وقت ہوا جب رات والا
واپس جا چکا تھا اور صبح اس کی جگہ نئے عملے نے لی تھی۔ تحقیقات کرنے والوں نے فوری طور پر رات والے
کال کر لیا۔ سارا عملہ حاضر ہو گیا مگر تنویر احمد نامی یہ سپاہی نہیں آیا۔ حاضر افراد سے تفتیش شروع کرنے کے سا
ہی دو سپاہی تنویر احمد کے گھر کی طرف روانہ کیے گئے جہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ تنویر گھر پر نہیں ہے۔ و
ڈیوٹی سے واپس آتے ہی اپنے چند جوڑے کپڑے لے کر گھر سے نکل گیا تھا کہ کسی ضروری کام سے جانا ہے
سپاہیوں نے اس بات کی اطلاع ایس پی کو دی۔ تنویر احمد کے بلاوے پر حاضر نہ ہونے پر ویسے ہی اس کی طرف
سے کھٹکا ہو گیا تھا، اب جو اس کے گھر سے غائب ہونے کی اطلاع ملی تو یقین ہو گیا کہ خواجہ سرا کے قتل کے پی
اسی شخص کا ہاتھ ہے۔ برق رفتاری سے ہر طرف بندے دوڑائے گئے۔ تنویر احمد کے گھر سے کپڑے وغیرہ لے
نکلنے سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ شہر سے باہر کہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ اسی رخ پر تحقیق کی گئی۔ اس
بیوی کو ذرا دھمکا کر اس سے ان کے بیرونِ شہر مقیم رشتے داروں کے نام پتے معلوم کیے گئے۔ تنویر احمد کے گھ
سے اس کی چند تصویریں بھی مل گئیں۔ سپاہی تصویروں سمیت ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈے کی طرف
دوڑے۔ بالآخر اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بس اڈے سے معلوم ہو گیا کہ اس حلیے اور شکل وصورت کا آدمی
فلاں روٹ کی بس میں بیٹھ کر فلاں وقت روانہ ہوا ہے۔ بس جس شہر کی طرف گئی تھی، وہاں تنویر احمد کی بیوی کی
فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کی بہن رہتی تھی۔ اب پولیس کے پاس یہی حل تھا کہ یا تو یہاں سے کسی کو
تنویر احمد کے تعاقب میں روانہ کرے یا وہاں کی مقامی پولیس کو ذمے داری سونپے کہ جیسے ہی تنویر احمد پہنچے، اسے
گرفتار کر کے واپس لاہور بھیجا جائے۔ لیکن سجاد رانا کی ذاتی دلچسپی اور سخت ہدایات کے باعث پولیس والوں
نے کچھ غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ ٹرانسپورٹ کمپنی سے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وقت کے اس دورانیے میں
ان کی کمپنی کی بس کہاں تک پہنچی ہو گی، اس علاقے کے تھانہ انچارج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں ہی بس رُکوا کر
فلاں شخص کو گرفتار کرو اور فوری طور پر لاہور روانہ کرو۔ نتیجتاً اس وقت تنویر احمد ''ابھی اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ
گرفتار ہو گئے'' کے مصداق ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے وہاں موجود تھا۔ سجاد رانا یہ معاملہ کسی اور پر چھوڑنے کے
بجائے خود اس سے پوچھ گچھ کے لیے آ پہنچا تھا اور اب اس شخص کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کس کے کہنے پر تم نے اس شخص کو زہر دیا؟'' چند لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد اس نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

''اللہ پاک کی قسم سر! میں نے کسی کو زہر نہیں دیا۔'' اپنی شہ رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر بھاگ کیوں رہے تھے شہر سے؟'' اس نے کچھ اور کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

''میں بھاگ نہیں رہا تھا سر! میری بہن کا فون آیا تھا کہ اس کے گھر والے کی طبیعت خراب ہے اس لیے میں ایمرجنسی میں اپنی بہن کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس والوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے بہت پوچھا مگر کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر لاک اپ میں بند خواجہ سرا کو زہر دینے کا الزام ہے۔'' وہ اب کسی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا اور شاید وہ سب کہہ رہا تھا جو اس



... ان اس نے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے سوچا تھا۔

''آپ خود سوچیے سر! میری بھلا اس خواجہ سرا سے کیا دشمنی تھی جو میں اسے زہر دے کر مارتا؟'' سجاد رانا کو ... راست مخاطب کر کے یہ جواب دیتے ہوئے اس نے پہلے تھوک نگل کر اپنے خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی ... کوشش کی تھی۔ خود کو ہزار سنبھال لینے کے باوجود بہر حال اس معمولی سپاہی کا ڈی آئی جی سے بات کرتے ... پانی ہو رہا تھا۔

''میرے خیال میں ہاشمی صاحب! یہ شخص شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے کہ اسے اس کے ساتھیوں ... والے کر دیا جائے۔ وہ لوگ خود ہی اس سے سارا سچ جھوٹ اُگلوا لیں گے۔'' اس کے بیان کو خاطر میں ... بغیر سجاد رانا نے ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں حکم دیا تو تنویر احمد کا جسم ایک بار پھر ... لگا۔ اس نے پولیس کی ملازمت میں پانچ سال گزارے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے سچ ... اگلوانے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کریں گے۔ ان طریقوں کو مجرموں پر آزمانا مختلف بات تھی، خود ... ہنا اور بات۔ وہ فوراً ہی ڈھے گیا۔

''میں سچ بتاتا ہوں سر! میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتاتا ہوں۔'' اس سے قبل کہ ایس پی کے اشارے پر ... اسے وہاں سے لے جایا جاتا، وہ فوراً ہی بول پڑا اور دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

''بولو..... لیکن یاد رکھنا کہ ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔'' سجاد رانا نے اسے دھمکایا۔

''میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔'' اس نے یقین دہانی کروائی پھر ذرا سا توقف کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''میں رات کے کھانے سے پہلے باہر پان والے کے کھوکھے سے سگریٹ لینے گیا تھا۔ سگریٹ لے کر واپس آیا تو ایک عورت نے آواز دے کر روک لیا۔ بے چاری اچھی خاصی بوڑھی عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سلور کا ایک ٹفن تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ پولیس نے میرے بے گناہ بچے کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پہلے ہی قسمت کا مارا ہے کہ نہ تو مکمل طور پر عورت ہے نہ ہی مرد۔ بہن بھائی اس ناکردہ گناہ کے جرم میں بے چارے کے ساتھ حقارت سے پیش آتے ہیں۔ باپ ناراض رہتا ہے کہ اس کی وجہ سے سر جھک گیا۔ ایک لے دے کر میں اکیلی ماں ہی ہوں جو اپنے لختِ جگر کا دُکھ سمجھتی ہوں۔ اب بھی پولیس نے اسے گرفتار کیا ہے تو بہن بھائیوں اور باپ کو کوئی فکر نہیں۔ میں ہی ماری ماری پھر کر اس کے یہاں موجود ہونے کا معلوم کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ پہلے کوشش کی تھی کہ اپنے بچے سے ملاقات کر لوں لیکن جواب ملا کہ بڑے صاحب کی اجازت نہیں۔ مجھ ممتا کی ماری کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو گھر جا کر اپنے بچے کے لیے کھانا پکا کر لے آئی۔ اب جب سے یہاں انتظار میں کھڑی ہوں کہ کوئی رحم دل شخص نظر آئے تو اس کے ذریعے اپنے بچے کو کھانا بھجواؤں۔ تم تھانے سے نکلے تھے، تب ہی تمہاری شکل دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم کسی نیک ماں باپ کی نیک اولاد ہو۔ بیٹا! اللہ کے واسطے مجھ دکھیاری کی مدد کرو۔ میرے بچے تک یہ کھانا پہنچا دو۔ اس کا پیٹ بھر جائے گا تو میرے کلیجے میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ میں دُکھوں کی ماری ماں اس بھلائی کے بدلے میں تمہیں ڈھیر ساری دعائیں اور یہ پانچ سو روپے دوں گی۔ بس جناب! میں اس عورت کی باتوں میں آ گیا۔ کچھ میرا دل پسیجا، کچھ پانچ سو کے لالچ نے کام دکھایا۔ میں نے کھانے کا ٹفن عورت سے لیا اور قیدی کو پہنچا دیا۔ صبح کے قریب میں نے چکر لگایا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو، کھانے میں کوئی گڑبڑ تھی۔ بوڑھی عورت باتیں بنا کر مجھے بے وقوف بنا گئی ہے۔

گھبراہٹ میں میری اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہوتے ہی گھر گیا اور پھر وہاں سے چند جوڑے لے کر بس اڈے چلا گیا۔ خیال تھا کہ کچھ دن بہن کے گھر چھپ کر رہوں گا اور دیکھوں گا کہ معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں لیکن راستے میں ہی دھر لیا گیا۔''

اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ سجاد رانا کی تجربہ کار نگاہیں کسی پولی گراف مشین کی طرح اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو جانچتی رہیں۔ ان کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا۔ واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے ہیں جیسے اس نے بتایا ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی حماقت اور لالچ کی وجہ سے نہ صرف وہ پھنس گئے تھے بلکہ ایک اہم کلیو بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ان کے مخبروں نے کئی دن کی محنت کے بعد جسم فروشی کے دھندے میں ملوث اس خواجہ سرا کا پتہ لگایا تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوا تھا کہ یہ خواجہ سرا کچھ بڑے عہدے داروں تک بھی رسائی رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ شخص جاسوسی کا کام انجام دے رہا ہو۔ اگر وہ لوگ اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے تو اس شخص تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی جس کی نگرانی میں یہ سب ہو رہا تھا۔ مگر اس کی ہلاکت سے سارا منصوبہ ہی دھرا رہ گیا۔ البتہ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی وہ دشمنوں کا ایک اہم مہرہ تھا جس کے ہاتھوں اپنے پھنسنے سے قبل ہی انہوں نے خود ہی اسے پٹوا دیا تھا۔

''لے جاؤ اسے اور چیک کرو کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، ٹھیک ہے یا نہیں۔'' وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ حکم بے معنی ہی ہے لیکن تنویر احمد پر جو غصہ تھا وہ کسی صورت تو نکلنا ہی تھا۔

⊛----✪----⊛

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''بالکل سیدھی سادی تو بات ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اس زبردستی کی بے جوڑ شادی کے خلاف قانونی مدد حاصل کرنے کے لیے درخواست دو۔ درخواست میں لکھ دوں گی، تم صرف دستخط کر دو۔ تمہاری درخواست کو آگے پہنچانا میری ذمے داری ہے۔'' فریدہ کے حیرت بھرے لہجے میں کہی گئی بات کا جواب نہایت رسان سے دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے ساری بات سمجھائی۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں؟ آخر تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے کہ تم اپنے ہی گھر والوں کے خلاف مجھے اُکسا رہی ہو؟'' وہ عمر میں کشور سے کافی چھوٹی تھی پھر دونوں کے درمیان حیثیت کا بھی واضح فرق تھا، اس کے باوجود وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے ''تم'' کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔

''میں تمہیں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں، ظلم کے خلاف اُکسا رہی ہوں۔ ایک عاقل و بالغ لڑکی کا کسی ذہنی طور پر پسماندہ شخص سے نکاح اس کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے میں تمہارا ساتھ دوں''

''مگر تم یہ سب کرو گی کیسے؟ تم بھی تو میری طرح اس حویلی سے بغیر اجازت باہر نہیں جا سکتیں۔ چلو مان لیا کہ تمہاری کوئی ملازمہ میری درخواست کو کسی سرکاری دفتر تک پہنچا دے گی لیکن درخواست پر غور کون کرے گا؟ سارے افسر اور قانون وڈے چودھری کی مٹھی میں ہیں۔ کسی کی ہمت ہی نہیں ہو گی کہ انہیں کچھ کہہ سکیں۔'' فریدہ مایوسی سے بولی۔

''اس بات کی تم فکر نہ کرو۔ جو کچھ کر سکتے ہیں، انہوں نے ہی مجھے تم تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے کہا



ہے۔'' کشور مسکرائی۔

''کون؟.....کون ہے وہ؟''

''اس بات کو رہنے دو۔ تم صرف درخواست بھجوانے کی بات کرو اور پھر انتظار کرو کہ کب تمہیں یہاں سے نجات ملتی ہے۔'' کشور نے اسے ٹالا۔

''یہاں سے نجات مل بھی گئی تو کیا فائدہ ہو گا؟ میرا جو نقصان ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا۔ اس حرکت کے بدلے میں اُلٹا میرے بھاجی بھی پھنس جائیں گے۔ میں نے پہلے ہی انہیں وڈا دکھ دیا ہے، اب ہوران کی عزت اب نہیں کر سکتی۔ اب جو بھی کرنا ہو گا، میں آپ ہی کروں گی۔''

''بے وقوف مت بنو۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہاں عورت کسی جانور کی طرح بے بس ہے۔'' اس کے انکار پر کشور جھنجلا کر بولی۔

''تم نے وہ گل تو سنی ہو گی نا کہ وقت آنے پر چیونٹی بھی ہاتھی کو کاٹ لیتی ہے۔ بس میں بھی وقت کے انتظار میں ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، مت مانو میری بات۔ ایسا کرو کہ مجھے اپنے اس کزن قربان کا پتہ بتا دو۔ کم از کم میں اس بے چارے کو تو تمہاری کوئی خیر خبر دے دوں۔'' اس کی ضد دیکھتے ہوئے کشور نے بات کا رخ موڑ دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ قربان کا نام سنتے ہی فریدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بار اُس نے بنا کسی حیل و حجت کے اس کے سوال کا جواب دے دیا پھر یک دم ہی اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کشور نے بھی اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کے لیے اُٹھ گئی۔ بہزاد شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کھلے دروازے سے اندر گئی تو اس نے وہاں فریدہ کو اس کے ساتھ ربر کی بڑی سی گیند سے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ بہزاد شاہ دُلہن کو اپنے ساتھ کھیلتے پا کر بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار تالیاں بجا بجا کر کر رہا تھا۔ فریدہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خود پر کتنا جبر کرنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی ہو گی، کشور سمجھ سکتی تھی۔ دل میں گہرا تاسف لیے وہ اوپری منزل سے اُتر آئی۔ سیڑھیاں اُترتے ہی اس کا بڑی چودھرائن سے سامنا ہو گیا۔

''وڈے لاڈ ہو رہے ہیں نویں بھاوج کے۔ جب دیکھو تب اوپر جاتی آتی نظر آتی ہے۔ وڈے چودھری صاحب نے منع بھی کیا ہے کہ اس سے زیادہ میل ملاپ کی ضرورت نہیں ہے، پر تیری مت میں تو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ جو جی میں آتا ہے وہی کرتی پھرتی ہے۔'' اسے سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر اس نے فوراً تنقید کی۔

''زیادہ کہاں جاتی ہوں اماں! بس پورے دن میں ایک ہی چکر تو لگتا ہے اوپر کا.....اور وہ تو میں بہزاد شاہ کے لیے پہلے بھی لگاتی تھی۔'' وڈی چودھرائن سے بگاڑنا مناسب نہیں، یہ بات وہ بھی سمجھتی تھی چنانچہ نرمی سے ذرا لاڈ بھرے لہجے میں بولی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور الماری میں کپڑوں کی تہہ کے درمیان چھپا کر رکھا گیا موبائل نکال کر آن کیا۔ ذرا دیر میں وہ آفتاب کو آج فریدہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس طرح چپ رہ کر تو وہ اپنے ساتھ مزید ظلم کر رہی ہے۔''

''میرے خیال میں یہ کام میرے مقابلے میں قربان زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہے۔ میں نے فریدہ سے اس کا پتہ معلوم کر لیا ہے۔ آپ اس پتے پر جا کر قربان سے ملیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر ہم دونوں کی موبائل پر بات کروا دیں گے۔ قربان سمجھائے گا تو وہ سارے ڈر خوف بھول کر ہماری بات ماننے پر راضی ہو جائے

گی۔'' اس نے آفتاب کو قربان کا پتہ بتاتے ہوئے اُمید ظاہر کی۔

''جو حکم بیگم صاحبہ! بندہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔ آپ جیسا کہیں گی، ویسا ہی کرے گا۔ ویسے کیا بات ہے، آج کل آپ کی طرف سے ملاقات کا حکم ملنا بند ہو گیا ہے؟ اب ہم منتظر ہیں ایسے کسی پیام کے تو آپ کی طرف سے خاموشی ہے۔'' سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ اچانک ہی شوخی پر اُتر آیا اور کشور کو چھیڑا۔

''اب اس کھنڈر سے انڈسٹریل ہوم میں ملنے کا جی نہیں چاہتا۔ اب کبھی ملیں گے تو ایسے ماحول میں ہمارے رشتے کے شایانِ شان ہو۔ جب سے میرے نام کے ساتھ آپ کا نام جڑا ہے، اپنا آپ اتنا معتبر لگتا ہے کہ کسی عام سی جگہ پر آپ سے ملنے کے لیے آنے کو جی نہیں چاہتا۔'' اس نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

''بہت خوب! یعنی اب ملنے کے لیے لمبا انتظار کرنا ہوگا۔'' آفتاب نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری۔

''کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' اپنے لیے اس کی بے قراری محسوس کر کے اس کے دل میں فخر کا احساس جاگا اور وہ کھلکھلا کر شوخی سے بولی۔ جواباً آفتاب اس سے کچھ کہتا، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر دستک اُبھری۔ کشور نے جلدی سے لائن کاٹ کر موبائل ایک دراز میں ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے نچھی کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' نچھی کی پھیلی ہوئی باچھوں پر اندر ہی اندر جز بز ہوتے ہوئے اس نے سختی سے پوچھا۔

''آپ کے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے آئی تھی بی بی!'' اس کے لہجے کی سختی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے ہنوز پھیلی ہوئی باچھوں کے ساتھ بتایا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم تو ہے تجھے کہ میرے سارے کام رانی کرتی ہے۔ پھر کس لیے منہ اٹھا کر چلی آئی ہے؟'' اس نے کچھ اور سختی سے اسے جھڑکا۔

''جیسی تہاڈی مرضی بی بی! میں تو وڈی چودھرائن کے کہنے پر آئی تھی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں کہہ کر لہراتی، بل کھاتی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کشور دروازے پر ہی کھڑی پُرسوچ انداز میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ بڑی چودھرائن اس کے ساتھ چوہے بلی کا کوئی کھیل، کھیل رہی ہے۔ وہ کھل کر کبھی کچھ کہتی نہیں تھی لیکن آنے بہانے اسے جتاتی ضرور تھی کہ وہ اس کی نگرانی کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ دل ہی دل میں خود کو مزید محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کشور، نچھی کی نظروں سے غائب ہونے پر دروازے پر سے پلٹ کر واپس اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی اور سرہانے رکھی ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ لیکن یہ پریشانی ایسی نہیں تھی کہ کتاب سے خود کو بہلا کر نظر انداز کی جا سکتی۔

⊛----✪----⊛

''ڈاکٹر ماریہ کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں سر! آپ نے جو ایڈریس نوٹ کروایا تھا، وہ لاہور کے اسی گھر میں رہتی تھیں۔ محلے والوں کے مطابق وہ اور ان کی والدہ سنتھیا تقریباً تین سال سے اس گھر میں رہ رہی ہیں۔ محلے والوں سے ان لوگوں کا زیادہ ملنا جلنا نہیں البتہ سنتھیا آتے جاتے آس پڑوس والوں سے تھوڑی بہت بات کر لیتی تھی۔ مجموعی طور پر محلے والوں کے مطابق دونوں ماں بیٹی شریف اور بے ضرر خواتین ہیں۔ ڈاکٹر ماریہ کے پیر آباد آنے کے بارے میں سنتھیا نے ایک دو محلے داروں کو بتایا تھا اور یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ چند دن بعد وہ خود بھی بیٹی کے پاس چلی جائے گی۔ سنتھیا نظر نہیں آئی تو ان لوگوں نے یہی خیال کیا کہ وہ پیر آباد چلی گئی ہے۔ جن لوگوں کے ذمے میں نے یہ معلومات جمع کرنے کا کام لگایا تھا، انہوں نے ڈاکٹر ماریہ



کا جائزہ لیا ہے۔ گھر کا کافی سامان بندھا پڑا ہے جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ مکین کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔ ڈاکٹر ماریہ جس ہسپتال میں جاب کرتی تھیں، وہاں سے بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ وہ بہت ایمرجنسی میں جاب چھوڑ کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہسپتال سے اپنے واجبات بھی وصول نہیں کیے۔''

عبدالمنان نے جو رپورٹ پیش کی، وہ ڈاکٹر ماریہ کی اپنے بارے میں مہیا کردہ معلومات کی تصدیق کر رہی تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور دھیمی آواز میں بولا۔

''تھینک یو عبدالمنان! مجھے امید تھی کہ تم یہ کام ذمے داری سے انجام دو گے اسی لیے میں نے اسے تمہارے سپرد کیا تھا۔''

''مجھے آپ کے اس اعتماد پر خوشی ہے سر! اللہ نے چاہا تو میں آئندہ بھی آپ کے اعتماد پر پورا اُتروں گا۔'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''کیا بات ہے سر! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ڈاکٹر ماریہ پر کسی قسم کا کوئی شک ہے؟''

''نہیں..... اصل میں، میں ان کی والدہ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کے مطابق انہیں کسی نے جس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بنیاد پر انہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی اسی قسم کی مدد کرنے سے قبل تصدیق کروا لوں، جب ہی کوئی اسٹیپ لوں گا۔'' تصویروں والا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اسے فی الحال عبدالمنان سے بھی شیئر کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اس لیے صرف اتنی سی بات بتا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''اوہ!..... آئی سی۔'' عبدالمنان نے ہونٹ سکیڑے پھر پوچھنے لگا۔ ''کیا ڈاکٹر ماریہ نے کسی پر شک ظاہر کیا ہے؟''

''بہت صاف لفظوں میں تو نہیں لیکن مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگا تھا کہ شاید چودھری افتخار کی طرف سے انہیں پریشان کیا جا رہا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر گریز کی راہ اپناتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ اس سلسلے میں ہمارا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟'' عبدالمنان فوراً مستعد نظر آنے لگا۔

''فی الحال تو ہم خاموش رہیں گے۔ اگر ڈاکٹر ماریہ کی والدہ دو تین دن میں خود ہی واپس آ جاتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کوئی کارروائی کریں گے۔'' اس کا یہ جواب اس کی فطرت کے خلاف تھا جسے عبدالمنان نے محسوس تو کیا لیکن مزید کوئی سوال کیے بغیر اس سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی شہریار کافی دیر تک سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ تصویروں والا یہ معاملہ کتنا بڑا اسکینڈل بن سکتا ہے، وہ جانتا تھا۔ اس اسکینڈل کے سامنے آنے پر اس کے خاندان کی ساکھ داؤ پر لگ جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ بھیجنے والے نے نہ تو اپنا تعارف کروایا تھا اور نہ ہی کوئی ڈیمانڈ سامنے رکھی تھی۔ ان حالات میں وہ چودھری افتخار سے براہِ راست اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ صاف مکر جاتا کہ یہ میرا کام نہیں۔ وہ بہزاد شاہ کے ویسے پر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا حوالہ بھی دیتا تو بے کار جاتا۔ جو تصویریں اسے بھیجی گئی تھیں، ان میں نہ تو ڈاکٹر ماریہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ ہی کوئی اور ایسی شے دکھائی دے رہی تھی جس سے ثابت کیا جا سکتا کہ تصویریں حویلی کے اندر کھینچی گئی ہیں۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہر لمحہ یہی فکر رہتی تھی کہ جانے ان تصویروں کی بنیاد پر کون سا مطالبہ کر دیا جائے۔ فی الحال تو وہ ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ انکار نہیں کر سکتا تھا اور اقرار کرنے کا مطلب دشمن کے سامنے

پسپائی اختیار کرنا تھا۔

''ڈاکٹر ماریہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں سر!'' ٹیلی فون کی گھنٹی پر اس نے چونک کر ریسیور اٹھایا! دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی۔

''ٹھیک ہے، بات کروائیں۔'' ڈاکٹر ماریہ کا نام سن کر اس نے اجازت دی۔

''ہیلو اے سی صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' رابطہ ملنے پر دوسری طرف سے ڈاکٹر ماریہ نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کی طرف سے کوئی جواب دیئے جانے سے قبل ہی بولی۔ ''ظاہر ہے، آپ پریشان ہوں گے۔ میں نے آپ کی پریشانی کا سوچ کر ہی آپ کو فون کیا ہے۔''

''تھینک یو سو مچ۔'' وہ فی الحال یہی کہہ سکتا تھا ورنہ ڈاکٹر ماریہ کے فون کرنے یا نہ کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ اپنی مجبوری بتا کر وہ کسی بھی قسم کے تعاون سے پہلے ہی صاف انکار کر چکی تھی۔

''تھینک یو تو جب کہئے گا، جب میں آپ کو اپنے پاس موجود ایک زبردست خبر دوں گی۔''

''کیسی خبر؟'' اس کے لہجے میں موجود جوش کو محسوس کر کے وہ اپنی کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''آپ کا فون تو محفوظ ہے نا؟..... یہ نہ ہو کہ آپریٹر یا کوئی اور ہماری گفتگو سن لے۔'' اس نے خبر سنانے کے بجائے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''اگر ایسی بات ہے تو آپ میرے موبائل پر کر لیں۔'' اس نے اپنا موبائل نمبر نوٹ کروایا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی کال کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈز ہی گزرے ہوں گے کہ اس کا موبائل کال آنے کی نشان دہی کرنے لگا۔ اس نے جھپٹ کر کال ریسیو کی۔

''آپ کی خاطر میں نے ایک اہم کام تو کر ڈالا ہے، لیکن ڈر رہی تھی کہ کہیں کسی اور کو اس بات کا علم ہو گیا تو خود میں مشکل میں نہ پڑ جاؤں، اس لیے احتیاط ضروری سمجھی۔'' دوسری طرف وہی تھی اور اس کی ''ہیلو'' سننے کے بعد وضاحت پیش کر رہی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں۔ آپ پلیز وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ نے مجھے کال کی ہے۔ میرا موبائل بالکل محفوظ ہے۔ آپ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ آپ جو کچھ کہیں گی، وہ میرے سوا کسی اور شخص کے علم میں نہیں آئے گا۔'' اپنے ہیجان کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریہ کو تسلی دی۔

''مجھے اس جگہ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے جہاں چودھری نے آپ کی تصویریں اور ان کے نگیٹوز چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ چودھری کے ڈیرے میں موجود تہ خانے کے ایک کمرے میں خفیہ تجوری ہے۔ اس تجوری میں وہ اپنے خاص خاص کاغذات اور دوسری بیش قیمت اشیاء رکھتا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی اسی تجوری میں رکھی گئی ہیں۔''

''آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟'' ڈاکٹر ماریہ کی پُرجوش لہجے میں فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کل رات میں چودھری کے ڈیرے پر اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔ شراب کے نشے میں چُور جب وہ اے سی میرے ساتھ اپنی من مانیاں کر رہا تھا، میں نے موقع دیکھ کر اس کے ساتھ یہ موضوع چھیڑ دیا۔ میں نے کہا..... چودھری صاحب! آپ نے اے سی شہریار کو جو تصویریں بھیجی ہیں، ان کو دیکھ کر اس کا سارا شک تو آپ پر جائے گا۔ وہ بااختیار آدمی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی حویلی وغیرہ کی تلاشی لینے پر اُتر آئے۔ جواب میں وہ بولا کہ



اول تو ایسا ممکن ہی نہیں، پھر بھی اگر کسی طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے تو اے سی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ میں نے وہ اصل چیزیں بڑی حفاظت سے اپنی خفیہ تجوری میں رکھی ہیں جس تک پہنچنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ بس پھر میں نے اس کو اس طرح اپنی باتوں میں اُلجھایا کہ اس نے خود ہی اپنی خفیہ تجوری کے بارے میں ساری تفصیل اُگل دی۔ مگر خبیث ہے بڑا چالاک۔ آپ کے بارے میں تو زبان کھول دی لیکن میری ماں کے متعلق کچھ نہیں اُگلا۔ اب کوشش کروں گی کہ اگلی بار میں اس کی زبان کھلوا سکوں۔'' ماریہ نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ کا مستقل چودھری کی خلوت میں آنا جانا ہے؟''

''ظاہر ہے، میں مجبور ہوں۔ میری کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے مجھے اس کا مطالبہ بھی ماننا پڑتا ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک ماننا پڑے گا، جب تک میں خود کو ان کمزوریوں سے چھٹکارا نہ دلوا لوں۔''

''میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکوں۔''

''بہت شکریہ۔ فی الحال تو آپ خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کریں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق پیر آباد میں عنقریب جو سالانہ میلہ لگنے والا ہے، اس کے حوالے سے آپ کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ چودھری کا پروگرام ہے کہ میلے سے پہلے آپ کو پیغام بھیجا جائے گا کہ آپ اس کے راستے سے ہٹ جائیں۔ مزاحمت نہ کرنے کی صورت میں آپ کی تصویریں بھی منظر پر نہیں آئیں گی اور آپ کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو میلے میں دوسرے تماشوں کے ساتھ اپنی تصویریں بھی دیکھنے کے لیے تیار رہیے گا۔ ویسے بھی اس بار بہت بڑے پیمانے پر میلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کئی سیاسی اور سماجی شخصیات مدعو کی جائیں گی۔ میڈیا کوریج تو لازمی ہے۔ سمجھیں، آپ بری طرح پھنس کر رہ جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ کرنا ہے، ابھی کر گزریں۔ بعد میں آپ کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔'' وہ بہت خلوص سے مشورہ دے رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شہریار کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔

اس بار چودھری نے اس پر بہت کاری وار کیا تھا۔ سب کچھ اگر اسی ترتیب سے پیش آ جاتا جس طرح ڈاکٹر ماریہ کے مطابق چودھری نے پلان کر رکھا تھا تو وہ بری طرح پھنس جاتا۔ چودھری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا اپنے خاندان کے ناموس کو داؤ پر لگا دینے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ رہتا اور ان دو آپشنز میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرنا اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اس وقت تو ڈاکٹر ماریہ کی صورت میں ایک طرح سے اس کی غیبی امداد ہوئی تھی۔ وہ چودھری کے بچھائے ہوئے جال میں خود کو پھنسنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار سکتا تھا۔

''آپ مجھ سے جتنا کوآپریٹ کر رہی ہیں، اس کے لیے بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ماریہ!..... پلیز آپ مجھے چودھری کی خفیہ تجوری کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔'' اس نے بے حد ممنونیت سے کہتے ہوئے درخواست کی۔ جواب میں ڈاکٹر ماریہ اسے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگی۔

⊛----✪----⊛

کرسی پر بیٹھی ادھیڑ عمر عورت کی نظریں دال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ تین بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے اسے صرف پانچ منٹ ہی انتظار میں گزارنے لگے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی معاون لڑکیاں وہاں پہنچ جاتیں ندا اور حنا نامی وہ دونوں لڑکیاں وقت کی بے حد پابند تھیں۔ انہیں اس شادی دفتر میں اس کی زیر نگرانی کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن وہ یہ بات بہرحال جانچ چکی تھی کہ دونوں لڑکیاں وقت کی پابندی

معاملے میں بے حد ذمے دار تھیں۔ انہیں ہر روز شام چھ بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا اور انہوں نے کبھی اس سلسلے میں کوتاہی نہیں برتی تھی۔ آج بھی انہیں معمول سے تین گھنٹے قبل پہنچنے کا حکم دینے کے باوجود وہ مطمئن تھی کہ دونوں اپنی عادت اور تربیت کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گی۔ یہ یقین بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ سب مل کر جن لوگوں کے لیے اور جس ٹاسک پر کام کر رہی تھیں، اس میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور غفلت کا انجام ناکامی اور تذلیل کے ساتھ ساتھ بسا اوقات موت بھی ہو سکتا تھا اس لیے وہ سب بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اب بھی انتظار کے چار منٹ گزرے تو اس نے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ پھر بیرونی حصے میں جو کہ بیک وقت انتظار گاہ اور استقبالیہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، دونوں لڑکیوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک منٹ کا مختصر دورانیہ جیسے ہی گزرا اور گھڑی نے تین بجنے کا اعلان کیا، اس کے آفس کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''یس..... کم اِن۔'' اس نے پُروقار انداز میں اجازت دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور دونو جوان لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے جدید تراش خراش کے شلوار قمیض زیب تن کر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں آپس میں کافی ملتی جلتی تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آپس میں بہنیں ہیں۔

''ہیو آ سیٹ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں ان دونوں سے کہا۔

''تھینک یو میڈم!'' وہ دونوں کرسیاں کھسکا کر ان پر بیٹھ گئیں اور بنا سوال کیے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس طرح بے وقت اپنے بلائے جانے پر وہ اندرونی طور پر بے حد الرٹ تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ معمول سے ہٹ کر دفتر بلائے جانے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

''تم دونوں ہماری اچھی ورکر ہو۔ اب تک تمہیں جو بھی کام سونپا گیا، تم دونوں نے ہی اسے بہت اچھے طریقے سے انجام دیا۔ لیکن آج جو ذمے داری تمہیں سونپی جا رہی ہے، وہ نہ صرف مختلف ہے بلکہ بے حد نازک بھی ہے۔ اس کام کو کرنے میں تمہیں بے حد ہوشیاری اور ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ناکامی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں نکلے گا اور وہ ہے موت۔'' اس نے اپنے سپاٹ اور سرد لہجے میں گفتگو کے لیے تمہید باندھی۔

''ہم ہر ممکن طریقے سے اپنے کام کو پرفیکشن کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا تو اوپر سے حکم آنے سے پہلے ہم خود اپنے لیے موت کا انتخاب کر لیں گے۔ ہمارا جیون ہمارے دیش کی امانت ہے۔ ہمارے پتا نے بھی فرض کو نبھایا تھا، ہم سے بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔'' ندا نامی لڑکی نے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' اس کا لہجہ ذرا سا نرم ہوا پھر وہ ان دونوں کو ان کا کام سمجھانے لگی۔ وہ دونوں پوری توجہ سے اس کی بات سنتی رہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام کی نوعیت سچ مچ بڑی حساس ہے۔ اس سے قبل انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ بہر حال، انہیں اس نئے کام کو کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

''تم لوگ میری بات سمجھ گئی ہو؟''

''یس میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ آپ کی ہدایات کے مطابق ہی ہوگا۔'' ندا نے جواب دیا۔ اگرچہ دیکھنے پر دونوں بہنوں میں چھوٹی بڑی کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن وہ جس طرح ہر سوال کا جواب دینے کی ذمے داری خود انجام دیتی تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ ہی بڑی بہن ہے۔

''ٹھیک ہے۔ پھر تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چھ بجے تمہیں یہاں اپنی



ایوانی پر دوبارہ موجود ہونا چاہیے۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا تو وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ استقبالیہ پر ان کی مطلوبہ اشیاء موجود تھیں۔ حنا نے ایک تھیلا کھول کر اس میں موجود اشیاء ہم لگا لیں۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا برقعہ، بڑی سی چادر اور دو عدد سن گلاسز تھے۔ برقع اس نے ندا کو تھمایا اور خود چادر اوڑھنے لگی۔ اس کے چادر اوڑھ کر ایک پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر پھیلا کر، سن گلاسز لگانے تک ندا نے بھی برقع اوڑھ کر سن گلاسز لگا لیے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اب کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو کچھ دیر قبل اس دفتر میں پہنچی تھیں۔

اس تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو ''او کے۔'' کا اشارہ دیا اور ندا نے وہاں رکھا دوسرا بیگ اٹھا لیا۔ کینوس کا یہ بیگ اچھا خاصا بھاری تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس بیگ کو اٹھانے میں نخرے دکھاتی۔ لیکن اسے مستقل ورزش اور یوگا کی عادت کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس کے بیگ اٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہی حنا نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے قدموں کو حرکت دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا۔ اپنے ذاتی پرس ان دونوں نے پہلے ہی ایک دراز کھول کر اس میں رکھ دیئے تھے۔ دفتر سے نکل کر وہ آرام سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے کی طرف جانیں لگیں۔ اس چار منزلہ عمارت میں مختلف نوعیت کے کئی دفاتر تھے۔ سیڑھیاں اُترتے وقت کسی نے انہیں دیکھا بھی ہوگا تو زیادہ نوٹس نہیں لیا ہوگا اور یہی سمجھا ہوگا کہ دونوں خواتین کسی شادی دفتر میں اندراج کے لیے یا پھر کسی عامل پروفیسر کے پاس اپنے کسی رکے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے یہاں آئی ہوں۔ اس عمارت میں اس قسم کے دفاتر کی بھرمار کی وجہ سے اس طرح کے حلیے میں خواتین کا مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا اور کوئی بھی ان کے آنے جانے کا نوٹس لینے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔

عمارت سے باہر نکل کر وہ دونوں پیدل چلتی ہوئی قریبی بس اسٹاپ کی طرف بڑھیں اور اسٹاپ پر آگے آنے والی پہلی بس میں سوار ہو گئیں۔ حنا نے کنڈیکٹر کو کرایہ ادا کیا۔ دو اسٹاپ گزرتے ہی وہ دونوں بس سے اُتر گئیں۔ یہاں سے وہ پھر ایک بس میں سوار ہوئیں۔ اس بس میں انہوں نے صرف ایک اسٹاپ کا فاصلہ طے کیا اور پھر ایک رکشے میں بیٹھ کر اسے ایک معروف مارکیٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے دفتر کے نیچے سے براہِ راست رکشے میں بیٹھ کر مارکیٹ تک جا سکتی تھیں لیکن وہ جو کام انجام دینے جا رہی تھیں، اس کے لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی رِسک نہ لیا جائے۔ اگر کسی طرح وہ کسی کی نظروں میں آ بھی جاتیں تو رکشے والا بعد میں ان کے دفتر کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔

مارکیٹ تک کا فاصلہ انہوں نے خاموشی سے گزارا۔ مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دو دکانوں سے خریداری کی اور بنا کسی حیل و حجت کے دکان دار کو اس کی مطلوبہ قیمت ادا کر کے آگے بڑھ گئیں۔ اب ندا کے ہاتھ میں کینوس بیگ کے علاوہ دو شاپنگ بیگ اور نظر آ رہے تھے۔ حنا نے بھی ایک بڑا سا شاپنگ بیگ لٹکا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مارکیٹ میں ہیں اور بہت سی خریداری کرنے کے باجود ابھی اور بھی بہت کچھ لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دونوں اپنے دائیں بائیں موجود دکانوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ آخر انہیں ایک ایسی دکان نظر آ گئی جو ان کی مطلوبہ خصوصیات کی حامل تھی۔ یہ ایک کپڑے کی دکان تھی جس میں تخت پر چاندنیاں بچھا کر کپڑے کے تھان ڈالے گئے تھے۔ دیواروں پر بھی کئی کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ دو چار ذرا اچھی کوالٹی کے سوٹ ڈمی پر سجے نظر آ رہے تھے۔ دونوں بہنیں اس دکان میں داخل ہو گئیں۔ دکان کافی تنگ تھی۔ تخت اور گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے بچھائی گئی بینچوں کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ

گاہک بینچ پر بیٹھتے تو ان کے گھٹنے تخت سے تقریباً ٹکرانے لگتے۔ وہ دونوں، دکان پر موجود تین خواتین کے درمیان سے راستہ بناتی بمشکل اندر داخل ہوئیں اور بینچ پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود تھیلے نیچے زمین پر قدموں کے قریب رکھ لئے۔ ان تھیلوں میں کینوس کا وہ بھاری بیگ بھی شامل تھا۔

''جی باجی! کیا دکھاؤں آپ کو؟ لان کے بڑے اچھے پرنٹ آئے ہوئے ہیں میرے پاس۔'' ایک سیلز مین فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''اچھا تو پھر دکھاؤ۔'' حنا نے اسے جواب دیا۔ وہ تھان کھول کھول کر ان کے سامنے پھیلانے لگا۔ ساتھ ہی سیلز مینوں والی مخصوص چرب زبانی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔

''یہ سوٹ دیکھیں باجی! بالکل نیا پرنٹ آیا ہے۔ اور یہ والا کلر تو آج کل بہت ہی اِن ہے۔'' وہ ہر تھان کھولتے ہوئے تقریباً اسی طرح کے جملے ادا کر رہا تھا۔

''اور بھی دکھاؤ۔'' اس کے پانچ چھ تھان کھولنے کے بعد ندا نے فرمائش کی۔ دکان پر موجود دوسری گاہک خواتین اپنے لیے کپڑے کا انتخاب کر چکی تھیں اور اب ان کی سیلز مین سے قیمت پر بحث چل رہی تھی۔

''باجی! آپ تو بہت ہی کم قیمت لگا رہی ہیں۔ اتنی تو ہماری خرید بھی نہیں ہے۔ آپ کے لیے میں ایسا کرتا ہوں کہ پچاس روپے کم کروا دیتا ہوں۔ دیکھیں، اب مزید بحث مت کیجئے گا۔'' انہیں کپڑے دکھاتے ہوئے سیلز مین نے اپنے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے ان کے درمیان ہونے والی بحث میں دخل دیا۔ اسی وقت ندا نے اپنے پیر کے قریب رکھے کینوس بیگ کو چپکے سے تخت کے نیچے دھکیل دیا۔

''یہ والے پرنٹ کا ایک سوٹ نکال دیں اور دوسرا وہ فیروزی والا دے دیں۔'' حنا جس نے ندا کی کارروائی دیکھ لی تھی، کام مکمل ہوتے دیکھ کر سیلز مین سے بولی۔ اب مزید یہاں رکنا وقت ضائع کرنا تھا۔ سیلز مین نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ البتہ اس کی زبان مسلسل ان دونوں خواتین کو کنونس کرنے کے لیے مصروفِ عمل تھی۔ ان دونوں نے بغیر کسی بحث و مباحثے کے اپنے خریدے ہوئے سوٹوں کی قیمت ادا کی اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرا خریدا ہوا سامان بھی اپنے پیروں کے پاس سے اٹھا کر دکان سے باہر نکل گئیں۔ اس سامان میں وہ کینوس بیگ شامل نہیں تھا۔ کپڑے کی دکان سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی اور دکان کا رخ نہیں کیا اور مارکیٹ سے نکلتی چلی گئیں۔ یہاں سے انہوں نے پہلے والے طریقے پر ہی عمل کرتے ہوئے واپس اپنے دفتر کا رخ کیا لیکن بس سے اُترنے کے بعد وہ دونوں اکٹھی عمارت میں داخل نہیں ہوئیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے قبل ایک ساتھ دوبارہ دکھائی دینے پر وہ کسی کے نوٹس میں آسکتی تھیں چنانچہ احتیاطاً پانچ منٹ کا وقفہ دے کر اندر گئیں۔

دفتر پہنچ کر انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی چھ نہیں بجے تھے۔ برقعے اور چادر سے نجات حاصل کر کے واپس پہلے والے حلیے میں آنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ انہوں نے پھرتی سے یہ کام انجام دیا۔ خریدی ہوئی اشیاء اور برقعے وغیرہ کو ایک الماری میں رکھنے کے بعد وہ استقبالیہ پر یوں تر و تازہ کھڑی تھیں جیسے ابھی ابھی دفتر آئی ہوں۔ ٹھیک چھ بجے ان کے پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کی باس نے باہر آنے کے بجائے صرف دروازے سے ہی جھانک کر ان کی طرف دیکھا۔ ندا نے اُنگلیوں کی مدد سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے اسے دیکھا۔ جواباً اس نے مطمئن سے انداز میں اپنا سر ہلایا اور واپس پلٹ گئی۔

حنا اور ندا جو کہ درحقیقت ارمیلا اور گیتا تھیں، اس کی بہت کارآمد ماتحت تھیں۔ اسے ان سے اسی کارکردگی کی امید تھی۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتیں اور پھنس جاتیں تو کبھی لوٹ کر واپس دفتر نہیں آتیں۔ پھنسنے کی صورت میں وہ اپنے دیئے ہوئے وچن کے مطابق وہ زہریلا کیپسول نگل لیتیں جو ہمہ وقت ان کے پاس موجود رہتا تھا۔



وہ لوئی عام لڑکیاں نہیں تھیں جو موت کو گلے لگاتے ہوئے ہچکچاتیں۔ ضرورت پڑنے پر جان دینا اور جان لینا انہیں بہت اچھی طرح سکھایا گیا تھا۔ وہ ''را'' کے مایہ ناز ایجنٹ راجیش شرما کی بیٹیاں تھیں۔ راجیش شرما نے اپنی ساری زندگی پاکستان میں ہی گزاری تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جو کٹر برہمن تھا۔ اس کے ماتا پتا تقسیم کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت تو نہیں گئے لیکن انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قطعی غلط قرار دیتے ہوئے ساری ذمے داری مسلمانوں کے سر ڈال دی۔ ان انتہا پسند والدین کے زیرِ سایہ پلنے والا راجیش بھی انہی جیسی سوچ کا حامل تھا چنانچہ پاکستان میں اپنے لیے خدمت انجام دینے والوں کے متلاشی رہنے والوں کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ گئی۔ وہ ان کے لیے کام کرنے پر بہ خوشی راضی ہو گیا۔ لیکن اس کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقاؤں نے اس کی بیوی سنیتا سے رابطہ کیا۔ ان کے مشورے پر سنیتا نے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت دکھاوے کا اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ بچیاں جوان ہو چکی تھیں۔ لوگ انہیں حنا اور ندا کہہ کر پکارتے تھے لیکن ان کی تربیت جن خطوط پر ہوئی تھی، اس کی وجہ سے وہ اندرونی طور پر اب بھی ارمیلا اور گیتا ہی تھیں۔ بھارت ماتا کی وہ قابلِ فخر بیٹیاں جن کے لیے جان دینا اور لینا ایک کھیل تھا، شادی دفتر کی آڑ میں انہوں نے اپنے قدم خوب جما رکھے تھے۔ اس دفتر کی انچارج اور ان کی باس ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا خوب جانتی تھی۔ ان کی کارکردگی کے طفیل اس نے بڑے بڑے افسروں سے کئی قیمتی راز اُگلوائے تھے اور اب اپنے موبائل فون پر ریڈیو لگائے مختلف اسٹیشن ٹیون کر رہی تھی۔ آخر ایک اسٹیشن سے نشر ہونے والی نیوز نے اس کے کانوں تک اس کی مطلوبہ خبر پہنچا دی۔ شہر کی معروف مارکیٹ میں ایک کپڑے کی دکان پر ہونے والا بم دھماکا کافی ہلاکت خیز ثابت ہوا تھا۔ دھماکے نے اس دکان کے ساتھ ساتھ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کی کئی دکانوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رش کا وقت ہونے کی وجہ سے تمام ہی دکانوں پر اچھے خاصے گاہک موجود تھے چنانچہ بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ کافی لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

''وزیرِاعظم نے کہا ہے کہ اس قسم کی پُرتشدد کارروائیاں کرنے والوں کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور کسی کو عوام کی جان و مال سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' نیوز ریڈر خبریں پڑھتے ہوئے وہی بیان دہرا رہی تھی جو اس سے قبل بھی ایسے موقعوں پر دیا جاتا رہا تھا۔

''ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں۔'' وہ مسکراتے لبوں کے ساتھ بڑبڑائی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''یس..... کم اِن۔'' اس نے تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے اجازت دی۔ ندا کی معیت میں ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ خاتون شکل اور لباس سے کافی خوش حال لگ رہی تھیں۔ ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر جب انہوں نے اپنی بیٹی کی تصویر سامنے رکھتے ہوئے اس کے اور اپنے کوائف بتانا شروع کیے تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ ان ماؤں میں سے تھیں جن کی بیٹیاں اپنے آئیڈیل جیون ساتھی کے انتظار میں عمر کا قیمتی حصہ گزار دیتی ہیں اور بعد میں مائیں ان کی تصویریں پرس میں ڈالے ان کے لیے کسی مناسب بر کی تلاش میں شادی دفتروں کی خاک چھانتی پھرتی ہیں۔ خاتون کا مسئلہ نہایت ہمدردی سے سنتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی نرمی تھی کہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ ابھی کچھ دیر قبل یہ عورت ایک بم بلاسٹ کی خبر سن کر بڑی سفاکی سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

سیاہ رنگ کی چست پینٹ پر سیاہ ہی جرسی پہن کر اس نے ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں کینوس کے سیاہ جوتے چڑھائے اور الماری کھول کر دراز میں سے ریوالور نکال کر اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکتے ہولسٹر میں رکھا اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رات اچھی خاصی گزر چکی تھی چنانچہ ملازم سونے کے لیے جا چکے تھے اور پورے بنگلے میں سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا اپنا کوئی آواز پیدا کیے باہر نکل آیا۔ پورٹیکو میں اس کی گاڑی کے ساتھ ہی ایک ہنڈا سی ڈی سیونٹی بائیک کھڑی تھی۔ اس کے ہینڈل کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ہیلمٹ لٹک رہا تھا۔ اس نے ہیلمٹ اٹھا کر اپنے سر پر پہنا اور پینٹ کی جیب تھپتھپا کر اس میں سے چابیاں برآمد کیں۔ ان چابیوں میں ایک چابی اس بائیک کی تھی لیکن وہ چابی لگا کر بائیک کا انجن اسٹارٹ کرنے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے بے حد پھرتی مگر خاموشی کے ساتھ گیٹ وا کر دیا۔

''خیال رکھنا نثار! کسی کو ہرگز بھی میرے اس وقت باہر جانے کی خبر نہیں ہونی چاہئے۔'' اس نے دھیمی مگر بے حد سخت آواز میں چوکیدار کو حکم دیا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! میں کسی کے سامنے کچھ نہیں کہوں گا۔'' چوکیدار نے اسے یقین دلایا۔ شہریار نے شام کے بعد ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ رات کو دیر سے کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی یہ آمد و رفت خفیہ ہوگی اس لیے وہ پوری طرح مستعد رہے تاکہ بنگلے میں موجود کسی اور ملازم کو خبر نہ ہو سکے۔ چوکیدار ظاہر ہے، اس پروگرام کو سن کر حیران ہوا ہوگا لیکن سوال کر کے اپنی اس حیرانی اور تجسس کو دور کرنے کی اس کی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے شہریار کی اطلاع کے مطابق کسی بندے کی بنگلے پر پہنچائی جانے والی بائیک بھی خاموشی سے پورٹیکو میں اس کی گاڑی کے پہلو میں کھڑی کر دی تھی۔ اندازہ تو اسے بائیک کو دیکھ کر ہی ہو گیا تھا کہ اے سی صاحب اپنی شان دار گاڑی چھوڑ کر اس بائیک پر کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اب اسے بائیک سمیت باہر کی طرف جاتے دیکھ کر تصدیق بھی ہو گئی۔

''میں چند گھنٹوں تک واپس آ جاؤں گا۔ تم ہوشیار رہنا۔ یہ نہ ہو کہ میرے واپس آنے تک سو جاؤ۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر!'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ شہریار مزید کچھ کہے بنا بائیک کو دھکیلتا ہوا بنگلے سے ذرا آگے لے گیا اور پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس محفوظ فاصلے سے بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز بنگلے کے اندر سوئے ہوئے ملازمین میں سے کسی کے کانوں میں پڑ کر اسے بیدار کرنے کا سبب نہیں بنے گی، اگنیشن میں چابی ڈال کر بائیک اسٹارٹ کی۔ موٹر سائیکل کا انجن غرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس دو پہیوں والی قطعی غیر افسرانہ سواری پر بیٹھا، ہوا ہو چکا تھا۔ حکمرانی کے اصول و قواعد کی مجبوری اپنی جگہ مگر خود اسے ذاتی طور پر یہ سواری بڑی پسند تھی۔ دورِ طالب علمی میں وہ عموماً موٹر بائیک پر ہی سفر کرنا پسند کرتا تھا اور اسے اس دو پہیوں کی سواری کو چلانے میں خاصی مہارت بھی حاصل تھی۔ اس لیے اس وقت بڑے آرام سے اپنی منزل کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ آج اسے جس مشن پر جانا تھا، وہ قطعی غیر سرکاری نوعیت کا بلکہ اس کے عہدے کی شان سے متصادم تھا لیکن اس کی رگوں میں دوڑتے جوان اور گرم خون کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ڈاکٹر ماریہ سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس پر عمل پیرا بھی تھا۔ کسی فور وہیل گاڑی کے بجائے بائیک کا انتخاب اس نے اس لیے کیا تھا کہ اس چھوٹی سی سواری کو کہیں بھی چھپانے میں آسانی رہتی تھی جبکہ گاڑی آسانی سے نظروں میں آ جاتی۔ پھر اس کی گاڑی تو تھی بھی جانی پہچانی۔ اور وہ یہ قطعی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص بطور اسسٹنٹ کمشنر اسے شناخت کر سکے۔ نڈر اور بے باک ہونا اپنی جگہ لیکن



[illegible] میں ہاتھ ڈالنے سے قبل جو لازمی احتیاط تھی، وہ تو اسے کرنی ہی تھی۔

[illegible] آج کی اس مہم پر جاتے ہوئے اسے مشابرم خان بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس جیسا نڈر اور [illegible] نثار شخص اس مہم میں اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اپنے ساتھ [illegible] لے کر جاتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ملتان روڈ پر پیش آنے والے خونی تصادم میں مشابرم خان بری طرح زخمی [illegible] تھا۔ خود ذاتی طور پر تو وہ یہی کہتا تھا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن شہریار نے اسے ابھی تک ڈیوٹی پر آنے [illegible] کی اجازت نہیں دی تھی اور وہ لاہور میں ہی مقیم تھا۔ ان حالات میں وہ اسے ایک ایسے معرکے پر اپنے ساتھ [illegible] لے جانے کے لیے کیسے بلا سکتا تھا جہاں کافی اٹھا پٹخ کی امید تھی۔ مشابرم خان کے بعد جس دوسرے شخص پر [illegible] اعتبار تھا، وہ عبدالمنان تھا۔ لیکن عبدالمنان ذرا مختلف فطرت کا آدمی تھا۔ وہ اس سے کہتا تو وہ ساتھ چل [illegible] نے پر راضی تو ہو جاتا لیکن مار دھاڑ اور اُچھل کود اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر اس میں اور مشابرم خان [illegible] میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ مشابرم خان کم تجسس کرنے والا، سیدھا سادہ اور خاموشی سے حکم کی تعمیل کرنے والا [illegible] آدمی تھا جبکہ عبدالمنان عرصے سے بیوروکریسی کا ایک چھوٹا سا پُرزہ ہونے کے باعث بے حد ذہین اور معاملہ فہم [illegible] تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق تجسس اور کھوج کی عادت اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ خاموش رہتا اور اس [illegible] سے کوئی سوال نہ کرتا، تب بھی معاملہ بھانپ جاتا اور شہریار نہیں چاہتا تھا کہ تصویروں والا معاملہ کسی بھی شخص کے [illegible] علم میں آئے۔ بالا ہی بالا اس معاملے کو نمٹانے کی جو سبیل ڈاکٹر ماریہ کے تعاون کی وجہ سے نکلی تھی، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

بائیک کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس نے پیر آباد تک کا فاصلہ عمومی دورانیے سے نصف وقت میں ہی طے کر لیا البتہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اسے احتیاط کرنا پڑی۔ ناہموار کچے راستے پر پہلے کے مقابلے میں قدرے کم رفتار میں بائیک دوڑاتا ہوا بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چودھری کا ڈیرا موجود تھا۔ ڈیرے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر اس نے بائیک کا انجن بند کر دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ڈیرے کے قریب ایک درخت کی آڑ میں پہنچ کر اس نے بائیک کھڑی کی اور خود بے قدموں ڈیرے کی عمارت کی عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار بہت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یقیناً اپنی ریاست میں واقع اپنے اس خاص ٹھکانے میں کسی کے گھسنے کی جرأت کرنا چودھری کے خیال کے مطابق ناممکن ہوگا اس لیے زیادہ بلند و بالا دیواریں تعمیر کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس بے نیازی کی دوسری وجہ وہ کتے بھی تھے جو اس کے نوکروں کے علاوہ پہرے داری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی شامت کا مارا دیواروں کی کم بلندی دیکھ کر چوری چکاری یا کسی دوسرے مقصد کے لیے ڈیرے میں گھسنے کی کوشش کرتا تو چوکیداری پر مامور یہ کتے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ وہ خود ڈاکٹر ماریہ کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے ان کتوں کی موجودگی سے واقف تھا چنانچہ بے خبری میں مارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دیوار کی منڈیر پر ہاتھ جما کر اچک کر اس پر چڑھنے کے بعد اس نے دوسری طرف چھلانگ لگانے کی غلطی قطعی نہیں کی اور وہیں بیٹھ کر پہرے دار کتوں کا انتظار کرنے لگا۔ سائلنسر لگا ریوالور اس کے ہاتھ میں بالکل تیار تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ چند سیکنڈ سے زیادہ کا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی چمک دار ذہین نظروں نے اس طرف نمودار ہونے والے دو جسیم کتوں کو فوراً ہی دیکھ لیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے ریوالور کی نال سیدھی کی اور لبلبی دبا دی۔ ریوالور سے گولی نکل کر آگے والے کتے کے سر میں ٹھک سے لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا کتا اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر زور زور سے بھونکنے لگا۔ لیکن اس نے اسے زیادہ بھونکنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے

ریوالور سے نکلنے والی گولی اس دوسرے کتے کے بھی سر میں پیوست ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئی۔ دوسرے کتے کے جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہی اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور ڈیرے کے احاطے میں کود گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈیرے پر رات کے وقت پہرے داری کا فریضہ انجام دینے والے کتوں کی تعداد صرف دو ہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اس فرض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو چکے تھے اور اسے ان کے کسی بھائی بند کی آمد کا خوف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ وہ قدرے اطمینان سے مگر محتاط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یہ چودھری کا ڈیرا تھا اور یہاں اس کے گرگوں کا موجود ہونا لازمی تھا۔ محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس بات کی بھی امید کر رہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی سبب جاننے کے لیے اس طرف کا رخ کرے گا لیکن اس کی توقع کے خلاف کوئی شخص نمودار نہیں ہوا اور وہ بنا کسی ٹکراؤ کے اگلے حصے تک پہنچ گیا۔

''تُو بہت کام چور ہے شریف! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کتا بھونکا ہے، ذرا جا کر دیکھ لے کہ کیا مسئلہ ہے..... پر تُو اپنی جگہ سے ہل کر بھی نہیں دیا۔'' کسی کی شکل نظر آنے سے پہلے ہوا کے دوش پر لہراتی یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

''میں کام چور ہوں تو تُو جا کر دیکھ لے۔ تیرے پیروں میں مہندی لگی ہے یا تُو میرا افسر ہے جو خود چل کر جانے کے بجائے مجھے حکم دے رہا ہے۔'' وہ یقیناً شریف نامی شخص تھا جو بگڑے تیوروں کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

''حکم شکم نہیں دے رہا، تجھے احساس دلا رہا ہوں۔ تُو ساری ذمے داری مجھ کلّے بندے پر ڈال کر خود پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ کسی روز میں نے چودھری صاحب کو تیری شکایت لگا دی تو فیر شکوہ نہ کرنا۔''

''چل چھڈ یار! تُو بھی ایویں ناراض ہو جاتا ہے۔ یار نہیں ہے میرا؟ ذرا سا کتے کے بھونکنے پر میرا مزہ کیوں خراب کرتا ہے؟ جناور (جانور) ہی تو ہے، بھونک دیا ہوگا۔ کوئی لفوا ہوتا تو وہ کوئی ایک واری بھونک کر چپ ہو جاتا؟ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لینا تھا۔'' ساتھی کی دھمکی پر شریف نامی آدمی اکڑ چھوڑ کر خوشامدانہ انداز میں اپنے ساتھی کے سامنے دلیلیں پیش کرنے لگا۔ وہ یقیناً کام چور آدمی تھا جو ہاتھ پیر چلانے کے بجائے زبان ہلا کر ہی جہاں تک کام نکل سکتا ہو، نکالنے کا قائل تھا۔

''کہہ تو تُو ٹھیک رہا ہے۔ چل چھڈ جانے دے۔ لا میرے پیالے میں تھوڑی ہور ڈال۔'' شریف کا ساتھی فوراً ہی نرم پڑ گیا اور جانے کس چیز کی بابت فرمائش کرنے لگا۔ وہ جو اتنی دیر میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ صرف دو ہی آدمی ہیں، آڑ سے نکل کر فوراً سامنے آ گیا۔ وہ دونوں جو پیتل کی چھوٹی سی گھڑونچی سامنے رکھے اس میں سے بھنگ نکال کر پی رہے تھے، اسے یک دم سامنے پا کر ہکا بکا رہ گئے۔ سیاہ لباس میں، سر پر سیاہ ہی ہیلمٹ پہنے ہوئے..... وہ بھی اس انداز میں کہ ہیلمٹ کا شیشہ گرا ہونے کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ یقیناً ان لوگوں کو ایک پل کے لیے بھوت ہی لگا ہوگا۔ بھوت بھی ایسا جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھام رکھا تھا۔

''اے! کون ہے تُو؟'' بالآخر ان میں سے ایک نے خود کو سنبھالا اور بھڑک کر پوچھتے ہوئے اپنے دائیں جانب رکھی کلاشنکوف اٹھانے کی کوشش کی۔

''خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اس نے غراتے ہوئے تنبیہہ کی۔ کلاشنکوف کی طرف بڑھنے والا ٹھٹک کر رک گیا مگر اس کے ساتھی نے احمقانہ دلیری سے کام لیتے ہوئے جھپٹ کر کلاشنکوف اٹھانے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے بھی نہیں پایا تھا کہ شہریار کے خاموش ریوالور سے



اب گولی سنسناتی ہوئی نکلی اور اس کے ہاتھ کی پشت پر لگی۔ اس آدمی کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور اس نے کلاشنکوف چھوڑ دی۔

''میری بات خاموشی سے مان لو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ انجام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ ممکن ہے اگلی بار میں ہاتھ یا پیر کو نشانہ بنانے کے بجائے تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بناؤں۔'' شہریار نے سرد لہجے میں دھمکی دی۔ حقیقتاً وہ یہاں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہاں سے صرف اپنی تصویریں لینی تھیں اور یہ کام کسی انسانی جان کے نقصان کے بغیر کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ لوگ شاید اس بات پر آمادہ نہیں تھے اور چودھری کا نمک حلال کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور کی پروا کیے بغیر اس کی طرف جھپٹے۔ زخمی آدمی زیادہ ہی بلبلایا ہوا تھا چنانچہ کسی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کے حملے میں اتنی پھرتی تھی کہ شہریار دوبارہ ریوالور کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکا۔ بہرحال، عین اس لمحے جب وہ بھینسا اس سے ٹکرانے ہی لگا تھا، اس نے دائیں جانب ہٹتے ہوئے خود کو اس کے حملے سے بچایا اور اڑتا ہوا اس دوسرے آدمی پر جا گرا جو اس پر ہاتھ پیروں سے حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے ایک بار پھر کلاشنکوف کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو جھٹکے سے کلاشنکوف اس کی گرفت سے نکل گئی۔ شہریار نے اسے ایک زوردار لات رسید کی اور ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر خود کلاشنکوف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران زخمی آدمی جو اس کی طرف ہٹ جانے کے باعث اپنے ہی زور میں آگے چلا گیا تھا، سنبھل کر ایک بار پھر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے شہریار کو کمر سے تھام لیا اور زمین پر رگیدنے کے چکر میں تھا لیکن اس نے اس کی پیش نہ چلنے دی اور کہنی کی مدد سے اس کے بائیں پہلو میں ایک نپی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کی شدت کا اندازہ زخمی آدمی کی چیخ سے لگایا جا سکتا تھا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر اس کی کمر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر شہریار دوسرے بندے پر جھپٹا۔ وہ ایک بار پھر کلاشنکوف پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کو ہی احساس تھا کہ کلاشنکوف جس کے قبضے میں ہوگی، اس لڑائی کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے گا چنانچہ وہ اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ مقابل کے مقابلے میں شہریار کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اُس کے پاس یہاں سے کامیاب واپس جانے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ ایک طرح سے تو اس نے یہاں آ کر ہی حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک بیوروکریٹ سے اتنے غیر سنجیدہ عمل کی اُمید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں پھنس جاتا تو بہت بڑے اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑتا۔ کسی کے سامنے اپنی یہاں موجودگی کا جواز پیش کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسے ہر حال میں یہاں سے واپس جانا تھا اور اس صورت میں کہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب رہتا اور دشمنوں کے ہاتھ اپنی یہاں آمد کا کوئی ثبوت بھی نہ لگنے دیتا۔ اپنی ساری تیاری میں اس نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس موجود ریوالور بھی وہ تھا جو کسی چور بازار سے اس تک پہنچا تھا۔ وہ بھی اتنے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد کہ تحقیق کرنے والے کوشش کرتے بھی تو ان کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ویسے تو اسے معلوم ہی تھا کہ یہاں کی پولیس کوئی اتنی باریک بینی سے کسی کیس کی تفتیش و تحقیق کرتی ہی نہیں کہ کسی خاص میک کے ہتھیار سے چلائی گئی گولی کے سہارے اس کے استعمال کرنے والے تک پہنچ سکے۔

اس کے پھرتی کے مظاہرے کے باوجود وہ شخص کلاشنکوف کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن بہرحال، فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شہریار نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نال کی جانب سے کلاشنکوف کو تھام لیا۔ اب ان دونوں میں اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے زور آوری ہو رہی تھی۔

شہریار نے اگر باقاعدہ ورزش اور جوڈو وغیرہ کی تربیت کے ذریعے خود کو کافی مضبوط بنا رکھا تھا تو وہ بھی دیہا
ماحول کا پروردہ بھاری ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ دونوں اپنی طرف سے پورا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح کلاشنکوف
اپنے قبضے میں لے لیں۔ بالآخر شہریار نے کلاشنکوف کو اپنی طرف کھینچنے کی جدوجہد چھوڑ کر اس کی نال پر دونوا
ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اپنے جسم کو اٹھایا اور دونوں پیر اپنے مقابل شخص کے پیٹ میں دے مارے۔ اس
چوٹ کو کھا کر اس شخص کی کلاشنکوف پر گرفت ختم ہوگئی اور وہ پیٹھ کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ شہریار بھی خود کو گر
سے نہیں بچا سکا اور اسی آدمی کے انداز میں ہی خود بھی پشت کے بل زمین پر گر گیا لیکن اسے یہ برتری حاصل تھ
کہ کلاشنکوف اس کے قبضے میں آ چکی تھی۔ اسے نال سے پکڑے پکڑے ہی وہ اُچھل کر کھڑا ہوا۔ اس دوران اس
کا مقابل بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس بار شہریار نے اسے حملہ کرنے کی
مہلت نہیں دی اور کلاشنکوف کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کا بٹ اس کے پہلو میں مارا۔ اس شخص
کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی لیکن وہ پسپائی اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوا اور شہریار کے پیٹ میں اپنے سر
سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر شہریار چند قدم پیچھے ہٹا اور نہایت اطمینان سے کلاشنکوف کے
بٹ سے اس کے سر پر ایک جچی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کھا کر اس شخص نے منہ سے ''اوغ'' کی آواز نکالی او
زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ساتھی پہلے ہی زمین چاٹ رہا تھا۔ بائیں پہلو میں ایک خاص زاویے سے لگائی گئ
شہریار کی کہنی کی ضرب کوئی معمولی نہیں تھی۔ یہ ضرب پسلیوں کے حفاظتی پنجر کو خاطر میں لائے بغیر اس کے دل
پر اثر انداز ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ جو پہلے ہی ہاتھ سے بہتے خون کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا، نیم بے ہوش
ہو گیا تھا۔ اس کے دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی شہریار نے مناسب سمجھا کہ اس کے
تربوز جیسے سر پر بھی کلاشنکوف کے بٹ سے ہلکی سی تھپکی دے دے۔ یہ شفقت بھری تھپکی وصول کرنے کے بعد و
شخص بالکل ہی انٹا غفیل ہو گیا جبکہ اس کا ساتھی تو پہلے ہی بے ہوشی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ان دونوں کی طرف
سے مطمئن ہوتے ہوئے اس نے تہ خانے کا رخ کیا۔ اس ڈیرے پر اس کا پہلی بار آنا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر ماریہ
نے اسے ہر بات اتنی تفصیل سے بتائی تھی کہ اسے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے مقابلے پر
آنے والے ان دو آدمیوں کو نمٹانے کے بعد اس نے کسی تیسرے کی تلاش میں بھی اس لیے وقت ضائع نہیں کیا
تھا کہ ڈاکٹر ماریہ کے مطابق چودھری کی عدم موجودگی میں ڈیرے پر اس کے دو تین سے زیادہ آدمی موجود نہیں
ہوتے تھے۔ اگر کوئی تیسرا وہاں موجود ہوتا تو اس دھینگا مشتی کے دوران سامنے آ چکا ہوتا۔ چنانچہ کسی بھی
مداخلت کی طرف سے قطعی مطمئن وہ تہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس نے
سب سے آخر میں موجود کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے میں جدید ساخت کا آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔
اس کی اطلاع کے مطابق یہ چودھری کا کمرۂ خاص تھا جس کی چابی کسی کارندے کے پاس ہونے کا کوئی امکان
نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف سیدھی کی اور بلا تکلف لاک پر فائر کھول دیا۔ تہ خانے میں کلاشنکوف
چلنے کی آواز بری طرح گونجی مگر اسے اطمینان تھا کہ یہ آواز باہر کہیں نہیں سنی جا سکے گی۔ ڈیرہ گاؤں کی آبادی سے
دُور ذرا سنسان سے علاقے میں تھا جہاں عموماً چودھری کے آدمیوں کے علاوہ دوسرے لوگ رخ کرنا پسند نہیں
کرتے تھے۔

کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں نے لاک توڑ دیا تھا۔ پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل
ہوا۔ یہ کمرہ بیڈ روم کے انداز میں سجا ہوا تھا اور یہ سجاوٹ اتنی عمدہ تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں داد دیئے بنا نہ رہ
پاتیں لیکن اس کی آنکھوں سے کسی بھی قسم کی تحسین کے بجائے نفرت اور کراہیت برس رہی تھی۔ یہ وہ کمرہ تھا



ں پچھلی ہی رات چودھری نے ڈاکٹر ماریہ کی بے بسی اور مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دادِ عیش دی تھی.....
ہی نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کمرے میں آتی جاتی رہی تھیں اور چودھری کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی تھیں۔
دل میں ٹھاٹھیں مارتے نفرت کے طوفان کو قابو میں رکھتے ہوئے وہ دیوار میں بنے بُک شیلف کی طرف
ھا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اسے بائیں طرف کھسکانے کے لیے زور لگایا۔ بُک شیلف بائیں طرف موجود
یوار کے خلا میں غائب ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک اور شیلف موجود تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی شراب کی
ملیں ہی ہوئی تھیں۔ ان بوتلوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ انہیں ہی پوشیدہ رکھنے کے لیے بُک شیلف کے
پیچھے یہ خفیہ الماری بنائی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ بھی ایک ڈاج تھا کہ تلاشی لینے والا ان سے دھوکا کھا کر پلٹ
ہائے۔ اگر اس کے ساتھ ڈاکٹر ماریہ کا تعاون نہ ہوتا تو وہ بھی دھوکا کھا جاتا لیکن اسے حقیقت معلوم تھی کہ اس
اب کی بوتلوں سے بھری الماری کے پیچھے بھی کچھ ہے۔ اس نے اس الماری کو زور لگا کر دائیں طرف دھکیلا۔
اک شیلف کی طرح وہ بھی دیوار کے خلا میں غائب ہو گئی۔ دراصل یہ سارا سیٹ اپ دوہری دیواریں بنا کر ان
کے درمیان بنایا گیا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو خیال ہی نہیں گزرتا تھا کہ دو کمروں کی درمیانی دیوار ایک نہیں
ہے بلکہ دو الگ الگ دیواریں اٹھا کر درمیان میں یہ خفیہ جگہ بنائی گئی ہے۔ ویسے بھی اس تہ خانے تک دو طرح
کے افراد کی ہی رسائی تھی۔ ایک چودھری کے نمک خوار اور دوست تھے تو دوسرے وہ ستم رسیدہ افراد جو پہلے ہی
اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے سبب چودھری کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے افراد کے پاس
چودھری کے خلاف کچھ بھی سوچنے اور عمل کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اب تک یہاں جو مظلوم افراد لائے گئے
تھے، ان میں شاید ڈاکٹر ماریہ ہی وہ ذی شعور ہستی تھی جس نے مجبور ہونے کے باوجود اپنے حواس قائم رکھے تھے
اور چودھری کے چند اہم راز جان کر یہاں سے باہر نکلی تھی۔ اُس کی اس ہوش مندی نے شہریار کا بڑا بھلا کیا تھا۔
اس وقت وہ دونوں الماریوں کے ہٹ جانے کے بعد وہاں پیدا ہو جانے والے درمیانی خلا میں کھڑا اپنے
سامنے موجود تجوری کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوئچ بورڈ تلاش کر کے وہاں روشنی کر دی
تھی۔ وہ روشنی یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ روشنی کی مدد سے وہ سامنے موجود تجوری کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ
نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ تجوری کھولنے کے طریقے سے واقف نہیں۔ نہ ہی چودھری نے اسے براہِ راست
تجوری کا دیدار کروایا ہے جو وہ اس میں موجود لاک کی نوعیت سے اسے آگاہ کر سکے۔ خود اس کا اندازہ تھا کہ
تجوری میں نمبروں والا تالا ہی موجود ہوگا اور نمبر ظاہر ہے صرف چودھری ہی جانتا ہوگا اس لیے اس نے سوچ لیا
تھا کہ کسی زحمت میں پڑے بغیر سیدھے سیدھے ریوالور کی گولی سے لاک توڑ دے گا لیکن اب جو لاک کا جائزہ
لیا تو اندازہ ہوا کہ یہ نمبروں والا لاک نہیں بلکہ اسی کی طرز پر بنایا گیا قدرے مختلف انداز کا لاک ہے۔ تجوری پر
نظر آتے ڈائل پر نمبروں کے بجائے الفابیٹس نظر آ رہے تھے۔ یہ فور کمبی نیشن والا لاک تھا جس کا درست کمبی
نیشن جیسے ہی ملایا جاتا، لاک کھل جاتا۔ لاک کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چودھری کی نفسیات کو سامنے رکھتے
ہوئے اس نے غور کیا کہ اس جیسا بندہ کیا کمبی نیشن سیٹ کر سکتا ہے؟ فوراً ہی اس کے ذہن میں چودھری کا نام
اُبھرا۔ اس جیسا خود پسند بندہ اپنے نام کے کسی حصے کو ہی سوچ سکتا تھا۔ افتخار عالم شاہ.....اس نام میں ''عالم''
اور ''شاہ'' دو ایسے حصے تھے جن میں چار چار الفابیٹس آتے تھے۔ اس نے ان دونوں کو ہی باری باری آزمایا
لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی پر وہ تھوڑا سا جھنجلا گیا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے کلاشنکوف سیدھی کی اور
لاک پر فائر کرنے ہی جا رہا تھا کہ ایک اور خیال ذہن میں اُبھرا۔ اس خیال کو آزمانے کے لیے اس نے آخری
کوشش کے طور پر C,I,A,S کا کمبی نیشن ملایا۔ یہ چودھری افتخار عالم شاہ کے مکمل نام کے ہر حصے کے پہلے

حروف والا کمبی نیشن تھا جسے ملاتے ہی لاک کھل گیا۔

لاک کھلتے ہی اس نے تجوری کا پٹ کھولا۔ اس کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ وہاں سونے کے بسکٹس کا ا
ڈھیر لگا ہوا تھا۔ غریب مزارعوں کا خون چوس کر اور دوسری بے ایمانیوں سے کمائی گئی حرام دولت کو چودھری
اپنی اس خفیہ تجوری میں سونے کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔ بہرحال، اسے سونے کے اس ڈھیر سے کوئی دلچ
نہیں تھی۔ یہاں وہ اپنی ان تصویروں کے حصول کے لیے آیا تھا جن کے ذریعے چودھری اور اس کے سا
اسے زیر کرنے کا منصوبہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے تجوری کے نچلے خانے میں موجود کاغذات اور
لفافوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ ایک لفافے میں اسے آخر کار اپنی تصاویر مل گئیں۔ تصویروں کے ساتھ ان
نگیٹوز بھی موجود تھے۔ اس لفافے کو اپنی بیلٹ میں اڑسنے کے بعد اس نے تجوری کی مزید تلاشی لینا جائز
رکھی۔ اسے ڈاکٹر ماریہ کی تصویروں کی تلاش تھی۔ وقت کی قلت کے باعث وہ وہاں موجود کاغذات کی نوعیت
جاننے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے صرف تصویروں کی تلاش تھی لیکن اس تلاش میں اسے کامیابی حاصل
ہو سکی۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔ واپس پلٹتے ہوئے اس نے تجوری کو بند کرنے یا شیلف کو واپس ا
کی جگہ لانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ شراب کی بوتلوں میں سے چند قیمتی شراب کی بوتلیں نکال لیں اور کمرے
میں پہنچنے کے بعد انہیں بیڈ کراؤن سے ٹکرا کر توڑ ڈالا۔ قیمتی شراب بوتلوں سے نکل کر بستر پر گر گئی اور کمرا الکحل
کی بُو سے بھر گیا۔ اس نے سائیڈ بورڈ پر پڑا سنہری لائٹر اُٹھایا۔ یہ لائٹر وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہاں
جائزہ لیتے ہوئے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس کے انگوٹھے کی معمولی سی جنبش سے سنہری لائٹر نے ایک سرخ شعلہ
اُگلا۔ اس نے کسی خون آشام بلا کی سرخ زبان جیسا شعلہ اُگلتے اس لائٹر کو بستر کی طرف اُچھال دیا اور تیز تیز
قدم اٹھاتا ہوا بنا پیچھے مڑ کر دیکھے، باہر نکلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک
شعلے سے وہاں کئی شعلے بھڑک چکے ہوں گے۔ یہ سرخ سرخ شعلے ذرا دیر بعد چودھری کے اس عیش کدے کو
خاک میں بدل دیتے۔ مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ چودھری کا لاکھ کا مال خاک میں تبدیل ہونے کے باوجود
ان مظلوم لڑکیوں کے نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا جن کے وجود اس عیش کدے میں پامال کیے گئے تھے۔

اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ ظالم اور اس کے ظلم کے خلاف نفرت کا معمولی اظہار تھا۔ اظہار کے اس لمحے میں
وہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والا، ذمے دار اور قانون کا پاسدار اسسٹنٹ کمشنر ہے۔
اس وقت وہ ایک جذباتی اور غصے سے بھرا نوجوان تھا جس کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اپنے پیچھے جاری شعلوں کے رقص کو چھوڑ کر وہ ڈیرے سے باہر نکل آیا۔ موٹر بائیک اپنی جگہ پر موجود تھی۔
ذرا دیر میں وہ اس پر سوار پیر آباد سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ واپسی کا سفر اس نے پہلے سے بھی کم
وقت میں طے کر لیا۔ چوکیدار نثار اس کی ہدایت کے مطابق مستعد اور چوکنا اس کا منتظر تھا۔

''صبح سے پہلے ہی وہ آدمی جو یہ بائیک دے کر گیا تھا، یہاں آئے گا۔ تم بائیک اس کے حوالے کر دینا۔''
سر پر موجود ہیلمٹ اتار کر اسے پہلے ہی کے انداز میں بائیک کے ہینڈل کے ساتھ لٹکاتے ہوئے اس نے
چوکیدار کو حکم دیا۔

''ٹھیک ہے سر!'' چوکیدار نے جواب دیا۔

''اور ہاں نثار! تم نے اپنی ٹرانسفر کے لیے جو درخواست دی تھی، وہ میں نے منظور کر لی ہے۔ بہت جلد تم



ا ش کے مطابق اپنے آبائی علاقے میں جا کر وہاں کام کر سکو گے۔'' اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے
نے چوکیدار سے کہا۔

''بہت بہت شکریہ سر!'' چوکیدار خوش ہو گیا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آج کی رات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا ورنہ نقصان میں رہو
'' اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لہجے کی سنسناہٹ اپنی ریڑھ کی ہڈی
س کرتا ہوا چوکیدار اپنی ڈیوٹی دینے لگا۔

⊛----✪----⊛

''آپ خوب ترسا رہی ہیں مجھے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کتنا بے قرار ہوں۔''

''کبھی ہم بھی تو ایسے ہی بے قرار رہتے تھے اور آپ پابندیاں لگاتے تھے۔'' وہ اس کی بے قراری کا لطف
ہوئے دھیمے سُروں میں ہنسی۔

''تب اور اب میں بڑا فرق ہے محترمہ! پہلے میں جسے روکتا تھا، وہ پیر آباد کی ایک چودھرائن تھی لیکن اب
س سے ملنے کی خواہش کر رہا ہوں وہ میری منکوحہ ہے۔'' آفتاب نے جتایا۔

''یہی فرق تو مجھے روکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ اب اس پہلے والی جگہ پر ملنا مجھے اپنے
شتے کے شایانِ شان نہیں لگتا۔ میں آپ سے ملوں گی لیکن ابھی نہیں۔ ذرا مجھے موقع ملنے دیں پھر میں لاہور
پلی جاؤں گی۔ آپ بھی وہیں آ جائیے گا۔''

''اس پروگرام پر عمل درآمد ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟'' آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اصل میں مجھے شک ہے کہ بڑی ماں کو کسی قسم کی بھنک پڑ گئی ہے۔ ان کی چہیتی
ملازمائیں میری ٹوہ میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے آپ سے فون پر بات کرنے کے لیے بھی بہت محتاط رہنا
پڑتا ہے۔'' اس نے اپنی مجبوری بتائی تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''کہیں آپ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری طرح ہوشیار رہتی ہوں۔'' کشور نے اسے تسلی دی اور پھر گفتگو کا موضوع
بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''آپ نے فریدہ والے معاملے میں کچھ کیا؟ میں نے آپ سے قربان کا پتہ معلوم
کرنے کا کہا تھا۔''

''آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے سرکار! میں نے اپنے ایک شاگرد سے ذکر کیا تھا۔ وہ قربان کو جانتا ہے۔
اگر میں اس سے کہوں گا تو وہ قربان کو میرے پاس لے آئے گا۔ پھر ہم اس کی اور فریدہ کی آپس میں بات کروا
دیں گے۔''

''تھینک یو آفتاب! اصل میں فریدہ کے سلسلے میں بڑا بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ اس پر ظلم ہوا ہے اور ظلم
کرنے والے میرے اپنے ہیں۔ اگر میری مدد سے وہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات پانے میں کامیاب ہو
گئی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔'' وہ دردمندی سے بولی۔

''انشاء اللہ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔'' آفتاب نے صدقِ دل سے کہا پھر مزید بولا۔ ''کیا ایسا
ممکن ہے کہ آپ ابھی فریدہ سے میری بات کروا دیں؟ ہو سکتا ہے آپ کی باتوں پر اس نے یقین نہ کیا ہو۔ میں
بات کروں تو وہ قائل ہو جائے کہ واقعی ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے یقین دہانی کروانے کی کوشش

کروں گا کہ اے سی صاحب بذاتِ خود اس کے کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ ذرا سی ہمت کرے اور ہمارا ساتھ دے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔''

''میں کوشش کرتی ہوں۔ آپ انتظار کریں۔ اگر فریدہ راضی ہوگئی تو میں تھوڑی دیر بعد آپ کو فون کروں گی۔'' اس نے آفتاب سے کہتے ہوئے کال منقطع کردی اور موبائل کو اپنی اوڑھنی میں چھپاتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رانی لپک کر اس کے قریب آئی۔ کشور کی طرف سے نچھی اور شادو پر بے پناہ شک کے اظہار کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جتنی دیر کشور فون پر بات کرے گی، وہ باہر ہی رہے گی تاکہ کوئی اس کے کمرے کے دروازے پر آکر سن گن لینے کی کوشش کرے تو وہ رکاوٹ بن سکے۔

''میں تھوڑی دیر کے لیے اوپر جارہی ہوں رانی!.....تم یہاں کا خیال رکھنا۔'' رانی سے آہستگی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اوپری منزل کی سیڑھیاں طے کرکے وہ اوپر پہنچی اور سب سے پہلے بہزاد شاہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بستر پر پُرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس کی ملازمہ بھی کارپٹ پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کمرے کے سامنے سے گزر کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں فریدہ کا قیام تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے جھانکتی نیلی روشنی، نائٹ بلب کے جلنے کا پتہ دے رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ فریدہ سو رہی ہے۔ اس کی نیند میں مداخلت کے خیال سے وہ تھوڑی سی جھجکی لیکن پھر جانے کیوں اسے احساس ہوا کہ اندر کمرے میں نیند کے بعد والی خاموشی نہیں ہے۔ ایک بار چیک کرلینے کے خیال سے اس نے دروازے کو ہاتھ سے ہلکا سا دھکیل کر کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس پر گویا کوئی پہاڑ آگرا۔ کمرے کا منظر جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سب کچھ حقیقت ہے۔

اسے اپنے اردگرد موجود ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چکراتے ہوئے در و دیوار پوری قوت سے آکر اس سے ٹکرائیں گے اور اسے پاش پاش کرکے رکھ دیں گے۔ موجودہ منظر نے اس کی ساری ہستی کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا تھا۔ آفتاب کے اپنی زندگی میں آمد سے قبل وہ خوشی کے وجود سے ناواقف تھی۔ زندگی اس کے نزدیک ایک جلتے بلتے صحرا میں ننگے پیر سفر کرنے کے سوا کچھ نہیں تھی۔ لیکن ابھی وہ جس لمحے میں موجود تھی، وہ تو ساری زندگی کے دکھوں سے بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ آج اس نے اپنی زندگی کا سب سے کریہہ منظر دیکھا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا۔

حویلی میں فریدہ کی وہ پہلی صبح.....جب وہ اس سے ملنے اس کمرے تک آئی تھی اور حیران ہورہی تھی کہ کیا بہزاد شاہ بھی کسی لائق ہے؟ آج اُس پر سارے اسرار کھل گئے تھے۔ فریدہ کی تلخ اور زہر میں ڈوبی ہوئی باتوں کا مفہوم بھی اس لمحے اسے بہت اچھی طرح سمجھ آگیا تھا۔ چند سیکنڈوں کے اندر وہ آگہی کے کرب ناک عذاب سے گزری تھی۔ اسے لگا کہ مزید ایک سیکنڈ بھی وہاں رُکی تو اذیت سے مرجائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے جسم کی تمام تر طاقتیں مجتمع کرتی ہوئی پلٹی اور دیوانہ وار دوڑ پڑی۔ بالائی منزل سے نچلی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں اس نے اتنی برق رفتاری سے طے کیں جیسے کسی پہاڑی ڈھلوان سے لڑھک رہی ہو۔ سیڑھیاں طے کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی تو رانی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ برآمدے میں اسی کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔

''کیا گل ہے بی بی! سب خیر تو ہے؟'' رانی گھبرا کر اس کی طرف لپکی۔ ساتھ ہی اس نے کشور کے عقب میں بھی نظر دوڑائی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کے تعاقب میں ہوگا لیکن برآمدہ ہنوز سنسان پڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ پھر کشور کی یہ حالت کیوں ہے؟

رانی کو زیادہ غور و خوض کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کشور اس کے وجود کو سراسر نظر انداز کرتی ہوئی وحشت زدہ



[illegible] میں بغیر رُکے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ رانی نے کمرے میں داخل ہونے سے قبل گردن موڑ کر یہ ضرور [illegible] تھا کہ کوئی پیچھے تو نہیں آرہا اور پھر مطمئن ہوجانے پر کمرے میں داخل ہوگئی۔ کشور اپنے بستر پر گری [illegible] سانس لے رہی تھی۔ رانی نے احتیاطاً پہلے دروازے کی کنڈی چڑھائی پھر کشور کے قریب آئی۔

''[illegible] ٹھیک تو ہو بی بی! کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟'' پریشانی کے عالم میں اس نے کشور سے پوچھا لیکن پھر [illegible] احساس ہوا کہ بستر پر گری کشور بری طرح کپکپا رہی ہے اور کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے [illegible] سے اسے ایک کھیس اوڑھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ کافی دیر بعد کشور کی [illegible] ذرا سنبھلی۔

''کیا ہوا تھا بی بی! آپ کس چیز سے ڈر گئی تھیں؟'' اسے سنبھلا ہوا دیکھ کر رانی نے سوال دہرایا۔

''کسی سے نہیں۔ تم بتی بجھا دو، مجھے نیند آرہی ہے۔'' کشور نے رُوکھے سے لہجے میں جواب دے کر اپنی [illegible] آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ حیران پریشان رانی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ٹیوب لائٹ بند کرکے نائٹ بلب [illegible] روشن کردیا۔ بلب روشن کرنے کے بعد اس نے کشور کے سرہانے پڑا موبائل اُٹھا کر الماری میں اس کی مخصوص [illegible] پر رکھا اور الماری کو تالا لگا دیا۔ کشور پلکوں کی درز سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنی وفادار ملازمہ کی اس قدر [illegible] پال داری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس حویلی میں جہاں ہر پل سازشیں جنم لیتی رہتی تھیں، خدمت [illegible] اروں کی فوج جبراً بھرتی کی جاتی تھی۔ انسانی حقوق اور انسانیت کی پامالی معمولی باتیں تھیں، وہاں رانی جیسی [illegible] مہ کا میسر آجانا بہت بڑی نعمت تھی۔

''یہ نائٹ بلب بھی بند کردے رانی!'' آنکھوں پر بازو رکھے رکھے ہی اس نے حکم دیا جس کی فوراً تعمیل کی [illegible] گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا ہوگیا لیکن وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اندھیرے میں کچھ دیر قبل دیکھے گئے منظر سے فرار [illegible] حاصل ہوجائے گا، اپنی کوشش میں بری طرح ناکام رہی۔ اندھیرا تو اس منظر کو اور بھی واضح کرکے دکھا رہا تھا۔ [illegible] اس منظر کے پس منظر میں اسے اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''میں شرمندہ ہوں کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور [illegible] بھی کیا سکتی ہوں؟'' فریدہ سے پہلی ملاقات کے موقع پر جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ چودھری افتخار نے پناہ کے [illegible] لیے اپنے پاس آنے والی فریدہ اور اس کے محبوب قربان کو دھوکا دے کر فریدہ کی شادی زبردستی بہزاد شاہ سے کروا [illegible] ی ہے، اس وقت اس نے یہ بات فریدہ سے کہی تھی۔ جواب میں فریدہ نے کہا تھا۔ ''میں جانتی ہوں، تب ہی تو [illegible] تمہیں اپنے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہونے کی خواہش [illegible] کرنے لگو گی۔'' واقعی اس نے جو منظر دیکھا تھا، اسے دیکھ کر دل یہ چاہا تھا کہ زمین شق ہوجائے اور وہ اس میں سما [illegible] جائے۔ ان کے خاندان کے مرد رنگین مزاج اور عیش پرست ہیں، یہ حقیقت جاننے کے باوجود اس کے لیے اپنے باپ کا وہ مکروہ روپ دیکھنا بے حد کٹھن ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ایک برا آدمی ہے، لیکن یہ [illegible] نہیں تھی کہ وہ اتنا برا باپ ہے کہ اسے اپنے رشتوں کے تقدس کا بھی احساس نہیں۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے [illegible] کی بیوی کو بہو کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی داشتہ بنا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے اتنی شدید نفرت [illegible] محسوس کررہی تھی کہ اس کے مقابل کھڑی ہوکر بھی اس نفرت کا اظہار کرسکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

''کدھر مری رہتی ہو تم دونوں؟ کچھ ہوش رہتا ہے تمہیں حویلی کا یا نہیں؟'' بڑی اور چھوٹی دونوں چودھرائنیں صبح کی پہلی گھڑی میں چودھری کی عدالت میں موجود تھیں اور وہ ان پر برس رہا تھا۔

''ایسا کیا ہو گیا چودھری صاحب! حویلی میں تو سب چنگا بھلا چل رہا ہے۔ فیر بھی اگر کوئی گل ہے مینوں دسّو۔''

''میں نے منع نہیں کیا تھا کہ کوئی بہزاد کی وہٹی سے تعلق نہیں رکھے گا؟ وہ میرے دشمن کی بہن ہے۔ میں اس کی ناک نیچی کرنے کے لیے اس کی بہن کو بہزاد سے ویاہ کر لایا ہوں، پر یہاں تو اس سے دوستیاں گھڑی جا رہی ہیں۔ کیوں جاتی ہے بھلا کشور اس سے ملنے اوپر؟ تم اسے روکتی کیوں نہیں ہو؟'' چودھری کا رُوئے سخن بڑی چودھرائن کی طرف تھا کیونکہ کشور کی ماں سے زیادہ بڑی چودھرائن ہی حویلی کی کرتا دھرتا تھی۔

''میں تو اسے بہت واری سمجھا چکی ہوں چودھری صاحب! پر آپ کی یہ دھی بڑی اتھری ہے۔ میرے روکنے پر بولی کہ میں اپنے بھرا سے ملنے جاتی ہوں۔ میں نے تو ناہید سے کہا تھا کہ سنبھال کر رکھی اپنی دھی کو ورنہ یہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی۔ پر اُسے دھی کی ویران زندگی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ میرے سمجھانے پر بھی اس کے ساتھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی ہے۔'' بڑی چودھرائن نے فوراً توپوں کا رخ سوکن کی طرف کر دیا۔

''یہ گل نہیں ہے چودھری صاحب! میں تو بس اس لیے نہیں روکتی کشور کو اوپر جانے سے کہ وہ وچارے بہزاد چودھری کی محبت میں جاتی ہے۔ کشور کو روکنے کا سوچوں تو دل میں خوفِ خدا آتا ہے۔ فیر یہ بھی سوچتی ہوں کہ میرے روکنے ٹوکنے پر کل کو کوئی یہ الزام لگا دے گا کہ میں سگے سوتیلے کا فرق کرتی ہوں۔ کشور اور بہزاد شاہ سگے بھائی بہن نہیں اس لیے کشور کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔'' چھوٹی چودھرائن ناہید بے شک بڑی چودھرائن سے دبتی تھی لیکن خود کو پھنستا دیکھ کر اشارے کنایے میں ہی سہی، سوکن کو رگیدنے سے باز نہ رہ سکی۔ اُس کی اس حرکت پر بڑی چودھرائن کوئی جوابی حملہ کرتی، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور پھر ایک ملازمہ پریشان اور گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کیا گل ہے؟'' اس دخل اندازی پر چودھری نے غصے سے پوچھا۔

''منشی اللہ رکھا آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ چودھری صاحب سے ملنا ضروری ہے۔'' ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں بتایا تو چودھری کچھ سوچتا ہوا ملاقاتی کمرے کی طرف چلا گیا۔ ویسے وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ منشی کیا اطلاع لے کر آیا ہو گا؟ اسے اتنی جلدی کی امید نہیں تھی۔

''ہاں بھئی منشی! بول کیا خبر لایا ہے جسے سنانے کے لیے اتنا بے تاب ہو رہا ہے؟'' ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس نے اطمینان سے منشی سے پوچھا اور خود اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ کر حقے کی نے تھام لی۔

''خبر بڑی بری ہے چودھری صاحب! ابھی ابھی بالا وہ خبر لے کر آیا ہے۔ میں اسے بلواتا ہوں، وہ آپ ہی سب کچھ بتائے گا۔'' منشی کے لہجے میں واضح کپکپاہٹ تھی۔ بالے کا ذکر سن کر چودھری پہلے سے بھی زیادہ مطمئن ہو گیا۔ بالا کمرے میں آیا تو اس کا فق چہرہ دیکھ کر وہ تھوڑا سا ٹھٹکا۔

''کیا گل ہے؟ یہ تیرے بوتھے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ جس کام کے لیے گیا تھا، اس میں کوئی گڑبڑ کر دی کیا؟'' اس نے تیز لہجے میں بالے سے پوچھا۔

''نہ چودھری صاحب! وہ کام تو میں نے وڈی چنگی طرح کر دیا ہے۔ ادھر سے آپ کو جلد اپنی مرضی کی خبر مل جائے گی۔ پر ابھی جو میں خبر لایا ہوں، وہ بڑی بُری ہے۔''

''اب بک بھی دے کہ کیا ہو گیا ہے؟..... بُری خبر، بُری خبر کہہ کر جب سے دونوں مجھے ہولانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' بالے کا جواب سن کر چودھری کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بری طرح دھاڑا۔

''میرا تو آپ کو معلوم ہی ہے سرکار! کہ رات میں ڈیرے پر نہیں تھا۔ دو بندوں کو ادھر چھوڑ کر میں آپ کا



کام پورا کرنے گیا ہوا تھا۔ کام ہونے کے بعد میں ڈیرے پر پہنچا تو وہاں عجیب حال تھا۔ جن دو بندوں کو میں ڈیرے پر چھوڑ کر گیا تھا، وہ پانی کا پائپ لگائے نیچے تہ خانے کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ آگ بجھی تو میں نے ان دونوں سے تفصیل پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی بندہ ڈیرے کے پیچھے سے گھس آیا تھا۔ اس نے کتوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ان دونوں کو بھی بے ہوش کر ڈالا۔ وہ ہوش میں آئے تو بندہ غائب تھا اور نیچے تہ خانے میں آگ لگی ہوئی تھی۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟..... کس مائی کے لال میں اتنی جرأت ہے کہ چودھری افتخار کے ڈیرے میں گھس کر یہ سب کر سکے؟'' چودھری یہ خبر سن کر بھڑک اٹھا۔

''نہیں معلوم چودھری صاحب! دونوں بندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس آدمی کی شکل نہیں دیکھی مگر یہ اندازہ ضرور ہے کہ وہ ادھر پیر آباد کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ وہ بندہ آدمی کے بجائے کوئی بھوت لگ رہا تھا جو پوری کوشش کے باوجود ان کے قابو میں ہی نہیں آیا۔''

''ان ہڈ حراموں کی تو میں کھال کھنچوا دوں گا۔ پڑے ہوں گے نشہ کر کے، اس لیے کچھ خبر نہیں ہوئی اور یہ بہانہ بنا رہے ہیں کہ کوئی بھوت تھا۔ بھوتوں کو بھلا کیا ضرورت پڑی ہے ڈیرے میں گھس کر آگ لگانے کی۔ وہ یقیناً میرا کوئی دشمن تھا جو ان بندوں کی غفلت کی وجہ سے ہاتھ دکھا گیا ہے۔ ان حرام خوروں سے تو میں بھی طرح حساب لوں گا۔ پہلے میں ڈیرے پر جا کے دیکھوں کہ وہاں کیا حشر مچا ہے۔'' غصے سے سرخ ہوتے چودھری کے ساتھ چودھری اپنے تخت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ تینوں ایک شان دار لینڈ کروزر میں بیٹھے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ لینڈ کروزر کے طاقتور انجن نے بہت تیزی سے انہیں ان کی منزل تک پہنچا دیا۔ چودھری زمین پر زور زور سے پیر مار کر چلتا ہوا ڈیرے میں داخل ہوا۔ سامنے ہی اس کے چہیتے کتوں کی لاشیں موجود تھیں۔ ان لاشوں کے قریب شریف اور اس کا ساتھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چودھری کے کچھ اور کارندے بھی ڈیرے پر موجود تھے۔ ان سب کے چہرے سُتے ہوئے تھے لیکن شریف اور اس کے ساتھی کی حالت پتلی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ رات جو کچھ پیش آیا ہے، اس کی ذمے داری انہی کے سر ڈالی جائے گی۔ وہ محافظ ہو کر ڈیرے کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے اور چودھری کے نزدیک یہ ناکامی نمک حرامی کے مترادف میں آتی تھی۔ اس لیے وہ دونوں خوف زدہ تھے کہ جانے ان کا کیا انجام ہو؟ اگر انہیں اپنے پیچھے سے اپنی بیوی بچوں کی زندگی کا خوف نہ ہوتا تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ایک لمحہ بھی یہاں رکنے کے بجائے گاؤں سے فرار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتے۔ اپنے گھر والوں کا لرزہ خیز انجام سوچ کر وہ اپنی ذات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن بہر حال، انجام سے خوف زدہ تو تھے۔ چودھری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کسی پالتو جانور کی طرح لپک کر اس کے قریب آئے اور اس کی ٹانگوں میں اپنے سر رکھ دیئے۔

''صورت گم کرو ان نمک حراموں کی۔'' چودھری نے دونوں کے سروں پر باری باری پیر سے زوردار ٹھوکر لگائی اور اس طرف بڑھ گیا جہاں تہ خانے کا راستہ تھا۔ منشی اور بالا دونوں اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کے نتھنوں سے وہ مخصوص بُو ٹکرائی جو کسی جگہ لگنے والی آگ کو بجھائے جانے کے بعد آتی ہے۔ آگ بجھے کافی دیر ہو چکی تھی، چنانچہ اندر دھواں تو نہیں بھرا ہوا تھا لیکن بہر حال، گھٹن ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ چودھری نے سب سے پہلے اپنے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ لکڑی کا تھا اور اس کا بیشتر حصہ جل چکا تھا۔ چودھری نے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر لمحہ بھر کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں موجود ہر شے کو آگ کے شعلوں نے چاٹ لیا تھا۔ وہاں اگر کچھ خاک بننے سے رہ بھی گیا تھا تو بس ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں

موجود تھا۔ بڑی چاہت سے سجائے گئے کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اسے دھچکا تو ضرور لگا لیکن اس سے بھی ز
اسے تجوری میں موجود اپنے خزانے کی فکر تھی۔ دو تین لمبے ڈگ بھر کر اس نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس
تک پہنچ گیا جس میں اس کی خفیہ تجوری تھی۔ تجوری پوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں رکھے کاغذات جل کر خاک
چکے تھے۔ سونے کا ڈھیر بھی متاثر ہوا تھا لیکن بہرحال موجود تھا۔

''اسے کسی صندوقچی میں ڈال کر محفوظ جگہ پر رکھواؤ۔'' اس نے سونے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر
ہوئے بنا کسی کو مخاطب کیے حکم صادر کیا۔

''بہتر سرکار!'' منشی کو معلوم تھا کہ یہ حکم اس کے لیے ہے اس لیے فوراً مستعدی سے جواب دیا۔

چودھری پلٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ آگ بڑے خوفناک طریقے سے لگی تھی لیکن بہرحال بچت ہوگئی
کہ آگ کے شعلوں نے اس کے کمرے کے سواتہ خانے کے کسی اور حصے کو لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ اگر ایسا ہو
تو پھر اس کے کارندوں کے لیے آگ بجھانا کسی طور ممکن نہ ہو پاتا۔ کمرے سے نکلنے کے بعد وہ تہ خانے
مزید نہیں رُکا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کھلے حصے میں آ گیا۔ بالا اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ منشی حکم کی پیروی
لیے وہیں رک گیا تھا۔ کھلے حصے میں پہنچ کر چودھری نے اپنا موبائل نکال کر ایس پی کا نمبر ڈائل کیا۔

''میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا چودھری صاحب! لیکن لگتا ہے آپ کو میرے فون سے پہلے ہی خبر
گئی ہے۔'' کال ریسیو کرتے ہی تارڑ نے بولنا شروع کر دیا۔

''کیسی خبر؟'' چودھری لمحہ بھر کے لیے چونکا۔

''اوہ! اس کا مطلب ہے آپ کو نہیں معلوم۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس ہیلتھ یونٹ سے ڈاکٹر
فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اقبال باجوہ کا شوفر اور ملازم اسے لے کر ہیلتھ یونٹ آئے تھے۔ باجوہ
چیک اپ کرتے ہی ڈاکٹر کو اندازہ ہوگیا کہ وہ مر چکا ہے اور موت کی وجہ ہارٹ فیل ہے۔'' ایس پی نے مختصر
ساری بات بتائی۔

''اوہو..... یہ تو صبح صبح دوسری بُری خبر سننے کو مل گئی۔'' چودھری نے تبصرہ کیا۔

''دوسری بُری خبر؟..... اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' ایس پی چونکا۔

''ادھر میرے ڈیرے کے تہ خانے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میرا خاص کمرہ جل کر خاک ہوگ
ہے۔ رات جانے کون آدمی ڈیرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے پہلے میرے کتوں کو گولی ماری پھر میرے بندوں کو
بے ہوش کر کے تہ خانے میں آگ لگا دی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ساتھ میں کچھ لے بھی گیا ہو لیکن ابھی میں اندازہ
نہیں لگا سکا۔ آپ کو اسی لیے کال کی تھی کہ یہاں آ کر ذرا اس واقعے کی چھان بین تو کریں۔'' چودھری نے اپنی
بات کی وضاحت کی۔

''یہ تو بڑی بری خبر سنائی آپ نے۔ ایسا کون ساجی دار دشمن پیدا ہوگیا آپ کا، جس نے ڈیرے میں گھس
کر یہ کارروائی کرنے کی ہمت کی؟ بہرحال، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پیر آباد پہنچ رہا ہوں۔ باجوہ والا معاملہ
بھی دیکھ لوں گا اور ڈیرے کا چکر بھی لگا لوں گا۔'' ایس پی نے چودھری کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ فون سے
فارغ ہو کر چودھری، بالے کی طرف متوجہ ہوا۔

''کام تمام ہوگیا ہے باجوہ کا۔ ایس پی بتا رہا تھا کہ موت ہارٹ فیل سے ہوئی ہے، یعنی کسی کو شک نہیں ہو
گا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ تُو بتا..... تجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی؟'' چودھری کے چہرے پر چھائی سختی ذرا کم
ہوگئی تھی۔



''[illegible] پریشانی نہیں ہوئی تھی سرکار! میں آپ کا پیغام لے کر باجوہ صاحب کے پاس گیا۔ پروگرام کے
[illegible] میں کافی رات گئے وہاں پہنچا تھا۔ جب انہیں پیغام پہنچا کر فارغ ہوا تو اور بھی دیر ہوگئی تھی۔ آپ کو
[illegible] یہ کہ باجوہ صاحب کا نوکر میرا یار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ رات یہیں رک جا۔ میں رک گیا اور
[illegible] ساتھ ساتھ لگا رہا۔ اس نے باجوہ صاحب کے لیے دودھ گرم کر کے گلاس میں نکالا تو میں نے
[illegible] اس کی توجہ ہٹا دی اور موقع کا فائدہ اٹھا کر دودھ میں آپ کی دی ہوئی دوا ملا دی۔ اگر رات موقع نہ
[illegible] میرے چائے میں دوا ملا سکتا تھا، پر قسمت اچھی تھی کہ رات میں ہی کام ہوگیا اور میں منہ اندھیرے
[illegible] بھی پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ ڈیرے پہنچا تو یہاں الگ مصیبت کھڑی تھی، پر میرے پہنچنے سے یہ
[illegible] ہوا کہ آگ بجھانے میں آسانی ہوگئی۔'' بالے نے اپنی کارکردگی رپورٹ پیش کی۔

''[illegible] مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑے گا کہ یہاں میری ناک کے نیچے آ کر کارروائی ڈالنے کی حرکت کس نے کی؟
[illegible] کرنے والے دشمن کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔'' مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے چودھری غرایا۔

''یہ کام دو ہی بندے کر سکتے ہیں چودھری صاحب! ایک چودھری بختیار، دوسرا اے سی شہریار۔ یہ دو ہی
[illegible] ہیں جن کی دُم پر آپ نے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بلبلا کر حملہ کرنے کی غلطی کر سکتا
[illegible] بالے نے چودھری کی توجہ اس کے دشمنوں کی طرف مبذول کروائی تو چودھری سوچ میں پڑ گیا۔

''[illegible] ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ سارا اے سی کا کیا دھرا ہے۔ وہ اپنی تصویروں کی تلاش میں آیا ہوگا۔ اب جانے
[illegible] لے گیا یا یہیں جلا کر راکھ کر دیں، پر ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ ساری محنت ہی ضائع ہوگئی۔ دوبارہ اُس
[illegible] بچے کو اس طرح گھیرنا بڑا مشکل ہوگا۔'' اس کا مزاج باجوہ کی موت کی خبر سن کر ذرا سا بحال ہوا تھا،
[illegible] برہم ہونے لگا۔ پہلے کشور کا اسے فریدہ کے کمرے میں دیکھ لینا، پھر ڈیرے میں آگ لگنا اور اب
[illegible] بندی کے بعد حاصل ہونے والی تصویروں کا ہاتھ سے نکل جانے کا خیال..... اسے تو برہم ہونا ہی تھا۔

''میں حویلی واپس جا رہا ہوں۔ وہاں سے باجوہ کے بنگلے پر جاؤں گا۔ تُو اِدھر ہی رُک اور شریف اور
[illegible] کو ہڈحرامی کا مزہ چکھا۔ کھال اُدھیڑ ڈالنا سالوں کی، پر جان نہ نکلنے دینا۔ ایس پی اِدھر آئے گا تو ان سے
[illegible] بات بھی کرے گا۔ ویسے تو اپنا بندہ ہے، پر پھر بھی ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ بندوں کو زخمی دیکھے گا تو ہم
[illegible] آگ لگا کر جانے والے کے سر الزام رکھ دیں گے، پر بیان دینے کے لیے ان خبیثوں کا زندہ رہنا ضروری
[illegible] بالے کے لیے احکامات جاری کرنے کے بعد وہ آف موڈ کے ساتھ ڈیرے سے روانہ ہوگیا۔ ہمیشہ اپنی
[illegible] پر، کامیابی کے نشے سے سرشار زندگی گزارنے کے عادی اس شخص کے لیے متواتر ناکامیوں کا سامنا کرنا
[illegible] مشکل تھا۔ شہریار کی شرم ناک تصویروں کے حصول کے بعد جو اُمید بندھی تھی، وہ بھی ڈیرے پر لگنے والی
[illegible] میں جل کر خاک ہوگئی تھی۔ وہ جو یہ گمان کیے بیٹھا تھا کہ وہ بہت سے کام نکالنے کے ساتھ ساتھ شہریار
[illegible] ماہ پارہ کا پتہ بھی حاصل کر لے گا، خود کو لگنے والی اس چوٹ پر اندر تک بلبلا کر رہ گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''رات بالا، چودھری صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ صاحب نے اس سے ملاقات کی تو اس وقت جنگے
[illegible] تھے۔ فیر میں نے روزانہ کی طرح انہیں سونے سے پہلے دودھ کا گلاس لے جا کر دیا، تب بھی مجھے وہ بالکل
[illegible] نظر آئے۔ آرام سے بیٹھے ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے دودھ پیا۔
[illegible] خالی گلاس لے کر باہر نکلا، تب بھی ان کو دیکھ کر ایسا کوئی خیال نہیں آیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ تو

سویرے جب میں نے بالے کو ناشتہ کروا کر اِدھر سے روانہ کیا تو صاحب نے گھنٹی بجائی۔ میں حیران سا
آواز سن کر ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ صاحب اتنی سویرے تو کبھی اُٹھتے تھے اور نہ ہی مجھے بلاتے تھے
کمرے میں پہنچا تو صاحب کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بالکل بے دم سے پڑے تھے۔ میں نے جلدی
ڈرائیور کو جا کر جگایا۔ ہم دونوں نے مل کر صاحب کو گاڑی میں ڈالا کہ ہسپتال لے جائیں، پر اندازہ ہم دو
ہی ہو گیا تھا کہ صاحب ختم ہو گئے ہیں۔ اُدھر ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کر دی اور بو
صاحب کا دل بند ہو گیا ہے۔'' اقبال باجوہ کا ملازم سُنتے ہوئے چہرے کے ساتھ ساری تفصیل سنا رہا تھا۔
سننے والوں میں ایس پی، ڈی ایس پی اور مقامی تھانے دار سمیت شہریار بھی شامل تھا۔ چودھری کے ڈیر
رات اس نے جو کارروائی کی تھی، اس کے بعد اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق صبح
وہ ایکسرسائز میں مصروف تھا، اس وقت اس کے پاس ایس پی کی کال آئی اور اس نے اقبال باجوہ کی مو
اطلاع دی۔ اطلاع سن کر فوراً پیر آباد کے لیے روانہ ہونے کے بجائے اس نے اپنے معمولات نمٹائے ا
مقررہ وقت پر دفتر پہنچ کر اسٹاف کو چند ضروری ہدایتیں دیں پھر ڈرائیور کے ساتھ پیر آباد کے لیے روانہ ہوا

اقبال باجوہ کا رہائشی بنگلہ گاؤں سے کافی ہٹ کر جنگل کے قریب تھا۔ وہ بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ
ابھی کچھ دیر قبل ہی مرکزِ صحت سے بنگلے پر پہنچائی گئی ہے۔ موت طبعی تھی اس لیے پوسٹ مارٹم وغیرہ کا تو جو
نہیں تھا لیکن ڈیڈ باڈی کو تیرہ چودہ گھنٹے کی مسافت پر واقع باجوہ کے آبائی گاؤں پہنچانا تھا۔ چنانچہ غسل
اور کفنانے کے بعد جب لاش کو تابوت میں منتقل کیا جا رہا تھا تو ڈاکٹر نے چند ایسے انتظامات کر دیئے کہ لاش
خراب نہ ہو۔ شہریار کے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی اقبال باجوہ کی ڈیڈ باڈی اس کے آبائی گاؤں ر
دی گئی۔

ڈیڈ باڈی کی روانگی کے بعد ایس پی صاحب کی نگرانی میں باجوہ کے ملازم کا بیان لیا جا رہا تھا اور اس
شہریار بھی موجود تھا۔ ملازم کے بیان سے یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ بالا، رات چودھری کا کوئی پیغام لے کر آ
اور صبح تک بنگلے پر ہی رکا تھا، وہ چونک پڑا۔

''بالا، چودھری صاحب کا کیا پیغام لے کر آیا تھا باجوہ صاحب کے پاس؟'' اس نے ملازم سے پوچھا۔

''کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی۔ چودھری صاحب نے آج رات کے کھانے کی دعوت کہلوائی تھی
اکثر ہی وہ بلاتے رہتے تھے صاحب کو۔ ہر پندرہ بیس دن میں ان کا فون آ جاتا تھا صاحب کے پاس کہ فلاں
وقت کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ کل بنگلے کا فون خراب تھا، شاید اس لیے انہوں نے بالے سے کہلوا دیا۔ وہ کہہ
ہو ر بھی کام سے گیا ہوا تھا، اس لیے اِدھر پہنچنے میں دیر ہوئی اور میرے کہنے پر رات اِدھر ہی ٹھہر گیا۔'' ملازم
تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ بہ ظاہر یہ ایک سیدھی سادی صورتِ حال تھی، جس میں کسی قسم کا شک
کرنا مناسب نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موت کی وجہ قطعی طبعی تھی، پھر بھی وہ اپنے اندر کھٹک سی محسوس کر
تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو باجوہ تو خود چودھری کا ہی ساتھی تھا اس لیے اس سے اسے نقصان پہنچانے کے
امکانات بہت کم تھے لیکن چودھری کی سانپ جیسی فطرت کو سمجھنے کے بعد وہ اس سے کوئی اچھی اُمید نہیں رکھ
تھا۔ سانپ ڈسنے پر آتا ہے تو بھلا کب دیکھتا ہے کہ سامنے دوست ہے یا دشمن..... وہ تو بس ڈس لیتا ہے۔''

''ملازم کا بیان مکمل ہو گیا ہے۔ اگر آپ اس سے کوئی اور سوال نہ کرنا چاہتے ہوں تو میں اسے فارغ کر
دوں؟'' اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر ایس پی نے اس سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔ فوراً ہی ایس پی کے حکم پر ملازم سمیت دیگر افراد بھی باہر نکل



اب کمرے میں صرف وہ دونوں ہی موجود تھے۔

''چودھری صاحب نظر نہیں آ رہے یہاں؟ ورنہ باجوہ کے دوست کی حیثیت سے تو میں ان کی یہاں
کی امید کر رہا تھا۔'' اس نے ایس پی سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر پہلے تک وہ یہیں موجود تھے پر انہیں مجبوراً جانا پڑا۔ وہ بے چارے خود بڑی پریشانی میں
رات جانے ان کے کس دشمن نے ڈیرے میں گھس کر تہ خانے میں آگ لگا دی۔ لاکھوں کا سامان جل
غیر، مال کی تو چودھری صاحب کو فکر نہیں لیکن پریشان ہو گئے ہیں کہ کس دشمن نے اتنی جرأت کی؟'' اس کی
کہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ایس پی نے جواب دیا۔

''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ آپ کے محکمے کے لوگوں نے انویسٹی گیشن کی اس معاملے کی؟'' اس
نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

''ابتدائی تحقیق تو ہو چکی ہے۔ حملہ آور تنہا تھا اور موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ ہمیں موٹر سائیکل کے پہیوں کے جو
نشانات ملے ہیں، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیر آباد سے باہر کا آدمی تھا جو آیا اور اپنی کارروائی کر کے چلا
گیا۔ اس کا اصل مقصد کیا تھا، یہ ابھی سمجھ نہیں آیا۔ ممکن ہے کسی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہو یا پھر یہ کہ کوئی
خاص شے کی تلاش میں آیا ہو۔'' ایس پی کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اپنے آخری جملے سے اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا
شہریار کی ذات بھی شک کی زد میں آتی ہے۔ لیکن شہریار قطعی نروس نہیں ہوا اور بے پروائی سے بولا۔

''چودھری صاحب سے ان خاص چیزوں کی فہرست بنوا لیں جن کی تلاش میں ان کے خیال میں کوئی
ڈیرے میں گھسنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ چیزوں کی تفصیل سامنے آئے گی تو مشکوک افراد کے نام بھی سامنے آ
جائیں گے۔'' اسے معلوم تھا کہ اُس کے اس مشورے پر عمل ممکن نہیں۔ کم از کم چودھری یہ تو ہرگز بھی نہیں بتا سکتا
تھا کہ اس نے ڈیرے میں موجود اپنی خفیہ تجوری میں چند ایسی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعے وہ شہریار
کو بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس سچ کو تسلیم کیے بغیر شہریار پر کوئی الزام عائد کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔
کم از کم وہ لوگ اسے قانون کے شکنجے میں جکڑنے کی ہمت تو ہرگز بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''آپ تو یقیناً یہاں سے چودھری صاحب کے پاس ہی جائیں گے۔ میری طرف سے انہیں پیغام دیجئے
گا کہ اگر میری مدد درکار ہو تو تکلیف نہ کریں۔ میں فی الحال مزید یہاں رُک نہیں سکتا ورنہ خود ان سے ملاقات
کرتا۔ اپنے پیچھے کئی اہم کام چھوڑ کر آیا ہوں اس لیے جلد واپس جانا ضروری ہے۔'' اس نے ایس پی کو اپنا پیغام
دیا اور اس سے مصافحہ کیے بغیر باوقار انداز میں قدم اٹھاتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''آپ کو کیا ہو گیا ہے بی بی؟ رات سے ایسے ہی لیٹی ہیں۔ نہ کچھ بولتی ہیں، نہ کھاتی پیتی ہیں۔ اس طرح
تو آپ بیمار پڑ جائیں گی۔'' کشور کے سرہانے کھڑی رانی تشویش زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے
مخاطب تھی۔

''جی تو کرتا ہے مر جاؤں، پر موت پر بھی تو اختیار نہیں۔'' آنکھوں پر بازو دھرے کشور نے رندھے ہوئے
لہجے میں جواب دیا۔

''اللہ نہ کرے بی بی! مریں آپ کے دشمن۔ چنگا بولیں، کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔'' رانی نے
دہل کر اسے ٹوکا۔

''اس وقت تو سب سے اچھا یہی لگ رہا ہے کہ اپنی جان سے چلی جاؤں۔ گناہ کرنے والے گناہ کر
نہیں شرماتے لیکن میں ایک گناہ کو ہوتے دیکھ کر اتنی شرمندہ ہوں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں
جاؤں۔'' وہ ہنوز اسی کیفیت میں تھی۔

''آپ دل کی بہت نرم ہیں نا جی، اس لیے ذرا ذرا سی گل پر اتنی شرمندہ ہو جاتی ہیں..... ورنہ اِدھر تو لوگ
وڈے سے وڈا گناہ کر کے بھی اکڑ کر چلتے ہیں۔'' وہ نہیں جانتی تھی کہ کشور کی اس حالت کی وجہ کیا ہے، بس یونہی
ایک عمومی بات کر رہی تھی۔ لیکن یہ بات کشور کو کوڑے کی طرح لگی اور چودھری کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا،
کتنے بڑے بڑے گناہوں کا بوجھ تھا اس کے سر پر لیکن وہ اس بوجھ کو محسوس کیے بغیر پوری ڈھٹائی سے جی رہا
تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے باپ کے عہدے پر فائز اس ظالم اور بے حیا شخص کو کوئی کڑی سزا سنا ڈالے۔ مگر یہ
اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

بے بسی سے تکیے پر اِدھر سے اُدھر سر پٹختے اسے یک دم ہی شہریار کا خیال آیا۔ آفتاب کے مطابق وہ ایسا
شخص تھا جو چودھری سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اگر فریدہ ساتھ دیتی تو شہریار کی مدد سے چودھری کے خلاف کارروائی
کی جا سکتی تھی۔ شدید دکھ اور اذیت کے احساس سے دوچار وہ اس خیال کے آتے ہی بستر چھوڑ بیٹھی۔ اسے فوری
طور پر فریدہ سے ملنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ خود پر ظلم سہنے کے بجائے اس ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو۔
اسے اُمید تھی کہ رات والے واقعے کے بعد سے فریدہ کو راضی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

''کہاں جا رہی ہیں بی بی؟..... کوئی کام ہے تو مجھے حکم دیجیے۔'' اسے بپھرے ہوئے موڈ کے ساتھ کمرے
سے باہر کا رخ کرتے دیکھ کر رانی نے اسے ٹوکنے کی کوشش کی۔ آج صبح سے ہی حویلی کی فضا میں اچھا خاصا کھنچاؤ
تھا۔ ڈیرے پر آگ لگنے کی خبر حویلی میں بھی پہنچ گئی تھی۔ باجوہ کی موت کا بھی پتہ چلا تھا اور یہ دونوں واقعات
ایسے تھے جن سے حویلی کی فضا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن رانی محسوس کر رہی تھی کہ ان وجوہات کے
علاوہ بھی کوئی وجہ ایسی ہے جس کے سبب وڈی چودھرائن کا مزاج برہم ہے۔ چودھرائن ناہید بھی اسے کچھ
پریشان سی لگی تھی۔ بڑی چودھرائن نے اسے حکم بھی دیا تھا کہ کشور کو میرے کمرے میں بھیجو لیکن اس نے کشور کی
بے حد خراب طبیعت کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ کشور کی مزاج آشنا ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ اس وقت
وہ جس کیفیت کا شکار ہے، بڑی چودھرائن کے حکم کی ہرگز بھی تعمیل نہیں کرے گی۔ بڑی چودھرائن کی منہ چڑھی
ملازمائیں نجمی اور شادو، کشور کی مزاج پرسی کے بہانے آ کر اس بات کی تصدیق کر گئی تھیں کہ وہ واقعی بیمار ہے،
بہانہ بنایا گیا ہے۔ چودھرائن ناہید بھی وہاں آئی تھی لیکن کشور نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھنے کی بھی
زحمت نہیں کی اور اسے تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھنے کے بعد مایوس ہو کر واپس جانا پڑا۔

ان ساری باتوں سے رانی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے کشور اپنے
بزرگوں سے اور بزرگ اس سے ناراض ہیں۔ اپنے اسی اندازے کی بنیاد پر وہ کشور کو باغیانہ سی کیفیت میں
کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اس کی کسی بات پر دھیان
دیئے بغیر باہر نکل گئی اور برآمدہ پار کر کے سیدھے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا۔
پریشان سی رانی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''رُک جا کشور! تُو اوپر نہیں جا سکتی۔'' ابھی کشور نے پہلے قدمچے پر ہی پیر رکھا تھا کہ ایک رعب دار آواز
فضا میں اُبھری۔ کشور اس تحکمانہ آواز کو پہچان چکی تھی پھر بھی اس نے گردن گھما کر حکم دینے والی ہستی کی طرف
دیکھا۔ وہ بڑی چودھرائن تھی جو اس کی طرف پُر جلال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔



''کیوں؟..... کیوں نہیں جا سکتی میں اوپر؟'' اس نے چودھرائن کی جلال بھری نظروں کو خاطر میں نہ
لاتے ہوئے تنتنا کر پوچھا۔

''یہ تیرے ابا جی کا حکم ہے۔ میرے روکنے سے تو رُکتی نہیں، کیا اُن کی گل بھی نہیں مانے گی؟'' وہ گویا
اسے بلیغ کر رہی تھی کہ چودھری کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے بعد بھلا وہ کیسے حکم عدولی کی جرأت کر
سکتی ہے؟

''کسی کا بھی حکم ہو، میں نہیں رُکنے والی۔'' کشور نے رُکھائی سے کہتے ہوئے سیڑھی پر اپنا پیر رکھا۔ رات
سے اب تک وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی ورنہ اس جرأت مندی کا مظاہرہ بہ قائمی ہوش و حواس کرنا ممکن
نہیں تھا۔

''رب دا واسطہ بی بی! ضد نہ کریں۔ واپس اپنے کمرے میں چلیں۔'' وفادار ملازمہ نے اس بگڑتی ہوئی
صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے استدعا کی۔ اس
نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ رانی کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

''مت روک مجھے۔ اب میں کسی ظالم کے دباؤ میں آنے والی نہیں۔'' وحشت زدہ سے انداز میں کہتے
ہوئے اس نے ایک قدم اور بڑھایا۔

''مت ماری گئی ہے اس کُڑی کی۔ لگتا ہے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ کہاں ہے ناہید؟ اسے بلاؤ۔ کہو کہ آ
کر آپ اپنی دِھی کو سنبھالے۔'' اس کی کھلم کھلا بغاوت نے بڑی چودھرائن کو چراغ پا کر دیا اور وہ زور سے چیخی۔
اس سے قبل کہ وہاں موجود ملازماؤں میں سے کوئی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے جاتی، افتاں و خیزاں چودھرائن
ناہید خود وہاں آ پہنچی۔

''کیا ہو گیا ہے میری دِھی؟..... کیوں اتنی ضد کر رہی ہے؟..... تُو نے سنا نہیں کہ تیرے ابا جی نے تیرے
اوپر جانے پر پابندی لگائی ہے۔ تُو چل میرے ساتھ اپنے کمرے میں۔ میں تیرے ابا جی سے گل کر کے تجھے
بہزاد سے ملنے کی اجازت دلوا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے، تُو اپنے بھرا سے وڈی محبت کرتی ہے۔ اس سے ملے
بغیر نہیں رہ سکتی۔ پر اس وقت تھوڑا سا صبر کر لے۔'' اپنے بھاری وجود کے ساتھ تیزی سے چل کر آنے اور پھر دو
تین سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے چودھرائن ناہید کا سانس پھول رہا تھا لیکن پھر بھی وہ کشور کا بخار کی حدت سے
جلتا ہاتھ تھامے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا ہنگامہ ہو رہا ہے یہاں؟..... کیوں تماشا لگا کر رکھا ہوا ہے؟'' چودھرائن ناہید کو اپنی کوشش میں
کامیابی ہوتی، اس سے پہلے ہی چودھری افتخار خود وہاں چلا آیا۔ ایک تو ڈیرے والے حادثے نے پہلے ہی موڈ
آف کر رکھا تھا، اس پر سے حویلی کے زنان خانے میں قدم رکھتے ہی جو پہلا منظر دیکھنے کو ملا، اسے دیکھ کر مزاج
اور بھی برہم ہو گیا۔ کشور کو سیڑھیوں پر کھڑے دیکھ کر صورتِ حال بھی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی چنانچہ اپنے مخصوص
دبنگ اور بارعب لہجے میں با آوازِ بلند پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں چودھری صاحب! یہ کشور کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے اس لیے عجیب
عجیب ضدیں کر رہی ہے۔ تسی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' چودھرائن ناہید نے گھبرا کر بہانہ بنایا تاکہ
بیٹی کو باپ کے عتاب سے بچا سکے مگر وہ خود اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ ماں کی مصلحت پسندی کی
پروا کیے بغیر زور سے چیخی۔

''کوئی دماغ خراب نہیں ہوا ہے میرا۔ مجھے بس اوپر جانا ہے۔''

''کیوں جانا ہے تجھے اوپر؟..... جب ایک واری منع کر دیا تو تیری سمجھ میں نہیں آتا؟'' چودھری نے اسے لہجے کے جلال سے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''ہاں نہیں آتا میری سمجھ میں۔ آپ بتائیں، آپ کیوں جاتے ہیں اوپر؟'' وہ بجائے دبنے کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس کی نظروں میں اتنے شرارے تھے جن کی چودھری جیسا بندہ بھی تاب نہ لا سکا اور بے اختیار نظریں چرا گیا۔ وہاں موجود دیگر لوگ البتہ کشور کی اس جرأت مندی پر دنگ رہ گئے تھے۔ رانی نے تو اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اُس کی جرأت مندی کے اظہار کے بعد کشور کو خوفناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

''اس کا تو دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے علاج کے لیے کسی وڈے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ تم لوگ اس کا سامان تیار کرواؤ۔ کل سویرے میں اسے لاہور بھجوا دوں گا۔ اُدھر رہ کر اس کا علاج ٹھیک طرح سے ہو جائے گا۔'' دوسرے لوگوں کو باپ بیٹی کے درمیان چھڑی سرد جنگ کی وجہ معلوم نہیں تھی اس لیے وہ اس نرم سزا کو سن کر حیران رہ گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ چودھری جس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے بیٹی کے سامنے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، اس میں خود بھی اتنی تاب نہیں رہی کہ اس کا سامنا کر سکے۔ اسی لیے علاج کے بہانے اسے شہر بھجوا کر اس کی نظروں سے بچنا چاہتا ہے۔

''آئیں بی بی! اپنے کمرے میں چلیں۔'' چودھری بہ ظاہر پورے رعب کے ساتھ احکامات جاری کرنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی ہٹ گیا تھا۔ رانی نے ساکت سی کھڑی کشور کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے اس سے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی رانی کے سہارے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

⊛----✪----⊛

''ماہ بانو بہن! تیار ہونا؟'' وہ اپنے دراز بالوں کی چٹیا گوندھنے کے بعد اپنے گرد چادر لپیٹ رہی تھی، جب اکرم خان نے اسے پکار کر پوچھا۔

''ہاں بھائی اکرم! تیار ہوں۔ ابھی باہر آتی ہوں۔'' اس نے اکرم خان کو جواب دیا اور دیوار پر ایک کیل کی مدد سے ٹنگے دُھندلے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرائی۔ نیلے پھولوں والی سیاہ چادر میں اس کا چہرہ اس دھندلے آئینے میں بھی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ چمک اس کے چہرے کے گرد ہالے کی طرح لپٹی اس چادر کی وجہ سے ہے جو بڑی شدت سے کسی کی یاد دلاتی ہے۔ اسے یہ چادر خرید کر دینے والا خود تو شاید اپنی اس مہربانی کو بھول بھی گیا ہو گا لیکن وہ ایک پل کے لیے بھی اسے بھلا نہیں پائی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اسے یاد آتا تھا۔ اس کے بھجوائے گرم کپڑوں کی حدت میں، ہاتھ پیروں پر لگائے جانے والے لوشنز کی مہک میں، کتابوں کی سطروں میں، ہر ہر شے میں اس کی یاد بسی تھی۔ وہ یہاں نہیں تھا لیکن ہر پل، ہر دم یہیں تھا۔ وہ یہاں تھی لیکن ہر پل، ہر لمحہ یہاں سے بہت دُور پنجاب کے اس ضلع کے کوچوں میں بھٹکتی تھی جہاں وہ اسسٹنٹ کمشنری کی ذمے داریاں نبھاتا یقیناً اسے یاد کرنے کی فرصت بھی نہ پاتا ہو گا۔ اس سے جدا ہوتے وقت اس نے اپنے دل میں جو عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی، کاندے کے تنہا شب و روز نے اس کی خوب وضاحت کر دی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ دِکھنے میں ذرا ذرا سا خود پسند اور مغرور نظر آنے والا اے سی اُس کے دل میں بس چکا ہے اسی لیے ہر پل کسی سائے کی طرح ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ شہریار کے لیے اس کے دل میں وہ جذبہ



[illegible] جو لوگوں کے ہجوم میں گھر کر بھی انسان کو سب سے کٹ کر تنہا رہنے کا ہنر سکھا دیتا ہے لیکن یہ تنہائی [illegible] کہ انسان اپنے من کی دنیا میں محفل سجائے بیٹھا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محفل میں سوائے [illegible] اور کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس وقت آئینے کے سامنے کھڑی وہ یک دم ہی محبوب کی [illegible] میں ڈوب گئی تھی۔ دروازے پر آہٹ اُبھری تو چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔ اکرم خان کی ماں چوکھٹ [illegible] اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

[illegible] ہوں ماں جی!..... آ رہی ہوں۔'' اس نے بولتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ باہر صحن [illegible] خان منتظر کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دو بیگ تیار رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بیگ ماہ بانو کا تھا جبکہ [illegible] میں اکرم خان اور اس کی ماں کا سامان تھا۔ وہ لوگ اکرم خان کے ماموں زاد بھائی کی شادی میں [illegible] لیے ہوشے جا رہے تھے۔

[illegible] جاؤ بہن! دیر سے نکلے تو مشکل ہو جائے گا۔ ہم تو عادی ہے ان راستوں کا، پر تمہارے لیے یہ سفر [illegible] رہے گا۔'' اسے دیکھتے ہی اکرم خان دونوں بیگ کاندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پرفیشنل [illegible] بڑا بھاری بھرکم سامان اپنے شانوں پر رکھ کر اِدھر سے اُدھر پہنچانے کی اچھی خاصی مشق تھی۔ ان [illegible] لو تو اس نے یوں اٹھا لیا تھا، گویا گلاب کے پھول ہوں۔

[illegible] میں تو یہ سارا راستہ ہاتھوں کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ اُدھر اسکردو سے ہوشے تک اتنے چکر لگائے [illegible] بھی یاد نہیں۔ آج کل سیاح لوگ گندوگورو دیکھنے بہت جاتا ہے۔ ہم ماں کی وجہ سے پہاڑوں پر نہیں [illegible] اسکردو سے ہوشے تک سفر کرتا رہتا ہے۔'' گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ خوشگوار موڈ میں [illegible] لو بتا رہا تھا۔

''پھر تو آپ کا ہوشے میں ماموں کے گھر بھی آنا جانا لگا رہتا ہو گا؟'' ماہ بانو نے اس کی گفتگو میں دلچسپی [illegible] تے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ہر بار اُدھر جانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم ٹیم کے ساتھ جاتا ہے تو پھر اسی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔'' [illegible] خان نے بتایا۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کاندے [illegible] بہہ رہا تھا۔ بلند پہاڑوں سے بہہ کر آتے اس نالے کے پانی کا شور دور سے ہی سنائی دے گیا تھا۔ نالے [illegible] تیزی سے بہتے پانی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ نالا پار کرنے [illegible] لیے جو پُل بنایا گیا تھا، وہ محض دو شہتیروں پر مشتمل تھا۔ اس پُل کے ذریعے اتنے پُرشور نالے کو پار کرنے [illegible] خیال سے ماہ بانو کانپ گئی۔

''فکر نہ کرو بہن! ہم تمہیں سہارا دے کر پُل پر سے لے جائے گا۔'' اکرم خان نے اس کے خوف کو محسوس [illegible] تے ہوئے اسے تسلی دی پھر بھی اس کا ڈر ختم نہیں ہوا۔

''پہلے اماں کو لے کر جاؤ۔'' اس نے اکرم خان سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ تھام [illegible]۔ پہاڑوں کی باسی اس بوڑھی عورت نے بلا جھجکے پھسلن زدہ شہتیروں پر مشتمل پُل پر قدم رکھا اور اپنے جوان [illegible] کے سہارے نالے کے اس پار جا پہنچی۔ ماں کو اس پار پہنچانے کے بعد اکرم خان واپس آیا۔ اس دوران ماہ [illegible] نو اپنے اندر کافی حوصلہ پیدا کر چکی تھی، چنانچہ اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی لیکن پھر بھی خوف تو دل میں تھا [illegible]۔ اس نے اپنی زندگی میں پانی کا جو سب سے بڑا ذخیرہ دیکھا تھا، وہ پیر آباد کی نہر تھی۔ وہ نہر اچھی خاصی [illegible] طویل اور گہری ضرور تھی، لیکن اس کا پانی اتنا ہنگامہ پرور نہیں تھا کہ دیکھنے والا دُور سے ہی ڈر جائے۔ زیر لب

دعائیں مانگتے اس نے اکرم خان کے سہارے کاندے کا ہیبت ناک نالہ پار کیا اور اس کنارے پر پہنچتے ہی طویل اطمینان بھرا سانس لیا۔

''اچھا ہوا ہم نے تمہیں اس نالے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ہم تمہیں یہ بتا دیتے کہ اس نالے میں گرنے کے بعد آدمی کا بچنا ممکن نہیں تو تم تو پُل پر قدم ہی نہیں رکھتا۔ اس میں گرنے والا تو بس ہوا سیدھا نیچے شیوک میں ہی پہنچتا ہے۔ شیوک دریا کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟'' اکرم خان اُس کی حالت محظوظ ہوتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔

''مجھے ابھی بتا دو کہ آگے تمہارے ہوشے کے راستے میں اور کتنے ایسے ندی نالے پڑتے ہیں؟ تاکہ یہیں رُک جاؤں۔ اس سے آگے میں اور کوئی ایسا خطرناک نالا پار کرنے کو تیار نہیں۔'' ماہ بانو نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو اکرم خان زور سے ہنس پڑا پھر اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

''فکر نہ کرو ہمارا بہن! آگے ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے آگے ہم ہوشے تک آرام سے جیپ میں کرے گا۔''

ماہ بانو نے دیکھا تو واقعی وہاں کچھ فاصلے پر چند جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ اکرم خان اسے اور اپنی ماں لے کر ان میں سے ایک جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ جیپ ڈرائیور اس کا آشنا تھا جس نے مقامی بولی میں اس سے دوستانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے ان دونوں کے جیپ میں بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ جیپ میں بہت سا سامان ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے بیٹھنے کے لیے مشکل سے ہی جگہ بن سکی تھی۔

''پچھلی جیپ میں جو ایکسپی ڈیشن ٹیم بیٹھا ہے، یہ اس کا سامان ہے۔ یہ جیپ ڈرائیور ہمارا دوست ہے۔ اس لیے ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا ہے ورنہ اِدھر سے ہوشے تک جانے کا جیپ والا ہم سے پیسہ لیتا ہے۔'' اکرم خان نے جیپ میں موجود سامان اور غیر آرام دہ نشست کے لیے اس کے سامنے وضاحت پیش کی۔

''کوئی بات نہیں بھائی اکرم! آپ نے بتایا تھا نا کہ یہ صرف گھنٹے بھر کا راستہ ہے، تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹہ تو آسانی سے کٹ جائے گا۔'' اس نے اکرم خان کو شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا۔ جیپ روانہ ہوئی تو وہ اردگرد کے مناظر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ کہیں درخت اور جھاڑیاں تھیں تو کہیں بڑی بڑی چٹانیں۔ ان کا کھیتوں کے ایک سلسلے کے قریب سے بھی گزر ہوا۔

''اس پُل کے پار جانے کے بعد ایک چڑھائی آئے گی اور ہم ہوشے پہنچ جائیں گے۔ اچھا خاصا طویل راستہ طے کرنے کے بعد جب اُن کی جیپ چٹانوں کی اوٹ میں سے گزر رہی تھی تو اکرم خان نے گہرائی میں موجود پُل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرخوشی کے عالم میں بتایا۔ اُس کے لہجے کی اس خوشی پر وہ ابھی غور کر رہی تھی کہ جیپ نے پُل طے کر لیا اور ایک زبردست چڑھائی چڑھنے لگی۔ چڑھائی اتنی زیادہ تھی کہ اسے لگتا تھا جیپ سے نکل کر نیچے جا گرے گی لیکن خیر گزری اور ماہر ڈرائیور نے انہیں بہ خیر و عافیت ہوشے پہنچا دیا۔ چند گلیوں پر مشتمل ہوشے گاؤں کا ایک کچا پکا سا مکان ان کی منزل تھا۔ اپنی اکڑ جانے والی ٹانگوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لوگ جیپ سے اُتر کر جیسے ہی اس مکان میں داخل ہوئے، ایک لڑکی سامنے آ گئی۔ لڑکی کی رنگت صاف تھی اور اس نے اپنے بالوں کو بے شمار مینڈھیوں کی صورت میں گوندھ رکھا تھا۔

''یہ گل مینا ہے، ہمارا ماموں زاد۔'' لڑکی پر نظر پڑتے ہی اکرم خان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے ماہ بانو سے اس کا تعارف کروایا۔ یک دم اس پر منکشف ہو گیا کہ اکرم خان کی خوشی کا سبب یہی لڑکی گل مینا ہے۔



گل مینا پہلے اپنی پھوپھی سے ملی، پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ماہ بانو نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ گل مینا کے جسم سے ہلکی سی بُو اُٹھ رہی تھی۔ یقیناً ہوشے کی روایت کے مطابق وہ بھی بہت کم کم ہی نہانے کی زحمت کرتی تھی۔ ماہ بانو کے نتھنوں نے اس بُو کو محسوس ضرور کیا لیکن ناگواری کے احساس کے بغیر۔ کیونکہ اس بُو کے مقابلے میں محبت کی وہ مہک زیادہ طاقتور تھی جسے کوئی محبت بھرا دل رکھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ماہ بانو نے بھی محسوس کیا تھا کہ گل مینا کے چمنِ دل میں اکرم خان کی محبت کا پھول مہک رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

ٹخنوں سے اونچے میلے چیکٹ گھاگھروں کے ساتھ، سر پر پھٹی پرانی سی اوڑھنیاں رکھے وہ دونوں عورتیں زمین پر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے شانوں سے بڑے بڑے جھولے لٹک رہے تھے جن میں وہ راستے میں ملنے والے ہڈیوں اور کانچ کے ٹکڑوں کے علاوہ کاغذ کے پُرزے اور دیگر اسی طرح کی چیزیں اکٹھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں کی سیاہ رنگت، پپڑی زدہ ہونٹ اور گندے اُلجھے ہوئے بال ان کے شانوں سے لٹکے جھولوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ لوگ اس حلیے میں گلیوں اور کچرا کنڈیوں سے کچرا چننے والی ان عورتوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان دونوں عورتوں کو بھی کئی ایک افراد نے دیکھا تھا لیکن سرسری سی نظر ڈال کر ایک معمول کا حصہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ کسی نے اگر گہری نظر ڈالی بھی تھی تو ان کے چہروں پر نہیں بلکہ ان نشیب و فراز پر جو سر پر ٹکی اوڑھنیوں کے دونوں پلو شانوں سے پیچھے پڑے ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو ہی دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ جو ہوس پرست تھے، وہ اس نظارے سے بن مانگی نعمت کی طرح لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ایک آدھ فحش جملہ پھینک کر آگے بڑھ جاتے مگر کوئی ان کے زیادہ قریب نہیں آتا تھا..... کہ سب ہی کو معلوم تھا، یہ کچرا چننے والی عورتیں کس درجہ بدزبان اور مرد مار ہوتی ہیں۔ کھلی تجوری بن کر سڑکوں پر پھرنے والی یہ عورتیں اتنی بے باکی سے گھوم کر اپنا کام کرتی ہیں اس اعتماد کی بنیاد پر تھیں کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی مائی کا لال ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کوئی جرأت کرتا تو وہ اس کی عزت کو کچرا کرنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگاتیں۔ چنانچہ من چلے دور سے چاہے جتنی آنکھیں سینکیں، قریب آنے کا رسک نہیں لیتے تھے۔ ان عورتوں کے گندے حلیے بھی مردوں کو ان سے دور رکھنے کا ایک سبب تھے۔

وہ دونوں بھی اپنی برادری کی دیگر عورتوں کی طرح اپنے کام میں منہمک بڑی بے نیازی سے قدم اُٹھا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ نظریں اردگرد دوڑاتی ہیں تو صرف زمین پر پڑے کچرے کو نہیں ٹٹولتیں بلکہ اپنے اطراف کا بے حد ماہرانہ اور پیشہ ورانہ جائزہ بھی لیتی ہیں۔ بہ ظاہر بے نیازی سے لیکن حقیقت میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھاتی وہ دونوں اب ایک سرکاری اسکول کے مین گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ابھی انٹرویل نہیں ہوا تھا لیکن اسکول کے گیٹ کے باہر ٹھیلے اور خوانچے والے جمع ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اس منظر کو سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی اسکول کے سامنے سے گزر کر دائیں جانب مڑ گئیں۔

اسکول کی دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ اہلِ علاقہ نے کچرا کنڈی بنا رکھی تھی۔ وہ دونوں کسی معمول کی طرح اس کچرا کنڈی میں داخل ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے کچرا چننے کا عمل جاری رکھا۔ پھر ان میں سے ایک کچرا چنتے چنتے اسکول کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اپنے شانے پر لٹکا بڑا سا جھولا پھرتی سے اُتار کر دیوار کی جڑ میں رکھ دیا۔ اس عمل سے فارغ ہوتے ہی اس نے ذرا فاصلے پر کچرا چنتی اپنی ساتھی کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا اور پھر وہ دونوں جس انداز میں وہاں آئی تھیں، اسی انداز میں اس علاقے سے دُور نکلتی چلی

گئیں۔ اس علاقے سے بہت دُور نکلنے کے بعد ایک گاڑی، ڈرائیور سمیت ان کی منتظر تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے اپنے حلیے تبدیل کرنا شروع کر دیئے۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، کچرا چننے والی عورتوں کے چولے میں سے دو مختلف لڑکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ ''را'' کی خصوصی ایجنٹس ارمیلا اور گیتا، المعروف ندا اور حنا۔

⊛----✪----⊛

''ایک ہفتے میں دوسرا بم بلاسٹ..... وہ بھی ایسا جس میں اسکول کے معصوم بچے مارے گئے۔ لوگ کیسے برداشت کر سکتے ہیں اس صورتِ حال کو؟ اوپر سے نیچے تک سب ہل کر رہ گئے ہیں۔'' اپنی کیپ اُتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مختار مراد خود کلامی کے انداز میں بولا اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ اعصابی دباؤ اور تھکن کا شکار ہے۔

''اوپر والوں کو رہنے دیں۔ انہیں کسی حادثے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دو چار جذباتی بیان دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہم پولیس والے ہیں جو اسے ہر موقع پر گدھوں کی طرح کام بھی کرتے ہیں اور لوگوں کی باتیں بھی سنتے ہیں۔ آپ معلوم کر کے دیکھ لیں، وزیراعظم اور صدر میں سے کوئی رات کے اس پہر نہیں جاگ رہا ہوگا۔'' سجاد رانا نے تھکے تھکے انداز میں خود بھی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا جسے سن کر مختار مراد کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ دوڑی اور پل بھر میں معدوم ہو گئی۔

''آج تو تم اپنے کزن شہریار کے لہجے میں بات کر رہے ہو۔''

''ہر صحیح آدمی کو ان حالات میں اسی لہجے میں بات کرنی چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ شہریار غلط نہیں ہے، بس مصلحتاً ہی اسے ٹوکتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جذبات کا اظہار ہم جیسے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا لیکن ہیں تو بہرحال، ہم بھی انسان۔ آپ بتائیں، کیا آپ کا دل نہیں کانپا ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی سوختہ لاشیں اور بکھرے ہوئے عضو دیکھ کر؟..... لیکن میڈیا والے ہم سے ایسا رویہ رکھتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہو۔ پولیس کیا کر رہی ہے؟ حادثے کا ذمے دار کون ہے؟ اس واقعے کے پیچھے کوئی جہادی تنظیم ہے یا پڑوسی ملک کے دہشت گرد؟ ہر سوال کا جواب آن دی سپاٹ چاہئے ہوتا ہے انہیں۔ کیا پولیس کو الہام ہوتا ہے کہ حادثہ ہوتے ہی کھڑے کھڑے ان کے ہر سوال کا جواب دے دیں؟ اگر ہمیں کسی پر شک بھی ہے تو کیا میڈیا پر ایسی باتیں بتائی جا سکتی ہیں؟ تاکہ ہمارے کچھ کرنے سے پہلے ہی مجرم ہوشیار ہو جائیں۔'' حادثے کی ہولناکی، دن بھر کی بھاگ دوڑ اور میڈیا کی مسلط کردہ اعصابی جنگ نے اسے اتنا اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ اس وقت وہ کسی طرح اپنے مزاج کی برہمی کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

''پانی پیو تاکہ کچھ غصہ ٹھنڈا ہو۔'' مختار مراد نے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا اور انٹرکام پر چائے اور اسنیکس کے لیے آرڈر دینے لگا۔ اسے سجاد رانا کی ذہنی کیفیت کا مکمل ادراک تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جس نے حال ہی میں اپنی نوجوان بیٹی کو کھویا تھا، معصوم بچوں کے کٹے پھٹے جسم دیکھ کر کسی ذہنی و قلبی اذیت سے گزرا ہوگا۔ خود وہ بھی بری طرح ڈسٹرب ہوا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

''سوری..... میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔'' اس کے مشورے پر گلاس بھر پانی پینے کے بعد سجاد رانا ذرا ٹھنڈا ہوا تو شرمندگی سے بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ کبھی نہ کبھی ہم میں سے ہر ایک پر یہ وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنے عہدے اور



ہٹ کر ایک عام انسان کی طرح ری ایکٹ کرنے لگتا ہے۔ تربیت اپنی جگہ لیکن اپنے جذبات کو یکسر اکھاڑ پھینکنا بہرحال ممکن نہیں۔'' مختار مراد نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے جواب اس وقت دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور ایک ملازم اجازت ملنے پر چائے اور اسنیکس سے بھری ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ ملازم کے ٹرالی پہنچا کر واپس چلے جانے تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ وہ گیا تو مختار مراد نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑا۔

''میں تمہاری کیفیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میڈیا والے بعض اوقات واقعی زیادتی کر جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی آپے سے باہر ہو جائیں۔ اس طرح کی کا مظاہرہ تم ابھی میرے سامنے کر رہے ہو، اگر کسی نیوز چینل کے نمائندے کے سامنے کر دیتے تو اس کا انجام جانتے ہو؟..... ہمارے ہاں پہلے ہی پولیس سے بڑھ کر نا قابل اعتماد کوئی ادارہ یا فرد نہیں۔ تم میڈیا والے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیتے تو ہر طرف سے لوگ پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ جاتے۔ پہلے ہی تمہاری کافی نازک چل رہی ہے۔ خواجہ سراؤں والے معاملے میں تمہارا نام سرفہرست ہے۔ پولیس کسٹڈی میں سرا مارا گیا، اس کے بارے میں ہی ہم ابھی تک میڈیا کے شکوک و شبہات دور نہیں کر سکے۔ ایسے حالات اگر تم نے میڈیا کے خلاف کچھ بول دیا تو وہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے کیا؟ وہ تو تمہارے اگلے پچھلے سارے کھول کر بیٹھ جائیں گے۔'' اس کا کہا ایک ایک لفظ اپنی جگہ درست اور مبنی بر حقیقت تھا۔ سجاد رانا جسے اپنی جذباتیت کا احساس ہو چکا تھا، کچھ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

''آپ جانتے تو ہیں انکل! کہ میں شینا والا کیس ابھی تک حل نہ ہونے کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔ تک اس معاملے میں کوئی حتمی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اوپر سے ان بم دھماکوں نے اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ والے بلاسٹ پر کتنا کام کیا میری ٹیم نے لیکن کیا معلوم ہوا؟ اتنی جدوجہد کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا دکان میں بم رکھا گیا تھا، وہاں بلاسٹ سے پہلے دو ایسی لڑکیوں کو جاتے دیکھا گیا تھا جن میں سے کے ہاتھ میں بھاری بیگ تھا۔ نہ لڑکیوں کو کوئی جانتا تھا اور نہ ہی کوئی ان کا حتمی حلیہ بتا سکا۔ خفیہ اداروں کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے کیس کو حل کرنے میں مدد ملے یا تفتیش کی گاڑی آگے بڑھائی جا سکے۔ آج والے بلاسٹ میں بھی دو مشکوک عورتوں کا ذکر سننے میں آیا ہے۔ بم اسکول کی جس دیوار کے ساتھ رکھا تھا، اس کے ساتھ کچرا گھر ہے اور بلاسٹ سے پہلے وہاں کچرا چننے والی دو عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا پولیس کے مخبر آج سارا دن اُن لوگوں کے درمیان دونوں عورتوں کی بُو سونگھتے ہوئے پھرتے رہے ہیں، سے کوئی کلیو نہیں ملا۔ بات ویسے بھی سمجھ آتی ہے۔ یقیناً کچرا چننے والی عورتوں کا گیٹ اپ دہشت گردوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ عورتیں آرام سے اپنے کسی ٹھکانے پر بیٹھی ہوں گی اور ٹی وی پر خبریں دیکھ کر ہماری بے بسی اور اپنی کامیابی پر قہقہے لگا رہی ہوں گی۔'' اپنے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی ہو گیا۔

''ان معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، ایسے کام کرنے والا احتیاط سے کام تو لے گا۔ مجرم خود تو آپ کو تھالی میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خصوصی کیسز میں تو ویسے بھی حالات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر تو سارے کلیوز بھی مل جاتے ہیں اور مجرم کی شناخت بھی ہو جاتی ہے لیکن مصلحتوں مجبوریوں کی وجہ سے کچھ بھی سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ تم نے تو ایک طویل وقت گزارا ہے ملازمت میں۔ تم یہ سارے حقائق جانتے ہو۔ میرے خیال میں تو مجھے تمہیں کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے

تھی۔'' مختار مراد نے گفتگو کے دوران سامنے رکھی جانے والی سینڈوچز کی پلیٹ کی طرف اسے متوجہ نہ
دیکھ کر چائے کے برتن اپنی طرف کھسکائے۔

''آپ رہنے دیں۔ میں بناتا ہوں۔'' اسے یک دم اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ عہدے کے اعتبار
اور رشتے کے لحاظ سے بھی دونوں صورتوں میں مختار مراد اس کے لیے واجب الاحترام تھا۔ اگر تنہائی اور بے تا
ماحول درکار نہ ہوتا تو اس وقت ملازم یہ خدمت انجام دیتا۔ لیکن ملازم کی عدم موجودگی میں تو اس کا ہی فرض
تھا کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے مگر وہ اپنی اُلجھن میں گھر کر کوتاہی کا مرتکب ہو گیا تھا۔ اب خیال آیا تو
مستعد ہوا۔

''ساتھ میں کچھ کھا بھی لیتے تو اچھا ہوتا۔ چند گھنٹوں بعد صبح پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی۔'' جب
اپنی بنائی ہوئی چائے کی پیالی سے گھونٹ بھر رہا تھا تو مختار مراد نے اسے ٹوکا۔

''نہیں، کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے پی کر اب فوراً گھر کے لیے نکلوں گا۔ مجھے معلوم
مریم ابھی تک جاگ رہی ہوگی اور پریشان ہوگی۔ شینا کے بعد اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ چھوٹی
باتوں کا اثر لے لیتی ہے۔ آج والا حادثہ اس کے علم میں آیا ہوگا تو بری طرح متاثر ہوئی ہوگی۔ میں تو سو
ہوں کہ اسے لے کر ممی کی طرف شفٹ ہو جاؤں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری عدم موجودگی
کسی اپنے کے ساتھ ہے۔''

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو تمہیں فوراً اپنے اس فیصلے پر عمل کر لینا چاہئے۔'' مختار
نے اس کی بھرپور تائید کی۔

''میں ایسا ہی کروں گا۔ ابھی تو مریم کی فکر کی وجہ سے میں بہت سے معاملات ادھورے چھوڑ کر گھر وا
لوٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں لیکن اسے ممی کے پاس شفٹ کرنے کے بعد میں پوری یکسوئی سے شینا کے کیس
نگرانی کر سکوں گا۔ اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا۔
کتنے ہی طاقتور اور پہنچ والے کیونکر نہ ہوں، میں نے انہیں نیست و نابود کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس عہد کی
میں کوئی مصلحت اور مجبوری نہیں آ سکتی۔'' اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور پیالی میں موجود آخری گھونٹ
اپنے حلق میں انڈیل کر کھڑا ہو گیا۔

مختار مراد خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اب تک جو حالات سامنے آئے تھے، ان سے یہی ظاہر
تھا کہ شینا کا قتل کسی عام مجرم کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔ اس قتل کے ڈانڈے جن لوگوں سے جا کر مل رہے
ان کے مقابل کھڑا ہونا آگ کے شعلوں میں کودنے کے مترادف تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ہی لوگ
جنگ میں ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے لیکن وہ سجاد رانا کو روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اولاد کی جدائی کے
سے جلتا ہوا باپ کا سینہ کسی بھی مصلحت کا پانی چھڑک کر ٹھنڈا نہیں کیا جا سکتا، یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیسی ہیں ڈاکٹر ماریہ!.....مزاج تو اچھا ہے آپ کا؟''

''جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، آپ کا مسئلہ حل ہوا یا نہیں؟''

''اسی کے سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اصولاً تو مجھے کل ہی آپ کو فون کر
چاہئے تھا لیکن مصروفیت ہی کچھ ایسی رہی کہ موقع نہیں مل سکا۔ فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے انتقال کے



ں آپ کو علم ہے ہی۔ اسی کی وجہ سے کل شیڈول سے ہٹ کر پیر آباد آنا پڑا۔ پھر دیر سے بہت سے
ملنے تھے اس لیے آپ کو کال کرنے میں تاخیر ہو گئی۔'' وہ دل سے ماریہ کا احسان مند تھا اس لیے شکریہ
میں دیر ہو جانے پر اتنی وضاحت پیش کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں اے سی صاحب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اس لیے آپ سے شکوہ
نہیں۔ آپ کا کام ہو گیا ہے، اس کا اندازہ کل ڈیرے پر آگ لگنے کی اطلاع سن کر ہی ہو گیا تھا۔
ملایا آپ نے چودھری افتخار کو۔ تلملایا ہوا پھر رہا ہے بے چارہ۔ میرے خیال سے تو کل کا دن آپ
بہت ہی خاص تھا۔ ایک طرف چودھری کو زک پہنچائی تو دوسرے اس کے اہم حلیف باجوہ سے بھی جان
لی۔ لگتا ہے قدرت بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ میری طرف سے ان کامیابیوں پر مبارک باد قبول
ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے باجوہ کی موت کی خبر سن کر بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔ میں کسی
کو اپنی کامیابی تصور کر کے شادیانے بجانے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہاں البتہ اگر باجوہ کا جرم ثابت ہو
اور اسے عدالت سے سزا ملتی تو بہت خوشی ہوتی۔'' شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ تو اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ آپ سرکاری آدمی ہیں اس لیے قانون کی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم جیسے
لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح سہی، بُرے آدمی سے نجات مل گئی۔ آپ کے بڑے
رات ہیں، کوشش کیجئے گا کہ باجوہ کی جگہ کوئی ایسا بندہ آ جائے جو چودھری کا پٹھو نہ بنے۔ ہے کوئی ایسا شخص
لی نظر میں؟''

''فی الحال تو نہیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گا کہ نیا فاریسٹ آفیسر کوئی ڈھنگ کا بندہ
''اس نے ڈاکٹر ماریہ کو تسلی دی۔

''ایک نام میں بھی تجویز کر سکتی ہوں۔ عابد انصاری نام ہے ان صاحب کا۔ میں جس ہسپتال میں جاب
تی تھی، ایک بار وہ اپنے پتے کے آپریشن کے سلسلے میں وہاں کچھ عرصہ داخل رہے تھے۔ ان دنوں میری ان
کافی بات چیت ہوتی تھی۔ مردم شناسی کا دعویٰ تو نہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے دن میں بے شمار لوگوں
ملنا پڑتا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ بندے کی پرکھ ہے مجھے۔ عابد انصاری صاحب کو میں نے بہت اچھا آدمی
پایا تھا۔ اپنی گفتگو سے بہت پڑھے لکھے، نفیس اور ایمان دار آدمی لگتے تھے۔ اگر ہو سکے تو آپ انہیں ضرور
آزمائیے گا۔'' ڈاکٹر ماریہ نے بے حد شائستہ لہجے میں اسے مشورے سے نوازا۔

''جی بالکل، میں دھیان رکھوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی والدہ کی کوئی اطلاع ملی؟ اس وقت آپ کا
شکریہ ادا کرنے کے علاوہ میرے کال کرنے کا اہم مقصد ان کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ
اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ چودھری کے ایک دو خاص بندے ہیں میری نظر میں۔ ان میں سے کسی
کو اپنے آدمیوں سے اُٹھوا کر اگر پوچھ گچھ کروں تو آپ کی والدہ کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔''

''نہیں نہیں، پلیز! ایسا مت کیجئے گا۔ اس طرح ممی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ چودھری کے
آدمیوں میں سے کسی سے اگر اس سلسلے میں تفتیش کریں گے تو فوراً یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے آپ کو
ممی والے معاملے کی خبر دی ہے اور مجھے یہ بات پہلے ہی سمجھا دی گئی تھی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتایا تو ممی کی
زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ میں ممی کی زندگی کے لیے کوئی رِسک لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے پلیز! آپ کوئی بھی
کارروائی کرنے سے گریز کریں۔ میری قسمت میں جب ہوگا، ممی مجھے مل جائیں گی۔ ابھی تو میرے لیے اتنا ہی

کافی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور فون پر کبھی کبھار مجھے ان کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔'' خوف زدہ سے لہجے اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ نے اپنے انکار کی وجہ بیان کی۔

''لیکن اس طرح تو آپ نامعلوم مدت تک چودھری کے چنگل میں پھنسی رہیں گی اور وہ آپ کا جا اور جسمانی استحصال کرتا رہے گا۔ میری مانیں تو تھوڑی سی ہمت کریں اور مجھے کوشش کرنے دیں۔'' شہریار اسے سمجھایا۔

''بالکل نہیں..... میری ممی اس دنیا میں میرا واحد رشتہ ہیں۔ میرے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں ان کے لیے ذرا سا بھی رِسک لینا پسند نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے زبردستی اپنی مرضی سے کچھ کر کوشش کی تو میرے تعاون سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنی ممی کی حفاظت کے لیے میں آپ کا ساتھ چھ چودھری افتخار کی صف میں بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے گا۔'' ڈاکٹر ماریہ کا لہجہ کچھ آمیز ہو گیا لیکن شہریار نے برا نہیں مانا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریہ بہت خوف زدہ ہے اور کسی بھی صورت اسے کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر گئی ہے۔

''او کے ڈاکٹر ماریہ!..... ریلیکس۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر اس معاملے میں اندازی نہیں کروں گا۔'' اس نے ماریہ کو تسلی دی۔

''تھینک یو، اے سی صاحب! مجھے امید ہے کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں منائیں گے۔ آپ میری پوزیشن سمجھ سکتے ہیں۔ میں درندوں کے نرغے میں پھنسی ایک تنہا لڑکی ہوں اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی مجھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر دے۔ لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، آپ کی کرتی رہوں گی۔'' اس کی تسلی پر مطمئن ہو کر وہ اپنے تعاون کی یقین دہانی کروانے لگی۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں بہرحال، ہر وقت آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے فون کر سکتی ہیں۔'' اس نے ڈاکٹر ماریہ کو جواب دیا اور ایک دو روایتی جملے ادا کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر کے بعد ایک گہرا سانس لیا۔ چودھری کے جرائم اور مظالم کی کئی داستانیں سامنے ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے خلاف ٹھوس اقدامات اٹھا سکے۔ چودھری کا اثر و رسوخ اور دہشت قدم قدم پر رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتی تھی۔

⊛----✪----⊛

''آپ کا شک درست نکلا چودھری صاحب! آپ کے ڈیرے پر کارروائی کرنے والا شخص یقینی طور پر اے سی شہریار ہی تھا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ جس رات ڈیرے پر کارروائی ہوئی، اس رات اے سی نے اپنے بنگلے پر ایک موٹر سائیکل چوری چھپے منگوائی تھی اور صبح وہ بندہ جس کی موٹر سائیکل تھی، اسے بنگلے سے واپس لے گیا تھا۔ موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر طویل سفر کیا گیا ہے۔ وہ بھی کچے پکے، ٹیڑھے میڑھے راستوں پر۔''

''تو پھر آپ کارروائی کریں نا ایس پی صاحب! آپ کے پاس ثبوت ہے تو پھر آپ چاہیں تو اے سی کو گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ابھی تک ایف آئی آر میں کسی مشکوک بندے کا نام نہیں لکھوایا۔ آپ کہیں تو اب اے سی کا نام لے لیتا ہوں۔'' ایس پی تارڑ کی فراہم کردہ اطلاع سن کر چودھری اپنی جگہ سے اُچھل پڑا اور پُرجوش لہجے میں اسے مشورے سے نوازتے ہوئے خود بھی آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔



''ایسا نہیں ہو سکتا چودھری صاحب! ہمارے سارے ذرائع ایسے نہیں ہوتے کہ ہم انہیں عدالتوں میں گواہ بنا کر پیش کر سکیں۔ بس آپ سمجھیں کہ یہ آف دی ریکارڈ معلومات ہیں جو میں نے آپ تک پہنچائی ہیں۔ اگر میں نے کسی طرح مخبری کرنے والے کو عدالت میں گواہی دینے پر مجبور بھی کر دیا تو ہم اے سی کو نہیں گھیر سکیں گے۔ وہ یہ کہہ دے گا کہ ہاں، میں نے اس رات اپنے بنگلے پر ایک موٹر سائیکل منگوائی تھی اور رات بھر اس پر آس پاس کے علاقے میں گھومتا رہا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں چودھری افتخار کے ڈیرے پر آگ لگانے بھی جا پہنچا تھا۔ کیا وہاں کوئی ایسا ثبوت ملا ہے جس سے میری آمد ثابت ہو سکے؟ چودھری یا اس کے کسی بندے نے اپنی آنکھوں سے مجھے وہاں آتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو پہلے ہی دن کیوں نہ بتا دیا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تصدیق کے باوجود میں اُس اے سی کے بچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کی بنائی ہوئی انفارمیشن آف دی ریکارڈ ہی رہے گی اور اس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔'' تارڑ کے انکار اور دلائل نے چودھری کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ آپ کو اس انفارمیشن سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ ہو۔ کم از کم آپ اے سی کا دباؤ تو ڈلوا ہی سکتے ہیں۔ فون کریں اس کے ایم این اے ماموں کو اور بتائیں کہ اس کا بھانجا یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ ساتھ یہ احسان بھی جتا دیں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے میں صرف آپ کے لحاظ میں آپ کے بھانجے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ لیاقت رانا خود اپنے بھانجے کو سمجھا لے گا کہ چودھری سے زیادہ پنگا نہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اے سی صاحب کم از کم اپنے ماموں کے علم میں تصویروں والی بات لانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس میں انہیں ڈر ہو گا کہ جانے ماموں یقین کریں یا نہ کریں..... الٹا اپنا کردار مشکوک ہو جائے گا۔''

تارڑ نے شاطرانہ انداز میں چودھری کو صلاح دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''گل تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے ایس پی صاحب! چلیں تو فیر ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ دن تو وہ بلونگڑا آرام نال بیٹھے گا۔'' آخر اس نے تارڑ کا مشورہ قبول کر لیا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے چودھری صاحب! ان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس سے ذرا مختلف انداز میں نمٹنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کے معاملے میں ڈائریکٹ ایکشن سے زیادہ اس طرح کی چال بازیوں سے کام لینا مناسب رہتا ہے۔ کیونکہ صاف بات ہے کہ ہم انہیں آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتے، اس لیے بہتر ہے کہ تھوڑی نرمی، تھوڑی گرمی کے ساتھ معاملات چلاتے رہیں۔'' ایس پی نے اس کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے مزید سمجھایا۔

''آپ کا مشورہ ہے تو ہم ماننے سے انکار کیسے کرتے؟ پر یقین رکھئے گا کہ جلد ایسا کوئی موقع دوبارہ آئے گا جب آپ کو ہماری طرف کی بات جاننے کے بعد اسے آف دی ریکارڈ رکھنا ہو گا۔'' چودھری نے معنی خیز لہجے میں کہا تو تارڑ اُلجھ گیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا چودھری صاحب؟'' اس نے ناسمجھی کے انداز میں وضاحت چاہی۔

''گل یہ ہے ایس پی صاحب! کہ وہ لڑکی ماہ بانو ابھی تک ہمارے دل میں پھانس بن کر چبھی ہوئی ہے۔ جب تک ہم اسے پا نہیں لیں گے، چین نہیں آئے گا..... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ماہ بانو کا پتہ اپنے اے سی صاحب کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں۔ میرے بندوں نے اس کے اسٹاف کو بڑا ٹٹولا۔ رشوت، دھونس، دھمکی سارے حربے آزما لیے، پر کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا..... جس کا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اب میرے پاس آخری حل یہی ہے کہ اے سی سے ماہ بانو کا پتہ اُگلواؤں۔ پہلے سوچا تھا کہ تصویروں والے معاملے

میں اسے بلیک میل کر کے اور کاموں کے ساتھ یہ کام بھی نکلوا لوں گا۔ یہ تصویریں تو نکل گئیں ہاتھ سے، اب میں ایسا سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے اے سی صاحب گڈی میں بیٹھ کر بہت اِدھر اُدھر دوڑیں لگاتے پھرتے ہیں. کسی دن موقع دیکھ کر انہیں اپنے کسی ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کچھ دن آرام بھی کر لیں گے اور ہمیں ماہ بانو کا پتہ بھی بتا دیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ یہ معاملہ آف دی ریکارڈ رہے گا کہ نہیں؟'' چودھری نے اپنا پورا منصوبہ ایس پی کے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''یہ ذرا خطرناک کام ہو جائے گا چودھری صاحب! بہر حال، آپ اتنا اطمینان تو رکھیں کہ میرا تعاون آپ ہی کے ساتھ ہو گا لیکن جلد بازی سے کام مت لیجئے گا۔ کچھ دن انتظار کریں، ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے لڑکی کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ وہ اس کے ماں باپ.....اور ایک بہن بھی تو ہے یہاں۔ ممکن ہے کسی روز لڑکی خود اپنے رشتے داروں سے رابطہ کرے۔ آپ ان لوگوں پر نظر رکھوائیں تو میرے خیال میں آپ کا مقصد زیادہ آسانی سے پورا ہو جائے گا۔'' ایس پی کے مشورے نے چودھری کو یاد دلایا کہ وہ ایک عرصے سے ماہ بانو کے ماں باپ کو فراموش کیے بیٹھا ہے۔ وہ دونوں کیا کر رہے ہیں اور کیسے ان کا گزارہ ہو رہا ہے، کچھ معلوم ہی نہیں۔ اس نے فوراً ان معلومات کے حصول کے لیے منشی اللہ رکھا کو آواز دی۔

''حکم سرکار!'' منشی اُس کی پکار پر فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

''غیاثے اور نوراں کی کیا خبر ہے؟ زندہ ہیں کہ مر کھپ گئے ہیں؟''

''زندہ ہیں سرکار!..... پر مُردوں جیسی حالت میں۔ نوراں تو اپنے پُتر کی موت کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی۔ سارا دن گاؤں میں ماری ماری پھرتی ہے۔ غیاثا اُسے پکڑ پکڑ کر گھر لے جاتا ہے۔ اس کا اپنا حال بھی اچھا نہیں۔ ایک تو اکلوتے پُتر کی موت کا غم، اس پر سے گھر والی کی حالت۔ سالا کسی کام جوگا نہیں رہا۔ سنا ہے، اے سی کے دفتر سے اس کے گھر کے لیے مہینے کا راشن جاری ہو گیا ہے، اسی پر گزر بسر ہو رہی ہے۔'' منشی کی معلومات ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ ہوتی تھیں اسی لیے تو وہ چودھری کے اتنے قریب تھا۔ اس وقت بھی اس کے سوال کا بھرپور اور تفصیلی جواب فراہم کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تُو جا۔'' چودھری نے اسے رخصت دی اور ایک بار پھر تارڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ نے سنا تارڑ صاحب! منشی کیا کہہ رہا تھا؟ ان باتوں کو سن کر تو مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کی نگرانی کروانے سے کچھ حاصل ہو گا۔ ویسے بھی ماہ بانو اپنے ماں پیو سے ناراض تھی، وہ ان سے رابطہ کیوں کرے گی؟''

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے دباؤ اور لالچ میں آ کر غیاث اور نوراں نے ماہ بانو کی اس سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ ماہ بانو کو اپنے ماں باپ سے بدگمان کر گیا تھا اس لیے اس بات کا امکان ذرا کم ہی تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اسے رابطہ کرنا ہوتا تو اپنی بڑی بہن اور بھائی کی موت کے موقع پر کرتی لیکن جب وہ اتنے نازک مواقع پر خاموش رہی تھی تو اب کس لیے ان سے رابطہ کر کے خود کو منظر پر لانے کا خطرہ مول لیتی؟

''اگر یہ معاملہ ہے تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔ لیکن ذرا ہاتھ پیر بچا کر، صفائی کے ساتھ۔ اور ہاں، کچھ کرنے سے پہلے مجھے ضرور مطلع کر دیجئے گا۔ میں بھی کچھ انتظامات کر دوں گا۔ خصوصاً ڈی ایس پی منظور کو اس موقع پر اِدھر اُدھر کرنا ہو گا۔ پچھلے دنوں بڑی چمچہ گیری کرتا رہا ہے وہ اے سی کی۔ یقیناً اے سی کو استعمال کر کے میری جگہ خود ایس پی بننے کے خواب دیکھ رہا ہو گا۔ بہر حال، میں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں جو اسے اس کے مقصد میں کامیاب ہونے دوں۔ خواب ہی دیکھتا رہ جائے گا وہ ایس پی بننے کے۔'' تارڑ نے بھی



[illegible] ذاتی دشمنی کا اظہار کیا۔

''اگر زیادہ مسئلہ ہے تو مجھ سے کہیں، میں کام ہی تمام کروا دیتا ہوں آپ کے دشمن کا۔ ہمارے ہوتے [illegible] ستوں کو کوئی پریشانی ہو، ہمیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ باجوہ کا کتنا ساتھ دیا ہم نے۔ [illegible] تعاون کی وجہ سے وہ مشکوک ہونے کے باوجود سلاخوں سے باہر بیٹھا تھا۔ دیکھا جائے تو ہمارے کام [illegible] رہا۔ خیر بھی ہم اس سے آخری دم تک دوستی نبھاتے رہے۔'' تارڑ کو پیشکش کرتے ہوئے چودھری [illegible] ایسا حوالہ دیا جو خود تارڑ کے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔ باجوہ کی موت طبعی تھی اس کے باوجود جانے کیوں اس [illegible] میں کھٹک سی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ ملاقات تھی جس میں اس نے چودھری سے باجوہ کے خدشات کو [illegible] لیا تھا اور جواباً چودھری نے بہت عجیب و غریب رویہ اپنایا تھا۔ پھر باجوہ کی موت والی رات اس کے بنگلے [illegible] کا ہونا بھی بڑا معنی خیز تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مرکزِ صحت میں موجود دونوں ڈاکٹرز نے موت کی وجہ ہارٹ [illegible] ہالی تھی۔ وہ ڈاکٹرز کے بیان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ ڈاکٹرز کو خرید لینا چودھری کے [illegible] ل مشکل بات نہیں مگر ڈاکٹرز کے بیان کو چیلنج کر کے زبردستی باجوہ کا پوسٹ مارٹم کروانا بھی اس کے لیے [illegible] نہیں تھا۔ اُس کی ایسی کوشش چودھری کو بھڑکا سکتی تھی۔ وہ چودھری کو بھڑکا کر اپنے لیے مصیبت نہیں مول [illegible] تا تھا اس لیے وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر اس صورتِ حال میں اس کے لیے چودھری پر پہلے جیسا [illegible] نا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو گیا تھا کہ کسی روز وہ بھی باجوہ جیسے انجام سے دوچار [illegible] ہے۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ چودھری کو محسوس ہونے لگے کہ وہ اس کے لیے اب مفید نہیں رہا۔

''کیا ہوا ایس پی صاحب! کس سوچ میں پڑ گئے؟'' اسے غائب دماغ پا کر چودھری نے اسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔ بس باجوہ کا خیال آ گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ بنی ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ اب نہ جانے اس کی [illegible] نیا فاریسٹ آفیسر آئے، وہ کیسا بندہ ہو؟ ہم سے تعاون کرے یا نہیں؟ پہلے ہی اے سی کی وجہ سے بزنس [illegible] ہو رہا ہے۔ اگر فاریسٹ آفیسر بھی کوئی اس کا جوڑی دار آ گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

اپنی اصل قلبی کیفیات چھپاتے ہوئے تارڑ نے بات بنائی جسے سن کر چودھری مسکرا دیا اور خوش دلی سے [illegible] ''تسی کیوں فکر کرتے ہو ایس پی صاحب! میں ہوں نا۔ میں اپنا پورا زور لگا دوں گا کہ نیا فاریسٹ آفیسر [illegible] مطلب کا بندہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو آنے والا، باجوہ سے زیادہ کام کا بندہ نکلے گا۔'' وہ، جو شیطان کا [illegible] تھا، اپنے پیدائشی مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا کر بڑے دھڑلے سے اپنے مذموم مقاصد کی کامیابی کے [illegible] اللہ کا نام استعمال کر رہا تھا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اللہ کبھی بھی ظالم کا ساتھ نہیں دیتا، بس کبھی کبھی اس کی رسی [illegible] دیتا ہے۔

⊛----✪----⊛

''تم بہت خوب صورت ہو گل مینا! تمہارے بال تو بہت ہی پیارے ہیں۔'' گل مینا دھوپ میں بیٹھی اپنے [illegible] بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے انہیں خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماہ بانو کی اس پر نظر پڑی تو اس کے [illegible] پاس چلی آئی اور بڑی بے ساختگی سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ بالکل سچ تھی کہ بالوں [illegible] لٹ ڈھیوں کی شکل میں باندھ کر قدرے میلے سے حلیے میں رہنے والی گل مینا اس وقت واقعی بہت اچھی لگ [illegible] رہی تھی۔ آج اس کے بھائی کی بارات تھی اور اس خوشی میں جانے کتنے دنوں بعد اس نے غسل کی زحمت کی تھی۔ [illegible] کا ڈھلا ڈھلایا اور تروتازہ وجود بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

''تم خود بہت پیارا لڑکی ہو۔'' گل مینا نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تعریف وصول کی ا
جوابی تعریف سے نوازا۔

''بال سکھانے کے بعد کیا تم دوبارہ ان کی مینڈھیاں کرو گی؟'' وہ گل مینا کے برابر میں ہی بیٹھ گئی
کے نرم ریشمی بالوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔ ویسے اسے گل مینا کے جواب کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ ا
گل مینا سمیت یہاں تمام خواتین کو اسی ہیئر اسٹائل میں دیکھا تھا جبکہ بچوں کے سروں پر عموماً اُسترا پھرا ہو

''بالوں کی مینڈھیاں نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا؟ ادھر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔'' اس کی تو
مطابق گل مینا نے اسے جواب دیا۔ وہ ''کیوں'' کا سوال اٹھاتے اٹھاتے یک دم چپ کر گئی۔ اسے یاد
کہ پانی کی قلت اور موسم کی سختی کا شکار ان علاقوں اور پنجاب کے میدانوں میں بڑا فرق ہے۔ جغرافیائی
ماحول اور مزاج میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ ہوشے کی گل مینا، پنجاب کی ماہ بانو کی سی عادات کی ما
ہوسکتی۔ البتہ فطرت دونوں کی ایک تھی۔ گل مینا مشابرم کے دامن میں واقع جس ہوشے میں رہتی تھی
سینکڑوں مسائل تھے۔ سال کی ایک فصل، پھل دار درختوں کی کمی، شدید برف باری، لکڑی کی قلت.....
کون کون سے مسائل تھے جن کا اسے سامنا تھا پھر بھی وہ مطمئن تھی اور اپنی مٹی سے محبت کرتی تھی۔ ماہ
یہ سارے مسائل نہیں دیکھے تھے لیکن ایک درندہ صفت انسان کے ہاتھوں اس بری طرح ستائی گئی تھ
علاقہ چھوڑ کر ان پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی تھی لیکن واپس پلٹ کر جانے کی خواہش اب بھی
موجود تھی۔ اس خواہش کے پیچھے یقیناً وہی فطری محبت تھی جو ہر انسان کو اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ انسان
بھی ہو، فطرت سے انحراف نہیں کرسکتا۔

''کیا سوچتا ہے؟.....اکرم خان بتا رہا تھا کہ تم اُدھر لاہور سے آیا ہے۔ اُدھر اور اِدھر میں تو بڑا فر
تم رہ لے گا اِدھر؟'' ماہ بانو کو خاموش پا کر اس نے خود گفتگو آگے بڑھائی۔

''کیوں نہیں۔ آخر مشابرم خان بھی تو یہاں سے جا کر وہاں رہ رہا ہے۔ اور بھی کتنے لوگ رہ
جب یہاں والے وہاں جا کر رہ سکتے ہیں تو میں کیوں یہاں نہیں رہ سکتی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ الگ بات ہے۔ یہاں سے لوگ تعلیم اور روزگار کے لیے اُدھر جاتا ہے۔ پر یہاں زندگی
ہے۔ باہر سے لوگ یہاں گھومنے پھرنے تو آسکتا ہے، لیکن رہنے کے لیے نہیں۔'' گل مینا کے اُداس
کہی گئی بات میں دلیل تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آواز
لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سے افراد مل کر کسی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ بولنے والے سب مرد تھے
خواہش کے باوجود بھی گھر کے اس حصے کی طرف نہیں جاسکی۔ گھر میں موجود دیگر خواتین کے چہرو
تشویش نظر آرہی تھی۔ آخر شور کچھ تھما اور اکرم خان اس طرف آتا نظر آیا۔

''کیا ہوا، سب خیر تو ہے نا؟'' اس نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اکرم خان سے سوال کیا۔

''دلہن کے گھر سے آدمی آیا تھا۔ دلہن کے باپ نے کہلوایا ہے کہ دس ہزار کا اور بندوبست کرو
نہیں ہوگا۔'' اکرم خان نے پریشانی سے بتایا۔ اس جواب پر باقی خواتین تو آپس میں چہ میگوئیوں او
میں مصروف ہوگئیں لیکن اس کی حیرانی سوا تھی۔

''کیا مطلب؟.....کیسے دس ہزار؟''

''ہمارے ہاں رواج ہے کہ لڑکا شادی سے پہلے دلہن کے باپ کو رقم دیتا ہے۔ میرے ماموں زا
اپنے سسر کو روپیہ دیا ہے لیکن اب وہ دس ہزار اور مانگتا ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ایک بار جو بات ہ



ں لے بعد کوئی اپنی زبان نہیں بدلتا۔ پر اس خانہ خراب کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے؟ ابھی تو ہم نے بڑی مشکل سے
ب لو سمجھا بجھا کر چپ کروا دیا ہے کہ ذرا آرام سے مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل سوچتے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ
ماہ اور تک کوئی چپ نہیں رہے گا اور خامخاہ (خوامخواہ) لڑائی شروع ہو جائے گا۔'' اکرم خان جو کچھ بتا رہا تھا،
ں کی روشنی میں یہی سمجھ آرہا تھا کہ دلہن کے باپ نے عین وقت پر ایک بالکل نازیبا مطالبہ کیا ہے جس کے
ہ میں اچھا بھلا شادی کا گھر دنگل بن سکتا تھا۔ ماہ بانو اپنی نرم طبیعت کے باعث یہ ساری صورتِ حال جان کر
پریشان ہوا اٹھی۔ پھر یک دم اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

''بھائی اکرم! تم مجھے دُلہن کے گھر لے چلو۔'' ذہن میں خیال آتے ہی اس نے اکرم خان سے مطالبہ کیا۔

''لیکن تم وہاں جا کر کیا کرے گا؟'' اکرم خان اس مطالبے پر حیران ہوا۔

''جو بھی کروں گی، تم اسے چھوڑو۔ بس مجھے وہاں لے چلو۔ میرے جانے سے شاید یہ مسئلہ بغیر کسی لڑائی
ھگڑے کے ختم ہو جائے۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

''ہماری تو کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہا ہے؟'' اکرم خان تذبذب کا شکار تھا۔

''وہ تم میرے ساتھ چلو گے تو دیکھ لینا لیکن پہلے مجھے لے کر تو چلو۔'' اس نے تھوڑی سی جھنجلاہٹ کا
ظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم لے چلتا ہے لیکن دھیان رکھنا کہ تم اِدھر اجنبی ہے۔ اِدھر کے رواجوں کو جانتا نہیں ہے۔
پھر الٹا سیدھا ہوگیا تو ہمیں بڑا مشکل ہو جائے گا۔ ہم نے مشابرم خان کے صاحب سے تمہاری حفاظت کا
وعدہ کیا ہے۔'' وہ راضی تو ہوگیا لیکن پریشان تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر رہو۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دی اور ایک منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر
کمرے میں چلی گئی۔ کمرے سے باہر آئی تو اس نے اپنی مخصوص سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ تازہ صورتِ حال پر
کمرے میں مصروف خواتین کو اس کے اور اکرم خان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ ان
والوں کو باہر جاتے دیکھ کر وہ چونک گئیں۔

''ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے۔'' سوالات کرنے والوں کو یہ مختصر جواب دے کر اکرم خان
اسے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔ گاؤں بہت مختصر تھا۔ بس چند گلیاں ہی تھیں جن میں کچے پکے سے مکانات تھے۔
ہر گلی کے بعد ایک اُترائی آتی اور پھر کھیت شروع ہو جاتے۔ اس مختصر سے گاؤں کو البتہ یہ اعزاز حاصل تھا کہ دنیا
بھر سے آنے والے پہاڑوں کے عاشق اپنے محبوب یعنی پہاڑوں تک پہنچنے سے قبل کچھ دیر اس کی خیمہ گاہ میں
ضرور ٹھہرتے تھے اور پھر واپسی میں بھی جب وہ محبوب کو سر کر لینے کے نشے میں چور ہوتے تھے، ہوشے کی قدم
بوسی کرتے ہوئے ہی واپس جاتے تھے۔ وہ دونوں بھی اس بہ ظاہر چھوٹے مگر درحقیقت عظیم ہوشے کی گلیوں میں
قدم رکھتے چند منٹوں میں دلہن والوں کے گھر پہنچے۔ اکرم خان کی، وہ بھی ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ آمد کو وہاں
بہت تعجب سے دیکھا گیا۔ تاہم کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور اکرم خان کی خواہش پر انہیں دلہن کے باپ سے
ملوا دیا گیا۔

''ہمیں آپ کا پیغام ملا تھا۔ اس پیغام کو سننے کے بعد ہی میں بھائی اکرم سے اصرار کر کے آپ سے ملنے
کے لیے آئی ہوں۔'' ماہ بانو نے خود ہی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھاری اونی لبادے کے ساتھ سر پر سفید اونی
ٹوپی پہنے دلہن کے بوڑھے باپ کو بتایا۔ جواباً وہ کچھ بولا نہیں، صرف سوالیہ نظروں سے اس طرح اس کی جانب
دیکھتا رہا جیسے اس کے چہرے سے اپنے پیغام کا ردِعمل جاننا چاہتا ہو۔

"مجھے آپ کے رواجوں کا علم نہیں۔ بھائی اکرم خان نے البتہ اتنا ضرور بتایا ہے کہ ایک بار جو بات ہو جائے اس کے بعد کوئی فریق اپنی زبان سے نہیں پھرتا۔ آپ نے پیغام بھیج کر مزید دس ہزار کا جو مطالبہ ہے، اس کے پیچھے یقیناً آپ کی کوئی مجبوری ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے، آپ اپنی روایت کے خلاف کیوں جاتے میں اس وقت آپ سے آپ کی مجبوری کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں۔ میں آپ کو یہ دس ہزار روپے دے آئی ہوں تاکہ آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے اور سب کی خوشی بھی قائم رہے۔" اس نے اب تک چادر کے پیچھے چھپا کر رکھا اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا اور چند نیلے نوٹ بوڑھے کے سامنے رکھ دیئے۔ یہ وہی نوٹ تھے جو شہریار نے یہاں آنے کے بعد اسے بھجوائے تھے۔

"ماہ بانو بہن! یہ کیا؟" اکرم خان اس کے عمل پر سٹپٹا گیا۔

"کچھ مت کہو بھائی اکرم!" اس نے اکرم خان کو زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے بھی منع کیا اور خود بوڑھے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"اب ہم چلتے ہیں بابا! وقت پر بارات لے کر آئیں گے۔" ساکت وصامت بیٹھے بوڑھے سے نرم لہجے میں یہ مختصر سی بات کہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اکرم خان کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ البتہ بوڑھا نہ تو اپنی جگہ سے ہل سکا تھا اور نہ ہی اپنے سامنے دھرے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا سکا تھا۔

"تم نے اتنا بڑا رقم اس لالچی بڈھے کو دے دیا۔ یہ سب کرنے سے پہلے تمہیں ہمیں بتانا تو چاہئے تھا۔" واپسی کے راستے پر چلتے ہوئے اکرم خان اس سے اُلجھ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں بھائی اکرم! میرے پاس بھی تو وہ روپے یونہی رکھے تھے۔ اگر ان روپوں سے کوئی جھگڑا رُک گیا اور کسی کو خوشیاں ملنے کی اُمید بندھ گئی تو میرا کیا گیا؟..... تم پریشان مت ہو، نہ ہی کسی اور کو اس بارے میں کچھ بتانا۔ جو کچھ ہوا، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہنا چاہئے۔" اپنے میزبانوں کے گھر میں داخل ہونے سے قبل ماہ بانو نے اکرم خان کو سمجھایا۔ اکرم خان نے اس کی بات کا مان رکھا اور کسی کو بھی اصل صورت حال بتائے بغیر دلہن کے باپ کے مان جانے کی نوید سنا دی۔ مقررہ وقت پر سفید پھندنوں والی سرخ ٹوپی پہنے دولہا کو لے کر بارات دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اکرم خان کو ماہ بانو کی بات کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اگر وہ سب کو اصل صورتِ حال بتا دیتا تو حالات میں کشیدگی ہوتی اور کسی کے چہرے پر وہ خوشی دیکھنے کو نہیں ملتی جو اب نظر آ رہی تھی۔

دلہن کے گھر پہنچنے کے بعد شادی کی مخصوص رسومات انجام دی گئیں۔ آخر میں کچھ خوش گلو نوجوانوں نے طربیہ گیت چھیڑ دیئے۔ گیتوں کی لے اور تالیوں کے آہنگ کے ساتھ بہت سے لوگ رقص کرنے لگے۔ شاید اس طربیہ محفل میں چھڑے گیتوں کی آوازیں ہوشے کی گلیوں سے نکل کر اس کیمپنگ سائٹ تک بھی پہنچی تھیں جہاں موجود رنگ برنگے خیموں میں سفید پوش پہاڑوں کے عاشق فروکش تھے۔ ان میں سے کچھ من چلے گلے میں کیمرے لٹکائے ہوشے کی گلیوں میں اُتر آئے اور خود بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ یہاں کسی کو بھی ان کی آمد پر اعتراض نہیں تھا۔ خود ماہ بانو بھی مگن تھی لیکن جب تیسری بار اس نے اپنے چہرے پر فلیش کی چمک محسوس کی تو ناگواری کے احساس کے ساتھ اس حرکت کے مرتکب شخص کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ غیر ملکی پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکرایا اور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی جانب ایک ہوائی بوسہ اُچھالا۔



ماہ بانو، جو ابھی اس کے کچھ کچھ آشنا لگتے نقش ونگار میں اُلجھی ہوئی تھی، اس حرکت پر یک دم ہی اسے پہچان گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے بشام ہوٹل کے سامنے بھی یہی حرکت کی تھی۔ اُس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے ساتھ موجود شہریار چراغ پا ہو گیا تھا لیکن چونکہ یہ شخص چلتی جیپ میں سوار تھا، اس لیے شہریار اُسے اس حرکت کا مزہ نہیں چکھا سکا تھا۔ اُس روز ماہ بانو نے دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اچھا ہوا وہ بدتمیز آدمی شہریار کے ہاتھ نہیں لگا ورنہ خوامخواہ کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش شہریار یہاں موجود ہوتا اور اس شخص کا منہ توڑ ڈالتا۔ مگر شہریار یہاں کہاں تھا؟ وہ تو اس سے بہت دور بیٹھا اپنے فرائضِ منصبی نبھا رہا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت بھی اس کے نزدیک ایک فریضے کی سی تھی جسے محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد شاید وہ اسے بھول بھی گیا تھا۔ اسے ضرورت بھی کیا پڑی تھی اپنے سے اتنی کم تر اور بے حیثیت ماہ بانو کو یاد رکھنے کی؟ وہ تو کسی شہزادے کی طرح تھا، جس کے ساتھ کوئی شہزادی ہی جچتی۔ ماہ بانو تو بس اسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں بسا کر چپکے چپکے چاہنے کی ہی جرأت کر سکتی تھی۔ اس چاہت نے اسے روپہلے خوابوں کے بجائے نارسائی کے دکھ میں لپٹی اُداسی عطا کی تھی۔ اس نے محبت کا بخشا یہ تحفہ بھی بڑے ظرف سے سینے سے لگا کر رکھا تھا لیکن یہ اُداسی کبھی کبھی اُسے ساری دنیا سے کاٹ کر اپنی ذات میں تنہا ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس بدتمیز غیر ملکی سیاح سمیت اس ساری خوشی بھری محفل کو فراموش کر بیٹھی اور خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد کے مناظر دیکھنے لگی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب دلہن کا باپ اس کے ساتھ آ کر کھڑا ہوا اور اس کی مٹھی میں کوئی شے دبا کر فوراً ہی اس سے دور بھی ہٹ گیا۔ وہ چونک کر اپنی مٹھی کی طرف متوجہ ہوئی اس کی مٹھی میں وہی نیلے نوٹ دبے ہوئے تھے جو چند گھنٹے قبل وہ کسی کی خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لیے اس بوڑھے کی نذر کر آئی تھی۔ یقیناً بوڑھا ایک اجنبی لڑکی کے خلوص سے ہار گیا تھا اور یہ احساس ہوتے ہی پہلی فرصت میں اپنی غلطی کی تلافی کر ڈالی تھی۔

⊛----✪----⊛

"بی بی! آپ کے لیے فون ہے۔" وہ ٹیرس پر رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر گم صم سی بیٹھی آسمان کی وسعتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ رانی نے فون کی اطلاع دی تو اپنے خیالات سے چونکی اور کسل مندی سے اٹھ کر اندر کمرے میں رکھی اس تپائی کی طرف بڑھی جس پر ٹیلی فون سیٹ دھرا تھا۔

"ہیلو!" ریسیور اٹھا کر اس نے بے حد بے دلی سے کہا۔ اندازہ تھا کہ یہاں اس کے لیے آنے والی کال حویلی کے ہی کسی مکین کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

"محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرتے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ میں اس طرح اچانک آپ کی طرف خاموشی چھا جانے پر کتنا پریشان ہوں۔" دوسری طرف سے اس کی توقع کے بالکل برعکس جو آواز سنائی دی، اس نے اس کے جسم وجاں کو لرزا کر رکھ دیا۔

"آفتاب! آپ..... آپ کو یہاں کا نمبر کیسے ملا؟" بے پناہ حیرت سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال تھا کہ آپ موبائل آف کر دیں گی اور اپنی شہر والی کوٹھی میں آ چھپیں گی تو مجھے آپ سے رابطہ کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ملے گا؟" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی خفگی تھی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں آفتاب! ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا آپ گمان کر رہے ہیں۔ میں نے موبائل

آف نہیں کیا۔ بس مجھے اسے چارج کرنے کا خیال نہیں رہا اور شاید بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ خود آف ہوگیا۔'' کشور نے وضاحت پیش کی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو موبائل چارج کرنے جیسا اہم کام یاد نہیں رہا؟ آپ تو مجھ سے بات کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں پھر یہ کیسا انقلاب آیا کہ آپ کو وہ شے ہی بھول جو میرے آپ کے رابطے کا ذریعہ ہے؟'' اس کے لہجے سے ہنوز ناراضی جھلک رہی تھی۔

''مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔'' بالآخر اس کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور سسک پڑی۔ اُس کے اس طرح رونے سے آفتاب اپنی ناراضی بھول کر پریشان ہوگیا۔

''کشور پلیز! اس طرح روئیں نہیں۔ مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟ دیکھیں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اس رات آپ میری فریدہ سے بات کروانے کا کہہ کر غائب ہی ہوگئیں اور میں انتظار کرتا۔ میں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو آپ کا موبائل بند جا رہا تھا۔ رانی بھی انڈسٹریل ہوم نہیں آئی کہ میں اس سے آپ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر اس کے بھائی کی زبانی مجھے اطلاع ملی کہ آپ لاہور پہنچی ہوئی ہیں اور رانی آپ کے ساتھ ہے۔ میں سمجھا کہ آپ نے مجھ سے ملاقات کے لیے کوئی سبیل نکالی ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچ گیا لیکن یہاں آکر بھی آپ نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو مجھے بہت برا لگا۔ میں نے آپ کی کوٹھی کا فون نمبر حاصل کیا اور آپ سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر بار کوئی ملازم فون اٹھاتا تھا اس لیے مجھے بنا بات کیے لائن کاٹنی پڑتی۔ اس بار فون پر رانی کی آواز سنائی دی تو میں نے اس سے آپ سے بات کروانے کے لیے کہا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ اپنی پچھلی ناکامیوں پر میں اچھا خاصا جھنجلایا ہوا تھا اس لیے آپ کی آواز سنتے ہی کچھ تلخ ہوگیا..... لیکن پلیز! آپ اس طرح روئیں تو نہیں۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ اپنے تلخ لہجے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے آپ کی باتوں کا برا نہیں مانا آفتاب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت پریشان رہے ہوں گے اور پریشانی میں آدمی کے منہ سے کچھ بھی اُلٹا سیدھا نکل سکتا ہے۔ آپ نے تو ایسا کچھ غلط کہا ہی نہیں۔'' اسے شرمندہ پا کر کشور نے خود کو سنبھالا اور آہستگی سے بولی۔

''تو پھر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو اس قدر دُکھی اور پریشان کر دیا ہے؟ کیا حویلی میں کچھ ہوا ہے؟'' آفتاب نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''حویلی میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا ظلم و ستم ہوتا رہتا ہے اور یہ میری بدقسمتی..... کہ میں وہاں پیدا ہوئی۔'' اس کے لہجے میں تلخی اور دکھ دونوں ہی جھلک رہے تھے۔

''آپ مجھے بتائیں تو سہی کہ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں؟'' آفتاب نے اصرار کیا۔

''نہیں بتا سکتی۔ ایسی بات ہے کہ زبان پر لاتے ہوئے میں شرم سے مرنے لگتی ہوں۔ رانی دن رات میرے ساتھ رہتی ہے، میں اسے بھی کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔'' اس نے انکار کیا تو آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ کشور کی باتوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس کا یہ ڈپریشن خود آفتاب کو تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا اس مسئلے کا یہی حل تھا کہ کشور کی اس سے ملاقات ہو جاتی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا ساتھ کشور کو ایسی بے پایاں مسرت عطا کرتا ہے کہ اس کے آگے وہ سب کچھ بھول سکتی ہے۔



''آپ مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ لیکن آپ تکلیف میں ہوں، یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی طرح مجھ سے ملاقات کی راہ نکالیں۔ بلکہ ایسا کریں کہ کتابیں خریدنے کے بہانے لبرٹی تک آجائیں۔ میں وہاں بک شاپ پر آپ کا منتظر رہوں گا۔'' اس نے پروگرام ترتیب دیا لیکن جواباً خاموش رہی۔

''کیا بات ہے؟..... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کیا آپ مجھ سے ملنے کے لیے آنا نہیں چاہتیں؟'' اس کی خاموشی کے باعث آفتاب نے پوچھا۔

''بات نہیں ہے۔ آپ سے ملنا تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ لیکن ہم آج نہیں ملیں گے۔ آپ کو ملاقات کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میں خود فون کر کے آپ کو وقت کے بارے میں بتاؤں گی۔'' کشور کا انداز کچھ پُراسرار تھا۔ آفتاب اُلجھ سا گیا تاہم کوئی اختلاف نہیں کیا۔

''چلیں، جیسی آپ کی مرضی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس دو دن اور ہوں گے یہاں..... اگر ان دو دنوں میں آپ کا موڈ بن جائے تو مجھے بتا دیجیے گا۔'' اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے کشور کا جواب سن کر کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی خاطر دوڑا آیا تھا اور وہ بہانے بنا رہی تھی تو اس کا موڈ آف ہونا لازمی تھا۔ کشور نے اس کا انداز محسوس کر لیا پھر بھی زیادہ توجہ نہیں دی اور ریسیور کریڈل پر رکھ کر رانی کو آواز دینے لگی۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔'' رانی آئی تو اس نے حکم دیا۔ اس حکم پر رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ماسٹر صاحب سے ملنے جانا ہے بی بی؟'' آفتاب کے فون کے بعد اُس کے اِس حکم کو سن کر رانی یہی اخذ کر سکتی تھی۔

''نہیں..... کہیں اور جانا ہے۔'' اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی مبہم سی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جس کا مطلب نہ سمجھنے کے باوجود رانی اتنا اندازہ لگانے میں تو کامیاب ہو ہی گئی تھی کہ بی بی اپنے پچھلے دنوں کی کیفیت سے باہر آرہی ہیں۔

⊛----✪----⊛

''گل مینا! یہ جو تمہارے گاؤں میں کیمپنگ سائٹ ہے، وہاں چلیں؟ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ قریب سے ان دیوانوں کو دیکھوں جو اچھی بھلی آرام کی زندگی چھوڑ کر اتنے مشکل مشکل پہاڑوں کو سر کرنے نکل پڑتے ہیں۔ سفرناموں میں ان لوگوں اور ان کی خیمہ گاہوں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آج ذرا قریب جا کر اپنی آنکھوں سے اس دنیا کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔'' شادی کا ہنگامہ کل رات گئے تک جاری رہا تھا، اس کے باوجود اگلی صبح وہ لوگ جلدی جاگ گئے تھے۔ اس نے لکڑی کے چولہے پر توا رکھے جلدی جلدی روٹیاں تھوپتی گل مینا سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

''ابھی تو بہت کام کرنا ہے۔ اتنا کام چھوڑ کر ہم کیسے جا سکتا ہے؟ ویسے بھی اُدھر کچھ نہیں رکھا۔ ہماری بستی کا بچہ لوگ، گوروں کے اِدھر قدم رکھتے ہی ان سے سارا چاکلیٹ اور چیونگم وغیرہ نکلوا لیتا ہے۔ اُدھر کیمپ جائے گا تو ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ مفت میں گورا لوگ تصویریں کھینچنے کے لیے پیچھے پڑ جائے گا۔'' اپنی مصروفیت کے علاوہ گل مینا نے اپنے ساتھ نہ چلنے کی جو وجہ بتائی، اسے سن کر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے سن

رکھا تھا کہ اس طرح کے علاقوں کے باسی ولایتی چاکلیٹس اور اسی قسم کی دوسری اشیاء ہتھیانے کے لیے
پیچھا لے لیتے ہیں۔ گل مینا کی بات سن کر اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ بھی تو اسی ماحول کا حصہ تھی جہ
باسی اپنی غربت اور بھوک کے باوجود آئے دن یہاں سے گزرنے والے غیر ملکی سیاحوں کی عنایتوں کے
ولایتی مال کی لت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرو۔ میں خود چکر لگا کر آتی ہوں۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گل مینا نے
آواز دے کر اس سے کچھ کہا بھی لیکن اس نے اَن سنی کر دی۔ آزادی کے احساس کے ساتھ اس دھند
میں ہوشے کی گلیوں میں چلنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہاں کا موسم اس کے لیے کچھ سخت ضرور تھا
اس خوف سے آزاد تھی کہ چودھری یا اس کا کوئی ہرکارہ اسے دیکھ لے گا۔ آزادی کی اس نعمت سے لطف
ہوتی وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہوشے کی کیمپنگ سائٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہاں دو تین خیمہ گاہیں
اتنی صبح کے وقت وہاں وہ رونق تو نظر نہیں آ رہی تھی جس کا تذکرہ سفر ناموں میں پڑھتی رہی تھی لیکن دھند
صبح میں سر اٹھائے کھڑے رنگ برنگے خیموں کا نظارہ بھی بہت شان دار لگ رہا تھا۔ ایک خیمہ گاہ میں جھا
اسے متحرک پورٹر نظر آئے۔ وہ چند خیموں کو اُکھاڑ رہے تھے۔ شاید وہاں کسی ٹیم کو بہت جلدی تھی اور وہ جلد
جلد روانہ ہونے کے خواہش مند تھے۔ ماہ بانو اس خیمہ گاہ کو چھوڑ کر دوسری طرف بڑھ گئی۔ یہاں بالکل خا
تھی۔ خیمہ گاہ کے کھلے پھاٹک سے اندر داخل ہو کر پہلے تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ لگے پاپلر کے درختوں کے
سے گزرتی وہاں سورج مکھی کے پودوں کا جائزہ لیتی رہی، پھر خیموں کے درمیان چلی آئی۔ یہاں چند ہی
تھے اور ابھی ان خیموں میں زندگی کا تحرک نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ان خیموں میں پہاڑوں سے اُتر کر آنے وا
سیاح استراحت فرما رہے تھے جو واپسی کے سفر سے پہلے اپنی تھوڑی سی تھکن اُتار لینا چاہتے تھے۔ اس سوئی
خیمہ گاہ کی خاموشی سے لطف اندوز ہوتی وہ ایک بڑے سے خیمے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ یک دم ہی
نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے اسے اتنی بری طرح بوکھلاہٹ میں مبتلا کیا
وہ چیخ تک نہیں سکی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد ذرا سنبھلی تو خیمے میں موجود روشنی میں اُس نے اس امریکی کو د
جسے پہلے وہ بشام موٹیل کے باہر اور کل رات یہیں ہوشے میں بھی دیکھ چکی تھی۔

''تم بڑی خوب صورت لڑکی ہو۔ پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، تب ہی دل تمہیں پانے کے لیے مچل گیا تھا لیکن
اس وقت ایک تو تم کسی اور کے ساتھ تھیں، دوسرے میرے پاس بھی وقت نہیں تھا اس لیے صبر کرنا پڑا۔ تمہیں
شاید میری دلچسپی کا اندازہ ہو گیا تھا جب ہی کل رات مجھے گاؤں میں دیکھنے کے بعد آج صبح صبح خود ہی مجھے
ڈھونڈتی ہوئی آ گئی ہو۔ لیکن دیکھو، میرے پاس بس ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ پھر ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔
مجھے اس وقت میں خوش کر دو۔ میں تمہیں اس ریٹ سے بھی زیادہ دوں گا جتنے تم رات بھر کے لیے چارج کرا
ہو۔'' وہ بہت رواں اور صاف اردو میں بات کر رہا تھا۔ ایک امریکی گورے کو اتنی صاف اُردو میں بات کر
دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ جانے والی ماہ بانو کو اس کی کہی بات کا مفہوم سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ جب بات سمجھ میں آئی
تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے گورے کی گرفت میں موجود اپنی کلائی کو جھٹکا دے کر چھڑانے کی
کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

''ناراض کیوں ہو رہی ہو؟ اگر تمہیں میری آفر قبول نہیں تو تم اپنی مرضی کا ریٹ بتا دو۔'' وہ اسے جو سمجھ رہا
تھا، اسی حساب سے بات کر رہا تھا۔ شاید بشام میں اسے شہریار کے ساتھ دیکھنے کے بعد یہاں ہوشے میں مقامی
لباس میں مقامی لوگوں کے درمیان دیکھ کر اس نے اپنی مرضی سے کچھ اندازے قائم کر لیے تھے اور اب اسے



ایک کال گرل کی طرح ڈیل کر رہا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ میں اس طرح کا کام کرنے والی لڑکی نہیں۔'' اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ماہ
بانو کو اپنی زبان کھولنی پڑی۔

''اچھا۔'' اس کا جواب سن کر وہ بے یقینی سے بولتے ہوئے ہنسا۔ ''تم جو بھی ہو، اب میں تمہیں ایسے تو
نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے ماہ بانو کو اپنی طرف کھینچا اور پھر زور لگا کر اسے زمین پر بچھے میٹرس پر گرا دیا۔ اُس
کی اس حرکت پر ماہ بانو کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اسے لگا کہ سنہری بالوں اور گوری رنگت والے اس شخص
کا شکل و نگار اپنا روپ بدل کر چودھری افتخار کے نقوش میں ڈھلنے لگے ہوں۔ شاید ہر ہوس پرست کا چہرہ اتنا ہی
مہیب اور مکروہ لگتا ہے۔ وہ ایک چودھری سے اپنا آپ بچا کر اس الگ تھلگ دنیا میں آ کر بسی تھی تو یہاں اس
کا دوسرے سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ چودھری اگر ایک گاؤں کا مالک ہونے کے ناتے اپنے علاقے میں موجود ہر
جان دار و بے جان شے پر اپنا حق سمجھتا تھا تو اس وقت اُس کے سامنے موجود شخص بھی اس قوم کا فرد تھا جو پوری
دنیا کو اپنا محکوم بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ محکوم قوم کی کمزور عورتیں تو فاتحین کا سب سے پہلا نشانہ ہوتی
ہیں۔ وہ امریکی گورا بھی ماہ بانو کو ذہنی اور معاشی غلامی میں مبتلا قوم کی کمزور عورت سمجھ کر اس پر پل پڑا تھا۔

ماہ بانو اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔
اس کے جسم سے لپٹی چادر الگ ہو چکی تھی اور اب لبادہ بھی جدا ہونے کو تھا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے
وہ مسلسل چلانے کے ساتھ ساتھ چیخیں بھی مار رہی تھی۔ شاید یہ ان چیخوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے خیمے میں کسی
اور کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے وجود سے لپٹا عفریت ایک جھٹکے سے دور جا گرا۔ خیمے
میں آنے والا اکرم خان تھا جس نے غیر ملکی سیاح کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا تھا۔ اب وہاں ماہ بانو کے بجائے
اس گورے کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ ماہ بانو نے پھرتی سے اپنا لباس درست کیا اور ایک بار پھر اپنے گرد چادر
لپیٹ لی۔ اس دوران خیمے میں دو تین افراد اور بھی گھس آئے تھے۔ ان افراد کے آنے کے بعد معمول سے کافی
بڑا خیمہ بھی تنگ پڑ گیا تھا۔

''اسٹاپ..... اسٹاپ اِٹ۔'' اندر آنے والے افراد میں دو غیر ملکی اور ایک مقامی آدمی تھا۔ اکرم کو رُکنے کا
حکم غیر ملکی نے دیا تھا جسے سن کر اکرم خان تو نہیں رُکا لیکن مقامی شخص نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

''چھوڑو ہمیں۔ ہم اس گورے کو چھوڑے گا نہیں۔ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' اکرم خان
بپھرا ہوا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ میں نے اس سے ریٹ طے کیا تھا۔'' فرش پر گرا
وہ امریکی سیاح اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوری ڈھٹائی سے بولا۔

''جھوٹ بولتا ہے بدبخت۔'' اکرم خان چلایا۔

''دیکھ یارا! جھگڑا مت کر۔ ہم نے بھی دیکھا تھا کہ یہ لڑکی خود آیا تھا۔ ہم پھاٹک پر سے ہٹ کر حاجت
کے لیے جا رہا تھا، تب ہم نے اس لڑکی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ ہم جلدی میں تھا اس لیے اسے روک نہیں سکا۔
بعد میں یہ ہمیں نظر نہیں آیا تو ہم سمجھا واپس چلا گیا۔ ابھی تو اِدھر آیا اور پھر لڑکی کا چیخ سنائی دیا تو ہمیں پتہ چلا کہ
یہ اِدھر صاحب کے خیمے میں ہے۔'' مقامی شخص جو اس خیمہ گاہ کا چوکیدار تھا، اکرم خان کو سمجھانے لگا۔

''یہ اِدھر صرف گھومنے آیا تھا۔'' اکرم خان نے ماہ بانو کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ خود اس میں تو
اتنی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

''بحث مت کرو خان! اگر تم نے مزید بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارا ایسا بندوبست کروں گا کہ اس علاقے میں نظر بھی نہیں آؤ گے۔'' امریکی پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اکرم خان کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں کے تیور بھی خاصے خطرناک تھے۔

''جانے دے اکرم خان! کیوں خود کو مشکل میں ڈالتا ہے؟ ان لوگوں کا کتنا پہنچ ہے، تجھے بھی معلوم ہے، تُو چپ رہے گا تو کچھ نہیں جائے گا۔ یہ لوگ تو ویسے بھی گھنٹہ بھر بعد اِدھر سے نکلنے ہی والا ہے۔ اگر تُو نے بات بڑھائی تو تُو زیادہ مشکل میں پڑ جائے گا۔'' چوکیدار اب سرگوشیوں میں اکرم خان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی سرگوشیاں سنیں۔

''یہاں سے چلو بھائی اکرم! اللہ نے مجھے بچا لیا، کافی ہے۔ اب تمہیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' بالآخر وہ آگے بڑھی اور اکرم خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے گئی۔ اب وہ دونوں چپ چاپ پیچھے کے راستے پر چل رہے تھے۔

''میں یہاں صرف گھومنے آئی تھی۔ گل مینا نے مصروفیت کی وجہ سے آنے سے منع کر دیا تھا اس لیے میں اکیلی ہی آ گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں.....'' تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے اکرم خان کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ امریکی گورے نے اس پر جو الزام لگایا تھا، اس کی وجہ سے وہ اکرم خان کے سامنے بڑی سبکی محسوس کر رہی تھی۔

''ہمیں معلوم ہے۔ گل مینا نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس طرف آیا ہے جب ہی تو ہم تمہیں ڈھونڈتا ہوا اِدھر آیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ورنہ ہم مشابرم خان اور اس کے صاحب کو کیا جواب دیتا! ان گورا لوگ کی فطرت ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ ہم دیکھتا رہتا ہے انہیں کہ یہ کیسے شراب پی کر عورتوں کے ساتھ مونج مستی کرتا ہے۔ ان کے ساتھ عورت لوگ آتا ہے، وہ بھی انہی جیسا ہوتا ہے، پر ہم تمہیں جانتا ہے۔ تم ہمارا بہن جیسا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا یہ بہن بہت اچھا اور نیک ہے۔'' اس کی پیش کی گئی نامکمل وضاحت کے جواب میں اکرم خان نے جو جملے کہے، وہ اسے اپنی نظر میں سرخرو کرنے کے لیے کافی تھے۔

⊛----✪----⊛

''میں امریکہ جا رہا ہوں۔''

''اچانک کیوں؟ خیریت تو ہے چودھری صاحب؟'' تارڑ اس اطلاع پر حیران ہوا۔

''ہاں ہاں، سب خیر ہے۔ بس بڑے دنوں سے اپنے پُتر کی یاد آ رہی ہے۔ آٹھ ماہ ہو گئے اس سے ملا نہیں۔ خود وہ تو اِدھر آنے کی گل کرتا نہیں۔ میں نے سوچا، میں آپ ہی اس سے مل کر آ جاتا ہوں۔ اس بہانے تھوڑا میموں کے ساتھ بھی وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔'' اپنے امریکہ جانے کی وجہ بتاتے ہوئے آخر میں چودھری نے ایک اور شوشہ چھوڑا اور خود ہی اپنی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگا۔

''میموں کی آپ کو کیا کمی چودھری صاحب! اب تو پیر آباد میں ہی آپ کو ایک میم کی اولاد مل گئی ہے۔'' تارڑ نے ڈاکٹر ماریہ کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ اپنی جگہ ہے۔ چیز زبردست ہے..... مجھے انکار نہیں، پر سالی خالص میم نہیں۔ اس کا باپ ایشیائی تھا۔ پڑھنے کے لیے ولایت گیا تو گوری میم کو بھا گیا۔ بے چاری ایسی دیوانی ہوئی کہ اس کی خاطر ولایت چھوڑ کر اِدھر آ بسی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بھی واپس نہیں گئی۔ ان دونوں عاشقوں کی اولاد وہ ڈاکٹرنی اِدھر ہمارے



[illegible] پوری میم نہیں۔ پوری میم سے ملنے ہمیں ادھر امریکہ ہی جانا پڑے گا۔'' چودھری ایک بار پھر خباثت [illegible] ہوئے بولا۔

''پھر کب تک جا رہے ہیں؟'' تارڑ نے اس کا پروگرام جاننا چاہا۔

''ویزا لگنے کے لیے دے دیا ہے۔ دو چار دن میں کام ہو جائے گا تو نکل جاؤں گا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ [illegible] جانا لگا ہی رہتا ہے، اس لیے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ یہ تو اس واری ہی کچھ لمبا وقت گزر گیا، ورنہ جب [illegible] ادھر ہے، ہر چار چھ ماہ بعد جاتا ہی رہتا ہوں۔''

''چلیں اچھی بات ہے۔ آپ کچھ عرصہ بیٹے کے ساتھ انجوائے کر لیں۔ یہاں تو ویسے بھی بزنس ڈاؤن جا [illegible] اچھی خاصی فراغت ہی ہے۔ اپنے مطلب کا نیا فاریسٹ آفیسر آ گیا تو کچھ کام بن جائے گا۔ آپ [illegible] آپ نے لیاقت رانا صاحب سے شہریار کے سلسلے میں بات کی؟ ذرا وہ نچلا بیٹھے تو میں ڈی ایس پی منظور [illegible] یہاں سے کھسکاؤں۔ ابھی تو اس کے سر پر اے سی کا ہاتھ ہے اس لیے کہیں اور ٹرانسفر کرنا مشکل ہو گا۔''

[illegible] انتظار تو جدی پشتی جاگیردار تھا، اُلٹے سیدھے دھندوں میں نہیں پڑتا تب بھی زمینوں سے اتنی آمدنی [illegible] کہ تجوریاں بھری پڑی رہتی تھیں۔ وہ تو اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سارے دھندے کرتا تھا ورنہ [illegible] اسے کوئی کمی نہیں تھی لیکن تارڑ کو لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ میں سے ملنے والا کمیشن بند ہو جانے سے بڑا [illegible] پڑ گیا تھا۔ حرام منہ کو لگنے کے بعد سوکھی تنخواہ میں گزارہ مشکل لگتا تھا اس لیے اسے بڑی پریشانی تھی کہ کسی [illegible] پچھلا سیٹ اپ دوبارہ قائم ہو جائے۔

''لیاقت رانا سے تو میں نے گل نہیں کی۔ سوچا کچھ دن اور اُس بلونگڑے کو من مانی کرنے دوں۔ واپس آ [illegible] دیکھ لوں گا۔ پر تسی فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' چودھری نے بے پرواسے انداز میں اسے تسلی دی۔

''آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے فکر۔ آپ امریکہ جا کر گوریوں کے ساتھ انجوائے کریں۔ ہمارے لیے ذرا [illegible] ماریہ کو اشارہ کر جائیے گا۔ ہم بھی کچھ دن ادھوری میم کے ساتھ گزار کر غم دوراں کو بھولنے کی کوشش کر کے [illegible] گے۔'' تارڑ نے موقع دیکھ کر اپنی خواہش بیان کی۔ جب سے ڈاکٹر ماریہ کو دیکھا تھا، اُس کی طلب ستا [illegible] تھی لیکن چودھری کی اس پر خاص توجہ دیکھ کر اس کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا اس سے۔ آپ جیسے دوستوں کی کہی بات کیسے ٹالی جا سکتی ہے بھلا؟'' [illegible] دھری کے جواب نے ایس پی کو خوش کر دیا۔

''تھینک یو چودھری صاحب! آپ سے مجھے یہی امید تھی۔ اچھا اب اجازت دیجیے..... اور ہاں پلیز! [illegible] پ کی سیٹ کنفرم ہو جائے تو مجھے ضرور بلائیے گا۔ میں ایئرپورٹ تک آپ کو سی آف کرنے ضرور جاؤں گا۔''

''کیوں نہیں۔ میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔'' تارڑ کو یقین دہانی کروانے کے بعد چودھری نے فون بند [illegible] ردیا اور ایک نوکر کو آواز دے کر بالے کو بھیجنے کا حکم دیا۔ ذرا دیر میں بالا اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

''دیکھ بھئی بالے! تیری پچھلی ساری غلطیاں میں نے معاف کر دی تھیں، پر اس واری جو کام تیرے سر لگا [illegible] رجا رہا ہوں اس میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے، ورنہ میرے کچھ کرنے سے پہلے تُو آپ ہی مارا جائے گا۔ [illegible] رے پیچھے تُو نے سارا کام وڈی صفائی اور ہشیاری سے کرنا ہو گا۔''

''تسی فکر ہی نہ کرو سرکار! میں سب سنبھال لوں گا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ ڈیریکٹ (ڈائریکٹ) ایکشن کا [illegible] قع مل جائے۔ آپ نے وڈا چنگا فیصلہ کیا ہے کہ سیدھے سیدھے اے سی پر ہی ہتھ ڈالنے کا سوچا ہے۔ اب [illegible] پ دیکھئے گا کہ میں کیسے اس کا دماغ ٹھکانے لگاتا ہوں۔ غیاثے کی دِھی کا پتہ تو وہ میرے دو ہاتھ کھا کر فوراً

ہی اُگل دے گا۔ میں تو اس کے کانوں کو ہتھ لگوا دوں گا۔ آپ اپنے منہ سے کسی لفڑے میں پڑنے سے
لے گا بلکہ آپ دیکھئے گا کہ اِدھر سے بھاگ ہی نکلے گا۔'' بالا حسبِ عادت سینہ پھلا کر چودھری کو یقین
کروانے لگا۔

''زیادہ بڑھکیں نہ مار۔ مجھے تیری بڑھکیں نہیں سننی۔ کم (کام) دیکھنا ہے کم..... بچوں کا کھیل نہ سمجھا
کے اغوا کو۔ اس کے سارے مامے چاچے اسے ڈھونڈنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ تجھے بہت صفائی
کام کرنا ہوگا۔ رازداری کی وجہ سے میں نے ایس پی کو بھی یہ گل نہیں بتائی، پر اُسے میرا ارادہ تو مالوم ہی
سب سے پہلے تم لوگوں پر ہی شک کرے گا، پر اسے بھی ہوا نہ لگنے دینا۔ وہ میرا سانجھے دار سہی، پر آدمی کا
چلتا ہے کہ کب دھوکا دے جائے۔'' چودھری کی اپنی فطرت میں وفا نہیں تھی اس لیے وہ دوسروں پر بھی
نہیں کرتا تھا۔

''جیسا آپ کا حکم سرکار! آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی۔'' بالے نے
بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔

''اور ہاں، دیکھ..... ڈاکٹر ماریہ کا بھی دھیان رکھنا۔ ایسی کام کی چیز ہاتھ لگی ہے، اسے ہاتھ سے نکلنا
چاہئے۔ اپنے ایس پی کی رال ٹپک رہی ہے اس پر۔ میرے جانے کے بعد بس ایک واری ڈاکٹر ماریہ کو اس
پاس لے جانا۔ ایس پی بار بار ضد کرے تو اسے بہانے سے ٹال دینا۔ سمجھ رہا ہے نا میری گل؟'' بالے کو
ہدایتوں سے نوازتے ہوئے چودھری نے اس سے پوچھا۔

''جی سرکار!''

''چنگی گل ہے۔ میرے پیچھے تجھے ہی یہ سب دیکھنا ہے۔ منشی زمینوں کے معاملات دیکھے گا اور تجھے
پھڈے نمٹانے ہوں گے۔ میں پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں لگاؤں گا امریکہ میں۔ میرے آنے تک تجھے
بانو کا پتہ چلا کر اسے لانا بھی ہوگا اور سنبھال کر بھی رکھنا ہوگا۔ اس واری اسے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہئے۔
کے پیچھے میں اتنا رِسک لینے کو تیار ہوا ہوں۔ نہ ملی تو میں جان نکال دوں گا تم ساروں کی۔'' چودھری نے بالے
دھمکایا جس کے جواب میں ظاہر ہے اسے اپنی تابعداری کا یقین دلاتے ہوئے چودھری کو سب کچھ ٹھیک
جانے کی یقین دہانی ہی کروانی تھی۔

⊛----✪----⊛

''اچھا مریم! میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ مجھے واپسی میں کافی دیر ہو سکتی ہے۔ تم ممی کو بتا دینا اور خود
آرام سے سو جانا۔'' اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے کے لیے سجاد رانا نے خود پر ایک بار پھر پرفیوم چھڑکا اور بستر
لیٹی ہوئی مریم سے کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ نیچے پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی بجتی گھنٹی نے
کے قدم روک لئے۔

''ہیلو!'' اس نے ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا۔

''السلام علیکم سجاد بھائی! خیریت سے ہیں آپ؟'' دوسری طرف شہریار تھا جو اس کی آواز سن کر خیر خیر
دریافت کرنے لگا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم اپنی سناؤ۔'' اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں دیکھا۔ ابھی اس کے پاس کچھ
وقت تھا چنانچہ وہ شہریار سے بات چیت کر سکتا تھا۔



''میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس ماموں جان سے ایک کام کے سلسلے میں بات کرنی تھی اس لیے فون کیا تھا۔
ل سے آپ کی آواز سننے کو مل گئی ورنہ آج کل جیسے حالات ہو رہے ہیں، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے
ہالکل نہیں ہوگی۔ پچھلے دنوں بھابی سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ آپ بہت
ہیں۔''

''ہاں یار! مصروفیت تو بہت ہے اسی لیے مریم کو لے کر یہیں شفٹ ہو گیا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں
کم اسے بالکل تنہا نہیں رہنا پڑے گا۔'' سجاد رانا کی آواز میں اُداسی در آئی تھی مگر پھر اس نے خود کو فوراً ہی
سنبھال لیا اور بشاش لہجے میں بولا۔ ''تم سناؤ، کوئی نئی گڑبڑ تو نہیں کر دی جس سے نمٹنے کے لیے پاپا کی مدد کی
ہے؟''

''نہیں، فی الحال تو خاصا امن و امان ہے۔ بس ایک بندے کے سلسلے میں ماموں جان سے بات کرنی
عابد انصاری نام ہے اس کا۔ مجھے کسی نے تجویز دی تھی کہ باجوہ کی جگہ اس شخص کو فاریسٹ آفیسر کی جگہ دلوا
اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ میں نے سوچا ماموں جان سے ڈسکس کر لوں۔ اور اگر واقعی وہ اچھا آدمی
کوشش کر کے اسے اپنے علاقے میں لے آؤں۔'' شہریار نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی۔

''عابد انصاری تو کافی ٹھیک ٹھاک بندہ ہے۔ میری تھوڑی بہت واقفیت ہے اس سے۔ کبھی کسی قسم کی
کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔'' اس نے شہریار کو بتایا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے، میں ماموں جان سے کہوں گا کہ بھرپور کوشش کر کے یہ بندہ مجھے دلوا دیں۔ میں
علاقے میں جو تبدیلیاں چاہ رہا ہوں اس کے لیے مجھے ایک اچھی ٹیم کی اشد ضرورت ہے۔'' سجاد رانا کی
انصاری کے سلسلے میں اچھی رائے نے اسے خوش کر دیا۔

''اللہ تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی
میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپلائرز کو معمولی غنڈے سمجھ کر ہم
والے چھوٹ دیتے رہتے ہیں، انہی کے روپ میں کیسے کیسے خطرناک ایجنٹس چھپے بیٹھے ہیں، اس سے
اندازہ ہی نہیں تھا۔ جسم فروشی کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بہت ہی بھیانک ہے۔ ٹیلی فون پر میں تمہیں
تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ ملاقات ہونے پر بتاؤں گا۔ ابھی تم پاپا سے اپنے کام کے سلسلے میں بات کر لو۔''
رانا نے یک دم ہی اس سے گفتگو کا سلسلہ ختم کر کے کال لیاقت رانا کے بیڈ روم میں موجود ایکسٹینشن پر
کر دی اور باہر نکل گیا۔

باوردی ڈرائیور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا لیکن وہ ڈرائیور یا کسی گارڈ کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ
رکھتا تھا۔ گارڈ اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن اس کے حکم کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اپنی گاڑی
ڈرائیو کرتے ہوئے وہ جس مقام پر پہنچا وہ شہر کا ایک مشہور فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ ریسپشن سے اس نے پہلے
بک شدہ کمرے کی چابی لی اور لفٹ کے ذریعے کمرے میں جا پہنچا۔ یہ ایک ڈبل بیڈ کمرہ تھا جہاں دنیا جہان
آسائشات جمع کر دی گئی تھیں۔ وہ اس کمرے میں کسی سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس ملاقاتی کے آنے
وہ ٹی وی کے چینلز بدل بدل کر دیکھتا رہا لیکن درحقیقت اس کا ذہن کسی بھی پروگرام کی طرف توجہ دینے سے
تھا۔ وہ اپنے متوقع ملاقاتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بالآخر انتظار کے یہ بوجھل لمحات کسی نہ کسی طرح
گئے اور کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''یس، کم اِن۔'' اندرونی بے چینی کے باوجود اس نے خود اٹھ کر دروازے تک جانے کے بجائے اپنی جگہ

بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اُس کی طرف سے اجازت ملنے پر دروازہ بے آواز کھلا اور ویٹر کے یونیفارم میں
ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک شولڈر کٹ ہیئر اسٹائل
الٹرا ماڈ لڑکی بھی تھی۔

''آپ کا کام کر دیا ہے سر! کوئی اور حکم ہو تو بولیں؟'' لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ویٹر نے
پوچھا۔

''نہیں۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور پرس سے ایک نوٹ نکال
کی طرف بڑھا دیا۔ ویٹر نے دانت نکالتے ہوئے نوٹ وصول کیا۔

''ریفریجریٹر میں دوسری کام کی چیز بھی آپ کو مل جائے گی سر! اس کے علاوہ کچھ چاہئے ہو تو روم
بتا دیجئے گا۔ میں خود پہنچا دوں گا۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکی
تک کھڑی ہوئی تھی، دروازہ لاک کر کے پلٹی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے روم ریفریجریٹر کی
بڑھ گئی۔ ریفریجریٹر سے آئس کیوبز اور ایک سربمہر بوتل نکال کر اس نے قریب ہی رکھی ایک ٹرے میں
سے رکھے۔ اس ٹرے میں نہایت نفیس کانچ کے دو گلاس پہلے سے موجود تھے۔ ان خاص لوازمات سے
اٹھائے وہ سجاد رانا کی طرف آئی۔ اُس کی ہر حرکت میں بڑا توازن اور اعتماد تھا۔ وہ کال گرل کی حیثیت
کمرے میں آئی تھی لیکن اُس کے کسی انداز میں بازاری پن نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر بس کسی پڑھی لکھی الٹرا
لڑکی کا خیال آتا تھا۔ سجاد رانا جو بہت عمیق نظروں سے اس کی ایک ایک جنبش کو نوٹ کر رہا تھا، کافی مطمئن
آنے لگا۔ اس نے اپنے مخبروں کی اطلاع پر جن لوگوں کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ان کے بارے میں
معلوم ہوا تھا کہ ان کے لیے کام کرنے والی لڑکیاں بے حد نفیس ہوتی ہیں۔ اعلیٰ عہدے داروں اور
دانوں کے ذوق کی تسکین کے لیے کسی عام بازاری عورت کا رکھ رکھاؤ رکھنے والی عورت سے گزارہ ہو
سکتا تھا۔ اس قسم کی لڑکیوں کے سپلائرز کے طور پر جو نام سامنے آئے تھے، ان میں سے ایک اس فائیو اسٹار
کا ویٹر بھی تھا۔ اس نے اپنے جس آدمی کے ذریعے ویٹر سے رابطہ کیا تھا، اس نے صاف لفظوں میں ویٹر
تھا کہ لڑکی ڈی آئی جی صاحب کو درکار ہے اس لیے کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہئے جو اعلیٰ عہدے داروں
وقت گزارنے کا ٹھیک ٹھاک تجربہ رکھتی ہو۔ کمرے میں موجود لڑکی کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویٹر
کی ڈیمانڈ پوری کرنے کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

''سوری سر! میں نے آپ سے اجازت نہیں لی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس وقت سب سے زیادہ
کی ضرورت ہوگی۔'' ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے نہایت مترنم لہجے میں کہا اور پھر بڑے
تلے انداز میں پیگ تیار کرنے لگی۔ ایک جام اسے تھمانے کے بعد دوسرا اس نے خود تھام لیا۔

''تھینکس۔ تمہاری ایفی شینسی دیکھتے ہوئے مجھے ابھی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارے ساتھ میرا
بہت اچھا گزرے گا۔'' سجاد رانا کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ اُبھری اور اس نے اسے تعریف سے نوازا
ہوئے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔ وہ کوئی زاہد خشک نہیں تھا۔ پارٹیز میں دوستوں کے ساتھ ڈرنک کرنا
معمول کی بات تھی اور اس وقت تو وہ جو رول ادا کر رہا تھا، اس میں شراب کے بعد شباب کی بھی باری آئی تھی

''تعریف کے لیے شکریہ سر! میرا کوئی کسٹمر کبھی مجھ سے ناخوش نہیں ہوا۔ آپ بھی مایوس نہیں ہوں
اس نے ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے اسے جواب دیا اور نہایت نزاکت سے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔

''میں نے سن رکھا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تمہارے کسٹمرز میں شامل ہیں۔ آج ہمیں بھی یہ اعزاز



''اس نے ٹھیٹ عاشقانہ لہجہ اپنایا۔

''اعزاز تو یہ ہمارے لیے ہے سر! ہماری ساری قدر و قیمت تو آپ کے دم سے ہے۔ اس روم سے باہر
تو ہم پوچھتی بھی نہیں۔ لیکن ابھی آپ کے ساتھ ہیں تو ہوٹل کے معمولی ویٹر سے مالک تک جس سے بھی سامنا
وہ جھک کر عزت سے بات کرے گا ہمارے ساتھ۔'' وہ واقعی اپنے پیشے کے اعتبار سے تربیت یافتہ تھی
ایک کو غبارے کی طرح ہوا بھر کر پھلانا خوب آتا تھا۔

''تم تو کافی حساس اور ذہین خاتون لگتی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کے بعد بھی میرا تم سے بار بار ملنے کا جی
گا۔'' سجاد رانا بھی اپنی حکمت عملی کے مطابق خوب چل رہا تھا۔

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ آپ ابھی تو ہم سے مل کر دیکھیں۔'' وہ یک دم جارحانہ موڈ میں آ گئی۔
مانع کو پوری طرح الرٹ رکھنے کے باوجود بھی سجاد رانا کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لڑکی کسی بھی مرد کے ہوش و
حواس چھین لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ گزرنے والے اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے
لیے آزمائش کے تھے۔ اس آزمائش سے کسی نہ کسی طرح گزرنے کے بعد جب اُس نے اس حسین فتنے کو
رخصت کیا تو اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اس لڑکی کی صورت میں ایک ایسا راستہ دکھائی دے گیا ہے جس
پر چلتے ہوئے وہ اپنے اصل ہدف تک پہنچ سکتا ہے۔

⊛----✪----⊛

سجاد رانا سے ہوٹل کے کمرے میں کال گرل کی حیثیت سے ملنے والی اس لڑکی کا نام جولیا تھا لیکن اپنے
والوں میں وہ مس جولی کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ قیامت خیز حسن رکھنے والی مس جولی جب ہوٹل سے
روانہ ہوئی تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کامیابی کا مطلب تھا کہ
سجاد رانا سے مزید ملاقات کے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ اس پہلی ملاقات میں تو اس نے احتیاطاً اسے کسی
خاص موضوع پر چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مبادا وہ چونک جائے لیکن اسے امید تھی کہ آئندہ دو چار
ملاقاتوں میں وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہی اس کا مشن تھا۔ ہائی سوسائٹی میں موو کرنے والی
کال گرل کا بہروپ اس نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے ہی اپنایا تھا لیکن ابھی تک اس کے کریڈٹ پر
کوئی خاص کارنامہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک وہ ایک آدھ ہی اعلیٰ افسر تک رسائی حاصل کر سکتی۔ اُسے تو اس پر بھی حیرت
ہوئی تھی اور وہ بھی ایسے نہیں تھے جن سے وہ بہت زیادہ کارآمد معلومات حاصل کر سکتی۔ اُسے تو اس پر بھی حیرت
ہوئی تھی کہ اسے سجاد رانا سے ملاقات کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ حالانکہ اس کی طرف سے واضح طور پر خواہش
ظاہر کی گئی تھی کہ کوئی بہت ہی تجربہ کار لڑکی ہونی چاہئے۔ وہ تربیت یافتہ تھی لیکن عملی تجربہ اتنا زیادہ نہیں تھا پھر بھی
اپنے بڑوں کی ہدایت پر اس نے سجاد رانا پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی بہت سے اعلیٰ عہدے داروں
کے ساتھ وقت گزار چکی ہے۔ اُس نے اس کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا اور اب وہ اس سے رخصت ہو کر بہت
خوشی خوشی واپس جا رہی تھی۔ سجاد رانا کے مٹھی میں آ جانے کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بہت سے قیمتی راز
اگلوانے میں کامیاب ہو جائے گی اور یہ کامیابی اسے اپنے آقاؤں کے سامنے سرخرو کر کے اس کی ترقی کا
سبب بن سکتی تھی۔ کامیابی کے نشے میں چُور اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اسے قطعی اندازہ نہیں
ہو سکا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ تعاقب کرنے والے کی مہارت نے بھی اس کے بے خبر رہنے میں
بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ موجود ہونے کے باوجود اس کی نظروں سے

اوجھل رہا تھا۔

جولی شہر کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک چھوٹی سی گاڑی بھی موجود تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی ڈرائیونگ کے دوران ہی اس نے گلوکمپارٹمنٹ میں رکھا ایک موبائل سیٹ نکالا اور اسے آن کیا۔ اس موبائل میں موجود سم ان ڈھیروں سموں میں سے تھی جو اس نے اپنی دیگر ساتھیوں کی طرح غیر قانونی طور پر رکھی ہوئی تھیں کال ٹریس ہونے کے خطرے سے بچنے کے لیے ایسی سم کا استعمال سب سے محفوظ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ پر پہنچنے سے پہلے اپنی کارکردگی کی رپورٹ اوپر والوں کو دینا چاہتی تھی اسی لیے موبائل باہر نکالا تھا۔ لیکن نمبر ملانے پر اس کا اپنے مطلوبہ نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ موبائل کی اسکرین پر روشن ہونے والے NOT AVAILABLE کے الفاظ نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ باقی کا راستہ بھی وہ بار بار نمبر ملا کر دیکھتی رہی لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ سامنے آتا رہا۔ اسی اُلجھن میں مبتلا وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی اور اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ ہوٹل سے یہاں تک اس کا تعاقب کرتے ہوئے آنے والا شخص اس کا فلیٹ نمبر جاننے کے بعد کب چپکے سے واپس بھی پلٹ گیا۔ اپنے فلیٹ میں جانے کے بعد اس نے پہلے لاؤنج کی لائٹ روشن کی اور پھر بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ بیڈ روم مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوئچ بورڈ پر موجود تیسرے بٹن کو بالکل صحیح انداز کے ساتھ اس طرح دبایا جیسے دن کی روشنی میں اسے دیکھ رہی ہو۔ بٹن دبتے ہی کمرے میں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی لیکن اس روشنی میں اس کی نظر جس چہرے پر پڑی، اس نے اسے گنگ کر دیا۔

''مس گیتا! آپ؟..... میں تو خود آپ کو فون پر رپورٹ کرنے والی تھی لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔'' اس نے خود کو لگنے والے جھٹکے سے تیزی سے سنبھلتے ہوئے کرسی پر بیٹھی تقریباً اپنی ہم عمر لڑکی سے کہا۔ لڑکی کے ہم عمر ہونے کے باوجود جولی کے لہجے میں موجود احترام بتا رہا تھا کہ وہ اس سے سینئر ہے۔

''اچھا! کیا رپورٹ ہے تمہارے پاس؟'' گیتا نے تمسخرانہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''ابھی تو پہلی ملاقات تھی لیکن میں سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہوں۔ اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ دوبارہ بھی مجھ سے ملنا پسند کرے گا۔ میرے خیال میں وہ اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ ایک آدھ دن میں دوبارہ رابطہ ضرور کرے گا۔'' وہ سجاد رانا سے ملاقات کے بعد بہت پُرجوش تھی۔ گیتا کو اپنے فلیٹ میں پا کر خاصی کنفیوز ہو گئی تھی اور کچھ رُک رُک کے سے انداز میں اپنی کارکردگی کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔

''میرے خیال میں تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ سجاد رانا تو تم سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس نے تمہارا ٹھکانہ معلوم کرنے کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے اپنا آدمی بھی بھیج دیا ہے۔'' گیتا کے بے حد چبا چبا کر بولے ان جملوں نے جولی کے چہرے پر خوف دوڑا دیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تردید کرنے کی کوشش کی۔

''ایسا ہی ہوا ہے۔ لیکن تمہاری بے خبری سے ظاہر ہے کہ تم نے اپنی تربیت سے کچھ نہیں سیکھا۔ اگر ہم نے تمہاری نگرانی پر احتیاطاً اپنا آدمی نہ لگایا ہوتا تو تم اپنے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سوں کو مروا دیتیں۔'' گیتا کا لہجہ زہر خند ہو رہا تھا۔ جولی اپنا سر پکڑتی ہوئی بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

''اتنی ناقص کارکردگی کا انجام معلوم ہے نا تمہیں؟'' گیتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں وہ محض سر ہی ہلا سکی۔

''تمہیں یاد ہو گا کہ ہم سب کی طرح تم نے بھی ''را'' میں شامل ہوتے وقت وچن دیا تھا کہ دیش کی خاطر



[illegible] سے نہیں ہچکچاؤ گی۔ اس وقت کی ناکامی کا داغ دھونے کے لیے تمہیں اپنا وچن پورا کرنا ہو گا۔''

''وہ کیسے؟'' وہ بہ مشکل گیتا سے یہ سوال کر سکی۔

''رائٹنگ پیڈ اٹھاؤ اور اس پر لکھو کہ میں ایک کال گرل کی زندگی گزارتے گزارتے بیزار ہو گئی ہوں اس [illegible] زندگی سے چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کر رہی ہوں۔''

وہ کانپتے ہاتھوں سے گیتا کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ گیتا کی آنکھوں میں لکھی اپنی موت وہ بہت اچھی [illegible] رہی تھی۔ اگر اس کی بات ماننے سے انکار کرتی، تب بھی موت سے نہیں بچ سکتی تھی اس لیے بہتر تھا [illegible] اس کی بات مان لے۔ کم از کم اس پر دیش دروہی (غدار) ہونے کا الزام تو نہیں آتا۔

''ہری گڈ۔ اب لو، یہ دودھ پی کر اچھے بچوں کی طرح بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔'' وہ نوٹ لکھ کر [illegible] ہوئی تو گیتا نے پہلے سے تپائی پر رکھے دودھ کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ جولی کو اندازہ تھا کہ ہوٹل سے [illegible] تعاقب کا علم ہوتے ہی اس کے اوپر والے فوراً حرکت میں آ گئے ہوں گے، تب ہی تو اس کے فلیٹ پر [illegible] سے قبل گیتا اس کی موت کا ہرکارہ بن کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ دودھ کی شکل میں گلاس میں موجود اپنی [illegible] گلے سے نیچے اُتارتے ہوئے اُسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ سجاد رانا جیسے افسر کے لیے کسی [illegible] ہوئی ایجنٹ کے بجائے اس کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ یقینی طور پر وہ لوگ سجاد رانا کی طرف سے پہلے ہی [illegible] تھے چنانچہ کسی قیمتی ایجنٹ کو ضائع کرنے کا رسک لینے کے بجائے انہوں نے جولی کو چارہ بنا کر سجاد رانا [illegible] سامنے ڈال دیا تھا اور اب اسے دیش پریمی ہونے کا ثبوت دینے کے لیے خود اپنی موت کو اپنے وجود میں [illegible] رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیا خبر ہے سنتھیا! کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟''

''گڑبڑ تو کافی تھی سر! لیکن ہم نے معاملہ سنبھال لیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم سجاد رانا کی ایکٹیویٹیز کے [illegible] میں پہلے ہی خاصے الرٹ تھے ورنہ بے خبری میں مارے جاتے۔ اسے یقیناً کہیں سے کلیو مل گیا تھا کہ [illegible] ورکر لڑکیاں کال گرلز کے بھیس میں بھی کام کر رہی ہیں۔ کسی طرح وہ درمیانی آدمی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ [illegible] پہلے ہی سے الرٹ تھی اس لیے کسی خاص ورکر کے بجائے جولیا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جولیا کی نگرانی پر [illegible] بندے نے جیسے ہی یہ اطلاع دی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے، میں نے فوری ایکشن لے لیا۔ ویٹر فدا [illegible] ڈیوٹی سے واپس جاتے ہوئے ایک ٹرک کی زد میں آ کر مارا گیا ہے جبکہ جولیا کی موت آتما ہتھیا [illegible] ظاہر کی گئی ہے۔ دونوں کام بالکل نیچرل طریقے سے کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے، سجاد رانا چونک تو [illegible] جائے گا۔ اسے ملنے والے کلیوز مٹانے کے لیے اپنی دونوں ورکرز کی بلی دینا ضروری ہو گیا تھا ورنہ آئندہ [illegible] سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔'' سنتھیا نے مؤدبانہ لہجے میں اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔

''ورکرز کا پرابلم نہیں۔ ایسے نچلے درجے کے کام کرنے کے لیے تو بہت لوگ مل جائیں گے۔ لیکن اصل [illegible] سجاد رانا کا ہے۔ بیٹی کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے اور وہ ہر حال میں اس کے قاتلوں تک پہنچنا چاہتا [illegible]۔ اس کے اس پاگل پن کی وجہ سے اچھا خاصا بنا بنایا سیٹ اپ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے سارے لوگ [illegible] گراؤنڈ کرنے پڑے ہیں۔ اب اگر وہ تمہاری ورکر لڑکیوں کے پیچھے پڑ گیا تو ہم اور بھی کٹھنائیوں کا شکار ہو جائیں گے۔''

''اگر آپ حکم دیں تو اسے خاموش کرنے کا بندوبست کیا جائے؟'' سنتھیا نے معنی خیز لہجے میں سوال

''میرے خیال میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ہماری گڈ لک ہے کہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑنے کی وجہ سجاد رانا نے ساری انفارمیشنز اپنی ذات تک ہی محدود رکھی ہیں۔ میں اپنے سورسز سے اس بات کی تصدیق چکا ہوں کہ سجاد رانا اپنی کسی بھی ایکٹیوٹی کو کسی ایجنسی کے ساتھ شیئر نہیں کر رہا ہے۔ پھر بھی خطرہ تو ہے ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ پہلے ہی پیر آباد اور اللہ آباد والے سیٹ اپ بگڑنے کی وجہ سے والے مجھ سے ناراض ہیں۔ تم سب کی تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے لیکن مجھے ڈائریکٹ جواب دینا پڑتا ہے۔ والے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسٹر ورما! تمہارے لوگ یہ کیسی غلطیاں کر رہے ہیں؟ میرے پاس شرمندگی کوئی جواب نہیں ہوتا۔'' وہ خاصا خفا لگتا تھا۔

''لیکن سر! ہماری طرف سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے ٹاسک کتنی کامیابی سے پورے کیے ہیں۔ یہاں کی ایجنسیز تک یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں ایکسپلوزیو آیا کہاں سے؟'' سنتھیا نے اپنی کارکردگی جتائی۔

''اس بات سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری ان کارروائیوں سے ہم حکومت کو ہلا کے علاوہ سجاد رانا کا دھیان بھی بٹانے میں کامیاب رہیں گے۔ اصولاً موجودہ سچویشن میں اسے اتنا مصروف جانا چاہئے تھا کہ اپنی بیٹی کی موت کے معاملے کو بھول جاتا لیکن وہ نہیں بھولا۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی منا رہتا ہے کہ ان کا کوئی مستقل انتظام کر دیا جائے۔'' ورما نے گویا سجاد رانا کی موت کے پروانے پر مہرِ تصد ثبت کر دی۔

''آپ کہیں تو یہ کام بھی میں کر دوں سر؟''

''نہیں، فی الحال تو تم بھی احتیاط سے کام لو۔ یہ کام کرنے کے لیے دوسرے بندے ہیں میرے پاس ورما نے سختی سے انکار کیا تو سنتھیا کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

''یہ بتاؤ کہ شہریار کے سلسلے میں کچھ ہوا یا نہیں؟ جوانی کے جوش میں وہ بڑے پَر پُرزے نکال رہا ہے۔ ایکٹیو نہ ہوتا تو ہمارا پیر آباد اور اللہ آباد والا سیٹ اپ تباہ نہیں ہوتا۔ سالے اشیش کو اپنی بری عادت کی وجہ سے آباد کی مسجد چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسرے اگر وہ اے سی کا بچہ اس معاملے میں نہیں کودتا تو پولیس والے اتنی ا شینسی دکھا ہی نہیں سکتے تھے کہ مسجد کے حجرے کا فرش کھود کر بچے کی لاش نکال لیتے۔ پانڈے کی حماقت بارے میں بھی تمہیں معلوم ہے۔ اس نے نور پور میں بلاسٹ کے لیے غلط لڑکے کا سلیکشن کیا۔ لڑکے کا مدر سے تعلق ظاہر ہونے کے بعد یہ سمجھنا کون سا مشکل تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کون تھا۔ وہ تو پانڈے کی ا اچھی تھی کہ وہ پہلے ہی نکل چکا تھا اور اشیش کو بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔''

سنتھیا رینک کے اعتبار سے ورما سے نیچے تھی لیکن اس کی کارکردگی ہمیشہ اتنی اچھی رہی تھی کہ وہ دوسرا کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل بھروسہ سمجھی جاتی تھی اس لیے ورما بھی اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''آپ ٹینشن مت لیں سر! دھیرے دھیرے سب معمول پر آ جائے گا۔ شہریار کو بھی قابو کر لیا جائے گا۔ اپنے ضلع کی ترقی کے جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ ہرگز پورے نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ آدھا کام تو وہاں کا وڈیرا افتخار عالم ہی کر دے گا۔'' سنتھیا نے اسے تسلی دی اور اس کے کشیدہ اعصاب کو آرام دینے کے لیے وہسکی کا جام تیار کرنے لگی۔



کسی زمانے میں وہ اس لائق تھی کہ خود سے کئی سال چھوٹے ورما کو شراب کے ساتھ ساتھ شباب سے بھی ا لیکن جوانی ڈھلنے کے بعد ورما کے لیے اس کے وجود میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر ا لطف اندوز ہونا بھی چاہتا تو اس کا انتخاب سنتھیا کے بجائے اس کے انڈر کام کرنے والی کوئی شعلہ ا ہوتی تھی۔ ذہین اور سمجھ دار سنتھیا نے وقت کی اس تبدیلی کو آسانی سے قبول کر لیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''رانی! تو نے میری ساری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا؟ دیکھ، کوئی غلطی نہیں کرنا ورنہ مشکل ہو جائے ا'' قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے گیلے بالوں میں برش پھیرتی ہوئی کشور نے رانی سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو بی بی! میں سب سنبھال لوں گی۔'' سرخ کام دار دوپٹے کو احتیاط سے تہ کر کے ایک بیگ ں رکھتے ہوئے رانی نے جواب دیا اور پھر بڑی محویت سے کشور کی طرف دیکھنے لگی۔ آج وہ بڑی نکھری نکھری ا لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں کی کیفیت کہیں اندر چھپ گئی تھی اور اندر سے جو روپ نکلا تھا، وہ بڑا ہی پیارا تھا۔ ں اب کو مزید نکھارا ایک مشہور پارلر کی ماہر بیوٹیشن نے دیا تھا۔ کل جب کشور نے اسے اچانک باہر چلنے کا حکم ا تھا تو وہ سمجھی تھی کہ بی بی، ماسٹر آفتاب سے ملنے جا رہی ہیں لیکن اس کے انداز کے برخلاف کشور اسے لبرٹی ا لے گئی تھی جہاں سے اس نے بڑی چھان پھٹک کے بعد سرخ عروسی جوڑا اور اس کی میچنگ کے زیورات وغیرہ ا ے تھے۔ لبرٹی سے وہ لوگ سیدھے ایک مشہور پارلر پہنچے تھے۔ اس پارلر کے بارے میں کشور کو اخبار میں والے اشتہار کے ذریعے علم ہوا تھا۔ پارلر میں کشور نے اگلے دن کی بکنگ کے ساتھ بیوٹیشن کے مشورے پر ا ری لیس ٹریٹمنٹ بھی کروایا تھا اور ہاتھ پیروں پر مہندی بھی لگوائی تھی۔ مہندی کو ڈرائیور کی نظروں سے ا نے کے لیے وہ پارلر سے خود کو بہت اچھی طرح اپنی چادر میں لپیٹ کر کوٹھی واپس آئی تھی۔ کوٹھی واپس پہنچنے ا بعد کل سے آج تک کا سارا وقت اس نے اپنے کمرے میں ہی گزارا تھا کہ مبادا کوٹھی میں کام کاج کرنے ال چوکیدار کی بیوی نہ چونک جائے۔ کھانے پینے کا سامان رانی نے اسے کمرے میں ہی مہیا کر دیا تھا۔ کل سے تک وہ کشور کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ آفتاب سے ملنے کے بعد وہ ہمیشہ ہی بڑی پُرجوش نظر ا تھی لیکن آج تو معاملہ ہی الگ تھا۔ آج وہ صرف محبوبہ بن کر نہیں بلکہ منکوحہ کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ اس ا انگ انگ سے چھلکتی مستی اس کی اندرونی کیفیت کے راز افشا کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سجا حیا آلود تبسم ال ویسا ہی تھا جو بابل کے آنگن سے رخصت ہو کر پیا کے نگر جانے والی دلہن کے چہرے پر کھیلتا ہے۔

''کیا دیکھ رہی ہے رانی؟'' اس کی محویت کو محسوس کر کے کشور نے اس سے پوچھا۔

''اپنی نظروں سے آپ کی بلائیں لے رہی ہوں بی بی! آج تو آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ آپ کے ے سے نظر ہٹانے کو من ہی نہیں کرتا۔''

''اچھا۔'' اس کی بات سن کر کشور خوشگوار انداز میں ہنسی۔

'سوچ لیں ماسٹر صاحب! آج ہم آپ کے ہوش اُڑا کر رکھ دیں گے۔ ابھی تو کچھ تیاری کی ہی نہیں تو رانی ں ہمارے بارے میں یہ رائے ہے، جب ہم مکمل تیاری کے ساتھ آپ کے روبرو ہوں گے تو آپ کیا کریں گے؟' آنکھ کی پتلیوں سے آئینے میں اُتر آنے والے آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں ے چیلنج کیا اور پھر خود ہی شرما گئی۔

''شریف سے بول رانی! کہ گاڑی نکالے۔ میں بھی آ رہی ہوں۔'' رخساروں پر اترتی سرخی کو رانی سے

چھپانے کے لیے اس نے بہانے سے اسے کمرے سے باہر بھیجا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی بڑی سی چادر
طرح لپیٹ کر کہ سوائے آنکھوں کے جسم کا کوئی عضو نظر نہیں آ رہا تھا، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے سا
بیگ رانی پہلے ہی ساتھ لے گئی تھی۔ پورٹیکو میں رانی اور ڈرائیور دونوں اس کے منتظر تھے۔ شریف نامی
گاؤں سے ان کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے قبل جب کشور انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب
کے بہانے سے آفتاب سے ملنے اس کے گاؤں والے گھر میں گئی تھی، تب بھی یہی ڈائیور ان کے ساتھ
ان کا مکمل رازداں نہیں تھا لیکن جتنا دیکھتا تھا، اسے بھی قیمت وصول کرنے کے بعد بھول جاتا تھا۔ کشور
مصروفیات پر بھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور صرف حکم کا غلام بنا عمل کر رہا تھا۔

''مجھے پارلر میں کافی دیر لگ جائے گی رانی! مجھے وہاں پہنچانے کے بعد تُو شریف کے ساتھ کوٹھی وا
جانا اور حاجرہ کا کام میں ہاتھ بٹانا۔ میرے ساتھ پارلر میں بیٹھ کر تو تجھے کھیاں مارنے کا کام بھی نہ
پڑے گا۔ میں دو ڈھائی گھنٹے بعد یا جب بھی فارغ ہوں گی، تجھے کوٹھی پر فون کر دوں گی۔ تُو شریف کے
کر مجھے لے جانا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت راستے میں کشور نے با آوازِ بلند رانی کو حکم دیا۔ اصل مقصد
کو سنانا تھا۔

پارلر میں داخل ہو کر کشور نے پہلے اپنا سامان ایک مددگار لڑکی کے سپرد کیا پھر اپنے موبائل سے آ
نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''آخر آپ کو ہماری یاد آ ہی گئی۔'' کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے شکوہ کیا۔

''یاد آنے کے بارے میں کچھ نہ پوچھیے۔ جن کا خیال دل سے جدا ہی نہ ہوتا ہو، انہیں یہ شک ہو
انہیں یاد دلانے کے لیے فرصت کی تلاش کرتے ہیں.... تو دل بڑا دُکھتا ہے۔ ہم تو بس اپنا وعدہ نبھانے کی
میں لگے ہوئے تھے۔ کہا تھا نا کہ اب جب کبھی ملیں گے تو اس طریقے سے ملیں گے جو طریقہ ہمارے رشتے
شایانِ شان ہو۔ ہم اپنا وعدہ نبھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بتائیں، دو گھنٹوں کے اندر آپ ایسی کسی
انتظام کر سکتے ہیں جہاں ہم آپ سے ملنے آ سکیں؟'' اس نے آفتاب کے شکوے کا بھرپور جواب دیتے
اس سے پوچھا۔

''جگہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنے دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ بتائیں کہ یہاں کیسے پہنچیں
آپ چاہیں تو میں آپ کو لینے آ جاتا ہوں..... بتائیں کہاں ملیں گی؟'' وہ سارے گلے شکوے بھول کر اس
ملنے کے خیال سے جوش میں آ گیا۔

''بتائیں گے..... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ بس دو گھنٹے تک انتظار کیجیے پھر آپ کو جگہ بھی بتا دی جا
گی۔'' اس کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کشور نے شرارت سے کہا اور لائن کاٹ دی۔ ا
خیال تھا کہ آفتاب دوبارہ کال کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تیاری کے طویل مرحلے
گزرتے ہوئے ایک بار بھی اس کے موبائل کی گھنٹی نہیں بجی۔ آفتاب کی اس بے اعتنائی پر وہ دل ہی دل
روہانسی ہونے لگی۔

بیوٹیشن نے اسے مکمل تیار کر کے آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو اس وقت وہ عجیب سے تذبذب کا شکار
تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص نے پلٹ کر دوبارہ پوچھا بھی نہیں، اس کے لیے اتنی تیاری کرنی
چاہیے تھی کہ نہیں؟ وہ ابھی اسی سوچ میں گھری کھڑی تھی کہ خاموش موبائل بول پڑا۔ کال کرنے والا آفتاب
سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔



''اطمینان کے دو گھنٹے گزر گئے ہیں محترمہ! اب فرمائیے کہ کہاں حاضر ہوں؟'' اس کی شوخ زندگی سے
ا ا ا ا نے کشور کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ اس نے فوراً آفتاب کو اس پارلر کا پتہ بتایا جہاں وہ اس
ا ا ا تھی۔

''اس دس منٹ انتظار کیجیے۔ میں پہنچتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور واقعی دس منٹ کے بعد وہ وہاں پہنچ
ا ا ا پارلر سے نکلنے سے پہلے کشور نے پہلے ہی کی طرح خود کو چادر میں چھپا لیا تھا لیکن سجی بنی دُلہن اور گلاب
ا ا ا ا کی یہی تو خاصیت ہوتی ہے کہ چھپانے کے باوجود ان کی مہک چھپ نہیں پاتی۔ آفتاب نے بھی اس
ا ا ا ا ا ا لی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

''لگتا ہے آج آپ مجھے سرپرائز دینے کے موڈ میں ہیں۔'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ساتھ
ا ا ا کشور کو چھیڑا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔ آفتاب نے بھی راستے بھر مسکراتے رہنے کے سوا اس سے دوسری کوئی
ا ا ا ا کی۔ دس منٹ بعد وہ اپنے دوست کے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دروازے پر گاڑی روک
ا ا ا نے ہارن دیا تو تقریباً اسی کے ہم عمر ایک مرد نے گیٹ کھول دیا۔ آفتاب کھلے گیٹ سے گاڑی اندر لے
ا ا ا سامنے ہی ایک بے حد گوری اور فربہ سی خاتون کے ساتھ دو چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ آفتاب
ا ا ا ا سے اُتر کر اس کی سائیڈ والے دروازے پر آیا اور اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اُتارا۔ وہ جو اسے سرپرائز
ا ا ا ا لیے آئی تھی، اب شرم و حیا اور گھبراہٹ کے مارے باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت
ا ا ا ا ا ا ا ا ا جب استقبال کے انداز میں کھڑی خاتون اور بچوں نے پہلے اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور
ا ا ا ا ا خاتون نے ایک موٹا سا ہار اس کے گلے میں ڈال کر اسے خود سے لپٹا کر پیار کیا۔

''بڑی ایمرجنسی میں آئی ہو دیورانی صاحبہ!..... اس لیے اگر کوئی کمی رہ جائے تو نظرانداز کر دینا۔'' اسے
ا ا ا ا ا لگائے لگائے ہی خاتون نے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف لے گئیں۔ دونوں بچے بھی ساتھ
ا ا ا ا ا ا ا۔ خاتون کشور کو ایک کمرے میں لے جانے لگیں تو بچوں میں سے ایک نے احتجاج کیا۔

''یہ کیا ممی!..... کیا دلہن ہمارے ساتھ ڈنر نہیں کرے گی؟''

''نہیں۔ دلہن ہمارے ساتھ نہیں بلکہ اپنے دولہا کے ساتھ ڈنر کرے گی۔'' خاتون نے بچے کو جواب دیا
ا ا ا کشور کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تم زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں رک سکو گی اس
ا ا ا ا ا ا ا ا اور آفتاب کو ایک ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع دینے کے لیے میں نے یہ انتظام کیا
ا ا ا ا کہ تم لوگ کھانا اپنے کمرے میں ہی کھا لو۔ ہمارا آپس میں تفصیلی تعارف اور ملاقات بعد میں ہو جائے گی۔
ا ا ا ا ا ا تم بس یہ سن لو کہ آفتاب، افضل کو اپنے سگے بھائیوں کی طرح عزیز ہے اور اس کے حوالے سے تم بھی
ا ا ا ا ا لیے اتنی ہی اہم ہو۔ ہمیں کبھی غیر مت سمجھنا۔'' خاتون کے پُرخلوص جملے کو سنتے ہوئے وہ کمرے کے
ا ا ا ا ا داخل ہوئی تو مبہوت رہ گئی۔ پورا کمرہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ نئی دُلہن کے استقبال کے لیے
ا ا ا ا ا ا پھیلائے کھڑا ہو۔

''یہ سارے پھول آفتاب خرید کر لایا تھا۔ میں نے اور افضل نے اس کے ساتھ مل کر انہیں ڈیکوریٹ کیا
ا ا ا ا۔'' خاتون نے اسے اطلاع دی تو وہ مسکرا دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے جو اس نے پارلر میں
ا ا ا گزارے تھے، ان میں آفتاب بھی بہت مصروف رہا تھا۔

خاتون اسے کمرے میں پہنچا کر بچوں سمیت باہر نکلیں تو فوراً ہی آفتاب چلا آیا۔ خوشی اس کے چہرے پر
ا ا ا مسکراہٹ بن کر کھیل رہی تھی۔ گاڑی میں تو وہ حیا کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکی تھی لیکن اب اس نے

دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہمیشہ والے لباس سے ہٹ کر بہت خوب صورت آف وہائٹ رنگ کے کُرتہ شلوار ملبوس ہے۔

''مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کس انداز سے ملنے کے لیے آرہی ہیں۔ دو گھنٹے کے مختصر وقت میں بھاگ دوڑ کر کے یہ سارا انتظام کیا ہے۔ افضل اور مہتاب بھابی نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا ورنہ آپ کے سر کے مقابلے میں ہماری ادھوری تیاری تو ہمیں آپ کے روبرو شرمندہ کروادیتی۔'' کشور کے مقابل بیٹھتے ہو اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جگر جگر کرتے ہوئے نگینوں سے مرصع نازک سی انگوٹھی کی انگلی میں پہنادی۔

''جس دن سے نکاح ہوا ہے، اسے جیب میں لیے گھوم رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے حق، حق دار تک دیا جائے۔'' خوشی سے بوجھل لہجہ کشور کو یقین دلا رہا تھا کہ اس نے ناحق اس شخص تک پہنچنے کے لیے اتنا کا نہیں اٹھایا۔ وہ واقعی اس کا سچا قدر دان تھا..... بالکل اس جوہری کی طرح جس کے ہاتھوں میں آکر غیر تراشا ہیرے کی قسمت جاگ اُٹھتی ہے۔ اس نے بھی بہ خوشی اپنا آپ اپنے قدر شناس جوہری کو سونپ دیا۔

⊛----✪----⊛

''تُو بی بی کے ساتھ ہی رک جاتی تو اچھا تھا۔'' گاڑی واپسی کے راستے پر ڈالتے ہوئے شریف نے سے کہا۔

''کیسے رک جاتی؟ سنا نہیں تھا تُو نے کہ بی بی نے آپ مجھے کوٹھی واپس جانے کا حکم دیا تھا۔'' شریف بات کے جواب میں رانی چہک کر بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، پر مجھے وڈے چودھری صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کیا خبر انہیں بی بی کا اس طرح ا کوٹھی سے باہر کہیں رہنا اچھا نہ لگے۔'' وہ تذبذب کا شکار تھا۔

''اس سے ہمیں کیا؟ ادھر تو بی بی ہی ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کا ہی حکم ماننا ہوگا۔ ویسے بھی وڈ چودھری کو خبر کیسے ہوگی اس گل کی؟ کیا تُو بتائے گا اُنہیں؟'' بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اچا معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''مینوں کی لوڑ پڑی ہے؟ میں تو بی بی کے خیال سے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ برا مان کر بولا۔ پھر باقی راستے میں اس کے اور رانی کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

کوٹھی واپس پہنچنے کے بعد رانی، چوکیدار کی بیوی حاجرہ کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ کاموں کے دوران ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا دورانیہ تیزی سے گزر گیا۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ حاجرہ سے باتوں میں مصروف رانی کا ذہن وقت کا حساب کتاب بھی کر رہا تھا۔ پونے دو گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔

''باورچی خانے کا باقی کام میں دیکھ لوں گی حاجرہ!..... تُو ذرا مہربانی کر کے بی بی کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کردے۔ بی بی نے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے حکم دیا تھا، پر میں بھول گئی۔ تُو جلدی سے یہ کام کر آ، پھر مل کر چائے پیتے ہیں۔'' چائے کا پانی کھولنے لگا تو اس نے بہانے سے حاجرہ کو وہاں سے ہٹایا۔ وہ اس کی بات مان کر باہر نکل گئی تو اس نے جلدی سے چائے تیار کر کے پہلے ایک پیالی میں اپنے لیے نکالی پھر باقی کی چائے میں اپنے گریبان میں چھپا کر رکھی پڑیا نکال کر اس میں موجود گولیاں اُلٹ دیں۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ گولیاں



پوری طرح حل ہو چکی ہیں، اس نے چائے کو تین پیالیوں میں اُلٹا اور کپ ٹرے میں رکھ کر باہر نکل سے پہلے اس نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو چائے پہنچائی پھر شریف کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔

''لے بھائی شریف! چائے پی لے۔ بی بی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں، ابھی آدھا گھنٹہ ہور لگے گا۔ تُو لے کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔ فیر ہم انہیں لینے چلیں گے۔''

''اچھا ہے۔'' شریف نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ سمجھ نہیں آرہی۔ یہ اچانک ہی بی بی کو بننے سنورنے کا اتنا شوق کیوں چڑھ گیا کہ روز روز پولر (پارلر) لگیں؟''

''کیوں، بی بی انسان نہیں ہیں کیا جو اُن کا دل کسی چیز کو نہیں چاہ سکتا؟ ویسے بھی تجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت تُو اپنے کام سے کام رکھ۔'' براہِ راست مخاطب نہ کیے جانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ شریف نے اسی ال کیا ہے اس لیے اسے ٹوک کر باہر نکل گئی۔ سامنے ہی حاجرہ چلی آرہی تھی۔

''کر دی صفائی؟..... چل آ تیرے کوارٹر میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ تھوڑی گپ شپ بھی لگالیں گے۔'' لے کر وہ اس کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اپنی اپنی چائے پیتے ہوئے وہ دونوں باتیں بھی کرتی رہیں۔ ختم ہوتے ہی حاجرہ جماہیاں لینے لگی۔

''آج پتہ نہیں کیوں ابھی سے نیند آنے لگی؟'' منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے نے کہا۔

''تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کر لے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ ابھی شریف کے ساتھ بی بی کو لینے بھی جانا ہے۔'' اسے مشورہ دے کر وہ کوارٹر سے باہر نکل گئی۔ گولیوں کی اثر انگیزی کے بارے میں اسے اچھی طرح علم تھا۔ ان گولیوں کی مدد سے تو وہ حویلی میں موجود ملازموں اور مالکان کی بڑی تعداد کو غافل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی، یہاں صرف تین بندوں سے نمٹنا کیا مشکل تھا؟ چائے کی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر گیٹ کی طرف آئی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''نیند آرہی ہے تو اندر اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاؤ۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد ڈیوٹی پر واپس آجانا۔'' چوکیدار کا ہلا کر اُس نے اُسے یہ مشورہ دیا تو وہ اونگھتا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ اب رانی کو اطمینان تھا۔ صبح پروگرام کشور، رانی سمیت ان تینوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی غیر ذمے داری پر ڈانٹ بھی پلاتی اور یہ ظاہر کرتی کہ کوٹھی پر کسی ملازم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے رات اسے مجبوراً ٹیکسی سے تنہا واپس آنا پڑا۔ اس صورتِ حال پر مشکوک تو ضرور ہوتے لیکن ظاہر ہے وہ مالکن سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ رانی بھی ان کی چہیتی ہونے کی وجہ سے محفوظ رہتی۔

ہر طرف سے مطمئن رانی کوٹھی میں کشور کے زیر استعمال کمرے میں چلی آئی۔ یہاں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ وہ احتیاطاً رات جاگ کر گزارنا چاہتی تھی چنانچہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ اُردو کے اس ناول میں کھوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گیٹ پر کسی گاڑی کا زوردار ہارن سنائی دیا تو وہ چونکی اور پھر کتاب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف دوڑی۔ خیال تھا کہ کشور واپس آئی ہوگی۔ اسی خیال کے سبب اس نے بے دھڑک گیٹ کھول دیا۔ لیکن سامنے موجود گاڑی اور اس میں سوار افراد کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ گاڑی میں تاجور اور اس کا شوہر اشرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گیٹ مکمل وا کیا تو گاڑی تیزی سے اندر آگئی۔ کانپتے ہاتھوں سے گیٹ بند کر کے رانی تیزی سے

گاڑی کی طرف بڑھی اور پچھلی نشست پر بیٹھی تاجور کی گود میں سر رکھ کر سوئے ہوئے منور کو اپنی گود میں لے

''چوکیدار کہاں مر گیا ہے جو تجھے گیٹ کھولنا پڑا؟'' اشرف نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''اس کی طبیعت وڈی خراب ہے جی۔ اپنے کوارٹر میں پڑا لوٹ رہا ہے۔'' حاضر دماغی سے کام ہوئے اس نے چوکیدار کی گیٹ سے غیر حاضری کا بہانہ بنایا اور بچے کو لیے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی سے یہاں چودھری کے علاوہ کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا لیکن سارے کم ہر وقت صاف ستھرے اور تیار رہتے تھے۔ ان کمروں میں سے ہی ایک میں اس نے تاجور کے بیٹے کو پہ آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ تاجور خود بھی پیچھے ہی چلی آئی۔

''آپ لوگوں کے لیے کھانا لگاؤں بی بی؟'' رانی نے اس سے مؤدبانہ پوچھا۔

''نہیں، کھانا ہم کھا کر آئے ہیں۔ اشرف کے ایک دوست کی شادی تھی یہاں، اسی میں شرکت کر رہے ہیں۔'' تاجور نے اسے جواب دیا۔

''تو فیر میں آپ لوگوں کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔'' ایک تو اسے معلوم تھا کہ حویلی سے تعلق ر والے سارے افراد رات سونے سے پہلے دودھ پینے کے عادی ہیں، دوسرے وہ زیادہ دیر تاجور کے سامنے نہیں چاہتی تھی کہ مبادا وہ کشور کے بارے میں کوئی سوال نہ کر لے اس لیے اس کے جواب کا انتظار کیے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سیدھا باورچی خانے کی طرف جا کے بجائے نشست گاہ کا رخ کیا۔ ٹیلی فون سیٹ یہیں رکھا ہوا تھا۔ اسے کشور کو فون کر کے اس نئی صورتِ ح کے بارے میں خبر دینی تھی۔ ایسی ہی کسی ایمرجنسی کے لیے ذہن نشین کروایا ہوا کشور کا موبائل نمبر ڈائل کر کے بیل جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت اس پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی کہ سیکنڈ کا ہزارواں حصہ گزارنا بھی مشک لگ رہا تھا۔ جیسے ہی پہلی بیل جانے کی آواز سنائی دی، اس کی رُکی ہوئی سانس بحال ہونے لگی۔

''اس وقت کسے فون کر رہی ہے؟'' عقب سے سنائی دینے والے اس سوال پر وہ اس بری طرح اُچھلی ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیچے پڑے ریسیور پر سے نظر ہٹا کر اس نے اپنے پیچھے کی طرف دیکھ ماتھے پر ڈھیروں شکنیں سجائے چودھری اشرف شاہ اسے خشونت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

رانی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ فوری طور پر اشرف شاہ کے سوال کا جواب دے سکتی۔ وہ خوف زدہ کھڑی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی تھی؟'' اسے خاموش پا کر اشرف شاہ اپنا سوال دہرایا۔

''کسی کو نہیں شاہ جی! فون کی گھنٹی بجی تھی تو میں نے فون اٹھایا تھا۔ پر دوسری طرف سے کوئی کچھ بولا ہ نہیں۔'' رانی نے تھوک نگل کر اپنا خشک ہو جانے والا گلا تر کیا اور اشرف شاہ کی بات کا جواب دیا۔ اچانک نازک ہو جانے والے چودھری افتخار کے اس بڑے داماد کو ٹالنے کے لیے فی الحال یہی بہانہ اسے سوجھ سکا تھا۔ اشرف شاہ نے اس کا جواب سنا اور خود آگے بڑھ کر نیچے گرا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔ ریسیور کان سے لگانے پر اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک لائن پر کوئی موجود ہے۔

''ہیلو!'' اُس نے غرّانے کے انداز میں کہا۔ ردِعمل میں فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا اور ٹوں ٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اشرف شاہ نے رانی کو کھا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کشور کہاں ہے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں شک سرسرا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس



اور اس کشور سے تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''بی بی تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔'' تاجور اور اشرف شاہ کی کوٹھی میں آمد کے ساتھ ہی اُس نے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا اس لیے اس بار پورے اعتماد سے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

''بی بی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر تک مجھ سے سر دباتی رہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دوا کھا کر سوئی ہیں۔ سونے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں خود نہ جاگوں، مجھے سویرے اٹھانا نہیں۔'' حتی الامکان تحت اس نے آگے کے حالات کو سنبھالنے کے لیے پیش بندی شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' اشرف شاہ نے اسے اجازت دی اور خود بھی باہر نکل گیا۔ رانی نے فوری مصیبت ٹل جانے پر سکون کا گہرا سانس لیا اور باورچی خانے میں جا کر بے وقت چلے آنے والے اپنے ان مالکان کے لیے دودھ گرم کر کے گلاسوں میں نکالنے لگی۔ ہاتھوں کی طرح اس کا ذہن بھی بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے بہت کچھ کرنا تھا کشور کو مطلع کرنا، تاجور اور اشرف شاہ کو کشور کے بارے سے بے خبر رکھنا اور خواب آور دوا ملی چائے پی کر سو جانے والے ملازمین کو سنبھالنے کی تمام تر ذمہ داریاں اس کے سر تھیں۔ صرف وہ تھی جو کشور کے رازِ محبت کی امین تھی اور اس امانت کا حق ادا کرنے کے لیے اسے بے حد مستعدی سے کام لینا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آفتاب! مجھے یقین دلائیں کہ یہ سب خواب نہیں ہے۔ میں سچ مچ اس وقت آپ کی بیوی کی حیثیت سے آپ کے قریب، آپ کے ساتھ موجود ہوں۔'' کشور نے اپنا سر آفتاب کے سینے پر رکھتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں اس سے فرمائش کی۔ اس کی فرمائش پر آفتاب نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیا۔ کشور نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ شاید وہ واقعی اپنی زندگی کے ان انمول لمحات کو خواب تصور کر رہی تھی اور اس خوب صورت خواب کے ٹوٹ جانے کے ڈر سے آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔ آفتاب اس کی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی انہی احساسات سے دوچار تھا۔ کبھی کبھی اچانک مل جانے والی خوشیاں انسان کو ایسی ہی بے یقینی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ وہ خواب جو بار بار دیکھے جائیں، تعبیر کے عمل میں داخل ہونے کے بعد بھی خواب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر آپ دیکھنے والے کو ڈرا دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ تعبیر نہیں کانچ کا نازک بلوریں جام ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جائے گا۔ وہ دونوں بھی اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہونے اور بہت سے کیف آور لمحات گزارنے کے بعد بھی اسی ڈر، اسی خوف میں مبتلا تھے۔

''اگر آپ کو یہ لمحے خواب لگتے ہیں تو بھی کیا حرج ہے کہ ہم یہ خواب دیکھتے رہیں۔ اتنے خوب صورت خواب تو قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے خوابوں کے پھولوں سے بھری یہ فصل تو بس انہی لوگوں کی سرزمین پر اُگتی ہے جنہیں محبت کے پانی سے سیراب ہونے کا موقع ملا ہو۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ محبت نے ہمارے دلوں کی زمین کو اتنا زرخیز بنایا ہے۔'' بہت دھیمی آواز میں اپنے لفظوں کا جادو جگاتے ہوئے اس نے نرمی سے کشور کی بند آنکھوں کو باری باری چوما۔ پھر گویا اسے اور خود کو یقین دلانے کے لیے پوری محبت سے اس کے ایک ایک نقش کو چومتا چلا گیا۔ کشور کے قرب نے اسے ایک ایسا بادل بنا دیا تھا جو برسنے کے بعد بھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اس کی چاہت کی گھٹا اور بھی اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھی۔ دھرتی بھی جل تھل ہو جانے کے

باوجود مزید برسات کو قبول کرنے سے انکاری نہیں تھی۔ ان کے لیے اس وقت کائنات میں ایک دُوجے
کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ 'میں اور تُو' کا فرق مٹائے ایک دُوجے میں گم تھے۔ ایک دُوجے کو چاہت سے لبریز
جام پلاتے وہ بالکل مدہوش تھے۔ اچانک ہی ایک آواز نے اس فسوں کو توڑ دیا۔ دو چاہنے والوں کی تنہائی
مخل ہونے والی یہ آواز کشور کے موبائل کی رنگ ٹون تھی جسے سن کر وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کے موبا
صرف ایک شخص کال کرتا تھا اور وہ شخص اس کے ساتھ تھا۔ یہاں آنے سے قبل وہ رانی کو اپنا موبائل نمبر
آئی تھی اور گھنٹی بجنے کا مطلب تھا کہ کال کرنے والی رانی ہے۔ رانی کی طرف سے کال آنے کا یہی مطلب
سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے ورنہ وہ اس وقت اسے ہرگز بھی ڈسٹرب نہیں کرتی۔ اندیشو
خوف میں گھری کشور نے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین پر کوٹھی کا فون نمبر جگمگا رہا تھا
نے ''یس'' کا بٹن پش کرتے ہوئے کال ریسیو کی لیکن دوسری طرف سے توقع کے برخلاف رانی کی آواز
نہیں دی۔ وہ کچھ بولتی اس سے قبل ہی ایک مردانہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اپنی سماعتوں کو
طرح دوسری طرف سے سنائی دینے والی آوازوں پر مرکوز کر دیا۔

''میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی ہے؟'' اس بار وہ آواز سننے کے سا
ساتھ لفظوں کو سمجھنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ اسے اس آواز اور لہجے کو پہچاننے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگا۔ نتیجتاً چاہ
کے رنگوں سے سجا اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔ اس کے ساتھ موجود آفتاب خاموشی سے اُس کی اس بدلتی کیفیت کو
رہا تھا۔ فی الوقت وہ اسے بھی بھلائے رانی کی آواز سن رہی تھی۔ رانی کا وضاحتی جملہ ابھی اس کی سماعتوں
گزر رہا ہی تھا کہ ایک غراتی ہوئی مردانہ ''ہیلو'' نے اس کے وجود کو ہلا ڈالا۔ اب شک و شبے کی کوئی گنجائش
نہیں رہی تھی۔ وہ سو فیصد اس کا بڑا بہنوئی اشرف شاہ تھا۔ اشرف شاہ کے کوٹھی پر موجود ہونے کا مطلب تھا
بہت بڑا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر تاجور بھی تھی تو کشور کا کوٹھی سے غیاب چھپانا بہت مشک
تھا۔ بے حد خوف زدہ ہوتے ہوئے اس نے لائن کاٹ دی اور ہارے ہوئے انداز میں موبائل کان پر
ہٹاتے ہوئے بیڈ پر ڈال دیا۔ حقیقت کی تلخی اسے خوابوں کی دنیا سے واپس لے آئی تھی۔

''کیا بات ہے کشور!..... کیا ہوا؟'' آفتاب نے پُرتشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ

''بھا اشرف کوٹھی پر آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے مُردہ لہجے میں بتایا۔

''یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔'' آفتاب اس کی دی ہوئی اطلاع کو سن کر پریشان ہوگیا۔

''مجھے فوری طور پر کوٹھی واپس جانا ہوگا۔'' کشور جو بالکل بے دم سی بیٹھی تھی، کوئی خیال آنے پر یک دم
متحرک ہوئی۔

''لیکن اس وقت آپ کا اس طرح سے جانا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' آفتاب نے تشویش کا اظہار کیا۔

''میرا نہ جانا رانی کے لیے بہت برا ثابت ہوگا۔ میں اسے اس کی وفاداری اور محبت کے بدلے میں اتنے
بڑے خطرے سے دوچار نہیں کرسکتی۔'' کشور کا لہجہ اٹل اور دلیل جان دار تھی۔ واقعی انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ
ایک وفادار و جاں نثار ملازمہ کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' اس نے جرأت مندی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اور کشور ایک دوسرے سے
الگ تھلگ نہیں تھے۔ وہ اس کی ذات سے اپنے لیے خوشیاں کشید کرتا تھا چنانچہ اب مصیبت کی گھڑی میں بھی
اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ دوسری طرف کشور اسے مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آفتاب کے
ساتھ جانا بھی اس کی مجبوری تھی۔ رات کے اس پہر وہ اکیلی کوٹھی تک واپس نہیں جاسکتی تھی۔ آفتاب کو کوٹھی کے



ں واپس لوٹا دینے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب
ں واپس لوٹنے کے لیے راضی نہیں ہوگا مگر وہ اسے اپنی قسم دے کر واپس ہونے پر مجبور کرسکتی تھی۔

''آپ تیار ہو کر باہر آئیں، میں افضل اور بھابی کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' آفتاب نے کہا اور
ں لائن بند کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور بھی بجھے دل کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ زندگی کے اتنے
صورت لمحات اس طرح درہم برہم ہو جانے پر دل کا بجھ جانا ایک فطری سی بات تھی۔ اس نے کوٹھی سے
ے ہوئے جو لباس پہنا تھا، وہی اب دوبارہ پہن لیا اور حسرت بھری نظروں سے اب سرخ عروسی لباس کو
جو اس نے بطور خاص بڑے ارمانوں سے اس موقع کے لیے خریدا تھا۔ آفتاب نے اسے اس لباس
لرخوب سراہا تھا لیکن اتنا سراہے جانے کے بعد بھی وہ سیر نہیں ہوئی تھی۔ جو لمحے گزر گئے تھے وہ بے شک
لیکن وقت نے خواہش سے بہت کم یہ انمول لمحات اس کی جھولی میں ڈالے تھے۔ اسے اپنا آپ ایک
ے تلوار کی طرح لگ رہا تھا جسے پوری طرح سے سرور آنے سے قبل ہی مے خانے سے رخصت کا حکم سنا
گیا ہو۔

''تیار ہو کشور؟'' اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور افضل کی بیوی مہتاب اندر داخل ہوئی۔

''جی، بس یہ چیزیں سمیٹنی ہیں۔'' اس نے بیڈ پر بکھرے عروسی لباس اور زیورات کی طرف اشارہ کرتے
ے جواب دیا۔

''یہ میں سمیٹ لوں گی۔ تم ایسا کرو کہ اچھی طرح منہ دھولو۔ افضل گاڑی نکال رہے ہیں۔ وہ اور آفتاب
ں تمہارے ساتھ جائیں گے۔'' گزرے لمحات کا فسانہ سناتے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے
تاب نے اسے مشورہ دیا اور خود اس کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کشور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ملحقہ غسل خانے
جا کر اچھی طرح منہ دھو آئی۔ منہ دھو لینے کے باوجود اس کے وجود پر کئی ایسی نشانیاں سجی تھیں جو اس کے نئی
ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہاتھ پیر، بالوں کا خوب صورت سا اسٹائل
ا سا بگڑا ضرور تھا لیکن بہرحال قائم تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں چمکتی افشاں اور سب سے بڑھ کر اس کے
سے اُٹھتی خوشبو کی لپٹیں۔ ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ ایک دُلہن ہے۔ مہتاب نے اپنے دل میں
کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ بے رحمانہ اور غیر منصفانہ روّیوں کی شکار اس لڑکی نے اپنے بااختیار و عالی
ت باپ سے چھپ کر اپنے لیے خوشیوں کا ایک چور دروازہ کھولا تھا لیکن اسے خوشی کے بہت ہی مختصر لمحات
آسکے تھے۔

''بھابی! یہ چیزیں آپ کے پاس میری امانت رہیں گی۔ انہیں بہت سنبھال کر رکھئے گا۔ کیونکہ یہ صرف
ی اشیاء نہیں ہیں۔ ان میں میرے جذبات اور زندگی کے انمول لمحوں کی مہک بھی بسی ہوئی ہے۔'' چادر کو
تے تک لا کر اوڑھتے ہوئے اس نے رندھی ہوئی آواز میں مہتاب سے درخواست کی۔

''تم فکر مت کرو۔ تمہاری ہر شے بالکل محفوظ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر عطا کرے اور تمہیں دوبار
ن چیزوں کو برتنا نصیب ہو۔'' مہتاب نے بڑی بہنوں کے انداز میں اسے گلے لگاتے ہوئے دعا دی تو اس کی
آنکھوں سے اور بھی تیزی سے آنسو بہنے لگے۔ بس یہی تو کمی تھی اس کی زندگی میں۔ اس کے خون کے رشتے
ے زندگی کی ہر آسائش فراہم کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن ان کے لبوں پر اس کے لیے ایسی خوش کُن دعائیں
بھی نہیں ہوتی تھیں۔

''چلو باہر چلتے ہیں۔ افضل اور آفتاب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' مہتاب جس کی اپنی آنکھوں میں بھی

آنسو اُمڈ آئے تھے، خود کو سنبھالتے ہوئے بولی اور اسے خود سے الگ کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس
رخساروں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ کشور نے بھی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خود کو تیزی سے سنبھال لیا
چادر کے پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر لینے کے بعد مہتاب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ افضل اور آفتاب
منتظر کھڑے تھے۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' مہتاب نے ان کے نکلنے سے قبل بیویوں والی مخصوص فکرمندی کے ساتھ افضل
تاکید کی۔

''میں تو کہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ہی مت چلو۔ کشور کے ساتھ میرا اکیلے ہی جانا مناسب ہے۔ و
کچھ بھی حالات ہو سکتے ہیں۔'' مہتاب کی فکرمندی دیکھتے ہوئے آفتاب نے افضل سے کہا۔

''اس بات پر ہم پہلے ہی بہت بحث کر چکے ہیں اور میں تمہیں واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ میں ان حالا
میں تمہیں ہرگز بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' افضل نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ آفتا
بے بس سا ہو کر مہتاب کو دیکھنے لگا۔

''افضل ٹھیک کہہ رہے ہیں آفتاب! تم ہمیں بھائیوں کی طرح عزیز ہو۔ ہم تمہیں کسی صورت بھی تنہا
چھوڑ سکتے۔ اگر بچوں کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہی چلتی۔'' وہ جو یہ خیال کر رہا تھا
مہتاب، افضل کے اس کے ساتھ جانے پر متوحش ہے، اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ گوری چٹی، لمبی چو
مہتاب نے اپنے الفاظ سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پہاڑوں میں آباد ایک قبائلی خاندان کا خون ہے۔ ایک ا
خاندان کا جہاں مردوں کی طرح عورتوں کے حوصلے بھی بہت بلند اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ مہتاب پر ا
تشکرانہ سی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ کشور بھی اس کے ساتھ تھی۔

''آپ نے دوبارہ کوٹھی فون کر کے صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟'' گاڑی کو روڈ پر لا
ہوئے افضل نے کشور سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اگر آپ وہاں فون کر لیتیں تو ممکن تھا کہ آپ کو اپنی ملازمہ سے صحیح صورتِ حال معلوم ہو جاتی۔''

''مجھے ڈر تھا کہ فون رانی کے بجائے بھا اشرف سنیں گے اس لیے میں ڈر کر فون نہیں کر سکی۔'' کشور
اپنے کوٹھی فون نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

فون کرنے کے مقابلے میں اس طرح براہِ راست کوٹھی واپس پہنچ جانا زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ ا
بالکل اندھیرے میں ہیں۔ نہیں معلوم کہ وہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔ فون پر بات کر لینے کی صورت م
کچھ تو واضح ہو جائے گا۔'' افضل نے اسے سمجھایا۔

''صورتِ حال جو بھی ہو، مجھے ہر حال میں کوٹھی واپس پہنچنا ہے۔ میرا نہ پہنچنا رانی کی زندگی کو خطرے م
ڈال دے گا۔ میں بدترین حالات میں بھی اسے کسی زیادتی کا نشانہ بننے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ لوگ
سے میری درخواست ہے کہ مجھے کوٹھی کے قریب اتار کر خود واپس چلے جائیے گا۔ آگے جو کچھ پیش آئے گا، ا
سے میں خود نمٹ لوں گی۔''

کشور کا لہجہ اس بار بہت مضبوط تھا لیکن آفتاب کو اس کی بات نے تکلیف پہنچائی۔ کشور کا یہ کہنا کہ آ
لوگ واپس چلے جائیے گا، میں خود نمٹ لوں گی..... اس کو اپنی محبت کی توہین کرنا لگا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ
کشور کو کسی خطرے میں گھرا چھوڑ کر خود واپس آ جاتا؟ اس نے پلٹ کر عقبی سیٹ پر بیٹھی کشور پر ایک شکوہ کنا
نظر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے قبل ہی کشور کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے موبائل ا



ا ں پر نظر ڈالی۔ حسب توقع کوٹھی کا نمبر ہی وہاں جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی لیکن زبان سے کچھ نہ
ں کہا۔ دوسری طرف اشرف شاہ ہی موجود نہ ہو۔

''بی بی! میں رانی بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے رانی نے کال ریسیو کیے جانے کو محسوس کر کے نیچی
آواز میں بتایا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سرگوشی سے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''وہاں کیا حال ہے رانی! تجھے کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟'' رانی کی آواز سن کر کشور نے بے تابی سے
ا۔ افضل اور آفتاب کے کان بھی رانی کا نام سن کر کھڑے ہوئے۔

''زیادہ مشکل نہیں ہوئی بی بی! تاجور بی بی اور اشرف شاہ جی نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا، میں نے
ا کہ آپ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ پر سویرے میں کیا کروں گی جی؟ ابھی تو میں نے دودھ میں تھوڑی
ں کی دوا ملا کر دے دی تھی، وہ لوگ دودھ پی کر سو گئے ہیں۔ آپ بتائیں، آپ کب واپس آئیں گی؟'' رانی
ں آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ اگر کشور کے کوٹھی پر موجود
ہونے کی بات کھل گئی تو سب سے پہلے اسی کی شامت آئے گی۔

''فکر نہ کر رانی! میں کوٹھی واپس آ رہی ہوں۔ راستے میں ہی ہوں۔'' صورتِ حال قابو میں ہے، یہ جان کر
ں نے ایک سکون بھرا سانس لیا اور رانی کو بھی تسلی دی۔

''ٹھیک ہے بی بی! میں آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ آپ دروازے کی گھنٹی مت بجانا۔ میں چھوٹے گیٹ کی
ں اندر سے کھول دوں گی اور خود قریب ہی رہوں گی۔ آپ چپکے سے اندر آ جانا۔'' رانی نے جلدی سے
ا کا منصوبہ ترتیب دیا جس سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی اور متجسس سے بیٹھے آفتاب
ور افضل کو تفصیلات بتانے لگی۔

⊛----✪----⊛

''کشور کہاں ہے رانی؟ اسے کہو کہ وہ بھی آ کر ناشتہ کر لے۔'' رانی اور حاجرہ میز پر ناشتے کے لوازمات سجا
ں تھیں، تب تاجور نے رانی کو یہ حکم دیا۔

''بی بی نے تو سویرے جلدی ناشتہ کر لیا تھا جی۔'' رانی نے اطلاع دی پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے
ا۔ ''اصل میں بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اس لیے میں نے ان کے کمرے میں ہی ناشتہ پہنچا دیا تھا۔''

''چل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی رات جانے کیوں اتنی گہری نیند آئی کہ سویرے جلدی آنکھ نہیں کھل سکی۔ اب
ی طبیعت مندی مندی سی ہے۔ اچھا ہے تُو نے کشور کو ناشتہ کروا دیا۔ بے چاری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کب
ک ہمارا انتظار کرتی؟'' کشور کے کمرے سے باہر نہ آنے پر تاجور دل ہی دل میں بے حد برہم تھی لیکن اشرف
ا کے سامنے اظہار کرنے سے گریز کیا اور فی الحال بہن کی حمایت کرنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسری طرف رانی
ں سے نظریں چرا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تاجور اور اشرف کی صبح جلدی آنکھ کیوں نہیں کھل سکی۔ خود اسی نے تو
ں احتیاط کے پیشِ نظر کہ کہیں کشور کا رات کے آخری پہر کوٹھی واپس آنا کسی کے علم میں نہ آ جائے، ان کی نیند
ے گہرے ہونے کا بندوبست کیا تھا۔ کوٹھی پر موجود دوسرے ملازمین کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح قابو کر چکی تھی۔
ایسے بھی وہ اس معاملے میں زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کشور کے بارے میں کوئی
ایسی ویسی اطلاع سن کر مالکان اس کا جو حشر کرتے سو کرتے لیکن اس سے بھی پہلے اطلاع دینے والا زیرِ عتاب
آ۔ سو انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

ناشتے کا مرحلہ خاموشی سے تمام ہوا۔ تاجور اور اشرف شاہ، کشور کے خود کو نظر انداز کرنے پر کبیدۂ خاطر
تو رانی اور حاجرہ اندرونی خوف کے زیر اثر تھیں۔ ویسے بھی وہ خادمائیں تھیں جنہیں مالکان کے خود سے مخا
کیے بغیر کم ہی زبان کھولنے کی جرأت ہو پاتی تھی۔ ناشتے کی میز پر اگر رونق تھی تو وہ ننھے منے منور کی وجہ
وہی تھا جو چھوٹی موٹی فرمائشیں کرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ سے بات چیت کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا

''میں ذرا کشور کی طبیعت پوچھ آؤں۔'' ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تاجور نے اپنی کرسی چھوڑتے ہو
اشرف شاہ سے کہا۔

''جلدی آنا۔ پندرہ منٹ میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے حکم دیا۔ تا
اثبات میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ منور بھی ماں کے ساتھ ہولیا۔

''بڑے نخرے ہو گئے ہیں تیرے کشور! یہ نہیں کہ آ کر بڑے بہنوئی کو سلام کر جاتی۔ اب وہ واپس گاؤ
کر مہینے بھر تک اسی بات کا طعنہ دیتا رہے گا کہ تیری بہن مجھے سلام تک کرنے نہیں آئی۔'' کشور کے کمرے
داخل ہوتے ہی تاجور نے اتنی دیر سے ضبط کیے غصے کا اظہار شروع کر دیا۔ کشور جواباً کچھ نہیں بولی اور اسی
بیڈ پر نیم دراز حالت میں بیٹھی رہی جس طرح تاجور کے کمرے میں آنے سے قبل بیٹھی تھی۔ فرق صرف ا
کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف متوجہ تھی اور اب تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آہا..... کشور خالہ نے کتنی پیاری مہندی لگائی ہے۔'' کشور کے پیر تو اس چادر کے نیچے چھپے ہوئے
اس نے پیروں سے لے کر سینے تک اوڑھ رکھی تھی لیکن کتاب کو گرفت میں لیے ہوئے ہاتھ واضح تھے۔ تا
غصے میں ہونے کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہیں ہو سکی تھی لیکن منور نہ صرف خود متوجہ ہوا تھا بلکہ ماں کی تو
مبذول کروا دی تھی۔

''خالہ تو دُلہن لگ رہی ہیں۔'' تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا، دو دن قبل پارلر سے کر
گئی فیس سروسز اور اندرونی خوشی کی چمک..... یہ سب چیزیں مل کر کشور کو ایسا روپ بخش گئی تھیں کہ معصوم بچ
ساختہ ہی ذہن میں اُبھرنے والے تاثر کا زبان سے اظہار کر گیا۔ اس کی بات سن کر جہاں کشور گھبرائی، و
تاجور بھی ٹھٹک گئی۔

''یہ سب کیا ہے کشور؟'' وہ جو گلہ کرنے آئی تھی، اسے بھول کر کشور کے چہرے اور ہاتھوں کی طرف ا
کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ایسے ہی آپا! بس جی چاہ رہا تھا۔'' کشور نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''پر تجھے تو یہ سب اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ تُو تو کبھی مہندی لگانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھ
مجھے کوئی ارمان نہیں ہے۔'' تاجور اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور جرح کرنے لگی۔

''کہنے سے کیا ہوتا ہے آپا! ہوں تو آخر میں بھی ایک جیتی جاگتی لڑکی۔ بندہ خود پر، اپنے ارمانوں پ
باندھ کر ہر خواہش سے دست برداری اختیار کر لے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اندر سرے سے کوئی خوا
موجود ہی نہیں۔ خواہش اور احتیاج کو کتنا ہی کچلو، یہ سر اٹھانے سے باز نہیں آتیں، اپنی تکمیل کے لیے کوئی
راہ نکال ہی لیتی ہیں۔ اب چاہے یہ راہ کوئی چور دروازہ کھول کر ہی نکالی جائے۔''

یاسیت سے یہ سب کہتی کشور کی باتوں کا کیا پس منظر ہے، تاجور نہیں جانتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ا
ایک جائز حق کو چور راستے سے حاصل کر لینے والی کشور پر کیا بیت رہی ہے۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی
میں ارمان تھا کہ اس کی بارات پوری شان سے اس کے باپ کی چوکھٹ تک آئے۔ وہ سکھیوں کی چھیڑ چ



ماں کے پیار اور ماں باپ کی دعاؤں کے جلو میں اپنے پیا کے نگر جائے۔ لیکن زر و دولت کے پجاری اس کے
باپ نے اس پر خوشی کا ہر در بند کر دیا تھا۔ وہ جو اپنی سیج پر ہر رات ایک نئی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا، بیٹی کو اس کا
جائز حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تاجور بی بی! آپ کو چودھری اشرف شاہ بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں جلدی کریں، انہیں دیر ہو رہی ہے۔''
ایک پریشان سی تاجور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی، اس سے قبل ہی رانی کمرے میں چلی آئی اور اسے اشرف
کا پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کو سن کر تاجور کمرے سے باہر نکل گئی۔ البتہ اس نے رانی کو اپنے ساتھ آنے کا
اشارہ کر دیا تھا۔

''یہ کشور کو کیا ہوا ہے رانی! بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔'' باہر نکلتے ہی اس نے رانی سے پوچھا۔

''میں کیا کہوں بی بی! چھوٹا منہ بڑی بات والی گل ہو جائے گی۔ پر سچ تو یہی ہے کہ کشور بی بی کی طبیعت
ٹھیک نہیں ہے۔ لگتا ہے دماغ پر کچھ اثر ہوا ہے۔ میں نے اپنی اماں سے سنا ہے کہ جن لڑکیوں کی وقت پر شادی
نہ ہو ان کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ کشور بی بی جانے کب سے اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں۔ اب پھٹی ہیں تو یہ
حال ہو گیا ہے۔'' رانی اور کشور میں رات ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ تاجور کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ ظاہر ہے
اس نے کشور کا حلیہ پوشیدہ رکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ اور بجائے یہ کہ اس کا ذہن کسی خاص رخ پر سوچے، اس کو بھٹکا
کر اپنی مرضی کے رخ پر سوچنے پر مجبور کر دینے میں ہی بہتری تھی۔

''ہائے میرے ربا! یہ گل ہے۔ مجھے مالوم تو ہوا تھا کہ کشور کا دماغ کچھ چل گیا ہے۔ ایک دن ابا جی کے
سامنے بھی تو تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔'' رانی کی بات سن کر تاجور کو یاد آیا تو بولی۔ کشور کے کمرے سے نکل کر وہ
اماں بے حد سست قدموں سے چلتی اس کمرے کی طرف جا رہی تھیں جس میں رات تاجور اور اشرف شاہ
ٹھہرے تھے۔ منور ان سے پہلے ہی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ چکا تھا۔

''آپ کو ٹھیک مالوم ہوا تھا بی بی! وڈے چودھری صاحب نے غصے میں ہی تو کشور بی بی کو حویلی سے ادھر
بھیجا تھا کہ شہر میں ان کا علاج ہو سکے۔'' رانی نے اس کے خیال کو مزید تقویت دی۔

''خیر دکھایا کسی ڈاکٹر کو؟'' تاجور نے پوچھا جس کے جواب میں رانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دکھائے گا بھی کون؟ ادھر نوکروں کے اوپر اسے چھوڑ کر سارے اُدھر حویلی میں بیٹھے ہیں۔ میں واپس جا
کر اماں کو کہتی ہوں کہ چھوٹی اماں کو بھیجیں ادھر۔ ابا جی تو سنا ہے امریکہ جانے والے ہیں۔ چھوٹی اماں ہی آ کر
حویلی کو سنبھالیں گی۔ کڑی کو ایسے آزاد چھوڑ کر ہم ساروں کو اپنی ناکیں تھوڑی کٹوانی ہیں۔'' اپنے لیے مخصوص
کمرے کے دروازے تک پہنچنے کے لیے تاجور نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ سنایا اور اندر داخل ہو گئی۔ رانی
اس سے بند ہو جانے والے دروازے کو تکتی رہی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا وقت کشور کے لیے کوئی
خوشی لائے گا یا وہ مزید حالات کے گرداب میں پھنستی چلی جائے گی۔

⊛----✪----⊛

''ماہ بانو بہن! یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ہے۔'' وہ اپنے کپڑے رکھ کر بیگ کی زِپ بند کر رہی تھی
کہ گل بینا کمرے میں چلی آئی اور اپنی مٹھی میں دبی کوئی شے اس کی طرف بڑھائی۔

''دکھاؤ تو کیا ہے؟'' ماہ بانو نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔ آج وہ لوگ ہوشے
واپس کاندے جانے والے تھے اور وہ اسی سلسلے میں اپنی تیاری میں مصروف تھی۔

''یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔'' شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گل مینا نے اپنی مٹھی
شے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھی۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ پتھر کی بنی ہوئی ایک بھدی سی انگوٹھی ہے۔

''شکریہ گل مینا! یہ تو بہت پیاری ہے۔'' ماہ بانو نے فوراً وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی
بھدی اور بے کشش تھی لیکن جس خلوص سے اسے دی گئی تھی، اس نے اسے بہت خوب صورت بنا دیا تھا
کے منہ سے انگوٹھی کی تعریف سن کر گل مینا کا چہرہ چمک اٹھا۔

''یہ بہت خاص انگوٹھی ہے۔ زہر موہرا پتھر سے بنا ہے۔ ہمارا بھائی شگر کی وادی سے خود زہر موہرا
لایا تھا اور ہمیں یہ انگوٹھی بنا کر دیا تھا۔ یہاں لوگ زہر موہرا کے نام سے بہت چیزیں بیچتا ہے، پر وہ
نہیں ہوتا۔ زہر موہرا کوئی اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ یہ پتھر بہت بلند علاقے میں ملتا ہے اور بہت کم
معلوم ہوتا ہے کہ کس پہاڑ کے نیچے زہر موہرا ملے گا۔ ہمارے بھائی کو تو اس کے ایک دوست کے وجہ
معلوم ہو گیا تھا۔ ورنہ جن لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر کدھر ملے گا، وہ دوسروں کو بتاتا نہیں ہے۔'' ما
تعریف سے حوصلہ پا کر گل مینا اسے جوش و خروش سے بتانے لگی۔

''ایسی کیا خاص بات ہے اس پتھر میں؟'' ماہ بانو نے تجسس سے پوچھا۔

''اس پتھر میں زہر کو جذب کر لینے کا صلاحیت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بادشاہ لوگ اس پتھر سے
برتن بنواتے تھے تا کہ اگر کوئی دھوکے سے ان کے کھانے میں زہر ملا دے تو سارا زہر برتن میں ہی جذ
جائے اور بادشاہ کی جان بچ جائے۔'' گل مینا نے بتایا۔

''پھر تو یہ واقعی بڑے کام کی چیز ہوئی۔ میں ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھوں گی تا کہ کبھی ضرورت پڑ
آئے۔ ویسے کام کی چیز نہیں بھی ہوتی تو بھی تمہارا تحفہ ہونے کی وجہ سے تو مجھے اسے سنبھال کر ہی رکھنا
اتنی پیاری لڑکی ہو، تم سے یہ ملاقات تو مجھے ویسے بھی ساری زندگی یاد رہے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ
بھی تم سے ملنے آ سکوں۔ بلکہ ایسا کرتی ہوں کہ بھائی اکرم کی ماں سے بات کرتی ہوں کہ تمہاری اور ا
جلدی سے شادی کر دے۔ شادی کے بعد تم وہاں کاندے آ جاؤ گی۔ پھر جب تک میں کاندے میں ہوا
دونوں مزے سے رہیں گے۔'' ماہ بانو کو اچانک ہی آئیڈیا سوجھا اور وہ آگے کا منصوبہ ترتیب دینے لگی جسے
گل مینا کا چہرہ گل گوں ہوں گیا۔ سرخ چہرے کے ساتھ اس طرح شرماتی ہوئی وہ بے حد پیاری لگ رہ
ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

''تم تو سچ مچ بڑی پیاری ہو۔''

''تم ایسے ہی ہمیں بناتا ہے۔'' گل مینا اس کی بات سن کر جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بالکل نہیں بناتا۔ اگر کہو تو اکرم خان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اسے مزید چھیڑ

''مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟'' اچانک ہی دروازے کی طرف سے اکرم خان کی آواز سنائی دی۔

''ماہ بانو بہن پوچھ رہا تھا کہ کب تک واپس جائے گا؟'' ماہ بانو سے الگ ہوتے ہوئے گل مینا نے
سے بات بنائی۔ اُس کے اس طرح بات بنانے پر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تاہم اس نے
کی کوشش نہیں کی۔

''میں یہی بتانے آیا تھا کہ جیپ آ گیا ہے۔ اگر تیاری پورا ہے تو چل کر جیپ میں بیٹھ جاؤ۔'' اکرم
نے جواب دیا۔

''تیاری تو ہو گئی ہے بھائی اکرم! تم میرا یہ بیگ جیپ میں رکھو، میں سب گھر والوں سے مل کر ابھی



''ا ا ا لے جواب دیا تو اکرم خان، گل مینا پر ایک بھرپور نظر ڈال کر حسب ہدایت بیگ لے کر باہر نکل
لے باہر نکلتے ہی وہ دونوں بھی کمرے سے باہر آ گئیں۔ اکرم خان کی ماں اپنے عزیزوں سے رخصت
ماہ بانو بھی ان سب سے ملنے لگی۔ پھر وہ اور اکرم خان کی ماں گھر سے باہر نکل گئیں۔ اکرم خان
والی سیٹ پر بیٹھا ان کا منتظر تھا۔ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ عقبی حصے میں ان کے
وہ سامان بھی رکھا تھا جس کا تعلق یقیناً کسی نہ کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم سے ہی ہوگا۔ ان کے بیٹھتے
ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

ا ا ا لے پیچھے مڑ کر دروازے کے باہر آ کھڑے ہونے والے اپنے میزبانوں کی طرف دیکھتے ہوئے
ا ا ا والے گل مینا کے تقریباً سب ہی لوگ اس کی توجہ متوجہ تھے۔ گل مینا بھی لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی جیپ کی
رہی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز اکرم خان تھا جس کو رخصت کرتے ہوئے جدائی کے پہلے ہی لمحے
ی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جل گئے تھے۔ ماہ بانو کو اکرم خان پر رشک آیا۔ وہ کتنا خوش قسمت
کہ کسی کی آنکھوں میں اس کے لیے انتظار کے دیپ جلتے تھے۔ دوسری طرف وہ خود تھی جو اس کے
میں سفر کرنے کے باوجود اس جیسی قسمت نہیں رکھتی تھی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس کے لیے
کی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلتے ہوں گے وہ تو وہ حرماں نصیب تھی جسے وقت کے طوفانوں نے
سے جدا کر کے اس اجنبی علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ حالات کے اس گرداب
گی اور نکل بھی سکے گی یا نہیں؟

ا ا ا خیالات اور اُداسیوں میں گھرے ہونے کے باعث اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کب
باہر نکل آئے۔ اس کے علاوہ جیپ میں موجود باقی تین نفوس بھی بالکل خاموش تھے۔ اس کے ساتھ
اکرم خان کی ماں اونگھ رہی تھی۔ خود اکرم خان بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ
کے بجائے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے موجود گل مینا کے تصور میں گم ہے۔ جیپ ڈرائیور یقیناً مزاجاً کم گو
اپنے ہم سفروں کی خاموشی میں مخل ہونے کو مناسب نہ جانتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا
ذہن میں موجود مایوس کن سوچوں کو جھٹکتی ہوئی بیرونی مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیپ گرد اُڑاتی
بڑی بڑی چٹانوں والے ایک نہایت خشک صحرائی علاقے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس علاقے میں
تعمیر کردہ چند گھر موجود تھے۔ ماہ بانو کو یاد آیا، ہوشے جاتے ہوئے اکرم خان نے اس علاقے کو
اس تھنگ'' کے نام سے متعارف کروایا تھا۔ وہی کینڈ اس تھنگ جہاں کاندے کے سیلاب زدگان نے
نئے گھر بنائے تھے۔ چٹانوں کو توڑ توڑ کر بنائے گئے ان گھروں کے مکین اس علاقے میں پانی جیسی
حرارت سے محروم تھے مگر وہ یہاں رہنے پر مجبور تھے۔

ان لوگوں کے حالات پر دکھ محسوس کرتے ہوئے وہ اتنی بری طرح ان کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ
اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں کھڑی جیپ کب حرکت میں آئی اور دندناتی ہوئی ان
راہوں پر آ پہنچی۔ اس جیپ کے اچانک سامنے آ جانے کے باعث ان کی جیپ کے ڈرائیور نے ایمرجنسی
لگائے جس کے نتیجے میں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لوگ جھٹکے سے سنبھلے تو چار عدد مسلح افراد ان کی جیپ کو
چکے تھے۔

''کون لوگ ہے تم؟'' اکرم خان ذرا سا سنبھلا تو اپنی جانب کھڑے ہوئے مسلح نقاب پوش سے بلند آواز
میں بولا اور جیپ سے اُترنے کی کوشش کی۔ نقاب پوش نے اپنی رائفل کی نال اس کی گردن پر رکھتے ہوئے

اسے اس کوشش سے باز رکھا۔ اکرم خان کو رائفل کے زور پر قابو رکھنے والے نقاب پوش کے علاوہ نقاب پوشوں نے جیپ کا ایک ایک دروازہ سنبھال رکھا تھا لیکن ابھی تک ان تینوں کو کسی حرکت کی ضر نہیں آئی تھی۔ جیپ ڈرائیور نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں گھیرنے والوں نے جس کسی مقصد سے ہے اس کا تعلق بہرحال اس کی ذات سے نہیں ہے۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں جیپ چلا رہا تھا او کسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اب جو صورت پیش آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور و اس کے بجائے اس کی جیپ میں سوار دیگر افراد ہیں۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھنے میں ا جانی تھی یا پھر شاید وہ صورتِ حال کے واضح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بہرحال، جو بھی بات تھی، اس سے مکمل خاموشی تھی۔ اکرم خان کی ماں بے حد گھبرا جانے کے باعث کچھ کہنے یا کرنے کے لائق نہیں جبکہ ماہ بانو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ کیا شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب ہوئے چودھری کے کارندوں نے اس جگہ بھی اس کی بُو پالی ہے اور اب اسے دبوچ کر اپنے مالک کے میں پہنچانے والے ہیں؟

''لڑکی کو نیچے اتارو۔'' اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نال لگائے کھڑے شخص نے حکم صادر کیا میں سرسراتے اس خدشے کی تصدیق ہوگئی کہ یوں اس ویرانے میں انہیں گھیرنے والے ماہ بانو کے ہی د جو ایک بار پھر اس کی زندگی کا سکون درہم برہم کر دینے کے درپے ہیں۔

''نیچے اُترو لڑکی!'' حکم ملتے ہی ماہ بانو والی جانب کھڑا نقاب پوش اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہو اور پھر اپنے کہے جملے کا ردِعمل ظاہر ہونے سے قبل خود ہی ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جیپ سے باہر کھینچا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم نے ہاتھ کیسے لگایا لڑکی کو؟'' اپنی گردن سے لگی رائفل کی نال کو خاطر میں نہ ہوئے اکرم خان بھڑکا۔ عورت کا احترام یوں بھی اس کی گھٹی میں پڑا تھا اور ماہ بانو تو تھی بھی اس کی مہمان پناہ کے لیے ہی اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کسی بدسلوکی پر اس کا بھڑکنا لازم تھا۔ ماہ بانو چ پوش کے خود کو کھینچنے کی وجہ سے جیپ سے باہر پہنچ گئی تھی، اکرم خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا چہرہ شد کے باعث تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی اُتر آئی تھی۔ اس حالت میں وہ مشابرم خان سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ سگے بھائی ہونے کی وجہ سے یوں بھی ان کی شکلوں میں تھوڑی سی مشابہت تھی اور اب کیفیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ پُرجوش و مہم جو مشابرم خان سے مشابہ لگ رہا تھا۔

''آرام سے بیٹھو۔ زیادہ جوش دکھایا تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نا کر کھڑے نقاب پوش نے نال سے ہی اس کے جبڑے پر زوردار ضرب لگائی لیکن اب اکرم خان بری بھپر چکا تھا۔ اس نے جبڑے کی چوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے رائفل کی نال کو پکڑ کر سے دھکا دیا۔ رائفل بردار اس جھٹکے سے پیچھے کی طرف لڑھکا۔ اکرم خان دندناتا ہوا جیپ سے نیچے اُترا اور گرے ہوئے شخص کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ عالمِ جوش میں تھا اور اس حقیقت کو فراموش کر چکا تھا کہ کے مقابل صرف یہی ایک شخص نہیں ہے جسے زیر کر کے وہ حالات پر قابو پا سکتا ہے۔ وہاں تین مسلح افراد او موجود تھے۔ اکرم خان کی زورآوری دیکھتے ہوئے اس کی ماں کو کور کیے کھڑے نقاب پوش نے اپنی رائفل س کی اور پھر دھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ اکرم خان لہراتا ہوا نیچے آگرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے پہلو سے خون بہت تیزی سے اس کے کپڑوں کو گل رنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران خوف زدہ سی کھولے بیٹھی اس کی ماں نے یہ منظر دیکھ کر ایک دل دوز چیخ ماری اور جیپ سے اُتر کر اس کی طرف دوڑ



ہاں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ماہ بانو اور جیپ کا ڈرائیور بھی یہ سب دیکھ رہے ا ور نے شروع سے ہی ایسا طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی جھگڑے میں پڑنے ارادہ نہیں ہے۔ اور اب جو کچھ وہاں ہوا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ل بھی کرتا کہ مبادا کسی مشکل میں پڑ جائے۔ ماہ بانو خود کو جیپ سے اُتارنے والے نقاب پوش کی میں جکڑی شاک کے سے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اکرم خان جس کے گھر میں وہ پناہ گزین تھی، ا کر گل مینا کے دروازے تک لے جانے کا وہ اس سے وعدہ کر کے آئی تھی، جسے اس کی ماں صرف بلند و بالا پہاڑوں کا سفر نہیں کرنے دیتی تھی کہ کہیں پہاڑ اُس کے ایک اور پیارے کو نہ نگل لے، اپنے میں نہایا خشک زمین پر پڑا تھا۔ پیاسی زمین اس کے جوان خون سے سیراب ہو رہی تھی جبکہ غم سے حال گرلاتی ماں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس طرح اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا جیسے فرشتۂ ل سے اسے چھپا لینا چاہتی ہو۔ ماہ بانو پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ آج پھر ایک انسانی اس پر قربان ہوئی تھی۔ آج پھر کوئی اسے بچانے کے لیے اپنے خون میں نہا گیا تھا۔ آج پھر اس کے اب میں پھنسے وجود کو گرداب سے نکالنے کی کوشش کرنے والا خود اس گرداب کا شکار ہو گیا تھا۔

''لڑکی کو جیپ میں بٹھاؤ۔'' اکرم خان کے دھکے سے نیچے گرنے والا نقاب پوش جو یقیناً ان حملہ آوروں کا ا تھا، کب کا سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے وہاں بپا قیامت پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور ماہ بانو کے عقب اسے جکڑے کھڑے شخص کو حکم دیا۔ وہ شخص حکم کی تعمیل میں اسے کھینچتا ہوا اپنی جیپ کی طرف لے گیا۔ ماہ بانو صدمے سے ساکت ہو جانے والے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں کو حرکت دے سکتی۔ اس ا طاقت بھی نہیں تھی کہ اپنے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر مزاحمت کر پاتی۔ وہ کاٹھ کی کسی گڑیا کی ح طرح کھینچنے والے کے ساتھ کھنچتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد اس کی ناک پر ا فارم میں ڈوبا ہوا رومال رکھا، تب بھی اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے بے ہوشی کے اندھیروں میں اُتر گئی۔ ان اندھیروں میں سفر کرتے اسے علم نہیں تھا کہ کچھ دیر قبل وہ جس جیپ میں سفر کر رہی تھی، اس کے چاروں ٹائرز رائفل کی گولیوں سے ناکارہ کر دیئے گئے ہیں اور اب وہ اپنے دوستوں کے بجائے ا ہلوں کی ہم رکابی میں ایک انجان و اجنبی دنیا میں لے جائی جا رہی ہے۔

⊛----✪----⊛

''رانی! ذرا ایک کپ گرما گرم چائے تو لے آ۔'' گیلے چہرے کو تولیے سے تھپتھپا کر صاف کرتے ہوئے شور نے حکم دیا۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ رات کے آخری پہر کوٹھی واپس لوٹنے کے بعد باقی کا وقت نہا ھو کر اپنا حلیہ درست کرنے اور رانی سے مشاورت میں گزرا تھا۔ تاجور کی کوٹھی میں موجودگی اس کے لیے اتنی اعصابی کشیدگی کا باعث تھی کہ جو تھوڑا بہت وقت بچا، اس میں بھی نیند نہیں آسکی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اشرف شاہ جلدی میں تھا، اس لیے تاجور کو زیادہ دیر وہاں رکنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے حد ذہنی سکون محسوس کیا اور لمبی تان کر سو گئی۔ رت جگے اور اعصابی کشیدگی کے بعد آنے والی یہ نیند کافی گہری تھی اور وہ کئی گھنٹوں بعد دوبارہ جاگی تھی۔ جاگنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اب بھی کچھ کچھ نیند کے خمار میں ڈوبے ذہن کو فریش کرنے کے لیے چائے پینے کی فرمائش کی۔

''آپ کہیں تو کھانا لگوا دوں بی بی! آپ نے صبح بھی بہت تھوڑا سا ناشتہ کیا تھا۔ اب تو دوپہر کے کھانے

کا وقت ہو گیا ہے۔ خالی پیٹ چائے پینے کے بجائے اگر پہلے کچھ کھا لیتیں تو اچھا ہوتا۔'' ہر دم اس
کے لیے فکرمند رہنے والی رانی نے مشورہ دیا تو وہ مسکرا دی۔ واقعی صبح رانی کے بے حد اصرار کے باوجود
کپ چائے کے ساتھ ایک سلائس کے سوا کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ رات افضل کی بیوی مہتاب نے کھانا
خاصا اہتمام کیا تھا لیکن وہ بے حد اہتمام سے تیار کیا گیا کھانا جذبات کی شوریدہ سری کے باعث اس
آفتاب کی بہت زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروا سکا تھا۔ ان دونوں ہی نے بہت کم کھانا کھایا
اصولاً اسے اس وقت بھوک لگنی چاہیے تھی اور لگ بھی رہی تھی۔ پھر بھی وہ رانی کو ٹال گئی۔

''ابھی تو تم چائے لے آؤ۔ کھانے کا میں تمہیں بعد میں بتاتی ہوں۔'' وہ اپنا پرس کھول کر موبائل
کرنے لگی۔ کوٹھی میں داخل ہوتے وقت اس نے موبائل آف کر دیا تھا جواب تک بند ہی تھا۔ موبائل
پاس موجودگی کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ عموماً اسے بند ہی رکھتی تھی کہ مبادا اچانک کسی کی
میں گھنٹی بج اُٹھے اور اس کا راز فاش ہو جائے۔ موبائل پرس سے نکال کر آن کرنے کے بعد اس نے آ
نمبر ملایا۔ پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں تھیں آپ؟ میں کب سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔'' فوراً ہی دوسری طرف سے
کی خفا سی آواز سنائی دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکی ہے۔ پہلے حا
اپنے کنٹرول میں لینے کے چکر میں اُلجھے ہونے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا کہ آفتاب کو کال کر
بعد میں ریلیکس ہونے کے بعد اسے نیند نے دبوچ لیا۔ وہ بے چارہ رات سے اب تک یقیناً اس کی طرف
کال کیے جانے کے انتظار میں بیٹھا خوار ہو رہا تھا۔

''سوری آفتاب! میں آپ کو کال بھی نہیں کر سکی۔ پہلے آپا کی موجودگی کی وجہ سے اتنی ٹینشن تھی، پھ
سو گئی۔ ابھی ابھی اُٹھی ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔'' اس نے نہایت شرمندگی کے عالم میں
کا اعتراف کیا۔

''کیا کہنے ہیں آپ کی بے نیازی کے۔ شاید اللہ نے عورتوں کو دنیا میں بھیجا ہی اس لیے ہے
بے چارے شریف مردوں کو خوار کر سکیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''میں نے آپ سے سوری تو کہا ہے۔ بس غلطی ہو گئی، اب کیا کان پکڑوں، تب معاف کریں گے؟''
نے فوراً ناز و ادا کا ہتھیار سنبھال لیا۔ اسی وقت رانی ٹرے میں چائے رکھے اندر داخل ہوئی اور اس کے اشا
پر ٹرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر نکل گئی۔ کشور نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ ٹرے، چائے کی پیالی
علاوہ اور بھی بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی ہے۔ ان لوازمات میں نمکین بسکٹ، شامی کباب اور سینڈ
نمایاں تھے۔

''کان پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ پکڑنا ہی ہے تو ہمارے پاس آ کر ہمارا ہاتھ پکڑیں
اس بار آفتاب کا لہجہ خاصا شوخ تھا۔

''اچھی فرمائش کی ہے۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ ہم جیتے ہیں کہ مرتے ہیں..
بس فوراً اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور ٹرے میں سے چائے کی
اٹھا کر اس کا ایک گھونٹ بھرا۔

''اجی ایسے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ رات سے آپ کی کوٹھی کے باہر میرے یار نے پہرہ بٹھایا ہوا تھا۔ سب
معلوم ہے کہ آپ کے بہن بہنوئی اپنے سپوت کے ساتھ صبح کتنے بج کر کتنے منٹ پر روانہ ہوئے تھے۔ باقی کی



ت اس کے فون پر کال کر کے ان خاتون سے حاصل کر لیں جن کا نام تو رانی ہے لیکن فرائض وہ آپ کی
ا انجام دیتی ہیں۔ ویسے آپ کی کیا بات ہیں۔ آپ چاہیں تو سچ مچ کے رانی راجاؤں کو اپنی خدمت پر
ا اس۔ وہ بے چاری تو خیر سے ہے ہی صرف نام کی رانی۔'' آفتاب آج اپنے مزاج کے برخلاف
ا شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ہر انسان کے اندر چاہے وہ کتنا ہی سنجیدہ و بردبار ہو، ایک شوخ و شنگ اور شریر سا گوشہ ہوتا ہے۔ لیکن
اس کسی کو ہی اس تک رسائی حاصل کرنے دیتے ہیں۔ کشور، آفتاب کے مسندِ دل پر براجمان تھی اور
ت کرتی تھی۔ اس سے بھلا وہ اپنی ذات کا کوئی گوشہ کیونکر پوشیدہ رکھتا؟ کشور بے ساختہ ہی اس کی
ہنسی چلی گئی پھر بولی۔

''کھاری ہیں نا..... لفظوں سے کھیلنا آپ سے بڑھ کر بھلا کس کو آ سکتا ہے؟''

''لفظوں کے کھلونوں سے بہت کھیل چکے۔ اب تو بس آپ کی زلفوں سے کھیلنا چاہتے ہیں۔'' اسے واقعی
اس کا استعمال خوب آتا تھا۔ کشور کے جملے سے لفظ پکڑتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کہہ گیا۔

''میں کوشش کرتی ہوں آفتاب! سچ پوچھیں تو میں بھی آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتی
ہوں کہ ہر دم، ہر پل آپ کے پاس رہوں لیکن حالات آپ کے سامنے ہی ہیں۔ میری بہت زیادہ
ا آپ کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن سکتی ہے۔ رات میں نے حالات سنبھال لیے تھے۔ ملازمین
کسی نہ کسی طرح خاموش رکھنے میں کامیاب رہی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کب ابا جی کا
جائے۔ ان ملازمین کو جُل دے کر ہی مجھے آپ تک پہنچنا ہو گا۔'' کشور نے سنجیدگی اختیار کرتے
اس کو حالات سے آگاہ کیا۔

''میں آپ کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور آپ کو بہت زیادہ مشکل میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس
فرمائش اس لیے کی ہے کہ آج رات مجھے پیر آباد واپس جانا ہے۔ دوبارہ چھٹی کے دن سے پہلے لاہور
سکوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ پیر آباد کا اسکول میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے اور میں اس سے غیر حاضر
نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لوں ورنہ ہم دونوں کو
رہے گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دن کے وقت کوٹھی سے نکلنے میں آپ کو بہت زیادہ مشکل پیش نہیں
گی۔'' جواباً آفتاب نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد فون کر کے آپ کو آگے کا پروگرام بتاتی ہوں۔ آپ مہتاب بھابی سے
کہ کھانا تیار رکھیں۔ میں نے رات سے اب تک کچھ نہیں کھایا۔'' اس نے شعوری طور پر اپنے لہجے میں
ہلکی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا۔ چلیں، آپ آ جائیں تو ساتھ مل کر ہی کھائیں گے۔'' آفتاب نے بھی
ہلکے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد کشور سوچ میں پڑ گئی۔ کوٹھی سے باہر نکل کر
جانے کے لیے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی کون سی جگہ جائے جہاں چند گھنٹے
لگانے کا بہانہ بنا کر ڈرائیور کو واپس بھیجا جا سکے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک جگہ اس کے ذہن میں آ گئی۔
اس دوران پیالی میں بچ جانے والی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پیالی ٹرے میں واپس رکھ کر اس نے رانی کو
کمرے میں بلایا۔

''آپ نے تو کچھ نہیں کھایا بی بی! چائے بھی آدھی چھوڑ دی۔'' رانی نے اس سے شکوہ کیا۔

''کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر بعد میں بڑا مزیدار سا کھانا کھانے والی ہوں۔ تم ذرا میرا وہ فیروزی تو نکال دو جو میں دو دن پہلے خرید کر لائی تھی۔ اور ہاں، ڈرائیور سے بھی کہہ دینا کہ گاڑی تیار رکھے۔ دیر میں سینٹرل لائبریری تک چلیں گے۔'' کشور نے احکامات جاری کیے جنہیں سن کر رانی کو اندازہ ہو ایک بار پھر آفتاب سے ملنے جانے والی ہے۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ مالکن کو روک بھی تھی۔ لیکن کل جو کچھ پیش آیا تھا، اس کے بعد فوری طور پر یہ دوسرا خطرہ مول لینا بھی مناسب نہیں لگ

''بس آج کی بات ہے رانی! پھر ہفتے بھر تک میں کوٹھی سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔'' کشور تذبذب بھانپ کر خود ہی اسے تسلی دی تو وہ احکامات پر عمل کرنے کے لیے متحرک ہوگئی۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ لائبریری کی طرف جا رہی تھیں۔

''لائبریری پانچ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ ہم اس وقت تک اندر ہی رہیں گے۔ تم چاہو تو واپس باہر ہی رُکے ہو۔ میری طرف سے پانچ بجے تک تم آزاد ہو۔'' لائبریری کے سامنے اُترنے سے قبل ڈرائیور سے کہا۔ اس بار اسے شک میں پڑنے سے بچانے کے لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔

''میں یہیں رک کر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا بی بی!'' ڈرائیور نے اپنا فیصلہ سنایا جس پر کوئی ظاہر کیے بغیر وہ رانی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ سکیورٹی کے نقطۂ نظر سے چند لوگوں کے علاوہ دگا گاڑی لائبریری کی عمارت کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ وہ دونوں لائبریری کے احا پہنچیں تو افضل کی گاڑی کو وہاں کھڑے دیکھ کر کشور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آفتاب اور افضل پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ افضل چونکہ لاہور میں رہ کر اس میدان میں زیادہ سرگرمِ عمل تھا، اس کے تعلقات بھی زیادہ تھے۔ اس کے تعلقات کا ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے آفتاب اس کی گاڑی کو لائبر احاطے کے اندر لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

''تم جا کر پانچ بجے تک مزے سے اپنی پسند کی کتابیں پڑھو۔ ہم اتنی دیر میں زندگی کو پڑھ کر آتے رانی کو اشارے سے لائبریری کی مرکزی عمارت کا دروازہ دکھاتے ہوئے وہ خود گاڑی میں منتظر بیٹھے آ طرف بڑھ گئی۔ وہ اُس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی کار کا دروازہ کھول چکا تھا۔

''کیا قسمت ہے افضل کی گاڑی اور اس کے گھر کی..... جہاں آپ قدم رنجہ فرماتی ہیں۔'' اس سیٹ پر بیٹھتے ہی آفتاب نے سرد سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی اور گھر تو آپ کے دم سے اہم ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم آئے ہیں۔'' اس نے دل رُبا میں جواب دیا تو آفتاب مسکرا دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے لائبریری سے باہر نکالی۔ لائبریری کے مین گیٹ باہر عام پبلک کے لیے مختص پارکنگ ایریا میں گاڑی سے ٹیک لگائے کشور کا ڈرائیور گمان بھی نہیں کر سکتا ابھی جو گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی ہے، اس میں اس کی مالک سوار ہے۔ احتیاط کے پیشِ نظر کشور نے اپنے چہرے کو چادر کے پلّو کی مدد سے مزید چھپا لیا تھا۔

''آپ کے دوست اور ان کی بیگم پتہ نہیں میرے بارے میں کیا گمان کرتے ہوں گے۔ اس طرح چھپے نکاح کرنے اور ملنے ملانے والی لڑکیوں کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ایسی ہر لڑکی کو کر پھ جاتا ہے۔'' گاڑی ذرا آگے بڑھی تو کشور نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے اندیشے کو آفتاب سے شیئر کیا۔

''کل آپ کو ان دونوں کے رویے میں ایسی کوئی بات نظر آئی تھی جو آپ یہ سوچ رہی ہیں؟'' آفتاب پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ ڈرائیونگ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے



''نہیں۔ لیکن شاید ایسا تو انہوں نے آپ سے دوستی کے احترام میں کیا ہو دل میں تو وہ کچھ بھی سوچ سکتے ہیں اس کی۔''

''اس بات کی میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں کہ ان کے دلوں میں بھی آپ کے لیے احترام ہے۔ وہ پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں جو ہر معاملے کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے۔ کسی لڑکی کا والوں سے چھپ کر نکاح کر لینا یقیناً کوئی پسندیدہ فعل نہیں لیکن جہاں بنیادی انسانی حقوق کا استحصال وہاں ایسے ہی ردّیے اور ردِعمل ظاہر ہوتے ہیں۔ قانون و شریعت دونوں کی رو سے آپ کو یہ حق ہے کہ آپ اپنے دل کی رضامندی کے ساتھ کسی بھی شخص کو اپنا رفیقِ حیات منتخب کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ حق تو دور کی بات، آپ کے والد محترم نے تو اپنے خود ساختہ اور جاہلانہ رواجوں کی پابندی کرتے ہوئے ایک نارمل زندگی سے بھی دور کر رکھا تھا۔ جو لوگ اپنی زیرِ کفالت عورتوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے اللہ کی نظر میں بھی یقیناً معتوب ہی ہیں..... تو آپ یہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ ایک غلط شخص کے ظلم کے احتجاج کرنے پر میرا دوست یا اس کی بیوی آپ کو برا سمجھ سکتے ہیں؟''

''بس یونہی ذہن میں خیال آ گیا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں عورت کی ضروریات و خواہشات کو سمجھنے والا ہی نہیں ہے نا، اس لیے میں ڈر جاتی ہوں۔'' آفتاب کا جواب سن کر کشور اُداسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''آرام کریں۔ ہمارے درمیان جو رشتہ ہے، اس کا سب سے زیادہ احترام میرے دل میں ہے اور آپ کو اس میرے دل کی پروا ہونی چاہیے۔'' دائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے آفتاب نے اس کا ہاتھ دائیں ہاتھ کی گرفت میں لیا اور ہونٹوں کے قریب لے جا کر ہاتھ کی پشت پر ایک نرم سا بوسہ لیا۔ کشور کے چہرے پر اس کے اس عمل کے باعث سرخی سی دوڑ گئی۔

''ویسے میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں؟ یہ جو افضل اور مہتاب بھابھی ہیں، ان کا کیس بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اس لیے ان دونوں سے ایک فیصد بھی امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ مجھے یا آپ کو غلط سمجھیں۔'' اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ختم کیے بغیر آفتاب نے انکشاف کیا۔

''مطلب؟''

''مطلب کچھ یوں ہے کہ یہ جو ہماری مہتاب بھابی ہیں، ان کا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے ہے۔ بھابی کے والد آکسفورڈ سے ڈگری یافتہ ایک خاصے روشن خیال سردار تھے لیکن یہ روشن خیالی بس اس حد تک تھی کہ انہوں نے بیٹی پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بھابی نے نہ صرف گریجویشن کیا بلکہ ماسٹرز کے لیے بھی اپنے علاقے سے نکل کر اسلام آباد کی یونیورسٹی تک پہنچ گئیں۔ مگر خاندانی رواج کے مطابق ان کی منگنی بچپن میں ہی ان کے بھائی سے کر دی گئی۔ چچا زاد ان سے عمر میں تین سال چھوٹا ہونے کے علاوہ تعلیمی میدان میں بھی بہت پیچھے تھا۔ اصل میں اس نالائق اور بگڑے ہوئے سردار زادے کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے، مہتاب بھابی جیسی پڑھی لکھی اور نازک احساسات رکھنے والی خاتون ایسے شخص کو پسند نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن اپنے والد کے احترام میں اس رشتے سے انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں ان کی ملاقات افضل سے ہوئی۔ افضل اپنے ایک اسائنمنٹ کی تیاری کے سلسلے میں قبائلی علاقوں کا دورہ کرتا پھر رہا تھا۔ مہتاب بھابی جوان دنوں بہنوں پر اپنے گھر گئی ہوئی تھی، افضل کے لیے بہت ہیلپ فل ثابت ہوئیں۔ وہیں دونوں کے دلوں میں

پسندیدگی کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن بھابی نے ایسا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دیا کہ اس جذبے کا اظہار
افضل بنا اظہار کیے ہی واپس آ گیا لیکن اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ بھابی اسلام آباد یونیورسٹی سے ماسٹ
ہیں۔ اس نے ان سے رابطہ کیا مگر بھابی نے اپنی منگنی اور روایات کے بارے میں بتاتے ہوئے ا
افضل اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں قائل نہیں کر سکا اور یوں سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ بھابی امتحا
فارغ ہو کر اپنے گھر واپس پہنچ گئیں۔ ذہنی طور پر آمادہ بھی تھیں کہ کزن سے شادی کر لیں گی۔ لیکن
کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کا منگیتر اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہے تو وہ برداشت نہیں کر سکیں۔ منگیتر
اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ زیادتی کا کیس ان کے سامنے ہی پیش آیا جسے سرداروں نے اپنے اثر ور
استعمال سے دبا دیا۔ لیکن ظاہر ہے بھابی پر تو سچائی عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے بات کی کہ
ساری زندگی ان کی کسی سے شادی نہ کی جائے لیکن وہ اس بدکردار شخص سے شادی نہیں کریں گی۔ پڑ
روشن خیال والد صاحب اس موقع پر روایتی سردار ثابت ہوئے جن کے مطابق مردوں کی ایسی غلطیا
گرفت نہیں تھیں۔ بھابی نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے والد کو قائل نہیں کر سکیں گی۔ انہوں نے عقل مندی کا
کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ اور جب اپنا رزلٹ معلوم کرنے اسلام آباد گئیں تو افضل سے رابطہ
اس سے پوچھا کہ کیا تم فوری طور پر مجھ سے نکاح کر سکتے ہو؟ افضل صاحب، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں
مصداق فوراً راضی ہو گئے۔ دونوں کا خاموشی سے نکاح ہوا اور پھر وہ اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو
سرداروں میں سے کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ سال بھر پہلے ان کے علاقے میں آنے والا اخباری رپورٹر
لڑکی کو لے اُڑا ہے۔ وہ انکل پچو سے کام لیتے ہوئے اپنی لڑکی کی تلاش کرتے رہے۔ اب تو کافی سال گز
ہیں لیکن مہتاب بھابی کو یقین ہے کہ آج بھی انہیں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ بہت کم گھ
باہر نکلتی ہیں۔ نکلتی بھی ہیں تو مکمل پردے میں۔'' آفتاب کے یہ ساری داستان سنانے کے دوران راستہ بھی
گیا اور کشور کو خبر نہیں ہو سکی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب گاڑی افضل کے دو منزلہ مکان کے سامنے رُکی اور آ
نے ہارن دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کل رات کی طرح اس وقت بھی مہتاب نے مسکراتے ہوئے گرم
کے ساتھ ان دونوں کا استقبال کیا لیکن آج اس کے ساتھ افضل اور بچے موجود نہیں تھے۔

''افضل بھائی اور بچے گھر پر نہیں ہیں کیا؟'' کشور نے اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ اس سے
ملتے ہوئے سوال کیا۔

''افضل اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں اور بچے ابھی اسکول سے آئے نہیں ہیں۔ بس آنے ہی والے ہو
گے۔'' مہتاب کا جواب ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ باہر سے ہارن سنائی دیا۔

''لو آ گئے بچے بھی۔ نام لینے کے ساتھ ہی شیطان حاضر ہیں۔'' مہتاب ممتا بھری محبت کے ساتھ کہتی ہو
دروازے کی طرف بڑھی۔ پل بھر کے وقفے کے بعد ہی دونوں گول گوتھنے سے بچے کشور کے سامنے موجود تھے۔

''آہا..... دلہن آئی ہے۔'' اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش گئے۔

''یار! تم لوگ انہیں چچی کہہ لیا کرو۔ دلہن تو یہ میری ہیں۔ خوامخواہ تمہارے دلہن کہنے سے مجھے جیلسی
ہونے لگتی ہے۔'' آفتاب نے چھوٹے والے کو گود میں اٹھاتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

''ٹھیک ہے، ہم انہیں دلہن چچی کہیں گے۔'' بڑے آصف نے مدبرانہ انداز میں فیصلہ سنایا۔

''یعنی دلہن سے دست بردار بہر حال صاحبزادے نہیں ہوں گے۔ آخر اولاد کس شخص کی ہیں؟'' آفتاب
نے ہنس کر کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے تھے۔ مہتاب نے حسبِ فرمائش مزیدار



کھانا تیار کر رکھا تھا۔ ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کشور کو زندگی میں پہلی بار ایک مکمل گھرانے کا یہ
ماحول نصیب آیا تھا۔ وہ مستقل مہتاب کے آصف اور واصف نامی دونوں سپوتوں کے ساتھ لگی رہی۔ کھانے کے
بعد بچوں کا موڈ نہ ہونے کے باوجود مہتاب نے انہیں آرام کے لیے ان کے کمرے میں بھیج دیا اور خود کچن کی
صفائی کا بہانہ کر کے منظر سے ہٹ گئی۔ مہتاب کی سمجھ داری کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے وہ دونوں اس
کمرے میں پہنچ گئے جہاں کل رات انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے اوّلین لمحات بتائے تھے۔ اس کمرے
کا فسوں آج بھی اسی طرح قائم تھا۔ اس فسوں خیزی کے حصار میں گھرے وہ پھر ایک دوسرے کو حکایتِ دل
سنانے لگے۔ کل اگر پہلی شبِ عروسی کی بے تابیاں تھیں تو آج جدائی کی دہلیز پر کھڑے دو پیار کے متوالوں کی
آخری ملاقات کی بے قراری۔ آفتاب آج پیر آباد واپس چلا جاتا تو ہفتہ بھر بعد ہی آپاتا اور یہ طے نہیں تھا کہ
پھر بعد وہ دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ محبت میں اندیشے اور خدشات یوں بھی ساتھ ساتھ چلتے
ہیں اور ان کا تو معاملہ ہی ایسا تھا جب ملتے تھے، چاہتے تھے کہ عمر بھر کا پیار اس ایک ملاقات میں ہی ایک دُوجے
کو دے دیں۔ محبت کی اس رِم جھم سے سیراب ہو کر مقررہ وقت پر طے شدہ طریقِ کار کے مطابق جب کشور واپس
گھر پہنچی تو اس کے دل میں ایک ہی سوال تھا۔ 'خوشی میں بھیگے لمحے اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں؟'

⊛----✪----⊛

''تم نے پیک اپ کر لیا سنتھیا؟''

''یس سر!'' لائن کی دوسری طرف موجود ورما کے سوال کا سنتھیا نے مستعدی اور اختصار کے ساتھ
جواب دیا۔

''گڈ۔ پھر کب تک تم لوگ منظر سے ہٹ جاؤ گے؟ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اور تمہاری ٹیم کے انڈر
گراؤنڈ ہونے سے پہلے کوئی کارروائی ہو۔ رانا تم لوگوں کی بُو سونگھتا پھر رہا ہے۔ اس کے ماتحتوں میں سے بھی
ایک آدھ لازماً صورتِ حال سے واقف ہوگا۔ ہماری کارروائی کے جواب میں ایسا کوئی شخص ایکٹیو ہو کر تم تک نہ
پہنچے، اس لیے احتیاط ضروری ہے۔''

''ڈونٹ وری سر! آپ کو جو ایکشن لینا ہے لے لیں۔ ہم لوگ بالکل محفوظ ہیں۔ ارمیلا اور گیتا اپنی ماتا
کے ساتھ پہلے ہی ناردرن ایریاز کی طرف نکل چکی ہیں اور میں بھی آج ٹھکانہ بدلنے والی ہوں۔'' ورما کی
ہدایت کے جواب میں اس نے پُرسکون اور سنجیدہ رویہ اختیار کیا۔

''اوکے۔ مجھے بس تمہاری طرف سے ہی گرین سگنل چاہیے تھا۔ کلنگ سیکشن، ایکشن کے لیے بالکل تیار
ہے۔ رانا کی تمام ایکٹیویٹیز ہماری نظروں میں ہیں۔ میں صرف تم لوگوں کی طرف سے خاموش تھا۔ پہلے ہی
ہمارے چند اہم ورکرز مارے جا چکے ہیں، اس لیے میں کوئی رِسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب تم نے اطمینان دلا دیا
ہے تو بس سمجھو کام ہو گیا۔ بہت جلد تمہیں خود بھی نیوز سننے کو مل جائے گی۔''

''بیسٹ آف لک سر!'' ورما کی بات سن کر سنتھیا نے اس کے ارادوں کے لیے اپنی نیک خواہشات کا
اظہار کیا۔ درحقیقت اس خواہش میں نیک نیتی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بس اقتدار و اختیار کی وہ ہوس تھی جو
دوسروں کو بے امنی اور خوف میں مبتلا کر کے ہی تسکین پاتی تھی۔

''تھینکس۔'' ورما نے سپاٹ سے لہجے میں سنتھیا سے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔ اس کے فون بند
کرتے ہی سنتھیا نے بھی ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اور میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

میز پر اب ٹیلی فون سیٹ کے علاوہ کوئی شے موجود نہیں تھی۔ بلکہ پورے دفتر میں فرنیچر کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ لوگ اپنا تمام ضروری اور غیر ضروری سامان بہت خاموشی سے یہاں سے ہٹا چکے تھے۔ دفتر کی بہت بار
بنی کے ساتھ صفائی بھی کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی کھوج لگاتا ہوا یہاں تک پہنچ بھی جائے تو اسے کوئی کلیو
سکے۔ خصوصاً فنگر پرنٹس کے معاملے میں انہوں نے بے حد احتیاط برتی تھی۔ سنتھیا تو اس معاملے میں اتنی
تھی کہ ہمہ وقت ہاتھوں کے لیے باریک دستانوں کا استعمال کرتی تھی۔ لباس کی میچنگ سے تیار کیے جا
والے یہ دستانے کسی کو شک میں مبتلا کرنے کے بجائے اس کی شخصیت کو دلکش تاثر دیتے تھے۔ عمر کے کئی سم
سال گزرنے کے بعد ادھیڑ عمری کی دہلیز پر قدم رکھ چکنے والی سنتھیا کی شخصیت میں ایسا وقار تھا جو لوگوں
دلوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات اُبھارتا تھا۔ اس تاثر کو قائم رکھنے میں اس کے لباس اور رکھ رکھا
بڑا دخل تھا۔ اس وقت بھی اس نے فان کلر کا ایک خوب صورت لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پر گولڈ
کلر کی نہایت نازک سی بیل کڑھی ہوئی تھی۔ لباس کی مناسبت سے اس نے فان کلر کے ہی گولڈن پمپ وا
خوب صورت دستانے پہن رکھے تھے۔ کانوں میں موجود سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور گلے میں
نازک سی چین بھی اس کے لباس سے ہم آہنگ تھی۔ اپنی شخصیت کے پاس گریس سے واقف سنتھیا نپے
قدموں سے چلتی ہوئی دفتر سے باہر نکلی اور بیرونی دروازہ لاک کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جس عمار
میں اس کا دفتر موجود تھا، وہ علاقے میں موجود دیگر کمرشل بلڈنگ کی طرح کچھ ایسے طرز پر تعمیر کی گئی تھی کہ
کے وقت بھی وہاں اچھا خاصا اندھیرا رہتا تھا اور مصنوعی روشنیوں کے بغیر گزارہ ممکن نہیں تھا۔ آج سیڑھیوں
روشن رکھنے والے بلبز کی سپلائی لائن میں شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سیڑھیاں تاریک پڑی تھیں
اس تاریکی نے سیڑھیاں طے کرتے سنتھیا کے قدموں میں کسی قسم کی ڈگمگاہٹ پیدا نہ ہونے دی۔ وہ ایک
تربیت یافتہ ایجنٹ تھی جس کا ذہن ہر شے کا حساب کتاب رکھنے کا عادی تھا۔ اسے سیڑھیوں پر آنے والا ہر
اور اس کے قدمچوں کی تعداد ازبر تھی۔ چنانچہ وہ تاریکی میں بھی پورے اطمینان سے چلتی ہوئی گراؤنڈ فلور تک
گئی اور وہاں موجود ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر کا رخ کیا۔ اس دفتر کا مالک درحقیقت اس پوری بلڈنگ ہی
مالک تھا جو اپنے کاروباری مزاج کی وجہ سے بلڈنگ میں قائم ڈھیروں دفاتر کے کرائے سے حاصل ہونے وا
آمدنی کے باوجود مزید کمائی کے لیے یہ ایجنسی کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ سنتھیا کو اپنے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ
اس نے خوشگوار مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ قبل از وقت بغیر کسی مطالبے کے پابندی سے کرایہ ادا کر
والی سنتھیا کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔

''تشریف رکھیں میم! اور فرمائیے آپ نے آج کیسے یہاں آنے کی زحمت کی؟'' سنتھیا صرف کرائے کی
ادائیگی کے لیے ہی اس کے دفتر کا رخ کرتی تھی اور کرایہ وہ دو دن پہلے ہی دے چکی تھی اس لیے اسے سامنے
کر وہ کچھ تشویش محسوس کر رہا تھا۔

''میں بیٹھوں گی نہیں مسٹر رحمت! میں بس آپ کو آپ کے دفتر کی یہ چابیاں واپس کرنے آئی تھی۔ میں ا
میرج بیورو بند کر رہی ہوں اس لیے مجھے مزید آپ کے آفس کی ضرورت نہیں ہے۔'' سنتھیا نے اپنے ہینڈ بیگ
سے دفتر کی چابی نکال کر اس کے سامنے رکھی۔

''لیکن کیوں؟..... اتنی اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟'' عمارت کا مالک حیران ہوا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والی دونوں لڑکیاں ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہیں او
اکیلے کام سنبھالنا میرے بس میں نہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کام سمیٹ کر ریٹائرمنٹ لے لوں۔ میرے



بہت عرصے سے اصرار کر رہے تھے کہ میں ان کے پاس آ کر رہوں۔ اب میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر
آرام سے لائف انجوائے کروں گی۔'' سنتھیا نے اسے تفصیلی جواب دیا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
اس بار عمارت کے مالک نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا دفتر خالی ہو چکا تھا اور ایسی صورت میں کہ دفتر کا
کرایہ بھی ادا کیا جا چکا تھا اور ایڈوانس کی رقم کے لیے بھی کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا۔ وہ مکمل طور پر فائدے میں تھا۔
اس اب اسے خالی ہونے والے دفتر کے لیے نئی پارٹی تلاش کرنی تھی جو کہ ایسا خاص کام نہیں تھا۔

سنتھیا عمارت کے مالک کے تمام احساسات کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن اسے رقم کی پروا نہیں تھی۔ اس
کے لیے وہ مشن اہم تھا جس پر اتنے برسوں سے کام کر رہی تھی۔ اس وقت بھی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اس
نے ایک خالی ٹیکسی ہائر کی اور ٹیکسی والے کو دس منٹ کی مسافت پر واقع ایک علاقے کا نام بتا کر وہاں چلنے کا حکم
دیا۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پبلک کال آفس کا رخ کیا۔ خود کو ٹریس ہونے سے بچانے
کے لیے اہم کالز کے لیے ان پی سی اوز کا استعمال سب سے مناسب رہتا تھا۔

''ایس جے بول رہی ہوں۔ کام ہونے والا ہے۔ میں ہدایت کے مطابق کچھ عرصے کے لیے انڈر گراؤنڈ
ہو رہی ہوں۔'' مطلوبہ نمبر پر رابطہ قائم ہونے پر اس نے رپورٹ پیش کی۔

''او کے۔ پی اے کے بارے میں رپورٹ کرو۔ وہاں کیا سچویشن ہے؟'' دوسری طرف سے حکم دیا گیا۔

''وہاں سب کنٹرول میں ہے۔ پی اے کا لارڈ تین دن بعد نیویارک کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔''
پی اے سے مراد پیر آباد اور لارڈ کا مطلب چودھری افتخار تھا۔ سوال کرنے والے کو اطلاع دیتے ہوئے اس نے
چودھری افتخار کی روانگی کا وقت اور فلائٹ نمبر بھی بتا دیا۔

''او کے! ہم اُسے سنبھال لیں گے۔ بس تم پی اے کے معاملات پر نظر رکھو۔'' دوسری طرف سے حکم صادر
کیا گیا اور لائن کٹ گئی۔ سنتھیا اپنے خصوص باوقار انداز میں چلتی ہوئی پی سی او سے باہر نکلی اور ایک دوسری ٹیکسی
کو اشارے سے روک کر اس میں سوار ہو گئی۔ اس کے بتائے ہوئے پتے کی طرف منہ مانگے داموں ٹیکسی پر
ٹھسی دوڑانے والے ٹیکسی ڈرائیور کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس وقت وہ موساد کی سپیشل ایجنٹ سنتھیا کی
خدمت انجام دے رہا ہے۔ بے چارے ٹیکسی ڈرائیور کی خیر حیثیت ہی کیا تھی، خود کو بہت زیادہ ذہین اور قابل
سمجھنے والے ''را'' کے سورما بھی کبھی اپنے درمیان موجود سنتھیا کی حقیقت نہیں جان سکے تھے۔ انہیں نہیں معلوم
تھا کہ ان کی بظاہر وفادار ایجنٹ سنتھیا درحقیقت ڈبل ایجنٹ ہے جس کی اصل وفاداریاں ''موساد'' کے ساتھ
وابستہ ہیں۔

⊛----✪----⊛

کال گرل جولی اور ویٹر کی موت نے سجاد رانا کو بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ بظاہر حادثہ معلوم
ہونے والی یہ اموات درحقیقت سوچے سمجھے قتل ہیں، وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ویٹر کی روڈ ایکسیڈنٹ میں
موت کی اطلاع تو اسے فوری طور پر مل گئی تھی بظاہر یہ ایک حادثہ تھا جو کسی بھی شخص کے ساتھ پیش آ سکتا تھا لیکن
جولی سے اپنی ملاقات کے چند گھنٹوں بعد ہی اس حادثے کی اطلاع سن کر وہ چونک گیا اور فوری طور پر اپنے دو
ماتحتوں کو جولی کے اپارٹمنٹ کی طرف دوڑایا۔ وہاں جانے والوں نے پہلے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی لیکن کوئی
ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ جولی ہوٹل سے اپنے اپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی ہے، اس بات کا اسے علم
تھا۔ چنانچہ گھنٹی کا ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر یہی خیال آیا کہ اندر موجود جولی یقیناً کسی حادثے سے دوچار ہو چکی ہے

اور دروازہ کھولنے کے لیے آنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ دونوں ماتحتوں کو اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے دروازے کا لاک توڑ کر اندر جانا پڑا۔ جولی کا کشادہ اور خوب صورت اپارٹمنٹ مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈروم میں انہیں جولی اس حال میں نظر آئی کہ اس کے ہونٹوں پر ابدی خاموشی تھی۔ زندگی کی رمق سے عاری اس کا جسم موت کی اذیت سے گزرتے ہوئے کچھ بے ترتیب ضرور ہوا تھا لیکن اس کے بیڈ سمیت پورے اپارٹمنٹ میں کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دودھ کا خالی گلاس اور جولی کے ہاتھ لکھا خودکشی کا خط فوراً ہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا جسے اپنی کسٹڈی میں لینے کے بعد انہوں نے بعد میں رانا تک پہنچا دیا تھا۔ گلاس میں بچ جانے والے دودھ کے نمونے اور جولی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ظاہر کر تھا کہ اس کی موت زہر خورانی کے باعث ہی ہوئی ہے۔ جولی کے پورے جسم پر ایسا کوئی نشان یا زخم وغیرہ تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اسے زبردستی زہر ملا دودھ پینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ دودھ کے گلاس پر والے فنگر پرنٹس بھی صرف جولی کے تھے۔ پولیس کے ایکسپرٹس پورے اپارٹمنٹ میں سے جولی کے سوا دوسرے شخص کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کسی قسم کی بے ترتیبی سے عاری اپارٹمنٹ، جولی کے بے داغ جسم اور خودکشی کے خط کی موجودگی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ واقعی خودکشی کا کیس ہے۔ لیکن سجاد رانا جانتا تھا کہ اس نے جن لوگوں کی دُم پر پیر رکھنے کی کوشش کی ہے، وہ ایسے ہی بے داغ جرم کے ماہر ہیں۔ جولی اور ویٹر کی موت نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بری بات ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ مجرم ہوشیار ہو گئے تھے اور انہوں نے وہ نشانات مٹا ڈالے تھے جن پر چل کر ان تک پہنچ سکتا۔ اس سے قبل گرو الماس اور ایک دوسرے مشکوک خواجہ سرا کو بھی پولیس کسٹڈی میں ہلاک کے اس کی راہیں مسدود کی گئی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، دشمن اسے اس دُگنا پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ یہ ناکامی اس کے سینے میں بھڑکتی آگ پر تیل کے چھینٹوں کے مانند اثر کرتی تھی۔ ڈی آئی جی کی پوسٹ پر تعینات ہوتے ہوئے وہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ شینا کی سوختہ لاش ہر پل اس کی نظروں کے سامنے گھومتی رہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی نوعمر بیٹی کی لاش اس سے اپنے قاتلوں کا مطالبہ کر رہی ہو۔ شینا کی دنیا سے جانے کی عمر تو نہیں تھی۔ ابھی تو اس پر پوری طرح شباب بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو کچی کلی کے مانند تھی جسے کھلنے سے پہلے ہی توڑ کر مسل دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی انتہا پسندی اور جنون نے جیتی جاگتی شینا کو ایک پتھر کی مورتی کی بھینٹ چڑھا کر زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

شینا کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہش میں وہ جنون کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اور اس کا رویہ نارمل نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی اس ابنارمیلٹی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس پر بھی ذمے داریوں کا ایک کوہِ گراں تھا لیکن شینا کی موت کسی طور اسے بھولتی نہیں تھی۔ اس وقت بھی اسے ایک طے شدہ میٹنگ میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ روز بہ روز بڑھتی دہشت گردی اور امن و امان کی خراب صورتِ حال پر غور و فکر کے لیے وزیر اعلیٰ کی طرف سے بلائی گئی اس میٹنگ کے بعد حسب معمول عوام کے لیے ایک پریس نوٹ جاری کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جائے گا، یہ جاننے کے باوجود اسے میٹنگ میں شرکت تو کرنی ہی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے نکلا۔ گاڑی ڈرائیور سمیت بالکل تیار تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک گن مین بیٹھا تھا۔ آج بھی وہ صرف ایک ڈرائیور اور گن مین کے ساتھ میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر ایک فائل دھری تھی جس کے مندرجات کا وہ آنکھوں پر موجود



عینک سے مطالعہ کر رہا تھا۔ سبک رفتاری سے چلتی گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رُکی تو اس نے فائل بند کر باہر کے منظر پر دوڑائی۔ ٹریفک سگنل کے قریب کھڑا ایک نوعمر ہاکر لڑکا آواز لگا لگا کر اخبار بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کالعدم تنظیم کی طرف سے مزید اسکولوں کو بم سے اُڑانے کی دھمکی!'' اسکول کی دیوار سے ملحق کچرا دان میں رکھے گئے بم کے دھماکے سے ہلاک ہونے والے معصوم بچوں کا ذکر ابھی اخباروں کی سرخیوں میں تھا۔ اس نے ہاکر کے ہاتھ میں موجود اخباروں کی طرف سے توجہ ہٹائی اور ایک بار پھر فائل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی لمحے سگنل گرین ہوا اور اس کی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ اس سگنل سے آگے دائیں جانب مڑ کر اس کی گاڑی جس روڈ پر چلی، وہاں ٹریفک کا بہاؤ قدرے کم تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے ہی ایک سفید رنگ کی مارگلہ والی موٹر سائیکل بھی اسی روڈ پر مڑی تھیں۔ سفید مارگلہ میں تین افراد بیٹھے تھے جبکہ سیونٹی موٹر سائیکل پر دو افراد تھے۔ پہلے سیونٹی والے نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور درمیانی فاصلہ پاٹ کر سجاد رانا کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل گاڑی کے بائیں جانب رکھی ہوئی تھی۔ اس جانب بیٹھا ہوا گن مین ساتھ چلتی موٹر سائیکل کو دیکھ کر الرٹ ہوا۔ موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ خالی نظر آنے کے باوجود اس کا ساتھ ساتھ چلنا اسے کھٹک رہا تھا۔ اس نے اپنی گن پہلے کے مقابلے میں اور بھی نمایاں کی تاکہ موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے دور ہٹ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ کارگر تو ان کی ترکیب تھی جو گاڑی میں موجود اکلوتے گارڈ کی توجہ ہٹانا چاہتے تھے۔ گارڈ موٹر سائیکل کی طرف متوجہ رہا اور اسے اندازہ نہیں ہو سکی کہ کب سفید مارگلہ نے اپنی رفتار بڑھائی اور سجاد رانا کی گاڑی کے دائیں پہلو میں پہنچ کر اس پر فائرنگ شروع کر دی۔ سجاد رانا گاڑی میں دائیں جانب ہی بیٹھا تھا۔ پہلے برسٹ میں ہی اس کے جسم میں کئی گولیاں اُتر گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بننے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ ڈرائیور اور گن مین بھی اس اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آئے تھے۔ سفید مارگلہ اور سیونٹی سیکنڈوں میں اس ساری کارروائی کو نمٹا کر آگے بڑھ چکی تھیں۔ متوجہ ہونے والے جب تک متوجہ ہوئے، منظر میں خون سے نہائے ہوئے تین بے جان انسانی جسموں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ زندگی سے محروم ان جسموں سے بہتے خون کی سرخی سے اخبارات کی تازہ خبروں کی سرخیاں لگنی تھیں۔

⊛----✪----⊛

''کیا خبریں ہیں عبدالمنان؟''

''باقی سب کچھ تو معمول کے مطابق ہی جا رہا ہے سر!..... بس پیر آباد میں لگنے والے سالانہ میلے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ فی الحال اسے ملتوی کر دیا گیا ہے۔''

''وہ کیوں بھئی؟'' اس اطلاع کو سن کر شہریار چونکا۔ پیر آباد کے میلے کے ذکر کے ساتھ ہی اسے چودھری کی وہ بھیانک سازش بھی یاد آ گئی تھی جب بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر چودھری نے اس کے کھانے میں کچھ ملال کروا دیا تھا اور پھر اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ شرم ناک تصویریں اُتاری گئی تھیں۔ چودھری کا ارادہ تھا کہ تصویروں کو میلے کے موقع پر منظر عام پر لانے کی دھمکی دے کر اس سے اپنے مطالبات تسلیم کروا لے گا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی نکلی تھی کہ وہ ڈاکٹر ماریہ کے تعاون کی وجہ سے چودھری کے ڈیرے کی خفیہ تجوری سے وہ تصویریں نکال لانے میں کامیاب ہو گیا اور چودھری کو منہ کی کھانا پڑی

ورنہ شاید وہ چودھری کی اس سازش میں پھنس کر اس کے سامنے مجبور ہو ہی جاتا۔

''چودھری افتخار عالم شاہ صاحب اپنے برخوردار سے ملاقات کے لیے نیویارک تشریف لے جا
ہیں۔ ظاہر ہے، ان کی پیر آباد میں غیر موجودگی کے دوران کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی کہ میلوں ٹھیلوں سے ا
اندوز ہوسکے۔ چنانچہ جب چودھری صاحب نیویارک سے شغل میلہ کر کے واپس آئیں گے تو پیر آباد کے سا
میلے کے بارے میں غور وخوض کیا جائے گا۔''

عبدالمنان نے جس طنزیہ لہجے میں جواب دیا، اسے سن کر شہریار مسکرا دیا پھر مسکراہٹ چھپاتے ہ
بولا۔ ''ویسے کچھ معلوم ہوا ہے کہ چودھری صاحب کو اتنی ایمرجنسی میں بیٹے سے ملاقات کی کیونکر سوجھی؟''

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ویسے تو چودھری صاحب ٹھہرے پیروں کے خاندان کے چشم و چراغ..... کم
خواب میں انہیں بشارت ہوئی ہو کہ بیٹے سے ملنے نیویارک چلے جائیں۔ سو اب وہ بوریا بستر سمیٹ کر
جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔'' عبدالمنان کے جواب پر شہریار ایک بار پھر مسکرا اُٹھا۔ یہ وہی عبدالمنان ا
اس کی یہاں آمد کے پہلے دن مکمل طور پر چودھری کے دباؤ میں نظر آتا تھا۔ لیکن جوں جوں اسے یہ معلوم ہ
کہ نیا اے سی پچھلوں سے بہت مختلف ہے اور کسی چودھری وغیرہ کے دباؤ میں نہیں آنے والا، اس کی صلا
اور چودھری کے خلاف ناپسندیدگی کھل کر سامنے آنے لگی۔ اب وہ نہ صرف چودھری کے لیے اپنی ناپسند
برملا اظہار کرتا تھا بلکہ شہریار کے لیے بھی اچھا معاون ثابت ہو رہا تھا۔

''چلو جانے دو اپنے چودھری صاحب کو نیویارک۔ وہ بھی وہاں کچھ دن عیش کرلیں گے اور یہاں ہم
سکون رہے گا۔'' شہریار نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی فائل کھولی۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ ا
اب وہ مزید گپ شپ لگانے کے موڈ میں نہیں ہے۔

''سر! آج سے مشابرم خان نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کرلی ہے۔ باہر آیا بیٹھا ہے۔ آپ سے ملاقا
خواہش ظاہر کر رہا تھا۔'' اس کا انداز سمجھنے کے باوجود عبدالمنان نے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم فوراً اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے اس کا حال چال ہی پوچھ
گا۔'' شہریار نے اس کے اندازے کے مطابق مشابرم خان کے لیے ملاقات کی اجازت دے دی۔ مشا
خان بے شک ایک معمولی ڈرائیور تھا لیکن اس کی جاں نثاری کی ادا اسے اس بات کی مستحق بناتی تھی کہ اس
ساتھ خصوصی سلوک روا رکھا جائے۔ عبدالمنان اُس کی طرف سے رضامندی پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر
کے دو منٹ بعد ہی مشابرم خان نے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔

''آؤ بھئی مشابرم خان! بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ معاف کرنا بھئی۔ میں مصروفیا
وجہ سے دوبارہ تمہیں دیکھنے ہسپتال نہیں آسکا۔ لیکن تمہاری کمی میں نے بہت محسوس کی۔'' مشابرم خان کو
آنے کی اجازت دیتے ہوئے وہ خوش مزاجی سے بولا۔

''آپ نے مجھے یاد کیا، یہ کافی ہے سر! آپ کے ہسپتال نہ آنے کا مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں اچھی ط
جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ فون پر میری خیریت پوچھ لیتے تھے تو ہی میں خوش ہو جاتا
ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ تو آپ نے اجازت نہیں دی ورنہ میں بہت پہلے ہی ڈیوٹی پر حاضر
جاتا۔'' مشابرم خان نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اور سناؤ، وہاں کاندے میں کیا حال ہے؟ تمہاری بات تو ہوتی ہوگی نا اپنے بھائی اکرم خان سے؟''
سوال کرتے ہوئے شہریار نے بطورِ خاص کسی کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس کی نظروں میں ماہ بانو کا سراپا ضرور



گاؤں۔ عام سے گھرانے سے تعلق رکھنے والی وہ چھوٹی سی لڑکی جانے کیوں اسے بھولتی نہیں تھی۔

''ادھر بات ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھے موبائل خرید کر دیا ہے۔ لیکن
الم لان تو بس اسی وقت فون کرسکتا ہے جب اسکردو میں ہوتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے جب اس نے مجھے فون کیا
ل تا تھا کہ ماموں کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ ہوشے جا رہے ہیں۔ وہ لڑکی ماہ بانو بھی
ان کے ساتھ ہی جانے والی تھی۔ اکرم خان بہت تعریف کر رہا تھا ماہ بانو کی۔ کہتا تھا، ماہ بانو بالکل بیٹی کا موافق
ان کا خیال رکھتا ہے۔ گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا ہے اس نے۔'' مشابرم خان نے اسے رپورٹ دی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے نہ جانے کب تک وہاں رہنا پڑے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ وہاں اپنا دل لگانے
ی کوشش کر رہی ہے۔ تمہاری اب اکرم خان سے بات ہو تو میری طرف سے پوچھ لینا کہ اگر ماہ بانو کو کسی چیز کی
ضرورت ہو تو بتا دے۔ یہاں سے بھجوا دی جائے گی۔'' اس نے ماہ بانو کی مصروفیات پر تبصرہ کرنے کے ساتھ
ساتھ اس کے لیے پیغام بھی نوٹ کروایا۔

''ٹھیک ہے سر! میں کہہ دوں گا۔'' مشابرم خان نے جواب دیا اور پھر یوں حرکت کی جیسے کرسی سے اُٹھنے
والا ہو لیکن مزید کچھ کہنے کی خواہش میں اُٹھ بھی نہ رہا ہو۔

''کیا بات ہے مشابرم خان!..... کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی کشمکش کو بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا سر! کہ آپ کی گاڑی تو میں ہی چلاؤں گا نا؟''

''بالکل بھئی۔ وہ تو مجبوری تھی ورنہ میں خود بھی تمہیں ساتھ رکھ کر زیادہ آرام محسوس کرتا ہوں۔'' شہریار نے
اسے تسلی دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مشابرم خان اپنی عدم موجودگی میں اس کی گاڑی چلانے والے ڈرائیور کی وجہ سے
پریشان ہے۔ اس کے اور مشابرم خان کے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی، اس کے باعث اب مشابرم
خان مسلسل اسی کے ساتھ رہنے کا خواہش مند تھا۔

''بہت بہت شکریہ.....'' مشابرم خان کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔

''سوری سر!'' وہ شہریار کے مقابل بیٹھ کر موبائل کے بج اُٹھنے پر شرمندہ ہوگیا۔

''کوئی بات نہیں۔ کال اٹینڈ کرلو۔'' شہریار نے اجازت دی تو اس نے قمیض کی جیب میں رکھا موبائل نکالا۔

''یہ تو اسکردو کا نمبر ہے۔'' مشابرم خان آہستہ سے بولا اور کال اٹینڈ کرلی۔ شہریار اس دوران بہ ظاہر
اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس کے کان مشابرم خان کی آواز پر لگے
ہوئے تھے۔

''کون؟..... گل خان بات کر رہا ہے؟..... ہاہا یار! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم اکرم خان کے دوست
ہو۔ پر یہ بتاؤ کہ اکرم خان کے بجائے تم نے کیوں فون کیا ہے؟'' وہ کال کرنے والے کو شناخت کر لینے کے
مرحلے سے گزرنے کے بعد اب قدرے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ دوسری طرف سے یقیناً اس کے سوال کا
جواب دیا جانے لگا۔ شہریار کو دوسری طرف کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن مشابرم خان کی تشویش ''کب''
اور ''کیسے'' ضرور سنائی دی تھی جسے سننے کے بعد اس نے مشابرم خان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں بے تحاشا
ضبط کے باوجود زلزلے کے سے آثار تھے۔ وہ بالکل خاموشی سے دوسری طرف موجود شخص کی بات سن رہا تھا۔
لیکن اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ کوئی بہت بری خبر سنائی گئی ہے۔ اُس کی اس کیفیت پر شہریار خود بھی تشویش
میں مبتلا ہوگیا۔ فون کرنے والا اسکردو سے بول رہا تھا اور اکرم خان کا دوست تھا۔ مشابرم خان کی جو حالت تھی،
اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس کے گھر سے متعلق ہی کوئی بری خبر سنائی جا رہی ہے۔ اس کے گھر میں آج کل

ماہ بانو بھی مقیم تھی۔ چنانچہ شہریار کا ذہن لامحالہ اس کی طرف بھی چلا گیا تھا کہ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ ہو۔ ماہ بانو کی پریشانی اور تکلیف کا خیال آتے ہی اس کا دل خودکار انداز میں تشویش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

''خیریت تو ہے خان؟ کیا کوئی پریشانی کی خبر ہے؟'' مشابرم خان کال سے فارغ ہوا تو اس دریافت کیا۔

''بہت بری خبر ہے سر!..... میرے بھائی اکرم خان کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''ویری سیڈ..... یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟'' شہریار نے دلی ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

''یہ کل کی بات ہے سر! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے اور ماہ بانو شادی میں شرکت لیے ہوشے گئے تھے۔ ہوشے سے واپسی پر کچھ مسلح لوگوں نے ان کی جیپ کو گھیر کر ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کو کی۔ اکرم خان ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا چنانچہ انہوں نے اکرم خان کو گولی مار دی اور ماہ با اپنے ساتھ لے گئے۔ جاتے جاتے وہ جیپ کے ٹائر بھی ناکارہ کر گئے تھے اس لیے ڈرائیور اکرم خان کو ہسپ بھی نہیں پہنچا سکا۔ دو گھنٹے بعد جب ایک دوسری جیپ وہاں سے گزری تو اس جیپ والوں نے مدد کی لیکن وقت تک اکرم خان مر چکا تھا۔ اس کی لاش اسکردو کے دوغانے ہسپتال میں رکھی ہے۔ میری ماں جس صدمے سے دماغ اُلٹ گیا ہے، وہ بھی وہیں داخل ہے۔ اکرم خان کے دوست نے بڑی مشکل سے میرا تلاش کرنے کے بعد ابھی مجھے حادثے کی اطلاع دی ہے۔'' مشابرم خان نے تفصیل سے اس کے سوال جواب دیا۔ اس کا حوصلہ اور ضبط قابلِ رشک تھا۔ فرطِ غم سے چہرہ سرخ پڑ جانے کے باوجود یہ سب بتاتے ہو ایک بار بھی اس کی آواز بھرّائی نہیں تھی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ میں نے ماہ بانو کو حفاظت کے خیال سے اتنی دور بھجوایا تھا۔ اس کے دشمن اس کی سونگھتے ہوئے وہاں پہنچ جائیں گے، مجھے بالکل اُمید نہیں تھی۔'' شہریار تاسف سے بڑبڑایا اور انٹرکام اٹھا عبدالمنان کو اپنے آفس میں آنے کا حکم دیا۔

''عبدالمنان! فوری طور پر اسکردو جانے والی پہلی فلائٹ میں دو سیٹیں بک کرواؤ۔ میں اور مشابرم خان ابھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔ ہمیں یہاں سے لاہور اور لاہور سے بائی ایئر اسلام آباد پہنچنے میں جتنا وقت لگے گا، اس دوران یقیناً تم یہ سارا انتظام کر لو گے۔''

''او کے سر! میں ابھی ٹرائی کرتا ہوں۔'' عبدالمنان مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ اس نے شہریار سے یہ پوچھنے کی قطعی جرأت نہیں کی تھی کہ اتنی اچانک اسکردو جانے کا پروگرام کیوں بن گیا؟ البتہ اسے یہ ضرور سمجھ آ گیا تھا کہ جو بھی بات ہے، اس کا تعلق لازماً ماہ بانو سے ہی ہے۔

''صرف ٹرائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہنڈرڈ پرسنٹ شیورٹی چاہیے۔ ماہ بانو اغوا کر لی گئی ہے اور اکرم خان ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمیں اس معاملے کو دیکھنے کے لیے فوراً اسکردو پہنچنا ہوگا۔ اکیلے مشابرم خان کے جانے سے بات نہیں بنے گی اس لیے میں ساتھ جانا چاہتا ہوں۔'' شہریار کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ جذبات میں اس کی آواز کافی بلند ہو چکی ہے۔

''او کے سر! میں انتظام کرتا ہوں۔'' اصل صورتِ حال جان کر مستعد سا عبدالمنان اور بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا باہر کی طرف دوڑا۔

''تمہیں اپنی جو ضروری چیزیں وغیرہ ساتھ رکھنی ہوں، وہ لے لو خان! ہم دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائیں گے۔'' اس نے مشابرم خان کو ہدایت دی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد خود وہ اپنے بنگلے کا نمبر ملا کر



[illegible] سامان تیار کرنے کا حکم دینے لگا۔ حکم دینے کے بعد اس نے فون بند ہی کیا تھا کہ عبدالمنان کچھ [illegible] اندر آیا۔

''ایک بیڈ نیوز ہے سر!'' اس نے اپنی گھبراہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار سے کہا۔

''کیا؟..... سیٹ نہیں ملی یا موسم خراب ہونے کی وجہ سے آج اسکردو کے لیے کوئی فلائٹ نہیں جا [illegible] اس نے اسکردو جانے کے خواہش مندوں کو درپیش دو عمومی مسائل کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے [illegible]

''اس کام کے لیے میں ابھی فون کر ہی نہیں سکا سر!..... یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہی میرے [illegible] سے ایک فون کال آ گئی۔ اطلاع ملی ہے کہ ڈی آئی جی سجاد رانا کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ [illegible] اس خبر کی تصدیق کر لی۔ نیوز چینلز پر بھی اس وقت یہی بریکنگ نیوز چل رہی ہے۔'' عبدالمنان نے [illegible] بولتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ایک پل کے لیے تو ساکت ہی رہ گیا۔ اعلیٰ افسران، سیاست دانوں [illegible] دینی شخصیات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ آئے دن نیوز چینلز دہشت [illegible] ایسی کسی نہ کسی کارروائی کی خبریں نشر کرتے ہی رہتے تھے لیکن اپنی اتنی قریبی ہستی کے بارے میں یہ [illegible] اس کو قائم رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کہنے کو سجاد رانا اس کا کزن تھا لیکن ان کی حیثیت اس کے [illegible] بھائی جیسی تھی۔ بڑا بھائی بھی ایسا جس نے بھائی سے بڑھ کر باپ کا کردار نبھایا ہو۔ جب وہ یتیم [illegible] ماموں لیاقت رانا کی زیرِ نگرانی آیا تھا تو لیاقت رانا کے ساتھ ساتھ سجاد رانا نے بھی اس پر اپنی [illegible] لٹائی تھی۔ قدم قدم پر وہ اس کے کام آیا تھا اور اب اسے اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ سجاد رانا اب [illegible] نہیں رہا تھا۔

''آر یو او کے سر؟'' اس کی بے پناہ خاموشی سے گھبرا کر عبدالمنان نے پوچھا۔

''یس!'' وہ عبدالمنان کو مختصر جواب دے کر مریم کا نمبر ملانے لگا۔ شینا کے بعد سجاد رانا کی موت کا صدمہ [illegible] لیے کتنا بڑا ثابت ہوگا، وہ اندازہ لگا سکتا تھا۔ دوسری طرف بیل جانے کی آواز سنائی دیتی رہی لیکن کسی [illegible] ریسیو نہیں کی۔

''میں لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم مشابرم خان کے اسکردو جانے کا بندوبست کر دینا۔'' دوسری طرف [illegible] رسپانس نہ ملنے پر اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا [illegible] اور نمبر ملاتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار اس نے لیاقت رانا کا نمبر ملایا تھا۔ کال ان کے سیکرٹری [illegible] کی۔

''رانا صاحب تو اس وقت بات نہیں کر سکتے۔ ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی اس لیے انہیں ہسپتال شفٹ [illegible]۔ اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔'' یہ جاننے کے بعد کہ کال کرنے والا شہریار ہے، سیکرٹری نے مؤدبانہ [illegible] معلومات فراہم کیں جو ظاہر ہے اس کے لیے تشویش ناک تھیں۔ اسے شدت سے اپنی لاہور سے [illegible] کا احساس ستانے لگا۔ وہ پلک جھپکتے میں لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ اس کی جدید ماڈل کی [illegible] والی مرسڈیز بھی ایک حد تک ہی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ اس سے بڑھ کر تیز [illegible] دوسرا نقل و حمل کا ذریعہ یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

ماہ بانو نے ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی بند کر لیں۔ سور
برچھی کی طرح آنکھوں میں در آتی کرنوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سورج کی کرنیں
پیامبر بن کر کائنات کے ایک ایک ذرّے کو دیدار کے لیے عیاں کر دیتے ہیں..... کبھی کبھی، کہیں کسی مقا
ہی ظالم ثابت ہوتی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں سے ان کی بینائی ہی اچک کر لے جائیں۔ اس کی آنکھو
پل بھر کے لیے اتنی روشنی بھر گئی تھی کہ اسے اپنی بصارت جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ قدرت کے و
خودکار نظام کے تحت اس نے فوری طور پر اپنی آنکھیں بند کیں اور دیگر حواس کی صلاحیتوں کو بروئے
ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں اندازہ کرنے لگی۔ سب سے پہلا احساس جو اس کے ا
وہ یہ تھا کہ وہ کسی مسلسل ہلتی ہوئی شے پر دراز محوِ سفر ہے لیکن یہ ہلتی ہوئی شے کوئی انسانی ایجاد نہیں تھی
جانور تھا جس کی پشت پر اسے باندھ کر آگے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جانور کی چال کے مخصوص ہچکو
علاوہ جو دوسری چیز اس نے فوری طور پر محسوس کی، وہ شدید قسم کی سردی تھی۔ اس سردی سے اسے بچا
لیے اس پر کوئی ترپال نما شے ڈالی گئی تھی۔

وہ کہاں تھی؟ اور کن لوگوں کے ساتھ تھی؟ اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ اپنے اغوا کے
سارا منظر کسی فلم کی طرح آنکھوں میں گھوم گیا۔ اس منظر کے یاد آتے ہی اسے اکرم خان کا بے جان
اس کی بوڑھی ماں کی ویران آنکھیں بھی یاد آ گئیں۔ اس کے لبوں سے ایک سسکاری سی نکلی۔ عجیب
اس کا..... محبت کرنے والے لوگ ملتے تھے اور اچانک ہی چھوٹ جاتے تھے..... وہ بھی اس عالم میں
کی جان جانے کا بوجھ اپنی جان پر محسوس کرتی تھی۔ سب سے پہلے اسے پال پوس کر بڑا کرنے والی
ابا نے اس کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ چودھری نے اس کے غائب ہو جانے پر سب سے
ہی ظلم کا نشانہ بنایا تھا کہ کسی طرح ان سے ماہ بانو کا پتہ حاصل کر سکے۔ دارلامان جہاں وہ پیر آباد سے
بعد پناہ گزین ہوئی تھی، اس کی منتظمہ اور چوکیدار بھی اسی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ موتی والا کے گھر
لی تو چودھری کے گرگے کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے اور موتی والا اور اس کی
قتل کر ڈالا۔ موتی والا کے ڈرائیور سرمد نے اسے اپنے دوست عامر کے گھر پہنچایا تو وہاں عامر کی ماں او
پڑوسی لڑکی جمیلہ حادثے کا شکار ہو گئیں۔ جمیلہ کی لاش اس کے دھوکے میں دفنانے کے بعد کافی دنوں
سمجھا جاتا رہا کہ وہ ختم ہو گئی ہے۔ لیکن وہ تو جمیلہ کے دھوکے میں خواجہ سراؤں کے چنگل میں پھنس گئی تھی
بھی اس کی طرف لپکنے والی موت رخ موڑ کر سجاد رانا کی بیٹی ثمینا کی طرف چلی گئی۔ یہ قدرت کا اس پر
کہ ہر قدم پر بے شمار مصائب کے باوجود اس کی حفاظت کی جا رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ نادم تھی کہ ایک
زندگی پر اتنی جانیں نچھاور ہو گئی ہیں اور مصائب کا سلسلہ ہے کہ دراز ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اب وہ جو
اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے دور تھی، ایک جانور کی پشت پر سوار نہ جانے کہاں لے جائی جا رہی
کون تھا جس کے اشارے پر یہ مذموم حرکت کی گئی تھی؟ اُس کے ذہن میں تو اپنے دشمن کی حیثیت سے
چودھری افتخار کا نام ہی خطرے کی سرخ بتی کی طرح روشن رہتا تھا اور اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتنی
دوڑ اور تگ و دو کے باوجود بھی بالآخر چودھری اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

چودھری کی گرفت میں آ جانے کے خیال سے اس کا بندھا ہوا جسم کسمسایا اور اس بار اس نے چہرے
بدل کر ایسے زاویے پر لاتے ہوئے کہ سورج کی روشنی براہِ راست آنکھوں میں نہ گھسے، دھیرے
آنکھوں کو کھولا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ نے اس جانور کو اپنی زد میں لیا، جس کی پشت پر وہ سفر کر رہی تھی



سے بدن کا سیاہ، گھنے کھردرے بالوں والا جانور تھا جس کے آگے اسی جیسا ایک دوسرا جانور حرکت کر رہا
آگے والے جانور کی خوب گھنی اور مور چھل نما دُم دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی سواری کا کام انجام
والا جانور بھی ایسی ہی ایک دُم کا مالک ہوگا۔ بس فرق تھا تو یہ کہ وہ جس جانور کی پشت پر سوار تھی، اس کے
پر سیاہ تھے جبکہ آگے والا جانور چتکبرا تھا۔

"یاک....." اُس کے ذہن میں جانور کا نام سرسرایا۔ اچھے اچھوں کو صرف اپنی دید اور سموں کی دھمک
زدہ کر دینے والا یہ جانور اس وقت اس کی سواری تھا۔ آگے والے یاک پر سوار گرم کپڑوں میں ملبوس
اس وحشی جانور کو سدھانے اور اس قابل بنانے کے ذمے دار تھے۔ وحشی کو قابو میں کر لینے والے خود
ہوں گے، اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

ان یاکوں کو دیکھ کر قدرتی طور پر اسے خیال آیا کہ اس وقت وہ کسی بہت ہی بلند مقام پر موجود ہے۔ بلندی
کی وجہ سے آکسیجن کی مقدار قدرے کم تھی۔ اس کے چاروں طرف برف ہی برف تھی جس سے ٹکرا کر
کی شعاعیں یوں منتشر ہو کر سیدھی آنکھوں میں گھسی چلی آتیں اور اچھے بھلے انسان کو اسنو بلائنڈنیس کا
لاحق ہو جاتا۔ وہ بھی چند ساعتوں سے زیادہ اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ ہچکولے کھاتے جسم کے
آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اگر اغوا کاروں کا تعلق چودھری افتخار سے
اسے پہاڑوں سے میدانوں کی طرف لے جانے کے بجائے مزید بلندی کی طرف کیوں لے جا رہے
کیا چودھری کا ان برف زاروں میں بھی کوئی ٹھکانہ تھا؟ شاید ایسا ہی ہو۔ ایسا بندہ جو تہذیب کے آخری
ہوشے تک رسائی رکھتا ہو، جس کے بندے اتنی دور پہنچ کر اسے اغوا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں، اس
کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ دولت..... اور بے تحاشا دولت کے بل بوتے پر تو دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے لیے
گدھ خریدا یا بنایا جا سکتا تھا۔ اس عیش کدے میں اپنے من پسند جسم بھی خرید کر ڈالے جا سکتے تھے اور جو
فروخت نہ ہوں، ان کو کرائے کے ٹٹوؤں پر لاد کر لایا جا سکتا تھا۔ ماہ بانو کو چودھری نہ تو دھوکے سے
کر سکا تھا، نہ دولت کی جھلک دکھا کر پر چا سکتا تھا..... چنانچہ اب طاقت کے استعمال پر تُلا ہوا تھا۔ چودھری
اختیارات اور عزائم اپنی جگہ لیکن اس نے بھی ٹھان لی کہ چاہے جان چلی جائے، چودھری کو اپنے وجود سے
حاصل نہ کرنے دے گی۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گئی اور سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگی۔
طویل تھا۔ راستے میں دو ایک بار ایک آدمی نے اس کے منہ سے بوتل لگا کر کوئی مشروب اس کے حلق
انڈیلا۔ ذائقے میں وہ مشروب نمکول کے مانند لگتا تھا۔ ڈی ہائیڈریشن سے بچنے کے لیے ان برف زاروں
اکسیر کی سی حیثیت رکھنے والا مشروب، جو پہاڑوں کے عجیب و غریب موسم میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔
ماہ بانو نے دونوں بار اس مشروب کے گھونٹ خاموشی سے حلق سے نیچے اُتار لئے۔ جب تک جسم سے روح کا
قائم تھا، اسے جسم کی توانائیاں برقرار رکھنی تھیں تاکہ بوقتِ عمل، قوتِ عمل جواب نہ دے جائے۔

آخرکار سفر ختم ہو ہی گیا اور وہ لوگ ایک مقام پر ٹھہر گئے۔ یہاں رکنے کے بعد اس کے جسم کو بندشوں سے
آزاد کر کے اسے نیچے اتارا گیا۔ زمین پر قدم جما کر کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ
کھلی جگہ تھی جس کے اردگرد چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ اس جگہ سے ہٹ کر
دور تک کا منظر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نظر کی حد ان پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ آتی تھی۔ وہ لوگوں کی
نظروں سے چھپ کر رہنے کے خواہش مندوں کے لیے ایک آئیڈیل ٹھکانہ تھا مگر ایسا ٹھکانہ تو بس وہی لوگ
حاصل کر سکتے تھے جو بے پناہ وسائل کے مالک و مختار ہوں۔ ماہ بانو کو اُلجھن سی محسوس ہونے لگی۔ چودھری افتخار

کی دولت مندی میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چودھری کو ایسے کسی ٹھکانے کی ضرورت تھی؟ اس نے اپنا مال یہاں خرچ کیا تھا تو اس سے اسے حاصل کیا ہونے والا تھا؟ محض عیاشی کے لیے حماقت نہیں کی جاسکتی تھی۔

''اُدھر چلو۔'' وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں اُلجھی جانے کب تک یونہی کھڑی رہتی کہ ایک آواز والے شخص نے کھردرے لہجے میں حکم دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جو راستے اسے نمکول پلاتا رہا تھا۔ اس شخص کی اپنے قریب آمدورفت سے اسے اندازہ ہوا کہ آگے جانے والے یا کہ علاوہ ایک یا کہ اس کے پیچھے بھی موجود ہے۔ اب وہ تینوں یا کہ اس کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ ا جسم سے بندھے کپڑے کے بھرے ہوئے بڑے بڑے بورے نیچے اُتارے جارہے تھے اور انہیں مشا صلہ دینے کے لیے تازہ گھاس ان کے سامنے ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں پر اُترتی شام پر ایک نظر ڈال کر وہ حکم دینے والے شخص کے اشارے کی سمت بڑھ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے پہاڑ میں موجود وہ دہانہ نظر جو آگے کسی غار کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ چلتے شخص کی حرکات وسکنات سے اس ارادوں کو پہچانتی، وہ غار کے کھلے دہانے سے اندر داخل ہوگئی۔ اندرونی طور پر بے حد ہیجان میں مبتلا ہو باوجود اس نے ابھی تک کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اسے یہاں تک لانے والے محض ہیں جو بساط پر بازی کھیلنے والے کی مرضی سے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان بظاہر متحرک لیکن درحقیقت قو سے محروم افراد سے کوئی سوال کرنے سے بہتر تھا کہ اس بازی گر کا سامنا ہونے کا انتظار کیا جائے جس سارا کھیل رچایا تھا۔ وہ جو بہت آسانی سے اس بازی گر کے گرگوں کے ہاتھ لگ گئی تھی، اب اتنی بے تحاشا میں بھری ہوئی تھی کہ خوف کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ نئی چال چلنے والا اگر چودھری تھا تو وہ طرح تیار تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اس کا منہ نوچ ڈالے۔ لیکن جیسے ہی وہ دہانے سے گزر کر غار میں ہوئی، بھونچکی رہ گئی۔ اندر سے کافی کشادہ اس غار کی دنیا تو اس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھی اور وہ ونڈر لینڈ اتفاقاً جا پہنچنے والی ایلس کی طرح کھڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

لیاقت رانا کے خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی تو وہ لوگ شینا کی موت کے صدمے سے پوری طر سنبھل نہیں پائے تھے کہ سجاد رانا کے قتل نے ایک اور قیامت ڈھادی۔ پیرانہ سالی سے گزرتے لیاقت رانا پوتی کے بعد بیٹے کی موت کی خبر سنی تو بستر سے جا لگے۔ صدمے سے چُور چُور ان کے دل کی دھڑکنوں کو اعتدا پر لانے کے لیے ہسپتال میں ملک کے بہترین ڈاکٹرز جمع کر دیئے گئے تھے لیکن شہریار کی پریشانی قائم تھی۔ ا کا ایک پیر ہسپتال میں تو دوسرا گھر میں ہوتا تھا۔ گھر میں مسز آفرین رانا اور مریم دونوں ہی کی حالت خراب تھی ان کا رونا شہریار کے دل کو چیر ڈالتا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس انہیں صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دونوں خواتین اس تلقین کو سن کر اور بھی شد و مد سے روتیں اور اس کا دل جل تھل کر ڈالتیں۔ لیکن وہ ہونے کے ناتے آنکھوں سے آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔ کم از کم سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ رعایت قدرت کی طرف سے خواتین کو ہی ملی ہے کہ وہ ہر دکھ پر دل کھول کر رو لیتی ہیں اور نتیجتاً دل کا بوجھ ہلکا ہو ہے۔ مرد بے چارے اس نعمت سے محروم اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اندر ہی اندر سہتے رہ ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراضِ قلب کا تناسب زیادہ ہے۔ مثال



اس میں ہی موجود تھی۔ خواتین غم سے زیادہ نڈھال نظر آتی تھیں لیکن ہسپتال لیاقت رانا پہنچ گئے تھے۔ اس وقت ان کی خیریت معلوم کرنے ہسپتال ہی پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے تسلی دی تھی کہ لیاقت رانا اب سنبھلنے لگی ہے۔ وہ فون پر بھی اسے یہی تسلیاں دیتے رہے تھے اور اسے مجبوراً ان تسلیوں سے بہلنا ہی تھا۔ اس وقت ساری ذمے داریاں اسی کے شانوں پر تھیں۔ سجاد رانا کی تدفین، تعزیت کے لیے آنے والوں سے نمٹنے اور اخباری رپورٹرز کو بیانات دینے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ ان سارے کی انجام دہی میں وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرا تھا۔ خصوصاً حکمرانوں کے مذمتی بیانات اسے بری طرح جلانے کا سبب بنتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانوں کے یہ بیانات محض زبانی کلامی باتیں ہیں۔ دہشت گردوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے ان کے سارے دعوے سراسر کھوکھلے ہیں۔ یہ آہنی ہاتھ نہ تو ماضی میں کبھی حرکت میں آیا تھا اور نہ ہی اب کوئی امید تھی۔ شاید بغیر استعمال کے یونہی صرف بیانات کا حصہ بننے والا یہ ہاتھ زنگ آلود ہو کر ناقابلِ استعمال ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے طول عرض میں دہشت گرد اس طرح راج کیسے کرتے پھرتے؟ عوام سے لے کر خواص تک کوئی بھی تو اس دہشت گردی سے محفوظ نہیں تھا۔ اور المیہ اتنا تھا کہ عوام ایک ہی ہلّے میں کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑی تعداد میں بے دردی سے مارے جاتے اور خواص کو بڑا ناپ تول کر، حساب کتاب سے ملکِ عدم کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اس جچے تلے قتال کو ''ٹارگٹ کلنگ'' کا نام دیا جاتا تھا۔ سجاد رانا کی موت بھی ٹارگٹ کلنگ تھی اور حسب معمول کلرز کا کوئی نام ونشان نہیں مل سکا۔ خود ڈی آئی جی ہونے اور آئی جی کے داماد ہونے کے باوجود ان کے قتل کی رپورٹ نامعلوم قاتلوں کے نام درج کی گئی تھی۔ ان کے ایم این اے والد اپنی تمام تر پہنچ کے باوجود بیٹے کی موت کے صدمے سے نڈھال ہسپتال کے ایک وی آئی پی رُوم میں بے دست و پا پڑے تھے۔ ان میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹے کے جنازے میں ہی شرکت کر سکتے۔ شہریار ان سے ملاقات کے لیے ہسپتال آیا تو وہ تھوڑی دیر تک حسرت بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں موند کر اپنا رخ بدل گئے۔ جس بچے کو انہوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اسسٹنٹ کمشنر کی کرسی تک پہنچا دیا تھا، اس کے سامنے وہ اپنے دل کا درد کیونکر آنکھوں سے بہا سکتے تھے؟ ان کی کیفیات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے ان کے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت مندانہ بوسہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ عین اسی وقت مختار مراد وہاں پہنچ گئے۔ غم ان کا بھی کم نہیں تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی گود اور مانگ دونوں ہی اُجڑ گئی تھیں لیکن بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ غم کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے شہریار کو ان کی ذات سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اب بھی وہ نظر آئے تو اس کے دل کو ڈھارس سی ملی۔

''کیسی طبیعت ہے رانا صاحب کی؟'' شہریار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس سے سوال کیا۔ ان کی سیکیورٹی پر مامور عملہ ذرا فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔

''طبیعت تو اب کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے نکل آئے ہیں۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق شدید ڈپریسڈ ہیں۔''

''وہ تو ہونا ہی ہے۔ کسی بوڑھے باپ کے لیے اپنے بیٹے کا جنازہ دیکھنا کسی بھی صورت آسان نہیں ہو سکتا۔'' اس کی بات سن کر مختار مراد نے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وزیٹنگ روم میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام وزیٹنگ روم نہیں تھا۔ یہاں صرف لیاقت رانا جیسے وی آئی پیز سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے تیمار دار ہی داخل ہو سکتے تھے۔

کی دولت مندی میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چودھری کو ایسے کسی ٹھکانے کی ضرورت تھی؟ اس نے اپنا مال یہاں خرچ کیا تھا تو اس سے اسے حاصل کیا ہونے والا تھا؟ محض عیاشی کے لیے حماقت نہیں کی جاسکتی تھی۔

''اُدھر چلو۔'' وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں اُلجھی جانے کب تک یونہی کھڑی رہتی کہ ایک آواز والے شخص نے کھردرے لہجے میں حکم دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جو راستے اسے نمکول پلاتا رہا تھا۔ اس شخص کی اپنے قریب آمدورفت سے اسے اندازہ ہوا کہ آگے جانے والے یا کہ علاوہ ایک یا اس کے پیچھے بھی موجود ہے۔ اب وہ تینوں یا اس کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ ا جسم سے بندھے کپڑے کے بھرے ہوئے بڑے بڑے بورے نیچے اُتارے جارہے تھے اور انہیں مشا صلہ دینے کے لیے تازہ گھاس ان کے سامنے ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں پر اُترتی شام پر ایک نظر ڈال کر و حکم دینے والے شخص کے اشارے کی سمت بڑھ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے پہاڑ میں موجود وہ دہانہ نظر جو آگے کسی غار کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ چلتے شخص کی حرکات وسکنات سے ا ارادوں کو پہچانتی، وہ غار کے کھلے دہانے سے اندر داخل ہوگئی۔ اندرونی طور پر بے حد ہیجان میں مبتلا ہو باوجود اس نے ابھی تک کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اسے یہاں تک لانے والے محض م ہیں جو بساط پر بازی کھیلنے والے کی مرضی سے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان بظاہر متحرک لیکن درحقیقت قو سے محروم افراد سے کوئی سوال کرنے سے بہتر تھا کہ اس بازی گر کا سامنا ہونے کا انتظار کیا جائے جس سارا کھیل رچایا تھا۔ وہ جو بہت آسانی سے اس بازی گر کے گرگوں کے ہاتھ لگ گئی تھی، اب اتنی بے تحاشا میں بھری ہوئی تھی کہ خوف کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ نئی چال چلنے والا اگر چودھری تھا تو وہ طرح تیار تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اس کا منہ نوچ ڈالے۔ لیکن جیسے ہی وہ دہانے سے گزر کر غار میں دا ہوئی، بھونچکی رہ گئی۔ اندر سے کافی کشادہ اس غار کی دنیا تو اس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھی اور وہ ونڈر لینڈ اتفاقاً جا پہنچنے والی ایلس کی طرح کھڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

لیاقت رانا کے خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی تو وہ لوگ شینا کی موت کے صدمے سے پوری ط سنبھل نہیں پائے تھے کہ سجاد رانا کے قتل نے ایک اور قیامت ڈھادی۔ پیرانہ سالی سے گزرتے لیاقت رانا پوتی کے بعد بیٹے کی موت کی خبر سنی تو بستر سے جا لگے۔ صدمے سے چُور چُور ان کے دل کی دھڑکنوں کو اعتد پر لانے کے لیے ہسپتال میں ملک کے بہترین ڈاکٹرز جمع کر دیئے گئے تھے لیکن شہریار کی پریشانی قائم تھی۔ کا ایک پیر ہسپتال میں تو دوسرا گھر میں ہوتا تھا۔ گھر میں مسز آفرین رانا اور مریم دونوں ہی کی حالت خراب تھ ان کا رونا شہریار کے دل کو چیر ڈالتا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس انہیں صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ تھا۔ دونوں خواتین اس تلقین کو سن کر اور بھی شد و مد سے روتیں اور اس کا دل جل تھل کر ڈالتیں۔ لیکن وہ ہونے کے ناتے آنکھوں سے آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔ کم از کم سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ رعایت قدرت کی طرف سے خواتین کو ہی ملی ہے کہ وہ ہر دکھ پر دل کھول کر رو لیتی ہیں اور نتیجتاً دل کا بوجھ ہلکا ہو ہے۔ مرد بے چارے اس نعمت سے محروم اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اندر ہی اندر سہتے ر ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراضِ قلب کا تناسب زیادہ ہے۔ م



ا ا ا ں میں ہی موجود تھی۔ خواتین غم سے زیادہ نڈھال نظر آتی تھیں لیکن ہسپتال لیاقت رانا پہنچ گئے تھے۔ ا ا ں وقت ان کی خیریت معلوم کرنے ہسپتال ہی پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے تسلی دی تھی کہ لیاقت رانا ا ا ا ت اب سنبھلنے لگی ہے۔ وہ فون پر بھی اسے یہی تسلیاں دیتے رہے تھے اور اسے مجبوراً ان تسلیوں سے بہلنا ا ا ا تھا۔ اس وقت ساری ذمے داریاں اسی کے شانوں پر تھیں۔ سجاد رانا کی تدفین، تعزیت کے لیے آنے ا ں سے نمٹنے اور اخباری رپورٹرز کو بیانات دینے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ ان سارے ا ا ل ی انجام دہی میں وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرا تھا۔ خصوصاً حکمرانوں کے مذمتی بیانات اسے بری ا ج ا نے کا سبب بنتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانوں کے یہ بیانات محض زبانی کلامی باتیں ہیں۔ دہشت ا ا ں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے ان کے سارے دعوے سراسر کھوکھلے ہیں۔ یہ آہنی ہاتھ نہ تو ماضی میں ا ں ر ت میں آیا تھا اور نہ ہی اب کوئی امید تھی۔ شاید بغیر استعمال کے یونہی صرف بیانات کا حصہ بننے والا یہ ا ا ا ا ا زنگ آلود ہو کر نا قابلِ استعمال ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے طول عرض میں دہشت گرد اس ا ع ا ا ج کیسے کرتے پھرتے؟ عوام سے لے کر خواص تک کوئی بھی تو اس دہشت گردی سے محفوظ نہیں تھا۔ ا ل ص ف اتنا تھا کہ عوام ایک ہی ہلّے میں کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑی تعداد میں بے دردی سے مارے جاتے ا ا ا ص کو بڑا ناپ تول کر، حساب کتاب سے ملکِ عدم کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اس جچے تلے قتال کو ''ٹارگٹ ا ا ا'' کا نام دیا جاتا تھا۔ سجاد رانا کی موت بھی ٹارگٹ کلنگ تھی اور حسب معمول کلرز کا کوئی نام ونشان نہیں مل ا ا ا تھا۔ خود ڈی آئی جی ہونے اور آئی جی کے داماد ہونے کے باوجود ان کے قتل کی رپورٹ نامعلوم قاتلوں کے ا ا م ا ر ج کی گئی تھی۔ ان کے ایم این اے والد اپنی تمام تر پہنچ کے باوجود بیٹے کی موت کے صدمے سے نڈھال ا ا ا ا ں کے ایک وی آئی پی رُوم میں بے دست و پا پڑے تھے۔ ان میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹے کے ا ا ا ا ے میں ہی شرکت کر سکتے۔ شہریار ان سے ملاقات کے لیے ہسپتال آیا تو وہ تھوڑی دیر تک حسرت بھری ا ظ ر ں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں موند کر اپنا رخ بدل گئے۔ جس بچے کو انہوں نے انگلی پکڑ کر ا ا ا ا سکھایا تھا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اسسٹنٹ کمشنر کی کرسی تک پہنچا دیا تھا، اس کے ا ا ا ں وہ اپنے دل کا درد کیونکر آنکھوں سے بہا سکتے تھے؟ ان کی کیفیات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے ان کے ہاتھ ا ں ی پشت پر ایک عقیدت مندانہ بوسہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ عین اسی وقت مختار مراد وہاں پہنچ گئے۔ ا ل ان کا بھی کم نہیں تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی گود اور مانگ دونوں ہی اُجڑ گئی تھیں لیکن بے پناہ برداشت کا ا ظ ا ہ ہ کرتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ غم کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے شہریار کو ان کی ا ا ت سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اب بھی وہ نظر آئے تو اس کے دل کو ڈھارس سی ملی۔

''کیسی طبیعت ہے رانا صاحب کی؟'' شہریار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس سے سوال کیا۔ ان کی ا ی ی ر ٹی پر مامور عملہ ذرا فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔

''طبیعت تو اب کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے نکل آئے ہیں۔ لیکن ا ی ے اندازے کے مطابق شدید ڈپریسڈ ہیں۔''

''وہ تو ہونا ہی ہے۔ کسی بوڑھے باپ کے لیے اپنے بیٹے کا جنازہ دیکھنا کسی بھی صورت آسان نہیں ہو ک ک ا۔'' اس کی بات سن کر مختار مراد نے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وزیٹنگ روم میں ا ی ی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام وزیٹنگ روم نہیں تھا۔ یہاں صرف لیاقت رانا جیسے وی آئی پیز سے ا ل ق رکھنے والے لوگوں کے تیمار دار ہی داخل ہو سکتے تھے۔

''کچھ معلوم ہوا سجاد بھائی کے قاتلوں کے بارے میں؟'' وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سا
گئے تو شہریار نے ان سے پوچھا۔

''قاتلوں کی حتمی نشان دہی تو نہیں ہوئی لیکن ایسی بہت سی وجوہات سامنے آئی ہیں جن کو سجاد کے
وجہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اصل میں اس نے شینا کی موت کا بہت گہرا اثر لیا تھا اور اس کے قاتلوں کو کیفرِ کر
پہنچانے کے لیے دیوانہ وار کوششیں کر رہا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں اس نے مجھے شامل کرنا یا آگاہ
نہیں کیا تھا۔ تحقیقات کے مطابق شینا کی موت کے بعد سجاد مسلسل خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہا لیکن ا
ان سرگرمیوں میں اپنے ماتحتوں کو بھی ایک حد سے زیادہ ملوث نہیں کیا۔ جن لوگوں نے اس کے احکا
پیروی کی، وہ بھی حقائق سے واقف نہیں یا بہت کم جانتے ہیں۔ اس سارے عرصے میں کئی بار ایسا بھی ہو
نے گارڈز اور ڈرائیور کو بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کیا۔ میرے پاس جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے
کچھ دن قبل ہی وہ تنہا اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا تھا اور وہاں اس نے جولی نا
لڑکی کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے۔ جولی ایک کال گرل تھی جسے سجاد نے ہوٹل کے ایک ویٹر کے
اپروچ کیا تھا۔ سجاد کے حکم پر اس کے ایک ماتحت نے جولی کا تعاقب کر کے اس کی رہائش گاہ کا پتہ معلو
تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اسی رات ہوٹل کا ویٹر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا اور جولی نے اپنی غیر
زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔'' مختار مراد کی بات سنتے ہوئے اسے یک دم ہی ا
رانا سے آخری ٹیلی فونک گفتگو یاد آ گئی۔ اس گفتگو کے دوران انہوں نے اسے بتایا تھا کہ شینا کے قاتلوں کو
کرتے ہوئے وہ کچھ ایسے سپلائرز تک پہنچ گئے ہیں جن کے روپ میں خطرناک ایجنٹس چھپے بیٹھے ہیں۔ ب
بتاتے ہوئے انہوں نے جسم فروشی کے دھندے کا بطورِ خاص ذکر کیا تھا۔ لیکن پھر ٹیلی فون پر ہونے والی گ
غیر محفوظ قرار دیتے تفصیلات ملاقات پر چھوڑ دی تھیں۔ شومئ قسمت کہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آسکی۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں حادثات یقینی طور پر قتل کی وارداتیں تھیں۔ سجاد بھائی کا اس قسم کے افراد
خلاف کام کرنے کا تو کسی حد تک مجھے بھی علم ہے۔ یقیناً جو بڑے مجرم ہیں، انہوں نے اپنی طرف جانے وا
راستوں کا نشان مٹانے کے لیے اپنے ہی بندوں کو بلی چڑھا دیا ہوگا۔'' وہ بے ساختہ ہی درمیان میں بول
اور مختار مراد کو اپنی اور سجاد رانا کی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

''تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔ میرے سامنے کچھ ایسے شواہد آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ
کچھ خاص قسم کے مجرموں کی راہ پر لگ گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے جان سے جانا پڑا۔ میرے بندے
ایسے میرج بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ان کی مالکن، لڑکیو
سپلائر رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ وہ میرج بیورو بند ہو چکا ہے اور مالکن سم
اسٹاف کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ عمارت کے مالک کے ریکارڈ میں عورت کا جو پتہ درج ہے، وہ بھی
ہے۔ میرے آدمیوں نے دفتر کی تلاشی لے کر کلیوز حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی مکمل طور پر
کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کسی کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس صورت
سے ظاہر ہے کہ مجرم کوئی عام لوگ نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور بے حد ذہین تھے جنہوں نے اپنے پیچھے کوئی
نہیں چھوڑا۔'' مختار مراد نے اسے آگے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے بتانے کے
مزید کچھ باقی نہ رہا ہو۔

شہریار خود بھی کچھ دیر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بو



اب اجازت دیجیے۔ مجھے کچھ اور معاملات بھی دیکھنے ہیں۔ آپ البتہ ماموں جان سے مل لیں۔
اور حوصلے کو دیکھ کر یقیناً انہیں بھی حوصلہ ملے گا۔'' وہ ان سے مصافحہ کر کے ہسپتال سے رخصت ہو
یہاں سے لیاقت رانا کی رہائش گاہ کی طرف جانا تھا۔ مشابرم خان کی عدم موجودگی میں ڈرائیونگ
الہام دینے والے ڈرائیور نے اس کی سبک رفتار مرسڈیز ٹریفک کے بہاؤ میں شامل کی تو اس نے اپنا
کال کر مشابرم خان کا نمبر ملایا۔ سجاد رانا کی آخری رسومات اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں اسے موقع
تھا کہ مشابرم خان سے رابطہ کر پاتا، حالانکہ اس بے تحاشا پریشانی کے عالم میں بھی وہ اس مسئلے کو
تھا۔ ماہ بانو کو اس نے اپنی ذمہ داری پر بلتستان بھیجا تھا تو اب اس کے اغوا کی خبر پر وہ خود سب سے
مضطرب تھا لیکن حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر کٹے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔
اصل بات تھی کہ کسی طرح بلتستان پہنچا جائے اور ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں ہاتھ پیر مارے جائیں۔ لیکن
اور خونی رشتوں کا حق راہ میں حائل تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو ان حالات میں تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کی خاطر
نہیں جا سکتا تھا، چاہے وہ لڑکی اسے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر پیاری ہوتی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مرد
مجبور نہیں ہوتا لیکن عملی زندگی میں بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جب طاقتور سے طاقتور مرد خود کو مجبور
کرتا ہے۔ خصوصاً اگر معاملہ فرض اور خواہش کی جنگ کا ہو تو اعلیٰ تربیت کے حامل افراد اپنی ذاتی خوشی
کر کے فرض کی ادائیگی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور خود پر ضبط کر کے ماہ نور کا
پر تقدیر کر دیا تھا۔ البتہ تقدیر پر بھروسہ کرنے کے باوجود وہ جتنی تدبیر یہاں بیٹھے بیٹھے کر سکتا تھا، وہ اس
ضرور کی تھی اور اب اسی تدبیر کے نتائج جاننے کے لیے مشابرم خان کو کال ملائی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' مشابرم خان نے کال ریسیو کر لی اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! کیا حال ہے خان؟ آرام سے وہاں پہنچ تو گئے تھے نا؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں سر! آپ کی مہربانی سے سفر میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔'' مشابرم خان نے ترتیب
اس کے سوالوں کا جواب دیا لیکن اس کا لہجہ کچھ بجھا ہوا اور تھکن آلود تھا۔

''تمہاری والدہ کی کیسی طبیعت ہے؟'' وہ بے شک ماہ بانو کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا
اخلاقی تقاضا تھا کہ پہلے مشابرم خان کے مسائل پر بات کی جائے۔

''اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ابھی وہ ہسپتال میں ہی ہے اور
بے ہوش ہے۔ مجبوری میں مجھے اکرم خان کی تدفین بھی اس کے بغیر ہی کرنی پڑی۔'' مشابرم خان نے اُداسی
بتایا۔

''ویری سیڈ۔ تمہیں میری کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ بلکہ ایسا کرو کہ اپنی ماں کو لے کر لاہور یا
اسلام آباد کے کسی ہسپتال پہنچ جاؤ۔ اسکردو کے مقابلے میں ان شہروں کے ہسپتال زیادہ جدید اور باسہولت
ہیں۔ تم کہو تو میں انتظامات کروا دوں؟'' اس نے ہمدردی کے ساتھ مشابرم خان سے پوچھا۔

''شکریہ سر! لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ماں کو کوئی جسمانی
مسئلہ نہیں ہے، بس صدمہ ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ ہی نکل سکے گی۔'' مشابرم خان نے جواب دیا تو وہ
خاموش ہو گیا۔ اگر مشابرم خان خود مطمئن تھا تو مزید اصرار بے کار تھا۔

''حادثے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ کیا ہوا تھا اور کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟'' اس نے اصل

موضوع چھیڑا۔

''واقعہ ہوشے سے واپس کاندے جاتے ہوئے کینداس تھنگ کے قریب پیش آیا تھا۔ جیپ کے مطابق اچانک ہی ایک جیپ میں سوار کچھ لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کو جس پر اکرم خان نے جوش میں ان سے بھڑنے کی کوشش کی اور جواباً اسے گولی مار کر وہ لوگ ماہ بانو کو یہاں کی پولیس نے اس واردات کے بارے میں تحقیقات کیں تو اس جیپ کا پتہ چل گیا جس میں اغوا تھے۔ وہ ایک ٹورسٹ کمپنی کی جیپ تھی۔ جیپ کا ڈرائیور خالی جیپ لے کر طے شدہ شیڈول کے مطابق سے واپس آنے والی ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کو لینے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی جیپ روک لی گئی اور ا ہوش کر کے روکنے والے جیپ لے اُڑے۔ ہوش میں آنے کے بعد جب تک اس نے تھانے میں کروائی اور جیپ تلاش کی گئی، تب تک مجرم اپنا کام کر چکے تھے۔ خالی جیپ پولیس کو ایک بالکل ویران کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ مجرم وہاں سے کہاں اور کیسے گئے؟ اس بات کا سراغ نہیں مل سکا۔ کیا علاقے میں جیپ ملی، وہاں زمین کی ساخت ایسی ہے کہ کسی سواری یا انسانی قدموں کے نشانات ممکن نہیں۔ اب یہاں کی پولیس اُلجھی ہوئی ہے کہ آگے کی تفتیش کس بنیاد پر کریں؟ ماں کی بیماری اور ا کی آخری رسومات کی ادائیگی میں اُلجھے ہونے کی وجہ سے میں خود بھی اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن فکر نہ کریں سر! اب میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح کچھ معلوم کر سکوں۔'' مشابرم خان نے سناتے ہوئے آخر میں اپنا عزم ظاہر کیا۔

''اپنی سہولیات اور وسائل کے مطابق اگر تم کچھ کر سکو تو ضرور کرو خان! لیکن میری طرف سے زور زبردستی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس وقت کسی بھی اور کام سے بڑھ کر تم پر اپنی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس لیے تمہیں سب سے زیادہ انہی کا دھیان رکھنا چاہیے۔'' وہ اور مشابرم خان بیش ایک ہی جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ چنانچہ وہ مشابرم خان کے مسائل کو سمجھ سکتا تھا۔ ان مسا سمجھتے ہوئے ہی اس نے مشابرم خان کو کسی بھی ذمے داری کے بوجھ سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ماں کا خیال تو ہسپتال والے رکھ رہے ہیں سر! لیکن مجھے اپنے بھائی کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا کرنا ہوگا۔ ادھر ہمارے علاقے میں ایسی واردات پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو تو یہ بھی سمجھ نہیں کہ اب کیا کریں؟ اس لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' مشابرم خان کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ وہ جگہ کرائم ریٹ زیرو ہو، وہاں اس طرح کی کوئی واردات ہو جائے تو وہاں کی پولیس کا بوکھلانا سمجھ آتا ہے۔

''ٹھیک ہے خان! جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں وہاں کی انتظامیہ سے ایک بار پھر درخواست کروں تمہارے ساتھ تعاون کریں۔'' اس نے مشابرم خان کو اجازت دی اور کال منقطع کر کے سیٹ کی پشت سے لیا۔ گھر، ہسپتال اور ماہ بانو سمیت ایک پورے ضلع کی ذمے داریوں کا بوجھ تنہا اس کے شانوں پر تھا اور وہ آرام دہ انداز میں بیٹھا ہونے کے باوجود اندرونی طور پر ان ساری ذمہ داریوں سے احسن طور پر عہدہ برآ ہو کی تدابیر سوچنے میں اُلجھا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

وہ بہت دیر سے غار کی دیوار سے پشت ٹکائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا جیسے قدیم دیو مالائی داستانوں میں مذکور کسی دیوی کا ضدی آنکھوں والا مجسمہ دیوار کے ساتھ ٹکا ہو۔ لیکن یہ ایک



ایسا مجسمہ تھا جس کے خطوط میں ایک آہنگ سے ہونے والی حرکت سانسوں کے تموّج کو ظاہر کر رہی تھی۔ سانس زندگی کی علامت ہے اور جس کے دم سے ہی سارے جذبے اور خواہشیں قائم ہیں۔ سانس جسم کا ساتھ چھوڑ تو حسین سے حسین انسان بھی مٹی کے ڈھیر کے برابر ہو جاتا ہے۔ پتھروں سے تراشے مجسمے بھی اپنی تمام تر صورتی کے باوجود صرف سانس کی عدم موجودگی کے باعث ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ایسے مجسموں کے دیکھنے والی آنکھ میں تحسین تو ہوتی ہے لیکن دل میں جذبات نہیں۔ اور اس کی خوبی یہی تھی کہ وہ ادھوری نہیں تھی۔ اس کے انگ انگ میں زندگی بھری تھی۔ جوانی اور شباب سے پُر زندگی جو دیکھنے والی آنکھ میں صرف تحسین نہیں بھرتی، پورے وجود کو اُکساتی ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور بظاہر اردگرد سے بے نیاز تھی۔

لیکن اچانک ہی اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس کی زنانہ جبلت نے فوراً ہی اس اندر خطرے کی گھنٹی بجائی اور اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر پختہ عمر کا، اُلجھی ہوئی داڑھی اور بالوں والا شخص کھڑا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ان وغریب لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ کینداس تھنگ سے اغوا ہو کر اس برف زار میں آنے کے بعد مسلسل اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ وہ سارے لوگ بڑے عجیب تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ انہوں نے زمانے سے تہذیب یافتہ دنیا کی شکل نہ دیکھی ہو۔ ان کے چہروں سے وحشت برستی تھی اور آنکھوں میں کسی جانور کی سی درندگی تھی۔ ان کے اعضاء کے تناؤ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شکار پر گھات لگائے ہوں اور کسی بھی پل ان پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار ہوں۔

وہ ان عجیب وغریب لوگوں کے ساتھ ان کی دنیا میں قیدی کی حیثیت سے رہ رہی تھی اور حیران تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کس مقصد کے تحت دنیا سے کٹ کر اس ویرانے میں رہ رہے ہیں؟ اس بات کا تو اسے حتمی یقین تھا کہ بہرحال، وہ اس جگہ کے قدیمی باشندے نہیں ہیں۔ وہ سب باہر کی دنیا سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ان کے رنگ روپ اور لہجے چغلی کھاتے تھے کہ وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے حلیے بے حد یکساں تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی داڑھیاں اور اُلجھے ہوئے بالوں نے انہیں ایک دوسرے سے مشابہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی یا پھر اس علاقے میں پانی اور دیگر سہولیات کی قلت کے باعث ان کے لیے حجامت کروانا ممکن نہیں تھا، وہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔

ان کے جسموں پر موجود لباس بھی ایک جیسے تھے۔ وہ بدرنگ اور گھسے ہوئے اُونی پاجاموں کے ساتھ لمبی بش شرٹ نما قمیصیں پہنے ہوتے تھے۔ یہ مشترکہ حلیے اختیار کر لینے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ شناخت کیے جا سکتے تھے۔ ان میں کوئی گورے رنگ اور سنہری بالوں کا مالک تھا تو کوئی لمبے قد اور کھڑے کھڑے نین نقش والا۔ سیاہ تارکول سے رنگ والوں کے ساتھ بونے قد اور سانولی رنگت والے چہرے بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ یہی حال زبان کا تھا۔ وہ جو زبان آپس میں بولتے تھے، اس میں سندھی، سرائیکی، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے الفاظ آپس میں اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ زبانوں کا ایک لشکر سا تشکیل پا گیا تھا۔ یقیناً ایسا مختلف علاقوں اور تہذیبوں کے لوگوں کے آپس میں مل کر رہنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے لوگ آخر اس جگہ مل کر کیوں رہ رہے ہیں؟ ایسا کون سا مشترکہ مشن ہے جس نے انہیں اس جگہ جمع کر دیا ہے؟ برف میں گھری یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہی مہذب دنیا کے افراد کی رہائش گاہ کے طور پر قابل قبول نہیں تھی۔ اوپر سے وہاں کی ہولناکی نے ماہ بانو کو پہلے قدم پر ہی ہلا کر

رکھ دیا تھا۔ خود کو یہاں تک لانے والوں میں سے ایک کے اشارے پر جب وہ اس غار میں داخل ہوئی تھی لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا کہ وہ کسی غار میں نہیں بلکہ اسلحے کی ذخیرہ گاہ میں داخل ہو۔ غار کی پتھریلی دیواروں پر دنیا جہاں کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ رائفل، کلاشنکوف، ریپیٹر، ریوالور اور نہ جانے کون سی قابلِ شناخت اور نا قابلِ شناخت چیزیں تھیں جو وہاں موجود تھیں۔

وہ راہ داری کے اختتام پر موجود ایک چھوٹے سے قید خانے میں پہنچنے تک اس اسلحے کو دیکھتی رہی تھی اب اس قید خانے میں بند اپنے ناکردہ جرم کی سزا میں ملنے والی قید کو کاٹتے ہوئے بھی یہی منظر دیکھ رہی تھی اس کے لیے کھانا اور پانی پہنچانے کے لیے کوئی ایک شخص مخصوص نہیں تھا، ان میں سے کوئی بھی یہ فرض ادا دے دیتا تھا لیکن ہر شخص کے جسم کے ساتھ کسی نہ کسی اسلحے کا جڑا ہونا لازمی ہوتا تھا۔ اسلحے کی موجودگی کے ان کے درمیان جو قدرِ مشترک تھی، وہ تھی زبان کی عدم موجودگی۔ کم از کم ماہ بانو کو یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ سارے کے سارے قوتِ گویائی سے محروم ہوں۔ وہ ان میں سے کسی سے بھی کوئی سوال کرتی، جواب ہرگز نہیں ملتا۔ اس نے جل کر انہیں گونگا بہرا تسلیم کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سچ نہیں ہے۔ ان لوگوں آوازیں اس قید خانے میں اس تک بھی پہنچتی تھیں اور اس گفتگو میں کئی لفظ ایسے ہوتے تھے جن کے معنی و اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ مگر وہ لوگ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کے سامنے زبان کھولنے کے تیار نہیں تھے۔ ان کی زبان بندی نے اس کی اُلجھن کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ البتہ وہ اپنے اس خیال میں ڈانوا ڈول ہوگئی تھی کہ اسے چودھری کے حکم پر اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ وہ جن لوگوں کی قید میں تھی، وہ چودھری کے کارندوں سے بہت مختلف تھے۔

چودھری کے کارندے بے شک بے رحم اور جھگڑالو تھے لیکن اس کے سامنے جو لوگ موجود تھے، وہ سپاہیوں کی طرح سے منظم و مرتب تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات انہیں چودھری کے کارندوں سے زیادہ خطرناک اور سفاک ظاہر کرتے تھے۔ اس کی جب بھی ان میں سے کسی پر نظر پڑتی، وہ اپنی جگہ لرز کر رہ جاتی تھی۔ شکر یہ تھا کہ وہ اپنی تمام تر سفاکی کے باوجود اب تک اس کی طرف سے قطعی بے نیاز نظر آتے تھے۔ یہاں اسے سوائے قیدِ تنہائی کے کوئی اور تکلیف نہیں تھی۔ اس کے پاس آرام دہ بستر بھی تھا اور موسم کی سختی کو برداشت کرنے والا لباس بھی۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسے تینوں وقت کا کھانا نہایت پابندی سے فراہم کر دیا جاتا تھا۔ بس پریشانی تھی تو یہ کہ اسے کس کے حکم پر اور کیوں یہاں لایا گیا ہے۔ اس وقت بھی وہ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہی سوالوں کا جواب کھوجنے کے لیے سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھی ہوئی تھی کہ خود کو گھورے جانے کے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورنے والا شخص وہی تھا جو کچھ دیر قبل اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اب اس کا دوبارہ آمد کا مقصد یقیناً یہ تھا کہ کھانے کے خالی برتن واپس لے جائے۔ لیکن وہ خالی برتن واپس لے جانے کے بجائے اُس کے پُر شباب وجود میں اُلجھ گیا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تحریر لکھی تھی۔ ایسی تحریر جسے عورت بہ خوبی پڑھ سکتی ہے۔

ماہ بانو نے کسی فوراً ہی یہ تحریر پڑھ لی اور خوف کے باعث اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ اس سے قبل اس نے چودھری افتخار اور ہوشے کی کیمپنگ سائیڈ میں ملنے والے امریکی سیاح کی آنکھوں میں بھی یہ تحریر پڑھی تھی لیکن دونوں [illegible] انوں کے مقابلے میں قدرت نے اس کی مدد کی اور وہ ان ہوس پرستوں کی تمام تر طاقت کے باوجود ان [illegible] نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن یہاں، اس مقام پر وہ اپنے سامنے موجود درندے سے بچنے کے



[illegible] کر سکتی تھی؟ یہاں نہ تو اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ تھا اور نہ ہی کسی بیرونی مدد کی اُمید۔ بے بسی کے اس [illegible] وہ بے ساختہ ہی دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارنے لگی۔ ساکت لبوں کے ساتھ رب کو پکارتے [illegible] اس کی آنکھیں اس شخص پر جمی ہوئی تھیں جو کسی درندے کی طرح اس پر نظریں جمائے دبے قدموں اس [illegible] بڑھ رہا تھا۔ قریب آتے آتے وہ اتنا نزدیک پہنچ گیا تھا کہ اس کے اور ماہ بانو کے درمیان مشکل سے [illegible] کا فاصلہ رہ گیا۔ اس قدر کم فاصلے سے وہ اس کے چہرے کی غیر معمولی سرخی اور سانسوں کے ہیجان کو بہ [illegible] کر سکتی تھی۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ شخص بدنیتی سے ہی اس کے قریب آنا چاہتا تھا۔ اس شخص [illegible] بھانپ کر وہ تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور دیوار سے اس حد تک چپک کر کھڑی ہوگئی کہ اگر کسی [illegible] ممکن ہوتا تو وہ پتھروں کی اس دیوار میں سما جاتی۔ اس کے خوف کو محسوس کر کے وہ شخص دانت نکوسنے کے [illegible] میں مسکرانے لگا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''گل شیر! چھیتی کر..... اساں نوں کمانڈر نے کال کیا ہے۔ وہ کوئی امپورٹنٹ گل دسنے والا ہے۔'' اس کی [illegible] ماہ بانو کے چہرے کو چھونے بھی نہیں پائی تھیں کہ کسی نے دور سے ملی جلی بولی میں اسے پکارا۔ اس پکار کو [illegible] وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور نیچے فرش پر رکھے کھانے کے برتن سمیٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے [illegible] سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک ماہ بانو سانس روکے دیوار سے چپکی کھڑی [illegible] وہ ایک موڑ مڑ کر راہداری سے غائب ہوگیا تو وہ گرنے کے انداز میں نیچے بیٹھ گئی۔ اب وہ ایک بار پھر [illegible] دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی لیکن اس کے اندازِ نشست میں پہلے کی سی بے فکری نہیں رہی تھی۔ جو خطرہ [illegible] پہلے اس کے قریب آنے کے بعد ٹل گیا تھا، دوبارہ کسی بھی وقت پوری شدت سے اسے اپنی لپیٹ میں لے [illegible] تھا۔ اسے اس خطرے سے بچنے کے لیے کوئی سبیل نکالنی تھی لیکن فی الحال تو کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''پھر آپ اس وِیک اینڈ پر لاہور آ رہے ہیں نا؟'' بستر پر اوندھی لیٹی وہ ایک ہاتھ سے موبائل تھامے [illegible] سے باتوں میں مصروف تھی۔ یہاں اسے آفتاب سے بات کرنے کے لیے رات کا انتظار نہیں کرنا پڑتا [illegible] آفتاب کی مصروفیت اور معمول کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ دن کے وقت بھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اس [illegible] بھی وہ دن کی روشنی میں ایک دوسرے کی، ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آوازوں سے جذبات کی شدت کا [illegible] کرتے ہوئے محوِ گفتگو تھے۔

''نہ آنے کا کیا سوال؟ میں تو خود گن گن کر لمحے گزار رہا ہوں۔ اچھے بھلے آدمی کو نکما بنا کر آپ نے اپنا [illegible] کر لیا ہے۔ پہلے پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں تھا، اب آپ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں [illegible]'' اس کے سوال کے جواب میں وہ بڑی بے بسی کا اظہار کرتا ہوا بولا تو کشور کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس ہنسی میں [illegible] کے رنگ بھی تھے اور یہ ناز بھی کہ وہ کسی کو اپنا دیوانہ بنانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

''ہنسیے، ہنسیے..... جی بھر کر ہنسیے۔ میں آؤں گا نا تو سارے بدلے چکا دوں گا۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ [illegible] دور دور سے کسی کو پانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔'' اس کے [illegible] لہجے میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار [illegible] تھا۔ کشور کا چہرہ [illegible] کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے حیا سے سرخ ہوگیا۔ مارے شرم کے وہ جواب میں کچھ کہہ [illegible] نہیں سکی۔

''بس بولتی بند ہوگئی محترمہ کی۔ پہلے تو بڑی بہادری دکھائی جاتی تھی۔ [illegible] یہ حال ہے کہ فون پر بھی ہمارا

ایک جملہ سن کر ڈھے جاتی ہیں آپ۔ کبھی کبھی تو یقین نہیں آتا کہ آپ وہی کشور ہیں جس کی طرف
محبت میں پہل کی گئی تھی۔'' آفتاب نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''تب اور اب میں بہت فرق ہے آفتاب! تب میں جانتی تھی کہ آپ چودھری افتخار شاہ کی بیٹی کو
خود سے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ چنانچہ میں نے اظہار میں پہل کر ڈالی۔ اب معاملہ مختلف ہے
میں صرف چودھری افتخار کی بیٹی نہیں، آپ کی بیوی بھی ہوں۔ ایسی بیوی جسے اس بات کا مکمل یقین ہے
شوہر اس سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اب مجھے قطعی اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ میں اپنی نسوانی انا
لگاتے ہوئے جارحانہ رویہ اختیار کروں۔ مرد کی طرف سے اظہارِ محبت سننا اور اس پر شرمانا عورت کا
ہے۔ پہلے مجھے یہ حق حاصل نہیں تھا لیکن اب حاصل ہے۔ تو پھر کیوں میں اپنی حدود سے باہر نکلوں اور
طرف سے انعام کی صورت ملنے والے حق سے محروم ہو جاؤں۔''

''یعنی اس کا مطلب ہے کہ اب ساری زندگی مجھے ہی آپ سے اظہارِ محبت کا فریضہ انجام دینا پڑے
اس کے بے حد سنجیدگی سے دیئے گئے جواب پر آفتاب بے چارگی سے بولا۔

''وہ تو کرنا پڑے گا۔'' کشور دلبرانہ ادا کے ساتھ ایک بار پھر کھلکھلائی۔ آفتاب جواب میں کچھ بولنے
سے قبل ہی دروازے پر دستک اُبھری۔

''ایک منٹ ہولڈ کریں آفتاب!'' وہ مدھم آواز میں ماؤتھ پیس میں بولی اور موبائل تکیے کے نیچے
سیدھی ہوئی۔

''کون ہے؟..... اندر آ جاؤ۔'' بلند آواز میں دیئے گئے اس جواب پر حاجرہ دروازہ کھول کر اندر
ہوئی۔ رانی کو خود اس نے اپنی کچھ ذاتی چیزوں کی خریداری کے لیے ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ تک بھیجا
پہلے بھی اس کا لاہور آنا ہوتا تھا تو وہ اپنی ہر طرح کی خریداری کے لیے خود ہی جایا کرتی تھی۔ اس طرح اسے
وقت آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ لیکن اب وہ خود کوٹھی سے باہر نکلنے سے گریز کر رہی تھی
آفتاب کی لاہور آمد پر جب باہر نکلنا پڑے تو ملازمین کو یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وہ روز روز سیر سپاٹے کرنے
جاتی ہے۔

''کیا کام ہے حاجرہ؟..... کیوں آئی ہو؟'' بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے حاجرہ سے پوچھا۔

''وہ بی بی!..... آپ سے ملنے کے لیے ایک عورت آئی ہے۔ کہتی ہے کشور بی بی سے ملنا ہے۔'' حاجرہ
نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

''یہاں کون عورت مجھ سے ملنے آسکتی ہے'' وہ حیران ہوئی۔ ''تم نے نام پوچھا تھا اس عورت کا؟''

''جی بی بی! پر اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس یہی کہتی ہے کہ آپ سے ملنا ہے۔ لمبی چوڑی سی بڑی
عورت ہے۔ منہ پر نقاب بھی لگایا ہوا ہے۔ آپ کہیں تو میں جا کر منع کر دوں..... جانے کون عورت ہے
چوکیدار نے اسے گیٹ پر ہی روک رکھا ہے۔'' حاجرہ نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی
آنے والی عورت کو ٹالنے کے سلسلے میں اجازت بھی چاہی۔

''نہیں، رہنے دو۔ میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری کوئی جاننے والی ہی ہو۔'' وہ اُلجھی اُلجھی سی بستر
کر کمرے سے باہر کی طرف چل پڑی۔ حاجرہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''چوکیدار سے کہو کہ عورت کو گیٹ سے اندر آنے دے۔'' گیٹ سے کافی فاصلے پر ہی رک کر
حاجرہ کو حکم دیا تو وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی آگے بڑھ گئی جبکہ کشور اپنی جگہ رُک کر انتظار کرنے لگی۔ حاجرہ نے



[illegible] پہچانا تو ذرا دیر کے تذبذب کے بعد اس نے ذیلی گیٹ کھول کر عورت کو اندر آنے کی اجازت
[illegible] لمبی چوڑی عورت سر جھکا کر اندر داخل ہوئی اور اعتماد سے چلتی ہوئی فاصلے پر کھڑی کشور کی طرف آنے
[illegible] پیچھے چوکیدار رائفل تھامے بالکل الرٹ کھڑا تھا۔ عورت ذرا بھی کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرتی تو وہ
[illegible] گولی مار دیتا۔ کشور خود اُلجھن میں کھڑی اس عورت کو دیکھ رہی تھی جو اب اس سے ذرا سے فاصلے پر آ کر
[illegible]

''[illegible] ہیں آپ؟..... اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟'' عورت کے اعتماد سے ذرا سا خائف ہوتے
[illegible] نے پوچھا۔ جواباً عورت نے کچھ بولنے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے پر موجود نقاب ہٹا دیا۔
[illegible] سے نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھ کر کشور بری طرح چونکی۔ لیکن یہ اس کا ابتدائی ردِعمل تھا۔
[illegible] لمحے وہ فرطِ مسرت سے عورت کے گلے لگ چکی تھی۔

''[illegible] مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ لہجے میں
[illegible] خوشی تھی۔

''میں نے سوچا کہ اپنی دیورانی کا حال چال ہی معلوم کر آؤں۔ ویسے تمہاری خوشی دیکھ کر تو مجھے سوچنا پڑ
[illegible] مجھے سامنے دیکھ کر تمہارا یہ حال ہے تو اگر جو کبھی دیور جی بھی اس طرح اچانک آ گئے تو تم کیا کرو گی؟''
[illegible] دھیمی آواز میں بولتی ہوئی کشور کو چھیڑنے لگی۔ اس چھیڑ چھاڑ پر کشور کا چہرہ گل رنگ ہو گیا لیکن پھر وہ
[illegible] کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی۔ اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں حاجرہ نے مہتاب کے الفاظ نہ سن
[illegible] لیکن یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ حاجرہ کافی فاصلے پر تھی۔ چوکیدار تو خیر تھا ہی دور۔

''[illegible] چلیں، اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے مہتاب کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور
[illegible] کر حاجرہ سے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''جلدی سے اسپیشل چائے تیار کر کے لے آؤ اور پھر اچھا سا کھانا
[illegible] تیار کر لینا۔''

''کھانے وانے تک میں نہیں رُکوں گی۔ وہ تو میرا تم سے ملنے کا بہت دل چاہ رہا تھا، اس لیے چلی آئی۔
[illegible] بھول گئے ہوئے ہیں۔ ان کے واپس آنے تک مجھے گھر پہنچنا ہوگا۔'' اس کا حاجرہ کو دیا جانے والا حکم سنتے
[illegible] مہتاب نے جھٹ اس پر صورتِ حال واضح کی۔

''تو آپ بچوں کے سکول سے آنے کے بعد انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر آ جاتیں نا۔ میرا تو خود بڑا دل کر
[illegible] ان سے ملنے کا۔'' مہتاب کی بات سن کر وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ اب وہ دونوں اس کے بیڈ روم تک پہنچ
[illegible] کھل کر بات کر سکتی تھیں۔

''بچوں کو میں جان بوجھ کر ساتھ نہیں لائی۔ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ انجانے میں ان کی زبان سے کوئی
[illegible] بات نکل سکتی تھی جس کی وجہ سے تم مشکل میں پڑ جاتیں۔'' مہتاب نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے بچوں کو
[illegible] نہ لانے کی وجہ بتائی۔

''اچھا، آپ یہ برقع تو اُتاریں اور آرام سے بیٹھیں۔ ابھی بچوں کی چھٹی میں کافی وقت ہے۔ کھانا چاہے
[illegible] نہ کھائیں لیکن درمیان کا وقت میرے ساتھ ہی گزارنا ہوگا۔'' کشور نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو مہتاب
[illegible] اتی ہوئی برقع اُتارنے لگی۔

''ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی پردہ دار خاتون ہیں کہ گھر سے باہر نکلنے کے لیے باقاعدہ برقع
[illegible] ہوں گی۔ میں تو ملازمہ کی زبانی یہ سن کر حیران ہی ہو رہی تھی کہ کوئی برقع پوش خاتون مجھ سے ملنے آئی

ہیں۔ آپ نے اپنا نام بھی تو نہیں بتایا تھا۔''

''نام تو میں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ اچانک تمہارے سامنے پہنچ کر تمہیں سرپرائز دے سکوں برقع والی بات تو سچ کہوں، یہ برقع میں پردہ دار ہونے کی وجہ سے نہیں پہنتی ہوں بلکہ اس لیے پہنتی ہوں کہ کچھ لوگوں کی نظروں سے روپوش رکھ سکوں۔'' مہتاب کا جواب سن کر اسے آفتاب کی اس کے متعلق داستان یاد آگئی۔ مہتاب نئے دور کی سوہنی تھی جس کے لیے محبوب سے ملن زندگی کی بنیادی شرط تھا۔ لیکن ملن کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا تھا، وہ منہ زور لہروں کو کچے گھڑے پر پار کرنے سے کم نہیں تھا۔ اس کے رسم و رواج کو ٹھکرا کر وہ ساری دنیا سے ناتا توڑ کر افضل کی بن گئی تھی اور اب بھی اس خوف کا شکار جانے کب کوئی تند لہر اُسے اُس کے کچے گھڑے سمیت بہا کر لے جائے۔

''اوہو..... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ میں آپ کے آنے سے پہلے آفتاب سے باتیں کر رہی تھی انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں ورنہ بے چارے پریشان ہی ہوتے رہیں میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔'' مہتاب سے متعلق آفتاب کی بتائی ہوئی باتیں یاد آئیں تو ساتھ ہی یہ گیا کہ وہ آفتاب سے اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر حاجرہ کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ اب یاد آیا تو فوراً تکیے چھپا موبائل نکال کر آفتاب کو خوشی سے مہتاب کی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ بھابی کے ساتھ انجوائے کریں۔ میں بھی اپنے کام دھندے نمٹاتا ہوں۔'' اس ہوئی اطلاع سن کر آفتاب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''اب آپ بتائیں بھابی! کہ کیا حال ہے؟..... بچے اور افضل بھائی تو خیریت سے ہیں نا؟'' آفتاب طرف سے مطمئن ہو کر وہ مہتاب کے برابر میں آ کر بیٹھی اور اس سے پوچھنے لگی۔ اپنا موبائل اس نے سے بیڈ پر ہی ڈال دیا تھا۔

''سب ٹھیک ہیں۔ بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ دُلہن چچی ہمارے گھر کب آئیں گی؟'' مہتاب مسکراتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی بے باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے لگا۔ حاجرہ اس دوران کھانے پینے کی پُرتکلف اشیاء سے بھری ٹرالی میں پہنچا کر جا چکی تھی۔ رانی کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مارکیٹ سے واپس آ چکی ہے باورچی خانے میں حاجرہ کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ مہتاب کے کھانے سے انکار کے باوجود کشور یونہی اسے واپس جانے دینا چاہتی تھی۔ اگر مہتاب کھانے پر نہ بھی رُکتی تو وہ بچوں کے نام سے اس کے ساتھ کھانا باندھ دیتی۔ ابھی تو خیر وہ باتوں میں مگن تھیں اور مہتاب نے واپس جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ باتوں میں مگن وہ دونوں اس وقت چونکیں جب کسی نے بنا دستک دیئے دھڑ سے دروازہ کھولا۔ اس غیر انداز پر کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی کشور نے کھلے دروازے میں کھڑی ناہید کو دیکھ لیا۔

''السلام علیکم اماں!..... آپ یہاں؟..... وہ بھی اتنی اچانک؟'' وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو ماں کی اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔

''کیوں، میرے یہاں آنے پر پابندی ہے کیا؟ جیسے یہ تیرے باپ کی کوٹھی ہے، ویسے ہی میرے بھی ہے۔ تُو یہاں رہ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں رہ سکتی؟'' چودھرائن ناہید نے نروٹھے پن سے جواب اس کے انداز میں کشور کے لیے بڑی رعایت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ خاصی خفا لگ رہی تھی۔ کشور پس منظر سمجھ سکتی تھی۔ تاجور نے اپنے لاہور کے دورے سے واپس جانے کے بعد یقیناً اس کے بارے



میں کہی ہوں گی کہ اس کی ماں سے پیر آباد میں زیادہ دن نہیں رُکا گیا اور وہ موقع ملتے ہی بیٹی کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے لاہور آ پہنچی۔ ماں کی آمد کا مقصد سمجھتے ہوئے کشور نے بے ساختہ ہی اپنے مہندی لگے ہوئے ہاتھ پشت پر کر لئے۔ اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی بے شک مدھم پڑ چکی تھی لیکن آفتاب کی محبت کا رنگ اس کے پورے وجود پر چڑھا تھا، وہ بہت پکا تھا اور اسے چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔ چودھرائن ناہید نے پہلی نظر میں ہی اس میں در آنے والی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور اب خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں نے آپ کے یہاں آنے پر اعتراض تو نہیں کیا اماں!..... آپ آئیں، یہاں بیٹھیں۔'' مہتاب کے ماں کے لہجے پر سبکی محسوس کرنے کے باوجود کشور نے رسان سے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے اسے اس بیٹھنے کا اشارہ کیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ خود بیٹھی تھی۔ چودھرائن ناہید، مہتاب کو گھورتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''کسی کون ہو بی بی؟'' بیٹھنے کے بعد اس نے براہِ راست مہتاب سے سوال کیا۔

''یہ میری سہیلی ہیں اماں! یہیں کتابوں کی دکان پر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بس پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ آج یہ پہلی بار مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں۔'' مہتاب کے کچھ بولنے سے قبل کشور نے اس کا ماں سے تعارف کروایا۔

''ایسے راہ چلتی عورتوں سے دوستیاں گانٹھنے کی تجھے کس نے اجازت دے دی؟ اپنے ابا جی کو جانتی ہے کہ وہ تو کتا بھی خریدیں تو اس کی نسل کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتے ہیں..... تُو بغیر پرکھے دوستی کر کے راہ چلوں کو گھر لانے لگی۔'' ناہید کے الفاظ اور لہجہ دونوں اتنے ہتک آمیز تھے کہ مہتاب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''میں اب چلتی ہوں کشور!'' اس نے کشور کی خاطر چودھرائن ناہید کو کوئی بھی جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے خود پر ضبط کیا اور کھڑی ہو کر اپنا برقع اوڑھنے لگی۔ کشور کی آنکھوں میں ماں کے رویے کیلئے گہری معذرت تھی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مہتاب برقع اوڑھ کر باہر نکلنے لگی تو چودھرائن ناہید کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''یہ فون شاید تمہارا ہے۔ اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ..... یہاں کہاں چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' اس نے میز پر پڑا کشور کا موبائل اٹھا کر مہتاب کی طرف بڑھایا۔

''یہ موبائل میرا نہ.....'' مہتاب نے موبائل کی ملکیت سے انکار کرنا چاہا لیکن فوراً ہی کشور نے مداخلت کر کے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

''ارے ہاں اماں! یہ تو ان کا ہی موبائل ہے۔ اچھا ہوا آپ نے صحیح وقت پر دیکھ لیا ورنہ بے چاری کو پریشانی ہو جاتی۔'' اس نے چودھرائن کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ کر مہتاب کو تھما دیا۔ اس نے بھی صورتِ حال سمجھتے ہوئے خاموشی سے موبائل اپنے پرس میں رکھ لیا اور خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''میں تجھے اپنے ساتھ واپس گاؤں لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ بہت رہ لی یہاں۔ اب واپس چل۔ یہاں رہ کر تُو جو ڈرامے کر رہی ہے، وہ میں ہور برداشت نہیں کر سکتی۔ ساری حیاتی وڈی چودھرائن سے دب کر رہی ہوں اور اب تیری وجہ سے ہور بھی طعنے سننے پڑتے ہیں۔ حویلی چل، میں دیکھتی ہوں وہاں رہ کر تیرا دماغ کیسے ٹھیک نہیں ہوتا۔ تیرے ابا جی بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔ اُنہیں مراد کے پاس امریکہ جانا ہے۔ ابھی تو مجھے یہاں اُتار کر خود کسی کام نال گئے ہیں۔ پھر شام میں ایئرپورٹ چلے جائیں گے۔ تُو تیاری رکھ۔ ڈریور (رائیور) انہیں چھوڑ کر واپس آئے گا تو ہم اس کے ساتھ واپس گاؤں چلے جائیں گے۔'' مہتاب کے جاتے

ہی چودھرائن ناہید نے اٹل لہجے میں اسے حکم سنایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی کشور گر
والے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جتنے اٹل لہجے میں چودھرائن نے اسے حکم سنایا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا
چاہے وہ کتنی ہی حیل و حجت سے کام لے، اسے چودھرائن کے ساتھ واپس جانا ہی پڑے گا۔ واپس جا
مطلب تھا آنے والے ڈیک اینڈ پر آفتاب سے طے شدہ ملاقات سے محرومی۔ اس ملاقات کے حوالے سے
دونوں کے دلوں میں کتنے ارمان تھے، یہ بات کوئی اور کیسے سمجھ سکتا تھا؟ اور وہ کسی کو سمجھا بھی کیسے سکتی تھی؟ فی الا
تو اس کے پاس موجود آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ ننھا منا سا موبائل بھی جدا ہو گیا تھا اور وہ ذرا دیر کے لیے
والی پرواز کی آزادی کے بعد ایک بار پھر کسی بے زبان کبوتر کی طرح واپس اپنے قفس کی طرف ہانکی جا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''دیکھ بالے! میرے پیچھے سارے کام ڈھنگ سے سمجھ لینا۔ اس واری مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو
چاہئے۔ میں تیرے ساتھ وڈی رعایت کر چکا ہوں، پر اب کے کام بگڑا نا تو تیرا انجام اچھا نہ ہو گا۔ یہ گل
طرح سمجھ لے۔ انور کی طرح میں تجھے کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا۔ غداری کی طرح کام چوری بھی نمک حرا
کی نشانی ہے۔ اب کی واری تُو نے نمک حرامی دکھائی تا تو سمجھ لے کہ فیر انجام بھی نمک حراموں جیسا ہی ہو گا
ڈیپارچر لاؤنج میں موجود چودھری افتخار، بالے کو دھمکی نما ہدایات جاری کر رہا تھا۔ فرماں برداری سے سر ہلا
بالے کی روح اُس کی دھمکیوں پر اندر سے فنا ہوئی جا رہی تھی۔ وہ انور کو اور اس کے انجام کو بھولا نہیں تھا۔ ماہ
کا بڑا بہنوئی انور جو اپنی بیوی نگار کو نازک حالت میں ہسپتال پہنچانے کے لیے حویلی کی طرف سے گاڑی
فراہمی کا طلب گار ہوا تھا اور انکار پر برگشتہ ہو کر بغاوت پر اُتر آیا تھا۔ بیوی کی موت کے صدمے نے انور
حواس چھین لیے تھے اور غصے میں وہ چودھری سے ٹکر لیتے ہوئے اے سی شہریار کا مخبر بن بیٹھا تھا۔ راز کھلنے
بعد انور کو چودھری کی طرف سے ملنے والی عبرت ناک سزا سہنی پڑی تھی۔ چودھری نے کمزور اور ناتواں انور
شکاری کتوں کے آگے دھکیل دیا تھا۔ انور اپنے ناتواں وجود کے ساتھ ان طاقتور کتوں سے مقابلہ نہ کر سکا
کتوں نے لمحوں میں اس کے جسم کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ انور کی اس بے بسی سے لطف اندوز ہونے والے بالے
جب اپنے سانڈ جیسے پلے پلائے جسم کو تصور کی آنکھ سے کتوں سے بھنبھوڑے جانے کا منظر دیکھا تو کانپ اٹھا
چودھری کی چاپلوسی کرتا ہوا خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار! سب کام خیر نال ہو جائیں گے۔ آپ بس چھوٹے شاہ جی کے پاس امریکہ
پہنچیں۔ پیچھے سے میں کام کر کے آپ کو خوشخبری سناتا ہوں۔ اس واری آپ کے دشمن کی ایک نہیں چلے گی
میں ناک کے رستے اُس کی ساری افسری نکال دوں گا۔ ایک رات میری قید میں گزار لے گا تو اپنے سارے
والے ماموں، چاچوں کو بھول جائے گا۔ بس آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ امریکہ سے واپسی پر آپ کے سامنے
آپ کی پسند کا تحفہ پیش کر دیا جائے گا۔''

''اپنی گل پر قائم رہنا۔ اگر تُو نے میری مرضی کے مطابق کام کیا تو میں بھی تجھے مالا مال کر دوں گا۔ ا
ہاں، اُس اے سی کے بچے سے کوئی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وڈا نخرا ہے اس میں۔ میں اس کے
کزن کی موت پر افسوس کرنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے ڈھنگ سے گل تک نہیں کی تھی۔'' چودھری جو شہریار
سے خار کھائے بیٹھا تھا، بالے کو اور چڑھانے لگا۔

''تسی بے فکر ہو جاؤ سردار! اے سی کو تو میں گل کرنا سکھاؤں گا۔ طوطے کی طرح فر فر بولے گا اور وہ سہ



ہ ام جا ہیں گے۔'' بالے نے چودھری کا موڈ بحال کرنے کے لیے بڑھک ماری۔

''ہ احتیاط سے کام کرنا۔ خبردار، کسی کو ایسا کوئی ثبوت نہ ملنے پائے کہ وہ ہم تک پہنچ سکے۔ بغیر ثبوت کے
ں لگاں شور مچائے، ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''اگر آپ حکم کریں تو اے سی کی زبان ہمیشہ کے لیے ہی بند کر دوں۔ سالا رہے گا نہ شور مچا سکے گا۔'' بالے
ال میں زیادہ ہی مستعدی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

''نہیں اوئے۔ اے سی کو تو میں نے زندہ ہی رکھنا ہے تاکہ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکوں۔ وڈا مرغی کی
ا کو اپنے پروں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم اس کُوی کو مسل کر رکھ دیں گے تو اے
ا حالت ہو گی، اسے دیکھ کر ہمیں اس کی موت سے زیادہ خوشی ملے گی۔'' چودھری نے فوراً ہی بالے کی
ا اختلاف کرتے ہوئے اپنے شیطانی ذہن میں پلتی خواہش کا اظہار کیا۔

''جیسی آپ کی مرضی سرکار! بالا تو آپ کے حکم کا غلام ہے۔'' بالے نے ایک بار پھر خوشامدانہ انداز اختیار
اس پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری نے اپنی گردن موڑ لی۔ ایسے لہجے اور رویے اس کی زندگی
معمولات میں شامل تھے۔ وہ ہمیشہ سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکتے دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر کبھی کوئی جھکنے سے
ا کرتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور اسے جھکانے کی ترکیبیں سوچنے لگتا۔ اب بھی اسے کافی اطمینان ہو گیا تھا
ا شہریار سے ماہ بانو کا پتہ حاصل کر کے اسے اپنے قبضے میں لانے کے بعد شہریار کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکے
اس پُرفریب خواب کو آنکھوں میں سجائے وہ چیکنگ کے مراحل سے گزرتا ہوا جہاز تک پہنچ گیا۔ اس کے
بزنس کلاس میں سیٹ ریزرو تھی۔ وہاں مسافروں کے استقبال کے لیے موجود ایئر ہوسٹس نے ہونٹوں پر
ب مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کی سیٹ تک راہ نمائی کی۔ ایئر ہوسٹس کی یہ دلفریب مسکراہٹ سراسر
اداری نوعیت کی تھی جس سے وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے مطابق ہر ایک مسافر کو نوازتی تھی لیکن چودھری
ا اور پسند بندے نے اس مسکراہٹ کو خاص اپنے لیے تصور کیا اور اس کی عیش پرست فطرت خوش ہو گئی کہ
ل سفر کے دوران ذرا رنگینی اور موج مستی رہے گی۔ دورانِ سفر ایئر ہوسٹس سے دل پشوری کے خیال نے
اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے گورے کی موجودگی پر بھی کبیدہ خاطر نہیں ہونے دیا۔ ویسے وہ عموماً گوروں کی
ی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے اور مختصر گفتگو کرنے والے گوروں کی سنگت اسے بور
تی تھی۔ ایسے لوگ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہیں دیتے تھے تو انہیں اپنے مربعوں اور جاگیر کے قصے سنا
مرعوب کیا خاک کیا جا سکتا؟ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک وہ گورے کی طرف سے رخ موڑے چپ چاپ
ا رہا۔ البتہ سیٹ بیلٹ باندھنے کے لیے آنے والی ایئر ہوسٹس کی قربت کے لمحات طویل کرنے کے لیے اسے
ا ساتھ خوب اُلجھائے رکھا۔ ایئر ہوسٹس اپنے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے اسے برداشت کرتی رہی
ن اس کی آنکھوں سے جھلکتی ناگواری واضح تھی۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے کے بعد جب پرواز ہموار ہو گئی اور
ں کی طرف سے مسافروں کو سیٹ بیلٹ کھولنے کا عندیہ دیا گیا تو چودھری نے خود سے یہ معمولی کام انجام
ے کے بجائے ایئر ہوسٹس کی خدمات حاصل کرنا ضروری سمجھا اور سیٹ کے ساتھ لگے بٹن کو دبانے کے لیے
ی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''لائیں جناب! میں آپ کی سیٹ بیلٹ کھول دیتا ہوں۔'' چودھری کے بٹن دبانے سے پہلے اس کے
ہ والی سیٹ پر بیٹھا گورا شائستگی سے رواں اُردو میں بولا۔ گورے کی زبان سے اتنی صاف اُردو سن کر
ھری اتنا حیران ہوا کہ بٹن دبانا بھول گیا۔ اس کی حیرانی کی پروا نہ کرتے ہوئے گورے نے اس کی طرف

جھک کر اس کی سیٹ بیلٹ کھول دی۔

''آپ تو بڑی صاف اُردو بول لیتے ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ اُردو جانتے ہوں گے آپ نے پاکستان میں طویل عرصہ گزارا ہے۔'' گورے کے اُردو بولنے پر حیرت کا اظہار کرنے کے ساتھ چودھری نے اندازہ بھی لگایا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب! میں یہاں بے شک کئی بار آ چکا ہوں لیکن اُردو میں نے یہاں نہیں امریکہ میں ہی رہ کر سیکھی ہے۔ اصل میں مجھے زبانیں سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اُردو کے علاوہ اور زبانیں روانی سے بول سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے پنجابی میں بات کر سکتے ہیں۔'' گورے نے اسے حیران کر دیا۔

''یہ سن کر مینوں وڈی خوشی ہوئی ہے۔ اُردو اور پنجابی بولنے والا امریکی مینوں پہلی واری ملا ہے۔ اس پہلے تہاڈا تعارف کرا دوتا کہ آگے چنگی گل شل رہے۔'' چودھری نے پُر جوش انداز میں فرمائش کی۔

''میرا نام ڈیوڈ ہے۔ پیشے کے اعتبار سے میں انجینئر ہوں لیکن سیاحت خصوصاً کلائمبنگ کا بڑا شوق ہے یہ شوق مجھے بار بار مشرقی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتایئے کہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ ویسے آپ کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں نے آپ کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا ہے کے مطابق تو آپ کوئی فیوڈل لارڈ ہی ہو سکتے ہیں۔''

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ میرا نام چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ میں پیر آباد نامی ایک گاؤں کا مالک ہوں۔ پُرکھوں سے ہم وہاں حکمرانی کرتے آ رہے ہیں۔ پڑھنے لکھنے اور سیر و تفریح کے لیے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پھر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ ابھی میں اپنے پُتر کے نیویارک جا رہا ہوں۔ تھوڑے دن اس کے ساتھ رہ کر واپس آ جاؤں گا۔ میرا پُتر ذرا وکھری ٹائپ کا ہے پُرکھوں کی طرح اسے حکمرانی کا ذرا شوق نہیں ہے۔ امریکہ میں رہ کر پڑھا لکھا اور اب وہیں ملازمت کر خوش ہے۔ پتہ نہیں آپ کے ملک میں ایسی کیا گل ہے کہ ہمارے جوانوں پر جادو ہو جاتا ہے۔ واپس آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔'' چودھری نے شکوہ کیا۔

''ارے نہیں چودھری صاحب! ہمارے ہاں کچھ نہیں رکھا ہوا۔ جو کچھ ہے، مصنوعی ہے۔ میں تو آپ کے شمالی علاقہ جات کے حسن کا اتنا عاشق ہوں کہ موقع ملتے ہی یہاں کا رخ کرتا ہوں۔ کہنے والے آپ کے پربت کو دیا میر یعنی پریوں کی سرزمین کہتے ہیں۔ اور سچ کہوں تو مجھے بھی ان برف پوش پہاڑیوں پر پریاں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپ پاکستانی تو اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتے ورنہ ایک بار اس برف پوش پہاڑ کی سیر کے لیے چلے جائیں تو ہمارے امریکہ کو بھول ہی جائیں۔'' ڈیوڈ کے انداز سے ظاہر تھا کہ واقعی وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوب صورتی سے بہت متاثر ہے۔

''آپ کہتے ہیں تو ماننا ہی پڑے گا مسٹر ڈیوڈ! ہم پاکستانیوں کو تو ویسے بھی امریکہ کی ہر گل ماننے کی عادت ہے۔'' چودھری اپنی بات کہہ کر خود ہی بلند آواز میں ہنسا۔

''باقی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا چودھری صاحب! لیکن جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں اس پر تو آپ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں۔ کیونکہ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم امریکی کبھی بھی کسی جگہ اپنا سرمایہ خرچ نہیں کرتے۔ میں اتنا خرچہ کر کے ان علاقوں کی سیر کرنے آتا ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ خاص ہے ان علاقوں میں۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنی رقم ضائع کرنے کی؟'' ڈیوڈ نے



اس انداز میں کہ چودھری کو قائل ہونا پڑا۔

''کل تو تہاڈی ٹھیک ہے۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں ادھر کی سیر کے لیے جاؤں۔''

''تو ایسا کریں نا چودھری صاحب! میرے ساتھ پروگرام رکھ لیں۔ آپ مجھے اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیں۔ میں اگلی بار ٹائم پاکستان آؤں گا تو آپ کو انفارم کر دوں گا۔ پھر آپ میری ٹیم کے ساتھ چلیے گا۔ ویسے ہم لوگ تو کافی اوپر تک جاتے ہیں۔ آپ کی جہاں تک ہمت ہو، ہمارا ساتھ دیجیے گا۔ اصل میں کلائمبنگ میں فٹنس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں لوگ اپنی فٹنس کا خیال نہیں رکھتے اس لیے زیادہ بلندی تک نہیں جا پاتے۔ ویسے ہمارے پاس ان لوگوں کی بھی مثالیں ہیں جو ستر اسی سال کی عمر میں ''کے ٹو'' کے بیس کیمپ تک پہنچ گئے۔''

ڈیوڈ کے آخری الفاظ نے چودھری کی انا کو زک پہنچائی لیکن بہرحال سچ، سچ تھا اس لیے وہ چاہنے کے باوجود ڈیوڈ کے سامنے کوئی بڑھک نہیں مار سکا۔ اگر وہ بھی اپنی جواں مردی کا دعویٰ کر بیٹھتا تو آنے والے وقت میں ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر خاموشی کو ہی غنیمت جانا اور ڈیوڈ کو اپنا کنٹیکٹ نمبر لکھوانے لگا۔

''چلیں تو پھر ڈن ہو گیا کہ اب جب بھی میرا دوبارہ پاکستان آنا ہوا، ہم ساتھ مل کر ایکسپی ڈیشن پر چلیں گے۔ ابھی میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے حالیہ وزٹ کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ بڑے شان دار سینز شوٹ کیے ہیں میں نے۔'' چودھری کا کنٹیکٹ نمبر نوٹ کرنے کے بعد ڈیوڈ اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے بولا اور اس میں سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔

''اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں بنائی تھیں میں نے۔ زیادہ تر تو ابھی کیمرے میں ہی محفوظ ہیں۔ ان میں کچھ خاص خاص تصویریں جو مجھے زیادہ ہی پسند آئی تھیں انہیں میں نے یہیں ڈیویلپ کروا لیا۔ آپ تصویریں دیکھیں گے تو خود میرے حسن نظر کے قائل ہو جائیں گے۔'' اس نے لفافہ چودھری کے ہاتھ میں تھمایا۔ لفافے کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں اچھی خاصی تصویریں موجود ہیں۔ چودھری نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک البم برآمد ہوا۔ پُر اشتیاق انداز میں البم کھول کر اس میں لگی تصویروں کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیوڈ کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ واقعی اس نے بڑی خوب صورتی سے قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں قید کیا تھا۔ چودھری بے ساختہ تعریفیں کرتا ہوا، ایک ایک تصویر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک مقام پر اس کی بولتی بند ہو گئی تھی اور وہ حیرت سے گنگ تصویر میں نظر آنے والے چہرے کو دیکھنے لگا۔ بھاری گرم لبادے میں کسی پہاڑی دوشیزہ کے روپ میں موجود لڑکی ماہ بانو ہی ہے، اسے شناخت کر لینے کے باوجود اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی انا کے لیے امتحان بن کر اس کی نیندیں چھین لینے والی ماہ بانو چہرے پر مسکراہٹ سجائے خوشی کی محفلوں میں شرکت کرتی پھر رہی تھی۔ اس بات کو سوچ کر اس کا تن بدن سلگ اُٹھا۔

''خوب صورت لڑکی ہے نا چودھری صاحب؟..... مجھے بڑی اچھی لگی تھی اس لیے میں نے اس کے کئی پوز لے لیے تھے۔ آپ آگے دیکھیں، آگے اور بھی پوز ہیں اس لڑکی کے۔'' چودھری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے اس سے کہا اور پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر نئی تصویر سامنے کر دی۔

''یہ لڑکی آپ کو کہاں ملی تھی مسٹر ڈیوڈ؟'' تصویر پر نظر جمائے جمائے چودھری نے سرسراتی ہوئی آواز میں ڈیوڈ سے سوال کیا۔

''اسے میں نے ایک پہاڑی گاؤں میں دیکھا تھا۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس گاؤں کی کیمپنگ سائیڈ میں موجود تھا کہ ہمیں اطلاع ملی، گاؤں میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔ ہم لوگ مقامی شادی دیکھنے کے شوق میں بغیر دعوت کے وہاں جا پہنچے۔ بڑے اچھے مہمان نواز لوگ تھے گاؤں والے۔ انہوں نے ہمارے اس طرح

پہنچنے کا برا نہیں مانا بلکہ تصویریں بنانے کی بھی اجازت دے دی۔ تصویریں بناتے ہوئے میری اس لڑکی پر پڑی تو بس بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں لے بیٹھا۔'' ڈیوڈ نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اس گاؤں کا کیا نام تھا مسٹر ڈیوڈ؟'' ڈیوڈ کی تفصیلات میں سب کچھ ہونے کے باوجود بنیادی جواب نہ تھا اس لیے اس بار چودھری نے ذرا زیادہ وضاحت سے اپنا سوال دہرایا۔

''خیریت ہے چودھری صاحب! مجھے لگتا ہے کہ آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں اور اس کی تصویر دیکھ کر پریشان ہو گئے ہیں۔'' ڈیوڈ کا انداز اگرچہ سرسری تھا لیکن وہ بہت گہری نظروں سے چودھری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ اس کا نام ماہ بانو ہے اور یہ میرے ایک مزارع کی بیٹی ہے۔ یہ لڑکی کافی دنوں سے اپنے گھر سے غائب ہے اور اس کے ماں باپ اس کے لیے پریشان ہیں۔ میں نے اپنے طور پر اسے تلاش کروانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔ کوگمان ہی نہیں تھا کہ لڑکی اتنی دور ایک پہاڑی گاؤں میں پہنچی ہوئی ہو گی۔'' چودھری نے ایک ہمدرد حکمران کا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈیوڈ کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''اوہ، آئی سی۔ خیر، آپ فکر نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ کی تلاش اب ختم ہوئی۔ میرے رابطے وہاں۔ ہم لینڈ کر جائیں، پھر میں پاکستان میں موجود اپنے دوستوں سے رابطہ کر کے اس لڑکی کو اس کی موجودہ قیام گاہ سے بازیاب کروالوں گا۔ اگر اغوا وغیرہ کا معاملہ ہے تو میں آپ کی پولیس کے ذریعے بھی یہ کام لے سکتا ہوں۔'' ڈیوڈ کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود پاکستان میں مضبوط رابطے رکھتا ہے۔

''نہ جی۔ پولیس کے ہاتھ میں معاملہ نہیں دینا ہے۔ وہ لوگ خوامخواہ ایشو بنا دیتے ہیں۔ مجھے لڑکی بازیابی راز داری سے اپنے قبضے میں چاہیے۔'' چودھری نے فوراً ہی ڈیوڈ کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''جیسا آپ چاہیں، ویسا ہی ہو گا چودھری صاحب! آخر آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو دوستی نبھانی بھی ہو گی۔ میرے خیال میں ہم منزل پر پہنچ جائیں تو پھر اس موضوع پر کھل کر بات کریں گے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیے گا کہ آپ کا پرسنلی لڑکی میں کیا انٹرسٹ ہے..... بلکہ ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنے ہاں کھانے پر انوائٹ کروں گا۔ پھر ہم کھل کر اور اعتماد کی فضا میں بات چیت کریں گے۔ آپ البتہ اتنا اطمینان رکھیں کہ آپ کی ماہ بانو اب آپ کے ہاتھ سے نکلنے والی نہیں ہے۔ وہ ہماری نظر میں ہے بلکہ آپ ایک طرح سے یہ سمجھیں کہ وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ جب چاہیں گے، وہ آپ کو مل جائے گی۔'' ڈیوڈ کے آخری جملے بڑے معنی خیز تھے۔ ان جملوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو کو اچھی طرح جانتا ہے اور چودھری کی اس کے لیے بے تابی سے بھی واقف ہے۔ یعنی اب تک جو کچھ چودھری کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، وہ محض ایک ڈرامہ تھا۔ اس ڈرامے کا مقصد سمجھنے کے لیے چودھری، ڈیوڈ کے چہرے کا ٹٹولنے والی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ وہاں صاف لکھا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں ہے۔

''کون ہو تم؟ اور ماہ بانو کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے سرد سے لہجے میں ڈیوڈ سے دریافت کیا۔

''ان سوالوں کے جواب کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔'' ڈیوڈ نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں جواب دیا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتا ہوا بولا۔



''ایکسکیوزمی! میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات میں وہی رعونت تھی جو حکمرانی کرنے والوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چودھری اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا خود بھی اس کی طرف سے رخ موڑ گیا۔ ڈیوڈ اس کی جاگیر پر کام کرنے والا ملازم تو ہے بس مزارع نہیں تھا جس سے وہ کسی قسم کی زبردستی کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا موڈ خراب کر سکتا تھا، وہ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ مزاج کی اس خرابی نے اسے طویل سفر میں ایئر ہوسٹسوں سے دل پشوری کا خیال بھی بھلا دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

کشور بستر پر چت لیٹی کمرے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ یہ کمرہ اس کے لیے ایک ایسے قفس کے مانند تھا جہاں اسے ہر حال میں لوٹ کر واپس آنا ہی تھا۔ اس بار بھی وہ لاہور میں آزادی کے چند دن گزارنے کے بعد یہاں پہنچا دی گئی تھی۔

چودھرائن ناہید نے اس کی ایک نہ سنتے ہوئے اسے اپنے ساتھ حویلی آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حویلی کی یہ قید اس پر پہلے کبھی اتنی بھاری نہیں گزری تھی جتنی کہ اب..... اب تو دل ہمیشہ اپنے دلدار کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتا تھا لیکن اچانک حویلی واپسی نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو آنے والے دنوں میں ایک بار پھر آفتاب کی بانہوں میں سما کر زندگی کی خوشیاں کشید کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، یک دم ہی زمین پر آ گری تھی۔ بالائے ستم یہ کہ آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ موبائل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ موبائل کو اپنی ملکیت نہ ظاہر کرنے کے چکر میں اسے موبائل مہتاب کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

اس وقت اگر موبائل ہی اس کے پاس ہوتا تو وہ آفتاب سے بات کر کے ہی اپنی تسلی کر لیتی۔ جب آمنے سامنے بیٹھ کر ملاقات کرنے کی سبیل نہ نکلے تو اس ننھے سے برقی آلے کا سہارا بھی غنیمت لگتا ہے لیکن اس سے تو یہ سہارا بھی جدا ہو گیا تھا۔ لاہور سے پیر آباد واپس آتے وقت راستے بھر اور اب اپنے کمرے میں عالم استراحت میں بھی اس کا ذہن مسلسل اپنے موبائل میں ہی اٹکا رہا تھا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ آفتاب میری کال کا انتظار کر رہے ہوں گے، انتظار سے تھک کر اب انہوں نے خود کال ملالی ہو گی۔ شاید مہتاب بھابی نے ان کی کال ریسیو کی ہو اور بتا دیا ہو کہ کشور کو اس کی ماں واپس حویلی لے گئی ہے۔ آفتاب یہ اطلاع سن کر بڑے مایوس ہوئے ہوں گے۔

آفتاب کی مایوسی کا سوچ کر وہ مزید افسردہ ہو گئی اور چھت پر سے نظر ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر ڈالی۔ کچھ دن قبل خوب کھل کر اپنا رنگ جمانے والی مہندی کے نقش و نگار بے حد مدھم پڑ چکے تھے لیکن وہ حنا کے رنگ سے ہٹ کر بظاہر غیر مرئی لیکن حقیقتاً بہت گہرے آفتاب کی محبت کے رنگوں کو وہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ رنگ تو اس کی پور پور میں بس گئے تھے۔ اس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کی پُرجوش سی گرفت، ہونٹوں کی نرم سی حدت، پُرشوق نگاہوں کی شوخی..... سب کچھ ہی تو بڑی آب و تاب سے اس کے وجود سے لپٹا ہوا تھا۔ آفتاب نے اتنی نزاکت سے اسے اپنی محبت کے رنگوں سے رنگا تھا کہ وہ اس کی مہارت کی قائل ہو گئی تھی۔ اس کی بے رنگ تصویر آفتاب کی محبت کے رنگوں سے رنگ کر ایسی سجی تھی کہ اب اس کا دل چاہتا تھا، وہ ہر روز نئے سرے سے ان رنگوں سے رنگی جائے۔ مگر یہاں اس قفس تک آفتاب کی رسائی ہی کہاں تھی؟

حویلی میں رہ کر وہ آفتاب سے ملنے کی خواہش کرتی تو اسے رات کی تاریکی میں چھپ کر اس انڈسٹریل

ہوم تک جانا پڑتا جہاں پہلی بار اس نے آفتاب کو اپنے جسم و جاں سونپے تھے..... جہاں وہ دونوں نکاح بندھن میں بندھے تھے اور آفتاب نے اپنے تعلق پر سے ہوس کا ٹیگ ہٹا کر محبت کا جگمگاتا نیون سائن آویزاں کر دیا تھا۔ انڈسٹریل ہوم تک راتوں کو چھپ کر ملاقات کے لیے جانا بہت خطرناک تھا۔ خطروں سے وہ نہیں ڈرتی تھی لیکن نکاح کے بعد اس نے خود اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ وہ اس جگہ آفتاب سے ملنے نہیں جائے گی۔

وہ اپنے کیے اس فیصلے پر قائم بھی رہنا چاہتی تھی لیکن افضل اور مہتاب کے گھر اس کی اور آفتاب کی یادگار ملاقاتیں ہوئی تھیں، اس کے بعد آفتاب سے زیادہ دن کی دُوری برداشت کرنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور سے روانہ ہونے سے لے کر اب تک وہ گھنٹوں اس مسئلے پر سوچتی رہی تھی۔ شاید بہت زیادہ سوچنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ اسے اپنا پورا جسم بری طرح تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی کسل مندی اور سستی تھی کہ وہ بستر سے اُٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ حالانکہ کئی بار فریدہ سے ملاقات کا خیال بھی دل میں آیا۔ حرماں نصیب فریدہ جو ذہنی معذور بہزاد شاہ کی منکوحہ کی حیثیت سے حویلی کی اوپری منزل میں مقیم تھی اور جسے درحقیقت ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چودھری اپنی ہوس کا پیٹ بھرنے کے لیے حویلی لے کر آیا تھا، وہ فریدہ سے مل کر اسے اپنے باپ کے اس ظلم کے خلاف لڑنے پر اُکسانا چاہتی تھی لیکن جب اس نے فریدہ سے ملاقات کے خیال سے اپنے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی تو اتنی بری طرح سر چکرایا کہ پھر وہ ہمت ہی نہیں کر سکی۔ طبیعت میں عجیب سا بھاری پن تھا۔ یہاں تک کہ ملازمہ رات کے کھانے کا پوچھنے آئی بھی تو اس نے انکار کر دیا۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ رانی اس کے ساتھ حویلی واپس نہیں آئی تھی۔ اسے واپس چودھرائن کی طرف سے حکم بھجوایا گیا تھا کہ وہ لاہور والی کوٹھی میں ہی رک کر حاجرہ کے ساتھ کوٹھی کا کام کاج دیکھے۔ کشور نے اس حکم پر احتجاج کیا تھا لیکن اس کے احتجاج کو خاطر میں نہیں لایا گیا اور رانی کو لاہور میں رُکنا پڑا۔ رانی کے بغیر وہ خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ وہی تھی جو اس کی آفتاب تک رسائی کو ممکن بناتی تھی۔ وہ نہیں تھی تو نہ تو پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ تھا، نہ ہی ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جا سکتی تھی۔ حویلی کے سازشی ماحول میں رانی جیسی وفادار ملازمہ کے بغیر موجودہ صورتِ حال میں رہنا اسے عذاب ناک لگ رہا تھا۔ اتنا عذاب ناک کہ سوچ سوچ کر سر چکرانے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے چکراتے سر کو تکیے پر اِدھر اُدھر پٹکتی نیند کے مہربان ہونے کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور پھر فوراً ہی نچھی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے تھام رکھی تھی۔

''کھانا کھالیں بی بی! وڈی دیر ہوگئی ہے۔ رات میں خالی پیٹ سونا صحت کے لیے چنگا نہیں ہوتا۔'' کشور کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

''تجھ سے کس نے کہا تھا کھانا لانے کو؟ چل جا یہاں سے۔ مجھے نہیں کچھ کھانا وانا۔'' نچھی سے پہلے ہی اس کی جان جلتی تھی اور اس وقت تو ویسے ہی طبیعت بڑی عجیب ہو رہی تھی اس لیے بالکل بھی برداشت نہیں کر سکی اور نچھی کو ڈپٹ کر رکھ دیا۔

''یہ میرے کہنے سے آئی ہے۔'' نچھی اُس کے حکم پر واپس پلٹتی، اس کے بجائے کمرے میں وڈی چودھرائن کی آواز گونجی۔ وہ شاید نچھی کے پیچھے پیچھے ہی وہاں تک آئی تھی اور اب بالکل عین وقت پر دخل انداز ہوئی تھی۔

''مجھے معلوم ہے، رانی کے شہر میں رکنے کی وجہ سے تجھے پریشانی ہوگی اس لیے میں نے نچھی کو حکم دیا تھا کہ



[illegible] رانی حویلی میں نہیں ہے، اسے تیرا خیال رکھنا ہوگا۔ چل اب اُٹھ اور اُٹھ کر کھانا کھا لے تاکہ اس [illegible] ایوی بھی ختم ہو۔'' چودھرائن کی طرف سے محبت کا یہ اظہار درحقیقت اس کی بے بسی سے لطف اندوز [illegible] لیے کیا جا رہا تھا۔

''میرا جی نہیں کر رہا وڈی ماں!'' وہ وڈی چودھرائن کے احترام میں لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی لیکن کھانا [illegible] بھی آمادہ نہیں تھی۔

''جی نہیں کر رہا، تب بھی تھوڑا سا کھا لے۔ تیری طبیعت پہلے ہی صحیح نہیں، بھوکی رہ کر اور کمزور ہو جائے [illegible]'' چودھرائن اس واقعے کے حوالے سے اس کی طبیعت کو خراب قرار دے رہی تھی جب وہ چودھری کو فریدہ [illegible] قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی اور عالم طیش میں چودھری کے مقابل کھڑی ہو [illegible]۔ اس وقت چودھری نے خود کو بچانے کے لیے اسے ذہنی طور بیمار قرار دیتے ہوئے علاج کے بہانے [illegible] یا تھا حالانکہ درحقیقت خود اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا کہ اپنی چوری پکڑی جانے کے بعد بیٹی کا سامنا کر [illegible] اس سے نظر ملا سکے۔

''تو کیا ابھی تک ٹرے پکڑے کھڑی ہے؟ یہاں رکھ بی بی کے سامنے۔'' اس بار چودھرائن نے نچھی کو [illegible] ہوئے حکم دیا تو اس نے ٹرے کشور کے سامنے رکھ دی۔ کشور کو اندازہ ہو گیا کہ وڈی چودھرائن ایسے ٹلنے [illegible] نہیں۔ چاہے اسے دوبارہ اس قید خانے میں بلا لینے کی خوشی میں اس کی بے بسی سے حظ اُٹھانے کے لیے ہی [illegible] اس وقت اس کی ہمدرد بنی کھڑی تھی تو وہ اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ دل پر [illegible] ہوئے اس نے کھانے سے بھری ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال کر روٹی [illegible] منہ میں رکھا۔ لقمہ منہ میں رکھتے ہی اسے زور کی ابکائی آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف [illegible] لیکن اس بری طرح سر چکرایا کہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ اگر بروقت نچھی اسے سہارا نہ دیتی تو وہ فرش پر گر [illegible]۔ نچھی کے سہارے وہ نڈھال سی اپنے بستر تک پہنچی۔ منہ میں رکھا لقمہ تو پیلے پیلے پانی کے ساتھ پہلے ہی [illegible] تھا۔ بستر پر بیٹھنے کے بعد بھی اسے دوبارہ ابکائی آئی۔ اس بار اس کے پیٹ سے صرف پانی نکلا۔

''ڈرائیور سے کہہ نچھی! کہ ہسپتال سے ڈاکٹرنی کو لے کر آئے۔ ڈاکٹرنی آ کر دیکھے تو معلوم ہو کہ کیا ہوا ہے [illegible] کو؟'' کشور دوہری اُلٹیوں کے بعد پیلی پڑ گئی تھی اور اب بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نڈھال سی لمبے لمبے [illegible] لے رہی تھی۔ اس کی حالت کا بغور جائزہ لیتی چودھرائن نے سرد سے انداز میں نچھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اس [illegible] کی تعمیل کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

''اور ہاں، اس کی ماں کو بھی خبر کر دینا دِھی کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں۔ اس کو اپنی نیندیں [illegible] کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی، دِھی کی خبر کیا خاک رکھے گی۔'' یہ دوسرا حکم وڈی چودھرائن نے نچھی کے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے جاری کیا تھا جسے سن کر نچھی تو سر ہلاتی باہر کی طرف دوڑ گئی لیکن نڈھال سی کشور کے [illegible] عجیب سا احساس جاگا۔ وڈی چودھرائن کے کٹیلے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور [illegible] دیا تھا۔ ابتر ہوئی حالت کے باوجود وہ اس کی بات پر غور کرنے لگی۔ یک دم ہی اس کے اندر ایک احساس [illegible] جاگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ سوچنے کے نتیجے میں جو خیال ذہن میں اُبھرا، اس نے اُسے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ [illegible] نڈھال سی بیٹھی تھی، بیٹھنے کی سکت بھی کھو بیٹھی اور بستر پر لڑھک سی گئی۔ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں [illegible] ہوئے یہ خیال تو ذہن میں آ ہی نہیں سکا تھا کہ کبھی ایسی کسی صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

''کیا گل ہے وڈی آپا! کیا ہوا ہے کشور کو؟'' وہ آنکھیں بند کیے خوف زدہ سی لیٹی تھی کہ اسے اپنی ماں

چودھرائن ناہید کی پریشان اور بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ اُلٹیوں پر اُلٹیاں کر رہی ہے۔ اب کیا ہوا ہے؟ یہ تو ڈاکٹرنی بتائے گی۔ ڈرائیور کو بھجوایا ہے میں نے ڈاکٹرنی کو لانے کے لئے۔'' وڈی چودھرائن کے طنز بھرے ہی اندر مزید سہمتے ہوئے کشور نے آنکھوں کے درمیان ذرا سی جھری بنا کر کمرے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں جبکہ وڈی چودھرائن اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھی فرش سا شادو کا جائزہ لے رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے کشور؟..... کیا اُلٹا سیدھا کھا لیا تھا جو ایسے طبیعت خراب ہوگئی؟'' چودھرائن ناہید کے قریب آ کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے لرزتی آواز میں پوچھا۔ کشور اُس کی بات کے جواب میں کچھ اور چپ چاپ پڑی رہی۔ خاموشی سے بوجھل پریشان کن لمحات آخر کار کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ ہی ڈاکٹر ماریہ حویلی آ پہنچی۔ آتے ہی اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کشور کا چیک اپ کیا اور اس کے کھانے متعلق چھوٹے موٹے سوالات کئے۔ چیک اپ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی وڈی چود طرف پلٹی اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے چودھرائن صاحبہ! ایسا کوئی تشویش ناک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ آ لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ.....'' اس ''کہ'' کے آگے وہ جو بھی کہنے والی تھی، وہ حویلی کے در و دیوار کو لرزا تھا۔ آنے والے طوفان کی آہٹیں سنتی چودھرائن ناہید کا دل چاہا کہ وہ ڈاکٹر ماریہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ا بھی کہنے سے روک دے۔ جبکہ خود کشور کا یہ حال تھا کہ طبیعت کی خرابی سے اس کا پیلا پڑ جانے والا چہرہ زردی سے مل کر اور بھی پیلا ہو گیا تھا۔

کمرے میں موجود تمام نفوس ڈاکٹر ماریہ کا جملہ مکمل ہونے کے انتظار میں اپنی سانسیں روکے ہو ڈاکٹر ماریہ نے ان سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''آپ لوگوں کے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ میں اپنے ساتھ گلوکوز اور ضروری انجکشن وغیرہ لے کر آئی میں انہیں ابھی ڈرپ لگا دیتی ہوں۔ اُلٹیوں کی وجہ سے جسم میں پانی کی جو کمی ہوگئی ہے، وہ پوری ہو جائے ڈاکٹر ماریہ جوں جوں بولتی جا رہی تھی، وہاں موجود افراد کے چہروں کی رنگت میں تغیر آتا جا رہا تھا۔ چود ناہید کے چہرے کی گھبراہٹ بتدریج اطمینان کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ کشور کے چہرے کی زردی میں واقع ہوئی تھی جبکہ وڈی چودھرائن کے چہرے پر مایوسی کے رنگ تھے۔ وہ تو منتظر تھی کہ کوئی ایسی بات سا جائے جس کے ذریعے وہ سوکن کو ذلیل کرنے کا موقع نکال سکے۔ لیکن ڈاکٹر ماریہ کے الفاظ اُس کی اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز ڈاکٹر ماریہ نے اپنی بات جاری رکھی ہوئی تھی

''یہ ڈائریا کی بالکل ابتدائی اسٹیج ہے۔ ایک آدھ میڈیسن اور ڈرپ سے معاملہ سنبھل جائے گا۔ اُلٹیو وجہ سے انہیں ڈی ہائیڈریشن ہوگئی ہے۔ میں گلوکوز چڑھاؤں گی تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر ماریہ کی کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی مصروفِ عمل تھے۔ اپنا بڑا سا بیگ کھول کر وہ اس میں سے ٹریٹمنٹ کا نکالتی جا رہی تھی۔

ادھر وڈی چودھرائن پر اوس پڑ گئی تھی۔ تاجور کی زبانی اس نے کشور کے لاہور کے قیام کے عرصے کے حلیے کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے وہ شک میں پڑ گئی تھی۔ تاجور نے اسے بتایا تھا کہ کشور نئی نویلی دلہن کی طرح ہاتھ پیروں پر مہندی لگا رکھی تھی۔ اگرچہ اس بات کو کشور کی ذہنی کیفیت کی خرابی سے



لیکن وڈی چودھرائن کھٹک سی گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ کشور کوئی گل کھلا چکی ہے اور اس کا نتیجہ آج سامنے آنے والا ہے۔ لیکن خلافِ توقع بات کچھ اور ہی نکلی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ نے بتایا تھا کہ کشور ڈائریا کا شکار ہوئی ہے اس اطلاع کو سن کر وڈی چودھرائن کو مایوسی ہوئی تھی۔ سوتن کو نیچا دکھانے کا ایک سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ حویلی کی خواتین میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ چودھری کے بعد حویلی میں اس کا ہی حکم چلتا تھا۔ لیکن سوتن کا جلاپا اس عمر میں بھی اس کے دل میں برقرار تھا۔ چودھرائن ناہید اگرچہ اس کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پھر بھی وڈی چودھرائن اسے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اپنی ملازمۂ خاص رحمتے کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ کشور کے پاس موبائل ہے، وہ مسلسل کھوج میں لگی ہوئی تھی کہ کشور کو کسی طرح رنگے ہاتھوں پکڑ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے رحمتے کی بیٹیوں نچھی اور شادو کو کشور کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس وقت اُمید بندھی تھی کہ کوئی ایسا سامنے آ جائے جسے کشور کی مشکوک سرگرمیوں کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کو ڈرپ لگانے کی تیاریوں میں مصروف چھوڑ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو بیٹھ ناہید! اپنی دِھی کے پاس۔ میں تو اب آرام کرنے جا رہی ہوں۔ نہ جانے کیا الا بلا کھا بیٹھی ہے کہ آدھی رات ویلے پریشانی کھڑی کر دی ہے۔'' وہ مغرورانہ انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے نچھی اور شادو بھی تھیں۔

''آپ بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں چھوٹی چودھرائن! میں ہوں یہاں پر ان کی دیکھ بھال کے لیے۔ جانے سے پہلے اطلاع کر دوں گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو آپ کسی ملازمہ کو ان کے پاس بھیج دیجئے گا۔ ایسے تو میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے انہیں انجکشن لگا دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں انہیں نیند آ جائے گی اور آرام سے سو جائیں گی۔ اس لیے میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گی کہ فکر نہ کریں اور آرام سے جا کر سو جائیں۔'' وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریہ نے چودھرائن ناہید سے کہا تو وہ بھی فوراً ہی باہر نکل گئی۔ حویلی کی پُرتعیش زندگی میں جہاں دن رات ملازمائیں خدمت کے لیے حاضر رہتی تھیں، مالکوں میں شمار خواتین کو خود سے ہاتھ پیر ہلانے کی قطعی عادت نہیں رہی تھی۔ ان کے بچے ملازماؤں کی گود میں پل کر بڑے ہوئے تھے اور انہیں عادت نہیں تھی کہ بیماری آزاری میں بچوں کے سرہانے بیٹھ کر خدمت کریں۔ اس وقت بھی چودھرائن ناہید نے کشور کے کمرے میں رُکنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک ایک قابل ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے کشور کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ خود کو بے آرام کرنے کے بجائے اس نے ڈاکٹر ماریہ کے مشورے کو قبول کرنا بہتر سمجھا۔

''کشور نے اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکلنے کا منظر دیکھا تو کرب سے آنکھیں موند لیں۔ محبتوں کے معاملے میں وہ سدا قلاش رہی تھی۔ قیمتی ساز و سامان سے بھری اس حویلی میں ہر طرح کا آرام تھا لیکن رشتوں کے درمیان وہ جذبہ نہیں تھا جو انہیں ایسی پائیداری بخشتا کہ وہ آفتاب کی طرف بڑھنے والے اپنے قدموں کو روک پاتی۔ اس کی پیاسی روح کو سیراب کرنے والا جامِ محبت آفتاب کے پاس تھا چنانچہ وہ ہر خطرے کو پس پشت ڈال کر اس کی اور سفر کرنے پر خود کو مجبور پاتی تھی۔ آفتاب کی زندگی میں آمد کے بعد اس نے جانا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور زندگی کب پیاری لگتی ہے۔ آفتاب کی محبت اس کی ساری زندگی کی محرومیوں کا مداوا بن گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اپنی سگی ماں کی بے نیازی کو دیکھا تو یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ جو کچھ میں کر گزری ہوں، وہ قطعی جائز اور مناسب ہے۔ وہ رشتے جنہیں میری پروا نہیں، میں ان کی خاطر محرومیوں کو اپنی جان سے

کیوں لگا کر رکھوں؟''

''فی الحال تو میں نے آپ کو مشکل سے بچا لیا ہے لیکن آگے کیا ہوگا یہ آپ نے سوچا ہے یا
خیالات میں غلطاں و پیچاں کشور کے کانوں سے ڈاکٹر ماریہ کی آواز ٹکرائی تو وہ بری طرح چونکی اور نا
انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر ماریہ کا جملہ کچھ مبہم لیکن کافی معنی خیز تھا۔ وہ جو ذرا مطمئن ہو
ایک بار پھر پریشان ہوگئی۔

''کک.....کیا مطلب؟'' اٹکتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریہ سے پوچھا۔

''مطلب تو آپ مجھ سے بہتر جانتی ہوں گی۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں نے آپ کے جسم میں جس
سراغ لگایا ہے، آپ خود اس سے کیسے ناواقف ہوسکتی ہیں؟ آپ کی رضامندی کے بغیر تو آپ کے جسم
نئے وجود کی داغ بیل نہیں ڈالی گئی ہوگی؟'' ڈاکٹر ماریہ کا طرزِ تخاطب اگرچہ ویسا ہی تھا جیسا حویلی کی کسی
سے بات کرتے ہوئے ہونا چاہئے تھا لیکن اس احترام کے ساتھ ایک محسوس کن کٹیلا پن بھی تھا۔ کشور کو
لہجے و انداز کی کسی ادا پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ تو ابھی ڈاکٹر ماریہ کے کیے گئے انکشاف
والے طوفان کی زد میں تھی۔ ڈاکٹر ماریہ نے اسے کیسی خبر سنائی تھی؟ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس خبر کو سن
ہو یا اس خوف سے نمٹے جس نے دل کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اپنے محبوب شوہر کی نشانی کے اپنے
سانس لینے کی خبر نے فطری طور پر ہر عورت کی طرح اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی خوشگوار سا انتشار
تھا لیکن اس کے ساتھ ہی راز کھل جانے کا خوف بھی جڑا تھا، سو وہ پوری طرح خوش ہونے میں ناکام تھی۔
معلوم تھا کہ جیسے ہی یہ خبر حویلی والوں کو ملے گی، حویلی میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ حویلی کا قانون بغیر
کے اس کے لیے سزائے موت تجویز کر دے گا۔ وہ زندگی جو ابھی کچھ عرصے سے ہی اچھی لگنے لگی تھی، ا
محروم ہو جانا اب اسے منظور نہیں تھا۔ خصوصاً یہ جاننے کے بعد کہ وہ کائنات کے سب سے عظیم رتبے
ہونے والی ہے، اسے زندگی کی اور بھی شدت سے خواہش ہونے لگی تھی۔

''پلیز ڈاکٹر! میرے اس راز کو راز ہی رکھئے گا۔ اگر یہاں کسی کو اس بات کا علم ہوگیا تو یہ لوگ
سے ماردیں گے۔'' اس نے ڈاکٹر ماریہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

''اوکے! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی لیکن سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ آخر کب تک؟ یہ کوئی چھپنے والی
تو نہیں۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن کچھ عرصے بعد آپ کا جسم خود بولنے لگے گا۔ اس وقت آپ کیا
گی؟'' ڈاکٹر ماریہ کا سوال بالکل منطقی تھا۔

''میں اس سلسلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لوں گی۔ بس مجھے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔'' وہ خود بھی ا
آئندہ کا لائحہ عمل طے نہیں کر سکی تھی، سو ڈاکٹر ماریہ کو کیا بتاتی۔ فی الحال تو اسے تھوڑی سی مہلت مل جانے
آرزو تھی تا کہ اس مسئلے پر غور و خوض کر سکے۔

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ اتنا کو آپریٹ کر سکتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ چند ضروری
وغیرہ بھی میں آپ تک پہنچا دوں گی۔ پراپر ڈائٹ اور میڈیسن لیتی رہیں تو امید ہے کہ آپ کی حالت
رہے گی۔ اس عرصے میں آپ اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کر لیجئے گا۔'' ڈاکٹر ماریہ، کشور کے انداز سے
بڑھ کر اس کی مدد کر رہی تھی۔

''تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر!'' کشور نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ جس ماحول میں رہ رہی ہیں، وہاں اگر کسی



ا ہو گیا تو آپ کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے انسانی جان کو بچانا
ا فرض سمجھتی ہوں۔ آپ نے اپنی معاشرتی اور مذہبی حدود کو توڑا ہے تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں بہرحال
ا کے ناتے دو انسانی جانوں کا تحفظ زیادہ ضروری سمجھتی ہوں۔'' ڈاکٹر ماریہ کے انداز میں بے نیازی
ا لگی۔

آپ کی اس ہمدردی کے لیے ایک بار پھر بہت بہت شکریہ ڈاکٹر!..... البتہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ
ا میں پلنے والے بچے کے باپ سے میرا نکاح ہوا ہے۔'' کشور نے ڈاکٹر ماریہ کا شکریہ ادا کرتے
ا بات کی وضاحت ضروری سمجھی۔

تو بہت اچھا ہے کہ آپ کا بچہ جائز ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ حویلی کے مکین ہرگز بھی نہیں جانتے ہوں
آپ کا نکاح ہو چکا ہے اور یقینی طور پر یہ نکاح کسی ایسے شخص سے ہوا ہوگا جو حویلی والوں کے لیے ناقابل
ا۔'' ڈاکٹر ماریہ کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس نے اس کم عمری میں بھی ایک دنیا دیکھ رکھی ہے اور حالات
ا ایک ٹھیک تجزیہ کر سکتی ہے۔ کشور کے پاس اس کی باتوں کے جواب میں ایک خاموش اعتراف کے سوا
ا۔

اگر آپ چاہیں تو مجھے اپنا مکمل رازداں بنا سکتی ہیں۔ میں آپ کے ہسبنڈ سے مل کر آپ کے اس مسئلے کو
نے کی کوئی صورت نکال سکتی ہوں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے اسے پیشکش کی تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ڈاکٹر ماریہ
سے بہت مہربان ثابت ہو رہی تھی لیکن پہلی بار میں کسی پر اتنا اعتماد کر لینا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ اگر
پر ڈاکٹر ماریہ کی زبان پر سچ آ جاتا تو آفتاب کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور وہ یہ خطرہ مول نہیں
ا، چنانچہ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ کا شکریہ ڈاکٹر! لیکن فی الحال میں اس معاملے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ امید
آپ برا نہیں مانیں گی۔''

ا آپ کی مرضی۔ میری آفر بہرحال برقرار رہے گی۔'' ڈاکٹر ماریہ مسکراتے ہوئے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔
ا صبح میں آپ کی دوائیں اور ڈائٹ شیڈول بھجوا دوں گی۔ احتیاط کے ساتھ اپنا خیال رکھئے گا۔'' اپنا
ے سے لٹکاتے ہوئے وہ کشور سے بولی اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اگر آپ کہیں تو کسی ملازمہ کو آپ کے پاس بھیج دوں؟'' باہر نکلنے سے پہلے اس نے کشور سے سوال کیا۔

نہیں۔ میں اس وقت بالکل اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔'' کشور نے انکار کیا تو ڈاکٹر ماریہ شانے اچکاتے
ا کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد کشور نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔
ے ایک ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو گرداب میں گھرا محسوس کر رہی تھی۔ اس گرداب سے
ا طریقہ سوچتے سوچتے اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔

⊛----✪----⊛

ا میں بیٹھے ایک فائل کے مطالعے میں مصروف شہریار نے یک دم ہی فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے
ا آنکھیں موند لیں۔ پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے احساس نے اسے لاہور سے واپس آنے پر مجبور
ا۔ سجاد رانا کی موت کے بعد وہ اپنے شانوں پر خاندان کی ذمے داری کے بوجھ کو محسوس کر رہا تھا لیکن
ی کہ وہ جس سیٹ پر بیٹھا تھا اس کے بھی بہت سے تقاضے تھے۔ اس کے شانوں پر اپنے زیر نگیں ضلع

کے سینکڑوں خاندانوں کا بوجھ دھرا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کو مصلحتاً نظرانداز کر کے واپس نور کو
تھا۔ اسے یہاں رہ کر بہت سے معاملات کی نگرانی کرنی تھی۔ پیر آباد، نور پور اور اللہ آباد میں چ
منصوبے اس کی عدم توجہ کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ جاتے تو اسے ساری زندگی افسوس رہتا۔ اس نے
کا شوق پورا کرنے کے لیے اسسٹنٹ کمشنر کی ذمے داریاں قبول نہیں کی تھیں۔ وہ ایک حساس طبع
جوان تھا جو کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ جس کے دل میں لوگوں کو اپنی ذات سے بھلائی پہنچانے کی
اس اُمنگ نے اسے چودھری افتخار جیسے مگرمچھ سے بیر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چودھری نے اس
عرصے میں ہی اسے اچھا خاصا زِچ کر دیا تھا۔ اس کے منصوبے اور ارادے چودھری کے مفادات
تھے چنانچہ پہلے تو اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اس کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی اور اشاروں کنایوں
اس کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ شہریار نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ براہِ راست
تصادم کی نوبت نہ آئے لیکن اس کوشش میں بہرحال وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کا مرتکب تو نہیں
چنانچہ نتیجہ چودھری سے چپقلش کی صورت میں ہی نکلا۔

اسے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد چودھری اوچھے
اُتر آیا تھا جس کی سب سے بڑی مثال بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر اسے کھانے میں نشہ آور شے
بعد اس کی ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ قابل اعتراض تصاویر اُتارنے کی صورت میں موجود تھی۔ اگر ڈاکٹر ماریہ
تعاون نہیں کرتی تو وہ بری طرح چودھری کی اس چال میں پھنس جاتا۔ ڈاکٹر ماریہ کے تعاون کے
قابل ہو سکا تھا کہ ان خوفناک تصویروں کو حاصل کر کے ضائع کر سکے لیکن یہ بات وہ بھی جانتا
آخری وار نہیں تھا جو چودھری نے اس پر کیا تھا۔ وہ جب تک چودھری کے مفادات کے خلاف کام
چودھری کی نظروں میں کھٹکتا رہتا۔

پیر آباد سمیت اردگرد کے کسی بھی گاؤں میں کسی سہولت کی فراہمی اور تعلیم کا پھیلاؤ چودھری کے
قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ چودھری اور اس جیسے دوسرے افراد رعایا پر اسی وقت تک حکمرانی کر سکتے تھے
کا شعور سویا رہتا۔ شعور کو سلائے رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے
بنیادی ضروریات اتنی ترسا ترسا کر فراہم کی جائیں کہ وہ ان ضروریات کے حصول میں ہی اُلجھ کر
شہریار اپنے ضلع کے عوام کو ان دونوں طرح کی مشکلات سے نکالنے کا خواہاں تھا چنانچہ اس کی اور
عداوت تو لازمی تھی۔ اس عداوت نے شہریار کے احساسِ ذمے داری کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ عام
شاید وہ تھوڑا بہت ڈھیلا پڑ بھی جاتا لیکن موجودہ صورتِ حال نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس
کسی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ذاتی طور پر بے حد دُکھی اور رنجیدہ ہونے کے باوجود
ادائیگی کے لیے ایک بار پھر میدان میں اُتر آیا تھا۔ خاندانی ذمے داریوں کے مقابلے میں یہ فریضہ
زیادہ ضروری تھا، خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کا خاندان بہرحال کوئی لاوارث اور بے سہارا خاندان
بہت سے رشتے دار اور دوست تھے جو ان مشکل گھڑیوں میں دلاسے کے لیے رانا ہاؤس آتے
تھے۔ خود وہ بھی ان سے مکمل طور پر غافل نہیں تھا۔ رابطوں کی آسانی نے کم از کم اتنی مدد تو کی تھی
چاہتا، فون پر لاہور بات کر لیتا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے بھی جایا جا سکتا تھا چنانچہ
طرح ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد وہاں سے واپس آ گیا تھا لیکن یہ طے تھا کہ جو عظیم دکھ ملا تھا، اس
سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔



اسے اچانک بہت شدت سے سجاد رانا کی یاد آئی تھی اور وہ اپنا کام روک کر بیٹھ جانے پر
بھائیوں سے بڑھ کر محبت کرنے والے سجاد رانا کی موت کا صدمہ ایسا نہیں تھا جس کے اثر
سے نکال سکتا۔ سینے میں اُٹھتے جوار بھاٹے کے زیر اثر آنکھیں بند کیے بیٹھے کتنا وقت گزرا، وہ
کام۔ انٹرکام بجا تو وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

عبدالمنان! بولو کیا بات ہے؟'' اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ خیال یہی تھا کہ کوئی بے وقت
صاحب سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے آیا ہوگا۔ پوسٹنگ کو کافی وقت گزر جانے کے باوجود
سلسلہ رکا نہیں تھا۔ اُس کے سرد رویے کے باوجود بھی بعض ڈھیٹ قسم کے ملاقاتی قسمت آزمائی کے
آتے تھے۔

آباد سے ایک بہت بری خبر آئی ہے سر! آپ کو اس کے بارے میں بتانا تھا۔'' عبدالمنان کا جواب
تھا۔

آفس میں آ جاؤ۔'' اس نے مختصر جواب دے کر انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔ اللہ آباد سے کسی بری خبر
سن کر وہ خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اللہ آباد سے جڑی کوئی بھی بات اب تک خوش کن
ہوئی تھی۔ اللہ آباد وہی گاؤں تھا جہاں شاہنواز نامی شخص نے دینی مدرسے کے نام پر معصوم اور
نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے ان سے وطن کے خلاف کارروائیاں کروانے کا اڈا کھول رکھا تھا۔
ثبوت و شواہد سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ شاہنواز کوئی عالم دین یا مفتی وغیرہ نہیں تھا بلکہ پڑوسی ملک سے
والا ان کی کسی خفیہ ایجنسی کا رُکن تھا جو اس پس ماندہ سے گاؤں میں رہ کر اپنے ملک کے مفاد میں
رہا تھا۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے ذہن کو بھٹکا کر انہیں پاکستان کے خلاف ہی
سے بڑھ کر بھلا کس بات سے بھارت کا مفاد وابستہ ہو سکتا تھا؟ وہ تو بھلا ہوا کہ اللہ آباد سے تعلق
نوجوان عبدالمتین کو شہریار نے عین اس وقت شناخت کر لیا جب وہ نور پور میں ہسپتال و سکول
تعلق رکھنے والی افتتاحی تقریب میں خودکش حملہ آور کی صورت میں ظاہر ہوا۔

شہریار، عبدالمتین کو نور پور والے حادثے سے پہلے سے جانتا تھا۔ عبدالمتین وہ نوجوان تھا جس کی بہن کو
نے اغوا کر لیا تھا۔ لڑکی کا باپ، شہریار کے پاس اس کے اغوا کے سلسلے میں شکایت کرنے آیا تھا لیکن
ایس پی معظم تارڑ اور اس کے ماتحت نے شہریار کو گمراہ کر کے اُلٹی کہانی سنا دی تھی۔ اصل حقائق بہت
شہریار کے سامنے آئے لیکن اس وقت تک عبدالمتین کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ بہن کے ساتھ ہونے والی
اور قانون کی بے نیازی نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا کہ وہ شاہنواز کا آلۂ کار بن کر نور پور کی افتتاحی
میں خودکش حملہ کرنے پہنچ گیا۔ اس حادثے میں خودکش حملہ آور عبدالمتین سمیت کئی لوگ مارے گئے
واقعات کی کڑیاں جوڑتا ہوا شہریار، اللہ آباد میں واقع شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو شاہنواز
تھا۔ لیکن ایسے ثبوت ضرور مل گئے جن سے اس کا پڑوسی ملک سے تعلق ظاہر ہو گیا۔ اس موقع پر شاہنواز
پر سے پردہ اُٹھنے کے علاوہ پیر آباد کی مسجد کے مفرور امام غلام محمد کے بارے میں بھی پتہ چلا تھا۔ قوم
میں شامل غلام محمد نے بھی ایک امام اور معلم کی شخصیت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ ماہ بانو کا اکلوتا
کی اندھی ہوس کا نشانہ بن کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ غلام محمد اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر اللہ آباد
کے مدرسے میں ہی چھپا تھا اور پھر شہریار اور اس کی ٹیم کے چھاپہ مارنے سے قبل ہی وہاں سے بھی
تھا۔ اتنے بہت سارے ناخوشگوار واقعات کے ساتھ جڑے اللہ آباد کے نام والے گاؤں سے ایک اور

بری خبر کے بارے میں سن کر شہریار مضطرب ہو اُٹھا اور بے چینی سے عبدالمنان کے اپنے دفتر میں آ
کرنے لگا۔ عبدالمنان کو وہاں پہنچنے میں ایک منٹ سے بھی قلیل وقت ہی لگا ہوگا لیکن اس قلیل و
اس کی بے قراری دیدنی تھی۔

''ہاں عبدالمنان! بولو کیا مسئلہ ہے؟ کیا خبر آئی ہے اللہ آباد سے؟'' عبدالمنان اندر آیا تو اُس
چہرے کے گمبھیر تاثرات کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عبدالمنان اچھا خاصا سیلف کنٹرولڈ آدمی تھا لیکن
اس کے چہرے سے جو کیفیت جھلک رہی تھی، اسے دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ کوئی بہت ہی اندو
پیش آیا ہے۔

''خبر بہت افسوس ناک ہے سر! میں تو سن کر کانپ اٹھا ہوں کہ سگے ماں باپ بھی اتنے
ہیں۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ اللہ آباد میں رہنے والے ایک جوڑے نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دو
کر کے گھر میں ہی دفن کر رکھا تھا۔ رات وہ اپنے تیسرے بچے کو بھی ذبح کرنے جا رہے تھے کہ
ہو گیا اور انہوں نے دخل اندازی کر کے انہیں اس مذموم حرکت سے روکا۔ اب وہ دونوں میاں بیوی
ہیں اور ان سے اس حرکت کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔'' عبدالمنان کی دی ہوئی اطلا
خیز تھی۔ ماں باپ جیسے عظیم رشتے کا یہ بھیانک روپ بے حد دل دہلا دینے والا تھا۔ اس خبر کو
صاحبِ دل شخص رنج محسوس نہ کرتا، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ والدین جو اپنی اولاد کی پیدائش سے بھی
کے متعلق سوچنا، خواب دیکھنا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہی اپنی اولاد کو
سے ہلاک کر دیں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ انسان کوئی جانور بھی پالے تو اس سے محبت ہو جاتی ہے
ضرورت کے تحت خود سے جدا کرتے ہوئے دکھی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے بچوں کو جن کی اس نے
حفاظت کی ہوتی ہے، زمانے کے سرد و گرم سہہ کر انہیں ہر سختی سے بچانے کی کوشش کی ہوتی ہے
بے دردی سے کیسے ہلاک کیا جاسکتا ہے؟

''اس جوڑے کے پڑوسیوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ لوگ اپنے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے جا
دکھ کے شدید احساس کے تحت شہریار نے واقعے کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سوال
''پڑوسی بچے کی ماں کے بلند آواز میں رونے پر جاگے تھے۔ آدھی رات کے وقت انہوں
عورت کے زور زور سے بین کرنے کی آوازیں سنیں تو وہ نیند سے جاگ کر اس کے گھر کی طرف بھا
دروازہ بجایا لیکن دروازہ نہیں کھولا گیا۔ البتہ اندر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے عورت کا شوہر اس
اسے پیٹ رہا ہو۔ پڑوسیوں کو تشویش ہوئی اور ایک لڑکے نے دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازہ
کھول دی۔ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں عجیب منظر دیکھا۔ گھر کے صحن میں
کھڑی ہوئی تھی اور قبر کے قریب چھوٹا بچہ رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھنسا ہوا
آواز نہ نکال سکے۔ ایک پڑوسی، بچے کو بندشوں وغیرہ سے آزاد کرنے لگا جبکہ باقی اندر کی طرف
دونوں میاں بیوی موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شوہر ایک ہاتھ میں تیز دھار چھری اور دوسرے
بال جکڑے کھڑا تھا۔ اس نے عورت کو اس حد تک خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ منہ سے کوئی آواز بھی
رہی تھی۔ پڑوسیوں نے بڑی مشکل سے مرد کو قابو کیا پھر آس پاس کی عورتوں نے مل کر عورت کو سنبھا
بعد کہیں جا کر وہ اس لائق ہو سکی کہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس کے بچے کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور
بچوں کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔''



''اوہ مائی سیڈ..... یہ تو واقعی بے حد الم ناک صورتِ حال ہے جس کی اچھی طرح تحقیق ہونی چاہئے۔ ویسے
کہ پہلے دو بچوں کی ہلاکت کا پڑوسیوں کو کیوں علم نہیں ہو سکا؟ گاؤں دیہات میں تو لوگ ایک
اتنے غافل نہیں رہتے کہ انہیں ایک دوسرے کے حالات کا علم نہ ہو سکے۔ کم از کم لوگوں کو پہلے دو
اب پر تو ضرور چونکنا چاہئے تھا۔'' شہریار نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

''اب تک جو صورتِ حال سامنے آئی ہے سر! اس کے مطابق مجرم بہت چالاک اور منصوبہ ساز آدمی ثابت
اس نے سارا کام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا۔ پہلے بچے کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے اردگرد یہ
تھا کہ وہ بچے کو اس کی ضد پر گوجرانوالہ میں اس کی خالہ کے گھر رہنے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔
کے بارے میں بھی اس نے یہی بہانہ کیا کہ بڑے بچے کا دل خالہ کے گھر بہت زیادہ لگ گیا ہے
کہیں آنا چاہتا جبکہ دوسرا ابھی وہاں جانا چاہتا تھا اس لیے میں اسے بھی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ ساتھ ہی
مشہور کر دیا کہ بچے کی خالہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ بچوں کو مستقل اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے
اسکول میں داخل کروا کر ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دے۔ مجرم اپنے اردگرد والوں پر یہی
کہ وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ان کی خالہ کی یہ پیشکش قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی اس
کے لیے پوری پیش بندی کر لی تھی کہ آس پاس والے طویل عرصے تک اس پر شک نہ کر سکیں۔

''او مائی گاڈ! یہ تو بالکل ناقابلِ یقین صورتِ حال ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ آخر ایک باپ اس حد تک
کا دشمن کیوں بن گیا؟ کہیں وہ شخص نفسیاتی مریض تو نہیں ہے؟'' ساری تفصیلات سن کر شہریار نے
کی۔

''اس بارے میں ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے سر! اس شخص نے اس پورے واقعے کے پس منظر میں
اصل وجہ کے سلسلے میں ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔ پڑوسیوں وغیرہ سے اس کے بارے میں جو کچھ
ہے، اس کے مطابق وہ ایک بے حد جذباتی اور جوشیلا آدمی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے
نہیں دیکھا گیا لیکن دیگر معاملات میں اس کا جوش وخروش دیدنی ہوتا تھا۔ عرس میں شرکت کرنا، خاص
گاؤں کو سجانا، وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بزرگ کی قبر پر حاضری دینا اور کسی بھی پیر، مرشد یا ولی کی شان میں
سے بھی گستاخانہ کلمات سن کر کہنے والے کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے پر تُل جانا اس کے معمولات میں شامل
شخص کی کسی کرامت کا معمولی شہرہ ہو جانے پر وہ اس سے گہری عقیدت پیدا کر لیتا تھا۔ گاؤں والوں
بنیادی طور پر وہ ایک شریف آدمی ہے جس کی حد سے بڑھ کر مذہبی حساسیت کے علاوہ اس میں کوئی
تھی۔ اور بہرحال اُس کی اس حساسیت کو بھی لوگ بری نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔'' عبدالمنان کی گفتگو
تھا کہ وہ شہریار کو اطلاع دینے سے قبل خود ذاتی طور پر واقعے کی تمام تفصیلات حاصل کر چکا ہے۔ وہ
کار شخص تھا جسے اندازہ تھا کہ اُس کا افسر اُس سے کسی واقعے کے کن کن پہلوؤں سے متعلق سوال
کر سکتا ہے اس لیے ہر معاملے میں اپنی معلومات ممکنہ حد تک مکمل رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

''ان دونوں میاں بیوی کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟'' شہریار نے سوال کیا۔

''وہ لوگ یہیں نور کوٹ میں موجود ہیں۔ مرد تھانے میں ہے جبکہ عورت کی حالت کافی خراب تھی اس لیے
ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے اسے سکون آور ادویات دی ہیں تاکہ وہ ذہنی طور پر سنبھل سکے۔ بچ
والے بچے کو بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔'' عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا۔

''میں ان دونوں میاں بیوی سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ واقعے کا اصل محرک جان سکوں۔ یہ کوئی

معمولی حادثہ نہیں ہے۔ ہمیں اس کی گہرائی میں بھی جانا ہوگا تاکہ آئندہ کے لیے سدِ باب کیا جا سکے۔"
وقت بے انتہا سنجیدہ تھا اور پوری سنجیدگی سے اس واقعے کی تحقیقات کروانا چاہتا تھا۔ اس نوعیت کے کچھ
پہلے بھی اخبارات کے ذریعے اس کے علم میں آتے رہے تھے جن پر افسوس کرنے کے علاوہ وہ عملی طور پر
کر سکا تھا۔ ان واقعات کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے تھے لیکن اللہ آ
کے زیرِ نگیں تھا۔ چنانچہ وہاں پیش آنے والے اس افسوس ناک واقعے کی مکمل تحقیق پر وہ اپنا فرض سمجھتا تھا

"آپ جب چاہیں چل سکتے ہیں سر! میں ہسپتال اور تھانے دونوں جگہ ملاقات کا انتظام کروا دوں
وقت تک ویسے بھی میڈیا والے بھی متحرک ہو چکے ہوں گے۔ جائے حادثہ پر ان کا پہنچنا لازمی ہے۔
اب تک کھدائی وغیرہ کر کے پہلے ہلاک کیے جانے والے دونوں بچوں کی لاشیں دریافت کر لی گئی ہو
میڈیا کو تو اپنے مطلب کی بہت سی خبریں مل جائیں گی وہاں سے۔"

"پہلے جن دو بچوں کو ہلاک کیا گیا تھا، ان کی قبریں کہاں بنائی تھیں ان میاں بیوی نے؟" عبدا
جواب سن کر شہریار کو خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

"دونوں بچوں کی قبریں بھی گھر کے آنگن میں ہی بنائی گئی تھیں مگر قبریں بناتے ہوئے یہ احتیاط کی
کہ انہیں لیول میں رکھا گیا اور پھر ان پر پھولوں اور سبزیوں کے پودے لگا کر انہیں کیاری کی شکل دے
اسی لیے تو اردگرد والوں کو شبہ نہیں ہو سکا کہ گھر کے آنگن میں دو معصوم بچوں کی قبریں موجود ہیں۔"

"یہ سب کرنے کے لیے تو بہت زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو
اتفاقاً یا اچانک ہوا۔ سب کچھ پری پلانڈ تھا اور اب یہی معلوم کرنا ہے کہ ایک باپ نے ایسا منصوبہ کیونکر
دیا۔ میرے خیال میں ہم پہلے ہسپتال چلتے ہیں۔ عورت نے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے
جس طرح کا ری ایکشن ظاہر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مرحلے پر آ کر ٹوٹ گئی تھی اور
کوشش کریں تو اس سے پورا سچ اُگلوا سکتے ہیں۔" شہریار نے خیال ظاہر کیا جس کی عبدالمنان نے تائید کی

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! ہمیں واقعی اس عورت سے ملاقات کر کے اصل صورتِ حال جا
کوشش کرنی چاہیے۔"

"اوکے..... تو تم انتظامات کر لو۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ہسپتال چلیں گے۔ اور ہاں، آرڈر کر دو کہ عورت
میڈیا والوں کو دور رکھا جائے۔ میڈیا کے لوگوں کی یلغار سے گھبرا کر وہ بدک بھی سکتی ہے۔ میں چاہتا ہو
بہت نرمی اور احتیاط سے اس معاملے کو ہینڈل کر کے اصل صورتِ حال معلوم کی جائے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ابھی آپ کے آرڈرز پہنچا دیتا ہوں۔ سنا ہے آج ایس پی صاحب بھی کسی نجی
پر ضلع سے باہر ہیں اس لیے اس واقعے کو مکمل طور پر آپ ہی کو دیکھنا ہوگا۔" عبدالمنان اسے ایک اور اہم
دے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ شہریار کے پاس فی الحال آدھے گھنٹے کا وقت تھا۔ اس درمیانی وقفے کو ضائع
کے بجائے وہ خود کو کمپوز کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اس فائل کی طرف متوجہ ہو گیا جو
قبل اس کے زیرِ مطالعہ تھی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہسپتال میں حسب
میڈیا کے نمائندے موجود تھے اور اس کوشش میں تھے کہ انہیں ملزمہ سے ملنے کا موقع مل جائے۔ شہر
عبدالمنان ہسپتال پہنچے تو صحافی برادری نے انہیں بھی گھیرنے کی کوشش کی۔

"یقیناً یہ ایک نہایت افسوس ناک واقعہ ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں نے ذا
پر اس واقعے پر گہرا رنج محسوس کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ واقعے کی حقیقی وجوہات معلوم کر سکوں۔ اگر



ہوا تو ہم میڈیا کو بھی ضرور تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔" شہریار نے یہ مختصر بیان دیا اور صحافیوں کے
کو نظر انداز کرتا ہوا عبدالمنان کے ساتھ ہسپتال کے عملے کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا
بچوں کی ماں اور اپنے خاوند کی شریکِ جرم بتول بی بی کو رکھا گیا تھا۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے
عبدالمنان کی طرف جھک کر اس سے کوئی سوال کیا جس کے جواب میں عبدالمنان نے اثبات میں
ہلا دی۔ اس کے مثبت جواب پر اطمینان محسوس کرتا ہوا شہریار لیڈی ایم آر او کے پیچھے کمرے میں داخل
لیڈی ایم آر او کے علاوہ ان کے ساتھ ہسپتال کے عملے کے جو افراد تھے، انہیں باہر رُکنے کی ہدایت کر دی
سفید چادر بچھے بیڈ پر ایک دُبلی پتلی قریباً تیس سال کی سانولی سی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ عورت کی آنکھیں
اور وہ ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بتول بی بی! ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل صاحب تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" لیڈی ڈاکٹر
مخاطب کیا تو اس نے بنا چونکے نظریں پھیر کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد ویرانی
محسوس ہوئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی بی بی؟ یہاں ہسپتال میں آپ کا خیال تو رکھا جا رہا ہے؟" شہریار نے نرم لہجے
مخاطب کر کے پوچھا تو اس کی ویران آنکھوں میں حیرانی کی لہر سی دوڑ گئی۔ یقیناً گرفتاری کے بعد سے
وہ مسلسل لوگوں سے لعن طعن ہی سن رہی تھی۔ ایسے میں کسی نے نرم لہجے میں بات کی تو وہ حیران رہ گئی
اثبات میں ہلکی سی جنبش دے کر شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

"آپ کے بچوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس پر مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ اپنے
کے جبر کے سامنے مجبور ہو گئی تھیں ورنہ میں جانتا ہوں کہ کوئی ماں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک
یا ان کے قتل میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ کے شوہر نے
کے بچوں کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیوں اور کس کے کہنے پر کیا؟" وہ عورت کے بیڈ کے قریب ہی رکھی
پر بیٹھ چکا تھا اور بے حد نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن عورت نے اس کی نرمی کے
کوئی جواب نہیں دیا اور سر کو زور زور سے نفی میں حرکت دینے لگی۔

"دیکھیں مجھے معلوم ہے کہ اصل مجرم آپ کا شوہر ہے۔ اگر آپ اس کے فعل میں دل سے شامل ہوتیں تو
بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے موقع پر ہرگز بھی احتجاج نہیں کرتیں۔ یقیناً جو کچھ ہوا، وہ کسی مجبوری
سے ہوا۔ لیکن جب تک آپ ہمیں اپنی اس مجبوری کے متعلق بتائیں گی نہیں، ہم اس ظلم کے خلاف کوئی
کارروائی نہیں کر سکیں گے۔" شہریار نے عبدالمنان کو خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے عورت کو سمجھانے کا سلسلہ
رکھا۔ عبدالمنان اس کے اشارے پر دروازے کی طرف لپکا اور دوسری طرف اپنے انتظار میں کھڑے شخص
گود سے تقریباً تین سال کے بچے کو لے کر واپس عورت کے بیڈ کی طرف بڑھا۔ بچے کو دیکھتے ہی عورت تیزی
اٹھ کر بیٹھی اور اسے اپنی گود میں لینے کے لیے بانہیں پھیلائیں۔ شہریار کے اشارے پر عبدالمنان نے بچہ
کے حوالے کر دیا۔ بچے کو گود میں لے کر بتول بی بی اسے بے تحاشا چومنے لگی۔

"یہ بچہ آج صرف اس لیے زندہ ہے کہ آپ نے عین وقت پر اپنے شوہر کے ظلم کے خلاف احتجاج کر
۔ اگر آپ کل رات بھی پہلے کی طرح خاموش رہتیں تو اس بچے کی بھی اپنے دونوں بھائیوں کی طرح اپنے گھر
آنگن میں قبر بن چکی ہوتی اور آپ اپنی اولاد کو پیار کرنے کے لیے ترس جاتیں۔" بتول بی بی کی طرف
نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اسے احساس دلایا تو وہ رو پڑی اور مزید شدت کے ساتھ بچے کو پیار

کرنے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ یہ بچہ تو بچ گیا ہے لیکن اسے اپنے ماں باپ کے سائے سے دور رہنا پڑے گا رفاہی ادارے میں رہ کر بڑا ہوگا اور بڑا ہونے کے بعد اس سوال کا جواب ڈھونڈتا رہے گا کہ اس کے نے اس کے بھائیوں کو کیوں قتل کیا؟ اس بچے کی زندگی اپنے والدین کی شقی القلبی کے طعنے سنتے ہوئے گی اور ہوسکتا ہے کہ ردِعمل میں یہ خود بھی کوئی خطرناک مجرم یا جنونی قاتل بن جائے۔''

''رب نہ کرے۔'' شہریار کی بات سن کر عورت دہل کر بولی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ رب نہ کرے یہ بچہ کوئی مجرم، ڈاکو یا قاتل بنے۔ اسی لیے تو آپ سے ہوں کہ مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتائیں۔'' شہریار نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''اصل واقعہ تو مینوں آپ بھی سمجھ نہیں آیا۔ میرا خاوند نذیر محمد بڑا جذباتی اور اللہ والوں سے محبت والا آدمی ہے۔ کوئی اللہ والا اسے کچھ کہہ دے تو ضرور اس کی گل مانتا تھا۔ اس چکر میں کبھی اس کے شڈے بھی ہو جاتے تھے۔ کئی واری ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنی ساری آمدنی کسی مزار یا درگاہ پر دے دی لوگوں سے قرض ادھار لے کر یا فاقے کر کے گزارہ کرنا پڑا۔ ایسے موقعوں پر اگر میں نذیر محمد کو کچھ کہتی تو میری نہیں سنتا تھا۔ کہتا تھا، پگلی! یہ ادھر کی سختی آگے کی آسانی ہے۔ اللہ والوں کو خوش رکھیں گے اور ان مانیں گے تو آخرت میں بخشے جائیں گے۔ میں ہر واری اس کی گل مان جاتی تھی۔ خیر، ہمارے گاؤں شاہنواز صاحب نے مدرسہ کھول لیا۔ سارے ہی گاؤں والے ان کی وڈی تریف (تعریف) کرتے نذیر محمد تو ان کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ کہتا تھا، میں نے شاہنواز صاحب جیسا دریا دل، نیک اور سمجھ دار آدمی کوئی دُوجا نہیں دیکھا۔ سارا وقت وہ انہی کے گن گاتا رہتا تھا۔ میں بھی دو ایک دفعہ ان سے ملنے گئی تھی۔ بھی وہ وڈے چنگے لگے۔ میرے بچوں کو وڈا پیار کرتے تھے۔ ان کا دم کیا ہوا پانی میں اپنے کسی بیمار دیتی تو وہ فوراً بھلا چنگا ہو جاتا۔ ہور بھی جس ماملے میں ہم نے ان سے رائے لی، ہمیں فیدہ (فائدہ) میں اور نذیر محمد تو ان کے پکے پکے مرید بن گئے تھے۔ وہ جو کہتے ہم مانتے۔ پر فیر ایک ایسی گل ہوئی شاہنواز صاحب کی گل ماننے سے کانپ گئی۔ پر نذیر محمد ذرا نہ گھبرایا اور بولا کہ ہم وہی کریں گے جس شاہنواز صاحب نے مشورہ دیا ہے۔'' بتول بی بی یہاں تک بتانے کے بعد بری طرح ہانپنے لگی۔ اس کی دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میلوں دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ یقیناً شاید جذباتی انتشار نے اس کی یہ کر دی تھی اور اس کے دماغ میں وہ واقعات گردش کر رہے تھے جن کے بارے میں سوچنا بہ حیثیت ماں اس لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔

''شاہنواز نے تمہیں اور نذیر محمد کو کیا مشورہ دیا تھا؟ کیا اس نے کہا تھا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو ہلاک دو؟'' کسی حد تک بات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے عورت سے تیز لہجے میں پوچھا۔

''انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ جس طرح رب کے حکم پر اپنے پیارے بیٹے کی قربانی دینے کے لیے دل سے تیار ہو گئے تھے، اسی طرح ہمیں بھی بچوں کی قربانی دینی ہوگی۔ یہ قربانی دے کر ہم اللہ کی نظر میں سب سے اچھے ہو جائیں گے اور وہ ہمیں جنت وڈی چنگی جگہ دے گا۔ ادھر سونے کے محل ہوں گے، اچھے اچھے کھانے ہوں گے اور ہر وہ چیز ملے گی جس جی کرے گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ جنت میں ہمیں ہمارے بچے بھی واپس مل جائیں گے۔'' بتول بی کو سنبھال چکی تھی اور اب بڑی عقیدت مندی سے بتا رہی تھی۔



''کیوں، شاہنواز کے پاس کیا وحی آئی تھی جو اُس نے تم لوگوں سے یہ سب کچھ کہا؟'' شاہنواز وہ شخص تھا گاؤں سے پہلے ہی عبدالمتین سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ جو اپنے ساتھ گاؤں کے دونو جوانوں کو لے غائب ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کا ایجنٹ ہے۔ چنانچہ اس کے میں یہ جان کر کہ اس نے بتول بی بی اور نذیر محمد جیسے اَن پڑھ اور اندھی عقیدت رکھنے والے لوگوں کے اس کو اس بربریت کے راستے پر ڈالا تھا، وہ برداشت نہیں کر سکا اور بے حد غصے سے بولا۔

''وحی تو پیغمبروں پر آتی ہے جی۔ پر اللہ والوں کے پاس بھی بڑی بڑی کراتیں ہوتی ہیں۔ وہ اشاروں سے بھی سمجھ لیتے ہیں۔ شاہنواز صاحب نے بھی سمجھ لیا تھا۔ نذیر محمد نے انہیں اپنا ایک خواب سنایا تھا۔ خواب سن شاہنواز صاحب بولے کہ نذیر محمد! تیرا یہ خواب تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب جیسا ہے۔ تجھے ان کی پر عمل کرنا ہوگا۔ فیر دیکھنا تجھ پر رب کی کیسی رحمت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر نوچندی جمعرات کو یہ کام کے کا حکم دیا تھا۔ نذیر محمد سن کر رویا تو بڑا، پر اس نے کہا کہ رب کے حکم سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں۔ یہ تو میرا نصیب ہے کہ رب نے مجھے اس کام کے لیے چنا جس کے لیے پہلے وہ اپنے ایک نبی کو چن چکا ہے۔ بس نے ویسا ہی کیا جیسا اسے شاہنواز صاحب نے بتایا تھا۔ میں بھی اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر رب کی مرضی میں ہو گئی تھی، پر اس واری مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مدرسے پر چھاپے کے بعد ویسے ہی میرا جی کھٹک گیا نذیر محمد اپنے عقیدے میں پکا رہا۔ کہنے لگا، اللہ والوں کو دنیا دار لوگ اسی طرح تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں پڑ کر ہمیں کسی اللہ والے کے خلاف دل میں میل نہیں لانا چاہئے۔''

بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد شاہنواز کا کردار اور بھی کھل کر واضح ہو گیا تھا۔ دین داری اور بزرگی کی آڑ میں وہ شخص معصوم گاؤں والوں کی برین واشنگ کا کام کرتا رہا تھا۔ اس نے جس شخص کے مزاج میں ذرا بھی فتنے کے لیے گنجائش پائی، اسے راہ سے بھٹکا دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ بھٹکنے والا یہی سمجھتا رہا کہ وہ فلاح کی راہ پر چل رہا ہے۔ عبدالمتین والا واقعہ اتنا ناگہانی ہوا تھا کہ کسی کے ذہن سے نکل جاتا اور اب یہ واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ کم علم اور جذباتی دیہاتی نذیر محمد کو شاہنواز نے اس طرح گمراہ کیا تھا کہ وہ خود کو سنتِ ابراہیمیؑ کا پیروکار سمجھتے ہوئے اپنے دو معصوم بچوں کی جان لے بیٹھا۔ اگر نذیر محمد میں ذرا بھی فہم و شعور ہوتا تو اپنے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے لیکن عام آدمی کے خواب کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی رحیم و غفور نہیں۔ اللہ نے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محض آزمائش کی تھی۔ باپ کے ہاتھ بیٹے کے خون سے بہرحال رنگنے نہیں دیئے تھے۔ اس کی سوچ اور دونوں غلط تھے..... جس کا ادراک نہ رکھتے ہوئے اس نے اپنی دونوں اولادوں کو ہلاک کر ڈالا اور اس بعد تیسرے کی قربانی بھی دینے چلا گیا۔ اس طرح کی اندھی عقیدت مندی کو نفسیاتی عارضے کے سوا کچھ کہا جا سکتا۔ بتول بی بی کی زبانی معلوم ہونے والے حقائق نے شہریار سمیت عبدالمنان اور لیڈی ڈاکٹر کو اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔ جو لرزہ خیز حقیقت سامنے آئی تھی، اس نے ذہنوں میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ نے شاہنواز نے اور کتنے ذہنوں میں گمراہی کا بیج بویا ہوگا اور یہ بیج ایک دن پھر کسی طاقتور درخت کی صورت ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

''شاہنواز کے بارے میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ اس کا پڑوسی ملک سے بھی کوئی تعلق بنتا ہے، اس کی تمام منفی روائیوں سے میڈیا والوں کو تفصیلات سے آگاہ کر دو۔ حقائق سامنے آئیں تو شاید لوگوں میں شعور پیدا ہو

جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر گاؤں میں دینی تعلیم کے لیے مستند علماء کی تعیناتی ہو سکے۔ عالم دین
معاشرے کی تعمیر کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے لیکن اکثر ہم اس بات کو نظر انداز کر کے نیم خواندہ یا
افراد کو اپنا دینی راہنما بنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ پھر اس طرح کے بھیانک واقعات کی صورت میں ہی سا
ہے۔ بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق کو سن کر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے شہریار اس کے کمرے
تو اس نے عبدالمنان کو سب سے پہلا حکم یہی دیا۔

''او کے سر! میڈیا والوں کو تو میں ابھی فوری طور پر بریف کر دوں گا، باقی آگے کی جو پلاننگ آ
ذہن میں ہے اس کے لیے ظاہر ہے کچھ وقت اور وسائل درکار ہوں گے جس کے لیے میرا مکمل تعاون آ
وقت حاصل رہے گا۔'' عبدالمنان نے مستعدی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کی بات کا جواب

''ایسا کرنا کہ اس واقعے پر آفتاب کو اسپیشلی کچھ لکھنے کے لیے ضرور کہنا۔ وہ حساس اور دردمند
رکھنے والا آدمی ہے اس لیے اس کی تحریر میں خاصی اثر انگیزی پائی جاتی ہے۔'' شہریار نے ایک اور ہدایت
کی جس سے ظاہر ہے عبدالمنان کو اتفاق ہی کرنا تھا۔ لیکن اس کے کسی بھی طرح کے ردِعمل ظاہر کرنے
ہی ڈی ایس پی منظور تیز تیز چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب چلا آیا۔ اس وقت وہ لوگ ہسپتال کی عمارت
نکل چکے تھے اور گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ لوگ یہاں سے سیدھے تھانے
گے اور نذیر محمد سے ملاقات کریں گے۔ اس ملاقات کے بعد ہی میڈیا والوں کو واقعے کے متعلق بریف
جاتی۔ لیکن ڈی ایس پی منظور چہرے پر جس طرح کے تاثرات سجائے اور جس انداز میں سامنے آیا تھا
دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا ہے۔

''ابھی ابھی تھانے سے میرے پاس فون آیا ہے سر! مجھے افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی اچھی خبر نہیں
شہریار متوجہ ہوا تو ڈی ایس پی منظور نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''خیریت، کیا خبر آئی ہے تھانے سے؟'' شہریار کا ماتھا ٹھنکا۔

''خبر آئی ہے کہ ایک سپاہی نے ملزم نذیر محمد کو فائرنگ کر کے لاک اپ میں ہی ہلاک کر دیا ہے۔
میں سپاہی بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور جذبات میں یہ حرکت کر بیٹھا۔ تھانے کے دوسرے عملے نے اس
گرفتار کر لیا ہے لیکن وہ خود کو مجرم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ایک برے آدمی
کے صحیح انجام تک پہنچایا ہے، چنانچہ یہ قتل جرم نہیں بلکہ جہاد کہلائے گا۔'' ڈی ایس پی منظور کی بات سن کر ش
بے ساختہ دل چاہا کہ اپنے سر کے بال نوچ لے۔ عوام کی یہ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت ایک ایسا مسئلہ
کی وجہ سے کبھی بھی کام کرنے والوں کو صحیح پلاننگ کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ اب بھی
اور کون کون سے حقائق تھے جو نذیر محمد کی موت کے بعد ہمیشہ کے لیے پردے میں چلے گئے تھے۔ وہ زندہ
شاید اس سے شاہنواز کے بارے میں کوئی کلیول جاتا لیکن اب تو خالی لکیر پیٹنے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا

⊛----✪----⊛

''السلام علیکم ابا جی!'' ایئرپورٹ پر چیکنگ کے طویل مرحلے سے گزر کر چودھری افتخار ارائیول لاؤ
پہنچا تو اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ سامنے اس کا بڑا اور چہیتا بیٹا چودھری مراد لبوں پر مسکراہٹ سجائے
استقبال کر رہا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ مراد کے نیویارک میں قیام کے عرصے میں چودھری جب بھی و
تھا، مراد اس کے استقبال کے لیے ضرور پہنچتا تھا۔ خود وہ بھی ارائیول لاؤنج میں داخل ہوتے ہی بیٹے کو



کھوجنے لگتا تھا لیکن آج ذرا مختلف صورتِ حال تھی۔ وہ اپنے ہم سفر ڈیوڈ کی وجہ سے بری طرح اُلجھ
ایا جو ابتدا میں ایک اچھا ہم سفر اور دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی محسوس ہوا تھا، اچانک ہی خطرناک
چودھری نے اپنی عیار فطرت کی وجہ سے بھانپ لیا تھا کہ ڈیوڈ کا اس سے ملنا اور ماہ بانو کی تصویریں
اتفاق نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری کے لیے ماہ بانو کی کیا اہمیت ہے اور اب شاید وہ ماہ
لے اس سے کوئی ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چودھری کو کھانے پر مدعو بھی کیا تھا کہ کھانے کی میز پر
اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس ملاقات کا ایجنڈا کیا ہو گا، چودھری نہیں جانتا تھا لیکن اتنا
سمجھتا تھا کہ ڈیوڈ اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ کام یا مقصد کیا ہو سکتا ہے، اس
نے چودھری کو اُلجھا رکھا تھا۔ اسی اُلجھن میں گھرے ہونے کی وجہ سے اسے مراد شاہ کا خیال نہیں رہا تھا۔
کے مراحل سے گزر کر ارائیول لاؤنج میں پہنچنے تک ڈیوڈ کو کھوجنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن وہ تو جہاز
نے کے بعد گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چودھری کو اس کی کہیں ایک جھلک تک
نہیں آئی تھی۔

''خیریت تو ہے ابا جی! آپ کچھ پریشان پریشان سے لگ رہے ہیں؟'' مراد شاہ نے فوراً ہی اس کی
بھانپ لی۔

''کوئی پریشانی نہیں پتر! بس ادھر یہ لوگ ہم پاکستانیوں کی ایسے چیکنگ کرتے ہیں کہ طبیعت بری ہونے
ہے۔ اپنے ملک میں ہم اچھے بھلے عزت دار آدمی ہیں۔ لوگ جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں۔ لیکن یہ
، بندے کی ساری عزت خاک میں رول دیتے ہیں۔'' چودھری نے خود کو سنبھالتے ہوئے بہانہ بنایا تو
شاہ مسکرا دیا۔ یہ شکوہ تو چودھری ہر بار نیویارک آمد کے موقع پر کرتا تھا اور اب تو صورتِ حال ماضی کے
میں اور بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈا کرنے والے امریکی
پروپیگنڈے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ہر مقام پر مسلمانوں کے لیے بے حد سختی کا مظاہرہ کرنے لگے
اس سختی کے پیچھے ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو
ہیں اور ردِعمل میں مسلمان بھی کوئی کارروائی کر سکتے تھے۔ ساری دنیا پر جنگ مسلط کرنے والے اپنے
لگائے گئے شعلوں کی آنچ اپنے دامن میں لگنے سے سدا خوف زدہ رہتے تھے چنانچہ ان کے حفاظتی اقدامات
اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

''جانے دیں ابا جی!..... اپنا جی میلا نہ کریں۔ ہر جگہ کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہاں والے ہمارے لوگوں
لیے ذرا روکھی طبیعت کے ہیں، پر آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اپنے علاقے میں تو آپ کی بڑی عزت
نا۔'' مراد شاہ نے باپ کی دل جوئی کی کوشش کی اور انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

''سو تو ہے۔ اسی واسطے تو میں تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ واپس اپنے گاؤں آ جا۔ دنیا کا کون سا آرام ہے جو
نہیں ہے۔ اپنی حویلی میں ہر سہولت موجود ہے۔ فیر اُدھر رہ کر کسی کی نوکری شوکری بھی نہیں کرنی پڑتی۔ رب
کرم سے ہمارے پُرکھوں نے اتنا چھوڑا ہے کہ سات پیڑھیوں تک بھی بیٹھ کر کھائیں تو کم نہیں پڑے گا۔ تُو
خوامخواہ کی ضد لگا کر گوروں کی نوکری کر رکھی ہے۔ ورنہ تیرے لیے تو وہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ پچاسیوں
تیرے آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر گھومیں۔'' چودھری نے اپنی ہر بار کہی جانے والی بات ایک بار پھر بیٹے
سامنے دہرائی۔

''آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے ابا جی! لیکن میں کیا کروں، میرا مزاج ذرا مختلف ہے۔ مجھے لوگوں کا

اپنے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا۔ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے۔ میں اپنے جیسے انسا
کو اپنی غلامی کرتا دیکھتا ہوں تو دل برا ہونے لگتا ہے۔''

''فیرو ہی گل۔ تجھ میں اور ان جاہل مزارعوں میں وڈا فرق ہے۔ تُو چودھری افتخار کا پُتر، اُس کی جا
جانشین ہے۔ تُو اور وہ مزارعے دونوں ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تجھے اللہ نے حکمرانی کے لیے بنایا
انہیں غلامی کے لئے۔ اگر اللہ سب کو ایک جیسا دیکھنا چاہتا تو فیر آپ ہی سب کو برابری سے مال و دولت
مقام دیتا۔ اللہ نے آپ بندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے، پر تیرے جیسے نوجوانوں پر سوشلسٹ
بھوت سوار رہتا ہے۔ خیر، رہ لے جتنے دن چاہے یہاں..... آخر کو ایک دن تجھے میری گل سمجھ آ ہی جائے
بیٹے کا جواب چودھری کو پسند نہیں آیا اور وہ اپنی طرف سے دلیلیں دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے

''میں مانتا ہوں کہ اللہ نے بندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ انسا
میں سے کچھ کو برتر اور کچھ کو کم تر رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے ہاں تو روپے پیسے کی بنیاد پر برتری اور کم تری
نہیں۔ اس کے نزدیک تو بس وہ برتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ معاشی اور معاشرتی تقسیم کے ذریعے تو
ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ جو اس آزمائش میں پورا اُترے گا، وہی اللہ کے نزدیک بلند اور کامیاب ہوگا۔''

''چل چھڈ۔ رہنے دے اس گل کو۔ تیری گل سن کر مجھے لگتا ہے کہ جیسے تُو امریکہ میں نہیں، سعودی
کے کسی مدرسے میں رہ رہا ہے، جہاں تجھے یہ سب سکھایا جاتا ہے۔'' چودھری کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو گیا
چنانچہ اس نے موضوع ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔ مراد نے بھی باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے مزید
مناسب نہیں سمجھا ورنہ وہ اُنہیں بتانا چاہتا تھا کہ دین صرف سعودی عرب کے مدرسوں میں نہیں سکھایا جا
فطرت میں بھلائی اور دل میں نیک خواہشات رکھنے والے کو ہر جگہ راہنمائی مل جاتی ہے۔ وہ نیویارک
آزادانہ مزاج رکھنے والے شہر میں رہ کر ایسی باتیں کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کے احباب کا حلقہ
حقوق کا شعور رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا۔ ان افراد میں بہت سے اچھے مسلمان بھی تھے اور کچھ غیر مسلم
لیکن اچھے انسان بھی۔ چنانچہ وہ اگر اپنی پرورش کے ابتدائی عرصے میں خود کو ملنے والی غیر معمولی اہمیت کی
سے کچھ بگڑا بھی تھا تو ان چند سالوں میں بالکل سدھر گیا تھا۔

''شاہدہ اور علینہ گھر پر بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ جس وقت میں ایئرپورٹ
لیے روانہ ہوا تھا، میں نے فون پر ان دونوں کو اطلاع دے دی تھی۔ مجھے آج آفس میں ضروری کام نہیں ہو
میں چھٹی کر لیتا اور ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ ہی ایئرپورٹ لاتا۔ لیکن مصروفیت کچھ ایسی تھی کہ مجھے آفس
نکل کر سیدھا یہاں آنا پڑا۔'' موضوعِ گفتگو بدلنے کے لیے مراد شاہ، چودھری کو اپنی بیوی اور بیٹی کے بار
میں بتانے لگا۔ اس کی بیوی شاہدہ اس کی سگی پھوپھی کی بیٹی تھی جس کو وہ باپ کی خواہش پر بیاہ کر کے ا
ساتھ امریکہ لے آیا تھا۔ کم تعلیم یافتہ شاہدہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن مراد شاہ نے
داری اور بردباری کا ثبوت دیتے ہوئے بیوی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی راہ نکال لی تھی۔ اگرچہ بیوی اور ا
درمیان موجود ذہنی فرق کی وجہ سے بعض اوقات اسے شدید احساسِ تنہائی بھی ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی یہ با
شاہدہ پر ظاہر نہیں کی تھی اور یوں وہ دونوں اپنی بیٹی علینہ کے ساتھ کافی مناسب زندگی گزار رہے تھے۔ علینہ
عمر تین سال ہو چکی تھی اور اس کا وجود دونوں میاں بیوی کے لیے خوشی کا باعث تھا۔

''نوکری کی یہی تو برائی ہوتی ہے کہ بندہ پابند ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس کی جگہ تُو اپنے گاؤں میں ہوتا
ایسی کوئی مجبوری آڑے نہیں آتی۔'' مراد کی بات سن کر چودھری کو ایک نکتہ مل گیا چنانچہ اس نے فوراً ہی اسے



اس کی بات سن کر محض مسکرا دیا اور جواب میں کچھ کہے بغیر ڈرائیو کرتا رہا۔ نیویارک جیسے مصروف شہر
میں اپنی گاڑی چلانے کے لیے اچھی خاصی حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ برسوں یہاں رہنے
وہ اس ٹریفک کا عادی ہو گیا تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ ہلکی پھلکی گپ
ہوئے آخر کار وہ لوگ مراد شاہ کے لگژری اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ مراد کی یہاں ٹھیک ٹھاک
لیکن یہ شان دار اپارٹمنٹ بہر حال اسے چودھری نے ہی خرید کر دیا تھا ورنہ خود مراد تو شاید ابھی تک
کے اپارٹمنٹ میں ہی رہ رہا ہوتا۔ اپارٹمنٹ پہنچ کر چودھری کی بہو اور پوتی سے ملاقات ہوئی تو ان
وہ اپنی ذہنی اُلجھن کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا۔ شاہدہ نے اس کے لیے خاص طور پر اپنے ہاتھوں
کھانا تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اسے مراد شاہ کے ساتھ نیویارک
چودھری نے بیٹے سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو مشرقی روایات کے خلاف امریکی ماحول میں
اجازت دے گا۔ شاہدہ حویلی کی دوسری خواتین کی طرح نیویارک میں رہنے کے باوجود گھریلو زندگی گزارے
نے یہ شرط قبول کر لی تھی۔ خود شاہدہ کو بھی باہر کی دنیا سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اس لیے وہ آرام سے ایک
کی ذمے داریاں نبھا رہی تھی۔ کام کاج میں مدد کے لیے دن بھر ایک ملازمہ اس کے ساتھ رہتی تھی
اس پر بہت زیادہ بوجھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے مراد شاہ نے اسے شخصی آزادی سے قطعی محروم نہیں کیا تھا۔
سے معاملات میں اپنی مرضی کی مالک تھی اور اسے اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے کے لیے آزادی
حاصل تھی۔

''ماموں جان! آپ کا کمرہ تیار ہے۔ آپ لمبے سفر سے آئے ہیں، کچھ دیر آرام کر لیں پھر پوتی کے لاڈ
گا۔'' شاہدہ نے چودھری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پوتی کے ساتھ
تھا۔

''ہاں پُتر! میں واقعی بڑا تھک گیا ہوں۔ اب کچھ دیر آرام کروں گا۔'' چودھری نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ
اس کی توجہ سے یک دم محروم ہو جانے پر علینہ نے احتجاجاً رونا شروع کر دیا لیکن اس بار چودھری نے اسے
طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ تو علینہ کو پوتی ہونے اور اتنی دور رہنے کی وجہ سے کافی رعایت حاصل تھی ورنہ
سے محبت کا برتاؤ کرنا حویلی والوں کی روایات میں ہی شامل نہیں تھا۔ مراد شاہ جو باپ کے اس انداز کو
تھا، خود ہی علینہ کو گود میں لے کر اسے بہلانے لگا جبکہ چودھری نے اپنے لیے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔
میں پہنچ کر وہ آرام دہ بستر پر لیٹا تو اسے ایک بار پھر ڈیوڈ اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔
میں ایک کارآمد بات یہ تھی کہ ڈیوڈ نے اسے ماہ بانو سے متعلق یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اسے مل
گی۔ ڈیوڈ سے معاملات جس طرح بھی طے پاتے لیکن ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ اسے ماہ بانو کے حصول
اب شہریار پر دباؤ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ اسے اغوا کروانا بھی بے کار ہی تھا۔ اس خیال
کے بعد اس نے فوراً ہی بالے کا موبائل نمبر ملایا۔ موبائل کی سہولت آ جانے کے بعد اس نے بالے
اپنے کچھ خاص ملازمین کو موبائل سیٹ فراہم کر دیئے تھے تاکہ وقتِ ضرورت فوری رابطہ ہو سکے۔ لیکن
اسے بالے سے رابطہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ جانے کس وجہ سے بالے کا موبائل نمبر
نہیں رہا تھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد چودھری نے منشی اللہ رکھا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے
ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

''سلام سرکار! خیر نال پہنچ گئے؟ میں یہی انتظار کر رہا تھا کہ آپ کی طرف سے خیریت کا فون آ جائے۔''

چودھری کا فون سنتے ہی منشی نے خوشامدانہ انداز میں بولنا شروع کر دیا۔

''بالا کدھر ہے منشی؟ میں اتنی دیر سے اُسے فون کر رہا ہوں، پر اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔''

خوشامدانہ باتوں پر کان دھرے بغیر چودھری نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''بالا تو رات سے ہی غائب ہے سرکار! مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ آپ نے اس کے ذمے کوئی کام لگا
اسی کے سلسلے میں انتظامات کرنے جا رہا ہے۔ دو تین دن میں واپسی ہو گی۔'' منشی نے اسے اطلاع د
ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یقیناً بالا شہریار کے اغوا کے انتظامات کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ موجود تھا
موبائل سگنلز نہیں پہنچتے ہوں گے۔

''ٹھیک ہے۔ پرتُو کوشش کر کے دیکھ لے کہ کسی طرح بالے سے تیرا رابطہ ہو جائے۔ اس سے کل
کہ ابھی رُک جائے۔ میں نے اسے جو کام کہا تھا، اس میں فوری ہتھ نہ ڈالے۔'' چودھری نے ہدایات
کیں اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب اگر منشی کا بالے سے رابطہ ہو جاتا تو شہریار کا اغوا رُک جاتا ورنہ دوسری
میں اس نے سوچ لیا تھا کہ بالے سے کہے گا کہ شہریار سے ماہ بانو کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے
اس کی تھوڑی بہت پھینٹی لگا کر اسے آزاد کر دے۔ شہریار کو اتنی تکلیف بھی پہنچ جاتی تو وہ اپنے دل میں
ٹھنڈک محسوس کرتا۔

⊛----✪----⊛



قدرے ناہموار سڑک پر چلتے مشابرم خان کے قدم اس ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی طرف اُٹھ رہے تھے
ل جیپ ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق نامعلوم افراد نے جیپ
لے والے ڈرائیور کو اچانک ہی روک کر اس سے جیپ چھین لی تھی اور ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا تھا۔ پولیس
طابق جیپ ڈرائیور حملہ آوروں کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں بتا سکا تھا لیکن مشابرم خان ایک
ا جیپ ڈرائیور سے مل کر معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی ماں، اکرم خان اور ماہ بانو کو
لے سے کاندے واپس لانے والے جیپ ڈرائیور سے بھی پوچھ گچھ کر چکا تھا لیکن اس نے محض یہی بتایا تھا
ا کاروں کی تعداد چار تھی اور انہوں نے اپنے چہروں کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ اغوا کاروں کی
ت کے بارے میں بھی کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اس نے ان کے قد و قامت کے بارے میں
ا کر دیا تھا۔

مشابرم خان چاہتا تھا کہ اغوا کے لیے استعمال کی جانے والی جیپ کے ڈرائیور سے بھی مل کر دیکھ لے
اگر وہ کوئی خاص بات نوٹ کر سکا ہو تو اس کے ذریعے حملہ آوروں کا سراغ لگایا جا سکے۔ اسے تھانے سے
ڈرائیور کے بارے میں معلومات مل گئی تھیں۔ اس شخص کا نام نیاز علی تھا اور وہ کئی سالوں سے ایک ٹورسٹ
ل میں بہ حیثیت ڈرائیور ملازمت کر رہا تھا۔ اُس کا بلتستان کے مختلف حصوں میں مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا
وہ پہلی بار ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا۔ وقوعہ میں وہ بے چارہ زخمی بھی ہوا تھا۔ حملہ آوروں نے اسے
ل کرنے کے لیے سر پر ضرب لگائی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر پر زخم آ گیا تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے
ٹ کمپنی آج کل اسے کسی جگہ نہیں بھیج رہی تھی اور مشابرم خان کی معلومات کے مطابق ان دنوں وہ اپنے گھر
ام کر رہا تھا۔ تھانے سے اسے نیاز علی کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہو سکا تھا چنانچہ وہ ٹورسٹ کمپنی کے دفتر جا کر
سے اس کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم دفتر کی طرف جانے والے راستے
ھکائے چلتے ہوئے وہ اردگرد سے تقریباً بے خبر تھا اس لیے جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ چونک
ر سر اُٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ پکارنے والا اس کا ایک واقف کار آذر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے آذر رپورٹر تھا
انیزن میں پہاڑوں کے سفر پر ہی رہتا تھا۔

''او یار امشابرم خان! کیا حال چال ہے؟..... ابھی اس طرح سر جھکائے بے خبری میں کدھر جاتا ہے؟''
م خان متوجہ ہوا تو آذر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''بس یار! ایک کام سے جا رہا تھا۔ ماں ہسپتال میں داخل ہے، اس کے لیے دوائیں خریدنی تھیں اور ایک
کام بھی تھا۔'' اس نے آذر کے سوال کا سرسری انداز میں جواب دیا۔

''ہاں یارا! ہمیں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتہ چلا تھا۔ بڑا برا ہوا تمہارے خاند
ساتھ۔ بے چارہ اکرم خان تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہم دونوں کا اکثر ہی ایک ساتھ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اکر
ماں جی کی خاطر ہی اوپر پہاڑوں پر نہیں جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ ماں ڈرتی ہے کہ کہیں میرے باپ اور بڑ
کی طرح میں بھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ پر قسمت کی خرابی دیکھو کہ اتنی احتیاط کے باوجود
چاری ماں کو اس عمر میں اتنا بڑا صدمہ سہنا پڑا۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ کے ٹو بیس کیمپ تک گیا ہوا تھا۔ ا
واپس آیا ہوں۔ اگر یہاں ہوتا تو اکرم خان کی تدفین میں ضرور شریک ہوتا۔ اب تو ساری زندگی یہی
رہے گا کہ اپنے اتنے اچھے ساتھی کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔'' آذر اس سے اکرم خان کی موت
افسوس کرنے لگا۔ جواباً مشابرم خان خاموش رہا۔ اکرم خان کے ذکر پر اسے اپنے سینے میں دھواں سا
محسوس ہوتا تھا۔ انتقام کی ایک آگ سی تھی جو تن بدن کو جھلسانے لگتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو لوگوں سے
کے لیے وہ ایسے مواقع پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

''اچھا ہوا کہ تم مجھے راستے میں ہی مل گئے ورنہ میں خود تم سے ملنے کے لیے ہسپتال کی طرف ہی جا
مجھے کسی سے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنا زیادہ وقت ہسپتال میں اپنی ماں کے پاس ہی گزارتے ہو۔ چلو چل کر
دوا لے لیتے ہیں، پھر میں تمہارے ساتھ ہی ہسپتال تک چلوں گا تاکہ ماں جی کی مزاج پرسی کر سکوں۔
نے اس کی خاموشی کو محسوس کیے بغیر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسا دینے کے انداز میں ہلکی
دی اور اسی راستے پر قدم آگے بڑھائے جس راستے پر مشابرم خان پہلے جا رہا تھا۔

''اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو میرے ساتھ چلو ورنہ چاہو تو سیدھے ماں سے ملنے ہسپتال بھی جا سکتے ہو
میں مجھے دوائیں خریدنے کے بعد نیاز علی ڈرائیور سے ملنے اس کی ٹورسٹ کمپنی کے دفتر تک بھی جانا ہے۔
شاید کسی سے معلوم ہوا ہو کہ اکرم خان کے قتل میں جو لوگ ملوث ہیں، انہوں نے نیاز علی کی جیپ ہی استعما
تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ نیاز علی سے مل کر ان لوگوں کے حلیے وغیرہ معلوم کر سکوں۔'' آذر کو اپنے ساتھ
مُصر دیکھتے ہوئے مشابرم خان کو اس پر اپنا پروگرام ظاہر کرنا پڑا۔

''ہاں، میں نے سنا تھا کہ قاتلوں نے نیاز علی سے جیپ چھین کر اسے واردات کے لیے استعمال کیا
اگر تم کہو تو میں تمہیں اس کے گھر تک لے جا سکتا ہوں۔ سنا ہے اپنی کمپنی کے دفتر تو وہ آج کل نہیں جا رہا
دفتر والوں نے اسے آرام کے لیے چھٹی دی ہوئی ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن مجھے نیاز علی کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا اس لیے میں دفتر کی طرف جا
کہ وہاں سے اس کا پتہ معلوم کر لوں گا۔ تمہیں اس کا گھر معلوم ہے تو اچھی بات ہے۔ ایسا کرو کہ مجھے اس
دکھا دو، پہلے میں اُس سے ہی ملاقات کر لیتا ہوں۔'' آذر کی پیشکش سن کر مشابرم خان فوراً ہی اس کے ساتھ
علی کے گھر جانے پر آمادہ ہو گیا۔

''چلو، تم کہتے ہو تو پہلے وہیں چلتے ہیں لیکن تم نیاز علی سے زیادہ اچھی اُمید نہ رکھنا۔ کچھ خرد ماغ سا
ہے۔ زیادہ کسی سے ملنا جُلنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ کچھ سال پہلے اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ سب سے مل
کر رہتا تھا، پر اب بہت بدل گیا ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کے بیوی بچوں کا پہننا اوڑھنا دیکھ کر لگتا ہے
اس کے پاس کہیں سے پیسہ آنے لگا ہے۔ حالانکہ پہلے بھی وہ ڈرائیوری ہی کرتا تھا اور اب بھی یہی کام
ہے۔'' نیاز علی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے آذر نے اسے بتایا تو وہ ٹھٹک گیا۔ آذر کا نیاز علی کے بارے
سرسری طور پر کیا جانے والا تبصرہ قابلِ غور تھا۔ اگر کسی طرح نیاز علی کے پاس معمول سے زیادہ پیسہ آنے لگا



ب تھا کہ نیاز علی کچھ مشکوک شخصیت کا مالک ہے اور ایسے شخص کی ہر بات پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔
م نے کبھی غور نہیں کیا کہ نیاز علی کے پاس پیسہ کہاں سے آ رہا ہے؟ اگر وہ کوئی نیا کام دھندا کرتا تو پیسہ
الی بات سمجھ بھی آتی لیکن پہلے والی نوکری کے ساتھ زیادہ پیسہ آنا تو ذرا عجیب سی بات ہے۔'' مشابرم
ا ار کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

ہاں یارا! ہمارے پاس نہ تو فرصت ہے اور نہ ہی ہمیں عادت ہے کہ دوسرے کے معاملوں میں ٹانگ
اس لیے کبھی جان کر اس معاملے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' آذر نے بے نیازانہ انداز میں
وال کا جواب دیا۔

ا ہی..... کبھی تو تم نے نیاز علی کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہو گی جو تمہیں معمول سے ہٹ کر اور ذرا
ل ہو؟'' مشابرم خان آسانی سے ہمت ہارنے والا نہیں تھا، چنانچہ آذر کو دماغ پر زور دینے کے
ا ا۔

ا کوئی خاص مشکوک حرکت تو نہیں دیکھی، پر ایک بار اُس کی ایک حرکت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی
پچھلے سال کا ذکر ہے۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہنزہ گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا
ب صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ اسکردو آیا ہوا ہے۔ رابرٹ صاحب مجھے بڑا پسند کرتا ہے۔ اسے جب
ا کہ میں اسکردو میں نہیں ہوں لیکن جلد واپس آنے والا ہوں تو وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گیا کہ میں کسی
ے جوائن کر لوں۔ اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ نیاز علی ایک ٹیم کو واپس لانے کے لیے آگے جانے والا
ں نے اس سے لفٹ مانگ لی۔ اس وقت میں نے اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی
ں کھانے پینے کا سامان اور دوائیں وغیرہ بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اگر وہ کسی
ا ساتھ سفر پر جا رہا ہوتا تو سامان کی موجودگی سمجھ آتی لیکن وہ تو ٹیم کو واپس لانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں
ے سامان کے بارے میں پوچھا تو بولا، آگے کسی گاؤں میں اس کے دوست نے یہ سامان منگوایا ہے۔
ں کا جواب سن کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد بھی کئی بار میں نے نوٹ کیا کہ نیاز علی جب بھی کسی ٹیم کو
ے جاتا ہے تو اس کی جیپ خالی نہیں ہوتی، اس میں کافی سامان لدا ہوا ہوتا ہے۔'' آذر کی فراہم کردہ
ت بڑی قیمتی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں نیاز علی کا کردار جس طرح سامنے آیا تھا، اس کے مطابق وہ
امہ آدمی نہیں تھا۔ چنانچہ اُس کے اس بیان پر بھی یقین کرنا مناسب نہیں تھا کہ اغوا کاروں نے اس سے
لی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پیسے کے حصول کے لیے نیاز علی نے خود ان لوگوں سے سودا طے کیا ہو اور انہیں
ے کے لیے جیپ فراہم کر کے خود کو زخمی کیے جانے کا ڈرامہ رچایا ہو۔ یہ امکان ایسا تھا جس کو سامنے رکھتے
شابرم خان سمجھتا تھا کہ نیاز علی سے سیدھے طریقے سے بات کرنا اتنا سودمند ثابت نہیں ہو گا اور اس شخص
ت معلومات اُگلوانے کے لیے اس پر ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

ا وہ دیکھو..... وہ جو لال چھت والا مکان ہے، اس میں نیاز علی رہتا ہے۔'' مشابرم خان کی سوچوں سے
ارنے ہاتھ کے اشارے سے ایک مکان کی نشان دہی کی تو وہ مکان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مکان زیادہ
تھا لیکن عمارت اچھی حالت میں اور مضبوط تھی اور اس پر موجود رنگ و روغن بھی ایسا لگتا تھا کہ حال ہی
کیا ہو۔

ایسا کرو کہ تم نیاز علی سے ملاقات کر لو۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔ نیاز علی کا معلوم
س رُوکھے انداز میں ملے اور میں رات ہی سفر سے تھکا ماندہ آیا ہوں۔ تھکن میں برداشت ذرا کم ہو

جاتی ہے اس لیے میرے خیال میں، میں اس سے نہ ہی ملوں تو اچھا ہے۔'' گھر کے قریب پہنچ کر
اچانک ہی اندر جانے کا ارادہ بدل دیا اور مشابرم خان سے بولا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ مگر میری تو مجبوری ہے۔ مجھے نیاز علی سے بڑی اہم باتیں معلوم
اس لیے چاہے وہ جس انداز میں بھی ملے، مجھے تو اس سے ملنا ہی پڑے گا۔'' مشابرم خان خود آذر
ملاقات میں ساتھ ہونے کے خیال سے اُلجھن کا شکار تھا اور اسے خوش دلی سے رخصت دے دی۔ آذر
مصافحہ کر کے واپسی کے راستے کی طرف چل پڑا، تب مشابرم خان نے نیاز علی کے دروازے پر دستک
دستک بلند آواز میں لیکن مہذبانہ انداز میں دی گئی تھی۔ دستک کے جواب میں تقریباً سات آٹھ سال کا
دروازے سے باہر نکلا۔

''میرا نام مشابرم خان ہے۔ مجھے نیاز علی سے ملنا ہے۔'' اس نے بچے کی سوالیہ نظروں کے جواب
بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا واپس اندر چل پڑا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر ایک دراز
رنگت اور بھوری آنکھوں والا تقریباً چالیس بیالیس سالہ مرد نمودار ہوا۔

''السلام علیکم بھائی مشابرم! آؤ اندر آ جاؤ۔'' آذر کی فراہم کردہ معلومات کے برخلاف نیاز علی
سے کافی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ مشابرم خان نے یہ دعوت قبول
''مجھے معلوم ہوا تھا کہ اکرم خان کا بھائی مشابرم خان اسکردو آیا ہوا ہے۔ میں اکرم خان کے
لیے تم سے ملنا بھی چاہتا تھا لیکن طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ تمہیں معلوم تو ہوا ہوگا کہ جن لوگوں نے اکرم
ہلاک کیا، وہ جیپ چھیننے کے چکر میں مجھے بھی زخمی کر گئے تھے۔'' گھر کی بیٹھک میں پہنچ کر نیاز علی
وضاحتی سا بیان دیا لیکن اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ صرف مشابرم خان کو سامنے پا کر باتیں بنا رہا
حقیقتاً وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''مجھے تمہارے زخمی ہونے کا معلوم ہوا تھا۔ میں نے سوچا چل کر مزاج پرسی کر لوں۔ ساتھ ہی اگر
خان کے قاتلوں کے بارے میں کچھ بتا سکو تو بڑی مہربانی ہوگی۔'' نیاز علی کی بھوری آنکھوں سے چھلکتی
نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نرمی سے درخواست کی۔

''پولیس والوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن میں کیا بتا سکتا تھا؟ جن لوگوں نے
جیپ چھینی، وہ اپنے چہروں کو نقاب میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں
لیے ان کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔'' اس بار نیاز علی کا لہجہ قدرے رُوکھا ہو گیا تھا۔

''لیکن تم نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی تو اندازہ لگایا ہوگا۔ کم از کم اتنا اندازہ ہی ہو گیا ہو
لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے؟'' اندرونی طور پر غصہ محسوس کرنے کے باوجود مشابرم خان نے نیاز
سامنے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ نیاز علی جواب میں کچھ بولتا، اس سے قبل ہی مشابرم خان کی آمد پر دروازہ کھ
سات آٹھ سال کا بچہ چھوٹی سی گول تھالی میں قہوے کی پیالیاں رکھے اندر چلا آیا۔ بچے کی آمد پر نیاز
طرف متوجہ ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے تھالی لے کر مشابرم خان کے آگے رکھی۔ مشابرم خان نے دیکھا
میں قہوے کی پیالیوں کے ساتھ ایک طشتری میں خشک خوبانیاں بھی رکھی ہیں۔

''لو بھائی! قہوہ پیو۔'' بچہ تھالی تھمانے کے بعد فوراً ہی واپس پلٹ گیا جبکہ نیاز علی میزبانی کے فرائض
دینے لگا۔

''یہ تمہارا بیٹا ہے؟'' مشابرم خان نے نیاز علی کی بڑھائی ہوئی طشتری میں سے ایک خشک خوبانی



اس سے پوچھا۔

''ہاں..... یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس سے بڑی دو بہنیں ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے، پر ہے بڑا
ارادہ ستاتا نہیں ہے۔ ہر حکم مانتا ہے اور پڑھنے لکھنے کا بھی بڑا شوقین ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ یہ
اسکول پاس کر لے تو اسے کسی بڑے شہر کے اچھے سے اسکول میں داخل کروا دوں گا۔ اچھی جگہ سے
تو انشاء اللہ بڑا ہو کر کہیں اونچا افسر لگ جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر سے نیچے کے تو خواب ہی نہیں دیکھتا میں
کے لئے۔ یہ ہے بھی اتنا ذہین کہ مجھے یقین ہے کہ میرے سارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔''
لہجے میں گہری پدرانہ شفقت و محبت تھی۔

''اللہ تعالیٰ تمہاری خواہش پوری کرے۔ لیکن ہے یہ بہت مہنگی خواہش۔ خاص طور پر کسی بڑے شہر کے
اسکول میں بچے کو داخل کروا کر پڑھانے میں تو بہت خرچہ آئے گا۔ ایک تو بڑے اسکولوں کی فیسیں
ہوتی ہیں، دوسرے تمہیں ہاسٹل وغیرہ کا خرچ بھی اٹھانا پڑے گا۔'' مشابرم خان کو یاد تھا، آذر نے اسے بتایا
نیاز علی کے پاس کہیں سے روپیہ آنے لگا ہے۔ اب جو اس نے بیٹے کے بارے میں اپنی خواہشات کا
کیا تو اسے احساس ہوا کہ آذر واقعی صحیح کہہ رہا ہے۔ ورنہ کسی عام آدمی کے لیے تو اتنے مہنگے خواب دیکھنا
نہیں ہوتا۔

''مہنگا چہ تو واقعی آئے گا لیکن اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر تو مارنے ہی پڑتے
میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم کا انتظام کر لوں گا۔'' نیاز علی نے بہ ظاہر بے نیازی سے
کہا لیکن مشابرم خان محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی اس بے نیازی میں ایک خاص قسم کا یقین ہے۔ یوں لگتا تھا
منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے وسائل کی تنگی کا ذرا بھی خدشہ نہ ہو۔

''چلو، اللہ تمہارا ساتھ دے۔ میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ تم خود زیادہ اچھی
جانتے ہو گے کہ اپنے بچے کے لیے کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں؟ میں تو یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کے
میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ وہ لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے لگتے تھے؟''
آمد کی وجہ سے جو سوال ٹل گیا تھا، وہ مشابرم خان نے پھر دہرایا۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں وہ کہیں باہر کے ہی لوگ ہوں گے۔ مقامی افراد
سے تو کوئی بھی ایسی کارروائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' کوئی واضح جواب دینے کے بجائے نیاز علی نے
آرائی کی۔

''تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو نیاز علی! جہاں سے حملہ آوروں نے تمہاری جیپ چھینی تھی؟''

''دکھا تو سکتا ہوں لیکن تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے؟ وہ تو بالکل ویران اور چٹیل سی جگہ ہے۔ اس جگہ کا
والے پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں اور انہیں وہاں سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کے ذریعے مجرموں کی
ہو سکے۔'' نیاز علی نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بس میں ایک بار اپنی تسلی کے لیے وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار مجھے وہاں لے چلو تو تمہاری بڑی
ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، تم ضد کر رہے ہو تو میں چلوں گا۔ لیکن وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے اور بغیر جیپ کے پہنچنا
نہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے جیپ کا انتظام تمہیں خود کرنا ہوگا۔ میں جس ٹورسٹ کمپنی کے لیے کام کرتا
وہ صرف اپنے کام کے لیے ہی مجھے جیپ فراہم کرتی ہے۔'' نیاز علی نے نیم دلانہ سے انداز میں ہامی بھری۔

''جیپ کا مسئلہ نہیں، اس کا میں خود انتظام کرلوں گا۔ تم دو گھنٹے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں
علی کو کسی قسم کا بہانہ بنانے کا موقع دیئے بغیر اس نے کہا اور قہوے کی خالی پیالی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''دو گھنٹے بعد..... لیکن میری طبیعت ابھی اتنی اچھی نہیں کہ میں گاڑی چلا سکوں۔ سر کی چوٹ
ہے۔ اگر اچانک چکر وغیرہ آ گیا تو کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔'' مشابرم خان کو بالکل تیار دیکھ کر نیاز علی
اور بہانہ تراشا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے ڈرائیوری کا بڑا تجربہ ہے۔ میں آرام سے جیپ چلا لوں گا۔ تمہیں
رہنمائی کرنی ہو گی۔'' مشابرم خان نے اس کا یہ بہانہ بھی مسترد کر کے مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ جواباً
چہرے کے عضلات کچھ تن سے گئے لیکن اب ہامی بھرنے کے بعد انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ
ہی سہی، اسے آمادگی ظاہر کرنی پڑی۔ اس کے آمادگی ظاہر کرتے ہی مشابرم خان اس سے رخصت
ایک ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پہنچا تا کہ وہاں سے جیپ حاصل کر سکے۔ ٹورسٹ کمپنی والے عموماً بغیر ڈرائیور
کو جیپ فراہم نہیں کرتے لیکن اس دفتر میں مشابرم خان کا ایک دیرینہ دوست ملازمت کرتا تھا۔ اس
پر اسے جیپ فراہم کر دی گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ ایک بار پھر نیاز علی کے دروازے پر تھا۔

''میری تو سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے جہاں سے ان غنڈوں نے مجھ سے
تھی..... بے کار میں تمہارا اور میرا دونوں کا وقت ہی ضائع ہو جائے گا۔'' اسے سامنے دیکھ کر نیاز علی
بناتے ہوئے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''بس تم میری تسلی کے لیے چلے چلو۔ اب تو میں کرائے پر جیپ بھی لے آیا ہوں۔'' مشابرم
اصرار کیا تو نیاز علی کو چار و ناچار اس کے ساتھ جیپ میں سوار ہونا ہی پڑا۔ ڈرائیونگ مشابرم خان کر رہا
نہایت مہارت سے نیاز علی کی راہنمائی میں گاڑی آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔ ڈھائی تین گھنٹے کی خاصی
طلب ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں زمین کی رنگت سلیٹی مائل اور ساخت پتھریلی
یہ علاقہ بالکل ویران اور بنجر تھا اور دُور تک پھیلی پتھریلی زمین کے سرے پر اسی کی طرح ویران اور
کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''اس جگہ ان غنڈوں نے مجھے گھیرا تھا۔ اس جگہ سڑک کتنی خراب ہے، تم دیکھ ہی رہے ہو۔ یہاں
گزرتے ہوئے ڈرائیور کو بہت احتیاط سے اور ہلکی اسپیڈ میں گاڑی چلانی پڑتی ہے ورنہ ڈر ہوتا ہے کہ
بے قابو ہو کر سڑک کی دوسری طرف کھائی میں گر جائے گی۔'' جیپ اغوا کیے جانے کی جگہ کی نشاندہی
ہوئے نیاز علی نے مشابرم خان کی توجہ راستے کی کٹھنائی کی طرف مبذول کروائی۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ سڑک
حالت واقعی کافی مخدوش تھی اور اس کی ایک جانب موجود وسیع لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف
کھائیاں تھیں۔ سڑک کو یہاں کھائی کے قریب سے گزارنا بھی مجبوری تھی کیونکہ آگے جا کر جہاں سے
سلسلہ شروع ہو رہا تھا، وہاں راستہ تنگ ہو گیا تھا اور کسی اور زاویے سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔

''میری جیپ چھیننے والے غنڈے شاید اس پہاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ میں راستے پر توجہ
وجہ سے دھیان نہیں دے سکا کہ وہ کس طرف سے آئے تھے۔ بس مجھے تو ایسا لگا کہ وہ بالکل اچانک
راستے میں آ کھڑے ہوئے ہوں۔'' نیاز علی تفصیلات بتا رہا تھا جبکہ مشابرم خان نے جیپ کو سڑک سے
بنجر زمین پر ایک طرف روک لیا تھا اور اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ علاقے کا معائنہ کرتے ہوئے اسے نیاز
بات کافی درست محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے جیپ چھیننے والے غنڈوں کو اصولاً پہاڑی کے پیچھے ہی



کوئی جگہ موجود ہونے کی صورت میں تو وہ فوراً ہی نظروں میں آ جاتے۔ وہ ٹہلتا ہوا بنجر پہاڑی کی
چلا گیا۔ نیاز علی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ قریب پہنچ کر پہاڑی کا جائزہ لینے پر چونک سا گیا۔ وہ
چھپنے والوں کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ اس کے پیچھے کچھ
ہوتی۔ لیکن اس پہاڑی کے پیچھے تو بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ گھوم کر پہاڑی کی دوسری طرف جانے کی
کرنے والے مشابرم خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد معنی خیز انداز میں سر گھما کر نیاز علی کی طرف
اس کی نظروں کی معنی خیزی نے نیاز علی کو بوکھلا دیا۔ وہ خود بھی وہ بات محسوس کر چکا تھا جسے مشابرم خان
کہا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف کسی شخص کے کھڑے ہونے کے لیے بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ دوسری
ویسی ہی گہری کھائی تھی جیسی سڑک کے دائیں جانب موجود تھی۔

''تم کہتے ہو کہ وہ غنڈے اس پہاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے لیکن یہاں تو چھپنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔''
واپس پلٹا اور نہایت سنجیدگی سے نیاز علی سے بولا۔

''میں نے شاید کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں اور چھپے ہوں۔'' نیاز علی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں
کی۔

''کہیں اور کہاں چھپ سکتے تھے وہ لوگ؟ سڑک کے دائیں جانب گہری کھائی ہے جہاں کوئی چھپ ہی
سکتا۔ اب بائیں جانب کا علاقہ ہی رہ جاتا ہے اور یہ اتنا کھلا ہے کہ تم دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھ سکتے
اب مشابرم خان کے لہجے میں ذرا تندی آ گئی تھی۔

''لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے وہ زمین سے چپک کر لیٹے ہوئے ہوں۔ اس لیے میری ان
پڑ سکی ہو۔''

نیاز علی نے ایک اور دلیل دی جو قدرے معقول تھی۔ اس جگہ کی زمین واقعی ایسی رنگت کی تھی کہ اگر کوئی
رنگ کے کپڑے پہن کر اس سے چپک کر لیٹ جائے تو بے دھیانی میں گزرنے والے کو کسی کی
کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن مشابرم خان، نیاز علی کی طرف سے کھٹک چکا تھا۔ پہلے آذر کی فراہم کردہ
اور اب نیاز علی کا بوکھلایا ہوا رویہ اس کے ذہن میں شک پیدا کر رہا تھا۔ ذہن میں موجود شک نے ہی
دکھائی اور اسے ایک اہم نکتے کا خیال آیا۔

''تمہاری جیپ چھیننے والے غنڈے خود یہاں تک کیسے پہنچے تھے؟ یہ جگہ ایسی تو نہیں کہ یہاں تک کوئی
سکے۔ وہ لوگ یقیناً کسی جیپ میں ہی یہاں تک آ سکتے تھے۔ اگر وہ جیپ میں آئے تھے تو انہوں نے اپنی
کہاں چھپائی تھی؟''

نیاز علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یہ سوال کیا تو وہ واضح طور پر بوکھلا گیا اور اپنی اس بوکھلاہٹ
چھپانے کے لیے غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے نہیں پتہ کہ وہ لوگ یہاں کیسے آئے تھے اور کہاں چھپے تھے؟ میں نے تمہاری درخواست پر تمہیں
راستہ دکھا دی ہے۔ اب تمہیں جو دیکھنا ہے اور معلوم کرنا ہے، خود ہی معلوم کر لو۔ میں تمہارے سوالوں کا
دینے کا پابند نہیں ہوں۔''

''مجھے جو دیکھنا تھا وہ تو دیکھ چکا ہوں۔ لیکن جو معلوم کرنا ہے، وہ تم سے معلوم کروں گا اور تمہیں میرے ہر
کا جواب دینا پڑے گا۔'' اس کا جواب سن کر مشابرم خان جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

''خبردار! مجھ سے دور رہو۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' نیاز علی نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے پسٹل نکال کر اس پر تان دیا۔

''تمہاری اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ اکرم خان کے ساتھ جو کچھ ہوا، تم خود بھی اس میں
اور جیپ چھینے جانے کا ڈرامہ کر کے تم نے پولیس والوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔'' اپنی
پسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے مشابرم خان نے پُریقین لہجے میں کہا۔ نیاز علی کے پسٹل نکال لینے
بے شک اپنی جگہ پر رُک گیا تھا لیکن اُس کے لہجے اور انداز میں خوف زدگی کا ذرا سا شائبہ تک نہیں تھا
طرح پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''تم جو چاہے سمجھو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں
نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور مشابرم خان پر نظر جمائے جمائے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''تم اپنے دو
اٹھا کر سر پر رکھ لو اور اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا جب تک میں یہاں سے چلا نہ جاؤں
نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھنا کہ میں بلا تکلف تمہیں گولی مار دوں گا۔'' نیاز علی کا انداز
کا سا تھا جو بند کمرے میں پھنس گئی ہو اور باہر نکلنے کی خواہش میں سامنے آنے والے انسان کا نرخرہ او
میں بھی عار نہ سمجھے۔ اس کے لہجے کی خوں خواری دیکھتے ہوئے مشابرم خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی
بھی وہ گھبرایا ہوا یا پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیاز علی پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ اس
تانے تانے اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مشابرم خان کو اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش
وہ اُسے اس ویرانے میں چھوڑ کر خود جیپ میں فرار ہونے کا سوچ رہا تھا۔ اگر اسے آسانی سے جیپ تک
مہلت دے دی جاتی تو اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔

مشابرم خان کو جیپ سے اُترتے وقت چابی نکالنے کا خیال نہیں آیا تھا اور چابی ہنوز اگنیشن میں
تھی۔ نیاز علی ایک بار جیپ تک پہنچ جاتا تو اسے وہاں چھوڑ کر لمحہ بھر میں ہوا ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے اس
مقام پر رہ جانے کی تو فکر نہیں تھی کہ کبھی نہ کبھی کوئی ٹورسٹ یہاں سے گزرتا تو وہ اس سے لفٹ لے سکتا
دوسری صورت میں پیدل چل کر آگے ایسے کسی مقام تک جایا جا سکتا تھا جہاں سے سواری کا کوئی بندو
جاتا۔ لیکن اصل مسئلہ نیاز علی کا تھا۔ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر دوبارہ اسے گھیرنا اور اس سے
کرنا بہت مشکل ہوتا۔

مشابرم خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پل بھر میں یہ سارا حساب کتاب کیا اور اپنے اردگرد ایک
نظر ڈالی۔ اس کی دائیں ٹانگ کے قریب چند انچ کا ایک نوکیلا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس پتھر کے نظروں کی گرا
آتے ہی وہ فیصلہ کُن قدم اُٹھانے کے لیے تیار ہو گیا اور بے حد تیزی سے دائیں ٹانگ کو نہایت جچے
میں حرکت دی۔ اس کی ٹھوکر سے پیر کے قریب پڑا پتھر زمین سے اوپر اُٹھا اور قوس کی صورت میں حرکت
نیاز علی کی طرف بڑھا۔ نیاز علی جو اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا، اس کی حرکت پر بدک گیا اور بنا تو
داغ دیا۔ لیکن مشابرم خان اس ردِعمل کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس لیے اس کے فائر کرنے سے قبل
بیٹھ چکا تھا۔ اس کا یہ پھرتی سے بیٹھنا اس کے کام آیا اور گولی چند انچ کے فاصلے سے اس کے سر کے اوپر
گئی۔ اس وقت میں اس کا نیاز علی کی طرف اُچھالا گیا پتھر بھی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ بہت حساب کتاب
گئے پتھر نے فائر کے اگلے لمحے میں پسٹل کو ضرب لگائی اور پسٹل اُچھل کر نیاز علی کے ہاتھ سے نکلنے
لڑھکتا ہوا نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

پسٹل کے غائب ہوتے ہی نیاز علی کی خود اعتمادی بالکل جواب دے گئی اور وہ پلٹ کر جیپ کی طر



م خان کب چوکنے والا تھا۔ اس نے ایک لمبی جست لگائی اور چند سیکنڈوں میں ہی اسے چھاپ لیا۔
ب فرار کی راہ مسدود دیکھی تو دوبدو مقابلے کے لیے غراتا ہوا اس کی طرف پلٹا۔ پلٹنے کے اس عمل
کی خاصی طاقت صرف کرنی پڑی تھی کیونکہ اس کی گردن اور ایک بازو مشابرم خان کی گرفت میں
ے ساتھ ہی اس نے بلا توقف اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر مشابرم خان کے منہ پر مارنے کی کوشش
ابرم خان نے بچاؤ کے لیے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا لیکن پھر بھی نیاز علی کے مکے سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ
تا ہوا سا وار اس کے رخسار پر لگا۔ اس معمولی چوٹ نے ہی ہمالیہ کی ایک عظیم چوٹی کے ہم نام مشابرم
ب ناک کر دیا۔ وہ پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ اس نے پہاڑوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ ساری
اں کو سر کرتا ہوا آخر انہی کی آغوش میں جا سویا تھا۔ اس پہاڑ آشنا شخص نے اپنے بیٹے کا نام ایک
ی کے نام پر رکھا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پہاڑ جیسا مضبوط دیکھنا چاہتا
حال وجہ جو بھی رہی ہو، یہ طے ہے کہ جب پہاڑ نامہربان ہو جائیں تو ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔
ب کا غضب سہنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ مشابرم خان بھی غصے میں آیا تو نیاز علی کی ذرا پیش نہ چلی۔
م خان نے اسے پے در پے مکوں کی زد پر رکھ لیا۔ ساتھ ہی اس کی ٹانگیں بھی مسلسل چل رہی تھیں۔
یاز علی نڈھال ہو کر نیچے گر پڑا۔

''تا، کون تھے وہ لوگ جنہوں نے میرے بھائی کو قتل کیا اور ہماری مہمان لڑکی کو اغوا کر کے لے
'' مشابرم خان نے اپنا گھٹنا اس کے سینے پر رکھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی سخت گرفت میں لیتے
ہا۔

''م..... مجھے نہیں معلوم۔'' نیاز علی نے خوف زدہ لہجے میں انکار کیا۔ اُس کے اس انکار نے مشابرم خان
غضب ناک کر دیا۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اُس کی دو انگلیوں کو نیاز علی کے نتھنوں میں
اس زور سے دباؤ ڈالا کہ اس کے نتھنے چر سے گئے۔ تکلیف کی شدت سے نیاز علی کسی ذبح کیے جانے
ے کی طرح چیخنے لگا۔

''مجھ پر اس وقت خون سوار ہے نیاز علی! میرا سینہ اپنے جوان بھائی کی موت کے غم سے جل رہا ہے۔ یہ
صرف اسی صورت ہی بجھ سکتی ہے کہ میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا دوں اور اپنی
کی کو ان کی گرفت سے نکال لاؤں۔ اگر تُو نے میرے اس ارادے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش
مجھے سچ نہیں بتایا تو میرے سینے میں جلتی آگ سب سے پہلے تجھے بھسم کر ڈالے گی۔'' مشابرم خان کے
پر بالکل ویسی سرخی چھائی ہوئی تھی جیسی آگ کے قرب میں موجود شخص کے چہرے پر دیکھنے میں آتی
ہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا کہ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کے شعلوں کا رقص اس کے
پر دیکھا جا سکتا تھا۔

''وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں نے تمہیں کچھ بتایا تو وہ مجھے اور میرے بیوی بچوں سب کو مار ڈالیں
یاز علی تقریباً رو پڑا تھا۔

''اس وقت بھی میں تمہارے لیے کسی جلاد سے کم نہیں ہوں۔ تم نے اگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں
یا تو میں بھی تمہیں مار ڈالوں گا اور وہ بھی آسانی سے نہیں، تڑپا تڑپا کر، بے حد اذیت کے ساتھ۔'' نہایت
سے جواب دیتے ہوئے مشابرم خان نے اس کے نتھنوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ایک بار پھر جنبش دی۔
کے حلق سے ایک بار پھر چیخ برآمد ہوئی۔

''بولو! کون ہیں وہ لوگ؟.....تمہارا ان غنڈوں سے کیا تعلق ہے؟'' اس کے چیخنے کی پروا کیے
خان نے پوچھا۔

''وہ کون ہیں، میں نہیں جانتا۔ بس یہ معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔'' نیاز علی
لیتے ہوئے بتایا۔

''تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں وہ کیسے اور کہاں ملے؟'' مشابرم خان نے اپنا سوال
اضافے کے ساتھ دہرایا۔

''وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں ان کا ایک معمولی سا
کروں تو بدلے میں مجھے کافی بڑی رقم ملا کرے گی۔ میں اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے رقم کے
گیا۔ پھر کام بھی کوئی خطرے والا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں جب کسی ایکسی
واپس لینے جاؤں تو انہیں راشن اور ادویات وغیرہ سپلائی کر دیا کروں۔ بس میں ان کے لیے یہ کام
بدلے میں مجھے اچھی رقم مل جاتی تھی۔ اس بار میں انہیں راشن پہنچانے گیا تو انہوں نے مجھ سے
مانگ لی۔ ظاہر ہے، میں اس طرح انہیں جیپ نہیں دے سکتا تھا۔ دے دیتا تو اپنی کمپنی کے مالک کو کیا
کہ میں وقت پر ٹیم کو لینے کیوں نہیں پہنچا۔ مالک کے سوال جواب سے بچنے کے لیے ہم نے جیپ
اور مجھے بے ہوش کرنے کا ڈرامہ کیا۔ پولیس والوں سمیت سب نے اس ڈرامے پر یقین کر لیا لیکن تم
کیسے شک پڑ گیا..... مگر یقین کرو خان! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مجھ سے جیپ لے کر کیا کر
رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا، بس یہی کہا تھا کہ انہیں اپنے ایک کام کے لیے چند
لیے جیپ چاہیے۔ اس خدمت کے لیے انہوں نے مجھے رقم بھی دی تھی نہیں دیتے، تب بھی میں انکار
تھا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میرے انکار پر غصے میں آ کر مجھے قتل بھی کر سکتے تھے۔'' نیاز علی کے
واضح خوف تھا۔

''تم انہیں راشن کس جگہ پہنچاتے ہو؟'' اس کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر مشابرم خان نے پھر
میں سوال کیا۔

''کسی ایک جگہ نہیں۔ راشن بھیجنے والے جب مال میرے حوالے کرتے ہیں تو اس وقت جگہ
میں بتاتے ہیں۔''

''کون ہیں وہ لوگ؟ کیا یہیں اسکردو میں رہتے ہیں؟'' مشابرم خان اس کا جواب سن کر چونکا۔

''میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' نیاز علی نے جواب دیا۔ لیکن یہ جواب دیتے
نے جس طرح نظریں چرائی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

''جھوٹ مت بولو نیاز علی! یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ اتنے عرصے سے مسلسل تم سے یہ کام لے
تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہی نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان لوگوں کے بارے میں جانتے ہو گے۔
کی وصولی اور اپنی خدمت کا معاوضہ لینے کے لیے تمہیں کسی سے تو ملنا پڑتا ہو گا۔ تم مجھے ان لوگوں
میں بتاؤ۔'' پہاڑوں میں ٹھکانہ بنا کر رہنے والوں کے بارے میں تو مشابرم خان یقین کر سکتا تھا کہ
کے لیے اجنبی ہوں گے۔ جو لوگ سب سے چھپ کر پہاڑوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے، ان
میں یہ بات یقینی تھی کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپائے رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہو گی لیکن اسکر
رہ کر نیاز علی سے کام لینے والے کا پردے میں رہنا ممکن نہیں تھا۔



نے کہہ دیا نا کہ میں کسی کو نہیں جانتا تو پھر تم کیوں زبردستی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟'' نیاز علی
ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا اور یک دم ہی اسے دھکا دے دیا۔ مشابرم خان جو نیاز علی کو تعاون
کر اسے قدرے ڈھیلا چھوڑ چکا تھا، اس اچانک دھکے کو سہار نہیں سکا اور پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ اس
اب تک بے بس پڑے نیاز علی نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے کھڑا ہو کر جیپ کی طرف
مشابرم خان کے سنبھل کر کھڑا ہونے تک وہ جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ
نہیں پکڑ سکے گا پھر بھی وہ اس کی طرف دوڑا لیکن اس دوڑ بھاگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے کچھ بھی
سے قبل نیاز علی جیپ میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مشابرم خان نے چھلانگ لگائی کہ کسی طرح
سوار ہو سکے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کی انگلیاں صرف جیپ کی باڈی کو مس ہی کر سکی
جیپ جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ بے بس ساز مین پر گرا مشابرم خان ابھی کفِ افسوس ہی مل رہا تھا کہ
دم بہ خود رہ گیا۔ اس کی دسترس سے نکل جانے والی جیپ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور بے قابو ہو کر سڑک
طرف موجود کھائی میں لڑھک گئی۔ شاید عجلت اور گھبراہٹ کے باعث نیاز علی جیسا تجربہ کار ڈرائیور
رہا تھا۔

مشابرم خان لمحہ بھر کے لیے شاک کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا اور کھائی کی طرف
سڑک پر کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے جھک کر نیچے کی طرف جھانکا۔ بے قابو ہو کر سڑک سے
والی جیپ لڑھکتی ہوئی کافی نیچے تک پہنچ چکی تھی اور ابھی لڑھکنے کا عمل جاری تھا۔ موجودہ صورتِ حال
بغیر کسی شک و شبہے کے یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ نیاز علی کی زندگی کا چراغ جلتے رہنا اب ممکن نہیں تھا۔
میں لڑھکتی ہوئی جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جیپ کے غائب ہو جانے کے بعد مشابرم خان ایک گہرا
لیتا ہوا پیچھے ہٹا اور سڑک پر پیدل چلنے لگا۔ اب اس کے واپس شہر پہنچنے کا انحصار اسی بات پر تھا کہ کوئی
اتفاق سے اس طرف آ نکلے اور اسے لفٹ مل جائے۔ کچھ دیر قبل نیاز علی نے اُسے اس ویرانے میں چھوڑ
ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں وہ بہر حال کامیاب ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے ارادے
سابق یہاں سے نکل کر واپس شہر کی طرف سفر کرنے کے بجائے ہمیشہ کی واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔
تھا جس پر جانے کا ارادہ کبھی کوئی نہیں باندھتا لیکن بالآخر اُسے اس راستے پر سفر کے لیے قدم اُٹھانے ہی
ہیں۔ نیاز علی کی واپسی کا سفر بھی قدرت کے طے کردہ وقت پر شروع ہو گیا تھا اور اس سفر کے دوران ہی
یہ جانتا تھا کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے آرام کے لیے جو مال و زر جمع کرتا رہا تھا، اس نے اس کا سفر
کتنا مشکل بنا ڈالا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیا حال ہیں چودھری صاحب!.....سفر کی تھکن اُتر گئی یا نہیں؟'' گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے
ہی نے اپنا سیل فون بجنے پر کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نہایت بے تکلفانہ انداز میں پوچھا گیا۔
ہی جو فون کی اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھ کر اُلجھ گیا تھا، اس بے تکلفانہ لب و لہجے کو فوراً شناخت کر گیا۔

''آپ سنائیں مسٹر ڈیوڈ! آپ نے کیسے کال کی زحمت کی؟'' دورانِ سفر اُس کی ڈیوڈ سے اچھی خاصی
ہو گئی تھی لیکن آخر میں جس طرح ڈیوڈ نے پینترا بدل کر دھمکی آمیز لہجہ اختیار کر لیا تھا، وہ چودھری کو بھولا
تھا۔ چنانچہ اس وقت اس کے لہجے میں کافی سرد مہری تھی۔

''زحمت کیسی؟ آپ کو کال کر کے تو مجھے دلی خوشی ہوئی ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کال کے ذ
آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سفر کے دوران ہمارے درمیان ایک ڈیل
میں گفتگو چل رہی تھی اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس موضوع پر بعد میں اطمینان سے بات
گے۔ شاید اپنے ساتھ لنچ کی آفر بھی میں نے آپ کو اسی وقت دے دی تھی۔ اس وقت میں نے اسی
یاد دہانی کے لیے فون کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ آج لنچ میرے ساتھ ہی کریں۔'' ڈیوڈ کا
شائستہ ہونے کے باوجود چودھری اس میں موجود تحکمانہ پن کو محسوس کر رہا تھا اور یہ شے اس کے
تکلیف دہ تھی۔ اس جیسے حکم چلانے کے عادی شخص کے لیے کسی دوسرے کے احکامات کو برداشت
ناقابل قبول تھا۔

''فی الحال میرا ایسا کوئی موڈ نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں
نے قدرے رُوکھے پن سے ڈیوڈ کو جواب دیا۔

''موڈ کا کیا ہے چودھری صاحب! آپ چاہیں گے تو موڈ بھی بن جائے گا۔ اور یاد رکھیں کہ موڈ
سراسر آپ کا ہی فائدہ ہے۔ ہماری یہ ملاقات آپ کے لیے ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہو گی۔''

''میرے فائدے کو چھوڑیں، یہ بتائیں کہ آپ کا کیا فائدہ ہے جو آپ میرے پیچھے پڑے ہو
صرف میرے فائدے کے لیے تو آپ اتنے بے چین نہیں ہو سکتے۔'' ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری
ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ بڑے ذہین آدمی ہیں چودھری صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ میں بھی آپ
کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یاد رکھیں کہ آپ کا منافع مجھ سے زیادہ ہی ہو گا۔ میں آپ کو آ
منظورِ نظر ماہ بانو بھی دے دوں گا اور ساتھ ہی ہمارے درمیان ایک کاروباری معاہدہ بھی طے پا جائے گا
معلوم ہے کہ نئے اے سی شہریار عادل کی آمد کے بعد آپ کا لکڑی کا کاروبار بالکل ٹھپ ہو گیا ہے۔ آ
سے ملاقات کریں تو میں آپ کو اس کے متبادل دوسرے کاروبار کے سلسلے میں مشورہ دوں گا۔ اور یقین جا
وہ نیا کاروبار آپ کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہو گا۔''

ڈیوڈ نے چودھری کے سامنے وہ دانہ ڈالا کہ اس کے لیے ملاقات سے انکار ممکن ہی نہیں رہا۔ وہ زن
اور زمین کا دیوانہ تھا۔ ڈیوڈ اسے ان تینوں میں سے دو کے ملنے کی نوید دے رہا تھا اس لیے ممکن ہی نہیں تھا
اسے انکار کر دیتا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری آفر قبول کر لیتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کب اور کہاں پہنچنا ہے؟'' اس نے ہامی بھر
ہوئے ڈیوڈ سے پوچھا۔

''آپ ایک بجے تک ٹائمز اسکوائر پہنچ جائیں۔ وہاں سے میں خود آپ کو پک کر لوں گا۔'' ڈیوڈ نے بتا

''ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔''

چودھری نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پُرسوچ انداز میں اپنے سامنے چلتے ٹیلی ویژن
اسکرین کو گھورنے لگا۔ البتہ اسکرین پر تھرکتے انسانی جسموں کے بجائے اس کا دھیان ڈیوڈ کی باتوں میں
اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اسے کسی منفعت بخش کاروبار میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ
کاروبار کیا ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے یہ کوئی عام اور قانونی قسم کا کاروبار نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ڈیوڈ کو اس
پراسرار طریقے سے ملنے اور گھیرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہی سوچوں میں گھرے کافی



ہدھری اپنے خیالات کی دنیا سے اس وقت نکلا جب دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور اس کی
احتیاط سے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''آپ مصروف تو نہیں ہیں ماموں جان؟'' چودھری اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے شائستگی سے پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں۔ تم کہو، کوئی کام تھا کیا مجھ سے؟'' چودھری نے اپنے مخصوص روکھے انداز میں پوچھا۔

''جی۔ میں کھانا تیار کروا رہی تھی، اس لیے آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ آپ دوپہر کے کھانے میں کیا کھانا
گے؟'' نیویارک میں کئی برس رہنے کے باعث شاہدہ میں کافی خود اعتمادی تو پیدا ہو گئی تھی لیکن بہر حال
ل بہادر نہیں ہوئی تھی کہ چودھری افتخار عالم شاہ سے جس کی ہیبت پورے خاندان پر طاری تھی، ایک
ی پورے اعتماد سے کر سکتی۔

''دوپہر کے کھانے پر مجھے ایک دوست نے بلایا ہے۔ میں کھانا اس کے ساتھ کھاؤں گا اس لیے میری فکر
اپنے لیے جو چاہے پکوا لو۔''

''جی اچھا۔'' شاہدہ اس کا جواب سن کر واپس پلٹنے لگی۔

''سن شاہدہ!'' چودھری نے اسے روکا۔

''جی ماموں جان!'' وہ رک کر مؤدبانہ انداز میں ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''میں نے تجھے شاید پچھلی واری بھی بتایا تھا کہ ہر روز ''کیا کھائیں گے؟'' پوچھنے مت کھڑی ہو جایا کر۔
کہہ کر چھ آٹھ کھانے بنا لیا کر..... وقت پر میرا جو دل کرے گا، وہ کھا لوں گا۔ اگر تجھے میری پسند
نہیں تو حویلی فون کر کے اُدھر اپنی ساس سے پوچھ لے۔ وہ تجھے میرے پسند کے کھانوں کی لسٹ لکھوا
گی۔''

''اصل میں ماموں جان! مراد شاہ کو ایک وقت میں دو سے زیادہ کھانے دیکھ کر غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ کہتے
آدمی زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے، کوئی کھانے کے لیے زندہ نہیں رہتا جو کھانے کی ٹیبل کو روزانہ
وہاں تک بھر دیا جائے۔ پھر یہاں حویلی والی گل بھی تو نہیں کہ ہر وقت کے کھانے پر ڈھیر سارے
ہوں۔ زیادہ کھانا بنواؤ تو باسی ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ ملازمہ بھی صرف ایک ہے۔ اس سے اتنا سارا
گی تو نوکری چھوڑ کر چلی جائے گی۔ خیر، کام کا تو مسئلہ نہیں۔ آپ کی خاطر میں اپنے ہاتھ سے بھی کھانا
ہوں۔ بس آپ یہ وعدہ کریں کہ مجھے مراد شاہ کی ڈانٹ سے بچا لیں گے۔'' شاہدہ نے بڑے سبھاؤ
بات اس کے گوش گزار کر دی تھی لیکن سامنے چودھری جیسا بندہ تھا جسے اپنی بات کے آگے کسی کا ایک
گوارا نہیں تھا۔

''مراد شاہ کا دماغ تو مجھے ٹھیک کرنا پڑے گا۔ دن بہ دن انقلابی بنتا جا رہا ہے۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ ہوتا کون
سب بتانے والا؟ میں اس کا باپ ہوں، وہ میرا نہیں کہ میں اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر
گھوں سے ہماری کچھ روایتیں رہی ہیں۔ اس کل کے چھوکرے کے کہنے پر میں اپنی ان روایتوں کو
پونجیوں اور منگتوں جیسی زندگی تو نہیں گزار سکتا۔ ہاں، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری حکمرانی صرف حویلی
ہے اور اس گھر کا وہ مالک و مختار ہے تو گل الگ ہے۔ فیر تو میرے یہاں رُکنے کا بھی کوئی جواز پیدا
میں آج اور ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں ہوٹلوں کی کمی ہے، نہ ہی میری جیب
اپنے ہی پُتر کے در پر بے عزت ہونے کے لیے پڑا رہوں۔'' نہایت غصے سے کہتا ہوا وہ اس الماری
بڑھا جہاں اس کا سفری بیگ اور بریف کیس وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

''سوری ماموں جان! پلیز تسی برا نہ مانو۔ میں تو صرف آپ کو مراد شاہ کے خیالات کے بارے رہی تھی۔ ہوگا تو وہی جو آپ چاہیں گے۔'' چودھری کو الماری سے سامان نکالتا دیکھ کر شاہدہ سٹپٹا گئی اور کرتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تُو جو بھی کہہ لے، اب میں یہاں رکنے والا نہیں۔ مراد شاہ کو بتا دینا کہ اس کے گھر سے نکل کر کھلے آسمان تلے نہیں آ جاؤں گا۔ میں اسے امریکہ میں سیٹل کر سکتا ہوں تو کیا خود اپنے چند دن رہنے نہیں کر سکتا؟''

شاہدہ کی منت سماجت کے باوجود وہ کسی صورت رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شاہدہ نے تین سال اس کے سامنے لا کھڑا کیا کہ شاید اکلوتی پوتی کو دیکھ کر اس کا دل پسیج جائے لیکن وہ چودھری افتخار عالم شاہ کی ضد اور خودسری کے سامنے کسی شے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے ایک بار فیصلہ کر لیا تھا کہ مراد اپارٹمنٹ میں نہیں رکنا تو اب دنیا کی کوئی طاقت اسے وہاں رکنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

شاہدہ کی معذرتوں اور علینہ کی معصوم پکار کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا وہ وہاں سے نکل گیا اور ایک کیب اس کے ڈرائیور کو شہر کے بہترین ہوٹل چلنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی اور اسے ایک بہترین پہنچا دیا۔ شان دار طرزِ تعمیر رکھنے والا وہ ہوٹل اپنی آؤٹ لک سے ہی بتا رہا تھا کہ وہاں قیام کرنا حیثیت کے بندے کے بس کی تو بات نہیں۔ چودھری عام حیثیت کا مالک نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں ہوئے جھجکتا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس اس دولت سے بھرے ہوئے تھے جو اس نے اور اس کے آباؤ دوسروں کا خون چوس چوس کر بھرے تھے۔ اس دولت کو وہ ہوٹل بازی میں لٹاتا، نائٹ کلبز میں یا پیشہ پر..... دُکھ تو کسی صورت نہیں ہونا تھا۔ پیسے کا بے جا زیاں تو اس محنت کش کو گراں گزرتا ہے جس نے پیسے کے حصول کے لیے اپنے خون کو پسینہ بنایا ہو اور رزقِ حلال کے حصول کے لیے کی جانے والی محنت کی ہڈیاں تک گلا دی ہوں۔ چودھری جیسے لٹیرے اور غاصب کو اس دولت کو لٹانے میں کیا عار تھی۔ ہوٹل کے ہوش ربا کرائے کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے اپنے لیے ایک سوئٹ بک کروایا اور ویٹر کی میں اس شان دار سوئٹ میں جا پہنچا۔

یہاں پہنچ کر اس نے وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوا بارہ ہو چکے ہیں۔ ڈیوڈ نے اسے ایک اسکوائر بلایا تھا۔ یعنی اپنی تیاری اور وہاں تک کا سفر طے کرنے کے لیے اس کے پاس محض پون گھنٹہ پون گھنٹے کو اس نے ذرا بھی ضائع نہیں کیا۔ نتیجتاً ایک بجنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے کہ وہ ٹائمز اسکوائر تھا۔ نیویارک کے اس پُر رونق علاقے میں وہ پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا اور اس کے تاریخی پس منظر سے واقف آج کا مصروف ترین ٹائمز اسکوائر اُنیسویں صدی تک ''لونگ ایکٹر'' کہلاتا تھا۔ 1904ء میں جب مشہور اخبار ''نیویارک ٹائمز'' کی عمارت اس علاقے میں کھڑی کی گئی تو اس بلند عمارت کی مناسبت سے ''ٹائمز اسکوائر'' پکارا جانے لگا۔ ماضی میں یہ جگہ کچھ اچھی تصور نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں غنڈوں کا راج میں جولیانو نام کے ایک میئر نے اس علاقے کی اصلاح کی اور یہاں سے غنڈہ عناصر کو باہر نکالا۔ اب کافی پُر امن تھی جہاں لوگ آنا اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا پسند کرتے تھے۔ ماضی کے ٹائمز اسکوائر مقابلے میں اب یہاں شوقیہ فنکاروں، کاروباری افراد، ضرورت مندوں اور سیاحوں وغیرہ کا راج تھا۔ کئی بار کے دیکھے منظر پر سرسری سی نظر ڈال کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر اُس کی نظریں پُرشکوہ بگھیوں کو چوان لڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ایسی لڑکی پر جا ٹھہریں جو شکلاً تو بے شک اپنی دوسری ساتھی



صورت نہیں تھی لیکن اس کا جسم غضب کا پُرکشش تھا۔ وہ یقینی طور پر اپنی اس جسمانی کشش سے اچھی تھی اس لیے اس نے خود کو ایکسپوز کرنے کا خصوصی اہتمام کر رکھا تھا۔ چودھری کو یقین تھا کہ بگھی کے شوقین افراد میں سے بیشتر افراد کا انتخاب اس لڑکی کی بگھی ہوتی ہوگی۔ خود اس کا دل لڑکی کی بگھی کی سیر کرنے کو مچل گیا۔ سیر کے بہانے وہ اس کے حُسنِ بے حجاب کا اور بھی زیادہ قریب سے نظارہ کر سکتا وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے قدم اٹھانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کسی کے شانے پر ہاتھ رکھنے پر چونکا۔ وہ ڈیوڈ تھا جو اس کے بالکل قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ہیلو چودھری صاحب! یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ وقت کے کافی پابند ہیں۔'' چودھری کو اپنی طرف متوجہ کر وہ شستہ اُردو میں بولا۔

چودھری اُس کی اُردو دانی جہاز کے سفر کے دوران بھی ملاحظہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی اسے اس خالص شکل و نگار اور لباس کے مالک شخص کی زبان سے یہ جملے سننا عجیب لگا۔

''کیا خیال ہے؟ پھر چلتے ہیں۔ لنچ بالکل ریڈی ہے، اس لیے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔'' بظاہر اس سے پوچھتا ہوا وہ دراصل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' چودھری خود اصل بات جاننے کے لیے بے چین تھا چنانچہ اس کی تائید کی اور کوچوان لڑکی کو مسکراتا ہوا ڈیوڈ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی ڈیوڈ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

''افسوس مت کریں چودھری صاحب! میرے اپارٹمنٹ پر اس کوچوان لڑکی سے بھی زیادہ حسین لڑکی کی میزبانی کے لیے موجود ہوگی۔''

گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے ڈیوڈ نے بظاہر سرسری لہجے میں یہ بات کہی لیکن اُس کے اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خاصی تیز نظر رکھتا ہے اور چودھری کا زاویۂ نظر بھانپ چکا ہے۔ چودھری نے اس کی کے جواب میں خاموشی مناسب سمجھی اور کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ ڈیوڈ کا اپارٹمنٹ ٹائمز اسکوائر کے پہلو میں موجود براڈوے کے علاقے میں تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں موجود اشیاء خود سے اپنی قیمت کا اعلان کر رہی تھیں۔ پھر ان کی نہایت جچی تلی ترتیب سے بھی واضح تھا کہ کسی ماہر ڈیکوریٹر کی زیرِ ہدایت یہ کام کیا گیا ہے۔ لاؤنج میں رکھے صوفوں سے لے کر دیواروں پر موجود پینٹنگز کی شے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس جگہ مس فٹ ہے۔ ہر شے اپنی جگہ اتنی موزوں لگ کہ دیکھنے والے کے لیے کہیں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر ان سب اشیاء سے بڑھ کر وہ حسینہ تھی نے ڈور بیل کے جواب میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ سریلی آواز والی وہ حسینہ جس کے بالوں اور جلد میں سنہری پن اتنا نمایاں تھا کہ اس پر سونے سے بنی ہوئی کسی مورتی کا گمان ہوتا تھا، بالکل ایسی لگ جیسے اپارٹمنٹ میں موجود دیگر اشیاء کی طرح اسے بھی بالخصوص آرڈر پر تیار کروا کے یہاں سجا دیا گیا ہو۔ کی نظر اس حسینہ پر پڑی تو پھر اُس کے سارے جسم پر پھسلتی ہی چلی گئی۔ ایک طرف اس کے عریاں بازو نظارہ دیتے تھے تو دوسری طرف جسمانی نشیب و فراز آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ عریاں کمر کے خم میں والے کو گرفتار کر لینے کی صلاحیت تھی تو لمبی سڈول ٹانگیں قدموں سے لپٹ جانے پر مجبور کرتی تھیں۔

''یہ میری دوست لِنڈا ہے۔ اسے میں نے خاص طور پر آپ کی میزبانی کے لیے یہاں بلوایا ہے۔'' ڈیوڈ اس قاتل حسینہ سے اس کا تعارف کروایا تو اس نے جواباً مسکراتے ہوئے چودھری سے مصافحہ کیا۔ یہ ایک

نہایت پُرجوش مصافحہ تھا جس کے دوران لِنڈا نے چودھری کے ہاتھ کو مخصوص انداز میں دبا کر یوں آ
آزاد کیا کہ وہ اس دباؤ کی سنسناہٹ اپنے پورے جسم میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میرے خیال میں پہلے لنچ کر لیتے ہیں پھر بعد میں اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔'' چود
سرخ پڑتے ہوئے چہرے کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے خیال ظاہر کیا۔ اپارٹمنٹ
رکھتے ہی لِنڈا کی موجودگی کے باعث ان کے درمیان گفتگو کے لیے انگلش کا استعمال ہونے لگا تھا
اگرچہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں گفتگو کو زیادہ پسند کرتا تھا لیکن انگریزی سے نابلد نہیں تھا۔ جس طرح
اپنے بیٹے کے لیے بہترین تعلیم کا بندوبست کیا تھا، اسی طرح اس کے باپ نے بھی اس کی شخصیت کو
کی کوشش کی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کے پاس بیٹے جیسی بھاری بھرکم ڈگریاں نہیں تھیں اور تربیت
معاملہ ہی الگ تھا۔ وہ دوسروں پر حکمرانی کرنے والے لوگ تھے چنانچہ ان کی تربیت کتابوں
اخلاقیات کے اصولوں پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چودھری اور اس سے قبل اس کے آباؤ
تربیت حکمرانی کرنے والوں کے اپنے طے کردہ اصولوں پر ہوتی رہی تھی۔ جانے کیسے چودھری کی
گرفت ذرا کمزور پڑ گئی اور وہ اپنے خاندان کے مردوں سے مختلف نکل آیا۔ شاید یہ کئی سال اپنے ماحول
ایک آزاد معاشرے میں رہنے کا اثر تھا۔ اس آزاد ماحول میں رہ کر اسے جو کچھ مناسب محسوس ہوا،
گیا۔ اور اب نتیجتاً وہ اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھا۔

''ڈیوڈ صحیح کہہ رہا ہے چودھری صاحب! لنچ تیار ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اگر ٹھنڈا ہو گیا تو
دے گا۔''

لِنڈا نے ڈیوڈ کی تائید کرتے ہوئے چودھری کا بازو تھاما اور اس حصے کی طرف بڑھ گئی جسے ایک
پردے کے ذریعے لاؤنج سے الگ کر کے وہاں آٹھ کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل رکھی گئی تھی۔ لاؤنج میں
سامان کی طرح یہ ڈائننگ ٹیبل اور اس پر سجی کراکری بھی بے حد شان دار تھی۔ چودھری کے لیے اس
شوکت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں تھا کہ خود اس کی دسترس میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی لیکن اس کا ذہن
کتاب ضرور لگا رہا تھا کہ ایک انجینئر کی کتنی آمدنی ہو سکتی ہے جو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اتنی بیش قیمت
کر سکے۔

لِنڈا کی خوب صورت میزبانی میں لنچ سے لطف اندوز ہوا گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر انگریزی کھانوں
ٹن پیک مشرقی کھانے بھی موجود تھے۔ لِنڈا خود بڑھ چڑھ کر ہر شے چودھری کو پیش کر رہی تھی۔ پہلو میں
مسلسل آنچ دیتے شباب اور سامنے رکھی شراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ کتنا کھا گیا، اسے اندازہ
ہوا۔ اس کا ساتھ دینے والے لِنڈا اور ڈیوڈ البتہ بہت محتاط انداز میں کھا پی رہے تھے۔ چودھری کو ناک تک
دینے کے بعد جب وہاں خدمت کے لیے مامور ادھیڑ عمر میڈ ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہی تھی تو ڈیوڈ کا سیل
بجنے لگا۔ اس نے چودھری اور لِنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے ایکسکیوزمی کہا اور کال ریسیو کر لی۔ موبائل
جانے والی اس کی یک طرفہ گفتگو سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کہیں آنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کے
راضی نہیں۔ پھر یوں لگا کہ جیسے اس نے بالآخر مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' اس کے موبائل آف کرتے ہی لِنڈا
سے پوچھا۔

''ہاں، اصل میں باس کی کال تھی۔ اس نے کسی پراجیکٹ پر ڈسکشن کے لیے میٹنگ رکھ لی ہے



میری شرکت کو ضروری قرار دے رہا ہے۔ لیکن مجھے چودھری صاحب کو چھوڑ کر کہیں جانا اچھا نہیں

کوئی اتنا بڑا پرابلم تو نہیں ہے۔ تم جاؤ اپنی میٹنگ اٹینڈ کرو۔ میں اتنی دیر میں چودھری صاحب کو کمپنی
لِنڈا نے گویا چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کیا اور چودھری کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو
اعتراض نہیں ہے چودھری صاحب؟ آپ تو سنا ہے نیویارک آئے ہی گھومنے پھرنے اور تفریح کے
ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیوڈ کے آنے تک آپ اگر کچھ وقت میری کمپنی میں گزار لیں تو ہرگز بھی بور
گے۔'' یہ بات کہتے ہوئے لِنڈا کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایسی بلاوا دیتی مسکراہٹ تھی کہ چودھری
اور کی بات، کوئی زاہدِ خشک بھی ہوتا تو ایک لمحے کے لیے ضرور ڈگمگا جاتا۔

کوئی اعتراض نہیں مسٹر ڈیوڈ! میں آج پورا دن فارغ ہی ہوں۔ آپ جا کر اپنی میٹنگ اٹینڈ کر لیں۔
مس لِنڈا کی کمپنی کو انجوائے کرتا ہوں۔'' نہایت لہک کر شراب و شباب کے نشے میں غرق یہ جواب
چودھری کو یاد بھی نہیں تھا کہ ڈیوڈ سے آج کی یہ ملاقات کسی خاص مقصد کے تحت کی جا رہی ہے اور
سے قبل وہ اس مقصد کو جاننے کے لیے بے حد بے چین تھا۔

یو چودھری صاحب! آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔'' ڈیوڈ خوش دلی اور ممنونیت سے اس کا
کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ڈیوڈ کے رخصت ہوتے ہی لِنڈا چودھری کی طرف متوجہ ہوئی۔

ئیں چودھری صاحب! تھوڑی دیر آرام کر لیں۔'' اس نے چودھری کو صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ
میں بازو ڈال کر سہارا بھی دیا۔

کے حسین بازوؤں کے سہارے چودھری جھومتا ہوا اُٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اس کمرے کی
نے لگا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔ لِنڈا کے آنچ دیتے جسم سے چپکا وہ بیڈ روم کی طرز پر سجے
میں داخل ہوا تو خود پر قابو رکھنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ اس نے یک دم ہی خود کو سہارا دے کر بیڈ پر لٹاتی
طرف کھینچ لیا۔ اس نے جواباً کوئی تعرض نہیں کیا اور خود سپردگی کے عالم میں چودھری کی من مانیوں کا
کرنے لگی۔ شراب کے نشے میں شباب کی آمادگی نے بات بہت آگے تک پہنچا دی۔ ہوس و نفسانی
ڈوبے لمحات کتنی تیزی سے گزرتے رہے، چودھری کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے زندگی میں بے شمار
قربت سے لطف اٹھایا تھا۔ ان عورتوں میں اس کی بیویوں سے لے کر بے باک طوائفیں اور وہ مظلوم
نہیں وہ طاقت و اختیار کے زور پر اپنے بستر تک آنے پر مجبور کر دیتا تھا، سب ہی شامل تھیں..... لیکن
کوئی بھی لِنڈا جیسی نہیں تھی۔ بے پناہ جنسی کشش کی حامل لِنڈا کسی منہ زور ندی کی طرح تھی جس میں
بعد چودھری تیرنے کی کوشش میں ہانپ سا گیا لیکن اسے اعتراف تھا کہ اس منہ زور ندی کی قربت
ہے، وہ اسے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی کہیں بھی نہیں ملا۔ اسی لیے وہ ہانپنے اور تھکنے کے باوجود
سے باہر آنے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔

گھنٹے گزر چکے ہیں۔ ڈیوڈ آنے والا ہو گا۔'' آخر کار لِنڈا نے خود ہی اسے احساس دلایا تو چودھری
اس سے الگ ہوا۔ وہ دونوں بیڈ روم سے نکل کر باہر لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو پندرہ منٹ بعد ہی ڈیوڈ
لیا۔

اری چودھری صاحب! مسئلہ ہی ایسا سامنے آ گیا تھا کہ مجھے جانا پڑا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ
ان ہے جو دعوت پر بلا کر خود غائب ہو گیا۔'' چودھری کے مقابل ایک سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے ڈیوڈ

معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں مسٹر ڈیوڈ! آپ اپنے بدلے میں مجھے اتنی شان دار میزبان کی نگرانی میں چھوڑ
تھے کہ کسی قسم کی بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' چودھری نے اپنے پہلو میں بیٹھی لِنڈا کی طرف
مسکراتے ہوئے ڈیوڈ کو جواب دیا۔ اگر وہ جواب نہ بھی دیتا تو اس کی ساری کیفیت اس کے چہرے پر
تھی۔ بھاری بھرکم چہرے کی سرخی اور آنکھوں کا خمار ان لمحات کی کہانی سنا رہے تھے جو اس نے لِنڈا کے
گزارے تھے۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میرے نہ ہونے سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ورنہ میں تو سارا
اسی اُلجھن میں رہا کہ کہیں آپ بور نہ ہو رہے ہوں۔''

''میرے ہوتے ہوئے کسی کو بوریت ہو، یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا ڈیوڈ؟'' چودھری کی بات سن کر
نے بڑی ادا سے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہنی! تمہارا ساتھ تو بندے کو پرانی شراب کے نشے کی طرح مدہوش کر دیتا
میرا خیال ہے کہ اس مدہوشی کو کم کرنے کے لیے تم ہمیں گرم گرم بلیک کافی پلوا دو تا کہ میں چودھری صاحب
ذرا کام کی باتیں بھی کر سکوں۔''

بظاہر خوشگواری سے کہتے ہوئے ڈیوڈ کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔ اس معنی خیزی کو محسوس کر کے
سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ مرحلہ آ گیا تھا جب اس پر اس ملاقات کا مقصد واضح ہو جاتا۔

''وہیں سے بات شروع کرتے ہیں چودھری صاحب! جہاں تک پلین میں ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں
آپ ماہ بانو نام کی اس لڑکی میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب
کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی کہاں ہے، یہ صرف میں جانتا ہوں اور میں ہی اسے آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔
لڑکی کے حصول کے لیے اے سی شہریار کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اس بات کا بھی مجھے اچھی طرح علم ہے
چکر میں آپ ایک بار اے سی کو دھوکا دے کر اس کی قابلِ اعتراض حالت میں تصویریں بھی اُتار چکے ہیں،
بھی مجھے علم ہے اور اب بھی یقیناً آپ کوئی نئی ترکیب لڑانے کا سوچ رہے ہوں گے، یہ بھی میں جانتا ہوں
لیکن ماہ بانو کہاں ہے، یہ شہریار کو بھی معلوم نہیں۔ اس کا پتہ دینے والا ساری دنیا میں آپ کو میرے سوا کوئی
شخص نہیں ملے گا۔ لیکن ظاہر ہے اتنی قیمتی معلومات میں آپ کو ایسے ہی تو فراہم نہیں کر دوں گا۔ اس لیے
آپ کو GIVE AND TAKE کے اصول کے مطابق میرے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔'' لِنڈا کے لاؤنج
باہر نکلتے ہی ڈیوڈ نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

''تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟'' چودھری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کام بھی بتاؤں گا لیکن پہلے اتنا جان لیں کہ میری بات مان لینے کی صورت میں آپ کو صرف ماہ
نہیں ملے گی بلکہ میں آپ کو باقاعدہ معاوضہ بھی ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ لِنڈا اور دوسری من پسند لڑکی
قربت بونس سمجھ کر انجوائے کیجیے گا آپ۔'' وہ چودھری کی لالچی فطرت کو للچانے کی ہر ممکن ترکیب لڑا رہا تھا

''کام بتاؤ۔ کام معلوم ہوگا، تب ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔'' چودھری نے بھی کوئی کچی گولیاں
کھیل رکھی تھیں جو اتنی آسانی سے ڈیوڈ کو خود پر حاوی ہونے دیتا۔ لِنڈا کی ہوش رُبا قربت میں دو گھنٹے گزر
کے بعد بھی بہرحال وہ اتنا تو ہوش میں تھا کہ کام کی نوعیت جانے بغیر ڈیوڈ کی کسی پیشکش سے متاثر نہ ہو یا
اسے متاثر ہونے کا تاثر نہ دے۔



آباد کے ساتھ جو جنگل لگا ہوا ہے، وہ آپ کی انکم میں کتنا اضافہ کرتا ہے، یہ بات میں بہت اچھی طرح
اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نئے اے سی شہریار کی پوسٹنگ کے بعد آپ اس سلسلے میں بڑے پریشان
لکڑی اسمگل کرنے دیتا ہے اور نہ ہی جانوروں کی کھالیں۔ اس کی طرف سے ہونے والی سختی کی وجہ
آپ کا اچھا خاصا بزنس تباہ ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا یہ نقصان پورا ہو جائے۔''

''تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی اور منصوبہ ہے؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں ہے۔ لیکن لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے بجائے نئے بزنس کا منصوبہ۔''

''کیا بزنس..... وہ کیا؟'' چودھری حیران ہوا۔

''اس کی تفصیلات میں ابھی بتاتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا اور کافی کے مگ لے کر آنے والی لِنڈا کی طرف
گیا۔ لِنڈا نے اسے اور چودھری کو کافی پکڑائی اور خود ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''زبردست۔ تم نے بالکل اپنی طرح شان دار کافی بنائی ہے۔'' ڈیوڈ نے گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر لِنڈا
اور پھر چودھری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں تو میں آپ کو بزنس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ پیر آباد آپ کے ضلع کا سب سے بڑا
ہے اور آپ کا ہی پورے علاقے میں سب سے زیادہ ہولڈ بھی ہے۔ اس لیے ہم آپ سے معاملات طے
چاہتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہمیں دیگر زمینداروں میں سے کسی سے رابطہ کرنا ہوگا اور یہ بات یقیناً
اچھی نہیں لگے گی۔'' اتنی بات کہہ کر اس نے لمحے بھر کا توقف کیا اور چودھری کے چہرے کے تاثرات کا
لیتے ہوئے بات مزید آگے بڑھائی۔

''آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کے علاقے میں جو جنگل ہے، وہ حیرت انگیز ماحول رکھتا ہے۔ آپ کی
نے توجہ نہیں دی ورنہ اس جنگل میں دنیا کے نایاب ترین پودوں اور جانوروں کی نشوونما ہو سکتی تھی۔
حال، میں نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ
کا حیرت انگیز ماحول اور موسم پوست کی کاشت کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم مستقبل میں
بڑے پیمانے پر اس سلسلے میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن فی الحال تو اس سے پہلے کاشت کا مرحلہ
اور اس سلسلے میں ہمیں جو مین پاور چاہئے، وہ آپ ہمیں پروائیڈ کریں گے۔ آپ کے پاس ایسے محنتی اور
اعتماد بندوں کی کمی نہیں ہوگی جو یہ کام کریں بھی اور معاملے کو راز میں بھی رکھیں۔'' ڈیوڈ نے آخر کار تھیلے
سے بلی نکال ہی دی۔

''لیکن فاریسٹ آفیسر کو ساتھ ملائے بغیر یہ کام کیسے ہوگا؟ میں نے سنا ہے کہ نیا فاریسٹ آفیسر عابد
ری بہت اچھی شہرت رکھتا ہے اور کبھی کسی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سامنے نہیں آیا۔'' چودھری نے
کی توجہ اہم نکتے کی طرف مبذول کروائی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم کر لیں گے۔ عابد انصاری کتنی ہی اچھی شہرت رکھتا ہو، ہے تو آخر
ان ہی۔ اور انسانوں کو ان کے اصولوں سمیت خریدنے کا پرانا تجربہ ہے ہمیں۔'' ڈیوڈ نے اطمینان سے
ب دیا۔

''اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اصل میں تو عابد انصاری آپ کا اپنا مسئلہ ہے، میں تو
بارے میں بات کروں گا۔ آپ جو کام مجھ سے لینا چاہتے ہیں وہ بہت رِسکی ہے۔ بندے بے شک میں
کو فراہم کر سکتا ہوں لیکن کام کی نوعیت ایسی ہے کہ بہت چھان پھٹک کر بندوں کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اور

یہ تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ایسے منتخب بندوں کا ریٹ بھی اونچا ہوتا ہے۔ میرے بندے میرے وفادار
صرف اس لیے کہ میں انہیں ان کی وفاداری کی مناسب قیمت ادا کرتا ہوں۔ آپ جو کام لینا چاہتے
کے لیے میں جو بندے لگاؤں گا، ان کی قیمت اچھی خاصی ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ مجھے
ادائیگی کریں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ کام پارٹنرشپ کی بنیاد پر ہو۔ لکڑی اور کھالوں والے بزنس میں بھی
بنیاد پر کام کرتے تھے۔ اس بزنس کے لیے بھی میری یہی شرط ہوگی۔'' چودھری نے ایک پل کے لیے
سوچا تھا کہ اس کے تعاون سے کاشت کی جانے والی پوست آنے والے وقت میں کتنوں کی زندگی برباد کر
سبب بنے گی۔ وہ بے ضمیر انسان، انسانیت کا ہر فریضہ واحساس بھول کر مال و دولت کے حساب کتاب
گیا تھا۔

''پارٹنرشپ کی ضد نہ کریں چودھری صاحب! آپ نے ضد کی تو ہم آپ کے کسی حریف
معاملات طے کر سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اس کا مطالبہ سن کر دھمکی دی۔

''میرا کوئی حریف اتنا طاقتور نہیں کہ میرے مقابلے پر آ کر کسی کام میں ہاتھ ڈال سکے۔ بلکہ سچ پوچھیں
آپ اس علاقے میں میرا کوئی حریف ڈھونڈ ہی نہیں سکیں گے۔ پیر آباد کو چھوڑ کر جتنے بھی گاؤں ہیں، ان
سے کسی کا بھی زمیندار میری ٹکر کا نہیں ہے۔ اس لیے اگر کسی کے دل میں دشمنی ہو بھی تو زبان سے اظہار
جرأت نہیں کر سکتا۔'' معاملے کی نوعیت سامنے آنے کے بعد چودھری مکمل طور پر فارم میں آ گیا تھا اور
عیاری سے ڈیوڈ سے معاملات طے کر رہا تھا۔

''اوکے! اگر آپ کی یہی شرط ہے تو ہم پرسنٹیج پر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ آپ اس بزنس میں ٹین پرسنٹ
کے حصے دار ہوں گے۔ اب تو آپ خوش ہیں نا؟'' ڈیوڈ بھی چودھری کے بیان کردہ حقائق اچھی طرح جانتا
اس لیے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

''ٹین پرسنٹ بہت کم ہے۔ تھرٹی فائیو پرسنٹ سے ایک پوائنٹ نیچے بھی معاملہ طے نہیں ہوگا۔'' ڈیوڈ
پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے چودھری نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''تھرٹی فائیو پرسنٹ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ ہم جو بزنس کرنے جا رہے ہیں،
میں قدم قدم پر کتنی دشواریاں سامنے آتی ہیں اور کتنے لوگوں کو ساتھ ملانا پڑتا ہے۔ اگر میں اپنے ایک پارٹنر کو
تھرٹی فائیو پرسنٹ دے دوں گا تو باقی لوگوں کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟'' ڈیوڈ نے اعتراض کیا۔

''یہ سب میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ سب سے زیادہ خطرہ میرے لیے ہوگا۔ میرے بندے
کریں گے تو کسی اونچ نیچ کی صورت میں، میں ہی پکڑا جاؤں گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطالبہ بالکل
درست ہے۔'' چودھری بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈیمانڈ پر اڑا رہا۔

''اس طرح روّیے میں لچک لائے بغیر تو بات نہیں بنے گی چودھری صاحب! میری نرم گفتاری کو
آپ میری کوئی مجبوری سمجھ رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ ہم جیسے کام کرنے والے لوگ کسی کے سامنے مجبور نہیں
ہوتے۔ اگر کوئی ہم سے تعاون کرے تو ٹھیک ورنہ اپنی راہ کی رکاوٹیں ہٹانا ہمیں اچھی طرح آتا ہے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری بھڑک اُٹھا۔

''یہ دھمکی نہیں، حقیقت ہے۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ردِعمل میں چودھری اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا

''آرام سے ڈارلنگ! یہ تم چودھری صاحب جیسے شخص سے کس انداز میں بات کر رہے ہو؟'' اب
خاموش کردار کی طرح کمرے کے منظر میں موجود لنڈا فوراً ہی حرکت میں آئی اور ڈیوڈ کو ٹوکا۔ جواباً وہ بری



لے لگا۔

''ایڈا کی بات کا برا مت مانیں چودھریں صاحب! اصل میں اپنی جگہ یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ لیکن آپ
اس بزنس میں ہاتھ ڈالنے جا رہے ہیں، اس لیے آپ کو صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہے۔ آپ کو
پرسنٹ دے کر واقعی ڈیوڈ کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں ڈیوڈ سے آپ
ٹونٹی فائیو پرسنٹ شیئرز کی سفارش کر سکتی ہوں۔ یقین کریں، ٹونٹی فائیو پرسنٹ لے کر بھی آپ بہت
میں رہیں گے۔'' چودھری کا بازو پکڑ کر اسے واپس صوفے پر بٹھاتے ہوئے لنڈا نے کچھ ایسی ادا سے
کی کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب لنڈا اس کے پہلو سے بالکل جڑ
ہوئی تھی۔

''تم نے تو مجھے پھنسا دیا لنڈا! ٹونٹی فائیو پرسنٹ شیئر بھی بہت زیادہ ہے۔'' ڈیوڈ نے احتجاج کیا۔

''کتنا بھی زیادہ ہو، اب تو میں چودھری صاحب سے وعدہ کر چکی ہوں۔ تمہیں میرا یہ وعدہ ہر صورت پورا
کرنا ہوگا۔'' لنڈا نے محبوبانہ ناز کے ساتھ حکم صادر کیا۔

''تمہاری سفارش ہے تو میں انکار کیسے کر سکتا ہوں؟'' ڈیوڈ نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

''اب تو آپ خوش ہیں نا چودھری صاحب؟'' لنڈا نے تفاخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے چودھری سے

''تم ساتھ ہو تو خوش نہ ہونے کا کیا سوال ہے ہنی! تم نے جو کہہ دیا ہم نے مان لیا۔'' لنڈا کے آنچ دیتے
ان کی حدت اپنے اندر اتارتے ہوئے چودھری نے جواب دیا۔ جواباً لنڈا نے سامنے بیٹھے ہوئے ڈیوڈ
ایک بغیر اس کے رخسار کو چوم لیا۔ چودھری کے نزدیک یہ اس کی فتح تھی کہ ڈیوڈ کی گرل فرینڈ اس کے
اس کے بجائے چودھری کے ناز اُٹھا رہی تھی۔ حُسن کی شاطرانہ چالوں کے آگے
جان سکتا تھا کہ فتح تو انہی کے ہاتھ آئی ہے جنہوں نے اس کھیل کا آغاز کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''بات سنو! ذرا دو منٹ یہاں رک جاؤ۔'' کھانے کے برتن لے کر آنے والا اس کے سامنے کھانا رکھ کر
تھا، تب ماہ بانو نے اسے پکارا۔ یہ تقریباً بیس اکیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا جس کی سبز آنکھوں
اُداسی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھتے ہی دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ اس نوجوان نے اپنی زندگی میں کوئی
نقصان اٹھایا ہے۔ ایسا نقصان جس کے بعد اس کے لیے زندگی بے معنی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ماہ بانو نے
بار اس نوجوان کو دیکھا تھا اور جانے کیوں اس کے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ وہ وہاں موجود دیگر
کے مقابلے میں قدرے مختلف ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت و بربریت کے وہ آثار نظر نہیں آتے تھے
اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ شاید یہ اُس کی شکل وصورت کا بھی کمال تھا کہ دیکھنے والے کو خود بہ خود
دل میں اس کے لیے ایک نرم سا گوشہ پیدا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ ماہ بانو کو بھی وہ اچھا لگا تھا اور ایک بے
امید کے سہارے وہ اسے پکار بیٹھی تھی۔ اس کی پکار کے جواب میں وہ نوجوان رُکا ضرور لیکن بغیر کچھ کہے
اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ماہ بانو نے اس سے دریافت کیا۔ ردِعمل میں وہ جواب دینے کے بجائے یوں منہ
اسے جتانا چاہتا ہو کہ اگر کوئی کام کی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ میں چلتا ہوں۔

"دیکھو! میں جانتی ہوں کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور اس کا جواب بھی دے سکتے
سے بات کر رہی ہوں تو اس لیے کہ مجھے تم اپنے دوسرے ساتھیوں سے مختلف لگے ہو۔ وہ سب وحشی
ہیں لیکن تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کسی اچھے خاندان کے پڑھے لکھے لڑکے ہو۔ تمہیں میرا
چاہیے۔ میری طرح تمہاری بھی تو کوئی بہن ہوگی۔ ذرا سوچو اگر اُسے اس طرح کسی جگہ قید کر دیا جا
کیا گزرے گی؟ ساری دنیا سے کٹ کر اس ویرانے میں وحشی مردوں کے درمیان رہنا کتنا خوفناک
ایک بہن کی نظر سے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا۔" اسے وہاں سے ہٹنے کے لیے پَر تولتا دیکھ کر ماہ بانو
لہجے میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔

"تم یہاں کیوں قید ہو؟ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں ہم سے کوئی
پہنچ رہی۔ ہم تمہارے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ رہی مردوں کے درمیان تمہارے
اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ یہاں کوئی تمہیں میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

یہ پہلی بار تھا کہ اس برف زار کی قید کے دوران کسی نے ماہ بانو سے براہِ راست بات کی تھی ورنہ
اس کے سامنے گونگے بن کر رہتے تھے۔

"یہ تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے یہاں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میں
محفوظ نہیں سمجھ رہی۔ پچھلی رات میں نے یہاں کسی کی آنکھوں میں ہوس دیکھی ہے اور اس کو دیکھنے کے
ایک پل کے لیے بھی سکون کی نیند نہیں آسکی۔ تم جو کوئی بھی ہو اور تمہارا جو بھی نام ہے، میں تم سے
کرتی ہوں کہ اپنے کسی بڑے تک میرا پیغام پہنچا دو۔ ان سے کہو کہ مجھے میرا جرم بتایا جائے۔ میں
کب تک اس قید خانے میں بند رہوں گی؟ اگر میں کسی کی مجرم ہوں تو وہ سامنے آ کر مجھے میرے
سنائے۔ لیکن اس ذہنی اذیت سے تو کسی طرح نجات ملے۔" نوجوان کا جواب سن کر ماہ بانو غصے میں
گئی۔ جذبات کی شدت کے باعث بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی چھلک پڑے
تھی کہ کل جس طرح وہ شخص ہوس ناک انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اس صورتِ حال
خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ایک تو بے جرم کی زبردستی مسلط کردہ قیدِ تنہائی اور اس پر سے عزت جانے کا
کے اعصاب جواب نہ دیتے تو اور کیا ہوتا؟

"پچھلی رات کون تمہیں کھانا پہنچانے آیا تھا؟" اس کی بات سن کر نوجوان چونکا۔

"کوئی گل شیر نام کا آدمی تھا۔" ماہ بانو نے رخساروں پر پھسلتے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب

"ٹھیک ہے۔ میں آئندہ نظر رکھوں گا کہ کوئی تمہاری طرف غلط ارادے سے نہ بڑھ سکے۔ ہا
بڑے کو تمہارا پیغام پہنچانے کی بات تو میں کمانڈر سے کہہ دوں گا۔ وہ اوپر والوں سے بات کر لے گا۔
رُوکھے لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی ظاہر تھا کہ کچھ نہ کچھ اس کی باتوں کا اثر لیا ضرور ہے
ہوتا تو اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح وہ بھی حسبِ معمول گونگا بہرہ بنا رہتا اور اسے کوئی رسپانس نہ دیتا۔

"بہت بہت شکریہ بھائی! میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گی۔" ماہ بانو نے جھٹ اس کا شکریہ
کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماہ بانو بھی اس پر
کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ چنے کی دال کے ساتھ گندم کی موٹی موٹی روٹیاں تھی۔ اس نے بسم
کھانا شروع کر دیا۔ یہاں آنے کے بعد کھانے سے منہ موڑنے کی حماقت اس نے ایک بار بھی
شروع میں یہ بات اس کے ذہن میں تھی کہ اس قید کے دوران اگر کوئی ایسا مرحلہ آئے جب جسما



لانے کی ضرورت ہو تو وہ ناتواں ثابت نہ ہو..... اور توانائی کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ غذا
لیتی رہے۔ اس وقت بھی طبیعت پر بہت بوجھ ہونے کے باوجود اس نے کھانے سے منہ نہیں موڑا
کر کھانا کھا لیا۔ کھانے کے بعد وہ برتن ایک طرف سرکا کر خود دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

قید خانے کے میزبانوں میں سے کوئی خود ہی آ کر برتن واپس لے جاتا۔ اس کے پاس تو یہاں
ہونے اور لایعنی سوچوں میں گھرے رہنے کے سوا کوئی چوتھا کام نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی سوچوں
ہی تھی کہ یک دم نظر دروازے پر گئی۔ اسے کھانا پہنچانے والا نوجوان دروازے کو مقفل کرنا بھول گیا
کے دل میں جانے کیا خیال آیا کہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دبے قدموں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ قید خانے
موجود تنگ راہداری کو اس نے بے حد احتیاط سے دبے قدموں طے کیا۔ یہاں لائے جانے کے وقت
راستہ دیکھا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کئی شاخوں میں منقسم اس غار کا دہانہ بائیں جانب موجود
انے تک پہنچنے کے لیے البتہ اسے اس مقام سے گزرنا پڑتا جہاں اس نے کئی لوگوں کو دیکھا تھا اور جہاں
پر دنیا بھر کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ ایک موہوم سی اُمید کے سہارے وہ راہداری عبور کر کے بائیں جانب مڑ
احتیاط کے پیشِ نظر وہ بلی کی طرح پنجوں کے بل چل رہی تھی تاکہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ پر چونک
۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہی اسے مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کے
کی گہری لہر دوڑ گئی۔ ان آوازوں کا مطلب تھا کہ آگے راستہ صاف نہیں ہے اور وہ لوگ اس مقام پر
جہاں سے گزر کر اسے دہانے تک پہنچنا تھا۔ غار کا وہ کشادہ حصہ کسی ہال کی طرح تھا جہاں بڑی تعداد
بیٹھ سکتے تھے جبکہ اس کی باقی جتنی بھی راہداریوں میں نظر پڑی تھی، انہیں اس نے اپنے قید خانے والی
کی طرح تنگ پایا تھا۔

مایوس ہونے کے باوجود اس نے اپنے قدموں کو نہیں روکا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اسے قیدی بنا کر رکھنے
کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مشکوک حلیوں والے وہ نیم وحشی سے انسان اس کے لیے ابھی
معمہ ہی تھے۔ ابھی تک وہ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکی تھی اب موقع ملا تو سوچا کہ
نہ چھپ کر ان کی ٹوہ لی جائے..... کہ ہو سکتا ہے اسی طرح ان کی شخصیت پر پڑے اسرار کے پردے کچھ
تجسس و کھوج میں مبتلا وہ آہستگی سے ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں ایک آڑ میں کھڑی ہو کر وہ نہ صرف
کی آوازیں واضح طور پر سن سکتی تھی بلکہ ان کی سرگرمیوں کا بصری جائزہ بھی لے سکتی تھی۔

"چھیتی کرو اوئے۔ ساروں کو ادھر جمع کر کے بیٹھ گئے ہو اور ابھی تک پروجیکٹر ڈھنگ سے نہیں لگایا۔
اور بھی تو کام کرنے ہیں یا نہیں؟" اس نے آڑ سے ذرا سا سر نکال کر جھانکا تو وہ سب اسے سینما ہال میں
تلاش بینوں کی طرح پروجیکٹر کی طرف منہ کر کے بیٹھے دکھائی دیئے۔ آبادی سے بہت دور اس برف سے
پہاڑی علاقے میں پروجیکٹر کو چلانے کے لیے طاقتور بیٹریوں کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایک لمبی داڑھی والا
پروجیکٹر کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو دیئے جانے والے اس حکم کے بعد اور بھی مستعد نظر آنے لگا۔
تجسس و تحیر کے عالم میں یہ ساری کارروائی دیکھنے لگی۔

آخر کار پروجیکٹر کو آپریٹ کرنے والا آدمی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور سادی اسکرین پر متحرک
نظر آنے لگے۔ یہ متحرک سائے دراصل چار عدد مرد تھے۔ ان مردوں میں سے ایک کی آنکھوں پر پٹی
ہوئی تھی اور وہ قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا جبکہ باقی تینوں کے چہروں پر نقاب منڈھے ہوئے تھے۔ ان
سے جھانکتی آنکھوں سے وحشت جھلک رہی تھی ان میں سے دو نے آنکھوں پر پٹی باندھے نوجوان

کے بازوؤں کو سختی سے جکڑا ہوا تھا۔ نوجوان جس انداز میں چل رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر
نے اسے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔ اس منظر کو دیکھ کر ماہ بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی فلم
کوئی منظر دیکھ رہی ہو۔ لیکن پروجیکٹر پر چلتی فلم کی کوالٹی بتا رہی تھی کہ اسے کسی عام مووی کیمرے سے
گیا ہے۔ ظاہر ہے، فلم یا ڈرامے کے لیے ایسے کیمرے کا استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے اندر عجیب
چینی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے کچھ اور غور سے اس منظر کا جائزہ لیا۔

اسے لگا کہ دو بندوں کی گرفت میں موجود نوجوان کا جسم زخمی ہے اور اس کے لباس پر دکھائی
دھبے دراصل خون کے ہیں۔ کیمرے نے باقی افراد کو چھوڑ کر اس نوجوان کو فوکس کرنا شروع کیا تو اس
کی تصدیق ہو گئی۔ نوجوان واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کی باچھیں چری ہوئی تھیں جن پر خون جما ہوا
آستین والی ٹی شرٹ میں سے جھانکتے اس کے بازو بھی بری طرح زخمی تھے جبکہ پیروں کی انگلیوں کے
ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور جس انداز میں اسے لانے والے لے کر
تھے، اس سے ظاہر تھا کہ وہ اس پر رحم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

دکھائی دینے والے اگلے منظر نے ماہ بانو کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ نوجوان کو پکڑ کر لا
نقاب پوشوں نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ نوجوان کی ٹانگیں پہلے ہی لڑ
تھیں، اس دھکے کو سہہ نہ سکا اور ننگے فرش پر گر گیا۔ نقاب پوشوں کا تیسرا ساتھی جو اپنی حرکات و سکنات
کا لیڈر لگ رہا تھا، کمرے میں پڑی واحد لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی دونوں کو احکامات دینے لگا۔ وہ
کے احکامات جاری کر رہا تھا، اس بات کا اندازہ ماہ بانو نے اس کا روئے سخن اور باقی دو کے تابعداری
ہوئے سروں کو دیکھ کر لگایا تھا ورنہ پروجیکٹر پر چلنے والی فلم مکمل طور پر خاموش تھی۔ کسی قسم کی آواز سنائی
کے باوجود اس فلم میں کچھ ایسا تھا جو جسم کے اندر تھرتھری سی پیدا کر رہا تھا اور دل کسی انہونی کے اندیشے
طرح دھڑکے جا رہا تھا۔

آخر کار ماہ بانو کے اس خوف نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کو دھکا دے
پر گرانے والے نقاب پوشوں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ پیروں کو دبوچا
کمر کے ساتھ بندھی رسّی کا گچھا کھول کر اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھنے لگے۔ نوجوان نے اس
شدید مزاحمت کی اور تڑپ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دونوں تو کسی تجربہ کار
کی سی مہارت رکھتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے نوجوان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اس کے
پیروں کو رسّی سے اچھی طرح جکڑنے کے بعد ان میں سے ایک اس کے پیروں پر جبکہ دوسرا سینے پر گھٹنا
بیٹھ گیا۔ نوجوان جو بندھنے کے نتیجے میں پہلے ہی بے بس ہو گیا تھا، اب ہلنے جلنے کے لائق بھی نہیں رہا
کے مکمل طور پر بے بس ہوتے ہی اب تک کرسی پر بیٹھ کر خاموشی سے نظارہ کرنے والا تیسرا نقاب پوش
سے اٹھا اور اپنی جیکٹ کی زِپ کھول کر گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ گریبان سے برآمد ہوا تو اس
لمبے پھل والی ایک تیز دھار چھری چمکتی ہوئی نظر آئی۔ چھری نکالنے کے بعد پہلے اس نے اسے اپنی آنکھوں
عین سامنے لاتے ہوئے اس کا جائزہ لیا پھر مزید اطمینان کے لیے دھار پر اُنگلی پھیر کر چیک کیا۔ فرا
بندھے پڑے نوجوان اور اس چھری بردار کی حرکات و سکنات نے ماہ بانو کو باور کروا دیا کہ وہ کیا کرنے
ہے۔ آنے والے لمحات کا سوچ کر ماہ بانو کپکپا اُٹھی اور ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس کر کے نیچے بیٹھ گئی
طرح کا لرزہ خیز منظر وہ ایک بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ منظر اس نے لائیو دیکھا تھا



کارڈ تھا۔ سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی ثمینا کے بہیمانہ قتل کو وہ ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔
کر پر جو فلم چل رہی تھی، اس کے پس منظر میں بھی شاید ایسا ہی کچھ تھا۔ چھری بردار نقاب پوش
نوجوان کے قریب بیٹھا تو ماہ بانو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے اندر ایسا ظالمانہ اور
منظر دیکھنے کی قطعی جرأت محسوس نہیں کر رہی تھی۔

مبارک ہو عمران! مجھے یقین ہے کہ اپنے دشمن کا یہ انجام دیکھ کر تمہیں خوشی ہوئی ہو گی اور تمہارے سینے
انتقام کی آگ بھی بجھ گئی ہو گی۔'' اسے آنکھیں بند کیے ایک منٹ کا وقفہ گزرا تھا کہ ایک بھاری مردانہ
آواز ابھری۔ اس جملے کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کسی جانور کی طرح باندھ کر ڈالا گیا نوجوان اپنے انجام کو
پہنچ گیا۔

''میں لگی آگ کا نہ پوچھیں بھائی صاحب! یہ آگ تو ایسی زور آور ہے کہ دل کرتا ہے اس کمینے کو سو بار
مزید مارا کروں۔ اگر آپ لوگ مجھے یہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی اجازت دے دیتے تو شاید میرے
کلیجے کو ٹھنڈ پڑ جاتی۔ ابھی تو لگتا ہے کہ میرا اس رذیل سے انتقام ادھورا رہ گیا ہے۔''

یہ آواز نفرت میں ڈوبی یہ آواز ماہ بانو کو شناسا لگی۔ یقینی طور پر یہ اسی نوجوان کی آواز تھی جس سے کچھ دیر
پہلے اپنے قید خانے میں گفتگو کی تھی۔ نوجوان کی اس انتہا کو پہنچی ہوئی نفرت پر دل میں شدید رنج محسوس
ہوئے اور اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے ماہ بانو نے آنکھیں کھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ فرطِ جوش
سے تمتماتے چہرے کے ساتھ وہ یقیناً وہی نوجوان تھا جس کے بارے میں کچھ دیر قبل اس نے اندازہ لگایا تھا
کہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں بہت معصوم اور شریف ہے۔ وہ معصوم دکھائی دینے والا چہرہ اس وقت غصے
اور انتقام کی آگ میں جل کر بری طرح مسخ ہو کر اپنی دلکشی کھو بیٹھا تھا۔

''ہم نے جان بوجھ کر تمہیں تمہارے ہاتھوں سے یہ کام نہیں کرنے دیا۔ تم ہمارے دوست ہو اور دوستوں
کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رہی تمہارے انتقام کی آگ
کی بات تو میرے خیال میں یہ آگ جلتی رہے تو اچھا ہے۔ یہ آگ جلتی رہے گی تو ہی تم اس جیسے کرتوت
والے دوسرے شیطانوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکو گے۔ ذاتی انتقام لے کر سکون سے بیٹھ جانا تو کوئی
بات نہیں۔ بات تو جب ہے کہ آدمی ہر برے آدمی کے خلاف لڑے اور اس کا وہ حشر کرے کہ باقیوں کو عبرت
ہو۔ ہم سب یہاں اسی مشن پر کام کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم اس مشن میں ہمارا
ساتھ دو گے یا نہیں؟'' بہت رواں لہجے میں بولتا وہ شخص عمران نامی اس نوجوان سے پوچھ رہا تھا۔

''بالکل دوں گا۔ میری زندگی میں اب رہ ہی کیا گیا ہے؟ اگر یہ بچ جانے والی سانسیں کسی اچھے مقصد کے
کام آ گئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے زندہ رہنے کا حق ادا کر دیا۔'' عمران نے وہی کہا تھا جو اس سے
گفتگو شخص کہلانا چاہتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے دنوں سے اس معصوم نوجوان کی برین واشنگ کر رہا تھا جو
دل میں زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر شعور اور حساسیت کی مالک ماہ بانو نے اس صورتِ
گہری سانس لیتے ہوئے وہاں موجود دیگر افراد کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ وحشت زدہ چہرے اس وقت
بھی بھیانک لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بے خیالی میں اس کی نظر پروجیکٹر کی
طرف چلی جا پڑی۔ اسکرین ابھی تک روشن تھی اور اس پر ذبح کیے ہوئے نوجوان کی خون آلود لاش دکھائی دے
رہی تھی۔ نوجوان، صحت مند جسم سے نکلنے والے ڈھیروں خون نے لاش کے گرد ایک چھوٹا سا سرخ تالاب بنا ڈالا
تھا۔ اسی خون میں پڑی نوجوان کی وہ لاش کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی لاش سے مشابہ لگ رہی تھی۔ ماہ بانو

صرف ایک پل کے لیے یہ منظر دیکھ سکی۔ اگلے ہی پل اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے
گئی۔ وہ لوگ جو کسی تفریحی فلم کی طرح اس دردناک منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ابکائی
چونک پڑے۔

''لگتا ہے قیدی لڑکی اپنی کوٹھری سے نکل کر یہاں آ گئی ہے۔'' سب سے پہلے عمران متحرک
سمت دوڑا۔ اس دوران ماہ بانو خود پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ اس لڑکی کو یہ سب نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔'' وہ آدمی جواب تک عمران سے
تھا اور وہاں موجود افراد کا کمانڈر تھا، ماہ بانو کو دیکھ کر بولا۔

''یہ باہر کیسے نکلی؟.....کون اسے کھانا دینے گیا تھا؟'' صورتِ حال پر تبصرے کے ساتھ ہی کما
سب سے اہم خیال آیا

''میں نے اسے کھانا پہنچایا تھا۔'' عمران نے کسی جرم کی طرح اعتراف کیا جسے سن کر کمانڈر
گئے۔

''ہمارے کام میں ایسی غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوتی، اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس بار تو میں
کر رہا ہوں لیکن آئندہ کسی کوتاہی کا انجام بہت برا ہوگا۔'' وہ جواب تک بڑی نرمی اور محبت سے عمران
کرتا رہا تھا، نہایت سخت لہجے میں بولا۔

''سوری کمانڈر!'' عمران نے فوراً ہی اس سے معافی مانگی۔

''اسے اس کی کوٹھڑی تک پہنچا کر کوٹھڑی کو تالا لگا دو۔'' اس کی معذرت کو خاطر میں لائے بغ
سرد لہجے میں حکم دیا اور پلٹ گیا۔ ماہ بانو کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اس کی کوٹھڑی کی طرف لے
عمران کا ذہن لہجے کے ان تضادات میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''گاڑی تیار ہے سر!'' عبدالمنان کی اس اطلاع پر اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کرسی چھو
ہوا۔ اس نے لاہور سے واپس آ کر جو نیا شیڈول ترتیب دیا تھا، اس کے مطابق آج اسے پیر آباد
جانا تھا۔ اس کے زیرِ نگیں علاقے میں پیر آباد سب سے بڑا گاؤں تھا اس لیے وہ اسے بالکل بھی نظر
چاہتا تھا۔ دیگر دیہاتوں کے مقابلے میں پیر آباد کی ترقی کی رفتار قدرے تیز ہونے کے باوجود وہ
خصوصی توجہ دینا چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ مزاحمت بھی اسی جگہ ہے اور اگر وہ
پڑا تو سب کیا کرایا ضائع ہو جائے گا۔

''نور پور میں جو ٹھیکے دار کام کر رہا ہے آج تم اس سے ملاقات ضرور کر لینا۔ اس کی رپورٹ
ہم کسی دن اچانک وہاں جا کر کام کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس پر کتنا اعتبار کیا جا سکتا
دفتر سے نکل کر باہر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو یاد دہانی کروائی۔

''یس سر! آپ بے فکر رہیں۔ میں یہ کام کر لوں گا۔'' عبدالمنان نے مستعدی سے جواب
ہو کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ
مشابرم خان کی غیر موجودگی میں آج کل یہی ڈرائیور اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ مشابرم خان ابھی تک
تھا، البتہ اس کی طرف سے رپورٹیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اس نے نیاز علی سے اپنی ملاقات سے



ل موت تک ہر بات تفصیل سے شہریار کو بتا دی تھی۔ نیاز علی کی حادثاتی موت نے اسے کچھ مشکل میں بھی
ال دیا تھا۔ نیاز علی کے جیپ سمیت کھائی میں گر جانے کے بعد وہ پیدل طویل سفر کر کے ایسے مقام پر پہنچنے
ل کامیاب ہو سکا تھا جہاں سے اسے پہاڑوں سے واپس لوٹنے والی ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم نے اپنی جیپ میں
ف دی اور اسے اس کی درخواست پر تھانے کے قریب ڈراپ کر کے چلے گئے۔

تھانے پہنچ کر اس نے وہاں موجود ڈیوٹی افسر کو حادثے کے بارے میں بتایا۔ افسر نے پولیس کی روایت
ے مطابق اسے ڈھیر سارے سوالوں کی زد میں لے لیا لیکن مشابرم خان ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے پولیس افسر
ان کے منہ سے کوئی ایسی بات اُگلوانے میں ناکام رہا جس کے ذریعے مشابرم خان کو نیاز علی کی موت کا ذمے دار
ٹھرایا جا سکتا۔ نیاز علی کے ساتھ اپنے اس علاقے میں جانے کی وجہ اس نے بالکل سچ سچ بتا دی تھی جس پر
پولیس افسر تھوڑا جز بز بھی ہوا تھا کہ اسے پولیس کی کارکردگی پر یقین نہیں تھا جو خود معاملے کی تحقیق کرنے نکل
کھڑا ہوا۔

جواب میں مشابرم خان نے اس کا دھیان ان نکات کی طرف دلوایا جنہیں پولیس والوں نے یکسر نظر انداز
کر دیا تھا۔ اس نے انہیں باور کروایا تھا کہ وہ لوگ صرف نیاز علی کے بیان پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے تھے اور معاملے
کے ان پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا تھا جس سے نیاز علی کے سچ جھوٹ کا اندازہ ہو سکتا۔ اس نے پولیس افسر کو
تفصیل سے اس علاقے کے محلِ وقوع اور مٹی کی ساخت وغیرہ سے آگاہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ نیاز علی کا
بیان سراسر جھوٹ پر مبنی تھا اور کسی نے اس سے جیپ چھینی نہیں تھی بلکہ وہ خود مجرموں کا ساتھی تھا۔ اس نے
پولیس افسر کو صاف لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ نیاز علی اپنا جھوٹ کھل جانے کے بعد گھبراہٹ میں جیپ لے کر
فرار ہونے کے چکر میں حادثے کا شکار ہوا تھا۔ البتہ وہ نیاز علی پر تشدد اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی
معلومات کا ذکر گول کر گیا تھا۔

اس کے بیان کی روشنی میں پولیس افسر نے نیاز علی کی لاش اور جیپ کھائی سے نکلوانے کے انتظامات
شروع کر دیئے لیکن تا حال جیپ یا لاش نہیں نکالی جا سکی تھی۔ مشابرم خان کے ذاتی خیال کے مطابق یہ ممکن بھی
نہیں تھا۔ بہر حال، لاش نکلتی یا نہیں وہ خود براہِ راست نیاز علی کی موت کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکا تھا۔ پھر کچھ
دیر بعد شہریار کی فون کال نے بھی دکھایا۔ اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب کو فون کر کے یہ باور کروا دیا
کہ مشابرم خان ایک دیانت دار اور بے ضرر آدمی ہے جو اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے اسکردو میں رکا ہوا ہے۔
اپنے بھائی کے قتل کی تحقیق کے لیے اگر اس نے کچھ ہاتھ پیر مارے ہیں تو یہ صرف برادرانہ محبت کا نتیجہ ہے۔
نہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے والا یا انسانی جان سے کھیلنے والا بندہ نہیں ہے۔ اس کی ضمانت پر مشابرم خان کے
ساتھ خصوصی نرمی برتی گئی اور اسے قتل کے شک میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کرنے کے بجائے آزاد چھوڑ دیا
گیا۔ البتہ اتنی پابندی ضرور عائد کی گئی تھی کہ وہ مقامی مختار سے اجازت لیے بغیر اسکردو چھوڑ کر واپس اپنی ڈیوٹی
پر نہیں جا سکتا۔ مشابرم خان کا فی الحال واپس لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ وہیں رہ کر اس معاملے کی مزید
تحقیق کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اس حکم پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

شہریار خود بھی اُس کے اس پروگرام سے متفق تھا۔ مشابرم خان کے وہاں رہنے اور ہاتھ پیر مارنے کی
صورت میں ہی یہ ممکن تھا کہ ماہ بانو کا کوئی اتہ پتہ مل سکتا اور ساتھ ہی اس راز سے بھی پردہ اُٹھتا کہ وہ کون لوگ
ہیں جنہیں نیاز علی خفیہ طور پر راشن اور ادویات وغیرہ سپلائی کر رہا تھا۔ اتنے خفیہ طور پر چھپ کر رہنے والے
ان کا کسی کارِ خیر میں مصروف ہونے کا گمان تو کیا نہیں جا سکتا تھا پھر ان کا ماہ بانو کو اغوا کرنا بھی ان کے خلاف

اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ لوگ منفی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ بات شہریار کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ لوگوں نے اس قدر پلاننگ کے ساتھ ماہ بانو کو اغوا کیوں کیا؟ ماہ بانو کی کھوج تو صرف ایک ہی بندے کو تھی اس شخص کا بلتستان سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ اپنے علاقے میں بے حد بااختیار اور طاقتور چودھری کی بے حکومتی ایوانوں تک بھی پہنچ تھی لیکن وہ اتنا بااختیار بہرحال نہیں تھا کہ بلتستان میں اس کے بندے اس قدر سرگرم ہوتے۔ شہریار کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ لیکن سوال وہی تھا کہ اس معاملے سے ماہ بانو کیا تعلق تھا؟ فیصل آباد میں پرورش پانے والی وہ کم عمر لڑکی جو اپنے آبائی گاؤں چھٹیاں گزارنے آئی تھی چودھری کی ہوس بھری نظروں میں آنے کے بعد اتنی مصیبت میں پڑی کہ پھر اس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ مشابرم خان کے مشورے اور شہریار کے تعاون کے نتیجے میں پناہ کی تلاش میں بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر ٹھہری تو وہاں بھی اسے سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس دور افتادہ گاؤں میں بھی حالات کے گرداب نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آثار بتاتے تھے کہ اس بار وہ جن لوگوں کے نرغے میں پھنسی ہے، ان کا چودھری سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ ایک عام سی بے ضرر لڑکی میں آخر ایسی کیا بات تھی کہ وہ بالکل انجان جگہ پر بھی محفوظ نہیں رہ سکی اور اسے باقاعدہ ایک سازش کے ذریعے اغوا کر لیا گیا؟

سارے وہ سوالات تھے جن کے جواب کے حصول کے لیے تحقیق و تفتیش کی ضرورت تھی۔ مشابرم خان کی صلاحیتیں شہریار دیکھ چکا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے چنانچہ اس نے اسے بلتستان میں ہی رُکے رہنے کی منظوری دیتے ہوئے اس کی چھٹیاں بڑھا دیں۔ خود وہ تو اپنی پوسٹ اور ذمے داریوں کی وجہ سے بری طرح جکڑا ہوا تھا چنانچہ خواہش رکھتے ہوئے بھی اس کام کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم فوری طور پر بالکل نہیں۔ ان حالات میں مشابرم خان کے تعاون کو غنیمت جانتے ہوئے اس نے اپنی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا اور ماہ بانو کی تلاش کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس کا دل کتنی بار اس بات پر مچل جاتا ہے کہ وہ خود جا کر ماہ بانو کو تلاش کرے۔ اسے آج بھی وہ لمحات یاد تھے، جب ماسٹر آفتاب کے اسکول میں چہرے کو نقاب میں چھپائے ماہ بانو اس سے مدد کی درخواست کرنے وہاں پہنچی تھی۔ فرض اور انسانی ہمدردی اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود اس کے اپنے دل نے بھی یہ خواہش کی تھی کہ وہ اس ہراساں ہرنی جیسی لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لے۔ دل کی اس خواہش کو اس نے اپنی سرکاری حیثیت کے اندر رہتے ہوئے پورا بھی کیا تھا لیکن اس کی ہر کوشش ناکام چلی گئی اور آج پھر ماہ بانو اس سے بہت دور کسی کی قید میں پھنسی اس کی مدد کی طلب گار تھی اور وہ مجبوریوں اور اصولوں کی قید میں جکڑا خود اس کی تلاش میں نکلنے سے قاصر تھا۔

گاڑی کی پچھلی نشست پر بہ ظاہر سکون سے بیٹھا وہ مسلسل حالات و واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کے باہر تیزی سے گزرتے مناظر کی طرح اس کے ذہن کے جھروکے سے بھی واقعات ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والا ہر نیا دن نئی خبر لے کر آتا تھا۔ ان خبروں میں اچھی خبروں کا تناسب کافی کم تھا بلکہ دیکھا جائے تو چند چھوٹے موٹے ترقیاتی منصوبوں کے آغاز کے سوا کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ خوش ہو پاتا۔ سازشیں، حادثات، دشمنیاں یہی سب تھا جنہیں وہ اس عرصے میں بھگتا رہا تھا۔ لیکن بہرحال خود اُس کی طرح ابھی اُس کا حوصلہ بھی جوان تھا اور وہ اتنی آسانی سے حالات کے سامنے ہار نہیں ماننے والا تھا۔ اسے حالات کے اس گرداب سے نکلنا تھا اور وہ تبدیلیاں لانی تھیں جن کو لائے بغیر حقِ انسانیت ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی حق کو ادا کرنے کے لیے وہ ہر ذاتی خواہش اور تکلیف کو نظر انداز کر کے سرگرمِ عمل ہو گیا تھا اور کسی عام افسر



طرح اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھ کر محض رپورٹوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے خود تکلیف اٹھاتے ہوئے آباد کی طرف رواں دواں تھا۔ خیالات کے ہجوم میں گھرے پیر آباد تک کا سفر کیسے طے ہوا، وہ خود بھی اندازہ نہیں کر سکا لیکن جب گاڑی پیر آباد کے داخلی راستے پر چلنے لگی تو کچے راستے پر لگنے والے جھٹکوں نے اسے یاد دہانی کروائی کہ اس راستے پر پختہ سڑک کی تعمیر از حد ضروری ہے۔ اصل میں اسکول اور مرکزِ صحت کی تعمیر کے کام فوری طور پر اس لیے انجام پا گئے تھے کہ ان کے لیے سیٹھ موتی والا کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے قائم کردہ ٹرسٹ سے سرمایہ فراہم کر دیا گیا تھا لیکن سڑک کی تعمیر کے لیے خالصتاً حکومتی فنڈ سے رقم حاصل کی جانی تھی اور اس کے لیے منظوری ملتی، تب ہی کچھ ہو پاتا۔

پیر آباد میں اس کا شیڈول طے شدہ تھا۔ اسے سب سے پہلے مرکزِ صحت پھر اسکول و انڈسٹریل ہوم اور آخر میں نئے فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کے لیے جانا تھا اس لیے طے شدہ شیڈول پر عمل کرتے ہوئے ڈرائیور نے گاڑی مرکزِ صحت کے سامنے لے جا کر روک دی۔ مرکزِ صحت کے دروازے پر تیس پینتیس سال کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ آدمی یہاں بہ یک وقت کمپاؤنڈری اور چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ شہریار کو دیکھ کر وہ جھٹ دوڑا آیا اور اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ سب ٹھیک ہے؟ اندر ڈاکٹرز موجود ہیں یا نہیں؟'' اس نے نرمی سے اس شخص کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ ہیں جی۔ ایک دو مریض عورتیں رہ گئی ہیں، انہیں دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب البتہ اپنے کوارٹر میں چلے گئے ہیں۔'' اس شخص نے مستعدی سے اطلاع دی جس پر سر کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے شہریار اندر داخل ہو گیا۔

''یہ دوا رکھو اور اسے پابندی سے کھاتی رہنا۔ ابھی تمہاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ابھی سے بچوں وغیرہ کے جھنجٹ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چار پانچ سال آرام سے گزارو پھر اس بارے میں سوچنا۔ سسرال والے طعنے دیتے ہیں تو دینے دو۔ ابھی تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، انہیں بچوں کے چکر میں پڑ کر ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ ڈاکٹر ماریہ کے کمرے کے قریب پہنچا تو اسے اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ مریضہ کی موجودگی کی وجہ سے وہ اندر جانے کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کمپاؤنڈر نے خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر ماریہ کو اس کی آمد کی اطلاع دی وہ فوراً ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے باہر رُکے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

''ہاؤ ونڈرفل سرپرائز۔ آپ کو یوں اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

''میں اپنے روٹین وزٹ پر آیا تھا۔ آپ بتائیں، ایوری تھنگ اِز اوکے اور ناٹ؟'' اس نے مریضہ عورت کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ سے پوچھا۔ بیس بائیس سال کی وہ عورت اچھی شکل و صورت کی مالک تھی اور چہرے سے کسی طور بیمار نہیں لگتی تھی۔

''آل اِز اوکے سر!..... بلکہ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی نیوز بھی ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ نے خوشگوار لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر مریضہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولی۔ ''اب تم جاؤ بی بی! اور میری ہدایت کے مطابق پابندی سے دوا استعمال کرتی رہنا۔''

''بہت بہتر ڈاکٹرنی صاحبہ!'' عورت فوراً ہی باہر نکل گئی۔ اس عورت کی صحت اور عمر دیکھتے ہوئے شہریار کو

خیال آیا کہ ڈاکٹر ماریہ تھوڑی دیر قبل اسے جو مشورہ دے رہی تھی، وہ کچھ مناسب نہیں تھا۔ خصوصاً گاؤں کے ماحول میں جہاں کم عمری کی شادی اور پھر جلد بچوں کی پیدائش کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں عرصے تک اس عورت کا ماں نہ بننا اس کے لیے مشکلات بھی کھڑی کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا ڈاکٹر ماریہ کے سامنے اظہار نہیں کیا اور یہ سوچ کر ذہن سے جھٹک دیا کہ ممکن ہے عورت کو کوئی ایسی بیماری ہو جس کے پیشِ نظر ڈاکٹر ماریہ فی الحال اس کے لیے بچے کی پیدائش کو خطرناک سمجھتی ہو۔ بہرحال، وہ ڈاکٹر تھی اور ان معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتی تھی۔

''اور کوئی مریضہ رہ گئی ہے تو اسے اندر بھیج دو۔'' عورت کے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریہ نے کمپاؤنڈر کو حکم دیا۔

''صرف ایک عورت اور ہے جی۔ میں اسے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے دیکھیں، تب تک میں اے سی صاحب کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔'' کمپاؤنڈر نے مستعدی دکھانے کی کوشش کی۔

''چائے پانی رہنے دو۔ میں اُنہیں اپنے کوارٹر میں لے جا کر کروا دوں گی۔ تم بس پیشنٹ کو بھیج دو۔'' شہریار انکار کرتا، اس سے قبل ڈاکٹر ماریہ نے خود ہی منع کر دیا۔

''میں زیادہ دیر یہاں نہیں رُکوں گا اس لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے یہاں کی ضروریات اور مسائل وغیرہ سے آگاہ کر دیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ ڈاکٹر صاحب کی رائے بھی لے لیں تو مناسب ہوگا۔'' ماریہ کو ٹوکتے ہوئے شہریار نے اس سے کہا لیکن وہ کوئی جواب دیئے بغیر اندر آنے والی ادھیڑ عمر عورت کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ عورت نزلہ زکام اور بخار میں مبتلا تھی۔ اس کا چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر ماریہ نے پرچے پر دوائیں لکھ کر دیں کہ جا کر کمپاؤنڈر سے لے لو پھر شہریار کی طرف متوجہ ہوئی۔

''یہاں کی ضروریات کی لسٹ میں اور ڈاکٹر داور ٹل کر پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ میں وہ لسٹ آپ کو دے دیتی ہوں، البتہ آپ چاہیں تو اپنی تسلی کے لیے ڈاکٹر داور سے بھی مل سکتے ہیں۔ میں کمپاؤنڈر کو بھیج کر انہیں بلوا لیتی ہوں۔ ایکچولی میل پیشنٹس کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ ذرا جلدی فارغ ہو جاتے ہیں اور اپنے کوارٹر میں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت شاید وہ ریسٹ کر رہے ہوں گے۔''

''او کے۔ پھر آپ اُنہیں رہنے دیں اور لسٹ مجھے دے دیں۔'' شہریار نے اس کی بات سن کر کہا۔ مرکز کی صحت کی صورتِ حال اسے یہاں داخل ہوتے ہی تسلی بخش لگی تھی۔ اُس کی تیز نظروں نے لمحے بھر میں ہی جائزہ لے لیا تھا کہ وہاں صفائی کا معیار عمدہ ہے اور ہر شے ترتیب و تنظیم کے ساتھ موجود ہے اس لیے میل ڈاکٹر کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔

''یہ لیجئے لسٹ اور اب میرے ساتھ چلئے۔'' ڈاکٹر ماریہ نے دراز کھول کر اس میں سے ایک فل اسکیپ پیپر نکال کر شہریار کے حوالے کرتے ہوئے اپنی فرمائش دہرائی۔

''پلیز! میں نے کہا نا کہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے یہاں اور بھی کام ہیں۔'' اس سے لسٹ وصول کر کے اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''اچھا تو میں چاہ رہی تھی کہ آپ کی اپنی ممی سے ملاقات کروا دوں۔'' ڈاکٹر ماریہ کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''ممی سے؟..... یو مین آپ کی مدر چودھری کی قید سے آزاد ہو کر آپ تک پہنچ چکی ہیں؟'' شہریار حیران ہوا جس کے جواب میں ڈاکٹر ماریہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لیکن کیسے؟..... یہ کیسے ممکن ہوا؟'' شہریار اب بھی حیران تھا۔



اور چودھری کے درمیان ڈیل ہو گئی ہے۔ میں یہاں رہ کر چودھری کی مرضی کے مطابق کام کرتی ہوں شرط پر اس نے میری ممی کو رہا کیا ہے اور ساتھ یہ بھی تنبیہ کر دی ہے کہ میں خود کو آزاد نہ سمجھوں۔ ہر وقت میری اور میری ممی کی نگرانی کرتے رہیں گے۔'' ڈاکٹر ماریہ نے اُداسی سے بتایا۔

کل لفنڈہ گردی ہے۔ آپ کو اس واقعے کی رپورٹ لکھوانی چاہئے۔ میں خود اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔'' غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ شہریار نے ماریہ کو اُکسایا۔

فار یور کائنڈ نیس سر! بٹ آئی کانٹ ڈو اِٹ۔ میں اچھی طرح اس فیوڈل سسٹم کو جانتی ہوں اور کہ اس کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ نے صاف انکار کیا۔

آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی باتیں کریں گے اور اس طرح ڈرتے رہیں گے تو کون اس ظلم کا مداوا کرے گا؟ آپ تھوڑی سی ہمت تو کریں۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ میں چودھری کو سبق کہ کسی کے ساتھ اس طرح زبردستی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' شہریار نے اس پر زور ڈالا۔

اری سر! میں آپ کا ساتھ ہرگز بھی نہیں دے سکتی۔ آپ چودھری کے خلاف ہیں، مجھے معلوم ہے لیکن کی لڑائی میں خود کو فریق بنانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ دونوں بڑے لوگ ہیں۔ اس لڑائی میں نہیں جائے گا لیکن میں اور میری ممی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔'' ماریہ نے پھر صاف انکار کیا۔

او کے! پھر میں چلتا ہوں لیکن مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ایک پڑھی لکھی، باشعور خاتون نے ظالم کے آسانی سے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ رول ادا نہیں کیا جو اس کا فرض بنتا تھا۔'' وہ کافی آف موڈ کے ماریہ کے پاس سے رخصت ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسکول وانڈسٹریل ہوم تھا۔ اسکول کا ٹائم چونکہ ختم اس لیے کمروں میں تالا پڑا تھا۔ البتہ انڈسٹریل ہوم کھلا ہوا تھا۔ وہاں نگرانی پر تعینات چوکیدار شام کے پر آتا تھا اس لیے شہریار کے آنے کی اطلاع اندر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی رُکوائی صلے پر تھی ورنہ گاڑی کی آواز سن کر ہی کوئی متوجہ ہو جاتا۔ گاڑی سے اُتر کر وہ پیدل ہی اطمینان سے انڈسٹریل ہوم تک پہنچا۔ ایک کمرے پر مشتمل انڈسٹریل ہوم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کھلے دروازے کام کرتی خواتین صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بہت منظم انداز میں خاموشی سے اپنا کام سرانجام دے رہی کام کرنے والی ان خواتین کے علاوہ وہاں آفتاب بھی موجود تھا جو کرسی پر بیٹھا اپنے سامنے رکھے رجسٹر طرح غرق تھا۔ شہریار کی اچانک آمد نے اسے حیران کر دیا۔

''تشریف لائیں سر! میں اس وقت آپ کی آمد کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔'' شہریار سے مصافحہ کر کے اسے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے اس نے خوشی اور اطمینان کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''ایکسپیکٹ تو میں بھی نہیں کر رہا تھا کہ اس ٹائم تمہیں یہاں دیکھ سکوں گا۔'' شہریار نے مسکراتے ہوئے ات کے جواب میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے تو میں کبھی کبھار ہی یہاں کا چکر لگاتا ہوں لیکن آج کل یہاں نگرانی پر کی چودھری افتخار کی لاہور والی کوٹھی میں ہے اس لیے مجھے روزانہ ہی آنا پڑتا ہے۔ وہ لڑکی ان کی ہے اس لیے حکم کی تعمیل پر مجبور تھی۔'' شہریار کو لگا، بظاہر مسکرا کر یہ جواب دیتے ہوئے آفتاب حقیقتاً کافی ہے۔

''اوہ، آئی سی..... لیکن اس طرح تمہیں تو بڑی پریشانی ہو رہی ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم اس لڑکی کی جگہ کسی ایسی لڑکی کو لے آؤ جو کسی اور کی ملازمت میں نہ ہو۔'' شہریار نے اسے مشورہ دیا۔

"یہی تو مشکل ہے کہ یہاں ایسی لڑکیاں ملتی نہیں ہیں۔ رانی کافی سمجھ دار اور تھوڑی پڑھی لکھی
لیے مجھے ذرا سہولت رہتی ہے۔ خیر، وہ کسی دن واپس آ ہی جائے گی۔ فی الحال آپ یہ دیکھیں۔
اور اسلام آباد میں ملبوسات کے بزنس سے جڑے کچھ افراد سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی طرف سے
ہے۔ وہ یہاں کی خواتین سے کام کروانے کے لیے تیار ہیں اور معاوضہ بھی مناسب آفر کر رہے ہیں
رہا ہوں کہ ان سے آرڈرز لے لیے جائیں۔ اس طرح ان خواتین کے لیے آمدنی کا معقول ذر
گا۔" آفتاب نے شہریار کے سامنے دو لفافے رکھے جن پر مشہور ڈریس ڈیزائنرز کے مونوگرام پر

"ویل ڈن آفتاب! تم تو ہر فیلڈ میں بڑی پرفیکشن کے ساتھ کام کرتے ہو۔ میں نے آج
پڑھا ہے جو تم نے اللہ آباد والے واقعے پر میرے کہنے پر لکھا تھا۔ بہت شان دار کالم ہے۔ تم نے
ہر وہ پوائنٹ شامل کیا جو میں چاہتا تھا۔ اتنی محنت سے اور اتنا اچھا کالم لکھنے پر مجھے تمہیں اسپیشل
چاہیے۔" شہریار نے کھلے دل سے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

"تھینکس کی ضرورت ہی نہیں سر! آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اپنی
صلاحیتوں کے مطابق جس نے جو کر لیا، سمجھیں وہ اس کا فرض تھا جس کی ادائیگی کے لیے اللہ نے
دیئے۔ ورنہ انسان کی کیا اوقات کہ کہیں بھی، کچھ بھی کر سکے۔" آفتاب نے انکساری سے جواب
انکساری تو تھی جو اسے بہت سے لوگوں میں ممتاز کرتی تھی۔ دل میں بہت خوشگوار سا احساس لیے
وہاں سے رخصت چاہی۔ ماسٹر آفتاب کی کام کے ساتھ لگن ہمیشہ ہی اسے بہت متاثر کرتی تھی لیکن آ
محسوس کیا تھا کہ پوری تن دہی سے اپنے کام میں مصروف آفتاب کچھ بجھا ہوا ہے۔

"تمہاری ترقی کی رفتار دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی آفتاب! اسی اسپرٹ کے ساتھ کام جاری رکھو۔
سے تمہیں اجازت ہے کہ اگر اسکول اور انڈسٹریل ہوم کی بہتری کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا چاہے
مرضی سے اٹھا سکتے ہو۔ بس تمہارا فون پر مجھے یا عبدالمنان کو انفارم کر دینا کافی ہوگا۔" آفتاب سے
ہوئے اس نے کہا۔

"تھینک یو سر!..... آپ کا یہ اعتماد میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔" آفتاب مسکرایا لیکن یہ مسکرا
بجھی ہوئی تھی۔

"اوکے! تو پھر میں چلتا ہوں۔ اگر کسی نوعیت کا کوئی بھی مسئلہ ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔"
کیفیت دیکھتے ہوئے بالآخر شہریار کو کہنا ہی پڑا۔

"نو سر! کوئی پرابلم نہیں۔" اس نے اپنی مسکراہٹ کو کچھ اور بھی گہرا کرتے ہوئے شہریار کو یقین
کوشش کی تو وہ چپ ہو گیا۔ اتنا اندازہ تو بہرحال اسے ہو گیا تھا کہ مسئلے کی نوعیت کچھ نجی قسم کی ہے
آفتاب بتانے سے گریزاں ہے۔ مزید اصرار کو بے کار جان کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کی
فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کا بنگلہ تھا۔ یہ وہی بنگلہ تھا جس پر کچھ عرصہ قبل تک اقبال باجوہ رہائش پذیر تھا
فاریسٹ آفیسر ہر طرح کی بدعنوانی میں ملوث رہنے کے بعد بالآخر ایک دن بالکل اچانک ہارٹ
جاں بحق ہو گیا تھا۔ موت اسے اچانک دبوچتے ہوئے نہ اس کی کمائی دولت سے مرعوب ہوئی تھی، نہ
سے۔ وہ اپنا کمایا ہوا سارا مال اسی خالی دنیا میں چھوڑ کر سیاہ کاریوں سے بھرا نامۂ اعمال لے کر خالق
سامنے شرمندہ ہونے پہنچ گیا تھا۔ وہ جنگل کی ابتدائی حدود میں واقع فاریسٹ آفیسر کے بنگلے تک پہنچ
کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ بنگلے پر عابد انصاری نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ وہ پچاس پچپن سال



آدمی تھا جس کے نفاست سے کنگھی کیے گئے بالوں میں سے کہیں کہیں جھلکتی سفیدی اس کی شخصیت کو
صورت و پُرکشش بنا رہی تھی۔ شخصیت کی اس کشش کو بڑھانے میں اس کی آنکھوں پر لگے سنہری
سے چشمے کے ساتھ وہ آف وہائٹ سفاری سوٹ بھی اہم کردار ادا کر رہا تھا جو اس نے یقیناً کسی
سے سلوا کر زیبِ تن کیا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں پوسٹنگ سے قبل آپ کے بارے میں کافی کچھ سننے کو ملا تھا۔ یہ
ع ملی تھی کہ آپ کی سفارش پر مجھے یہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یقین رکھیں کہ میں
امیدوں پر پورا اُترنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔" اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد جب
تعارف کا مرحلہ گزر گیا تو عابد انصاری نے مسکراتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا۔

"میں بھی یہی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ میری امیدوں پر پورے اُتر سکیں اور میں اچھے ٹیم ورک کے لیے
دے رہا ہوں، آپ اس کے ایک اچھے ممبر ثابت ہوں۔ ڈاکٹر ماریہ نے مجھ سے بطورِ خاص آپ کی
کی تھی۔ وہ خود ایک محنتی اور فرض شناس خاتون ہیں اس لیے میں نے ان کی تعریف پر یقین کرتے ہوئے
یہاں پوسٹنگ کے لیے سفارش کروا دی۔ اب آگے آپ کا کام بتائے گا کہ میں اپنے اس عمل میں
غلط تو نہیں۔" شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔ البتہ میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اتنے محتاط
ہیں۔ دنیا میں اُٹھ جانے والوں کی برائی مناسب تو نہیں لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ باجوہ صاحب نے
فرائض سے غفلت کی حد تک بے پروائی برتی تھی اور یقیناً ان کا یہی رویہ آپ کو محتاط ہونے پر مجبور کر رہا
بہرحال، میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ پر میرے اور باجوہ صاحب
درمیان موجود فرق ظاہر ہو جائے گا۔ آپ کی تسلی کے لیے میں اتنا بتا دوں کہ میں نے اپنے فرائض کی
کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ خصوصاً میں ریکارڈ مین ٹین کرنے پر زور دے رہا ہوں۔
پاس جنگل میں موجود جانوروں اور درختوں کے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے اسمگلنگ
روک تھام کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی ہے جس میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے
ایسے افراد فراہم کیے جائیں جو اس کام کے ماہر ہوں۔ میں ٹیگنگ کی تکنیک کا استعمال کرنا چاہتا ہوں۔
طرح جنگل میں موجود فانا اور فلورا کی کاؤنٹنگ بھی ہو جائے گی اور نشان زدہ جانوروں اور درختوں کو اسمگل
بھی آسان نہیں رہے گا۔" عابد انصاری نے مختصر الفاظ میں اسے اپنا سارا منصوبہ بتایا۔

"یہ تو آپ بہت زبردست کام کریں گے انصاری صاحب! میری ذاتی خواہش بھی یہی تھی کہ جنگل کے
میں کچھ اس طرح سے کام کیا جائے جو مستقل بنیادوں پر ہو۔ آپ بے فکر ہو کر اپنی درخواست بھجوائیں۔
بھی آپ کی سفارش کروں گا۔"

وہ جو کام کرنے والے افراد کا دل سے قدردان تھا، عابد انصاری کی بات سن کر خوش ہو گیا اور انہیں اپنے
تعاون کی یقین دہانی کروانے لگا۔

"تعاون کے لیے شکریہ شہریار صاحب! اگر آپ کا اعتماد اور تعاون اسی طرح میرے ساتھ رہا تو میں اپنی
دگی سے آپ کو حیران کر دوں گا۔" عابد انصاری اس کے جوش کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد
ان دونوں میں کافی دیر تک اس موضوع پر گفت و شنید ہوتی رہی۔ اس گفتگو کے دوران وقت گزرنے کا
ان نہیں ہوا۔ شہریار تو اس وقت چونکا جب ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

''مجھے اجازت دیں انصاری صاحب! آپ کی کمپنی میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں
طے شدہ شیڈول کے مطابق تو مجھے اب تک واپس نورکوٹ پہنچ جانا چاہئے تھا۔'' وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے
عابد انصاری سے اجازت طلب کرنے لگا۔

''اب آپ اس طرح بغیر کھانا کھائے تو یہاں سے نہیں جا سکتے۔ جہاں اتنا وقت گزر گیا ہے،
منٹ اور عنایت کر دیں۔'' عابد انصاری نے اصرار کیا اور پھر ان کا یہ وضع دارانہ اصرار اتنا زیادہ بڑھ گیا
کو کھانے کے لیے رُکتے ہی بنی۔

کھانا عمدہ اور قدرے پُرتکلف تھا لیکن اتنی بہتات میں نہیں تھا جیسا چودھری کی ڈائننگ ٹیبل
شہریار اور عابد انصاری نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا۔ ڈرائیور
میں بھی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اسے بھی کھانا کھلا دیا گیا ہے۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور چلا اور
شہریار نے وہاں سے رخصت چاہی۔ عابد انصاری کے بنگلے سے نکل کر وہ اپنی گاڑی میں واپسی کے
ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت خوش گوار سا احساس تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جس مشن کے تحت کام
اس کے لیے اس کا ساتھ دینے والوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا ایک قافلہ تشکیل
اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔ سکون اور اطمینان کے اس گہرے
ساتھ وہ گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ناہموار سطح پر چلتی گاڑی کو لگنے والے
اس کے اطمینان میں فرق نہیں لا رہے تھے۔ لیکن پھر یک دم ہی ایک زوردار جھٹکا لگا اور بریکس کی
چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ شہریار نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی کے
آنے والا منظر حیران کن تھا۔

وہ ایک کھلی جیپ تھی جس نے اس کی گاڑی کے عین سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا تھا اور اب
ہتھیاروں سے لیس نقاب پوش اُچھل اُچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ وہ لوگ کون تھے؟ فوری طور پر اس
فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ جو بھی ہیں، دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ وہ اچانک سامنے
والے ان دشمنوں کے لیے تر نوالہ بننے کو تیار نہیں تھا اس لیے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس
بڑھا کر گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اس بات
رکھا تھا کہ سیدھا کھڑا نہ ہو اور جسم کو ایسے زاویے پر رکھے کہ گاڑی کے دروازے کی آڑ میں چھپ
دوسری صورت میں اگر حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی جاتی تو وہ نشانہ بن سکتا تھا۔ اگلے ہی پل سنا
والی فائر کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اسے باہر نکلتے دیکھ کر ان میں سے کسی نے
تھا۔ فائر کی آواز کے فوراً بعد جو دوسری آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی، وہ اس کی گاڑی کے ڈرائیور کی
چیخ تھی۔ وہ بے چارہ اس صورتِ حال پر بری طرح بوکھلا گیا تھا اور اچانک راستہ روکے جانے پر
بریکس لگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اس کی چیخ سن کر شہریار کو اندازہ ہوا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہلاک یا شدید زخمی ہو
ڈرائیور کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا، اسے اس پر دلی افسوس تھا لیکن اس وقت وہ اس کے لیے
سکتا تھا۔ فی الحال تو اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی اور وہ بھی بنا ہتھیار۔ فی الوقت وہ قطعی نہتا تھا۔ ایک
معمول کے دورے پر آتے ہوئے اسے خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے کر چلتا
ڈرائیور کے پاس موجود ریوالور کو ہی کافی جانا تھا لیکن قسمت کی خرابی سے ڈرائیور اس کے تحفظ کے لیے



خود ہی نشانہ بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے کسی مدد کی قطعی اُمید نہ رکھتے ہوئے شہریار گاڑی
ک گیا۔ جیپ سے اُترنے والے نقاب پوش ابھی تک اس کی گاڑی کے قریب نہیں آئے تھے
ازہ لے رہے تھے۔

محنت نہ کریں اے سی صاحب! ہم تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ بھی ٹھیک
م چاہتے تو آپ گاڑی سے اُتر بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ڈرائیور کو لگنے والی گولی کو ہماری کوئی
انہ ہم سب کا بالکل اے ون ہے۔ آپ ہمیں گلیوں میں کنچے کھیلنے والے لونڈے تصور کرنے کی
آرام سے بغیر کسی مزاحمت کے ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جائیں۔''

ے عقب میں پہنچا ہی تھا کہ ان نقاب پوشوں میں سے ایک کی قدرے بلند لیکن ہموار آواز سنائی
لوسن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ بولنے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور پُراعتماد
ں نے جو بات کہی تھی، وہ تو بالکل روشن حقیقت کی طرح عیاں تھی۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ بھی
ہتھیار بند بھی۔ وہ اگر ان کے خلاف مزاحمت کرتا بھی تو ان کے آگے اس کی کتنی دیر پیش
سے ہار ماننی ہی پڑتی۔ لیکن اس طرح بغیر مزاحمت کے ہار مان لینا بھی اس کے لیے خلافِ
رتا مہم جو تھا اور ایسے کسی موقع پر اپنی حیثیت و مقام سب بھول کر میدانِ عمل میں اُترنے کے
تھا۔ اس وقت بھی اس کے عضلات پوری طرح تنے ہوئے تھے اور اس کی فطرت اسے مقابلے

ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جائیں اے سی صاحب! کوئی بھی غیر ضروری حرکت آپ کے لیے
ہو گی۔'' اس سے قبل کہ وہ از خود کوئی فیصلہ کرتا، اس کی پشت پر سے آواز اُبھری اور کوئی ٹھنڈی
ردن سے ٹکرائی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ گردن پر موجود ٹھنڈک کو پہچانتا اس کے لیے
تھا۔ لوہے کی یہ ٹھنڈک یقینی طور پر کسی ہتھیار کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس کا راستہ روکنے والوں
ت آہستگی سے چل کر اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس بے بسی پر شدید
کرتے ہوئے وہ اپنی پشت پر موجود شخص کے حکم کے مطابق سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب
نظر زیادہ واضح تھا۔ اسے روکنے والی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈھاٹا پوش بالکل تیار بیٹھا
پ کا انجن بند نہیں کیا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہونے
آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ دو ڈھاٹا پوش اس کی گاڑی کے بالکل قریب کھڑے ہوئے تھے جبکہ
تو اس کی پشت پر موجود ہی تھا۔

جھو۔'' وہ اس جائزے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی پشت پر موجود شخص نے اسے ہلکا سا ٹہوکا
دیا۔ شہریار نے اس کی آواز کو شناخت کر لیا۔ اسے گھیرنے والوں میں سے اب تک صرف یہی
م کلام ہوا تھا۔

ئیور زخمی ہے۔ یہ اگر اسی طرح یہاں پڑا رہا تو مر جائے گا۔'' عقب میں موجود شخص کے حکم کی
نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ زخمی ڈرائیور پر نظر پڑنے پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اردگرد چھائے
وجود گاڑی کی اندرونی بتی روشن ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ڈرائیور کو صاف دیکھ سکتا تھا۔
دلی لگی تھی اور زخم سے نکلنے والے خون نے اس کے سفید یونیفارم کی قمیض کو بے تحاشا رنگ ڈالا
ں بے تحاشا بہاؤ کے باوجود شہریار نے نوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس کی جان نہیں نکلی ہے اور وہ

آنکھیں بند کیے اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہا ہے۔

''اس کی فکر کرنا بے کار ہے۔ چند منٹ سے زیادہ مزید زندہ نہیں رہ سکے گا۔'' بے حد
جواب دے کر ایک ٹہوکا اور دیا گیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہے۔
تاب کھاتے ہوئے شہریار نے اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا

''تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟''

''ہم کون ہیں، یہ تو نہیں بتا سکتے۔ البتہ مقصد شاید آپ کو آگے چل کر معلوم ہو جائے۔
دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے اس کام میں شامل ہوئے ہیں۔''

بڑے بے نیاز اور پُراعتماد انداز میں اس کی بات کا جواب دیا گیا۔ اس جواب کو سن کر
قطعی مختلف لب و لہجے میں بات کرنے والا یہ آدمی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ لگا
مقامی نہیں ہے، اس کے کسی دشمن کے ایما پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور اس علاقے میں
افتخار کے علاوہ بھلا اور کس سے دشمنی تھی؟

اس سوچ کے حصار میں گھرا وہ جیپ تک پہنچ گیا۔ پشت پر موجود شخص کے علاوہ اب
رائفلیں بھی اس پر اُٹھی ہوئی تھیں اور اس کے لیے کسی قسم کی حرکت کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی
پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد دونوں ڈھاٹا پوش اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ جبکہ عقب
پوش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور
آگے بڑھا دی۔ رات کے سناٹے میں جیپ کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونجی لیکن آبادی
کے اس قریبی حصے میں کوئی گولی کی آواز سننے والا نہیں تھا تو ٹائروں کی چرچراہٹ کسے متوجہ کر
والی جیپ زناٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

''تم لوگ جس بھی مقصد کے تحت مجھے.....'' یہ سمجھتے ہوئے کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ڈھاٹا پوش
کرنے والوں کا اس کارروائی کے دوران لیڈر ہے، شہریار نے اس سے گفتگو کی کوشش کی۔ لیکن
ہونے سے قبل ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد میں سے کسی ایک نے کلوروفارم میں بھیگا
ناک پر رکھ دیا۔ وہ چونکہ اپنی توجہ مکمل طور پر اگلی سیٹ پر موجود شخص پر مرتکز کیے ہوئے تھا اس
کارروائی سے آگاہ نہ ہو سکا اور بے خبری میں ہی بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبنے پر مجبور ہو

⊛----✪----⊛

رات بے حد تاریک تھی اور اس مقام پر تو تاریکی کے ساتھ ساتھ بھیانک بھی لگ
رونقوں کا سبب اس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے والے جسموں کی آخری پناہ گاہ کا یہ عجیب ا
روح جسم کو چھوڑ کر پرواز کرتی ہے، مٹی کے ڈھیر خالی وجود کو یہاں لا کر گاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ جو
چلایا کرتے تھے، اس شہرِ خموشاں میں منوں مٹی تلے دبے ڈی کمپوزرز کی کارروائی سے آہستہ
ہوتے اس مٹی میں ملتے جاتے ہیں۔ ہنگامۂ حیات کو جاری رکھنے والے انسانوں کی آخری پناہ
جانے ایسی کیا بات ہوتی ہے کہ جیتا جاگتا انسان اس طرف کا رخ کرے تو ایک دہشت سی
خصوصاً رات کے وقت قبرستان میں داخل ہونے کو بڑے دل گردے کا کام سمجھا جاتا ہے۔ ا
کرتے ہیں کہ جیسے قبروں کے اندر لیٹے مُردے مٹی کے ڈھیر کو چیر کر اپنے ہاتھ باہر نکالیں گے



وں اس خوف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قبرستان کا گورکن تھا جس
رتے ہی اس شہرِ خموشاں میں تھے۔ وہ انہی قبروں کے درمیان مُردوں کی ہڈیوں سے کھیلتا ہوا بڑا
ر کی آخری منزل پر تھا۔ عمر کے ان سالوں میں اس نے بے شمار مُردوں کو مٹی تلے اُترتے اور پھر
دیکھا تھا۔ مرنے والے مر جاتے تو چند دنوں تک ان کے عزیز و اقارب باقاعدگی سے قبر پر
تازہ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور پھولوں کی پتیاں بکھیری جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا
ایسا آتا کہ عید، شب برات پر حاضری کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا۔ گورکن کی بوڑھی آنکھیں
سالے دیکھ رہی تھیں۔

کی رات بوڑھے گورکن کے تجربوں میں ایک اور تجربے کا اضافہ کرنے کے لیے آئی تھی۔ رات
قبرستان میں آنے والے وہ تینوں نفوس کسی مرنے والے کے لواحقین تھے، نہ ہی پناہ کے متلاشی
دیوانے۔ وہ کفن چور بھی نہیں تھے لیکن آئے بہرحال کچھ لے جانے ہی تھے۔ انہوں نے گورکن
قبر میں دفن ایک مُردے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورکن اس مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا لیکن مطالبہ کرنے
اور حیثیت نے اسے انکار کی جرأت نہیں کرنے دی۔ وہ سرکاری اہلکار تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی
والے ایک سرکاری افسر کی ڈیڈ باڈی لے جانے آئے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لیے
تھا اور وہ چاہتے تو دن دہاڑے بھی یہ کام کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کام کے لیے رات
کا انتخاب کیا تھا۔ گورکن کے لیے حکم تھا کہ کام نہایت صفائی اور خاموشی سے کیا جائے اور کسی کو
نہ ہونے دی جائے۔ غریب گورکن کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پھاوڑا
والے اپنی دھوتی کو گھٹنوں سے اوپر باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آیا اور مشاقی سے کھدائی کا کام
تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ قبر ابھی پکی نہیں کی گئی تھی اور اسے صرف چاروں طرف سے اکھری اینٹوں کی
کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچی قبر کی کھدائی کرتے کرتے بالآخر گورکن اس مقام پر پہنچ گیا جہاں قبر میں
ہو گئی۔

ظاہر ہونے سے پہلے وہاں موجود افراد کا اس بدبو سے سابقہ پڑا جو مُردہ، گلتے سڑتے جسموں سے
کوئی معمولی بُو نہیں تھی۔ اگر کسی عام آدمی کے نتھنوں سے ٹکراتی تو وہ ابکائی لے کر پیٹ میں موجود
پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن گورکن تو اس شہرِ خموشاں کا ہی باسی تھا۔ یہاں بسنے والے سینکڑوں باسیوں
زندہ باسی۔ اس کے لیے یہ بُو انجان نہیں تھی اور اس نے پہلے ہی حفظِ ماتقدم کے تحت اپنے منہ پر
تھا۔ اس کے ساتھ موجود سرکاری اہلکاروں نے بھی اپنے منہ اور ناک ہلکے سبز رنگ کے ماسکس
رکھے تھے۔ وہ لوگ گورکن کے کھدائی کرنے کے دوران مٹی کو ہٹا کر ایک جانب کرنے میں اس کی
ہے تھے۔ قبر کشائی کے بعد لاش ظاہر ہوئی تو اسے قبر سے نکال کر مخصوص پولی تھین بیگ میں منتقل
کام میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ یہ لاش بہت زیادہ پرانی نہ ہونے کے باوجود اچھی خاصی خراب ہو
کن کے تجربے کے مطابق لاش کو دفن ہوئے جتنی مدت گزری تھی وہ اس سے دُہری مدت کے برابر
تھی۔ اس طرح کی گلی سڑی، بدبودار لاش کو قبر سے برآمد کر کے پولی تھین بیگ میں منتقل کرنا کوئی
تھا۔ لیکن ان لوگوں نے کر لیا۔ ظاہر ہے، وہ اس کام کے ماہر تھے تب ہی تو یہاں بھیجے گئے تھے۔
دوبارہ مٹی ڈال کر پہلے والی حالت میں کر دو۔ کام اتنی صفائی سے کرنا کہ کسی کو قبر کھولے جانے کا

شبہ نہ ہو سکے۔'' لاش کو جراثیم کش ادویات اور بُو دبانے والی خوشبوؤں کے چھڑکاؤ کے بعد ا
ہوئے ایک تابوت میں منتقل کر کے ان میں سے ایک نے گورکن کو حکم دیا اور پھر اسے ایک نیلا
تھما کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تابوت سمیت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ سرکاری اہلکار کا حکم، ا
کڑکڑاتے نوٹ کی خوشبو..... گورکن ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پوری تن دہی سے قبر
لگا۔ اس قبر کا گڑھا جو اپنے مکین کے رخصت ہونے پر کسی ماں کی کوکھ کی طرح خالی ہو گئی تھی۔

⊛----✪----⊛

شہریار کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں فرش پر بچھے گدے پر لیٹا ہوا
مختصر تھا جس میں اس کے بستر کے بعد بس چند فٹ کی جگہ بچی تھی۔ وہ بستر پر اُٹھ بیٹھا اور مدھم ر
کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک چوکور کمرہ تھا جس میں اس کے بستر کے علاوہ جو دوسری شے موجود تھی
ساتھ رکھی پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ موجود نہیں تھا۔ اس نے بستر پر
باقی جائزہ بھی مکمل کیا۔ کمرہ اینٹوں کی مدد سے بنایا گیا تھا اور دیواریں پلاستر اور رنگ و روغن
تھیں۔ دائیں دیوار میں لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی چوڑائی بہت کم تھی ا
کچھ اس طرح سے فکس تھا کہ کوئی درز نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ باہر سے روشنی آنے
موجود نہیں تھی۔ کمرے کی تاریکی کو نیم روشن کرنے کے لیے دیوار پر ایک کیل کے ساتھ لالٹین
مختصر قید خانے کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو لمحہ بھر کے لیے سر چکرا کر رہ گیا۔ یہ
ہوش کرنے والے کلوروفارم کا اثر تھا جو اب بھی باقی تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کے اثر
کی کوشش کی اور صراحی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس پر رکھے اسٹیل کے گلاس میں پانی انڈ
شفاف تھا اس لیے اسے پانی پینے میں کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ پانی پی کر اس کی طبیعت بشاش ہو گئی۔

وہ اُٹھ کر دروازے تک گیا اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مضبوط لکڑی کا
طرح سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا کہ اسے ہلانے جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس طر
ہونے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی تا کہ اس کو یہاں تک لانے والے اگر باہر موجو
اس کے ہوش میں آنے کا علم ہو جائے اور وہ اس سے بات چیت کر کے اسے اغوا کر کے یہاں
سبب بتا سکیں۔ مگر اس کی مسلسل دستک بے کار گئی اور باہر سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے
کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموشی سے بیٹھ کر ان لوگوں کے متوجہ ہونے کا انتظار کرے۔ اس
اس خالی خولی انتظار کے دوران بھی اس کے حواس جاگ رہے تھے۔ ذرا سے ارتکاز کے بعد وہ
میں کامیاب ہو گیا کہ اسے جس چار دیواری کے اندر قید رکھا گیا ہے، وہ عام آبادی میں موجود نہیں
ساعت چار دیواری سے باہر موجود آوازوں کو محسوس کر رہی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، ہوا کی سر
غیر معمولی سی آہٹیں تھیں جو اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ ساعت کے بعد اس نے اپنی قوتِ شامہ
میں جنگلی بوٹوں کی مہک اور نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کا ذہن فوراً حساب کتاب کرنے لگا۔ قوتِ سا
حاصل کردہ معلومات کے تجزیے نے اس کے سامنے ایک ہی جواب پیش کیا۔ وہ اس وقت جنگ
میں موجود تھا اور اس خیال کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ اسے جنگل کے قریب سے
تھا۔ یعنی اغوا کرنے والوں نے اسے جنگل ہی میں موجود اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں رکھا تھا۔ وہ کو



اب بھی خود سے یہ سوال کرتا، اس کے سامنے ایک ہی جواب آتا۔
ہری افتخار عالم شاہ۔
ہاں اُس کا دشمن بھی وہی تھا اور اختیارات بھی اسی کے اتنے وسیع تھے کہ وہ اس جنگل سمیت پورے
ں جہاں چاہتا اسے قید کروا سکتا تھا۔ چودھری کے پاس اسے اغوا کروانے کے لیے کئی مضبوط جواز بھی
ے۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا اور لوگ اپنی ہر ضرورت کے لیے نہ صرف اس کی طرف دیکھتے تھے
اس کا ہر ظلم بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے۔ لیکن اب اسکول و ہسپتال کے باقاعدہ آغاز نے چودھری
اس حیثیت کو زک پہنچائی تھی۔ دوسری طرف لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے لیے جانے والی سختی نے
مالی اعتبار سے نقصان پہنچایا تھا۔ پھر ماہ بانو کا شہریار کی مدد سے اس کے ہاتھوں سے نکل جانا بھی اس کے
انے کا سبب بنا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ماریہ کو چارے کے طور پر استعمال کر کے شہریار کو ٹریپ کرنے کی
اس کی تھی لیکن خوش قسمتی سے شہریار اُس کی اس گھناؤنی چال سے بچ گیا تھا۔ اب یقیناً وہ ایک نیا حربہ
رہا تھا اور اس حربے کے استعمال سے پہلے خود امریکہ روانہ ہو گیا تھا تا کہ خود کو شک سے بری رکھنے کے
موجودگی کا جواز دے سکے۔

شہریار جوں جوں اس صورتِ حال پر غور کر رہا تھا، اس کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اس ساری کارروائی
چودھری کا ہی ہاتھ ہے۔ اپنے یقین پر پختہ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور
پر دستک دی۔ حسبِ سابق اس دستک پر بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا لیکن اسے یقین تھا کہ باہر کوئی نہ
ضرور موجود ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے اتنی جدوجہد سے اغوا کر کے لانے کے بعد بغیر کسی نگراں کے
دیا جاتا۔

''میں جانتا ہوں کہ باہر میری آواز سنی جا رہی ہے۔ بے شک تم لوگ مجھے رسپانس نہ دو لیکن میرا یہ پیغام
تک پہنچا دو کہ وہ تھرڈ کلاس مجرموں کی طرح اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے مجھ سے فیس ٹو
ات کرے۔'' اپنے یقین ہی کی بنیاد پر اس نے بلند لیکن باوقار لہجے میں یہ بات کہی اور واپس بستر پر آ بیٹھا۔

''آپ بے کار اندازے لگانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں اے سی صاحب! یہاں جس کو اور جب
آپ سے مذاکرات کرنے ہوں گے وہ خود سامنے آ جائے گا۔'' ذرا سے توقف کے بعد دروازے کی دوسری
قدموں کی آہٹ سنائی دی اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں شہریار کو جواب دیا گیا۔ جواب دینے والے کی
الفاظ کرنے میں اس بار اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ وہی تھا جو اغوا کے دوران بھی اس سے گفتگو
رہا تھا۔ اس شخص کے لہجے کا ٹھہراؤ اور زبان کی روانی اس کو ہر بار ٹھٹکا دیتی تھی۔ وہ بولتا تو صاف احساس
کہ وہ کوئی پڑھا لکھا، شہری ماحول کا بندہ ہے جو شاید کسی مجبوری کے سبب ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں
شامل ہو گیا ہے۔ فی زمانہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور کرپشن نے یہ ایک نیا ٹرینڈ جنم دیا تھا۔ بحیثیت ایک
شہریار کے لیے یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی قید و بند کی پریشانی کو بھول کر اس نوجوان کی
میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہریار عادل زندہ سلامت چاہئے ایس پی صاحب!..... آپ یہ بات
اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر آپ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تو یاد رکھئے گا کہ پھر پولیس کی نوکری میں

آپ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ناکامی آپ کے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول دے گی۔ شہر
کوئی معمولی شخص نہیں ہے جو اسے اس طرح اغوا کرلیا جائے اور کہیں کوئی طوفان نہ اُٹھے۔ مجھے ہر حال
چوبیس گھنٹے سے پہلے واپس چاہئے۔''

ریسیور کان سے لگائے یہ سب سنتے معظم تارڑ کو دوسری طرف موجود آئی جی مختار مراد کی کیفیت
اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ یقیناً سجاد رانا کی ہلاکت کے بعد ہونے والا شہر
اس کے اعصاب کے لیے بڑی آزمائش ثابت ہوا تھا اور اس کا اپنا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح
چوتھائی میں شہریار کو بازیاب کرواڈالے۔

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر! پولیس فورس کے جوانوں نے اس سارے علاقے کو گھیر
جہاں سے شہریار صاحب کی گاڑی اور ان کے ڈرائیور کی لاش ملی ہے۔ میرے جوان کوشش کر رہے ہیں
طرح کوئی کلیو مل جائے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ اے سی صاحب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا
ویسے مجھے شک ہے کہ انہیں جنگل کی طرف لے جایا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پولیس فورس کو کارروائی کر
بہت مشکل پیش آئے گی۔ ہمارے پاس نہ تو اتنی نفری ہے اور نہ ہی اتنی سہولیات کہ گھنے جنگل میں
کارروائی کرسکیں۔'' اس نے مختار مراد کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ
موجود خدشات اور درپیش مسائل بھی بیان کردیئے۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔
اغوا اتنی معمولی بات نہیں تھی کہ آرام سے دب جاتی۔ ابھی مختار مراد کا فون آیا تھا، بعد میں اور بھی نہ جا
کون اس سے رابطہ کر کے شہریار کی بازیابی کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالتا۔''

''آپ کو شہریار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔
بس چوبیس گھنٹے میں اس کے ملنے کی اطلاع چاہئے۔ باقی آپ کو جتنی فورس اور سہولیات درکار ہیں، وہ نو
دیں۔ آپ کو چند گھنٹوں کے اندر سب کچھ پروائیڈ کردیا جائے گا۔''

مختار مراد نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات کا جواب دے کر ریسیور پٹخ دیا۔ ریسیور
جانے کی آواز سن کر معظم تارڑ نے بھی ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کان سے لگا ریسیور کریڈل پر ڈال دا
بے وقوف نہیں تھا کہ مختار مراد کا اشارہ نہیں سمجھتا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کو شہریار کی تلاش میں جنگل چھاننا
یا کسی کا محل..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔

اس بات کا مطلب تھا کہ وہ چودھری افتخار پر شبہ کر رہا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں محل جیسی حویلی تو بس
کی تھی۔ خود معظم تارڑ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ کارروائی چودھری کی طرف سے ہی کی گئی ہے۔ چودھری اس سلسلے
پہلے ایک بار اپنا ارادہ ظاہر کرچکا تھا، بعد میں اس نے اچانک نیویارک جانے کا پروگرام بنالیا۔ اب اس کی
موجودگی میں یہ واردات ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ چودھری یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا اس کارروائی
کوئی تعلق نہیں۔ لیکن دوسرے لوگ بھی کوئی گھاس نہیں کھائے ہوئے تھے جو حقیقت کو نہ سمجھ پاتے۔ تارڑ
بھی حقیقت سمجھ لی تھی اور واردات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر
لیکن اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ پاکستان اور نیویارک کے درمیان جو طویل فاصلہ تھا، اس نے
بھی بہت بڑا بُعد پیدا کردیا تھا۔ ایس پی تارڑ کو معلوم تھا کہ اس پہر جبکہ یہاں دن نکلا ہوا ہے، نیویارک
رات ہوگی۔ اب جانے رات کی یہ گھڑیاں چودھری خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے گزار رہا تھا
گورمی رنگت والی حسینہ کی سنہری زلفوں کی چھاؤں میں۔ وجہ بہرحال جو بھی رہی ہو، مسلسل کوشش کے باو



رابطے میں ناکام تھا۔

مراد سے احکامات ملنے کے بعد اس نے ایک بار پھر چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں
صورت حال تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے حویلی فون کیا اور منشی اللہ رکھا سے بات کرنے کی
ہر کی۔ فوراً ہی منشی لائن پر آگیا۔

''حکم ایس پی صاحب! آپ نے خادم کو کیسے یاد فرمایا؟'' اس کا وہی سدا کا خوشامدانہ انداز اور لب و
لہجہ۔

''یاد تو اصل میں مجھے تمہارے سرکار کی آرہی ہے لیکن کئی بار کوشش کرنے کے بعد بھی ان سے رابطہ نہیں ہو
جاتم سے معلوم کرلوں۔ تمہیں تو یقیناً ان کے بارے میں علم ہوگا۔'' تارڑ نے منشی کی خوشامد کو نظرانداز
ہوئے سیدھے اپنے مطلب کی بات کی۔

''سرکار سے تو خود ہمارا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انہوں نے اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ ادھر چھوٹے چودھری مراد
گھر کے نمبر پر گل کرنے کی کوشش کی تھی، پر اُدھر سے بہو جی نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی گل سے
ہو کے گھر سے چلے گئے ہیں۔ چھوٹے چودھری صاحب نے وہ ہوٹل تو تلاش کرلیا ہے جدھر چودھری
کے ہیں، پر آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ ابھی ادھر رات ہو رہی ہے اور چودھری صاحب ہوٹل والوں
کر سوئے ہیں کہ انہیں صبح سے پہلے کوئی نہ جگائے..... تو آپ سمجھ لیں کہ جب ادھر صبح ہوگی، تب ہی آپ
گل کرسکدے ہو۔'' منشی نے اسے چند جملوں میں پوری کتھا سنادی۔

''ٹھیک ہے..... میں چودھری صاحب سے بعد میں بات کرلوں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ بالا کہاں ہے؟'' یہ
لینے کے بعد کہ ابھی کم از کم تین چار گھنٹوں تک اس کا چودھری سے رابطہ نہیں ہوسکے گا، ایس پی نے
رخ سے تفتیش کی کوشش کی۔

''ادھر حویلی میں ہی ہے سر جی! کل سے وچارے کو تاپ چڑھا ہوا ہے اس لیے منجی پکڑ کر لیٹا ہوا ہے۔
ہو، آپ کو اس نال کوئی کام شام ہے کیا؟ میں کسی ہور کام کے بندے کو تہاڈے ول بھیج دوں گا۔'' چرب
منشی کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے فون کرنے کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے لیکن کسی نہ
طرح اسے بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''تم میرے اور چودھری صاحب کے درمیان تعلقات کی نوعیت اچھی طرح جانتے ہو منشی! ہم ایک
کے راز داں ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو اور سیدھی طرح سے وہ بتاؤ جو
چھنا چاہ رہا ہوں۔'' ایس پی، منشی کا انداز سمجھ کر یک دم ہی براہ راست گفتگو پر آگیا۔

''مینوں کیا خبر حضور! کہ آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے، کھل کر پوچھیں۔ مینوں اگر کسی
کی خبر ہوئی تو آپ کو ضرور دسوں گا۔'' منشی کی منافقت تو تھی ہی بے مثال، سو اسی فدویانہ لہجے میں اسے
دیا۔

''رات تمہارے علاقے میں اے سی شہریار کو اغوا اور اُس کے ڈرائیور کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ بات تو تمہیں
ہی ہوگی۔ اب میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اے سی کہاں ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ تمہارے علاقے میں
ی واردات ہو اور تمہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔'' منشی کی اداکاری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایس پی نے اس سے
کیا۔

''یہ آپ کیسی گل کر رہے ہیں ایس پی صاحب! بے شک اے سی صاحب کا اغوا ادھر سے ہی ہوا ہے لیکن

گاؤں سے بہت دُور جنگل کے علاقے میں.....اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل اُدھر ہمارے بندے کا
کر رہے ہیں۔ ادھر حویلی میں بھی صبح ہی واقعے کی خبر پہنچی ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تو سرکار کو فون
کی کوشش کر رہا تھا، پر اُن سے گل نہ ہو سکی۔ پر آپ کی گل سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم پر ہی شک کر
ہیں۔ یہ تو وڈی غلط گل ہے۔ آدمی کو اپنے دوستوں پر تو بھروسہ کرنا چاہیے۔'' منشی فوراً معصوم بن کر اس کی
کرنے لگا۔

''بات شک کی نہیں ہے۔ پیر آباد اور اس کے قرب و جوار کے سارے علاقے میں تم لوگوں کا ہو
اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ براہِ راست اگر اس واقعے میں تم ملوث نہیں بھی ہو تو بھی تمہیں کچھ نہ کچھ معلوم
ہوگا۔ یہ تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ وہاں کچھ ہوا اور تم لوگوں کو اس کی سن گن نہ ملی ہو۔'' ایس پی نے
سے بھرپور لہجے میں منشی کو باور کروایا کہ وہ اس کے انجان ہونے پر قطعی یقین نہیں رکھتا۔

''اب ایسی بھی گل نہیں ہے ایس پی صاحب! اب وہ پہلے والی گل رہی ہی کدھر ہے؟ آپ کو تو خود
کہ ابھی تھوڑے دن پہلے ادھر ڈیرے پر کوئی گھس آیا تھا اور ہمارے بندوں کو بے ہوش کر کے تہ خانے میں
لگا گیا تھا۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ساتھ یہ کارروائی کرنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے.....
اے سی صاحب کے معاملے کی ہمیں کیا خبر؟ آپ کے محکمے کے بندے صبح سے ادھر پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ
سے کہیں کہ وہ کھوج لگائیں، اے سی صاحب کا۔ اسان نوں کچھ معلوم ہوا تو آپ کو بتا دیں گے۔'' منشی کے
سے صرف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ قطعاً تعاون پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر ایس پی نے
منقطع کر دی اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

شہریار کا اغوا اس کے لیے اتنی تشویش ناک بات نہیں تھی جتنے چودھری کے بدلے ہوئے تیور اس
دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اس نے چودھری کا باجوہ سے بدلا ہوا رویہ بھی دیکھا تھا اور اس کے
باجوہ کی اچانک موت بھی۔ بظاہر باجوہ دل کے دورے سے جاں بحق ہوا تھا لیکن ایس پی کو یقین نہیں آ رہا
یہ سچ ہے۔ اور وہ سچ کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔ سچ کو جاننے کے لیے ہی اس نے ایک بار پھر ٹیلی فون کی
ہاتھ بڑھایا اور ایک خاص نمبر ڈائل کیا۔

''اچھا ہوا آپ نے خود کال کر لی تارڑ صاحب! میں آپ سے رابطہ کرنے ہی والا تھا۔ رات جو ڈیل
آپ نے بھجوائی تھی، آپ کے حکم پر میں نے اس کا ایمرجنسی میں پوسٹ مارٹم کروا ڈالا ہے اور پوسٹ مار
نتیجے میں بہت ہی حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ مرنے والے کی موت آپ کے مطابق ہارٹ اٹیک سے
تھی لیکن پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ایک ایسا زہر دے کر
کے ظاہری اثرات دیکھ کر ڈاکٹرز یہی اندازہ لگا پاتے ہیں کہ مریض کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اسی حساب
ٹریٹمنٹ بھی دیتے ہیں۔ نتیجتاً مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔'' دوسری طرف موجود سرجن جو انکشاف
رہا تھا، انہیں سن کر تارڑ زلزلے کی زد میں آ گیا تھا اور اس کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی کسی دیوہیکل
سی قوت سے بجنے لگی تھی۔

⊛----✪----⊛

''ابا جی! ناراضگی جانے دیں نا.....دیکھیں میں خود آپ کو منانے کے لیے آیا ہوں۔'' مراد شاہ، م
کے مقابل بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔



اسے اپنی بیوی شاہدہ کی زبانی چودھری کی ناراضگی کا سبب بننے والے سارے قصے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جانتا
معاملے میں شاہدہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس بے چاری نے تو چودھری سے وہی کچھ کہا تھا جو مبنی بر حقیقت
ارک میں قیام کے دوران مراد میں واقعی ایسی کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں جو حویلی کے طرزِ زندگی سے میل نہ
تھیں۔ ان تبدیلیوں میں سے ہی ایک تبدیلی کھانے پینے کے معاملے میں نسبتاً سادگی اختیار کرنا بھی تھی
اظہار شاہدہ نے، جو کہ ایک اچھی مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی پسند ناپسند میں ڈھل گئی تھی، چودھری کے
کر دیا تھا اور چودھری کی نازک مزاجی اسے برداشت نہیں کر سکی تھی۔ مراد کو آفس سے واپس آنے کے بعد
واقعے کا علم ہوا تو اس نے چودھری کو منانے کے لیے اس کی تلاش شروع کر دی۔

وہ اپنے باپ کے مزاج سے آشنا تھا اس لیے اتنا اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے ہوٹل کا ہی رخ کرے
اس نے اپنی تلاش کا آغاز انہی ہوٹلوں سے کیا اور بالآخر ایک ہوٹل کے ریسپشن سے اسے علم ہو گیا کہ
افتخار عالم شاہ نامی شخص وہیں ایک سوئٹ میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اس وقت اُس کی چودھری سے
نہیں ہو سکی۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ بے حد تھکن کے باعث وہ رات کے وقت
سے ملاقات نہیں کر سکے گا، چنانچہ کسی ملاقاتی کی آمد یا ٹیلی فون کال کی صورت میں اسے ڈسٹرب نہ کیا
ناچار مراد کو لوٹنا پڑا اور دوسرے دن وہ صبح ہی صبح دوبارہ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس بار اسے باپ کی طرف سے
کامیابی مل گیا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری سے بہت سے
اختلافات کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ چودھری اس کا باپ تھا اور وہ اس رشتے کو ہرگز بھی
اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

''تو نہ آتا منانے۔ میں نے کیا تجھے پیغام بھیجا تھا کہ آ کر مجھے منا؟'' چودھری اتنی آسانی سے رام ہو
والا بندہ ہوتا تو ذرا سی بات پر ناراض ہی کیوں ہوتا؟ مراد کی خوشامد کا تیکھے لہجے میں جواب دے کر وہ
بازی سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

''کیسے نہ آتا ابا جی! آپ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکل گئے، یہ کوئی معمولی بات ہے کیا؟ میں کل سے
بے چین ہوں۔ رات بھر نیند بھی ٹھیک طرح نہ آ سکی۔ شاہدہ بھی بڑی شرمندہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے
ایک بار کسی طرح ماموں کو منا کر لے آئیں، پھر میں انہیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' اپنی کیفیت
کے ساتھ مراد شاہ نے لگے ہاتھوں بیوی کا پیغام بھی پہنچا دیا۔

''نہ تو وہ کیوں شرمندہ ہے؟ اس نے تو مجھے وہی کچھ بتایا تھا جو تُو نے اُسے سکھایا ہے۔ انقلابی بن گیا ہے نا
وڈی وڈی گلاں کرنے لگا ہے۔ اب ہمیں تجھ سے سیکھنا پڑے گا کہ کیسے رہیں؟ کیا کھائیں؟ کیا پہنیں؟
پُرکھوں سے چلی آئی ریت رسموں کو تیرے جیسا کل کا مُنڈا غلط کہے گا اور ہم مان لیں گے؟'' چودھری کو
ملا تھا، وہ کیوں نہ جی بھر کر بیٹے کے لتے لیتا۔

''میں آپ سے یہ ساری بحث کرنے نہیں آیا ہوں ابا جی! میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں اور
وعدے پر کہ جب تک آپ یہاں رہیں گے، گھر میں وہی کچھ ہوگا جو آپ چاہیں گے اور جیسی آپ کی مرضی
گی۔'' وہ جانتا تھا کہ نظریاتی اعتبار سے اس کے اور اس کے باپ کے درمیان مفاہمت ممکن نہیں اس لیے ایک
کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

''اچھا، میں سوچتا ہوں۔ ابھی تُو چل۔ چل کر ذرا ناشتہ کرتے ہیں۔'' چودھری نے اگرچہ اپنا لہجہ سخت ہی
تھا لیکن پھر بھی مراد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نرم پڑ گیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے کمرے سے باہر نکلے اور

لفٹ کے ذریعے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ ان کے وہاں پہنچ کر میز منتخب کرتے ہی ایک ویٹرس میں حاضر ہوگئی۔ وہ ہوٹل جتنا خوب صورت اور لشکارے مارتا ہوا تھا، وہاں خدمت پر مامور عملہ بھی ویسا ان سے ناشتے کا آرڈر لینے آنے والی ویٹرس بھی ہوٹل کے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ وہ نہ خوب صورت تھی بلکہ اس خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اپنی ملازمت کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف یقینی طور پر اتنے بڑے ہوٹل کی ملازمت کے لیے اسے خصوصی تربیت دی گئی ہوگی۔ پھر اس کا لباس بھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ چودھری نے بھی اُس کے حُسنِ بے باک سے خوب آنکھیں ہوئے اپنا آرڈر نوٹ کروایا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم بھی اپنی پسند کے ناشتے کا آرڈر نوٹ کروادو۔''

''میں صرف ایک کپ کافی اور سینڈوچ لوں گا۔'' باپ کے لمبے چوڑے آرڈر کے مقابلے میں اپنی پسند بتائی۔

''یہ تو حال ہے تیرے کھانے پینے کا..... تب ہی تو صحت نہیں رہی ہے۔ ادھر ویسے بھی کھانے ہے، سوکھا سوکھا تو ہوتا ہے سب۔ کھانے پینے کا مزہ تو اُدھر اپنے ملک میں آتا ہے۔ ناشتے میں سری نہاری، آملیٹ شاملیٹ، پراٹھوں کے ساتھ کھاتے ہیں تو سواد آجاتا ہے۔ ادھر یہ جو سینڈوچ اور جوس ہوتے ہیں، وہ تو ہم اپنے ہاں کھانے کے بعد چکھنے شکھنے کے لیے رکھتے ہیں۔ تُو بھی شاہدہ سے کہہ کر ناشتہ بنوایا کرتا کہ کچھ باڈی شاڈی بنے۔'' چودھری نے بیٹے کی پسند پر تنقید کرتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ جو اچھا خاصا سرخ وسفید اور اسمارٹ نوجوان تھا، باپ کی نصیحت سن کر محض مسکرا کر رہ گیا۔ اب وہ اسے کہ تھل تھل کرتا بے ڈول جسم صحت مندی کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسا شخص کئی عوارض کا شکار ہو جاتا ناراض کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ باپ کو منانے آیا تھا اس لیے حتی الامکان بحث سے گریز کا اپنائے ہوئے تھا۔

''اگر آپ کو سری پائے اور نہاری یاد آرہے ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے ابا جی! آپ میرے ساتھ گھر میں دوپہر کے کھانے پر ان چیزوں کا انتظام کروادوں گا۔''

''باپ کو بچوں کی طرح لالچ دے کر پٹانے کی کوشش کر رہا ہے؟'' مراد کی بات سن کر چودھری نے کھل کر ہنس پڑا۔ سب سے بڑی اولاد، وہ بھی نرینہ ہونے کی وجہ سے مراد شروع ہی سے اسے بہت عزیز اور وہ اسے دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ ہی بہت زیادہ رعایت دیتا تھا۔ اس بار بھی وہ زیادہ دیر اپنی ناراضی برقرار نہیں رکھ سکا اور ہنس دیا تو مراد کو اطمینان ہوگیا۔ اس ہنسی نے طے کر دیا تھا کہ وہ اپنے نخریلے باپ کو منانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

''آپ نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ میں اور شاہدہ کل سے کتنی بار آپ کا نمبر ملا کر دیکھ چکے لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گاؤں سے منشی اللہ رکھا کا بھی فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ بھی پریشان ہو رہا تھا چودھری صاحب کا فون کیوں بند ہے؟ میرے خیال میں اس کو آپ سے کوئی ضروری کام ہوگا۔'' مطلع صاف ہوا تو مراد نے اس سے دوسری گفتگو چھیڑ دی۔

''موبائل میں نے جان کر آف کیا تھا۔ مجھے ملوم تھا کہ تُو سب سے پہلے مجھے فون کرنے کی ہی کوشش کرے گا، پر میں اتنی آسانی سے تیرے ہتھ تھوڑی آنے والا تھا۔'' چودھری نے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔

''ڈھونڈ تو میں نے آپ کو بھی لیا۔ کل رات ہی میں یہاں پہنچ گیا تھا لیکن آپ آرڈر دے کر سوئے



آپ کے کمرے تک نہ آنے دیا جائے، نہ ہی فون پر بات کروائی جائے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں رات ہی آپ لے جاتا۔'' مراد نے جواباً اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''مینوں ملوم تھا کہ تُو مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ آخر میرا پُتر ہے۔ تیری ذہانت میں مجھے کوئی شبہ تھوڑی ہے؟ پہلے ہی سے سارا بندوبست کر کے سویا تھا۔''

چودھری شرارت سے مسکرایا۔ وقت کے اس لمحے میں وہ ایک بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا جس کی ساری گیری اور سفا کی کہیں گم ہوگئی تھی اور وہ صرف اور صرف ایک جوان بیٹے کا محبت کرنے والا باپ محسوس ہو

اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر قدرت کے اس اصول پر یقین آتا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے اندر خیر وشر جذبوں کو رکھا ہے۔ محبت ونفرت، سختی ونرمی، سفا کی ورحم دلی ہر دو متضاد پہلو انسان کے اندر ہوتے ہیں، انسان پر ہوتا ہے کہ وہ کس جذبے کو اُبھار کر سامنے لائے اور کس کو دبا دے۔ چودھری نے بھی اپنے اندر ہر مثبت جذبے کو دبا کر منفی خوبیوں کو اتنی شدت سے پروان چڑھایا تھا کہ اب مشکل سے ہی کبھی کسی مثبت کی جھلک نظر آتی تھی۔

''اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہے نا؟..... اب آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔'' باپ کا اچھا موڈ دیکھ کر نے بھی ذرا لاڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔

''تُو اتنی ضد کر رہا ہے تو چلتا ہوں۔'' آخر کار چودھری نے بھی ہامی بھر ہی لی۔

اشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکلے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ مراد اوپر کمرے کر چودھری کا سامان لے آئے گا اور چودھری اس دوران لاؤنج میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ پروگرام مطابق مراد نے جیسے ہی اوپر کمرے میں جانے کے لیے لفٹ میں قدم رکھا، چودھری کی نظر حشر ساماں لنڈا ا۔ وہ کل ہی کی طرح منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ کی بے حد مختصر لمبائی اور اونچی ایڑی کی سینڈل کی سڈول ٹانگوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ کل کی طرح آج بھی چودھری اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

''اچھا ہوا کہ آپ مجھے یہیں مل گئے چودھری صاحب! میں آپ ہی سے ملنے آئی تھی لیکن آپ کا روم رے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' چودھری کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنی سریلی آواز

''یہ تو میری خوش قسمتی ہے ہنی! کہ تم مجھ سے ملنے یہاں تک آئی ہو، ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سے ملاقات کے لیے ڈیوڈ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔'' چودھری نے بھی جوابی خوشی کا اظہار کیا۔

''میں صرف آپ سے ملنے نہیں آئی ہوں۔ آج کا سارا دن میں آپ کے ساتھ گزاروں گی اور آپ کو ک دکھاؤں گی۔ آئی ہوپ کہ آپ میری کمپنی کو ضرور انجوائے کریں گے۔''

''وہ تو لازم ہے۔ کون ایسا ناشکرا ہوگا جو تم جیسی حسینہ کی کمپنی انجوائے نہ کرے۔'' چودھری کی باچھیں لنڈا کا نام سن کر کانوں تک چر گئیں۔ لنڈا کو سامنے پا کر وہ یہ تک فراموش کر چکا تھا کہ مراد بھی اسی ہوٹل میں ہے اور وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ جانے کا وعدہ کر چکا ہے۔

''تو پھر چلیں..... ابھی نکل پڑتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے لبرٹی آئی لینڈ چلیں گے اور وہاں اسٹیچو آف کے سامنے ڈھیر سارے فوٹو گرافس بنوائیں گے۔ میں ساری تیاری کے ساتھ آئی ہوں۔ آپ کا اس بار کا ٹرپ یادگار نہ بنا دیا تو میرا نام بھی لنڈا نہیں۔'' پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چودھری کا بازو

تھام لیا۔

''اس کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے ساتھ نیویارک گھومنے کا مزہ ہی الگ ہوگا، بس یہ ذرا آف لبرٹی تمہارے سامنے پھیکا نہ پڑ جائے۔'' چودھری نے وارفتگی کا مظاہرہ کیا۔

''اوہ..... چودھری صاحب! آپ تو مجھے بنانے لگے۔'' لِنڈا اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنسی امریکن اسٹائل میں اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مراد شاہ ایک سروس بوائے سے سامان اُٹھوائے وہاں پہنچا۔ دونوں باپ بیٹے کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو مراد نے فوراً ہی رسماً

''ایکسکیوزمی لِنڈا! میں ابھی آتا ہوں۔'' چودھری، لِنڈا کو خود سے دُور کر کے فوراً مراد کی طرف بڑھا

''تُو میرا سامان اپنے ساتھ لے کر اپنے اپارٹمنٹ چلا جا پُتر! میں فارغ ہو کر آپ وہاں پہنچ جاؤں شرمندہ تو خیر نہیں تھا لیکن بیٹے کے چہرے پر موجود ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھ کر ذرا دھیمی آواز میں اس

''ٹھیک ہے ابا جی! میں چلتا ہوں۔'' مراد نے آہستگی سے جواب دے کر اپنے قدم آگے بڑھا دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کو کتنی حسینِ مصروفیت میسر آ گئی ہے اس لیے اس کے جلد فارغ ہونے کے قطعی ناممکن تصور کرتا ہوا وہاں سے فوری طور پر رخصت ہو گیا۔

''بیٹا تھا میرا..... مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔'' مراد کے رخصت ہونے کے بعد پلٹ کر لِنڈا کی طرف آیا تو اسے بتانے لگا۔

''بڑا ہینڈسم مین ہے۔ لگتا ہے آپ پر گیا ہے۔'' لِنڈا نے فوراً ریمارکس پاس کیے تو چودھری مسکرانے لگا۔ ہنستے مسکراتے وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے میں لِنڈا کی گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر چند نیویارک کے بے پناہ ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔

''اطلاع ملی ہے کہ اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کو کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ کل رات وہ فاریسٹ انصاری سے ملاقات کر کے واپس آ رہا تھا، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ کڈنیپنگ کو کئی گھنٹے گزرنے کے پولیس ابھی تک کچھ نہیں کر سکی ہے۔ خیال ہے کہ اسے کڈنیپ کر کے گھنے جنگل میں کہیں کسی خفیہ ٹھکانے گیا ہے۔ آئی جی مختار مراد اس صورتِ حال پر سخت چراغ پا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح جنگل آپریشن شروع کروا دیا جائے۔'' وہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ لِنڈا نے مہارت سے ڈرائیو کرتے اسے اطلاع دی۔

''اوہ شٹ!..... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ میرے بندے مجھے اس بات کی اطلاع دینے کے لیے رہے ہوں گے لیکن میں نے اپنا موبائل بند کیا ہوا ہے اس لیے ابھی تک مجھ تک یہ خبر نہیں پہنچی۔'' لِنڈا کردہ معلومات پر چودھری نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور اسے آن کیا۔ اپنی اس میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ لِنڈا اس کے چہرے کے تاثرات کا بہ غور جائزہ لے رہی ہے۔

''یہ کام آپ کے حکم پر ہوا ہے نا چودھری صاحب؟'' اس نے سوال کیا تو چودھری چونکا۔ ''ہم جا کہ یہ کارروائی آپ ہی کے بندوں نے کی ہے۔ آپ شہریار سے بری طرح خار کھائے ہوئے ہیں اور ایک بار اسے ڈاکٹر ماریہ کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی چال تھا، چنانچہ اب آپ اسے اغوا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں..... لیکن میں آپ کو بتانا چاہ کہ آپ کا یہ عمل ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔ اس حرکت سے ہمارے پروجیکٹ کو سخت نقصان پہنچ سکتا



ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ لِنڈا کے سوال کا جواب ہاں میں دے یا ناں میں کہ اس نے خود ہی بولنا کر دیا۔ اس کے لہجے کا تیقن اتنا گہرا تھا کہ چودھری چاہنے کے باوجود کسی بات سے انکار نہیں کر سکا۔

''جنگل میں سرچ آپریشن شروع ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟ ایک بار اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے قدم ان راستوں پر اُٹھ گئے تو پھر انہیں ہمیشہ کے لیے راہ مل جائے گی اور ہمارا وہاں پوست کاشت کرنے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ہم اس پروجیکٹ پر اچھا خاصا کام کر چکے ہیں اور رقم بھی ٹھیک ٹھاک لگی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنے کا مطلب ہوگا، ویسٹ آف ٹائم اینڈ منی۔ اور یہ قابل برداشت نہیں۔ ویسے بھی اب اس اے سی کو اغوا کروانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ وہ لڑکی ماہ بانو ہم نے آپ کو فراہم کرنے کا کر لیا ہے اور لکڑی دکھالوں کے بزنس کا بھی بہتر متبادل آپ کے سامنے ہے۔ اس صورتِ حال میں اے سی کو چھیڑنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

سریلی آواز میں بات کرنے والی لِنڈا کے لہجے میں اس وقت خاصی تلخی تھی اور چہرے کے تاثرات میں بھی کا عنصر نمایاں تھا۔

''آئی ایم سوسوری ہنی! یہ سب ایک ذرا سی غفلت کی وجہ سے ہو گیا ورنہ میں نے خود بھی یہ بات سمجھ لی تھی اب شہریار کے اغوا کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ابھی اپنے بندوں کو فون کر کے شہریار کی کا حکم دے دیتا ہوں۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ پاکستان میں اس وقت لگ بھگ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں شہریار کو واپس بھیج دیا جائے تو کہیں کچھ نہیں ہوگا۔ سرچ آپریشن کی طرف سے بھی زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ ہمارے ہاں ایسے کام اتنی آسانی سے شروع نہیں ہوتے۔ شہریار واپس پہنچ گیا تو یہ معاملہ بالکل دب جائے گا۔''

یہ یقیناً لِنڈا کا رعبِ حُسن تھا جو چودھری جیسا بندہ زندگی میں پہلی بار کسی سے معافی طلب کر رہا تھا۔ لِنڈا نے اس کی ساری وضاحت بے تاثر چہرے کے ساتھ سنی اور خاموشی سے اسے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

''ہاں منشی!..... گل سن، بالا کدھر ہے؟..... اس سے بول کہ شہریار کو فوراً آزاد کر دے۔'' رابطہ قائم ہوتے ہی وہ انگریزی ترک کر کے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بات کرنے لگا۔

''میں کہہ دوں گا سرکار! پر آپ بتائیں کہ آپ کدھر ہیں؟ کل سے میں آپ سے گل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ایس پی نے بھی آپ کا پوچھ پوچھ کے میری جان کھائی ہوئی ہے۔ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھ سے اُگلوا لے، اے سی کا اغوا ہمارے ہی بندوں نے کیا ہے لیکن میں نے بھی پٹھے پر ہتھ نہیں رکھنے دیا اُسے۔'' چودھری کو اطلاع فراہم کرتے ہوئے منشی نے اپنا کارنامہ بھی فخر سے بیان کیا۔

''ایس پی کو رہن دے۔ اس سے تو بعد میں، میں آپ نبٹ لوں گا..... تُو بس کسی طرح اپنی زبان نہ کھولنا۔ اور ہاں، بالے کو بولنا کہ آزاد کرنے سے پہلے اے سی کی چنگی پھینٹی شینٹی ضرور لگا دے۔ وہ ہمارا مہمان ہے اور بغیر خاطر مدارت کے واپس چلا جائے، یہ تو کوئی چنگی گل نہیں ہے نا۔''

''جی چودھری صاحب! وڈی چنگی طرح اس کی خاطر مدارت ہو جائے گی۔ کوئی اور خدمت ہو تو وہ بھی آپ مینوں دس دیں۔'' منشی نے اپنے ازلی خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ میرا موبائل اب کھلا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مینوں فون کر دینا۔'' چودھری نے منشی کو حکم دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور مسکراتا ہوا لِنڈا کی طرف متوجہ ہوا۔

''لو ہنی! تمہاری پرابلم سالو (Solve) ہوگئی۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں خبر مل جائے گی کہ شہریار اپنے بنگلے پر پہنچ گیا ہے۔''

''یہی ہم سب کے حق میں بہتر رہے گا۔'' لِنڈا نے ہنوز سنجیدہ رہتے ہوئے اس کی بات کا جواب چودھری کی ٹیلی فونک گفتگو کے دوران وہ نہایت خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی تھی۔

''اوہ کم آن ہنی! اب تو اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ اگر تم اسی طرح موڈ آف رکھو گی تو ہم کیا خاک انجوائے کرسکیں گے؟'' چودھری نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے منانے کی سعی کی۔ حیرت انگیز طور پر لِنڈا نے اپنا موڈ فوراً ہی بحال کرلیا اور کھل کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ چودھری کے لیے اس نظارے سے بڑھ کر خوب صورت تھی جو لبرٹی آئی لینڈ کی طرف فیری میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے پانی میں نیویارک کی روشنیاں پڑنے سے اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چودھری قدرت کی صناعی میں سے صرف ایک شے کو سراہنے کا قائل تھا اور وہ شے تھی عورت..... جسے سراہنے کے لیے وہ اسے برتنا ضروری سمجھتا تھا اور لِنڈا تو تھی ہی ایسی عورت جسے ایک بار برتنے کے بعد چودھری کے اندر اس کے قرب کی طلب مزید بھڑک گئی تھی۔

❀----✪----❀

شہریار کو اس قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہونے کے باوجود وہ مشاہدے کی بنیاد پر دن کے مختلف پہروں کے بارے میں اندازہ قائم کررہا تھا۔ جس وقت وہ بے ہوش ہوا جاگا تھا، اس وقت پرندوں کی چہچہاہٹ نے اسے وقتِ صبح کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ دن آہستہ آہستہ گزرا شام کے سایوں کی آغوش میں آیا تو بھی اس کی قوتِ سماعت نے اسے مطلع کردیا۔ کمرے کی دیواروں دروازے کے درمیان کوئی درز نہ ہونے کے باعث بصری رابطہ تو تھا ہی منقطع..... بات چیت پر بھی باہر افراد میں سے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اتنا طویل وقت گزر جانے کے باوجود کسی نے اس سے کھانے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ حوائج ضروریہ کا بھی یہی عالم تھا۔ اس سلسلے میں اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑا تھا۔ ورنہ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ اس مختصر کمرے کے ہی کسی کونے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا۔ اس کی نفاست پسند طبیعت کو یہ بات گوارا نہیں تھی اس لیے اب تک ضبط سے ہی کام لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیاس محسوس ہونے پر بھی اس نے کونے میں رکھی صراحی سے دو بار چند قطرے ہی حلق کو تر کرنے کے لیے اپنے منہ میں ٹپکائے تھے۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی بھی لمحے فطری ضرورت کے آگے ہار ماننی پڑے گی۔ ہار ماننے سے قبل اس نے مناسب سمجھا کہ ایک کوشش اور دیکھے۔ شاید باہر موجود افراد اس کی درخواست پر کان دھر لیں۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنی جگہ سے اٹھا دروازے کی طرف بڑھا۔

''کوئی ہے؟..... پلیز دروازہ کھولو۔ میں حاجت محسوس کررہا ہوں۔'' اس نے دروازے کے قریب کرزوردار دستک دی اور بلند آواز میں بولا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی موجود ہی نہ ہو لیکن پھر پل بھر کے توقف کے بعد دروازے کے قریب آہٹیں اُبھریں۔

ان آہٹوں کو سن کر اس کے دل میں اُمید کی لہر جاگی اور باہر موجود افراد پر مزید زور ڈالنے کے لیے نے ایک بار پھر دروازے کو بجایا۔ ردِعمل میں دروازہ اتنی تیزی سے کھولا گیا کہ اس کو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہ ملا اور دروازے کا پٹ پوری قوت سے اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ اچانک لگنے والے اس جھٹکے کو سہار نہیں



کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ اس اثنا میں دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں موٹے ڈنڈے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے نقاب کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک یہ وقت اپنے ہاتھوں میں موجود ڈنڈوں سے شہریار پر حملہ کردیا۔ وہ جو گرنے کے بعد سنبھل نہیں اچانک حملے سے اپنا بچاؤ نہیں کرسکا اور دونوں ڈنڈے پوری قوت سے اس کے جسم پر پڑے۔ لگنے والی چوٹوں نے اسے بلبلا کر رکھ دیا اور وہ تڑپ کر اپنے بچاؤ کے لیے سیدھا ہوا۔ اس دوران سرا وار کرچکے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کے ڈنڈے کو اپنے دائیں ہاتھ پر روکا اور دوسرے کو لیے بایاں ہاتھ پھیلایا لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور دوسرے حملہ آور کا ڈنڈا پوری قوت سے اس کے پر آکر لگا۔ اس چوٹ نے اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنی میں اس شخص کو دے ماریں۔ اس کے حملے کے زور سے وہ شخص پیچھے کی طرف اُلٹا اور مختصر کمرے میں سے جا کر ٹکرایا۔ صراحی فرش سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ صراحی میں موجود پانی کمرے کے نیم پر پھیل گیا۔

سارے عمل کے دوران پہلے ڈنڈا بردار نے اپنے حواس قائم رکھے تھے، چنانچہ اس نے بلاتوقف ہاتھ لے کی زوردار ضرب شہریار کی ٹانگوں پر لگائی۔ ضرب کھا کر شہریار نے خود کو سنبھال کر اس شخص کو اس جواب دینے کی کوشش کی لیکن کمرے کی محدود چاردیواری اس کے تیزی سے حرکت کرنے میں مانع تب تک سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا، حملہ آور اس پر دوسرا وار کرچکا تھا۔ اس بار اس نے شہریار کی کمر کو تھا۔ کمر پر یہ چوٹ کھانے کے بعد شہریار نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس شخص کے منہ پر ایک لہ رسید کیا۔ لیکن اس دوران اس کا صراحی پر گرنے والا ساتھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے ڈنڈے پر حملہ کردیا اور اس کے سر پر ضرب لگائی۔ سر پر لگنے والی یہ ضرب ایسی تھی کہ وہ چکرا اُٹھا اور پھر اسے موقع نہیں ملا۔ وہ دونوں پے در پے اسے ضربیں لگاتے چلے گئے۔ اس کا جسم جو فطری تقاضے پورے نہ وجہ سے پہلے ہی کچھ نڈھال سا ہو رہا تھا، زیادہ دیر مزاحمت نہیں کرسکا اور اگلے چھ سات منٹ میں ہی اس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

رہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تکلیف دیتے جسم کی ٹیسوں کے ذریعے اپنے پورے واقعے کو دُہراتے ہوئے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرہ مختصر لیکن صاف ستھرا تھا اور اپنے ان سے کسی ہسپتال کا حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے اس کمرے کے لیے اپنے ذہن میں آشنائی محسوس اس کے کہ وہ اپنی یادداشت پر زور دیتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے مخصوص گیٹ اپ میں ایک داخل ہوا۔ شہریار نے اس شخص کو فوراً شناخت کرلیا۔ وہ پیرآباد کے مرکزِ صحت میں ڈیوٹی دینے والا ر، داور تھا۔

ب آپ کیسا محسوس کررہے ہیں سر؟'' شہریار کو ہوش میں دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا جواب میں شہریار اپنے سر کو محض ایک اثباتی جنبش دے سکا۔

لیس کے جوان بے ہوشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ دولڑکے جنگل سے اپنی را کرواپس آرہے تھے تو انہوں نے آپ کو راستے میں بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اتفاق سے ان لڑکوں ری کھوگئی تھی جس کی تلاش میں انہیں واپس لوٹنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ انہوں نے آپ کو بے ہوش پڑا پہچان گئے کہ آپ اے سی شہریار عادل ہیں۔ گاؤں میں آپ کی مستقل آمدورفت کی وجہ سے یہاں

کے کافی لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ پھر آپ کے اغوا اور پولیس کی تلاش میں متحرک ہونے سے بھی لوگ
ہو گئے تھے اس لیے ان لڑکوں کو آپ کی شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ انہوں نے فوراً
والوں کو اطلاع دی اور وہ لوگ آپ کو اپنی گاڑی میں یہاں لے آئے تا کہ ابتدائی طبی امداد دی جا
سر پھٹ گیا تھا اور جسم کے چند اور مقامات پر بھی ایسی چوٹیں لگی تھیں جن سے خون رِس رہا تھا۔ آپ
چہرہ اور لباس دیکھ کر ہم لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں سیریس معاملہ نہ ہو..... لیکن اللہ کا شکر
کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر ماریہ نے مل کر آپ کو ٹریٹ منٹ دیا تو فوری طور پر آپ
سنبھل گئی۔ اب بھی میں نے ڈرپ میں پین کلر شامل کر دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنی چوٹوں میں
تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔'' اس کے سوال کرنے سے قبل ڈاکٹر داور نے از خود اسے تفصیلات
شروع کر دیا۔

''آپ لوگوں نے میرے آفس فون کر کے میرے ملنے کی خبر دے دی ہے یا نہیں؟'' دیوار گیر
وقت دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے اس سے دریافت کیا۔

''یس سر!..... وہاں اطلاع مل چکی ہے۔ آپ کے پی اے عبدالمنان صاحب نے کہا ہے کہ
تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایس پی معظم تارڑ نے بھی اپنے آنے کی اطلاع دی ہے۔
پولیس فورس کو لیڈ کرنے والے آفیسر نے اصرار کیا تھا کہ آپ کو نور کوٹ کے ہسپتال میں شفٹ کر دیا
میں نے اور ڈاکٹر ماریہ نے اسے یقین دہانی کروائی کہ آپ کی حالت بہتر ہے اور کوئی تشویش ناک
ڈاکٹر داور شاید زیادہ گفتگو کرنے کا عادی شخص تھا جو ہر بات کو نہایت تفصیل سے بیان کر رہا تھا۔

''تھینک یو ڈاکٹر!..... اب آپ ایسا کریں کہ اس پولیس آفیسر کو میرے پاس بھیج دیں۔'' بیڈ کی
سر ٹکا کر اس نے قدرے نیم دراز ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو ہدایت دی۔ اس ذرا سی حرکت کو کرنے میں
جسم کے جوڑ جوڑ نے جس طرح احتجاج کیا تھا، اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مارنے والوں نے خوب
پٹائی لگائی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بھی چوٹ خطرناک ثابت نہ ہو۔ شاید وہ لوگ اسے
دینا چاہتے تھے کہ سدھر جاؤ، ورنہ نتیجہ اس سے بھی زیادہ بُرا نکل سکتا ہے۔

''پولیس آفیسر کو بعد میں کال کیجیے گا، پہلے یہ سُوپ پی لیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے
بنا کر لائی ہوں۔ پولیس آفیسر کو اندر بلا لیا تو اسے بیان ریکارڈ کرانے میں یہ سُوپ ٹھنڈا ہو جائے
داور کے اس کی ہدایت پر عمل کرنے سے پہلے ڈاکٹر ماریہ ایک ٹرے میں بھاپ اُڑاتا ہوا سُوپ کا پیالہ
داخل ہوئی اور اس سے بولی۔ اسے سُوپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہریار کو سمجھ آ گیا کہ وہ
سے غائب تھی، ورنہ اُس کی جیسی نیچر تھی، اس سے تو یہی اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ شہریار کے ہوش میں
اس کے پاس ہی موجود رہتی۔

''تھینک یو ڈاکٹر! میں واقعی اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔'' شہریار نے خوش دلی سے اس
جواب دے کر ایک طرح سے اس کی تائید کر دی۔ ویسے سُوپ کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے
چوہوں کو پوری طرح جگا دیا تھا اور اسے یاد آنے لگا تھا کہ اسے پیٹ میں کچھ ڈالے ہوئے چوبیس
بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔

''ویل سر! آپ سُوپ پئیں، میں پندرہ منٹ بعد پولیس آفیسر کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''
کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر ماریہ نے اس کے سینے پر نیپکن پھیلایا اور خود بیڈ



پر بیٹھ گئی۔

''لیں، اب اچھے بچوں کی طرح منہ کھولیں اور یہ سُوپ پی لیں۔'' باؤل میں سے چمچ میں سُوپ بھر کر اس
کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ ایک ڈاکٹر کا یہ خالصتاً گھریلو عورت والا
اسے اچھا لگا تھا۔

''اتنی چوٹیں کھا کر بھی آپ مسکراتے ہیں..... بڑے بہادر ہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے اسے سراہا۔

''آپ جیسا تیمار دار میسر آ جائے تو بیمار کے چہرے پر تو خود بہ خود ہی رونق و مسکراہٹ آ جاتی ہے..... لیکن
دیکھیے گا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔'' اُس نے مرزا غالب کے شعر کو نثری پیرائے میں استعمال کرتے
ڈاکٹر ماریہ کی بات کا جواب دیا اور اس کے بڑھائے ہوئے چمچے سے سُوپ پی لیا۔ دائیں ہاتھ میں جسم کو
اہم کرنے والی سُوئی چبھنے کی وجہ سے وہ خود سے سُوپ پینے کے لائق تھا بھی نہیں۔

''ڈاکٹر سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ بیمار کا حال کیسا ہے؟ ہم آپ کے ہوش میں آنے کا ٹھیک ٹھاک
سکتے ہیں تو یہ کیسے نہیں جانیں گے کہ ابھی آپ کا حال اتنا خراب ہے کہ اگلے کئی دن تک بیڈ ریسٹ
گے، تب ہی کہیں جا کر بہتر ہوں گے۔ مارنے والوں نے آپ کو بڑی احتیاط سے مگر دل کھول کر مارا
ہائی داوے آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟'' اُسے سُوپ پلانے کا سلسلہ جاری رکھتے
ڈاکٹر ماریہ نے شوخ لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''معلوم تو نہیں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے..... لیکن حیرت
بات پر ہے کہ اس نے اتنا لمبا ڈرامہ رچانے کے بعد اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کیسے دیا؟ ورنہ میں نے تو
نے کے بعد یہی سوچا تھا کہ اب وہ مجھ سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرے گا۔'' اُس نے مبہم اور
انداز میں ڈاکٹر ماریہ کی بات کا جواب دیا۔

''آپ کا اشارہ چودھری افتخار عالم کی طرف ہے نا؟'' ڈاکٹر ماریہ نے اس سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہا
خاموشی خود اعلان کر رہی تھی کہ ڈاکٹر ماریہ کا اندازہ درست ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر ماریہ نے سمجھ داری
دیتے ہوئے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ اسے باؤل میں موجود سُوپ پلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھینکس فار دِس ڈیلیشیس سُوپ ڈاکٹر!'' شہریار نے اس سے کہا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک کی
ابھری۔

''یس کم اِن۔'' شہریار نے دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور عبدالمنان کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے
ایس پی معظم تارڑ بھی موجود تھا۔

''آر یو اوکے سر؟'' عبدالمنان نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی
اور آنکھوں کی سرخی سے ظاہر تھا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے بالکل بھی آرام نہیں کر سکا ہے۔

''یس، آئی ایم پرفیکٹلی اوکے۔ یو ڈونٹ وری۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے شہریار نے مسکرا کر
تسلی دی۔

''آئی جی صاحب آپ کے لیے بہت زیادہ پریشان تھے۔ انہیں آپ کی واپسی کی اطلاع ملی تو انہوں نے
کہا کہ آپ جب ہوش میں آ جائیں تو ان کی آپ سے بات کروا دی جائے۔ انہوں نے آپ کو علاج کے
اور شفٹ کرنے پر بھی زور دیا تھا۔'' عبدالمنان نے اسے مختار مراد کی بابت آگاہ کیا۔

''ان سے میں بات کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میری گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟''

کمرے میں ایس پی کی موجودگی کو نظر انداز کیے وہ مسلسل عبدالمنان سے مصروفِ گفتگو تھا۔

''ڈرائیور بے چارہ تو ختم ہو گیا۔ آپ کی گاڑی فوری طور پر دریافت نہیں کی جا سکی تھی، چنانچہ اس کو کسی قسم کی طبی امداد نہیں مل سکی۔ وہ کسی مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔'' عبدالمنان نے اسے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اغوا کاروں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور کے جانے کا کوئی امکان نہیں، پھر بھی وہ دل سے خواہاں تھا کہ کسی طرح اس غریب کی زندگی بچ جائے۔ لیکن خواہش نے طے شدہ فیصلے کو نہیں ٹالا تھا۔

''آپ ہمیں وقوعہ کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں سر! اچانک یہ سب کیوں اور کیسے ہوا، کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی گاڑی اور ڈرائیور کی لاش کو ویرانے میں پا کر ہم صرف یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ آپ کو اغوا کیا گیا ہے۔ پولیس فورس کے جوان آپ کو تلاش کرتے رہے۔ آئی جی صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ گھنٹوں کے اندر آپ کو تلاش نہیں کیا جا سکا تو وہ جنگل میں سرچ آپریشن شروع کروا دیں گے لیکن اس سے پہلے ہی آپ ہمیں مل گئے۔ آپ کا اغوا ہمارے لیے جتنی حیرت کی بات تھی، اسی طرح واپسی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ ورنہ میرا تو آئیڈیا تھا کہ اغوا کار آپ کے بدلے میں کسی قسم کے مطالبات کر کے سودے بازی کرنے کی کوشش کریں گے۔'' افسردگی بھرے ان لمحات میں ان کی اور عبدالمنان کی گفتگو میں تعطل آیا تو ایس پی نے ازخود اس سے گفتگو چھیڑ دی۔

''میں تھوڑی دیر بعد آپ کے آدمی کو اپنا بیان ریکارڈ کروا دوں گا۔ فی الحال تو میرے سر میں شدید درد ہے اس لیے میں زیادہ بول نہیں سکتا۔''

اس نے قدرے رُوکھے لہجے میں ایس پی کی بات کا جواب دیا۔ ڈرائیور کی موت نے اس کے دل پر اثر ڈالا تھا۔ وہ غریب صرف اس وجہ سے مارا گیا تھا کہ اسے شہریار عادل کی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس سے دشمنی تھی، نہ ہی وہ کسی قسم کے لینے دینے میں تھا۔ وہ تو بس اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا لیکن اپنی غرض میں مبتلا افراد کو کیا مطلب تھا کہ ان کی سفاکی نے کسی غریب خاندان سے اس کا سہارا چھین لیا ہے۔ اکبر چودھری کے گروپ کے بندے کی حیثیت سے وہ اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتا تھا، چنانچہ اس سے اس صحیح لہجے میں بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ایز یو وِش سر! ابھی آپ آرام کریں اور جب فیل کریں کہ بیان دینے کے قابل ہیں تو اطلاع کر دیں گا۔'' ایس پی بنا کسی حیل و حجت کے اُس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

''مجھے اپنا موبائل دے دو عبدالمنان!'' ایس پی کے باہر جانے کے بعد اس نے عبدالمنان سے طلب کی۔ خود اُس کا اپنا موبائل اور دیگر اشیاء تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اغوا ہونے کے بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے اپنے جسم پر موجود لباس کے سوا ہر شے کو غیر موجود پایا تھا۔ اب مرکزِ صحت کے اس کمرے میں وہ اپنے جسم پر موجود لباس کو بھی تبدیل شدہ پا رہا تھا۔ یقیناً اُس کا پہلے والا لباس خراب ہو گیا تھا، تب ہی بدل کر یہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیض پہنا دیا گیا تھا۔

''یس سر!'' عبدالمنان نے موبائل جیب سے نکال کر اسے دیا اور بولا۔ ''آپ اطمینان سے آرام کر لیں۔ میں اس دوران آپ کو یہاں سے شفٹ کرنے کے انتظامات دیکھتا ہوں۔''

شہریار نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دے دی۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ انتظامات تو وہ پہلے ہی کر چکا ہو گا۔ اس وقت صرف اسے پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بہانہ بنا کر نکلا ہے۔ عبدالمنان کی یہ سمجھ داری



اس کے دل میں اس کی قدر مزید بڑھا دیتی تھی۔ وہ جس سیٹ پر کام کر رہا تھا، واقعی اس کا مکمل طور پر اہل

اس کے باہر جاتے ہی اس نے مختار مراد کا نمبر ملایا۔ کال اُن کے پی اے نے ریسیو کی اور یہ جاننے کے بعد کہ شہریار عادل بات کرنا چاہتا ہے، فوراً فون مختار مراد کو تھما دیا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں پہلے ہی ہدایت کر چکے تھے۔ پی اے نے اس کا نام جاننے کے بعد مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''آل ایم سو ہیپی شہریار! یقین کرو تمہاری زندہ سلامت واپسی نے مجھے اتنی خوشی دی ہے کہ مجھے لگ رہا ہے جیسا کہ میرا بیٹا ایک بڑی مصیبت سے بچ کر واپس آ گیا ہو۔'' فون ہاتھ آتے ہی وہ جذباتی لہجے میں شہریار سے کہنے لگے۔

''تھینک یو سو مچ انکل! مجھے آپ کی اپنے لیے تشویش کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور میں آپ کی محبت کے لیے دل میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' اس نے ممنونیت سے مختار مراد کی محبت کا جواب دیا۔

''شکریے کی ضرورت نہیں بیٹا! میں تو خود اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہیں جیتا جاگتا واپس پہنچایا ہے۔ میں تو پریشان تھا کہ رانا صاحب کو اس واقعے کی اطلاع کیسے دوں؟ انہوں نے جو پے در پے صدمات اٹھائے ہیں، ابھی تو ان سے پوری طرح نہیں سنبھل سکے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے لیے تو بہت مشکل ہو جاتی۔ صرف ان کی اور بھابی صاحبہ کی وجہ سے ہی میں نے تمہارے اغوا کی خبر نشر نہیں ہونے دیا۔ میڈیا والوں کا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہر بات کو کتنا اُچھالتے ہیں۔ انہیں خبر نشر کرنے کی اجازت مل جاتی تو نہ جانے کتنی گھڑت کہانیاں وہ خود بنا لیتے۔ الحمدللہ! اب تم واپس آ گئے ہو تو خود اس معاملے کو ہینڈل کرنا کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ ہماری طرف سے پابندی پر وہ لوگ وقتی طور پر تو خبر نشر کرنے سے رُک گئے تھے لیکن اب پھر کیا کریں گے۔''

''میں بھی اُنہیں کیا بتا سکوں گا؟ وہ لوگ مجھ سے اس اغوا کا سبب جاننا چاہیں گے لیکن سبب تو مجھے خود نہیں معلوم۔ دوسرا سوال ان کا یہ ہو گا کہ مجھے اس سلسلے میں کس پر شک ہے تو ظاہر ہے میں شک ہونے کے باوجود نام نہیں لے سکوں گا۔ ان حالات میں میڈیا والوں سے گفتگو بے کار ہی ثابت ہو گی۔'' اس نے مختار مراد کو جواب دیا۔

''اچھا بھئی اور جو بھی تمہیں مناسب لگے، میڈیا والوں کو بتا دینا۔ تم سے زبردستی تو بہرحال وہ لوگ نہیں کر سکتے۔ ایسا کرو کہ تم مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنا دو۔ میں تمہیں گائیڈ کر دوں گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔''

مختار مراد نے اس سے کہا تو وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ مختار مراد خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ چپ ہوا تو وہ بولے۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ نہ تو تم کسی کو اغوا کا سبب بتانے کے قابل ہو اور نہ کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ جو جو اور جس طرح پیش آیا ہے، وہ بتا دو۔ میڈیا والوں کے سامنے اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرنے سے مکمل گریز کرنا ورنہ وہ لوگ پَر کا کوّا بنانے میں ماہر ہیں۔ خوامخواہ کہانیاں گھڑتے پھریں گے۔''

''اٹ ویری انکل! میں اپنا خیال رکھوں گا۔'' اس نے مختار مراد کو تسلی دی۔

''اوکے! تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے پی اے کو ہدایت دے دی تھی کہ تمہیں پیر آباد سے سیدھا لایا جائے۔ چوٹیں وغیرہ تو سنا ہے کہ تمہیں زیادہ مہلک نہیں ہیں لیکن پھر بھی مناسب ہے کہ تم یہاں کے ہسپتال سے اپنا علاج کروا لو۔ پھر یہاں آنے میں یہ بھی فائدہ رہے گا کہ تمہارے ماموں ممانی

آسانی سے تمہاری مزاج پرسی کرلیں گے۔ تمہارے وہیں رُکے رہنے کی صورت میں اُنہیں پریشانی ہو
وہ لوگ اتنا لمبا سفر آسانی سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی مریم کو تنہا چھوڑ کر گھر سے نکل سکتے ہیں۔ ابھی وہ
ہے نا۔'' آخری جملہ بولتے ہوئے ان کی آواز جس طرح کانپی تھی، اس نے شہریار کے دل کو مٹھی میں
''مریم عدت میں ہے نا۔'' یہ فقط ایک جملہ نہیں تھا۔ یہ وہ عظیم دُکھ تھا جو ان سب نے سجاد رانا کی اچانک
کی صورت میں بہ یک وقت اُٹھایا تھا۔

''ٹھیک ہے انکل! میں لاہور آجاتا ہوں۔'' بجھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دے کر اس نے
دیا اور تکیے پر سر رکھ کر سیدھا لیٹ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ سر میں درد کی جو ہلکی ہلکی سی
محسوس کر رہا تھا، وہ اب بے حد شدت اختیار کر گئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں
دھماکے ہو رہے ہوں۔

⊛----✪----⊛

وہ بالکل گم سم سی بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی۔ اس کے سامنے دھرا کھانا بھی جوں کا توں
نقاہت کے باوجود دل کسی طرح کھانے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ
داری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف خود کو توانا رکھنے کے لیے ہی اس قید خانے میں ملنے والا کھانا
زہر مار کر لیا کرتی تھی مگر جب سے اس نے پروجیکٹر پر چلنے والا وہ کریہہ منظر دیکھا تھا، حلق سے نوالہ
مشکل ہو گئے تھے۔ جب بھی کھانا سامنے آتا اور وہ نوالہ منہ میں رکھتی، خون میں لت پت لاش سامنے
جانے وہ کون تھا جسے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ ان کی گفتگو سے بس اتنا اندازہ کر سکی تھی کہ وہ عمران
دشمن تھا جسے اس کی تسلی کے لیے اس انجام تک پہنچایا گیا تھا۔ شکل سے معصوم اور شریف نظر آنے والا عمران
سے اتنا سفاک نکلے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے اور کانوں
لینے کے بعد کسی شک و شبے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ اس نے عمران
صورت سے دھوکا کھا کر اس کے بارے میں اچھا گمان کرنے کی غلطی کی تھی۔ وہ بھلا اچھا کیونکر ہو سکتا
وہ بھی تو انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کی قید میں وہ رہ رہی تھی۔ وہ شکل سے وحشی دکھائی دیتے لوگ
اس برف زار میں کن مذموم مقاصد کے حصول کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جنہوں نے شہروں کی
گھریلو زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر اس سخت ماحول میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور ہتھیاروں سے دل بہلا
وحشتوں کو اور بھی مہمیز کرتے رہتے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ اس بارے میں وہ ابھی تک حتمی اندازہ
تھی مگر اسے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ سب کے سب ایب نارمل تھے۔ ان ایب نارمل لوگوں کے
رہنا اب اس کے لیے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اس قید خانے میں ایک کریہہ منظر اور سفاکی دیکھنے
کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ جو پورے حوصلے سے حالات کے ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا
ہوئے تھی، ایک دم ہی کچھ ڈھے سی گئی۔ شاید یہ مایوسی کی ہی کیفیت تھی جو اس کے اندر سے حالات
کرنے کی اُمنگ مٹنے لگی تھی۔

مایوس آدمی زندگی کی بقا کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی کو جاری و ساری رکھنے
عناصر میں دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ بھی اسی مایوسی کی وجہ سے کھانے کی طرف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس
کر رکھنے والے اب بھی تمام اوقات کا کھانا پابندی سے اس تک معمول کے مطابق پہنچا رہے تھے۔ کبھی



میں سے چند لقمے نگل لیتی اور کبھی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔ کھانا
دیے جانے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ جو شخص ایک مخصوص وقت کے بعد کھانے
اس لے جانے آیا تھا، وہ برتنوں میں کھانے کو جوں کا توں رکھا دیکھ کر برتن اٹھائے بغیر خاموشی سے
گیا تھا کہ شاید بعد میں بھوک محسوس کرنے پر کچھ کھا لے۔ لیکن وہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس
نہیں ہوئی اور نہ جانے کتنی دیر تک یونہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

جب تھکن اور نقاہت کے باعث جسم جواب دینے لگا تو وہ اسی جگہ گٹھڑی سی بن کر لیٹ گئی۔
انسان کو نیند نہیں آیا کرتی اور پیٹ میں دوڑتے چوہے احتجاج کرنے لگتے ہیں لیکن وہ چونکہ کئی وقتوں
سے کھانا نہیں کھا رہی تھی، اس لیے کم خوراکی سے طاری ہونے والی نقاہت اسے غنودگی میں لے
گی کی اس کیفیت میں کتنے لمحے بیتے اسے ہوش نہیں تھا لیکن وہ اس وقت بری طرح چونکی جب اس
پر ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبا ہوا محسوس کیا۔ ساتھ ہی کسی کی گرم گرم سانسیں اس کی گردن سے
اس نے بری طرح کسمسا کر خود کو اس بوجھ سے آزاد کروانا چاہا لیکن اس کے نازک بدن کی طاقت
بوجھ کو دھکیلنے کے لیے ناکافی تھی۔ کچھ دیر قبل وہ زندگی سے کتنی ہی مایوس سہی لیکن تھی تو بہرحال
ہی..... جسے آخری دم تک اپنی عزت کی حفاظت کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی دوشیزگی چھن جانے
کر کے بری طرح مچلنے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ کچھ اور نہ کر سکے تو کم از کم چیخ ہی مار دے لیکن اس
اس کے وجود کو اپنے بوجھ تلے پیس ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ کو بھی ایک ہاتھ سے پوری قوت
رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے کپڑے تن سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود پر سوار اس
کے لئے..... جس کے جسم پر موجود بے تحاشا بالوں کی چبھن اور مساموں سے اُٹھتی گندی بدبو
برداشت تھی، اس نے بدن کی پوری قوت صرف کر کے اپنا داہنا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے سے نکالا
پر جسے اس کے ہاتھ پر ناخن گاڑتے ہوئے جھٹکے سے اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس
جھٹکا تو شاید اس وحشت زدہ درندے کا ہاتھ منہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو پاتا لیکن ناخنوں کی
کافی مدد دی اور اس کا ہاتھ ماہ بانو کے منہ سے ہٹ گیا۔

نے فوراً ہی ایک زوردار چیخ ماری لیکن بس اُسے ایک ہی چیخ مارنے کا موقع مل سکا اور اس درندے
اس کے منہ پر آ جما۔ اب اس کے انداز میں مزید وحشت در آئی تھی اور وہ اور بھی زیادہ شدت
کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وحشت کی ہی وجہ سے اسے اس طرف دوڑ کر آتے قدموں کی آواز سنائی
آنے والے نے بس ایک نظر یہ منظر دیکھا اور پوری قوت سے اسے ماہ بانو پر سے دھکیل کر غار کی
مارا۔ نفس کے وحشی جانور کے زیر اثر وہ شخص چوٹ کھا کر کسی بیل کی طرح بری طرح ڈکرایا اور
راہ کی رکاوٹ بننے والے پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نہ
آپ کو حملے سے بچایا بلکہ اس وحشی کا سر دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر ایک بار پھر اسے دیوار پر دے
کی پختہ دیوار سے ٹکرانے پر ایک زوردار آواز اُبھری اور اگلے ہی پل ماہ بانو نے اس شخص کے سر سے
سا نکلتا دیکھا۔ اس دوران وہ کسی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی اور وہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر جو
نے اس کے جسم پر سے نوچ پھینکی تھی، ایک بار پھر اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔

کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اس مدھم روشنی میں بھی وہ وہاں موجود
افراد کو شناخت کر سکتی تھی۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے والا شخص وہی گل شیر نامی آدمی تھا جس کی آنکھوں

کی ہوس نے پہلے بھی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی جبکہ ان نازک لمحات میں اس کے لیے
آنے والا معصوم صورت عمران تھا۔ وہی عمران جس سے پہلے بھی وہ اچھی امید باندھ چکی تھی لیکن
وحشت کی داستان سامنے آنے پر مایوسی کا شکار ہوگئی تھی۔ اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل
شخص اس وقت اس کا محافظ بن گیا تھا اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والے کو بری طرح پیٹ رہا تھا
محسوس کیا کہ گل شیر کو پیٹتے ہوئے عمران کے انداز میں وحشت اُتر آئی ہے اور وہ اس بات کی پروا
پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے، مسلسل اس کا سر دیوار سے مارتا رہا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے گل شیر کو بالکل
دیا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح ماہ بانو پر حملہ آور ہوا تھا، اب عمران کے ہاتھوں
بے جان شے کی طرح جھول رہا تھا۔ خونم خون گل شیر اور وحشت زدہ عمران کو دیکھ کر ماہ بانو کا اتنا برا
وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس پر چند لمحے قبل جو گزری تھی، وہی کیا کم تھی جو اس وحشت ناک منظر کو دیکھ کر
حواس قائم رکھ پاتی۔ وہ تو شور کی آوازیں سن کر دوسرے لوگ خود ہی اس طرف متوجہ ہو گئے اور
آئے۔ آنے والوں میں سے تین نے بڑی مشکل سے عمران کو قابو کر کے اس کی گرفت سے گل شیر کو آزا

''چھوڑ دو مجھے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس جیسے بھیڑیے جو معصوم لڑکیوں
سے کھیلتے ہیں، زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' خود کو قابو میں کر
گرفت میں مچلتا ہوا وہ وحشت زدہ انداز میں چلایا۔

''ہوش کرو عمران! وہ مر چکا ہے۔'' ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ لگاتے ہو
احساس دلایا تو وہ عالمِ وحشت سے باہر نکلا اور سامنے پڑی گل شیر کی لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشا
کے نتیجے میں اس کا سر پاش پاش ہو چکا تھا اور بھیجہ باہر نکل آیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے
قسم کا افسوس ظاہر نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نفرت بھری نظر گل شیر کی لاش پر ڈال کر حقارت سے اس پر
اور بولا۔

''اچھا ہوا مر گیا سالا۔ بچ جاتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دیتا۔''

''اسے یہاں سے لے کر جاؤ اور گل شیر کی لاش اُٹھوا کر جگہ صاف کرواؤ۔'' ان میں سے ایک
دوسروں سے ممتاز مقام رکھتا تھا، حکم دیا۔ فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ عمران کو بازوؤں میں
آدمی اُسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ یقیناً گل شیر
دیکھنے کے بعد اس کے جنونی غصے کا اُبال کم ہو گیا تھا۔

ماہ بانو چادر میں سمٹی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ عمران کو وہاں سے
کے بعد گل شیر کی لاش بھی اٹھالی گئی تھی اور اب ایک آدمی وہاں زمین اور دیواروں پر لگے خون کو صا
تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ گل شیر کے سر سے اس کے بھیجے کا بھی کچھ حصہ باہر نکل آیا تھا۔ صفائی کر
آدمی نے بڑے اطمینان سے اسے بھی صاف کر دیا۔ ماہ بانو نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان
کوئی بھی اپنے ساتھی کی موت پر افسردہ یا غمگین نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لیے گویا یہ ایک معمول کی بات
کے پیش آ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شاید وہ اس طرح کے مناظر اتنی بار دیکھ چکے تھے کہ
کے لیے ان کی حیثیت بالکل ایسی ہو گئی تھی جیسے روزانہ اپنے گھر سے دفتر جانے والے شخص کے لیے را
مختلف مناظر کی ہوتی ہے۔ ایسا شخص غیر ارادی طور پر سب کچھ دیکھتا تو ضرور ہے لیکن منظر میں کوئی نیا
نہ ہونے کے باعث اس کے دل و دماغ میں تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ ان تمام لوگوں نے بھی گل شیر کی لا



کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

❀----✪----❀

سمجھتا ہوں انکل! کہ جنگل میں آپریشن بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔
ہم پہلے ہی جانتے ہیں بلکہ میں اس سلسلے میں پہلے بھی آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ ڈاکوؤں کی
کے لیے کچھ کیجیے۔''

ہسپتال کے آرام دہ کمرے میں صاف ستھرے بستر پر نیم دراز وہ اپنی عیادت کے لیے آئے ہوئے آئی
اسے مخاطب تھا۔ بہترین نگہداشت اور علاج نے اسے تیزی سے روبہ صحت ہونے میں کافی مدد دی
اس حالت میں وہ اغوا کاروں کے چنگل سے نکل کر آیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہی قیاس کیا جا سکتا تھا
اسے دوبارہ سے زندگی کے معمولات میں شامل ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ بہرحال، اب بھی وہ سو
خطرہ سے باہر نہیں ہوا تھا۔ سر پر لگنے والا زخم گہرا ہونے کی وجہ سے اس پر ڈاکٹر داور نے ٹانکے لگائے تھے
ٹانکے کھولے نہیں گئے تھے۔ جسم کے باقی حصوں پر لگنے والے زخم بھی ابھی پوری طرح مندمل نہیں
تھے۔ پھر ڈنڈوں کی ضرب سے لگنے والی اندرونی چوٹیں جو حرکت کرنے میں اسے خاصی تکلیف دیتی
آباد کے مرکزِ صحت میں ملنے والی ابتدائی طبی امداد نے اگر اس کی زندگی خطرے میں جانے سے بچائی
اور کے اس جدید ہسپتال کے ڈاکٹرز بھی اسے تیزی سے روبہ صحت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ فرق
صرف اتنا تھا کہ ایک جگہ غریب لوگوں کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے رفاہی بنیادوں پر کام ہو رہا تھا
ہر جگہ پر خدمت کے عوض لمبے لمبے بل وصول کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں، درخت اُگانے والا اگلی نسل
درخت اُگاتا ہے اور خود اُسے اس درخت کا پھل کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ شہریار کے ساتھ معاملہ ذرا
تھا۔ اس نے دوسروں کے بھلے کے خیال سے اپنے ضلع میں دیہی مراکزِ صحت کا قیام عمل میں لانے کا
کیا تھا اور اس کی یہ نیکی و خدمت خود اس کے لیے خوش نصیبی بن گئی تھی، ورنہ ممکن تھا کہ وہ فوری طبی
ملنے پر محض خون کے زیادہ اخراج کے باعث ہی جان سے چلا جاتا۔ پسماندہ دیہاتوں کا سب سے بڑا
یہی ہے کہ قابل علاج امراض و مسائل بھی فوری طبی امداد نہ ملنے کے باعث پیچیدہ صورت اختیار کر کے
مریض کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔

اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے مجھ سے آپریشن کے لیے بات کی تھی۔ اس وقت تم ایک دیہاتی لڑکی
اور پھر اس کی لاش ملنے کے باعث یہ فرمائش کر رہے تھے جس کے بارے میں شک ظاہر کیا گیا تھا کہ
ڈاکوؤں نے اٹھایا ہے۔ لیکن مقامی پولیس آفیسر کا کہنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے خود اپنے آشنا کے ساتھ گھر
گئی تھی۔'' آئی جی مختار مراد نے اپنے مضبوط حافظے کا ثبوت دیتے ہوئے مختصراً اس واقعے کا حوالہ دیا۔

صرف یہی ایک کیس نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈاکوؤں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار
کی۔'' شہریار نے تڑپ کر یاد دلایا۔

ہاں، وہ واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ لیکن بیٹا! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ دونوں ہی واقعات اتنے
نہیں تھے کہ میں ان کی بنیاد پر حکومت کو اتنے بڑے آپریشن کے لیے راضی کر پاتا۔ تمہیں اس جنگل کی
شاید اچھی طرح اندازہ نہیں ہے۔ وہاں گھنے درختوں اور پہاڑیوں کی موجودگی کے باعث چھپنے کی
بہت ہیں اور آس پاس دیہاتوں کی موجودگی کے سبب ڈاکوؤں کے لیے راہِ فرار اختیار کرنا بھی زیادہ

مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اگر ہم وہاں آپریشن کرنا چاہیں گے تو ہمیں بہت بڑے پیمانے پر آپریشن کر
اس کے لیے جتنا بجٹ درکار ہے، اس کی منظوری کے لیے کوئی بہت ہی خاص ریزن سامنے ہونا ضرور
مختار مراد نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''آپ کے خیال میں ایک معصوم لڑکی کا اس کی شادی سے ایک دن قبل اغوا ہو جانا اور پھر اس کی
لاش ملنا کوئی معمولی واقعہ تھا؟ اس واقعے کے اثرات کتنے خطرناک نکلے تھے، یہ بھی آپ کو یاد ہوگا۔
اس جذباتی سے لڑکے عبدالمتین کو نہیں بھول سکتا جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی سے اتنی
متاثر ہوا کہ شاہنواز جیسے دہشت گرد کے ہاتھ چڑھ گیا۔ صرف اس ظلم کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے جسم سے
کر بھرے مجمع میں آ گھسا تھا۔ وہ مجھے، وزیروں، پولیس والوں اور ایسے تمام افراد کو مار دینا چاہتا تھا
ذمے قانون نافذ کرنا اور لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ لیکن اتفاق سے وہ اسٹیج تک پہنچنے میں کامیاب
سکا اور نتیجتاً ہم سارے وی آئی پیز کے صدقے میں بے گناہ عوام مارے گئے۔'' شہریار نے نہایت
سنگین واقعے کا ذکر کیا۔

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں شہریار! لیکن پھر وہی کہنے پر مجبور ہوں کہ اس واقعے کی
میں آپریشن ڈکلیئر نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمہارا معاملہ الگ تھا۔ اگر تم واپس نہ لوٹتے تو میں، رانا صاحب اور
دوسرے بارسوخ افراد مل کر زور لگاتے کہ تمہیں بازیاب کرنے کے لیے آپریشن کیا جائے اور اس وقت
بات منوا بھی لیتے لیکن اب جبکہ تم واپس آ گئے ہو تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس اب کوئی ٹھوس
رہی ہے۔ خود تمہیں بھی یقین نہیں کہ تمہیں اغوا کرنے والے ڈاکو ہی تھے۔ تمہیں تو چودھری اور اس کے
پر شک ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اغوا کیا تھا۔''

''تو یہ بات بھی تو ظاہر ہے کہ چودھری کا ڈاکوؤں سے ربط ضبط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے
ڈاکوؤں کے ذریعے اغوا کروا کر ان کے کسی ٹھکانے پر رکھا ہو۔ ورنہ خود ڈاکوؤں کو مجھ سے کیا غرض ہو سکتی
اس نے دلیل دیتے ہوئے مختار مراد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''یہ صرف ایک قیاس ہے۔ تم یا میں اس کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ تم کسی مخالف کی
نظر سے دیکھو تو تمہارے اغوا کا معاملہ ہی کافی مشکوک صورت اختیار کر لے گا۔ تمہارے پاس بتانے
کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے، کیوں اور کس لیے اغوا کیا تھا..... اور بغیر کوئی مطالبہ کیے اتنی آسانی
آزاد کیسے کر دیا؟ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ تم نے چودھری پر الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے اغوا کا
رچایا تھا اور اب فضول واویلا کر رہے ہو۔ اسی لیے میں نے تمہیں میڈیا والوں کے سامنے کسی پر شک ظاہر
سے منع کیا تھا۔ سچ کیا ہے، وہ تم جانتے ہو اور میں بھی اسے مانتا ہوں لیکن ہم اس سچ کو سب سے نہیں منوا سکتے
آئی جی مختار مراد نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس پر ہر بات واضح کر دی تو اس کا جوش بھی جھاگ کی طرح
گیا۔ واقعی موجودہ حالات میں تو خود اس کی اپنی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل! واقعی میں اپنے اغوا والے معاملے پر شور مچاؤں گا تو اس سے زیادہ
نہیں ہوگا کہ میڈیا والوں کو چٹ پٹی خبریں بنانے کے لیے ایک ایشو ہاتھ آ جائے گا۔'' آخر کار اس نے
مختار مراد سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

''مایوس مت ہو ینگ مین! ابھی تمہارے کیریئر کا اسٹارٹ ہے۔ آگے جا کر تمہیں بہت کچھ کرنے
بھی ملے گا اور کئی رکاوٹیں بھی سامنے آئیں گی۔ ہم سب جس سسٹم کا حصہ ہیں، وہ اسی طرح چلتا ہے



جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس سچ کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ کئی بار ہمیں ناانصافی دیکھنے کے باوجود
اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چودھری افتخار اور تمہارا کیس کوئی انوکھا نہیں ہے۔ ان چودھریوں اور وڈیروں
جب بھی کوئی ایمان دار افسر آتا ہے، یہ اسی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ
کلی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ابھی تک چودھری کھل کر تمہارے مقابل نہیں آیا اور صرف پیچھے سے وار
پر اکتفا کر رہا ہے، ورنہ تمہاری جگہ کوئی عام فرد ہوتا تو چودھری اب تک اسے اپنے علاقے سے اٹھا کر
دیتا۔ ان بااختیار چودھریوں کی زد میں آنے والوں کا کیریئر کس طرح تباہ ہو جاتا ہے، تمہیں اندازہ
ہے..... اور وہ صرف اس وجہ سے کہ تم ایک طاقتور خاندان کے فرد ہو۔ یوں سمجھ لو کہ جس سسٹم کی خامیوں
سے چودھری جیسے افراد احتساب سے بچے ہوئے ہیں، اسی سسٹم کے سہارے تم بھی اپنی سیٹ پر ٹکے
ہو۔''

مختار مراد ایک تجربہ کار شخص تھا اور اس وقت اس کے لفظوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ غصے اور ہوش سے
ہوئے شہریار کو اُس کی بات سمجھ آئی تو وہ ذرا پسپا پڑ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"مجھے آپ کے کہے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے اور چودھری کے
سب سے بڑا فرق حق و باطل کا ہے۔ اور میں حق کے غالب آنے تک یا کم از کم اس وقت تک جب تک
جسم میں جان ہے، چودھری سے اپنی جنگ جاری رکھوں گا۔''

"وش یو بیسٹ آف لک ینگ مین!..... مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش
کام لینا۔ تمہاری عمر کے لوگ عموماً اپنے جوش کی وجہ سے ہی ان کہنہ مشق جاگیرداروں سے شکست کھا جاتے
وہ نہیں کر پاتے جس کی انہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوتی ہے۔ سجاد کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس
اپنا پورا کیریئر اتنی احتیاط سے گزارا۔ وہ اگر ڈی آئی جی کی پوسٹ تک پہنچا تھا تو اس کے لیے اس نے خود کو
ثابت کیا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد وہ آئی جی بھی ضرور بنتا لیکن کیا ہوا؟ شینا کی موت نے اُس پر
سوار کیا کہ وہ احتیاط کے سارے تقاضے فراموش کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شینا کے قاتل بھی انجام تک نہیں
اور وہ خود بھی اپنی جان سے گیا۔''

سجاد رانا کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مراد کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی در آئی تھی۔ وہ اُس کی اکلوتی بیٹی کا شوہر تھا
نے ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہت ہی اچھا شخص منتخب کیا ہے
قسمت نے عجیب ہی چال چلی تھی۔ وقت کی آندھی نے نہ صرف اس کی بیٹی کی گود اُجاڑ دی تھی بلکہ اس کا
بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے اس غم پر اندر ہی اندر کڑھتا اور گھلتا رہتا تھا
ظاہر اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے اس کے چہرے سے اس کی اصل قلبی کیفیت کا
لگانا بہت مشکل تھا۔ یہ ضبط اور برداشت یقیناً پولیس کی برسوں کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔

''سجاد بھائی اور شینا کے قاتلوں کا کچھ معلوم ہوا انکل؟'' ذکر چھڑا تو وہ اس سے یہ سوال کیے بغیر نہیں
سکا۔

''نہیں۔'' مختار مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کر سکے کہ ان قاتلوں کے
تعلق انڈیا خفیہ تنظیم ''را'' سے جا کر ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیچھے ہم جہاں جہاں تک پہنچے، وہ وہاں سے
فرار ہو چکے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے آرڈر دے رکھا ہے کہ
سراؤں اور جسم فروش عورتوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور جہاں کوئی مشکوک بات ہو، میرے

نوٹس میں لائی جائے۔ مجھے یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ کام ہو رہا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سچ مچ کچھ ہوا نہیں۔ ہم جیسے بڑے افسروں کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ماتحتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کون اصل میں آپ کا ماتحت اور وفادار ہے، اس بات کا مشکل سے ہی اندازہ ہو پاتا ہے۔ سجاد کی ڈی آئی جی آیا ہے، وہ بظاہر ٹھیک آدمی ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی بڑی شکایت بھی نہیں بھی حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے سجاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال، ابھی تو انویسٹی گیشن چل رہی کچھ سامنے آیا تو میں تمہیں ضرور انفارم کروں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ بہت ٹائم گزر گیا ہے۔ مجھے کچھ معاملات بھی دیکھنے ہیں۔'' وہ گھڑی پر نظر پڑنے پر بات کرتے کرتے اچانک ہی اپنی گفتگو سمیٹ کر ہوا۔

''تھینک یو سو مچ انکل! کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر میری عیادت کے لیے آئے۔'' شہریار نے سے پُر جوش مصافحہ کرتے ہوئے حقیقی شکر گزاری کے احساس کے ساتھ کہا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں ینگ مین! مجھے خود تم سے ملنا اچھا لگتا ہے کیونکہ تم میں وہ اسپرٹ کی بدولت تمہارے اوپر تک جانے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے نیک مقاصد کامیاب ہو اور وہ کر کے دکھاؤ جو ہم نہیں کر پائے۔'' مختار مراد نے محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''اگر کرم فرماؤں نے اگلی بار بالکل ہی اوپر نہ پہنچا دیا تو یقیناً آپ کی دعا قبول ہو گی۔'' شہریار بات سن کر شوخی سے ہنستے ہوئے بولا۔

''ایسی باتیں مت کرو ینگ مین! اب تم ہی ہو جو رانا صاحب اور اپنی ممانی کو سنبھال سکتے ہو۔ تمہیں لمبی عمر دے اور تمہارے طفیل وہ لوگ وہ خوشیاں دیکھ سکیں جو وقت نے ان سے چھین لی ہیں۔'' نے اسے فوراً ہی ٹوکتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل

اس کے جانے کے بعد شہریار بھی تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ مختار مراد سے ملاقات کر کے اس کے پر سے بہت سے جالے صاف ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اس کا اسے ''ینگ مین'' کہہ کر پکارنے کا انداز مخلصانہ اور محبت سے بھرپور تھا کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ مختار مراد کے اور اس کے درمیان کوئی خونی رشتہ ہے۔ وہ اس کے کزن کا سسر ہی تو تھا جو اگر اس سے تعلق نہ بھی رکھنا چاہتا تو وہ شکایت نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے بے حد مصروف شیڈول میں سے بھی خاص طور پر اس کے لیے وقت نکال کر اس سے ملنے آیا تھا تو بات تھی۔

''آپ کی میڈیسن کا وقت ہونے والا ہے سر! پہلے آپ کچھ کھا لیں تاکہ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو میڈیسن دے سکوں۔'' مختار مراد کو گئے پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نازک سی نرس ٹرے دے کر اندر چلی آئی اور اس سے بولی۔

''اوکے! آپ میرا لنچ لے آئیں۔'' شہریار نے اسے اجازت دی۔ اس کی ممانی آفرین رانا خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود اس کے لیے ہر ٹائم کا کھانا ہسپتال پہنچایا کریں گی لیکن اس نے ان کی تکلیف خیال سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے بھی یہ ہسپتال بہت باسہولت تھا اور ہر شے آسانی سے دستیاب تھی۔ اس وقت بھی نرس نے اس کی اجازت پا کر ڈاکٹر کے تجویز کردہ فوڈ چارٹ کے مطابق اسے اپنی میں ہلکا پھلکا لنچ کروایا اور پھر پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اسے دوائیں کھلا کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں نرس کی موجودگی کو خود اس نے ناپسند کیا تھا اس لیے نرس ضرورت کے علاوہ وہاں نہیں رُکتی تھی۔ اگر اُسے کوئی



کے ساتھ لگا گھنٹی کا بٹن دبا کر اسے کال کر سکتا تھا۔

اس وقت نرس اسے دوائیں کھلا کر گئی تو تھوڑی دیر میں ہی اسے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ یقیناً پین کلر تھا۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر بیڈ کے عین سامنے لگا ٹی وی بند کر دیا۔ لنچ کرواتے ہوئے نرس کی فرمائش پر دھیمی آواز میں ٹی وی آن کیا تھا تاکہ وہ حسب خواہش نیوز دیکھ سکے۔ اب غنودگی محسوس اس نے ٹی وی آف کر کے سو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اسے عیادت کے لیے آنے والے اور فون کالز کی وجہ سے آرام کا زیادہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج صبح سے تو اس نے ڈاکٹرز کی تجویز پر اپنا ی آف کر دیا تھا تاکہ کم از کم ایک طرف سے تو سکون ہو۔ اس وقت وہ اس سکون اور تنہائی کا فائدہ اٹھا لے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر ڈیوٹی دینے والا پولیس اہلکار اجازت لے کر اندر آیا۔

''سر! ایس پی معظم تارڑ آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' اس نے شہریار کو اطلاع فراہم کی جس پر یک وقت حیرت اور کوفت محسوس کی۔ معظم تارڑ اس سے ملنے کے لیے یہاں تک آ جائے گا، اسے امید نہیں تھی۔ اور اب وہ آ گیا تھا تو اس کا اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''اوکے! اُنہیں اندر بھیج دو۔'' قلبی کیفیت کے برخلاف اسے ایس پی کو باہر سے ہی لوٹانا اچھا نہیں لگا اس اب کے لیے منتظر کھڑے اہلکار سے بادل ناخواستہ کہا۔ وہ اس کا جواب سن کر فوراً ہی پلٹ گیا۔ اگلے لمحے ارڈ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''گڈ آفٹرنون سر! آئی ہوپ کہ اب آپ پہلے سے بہت بہتر ہوں گے۔'' اس نے مہکتا ہوا فلاور بکے بیڈ ب رکھی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔ حالانکہ دشمنوں کی کوشش تو یہی تھی کہ میں بہت عرصے تک بستر سے اُٹھ ہی نہ سکوں..... لیکن کرم ہے کہ میں بہتر ہوں اور بہت جلد اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر کام شروع کر دوں گا۔''

معظم تارڑ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خود بہ خود ہی طنزیہ ہو گیا تھا جسے وہ کمال صفائی سے نظر انداز کر گیا راتے ہوئے بولا۔

''وائے ناٹ سر! ہم لوگ تو منتظر ہیں کہ آپ آئیں اور اپنی ذمے داریاں سنبھالیں۔''

''انشاء اللہ!..... وہ تو میں جلد سنبھال لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ لاہور کسی کام کے سلسلے میں آنا ہوا تھا یا خاص میری عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں؟'' اس نے ذہن میں پنپتا سوال آخر کار کر ہی ڈالا۔

''دونوں ہی باتیں سمجھ لیں۔ اصل میں مجھے وزیر اعلیٰ صاحب سے ایک کام تھا۔ کام تو خیر میں ان سے فون ی کہتا تو وہ کروا دیتے لیکن میں نے سوچا کہ ان سے ملاقات کے بہانے یہاں آؤں گا تو آپ کی مزاج پُرسی کر لوں گا۔''

معظم تارڑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تارڑ کی وزیر اعلیٰ سے داری ہے اور اس رشتے داری کے بل بوتے پر وہ ان سے اپنے مطلب کا کام کروا سکتا ہے۔ کام کی نوعیت سے البتہ اس نے تجسس کے باوجود گریز کیا۔

''میرے علم میں آیا تھا کہ محکمہ پولیس کے کچھ افسران کو ایک تربیتی کورس پر دو سال کے لیے بیرونِ ملک جا رہا ہے۔ میں نے ان افراد میں اپنا نام بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے یٹ اپ سے نکلنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مجھے بیرونِ ملک کوئی اچھا چانس مل گیا تو میں وہیں ل ہو جاؤں گا۔ یہاں رہنا اب مجھے اپنے لیے مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' اس کے سوال نہ کرنے کے

باوجود تارڑ نے خود ہی اپنی وزیراعلیٰ سے ملاقات کا سبب بتا دیا۔ اس کی باتیں سن کر شہریار چونک گیا اور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خلافِ معمول صورت سے دوچار ہے۔

''کیا بات ہے تارڑ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' آخر کار اس نے تارڑ سے پوچھا۔

''میں اپنے آپ کو یہاں اَن سیف محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھیں نا کہ حالات کس رخ پر ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔ آپ اپنے اغوا کی ہی مثال لے لیں۔ وہ تو آپ کی قسمت اچھی نہ جانے کس وجہ سے اغوا کاروں نے آپ کو آزاد کر دیا۔ ورنہ یہاں تو بندہ غائب ہو جائے تو اس کا کوئی نشان ہی نہیں ملتا۔''

اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا لیکن شہریار یہ جواب سن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی بات ہے جسے تارڑ بتانا چاہتا ہے لیکن جھجک کا شکار ہے۔

''آپ پولیس والے ہو کر خود ڈر رہے ہیں تارڑ صاحب! یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔'' تارڑ کو حوصلہ کے لیے وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

''پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ پشت پر سے ہونے والا حملہ وہ بھی نہیں روک سکتے۔ آپ رانا صاحب ہی کی مثال لے لیں۔ وہ تو مجھ سے بہت اوپر کے افسر تھے لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی ان کی حفاظت تو نہیں کر سکی نا؟'' اس نے گویا دلیل کے ساتھ شہریار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''خیر، سجاد بھائی کا تو کیس ہی الگ ہے۔ وہ جن خطرناک مجرموں کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے اختیارات اور وسائل بہت زیادہ تھے۔ لیکن آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ تو ایک چھوٹے سے ضلع کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں اور وہاں بھی آپ کی اچھی پی آر ہے۔'' اس نے نہایت نرمی سے ایک بار پھر تارڑ کو لپیٹ میں لیا۔

''پی آر کیا ہوتی ہے سر! طاقتور لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں کہ یہ بندہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔'' تارڑ کا یہ جملہ چونکا دینے والا تھا۔ شہریار نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ تارڑ کو استعمال کرنے والا طاقتور شخص صرف ایک تھا۔ چودھری افتخار عالم شاہ..... اور تارڑ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے چودھری کی طرف سے کوئی درپیش ہے۔

''آپ مجھ سے کھل کر بات کریں تارڑ صاحب! آخر آپ کس قسم کے خدشات کا شکار ہیں؟'' اس تارڑ سے اصل بات اُگلوانے کی کوشش کی۔

''نہیں سر! مجھے خدشات لاحق تھے لیکن اب میں مطمئن ہوں۔ کچھ دنوں میں، میں ملک سے باہر جاؤں گا اور جب یہاں ہوں گا ہی نہیں تو پھر خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہے گی۔''

''اوکے! آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔'' تارڑ کا گریز دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے اجازت دیں سر! آپ کا کافی وقت لے لیا۔'' وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ شہریار نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ آج پہلی بار اسے تارڑ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے دباؤ میں دوستانہ گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔

''اپنا خیال رکھیے گا سر! اور ساتھ ہی محتاط بھی رہیے گا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور اسے ایڈونچرز کی نذر



کرنا۔'' مصافحہ کرتے ہوئے اس نے شہریار کو نصیحت کی۔

''مشورے کا شکریہ۔ لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اپنی زندگی کسی ایڈونچر کی نذر کرنے کے بجائے قانون کے تحت بسر کرنے والا آدمی ہوں۔ اور مشن کی تکمیل کے لیے جان پر کھیل جانا بہادروں کا کام ہوتا ہے۔'' شہریار نے اسے دوبدو جواب دیا۔

''ویل آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ مرنا تو بہرحال آدمی کو ہوتا ہی ہے۔ اقبال باجوہ کے بارے میں یاد ہے کہ بے چارہ اچانک ہی مر گیا تھا۔'' اس نے سابقہ فاریسٹ آفیسر کا حوالہ دیا۔ اقبال باجوہ وہ شخص تھا جس کے دور سے ہی چودھری نے جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ تارڑ خود بھی اس کام میں شامل تھا لیکن اب جانے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

''باجوہ کی موت طبعی نہیں تھی سر! اسے ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جو بظاہر ہارٹ اٹیک کی طرح دکھاتا ہے۔ لیکن حال ہی میں ہونے والے باجوہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی۔'' وہ ابھی تارڑ کے رویے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ اچانک اس پر یہ انکشاف کر کے تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اس کا یہ انکشاف شہریار کے لیے خاصا دھماکا خیز تھا۔ پیر آباد مرکزِ صحت پر ڈاکٹر ماریہ اور ڈاکٹر داور دونوں کے متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا کہ باجوہ کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس تشخیص کے بعد باجوہ کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ صورتِ حال میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اب تارڑ اس پر انکشاف کر کے گیا تھا کہ باجوہ کی درحقیقت مہلک زہر سے ہوئی تھی اور یہ بات پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ موت کے اتنے عرصے بعد قبر سے لاش نکلوا کر اس کا پوسٹ مارٹم کروانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ان سوالات کے جواب تارڑ ہی دے سکتا تھا۔ لیکن وہ تو اُسے اُلجھن میں گرفتار کر کے خود وہاں سے جا چکا تھا۔

⊛----✪----⊛

کشور کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج کل اس کی حالت کا یہی عالم تھا۔ کبھی دم گھٹتا، کبھی متلی ہونے لگتی اور کبھی دل گھبراتا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کیفیات وہ ہیں جو تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ ایک ایسی صورتِ حال اور اہم مرحلے سے گزر رہی تھی جس میں اسے ہر حال میں اپنا یہ راز چھپانا تھا ورنہ نہ صرف اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ حویلی والے اس کی کھوج میں بھی لگ جاتے کہ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار کون ہے؟ وہ آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے بہت محتاط تھی۔ احتیاط کے باعث وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی تھی کہ نہ کسی کا سامنا ہو اور نہ ہی کوئی اس کا بھید پا سکے۔

حویلی میں اُس کی اس روش کو بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی تنہائی پسند تھی اور اس وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ چنانچہ کمرے میں رہنے کے اوقات مزید بڑھے ہوئے تو کسی نے بہت زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اُلٹیوں وغیرہ کے سلسلے میں ڈاکٹر ماریہ کے اس بیان کے بعد کہ وہ ڈائریا کا شکار ہوئی ہے، وڈی چودھرائن کا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر ماریہ نے اسے جو دوائیں دی تھیں، وہ اُلٹیوں اور متلی کو روکنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھیں اور

دوبارہ کسی کے سامنے اس کی طبیعت اس طرح نہیں بگڑی تھی کہ اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔ لیکن بہر زندگی کے ایک نہایت نازک تجربے سے گزر رہی تھی جس میں طبیعت کا بالکل معمول پر رہنا ممکن عمومی حالات میں اس مرحلے سے گزرنے والی عورتوں کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ اردگرد والے رکھتے ہیں اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے مشکل کو آسان بنا دیتے ہیں۔ لیکن وہ تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں ابھی تو اسے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ آفتاب کو بھی یہ خوشخبری سنا دیتی۔ رانی کی حویلی سے غیر موجودگی بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح آفتاب سے رابطے کی موبائل فون لاہور والی کوٹھی میں اس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گیا تھا جب آفتاب کے دوست مہتاب اس سے ملنے وہاں آئی تھی اور اسی وقت اچانک ہی اُس کی ماں چودھرائن ناہید بھی وہاں پہنچ گئی نے ماں سے مہتاب کا تعارف اتفاقاً بن جانے والی ایک دوست کے طور پر کروایا تھا جس پر اس ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وقت اس کی نظروں میں کشور کا موبائل بھی آ گیا تھا۔ کسی مشکل میں بچنے کے لیے کشور نے موبائل کو مہتاب کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا۔ یوں وہ خود محروم ہو کر آفتاب سے رابطے کی صورت کھو بیٹھی۔ ان حالات میں اس پر اپنی طبیعت کے سلسلے میں انکشاف بڑا سخت ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر وہ اپنی محبت کی اس نشانی کے پھوٹنے پر خوش تھی تو دوسری خوف بھی لاحق تھا کہ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہو جائے۔

خوف اور خوشی سے بھرے یہ دن وہ بالکل تنہا گزارنے پر مجبور تھی اور یہ تنہائی کبھی کبھی اس کی گھبراہٹ بے پناہ اضافہ کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گھٹن اور گھبراہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ ارادہ دیر پائیں باغ میں جا کر کھلی فضا میں ٹہلے گی تا کہ طبیعت کچھ فریش ہو جائے۔ لیکن اپنے کمرے سے برآمدہ طے کرنے کے بعد جب حویلی کے اس حصے میں پہنچی جہاں سے باہر کی طرف جانے کا راستہ گزرتا وہاں ڈاکٹر ماریہ کو دیکھ کر چونک گئی۔ ڈاکٹر ماریہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ کھڑی تھی اور قریب چودھرائن بھی موجود تھی۔

''ہماری چھوٹی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمہ کا کہنا ہے کہ اسے وڈی اُلٹیاں ہو رہی ہیں۔ اس میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے دیکھ لو۔ آج کل شاید اس مرض کی وبا پھیل گئی ہے۔ پہلے کشور بیمار ہوئی، اب بیگم کا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اگر مصیبت ماری مر مرا گئی تو وڈے چودھری صاحب کو کیا جواب دوں گی کرو، تم اوپر جا کر اسے دیکھ لو اور کوئی دوا شوا دے دو تا کہ یہ سیاپا تو مٹے۔''

وڈی چودھرائن اپنے مخصوص تحکمانہ لہجے میں ڈاکٹر ماریہ سے مخاطب تھی۔ ڈاکٹر ماریہ نے اس کے یقیناً پسند نہیں کیا ہو گا تاہم وہ زبان سے کوئی اظہار کیے بغیر چپ چاپ بالائی منزل کی طرف جانے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ کشور جو ایک آڑ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی، اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ اپنے حالیہ تجربے کے بعد اسے فریدہ کی حالت کے بارے میں سن کر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ فریدہ جو کہ کے زمیندار کی بہن تھی اور جسے چودھری جبراً اپنے ذہنی معذور بیٹے بہزاد شاہ کی منکوحہ بنا کر حویلی لے درحقیقت چودھری کی ہوس مٹانے کا سامان بنی ہوئی ہے..... اس راز سے صرف کشور واقف تھی۔ اسے تھا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے کھوج میں پڑ جانے والی وڈی چودھرائن، فریدہ کی طبیعت کے بارے میں اس لیے نہیں چونکی تھی کہ اس کے نزدیک فریدہ ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بیوی تھی اور بہزاد شاہ اس لائق نہیں کہ بیوی کے حقوق ادا کر سکتا لیکن اصل حالات سے واقف کشور کا ٹھٹک جانا تو لازمی تھا۔



انہیں باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وڈی چودھرائن کے منظر سے ہٹ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ چودھرائن کی چمچیاں نچھی اور شادو بھی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے قریب موجود نہیں تھیں۔ یہ کچھ دیر قبل کا وقت تھا اور اس وقت حویلی کے باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے ملازمائیں وہیں مصروف ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ کے اوپر جانے کے دو چار منٹ بعد وڈی چودھرائن تو کشور کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب سے وہ لاہور سے واپس آئی تھی، اس پر اوپر پابندی عائد تھی۔ پابندی کی تو شاید وہ اتنی پروا نہیں کرتی لیکن درحقیقت وہ اپنے مسئلے میں اس طرح گئی تھی کہ اسے فریدہ کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تو حسب معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اوپر مکین ہی کتنے تھے۔ فریدہ، اور ان کی ایک ملازمہ..... اگر بہزاد شاہ کو دورہ پڑ جاتا یا وہ کسی بچگانہ ضد پر اڑ جاتا تو اس خاموش ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہاں سناٹے ہی بولتے رہتے تھے۔ اوپر پہنچ کر کشور نے بہزاد شاہ کے کمرے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے بیڈ پر اس حال میں بیٹھا ہوا نظر آیا کہ اس کی گردن پر نیپکن اور ملازمہ اس کے سامنے بیٹھی اسے بڑے سے پیالے میں موجود کوئی دلیہ نما شے کھلا رہی تھی۔ کشور سے دبے پاؤں وہاں سے گزر گئی اور فریدہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کشور کے دروازے پر پہنچ کر اس اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی رک کر اندر کی سن گن لی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! تینوں رب دا واسطہ، اس گل کی کسی نوں خبر نہ ہونے دینا۔'' اسے اندر سے فریدہ کی منت آواز سنائی دی اور ذہن میں پلتا شک اور بھی مضبوط ہو گیا۔

''لیکن کیوں؟..... یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ چودھری صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم والی ہو تو سب بہت خوش ہوں گے۔ آخر تم حویلی کی بہو ہو اور حویلی والوں کی نسل بڑھانے کا سبب بنو'' جواب میں ڈاکٹر ماریہ اس سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

''میں حویلی کی بہو تو ہوں لیکن ناپسندیدہ..... یہ لوگ میرے بھاجی سے انتقام لینے کے لیے زبردستی مجھے یہاں لائے تھے اور فیر لا کر اس تنہائی میں ڈال دیا۔ اگر ان کی نظر میں میرا بہو والا مقام ہوتا تو یہ مجھے اس الگ تھلگ کیوں کر ڈالتے؟ بس تسی مہربانی کرو کہ کسی کو ابھی یہ گل نہ پتہ لگنے دو۔ مینوں ڈر ہے کہ اگر کسی ہو گئی تو فیر یہ لوگ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بچے کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔'' فریدہ بڑی سے ڈاکٹر ماریہ سے درخواست کرتے ہوئے اسے اپنا نقطۂ نظر سمجھا رہی تھی جبکہ باہر کھڑی ہوئی کشور کے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے، فی الحال میں خاموش رہوں گی لیکن یہ کوئی چھپنے والی تو بات نہیں۔ آخر کار دوسروں کو اس کا علم جائے گا۔'' ڈاکٹر ماریہ نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ فریدہ کو آنے والے وقت سے بھی خبردار کیا۔

''پتہ لگنے میں بھی وقت لگ گا۔ ویسے بھی اِدھر آتا کون ہے جو کچھ دیکھ سکے۔ مہینہ بھر تو گزر گیا ہے مجھے حال میں۔ دو تین مہینے ہور گزر گئے تو فیر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ابھی بھی نوکرانی نے نیچے خبر پہنچا دی تھی، طبیعت خراب ہونے کی تو وڈی چودھرائن نے آپ کو بلوا ڈالا۔ آئندہ کے لیے میں نوکرانی کو سختی سے منع کر گی۔ آپ بھی مجھے کوئی دوا شوا دے جانا تا کہ طبیعت خراب ہو تو میں کھا کر گزارہ کر لوں۔'' فریدہ نے گویا کچھ سوچ رکھا تھا، سو بڑے اطمینان سے ڈاکٹر ماریہ سے کہہ رہی تھی۔ کشور سے اب مزید برداشت نہ ہو سکا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اچانک اندر داخل ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ماریہ اور فریدہ دونوں

ہی چونک گئیں لیکن پھر اسے سامنے پا کر دونوں کے چہروں پر اطمینان کے رنگ آ گئے۔ کشور اس معا
ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتی، یہ بات دونوں ہی سمجھتی تھیں۔

''آئیے کشور صاحبہ! میں سوچ ہی رہی تھی کہ حویلی آئی ہوں تو آپ کی طبیعت بھی معلوم کرتی ہوئی
گی۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے ایک طرح سے اسے جتایا کہ اگر وہ اس کے
کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہے تو اپنی زبان بند رکھے ورنہ خود اس کا اپنا راز بھی افشا ہو سکتا ہے۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ کی دی ہوئی دوائیں پابندی سے کھا رہی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو آپ
رابطہ کر لوں گی۔'' اس نے ڈاکٹر ماریہ کی بات کا جواب دیا اور فریدہ کے قریب بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہا
لیا۔ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو پہلے ہی بہت مشکل میں تھی اور اب ا
بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فریدہ کو اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کا
اس بچے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہے۔

''وائے ناٹ۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔ آپ دونوں میں سے جس کو بھی، جب بھی
ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھے کال کر سکتی ہیں۔'' اس کی سوچوں سے بے خبر ڈاکٹر ماریہ نے خوشگوار
اس کی بات کا جواب دیا اور خود اپنا میڈیکل باکس سنبھال کر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھینک یو ڈاکٹر!'' کشور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ماریہ مسکراتی ہوئی ان دونوں سے مصافحہ
وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کشور، فریدہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟..... کیوں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو؟''

''کیونکہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ حقیقت جو بھی ہے لیکن کہلائے گا تو یہ بہزاد شاہ کی ہی اولاد نا
اس بچے کے ذریعے حویلی میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ حویلی کے وارثوں میں سے ایک کی ماں
میرا مقام تبدیل ہو جائے گا۔'' فریدہ نے اس پر اپنا نقطۂ نظر ظاہر کیا۔

''لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بچہ بہزاد شاہ کی اولاد ہے۔'' کشور نے اسے احساس دلایا۔

''اس بات کو تمہارا باپ تسلیم کروائے گا، ورنہ میں سب کے سامنے یہ راز کھول دوں گی کہ بچہ بہزاد
نہیں بلکہ چودھری افتخار عالم شاہ کی اولاد ہے۔'' فریدہ کا لہجہ سخت سنگین تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ
کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو، اسے پھر کسی بات
نہیں رہتا۔ فریدہ سے بھی اس کا گھر، محبوب اور عزت سب کچھ چھین لیے تھے چنانچہ وہ ہر خوف سے آزاد
تھی۔ کشور نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بے ساختہ ہی فریدہ کو گلے لگا
ہمدردی سے بولی۔

''اللہ تمہاری مشکلات دور کرے۔ میری تو دلی خواہش تھی کہ تم اس مشکل سے نکل جاؤ اور قربان کے
ایک اچھی زندگی گزارو لیکن خود میں حالات کے گرداب میں اس طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر
پا رہی۔ ان حالات میں، میں تمہارے لیے بس یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ زندگی تم پر مہربان ہو جائے اور تم
باپ کے ظلم سے آزاد ہو جاؤ۔''

''میں اس کے ظلم سے بچ کر نکل سکوں یا نہ نکل سکوں لیکن یہ طے ہے کہ اسے خود ایک دن اپنے
حساب دینا ہو گا۔ اس کے دامن میں اتنی بد دعائیں ہیں کہ اللہ اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔'' فریدہ نے
نفرت سے بھرپور لہجے میں یہ بات کہی، اس نے کشور کا دل لرزا کر رکھ دیا۔ مظلوم کی آہ عرشِ الٰہی کو ہلا



وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن طاقت و دولت کے نشے میں چُور اپنے بدکردار و ظالم باپ کو سمجھانے
کر لی۔

⊛----✪----⊛

گل شیر کے عمران کے ہاتھوں قتل ہونے والے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ ماہ بانو نے اس واقعے کا
ماحول پر کوئی اثر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی کوٹھری میں اس طرح معمول کے مطابق تینوں وقت
کے ساتھ کھانا پہنچایا جاتا جس سے وہ خود کو سمجھا بجھا کر چند لقمے زہر مار کر لیتی کیونکہ پیٹ کی آگ دنیا کی
بڑی حقیقت ہے۔ کم ہی سہی، بد دلی کے باوجود بہر حال وہ کچھ نہ کچھ حلق سے اُتار ہی لیتی تھی کہ جب
سانسوں کی ڈور سے بندھا ہے، اس کی ضروریات بھی پوری کرنی ہی تھیں۔

تین دن کے عرصے میں اسے عمران کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہشمند
گی۔ اس کے بارے میں اپنے غلط اندازے نے خود اس کو بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شکل سے معصوم نظر
عمران اتنا وحشی نکلے گا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عمران کے گل شیر کی کھوپڑی دیوار سے ٹکرا کر
کا منظر اُسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بے شک اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر وہ
پر وہاں نہ پہنچتا تو گل شیر اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ عمران کی مداخلت کی وجہ سے وہ
کسی مرد کی ہوس نا کی کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے عمران نے جو وحشیانہ طرزِ
کیا تھا، وہ اس کے لیے نہایت صدمے کا باعث تھا۔ وہ اب تک اس صدمے سے پوری طرح باہر
گئی تھی اور چاہتی تھی کہ دوبارہ عمران سے سامنا نہ ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

دن بھی گزر جانے کے بعد جبکہ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک آدمی کھانے کے
لے گیا تھا۔ وہ آرام کی غرض سے لیٹی تو بہت دیر یونہی گزر گئی۔ ایک محدود جگہ میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے
والے یہ شب و روز عموماً بے خواب ہی گزرتے تھے۔ نوجوانی کی وہ الہڑ نیند جو بستر پر گر کر آنکھیں
ہی مہربان ہو جایا کرتی تھی، اب اکثر رُوٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے خانماں برباد تھی۔ وقت کی
اسے اِدھر سے اُدھر اُڑائے پھرتی تھیں۔ ان حالات میں ٹھیک سے نیند آ جاتی یہ ممکن ہی کہاں تھا اور
قید میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً گل شیر کی حرکت کے بعد تو اس بے سکونی میں خوف کا
شامل ہو گیا تھا۔ بار بار خیال آیا کہ یہاں صرف ایک گل شیر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں تو بہت سے مرد تھے
آبادی سے دُور اس برف زار میں ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ گل شیر کی طرح ان میں سے
بھی فطرت اُکسا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو وہ مسلسل خطرے میں ہی تھی۔ شاید ذہن میں پلتا یہ
تھا جو آج بھی وہ آنکھیں بند کر کے بہت دیر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہیں سکی۔ لیٹے لیٹے یک دم اسے
ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی ہلکی سی آہٹ اُبھری ہے۔ اس آہٹ کو سن کر وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کا
نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک انسانی سایہ ہی تھا جسے وہ اپنے قریب ہی دیکھ رہی تھی۔ اس سائے کو دیکھ
کے اعصاب بری طرح تن گئے اور وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

ہش..... شور مت مچانا۔ میں عمران ہوں اور تم سے کچھ دیر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کے تیور
مائے نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ماہ بانو نے آواز دھیمی ہونے کے باوجود شناخت کر لیا کہ یہ واقعی
ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟" وہ جواب تک اس کا دوبارہ سامنا بھی نہ ہونے کی خوا
تھی، اسے سامنے پا کر نرم پڑ گئی اور قدرے رُوٹھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" وہ تھوڑے فاصلے سے اس کے قریب ہی بی

"لیکن کیوں؟ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا ہے جو تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے سے دلچسپی ر
اس نے ناراض سے لہجے میں اس سے کہا۔

"تعلق تو واقعی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب
تا کہ تم مجھ سے کم از کم اتنی نفرت نہ کرو جتنی کہ پچھلے واقعات کے بعد کرنے لگی ہو گی۔ میں نے تمہار
میں اپنے لیے اچھے جذبات دیکھے تھے۔ تمہارے انداز سے لگتا تھا کہ تم مجھے اچھا انسان سمجھتی ہو اور
یہ رائے بہت اچھی لگی تھی۔" دھیمی آواز میں نرمی سے بات کرتا ماہ بانو کو وہ وہی عمران لگ رہا تھا جیسا
اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد تصور کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کی بات سنتی رہی۔ عمران کہہ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ سے ایسا جنونی یا غصہ ور نہیں تھا جیسا کہ تم نے یہاں پایا ہے۔ میری شہرت تو بہت
اور نیک نوجوان کی تھی۔ لوگ میری ماں سے کہتے کہ اللہ نے تمہیں ایک بیٹا دیا ہے، پر ہے نیک۔ ا
سنتیں تو خوشی سے مسکرا دیتیں۔ شاید انہیں لگتا ہو کہ میری صورت انہیں اپنی برسوں کی ریاضت کا
ہے۔" وہ جیسے ٹرانس کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس نیم روشن جگہ پر بھی ماہ بانو اس کی کھلی آنکھوں کو کہیں
میں بھٹکتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس سے مخاطب تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ذہن میں کھل
والے کسی دریچے سے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

"ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن فرحانہ۔ میرے والد کم سنی
ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وقت امی نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور ایک
اسکول میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ا
دن رات کی محنت سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا لیکن پرائیویٹ اسکول کی نوکری میں تنخواہ بھی کم ملتی تھی
کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایسے میں امی کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ وہ بی اے پاس تو ہیں ہی، ساتھ
بھی کر لیں تو گورنمنٹ ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ امی کو اپنی سہیلی کا یہ مشورہ اچھا لگا اور انہوں نے
تیاری بھی شروع کر دی۔ ان دنوں انہیں بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں
وقت سویا کرتی تھیں۔ رات کو ہم بہن بھائی جب سونے کے لیے لیٹتے تو انہیں اپنی کتابوں کے ساتھ
جاگتے ہوئے چھوڑ کر سوتے اور صبح اُٹھتے تو بھی امی جاگ رہی ہوتیں۔ ہمارے اُٹھنے سے پہلے ہی
صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے علاوہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دن بھر کا کھانا بھی تیار کر چکی ہوتیں۔
ان مصروفیت بھرے دنوں میں بھی میں نے کبھی کسی کام میں بے ترتیبی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وہ ہم
سے کبھی جھنجلا کر یا سخت لہجے میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔"

اپنی ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمران کے لہجے میں گہری عقیدت اور مٹھاس بھری ہوئی تھی۔
حیرت ہونے لگی کہ یہ دل میں اتنی گہری محبت رکھنے والا لڑکا آخر نفرت کی راہ پر کیسے چل پڑا؟ اُس کی اس
سے بے خبر وہ اپنی ہی سنانے میں مصروف تھا۔

"امی کا بی ایڈ مکمل ہوا اور انہیں اپنے کسی جاننے والے کی وساطت سے گورنمنٹ اسکول میں ملاز
ہماری زندگی میں سکون آ گیا اور دن رات ذرا ترتیب اور آرام سے گزرنے لگے۔ میں چونکہ بڑا تھا



شانہ روز محنت اور کوششوں کا زیادہ احساس تھا۔ اس احساس کی وجہ سے ہی میں خوب دل لگا کر پڑھتا
گر سکوں۔ امی واقعی مجھ سے خوش بھی تھیں لیکن میری چھوٹی بہن فرحانہ جسے ہم پیار سے فری کہتے
جدوجہد کے ان دنوں میں شاید کسی نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پڑنے والی
کرہ کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ کبھی کبھی ہم اُس کی زبان سے ایسے الفاظ سنتے کہ انسان کے پاس
ساری دولت ہونی چاہئے۔ ترس ترس کر اور خواہشات کو مار کر جینا بھی کوئی جینا ہے..... تو زیادہ توجہ
ہمارے نزدیک تو یہ وہ باتیں تھیں جو آج کل کے کم از کم ستر اسی فیصد نوجوان کرتے ہی تھے۔
کالج میں ایڈمیشن ہونے کے بعد فرحانہ کے لائف اسٹائل میں تبدیلی آئی تو میں نے یا امی نے زیادہ
کیا۔ میں تو یوں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ امی نے بھی اس لیے زیادہ نوٹس نہیں لیا
کی بچیاں پہننے اوڑھنے اور فیشن کرنے کی شوقین ہیں، فرحانہ کا بھی اپنی کالج فیلوز کو دیکھ کر ذرا بن ٹھن
کا دل چاہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

بات فیشن کرنے سے کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ فرحانہ نے ہفتے میں ایک دو دن کالج سے لیٹ گھر
کر دیا۔ اس دیر کے لیے اس کے پاس یہ جواز تھا کہ اسے پریکٹیکل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ وہ
پری میڈیکل کی طالبہ تھی اس لیے اُس کا یہ بہانہ بھی قبول کر لیا گیا۔ اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
بہن بھائی پر بے پناہ اعتماد کرتی تھیں۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میری حد تک یہ بھروسہ
فرحانہ بھی بہرحال کردار کے اعتبار سے کوئی خراب لڑکی نہیں تھی بلکہ فطرتاً وہ بہت معصوم اور بھولی
کی وجہ سے اسے زمانے کی چالاکیوں اور چالبازیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی اسی معصومیت اور کچھ
خواہش میں وہ ایک صنعت کار کے اوباش بیٹے کے جال میں پھنس گئی۔ اس لڑکے نے اسے نہ جانے
سے سنہری خواب دکھائے کہ وہ اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور گھر والوں سے چھپ کر کالج
اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ میں اور امی ان حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ ہم پر تو اس وقت پہاڑ ٹوٹا
روز فرحانہ کالج سے شام ڈھلنے کے بعد گھر آئی۔ امی کو اس نے کالج جاتے ہوئے یہ تو بتا دیا تھا کہ آج
پریکٹیکل کا دن ہے اس لیے واپسی میں دیر ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ دیر ہو جانے پر امی پریشان ہو
انہوں نے فرحانہ کی دوستوں وغیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہر
نے یہی جواب دیا کہ آج کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اور فرحانہ معمول کے مطابق کالج سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ
کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فرحانہ کو کہاں تلاش کریں۔ میں بھی اس روز ایک
کمپی ٹیشن میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا، شام گئے گھر واپس پہنچا تو امی کو بے چینی سے ٹہلتا ہوا
سے سبب پوچھنے پر فرحانہ کے غیاب کا علم ہوا تو میں بھی گھبرا گیا۔

اور امی کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فرحانہ گھر واپس آ گئی۔ اس کی
خراب تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر امی کی
گئیں۔ فرحانہ نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ کالج سے واپس آتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکر مار دی
کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا۔ گاڑی والا تو ٹکر مارنے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ایک ہمدرد راہ گیر نے
پہنچا دیا جہاں اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا اور ہوش آتے ہی وہ رکشے میں بیٹھ کر گھر آ گئی۔ اس کی
سن کر امی نے اس سے سوال جواب کرنے چاہے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی وہ فری کو آرام
صبح جب وہ اُٹھے گی تو آپ اس سے تفصیلات پوچھ لیجئے گا۔ امی نے میری بات مان لی لیکن

افسوس کہ دوسری صبح فرحانہ اُٹھی ہی نہیں اور ہمیشہ کی نیند سوگئی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر ا
دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ہمیں تو صبح بس اُس کی لاش ہی ملی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس
نے مجھے اور امی کو مخاطب کر کے ہم سے معذرت طلب کی تھی۔''

''بہت دیر سے مسلسل بولتا عمران داستان کے اس مرحلے پر آ کر یک دم چپ ہو گیا۔ ماہ بانو
لیا تھا کہ اُس کی آواز بھرّا گئی تھی اور شاید وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی خاموشی اختیار کر گیا تھا
ڈوبے اس نوجوان کے لیے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے دھیرے سے ا
تھپتھپایا۔ یہ ایک خاموش دلاسہ تھا جس نے عمران کو سنبھلنے میں مدد دی اور اس نے ایک بار پھر اپنا
سلسلہ جوڑ دیا۔

''فرحانہ نے اپنے اس خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ کس صنعت کار کے بیٹے کی محبت کے
پھنس گئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے باہر جاتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات میں وہ لڑکا اُسے کلفٹن پر
اپارٹمنٹ لے گیا کہ چلو تمہیں وہ گھر دکھاتا ہوں جہاں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ خوابوں کی دنیا
والی فرحانہ خوشی خوشی اپنا مستقبل کا گھر دیکھنے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ
میں پھنس گئی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اس امیر زادے کے چار دوست اور بھی تھے۔ ان سب دوستوں
میری معصوم بہن کی آبروریزی کی۔'' یہ سب بتاتے ہوئے عمران کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

''انہوں نے اس موقع پر اس کی تصویریں بھی کھینچ لیں اور اپنی درندگی کے نتیجے میں اُس کے
والی چوٹوں پر معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد یہ دھمکی دے کر وہاں سے روانہ کر دیا کہ اگر تم نے کسی
بارے میں بتایا تو یہ تصویریں تمہارے گھر پہنچانے کے علاوہ کالج میں بھی پھیلا دی جائیں گی۔ فرحانہ
اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی یا اس وقت اتنے شدید صدمے میں تھی کہ اس نے اس دھمکی کے باوجود میرے
کے نام لکھے جانے والے اپنے آخری خط میں اس لڑکے کی نشان دہی کر دی۔ امی تو فرحانہ کی موت
کی وجہ جان کر صدمے سے اس بری طرح چُور ہوئیں کہ اُنہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ ہسپتال پہنچ گئیں
کے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد کون تھا جو مجھے روکتا یا کچھ سمجھاتا بجھاتا۔ میں نے تھانے میں اس
رپورٹ لکھوا دی اور فرحانہ کا خط تھانے دار کو دکھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میری بہن کے ساتھ ظلم کرنے
شخص کو گرفتار کیا جائے۔ تھانے دار بے وقوف نہیں تھا کہ میری بات پر کان دھرتا۔ اُس نے لڑکے کے
باپ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ جناب کے بیٹے کے خلاف یہ رپورٹ درج ہوئی ہے۔ اب آپ فرمائیے
کہتے ہیں؟ صنعت کار کو کیا کہنا تھا، اُس نے تھانے دار کا کھلا ہوا منہ نوٹوں سے بھر کر بند کر دیا..... اور
فرحانہ کے قتل کا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ میں بے بس سا کبھی انصاف کے لیے تھانے
لگاتا اور کبھی ہسپتال میں داخل امی کو دیکھنے جاتا۔

اُس روز میں امی کے پاس ہسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں رہی ہیں۔ ڈاکٹرز خود حیران
ریکور کرتے کرتے اچانک اُنہیں کیا ہو گیا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی
سے ملنے آیا تھا اور ان کے لیے ایک لفافہ لایا تھا۔ امی نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو اس کے
حالت بگڑ گئی اور پھر دوبارہ نہ سنبھل سکیں۔ میں نے امی کے سامان کی تلاشی لی تو ان کے پرس میں
مل گیا۔ لفافے میں تصویروں کے کچھ ٹکڑے تھے جو یقیناً امی نے ہی کیے تھے۔ میں نے ان ٹکڑوں
دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ امی کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ وہ فرحانہ کی وہی تصویریں تھیں جو اُن اوباش



کے لیے کھینچی تھیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس دھمکی پر عمل کرنے سے باز نہیں آئے۔
موت نے بالکل پاگل کر کے رکھ دیا اور میں ہر مصلحت کو بھول کر اس امیر زادے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا
ارادہ کر کے نکلا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔ لیکن اپنی اس دیوانگی میں، میں
پہنچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی ہتھیار وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔
جذبات سے بھرا میں نہتا ہی ہسپتال سے سیدھا اُس امیر زادے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر
تھے۔ مجھے اندر کون جانے دیتا؟ میرے چیخنے چلّانے اور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرنے پر
مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا کہ اس شخص نے قاتلانہ حملے کی
ہے۔ پولیس نے اور مارا اور پھر میں تین مہینے تک سلاخوں کے پیچھے قید اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ میرا
ختم ہو گیا تھا۔ نہ بہن رہی تھی نہ ماں۔ ماں کو تو میں..... اُس کے جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک
پہنچا سکا تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ جو کہ میرے روشن مستقبل کا راستہ تھا، وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہونے
منقطع ہو گیا۔ خیر، ان دنوں میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اگر آزاد بھی ہوتا تو کچھ پڑھ لکھ نہیں
میرے روز و شب عجب وحشت کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی میں دن بھر بھوکا رہتا تو کبھی رات
روتا رہتا۔

میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن ایک ساتھی قیدی میرے پاس آیا اور کچھ ایسی ہمدردی سے مجھ سے میرے
پوچھے کہ میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپا سکا۔ اس شخص نے میرے حالات سنے تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح
کی طرح روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بہتر ہے کہ خود میں حوصلہ پیدا کرو اور اپنے ساتھ ہونے
کا بدلہ لو۔ وہ شخص اس دن کے بعد ہر روز مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتا۔ آخر کار میں اس کی باتوں سے
ہونے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو اسی طرح کے مظالم کے خلاف
ہے اور ظالموں کو ان کے صحیح انجام تک پہنچاتی ہے۔ اس شخص کی باتیں سن کر میں تنظیم کی کارکردگی سے
متاثر ہوا۔

میرے نزدیک واقعی وہ لوگ لائقِ تحسین تھے جو اپنی ذات کو فراموش کر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے
خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس بے پناہ متاثر ہونے کا ہی اثر تھا کہ جب چھ ماہ بعد مجھے اپنے کچھ
کی کوششوں کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی تو میں سیدھا اس تنظیم کے افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان
نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے قابل بنا دیں گے لیکن اس کے
کچھ صبر سے کام لینا ہو گا اور تربیت حاصل کرنی ہو گی۔ ابتدائی دو تین ماہ انہوں نے مجھے شہر میں ہی رکھ
دی اور یہ جانچ لینے کے بعد کہ میں اپنے ارادے میں مضبوط ہوں، یہاں منتقل کر دیا۔ یہیں مجھے
ای گئی کہ تنظیم کے ساتھیوں نے میری بہن کے قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔ اُس روز تم نے جو ویڈیو
، وہ اسی شخص کی تھی۔ تم چاہے اسے ظلم کہو لیکن مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑا سکون ملا تھا۔ میری معصوم بہن کی
برباد کر دینے والا اور ہمارے ہنستے بستے گھر کو ختم کر دینے والا ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔''

آخری جملے بولتے ہوئے عمران کے لہجے میں نفرت کا وہی زہر بھر گیا تھا جس نے اس جیسے سلجھی ہوئی
کے نوجوان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی اور وہ ان لوگوں کے درمیان آ پھنسا تھا جو کسی طور بھی مثبت
کے حامل نظر نہیں آتے تھے۔ عمران کے ماضی کے تناظر میں ماہ بانو کو تین دن قبل پیش آنے والا واقعہ بھی
یاد تھا۔ گل شیر کو اس کی عزت کے درپے دیکھ کر یقیناً عمران کو یونہی لگا ہو گا کہ اس کی اپنی بہن کی عزت

خطرے میں ہے۔ اپنی بہن کو تو وہ بچا نہیں سکا تھا اور اس کے قاتل کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کیا چنانچہ اس نے گل شیر کو وہی امیر زادہ تصور کرتے ہوئے اپنی ساری نفرت اور غصہ اس پر نکال ڈالا۔

''مجھے تمہارے حالات جان کر دلی رنج ہوا ہے لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ صحیح ہیں جنہوں نے تمہیں برائیوں کے خلاف جہاد کے نام پر اپنے ساتھ شامل ہے۔ یہ وحشت زدہ نیم دیوانے لوگ جن کی آنکھوں سے انسانیت کی رمق بھی مٹنے لگی ہے، مجاہد کہلانے دار ہو ہی نہیں سکتے۔ مجاہد کا تو بڑا مقام اور رُتبہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت نہیں بلکہ نور یہاں تمہیں کسی ایک شخص کے چہرے پر ذرا سا بھی نور دکھائی دیا؟'' عمران کی ساری داستان سننے کے نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اس سے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی ان لوگوں میں مجاہدین والی کوئی بھی خُو بُو نہیں ہے۔'' خلافِ توقع عمران اس سے اختلاف کرنے کے بجائے فوراً ہی اتفاق کر لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

''اصل میں، میں جن حالات میں ان لوگوں سے ملا، وہ ایسے تھے کہ کوئی بھی مجھے راہ سے بھٹکا انتقام کے جنون میں میری اچھے برے اور صحیح غلط میں فرق کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر ان لوگوں خود کو کچھ اس طرح سے میرے سامنے پیش کیا کہ میں ان کے بارے میں ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں لگا دن پہلے تک بھی میں ان لوگوں کو بالکل صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ وہ خدائی فوجدار تھے جو معاشرے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بے لوث ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں انہیں مظلوموں کا ہمدرد اور ظالم دشمن سمجھتا تھا لیکن پھر اتفاق سے میں نے کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔'' عمران کے ان الفاظ نے ماہ بانو کا تجسس بھڑکا دیا۔ وہ سننے کے لیے ہو گئی کہ آخر وہ کون سے حقائق تھے جنہیں جاننے کے بعد عمران ان لوگوں سے بددل ہو گیا تھا۔

''گل شیر کی ہلاکت کے اگلے دن جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور مجھے احساس ہوا کہ ہاتھوں اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے..... جس کا ہو سکتا ہے، چند لوگوں کو افسوس بھی کمانڈر کاری ایکشن جاننے کے لیے اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت اور اس کے نائب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن کر رک گیا کہ اچھا ہے بغیر سامنے جائے ہی ان کی رائے جان لوں۔ میں نے سنا، کمانڈر کا نائب اس سے کہہ کہ سر! عمران کا کیا کریں؟ یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی نوجوان ہے۔ کل رات اس کی وجہ گل شیر جیسا قیمتی آدمی ضائع ہو گیا۔ لاکھوں کی رقم خرچ کی تھی ہم نے گل شیر کی تربیت پر..... اور وہ اپنے کام کا ماہر۔ ہمارے تربیت دیئے ہوئے آدمیوں میں خودکش جیکٹ کی تیاری میں اس جیسی مہارت کے پاس نہیں۔ وہ دھماکا خیز مواد کے بارے میں بے حد معلومات رکھتا تھا اور اسے اس طرح کی چیزوں کرنا بھی خوب آتا تھا۔ عمران نے اسے قتل کر کے ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے..... جواب میں کمانڈر بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی گل شیر جیسے آدمی کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے لیکن معاملے میں عمران کو کوئی تنبیہہ بھی نہیں کر سکتے۔ گل شیر نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اگر خود میں بھی حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ وہ لڑکی ہمارے پاس یہاں بگ باس کی امانت اور باس نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے..... لیکن میری تنبیہہ کے باوجود گل نیت خراب ہو گئی۔ وہ تو ایک طرح سے اچھا ہوا کہ عمران موقع پر وہاں پہنچ گیا ورنہ اگر لڑکی کو کچھ



بگ باس کو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کمانڈر کی اس بات کو سن کر نائب بولا کہ وہ تو آپ ٹھیک کہہ سر لیکن عمران جیسے جونیئر بندے کے ہاتھوں گل شیر جیسے سینئر کا نقصان بھی قابلِ برداشت نہیں ہے۔ ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں عمران کو کوئی سزا ضرور دینی چاہئے تاکہ وہ آئندہ سرکشی سے گریز کرے۔

کمانڈر اپنے نائب کی یہ بات سن کر مسکرایا اور بولا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں اس معاملے پر پہلے ہی غور و فکر کر حقیقت یہ ہے کہ عمران بہت دُور تک ہمارے ساتھ چلنے والا لڑکا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جذبات میں آ راہ پر چل پڑا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت اسے اس راہ پر چلنے نہیں دے گی۔ معلوم نہیں میں موجود کیمپ کے انچارج سے اس لڑکے کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی اور اُس نے اسے یہاں تک اب مجھے اس غلطی کو سدھارنا ہو گا اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد عمران کو استعمال کر کے اس جان چھڑا لیں۔

کمانڈر یہ سب کہہ رہا تھا اور میں باہر کھڑا حیران تھا کہ یہ کون دھوکے باز لوگ ہیں اور کس مقصد کے نے یہ سارا سیٹ اپ قائم کر رکھا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب کمانڈر کی آگے کی گفتگو نے دے رہا تھا۔ ہمارے پاس وفاقی وزیر شوکت مرزا کے قتل کا ٹاسک موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اوپر اشارہ مل چکا ہے اور یہاں ہم شوکت مرزا کے ایک مخالف کو بھی گھیر چکے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے معاوضہ دے دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے عمران کو خودکش بمبار کے طور پر استعمال کیا شوکت مرزا کے بارے میں، میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق دیگر برائیوں کے ساتھ وہ کئی عورتوں کی آبروریزی میں بھی ملوث ہے۔ اُس کے اس طرح کے چکروں کی افواہیں تو گردش رہی ہیں مگر کبھی وہ پکڑا نہیں گیا ہے۔ لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ایسا آدمی کتنا ہی ہاتھ پیر بچا کر کام کیوں نہ کہیں اس کے جرم کا ثبوت موجود ہوتا ہے۔ اور یہ ثبوت عموماً صحافی برادری کے کسی بندے کے ہوتا ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس صحافی کو تلاش کیا جس کے پاس شوکت مرزا کے خلاف مواد موجود تھا اس بلیک میلنگ اسٹف کے ذریعے اس سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ رہا تھا۔ ہم نے صحافی سے وہ اسٹف لے لیا۔ اب میں وہ ساری چیزیں عمران کو دکھاؤں گا اور اسے شوکت مرزا پر خودکش حملہ کرنے کے لیے لوں گا۔ اُس کے کل رات والے ردِعمل کو دیکھتے ہوئے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اس کام کے لیے فوراً راضی ہو اپنی بہن کی آبروریزی کے بعد وہ ہر اس طرح کے شخص کو واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے مرزا پر خودکش حملہ کرنے میں کوئی تعرض نہیں ہو گا۔ اس طرح ہمارا ایک کام بھی ہو جائے گا اور ہم عمران حاصل کرنے سے پہلے اس پر اب تک لگنے والی رقم بھی سُود سمیت وصول کر لیں گے۔

کمانڈر کے ان الفاظ نے جہاں مجھے لرزا کر رکھ دیا، وہیں اس کا نائب بے پناہ خوش ہوا اور بولا..... یُو آر سر! آپ نے مسئلے کا ایک ایسا حل ڈھونڈا ہے جسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔

میں ان دونوں کی اس گفتگو کو سن کر اتنا مشتعل تھا کہ دل چاہتا تھا، ابھی اندر جاؤں اور انہیں جان سے مار لیکن پھر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور دبے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہو کہ میری جذباتیت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا چکی ہے اس لیے اب مجھے جوش کے بجائے ہوش لینا ہو گا۔ میں نے وہ سارا دن معمول کے مطابق گزارا۔ پھر رات میں میرے پاس کمانڈر کا بلاوا آ گیا۔ نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس منافق آدمی کی شکل بھی دیکھوں لیکن مصلحتاً برداشت سے کام لیتا ہوا اس کی میں حاضر ہو گیا۔ کمانڈر نے بڑی سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا

کہ.....کل جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بہت افسوس ہے عمران!

میں نے کہا۔ بھائی صاحب! افسوس مجھے بھی ہے۔ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا غصے کی وجہ سے گل شیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقیناً آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس لیکن کمانڈر کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے گل شیر کے قتل پر نہیں، اس کی حرکت ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم مجاہدین کے درمیان اس جیسا شیطانی فطرت رکھنے والا آدمی بھی مو نے اس شیطان کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت میں نے تمہیں تمہارے اس کا شاباش دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔

اگر میں نے کمانڈر کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ میں نے دل میں اس منافق پر لعنت بھیجی اور مصلحتاً اُس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کمانڈر میری شکرگزاری کے اظہار پر خوش ہوا اور پھر اس نے تھیلے سے بلی نکالتے ہوئے وفاقی وزیر شوکت مرزا دیا۔ وہ بڑھا چڑھا کر مجھے وزیر کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں بتاتا رہا اور بولا کہ اس جیسا کر اس لائق نہیں کہ اسے مزید اس دنیا میں رہنے دیا جائے۔ میں نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق کیا اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ کمانڈر نے میرے اس جذ بہت شاباش دی اور بتایا کہ شوکت مرزا نہایت سخت سکیورٹی میں رہتا ہے۔ اسے دُور سے گولی مارنا یا گھیر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے ہمیں خودکش حملے کی تکنیک ہی استعمال کرنی پڑ اس کام کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ بارود سے بھری ہوئی گاڑی لے کر اچانک ہی شوکت مرزا کی گاڑی دو۔ گاڑی ہم تمہیں فراہم کر دیں گے اور شوکت مرزا کے شیڈول کے متعلق معلومات حاصل کر کے جگہ اور وقت کا تعین کرنا بھی ہماری ذمے داری ہوگی۔ بس تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہو کہ تمہیں اپنی جان کی قیمت پر کرنا ہے۔ باقی اس سلسلے میں تمہاری جو ٹریننگ وغیرہ ہوگی، اس کا انتظام بھی ہو جائے

میں نے کہا..... بھائی صاحب! جان کی کوئی پروا نہیں۔ اگر ایک شیطان کو دنیا سے مٹانے میں میرا چلی جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جامِ شہادت نوش کر کے ہمیشہ کی زندگی پالی۔

کمانڈر میرے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا کر میرے جذبے کی بہت تعریف کی اندر ہی اندر اُس کی مکاری پر کڑھتا رہا لیکن زبان اور چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔ کمانڈر کی اصلیت کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا کہ میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں مبتلا دو دن گزر گئے۔ آج شام کمانڈر نے مجھے پھر اپنے اور بتایا کہ کل کسی وقت مجھے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ روانگی کے بارے میں سن کر مجھے تمہارا خیال اور دل میں تجسس جاگا کہ تم سے معلوم تو کروں کہ آخر تم کون ہو؟ اور کیسے ان لوگوں کے جال میں پھنس ممکن ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکالنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی ا میں موقع ملتے ہی تم سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں ان بھیڑیوں کے درمیان تنہا چھوڑ کر نہیں جانا تمہاری صورت میں مجھے اپنی فری کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ فری کو تو میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بچا لیکن تمہارے لیے جو بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔"

عمران کے لہجے میں جو سچائی اور خلوص تھا، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا اور فرطِ جذبات سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ظالموں کی وجہ سے وہ اگر حالات کے گرداب میں پھنس گئی تھی تو یہ حقیقت بھی ا



قدرت ہر جگہ بہانے بہانے سے اُس کی مدد کے لیے کارفرما ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ نے ت میں اس کے لیے ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ وہ اس مددگار کے ظہور پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا عمران کو دھیمی آواز میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی سناتی چلی گئی۔ اس کی زندگی کی داستان ایسی نہیں ان جیسے دردِ دل رکھنے والے انسان کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ خاموشی سے مگر دلی افسوس کے ساتھ اس کی سنتا چلا گیا۔

تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ کل یہاں سے روانہ ہوں تو تم ہر صورت میرے ساتھ "رات اپنا بالکل آخری پہر طے کر رہی تھی، جب عمران نے اس کے پاس سے رخصت ہوتے ہوئے اور اس کے دل میں امید کی شمعیں روشن کر کے خود جس طرح تاریکی میں خاموشی سے یہاں تک آیا خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان ہنوز اسکردو میں ہی مقیم تھا۔ پولیس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ فی الحال سلامت پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرف سے اُسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کیونکہ شہریار نے اُس کی شکار کرتے ہوئے اسے وہیں رُکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی کر سکتا تھا اور ان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے غواکاروں کا کھوج بھی لگانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ہسپتال میں داخل اس کی حالت ہنوز پہلے جیسی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے اتنی بری طرح متاثر کیا تھا کہ وہ آنکھیں کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ مشابرم خان روز ہسپتال جاتا اور خاموشی سے ماں رہانے بیٹھا رہتا۔

ہسپتال سے نکلتا تو ان لوگوں کی تلاش شروع کر دیتا جو نیاز علی کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے نیاز علی نے مرنے سے قبل اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ کسی شخص کے کہنے پر پہاڑوں میں کہیں خفیہ طور پر لوگوں کے لیے خوراک اور ادویات کا ذخیرہ سپلائی کرتا ہے لیکن اس نے اس آدمی کی نشان دہی نہیں کی وہ ایسے کسی پوائنٹ کا نام بھی نہیں بتا سکا تھا جہاں سے اس سے سپلائی لی جاتی ہو۔ اس کے مطابق مال کرنے والے ہمیشہ مختلف مقام پر اس سے وصولی کرتے تھے۔ یعنی نیاز علی کو استعمال کرنے کے باوجود وہ اس پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں مشابرم خان کے پاس یہی راستہ رہ جاتا تھا اس شخص کو تلاش کرے جو یہاں اسکردو میں نیاز علی کو آگے لے جانے کے لیے سامان فراہم کرتا تھا۔ اس کی تلاش کے لیے اس نے نیاز علی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر اس کے بہت زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے اور کچھ عرصہ سے تو اس نے دوستوں وغیرہ سے ملنا ترک ہی کر دیا تھا۔ بس لے دے کر ٹورسٹ کمپنی میں اُس کے ساتھ ملازمت کرنے والے چند ساتھی ہی ن سے اُس کا تھوڑا میل ملاپ تھا۔ مشابرم خان نے ان ملازمین اور کمپنی کے مالک پر نظر رکھنی شروع کر ن تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اس کام میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بیک وقت ان تمام افراد کی نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ کمپنی سے وابستہ ڈرائیورز تو عموماً سفر میں ہی رہتے تھے۔ وہ ں سے کس کس کا پیچھا کرتا اور کس طرح؟ اُس کے پاس یہاں اپنی کوئی ذاتی سواری بھی نہیں تھی۔ کرائے پ البتہ مل سکتی تھی لیکن ابھی تک اُس نے اس سہولت کو حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ فی

الحال وہ یہیں رہ کر جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی ایسی مشکوک جیپ نظر آجائے جسے پہاڑوں پر جانے والی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو اور اس کے باوجود اس میں سامان لوڈ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر دفتر کے آس پاس چکراتا رہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیاز علی کی موت کے بعد اس کام کے لیے کسی ہائر کیا جائے گا۔ وہ کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیاز علی کی جگہ لینے والے ڈرائیور کا کھوج لگا لے۔ علم ہو جاتا تو پھر اس شخص تک پہنچنے کی راہ بھی نکل آتی جو یہ کام کروا رہا تھا۔ اپنی اس کھوج کے چکر صبح ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے جا پہنچتا۔ عموماً جیپیں اسی وقت روانہ ہوتی تھیں اور نظر رکھنے کی ایسی جیپ پکڑ میں آسکتی تھی جو مشکوک ہو۔ ابھی تک اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ثابت قدمی سے اپنے معمول پر ڈٹا ہوا تھا۔

نگرانی کا کام انجام دینے کے لیے اس نے دفتر کے عین سامنے موجود ایک چھوٹے سے ہوٹل بنا لیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کیا تھا، بس ایک طرح سے چائے خانہ ہی تھا جہاں چائے کے ساتھ ناشتے بھی مل جاتے تھے۔ مشابرم خان ہر روز صبح وہاں پہنچ کر ناشتہ کرتا۔ اس دوران اس کی نظریں ٹورسٹ دفتر پر ہی لگی رہتیں۔ ابھی تک اس نے وہاں سے جتنی جیپیں روانہ ہوتی دیکھی تھیں، ان میں سے کوئی نہیں لگی تھی۔ وہ موقع پا کر جیپ کے ڈرائیور سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ اس گفتگو سے اُسے علم کون سی جیپ کہاں اور کس مقصد کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے اب تک کوئی ایسی جیپ ہوئی تھی جسے کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو۔ مسلسل ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کا لائحہ عمل غلط ہے۔ اسے نیاز علی کی ٹورسٹ کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنیوں پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ اب اس شک کی بنیاد پر صرف اسی کمپنی کی جیپوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ہو نہ ہو، کمپنی کا مالک بھی اس کام میں گا۔ نیاز علی نے اگرچہ ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن مشابرم خان کو شبہ تھا کہ اتنا بڑا کام مالک کی کے بغیر کرنا صرف ڈرائیور کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اب وہ خود اپنے اس نظریے کی طرف سے مشکوک لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لائن آف ایکشن غلط ہے اور اب اسے اپنی نگرانی کا دائرہ وسیع کر ٹورسٹ کمپنیوں اور ان کے ڈرائیورز کو بھی چیک کرنا چاہئے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے تنہا اس کی ناکافی ہوتی اور اسے مقامی حکام سے مدد لینی پڑتی۔ شہریار کی وجہ سے اُسے یہ مدد بھی مل جاتی لیکن اس میں شاید وہ خود لاعلم رہ جاتا۔ سرکاری لوگ اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے بجائے جو بھی کرنا ہوتا، کرتے جبکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود یہ مہم سر کرے۔

اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا نے اس معاملے کو اس کی ذاتی لڑائی بنا دیا تھا۔ نہ وہ اپنے قاتلوں کو معاف کر سکتا تھا، نہ ہی اپنے گھر پناہ گزین ماہ بانو کے اغوا کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ معلوم تھا کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھی اور کن حالات سے گزر رہی تھی۔ ان ساری سوچوں اور فکروں کے گرداب پھنسا آج پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سبز چائے کے گھونٹ بھر اچانک ہی اُس کی جیب میں موجود سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے فون نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک یہ اس ہسپتال کا نمبر تھا جہاں اس کی ماں داخل تھی۔ ہسپتال کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ اس نے انتظامیہ کو خود اپنا نمبر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے کال کر لی جائے۔ وہاں سے فون آنے کا تھا کہ خیریت نہیں تھی۔

''ہیلو!'' اس نے تشویش کے عالم میں کال ریسیو کی۔



ماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے، فوراً ہسپتال پہنچو۔'' کسی نے بہت تیزی سے یہ پیغام کر دیا۔ مشابرم خان اپنے بدترین اندیشے کے درست ثابت ہونے پر گھبرایا ہوا پھرتی سے اُٹھ کر روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اس کے مسلسل بے ہوشی میں ہونے کے باوجود بیٹھا تھا کہ ایک دن ماں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جو اس کی طبیعت بگڑنے کا فون آیا تو زیر و زبر ہونے لگی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کام لے کر فوراً ہی ہسپتال پہنچا لیکن جب ماں کو والی ہی کیفیت میں تھی۔

یہاں سے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا سچ مچ اس کی ہو گئی ہے؟'' یہ گمان کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، ماں کی حالت خراب ہوئی ہو اور ڈاکٹرز نے قابو پا لیا ہو، نرس سے پوچھا۔

ان کی طبیعت تو پہلے ہی جیسی ہے۔ یہاں سے تو کسی نے آپ کو فون نہیں کیا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہے۔'' نرس کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہایت خوب بے وقوف بنایا گیا ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی ایک ایسا بہانہ تھا جس کی مدد سے اسے اس جگہ سے تھا اور یقیناً اسے وہاں سے ہٹانے کے بعد مجرم اپنا کام کر گئے تھے۔ اس صورت حال نے جہاں اس کیا کہ نیاز علی جس ٹورسٹ کمپنی سے وابستہ تھا، وہ اس غیر قانونی کام میں ملوث ہے، وہیں یہ بھی کہ وہ لوگ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں موقع پر اسے وہاں سے ہٹانے کا انتظام کر دیا۔

⊛----✪----⊛

کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف طبیعت کی خرابی نے نڈھال کر رکھا تھا تو دوسری طرف راز کا خوف ہر آن گھیرے رکھتا۔ فریدہ کے بارے میں ہونے والے انکشاف نے اسے اور بھی پریشان اس کی کوکھ میں چودھری کے گناہ کا بیج پھوٹ پڑا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے ہر آن یوں حویلی پر کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مظالم اور گناہوں کے نتیجے میں عذاب بھی چاہئے تھا۔ وہ تو حیران تھی کہ اللہ نے کیوں اب تک اپنی رسی دراز کر رکھی ہے؟ شاید اس میں بھی مصلحت تھی۔ لیکن بہر حال وہ اس جگہ پر مزید ٹھہر کر کسی عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے آفتاب کی محبت کی نشانی پل رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اتنا ضرور جیے کہ اپنی محبت کا یہ تحفہ آفتاب کر سکے۔ یہ تحفہ اسی صورت میں آفتاب کو دیا جا سکتا تھا اور وہ حویلی سے نکل جاتی۔ لیکن اس کے لیے حویلی کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ رانی کی حویلی میں عدم موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے تھے۔ واپسی کے سلسلے میں اس نے ایک دو بار وڈی چودھرائن سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ رانی کا کی کوٹھی میں رُکنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہاں حاجرہ اکیلی صحیح طرح سے انتظامات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ کشور کہنا چاہتی تھی کہ رانی کو واپس بلا کر کسی اور ملازمہ کو وہاں بھیج دیا جائے۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ چودھرائن سے بحث فضول ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کشور سے رابطے کی ایک صورت نظر آئی۔ آفتاب اس کی بڑی بہن تاجور کے بیٹے منور کو پڑھانے کے لیے اس کی دونوں بڑی سوتیلی بہنیں تاجور اور صنوبر اپنے ماموں کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ بہنوں اور ان

کے بچوں سے ملنے کے بہانے وہاں جا سکتی تھی۔ اس اُمید پر کہ وہاں جانے پر آفتاب سے را
صورت نکل آئے، اس نے وڈی چودھرائن سے بہنوں کے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو
کرتی رہی، پھر اس کے اصرار پر اس شرط پر راضی ہوگئی کہ دو دن بعد چلیں گے۔ ان دو دنوں میں
میں استعمال ہونے والے اناج کے اسٹورز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانی تھی۔ بے شمار مستعد ملا
موجودگی کے باوجود وڈی چودھرائن ایسے ہر کام کی خود نگرانی کرنا پسند کرتی تھی۔ اسے شک رہتا تھا
ملازماؤں کے سر پر مسلط نہیں رہی تو وہ ہڈ حرامی کریں گی یا موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ چرا کر لے جائیں گی
کر کے انتظار کے یہ دو دن گزرے اور کشور نے وڈی چودھرائن کے ساتھ اس کے میکے جانے کے
سفر باندھا۔ اس کی اپنی ماں چودھرائن ناہید البتہ ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن نے
حویلی کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور خود شاید کشور کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔

وہ دونوں وہاں پہنچیں تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تاجور اور صنوبر، ماں کی آؤ بھگت کر
ساتھ ساتھ اسے بھی کریدتی رہیں کہ اس کی ذہنی حالت کو جانچ سکیں۔ پچھلے دنوں تسلسل سے یہ سننے
تھا کہ کشور کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تاجور تو اپنے تئیں لاہور میں
قیام کے عرصے میں اس کی دیوانگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات
کشور نکاح کے بعد پہلی بار آفتاب سے ملنے گئی تھی اور اس نے اس ملاقات کے اہتمام کے لیے پورا
تھا۔ اس وقت رانی نے مصلحتاً یہ جھوٹ بول دیا کہ بی بی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دیوانگی کی حا
خود کو اس طرح سجانے سنوارنے بیٹھ جاتی ہے۔ تاجور نے واپس گاؤں آ کر ماں کو ساری رپورٹ دی۔
صنوبر کو بھی سب کچھ بتایا۔ چنانچہ اب جبکہ وہ بہنوں سے ملنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ بہانے بہانے
ذہنی حالت جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کشور نا سمجھ نہیں تھی لیکن سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان
بہنوں کی باتیں نظر انداز کر کے ان کے بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں لگی رہی۔ سوتیلے رشتے کے باوجود
بچوں سے بہت محبت تھی اور اب تو جبکہ وہ خود ماں بننے جا رہی تھی، اسے یہ بچے اور بھی اچھے لگ
بچوں کے ساتھ مصروف وقت کس طرح گزرا، اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ دوپہر کے کھانے
ہونے کے بعد اس کے اعصاب تن گئے۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب دوپہر کے بعد ہی منور کو پڑھانے آ
اسے اسی موقع سے کسی طرح فائدہ اُٹھانا تھا۔ کھانے کے بعد کا وقت اس کے لیے بڑا کٹھن اور صبر آزما
خدا خدا کر کے یہ وقت بھی گزرا اور ایک ملازمہ نے اطلاع دی کہ منور شاہ کے ماسٹر صاحب پڑھانے
گئے ہیں۔ کشور اس وقت غیر محسوس طور پر منور کے ساتھ ہی مصروف تھی اور اس کے بیگ سے کتابیں
نکال کر بظاہر اس سے پڑھائی کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کی آمد کی اطلاع سنی
دل بری طرح دھڑک اُٹھا۔ منور کی کتابیں کاپیاں سمیٹ کر بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح
رہے تھے۔

''منور کو پڑھانے کے بعد مجھ سے حویلی کے باغ میں ملیں۔'' اُس نے منور کی اُردو کی کاپی کے اس
پر جہاں آفتاب نے اسے ہوم ورک دیا تھا، یہ مختصر سا پیغام موقع ملتے ہی چپکے سے لکھ دیا تھا اور بیگ میں
سب سے اوپر رکھ دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل ڈر رہا تھا کہ جانے آفتاب یہ پیغام دیکھے گا بھی یا نہیں۔ وہ کسی
سے نہ دیکھ پاتا تو اس کا یہاں آنا بے کار چلا جاتا۔ پھر دوبارہ ایسا موقع نکالنا بھی مشکل تھا۔ منور اپنی ملازمہ
ساتھ پڑھنے کے لیے چلا گیا..... وہ تب بھی بہت دیر تک تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔



ہے کشور! وڈی چپ چپ سی ہے؟'' اس کی خاموشی کو دیکھ کر صنوبر نے اس سے دریافت کیا۔
نہیں آپا! بس طبیعت کچھ سست ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اس نے
اس بہانے کی اسے ضرورت بھی تھی تا کہ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکے۔
جا، جا کر تھوڑی دیر سو لے۔'' اس کی حسبِ خواہش صنوبر نے مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا
سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔
میں بچوں کے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہوں۔ وہاں آپ نے بڑی اچھی سیٹنگ کروائی ہوئی ہے۔
بڑا سکون ملتا ہے۔''
ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اختر نے خاص طور پر شہر سے بندہ بلا کر وہ کمرہ سیٹ کروایا تھا۔ تجھے وہاں چنگا
جا، وہیں جا کر سو جا۔ بچے کون سا وہاں رہتے ہیں؟ انہیں تو اماؤں کے کلیجے میں ہی گھسنے سے فرصت
۔'' اس کی تعریف پر خوش ہوتے ہوئے صنوبر نے اپنے شوہر کا نام لیا اور وہ بات بتائی جو اس سے قبل
بار بتا چکی تھی اور ساتھ ہی فراخ دلی سے اجازت بھی دے دی۔
''ابھی بچے چھوٹے ہیں نا آپا! اس لیے انہیں آپ کے پاس رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بڑے ہوں گے تو
کمرے کی طرف لپکیں گے۔'' کشور نے اسے تسلی دی اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس
کا انتخاب اس نے خود جان بوجھ کر کیا تھا۔ کیونکہ ایک تو واقعی یہ کسی کے زیر استعمال نہیں رہتا تھا،
اس کمرے میں سلائیڈنگ ونڈوز لگی تھیں جن کے باہر کسی قسم کی سلاخیں یا جالیاں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ
اتر کر باغ میں جا سکتی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اندر سے لاک لگا لیا اور وقت گزرنے کا انتظار
لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق اب آفتاب کے وہاں سے رخصت ہونے میں دس منٹ ہی رہ گئے
وہ ذرا سی کوشش کرتا تو گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف مڑ کر باغ میں جا سکتا تھا۔ کشور کو یقین تھا
کا پیغام پڑھ لینے کی صورت میں وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اُس نے حسب پروگرام
دیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھڑکی پھلانگ کر باغ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس حالت میں تھی، اس
طرح کی حرکت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن بڑے خطرے میں پھنسنے سے پہلے اس نے یہ
چھوٹا خطرہ مول لینا مناسب سمجھا تھا۔ خیر گزری کہ وہ آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی اور باغ کے اس
پہنچ گئی جہاں امرودوں کے درخت تھے۔ دو منٹ بعد ہی اسے آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ پر متوجہ ہوئی
کر اطمینان ہوا کہ آنے والا آفتاب ہی تھا۔
''کہاں کھو گئی ہیں آپ؟ میں اس عرصے میں کتنا پریشان رہا ہوں، آپ کو لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔'' اس
پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو کشور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ یہ محبت ہی تو
اسے ہر خطرے سے بے خوف کر دیتی تھی۔ لیکن فی الحال یہ جذباتی ہونے یا اپنی کیفیات کے اظہار کا
نہیں تھا۔ اسے اس مختصر سی مہلت میں آفتاب کو سارے حالات سے باخبر کرنا تھا چنانچہ خود کو مضبوط کرتے
بولی۔
''پچھلے دنوں مجھ پر کیا گزری اور میرا آپ سے رابطہ کس طرح ٹوٹا، یہ ساری تفصیلات میں آپ کو بعد میں
گی۔ فی الحال میں نے آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانے کے لیے بلایا ہے۔''
''کیا ہوا ہے کشور! خیریت تو ہے؟'' آفتاب اس کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہوا۔
''پتہ نہیں اسے کیا کہیں گے۔ میں جو خبر آپ کو سنانے جا رہی ہوں، عام حالات میں تو وہ کسی شادی شدہ

جوڑے کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہوتی ہے لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم کھل کر اس خوشی پر
نہیں ہو سکتے۔''

''کیسی خوشخبری؟'' اُس کی بات سن کر آفتاب چونکا۔

''میرے وجود میں آپ کی محبت کی نشانی سانس لینے لگی ہے آفتاب!'' کشور نے جھجکتے ہوئے
''واقعی؟'' اس نے ردِعمل میں بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

''ہاں، یہ سچ ہے۔ میں تصدیق کروا چکی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب میں مزید حویلی میں نہیں رک
کسی پر اگر میرا یہ راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آ جائے گی۔'' اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے کشور کا دل
چاہتا تھا کہ اس لمحے میں اس طرح کی گفتگو کرے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے ابھی یہ ساری باتیں کرنی
آفتاب نے اُس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے حویلی سے باہر کہیں جا سکتی ہیں؟ کچھ نہیں تو درگاہ تک ہی سہی۔

''ہاں، یہ تو ممکن ہے۔ میں جمعرات کے دن درگاہ پر حاضری کے بہانے کسی ملازمہ کے ساتھ وہاں
سکتی ہوں۔'' اس کا مطلب پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی کشور نے جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''بس تو پھر اب آپ آنے والی جمعرات کو عصر مغرب کے درمیان وہاں پہنچ جائیے گا۔'' وہ دھیمی آواز
اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اچانک سامنے آ جانے والی اس صورتِ حال پر اس نے گھبرانے یا سٹپٹانے
بجائے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا اور بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ کشور پوری توجہ
کے منصوبے کی ساری جزئیات سن کر ذہن نشین کرنے لگی۔ اب اس منصوبے کی کامیابی پر ہی اس کی اور
کے آنے والے بچے کی زندگی کا دارومدار تھا۔

''ٹھیک ہے نا..... آپ میری ساری بات اچھی طرح سمجھ تو گئی ہیں نا؟'' اسے سب کچھ سمجھانے کے
آفتاب نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں کشور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا اور آپ کا منظر سے غائب رہنا کوئی مشکل
کھڑی کر سکتا ہے۔'' آفتاب نے اس سے کہا اور جاتے جاتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں
اپنے ہونٹوں کے نزدیک لے گیا۔ بس یہی وقت کا وہ مختصر لمحہ تھا جو وہ دونوں اپنے اردگرد سے بے خبر ہو گئے
انہیں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی نہیں دے سکی۔

''خبردار.....!'' ایک نہایت رعب دار آواز قریب سے اُبھری تو وہ دونوں بری طرح بدک کر مدہوش
کیفیت سے نکلتے ہوئے اس سمت متوجہ ہو گئے جہاں سے آواز آئی تھی۔

اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی بارُعب آواز پر وہ دونوں بدک کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہو
اور دونوں کے سینے سے ہی بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ وہ منور شاہ تھا جو اپنے ننھے ہاتھ
میں ایک کھلونا کلاشنکوف اٹھائے ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔

''میں نے آپ کو ڈرا دیا۔ اتنے بڑے ہو کر بھی آپ دونوں اتنے بزدل ہیں۔'' منور شاہ جس کی
کلاشنکوف کا رخ ان دونوں ہی کی جانب تھا، اس طرح انہیں ڈرا دینے کے اپنے کارنامے پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا

''بہت شریر ہو گئے ہو تم شیطان!'' کشور نے اس کے قریب جا کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ
اور آفتاب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جھینپے ہوئے تھے کہ وہ ایک بچے سے ڈر گئے۔ اصل میں کچھ تو خوف ان
اپنے اندر تھا اور کچھ منور آواز بھی بھاری بنا کر بالکل کسی بڑے آدمی کی طرح بولا تھا، اس لیے لمحہ بھر کے لیے



ہی سن پڑ گئے تھے۔

''آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟'' منور نے اپنا کان کشور کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے
پوچھا۔ اس کے سوال نے انہیں احساس دلایا کہ منور کا یہاں آنا اور ان دونوں کو ساتھ دیکھ لینا اتنا بھی
نہیں ہے۔ بے شک وہ بچہ تھا اور ان کے درمیان موجود تعلق کو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنی نادانی اور معصومیت
کسی کے سامنے اس بات کا تذکرہ تو کر سکتا تھا۔

''آپ جائیں آفتاب! میں اسے سنبھال لوں گی۔'' گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے کشور نے
پہلے وہاں سے رخصت کر دینا مناسب سمجھا۔ زیادہ تاخیر گیٹ پر موجود چوکیدار کی نظر میں آ سکتی تھی۔
مناسب سمجھتے ہوئے آفتاب نے بھی فوری طور پر وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور ننھے منور سے
کرتے ہوئے کہا۔

''او کے ماسٹر! میں چلتا ہوں۔ تم اپنا ہوم ورک اچھی طرح کر لینا۔''

''یس سر! میں کر لوں گا بلکہ خالہ سے کہوں گا کہ یہ میرا ہوم ورک کرا دیں۔'' منور نے جواب دیا۔ اس
سے عرصے میں وہ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ بڑے طریقے سلیقے سے بات چیت
اصل میں ابھی وہ تھا بھی اتنا کم عمر کہ مزاج میں حاکمانہ خُو بُو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب نے اس کے
انداز پر پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''آپ میرا ہوم ورک کروائیں گی نا خالہ؟'' کشور ابھی جانے والے کے قدموں کے نشانوں میں ہی محو تھی
نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بالکل کرواؤں گی۔ مگر ایک شرط پر۔''

''وہ کیا؟'' منور نے تجسس سے پوچھا۔

''آپ کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گے کہ آپ نے مجھے اور ماسٹر صاحب کو یہاں دیکھا تھا۔''

''میں کروں گا۔ لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟'' منور نے اس کی بات
ہامی بھر لی لیکن فطری تجسس کے باعث سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''بات میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گی۔'' کشور نے گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے اس سے کہا
کی انگلی تھام کر واپسی کے راستے پر چل پڑی۔

''ہم یہاں سے اندر جائیں گے؟'' وہ واپس بچوں کے کمرے کی کھلی سلائیڈنگ ونڈو کے پاس آ کر ٹھہری
نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، یہاں سے اندر جانے میں بہت مزہ آئے گا۔'' کشور نے اسے جواب دیا اور پہلے اسے سہارا دے
پر چڑھنے میں مدد دی، اس کے بعد خود بھی کھلی کھڑکی سے گزر کر اندر پہنچ گئی۔

''کیوں آیا نا مزہ؟'' اندر پہنچ کر اس نے منور سے پوچھا۔

''بہت مزہ آیا۔'' وہ بچہ تھا اور اسے زندگی میں ہونے والا ہر نیا تجربہ انوکھا اور خوش کُن ہی لگ سکتا تھا۔
وقت یوں کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچتے ہی خوش ہو گیا۔

''میں اسی لیے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر باغ میں گھومنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے بھی ایسے کھڑکی سے
میں بڑا مزہ آتا ہے۔'' وہ منور کا ذہن اپنی اور آفتاب کی ملاقات کی طرف سے صاف کرنے کے
کر رہی تھی۔

''اور ماسٹر صاحب کس لیے باغ میں گئے تھے؟'' خالہ کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے پر اس استاد کے بارے میں سوال کیا۔

''ان کا امرود کھانے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے وہ وہاں گئے تھے۔'' کشور نے اسے بہلایا۔

''تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں مالی سے بہت سارے امرود تڑوا کر اُنہیں دے دیتا۔''

''لیکن ان کا تو خود سے امرود توڑ کر کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ جیسے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آنے میں بہت مزہ آتا ہے، ایسے ہی خود اپنے ہاتھ سے امرود توڑ کر کھانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔'' کشور نے سمجھایا۔

''اچھا تو یہ بات تھی..... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' منور شاہ یوں سر کو ہلا کر بولا جیسے کوئی بہت ہی سلجھ گئی ہو۔

''اب آپ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کرنا ورنہ پاپا، ماسٹر صاحب سے ناراض ہو جائیں گے ان کا یہاں آنا بند کروا دیں گے۔ ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے تو آپ کو پڑھائے گا کون؟'' وہ واقف تھی کہ آفتاب کو اچھا خاصا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی کمزوری کو پکڑتے ہوئے اسے زبان بندی کے لیے کی کوشش کی۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب آپ جلدی سے میرا ہوم ورک کروا دیں نانی جان آپ کو واپس بڑی حویلی لے جائیں گی۔'' منور نے اسے یقین دہانی کروائی اور اپنے مسئلے کی متوجہ کروایا۔

''ٹھیک ہے، جاؤ۔ آپ اپنا بیگ لے کر آؤ۔ میں آپ کا ہوم ورک کروا دیتی ہوں۔'' کشور نے معصومانہ ادا پر اس کا رخسار چومتے ہوئے اس سے کہا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور باہر نکلتے ہی بے دم سی ہو کر ایک فلور کشن پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ننھے سے بچے کی مداخلت سے صورتِ حال کافی گمبھیر ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر تو اس نے پکا انتظام کر دیا تھا کہ منور شاہ کسی کے سامنے نہ کھولے لیکن ایک معصوم بچے پر کتنا بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اپنی معصومیت میں وہ غیر ارادتاً ہی کسی کے سامنے سارا واقعہ دُہرا دیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

⊛----✪----⊛

ناشتہ کرتے ہوئے ماہ بانو کا ذہن رات عمران سے ہونے والی گفتگو میں اُلجھا ہوا تھا۔ عمران کی حیات واقعی بڑی پُر درد تھی۔ ایک امیر زادے کی ہوس نے ہنستے بستے گھر کو اُجاڑ ڈالا تھا۔ وہ گھر جو عمران نے اپنی شبانہ روز محنت سے تنکا تنکا جمع کر کے بنایا تھا، صرف اس لیے بکھر گیا تھا کہ عمران کی نادان بہن امیر زادے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ امیر زادے نے جال میں پھنسی اس چڑیا کی بے بسی سے فائدہ اُٹھایا اور اس بات کی پروا نہ کی کہ اس کی یہ حرکت ایک عزت دار سفید پوش گھرانے کے لیے کیسی مصیبت لے آئے گی۔ ماہ بانو کو اپنی اور عمران کی زندگی میں کافی مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ہوس پرست وڈیرے چوہدری افتخار عالم شاہ کی وجہ سے دربدر تھی۔ چودھری نے اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔ نہ تو فیصل آباد میں موجود اس کا وہ چھوٹا سا گھر باقی رہا تھا جہاں وہ بے بے اور ابا کی چھاؤں میں رہا کرتی تھی اور نہ ہی پیر آباد کا وہ کچا مکان جہاں اس کے سگے ماں باپ، بہن بھائی رہتے تھے



چھٹیوں میں گاؤں جاتی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزار آتی تھی۔ اماں ابا سے بے شک شکوہ تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی ہونے کی وجہ سے جان بوجھ کر پیدا ہوتے ہی دوسروں کو تھما دیا تھا لیکن وہ اپنے دل سے ان کی فطری محبت نہیں نکال سکی تھی۔ چنانچہ جہاں اسے اپنے پرورش کرنے والے ابا کی ناگہانی موت رُلاتی تھی، وہیں اپنا پیر آباد والا گھر اُجڑ جانے کا غم بھی بے چین رکھتا تھا۔

وہ بالکل عمران کی طرح ہی خانماں برباد تھی۔ ان دونوں میں فرق تھا تو اتنا کہ ایک تو وہ عمران کی بہن فری کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی تھی، دوسرے وہ عمران کی طرح انتقام کی راہ پر نہیں چلی تھی۔ پہلے اپنا گھر اُجاڑنے والے سے اس کی زندگی چھین لی تھی جبکہ وہ ابھی تک اپنی بقا کی جدوجہد میں لگی تھی۔ اس جدوجہد کے دوران اسے کبھی انتقام کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بس بھاگتی پھر رہی تھی کہ کسی گوشۂ عافیت میسر آ جائے جہاں وہ چودھری کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اس خواہش نے اُسے اس گرداب میں لا پھینکا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلے بغیر ہی دوسرے گرداب میں پھنس گئی ہے، جس سے باہر نکلنے کا اسے کل تک کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن گزشتہ رات عمران نے اسے آس دلائی تھی کہ وہ یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ اس آس نے اس کے مایوسی میں گھر جانے والے دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ جو دکھ اور مایوسی کے باعث کھانا پینا تک ترک کر چکی تھی، ایک بار پھر جی اُٹھی تھی اور اس وقت اپنے سامنے رکھا ناشتہ کافی رغبت سے کر رہی تھی۔

پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود اُسے اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ یہاں سے فرار کا سفر بہت دشوار ہوگا اور اس دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم میں توانائی کا ہونا ضروری تھا۔ اس توانائی کے حصول کی خاطر اس نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد اس کا وقت حسبِ معمول تنہائی کے اذیت ناک لمحے شمار کرتے ہوئے گزرنے لگا۔ لیکن آج آزادی کی امید نے اس اذیت کو کافی کم کر دیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اذیت ختم ہوتی نظر آتی تھی اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔ اس امید کے ساتھ ہی وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام کے سائے جب گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تو اسے تشویش محسوس ہونے لگی۔ پورے دن میں عمران نے اس سے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اسے ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی تھی جس سے یہ احساس ہو پاتا کہ وہاں کوئی غیر معمولی صورت حال ہے۔ اسی فکر میں مبتلا وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس آہٹ کو سن کر بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رات کے کھانے کا وقت ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے لیے کھانا لے کر آیا ہوگا۔

''ماہ بانو!'' آنے والے نے جب اسے اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھا تو کھانے کے برتن اس کے قریب رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ آواز شناخت کر کے فوراً ہی متوجہ ہو گئی۔ وہ عمران ہی تھا جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور کچھ دیر آرام کر لو۔ چند گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' اس کے انداز میں اسے یہ نوید سنا کر وہ ایک پل بھی مزید ٹھہرے بغیر تیزی سے واپس پلٹ گیا لیکن تشویش کا شکار ماہ بانو کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس اطلاع نے کہ چند گھنٹوں بعد وہ اس قید خانے سے نکل سکے گی، اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ملنے والی آزادی کی اُمید نے اسے اتنا پُر جوش کر دیا کہ اس نے اس قید میں پہلی بار بے حد رغبت سے کھانا کھایا۔ آج کھانا تھا بھی کافی پُر تکلف۔ مرغی کے شوربے والے سالن

کے ساتھ ساتھ ٹیونا فش کے تلے ہوئے قتلے بھی کھانے میں شامل کیے گئے تھے۔ ایک پیالے میں بھا
کا رن سُوپ بھی تھا..... یعنی پورا دعوت کا اہتمام تھا۔ اس نے جی بھر کر یہ غذائیت بخش کھانا کھایا ا
معمول اس مختصر سی جگہ میں ٹہلنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے کھانا ہضم ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے قید کے
یہ معمول بنا لیا تھا کہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹہلتی ضرور تھی۔ حالانکہ ٹہلنے کے لیے وہ جگہ بے حد محدود تھی۔
اس نے دس منٹ تک چہل قدمی کی اور پھر عمران کی حسبِ ہدایت آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔ بہت
پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی کافی پُرسکون تھا، چنانچہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے لیکن ماحول میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی تھی جس
نیند سے جگا دیا۔ وہ لمحہ بھر تو خالی الذہنی کی کیفیت میں اچانک اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی
اس کی قوتِ سماعت نے اسے احساس دلایا کہ وہ ماحول میں پیدا ہونے والے غیر معمولی شور کی وجہ
ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی مشکل سے ہی بولتا تھا اور وہ انسانی آواز سننے کے لیے ترس جاتی تھی، یہ شور
محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سماعت پر ذرا سا زور دینے پر اسے
گیا کہ وہ لوگ اپنی بھونڈی آوازوں میں گانے کے ساتھ ساتھ بلند و بالا قہقہے لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا
کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ اس کے اندر جشن کی نوعیت جاننے کے لیے تجسس جاگ اُٹھا اور وہ اپنی جگہ
دبے قدموں باہر کی طرف بڑھی۔ اسے کھانا پہنچانے چونکہ عمران خود آیا تھا، اس لیے قید خانے کا راستہ
تھا۔ وہ بے حد احتیاط سے چلتی آوازوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ حسبِ معمول غار کے کشادہ حصے میں
جمع تھے اور محفل سجی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان بے ہنگم حلیوں والے لوگوں میں سے بیشتر دیوار
ساتھ لگ کر کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دائرہ سا بن گیا تھا اور اس دائرے میں پانچ چھ افراد رقص
میں جھوم رہے تھے۔ ناچنے والوں میں اور بیٹھے ہوئے دونوں افراد میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ بلند آ
گانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں جام بھی تھامے ہوئے تھے۔ جام پر جام لُنڈھاتے وہ جس مستی کی
تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس محفل میں اُم الخبائث گردش میں ہے جس کے زیرِ اثر
مرد جھوم رہے ہیں۔

ماہ بانو کے دیکھتے ہی دیکھتے رقص کرنے والوں میں سے ایک نے ایک جانب بیٹھے عمران کو ہاتھ
کھڑا کیا اور پھر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ناچنے لگا۔ اُس کی اس حرکت سے محفل میں مزید گرمی آ گئی
ہوئے لوگوں میں سے بھی مزید کچھ افراد کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔ عمران کو کاندھے
بٹھانے والا درمیان میں رقص کر رہا تھا جبکہ باقی سب اس کے اردگرد ناچتے ہوئے بار بار عمران کے جسم
دیتے تھے۔ ان سب کے رویوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کوئی دُولہا ہو جس کی بارات روانہ
ہو..... اور بے تکلف دوست اپنے یار کی شادی کا جشن منا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ ہڑبڑی جاری رہی
یک دم ان میں سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے ناچنے گانے والوں کو خاموشی اختیار
کی ہدایت کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"دوستو! تھوڑا صبر کرو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بھائی صاحب آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"
شخص کے یہ اعلان کرتے ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اس
کے چھا جانے کے بعد ایک دراز قد شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ ماہ بانو نے اس شخص کو پہچان لیا۔
بھائی صاحب کہلانے والے اس آدمی کو اس سے قبل وہ اس وقت بھی دیکھ چکی تھی جب پروجیکٹر



کی عزت برباد کرنے والے جوان کے ذبح کیے جانے کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی صاحب کہہ کر پکارا
وہ آدمی جو وہاں ان لوگوں کا کمانڈر تھا، کھڑے ہونے کے بعد اپنا گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

"ساتھیو!..... میرے بہادر مجاہدو!..... آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر
ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنی جانیں تک قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم
ہیں کہ جس نیک مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جائے تو یہ
نہیں۔ اس قربانی کے بدلے میں پروردگار ہمیں اپنی جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ میری دعا ہے
پروردگار ہم میں سے ہر ایک کو یہ اعزاز نصیب کرے۔ فی الحال میں یہ بتاتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر
ہوں کہ ہمارے درمیان سب سے کم وقت گزارنے والے اور ہم میں سے سب سے کم عمر عمران کے نصیب
میں یہ قسمت لکھی گئی ہے کہ وہ ہم سب سے پہلے شہادت کی راہ پر چلنے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ آج کا یہ جشن
اس کے اعزاز میں ہی منا رہے ہیں۔ شہید کبھی مرتا نہیں بلکہ اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اس لیے راہِ
پر جانے والے کے لیے رونے اور اُداس ہونے کے بجائے اسے بہت خوش دلی سے رخصت کرنا
ہے۔ آپ سب آج رات دل کھول کر کھائیں پئیں، ناچیں گائیں۔ آج آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"
کے اس اعلان نے وہاں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ سوچے بغیر کہ ایک جیتے جاگتے،
جوان کو حرام موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔ تالیوں کی گونج تھمی تو کمانڈر
ان کو اپنے قریب بلایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"کیوں عمران! ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"نہیں بھائی صاحب! ڈرنے کا کیا سوال؟ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کام کے
لیے۔" عمران نے مسکراتے ہوئے کمانڈر کی بات کا جواب دیا۔

"شاباش میرے شیر! مجھے تم سے اسی بہادرانہ جواب کی امید تھی۔" کمانڈر نے اس کے جواب پر خوش ہو
بار پھر اس کی پیٹھ پر زوردار تھپکی دی اور بلند آواز میں بولا۔ "میری طرف سے ایک جام عمران کی اس
کے نام۔" فوراً ہی کمانڈر کے اعزاز میں سکوت اختیار کرنے والے حرکت میں آ گئے اور محفل میں ایک
جام گردش کرنے لگے۔

ماہ بانو پھٹی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے مجاہد ہیں جو
کے رسیا ہیں اور گانے بجانے سے دل بہلاتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہو سکا
ساری طرح سے اوٹ میں نہیں رہی ہے اور اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پر نظر پڑی
عمران کی ہی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اشارہ کیا کہ واپس پلٹ جاؤ۔ وہ خود بھی اسی کی طرف متوجہ
چنانچہ اس خفیف اشارے کو دیکھ لیا اور جس خاموشی سے وہاں تک آئی تھی، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔
اپنی جگہ پر پہنچ کر اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور اب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت
لگ رہی تھیں۔ دل کے اندر یہی خواہش اُٹھ رہی تھی کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے لیکن
سے سنائی دیتے شور کو سن کر یوں لگ رہا تھا کہ رات بھر یہ محفل سجی رہے گی۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتظار کی یہ
گزریں۔ پہلے آہستہ آہستہ باہر سے سنائی دیتی گانے بجانے کی آوازیں معدوم ہونا شروع ہوئیں اور
لگا جیسے سارے ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ اس سکوت میں وہ قدموں کی تیز آہٹ سن کر
سے کھڑی ہوئی۔ حسبِ توقع اس طرف آنے والا عمران ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان

اٹھایا ہوا تھا۔

''جلدی سے یہ لباس اور جوتے موزے وغیرہ پہن لو۔ پانچ منٹ میں ہمیں یہاں سے نکلنا
اپنے ہاتھ میں موجود سامان اسے تھما کر خود جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ماہ بانو
کی ہدایت کے مطابق وہ چیزیں پہننی شروع کر دیں۔ جو لباس اس نے اس وقت پہن رکھا تھا، وہ بھی
تھا جس پر اُس نے عمران کا دیا ہوا موٹا اُونی لبادہ پہن لیا۔ اُسے یہاں لاتے وقت بھی اسی قسم کا لباس
تھا اور وہ اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس برف زار میں باہر کا موسم غار کے مقابلے میں بہت شدید تھا۔ غار
کی سردی باہر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی کیونکہ یہاں ان قاتل ہواؤں کا گزر نہیں تھا جو انسان کے
ٹکراتی تھیں تو ایسے لگتا تھا کہ ایک برچھی سی جسم میں اُتر گئی ہو۔ لباس پہننے کے بعد اس نے پیروں میں
جرابیں پہن کر جوگرز چڑھائے۔ جوگرز اس کے پیروں میں قدرے ڈھیلے تھے اور چلتے وقت دشواری
بن سکتے تھے۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔ پھر یک دم ہی اس کی نظر جرابوں کی
جوڑی پر پڑی۔ اس نے جوگرز اُتار کر وہ دوسری جوڑی بھی پہلے والی جرابوں پر چڑھا لی۔ اب اس
سے جوگرز پہنے تو وہ پہلے کے مقابلے میں اس کے پیروں میں کافی بہتر تھے۔ عمران کے لائے ہوئے
سے پہننے کے لیے اب دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک اُونی ٹوپی اور دوسرے مٹاف (پہاڑوں پر پہنے جانے
خصوصی دستانے)۔ اس نے پہلے بالوں کو سمیٹ کر اُونی ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور پھر ہاتھوں پر مٹاف
لئے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھی۔

''تم تیار ہوگئیں..... ویری گڈ۔ چلو اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔'' اسی وقت عمران وہاں چلا آیا
تیار دیکھ کر بولا۔ اس وقت وہ خود بھی اس سے ملتے جلتے حلیے میں تھا اور اسی کی طرح اس حلیے میں اپنے
سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہا تھا۔

''ٹوپی کا باقی حصہ اپنے چہرے پر بھی چڑھا لو ورنہ باہر کی ٹھنڈی ہوا تمہارے چہرے کی جلد اوپر
گی۔'' اس کا کھلا منہ دیکھ کر اس نے ماہ بانو کو ہدایت کی اور پھر ایک ذرا مختلف ساخت کی عینک اس کی
بڑھا دی۔ وہ خود بھی اپنی آنکھوں پر ایسی ہی عینک پہنے ہوئے تھا۔ ماہ بانو نے خاموشی سے عینک تھام
آنکھوں پر لگا لی۔ عینک لگانے کے بعد اسے لگا کہ وہ نیم تاریک ماحول پہلے کے مقابلے میں واضح ہوگیا
نائٹ گاگلز کا کمال تھا جو عمران کے کہنے پر اس نے ابھی ابھی پہنی تھیں۔

''آ جاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔ سب لوگ نشے کی حالت میں دھت پڑے ہوئے ہیں..... ہلکی
آوازوں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔'' سرگوشی میں اسے ہدایت کر
وہاں سے آگے بڑھا۔ ماہ بانو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ عمران کا بے حد محتاط رویہ اسے بھی احتیاط پر کاربند
ہوئے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدہوشی کے باوجود وہ اتنا محتاط اور چوکنا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود
بالکل تیار رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس کے سینے میں اس ریوالور
بلا تکلف اُتار دیتا۔ ریوالور کے علاوہ اس نے اپنے شانے سے ایک دُور مار رائفل بھی لٹکائی ہوئی تھی
لباس کے اندر بھی کچھ اسلحہ چھپایا تھا جس کو ماہ بانو دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف اس کے بارے میں قیاس
تھی۔ مخصوص راستے پر سے گزرتے ہوئے وہ دونوں غار کے کشادہ ہال نما حصے میں پہنچے۔ وہاں مرغی کی
ہوئی ہڈیاں، شراب کے خالی پیمانے اور انسانی جسم ایک جیسی بے ترتیب حالت میں اِدھر اُدھر پڑے
تھے۔ وہ دونوں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا پیر کسی کے جسم سے نہ ٹکرا جائے، وہاں سے گزر کر غار کے



ے۔

ہے.....؟'' ابھی وہ دہانے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی کی مدہوش سی آواز اُبھری اور مُردوں کی طرح
ے انسانی جسموں میں سے ایک نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو کا دل اس
ل پر اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں قفس کے دروازے پر دھر لیے جانے کا سوچ کر ہی اس کا جسم
لے لگا۔

ں ہوں بھائی! عمران۔ ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔'' ماہ بانو کے برعکس عمران نے پُرسکون رہتے
الان آواز میں سوال کرنے والے کو جواب دیا جسے سن کر اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی گردن فرش پر
اور پہلے ہی کی طرح خراٹے لینے لگا۔ عمران نے ماہ بانو کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے
ے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سینے میں اٹک جانے والا سانس آہستہ سے خارج کرتے ہوئے
ا دیے۔ غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی سرد نکیلی ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اور باوجود پوری
ے، ماہ بانو کو اپنے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی عمران کے ساتھ
ں۔

ہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف چاند کی مدھم روشنی تھی جو منظر کو پوری طرح واضح کرنے میں
یں ہو پا رہی تھی۔ اگر ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر نائٹ گاگلز نہیں لگائے ہوئے ہوتے تو بہت
ل آتی مگر گاگلز کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہوگئی تھی۔ ماہ بانو دیکھ سکتی تھی کہ وہاں وہی قوی ہیکل جانور
ے جس پر لاد کر اسے یہاں لایا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے بھاری جثے کے ساتھ اور بھی
اک لگ رہا تھا۔ ماہ بانو کو حیرت تھی کہ ان لوگوں نے کیونکر اس جانور کو سدھا کر اپنے استعمال کے لائق
ا۔ ایسے وحشی کو قابو کرنے کے لیے تو اس سے بڑھ کر وحشت کی ضرورت تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ
ہی ہو گئے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، اس وقت تو ایک سیاہ پُرشکوہ یاک ان کی سواری کے لیے تیار کھڑا
ا سامان کا بڑا سا تھیلا بھی لدا ہوا تھا۔ یہ یقیناً زادِ راہ تھا جس کا عمران نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔
ہیں یہاں سے نکلنے کے لیے اس یاک کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس برفانی علاقے میں یہ بہت تیزی سے
رتے ہیں اور پھر اس پر سواری کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سدھائے ہوئے ہیں اور راستوں کو خوب
ہیں۔ میں نے چونکہ خود بھی یہ جگہ اچھی طرح نہیں دیکھ رکھی اس لیے اندیشہ ہے کہ پیدل نکلنے کی صورت
استہ بھٹک جائیں گے۔'' یاک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عمران نے اسے بتایا اور پھر اس کے قریب
ے پر ماہ بانو کو اس پر سوار ہونے میں مدد دینے لگا۔

اپنی جگہ پر رک جاؤ عمران! اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔'' ابھی ماہ بانو سوار نہیں ہو پائی تھی
ں عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر بری طرح چونک کر پلٹے۔ وہ نائب کمانڈر تھا جو ہاتھ میں
ے ان دونوں کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گن کا رخ تو ظاہر ہے سو فیصدی ان دونوں ہی کی
ا۔

ھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ کرنے والے ہو اس لیے میں تم پر اعتماد کرنے کے لیے تیار
ن بھائی صاحب اور میرا دونوں کا یہ خیال تھا کہ تم جو کچھ بھی گڑبڑ کرو گے، وہ شہر پہنچ کر کرو گے۔ ہمیں
ارہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ایسی کوئی جرأت کر سکتے ہو۔ وہ تو آج کی محفل میں، میں
ں سے اوروں کے مقابلے میں کم شراب پی تھی اس لیے میری اس وقت آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھ لیا

کہ تم اس لڑکی کو لے کر یہاں سے فراز ہو رہے ہو۔ اب ایسا کرو کہ فرار کا خیال دل سے نکال کر ا
طرح واپس اندر چلو۔ تمہارا فیصلہ صبح ہونے پر بھائی صاحب خود کریں گے۔'' نائب کمانڈر نے
والے انداز میں حکم صادر کرتے ہوئے کہا لیکن عمران اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور وہیں
گھورتا رہا۔

''ہری اَپ مین!..... ٹائم ویسٹ مت کرو۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کتنی سردی ہے اور میں
طرح سردی سے بچاؤ کا انتظام بھی نہیں کر رکھا۔'' عمران کو اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر نائب نے
ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو خوب انجوائے کر رہا ہے۔
عین موقع پر دھر لیے جانے کے کارنامے پر یقیناً وہ بہت خوش تھا اور اس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا
''اور ہاں، دیکھو..... آگے بڑھنے سے پہلے اپنے پاس موجود اسلحہ ضرور نیچے ڈال دو۔ یہ کافی
چیز ہے۔ اس لیے تم جیسے بچے کے پاس اس کا رہنا مناسب نہیں۔'' نائب نے ایک بار پھر عمران کا
ہوئے اسے حکم دیا۔ اُس کا یہ حکم سن کر عمران نے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے ڈال دیا اور پھر شا
رائفل اُتارنے لگا۔ رائفل اُتارتے اُتارتے اچانک ہی اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہو
بدلا اور بجائے رائفل نیچے پھینکنے کے سیدھی کر کے نائب کی طرف ایک فائر داغ دیا۔ رائفل سے نکلی
سیدھی جا کر نائب کے بائیں شانے سے ذرا نیچے سوراخ بنا گئی۔ گولی کھا کر نائب کو زوردار جھٹکا لگا اور
گیا۔ معلوم نہیں گولی نے اس کے دل کو متاثر کیا تھا یا نہیں..... لیکن زخم بہر حال کاری تھا اور نائب
گرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ نہیں سکا تھا۔

''ہری اَپ ماہ بانو! ہمیں بہت تیزی سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر اندر
ہوئے افراد میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگ گیا ہوگا۔ اگر زیادہ افراد اُٹھ کر باہر نکل آئے تو میں ان کا
بگاڑ سکوں گا۔'' اسے سوار کرواتے ہوئے وہ اس پر صورتِ حال واضح کرنے لگا اور پھر خود بھی اس کے
گیا۔ یاک پر سوار ہونے سے قبل وہ نیچے زمین پر گرا ہوا اپنا ریوالور اُٹھانا ہرگز بھی نہیں بھولا تھا۔ سوار
نے جیسے ہی اشارہ کیا، یاک چل پڑا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ بہت
روی سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ رگوں کو کاٹتی سردی کے ساتھ ہڈیوں کا گودا جما دینے والا خوف مل کر
جسموں کو کپکپا رہا تھا اور دل میں خواہش اُبھر رہی تھی کہ کاش کسی طرح اس یاک کو پَر لگ جائیں اور وہ
اس جگہ سے بہت دور نکل جائیں۔ ایسے میں انہوں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں تو اور بھی زیادہ
گئے۔ دونوں نے بہ یک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تین افراد تھے جو شاید گولی چلنے کی آواز سن کر
بعد غار سے باہر نکل آئے تھے اور اب نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے صورتِ حال کو سمجھنے کی
رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک اس سمت نہیں دیکھا تھا جس طرف ماہ بانو اور عمران، یاک پر سوار
رہے تھے۔ اُن کی یہ کوتاہی بے تحاشا شراب کے نشے کے سبب تھی ورنہ بھاری بھرکم یاک کے چلنے
میں دھمک پیدا ہوتی ہے، اسے دور ہی سے محسوس کر لیا جاتا ہے۔

''یہاں اور بھی تو یاک ہیں۔ کہیں یہ لوگ ان پر سوار ہو کر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کریں۔''
نے خوف زدہ سے لہجے میں عمران سے کہا۔

''فی الحال وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے یاکوں کو کافی مقدار میں شراب پلا دی تھی اس لیے ا
ہمارے اس یاک کے علاوہ کوئی دوسرا یاک سواری کے لائق نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی ا



تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔'' عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنی توجہ پیچھے کی طرف ہی مرکوز
یہ لوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے افراد ان کی طرف متوجہ
وہ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے لیکن درحقیقت وہ دونوں ان کی رسائی سے بہت دور
اس بات کو محسوس کر کے ان میں سے ایک کو عقل سوجھی اور اس نے رُک کر اپنی رائفل ان کی
ل۔
جھک جاؤ۔'' عمران نے اسے ہدایت کی اور خود بھی اپنا سر اور بالائی جسم جھکا لیا۔ اب وہ دونوں
حرکت کر کے یاک کی پشت پر اس طرح محوِ سفر تھے کہ ان کے جسم اس کے سیاہ جثے سے لپٹے ہوئے
فائر داغا گیا جو کسی نشانے پر نہیں بیٹھ سکا، البتہ فائر کی آواز نے یاک کو بھڑکا کر اس کی رفتار اور
دی۔
مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جمائے رکھو۔ فائرنگ سے خوف زدہ مت ہونا۔ ہم بہت دور نکل آئے
فاصلے سے ان لوگوں کے لیے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں۔'' عمران نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ
ہو کر یاک کی پشت سے گر نہ پڑے، اسے تسلی بھری ہدایت دی۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں
اس ہدایت پر عمل کیا۔ پھر پے در پے ہونے والے اگلے مزید فائروں کی آواز نے عمران کی اس
یق بھی کر ڈالی کہ وہ فائرنگ رینج سے نکل چکے ہیں۔ پیچھے سے فائر کرنے والوں نے بھی اس بات
اور فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اب وہ جانے کون سا حربہ استعمال کر کے ان دونوں کو روکنے کی
ے، فی الحال یہ واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں یاک کی پشت سے چمٹے تن بہ تقدیر انجانے راستوں پر تیزی
ے جا رہے تھے۔

PAKISTANIPOINT

⊛----✪----⊛

ایش آنے والے واقعے نے مشابرم خان کو بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہایت
ے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی نگرانی کر رہا تھا اور وہاں
ونے والی جیپوں پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ ایک جیپ جس کی روانگی کا اسے انتظار تھا، نہایت
اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ کر دی گئی تھی۔ کسی نے عین موقع پر اسے ہسپتال کے نمبر سے
یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ نگرانی
گیا اور دیوانہ وار ہسپتال کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں کی طبیعت تو حسبِ معمول ہے
کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ اس وقت اُسے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈرامہ اسے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر
سے ہٹانے کے لیے رچایا گیا تھا۔

پارٹی کی اس چال نے جہاں اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا وہیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ
کا مالک اس کام میں ملوث ہے۔ چنانچہ اب وہ کمپنی کے مالک کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لینے
میں ہی غور کر رہا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو منصوبہ آیا، اس کے مطابق اس
کمپنی کے دفتر کی معمول کی نگرانی ترک کر دی اور چائے کے ہوٹل پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سارا دن
کے ساتھ ہسپتال میں گزارا۔ شام کے وقت جب اس کی معلومات کے مطابق دفتر بند ہونے کا وقت
تو وہ ہسپتال سے نکلا اور چپکے سے کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنے لیے کرائے

کی ایک جیپ حاصل کرنا بالکل نہیں بھولا۔ جیپ کے لیے اس نے دن میں ہی ہسپتال سے فون کر لی تھی لیکن احتیاطاً دن میں اپنے پاس جیپ رکھنے سے گریز کیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کی حرکات رکھے ہو تو جیپ کرائے پر لینے کی وجہ سے چونک جائے۔

ہسپتال سے روانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس طرف سے بہت محتاط رہا تھا لیکن اسے اپنے مشکوک شخص نظر نہیں آیا جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ شا گزرنے کے بعد مخالفین نے اس کی نگرانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نگرانی کی طرف وہ جیپ میں اس راستے کی طرف ہوا جو ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی طرف جاتا تھا لیکن دفتر تک جا راستے میں ہی ایک جگہ رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کمپنی کے مالک کو دفتر سے اپنے گھر جا لازماً گزرنا پڑتا۔ مشابرم خان کو مالک کے گھر کا پتہ معلوم تھا اور وہ چاہتا تو وہاں جا کر بھی اسے لیکن ڈرائیور نیاز علی کی ہلاکت کے بعد وہ اس معاملے میں محتاط ہو گیا تھا۔ نیاز علی کو وہ اس معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نیاز علی اپنی غلطی کے باعث کھائی میں گر لیکن اس واقعے نے مشابرم خان کی حیثیت مشکوک کر دی تھی۔ اسی وجہ سے ابھی تک اسے بلتستان اجازت نہیں تھی۔ ان حالات میں اگر ٹورسٹ کمپنی کے مالک کے ساتھ کچھ برا بھلا ہو جاتا اور اس کا جاتا تو اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی، اسی لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو پوشیدہ رکھے۔

کمپنی کے مالک کو راستے میں ہی روکنے کے لیے بھی اس نے ایسے مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس مقام پر اسے روکنے اور اپنے مقصد کے کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جیپ اس نے سڑک سے اُتار کر ایک طرف روک لی تھی اور راستے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں رکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑی۔ ٹورسٹ کمپنی جیپ کو اس نے دُور سے ہی شناخت کر لیا۔ اُس کی جیپ شناخت کرتے ہی وہ فوراً حرکت میں آیا اور اسٹارٹ کر کے عین سڑک کے درمیان میں لے گیا۔ سڑک پر سیدھے چلے آنے والے ٹورسٹ کمپنی اپنی جیپ کو ایمرجنسی بریکس لگانے پڑے۔

''کون پاگل کا بچہ ہے تُو؟'' جیپ رُکتے ہی وہ غصے سے دہاڑتا ہوا باہر نکلا لیکن مشابرم خان تو ا ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہی نہیں تھا۔ جیپ عین سڑک پر روکنے کے بعد وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ سے کود کر نیچے سڑک پر رینگ گیا تھا۔ شام کے جھک آنے والے سایوں میں کمپنی کا مالک اس کی نہیں دیکھ سکا، چنانچہ اب خالی ڈرائیونگ سیٹ دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ اُس کی اس حیرت میں اس اضافہ ہو گیا جب مشابرم خان نے پیچھے سے آ کر اسے چھاپا۔ پھر کنپٹی پر لگنے والی مشابرم خان کی نے اس کے حواس اس طرح غائب کیے کہ وہ حیرت سمیت کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا سڑک پر گرنے لگا لیکن مشابرم خان نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور اپنی جیپ تک لے گیا۔ اسے جیپ کے پچھلے حصے میں ڈالنے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ترچھی کھڑی جیپ کو ریورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہوئے برق رفتاری سے دوڑا دیا۔ اتنی زیادہ مظاہرہ کرنے کے باعث جیپ کے پہیے بری طرح چرچرائے اور فضا میں چرچراہٹ دُور تک پھیل دوران سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی اس لیے مشابرم خان کو اطمینان تھا کہ اس سار کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ ویسے اس نے جس انداز میں اپنی جیپ ریورس کر کے اسے دوڑایا تھا، وہ انداز



ی جیپ کو غیر متوازن کر کے حادثے کا سبب بن سکتی تھی لیکن خیر گزری اور اس کی ڈرائیونگ میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہونے دیا اور وہ اسی رفتار سے جیپ چلاتا ہوا اپنی طے شدہ منزل کی طرف

خوش کن اتفاق ہی تھا کہ ایک دن قبل ہی آذر نے اسے اپنے گھر پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش ا نامی ٹورسٹ گائیڈ جو اکرم خان کے دوستوں میں سے تھا، بہت اچھا اور با اخلاق آدمی ثابت ہوا کی موت کے بعد ایک روز اتفاقاً اس کی مشابرم خان سے چائے کے ہوٹل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اس بات کا علم ہوا کہ مشابرم خان کی ماں ہنوز ہسپتال میں ہے اور وہ ایک سرائے میں سکونت اختیار ہے تو اس نے پُرزور اصرار کر کے مشابرم خان کو اپنے گھر پر ٹھہرنے کے لیے راضی کر لیا۔ آذر تنہا اس کے ایک کمرے کے گھر میں کوئی دوسرا متنفس موجود نہیں تھا اور وہ خود بھی کم ہی اپنے گھر میں ٹِک دن اسے کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر جانا ہوتا تھا۔ مشابرم خان نے اس کے خلوص اس کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اس کی گزشتہ رات آذر کے گھر پر ہی گزری تھی۔

آذر حسبِ معمول ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور جاتے جاتے گھر کی چابیاں مشابرم خان کو دے گیا مشابرم خان کے لیے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اغوا کرنے کے بعد کسی ٹھکانے تک لے جانے کا کوئی رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سارا منصوبہ بنا ہی اسی لیے سکا تھا کہ اس کے پاس ایک مناسب ٹھکانہ موجود گھروں سے ہٹ کر بنا آذر کا چھوٹا سا گھر اس کے لیے موجودہ صورتِ حال میں بہت کارآمد ثابت والا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے پہلے دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر جیپ کی پچھلی طرف پڑے رسٹ کمپنی کے مالک کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد سے ترپال میں ڈھانپ دیا تھا اور اب اسی ترپال میں لپیٹے ہوئے اسے اندر لے گیا تھا۔ اگر کسی شخص نے حرکت دیکھ بھی لی ہو گی تو یہی گمان کیا ہو گا کہ وہ کوئی سامان مکان کے اندر لے جا رہا ہے۔

مکان کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کے ہاتھ پیروں کو رسّی کی مدد سے اور ساتھ ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ سب اس نے احتیاطی طور پر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغیر بیگ، آذر کے گھر کو شناخت کر سکے یا ہوش میں آنے کے بعد شور کی راہ چلتے شخص کو متوجہ کر سکے۔ آذر کا گھر دوسرے مکانات سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود وہ اپنے پوری احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ان انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں وہاں سے گوشت کاٹنے کی تیز دھار والی چھری کے ساتھ پانی کا جگ بھی بھر کر لے آیا۔

پانی کا بھرا ہوا جگ اس نے صغیر بیگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ وہ چہرے پر ٹھنڈا پانی گرنے پر ہڑبڑی سی لے کر ہوش میں آ گیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی نشانی یہ تھی کہ اس نے پانی ڈالے جانے کے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں نہیں ہو سکا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے آواز نکالنا تو یوں بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

صورتِ حال پر وہ بے چین ہو کر بری طرح کسمسانے لگا۔

''میں تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے لیے تیار ہوں صغیر بیگ!..... لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے یہ دلانا ہو گا کہ تم غیر ضروری آوازیں نہیں نکالو گے اور میں جو کچھ پوچھوں گا، اس کا صحیح جواب دو گے۔'' اس بے چینی ملاحظہ کرتے ہوئے مشابرم خان نے گمبھیر لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش

کیں۔ جواب میں وہ شدومد سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مشابرم خان نے آگے بڑھ کر اس کے
ہوا کپڑا باہر کھینچ لیا۔ کپڑا نکلتے ہی وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

''پپ..... پانی.....'' کھانسی کے دوران ہی اس نے بہ مشکل یہ ایک لفظ ادا کیا۔ مشابرم خان
میں بچ جانے والے پانی میں سے دو گھونٹ اس کے منہ میں ڈال دیئے۔

''کون..... کون ہو تم؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا ہے؟'' پانی نے خشک حلق کو تر کیا تو اس نے

''سوال تم نہیں، میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کے جواب میں سچ بولنا ہوگا، ورنہ اپنے
تم خود ذمے دار ہو گے۔'' مشابرم خان نے اپنی آواز میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی اور
چھری کی نوک اس کے رخسار میں اس حد تک چبھوئی کہ وہاں سے خون کا ایک قطرہ نکل آیا۔

''مم..... میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں روپیہ پیسہ چاہئے تو وہ میں تمہیں دے دوں گا.....
خود جا کر نکال لو۔ میرے دفتر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے ایک سیف.....'' وہ چھری کی صرف نوک
پر ہی اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ مشابرم خان کو کوئی لٹیرا سمجھ کر از خود اسے اپنے دفتر میں موجود خفیہ
بارے میں بتانے لگا۔

''مجھے تمہارے روپے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم خود سے بک بک کرنے کے بجائے ان
جواب دو جو میں تم سے پوچھوں۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشابرم خان نے اسے ڈپٹ
سہم کر خاموش ہو گیا۔

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' مشابرم خان نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

''کسی کے لیے نہیں۔ میرا اپنا ذاتی بزنس ہے۔ اسکردو پہنچ کر اوپر پہاڑوں پر جانے والے میر
سواری، پورٹرز اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کرتے ہیں۔'' اس نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔

''میں اس بزنس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کے بارے میں بتاؤ جس
لیے تم نیاز علی کو استعمال کرتے تھے۔ اب کون نیاز علی کی جگہ یہ کام کر رہا ہے؟'' اس نے چھری کی نوک
دباؤ ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''نیاز علی جیپ ڈرائیور تھا۔ اس کا کام ٹورسٹس کو لے جانا اور واپس لانا تھا۔ ابھی سیزن زوروں پر
اس لیے میں نے ابھی تک نیاز علی کی جگہ دوسرا ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔'' صغیر بیگ نے کراہتے ہو
معصومیت سے جواب دیا جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے۔'' مشابرم خان
کا جواب سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے صغیر بیگ کے رخسار میں چبھی چھری کی نوک کو بے دردی سے حرکت
ڈالی۔ چھری کی نوک نے صغیر بیگ کے رخسار پر ڈیڑھ انچ کے قریب گہری سرخ لکیر کھینچ دی۔ اس زخم
صغیر بیگ کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی جس کو مشابرم خان نے درمیان میں ہی اس کے منہ
رکھ کر گھونٹ ڈالا۔

''سچ سچ بتاؤ کہ نیاز علی جب کسی ٹیم کو واپس لینے کے لیے جاتا تھا تو اپنے ساتھ کسے راشن پانی
کرنے کے لیے لے جاتا تھا؟ کون ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر چھپے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اکرم خان
کرنے کے علاوہ اس کی مہمان لڑکی کو اغوا بھی کیا ہے؟'' مشابرم خان نے قہر آلود لہجے میں اس سے سوال
ہوئے اس کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹا دیا۔



نہیں معلوم۔'' صغیر بیگ نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔'' مشابرم خان نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور پھر اس پر پل پڑا۔
اس پر لاتیں اور مکے برساتا جا رہا تھا۔ صغیر بیگ کا بندھا ہوا جسم اس کی لگائی گئی ہر ضرب پر تڑپتا
بے بس تھا اور اس کے پاس مار کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر کار وہ مار سہہ سہہ کر ادھ موا
اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مشابرم خان نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ صغیر بیگ
بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پانی کا خالی ہو جانے والا جگ اُٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا اور ایک بار
بھر کر کمرے میں واپس آیا۔ اس بار اس نے جگ میں موجود تمام پانی ایک ساتھ صغیر بیگ کے اوپر
ڈالا۔ ٹھنڈا پانی اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس لے آیا۔

''بولو، اب بھی سچ بتاؤ گے یا میں تمہاری اور خاطر کروں؟'' مشابرم خان نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا
سے کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوال کیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں معلوم۔'' صغیر بیگ دھاڑیں مار مار کر رونے
آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے آنسو تو بے شک بہتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ ہی
موجود تاثرات کو پڑھ کر سچ جھوٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی
مشابرم خان کو سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد اس قدر استقامت سے جھوٹ پر ڈٹے رہنا
ڈھیٹ اور پیشہ ور مجرموں کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے لیکن صغیر بیگ جس قدر نڈھال اور خوف زدہ نظر آ
اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ مجرموں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

''اگر تم نیاز علی کی حرکتوں سے واقف نہیں تھے تو یہ بتاؤ کہ وہ تمہاری کمپنی کی جیپ میں تمہارے علم میں
سامان لوڈ کر کے کیسے لے جاتا تھا؟ کیا کبھی تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب وہ کسی ٹیم کو لینے جاتا ہے تو
جیپ خالی نہیں ہوتی؟'' اس بار اس نے اپنا لہجہ ذرا نرم کرتے ہوئے صغیر بیگ سے سوال کیا۔

''نیاز علی میرا بہت پرانا ڈرائیور تھا۔ میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسے جب پہاڑوں سے اُترنے
ٹیم کو واپس لینے جانا ہوتا تھا تو وہ رات میں ہی مجھ سے جیپ لے جاتا تھا اور صبح دفتر آنے کے بجائے
گھر سے ہی روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کی کبھی کہیں سے شکایت نہیں ملی تھی اس لیے میں بھی اس معمول پر
نہیں کرتا تھا۔'' صغیر بیگ نے گویا کوئی عقدہ کھولا جس پر مشابرم خان سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا
کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے عین وقت پر صغیر بیگ کے دفتر کے سامنے سے اس لیے ہٹایا گیا
اسے خاص جیپ کی روانگی کا علم نہ ہو سکے۔ لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا
مشکوک جیپ تو صغیر بیگ کے دفتر سے روانہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس نے اتنے دن دفتر کی نگرانی کر
وقت ضائع کیا تھا۔ لیکن بہر حال یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ صغیر بیگ جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ
نیاز علی کے بارے میں دیئے گئے بیان کی تصدیق کیے بغیر اس پر مکمل بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر صغیر
تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اصل مجرم اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے
کے لیے ایسی حرکت کی تھی جس کے باعث وہ صغیر بیگ کے پیچھے پڑ جائے۔

''کیا تم پولیس والے ہو؟'' وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ صغیر بیگ کی آواز نے اسے چونکایا۔

''ہاں۔'' اُس نے اُس کے خیال کی تصدیق کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''تم نے جو
بتایا ہے، اس کے سچ جھوٹ ہونے کا پتہ لگا لیا جائے گا۔ سچ کی صورت میں رہائی اور جھوٹ کی صورت

میں قہر تمہارا نصیب ہوگا۔ تم اپنے انجام کے لیے یہاں رک کر انتظار کرو۔'' وہ ایک بار پھر صغیر بیگ کے کپڑا ٹھونس کر آذر کے گھر سے روانہ ہوگیا۔ عارضی طور پر قوتِ حرکت و گویائی سے محروم کردہ صغیر بیگ کو اسے بے فکری تھی کہ وہ یہاں سے کسی طور نہیں بھاگ سکے گا۔

⊛----✪----⊛

''یہ کافی پی لو۔ اسے پی کر تمہارے جسم میں گرمی آجائے گی۔'' عمران نے بھاپ اُڑاتا ہوا کافی کا مگ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں یاک کی پشت پر اندھیرے میں کیے جانے والے تکلیف دہ اور خطرناک سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ترک کر کے ایک پہاڑی چٹان کے سائے میں رُکے ہوئے موقع پر عمران نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بڑے سے تھیلے کو کھول کر اس میں سے مٹی کے تیل سے چلنے والا اسٹوو نکالا اور پھرتی سے کافی تیار کر ڈالی۔ کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے جو اس نے کھانے کے لیے ماہ بانو کو پیش کیے۔

''جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ وہ لوگ ہمارے فرار کے راز میں جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں ان راستوں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اس لیے وہ زیادہ تیزی سے فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔'' کافی کا بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے عمران نے بے حد صاف گوئی سے ماہ بانو کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

''تو پھر چلو، ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں موجود کپ نیچے رکھ دیا اور سراسیمگی سے بولی۔

''پہلے ناشتہ کر لو۔ اس علاقے میں سروائیو کرنے کے لیے جسم میں طاقت ہونا بہت ضروری ہے ورنہ سردی سے پہلے موسم کی سختی ہمیں ہلاک کر ڈالے گی۔ خصوصاً تمہیں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی کمزور ہو، اوپر سے قید کے دنوں اور ڈپریشن نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہے۔'' عمران نے بردباری سے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ہی قائل ہوگئی اور عمران کی پیروی کرتے ہوئے ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیزی سے حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ منٹ بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں عمران جو کہ پہلے ہی ناشتے کو نمٹا چکا تھا، ناشتے کی اشیا کے لیے نکالا جانے والا سامان واپس رکھ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ مشکل سے چند گز ہی آگے بڑھے تھے کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اگلے ہی لمحے عمران کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ اس چیخ کو سن کر ماہ بانو نے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی کہ اس کے بائیں شانے سے خون نکل کر اس کے اُونی لباس پر پھیلتا جا رہا ہے۔

''اپنا سر جھکا لو اور نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش کرو۔'' پہلی بے ساختہ چیخ کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے بھنچی ہوئی آواز میں ماہ بانو کو ہدایات دیں۔ اتنی دیر میں کچھ اور گولیاں بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر چکی تھیں۔ دشمن نے ان کی توقع سے بہت قبل اُنہیں آلیا تھا اور ان کی فرار کی کوشش کو مسدود کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران جانتا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ تعاقب میں آنے والے اس راستے پر سفر کرنے میں ان سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اب ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ رک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کریں اور ان سے جان چھڑانے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ ماہ بانو نے بھی بڑے خودکارانہ انداز میں یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ نیچے چھلانگ لگانے سے قبل اس نے



ہاتھ میں لے لی۔ عمران یقیناً اُس کی اس حرکت پر حیران ہوا ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بھی آیا کہ یہ نازک اندام لڑکی بھلا رائفل کا کیا کرے گی؟ لیکن یہ موقع کسی قسم کے سوال جواب کا نہیں تھا اس لیے وہ خاموش رہا اور اسے ایک پہاڑی کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی اس کی طرف دوڑ گیا۔ اس پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی اور یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں اب تک کسی گولی کی زد میں نہیں آئے اور پہاڑی کی آڑ لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

آڑ میں پہنچنے کے بعد عمران نے رائفل سیدھی کر کے اس سمت فائرنگ کرنا شروع کر دی جس طرف ان کے تعاقب میں آنے والے موجود تھے۔ اس جوابی فائرنگ کا کوئی خاص نتیجہ اس لیے نہیں نکل سکا کہ آنے والے اپنے تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ جاری رہی۔ ماہ بانو نے اگرچہ عمران کے پاس موجود فاضل رائفل ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ابھی تک اس نے فائر نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تعداد میں کم از کم تین سے چار ہیں۔

''وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' یکایک عمران کو احساس ہوا کہ فائرنگ پہلے کی طرح ایک سمت سے ہونے کے بجائے مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں ماہ بانو سے بولا۔ وہ جواب میں کچھ کہتی اس سے قبل ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے ان کی توجہ کھینچ لی۔ ان کی سواری کا کام دینے والا یاک اس سارے ہنگامے سے بُری طرح پریشان ہوگیا تھا اور پریشانی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا کہ دو ہی گولیوں کی زد میں آگیا تھا۔ قوی ہیکل جانور کے گولی کھا کر تڑپنے کا وہ منظر بے حد دلدوز تھا۔ گولی فوراً ہی اسے زمین بوس کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ البتہ اس زخم کو کھا کر وہ غضب ناک ہو کر بری طرح اُچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس کے بھاری قدموں کی دھمک فائرنگ کے شور کے باوجود سنی جا سکتی تھی۔

پھر اس غضب ناکی میں وہ بے قابو ہو کر بھاگا اور سیدھا اس شخص سے جا کر ٹکرایا جو رائفل اٹھائے جھکا جھکا کر فائرنگ کی کوشش کر رہا تھا۔ قوی ہیکل جانور کی ٹکر نے اسے کئی فٹ اوپر اچھالا اور پھر وہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ زمین پر آ کر گرا۔ اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کئی گز دُور جا گری اور پھر مرے پر سو دُرے کے مصداق بھاری بھرکم مشتعل یاک اُسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یاک کے اُس پر سے گزرنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کی کوئی ہڈی سالم رہی ہوگی یا وہ بعد دوسرا سانس لے سکا ہوگا۔ زخمی یاک کو بھی زیادہ سانسیں لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ طیش کے عالم میں اور تباہی مچاتا، اس سے قبل ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کے سر میں پیوست ہوگئی۔ یقیناً یہ گولی حملے کے کسی ساتھی نے اپنے بھائی بند کی موت کا انتقام لینے کے لیے چلائی تھی۔

''وہ دیکھو..... وہ راستہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اگر ہم وہاں سے اوپر چلے جائیں تو بہتر پوزیشن میں آ جائیں گے۔'' یاک کی موت کے بعد ماہ بانو نے عمران کی توجہ ایک تنگ سے راستے کی طرف مبذول کروائی۔ عمران جوابی فائرنگ میں مصروف تھا، وہ اردگرد کا جائزہ لینے کا ہی کام کرتی رہی تھی اور یہ راستہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عمران نے خود کو گھیرے جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس نے حل کے طور پر اپنے ذہن میں آنے والی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ عمران نے اس کی تجویز پر لمحے بھر کے لیے غور کیا تو اسے یہ ایک بہت ہی معقول نظر آیا۔ بلندی کی طرف جانے کے باوجود اس راستے کی خوبی یہ تھی کہ وہ دونوں براہِ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آ سکتے تھے۔ جگہ جگہ اُبھری ہوئی چٹانیں اُنہیں اوپر تک پہنچانے کے لیے بہترین آڑ فراہم

کر سکتی تھیں۔

"چلو..... ہری اَپ۔" عمران نے ماہ بانو سے کہا اور خود اس راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس
کی تھی کہ کھڑے ہو کر سیدھے چلنے کے بجائے ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طر
دُور سے دیکھ بھی رہا ہوتا تو وہ فوراً اس کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی تقلید کرتے
چڑھنے کے لیے یہی راستہ اختیار کیا۔ اب فائرنگ کی آوازیں جس طرح سے سنائی دے رہی تھیں
اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن ان کی سابقہ پناہ گاہ سے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

پھر یکایک فائرنگ رُک گئی۔ یقینی طور پر وہ لوگ عمران کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بند ہو
میں پڑ گئے تھے۔ خاموشی چھا جانے پر وہ دونوں اور بھی تیزی سے بلندی تک کا سفر طے کرنے لگے۔
کی وجہ سے ماہ بانو سے ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور اس کے پیر تلے آنے والا ایک پتھر اپنی جگہ سے
کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز نے انہیں گھیرنے کی کوشش کرنے والوں کو متوجہ کر
ایک فائر ہوا اور ماہ بانو کے منہ کے قریب چٹان کے کئی ٹکڑے اِدھر اُدھر اُڑے۔ ایک نکیلا سا ٹکڑا اُس
سے بھی آ کر ٹکرایا اور اس نے شدید تکلیف کے ساتھ پیشانی سے خون بھی نکل کر بہتا ہوا محسوس کیا
صورتِ حال میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ فائرنگ کی زد میں آنے سے بال بال بچی تھی۔ اگر اس پر فائر کرنے والے کا نشانہ نہ چوکتا تو
بجائے اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہوتے۔ اس نے بری طرح گھبرا کر خود کو ایک چٹان
میں چھپایا اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں سے فائر ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے
ساتھ ایک شخص کو نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ عمران کا کارنامہ تھا جو اس سے پہلے مطلوبہ مقام تک
ماہ بانو پر فائر کرنے والے کے نظر میں آ جانے پر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ماہ بانو نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر
جائزہ لینے لگی۔ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے والے کی موت کے بعد دوستوں سے ان پر بڑی شدت
فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے اپنے
رائفل سیدھی کی اور دائیں طرف موجود شخص کو اس کی فائرنگ کا جواب دیا۔ اسے میدانِ عمل میں اُترے
عمران کو کچھ تقویت سی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ بہت بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ ورنہ زخمی شانے
مسلسل فائرنگ کرنا اور اتنی بلندی پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد البتہ یہ فائدہ ضرور
کہ وہ بہتر پوزیشن پر آ گیا تھا اور اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حملہ آور کہاں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ بائیں
والے نے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ دائیں طرف والا ایک چھوٹی چٹان کے

عمران اِکا دُکا فائر کرتے ہوئے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی سے غلطی
جوش میں آ کر اپنی پناہ گاہ سے جسم کا کوئی عضو باہر نکالنے کی غلطی کرے تو وہ اس موقع سے فائدہ
آخر کار بائیں جانب والے نے اُسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اُس کی طرف سے فائرنگ میں وقفے کی
اس نے شاید کوئی چانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوشش اسے مہنگی پڑی اور جونہی اس کا سر
سے باہر آیا، عمران کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ بغیر آواز
ڈھیر ہو گیا۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہا تھا جس سے انہیں اپنی جان چھڑانی تھی لیکن وہ بے حد محتاط تھا
نے اپنی پناہ گاہ سے اُنگلی تک باہر نکالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی رائفل خاموش



ان کی موت کا اندازہ لگا لیا ہو گا۔

"خبیث..... بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔" یک دم ہی عمران کو احساس ہوا کہ مقابل کی طرف سے فائر تو
رہا ہے لیکن اس کی آواز دُور ہوتی جا رہی ہے۔ سو وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے پاس
ہینڈ گرنیڈ نکالا۔ اگلے ہی پل اس کے دائیں بازو نے فضا میں قوس بناتے ہوئے حرکت کی اور ہینڈ گرنیڈ
ان کا اچھا خاصا فاصلہ طے کرتا ہوا اس چٹان کے عقب میں جا کر گرا جس کے پیچھے ان کا آخری دشمن اب
چھپا رہا تھا۔

پہاڑوں میں کان پھاڑ دھماکا گونجا اور چٹان کے عقب سے مٹی اور پتھروں کے اُٹھتے طوفان کے ساتھ اس
انسانی اعضاء کو بھی اُڑتے ہوئے دیکھا۔ دل کو کپکپا دینے والے اس منظر نے وقت کے اس پل میں اسے
بے حد سکون بخشا تھا۔ کسی انسان کی ایسی عبرت ناک موت لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن یہ سچ تھا کہ جو لوگ
اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اسے ان میں سے کسی کی بھی موت کا افسوس نہیں تھا۔ ان افراد کی موت
اس کے اور ماہ بانو کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی زندگی کو بقا بخشی تھی۔ وہ جو ابھی ان پہاڑوں میں
چوہوں کی طرح مارے گئے تھے، درحقیقت خود چلتی پھرتی موت تھے..... جو اگر جیتے تو جانے کتنوں کی
ان کا چراغ گُل کر ڈالتے۔

آخری دشمن کے بھی موت کے گھاٹ اُتر جانے کے بعد عمران کچھ نڈھال سا ہو کر وہیں اپنی جگہ پر ہی
لیا۔ ماہ بانو جو کہ اس لڑائی میں کسی دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا سکی تھی لیکن عمران کی معاونت کرتی رہی تھی، امن
نے پر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

"تمہارا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔" عمران کے خون سے تر لباس کو دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا اور
اس کے قریب بیٹھ کر اس کے زخمی شانے کا معائنہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں مزید ٹھہرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آگے کا سفر
کرنا چاہیے۔" عمران نے اسے معائنے کے لیے اپنا زخمی شانہ پیش کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا اور
سے اُٹھ کر واپس نیچے کی طرف جانے لگا۔ ماہ بانو نے بھی کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اس کی پیروی
وہ دونوں انسانی لاشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی سواری کا کام دینے والے
مُردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ ان کے سامان کا تھیلا اب بھی یاک کی پشت سے بندھا تھا اور سواری سے محروم ہو
کے باوجود یہ بات خوش آئند تھی کہ یاک ایسے رخ سے گرا تھا کہ ان کے سامان کا تھیلا اس کے دیوہیکل
کے نیچے آنے سے محفوظ رہا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ دونوں کسی طور بھی اس کے پہاڑ جیسے وجود کو ہٹا
کے نیچے سے اپنا سامان نہیں نکال سکتے تھے۔

"یہ تو گیا۔ اب ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہو گا۔" یاک پر سے اپنا تھیلا اُتارتے ہوئے عمران بولا۔

"ہمارے تعاقب میں آنے والے بھی تو کسی سواری پر آئے ہوں گے۔" اس کی بات سن کر ماہ بانو نے
لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ دو یاکوں پر آئے تھے لیکن وہ دونوں یاک فائرنگ کے شور سے بدک کر بہت پہلے ہی یہاں سے
چکے ہیں۔ اگر ہم نے کسی طرح ان یاکوں کو تلاش بھی کر لیا تو ان پر قابو پا کر سواری نہیں کر سکیں گے۔"
نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور سامان کے تھیلے میں سے ایک نسبتاً چھوٹا تھیلا نکال کر اس کی
دھا دیا۔

''میں شرمندہ ہوں لیکن مجبوری ہے کہ تمہیں بھی اس سفر میں کچھ وزن اُٹھانا پڑے گا۔'' وہ یقیناً ا
شانے کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

''سامان میں دوائیں وغیرہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟'' اس کے ہاتھ سے تھیلا تھامتے ہوئے ماہ
سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ہیں بلکہ اسی تھیلے میں ہیں جو میں نے ابھی تمہیں دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر تم کچھ دیر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہارے زخمی شانے کی مرہم پٹی کروں گی
ہم آگے کا سفر کریں گے۔'' عمران کا جواب سن کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

''میرا خیال تھا کہ ہم کچھ فاصلہ طے کر لیتے پھر اس کے بعد یہ مرہم پٹی کا کام ہوتا رہتا۔'' عمران
کرنا چاہا۔

''نہیں، تم بہت زخمی ہو اور اس حالت میں تمہارا وزن اُٹھا کر ایسے ہی سفر جاری رکھنا مناسب نہیں
بانو کے انداز میں جو قطعیت تھی، اس سے عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی چنا
نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ماہ بانو نے اچھی خاصی مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کے زخمی شانے کی مرہم
اور دواؤں میں موجود ایک پین کلر اسے کھانے کے لیے دی۔ کالج میں بھی شوق میں لی جانے والی فرسٹ
ٹریننگ اس ویران برفانی پہاڑی علاقے میں کام آئے گی، اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس
اپنی تربیت کی اچھی خاصی لاج رکھتے ہوئے عمران کی ٹھیک ٹھاک قسم کی بینڈیج تو کر دی تھی لیکن اسے
اندازہ ہو گیا تھا کہ گولی اندر ہی موجود ہے اور وہ اس گولی کو نکالنے سے معذور تھی۔ اس کام کے لیے نہ تو اس
پاس مطلوبہ مہارت تھی اور نہ ہی سامان۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ
جائیں جہاں طبی سہولتیں بھی میسر آسکیں۔ پھر اس نے عمران کی معیت میں آگے کا سفر شروع کر دیا۔ ایک
سفر جس کے راستوں کا انہیں علم نہیں تھا۔ وہ، جسے ان راستوں پر چلنے کی تربیت دی گئی تھی، ایک مٹی کے
کی طرح بے جان پڑا تھا۔ ایک جانور کی موت نے انہیں سواری ہی نہیں، راہنما سے بھی محروم کر دیا تھا اور
وہ اپنا بوجھ خود اُٹھائے انجانے راستوں پر تن بہ تقدیر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

⊛----✪----⊛

''تم یہیں رُکو، اندر میں اکیلی جاؤں گی۔'' درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے بعد کشور نے اپنے ساتھ
ہوئی شادو سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن بی بی!.....وڈی چودھرائن نے تو کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔'' اس نے فوراً ہی اعتر
کیا۔

کشور کی درگاہ پر حاضری کی خواہش پر وڈی چودھرائن نے یوں تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اپنی
ملازماؤں میں سے شادو کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی کی عورتیں تنہا صرف ڈرائیور کے ساتھ کہیں
بھی نہیں تھیں۔ ایسے ہر موقع پر ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ملازمہ ضرور موجود ہوتی تھی۔ لیکن کشور جانتی تھی کہ
وقت شادو کو اس کے ساتھ بھیجنے کا مقصد روایت کی پاسداری نہیں بلکہ اس کی نگرانی ہے اور اب شادو کے
نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

''ساتھ رہنے کو کہا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے سر پر ہی سوار ہو جانا۔ یہاں تک آ گئی ہے نا، بس



حاضری کے وقت میں تجھ کو اپنے سر پر نہیں برداشت کر سکتی۔ حویلی واپس جا کر تُو وڈی چودھرائن کو بتا
ں نے تجھے باہر روک دیا تھا۔'' کشور نے سخت لہجے میں اسے جھڑک کر اپنے ساتھ اندر جانے سے
وہ عموماً ملازماؤں سے ایسا برتاؤ کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے
اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے بھی نچھی، شادو اور ان کی ماں جس طرح ہر
چودھرائن کی چمچہ گیری کرتی رہتی تھیں، اسے ان سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔

''یہ مجھے دے۔'' شادو جھڑکی سن کر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع
اس نے اس کے ہاتھ میں موجود بڑا سا تھال خود تھام لیا اور حسبِ قاعدہ پیروں سے چپل اُتار کر اس
ہال میں داخل ہو گئی جس کے بالکل وسط میں اس کے دادا چودھری مراد عالم شاہ کی قبر بنائی گئی تھی۔
انداز دیکھتے ہوئے شادو ہمت نہیں کر سکی تھی کہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو۔ اس نے اندر پہنچ کر
کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ قیمتی سنگِ مرمر لگی دیواروں والے اس ہال کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔
مقامات پر لگے بلبز کے علاوہ عین قبر کے اوپر موجود بڑے سے فانوس کی دودھیا روشنی نے ماحول میں
سا تقدس بھرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس کو تقویت دینے کے لیے وہ خوشبوئیں بھی اہم کردار
تھیں جنہیں قبر پر موجود چادر کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا گیا تھا۔

سادہ لوح، اَن پڑھ دیہاتی یہ سب دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دینی تعلیم و شعور سے
ذہن اندھی عقیدت کے تاریک گڑھے میں بھٹکنے لگتے تھے۔ لیکن کشور کے لیے یہ سب کچھ کسی ڈرامے
سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ جس شخص کی تربیت نے اس کے باپ جیسے شیطان صفت
دیا ہے، وہ خود اخلاقی اعتبار سے کس قدر پستی میں ہو گا۔ ایسے شخص سے کسی بھی قسم کی عقیدت کو
کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یوں بھی اس کا شعور اسے قبروں کی پوجا سے روکتا تھا چنانچہ وہ اس سارے
سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر سپاٹ سے انداز میں چلتی ہوئی قبر کے قریب پہنچی اور اپنے ہاتھ میں
تھال اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس تھال میں جلتا ہوا دیا، سبز رنگ کی قیمتی چادر، گلاب کے پھول، خشک
اور نذرانے کی موٹی رقم موجود تھی۔

درگاہ پر حاضری کے لیے آنے والوں کے لیے مثال قائم کرنے کی خاطر حویلی کے مکین وقتاً فوقتاً اسی اہتمام
یہاں آتے رہتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے کہ
کا اہتمام کر سکیں۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اپنے ساتھ نذرانے کے لیے جو کچھ بھی لاتا، درگاہ
اسے فوراً قبضے میں لے لیتے۔ لیکن چونکہ اس وقت چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی وہاں حاضری دینے
اس لیے کسی خادم کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس ہال میں رک سکے۔ اس کی وہاں موجودگی تک دیگر
مندوں کا بھی وہاں آنا ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں تو درگاہ کے احاطے میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بی
اپنے دادا کی قبر پر چڑھاوا چڑھا کر واپس جاتی تو پھر عام لوگ اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور حاجات
کے لیے یہاں قدم رکھ سکتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ کشور بی بی کا یہاں سے واپس حویلی لوٹنے کا
کرام ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نئی دنیاؤں کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر کے حویلی سے نکلی تھی،
رانوں سے بھرے تھال کو قبر کے سرہانے پٹخنے کے بعد پھرتی سے چلتی ہوئی ہال کے اس دروازے کی
جو دوسری سمت میں موجود تھا۔

س وغیرہ کے موقع پر جب درگاہ پر لوگوں کا بے حد رش ہوتا تھا، صرف ایک دروازہ کافی نہیں ہوتا تھا۔

لوگ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کو روندنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس ہ
پانے کے لیے ہال کی چار دیواروں میں ایک ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں تین دروازے
تھے اور صرف وہ ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا جس سے گزر کر کشور اندر داخل ہوئی تھی۔ اپنے باہر نکلنے
اس نے تین بند دروازوں میں سے اس دروازے کا انتخاب کیا تھا، جو درگاہ کی عقبی دیوار سے سب
نزدیک تھا۔

دروازے کی موٹی کنڈی اندر سے بند تھی لیکن اس پر کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کشور نے ہاتھ
کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی سختی سے بند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں
ہے۔ شاید بہت کم استعمال ہونے کی وجہ سے کنڈی جام ہوگئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا
کھولنے کی کوشش کی۔ زیادہ طاقت کے استعمال سے کنڈی نے تھوڑی سی حرکت کی تو ضرور کی لیکن سا
کا شور بھی بلند ہوا۔ یہ شور کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا، خصوصاً باہر شادو کی طرف سے اسے خطرہ تھا
شک اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن کان اسی طرف لگا کر کھڑی ہوگی کہ کوئی بھی غیر معمولی
تو فوراً اس کے علم میں آسکے۔

اس نے کنڈی پر زور لگانا چھوڑ کر لمحہ بھر کے لیے اس مسئلے کا حل سوچا اور پھر پلٹ کر قبر کی طرف
سرہانے رکھے تھال میں موجود دیا ہنوز جل رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور تھال سے اٹھا
ہاتھ میں لے لیا۔ دیا ہاتھ میں لیے وہ واپس دروازے کی طرف آئی اور اس میں موجود تیل کنڈی پر ڈا
کنڈی کو تیل دینے کے بعد اس نے تقریباً تیس سیکنڈ تک انتظار کیا اور ایک بار پھر اس پر طبع آزمائی کر
اس بار کنڈی نسبتاً آسانی سے اور کم شور کے ساتھ حرکت کرنے لگی۔

اس نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری کنڈی کھلنے تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا۔ اس
مشقت پر اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا چنانچہ وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کنڈی کھلی تو اس
حد احتیاط سے زور لگا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی شام کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے
کنڈی کھلنے کی مشقت میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرا
نے بڑی فرحت محسوس کی اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے قدم باہر رکھ دیئے۔

مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ماحول اتنا روشن نہیں تھا۔ شام کے اُترتے سایوں نے دن کی
شکست دینا شروع کر دی تھی۔ درگاہ کے احاطے کی لائٹیں بھی فی الحال روشن نہیں کی گئی تھیں اس لیے
اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ نیم تاریکی ایک نعمت کے مانند تھی۔ وہ محتاط قدموں سے چلتی ہوئی
دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے آفتاب نے یہیں تک کے ایکشن کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔
مطابق آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیتا۔ وہ اپنے حصے کا کام کرنے کے بعد کچھ ہراساں سی عقبی احا
کھڑی تھی کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا۔

''کشور بھابی! آئیں، میرے ساتھ آجائیں۔'' اس پکار پر وہ چونک کر پلٹی تو افضل کی جانی پہچانی
آئی۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ بنا کوئی سوال
کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔

''یہاں سے باہر نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑی سی زحمت کرنی
ویسے دیوار زیادہ بلند نہیں ہے۔ آپ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر آرام سے اس پر چڑھ سکتی ہیں۔'' وہ چند قدم



قریب پہنچے تو افضل نے اس سے کہا۔ کشور جو دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑے آدمی کو دیکھ کر اُلجھ گئی
بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ زمین پر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ بے ہوش
مخصوص سبز لباس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ درگاہ کا کوئی خادم ہے، جو یقیناً اس طرف
فریضہ انجام دے رہا تھا اور افضل کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا ہے، وہ افضل کی ہدایت کے مطابق
پر چڑھ گئی۔

دیوار پر چڑھی تو افضل پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اچک کر خود بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف
اتر گیا۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد اس نے کشور کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار لیا۔ احاطے کی
طرف دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگوں کا عموماً اس طرف گزر نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ
سنسان ہی پڑی رہتی تھی، اسی لیے کشور کے فرار کا منصوبہ بناتے وقت اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کشور
کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے اور گاڑی کی عقبی نشست پر ایک نقاب پوش عورت بھی موجود ہے۔
کے بارے میں اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ افضل کی بیوی مہتاب ہے۔ افضل نے گاڑی کا عقبی
کھول کر اسے اندر بٹھایا تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مہتاب نے والہانہ انداز میں اسے
سے لگا کر پیار کرتے ہوئے سلام کیا جس کا کشور نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ البتہ افضل ان دونوں
سے بیکسر انجان بنا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب اس کی گاڑی فراٹے بھرتی
بڑھ رہی تھی۔ کشور جو پہلے ہی خود کو چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی، تھوڑا سا اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ
وہ لوگ گاؤں کی حدود میں موجود تھے چنانچہ اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ
مہتاب کی سلامتی کے لیے بھی پریشان تھی۔

کسی کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہ اسے لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں تو اس سے پہلے ان لوگوں
انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ زیر لب دعائیں مانگتے ہوئے، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ سارا
کیا۔ مہتاب اور افضل کی خاموشی سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ لوگ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ کشور کو
نکال کر لے جانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ان کا اعصاب زدہ ہونا کچھ ایسا
نہیں تھا۔

آفتاب کہاں ہیں؟ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟'' گاڑی پیر آباد کی حدود سے کافی آگے
سڑک تک پہنچی تو کشور نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بہت دیر سے ذہن میں اٹکا ہوا سوال دھیمی
مہتاب سے کیا۔

آفتاب کو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے کسی بھی طرح کے شک سے محفوظ رہنے
ضروری ہے کہ وہ یہیں سب کی نظروں کے سامنے موجود رہے۔'' دھیمی آواز کے باوجود اگلی نشست پر
نے اس کا سوال سن لیا تھا چنانچہ خود اسے جواب دیا۔

ہمیں یہاں سے نکال کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے تم دونوں کے مستقبل کی سلامتی بھی
رکھتی ہے، چنانچہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساری منصوبہ بندی کی
نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ پُرخطر تھا۔ افضل نے دماغ لڑا کر اس کی خطرناکی کو ذرا کم
کوشش کی ہے۔ میں اور افضل اس وقت تنہا پیر آباد نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور گاڑی میں
دوسرے نمائندے موجود تھے جو افضل کے ایما پر پیر آباد اور اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں

ہونے والے ترقیاتی کاموں پر ایک رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔ وہ لوگ چینل کی گا
آئے ہیں جبکہ ہم نے یہ کار کرائے پر لے لی تھی۔ چینل کے جو نمائندے ہمارے ساتھ آئے ہیں، انہیں
اس منصوبے کا کچھ علم نہیں۔ افضل نے ان سے کہا تھا کہ میری بیوی کو دیہاتی زندگی دیکھنے کا بہت شوق
اس دورے پر میرے ساتھ جانا چاہتی ہے اس لیے میں آپ کی گاڑی کے بجائے الگ گاڑی میں چلوں
لوگوں کو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ پروگرام چونکہ سارا افضل نے ترتیب دیا تھا، اس لیے ہمیں آ
تم سے طے کیے گئے وقت کے مطابق درگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس مجھے ذرا
کرنی پڑی۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے مہتاب دھیرے سے ہنسی۔

''ایکٹنگ.....وہ کیوں؟'' کشور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے اپنی قبل از وقت روانگی کے لیے کوئی بہانہ چاہئے تھا چنانچہ میں نے عین
ڈرامہ شروع کر دیا کہ میرے گردے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ افضل نے اپنے ساتھیوں سے معذرت
مزید ان کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انہیں اپنی وائف کو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ بس پھر ہم بہانے
سے نکل آئے۔ تمہارے میاں جی البتہ گھرے ہوئے تھے میڈیا والوں کے درمیان اور انہیں بتا رہے
طرح ان کا اسکول ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ میں آتے آتے ان چھپے رستم کو آنکھ مار کر آئی ہوں۔
بڑے جھینپے لیکن سب کے سامنے مجھے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔'' مہتاب نے اپنی بات کے اختتام
زوردار قہقہہ لگایا۔ جوں جوں وہ لوگ فاصلہ طے کرتے جا رہے تھے، اعصابی تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا
حرکات وسکنات اور رویے میں واضح فرق نظر آ رہا تھا۔

''منصوبہ تو واقعی آپ لوگوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ اگر آپ لوگ چینل والوں کے ساتھ
بجائے ایسے ہی آ جاتے تو گاڑی کی وجہ سے فوراً ہی ابا جی کے کارندوں کی نظر میں آ جاتے اور پھر وہ
کی یہاں آمد کا مقصد جانے بغیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔'' کشور جو اس کی بات پر خود بھی دھیرے
تھی، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

''اس منصوبے سے ہمیں ہی نہیں، آفتاب کو بھی بہت سیفٹی ملے گی۔ جس وقت آپ کے گاؤں
ہونے کا واقعہ پیش آیا ہے، وہ مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ پھر چینل والوں کی موجودگی
فائدہ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے بیشتر لوگ ٹی وی والوں کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمیں میدان
گیا۔'' افضل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس سارے معاملے کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

''میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں افضل بھائی! آپ اور مہتاب بھابی اتنا ساتھ نہیں دیتے تو
مشکل میں پڑ جاتی۔'' کشور کی آنکھوں میں یک دم نمی اُتر آئی۔

''بے وقوف.....اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے؟ تم ہمارے لیے چھوٹی بہنوں جیسی
مشکل گھڑی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے، یہ کیسے ممکن تھا؟'' مہتاب نے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

''مہتاب ٹھیک کہہ رہی ہے بھابی! ویسے بھی مجھے تو لڑکی بھگانے کا پرانا تجربہ ہے۔ ضرورت
تجربہ میرے دوست کے کام آ گیا تو اس میں کیا حرج ہے؟'' افضل نے بھی شوخ لہجے میں بولتے ہو
کی اُداسی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''فضول نہ بولیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم بلاوجہ کسی لڑکی کو اس کے گھر سے نکلنے کی ترغیب دیں۔
کشور کے کیس میں صرف محبت گھر چھوڑنے کا سبب نہیں بنی ہے۔ ہم دونوں ایسی خواتین ہیں جنہیں



ں کی محبت اور اعتماد حاصل ہوتا تو ہم ہرگز گھر کی دہلیز پار نہیں کرتیں لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے
ی حقوق سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہ قدم اُٹھانا پڑا۔'' مہتاب نے افضل کی بات
ا مانتے ہوئے فوراً ہی اُسے ٹوکا۔

''سوری بیگم صاحبہ! آپ تو برا ہی مان گئیں۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا
ے دل میں تمہاری جتنی قدر ہے، اس کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں کہ میں تمہارے لیے کوئی غلط لفظ
ں کروں۔'' افضل نے جلدی سے معذرت کی۔

''مجھے معلوم ہے افضل!.....آپ صرف مذاق کر رہے تھے لیکن صرف اپنی مرضی سے میکے کی دہلیز پار
ے والی عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس بات سے ڈرتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسے
ی ہوئی عورت'' کا طعنہ نہ دے دے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات کا برا مان گئی تھی۔''
ے اس کی معذرت سن کر اداس سے لہجے میں اپنے رویے کی وضاحت کی تو کشور کا دل بھی عجیب سی
ں بھر گیا۔

اداسی کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے موضوعِ گفتگو بدلا اور مہتاب کو مخاطب کرتے ہوئے
''یہ تو بتائیں بھابی! کہ آپ کے وہ دونوں بلونگڑے کہاں ہیں؟ آپ دونوں سیر کرنے کے لیے نکلے ہوئے
ں کہاں چھوڑا ہے؟''

''وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔ میں نے کام والی کو ایکسٹرا پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ آج
ک ہمارے گھر پر بچوں کے ساتھ رک جائے۔ اچھی اعتماد کی عورت ہے، میرے کہنے پر فوراً راضی ہو گئی۔
ں اس سے مانوس ہیں اس لیے آرام سے اس کے ساتھ رک گئے۔ اب ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر
ے تو خوب خوش ہوں گے کہ چچی آئی ہیں۔ وہ بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔ اصل میں بے چارے ننھیال،
ں دونوں سے ہی محروم ہیں اس لیے کوئی بھی بھولا بھٹکا مہمان گھر آ جائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔''
ابھی تک مکمل طور پر اُداسی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔

''چلیں اب تو مہمان بلائے جان بن کر آپ کے گھر میں نازل ہو رہے ہیں۔ جانے کتنا عرصہ مجھے آپ
یا قیام کرنا پڑے۔ بچوں کا خوش ہو ہو کر بھی دل بھر جائے گا۔'' کشور کی اپنی کیفیت اندرونی طور پر مہتاب
ا تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اسے اُداسی کے حصار سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''خوامخواہ.....تم کیوں ہونے لگیں بلائے جان؟ ذرا ہمارے ساتھ رہ کر تو دیکھو پھر دیکھنا ہم تمہیں کیسے
ا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔'' حسبِ توقع مہتاب اسے ٹوکتے ہوئے اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی۔

''اب یہ تو آزمانے پر ہی معلوم ہوگا۔'' کشور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ جواباً وہ اسے مصنوعی غصے سے
نے لگی اور پھر یک دم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ایک ایسی ہنسی جس میں زندگی اور اُمید تھی۔

⊛----✪----⊛

ی چودھرائن کے سامنے کھڑی شادو بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شدید خوف کے باعث اس میں
ا تھا کہ وڈی چودھرائن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ وہ بس نظریں جھکائے کھڑی اس کی گھن گرج سن

''جانتی ہے تیرا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ میں نے تیرے ذمے ایک کام لگایا تھا اور وہ بھی تجھ سے نہیں کیا

گیا۔ اپنا منحوس بُوتھا لے کر میرے سامنے آ گئی ہے کہ کشور بی بی درگاہ سے کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ میں
ہوں کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو گئی؟ تُو نے بھنگ پی رکھی تھی جو تجھے اتنی وڈی گڈی
جانے کا پتہ نہیں لگا؟'' اس پر گرجتی چودھرائن درحقیقت اندر سے خود لرزاں تھی۔ چودھری کی غیر موجود
حویلی کے اندرونی معاملات کلی طور پر اس کے ذمے ہوتے تھے۔ ایسے میں کشور کا غائب ہو جانا خود
لیے باعثِ عتاب بن سکتا تھا۔

''میں تو پورا ٹیم (ٹائم) ہوشیار ہی کھڑی تھی وڈی چودھرائن جی!..... پر آپ کے حکم کے مطابق
کے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر باہر رُکنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ
درگاہ میں سے غائب ہو جائیں گی۔ میں تو بڑی دیر تک باہر کھڑی ان کے اندر سے نکلنے کا ہی انتظار کرتی
وہ تو جب درگاہ کے خادموں میں شور مچا کہ ان کا ایک ساتھی باہر بے ہوش پڑا ہے اور درگاہ کا پچھلا دروا
ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً اس دروازے سے اندر گئی، پر کشور بی بی کا اندر نام ونشان نہیں تھا۔ چ
تھال جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں، وہ ادھر ہی تھا لیکن بی بی کا کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کسی سے بی بی کے
میں تو پوچھ نہیں سکتی تھی کہ اس میں حویلی کی بدنامی تھی۔ میں آپ ہی ساری درگاہ میں گھوم پھر کر بی بی
کرتی رہی پر وہ اندر تھیں ہی نہیں۔'' شادو نے وہ ساری تفصیلات جن سے وہ حویلی پہنچتے ہی وڈی چودھ
آگاہ کر چکی تھی، ایک بار پھر دہرائیں۔

''ڈرائیور سے کیا کہا تھا تُو نے کہ بی بی تیرے ساتھ واپس حویلی کیوں نہیں جا رہی ہیں؟''
چودھرائن نے اسے گھورتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ بی بی ابھی کچھ دیر اور درگاہ پر رُکیں گی۔ مجھے انہوں نے حویلی میں
بتایا ہے اس لیے مجھے حویلی لے چل۔ بی بی کو لینے کے لیے وڈی چودھرائن بعد میں دوسری گڈی بھیج دیں
شادو کا جواب سن کر وڈی چودھرائن نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی
لکیروں کا جال اس کے گہرے تفکر کا پتہ دے رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے ساتھ کشور کی سگی ماں
ناہید بھی موجود تھی لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھنے کے علاوہ کسی بھی قسم کے ردِعمل سے محروم
کے اس طرح سے غائب ہو جانے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گم کر دی تھیں۔ وہ جانتی
کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بیٹی کے اس فعل کی سزا اسے بھی بھگتنی ہو گی۔

''نچھی کہاں ہے؟ اس کو یہاں بلا کر لا۔'' وڈی چودھرائن کی پیشانی پر پھیلی لکیریں کچھ کم ہوئیں تو
شادو کو حکم دیا۔ وہ تیر کی طرح اس حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔

''اب سر پکڑ کر بیٹھی ہو، اگر پہلے ہی دِھی کی لگامیں کھینچ کر رکھی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہیں
مجھے تو بہت دنوں سے کُڑی کی حرکتیں شک میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اپنے طور پر کوشش بھی کی کہ اصل معا
کھوج لگا سکوں، پر تیری دِھی تھی وڈی ہوشیار۔ میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک گئی۔ ویسے بھی میں اکیلی
کون کون سے دھندے نبیڑوں۔ حویلی کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر ہے۔ تم تو ساری حیاتی
ہی کرتی رہیں۔ نہ کوئی ذمے داری سنبھالی، نہ ہی اپنی اولاد۔ کچھ نہیں، اپنی اولاد کو ہی دیکھا ہوتا تو آج
سر پر کھڑی نہ ہوتی۔ اب بتاؤ، چودھری صاحب کو کون جواب دے گا؟ وہ تو جان کھا جائیں گے ساروں کی۔

شادو کے باہر نکلنے کے بعد وڈی چودھرائن نے چودھرائن ناہید کے لتے لینا شروع کر دیئے۔ شادو
درگاہ سے واپس لوٹنے کا معاملہ ابھی ان تینوں کے ہی درمیان تھا اور بات وڈی چودھرائن کے کمرے



کسی کو کچھ معلوم ہو جاتا تو حویلی کی عزت خاک میں مل جاتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر بے حد چراغ پا
اور وڈی چودھرائن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔

کچھ کر وڈی آپا! کسی طرح اُس نانجار کو ڈھونڈ کر واپس حویلی لاؤ، ورنہ چودھری صاحب تو میری
سے اُکھاڑ ڈالیں گے۔'' سوکن سے ڈانٹ کھانے کے بعد بجائے برا ماننے کے چودھرائن ناہید
ماجت کرنے لگی۔

تو وہ میری بھی اُکھیڑ دیں گے۔ بس اب تُو دعا کر کہ کسی طرح یہ ماملہ نبٹ جائے ورنہ پھر چودھری
امریکہ فون کر کے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی تو میں اس کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ
کے غائب ہو جانے کی خبر نہ ہو سکے۔ کُڑی کو تو بعد میں چودھری صاحب ڈھونڈ ہی نکالیں گے لیکن
کی عزت بچانا سب سے اہم ہے۔'' وڈی چودھرائن کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔ وہ اپنی بات
ہی ہوئی تھی کہ شادو، نچھی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چودھرائن جانچتی ہوئی نظروں سے نچھی کا جائزہ
پھر کچھ مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

کی الماری میں سے کوئی چنگا سا جوڑا نکال کر پہن لے اور چپکے سے درگاہ پہنچ جا۔ وہاں سے شادو
کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ اپنا منہ چنگی طرح چھپا لینا۔ ڈرائیور کو خبر نہ ہونے پائے کہ تُو کشور
ہے۔'' اس نے نچھی کو حکم دیا تو دونوں بہنیں سمجھ گئیں کہ وڈی چودھرائن کشور کے غائب ہونے کے
چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ کشور درگاہ سے واپس لوٹ آئی ہے۔

وڈی چودھرائن!'' کہتی ہوئی وہ دونوں حکم کی تعمیل کے لیے باہر نکل گئیں۔ ان کے باہر جانے کے
چودھرائن نے ایک ملازمہ کے ذریعے منشی کو طلب کیا اور خود ملاقات کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پردے
اس کا منتظر تھا۔

منشی! تجھے گاؤں کی کچھ خبر ہے؟ گاؤں میں کوئی نئی گل ہوئی ہے تو مینوں بتا۔''

کوئی خاص گل تو نہیں ہوئی چودھرائن جی! بس آج ٹی وی والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے
جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فلم تیار کریں گے۔ اسی اے سی نے بھیجا ہو گا، انہیں
کے لئے۔'' منشی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

اور اس ماسٹر کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ گاؤں میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟'' چودھرائن کو کشور اور
کے تعلقات کے بارے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے شک سا رہتا تھا اس لیے اس
کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

تو گاؤں میں ہی ہے جی۔ وہ تو ہے ہی اے سی کا چمچہ..... آج وہ کیسے گاؤں سے کہیں جا سکتا تھا۔ لگا
وی والوں کے سامنے اے سی کی تعریفیں کرنے میں۔'' منشی نے رپورٹ دی تو چودھرائن پر مایوسی
نے لگی۔ اس کے حساب سے تو اگر کشور غائب تھی تو آفتاب کو بھی منظر سے غائب ہونا چاہئے تھا۔

ہے منشی!..... تُو جا۔ اور ہاں، اردگرد نظر رکھنا۔ چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں تجھے ہی ہر
نگاہ رکھنی ہے۔'' وہ منشی کو ہدایت دیتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔ اب اسے نچھی اور شادو کا انتظار تھا۔
چودھری کو امریکہ فون کر کے اس حادثے کی اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ اس کی
کے مطابق ایکشن لے سکے۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود سے اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں وڈی چودھرائن جی!'' ابھی اسے ملاقاتی کمرے میں واپس آئے۔

پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔ وہ تیزی سے منشی سے ملنے کے
کوئی نئی خبر مل جائے۔

''معافی چاہتا ہوں وڈی چودھرائن! گل تو اتنی خاص نہیں کہ میں آپ کو پریشان کرتا لیکن فیر
کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔''

''کیا گل ہے؟''

''ابھی ابھی درگاہ کا ایک خادم میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں کسی نے پچھلی طرف
والے خادم کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا، کسی کو سمجھ نہیں آیا۔ لیکن میں اس لیے
کہ مجھے خبر ملی تھی کہ آج کشور بی بی درگاہ گئی ہوئی ہیں۔'' اس کے پوچھنے پر منشی نے وہ اطلاع دی جو
پہلے ہی اس تک پہنچ چکی تھی۔

''کشور کے لیے پریشان نہ ہو۔ شادو ڈرائیور کے ساتھ اسے لینے گئی ہوئی ہے، ابھی واپس
لیکن یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرو کہ وہ کون تھا جس نے خادم کو بے ہوش کیا۔'' چودھرائن، منشی کو
ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئی جہاں چودھرائن ناہید ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی
نظر انداز کر کے وہ اپنی وسیع و عریض مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شادو واپس پہنچ گئی۔

''میں نے نچھی کو کشور بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا ہے وڈی چودھرائن! آپ بتائیں میرے
حکم ہے؟'' چودھرائن کی خود پر جمی نظروں سے گھبرا کر اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ آگے کے
ہدایت چاہی۔

''چنگی گل ہے۔ اب ایسا کر کہ نچھی سے بول کہ واپس اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جائے۔ فیر
بہنیں تہ خانے کے دروازے پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی آ رہی ہوں۔''

''چنگا وڈی چودھرائن!'' اس کا حکم سن کر شادو مستعدی سے بولتی ہوئی پلٹی۔

''گل سن.....'' چودھرائن نے اسے پکارا۔

''جی وڈی چودھرائن!'' شادو نے فوراً اس کی پکار کا جواب دیا۔

''تم دونوں بہنوں کے علاوہ اور کس کس کو اس معاملے کی خبر ہے؟'' اس کو اندر تک اُتر جانے والی
سے گھورتے ہوئے چودھرائن نے دریافت کیا۔

''کسی کو نہیں چودھرائن جی! ہم نے تو اپنی اماں کو بھی ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔''

''ٹھیک ہے، فیر تُو جا اور نچھی کو اپنے ساتھ لے کر تہ خانے تک پہنچ۔'' اس حکم کی شادو نے پھرتی
کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں تہ خانے کے راستے پر پہنچ گئیں اور سہمی ہوئی وڈی چودھرائن کا انتظار
لگیں۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے وڈی چودھرائن کو چابیوں کے گچھے کے ساتھ وہاں آتے

''تالا کھول۔'' اس نے چابیوں کا گچھا شادو کو تھمایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے گچھا تھام کر چودھ
نشان دہی کردہ چابی سے تالا کھول دیا۔ پھر اس کے اشارے پر دونوں بہنیں سیڑھیاں اُتر گئیں۔ خود
بھی اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالے ان کے پیچھے تھی اور بری طرح ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اُتر رہی
کوٹھریوں پر مشتمل اس تہہ خانے میں پہنچ کر اس نے شادو کے ہاتھ سے ہی ایک کوٹھری کا دروازہ کھلوا
اس سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے دونوں بہنوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں جواب کسی
کو یہاں تک لائے جانے کا مقصد سمجھ گئی تھیں، اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے پیروں میں گر گئیں



ہمیں معافی دے دیں چودھرائن جی! ہمیں اس کال کوٹھری کی سزا نہ دیں۔'' چودھرائن کے قدموں سے
وفاداری کرتے ہوئے اس سے استدعا کرنے لگیں۔

''او رہو نمک حرامو! تمہاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ اب کیا دوسری غلطی میں کروں اور تمہیں
دوں کہ تم لوگوں کے سامنے سب بکتی پھرو۔'' چودھرائن نے اپنی بھاری ٹانگ ان دونوں کو رسید
ہوئے پیچھے دھکیلا۔

''ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے وڈی چودھرائن! ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔ ہماری ماں
ساری حیاتی آپ کی خدمت کی ہے اور ہم بھی ہمیشہ آپ کی خدمت کریں گے۔'' اب وہ دونوں اپنے
اپنی خدمتوں کا واسطہ دیتے ہوئے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''تمہاری خدمتوں کا ہی خیال ہے جو میں تمہیں صرف اس کوٹھڑی میں قید کر رہی ہوں۔ کوئی اور ملازمہ
کرتی تو میں اس پر کتے چھڑوا دیتی۔ اب بھی تم نے زیادہ شور مچایا تو فیر مجھے اسی طریقے سے تمہارا منہ
پڑے گا۔'' چودھرائن کی دھمکی اتنی خطرناک تھی کہ دونوں بہنوں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔
اس اندھیری کوٹھری میں داخل ہو گئیں۔ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دوسروں کے خلاف سازش کر
کا قرب حاصل کرنے سے کامیابی نہیں ملتی کیونکہ جن کو ظلم کی عادت ہو، وہ رحم بھی ایسے کرتے ہیں کہ
ظلم سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

⊛----✪----⊛

''لنڈا!..... مائی ڈارلنگ! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تمہاری قربت میں کیسا جادو ہے۔ میں اس سے پہلے بھی
نیویارک آیا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے نیویارک اتنا حسین کبھی نہیں لگا جتنا کہ اب لگ رہا ہے۔ میرا
ہے کہ اپنا ویزا بڑھوا کر مزید کچھ عرصہ یہاں رک جاؤں۔'' چودھری کی اُنگلیاں لنڈا کے عریاں بازو پر
رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے شراب و شباب کا نشہ چھلکا پڑ رہا تھا۔

''ویزا تو آپ کا ابھی کافی باقی ہے چودھری صاحب! لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی
روانہ ہو جائیں۔ آپ یہ مت سمجھئے گا کہ آپ کی میزبانی کرنا ہمیں بھاری پڑ رہا ہے مگر وہاں پاکستان میں
ام ہیں جن کے لیے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ لنڈا کا کیا مسئلہ ہے، یہ خود آپ سے ملنے وہاں آ
گی۔''

ڈیوڈ کی بے وقت انٹری نے چودھری کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا لیکن اس کا آخری
یا تھا کہ اس نے ڈیوڈ کی بات کی سختی کو کچھ کم کر دیا اور چودھری دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''اگر لنڈا وہاں آ گئی تو پھر تو ہمیں اپنا پیر آباد آپ کے نیویارک سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے گا۔''

''آپ نے خوب پٹری بدلی ہے چودھری صاحب! پیر آباد سے نکلے تھے تو ماہ بانو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا
لنڈا میں یوں کھوئے ہوئے ہیں کہ ماہ بانو بالکل بھول گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے چھیڑا۔

''وہ بالکل الگ معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ! لنڈا سے ہمیں عشق ہو گیا ہے جبکہ ماہ بانو ہماری ضد ہے۔ اس لڑکی
ماری انا کو للکارا ہے۔ ہم جب تک اسے خاک میں نہیں ملائیں گے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔'' چودھری نے
ت انداز میں جواب دیا۔

''چلیں آپ پاکستان واپس پہنچیں، آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ ہماری طرف سے ہماری

دوستی کا ثبوت ماہ بانو کی شکل میں آپ تک پہنچ جائے گا اور لنڈا تو ہے ہی آپ کی۔ جب آپ ا
گے، تب یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔'' بلتستان کے پہاڑی کیمپ کے انچارج نے ابھی تک
فرار کی خبر ڈیوڈ تک نہیں پہنچائی تھی اور فی الحال اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مفرور ماہ بانو اور عمر
نکالے اس لیے ڈیوڈ بڑے پُراعتماد لہجے میں چودھری کے سامنے دعویٰ کر رہا تھا۔ درحقیقت پہلے تو
نیت ماہ بانو پر خراب ہوئی تھی۔ مشرقی حُسن کا نمونہ ماہ بانو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھا گئی تھی۔

پہلی بار اُس نے اُسے اس وقت بشام ہوٹل کے باہر دیکھا تھا جب وہ ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم
وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ شہریار کے ساتھ تھی اور چونکہ وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو رہا
اس کی طرف ایک فلائنگ کِس اُچھال کر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اتنا مصروف رہا کہ اسے ماہ
بھی نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جا کر ہائیکنگ کے بہانے وہ ان پہاڑوں کے
اور مختلف جغرافیائی حالات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ انجینئرنگ کی
اور تنظیم کی طرف سے دی گئی تربیت کی وجہ سے اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ سیر
ایڈونچر کے بہانے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اس نے کئی اہم اور قیمتی نقشے تیار کر لیے تھے جو
کی اپنی تنظیم کے پاس ریکارڈ میں موجود تھے بلکہ وقتاً فوقتاً وہ ان معلومات کا بھارتی سیکرٹ سروس ''را''
تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ان معلومات کی فراہمی کے عوض ''را'' کو بھی ان کے لیے خدمات انجام
تھیں۔ لیکن چونکہ یہ خدمات پاکستان مخالف سرگرمیوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اس لیے ''را'' والے
خاموشی سے ان کا یہ کام کر دیتے تھے۔

بعض اوقات معلومات کی اس فراہمی پر وہ لوگ صرف پاکستان کے خلاف کارروائی کرنے پر
نہیں کرتے تھے بلکہ نقد معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اپنی پاکستان دشمنی میں بھارتی حکومت کو یہ سودا
نہیں لگتا تھا کیونکہ ''موساد'' سے حاصل کردہ معلومات انہیں پاکستان کے خلاف شرانگیز کارروائیاں کرنے
مدد دیتی تھیں۔ ''موساد'' کا اہم ترین ایجنٹ ڈیوڈ اپنے پاکستان کے دوروں پر نہ صرف یہ معلومات جمع
بلکہ ''موساد'' ہی کی پالیسی کے تحت قائم کردہ ایک مذہبی انتہا پسند تنظیم جو درحقیقت دہشت گردی کی کارروا
میں ملوث تھی، اس کے مختلف مراکز کا دورہ بھی کر ڈالتا تھا۔ اس بار بھی اس نے پہاڑوں پر موجود خفیہ
دورہ کیا تھا اور وہاں کے انچارج سے زیرِ تربیت افراد کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے علاوہ
اور بارود کی مزید فراہمی کے بارے میں بھی ان کی ضروریات کے بارے میں جان کر آیا تھا۔ یہ ہتھیار اور
فوڈ سپلائی کے ساتھ ہی چھپا کر کیمپ تک بھیجے جاتے تھے لیکن انہیں لے جانے والے جیپ ڈرائیور
بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ اچھے معاوضے کے عوض ایک بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا
خوشی انجام دے دیا کرتے تھے۔

ڈیوڈ اپنے معمول کے کامیاب دورے سے واپس لوٹ رہا تھا جب اس نے ہوشے میں ماہ بانو کو
پھر دیکھا۔ اس موقع پر وہ مخصوص پہاڑی لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی اور بشام کے باہر نظر آنے والی
کے مقابلے میں خاصی مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی شخصیت کی خاص دل آویزی کے باعث وہاں موجود
خواتین سے ممتاز لگتی تھی۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جواب میں
نے ماہ بانو کے چہرے پر پھیلنے والا ناگواری کا تاثر بھی دیکھا تھا لیکن پروا نہیں کی۔ البتہ خواہش کے مطابق
وہاں اس سے ملنے یا چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکا۔



موں سے ان علاقوں میں سفر کرتے رہنے کے باعث اسے وہاں کے لوگوں کے مزاج کے بارے
م تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اسے لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔
ب اس نے ماہ بانو کو اپنی کیمپنگ سائٹ پر دیکھا تو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ اس نے گمان کیا کہ
کیوں میں سے ہے جو غربت سے نمٹنے اور روپیہ کمانے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کا کھلونا بننا قبول کر
ی حساب سے اس نے اسے اپنے خیمے میں گھسیٹ کر اس سے زبردستی کرنی چاہی لیکن ماہ بانو کے
اسے بتا دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ پھر اکرم خان کی مداخلت کی وجہ سے نہ صرف اسے اپنے مکروہ ارادے
ہونا پڑا بلکہ اکرم خان کے ہاتھوں شدید ہزیمت بھی اُٹھانی پڑی۔

ں وہ اپنی اس ذلت پر بری طرح چڑا، وہیں ماہ بانو کی شخصیت کے بارے میں بھی کھٹک گیا۔ اس کے
کوں سے مختلف نین نقش ویسے ہی چونکا دینے والے تھے، اس پر اُس کی اس سے جو مختصر گفتگو ہوئی،
ی یہ بات سامنے آ گئی کہ وہ کوئی پہاڑی دوشیزہ نہیں ہے۔ ایک مختلف ماحول کی لڑکی ان پہاڑی
ں کیا کر رہی ہے؟ اس کے ذہن میں تجسس جاگ اُٹھا۔ ری سورسز کی تو اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ
ں موجود اپنے نیٹ ورک کو حرکت میں لے آیا۔ نتیجتاً اسے ماہ بانو کی ساری ہسٹری معلوم ہو گئی۔
ار کا نام اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے ہی ان کی لسٹ میں موجود تھا۔ چودھری کو لالچ دینے
اس نے بہتر سمجھا کہ ماہ بانو کو کسی طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ہوشے سے اسے اغوا کر کے کسی
ک فوری طور پر پہنچانے میں خطرہ ہوتا چنانچہ اُس نے اس کام کے لیے اپنے پہاڑی کیمپ پر موجود
استعمال کیا اور یوں ماہ بانو ہوشے سے نکل کر برف زار کے ایک غار میں پہنچ گئی۔

کو اطمینان تھا کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کا سلسلہ ٹھنڈا پڑنے پر جب چاہے گا، اسے وہاں سے نکال کر
ک پہنچا دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔ چودھری بھی ان کی مٹھی میں آ جاتا اور ماہ بانو
ی ذلت کا بدلہ بھی چکا دیتا۔ اکرم خان کو تو پہلے ہی اس کے آدمی ٹھکانے لگا چکے تھے۔ جدید دنیا کا باسی
ب مہذب دکھائی دینے والا ڈیوڈ درحقیقت پیر آباد کے چودھری افتخار سے فطرت میں مختلف نہیں تھا۔
گر اپنی چودھراہٹ اور جاگیر کا غرور تھا تو ڈیوڈ بھی اپنے اختیارات پر نازاں تھا۔ یہ غرور اور ناز ایسے
ں جو آدمی کو آپے میں رہنے دیں۔ ''میں اوروں کے مقابلے میں با اختیار ہوں.....'' یہ احساس بہت
راد میں عاجزی اور خدمت گزاری کا وصف پیدا کرتا ہے۔ ورنہ عموماً تو لوگ خود کو زمینی خدا تصور کرنے
انہیں خلافِ مزاج کچھ گوارا نہیں ہوتا اور جب کچھ مرضی سے ہٹ کر ہو جائے تو پھر وہ اس کا بدلہ لیے
رہ سکتے۔

کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ ہم سے بات کرتے کرتے کن خیالات میں ڈوب گئے؟'' چودھری سے
گر کرتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا چنانچہ وہ کچھ دیر کے لیے ماحول سے کٹ گیا۔ اس
ی کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے ٹوکا۔

میں کس کے خیالوں میں ڈوبنا ہے چودھری صاحب! یہ تو آپ خوش نصیب ہیں جو ہر جگہ ایک حسینہ
نظر ہے۔'' ڈیوڈ نے ہنس کر مذاق میں بات ٹالی تو چودھری بھی زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس قہقہے کی
ہی اسے اپنے موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر
لی کے نمبر سے کال کی جا رہی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ لائن کاٹ دے پھر یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے
معاملہ درپیش ہو، کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہریار کے اغوا والے معاملے کے بعد وہ اپنی فون کالز

کی طرف سے خاصا محتاط تھا۔ اس وقت بھی موبائل فون بند رکھنے کی وجہ سے اس کا اپنے بندوں سے رابطہ ہو گیا تھا اور کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''سلام چودھری صاحب! میں وڈی چودھرائن گل کر رہی ہوں۔'' چودھری نے جیسے ہی کال ریسیو کی دوسری طرف سے اپنی بیگم نمبر ایک کی آواز سنائی دی جسے خود کو وڈی چودھرائن کہلوانے کی اس قدر عادت تھی کہ اپنے نام کا استعمال وہ خود بھی ترک کر چکی تھی اور خود کو اکثر وڈی چودھرائن ہی کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔

''کی گل ہے؟ اس وقت تُو نے مجھے کیسے فون کیا ہے؟'' جوان و حسین لِنڈا کی قربت میں اپنی مولی اور برسوں پرانی بیوی کی آواز سننا بھی اسے سخت ناگوار گزرا تھا، چنانچہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر اس سے پوچھا۔

''وڈی خاص گل تھی چودھری صاحب! اس لیے مجھے آپ کو فون کرنا پڑا۔ آپ اتنی دُور ہو، کچھ سمجھ نہیں لگتی کہ آپ کو پریشان کروں، پر میں بھی مجبور ہوں..... گل ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کو بتائے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ میری تو اپنی مت ماری گئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ اب آپ ہی کچھ دیں گے تو میں کچھ کر سکوں گی۔''

''کیا پہیلیاں بجھوائے جا رہی ہے؟ سیدھی طرح بتا کہ کیا گل ہے؟'' وڈی چودھرائن کے لہجے نے اتنا تو بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا ہے لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون سی بھیانک صورتِ حال ہو گی جس کے لیے وڈی چودھرائن نے اسے اتنی دور کال کر کے اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ اس لیے ذرا غصے اور چڑچڑے پن سے سوال کیا۔

''کیا بتاؤں چودھری صاحب! گل ہی کچھ ایسی ہے کہ بتاتے ہوئے میری زبان رُکتی ہے۔ میری عزت داؤ پر لگی ہے اور میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟'' اپنی بات کے اختتام پر وڈی چودھرائن باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

''میں کہتا ہوں مینوں اصل گل دس۔ پہیلیاں نہ بجھوا۔'' چودھری اعصاب زدہ ہو کر حلق کے بل دھاڑا۔

''کشور کہیں غائب ہو گئی ہے چودھری صاحب! آپ کی دِھی ہمارے منہ پر کالک مل گئی ہے۔'' چودھرائن نے ایسے الفاظ اور انداز میں اطلاع دی کہ حادثے کی شدت دُگنی ہو کر چودھری تک پہنچی۔

''کیا بک رہی ہے؟..... ہوش میں تو ہے یا نہیں؟'' اس نے یقیناً چیخنے کی ہی کوشش کی تھی لیکن آواز گلے کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی اور وہ بس سرگوشی میں ہی وڈی چودھرائن سے یہ سوال کر سکا تھا۔

''ہوش تو میرے سچ مچ گم ہو گئے ہیں چودھری صاحب! لیکن جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ صحیح ہے۔''

''مجھے تفصیل سے ساری گل بتا۔ آخر تیرے ہوتے ایسا کس طرح ہو گیا؟ کیا میرے پیچھے تُو نے کشور کے معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں؟'' وہاں ڈیوڈ اور لِنڈا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے لہجہ کافی سنبھال لیا تھا لیکن پھر بھی لہجے سے دبا دبا غصہ جھلک ہی رہا تھا۔ ڈیوڈ کی اُردو اور پنجابی سے واقفیت پر اسے خاص طور پر احتیاط برتنی پڑ رہی تھی۔

''میری آنکھیں بند نہیں تھیں مگر وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ حویلی سے درگاہ جانے کی اجازت لے کر نکلی تھی۔ شادو اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھے لیکن جانے اس نے کیا چکر چلایا کہ ان دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ درگاہ سے غائب ہو گئی۔ جانے کون ہے جس نے اس کو یہ راہ دکھائی اور اپنے ساتھ لے اُڑا۔



کڑی کے کرتوتوں کی طرف سے فکر میں تھی لیکن اس کی ماں کی شہ اور آپ کی ڈھیل کی وجہ سے ہر بار چپ ہونا پڑا۔'' وہ بہت عرصے سے کشور کے خلاف اپنے دل میں جمع زہر اُگلنے لگی۔

''وقت ایسی گلاں کرنے کا نہیں۔ تُو ایسا کر کہ اس کی سب سے قریبی ملازمہ رانی کو ٹٹول۔ مجھے یقین ہے ضرور کچھ نہ کچھ خبر ہو گی۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹہلتا ہوا اپارٹمنٹ کی بالکنی کی طرف چلا گیا اور دھیمی آواز میں چودھرائن کو مشورہ دیا۔

''اچھا چودھری صاحب! میں ابھی بندہ دوڑاتی ہوں۔ رانی آج کل شہر والی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ اسے جا کر میں اس کے حلق سے اُگلواتی ہوں کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟'' چودھری کا مشورہ سن کر وہ فوراً جوش میں آ گئی۔ کشور کی ملازمہ خاص رانی پر ویسے ہی اسے شک رہتا تھا کہ وہ حویلی سے زیادہ کشور کی وفادار ہے لیکن چونکہ رانی لاہور میں رہ رہی تھی، اس لیے کشور کے غائب ہوتے ہی اسے رانی کا خیال نہیں آیا تھا۔

''اچھا کام کر۔ میں پہلی فلائٹ ملتے ہی واپس آتا ہوں۔ اور ہاں..... خیال رکھنا کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہو سکے۔''

''کسی نوں فکر نہ کرو چودھری صاحب! کسی نوں کچھ خبر نہیں ہے۔ صرف شادو اور اس کی بہن نچھی کو معلوم تھا، سو میں نے حویلی کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے۔'' چودھری کی ہدایت کے جواب میں اس نے فخر سے بتایا۔

''اچھا گل ہے۔ اب تُو فون بند کر۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں، زیادہ کھل کر گل نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہتے ہوئے خود ہی لائن کاٹ دی اور پھر موبائل جیب میں رکھ کر چہرے پر ایک نمائشی مسکراہٹ سجائے کمرے میں واپس آیا۔

''خیریت چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں..... آخر ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتے۔'' اس کی مسکراہٹ کے باوجود ڈیوڈ نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں مسٹر ڈیوڈ! بس ایک چھوٹا سا پرسنل پرابلم ہے، میں خود ہی سولو کر لوں گا۔ بلکہ ابھی آپ ذکر کر رہے تھے کہ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تو بس سمجھیں کہ ایسا سبب بن گیا ہے کہ میں خود بھی فوری طور پر جانا پسند کروں گا۔'' جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا، وہ اس کے بارے میں اپنی زبان سے کسی کو بتا سکتا تھا؟ چنانچہ ڈیوڈ کے سوال کرنے پر اسے ٹال گیا اور پھر فوری طور پر اس سے اور لِنڈا سے معذرت کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اس کے ہوتے لِنڈا کا حسین وجود بھی کھو بیٹھا تھا۔ لِنڈا اور ڈیوڈ نے اس کا یہ انداز دیکھا تو چونک پڑے۔

''لگتا ہے کہ چودھری کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے مسئلے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کر کے پیر آباد میں موجود ایجنٹ کی ڈیوٹی تو لگاؤ کہ وہ ذرا اس معاملے کی کھوج لگائے۔'' ڈیوڈ نے بات کی تو وہ ٹیلی فون پر مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈیوڈ کا حکم دوسری طرف سنایا اور پھر تاکید کے ساتھ کہ جلد اصل معاملہ ان کے سامنے آ جائے گا، کال منقطع کر دی۔

⊛----✪----⊛

''شہر کس کام سے آئے تھے؟'' گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے سامان کی گٹھڑی کے ساتھ بیٹھی رانی سے پوچھا۔ اسے اتنی اچانک واپسی کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ ڈھنگ سے اپنا سامان بھی سمیٹ نہیں

پائی تھی۔ اب گاڑی میں بیٹھ کر اسے یاد آ رہا تھا کہ کوٹھی کی عقبی جانب اس نے اپنا بالکل نیا جوڑا دھو
جلدی میں وہ جوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ یہ جوڑا اسے کشور نے اپنے لاہور میں قیام کے عرصے میں خر
اسے خاصا پسند تھا۔ اس کے علاوہ اس کی چاندی کی بالیاں بھی جو کہ حاجرہ نے اس سے مستعار لے
وہیں رہ گئی تھیں۔ دوسرے بھی کئی چھوٹے چھوٹے معاملات تھے جن پر اس کے خیال میں وہ ڈرائیور
مچانے کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی تھی۔ لیکن اب چلتی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہو بھی نہیں سکتا
وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دی۔

''نہیں، مجھے شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ سویرے سورج
پہلے وڈی چودھرائن کا حکم ملا کہ شہر جا کر رانی کو لے آؤ تو میں تجھے لینے آ گیا۔'' ڈرائیور نے اس
جواب میں بیزاری سے بتایا۔ اسے اپنا منہ اندھیرے جگا کر شہر روانہ کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن ا
کہ وڈی چودھرائن نے رات بھی کس مشکل سے گزاری ہے۔ کشور کے غائب ہونے کا علم ہونے
معاملات سے نمٹنے اور چودھری سے رابطہ ہونے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا، ورنہ ممکن تھا کہ وہ
اسے لاہور روانہ کر دیتی۔

''کشور بی بی تو خیریت سے ہیں نا؟ کہیں انہوں نے ہی تو مجھے نہیں بلوایا؟'' رانی چونکہ ا
بلائے جانے پر حیران تھی اس لیے اس اچانک طلبی کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں کشور
اس کی واپسی کا سبب بن سکتی تھی اس لیے اس کے بارے میں سوال کیا۔

''مجھے تو وڈی چودھرائن کا حکم ملا تھا۔ اب ان سے کس نے کہا، مجھے خبر نہیں۔ ویسے تُو اطمینان
بی بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل ہی میں عصر کے بعد انہیں درگاہ پر حاضری کے لیے لے کر گیا تھا
فکرمندی دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے اسے تسلی دی تو وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی لیکن تشویش ا
تھی۔ بغیر وجہ کے وہ خاص طور پر گاڑی بھیج کر اپنے بلوائے جانے کو کسی طرح قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

''میرے گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟'' مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے دل میں آنے والے ا
کے تحت سوال کیا۔

''ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہیں بھی ہوتا تو کیا تیرے خیال میں حویلی والے اتنے
کہ تیرے گھر کی پریشانی پر گڈی بھیج کر تجھے شہر سے بلواتے۔ ان کا اپنا ہی کوئی کام شام ہوگا جو انہوں
بلوایا ہے۔'' ڈرائیور نے جھنجلاہٹ زدہ لہجے میں جو جواب دیا، وہ تلخ ہونے کے باوجود اپنی جگہ بالکل
سن کر رانی کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اس خاموشی میں اونگھتے جاگتے واپسی کا سفر طے ہو گیا اور پیر آباد
میں داخل ہو گئے۔ گاڑی کے پیر آباد میں داخل ہوتے ہی رانی کے دل نے بے حد خوشی محسوس کی۔
بڑے اور پُررونق شہر میں رہ کر بھی اسے اپنے اس کچے پکے گھروں والے پیر آباد کی یاد مسلسل ستاتی
اب جبکہ وہ پیر آباد کی فضاؤں میں سانس لے رہی تھی تو یہ اس کے لیے از حد خوشی کا مقام تھا۔ خوشی کی اس
میں ڈوبی وہ آنے والے ظالم وقت کی آہٹیں سنے بغیر حویلی تک پہنچ گئی۔

''سیدھی وڈی چودھرائن کے پاس چلی جا۔ انہوں نے کہا تھا کہ رانی کو لاتے ہی فوراً میرے پاس
وہ گاڑی سے اُتر رہی تھی کہ ڈرائیور نے اسے وڈی چودھرائن کا پیغام پہنچایا۔ وہ جو حویلی پہنچتے ہی کشور
کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس حکم کو سن کر ٹھٹک گئی۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے کشور کے
حویلی واپس بلوایا گیا ہوگا۔ لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کا



سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا چنانچہ وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے سامان کی
ی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

''وڈی چودھرائن اپنے کمرے میں نہیں ہے رانی! میرے ساتھ آ، میں تجھے ان کے پاس لے چلوں۔''
وڈی چودھرائن کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑی ہی تھی کہ اسے نچھی مل گئی۔
''تو ہے؟..... تُو بڑی کمزور لگ رہی ہے..... چہرہ اُترا ہوا سا ہے۔ کیا بیمار رہی ہے؟'' نچھی کے
م ملا کر چلتے ہوئے اُس نے اُس سے دریافت کیا۔
''ٹھیک ہوں میں۔'' نچھی نے جس کی شکل ایک دن کی قید کے بعد ہی بالکل اُتر کر رہ گئی تھی، سپاٹ سے
جواب دیا تو اس کی مزید سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی نچھی اور اس کی بہن شادو
کے تعلقات کبھی بھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ ان خوشامدی اور سازشی لڑکیوں سے دُور ہی رہنا
تھی۔

''وڈی چودھرائن اِدھر ہے؟'' جب نچھی اُسے لے کر وہ تہ خانے کی سیڑھیاں اُترنے لگی تو اُس نے حیرت
یا۔ جواباً نچھی نے محض اثبات میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔
''پر وہ اِدھر کیا کر رہی ہے؟'' اسے تہ خانے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔
''اُس کی مرضی، جو چاہے کرے۔ تُو اور میں کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے؟'' نچھی کا لہجہ اگرچہ
ہوا تھا لیکن بات اُس نے سولہ آنے درست کہی تھی۔ واقعی کسی ملازمہ کی کیا مجال تھی کہ وہ مالکن سے
کر سکتی۔ رانی کو بھی چار و ناچار تہ خانے کی سیڑھیاں اُترنی پڑیں لیکن اب اس کے دل میں خوف اس طرح
تھا کہ گاؤں آنے کی ساری خوشی اُڑن چھو ہو گئی تھی۔ سیڑھیاں اُترنے کے بعد نچھی اُسے لیے تہ خانے
کمرے کی طرف بڑھی۔ رانی کا آج پہلی بار تہ خانے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس تہ خانے کے
میں اس نے بہت سی کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔
تھا کہ یہ تہ خانہ، چودھری کے دادا نے حویلی تعمیر کرتے وقت بنوایا تھا اور اس تہ خانے کی حیثیت ایک
جیسی تھی جہاں وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو قید میں رکھتے اور ایذا دیتے تھے۔ دادا کے بعد چودھری کا باپ
تہ خانے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن چودھری کے بارے میں یہی سننے میں آیا تھا کہ اس
خانے کا یہ استعمال بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی رحم دلی نہیں بلکہ عقل مندی تھی۔ بدلتے ہوئے سیاسی
کے پیشِ نظر اُس نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنی ذاتی رہائش گاہ کو کسی متنازع کام کے لیے استعمال نہ
۔ دوسرے وہ اپنے باپ دادا کی طرح اپنے مخالفین کو مستقل قید میں رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔
کے مجرم وہ دشمن چند دن کی قید اور ایذا سہہ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتے تھے..... اور اس مقصد کے لیے
سے زیادہ مناسب تھا جہاں معاملات اہلِ خانہ سے بھی مخفی رہتے ہوئے بالا ہی بالا طے پا جاتے
ہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو رانی اس بدنام تاریخی پس منظر رکھنے والے تہ خانے کی گھٹن زدہ فضا میں خود
خوف زدہ اور مجبور محسوس کر رہی تھی۔ نچھی اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود وڈی
کے چہرے کے تاثرات نے اس کے خوف کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ قہر برساتی نظروں سے اسی کی
دیکھ رہی تھی۔
''سلام وڈی چودھرائن!'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اپنا جرم معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا
لگا چکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جس نے وڈی چودھرائن کو اس کی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔

"شادو، نچھی! اسے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دو۔" اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر وڈی چودھرائن نے اپنی چمچیوں کو حکم دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آ گئیں۔ خود ان کے ساتھ وڈی چودھرائن نے جو سلوک کیا اس کے پیشِ نظر تو اصولاً ان دونوں کی ہمدردیاں رانی کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں لیکن وہ اپنی لالچی فطرت کی وجہ سے ایک بار پھر وڈی چودھرائن کے جھانسے میں آ گئی تھی۔

وڈی چودھرائن نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں تم دونوں میری وفادار ہو اور کشور والے معاملے میں بھی مجھ سے وفاداری نبھاتے ہوئے رازداری برتو گی لیکن میں تمہیں قید کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔ اب ایسا ہے کہ تم دونوں کی جان اسی طرح چھوٹ سکتی ہے کہ کسی طرح کشور ہمارے پاس واپس آ جائے۔ اسے واپس لانے کے لیے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں، اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی ملازمۂ خاص رانی سے کسی طرح اس شخص کا نام پتہ اُگلوا لیا جائے جس کی خاطر کشور نے ایسی حرکت کی ہے۔ میں رانی کو یہاں بلوا کر پوچھ گچھ کروں گی۔ ظاہر ہے، وہ آسانی سے تو بتائے گی نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ مار پیٹ کر سچ اُگلوانے کی کوشش کرنی پڑے۔ میں خود تو یہ کام نہیں کر سکتی اس لیے تم دونوں کو میری مدد کرنی ہو گی۔ اگر تم رانی سے سچ اُگلوانے میں کامیاب ہو گئیں تو میں چودھری صاحب سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دوں گی۔

آزادی کے لالچ میں دونوں بہنوں نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور یہ بھول گئی تھیں کہ طاقتور کے وعدے بھی انہی کی طرح جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت چودھرائن نے جو پیشکش کی تھی، وہ اپنی غرض سے تھی۔ رانی سے سچ اُگلوانے کا کام وہ تنہا خود نہیں کر سکتی تھی اور کسی اور ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرنا راز کو پھیلانے کا سبب بنتا چنانچہ وہ پہلے ہی سے باعلم تھے، انہی کو استعمال کرنا بہتر تھا۔

"چھوڑو..... مجھے کیوں باندھ رہی ہو؟" دونوں بہنیں اسے بازو سے پکڑ کر رسّی تک لے گئیں تو وہ احتجاج چلائی مگر انہوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دو مخالف دیواروں میں لوہے کے کنڈے کی مدد سے لٹکی ہوئی رسیوں تک پہنچا کر دم لیا۔ پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو رسّی کی مدد سے باندھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اب وہ فرش پر اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں رسیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

"میرا قصور کیا ہے وڈی چودھرائن! میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں؟" خود کو باندھے جانے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر کے وڈی چودھرائن سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ معصوم نہ بن۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی ہے نمک حرام! تُو ہی تو ہے جس کے سہارے وہ کنجری بچی اتنا بڑا کام کر گئی ہے۔ اب تُو ہمیں بتائے گی کہ وہ حویلی سے بھاگ کر اپنے کس یار کے پاس گئی ہے؟" وڈی چودھرائن نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

"کشور بی بی حویلی سے چلی گئیں؟" رانی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

"ہاں..... اور اب تُو ہمیں بتائے گی کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہے؟" چودھرائن نے اس کا انداز بھانپ کر اور دوٹوک لہجے میں بولی۔

"میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں جی۔ میں تو حویلی میں تھی ہی نہیں۔ مجھے بھلا کیا خبر کہ وہ کہاں گئی ہیں؟" رانی نے تجاہل برتتے ہوئے اپنی قطعی لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

"شادو.....!" اُس کا جواب سن کر وڈی چودھرائن بلند آواز سے چیخی۔ نتیجتاً رانی کے بائیں جانب



کا بیلٹ لے کر کھڑی ہوئی شادو کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیلٹ کا بکل لوہے کا تھا اور شادو نے اسے اس طرح پکڑا ہوا تھا کہ بیلٹ حرکت کرتا ہوا اس کی پیٹھ کی طرف بڑھا تو اس کا بکل والا سرا آزاد تھا جو ٹھک سے آ کر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کھا کھا کر جسم پر چربی جمع کر لینے والی شادو کے اس وار میں بڑی طاقت تھی۔ رانی اچھی خاصی جان کے باوجود بلبلا کر رہ گئی۔

"اب بھی وقت ہے، مجھے سب کچھ بتا دے، ورنہ میں تیری کھال اُدھڑوا کر رکھ دوں گی۔" اسے بلبلاتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے اسے خبردار کیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" چودھرائن کی دھمکی کے باوجود رانی اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہمیشہ کشور کی وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی اور آج وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کو ثابت کر دکھاتی۔ چنانچہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی لاعلمی کے دعوے پر قائم رہی تھی۔

"ٹھیک ہے فیر۔ تیری چمڑی کو مار ہی چاہئے تو اب میں ان دونوں کو روکوں گی نہیں۔ جب تیرا مار کھا کھا کر بے حال ہو جائے تو آپ مجھے بتا دینا۔" چودھرائن سفاکی سے کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور منکر نکیر کی طرح رانی کے دائیں بائیں کھڑی نچھی اور شادو کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے میں موجود کرسی پر براجمان چودھرائن کے اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آ گئیں اور ان کے ہاتھ متواتر چمڑے والے ہاتھ اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں رحم سے ناواقف تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" چیخوں کے درمیان رانی کا تواتر سے کہا جانے والا یہ جملہ بھی گویا اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر پہلے اس کے الفاظ گم ہوئے اور پھر حلق سے نکلتی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ بے پناہ تشدد سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ دیوار کے ساتھ بندھی رسیوں میں نہ جکڑے ہوتے تو وہ فرش پر گر پڑتی لیکن اب اس کا بے ہوش جسم بے خبری کے عالم میں جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئی تو نچھی اور شادو نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ وہ خود اس کی وجہ سے ہانپ کر رہ گئی تھیں۔

"ہوش میں لاؤ اسے۔ مکر رہی ہے نمک حرام۔ اسے سارے چکر کا چنگی طرح پتہ ہے۔ دن رات کشور بی بی کے ساتھ چمٹی رہتی تھی۔ اس کی رازدار تھی جب ہی تو وہ ہر وقت اس کی طرف داری کرتی تھی۔ اس کے سوا کسی نوکر کو تو اس نے کبھی اتنا سر نہیں چڑھایا۔" رانی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے نفرت زدہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ اس کے حکم پر شادو نے وہاں موجود پانی کا جگ رانی کے چہرے پر اُلٹ دیا۔ پانی کی تیزی سے وہ جھرجھری لے کر ہوش میں آ گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس نے جو دوسری بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ اس کے بال اور گردن کو بھگونے کے بعد قمیض کو بھی تر کر کے زمین پر گرنے والے پانی کے قطروں کے علاوہ کوئی چیز بھی ہے جو اس کے جسم پر سے قطروں کی صورت پھسلتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس سیال کی حرکت وہ اپنی پیٹھ پر محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سا سر جھکا کر نیچے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو پانی کے ساتھ گھلتے ملتے سرخ رنگ نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ لوہے کے بکل سے اُدھڑ جانے والی پیٹھ سے خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا جو قطرہ قطرہ کر کے نیچے گر رہا تھا۔

"کچھ یاد آیا تجھے؟..... یا یاد کروانے کے لیے کچھ اور انتظام کروں؟ میرے پاس ابھی تجھ سے سچ

اُگلوانے کے لیے بہت طریقے ہیں۔'' چودھرائن نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے

''میں کچھ نہیں جانتی جی۔ میں تو یہاں تھی ہی نہیں۔'' رانی نے نقاہت زدہ لہجے میں اپنا پچھلا بیان

''اچھا چل، مان لیا کہ تُو یہاں نہیں تھی اس لیے تجھے کچھ خبر نہیں کہ تیری بی بی کس کے ساتھ اور بھاگی، پر تُو یہاں تھی، تب کی گل تو بتا سکتی ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کس سے چھپ چھپ کر فون پر گل کرتی کے پاس جو موبائل تھا وہ اسے کس نے دیا تھا؟'' چودھرائن نے طراری کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

''مجھے نہیں خبر۔ میں نے ان کے پاس کوئی موبائل نہیں دیکھا۔'' اس نے چودھرائن سے نظر ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تُو بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ تیری اس ڈھٹائی کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔'' چودھرائن اس کا جواب چراغ پا ہوگئی اور اپنی چمچیوں کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اس اشارے کو پا کر نچھی نے ایک جانب رکھی برنی اٹھائی اور اس میں موجود نمک اور سرخ مرچوں کا کسچر مٹھی میں بھر کر رانی کی زخمی پیٹھ پر مل ڈالا ٹیسیں دیتے زخم، نمک اور مرچ لگتے ہی جل اُٹھے۔ رانی کو ایسا لگا کہ اس کی پیٹھ پر کسی نے آگ بھر کا تکلیف کی شدت سے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگی۔ یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ اسے وفاداری کا سبق بھی بھولنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وڈی چودھرائن کو سب کچھ بتا کر اس نجات حاصل کر لے لیکن یہ خیال بس لمحاتی ہی تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی عقل نے اس کا اور وہ سچ اُگلتے اُگلتے اپنے لبوں کو بھینچ گئی۔

یک دم ہی اسے خیال آ گیا کہ سچ بولنے کے بعد بھی اس کی جاں بخشی ہونا ممکن نہیں۔ کشور اس کا ساتھ دینے اور اس کے راز کو راز رکھنے کا قصور اتنا بڑا ہے کہ وہ سب بتا کر بھی سزا سے نہیں حویلی والوں کی یہ ریت رہی تھی کہ وہ اپنی کسی بہو، بیٹی کے قدم لڑکھڑانے پر اس سے بعد میں حساب اس کے مددگاروں کو پہلے ٹھکانے لگاتے تھے۔ یعنی یہ طے تھا کہ وہ زبان بند رکھے یا کھول دے صورت نہیں بچ سکتی۔ تو بہتر تھا کہ اپنی وفاداری پر آنچ نہ آنے دیتی اور کشور کو جس سے وہ حقیقتاً خود محبت کرتی تھی، ایک بار اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے کا موقع فراہم کر دیتی۔ ذہن و دل میں اُبھرنے والے یہ خیالات و جذبات ایسے تھے کہ پیٹھ پر بھڑکتے شعلوں کی آنچ کم ہونے لگی اور اس سے نکلتی چیخیں دم توڑ گئیں۔ درحقیقت وہ ایک بار پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر بازوؤں میں بندھی جھول گئی تھی۔

''اسے ایسے ہی بندھا رہنے دو۔ دوبارہ ہوش آئے تو کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے زخموں میں نمک بھر دینا اور ناک میں مرچوں کی دھونی دینا۔ یا تو سچ نکالے گی یا پھر اس کے جسم سے روح نکلے گی۔'' رانی کی مستقل مزاجی نے وڈی چودھرائن کو ہار ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اسے چھوڑنے یا اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ رعونت سے حکم جاری کرنے کے بعد اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

⊛----✪----⊛

''باجوہ والے معاملے کی تحقیق کروائی تم نے عبدالمنان! کچھ معلوم ہوا کہ تارڑ کے بیان میں ہے؟'' طبیعت ذرا بہتر پا کر شہریار نے ہسپتال سے چھٹی لے لی تھی اور اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔



کے دوران بھی وہ اپنے ضلع کے معاملات سے یکسر بے خبر نہیں رہا تھا اور فون پر عبدالمنان کو ہدایات تا تھا۔ باجوہ والا معاملہ بھی اس نے فون پر اسے بتا دیا تھا۔ تارڑ ہسپتال میں اس سے ملاقات کے اس نے دبے لفظوں میں یہ شک بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہو سکتا ہے باجوہ قانون کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے زیادہ مفید نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو اریسٹ آفیسر اپنی مرضی کا لے آئے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر ماریہ کی سفارش پر شہریار کو عابد انصاری گیا تھا۔ شہریار اس سے ملاقات کر کے کافی مطمئن ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ شخص اس کی خواہش بہت اچھے طریقے سے کام کرے گا۔ بہرحال، عابد انصاری کی کارکردگی تو ابھی سامنے آنی تھی لیکن وہ باجوہ والے معاملے کو پرکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عبدالمنان کی ڈیوٹی لگا دی کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ کام سرانجام دے ڈالے گا۔

سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ باجوہ کا آبائی گاؤں الگ ضلع میں ہونے کی وجہ ات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگا لیکن تارڑ کے بیان کی تصدیق ہوگئی ہے۔ میرے اعتماد کے ایک کرگن سے مل کر یہ تصدیق کر لی ہے کہ باجوہ کی قبر کو کھود کر وہاں سے اس کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی ہے اور نکالنے والے سرکاری اہلکار تھے۔ وہ شخص باجوہ کی خالی قبر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ اس کے اس پولیس سرجن کو بھی اپروچ کر لیا ہے جس نے باجوہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہاں سے بھی یہ ہوگی ہے کہ تارڑ کی آپ کو دی ہوئی انفارمیشن درست ہے۔ باجوہ کی موت واقعی ہارٹ فیل سے نہیں ائی سے ہوئی ہے۔'' حسبِ توقع عبدالمنان کے پاس مکمل رپورٹ موجود تھی۔

اب اتنی باتیں درست ہیں تو تارڑ کا یہ شک بھی درست ہو سکتا ہے کہ باجوہ کی موت کے پیچھے چودھری ہے۔ لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ہم چودھری پر ہیں۔ خود تارڑ بھی اس سے خوف زدہ نظر آ رہا ہے اور ملک سے باہر نکلنے کے چکر میں ہے بلکہ سمجھو کچھ وانہ ہی ہو جائے گا۔''

آپ کا خیال درست ہے سر!..... لیکن سرِدست ہم اس مسئلے پر کچھ نہیں کر سکتے اور بہت سے معاملات ہمیں اس معاملے کو بھی فی الحال نظرانداز ہی کرنا ہوگا۔'' عبدالمنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے لدی کا مظاہرہ کیا۔

کہا ہے تو ایسا ہی سہی لیکن تم دیکھنا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب چودھری کو اپنے اعمال کا حساب ں دینا پڑے گا۔ اس کی گردن کب گرفت میں آتی ہے، یہ ابھی مجھے بھی نہیں معلوم لیکن وہ پکڑا ضرور ا۔''

طرور سر! انشاء اللہ۔'' عبدالمنان نے صدقِ دل سے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کہا ب کے مختلف دیہاتوں میں دورے کا شیڈول تیار کر دوں، وہ میں نے کر دیا ہے۔ آج آپ کو لنچ ٹائم ات کے لیے نور پور جانا ہوگا۔''

اے! یہ تم نے اچھا کیا کہ سب سے پہلے نور پور کا وزٹ رکھ لیا۔ میں کافی دنوں سے چودھری بختیار ا رہا ہوں لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب جاؤں گا تو مل لوں گا۔'' عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ار نے ایک بار پھر اپنے دل میں اس شخص کی صلاحیتوں کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔ اپنے آفیسر کا مزاج آشنا پی اے مل جانا بڑے شکر اور خوشی کا مقام تھا۔

''ایک کام اور کرو عبدالمنان! میری ایس پی تارڑ سے بات کروا دو۔ اس شخص میں بہتری کے
رہے ہیں تو کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔'' عبدالمنان نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور تا
کے اس کے لائن پر آنے کے بعد ریسیور شہریار کو تھما دیا۔

''خیریت سر! آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آ گئی آپ کو؟'' شہریار کی ہیلو کے جواب میں تارڑ
لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میں نے سوچا کہ اب تو آپ رخصت ہونے والے ہیں، آپ سے معلوم کر لوں کہ کوئی
میرے لائق ہو تو بتائیں۔'' شہریار نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''کام تو کوئی نہیں، ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر میرے جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کسی
لیں تو بہت اچھا رہے گا۔'' تارڑ نے پیشکش کی۔

''چلیں ٹھیک ہے، ایسا کر لیتے ہیں۔ لیکن ڈنر میری طرف سے ہو گا۔ آپ نے پہلے ذکر
اصولی طور پر مجھے آپ کو اس الوداعی ڈنر کی دعوت دینی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ اس سنڈے کو میر
تشریف لے آئیں۔ ساتھ بیٹھ کر ڈنر بھی کر لیں گے اور کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔'' اس نے جوابی
جس سے انکار ظاہر ہے تارڑ کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''مجھے آپ سے ایک کام اور تھا تارڑ صاحب! امید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے
گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اصل مطلب پر آتے ہوئے تارڑ سے کہا۔

''حکم فرمایئے سر! اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور آپ سے تعاون کروں گا۔''

''نور پور بم بلاسٹ میں خودکش حملہ آور لڑکے کے والدین اور بڑے بھائی کو آپ نے گرفتار کر
یہ کہنا چاہئے کہ گرفتار تو وہ میرے کہنے پر کیے گئے تھے لیکن بعد میں آپ نے انہیں اپنی کسٹڈی میں
ان لوگوں کا بعد میں کچھ پتہ نہیں چلا حالانکہ میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں کہ ان بے چاروں کا اس
سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ بالکل بے قصور تھے۔ آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ مجھے ان لوگوں کے
انفارم کر دیں۔'' اُس کی اس درخواست کے جواب میں تارڑ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر بولا تو
لہجے میں ندامت تھی۔

''آئی ایم سوری، اے سی صاحب! اس فیملی کا تو اب مجھے بھی کچھ اتہ پتہ معلوم نہیں ہے۔ ایکچ
کی انویسٹی گیشن شروع کرتے ہی ایجنسیز والوں نے ان لوگوں کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا، چنا
میرا بھی ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔'' تارڑ کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا۔ وہ افسر شا
پُرزہ تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسیز کے ہاتھ لگ جانے والوں کے بارے میں کچھ بھی
آسان نہیں ہوتا۔

''او کے تارڑ صاحب! آپ نے جتنا بتا دیا، یہ بھی کافی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے
ضروری امور نمٹانے ہیں۔'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پل بھر کے توقف
اپنا موبائل نکال کر مشابرم خان کا نمبر ملانے لگا۔ عبدالمنان کو وہ تارڑ سے گفتگو کے دوران ہی اشا
جانے کی اجازت دے چکا تھا چنانچہ اس وقت اپنے دفتر میں بالکل تنہا تھا۔ اس تنہائی نے اسے ما
دلائی تھی، تب ہی اسے اس کی تلاشی میں سرگرداں مشابرم خان سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اس کے نمبر
بہت دیر تک بیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اللہ جانے مشابرم خان کہاں



سے اس کی کال ریسیو کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے
میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا۔

''ماہ بانو نامی لڑکی کے اغوا کے کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی جناب یا نہیں؟'' رسمی سلام دعا اور حال احوال
اس نے وہ سوال کیا جس مقصد کے تحت کال کی تھی۔

''سوری مسٹر شہریار! میں بہت شرمندہ ہوں کہ ابھی تک ہم لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے
کیس بہت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ پہلے ٹورسٹ کمپنی کا وہ ڈرائیور حادثاتی موت کا شکار ہوا جس
چھین کر اسے ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور اب ٹورسٹ کمپنی کا مالک صغیر بیگ غائب
بیگ کی گاڑی ایک جگہ خالی پائی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن
کون ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔'' دوسری طرف سے ذرا شرمندہ سے
جواب دیا گیا۔

''یہ تو واقعی بہت پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ بہرحال، آپ خیال رکھیے گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو،
انفارم کر دیجئے گا۔'' وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا اپنا طریقۂ تفتیش ہے جو ان کی سیدھی سادی زندگیوں
اتنا زیادہ تیز رفتار نہیں۔ ویسے بھی پولیس کی کارکردگی تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بھی
تھی کہ اتنے دشوار گزار علاقے میں ان سے کوئی اچھی امید رکھنا عبث تھا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مشابرم خان کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس بار بھی بیل جاتی
کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر سلسلہ منقطع ہی کرنے والا تھا کہ کسی نے کال ریسیو
کال ریسیو کرنے والے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کا کم عمر لڑکا ہے۔

''کون بات کر رہا ہے؟ یہ مشابرم خان کا فون ہے نا تو وہ خود کہاں ہے؟'' اُس نے تیز لہجے میں لڑکے
سوال کیا۔

''ہم نہیں جانتا صاحب! کہ مشابرم خان کون ہے۔ یہ فون ہمیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ ہم نے اٹھا کر
اس رکھ لیا۔'' لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور قدرے
سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہم سمندر خان ہے۔ یہاں ایک موٹیل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔'' لڑکے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''سنو سمندر خان! یہ موبائل جس شخص کا ہے، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہوٹلوں میں گھوم
معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مشابرم خان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو یہ فون اسے دے دینا۔ اس
لے تمہیں انعام مل جائے گا۔'' بہت سمجھانے والے انداز میں اس نے لڑکے کو یہ ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے جناب! ہمیں وقت ملا تو کوشش کرے گا۔'' لڑکے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''وقت کی بات مت کرو۔ تمہیں ہر حال میں مشابرم خان کو تلاش کرنا ہے۔ انعام میں، میں تمہیں اس
اچھا موبائل دلوا دوں گا۔'' یہ محسوس کر کے کہ لڑکا موبائل کے لالچ میں مشابرم خان کو ڈھونڈنے میں
کر رہا ہے، اس نے اسے لالچ دیا۔

''سچ کہہ رہے ہو صاحب؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ بس تم میرا کام کر دو..... اور ہاں، اس موبائل کو آف مت کرنا۔ میں اسی نمبر پر

تم سے تھوڑی تھوڑی دیر میں رابطہ کرتا رہوں گا۔'' اس نے لڑکے کو پابند کرنے کے لیے کہا۔ دراصل وہ خان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا موبائل کسی جگہ پڑا ملنا کوئی اچھی علامت نہیں تھا بیٹھ کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ موبائل مشابرم خان سے بے خیالی میں گر گیا تھا یا وہ کسی غیر معمولی صورت سے دوچار ہوا تھا اور کسی سے لڑائی جھگڑے میں اس کا موبائل گرنے کی نوبت آ گئی تھی۔

''سنو سمندر خان! ایک کام کرو۔ ہوٹلوں میں معلوم کرنے سے پہلے سب سے پہلے دوغانے (بہن) جاؤ۔ وہاں مشابرم خان کی ماں داخل ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو مشابرم خان مل جائے گا یا پھر اس کے بارے کوئی خبر ہی مل جائے گی۔'' وہ فون بند ہی کرنے والا تھا کہ مشابرم خان کی تلاش کا ایک نسبتاً آسان راستہ دیا چنانچہ سمندر خان کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے صاحب! ہم ایسا ہی کرے گا۔'' سمندر خان نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو وہ بھی جھٹک کر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن یہ توجہ خالصتاً پیشہ ورانہ نوعیت کی تھی۔ اس مصروفیت کے دوران بھی دل اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ جانے ماہ بانو کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اپنی بے پناہ مصروفیات اور مسائل کے باوجود وہ زندگی میں آنے والی اس بظاہر عام سی لڑکی کو فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہر پریشانی، ہر مصروفیت اور ہر کام کے دوران اس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح پل پل دل میں رہنے والی ہستی درحقیقت زندگی میں سب سے اہم مقام کی حامل ہوتی ہے۔ اے سی شہریار عادل کو ابھی حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ محبت میں اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں کام عشق کے آڑے آ جاتا دیتا ہے اور بندہ صرف محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بھی تھا، فی الحال تو وہ اپنے فرائضِ منصبی کو ہی ترجیح دے رہا تھا چنانچہ خیال کے پردے پر بار بار اُبھرنے والی ماہ بانو کی شبیہہ سے نظریں چرا کر لنچ ٹائم تک اپنے معمول کے مطابق نمٹاتا رہا۔ لنچ کے فوراً بعد وہ اور عبدالمنان نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ نور پور تک کا راستہ کافی طویل ہونے کی وجہ سے یہی امید تھی کہ انہیں واپسی میں مغرب تک کا وقت تو ضرور ہی لگ جائے گا۔

''نور پور میں کنسٹرکشن کی کیا صورتِ حال ہے؟'' دورانِ سفر اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

''کام تو حتی الامکان تیزی سے ہی ہو رہا ہے۔ اسکول اور مرکزِ صحت دونوں کی عمارتیں تیاری کے آخری مراحل میں ہیں۔ ہم نے اسٹاف کے اپائنٹ منٹ کی کارروائی بھی شروع کر دی ہے لیکن نور پور کا مسئلہ یعنی بجلی کی فراہمی..... ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ چیمہ صاحب نے اس سلسلے میں وعدہ کیا تھا، وہ ابھی تک بس وعدہ ہی ہے۔ میری چودھری بختیار سے جو آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں اس معاملے کی طرف توجہ دلوائی تھی۔ اصل میں اس نے گاؤں میں چھوٹی صنعتوں کے آغاز کا جو منصوبہ ہے، اس پر عمل درآمد کے لیے بجلی کی عدم موجودگی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔'' عبدالمنان نے تفصیل کے سوال کا جواب دیا۔

''واقعی یہ تو بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں بھی پچھلے سارے عرصے میں اتنی بری طرح اُلجھا رہا کہ اس معاملے کو بھول ہی گیا۔ تم ذرا چیمہ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ ابھی اسی وقت انہیں یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔'' اپنی کوتاہی پر افسوس محسوس کرتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل درآمد کیا۔

''میں اے سی شہریار عادل صاحب کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ اے سی صاحب، مسلم صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا؟'' رابطہ ہونے پر اس نے مہذب لہجے میں دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے چیمہ کے پی اے سے پوچھا۔



''ایم سوری مسٹر عبدالمنان! فی الحال چیمہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں اس لیے ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ جیسے ہی وہ میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں، میں انہیں میسج دے دیتا ہوں'' دوسری طرف سے پیشہ ورانہ تہذیب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ویسے چیمہ کا پی اے چونکہ شہریار اور چیمہ کی ملاقات کے دوران موجود تھا اس لیے وہ اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا..... ورنہ ممکن تھا کہ ڈائریکٹر کا پی اے، ایک چھوٹے ضلع کے اے سی کے پی اے سے اتنی رواداری کا مظاہرہ نہ کرتا۔

''فی الحال تو بات نہیں ہو سکی لیکن تمہیں خود دوبارہ اب دھیان سے میری چیمہ صاحب سے بات کروانی ہے۔'' عبدالمنان نے دوسری طرف سے ملنے والا جواب شہریار کے گوش گزار کیا تو اس نے اسے فوراً ہی سامنے کے منظر میں اُلجھ گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ افراد تھے جو ایک چارپائی اٹھائے سڑک پر تھے۔ چارپائی پر کوئی مختصر سا وجود دراز ہے، یہ فاصلہ ہونے کے باوجود شہریار نے دیکھ لیا تھا۔

''گاڑی روک دو۔'' ہجوم تقریباً سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اس سے کنی کاٹ کر نکل جاتا، شہریار نے اسے حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔

''کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اس طرح بیچ سڑک پر کیوں کھڑے ہو؟'' عبدالمنان نے آگے بڑھ کر ان سے سوال کیا۔

''ہمارا بھانجا ہے صاحب! اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً ہسپتال نہیں پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ گاؤں سے اسے منجی پر ڈال کر یہاں تک لائے ہیں کہ اگر کوئی لاری یا ٹرک سڑک سے گزرے تو اس کے ہسپتال تک پہنچا سکیں۔'' ایک منحنی سے شخص نے آگے بڑھ کر عبدالمنان کے سوال کا جواب دیا۔ ان لوگوں نے چارپائی نیچے رکھ دی تھی اور اس پر لیٹا بارہ تیرہ سال کا لڑکا صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکے کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کی باچھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ خود تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔

''اسے گاڑی میں بٹھاؤ عبدالمنان! ہم واپس نور کوٹ جائیں گے۔'' لڑکے کی حالت کے پیش نظر شہریار نے فیصلہ کرتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود واپس گاڑی کی اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے حکم پر چارپائی سے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ عبدالمنان اور لڑکے کا ماموں بیٹھا۔

''آپ کا بہت شکریہ صاحب! یہ لڑکا میری بہن کا اکلوتا پُتر ہے۔ اس کا پیوڈی خراب طبیعت کا مالک ہے۔ جھٹکے کو کچھ ہو گیا تو وہ میری بہن کو جان سے مار دے گا۔'' ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر واپس نور کوٹ کے راستے پر ڈالی تو بچے کا ماموں شکر گزار لہجے میں بولا۔

''اس بچے کو ہوا کیا ہے؟'' شہریار نے بچے کی غیر ہوتی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''پتہ نہیں جانے صاحب! کہ کیا ہو گیا۔ چنگا بھلا ہی تھا سویرے تک۔ دوپہر میں تاپ چڑھا تو ماں ڈاکٹر کے لے گئی۔ اس نے جانے کیسا ٹیکہ لگایا کہ بچہ ہاتھوں میں آنے لگا۔ خبیث بولا کہ پریشانی کی کوئی گل نہیں، اسے گھر لے جاؤ، تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔ میری بہن سیدھی سادی عورت اس کی چال میں آ گئی۔ گھر جا کر تو بچے کی حالت ہی بگڑ گئی۔ اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ بہن دوبارہ ڈاکٹر کی دکان کی طرف گئی۔ اسے بلا کر بچے کی حالت دکھائے لیکن وہ مردود تو وہاں پر تھا ہی نہیں۔ اردگرد والوں نے بتایا کہ وہ تو اپنا سامان رکھ کر اپنی ویسپا پر بھاگ نکلا۔ میں نے کہا اس مردود سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے بچے کو بچانے کی کوشش کریں۔ بس اللہ نے ساتھ دیا کہ سڑک پر آتے ہی آپ کی گڈی مل گئی۔ بچہ چنگا بھلا

ہو کر خیر نال گھر آ جائے، باقی اُس ڈاکٹر دے پُتر سے تو اس کا پیو خود ہی بعد میں دو دو ہاتھ کر
بندہ ہے وہ۔ ہتھ چُھٹ ایسا کہ گل بعد میں کرتا ہے، بندے کی گدی پہلے پکڑتا ہے۔'' بچے کا ما
ہوا انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

''اس ایریے میں ڈاکٹر کہاں سے آیا؟ ہمیں اپنے ہیلتھ یونٹس کے لیے تو ڈاکٹرز ملتے نہیں
نے پلٹ کر عبدالمنان سے سوال کیا۔

''ڈاکٹر واکٹر کیا سر!.....اس طرح کے علاقوں میں جہاں میڈیکل کی سہولیات دستیاب نہیں
اپنی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانے لگتے ہیں۔ ان نان کوالیفائیڈ ڈاکٹر
اناڑی پن کی وجہ سے اس طرح کے واقعات رونما ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ہے، جیسا کیس اس
سامنے ہے۔'' عبدالمنان نے اپنے سامنے موجود بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی حالت ہر گزر
ساتھ دگرگوں ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''یہ تو سیدھا سادھا کرائم ہے۔ ایسے افراد کے خلاف تو سخت ایکشن لینا چاہیے۔ آ
اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔'' بچے کی حالت شہریار کو غصے میں
وہ ذرا سا رخ موڑ کر بچے کے ماموں کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ اس جعلی ڈاکٹر کا حلیہ اور اس کی ویسپا کا نمبر بتا سکتے ہیں؟''

''ویسپا کا نمبر تو مجھے نہیں مالوم صاحب! بس اتنا پتہ ہے کہ نیلے رنگ کی ویسپا ہے۔ رہی اس
حلیے کی گل تو حلیہ تو اُس کا ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی خباثت کا معلوم پڑ جاتا ہے۔ کالی سیاہ تو
بونا سا قد، خوب باہر کو نکلی ہوئی توند اور وڈی وڈی مونچھیں ہیں اُس کی۔'' بچے کا ماموں جو شہریار
نہیں پہچانتا تھا، اُس کے بارعب لہجے اور انداز سے اُس کی بااختیار حیثیت کا اندازہ لگاتے
سے لہجے میں بتانے لگا۔

''عبدالمنان! ڈی ایس پی منظور کو فون کرو کہ ساری چیک پوسٹس پر پیغام دے دے کہ
پر ایسے حلیے والا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے
سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوگا۔'' اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس کی تعمیل کے لیے
نکال کر فوراً ہی ڈی ایس پی منظور کو کال کرنے لگا۔

''یہ کون صاحب ہیں جناب؟'' وہ کال کر کے فارغ ہوا تو بچے کے منحنی سے ماموں نے سر
سے پوچھا۔

''یہ ہمارے ضلع کے اے سی صاحب ہیں۔'' عبدالمنان نے جواب دیا تو اس کا منہ کھل
سرکاری افسر کا ایسا ہمدردانہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اسے اپنی اس حیرت کا زبان سے
نہیں ملا اور گاڑی نور کوٹ کے ہسپتال کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اور بچے کے ماموں مل کر
اتار کر ہسپتال میں منتقل کرنے لگے۔ ہسپتال کے عملے کے لیے شہریار کی گاڑی جانی پہچانی تھی چنا
ذمے دار بھاگا ہوا آیا۔

''اس بچے کا ٹریٹمنٹ بہت کیئر فل ہو کر کرنا ہے۔ بعد میں مجھے اس کی حالت کے بارے میں
گا۔'' شہریار نے اسے ہدایت دی جس کے جواب میں اس نے تیزی سے اپنی گردن کو حرکت دی
''آپ فکر نہ کریں سر! ہم بچے کا پورا دھیان رکھیں گے۔''



دفتر چلو۔'' ہسپتال کے گیٹ پر عملے کے کسی فرد نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی تھی اس لیے وہ واپس
شہریار نے یہ جملہ اسی سے کہا تھا۔ اس نے فوراً حکم پر عمل درآمد کیا اور گاڑی دفتر کی طرف چل پڑی۔
کیس کی وجہ سے ان کا آج نور پور جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لیکن شہریار مطمئن تھا۔ ایک
اس کے نور پور کے دورے سے زیادہ اہم تھی۔

جعلی ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے سر!'' وہ لوگ ابھی دفتر واپس نہیں پہنچے تھے کہ عبدالمنان کے موبائل
ہوئی اور اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

.....دیری گڈ۔ خیال رکھنا کہ یہ شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو اس کے علاوہ اس طرح
افراد مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے ان کے
لو۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ان اتائیوں کے ہاتھ میں دینے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔'' جعلی
گرفتاری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں لیکن خود اسے اس بات کا بھی
کہ عوام کو اتائیوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے صرف ان افراد کے خلاف ایکشن لینا کافی نہیں ہو
جلد از جلد لوگوں کو علاج کی ایسی سستی سہولیات فراہم کرنی ہوں گی کہ اگر کوئی اتائی کہیں بے خبری میں
اٹھانا بھی چاہے تو از خود ناکام ہو جائے۔ طبی سہولیات کی ناقص فراہمی یا عدم دستیابی ملک بھر کا مسئلہ
جانتا تھا لیکن پورے ملک کے مسائل کو حل کرنا اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دائرۂ عمل میں
جتنا کر سکتا تھا، اتنا کر رہا تھا اور مزید بھی کرتے رہنے کا عزم دل میں رکھتا تھا۔

⊛----✪----⊛

اس کے ہر سُو برف ہی برف تھی۔ وہ گھنٹوں چلتے تھے اور پھر خود کو اسی برف زار میں پاتے تھے۔ انہیں خود
ہو چکا تھا کہ وہ اس برف زار میں بھٹک گئے ہیں۔ درحقیقت وہ دونوں ہی راستوں سے قطعی ناآشنا
نے فرار کا منصوبہ بناتے وقت صرف ایک بات کو مدِنظر رکھا تھا اور وہ یہ کہ تربیت یافتہ یاک انہیں
راستوں سے گزار کر خود ہی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا لیکن قسمت کی خرابی سے وہ پہلے ہی
یاک سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں فرار سے روکنے کی کوشش کرنے والوں نے جب ان پر فائرنگ کی تھی
فائرنگ کی زد میں ان کی سواری کا ذریعہ اور راہبر یاک آ گیا تھا۔ یاک کے بغیر وہ بالکل بے دست و پا ہو
تھے۔ اوپر سے عمران خود بھی زخمی تھا۔ ماہ بانو مخصوص وقفے کے بعد اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتی
درد کم کرنے اور بخار اُتارنے کی گولیاں بھی باقاعدگی سے کھا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت
دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔

اس گولی کی وجہ سے تھا جو ابھی تک جسم میں پیوست تھی اور زخم کو خراب کرنے کا سبب بن رہی تھی۔
بھی وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال تھا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی لحہ بہ لحہ بڑھتی سرخی اس بات کی
کر رہی تھی کہ بخار ایک بار پھر کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کے باوجود اس نے اپنے قدم نہیں
اور مسلسل چل رہا تھا۔ اس کے صحت مند شانے سے وہ تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں اس کی ضرورت کا
تھا۔ ایسا ہی ایک تھیلا ماہ بانو کے پاس بھی تھا۔ یاک کی موت اور عمران کے زخمی ہونے کے بعد انہوں
ساتھ لایا ہوا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھ لیا تھا۔ ماہ بانو کے حصے میں جو
تھا، اس میں خوراک اور ادویات موجود تھیں جبکہ عمران کے تھیلے میں سلیپنگ بیگز، اسٹوو، پانی کی بوتلیں

اور کچھ ایسی چیزیں موجود تھیں جو کسی برفانی علاقے میں سفر کے دوران معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس
اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور ماہ بانو کے پاس صرف ایک ہلکی سی رائفل تھی۔ اگر وہ زخمی نہیں ہوتا
بوجھ خود ہی اٹھانا پسند کرتا۔ لیکن اب مجبوری تھی اس لیے ماہ بانو کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

وہ دونوں ہی بے حد تھک چکے تھے لیکن ایک بار پھر زندگی کی رونقوں میں شامل ہونے کی
انہیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس خواہش کا دامن تھامے، اس وقت وہ ایک گلیشیر پر
تھے۔ قدرے سخت برف والے اس گلیشیر پر قدم جما کر چلنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آ رہی تھی
ہوائیں خوب مزاج پوچھ رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی ٹھنڈک میں ایسی کاٹ تھی کہ بارہا انہیں محسوس
کے ساتھ برف کی کرچیاں سی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ان کاٹ دار ہواؤں سے
انہوں نے اپنے سروں پر پہنی مخصوص ٹوپیوں کو چہرے پر بھی کھینچ لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں
جن پر انہوں نے چشمے چڑھا لیے تھے۔ لیکن برف زاروں کی موسمی شدت کا مقابلہ کرنا اتنا آسان
ہے۔ یہاں موسم اتنی تیزی سے اور اچانک بدلتے ہیں کہ ہر احتیاطی تدبیر ناکام ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ پہلے ٹھنڈی یخ ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے
بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر بڑی تیزی سے ان قطروں نے منجمد ہو کر برف کی شکل اختیار کر لی
گالوں کی طرح تواتر سے گرتی برف جہاں سردی کے احساس کو بڑھا رہی تھی، وہیں اس نے اردگرد
بھی دُھندلا ڈالا تھا۔ ان کے لیے چند فٹ آگے کا راستہ دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود
اٹھانے پر مجبور تھے کیونکہ آس پاس کوئی ایسی پناہ گاہ بھی نہیں تھی جہاں کچھ دیر رک کر اس برف باری
جا سکے۔

''ماہ بانو! میرا ہاتھ تھام لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دُھند میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔''
کو اپنے قریب سے عمران کی مدھم سی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس ویران
میں تنہا رہ جانے کا خیال ہی بہت خوف ناک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جگہ جہاں عمران کے ساتھ ہونے
زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہے، تنہا رہ جانے کی صورت میں دشوار ترین ہو جائے

''پتہ نہیں ہم یہاں سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟'' لمحہ بہ لمحہ اپنے لباس پر موٹی ہوتی برف کی
کرتے ہوئے اس نے قدرے مایوس کن لہجے میں عمران سے کہا۔

''ان شاء اللہ!..... ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت
ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہتا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔''
نے اسے تسلی دی۔

''تم شاید ٹھیک کہہ.....'' ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور
اپنے بڑھے ہوئے دائیں قدم کے نیچے سے زمین کو غائب پایا۔ اس کا بایاں قدم ابھی زمین پر ہی تھا
اتنی مضبوطی سے نہیں جما ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال پاتی۔ اضطراری طور پر اس کے حلق سے ایک زوردار
پھر اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ یہ عمران تھا جس نے پوری قوت سے اسے پیچھے کی طرف
نظر اسے بھی کچھ نہیں آیا تھا لیکن ماہ بانو کا ہاتھ گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے اس کے جسم کو
فوری طور پر محسوس کر لیا تھا اور فوری ردِعمل کے طور پر اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس خوفناک
گزرنے کے بعد انہوں نے بہ غور جائزہ لیا تو ایک دراڑ نظر آئی۔ کسی گلیشیر پر موجود ایسی دراڑیں



اگر کوئی شخص بے دھیانی میں دراڑ میں گر جائے تو پھر اس کا بچنا ممکن نہیں رہتا۔ نیچے موجود یخ برف
میں اسے منجمد کر کے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ماہ بانو کی خوش قسمتی تھی کہ دراڑ نے اسے
دم ہی بخش دیا تھا اور عمران کا ہاتھ تھامنا اس کے کام آ گیا تھا۔

ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اس کے خوف نے انہیں مزید قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرنے
رک کر برف باری رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور برف باری
اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک رک گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ان دونوں کا حشر خراب ہو چکا
برف گر چکی تھی کہ وہ خود برف سے بنے ہوئے پُتلے لگ رہے تھے۔ برف باری رُکی تو انہوں نے
برف کی تہ جھاڑی اور آگے کا سفر شروع کیا۔

دراڑ میں ماہ بانو گرتے گرتے بچی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ان دونوں نے آرام سے وہ دراڑ
اور آگے کا سفر شروع کیا۔ لیکن اب وہ بہت زیادہ محتاط تھے۔ اور ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھا رہے
نے اپنی رائفلوں کو واکنگ اسٹک کی طرح ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس طرح وہ برف کی کسی پتلی تہ
دراڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ آگے کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ جلد گلیشیر کو پار کر کے ایک ایسے
گئے جہاں کچھ دیر ستایا جا سکتا تھا۔ عمران جواب تک بہت زیادہ اہمیت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، اس
کر بالکل ڈھے گیا اور اپنا سلیپنگ بیگ بچھا کر اس میں گھس گیا۔ اس کی حالت کے پیش نظر ماہ بانو
یا اور جلدی سے نوڈلز سُوپ کا پیکٹ نکال کر سُوپ تیار کیا اور پھر چائے کا پانی چڑھایا۔

گرم سُوپ نے عمران کے سرد پڑتے جسم کو خاصی توانائی فراہم کی اور وہ اس لائق ہو گیا کہ اُٹھ کر بیٹھ
پینے سے خود ماہ بانو نے بھی خود کو کافی بہتر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ چائے نکالنے سے پہلے اس نے
زخم کی نئے سرے سے مرہم پٹی کی۔ ٹھنڈک نے زخم پر برا اثر ڈالا تھا اور زخم کے اردگرد کی جگہ پر اس کا
پڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن ماہ بانو مجبور تھی۔ وہ زخم کی پٹی تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی
تبدیل کرنے کے بعد اس نے کپوں میں چائے نکالی۔ ساتھ ہی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے۔ چائے
ڈبل روٹی کھانے کے بعد عمران نے بخار اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائیں اور ماہ بانو کو سامان سمیٹتے
رہا۔

اب آگے چلتے ہیں۔'' وہ سامان سمیٹ چکی تو اس نے اس سے کہا۔

تم مزید چل سکو گے؟'' ماہ بانو نے اس کی حالت کے پیش نظر تشویش سے پوچھا۔

چلے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک
جائے۔'' اتنی تکلیف اور مایوس کن صورتِ حال کے باوجود عمران کا عزم اور حوصلہ قابل ستائش تھا۔

ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے سامان کا تھیلا کاندھے پر لٹکا لیا۔ سامان سمیٹ کر رکھنے کے
عمران کے تھیلے کا بھی کچھ سامان اپنے تھیلے میں منتقل کر چکی تھی۔ وہ زخمی اور بیمار تھا اس لیے وہ اسے کم
دینا چاہتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ پورا ہی سامان خود اٹھا لیتی۔ لیکن ظاہر ہے، اس کا تعلق صنفِ نازک
وہ ایک حد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی۔ اگر اس کی پرورش گاؤں کے سخت ماحول میں ہوئی
بھی اسے سخت کوشی کی عادت ہوتی ہے لیکن بے بے اور ابا نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اس
میں کتابوں کے بوجھ کے سوا مشکل سے ہی کوئی دوسرا بوجھ اٹھایا تھا۔ وہ تو اس میں قدرتی طور پر
مطابق خود کو ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ اپنے سخت حالات سے کسی نہ کسی

طرح گزرتی جارہی تھی۔ اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ گرم میدانوں کی رہنے والی وہ لڑکی اس میں اپنی بقا کی جنگ لڑسکتی۔

''میرے خیال میں ہم اپنا رخ بدل کر جنوب کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس چلنے پر ہمیں آبادی کی طرف جانے والا کوئی راستہ سجھائی دے جائے۔'' کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا۔ اس کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ برف کے ان سفید اژدہے مسلسل ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے تھے۔ ان کے پاس سفر کے لیے کوئی واضح منصوبہ تو موجود نہیں تھا کی گنجائش نکل پاتی۔ بس راستہ چلتے ایک کو اگر کوئی خیال سوجھ جاتا تو دوسرا اس پر عمل درآمد کر بہتری جانتا۔

اس وقت بھی انہوں نے اپنا رخ بدل کر جنوب کی سمت سفر شروع کردیا۔ زخمی ہونے کے باوجود رفتار اس سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے حصے کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ سست رفتار ہوگئی تھی لیکن منظر صاف ہونے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ دور رہ کر بھی ایک نظر رکھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس مقام سے گزر رہے تھے، وہ خود تو ہموار تھا لیکن اس پر بہت سی چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں نے نہ جانے کب سے گرنے والی برف کا بوجھ اپنے سروں پر اور دیکھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ اتار پھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ کم از کم ماہ چوٹیوں پر نظر ڈال کر یہی احساس ہوا تھا۔ اب جانے یہ قدرت کا طے شدہ فیصلہ تھا یا اس کے احساس کی کہ یکایک فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور دو پہاڑوں کے درمیان سے برف کا تودہ لڑھکتا ہوا

برف کا یہ بھاری تودہ اپنے راستے میں موجود برف کو بھی دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ برسوں سے پہاڑوں برف سفید سفوف کے آبشار کی شکل میں نیچے کی طرف برق رفتاری سے بہتی چلی آرہی تھی۔ یہ ایوالانچ زاروں کا ایک خاص تحفہ جسے ایک جانب کھڑے ہوکر خوشگوار موڈ میں دیکھو تو اس سے بڑھ کر خوب صورت کوئی نہ لگے۔ اور اگر جو کوئی اس کی زد میں آجائے تو بچ نکلنے کی راہ نہ پائے۔ ماہ بانو نے اپنی زندگی میں کوئی ایوالانچ دیکھا تھا چنانچہ پل بھر کو تو وہ منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے تکتی ہی چلی گئی لیکن اسے عمران کا خیال آیا۔ وہ اسی طرف تھا جس طرف اس ایوالانچ کا رخ تھا۔ اس نے نظروں کا رخ بدل کر کی پوزیشن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی ایوالانچ کی وجہ سے اُبھرنے والی گونج سن لی بالکل اسی کی طرح حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے قطعی ادراک نہیں ایوالانچ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔

''عمران! بھاگو..... ہٹ جاؤ وہاں سے۔'' ماہ بانو زور سے چیخی لیکن اس کی آواز برفانی تو گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ پھر عمران نے خود ہی صورتِ حال کو بھانپ لیا اور اپنی جگہ سے بھاگا لیکن اس ایوالانچ کی رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ایوالانچ کسی پھنکاریں مارتے سفید اژدھے کی طرح اس کی لپکتا چلا جارہا تھا۔

ابھی کچھ دیر قبل وہ جس ایوالانچ کو پہاڑ سے برف کے سفید بہتے آبشار کی طرح گرتے دیکھ کر محو وہ اسے کسی سفید اژدھے کے مانند عمران کو نگلتے دیکھ کر خوف کی شدت سے چیخنا بھی بھول گئی۔ سفید سلا نے عمران کے فرار کی کوشش کو ناکام بنا کر لمحوں میں اسے آلیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا وجود اس برف دب گیا۔ ایک انسانی جان کی بھینٹ لینے کے بعد وہ شور مچاتا برفیلا اژدھا خاموش ہوا تو یوں لگا کہ جیسے



ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن یہ ماہ بانو تھی جو محسوس کرسکتی تھی کہ کیا ہوگیا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ان جسے ایک حادثے نے کچھ عرصے کے لیے راہِ راست سے بھٹکا دیا تھا، وجود سے عدم ہوگیا۔ اپنی ماہیت قلبی کے بعد جانے کون کون سے کام کرنے تھے؟ وہ اس برف زار سے نکل کر کی رونقوں میں شامل ہوکر کچھ کر دکھانا چاہتا تھا لیکن یکدم ہی اس کا وجود زمین سے غائب ہو ب ہونا ماہ بانو کو اس برف زار کی ویرانیوں میں بالکل تنہا کرگیا۔ وہ پیارا لڑکا جس نے اسے دیکھ وہ اسے بالکل اپنی بہن جیسی لگتی ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اسے اس کے قید خانے سے نکال لایا اس سے جدا ہوگیا تھا۔

ان کے بغیر میں تنہا اس برف زار میں کیسے سفر کروں گی؟'' پھنکاریں مارتا ہوا یہ خیال اس کے ذہن کہ صدمے سے منجمد سی ہوگئی تھی، سامان کا تھیلا ایک طرف پھینکا اور اس طرف بھاگی جہاں اس عمران کو دیکھا تھا۔

ان!..... عمران.....!'' برف ہٹاتے ہوئے وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دے رہی تھی لیکن اس کی ہر کر واپس پلٹ آتی تھی۔ وہ برف ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے زار و قطار رو بھی رہی تھی لیکن آنسوؤں کے بہنے کا احساس نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک بات سوچ رہی تھی کہ اسے کسی کو اس برف کے نیچے سے نکالنا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ اس کوشش میں ناکام ہیں پلٹ کر اپنے سامان کے تھیلے کی طرف گئی۔ اس تھیلے میں اسٹیل کے ایک بڑے چمچے اور ایک چھری کچھ نہیں تھا جس سے وہ برف کی کھدائی کرسکتی۔ شاید عمران کے تھیلے میں ایسی کچھ چیزیں موجود ہوں تھیلا اس کے ساتھ ہی ایوالانچ کی نذر ہوچکا تھا۔ ماہ بانو اسٹیل کا چمچہ اور چھری لے کر واپس اس مقام پر وہ کچھ دیر قبل اپنے ہاتھوں سے برف کھودنے کی کوشش کررہی تھی۔ چمچے اور چھری کی مدد سے اس کو کھرچنے اور کھودنے کی سرتوڑ کوشش شروع کردی۔ اس کوشش میں اس کے دونوں بازو شل ہوگئے مضبوطی سے بلاک کی طرح جم جانے والی برف کی تہ کو چند انچ سے زیادہ کھودنے میں کامیاب نہیں اسے احساس ہوگیا کہ وہ ایک سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہے۔ اوّل تو وہ اس برف کو کھود نہیں سکے ایک طویل جدوجہد کے بعد کھودنے اور ہٹانے میں کامیاب ہو بھی جاتی ہے تو اتنی دیر بعد عمران کا زندہ نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔ ناکامی کے اس احساس نے اس کی ہمت توڑ دی اور وہ وہیں برف پر گر کر رونے لگی۔ اس رونے میں عمران جیسے پُرخلوص نوجوان کی ناگہانی موت کا غم بھی شامل تھا اور اپنی بھی۔ کافی دیر تک وہ ان دونوں احساسات کے تلے برف پر چت لیٹی آنسو بہاتی رہی۔

ان شاء اللہ! ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔'' روتے کے ذہن میں عمران کے الفاظ گونجے۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا عمران کو اس سے یہ الفاظ ۔ ابھی مشکل سے چند گھنٹے ہی تو گزرے تھے اور اس کے ان الفاظ کو ادا کرنے کے بعد اگلے ہی لمحے اس کے ان الفاظ کی تصدیق بھی کردی تھی۔ ایک دراڑ اُسے نگلنے کو ہی تھی جب عمران نے یک دم اسے رف کھینچ کر گرنے سے بچالیا تھا۔ وہ نہ تو اس دراڑ میں گر کر منجمد ہوئی تھی، نہ ہی زندگی میں پہلی بار بھگتی ی برف باری نے اسے کچھ کہا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ وہ ایوالانچ آنے کے وقت سامان کی وجہ سے عمران کے بالکل ہم قدم چلنے کے بجائے اس سے کافی پیچھے چل رہی تھی ورنہ دوسری صورت

یہ بھی تو ہوسکتی تھی کہ وہ عمران کے ساتھ ہی اس منوں برف کے نیچے دفن ہو جاتی اور اس کا نام ونشان نہیں رہتا۔ پھر کسے خبر ہوتی کہ پنجاب کے میدانوں میں رہنے والی ماہ بانو جو اپنی بقا کی جدوجہد کر اس برف زار میں پہنچ گئی تھی، برف تلے کہاں اور کس مقام پر خود بھی برف ہوگئی ہے۔ عمران نے تھا، اللہ ہر ہر مقام پر، ہر ہر لمحے اس کی حفاظت ہی تو کر رہا تھا۔ پھر وہ کیوں مایوسی کا شکار ہو کر کفران مرتکب ہو رہی تھی۔ اسے تو اللہ کی ان مہربانیوں کے جواب میں شکر ادا کرنا چاہئے تھا۔

''یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔'' بھی کچھ دیر قبل عمران نے کہے تھے۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی حالت کتنی خراب تھی۔ گولی کی تکلیف کی شدت کے باوجود وہ مایوس ہونے کے لیے راضی نہیں تھا تو پھر وہ کیسے اپنے صحیح وسالم ہاتھ پیروں ہمت چھوڑ سکتی تھی۔ اسے بھی سفر جاری رکھنا تھا۔ اس وقت تک کوشش کرنی تھی، جب وہ یا تو اس برف سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی یا پھر عمران ہی کی طرح مشیت ایزدی اسے اس برف زار کا پیوند بنا دیتی والا وقت پردۂ غیب سے کیا سامنے لانے والا تھا، اس کا علم تو اس عالم الغیب کے علاوہ کسی کو نہیں تھا خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر اپنی جان کی حفاظت فرض تھی۔ اس فرض کا احساس دل میں جاگتے جگہ سے اُٹھی اور سامان کا تھیلا شانوں پر لادتے ہوئے ایک بار پھر ایک نئے عزم سے چلنے لگی۔ لیکن آنکھیں پُرنم تھیں..... اپنے اس ساتھی کے لیے جسے وہ اس برف زار میں منوں برف کے نیچے تنہا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

آذر کے گھر سے نکلنے کے بعد مشابرم خان نے ہسپتال کا رخ کیا۔ رات ہو چکی تھی اور وہ صغیر بیگ بیان کی تصدیق کے لیے کسی سے ملنے نہیں جا سکتا تھا۔ صغیر بیگ نے نیاز علی کی کارروائیوں کی طرف لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ نیاز علی کو پرانا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے خصوصی رعایت دیتا اکثر اوقات کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس جانے سے ایک رات قبل ہی نیاز علی جیپ اپنے ساتھ اپنے جاتا تھا۔ ان حالات میں بہت ممکن تھا کہ نیاز علی جو کچھ کرتا رہا تھا، اس سے صغیر بیگ واقف نہ بہرحال اسے صغیر بیگ کے اس بیان کی تصدیق کرنی تھی اور تصدیق کے لیے صبح کا انتظار لازمی تھا۔ چنانچہ نے وہ وقت ماں کے پاس ہسپتال میں گزارنا مناسب سمجھا۔ وہ ہسپتال پہنچا تو نائٹ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر معمول کا چیک اپ کرنے میں مصروف تھا۔

''آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! کیسی حالت ہے ان کی؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''وہی پہلے جیسی۔ ان کے جسم کے سارے اعضاء درست کام کر رہے ہیں لیکن ذہن کو لگنے والے کی وجہ سے خود ان کے اپنے اندر جاگنے اور آنکھیں کھولنے کی خواہش پیدا نہیں ہو پا رہی۔ اس قسم کے کے بارے میں کوئی بھی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ چند دنوں میں بھی ہوش میں آسکتی ہیں اور کئی سال بھی سکتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے مریض اسی حالت میں موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بہت سا گوئی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا لیکن بس ایک بے نام سی تھی جو اسے بار بار ڈاکٹروں سے سوال کرنے پر اُکساتی تھی۔

''اگر میں انہیں اسلام آباد یا لاہور کے کسی ہسپتال لے جاؤں تو کوئی فرق پڑ سکتا ہے؟''



''ایز یو وِش۔ لیکن میرے خیال میں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ کوشش کر لینے میں کوئی حرج ہے۔'' ڈاکٹر نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ مشابرم خان تھکے تھکے انداز میں ماں کے قریب رکھی کرسی پر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

اس کیفیت میں بیٹھے بیٹھے اسے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ یونہی اس کے دل میں اپنا موبائل چیک کا خیال آیا۔ خیال آنے پر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالنا چاہا لیکن موبائل موجود نہیں تھا۔ وہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ساری جیبیں ٹٹولنے لگا لیکن کسی بھی جیب سے موبائل برآمد نہ ہو سکا۔ یہ ایک کن صورتِ حال تھی۔ وہ ذہن پر زور دینے لگا کہ موبائل کہاں رہ سکتا ہے؟ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ صغیر کے پیچھے روانہ ہونے سے قبل اس نے اپنے موبائل سے جیپ کے لیے کال کی تھی۔ یعنی اس وقت تک اس کے پاس موجود تھا۔ اب دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو موبائل اس وقت جبکہ وہ صغیر بیگ کو بے ہوش کے بعد اپنی جیپ میں منتقل کر رہا تھا، جائے وقوعہ پر ہی گر گیا تھا یا پھر آذر کے گھر پر رہ گیا تھا۔ اگر آذر میں رہ گیا تھا تو خیر تھی لیکن جائے وقوعہ پر گر جانے کی صورت میں اسے ایک بار پھر پولیس کی تفتیش کا کرنا پڑتا۔ نیاز علی والے معاملے میں اس کی پوزیشن پہلے ہی مشکوک تھی، اب صغیر بیگ کے اغوا کیے جانے ام پر اس کا موبائل پولیس کو مل جاتا تو اس کے لیے دامن بچانا مشکل ہو جاتا۔

وہ پریشان سا ہو کر ہسپتال سے نکلا۔ کرائے کی جیپ اب بھی اس کے پاس موجود تھی لیکن جیپ استعمال کے بجائے اس نے پیدل جانا مناسب سمجھا۔ اگر موبائل سڑک پر کہیں گرا تھا تو اسے پیدل چل کر تلاش زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ اس طرح اس کے نظر میں آجانے کے زیادہ امکانات ہوتے۔ کشمکش اور اُلجھن کا پیدل چلتا ہوا اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں سے اس نے صغیر بیگ کی جیپ رُکوا کر اسے اغوا کیا تھا۔ سڑک رکتے ہی اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ عموماً ویران پڑا رہنے والا وہ راستہ اس وقت ویران نہیں تھا اور وہاں کے چند سپاہی نظر آرہے تھے جو اپنے ہاتھوں میں روشن ٹارچیں تھامے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ بہت زیادہ لوگوں کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے یقیناً پولیس کو دیر سے وقوعہ کی اطلاع ملی تھی اس لیے وہ وقت کارروائی کر رہے تھے۔ پولیس کی موجودگی میں اس کا وہاں جانا خطرناک ثابت ہوتا چنانچہ وہ وں پلٹ گیا اور راستہ بدل کر آذر کے گھر کا رخ کیا۔ اب وہ اس امید پر ہی تکیہ کر سکتا تھا کہ اس کا آذر کے گھر مل جائے تاکہ وہ پولیس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہ سکے۔

پریشانی کے عالم میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آذر کے گھر پہنچا۔ صغیر بیگ رسیوں سے بندھا اسی حالت تھا جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی آمد کو محسوس کر کے صغیر بیگ کا جسم ذرا سا کسمسایا لیکن اندشوں کی وجہ سے نہ تو وہ حرکت کر سکتا تھا اور نہ ہی مشابرم خان نے اس کی آواز نکالنے کی گنجائش ی۔ چنانچہ بے چارہ بے بسی سے بس کسمسا کر ہی رہ گیا۔

شابرم خان اسے نظرانداز کرتے ہوئے اپنا موبائل تلاش کرنے لگا۔ پہلے اس نے کمرے کی تلاشی لی، اسے مایوس ہونے کے بعد کچن میں جا کر اٹھا پٹخ کرنے لگا۔ بہت باریک بینی سے کسی سُوئی کے مانند گھر میں اپنا موبائل تلاش کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ ناکامی ہی آسکی۔ اپنی جیپ کی وہ ہسپتال سے تے وقت اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا چنانچہ اب صرف یہی امکان رہ گیا تھا کہ اس کا موبائل جائے ی کہیں گر گیا تھا اور وہاں پولیس پہنچ چکی تھی۔ اور چنانچہ اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ موبائل پولیس کو اور اس کے بعد اسے صغیر بیگ کے اغوا کے معاملے میں شامل تفتیش کر لیا جاتا۔ وہ اپنے ذہن میں اس

متوقع تفتیش سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچتا ہوا ایک بار پھر آذر کے گھر سے نکل کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو
موجودہ حالات میں ضروری تھا کہ وہ آذ کے گھر سے دور کسی پبلک پلیس پر رہتا تا کہ کچھ ایسے گواہ مل جا
پولیس کو یہ بتا سکتے کہ اس نے آج کے دن اور رات کو زیادہ تر حصہ اپنی ماں کے ساتھ ہسپتال میں گزارا
ہسپتال پہنچ کر ماں کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سوئی جاگتی کیفیت میں رات گزاری۔
اسے ایسا لگتا تھا کہ ابھی پولیس کا کوئی اہلکار وہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن صبح تک ایسا کچھ نہ ہوا تو وہ خود اُلجھن کا
ہوگیا۔ بہر حال، ہسپتال میں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرتے رہنا بھی ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ وہاں سے نکلا اور
اس چائے خانے پر پہنچا جو صغیر بیگ کی ٹورسٹ کمپنی کے عین سامنے تھا۔ کئی دن سے مسلسل وہاں ناشتہ کر
رہنے کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک مستقل گاہک کی سی ہوگئی تھی اور کافی لوگ اسے پہچاننے لگے تھے۔
لوگوں میں شامل ہوگیا۔ ان کے درمیان دو موضوع زیر بحث تھے۔ ایک کل رات صغیر بیگ کا ہونے والا اغوا
دوسرا ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کے ساتھ لوٹنے والے پورٹرز کی یہ اطلاع کہ انہوں نے پہاڑوں میں کہیں فائر
کی آوازیں سنی ہیں۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں یارا! ہم لوگوں نے خود پہاڑوں پر فائرنگ کا آواز سنا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ
گروپ آپس میں مقابلہ کر رہے ہوں۔'' واپس لوٹنے والے پورٹرز میں سے ایک اس وقت بھی یہاں موجود
اور بڑے جوش سے بتا رہا تھا۔ وہ یقیناً آج صبح سویرے ہی واپس لوٹا تھا۔ سفر کی تھکن اس کے جسم سے ٹپک
رہی تھی اور آنکھیں نیند سے بے حال تھیں۔ لیکن شاید اپنے پاس موجود ایک سنسنی خیز اطلاع کی بے چینی
اسے گھر جا کر آرام نہیں کرنے دیا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی فوجیں آپس میں فائرنگ کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی دونوں فوجوں
کے درمیان ایسی جھڑپ ہو جاتی ہے۔'' مشابرم خان نے تفصیلات جاننے کے لیے ایسے ہی ایک نکتہ بیان
ورنہ وہ خود فائرنگ کی اطلاع سن کر چونک گیا تھا۔ اس کے ذہن میں پوری طرح یہ بات موجود تھی کہ کچھ لوگ
ہیں جو پہاڑوں میں خفیہ طور پر بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ جس طرح ان لوگوں نے اکرم خان کو قتل اور ماہ بانو کے
کی کارروائی کی تھی، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی پُرامن یا بے ضرر لوگ نہیں ہیں۔ اگر انہوں
دنیا سے کٹ کر برف پوش پہاڑوں میں اپنا ٹھکانہ بنایا تھا تو یقیناً ان کے کچھ ایسے مذموم مقاصد تھے جنہیں
سب سے چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ پہاڑوں سے واپس لوٹنے والے پورٹر کی سنائی گئی اطلاع پر اس کا ذہن
لامحالہ ان لوگوں کی طرف چلا گیا۔

''پاک بھارت فوجوں کا جہاں ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے، وہ پوزیشن الگ ہے۔ ہم نے
طرف سے فائرنگ کا آواز سنا، ادھر تو سرے سے کوئی جاتا ہی نہیں۔ پاک فوج کا بھی اُدھر کوئی کیمپ نہیں
ہم نے جس طرف سے فائرنگ کا آواز سنا، وہ جگہ تو ہمارے ٹریک سے بھی بہت ہٹ کر تھا۔ ہمیں بھی بس دور
ہی آواز سنائی دی تھی، پر وہ اتنی دور کی بھی آواز نہیں تھی کہ ہم اسے پاک بھارت فوج کی جھڑپ سمجھتے۔'' پورٹر
نے کچھ خفگی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اچھا، یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔ ذرا لوکیشن تو بتاؤ تا کہ ہمیں بھی کچھ اندازہ ہو سکے کہ یہ سب کس
طرف ہوا؟'' مشابرم خان نے تجسس سے پوچھا۔ جواباً پورٹر نے اسے لوکیشن کی تفصیل کہہ سنائی۔

''میرے خیال میں اس طرف پاک آرمی نے اپنا کوئی نیا یونٹ قائم کیا ہوگا اور وہ لوگ کوئی مشق کر رہے
ہوں گے۔ اس طرف حکومت کی کوئی نہ کوئی خفیہ کارروائی چلتی ہی رہتی ہے۔ وہ تو اتفاق تھا کہ تم لوگوں



کی آواز سن لی، ورنہ نہ جانے پہاڑوں میں کہاں کہاں آرمی نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔'' محفل میں
ایک شخص نے خیال آرائی کی جس سے دوسرے افراد نے بھی اتفاق کیا۔ وہ لوگ اس حیرت انگیز فائرنگ
اور دوسری توجیح پیش کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔

''نہ جانے یہاں کیا کیا ہونے لگا ہے۔ ورنہ ہمارے علاقے سے زیادہ پُرامن جگہ تو کوئی دوسری تھی ہی
اب صغیر بیگ صاحب کے اغوا کا معاملہ ہی لے لو۔ کل سے اب تک ان کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔
رے اچھے، نیک اور شریف آدمی ہیں۔ پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ پہلے ان کا ڈرائیور
اپنی جان سے گیا اور اب وہ خود غائب ہیں۔''

ایک شخص کے اس تبصرے پر مشابرم خان چور سا بن گیا۔ ان دونوں معاملات سے ہی اس کا براہِ راست
تھا لیکن شکر ہے کہ وہاں موجود افراد میں سے کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ نیاز علی اپنی موت کے
کے ساتھ تھا۔ وہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر اپنے تبصروں میں مصروف رہے۔

''صحیح کہہ رہے ہو بھائی! صغیر بیگ صاحب تو خیر آدمی ہی بہت اچھے ہیں لیکن مجھے تو نیاز علی کا بھی دل
ہے۔ وہ جیسا بھی تھا اور ہم سے کتنی ہی بداخلاقی سے پیش آتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کا سوچ کر دکھ
ہے۔ اس کے بعد کون ان لوگوں کا خیال رکھے گا؟'' ایک شخص اسی دردمندی سے کہہ رہا تھا جو ان پہاڑی
ل رکھنے والوں کی ازلی خاصیت ہے۔

''اس بات کا تو سب کو افسوس ہے۔ لیکن سنا ہے کہ نیاز علی کچھ غلط کام کرنے لگا تھا اور اس کے پاس پیسہ
آ گیا تھا۔ غلط دھندے میں پڑنے والوں کے ساتھ کب کیا ہو جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔'' وہ لوگ
کر رہے تھے جنہیں مشابرم خان دھیان سے سن رہا تھا۔

''کیا صغیر بیگ صاحب کو نہیں معلوم تھا کہ نیاز علی غلط کام کرنے لگا ہے؟ وہ تو سنا ہے اس پر بہت اعتماد
تھے۔'' صغیر بیگ کے کردار کے تعین کے لیے اس نے یہ سوال کیا۔

''اپنے بیگ صاحب تو اللہ والے ہیں۔ انہیں کسی پر شک وشبہ کرنا آتا ہی نہیں۔ ہر ایک کو اپنی طرح سمجھ کر
بھروسہ کر لیتے ہیں۔ نیاز علی کے بارے میں بھی اگر کچھ سنا ہوگا تو نظرانداز کر دیا ہوگا۔'' اس جواب نے
م خان کو احساس دلایا کہ وہ ایک بڑی غلطی کر چکا ہے۔ صغیر بیگ کے شاملِ جرم ہونے کے شک کی وجہ
ں نے نہ صرف اسے اغوا کیا تھا بلکہ حقائق اُگلوانے کے چکر میں کافی زدوکوب بھی کیا تھا۔ اب بھی وہ بے
ذر کے گھر میں بھوکا پیاسا رسیوں سے بندھا بے بس پڑا ہوا تھا۔ اپنی زیادتی کا احساس ہونے پر وہ چائے
لی خالی کیے بغیر عجلت میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ کرائے کی جیپ اب بھی اس کے پاس تھی۔ اس جیپ میں
آذر کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ روانگی سے قبل اس نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے
ں۔ ان چیزوں کے ساتھ وہ آذر کے گھر پہنچا تو صغیر بیگ کو اسی طرح بندھی ہوئی حالت میں پڑا ہوا پایا۔
سانسوں کا زیر و بم ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نیند کی حالت میں ہے۔ مشابرم خان نے اسے دھیرے سے ہلا کر
ر ساتھ ہی اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا بھی باہر نکال دیا۔

''اُٹھ کر ناشتہ کر لیں بیگ صاحب! پھر میں آپ کو آپ کے دفتر یا کسی دوسری مناسب جگہ پہنچا دوں گا۔''
افسوس اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت میں اس نے صغیر بیگ سے کہا تو وہ حیران رہ گیا پھر اپنی حیرت پر قابو
ہوئے بولا۔

''مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے اگر پہلے تم مجھے باتھ روم۔ چلو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔''

"ٹھیک ہے۔" مشابرم خان نے مختصر سا جواب دیا اور اس کے ہاتھ پیروں کی بندشیں کھولنے لگا۔ آنکھوں پر بندھی پٹی کے سوا وہ بالکل آزاد تھا۔

"میں آپ کو آزاد کر رہا ہوں بیگ صاحب! لیکن یہ پٹی اس وقت تک آپ کو اپنی آنکھوں پر پڑے گی جب تک ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو جاتے۔ یاد رکھیں، آنکھوں پر بندھی یہ پٹی آپ کی زندگی کی ضمانت ہے۔ آپ مجھ سے انجان رہیں، اسی میں آپ کی سلامتی ہے۔" خوفناک لہجے میں صغیر بیگ کو یہ دینے کے بعد اس نے باتھ روم کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صغیر کو ناشتہ کروایا اور پھر اسے جیپ میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اس کے ایک بار پھر احتیاطاً باندھ دیئے تھے۔ اس کی فرمانبرداری کے باوجود وہ خود اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے تھا۔ اگر صغیر بیگ اسے شناخت کر لیتا اور بعد میں پولیس کو بتا دیتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتا جبکہ ابھی اسے سے اہم کام سرانجام دینے تھے اور وہ پولیس کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ صغیر کو جیپ کی پچھلی نشست کے درمیان لیٹنے کا حکم دے کر وہ اسے ساتھ لے کر روانہ ہوا اور کم ہجوم والے راستوں سے گزر کر ایک ویران جگہ پر لے جا کر جیپ روک دی۔

"اُٹھ جایئے بیگ صاحب! ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب آپ آزاد ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے آپ سے اس تکلیف کے لیے معافی چاہتا ہوں جو آپ کو اٹھانی پڑی۔" وہ بہت سنبھل کر اور اپنا لہجہ قدرے بدل کر صغیر بیگ سے مخاطب تھا جو آزادی کی نوید پا کر خوش ہو گیا تھا۔ پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ اگرچہ اسے نشستوں کے درمیان سے اُٹھنے میں مشکل پیش آئی لیکن پھر بھی اس نے ممکنہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ چھوڑ دی۔ اس کے جیپ سے اُترتے ہی مشابرم خان نے ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا اور ہوا ہو گیا۔ صغیر بیگ کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ خود اسے اب ایک نئے سفر پر روانہ ہونے کی جلدی تھی۔ اسے ان پہاڑوں کا سفر اختیار کرنا تھا جن سے اس کی ماں نے اسے ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن پہاڑوں کے بیٹے کو کب تک ان کے پاس جانے سے روکا جا سکتا تھا۔ اسے بھی پہاڑ پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں اکرم خان کے قاتلوں اور ماں کے اغوا کاروں کا پتہ بتائیں گے۔ اسے جلد از جلد اس سمت روانہ ہونا تھا جہاں سے آج صبح واپس لوٹنے والی ایکسپی ڈیشن ٹیم میں شامل پورٹر کے بیان کے مطابق فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ وہ صرف آوازیں ہی تھیں، وہ ایک سراغ تھا جس کے سہارے وہ اپنے مجرموں تک پہنچ سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

حویلی کی فضا پر دہشت سی طاری تھی۔ چودھری افتخار نیویارک سے واپس آ گیا تھا اور اس کیفیت میں آیا تھا جیسے کوئی شیر، شکاری کی بندوق سے نکلنے والی گولی کا زخم کھا کر زندہ بچ گیا ہو اور تکلیف کی شدت سے بے حال ہر ایک کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتا ہو۔ نوکروں چاکروں کا کیا ذکر، دونوں چودھرائنیں بھی اس سے سخت خوفزدہ تھیں۔ وڈی چودھرائن کو اگر اپنی انتظامی صلاحیتوں کی ناکامی پر احتساب کا سامنا کرنا تھا تو چودھرائن ناہید کے حصے میں کشور کی ماں ہونے کا جرم آیا تھا۔ وہ دونوں ہی چودھری کے مقابل اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ کشور کے غیاب سے ناواقف ملازمین کو بھی اتنا اندازہ بہرحال ہو چکا تھا کہ حویلی میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے جس کی وجہ سے حویلی کے مالکان بری طرح پریشان اور گھبرائے ہوئے ہیں۔



نہیں تھی کہ اس واقعے کے بارے میں جاننے کے لیے کھوج لگانے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ سب اپنی بے حد محتاط ہو گئے تھے کہ کہیں ذرا سی کوتاہی انہیں حویلی والوں کے غضب کا نشانہ نہ بنا دے۔ اتنی کے باوجود بھی کئی ملازمین بہانے بہانے سے زیرِ عتاب آ چکے تھے۔ کسی کو برتن نہ دھونے پر سزا ملی تھی تو صاف کیے ہوئے غلے میں کنکر باقی رہ گئے تھے۔ ان معمولی غلطیوں کی پاداش میں بے چارے مظلوم کو سخت سزا سہنی پڑی تھی۔ سزا سہنے والوں میں شادو اور نچھی کی ماں رحمتے بھی شامل تھی۔ اس کا جرم یہ تھا نے دودھ گرم کرتے ہوئے تھوڑا سا دودھ اُبال دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے نوکروں سے پٹوا کر سے نکال باہر کیا گیا تھا۔

رحمتے جو اپنی بیٹیوں کے اچانک منظر سے غائب ہو جانے پر پہلے ہی پریشان تھی، اس نئی افتاد پر مزید گھبرا بڑی مشکلوں اور منتوں سماجتوں کے بعد اسے ایک نوکرانی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ اس کی دونوں کشور بی بی کے ساتھ لاہور والی کوٹھی میں بھیج دیا گیا ہے۔ حویلی کے نوکروں میں یہی مشہور کیا گیا تھا۔ حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ رحمتے کے پاس اس خبر پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا البتہ یہ کوشش ضرور کی تھی کہ کسی طرح وڈی چودھرائن سے مل کر معافی تلافی کر ڈالے اور اپنی چرب زبانی سے دوبارہ خود پر حویلی کے دروازے کھلوا لے لیکن اسے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چودھرائن خود اس سے خوف زدہ ہے اور نہیں چاہتی کہ رحمتے جیسی ہوشیار اور چالاک عورت حویلی کے اندر آ کے اور اپنی فطرت کی وجہ سے اصل حالات کا کھوج نکالے۔ رحمتے جس کی فطرت کا وڈی چودھرائن خود فائدہ اٹھاتی رہی تھی، آج اسی سے خوف زدہ ہو کر چہیتی ملازمہ کو حویلی سے دُور رکھنے پر مجبور تھی۔ ملازمین کا چہیتا ہونا حویلی کے مکینوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جب تک کوئی ملازم ان کے کام کا اسے اہمیت دیتے اور پھر صورتِ حال بدلنے پر آنکھیں پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ وڈی چودھرائن رحمتے اور اس کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ یہی کیا تھا۔ نچھی اور شادو کو البتہ وہ اب تک یہ جھانسہ دے کر کہ کے سچ اُگل دینے کی صورت میں تمہاری چودھری صاحب سے سفارش کروں گی، اپنی مطلب برآری استعمال کر رہی تھی۔ اس کے حکم پر ان دونوں بہنوں نے مل کر رانی پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ اسے چمڑے سے پیٹنے اور زخموں میں نمک مرچ بھر دینے کے علاوہ جلتی لکڑی سے داغا بھی گیا تھا۔ اس بہیمانہ تشدد ادھ موئی ہو گئی تھی لیکن اس نے سچ نہیں اُگلا تھا۔ جھنجلائی ہوئی چودھرائن نے غصے میں آ کر اس کا کھانا بالکل بند کر دیا تھا لیکن اپنے مقصد کے حصول میں بالکل ناکام رہی تھی اور اب اسی ناکامی کے ساتھ چودھری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"بالکل ناکارہ ہو گئی ہے تُو۔ ایک نوکرانی سے سچ تک نہیں اُگلوا سکی۔ ٹوٹے ٹوٹے کر کے رکھ دیئے ہوتے کیسے نہیں بولتی فیروہ۔" وہ وڈی چودھرائن پر بگڑ رہا تھا۔

"مار کھا کھا کر ادھ مری ہو گئی ہے وہ چودھری صاحب!..... فیر بھی زبان بند کر کے بیٹھی ہے۔ اب تو شک پڑنے لگا ہے کہ شاید اسے کچھ ملوم ہی نہیں ہے، پر فیر خیال آتا ہے کہ کسی کی مدد کے بغیر کشور نکل کر سکتی ہے؟ رانی ہی تھی جو ہر جگہ اس کے ساتھ رہتی تھی مجھے تھوڑا سا شک پڑ گیا تھا کہ بھلا مالکن اور کی آپس میں اتنی کیوں گھٹ رہی ہے اس لیے میں نے رانی کو کشور سے الگ کر کے لاہور والی کوٹھی پر تھا۔ اب جانے کشور نے کیسے راہ نکالی کہ رانی کے بغیر بھی ہماری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ خیر، یہ تو ہے پر مجھے شک ہے کہ جو بھی چکر تھا، اس کا رانی کو چنگی طرح پتہ ہے۔ بس ڈھیٹ بنی ہوئی ہے اور سچ

اُگل کر نہیں دے رہی۔'' اس نے چودھری کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''پچھلی واری کشور لاہور گئی تھی تو اس کے ساتھ ڈرائیور اشرف تھا نا؟'' چودھری نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔

''ہاں جی، وہی تھا۔'' وڈی چودھرائن نے جواب دیا۔ چودھری سے گفتگو کا بوجھ فی الحال اسی کے تھا۔ چودھرائن ناہید تو حسبِ معمول ایک طرف سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں ذرا اُس کو دیکھ لوں، فیر رانی سے بھی نمٹتا ہوں۔ وہ نمک حرام ہماری عزت پر بنا کر خود ہونٹ کیسے بیٹھ سکتی ہے؟ میں تو اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سچ اُگلوا لوں گا۔ حویلی کی عزت سے کھیلنا کوئی معمولی نہیں ہے۔ جس کسی نے یہ حرکت کی ہے اور میری دِھی کو ورغلایا ہے، میں اس کا ایسا انجام کروں گا کہ اس کا ہی مٹ جائے گی۔'' غیظ و غضب میں بھرا ہوا چودھری زنان خانے سے نکل کر اپنے مخصوص ملاقاتی کمرے پہنچا اور اشرف ڈرائیور کو طلب کیا۔ اس طلبی کے جواب میں اشرف فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

''کشور بی بی کے ساتھ آخری واری لاہور تم گئے تھے نا؟'' اس نے اشرف کو گھورتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''جی سرکار!'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا لیکن اندر سے بری طرح پریشان تھا کہ چودھری صاحب کو واپس لوٹتے ہی اس قسم کی تحقیقات کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

''کشور بی بی نے تیری شکایت کی ہے کہ تُو ان کا حکم ٹھیک طرح سے نہیں مانتا تھا اور وہ کہیں آنے جانے کو کہتی تھیں تو آنا کانی کرتا تھا۔'' وہ بہت ہوشیاری سے اشرف کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس سے پتا لگ سکے کہ کشور اپنے لاہور میں قیام کے عرصے میں کہاں کہاں اور کس کس سے ملنے گئی تھی۔ براہِ راست سوال کرنے کی صورت میں ڈرائیور مشکوک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس لیے اس نے یہ لائحہ عمل اختیار کیا تھا۔

''میری کیا مجال سرکار! کہ میں مالکن کے حکم کی خلاف ورزی کروں۔ فیر بھی اگر انہیں کوئی شکایت ہے تو میں مافی چاہتا ہوں۔'' ڈرائیور بے چارہ گھبرا گیا اور فوراً دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''کوئی تو ایسی گل ہوئی ہوگی جو بی بی نے شکایت کی ہے۔ تُو مجھے بتا کہ تُو اسے لے کر کہاں کہاں گیا تھا۔'' اب چودھری نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''لاہور میں تو بی بی بس ایک ہی جگہ جاتی ہیں۔ انہیں کتابوں کا شوق ہے نا تو بس لبرٹی میں کتابوں کی دکان پر ہی زیادہ تر جاتی ہیں۔ ہاں، اس واری وہ دو بار بوٹی پالر (بیوٹی پارلر) ہور ایک واری لائبریری گئی تھیں۔ میں حیران تو ہوا تھا، پر میں نے انہیں وہاں لے جانے سے انکار کی جرأت نہیں کی تھی۔'' ڈرائیور نے رپورٹ پیش کی۔

''تُو نے کچھ تو غلطی کی ہوگی جو اُسے شکایت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تُو اسے چھوڑ کر خود سیر سپاٹے کو نکل جاتا ہو، اور اُسے واپسی کے لیے تیرا انتظار کرنا پڑتا ہو؟'' چودھری بہت چالاکی سے اس سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ خوف زدہ و پریشان ڈرائیور کے لیے اُس کی اس چالاکی کو سمجھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

''نہیں سرکار! اپنی مرضی سے تو میں کبھی کہیں نہیں گیا۔ اِک واری بی بی نے پالر سے خود ہی واپس آنا تھا کہ مجھے دیر لگے گی، تم کوٹھی واپس چلے جاؤ..... بعد میں آ کر لے جانا۔ اس کے علاوہ تو میں کبھی انہیں چھوڑ کر نہیں ہٹا۔ بی بی جہاں بھی جاتی تھیں، میں باہر ہی گڈی لے کر کھڑا رہتا تھا۔'' وہ بے چارہ گھبرایا ہوا صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے چودھری نے اندازہ لگا لیا کہ جب کشور پارلر گئی تھی تو یقیناً اس



نے کوٹھی بھجوا کر درمیان میں خود کہیں غائب ہو گئی تھی لیکن ظاہر ہے ڈرائیور کو اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے ابھی تو میں تجھے کچھ نہیں کہہ رہا، بعد میں رانی سے پوچھوں گا۔ اسے بھی تو سب پتہ ہوگا کہ تُو ہر واری لگا کر واپس بی بی کو لینے جاتا تھا۔ وہ بھی تو بی بی کے ساتھ ہی ہوتی تھی نا یا کوٹھی پر رہ جاتی تھی۔'' اب وہ معاملے میں رانی کے کردار کا تعین کر رہا تھا۔

''زیادہ تر تو بی بی کے ساتھ ہی رہتی تھی، بس جب بی بی بوٹی پالر گئی تھیں تو تب انہوں نے رانی کو بھی اپنے ساتھ واپس کوٹھی بھجوا دیا تھا۔'' ڈرائیور کے اس بیان نے رانی کی بے پناہ مشکوک محسوس ہونے والی حرکت کو ذرا سا سنبھالا دیا لیکن وڈی چودھرائن کی طرح چودھری کو بھی یقین سا تھا کہ کشور اکیلی کوئی چکر نہیں چلا سکتی تھی۔ یقیناً رانی اُس کی رازداں ہوگی کیونکہ اونچی دیواروں والے محلوں اور حویلیوں میں جہاں قدم قدم پر ملازمین ہوں، ہمیشہ قریبی ملازمین ہی چور راستوں تک راہنمائی کرتے ہیں۔

''چل ٹھیک ہے۔ تُو جا، میں رانی سے پوچھتا ہوں۔'' چودھری نے اسے چلتا کیا۔ بے پناہ ذہنی دباؤ اور غصے میں ہونے کے باوجود اس پوری گفتگو کے دوران اس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنے رویے سے وہ ڈرائیور کو کسی شک میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ ڈرائیور کو رخصت کرنے کے بعد وہ واپس زنان خانے میں آیا۔

''کسی کو بھیج کر رانی کی ماں اور چھوٹے بھرا کو حویلی بلوا لے۔'' اپنے ذہن میں پلتے منصوبے کے پیشِ نظر اس نے چودھرائن کو حکم دیا۔

''ہاں چودھری صاحب!'' وہ فوراً حکم کی تعمیل کے لیے لپکی۔ رانی کی ماں بھی ان ملازماؤں میں شامل تھی جن کے زیرِ عتاب آئی تھیں۔ اسے بھی اس نے ایک معمولی غلطی پر سخت سزا دی تھی اور ساتھ ہی حویلی میں داخلے پر پابندی لگا دی تھی۔ حویلی والوں کے ظلم و ستم کے باوجود یہ پابندی ملازمین پر سخت گزرتی تھی کیونکہ حویلی میں وہاں کے مکینوں کی خدمت نہ کرنے کا مطلب تھا کہ خود ان کے اپنے گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑ جائے۔ جہاں ضرورت کا عوضانہ ہی مشکل سے ملتا ہو، وہاں سے بغیر خدمت کے کچھ ملنا بھلا کیسے ممکن تھا۔ رحمتے کی طرح رانی کی ماں کے حویلی میں داخلے پر پابندی لگانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔ اب چودھری نے اسے حویلی بلوایا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی خاص مقصد ہی تھا۔ اس کا یہ مقصد چودھرائن کو اس وقت سمجھ آیا جب وہ چودھری کے ساتھ تہ خانے میں پہنچی۔ تہ خانے میں رانی اس حال میں فرش پر پڑی تھی کہ اس کا پورا جسم زخموں سے چُور تھا اور وہ ذرا سی کروٹ بھی لیتی تھی تو منہ سے کراہیں نکل جاتی تھیں۔ اس کے لیے ہلنا جلنا محال ہو گیا تھا۔ خون کے اخراج، تکلیف کی شدت اور غذا کی کمی نے مل کر اس کی ساری قوتیں نچوڑ ڈالی تھیں۔ چہرے کی حالت اتنی بری تھی کہ اس کے اصل نقش و نگار مٹ گئے تھے۔ نیل کے نشانوں اور سوجن نے مل کر اس کا چہرہ ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ چودھری اور وڈی چودھرائن وہاں پہنچے تو وہ آنکھیں بند کیے تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

''اسے اُٹھاؤ۔'' چودھری نے وہاں موجود نچھی اور شادو کو حکم دیا تو نچھی نے اس کے چہرے پر پانی کا پورا مگ اُلٹ دیا اور پھر دونوں بہنوں نے اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے دیوار سے ٹکا کر بٹھا دیا۔ اس نے کسمسا کر ہلکی سی کھلی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود چودھری کو دیکھا اور اپنے درماندہ جسم پر مزید ظلم و ستم سہنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چودھرائن نے ایک گھریلو عورت ہو کر اس پر تشدد کے متعدد نئے آزمائے تھے۔ چودھری کا قہر و ظلم مشہور تھا، جانے کون سی انتہا کر دیتا۔ اس انتہا کا سوچ کر ہی اس کی

جان نکلنے لگی لیکن زبان نہ کھولنے کا ارادہ اپنی جگہ مصمم تھا۔

''تجھ سے سچ اُگلوانے کے لیے بہت تشدد کیا جا چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب میں نے بھی تیرے مار پیٹ کی تو تُو سہہ نہیں سکے گی اور مر جائے گی اس لیے میں اب تیرے ساتھ کوئی مار پیٹ نہیں کروں گا۔'' چودھری کے نہایت سرد لہجے میں کہے ہوئے الفاظ اُس کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ اُلجھن و حیرت میں گم ہو گئی۔ چودھری نے اسے مزید تشدد نہ کیے جانے کا مژدہ سنایا لیکن اس کے لہجے کی کاٹ ایسی تھی جو ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دیتی تھی۔

''میں نے تیری ماں اور بھرا کو حویلی بلوایا ہے۔ اب تیری جگہ ان دونوں کو رسیوں سے باندھ کر ان کے ساتھ تیرا والا سلوک کیا جائے گا۔ تیری زبان نہیں کھلی تو میں ان دونوں کی کھال کھچوا ڈالوں گا۔ فیر میں دیکھوں گا کہ تُو کیسے برداشت کرتی ہے۔'' قہر آلود لہجے میں دی گئی اس دھمکی نے رانی کی روح کو کپکپا ڈالا۔ بے قصور ماں اور چھوٹے معصوم بھائی کے اس ظالمانہ تشدد سے گزرنے کا تصور ہی جس سے وہ گزری تھی، اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس وحشت ناک تصور نے اس کے نڈھال پڑے ہوئے جسم میں جنبش دی اور وہ خود کو بہ مشکل گھسیٹتی ہوئی چودھری کے قدموں تک پہنچ گئی۔

''رحم کر دیں سرکار! میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کشور بی بی کس کے ساتھ اور کہاں گئی ہیں۔ اگر کو میری گل کا بھروسہ نہیں تو بے شک میری کھال اُدھیڑ ڈالیں لیکن میری ماں اور بھرا کو کچھ نہ کہیں۔ وہ بے قصور ہیں۔'' چودھری کے پیر تھامتے ہوئے اُس نے اُس سے درخواست کی۔ جواباً اُسے اپنے سر پر ایک زوردار ٹھوکر سہنی پڑی۔

''پرے ہٹ، میرے ساتھ مکر کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں تجھے سب خبر ہے۔ پر تُو جان کر اپنی زبان نہیں کھول رہی۔ کوئی گل نہیں۔ تھوڑی دیر میں تیری ماں اور بھرا آ جائیں، فیر میں دیکھتا ہوں کہ تُو ان کی چیخیں سننے کے بعد بھی کیسے اپنی زبان بند رکھے گی۔''

''میری ماں اور بھرا کو کچھ مت کہنا چودھری صاحب! ان بے چاروں کی کوئی غلطی نہیں ہے۔'' رانی ہوش کھا کر پیچھے اُلٹ گئی تھی، ایک بار پھر خود کو سنبھالتی ہوئی پلٹی اور چودھری کے پیر تھام کر اپنی درخواست دہرائی لیکن اس بار اس کے لہجے میں لجاجت سے زیادہ جنوں خیزی تھی۔ چودھری جیسا ہوشیار بندہ اس تبدیلی کو نہ نہیں کر سکا اور اس کے قدموں سے لپٹی رانی بے انتہا زخمی ہونے کے باوجود حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئے اس کی قمیض کا دامن تھام کر ایک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس کے ہولسٹر میں موجود ریوالور نکال لیا۔ رانی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر چودھری گھبرا سا گیا اور اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی۔ اگلے پل نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ رانی کا ہدف وہ نہیں، خود اپنی ذات تھی۔ اس نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا تھا اور تیورا کر فرش پر گر گئی تھی۔ شاید اس کا یہ فیصلہ بالکل بروقت اور درست تھا۔ اپنی زندگی کے بارے میں تو وہ جانتی ہی تھی کہ اس کا بچنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ وہ اپنے گھر والوں کو بچانے کے لیے یہ حرکت کر گزری تھی۔ اب چودھری سے سچ اُگلوانے کے لیے کوئی ترکیب نہیں لڑا سکتا تھا۔ وہ چاہتی تو گولی کا نشانہ چودھری کو بھی بنا سکتی تھی لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس جرم کی پاداش میں اس سمیت اس کے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جاتا۔ اب کم از کم یہ امید تو وہ اپنے ساتھ لے کر دنیا سے گئی تھی کہ اس کی قربانی اس کے گھر والوں کو بچا لے گی۔

''مر گئی نمک حرام۔ نمک حراموں کے نصیب میں مرنا ہی لکھا ہوتا ہے۔ تم دونوں بھی اب مزید زندہ نہیں



رہو۔'' چودھری جو کچھ دیر کے لیے تو رانی کی خودکشی پر ششدر رہ گیا تھا، زمین پر گرا اپنا ریوالور اُٹھاتا ہوا غرایا اور دھائیں دھائیں دو فائر اس ساری صورتِ حال کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی نجھی اور شادو پر کیے۔ ان دونوں کو اس اچانک دبوچ لینے والی موت نے یوں ساکت کیا کہ وہ حلق سے چیخ بھی نہیں نکال سکیں اور اپنی تمام تر مکاری، چالاکی، مطلب پرستی اور لالچ سمیت دوسرے جہاں سدھار گئیں۔

''بالے! دو بندے لے کر حویلی کے تہ خانے میں پہنچ۔ وہاں تین لاشیں پڑی ہیں۔ انہیں اُٹھا کر کہیں بھی پھینک دے۔'' وہیں کھڑے کھڑے چودھری نے اپنے موبائل سے بالے کا نمبر ملایا اور اسے حکم دینے کے بعد رعونت چال چلتا ہوا واپسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ وڈی چودھرائن بھی خاموشی سے اس کے تمام تر تکبر اور رعونت کے باوجود ان دونوں کے چہروں پر وہ ناکامی لکھی ہوئی تھی جس سے رانی نے دوچار کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''میری وزیر صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے یقین دہانی کروائی ہے کہ بہت جلد نور پور میں بجلی کو ممکن بنا دیا جائے گا۔ آپ کے ذہن میں گھریلو صنعتوں سے متعلق جو منصوبے ہیں، آپ اس کی فائلیں تیار کریں تاکہ بجلی پہنچتے ہی آپ کے منصوبوں پر کام شروع ہو سکے۔'' گزشتہ روز نور پور کا دورہ ملتوی ہونے کے بعد آج وہاں پہنچا تھا اور چودھری بختیار کے سامنے بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ اے سی صاحب! یہ آپ کی مہربانی ہے کہ ہمارے صرف نام کے نور پور کہلانے والے گاؤں میں بھی کچھ روشنی کی امید پیدا ہوئی ہے۔ بجلی آنے سے گھروں میں بلب کی روشنی جو پھیلے گی سو پھیلے گی سب سے زیادہ اسکول کی تعمیر کی خوشی ہے جس سے ہماری نئی نسل کا ذہن علم کے نور سے منور ہو گا اور نور پور صحیح معنوں میں نور پور کہلا سکے گا۔'' چودھری بختیار نے اس کی دی ہوئی اطلاع پر خوشی کا اظہار کیا۔ دیکھ رہا تھا کہ چودھری بختیار پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو چکا ہے۔ پہلے وہ جب بھی اس سے ملا تھا، اس کی معذوری کے باوجود بہت پُرجوش اور باہمت محسوس ہوا تھا لیکن اب اسے دیکھنے کے ساتھ ہی کسی بجھے ہوئے انسان کا خیال آ رہا تھا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا چودھری صاحب! کافی کمزور لگ رہے ہیں؟'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہی ہوں۔ جی رہا ہوں اور اس وقت تک جینا چاہتا ہوں جب تک اپنے گاؤں کے لوگوں کے کام آ سکوں۔ موت مجھے نہیں لیتا۔ یہ مظلوم لوگ اپنے ہر دکھ کے مداوے کے لیے میری ہی طرف دیکھتے ہیں اس لیے تو دل پر بڑا گھاؤ سہہ کر بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔'' چودھری بختیار نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ یہ جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی چمک پڑی تھی۔

''آپ کے دل پر جو تازہ گھاؤ لگا ہے، اس سے میں بھی واقف ہوں لیکن وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر ہوا؟ آپ کو چودھری افتخار کے سامنے اس طرح شکست تسلیم نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ایک ہوش مند لڑکی کی معذور لڑکے سے شادی کر دینا اتنا بڑا ظلم ہے کہ میں آپ سے اس ظلم میں شامل ہونے کی ایک فیصد امید نہیں رکھتا تھا۔'' وہ خود بہت عرصے سے فریدہ اور بہزاد شاہ کی بے جوڑ شادی کی وجہ سے اُلجھن کا شکار

تھا اس لیے موقع ملتے ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اس وقت چونکہ عبدالمنان، ٹھیکے دار کے ساتھ تھا اور وہ اور چودھری بختیار تنہا ہی تھے، اس لیے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔

''ظلم میں نے نہیں، خود فریدہ نے اپنے آپ پر کیا تھا۔ وہ اگر چودھری کے دادا کی درگاہ پر نہ آتی تو مشکل میں گرفتار نہیں ہوتی۔ چودھری نے اسے اپنی قید میں رکھ لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس سے راضی نہ ہوا تو وہ فریدہ کو کسی لائق نہیں چھوڑے گا۔ اس کی عزت اور جان دونوں جائیں گی۔ میں نے سوچا ایک طرح گئی ہے، کیوں نہ رہی سہی عزت بچا لوں۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں چودھری سے اجازت لے کر فریدہ سے ملا اور اس نے بھی مجھ سے یہی درخواست کی کہ میں چودھری کی بات مان لوں۔ بس تو پھر میں نے ہتھیار پھینکنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔'' چودھری بختیار نے تھکے تھکے لہجے میں اپنی مجبوری کی داستان سنائی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ فریدہ وہاں کیوں اور کس کے ساتھ گئی تھی؟'' اس نے ایک نہایت نازک سوال کیا جس کے جواب میں پل بھر کو چودھری خاموش ہو گیا اور پھر آہستہ سے گردن کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''مجھے معلوم ہے وہ ہمارے دشمن کے بیٹے قربان کے ساتھ اس کے کہنے پر چودھری کی پناہ لینے گئی تھی۔ قربان کا بڑا بھائی سبحان اس روز مجھ سے ملنے آیا تھا اور بڑی دھمکیاں دے کر گیا تھا کہ اگر فریدہ اس کا بیاہ ہوا تو وہ دونوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس روز پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میری بیٹی قربان کو پسند کرنے لگی ہے اور اس سے چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ میں جو فریدہ کے غائب ہونے سے پریشان تھا، یہ جان کر بہت دکھی ہوا پھر بھی میں نے یہی سوچا کہ کاش فریدہ مجھ سے چھپانے کے بجائے بتا دیتی تو میں یا تو اسے سمجھاتا یا پھر کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ دونوں کا جلد از جلد نکاح ہو جاتا۔ لیکن وہ تو اندھی ہو کر قربان کے کہنے پر میری عزت خاک میں ملا کر اس کے ساتھ پیر آباد جا پہنچی۔ وہاں جا کر کھیلا گیا کہ قربان کو تو چودھری نے چھوڑ دیا اور فریدہ کو اپنے قبضے میں رکھ لیا۔ ان حالات میں میرے پاس چودھری کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فریدہ کے ایک غلط قدم نے اسے بھی نقصان پہنچایا اور میں نے زندگی بھر کے پچھتاوؤں میں گھر گیا۔ ویسے مجھے یقین نہیں ہے کہ قربان اس کے ساتھ مخلص تھا۔ اگر مخلص ہوتا تو فریدہ کے بیاہ کے ہفتے بھر بعد ہی اپنی بچپن کی منگ کو بیاہ کر اپنے گھر نہ لے آتا۔ میرے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ قربان کے بیاہ پر بڑی رونق تھی۔ خوب ڈھول تاشوں اور پٹاخوں کے ساتھ ان لوگوں نے جشن منایا۔ خود قربان نے بڑھ چڑھ کر ہر رسم میں حصہ ڈالا۔ اگر اسے فریدہ سے محبت ہوتی تو کیا اس طرح سے بیاہ کرتا؟ مجھے یقین ہے کہ اس نے صرف میری پگ اُچھالنے کے لیے فریدہ سے محبت کا ناٹک کیا تھا جسے وہ بیوقوف لڑکی سمجھ نہ سکی۔''

چودھری بختیار، شہریار کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ حالات سے کافی واقف ہے اس لیے کھل کر اس کے سامنے گفتگو کر رہا تھا۔ شاید اسے اپنا یہ غم کہنے کے لیے کسی غمگسار کی ضرورت بھی تھی۔ اپنے گاؤں کا چودھری سب سے عزت دار شخص ہونے کے ناتے وہ کسی اور کے ساتھ تو یہ سب شیئر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اب موقع ملا تو نم آنکھوں کے ساتھ سب کہتا جا رہا تھا۔ قربان کی شادی کا سن کر خود شہریار کو بھی جھٹکا لگا۔ ایک بار نور پور واپسی میں اس نے قربان اور فریدہ کو درختوں کے ایک جھنڈ میں اس طرح ساتھ دیکھا تھا کہ انہیں قربان کے بڑے بھائی سبحان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھیر رکھا تھا اور فریدہ کی جان کے درپے تھا۔ اس وقت قربان نے بڑے بھائی کے سامنے بھرپور مزاحمت کی تھی پھر شہریار کی مداخلت کی وجہ سے اس وقت



لیکن اسی قربان کے بارے میں جو کبھی فریدہ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھا، یہ جان کر کہ اس کی شادی کے محض ہفتے بھر بعد بڑی دھوم دھام سے خود بھی شادی کر لی تھی، اسے بڑا دکھ ہوا تھا۔ محبت کے سہارے فریدہ اپنے محبت کرنے والے بھائی کو ہمیشہ کا دکھ دے گئی تھی، اس نے چند دن جدائی کا غم نہ منایا تھا اور اپنی نئی دنیا بسا بیٹھا تھا۔

''معذرت چاہتا ہوں چودھری صاحب! میں نے آپ کا اتنا ذاتی معاملہ چھیڑ کر آپ کو دکھی کر ڈالا۔ بات یہ ہے کہ مجھے فریدہ کی اس طرح ایک ذہنی معذور شخص سے شادی کیے جانے پر بہت افسوس ہے۔ یہ انسانی حقوق کی پامالی کے برابر ہے اور ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ فریدہ کو مزید یہ رشتہ نبھانے پر مجبور کیا جانا چاہیے۔''

''اس رشتے کو ختم کرنا بھی آسان نہیں۔ جتنا میں فریدہ کو بیاہتے ہوئے مجبور تھا، اتنا ہی اب بھی مجبور ہوں۔ اگر فریدہ کا نکاح ختم کروانے کی کوشش کی تو چودھری افتخار اسے اپنی عزت پر حملہ سمجھے گا اور فی الحال میں کسی سے کوئی دشمنی نہیں پالنا چاہتا۔ میں اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے ضروری ہے کہ کسی ذاتی دشمنی میں خود کو نہ اُلجھاؤں۔'' چودھری بختیار کا لہجہ بے لچک تھا۔ شہریار سمجھ گیا کہ فریدہ نے زندگی کو جس عظیم دکھ سے دوچار کیا ہے، اس کے بعد وہ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور فی الحال دل میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ بہن کے ساتھ کوئی ہمدردی کر سکے۔

چودھری بختیار کی دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس نے اس موضوع پر اس وقت خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا اور دوسرے موضوعات کو ڈسکس کرنے لگا۔ نور پور سے واپسی میں وہ وہاں کی صورتِ حال پر کافی مطمئن تھا۔ سکول اور مرکز صحت کی تعمیر کے کام آخری مراحل میں تھے اور جلد دونوں جگہ پر عوام الناس کی فلاح کا کام شروع ہو جاتا لیکن اس ایک اطمینان کے علاوہ اس کے ذہن پر بہت سارے بوجھ بھی تھے۔ ایک طرف اس کے قاتلوں تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکی تھی تو دوسری طرف ماہ بانو ہنوز لاپتہ تھی۔ اس کی تلاش پر مشابرم خان بھی یک دم غائب ہو گیا تھا۔ سمندر خان نامی جس لڑکے کے پاس مشابرم خان کا موبائل تھا، اس نے فون پر بات چیت کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سمندر خان کے مطابق اسے مشابرم خان کہیں نہیں ملا تھا۔ اس لڑکے کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا اور اس سے مشابرم خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اس کی طرف سے یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ مشابرم خان پولیس کو مطلع کیے بغیر اسکردو سے غائب ہے اور اس کے بارے میں صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ایک ٹورسٹ کمپنی سے طویل عرصے کے لیے جیپ کرائے پر لے کر روانہ ہوا ہے لیکن اس نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کتنے دن کے لیے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی خواہش پر اس کے افسر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جیپ کی مدد سے جلد از جلد مشابرم خان کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ شہریار خود یہ محسوس کر رہا تھا کہ مشابرم خان کو شاید ماہ بانو کا کوئی سراغ مل گیا تھا چنانچہ وہ اس کے پیچھے جلدی سے روانہ ہو گیا تھا۔ بہرحال اس کی پریشانی تو اپنی جگہ تھی۔ ایک طرف اگر اسے ماہ بانو کی فکر تھی تو دوسری طرف وہ اور مشابرم خان کو بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ تھانے کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا اُس اتائی ڈاکٹر سے بھی ملاقات ہو جائے جس نے ایک معصوم بچے کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔'' گاڑی نورکوٹ کی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ بچے کے بارے میں اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ اب خطرے سے

باہر ہے اور ہسپتال میں اس کا مناسب علاج کیا جا رہا ہے لیکن وہ ذاتی طور پر اس شخص سے ملنے کا
جس کی بے حسی اور دھوکا دہی نے ایک انسانی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس کی خواہش پر
گاڑی کا رخ تھانے کی طرف کر دیا۔ تھانے میں اس کی آمد کی وجہ سے حسبِ معمول ہلچل مچ گئی۔
سکون سے اس ہلچل کے تھمنے کا انتظار کیا اور پھر تھانے دار کو ملزم سے اپنی ملاقات کروانے کا حکم دیا۔
کی تعمیل میں اس موٹے اور بد ہیئت اتائی کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہ متاثرہ بچے کے ماموں
کردہ حلیے پر پورا اُترتا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی چالاکی اور خباثت صاف پڑھی جا
''ہاں تو مسٹر! آپ کس کی اجازت سے بغیر کسی ڈگری اور پرمٹ کے لوگوں کا علاج بلکہ ان کی
برباد کر رہے تھے؟'' اس شخص کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد اس نے ذرا سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔
''میں نے کسی کی زندگی برباد نہیں کی۔ رہی اجازت کی بات تو میں وہاں لوگوں کی خدمت کر
خدمت کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس نے نہایت بے نیازی سے شہریار کے
جواب دیا۔
''خوب..... آپ کی وجہ سے ایک معصوم بچہ موت کے منہ میں پہنچ گیا اور آپ کہتے ہیں کہ آپ
لوگوں کی خدمت کر رہے تھے؟'' شہریار نے طنز و غصے سے ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔
''اس طرح کے واقعات تو ہو ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا کام علاج کرنا ہے، آگے صحت اور زندگی
کے ہاتھ میں ہے۔'' اس کی بے نیازی اسی طرح قائم تھی۔
''بہت ہی خوب۔ یعنی آپ جناب ڈاکٹر ہونے کے دعوے دار ہیں۔ ذرا اپنی ڈگری تو چیک کر
میں بھی تو دیکھوں کہ کس میڈیکل کالج نے آپ کو ایم بی بی ایس کی ڈگری عطا کی ہے؟'' شہریار کے
مطالبے پر اس شخص نے نظریں چرا لیں۔
''میں اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر! کہ تم قطعی کوئی ڈگری یافتہ ڈاکٹر نہیں ہو۔ تم ان اتائیوں میں
ہو جو گلی محلوں میں اپنی دکانیں کھول کر چند روپوں کے لیے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ تمہارے
سخت ایکشن لیا جائے گا۔'' اس کے نظریں چرانے پر شہریار نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں مطلع کیا۔
''آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اے سی صاحب! میں اتائی نہیں، عطائی ہوں۔ اور عطائی
ہے جسے طب کا علم عطا کیا جاتا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' اُس کی اس عجیب منطق پر شہریار حیران ہوا۔
''دیکھیں، جیسے کسی بزرگ، کسی ولی کی صحبت میں رہ کر اس کے مرید روحانی علم حاصل کرتے ہیں
میں خود بھی اس جیسے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں نے بھی ایک ڈاکٹر کے ساتھ کافی
کے کمپاؤنڈر کے طور پر کام کیا ہے اور اس تجربے کی وجہ سے مجھے بیماریوں اور ان کے علاج کے بارے میں
معلومات حاصل ہیں۔ اب اگر میں اپنے اس علم کی روشنی میں کسی کا علاج کرتا ہوں تو آپ کو کیا اعتراض
اس ملک میں جہاں ڈاکٹروں کی اتنی کمی ہے، مجھ جیسے لوگوں کی تو بہت زیادہ قدر کرنی چاہیے لیکن آپ نے
پکڑ کر تھانے میں بند کروا دیا ہے اور اب برے انجام کی دھمکی بھی دے رہے ہیں۔'' اس شخص کی اتنی
دلیل نے شہریار کا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ وہ شخص ایک جرم کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے
درست کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس ڈھٹائی کے مظاہرے پر اس شخص کو کوئی جواب دیتا، تھا
حدود میں بڑی غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ افراد زبردستی اس طرف آنے کی کوشش کر



اس کے سپاہی انہیں روک رہے ہیں۔
دیکھو! میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے صرف اس خبیث سے نمٹنا ہے جس نے میرے پُتر کی
کی کوشش کی تھی۔ تم لوگوں نے اگر زبردستی مجھے روکنے کی کوشش کی تو خوامخواہ مجھے تم پر بھی ہاتھ اٹھانا
آوازوں کے ہجوم میں سے یہ بلند آواز ان لوگوں کی سماعت سے ٹکرائی۔ ان الفاظ پر شہریار کو فوراً ہی
کیا کہ یوں زبردستی تھانے میں گھسنے کی کوشش کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جب وہ لوگ متاثرہ بچے کو
میں بٹھا کر ہسپتال کی طرف لے جا رہے تھے، بچے کے ماموں نے کہا تھا کہ بچے کا باپ بہت
اور جھگڑالو آدمی ہے۔ یقیناً اس شخص کو اپنے بچے کی بیماری اور جعلی ڈاکٹر کی گرفتاری کی اطلاع مل گئی تھی
دھڑا تھانے اُٹھ آیا تھا۔
اس آدمی کو ذرا آرام سے اندر لے آئیں۔'' شور سن کر اپنی کرسی سے کھڑے ہونے والے تھانے دار کو
حکم دیا تو وہ اپنی پینٹ سنبھالتا ہوا تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔
ئے چھوڑ دو اسے اور اندر آنے دو۔'' باہر جا کر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا جو اندر بھی سنا گیا۔
ٹھیک نیت سے ادھر نہیں آیا ہے سر جی! اس کی وجہ سے کوئی بڑا لفڑا بھی ہو سکتا ہے۔'' کسی سپاہی نے
کو مطلع کرنا ضروری سمجھا۔
کرتا لفڑا۔ تم اسے اندر آنے دو اور اس کے باقی ساتھیوں کو باہر ہی روک کر رکھو۔ اسے اے سی
نے اندر بلانے کو کہا ہے۔'' تھانے دار نے قدرے سخت لہجے میں اپنے سپاہی کو جواب دیا تو وہاں
چھا گئی اور چند لمحوں بعد ہی ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھانے دار کے ساتھ اس کے
میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک زوردار سلام کیا اور شہریار اور عبدالمنان کو
ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان دونوں میں سے اسسٹنٹ
ہے؟ تھانے دار نے اسے اس مشکل سے نکال دیا اور تعارف کرواتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے
اے سی شہریار عادل صاحب اور ان کے پی اے ہیں۔ اے سی صاحب کی سفارش پر ہی تمہیں میں
کی گرفت سے چھڑوا کر اندر لایا ہوں ورنہ اس وقت تم اور تمہارے ساتھی تھانے پر بلوے کے الزام میں
کے پیچھے ہوتے۔''
جانے دیں تھانے دار صاحب! ہمیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ تو سمجھیں کہ آپ
کتنی ہے کہ اس وقت اے سی صاحب یہاں موجود ہیں۔'' اس آدمی نے تمسخرانہ انداز میں تھانے دار کی
اب دیا اور اس کے چہرے کے بگڑتے ہوئے تاثرات سے بے نیاز شہریار کی طرف متوجہ ہو گیا۔
میں یہاں سے فارغ (فارغ) ہو کر آپ کی خدمت میں ہی حاضر ہونے والا تھا۔ آپ نے میرے پُتر
پر ہسپتال پہنچا کر ہم پر جو احسان کیا ہے، وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ سمجھیں کہ اس احسان کے
آپ نے جگو کو خرید لیا ہے۔ آج سے جگو آپ کا گلام (غلام) ہے۔ آپ دن رات کے جس پہر میں
گے اور مجھے حکم دیں گے، میں فوراً اسے پورا کرنے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔'' وہی شخص جو ابھی لمحہ بھر
نے دار سے تمسخرانہ لہجے میں بات کر رہا تھا، اب سراپا نیاز مند بنا شہریار سے مخاطب تھا۔
تمہاری اس آفر کے بارے میں تو میں بعد میں سوچوں گا لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تھانے میں داخل ہونے
سا طریقہ تھا؟ اگر تمہیں یہاں کوئی کام تھا تو تم آرام سے بھی آ کر بات کر سکتے تھے۔'' شہریار نے اسے
جگو کے چند جملے سن کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی پہنچی ہوئی چیز ہے جو بہر حال کوئی شریفانہ زندگی

نہیں گزار رہا ہے لیکن اپنی ذات کے لیے اس کا غیر مضر ہونا بھی وہ بھانپ چکا تھا۔ اس کے برعکس کافی تناؤ کا شکار تھا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ یوں ریوالور کے دستے پر رکھا ہوا تھا کہ جگو اگر ذرا سی حرکت کرتا تو وہ اسے نشانہ بنا لیتا۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی! مجھے ملوم ہوتا کہ آپ اِدھر ہیں تو ایسی گلطی (غلطی) نہ کرتا۔ میں خبیث کا ٹینٹوا دبانے آیا تھا جس کی وجہ سے میرا پُتر ہسپتال پہنچ گیا۔'' اُس نے مستقل مزاجی سے ''لیا'' ''گاف'' کا استعمال کرتے ہوئے اپنا ارادہ بتایا تو شہریار نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہاں موجود سپاہی کے ذریعے اس جعلی ڈاکٹر کو واپس لاک اپ میں بھجوا دیا ہوسکتا تھا کہ اس کی موجودگی کے باوجود وہاں صورتِ حال بگڑ جاتی۔

''تم جانتے ہو کہ یہ کھلی بدمعاشی ہے۔ مجرموں سے نمٹنا پولیس کا کام ہے۔ اگر اس طرح ہر حساب برابر کرنے نکل کھڑا ہو تو قانون اور پولیس کے محکمے کی تو ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ لوگ اپنے کو خود ہی بدلوں اور سزاؤں کا شکار بناتے رہیں گے اور انسانی بستیوں میں جنگل کی فضا قائم ہو جائے گی۔'' نے سخت لہجے میں جگو کو اس کے غلط رویّے کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''پولیس اور قانون کا بھروسہ ہی کہاں ہے سر جی! اگر یہ لوگ مجرموں کو پکڑ کر سزائیں دینے والے ہر طرف اتنی ناانصافی اور ظلم کیوں نظر آتا؟'' جگو نے دھیمے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے محض شہریار کے لحاظ میں اپنی آواز پست کر رکھی ہے ورنہ پولیس والوں کی نظر میں کوئی عزت و وقعت نہیں۔

''اور کسی کو بھروسہ ہو یا نہ ہو، تمہیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ تمہارا مجرم بروقت پکڑا گیا ہے اور نے اسے گرفتار کیا ہے تو پھر اسے اس کے جرم کی سزا بھی دلوائیں گے۔'' جگو کو یہ جواب دیتے ہوئے آواز کافی بلند تھی۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی! یہ تو آپ کا احسان ہے کہ مجرم پکڑا گیا ہے اور میں آپ کے آگے نہیں کر سکتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ میں نے ایک عمر پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کرتے ہوئے گزاری لیے میں ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔'' اس کی بلند آواز کے ردِعمل میں بھی جگو کا لہجہ اور اس نے شہریار کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔ اس بار شہریار اسے جگو کی شخصیت سے وہ یہ اندازہ تو پہلے ہی قائم کر چکا تھا کہ اس شخص کی زندگی شریفانہ سرگرمیوں میں ہے۔ اب اس نے واضح طور پر اس بات کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ پولیس تھانہ اس کے لیے کوئی چیزیں نہیں ہیں۔

''یہ میرا فون نمبر ہے۔ اگر کبھی آپ ضرورت محسوس کریں تو بس ایک فون کر دیجئے گا، میں آؤں گا۔'' وہ کاغذ کی ایک پرچی پر لکھا اپنا فون نمبر اسے تھما کر سلام کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ میں تھمائی گئی پرچی اور جاتے ہوئے جگو دونوں پر ایک ایک نظر ڈالتا جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان نے اپنے شانے سے لٹکا بھاری رک سیک نیچے پٹخا اور خود ایک بڑے سے پتھر پر کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں میں زیادہ



جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک کافی کٹھن چڑھائی طے کی تھی اور اس کٹھنائی کی ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کر اسے ہموار کرنے کے بعد اس نے تھرماس نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگا۔ یہ نمکول ملا پانی تھا جس نے اس کے سارے جسم کو فوری توانائی مہیا کی۔

ماں کی خواہش کے احترام میں پہاڑوں کی زندگی ترک کر کے ڈرائیوری کا پیشہ اختیار کرنے والے مشابرم پہاڑوں کے مزاج سے خوب آشنائی تھی۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں ایسا ماحول دیکھا تھا کہ لیے پہاڑوں سے یکسر انجان رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کا باپ اور بڑا بھائی ہر وقت سفر میں رہتے انہوں نے غیر ملکی ٹیموں کے ساتھ کئی اونچی اونچی چوٹیوں کو سر کیا تھا۔ مشابرم خان کا باپ اپنے تینوں کو بھی اسی پیشے میں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً انہیں گر کی باتیں بتاتا رہتا تھا۔ مشابرم خان نے اپنے کے ساتھ ایک دو نسبتاً چھوٹی مہمات میں حصہ بھی لیا تھا پھر اس کا باپ حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کے بعد بھی۔ ان دو حادثات نے اس کی ماں کو اتنا خوف زدہ کیا کہ اس نے زندہ رہ جانے والے اپنے باقی بیٹوں کو بلندی کے سفر سے روک دیا۔ دونوں نے ہی ماں کی اس خواہش کا احترام کیا۔ اکرم خان نے خود اسکردو سے ہوشے تک محدود کر لیا اور وہ خود رزق کے حصول کے لیے پہاڑی وادیاں چھوڑ کر میدانی میں چلا گیا۔

اس کی یہ ہجرت رزق کے حصول سے زیادہ اپنے شوق کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی تھی۔ درحقیقت وہ کا عاشق تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اکرم خان کی طرح خود کو محدود رکھ کر یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس کی مہم جو کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو ہوشے کی کیمپنگ سائٹ پر چھوڑ کر خود واپس آ جاتا۔ معلوم تھا کہ اگر وہ وہاں تک جائے گا تو پھر اس سے آگے جانے سے خود کو ہرگز بھی نہیں روک پائے گا اور صورت میں وہ ماں کی نافرمانی و دل آزاری کا مرتکب ہوسکتا تھا لہٰذا اس نے خود کو پہاڑوں سے دور رکھنا ہی سمجھا مگر شاید اس کی پہاڑوں سے محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ خود پہاڑ بھی اس سے ملاقات کے مشتاق تھے نے خود اسے پکار لیا تھا اور وہ یہ سفر اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ محدود تجربے کے باوجود اس نے اب کا سفر کامیابی سے طے کیا تھا اور اپنے اندازے کے مطابق اس مقام کے قریب پہنچ چکا تھا جس کی نشان سفر سے واپس آنے والے ایک پورٹر نے کی تھی۔

پورٹر نے بتایا تھا کہ اس نے اس جگہ پر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں اور مشابرم خان کے دل نے گواہی دی کہ اس فائرنگ کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کی اسے تلاش ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ سوچ بچار کیے بغیر روانہ ہو تھا اور نہایت کامیابی سے سفر کر کے اتنی دور تک پہنچ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ مچھلی کے بچے کو کسی سے تیرنا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سفر کے لیے جو لوازمات درکار تھے، ان کے سلسلے میں بھی اسے کوئی پریشانی نہیں پڑی تھی۔ کاندے میں موجود اس کے گھر میں ایک لکڑی کا صندوق طویل عرصے سے ان لوازمات کو اپنے میں سمو کر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ صندوق اور اس میں موجود سامان اس کے باپ کی نشانی تھی۔ کوہ پیمائی میں استعمال والی یہ اشیاء ایک جرمن کوہ پیما نے اس کے باپ کی خدمات پر خوش ہو کر اسے عنایت کی تھیں۔ وہ چاہتا اشیاء کو بیچ کر اچھی خاصی رقم کما سکتا تھا لیکن وہ لالچ و طمع سے پاک ایک وضع دار آدمی تھا جس نے تحفے ہی سمجھا تھا اور بڑی محبت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ آج یہ سنبھال کر رکھا گیا تحفہ مشابرم خان کے کام آ رہا اپنی مہم پر روانہ ہونے کے لیے اسے صرف خورونوش کی اشیاء کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ کرائے کی جیپ بھی

اس نے کاندے تک کے لیے اپنے پاس رکھی تھی اور پھر ٹورسٹ کمپنی کے ایک نمائندے کے ذریعے
دی تھی۔

آگے کا سفر اس نے کاندے سے ہوشے تک کا دن میں کئی بار پھیرا لگانے والی جیپوں میں سے ایک
تھا اور اس سے آگے تو پھر ہر ایک کو ہی پیدل مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ بڑی بڑی عالی شان گاڑیوں
کرنے والے بھی پہاڑوں کے سامنے سرنگوں ہو کر پیدل سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ مجبوری ایک
ہے جسے بندہ اپنے شوق اور خواہش سے اپناتا ہے۔ مشابرم خان کا معاملہ ذرا سا مختلف تھا۔ پہاڑوں کو سر
کا شوق اور خواہش تو وہ بھی اپنے دل میں رکھتا تھا لیکن موجودہ سفر اس نے کسی خواہش اور شوق کی تکمیل کے
نہیں بلکہ مقصد کے تحت اختیار کیا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کی بظاہر کوئی امید نہیں تھی۔ اس سفر کو اختیار
اس نے ایک طرح سے بلائنڈ چال چلی تھی لیکن بس یہ اس کے اندر کی آواز تھی جسے سن کر وہ چل پڑا
انسانی آبادی سے بہت دور اس ویران برف زار میں موجود تھا۔

وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے اسے اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں اور بڑے بڑے پتھروں کے
نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس پورے علاقے میں اس کے سوا کوئی دوسرا متنفس موجود نہیں تھا اور یہ تنہائی اسے
مجبور کر رہی تھی کہ اگر وہ اس ویرانے میں کہیں مر جائے تو کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی کہ وہ کس انجام سے
ہے۔ اس کی جان پہچان والے اسے ہمیشہ ایک گمشدہ شخص ہی سمجھتے رہیں گے، خاص طور پر شہریار کو
گمشدگی پر ضرور ہی تشویش ہوتی۔ اس نے مشابرم خان پر اعتماد کرتے ہوئے اسے چند ذمے داریاں
تھیں، وہ خلوصِ دل سے اس کے لیے کام کرتا بھی رہا تھا لیکن اپنی جذباتیت کی وجہ سے یہ غلطی کر بیٹھا تھا
پر روانہ ہونے سے پہلے شہریار کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اس کا اچانک غیاب یقیناً شہریار کے لیے
باعث بنا ہو گا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ اس زمین کے جس خطے پر موجود تھا، وہاں سے کسی سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی چنانچہ اپنی
کے ازالے کے لیے اسے اب یہی کرنا تھا کہ کسی طرح کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے واپس لوٹے اور کام
دارومدار بڑی حد تک قسمت پر تھا۔ قسمت اسے کہاں لے جانے والی تھی، وہ نہیں جانتا تھا لیکن اسی پر
کے کچھ دیر ستانے اور سانس ہموار کرنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک بار پھر رک سیک کو شانے
لٹکا کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اس کی نظر کافی فاصلے پر موجود کسی سیاہ چیز پر
دُور سے دیکھنے پر وہ سفید برف پر موجود کوئی سیاہ دھبہ محسوس ہوا تھا اور اتنا نمایاں تھا کہ اس کا اس کی طرف
ہونا لازمی تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اس سیاہ دھبے کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا۔ جیسے جیسے فاصلہ سمٹ
تھا، منظر زیادہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا سا سیاہ پتھر ہے جسے برف نے ڈھانپ
ہے اور اس کا صرف ایک حصہ برف کے لباس سے باہر نکل کر جھانک رہا ہے۔ مشابرم خان شاید اسے کوئی
سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے اس نے اب تک ایک بھی اس نوعیت کا
دیکھا تھا چنانچہ تجسس کی انگلی تھامے وہ اس برف کے ڈھیر کے پاس پہنچ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے سیاہ
انگلیوں کی مدد سے چھوا۔ فوری طور پر اس کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا اندازہ بالکل
تھا۔ دور سے پتھر دکھائی دینے والا وہ ڈھیر واقعی پتھر نہیں تھا بلکہ کسی جانور کا مُردہ جسم تھا جس کی کھال سردی
سخت ضرور ہو گئی تھی لیکن بہرحال یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی پتھر نہیں ہے۔

اپنے تجربے کی بنیاد پر مشابرم خان یہ قیاس کر سکتا تھا کہ اس جثے کا جانور یاک کے سوا کوئی اور نہیں



اپنے اندازے کی درستگی کو جانچنے کے لیے اس نے بہ غور اس ڈھیر کا جائزہ لیا اور پھر اپنے سامان میں سے
کرچی سی نکال کر احتیاط سے برف کو ہٹانے لگا۔ برف کی وہ تہ بہت پرانی نہیں تھی اس لیے اسے بہت
محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ بالآخر پانچ چھ منٹ کی کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا
بالکل درست تھا۔ برف کی تہ میں سے جو چہرہ باہر نکلا تھا، وہ سو فیصد ایک یاک کا تھا جس کی موت کی وجہ
کرنے میں اسے بالکل بھی دقت پیش نہیں آئی۔ یاک کی کھوپڑی میں موجود گولی کا سوراخ بے حد نمایاں
مشابرم خان ایک گہرا سانس لیتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ قسمت نے اب تک اس کا خوب ساتھ نبھایا تھا۔
سے ہلاک شدہ اس یاک کا مُردہ جسم گواہ تھا کہ وہ اس جگہ پر پہنچ گیا ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ یاک کی
میں موجود سوراخ کا قطر ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی موت کا سبب بننے والی گولی کسی رائفل سے نکلی تھی۔
یقین تھا کہ اس مقام پر رائفل کا استعمال کرنے والے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے اکرم خان کو ہلاک
اور ماہ بانو کو اغوا کر کے ان پہاڑوں میں کہیں روپوش ہو گئے تھے۔

اپنے دشمنوں کی کہیں قریب ہی موجودگی کے خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا لیکن فی الحال
وہاں کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ فائرنگ کا واقعہ ان کے ٹھکانے سے
آیا ہو اور وہ یہاں سے کہیں دور موجود ہوں۔ حقیقت جو بھی تھی، ابھی تک پردے میں ہی تھی اور وہ جس
قسمت اور اپنی لگن پر بھروسہ کر کے یہاں تک آیا تھا، اسی طرح آگے کا سفر بھی جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا
اب وہ محتاط ہو گیا تھا اور پہلے کی طرح بے خطر سفر کرنے کے بجائے خود کو چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں
سفر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے اپنے وجدان کے سہارے خود ہی ایک سمت کا تعین کر لیا تھا اور اس سمت میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
پُر امید مرحلہ شروع ہوئے ابھی مشکل سے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اس نے زمین میں دھمک سی محسوس
دھمک کو سن کر وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور اپنے اطراف کا چوکنا نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی
سامنے سنائی دینے والی دھمک کی وجہ آ گئی۔ وہ ایک قوی الجثہ یاک تھا جو اس کی نظروں کے سامنے سے
ان سے گزرتا ہوا اسی سمت جا رہا تھا جس سمت وہ خود بھی سفر کر رہا تھا۔ یاک کی پشت پر اسلحہ بردار دو آدمی
تھے۔ اگر مشابرم خان ایک بڑے پتھر کی آڑ میں نہ چھپا ہوا ہوتا تو ان کی نظروں کی زد میں آ سکتا تھا لیکن
اور وہ یاک سوار اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ وہ آگے نکلے تو مشابرم خان بھی اپنی اٹھل
دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ جس اندھے راستے پر چل رہا تھا، اس پر ان یاک
کا نظر آ جانا کسی غیر متوقع مشعل کے جل اُٹھنے کے برابر تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ایک تو اسے یہ تقویت
ہوئی تھی کہ اس کا اب تک کا سفر رائیگاں نہیں گیا، دوسرے اب وہ ان کے نقشِ پا پر چلتا ہوا ان کے
تک بھی پہنچ سکتا تھا۔

بے حد احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تعاقب شروع کر دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ پیدل
ان کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکتا۔ ان کی تیز رفتار سواری بہت جلد انہیں اس کی نظروں سے اوجھل کر دے
اس مسئلے کے حل کے لیے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ ان کے تعاقب میں ان کے پیچھے پیچھے
کر کے ایک قریبی نسبتاً اونچی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یہ چڑھائی کچھ مشکل نہیں تھی اس لیے جلد ہی وہ
پہنچ گیا۔ اب شمال کی طرف جانے والا یاک اور اس کے سوار اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ تا حدِ نگاہ
منظر میں وہ انہیں سفر کرتا ہوا دیکھتا رہا، یہاں تک کہ محوِ سفر یاک کی متحرک تصویر لحہ بہ لحہ چھوٹی ہوتے

ہوتے پہلے ایک سیاہ نقطے میں ڈھلی، پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یاک کے نظروں سے اوجھل ہو
کے بعد وہ ایک گہرا سانس لیتا ہوا پہاڑی سے نیچے اُتر آیا اور خود بھی اسی سمت میں چلنا شروع کر دیا۔ جہاں
اس کی نظروں نے ساتھ دیا تھا، وہاں تک کا راستہ اس کے لیے واضح تھا۔ اس کے بعد آگے شاید اسے
کی طرح قسمت پر بھروسہ کرنا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، یہ سوچ کر وہ چل پڑا۔ یاک نے
نہایت قلیل وقت میں طے کر لیا تھا، اسے طے کرنے میں اس کا اچھا خاصا وقت اور توانائی خرچ ہوئی
مسافت کی تھکن اتارنے اور توانائی بحال کرنے کے لیے وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ ذرا سا ستا لینے
کے گھونٹ حلق میں انڈیل لینے کے بعد اس نے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کیا تا کہ آگے کے سفر کے لیے
تعین کر سکے۔ اس جائزے نے اسے یک دم اپنی خوش قسمتی کا احساس دلایا۔ وہ اس وقت جس جگہ
وہاں سے آگے بڑھنے کی صرف ایک ہی راہ تھی جو سیدھی جا رہی تھی۔ اس راستے کے علاوہ دائیں بائیں
عمودی چٹانیں کھڑی ہوئی تھیں چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ یاک سوار سیدھے جانے کے بجائے کسی
میں نکل گئے ہوں۔ وہ تہ دل سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا ایک بار پھر چل پڑا۔ اس بار مسافت خاصی مختصر
ہوئی لیکن اس مسافت کے اختتام پر سامنے آ جانے والی پہاڑیاں اس کی خوش قسمتی کے لیے تازیانہ
ہوئیں۔ ان پہاڑیوں کی نوعیت و ساخت کچھ اس طرح کی تھی کہ انہیں عبور کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں
لیکن عقل یہ بھی کہتی تھی کہ یاک اور اس کے دونوں سوار اسی طرف آئے تھے۔ اگر وہ یہاں آئے تھے اور
سفر کیا تھا تو یہ بات یقینی تھی کہ انہوں نے کسی طرح ان پہاڑوں کو عبور کیا تھا۔ اسے وہ مقام کھوجنا تھا جہاں
دوسری طرف پہنچا جا سکتا تھا۔ اس تجسس اور کھوج میں وہ اس طرح مگن ہوا کہ ساری احتیاط بھول کر اردگرد
ماحول سے غافل ہو گیا۔ اُس کی اس غفلت نے رنگ دکھایا اور اسے علم ہی نہیں ہو سکا کہ کب وہ تین
بردار اچانک آ کر اس کے سر پر سوار ہو گئے ہیں۔ وہ تو ان کی طرف اس وقت متوجہ ہوا جب ایک بندوق
اس کی کنپٹی سے آ کر لگی اور اسے غراتی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لینے کا حکم دیا گیا۔

⊛----✪----⊛



"کیا حال ہیں چودھری صاحب! آپ تو ایسے واپس گئے کہ پلٹ کر ہمیں پوچھا ہی نہیں۔ لِنڈا بھی
شکایت کر رہی تھی کہ چودھری صاحب نے ایک فون کال تک نہیں کی، وہاں جا کر ہمیں بھول گئے۔" چودھری
ایڈوارک سے آنے والی ڈیوڈ کی کال ریسیو کی تو اس نے چودھری کے ہیلو کہتے ہی شکوے شروع کر دیئے۔
"ایسی کوئی بات نہیں مسٹر ڈیوڈ! آپ لوگ مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ بس میں واپس آتے ہی کچھ
مسئلوں میں اُلجھ گیا کہ آپ کو یا لِنڈا کو کال کرنے کا وقت ہی نہیں نکال سکا۔" چودھری نے لہجے میں مصنوعی
شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ کی بات کا جواب دیا۔
درحقیقت وہ آج کل بہت پریشان تھا۔ رانی کے مرنے کے بعد اس کے پاس کشور کا سراغ لگانے کے
سوا کوئی کلیو نہیں رہا تھا اور معاملہ ایسا تھا کہ وہ کھل کر اپنے بندوں کو اس کام پر بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اپنے ہی
ملازمین کے سامنے یہ اعتراف کرنا کہ اس کی یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی بھاگ گئی ہے، بڑی ذلت کی
بات تھی اور وہ یہ ذلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے ابھی تک کشور کی تلاش کا کام بھی ڈھنگ
سے شروع نہیں ہو سکا تھا۔ لے دے کر وہ اس کے قریبی ملازمین کو ہی ٹٹول سکتا تھا اور اس مقصد کے لیے لاہور
چلا گیا تھا تا کہ وہاں کے ملازمین کی نظر میں کچھ آیا ہو تو ان سے معلوم کر سکے۔ وہاں سے اسے صرف وہی
باتیں معلوم ہوئیں جو کسی حد تک وڈی چودھرائن نے بھی بتا دی تھیں۔ لاہور کی کوٹھی پر موجود ملازمہ حاجرہ نے
کشور کے بیوٹی پارلر جانے اور دلہنوں جیسی تیاری کرنے کے بارے میں جھجکتے ہوئے بتایا تھا لیکن اس سے
زیادہ وہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی کہ کشور، رانی کے علاوہ کسی دوسرے ملازم کو زیادہ قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتی
اور رانی نے حاجرہ کو یہی بتایا تھا کہ کشور کی ذہنی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ ایسی اُلٹی سیدھی
حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ اس بیان سے چودھری سمجھ گیا کہ بیٹی اپنی ملازمۂ خاص کی مدد سے بہت صفائی سے سب
کو بے وقوف بناتی رہی ہے۔
وہ بہت دنوں سے ہی کسی کے چکر میں تھی لیکن تھوڑی بہت مشکوک حرکات کے سوا اس نے اتنی چالاکی کا
مظاہرہ کیا کہ کسی کو اس شخص کے بارے میں بھنک بھی نہیں لگنے دی جس کے عشق کے سہارے وہ باپ کے
لگائے شکنجے کو ٹھوکر لگا کر حویلی سے بھاگ نکلنے کی ہمت کر سکی تھی۔ اس شخص کے بارے میں یقینی طور پر رانی کو
علم تھا لیکن اس نے بھی جان دینا منظور کر لیا، پر زبان نہیں کھولی۔ اب وہ رانی کی روح سے تو معلومات
حاصل نہیں کر سکتا تھا چنانچہ پیچ و تاب کھاتا کبھی بیویوں پر اپنا غصہ نکالتا اور کبھی نوکروں کی شامت آ جاتی لیکن
اس طرح تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ ہنوز اسی طرح موجود تھا۔
"کیسے مسئلے چودھری صاحب! آپ کو اگر کوئی پریشانی تھی تو مجھ سے شیئر کرنی چاہئے تھی۔ آخر آپ اور ہم

دوست ہیں۔ ہم آپ کو پریشان کیسے دیکھ سکتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''آپ کے خلوص کا شکریہ مسٹر ڈیوڈ! لیکن اصل میں گل یہ ہے کہ مسئلہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے اس لیے نے اسے کسی بھی دوست یا ہمدرد سے شیئر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر آپ تو ہیں بھی بہت دور۔ آپ مدد کر سکتے ہیں؟''

''یہ کیسی بات کر دی آپ نے چودھری صاحب! ہم دور ہیں تو کیا آپ کی طرف سے غافل بھی گے؟ آخر کو آپ سے دوستی کا ہاتھ ملایا ہے اور دوستوں کے حال سے باخبر رہنا ہماری دوستی کا اوّلین اصل ہے۔'' چودھری کی بات کے جواب میں کہی گئی ڈیوڈ کی بات خاصی معنی خیز تھی۔ ایک طرح سے وہ دعویٰ کر کہ سات سمندر پار بیٹھ کر بھی وہ واقف ہے کہ چودھری کی حویلی میں کون سا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اُس کے انداز پر چودھری چونک پڑا۔

''کیا مطلب؟'' کچھ بے یقینی کے عالم میں اس نے یہ دو لفظی سوال کیا۔

''مجھے آپ کے مسئلے کی نوعیت کا علم ہے چودھری صاحب! آپ اپنی بیٹی کے اچانک حویلی سے غائب جانے کی وجہ سے پریشان ہیں اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے ہیں۔'' ڈیوڈ کے جواب نے کو لمحہ بھر کے لیے سُن کر دیا۔ وہ جس بدنامی کی خبر کو اپنے سائے سے بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ نیویارک تک جا پہنچی تھی۔

''آپ خود مجھے اپنا مسئلہ بتاتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ بہرحال، میں نے اپنی طرف سے دوستی پوری کوشش کی ہے اور آپ کے لیے ایک ایسا کلیو تلاش کیا ہے جس سے یقیناً آپ کو بہت مدد ملے گی۔'' اس اندرونی کیفیت سے بے خبر ڈیوڈ اپنی ہی بولے جا رہا تھا لیکن اس کی یہ بات ایسی تھی جس نے چودھری زندگی جگا دی۔

''کیسا کلیو؟..... پلیز مجھے تفصیل سے بتائیں مسٹر ڈیوڈ! اگر آپ کی مدد سے میں اپنے مجرم تک کامیاب ہو گیا تو سمجھیں یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' اُس کی اس پر لائن کی دوسری طرف موجود ڈیوڈ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ وہ جس قوم کا نمائندہ تھا، وہ کسی پر احسان کر اس لیے تھے کہ اس سے سود سمیت فائدہ حاصل کیا جائے۔ چودھری نے ہمیشہ اس کے احسان کو یاد رکھا کیا تھا۔ حقیقتاً اگر کبھی چودھری اس احسان کو بھولنے بھی لگتا تو وہ اسے یاد دلا دیتا اور ہرگز بھی بھولنے نہ دیتا۔

''میری درخواست پر میرے چند دوستوں نے اس واقعے کی تحقیقات ہیں اور کچھ شکوک کا اظہار کیا اب ان شکوک کی تصدیق کر کے آگے کی کارروائی کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔''

''میں سب دیکھ لوں گا۔ آپ بس مجھے اس بندے کا نام بتائیں جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا۔'' چودھری جو پہلے ہی غصے سے بھرا بیٹھا تھا، کوئی سراغ مل جانے کی اُمید بندھنے پر بے تابی سے بولا۔

''بندے کا نام سننے سے پہلے آپ کو واقعات کو سمجھنا ہو گا۔ مجھ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان آپ کی بیٹی جمعرات کی شام درگاہ گئی تھی۔ اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ یعنی وہ اس شام درگاہ غائب ہو گئی تھی۔'' ڈیوڈ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چودھری سے اپنی بات کی تصدیق چاہتا ہو۔ چودھری تائید کی۔

''ہاں! اس کی ملازمہ جو اس کے ساتھ گئی تھی، وہ یہی اطلاع لے کر حویلی آئی تھی کہ کشور بی بی اندر سے اچانک ہی غائب ہو گئی ہیں اور پچھلی طرف درگاہ کا ایک خادم بے ہوش پڑا ہے۔''



''بالکل صحیح۔ اب آگے سنیں۔ یہ جمعرات کے دن کی ہی بات ہے کہ آپ کے گاؤں میں میڈیا سے تعلق لے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ بظاہر ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ پیر آباد اور اردگرد کے دیہاتوں میں قیاتی کاموں کے بارے میں رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں۔ انہوں نے یہ کام کیا بھی لیکن میں سے افضل نام کا ایک صحافی ایسا تھا جو پورا وقت اپنی ٹیم کے ساتھ نہیں رہا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے کر آیا تھا اور اچانک ہی اس کی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے واپس شہر لوٹ گیا۔''

''یہ سب تو مجھے بھی معلوم ہے۔ میرے بندے اتنے بے خبر نہیں رہتے کہ گاؤں میں آنے جانے والوں میں رپورٹ نہ رکھیں۔'' چودھری نے ڈیوڈ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے باخبر ہونے کی اطلاع دینا سمجھا۔

''بے شک آپ کے بندوں نے آپ کو یہ ساری رپورٹ دی ہو گی لیکن ایک بات انہیں نہیں معلوم تھی اس نے آپ کو بھی نہیں بتائی ہو گی۔''

''وہ کیا؟'' ڈیوڈ کے سنسنی خیز انداز پر چودھری نے بے ساختہ ہی پوچھا۔

''وہ یہ کہ افضل آپ کے دشمنوں میں سے ایک ماسٹر آفتاب کا گہرا دوست ہے۔ اب آپ سوچئے کہ کیا یہ کہ اس وقت جبکہ گاؤں کے بیشتر افراد کی توجہ میڈیا والوں کی طرف تھی اور افضل اپنی بیوی کے ساتھ قبل اپنے ساتھیوں کو کام کرتا چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا تھا، وہ جاتے جاتے آپ کی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ میں بٹھا کر لے گیا ہو؟'' ڈیوڈ کا پیش کردہ تجزیہ واقعی بڑا غور طلب تھا۔ چودھری جوں جوں سوچ رہا ڈیوڈ کی بات بالکل صحیح محسوس ہو رہی تھی۔ حویلی کے ملازمین اور گاؤں کے نوجوانوں میں سے کسی کی نہیں ہو سکتی تھی کہ چودھری افتخار کی بیٹی کے قریب پھٹک بھی سکیں۔ پھر کشور کا اپنا بھی ایک مزاج تھا۔ پسند اور پڑھنے لکھنے سے شغف رکھنے والی لڑکی تھی جس کا ماسٹر آفتاب جیسے شخص سے متاثر ہو جانا بعید نہیں تھا۔ آفتاب وہ شخص تھا جو گاؤں میں بھی سرگرم رہتا تھا اور اس کا شہر بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بہت سے گاؤں میں نہ سہی شہر میں اس کی کشور سے کہیں ملاقات ہو گئی ہو اور اس ملاقات نے محبت کا روپ اور بغاوت پر اُکسایا ہو۔ حقیقت جو بھی تھی، نہ تو وہ اپنی باغی بیٹی کو معاف کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے راہ پر چلانے والے کو۔

''شکریہ مسٹر ڈیوڈ! آپ کی دی ہوئی انفارمیشنز یقیناً میرے بہت کام آئیں گی اور میں آپ کے اجازت دیں تاکہ میں اس ماملے کو نمٹا لوں۔'' عجلت میں یہ چند جملے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ درندے کی طرح اپنے حریف پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین تھا۔ اس لیے فی الحال باتوں میں خرچ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

چلتے چلتے اسے کتنا وقت گزر گیا تھا، وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔ اس برف زار میں پہر، گھنٹے، پہچان مٹ گئی تھی۔ بس کچھ سمجھ آتا تھا تو وہ یہ کہ ایک مسافت ہے جو جاری ہے اور جس کی انتہا کا کہ کب یہ ختم ہو گی اور منزل ملے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منزل سرے سے ملتی ہی نہیں اور وہ یونہی ان کی طرح موت کی آغوش میں جا پہنچتی۔ تنہائی، تھکن اور موسم کی سختی نے مل کر اسے نڈھال کر دیا کوشش کر رہی تھی کہ ان سب چیزوں کو اپنے اعصاب پر حاوی نہ ہونے دے۔ اگر وہ اپنی کیفیات کو

اپنے اعصاب پر حاوی ہونے دیتی تو پھر اس کا نتیجہ شدید مایوسی کی صورت میں ہی نکلتا اور مایوسی موت
دوسری صورت ہے۔ مایوس انسان سانسوں کی گنتی ختم ہونے سے قبل ہی عملاً مُردہ ہو چکا ہوتا ہے جو نہ
لیے کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے کام آ سکتا ہے۔

وہ کئی بار مشکل حالات سے بہ خیر و عافیت بچ نکلی تھی اور اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا
اسے بار بار بچاتا ہے تو اس لیے کہ اسے اس کی زندگی منظور ہے اور وہ اللہ کی عطا کردہ اس زندگی کو کسی
مقصد کے لیے استعمال کر سکتی ہے چنانچہ وہ اپنی طاقت کا خزانہ ختم ہونے تک اللہ کی اس نعمت کو بچا
جدوجہد کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے لیے بقا کی جدوجہد جاں
دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت کے مسلسل زائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پاس موجود
اور ایندھن کا ذخیرہ بھی ختم ہونے کو تھا۔ اس پر سے مستزاد یہ کہ آج صبح سے اسے بخار بھی ہو گیا تھا۔
علاج کے لیے اس نے اپنے پاس بچ جانے والی آخری گولی فوراً ہی کھا لی تھی۔ گولی کھانے سے اسے
افاقہ بھی ہوا تھا لیکن چند گھنٹوں بعد ہی ایک بار پھر بخار نے اسے آ دبوچا اور اب یہ بخار لحہ بہ لحہ تیز ہوتا
جس کے علاج کے لیے اس کے پاس اب کوئی دوا بھی باقی نہیں بچی تھی۔ وہ لوگ فرار ہوتے وقت
دواؤں کا جو ذخیرہ لے کر چلے تھے۔ اس میں موجود بخار کی گولیاں وہ مسلسل عمران کو کھلاتی رہی تھی اس
اس کے پاس بخار سے بچاؤ کی کوئی دوا باقی نہیں رہی تھی۔ یہ برف زار جہاں چلنا پھرنا یوں بھی بہت
بخار کی شدت کے باعث اس کے لیے اور بھی زیادہ دشوار گزار ہو گیا تھا۔ جسم کی سلب ہوتی توانائیاں
اسے مایوسی کی طرف بھی دھکیلنے کی کوشش کرتیں لیکن پھر اسے عمران کی بات یاد آ جاتی۔ اس نے کہا تھا
مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے ویسے ہی یہاں
کر نکال دے گا۔'' اللہ نے فوری طور پر عمران کے اس یقین کی تصدیق بھی کی تھی اور اسے ایک کھائی
سے بچا لیا تھا۔ عمران کا کہا وہ جملہ اور حادثے سے محفوظ رہ جانے کا واقعہ اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا
اس انتہائی خراب صورتِ حال میں بھی ہمت ہارنے کے بجائے گرتی پڑتی ہی سہی، چلتی جا رہی تھی۔
راہ پر جس کے بارے میں اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ اسے کسی منزل تک لے بھی جائے گی یا نہیں
حرکت میں برکت ہے والے مقولے پر عمل کرتے ہوئے چل رہی تھی۔

چلتے رہنے کی صورت میں یہ اُمید تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس برف زار کی بھول بھلیوں سے نکل
رُک جانے اور ایک جگہ بیٹھ جانے کی صورت میں یہ امید بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ امید کا تھامن تھام کر
جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے قدموں میں مزید چلنے کی سکت نہیں رہی ہے اور اسے تھوڑی
کے ساتھ کچھ کھا پی بھی لینا چاہیے تو وہ رک گئی اور اپنے شانے پر لٹکا تھیلا اتار کر اس میں باقی
کھانے پینے کی اشیاء کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے پاس موجود خوراک کے ذخیرے میں خشک ڈبل روٹی
بسکٹوں کا ایک ڈبہ، تلی ہوئی مونگ پھلی کا آدھا پیکٹ اور تھوڑی سی کافی بچی تھی۔ اختتام کے بالکل
جانے والی یہ خوراک کی مقدار ایک بار پھر خوف کا دیو بن کر اس کے دل کو مسلنے اور ڈرانے لگی لیکن
اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے سر جھٹکا اور کافی بنانے کے خیال سے برتن میں تھوڑی سی برف ڈال کر
کے لیے اسٹوو پر رکھا۔ اسٹوو بہت ہی دھیما جل رہا تھا۔ پھر ابھی مشکل سے برف پگھلی ہی تھی کہ یک
اس نے کوشش کی کہ کسی طرح دوبارہ اسے جلا سکے لیکن کوشش کے نتیجے میں اس پر انکشاف ہوا کہ اس
میں موجود ایندھن کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے لیے کافی بنانا بھی ممکن نہیں۔ یہ ایک لرزہ



نے کسی نہ کسی طرح ذہن سے جھٹکا اور بسکٹوں کا ڈبہ کھول کر اس میں سے چند بسکٹ نکال کر کھانے
لی بھر مونگ پھلیاں بھی چبا ڈالیں۔ بخار کی وجہ سے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا تھا اس لیے اس کے
سے زیادہ کچھ حلق سے نیچے اُتارنا ممکن بھی نہیں تھا۔ دوسرے اب اسے یہ محدود خوراک ہی بہت سنبھال
ل کرنی تھی تا کہ شدید بھوک لگنے کی صورت میں کفایت سے اسے استعمال کر سکے۔

نے اور تھوڑی دیر ستا لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر سفر شروع کر دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس
اک کے ساتھ وہ بہت زیادہ وقت اس برف زار میں نہیں گزار سکے گی اس لیے یہی مناسب تھا کہ زیادہ
ہ چلتی اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔ اٹکل پچو سے ایک سمت کا تعین کرتی ہوئی وہ اس جانب چلنے
تھوڑی ہی دیر میں موسم کے تیور بگڑنے لگے۔ آسمان جو کچھ دیر قبل صاف لگ رہا تھا، تیزی سے سیاہ
ے پیچھے چھپنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں نے نیلے آسمان کے وجود پر سیاہ نقاب تان کر سورج کی
ے نیچے پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ اس اندھیرے میں آگے بڑھنا خاصا مشکل تھا۔ اس پر شروع ہو جانے
ں کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور اس کے بخار سے جلتے جود کو کپکپا ڈال رہا تھا۔

یکھتے ہی دیکھتے بارش کے یہ قطرے مزید سرد ہونے لگے۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اب آسمان سے
قطرے نہیں بلکہ نرم نرم سی برف گر رہی ہے۔ وہ جو پہلے ہی کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں
تھی اور منظر واضح نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی، مزید گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں
ف بڑھنے کی کوشش کی تو بری طرح پھسلی۔ پھسلنے کے بعد اسے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ بہت دور تک برف
رح پھسلتی جائے گی اور بالآخر کسی کھائی میں جا گرے گی لیکن قدرت ایک بار پھر اس کی مدد کے لیے
ئی اور اس کے دونوں ہاتھ جو اضطراری طور پر آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے، ایک بڑے پتھر سے
ے۔ اس نے بے اختیار خود کو روکنے کے لیے اس پتھر کو تھام لیا۔ پتھر کافی بڑا تھا جس نے اس کے پھسلتے
ک لیا لیکن چونکہ وہ کافی رفتار سے پھسلتی ہوئی آ رہی تھی اس لیے خود کو پتھر سے ٹکرانے سے بچا نہیں سکی
ے کے باوجود اس کی ٹھوڑی زد میں آ گئی۔ اسے فوراً ہی وہاں خون کی چپچپاہٹ کا احساس ہوا لیکن بہر حال
ا ہی بچت ہو گئی تھی۔ خصوصاً آگے کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے وہ کافی محفوظ رہی تھی لیکن
ے کے ساتھ ہی اسے دو نقصانات مزید سہنے پڑے تھے۔

سلنے کے دوران اس کے ہاتھ میں موجود اسنو اسٹک کا کام دینے والی رائفل چھوٹ کر کہیں گر گئی تھی اور
سان یہ ہوا تھا کہ اس کے دائیں پیر کا جوتا بھی نکل گیا تھا۔ رائفل کے بغیر تو پھر گزارہ ہو جاتا لیکن جوتے
وہ آگے کا سفر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہاں اتنی سردی تھی کہ اس کا پیر فوراً ہی اسنو بائٹ کا شکار ہو جاتا۔
ابھی اپنے اس نقصان کا ادراک نہیں ہو سکا تھا اور وہ ہاتھوں کو لگنے والے جھٹکے اور ٹھوڑی کے زخم میں ہی
لی تھی۔ کسی کھائی میں گرنے سے محفوظ رہنے کے بعد اس نے اپنا جسم سیدھا کیا اور جس پتھر نے اسے
تھا، اسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ پتھر سے ٹکراؤ کے نتیجے میں صرف
ٹھوڑی ہی متاثر نہیں ہوئے ہیں بلکہ باقی جسم کو بھی کافی زور کا جھٹکا لگا ہے اور فی الحال وہ فوری طور پر
ہو کر چلنے کے لائق نہیں ہے۔ اگر لائق ہوتی بھی تو مسلسل جاری برف باری اس کی راہ میں حائل ہو
ں انتہائی بے بس کر دینے والی صورتِ حال میں وہ پتھر سے ٹیک لگائے خود بھی کسی پتھر کی مورتی کی
ی رہ گئی۔ آسمان سے گرنے والی برف آہستہ آہستہ اس کے اپنے وجود کو بھی ڈھانپنے لگی لیکن اس کے
کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اب تک اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنے کی جو جدوجہد کرتی آ رہی تھی، وہ اس

موجودہ لمحے میں یک دم ہی دم توڑ گئی تھی اور شاید خود پر آہستہ آہستہ جمتی برف کی تہ کے نیچے وہ خود بھی کب
دم توڑ دیتی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اسے زندگی کی اُمید دلانے والا عمران موت سے ہار کر ایک ایوالانچ کا
گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

اپنی ذات کو شک سے بالاتر رکھنے کے لیے آفتاب مسلسل گاؤں میں ہی موجود تھا۔ کشور سے اس کی
بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ وہ افضل کے گھر میں اس کی بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہونے کے باوجود آفتاب
لیے پریشان تھی اور اس کا خیال تھا کہ آفتاب کو بھی اب گاؤں سے نکل جانا چاہئے۔ لیکن اس نے کشور کو
تھا کہ وہ اگر اچانک غائب ہو گیا تو شک کی زد میں آ سکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ معمول کے مطابق گاؤں
ہی رہ کر اپنے فرائض انجام دیتا رہے۔

کشور کو اس نے چند دن بعد لاہور آنے کی یقین دہانی کروائی تھی البتہ دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ مسلسل
تھا۔ فون پر اس سے گفتگو کرتے ہوئے کشور اکثر اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ وہ دونوں پیر آباد سے کہیں
پُرامن جگہ پر اپنا گھر بنا کر وہاں سکون سے رہیں گے۔

آفتاب اس کے ان خیالات کو سن کر فی الحال خاموش رہتا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ اس بات کے
راضی نہیں تھا۔ وہ پیر آباد میں ایک مشن کے تحت کام کر رہا تھا۔ اس کی مستقل مزاجی اور استقامت کے
اب کہیں جا کر وہ وقت آیا تھا کہ اسکول باقاعدہ اور منظم طریقے سے کام کرنے لگا تھا۔ ایسی صورت میں
سے چلا جاتا تو ساری محنت ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔ اس کے بعد جانے دوسرے لوگ اتنی جرأت کر بھی
نہیں کہ چودھری کی مخالفت کے باوجود کام کرتے رہتے۔ لیکن دوسری جانب وہ کشور کو بھی آخر کتنا عرصہ
کے گھر چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے آفتاب کی رفاقت کے لیے ہی حویلی چھوڑنے کا پُرخطر فیصلہ کیا تھا اور
رفاقت میسر نہ آتی تو یقیناً وہ مایوس ہوتی۔

آفتاب بڑی اُلجھن میں تھا۔ ایک طرف اس کا مشن تھا تو دوسری طرف وہ لڑکی جس کی تند و تیز
اس کی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی زندگی میں ہلچل سی مچا کر رکھ دی تھی۔ عشق کا جادو کچھ اس طرح سر
بولا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایسے خطرے مول لیتا چلا گیا تھا جن کے بارے میں عام حالات
جیسے آدمی سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ خود اکثر حیران رہ جاتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہو گیا
شہر کا پروردہ تھا اور جس کے لیے عورت کے وجود میں کبھی بھی بہت زیادہ کشش نہیں رہی تھی کہ وہ شروع
ذرا مختلف مزاج کا کچھ انقلابی سا لڑکا تھا اور ہمیشہ یہ خواب دیکھتا تھا کہ عام لوگوں کی طرح کمانے کھانے
بیوی بچوں کو پالنے میں ہی عمر کاٹنے کے بجائے کچھ مختلف طریقِ زندگی اپنائے گا، اچانک ہی کشور کی
مبتلا ہو کر وہ سب کچھ کرتا چلا گیا جس کی اسے خود بھی اپنے آپ سے توقع نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ یہ سب
چکا تھا تو اسے اپنی ذمے داریوں کو نبھانا بھی تھا۔ ذمے داری کے احساس نے ہی اسے کشور کو فوری طور
سے نکال کر شہر پہنچانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کسی کو حویلی میں بھنک بھی پڑ گئی کہ کشور ماں
ہے تو اس کی زندگی ختم کر دی جائے گی۔ کشور کی زندگی محفوظ رکھنے کے خیال نے اسے اپنے سارے
سے صرفِ نظر کر کے خطرہ مول لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن فی الحال وہ گاؤں چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں
وہ یہاں رہ کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر حالات موافق رہتے تو وہ یہاں سے جانے کے بجائے



منتقل کر دیتا اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے کے لیے جاتا رہتا۔ اپنے اس خیال کا اس نے کشور کے
ذکر نہیں کیا تھا۔

حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور چودھری کے امریکہ سے واپس لوٹ آنے کے سوا اسے کوئی بہت بڑی
نہیں آئی تھی۔ اس کے خاص ملازمین بھی معمول کے مطابق ہی کام کرتے نظر آتے تھے اور ان کی
حرکات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس بات سے اس نے
تھا کہ چودھری نے کشور کے غیاب کا معاملہ بدنامی کے خوف سے بے حد خفیہ رکھا ہے اور اگر اسے
کے لیے کوئی کوشش کی بھی جا رہی ہے تو کھل کر کارروائی نہیں کی جا رہی۔ جو بھی تھا، اس کے لیے
ہی چین لکھ رہا تھا اور کسی نے بھی اب تک اس کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔

احساس ہونے کے بعد کہ اس کی ذات شک سے بالاتر ہے، وہ کافی مطمئن ہو گیا تھا اور اگلے دو تین
لاہور جا کر کشور سے ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان اس روز شام کے وقت
گیا۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا
ہی منیب اس کے کمرے میں چلا آیا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ اس کے ساتھ اس مکان
زیر اساتذہ جانتے تھے کہ جس وقت وہ اپنے کمرے میں بند ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی تخلیقی کام کر رہا ہوتا
لیے کوئی بھی ان اوقات میں اسے ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ لیکن آج منیب کی آمد اور اس کے چہرے پر
ات دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے جس کی وہ اسے اطلاع دینا چاہتا ہے۔

ریت ہے منیب! کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' اپنے ہاتھ میں موجود قلم کو قلم دان میں رکھتے ہوئے اس
سے پوچھا۔

ریت نہیں ہے اور جو اطلاع اس وقت مجھے ملی ہے اسے سن کر مجھے لگتا ہے کہ تم کسی بڑی مشکل میں
لے ہو۔''

کیوں، کیا ہوا؟'' وہ فوراً پریشان ہو اٹھا۔

جنگل سے تین لڑکیوں کی لاشیں ملی ہیں۔ انہیں کسی نے زمین کھود کر ایک ہی گڑھے میں دفن کیا تھا۔
گاؤں والوں نے زمین کھود کر لاشیں باہر نکال لیں اور ان کا اچھا خاصا حصہ کھا گئے لیکن اس کے باوجود لاشیں
شناخت نہیں ہیں۔ لواحقین نے انہیں پہچان لیا ہے۔ وہ گاؤں کی ہی تین لڑکیاں نچھی، شادو اور رانی ہیں
لاشوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی پولیس نے یہ جان لیا ہے کہ تینوں لڑکیوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا
'' منیب جو خبر لایا تھا وہ واقعی نہایت بری تھی۔ مرنے والی لڑکیوں میں رانی کا نام سن کر آفتاب کے
خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ رانی لاہور کی کوٹھی میں رہ رہی تھی اس لیے وہ اور کشور دونوں ہی اسے
ہوئے تھے لیکن چودھری اسے نہیں بھولا تھا۔ بظاہر جو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کشور کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی
نہیں کی جا رہی تو درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ چودھری نے نہایت چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشور کی
خاص ملازمہ رانی کو اپنے قبضے میں لے کر یقیناً اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر
کر دیا تھا۔ رانی کے ساتھ نچھی اور شادو کیوں ماری گئیں، یہ بات اسے سمجھ نہیں آئی تھی اور نہ ہی
فرصت تھی۔ رانی کی موت پر افسوس کے ساتھ اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ مرنے سے پہلے نہ جانے
کیا کیا معلومات حاصل کی گئی ہوں گی۔ اگر اس نے زبان کھول دی ہو گی تو یقیناً آفتاب کا نام سامنے آ

''کیا سوچ رہے ہو آفتاب؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ان تینوں لڑکیوں کی موت کے پیچھے کوئی اہم
خاص طور پر اس لڑکی رانی کا نام سن کر میں کافی پریشان ہو گیا ہوں۔ رانی ہی وہ لڑکی ہے نا جو تمہار
بی بی کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھی؟ ہوسکتا ہے اس نے یہ بات ان دونوں لڑکیوں کو بتا دی ہو
ذریعے حویلی والوں میں سے کسی کو پتہ چل گئی ہو چنانچہ بدنامی سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے ان
ٹھکانے لگا دیا ہو اور اب تمہیں نشانہ بنانے کا سوچ رہے ہوں۔ یہ سب باتیں ہیں تو میرا قیاس لیکن
کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ تمہارے لیے حالات کچھ مناسب نہیں ہیں اور تمہیں کچھ دنوں کے لیے
سامنے آنے تک یہاں سے غائب ہو جانا چاہیے۔''

منیب کی آواز نے اسے اپنے خیال سے چونکایا۔ منیب کو کشور کے پیر آباد سے غائب ہونے
میں کچھ علم نہیں تھا لیکن چونکہ وہ ان دونوں کی محبت اور نکاح سے واقف تھا اس لیے اس کا دماغ
اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے کسی حد تک درست بھی کہا جا سکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے واقعی فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' وہ حالات کو منیب سے
طریقے سے سمجھ رہا تھا چنانچہ فوراً ہی اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور اسی وقت اپنی کرسی چھوڑ کر پھرتی
بیگ میں اپنی ضروری اشیاء بھرنے لگا۔ منیب بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے دوست! چلتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔'' دس منٹ سے بھی کم
میں اپنی تیاری مکمل کر کے وہ منیب سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''انشاء اللہ۔'' منیب مسکرایا۔ آفتاب کی پھرتی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ واقعی گڑبڑ
کی قیاس آرائی کے علاوہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس نے آفتاب کو فوری طور پر اس کی تجویز پر عمل کرنے
کیا ہے۔ لیکن آفتاب اتنی عجلت میں تھا کہ وہ اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔

''خیریت سے پہنچ جاؤ تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔'' آفتاب کمرے سے باہر نکل رہا تھا جب اس
پیچھے سے آواز دے کر اسے ہدایت کی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ گاؤں سے باہر
والے راستے کی طرف تھا۔ بس اڈے پہنچ کر وہ روانگی کے لیے تیار کسی بھی روٹ کی بس میں بیٹھ جاتا
سے لاہور چلا جاتا۔ اس وقت تو یہی سب سے ضروری تھا کہ وہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکل جا
جلدی کے خیال سے ہی اس کے قدم بہت تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ یک دم ہی اس نے اپنے پیچھے کسی
کی آواز سنی۔ یہ آواز اس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی لیکن اس کی بے بسی یہ تھی کہ وہ اس گھنٹی کو سن کر
کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بس اس خیال کے تحت کہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کہیں اسے روندتی
نہ گزر جائے، وہ راستہ چھوڑ کر ذرا سا سائیڈ میں ہو گیا۔ چند سیکنڈوں میں ہی گرد و غبار کا طوفان اُڑاتی گاڑی
کے قریب سے گزری اور پھر یک دم ہی ذرا آگے جا کر ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

''کہاں جا رہے ہو ماسٹر! آؤ ہم تمہیں چھوڑ دیں۔'' ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ موجود گاڑی کی اگلی
سے جھانک کر چودھری کے چیلے بالے نے اس سے پوچھا۔

''شکریہ، میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔'' آفتاب نے اسے انکار کیا۔

''ایسا تو نہیں ہوسکتا ماسٹر! ہم تمہارے لیے یہ گڈی لے کر نکلے ہیں اور تم ہی اس میں نہ بیٹھو، یہ کیسے
ہے؟'' بالا گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اور نہایت معنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے کی مثل
کو محسوس کرتا آفتاب اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتا اس سے قبل ہی گاڑی کی پچھلی نشست سے اُترے



لیا۔ وہ سب اسلحے سے لیس تھے اور انہوں نے اس طرح اس کے گرد گھیرا ڈالا تھا کہ اس کے لیے
فرار نہیں رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے گاڑی میں منتقل کیا جا چکا تھا اور گاڑی چل پڑی تھی۔ شاید
جانے والے راستے پر.....

⊛----✪----⊛

تم یہاں تک پہنچ ہی گئے۔'' مشابرم خان کو رائفلوں کے سائے میں جس شخص کے سامنے پہنچایا گیا،
اس کا جائزہ لیتے ہوئے طنز سے کہا۔

صرف میں نہیں پہنچا ہوں میرے ساتھ تمہاری موت بھی پہنچی ہے۔'' مشابرم خان نے ترکی بہ ترکی
سن کر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

لگتا ہے بھائی کی موت نے سچ مچ بے چارے کا دماغ الٹ دیا ہے جب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا
کمانڈر کی بات سن کر مشابرم خان کو زد میں لیے کھڑے لوگ مسکرانے لگے۔ ایک شخص جو خود ہتھیاروں
کھڑا ہو، اس کا یہ دعویٰ پاگل پن ہی لگتا تھا۔

مت سمجھنا کہ ہم تمہاری سرگرمیوں سے واقف نہیں تھے۔ اسکردو میں موجود ہمارے ساتھی دیکھ رہے
کس طرح اپنے بھائی کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین ہو۔ اگر ہمیں منظور ہوتا تو تمہارا وہاں
بھائی سے خاتمہ کیا جا سکتا تھا لیکن یہی سوچا گیا کہ جانے دو، بے چارہ خود ہی تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔
قتل و غارت سے ہمارا یہاں بنا بنایا سیٹ اپ ڈسٹرب ہو سکتا تھا۔ تمہارے بھائی کو بھی ہم نے مجبوراً
تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کو خاموشی سے میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا اور مزاحمت نہیں کرتا تو اسے کچھ
جاتا لیکن اس نے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کی تھی اس لیے اپنی جان سے گیا۔ تمہیں بھی اپنے لیے
سمجھ کر اب تک ڈھیل دی جاتی رہی تھی۔ تمہارا پہاڑوں کی طرف آنکلنا بھی میرے ساتھیوں کی نظر سے
تھا لیکن یہی خیال تھا کہ تم ہمارے اس ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکو گے اور اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مار کر یا
چلے جاؤ گے یا یہیں کہیں مر مرا جاؤ گے۔ لیکن تم تو یہاں تک آ پہنچے..... اور یقین جانو یہاں پہنچ کر تم
اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اب جبکہ تم ہمارا یہ خفیہ ٹھکانہ دیکھ چکے ہو تو ہمارے لیے تمہیں مزید زندہ
ن نہیں۔'' کمانڈر بہت پُرسکون لہجے میں موسم کی خبریں سنانے کے انداز میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔
باتیں سن کر بھی مشابرم خان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اسی طرح نفرت
نظروں سے کمانڈر کو گھورتا رہا اور پھر دانت بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''ماہ بانو کہاں ہے؟ تم نے کیوں اس معصوم لڑکی کو اغوا کروایا تھا؟''

''افسوس! میرے پاس تمہارے دونوں ہی سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ البتہ ایک عنقریب مر جانے والے
کی کچھ نہ کچھ تسلی کے لیے میں تھوڑی بہت وضاحت کر سکتا ہوں۔ پہلے تمہارے دوسرے سوال کا جواب،
نے اس لڑکی کو کیوں اغوا کروایا تھا، اس کی وجہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ مجھے اوپر سے حکم ملا اور میں نے تعمیل
ہم سپاہی لوگ ہیں جو صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتے ہیں اور ''کیوں؟''..... ''کس لئے؟'' جیسے سوالوں میں
الجھتے۔ رہی یہ بات کہ ماہ بانو کہاں ہے؟ تو یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میرے ایک ساتھی کی غداری کی
سے وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور اب ان دونوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ابھی تمہیں جن افراد نے
رکیا ہے، وہ ان دونوں کی تلاش کی مہم پر ہی گئے ہوئے تھے۔ تم کہاں سے ان کے پیچھے لگے، انہیں اندازہ

نہیں ہوا لیکن ٹھکانے پر پہنچنے سے قبل انہوں نے تمہیں دیکھ لیا تھا چنانچہ جب تم پہاڑوں میں آنے کا ارا
کر رہے تھے تو انہوں نے تمہیں گھیر لیا۔ ماہ بانو اور اپنے غدار ساتھی کو بھی ہم اسی طرح پکڑ لیں گے
دونوں گرفتار نہیں کیے جا سکے، تب بھی ان پہاڑوں میں ہی بھٹک بھٹک کر مر جائیں گے۔ ان پہاڑوں
اتنا آسان نہیں ہے۔'' کمانڈر بولتا جا رہا تھا۔ مشابرم خان کو احساس ہوا کہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہے اور
وجہ یقیناً ماہ بانو کا فرار تھا جسے اس نے اپنے اوپر والوں کے حکم پر اغوا کروایا تھا اور اب لازماً اسے اس
جانے پر اوپر والوں کو جواب دینا تھا۔ خود مشابرم خان کو ماہ بانو کے یہاں سے فرار ہو جانے کا سن کر
تھی لیکن ساتھ ہی وہ پریشان بھی ہوا تھا کہ واقعی ان پہاڑوں سے نکل جانا کسی انجان شخص کے لیے بہت
تھا۔ بس یہی امید تھی کہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہونے والا شاید راستوں سے واقف ہو۔

''جب تمہارا ساتھی اس کے ساتھ گیا ہے تو وہ اسے یہاں سے نکال کر کسی آبادی میں بھی پہنچا
اس نے کمانڈر کے سامنے اپنے ذہن میں آنے والے خیال کا اظہار کیا۔

''وہ.....'' کمانڈر استہزائیہ لہجے میں ہنسا۔ ''وہ تو خود یہاں کے راستے نہیں جانتا۔ ہم نے تو اس
لیے جنت کا راستہ منتخب کیا تھا لیکن بے وقوف اس راستے کو چھوڑ کر پہاڑوں میں بھٹک کر مرنے کے لیے

''جنت کا راستہ.....؟'' مشابرم خان حیران ہوا۔

''ہاں، جنت کا راستہ۔ یہاں تمہیں جتنے بھی لوگ نظر آ رہے ہیں، یہ سارے کے سارے مجاہد ہیں
کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنت کے راستے پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان میں سے جس کا اس راستے پر
لیے جتنی جلدی انتخاب ہو گیا، وہ اتنا ہی خوش قسمت ہو گا۔'' وہ جو باتیں کر رہا تھا، مشابرم خان کو اُلجھا رہی
لیکن اس کے اردگرد کھڑے لوگوں کے چہروں پر اپنے کمانڈر کے الفاظ سے چمک آ گئی تھی۔ وہ اتنی عقیدت
اپنے کمانڈر کو دیکھ رہے تھے جیسے جنت میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ کا ٹھیکہ اللہ تعالیٰ نے اسی شخص کے ہاتھ میں
رکھا تھا۔

''کیسا جنت کا راستہ.....؟ میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا ہوں۔'' کمانڈر کو گفتگو کے موڈ میں
اس نے وضاحت طلب کی۔

''یہ لوگ اللہ کے سپاہی ہیں جو بدی کو ختم کرنے کے لیے عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کا کام
سارے افراد کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہے جو کفر و الحاد اور بے حیائی کے کاموں میں مبتلا ہیں۔ اس کام کے
انہیں اپنی جان سے بھی گزرنا پڑے تو یہ گریز نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک اتنا بلند حوصلہ ہے کہ اپ
سے بم باندھ کر بھی اس مشن کو انجام دے سکتا ہے۔'' کمانڈر کی بلند آواز وہاں موجود افراد کے چہروں پر جو
سرخی پھیلا رہی تھی اور گندی میل بھری آنکھوں میں چمک لہرانے لگی تھی۔

مشابرم خان کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے نور پور میں ہونے والا بم دھماکا یاد آیا۔ اس دھما
میں خودکش بمبار کا کردار ادا کرنے والے نوجوان عبدالمتین کو بھی تو وہاں جعلی مدرسہ کھول کر بیٹھے شاہنواز نے
طرح کی باتیں کر کے راہ سے بھٹکایا تھا۔ شہریار کے ڈرائیور کے فرائض انجام دینے کی وجہ سے اسے اس بات
بھی علم تھا کہ شاہنواز کے غیر ملکی جاسوس ہونے کا قیاس لگایا گیا تھا۔ یہاں موجود افراد بھی یقیناً اسی کیٹگری
تعلق رکھتے تھے۔ انہیں بھی معصوم عبدالمتین کی طرح راہ سے بھٹکا کر معاشرے کے لیے ناسور بنایا جا رہا
ملک کے طول و عرض میں آئے دن ہونے والے بم دھماکے جن میں کئی لوگ مارے جاتے تھے، اور کتنے
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے تھے، عموماً کسی خودکش بمبار کا ہی کارنامہ ہوتے تھے۔ اپنی زندگی کی بازی



ں کو موت سے ہمکنار کرنے والے یہ کج روی کے شکار انسان اسی طرح کا لالچ دے کر ہی تو اتنی
کے لیے تیار کیے جاتے ہوں گے۔ کسی بہت بڑے جرم کو اگر نیکی کا پُرفریب جامہ پہنا دیا جائے تو جرم
الے کو وہ جرم، جرم لگتا ہی نہیں۔ ان برف پوش پہاڑوں میں بھی یقیناً ایسے ہی افراد کو تیار کیا جا رہا تھا۔
رے خیال میں تمہارے سارے سوالات ختم ہو گئے ہیں اس لیے اب تمہیں مرنے پر کوئی اعتراض
ا۔'' سوچ میں ڈوبے مشابرم خان کو خاموش پا کر کمانڈر نے اس سے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے
گران سے بولا۔ ''دیکھ کیا رہے ہو بھئی پہنچا دو اسے اس کے بھائی کے پاس۔ کب سے بے چارہ اس
پتا پھر رہا ہے۔''

انڈر کے ان الفاظ پر وہاں موجود افراد کی رائفلیں فوراً فائرنگ کی پوزیشن میں آ گئیں لیکن مشابرم خان
سے کہیں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جب فضا میں فائرز کی آواز گونجی تو وہ اپنی جگہ سے تقریباً
انڈر تک پہنچ چکا تھا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے اس طرح چھاپ لیا تھا کہ خود مکمل طور پر
ے پیچھے محفوظ تھا اور کمانڈر کی گردن اس کے بائیں بازو کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر فائرنگ
الے جہاں اس کی پھرتی پر ششدر رہ گئے، وہیں اپنے کمانڈر کو اس کے قبضے میں دیکھ کر اپنی جگہ گنگ
ے۔ اب اگر وہ مشابرم خان کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے تو ان کا اپنا کمانڈر مارا جاتا۔

سری طرف مشابرم خان نے کمانڈر کو صرف ڈھال بنانے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہولسٹر میں لٹکتا
الا خوف ناک پسٹل بھی کھینچ لیا تھا۔ خود اس کے پاس موجود اسلحہ تو یہاں پکڑے جانے کے ساتھ ہی
دوران اس سے چھین لیا گیا تھا۔ کمانڈر سے ہونے والی گفتگو کے دوران وہ مسلسل اس امکان کا ہی
رہا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے اسے کیا قدم اٹھانا پڑے گا اور اسے یہی بات سمجھ آئی تھی کہ کمانڈر کو
رلیا گیا تو بڑی حد تک بچاؤ کی صورت نکل سکتی ہے۔ چنانچہ موت کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر وہ فوراً ہی
ی ہوئی تدبیر پر عمل پیرا ہو گیا۔ پسٹل ہاتھ میں آتے ہی اس نے اسے سیدھا کیا اور خود کو یہاں لانے
والے افراد کو نشانہ بناتا چلا گیا۔ وہ جو حیران پریشان کھڑے تھے، کٹے ہوئے شہتیروں کی طرح گرتے
ے۔ البتہ ان میں سے ایک نے گرنے سے پہلے اضطراری طور پر فائر کر ڈالا تھا۔ اس کی رائفل سے نکلنے
لی منطقی طور پر مشابرم خان کے لیے ڈھال کا کام انجام دینے والے کمانڈر کو لگی اور اس کی دائیں ٹانگ کی
سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ فائرنگ کی آواز وہاں ایک بھونچال سا لے آئی اور مشابرم خان کے دیکھتے ہی
ئی لوگ بھاگتے ہوئے ایک غار سے باہر نکلنے لگے۔ نکلنے والا ہر شخص مسلح تھا اور یقیناً وہ اتنے ڈھیر
لوگوں کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا کمانڈر کسی ترپ کے پتے کی طرح اس
ے میں تھا۔

''ان سب سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں اور ایک طرف قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں ورنہ میں ابھی تمہاری
توڑ دوں گا۔'' اس نے کمانڈر کو دھمکی دی۔

''تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔ اتنے سارے لوگوں سے تنہا مقابلہ کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہو
کمانڈر نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''میں تنہا کہاں ہوں۔ میرا ساتھ دینے کے لیے تم جو ہو۔ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا اور تمہارے آدمی
ہاری زندگی کی حفاظت کے لیے تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو بھی میرا کچھ نہیں
گا۔ میں تو پہلے ہی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلا تھا اس لیے ہر لمحہ مرنے کے لیے تیار ہوں۔ البتہ مجھے لگتا ہے کہ

تمہیں مرنا کچھ خاص پسند نہیں ہے اس لیے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔'' اس نے کمانڈر کی گردن پر
حلقہ مزید تنگ کرتے ہوئے اسے جواب دیا تو وہ جو پہلے ہی ٹانگ پر لگنے والی گولی کے زخم سے تڑپ
مزید بلبلا اُٹھا۔

''بھائی صاحب کو چھوڑ دو۔ بدلے میں ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔'' غار سے
والوں میں سے ایک آدمی جو کہ نائب کمانڈر تھا، دو قدم آگے بڑھ کر بلند آواز میں بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود کو گولی مار لو۔'' مشابرم خان نے اسے جواب دیا جسے سن کر
منہ لے کر رہ گیا۔ خود اپنے آپ کو گولی مارنے کی ہمت یقیناً اس میں نہیں تھی۔

''تم سب اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو۔'' مشابرم خان نے خود ہی بلند آواز میں
ہتھیار سنبھالے وحشت زدہ سے نظر آنے والے افراد کو حکم دیا۔ اس حکم کو سن کر وہ تذبذب میں پڑ گئے
کمانڈر نے بھی سر کو جنبش دیتے ہوئے اس کے حکم کی توثیق کی تو ناچار ان لوگوں کو ہتھیار پھینکنے پڑے۔

''اب تم سب اسی طرح ہاتھ اوپر اٹھا کر غار کے اندر واپس چلے جاؤ۔'' مشابرم خان نے انہیں
دیا۔ ''تم بھی مسٹر!'' ان لوگوں کو بادل ناخواستہ اپنے حکم کی تکمیل کرتے دیکھ کر اس نے ابھی تک اپنی
نائب کمانڈر کو مخاطب کیا تو وہ بھی ناچار مڑنے لگا۔

''یہاں پٹرول یا مٹی کا تیل تو ضرور ہوگا۔ ذرا اندر جا کر اس کا ایک کنستر تو لے آؤ۔'' مڑتے ہوئے
کمانڈر کو اس نے پیچھے سے حکم دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں اس مقام پر اپنے کھانے پینے کا انتظام کرنے
لیے ان لوگوں کو ایندھن کی ضرورت پڑتی ہوگی اس لیے اس نے یہ مطالبہ کیا تھا۔ وہ جن لوگوں کے
پھنسا تھا ان سے بچاؤ کے لیے اس کے ذہن نے ایک تدبیر سوچ لی تھی۔ اگر اس کی یہ تدبیر کامیاب ہو
یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس وقت اس کی اصل طاقت یہ تھی کہ ان کا کمانڈر اس کے
تھا لیکن اگر وہ لوگ بدک جاتے اور کمانڈر کی پروا کرنا چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑتے تو وہ کچھ بھی نہیں کر
ایسا وقت آنے سے پہلے ہی وہ خود تیزی سے اپنی ترکیب پر عمل کر گزرنا چاہتا تھا۔

''سنا نہیں تم نے کہ میں نے کیا کہا ہے؟'' نائب کمانڈر اس کا حکم سن کر رک گیا تھا۔ اس
جھاڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو وہ حرکت میں آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مشابرم خان بھی زخمی کمانڈر
ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ غار سے اپنا فاصلہ کم کرنا چاہتا تھا لیکن اس حرکت کے دوران بھی اس نے پورا
تھا کہ اس کا جسم کمانڈر کے جسم کی آڑ میں ہی رہے۔ کمانڈر کا بھاری ڈیل ڈول اس کی اس کوشش کو کامیاب
تھا۔ کمانڈر کو ڈھال بنائے بنائے وہ غار کے دہانے کے قریب پہنچ گیا لیکن دہانے کے بالکل سامنے
ہونے کے بجائے ایک جانب ہو کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اندر سے آنے والا تو اس کی نظروں میں آ جاتا
خود اندر موجود افراد اسے نہیں دیکھ سکیں۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' ابھی تک اس کے بازو کی گرفت میں موجود کمانڈر نے بھنچی ہوئی آواز
سے سوال کیا۔

''تھوڑی دیر میں تم خود دیکھ لو گے۔'' مشابرم خان نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس دوران
کمانڈر ایک کین لے کر باہر آ چکا تھا۔

''اس کا ڈھکن کھول کر یہاں رکھ دو اور تم خود اندر چلے جاؤ۔'' مشابرم خان نے اسے حکم دیا جسے
کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے اور وہ بجائے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے جوں کا توں کھڑا



نہیں تم نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' مشابرم خان چیخا۔ ساتھ ہی اس نے کمانڈر کی گردن پر بازو کا
ڈالا۔

پہلے ہی ٹانگ میں لگنے والی گولی کی وجہ سے تکلیف میں تھا، بلبلا اُٹھا مگر اس کے نائب نے پروا
اور خوفناک انداز میں بولا۔ ''کمانڈر کی زندگی ہمیں عزیز ہے لیکن اس ایک زندگی کو بچانے کے لیے ہم
سے جمایا گیا سیٹ اپ تباہ نہیں کر سکتے۔ کمانڈر کو اس سب کو بچانے کے لیے قربانی دینی ہوگی۔''
ادا کرنے کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو
ایک ہینڈ گرنیڈ موجود تھا۔ مشابرم خان نے جو اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ پہلے ہی ہر طرح کی
سے نمٹنے کے لیے ہوشیار تھا، اس کے ہلاکت خیز ہاتھ کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اپنے
موجود پسٹل کا ٹریگر دبایا۔ پسٹل کی نال نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اُگلے۔ ایک شعلے نے نائب کمانڈر
دبایا جبکہ دوسرے نے کین میں سوراخ کر دیا۔ ہونے والے سوراخ سے مٹی کا تیل تیزی سے باہر نکلنے
ہی لمحے ایک دھماکا سا ہوا۔ کین میں داخل ہونے والی گولی نے مٹی کے تیل میں آگ لگا دی تھی۔
نائب کمانڈر عین دل پر گولی کھا کر مٹی کے بے جان مجسمے کی طرح ڈھے گیا تھا۔ گرتے ہوئے اس
میں موجود ہینڈ گرنیڈ چھوٹ کر زمین پر گرا۔ دوسرا دھماکا اس ہینڈ گرنیڈ کے پھٹنے کا تھا جس سے پہاڑیاں
گئیں۔ غار میں موجود افراد نے بھی یہ دھماکے سنے تھے چنانچہ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکے لیکن اس
کا خیز مواد اور مٹی کے تیل نے مل کر جو کام کر دکھایا تھا، اس کے باعث غار کے دہانے کے آگے آگ
دیوار سی بن گئی تھی۔ پورے غیظ و غضب سے بھڑکتی اس آگ سے گزر کر باہر نکلنا بڑے دل گردے کا
باہر آنے کے خواہش مندوں کے قدم ٹھٹک گئے لیکن آگ جس تیزی سے پھیل رہی تھی، دیکھتے ہی
کے دہانے سے اندر بھی داخل ہونے لگی۔ ٹھٹک جانے والے قدم اس صورتِ حال پر ایک بار پھر
میں آئے اور موت سے ہر دم برسرِ پیکار رہنے والے زندگی کی چاہ میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے،
پڑتے کھلی فضا میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں ان میں سے کئی کے جسم سے آگ کے
گئے۔ وہ چیختے پکارتے اس آگ کو بجھانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگے۔ وہاں گویا قیامت صغریٰ
تھا۔ ہر شخص ٹوٹنے والی افتاد سے خود کو بچانے کی فکر میں دوسرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اس قیامت کی شدت اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب بہتے ہوئے مٹی کے تیل کے ساتھ سفر کرتی ہوئی
نے غار کے اندر تک کا فاصلہ طے کر لیا۔ یہاں بہت سا اسلحہ بھی تھا اور دھماکا خیز مواد بھی جو آگ کی لپیٹ
ہی پھٹنا شروع ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے ان دھماکوں سے صدیوں سے خاموشی کی چادر
ہونے والے پہاڑ گونج اُٹھے۔ یہ گونج ایسی نہیں تھی جو وہیں ختم ہو جاتی۔ اس گونج کی بازگشت بہت دور
جانی تھی اور ان ذمے داروں کو جگانے والی تھی جو اپنی کوئی بھی ذمے داری ادا کرنے کے بجائے سب
کا راگ الاپتے غفلت کی نیند سوئے رہتے تھے۔ ان میں سے یقیناً کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ
منظر پر آ جانے والے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے اس ٹھکانے کے وجود سے اپنی لاعلمی کا جواز
سکے۔

⊛----✪----⊛

رسیوں کی مدد سے کرسی کے ساتھ جکڑا آفتاب کمرے میں تنہا تھا۔ اسے زبردستی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا
نے والوں نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی چنانچہ وہ نہیں جانتا تھا کہ

اسے کس جگہ لایا گیا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا کہ اسے پیر آباد سے ا
جایا گیا۔ گاڑی نے جو مختصر سفر طے کیا تھا، وہ پیر آباد سے باہر کہیں جانے کے لیے ناکافی تھا یعنی وہ
حدود میں ہی کہیں موجود تھا اور یقینی طور پر چودھری کی ہی گرفت میں تھا۔

منیب نے اسے رانی کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ رانی کے ذریعے اس
کشور کے تعلق کا علم چودھری کو ہو گیا ہے، وہ کافی حد تک ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔ پیر آباد کی حدود میں ا
دیدہ دلیری سے اغوا کرلانے والے چودھری کے گرگوں کے سوا بھلا اور کون ہو سکتے تھے؟ اپنے اس ا
تصدیق کے لیے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کرسی سے بندھا وہ اپنے قید خانے کا کام انجام د
کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی
دیکھا۔ کھلے دروازے سے چودھری افتخار اپنے اونچے شملے کو سنبھالتا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر آنے
آفتاب کے عین مقابل ایک اونچے صوفے پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر تک زبان سے کوئی لفظ نکالے بغیر ا
نظروں سے گھورتا رہا۔

''مجھے اس طرح یہاں بلوانے کا کیا مقصد ہے چودھری صاحب! اگر آپ کو مجھ سے کوئی بات کر
کوئی شکایت تھی تو پیغام بھیج کر بلوا لیا ہوتا؟'' آخر آفتاب نے ہی پہلے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کس کام کے لیے کیا طریقِ کار استعمال کرنا ہے، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ البتہ تم یوں انجان
کوشش کر رہے ہو، وہ ہمیں بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ تمہیں وڈی چنگی طرح ملوم ہے کہ تمہیں یہاں کیوں
ہے۔'' چودھری نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتے ہوئے آفتاب کی بات کا جواب دیا۔

''میں درست وجہ کا تعین کیسے کر سکتا ہوں؟ آپ کو تو مجھ سے کئی شکایات ہیں۔ میرا یہاں رہنا
چلانا، بچوں کے ذہنوں کو روشن کرنا..... آپ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ آپ ان میں سے کسی بھی بات پر
ہو کر جب چاہیں مجھے اپنے آدمیوں سے زخمی بھی کروا سکتے ہیں اور آج کی طرح اغوا بھی۔'' وہ سمجھ رہا تھا
یہاں کیوں بلایا گیا ہے اس کے باوجود تجاہل برتتا بے خوفی سے بول رہا تھا۔

''افضل جو صحافی ہے..... تمہارا دوست ہے نا؟'' اس کی باتوں پر کان نہ دھرتے ہوئے چودھری
سوال کیا۔

''بالکل..... اور میرے خیال میں یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔'' آفتاب نے جواب
''وہ اپنی بیوی اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا؟'' چودھری نے کٹیلے لہجے میں
''میرے خیال میں آپ اس کی آمد سے واقف ہیں تو وجہ بھی جانتے ہوں گے۔ وہ لوگ اپنے
لیے ایک رپورٹ تیار کرنے آئے تھے اور پیر آباد کے علاوہ انہوں نے اردگرد کے دوسرے دیہاتوں
وزٹ کیا تھا۔'' چودھری کے سوال نے درحقیقت اسے ششدر کر دیا تھا اور اس خیال سے کہ چودھری
کے سارے منصوبے کو سمجھ لیا ہے، اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا لیکن اپنی اس کیفیت کو وہ چودھری
نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''وزٹ صرف افضل کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ خود وہ اور اس کی بیوی فوراً ہی واپس چلے گئے
جاتے جاتے وہ ہماری بہت قیمتی شے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ہمیں تم سے اس شے کا پتہ
چودھری غرایا۔

''آپ کس شے کی بات کر رہے ہیں چودھری صاحب!..... میں سمجھا نہیں۔ اوّل تو افضل ایسا آ



ل کی چیزیں چراتا پھرے لیکن اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی بھی ہے تو میں اس سے قطعی لاعلم ہوں۔'' اس
ل کی دھڑکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی پھر بھی وہ خود کو انجان ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش
ا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم مت بتاؤ۔ میں تو چاہتا تھا کہ اس بند کمرے میں ہمارے اور تمہارے درمیان بغیر کسی
ے اس مسئلے پر سیٹل منٹ ہو جائے لیکن تم راضی نہیں ہو تو مجھے اپنے آدمیوں کو ہی زحمت دینی پڑے گی۔ تم
ڈیاں تڑوانے کے بعد اپنی زبان کھولنے پر راضی ہوتے ہو، یہ تمہاری برداشت پر ہے۔ میرے آدمی
ں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بننے تک بھی نہیں تھکیں گے۔ تمہاری برداشت کی حد جہاں ختم ہو جائے، مجھے
ا دینا۔ اگر تم نے جلدی ہار مان لی تو میں غور کروں گا کہ تمہارے جرم کے مقابلے میں تمہیں کتنی آسان
ی سزا دی جا سکتی ہے۔'' اس کا جواب سن کر چودھری غضب ناک لہجے میں بولا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر
ے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی آفتاب کو اغوا کر کے لانے والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان
ے ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ موجود تھا اور یہ تمام چیزیں ہی بہت مہلک تھیں۔ آفتاب کے جسم پر سب
ل ضرب بالے نے لگائی۔ لوہے کی زنجیر پوری قوت سے آ کر اس کے شانے سے ٹکرائی تو وہ اپنی کراہ کو
یں سکا۔ اس کے بعد تو مسلسل ضربوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے ساتھ اس کی بے اختیار چیخوں کا سلسلہ بھی
ا ہو گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''ہے لیڈی! ہُو آر یُو؟'' ماہ بانو اپنی آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کر رہی تھی کہ اس کے کانوں سے کسی کا یہ
ا۔ اس آواز کو سن کر اس نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی نظریں ایک غیر ملکی چہرے سے ٹکرائیں۔
ا نگار سے وہ شخص اسے کوئی جاپانی لگا جو اپنے چہرے پر ڈھیروں حیرت اور تشویش لیے اس کی طرف ہی
تھا۔ ماہ بانو فوری طور پر اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکی اور اپنی نظروں کا زاویہ بدل کر اردگرد
ل۔ وہ نیلے رنگ کا ایک خیمہ تھا جس میں وہ ایک آرام دہ سلیپنگ بیگ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے سلیپنگ
ں لٹانے سے قبل گرم اُونی سویٹر بھی پہنایا گیا تھا۔ سویٹر یقیناً اس شخص کا تھا جس کے خیمے میں وہ اس
وجود تھی۔ جاپانی مرد عموماً زیادہ لحیم شحیم نہیں ہوتے۔ اس کے سامنے موجود شخص بھی گٹھے ہوئے جسم کا مالک
اس کے باوجود ماہ بانو کے نازک جسم پر اس کا سویٹر ڈھیلا ہی تھا۔ سویٹر اور سلیپنگ بیگ کی فراہم کردہ
حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو کو ایک دم ہی وہ لمحہ یاد آ گیا جب وہ ایک ڈھلوان پر پھسل گئی تھی اور
کے بعد بے بسی کے عالم میں ایک جگہ بیٹھی خود پر گرتی برف میں اپنے آپ کو دفن ہوتا ہوا محسوس کر رہی
ردی کی شدت، بخار اور کمزوری نے مل کر اسے ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیا تھا۔ برف کی سرد قبر میں وہ
رہ وجود کو دفن ہوتے محسوس کرتے ہوئے وہ اُس وقت جو بے ہوش ہوئی تھی تو اب اس آرام دہ خیمے میں
تھی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اللہ کی طرف سے نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔

تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی
سے بھی بچا کر نکال دے گا۔'' عمران کے الفاظ ایک بار پھر اس کے ذہن میں گونجے اور ان الفاظ کے یاد
احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برف تلے دبے ہوئے اسے یہی تو لگا تھا کہ اب اس کے
انسیں ختم ہونے والی ہیں لیکن اللہ نے اس ویران برف زار میں بھی اپنے ہونے کو ثابت کر دیا تھا اور

اسے اس طرح سے مدد پہنچائی تھی کہ خود اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''میں کلائمبر ہوں اور ہمیشہ سولو کلائمبنگ کرتا ہوں۔ اس بار میں ''کے۔ٹو'' کے بیس کیمپ تک جا
آرہا ہوں۔ تین چار گھنٹے پہلے ہونے والی اسنوفال کی وجہ سے مجھے اپنا سفر روک کر خیمہ نصب کرنے کا
پڑا۔ خیمہ لگا کر میں ٹیلی اسکوپ سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسنوفال کی وجہ سے منظر صاف نہیں تھا
ایسا لگا کہ قریب ہی کوئی موجود ہے اور اسنوفال کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ میں اپنے
کر پھنسنے والے کی مدد کے خیال سے چل پڑا۔ قریب پہنچ کر جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے اپنا
باہر نکلنے کا فیصلہ ٹھیک لگا۔ تم پر اچھی خاصی برف گر چکی تھی اور تم بے ہوش تھیں۔ میں بڑی مشکل سے تمہیں
کے نیچے سے نکال کر یہاں تک لایا اور تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اصل میں تم بری طرح
کا شکار ہوگئی تھیں۔ تمہیں ہوش میں لانے کے لیے مجھے پورے چار گھنٹے خرچ کرنے پڑے ہیں۔ لیکن
بات یہ ہے کہ میری محنت ضائع نہیں گئی اور تم ہوش میں آگئیں۔''

ماہ بانو اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی تھی جس کی اس نے پروا بھی نہیں کی تھی اور خود ہی ٹھہر
کے اپنے خیمے میں پہنچنے کا پورا قصہ سنانے کے بعد مسکرانے لگا تھا۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے ظاہر
وہ انگریزی پر مکمل عبور نہیں رکھتا اس لیے اسے تھوڑا ٹھہر کر اور آسان الفاظ میں گفتگو کی ضرورت پیش آ رہی
خود ماہ بانو کی انگریزی بھی بہت عمدہ نہیں تھی لیکن بہرحال اُس نے اس جاپانی کوہ پیما کی بات کا مفہوم سمجھ لیا۔

''تھینک یو ویری مچ مسٹر.....'' اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے جاپانی سے کہا۔

''فان.....تم مجھے فان کہہ سکتی ہو۔ یہ میرا نِک نیم ہے اور زیادہ تر لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں''
اسے اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر جاپانی نے ایک فلاسک سے گرما گرم کافی کا کپ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے
اپنا تعارف کروایا۔ ماہ بانو نے شکریے کے ساتھ کپ تھام لیا اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔ خوشبودار، خوش ذائقہ
اور گرما گرم کافی کے اس گھونٹ نے اس کے اندر تک راحت دوڑا دی۔

''میں ماہ بانو ہوں۔ میں اور میرا ایک ساتھی ان پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے میرا ساتھی
ایک ایوالانچ کا شکار ہوگیا اور میں راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے مشکل میں پڑ گئی۔ موسم کی شدت اور تھکن کی
وجہ سے مجھے بخار بھی ہوگیا لیکن یہ ایک اور بدقسمتی تھی کہ میرے پاس موجود خوراک اور دواؤں کا ذخیرہ بھی ختم
گیا تھا۔ پھر میں اس اسنوفال میں پھنس گئی اور بیلنس بگڑ جانے کی وجہ سے پھسل گئی۔ وہ تو خدا نے کرم کیا
یہاں پہنچ گئے ورنہ یقیناً میں یہیں برف کے نیچے دب کر مر جاتی۔'' اپنی پوری داستان سنانے کے بجائے
نے مختصراً فان کو اپنے حالات بتائے۔

''اوہ.....ویری سیڈ.....یقیناً پھسلنے کی وجہ سے ہی تمہارے پیر سے جوتا نکل گیا تھا۔ میں نے تمہارے
پیر کو چیک کیا ہے۔ کھلی حالت میں برف میں دبے رہنے کی وجہ سے پیر کا پنجہ متاثر تو ہوا ہے لیکن کوئی تشویش کی
بات محسوس نہیں ہو رہی۔'' فان نے اپنی طرف سے اسے خوش خبری سنائی جبکہ ماہ بانو کو پہلی بار احساس ہوا کہ
کی دائیں ٹانگ کچھ سُن سی ہے۔ یقیناً یہ برف میں دبے رہنے کا نتیجہ تھا۔

''اگین تھینکس فان! یہ واقعی میری خوش قسمتی ہے کہ تم مجھے مل گئے۔ ورنہ یقیناً میرا بہت برا انجام ہوتا''
اس کے لہجے میں حقیقی احسان مندی تھی۔ فان کے لیے بھی اور اللہ کے لیے بھی جس نے فان کو اس کا
دہندہ بنا کر اس ویرانے میں بھیج دیا تھا۔

''اور اس سے بھی بڑی تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ میں اوپر جانے کے بجائے واپس آ رہا تھا۔ اگر میں



تو میرے لیے تمہاری مدد کے لیے رکنا مشکل ہوتا۔ میرے لیے پہاڑوں کی بلندیاں کسی محبوبہ کی طرح
ب میں اپنی اس محبوبہ سے ملنے جا رہا ہوتا ہوں تو مجھے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ
جاتے ہوئے مجھے نظر آتیں تو میں تمہیں نظرانداز کر کے گزر جاتا لیکن اب تم میرے ساتھ واپس چل
ور میرا سامان بھی شیئر کر سکتی ہو۔ خود تمہارا اپنا سامان تو تمہارے پاس رہا نہیں لیکن میرے پاس کافی کچھ
س طور پر میرے سامان میں موجود جوتوں کا فاضل جوڑا اس وقت تمہاری سب سے بڑی خوش قسمتی
وتوں کے بغیر تو تم یہاں چند قدم بھی نہیں چل سکتیں۔'' اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے
سے یہ تو بتا دیا تھا کہ اگر وہ اوپر جا رہا ہوتا تو ہرگز بھی اس کے لیے زحمت نہ کرتا لیکن ساتھ ہی اسے اپنے
اپس لے جانے کی بھی آفر کر دی تھی۔

ماہ بانو کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جتنا نرم مزاج انسان لگ رہا ہے، اس کے لیے اوپر جاتے وقت بھی یہ ممکن
وتا کہ وہ کسی کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنا آگے کا سفر جاری رکھ سکتا۔ بہرحال حقیقت جو بھی تھی، اس کے
ب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے ایک اچھا ہم سفر میسر آ گیا تھا اور اس بات کے لیے وہ اللہ کی جتنی بھی
ار ہوتی، وہ کم ہی تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ عمران کی موت کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اور اس کے
امانِ سفر بھی نہیں رہا تھا، اللہ نے اس ویرانے میں ایک ایسا شخص بھیج دیا تھا جو اپنی تجربہ کاری اور مہیا
ت کی وجہ سے اس کے لیے عمران سے کئی گنا زیادہ مفید ثابت ہوسکتا تھا۔ عمران تو خود راستوں سے
ل ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا تھا جبکہ فان کے لیے یہ راستے پوری طرح آشنا
زیادہ کہہ سکتی تھی کہ فان، عمران کا بہتر نعم البدل ہے اور اس نعم البدل کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کلامِ پاک
یت گونجنے لگی۔

''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

ناشکری اور نا اُمیدی نعمتوں کو جھٹلانے کی ہی ایک شکل ہے۔ آئندہ زندگی میں ماہ بانو اس غلطی کی مرتکب
ہوسکتی تھی کیونکہ تجربات نے اسے سکھا دیا تھا کہ اللہ اس پر بہت مہربان ہے۔

⊛----✪----⊛

''سر! پیر آباد سے ماسٹر منیب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' شہریار ایک فائل کے مطالعے میں مصروف
انٹرکام بجا اور اسے اطلاع دی گئی۔

''ماسٹر منیب.....'' وہ حیرت سے بڑبڑایا۔ منیب نے کبھی اسے فون نہیں کیا تھا اس لیے اس کی کال
معمول ہونے کی وجہ سے اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

''بات کروائیں۔'' دل میں کچھ تشویش محسوس کرتے ہوئے اس نے اجازت دی۔

''سر! میں منیب بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کا دوست اور ساتھی ٹیچر۔'' لائن ملتے ہی منیب کی آواز سنائی دی۔

''میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ فرمائیے، آپ نے کیسے فون کرنے کی زحمت کی؟'' آفتاب کے مشن میں
ساتھ دینے کی وجہ سے منیب کے لیے بھی اس کے دل میں بڑی قدر تھی چنانچہ اخلاق سے دریافت کیا۔

''میں نے آپ کو آفتاب کی وجہ سے فون کیا ہے۔ اُس کی جان خطرے میں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' منیب کی دی اطلاع سن کر وہ بری طرح چونکا۔

''آفتاب شہر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن راستے میں ہی اسے چودھری کے آدمیوں نے گھیر کر اپنی

گاڑی میں بٹھالیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ واقعہ تانگہ چلانے والے ایک لڑکے نے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی اور میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں آپ کو بتا دوں تاکہ آفتاب کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔" منیب نے اسے بتایا۔

"میں آفتاب کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ چودھری کے آدمی نے اس طرح اچانک اسے اغوا کیوں کرلیا؟ اب تو اسکول والے معاملے میں بھی چودھری نے بہت عرصے سے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔" منیب کی اطلاع نے اسے اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔

"اصل میں معاملہ کچھ اور ہے سر! عام حالات میں، میں آپ کو یہ بات کبھی نہیں بتاتا لیکن اب آفتاب کی زندگی کی خاطر میں آپ پر اس کا ایک اہم راز کھولنے پر مجبور ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آفتاب اور چودھری افتخار کی صاحب زادی کشور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے خفیہ طور پر نکاح بھی کر رکھا ہے۔ میں خاص ملازمہ رانی ان کے اس راز میں شریک تھی۔ آج جنگل سے رانی سمیت حویلی کی دو اور ملازماؤں کی لاشیں ملی ہیں۔ رانی کی لاش ملنا ایک تشویش ناک اطلاع تھی اس لیے میں نے آفتاب کو مشورہ دیا کہ وہ فی الحال عرصے کے لیے گاؤں سے کہیں چلا جائے۔ بعد میں اگر حالات سازگار ہوں تو واپس آ جائے۔ میرے مشورے پر وہ فوری طور پر اپنا ضروری سامان لے کر شہر جانے کے ارادے سے گھر سے نکل پڑا لیکن راستے ہی اسے چودھری کے آدمیوں نے گھیر لیا۔ آپ جانتے ہیں کہ گاؤں میں چودھری کا راج ہے اور گاؤں کا کوئی فرد اس طرح کا کوئی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس معاملہ ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ رانی کا منگیتر ہے اور کشور بی بی نے کئی بار آفتاب سے ملاقات کے لیے اسی کے لیے اس کا تانگہ استعمال کیا تھا۔ رانی کی لاش ملنے کے بعد اس نے جب آفتاب کو اغوا ہوتے ہوئے دیکھا تو یقیناً سمجھ گیا ہوگا کہ رانی کس جرم میں ماری گئی۔ شاید اپنی منگیتر کے قتل نے ہی اسے یہ جرأت بخشی کہ زبان رکھنے کے بجائے اس نے مجھ تک اطلاع پہنچا دی۔"

منیب نے اسے پوری تفصیل بتا ڈالی۔ وہ خود بھی کشور اور آفتاب کے تعلقات سے واقف تھا اور اس میں رانی کا کردار بھی اس پر ظاہر تھا لیکن نکاح والی بات اس کے علم میں نہیں تھی۔ منیب نے حالات کی جو تفصیل اسے سنائی تھی، اس کے بعد وہ خود بھی پُر یقین تھا کہ چودھری کو کسی طرح اپنی صاحبزادی اور آفتاب کے تعلق کی بھنک پڑ گئی ہوگی اور وہ غضب ناک ہو کر ایکشن میں آ گیا ہوگا۔ اس کہانی کے ایک کردار رانی کو اس نے انجام سے دوچار کر دیا تھا۔ آفتاب اغوا ہو چکا تھا، البتہ کشور کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔

"اُلّو نے یہ دیکھا تھا کہ آفتاب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہے؟" آفتاب کی زندگی خطرے میں محسوس کر کے وہ بے حد مضطرب ہو گیا تھا لیکن بظاہر خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اُلّو کا کہنا ہے کہ آفتاب کو ڈیرے پر لے جایا گیا ہے۔" منیب نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ کرتا ہوں۔" شہریار نے فون بند کر دیا اور آپریٹر کو تارڑ کی جگہ آنے والے ایس پی کا نمبر ملانے کا حکم دیا۔

"ایس پی صاحب! ہمیں ایک بندے کو بازیاب کروانے کے لیے پیر آباد کے چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ کرنا ہے۔ آپ فوری طور پر اس کام کے لیے پارٹی تیار کروائیں۔ میں خود آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔" ایس پی کے لائن پر آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر کی کوئی بات کیے بغیر اس سے ڈائریکٹ کہا۔



"چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ؟..... سر! چودھری تو اس ایکشن پر طوفان اٹھا دے گا۔" اس کا حکم سن کر ایس پی گھبرا گیا اور تشویش کا اظہار کیا۔

"یس اِز مائی آرڈر مسٹر ایس پی! اور جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں خود پولیس پارٹی کے ساتھ چلوں گا تو آپ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" شہریار نے جھنجلا کر بلند آواز میں جواب دیا۔ عام حالات میں وہ بھی چودھری کے ڈیرے پر پولیس ریڈ کروانے سے پہلے کچھ دیر سوچتا لیکن یہ آفتاب کی زندگی کا معاملہ تھا اس لیے وہ خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

"او کے سر! میں آدھے گھنٹے کے اندر پولیس پارٹی تیار کروا کر آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔" اس کے لہجے کی مجبوری سے ایس پی اس سے مزید بحث کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ خود شہریار کا یہ عالم تھا کہ اس کے لیے انتظار کا ایک گھنٹہ گزارنا بھی مشکل ہوا جا رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد جیسے ہی اس کے پاس ایس پی کی کال آئی، وہ دفتر سے نکل پڑا۔ ڈرائیور کو پیر آباد جانے کے لیے تیار رہنے کا وہ پہلے ہی حکم دے چکا تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پولیس پارٹی بھی اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی لیکن شہریار کی گاڑی سب سے آگے اُڑی جا رہی تھی۔ پیر آباد تک کا طویل فاصلہ انہوں نے خلافِ معمول بہت کم وقت میں طے کیا۔ پہلے شہریار کی گاڑی ڈیرے کے سامنے رُکی، پھر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ آنے والی دونوں گاڑیاں بھی پیچھے آ رُکیں۔ ڈیرے کے دروازے پر کھڑا چودھری کا کارندہ جس کے شانے سے جدید رائفل لٹک رہی تھی، گاڑیوں کو رُکتا دیکھ کر دوڑتا ہوا نزدیک آیا اور شہریار کی گاڑی کے قریب پہنچ کر رُکا۔

"سلام صاحب!" اسے شناخت کر کے اس نے زوردار سلام جھاڑا لیکن نگاہوں میں یہ سوال بھی موجود تھا کہ اس طرح یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟

"گیٹ کھولو۔ پولیس ڈیرے کی تلاشی لے گی۔" اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے شہریار نے حکم دیا۔ ابھی تک اپنی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔

"ڈیرے کی تلاشی..... وہ کیوں صاحب؟" چوکیدار نے حیرت سے سوال کیا۔

"کیوں کا جواب تمہیں دینا ضروری نہیں ہے۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔

"معاف کرنا صاحب! آپ کہتے ہیں تو میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔" حیرت انگیز طور پر چوکیدار نے زیادہ بحث نہیں کی اور جس طرح دوڑتا ہوا آیا تھا، اسی طرح دوڑتا ہوا واپس گیا اور بڑا سا گیٹ پوری طرح وا کر دیا۔ شہریار کا اشارہ پا کر اس کے ڈرائیور نے گاڑی کھلے گیٹ سے اندر داخل کر دی۔ پیچھے منتظر کھڑی پولیس کی گاڑیاں بھی حرکت میں آئیں اور اندر داخل ہو گئیں۔ یہ کافی وسیع احاطہ تھا جس میں تین گاڑیوں کے داخل ہو جانے کے بعد بہت سی کھلی جگہ باقی تھی۔ احاطے میں پہنچنے کے بعد شہریار اپنی گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ اس کی تقلید میں ایس پی اور دیگر پولیس والے بھی نیچے اُتر آئے۔ اس عرصے میں چوکیدار اندر جا کر منشی اللہ رکھا کو بلا لایا تھا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں سر! آپ اس جگہ کی، یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کے ڈیرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں..... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ چودھری صاحب ایک عزت دار آدمی ہیں اور اس طرح یہاں کی تلاشی لے کر ان کی توہین کریں گے۔" منشی کی یہ خوبی تھی کہ جب وہ چاہتا تھا، دیگر لوگوں کی طرح دیہاتی لب و لہجے میں بات کرتا تھا اور جب ضرورت محسوس کرتا، اپنی اُردو دانی کا مظاہرہ کرنے لگتا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ چودھری افتخار عالم شاہ کا ڈیرا ہے۔ اسی لیے مجھے خود پولیس پارٹی کے

ساتھ آنا پڑا ہے۔'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو کس چیز کی تلاش ہے؟'' منشی نے حجت جاری رکھی۔

''ہمیں کسی چیز کی نہیں بلکہ ایک بندے کی تلاش ہے۔''

''بندہ.....کون سا بندہ؟'' منشی نے حیرانی سے پوچھا۔

''ماسٹر آفتاب.....'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ منشی جس طرح [illegible] کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس پر اُسے غصہ آ رہا تھا۔

''ماسٹر آفتاب.....اور یہاں؟ آپ مذاق تو نہیں کر رہے سر!..... بھلا اس معمولی اسکول [illegible] یہاں لا کر چھپانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟''

''ضرورت کا علم ہو سکتا ہے۔ تمہیں نہ ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ تمہارے چودھری صاحب کی ماسٹر [illegible] سے کیا دشمنی ہے۔ اور ہاں.....اب تم یہ لاعلمی کا ڈرامہ بند کرو۔ میں جانتا ہوں کہ آفتاب کو یہیں لایا [illegible] میرے پاس عینی شاہد موجود ہے۔'' وہ اس ساری بحث سے اچھا خاصا جھنجلا چکا تھا چنانچہ ذرا سختی سے بولا۔

''ٹھیک ہے سر! اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو پورا ڈیرا آپ کے سامنے ہے، آپ تلاشی لے [illegible] اگرچہ اس طرح ڈیرے کی تلاشی لینا ہمارے لیے بے عزتی کا سبب بنے گا لیکن اپنے قانون پسند [illegible] ثبوت دینے کے لیے ہم یہ بے عزتی سہنے کو تیار ہیں۔'' اس کے مقابلے میں منشی کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔ اس [illegible] سکون شہریار کو ٹھٹکا گیا۔

منشی کے اتنی آسانی سے تلاشی دینے کے لیے تیار ہو جانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آفتاب [illegible] ڈیرے پر موجود نہ ہو اور اسے یہاں سے کہیں اور شفٹ کر دیا گیا ہو۔ دوسرا امکان اس سے بھی زیادہ [illegible] تشویش ناک تھا۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب تک اس کا کام ہی تمام کر دیا گیا ہو اور اس کی لاش [illegible] کہیں پڑی ہو۔ بہرحال جو بھی صورتِ حال تھی، وہ پولیس پارٹی لے کر یہاں تک آیا تھا تو اب تلاشی [illegible] واپس جا نہیں سکتا تھا۔ اُمید کی کرن بہت مدھم پڑ جانے کے باعث اس نے ذرا ڈھیلے سے انداز میں ایس [illegible] اشارہ کیا کہ تلاشی کا کام شروع کیا جائے۔ اس کی اور منشی کی بحث کے دوران خاموش تماشائی بن کر کھڑا [illegible] والا ایس پی یہ اشارہ پا کر حرکت میں آ گیا اور اپنے ماتحتوں کو ہدایات دینے لگا۔ اس مرحلے پر شہریار نے [illegible] غیر فعال رہنا پسند نہیں کیا اور تہ خانے کی تلاشی کے لیے جانے والے سپاہیوں کے ساتھ خود بھی نیچے اُتر [illegible]

اس جگہ شہریار پہلے بھی آ چکا تھا، جب اپنے پاگل بیٹے بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر چودھری نے [illegible] دھوکے سے نشہ آور کھانا کھلا کر اس کی ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ قابلِ اعتراض تصاویر کھینچ لی تھیں۔ ان تصاویر [illegible] ذریعے وہ اسے بلیک میل کر کے اپنے اشاروں پر نچانے کا خواہش مند تھا۔ خاص طور پر اس سے ماہ [illegible] اُگلوانے کے لیے چودھری نے یہ حرکت کی تھی لیکن اس وقت ڈاکٹر ماریہ نے اس سے تعاون کیا اور [illegible] کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ چودھری نے وہ تصاویر کہاں رکھی ہیں۔ شہریار کے لیے تصاویر کا معاملہ بہت [illegible] تھا چنانچہ اس موقع پر وہ خود حرکت میں آیا اور رات کے اس اندھیرے میں چودھری کے ڈیرے میں گھس [illegible] تصویریں حاصل کر لیں۔

ایک گھنٹے کی مکمل تلاشی کے بعد وہ ڈیرے میں کہیں سے آفتاب کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں [illegible] ایک گھنٹے بعد جب پولیس پارٹی اپنی ناکامی تسلیم کرنے کے بعد وہاں سے روانگی کی تیاری کر رہی تھی تو [illegible] افتخار کی لینڈ کروزر ڈیرے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ شہریار اس وقت تک اپنی گاڑی میں نہیں [illegible]



[illegible] چودھری لینڈ کروزر سے اُتر کر اس کی طرف بڑھا تو اُسے رُکنا پڑا۔

''آپ سے ہمیں یہ اُمید نہیں تھی اے سی صاحب! چھوٹے موٹے اختلافات اپنی جگہ، لیکن میں یہ اُمید [illegible] کر سکتا تھا کہ آپ کبھی اس طرح پولیس پارٹی لے کر میرے ڈیرے پر چڑھائی کر ڈالیں گے۔ اب جبکہ [illegible] تلاشی میں ناکام ہو کر یہاں سے واپس جا رہے ہیں تو میں یہ حق رکھتا ہوں کہ چاہوں تو آپ پر عدالت میں [illegible] عزت کا کیس دائر کر دوں۔'' ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے چودھری کے چہرے پر بے حد غضب تھا۔

''آپ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں، چاہیں تو یہ شوق پورا کر لیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے گا کہ جب [illegible] میں اس مقدمے کی کارروائی شروع ہو گی تو یہ سچ بھی سامنے آئے گا کہ آپ پر ماسٹر آفتاب کو اغوا کرنے [illegible] کیوں ظاہر کیا گیا۔ حویلی کی ملازمہ رانی کے قتل کا معاملہ بھی اس موقع پر اُٹھ سکتا ہے۔ لہٰذا میرا آپ کو [illegible] ہے کہ ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کرتے وقت ذرا اچھی طرح سوچ بچار کر لیجیے گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مقدمے [illegible] آپ کی عزت زیادہ خطرے میں پڑ جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میڈیا والوں کو اس طرح کی کہانیوں کی [illegible] تلاش رہتی ہے اور وہ ایسی خبریں کس طرح مرچ مسالا لگا کر پھیلاتے ہیں۔''

[illegible] چودھری کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر دوبدو بولا تو چودھری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ [illegible] شہریار کی بات سن کر ہی خیال آیا تھا کہ وہ کشور کے حویلی سے غائب ہو جانے والی بات سے واقف ہے۔ [illegible] ایسا نہیں تھا۔ اس نے تو صرف کشور اور آفتاب کے تعلق کی بنیاد پر یہ دھمکی دی تھی۔ کشور حویلی چھوڑ کر جا [illegible] ہے، اس بات کا اسے قطعی علم نہیں تھا۔

''میں جانتا ہوں چودھری صاحب! کہ آفتاب کو آپ کے ہی حکم پر آپ کے آدمیوں نے اٹھایا ہے۔ [illegible] پاس عینی شاہد موجود ہے جو میرے کہنے پر کہیں بھی یہ بیان دینے کے لیے تیار ہو جائے گا کہ آپ کے کن [illegible] آدمیوں نے کب اور کہاں سے آفتاب کو اغوا کیا تھا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ آپ میرے کسی گواہ کے میڈیا کے [illegible] زبان کھولنے سے پہلے ہی آفتاب کو رہا کر دیں ورنہ نتائج کے لیے میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔'' وہ گویا [illegible] چودھری سے براہِ راست جنگ کے موڈ میں آ گیا تھا اور ہر طرح کی احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا۔

''بس کر دو اے سی! میں اب تک تمہارے ماموں سے تعلق کی وجہ سے تمہیں چھوڑتا رہا ہوں ورنہ تم جیسے [illegible] افسر کی میرے سامنے اوقات کیا ہے۔ جس کرسی کے بل پر تم اتنا زور دکھا رہے ہو، میں اس کرسی سے [illegible] کئی سرکشوں کو اُٹھا کر پھینک چکا ہوں۔'' چودھری دھاڑا۔

''چلیں تو اس بار یہ کوشش کر دیکھیں۔ آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ میں کتنا زور ہے۔'' چودھری [illegible] کے پیچھے چھپی بے بسی کو محسوس کر کے شہریار چڑانے والے انداز میں بول کر مسکرایا اور متوازن قدم [illegible] اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے چودھری، ایس پی کی گوشمالی کر رہا ہو گا لیکن [illegible] ایس پی کے پاس بھی یہ عذر ہو گا کہ وہ اے سی صاحب کے حکم کے آگے مجبور تھا۔ بہرحال، چودھری کو [illegible] دینا ایس پی کا اپنا مسئلہ تھا۔ خود شہریار کو اس وقت اصل میں آفتاب کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ کسی [illegible] آفتاب جیسے مخلص آدمی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ جب گاڑی میں بیٹھ کر ڈیرے سے روانہ ہوا تو اس [illegible] پیشانی پر تفکر کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آفتاب سے میرا رابطہ نہیں ہو پا رہا بھابی! میں اتنی دفعہ ٹرائی کر چکی ہوں لیکن ہر بار ان کا فون بند ہی مل [illegible]۔'' ہاتھ میں موبائل تھامے پریشانی سے بولتی کشور، مہتاب کے برابر میں آ بیٹھی۔

''وہ کسی کام میں مصروف ہوگا اس لیے ڈسٹرب ہونے سے بچنے کے لیے موبائل آف کر دیا ہوگا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ کام کے معاملے میں کتنا کریزی آدمی ہے۔ خاص طور پر جب کچھ لکھنے کے لیے جائے تو پھر اسے ساری دنیا بھول جاتی ہے۔ تم فکر نہیں کرو اور ایک آدھ گھنٹے بعد پھر ٹرائی کر کے دیکھو۔ اللہ بات ہو جائے گی۔'' مہتاب نے اسے تسلی دی۔

''ہوسکتا ہے آپ کا اندازہ ٹھیک ہو لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں نے اور آفتاب نے یہ وقت دوسرے سے بات کرنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے اس لیے مجھے یہ امید نہیں ہے کہ آفتاب ان اوقات میں موبائل آف کر کے کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔'' مہتاب کی تسلی کے باوجود اس کی پریشانی اپنی جگہ قائم تھی اور یہ پریشانی بے وجہ بھی نہیں تھی۔ افضل اور مہتاب کی مدد سے وہ خود تو پیر آباد سے نکل آئی لیکن جب تک آفتاب وہیں تھا، اس کی جان سُولی پر ہی اٹکی رہتی۔ وہ کئی بار آفتاب پر زور بھی دے چکی تھی کہ اسے پہلی فرصت میں پیر آباد چھوڑ دینا چاہئے لیکن ہر بار وہ اسے ٹال جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی ابھی تک کوئی شک ظاہر نہیں کیا گیا ہے تو پھر کیوں وہ اچانک پیر آباد چھوڑ کر خود کو مشکوک ظاہر کرے۔

کشور کو اس کی یہ دلیل صحیح لگی تھی پھر وہ آفتاب کی اسکول سے وابستگی سے بھی واقف تھی۔ وہ اپنے کے پروجیکٹ کے معاملے میں بہت جذباتی تھا اور اس کے لیے اس پروجیکٹ سے الگ ہونا آسان نہیں ہوتا چنانچہ کشور نے خاموشی اختیار کر لی لیکن آفتاب کی ہی زبانی اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ چودھری امریکہ سے واپس آ چکا ہے اس لیے اب آفتاب کا موبائل بند جا رہا تھا تو اسے تشویش نے گھیر لیا تھا۔

وہ اپنے باپ سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے غائب ہونے کی اطلاع پر امریکہ سے فوری طور پر واپس آیا ہوگا اور اب پوری شد و مد سے اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ اس تلاش کے دوران آفتاب تک بھی پہنچ سکتا تھا بلکہ اسے ڈر تھا کہ شاید وہ پہنچ ہی چکا ہے جب ہی اس کا آفتاب سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ چودھری آفتاب تک پہنچ جانے کا خیال اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ اپنے اس خیال کو کئی بار واہمہ قرار دے کوشش کے باوجود بری طرح بے کل تھی اور اب اپنی پریشانی کو لے کر مہتاب کے پاس چلی آئی تھی۔

''تم پریشان مت ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب خیر ہوگی۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ افضل کو فون کر دیتی ہوں وہ اپنے کسی ذریعے سے آفتاب کے بارے میں معلوم کر کے بتا دیں گے۔'' اس کی پریشانی کو دیکھتے مہتاب نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور خود اپنے موبائل کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمانے لگی۔ ایک تپائی پر اسے موبائل رکھا ہوا نظر آ گیا۔

''بچے کیا کر رہے ہیں؟ کافی دیر سے ان کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔'' مہتاب فون بک کھول کر اس میں سے افضل کا نمبر ڈائل کرنے جا رہی تھی جب کشور نے اس سے پوچھا۔

''دونوں کو زبردستی پڑھنے کے لیے بٹھا کر آئی ہوں۔ مڈٹرم ایگزامز شروع ہونے والے ہیں اور شیطانوں کا آج کل تمہارے ساتھ اتنا دل لگا ہوا ہے کہ پڑھنے بیٹھنے کے لیے راضی ہی نہیں ہوتے۔ ابھی یہی ضد تھی کہ دلہن چچی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں لیکن میں نے ڈانٹ کر مشکل سے دونوں کو قابو میں کیا۔'' مہتاب نے اسے جواب دیا اور خود دوسری طرف جاتی گھنٹی کی آواز سننے لگی جبکہ اس کا جواب سن کر کشور کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مہتاب کے دونوں بچے بہت پیارے تھے اور اس کے ساتھ اتنا ہل گئے تھے کہ اسکول سے آنے کے بعد مشکل سے ہی اس کو چھوڑنے کے لیے راضی ہوتے تھے۔ وہ خود ان کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور معصومیت بھری باتیں انجوائے کرتی تھی ان دونوں کے ساتھ مصروف رہنے



وجود میں پلتے اس بچے کا خیال آ جاتا تھا جو اس کی اور آفتاب کی محبت کی نشانی تھا۔ مہتاب کے بچوں سے لطف اندوز ہوتے اس کے ذہن کی اسکرین پر اپنے بچے کا تصور اُبھر آتا اور اسے اپنے سامنے شرارتیں کرتا نظر آنے لگتا۔ اس پریشان کُن صورتِ حال میں بھی اس کے دل میں ایسا ہی خیال بے اختیار اس کے ہونٹ مسکرانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

افضل! میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ یہ کشور، آفتاب کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہے۔ ہے کہ یہ بہت دیر سے آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس کا موبائل مسلسل آف جا ہے! آپ ذرا کسی طرح معلوم تو کریں کہ کیا مسئلہ ہے تاکہ اس پاگل لڑکی کو چین آئے۔'' مہتاب کی سے اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا اور وہ اس گفتگو کی طرف متوجہ ہوئی۔

میں نے اُسے تسلی دی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی پریشان ہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود کسی طرح رابطہ کریں اور اس سے کہیں کہ اپنی بیگم صاحبہ کو فون کر لے ورنہ تو محترمہ اپنی جان ہلکان کرتی رہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مہتاب نے مسکراتے ہوئے افضل سے یہ بات کہی اور پھر اس کا جواب سن کر دیا۔

نے افضل سے کہہ دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ کشور سے کہو پریشان نہ ہو، میں ابھی آفتاب سے کی کوشش کرتا ہوں۔'' موبائل کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس نے کشور کو بتایا تو اس نے اثبات دیا لیکن اس کا دل جس بری طرح بے چین تھا، اس کیفیت کا خاتمہ آفتاب کی آواز سنے بغیر ہو ہی تا۔

کرو تم بچوں کے کمرے میں چلی جاؤ ذرا ان کی نگرانی کر لینا کہ صحیح سے پڑھ بھی رہے ہیں یا آپس لڑانے لگے ہوئے ہیں۔ میں اتنی دیر میں کچن دیکھ لیتی ہوں۔ کھانا تقریباً تیار ہی ہے۔ بس صرف ہیں۔ وہ پکا کر میں کھانا لگا دیتی ہوں تاکہ بچے کھا پی کر جلدی سو جائیں۔ رات کو دیر سے سوتے ہیں سکول جانے کے لیے اُٹھنے میں تنگ کرتے ہیں۔'' مہتاب بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ کس کیفیت کا شکار ہے سے بچوں کے ساتھ مصروف کر دینا مناسب سمجھا۔ یہ بات اسے بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ بچوں کے جاتی ہے۔ کشور نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور واقعی کسی حد تک بہل بھی گئی۔ البتہ جب مہتاب یا اور اس سے بھی کھانے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر مہتاب نے خود بھی بہت نہیں کیا اور دونوں بچوں کو کھانا کھلا کر ان کے دانت وغیرہ صاف کروانے کے بعد سونے کے لیے بھیج دیا۔ ان دونوں میں یہی طے ہوا تھا کہ وہ بعد میں افضل کے آنے کے بعد اس کے ساتھ ہی گی اور افضل کا فی الحال کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ بچوں کو سونے کے لیے بستر پر لٹایا گیا تو انہوں نے کہانی سنانے کی فرمائش کر ڈالی۔ بچوں کی فرمائش پر وہ ان کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ کر کہانی سنانے اس دوران باورچی خانہ سمیٹنے کا کام کر رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے دونوں بچے نیند کی آغوش میں چلے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ مہتاب نے اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد بچوں کے کمرے میں سے یہی گمان گزرا کہ کشور بھی سو چکی ہے۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے واپس پلٹ گئی۔ ابھی وہ جا کر بیٹھی ہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ ساتھ ہی افضل کی گاڑی کا مخصوص ہارن بھی سنائی دیا۔ اس نے گیٹ کھولا۔ افضل گاڑی اندر لے آیا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے گیٹ بند کر کے مہتاب واپس پلٹی تو سے اُتر چکا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مہتاب چونک گئی۔ وہ بہت سنجیدہ اور پریشان

نظر آ رہا تھا۔

''سب ٹھیک تو ہے افضل! آپ مجھے پریشان لگ رہے ہیں؟'' اس نے تشویش سے سوال کیا۔

''کچھ اچھی اطلاع نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کشور کہاں ہے؟'' اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے افضل نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

''بچوں کے کمرے میں ہے۔ ان کی فرمائش پر انہیں کہانی سنا رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے بچے ہی خود اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔ لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ بات کیا ہے؟ آفتاب کے بارے میں کوئی خبر ملی؟'' اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے مہتاب نے پریشانی سے پوچھا۔ اس وقت وہ لوگ لاؤنج میں پہنچے تھے۔ افضل ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

''میں اسی کے لیے پریشان ہوں۔ اس کی طرف سے بالکل بھی اچھی اطلاعات نہیں ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی ٹیچر منیب سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آفتاب لاہور آنے کے ارادے سے گاؤں سے نکلا تھا کہ راستے میں اسے چودھری کے کارندوں نے اٹھا لیا۔ منیب نے اس واقعے کی اطلاع اے سی شہریار کو دی جس نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے چودھری کے ڈیرے پر اپنی نگرانی میں پولیس ریڈ کروایا۔ ایکشن کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکا۔ پولیس اپنی پوری کوشش کے باوجود آفتاب کو ڈیرے سے بازیاب کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں نے منیب سے بات کرنے کے بعد اے سی شہریار کو بھی کال کی تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان ہے اور مجھے یقین دلایا ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ ممکن ہو سکا، وہ ضرور کیا جائے گا۔ اچھا بندہ ہے۔ مجھے اس کی بات پر یقین بھی ہے۔ لیکن چودھری جیسے بندے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس کی پہنچ بڑی ہے اور وہ بدخصلت بھی بہت زیادہ ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ شہریار عادل کو کنفرمڈ اطلاع ملی تھی کہ اغوا کرنے کے بعد ڈیرے پر لے جایا گیا ہے لیکن اسے ڈیرے سے بازیاب نہیں کروایا جا سکا۔ اس کا مطلب لیا جا سکتا ہے کہ پولیس والوں میں بھی اس کے پٹھو موجود ہیں جنہوں نے پولیس فورس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی چودھری کو خبردار کر دیا اور چودھری نے آفتاب کو کہیں اور شفٹ کر دیا۔ بس اب تم یہ دعا کرو کہ آفتاب جہاں بھی ہو، صحیح سلامت ہو ورنہ چودھری کا کیا بھروسہ ہے، وہ تو کسی خوں خوار بھیڑیے کی طرح ہے جس کے لیے کسی کی جان لینا ذرا بھی مشکل نہیں۔ منیب بتا رہا تھا کہ حویلی کی تین ملازماؤں کی لاشیں ملی ہیں۔ وہ لڑکیاں کیسے مریں اور ان کی لاشیں جنگل میں کیسے پہنچیں، کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن شک ہے کہ ان لڑکیوں کی موت کے پیچھے چودھری کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔'' افضل نے اسے ساری بات کہہ سنائی۔

''اوہ مائی گاڈ!..... یہ سب تو بہت خوفناک ہے۔ کشور کو اگر یہ ساری باتیں معلوم ہو گئیں تو اس کی بری حالت ہو گی۔'' تفصیل سن کر مہتاب پریشانی سے بولی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کشور کو یہ ساری باتیں معلوم ہے۔ وہ اسے سویا ہوا سمجھی تھی لیکن درحقیقت تو وہ جاگ ہی رہی تھی اور بیل کی آواز سن کر کمرے سے نکلی تھی۔ افضل اور مہتاب نے آپس میں جو بھی گفتگو کی، اس نے لاؤنج کے دروازے پر کھڑے ہو کر سنی تھی اور یہ سب سن کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ افضل نے چودھری کے بارے میں جو رائے دی تھی سے وہ پوری طرح متفق تھی بلکہ افضل تو پھر چودھری کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا جتنی اچھی طرح وہ جانتی تھی، اس لیے اسے اندازہ تھا کہ اگر آفتاب اس وقت زندہ ہے تو بہت تکلیف میں ہو گا۔ اس کی تکلیف کا سوچ کر کشور کا دل ڈوبنے لگا اور اسے زمین و آسمان اپنے گرد گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ خود کو سنبھالنے کی



نے دروازے کے پٹ کا سہارا لینا چاہا لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی اور دھڑام سے نیچے گر گئی اور مہتاب جو اسے بچوں کے کمرے میں سویا ہوا سمجھ کر بنا کسی احتیاط کے گفتگو کر رہے تھے، اس کے گرنے کی آواز پر چونکے۔

''یا اللہ! یہ کیا ہوا؟'' مہتاب بولتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور پھر چوکھٹ پر پڑا خون دیکھ کر چلائی۔ گرنے پر کشور کا سر چوکھٹ سے ٹکرایا تھا اور اب اس سے خون بہہ رہا تھا۔

''کشور!..... کشور!'' مہتاب اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے آوازیں دینے لگی لیکن اس کی آنکھیں بند اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔

''تم اس کے سر پر کوئی پٹی باندھ دو تاکہ خون کا اخراج کم ہو سکے۔ میں گاڑی نکالتا ہوں تاکہ ہسپتال جایا جا سکے۔''

افضل جو خود بھی قریب آ کھڑا ہوا تھا، مہتاب سے بولا۔ کشور کی حالت نے اسے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ماں بننے کے نازک مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس پر اسے ملنے والا ذہنی صدمہ اور چوٹ خطرناک بھی ہو سکتی تھی۔

''بچے گھر پر اتنی رات کو اکیلے نہیں رہ سکتے اس لیے مجھے اکیلے ہی ہسپتال جانا ہو گا۔ تمہیں میں فون پر حال بتا دوں گا۔'' اس کے حسب ہدایت مہتاب نے کشور کے سر پر پٹی باندھ دی تو افضل نے اس کی مدد سے کشور کو اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ مہتاب نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ خواہش تو اس کی یہی تھی کہ وہ کشور کے ساتھ بھی ہسپتال جائے لیکن مجبوری ایسی تھی کہ وہ بے بس سی ہو گئی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ اپنی کام والی کو بچوں کے پاس چھوڑ دیتی لیکن رات کو تو ماسی بھی نہیں ہوتی تھی اس لیے اس کے ہاتھ پیر بالکل بندھے ہوئے تھے۔ وہ افضل کی گاڑی روانہ ہونے کے بعد گیٹ بند کر کے اندر آ گئی اور خلوصِ دل سے کشور کے لیے دعا کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ آفتاب کی خیر و عافیت کے لیے بھی دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔

دوسری طرف افضل، کشور کو لے کر ایک نجی ہسپتال پہنچا۔ صحافت کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کا بہت لوگوں سے جان پہچان تھی اور یہ جان پہچان اکثر نازک مواقع پر کام بھی آ جاتی تھی۔ اس ہسپتال کے عملے نے بھی اس سے بھرپور تعاون کیا اور وہ کشور کو اپنی سالی کی حیثیت سے متعارف کروا کر اسے فرضی نام سے وہاں ایڈمٹ کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں نے آپ کی سسٹر اِن لا کو چیک کر لیا ہے مسٹر افضل! ان کے سر پر لگنے والی چوٹ خطرناک نہیں ہے۔ معمولی سا زخم ہے جس کی بینڈیج کر دی گئی ہے۔ چند دن میں زخم بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ان کی بے ہوشی کے سلسلے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خاتون شاک کی حالت میں ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، لیکن کب انہیں ہوش آتا ہے۔ اصل میں خاتون کے پریگنینٹ ہونے کی وجہ سے مسئلہ زیادہ نازک ہو گیا ہے۔ ماں کی یہ کنڈیشن بچے کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔'' کشور کو اندر لے جائے جانے کے بعد وہ ویٹنگ روم میں انتظار کر رہا تھا جب ڈاکٹر نے آ کر اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ صورتِ حال کو جاننے کے بعد افضل کو پریشان ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے گی۔'' اس کی پریشانی دیکھ کر ڈاکٹر نے تسلی دی۔

''پریشانی کی بات تو ہے ڈاکٹر! یہ میرے گھر مہمان آئی ہوئی تھیں۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو ان کے شوہر اور سسرال والوں کو کیا جواب دوں گا؟'' افضل نے اپنی پریشانی کا روایتی سا جواز پیش کیا۔ درحقیقت وہ پہلے ہی آفتاب کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس پر سے کشور کی ایسی حالت نے اس کی پریشانی مزید بڑھا دی تھی۔

''یہ پرابلمز تو ہماری سوسائٹی میں ہر شخص کو قدم قدم پر فیس کرنے پڑتے ہیں۔ میکے والوں کو موقع موقع دباؤ میں مبتلا کرنا سسرال والے اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے آپ مجھے یہ بتائیں کہ محترمہ اس حالت کو پہنچیں کیسے؟'' ڈاکٹر بھی اچھا خاصا باتونی شخص تھا جو باتوں ہی باتوں میں اس سے تفصیلات جان لینے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔

''میں صحیح سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری مسز کے مطابق یہ فون پر اپنے کسی سسرالی عزیز سے بات کر رہی تھیں، فون بند کیا اور اس کے بعد چکرا کر گر پڑیں۔'' افضل نے ایسا بہانہ گھڑا جو اس باتونی ڈاکٹر کے دل کو بھا گیا۔

''ویری سیڈ! یقیناً وہاں سے انہیں کچھ ایسا کہا گیا ہوگا جو ان سے برداشت نہیں ہو سکا۔ آپ کو چاہیے کہ ان کے شوہر کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ یویو بھی اس وقت آپ کی جگہ انہیں بیوی کے پاس ہسپتال میں موجود ہونا چاہیے تھا۔'' افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا۔

''وہ آج کل ملک سے باہر ہیں اور میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے۔'' افضل نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔

''پھر بھی، آپ کوشش کریں کہ کسی طرح ان سے رابطہ ہو جائے۔ یہ معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ آپ کتنی ہی بھاگ دوڑ کر لیں لیکن ذرا بھی اونچ نیچ ہو گئی تو آپ کے سر ہی الزام آئے گا۔ میں خود چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں اس لیے اس قسم کی صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اس پر زور دیتے ہوئے آخر میں جو بات کہی، اسے سن کر افضل کو اندازہ ہوا کہ یہ ڈاکٹر اتنا باتونی اور گھریلو معاملات میں اتنا انوالو کیوں ہے۔ بے چارہ یقیناً اکلوتے بھائی کی حیثیت سے چھ بہنوں کے سسرالی مسائل بھگتاتے بھگتاتے پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ جس کسی کو بھی اس طرح کی مشکل میں دیکھتا تھا اس سے دلی ہمدردی محسوس کرنے لگتا تھا۔

''مشورے کا شکریہ ڈاکٹر صاحب! میں اپنی وائف سے کہوں گا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کریں۔ فی الحال رات کا وقت ہے اور کسی کو بھی ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس وقت کسی سے رابطہ کرنا مناسب ہوتا تو میرے ساتھ میری وائف بھی ہسپتال آتیں لیکن ہماری مجبوری تھی کہ گھر پر بچے اکیلے تھے اور ان کے ساتھ کسی کا ہونا لازمی تھا۔ خیر، صبح ہو گی تو دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ اس وقت تو آپ ہی تعاون کریں اور اسٹاف کے ساتھ مل کر میری سسٹر اِن لا کی دیکھ بھال کریں۔'' افضل نے بہت شائستگی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں ڈاکٹر کو جتا دیا کہ اس وقت اس کی یہاں کے بجائے کشور کے پاس موجودگی زیادہ ضروری ہے۔

''بالکل جناب! آپ بے فکر رہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد افضل نے مہتاب کا نمبر ملایا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

''یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔ پہلے ہی آفتاب کی وجہ سے دل اتنا گھبرا رہا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اسے کس طرح سے چودھری کے چنگل سے بچایا جائے۔ اس پر سے کشور کی یہ حالت۔'' وہ صورتِ حال جان کر پریشان ہو گئی۔

''اللہ سے اچھی امید رکھو۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ ہوا، ضرور کریں گے۔ میں اپنے چند ساتھیوں سے مشورہ کر کے دیکھتا ہوں، پھر ہم مل کر طے کریں گے کہ آفتاب کو آزاد کروانے کے لیے چودھری کو کس طرح



جائے۔ اصل میں یہ روایتی جاگیردار اور وڈیرے مغرور بہت ہوتے ہیں اور اپنی اکڑ کی وجہ سے مشکل میں آتے ہیں۔ لیکن تم ہم صحافیوں کو بھی جانتی ہو۔ کسی کے بارے میں جاننے پر آئیں تو گڑے مُردے اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ چودھری کا بھی کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ثبوتوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ آ جائے گا جس کے سامنے آنے پر چودھری کو ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔'' افضل نے بیوی کو تسلی دی۔

''انشاء اللہ!'' مہتاب نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

''تم کوشش کرو کہ تھوڑی دیر سو جاؤ۔ صبح بچوں کو اسکول بھجوانے کے بعد تم یہاں ہسپتال آ جانا تاکہ میں باہر کچھ ہاتھ پیر مار سکوں۔'' افضل نے اسے مشورہ دے کر فون بند کر دیا اور اپنے قریبی صحافی دوستوں سے رابطے کے لیے انہیں فون کرنے لگا۔ دوستوں سے جاری اس ٹیلی فونک گفتگو کے علاوہ وہ وقتاً فوقتاً کشور کے بارے میں بھی معلوم کر لیتا تھا۔ وہ ہنوز پہلے والی حالت میں ہی تھی البتہ ڈاکٹر نے اسے ڈرپ کے ساتھ ملا کر ادویات دے دی تھیں جو بچے کو کوئی نقصان پہنچنے سے بچا سکیں۔ افضل کی درخواست پر اس نے اپنی دوست مشہور گائنا کالوجسٹ کو بھی کچھ دیر کے لیے ہسپتال بلوا کر کشور کا چیک اپ کروایا تھا۔ گائنا کالوجسٹ نے صرف سے مشورے دینے کے ساتھ ساتھ یہ تسلی بھی دی تھی کہ بچہ بالکل محفوظ ہے اور فی الحال اسے کوئی خطرہ نہیں۔

افضل کی پوری رات ہسپتال میں جاگتے ہوئے گزری۔ صبح کی روشنی پھیلی تو وہ ڈیوٹی اسٹاف کو اپنے تھوڑی دیر کے لیے گھر جانے کا بتا کر ہسپتال سے نکل پڑا۔ اس کا ارادہ تھا کہ گھر جا کر مہتاب کو لے آئے گا اور اسے بچوں کو چھوڑنے کے بعد خود آفتاب کی بازیابی کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔ گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے حسبِ عادت گاڑی کا ہارن بجایا۔ مہتاب ہارن کی آواز پہچانتی تھی اور اسے سن کر فوراً ہی گیٹ کھولنے کے لیے چلی آتی تھی لیکن آج جانے کیا بات تھی کہ وہ گیٹ ہی نہیں کھول رہی تھی۔ افضل نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ ذیلی گیٹ اندر سے لاک نہیں ہے اور یونہی بھڑا ہوا ہے۔ وہ کچھ تشویش کے عالم میں گاڑی سے اُتر کر اس کی طرف بڑھا اور ذیلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ گھر کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یقیناً بچے جو اسکول دُور ہونے کی وجہ سے صبح جلدی ہی روانہ ہو جاتے تھے، جا چکے تھے اور مہتاب شاید رات بھر جاگنے کی وجہ سے اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بچوں کے روانہ ہونے کے بعد اسے صحن سے دروازہ بند کرنے کا خیال ہی نہیں آیا اور وہ وہیں سو گئی۔

دل ہی دل میں قیاس آرائی کرتے ہوئے اس نے اپنے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس کے اندازے کے مطابق مہتاب کو یہیں ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں مہتاب کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ بستر کی چادر اس طرح بے شکن تھی کہ صاف سمجھ آ رہا تھا کہ مہتاب پل بھر کے لیے بھی اس بستر پر نہیں لیٹی ہے۔ وہ بیڈ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بچوں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اپنے کمرے کے بعد دوسری جگہ یہی تھی جہاں مہتاب جا سکتی تھی یا جانے کا امکان تھا۔ بچوں کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے بند دروازے کو دھکیلا، اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ مہتاب یہیں بچوں کے بستر پر ہی لیٹی ہوئی تھی بلکہ اندازے کے برخلاف دونوں بچے بھی اس کے پہلو میں ہی موجود تھے مگر اس منظر میں کچھ ایسا بھی شامل تھا جس نے افضل کے سامنے زمین و آسمان کو گھما دیا۔ وہ جو ایک صحافی ہونے کے ناتے بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا، اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کی ہمت نہیں کر سکا اور نیچے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

اس نے اپنی صحافتی زندگی میں بے شمار ایسے مناظر دیکھے تھے جو دل کو دہلا ڈالتے تھے اور وہ ایک دردمند

انسان ہونے کی وجہ سے متاثر بھی ہوتا تھا لیکن یہ منظر تو ایسا تھا کہ لگتا تھا دل دھڑکنا ہی بند کر دے گا۔ سامنے
پر اس کی عزیز از جان بیوی اور معصوم بچوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ مہتاب نے دونوں
کے گرد اپنے بازو اس طرح لپیٹ رکھے تھے جیسے انہیں اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہو لیکن ظالم موت نے
اس طرح سے وار کیا تھا کہ ماں کی آغوش بھی معصوم جانوں کو پناہ فراہم نہیں کر سکی تھی۔ افضل کچھ دیر
بے حس و حرکت بیٹھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر یک دم اس کے دل میں اس امید نے
کہ شاید ان تینوں میں سے کسی کے بدن میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہو۔ اس امید کا سہارا لے کر وہ اپنی
سے کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے بیڈ کے قریب پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے باری باری مہتاب اور
بچوں کی نبضیں چیک کیں لیکن وہاں جامد خاموشی تھی اور حرارت سے عاری قدرے اکڑ جانے والے بدن
دے رہے تھے کہ روح اور جسم کا رشتہ ٹوٹے کافی دیر گزر چکی ہے۔ اس کی پیاری بیوی مہتاب جسے اس نے
دعاؤں کے بعد حاصل کیا تھا اور جس کی آغوش میں پلتے اپنے ننھے تاروں کو دیکھ دیکھ کر جیا کرتا تھا، کسی
طرح اچانک بدلی میں چھپ گئی تھی اور ساتھ ہی ننھے تاروں کو بھی لے گئی تھی۔

مہتاب اور بچوں کے جسم میں پیوست گولیاں کن ظالم ہاتھوں میں تھے ہتھیاروں سے نکلی تھیں،
جانتا تھا۔ ان بے گناہوں کو اس انجام تک پہنچانے والے چودھری افتخار کے گرگے بھی ہو سکتے تھے۔ افضل
آفتاب سے دوستی نبھاتے ہوئے چودھری کی بیٹی کو فرار کروانے کا ناقابل معافی جرم جو کیا تھا۔ اور برسوں
مہتاب کی تلاش میں بھٹکتا اس کا سابقہ منگیتر بھی اپنی نارسائی کا انتقام لینے کے لیے یہ حرکت کر سکتا تھا۔
میں سے کس دشمن نے یہ وار کیا ہے، فی الحال افضل یہ تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اپنے پیاروں
لاشوں کے سرہانے بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر اُس کی کل کائنات مشتمل تھی اور اس
اچانک ہی اس کائنات کو چھین لیا گیا تھا۔ اپنی اس تہی دامنی کا وہ جتنا بھی سوگ مناتا، کم تھا لیکن پھر اسے
آ گیا۔ بیوی بچوں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر رونے سے اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ یہ غم زندگی بھر کا
اسے زندگی بھر اس غم کو سینے سے لگا کر جینا تھا لیکن وقت کا تقاضا تھا کہ وہ حرکت میں آ جائے اور وہ کرے
وقت ضروری تھا۔ سب سے پہلے اس نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کر کے اپنے اوپر گزر جانے والے حادثے
اطلاع دی پھر ایک قریبی دوست کا نمبر ملایا۔

"بابر! مہناز کے نام سے میری ایک عزیزہ سٹی ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ تمہیں اسے بہت خاموشی
رازداری کے ساتھ کسی دوسرے ہسپتال شفٹ کروانا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہ کام کر دو اور پلیز خیال رکھنا
اس بات کا تمہارے سوا کسی دوسرے کو علم نہ ہونے پائے۔" اس نے ابھی تازہ ترین دشمنی چودھری ہی کی
اس لیے منطقی طور پر یہی خیال آیا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہے۔ بہت ممکن تھا کہ
نے آفتاب کو اغوا کروانے کے بعد اس سے تشدد کے زور پر یہ حقیقت اُگلوالی ہو کہ کشور، افضل کے گھر میں
ہے۔ یہ جاننے کے بعد چودھری نے اپنے بندوں کو افضل کے گھر دوڑا دیا ہو گا لیکن جب انہوں نے یہاں
کو نہیں پایا تو طیش میں آ کر مہتاب اور بچوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ کشور کو فوری طور
کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے ورنہ جب میڈیا پر یہ خبر آئے کہ نامور صحافی افضل کی اہلیہ اور بچوں کو رات
کسی پہر قتل کر دیا گیا تو ممکن تھا کہ ہسپتال کے عملے میں سے جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا، وہ کسی کے سامنے
اس بات کا اظہار کر دیں کہ جس وقت افضل کے بیوی بچے قتل ہوئے، وہ ایک خاتون کے ساتھ ہسپتال میں
یہ خبر کسی طرح چودھری تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ کشور کی ہسپتال سے منتقلی ضروری تھی۔ غم سے نڈھال



زندگی کے نازک ترین لمحات میں بھی دوستی کے تقاضوں کو یاد رکھا تھا اور دوست کی امانت کی حفاظت کا
قدم جانتے ہوئے اتنی بے غرضی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اپنے صحافی دوست بابر کو اپنے ساتھ بیتنے والے
کی اطلاع بھی نہیں دی تھی کہ مبادا وہ اس کے معاملے میں اُلجھ کر کشور کو ہسپتال سے منتقل کروانے میں کسی
مرتکب ہو جائے۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان جانتا تھا کہ وہ اتنے بہت سارے مسلح افراد کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آدمیوں کی اتنی بڑی
سے نمٹنے کے لیے طاقت کے بجائے حکمت کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے ان افراد کے کمانڈر کو قابو
نے کے بعد انہیں غار میں چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جیسے ہی وہ یہاں سے
کوشش کرے گا، وہ لوگ بھی اس کے پیچھے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ اتنے بہت
لوگ مل کر اسے آسانی سے چھاپ سکتے تھے۔ انہیں اپنے تعاقب میں آنے سے روکنے کے لیے اس
ترکیب سوچی تھی کہ غار کے دہانے کے آگے آگ لگا دے گا تاکہ اندر موجود لوگ باہر نہ نکل سکیں۔ لیکن
کمانڈر عین وقت پر سرکشی پر اُتر آیا اور اس نے کمانڈر کی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے مشابرم خان کے
ہتھیار اٹھا لیا۔ مجبوراً مشابرم خان کو بھی فوراً ایکشن لینا پڑا۔ اس کی چلائی گئی گولیوں میں سے ایک نائب
کو لگی جبکہ دوسری نے مٹی کے تیل کے کین میں سوراخ کر دیا۔ فوراً ہی وہاں آگ بھڑک اُٹھی۔ اس پر
کمانڈر نے اس پر پھینکنے کے لیے جو ہینڈ گرینڈ نکالا تھا، وہ بھی پھٹ گیا۔ گرینڈ پھٹنے سے آگ اور بھی
سے بھڑک اُٹھی۔ ادھر کین سے نکل کر بہنے والے تیل نے غار کے اندر ایک راستہ بنا لیا اور اس آگ اور
نے مل کر غار میں ذخیرہ شدہ ہتھیاروں اور دھماکا خیز مواد تک رسائی حاصل کر لی۔ نتیجہ پے در پے دھماکوں
رت میں نکلا۔ ان دھماکوں نے پہاڑوں کو تھرا کر رکھ دیا اور ٹوٹے ہوئے چٹانوں کے ٹکڑے اور پتھر اِدھر
نے لگے۔ غار میں موجود بہت سے افراد تو آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ ان میں سے چند جو کسی نہ کسی
بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے، وہ ان اُڑتے ہوئے پتھروں کی زد میں آ گئے۔ مشابرم خان خود ہینڈ گرینڈ
کمانڈر کی گردن ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگ پڑا تھا لیکن اسے زیادہ دور تک جانے کا موقع نہیں ملا اور
لیلا پتھر آ کر اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ پتھر کی ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ
قدم بھی مزید آگے بڑھانے میں ناکام ہو کر زمین پر آ رہا۔ زمین پر گرنے کے بعد اس کی آنکھوں نے جو
منظر دیکھا، وہ قیامت کے منظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دھماکوں سے اُڑتے پہاڑ کے ٹکڑے اور پناہ کے لیے
پکارتے انسانوں کے لیے کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ تمام تر صورت حال قیامت کی بیان کردہ نشانیوں
تو منظر کشی کر رہی تھی۔

زخمی مشابرم خان کی آنکھیں چند لمحوں سے زیادہ یہ منظر نہیں دیکھ سکیں اور اس کے دماغ پر تاریکی کی چادر تن
اس تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ چکا ہے اور اب
کبھی اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ دوسرے جہان میں ہو گا۔ مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ معلوم نہیں کتنے
ان کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی جگہ موجود تھا اور دو افراد اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایک ہیلی کاپٹر کی
لے جا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص رنگت اور اسٹریچر اٹھانے والے آدمیوں کا یونیفارم دیکھ کر اس نے
لیا کہ پاکستان آرمی وہاں پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے وہاں جتنے زوردار دھماکے گونجے تھے اس کے بعد آرمی

والوں کا متوجہ نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ انہیں اس جگہ پہنچ کر کارروائی شروع کرنے میں کافی وقت تو ضرور
لیکن بہرحال اب وہ وہاں موجود تھے اور مشابرم خان کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ وردی پوش فوج کے
اُدھر پھیلے بری طرح مصروف تھے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ زندہ بچ جانے والے افراد کو طبی امداد
سکے۔ لیکن وہاں مشابرم خان جیسے خوش نصیب شاذ و نادر ہی تھے۔ ان میں سے بیشتر کو موت نے آ
کچھ آگ میں جل کر مرے تھے، کچھ پتھروں کی زد میں آئے تھے اور کچھ جو صرف زخمی ہوئے تھے، دھماکے
سے اپنی جگہ چھوڑ دینے والی برف تلے آ کر دب گئے تھے۔ مشابرم خان کی خوش نصیبی تھی کہ وہ صرف زخمی
اور پتھروں اور برف میں دبنے سے بچ گیا تھا۔ اسے فرسٹ ایڈ دینے والوں نے اس کے زخم پر پٹی باندھ
اور وہ جو اپنا آخری وقت سمجھ رہا تھا، ایک اسٹریچر پر لدا زندہ سلامت ہیلی کاپٹر میں سوار تھا۔ اس ہیلی
اس کے سوا تین زخمی اور بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈاکٹر بھی تھا جو زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف
مشابرم خان کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرنے کے بعد اس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ذرا دیر بعد ہیلی کاپٹر حرکت
گیا۔ متحرک ہیلی کاپٹر اپنی منزل پر پہنچتا، اس سے قبل ہی مشابرم خان پر ایک بار پھر غنودگی سی چھا گئی
اس کی آنکھ کھلی تو وہ کسی ہسپتال میں تھا۔

''اسے ہوش آ گیا ہے۔ میجر صاحب کو اطلاع دے دو۔'' اسے آنکھیں کھول کر دیکھتا پا کر وہاں
ڈاکٹر نے کسی سے کہا اور خود اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''تم کیسا محسوس کر رہے ہو مسٹر؟'' معائنے کے دوران میں اس نے مشابرم خان سے سوال کیا۔

''میرے سارے جسم میں شدید درد ہے، خاص طور پر سر تو درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' مشابرم خان
کیفیت سے آگاہ کیا۔

''تمہیں کافی چوٹیں آئی ہیں اس لیے درد تو ہوگا۔ شکر کرو کہ تمہاری ہڈیاں سلامت ہیں ورنہ تمہارے
جو دوسرے زخمی لائے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹی ہو، سب کے سب
زخمی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں پین کلر لگا رہا ہوں۔ اس سے تم اپنے درد میں کافی کمی محسوس کرو گے۔'' ڈاکٹر
اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے قریب کھڑی نرس سے انجکشن تیار کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر انجکشن لگا کر
ہی ہوا تھا کہ قدموں کی آواز اُبھری اور سادہ لباس میں ملبوس دو افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ سادہ لباس
ہونے کے باوجود ان دونوں کا مخصوص ہیئر اسٹائل چغلی کھا رہا تھا کہ ان کا تعلق فوج سے ہے۔ ان دونوں
اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر اور نرس باہر نکل گئے جبکہ ان دونوں نے مشابرم خان کے بیڈ کے ساتھ رکھی کر
سنبھال لیں۔

''تمہارا نام؟'' ان میں سے ایک نے جس کے چہرے پر نسبتاً زیادہ رعب و دبدبہ محسوس ہو رہا تھا، ما
خان کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا جبکہ اس کا ساتھی قلم اور نوٹ پیڈ سنبھالے
اس کے جوابات نوٹ کرنے کے لیے تیار تھا۔

''مشابرم خان۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' فوراً ہی دوسرا سوال داغا گیا۔

''کاندے کا۔ لیکن کافی عرصے سے ملازمت کے سلسلے میں پنجاب میں رہ رہا ہوں۔'' مشابرم خان
تھا کہ وہ جو اتنا بڑا حادثہ پیش آ چکا ہے، اس کے بعد یہ تفتیش لازمی ہے اس لیے سب کچھ سچ بتا دینے کا
کرتے ہوئے اس آدمی کے سوالوں کا جو اس کے اندازے کے مطابق میجر تھا، جواب دینے لگا۔



''کہاں اور کس قسم کی ملازمت کرتے ہو؟'' سوالات کا سلسلہ آگے بڑھا۔

''میں ڈرائیور ہوں اور آج کل اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے ڈرائیور کے طور پر کام کر رہا ہوں۔'' اس کا
سن کر میجر نے اس کی مدتِ ملازمت، تعیناتی کے اضلاع اور کام کی نوعیت کے متعلق متعدد سوالات کر
مشابرم خان ہر سوال کا جواب سچائی کے ساتھ دیتا رہا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان!'' میجر نے کرسی پر اپنا اندازِ نشست ذرا سا تبدیل کیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں
سلسلے میں آئے تھے؟ اور پھر پہاڑوں پر اس جگہ کیسے جا پہنچے جہاں سے آرمی والے تمہیں اٹھا کر لائے
مشابرم خان کا پورا پس منظر جان لینے کے بعد وہ اصل واقعات کی تحقیق کی طرف آیا۔

''میں یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش میں آیا تھا اور ان قاتلوں کو تلاش کرتا کرتا وہاں پہنچ گیا۔''

''مطلب؟..... ذرا کھل کر اور تفصیل سے ساری بات بتاؤ؟'' میجر نے اسے حکم دیا۔

''تفصیل تھوڑی سی طویل ہے سر! بہرحال میں آپ کو ذرا مختصر کر کے سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ میجر
ملازمت، شہریار کی فطرت، اس کے اور چودھری کے درمیان جاری مخاصمت سے لے کر ماہ بانو کے قصے
ایک ایک بات بتاتا چلا گیا۔ اس نے اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا کے بعد اپنے بلتستان پہنچنے
کر مجرموں کی تلاش میں کی جانے والی اپنی ساری جدوجہد کی تفصیل بھی کہہ سنائی۔ میجر نہایت سنجیدگی
سے اُس کی داستان سنتا رہا۔ اُس کی ایکسرے جیسی نگاہیں مشابرم خان کے چہرے پر یوں گڑی ہوئی
جیسے وہ اس کے اندر تک جھانک کر سب سچ جھوٹ جان لینے کا خواہش مند ہو۔ اس کا ساتھی البتہ بغیر نظر
تیزی کے ساتھ نوٹس لینے میں مصروف تھا۔ مشابرم خان نے دیکھا کہ اس شخص کے پاس قلم اور نوٹ پیڈ
وہ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے جس میں یقینی طور پر اس کا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی
خوف دل میں لائے بغیر سچ بتاتا رہا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذرا سی غلط بیانی سے ان عناصر کے
تحقیقات میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جو پہاڑوں میں موجود خفیہ پناہ گاہ میں یقینی طور پر وطن دشمن سرگرمیوں
مصروف تھے۔ اس سے قبل اس نے ذاتی طور پر بھائی کا انتقام لینے کے چکر میں پولیس والوں کو اس معاملے
نہیں کیا تھا لیکن اب بات دوسری تھی۔ پولیس کے مقابلے میں اسے آرمی کی کارکردگی پر زیادہ بھروسہ
اس کے سینے میں جلتی انتقام کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ اکرم خان کے وجود میں گولیاں اُتارنے والا شخص
تھا، یہ تو اسے نہیں معلوم تھا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ اُس نے اس جرم میں ملوث پورے گروہ کو ہی نادانستہ طور
دی، اذیت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بھڑکتی آگ اور پتھروں کی بارش کی زد میں آ کر مرنے
اس سارے دہشت گرد گروہ کے افراد نے یقیناً مرتے وقت ایک بار تو ضرور یہ سوچا ہوگا کہ انہیں قیامت
یوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ سب جو اُن پہاڑوں پر بیتا تھا، کسی آسمانی عذاب سے کم تو نہیں تھا اور آسمانی
بھی کسی مومن و مجاہد پر نہیں آیا کرتا۔ تو وہ سب جو اس عذاب کی زد میں آ کر مارے گئے تھے..... کیا
وقت انہیں یہ ادراک نہ ہوا ہوگا کہ وہ گمراہی میں مبتلا تھے؟

⊛----✪----⊛

سوری سر! لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ نے جذبات میں آ کر چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ
بہت بڑی غلطی کی۔ آپ کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اس طرح پولیس ریڈ کروانے سے کچھ حاصل
ا۔ پولیس اور چودھری کا گٹھ جوڑ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ چودھری کے کسی چیلے نے ریڈ سے پہلے

ہی اسے اطلاع دے دی ہوگی چنانچہ اس نے پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی آفتاب کو وہاں سے ہٹا لیا
سے آپ کے ہاتھ ناکامی اور چودھری کی مخالفت کے سوا کچھ نہیں آیا۔'' وہ ڈیرے پر ناکام ریڈ کے بعد
اپنے دفتر پہنچا تو عبدالمنان نے سارا واقعہ جاننے کے بعد نہایت صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
یہ صاف گوئی اس اعتماد اور آزادی کا نتیجہ تھی جو شہریار کی طرف سے اسے حاصل تھی۔ اگر شہریار کوئی روا
ہوتا تو وہ ہرگز اس کے سامنے اتنی صاف گوئی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا آفیسر
اپنی غلطی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس وقت شہریار کے پاس منیب کا فون آیا اور اس نے
ریڈ کا فیصلہ کیا، عبدالمنان دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی نجی کام کے سلسلے میں دفتر سے چند گھنٹوں کی
لے کر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو سارا قصہ معلوم ہوا جسے جان کر اسے سخت افسوس ہوا۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ میں نے صرف اس بنیاد پر کہ اس تانگے والے اکو نے چودھری کے
آفتاب کو ڈیرے پر لے جاتے ہوئے دیکھا ہے، پورے اعتماد سے ڈیرے پر ریڈ کروا دیا۔ اس وقت
بات بھول گیا تھا کہ پولیس والوں میں بھی چودھری کے مخبر موجود ہیں۔ اصل میں تم جانتے ہی ہو کہ میں
کو اس کی ہمت اور لگن کی وجہ سے کتنا پسند کرتا ہوں۔ وہ میری ٹیم کا بہت اہم کارکن ہے جسے میں کسی
کھونا نہیں چاہتا۔'' اس نے اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اس کی توجیہہ بھی پیش کی۔

''یہ بات تو میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں سر! ہم یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر
آفتاب کو کھو دیا تو اس جیسا کوئی دوسرا بندہ ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس وقت بھی پیر آباد میں چودھری کے
ڈٹا ہوا تھا جب اسے آپ کی سپورٹ حاصل نہیں تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پیر آباد کا اسکول اگر کھلا
اس کے پیچھے صرف اور صرف آفتاب کا حوصلہ اور مستقل مزاجی تھی۔ میں خود اس کے اغوا کا سن کر بہت
ہوں اور ہر حال میں اسے چودھری کے چنگل سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں قانونی طریقہ
اختیار کرنے کے بجائے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''مطلب.....؟'' شہریار اس کی بات سن کر چونکا۔

''مطلب یہ کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں۔ آپ نے
پولیس ریڈ کروا کر دیکھ لیا، اس ریڈ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب ہم ایسا کوئی ذریعہ استعمال کریں گے کہ کام
سے ہو جائے اور کوئی چودھری کو قبل از وقت خبردار کرنے والا بھی نہ ہو۔'' عبدالمنان کا انداز معنی خیز تھا۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ..... کھل کر بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' شہریار نے اسے ٹوکا۔

''آپ کو جگو تو یاد ہوگا سر! اس بچے کا باپ جو نور پور جاتے ہوئے ہمیں شدید بیمار حالت میں ملا
آپ نے اپنا نور پور جانا کینسل کر کے اس بچے کو اپنی گاڑی میں فوری طور پر ہسپتال پہنچانے کے ساتھ ساتھ
اتائی ڈاکٹر کو بھی گرفتار کروا ڈالا تھا جس کی غلط دوا نے بچے کو اس حال کو پہنچایا تھا۔ آپ کے اس عمل سے
باپ جگو آپ کا کتنا احسان مند ہوا تھا اور اس نے آپ کو اپنا فون نمبر دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ جب
اسے کسی بھی کام کے لیے یاد کر سکتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے ہم آفتاب کی بازیابی کے لیے جگو کی خدمات
کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ یہ کارنامہ انجام دے دے گا۔'' عبدالمنان نے اپنی بات کی وضاحت کی

''میرا تو جہاں تک اندازہ ہے جگو کوئی عام سا غنڈہ ہے جو چودھری سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں کر
عبدالمنان کا منصوبہ سن کر اس نے اعتراض کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر! جب جگو نے اپنا فون نمبر آپ کو دے کر اپنی خدمات کی پیشکش کی تھی



کام کا بندہ جان کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ اتنا معمولی غنڈہ بھی نہیں ہے۔
بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی ہے جس کے لیے کام کرنے والے غنڈوں میں جگو کو کافی
ہے۔ جگو چاہے تو اپنے بچے اور بیوی کو شہر میں رکھ کر انہیں بہت اچھی زندگی دے سکتا ہے لیکن اس
ایک اور شادی کی ہوئی ہے اور اپنی طرح دار شہری بیوی کی وجہ سے گاؤں والی کو شہر نہیں لے جاتا
عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ پیش کی، اسے سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کا پی اے واقعی ایک بیدار مغز
موقع بے موقع اس کے کام آ کر اس پر اپنی اہمیت ثابت کر دیتا تھا۔

اگر تم کہتے ہو تو جگو سے رابطہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' شہریار نے گویا اسے اجازت دی۔ اس کی طرف
ملتے ہی عبدالمنان جگو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف
ریسیو کر لی گئی اور جگو کی سخت آواز سنائی دی۔

''میں اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ آپ مسٹر جگو ہی ہیں نا؟''
ان نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''بالکل جناب! فرمایئے آپ نے کیسے مجھے یاد کیا؟..... اپنے اے سی صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟''
سنتے ہی جگو کا سخت لہجہ خوشگوار ہو گیا اور وہ بڑی عاجزی سے پوچھنے لگا۔

''الحمدللہ اے سی صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ بس ایک کام کے سلسلے میں ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت
اس لیے انہوں نے تمہیں یاد کیا ہے۔''

''بالکل جناب! یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اے سی صاحب نے مجھے یہ موقع دیا۔ میں ان کے کام آ کر
محسوس کروں گا۔'' جگو نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''تو ایسا کرو تم اے سی صاحب سے ہی بات کر لو۔'' عبدالمنان نے فون شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سلام سر جی! حکم کریں کہ کیا کام ہے؟ جگو اپنے وعدے کے مطابق آپ کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار
اس کے ''ہیلو'' بولتے ہی جگو نے فدویانہ لہجے میں کہا۔

''سوچ لو جگو! کام ذرا مشکل ہے اور جس بندے کے خلاف کرنا ہے اس سے دشمنی مول لینے کی جرأت
میں نہ ہو۔'' اصل بات کرنے سے پہلے شہریار نے اسے جانچ لینا مناسب سمجھا۔

''دشمنوں سے جگو نہیں ڈرتا سر جی! جگو پہلے ہی اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے اس لیے اگر اس کا ایک
بھی بن گیا تو پروا نہیں۔ آپ بس حکم کرو کہ کس کے خلاف کارروائی ڈالنی ہے؟'' جگو کے لہجے سے ایسا
کہ اس نے باقاعدہ سینہ ٹھونک کر یہ بات کی ہوگی۔ شہریار کے ہونٹوں پر اس کے انداز پر دھیمی سی
پھیل گئی۔

''اس بندے کا نام ہے چودھری افتخار عالم شاہ.....'' آخر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جگو کو بتا ہی دیا۔
صرف پل بھر کے لیے خاموشی چھائی پھر جگو کی مضبوط لہجے والی آواز سنائی دی۔

''حکم کریں سر! کہ چودھری کا کیا کرنا ہے؟ اگر آپ کو اس کی لاش دیکھنی ہے تو بھی میں اس کا بندوبست
گا۔''

''ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔ میرا ایک اہم بندہ چودھری نے اغوا کروا لیا ہے۔ اس بندے کو چودھری کے
سے چھڑوانا ہے۔'' شہریار نے اسے بتایا۔

''بندے کا حدود اربع بتائیں؟'' جگو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کا نام آفتاب ہے۔ پیر آباد کے اسکول میں پڑھاتا ہے۔ چودھری نے اپنے بندوں کے ا
اسے اغوا کروایا ہے اور ایک عینی شاہد کے مطابق اغوا کے بعد اسے چودھری کے ڈیرے پر لے جایا گیا
ہم پولیس ریڈ کروا کر بھی ڈیرے سے اسے بازیاب نہیں کروا سکے۔ تمہیں اس بندے کا پتہ بھی معلوم کرنا
اسے آزاد بھی کروانا ہے۔ کیا تم یہ کام کرلو گے؟" شہریار نے اسے مختصراً بتاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"تسی فکر نہ کرو سر جی! رب نے چاہا تو آج رات ہی آپ کا بندہ چودھری کی قید سے آزاد ہو جا
اگر کچھ دیر بھی لگی تو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لوں گا میں آپ سے۔" جگو نے دعویٰ کیا۔ اس کا ا
تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے مطابق عمل بھی کرے گا۔ اس سے بات کر کے شہریار نے فون بند کیا
کے دل کو ایک اطمینان سا تھا کہ اگر آفتاب زندہ ہے تو جگو اسے چودھری کی قید سے ضرور آزاد کروا لے گا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کر کے اچھا کیا ہے۔ یہ جگو کافی کام کا بندہ لگتا
اس میں صلاحیت نہیں ہوتی تو چودھری کا نام سن کر ہی ہمت چھوڑ دیتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔ لیکن اس نے ا
ہے کہ وہ یہ کام ضرور کر ڈالے گا۔ اب مجھے آفتاب کی طرف سے اچھی اُمید بندھ گئی ہے۔" فون بند کر
بعد اس نے عبدالمنان کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اِن شاء اللہ سر! اگر اللہ کو منظور ہوا تو جگو کی طرف سے ہمیں کامیابی ہی کی اطلاع ملے گی۔" عبدا
نے بھی خوش امیدی کا اظہار کیا۔ ابھی ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو جاری ہی تھی کہ فون ا
بج اُٹھی۔

عبدالمنان نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف آفتاب کا دوست افضل تھا اور شہریار سے بات کر
خواہش مند تھا۔ شہریار کی طرف سے رضامندی پا کر عبدالمنان نے ریسیور اسے تھما دیا۔ افضل نے
صحافی اور آفتاب کے دوست کی حیثیت سے شہریار سے اپنا تعارف کروایا پھر اسے آفتاب کے اغوا
معاملے سے آگاہ کیا۔

"مجھے اس واقعے کا علم ہے اور میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح آفتاب کو بازیاب
جائے۔" شہریار نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی ڈیرے پر پولیس ریڈ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس
پولیس ریڈ کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس نے افضل کو یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنی پہلی کوشش میں
کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے گا اور آفتاب کی رہائی کے سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کرے گا۔ افضل جا
ہوا یا نہیں تاہم اس نے شہریار کے اس تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ا
کال سے فارغ ہونے کے بعد شہریار نے دفتر سے اُٹھنے کا فیصلہ کیا۔ آج ویسے ہی وہ لوگ معمول سے کا
وقت دفتر میں ٹھہر گئے تھے۔ دفتر سے اپنے بنگلے پہنچ کر وہ ابھی فریش ہی ہوا تھا کہ آئی جی مختار مراد کی کال ا

"تم بہت غیر محتاط ہوتے جا رہے ہو شہریار! آج تم نے چودھری کے خلاف جو کارروائی کی اسے
جذباتیت کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔" سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد انہوں نے اسے تنبیہہ کرنے وا
میں ٹوکا۔

"تو آپ تک اطلاع پہنچ گئی؟" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے لگا
"چودھری نے خود مجھے کال کی تھی اور تمہارے رویے کی شکایت کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیا تھا
تمہیں آئندہ اس طرح کی کوئی حماقت کرنے سے روکوں۔" انہوں نے کچھ ناراض سے لہجے میں بتایا۔

"وہ حماقت نہیں، میرا فرض تھا۔ چودھری نے ایک پُرامن شہری کو اپنی غنڈہ گردی کے بل پر غا



ہر ایک مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ مجھے اس غنڈہ گردی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لینا چاہئے تھا۔ آپ
یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایک شخص دن دہاڑے جرم کرتا ہے اور ہم قانون نافذ کرنے والے اداروں
رکھنے کے باوجود اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا
ہم نہ ہو جائے۔ میں اس ناانصافی کو نہیں مانتا۔ اگر میرے پاس چودھری سے لے کر اس کے ایک
زارع تک کسی کے خلاف بھی کمپلین آئے گی تو میں ضرور ایکشن لوں گا۔" وہ ایک دم ہی جھنجلاہٹ کا
یا تھا اس لیے مختار مراد کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

"تم غلط نہیں ہو لیکن یہاں سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ صحیح آدمی کو ہی زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔
جو ہوا، سو ہوا۔ میں نے چودھری کے سامنے تو تمہاری ہی حمایت کی تھی لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے
یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ آئندہ محتاط رہنا اور ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ لے لینا۔"
نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

"سوری انکل! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اصل میں اغوا ہونے والا اسکول ماسٹر آفتاب مجھے بہت عزیز
اس لیے میں میٹھلی کافی ڈسٹرب ہوں۔" اس کے نرم لہجے پر اسے اپنے رویے کا احساس ہوا تو فوراً ان
لت کی۔

کوئی بات نہیں۔ جوانی میں آدمی ایسا ہی جذباتی ہوتا ہے لیکن ہم بزرگوں کا فرض ہے کہ چھوٹوں کو جوش
ہوش سے کام لینے کی نصیحت کرتے رہیں۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ ان سے بات کرنے
شہریار خلافِ معمول جلد اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ آج اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور صرف
دودھ پر اکتفا کیا تھا۔ بیڈ روم میں آ کر وہ فوری طور پر سونے کے بجائے ایک کتاب کا مطالعہ کرنے
ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہونے کے باوجود اس کا ذہن مطالعے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بٹ ہی گیا۔ اس لیے
روم کی مکمل خاموشی میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا سا چونک گیا۔ موبائل اٹھا کر اس نے
پر آنے والا نام دیکھا۔ جگو کی طرف سے کال کی جا رہی تھی۔ اس نے جگو کو آج ہی کسی ایمرجنسی کی
میں رابطے کے لیے اپنا نمبر نوٹ کروایا تھا اور خود اس کا نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیا تھا۔ اب جو جگو
کی تو اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

ہیلو..... ہاں جگو! کیا بات ہے؟" لیس کا بٹن پش کرتے ہوئے اس نے جگو سے دریافت کیا۔

آپ کو اس وقت ڈسٹرب کرنے پر معافی چاہتا ہوں سر! مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ میں نے کارروائی
دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج رات ہی کچھ ہو جائے گا۔ آپ سے بس اتنی درخواست ہے کہ پولیس
ہدایت کر دیجئے گا کہ اگر پیر آباد سے کسی ہنگامے کی اطلاع آئے تو وہ اپنے کان بند کر کے بیٹھ جائیں۔
کا کام میرے ذمے ہے۔ وہ ہر حال میں ہو جائے گا۔"

میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم خیال رکھنا کہ کسی بے گناہ انسانی جان کو نقصان نہ پہنچے۔" شہریار نے
ہو کر اسے نصیحت کی۔

آپ فکر نہ کریں سر جی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" جگو نے اسے تسلی دی۔ اس سے بات کرنے کے بعد شہریار
پی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے احکامات جاری کئے۔ اس قسم کے احکامات کا ملنا ایس پی کے لیے کوئی نئی
تھی۔ اپنی مدتِ ملازمت میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا چنانچہ شہریار کو یقین دہانی کروائی کہ اس کے
ہوگا۔ دوسری طرف شہریار سوچ رہا تھا کہ آخر کار اسے سسٹم کے خلاف لڑنے کے لیے خود بھی ایک ایسا

طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا ہی پڑا جو کسی بھی طرح اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا لیکن جو جنگ ا
رہی تھی، اس میں کسی اصول پر عمل ہی کب کیا جا رہا تھا جو وہ اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔
نے بھی تو اسے انگلی ٹیڑھی کرنے کا ہی مشورہ دیا تھا چنانچہ اب وہ اس مشورے پر عمل پیرا تھا۔

⊛----✪----⊛

زخموں سے چُور آفتاب فرش پر پڑا سسک رہا تھا۔ اسے اتنی بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کہ
جسم کا کوئی حصہ زخم سے خالی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مارنے والوں نے اسے جی بھر کر مارا تھا اور کمال یہ تھا کہ
کے بدلے میں وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ مطالبہ نہیں آیا
انہیں کشور کا پتہ بتا دے۔ ان کے سوال نہ کرنے نے آفتاب کو مشکل سے بچا لیا تھا۔ یوں تو وہ کشور کا
بتانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا لیکن جس طرح کا تشدد اس پر کیا گیا تھا، وہ کوئی معمولی نہیں تھا۔ کیا
تشدد کے دوران کسی مقام پر اپنی برداشت کی حد سے گزر کر زبان کھول بیٹھتا لیکن جب سوال ہی نہیں
جواب دینے کی ضرورت ہی کیسے پیش آتی؟ مارنے والوں کے انداز سے اسے یہی اندازہ ہوا تھا کہ
کے حکم پر اس سے کچھ اُگلوانے کے لیے نہیں بلکہ اسے اس کے جرم کی سزا دینے کے لیے اذیت رسانی کر
ہیں اور یہ اذیت تو بہر حال اسے سہنی ہی تھی۔ چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی کی محبت کو قبول کرتے ہو
اپنے اس انجام کو دھیان میں رکھنا پڑا تھا۔ وہ شروع سے جانتا تھا کہ جب بھی چودھری پر اس کی اور کشور
کا راز آشکار ہوا، وہ ان دونوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ آج وہ چودھری کے اس قہر کو سہہ رہا تھا لیکن
تھی کہ کشور اپنے باپ کے ہاتھ نہیں لگ سکی ورنہ شاید اب تک وہ زندہ نہ ہوتی اور چودھری خود
اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ آفتاب کو اپنے اب تک زندہ ہونے پر بھی کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی
معلوم تھا کہ خود اس کا انجام بھی موت ہی ہے لیکن شاید چودھری نے کشور کے مل جانے تک اسے
مناسب سمجھا تھا کیونکہ وہی تھا جو اسے کشور کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

''کہو ماسٹر! کیا حال ہے؟ ہماری مہمان نوازی پسند تو آ رہی ہے نا یا پھر کوئی کسر باقی ہے؟'' ا
شدت سے بے حال آنکھیں بند کیے تکلیف کو برداشت کرتے آفتاب کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کب
دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ تو جب چودھری کی تمسخرانہ آواز کمرے میں گونجی تو وہ متوجہ ہوا
آنکھوں پر رکھا بازو بہ مشکل ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس بازو کو بھی بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا
اسے یہ معمولی سی حرکت دینے میں بھی اسے کافی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی۔

''ہر آدمی اپنے ظرف کے حساب سے دوسرے کو دیتا ہے چودھری صاحب! آپ نے ساری
ناانصافی کے ساتھ گزاری ہے چنانچہ آپ کے ملازم آپ کے حکم کی تعمیل میں اس شے کو بانٹنے میں کوئی
اٹھا رکھ سکتے ہیں..... لیکن اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس ظلم کے بدلے میں آپ مجھ سے اپنی مطلوبہ
حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی جان تو دے دوں گا لیکن
کھولوں گا۔''

چودھری کے طنزیہ سوالوں کے جواب میں اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں
قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر نفرت سے بولا۔ ''یہ تمہاری بھول ہے ماسٹر! کہ ہم تم سے کچھ ملوم کرنے کے لیے
تشدد کروا رہے ہیں۔ ہم اتنے مجبور نہیں ہیں کہ ایک معمولی سی گل معلوم کرنے کے لیے تمہارے محتاج



ے اس صحافی دوست کا پتہ ہم تک پہنچ گیا ہے۔ آج کی رات وہ اپنے جرم کی سزا بھی بھگت لے گا اور ہم
ائی جانے والی چیز بھی حاصل کر لیں گے۔ ہاں البتہ تمہارے لیے ہمارے پاس آسان موت نہیں ہے۔
ہم اسی طرح سسکا سسکا کر زندہ رکھیں گے تا کہ تم ہر سانس کے ساتھ یہ گل سمجھ سکو کہ چودھری افتخار عالم
عزت پر ہتھ ڈالنا کیسا بھیانک جرم ہے۔ اگر تمہیں اس سزا سے نجات حاصل کرنی ہو تو گڑگڑا کر خود ہی
وت کی دعا کرتے رہو۔ شاید موت کے فرشتے کو تم پر رحم آ جائے اور وہ تمہیں ہمارے قہر سے بچا کر لے
ا۔ اس کے علاوہ تو تمہارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے سارے ہمدردوں کو ہم ایک چٹکی
ا سکتے ہیں۔''

چودھری کی باتیں ہتھوڑے کی طرح آفتاب کے دماغ پر برس رہی تھیں۔ چودھری نے اس پر یہ شک تو
ی ظاہر کیا تھا کہ اس نے افضل کے ذریعے کشور کو گاؤں سے نکالا ہے، اب وہ افضل کا پتہ بھی حاصل کر چکا
ر آج رات اس کے گھر پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر چودھری کے کارندے افضل کے گھر پہنچ
تو وہ نہ صرف کشور کو پانے میں کامیاب ہو جاتے بلکہ افضل اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی کوئی کسی
م کا سلوک کر سکتے تھے۔ جہاں کشور کا اپنے ظالم باپ کی گرفت میں آ جانے کا خیال اس کے لیے سوہانِ
تھا، وہیں وہ افضل اور اس کے گھر والوں پر کوئی آنچ آنے کے خیال سے بری طرح مضطرب ہو گیا۔ اس کا
یں چل رہا تھا کہ کسی طرح افضل کو یہ اطلاع پہنچا دے تا کہ وہ کشور اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی محفوظ
پر منتقل ہو جائے مگر اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ تھا ہی کہاں؟ اپنا موبائل فون اس نے اسی وقت جیب سے
کر پھینک دیا تھا جب چودھری کے کارندوں نے اسے اغوا کیا تھا۔ موبائل میں کشور اور افضل دونوں کے
نمبرز فیڈ تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان نمبروں کے ذریعے کشور کو ٹریس کیا جا سکے۔ اُس کی اس احتیاط کے
د چودھری، کشور کا پتہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ اپنے موبائل سے محرومی کے باوجود بھی ناکام
ا۔ خیر موبائل ہوتا بھی تو اس وقت اس کی دسترس میں نہ ہوتا بلکہ اس کی مدد سے چودھری بہت پہلے کشور تک
چکا۔

''تیرا وہ ہمدرد اے سی بھی تیرے لیے وڈا بے قرار ہے۔ پولیس لے کر ڈیرے پر چڑھ دوڑا تھا، پر
رے کے ہتھ ککھ بھی نہ آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کو نمٹا کر آیا ہوں۔ تیرے نہ ملنے سے وڈا مایوس ہو کر
ا ہے۔ بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی یہاں سے جائے گا، پر اس واری میرا انتظام پکا
ا۔ میں اتنا کچا تو نہیں ہوں نا کہ بار بار دشمن کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کھل کھیلنے کا موقع دے دوں۔'' چودھری
لہجے میں شہریار کے لیے سخت نفرت تھی۔ دراصل اسے اپنی وہ ہزیمت بھولتی نہیں تھی جب شہریار تن تنہا اس
ڈیرے میں داخل ہو کر اس کے آدمیوں کو قابو میں کرنے کے بعد تہ خانے میں موجود خفیہ سیف سے اپنی وہ
ویریں نکال لے گیا تھا جنہیں چودھری نے بڑی منصوبہ بندی کے بعد حاصل کیا تھا۔

چودھری کی بات سن کر آفتاب کو خیال آیا کہ جب وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا
کوئی اسے ہاتھ پیروں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جا رہا ہو۔ یقیناً چودھری کو کسی ذریعے سے اطلاع مل
ی ہو گی کہ شہریار، آفتاب کی بازیابی کے لیے ڈیرے پر چھاپہ مارنے آ رہا ہے چنانچہ اس نے آفتاب کو منظر
ہٹا دیا۔ اب وہ جس کمرے میں تھا، وہ پہلے والے سے بالکل مختلف تھا۔ جس وقت اسے یہاں منتقل کیا گیا
اس کی حالت اتنی ردّی ہو رہی تھی کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت تک نہیں کر سکا اور اب چودھری کی
ت سن کر اس نے غور کیا تھا کہ اسے کہیں اور منتقل کیا جا چکا ہے۔ اب جانے یہ کمرہ ڈیرے میں تھا یا کہیں اور کسی

جگہ، خود اسے جہاں تک یاد پڑتا تھا اس کے مطابق تو اس نے انسانی بازوؤں کے علاوہ کسی اور شے پر
طے نہیں کیا تھا چنانچہ یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ڈیرے میں ہی کہیں ایسی جگہ موجود ہے جو خفیہ ہو
باعث پولیس والوں کی نظر میں نہیں آ سکی۔ اس سارے حساب کتاب میں گم وہ گھنٹی بجنے کی آواز پر
چودھری کے موبائل فون کی گھنٹی تھی۔

''ہاں بالے! بول کیا گل ہے؟'' چودھری نے کال ریسیو کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں پوچھا اور
طرف کی بات سننے لگا۔

''تیرا یار کہیں ایسے ہی بڑھک تو نہیں مار رہا؟ اپنا کمیشن بنانے کے چکر میں بھی حرام خور مال کو بڑھا
کر بتا سکتا ہے۔ تجھے علوم ہے آج کل میرا مزاج وڈا بگڑ ہوا ہے، کوئی ایسی ویسی چیز سامنے آ گئی تو متھا
گھوم جائے گا۔'' وہ جانے کس شے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، آفتاب اندازہ نہیں لگا سکا۔

''چل تُو کہتا ہے کہ سوہنا آئٹم ہے، ہور تُو میرا موڈ صحیح کرنے کے لیے ہی اسے یہاں لا رہا ہے تو
دیکھ لیتا ہوں۔ اج رات ویسے ہی میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑنے والی ہے۔ چنگا ہے کہ پہلے ہی جشن کا بندوبست
ہو جائے۔'' چودھری کے الفاظ سے اب اسے کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی عورت کے بارے میں بات
کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کوئی طوائف ہو گی جسے اس کے کارندے نے اپنے آقا کی دل بستگی کے لیے تلاش کیا ہو گا
اپنی عزت، اپنی بیٹی کے لیے اتاولے ہو جانے والے چودھری کا یہ دہرا معیارِ زندگی آفتاب کے اندر تک کھل
گیا۔ اپنے نفس کو کسی آوارہ کتے کی طرح آزاد چھوڑ دینے والا چودھری اپنی بیٹی کو اس کا جائز حق تک دینے
لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ حقوق ادا کرنے والا آدمی ہوتا تو آج اس پر یہ وقت ہی نہیں آتا کہ اس کی بیٹی حویلی
چوکھٹ پھلانگنے پر خود کو مجبور پاتی۔ کشور نے جو بھی قدم اٹھایا تھا، اس کے پیچھے اس کی مکمل خوشی تو بہر حال
تھی۔ وہ بھی ہر لڑکی کی طرح عزت سے بیاہے جانے کے خواب دیکھتی تھی لیکن جس کے ذمے یہ کام تھا اس
نے فرسودہ رسموں اور اپنے مفاد کو بیٹی کے جذبات پر مقدم جانا تھا اور آج نتیجے میں تلملاتا پھر رہا تھا۔

''چل بھئی ماسٹر! میں تو چلا عیش کرنے۔ تجھ میں ہمت ہوئی تو میں بالے سے کہہ دوں گا کہ تیری
رات تھوڑی ہور خاطر شاطر کر دے ورنہ تو خیر مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تجھے میں لمبے عرصے کے لیے
مہمان رکھوں گا۔ فیر تیری خاطریں ہوتی رہیں گی۔'' ہوس پرست چودھری کا موڈ ''نئے مال'' کا سن کر خاصا
خوشگوار ہو گیا تھا چنانچہ وہ لہک کر کہتا ہوا وہاں سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آفتاب کے پاس تنہائی میں ڈسنے والے اندیشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ وہ پہلے
ہی اندازہ لگا چکا تھا اور اب چودھری نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ اسے ایک بار کے بجائے
آہستہ آہستہ سسکا سسکا کر مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج دوپہر اسے خوراک کے نام پر
دلیے کی آدھی پیالی زبردستی کھلائی گئی تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ خوراک کی یہ معمولی مقدار اس کے جسم کو مطلوبہ توانائی
فراہم نہیں کرے گی لیکن اس کی وجہ سے جسم و جاں کا رشتہ اس طرح جڑا رہے گا کہ وہ خود اپنے مرنے کی دعا
کرے گا۔ ایک طرف اس کے سامنے اپنا یہ لرزا دینے والا انجام تھا تو دوسری طرف کشور، افضل اور اس کے
اہلِ خانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ سب اسے بے حد عزیز تھے اور ان میں سے کسی کو بھی گزند پہنچتی تو وہ بے
تکلیف محسوس کرتا اور یقیناً اس تکلیف کی شدت اس جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہوتی جو اسے چودھری کی
قید میں اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ افضل جیسے جاں نثار دوست اور کشور جیسی محبوب بیوی کو کوئی نقصان پہنچنے کا خیال
سوہانِ روح تھا اور یہاں تو چودھری صاف اپنے عزائم کا اظہار کر کے گیا تھا۔ اس کا اعتماد اور یقین دیکھ کر اندازہ



تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس کے لیے پورا بندوبست کر چکا ہے۔ یہ بری گھڑی ٹل جائے اور
اپنے ارادوں میں ناکامی حاصل ہو، اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آفتاب کے پاس دعا کے
چارہ نہیں تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی رب العالمین کو پکارنے لگا کہ کسی طرح اس
کو ٹال دے اور ظالم کی چال خود اس پر ہی اُلٹ دے۔ ہوش اور نیم بے ہوشی کے دوران اسی طرح
تے ہوئے کتنا وقت گزر گیا، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا، تب اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ وہ بہت دُور سے سنائی دینے
والی آوازیں تھیں جو کسی پُر ہنگام جگہ پر شاید اسے سنائی بھی نہ دیتیں لیکن اپنے قید خانے کی تنہائی میں اسے
یں سنائی دے گئیں۔ وہ کان لگا کر غور سے ان آوازوں کو سننے لگا۔ یک دم اُسے ادراک ہوا کہ وہ
کی آواز تھی۔ کہیں مسلسل اور لگاتار فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور یوں لگتا تھا کہ دو گروہ آپس میں متصادم
چودھری کی عمل داری میں ہونے کی وجہ سے اسے یہ تو سمجھ آ گیا کہ لڑنے والوں میں سے ایک گروہ
کے گرگوں کا ہو گا۔ لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں وہ اچنبھے کا شکار تھا۔ چودھری کے علاقے میں
باقاعدہ اس کے بندوں سے مقابلہ کرنا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اردگرد کے جتنے بھی
اور جاگیردار تھے، وہ چودھری سے دبتے تھے اور ان میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے خلاف
اٹھا سکیں۔ اب دوسرا امکان یہ تھا کہ پولیس نے اپنی دن والی ناکامی کے بعد رات کو ایک بار پھر چھاپہ
لیکن یہ بھی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ شہریار لاکھ اس کو پسند کرتا لیکن اوپر والوں کو جواب دہی کی تلوار تو
سر پر بھی لٹکتی رہتی تھی۔ ایک بار ڈیرے پر ریڈ میں ناکام ہونے کے بعد وہ بھلا کس چیز کو جواز بنا کر
پولیس فورس کے ساتھ وہاں چڑھائی کر سکتا تھا۔ تذبذب میں مبتلا آفتاب کان لگائے فائرنگ کی آوازیں
رہا۔ آخر اسے احساس ہوا کہ فائرنگ کی شدت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کار آہستہ آہستہ فائرنگ کا
رک گیا اور کچھ دیر کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ پھر کچھ دیر بعد اس خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔
کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور باتیں کرنے کی آوازیں تھیں جنہیں وہ تقریباً اپنے سر پر محسوس کر رہا
ان آوازوں کو سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہے، یعنی اسے ایک تہ خانے سے نکال کر
تہ خانے میں ہی منتقل کیا گیا تھا۔ آوازوں کے سنائی دینے کے بعد اسے بہت دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ
تھے جو پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں اس تک آ پہنچے تھے۔

''تم ماسٹر آفتاب ہو؟'' آنے والوں میں سے ایک نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں وہ محض
میں گردن ہی ہلا سکا۔

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔'' اس کی طرف سے اثبات میں جواب پا کر اس شخص نے بتایا اور پھر آفتاب کی
کو دیکھتے ہوئے خود ہی اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارے سے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اس کا
ساتھی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آفتاب کی ٹانگوں پر ہاکی کی مدد سے اتنی ضربیں لگائی گئی تھیں کہ وہ
ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لیے غیبی امداد بن کر آنے والے دونوں افراد تقریباً اسے اٹھا کر ہی اپنے
لے جا رہے تھے۔ کمرے سے نکلنے کے بعد وہ لوگ ایک سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ راستہ چند
سے زیادہ طویل نہیں تھا جس کے اختتام پر ایک کھلا ہوا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس راستے سے گزر کر وہ لوگ
طرف پہنچے تو اس نے خود کو ایک اسٹور نما جگہ پر پایا۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ
کاٹھ کباڑ کو یہاں پھینکنے کے لیے آنے کے علاوہ کوئی اس جگہ کا رخ بھی نہ کرتا ہو گا۔ وہ لوگ اس اسٹور نما

PAKISTANIPOINT

جگہ سے باہر آئے تو آفتاب کو شناسائی کا احساس ہوا۔ یہ وہی وسیع تہ خانہ تھا جس کے ایک کمرے میں اسے
کر کے لانے کے بعد رکھا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ تہ خانے سے متصل ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی
گیا تھا۔ باہر سے کوئی بھی فرد آتا تو وہ بیرونی تہ خانے کو دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا۔ شہریار کا پولیس کے
کروایا گیا ریڈ اسی لیے ناکام ہو گیا تھا کہ پولیس والوں نے اوپر ڈیرے کی عمارت دیکھی اور پھر نیچے تہ خانے
تلاشی لے کر چلے گئے۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے اسٹور روم میں موجود خفیہ راستے، سرنگ اور پھر اس کے
جڑے دوسرے تہ خانے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف
اس خفیہ تہ خانے کو دریافت کر لیا تھا بلکہ اسے رہائی دلوا کر اپنے ساتھ بھی لے جا رہے تھے۔ وہ ان لوگوں
ان کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا لیکن وہ جتنی خاموشی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اس کو دیکھتے ہوئے اندازہ
رہا تھا کہ وہ شاید ہی اس کے کسی سوال کا جواب دیں۔ ویسے بھی وہ جتنی عجلت میں تھے، ان سے کسی سوال
گنجائش نکلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اسے اُٹھائے اُٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر کھلے حصے میں آ گئے۔ اس حصے میں آتے
آفتاب کی نظر زمین پر گرے دو افراد پر پڑی۔ ان دونوں کے لباس خون آلود نظر آ رہے تھے اور حتمی طور پر
مشکل تھا کہ وہ مُردہ ہیں یا پھر صرف زخمی ہوئے ہیں البتہ اس نظارے نے اسے یہ ضرور باور کروا دیا تھا کہ
ٹھیک ٹھاک معرکہ ہوا تھا جس میں چودھری کے کارندے کام میں آ گئے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ سارا
ایک اس کی ذات کے لیے کیا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے غیبی امداد بن کر آنے والے یہ
ہیں؟ وہ ان سے یہ سوال کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ خود بڑی افراتفری میں نظر آ رہے تھے۔ اسے
آدمیوں کے ساتھ تہ خانے سے باہر آتے دیکھ کر احاطے میں اِدھر اُدھر بکھرے افراد نے تیزی سے گاڑیاں
بیٹھنا شروع کر دیا۔ آفتاب کو بھی انہوں نے ایک آرام دہ گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے
اگلی نشست پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جبکہ آفتاب کے ساتھ پچھلی نشست پر اسے اپنے ساتھ تہ خانے سے
آنے والوں میں سے ایک براجمان ہو گیا تھا۔

''اس کی مرہم پٹی کر کے کوئی سکون کی گولی کھلا دے شہزاد! بے چارے کی حالت خراب ہے، اسے
سفر میں تکلیف اور بھی بڑھ جائے گی۔'' گاڑی اسٹارٹ ہو کر ابھی احاطے سے نکلی ہی تھی کہ اگلی نشست پر
شخص نے آفتاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس
اس کے حکم کی پیروی کرنے لگا۔ گاڑی بے حد شان دار تھی چنانچہ تیز رفتاری سے گاڑی کے کچے پکے راستوں
گزرنے کے باوجود اسے اتنے جھٹکے نہیں لگ رہے تھے کہ شہزاد نامی شخص کو اپنے کام میں دشواری پیش آتی
نے پہلے آفتاب کو سکون آور گولی کھانے کے لیے دی اور پھر اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم
لگا۔ جب تک وہ اس کام سے فارغ ہوا، وہ لوگ گاؤں کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر آ چکے تھے۔
پر پہنچنے کے بعد گاڑی کی رفتار بالکل ہموار ہو گئی اور وہ جو اِکا دُکا جھٹکے لگ رہے تھے، ان سے بھی نجات مل
سبک رفتاری سے چلتی اس گاڑی کی ٹھنڈی فضا میں کب وہ نیند کی آغوش میں جا پہنچا، خود اسے بھی خبر نہ ہو

⊛----✪----⊛

شہریار کے موبائل کی گھنٹی علی الصباح بجی۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا۔ کال جگو کی طرف سے
تھی۔ اس نے فوراً ریسیور کا بٹن پش کر دیا۔

''آپ کا کام ہو گیا ہے سر جی! آپ کا بندہ چودھری کی قید سے چھڑا لائے ہیں ہم لیکن بے چارہ



حالوں میں اس لیے میں اسے سیدھا اپنے ساتھ لاہور لے آیا ہوں اور یہاں اپنی جان پہچان کے
پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔ سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا
ہیں ٹانگوں اور ایک ہاتھ میں فریکچر بھی ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ بہت لمبے عرصے تک بستر سے اُترنے
ل نہیں ہو سکے گا۔'' اُس کی ''ہیلو'' سنتے ہی جگو نے اسے رپورٹ پیش کرنا شروع کر دی جسے سن کر اس
ان کا سانس لیا۔ بے شک آفتاب شدید زخمی حالت میں ملا تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ وہ چودھری کی قید
ہ واپس آ گیا تھا۔ ورنہ اسے جس جرم کے بدلے اغوا کروایا گیا تھا، اس کے بعد تو اسے مسلسل یہی خدشہ
تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہو گا یا نہیں۔

''تھینک یو جگو! تم نے میرا بہت بڑا کام اتنے کم وقت میں کر کے کارنامہ انجام دیا ہے۔'' اس نے تہ
جگو کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا مجھ پر احسان ہے اے سی صاحب! آپ نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچا کر مجھے خر
ہے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اس ایک کام کو کر کے میں نے آپ کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔ میں ساری ز
لیے آپ کا خادم ہوں۔ آپ جب ضرورت محسوس کریں، مجھے یاد کر سکتے ہیں۔ جگو کبھی آپ کو ''نہ'' نہ
گا۔'' جگو نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر وہ اللہ کے انوکھے نظام پر ششدر
یا۔ ایک بندہ جو کہ غنڈہ تھا اور اپنی سیاسی جماعت کے حکم پر ہر جائز ناجائز کام کرتا پھرتا تھا، جس کے
ہی رشتے دار اس سے خوف زدہ رہتے تھے، کس طرح اس کا تابع ہو گیا۔ ایک معمولی سے احسان نے جو
ے احسان سمجھ کر کیا بھی نہیں تھا بلکہ اپنی دانست میں تو ایک انسانی فریضہ انجام دیا تھا، جگو کو خرید لیا تھا۔ شاید
ی کی راہ پر چلنے والوں کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہے۔

''یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کہ تم ایسا سوچتے ہو۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس واقعے کا احسان نہیں ج
زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ایک بیمار بچے کو بروقت ہسپتال پہنچانا میرا انسانی فرض تھا۔ بہرحال
تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم اسے احسان جانو ورنہ میری طرف سے کوئی جبر نہیں۔ ہاں اگر تم میرے کہنے پر
میرا کوئی کام کر دو گے تو یہ اطمینان رکھنا کہ وہ بھلائی کا ہی کام ہو گا۔ میں تمہیں تمہاری سیاسی جماعت
لوگوں کی طرح اپنے کسی ناجائز مفاد کے لیے ہرگز بھی استعمال نہیں کروں گا۔'' شہریار نے صاف گو
مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے سر! اور میں خوش بھی ہوں کہ میری گناہوں سے بھری زندگی میں بھی آپ کی بدولت
ایسے اعمال جمع ہو جائیں گے جنہیں میں نیکی کہہ کر اپنے رب کے حضور لے جا سکوں۔'' جگو کی آواز میں
پن تھا جو کسی پتھر دل پر ضرب لگنے پر لہجے میں اُترتا ہے۔

''خیر، ابھی تم ان باتوں کو جانے دو اور فی الحال تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کارنامہ انجام کیسے دیا؟
ے سے ناکام آ گئے تھے۔ تم نے چودھری کا دوسرا ٹھکانہ کیسے تلاش کر کے وہاں سے آفتاب کو آزاد کروا
گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے شہریار نے واقعے کی تفصیل جاننا چاہی۔

''میری کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ میں چودھری کی فطرت کو سمجھتا ہوں۔ ایک تو پیر آباد اور میرا گاؤں قر
نے کی وجہ سے میں پہلے ہی اسے کافی جانتا تھا پھر آپ کی طرف سے کام ملا تو میں نے اپنے ذریعے
تھوڑی سی معلومات اور کروا لیں۔ چودھری کے بارے میں معلوم پڑا کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے بس تو پھر
آسان ہو گیا۔ ایک اسٹیج ڈانسر ہے نیلی..... بڑی طرح دار ہے اور ہمارے کہنے پر ہمارے لیے کام کرتی

ہے۔ میں نے اسے اپنے ایک ذریعے سے اسے چودھری کے خاص گرگے بالے تک پہنچا دیا۔ بالے نے اسے اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس کے بعد تو نیلی کے لیے چودھری سے کچھ اُگلوا لینا مشکل ہی نہیں تھا۔ چودھری کو شراب اور شباب کے نشے میں ڈبو کر اس نے سب معلوم کر لیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک موبائل فون لے گئی تھی جس کو اس نے آن رکھا تھا۔ ادھر چودھری اُگلتا گیا، اُدھر ہم سنتے رہے۔ بندے تو میں نے پہلے ہی تیار کر رکھے تھے، جیسے ہی معلوم ہوا کہ اس نے ماسٹر کو کہاں رکھا ہوا ہے، میں اپنے بندے لے کر روانہ ہو گیا۔ نیلی کو بھی اندازہ تھا کہ ہم وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے اس لیے وہ پہلے ہی چودھری سے رخصت لے کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ خود چودھری بھی حویلی واپس چلا گیا تھا۔ بعد میں ڈیرے پر جو مارا ماری ہوئی، اس کے بارے میں تو آپ کو خود ہی رپورٹ مل جائے گی۔'' جگو نے اسے تفصیل سنائی۔

''اس کا مطلب ہے آفتاب، ڈیرے پر ہی تھا پھر پولیس اسے کیوں تلاش نہیں کر سکی؟'' جگو کی رپورٹ سن کر وہ حیرت سے بولا۔

''پولیس کا اس میں زیادہ قصور نہیں۔ اگر نیلی نہ ہوتی تو ہم بھی ڈیرے سے ناکام ہی واپس آتے۔ یہ نیلی کی وجہ ہمیں یہ معلومات مل گئی تھیں کہ چودھری نے تہ خانے کے ساتھ ایک اور نیا خفیہ تہ خانہ بنوایا ہے۔ شاید کچھ عرصہ پہلے کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جب کوئی تہ خانے کے خفیہ سیف سے کچھ چرا کر لے گیا تھا اور تہ خانے میں آگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد چودھری نے جب پرانے تہ خانے کی مرمت کروائی تو ساتھ ہی ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی بنوا ڈالا۔ آفتاب کو اس نے اسی نئے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔'' جگو نے اس کی حیرت دور کی۔

''او کے جگو! تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا اور ساری اُلجھنیں بھی دور ہو گئیں۔ اب تم ایسا کرو کہ مجھے اس ہسپتال کا نام پتہ لکھوا دو جہاں تم نے آفتاب کو ایڈمٹ کروایا ہے اور خود آرام کرو۔ رات بھر تم نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے اس لیے اب آرام ضروری ہے۔'' سب جان لینے کے بعد اس نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا تو اس نے بنا تامل اسے ہسپتال کا پتہ بتانے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ شہریار کو اسے یہ باور کروانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس بارے میں کسی اور کو خبر نہ ہونے دے۔ جگو جس نظام کا حصہ تھا، وہاں ایسی احتیاطیں اور رازداریاں تربیت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ خود وہ جگو کی کال سے فارغ ہونے کے بعد فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا آج کا دن بہت مصروف گزرنے والا ہے۔ آخر چودھری افتخار عالم شاہ کے ڈیرے پر حملہ ہوا تھا اور ضلع پولیس خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ اب تک تو اس واقعے کے خلاف چودھری نے جانے اپنے کتنے جاننے والے اعلیٰ عہدیداروں کو شکایت نوٹ کروا دی ہو گی۔ آج کا دن شہریار کو چودھری کے ان سارے ہمدردوں کو بھگتانا تھا۔

⊛----✪----⊛

سرخ و سنہری خوبانیوں سے لدے درخت، کھیتوں میں ہل چلاتی زوہ کی جوڑی، پانی کا مٹکا سر پر اٹھائے بے وجہ ہنستی ہوئی گھروں کی طرف جاتی لڑکیاں، اِدھر اُدھر آوارہ کھیلتے بچے۔ وہ راستے میں پڑنے والے ہر ہر منظر کو ایک عالمِ حیرت میں دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی سیاہ چمک دار آنکھیں یوں نیم وا تھیں جیسے وہ خواب کی کیفیت میں ہو۔ حقیقت میں اسے یہ خواب ہی تو لگتا تھا اور کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ، صحیح سلامت ان مناظر سے گزر رہی ہے۔ وہ فان کی راہنمائی میں اس برف زار سے جس میں اسے لگتا تھا کہ اس نے صدیاں بھٹکتے ہوئے گزار دی ہوں، نکل آئی تھی لیکن ابھی سفید چمکتی برف کا



س اور تند ہواؤں کی یخ بستگی اس کے ذہن پر نقش تھی۔ بدن موسم کی ان شدتوں سے رہائی پانے کے باوجود ی تک ٹھٹھرا ہوا تھا۔ اس کا ذہن حقیقت کو بھی حقیقت مانتے ہوئے ڈر رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ شاید وہ ا برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سو گئی ہے اور سوتے میں یہ سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔ ہنستے مسکراتے انسانی چہرے، یہ لہلہاتے کھیت، زندگی کا جاری کاروبار سب ہی تو خواب لگتا تھا۔ وہ عمران کے ساتھ اپنے قید خانے سے بھاگ نکلنے کے بعد مسلسل ان سب مناظر میں پہنچنے کے لیے سرگرداں رہی تھی اور اب پہنچ گئی تھی تو لگتا تھا کہ اپنی ہی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔ فان اُس کی اس حالت کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا چنانچہ اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے مسلسل باتیں کرتا رہتا۔ راستے میں پڑنے والے ہر منظر، ہر مقام کے بارے میں اسے آگاہ کرتا رہتا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ اُس کی باتوں کا کتنے فیصد حصہ سمجھ رہی ہے اور کتنا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا جا رہا ہے۔ اس کی یہ محنت بالکل رائیگاں نہیں گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ماہ بانو اس پر اعتماد کرنے لگی تھی اور اس نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات کی مختصر روداد اسے سنا ڈالی تھی چنانچہ جب وہ لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں سے گزرنے کے بعد اسکردو پہنچے تو فان اسے کسی ہوٹل میں ٹھہرانے کے بجائے اپنے ایک واقف کار کے گھر لے گیا۔ اس کا یہ واقف کار فوج سے ریٹائرڈ تھا اور اب اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہا تھا۔ فان اور ماہ بانو اس کی رہائش گاہ پر پہنچے تو اس نے گرم گرم قہوے اور خشک میووں سے ان کی خاطر مدارات کی۔ پھر چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر آئے ہوئے اپنے ایک دوست کے بیٹے کو جو کہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا، بلا کر ماہ بانو کا پیر دکھایا جو کافی دیر تک برف میں کھلا رہنے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔

''باقی پیر تو ٹھیک ہے لیکن یہ درمیانی انگلی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ مناسب علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے۔'' معائنے کے بعد میڈیکل کے اس طالب علم نے اعلان کیا۔

فان اس بات کا پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔ لہٰذا کہنے لگا۔

''اس کام کے لیے تو ہسپتال ہی جانا پڑے گا۔ تمہارا معائنے کے لیے آنے کا بہت بہت شکریہ بیٹے!'' فان کے واقف کار نے اپنے دوست کے بیٹے کو رخصت کر دیا۔

''ہسپتال جانے سے پہلے میں اس لڑکی کو کسی ذمے دار شخص سے ملوانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم اپنی آرمی کی سابقہ ملازمت کی وجہ سے اس کام میں ہماری بہتر مدد کر سکو گے۔ اصل میں یہ لڑکی کچھ ایسی باتیں جانتی ہے جن کا کسی عام فرد کے علم میں آنا شاید تمہارے ملک کے لیے نقصان دہ ہو اور خود یہ بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔'' فان بہت زیرک آدمی تھا۔ پاکستان کا باشندہ نہ ہونے کے باوجود وہ صرف یہاں کئی بار آنے کی وجہ سے یہاں کے ماحول کو سمجھتا تھا اس لیے پوری احتیاط برت رہا تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنے واقف کار کو بھی سارے معاملے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا اور صرف یہ چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو کسی محفوظ ہاتھ تک پہنچا دے۔

''اگر معاملہ اتنا ہی حساس ہے تو پھر میرے خیال میں، میں تمہیں اپنے بھتیجے سے ملوا دیتا ہوں۔ وہ آرمی انٹیلی جنس میں میجر کے عہدے پر کام کر رہا ہے اور آج کل یہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کی بہتر مدد کر سکے گا۔'' ان کے میزبان نے انہیں بتایا اور پھر اپنے بھتیجے کو فون کرنے چلا گیا۔

''میں نے فون کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ دو گھنٹے بعد یہاں آ سکے گا۔ اس کے آنے تک تم دونوں آرام کر سکتے ہو۔'' واپس آ کر اس نے انہیں اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ایک پُرکشش پیشکش بھی کی۔ لمبی مسافت طے کر کے آنے والے ان مسافروں کو آرام سے بہتر کیا لگ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے میزبان

کے فراہم کردہ آرام دہ بستروں میں محوِ استراحت تھے۔ ماہ بانو کو کسی گھر کی چار دیواری میں آرام دہ بستر پر سونے کا موقع بہت عرصہ بعد میسر آیا تھا۔ وہ تو گویا ایسی کسی عیاشی کے تصور سے بھی تقریباً مایوس ہی ہوگئی تھی۔ چنانچہ اب جو یہ سہولت میسر آئی تو بے ساختہ ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ نرم و ملائم بستر کی آغوش میں نیند کی وادیوں میں اترتے ہوئے اس کے ذہن میں تواتر سے قرآن کی یہ آیت گونجتی رہی۔

''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

وہ تو ان تمام معاملات پر اور ایسی مشکل گھڑیوں میں اپنے رب کی نعمتوں سے سرفراز ہوئی تھی کہ جس کا تصور ہی محال تھا۔ نوازے جانے کے اس احساس کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے وہ اس پُرسکون نیند میں ڈوبی کہ پھر فان کے پکارنے پر ہی جاگی۔

''میجر ذیشان آ گیا ہے اور تم سے ملاقات کا منتظر ہے۔'' اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو فان نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر اس نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور لباس کی سلوٹیں دور کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ یہ لباس اسے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے فان نے ایک محنت کش عورت سے خرید کر دیا تھا۔ وہ اچھا آدمی تھا اور بہت ترقی یافتہ لیکن ایشیائی ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے شاید اس میں مشرق کی یہ ادا موجود تھی کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بے نیازی سے شانے اچکا کر گزر جانے کے بجائے ممکنہ حد تک اس مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ ماہ بانو کم از کم اس کے مہربان رویّے کی یہی توجیح کر سکی تھی لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ فان فطرتاً ایک اچھا آدمی تھا۔ آدمی فطرت سے اچھا ہو تو پھر مشرق و مغرب کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور خراب فطرت اچھے سے اچھے ماحول میں بھی اپنا رنگ دکھا جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سڑک پر حادثے کا شکار ہو کر بے ہوش ہو جانے والے آدمی کی جیب سے اس کا بٹوہ اور موبائل فون نکالے جانے کے مناظر ہمارے ہاں کیونکر دکھائی دیتے؟

''السلام علیکم!'' سنجیدہ چہرے والے مدبر سے میجر کے سامنے پہنچ کر ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بیٹھیں بی بی! اور مجھے بتائیں کہ آپ ایسا کیا جانتی ہیں جس کا کسی انٹیلی جنس کے بندے کے علم میں لایا جانا ضروری ہے۔ لیکن پلیز! ذرا وقت کا خیال رکھ کر مختصر بات کیجئے گا۔ میں بہت مصروف ہوں اور زیادہ دیر یہاں نہیں رُک سکوں گا۔'' وہ یقیناً اپنے چچا کی مروّت میں ہاں تک آ گیا تھا لیکن اس بات کے لیے بھی فکرمند تھا کہ اس کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت اختصار سے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔ واقعات سناتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ میجر جو کافی بے دلی سے یہاں تک آیا تھا، اب اس کی داستان میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور بہ غور اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ کئی جگہ پر اس نے دخل اندازی کرتے ہوئے ماہ بانو سے سوالات بھی کیے۔ نتیجتاً اختصار کی ہدایت کے ساتھ شروع کی جانے والی گفتگو خاصا طول کھینچ گئی۔ اس عرصے میں فان اپنے میزبان کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا شطرنج کھیلتا رہا تھا۔ میجر کی خاطر مدارات کے لیے ایک بار قہوے کے ساتھ نمکین کا جو اور بسکٹ پیش کرنے کے لیے آنے کے سوا ان دونوں کی گفتگو کے دوران کوئی کمرے میں نہیں آیا تھا۔

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ جہاں میں تمہیں لے کر جاؤں گا، وہاں تمہارا بیان بھی ریکارڈ ہوگا اور میں تمہاری ایک ایسے شخص سے ملاقات بھی کراؤں گا جسے دیکھ کر تم یقیناً خوشی محسوس کرو گی۔'' گفتگو کے اختتام پر میجر نے اس سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر اپنے چچا کو آواز دینے لگا۔

''میں اس خاتون کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' چچا کے سامنے آنے پر اس نے اسے مطلع کیا۔

''کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں دم کا گوشت بنا رہا تھا جو تمہیں بہت پسند ہے۔''



''پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے جلدی ہے۔ اس لڑکی کے علاج اور کھانے پینے کا انتظام بھی میں خود ہی کر دوں گا۔'' اس نے عجلت میں جواب دیا اور ماہ بانو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وہ سمجھتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔ ذاتی سامان تو اس کے پاس کچھ رہا نہیں تھا کہ اسے سمیٹنے کی فکر ہوتی۔ ایک اجنبی کے ساتھ جانے میں کچھ تامل تھا لیکن پھر اس نے اپنے ہر اندیشے کو جھٹک ڈالا۔ اب تک اس کی زندگی میں آنے والے بیشتر اجنبی اس کے لیے مددگار ہی ثابت ہوئے تھے اور اگر کہیں کسی نے مشکل کھڑی کرنے کی کوشش بھی کی تھی تو اللہ رب العزت تھوڑی سی آزمائش کے بعد اسے اس مشکل سے نکال لایا تھا۔ پھر کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ بہت زیادہ فکر اور اندیشے پالتی۔ وہ تھا نا اس کا مددگار جس کا سہارا اور ساتھ ہر اندیشے سے بڑھ کر قابل بھروسہ تھا۔

⊛----✪----⊛

''یہ سب کیا ہو رہا ہے شہریار! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اس طرح تو تم اپنے لیے بہت زیادہ مشکلات کھڑی کر لو گے۔ چودھری بہت غضب ناک ہے۔ اس کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ چار اچھے خاصے زخمی ہیں۔ وہ ہر طرف شکایتیں کرتا پھر رہا ہے کہ اس کے ڈیرے پر شب خون مارا گیا اور کہیں سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔'' یہ مختار مراد تھے۔ اس کے لیے پریشان، فکرمند اور اپنائیت کے ساتھ خفا ہوتے۔

''کارروائی کیسے ہوتی انکل! جس وقت چودھری کے ڈیرے پر حملہ ہوا، اتفاق سے پولیس اسٹیشن کا فون پڑا ہوا تھا۔ ایس پی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور میں تھے اور میں ان کی خرابی کی وجہ سے ملازمین کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت کر کے جلدی سو گیا تھا۔ اب ہم ان سارے حالات کو چودھری صاحب کی بدقسمتی کہہ کر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے مختار مراد کو جواب دیا۔

''تم جانتے ہو کہ یہ ساری کہانیاں سنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں عمر گزاری ہے اور میں اس طرح کے سارے کھیل تماشوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔'' اس کا جواب سن کر انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔

''میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ ہر بات اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن آپ بتائیں کہ کیا اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا حل تھا؟ ابھی بھی آفتاب جس حالت میں ہمیں ملا ہے، وہ نہایت قابل افسوس ہے۔ اتنا تشدد تو پولیس والے بھی کسی خطرناک مجرم سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے نہیں کرتے جتنا اس پر کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن اور گزر جاتا تو وہ بے چارہ اپنی جان سے جاتا۔ اور آپ یقین کریں کہ آفتاب جیسے مخلص، محنتی اور دیانت دار آدمی کی زندگی چودھری کے ان پٹھوؤں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو اپنے مالک کے حکم پر کمزور اور نہتے لوگوں پر ظلم ڈھاتے پھرتے ہیں۔'' اس بار اس نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''تمہاری جذباتیت تمہیں بہت نقصان پہنچائے گی شہریار!'' مختار مراد نے بے بسی سے اسے تنبیہہ کی۔

''نقصان اٹھاتے ہوئے مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میرے جذبات نے کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''میں رانا صاحب کی وجہ سے تمہیں احتیاط کی نصیحت کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی صاحبِ فراش ہیں اور آج کل

عملی طور پر سیاست کے کاموں میں حصہ نہیں لے پا رہے ہیں۔ اس لیے ان تک زیادہ خبریں بھی نہیں تاب کے صحافی دوست افضل کے سامنے گزرنے والے حادثے کی اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی۔ افضل لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تم کھلم کھلا چودھری سے جنگ شروع کر چکے ہو تو وہ بہت پریشان ہو جا بچوں کو رات کی تاریکی میں جس طرح موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا، وہ نہایت افسوس ناک تھا اور وہ نرمی سے اسے حالات کا احساس دلانے لگے۔

ذہن میں قاتل کے طور پر چودھری کا نام آ جاتا تھا۔ بے شک یہ قتل اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں کیے

''آپ فکر نہ کریں انکل!..... اگر ماموں جان سے بھی کبھی اس موضوع پر بات ہو تو انہیں تیکن حکم تو اسی کا ہوگا۔ ابھی اس کی افضل سے براہِ راست بات نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس واقعے پر اس چودھری کی مخالفت سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا۔ چودھری کوئی خدا نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے بارے میں آگاہ نہیں تھا۔ اس نے عبدالمنان کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب بھی ممکن ہو، اس کا افضل زندگی اور موت کا فیصلہ ہو۔ ہاں اگر اس لڑائی میں میری موت لکھی ہے تو پھر کسی بھی تدبیر سے اسے ہ رابطہ کروا دیا جائے لیکن شاید اپنی بیوی بچوں کی آخری رسومات میں مصروف غم سے نڈھال افضل نے سکے گا۔ اب بھی آپ دیکھ لیں کہ چودھری صرف بلبلانے اور اِدھر اُدھر فون گھمانے کے علاوہ کیا کر سکے بچنے کے لیے اپنا موبائل ہی آف کر رکھا تھا اس لیے متعدد بار کوشش کرنے کے باوجود اس سے وہ تو کسی ایسے شخص کا نام بھی نہیں لے سکا جس پر اسے شک ہو کہ اس نے یہ حملہ کروایا ہے۔ کم از کم ہمیں ہو سکا تھا۔ افضل سے رابطہ ہو جاتا تو وہ اس کے ساتھ گزرنے والے حادثے پر تعزیت کرنے کے کسی صورت نہیں لے سکتا۔ اگر لے گا تو اس بات کی وضاحت کیسے کرے گا کہ میری طرف سے اسے آفتاب کے بارے میں بھی بتا دیتا۔ جگو نے اسے آفتاب کے سلسلے میں پورا اطمینان دلایا تھا کروایا گیا؟ کیا وہ قبول کر سکتا ہے کہ اس نے ماسٹر آفتاب کو اپنے ڈیرے کے خفیہ تہ خانے میں جس ہی وہ مناسب سمجھتا تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی اس کی خیر خبر لینے والا ہو جس سے اس کا قریبی تعلق اور دلی رکھا ہوا تھا اور اس پر غیر انسانی تشدد کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پنجوں سے شکار چھین کر لے گیا۔ یقیناً۔ افضل لاکھ دکھ اور صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اپنے دوست کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں پولیس کے پوچھنے کے باوجود یہ تک الزام نہیں لگا سکا کہ اس کے ڈیرے سے کچھ چرایا گیا ہے یا وہاں گا، اس بات کا اسے یقین تھا۔

گئی ہے۔ ان حالات میں پولیس اس کے ڈیرے پر ہونے والے حملے کو ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دے ہر! اسکردو سے کوئی میجر ذیشان آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھا افراد کے نام رپورٹ درج کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی؟ اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایسے نامعلوم فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا خیال تھا کہ افضل سے رابطہ ہو گیا ہوگا لیکن فون اٹھانے پر جو اطلاع دی گئی نہیں پکڑے جاتے۔ آپ کے پاس پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر آج تک کوئی ر وہ بری طرح چونک گیا۔ اسکردو میں آج کل مشاہرم خان مقیم تھا جس سے کئی دنوں سے اس کا رابطہ ہے جس میں اصل قاتلوں اور حملہ آوروں تک پہنچا جا سکا ہو؟'' وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اس کا تھا۔ وہ مشاہرم خان کے غیاب پر تشویش میں مبتلا تھا اور اس نے وہاں کے ذمے دار افراد سے اتنی صحیح تھی کہ مختار مراد کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کا کھوج لگانے کے سلسلے میں گزارش بھی کی تھی لیکن فوج سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا فون کرنا

''میں آپ سے معافی چاہتا ہوں انکل! ہو سکتا ہے میری باتوں نے آپ کو ہرٹ کیا ہو لیکن کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

اپنی کرسی اور جان بچانے کے لیے ظلم کے سامنے اس حد تک نہیں جھک سکتا کہ خود اپنا سامنا کرنے بات کروائیں۔'' اپنی حیرت اور تشویش کو ظاہر کیے بغیر اس نے جواب دیا۔

شرمندگی ہو۔ البتہ آپ کی تسلی کے لیے اتنی یقین دہانی ضرور کروا سکتا ہوں کہ میں بلاوجہ خود کو کسی جھمیلے سی صاحب! میں اسکردو سے میجر ذیشان بات کر رہا ہوں۔'' رابطہ ملتے ہی اسے دوسری طرف ڈالنے سے حتی الامکان پرہیز کروں گا۔'' ان کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے اپنا لہجہ ذرا دھیما کر انجیدہ اور بردبار آواز سنائی دی۔

ان سے کہا۔ جی میجر صاحب! فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے بھی ٹھہرے ہوئے لہجے میں

''میں نے تمہاری ماں کا بھی انہیں مانا بیٹا! میں تمہارے لیے یہی دعا کر سکتا ہوں کہ تمہارا اپنا

سلامت رہے اور راہ کی مشکلات تمہارے حوصلے کو ٹوٹنے نہ دیں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ جو راہ تم نے اپنی آپ کو میری درخواست پر یہاں اسکردو تک آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔'' میجر ذیشان نے اسی کی ہے، وہ بہت کٹھن ہے اس راہ میں تمہیں اپنے قدموں کے نیچے پھول بچھے کبھی نہیں ملیں گے۔ سے اسے جواب دیا۔ اس کے درخواست کا لفظ استعمال کرنے باوجود شہریار پر واضح ہو گیا تھا کہ یہ ایک کانٹوں سے ضرور ہو گا جو تمہارے تلوؤں پر لہو کے بیل بوٹے نقش کر دیں گے۔'' انہو لم ہے جس پر اسے عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ اسے اس حکم کی پیروی میں کوئی عار نہیں تھا لیکن وہ اپنے اس بند کر دیا اور خود کافی دیر تک بولتی کم صم بیٹھا رہا۔ ئے جانے کی وجہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

مختار مراد کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب تک اس کے پاس کتنے اعلیٰ عہدے داروں کے فون میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ میری وہاں اس طلبی کا کیا مقصد ہے؟''

جنہوں نے چودھری کے ساتھ ہونے والے سلوک کی مذمت کرتے ہوئے اس سے جواب دہی میں بہت کھل کر اس وقت آپ کو سب کچھ نہیں بتا سکتا لیکن دو نام ایسے ہیں جنہیں سن کر یقیناً آپ وزیراعلیٰ تک کے لوگوں کے اس صورت حال پر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اگر اس کی پشت پر اتنا مضبوط میں کوئی تاخیر کرنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ کا ڈرائیور مشاہرم خان اور پیر آباد کی ماہ بانو دونوں اس موجودہ ہوتا تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ وہ اپنی ملازمت سے فارغ ہو چکا ہوتا یا پھر کسی دُور دراز مقام پر ٹرانسفر پاس ہیں اور ان دونوں افراد نے اپنے بیان میں آپ کا نام لیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ہوتا۔ کسی [illegible] چودھری جیسے جابر کے سامنے ٹھہرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ایسے مخالف ان دونوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کی جا سکے۔'' میجر ذیشان نے اس کے استفسار کے جواب میں خاشاک [illegible] کر ڈالا۔ وہ تو صرف مشاہرم خان کے بارے میں کسی اطلاع کی امید کر رہا تھا لیکن وہاں تو مشاہرم خان

کے ساتھ ساتھ ماہ بانو کے مل جانے کی خوشخبری بھی اسے سنائی جا رہی تھی۔

''میں ان دونوں افراد سے واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے آپ کو اپنے بارے میں ہ
بتایا ہے، اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔'' اپنے اندر بپا ہیجان کو بہ مشکل چھپاتے ہوئے اس نے
میں میجر ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

''آپ اتنے اطمینان سے یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ حالات سے مکمل طور پر واقف
یہاں بہت حساس نوعیت کے واقعات پیش آ چکے ہیں جن کی تحقیق و تفتیش بڑی باریک بینی سے کی جا رہی
اس سلسلے میں ہمیں آپ کا تعاون بھی درکار ہے اسی لیے میں نے آپ کو کال کی ہے اور میری خواہش ہے
جتنی جلدی ممکن ہو سکے، بنا کسی تاخیر کے یہاں تشریف لے آئیں۔'' میجر ذیشان کے جواب نے اسے
میں ڈال دیا لیکن اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ معاملہ اگر بہت حساس نوعیت کا ہے تو اس کے استفسار کے
ذیشان اسے فون پر مزید کچھ بتانا پسند نہیں کرے گا چنانچہ کوئی سوال کیے بغیر سنجیدگی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میجر صاحب! میں فوری طور پر وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے اپنا کا
نوٹ کروا دیں تاکہ میں آپ سے رابطے میں رہ سکوں۔'' اس کی فرمائش پر میجر ذیشان نے اسے کا
نوٹ کروا دیا۔

''عبدالمنان! چیک کرو کہ اسکردو جانے والی فرسٹ فلائٹ کب کی ہے۔ اس فلائٹ پر میرے لیے
سیٹ بک کروا دو۔'' فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالمنان کو حکم دیا۔

''او کے سر! میں دیکھتا ہوں۔'' یقیناً وہ بھی اس کا یہ اچانک پروگرام سن کر حیران ہوا تھا لیکن کوئی سوال
مناسب نہیں سمجھا۔ وہ عبدالمنان کو ہدایت دینے کے بعد گھر پر اپنے بیٹ مین کو تیاری کے سلسلے میں
دینے لگا۔ دفتری امور کے سلسلے میں اہم نوعیت کی ہدایات اور احکامات جاری کرنے تک بیٹ مین اس
حسب ہدایت اس کا سامان تیار کر کے بھجوا چکا تھا جو گاڑی کی ڈکی میں رکھا تھا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی کم
میں لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لاہور سے اسے بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد جانا تھا جہاں عبدالمنان
کوششوں سے اسکردو جانے والی فلائٹ میں اس کے لیے بکنگ ہو چکی تھی۔ نورکوٹ سے لاہور ایئرپورٹ
طویل سفر طے کر کے وہ ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچا تو عبدالمنان نے اُسے افضل سے رابطہ ہو جانے کی اطلاع
''ٹھیک ہے، تم میری طرف سے اس سے تعزیت کر لو اور اسے آفتاب کے بارے میں بتا دو۔'' اس
مختصراً احکامات جاری کیے۔ وہ بالکل عین وقت پر ایئرپورٹ پہنچا تھا اور اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی
رک کر افضل سے بات کر سکتا۔ یوں بھی اسے جس دیار کی طرف جانا تھا وہاں سے خوشبوئے یار آ رہی تھی
بہت عرصہ فرائض و حقوق کی ادائیگی میں اُلجھے رہنے کے بعد اب اس میں اتنا یارا نہیں رہا تھا کہ مزید
مظاہرہ کر سکتا اور اپنے دل کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے کوئے یار کی طرف روانہ ہونے کے بجائے کسی اور
میں خود کو گرفتار کر کے بیٹھ جاتا۔

⊛----✪----⊛

''آفتاب!'' وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹا قطرہ قطرہ اپنے جسم میں داخل ہوتے ہوئے حیات بخش
کی تاثیر محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ گزرے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس جانی پہچانی آواز
کر چونک گیا اور فوراً آنکھیں کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ افضل تھا، اس کا عزیز از جان



میں نمی لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک تو ہو نا دوست! ظالموں نے تمہارا یہ کیا حال کر دیا ہے؟'' آفتاب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس
ری سے پوچھا اور اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

یسا ہوں تمہارے سامنے ہوں اور خود بھی حیران ہوں کہ میں زندہ بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟''
نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور یہ
مسکراہٹ لبوں پر سجانے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

ندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا وقت پورا ہو جائے، وہ گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ
ا۔ اور جس کی سانسیں باقی ہوں، اس کے جینے کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی ذریعہ بنا ہی دیتا ہے۔'' افضل
میں زمانے بھر کا درد تھا جسے آفتاب اپنی دھن میں محسوس نہیں کر سکا اور اس کی تائید کرتے ہوئے
ہوئے انداز میں بولا۔

تم بالکل ٹھیک کہتے ہو یار! میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھے چودھری کے
نجات دلائی۔ اپنے انداز و اطوار سے تو وہ غنڈے لگتے تھے لیکن میرے لیے رحمت کے فرشتے ثابت
انہوں نے نہ صرف چودھری کے ڈیرے کے خفیہ تہ خانے سے مجھے نکالا بلکہ یہاں اس ہسپتال میں
ل کروا دیا۔'' وہ افضل کو بتاتے بتاتے یک دم چونک سا گیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں
ہوں؟''

''میرے پاس اے سی شہریار عادل کے پی اے کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس ہسپتال کا ایڈریس
ئے بتایا کہ تم شدید زخمی حالت میں یہاں داخل ہو۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میری رہائی کے پیچھے اے سی صاحب کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے جب دیکھا ہوگا کہ
انگلیوں سے گھی نہیں نکل رہا تو پھر انہوں نے وہ طریقہ استعمال کیا جس کے ذریعے چودھری جیسے بندے
یا جا سکے۔''

''میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہاری بازیابی کے سلسلے میں پہلے انہوں نے قانونی طریقہ
کرتے ہوئے پولیس کے ذریعے چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کروایا تھا جو کہ ناکام ثابت ہوا۔ اس ناکامی
انہوں نے سوچا ہوگا کہ یوں بات نہیں بنے گی اور انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی چنانچہ انہوں نے
رہائی کے لیے غنڈہ عناصر کو استعمال کیا۔ چودھری افتخار کے ڈیرے پر حملے کی اطلاع مجھے بھی ملی تھی لیکن
معلوم تھا کہ یہ سارا ہنگامہ تمہاری خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ اب تمہیں یہاں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں تو
کہانی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' افضل نے اس کی تائید کرتے ہوئے خود بھی حالات کا تجزیہ کیا۔

''تمہیں کس نے اطلاع دی تھی میرے اغوا کی؟''

''میرے پاس منیب کا فون آیا تھا۔ پیر آباد میں کوئی اُگو تانگے والا ہے۔ اس نے تمہیں اغوا ہوتے ہوئے
تھا۔ اسی نے منیب کو بتایا اور منیب سے اے سی صاحب اور مجھ تک خبر پہنچی۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اوہ، آئی سی۔'' آفتاب نے تفہیمی انداز میں کہا اور پھر افسردگی سے بولا۔ ''اُگو کی منگیتر رانی، کشور کی
ی۔ رانی بے چاری نے ہم دونوں کا بہت ساتھ دیا اور شاید اس جرم کی سزا میں ہی اس سے اس کی زندگی
گئی۔ میں رانی کی لاش ملنے کی اطلاع سن کر منیب کے مشورے پر پیر آباد سے نکل رہا تھا کہ چودھری کے
ں نے مجھے گھیر لیا۔ چودھری نے حالات کا تجزیہ کر کے اندازہ کر لیا تھا کہ کشور کو تمہارے ذریعے ہی

گاؤں سے نکالا گیا ہے، بس وہ مجھ سے یہ بات کنفرم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اندر
آگ بھی تھی جس کی وجہ سے اس نے مجھ پر بے تحاشا تشدد کروایا۔ اسے مجھ پر اتنا شدید غصہ تھا کہ
سے مارنے کے بجائے سسکا سسکا کر زندہ رکھنے پر تُلا ہوا تھا۔'' خود پر گزرنے والے تشدد کا
نے ایک جھرجھری سی لی پھر موضوع کو قدرے بدلتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بھابی اور کشور کو تو
بارے میں نہیں بتایا نا؟ یہ خواتین ذرا کم ہمت ہوا کرتی ہیں اور کوئی بھی ایسی ویسی بات سن کر حوصلہ چھوڑ

''آئی ایم سوری یار! اصل میں بات یہ ہے کہ مجھے خود تمہارے اغوا کا علم کشور کی وجہ سے ہو
تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اس کی تم سے بات نہ ہو سکی تو اس نے پریشان ہو کر
پتہ کرنے کو کہا۔ اس کے کہنے پر میں نے منیب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ تمہیں اغوا کیا جا چکا
بات مہتاب کو بتا رہا تھا کہ میری لاعلمی سے کشور نے بھی سب کچھ سن لیا اور یہ سن کر وہ اتنے شدید
آئی کہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ گرنے سے اس کے سر میں بھی چوٹ لگ گئی۔ میں فوری طور پر اسے ہسپتال
جہاں ڈاکٹر نے اسے ٹریٹمنٹ دینے کے بعد مجھے بتایا کہ سر کی چوٹ معمولی نوعیت کی ہے لیکن ذہنی صد
باعث اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کشور ہسپتال میں ایڈمٹ ہے اور ہنوز
حالت میں ہے۔'' وہ خود بہت بڑے صدمے سے گزرا تھا لیکن خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے ابھی تک
کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور اسے یہ بتانے کے بجائے کہ تمہارے ساتھ دوستی نبھانے کی خاطر میں
بیوی اور معصوم بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں، کشور کی حالت پر مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ندامت کا اظہار

''وہ کون سے ہسپتال میں ہے؟ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' کشور کی حالت کے بارے میں
لیٹے سے اُٹھ بیٹھا۔ اس پل اُسے اس طرح اچانک اُٹھ بیٹھنے سے جسم میں دوڑ جانے والی درد کی ٹیس
احساس نہیں ہو سکا۔ اگر کچھ دھیان میں تھا تو صرف یہ کہ اس کی کشور اس کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت
ہسپتال میں پڑی ہے۔

''تم وہاں کیسے جاؤ گے؟ تم تو خود اتنے شدید زخمی ہو۔ یہاں کے ڈاکٹرز تمہیں بستر سے اُٹھنے
کی اجازت نہیں دیں گے۔'' افضل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کر
سمجھایا۔

''میں یہ سب نہیں جانتا افضل! مجھے ابھی اور اسی وقت کشور کے پاس جانا ہے۔ وہ میری وجہ سے
کو پہنچی ہے اور میں اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں پڑا رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔'' وہ اس
جذباتی ہو رہا تھا۔

''او کے! تم تھوڑی دیر آرام سے لیٹ کر انتظار کرو۔ میں ڈاکٹرز سے بات کر کے کچھ کرتا ہوں۔
کیفیت کو سمجھتے ہوئے افضل نے مزید اسے روکنے کی کوشش کرنا بے سود جانا اور تسلی دیتا ہوا باہر نکل
دوبارہ آفتاب کے پاس واپس آنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے اور اس نے یہ پندرہ منٹ کسی
طرح تڑپتے ہوئے گزارے تھے۔ یہ تو شکر ہوا کہ افضل واپس آیا تو اس کے ساتھ وہیل چیئر لیے ہسپتا
ملازم بھی موجود تھا جسے دیکھ کر آفتاب کو تسلی ہوئی ورنہ شاید وہ افضل پر خفا ہونے لگتا۔ افضل اور وارڈ بوا
کر اسے وہیل چیئر پر بٹھایا۔ افضل خود اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اس مقام تک لے گیا جہاں
جانے کے لیے ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ آفتاب کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔

''ڈاکٹرز نے بہت مشکل سے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی ہے۔ ان کا کہنا تھا



لچر ہے اور پھر بعض گہرے زخموں کو اسٹیچز لگا کر بند کیا گیا ہے۔ خطرہ ہے کہ زیادہ حرکت کرنے سے
لتے ہیں۔ میں نے مشکل سے سمجھایا کہ ان کے اجازت نہ دینے پر بھی تم رکنے کے لیے راضی نہیں ہو
ے اصرار پر انہوں نے جگو نامی آدمی کو فون کر کے اسے صورتِ حال بتائی اور پھر اس کی طرف سے
لنے پر مجھے اجازت دی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔'' ایمبولینس ہسپتال سے نکل کر
ڑنے لگی تب افضل نے اسے یہ ساری تفصیل بتائی۔

وہی شخص ہے جس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر مجھے چودھری کے ڈیرے سے نکالا تھا۔'' اس
افضل سر کو تفہیمی جنبش دے کر چپ ہو گیا۔ باقی کا راستہ خاموشی کے ساتھ ہی کٹا۔ درمیان میں بس
فضل نے کوئی فون کال ریسیو کی۔ اس کا موبائل یقیناً وائبریشن پر تھا اس لیے آفتاب کو گھنٹی کی آواز
وی تھی۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں انسپکٹر صاحب! کہ میں کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لے سکتا۔ میں صحافی ہوں اور
م والفاظ کی وجہ سے میرے اتنے دشمن ہیں کہ میں خود بھی اپنے ان دشمنوں سے واقف نہیں ہوں۔ ایسے
خاص طور پر نام لینا میرے لیے کسی صورت ممکن نہیں۔'' افضل کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے تو
کا۔

کریت..... کیا معاملہ ہے؟''

کچھ نہیں یار! تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔'' افضل نے اسے
کچھ وہ بھی ذہنی طور پر مکمل حاضر نہیں تھا اس لیے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ جلد ہی ایمبولینس نے انہیں
ہسپتال تک پہنچا دیا۔ افضل اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر ایک کمرے تک لے گیا۔ آفتاب کو کشور سے ملانے
پہلے وہ ہسپتال کی انتظامیہ سے فون پر بات کر چکا تھا اس لیے کسی نے اسے روکا نہیں۔ کمرے کا بند
ول کر وہ آفتاب کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا اندر لے گیا تو آفتاب کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ
میں لگی ڈرپ اور مختلف نلکیوں کی محتاج بنی بستر پر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹی زرد لڑکی وہ تھی جس کی تندو
نے اس کی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی زندگی میں کچھ نئے رنگ بھر کر ہلچل سی مچا دی تھی اور اب وہ
بے حس و حرکت ہسپتال کے ایک بستر پر لیٹی تھی۔ اس کا دل بری طرح بھر آیا۔ اپنی کسی بھی تکلیف کی
تے ہوئے اس نے اس بار افضل کی مدد لینے کے بجائے خود وہیل چیئر کو حرکت دی اور کشور کے نزدیک
بہت دھیمی آواز میں بالکل سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر

شور.....!'' یہ ایک سرگوشی نہیں تھی، صدا تھی جو کشور کے کانوں سے گزر کر اس کے جسم و جان میں
ل۔

آنکھیں کھولو میری جان!..... دیکھو میں، تمہارا آفتاب تم سے ملنے آیا ہے۔ کیا ایک نظر مجھے دیکھو گی
اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر اسے چومتے ہوئے سرگوشی میں ہی استدعا کی۔ اس کے ساتھ کمرے میں
ل چپکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ وہ محبت کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دل کی گہرائیوں سے
سچی محبت کرنے والا شخص صرف محبت نہیں کرتا بلکہ عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ محبت اسے سکھا دیتی ہے کہ
نے محبت تخلیق کی ہے، وہ خود کس قدر چاہے جانے کے قابل ہے۔ محبت کرنے والا صرف اپنے
ے محبت نہیں کرتا بلکہ اسے محبوب سے بڑھ کر محبوب جانتا ہے جس نے اس کے محبوب کو تخلیق کیا ہے۔

محبت اللہ پر انسان کے یقین کو پختہ کرتی ہے۔ اس وقت آفتاب جو اتنی بے قراری سے کشور کو پکار رہا تھا
یقین کے سہارے پکار رہا تھا کہ جس رب نے اس کے دل میں محبت کا بیج بویا ہے، وہ اس کی صدا
طاقت بھی پیدا کرے گا جو کشور کو اس کی بے ہوشی سے باہر نکال سکے۔ کوئی اس رمز کو سمجھے نہ سمجھے لیکن
جو کچھ آفتاب کر رہا تھا، وہ عبادت تھی۔

''تم ڈر گئی تھیں نا کہ کہیں میں بھی تم سے جدا نہ ہو جاؤں۔ اُٹھو اور دیکھو کہ تمہاری محبت مجھے زندہ
پاس لے آئی ہے۔'' بہت دھیمی آواز میں یہ کہہ کر اس نے کشور کے نیم وا لبوں پر ایک نرم سا بوسہ دیا۔ اس
کی حرارت نے گویا اس کے وجود میں برق سی دوڑا دی اور بے سدھ پڑے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔
والے اس جھٹکے نے آفتاب کو دیوانہ سا کر دیا اور اس عالمِ دیوانگی میں وہ کشور کے ایک ایک نقش کو چومتا
اس کی پیشانی، آنکھیں، رخسار، لب، گردن ہر ہر جگہ پر آفتاب کے بوسے ثبت ہوتے چلے گئے۔

''میں موت کے منہ سے لوٹ کر آیا ہوں۔ مجھے یہ زندگی تمہارے لیے دی گئی ہے۔ تم مجھ سے
اس طرح چپ چاپ لیٹی نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنا ہوگا اور مجھے یہ یقین
کہ زندگی کے اس سفر میں تم ہر قدم پر میرے ساتھ ہو۔'' وہ اسے بے تحاشا پیار کرنے کے ساتھ ساتھ
سے سرگوشیوں میں مخاطب بھی تھا۔ بالآخر کشور نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور آنکھیں کھول کر اس کی طرف
لیکن ایسا وہ صرف پل بھر کے لیے ہی کر سکی تھی۔ ابھی آفتاب اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھ کر پوری طرح
نہیں ہو سکا تھا کہ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کو مسلسل جھٹکے لگنے لگے۔ اُس کی اس
پریشان ہو گیا اور وہیل چیئر کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے
پکارنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی دو تین افراد کشور کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ان میں سے کسی نے اس
چیئر کو دھکیل کر مکمل طور پر دروازے سے باہر کر دیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ افضل جو باہر ہی موجود تھا،
اس کے قریب آیا۔

''اس کے لیے دعا کرو یار! اسے کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اس نے میری
روایتوں سے ٹکر لی ہے۔ وہ آنکھوں میں بہت سے خواب سجا کر میری طرف آئی تھی۔ اس کے سارے
پر قرض ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں یہ قرض کیسے ادا کروں گا؟'' وہ دلاسے کے لیے شانے پر رکھا
ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''حوصلہ کرو آفتاب! اللہ نے چاہا تو کشور کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے
تمہیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرے گا۔'' افضل نے نم آنکھوں کے ساتھ خلوصِ دل سے یہ
ہوئے گویا اس کے لیے دعا بھی کی۔ ابھی تو اس کا اپنا زخم بالکل تازہ تھا۔ چنانچہ اس کی دعا میں وہ
شامل تھی جو عرشِ الٰہی کو ہلا ڈالنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس کی تسلی اور دلاسوں نے آفتاب کو بھی سنبھلنے میں
اور وہ خود پر قابو پا کر جھکے سر کے ساتھ دل ہی دل میں پروردگار سے کشور کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے
کام اس کے ساتھ افضل بھی کر رہا تھا۔ اس نے خود جدائی کا زخم سہا تھا چنانچہ تہ دل سے خواہش مند تھا
کے دوست کو یہ زخم نہ سہنا پڑے۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کی جاں گسل گھڑیاں گزریں اور تقریباً پون گھنٹے
نے ان کے قریب آ کر خوشخبری سنائی۔

''مبارک ہو۔ آپ کی مریضہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے کی
ان کی حالت بگڑ گئی تھی لیکن اب سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ میں نے اور میرے ساتھی ڈاکٹرز نے مل



چیک اپ کیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ان کے سارے آرگنز بالکل صحیح فنکشن کر رہے ہیں۔ فوری طور
ٹ ہم نے کر لیے ہیں۔ لیکن کچھ ٹیسٹ مزید ہونا باقی ہیں جن کے لیے کچھ وقت درکار ہے اس لیے
کچھ دن اور مریضہ کو یہاں ایڈمٹ رکھنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے انہیں خوشخبری سنانے کے ساتھ ساتھ ساری
حال بھی واضح کی۔

''کیا ہم اپنے مریض کو دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر؟'' آفتاب تو کچھ بولنے کے لائق ہی نہیں تھا، افضل نے ہی
جذبات کو زبان دیتے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

''فی الحال ہم نے اُنہیں سکون آور ادویات دی ہوئی ہیں تاکہ وہ کسی اچانک لگنے والے جذباتی جھٹکے سے
ہوں۔ اس طرح طویل بے ہوشی سے ہوش میں آنے والے مریض بہت نازک ہوتے ہیں اور انہیں
احتیاط سے ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔ میں یہ سب آپ لوگوں کو اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ آپ سے جذبات میں
غلطی سرزد نہ ہو اور آپ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھیں۔''

''آپ بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب! ہم پوری احتیاط کریں گے۔'' ڈاکٹر کی ہدایات کے جواب میں افضل
اسے یقین دہانی کرائی۔

''او کے، آپ کے اصرار پر میں آپ کو صرف اتنی اجازت دے سکتا ہوں کہ آپ ایک نظر مریضہ کو دیکھ
لیں پلیز خیال رکھیے گا کہ ان کو پکارنے یا ان سے بات چیت کرنے کی غلطی نہ ہو۔ ویسے تو وہ خود ادویات
اثر ہیں لیکن پھر بھی آپ کو پوری احتیاط کرنی ہوگی کہ انہیں معمولی سا بھی ڈسٹرب نہ کریں۔'' ڈاکٹر سختی
ہدایات جاری کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو ان دونوں نے کشور کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں ایک
اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ زبان سے کچھ نہیں بولی بس ہونٹوں پر انگلی رکھ
خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی ڈاکٹر کی ہدایات سن کر آئے تھے چنانچہ خود سے بھی احتیاط برت رہے
بستر پر دراز کشور کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ زرد رنگ رہا تھا لیکن اس زردی کے باوجود اس کے تاثرات میں
تبدیلی محسوس کی جا سکتی تھی۔ پہلے اس کے ہر نقش سے بے چینی اور اضطراب ظاہر ہو رہا تھا جبکہ اس وقت
کے چہرے پر واضح اطمینان چھایا ہوا تھا۔ اس اطمینان نے آفتاب کے دل کو بھی پُرسکون کر دیا اور وہ نرس
رف سے اشارہ ملنے سے قبل ہی اپنی وہیل چیئر سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ وقت کے قلیل عرصے میں
بہت بڑے جذباتی طوفان سے گزرا تھا، وہ طوفان اس ایک نظر کی دید نے ہی قابو کر کے اسے پُرسکون
یا تھا۔

❀----✪----❀

''سب کچھ برباد ہو گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اتنے برسوں کی محنت اور انویسٹمنٹ منٹوں میں تباہ ہو کر رہ
''مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا ڈیوڈ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''کچھ معلوم نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ہمارے آدمیوں سے کوئی تو ایسی غلطی ہوئی ہوگی جس کی وجہ
ہمیں اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔'' لِنڈا اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے حسبِ معمول مختصر لباس
تن کر رکھا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے حُسن کی بجلیاں گرانے کے بجائے اس مسئلے میں زیادہ اُلجھی ہوئی تھی
نے ڈیوڈ کا چین چھین لیا تھا۔ اب تک پاکستان کے پہاڑی سلسلے میں واقع اپنے خفیہ ٹھکانے کی تباہی کی
پہنچ گئی تھی۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔

اپنے لوگوں کو تربیت دے کر انہیں پاکستان کے دینی مدرسوں اور حلقوں میں اس طرح داخل کرنا کہ کوئی ان کی شخصیت پر بہروپ کا شک نہ کر سکے، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے افراد کو بہت ہوشیاری اور چابک دستی سے کام لینا پڑتا تھا۔ وہ بہت چالاکی اور مکاری سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر انڈیلتے رہتے تھے پھر ان افراد میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر لیا جاتا تھا جن کی روح تک اس زہر کے اثر سے نیلو نیل ہو جاتی تھی۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو کسی نہ کسی معاشرتی ناانصافی کا شکار ہوں۔ ایسے افراد کے اندر معاشرے کی ناانصافی کا بدلہ لینے کی خواہش درونِ دل لازماً پل رہی ہوتی ہے چنانچہ اس خواہش کو مہمیز کر کے انہیں اپنے راستے پر لانا آسان ہوتا ہے۔

ان کے اس پروجیکٹ میں بھارت بھی ان کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ ''موساد'' کی نسبت بھارتی ایجنٹس یہ کام زیادہ آسانی سے کر لیتے تھے کیونکہ جغرافیائی اور ثقافتی مشابہت کے باعث ان کے لیے پاکستان کے ماحول میں سروائیو کرنا زیادہ آسان تھا۔ وہ نہ تو شکلوں سے الگ دکھائی دیتے تھے، نہ ان کے لیے اپنے لب و لہجے کو مخصوص ماحول میں ڈھال لینا زیادہ مشکل تھا۔ وہ پاکستانیوں کی نفسیات بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ ان پوائنٹس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''موساد'' کے اکابرین نے ''را'' کو اپنے اس مشن میں شامل کرنا پسند کیا۔ بھارت نے بھی اپنی ازلی پاکستان دشمنی کی وجہ سے بخوشی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی تھی حالانکہ ''موساد'' اس کے ایجنٹس کو صرف مہروں کی طرح استعمال کر رہی تھی اور انہیں سوائے اس کے کہ وہ پاکستانیوں میں رہ کر پاکستان کو کھوکھلا کرنے والے دہشت گرد تیار کرنے پر مامور ہیں، کچھ خبر نہیں تھی۔ بھارتی اکابرین اس طرح سمجھتے تھے کہ ''موساد'' مسلم دشمنی میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے، چنانچہ انہوں نے کبھی سب کچھ جاننے لینے کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کیا تھا۔ کسی بھی طرح سہی، پاکستان کو نقصان تو پہنچ رہا تھا، ان کے لیے اطمینان کافی تھا۔ انہیں پاکستان میں موجود ''موساد'' کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ان کے ایجنٹس کو چند مخصوص ٹھکانوں اور افراد تک محدود رکھا گیا تھا۔

موساد ایک ایسی قوم کی خفیہ تنظیم تھی جو برسوں کی نہیں صدیوں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم سے کم افراد کو رازدار بنایا جائے۔ اس پروجیکٹ کے لیے بھی بھارت نے بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری کی تھی، انہوں نے خاصی رازداری برتی تھی اسی لیے اب حیران تھے کہ ایک ایسا ٹھکانہ جس کا علم ان کے معاونین کو بھی نہیں، آخر کیسے اور کیونکر تباہ ہوا؟ ان کے جو چند ایجنٹس اسکردو میں موجود تھے، وہ بھی بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکے تھے۔ بس انہیں یہی معلوم ہو سکا کہ جہاں انہوں نے اپنی پہاڑی پناہ گاہ بنا رکھی تھی، وہاں بہت شدید دھماکے سنے گئے تھے۔ ان دھماکوں پر پاکستان آرمی کو متوجہ کیا اور جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ صرف چند زخمی افراد کو ہی وہاں سے لایا جا سکا تھا جن میں سے کسی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔

ان افراد کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وہ سب ان کے لیے بے کار تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی فردان کا کارکن نہیں تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مختلف علاقوں سے گھیر کر لانے کے بعد خفیہ پناہ گاہ میں تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ افراد اگر زندہ بھی بچ جاتے اور کوئی بیان دینے کے لائق بھی ہو جاتے تو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر آتشیں ہتھیاروں کا استعمال اور خودکش حملوں کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کا یہ بیان سننے والے یہی گمان کرتے کہ وہ کسی مذہبی انتہا پسند تنظیم کے لیے کام کر رہے تھے۔ ''موساد'' یا ''را'' کا نام کسی صورت سامنے نہیں آ سکتا تھا لیکن ڈیوڈ یہ جاننے کے لیے



کہ اتنا بڑا حادثہ کیسے اور کیونکر پیش آیا۔ وہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے والے لوگ تھے چنانچہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ غلطی کہاں اور کیا ہوئی ہے؟ ویسے بھی وہ اپنی تنظیم کی طرف سے اس پروجیکٹ کا انچارج تھا، اس کی ذمے داری یوں بھی عائد ہوتی تھی۔ لنڈا نے جو اس کی گرل فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ سیکرٹری بھی تھی، سوال اُٹھایا تو وہ ٹہلنا چھوڑ کر اس کے قریب ہی رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر پڑی وہسکی کی بوتل منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس بوتل کے ساتھ وہاں گلاس بھی موجود تھے لیکن وہ ذہنی انتشار کا شکار تھا، اس میں کسی قسم کے تکلفات نہیں برت سکتا تھا۔ شراب حلق سے نیچے اُتری تو وہ کچھ پُرسکون ہوا اور لنڈا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''غلطی تو یقیناً ہمارے لوگوں سے ہی ہوئی ہے۔ اب تک مجھے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کی روشنی میں مشابرم خان نامی ایک کردار سامنے آیا ہے۔ یہ شخص اے سی شہریار عادل کا ڈرائیور ہے جس کا آبائی گھر اسکردو میں ہی ہے۔ شہریار نے چودھری افتخار سے ماہ بانو کو محفوظ رکھنے کے لیے اسی شخص کے گھر میں چھپایا ہوا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ماہ بانو مجھے مل گئی اور میں نے چودھری کو اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے اسے کڈنیپ کروا دیا۔ شہریار کو جب ماہ بانو کے کڈنیپ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے مشابرم خان کو اس کی تلاش پر مامور کر دیا۔ مشابرم خان کا اپنا بھائی اس واقعے میں مارا گیا تھا چنانچہ ذاتی انتقام کی وجہ سے بھی وہ اس کام کو تندہی سے کرنے لگا۔ اس کی سرگرمیوں کا ہمارے لوگوں کو علم تھا لیکن وہ صرف اس وجہ سے کہ مشابرم خان اصل معاملے تک نہیں پہنچ سکتا، اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے گریز کرتے رہے اور شاید یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ان کی نظر انداز کر دینے والی پالیسی کا فائدہ اٹھا کر مشابرم خان اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا اور جانتی ہو کہ کیا ہوا؟ وہی مشابرم خان آرمی والوں کو ہمارے پہاڑی ٹھکانے کے پاس زخمی حالت میں ملا ہے جسے انہوں نے تفتیش کے لیے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے اور اتنا خفیہ رکھا ہے کہ ابھی تک ہمارا کوئی آدمی اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ نہ ہی یہ علم ہو سکا ہے کہ اس نے کیا بیان دیا ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت گمبھیر صورتِ حال ہے۔ اس معاملے کی پوری انویسٹی گیشن ہونی چاہئے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ پہاڑی ٹھکانے پر موجود ہمارے افراد نے بھی کچھ ایسی غلطیاں کی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں آ سکیں۔ ورنہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں کہ ایک اکیلا شخص اس ٹھکانے تک پہنچ کر اتنی آسانی سے اسے تباہ کر دے۔ مجھے یا تمہیں خود وہاں جا کر ساری صورتِ حال کی چھان بین کرنی چاہئے۔'' اس کی بات سن کر لنڈا نے اپنا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تجویز بھی پیش کی۔ اس وقت اس کے چہرے پر اتنی گہری سنجیدگی تھی کہ اگر چودھری افتخار اسے دیکھ لیتا تو ہرگز یقین نہیں کرتا کہ یہ وہی لنڈا ہے جس کی آنکھوں کے اشارے اور ادائیں پر بجلی کی طرح کوندتی مسکراہٹیں اسے بلاوا دیتی تھیں۔

''میرے خیال میں تم چلی جاؤ۔ ساتھ ساتھ چودھری کو بھی نمٹا دینا۔ اب صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ حسبِ وعدہ ماہ بانو کو اس کے حوالے نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پہاڑی ٹھکانے پر موجود تھی اور یقیناً دیگر افراد کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے بھی چیتھڑے اُڑ گئے ہوں گے۔ چودھری کو ماہ بانو کے بغیر بہلانے اور کام کی طرف راغب کرنے کے لیے تمہارا وہاں جانا مفید ثابت ہوگا۔ ویسے بھی اپنی بیٹی والے معاملے میں اُلجھ کر وہ میری مرضی کے مطابق کارکردگی نہیں دکھا پا رہا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آدمیوں کے ذریعے اس کا مسئلہ حل کر دوں لیکن میں اپنے بندوں کو ان غیر ضروری معاملات میں زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہ رہا۔ ویسے بھی میں کوئی چودھری کا نوکر نہیں ہوں کہ اس کے تمام مسئلے حل کر کے دوں۔ ہم اس سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے

بدلے میں معاوضہ بھی دے رہے ہیں اس لیے تم وہاں جاؤ تو اسے اچھی طرح یہ بات سمجھا دینا کہ کام کام کر کرے۔'' عام حالات میں شاید وہ چودھری کو رعایت بھی دیتا لیکن اس وقت بری طرح اپ سیٹ تھا سخت بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اوکے ڈارلنگ! تم ٹینشن مت لو۔ میں ہوں نا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔'' لِنڈا نے اس کی سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کے رخسار پر ایک بوسہ دینے کے بعد وہاں رخصت ہوگئی۔ ڈیوڈ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ لِنڈا جتنی حسین ہے، اس سے خطرناک بھی ہے اور جب کوئی کام اپنے ذمے لے لیتی ہے تو پھر اس کی تکمیل کے لیے اپنی جان لڑا دیتی اب وہ اپنا مشن مکمل ہونے تک سکون سے بیٹھنے والی نہیں تھی چنانچہ اب وہ اسے اس کی کامیابی تک اپنی روپ میں نہیں دیکھ سکے گا۔ اب وہ صرف اور صرف ''موساد'' کی ٹاپ ایجنٹ کے روپ میں نظر آئے گی عظیم اسرائیل کے مفادات سے زیادہ کسی شے کی پروا نہیں ہوسکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

''آپ کی بیان کردہ تفصیلات ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہیں جو ہمیں مشابرم خان اور ماہ بانو بتائی ہیں لیکن اس سے آگے کے معاملات اتنی بری طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ ان خصوصاً مشابرم خان کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے۔ وہ ایک ایسے معاملے میں انوالو ہوگیا ہے جس کا ملکی سالمیت سے ہے۔'' اسکردو پہنچنے کے بعد شہریار کی میجر ذیشان سے ملاقات ہوئی تو اس نے میجر کی پر بلاکم وکاست ماہ بانو کا سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ مشابرم خان کے بلتستان آنے کی وجوہات بھی دیں۔ اس کا بیان سننے کے بعد ہی میجر ذیشان نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ ویسے شہریار جانتا تھا کہ ان سب باتوں پہلے بھی کسی اور ذریعے سے تصدیق کروالی گئی ہوگی اور اسے یہاں بلانے کا مقصد محض شخصی ضمانت حاصل ہے چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کہیں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون سے معاملات ہیں جن میں مشابرم خان اس طرح انوالو گیا ہے کہ اس کی ذات آرمی انٹیلی جنس کے لیے مشکوک قرار پاتی ہے؟'' اس نے میجر ذیشان سے سوال کیا

''ہے تو یہ بہت کانفیڈنشل معاملہ لیکن کیونکہ آپ شروع سے کسی نہ کسی حد تک اس معاملے سے رہے ہیں اس لیے میں آپ کو مختصراً بریف کرسکتا ہوں۔'' وہ پہاڑوں میں ہونے والے دھماکوں سے لے کے وہاں پہنچنے، مشابرم خان کے ملنے اور پھر اس کے بیان تک مختصر الفاظ میں شہریار کو سب کچھ بتاتا چلا گیا

''مجھے یقین ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہوگا۔ مشابرم خان بہت سچا اور کھرا آدمی ہے اس کے بیان کی تصدیق کے لیے ماہ بانو کا وہ بیان ہی کافی ہے جو اس نے ازخود آپ سے مل کر آپ کو دیا ہے۔ دونوں کے بیانات کو آپس میں ملا کر دیکھیں تو اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اوپر پہاڑوں میں کسی گرد تنظیم کے ارکان نے اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا جہاں وہ لڑکوں کو دہشت گردی کی تربیت دیتے تھے۔ کے بیان میں عمران نامی جو کردار سامنے آیا ہے، اس کے حالات سن کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ قسم کے افراد کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ایک شخص جو پہلے ہی پریشان حال ہو ناانصافی کا شکار ہونے کے بعد اپنے لیے کوئی انصاف فراہم کرنے والا نہ پائے، اس کو گھیر کر اس کی واشنگ کرڈالنا اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ہمارا پڑوسی ملک مسلسل ایسی کو



رہتا ہے اور مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔''

رنے مشابرم خان کی حمایت میں اپنا مؤقف بیان کیا جسے سن کر میجر ذیشان چونک گیا۔

''آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں پڑوسی ملک انوالو ہے؟''

''حالات کا تجزیہ کرنے پر میں یہی نتیجہ اخذ کرسکا ہوں۔ ماہ بانو کے بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی جن افراد کو دہشت گردی کی تربیت دی جارہی تھی، انہیں مذہب کے نام پر یہ سب کچھ کرنے پر اُکسایا گیا ایسا ہی ایک کیس میں اپنے ضلع میں دیکھ چکا ہوں۔ اللہ آباد نام کے ایک گاؤں میں ایک بھارتی ایجنٹ نے از کا روپ دھار کر وہاں ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ بظاہر شاہنواز ایک نیک اور گاؤں والوں کا ہمدرد آدمی ان اندر ہی اندر وہ گاؤں کے بچوں کے معصوم ذہنوں کو بھٹکانے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی برین واشنگ کے میں عبدالمتین نام کا ایک نوجوان جذبات میں آکر خودکش حملہ آور بن گیا۔ عبدالمتین کی موت کے بعد میں ات کرتا ہوا شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو وہ گاؤں کے دونو جوانوں کو لے کر پہلے ہی فرار ہوچکا تھا لیکن ے کی عمارت کی تلاشی لینے کے بعد یہ بات سامنے آگئی کہ شاہنواز اصل میں کوئی بھارتی ایجنٹ تھا جو سب آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔'' میجر کے سوال پر اس نے مختصراً اپنے یقین کی وجہ کی۔

''آپ کا اندازہ کافی حد تک ٹھیک لگتا ہے مسٹر شہریار! تباہ شدہ پہاڑی ٹھکانے سے ہمیں جو اسلحہ اور ٹیکنیکل ت کی باقیات ملی ہیں، ان میں سے بیشتر بھارتی ساختہ ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ براہِ راست خود اس م کو چلا رہے تھے یا کوئی نام نہاد جہادی تنظیم ان اشیاء کی بھارت سے غیر قانونی طور پر خریداری کرتی رہی حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے سے کیا گیا کہ ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بھنک تک نہیں اب جو افراد زندہ ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے بھی ایک آدھ ہی اس لائق ہے کہ کوئی بیان دے سکے ان کے دیئے گئے بیانات سے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوسکا جو ہمیں مشابرم خان اور ماہ بانو بتا چکے ان حالات میں آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان دونوں کی ہمارے لیے کس قدر اہمیت ہوگی اور فی الحال ہم اپنی کسٹڈی میں ہی رکھنا پسند کریں گے۔''

''یہ ان دونوں کے ساتھ سخت زیادتی ہوگی میجر! ان دونوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ وہ تو خود حالات کار ہوئے ہیں۔'' میجر کی بات سن کر شہریار نے احتجاج کیا۔

''مجبوری ہے مسٹر شہریار! ویسے بھی کم از کم مشابرم خان کو تو مکمل طور پر معصوم نہیں مانا جاسکتا۔ اس نے ان کو اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر جب اس کے علم میں یہ بات تھی کہ نیاز علی ڈرائیور کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ہے، وہ پولیس کو رپورٹ کرتا لیکن اس نے ایسا کرنے بجائے خود نیاز علی سے پوچھ گچھ کی کوشش کی اور اس کوشش میں نیاز علی اپنی جان سے چلا گیا۔ یہی نہیں بلکہ نے صغیر ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کو اغوا کر کے حبسِ بے جا میں رکھا اور پھر خود ہی تنہا ایک مہم سر نے نکل کھڑا ہوا۔ اگر وہ یہ سب کرنے کے بجائے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنے اعتماد میں لیتا ورت حال مختلف بھی ہوسکتی تھی۔ ہم لوگ طریقے اور پلاننگ سے مجرموں کو گھیرتے تو بہت سی اہم معلومات ل ہوسکتی تھیں۔ اب تو سب کچھ تباہ ہوکر رہ گیا ہے اور ہم بالکل اندھیرے میں کھڑے ہیں، اس لائق بھی کہ کسی پر کوئی الزام دھر سکیں۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ ہم نے پہاڑوں پر ہونے والے دھماکوں کے لیے کیا ف اختیار کیا ہے؟'' میجر ذیشان کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ

وہ ایک محبِ وطن آدمی ہے جسے میڈیا کے سامنے یہ بیان دیتے ہوئے کہ دھماکے دراصل پاک آرمی کے ٹھکانے پر ہوئے تھے جہاں وہ اپنے معمول کی مشقیں کر رہے تھے، یقیناً شدید کوفت ہوئی تھی۔ دشمن بڑی زک اُٹھانے کے بعد وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اس کی طرف اُنگلی اُٹھا سکیں جبکہ ان کے مقابلے بھارت والے اپنے ہاں ہونے والے ہر حادثے کے لیے بلا تکلف پاکستان پر الزام دھر دیتے تھے اور الزام کو ثابت کرنے کے لیے خود ہی سچے جھوٹے ثبوت بھی بنا ڈالتے تھے۔

''جو کچھ ہوا، وہ یقیناً افسوس ناک ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مشابرم خان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن بہرحال وہ اتنا بڑا مجرم نہیں جس کے لیے کوئی سزا تجویز کی جا سکے۔ اگر آپ اسے مجرم قرار دیں گے تو سب سے پہلے آپ کو خود اپنا جرم تسلیم کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑی کوتاہی اور غفلت تو آپ کے ادارے سے ہوئی ہے۔ آپ کی ناک کے نیچے اتنا زبردست سیٹ اپ تیار کر لیا گیا ہے اور آپ بے خبر رہے تو یقیناً یہ مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی اگر آپ مشابرم خان کو مجرم سمجھتے ہوئے اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے پر بضد ہیں تو میں کسی حد تک آپ کا مؤقف تسلیم کر لیتا ہوں لیکن ماہ بانو کو آپ کس بنیاد پر روک سکتے ہیں؟ وہ تو حالات کا شکار رہی ہے اور جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے سب سے پہلے آپ لوگوں سے رابطہ کر کے اپنا قانون پسند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ کیا آپ اس لڑکی کو اس کی اس قانون پسندی کی سزا دیں گے؟'' وہ بولنے پر آیا تو اپنے مزاج کے مطابق صاف صاف سب کچھ کہتا چلا گیا۔

''سوری مسٹر شہریار! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف آپ سے مل کر واقعات کی تصدیق کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ آگے کیا ہونا ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ کرنل توحید کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اتنا مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتے ہیں کہ آپ کے لیے کرنل توحید کو اپروچ کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ آپ چاہیں تو ان سے ملاقات کر کے یہ سب ڈسکس کر سکتے ہیں۔'' میجر ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گویا ملاقات ختم ہو گئی تھی اور شہریار اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچنے کے بعد بھی ماہ بانو کی ایک جھلک دیکھنے سے محروم رہا۔

❀----✪----❀

''ہیلو آفتاب! مبارک ہو یار۔ میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر آفندی کو فون کیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ کشور کی حالت اب بالکل ٹھیک ہے اور وہ ایک نارمل پرسن کی طرح بی ہیو کر رہی ہے۔ یہ تو سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب تم بھی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تاکہ دونوں میاں بیوی ہسپتال کا پیچھا چھوڑ کر کہیں کسی ڈھنگ کی جگہ رہ سکو بلکہ میرا خیال میں تو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد تم لوگ نارورن ایریاز کی طرف نکل جانا۔ اپنا لیٹ ہنی مون منا لو گے اور تلاش میں پھرنے والوں سے بھی پیچھا چھوٹے گا۔'' آج کل افضل کی مصروفیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بے شمار جاننے والے تھے جن کی طرف سے ابھی تک تعزیت کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسری طرف صحافتی ذمے داریاں بھی ایسی تھیں کہ وہ غم کی ان گھڑیوں میں بھی مکمل طور پر اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کسی نہ کسی اہم معاملے میں اس کی ضرورت پڑ جاتی تھی اور اس کے کولیگز بے پناہ معذرت اور شرمندگی کے اظہار کے ساتھ اس کی مدد لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اپنی ان مصروفیات کی وجہ سے وہ دوبارہ ہسپتال جانے کی مہلت نہیں نکال سکا تھا۔ البتہ اپنے اسی کولیگ کے ذریعے جس کی مدد سے کشور کو اس ہسپتال میں شفٹ کرایا تھا، آفتاب کو بھی اسی ہسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا تاکہ وہ قریب رہ کر کشور کی خبر گیری بھی کرتا رہے اور خود اس



بھی جاری رہے۔ اس کے کہنے پر اس کے کولیگ نے آفتاب کو ایک نیا سیل فون سم سمیت مہیا کر دیا تھا اور وہ اسی سیل پر آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں افضل!'' اس کی تمام باتوں کے جواب میں آفتاب نے صرف ایک جملہ کہا اور اسے ایسا لگا جیسے یہ جملہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بالکل بجھا ہوا ہو۔

''میں موقع دیکھ کر تمہارے پاس چکر لگاؤں گا لیکن سوری یار! ابھی فوری طور پر نہیں آ سکتا۔'' اس نے معذرت کی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مصروف ہو گے اور تمہارے لیے میرے پاس آنا آسان نہیں ہوگا۔'' اس بار اس کے لہجے میں تلخی سی تھی۔

''مصروفیت تو واقعی ہے لیکن میں احتیاطاً بھی تمہاری طرف آنے سے گریز کر رہا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ لوگ مسلسل میری نگرانی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ چودھری کے گرگے ہوں اور میرے پیچھے لگ کر تم تک پہنچ جائیں۔'' اس نے آفتاب کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ اس کا خیال تھا کہ حال میں مجبور و لاچار پڑے آفتاب کو اس کے انکار سے ٹھیس لگی ہے اس لیے اس کا لہجہ تلخ ہو چلا ہے۔

''اچھا ہے کہ پہنچ جائیں۔ کم سے کم تم تو مزید قربانی کا بکرا بننے سے بچو گے۔'' آفتاب کے جھنجلاہٹ اور اذیت میں ڈوبے اس جواب نے اسے چونکا دیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو یار!'' اس کے انداز پر اُلجھ کر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''اور کتنا چھپاؤ گے دوست! تم پر جو گزری ہے، اس نے مجھے صرف دکھ ہی نہیں دیا، گہری شرمندگی سے بھی دوچار کیا ہے۔ یہ احساس کہ تم میری وجہ سے، میری خاطر اتنے عظیم صدمے سے گزرے ہو، مجھے ایک پل چین سے سانس لینے دے رہا۔'' اس بار آفتاب کی آواز رُندھ سی گئی جبکہ افضل نے سارا معاملہ سمجھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

''میں نے تم سے کچھ چھپایا نہیں ہے بس بتانے سے گریز کیا تھا کہ تم پہلے ہی اتنی پریشانی میں تھے۔ ایک طرف تمہاری اپنی حالت، دوسری طرف کشور کی پریشانی چنانچہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہیں ایک اور صدمے سے دوچار کر دوں۔''

''میری تکلیف اور پریشانی تمہارے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر مجھے تمہارا دکھ اپنے دل پر سہنا پڑے تو یہ ایک دوست کی حیثیت سے میرا حق ہے اور یہاں تو ایک طرح سے میں ہی تمہیں یہ دکھ پہنچانے کا سبب بنا ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میری قسمت میں جو چوٹ لکھی تھی، وہ مجھے مل گئی۔ ان تینوں کا مجھ سے بچھڑنا قدرت کا فیصلہ ہے۔ جب خدا نے ہمارا ساتھ ہی اتنا لکھا تھا تو سبب چاہے جو بھی ہوتا، مقررہ وقت پر یہ ساتھ ختم ہو ہی جانا تھا۔ تم خوامخواہ خود کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔'' شدید غم سے دوچار ہونے کے باوجود وہ آفتاب کو ایک اچھے دوست کا فرض ادا کرتے ہوئے اس کے احساسِ شرمندگی سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے افضل! تم نے ہر ضرورت کے وقت پر میرا ساتھ دیا ہے لیکن افسوس کہ جب تم پر مشکل گھڑی آئی تو میں تم سے دُور تھا۔ تم نے ملاقات ہونے پر بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے اتفاق سے میں نرس سے پچھلے دو چار دن کے اخبارات منگوا کر ان کا مطالعہ کر رہا تھا تو تمہارے متعلق خبر پر نظر پڑی۔ میں تو چکرا کر رہ گیا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ بھابی اور بچے اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ میں سوچ

رہا تھا تمہیں فون کر کے تم سے بات کروں لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تو خود تمہاری کال آ گئی۔'' وہ
اُداسی میں ڈوبا کہتا جا رہا تھا۔

''بس یار! جو اللہ کو منظور تھا، وہ ہو گیا۔ زخم تو خیر ایسا لگا ہے کہ اب ساری زندگی بھرنے والا نہیں لیکن
کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ اب تو میری یہی خواہش ہے کہ تم اور کشور سکھی رہو اور سارے جہان کی خوشیاں
میں تمہارے بچوں میں اپنے بچوں کا پیار پالوں گا۔'' افضل کی آواز میں بھی بالآخر دُکھ کی جھلک آ ہی گئی لیکن
نے خود پر فوراً ہی قابو پا لیا۔

''اب تم آرام کرو اور اپنے ذہن کو فضول باتوں میں اُلجھنے سے بچاؤ۔ اور ہاں، کسی قسم کی بے احتیاطی
کرنا۔ ابھی تمہارا روپوش رہنا بہت ضروری ہے۔ چودھری کے کارندے کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھر
ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ذرا سی بداحتیاطی سے ان کی نظر میں آ جاؤ۔ اللہ نے تمہیں اور کشور دونوں
زندگی عطا کی ہے۔ اس زندگی کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تم
ہسپتال میں محدود رہنے کا فائدہ اٹھاؤ اور اس عرصے میں اپنا حلیہ تبدیل کر ڈالو۔ میرے خیال میں داڑھی مونچھیں
رکھ لینے اور ہیئر اسٹائل تبدیل کر لینے سے تمہارے حلیے میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی اور سرسری طور پر دیکھنے
والے کے لیے آسانی سے تمہیں شناخت کر لینا آسان نہیں رہے گا۔'' وہ پے در پے اس کو ہدایات جاری کرتا
رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار! میں خیال رکھوں گا۔ تم میرے لیے اتنا پریشان مت ہو۔'' اس نے افضل کو تسلی دی۔

''اوکے، میں فون بند کرتا ہوں۔ آج مجھے ذرا اپنے دفتر کا بھی چکر لگانا ہے۔ کئی کام ادھورے پڑے ہیں
انہیں بھی دیکھنا ہے۔'' افضل نے فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔
آفتاب سے بات کرتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل دھاڑیں مار مار
رونے کو چاہ رہا تھا۔ عجیب وقت آ پڑا تھا کہ وہ دوست کے سینے سے لگ کر اپنے آنسو بھی نہیں بہا سکتا تھا اور اب
اسے ساری زندگی ان آنسوؤں پر بند ہی باندھے رکھنا تھا۔ سینے میں موجزن غم کے طوفان کو ساری دنیا سے
کر زندگی کو پوری فنکاری کے ساتھ گزارنا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے رونے کی خواہش کو پیچھے دھکیلا اور
گاڑی کی چابیاں لے کر ایک حسرت بھری نظر خالی گھر پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ گاڑی اپنے علاقے
نکال کر وہ مین روڈ پر پہنچا تو ایک ایسی گاڑی اُس کی نظر میں آ چکی تھی جو گھر سے مسلسل اس کے تعاقب میں تھی
اس نے اس تعاقب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سابقہ انداز میں ڈرائیونگ جاری رکھی۔ اگر تعاقب کرنے
والوں کا مقصد اس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچنا تھا تو وہ اس سلسلے میں پوری طرح محتاط ہو چکا تھا۔ اول
تو وہ ان سے ملاقات کے لیے جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا اور اگر کبھی جاتا بھی تو پھر ان تعاقب کنندگان کو
پیچھا چھڑا کر ہی وہاں جاتا۔ فی الحال تو اسے اپنے اخبار کے دفتر جانا تھا اور وہاں تک کسی کا پیچھے پہنچ جانا کوئی
قابل تشویش بات نہیں تھی۔ یہ دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک مشہور اخبار کے ساتھ منسلک ہے اور اسی اخبار کے لائسنس
کردہ نیوز چینل کے لیے بھی کام کرتا ہے۔

شہر کے گنجان علاقے میں واقع اخبار کے دفتر کے سامنے اپنی گاڑی روک کر وہ نیچے اُترا تو بیک ویو مرر
میں اسے وہ گاڑی بھی نظر آ گئی جو گھر سے ہی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کو یہاں بھی دیکھ کر اب
شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعی اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نگرانی کرنے والوں کے بارے میں وہ یہی
قیاس کر سکتا تھا کہ وہ چودھری کے کارندے ہیں جنہوں نے مبینہ طور پر اس کے بیوی بچوں کو بھی قتل کیا تھا۔ اس



لیے گھر کو اُجاڑنے والے قاتلوں کا تصور کر کے اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں لیکن اس غصے کے اظہار
لیے پیچھے گاڑی میں موجود لوگوں تک جانا اور ان سے بھڑنا کوئی دانش مندی نہیں تھی۔ وہ بہ مشکل خود پر قابو
ہوئے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہاں موجود ساتھیوں نے بڑے خلوص سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب
کے لیے اس کے گھر بھی آئے تھے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بڑے غم و غصے کا اظہار بھی
تھا۔ اس وقت بھی وہ لوگ اس سے بہت ہمدردی کے ساتھ حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ ان لوگوں
سوالوں کا جواب دے ہی رہا تھا کہ چپراسی پیغام لے کر آ گیا کہ ایڈیٹر صاحب اسے اپنے کمرے میں بلا
ہیں۔ ان تک اس کے آنے کی اطلاع پہنچانے والا بھی یقیناً وہی تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ اُٹھ کر ایڈیٹر کے
رے میں چلا گیا۔

''آؤ افضل! مجھے تمہیں دوبارہ دفتر میں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں خود غرضی کا مظاہرہ کر
ہوں۔ ایسا میں تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ تم جتنی جلدی خود کو زندگی کے معمولات میں شامل کر لو گے،
گزرنے والے حادثے کے صدمے کو سہنا اتنا ہی آسان ہوتا جائے گا۔ بس ان حالات میں تم خود کو تنہا
سمجھنا۔ تم نے کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لیا ورنہ تم دیکھتے کہ پوری صحافی برادری تمہارے پیچھے کھڑی ہو کر اس
کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں حصہ لیتی۔'' ایڈیٹر صاحب کے ان دعوؤں میں کتنے فیصد سچائی تھی، یہ افضل
جانتا تھا۔ وہ کوئی پہلا صحافی تو نہیں تھا جس کو کسی حادثے سے گزرنا پڑا تھا۔ کتنے تو اس دشت کی سیاحی میں
اپنی جان بھی گنوا چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان کے ساتھی ایسے مواقع پر بھرپور احتجاج کرتے
لیکن انصاف..... انصاف یہاں کس کو ملا تھا جو وہ اپنے لیے کوئی اُمید لگاتا۔ ہاں، ایڈیٹر صاحب نے جو
ہمدردی کر دی تھی، وہ بھی دل کو سہارا دینے کے لیے کافی تھی۔

''شکریہ سر! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود کسی کا نام لینے سے قاصر تھا اس لیے آپ لوگوں کو کیسے زحمت
؟'' اس نے ان کے سامنے بھی وہی مؤقف اختیار کیا جو اب تک پولیس اور پریس کے سامنے ظاہر کرتا رہا
اُس کے اس جواب کے بعد ایڈیٹر صاحب نے بھی موضوع بدل دیا اور ان پروجیکٹس پر گفتگو کرنے لگے
پر وہ کام کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کی ڈسکشن کے بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ افضل پہلے ہی خاصا کام کر چکا
اور آگے بھی مقررہ وقت پر اپنا کام کر لے گا تو انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

''ارے ہاں افضل! یاد آیا، جس رات تمہاری بیوی اور بچوں کا قتل ہوا، اس دن صبح میں ایک شخص تمہارا
پتا ہوا یہاں دفتر آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تمہاری بیوی کا کزن ہے لیکن اسے تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم
اس لیے دفتر چلا آیا ہے۔ اس روز تم فیلڈ میں تھے۔ میں نے اس شخص کو تمہارے گھر کا ایڈریس دے دیا
وہ گھر پر تم لوگوں سے ملنے آیا تو ہو گا؟'' وہ ایڈیٹر کے کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے پیچھے سے
آواز دے کر روکتے ہوئے یہ سب بتایا۔

''میری بیوی کا کزن.....؟'' افضل حیران ہوا۔ ''کیا نام بتایا تھا اُس نے اپنا؟''

''نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔'' ایڈیٹر صاحب نے اپنا سر کھجایا۔ ''بہرحال، دیکھنے میں کسی اچھی فیملی کا ممبر لگ
تھا۔ رنگ گورا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ جوان العمر آدمی تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی کا تعلق کسی قبائلی
ان سے تھا اس لیے اس جوان کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ وہ تمہارا سسرالی رشتے دار ہی ہے۔ کیا وہ تم سے
تمہارے گھر نہیں آیا تھا؟'' انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے تفصیلات بتاتے ہوئے آخر میں
ایش سے سوال بھی کیا۔

"میرے علم میں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ میری غیر موجودگی میں میری بیگم سے مل کر چلا گیا ہو۔ بعد میں اس بے چاری کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتی۔ ممکن ہے بعد میں اس کا وہ کزن جنازے میں فرا کے لیے بھی آیا ہو لیکن اس روز اتنے لوگ تھے کہ مجھے خود ہوش نہیں تھی کہ کون کون مجھ سے آ کر ملا تھا۔" نوجوان کا حلیہ سن کر مزید ٹھٹک گیا تھا لیکن ایڈیٹر پر کچھ ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گول مول جواب دے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس سے دفتر میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا گیا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی قلیل وقت وہاں سے نکل پڑا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہی گاڑی اس کے تعاقب میں تھی لیکن اب وہ تعاقب کنندگان بارے میں ابہام کا شکار تھا۔ پہلے تو اسے سو فیصد یقین تھا کہ چودھری کے کارندے آفتاب اور کشور کا پتہ کے لیے اس کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن اب وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں یہ مہتاب کا وہ چچا زاد تو نہیں جو ماضی کبھی اس کا منگیتر رہا تھا اور جس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مہتاب کو تلاش کر کے ٹھکرائے جانے کا انتقام لے کر رہے گا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ مہتاب اور بچوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد افضل کی جان کے درپے ہوتا کہ اپنے انتقام کی تکمیل کر سکے۔ ان خیالوں میں گاڑی چلاتے ہوئے نظریں مسلسل عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس گاڑی اور اس کے سواروں بارے میں سوچتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا اور پیچھے سے ایک تیز رفتار کار تعاقب میں آتی گاڑی اوورٹیک کر کے خود اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بائیں جانب چلنے لگی۔ کار سوار نے لمحے بھر کے لیے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور پھر ڈیش بورڈ پر پڑا چھوٹا مگر جدید ساخت کا پسٹل اُٹھا کر اس کا نشانہ لیتے ہو ٹریگر دبا دیا۔

⊛----✪----⊛

"یہ کیا چکر ہے؟..... ہمارے علاوہ اور کون ہے جو اس سالے صحافی کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ اُس کی سے ہم پہلے بھی ناکام رہے اور اب پھر اس نے ایسی گڑبڑ کی ہے کہ وہ صحافی کا بچہ اپنے سائے سے بھی ہو رہنے لگے گا۔" بالا اپنی رپورٹ کے ساتھ چودھری کی خدمت میں حاضر تھا اور اس کی پیش کردہ رپورٹ سن چودھری نے تشویش بھرے لہجے میں یہ تبصرہ کیا تھا۔

"معلوم نہیں سرکار! کون ہے۔ میں تو بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ ایک گڈی ہمارے پیچھے سے نکل کر آگے اور گڈی والے نے صحافی کی گڈی کے ساتھ چلتے ہوئے بالکل اچانک ہی فیر (فائر) مارا اور ہوا کی طرح گڈی نکال کر لے گیا۔ گولی کھا کر صحافی اپنی گڈی کو سنبھال نہیں سکا۔ لیکن یہ ہے کہ اس کی قسمت چنگی تھی اس لیے گڈی تھوڑی اِدھر اُدھر ہوئی اور فیر شاید انجن بند ہونے کی وجہ سے رُک گئی۔ گولی سے بھی اسے ایسا خاص نقصان نہیں پہنچا، بس بازو کے زخمی ہونے پر بلا ٹل گئی۔ اب ہسپتال میں پڑا ہے علاج کے لئے۔ تین چار سے پہلے تو اسے وہاں سے چھٹی نہیں ملنے والی اس لیے میں گامے اور شیدے کو اس کی نگرانی کی ڈیوٹی دے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔" بالا، چودھری کے چہرے پر چھائی کوفت اور غصے کی سرخی کو دیکھتے ہوئے جواب میں ایک بار پھر وہی سب کچھ دہرا رہا تھا جو وہ پہلے بھی بیان کر چکا تھا۔

چودھری کا مزاج آج کل کس قدر برہم ہے، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کچھ نامعلوم افراد اس کے ڈیرے حملہ کر کے اس کے شکار آفتاب کو بہت صفائی سے نکال لے گئے تھے۔ اس رات حملے سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے ہی بالا اپنے آدمیوں کو لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ افضل کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے



کے پیشِ نظر چودھری نے اسے اور منشی کو اپنا رازدان بنا لیا تھا۔ اپنا پروگرام اس رات یہ کرنا تھا کہ افضل پہنچ کر اسے اور اس کے اہلِ خانہ کو قابو میں کرتا اور اگر کشور وہاں موجود ہوتی تو اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ صورت میں وہ افضل کے بیوی بچوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر اسے اس بات پر مجبور کرتا کہ وہ کشور کا پتہ بتا لیکن جب وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ افضل کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ وہ ایک ساتھی کے ساتھ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا تو انہیں گھر میں کسی کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اندر داخل ہو کر ان لوگوں کو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی غیر آباد گھر میں پہنچ گئے ہیں۔ گھر کے اس حصے کو سناٹے کو آدھی رات کے بعد چھا جانے والی خاموشی پر مہول کرتے کرتے ہوئے انہوں نے جائزہ شروع کیا تو ایک کمرے میں افضل کی بیوی اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ لاشیں دیکھ کر صاف اندازہ لگا کہ انہیں سوتے میں موت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس صورتِ حال پر ہکا بکا ہوتے ہوئے انہوں نے باقی کی عجلت میں تلاشی لی لیکن نہ تو وہاں کشور موجود تھی اور نہ ہی افضل۔ وہ لوگ صورتِ حال کو نہ سمجھتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ واپس پہنچے تو معلوم ہوا ڈیرے پر اس عرصے میں کیا گزر چکی ہے۔ وہ خود شکاری بن کر کہیں جانے گئے تھے لیکن ایک طرف انہیں اپنی شکارگاہ میں کچھ نہیں ملا تو دوسری طرف پیچھے سے کوئی ان کے ڈیرے پر ہی شکار کھیل کر چلا گیا۔ اپنے سارے اچھے لڑاکے بالا ساتھ لے کر گیا تھا۔ جو چند ایک ڈیرے پر تھے، وہ حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے اور بری طرح چوٹ کھائی تھی۔

ڈیرے پر اس طرح حملہ آور ہو جانے کا تو ان میں سے کسی کو گمان تک نہیں تھا جو وہاں کی حفاظت کا بہت عمدہ انتظام کر کے جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ڈیرہ دہشت کی ایسی علامت تھا جہاں کسی کی قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور ماضی میں وہاں عموماً دو سے تین ملازموں کی ڈیوٹی لگانے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا لیکن جب بالا نے ایک بار وہاں گھس کر ڈیوٹی پر موجود بندوں کو اثاغفیل کرنے کے بعد نہ صرف اپنی وہ تصویریں حاصل کیں جن کے ذریعے چودھری اسے بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ تہ خانے میں آگ بھی لگا گیا تو اس کے بعد وہ لوگ ڈیرے کی نگرانی کے بارے میں کافی چوکنے ہو گئے اور زیادہ آدمی وہاں نگرانی کا کام انجام دینے لگے تھے لیکن اس رات تو مجبوری تھی۔ بالا ایک اہم کام کے لیے جا رہا تھا اور اس کے لیے ہوشیار بندوں کا ہونا ضروری تھا اور پھر وہ لوگ ڈیرہ کوئی بالکل ہی خالی چھوڑ کر نہیں چلے گئے تھے۔ جتنے ہتھیار بند بندے وہاں موجود تھے وہ بھی نگرانی کے لیے کافی تھے۔ لیکن ڈیرے پر حملہ ہی اتنا منظم ہوا تھا کہ وہاں موجود بندے کچھ نہیں کر سکے۔ اپنے آدمیوں کی اس شکست نے چودھری کو بڑا چراغ پا کیا تھا۔ اس کے بعد بالا بھی اپنی مہم میں ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس ہزیمت پر پہلے تو چودھری تمام کارندوں پر خوب گرجا برسا اور پھر جب غصے کی شدت کم ہوئی اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو اس نے بالے اور اس کے آدمیوں کو افضل کی نگرانی کا حکم دیا۔ حکم کو صادر کرنے اور پھر بالے کے عمل پیرا ہونے میں اتنا وقت لگ گیا تھا کہ وہ لوگ افضل کے پیچھے اس محل تک نہیں پہنچ سکے جہاں آفتاب اور کشور دونوں زیرِ علاج تھے۔ اپنی اس ایک اور بدقسمتی سے بے خبر وہ افضل کی نگرانی پر لگے رہے۔

افضل نے نگرانی کو محسوس کر کے ہسپتال کا رخ ہی نہیں کیا لیکن اس نے کسی مرحلے پر ان نگرانی کرنے والوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اس لیے بالے اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ افضل نے اپنے تعاقب کو بھانپ لیا ہے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام میں لگے رہے لیکن اب پھر ایسا حادثہ پیش آ چکا تھا جس کے باعث افضل کی نقل و حرکت ہسپتال کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی

تھی اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایسی کسی جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں آفتاب یا کشور میں سے کسی کو
سکتے۔ ان حالات میں چودھری کا مزاج برہم ہونا ایک لازمی بات تھی اور اس برہمی کے پیشِ نظر ہی بالا معمول
سے کہیں زیادہ نظریں جھکا کر عاجزی سے بات کر رہا تھا پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں چودھری بھڑک نہ جائے۔
حالات و واقعات کی اُلٹ پھیر کی وجہ سے کشور اور آفتاب تک پہنچنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس کی ذمے
اس کے شانوں پر ڈال کر اس پر اُلٹ ہی نہ پڑے لیکن خوش قسمتی سے گفتگو کے اختتام پر پہنچنے سے پہلے
چودھری کا موبائل بج اُٹھا۔ چودھری نے موبائل کی اسکرین پر کال کرنے والے کا نام پڑھنا چاہا لیکن وہاں
اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کچھ بے دلی کی سی کیفیت میں کال ریسیو کی۔

''کیا بات ہے چودھری صاحب! آواز کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''
کی بے دلی سے کی گئی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے بہ زبانِ انگریزی جس کھنکتی ہوئی آواز نے
مخاطب کیا، اسے سن کر وہ بہت زیادہ اعصابی تناؤ کا شکار ہونے کے باوجود کھل اٹھا۔ اس کھنکھناتی سریلی
نے اسے بولنے والی کا دلکش سراپا اور گرم جوش قربت یاد دلا دی تھی۔

''لِنڈا!..... ویئر آر یُو؟..... میرے موبائل پر جو نمبر آ رہا ہے، وہ تو پاکستان کا ہی ہے۔ کیا تم یہاں ہو؟''
اس نے بہت بے تابی سے پوچھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

''یس، آئی ایم ہیئر۔'' اس نے اپنی مخصوص بلاوا دیتی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

''یہاں کہاں؟..... لاہور ایئرپورٹ پر یا کسی ہوٹل میں؟ مجھے بتاؤ، میں فوراً تمہیں لینے کے لیے گاڑی
بھیجتا ہوں۔'' چودھری نے بے تابی سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنس پڑی، پھر شوخی سے بولی۔

''ایسی بھی کیا بے صبری چودھری صاحب! میں یہاں تک آئی ہوں تو کسی نہ کسی روز آپ سے ملنے بھی
ہی جاؤں گی۔''

''کسی روز کیوں؟..... آج اور ابھی کیوں نہیں؟'' چودھری نے کسی نوجوان عاشق کی سی بے قراری
سوال کیا۔

''ابھی کچھ پابندی ہے۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''کیسی پابندی؟ اور یہ پابندی کس نے لگائی ہے؟''

''ڈیوڈ نے۔'' یہ جواب دے کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر بھرپور سنجیدگی کے ساتھ بولی
''مجھے ڈیوڈ ہی نے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے چودھری افتخار سے وعدہ کیا تھا کہ لِنڈا کو پاکستان
بھیجوں گا اس لیے اپنا وہ وعدہ پورا کرنے کے لیے میں تمہیں بھجوا رہا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ مجھے صرف آپ کی
دل بستگی کے لیے تو نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آپ کے پاس جاؤں اور اب تک جو کام ہوا ہے، اس
کا جائزہ لوں۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے، تم آؤ اور جائزہ لے لو۔'' اس نے فوراً پیشکش کی۔

''لیکن کس چیز کا؟'' لِنڈا کے لہجے میں اس بار طنز کی کاٹ تھی۔ ''آپ کیا سمجھ رہے ہیں، ڈیوڈ آپ کی
طرف سے بے خبر ہے؟ اُسے ساری خبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ نے ابھی تک کام شروع نہیں کروایا ہے۔ اس
صورتِ حال پر وہ بہت برہم ہے۔ اگر میں درمیان میں نہ ہوتی تو وہ بہت سختی سے آپ سے باز پرس کرتا لیکن
میں نے آپ کی اور اپنی فرینڈ شپ کا خیال کرتے ہوئے اسے باز رکھا اور یقین دلایا کہ میرے کہنے پر آپ
اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کے پاس چند دن کی مہلت



تمام ضروری سامان ہم پروائیڈ کر چکے ہیں۔ آپ اپنے آدمیوں کو کام پر لگا دیں۔ جب مجھ تک یہ
پہنچے گی کہ آپ کے آدمی ہمارے حسبِ منشا کام کر چکے ہیں تو پھر میں خود آپ سے ملاقات کے لیے رابطہ
لاں گی۔''

ایک تو چودھری کو یہ اندازہ تھا کہ ڈیوڈ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کی پہنچ کسی ایسے خفیہ ادارے تک
جو اس جیسے زمیندار کو کیا، پاکستانی حکومت تک کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔ دوسرے یہ سب کہنے والی لِنڈا ہوشربا
ت تھی اس لیے وہ برداشت سے کام لے گیا ورنہ چودھری افتخار عالم شاہ جیسے مطلق العنان شخص سے کوئی اس
لی بھرے انداز میں گفتگو کرے، یہ کہاں ممکن تھا؟ لیکن اب وہ جس چکر میں پھنس چکا تھا، اس کے بعد یہ سب
سہنا ہی تھا۔

''سوری ڈارلنگ! تم اور ڈیوڈ جانتے ہی ہو کہ میں یہاں کس پریشانی میں مبتلا ہوں، اسی وجہ سے میں وہ
نہیں کر سکا جس کا ڈیوڈ سے وعدہ کیا تھا۔'' اس کی زندگی میں مشکل سے ہی کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہوگا کہ اسے
ی سے معذرت کرنی پڑی ہو لیکن اس وقت وہ لِنڈا سے سوری کہنے پر مجبور تھا۔

''وہ پریشانی آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہم جس حد تک آپ کی ہیلپ کر سکتے تھے، وہ ہم نے کی۔ اگر آپ
ڈ کی طرف سے ملنے والی انفارمیشن پر ڈھنگ سے اور فوری ایکشن لیتے تو آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا۔
حال، میں ایک بار پھر یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی پریشانی آپ کا پرسنل پرابلم ہے اور آپ کے کسی پرابلم
بزنس پر اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ آئی ہوپ کہ آپ خیال رکھیں گے اور نیکسٹ ٹائم جب میں آپ کو کال کروں
تو مجھے اچھی پروگریس سننے کو ملے گی۔ پھر میں اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھنے آؤں گی۔'' وہ اسے ساری تندو
سنانے کے بعد ایک بار پھر ملاقات کا چارہ ڈالنے لگی۔

''اگر تمہاری یہی شرط ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری امید سے بھی بڑھ کر
پروگریس دیکھنے کو ملے گی۔'' چودھری نے دعویٰ کیا۔

''اوکے! میں آپ کے اس چیلنج کو آزمانے آؤں گی۔ فی الحال تو اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ گڈ لک اینڈ
گڈ بائے۔'' اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا۔ چودھری نے بے تاب ہو کر اپنے موبائل پر آنے والے نمبر پر
کال بیک کرنا چاہی لیکن وہ نمبر کسی پبلک بوتھ کا تھا جس پر کال بیک کرنا ممکن نہیں تھا۔

''لعنت ہے ایسی اولاد پر جس کی وجہ سے زندگی کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے۔ ایک بار وہ باغی لڑکی میرے
آ جائے، فیر میں اُسے اُس کی اس جرأت اور بغاوت کا مزہ چکھاؤں گا۔'' لِنڈا سے رابطہ ٹوٹ جانے پر وہ
طرح جھنجلا گیا تھا چنانچہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ ویسے لِنڈا کا قصہ درمیان میں نہ بھی ہوتا تو کشور کے لیے
کے پاس کسی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ خاندانی رسم و رواج سے بغاوت کرنے والی لڑکیوں کو عبرت ناک
سے دوچار کرنے کا سلسلہ نسلوں سے ان کے خاندان میں جاری تھا اور چودھری اس رواج کو ختم کرنے کا
ی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے اس نظریے پر پورا یقین رکھتا تھا کہ بغاوت کرنے والی لڑکی کو
کڑی سزا دی جائے کہ آئندہ جنم لینے والی لڑکیاں بھی ان کے بارے میں سن کر تھرا اُٹھیں۔ اور اگر کسی کے
میں بغاوت کا خیال پیدا ہو تو بھی وہ اس انجام کا سوچ کر توبہ کر لے۔ لیکن کمال یہ تھا کہ اس نظریے اور
ول پر سختی سے کاربند ہونے کے باوجود ہر نسل میں کوئی نہ کوئی ایسی باغی لڑکی تو نکل ہی آتی تھی جو اپنے ساتھ
نے والی ناانصافی اور ظلم پر احتجاج کرتے ہوئے خاندانی روایات سے ٹکرانے کی جرأت کر ڈالتی۔ یہ اور بات
اس جرأت کے نتیجے میں عموماً اس بے چاری لڑکی کو اپنی جان ہی گنوانی پڑتی تھی لیکن شاید مرتے ہوئے اس

کے پاس یہ اطمینان ہوتا ہوگا کہ اس نے سونے سے بنے قفس کی قید میں ساری زندگی سسکتے ہوئے گزار لی بجائے اس قفس کو توڑ کر اُڑنے کی کوشش تو کی۔ کشور نے بھی اپنی اسی باغی نسل کی پیروی کی تھی چنانچہ اس کا اسے انہی جیسے انجام سے دوچار کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

قدرے کچی پکی سی سڑک پر مہارت سے جیپ چلاتا ہوا میجر ذیشان معمول کے مطابق اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اسے اپنی جیپ کو بریکس لگا کر روکنا پڑا۔ وہ سنہری بالوں والی عورت تھی جو سڑک کے درمیان پڑی تھی۔ فاصلے سے دیکھنے پر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور اب بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ عورت کی حالت کے پیشِ نظر وہ جیپ روکنے کے بعد نیچے اُترا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اُس کے قریب آنے پر بھی عورت کے جسم میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی تو وہ اس کے نزدیک پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے سیدھا کیا۔ سیدھا کرنے پر عورت کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا اور یہ چہرہ یقیناً ایسا تھا کہ دیکھنے والا خصوصاً اگر وہ مرد ہو تو چند لمحوں کے لیے ہی سہی مبہوت ضرور رہ جاتا تھا۔

میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا دیر کے لیے عورت کے دمکتے حُسن میں کھو کر ساکت ہی رہ گیا۔ اُس کی اپنی اب تک کی زندگی میں بے شمار دیسی اور بدیسی عورتوں سے ملاقات ہوئی تھی، ان میں بیشتر بہت خوب صورت بھی تھیں لیکن ایسا حُسن کبھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا جسے پہلی نظر دیکھنے کے ساتھ ہی پورے جسم میں برق سی دوڑ جائے۔ شارٹ اسکرٹ میں ملبوس لمبی عریاں ٹانگوں والی وہ عورت جس کی آنکھیں فی الحال بند تھیں، اپنے وجود میں کسی جادوگرنی کا سا سحر رکھتی تھی جو پل بھر میں کسی کو بھی ساکت کر سکتی تھی۔ میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن جب اسے خیال آیا کہ عورت بے ہوش ہے اور شاید اسے فوری طبی امداد کی ضرورت بھی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اپنے سکتے کی کیفیت سے باہر آیا اور عورت کے سنہری دمکتے ہوئے رخساروں کو تھپکتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگا۔ لیکن اُس کی یہ کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی اور عورت ہنوز بے ہوشی کی ہی حالت میں پڑی رہی۔

اُس کی یہ حالت دیکھ کر وہ اپنی جیپ کی طرف واپس پلٹا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکال کر واپس عورت تک آیا۔ اس بار اس نے پانی کی پوری بوتل اس کے چہرے پر انڈیل ڈالی۔ پانی کی تری اور ٹھنڈک نے عورت کو کسمسانے پر مجبور کر دیا اور ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے پناہ خوب صورت آنکھوں کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں سمندروں جیسی گہرائی تھی جو دیکھنے والے کو ڈبو ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میجر ذیشان بھی ڈوبنے لگا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''ہُو آر یُو میڈم؟..... آر یُو اوکے؟'' عورت نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور چند پل کے لیے ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھتے رہنے کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ میجر ذیشان نے محسوس کیا کہ وہ بہت زور زور سے سانس لے رہی ہے۔ سانس لینے کا یہ انداز ایسا تھا کہ جیسے اسے اس کام میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ عورت کی اس کیفیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہ بے شک وہ ہوش میں آ گئی ہے لیکن مکمل طور پر فٹ نہیں ہے اور اسے طبی امداد ملنی چاہیے، اس نے اسے سہارا دے کر اپنی جیپ تک لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ



ہسپتال پہنچا سکے۔

''تھوڑی سی ہمت کیجیے میڈم! اور میری جیپ میں چل کر بیٹھیے تاکہ میں آپ کو ہسپتال پہنچا سکوں۔'' اس نے عورت سے کہا اور اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے بھی اس کی بات سمجھ لی تھی چنانچہ وہ جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میجر ذیشان نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ عورت نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ خود اپنے بائیں بازو کو اس کے شانوں پر پھیلا دیا اور اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈالتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ عورت کی اس قربت نے میجر ذیشان کے جسم میں ایک بار پھر سے دوڑا دی۔ اس بار جسم میں دوڑنے والی برق کی شدت پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ پہلی بار اسے صرف اس کا مرعب حُسن کے دیدار نے جھٹکا لگایا تھا اور اب بات لمس کی تھی۔ عورت کا لمس تو اس کے عام سا ہونے کی حالت میں بھی مرد کو ہلا ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہاں تو حُسن کا شاہکار سامنے موجود تھا۔ وہ حُسن کی ان کیفیات سے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں نڈھال ہوا جا رہا تھا تو یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ پھر یہ حُسن کوئی ڈھکا چھپا بھی نہیں تھا۔ اپنی تہذیب اور معاشرت کے اعتبار سے اس عورت نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، وہ اس کے جسمانی خطوط کو بہت خوبی کے ساتھ عیاں کر رہا تھا۔ ایک طرف شارٹ اسکرٹ سے جھانکتی سڈول ٹانگیں تھیں تو دوسری طرف کھلے گریبان والے تنگ بلاؤز نے بھی بہت سے راز عیاں کر رکھے تھے۔ آج کل موسم خوشگوار تھا، یقیناً اس وجہ سے عورت کو اس قسم کا لباس پہننے میں قطعی تکلف محسوس نہیں ہوا ہوگا۔ یوں بھی اس کے خدوخال اور رنگت اس کے مغرب کے باسی ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ سرد ممالک میں رہنے والی عورتیں گرمی کی شدت کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور معمولی درجہ حرارت گر جانے کی صورت میں اوڑھ کر رہنے کی عادی نہیں ہوتیں چنانچہ وہ بھی اپنے منی اسکرٹ میں مزے سے تھی۔ میجر ذیشان نے ہانپتے کانپتے بہ مشکل اسے جیپ تک پہنچایا اور اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی لیکن فوری طور پر جیپ اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے اسے چند لمحے درکار تھے۔ ان لمحات میں اس نے محسوس کیا کہ عورت دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسے یوں دبا رہی تھی جیسے شدید درد محسوس کر رہی ہو۔

''کیا تم سر میں درد محسوس کر رہی ہو؟'' میجر ذیشان نے انگریزی میں اس سے پوچھا۔

''ہاں، ایکچوئیلی میرے سر کی پشت پر بہت زور سے ضرب لگائی گئی ہے جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی اور اب ہوش میں آنے کے بعد کافی درد محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے پہلی بار میجر کے کسی سوال کا جواب دیا۔ اس کا لب و لہجہ سن کر وہ سمجھ گیا کہ وہ امریکن شہری ہے۔

''کس نے تمہارے سر پر ضرب لگائی تھی ذرا وضاحت سے بتاؤ۔ بلکہ ایسا کرو کہ سب سے پہلے اپنا تعارف کروا دو۔'' ذیشان نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا۔

''میرا نام ایملی پارکر ہے۔ نیویارک سے آئی ہوں۔ وہاں میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں بطور آرکیٹیکچر جاب کرتی ہوں۔ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے اس لیے جب بھی کچھ معقول رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، چھٹیاں لے کر کسی نہ کسی ملک کی سیاحت کے لیے نکل پڑتی ہوں۔ اس بار میں نے اس کام کے لیے پاکستان کو منتخب کیا۔ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے شمالی علاقہ جات کو چنا ہے۔'' وہ خود کو اس حد تک سنبھال چکی تھی کہ سوالات کے جواب دے سکے چنانچہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی فرمائش پر اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''میرا نام ذیشان ہے۔ میں اپنی جاب پر جانے کے لیے یہاں سے گزر رہا تھا کہ تم بے ہوش پڑی ہوئی نظر آئیں۔ اب یہ تم بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی اور تم کیسے اس جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں؟'' وہ یونیفارم

میں نہیں تھا کہ اس کی شناخت ظاہر ہو جاتی چنانچہ اپنے نام کے ساتھ میجر لگائے بغیر محتاط انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ یہ اور بات تھی کہ اُس کی اس احتیاط پسندی نے تعارف سننے والی کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ دی تھی۔ تاہم جب اس نے میجر ذیشان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے اس کی طرف رخ کیا تو وہ طرح سنجیدہ تھی۔

''میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی گروپ مل جائے تو اس کے ساتھ ہو جاؤں گی، اس طرح سفری اخراجات کافی کم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے آج کے دن ایسا کوئی گروپ روانہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو آج یہیں اردگرد گھوم پھر کر دن گزار لیا جائے۔ چنانچہ میں صبح ناشتے سے بھی پہلے ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھ صرف اپنا ہینڈ بیگ لیا تھا اور ارادہ تھا کہ ایک آدھ گھنٹے کی واک کے بعد جہاں کوئی مناسب ہوٹل نظر آیا، وہاں ناشتہ کرلوں گی۔ لیکن پھر یہ حادثہ پیش آ گیا۔ میں سڑک پر سے گزر رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کر دیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔ اب تمہاری کوششوں سے ہوش میں آئی ہوں اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے میرا ہینڈ بیگ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر حملہ کرنے والا کوئی چور اُچکا تھا جس نے صرف ہینڈ بیگ حاصل کرنے کے لیے یہ حرکت کی تھی۔'' ایملی کی بتائی تفصیل نے میجر کو شرمندہ کر دیا۔ وہ ایک غیر ملکی تھی جسے اس کے وطن میں لوٹ گیا تھا چنانچہ اسے سخت افسوس ہوا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ پہلے تھانے چل کر اس واردات کی رپورٹ لکھوا دیتے ہیں۔ یہاں اس طرح کے جرائم عام نہیں ہیں بلکہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے سن کر مجھے کافی حیرت ہوئی ہے۔ اس علاقے میں تو برس بھر سے سیاح آتے رہتے ہیں اور کبھی انہیں اس طرح کی کوئی پریشانی نہیں اُٹھانی پڑتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ واردات کے پیچھے کوئی باہر سے آیا ہوا بندہ ہے۔ کیا تم نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟''

''نہیں۔ میں نے بتایا نا کہ اس نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا تھا اس لیے مجھے اسے دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔'' ایملی نے اپنے سر کی پشت سہلاتے ہوئے میجر کے سوال کا جواب دیا۔

''خیر، وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے امید ہے کہ اسے ڈھونڈ لیا جائے گا اور اس سے تمہارا سامان برآمد ہو جائے گا۔'' اس نے ایملی کو تسلی دی اور جیپ کا رخ مقامی تھانے کی طرف کر دیا۔ تھانے میں ایملی سے اس کے ہینڈ بیگ کی رنگت، ساخت اور اس میں موجود سامان کی تفصیلات کے علاوہ کئی دوسرے سوالات بھی کیے گئے۔ وہ لوگ رپورٹ درج کروا کر تھانے سے باہر نکلے تو کافی وقت گزر چکا تھا۔

''میرے خیال میں تم میری وجہ سے اپنے آفس پہنچنے میں لیٹ ہو گئے ہو۔'' ایملی نے قدرے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ذیشان سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ تمہاری مدد کرنا بھی میرا فرض تھا۔'' ایک تو وہ اس کے ساتھ ہونے والی واردات پر شرمندہ تھا دوسرے اس کے رعبِ حُسن نے بھی کچھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ دل کسی طور اسے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ مسکراتے ہوئے بہت اخلاق سے اس کی بات کا جواب دیا اور مزید بولا۔ ''تم نے ابھی تک کہ ناشتہ کیے بغیر ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ کسی اچھی سی جگہ ناشتہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ تمہارے سر پر لگائی جانے والی چوٹ سے خون بے شک نہیں بہا لیکن پھر بھی ایک نظر ڈاکٹر کو دکھا لینا مناسب رہے گا۔''

''میرے خیال میں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر میں معمولی سا درد ہے، میں کوئی پین



کی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ ناشتہ میں ضرور کروں گی بلکہ تم ایسا کرو کہ مجھے میرے ہوٹل تک لے چلو۔ اس کے بعد تم مجھے ڈراپ بھی کر دو گے اور ہم ساتھ ناشتہ بھی کر لیں گے۔'' ایملی نے تجویز پیش کی جس پر صاد کرتے ہوئے میجر ذیشان نے جیپ کا رخ اس ہوٹل کی طرف کر دیا جہاں وہ مقیم تھی۔ ہوٹل کا نام وہ اس وقت سن چکا تھا جب ایملی تھانے میں رپورٹ لکھوا رہی تھی۔ یہ ایک اچھی شہرت کا حامل خوب صورت سا ہوٹل تھا۔ جس کے احاطے میں سیب کے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال نچلی منزل پر تھا جبکہ رہائشی کمرے اوپر تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں گاڑی روکنے کے بعد میجر ذیشان نے ایملی کے ساتھ ڈائننگ ہال کا رخ کیا ہی تھا کہ ابھی وہ ایک دو قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ایملی ذرا سا لڑکھڑائی اور میجر کا بایاں بازو دبوچنے کے انداز میں پکڑ کر اس کا سہارا لیا۔

''آر یو اوکے؟'' اس نے خود بھی اسے سہارا دیتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''بس ذرا چکر سے آ رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ اوپر میرے رُوم میں چلتے ہیں۔ ناشتہ وہیں منگوا لیں گے۔'' اس نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

''اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' ذیشان نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، پہلے ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ناشتہ کر کے میری طبیعت سنبھل جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔'' ایملی نے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے اس کی بات مان لی۔ کمرے کے دروازے کی اضافی چابی اس نے کاؤنٹر کلرک سے لے لی تھی، خود ایملی کے پاس موجود چابی تو اس کے ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ایملی کو سہارا دیئے دیئے وہ پتھروں سے بنی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے کمرے کی طرف آیا۔ سیڑھیوں کی تعمیر میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا تھا اور حفاظت و سہارے کے لیے لگائی گئی ریلنگ سفید رنگ کی تھی۔ اس ریلنگ پر گلابی پھولوں والی سبز بیل لپٹی ہوئی تھی۔ ایملی کا تقریباً سارا بوجھ اپنے بازوؤں پر سنبھالے اس خوب صورت سے راستے سے گزرتے ہوئے میجر ذیشان اپنے جذبات میں خاصی ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ ایسی عورت اور ایسا ماحول کسی بھی مرد کو سحر زدہ کر دینے کے لیے بہت ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سحر میں گرفتار ہوا جا رہا تھا۔ خود کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھتے ہوئے وہ ایملی کے کمرے تک پہنچا اور ایک ہاتھ سے دروازے کا لاک کھولا۔ لاک کھولنے کے بعد وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

''مجھے بیڈ پر لٹا دو۔ کچھ دیر لیٹنے سے آرام آ جائے گا تو پھر اس کے بعد ناشتہ کریں گے۔'' اندر پہنچنے پر ایملی نے خواہش ظاہر کی۔ اس کے کہنے پر وہ اسے سہارا دیئے ہوئے بیڈ تک لے گیا اور جھک کر نرمی سے اسے بیڈ پر لٹایا۔ اسے لٹانے کے بعد وہ سیدھا ہونا چاہتا تھا لیکن نہ ہو سکا۔ ایملی نے ابھی تک اس کا بازو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے بازو نہ چھوڑنے پر وہ ذرا سا چونکا تو اس نے ہونٹوں پر ایک بلا وا دیتی ہوئی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے ذرا سا اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس ذرا سے کھینچنے پر ہی گرتا چلا گیا کہ کوئی چور خواہش تو پہلے ہی اندر مچل رہی تھی۔ ایملی پر گرتے ہی اس نے سب سے پہلے اس کے نرم و گداز سینے کا لمس محسوس کیا۔ تنگ بلاؤز میں قید حُسن کا یہ منبع سانسوں کے زیر و بم سے ایک ردھم میں حرکت کرتا پہلے ہی بہت دیر سے اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا، اب جو اس درجہ قربت ملی تو اسے یوں لگا جیسے وہ ریشم کے کسی ڈھیر پر جا گرا ہے۔ خود سپردگی پر آمادہ ایملی کے ریشم جیسے بدن کی نرماہٹوں اور گداز میں ڈوبتے ہوئے اسے بالکل بھی اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ ریشم کے تاروں میں اُلجھنے کے بعد پھر ان سے

نجات پالینا آسان نہیں ہوتا۔

⊛----✪----⊛

اُس کے سامنے گویا کوئی ناقابل یقین منظر تھا۔ اس ایک چہرے کی دید کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ یہاں
قید خانے کی تنہائیوں سے لے کر برف زاروں کی صعوبتوں کو سہتے سہتے گویا یہ امکان ہی معدوم ہو گیا تھا کہ
کبھی دوبارہ اس شخص کو دیکھ پائے گی اور اب جبکہ وہ دوبارہ اسے اپنے روبرو دیکھ رہی تھی تو اپنی آنکھوں پر یقین
نہیں آ رہا تھا۔

''کیسی ہو ماہ بانو؟'' وہ مسکراتا ہوا اس سے مخاطب ہوا تو گویا بے جان تصویر میں جان پڑ گئی۔ اس نے
کہ خود سے پوچھے جانے والے اس سوال کا جواب دے سکے لیکن حلق میں اٹک جانے والے آنسوؤں
گولے نے اسے بولنے نہیں دیا اور یک دم ہی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا سا بہہ نکلا۔

''یہ کیا؟..... بے وقوف لڑکی! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنے مشکل حالات سے نکال کر ایک
پھر نئی زندگی عطا کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، اس زندگی کو ہنستے مسکراتے گزارنے کی کوشش کرو۔ مشکلوں
پریشانیوں کا کیا ہے، یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ آج اگر وقت تمہارے لیے سخت ہے تو آنے والے کل میں
تمہارے حصے میں بہت سی خوشیاں اور آسانیاں بھی لکھی ہوں گی۔'' وہ اس کے بہتے آنسو دیکھ کر اپنی جگہ
نہیں رہ سکا اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے
دینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش کا نتیجہ اور بھی اُلٹ نکلا۔ وہ بجائے رونا ترک کرنے کے مزید شدت سے آنسو
بہانے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔

شہریار کے لیے یہ صورتِ حال بہت اچانک تھی۔ ایک خوب صورت اور نوخیز لڑکی جو کہ اس کے دل
بھی قریب تھی، اس کے سینے سے لگی تھی اور وہ رونے کی وجہ سے ہچکولے لیتے اس کے جسم کا گداز اپنے بدن
محسوس کر سکتا تھا۔ وہ گویا دہرے امتحان میں گھر گیا۔ ایک طرف اس کا رونا دل کو تکلیف دے رہا تھا تو دوسری
طرف اُس کی اس درجے قربت جسم و جان کو سلگا رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو ماہ بانو! یوں سمجھو کہ قدرت نے تمہیں زندگی گزارنے کا ایک اور سنہری موقع فراہم کیا ہے
تم نے جو پچھلے تکلیف دہ دن گزارے ہیں، اس کا ایک بہت اچھا نتیجہ بھی سامنے آیا ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی
گا کہ تمہیں جس پہاڑی غار میں قید کیا گیا تھا، وہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے۔ اس تباہی میں وہاں موجود تقریباً
سارے ہی لوگ مارے گئے ہیں۔ جو زندہ بچے تھے، ان میں سے بھی دو کل مر گئے۔ باقی بھی اس پوزیشن میں
نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں۔ اس صورتِ حال کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ تمہارے بارے میں کسی کے پاس
معلومات نہیں ہیں۔ ہم دو چار لوگوں کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ تم اس قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو
تھیں۔ چنانچہ یہی سمجھا جائے گا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ تم بھی ماری گئی ہو اور یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے
تمہارے پاس موقع ہے کہ ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ دوبارہ سے زندگی شروع کر سکو۔ میں نے کرنل
توحید سے بات کر کے سارے انتظامات کروا دیئے ہیں۔ جو بھی حالات و واقعات پیش آئے ہیں، ان میں تمہارا
ایک فیصد بھی قصور نہیں نکلتا۔ چنانچہ تم پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی جا سکتی۔ کرنل توحید اپنے ذرائع سے تمہارے
ماضی اور حالات کے بارے میں معلومات حاصل کر چکے ہیں اور انہیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ میری
درخواست پر انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اس سارے معاملے سے الگ رکھا جائے اور کسی کو بھی تمہارے



میں بھنک نہ پڑنے دی جائے۔ انہوں نے ازراہِ تجویز پیش کی ہے کہ تمہیں بالکل خاموشی کے ساتھ
سے کراچی منتقل کر دیا جائے۔ وہاں تم کسی گرلز ہاسٹل میں رہ کر اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ سکتی ہو کیونکہ
مُردہ سمجھا جا چکا ہے اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہو گا کہ کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ جائے
دشمن سے اتفاقی ٹکراؤ ہونے سے بچنے کے لیے تم یہ احتیاط کر سکتی ہو کہ جب کبھی باہر نکلو تو پردے کا
کر لو۔ اس طرح تمہیں یکسوئی اور اطمینان سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع مل جائے گا۔''

اس کی قربت سے سلگ اُٹھنے کے باوجود شہریار نے یک دم ہی اسے خود سے الگ کر کے شرمندہ کرنا
نہیں سمجھا چنانچہ ہولے ہولے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے وہ سب کچھ بتاتا چلا گیا جو بڑی
کے بعد اس نے اس کے لیے طے کیا تھا۔ کرنل توحید سے ملنے، انہیں حالات کو سمجھانے اور پھر اپنے
ہوئے منصوبے کے لیے قائل کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑی تھی لیکن خوش کن امر یہ تھا کہ اس
رائیگاں نہیں گئی تھی اور کرنل توحید نے اس کا نقطۂ نظر اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ قائل ہو گئے تھے کہ ایک
اور مظلوم لڑکی کو جو پہلے ہی حالات کے ہاتھوں اپنا سب کچھ کھو چکی ہے، مزید مشکلات سے دوچار نہ کیا
اور اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کر دیئے جائیں کہ وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے۔ ماہ بانو
کو کراچی منتقلی سے قبل ان دونوں کی اس خفیہ ملاقات کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔

''کراچی کے ایک گرلز کالج میں تمہارے داخلے کا انتظام ہو گیا ہے۔ اسی کالج کے ہاسٹل میں ہی تمہاری
ہو گی۔ تم وہاں رہ کر دل لگا کر پڑھنا لکھنا۔ تمہاری ضروریات کا میں پورا خیال رکھوں گا۔ موقع ملنے پر تم
قات کے لیے بھی آ سکتا ہوں۔ تم میرا فون نمبر اپنے پاس رکھنا تاکہ وقتِ ضرورت مجھ سے رابطہ کر سکو۔
یاد رکھنا کہ کراچی پہنچنے کے بعد تم ماہ بانو نہیں رہو گی۔ وہاں تمہارا داخلہ مہرین کے نام سے ہوا ہے اور
میں یہی نام تمہاری پہچان ہو گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرایا۔ ماہ بانو رونا دھونا بھول کر
سے اس کی بات سن رہی تھی، یک دم ہی چونکی اور پھر پہلی بار اسے شہریار سے اپنی قربت کا احساس ہوا۔
کر اس سے دور ہٹی۔ شہریار بھی اس کی پشت پر موجود اپنا ہاتھ ہٹا کر یوں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا
گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ماہ بانو کے لیے اپنے دل میں ایک خاص کیفیت محسوس کرنے کے باوجود وہ
اس کے بارے میں اس زاویے سے سوچنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے گریز کی سب سے بڑی وجہ
کی کم عمری تھی۔ وہ پہلے ہی سے مصیبتوں کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کو کسی اور مشکل میں گرفتار نہیں کرنا
تھا۔ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ نوعمری کی محبت انسان کے لیے ہی ساری دنیا کا روگ بن جاتی ہے اور وہ خود ماہ
کے لیے اپنے جذبات کے سلسلے میں سو فیصد پُر یقین نہیں تھا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا، وہ ایک وقتی کشش بھی
تھی۔ اپنے کسی وقتی جذبے کے لیے وہ اس معصوم لڑکی کو زندگی بھر کا روگ لگا دیتا، یہ اسے منظور نہیں تھا۔
احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل جب وہ کمرے میں
ہوا تھا اور ماہ بانو کے چہرے پر پہلی نظر پڑی تھی تو اس کے دل نے بہت شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ
بانہوں میں بھر لے اور اسے بتائے کہ اس کی گمشدگی کا ایک ایک دن اس نے کتنی مشکل سے گزارا ہے۔

''آپ مجھے چھوڑ نے میرے ساتھ کراچی چلیں گے نا؟'' یہ پہلا جملہ تھا جو اب تک ماہ بانو نے اس سے

''نہیں۔ کرنل توحید خود تمہیں اپنے کسی اعتماد کے بندے کے ذریعے وہاں بھجوائیں گے۔ میں نے
ساتھ کراچی جانے کے امکان پر غور کیا تھا لیکن مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری تلاش

میں مارے مارے پھرنے والوں نے میری سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی ہو۔ یہ تو چودھری بھی سمجھتا ہے کہ
اس کے چنگل سے نکالنے میں میرا بڑا ہاتھ ہے اس لیے وہ اور اس کے پالتو ہر وقت میری بُو سونگھتے
ہیں۔ ان حالات میں تم میرے ساتھ نہ ہی نظر آؤ تو بہتر ہے۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں خود
موقع دیکھ کر تم سے ملنے کراچی آؤں گا۔'' اس نے انکار میں جواب دیتے ہوئے ماہ بانو کو ساری صورت
سمجھانے کے ساتھ تسلی بھی دی۔

''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' جواب میں وہ صرف یہی چھوٹا سا جملہ بول سکی۔ لیکن حقیقتاً اس
بڑی گہرائی تھی۔ اس نے دل کی گہرائی سے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اس بات سے ناواقف ہونے کے باوجود کہ
بھی شہریار کے دل میں نقب لگا چکی ہے، وہ واقعی تاعمر اس کا انتظار کرنے کی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ تا
فیصلہ تو وقت کے ہاتھ میں تھا کہ وہ اپنے دعوے پر قائم رہتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر قائم رہتی بھی ہے تو یہ کیا
تھا کہ شہریار اُس کی طرف آتا؟ اصولاً تو اس کا انتخاب کوئی ایسی لڑکی ہی ہونی چاہئے تھی جو تعلیم، عمر اور
میں اس کی ہم پلہ ہوتی۔ مگر ماہ بانو بھی کیا کرتی کہ وہ محبت جیسے بے بس کر دینے والے جذبے کی زد میں
ہوئی تھی اور یہ جذبہ تو ہر حقیقت اور سچائی کو فراموش کر کے بس اپنی ہی کرنے پر تُلا رہتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''یہ سب کیا ہے افضل؟ مجھے اخبار سے پتہ چلا کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ خود تم تو مجھے کچھ بتاتے
اور جب مجھے معلوم ہوتا ہے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے تم پر آئی ہے۔''
قاتلانہ حملے کی اطلاع اس کے حلقے میں تیزی سے پھیل گئی تھی اور فوری طور پر اخبارات میں بھی یہ خبر شائع
تھی۔ اس خبر کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والے اس کی بیوی بچوں کے قتل کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ خبر شائع
سے پہلے ہی جو صحافتی دنیا کے لوگ تھے، انہوں نے اس کے موبائل پر فون کر کے اس کی خیریت دریافت
شروع کر دی تھی، باقیوں کو خبر کی اشاعت کے بعد معلوم ہو گیا، چنانچہ اس کے موبائل پر کالز کا تانتا سا بندھا
تھا۔ وہ بہت زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔

گولی نے صرف بازو کے گوشت کو متاثر کیا تھا اور چند ایک چوٹیں گاڑی کو اچانک لگنے والے جھٹکے
سے آئی تھیں اس لیے بستر پر لیٹے لیٹے آرام سے کالز ریسیو کر رہا تھا۔ اُس کی اس مصروفیت کو دیکھ کر ڈاکٹر
نے اسے ٹوکا تھا کہ وہ مسلسل فون کالز اٹینڈ کرنے کے بجائے اگر آرام کرے تو بہتر رہے گا۔ ڈاکٹر کی
کے بعد وہ نمبر دیکھ کر صرف ضروری کالز ہی ریسیو کر رہا تھا۔ اس بار اس کا موبائل بجا تو اسکرین پر آفتاب
جگمگا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آفتاب تک اس پر ہونے والے حملے کی اطلاع پہنچ گئی ہے چنانچہ اس نے آواز
الامکان بشاشت بھرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی لیکن بہرحال وہ اس کی آواز کی بشاشت سے متاثر
ہوا تھا اور دکھ اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

''میں ٹھیک ہوں یار! تم میری فکر نہ کرو اور خوامخواہ کی شرمندگی بھی مت پالو۔ تمہاری اس حساسیت
سے ہی میں جان بوجھ کر تمہیں کچھ بتانے سے گریز کرتا ہوں لیکن صحافی ہونے کی مجبوری ہے کہ جو بات
چاہو، یار لوگ اسے بھی چھاپ کر دم لیتے ہیں اور یہ بات چھپنے کے بجائے چھپ جاتی ہے۔'' اس نے ہلکے
انداز میں آفتاب کو بہلانے کی کوشش کی۔

''تمہارے کہنے سے میری فکرمندی دور نہیں ہو سکتی افضل! میں جانتا ہوں کہ یہ چودھری ہی ہے



سے تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کر
گا تاکہ کم از کم تمہاری جان تو چھوٹے۔ بس تم مجھ پر اتنا احسان اور کرنا کہ کشور کو کسی محفوظ جگہ منتقل کر کے
کا خیال رکھنا، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میں نہ سہی، میری محبت کی نشانی
اور اس کے پاس رہے۔'' اس نے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے افضل سے درخواست کی۔

''بکواس مت کرنا۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے جو اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہو؟ صرف ایک
رازے کی بنیاد پر تم اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کرنے چلے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہیں اس کے چنگل سے
انے کے لیے کسی نے کتنی کوشش کی تھی۔ تمہاری جذباتیت کی وجہ سے اس شخص کی محنت اور میری قربانی دونوں
یگاں چلی جائیں گی۔'' اس کا ارادہ جان کر افضل کو شدید غصہ آیا چنانچہ بری طرح اسے ڈپٹنے لگا۔

''مجھے ہر بات کا احساس ہے لیکن میں تمہاری جان کی قیمت پر اپنی جان بچانے کی خودغرضی نہیں دکھا
کتا۔'' اس کے سخت لہجے کا برا مانے بغیر آفتاب نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''تم جذبات سے کام لے رہے ہو دوست! یہ لازمی نہیں ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا چودھری ہی
ہو۔ میں صحافی ہوں اور میری ڈھیروں دشمنیاں ہیں۔ تم تو خود اس فیلڈ سے منسلک ہو۔ تم نہیں جانتے کہ یہاں
یہاں ذرا سا کسی کی دُم پر پیر رکھ دو، وہ مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے اور میری دشمنیوں میں سے ایک بڑی دشمنی تو
مہتاب کی وجہ سے بھی ہے۔ خود پر حملے سے پہلے میرے سامنے ایک ایسی بات آئی تھی جس کو سن کر میں یہ
سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید ہم چودھری کو مجرم سمجھ کر غلطی کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے بتایا تھا کہ جس
رات مہتاب کا قتل ہوا، اس دن کوئی شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا تھا اور اس نے خود کو مہتاب کا کزن ظاہر کرتے
ہوئے دفتر سے میرے گھر کا پتہ حاصل کر لیا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ شخص مہتاب کا وہی کزن ہے جس سے اس کی
منگنی ہوئی تھی اور جو اتنے برسوں سے ہمیں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب اتفاق سے ایک ایسے وقت میں وہ ہمیں
تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ چودھری افتخار بھی ہمارا دشمن بنا ہوا ہے۔ چنانچہ میری اور تمہاری دونوں کی
توجہ اسی کی طرف رہی اور میں اپنے دشمن نمبر ایک کو بھول گیا۔ لیکن اب جو صورتِ حال میرے سامنے آئی ہے،
اس کے پیشِ نظر میں تم سے یہی کہوں گا کہ کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتہ چلے کہ تم جذبات میں آ
کر خود کو چودھری کے حوالے کر دو اور یہاں میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں۔'' افضل نے بہت تیزی سے
خود پر قابو پا لیا تھا اور اب رسان سے آفتاب کو ساری صورتِ حال سمجھا رہا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کے لیے اپنے سسرالی دشمن کا بہانہ بنا رہے
ہو؟'' آفتاب نے اس کی بات سن کر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اگر تم حالات کا عقل سے تجزیہ کرو تب بھی یہ بات واضح ہے کہ چودھری کو میرے قتل سے
کچھ نہیں ملنے والا۔ مہتاب اور بچوں کو اگر اس نے اشتعال میں قتل کروا بھی دیا ہے تو اب میرے سلسلے میں یہ
غلطی نہیں کر سکتا۔ میری موت کا مطلب ہو گا کہ اس نے تم تک پہنچنے کا راستہ کھو دیا۔ اگر اس حادثے کے پیچھے
چودھری ہوتا تو لوجیکلی اس کے بندے مجھ پر گولی چلانے کے بجائے مجھے گھیرنے اور تشدد کے ذریعے تمہارا پتہ
معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔'' افضل کی اس دلیل میں جان تھی چنانچہ آفتاب کو قائل ہونا پڑا۔

''جو بھی بات ہو، اب تم اپنا بہت خیال رکھنا یار! تم جیسے قیمتی دوست کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔''
وہ فون بند کرنے سے پہلے اسے یہ ہدایت کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس کی اس فکرمندی پر افضل نے پھیکی سی مسکراہٹ
کے ساتھ موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اسے آفتاب کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا بلکہ وہ

خود بھی اسے اپنے دوستوں میں سے سب سے قیمتی خیال کرتا تھا لیکن مہتاب اور بچوں کے بعد گویا ہر شخص کی محبت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مہتاب نام کی وہ عورت جو اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی، اس کے لیے کل اہم تھی، وہ چاہتا بھی تو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مہتاب کو بے تحاشا چاہا تھا اور جواب میں اس نے بھی اسے ہر وہ خوشی دی تھی جو اس کے اختیار میں تھی۔ مہتاب اور بچوں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا بسانے کے بعد اس نے گویا ہفت اقلیم کی دولت پالی تھی اور اب یہ دنیا اُجڑی تھی تو باقی کی ساری دنیا بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

''سر! آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ خیالوں کی دنیا میں جانے کب تک ڈوبا رہتا کہ اس آواز کو سن کر چونک کر آنکھیں کھولنی پڑیں۔ وہ کوئی میل نرس تھا جو اپنے ہاتھ میں موجود ٹرے اس کے سرہانے موجود سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر افضل نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ جب تک وہ بیٹھتا، میل نرس اس کی طرف رخ کر چکا تھا۔ مخصوص سفید لباس میں ملبوس سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے اس میل نرس کو شناخت کرنے میں اسے کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی، اگر اس کے ہاتھ میں دبا ننھا سا جدید ساخت کا پسٹل دکھائی نہ دے رہا ہوتا۔ یہ وہی تھا جو اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے برسوں سے انتقام کی آگ دل میں جلائے انہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اپنے اس جنونی رقیب کو نظروں کے سامنے دیکھ کر افضل کو کوئی شک نہیں رہا کہ مہتاب اور بچوں کا قتل اسی کے ہاتھوں ہوا ہے اور اب وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اس کے خون کی بھینٹ لینے آ پہنچا ہے۔ اس شخص کو سامنے دیکھ کر افضل کا دایاں ہاتھ اضطراری طور پر پھیلا اور اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی دواؤں کی شیشیوں میں سے ایک شیشی اٹھا کر اسے دے ماری۔ اس کی ماری گئی شیشی سیدھی پستول بردار کی آنکھ پر جا کر لگی اور وہاں سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا لیکن اس اثنا میں وہ بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل جس کا رخ افضل کے سینے کی طرف تھا، چل چکی تھی اور اس کی اور افضل کی چیخ تقریباً ایک ساتھ ہی بلند ہوئی تھی۔

گولی سینے میں داخل ہونے سے قبل افضل نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر مہتاب کا وہی کزن تھا جس کو اس کا نام نہاد منگیتر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اپنے اس نیم خواندہ اور آوارہ گرد کزن کو اس کی بدکرداری کے سبب چھوڑ کر مہتاب نے افضل کا انتخاب کیا تھا۔ قبائلی رسم و رواج میں جکڑی مہتاب سیدھے راستے سے افضل کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ اس نے بہت خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ کر افضل سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ افضل اور اس کے مابین تعلقات کا کسی کو علم نہیں تھا اس لیے اس کے خاندان والوں کے لیے افضل تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ ان دونوں میاں بیوی کی احتیاط پسندی بھی تھی جس نے اتنے برسوں تک انہیں محفوظ رکھا تھا۔ لیکن مہتاب کا کزن یقیناً اتنے برسوں میں بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا اور انتقام کے جنون میں آخر کار اس نے ان لوگوں کا کھوج لگا ہی لیا تھا۔ اب وہ افضل کی پھینکی ہوئی بوتل سے آنکھ پر چوٹ کھانے کے بعد بھی جنونی انداز میں ہنس رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھ سے بہتے خون کے بجائے افضل کے سینے سے اُبلتا خون کا فوارہ اور اس کا تکلیف سے تڑپتا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر اس کے سینے میں برسوں سے جلتی انتقام کی آگ کے لیے باعثِ تسکین تھا۔

اپنی اس جنونی کیفیت میں وہ کمرے کے دروازے کا کھلنا محسوس نہیں کر سکا۔ وہ ایک نرس تھی جو ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آئی تھی لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے جو منظر نظر آیا، اس نے پل بھر کے لیے اسے ساکت کر دیا۔ اس کے سکتہ زدہ وجود میں پہلی حرکت ہاتھوں کی لرزش کی صورت میں پیدا ہوئی جس کے باعث اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے گر پڑی۔ ٹرے گرنے کے ساتھ ہی اس کا منہ کھلا



اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔ ٹرے گرنے اور نرس کے چیخنے کی آوازیں سن کر خونی قاتل دروازے کی طرف متوجہ ہوا اور تیزی سے نرس کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں اس مرحلے پر نرس نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور پھرتی سے باہر نکل کر دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ نرس کی عجلت نے افضل کے قاتل کو یہ احساس دلایا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس نے دیوانہ وار دروازے پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ ادھر نرس بھی مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس ہنگامے نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کرایا۔ ہسپتال میں موجود گارڈز بھی دوڑے آئے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن خوف زدہ نرس سوائے چیخنے اور بند دروازے کی طرف اشارہ کرنے کے کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی۔ بہرحال اس کے اشارے نے اتنا تو گارڈز کو سمجھا ہی دیا تھا کہ جو بھی گڑبڑ ہے، وہ افضل کے کمرے کے اندر ہے۔ خاص طور پر دروازے کے ساتھ اندر سے کی جانے والی آزمائی بڑی معنی خیز تھی۔ گارڈز نے اپنی گنز سمیت دروازے کے باہر پوزیشن لے لی۔

''اندر جو کوئی بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔'' ایک گارڈ نے بلند آواز میں حکم جاری کر دیا۔ دوسری طرف خوف زدہ نرس کو اس کی دو ساتھی نرسیں مل کر سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا اور اس کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ صورتِ حال ایسی تھی جس نے اچھے خاصے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ اور ہسپتال کے عملے کے علاوہ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے کافی لوگوں کا بھی وہاں ہجوم لگ گیا تھا۔

''آپ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔'' گارڈ بلند آواز میں چلایا۔ اس کی بات سن کر ہجوم منتشر ہونے لگا لیکن تجسس کے مارے دو چار افراد اب بھی ایسے تھے جو وہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گارڈ نے انہیں ایک بار پھر تنبیہہ کی اور کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ طے کیا اور پھر ان میں سے ایک نے کنڈی ہٹا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور کاؤنٹر سے لگ کر کھڑے نوجوان کے سر میں گھس گئی۔ وہاں موجود لوگوں کی منظر دیکھ کر چیخیں نکل گئیں اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے والے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

گارڈز ان لوگوں کی طرف سے بے نیاز اندر موجود شخص سے نمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ اندر موجود شخص مسلح ہے اور کوئی نیک ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ گارڈز کو بھی اپنی گنز کا استعمال کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا اور وہ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس گئے۔ جواب میں اندر سے بھی گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن گارڈز کی چلائی گئی گولیاں اپنا کام دکھا چکی تھیں چنانچہ اندر موجود شخص کو دو سے زیادہ فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

''مسلح گارڈز جب کمرے کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بستر پر موجود مریض اپنے ہی خون میں نہایا ہوا ساکت پڑا ہے جبکہ دوسرے شخص کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے دائیں شانے اور پیٹ میں گولیاں لگی تھیں۔ ایک آنکھ سے بھی خون بہہ رہا تھا جو اس کے چہرے پر پھیل کر اسے کافی بھیانک بنا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرش پر پڑا پسٹل ظاہر کر رہا تھا کہ کچھ دیر قبل وہی اس پسٹل کو استعمال کر رہا تھا لیکن اس کی چلائی گئی گولیوں نے کام کر دکھایا اور وہ پسٹل استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا۔ حملہ آور کو بے دست و پا پا کر گارڈز نے امدادی کارروائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ فوراً ہی ہسپتال کے منتظم کو بہتر صورتِ حال کی اطلاع کر دی گئی اور پھر اس کے حکم پر ڈاکٹرز اور پیرا میڈیکل اسٹاف حرکت میں آ گیا۔ افضل کے سرسری معائنے سے

قبل ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کے سینے میں لگنے والی گولی کام دکھا چکی تھی اور اس کی روح کا جسم سے رشتہ ٹ
چکا تھا جبکہ زخمی حملہ آور نازک حالت میں ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اس شخص کے قاتل ہونے سے قطع
اسے طبی امداد دی جانے لگی۔ اتفاق سے تھانہ، ہسپتال سے قریب ہی تھا اور یہ سارا ہنگامہ شروع ہوتے ہی
اطلاع کردی گئی تھی چنانچہ پولیس خلافِ عادت جلدی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پولیس والوں کی موجودگی اور اہ
نے ہسپتال کی انتظامیہ کے لیے حملہ آور کو بروقت طبی امداد پہنچانا آسان کردیا تھا جبکہ ڈاکٹرز نے اس کا
شروع کیا تو انہیں احساس ہوگیا کہ ان کی کوششیں کارگر ثابت نہیں ہوں گی اور کسی بھی لمحے یہ شخص اپنی زندگی
جائے گا۔ انہوں نے پولیس کارروائی کے لیے وہاں رکے ہوئے پولیس آفیسر کو صورتِ حال سے آگاہ کر
ڈاکٹرز کی زبانی یہ جاننے کے بعد کہ حملہ آور فی الحال زندہ ہے اور بیان دینے پر رضامند بھی نظر آتا ہے
نے فوراً کارروائی کے لیے کمر باندھ لی۔ اس کے ساتھی پہلے ہی جائے وقوعہ کی تفصیلات جمع کرنے، آلہ
اپنے قبضے میں لینے اور عینی شاہدین کے بیانات لینے کا کام کررہے تھے۔ حملہ آور کی گولی کا شکار ہو
والے نوجوان کی لاش بھی کاؤنٹر کے پاس سے اُٹھوالی گئی تھی لیکن ان کارروائیوں سے بڑھ کر حملہ آور کا
تھا۔ اس کے بیان سے صورتِ حال واضح ہو جاتی اور پولیس کو زیادہ مغز ماری کی زحمت نہیں کرنی
چنانچہ انکوائری آفیسر ڈاکٹرز کی طرف سے اشارہ ملتے ہی فوراً اپنے معاون کے ساتھ قریب المرگ حملہ آور
پاس جا پہنچا۔

''میرا نام صائب خان ہے۔ صحافی اور اس کے بیوی بچوں کا قتل میں نے ہی کیا ہے اور مجھے اپنے اس
پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' پولیس والوں کو دیکھتے ہی حملہ آور نے انہیں کسی سوال کی مہلت دیئے بغیر خود ہی
شروع کردیا۔

''تم نے ان لوگوں کو کیوں قتل کیا؟ کیا تمہاری افضل سے کوئی دشمنی تھی؟'' انکوائری آفیسر نے تیزی
سوال کیا۔ جس کے جواب میں صائب خان کے چہرے پر نفرت چھا گئی۔

''افضل نے میری غیرت کو للکارا تھا۔ افضل کی بیوی مہتاب میری بچپن کی منگ تھی لیکن اس نے نہ جا
کب اسے ورغلا کر اپنے ساتھ بھاگنے پر آمادہ کرلیا۔ اس نے یہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا کہ مجھ سمیت کوئی
اندازہ نہیں لگا سکا کہ مہتاب کو ورغلا کر لے جانے والا وہ ہے۔ بہرحال میں نے قسم کھائی تھی کہ جس کسی نے
یہ کام کیا ہے، میں مرتے دم تک اسے تلاش کروں گا اور اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔'' صائب خان کے
لفظ سے زہر ٹپک رہا تھا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانس لینے میں مشکل پیش آرہی ہے لیکن
اس حالت میں بھی وہ نفرت و غصے کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ درحقیقت اپنے قول کے مطابق اس نے مر
دم تک اپنی غیرت کو للکارنے والے سے دشمنی نبھائی تھی۔

''پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ افضل ہی تمہاری کزن مہتاب کو بھگا کر لے گیا تھا؟'' پولیس آفیسر کو صائ
خان کی اُکھڑتی سانسوں سے زیادہ ساری کہانی جان لینے میں دلچسپی تھی۔

''ایک دن میں ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا، تب میں نے افضل کو دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار
صحافی ہمارے ہاں آکر رکا تھا۔ اگرچہ یہ مہتاب کے غائب ہونے سے بہت پہلے کی بات تھی، پھر بھی میر
دل میں یہ خیال آگیا کہ ہوسکتا ہے کہ اس سارے معاملے کے پیچھے افضل ہو۔ اپنے شک کی بنیاد پر میں افضل
تلاش کرتا ہوا لاہور آگیا۔ یہاں آکر مجھے اس کے دفتر کا پتہ معلوم کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ دفتر
سے میں نے اس کے گھر کا پتہ حاصل کرلیا اور خاموشی سے وہاں پہنچ کر نگرانی کرنے لگا۔ میرے ذہن میں



ھی کہ اگر مہتاب ہی افضل کی بیوی ہے تو وہ کسی وقت تو گھر سے باہر نکلے گی اور میں اسے پہچان لوں گا۔
گھر سے باہر تو نہیں نکلی لیکن افضل کے گھر پہنچنے پر اس نے گیٹ کھولا تو مجھے اس کی ایک جھلک نظر آگئی۔
دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس وقت تو وہاں سے واپس آگیا لیکن آدھی رات کے بعد
وہاں پہنچا۔ میرا ارادہ تھا کہ سوتے میں خاموشی سے افضل اور مہتاب کا کام تمام کردوں گا۔ لیکن اس رات
میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو افضل گھر پر نہیں تھا۔ میں نے مہتاب اور اس کے بچوں کو گولی مار کر ختم
دیا اور اس کے بعد افضل کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک بار مجھے موقع ملا تو افضل کو اس کی قسمت نے بچالیا۔
وہ کب تک بچتا؟ دیکھ لو! آخر کار میں نے اس سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔'' اس بات کے اختتام پر صائب
نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ لیکن اپنے قہقہے کی تاب نہیں لا سکا۔ اس کی ڈوبتی اُبھرتی سانسوں میں اس قہقہے
اکھاڑ پچھاڑ مچادی۔ وہاں موجود ڈاکٹر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کی زندگی سے پہلے ہی مایوسی ظاہر کر
کے باوجود ڈاکٹر کو اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری تو نبھانی ہی تھی۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ صائب خان نے اتنا
چوڑا بیان کس طرح دے دیا؟ یقیناً یہ اپنے مقصد میں کامیابی کا نشہ تھا جو اس نے موت کی آغوش میں جاتے
تے بھی بڑے فخر سے اپنا سارا کارنامہ سنا ڈالا تھا۔

⊛----✪----⊛

''میں نے حادثے کے متعلق معلومات حاصل کرلی ہیں۔ اب میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کیا ہوا تھا جس کی
سے ہم اپنا اتنا اہم ٹھکانہ کھو بیٹھے۔'' لِنڈا نیویارک میں موجود ڈیوڈ کو رپورٹ پیش کرنے کے لیے تیار تھی۔
ذیشان سے اس نے ایک رات میں ہی اتنا کچھ اُگلوالیا تھا کہ اس پر صورتِ حال واضح ہوگئی تھی۔

''گڈ! مجھے تم سے اسی تیز رفتاری کی اُمید تھی۔ اسی لیے تو میں نے تمہاری جدائی گوارا کرکے تمہارا پاکستان
منظور کرلیا تھا۔'' اس کی طرف سے کامیابی کی نوید سن کر ڈیوڈ کھل اُٹھا۔

''میں جانتی ہوں ڈارلنگ! اگر یہاں میری اتنی ضرورت نہیں ہوتی تو میں خود بھی تم سے دُور رہنا پسند نہیں
رتی۔ لیکن مجھے اس معاملے کے ساتھ ساتھ چودھری کو بھی تو دیکھنا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم چودھری کو جس
جیکٹ کے لیے استعمال کررہے ہیں، وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔'' اس کی بات پر مسکراتے ہوئے لِنڈا نے اسے
اب دیا۔ ''موساد'' کے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے اگرچہ وہ بے شمار مردوں کو اپنی جسمانی قربت سے فیض
ب کرچکی تھی لیکن ڈیوڈ کا معاملہ سب سے جدا تھا۔ وہ واقعی ڈیوڈ سے محبت کرتی تھی۔

''میں سب سمجھتا ہوں۔ تم باقی باتیں جانے دو اور فی الحال مجھے اس معاملے کی تفصیلات بتاؤ کہ تم نے
یسے اور کیا معلومات حاصل کیں؟''

''اپنے مقامی نمائندے سے ہمیں یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ اس کیس کی تحقیقات آرمی انٹیلی جنس کا
یشان نامی ایک میجر کررہا ہے۔ بس میں اس میجر کو اپنے دام میں لے آئی اور توقع کے خلاف ایک رات میں
اس سے بہت کچھ اُگلوالیا ہے۔ بے چارہ شاید عرصے سے عورت کی قربت کے لیے ترسا ہوا تھا اس لیے فوراً
میرے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ میجر ذیشان اور اپنے آدمیوں سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان
کے مطابق ہمارے نقصان کا سبب وہ لڑکی ماہ بانو بنی ہے جسے تم نے اغوا کروا کر پہاڑی ٹھکانے پر قید کیا تھا۔
سسٹنٹ کمشنر شہریار عادل نے چونکہ اسے اپنی ذمے داری پر بلتستان بھجوایا تھا، چنانچہ وہ اس کے اغوا کا سن کر
ہت پریشان ہوا اور اس نے اپنے ڈرائیور مشابرم خان کو بھائی کی تدفین میں شرکت کے علاوہ ماہ بانو کی تلاش

کے لیے بھی بلتستان روانہ کردیا۔ مشابرم خان خود بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ اس نے دل و جان سے ماہ بانو کو اغوا کرنے والوں کی تلاش شروع کردی۔ ہمارے لوگ اس کی ساری کارروائی دیکھ رہے تھے لیکن انہیں امید نہیں تھی کہ مشابرم خان، ماہ بانو تک پہنچ سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسے غیر ضروری سمجھا اور دور سے ہی اس پر نظر رکھے رہے۔ وہ اپنی تلاش کے سلسلے میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا تب بھی کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی خیال تھا کہ وہ کسی صورت پہاڑی ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکے گا اور ناکام ہو کر خود ہی واپس پلٹ جائے گا۔ لیکن مشابرم خان کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ٹھکانے پر پہنچا۔ وہاں اس کی ہمارے آدمیوں سے جھڑپ ہوگئی اور کچھ اس طرح کی صورتِ حال پیش آئی کہ پہلے وہاں موجود ایندھن میں پھر اسلحے کے ذخیرے میں آگ لگ گئی جس کا نتیجہ دھماکوں کی صورت میں نکلا اور وہاں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مارے گئے۔ چند ایک افراد کے ساتھ مشابرم خان زخمی حالت میں بچ نکلا اور اس نے آرمی والوں کو ساری تفصیلات سنا دیں۔ باقی زخمیوں میں سے دو آدمی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے جبکہ تین ہمارے آدمیوں نے باری باری خفیہ طور پر موت کی نیند سلا دیا تاکہ وہ کوئی بیان دینے کے لیے باقی نہ رہیں مشابرم خان تک البتہ ان کی رسائی نہیں ہوسکی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر آرمی انٹیلی جنس والوں نے اسے بہت خفیہ طور پر اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ خود میجر ذیشان بھی اب اپنے آفیسر کرنل توحید کو مطلع کیے بغیر اس سے ملاقات نہیں کرسکتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ماہ بانو بھی اب زندہ نہیں رہی ہے۔'' ساری تفصیلات سننے کے بعد ڈیوڈ نے تبصرہ کیا۔

''یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے اور اسے تو ہم نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھی تو اس کو بھی باقی لوگوں کے ساتھ مرنا ہی تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے ہوگئے ہوں گے کہ دھماکوں کے بعد وہاں کارروائی کرنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوسکا ہوگا کہ مرنے والوں میں کوئی عورت بھی تھی..... مجھے میجر ذیشان نے بتایا ہے کہ جو لوگ غار کے اندر رہ گئے تھے، ان کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہے۔ ماہ بانو لازمی بات ہے کہ غار کے اندر ہی تھی اس لیے اس کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ تمہیں ان تھرڈ ورلڈ کنٹریز کے کام کرنے کا انداز تو معلوم ہی ہے۔ یہ لوگ اتنی محنت کہاں کرتے ہیں کہ ملبے سے ملنے والے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں۔ انہوں نے تو بس سب کچھ سمیٹ کر ایک اجتماعی قبر میں دفنا دیا ہوگا۔ ویسے بھی آرمی انٹیلی جنس اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اس حادثے کی اصلیت چھپانے کی کوشش کررہی ہے۔ انہوں نے میڈیا والوں کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے کہ اصل ماجرا کیا تھا؟'' لِنڈا کے لہجے میں وہی تحقیر تھی جو ترقی یافتہ ممالک کا شاید ہر فرد تیسری دنیا کے افراد کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اپنے اسی طرزِ فکر کی وجہ سے اس نے میجر ذیشان کو ماہ بانو کے سلسلے میں کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس کی معلومات زیادہ مکمل اور مستند ہوتیں۔

''پاکستان آرمی انٹیلی جنس کا شک کس پر ہے؟ وہ اس سیٹ اپ کے پیچھے کس کا ہاتھ سمجھ رہے ہیں؟''

''ہماری پلاننگ کے مطابق ان کا شک انڈیا پر ہی گیا ہے۔ اسلحہ اور دیگر ساز و سامان چونکہ زیادہ تر ہم نے انڈیا سے ہی اسمگل کروا کر وہاں پہنچایا تھا اس لیے انہوں نے انڈیا کو ہی اس کا ذمے دار سمجھا ہے۔ ویسے بھی دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی اتنی گہری ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک میں ہونے والی ہر تخریبی کارروائی کا ذمے دار ایک دوسرے کو ہی ٹھہراتے ہیں۔'' لِنڈا کا یہ جواب کافی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر انہوں نے یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ اگر کبھی ان کا بنایا سیٹ اپ پکڑا بھی جائے تو شک انڈیا پر ہی رہے۔ پہاڑی



ٹھکانے کے علاوہ ان کے تیار کردہ جو دہشت گرد اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، ان کے پاس بھی زیادہ تر بھارتی ساختہ اسلحہ ہی موجود ہوتا تھا۔ البتہ ساتھ ہی کچھ روسی ساز و سامان بھی اس کے ساتھ شامل تھا اور وہ بھی اس لیے کہ انڈیا والوں کو انہوں نے یہ تسلی دینی ہوتی تھی کہ وہ انڈیا اور روس کے پاکستان کے قریبی ممالک ہونے کی وجہ سے ان کی مصنوعات استعمال کروا رہے تھے کیونکہ اس طرح مال اسمگل کرنے میں سہولت کے ساتھ ساتھ رعایات بھی کم آتے ہیں۔

''چلو کم از کم یہاں تو ہم کامیاب رہے ورنہ یہ سوچ سوچ کر کہ پہاڑی ٹھکانے کی تباہی کے ساتھ ساتھ ساری اس پر کی گئی کثیر سرمایہ کاری بھی برباد ہوگئی ہے، میرا سر پھٹنے لگا تھا۔ عام آبادی سے ہٹ کر بالکل الگ تھلگ اور محفوظ لوکیشن دوبارہ ملنا اور پھر وہاں نیا سیٹ اپ قائم کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس پروجیکٹ پر تو ہم نے انڈیا کو یہ لالچ دے کر بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری ان سے کروا لی تھی کہ کبھی پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑی تو پہاڑی ٹھکانے پر موجود جنگجو اس کے بہت کام آئیں گے۔'' ڈیوڈ کا دکھ کسی طرح کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''جو ہوا اسے جانے دو۔ سب کچھ بہرحال ختم نہیں ہوا ہے۔ ہمارے تربیت یافتہ لوگ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہیں کبھی بھی کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' لِنڈا نے ڈیوڈ کو تسلی دی۔ یہ تسلی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ واقعی بھارتی ایجنٹس کے ساتھ مل کر اپنا بہت وسیع نیٹ ورک قائم کر چکے تھے۔ عملاً یہ نیٹ ورک بھارت کے ہی کنٹرول میں تھا لیکن ''را'' اور ''موساد'' کا آپس کا گٹھ جوڑ اتنا مضبوط تھا کہ اگر وہ لوگ کوئی فرمائش کرتے تو ''را'' کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو؟'' ڈیوڈ نے اپنا نقصان ہونے والے نقصان کی طرف سے ہٹاتے ہوئے اس کا آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

''میں اسکردو سے نکل گئی ہوں۔ ویسے تو میں نے میجر ذیشان کو پوری طرح نشے میں مدہوش کرنے کے بعد اس سے ساری معلومات حاصل کی تھیں اور مجھے امید ہے کہ اسے بالکل بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ مجھے کیا کچھ بتا رہا ہے..... پھر بھی میرا مزید یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں فوری طور پر نکل گئی۔ ویسے بھی مجھے اب اِدھر کو نمٹانا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میں جلد از جلد واپس تمہارے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔''

''او کے، وِش یو بیسٹ آف لک۔ تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے واپس آؤ۔ میں یہاں بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے بھی جواباً اس پر اپنی محبت جتائی اور پھر سلسلہ منقطع کردیا۔ اس سے رابطہ ختم ہونے کے بعد لِنڈا ایک اور شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئی۔

''حکم کیجئے میڈم! آج آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی؟'' مخصوص کوڈ ورڈ کی ادائیگی کے بعد جب دوسری طرف موجود شخص کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ لِنڈا ہے تو اس نے بڑے خوشامدی لہجے میں پوچھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں لِنڈا کا قرب حاصل کرنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ایک بار کی قربت میں ہی وہ اس حد تک اس کا گرویدہ ہوگیا تھا کہ اس کے کہنے پر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ ویسے تو اگر لِنڈا کی جگہ کوئی بدصورت عورت ہوتی، تب بھی اسے اس کے حکم کی پیروی کرنی ہی ہوتی کہ ''موساد'' کی ٹاپ ایجنٹ کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''یاد کی بھی تم نے خوب کہی نارائن! ہمارا جو اتنا بڑا نقصان ہوا ہے، اس کے بعد کیا ہم تمہیں یاد نہ کریں؟'' لِنڈا نے کاٹ دار لہجے میں مخاطب سے سوال کیا۔

''بالکل میڈم! بالکل۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو کچھ ہوا، وہ آپ سے بڑھ کر ہمارا نقصان ہے۔'' نارائن فوراً سنجیدہ ہوگیا۔

''تو پھر کوئی ایسا کام کرو کہ نقصان کی تلافی بے شک نہ ہو لیکن ہمارا دشمن بھی بری طرح بلبلا اُٹھے۔'' اس نے یوں فرمائش کی جیسے اپنے کسی عاشق سے کسی عمدہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کا وعدہ لے رہی ہو۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم! یہ کام ہو جائے گا۔ ہم خود بھی پہلے سے اس کی پلاننگ کر رہے ہیں۔'' نارائن نے اسے تسلی دی۔

''بہت خوب! تمہاری عمدہ کارکردگی کا انعام سمجھو کہ مجھ پر اُدھار رہے گا۔ جب کبھی ملنا ہوا، میں تمہیں انعام دینے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔''

لِنڈا نے اسے کسی لالچی بچے کی طرح لالی پاپ دکھایا۔ اسے یقین تھا کہ دوسری طرف موجود نارائن کی ابھی سے رال ٹپکنے لگی ہوگی۔ ''را'' کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے کام کرنا اپنی جگہ لیکن مستقبل میں لنڈا کی قربت کا وعدہ اسے کئی گنا فعال کر دیتا اور نارائن جیسے سفاک فطرت آدمی کی اعلیٰ کارکردگی میں اتنی سفاکی کی بہرحال ہوتی کہ پاکستانیوں کو ایک لمبی مدت تک اپنے زخم چاٹنے پڑتے۔

❁----✪----❁

شہریار بڑی گہری نیند سو رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد اسے اتنی پُرسکون نیند آئی تھی ورنہ ماہ بانو کے اغوا کے بعد سے تو اس کے لیے اطمینان سے سونا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ بے شمار اُلجھنیں، مسائل اور پریشانیاں اپنی جگہ لیکن سب سے زیادہ ماہ بانو کا غیاب تھا۔ جس نے اس کے دل کو بے کل سا کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دل میں ماہ بانو کے لیے موجود جذبے کا چاہے خود سے اعتراف کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن محبت کو ایسے کسی اعتراف کی ضرورت ہی کب ہوتی ہے؟ وہ تو خود اپنا آپ تسلیم کروا کر چھوڑتی ہے۔ یہ محبت کی زور آوری ہی تو تھی جو آج اس کے دل میں یہ اطمینان محسوس کرنے کے بعد کہ ماہ بانو اپنے دشمنوں کی دسترس سے دُور ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود ہے اور ایک بار پھر اپنی زندگی کو قرینے سے شروع کر سکتی ہے، چین کی نیند سو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کراچی جیسے پُرہجوم شہر میں ماہ بانو کا وجود اس طرح گم ہو جائے گا کہ اگر کوئی ڈھونڈنا بھی چاہے گا تو نہ ڈھونڈ سکے گا۔ ویسے بھی، اب کسی کا اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ماہ بانو مر چکی ہے۔ اس کے زندہ ہونے کے راز سے چند ہی لوگ واقف تھے اور یہ چند لوگ ایسے تھے جن کی زبان پر حقیقت آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ اگر وہ مطمئن ہو کر گہری، پُرسکون نیند سو رہا تھا تو یہ اس کے حق میں تھا۔ اس نے بہت سی راتیں یونہی بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی تو گزاری تھیں اور اپنے ان رت جگوں کا کسی کے سامنے ذکر تک نہیں کر سکا تھا۔ بہت سے رت جگوں کے بعد اسے آج کہیں جا کر سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی لیکن دشمنوں کو اس کا یہ سکون گوارا نہیں تھا۔ یک دم ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی اور کمرے کی پُرسکون فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ وہ بہت بے مزہ ہو کر نیند سے جاگا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔ اسکرین پر پیر آباد کے ماسٹر منیب کا نام آ رہا تھا۔

ابھی کچھ دن قبل ہی اس کے اور منیب کے درمیان موبائل نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا۔ آفتاب کی اسکول سے غیر موجودگی میں ضروری تھا کہ کوئی ایسا بندہ اس سے رابطے میں رہتا جس کے ذریعے وہ پیر آباد کے حالات کے بارے میں خیر خبر لیتا رہتا۔ اسی مقصد کے تحت اس نے منیب کو اپنا براہِ راست نمبر دے دیا تھا۔ وہ اسکول میں



کام کرنے والے استادوں میں سے سب سے زیادہ سمجھدار ہونے کے علاوہ آفتاب کے قریب رہنے کی وجہ سے بھی اس کے لیے زیادہ قابلِ بھروسہ تھا اور اب اتنی رات گئے منیب اس کے موبائل پر کال کر رہا تھا تو یہ ایک پریشان ناک بات تھی۔ دل میں سخت پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی لیکن بہرحال اس کی آواز میں ایسی کوئی علامت موجود نہیں تھی جس سے دوسری طرف موجود شخص اندازہ لگا سکتا کہ وہ پریشان ہے یا گہری نیند سے جاگا ہے۔

''خیریت تو ہے منیب! تم نے اتنی رات کو کس سلسلے میں فون کیا ہے؟'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے سر! صورتِ حال بہت خراب ہے۔'' دوسری طرف سے منیب کی ہیجان زدہ آواز سنائی دی۔

''کیوں..... کیا ہوگیا ہے؟'' اپنے اندیشوں کو درست ثابت ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''چودھری کے بندوں نے اسکول کی عمارت کو آگ لگا دی ہے۔ انہوں نے یہ کام چھپ چھپا کر کرنے کے بجائے کھلم کھلا کیا ہے اور اب اس مکان کو گھیرے کھڑے ہیں جس میں ہم ٹیچرز رہائش پذیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم سب ابھی فوری طور پر گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں۔ ورنہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ سب مسلح ہیں اور بری طرح دروازہ پیٹ رہے ہیں لیکن میں اور میرے ساتھی خوف زدہ ہیں۔ اگر ہم ان کے کہنے پر ابھی گاؤں چھوڑنے کے لیے مکان سے باہر نکلتے بھی ہیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ لیکن ہم زیادہ دیر اس مکان میں بند رہ کر بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ لوگ چاہیں تو بہت آرام سے دروازہ توڑ کر اور دیواریں پھلانگ کر اندر آسکتے ہیں۔'' منیب نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یقیناً یہ صورتِ حال بے حد گمبھیر تھی۔ شہریار نے اپنی سماعت پر تھوڑا سا زور دیا تو اسے بھی وہ آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ منیب کے بیان کے مطابق مکان کے دروازے کو بری طرح پیٹا جا رہا ہے۔

''تم موبائل آف مت کرنا منیب! موبائل آن رکھتے ہوئے تم دروازے کے قریب جاؤ اور باہر موجود لوگوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرو کہ تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کے لیے صبح تک کی مہلت دے دی جائے۔ اگر وہ صبح تک انتظار کے لیے راضی نہ ہوں تو ان سے کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے کی مہلت لے لو۔ اس دوران میں تمہاری مدد کے لیے کوئی بندوبست کرتا ہوں۔'' اس نے منیب کو ہدایات جاری کیں اور خود لینڈ لائن پر ایس پی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی سماعتیں اگر ایک طرف جاتی رِنگ ٹون کو سن رہی تھیں تو دوسری طرف اس نے منیب کی آواز پر بھی کان لگائے ہوئے تھے۔

''میری بات سنو!..... رُک جاؤ۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم یہ جگہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' وہ اس کے حسبِ ہدایت دروازے کے قریب جا کر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''چلے نہیں جائیں گے، ابھی باہر نکلو اور اپنی راہ لو۔'' جواب میں دروازہ دھڑ دھڑانے کا سلسلہ رُکا اور ایک بات کھردری آواز سنائی دی۔ عین اسی وقت ایس پی کی طرف سے شہریار کی کال ریسیو کر لی گئی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ایس پی صاحب! فوری طور پر ایک ٹیم پیر آباد روانگی کے لیے تیار کریں۔ وہاں اسکول کی عمارت میں آگ لگا دی گئی ہے اور ساتھ ہی اسکول ٹیچرز اپنی رہائش گاہ پر سخت خطرے سے دوچار ہیں۔ ان کے مکان کو چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا ہے اور مسلسل انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔'' اپنے موبائل کے ماؤتھ پیس

والے حصے کو مکمل طور پر ہتھیلی سے بند کرتے ہوئے اس نے ایس پی کو احکامات جاری کیے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ منیب اس کی آواز نہ سن سکے۔ اگر وہ یہ سن لیتا کہ شہریار کے نزدیک بھی ان لوگوں کی زندگی کے لیے خطرہ تھا تو اس کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ ابھی تو وہ دل میں اچھی امید رکھتے ہوئے چودھری کے کارندوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ انہیں صبح تک کی مہلت دینے پر تیار ہو جائیں۔ شہریار ان مذاکرات کو اپنے موبائل پر سن سکتا تھا۔

''میں آرڈر جاری کرتا ہوں سر! اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کرتا ہوں کہ ہمارے محکمے کے جو لوگ پیر آباد میں تعینات ہیں، کسی طرح ان سے رابطہ ہو سکے۔ جب تک یہاں سے پولیس پارٹی پہنچے، وہ لوگ صورتِ حال کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' ایس پی کافی مناسب آدمی تھا چنانچہ اس کا حکم سن کر کوئی حیل و حجت کرنے کے بجائے فوراً مستعد ہو گیا اور اپنی طرف سے ایک تجویز بھی پیش کی۔

''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ لوگ کچھ کر سکیں گے۔ ایک تو وہ تعداد میں ہی تین سے زیادہ نہیں ہیں، دوسرے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں ہو گی کہ چودھری کے کارندوں کے مقابلے میں کھڑے ہو سکیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ خود بھی چودھری کے ہی نمک خوار ہوں۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں ایک نہایت تلخ حقیقت بیان کی۔

''او کے سر! پھر میں ویسا ہی کرتا ہوں جیسا آپ نے کہا ہے۔'' ایس پی نے بھی فوراً اس کی بیان کردہ حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ایس پی کی کال سے فارغ ہو کر وہ منیب اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہونے والی بحث کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔

''دو گھنٹے کیا، ہم دو منٹ کے لیے بھی تم لوگوں کو اس گاؤں میں برداشت نہیں کر سکتے۔ فوراً باہر نکلو اور جس حال میں بھی ہو، یہاں سے نکل پڑو..... ورنہ تمہارا وہ حال کریں گے جسے دیکھ کر کسی میں ہماری گل ماننے سے انکار کی جرأت ہی نہیں رہے گی۔'' منیب نے یقیناً اس کی ہدایت کے مطابق مذاکرات کو آگے بڑھایا تھا لیکن چودھری کے کارندے بھی اسی کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم تھے چنانچہ چیختی ہوئی آواز میں منیب کو یہ دھمکی دی گئی۔ شہریار نے بھی اپنے موبائل پر ایک ایک لفظ سنا اور اپنا وارڈروب کھول کر اس میں سے لباس نکالنے لگا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا چنانچہ باہر نکلنے سے پہلے لباس کی تبدیلی ضروری تھی۔ رات کے اس پہر کوئی پُرتکلف لباس منتخب کرنے کے بجائے اس نے لائن سے استری کر کے ٹنگے ہوئے کپڑوں میں سے ایک سادہ سی شرٹ اور جینز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس لمحے اچانک اس کی موبائل پر گرفت کمزور ہو گئی اور موبائل اس کی انگلیوں سے پھسلتا ہوا نیچے زمین کی طرف گرنے لگا۔ اس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موبائل کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا۔ لیکن جب موبائل اس نے کان سے لگایا تو اس میں سے ہر قسم کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ اس نے موبائل کی اسکرین آنکھوں کے سامنے کی۔ منیب سے اس کی کال منقطع ہو چکی تھی۔ یقیناً گرتے ہوئے موبائل کو کیچ کرنے کے چکر میں سرخ بٹن پُش ہو گیا تھا جس کے باعث لائن کٹ گئی تھی۔

اس نے لباس نکال کر وارڈروب بند کی اور دوبارہ رابطے کی کوشش کرنے لگا لیکن منیب کی طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ شاید چودھری کے کارندوں کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ شہریار نے تیزی سے کپڑے تبدیل کیے اور ایک بار پھر کال ملا کر دیکھی۔ اب بھی وہی صورتِ حال تھی۔ منیب کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے عبدالمنان کا نمبر ملایا اور اسے فوری طور پر پیر آباد روانگی کے پروگرام



آگاہ کرتے ہوئے چند منٹوں میں تیار ہونے کی ہدایت کی۔ وہ اتنی عجلت میں تھا کہ اس نے عبدالمنان کو وہاں جانے کی وجہ سے بھی آگاہ نہیں کیا اور صرف اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ عبدالمنان بھی اس کا مزاج آشنا ہو چکا تھا چنانچہ کوئی سوال نہیں کیا اور صرف ''یس سر'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ جب شہریار اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو وہ بالکل تیار تھا۔ گاڑی رُکتے ہی وہ خاموشی سے اس میں سوار ہو گیا۔ شہریار فوری طور پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بجائے اپنے موبائل پر مصروف رہا۔ پہلے اس نے منیب کا نمبر ملا کر دیکھا۔ پھر تمام کوششوں کی طرح اس بار بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال پر سخت تشویش محسوس کرتے ہوئے اُس نے ایس پی سے رابطہ کیا۔ اس سے گفتگو کے دوران میں معلوم ہوا کہ پولیس پارٹی ان لوگوں سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی اور ان کے مقابلے میں پولیس پارٹی کا پیر آباد جلدی پہنچنے کا امکان تھا۔

ایس پی کے اتنے تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شہریار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ منیب اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے جو اقدامات کر سکتا تھا، وہ کر چکا تھا۔ لیکن اسے خود بھی شک تھا کہ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہو گی۔ نئے ایس پی کو تارڑ کے مقابلے میں کافی فرض شناس پانے کے باوجود اس نے اس بار خود پیر آباد جانے کا فیصلہ بھی اس لیے کیا تھا کہ اس کی موجودگی پولیس کے لیے سپورٹ کا باعث بن سکے اور چودھری کے دباؤ میں آ کر کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان لوگوں کو پیر آباد پہنچنے تک کچھ باقی بچے گا؟ اسکول کی جلتی عمارت اور اپنی رہائش گاہ پر محصور منیب اور اس کے ساتھی کہیں ان کے پہنچنے سے قبل ہی اپنی ہستی نہ کھو بیٹھیں..... انہی خدشات اور سوالات کے درمیان گھرے شہریار سے پیر آباد کی طرف رواں دواں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے عبدالمنان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ اس بات کا تو پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ پیر آباد میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے جو رات کے اس پہر شہریار نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن موجودہ صورتِ حال اس اعتبار سے زیادہ تشویش ناک تھی کہ تین قیمتی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ اسکول کی عمارت اگر جل کر تباہ بھی ہو جاتی تو اس نقصان کا ازالہ ہو سکتا تھا۔ مالی نقصانات عموماً قابلِ تلافی ہوتے ہیں لیکن انسانی جان کا نعم البدل تو کسی صورت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جان کے خطرے سے دوچار وہ تین اساتذہ اپنی ذات میں تنہا تو نہیں تھے۔ ان تین افراد کے ساتھ تین جان بھی جڑے ہوئے تھے۔ ان تینوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو دراصل یہ تین خاندانوں کا نقصان ہوتا۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے عبدالمنان کی اپنی پیشانی بھی شکن آلود ہو گئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''میرے خیال میں سر! اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ہمارے پاس ایک ہی طریقہ ہے۔'' کچھ دیر کی سوچ کے بعد وہ شہریار سے مخاطب ہوا۔

''کیا؟'' اس نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

''ہم چودھری افتخار سے رابطہ کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ کچھ نامعلوم افراد نے ہمارے اسکول کی رہائش گاہ کو گھیر لیا ہے۔ ہمارے لیے فوری طور پر انہیں امداد پہنچانا ممکن نہیں، چنانچہ آپ مہربانی کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ان ٹیچرز کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ ظاہر ہے، چودھری نہ تو انکار کر سکے گا اور نہ ہی اعتراف کر سکے گا کہ دراصل وہ اس کے آدمی ہیں جنہوں نے اسکول ٹیچرز کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ناچار ہماری خواہش پر اپنے آدمیوں کو وہاں سے ہٹانا پڑے گا۔ اس کے لیے ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑا بہت ڈرامہ کرے اور کچھ ایسا کر ڈالے جس سے یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے آدمیوں نے جدوجہد کر کے حملہ آوروں کو

مار بھگایا ہے۔ لیکن اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمارا کام بھی نکل جائے گا اور ہم بھی چودھری کو منا
مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے اس ''تعاون'' کے لیے شکریہ کہہ کر واپس آ جائیں گے۔'' عبدالمنان نے اپنا
منصوبہ اس کے گوش گزار کیا۔

''تجویز تو اچھی ہے۔ کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' پہلی بار شہریار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکرا
اُبھری۔ اسے عبدالمنان کی اس تجویز کو سن کر چور کو کوتوال بنا دینے والا محاورہ یاد آ گیا تھا۔ اس نے عبدالمنان
چودھری کا نمبر ملانے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پا کر وہ نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ اس کی بار
کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ آخر اس نے نمبر ڈائل کرنے کا سلسلہ روک دیا۔ شہریار نے سوا
نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''چودھری کا موبائل آف ہے اور حویلی کی لینڈ لائن والا نمبر مسلسل انگیج جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ
ریسیور ہی ہٹا کر رکھ دیا گیا ہو۔'' عبدالمنان نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے
گیا۔ جو تجویز عبدالمنان کے ذہن میں آئی تھی، وہ شاید پہلے ہی چودھری کے ذہن میں تھی چنانچہ اس نے
سے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ اس سے رابطہ ہی نہ کیا جا سکے۔ اب ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ
تھا کہ پیر آباد پہنچنے تک منیب اور دیگر اساتذہ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ شدید تناؤ کے عالم میں خا
سے ان کا سفر جاری رہا۔

ڈرائیور جو بظاہر کسی بے جان مورتی کی طرح بے تاثر چہرہ لیے بالکل خاموشی سے ڈرائیو کر رہا
درحقیقت اس ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہت تیزی
گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اُس کی اس کارکردگی کی وجہ سے پیر آباد تک کا فاصلہ تیزی سے سمٹ رہا تھا لیکن ابھی
آباد سے کچھ دور ہی تھے کہ اچانک باش شروع ہو گئی۔ راستہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ایک طرف سڑک کی حا
مخدوش تھی تو دوسری طرف روشنی کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ مجبوراً ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار کم کرنی
صورتِ حال کی گمبھیرتا کے باوجود شہریار کا ذہن ان باتوں کو نوٹ کرتا چلا گیا۔ ویسے تو اپنے علاقے
مسائل پہلے ہی اس کے نوٹس میں تھے اور وہ ان کے حل کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتا تھا لیکن بہرحال وہ لا
اختیارات اور وسائل کا مالک نہیں تھا۔ ان چیزوں کی بہتری کے لیے اسے جو فنڈز درکار تھے، وہ ابھی
گورنمنٹ نے منظور نہیں کیے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کوئی پیش رفت مشکل سے ہوتی تھی کہ علاقے
منتخب نمائندے مکمل طور پر اپنے فرائض سے غافل تھے اور مشکل سے ہی کبھی یہاں پائے جاتے تھے۔ ورنہ
بیوی بچوں کے ساتھ لاہور شہر ہی ان کا مستقل ٹھکانہ بنا ہوا تھا جہاں وہ خود بھی عیش و آرام سے رہتے تھے
کے بچوں کو بھی بہترین تعلیمی اور دیگر سہولیات میسر تھیں۔

خدا خدا کر کے ان کا سفر تمام ہوا اور گاڑی پیر آباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اس مکان کی
بڑھ گئی جہاں اسکول کے اساتذہ کی رہائش تھی۔ شہریار نے دور ہی سے اس مکان کے سامنے کھڑی پولیس
جیپ دیکھ لی۔ بارش کے باعث علاقے کی بجلی غائب تھی لیکن پولیس جیپ کی جلتی بتیوں نے کسی حد تک
کو روشن کر رکھا تھا۔

اس روشنی میں جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ اتنا خوش کن نہیں تھا۔ دو پولیس والے مکان کے اندر سے کسی
اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ جس شخص کو باہر لایا جا رہا تھا، وہ اس
بارے میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہاں کچھ برا ہو چکا



ں کی گاڑی پولیس جیپ کے پہلو میں جا کر رُکی تو منظر کچھ اور واضح ہو گیا۔ اب وہ لوگ دیکھ سکتے تھے کہ مکا
کی دیواریں سیاہ ہو رہی تھیں۔ یقیناً اسے آگ لگائی گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے آگ تو بجھ گئی تھی لیکن سیاہی
صورت آگ لگائے جانے کا واقعہ مکان کے در و دیوار پر لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔ گاڑی رُکی تو ایک پولیس و
ڑی سے پچھلے دروازے کی طرف لپک کر آیا۔ شہریار نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈی ایس پی منظور تھا۔

''السلام علیکم سر! ایس پی صاحب نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ وہ راستے میں ہی ہیں۔ بارش کی و
سے مشکل پیش آ رہی ہے لیکن ان کی کوشش ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائیں۔'' اسے سلام جھاڑتے ہو
ں نے تیزی سے اپنے آفیسر کا پیغام پہنچایا۔ شہریار اس پیغام پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل گئ
ں کے لیے ایس پی کا یہاں موجود ہونا یا نہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا جتنا وہاں موجود افراد کی زندگی کی اہمیت تھی۔

''کیا صورتِ حال ہے؟'' اپنی نظروں کو اِدھر اُدھر دوڑاتے ہوئے اس نے مختصر الفاظ میں سوال کیا۔
کے ساتھ برستی بارش نے لمحوں میں ہی اسے شرابور کر ڈالا تھا لیکن اس وقت اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں
تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈرائیور اور عبدالمنان بھی گاڑی سے نکل آئے تھے اور اب وہ سب اجتماعی طور پر ا
ارش میں بھیگ رہے تھے۔

''ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مکان کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی ا
لیے اندر والوں کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ پھر شاید بارش شروع ہونے کی وجہ سے آگ خود بخود ہی بجھ
لیکن یقیناً آگ اتنی زیادہ تھی کہ بجھتے بجھتے بھی ڈھیروں دھواں اُگل گئی۔ اندر موجود تینوں افراد آگ میں جل
نہیں بلکہ دھوئیں سے دم گھٹنے کے باعث اپنی جان سے چلے گئے۔'' ڈی ایس پی منظور کی پیش کردہ رپورٹ
واضح کر دیا کہ انہیں مدد کے لیے وہاں پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ کچھ لمحوں کے
سکتہ زدہ سا رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے دوسری لاش کو مکان سے باہر لایا جاتا دیکھنے لگا۔ پولیس والے جس
اس شخص کو اٹھا کر جیپ کے قریب پہنچے تو ہیڈ لائٹس کی روشنی نے اس کا چہرہ نمایاں کر دیا۔ وہ منیب تھا جس
اسے مدد کے لیے فون کیا تھا۔ کیا جرم تھا اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کا؟ وہ لوگ ایک محدود سی تنخواہ
عوض انتہائی مخدوش حالت میں معصوم بچوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
کوئی ایسا جرم تو نہیں تھا جس کی سزا میں ان کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا جاتا۔ وہ تو روشنی کے سفیر تھے جنہیں
کسی کے ظلم و جبر نے تاریک رات میں نگل لیا تھا۔

''ایس پی صاحب کو میں نے صورتِ حال بتا دی تھی۔ انہی کی ہدایت پر میں ان لاشوں کو مرکزِ صحت تک
منتقل کروا رہا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں سے صبح ایمبولینس کے ذریعے لاشیں نورکوٹ کے ہسپتال میں شفٹ
کر دی جائیں گی۔ ابھی اتنی تیز بارش میں تو ایمبولینس کا پہنچنا بھی ممکن نہیں۔'' اسے خاموش پا کر ڈی ایس پی خ
ہی آگے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس بار بھی وہ چپ ہی رہا۔ ایمبولینس ابھی لاشوں کو لے کر ہسپتا
جاتی یا صبح..... اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ وہ، جنہوں نے مدد کے لیے پکارا تھا، ان کی مدد سے بے نیاز ہو
تھے۔ اب ان کی لاشیں چند گھنٹوں کی تاخیر سے ہسپتال، گھر اور آخری آرام گاہ پہنچائی جاتیں بھی تو کیا فرق
جاتا؟ اصل میں تو تاخیر اس وقت نہیں ہونی چاہئے تھی جب وہ زندہ تھے اور ان کے دلوں میں زندگی کی اُم
روشن تھی۔

''آپ نے کوئی ایسا عینی شاہد تلاش کیا جو بتا سکے کہ یہاں آگ لگانے والے لوگ کون تھے؟'' مر
والے مر چکے تھے۔ اب کچھ بھی کر لیا جاتا، ان کے بے جان جسموں میں دوبارہ زندگی کی رمق پیدا نہیں کی

سکتی تھی۔ لیکن ان کا خونِ ناحق تو انصاف کے لیے پکار رہا تھا۔ ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی شاید اب ان کی روحوں کی بے قراری دور کی جاسکتی تھی۔

''موقع پر کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ ہم یہاں پہنچے تو صورتِ حال بالکل ایسی ہی تھی جیسی آپ ابھی دیکھ رہے ہیں۔ البتہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہماری جیپ یہاں سے ذرا فاصلے پر تھی، تب کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تھا۔ شاید مکان کو آگ لگانے والے باہر رہ کر نگرانی کر رہے تھے کہ کوئی ان لوگوں کی مدد کے لیے نہ آسکے۔ اور یقیناً اسی وجہ سے کوئی یہاں موجود نہیں تھا۔ اگر میرے پاس دو گاڑیاں ہوتیں تو میں ایک فرار ہونے والی گاڑی کے پیچھے بھیج دیتا لیکن پہلے یہاں کی صورتِ حال دیکھنا ضروری تھا۔ پھر کوئی گاڑی نظر بھی نہیں آئی تھی۔ بس مجھے آواز ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس اندھیرے اور برسات میں ہم کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہو پاتے۔'' ڈی ایس پی منظور اسے حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہر عمل کی وضاحت بھی پیش کرتا جا رہا تھا۔ ان سوال جواب کے دوران پولیس جیپ لاشوں کو لے کر مرکزِ صحت کی طرف روانہ ہو چکی تھی اور وہ لوگ ابھی تک مکان کے باہر ہی کھڑے مسلسل برستی بارش میں بھیگ رہے تھے۔

بے بسی اور دُکھ کی انتہائی کیفیت سے دوچار شہریار نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور مکان میں داخل ہو گیا۔ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب اس میں کچھ جیتے جاگتے انسان موجود تھے۔ اور اب یہ مکان ویران ہو چکا تھا۔ وہ گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ مکان میں دھوئیں کے ساتھ ساتھ واضح طور پر پٹرول کی بُو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً آگ لگانے والوں نے باہر سے پٹرول چھڑک کر مکان کو آگ دکھا دی تھی اور نتیجے میں یہ مکان اپنے رہائشیوں کی مقتل گاہ بن گیا۔ وہ دل پر بہت بھاری بوجھ لیے مکان کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک دیوار کے پاس اسے موبائل سیٹ پڑا نظر آیا۔ اس نے جھک کر وہ موبائل اٹھا لیا اور بٹن پش کر کے اسے چیک کرنے لگا۔ کال رجسٹر میں اسے متعدد مس کالز نظر آئیں جو کہ اس کے موبائل سے ہی کی گئی تھیں۔ یعنی یہ موبائل منیب کا تھا اور جانے کیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

''ڈی ایس پی صاحب! آپ اس واقعے کی رپورٹ لکھیں۔ ان مظلوم مقتولوں کی طرف سے میں مدعی ہوں اور میں عدالت میں گواہی دوں گا کہ انہیں قتل کرنے والے لوگ کون تھے۔'' موبائل پر نظریں جمائے وہ دھیمی مگر اندرونی رنج و غصے سے دہکتی آواز میں ڈی ایس پی سے مخاطب ہوا۔

⊛----✪----⊛

''یہ یہاں سے اسلام آباد کے لیے ڈائیو کے ٹکٹ اور میری خالہ کے گھر کا ایڈریس ہے۔ ایڈریس زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ کسی بھی ٹیکسی والے کو بتائیں گے تو وہ آپ کو پہنچا دے گا۔ لیکن بالفرض کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں نے ایڈریس کے ساتھ ہی اپنے کزن کا موبائل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ آپ اسے فون کر لیجیے گا، وہ آپ کو خود لینے آجائے گا۔'' افضل کے صحافی دوست نے ووٹکٹ اور پتہ لکھا ہوا ایک کاغذ گم صم بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھایا۔ یہ افضل کا وہی دوست تھا جس نے افضل کے کہنے پر کشور کو پہلے والے ہسپتال سے یہاں منتقل کروایا تھا۔ اب افضل کی موت کے بعد بھی وہ اپنے دوست سے دوستی نبھانا نہیں بھولا تھا اور ان دونوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ یوں تو آفتاب بھی کسی حد تک صحافت کے میدان کا ہی بندہ تھا اور ایک کالم نگار کی حیثیت سے اسے کافی پسند کیا جاتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس کا دماغ کچھ اس طرح ماؤف ہو گیا تھا کہ اس کی قوتِ عمل ہی جواب دے گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو اپنے ذاتی تعلقات سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔



''تھینک یو ویری مچ دوست! بغیر کسی تعلق کے بھی تم نے ہمیں یاد رکھا اور ان مشکل حالات میں ہماری مدد کے لیے آئے۔ ورنہ تو آج کل لوگ بنا غرض کے کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔'' چہرے پر ایک بجھی ہوئی سی مسکراہٹ لیے آفتاب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ افضل کی موت نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ افضل اس کا بچپن سے قریبی دوست تھا اور اس دوست کے پورے خاندان سمیت دنیا سے اُٹھ جانے کا واقعہ ایسا نہیں تھا کہ وہ آسانی سے فراموش کر دیتا۔ افضل اور اس کے بیوی بچوں کا قاتل صائب خان مرنے سے قبل جو بیان دے گیا تھا، اس سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ اس حادثے میں چودھری کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ وضاحت آفتاب اور اس کے لیے کسی حد تک اطمینان کا سبب بنی تھی۔ افضل اور اس کے اہلِ خانہ کی موت کے غم کے ساتھ اگر یہ احساس بھی ساتھ ہوتا کہ وہ لوگ ان کی وجہ سے چودھری کے عتاب کا نشانہ بنے ہیں تو یقیناً صدمے کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی۔

''تعلق تو تم نے خود ہی مجھ سے طے کر لیا ہے۔ دوست کہہ کر پکارا ہے تو پھر اب دوست ہی سمجھو اور تمام تر تکلفات کو چھوڑ دو۔ ویسے اگر تم یہ تعلق نہ بھی جوڑتے تو میں افضل کے دوست کی حیثیت سے تمہیں اپنا دوست سمجھتا۔ افضل سونے کا آدمی تھا۔ اس جیسا دوست ہونا آدمی کے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اسے کھویا ہے تو لگتا ہے زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے اور یہ خلا شاید کبھی پُر ہو بھی نہیں سکتا۔'' مرد ہونے کے باوجود ان لمحات میں اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اُمڈ آئی تھی۔

''تم نے اس کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی۔ وہ واقعی بہت زبردست انسان تھا۔ تمہاری صورت میں مجھے ایک اچھا دوست مہیا کر کے وہ تو جاتے جاتے مجھ پر ایک اور احسان کر گیا ہے۔'' آفتاب کی آواز بھی بھرا گئی۔

''اسے لوگوں پر احسان کرنے کے سوا کام ہی کیا تھا؟ ایسا مخلص اور بے لوث آدمی میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتاؤں، دو سال پہلے میرے والد کا بائی پاس ہونا تھا۔ گورنمنٹ ہسپتال میں آپریشن کروانے کو دل نہیں مانتا تھا اور پرائیویٹ کی رقم پوری نہیں تھی۔ اس وقت افضل نے مجھے بتائے بغیر اپنی بالکل نئی کار بیچ کر رقم فراہم کر دی۔ حالانکہ اس نے وہ کار بہت شوق سے اور مشکل سے خریدی تھی۔ مزاج کا بادشاہ تھا اس لیے اس کی خاصی انکم ہونے کے باوجود اس کا بینک بیلنس کبھی قابلِ ذکر نہیں رہا۔ عموماً اس کی آمدنی دوسروں کی مدد کرنے میں ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ بیگم بھی اس کو اپنی ہم مزاج ہی ملی تھیں اس لیے بھی عادتیں بدل نہیں سکیں۔ والد کے آپریشن کے بعد اس کے گھر شکریہ ادا کرنے گیا تھا، تب میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر تھوڑی خفگی دکھائی کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنی نئی گاڑی کیوں بیچ ڈالی؟ تو اس سے پہلے وہ بولیں کہ بھائی! گاڑی کا کیا ہے، ہم نے اس کی جگہ دوسری سیکنڈ ہینڈ کار لے لی ہے اور وہ بھی بالکل ٹھاک چلتی ہے۔ لیکن اگر آپ کے والد کا بروقت آپریشن نہ ہوتا اور خدانخواستہ وہ اس وجہ سے اپنی جان سے چلے جاتے تو ان کا نعم البدل کہاں سے آتا؟ اس وقت میں نے افضل کی قسمت پر رشک کیا تھا کہ اس کی بیوی جیسی عورتیں تو دنیا میں کہیں کہیں ہی ہوتی ہیں۔ ورنہ عموماً تو عورتوں کو روپے پیسے کے معاملے میں شوہروں سے لڑتے ہوئے ہی پایا جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ستائش اور ایک طرح کی عقیدت مندی تھی۔

''صحیح کہا یار تم نے۔ وہ دونوں ہی میاں بیوی اپنی جگہ انمول تھے۔ شاید اسی وجہ سے مختصر عمر لکھوا کر لائے تھے۔ اچھے لوگ اس دنیا میں کم ہی لمبی عمر پاتے ہیں۔'' آفتاب جو افضل سے متعلق اس طرح کے کئی واقعات کا خود ہی گواہ تھا، ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ پھر گویا دونوں کے درمیان بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور وہ

چند لمحے کے لیے یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ دو میں سے ایک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا۔ وہ چودھری کے کارندوں میں سے ایک تھا۔ ڈرائیور کو
''اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم اپنی مسز کے ساتھ کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکل ہی چھوڑ کر وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تو
کرنا۔ تمہاری مسز کی تو خیر ہے۔ میں ان کے لیے جو برقع لایا ہوں، اسے پہن کر وہ کسی کے نوٹس میں کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک بھی گئے۔ آفتاب اور کشور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں
بچ جائیں گی۔ لیکن تمہارے لیے مجھے یہ ڈر ہے کہ کسی نے ذرا غور سے دیکھ لیا تو کہیں پہچان نہ لے سکتے تھے لیکن اتنا اندازہ بہرحال انہیں ہو رہا تھا کہ چوکیدار ان لوگوں سے ان کی آمد کی غرض و غایت
مونچھیں تم نے ہسپتال میں رہ کر ہی بڑھائی ہیں، صرف رنگ آج تبدیل کیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اکر رہا ہے۔
وہ لوگ جن سے تمہارا زیادہ واسطہ پڑا ہے، اس تبدیلی کو نوٹ کر کے کہیں تمہیں پہچان نہ لیں۔ میں نہیں یہ لوگ یقیناً ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہوں گے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم
تمہارا یہ نیا حلیہ کسی کے علم میں ہو کیونکہ ہو سکتا ہے، تمہیں ڈھونڈنے والے ہسپتالوں کو بھی چھانیں۔'' اس منظر کو دیکھتی کشور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور یک دم ہی گاڑی کا لاک کھول کر نیچے
ہوں۔ تم جتنی زخمی حالت میں لائے گئے تھے، اس کے بعد یہ خیال تو خود بخود ہی ذہن میں آتا ہے کہ کئی۔
کے لیے کسی ہسپتال میں بھی ہو سکتا ہے اس لیے وہاں ڈھونڈنا چاہیے۔ بے شک تمہارا اور تمہاری مسز یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر نکلنے سے روکا۔
ہسپتال کے ریکارڈ میں نہیں لکھوایا گیا ہے لیکن کیا معلوم تمہیں تلاش کرنے والے تمہاری تصویریں ہا ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آفتاب! ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' اس نے اضطراری لہجے
کر ڈھونڈتے پھر رہے ہوں.... اور یہاں کوئی انعام وغیرہ کے لالچ میں بتا ڈالے کہ ہاں جناب! یہ ب دیا۔ اس کا یہ اضطراب اور بے چینی بے وجہ نہیں تھا۔ اگر چودھری کے گماشتوں کی نظر ان دونوں پر پڑ
داخل تھے اور اب فلاں فلاں حلیے میں یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔'' اس نے آفتاب کو احتیاط کی یقیناً وہ بری طرح پھنس جاتے۔ آفتاب خود بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ چودھری کے آدمیوں کا جو انداز تھا،
کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے خدشات سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس کے یہ خدشات نظر انداز کیے اس نے اتنا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی مبینہ اطلاع پر یہاں تک نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے طور پر اسے
قابل نہیں تھے چنانچہ آفتاب نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی یقین دہانی کرواتے ہوئے مختصر سا میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس اس کی وہاں موجودگی کی کوئی اطلاع ہوتی تو وہ بہت
اپنا اور کشور کا مشترکہ بیگ شانے سے لٹکا لیا۔ ارحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے اور یوں گیٹ پر رک کر چوکیدار کے سوالوں کا جواب دینے کی زحمت نہ
''تم مسز کو لے کر باہر نکلو۔ باہر میری نیلے رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی ہے۔ یہ اس کی چا۔ اس نے کشور کا ہاتھ تھامے تھامے ہی ایک بار پھر رخ موڑ کر ہسپتال کے گیٹ کی طرف دیکھا۔
دونوں گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتے ہوئے ریسیپشن پر بل بنانے کے لیے کہہ کر آیا تھا، وہ ادا کر کے آ کے آدمی اب اندر داخل ہو رہے تھے اور افضل کا دوست بابر باہر نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہسپتال
آفتاب کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے اس نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ منے کھڑی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی توجہ بھی اسی طرف تھی اور اس نے ایک بار بھی
آفتاب نے بھی اس کی تقلید میں اپنا کمرہ چھوڑ دیا اور کشور کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر مہران کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ گمان ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جن لوگوں کی تلاش میں وہ یہاں تک
کے حسب ہدایت برقع پہن کر تیار تھی۔ باہر نکل کر اس نے آفتاب کا بازو تھام لیا۔ ابھی وہ مکمل طور پر ہیں، وہ ان سے اتنے نزدیک کھلی فضا میں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔
نہیں ہوا تھا اور چلنے کے لیے اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ کشور نے بازو تھاما تو اسے مزید سہارا ''کیا بات ہے؟..... کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' بابر جو دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھتا ہوا آ رہا تھا، قریب
دونوں ہی اتنے محتاط تھے کہ ہسپتال سے نکلنے سے قبل ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کی۔ ان دونوں گاڑی کے کھلے دروازے اور اُترنے کے لیے پُرتولتی کشور پر سوالیہ نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔
ساتھ باہر نکلتے بہت سے لوگوں نے دیکھا لیکن یہ سرسری نظریں تھیں۔ دیکھنے والوں نے اگر ان کے ''ابھی یہاں سے چلو۔ تفصیلات بعد میں بتاتا ہوں۔'' آفتاب نے کچھ فاصلے پر کھڑی لینڈ کروزر پر ایک
کوئی رائے قائم بھی کی ہو گی تو یہی کہ وہ کسی مریض کے ملاقاتی ہیں اور اس سے ملاقات کر کے واپس نظر ڈالتے ہوئے بے چینی سے کہا تو بابر نے اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کو محسوس کر کے فوراً ہی
ہیں۔ ان کے ہمدرد نے انہیں دیگر رسمی کارروائیوں سے تو بچا ہی لیا تھا ورنہ ہسپتال سے ڈسچارج ہنگ سیٹ سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہسپتال کی حدود سے کافی دور نکل چکے تھے۔
ایک مکمل طریقِ کار ہوتا ہے۔ اگر اس طریقِ کار پر عمل کیا جاتا تو وہ اس نئے حلیے میں کم از کم ڈاکٹر ''اب بتاؤ کیا مسئلہ تھا؟''
آ ہی جاتے۔ ''ابھی جب تم ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو تم نے دو افراد کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا
باہر نکلتے ہی انہیں نیلے رنگ کی مہران نظر آ گئی۔ وہ گاڑی کا لاک کھول کر اس کی پچھلی نشست گیٹ کے بالکل سامنے ایک لینڈ کروزر بھی تمہیں نظر آئی ہو گی؟'' آفتاب نے جواباً اس سے پوچھا۔
ہو گئے اور نظریں ہسپتال کے خارجی دروازے پر ٹکا دیں۔ ''ہاں ہاں..... میں نے دیکھا تھا۔ ان دونوں افراد میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ سائز
ابھی مشکل سے ڈھائی تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تیز رفتار لینڈ کروزر ہسپتال سے بھی تھی۔ شاید وہ اس تصویر کی مدد سے کسی کو تلاش کر رہے تھے۔
کے عین سامنے آ کر رُکی۔ لینڈ کروزر کے اچانک لگائے جانے والے بریکس کی آوازیں فضا میں د ''وہ کسی کو نہیں، مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ چودھری کے کارندے تھے جو میری تلاش میں مارے مارے
دیں۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آفتاب اور کشور تو دیکھ ہی اسی طرف بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔ اگر ہمیں ہسپتال سے روانہ ہونے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹوں کی بھی تاخیر
چنانچہ جب لینڈ کروزر سے دو صورت سے ہی بدمعاش نظر آنے والے افراد نیچے اُترے تو وہ دونوں تو اس وقت ہم بری طرح پھنس چکے ہوتے۔'' آفتاب کے جواب نے بابر کو ششدر کر دیا۔ اس قسم کے

چند لمحے کے لیے یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

''اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم اپنی مسز کے ساتھ کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکلنے کی کوشش کرنا۔ تمہاری مسز کی تو خیر ہے۔ میں ان کے لیے جو برقع لایا ہوں، اسے پہن کر وہ کسی کے نوٹس میں آنے سے بچ جائیں گی۔ لیکن تمہارے لیے مجھے یہ ڈر ہے کہ کسی نے ذرا غور سے دیکھ لیا تو کہیں پہچان نہ لے۔ یہ داڑھی مونچھیں تم نے ہسپتال میں رہ کر ہی بڑھائی ہیں، صرف رنگ آج تبدیل کیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اسٹاف میں وہ لوگ جن سے تمہارا زیادہ واسطہ پڑا ہے، اس تبدیلی کو نوٹ کر کے کہیں تمہیں پہچان نہ لیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ نیا حلیہ کسی کے علم میں ہو کیونکہ ہو سکتا ہے، تمہیں ڈھونڈنے والے ہسپتالوں کو بھی چھانتے پھر رہے ہوں۔ تم جتنی زخمی حالت میں لائے گئے تھے، اس کے بعد یہ خیال تو خود بخود ہی ذہن میں آتا ہے کہ بندہ علاج کے لیے کسی ہسپتال میں بھی ہو سکتا ہے اس لیے وہاں ڈھونڈنا چاہیے۔ بے شک تمہارا اور تمہاری مسز کا اصل نام ہسپتال کے ریکارڈ میں نہیں لکھوایا گیا ہے لیکن کیا معلوم تمہیں تلاش کرنے والے تمہاری تصویریں ہاتھ میں لے کر ڈھونڈتے پھر رہے ہوں.... اور یہاں کوئی انعام وغیرہ کے لالچ میں بتا ڈالے کہ ہاں جناب! یہ دونوں یہیں داخل تھے اور اب فلاں فلاں حلیے میں یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔'' اس نے آفتاب کو احتیاط کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے خدشات سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس کے یہ خدشات نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھے چنانچہ آفتاب نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی یقین دہانی کرواتے ہوئے مختصر سامان پر مشتمل اپنا اور کشور کا مشترکہ بیگ شانے سے لٹکا لیا۔

''تم مسز کو لے کر باہر نکلو۔ باہر میری نیلے رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی ہے۔ یہ اس کی چابی ہے۔ دونوں گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتے ہوئے ریسپشن پر بل بنانے کے لیے کہہ کر آیا تھا، وہ ادا کر کے آتا ہوں۔'' آفتاب کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے اس نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔

آفتاب نے بھی اس کی تقلید میں اپنا کمرہ چھوڑ دیا اور کشور کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ اس کے حسبِ ہدایت برقع پہن کر تیار تھی۔ باہر نکل کر اس نے آفتاب کا بازو تھام لیا۔ ابھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا اور چلنے کے لیے اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ کشور نے بازو تھاما تو اسے مزید سہارا مل گیا۔ دونوں ہی اتنے محتاط تھے کہ ہسپتال سے نکلنے سے قبل ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کی۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ باہر نکلتے بہت سے لوگوں نے دیکھا لیکن یہ سرسری نظریں تھیں۔ دیکھنے والوں نے اگر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم بھی کی ہو گی تو یہی کہ وہ کسی مریض کے ملاقاتی ہیں اور اس سے ملاقات کر کے واپس جا رہے ہیں۔ ان کے ہمدرد نے انہیں دیگر رسمی کارروائیوں سے تو بچا ہی لیا تھا ورنہ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کا بھی ایک مکمل طریقِ کار ہوتا ہے۔ اگر اس طریقِ کار پر عمل کیا جاتا تو وہ اس نئے حلیے میں کم از کم ڈاکٹر کی نظر میں آ ہی جاتے۔

باہر نکلتے ہی انہیں نیلے رنگ کی مہران نظر آ گئی۔ وہ گاڑی کا لاک کھول کر اس کی پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے اور نظریں ہسپتال کے خارجی دروازے پر ٹکا دیں۔

ابھی مشکل سے ڈھائی تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تیز رفتار لینڈ کروزر ہسپتال کے دروازے کے عین سامنے آ کر رُکی۔ لینڈ کروزر کے اچانک لگائے جانے والے بریکس کی آوازیں فضا میں دور تک سنائی دیں۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آفتاب اور کشور تو دیکھ ہی اسی طرف رہے تھے۔ چنانچہ جب لینڈ کروزر سے دو صورت سے ہی بدمعاش نظر آنے والے افراد نیچے اُترے تو وہ دونوں ہی چونک



ان دو میں سے ایک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا۔ وہ چودھری کے کارندوں میں سے ایک تھا۔ ڈرائیور کو ی میں ہی چھوڑ کر وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تو اترافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک بھی گئے۔ آفتاب اور کشور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں ں سن سکتے تھے لیکن اتنا اندازہ بہرحال انہیں ہو رہا تھا کہ چوکیدار ان لوگوں سے ان کی آمد کی غرض و غایت یافت کر رہا ہے۔

''یہ لوگ یقیناً ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہوں گے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم اں ہیں۔'' اس منظر کو دیکھتی کشور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور یک دم ہی گاڑی کا لاک کھول کر نیچے زنے لگی۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر نکلنے سے روکا۔

''ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آفتاب! ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' اس نے اضطراری لہجے ں جواب دیا۔ اس کا یہ اضطراب اور بے چینی بے وجہ نہیں تھا۔ اگر چودھری کے گماشتوں کی نظر ان دونوں پر پڑ تی تو یقیناً وہ بری طرح پھنس جاتے۔ آفتاب خود بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ چودھری کے آدمیوں کا جو انداز تھا، ں سے اس نے اتنا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی مبینہ اطلاع پر یہاں تک نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے طور پر اسے پتالوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس اس کی وہاں موجودگی کی کوئی اطلاع ہوتی تو وہ بہت یادہ جارحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے اور یوں گیٹ پر رک کر چوکیدار کے سوالوں کا جواب دینے کی زحمت نہ ٹھاتے۔ اس نے کشور کا ہاتھ تھامے تھامے ہی ایک بار پھر رخ موڑ کر ہسپتال کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ ودھری کے آدمی اب اندر داخل ہو رہے تھے اور افضل کا دوست بابر باہر نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہسپتال ے سامنے کھڑی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی توجہ بھی اسی طرف تھی اور اس نے ایک بار بھی رخ موڑ کر مہران کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ گمان ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جن لوگوں کی تلاش میں وہ یہاں تک ئے ہیں، وہ ان سے اتنے نزدیک کھلی فضا میں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

''کیا بات ہے؟..... کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' بابر جو دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھتا ہوا آ رہا تھا، قریب پہنچنے پر گاڑی کے کھلے دروازے اور اُترنے کے لیے پَر تولتی کشور پر سوالیہ نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔

''ابھی یہاں سے چلو۔ تفصیلات بعد میں بتاتا ہوں۔'' آفتاب نے کچھ فاصلے پر کھڑی لینڈ کروزر پر ایک اضطراری نظر ڈالتے ہوئے بے چینی سے کہا تو بابر نے اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کو محسوس کر کے فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہسپتال کی حدود سے کافی دور نکل چکے تھے۔

''اب بتاؤ کیا مسئلہ تھا؟''

''ابھی جب تم ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو تم نے دو افراد کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا وگا؟ گیٹ کے بالکل سامنے ایک لینڈ کروزر بھی تمہیں نظر آئی ہو گی؟'' آفتاب نے جواباً اس سے پوچھا۔

''ہاں ہاں..... میں نے دیکھا تھا۔ ان دونوں افراد میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ سائز صویر بھی تھی۔ شاید وہ اس تصویر کی مدد سے کسی کو تلاش کر رہے تھے۔

''وہ کسی کو نہیں، مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ چودھری کے کارندے تھے جو میری تلاش میں مارے مارے رتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔ اگر ہمیں ہسپتال سے روانہ ہونے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹوں کی بھی تاخیر وجاتی تو اس وقت ہم بری طرح پھنس چکے ہوتے۔'' آفتاب کے جواب نے بابر کو ششدر کر دیا۔ اس قسم کے

خدشات ذہن میں ہونے کے باوجود وہ یہ امید نہیں کر رہا تھا کہ اتنی جلدی چودھری کے کارندے ہسپتال تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتاً اس وقت وہ بال بال بچے تھے۔ بہت مشکل حالات میں قسمت نے ایک بار پھر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ قسمت کی یاوری کب تک ان کے ساتھ رہتی۔

⊛----✪----⊛

اس نے کھڑکی پر پڑے بلائنڈز ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر بارش اسی شدومد سے برس رہی تھی۔ رات ان کے پیرآباد پہنچنے سے پہلے شروع ہونے والی بارش دوسرے دن کی شام ہو جانے کے باوجود کسی طور رُکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ تین مظلوموں کی دردناک موت نے آسمان کو بھی رُلا ڈالا ہو۔ شہریار کل رات ہی وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا اور صبح دفتر پہنچتے ہی ایک نئی مصروفیت نے اسے گھیر لیا تھا۔ محکمہ موسمیات کی طرف سے کسی پیشگی اطلاع کے بغیر شروع ہونے والے بارش کے اس سلسلے نے معمولاتِ زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور کئی چھوٹے موٹے حادثات کی اطلاعات اس کے دفتر تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان اطلاعات پر فوری امدادی کارروائیوں کے احکامات جاری کرنے کے علاوہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت دیر تک مزید احتیاطی اقدامات کے سلسلے میں مشاورت بھی کرتا رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے قبل اس نے خود باہر نکل کر اردگرد کے علاقوں کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اس جائزے نے اسے بہت شدت سے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کے زیرِ نگرانی ضلع میں قدرت کی کسی سختی اور آزمائش کو سہنے کی سکت بہت ہی کم ہے اور مرے پر سو درے کے مصداق ان کے پاس وسائل بھی اتنے تسلی بخش نہیں کہ صورتِ حال زیادہ بگڑ جانے پر کوئی تدارک کیا جا سکے۔ ان حالات میں اسے یہی سمجھ آیا تھا کہ صوبائی حکومت سے رابطہ کر کے ان سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کی اس درخواست کا وہاں سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا تھا بلکہ ایک طرح سے اسے یہ جتایا گیا تھا کہ وہ معمولی بارش کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر وہ خاصا کبیدۂ خاطر ہوا تھا لیکن اپنے ہاں کے اداروں کی بے حسی بھی اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ متعلقہ ادارے اس وقت تک حرکت میں آنا بے کار سمجھتے ہیں جب تک کوئی بڑا حادثہ پیش نہ آ جائے اور لوگ بلبلا کر چیخ نہ اُٹھیں۔ صوبائی حکومت کی طرف سے کسی اچھائی کی کم ہی امید رکھتے ہوئے اس نے ممکنہ حد تک اپنے انڈر میں موجود افراد کو متحرک کر دیا تھا اور خود دفتری اوقات ختم ہو جانے کے باوجود ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ دفتر کے دروازے پر ہلکی سی دستک اُبھری تو وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اس طرف متوجہ ہوا۔ آنے والا عبدالمنان تھا۔

''حالات کیسے ہیں عبدالمنان؟'' وہ پلٹ کر اپنی کرسی تک آیا اور بیٹھتے ہوئے عبدالمنان سے دریافت کیا۔

''مسلسل بارش کی وجہ سے حالات بتدریج خرابی کی طرف جا رہے ہیں سر! اطلاع ملی ہے کہ ایک جگہ بجلی کے تار گرنے کی وجہ سے پانچ افراد زد میں آ گئے ہیں۔ ان پانچوں میں سے دو نے تو موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا جبکہ باقی تین کو بھی کافی نازک حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے بجلی کی سپلائی مکمل طور پر منقطع کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے مزید مشکلات کا سامنا ہے۔ دیکھا جائے تو نظامِ زندگی بری طرح درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اکثر دیہاتوں کی صورتِ حال بہت خراب ہے۔ نہر میں بھی پانی کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ پیرآباد اور اردگرد کے چند اور گاؤں زیرِ آب آ سکتے ہیں۔'' عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ دی وہ بہت ہی تشویش ناک تھی جسے سن کر وہ کچھ دیر تک اپنے کمرے میں جلتی واحد ٹیوب لائٹ کو



روشنی سے تکتا رہا۔ یہ ٹیوب لائٹ بھی جنریٹر کی وجہ سے روشن تھی۔

روشن ٹیوب لائٹ سے نظریں ہٹا کر اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیاں لیاقت رانا کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ ان کی بیماری اور صدمات سے چُور حالت دیکھ کر اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی معاملے میں انہیں زحمت نہ دے لیکن یہ بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا معاملہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ لیاقت رانا کی کوشش سے اسے وہ سہولیات میسر آ سکتی ہیں جو اس کی درخواست کے باوجود صوبائی حکومت نے فراہم نہیں کی تھیں۔

لیاقت رانا فون لائن پر آئے تو انہوں نے بہت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی اور یقین دلایا کہ وہ حتی الامکان اس کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ سیاست دان تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے ماموں کا اس سے کیا ہوا یہ وعدہ کوئی سیاسی وعدہ نہیں ہے۔ سیاست کے کیچڑ بھرے میدان میں رہ کر وہ بے شک اپنے دامن کو مکمل طور پر چھینٹوں سے محفوظ تو نہیں رکھ پائے تھے لیکن بہرحال فطرتاً وہ ایک اچھے اور ہمدرد انسان تھے اور اب ان کے ذاتی دکھوں نے تو انہیں اور بھی زیادہ نرم دل کر دیا تھا۔ اپنی پوتی شینا اور بیٹے سجاد رانا کی موت کے بعد ان کی سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ روگ کی طرح جان سے لگ جانے والی بیماریوں نے انہیں اس لائق ہی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لے سکیں لیکن بہرحال اب بھی ان کی حیثیت ہاتھی سے کم نہیں تھی جو مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ اب بھی ان میں اتنا دم خم تو تھا کہ اس کے مطالبات پورے کروا سکیں۔ ان کی طرف سے وعدہ کیے جانے کے بعد شہریار خاصا مطمئن ہو گیا اور اس اطمینان نے اسے دوسرے امور کی یاددہانی کروانا شروع کر دی۔

''نیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی لاشوں کا کیا ہوا؟ انہیں پیرآباد کے ہیلتھ یونٹ سے شفٹ کیا جا سکا؟''

''یہ کام صبح دس گیارہ بجے کے درمیان ہی کر لیا گیا تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد ضروری قانونی کارروائی کے بعد انہیں ورثاء کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم نے ورثاء تک اطلاع پہنچا دی ہے۔ نیب کے ایک ماسٹر کے ورثاء یہاں پہنچ بھی گئے ہیں جبکہ تیسرے کے ورثاء کی طرف سے ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شدید بارش کی وجہ سے انہیں یہاں تک پہنچنے میں مشکل پیش آ رہی ہو۔'' عبدالمنان نے اسے جواب دیا۔

''اس طرف دھیان رکھنا۔ اگر وہ لوگ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکیں تو خود اپنی ذمے داری پر ڈیڈ باڈی ان کے گھر بھجوا دینا۔ ان بے چاروں پر جتنا بڑا دکھ ٹوٹا ہے، اس میں ہم سے جہاں تک ہو سکے، ان کی مدد کرنی چاہیے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مقتولین کے ورثاء کی مناسب مالی امداد بھی کی جا سکے۔ جو جان چلی گئی، اس کے نقصان کا مداوا تو خیر کسی صورت نہیں کیا جا سکتا لیکن کمانے والوں کی موت کے بعد پیدا ہونے والے مالی مسائل کا حل تو نکالا جا سکتا ہے۔'' وہ نیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی موت سے بہت دکھی تھا۔ اس کا بس چلتا تو فوری طور پر چودھری کو کڑی سزا دلوا ڈالتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہ ابھی تک اسے گرفتار بھی نہیں کروا سکا تھا۔

ایک تو اس کے پاس کوئی عینی شاہد نہیں تھا جو عدالت میں یہ بیان دے سکتا کہ اسکول و گھر کو نذرِ آتش کرنے والے چودھری کے ہی گرگے تھے، دوسرے موسم کی خراب صورتِ حال نے بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لی تھی اور وہ فوری طور پر درپیش مسائل کے تدارک میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ چند ہدایات دینے کے بعد عبدالمنان کے ساتھ موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کا ضلع بھر سے رابطہ رہے۔ مواصلاتی نظام کے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس

کوشش میں مکمل طور پر کامیاب تو نہیں تھے لیکن جہاں سے بھی ان کا جتنا بھی رابطہ ہو پا رہا تھا، وہاں سے کوئی
اچھی اطلاعات موصول نہیں ہو رہی تھیں۔ رات آٹھ بجے کے قریب انہیں اطلاع موصول ہوئی کہ نہر میں پانی
کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ اگلے ڈھائی تین گھنٹے میں پانی پیر آباد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔
اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہو اُٹھا۔

''مجھے فوری طور پر امدادی کارکنوں کے ساتھ پیر آباد پہنچنا چاہئے۔ اگر فوری مدد نہیں کی گئی تو کئی انسانی
جانوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔''

''میرے خیال میں سر! آپ خود وہاں جانے کے بجائے امدادی ٹیم کو بھجوا دیں۔ اس وقت راستے
بہت خراب ہیں، کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔'' عبدالمنان نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی
کوشش کی۔

''خراب راستوں کے ڈر سے میں اپنی جان بچا کر بیٹھ جاؤں اور دوسروں کی زندگیاں داؤ پر لگا دوں۔
یہ کہاں کا انصاف ہے؟ امدادی ٹیم کے ساتھ میں خود جاؤں گا تا کہ ان لوگوں کے حوصلے بھی بلند ہو سکیں۔ تمہیں
البتہ یہیں دفتر میں ہی رہنا ہو گا تا کہ ملنے والی اطلاعات پر مناسب اقدامات کر سکو۔'' اس نے تیز لہجے میں
عبدالمنان کو جواب دیا۔

اس کے اس انداز پر عبدالمنان نے بہ غور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ برہم ضرور تھا لیکن بہر حال اسے
دفتر میں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کسی ناراضی کے باعث نہیں بلکہ انتظامی نقطۂ نظر سے تھا۔ اس طرف سے اطمینان
ہو جانے کے بعد وہ اس کے حسب ہدایت ایسی ہی کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے تیار کردہ
ریسکیو ٹیم کے افراد کو احکامات جاری کرنے لگا۔ اس دوران شہریار نے ایک بار پھر لیاقت رانا سے رابطہ کر کے
انہیں تازہ صورتِ حال بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کیا کہ وہ کب تک اسے مطلوبہ امداد فراہم کرنے میں
کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کی طرف سے خاصا امید افزا جواب موصول ہوا۔ اس جواب کو سن کر وہ قدرے مطمئن
سا ہو کر اپنے دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر یہ اس کا پیر آباد کی طرف دوسری دفعہ سفر تھا لیکن اس
بار وہ اپنی ذاتی گاڑی کے بجائے ایک جیپ میں روانہ ہوا تھا۔ راستے کے بارے میں جو خدشات تھے، ان کے
پیشِ نظر جیپ میں سفر کرنا ہی مناسب تھا۔

امدادی ٹیم کے ارکان ایک سفید رنگ کے شہزور پر سوار تھے۔ دونوں گاڑیاں برستی بارش میں، رات کے
مہیب اندھیروں اور سناٹوں کا بڑے عزم سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئیں۔ راستے
واقعی بہت خراب ہو چکا تھا اور ڈرائیورز کو مشکل پیش آ رہی تھی لیکن انہوں نے بے پناہ ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ
کرتے ہوئے گاڑیوں کی رفتار کم نہ ہونے دی۔

بالآخر آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں نے کسی نہ کسی طرح پیر آباد تک کا درمیانی راستہ طے کر ہی لیا۔ جب وہ
لوگ پیر آباد میں داخل ہوئے تو شہریار نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آتے شہزور کی لائٹیں ایک جگہ رک گئی ہیں
اور ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو جیپ روک کر صورتِ حال معلوم کرنے کا حکم دیا۔
معلوم ہوا کہ شہزور کا ایک پہیہ کچی زمین میں دھنس گیا ہے جس کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا۔ امدادی ٹیم
کے ارکان نے امید ظاہر کی کہ وہ جلد ہی اس مصیبت سے نجات حاصل کر لیں گے۔ جتنے افراد اس کی جیپ میں
سما سکتے تھے، انہیں اپنے ساتھ سوار کر کے وہ باقی کو پھنسے ہوئے ٹرک کو نکالتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ آبادی کی
حدود شروع ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سارا گاؤں جاگ رہا ہے۔ بجلی کی سپلائی تو یہاں بھی منقطع تھی لیکن



لوں وغیرہ کی مدھم روشنی جگہ جگہ نظر آ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں وہ پریشانی سے چیختے چلاتے لوگوں کو اِدھر
اُدھر بھاگتے دیکھ سکتا تھا۔ ان پریشان حال لوگوں نے ضلع کے اے سی کو اپنے درمیان پایا تو ان کے چہروں پر
حیرت کے ساتھ ساتھ امید کی کرنیں بھی نظر آنے لگیں۔

ان کی زندگیوں میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اتنی جلدی کوئی سرکاری افسران کے درمیان پہنچ گیا تھا ورنہ
ہر طرح کے لوگ تو اس وقت پہنچتے تھے جب وہ اپنا مال و متاع گنوانے کے ساتھ ساتھ کئی پیاروں کو بھی زمین
میں دفنا چکے ہوتے تھے۔ ان لوگوں سے اسے اطلاع ملی کہ نہر کی سطح خطرناک حد تک بلند ہو چکی ہے اور پانی کسی
لمحے گاؤں میں داخل ہو سکتا ہے۔ نہر گاؤں کے مشرقی حصے میں تھی اور یہ حصہ نشیب میں تھا جبکہ گاؤں کا
غربی حصہ کافی بلند اور محفوظ تھا۔ وہ لوگ اپنے اہلِ خانہ اور مال مویشی مغربی حصے میں منتقل کرنے کی کوشش کر
رہے تھے۔ شہریار کے ساتھ آئے ہوئے امدادی کارکن اس کام میں ان کی مدد کرنے لگے۔ ان کے پاس طاقتور
ہیلجنسی لائٹس اور اس طرح کے کاموں کا تجربہ تھا چنانچہ کام میں تیزی آ گئی۔ شہریار نے اپنی جیپ بھی ان
لوگوں کے حوالے کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر کچی زمین میں دھنس جانے والا شہزور بھی میدان میں اُتر آیا
جس کی وجہ سے لوگوں اور مال و اسباب کی منتقلی کا کام اور بھی تیزی سے ہونے لگا۔ تاہم اب نہر کے پانی نے
حد پھلانگ کر گاؤں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ منہ زور پانی پہلے ہی بارش کی وجہ سے جل تھل زمین کو تیزی
سے غرق کرتا جا رہا تھا۔

''اس واری پانی کے تیور الگ ہی ہیں۔ پانی کا وڈا ریلا چودھری سرکار کی زمینوں کی طرف چلا گیا ہے۔''
ایک چھتری سر پر تانے اپنے ساتھ لائے گئے واحد بڑے سے خیمے میں عورتوں اور بچوں کے بہ مشکل سمائے
منظر دیکھ رہا تھا کہ کسی طرف سے یہ آواز سنائی دی۔ معلوم نہیں بولنے والے کی آواز میں تشویش تھی یا
مانیت..... وہ اندازہ نہیں لگا سکا۔ لیکن پھر فوراً ہی ہوا کے دوش پر سفر کر کے اس تک پہنچنے والی دوسری آواز نے
ان کی اُلجھن دور کر دی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔

''ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کل رات چودھری نے وڈا ظلم کمایا۔ بے قصور لوگوں کی جان لے ڈالی۔ اب دیکھ لو،
اب سے اس کے بندے کوشش کر رہے تھے کہ حفاظتی باڑھ بنا کر پانی کو چودھری کی زمینوں کی طرف آنے
سے روک سکیں لیکن پانی اتنی تیزی سے آیا کہ لمحہ بھر میں سب ملیامیٹ کر دیا۔ تین چار بندوں کو تو میں نے خود
ریلے کی زد میں آ کر ڈوبتے دیکھا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے میں ان کی شکلیں تو نہیں پہچان سکا لیکن تھے تو وہ
چودھری ہی کے نمک خوار جو ہمیں مصیبت میں چھوڑ کے خود اپنے آقا کی زمینیں بچانے میں لگے ہوئے تھے۔
بیچارے خود اپنی جان بھی نہیں بچا سکے۔''

وہ افسوس کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں افسردگی نہیں تھی۔ خود شہریار نے بھی اپنے دل میں ایسی
ہی کیفیت محسوس کی۔ اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے پانی میں ڈوب کر مر جانے والے افراد بھی ان بھیڑیوں میں
شامل ہوں جنہوں نے کل رات منیب اور اس کے نہتے ساتھیوں کو گھیر کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ یہ
ممکن تو نہیں تھا کہ اپنے آقا کے اشارے پر یہ ظلم کرنے والے آج خود انتقامِ قدرت کے گھیرے میں آ گئے
ہوں۔ اپنی اس گہری سوچ سے وہ کسی شے کے چھنکنے کی وجہ سے باہر آیا۔ وہ آواز کے ماخذ کی طرف متوجہ ہوا۔
ابتر حلیے والا چالیس بیالیس سال کا کوئی مخبوط الحواس شخص تھا جو ایک امدادی کارکن کے سہارے اپنے پیر میں
پڑی زنجیریں چھنکاتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں موجود زنجیروں نے شہریار کو اُلجھن میں ڈال
دیا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھا۔

"اس شخص کے پیروں میں زنجیریں کیوں ہیں؟" اس نے سہارا دینے والے امدادی کارکن سے سوال کیا۔

"معلوم نہیں سر! ہم لوگوں کو ریسکیو کر رہے تھے جب ہمیں ایک مکان کے اندر سے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ اندر جا کر دیکھا تو یہ آنگن میں ایک درخت کے ساتھ زنجیروں سے بندھا چلا رہا تھا۔ پانی مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے بڑی مشکل سے زنجیر کو درخت سے نکالا اور اسے اسی حالت میں یہاں لے آئے۔" امدادی کارکن نے جواب دیا جبکہ پیروں میں زنجیریں پہنا شخص ہر طرف سے بے نیاز اپنے میل بھرے ناخنوں کو چبانے میں مصروف تھا۔

"اس کے گھر والے کہاں ہیں؟ ذرا ان کو تلاش کر کے مجھ سے ملواؤ۔" اس نے مخبوط الحواس شخص کی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت کی چمک کو بہ غور دیکھتے ہوئے حکم دیا تو امدادی کارکن "یس سر!" کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ ایک عورت کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

"یہ نسیمہ بی بی ہے۔ اس شخص کی بھرجائی۔" گہری سانولی رنگت والی، دبلی پتلی سی اس عورت کے ہر نقش سے غربت چھلک رہی تھی۔

"یہ شخص جس کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں، تمہارا دیور ہے؟" امدادی کارکن تعارف کی مختصر رسم ادا کر آگے نکل گیا تو اس نے عورت سے سوال کیا۔

"ہاں جی! برسوں سے میرے متھے لگا یہ پاگل میرا دیور ہی ہے۔" عورت نے بیزاری سے اعتراف کیا۔ اس کے لہجے کی بیزاری اس بے پروائی سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک ذہنی معذور انسان کو اپنے گھر کے آنگن میں لگے درخت سے بندھا چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر نکل پڑی تھی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بے پروائی سے بھی بڑھ کر شقی القلبی کا مظاہرہ کرتی ہوئی جان بوجھ کر اسے ڈوب مرنے کے لیے چھوڑ آئی ہو تاکہ ہمیشہ کے لیے جان ہی چھوٹے۔

"نام کیا ہے تمہارے دیور کا؟" عورت کی نیت کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے کے بجائے اس نے سوال کیا۔

"بشیر محمد۔" عورت نے اسی بیزاری سے جواب دیا۔

"تم نے اسے زنجیروں سے درخت کے ساتھ کیوں باندھ رکھا تھا؟" شہریار نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"تسی دیکھ ہی سکدے ہو سرکار! کہ یہ پگلا ہے۔ اب میں اکیلی جان محنت مزدوری کروں، اپنے معذور منڈے کی دیکھ بھال کروں یا اس پاگل کے پیچھے لور لور پھروں؟" اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے وہ اپنی بیزاری کو قائم نہیں رکھ سکی اور لہجے میں مظلومیت بھر کر بولی۔

"کیوں..... اس کا بھائی اور تمہارا خاوند کہاں ہے؟"

"وہ بارہ سال ہوئے مر گیا۔ سارا کیا دھرا اسی منحوس کا ہے۔ اسی کی وجہ سے میرے خاوند کی جان گئی اور بالکا معذور پیدا ہوا۔" عورت نے تلخی سے جواب دیا لیکن شہریار کی سمجھ میں اس کی بات کا سر پیر نہ آ سکا۔

"کیا مطلب؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مطبل (مطلب) کیا ہونا ہے جی..... اس کی بدعقیدگی میرے ہنستے بستے گھر کو کھا گئی۔ نہ یہ پیر سرکار کے مزار کی بے حرمتی کرتا اور نہ ہی میرا ہنستا بستا گھر اُجڑتا۔ اس کی لمبی زبان میری ساری خوشیوں کو کھا گئی۔" عورت بھی گویا بھری بیٹھی تھی۔ بشیر محمد کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی اور پھر پے در پے اسے کئی کوسنے دیتی چلی گئی۔



"نسیمہ بی بی! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے؟" شہریار کی دلچسپی پیر سرکار کا نام سن کر اس کے قصے میں مزید بڑھ گئی۔

"تفصیل کی ہونی ہے جی۔ چنگا بھلا ہنستا بستا گھر تھا میرا اور صغیر محمد کا۔ کوئی کمی تھی تو بس اولاد کی۔ ویاہ کو چھ برس گزرنے کے بعد بھی رب سوہنے نے میری گود خالی رکھی ہوئی تھی۔ صغیر محمد کی ماں اُٹھتے بیٹھتے مجھے بے اولادی کے طعنے دیتی تھی بلکہ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب اگر ایک برس ہور میری گود خالی رہی تو وہ صغیر محمد کا دُوجا ویاہ کر دے گی۔ میری پریشانی دیکھ کر ایک پڑوسن نے مشورہ دیا کہ اگر میں پیر سرکار کے مزار پر جا کر چڑھاوا چڑھاؤں اور منت مانوں تو میری گود ضرور بھر جائے گی۔ میرے پاس ہور تو کچھ نہیں تھا۔ ماں پیو نے جہیز میں سونے کے جھمکوں کی ایک جوڑی دی تھی۔ اولاد کی خاطر میں نے وہ جھمکے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صغیر محمد بھی راضی ہو گیا اور وڈے عرس والے دن ہم دونوں میاں بیوی مزار پر جا پہنچے۔ میرا یہ دیور بشیر محمد ان دنوں شہر میں رہتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا وڈا شوق تھا۔ اس چکر میں یہ شہر میں رہ کر خود ہی محنت مزدوری کر کے اپنی تعلیم (تعلیم) حاصل کر رہا تھا۔ اسی شہری تعلیم نے اس کا متھا خراب کر دیا..... عرس والے دن یہ شہر سے گاؤں پہنچ گیا اور ماں سے یہ سن کر کہ میں اور صغیر محمد چڑھاوا دینے مزار پر گئے ہوئے ہیں، خود بھی ہمارے پیچھے وہیں آ گیا اور لگا نصیحتیں کرنے۔ کہتا تھا قبروں سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا۔ جو مانگنا ہے، اللہ سے مانگو۔ میں نے اور صغیر محمد نے اسے وڈا سمجھایا کہ تو واپس گھر چلا جا اور ہمیں ہماری مرضی پر چھوڑ دے لیکن یہ نہیں مانا اور زور زور سے بولنے لگا۔ وڈی گستاخی کی اس روز اس نے پیر سرکار کی شان میں۔ انہیں جعلی پیر اور جانے کیا کیا کہنے کے ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ چودھری صاحب نے غریبوں کو لوٹنے کے لیے یہ عرس کا چکر چلایا ہوا ہے اور ان پڑھ گاؤں والوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا بتائیں جی! چودھری صاحب کو کس چیز کی کمی تھی جو وہ ہم کمی کمینوں کو لوٹتے؟ بشیر محمد کی باتیں سن کر مزار کی خدمت کرنے والے مجاوروں کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے مار پیٹ کر اسے باہر نکالا اور کہیں لے جا کر بند کر دیا۔ بعد میں چودھری صاحب نے اسے اس کی گستاخی کی یہ سزا سنائی کہ اسے گھر میں ہی برگد کے درخت سے باندھ کر رکھا جائے اور کہیں آنے جانے نہ دیا جائے۔ صغیر محمد نے چودھری صاحب کا حکم مان کر ایسا ہی کیا۔ لیکن بشیر محمد نے ہمارا جینا حرام کر دیا۔ دن بھر چیختا چلاتا رہتا۔ کبھی چودھری صاحب کو تو کبھی وڈے پیر سرکار کو گالیاں دیتا۔ اس کی باتیں سن کر میں ہولتی رہتی کہ ضرور ہم پر کوئی مصیبت پڑنے والی ہے۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے میں اسے پورا پورا دن کھانا نہیں دیتی کہ چپ چاپ پڑا رہے گا تو روٹی ملے گی ورنہ بھوکا رہنا پڑے گا۔ میری اس دھمکی کا اس پر کیا اثر ہونا تھا۔ اس کی ماں بھی چپکے سے اور کبھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے پتر کو روٹی کھلا دیتی تھی۔ میں خود پیر سرکار کی کرامت سے ویاہ کے چھ برس بعد ماں بننے والی تھی اس لیے زیادہ اپنی ساس کے منہ نہ لگتی۔ لیکن بشیر محمد کے کیے کا عذاب تو ہمارے گھر پر اُترنا ہی تھا۔ ایک رات میری ساس ایسی سوئی کہ صبح اُٹھ ہی نہیں سکی۔ اس کے مرنے کے بعد بشیر محمد کی زبان کو کچھ لگام لگی لیکن کیا فیدہ تھا جی۔ ہم تو پیر سرکار کی ناراضی کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ میرے گھر اتنا سوہنا پتر پیدا ہوا لیکن گریب (غریب) پیدائشی طور پر دونوں پیروں سے معذور تھا۔ میں وڈی تڑپی، چیخی، چلائی۔ بشیر محمد کو مارا پیٹا بھی لیکن اس سے کچھ ہونے والا تو نہیں تھا۔ آخر صبر کر کے بیٹھ گئی۔ لیکن ہم پر پڑی نحوست ختم کہاں ہوئی تھی؟ جبھی دو سال بعد صغیر محمد کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ وہ وہیں چٹ پٹ ہو گیا۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ بشیر محمد کو اپنے آنگن میں رہنے نہیں دوں گی۔ میں دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیتی لیکن چودھری صاحب کا حکم ملا کہ بشیر محمد کو اسی طرح رہنے دو۔ اس کی گستاخی کی سزا یہی ہے کہ ساری حیاتی اسی طرح کھلے

آنگن میں بندھا رہے اور گرمی سردی برداشت کرے۔ مجھے حکم ماننا پڑا۔ پچھلے پندرہ سال سے میں اس منحوس کو اپنے آنگن میں برداشت کر رہی ہوں۔ اپنا اور اپنے پُتر کا پیٹ بھرنے کے لیے کھیت میں مزدوری کرتی ہوں۔ کچھ بچ جائے تو اس نحوست کے مارے کے آگے بھی ڈال دیتی ہوں۔ کم بخت ایسا ڈھیٹ ہے کہ ساری سختیاں سہہ کر بھی جیے جا رہا ہے۔ سات آٹھ سال سے تو اس کے دماغ نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے لیکن منحوس کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ بجائے وہیں ڈوب کر مر جاتا، میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے ایک واری فیر بچ کر آ گیا ہے۔''

نسیمہ بی بی کے لہجے میں بشیر کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ شہریار نے سر گھما کر اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سے بے نیاز بشیر محمد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی افراتفری اور شور شرابے پر کان دھرے بغیر سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔

''سزا ملنے کے وقت کتنی عمر ہوگی بشیر محمد کی؟'' وہ چودھری کے ظلم کا شکار، بشیر محمد سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر نسیمہ بی بی کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس۔'' نسیمہ بی بی کے لہجے میں پھر بیزاری اُترنے لگی۔

اس کی بیزاری کی پروا کیے بغیر شہریار حساب لگانے لگا۔ سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان اپنی عمر کے پندرہ سال ایک غیر انسانی سزا بھگتنے کے بعد آج یقیناً تینتیس سال کا تھا لیکن اس نے زندگی کی جو سختیاں سہی تھیں، انہوں نے اس کی عمر کو کہیں آگے دھکیل دیا تھا اور وہ چالیس سال سے زیادہ کا ہی نظر آتا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں میں کون کون سے خواب سجے ہوں گے اور وہ پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتا ہوگا؟ لیکن اپنی حق گوئی اور بے باکی کے جرم کے باعث انسانوں کے بجائے جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن جہالت کی گود میں پلنے والی عقیدت نے اُس کی اس حالت کو بھی پیرِ سرکار کا عتاب جانا تھا۔

''میں جاؤں صاحب! اپنے پُتر کو ایک عورت کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان ہو رہا ہو گا۔'' اسے نسیمہ کی آواز نے اپنے خیالات سے چونکایا۔

''ہاں جاؤ۔'' اس نے اسے اجازت دی اور خود بشیر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے بہت سے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے علاوہ بشیر محمد کو بھی اس منجدھار سے نکالنا تھا جس میں وہ پچھلے پندرہ سال سے پھنسا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

میجر ذیشان نے اگلے روز پھر اس ہوٹل کا رخ کیا جس میں اس نے ایملی پارکر نامی ساحرہ کے ساتھ بڑا سرور انگیز وقت گزارا تھا اور اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ وہ عورت حیرت انگیز تھی۔ اس سے ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کے لیے دل تڑپتا تھا اور وہ اس کی قربت کی خواہش دل میں لیے دوبارہ اس سے ملنے پہنچا تھا۔ اس بار اس نے دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایملی سے اس کی ملاقاتیں کسی کی نظر میں آئیں۔ لیکن ہوٹل پہنچ کر اسے اس وقت شدید دھچکا لگا جب اسے معلوم ہوا کہ ایملی کل دوپہر ہی یہاں سے رخصت ہو گئی ہے۔

اسے ایملی نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سیاحوں کے کسی گروپ کے ساتھ آگے سفر کا ارادہ رکھتی ہے لیکن اس کے جو ضروری کاغذات غائب ہو گئے تھے، ان کی غیر موجودگی میں اس کا سفر کے لیے آگے چلے جانا حیرت انگیز



تھا۔ کسی غیر ملکی سیاح کے لیے دیارِ غیر میں سفر و رہائش کے اخراجات کے علاوہ اس کے شناختی کاغذات کی جو اہمیت ہوتی ہے، اس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ ان حالات میں ایملی کا بنا کسی اطلاع کے اسکردو سے روانہ ہو جانا اس کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ اس نے ہوٹل انتظامیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس گروپ کے ساتھ اور کہاں کے لیے روانہ ہوئی ہے اور جواب میں اسے یہ تعجب خیز بات معلوم ہوئی کہ ایملی کسی گروپ کے ساتھ روانہ نہیں ہوئی۔ وہ اکیلی ہی ہوٹل سے نکلی تھی اور اس نے اپنی منزل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

اُس کی اس حرکت پر حیرت کا شکار میجر ذیشان مایوسی کے عالم میں اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ گیا۔ ایملی کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے سے اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اس کی ایک بار کی قربت کے بعد آدمی کی طلب مٹ جاتی۔ وہ تو میجر ذیشان کے اندر اپنی قربت کی پیاس بھڑکا کر چلی گئی تھی۔ اس پیاس کو بجھانے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔

وہ عادی شرابی نہیں تھا لیکن کبھی کبھی شغل کے طور پر مے نوشی میں حرج بھی نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اس کی رہائش گاہ پر ہمہ وقت شراب کی ایک دو بوتلیں موجود رہتی تھیں۔ اس وقت بھی اس نے ایک بوتل کھولی اور مے نوشی شروع کر دی۔ ابھی پہلا ہی جام اس کے حلق سے نیچے اُترا تھا کہ وہ بری طرح چونکا۔ کل اس نے ہوٹل کے کمرے میں ایملی کے شباب کے ساتھ ساتھ شراب پی تھی اور اب اسے دھندلا دھندلا سا کچھ یاد آ رہا تھا۔ شراب اور شباب کے نشے میں چُور اس کی زبان سے ایملی کے سامنے کچھ ایسی باتیں نکلی تھیں جو نہیں نکلنی چاہئے تھیں بلکہ اب اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ باتیں اس کی زبان سے خود بخود نہیں نکلی تھیں، ایملی نے کرید کرید کر اس سے معلوم کی تھیں۔

وہ جام ہاتھ سے رکھ کر مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جوں جوں وہ اس معاملے پر غور کرتا جا رہا تھا، ایملی کا کردار مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ ایملی کا اس سے ملنا، اپنے ساتھ واردات کی کہانی سنانا، پھر ہوٹل میں اپنے کمرے تک لے جانا اور وہاں یک دم ہی اسے اپنے حُسن کے سحر میں جکڑ کر بے بس کر دینا..... کچھ بھی تو اب حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔

اس ساری تفصیل میں ایک ڈرامائی سا عنصر تھا جسے میجر ذیشان کے تربیت یافتہ ذہن کو بہت پہلے محسوس کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی عام مردوں کی طرح ایملی کے حُسن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس طرح پھنسنے پر خود کو بری طرح ملامت کرتا گہری تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس عورت کے جال میں پھنسا تھا، وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ ''موساد'' کی اسپیشل ایجنٹ لنڈا تھی جو بڑے بڑے ذہین مردوں کی عقل خبط کرنے میں خصوصی مہارت رکھتی تھی۔ اگر اس نے میجر ذیشان کو اُلّو بنا دیا تھا تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔ اُسے اس کام کی بھرپور تربیت دی گئی تھی کہ وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ حُسن کو کسی طرح ہتھیار بنا کر انہیں زیر کر سکتی ہے۔

حیران پریشان میجر ذیشان پر جب اپنے آپ کو بے وقوف بنائے جانے کا انکشاف ہوا تو وہ فوراً ایکٹیو ہو گیا۔ اسے خود سے چند اہم راز اُڑا کر لے جانے والی ایملی پارکر کو تلاش کرنا تھا لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں تھا۔ ایملی کو ہوٹل سے چیک آؤٹ کیے تیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور تیس گھنٹے کسی کے منظر سے غائب ہو جانے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کروائیں تو معلوم ہوا کہ ایملی نے اسکردو سے واپس جانے کے لیے ہوائی جہاز کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ دوسری صورت زمینی راستے کی.....ایک ایسی جگہ

پر جہاں مسلسل غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا لگا رہے، ایک عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس کے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ نہ تو اس عورت کے اصل نام سے واقف تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس کی کوئی تصویر وغیرہ موجود تھی۔ اس کے حکم پر اس کے ماتحت صرف حلیے کی بنیاد پر ایملی کے بارے میں تحقیقات کرتے رہے تھے۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں بالآخر انہیں اتنا تو معلوم ہو گیا کہ بیان کردہ حلیے سے کسی قدر ملتی جلتی عورت نے اسکردو سے اسلام آباد تک سڑک کے ذریعے سفر کیا تھا۔ وہاں سے آگے وہ عورت کہاں گئی تھی، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس رپورٹ نے میجر ذیشان کو پوری طرح باور کروا دیا کہ وہ بہت بڑی لغزش کا مرتکب ہو گیا ہے۔ پچھتاوے اور احساسِ ندامت سے گھرے میجر ذیشان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کو اپنی اس کوتاہی سے آگاہ کر دے۔ چنانچہ پوری رات کی شب بیداری کے بعد صبح جب وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا ہوا کرنل توحید کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

کرنل توحید کو اپنے ذہین اور محبِ وطن آفیسر کی اس کوتاہی نے شدید صدمہ تو پہنچایا لیکن وہ چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس سے ایک ایک تفصیل معلوم کرتا رہا۔ کئی سوالات کے نتیجے میں اسے یہ معلوم ہو گیا کہ میجر ذیشان نے بے شک بیشتر تفصیلات جاسوس لڑکی کو بتا دی ہیں لیکن ماہ بانو کا معاملہ کھل کر سامنے نہیں آیا۔ بہرحال، میجر ذیشان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، اس کا ذمے دار مکمل طور پر بھارت کو سمجھنا شاید ان کی ایک غلطی ہے۔ کیونکہ جو لڑکی میجر ذیشان سے ٹکرائی تھی، اس کا ایشیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی غیر ایشیائی لڑکی کا بھارتی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کرنا اگرچہ ناممکن تو نہیں تھا لیکن اس پورے معاملے میں کچھ ایسا تھا جو کرنل توحید کی چھٹی حس کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ بات ان کے روایتی دشمن بھارت سے کہیں آگے کی ہے۔ وہ گہری فکر میں ڈوب گیا اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

⊛----✪----⊛

ملک کے تین بڑے شہروں میں پے در پے قیامت ٹوٹی تھی۔

پہلا واقعہ کراچی میں پیش آیا تھا۔ وہ کسی نیم سیاسی مذہبی جماعت کا سالانہ اجلاس تھا۔ جماعت کا دعویٰ تھا کہ ان کا مقصد محض اسلام کی سربلندی، تبلیغ و ترویج ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ جماعت ایک سیاسی جماعت کو درونِ خانہ ٹھیک ٹھاک سپورٹ کرتی تھی۔ مذہبی جماعتوں سے وابستہ، اس کے نظریات و عقائد سے متاثر لوگ اپنے ووٹ عموماً اسی سیاسی جماعت کے نمائندوں کو دینا پسند کرتے تھے۔ جواب میں لازمی ہے کہ سیاسی جماعت کی طرف سے بھی کافی کچھ کیا جاتا تھا۔ یوں مل جُل کر دونوں کا کاروبار چل رہا تھا۔ مذہبی جماعت نے اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا تو اپنی حمایتی سیاسی جماعت کی مدد سے انہیں من پسند جلسہ گاہ بھی میسر آ گئی اور جلسے کے شرکاء کو شہر کے مختلف حصوں سے لانے لے جانے کے لیے گاڑیوں کے علاوہ دیگر انتظامات بھی بہترین طریقے سے انجام پا گئے۔ جلسے کا باقاعدہ آغاز تو نمازِ مغرب کے بعد ہونا تھا لیکن لوگوں کو سہ پہر تین بجے سے وہاں جمع کیا جانے لگا۔ عصر تک جلسہ گاہ کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی بڑی تعداد میں جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ اسٹیج پر بھی بڑی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ملک کے کئی بڑے نعت خواں اس موقع پر مدعو کیے گئے تھے جو وقفے وقفے سے اسٹیج پر آ کر نعتیں پڑھ رہے تھے۔ ان کی خوب صورت آوازوں پر جھومتے شرکائے جلسہ جب وقتاً فوقتاً بلند کیے جانے والے نعروں کا جواب دیتے تو فضا



گونج اُٹھتی۔

ایک جوش اور سرور کا عالم تھا جس میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے اور انہیں اپنا کئی گھنٹے قبل جلسہ گاہ میں جمع کیا جانا بھی کوفت زدہ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ وہ عورتیں جن کی گود میں چھوٹے بچے تھے اور ماؤں کو پریشان کر رہے تھے، تھوڑی سی جھنجلاہٹ کا شکار تھیں۔ پہلے پہل وہ روتے پریشان کرتے بچوں کو مختلف ترکیبوں سے بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتیں۔ اگر بچہ بہل جاتا تو ٹھیک ورنہ آخر میں اس کا انجام یہ ہوتا کہ ماں سے دو چار دھموکے کھا کر تھوڑی دیر ریں ریں کرتا، پھر ہار مان کر یا تو چپکا بیٹھ جاتا یا ماں کی گود میں ہی دبک کر سو جاتا۔ بچے کو قابو میں کر لینے والی ماں ایک بار پھر اطمینان اور پوری عقیدت کے ساتھ نعت کے ساتھ جھومنے لگتی۔

مغرب سے ذرا قبل جماعت کے اکابرین نے جلسہ گاہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ ان کی آمد کے بعد تو جلسہ گاہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ لوگوں کے جوش و عقیدت میں کئی گنا اضافہ نظر آنے لگا۔ جلسہ گاہ مذہبی نعروں کے ساتھ ساتھ استقبالی نعروں سے بھی گونج اُٹھی۔ مغرب کی اذان شروع ہوئی تو یہ شور ذرا تھما اور اعلان کیا گیا کہ نماز کے بعد امیرِ جماعت حاضرینِ جلسہ سے خطاب فرمائیں گے۔ نماز کے لیے صفیں ترتیب دی جانے لگیں۔ اسلامی بھائی چارے اور مساوات کا پرچار کرتے رہنے کے باوجود اکابرینِ جماعت کی صفیں اوپر اسٹیج پر بنیں اور عوام کے حصے میں وہی مٹی سے اٹی دریاں آئیں جہاں وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے براجمان تھے۔

صف بندی کے بعد ابھی امام نے ''اللہ اکبر'' کہنے کے لیے ہاتھ بلند ہی کیے تھے کہ کان پھاڑ دھماکوں کی آوازوں سے فضا لرز اُٹھی۔ ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ایسی افراتفری اور ہاہا کار مچی کہ کسی کو کوئی ہوش نہیں رہا۔ خون اور انسانی اعضاء سے پٹ جانے والی جلسہ گاہ میں ایسی بھاگ دوڑ مچی کہ لوگ پیروں تلے بھی آ کر کچلے گئے۔ پولیس اور امدادی کارکنوں کے حرکت میں آنے تک بہت بڑی تعداد میں انسانی زندگیاں دم توڑ چکی تھیں اور کئی لوگ طبی امداد کے لیے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی دہشت گردی نہیں تھی۔ جلسہ گاہ میں چند سیکنڈوں کے وقفے سے تین دھماکے ہوئے تھے اور ان دھماکوں میں عوام کے ساتھ ساتھ جماعت کے اکابرین میں سے بھی کئی افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ان اکابرین کی موت نے شہر بھر میں قیامت برپا کر دی۔ مذہبی جماعت کی حمایتی سیاسی جماعت بھی میدان میں اُتر آئی۔ ایک طرف انتظامیہ کی ناقص کارکردگی اور سکیورٹی کے خراب انتظام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا تو دوسری طرف شہر بھر میں جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ احتجاجی مظاہرے کر کے دہشت گردوں کو پکڑنے اور سزا دیئے جانے کے مطالبات کیے جانے لگے۔ جلسہ گاہ میں جو قیامت برپا ہوئی تھی، سو ہوئی تھی، اس کے بعد بھی کئی دن تک شہر جلتا رہا۔ لوگ مرتے رہے اور بے پناہ معاشی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے مذاکرات، دعوؤں اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے ہفتے بھر میں کراچی میں کاروبارِ زندگی معمول پر لایا ہی گیا تھا کہ لاہور میں ایک دوسری قیامت کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک ایسا وقت تھا جب شہر کے بیچوں بیچ واقع ریلوے ٹریک پر سے بہ یک وقت دو ٹرینوں کو گزرنا تھا۔ ٹرینوں کا اس ٹریک پر سے گزرنا معمول کی بات تھی۔ جس وقت ٹرین کو اس مقام سے گزرنا ہوتا، دونوں طرف سے پھاٹک بند کر کے ٹریفک کو روک دیا جاتا۔ مصروف شاہراہ پر ٹریفک کی روانی کچھ دیر کے لیے منقطع ہو جاتی اور پھر ٹرین کے گزر جانے کے بعد ایک بار پھر ٹریفک رواں دواں ہو جاتا۔ اس روز جانے کیا ہوا کہ ٹرینوں کے گزرنے کے وقت پھاٹک بند نہیں کیا گیا اسپیڈ میں آتی کئی گاڑیاں ٹرینوں کی آمد سے بے خبر ریلوے ٹریک کو کراس کر کے آگے کی طرف گامزن ہونے کے لیے آگے بڑھیں تو دونوں طرف سے آتی ٹرینوں کی زد میں آ

گئیں۔ موقع پر ایک قیامت سی مچ گئی۔ گاڑیوں کے مسافر تو تیز رفتار ٹرینوں کی زد میں آ کر اپنی گاڑیوں سمیت جو قیمہ بنے سو بنے، ٹرینوں میں سفر کرنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک ٹرین کی کئی بوگیاں ٹریک سے اُتر گئیں جبکہ دوسری ٹرین کے ڈبے ایک دوسرے کے اندر اس بری طرح دھنسے کہ اندر موجود افراد پس کر رہ گئے اور موقع پر وہی معمول کی افراتفری مچ گئی۔ پولیس موبائلز اور ایمبولینسوں کے سائرن، نیوز چینلز کے نمائندوں کی بھاگ دوڑ، سیاسی و سماجی لیڈروں کے مذمتی بیانات، موقع پرستوں کا مردہ و زخمی افراد کے مال و اسباب کو لوٹنا..... یہ سب ہو چکا تو سوال اٹھا کہ آخر مقررہ وقت پر ریلوے پھاٹک کیوں بند نہیں کیا گیا تھا؟ سرکاری اہلکار اس سوال کے جواب میں گول مول بیانات دیتے رہے۔ لیکن بہرحال تحقیق کرنے والے بہت سے حقائق سے واقف ہو چکے تھے۔

انکوائری کے نتیجے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ریلوے پھاٹک کھولنے اور بند کرنے کے ذمے دار شخص کو قتل کر دیا گیا تھا چنانچہ وہ شخص اس قابل ہی نہیں تھا کہ اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتا۔ ریلوے کے اس ملازم کی موت نے ثابت کر دیا کہ جو حادثہ پیش آیا، وہ محض حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی سازش تھی جس کا شکار ہو کر کئی لوگ لقمۂ اجل بن گئے اور کئی کے نصیب میں عمر بھر کی معذوری لکھ دی گئی۔ تحقیقات کا دائرہ مزید وسیع کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ صرف گاڑیوں کے ٹرینوں سے تصادم کی سازش کا تانا بانا نہیں بُنا گیا تھا بلکہ ٹریک پر ایک ٹائم بم بھی نصب کیا گیا تھا۔ بم بہت زیادہ طاقتور نہیں تھا لیکن بہرحال ایسا ضرور تھا کہ اس نے ریل کی پٹریوں کو اُکھاڑ ڈالا تھا۔ یہ بم ٹھیک اس وقت پھٹا تھا جب ٹرینیں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ یعنی سازش تیار کرنے والوں نے پورا انتظام کیا تھا کہ اگر گاڑیوں اور ٹرینوں کا آپس میں تصادم نہ بھی ہو تو وسیع پیمانے پر تباہی پھیل سکے۔

تحقیقات کرنے والے خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے اگرچہ میڈیا کو حقائق کی بھنک نہیں پڑنے دی لیکن خود ان کی کارروائیاں جاری رہیں اور وہ اس دہشت گردی میں ملوث ہاتھوں تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ اس جدوجہد نے انہیں قبائلی علاقوں تک پہنچا دیا۔ کچھ ایسے نام سامنے آئے جو اسمگلرز کی حیثیت سے پہلے ہی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر خفیہ ادارے ہمیشہ انہیں طرح دیتے رہے تھے۔ ان افراد کے بارے میں قبائلی علاقوں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ پڑوسی ملک سے سامانِ آرائش اشیائے خورونوش، کپڑا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اسمگل کرتے ہیں۔ خفیہ اداروں کے پاس رپورٹ تھی کہ وہ ان اشیاء کی آڑ میں اسلحہ اور منشیات جیسی اشیاء بھی اسمگل کر رہے ہیں لیکن انہوں نے ان اسمگلرز پر ہاتھ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔

اب جو سانحۂ کراچی اور لاہور کی تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ پڑوسی ملک سے دھماکا خیز مواد انہی اسمگلرز کے ذریعے پاکستان پہنچایا گیا تھا۔ اس مرحلے پر یقیناً خفیہ ایجنسیوں کو ان کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہئے تھا اور ملک کی جڑیں کاٹنے والے ان غداروں کی گرفتاری عمل میں آنی چاہئے تھی۔ لیکن وہ اسمگلرز ایجنسیوں کے افراد سے چند قدم آگے ہی تھے۔ وہ اپنی گردن گرفت میں آنے سے قبل ہی بیرونِ ملک فرار ہو چکے تھے۔ چنانچہ حکومتی خفیہ اداروں کے بس میں فقط مایوسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ ہاں، اس بھاگ دوڑ سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ تحقیقی افسران کے ہاتھوں یہ خبر لگ گئی کہ دہشت گردی کا تیسرا واقعہ اسلام آباد میں پیش آنے کا امکان ہے اور اس مقصد کے لیے کچھ دہشت گرد دھماکا خیز مواد کے ساتھ اسلام آباد کی حدود میں داخل بھی ہو گئے ہیں۔



ہر طرف سکیورٹی ہائی الرٹ کر دی گئی۔ تمام سرکاری عمارتوں، مساجد اور تعلیمی اداروں کی سخت نگرانی کی جانے لگی۔ دہشت گردوں کی تلاش میں کئی جگہ چھاپے بھی مارے گئے لیکن وہ تو گویا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھوم رہے تھے کہ کسی کی پکڑ میں نہیں آ سکے۔ پھر انہوں نے جو کارروائی کی، وہ بھی توقع کے خلاف تھی۔ چنانچہ سارے حفاظتی انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دہشت گردوں نے اس بار اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل کو نشانہ بنایا تھا۔ ہوٹل میں دھماکا ہوا اور کئی منزلہ عمارت کو شدید نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ کئی انسانی جانیں بھی زد میں آ گئیں۔ مرنے والوں میں مقامی افراد کے ساتھ کئی غیر ملکی بھی شامل تھے۔ چنانچہ حکومتِ پاکستان کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

اُن کی اس پریشانی اور شرمندگی کے برعکس کہیں کچھ لوگ بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنا ہر ٹارگٹ بہت کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے خوش ہونا ان کا حق تھا۔ ان خوش ہونے والوں میں ''را'' کا اعلیٰ عہدے دار نارائن بھی شامل تھا جسے اسلام آباد ہوٹل کے بم دھماکے کے ٹھیک اگلے دن لنڈا کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ پیغام کے الفاظ تھے۔

''کامیابی مبارک۔ تمہاری کارکردگی نے ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے کا کام کیا ہے۔ تم نے ہمیں خوش کیا۔ جلد ہی تمہیں بھی خوش کر دیا جائے گا۔''

اس پیغام نے نارائن کی باچھیں پھیلا دیں۔ ملکی مفادات کے ساتھ ساتھ اسے انعام میں لنڈا کی ہوش ربا قربت بھی تو میسر آنے والی تھی۔ اس نوید کو سن کر وہ خوش نہ ہوتا، یہ کیسے ممکن تھا؟

⊛----✪----⊛

''ہیلو اے سی صاحب!'' وہ اپنے سامنے رکھی ایک رپورٹ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک جانی پہچانی پُرجوش آواز کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ڈاکٹر ماریہ تر و تازہ چہرہ لیے اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر عورت بھی موجود تھی۔ اس عورت نے لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں مفلر نما دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا۔

''ان سے ملیے، یہ میری ممی ہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ساتھ موجود خاتون کا تعارف کروایا۔

''اوہ..... ہیلو مسز جوزف! ڈاکٹر ماریہ سے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ ملنے کی خواہش بھی تھی لیکن بس اتفاق ہے کہ میں موقع ہی نہیں نکال سکا آپ سے ملاقات کے لئے۔'' شہریار نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ جس سیٹ پر کام کر رہے ہیں، اس کی مصروفیت ہی ایسی ہیں کہ بندہ چاہ کر بھی وقت نہیں نکال پاتا۔'' جواباً مسز جوزف نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک شان دار عورت تھی جس کے بولنے کا نپا تلا انداز اور چہرے پر موجود وقار ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی ساری زندگی مہذب ماحول میں گزری ہے۔ شہریار کو یاد تھا کہ ڈاکٹر ماریہ نے اسے اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بات بھی بتائی تھی کہ وہ ایک ملازمت پیشہ عورت تھی جس نے خود اپنی محنت سے اپنی اکلوتی بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم دلوائی تھی۔

''آپ لوگ تشریف تو رکھیں۔'' شہریار کو خیال آیا کہ وہ دونوں ابھی تک کھڑی ہوئی ہیں تو وہ اپنے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ اس وقت پیر آباد میں موجود تھا اور ایک ٹینٹ میں قائم کردہ عارضی دفتر میں بیٹھا متاثرین کے لیے کی جانے والی امدادی کارروائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہونے والی

طوفانی بارش نے پیر آباد سمیت اور بھی دیہاتوں کو متاثر کیا تھا لیکن نہر کا پانی گاؤں میں داخل ہو جانے کی وجہ سے پیر آباد میں نقصان نسبتاً زیادہ ہوا تھا۔ آج کل وہ ان متاثرین کی بحالی کے سلسلے میں بری طرح مصروف تھا اور باقی معاملات کی طرف سے اس کی توجہ فی الحال ہٹی ہوئی تھی۔ کبھی وہ ایک گاؤں میں ہوتا تو کبھی دوسرے گاؤں میں۔ اب بھی اسے پیر آباد پہنچے آدھے گھنٹے سے کچھ اوپر ہی وقت گزرا ہوگا۔ ڈاکٹر ماریہ اور مسز جوزف کو یقیناً اس کی یہاں آمد کی اطلاع مل گئی تھی چنانچہ وہ دونوں اس سے ملنے چلی آئی تھیں۔

''بارشوں نے اچھی خاصی تباہی مچادی ہے۔ بے چارے غریب لوگ بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ایک طرف ان کے گھر بار اور کھیت زد میں آئے ہیں تو دوسری طرف صحت کے مسائل بھی کھڑے ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بچے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ بچوں میں پیٹ اور جلد کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ مرکزِ صحت میں علاج کے لیے لائے جانے والے زیادہ تر مریض انہی دو تکالیف کی شکایت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اسٹاک میں موجود دواؤں کی بھی قلت ہونے لگی ہے۔'' اس کی پیشکش پر وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر ماریہ نے حالیہ تباہ کاری پر تبصرہ شروع کر دیا۔

''مجھے دواؤں کے سلسلے میں اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے۔ آج شام تک آپ تک ساری ضروری دوائیں پہنچ جائیں گی۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔

''تھینک یو اے سی صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طرف سے ایسے کسی کام میں تاخیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کے پاس آنے کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو میں ممی کے اصرار پر انہیں آپ سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔ ممی آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے مسز جوزف کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں اسکول کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں جو کچھ پیش آیا، وہ بہت افسوس ناک تھا۔ قیمتی انسانی جانوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ پہلے اسکول کے روحِ رواں ماسٹر آفتاب غائب ہوئے اور اب ان کے ساتھی بھی نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ فی الحال موجودہ مصیبت سے نمٹ رہے ہیں۔ اسکول کے سلسلے میں نئے سرے سے انتظامات کرنے میں تو آپ کو کافی وقت لگ جائے گا۔'' مسز جوزف نے بولنا شروع کیا تو شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی دردناک اموات ایسی نہیں تھیں جنہیں بھلایا جا سکتا۔ اور اس سے بڑھ کر افسوس کا مقام یہ تھا کہ ابھی تک ان کی ناحق اموات کے لیے کسی ظالم پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا۔ وہ دوسری طرف مصروف ہو گیا تھا تو گویا معاملہ دب ہی گیا تھا۔ حالانکہ اس نے قتل کی جو ایف آئی آر درج کروائی تھی، اس میں واضح طور پر چودھری پر شک ظاہر کیا تھا۔

''میں آج کل یہاں رہ کر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے فارغ بیٹھنے کی عادی نہیں رہی اس لیے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ ماریہ کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹا دوں۔ لیکن ظاہر ہے، میرا میڈیکل کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں اس لیے میں اس کے لیے زیادہ کارآمد بھی نہیں ہوں۔ اپنی اس بے کاری کی زندگی سے اُکتا کر میں کوئی حل ڈھونڈ رہی تھی تو کل بیٹھے بیٹھے مجھے اسکول کا خیال آ گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گاؤں کے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دوں؟ اس طرح مجھے بھی ایک اچھی مصروفیت مل جائے گی اور بچوں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔'' مسز جوزف کے الفاظ گویا اس کے لیے خوشی کا پیام تھے۔ وہ کھِل اُٹھا۔



''تھینک یو مسز جوزف!..... تھینک یو ویری مچ۔ موجودہ حالات میں آپ کا یہ تعاون میرے لیے بہت بڑا ن ہوگا۔ میں خود اس سلسلے میں پریشان تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ اسکول کے لیے نئے اسٹاف کا تقرر کرنا خاصا مرحلہ ثابت ہوگا۔ سابقہ اساتذہ کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد کوئی دوسرا ٹیچر رکار خ کرتے ہوئے گھبرائے گا۔ موجودہ حالات میں آپ کی یہ پیشکش بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں آپ ں آفر کے لیے تہ دل سے مشکور ہوں۔'' وہ واقعی بہت خوش تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اسکول کی عمارت کو نا ہوا نظر آ رہا تھا، مسز جوزف کی پیشکش اندھیرے میں اُمید کا دِیا بن گئی تھی۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں اے سی صاحب! ہم بے شک آپ کے ہم مذہب نہیں لیکن ہم وطن تو ہیں۔ ں اس مٹی سے محبت کرتے ہیں اور اس کا قرض اپنی جان پر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر مجھے اس قرض کو ادا نے کا ایک موقع مل رہا ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں؟'' مسز جوزف نے ٹھہرے ہوئے لہجے نا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے..... میں اپنے آدمیوں سے کہتا ہوں کہ اسکول کی عمارت کو دیکھ لیں اور اس لائق بنا لہ بچے وہاں بیٹھ سکیں۔ دیگر سہولیات بھی آہستہ آہستہ فراہم کر دی جائیں گی۔ آپ بتائیں، آپ کب سے روع کرنا پسند کریں گی؟'' مسز جوزف کے جذبے سے متاثر شہریار کے لہجے میں بڑا جوش تھا۔

''میں تو ابھی سے کام شروع کرنے کو تیار ہوں لیکن یقیناً عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں۔'' مسز جوزف نے ں دیا۔

''آپ مجھے آج اور کل کا دن دے دیں۔ پرسوں آپ کو آپ کا اسکول تیار ملے گا۔'' اس نے انہیں یقین کروائی۔

''ٹھیک ہے۔ تو پرسوں صبح میں اسکول پہنچ جاؤں گی۔ اب آپ ہمیں اجازت دیں۔ ماریہ کو بھی اپنے ں دیکھنے ہوں گے۔'' مسز جوزف نے کہا اور پھر وہ دونوں الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے وہاں سے ت ہو گئیں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد شہریار نے سامنے میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

''چودھری افتخار شاہ کے خلاف منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے الزام میں ایک ایف آئی آر کروائی گئی تھی ایس پی صاحب! آپ نے اس سلسلے میں کیا ایکشن لیا؟'' کال ریسیو ہونے پر مطلوبہ شخص ئن پر آتے ہی اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''اس سلسلے میں تو کوئی ایکشن لینے کا موقع ہی نہیں ملا سر! موسم کی خراب صورتِ حال نے ہی ساری گڑبڑ ں۔ آپ بھی مصروف ہو گئے۔ آپ کی سپورٹ کے بغیر تو ہم چودھری کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتے وہ بھی اس صورت میں کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ موجود نہیں۔'' ایس پی نے گویا اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ ایس پی برا آدمی نہیں تھا لیکن بہرحال اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اپنے ں پر ذمے داری لیتے ہوئے چودھری کے خلاف ایکشن لینے کی جسارت کر سکتا۔

''کتنے افسوس کا مقام ہے ایس پی صاحب! کہ جس قانون کو مظلوموں کا سہارا بننا چاہئے تھا، اس قانون افظ ایک ظالم کی بیخ کنی کے لیے خود سہاروں کی تلاش کریں۔ یہاں کچھ لوگ ناحق مارے گئے اور آپ نی جرأت نہیں کہ آپ قاتل کے خلاف قانونی کارروائی کر سکیں؟'' اس نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں پی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''میں مجبور ہوں سر! میرے شانے اتنے طاقتور نہیں کہ اتنا بھاری بوجھ اٹھا سکیں۔ میں عمر کے اس حصے بھی گزر چکا ہوں جب آدمی جذبات میں آ کر کچھ بھی دیکھے بغیر خود کو ہیرو ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی قدم لیتا ہے۔ لیکن ابھی آپ میری بات نہیں سمجھیں گے۔ ابھی آپ بیچلر ہیں۔ کوئی بھی جرأت مندی دکھاتے آپ کو اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں ستا سکتا۔ لیکن ہم جیسوں کو خیال آتا ہے، ہمارے کسی قدم کا ہماری فیملی اثر پڑ سکتا ہے۔'' ایس پی کے لہجے میں کچھ جھنجلاہٹ اور بے بسی تھی۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو پولیس فورس چھوڑ دینی چاہئے۔'' وہ ایس پی کا جواب سن کر شدید مایوس تھا اس لیے جلے دل سے مشورہ دیا۔

''میں اگر آپ کے مشورے پر عمل کر بھی لوں تو اس سے محکمے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری جگہ جو شخص آئے گا۔ وہ بھی یا تو میری طرح مجبور ہوگا یا پھر کوئی ایسا عقل مند جو اس جنگ میں آپ کے ساتھ کھڑا ڈراوے اور دھمکیاں سننے کے بجائے چودھری کی صف میں کھڑا ہونا پسند کرے گا۔''

''کیا بات ہے ایس پی صاحب! کیا آپ کو چودھری کی طرف سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟'' اس جواب نے شہریار کو چونکایا۔

''جس دن ہم نے ماسٹر آفتاب کی تلاش میں چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کیا تھا، اس کے دوسرے دن یہ صورتِ حال ہے۔ میری بیٹی سکول جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو اس کا گھر سے اسکول کے گیٹ تعاقب کیا جاتا ہے۔ آج بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ گیا تو وہاں اسے دو تین افراد ہراساں کرنے کی کوشش کی اور اس سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو زیادہ قانون کا محافظ نہ بنے۔ جو لوگ قانون توڑنا جانتے ہیں، ان کے لیے قانون کے محافظوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دینا مشکل نہیں ہے۔ اب آپ بتائیں، ان حالات میں، میں پریشان نہ ہوں اور گھبراؤں نہ تو پھر کیا کروں؟ جو لوگ میرے بچوں کا تعاقب کر سکتے ہیں، انہیں دھمکیاں دے سکتے ہیں، وہ کل کو انہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو کوئی نقصان پہنچنا تو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں تو میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں آپ کے مشورے کے مطابق پولیس فورس چھوڑ دوں اور اپنے روزگار کے سلسلے میں کوئی اور بندوبست کرنے کی کوشش کروں۔''

ایس پی کے الفاظ سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ بے چارہ واقعی خوف زدہ ہے اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چودھری افتخار جیسے غنڈہ گیری کرنے والے وڈیرے اور جاگیردار واقعی اتنے خطرناک ہوتے ہیں ان کے لیے پورے پورے خاندانوں کو اجاڑ ڈالنا ذرا مشکل نہیں ہوتا۔ موجودہ ایس پی تو پھر بہرحال شریف آدمی تھا لیکن سابقہ ایس پی معظم تارڑ جیسا آدمی جو عرصہ دراز تک چودھری کا ہم نوالہ و ہم پیالہ رہا تو بھی اس کے مقابل ٹکنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنے تیسرے ساتھی فاریسٹ آفیسر باجوہ کا دیکھا تھا۔ چودھری نے صرف اس وجہ سے کہ باجوہ اس کے لیے کارآمد نہیں رہا تھا اور جنگل سے لکڑی کھالوں کی چوری کے سلسلے میں اس کی گردن جکڑی جا چکی تھی، دوستی کا لحاظ کیے بغیر بڑی خاموشی سے باجوہ قتل کروا دیا تھا کہ نہ باجوہ رہے، نہ پولیس اس کی زبان سے چودھری کے خلاف کچھ اگلوا سکے۔

ایس پی رفیق تارڑ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سوچا وہ خود بھی کسی وقت چودھری کی زد میں آ سکتا چنانچہ اس نے عقل مندی سے کام لیا اور وزیراعلیٰ سے اپنی رشتے داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تربیتی کورس بہانے بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر نکل گیا۔ اس طرح ایک طرف اس کی ملازمت برقرار رہی تو دوسری



طرف وہ چودھری کا شکار بننے سے بھی بچ گیا۔ موجودہ ایس پی بھی خود کو اور اپنی فیملی کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انسانی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ یہ سوچے بغیر کہ موت کا ایک مخصوص وقت معین ہے اور اس معین وقت تک موت، زندگی کی حفاظت کرتی ہے، خود زندگی کی حفاظت سے ہلکان رہتا ہے۔ وہ اللہ کو زبان سے ربّ العالمین تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس کے اختیارات کو اتنا محدود سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت جیسے معاملات بھی اپنے جیسے انسانوں کے ہاتھ میں تصور کرنے لگتا ہے۔ عقیدے کی یہ خرابی اور ایمان کی کمزوری اسے زندگی کے ہر شعبے میں کمزور اور ناکام بنا دیتی ہے۔

ایس پی کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ کرپٹ آدمی نہیں تھا لیکن وہ ایسا ایمان والا بھی نہیں تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی قدرت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ شہریار نے ایس پی سے فی الحال مزید بات کرنا بے کار سمجھتے ہوئے خاموشی سے لائن کاٹ دی۔ اس کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ وہ جو جنگ لڑ رہا تھا، اس میں اس کا ساتھ دینے والی سپاہ کم حوصلہ اور بزدل تھی اور ان کی یہ بزدلی ظالم کے حوصلے اور بھی بلند کر دیتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ایک بار پھر اس رپورٹ کا جائزہ لینے لگا جسے ڈاکٹر ماریہ اور اس کی ممی کی آمد سے قبل دیکھ رہا تھا۔ ٹینٹ میں کچھ دوسرے افراد بھی مصروفِ عمل تھے لیکن کوئی بھی اس سے غیر ضروری طور پر مخاطب ہونے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ ٹینٹ کے سامنے کے حصے میں اس کا ڈرائیور کم باڈی گارڈ مستعد کھڑا ہوا تھا۔ عبدالمنان اس کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے ذمے اس نے نور پور کا دورہ کر کے وہاں حالیہ بارشوں کے بعد ہونے والی تباہ کاری کا جائزہ لینے اور ضروری اقدامات اٹھانے کا کام لگایا تھا۔

''اس رپورٹ کی حد تک تو آپ لوگوں کی کارکردگی خاصی تسلی بخش ہے۔ صحیح اندازہ فیلڈ میں جا کر ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہاں بھی مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔'' رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد اس نے وہاں بطور انچارج کام کرنے والے شخص سے کہا۔

''آپ اطمینان رکھیں سر! ہماری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' اس شخص نے پُراعتماد لہجے میں اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے دعوے پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور ٹینٹ سے باہر کا رخ کیا۔ اسے باہر کی طرف آتا دیکھ کر پہلے ہی سے مستعد کھڑا ڈرائیور اور بھی ہوشیار ہو گیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا تاکہ اس کے لیے پچھلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھول سکے۔ شہریار بھی اردگرد سے بے نیاز گاڑی ہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یک دم ہی کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے زبردست چرچراہٹ کے ساتھ ایک لینڈ کروزر اس کے قریب رُکی۔ اس نے نظر اٹھا کر لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ حسبِ توقع اس میں چودھری اپنے چیلوں کے ساتھ سوار تھا۔

''واہ جی واہ!..... ساڈے پنڈ کی تو قسمت ہی جاگ گئی ہے۔ اے سی صاحب آج کل اِدھر زیادہ ہی نظر آ رہے ہیں۔'' وہ شاید چودھری کو نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن چودھری بولتا ہوا اپنی گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔

''کمال ہے چودھری صاحب! آپ اس تباہی و بربادی کو قسمت کا جاگنا کہتے ہیں؟ میں تو یہاں اس لیے چلا آتا ہوں کہ غریب گاؤں والوں کی بے آرامی اور بھوک کا خیال مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔'' اس نے تلخی سے چودھری کی بات کا جواب دیا۔

''نقصان تو ہمارا بھی بڑا ہوا ہے لیکن آپ نے ہمارے نقصان کا حساب کتاب پوچھنے کے لیے کبھی ہماری طرف آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے فوراً شکوہ کیا۔

''آپ اپنا نقصان پورا کرنا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ البتہ حساب کتاب

واقعی مجھے آپ سے کرنا ہے اور اس کے لیے میں پہلی فرصت میں آپ کی طرف آؤں گا۔'' وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔ جواب میں چودھری نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں جی، سنا ہے آپ نے ماسٹر منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے الزام میں مجھے مجرم نامزد کیا ہے۔ آپ سے ایسی حماقت کی اُمید نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں واضح تمسخر تھا۔

''میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا ہے۔ مرنے سے پہلے منیب نے مجھے مدد کے لیے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کے مکان کو آپ کے گرگوں نے گھیر رکھا ہے۔ میرے موبائل فون پر مرنے سے قبل منیب کی طرف سے آنے والی کال آپ کے خلاف ایک اہم ثبوت ہے۔ آپ اتنی آسانی سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔'' اس کے اور چودھری کے درمیان جو دشمنی کا رشتہ تھا، اب اس پر کسی مصلحت کا پردہ ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی چنانچہ وہ بہت کھل کر دوبدو اس سے بات کر رہا تھا۔

''ایسے ثبوت عدالت میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کا بیان میرے اوپر ایک الزام سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ بلکہ ہوسکتا ہے جواباً میں آپ پر یہ الزام عائد کردوں کہ پچھلے دنوں میرے ڈیرے پر جو حملہ ہوا، اس میں آپ ملوث تھے اور آپ ہی کے اشارے پر اس موقع پر پولیس نے حرکت میں آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے شاطرانہ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ اپنی ساری چالیں دیکھیں لیکن یاد رکھیے گا کہ یومِ حساب زیادہ دُور نہیں ہے۔ اپنے ہر ظلم اور زیادتی کا آپ کو بالآخر نتیجہ بھگتنا ہی پڑے گا۔''

اس بار وہ اپنی بات کہنے کے بعد مزید وہاں رُکا نہیں اور اپنی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر پچھلی نشست پر براجمان ہوگیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیڈول کے مطابق اپنے سارے کام نمٹاتے ہوئے بھی اس کا ذہن چودھری کی باتوں میں اُلجھا رہا۔ چودھری نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کہ منیب کی آخری فون کال اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔

وہ قتل کے اس مقدمے میں چودھری کو گھسیٹ کر عدالتی کارروائیوں میں تو اُلجھا سکتا تھا لیکن اسے مجرم ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ چودھری اور اس کے گرگے قتل کے اس الزام سے صاف بچ نکلتے جبکہ ان مظلوم اساتذہ کا خون اس سے پکار پکار کر یہی مطالبہ کر رہا تھا کہ ان کے خونِ ناحق کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ غم و غصے کی شدید کیفیت میں مبتلا جب وہ سارے دن کا تھکا ہارا واپس اپنے دفتر پہنچا تو انتقامی جذبات سے پوری طرح مغلوب تھا۔ اپنے اندر بھڑکتے اس آتش فشاں کو سرد کرنے کے لیے یک دم ہی ایک نام اس کے ذہن کی اسکرین پر جھلملایا۔

''جگو!''

اس نام کے ذہن میں آتے ہی اس کے اندر جیسے سکون سا اُتر آیا اور انگلیاں بے تابی سے جگو کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

جگو ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور اس جماعت کے مفاد کے لیے ہر وہ کام کرتا تھا جسے کوئی غنڈہ کر سکتا تھا۔ اس کی حیثیت کسی سڑک چھاپ غنڈے کی نہیں تھی۔ نہ وہ ہر ایک کے ہاتھوں پکنے والا تھا۔ لیکن جب سے شہریار نے اس کے بیمار بیٹے کو بے یارومددگار دیکھ کر اپنی گاڑی میں ہسپتال پہنچایا تھا اور اس کی زندگی بچانے کا ذریعہ بنا تھا، جگو اس کا بے دام غلام بن گیا۔ اس نے شہریار کو پیشکش کی تھی کہ وہ جب چاہے، اس کو کسی کام کے لیے حکم دے سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر آفتاب کو چودھری کی قید سے چھڑا کر وہ اپنی وفاداری ثابت بھی



کر چکا تھا۔ اب ایک بار پھر اس کے دعوے کو آزمانے کا موقع آ گیا تھا اور شہریار کو یقین تھا کہ جگو اسے مایوس نہیں کرے گا۔

⊛----✪----⊛

''ہیلو.....!''

ناریل کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ اردگرد چلتی پھرتی لڑکیوں کو آپس میں خوش گپیاں کرتے دیکھنے میں مصروف تھی کہ اپنے قریب سے اُبھرنے والی اس آواز پر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ دُبلی پتلی سی ایک خوش شکل لڑکی تھی جو ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس سے مخاطب تھی۔ ماہ بانو نے بھی اپنے چہرے پر جوابی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

''میرا نام راحیلہ ہے۔ میں تمہاری کلاس فیلو ہوں۔ کئی دنوں سے تمہیں اپنی کلاس میں نئے اضافے کی صورت دیکھ رہی ہوں۔ سلام دعا کی نوبت اس لیے نہیں آسکی کہ میں اپنی اسٹڈیز کے مقابلے میں اچھی خاصی کریزی ہوں اور اس سے ہٹ کر مشکل سے ہی کہیں وقت خرچ کر پاتی ہوں۔ اصل میں ڈاکٹر بننا میرا جنون ہے اور میں ذرا بھی وقت ضائع کر کے یہ رِسک لینے کو تیار نہیں ہوتی کہ میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے میرٹ بنانے سے محروم رہ جاؤں۔ لیکن تم میں کچھ خاص بات ہے۔ دل خود بخود ہی تم سے بات کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ چنانچہ ابھی جو فری پیریڈ ملا تو میں نے سوچا کہ کچھ دیر تم سے گپ شپ کر لی جائے۔ ویسے تم بھی مجھے اپنے قبیلے ہی کی فرد لگتی ہو۔ تمہیں بھی میں نے ہر وقت کتابوں میں سر گھسائے رکھنے کے سوا اِدھر اُدھر کہیں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔ اگر میرا تمہارے بارے میں اندازہ درست ہے تو ہم یقیناً اچھے دوست بن سکتے ہیں۔''

راحیلہ نام کی وہ لڑکی نان اسٹاپ بولتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ چکی تھی۔ ماہ بانو کو اس دوران سوائے مسکرانے کے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ویسے وہ راحیلہ سے واقف تھی۔ اپنی اس کلاس فیلو کو اس نے کلاس میں بھی بہت ایکٹیو دیکھا تھا۔ لیکچرز کے دوران کوئی نہ کوئی سوال اٹھاتے رہنے اور ٹیچرز کے پوچھے گئے سوالوں کے نہایت اعتماد سے درست جوابات دینے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کلاس میں بہت نمایاں رہتی تھی۔ اس کی یہ خود اعتمادی اور ٹیچرز کا اس سے مشفقانہ سلوک گواہی دیتا تھا کہ وہ ایک ذہین طالبہ ہے۔

''اسی طرح بیٹھی مسکراتی رہو گی یا اپنا تعارف بھی کرواؤ گی؟'' راحیلہ کو اپنے بے تحاشا بولنے کا تو یقیناً احساس نہیں تھا لیکن ماہ بانو کی خاموشی اس نے محسوس کر لی تھی چنانچہ اپنے بے ساختہ انداز میں اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

''میرا نام مہرین ہے۔ پنجاب سے مائیگریٹ ہو کر یہاں آئی ہوں۔ تمہاری طرح مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا بہت شوق ہے۔ اب دیکھو، یہ شوق پورا ہوتا ہے یا نہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے لیے شہریار کے تجویز کردہ نئے نام سے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بندے کے اندر اپنے ارادے پورے کرنے کا دم ہونا چاہیے۔ پھر اس کی کوئی خواہش ادھوری نہیں رہتی۔ یہ میں نہیں میرے بڑے بھائی صاحب فرماتے ہیں اور درست ہی فرماتے ہیں۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی انہیں ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بچپن میں ہی ٹھان لیا تھا کہ ڈاکٹر بننا ہے اور اپنا یہ شوق پورا کر کے رہے۔ حالانکہ ہمارے والد کی بہت معمولی سی جاب تھی اور میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن بھائی نے اسکالرشپس لے لے کر اس مشکل کو آسان کر دیا۔ آج کل

وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال میں جاب کر رہے ہیں۔ مزید تعلیم کے لیے ان کا امریکہ جانے کا ارادہ ہے، فی الحال حالات اس بات کی اجازت نہیں دے رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ عرصہ حالات بھائی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے اور وہ جلد ہی اپنی خواہش کے مطابق امریکہ میں ہوں گے۔'' راحیلہ بہت مان اور فخر سے اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''واقعی تمہارے بھائی تو بہت باہمت انسان ہیں۔ ان کے بارے میں سن کر مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟'' راحیلہ کی زبانی اس کے بھائی کے بارے میں سن کر اس نے تبصرہ کرتے ہوئے یونہی اس کا نام بھی پوچھ ڈالا۔

''طارق..... ڈاکٹر طارق نام ہے میرے بھائی کا۔'' راحیلہ نے اسے بتایا پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''آؤ ہماری دوستی ہونے کی خوشی میں چل کر چنوں کی چاٹ کھاتے ہیں۔''

ماہ بانو خاموشی سے اس باتونی لڑکی کے سنگ چل پڑی۔ لیکن پھر اس کا رخ کالج کے گیٹ کی طرف دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ اس طرف کیوں جا رہی ہو؟ کینٹین تو پیچھے کی طرف ہے نا؟'' اس نے راحیلہ کو ٹوکا۔

''ارے کینٹین کی بدمزہ چاٹ کون کھائے گا؟ ہم تو گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے ریڑھی والے سے چاٹ لیں گے۔ سچ بہت مزے کی چاٹ بناتا ہے وہ۔'' راحیلہ نے یوں چٹخارا لیا جیسے چاٹ سے بھری پلیٹ اس کے سامنے رکھی ہو۔ ماہ بانو اس کے انداز پر مسکرا دی اور اس کے ساتھ ہی چوکیدار سے ذرا سی بحث و تکرار کے بعد کالج سے باہر نکل آئی۔ یہاں گیٹ کے بالکل سامنے تین چار ریڑھی والے کھڑے تھے۔

راحیلہ اسے لیے ایک ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔ ماہ بانو بہت دنوں بعد زندگی کا یہ رنگ دیکھ رہی تھی اس لیے اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کے ان لمحات میں وہ اپنے سارے مسائل اور دکھ وقتی طور پر فراموش کر بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ کالج کی حدود کے باہر احتیاط کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چہرے کو نقاب سے ڈھانپ لینے کا معمول اختیار کر چکی ہے۔ اس وقت وہ اس معمول کے خلاف کھلے چہرے کے ساتھ بے فکری سے کھڑی راحیلہ کو ریڑھی والے کو نمک، مرچ اور کھٹائی کے تناسب کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''اللہ کے نام پر دے دے بے بی! تیرے لیے چاند سے دولہا کی دعا کروں گی۔'' ایک دم ہی اس کے عقب سے بھونڈی آواز میں یہ صدا لگائی گئی اور ساتھ ہی تالی کی مخصوص آواز بھی سنائی دی۔ وہ بے ساختہ ہی پیچھے کی طرف گھومی اور بھڑکیلے لباس اور شوخ میک اپ والے ایک خواجہ سرا کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر لرز سی گئی۔ اسے لگا کہ اس کی قسمت کے گرداب نے ایک بار پھر اسے گھیر لیا ہے اور وہ ان آزاد فضاؤں سے ایک بار پھر کسی قید خانے میں پہنچائی جانے والی ہے۔

''ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے لڑکی! کیا پہلے کبھی کوئی خسرہ نہیں دیکھا؟'' اُس کی اسی گم صم کیفیت پر وہ مانگنے والا یا والی برا مان کر پوچھنے لگا لیکن اُس کی ایسی حالت ہو گئی کہ جواب دینے کے لائق بھی نہیں رہی۔

''کیا ہو گیا مہرین! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ چلو اندر چلتے ہیں۔'' راحیلہ جو اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی، اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر فکر مندی سے پوچھنے لگی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں چھولوں کی چاٹ کھانے کے لیے کالج سے باہر نکلی تھیں۔

''آؤ اندر چلیں۔ تمہاری طبیعت تو مجھے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' ماہ بانو کی طرف سے کوئی جواب نہ



راحیلہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور چھولوں کو بھول کر کالج کے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ ماہ بانو نے گیٹ سے داخل ہونے سے پہلے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ خواجہ سرا اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔ اس کے لیے ماہ کا ردِعمل یقیناً انوکھا تھا لیکن یہ تو ماہ بانو ہی سمجھتی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کی حالت غیر کیوں ہو گئی۔ اس کے نے اسے اپنے ماضی کا ایک تلخ تجربہ یاد دلا دیا تھا۔ بے شک وہ غریب ان میں سے نہیں تھا جن سے اس ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا صرف حلیہ ان جیسا تھا، چہرہ بالکل مختلف تھا۔ کردار بھی یقیناً مختلف ہو لیکن اس خواجہ سرا سے ہونے والے سامنے نے اس سے کچھ دیر قبل محسوس ہونے والا آزادی کا احساس ن لیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد دلا دیا تھا کہ اس کی جان کے ساتھ کیسے جھمیلے اور مسائل چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ کیسے پر گزرنے والا وہ وقت بھول سکتی تھی جب وہ چودھری کے پنجوں سے نکل بھاگنے کے چکر میں ان لوگوں کے ہان جا پھنسی تھی۔ وہ تو ان دنوں سیٹھ موتی والا کے ڈرائیور سرمد کے دوست عامر کے گھر پناہ گزین تھی جب ہ سراؤں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر وہ وہاں سے سیٹھ سندر رام نامی ایک تاجر کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ ں اس نے اپنی نظروں کے سامنے دُلہن بنی ایک کم سن لڑکی کو دیوی کے قدموں میں قربان ہوتے دیکھا۔ کچھ صے بعد اسے نگار کی مدد سے خواجہ سراؤں کے چنگل سے نجات ملی اور وہ ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر تک پہنچی ں پر انکشاف ہوا کہ اس نے جس لڑکی کو سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں مرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ سجاد ا کی اکلوتی بیٹی اور شہریار کی بھتیجی شینا تھی۔ پولیس قاتلوں کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی البتہ بعد کی تحقیقات سے رور معلوم ہو گیا تھا کہ سندر رام پاکستان میں رہ کر حقیقت میں ''را'' کے مددگار کے طور پر کام کر رہا تھا اور یہ د خواجہ سرا بھی اسی سیٹ اپ کا ایک حصہ تھے۔ جاسوسی کے اس نیٹ ورک کے دو اہم مہروں میں سے سندر م تو مر گیا تھا جبکہ مہا گرو غائب تھا۔ اس کی تلاش کے لیے بعد میں کیا اقدامات اٹھائے گئے، ماہ بانو کو اس کا نہیں تھا۔

ماہ بانو کو شہریار نے تحفظ کے خیال سے مشاہرم خان کے گاؤں کاندے منتقل کر دیا تھا لیکن وہاں بھی وہ الات کے گرداب سے بچ نہیں سکی اور اس گرداب میں ڈوبتی اُبھرتی اب کراچی آ پہنچی تھی۔ کراچی کے اس الج میں ایک عام طالبہ کی طرح دوبارہ اپنی پڑھائی کا آغاز کرنے کے بعد اسے لگا کہ اب وہ ایک نارمل زندگی طرف آ گئی ہے لیکن کالج کے باہر ایک خواجہ سرا سے ہونے والے ٹکراؤ نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کے یے زندگی کا نارمل ہو جانا اتنا آسان نہیں۔ اس نے زندگی کے جو پُرخطر رُخ دیکھے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً اسے یاد آ کر لاتے رہیں گے۔ آج بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا مہرین؟..... اگر طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو میں پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔ وہ لہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوا دیں گی۔'' اسے ایک بینچ پر بٹھانے کے بعد اس کی پسینے سے تر ٹھنڈی ہتھیلیوں کو ہلاتے ہوئے راحیلہ نے اس سے دریافت کیا۔

''نن..... نہیں، رہنے دو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے راحیلہ کو واب دیا۔

''تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا؟ میں نے تو بس یہ دیکھا کہ تم اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھی و۔ کیا تم اس سے ڈر گئی تھیں؟'' راحیلہ نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں یار! بس پتہ نہیں کیا بات ہے۔ میں بچپن ہی سے ان خواجہ سراؤں سے بہت ڈرتی ہوں۔ شروع سے میرا یہ حال ہے کہ جہاں کسی خواجہ سرا کو قریب سے دیکھا، وہیں میری جان نکلنے لگی۔ ابھی بھی وہ اچانک

سر پر آ کر کھڑا ہوا تو میں ڈر گئی۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے راحیلہ کی تسلی کے لیے بہانہ بنایا۔

''بہت بے وقوف لڑکی ہو تم۔ ساری دنیا جن سے لطف اندوز ہوتی ہے، تم نے دل میں ان کا خوف پال رکھا ہے۔ ارے یہ بے چارے تو خود دنیا سے ڈرتے ہیں۔ کبھی لڑکوں کو دیکھا ہے کہ کیسے ان سے چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ اکثر تو بے چاروں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ اور تم ہو کہ اس قدر بے ضرر مخلوق سے ڈرتی ہو۔'' راحیلہ اسے پیار سے ڈپٹنے اور سمجھانے لگی۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی کہ جواب میں اسے وہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور جو اس نے سہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''یہ لیجیے جناب چائے۔'' کشور نے بھاپ اُڑاتی چائے کی پیالی میز پر لا کر رکھی تو آفتاب لکھنے کا سلسلہ موقوف کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گزشتہ ایام کے مقابلے میں کافی نکھری ہوئی اور پُرسکون لگ رہی تھی۔ ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ انہیں کسی گھر کی چار دیواری کا تحفظ میسر آ گیا تھا۔ اسلام آباد میں مقیم بابر کی خالہ کا یہ گھر ان کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ بابر کی خالہ نے بھانجے کے بنا کسی حیل و حجت کے انہیں اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی اور آج کل وہ ان کے گھر کی بالائی منزل پر واقع اس کمرے میں مقیم تھے۔

''بڑی زیادتی ہوئی آپ کے ساتھ..... کہاں تو حویلی میں ہر وقت حکم بجا لانے والی ملازمائیں آپ کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں اور کہاں آپ کو یہ معمولی معمولی کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینے پڑ رہے ہیں۔'' اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

''ایسا مت سوچیں۔ ملازماؤں کے اس جھرمٹ اور آسائشوں کے ڈھیر میں مجھے اپنے دل کی کوئی خوشی میسر نہیں تھی۔ وہ تو کسی قید خانے میں مقید قیدی کی سی زندگی تھی جسے تین وقت کا کھانا اپنی کال کوٹھری میں فراہم کر دیا جاتا تھا۔ قیمتی ساز و سامان اور ملازماؤں کی فوج کے درمیان رہنے سے کسی کا خوش قسمت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ خوش قسمت وہ ہوتا ہے جو خوشی کو محسوس کر سکے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں کچن میں آپ کے لیے چائے بنا رہی تھی تو میرا دل ایسی خوشی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ اللہ کی مجھ پر مہربانی ہی تو ہے کہ اس نے میری ویران زندگی میں خوشی کے رنگ برنگے پھول کھلا دیے۔ خوشی کے یہ دن تھوڑے بھی ہوئے تو میں کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کروں گی۔ اب اگر موت بھی آ جائے تو میں اس اطمینان کے ساتھ مر جاؤں گی کہ مرتے ہوئے میں آپ کے قریب تھی۔'' وہ بہت جذب کے ساتھ اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار کر رہی تھی۔

''مرنے کی باتیں نہ کریں میری جان! ابھی تو ہم نے ساتھ جینے کا آغاز کیا ہے۔ ہمیں بہت دور تک ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے اور اس زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا ہے جو اللہ کی مہربانی سے آپ کے وجود میں سانس لے رہی ہے۔ ابھی ہم پر ذرا مشکل وقت ہے لیکن اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی ضرور آئیں گے جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں اپنے بچوں کو بھاگتا دوڑتا دیکھیں گے اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو گی۔''

آفتاب نے اس کا ہاتھ ہونٹوں کے قریب لے جا کر نرمی سے اس کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے ایک خواب اس کی آنکھوں کو سونپا۔

''سچ کہیں آفتاب! کیا سچ مچ وہ دن ہماری زندگی میں آئیں گے؟ جب ہمارا اپنا ایک گھر ہو گا اور اس گھر کا



آنگن ہمارے بچوں کی ہنسی سے مہکے گا؟..... اگر ایسا ہوا تو زندگی کتنی خوب صورت ہو جائے گی نا..... بالکل ایسا لگے گا جیسے آسمان سے ہمارے لیے رنگوں کی برسات ہو رہی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہی آفتاب کے سینے سے لگی اور آنکھیں موند کر گویا تصور میں اس منظر کو دیکھنے لگی۔

''بالکل ایسا ہی ہو گا۔ پھر ہم خود بچے بن کر اپنے بچوں کے ساتھ ان رنگوں سے کھیلیں گے۔ ویسے آپ کے خیال میں ہمارے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟'' وہ اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا ہوا شرارت سے پوچھنے لگا۔

اُس کے اس شرارت بھرے سوال پر کشور نے محجوب سی ہو کر اپنا چہرہ کچھ اور بھی اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اب آفتاب اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کے سامنے کشور کا سیاہ بالوں والا سر تھا۔ ان بالوں سے اُٹھتی شیمپو کی مہک اس کی سانسوں سے ٹکرا کر کچھ اور بھی اسے دیوانہ کرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کشور کا سر تھامتے ہوئے اس کا اپنے سینے میں چھپا چہرہ نظروں کے سامنے کیا اور پھر بے تحاشا اسے چومنے لگا۔ کشور کے گلابی ہونٹ، فراخ پیشانی، خم دار ٹھوڑی، چمکتے رخسار، بڑی بڑی آنکھیں سب بوسوں کی اس برسات میں بھیگتی چلی گئیں۔ محبت کے اس بے تحاشا اظہار پر وہ شدتِ جذبات سے اس بری طرح کانپنے لگی جیسے بہت دیر تک برسات کے ٹھنڈے پانی میں نہائی ہو۔

''اتنا مت چاہیں کہ پھر یہ دل زندہ رہنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائے اور جب میرے باپ کے نمک خور میری موت کا پیغام لے کر پہنچیں تو میرے لیے جان دینا مشکل ہو جائے۔'' کپکپاتے لبوں سے یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کئی موتی پھسل پڑے۔

''پھر وہی مرنے کی باتیں..... میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ مرنے کی بات مت کریں۔ ہمیں ایک لمبے عرصے تک جینا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جینا ہے۔'' آفتاب نے اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چنتے ہوئے خفگی سے ٹوکا تو وہ سنبھل گئی۔

''سوری آفتاب! بس حالات ہی ایسے ہیں کہ میں بار بار مایوسی کا شکار ہو جاتی ہوں لیکن اب میں ایسی باتیں نہیں کروں گی۔'' اس کے مضبوط مردانہ ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے وعدہ کیا پھر چونک کر بولی۔ ''باتوں باتوں میں آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ میں ابھی دوسری گرم چائے لے کر آتی ہوں۔''

''یہ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ ہم لکھنے والوں کے لیے گرم چائے کی پیالی ایندھن کا کام دیتی ہے۔ اس کے بغیر لگتا ہے کہ دماغ کی گاڑی ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں تو یوں بھی بہت دنوں بعد کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوں۔ خیالات کو یکجا کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔ پیچھے کے حالات کا بھی کچھ علم نہیں۔ میں نے بابر سے کہا تھا کہ مجھے مقامی اخبارات بھجوا دے تاکہ گاؤں کے حالات کا کچھ علم ہو سکے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اسکول کی ہے۔ تمہارے ابا جی پہلے ہی اسکول کے دشمن ہیں، اب جو کچھ پیش آیا ہے اس کے بعد تو ان کا سارا غصہ نزلہ اسکول پر ہی گرے گا۔ وہ کوشش کریں گے کہ کسی طرح اسکول بند کروا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ یوں بھی کبھی کبھی میں گلٹی فیل کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ذاتی خوشی کی خاطر اتنے بہت سے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے کرتے یک دم ہی رنجیدہ ہو گیا۔

پیر آباد کا وہ چھوٹا سا اسکول اس کی برسوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اب کہیں جا کر تو وہ وقت آیا تھا کہ اسے اپنی محنت کا صلہ ملتا نظر آنے لگا تھا لیکن حالات نے یک دم ہی کروٹ لی تھی۔ کشور کی محبت میں مبتلا ہو جانا، اس سے خفیہ نکاح، ملاقاتیں اور پھر کشور کے امید سے ہونے کی خبر سننے کے بعد اسے حویلی کے عتاب سے بچا

کے لیے گاؤں سے فرار کروانا..... یہ سب وہ واقعات تھے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ لیکن کشور کی تند و تیز محبت نے کچھ اس طرح اسے گھیرا کہ پھر وہ حالات کے دھارے پر بہتا ہی چلا گیا اور اب ر چیز سے الگ تھلگ یہاں اسلام آباد میں بیٹھا حالات کے سازگار ہونے کا منتظر تھا۔

''سوری آفتاب! میری وجہ سے آپ اپنے مشن سے الگ ہو گئے۔ میری جذباتیت نے آپ کی ساری نت و جدوجہد برباد کر کے رکھ دی۔ کاش! میں اپنے جذبات پر قابو رکھتی اور آپ کو اپنی محبت میں مبتلا ہونے پر بور کرنے کے بجائے حویلی کی دیواروں کے درمیان ہی گھٹ گھٹ کر مر جاتی تو یہ سب نہ ہوتا۔'' اس کی جیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بھی دکھی ہو گئی اور حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگی۔

''فضول باتیں مت سوچیں۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا تھا، ہم اسے کسی صورت ٹال نہیں سکتے تھے۔ میں صرف اس لیے اُداس ہو گیا تھا کہ میری اس پروجیکٹ کے ساتھ برسوں کی منت جڑی تھی۔ میرا مقصد آپ پر ام لگانا یا آپ کو شرمندگی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ آئندہ کبھی خود کو قصوروار جان کر اُداس ہونے یا ٹینشن لینے کی ونی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی جو حالت ہے، اس میں ٹینشن لینا ویسے ہی مناسب نہیں۔ بچے پر اس کا برا اثر لکتا ہے۔ اور یہ بچہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ آپ کو اس نشانی کی بہت حفاظت کرنی ہے۔ کچھ سمجھیں یا یں؟'' وہ فوراً اپنا موڈ بدل کر کشور کو بہلانے لگا اور آخر میں اس کی ناک کی پھنک کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی ے درمیان پکڑ کر ہلاتے ہوئے پیار سے استفسار کیا۔ جواب میں کشور نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

''اب جائیے اور گرم چائے لے آیئے۔ میں بھی اپنا کام مکمل کرتا ہوں۔'' آفتاب ایک بار پھر اپنے ا منے رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کشور ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کی پیالی لے کر کمرے سے نکل ئی۔ نیچے کچن میں بابر کی خالہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

''خالہ! آفتاب نے بابر بھائی سے کچھ اخبارات منگوائے تھے۔ وہ کوریئر سے بھجوائیں گے۔ آپ ذرا یال رکھئے گا۔'' خالی چولہے پر چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے اس نے خالہ سے کہا۔

''بابر کا بھیجا ہوا پارسل تو صبح گیارہ بجے ہی مل گیا تھا۔ میں نے صفائی والی ماسی سے کہا تھا کہ اوپر پہنچا ے۔ شاید وہ سمجھی ہو گی کہ بدر کے کمرے میں پہنچانا ہے اس لیے وہاں رکھ آئی ہو گی۔ تم وہاں دیکھ لینا۔'' خالہ نے جواباً کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی یہ چائے لے کر اوپر جاؤں گی تو دیکھ لوں گی۔'' اس نے اُبلتے ہوئے پانی میں پتی لتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھو لڑکی! یہ اوپر نیچے کے چکر ذرا کم کیا کرو۔ اس حالت میں بار بار سیڑھیاں چڑھنا اُترنا تمہارے ے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے بزرگوں والی اپنائیت سے اسے ٹوکا تو وہ برا ماننے کے بجائے کرانے لگی۔ زندگی میں کوئی تو ایسا میسر آیا تھا جو بڑے ہونے کے ناتے اسے مشورے اور ہدایات دے سکے۔

''ہنسو مت۔ تم آج کل کی لڑکیاں بزرگوں کی باتوں کو مذاق سمجھتی ہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنے تجربے کی نی میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ کا غلط مطلب لیتے ہوئے انہوں نے ذرا سا انتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

''ایسی کوئی بات نہیں خالہ! میں بھلا کیسے آپ کی بات کو مذاق میں اُڑا سکتی ہوں؟ مجھے تو خود کسی بزرگ مشوروں کی ضرورت ہے۔'' کشور نے جلدی سے انہیں صفائی دی پھر مزید وضاحت پیش کرتے ہوئے ۔ ''اصل میں ابھی آفتاب کو آرام کی ضرورت ہے۔ ان کا پیر اس حد تک ٹھیک نہیں ہو سکا کہ وہ سیڑھیاں



ھ اُتر سکیں اس لیے مجھے ہی انہیں اوپر سب کچھ لے جا کر دینا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ بات تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن تم بار بار چکر لگانے کے بجائے کوشش کیا کرو کہ ایک اتھ ہی ضرورت کی ساری چیزیں اوپر لے جاؤ۔ دوپہر تک تو ماسی یہیں ہوتی ہے۔ اس وقت اس سے کام لے ا کرو۔ یہ چائے وائے بھی گھڑی گھڑی بنا کر اوپر لے جانے کے بجائے ایک وقت میں تھرماس میں بھر کر لے اؤ تا کہ تمہارے یہ اوپر نیچے کے چکر کم ہوں۔ یہ پہلا پہلا معاملہ ہے، احتیاط بہت ضروری ہے۔'' وہ اسے ایتیں دیتی رہیں اور کشور ان کے خلوص کو محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ اسے وہ خاتون یوں لی شروع سے پسند آئی تھیں۔ انہیں بابر نے ان دونوں کے بارے میں جو بتایا تھا، انہوں نے اسی پر اکتفا کر لیا ا اور بار بار کے سوالات یا غیر ضروری تجسس سے انہیں پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر کے اندر بھی ان ونوں کو پوری آزادی میسر تھی اور وہ پُرتکلف مہمانوں کے بجائے گھر کے افراد کی طرح وہاں رہ رہے تھے۔ البتہ آفتاب نے اخراجات کی مد میں ایک مناسب رقم ضرور بہ اصرار ان کے حوالے کی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے رصے انہیں یہاں قیام کرنا پڑے گا۔ اور وہ طویل عرصے تک مہمان بن کر ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ خالہ نے شروع میں انکار کیا لیکن پھر آفتاب کا موقف سمجھتے ہوئے رقم قبول کر لی۔ اس طرح وہ دونوں خود کو بہت یادہ زیر بار نہ کرتے ہوئے آرام سے وہاں رہ رہے تھے۔

خالہ کی ہدایت پر فوری طور پر عمل کرتے ہوئے کشور نے تیار شدہ چائے تھرماس میں بھری اور بھرے وئے تھرماس کے ساتھ ایک ڈھلی ہوئی خالی پیالی لے کر اوپر پہنچ گئی۔ آفتاب پورے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے انہماک کو توڑنے کے بجائے اس نے چائے کا بھرا تھرماس اور پیالی اس کے قریب رکھی ور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس کا رخ خالہ کے اکلوتے بیٹے بدر کے کمرے کی طرف تھا۔ بدر گھر سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ بلا جھجک اس کے کمرے میں چلی گئی۔ سامنے ہی اسے ایک تپائی پر رکھا پارسل نظر آ گیا۔ پارسل آفتاب کے نام ہی تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی آفتاب پارسل کھول کر اس میں موجود اخبارات کا ائزہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ اس نے خود وہ پارسل کھول لیا۔ اسے بھی حالات کے متعلق تجسس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ں کا باپ اس کے غائب ہونے کے بعد آرام سے تو ہرگز نہیں بیٹھا ہو گا۔ اسے تلاش کرتے رہنے کے سوا اس نے اپنے غیظ و غضب میں کوئی نہ کوئی انتقامی کارروائی تو ضرور کی ہو گی۔

اسی فکر اور تجسس کے ساتھ وہ اخبارات کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اخبار ں چھپنے والی ماسٹر منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کی خبر ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ خبر میں ر چہ واقعے کو نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈالا گیا تھا لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ نامعلوم افراد کون ہیں۔ وہ اس کے باپ کے چیلوں کے سوا بھلا کون ہو سکتے تھے؟ وہ اس خبر کو پڑھ کر دیر تک گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ طوفانی بارشوں سے ہونے والی تباہ کاریوں کی خبریں بھی اخبار میں شائع ہوئی تھیں بلکہ یہ خبریں آگے ی تاریخوں کے اخبارات میں بھی چھپتی رہی تھیں۔ جبکہ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے متعلق دوبارہ کوئی بر نہیں آئی تھی۔ لیکن کشور کو سب سے زیادہ اسی ایک خبر نے متاثر کیا تھا۔ قدرتی آفت کا شکار ہونے والوں پر ز صبر کیا جا سکتا تھا لیکن منیب اور اس کے ساتھوں کے قتل کی وجہ تو وہ اور آفتاب ہی بنے تھے۔ وہ بے چارے بے قصور لوگ صرف ان کی وجہ سے زیر عتاب آئے تھے، یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں تھی۔

وہ جو بدر کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھی، سر تھام کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ اسے علوم تھا کہ اس سے زیادہ آفتاب کے لیے یہ خبر صدمے کا باعث بنے گی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تو اس نے اپنے

عزیز دوست افضل کی جدائی کا غم سہا تھا، اب وہ منیب جیسے ساتھی کے بچھڑ جانے کی اندوہناک خبر سنتا تو اس
کیا گزرتی۔ پریشانی کی اس شدید کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اند
داخل ہوا۔

''آپ نے کیسے ہمارے کمرے کو رونق بخش دی؟'' اپنے بہت قریب سے اسے یہ جملہ سنائی دیا تو،
چونک کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے بدر سرخ آنکھیں لیے کھڑا تھا اور اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''سوری! میں بغیر اجازت کے آپ کے کمرے میں آ گئی۔ اصل میں ملازمہ غلطی سے اخبارات کا یہ بنڈل
یہاں رکھ گئی تھی۔ میں یہی لینے آئی تھی۔ پھر یہیں بیٹھ کر پڑھنے لگی۔'' وہ جلدی جلدی وضاحت دیتے ہوئے
اخبارات سمیٹنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ جب تک چاہیں یہاں بیٹھیں بلکہ چاہیں تو لیٹ جائیں۔'' بد
نے اس کے دونوں شانے تھامتے ہوئے اسے واپس بٹھانے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے اُٹھتا بُو کا بھبکا کشو
کے نتھنے سے ٹکرایا۔ اس بُو اور بدر کی حرکات وسکنات نے اسے احساس دلایا کہ وہ نشے میں ہے۔ نشے میں
مست آدمی ہوش وحواس سے کس قدر بیگانہ ہوتا ہے اور اخلاق کی حد سے کتنا نیچے گر سکتا ہے، کشور کو اندازہ تھا۔
وہ بدر کو ایک زوردار دھکا دیتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ پیچھے اس کا بے ہنگم قہقہہ سنائی دیا۔ کشور کمرے سے باہر
نکل کر دیوار سے پیٹھ ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بدر کے رویّے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ جس گھر کو
پناہ گاہ سمجھ رہی تھی، وہ اتنا بھی محفوظ نہیں ہے۔ گرداب میں گھری اس کی زندگی کی کشتی کو ابھی کچھ اور طوفانوں
سے نمٹنا ہے۔

⊛----✪----⊛

''کیسے خشک اور کھردرے ہاتھ ہیں تیرے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بدن کو جوتے سے رگڑ رہا ہے۔'' صرف
ایک جانگیا جسم پر چڑھائے بالا اوندھے منہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور شکل سے ہی مظلوم نظر آنے والی بیوی اس کی
فرمائش پر اس کے جسم کی تیل سے مالش کر رہی تھی۔ عورت کی بڑی بڑی آنکھیں اور کھڑی ناک سے ظاہر ہو رہا
تھا کہ وہ ماضی میں کبھی خوش شکل رہی ہوگی لیکن اب آنکھوں میں بسی ویرانی، رخساروں کی اُبھری ہڈیوں اور جلد
کی مٹیالی پڑتی رنگت نے اسے قطعی بے رونق و بے کشش بنا ڈالا تھا۔ بالے کے اعتراض پر اس نے کوئی ردِعمل
ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے اس کے سانڈ جیسے بدن کا مساج کرتی رہی۔

''وہ بھی کیا عورتیں ہوتی ہیں جن کے ہاتھ جسم کو چھوئیں تو لگتا ہے مکھن ملائی سے گُندھی کوئی چیز جسم کو سہلا
رہی ہے۔ ایسی پیاری شکلوں والی، میٹھی میٹھی گلاں (باتیں) کرتی عورتیں..... کہ بندہ صرف ان کے پاس بیٹھے
تو آدھی تھکن اُتر جائے۔ اور یہاں ایسی منحوس شکل دیکھنے کو ملتی ہے کہ چنگا بھلا بندہ بھی بے کار میں غصے میں آ
جاتا ہے۔ نہ صورت دیکھ کر چین پڑے، نہ گل سننے کو جی چاہے اور نہ چھو کر سواد آئے۔'' بازارِ حسن کی سستی
طوائفوں کی تعریفوں میں رطب اللسان وہ مسلسل بیوی کو کچوکے لگا رہا تھا اور اس اللہ کی بندی میں اتنی جرأت
نہیں تھی کہ اسے وہ وقت یاد دلا سکے جب وہ کسی مہکتے گلاب کی سی لیے بالے کے آنگن میں اُتری تھی۔

شادی کے وقت اس کے حُسن کا پورے گاؤں میں چرچا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ شہزادی ہے جسے کوئی شہزادہ
ہی بیاہ کر لے جائے گا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ بالے کی اس پر نظر پڑ گئی اور پھر کس کی جرأت تھی کہ اس کی طرف
سے بھیجے گئے پیام کے لیے انکار کر سکے۔ یوں وہ جو شہزادی کہلاتی تھی، ایک دیو کی قید میں آ پھنسی۔ بالے کی



ند سالہ رفاقت نے اس کی ساری تازگی اور شادابی کو نچوڑ ڈالا۔ وہ بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھنے والا ایک
یوان صفت آدمی تھا جس کی وحشت بھری قربت نے بیوی کو تین عدد بچوں کا تحفہ تو ضرور دیا لیکن اس کے من
ے اندر کوئی پھول نہ کھل سکا۔ بالے کا وجود اس کے لیے ایک ایسا ناپسندیدہ بوجھ تھا جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی
ھانے پر مجبور تھی اور مجبوری کا یہ سودا اس سے اس کا سارا حُسن چھین کر لے گیا تھا۔

''ذرا یہ پیر تو داب۔ دن بھر بھاگ دوڑ کر کر کے ٹانگیں اکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ کسی کھوتے کی طرح چودھری
ی خدمت کرو، تب کہیں جا کر وہ جیب ڈھیلی کرتا ہے لیکن تم لوگوں کو کیا لوڑ؟..... تم تو آرام نال حلق تک
والے ٹھونس کر مستاتی ہو۔ اور اس پر یہ حال ہے کہ ہاتھ پیروں میں دم ہی نہیں۔ سالی ایسے مرے مرے ہاتھوں
سے پیر داب رہی ہے جیسے ہفتے بھر سے فاقے پر ہو۔'' اس نے اپنے حکم پر مساج چھوڑ کر پیر دبانے کا کام شروع
کر دینے والی بیوی کو بے نقط سنائیں۔ یہ سب سناتے ہوئے اسے قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ بیوی کو جن حلق بھر کر
کھائے جانے والے لقموں کے طعنے دے رہا ہے، وہ لقمے مشکل سے ہی اس بے چاری کے حلق سے نیچے اُتر
پاتے تھے۔ وہ گھر جس میں اس کے لیے نہ تو عزت تھی، نہ پیار کے دو بول..... وہاں رہ کر کچھ کھایا پیا اس کے
بدن کو لگتا بھی تو کیسے؟ وہ تو اس آگ میں ہی جل جل کر پگھلتی رہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کا حق طوائفوں پر لٹاتا آتا
ہے۔ رہی سہی کسر پے در پے پیدا ہونے والے تین بچوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ بچے بھی اپنے باپ کی طرح
اس کی جان سے چمٹی جونک کی طرح تھے۔ اس پر بالے کی بوڑھی ماں بھی کم نہیں تھی۔ بہو کو ہر وقت طعنوں سے
چھلنی کرنا اور کبھی کبھی موقع دیکھ کر دو چار ہاتھ جڑ دینا وہ ساس ہونے کے ناتے اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔

''ہوا'' جانے کیوں میری آنکھوں پر کیسے پٹی بندھ گئی تھی جو میں تجھ سے بیاہ کے لیے دیوانہ ہو گیا تھا۔ اب
سوچتا ہوں تو پچھتاتا ہوں۔ میرے لیے بھلا کیا کمی تھی؟..... پنڈ کی جس کڑی پر ہاتھ رکھ دیتا، وہ میری ہو
جاتی۔'' اسے بیوی کی خاموشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے جو جی میں آ رہا تھا، وہ سناتا جا رہا تھا کیونکہ جانتا
تھا کہ یہ بے زبان لونڈی اس کی کسی بھی بات سے اختلاف کی جرأت نہیں کرے گی۔ واقعی وہ چپ رہی لیکن
دوسرے پلنگ پر سویا اس کا سب سے چھوٹا بیٹا حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ عورت میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ
شوہر کی خدمت گزاری سے کچھ دیر کے لیے منہ موڑ کر بچے کو دیکھ لے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اس کے پیر
دباتی رہی۔

''پہلے اسے دیکھ۔ پتہ نہیں مردود کو کہاں درد اُٹھا ہے۔ ایک تو ماں میں کوئی گُن نہیں، اوپر سے اولاد بھی
ایسی پیدا کی ہے جو کچھ دیر چین نہیں لینے دیتی۔'' اس نے پیر دباتی بیوی کے پہلو میں ایک لات رسید کرتے
ہوئے بیزاری سے اسے حکم دیا۔ وہ چپ چاپ اُٹھی اور دوسرے پلنگ پر سوئے بچے کو جا کر چیک کیا۔ بچے نے
پیشاب کر دیا تھا اور اسی وجہ سے بے چین ہو کر رو رہا تھا۔ اس نے اس کے کپڑے تبدیل کروائے اور پھر اسے
دودھ پلانے لگی۔ ماں کے جسم سے غذا اور حرارت اپنے جسم میں منتقل ہو جانے پر بچہ ایک بار پھر نیند کی آغوش
میں چلا گیا۔ وہ بچے کو پلنگ پر لٹا کر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔

''کاکے کے پاس جا کر ہی مر گئی ہے کیا؟..... خاوند کا تجھے کچھ خیال نہیں کہ تیری راہ دیکھ رہا ہے۔'' نیم
تاریک کمرے میں بالے کی غراتی ہوئی آواز گونجی تو وہ جلدی سے بچے کو چھوڑ کر اس کے پلنگ کی طرف لپکی او
بدحواسی سے پائنتی بیٹھ کر ایک بار پھر اس کے پیر دبانے لگی۔

''چل چھوڑ یہ پیر دابنا۔ اب لیٹ جا۔'' بالے کی آنچ دیتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو سار
جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ کئی سال کی رفاقت اور تین بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس کا یہ عالم تھا کہ شوہر ک

ربت کے خیال سے کانپ جاتی تھی۔ وہ وحشی تھا جس کی وحشت کے مٹنے تک وہ نڈھال ہو کر رہ جاتی تھی۔
لیکن بہرحال انکار کی تاب بھی نہیں تھی چنانچہ چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ فوراً
ی ایک بالوں بھرا بازو اس کے جسم سے لپٹا اور پھر وہ اپنی سخت انگلیوں سے اس کے نازک جسمانی خطوط کو
ٹولنے لگا۔ وہ ہونٹ بھینچے کسی مٹی کے مادھو کی طرح پڑی رہی۔ اس کی یہ سرد مہری کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔
ہر اقریق طلب کی آگ میں اس بری طرح جھلس رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھی کے سرد جذبات سے کوئی غرض
نہیں تھی۔ اپنی طلب کو مٹانے کے لیے وہ مٹی کے اس مادھو کو بری طرح بھنبھوڑے جا رہا تھا۔ اس کی کسی بن مانس
کی سی گرم اور پُر وحشت سانسوں کی بُو کو بار بار سانس روک کر برداشت کرنے کی کوشش کرتی اس کی بیوی ان
لمحوں کے مختصر ہو جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔ یہ دعا وہ ہر ایسے موقع پر ہمیشہ مانگتی تھی لیکن آج حیرت انگیز طور پر
اس کی دعا قبول بھی ہو گئی۔

''بالے بھائی!'' کسی نے بیرونی دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے کے ساتھ بلند آواز میں پکارا۔ ''باہر
کوئی تمہیں بلا رہا ہے۔''

بالا فوری طور پر ہوش میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی بیوی نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ وہ اپنی
حاجات کا یہ موقع کیوں ضائع ہونے دیتی؟

''اس وقت کون آ گیا؟'' وہ بڑبڑایا اور طوعاً و کرہاً بدن پر دھوتی لپیٹتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ اس دوران
دروازے پر دوبارہ مزید دستک دی جا چکی تھی۔

''کون ہے بھئی جس سے دو منٹ کا صبر نہیں ہو رہا؟'' بالے نے دھاڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ لگاتار
مسلسل دستک نے اسے جھنجلا دیا تھا، دوسرے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے گاؤں میں، اس کے گھر کے
دروازے پر دستک دے کر اسے باہر بلانے والا اس کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔ وہ بنا کسی احتیاط کے غصے میں
دندناتا ہوا باہر نکلا تھا لیکن باہر نکلتے ہی جس طرح اسے چاروں طرف سے چھاپ لیا گیا، اس سے اسے اپنی غلطی
کا احساس ہوا۔ چھاپنے والوں نے اسے کچھ اس طرح سے چھاپا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ پیر چلانا تو دور کی بات منہ
نہیں کھول سکا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نکلنے سے قبل ہی اس کے منہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس کر اس کی آواز
کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اسے اس طرح بے دست و پا کرنے کے بعد وہ لوگ اسے لے کر چل پڑے۔ رات کا آخر
پہر شروع ہو چکا تھا۔ جلدی سو جانے کے عادی گاؤں کے باسیوں میں سے اس کی یہ درگت دیکھنے کے
لیے سنسان راہوں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر کہیں کسی نے کچھ دیکھا بھی ہوگا تو انجان بن گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ
ہونے کے بعد سے یہی سبق سیکھتے آئے تھے کہ ایسے ہر منظر پر آنکھیں بند کر لو اور بعد میں بھی زبان بند رکھو تو
یں بہتری ہے۔

بالے کو اٹھا کر لے جانے والے اسے چودھری کے اس گودام تک لے گئے جہاں ایکسپورٹ کیے جانے
والے پھلوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ بہترین پیکنگ میں موجود یہ پھل اپنے اُگانے والوں کو بھی میسر نہیں آتے تھے
جن کے خون پسینے کی محنت ان پھلوں میں ذائقہ اُتارتی تھی، وہ اس کا ذائقہ چکھنے سے بھی محروم تھے۔ کیونکہ
اُگائے جانے کا مقصد صرف اور صرف چودھری کے خزانے میں اضافہ کرنا تھا۔ کل ان پھلوں کی پہلی کھیپ
روانی تھی۔ بالے کو ساتھ لے کر جانے والے گودام تک پہنچے تو اس نے دیکھا کہ گودام کے دروازے پر
پہرہ دینے والا چوکیدار موجود نہیں ہے۔ اسے لے جانے والے اسے گودام کے اندر لے گئے اور کسی بے جان
شے کی طرح اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اس طرح پھینکے جانے سے اس کی کمر اور بازوؤں پر شدید چوٹیں لگیں اور اس
نے بے ساختہ ہی چیخنے کی کوشش کی لیکن منہ میں ٹھنسے کپڑے کے گولے کی وجہ سے اس کی چیخیں اس کے حلق میں ہی



گھٹ کر رہ گئیں۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے موجود چاروں افراد کو دیکھنے لگا۔ ان چاروں نے سیاہ
رنگ کے چست لباس پہن رکھے تھے اور چہروں کو ماسک کے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔

بالے نے اپنی ساری زندگی چودھری کے لیے غنڈہ گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن اس کی زندگی میں
کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ تن تنہا اور بالکل نہتا اس طرح کہیں پھنس گیا ہو۔ اب وقت آیا تو اس کی حالت
خراب تھی۔ وہ اشاروں میں خود کو گھیر کر لانے والوں سے التجائیں کرنے لگا لیکن وہ لوگ ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں
سے اندھے ہیں جنہیں اس کا کوئی اشارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کسی بھی التجا کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے
گودام میں ہی ایک طرف رکھے ڈنڈے اٹھائے اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ ان کا نشانہ اس کے دونوں پیر اور
بازو تھے۔ وہ بے دردی سے ان دونوں اعضاء پر تابڑ توڑ وار کرتے رہے۔ تکلیف کی شدت سے بے حال بالے
کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑتی رہیں۔ مارنے والوں نے اسے کسی رسّی وغیرہ سے باندھا نہیں تھا لیکن
وہ اسے اتنی مہلت بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اُٹھ کر بھاگ سکے اور اس گودام سے باہر نکل سکے۔ اپنے
بازوؤں اور پیروں پر پے در پے وار سہتے بالے کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ وہ منہ میں پھنسایا گیا کپڑے
کا گولا ہی کھینچ کر باہر نکال سکے اور کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارے۔ اس نے کئی بار یہ کوشش کر کے بھی دیکھی لیکن
اس کا ہاتھ ابھی اس کے منہ تک پہنچ نہیں پاتا تھا کہ کسی نہ کسی حملہ آور کے ڈنڈے کی ضرب اسے ہاتھ پیچھے کر
لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔

ایسی بے بسی اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز لڑائی
جھگڑوں اور مار کٹائی میں ہی گزرے تھے لیکن اس وقت وہ جن لوگوں کے ہتھے چڑھا تھا، وہ بڑے پروفیشنل
انداز میں اسے مار رہے تھے۔ ان کی مہارت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اس کے پیروں اور بازوؤں کو نشانہ بنایا
تھا۔ اب تک ایک بھی وار ان دونوں اعضاء کے سوا جسم کے کسی دوسرے حصے پر نہیں پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے اس
پہلے بدترین تجربے سے گزرتے بالے نے بالآخر مزاحمت ترک کر دی۔ یوں بھی اب اس میں مزاحمت کی سکت
باقی نہیں رہی تھی۔ روح تک کو لرزا دینے والی تکلیف سہتے ہوئے وہ یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ اس کی کئی ہڈیاں
ٹوٹ اور چٹخ چکی ہیں اور اب اگر ان لوگوں نے اسے زندہ چھوڑ بھی دیا تو وہ طویل عرصے تک بستر سے نہیں اُٹھ
سکے گا۔ وہ گودام کے فرش پر کسی قربان کیے جانے والے بکرے کی طرح پڑا تڑپ رہا تھا اور اپنے سینے میں ہی
رہ جانے والی چیخوں کو خود ہی سنتے ہوئے اس کے دماغ میں بے شمار مظلوموں کی وہ چیخیں گونج رہی تھیں جن
سے کبھی وہ قہقہے لگاتے ہوئے لطف اندوز ہوا تھا۔

اپنی زندگی کے ان نازک ترین اور اذیت ناک لمحات میں اسے وہ سب کچھ یاد آ رہا تھا جسے کرتے ہوئے
اس نے کبھی انسانیت کا بھرم رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کتے یا گھوڑے کی طرح چودھری کا سدھایا
ہوا ایک جانور بن کر اس کے اشاروں پر چلتا رہا تھا۔ اس نے اپنی حیوانی جبلّت کو چودھری کے نمک کا حق ادا
کرنے کے لیے خوب استعمال کیا تھا اور اب خود بھی کسی حیوان ہی کی طرح کے سلوک سے گزر رہا تھا۔ اس
سلوک کو سہتے سہتے آخر کار اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور بالآخر اپنے خون میں لتھڑا وہ بے ہوشی کی
تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اسے مارنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور
وہاں میں موجود ڈنڈے ایک طرف پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ وہ چار تھے جن میں سے دو نے اسے

کسی تعفن زدہ چوہے کی طرح زمین سے اٹھایا اور گودام سے باہر کی طرف لے گئے۔ ان کی منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ انہوں نے اسے گودام سے کچھ فاصلے پر موجود ایک درخت کے نیچے لے جا کر پھینک دیا۔ اسی درخت کے نیچے گودام کا چوکیدار بھی بے ہوش حالت میں پڑا تھا۔ چوکیدار کو بالے کی طرح تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اسے صرف سر پر کسی بھاری شے کی ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ بالے کو چوکیدار کے قریب پھینکنے کے بعد وہ دونوں واپس گودام کی طرف پلٹے اور قریب ہی کھڑی جیپ میں سوار ہو کر منتظر نظروں سے گودام کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں اندر جا کر یہ دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ ان کے ساتھی اندر کیا کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وہی کچھ کر رہے ہوں گے جو طے کر کے آئے ہیں۔ آخر کار مختصر وقفے کے بعد ان کا انتظار ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو گودام سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اب وہ بڑی خاموشی لیکن برق رفتاری سے پیر آباد کی حدود سے نکل رہے تھے۔ وہاں سے نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے عقب میں موجود گودام میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رقص دیکھا اور اپنے مشن کی سو فیصد کامیابی کا یقین لیے ہوئے پیر آباد سے باہر نکل آئے۔ ان کی اگلی منزل نور کوٹ میں تھی۔ نور کوٹ پہنچے تو کوئی ان کا منتظر تھا۔ انہوں نے جیپ اس منتظر آدمی کے حوالے کی اور پھر نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اپنے لیے تیار کیے جانے والے آرام دہ کمروں میں جا کر خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

رات کا باقی حصہ انہوں نے نہایت سکون سے گزارا اور پھر صبح ایک پُر تکلف ناشتے کے بعد صاف ستھرے لباسوں میں ملبوس ایک گھنٹے کے وقفے کے ساتھ دو دو کی ٹولیاں بنا کر بس اڈے پر پہنچ گئے۔ ان کے معزز حلیوں کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پچھلی رات پیر آباد میں داخل ہو کر چودھری کے سب سے سر چڑھے غنڈے کو عبرت کا نشانہ بنانے والے چار سیاہ پوشوں سے ان کا کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہی تو ان کا کمال تھا جسے مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لیے جلد سوم کا مطالعہ کیجئے

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....

جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

سوم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے



دفتر پہنچنے کے کچھ دیر بعد شہریار کو جو پہلی فون کال موصول ہوئی وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

''میں آفتاب احمد بات کر رہا ہوں سر!'' کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا تو پہلے تو وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا پھر اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس شخص آفتاب احمد کو وہ کتنا پسند کرتا تھا۔ اس کے عزائم اور مستقل مزاجی نے اسے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ سوچتا تھا کہ آفتاب احمد کو دوسروں کے لیے ایک مثال بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسکول کے ساتھ آفتاب کی گہری وابستگی نے اسے ہمیشہ یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اس کی ٹیم کا سب سے بہترین ممبر ہے لیکن آفتاب نے اسے بری طرح مایوس کیا تھا۔ صرف ایک لڑکی کی خاطر وہ اپنی برسوں کی محنت اور شہریار کا لگایا گیا سرمایہ داؤ پر لگا کر چلا گیا۔ اگر وہ چودھری کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہونے کی غلطی نہیں کرتا تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔ چودھری جو پہلے ہی اسکول کا سخت مخالف تھا، طیش کی وجہ سے ہر حد پار کر گیا تھا۔

''خیریت! تم نے کیسے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت کی؟'' اپنے اشتعال کو سرد مہری میں لپیٹ کر اس نے آفتاب سے سوال کیا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں سر! کہ فوری طور پر آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ لیکن رات پچھلے دنوں کے اخبارات میں پیر آباد سے متعلق خبریں پڑھیں تو رہ نہیں سکا۔ پوری رات شدید کرب کے عالم میں گزری۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اخبارات میں جو کچھ چھپا ہے سب غلط ہے۔'' آفتاب کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ شدید جذباتی کیفیت سے گزر رہا ہے اور کسی بھی لمحے رو پڑے گا۔

''حالانکہ اتنے عرصے تک چودھری کو بھگتنے کے بعد تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں سے کوئی بھی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ چودھری جیسا منتقم مزاج اور کینہ پرور آدمی کبھی بھی اور کسی بھی حد سے گزر سکتا ہے اور وہ ایسا کر کے دکھا چکا ہے۔ اسکول کی عمارت کو جو نقصان پہنچا، اس کا مجھے اتنا غم نہیں ہے۔ مالی نقصان قابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ لیکن جو انسانی زندگیاں ضائع ہو گئیں، ان کا نعم البدل کہاں سے لایا جائے؟ کیا قصور تھا منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کا؟ بس یہی نا کہ وہ خلوصِ نیت کے ساتھ ہمارے مشن میں شامل تھے اور گاؤں کے بچوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا چاہتے تھے۔ وہ بالکل بے ضرر لوگ تھے جن کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن ان بے چاروں کو تمہارے حصے کی سزا بھگتنی پڑی۔ چودھری کو تم نہیں ملے تو اس نے ان مظلوموں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالا۔''

وہ اتنے غصے میں تھا کہ آفتاب کی افسردگی محسوس کرنے کے باوجود اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوا اور بے نقط سناتا چلا گیا۔

PAKISTANIPOINT

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں سر! میں خود بھی منیب اور دیگر اساتذہ کی موت کے لیے خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یقین جانئے کہ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ چودھری اس حد تک گر جائے گا۔ اور ویسے بھی جو کچھ ہوا، ویسا کب کسی نے سوچا تھا؟ میں تو خود حالات کے دھارے پر بہتا چلا گیا۔ میں نے کبھی اپنی زندگی کے اس رخ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میری زندگی میں اسکول اور اپنے کاغذ قلم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کشور کیسے اچانک میری زندگی میں آئیں اور میں کیسے ان کی محبت میں ڈوبتا چلا گیا، مجھے بھی اندازہ نہیں۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ جذبہ اتنا زور آور ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کی ایک نہیں چلتی۔ میں بھی اس منہ زور جذبے پر کوئی بند نہیں باندھ سکا۔ حالانکہ یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے پیر آباد چھوڑنے اور اپنے اسکول سے دور ہونے کا کتنا دکھ ہے اور اب اس دکھ میں اپنے ساتھیوں کی ناحق موت کا دکھ بھی شامل ہو کر میرے لیے کیسی اذیت بن گیا ہے۔''

آفتاب کا کہا ایک ایک لفظ سچائی سے پُر تھا، یہ بات شہریار سمجھتا تھا چنانچہ اس بار جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

''تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا آفتاب! تم جانتے تھے کہ تم ایک ایسے شخص کی بیٹی سے محبت کر رہے ہو جو کسی صورت اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ اب دیکھ لو کہ اس کا کیا ردِعمل سامنے آیا ہے۔ وہ ملازمہ رانی جو تمہاری رازداں تھی، دوسری دو ملازماؤں کے ساتھ پہلے ہی ہلاک ہو چکی ہے۔ تمہیں غوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا، یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے پیچھے تمہارے فرار سے چودھری کو ہونے والی کھسیاہٹ ہے، یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور ابھی وہ مزید کہاں تک جائے گا اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو بھی نہیں بخشا ہوگا۔ حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے اس پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہوں گے، اس کی خبر دینے والا بھلا کون ہے؟''

''آپ کشور کے لیے پریشان نہ ہوں سر! وہ بہ خیر و عافیت ہیں اور میرے ساتھ ہی ہیں۔'' آفتاب کے اس انکشاف نے اسے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا مطلب؟..... یہ کیسے اور کب ہوا؟'' وہ اپنی حیرت کو لہجے میں در آنے سے نہیں روک سکا۔

جواب میں آفتاب نے وہ سارے حالات بیان کر دیئے جن کے باعث اسے کشور کو فوری طور پر پیر آباد سے نکال کر لے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

شہریار خاموشی سے ساری تفصیلات سنتا رہا۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری کا اتنا شدید ردِعمل سامنے کیوں آیا تھا۔ وہ شخص جو بیٹی کے معاشقے کی خبر سننے کا بھی ظرف نہیں رکھتا تھا، اتنی بڑی بات پر تو اس کا آپے سے باہر ہو جانا ایک یقینی سی بات تھی۔

''تم اپنے آپ کو بہت بڑی مشکل میں گرفتار کر چکے ہو۔ چودھری کسی صورت تم دونوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ کسی طرح تمہیں ڈھونڈ نکالے اور اس کے بعد وہ تمہارا کیا حشر کرے گا، اس کا اندازہ تو تم اس کی قید میں گزارے گئے وقت کو یاد کر کے بخوبی لگا سکتے ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی تو تمہارے وہ زخم ہی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے ہوں گے اور تم بغیر سہارے کے اپنے قدموں پر چلنے کے لائق بھی نہیں ہو سکے ہو گے۔'' شہریار نے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ان اجنبی محسنوں کے پیچھے آپ ہی تھے نا سر! جنہوں نے مجھے چودھری کی قید سے آزادی دلوائی؟ ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن میرا موہوم سا اندازہ تھا کہ شاید یہ آپ ہی ہوں جن کی وجہ سے



مجھے اس قید سے نجات ملی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ سر!'' آفتاب جو مسلسل اس اُلجھن میں رہا تھا کہ اس کو چودھری کی قید سے کس نے آزادی دلوائی، اس کے بعض جملوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ممنونیت کا اظہار کرنے لگا۔

''تم اچانک اس ہسپتال سے کہاں غائب ہو گئے تھے جہاں تمہیں علاج کے لیے داخل کروایا گیا تھا؟'' شہریار نے بھی گویا بالواسطہ طور پر اپنی مدد کو تسلیم کر لیا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔ جگو نے آفتاب کو جس ہسپتال میں داخل کروایا تھا، وہ وہاں سے اچانک ہی غائب ہو گیا تھا اور تحقیقات سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی دوست کی مدد سے وہاں سے گیا تھا۔ آفتاب اپنی مرضی سے گیا ہے، یہ جان کر شہریار کی پریشانی تو دُور ہو گئی تھی لیکن یہ اُلجھن بہرحال رہی تھی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے چنانچہ اب یہ سوال اس سے پوچھ بیٹھا۔

''افضل کا خیال تھا کہ میرا اس ہسپتال میں رہنا میری سلامتی کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اس نے مجھے ایک دوسرے ہسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا۔ افضل کی موت کے بعد اس کے ایک صحافی دوست نے اس ہسپتال سے بھی مجھے شفٹ کروا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چودھری میرے زخمی ہونے کی وجہ سے مختلف ہسپتالوں میں تلاش کروا رہا ہوگا اس لیے مجھے اب کسی ہسپتال میں نہیں رہنا چاہئے۔ اس کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ چند منٹوں کے فرق نے مجھے چودھری کے بندوں کے ہاتھ لگنے سے بچا لیا ورنہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہ لوگ اس ہسپتال تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اب میں لاہور سے دور ایک دوسرے شہر میں ہوں۔ کشور میرے ساتھ ہیں اور ہم دونوں فی الحال خود کو کافی محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا ہے اور قلمی نام کی وجہ سے میرے پکڑے جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن میں پیر آباد کے حالات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بارشوں کی وجہ سے جو پریشانی پیدا ہوئی ہے، اس سے تو خیر آپ آہستہ آہستہ نمٹ ہی لیں گے لیکن اسکول کے بارے میں سوچ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ منیب اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد تو کوئی بھی دوسرا استاد وہاں آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود وہاں پہنچ جاؤں لیکن اس سے بھی کیا فائدہ ہوگا؟ چودھری تو مجھے پیر آباد کی فضا میں دوسرا سانس لینے کا بھی موقع نہیں دے گا۔'' آفتاب کے لہجے میں حقیقی پریشانی تھی جسے محسوس کر کے شہریار کو اسے تسلی دینی ہی پڑی۔

''تم یہاں کی فکر نہ کرو۔ اسکول کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ماریہ کی والدہ مسز جوزف نے اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے مجھے اپنے تعاون کی پیشکش کی ہے۔ جب تک حالات سنبھل نہیں جاتے، مسز جوزف اسکول کا انتظام دیکھ لیں گی۔ بس یہ سمجھو کہ تم نے جس طرح زیرو سے کام شروع کیا تھا، اسی طرح اب مسز جوزف کو کرنا ہوگا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ کام جاری رہنا چاہئے، باقی تو سب آہستہ آہستہ معمول پر آ ہی جاتا ہے۔ تمہارے لیے اب میرا یہی مشورہ ہے کہ جہاں ہو، وہاں خاموشی اور سکون سے رہو۔ حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو پھر تم کچھ اور کرنے کا سوچ سکتے ہو۔ ویسے بھی دنیا کوئی پیر آباد کے اسکول پر ختم نہیں ہو جاتی۔ پیر آباد کے علاوہ بھی وطنِ عزیز میں ایسے بہت سے گاؤں اور دیہات ہیں جہاں کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ تم ایسے کسی دوسرے گاؤں میں کام شروع کر سکتے ہو۔ مقصد تو علم کی روشنی پھیلانا ہے۔ چراغ کو اس سے کیا مطلب کہ وہ کہاں جل رہا ہے؟ ہاں، اگر کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ مجھ سے جو ممکن ہو سکا، وہ تمہارے لیے ضرور کروں گا۔''

اس نے آفتاب کو ایک صائب مشورہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور کچھ دیر گم صم سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ وہ محبت کی طاقت پر غور کر رہا تھا۔ کیسا عجیب جذبہ تھا کہ ایک شخص کو اس کی زندگی کے محور و مرکز سے اتنی دور کھینچ کر لے گیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکا۔

کچھ دیر آفتاب کے بارے میں سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ بارشوں کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا تھا اور جو لوگ اپنے گھر چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ اب اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ جن لوگوں کی املاک زیادہ متاثر ہوئی تھیں اور وہ روزمرہ زندگی کے معمولات میں شامل ہونے سے معذور ہو گئے تھے، ان کے لیے اس نے اپنی ٹیم کی مدد سے ایک مربوط پلان بنایا تھا اور اس پلان کے مطابق لوگوں کی امداد کا سلسلہ شروع کیا جا چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی باقی ماندہ چھوٹے مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور وہ رک جانے والے ترقیاتی منصوبوں پر ایک بار پھر کام شروع کروا سکے گا۔ اس وقت وہ کاغذوں کے پلندے میں اُلجھا ہوا انہی معاملات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی اور اسے آئی جی مختار مراد کی کال کی اطلاع دی گئی۔ اس اطلاع کو سن کر اس کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ اس کی متوقع فون کال تھی جس کا وہ صبح سے انتظار کر رہا تھا۔

''السلام علیکم انکل! کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' آپریٹر نے اس کی طرف سے اجازت ملنے پر لائن ملائی تو اس نے پہل کرتے ہوئے انہیں سلام کیا اور بڑے جوش سے حال احوال پوچھنے لگا۔

''وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر ہے، میں بالکل بہ خیر و عافیت ہوں۔ لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟ آئے دن مار ڈھاڑ اور قتل و غارت کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ کل رات بھی سنا ہے کہ چودھری افتخار کے دو بندے زخمی ہو گئے جن میں سے ایک کی حالت بہت خراب ہے۔ حملہ آوروں نے چودھری کے پھلوں کے گودام میں بھی آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے اس کا بہت بڑا مالی نقصان ہوا ہے۔''

حسبِ توقع مختار مراد نے اس سے اسی موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے فون کیا تھا جس کا وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔

''سنا تو میں نے بھی ہے یہ سب کچھ۔ صبح دفتر آنے سے پہلے ہی ایس پی نے فون کر کے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ایف آئی آر کاٹو اور تفتیش کرو کہ کس نے یہ حرکت کی ہے۔ اگر مجرم پکڑے گئے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا تو پھر ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔'' اس نے نہایت اطمینان سے مختار مراد کو جواب دیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ چودھری نے مشکوک افراد کی فہرست میں تمہارا نام بھی لکھوایا ہے..... بلکہ سب سے زیادہ زور ہی تمہارے نام پر دیا ہے؟'' مختار مراد نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

''اب میں کیا کر سکتا ہوں کہ چودھری کو اپنے ہر بگڑے معاملے کے پیچھے میرا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس کا جو بندہ شدید زخمی ہوا ہے، اس کی شہرت کوئی اچھی نہیں ہے۔ اسے علاقے کا سب سے بڑا غنڈہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے تو بے شمار دشمن ہوتے ہیں۔ کسی کا بھی داؤ چل گیا ہوگا اور اس نے اپنی کوئی دشمنی نکال لی ہوگی۔ میرا بھلا اس قسم کے غنڈوں سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو سیدھے سیدھے پولیس کے ذریعے اُسے اُٹھواتا اور ڈرائنگ روم میں رکھ کر ایسی خاطر مدارات کرواتا کہ رات والے واقعے میں اس کی جتنی ہڈیاں بچ گئی ہیں، اتنی بھی نہیں بچ پاتیں۔ لیکن آپ بتائیں کہ



آپ نے مجھ سے اس معاملے میں باز پرس کرنے کی زحمت کیوں کی؟ کیا آپ کو بھی شک ہے کہ میں ایسے کسی کام میں انوالو ہو سکتا ہوں؟'' اپنے حق میں دلائل دیتے ہوئے اس نے اچانک ہی مختار مراد سے شکوہ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں چودھری نے خود مجھے فون کیا تھا اور تمہارے خلاف شکایت کی تو میں نے سوچا کہ تم سے اصل معاملہ پوچھ لوں۔''

مختار مراد اس کے اس سوال پر تھوڑا سا بوکھلا کر وضاحت دینے لگا۔ اپنی برسوں کی ملازمت میں اس نے اس طرح کی بڑی اُلٹ پھیر دیکھی تھی۔ شہریار کا پُراعتماد لہجہ مختار مراد کو اسے مشکوک سمجھنے سے روک نہیں سکتا تھا لیکن وہ اس کے لیے پدرانہ جذبات اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا۔ ان کی وجہ سے شہریار کے لہجے میں موجود شکوے نے اسے جذباتی کر دیا تھا۔ وہ اس کے اکلوتے مرحوم داماد سجاد رانا کا بالکل بھائیوں جیسا کزن تھا اور سجاد رانا کی موت کے بعد وہ اس کے اندر اسی کا عکس دیکھنے لگا تھا۔ شاید یہ اولادِ نرینہ سے محروم ایک تنہا شخص کی ایک ایسی اندرونی کمزوری تھی جس نے کچھ اس طرح اسے مغلوب کیا تھا کہ وہ خود بھی اس سے واقف نہیں ہو سکا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے انکل! کہ میں نے منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے سلسلے میں چودھری پر شک ظاہر کیا ہے اور بے وجہ نہیں کیا۔ منیب کے مرنے سے پہلے جو آخری کال مجھے موصول ہوئی تھی، اس میں اس نے صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ چودھری کے کارندوں نے اس کے مکان کو گھیر لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فون کال کی کوئی قانونی حیثیت نہیں اور نہ ہی میرے پاس وہ گفتگو ریکارڈ ہے کہ میں عدالت میں ثبوت کے طور پر پیش کر سکوں۔ لیکن خود مجھے بھی یقین ہے اور چودھری بھی جانتا ہے کہ اس واردات کے پیچھے کون تھا۔ اب چودھری کو موقع ملا ہے تو اس نے جوابی کارروائی کے طور پر مجھے ایک کیس میں مشکوک نامزد کر دیا ہے۔ اس طرح کے الزامات میرے اور اس کے درمیان جاری لڑائی کا ایک حصہ ہیں۔ آپ ان باتوں کی ٹینشن مت لیں۔ چودھری کچھ بھی ثابت نہیں کر سکے گا بلکہ میں اُلٹا اس پر الزام لگا دوں گا کہ اس نے خود اپنے کارندے کو پٹوایا اور اپنے گودام میں آگ لگوائی ورنہ اور کس میں ہمت ہے کہ باہر سے آ کر اس کے خلاف اس کے علاقے میں کارروائی کر سکے؟'' وہ پوری تیاری کے ساتھ بیٹھا تھا اور مختار مراد کے ہر سوال کا پورے اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔ پھر تم خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کر لینا۔ میں نے تو اس لیے ذکر چھیڑ دیا تھا کہ تم ہوشیار رہو اور بے خبری میں مارے نہ جاؤ۔ ویسے میرے فون کرنے کا اصل مقصد اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں تھا۔ میں تمہیں کچھ دوسری اہم باتوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔'' انہوں نے گویا سابقہ موضوع لپیٹ دیا۔

''وہ کیا؟'' شہریار نے فوراً ہی پوچھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ موضوع کیا ہے۔

''سجاد کے قتل کے معاملے کی تحقیقات کرتے ہوئے کچھ اہم انکشافات ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ دیگر مشکوک معاملات کی تحقیقات کرتے ہوئے ہمیں سجاد کے قاتلوں کے بارے میں کچھ کلیوز ملے ہیں۔ پچھلے دنوں مری کے ایک ریسٹ ہاؤس سے ندا اور حنا نامی دو لڑکیاں گرفتار کی گئی تھیں۔ یہ لڑکیاں بظاہر وہاں سیر و تفریح کے لیے رُکی ہوئی تھیں لیکن ایک تو اپنے طویل قیام کی وجہ سے نظر میں آ گئیں، دوسرے یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ دونوں بہنیں وی آئی پیز سے تعلقات قائم کرنے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ مقامی یا غیر مقامی دونوں طرح کے سرکاری افسران، سیاست دان اور اعلیٰ فوجی عہدے داران کا خاص ٹارگٹ تھے۔ ان کی اس

دلچسپی کو دیکھ کر انٹیلی جنس کے لوگ ان کے پیچھے لگ گئے اور بالآخر انہیں گرفتار کر کے ان سے یہ راز اُگلوا لیا گیا کہ وہ دونوں دراصل بھارتی ایجنٹس ہیں جن کے اصل نام ارمیلا اور گیتا ہیں۔ ان دونوں لڑکیوں نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور میں قائم ایک میرج بیورو کی آڑ میں جسم فروشی کا بزنس کرنے والے نیٹ ورک سے جڑی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کچھ لڑکیاں خصوصی تربیت یافتہ تھیں جو درحقیقت بھارت کے لیے جاسوسی کا کام کر رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی کو سجاد رانا سے بھی ملوایا گیا تھا اور بعد میں یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ سجاد اس لڑکی کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس لڑکی کو خودکشی پر مجبور کر دیا گیا۔ ارمیلا اور گیتا نے قبول کیا ہے کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سجاد کو بھی ''را'' کے اشارے پر ہی ہلاک کیا گیا ہو۔ بہرحال، وہ سو فیصد پُر یقین نہیں تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ میرج بیورو کی مالکن کا روپ دھار کر رہنے والی ان کی باس اصل حقیقت جانتی ہوگی۔ لیکن اب وہ کہاں ہے، یہ انہیں نہیں معلوم۔ سجاد کے قتل کے فوراً بعد ہی میرج بیورو والا وہ سیٹ اپ ختم کر دیا گیا اور اس کے بعد سے ان کا کبھی اپنے باس سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہمارے لوگ اس میرج بیورو تک پہنچے تھے لیکن وہاں سے اس عورت کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات معلوم نہیں ہوئی۔ عمارت کے مالک نے عورت کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ کسی بھی ادھیڑ عمر عیسائی عورت کا حلیہ ہو سکتا ہے جس کی بنیاد پر ہم کسی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہماری تحقیقات کی گاڑی اچھی خاصی چلنے کے بعد ایک بار پھر ٹھپ ہو چکی ہے۔''

''آپ کو ان دونوں لڑکیوں سے ہی اس عورت کا حلیہ اور اتا پتہ معلوم کرنا چاہئے تھا۔'' مختار مراد کی فراہم کردہ معلومات سن کر اس نے جوش کے ساتھ مشورہ دیا۔

''اتا پتہ تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا، وہ لڑکیاں جانتی ہی نہیں تھیں اور حلیہ معلوم کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔''

''کیا مطلب؟..... کیوں نوبت نہیں آسکی؟'' وہ اُلجھا۔

''وہ کوئی معمولی لڑکیاں نہیں تھیں جو ذرا سی دھمکیوں اور تشدد پر ہمارے قابو میں آجاتیں۔ ہمیں بڑے سائنٹفک طریقے سے ان پر کام کرنا پڑا تھا، تب کہیں جا کر یہ سب کچھ معلوم ہوا تھا۔ ہم اسٹیپ بائی اسٹیپ آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں سے معلومات حاصل کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے مکمل معلومات حاصل ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں مر گئیں۔ ارمیلا نے گیتا کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا اور بعد میں دیوار سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو اس حد تک زخمی کر لیا کہ واپس ہوش کی دنیا میں نہیں آسکی اور تین دن کومے میں رہنے کے بعد مر گئی۔''

مختار مراد نے اس کی اُلجھن دور کی تو وہ گہرے تاسف میں ڈوب گیا۔ اسے یقین تھا کہ شینا اور سجاد رانا کے قاتل ایک ہی تھے لیکن ان کی بدقسمتی تھی کہ ہر بار قاتل ہاتھ میں آتے آتے بچ نکلتے تھے۔ ہر عام آدمی کی طرح اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اصل قاتلوں تک رسائی حاصل کی جا سکے تاکہ انہیں ان کے جرم کی سزا دی جا سکے۔ ان سفاک قاتلوں نے صرف شینا اور سجاد رانا ہی کو ہلاک نہیں کیا تھا، انہوں نے اس کے پورے خاندان سے زندہ رہنے کی اُمنگ چھین لی تھی۔ یہ اُمنگ اب کبھی لوٹ کر واپس نہیں آسکتی تھی۔ لیکن زندہ لاش کی طرح جیتے لیاقت رانا، آفرین اور مریم کے دلوں کو یہ ٹھنڈک تو پہنچائی جا سکتی تھی کہ ان کے پیاروں کے خونِ ناحق کا بدلہ لیا جا چکا تھا۔ لیکن شاید ابھی وہ وقت آنے میں کچھ مدت باقی تھی اور انہیں صبر سے اس مدت کے گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔

⊛----✪----⊛



''تم آج میرے ساتھ میرے گھر چل رہی ہو۔'' پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد وہ لوگ لیب سے باہر نکل رہے تھے، تب راحیلہ نے ماہ بانو کا ہاتھ تھامتے ہوئے یہ حکم صادر کیا۔

''اتنی اچانک؟ پھر کسی دن کا پروگرام رکھ لو۔ اس طرح اچانک جانے میں تو مشکل ہو جائے گی۔'' ماہ بانو نے انکار کیا۔

''کیسی مشکل؟ تمہیں کون سا گھر والوں کو جواب دہی کرنی ہے۔ ہاسٹل ہی تو جانا ہے۔ تین چار گھنٹے لیٹ بھی پہنچ جاؤ گی تو کیا بگڑے گا؟'' راحیلہ نے اس کے انکار کو قطعی اہمیت نہیں دی۔

''لیکن آج ہی جانا کیوں ضروری ہے؟ بعد میں کسی اور دن اطمینان سے بھی تو جایا جا سکتا ہے۔'' ماہ بانو کو اس طرح اچانک اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اپنے سابقہ تجربات کی بنیاد پر وہ ذرا محتاط رہنا چاہتی تھی اور احتیاط پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ محدود رکھے۔ لیکن راحیلہ کے اصرار کو دیکھتے ہوئے اس سے صاف انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''آج چلنا اس لیے ضروری ہے کہ آج بھائی کی چھٹی ہے اور میں ان سے کہہ آئی تھی کہ میں اپنے ساتھ اپنی دوست کو لے کر آؤں گی۔ آپ کہیں مت جائیے گا۔ اب وہ بے چارے ہمارے انتظار میں گھر پر بیٹھے ہوں گے اور تم نہیں جاؤ گی تو یقیناً انہیں برا لگے گا۔''

''تمہیں اپنے بھائی سے کچھ بھی کہنے سے پہلے مجھ سے بات کرنی چاہئے تھی نا؟'' ماہ بانو نے قدرے بے بسی محسوس کرتے ہوئے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

''اب تو غلطی ہو گئی نا۔ تم کیسی دوست ہو کہ دوست کی ایک غلطی کو نبھا نہیں سکتیں۔ پلیز چلو نا..... ہم بھائی سے ایکالوجی کا وہ ٹاپک بھی سمجھ لیں گے جو کل مسز شیرازی کے لیکچر میں سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔'' راحیلہ نے اپنے اصرار میں ایک لالچ کو بھی شامل کیا۔

''ٹھیک ہے، تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو میں چلتی ہوں۔ لیکن پلیز آئندہ ایسی غلطی نہیں کرنا۔'' بالآخر ماہ بانو نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''تھینک یو۔ یہ ہوئی نا دوستوں والی بات۔'' راحیلہ اس کے رضامند ہو جانے پر خوشی سے چہکی۔ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی کالج سے باہر آگئیں۔ باہر نکلنے سے قبل ماہ بانو نے اپنے چہرے کو اچھی طرح چادر کے پلو کا نقاب بنا کر ڈھانپ لیا تھا۔ راحیلہ کے ساتھ اس کے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ اگر کسی آشنا کی اس پر نظر پڑ بھی گئی تو نقاب کی وجہ سے وہ شناخت نہیں کی جا سکے گی۔ راحیلہ نے رکشے والے کو کلفٹن چلنے کو کہا۔ کالج سے کلفٹن تک کا اچھا خاصا راستہ طے کرنے کے بعد وہ ماہ بانو کو مسلسل مختلف جگہوں اور سڑکوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ ماہ بانو توجہ سے سنتے ہوئے ان ساری معلومات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کراچی اس کے لیے قطعی اجنبی شہر تھا اور یہاں آنے کے بعد سے اس نے کالج اور ہاسٹل کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں دیکھی تھی۔ یہاں ایسا کوئی شخص تھا ہی نہیں جو اسے یہ نیا شہر گھما تا یا اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتا۔ آج راحیلہ کے طفیل وہ اس شہر کو دیکھ رہی تھی تو اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا، میں نے راحیلہ کے اصرار کے آگے ہار مان لی۔ جب اس شہر میں رہنا ہی ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی ہونی چاہئیں۔

تقریباً پینتیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ کشادہ سے علاقے کے ایک بڑے سے گھر کے

سامنے پہنچ گئے۔ رکشے سے اُترنے کے بعد راحیلہ نے کرایہ ادا کیا اور گیٹ کے سائیڈ میں لگی ڈور بیل بجادی۔ ماہ بانو متاثر ہونے والے انداز میں اس بڑے سے گھر کا جائزہ لیتی رہی۔ راحیلہ نے اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ اس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ لیکن اب وہ جس گھر کے سامنے کھڑی تھی، وہ اتنا شان دار تھا کہ متوسط طبقے کا کوئی شخص اس میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنی اس حیرت میں غلطاں اسے گیٹ کھولے جانے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ راحیلہ نے اس کا بازو ہلا کر اسے اندر چلنے کو کہا تو وہ ہوش میں آئی۔ گھر اندر سے بھی بہت خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔

''تم شاید اس گھر کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہو اور دل میں سوچ رہی ہو کہ راحیلہ نے تو اپنے بارے میں کچھ اور بتایا تھا..... پھر یہ شان دار گھر اس کا کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی راحیلہ نے اس کی حیرانی کو بھانپ لیا اور خود ہی اس کی حیرت کو لفظوں کی زبان دے دی۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''اصل میں یہ گھر ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ ہمارا ذاتی گھر تو متوسط طبقے کے ایک علاقے شاہ فیصل میں ہے۔ یہاں ہم اپنے ایک ننھیالی انکل کی وجہ سے رہ رہے ہیں۔ میرے وہ انکل اپنی پوری فیملی سمیت کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ اُن کا ارادہ ہے کہ وہ فیملی سمیت کینیڈا میں ہی سیٹل ہو جائیں گے لیکن اپنا یہ گھر انہوں نے احتیاطاً سیل نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ایک سال تک جائزہ لیں گے کہ وہ اور ان کے بیوی بچے کینیڈا میں ایڈجسٹ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ایک سال بعد وہ یا تو واپس آجائیں گے یا وہاں رہنے کی صورت میں مکان سیل کر دیں گے۔ واپسی کے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ یہ مکان سامان سمیت جوں کا توں چھوڑ گئے ہیں۔ کسی کو کرائے پر بھی اس لیے نہیں دیا کہ جانے کرایہ دار کس طرح چیزوں کو استعمال کریں۔ دوسرے ایک سال بعد واپس آنے یا مکان کو سیل کرنے دونوں صورتوں میں وہ کرائے داروں سے مکان خالی کرانے کی جھنجٹ سے بچنا چاہتے تھے لیکن بھرا ہوا مکان اس طرح خالی بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آئے اور اماں سے استدعا کی کہ ان کی عدم موجودگی میں ہم لوگ ان کے گھر میں رہائش اختیار کر لیں۔ اماں نے ان کی یہ بات مان لی، یوں ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ گھر میں ایک ملازم موجود ہے جو چوکیداری اور صفائی ستھرائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کی سال بھر کی تنخواہ انکل خود ادا کر کے گئے ہیں۔ باقی کچن کا کام کاج رہ جاتا ہے تو کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔ اماں یہاں ہوں تو وہ کچھ پکا دیتی ہیں ورنہ بھائی ہوٹل سے کچھ لے آتے ہیں۔''

راحیلہ نے ایک سانس میں پوری تفصیل کہہ سنائی۔ اس دوران وہ دونوں اندر لاؤنج تک پہنچ کر وہاں موجود نرم ملائم قیمتی صوفوں پر براجمان ہو چکی تھیں۔

''تمہاری اماں کیا مستقل تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہتیں؟'' راحیلہ کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''کہاں؟..... اباجی کی وجہ سے وہ بے چاری خوامخواہ گھن چکر بنی ہوئی ہیں۔ اصل میں ہمارے ابا ذرا اور دماغ کے آدمی ہیں۔ انہیں ہمارا اس گھر میں رہنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو پرائے گھر میں جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بعد میں بیکار میں اپنا گھر برا لگنے لگے گا۔ چار دن کی چاندنی کے بعد اندھیری رات زیادہ کھلے گی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اعتراضات کے جواب میں بھائی نے کہا کہ ابا کی مرضی وہ اسی پرانے گھر میں رہیں، ہم تو چار دن کی چاندنی کے مزے لوٹنے ضرور جائیں گے۔ کیا معلوم کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ ہمیں واپس ان پتلی پتلی گلیوں اور چھوٹے مکان کی طرف پلٹنا ہی نہ پڑے۔ بس اسی وجہ سے



بے چاری اماں گھن چکر بنی رہتی ہیں۔ کبھی یہاں رہتی ہیں اور کبھی ابا کے خیال سے پرانے گھر چلی جاتی ہیں۔ آج بھی وہ وہیں گئی ہوئی ہیں اس لیے تم تیار رہو، ہمیں کھانا باہر کا پکا ہوا کھانا پڑے گا۔ میرے خیال میں بھائی اسی انتظام کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔'' اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے راحیلہ نے آخر میں خیال ظاہر کیا۔

''تو تم خود کھانا تیار کر لیا کرو۔ دو افراد کا کھانا پکانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟'' ماہ بانو نے اسے مشورہ دیا۔

''نہ بابا! میں نہیں کر سکتی یہ کام۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں میڈیکل کے لیے اپنی میرٹ بناؤں یا ان فضول دھندوں میں پڑوں۔'' راحیلہ نے ناک چڑھاتے ہوئے ایک ادا سے جواب دیا تو ماہ بانو نے اسے مزید کوئی نصیحت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اسی وقت پچیس چھبیس سالہ ایک شخص ہاتھ میں بہت سارے شاپرز لیے چلا آیا۔ درمیانی قامت، گندمی رنگت والے اس شخص کے نقوش میں راحیلہ کی اتنی مشابہت تھی کہ ماہ بانو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق ہیں۔

''یہ لو بھئی، میں لنچ کے لیے چیزیں لے آیا ہوں۔ تم چیک کر لو کہ تمہاری سہیلی کی خاطر مدارات کے لیے ان چیزوں میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔'' ڈاکٹر طارق نے اپنے ہاتھوں میں موجود بھرے ہوئے شاپرز راحیلہ کو تھمائے۔

''میں چیک کر لیتی ہوں۔ آپ تب تک مہرین کو کمپنی دیں۔'' راحیلہ اس کے ہاتھ سے شاپرز لے کر باہر نکل گئی۔ وہ ماہ بانو کے سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''راحیلہ آپ کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔ بقول اس کے پہلی بار کلاس میں کوئی ایسی لڑکی آئی ہے جو پڑھائی میں اس کی ٹکر کی ہے۔ میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ آپ سے دوستی کر لے۔'' وہ دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے بتانے لگا۔

پھر گویا گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس نے ماہ بانو سے اس کی فیملی، تعلیم اور دلچسپیوں سے متعلق ڈھیروں سوال پوچھے۔ وہ اپنے غیر معمولی حالات کو چھپاتے ہوئے اس کے تمام سوالات کے سچائی سے مگر محتاط انداز میں جواب دیتی رہی۔ راحیلہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ لوگ لاؤنج سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ڈائننگ روم کی سجاوٹ بھی قابل دید تھی اور میز پر جن برتنوں میں کھانا پیش کیا گیا تھا وہ بھی نہایت نازک، نفیس اور خوب صورت تھے۔ ان تینوں نے خوشگوار موڈ میں کھانا ختم کیا اور کھانے کے بعد ایک بار پھر واپس لاؤنج میں آگئے۔ لاؤنج میں آنے کے بعد راحیلہ کی فرمائش پر طارق نے ان دونوں کو ایکالوجی کا وہ ٹاپک سمجھایا جو انہیں کالج میں دیئے جانے والے لیکچر کے دوران سمجھ نہیں آیا تھا۔

''اب تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو۔ میں ایک گھنٹے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ واپس آکر مہرین کو اس کے ہاسٹل ڈراپ کر دوں گا۔'' پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوا تو طارق یہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر گویا اچانک کچھ یاد آجانے پر جاتے جاتے واپس پلٹا۔

''میرے خیال میں، میں تم لوگوں کی کچھ تصویریں بنا دیتا ہوں۔ اچھا ہے یادگار رہیں گی۔'' اس نے جیب سے اپنا موبائل نکال لیا۔ یہ کیمرے والا موبائل فون تھا۔

''تصویروں کی کیا ضرورت ہے؟'' ماہ بانو تھوڑا ہچکچائی اور طارق کو روکنے کی کوشش کی۔

''کھینچنے دو نا مہرین! کون کس سے کب جدا ہو جائے، کیا معلوم ہوتا ہے۔ تصویروں کی شکل میں انسان

کے پاس کم از کم یادگار ہی رہ جاتی ہے۔''

راحیلہ نے پیار بھرے لہجے میں اصرار کیا تو وہ مزید انکار نہیں کر سکی۔ طارق نے جلدی جلدی اس کی اور راحیلہ کی چار پانچ تصویریں لیں اور پھر انہیں خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ، ماہ بانو کو اوپر کے پورشن میں لے گئی۔

''یہ میرا بیڈ روم ہے۔ میرا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا ہے۔'' ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر لے جاتے ہوئے راحیلہ نے بتایا۔

باقی گھر کی طرح اس کمرے کی سجاوٹ بھی نہایت عمدہ تھی۔ پنک اور وائٹ کمبی نیشن نے کمرے کے ماحول کو بڑا خوابیدہ سا بنا دیا تھا۔ ماہ بانو کو بے ساختہ ہی راحیلہ کے والد کا استدلال یاد آیا۔ واقعی وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ بڑے سے شان دار گھر میں رہنے کے بعد اپنے چھوٹے اور معمولی گھر میں واپس جا کر رہنا بہت مشکل لگے گا۔ راحیلہ جو اتنے استحقاق سے پرائے گھر کے ایک کمرے کو اپنا بیڈ روم قرار دے رہی تھی، واپس اپنے اصل گھر جاتی تو جانے کیسا محسوس کرتی۔

''تم بیٹھو۔ میں چائے بناتی ہوں۔'' ماہ بانو کی سوچوں سے بے خبر راحیلہ نے اس سے کہا اور وہاں موجود الیکٹرک کیٹل میں چائے کے لیے پانی ڈالنے لگی۔

''پڑھنے کے دوران اگر چائے کی طلب ہو تو میں یہیں اپنے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔ بھائی نے بھی یہی بندوبست کیا ہوا ہے۔ مجھے ڈسٹرب نہیں کرتے۔'' اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے وہ ماہ بانو کو بتانے لگی۔ وہ اس کی بات پر یونہی سر ہلا کر ٹیرس کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اس دروازے سے گزر کر ٹیرس پر جا پہنچی۔

کشادہ ٹیرس پر سے اس خوب صورت گھر کے لان کے علاوہ پڑوس کے بنگلے کا منظر بھی نظر آ رہا تھا۔ فی الحال دونوں ہی جگہیں ویران لگ رہی تھیں اور کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر اس منظر میں ایک مرد اور عورت داخل ہو گئے۔ مرد پختہ عمر کا اور کلین شیو تھا۔ اس نے چست جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اپنے لمبے بالوں کو پونی ٹیل میں قید کر رکھا تھا۔ مرد کے مقابلے میں عورت بہت کم عمر اور خوبصورت تھی۔ اس کے جسم پر جدید تراش خراش کا لباس تھا اور یہ تراش خراش اس حد تک کی گئی تھی کہ عورت کے جسم کے بیشتر اعضاء عریاں ہی نظر آ رہے تھے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وہاں موجود سیاہ رنگ کی کرولا تک پہنچے۔ باوردی ڈرائیور نے پھرتی سے پچھلی جانب کا دروازہ کھولا اور پھر خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔ مرد گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے عورت کی طرف گھوما۔ اُس کے اس طرح گھومنے سے اس کا چہرہ پوری طرح ماہ بانو کے سامنے آ گیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں شناسائی کا احساس جاگا لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا کہ اس شخص کو اس نے کہاں دیکھا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگی لیکن پھر بے ساختہ ہی چہرہ موڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مرد یک دم ہی عورت سے بغل گیر ہو گیا تھا اور اپنے لب اس کے بھرے بھرے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔ ماہ بانو نے اپنا چہرہ موڑا تو اسے اپنے برابر میں راحیلہ کھڑی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کچھ اور بھی جھینپ گئی۔

''بڑے ماڈرن ہیں تمہارے پڑوسی۔ ڈرائیور کی موجودگی کا بھی خیال نہیں۔ اگر ان صاحب کا بیوی سے رومانس کا موڈ ہو رہا تھا تو اندر سے فارغ ہو کر ہی باہر نکلتے۔'' اس نے شرمندہ لہجے میں تبصرہ کیا جس پر راحیلہ ہنس پڑی اور بولی۔



''ہائی سوسائٹی میں سب کچھ چلتا ہے ڈیئر! ویسے تمہیں کس نے کہا کہ وہ دونوں آپس میں میاں بیوی ہیں؟''

''کسی نے نہیں۔ میں نے ان کے اسٹائل سے اندازہ لگایا ہے۔ ظاہر ہے عورت اپنے شوہر سے ہی اس حد تک فری ہو سکتی ہے۔''

''لیکن پڑوس میں موجود خاتون ذرا مختلف ہیں۔ وہ اپنے ہاں آنے والے ہر بندے سے اسی طرح ملتی ہیں۔ ہر بار ان کا اسٹائل یہی ہوتا ہے لیکن ''شوہر'' بدل جاتا ہے۔'' اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے راحیلہ نے اس پر جو انکشاف کیا، اسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس انکشاف کی روشنی میں تو راحیلہ کی وہ پڑوسن خاصے مشکوک کردار کی عورت تھی۔

''تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ آج کل طوائفیں اسی طرح رہنے لگی ہیں۔ کوٹھوں کا رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوٹھیوں اور بنگلوں میں بزنس ہوتا ہے۔'' راحیلہ نے کسی پختہ کار عورت کی طرح اسے سمجھایا۔

''ہمیں کیا..... چلو اندر چل کر چائے پیتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اس موضوع پر گفتگو کو مزید جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ راحیلہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

اندر جا کر چائے پینے کے بعد وہ دونوں کمبائنڈ اسٹڈی کرتی رہیں۔ طارق کے واپس آنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ واپس آیا تو اس نے ماہ بانو کو واپس اس کے ہاسٹل چھوڑ دیا۔ ماہ بانو کے لیے یہ ایک اچھا دن تھا۔ بہت عرصے بعد اسے گھر کی چار دیواری میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ دن کا باقی بچا کھچا حصہ اپنے معمول کے مطابق گزارنے کے بعد اس نے رات کو کافی دیر سے بستر کا رخ کیا تو بھی راحیلہ کے ساتھ گزارے خوشگوار دن کی یادیں اس کے ساتھ تھیں۔

وہ حالات کی وجہ سے ایک طویل عرصہ پڑھائی سے دُور رہی تھی اس لیے اسے عام طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ وقت اور محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ اکثر وہ آدھی رات کے بعد ہی سونے کے لیے لیٹتی تھی۔ آج بھی اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ خاصی تھکن محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے تھکے ماندے ذہن میں کوئی چیز اس طرح اٹکی ہوئی تھی کہ وہ فوری طور پر سونے میں بھی ناکام تھی۔ اس کا ذہن مسلسل دن بھر کے واقعات کو دہرا رہا تھا۔

واقعات کے اس تسلسل میں راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر دیکھا جانے والا پڑوس کا منظر بھی شامل تھا۔ اس منظر کی جزئیات کو دہراتے ہوئے جیسے ہی مرد کا چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر اُبھرا، اسے اپنی نیند کے غائب ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اس کا لاشعور مسلسل اضطراب میں مبتلا رہا تھا کہ شناسا محسوس ہونے والا وہ چہرہ آخر کس کا تھا؟ اس وقت بھی وہ اس چہرے کے ایک ایک نقش کو ذہن میں دہراتے ہوئے اس کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کوشش میں جانے کیسے اس کے دماغ نے دیکھے گئے اس چہرے میں کچھ تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ اس نئے بننے والے نقش میں پہلے کچھ رنگ شامل ہوئے اور انہوں نے چہرے کو میک اپ زدہ کر کے نسوانی ٹچ دینا شروع کیا۔ پھر لباس کی تبدیلی واقع ہوئی اور جینز اور ٹی شرٹ کی جگہ ایک بھڑکیلے نسوانی لباس نے لے لی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی ماہ بانو کے اندر کوئی جھماکا سا ہوا اور وہ بے قراری ہو کر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ اس کے ذہن نے راحیلہ کے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کی تصویر کا جو تبدیل شدہ رخ دیکھا تھا، وہ سو فیصد خواجہ سراؤں کے مہا گرو سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ذہن میں شک بھی اُبھرا کہ شاید کوئی غلطی ہو رہی ہے لیکن اندر جیسے کوئی سگنل دے رہا تھا کہ وہ درست ہے۔

اس نے اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لیے پہلے ایک گلاس پانی پیا اور ایک بار پھر تجزیہ کرنے لگی۔ نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ ہاتھ میں چھرا تھامے کم سن شینا کو قربان کرتا وہ مکروہ وجود اُس کی یادداشت سے کبھی مٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے اتنی دیر بھی اس لیے لگی تھی کہ ایک خواجہ سرا اور مرد کے درمیان کی تفریق نے نظروں کو فوری طور پر بھٹکا دیا تھا لیکن اب فیصلہ ہو گیا تو اس کے لیے صبح کا انتظار کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس نے فوراً اپنے تکیے کے نیچے رکھا موبائل نکالا اور شہریار کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کراچی آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہریار سے رابطہ کر رہی تھی ورنہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ خود سے اسے فون کر لے۔ کبھی دل بہت ہی خواہش کرتا، تب بھی وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروا لیتی لیکن اب تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ وہ جس شخص کے بارے میں اطلاع دینے جا رہی تھی، اس سے زیادہ وہ شہریار کو مطلوب تھا۔ اس شخص نے اس کی پیاری بھتیجی کو قتل کیا تھا اور یقیناً وہ اس سفاک قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا۔ شہریار اس کا محسن تھا اور اپنے محسن کے کسی کام آنے کا اسے پہلی بار موقع مل رہا تھا تو وہ کسی صورت تاخیر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نمبر ملایا تو تیسری بیل پر دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

''خیریت تو ہے مہرین! تم نے اتنی رات کو کیسے فون کیا ہے؟'' وہ اس کا فون آنے پر یقیناً پریشان ہوا تھا اور احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کرنے کے بجائے تبدیل شدہ نام سے پکارا تھا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں لیکن آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتی تھی اس لیے بے وقت زحمت دی۔''

''کیسی اطلاع'' شہریار اگرچہ چند لمحوں میں ہی بہت سے واہموں اور خدشات سے گزر گیا تھا کہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ بہرحال اس نے ماہ بانو کو ٹوکا نہیں اور پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''آج میں نے شینا کے قاتل کو دیکھا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سو فیصد وہی ہے۔'' وہ گویا اسے تفصیل بتانے سے قبل ہی باور کروا دینا چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔

''تم نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے؟ مجھے پوری تفصیل سے بتاؤ۔'' اطلاع ایسی تھی کہ شہریار بھی ہل کر رہ گیا اور اس نے بہ مشکل خود پر قابو رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

جواباً ماہ بانو نے اسے راحیلہ سے ہونے والی تازہ دوستی، اس کے گھر جانے اور وہاں سے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کے بارے میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''تمہاری دوست کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟'' ساری تفصیل سننے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''وہ کلفٹن کے علاقے میں رہتی ہے لیکن میں اس کا بنگلہ نمبر وغیرہ نوٹ نہیں کر سکی۔'' ماہ بانو نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

''کل تم اس لڑکی سے ملنا تو کسی بہانے اس سے اس کا ایڈریس لے کر مجھے ایس ایم ایس کر دینا۔ باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔ تمہیں مزید پریشان ہونے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔'' آخری جملہ اس نے ماہ بانو کی تسلی کے لیے کہا تھا جسے سن کر وہ واقعی پُرسکون ہو گئی۔ فون بند کرتے ہی نیند کی دیوی فوراً ہی اس پر مہربان ہو گئی اور وہ اس دیوی کی بانہوں میں آرام سے سو گئی۔

لیکن دوسری طرف شہریار کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ اسے اپنے خاندان کو کبھی نہ بھرنے والا زخم دینے والے شخص کے متعلق اطلاع ملی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر اب وہ سکون سے سو سکتا، یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ رات کا باقی ماندہ حصہ اس نے بہت بے چینی کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے گزارا۔ اب اس کے



لیے یہاں رُکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اسے ہر صورت شینا کے قاتل تک پہنچنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آخر تم آ ہی گئیں۔ لیکن سچ کہوں تو بڑا تڑپانے اور انتظار کروانے کے بعد آئی ہو۔'' چودھری نے اپنے سامنے کھڑی لِنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی سریلی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ وہ ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔

''خاص چیزوں اور لوگوں کے لیے تو ہمیشہ انتظار ہی کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ بھی تم نے صحیح کہا لیکن کچھ تو سامنے والے کی چاہت کا بھی خیال کرنا چاہیے۔'' چودھری نے اس سے شکوہ کیا۔

''آپ کی چاہت کا ہی تو خیال تھا چودھری صاحب! جو میں ان حالات میں بھی آپ سے ملنے چلی آئی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ رِسک ہرگز نہیں لیتا۔''

''کیا مطلب؟..... کیسا رِسک؟'' چودھری اس کی بات سن کر چونکا۔

''آپ کے خیال میں یہاں کے حالات مجھ سے چھپے ہوئے ہیں..... میں کچھ جانتی نہیں ہوں؟'' لِنڈا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تمہارا اشارہ کن حالات کی طرف ہے؟'' چودھری کچھ اُلجھ سا گیا۔ ویسے سابقہ تجربے سے وہ یہ تو جان گیا تھا کہ لِنڈا اور ڈیوڈ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ وہ کسی ایسے نیٹ ورک سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے کسی بھی طرح کی معلومات حاصل کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کی ڈیوڈ سے پہلی ملاقات ہی ان حالات میں ہوئی تھی کہ وہ اس کی ماہ بانو میں دلچسپی اور اس کے فرار سے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ دوسری بار ان لوگوں نے اسے یہ بتا کر چونکایا تھا کہ وہ کشور کے حویلی سے فرار سے واقف ہیں۔ انہی لوگوں نے اسے افضل کا اتا پتہ بھی دیا تھا لیکن بدقسمتی سے افضل اپنی پرانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا اور چودھری کے بندے اس سے آفتاب کا پتہ معلوم نہیں کر سکے۔

اپنے ان تجربات کی روشنی میں چودھری کو یقین تھا کہ لِنڈا اگر یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ پیر آباد کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے تو اس دعوے میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا اشارہ خاص طور پر کن حالات کی طرف ہے۔ وہ تو آج کل ہر طرف سے ہی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف اس کے گودام میں آگ لگا کر بالے کو اس حد تک مارا پیٹا گیا تھا کہ دوبارہ اس کے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا امکان کم ہی تھا..... تو دوسری طرف اسے کشور کی تلاش میں ناکامی کا سامنا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کے بعد بھی اس کے کارندے صرف اس ہسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے جہاں کشور اور آفتاب زیرِ علاج رہے تھے۔ وہ ہسپتال سے کب اور کہاں گئے، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اور ان حالات نے چودھری کو صحیح معنوں میں زِچ کر رکھا تھا۔ آج کل وہ بری طرح بلبلایا ہوا تھا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور وخوض میں مشغول تھا۔

ان حالات میں اسے لِنڈا کی کال موصول ہوئی کہ وہ پیر آباد آنے کے لیے لاہور سے روانہ ہو چکی ہے تو اس نے فوراً سے پیشتر اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منشی اور ایک ڈرائیور حویلی کی سب سے شاندار گاڑی میں اسے ریسیو کرنے کے لیے گئے اور اسے پیر آباد پہنچنے سے قبل ہی اس شان دار گاڑی میں منتقل

کروالیا۔ لنڈا کو فی الحال حویلی ہی لایا گیا تھا اور اس کی رہائش کا بھی یہیں بندوبست کیا گیا تھا کیونکہ چودھری اسے اپنی معزز مہمان باور کرانا چاہتا تھا۔ براہِ راست ڈیرے پر وہ عورتیں لائی جاتی تھیں جو پیشہ ور ہوتی تھیں۔ لیکن لنڈا کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ وہ اپنی خدمات کا معاوضہ کس شکل میں وصول کرے گی، مستفید ہونے والا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ بظاہر تو وہ دوست بن کر ہی سامنے والے کو اپنی قربت سے نوازتی تھی لیکن وہ قیمت وصول ضرور کرے گی، یہ بات چودھری بھی اب سمجھنے لگا تھا۔ وہ لنڈا کی سحر انگیز قربت کے لیے ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کو تیار بھی تھا۔ لیکن اس بار وہ اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے بھی اس نے اسے حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ حویلی میں بیویوں کی موجودگی میں اسے خود پر کنٹرول رکھنے میں کچھ آسانی رہتی۔ بعد میں معاملہ سیٹ ہونے پر ڈیرے پر جا کر گل چھرّے اُڑائے جا سکتے تھے۔ لیکن لنڈا نے تو آتے کے ساتھ ہی اُسے اُلجھا دیا تھا۔ وہ صاف طور پر اس پر احسان جتا رہی تھی کہ وہ حالات کی خرابی کے باوجود اس سے ملنے کے لیے آ گئی ہے۔

''وہی حالات جن میں آپ کے لیے اپنی مال و عزت کی حفاظت کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ جان کا خطرہ بھی یقیناً ہو گا لیکن فی الحال تو بے چارے ملازموں کی ہی شامت آئی ہوئی ہے۔ ملازموں کے بعد آپ کے دشمن کب مہمانوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیں، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا۔ لیکن دیکھ لیں، ہم پھر بھی ہمت کر کے آپ کی محبت میں یہاں تک کھنچے چلے آئے ہیں۔'' ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے چودھری پر طنز کے تیر چلائے اور خود ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کچھ اس انداز سے بیٹھ گئی کہ پہلے ہی اسکرٹ سے نیچے اپنی رعنائی دکھاتی اس کی لمبی سڈول ٹانگوں کی خوب صورتی کچھ اور بھی عیاں ہو گئی۔ چودھری کو اس کے طنزیہ جملوں نے بلبلا کر نہ رکھ دیا ہوتا تو وہ سیدھا جا کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتا۔

''تم نے چند چھوٹے موٹے واقعات سے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں اگر چپ ہوں تو صرف مصلحتاً۔ تم نے اور ڈیوڈ نے خود مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اے سی شہریار کے خلاف کچھ نہیں کیا جائے۔ تم لوگوں کے کہنے پر ہی مجھے اچھا بھلا اپنے قبضے میں موجود اے سی کو رہا کرنا پڑا تھا ورنہ تو میں اس کل کے چھوکرے کا دماغ درست کر دیتا۔ اب بھی میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی شہ پر ہو رہا ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن صرف اس لیے چپ ہوں کہ میرا جوابی ردِعمل تمہارے پروجیکٹ کو نقصان نہ پہنچا دے۔'' تیوریاں چڑھا کر اس نے لنڈا کی بات کا ذرا سختی سے جواب دیا

''آپ تو برا ہی مان گئے چودھری صاحب! میرا مقصد آپ کی بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ لیں یہ پیجئے۔ آپ کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' لنڈا کے ہونٹوں پر وہی بجلی کوندنے جیسی مسکراہٹ چمکی اور وہ اپنی خاطر کے لیے سامنے رکھی جانے والی شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل سے جام بھر کر بہ نفسِ نفیس خود چودھری کے ہونٹوں سے لگانے کے لیے اس کے پہلو میں پہنچ گئی۔ یہ ون ٹو ون ملاقات تھی جس میں ملازموں اور مکینوں سمیت کسی کو بھی بلا اجازت اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

''غیرت کے معاملے میں ہم لوگ بہت نازک مزاج ہوتے ہیں۔ اس لیے آئندہ ایسی کوئی بات کرنے سے پہلے سوچ لینا۔ ہماری غیرت پر حملہ کرنے والے کو جلد یا بہ دیر اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ میرے جو دشمن ابھی میری پہنچ سے دُور ہیں، وہ ہمیشہ دُور نہیں رہیں گے۔ میں جلد ان کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ رہا تمہارے تحفظ کا معاملہ تو بے فکر رہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' چودھری کو اس کی قربت نے کافی حد تک پگھلا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے دو گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ کافی حد تک سنبھلا ہوا تھا



لیکن لفظوں کی سختی برقرار تھی۔

''سوری ڈارلنگ! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔'' لنڈا کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ چودھری کی دھمکیوں میں آتی لیکن مصلحتاً اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ ویسے بھی اس کا مقصد تو صرف چودھری پر اس کی پوزیشن واضح کرنا تھا، سو وہ کام ہو چکا تھا۔ اوپر سے چودھری کتنا ہی غصہ دکھا لیتا، حقیقت تو بہر حال نہیں بدل سکتی تھی۔

''اوکے، اب تم ایسا کرو کہ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر ہم لنچ پر دوبارہ ملتے ہیں۔'' اس کے بالکل اپنے پہلو میں بیٹھے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چودھری نے اس کا ایک بوسہ لیا اور بولا۔

''آرام تو میں لنچ کے بعد بھی کر لوں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ کام کی کیا پوزیشن ہے؟ ہم بہت زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں جلد از جلد نتائج درکار ہیں۔'' وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی عورت تھی، پل میں چودھری کو اس کے رومینٹک موڈ سے نکال کر کام کی بات پر لے آئی۔

''کام شروع ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے بندے مہیا کر دیئے ہیں۔ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری بھی تم لوگوں کے دعوے کے مطابق تعاون کر رہا ہے بلکہ سارا کام اصل میں اس کے مشوروں کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ یقیناً اسے بھی تم لوگوں نے بڑی قیمت ادا کی ہو گی۔'' رپورٹ دیتے دیتے آخر میں چودھری نے خیال آرائی کی۔

''اُسے تعاون کرنا ہی تھا۔ اسی تعاون کے لیے تو اُس کا یہاں ٹرانسفر کروایا گیا ہے۔'' لنڈا نے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، وہ شروع ہی سے تمہارا آدمی ہے؟'' چودھری چونکا۔

''یقیناً وہ ہمارا ہی آدمی ہے۔ آپ کے لیے مشورہ ہے کہ اسے اپنے پچھلے دھندوں کے لیے اُکسانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ وہ پچھلے فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کی طرح آپ کا ساتھ ہرگز نہیں دے گا کیونکہ اسے ہماری طرف سے اجازت نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنگل کا سارا انتظام ظاہری طور پر اتنے شفاف طریقے سے چلتا رہے کہ انتظامیہ مکمل طور پر بے فکر ہو جائے۔ اگر کھالوں اور درختوں کی چوری چکاری کا سلسلہ جاری رہا تو ہمارے پروجیکٹ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور ہم ایسا ہرگز نہیں چاہتے۔ اے سی شہریار کو عابد انصاری کافی حد تک مطمئن کر چکا ہے۔ اگر آپ ہماری طرف سے ملنے والے معاوضے پر، جو بہر حال بہت زیادہ ہے، اکتفا کریں تو آگے بھی حالات ہمارے لیے سازگار رہیں گے۔'' لنڈا کا یہ تنبیہہ کرتا ہوا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ بہر حال باس وہی ہے اور چودھری حسبِ روایت اس معاملے میں اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ چودھری نے کوشش تو کی تھی کہ عابد انصاری کے ساتھ بھی اقبال باجوہ کی طرح معاملات طے کر سکے لیکن عابد انصاری اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کی وجہ یقینی طور پر یہی تھی کہ وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کا مکمل وفادار تھا۔

''مجھے تمہارا مطالبہ قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بدلے میں رقم کی فراہمی کے سوا بھی تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو۔ ماہ بانو کے لیے تم لوگوں نے وعدہ کیا تھا چنانچہ وہ مجھے ملنی ہی چاہئے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی باغی بیٹی اور اس کو ورغلانے والے ماسٹر کا پتہ بھی چاہئے۔ میرا یہ کام ہو گیا تو میں سکون سے تم لوگوں کا ساتھ دے سکوں گا ورنہ میری یہ اُلجھنیں تمہارے لیے بھی مشکل کا باعث بنیں گی۔'' چودھری اپنے ان مطالبات کے بارے میں پہلے ہی سوچ کر بیٹھا ہوا تھا، چنانچہ موقع ملتے ہی فوراً ہی اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔

ماہ بانو کے معاملے میں ہم آپ سے صرف معذرت ہی کر سکتے ہیں۔ وہ لڑکی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے اس لیے اس کا آپ تک پہنچنا بھی ممکن نہیں۔ اپنے وعدے کو پورا نہ کرنے کی تلافی کے طور پر ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ کے معاوضے میں مزید کچھ اضافہ کر دیں۔ رہا آپ کی بیٹی کی تلاش کا سوال تو میں دیکھوں گی کہ اس سلسلے میں آپ سے کتنا تعاون کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، یہ ہمارے کیلبر کا کام نہیں ہے کہ ہم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو تلاش کر کے ان کے ماں باپ تک پہنچائیں۔ آپ سے خصوصی تعلقات کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ بہرحال کر ہی دیا جائے گا۔'' وہ جو تھوڑی دیر پہلے اس کے غصے میں آ جانے پر اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھی، ایک بار پھر اسی لب و لہجے پر اُتر آئی لیکن اس بار چودھری کی ہمت نہیں ہو سکی کہ اپنے غصے کا اظہار کر سکے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس قبیل کی فرد نہیں جو اس کے غصے کو خاطر میں لائے۔ وہ تو اس کے ملک کے حکمرانوں پر بھی حکمرانی کرنے والوں میں سے تعلق رکھتی تھی چنانچہ وہ کتنا بھی زور آور سہی، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ غلام بن کر جو کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ حاصل کر لے اور غلامی کا سب سے سنہری اصول زبان بندی تھا..... چنانچہ اس نے بھی اس بار زبان نہیں کھولی۔

''کسی ملازم سے کہیں کہ مجھے میرا کمرہ دکھا دیں۔ میں لنچ سے پہلے فریش ہونا چاہتی ہوں۔'' اس کے پہلو سے اُٹھتے ہوئے لِنڈا نے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں، میں ابھی کسی کو بلاتا ہوں۔'' چودھری نے فوراً گھنٹی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''کل صبح تیاری رکھیے گا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے میں جلد از جلد اب تک کے کام کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔'' چودھری کی انگلی کے دباؤ سے باہر بجنے والی گھنٹی کے ردِعمل میں کوئی ملازم اندر داخل ہوتا، اس سے قبل لِنڈا نے ایک اور حکم جاری کیا۔

''اوکے! میں انتظامات کر لوں گا۔'' چودھری نے اتنی فرماں برداری کا مظاہرہ کبھی اپنے باپ کے سامنے بھی نہیں کیا ہوگا جتنا لِنڈا کے سامنے کر رہا تھا۔

''میڈم کو ان کے کمرے تک لے جاؤ۔'' ملازم اندر آیا تو چودھری نے اسے حکم دیا۔ ملازم تابعداری کی تصویر بنا فوراً لِنڈا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس کی راہنمائی میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی۔

''بچ.....'' اُس کے عقب میں چودھری نے زیرِلب گالی دی۔ اب تک وہ لِنڈا سے بہ زبان انگریزی ہی گفتگو کرتا رہا تھا، شاید اسی لیے گالی دینے کے لیے بھی اسی زبان کا انتخاب کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''ویلکم مائی ڈیئر فرینڈ! تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، میں بتا نہیں سکتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے گھر والوں کو بھی تمہاری آمد کے بارے میں بتاتا اور وہ لوگ بھی تمہارے استقبال کے لیے اس وقت یہاں موجود ہوتے۔''

وہ جیسے ہی ارائیول لاؤنج میں پہنچا، وہاں منتظر کھڑے اس کے دیرینہ دوست زبیر نے اسے گرم جوشی سے گلے لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا شکوہ بھی کیا۔

چند سال قبل زبیر لاہور میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اس نے اور شہریار نے ساتھ ہی گریجویشن کیا تھا۔ گریجویشن کے بعد زبیر نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور شہریار سول سروسز کی طرف چلا گیا لیکن ان دونوں کی دوستی بہرحال برقرار رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ لیکن پھر زبیر کو ایم بی اے



کے دوران ہی کراچی شفٹ ہونا پڑا۔ شفٹنگ کی وجہ اس کے تایا کو ہونے والا شدید ہارٹ اٹیک تھا۔ تایا کی اکلوتی بیٹی سے زبیر کا رشتہ طے تھا اور تایا چاہتے تھے کہ زبیر فوری طور پر ان کی بیٹی سے شادی کرے، ان کا کاروبار سنبھال لے۔

اس موقع پر زبیر کے والد نے بھی اپنے بڑے بھائی کا ساتھ دیا۔ چنانچہ زبیر جو لاہور چھوڑتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا، بزرگوں کے اس فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کا یہ فیصلہ اس حساب سے معقول ثابت ہوا کہ اس کے تایا شادی کے محض ایک ہفتے بعد ہی دنیا سے چل بسے اور وہ مرتے ہوئے تایا کی آخری خواہش پوری نہ کرنے کی خلش سے بچ گیا۔ بعد میں اس کے والد نے بھی آہستہ آہستہ اپنا کاروبار کراچی منتقل کر لیا اور وہ سب مل کر ایک جگہ رہنے لگے۔ اس دوران زبیر کو گھر داماد بننے کا جو تھوڑا بہت قلق تھا، وہ بھی دور ہو گیا اور وہ ایک مطمئن زندگی گزارنے لگا۔

شہریار سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار لاہور جانے پر شہریار سمیت دیگر دوستوں کے ساتھ ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور وہ محفل جما کر پچھلی یادوں کو تازہ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن طالب علمی کے دور سے نکل کر عملی میدان میں آنے کے بعد سے یہ سلسلہ ذرا موقوف ہو گیا تھا چنانچہ جب شہریار نے زبیر کو یہ اطلاع دی کہ وہ کراچی آ رہا ہے تو زبیر کِھل اُٹھا۔ لیکن اس کی طرف سے لگائی گئی اس قدغن کی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کی کراچی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ اس وقت بھی اس نے اسی حوالے سے شہریار سے شکوہ کیا تھا۔

''ناراض مت ہو یار! تم جانتے ہو کہ مجھے خود بھی تمہارے گھر والوں سے مل کر ہمیشہ بہت خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن اس وقت میں کچھ ایسی نوعیت کے کام سے یہاں آیا ہوں کہ اپنی آمد سے متعلق کم سے کم لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے پی اے تک کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اسے بھی یہی علم ہے کہ میں لاہور اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا ہوں اور ان کے ساتھ چند دن گزار کر واپس آ جاؤں گا۔''

اس نے زبیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کا چھوٹا سا سفری بیگ جس میں ضرورت کی بس چند بہت ہی اہم اشیاء موجود تھیں، زبیر نے اس سے لے کر پہلے ہی اپنے شانے پر لٹکا لیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کسی بہت ہی خفیہ کام سے یہاں آئے ہو۔ لیکن یار! تم کوئی انٹیلی جنس کے بندے تو نہیں ہو کہ تمہیں اس نوعیت کے کام کرنے پڑیں۔'' اس کی معذرت کو قبول کرتے ہوئے زبیر نے نقطۂ اعتراض اُٹھایا۔

''میں محکمہ جاتی کام سے آیا بھی نہیں ہوں۔ یہ ذرا نجی نوعیت کا کام ہے لیکن ہے بہرحال ملکی مفاد میں۔ مجھے یہاں رہ کر کچھ ملک دشمن عناصر کے خلاف کارروائی کرنی ہے۔ لیکن اس طرح کہ کسی کو علم نہ ہو سکے۔ تم پر مجھے بہت اعتماد ہے اس لیے میں نے تمہیں اتنی تفصیل بتا دی ہے۔ اس سے زیادہ مزید تفصیل کچھ نہیں بتا سکوں گا اور تم پوچھنا بھی مت۔'' زبیر کی تسلی کے لیے اسے تھوڑا سا بریف کرنے کے ساتھ ہی اس نے آخر میں اسے تاکید کی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے میں تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جو بھی کرو، بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ تمہاری ایڈونچرس فطرت سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن اب طالب علمی کا دور نہیں رہا ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے جذبات میں کسی بھی معاملے میں انوالو ہو جاؤ۔ تم ایک حساس نوعیت کی پوسٹ پر کام کر رہے ہو اور تمہاری کوئی

بھی غلطی تمہارے کیریئر اور خاندان کی عزت کے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔'' اب وہ لوگ پارکنگ میں کھڑی زبیر کی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح شہریار کو مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

''تم مجھے جانتے ہو کہ میں غلط کام نہیں کرتا۔ ہاں، غلط کام کرنے والوں کو روکنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں اس لیے بالفرض اگر کوئی ایشو کھڑا بھی ہوا تو اس سے صرف میرے کیریئر کو نقصان پہنچے گا۔ خاندان کی عزت کو بہرحال کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' شہریار نے اپنے مخصوص نپے تلے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''چل بھائی! اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ تُو سب کچھ ٹھان کر آیا ہے۔ اب مجھے بتا دو کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ گھر والوں سے تم اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتے ہو اس لیے میرے ساتھ یقیناً گھر تو چلنا پسند نہیں کرو گے۔ تمہارے کام کی نوعیت کے اعتبار سے کون سی جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی، یہ تم خود بتا دو تاکہ میں اسی حساب سے بندوبست کر دوں؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے زبیر نے اس سے دریافت کیا۔

''کوئی بھی ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں میرا زیادہ لوگوں سے واسطہ نہ پڑے اور میری سرگرمیاں کسی کے علم میں نہ آسکیں۔'' شہریار نے اسے اپنی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا۔

''میرے پاس اس طرح کی دو جگہیں ہیں۔ ایک تو کلفٹن کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ ہے۔ جس پروجیکٹ میں، میں نے اپنا یہ اپارٹمنٹ لیا ہے وہ ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا اس لیے چند ایک کے سوا ابھی زیادہ تر اپارٹمنٹس خالی پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی فی الحال کسی کرائے دار کو نہیں رکھا ہے کہ خوامخواہ کا جھنجٹ ہوگا۔ دوسرا میرا ایک بنگلہ ہے جسے ہفتے بھر پہلے ہی کرائے دار خالی کر کے گئے ہیں اور فی الحال وہاں صرف ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ اب تم دونوں میں سے جس جگہ رہنا پسند کرو، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔'' زبیر نے اسے تفصیلات بتاتے ہوئے اس کی پسند پوچھی۔

''تمہارا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں ہے، چوکیدار تو وہاں بھی ہوگا۔'' شہریار نے کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے ضروری معلومات حاصل کرنا مناسب سمجھا۔

''وہاں تو بہ یک وقت چار چار چوکیدار ہوتے ہیں۔ دو بلڈنگ کے اگلے گیٹ پر ڈیوٹی دیتے ہیں اور دو پچھلے گیٹ پر تاکہ اگر ایک کو کسی ضرورت کے تحت گیٹ چھوڑنا بھی پڑے تو دوسرا وہاں موجود رہے۔ سکیورٹی کا بہت اچھا انتظام ہے وہاں۔'' زبیر نے اسے بتایا۔

''اس صورت میں وہاں کسی کی آمدورفت کا چھپا رہنا ممکن نہیں۔ میرے لیے تمہارا بنگلہ مناسب رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ وہاں موجود چوکیدار کو ایک ہفتے کی چھٹی دے دو۔'' شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن کسی ملازم کے نہ ہونے کی صورت میں تمہیں پریشانی ہوگی۔ خالی بنگلے میں کون تمہارے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھے گا؟'' زبیر ذرا پریشان ہوا۔

''لیو اِٹ یار! میں یہاں کسی تفریحی دورے پر نہیں آیا ہوں کہ ہر طرح کی سہولیات کے ساتھ رہنا ضروری سمجھوں۔ اس وقت میری سب سے اہم ضرورت پرائیویسی ہے اور اس حساب سے تمہارا بنگلہ بہت مناسب ہے۔''

''اوکے۔ پھر میں چوکیدار کو ابھی فون کر کے کہہ دیتا ہوں کہ وہ آدھے گھنٹے میں چھٹی پر جانے کی تیاری کر لے۔ اس دوران ہم دونوں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کر لیتے ہیں۔'' اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے زبیر اس سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس بار شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی



رضامندی کو محسوس کرتے ہوئے زبیر نے پہلے چوکیدار کو فون کر کے احکامات جاری کیے پھر گاڑی کا رخ ایک ریسٹورنٹ کی طرف کر لیا۔

ریسٹورنٹ کی پُرسکون فضا میں مزے دار سے لنچ کا لطف اٹھاتے دونوں دوست ماضی کی خوشگوار یادوں کو دہراتے رہے۔ ان باتوں کے دوران ایک گھنٹہ کیسے گزر گیا، معلوم بھی نہیں ہوا۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل کر زبیر کے خالی بنگلے تک پہنچے تو پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔

''میں اپنی یہ گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ تمہیں آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ میں ٹیکسی کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ پھر شام میں کسی وقت چکر لگاؤں گا تاکہ تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ لا سکوں۔''

اس کو بنگلے پر پہنچا کر رخصت ہونے سے قبل زبیر نے گاڑی کی چابی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ کافی سنجیدہ تھا اور اب اس کے انداز میں وہ جوش و خروش نظر نہیں آ رہا تھا جس کا اس نے ایئرپورٹ پر شہریار کو دیکھنے کے بعد مظاہرہ کیا تھا۔

''میرے خیال میں تم یہ زحمت نہ کرو۔ میں شاید ہی شام کو تم سے مل پاؤں گا بلکہ کسی بھی وقت کے لیے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب میں فارغ ہوں تو خود تمہیں فون کر کے انفارم کر دوں۔ میرے کھانے پینے کے سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی کچھ نہ کچھ ارینج کر لوں گا۔ میری سب سے بڑی ضرورت ایک محفوظ رہائش گاہ تھی اور وہ تم مجھے فراہم کر چکے ہو۔''

''اوکے..... ایز یو وِش۔'' اس بار زبیر نے ذرا بھی بحث نہیں کی اور اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''برا مت ماننا یار! میں تمہیں نظرانداز نہیں کر رہا ہوں، بس کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں خود مجبور ہوں۔'' شہریار نے اس کے ہاتھ کو ذرا زور سے دباتے ہوئے اس کی دل جوئی کے لیے وضاحت کی۔

''پاگل ہو گئے ہو جو اس طرح کی بات کر رہے ہو۔ میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جو ذرا سی بات کا برا مان جاؤں گا؟ میں تمہاری فطرت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لیے تمہارے متعلق کچھ غلط سلط سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے اس رویے کے پیچھے کوئی بہت ہی خاص وجہ ہوگی اس لیے کسی قسم کی بدگمانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی ہے کہ تم یہاں کراچی میں رہو گے اور پھر بھی ہماری محفلیں نہیں جم سکیں گی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی! تو ہم پھر دوبارہ کسی اچھے ماحول میں فراغت سے ملیں گے۔ تم بے فکری سے یہاں رہ کر اپنا کام کرو اور اگر کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت پیش آئے تو مجھے بتا دینا۔ مجھے تمہارے کام آ کر خوشی ہوگی۔'' زبیر نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''تھینک یُو دوست! تم نے میرے دل سے بوجھ اُتار دیا۔ ورنہ میں تمہاری دل آزاری کا سوچ کر بہت گھبرا رہا تھا۔'' شہریار بے ساختہ ہی اس سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کا یہ بے تکلف اظہارِ محبت بس چند لوگوں تک ہی محدود تھا ورنہ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کے مطابق وہ زیادہ تر اپنے خول میں ہی بند رہتا تھا۔ شاید اسی تربیت کا اثر تھا کہ وہ محبت کے مسلسل اپنے دل پر دستک دینے کے باوجود ابھی تک انجان بنا بیٹھا تھا اور مستقل اس دستک کو نظرانداز کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر اب میں چلتا ہوں۔'' دوستوں کے درمیان وہ جذباتی سا لمحہ گزر گیا تو زبیر نے اس سے اجازت لی اور ہاتھ ہلاتا ہوا بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار نے بھی اس کمرے کا

رخ کیا جس کے بارے میں زبیر نے نشاندہی کی تھی کہ وہ اسے اپنے بیڈ روم کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ بنگلہ چونکہ مکمل فرنشڈ حالت میں کرائے پر دیا جاتا تھا اس لیے وہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔ شہریار نے اپنے سفری بیگ سے لباس نکالتے ہوئے فریش ہونے کے خیال سے واش روم کا رخ کیا۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کررہا تھا۔ اس لائحہ عمل کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن بار بار کلفٹن کے اس گھر کا ایڈریس بھی دہرا رہا تھا جو ماہ بانو نے اس کے کہنے پر ایس ایم ایس کی شکل میں اسے بھیجا تھا۔

⊛-----✪-----⊛

''لو، اب یہ دہی پھینٹ کر سالن میں شامل کردو اور پھر پتیلی پر ڈھکن ڈھانپ کر چولہے کی آنچ ہلکی کر دو۔ سات آٹھ منٹ بعد تمہارا سالن بالکل تیار ہوگا۔ کھانا نکالتے وقت اوپر سے ڈش میں ہرا دھنیا چھڑک دینا۔ سالن کی خوشبو اور رونق دونوں بڑھ جائیں گی۔'' اس کے ہاتھ میں دہی کا پیالہ پکڑاتے ہوئے خالہ نے ہدایات جاری کیں۔

کشور نے خود ہی ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے کھانا پکانا سکھا دیں۔ ڈھیروں ملازماؤں کے جھرمٹ میں رہتے اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ باورچی خانے کا رخ کرتی۔ ہر ٹائم کا کھانا پکا پکایا سامنے آجاتا اور کھا لیا جاتا۔ اب اسے آفتاب کے ساتھ زندگی گزارنی تھی اور ظاہر ہے یہ زندگی حویلی جیسے شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ تو گزر نہیں سکتی تھی۔ پھر خود اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنے محبوب شوہر کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے۔ لیکن اس کی کوکنگ محض چائے بنا لینے تک محدود تھی چنانچہ آج کل خالہ کی زیرنگرانی اس کی ٹریننگ جاری تھی۔ آفتاب بھی اب اپنا زیادہ وقت لکھنے لکھانے کو دے رہا تھا، اس لیے وہ اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے زیادہ تر وقت خالہ کے ساتھ ہی بتانے لگی تھی۔ برسوں سے تنہائی کا شکار خالہ اس کا ساتھ پا کر خوش تھیں۔ کشور کی صورت میں گویا انہیں بیٹی مل گئی تھی جس کے ساتھ ان کا وقت بھی اچھا گزر جاتا تھا اور وہ بیٹی کی تربیت کا شوق بھی پورا کرلیتی تھیں۔ کشور کو خود بھی یہ مہربان خاتون بہت پسند آئی تھیں چنانچہ دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ خوب گزر رہی تھی۔

''یہاں سے جانے کے بعد میں آپ کو بہت یاد کروں گی خالہ! آپ بہت پیاری خاتون ہیں۔ آپ سے مل کر دل چاہتا ہے کہ کاش آپ میری ماں ہوتیں۔'' کشور نے ان کی ہدایات پر عمل کیا اور باورچی خانے میں رکھے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ شوق شوق میں وہ گھریلو کام کاج میں شامل تو ہو جاتی تھی لیکن ایک طرف عادت نہیں تھی اور دوسری طرف اس کی حالت بھی کچھ ایسی تھی کہ ذرا دیر میں ہی تھکن محسوس کرنے لگتی۔ اس وقت بھی اسے اپنا بی پی اچھا خاصا لو محسوس ہو رہا تھا اس لیے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''تم چاہو تو مجھے اپنی ماں سمجھ سکتی ہو لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہ یہاں سے جانے کا خیال تمہارے دل میں کیوں آیا؟ بابر نے تو کہا تھا کہ تم دونوں اب یہیں میرے پاس رہو گے۔'' وہ اس سے باز پرس کرتے ہوئے فریج سے سیب نکالنے لگیں۔

''ہم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتے نا! آپ کی زندگی ہمارے رہنے سے ڈسٹرب ہوتی ہوگی۔ اگر آفتاب کی ٹانگ کا مسئلہ نہیں ہوتا تو ہم اب تک اپنی شفٹنگ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرچکے ہوتے۔''

''تو یہ کہو کہ مجبوری میں یہاں رہ رہی ہو اور ابھی جو تھوڑی دیر پہلے اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا، وہ بس یونہی تھا۔'' وہ اس سے ناراض ہوچکی تھیں اور اس ناراض ناراض سی کیفیت میں ہی ڈھلے ہوئے سیبوں کے ٹکڑے



کاٹ کاٹ کر جوسر مشین میں ڈالتی جارہی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے خالہ! لیکن انسان کو بہت کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص پر تو خیر کوئی شک نہیں۔ لیکن بدر تو اس طرح اچانک ہمارے اپنے گھر میں آکر بیٹھ جانے کو محسوس کرتا ہوگا۔ نوجوان نسل کہاں پسند کرتی ہے کہ کوئی ان کی پرائیویسی میں دخل انداز ہو۔ اور ہم نے تو ایک طرح سے آپ کے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔'' کشور فوراً ہی انہیں وضاحت دینے لگی۔

''اُس نالائق کا ذکر نہ کرو۔ اُسے ماں کا خیال ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ دیکھا نہیں ہے تم نے کہ کیسے رات گئے تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو واپس ہی نہیں آتا۔ میں اکیلی بوڑھی عورت ہر وقت اس کی راہ تکتی رہتی ہوں۔ نہ اسے میرا خیال ہے، نہ اپنے مستقبل کی فکر۔ اب بھلا بتاؤ کہ جس شخص کو گھر میں رہنا ہی نہیں ہوتا، اسے کیا غرض کہ گھر میں کون رہتا ہے اور کون نہیں۔''

خالہ کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت نہیں روکی تھی چنانچہ بات کے اختتام پر سیب کے جوس سے بھرا ہوا گلاس انہوں نے کشور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جب سے یہاں رہ رہی تھی، خالہ اسی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں۔

''بدر ایسا کیوں ہے خالہ؟'' اس نے ان سے سوال کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ بدصورت منظر آگیا جب بدر نے اس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔

''یہ شروع سے ایسا نہیں ہے۔ پہلے تو اچھا خاصا پڑھنے لکھنے والا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ اس کے میٹرک کرتے ہی اس کے ابا کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جانے سے ہمیں مالی پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی لیکن بدر کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے ابا اچھے عہدے پر تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی دکانیں اور دو مکانات تھے جو انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ کرائے کی مد میں ہمیں ٹھیک ٹھاک رقم مل جاتی تھی۔ میری عدت کی مدت میں بدر ہی ان کرائے داروں سے لین دین کرنے لگا۔ کرائے داروں میں سے ایک شخص نے جس کے پاس ہماری چار دکانیں تھیں، بدر کو بھٹکانا شروع کردیا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ کب بدر پڑھائی سے دھیان ہٹا کر اُلٹے سیدھے دھندوں میں دلچسپی لینے لگا۔ جب معلوم ہوا تو پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ یہاں اسلام آباد میں میرا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں تھا جس سے میں مدد کے لیے درخواست کرتی۔ ویسے بھی مجھے شرم آتی تھی کہ اپنی اولاد کی خامیاں کسی کے سامنے بیان کروں۔ میں اپنے طور پر ہی اسے سدھارنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بھلا اکیلی عورت دنیا کی چالبازیوں کا مقابلہ کیا کرپاتی؟ یوں میرا بچہ مکمل طور پر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دکانیں اس نے اونے پونے داموں بیچ ڈالیں بلکہ بیچی بھی کیا، اسی منحوس کرائے دار نے چالاکی سے اپنے نام لکھوا لیں۔ اب مکانوں کے کرائے اور تمہارے خالو کی پنشن سے گھر کا خرچہ چلتا ہے۔ مالی پریشانی تو خیر اب بھی نہیں ہے لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کی برباد زندگی دیکھ کر کڑھتی رہتی ہوں۔ مفاد پرستوں نے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اچھے بھلے لڑکے کو تباہ کردیا۔ جانے کیا اُلٹے سیدھے دھندے کرتا پھرتا ہے، مجھے معلوم نہیں لیکن اس کی جیب میں نوٹ ہمیشہ دیکھے ہیں اور یہی بات مجھے ہولاتی ہے کہ تعلیم اور ہنر سے محروم شخص بھلا حلال روزی کہاں سے کما سکتا ہے۔'' خالہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور چہرے پر بے بسی کی انتہا پر پہنچے ہوئے دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ کشور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے قریب گئی اور ان کے دونوں شانے تھام کر تسلی دینے لگی۔

''صبر کریں خالہ! آپ کا یہ صبر ایک دن رنگ لائے گا اور ان شاء اللہ! بدر سدھر جائے گا۔''

خالہ نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ایک بار پھر کام میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے تاثرات سے کشور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بدر کی طرف سے مکمل مایوسی کا شکار ہیں اور اب انہوں نے اس قسم کی تسلیوں سے بہلنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت اس کی نظر کچن کے دروازے پر پڑی۔ وہاں بدر کھڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے یہاں ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔ کشور جھینپ سی گئی۔

''ناشتہ.....'' وہ بہت خراب موڈ کے ساتھ یہ ایک لفظی حکم سنا کر واپس پلٹ گیا۔ خالہ نے بھی بیٹے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگیں اور تیار کرنے کے بعد کام والی کے ہاتھوں ٹرے میں رکھ کر اوپر اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔

''تم کیوں یہاں گرمی میں بیٹھی ہوئی ہو؟ اندر کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میں بھی کھانے کے لیے یہ دو چار روٹیاں ڈال لوں تو پھر وہیں آتی ہوں۔'' سالن تو تیار ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے چاول دم پر رکھنے کے بعد چولہے پر توا رکھا اور کشور کو ٹوکتے ہوئے بولیں تو وہ جو واقعی گرمی محسوس کر رہی تھی، خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ البتہ دل ہی دل میں خالہ کے اسٹیمنا کو داد ضرور دے رہی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی پھرتی سے کام کرتی تھیں اور ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی خوب تھا۔

اندر کمرے میں پہنچ کر اس نے ٹی وی کھول لیا اور مختلف چینلز لگا لگا کر دیکھنے لگی لیکن کہیں پر بھی اس کا دل نہیں لگا۔ خالہ کا دُکھ مسلسل اس کے ذہن کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ ایک طرف رکھا اور کچھ وقت آفتاب کے ساتھ گزارنے کے خیال سے اوپر کا رخ کیا۔ ابھی اس نے آخری سیڑھی طے ہی کی تھی کہ بدر اپنے کمرے سے باہر نکلتا نظر آیا۔ کشور نے کوشش کی کہ اس سے کنی کترا کر گزر جائے لیکن وہ لپک کر اس کے قریب آ گیا اور اس کا راستہ روک لیا۔

''میرا راستہ چھوڑو۔'' کشور نے دھیمی آواز میں غصے کا اظہار کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز آفتاب تک پہنچے اور یہاں کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

''کیوں؟..... ویسے تو مجھ میں بڑی دلچسپی ہے کہ میری ماں سے میرا پورا تفصیلی تعارف حاصل کیا جا رہا تھا اور خود مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں۔ کبھی مجھ سے اکیلے میں ملو تو تمہیں اپنے بارے میں صحیح سے بتاؤں۔ بے چاری اماں کو معلوم ہی کیا ہے جو تمہیں بتا سکیں۔'' وہ بے باکی سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ کشور کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' کشور نے پہلے سے زیادہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا لیکن اس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔

''شور مچانے سے کیا ہو گا؟ تمہارا وہ لنگڑا تو آ کر میرا کچھ بگاڑنے سے رہا۔ ویسے تم ہو عجیب بدذوق لڑکی۔ گھر سے بھاگنے کے لیے تمہیں یہی مخنجو ملا تھا؟ اور انہیں دیکھو، ہمارے کزن بابر رضا کو۔ ہمارے گھر کو کوئی دارالامان سمجھ کر تم لوگوں کو یہاں بھجوا دیا۔ شاید ہمارے صحافی کزن فی الحال کہیں اور مصروف ہیں، بعد میں تم لوگوں پر کوئی چٹ پٹی سی رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔'' وہ صاف لفظوں میں مذاق اُڑا رہا تھا۔ احساسِ توہین سے کشور کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''ویسے داد دیتا ہوں میں لنگڑے کی قسمت کو۔ کیا چیز پائی ہے اس نے۔ میں نے تو جب سے تمہیں دیکھا ہے، تڑپ رہا ہوں۔ ایسا کرو، آج رات یہ تڑپ دور کر دو۔ پھر میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ تم



دونوں جب تک چاہے یہاں رہنا، کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خود تمہارے وارثوں کا اتا پتہ ڈھونڈ کر انہیں تمہارے یہاں ہونے کی اطلاع دے دوں گا۔'' وہ اپنی بدنیتی کا اظہار کرتے ہوئے اسے لالچ اور دھمکی دونوں دے رہا تھا۔

اس کی باتوں سے بہرحال اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ کشور اور آفتاب کی اصلیت سے واقف نہیں ہے اور محض قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے۔ اس کی اتنی گری ہوئی باتیں سن کر کشور کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے سے ہٹا کر آگے بڑھ جانے کی کوشش کی لیکن بدر نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ تھام کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو ذلیل آدمی!..... پتہ نہیں کیسے تم جیسا آوارہ و بدکردار شخص اس شریف گھرانے میں پیدا ہو گیا۔''

کشور نے بلبلا کر اسے لعنت ملامت کی۔ جواباً وہ ہنسنے لگا لیکن پھر یک دم ہی اس کی ہنسی رک گئی اور اس نے کشور کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔

کشور ایک پل کے لیے تو حیران ہوئی لیکن دوسرے ہی پل اسے وجہ سمجھ آ گئی۔ غصے میں بھری ہوئی خالہ اس کے عقب سے نکل کر سامنے آئیں اور انہوں نے بدر کے منہ پر لگاتار تین چار تھپڑ جڑ دیے۔

''نکل جاؤ اس گھر سے۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ تم جیسے آوارہ کی ماں کہلانے سے بہتر ہے کہ میں خود کو بے اولاد ہی تصور کر لوں۔'' وہ غصے کی شدت سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔ بدر نے کشور کو دھمکی آمیز نظروں سے گھورا اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اُتر گیا۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی!..... میرے بیٹے کی وجہ سے تمہیں جو تکلیف اٹھانی پڑی، اس کے لیے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم آرام سے یہاں رہو۔ اب میں اس ناخلف کو دوبارہ گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔'' اپنے بیٹے کے جانے کے بعد خالہ اس سے معذرت کرنے لگیں۔

''آپ اس طرح معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں خالہ!..... بدر کی بدتمیزی میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں۔'' کشور کی اپنی طبیعت کافی مکدر ہو گئی تھی لیکن اس نے ایک بوڑھی بے بس ماں کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا جس سے اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ آفتاب کو یہاں ہونے والے ہنگامے کی بھنک نہیں پڑی۔

''میرا ہی قصور ہے۔ میں نے اس کے ابا کے مرنے کے بعد بے پروائی نہ برتی ہوتی تو یہ اس حد تک نہ بگڑتا۔'' اب وہ بہت ہی زیادہ آزردہ تھیں۔

''آپ اتنی ٹینشن نہ لیں ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ چلیں، میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں۔ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔'' کشور زبردستی انہیں اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔ نیچے جاتے ہوئے اس نے آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان دیکھ لیا تھا۔ یقیناً خالہ اس مرتبان کو دھوپ میں رکھنے کے لیے ہی اوپر آ رہی تھیں جو انہوں نے بدر کو اس سے بدتمیزی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

''دیکھو بیٹی! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ بدر کو آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی۔ اس لیے تم یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ اور ہاں، اپنے میاں کو بھی کچھ مت بتانا۔ اس نے بابر سے تذکرہ کر دیا تو وہ کیا سوچے گا کہ خالہ کا بیٹا اتنا بگڑا ہوا ہے۔ میں نے برسوں سے خاندان میں اپنی جو عزت بنا

کر رکھی ہوئی ہے، اس آخری عمر میں اس کا بھرم رہ جائے تو اچھا ہے۔'' خالہ کو ان کے بستر پر لٹانے کے بعد اس نے انہیں بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والی گولی کھلائی اور پھر انہیں آرام کی تاکید کرتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکلنے لگی تو انہوں نے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

اُن کی درخواست پر یونہی سر ہلاتی ہوئی وہ باہر نکل گئی اور سست روی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا دماغ بری طرح اُلجھ گیا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ خالہ کتنے ہی دعوے کرتیں، بہرحال یہ بدر کا اپنا گھر تھا اور اسے یہاں آنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر روک بھی دیا جاتا تو وہ پہلے ہی دھمکی دے چکا تھا کہ کشور کے وارثوں تک اس کی خبر پہنچا دے گا۔ اب انتقام لینے کے لیے تو وہ ضرور ہی اس دھمکی پر عمل کرتا۔ دوسری طرف اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگر آفتاب کو سارے حالات بتائے جائیں تو وہ کچھ کر سکے گا یا نہیں۔ فوری طور پر اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونا کوئی آسان بات تو نہیں تھی، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ لوگ کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

اسی اُلجھن کے ساتھ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان اٹھا کر دھوپ میں رکھنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔

آفتاب رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا قلم پوری روانی سے چل رہا تھا۔ چند روز کے عرصے میں ہی کشور اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ بہت مگن ہو کر لکھتا ہے اور لکھتے ہوئے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اسے کمرے سے باہر ہونے والے ہنگامے کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی لاعلمی سے اطمینان محسوس کرتی ہوئی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے اسے ذہنی و جسمانی طور پر نڈھال کر دیا تھا اور وہ خود کو پُرسکون کر کے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی، چنانچہ تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ان بند آنکھوں سے وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ آفتاب کا حرکت کرتا ہوا قلم رُک گیا ہے اور اب وہ اس کی طرف رُخ کیے بہت تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

اُس کے موبائل میں راحیلہ کا پتہ محفوظ تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ماہ بانو نے اس بات کی پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی کہ اس مشکوک عورت کا بنگلہ جہاں اس نے مہا گرو کو دیکھا تھا، راحیلہ کے گھر کے بائیں جانب ہے۔

شہریار نے بے حد ہلکی رفتار میں گاڑی اس بنگلے کے سامنے سے گزارتے ہوئے بنگلے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کی بیرونی دیواروں پر کافی کلر کا پینٹ کیا گیا تھا۔ بنگلے کی دیواریں خاصی اونچی تھیں اور ان دیواروں پر خاردار تار بھی بچھائے گئے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ایسا کوئی درخت بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس کی مدد سے دیوار پر چڑھا جا سکتا۔ ایک طرح سے بنگلے کو محفوظ رکھنے کا ٹھیک ٹھاک انتظام کیا گیا تھا اور کسی شخص کے لیے وہاں نقب لگانا آسان نہیں تھا۔

شہریار کا چوری چھپے وہاں داخل ہونے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف باہر ہی سے بنگلے کو دیکھنا چاہتا تھا ورنہ اس کے ذہن میں کوئی اور ہی منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہی اس نے اپنی گاڑی روکے بغیر آگے بڑھا دی۔ جب وہ بنگلوں کی اس قطار کو پار کر کے داہنی جانب اپنی گاڑی موڑ رہا تھا تو اس نے راحیلہ والے بنگلے کے باہر ایک ٹیکسی کو رکتے ہوئے دیکھا۔ اس ٹیکسی میں سے ایک لڑکا اور لڑکی باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ وہ راحیلہ اور اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہوں گے جو کہیں سے واپس لوٹے تھے۔ اسے



ان بہن بھائی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ کسی خاص سمت میں گاڑی نہیں چلا رہا تھا بلکہ اس سارے علاقے میں یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس طرح وہ اس علاقے کے راستوں سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا کراچی بہت کم آنا جانا رہا تھا اس لیے وہ اس شہر سے بہت کم واقف تھا اور کسی مخصوص علاقے کے اندرونی راستوں سے واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی اسی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ذہن میں موجود منصوبے کے مطابق راستوں کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ آخر کار اس کی یہ جدوجہد رنگ لائی اور وہ ایک ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جس کی اسے اپنے منصوبے کے مطابق تلاش تھی۔ اس راستے سے گزر کر وہ بائیں جانب موجود ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر مڑتا تو اس راستے پر آ جاتا جس سے اس کے اندازے کے مطابق راحیلہ کی لین میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے علاقے سے نکل کر مین روڈ تک پہنچنے کے لیے لازماً گزرنا پڑتا۔

شہریار نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق وہ راحیلہ کے پڑوس والے بنگلے کی نگرانی کرتا رہتا اور جب وہاں مقیم عورت اپنی گاڑی میں کہیں جاتی تو خود بھی اس کے تعاقب میں نکل پڑتا لیکن مسلسل اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی لگا کر رکھنے کے بجائے دوسرے راستے پر چل پڑتا۔ اس وقت اسے یہ دھیان رکھنا تھا کہ اس کی گاڑی کی رفتار اس عورت کی گاڑی کی رفتار سے زیادہ ہوتا کہ وہ بائیں جانب والی تنگ سڑک کو پار کر کے پہلے اس بڑی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے عورت کی گاڑی کو گزرنا تھا۔ وقت کی اس برتری کا فائدہ اٹھا کر وہ یک دم ہی اپنی گاڑی عورت کی گاڑی کے سامنے لا کر اسے رکنے پر مجبور کر دیتا اور پھر اسلحے کے زور پر اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیتا۔ مزاحمت کی صورت میں اس کے پاس عورت کو بے ہوش کرنے کا بھی انتظام تھا۔ یہاں سے وہ اس عورت کو زبیر کے اس بنگلے میں لے جاتا جہاں وہ خود رہائش پذیر تھا۔ بنگلے میں اس نے اسی مقصد کے تحت کسی ملازم کو نہیں رہنے دیا تھا کہ تنہائی میں آرام سے اس عورت سے پوچھ گچھ کر سکے۔

اپنے اس منصوبے پر اسے پہلے ہی دن عمل کرنے کا موقع مل جائے گا، اس سلسلے میں وہ پُریقین نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ عورت آج ہی کہیں جانے کے لیے باہر نکلتی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دو تین دن تک کہیں بھی نہیں جاتی۔

شہریار دونوں طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے حلیے میں بھی کافی تبدیلی کر لی تھی۔ چہرے پر مصنوعی فرنچ کٹ داڑھی، مونچھیں اور بڑا سا سمّہ اس کی شناخت چھپانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس حلیے میں اس کے قریبی جاننے والے بھی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکیں گے۔ کراچی میں یوں بھی اس کے آشنا کم ہی تھے اور اس نے حلیے کی یہ تبدیلی کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے احتیاطاً کی تھی۔ اگر اسے ایک دن سے زیادہ بار عورت کے بنگلے کی نگرانی کرنی پڑتی تو وہ اسی حلیے میں کچھ چھوٹے موٹے ردّ و بدل کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا فل ٹائم نگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ عورت جس قسم کی تھی، اس کا اس نے ماہ بانو کے اشاروں کنایوں میں کی گئی گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا اور اسے بہ خوبی معلوم تھا کہ اس قسم کی عورت کا دن کی روشنی میں کہیں باہر نکلنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ وہ شام ڈھلے ہی بنگلے سے نکل کر کہیں جاتی ہو گی۔ چنانچہ اس نے اسی حساب سے نگرانی کے وقت کا دورانیہ طے کیا تھا۔ اب بھی اس نے جب اپنا ابتدائی کام نمٹا لیا تو گاڑی کو واپس موڑا اور اس بنگلے کے قریب ایسی پوزیشن میں گاڑی لے جا کر روک لی جہاں کسی کی اس کی طرف توجہ نہ جائے

لیکن وہ خود بنگلے کو نظر میں رکھ سکے۔

اس علاقے میں چونکہ زیادہ تر امراء رہائش پذیر تھے اس لیے اردگرد بڑا روایتی سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ متوسط طبقے کی گلیوں کی طرح ٹھیلے اور خوانچوں والوں کے تو یہاں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے سوا بھی کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہریار کے سامنے بس ایک بنگلے کا گیٹ کھلا تھا اور اس میں سے ایک گاڑی نکل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس بنگلے کے چوکیدار نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر گیٹ بند کر لیا تھا۔ شہریار نے اپنی گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی، وہ ایک خالی پلاٹ کے سامنے کا ایریا تھا۔ اگر وہ کسی بنگلے کے سامنے گاڑی کھڑی کرتا تو یقیناً وہاں کا چوکیدار اس سے باز پرس کرنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال اسے اب تک کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کا بونٹ اٹھائے وقتاً فوقتاً انجن سے اس طرح چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جیسے گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو اور وہ اسے صحیح کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اپنی اس اداکاری کے دوران وہ گاہے بگاہے اپنے مطلوبہ بنگلے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس عمل کے دوران اس کی راحیلہ کے بنگلے پر بھی اچٹتی سی نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک بار جو اس کی نظر وہاں پڑی تو اس نے بنگلے کے ٹیرس پر اسی لڑکے اور لڑکی کو کھڑا پایا جنہیں یہاں سے پہلی بار گزرتے ہوئے ٹیکسی سے اُترتا دیکھ چکا تھا اور قیاس کیا تھا کہ وہ راحیلہ اور اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہیں۔ لیکن اس بار جو اس کی دونوں پر نظر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا اندازہ شاید کچھ غلط تھا۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو جن مخمور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، وہ بہن بھائی کے رشتے کے منافی تھیں۔ اس موقع پر شہریار نے ایک بات اور نوٹ کی کہ ان دونوں کے درمیان ذرا بھی مشابہت نہیں ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ بہن بھائی ایک دوسرے سے مشابہ ہوں لیکن عموماً خونی رشتوں سے جڑے افراد میں ایک دوسرے کی جھلک آ ہی جاتی ہے۔ پھر اسے تو ماہ بانو نے بتایا تھا کہ راحیلہ اور اس کا بھائی شکل و صورت اور خیالات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اس ہم آہنگی نے انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ماں باپ کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ٹیرس پر لڑکی کے ساتھ کھڑا لڑکا اسمارٹ تھا لیکن لڑکی اس کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ حسین تھی۔ اس کی گلابی رنگت اور سنہری بال اسے لڑکے سے بہت مختلف ظاہر کر رہے تھے۔ پھر ایک اور بات جو اس نے نوٹ کی، وہ لڑکی کی عمر تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے باوجود اتنی کم عمر نہیں نظر آ رہی تھی کہ اسے ماہ بانو کا ہم عمر تصور کیا جا سکتا اور راحیلہ کو اس کی ہم جماعت ہونے کی وجہ سے لگ بھگ اسی کی ہم عمر ہونا چاہئے تھا۔ اس کا ذہن اُلجھ سا گیا لیکن فی الحال وہ راحیلہ یا اس کے بھائی پر تحقیق کرنے یہاں نہیں آیا تھا اس لیے اپنی توجہ اس جوڑے کی طرف سے ہٹالی اور ایک بار پھر انجن پر جھک گیا۔

''کیا بات ہے سر جی! آپ بہت دیر سے یہاں کھڑے ہیں۔ گاڑی میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟'' ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے اپنے عقب میں یہ آواز سنی اور سر گھما کر پوچھنے والے کو دیکھا۔ یہ اس بنگلے کا چوکیدار تھا جس سے کچھ دیر قبل اس نے ایک گاڑی کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ چوکیدار اُس کی مسلسل یہاں موجودگی سے شاید کچھ مشکوک ہو کر پوچھ گچھ کرنے چلا آیا تھا لیکن اس کا انداز بہرحال مہذبانہ تھا۔ یقیناً شہریار کی قیمتی گاڑی اور نفیس لباس نے اُسے اس احتیاط پسندی پر مجبور کیا ہوگا۔

''گڑبڑ تو اچھی خاصی ہے لیکن میں ٹھیک کر لوں گا۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں چوکیدار کو جواب دیا۔



خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے وہ اسے اپنے ساتھ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''آپ کو جانا کہاں ہے؟'' چوکیدار نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اگلا سوال کیا۔

''خیابانِ شمشیر میں بیرسٹر اظہار الحسن کے بنگلے تک..... لیکن تم اتنی انکوائری کیوں کر رہے ہو؟'' اس نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ بیرسٹر اظہار کا نام وہ اس طرف آتے ہوئے ایک بنگلے کی نیم پلیٹ پر دیکھ کر آیا تھا اور اس کے ذہن میں رہ گیا تھا اور چوکیدار پر اپنی حیثیت جتانے کے لیے اس وقت اس کا استعمال کر ڈالا تھا۔

''آپ کو خیابانِ شمشیر جانا تھا تو اس طرف کہاں نکل آئے؟ وہ تو یہاں سے کافی آگے ہے۔'' چوکیدار نے اعتراض کیا۔

''میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں اس لیے راستوں کا صحیح سے اندازہ نہیں ہے۔ مجھے بیرسٹر صاحب نے فون پر راستہ سمجھایا تھا لیکن شاید مجھ سے سمجھنے میں کچھ غلطی ہو گئی اور میں بھٹک کر اس طرف آ نکلا۔ اوپر سے یہ گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ اور تم بجائے یہ کہ مجھے سکون سے گاڑی ٹھیک کرنے دو، سوالات پر سوالات کیے جا رہے ہو۔''

وہ چوکیدار کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے ہر سوال کا جواب ضرور دے رہا تھا لیکن لہجے میں جھنجلاہٹ بھی عیاں تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہم جاتا ہے۔ آپ آرام سے اپنا گاڑی ٹھیک کرو۔'' اس کا موڈ دیکھتے ہوئے چوکیدار واپس جانے لگا۔ لیکن پھر جاتے جاتے پلٹ کر اس سے بولا۔ ''آپ بیرسٹر صاحب کو فون کیوں نہیں کر لیتے؟ وہ اپنا ڈرائیور بھیج کر آپ کو بلوا لیں گے اور گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''میں کوشش کر چکا ہوں۔ ان کا موبائل آف ہے۔'' بال کی کھال نکالنے والے اس شخص پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتے ہوئے اس نے قدرے تحمل سے جواب دیا۔ ورنہ اب حقیقتاً اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کا جواب سن کر چوکیدار سر ہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار بھی کچھ جھنجلاتا ہوا بونٹ گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس چوکیدار کے رویے نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ روز روز یہاں کھڑے ہو کر نگرانی کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ اگر آج ہی اس کی مطلوبہ عورت اپنے بنگلے سے نہیں نکلی تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ممکن تھا کہ اسے اپنے منصوبے میں ہی تبدیلی کرنا پڑتی۔

انہی سوچوں میں ڈوبا وہ بے خیالی کے عالم میں اپنے مطلوبہ بنگلے کے گیٹ کو گھور رہا تھا کہ اچانک گیٹ کھلتا چلا گیا اور اس میں سے ایک چمکتی ہوئی سرخ رنگ کی گاڑی برآمد ہوئی۔ گاڑی کو نکلتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر سرخ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس شخص کو دیکھ کر اس کے ذہن نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ تعاقب کرنا ہی بھول گیا اور سرخ کار اپنی پچھلی نشست پر بیٹھی طرح دار حسینہ کو لیے آگے نکلتی چلی گئی۔

سرخ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود باوردی ڈرائیور کا چہرہ اس کے لیے اتنا شناسا تھا کہ اسے گاڑی کا تعاقب کرنے یا اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور چند لمحوں کا توقف کرنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی بھی آگے بڑھا دی۔

راحیلہ والے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس کے ٹیرس پر پر ڈالی۔ ٹیرس خالی تھا اور وہاں کچھ دیر پہلے نظر آنے والا لڑکا اور لڑکی موجود نہیں تھے۔ وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھتا چلا گیا اس سے کافی آگے سرخ کار جا رہی تھی اور محض ایک دھبے کی صورت میں نظر آ رہی

تھی۔ اس کار کے ڈرائیور کو دیکھنے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر اپنا منصوبہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ سرمد تھا..... سیٹھ موتی والا کا سابقہ ڈرائیور۔ سیٹھ موتی والا، جو کبھی چودھری کے حلیفوں میں شامل ہوا کرتا تھا اور جنگل سے اسمگل کی جانے والی لکڑی کی اسمگلنگ میں پوری طرح شامل تھا۔ شہریار کا متعدد بار سرمد سے سامنا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماہ بانو کے تعاون اور بہادری کے نتیجے میں ہی سرمد اپنی محبت نیلم کو پانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ چنانچہ اس احسان کے بدلے وہ اس کا ساتھ ضرور دیتا۔ سرمد کا ساتھ مل جاتا تو اسے اپنے پہلے منصوبے میں موجود مشکلات اور خطرات کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بہر حال، تن تنہا کسی گاڑی کو روک کر اس میں سوار لڑکی کو غوا کرنا اتنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ یہ منصوبہ بنا کر اس نے ایک طرح سے خود کو خطرے میں ہی ڈالا تھا۔ سرمد ساتھ دیتا تو یہ رسک ہی نہیں لینا پڑتا۔ سرمد کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے اس سے ملاقات ضروری تھی لیکن اس ملاقات سے پہلے وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے نئے منصوبے کے بارے میں مزید سوچ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ سرخ کار سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے مخالف سمت میں اپنی گاڑی کا رخ موڑا اور زبیر کے اس بنگلے کا رخ کیا جہاں آج کل وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

اخبار کے دفتر سے نکل کر بابر اپنی نیلی سوزوکی مہران میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے کیسٹ پلیئر کو بھی آن کر دیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں گاڑی میں پھیل گئیں۔ وہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگناتے ہوئے مسرور انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔

پچھلے دنوں حالات بہت خراب رہے تھے۔ ملک کے تین بڑے شہروں میں دہشت گردی کے بڑے واقعات پیش آئے تھے اور انتظامی مشینری کے ساتھ جو لوگ سب سے زیادہ مصروف اور بھاگ دوڑ کا شکار رہے تھے، وہ میڈیا کے نمائندے ہی تھے۔ بابر بھی بطور صحافی اس بھاگ دوڑ کا حصہ رہا تھا۔ اس آفیشل مصروفیت کے علاوہ وہ افضل سے دوستی نبھانے کے چکر میں آفتاب والے معاملے کو بھی دیکھتا رہا تھا۔ گھر والے جو پہلے ہی اس کے گھر پر وقت نہ دینے کی شکایت کرتے رہتے تھے، کچھ اور بھی شاکی ہو گئے۔ ان شکوہ کرنے والوں میں اس کی بیوی بھی شامل تھی جس کا شکوہ اب بڑھتے بڑھتے ناراضی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور پچھلے ایک ہفتے سے یہ حال تھا کہ وہ بطور احتجاج اس سے ضروری بات کرنے کے سوا مخاطب بھی نہیں ہوتی تھی۔

بابر اسے اس رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا اور تلافی کا خواہش مند تھا لیکن فی الحال جان بوجھ کر کوئی عملی اقدام اٹھانے سے گریزاں تھا۔ حالانکہ دہشت گردی کے بعد پھیلنے والی بدامنی پر قابو پا لیا گیا تھا اور اس کی مصروفیات بھی خاصی کم ہو گئی تھیں۔ دراصل بیوی کو منانے کا معاملہ اس نے خاص موقع کے لیے اُٹھا رکھا تھا اور وہ خاص موقع آج آ گیا تھا۔

آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ بابر اپنی مصروفیات میں عموماً اس دن کو بھول جاتا تھا یا یاد بھی رہے تو اسے کوئی خصوصی اہتمام کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی، البتہ اس کی بیوی اس موقع کو ہمیشہ یاد رکھتی تھی اور بہت جوش و خروش سے اسے منانے کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ بابر کو یقین تھا کہ اس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس کی بیوی نے یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ آج بھی اس اہم دن کو بھول گیا ہوگا..... لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس بار اس نے پورا ہفتہ اس دن کے آنے کا انتظار کیا تھا اور رُوٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے لیے کچھ خصوصی انتظامات بھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ آج خلافِ معمول ذرا جلدی گھر پہنچے گا اور بیوی کے لیے خاص طور پر خریدے گئے تحائف



اس کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد اسے تیار ہو کر اپنے ساتھ ڈنر پر چلنے کی دعوت دے گا تو وہ خوشی سے جھومتے ہوئے کسی اَدھ کھلی کلی کی طرح مسکرا اُٹھے گی۔

بیوی کی اس خوشی اور سرشاری کا خیال اسے ابھی سے مسرور کیے دے رہا تھا اور اپنی اس خوشی کو خود ہی انجوائے کرنے کے لیے وہ اپنی پسندیدہ موسیقی سن رہا تھا۔ وہ اتنا مگن تھا کہ اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اخبار کے دفتر سے ایک گاڑی مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اپنی اس کیفیت میں وہ ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے موبائل فون کی رنگ ٹون پر بھی قدرے تاخیر سے متوجہ ہو سکا۔ متوجہ ہونے پر اس نے سیل فون اٹھا کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال اس کی بیوی کی طرف سے آ رہی تھی۔

''ہاں بولو۔'' اس نے پہلے موسیقی بند کی، پھر کال ریسیو کرتے ہوئے جان بوجھ کر بیزار کن لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس پل اس کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اسے ستا رہا تھا تاکہ منانے کا پورا پورا لطف حاصل کر سکے۔

''آپ گھر کب تک پہنچیں گے؟'' بیوی نے اس سے دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو بہت اہم کام سے جا رہا ہوں۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''کوشش کیجیے گا کہ کھانے کے وقت گھر پر ہی ہوں۔ ہم سب لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔'' وہ ہر سال شادی کی سالگرہ والے روز رات کے کھانے پر زبردست انتظام کرتی تھی اور اپنی تمام تر ناراضی کے باوجود اس بار بھی اس نے اپنا یہ معمول یقیناً برقرار رکھا تھا لیکن خود بابر کا تو کچھ اور ہی پروگرام تھا اس لیے اصل بات ظاہر کیے بغیر اپنی سابقہ ٹون برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے میرا انتظار کرنے کی۔ میرا کچھ بھروسہ نہیں ہے کہ میں بارہ ایک بجے تک بھی گھر پہنچ سکوں یا نہیں۔ کیا سب لوگوں کو میرے انتظار میں آدھی رات تک بھوکا بٹھا کر رکھو گی؟'' وہ جانتا تھا کہ سب لوگ کھانا کھا لیں گے لیکن اس کی بیوی ناراض ہونے کے باوجود اس کے گھر پہنچنے سے قبل کھانا نہیں کھائے گی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔'' بالآخر اس نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔ فون بند ہوتے ہی بابر کے حلق سے بہت دیر سے ضبط کیے جانے والے قہقہے اُبل پڑے اور وہ موبائل ڈیش بورڈ پر ڈالنے کے بعد ایک بار پھر کیسٹ پلیئر آن کر کے مگن ہو گیا۔ یونہی مگن سی کیفیت میں اس نے تقریباً پندرہ بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنی گاڑی ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے لے جا کر روکی اور گاڑی لاک کر کے شاپنگ سینٹر میں داخل ہو گیا۔

یہاں ایک جیولری شاپ پر اس نے بیوی کے لیے ایک بریسلیٹ کا آرڈر دیا تھا۔ شاپ پر پہنچ کر اس نے رسید دکھائی اور اپنا آرڈر کردہ بریسلیٹ وصول کر لیا۔ وہاں سے اٹھ کر شاپنگ سینٹر کے بیرونی گیٹ کا رخ کرتے ہوئے اُس کی نظر ایک ہلکی سبز رنگ کی ساڑھی پر پڑ گئی۔ ساڑھی کی رنگت اور کام دونوں ہی خوب صورت تھے۔ اس کا دل چاہا کہ بیوی کے لیے خرید لے۔ وہ دکان پر رک کر سیلز مین سے اس کی قیمت دریافت کرنے لگا۔

مول تول کرنے کے بعد ساڑھی پیک کروانے میں اس کے دس سے پندرہ منٹ مزید خرچ ہو گئے لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ آج وہ اپنے سارے کام نمٹا کر دفتر سے نکلا تھا اور کل صبح تک فارغ ہی تھا اس لیے کچھ وقت ضائع بھی ہو جاتا تو بس اتنا ہی ہوتا کہ وہ گھر قدرے تاخیر سے پہنچتا اور یہ اس لحاظ سے اچھا ہوتا کہ باقی اہلِ خانہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جاتے اور اسے اپنی بیوی کو اکیلے گھر سے لے کر ڈنر کے لیے نکلتے

ہوئے معیوب نہیں لگتا۔

اپنی اس سوچ کے تحت وہ کافی سست روی سے چلتا ہوا شاپنگ سینٹر سے باہر آیا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر چابی دروازے کے لاک میں ڈالنی چاہی لیکن چابی اندر داخل نہیں ہوئی۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہونے پر اس نے چابی کو قریب کر کے غور سے دیکھا کہ شاید وہ غلطی سے گچھے میں موجود کوئی اور چابی استعمال کر رہا ہے لیکن چابی بالکل درست تھی۔ اس نے ذرا اُلجھتے ہوئے ایک بار پھر چابی کو لاک کے سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکامی کا سامنا ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ غلط چابی استعمال نہیں کر رہا بلکہ گڑبڑ لاک کے ساتھ ہے۔ کسی نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ پریشانی اور اُلجھن کی ملی جلی کیفیت میں اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔

''کیا بات ہے یار! کیا اس گاڑی کو چرانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' اچانک ہی اس کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگا۔ بابر کو خیال آیا کہ اس شخص کو اس نے اندر شاپنگ سینٹر میں بھی اپنے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ ساڑھی کے لیے مول تول کر رہا تھا تو یہ شخص بھی دکان پر کپڑوں کے تھان کھلوا کر دیکھ رہا تھا۔

''مجھے اس گاڑی کو چرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ میری اپنی گاڑی ہے۔ لیکن شاید کسی نے اس کے لاک کے ساتھ شرارت کی ہے اس لیے لاک کھل نہیں رہا ہے۔'' اپنے اوپر لگنے والے الزام کا برا ماننے کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''لاؤ میں چیک کرتا ہوں، کیا گڑبڑ ہے۔ شاید میری کوشش سے لاک کھل جائے۔'' وہ شخص اس کے بالکل قریب چلا آیا اور اس سے چابی لینے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ بابر نے میکانکی انداز میں چابی اسے تھما دی۔

''میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے جو میری انگلی کے صرف ایک اشارے پر تمہارے جسم میں چھید کر سکتا ہے۔ اس لیے تم بغیر شور شرابا کیے خاموشی سے کھڑی سفید گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ دوسری صورت میں نتائج کی ذمے داری میری نہیں ہو گی۔'' چابی تھام کر وہ ایسے انداز میں بابر سے یہ دھمکی آمیز جملے بولنے لگا جیسے اس سے کسی موضوع پر تبادلہ خیال کر رہا ہو۔

بابر نے اس کے مطالبے پر چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض میں ملبوس تھا اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ قمیض کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اس ہاتھ کی جنبش اور جیب سے اوپر پیدا ہونے والا اُبھار بتا رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

''تم مجھے کہاں اور کس لیے لے جانا چاہتے ہو؟''

پہلے بھی کچھ دہشت گردوں کے ہاتھوں اس کے چند ساتھی صحافی اغوا ہو چکے تھے اور وہ اس شخص کو بھی اسی ٹولے کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا اس لیے جرأت کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ اندر سے بہرحال وہ خوف زدہ تھا کہ اغوا کار کسی مغوی صحافی سے عموماً کافی برا سلوک ہی کرتے ہیں۔

''سوال جواب اور بحث نہیں۔ جو میں نے کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ ورنہ میرا ریوالور بے آواز ہے۔ گولی چلی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کچھ ہوا ہے۔'' وہ شخص غرایا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ بابر نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے کہنے پر عمل کرنے سے گریز نہیں کرے گا چنانچہ بابر نے اس کا مطالبہ ماننے میں ہی عافیت جانی اور پیچھے کھڑی سفید گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔



گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک موچھیل ڈرائیور بیٹھا تھا جبکہ پچھلی نشست بھی خالی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی پچھلی نشست پر موجود شخص نے دروازہ کھول کر اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے سے زیادہ اس بڑی نال کی گن کی دہشت تھی جسے بھاری تن و توش کے آدمی نے اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان دبا رکھا تھا کہ بابر انکار نہیں کر سکا اور بے چون و چرا گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اسے گھیر کر یہاں لانے والے شخص نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھالی اور فوراً ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ پُرہجوم شاپنگ سینٹر کے باہر اگر کسی نے یہ سارا واقعہ دیکھا بھی ہو گا تو ہرگز یہ گمان نہیں کر سکا ہو گا کہ یوں بنا کسی شور شرابے کے ان کے سامنے ایک آدمی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ کسی مشکل میں گرفتار شخص کو لفٹ دینے کا منظر تھا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' آتشیں اسلحے کی موجودگی میں بے بس سے بیٹھے بابر نے ہمت کر کے اغوا کاروں سے سوال کیا۔

''وقت آنے پر بتا دیں گے۔ ابھی تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔'' اگلی نشست پر بیٹھے شخص نے سرد مہری سے جواب دیا تو اسے مزید کسی سوال کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ خاموشی سے سفر ختم ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اضطراری طور پر اپنی انگلیاں اس ڈبے پر پھیرتا رہا جس میں کچھ دیر قبل بیوی کے لیے بڑے چاؤ سے خریدی گئی ساڑھی موجود تھی۔

وہ جن حالات میں گھر گیا تھا، اس میں یہ تو قطعی ناممکن نظر آتا تھا کہ اب وہ یہ ساڑھی اسے دے سکے گا۔ اس کا بیوی کو سرپرائز دینے کا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بہت شدت سے دل چاہا کہ گھر فون کرے اور اپنی بیوی کو کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ وہ آج کا دن بھولا نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا اپنا موبائل فون گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی رکھا رہ گیا تھا اور اگر پاس ہوتا بھی تو اسے اغوا کرنے والے اس کی اجازت کب دینے والے تھے؟

وہ اسی طرح کی سوچوں میں گھرا بیٹھا رہا اور گاڑی جانی پہچانی سڑکوں سے گزرتے ہوئے گلبرگ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس کی منزل ایک ون یونٹ بنگلہ تھا جس کا نمبر تک بابر نے گاڑی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے قبل خوب اچھی طرح دیکھا۔ اس طرح کے واقعات میں عموماً یہی سننے میں آتا تھا کہ اغوا کنندہ کو مکمل اندھیرے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں اور کس جگہ موجود ہے۔ لیکن اسے تو بالکل کھلے عام یہاں تک لایا گیا تھا۔ شاید یہ بنگلہ ان کا عارضی ٹھکانہ تھا اور وہ تھوڑی دیر اسے یہاں رکھنے کے بعد یا تو آزاد کرنے والے تھے یا کسی اور خفیہ جگہ پر منتقل کرنے والے تھے۔ وہ بہرحال کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکا تھا اور قیاس آرائیوں سے کام چلاتا رہا۔ بنگلے میں لے جانے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ کمرہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے اور یہاں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی۔

''اسے کرسی سے باندھ دو۔'' شلوار قمیض میں ملبوس شخص نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ اس حکم کے ملنے پر ان لوگوں نے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی، پھر کرسی سے باندھ دیا۔ بابر نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اتنی طاقت اور صلاحیت نہیں کہ اکیلا اسلحے سے لیس ان غنڈوں کا مقابلہ کر سکے۔

''ہم تمہیں صرف ایک سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس سوال کا جواب کتنی جلدی دے کر اپنی جان چھڑاتے ہو۔ ہمیں بہرحال ہر صورت جواب چاہیے۔'' شلوار قمیض میں ملبوس شخص اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''کون سا سوال؟'' بابر نے حیرت سے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے ماسٹر آفتاب اور اس کی ساتھی لڑکی کو کہاں چھپایا ہے؟'' اس شخص نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو بابر چونک گیا۔ اسے تو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ آفتاب کے چکر میں دھرا گیا ہے۔

''کون ماسٹر آفتاب؟..... میں کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتا۔'' خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''لگتا ہے تمہاری یادداشت کچھ کمزور ہے۔ اسے بحال کرنے کے لیے ہمیں کچھ علاج شلاج کرنا پڑے گا۔'' وہ بابر کا چونکنا نوٹ کر چکا تھا اور پھر اسے اطلاع بھی یہی دی گئی تھی کہ یہ شخص ماسٹر آفتاب کا پتہ بخوبی جانتا ہے۔ چنانچہ استہزائیہ لہجے میں بولا اور اپنے ساتھی کو کوئی اشارہ کیا۔

بابر نے بھی یہ اشارہ دیکھ لیا اور تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے وہ لوگ اس پر کس قسم کا تشدد کر کے بکواس اُگلوانے والے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت جب اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا تو وہاں ایسا کوئی آلہ نظر نہیں آیا تھا جو تشدد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو لیکن ایک منٹ کے وقفے میں اپنی پشت پر محسوس ہونے والی معمولی کھٹر پٹر کے بعد جو کچھ اس کے سامنے آیا، اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ بھاری تن و توش کے آدمی نے بجلی کا ایک تار نیلی شلوار قمیض والے کے ہاتھ میں لا تھمایا اور خود دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔

''سنا ہے پاگل خانوں میں مریض کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اسے بجلی کا جھٹکا لگاتے ہیں۔ تمہاری یادداشت بھی چلی گئی ہے۔ اس لیے ہم تم پر بھی یہ طریقہ آزما کر دیکھیں گے۔'' نہایت سفاکی سے کہتا ہوا وہ بابر کے قریب آیا اور تار کا ننگا سرا اس کے بازو پر رکھ کر انگلی سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ فوراً ہی بابر کے پورے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے اپنے دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس کیں۔ برقی رو ایک ڈیڑھ سیکنڈ سے زیادہ اس کے جسم سے نہیں گزری تھی پھر بھی وہ پور پور پسینے میں نہا گیا۔

''یہ معمولی سا جھٹکا تھا۔ اگر اس نے تمہاری یادداشت ٹھیک کر دی ہو تو صحیح ہے ورنہ اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہوگا۔ میں پانچ منٹ دیتا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔'' وہ بابر کے قریب سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔

بابر کے بازو پر جہاں بجلی کا تار رکھا گیا تھا، وہاں انگارے سے دہک رہے تھے لیکن اسے اس تکلیف کو نظرانداز کر کے فی الحال سوچنے کا کام کرنا تھا۔ خود کو ملنے والی پانچ منٹ کی مہلت اس نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے گزاری۔ اسے علم تھا کہ آفتاب کو ڈھونڈنے والا پیر آباد کا چودھری افتخار ہے اور آفتاب کے ساتھ جو لڑکی موجود ہے وہ چودھری کی بیٹی ہے۔ یعنی اس وقت جو لوگ اسے اغوا کر کے یہاں لائے تھے، وہ چودھری کے گماشتے تھے۔

چودھری یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ جب وہ یہاں سے نکلے گا تو پولیس کو بیان دیتے ہوئے اپنے اغوا کی وجہ ضرور بتائے گا۔ بابر عام آدمی ہوتا تو بات چھپ بھی جاتی لیکن وہ میڈیا کا بندہ تھا جو زبان بھی کھولتا اور ہر طرف چودھری کی بدنامی بھی ہوتی۔ یعنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی بابر کی رہائی کسی صورت چودھری کے مفاد میں نہیں تھی۔ بابر کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اس بنگلے تک لاتے ہوئے اس سے اس کی لوکیشن چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے، وہ یہاں زندہ لایا گیا تھا لیکن زندہ واپس جانے والا نہیں تھا اس لیے اس سے ایسا کوئی خدشہ تھا کہ وہ بعد میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکے گا۔ حالات کا یہ تجزیہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس کی زندگی بس اس وقت تک ہے جب تک اس کی زبان بند ہے ورنہ اِدھر وہ آفتاب کا پتا



بتائے گا اور اُدھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

''ہاں بھئی، کیا سوچا تُو نے؟..... کچھ یاد آیا کہ کدھر چھپا رکھا ہے تُو نے اس ماسٹر کو؟'' پانچ منٹ کی مہلت ختم ہو گئی تھی اور وہ شخص ایک بار پھر اس کے سر پر مسلط تھا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کسی آفتاب کو نہیں جانتا۔'' اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بابر نے جواب دیا۔

''لا بھئی پہلوان! مجھے تار پکڑا۔ لگتا ہے صحافی بابو کو ابھی ہور علاج کی ضرورت ہے۔'' اس کا جواب سن کر نیلی شلوار قمیض والا اپنے بھاری تن و توش والے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ اسے شاید اس کے تن و توش کی وجہ سے ہی پہلوان کہہ کر پکارا جاتا ہوگا۔

پہلوان نے حکم کی تعمیل میں ایک بار پھر بجلی کا تار لا کر اپنے لیڈر کو تھمایا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بابر کے عقب میں موجود سوئچ بورڈ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اشارہ ملنے پر بٹن آن کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیڈر نے اس بار تار بابر کی ران پر رکھ کر اشارہ کیا۔ اشارہ ہوتے ہی برقی رو دندناتی ہوئی بابر کے جسم میں داخل ہوئی اور جسم کے ایک ایک خلیے سے گزرتے ہوئے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔

چیخوں کا ایک تسلسل تھا جس سے پورا کمرہ گونج اُٹھا لیکن شلوار قمیض والا شخص یوں مطمئن تھا جیسے کسی تڑپتے ہوئے انسان کی چیخوں کے بجائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اپنے طے شدہ وقت کے حساب سے جب اس نے پہلوان کو برقی رو کا سلسلہ منقطع کرنے کا اشارہ کیا تو بابر کی چیخیں بند ہو چکی تھیں اور بے ہوشی کی وجہ سے اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس دوسرے جھٹکے نے اس کی حالت اس حد تک تباہ کر دی تھی کہ منہ سے رال بہہ نکلی تھی۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' وہ واپس کرسی پر جا بیٹھا اور پہلوان کو حکم دیا۔ پہلوان حکم کی تعمیل میں آگے آیا اور اس کی نبض چیک کی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار منٹ کی کوشش کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوئی اور بابر ہوش میں آ گیا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا اور وہ خالی نظروں سے اپنے سامنے موجود لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر کیا ارادے ہیں صحافی صاحب! ہمیں ماسٹر آفتاب کا پتہ بتاتے ہو یا ایک جھٹکا اور کھانا ہے؟ لیکن سوچ لو کہ کہیں اگلا جھٹکا تمہیں دوسری دنیا میں نہ پہنچا دے۔ ابھی تو تم صرف بے ہوش ہوئے تھے اس لیے ہم ہوش میں لے آئے۔ مر مرا گئے تو لاش کسی کچرا خانے میں پھینکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔'' سفاکی میں ڈوبی یہ آواز سن کر بابر کو یاد آیا کہ وہ کس صورتِ حال سے گزر رہا ہے۔ اس نے اپنی حالتِ زار پر بھی غور کیا۔ باچھوں سے بہتی رال جسے وہ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے صاف بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی بے بسی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ وہ ایک دم ہی اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو بیٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''ابے کیا عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر رو رہا ہے؟'' پہلوان نے اس کے پیٹ میں اتنی زوردار لات ماری کہ وہ کرسی سمیت اُلٹ کر گرا۔ گرنے کے باعث اُس کا سر بڑی زور سے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس سے نکلنے والا خون فرش پر بہنے لگا۔

''مار ڈالو..... مجھے جان سے مار ڈالو۔ لیکن میں پھر بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں بتا بھی دیا تو تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔ تم مجھے مارنے کے لیے ہی یہاں لائے ہو ورنہ اپنے یہ مکروہ چہرے کبھی مجھے نہیں دکھاتے۔''

ایک اور نئی چوٹ کھا کر وہ رونا بھول گیا اور ہیجانی انداز میں چیخنے لگا۔ اس کے الفاظ نے پہلوان اور اس کے لیڈر کو احساس دلایا کہ ان سے غلطی ہوگئی ہے۔ ان کی بے پروائی نے بابر کو سمجھا دیا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور یہ آگہی خطرناک تھی۔ جس شخص کو اپنی موت کا یقین ہو جائے پھر اس سے جسمانی تشدد کے ذریعے کچھ نہیں منوایا جاسکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے مرنا تو ہر صورت ہے۔

''پہلوان! مجھے وہ ڈبہ تو دینا جو یہاں آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھا۔'' کچھ دیر بابر کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد شلوار قمیض والے شخص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی وہ ڈبہ لے آیا۔ ڈبے میں وہی ساڑھی تھی جو اس نے اپنی بیوی کو دینے کے لیے خریدی تھی۔ وہ ڈبہ لے کر اسے کھولنے لگا لیکن اس سے قبل وہ پہلوان کو گری ہوئی کرسی سیدھی کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ جب تک پہلوان نے کرسی سیدھی کی، وہ ڈبے پر موجود خوب صورت ربیر کو پھاڑ کر اسے کھول چکا تھا اور اس میں موجود ساڑھی باہر نکال لی تھی۔

''یہ تم نے یقیناً اپنی بیوی کے لیے خریدی ہے؟'' ساڑھی اس نے بابر کی نظروں کے سامنے لہرائی۔ وہ بنا جواب دیئے اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنی بیوی کو اس ساڑھی میں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ چچ چچ.... مجھے تو تمہاری قسمت پر رونا آرہا ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتے ہیں۔ پھر تم اسے یہ ساڑھی پہنا لینا۔ لیکن ایک شرط ہے۔ اس کے بدن پر جو کپڑے پہلے سے ہوں گے، انہیں ہم اُتاریں گے۔'' وہ جو دھمکی دے رہا تھا، بابر کو بہ خوبی سمجھ آرہی تھی۔ معاملہ اب اس کی جان سے بڑھ کر عزت تک آپہنچا تھا۔ جان اسے ہر حال میں دینی تھی لیکن بیوی کو بے آبرو کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''وہ اسلام آباد میں میری خالہ کے گھر میں ہیں۔ وہ سیکٹر.....'' پست آواز میں وہ خالہ کے گھر کا پورا ایڈریس بتاتا چلا گیا۔ اُدھر مکمل پتہ بتا کر اس کی زبان خاموش ہوئی، اِدھر کمرے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ چند انچ کے سیسے نے اُس کے سینے میں اُتر کر اُس دل کی دھڑکنوں کو خاموش کر دیا تھا جو مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹے قبل بڑی لے میں دھڑک رہا تھا اور اپنی بیوی کو سرپرائز دینے کے خیال سے مسرور تھا۔ سرپرائز تو اس بے چاری کو اب بھی ملتا..... جب شوہر کی زخم زخم لاش اُس کی چوکھٹ پر اُترتی اور اُس پر خوشیوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے۔

⊛----✪----⊛

''کشور.....'' وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی کہ آفتاب نے اسے آہستہ سے ہلاتے ہوئے سرگوشی میں پکارا۔

''کیا بات ہے آفتاب!..... آپ ابھی تک سوئے نہیں؟'' وہ اُٹھ کر بیٹھی اور حیرت سے پوچھنے لگی۔ رات اگرچہ بہت زیادہ نہیں گزری تھی اور گیارہ بجے سے کچھ اوپر کا ہی وقت ہوا تھا لیکن یہاں جلد سو جانے کے رواج کی وجہ سے وہ دونوں بھی جلد ہی سو جاتے تھے۔ کشور جب سونے کے لیے لیٹی تھی تو آفتاب بھی اس کے ساتھ ہی بستر پر لیٹا تھا اور فوراً ہی آنکھیں بند کر کے خاموشی بھی اختیار کر لی تھی۔ اس نے یہی گمان کیا تھا کہ وہ دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھک گیا ہے اس لیے جلد نیند آگئی ہے۔ لیکن اب وہ جس طرح چاق و چوبند اور تیار اس کے سرہانے کھڑا تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ سرے سے سویا ہی نہیں تھا۔

''آپ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیں اور برقع پہن لیں۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا ہے۔'' آفتاب



نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''یا اللہ خیر! ایسا کیا ہوگیا کہ ہمیں رات کے اِس اندھیرے میں یوں اچانک روانہ ہونا ہے؟'' پکڑے جانے کا خوف تو ہر پل ہی اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ آفتاب نے نیند سے اٹھا کر اچانک روانگی کی اطلاع دی تو یہی خیال ذہن میں آیا کہ کوئی انہونی ہوگئی ہے اس لیے سراسیمہ ہو کر پوچھنے لگی۔

''آپ گھبرائیں مت اور آرام سے تیار ہوں۔ فوری طور پر خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مزید اس گھر میں رہنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ اس لیے میں نے کسی اور جگہ رہائش کا بندوبست کر لیا ہے اور کچھ دیر بعد ہم وہیں جانے والے ہیں۔''

آفتاب نے نہایت رسان سے اُسے بتایا پھر بھی وہ چونک گئی اور غور سے آفتاب کی شکل دیکھنے لگی۔ اُس نے اس فوری فیصلے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بدر کی دوپہر والی بدتمیزی سے واقف تھا اور اُس وقت جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔

''آپ ایسا بدر کی وجہ سے کر رہے ہیں نا؟..... لیکن اُسے تو خالہ نے اسی وقت گھر سے نکال دیا تھا۔ اب تم اس طرح اچانک خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی والی بات ہوگی۔'' اسے آفتاب کا فیصلہ اس مناسب سے مناسب نہیں لگا تھا کہ خالہ نے ان کی محبت میں اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر بدر کر دیا اور اب وہ خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو وہ بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔

''آپ جذباتی ہو کر مت سوچیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بدر اپنے گھر واپس لوٹ کر نہ آئے۔ خالہ نے فی الحال جذبات میں اُسے نکال دیا ہے لیکن ہیں تو بہر حال وہ اس کی ماں۔ دو چار دن میں ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور وہ آپ سے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر آنے کی اجازت دے دیں گی۔ بالفرض وہ اپنے قول پر قائم بھی رہتی ہیں تو کیا آپ کے خیال میں بدر جس قماش کا آدمی ہے، وہ چپ چاپ یہ سب برداشت کر لے گا؟ وہ ضرور ہنگامہ مچا دے گا اور ہم پہلے ہی اتنے مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ مزید کسی نئی دشمنی کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ مناسب یہی ہے کہ ہم خاموشی سے یہ گھر چھوڑ دیں۔'' اس نے کشور کو سمجھایا۔

''ہم صبح خالہ کو بتا کر بھی تو جا سکتے ہیں؟ ہمارے اس طرح جانے سے انہیں دُکھ ہوگا۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

''نہیں۔ ہم نے اُنہیں بتایا تو وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گی اور آپ ان کے پُرخلوص اصرار پر جذباتی ہو کر مجھے ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کریں گی۔ تو اس لیے بہتر ہے کہ میں ایسی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑوں کہ ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے۔'' آفتاب نے صاف انکار کیا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ جب آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو میں آپ سے اختلاف کیسے کر سکتی ہوں؟'' وہ بجھی بجھی سی بستر سے اُٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانے میں جاتے جاتے اس نے دیکھ لیا تھا کہ جو سفری بیگ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، بالکل تیار کمرے کے وسط میں رکھا تھا اور آفتاب نے ٹیبل پر موجود اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی سمیٹ لیا تھا۔ یعنی وہ اس کے سونے کے دوران روانگی کی مکمل تیاری کر چکا تھا بلکہ اصل تیاری تو دن میں کسی وقت اس کی کمرے میں عدم موجودگی کے دوران ہوئی ہوگی۔ رہائش گاہ کا بندوبست کیے بغیر وہ دونوں بھلا اس وقت کہاں جا سکتے تھے؟ آفتاب کے اس رویے پر اس سے کچھ کچھ ناراض سی غسل خانے میں جا کر منہ دھونے لگی۔ دوسری طرف آفتاب اس کے انتظار میں بستر پر ہی ٹِک گیا تھا۔ اس نے کشور کی ناراضگی کو بخوبی محسوس کیا تھا لیکن فی الحال نظر انداز کر دینے پر اس لیے مجبور تھا کہ اس کی اپنی اندرونی

کیفیت کچھ مضطرب سی تھی۔

بدر کی کشور سے بدتمیزی کے بعد اس نے خالہ کا رویہ دیکھا تھا اور ان کے خلوص اور حق پرستی سے متاثر بھی ہوا تھا۔ کسی غیر کو اپنے سگے بیٹے پر، چاہے وہ غلطی پر ہی تھا، ترجیح دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس کا دل نہیں مانا تھا کہ وہ کشور کے ساتھ مزید یہاں رُکے۔ یہاں مزید رُکنے کے خیال سے ہی اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔

چنانچہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کی مدد سے ایک اسٹیٹ ایجنسی سے رابطہ کیا اور کسی نہ کسی طرح مالک کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اشتہار میں مذکور فلیٹ کو آج ہی اس کے حوالے کر دے گا۔ اس سلسلے میں اس نے مالک کی تمام شرائط قبول کرنے اور ایڈوانس و کرایہ فوری طور پر ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسے اس فیصلے میں آسانی اس لیے بھی رہی تھی کہ اسلام آباد پہنچتے ہی کشور نے اپنی انگلی میں موجود ایک ڈائمنڈ رنگ فوری طور پر فروخت کر دی تھی تاکہ وقتِ ضرورت ان کے پاس نقد رقم موجود رہے۔ ڈائمنڈ رنگ ٹھیک ٹھاک قیمت پر فروخت ہوئی تھی۔ کرایہ اور ایڈوانس دینے کے بعد بھی ان کے پاس کچھ نہ کچھ رقم ضرور بچ جاتی۔ اس رقم سے وہ اپنے ابتدائی اخراجات پورے کر سکتے تھے۔ اس کے بعد تو آفتاب کو اس کے کالمز کا معاوضہ ملنا شروع ہو جاتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ وہ دونوں بہت آرام سے، بشرطیکہ دشمن انہیں رہنے دیتے، اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ انہی سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھا وہ بیڈ پر بیٹھا تھا کہ کشور چہرے کو تولیے سے تھپتھپاتی ہوئی غسل خانے سے باہر نکلی۔

"مجھے ذرا کاغذ قلم تو دے دیں۔ میں خالہ کے نام ایک مختصر سا رقعہ ہی لکھ دوں۔" ناراضگی کا اظہار کرتے لہجے میں اس نے آفتاب سے مطالبہ کیا تو اس نے بنا کسی تعرض کے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ کشور نے مختصر وقت میں رقعہ لکھ کر اسے ٹیبل پر پیپر ویٹ تلے رکھا اور برقع اوڑھ کر اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے آفتاب سے یہ تک پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ واحد عمل تھا جس کے پیچھے اس کی ناراضگی کے بجائے آفتاب پر موجود حد درجے کا اعتماد تھا۔ بہت احتیاط سے سیڑھیاں طے کر کے وہ دونوں نچلی منزل پر پہنچے۔ وہاں مکمل خاموشی اور تاریکی تھی اور صرف خالہ والے کمرے کے دروازے کے نیچے سے جھانکتی نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی ذی نفس موجود ہے۔

اس بوڑھی عورت کو یوں تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے کشور کا دل بھر آیا لیکن اس کی مجبوری تھی کہ وہ آفتاب سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ نہایت بوجھل دل کے ساتھ وہ اس کے ہمراہ گھر سے باہر نکل آئی۔ دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا تھا اس لیے وہ دونوں مطمئن تھے کہ گھر کو غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جا رہے۔

باہر نکلتے ہی کشور نے آفتاب کا ہاتھ تھام لیا۔ ایسا اس نے اسے سہارا دینے کے لیے کیا تھا تاکہ اس کو اپنی ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب زیرِ لب مسکرایا۔ اسے اطمینان تھا کہ کشور اس سے ناراض تو ہو سکتی ہے لیکن محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔ اندھیرے کی وجہ سے کشور اس کی یہ مسکراہٹ نہیں دیکھ سکی۔

وہ دونوں قدم بہ قدم ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے گلی سے باہر نکل گئے اور دائیں طرف اس راستے پر چلنے لگے جو ٹیکسی اسٹینڈ تک جاتا تھا۔ انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ جب وہ اس راستے پر مڑے ہیں تو عین اس وقت بائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی خالہ کی گلی میں داخل ہوئی ہے اور سیدھی خالہ کے دروازے کے



آگے جا کر ٹھہری ہے۔ گاڑی سے اُترنے والے افراد وہی تھے جنہوں نے بابر کو اغوا کرنے کے بعد اس سے پناہ جسمانی و ذہنی تشدد کے ذریعے آفتاب کا یہ موجودہ پتہ معلوم کیا تھا۔ ان افراد کی تعداد میں البتہ مزید دو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اُن کا لیڈر وہی نیلی شلوار قمیض والا شخص تھا۔

یہ آدمی اور اس کا ساتھی پہلوان، دونوں کا پیر آباد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ لاہور کے رہائشی تھے اور رقم لے کر ہر قسم کے مجرمانہ کام سرانجام دیتے تھے۔ بالے کے بستر سے لگ جانے کے بعد چودھری کو مجبوراً ان لوگوں سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ انہیں ہائر کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ اپنے مزید ملازموں کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جس قدر رازداں بنائے گا، بات اتنی ہی کھلے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے خاص لوگوں کو پوست کی کاشت کرنے والے مزارعوں کی نگرانی پر رکھ چھوڑا تھا۔ کچھ افراد اسے اپنی سکیورٹی کے علاوہ مہمان بن کر آنے والی لِنڈا کے لیے بھی درکار تھے۔ ان اتنے سارے کام کے بندوں کو چھوڑنے کے بعد بھی بے شک اس کے پاس کئی نمک خوار بچ جاتے تھے لیکن یہ وہ لوگ تھے جن کی موٹی عقلوں پر وہ بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور وہ بس مار دھاڑ کے ہی کام آتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں اسے کرائے کے ان ٹٹوؤں کا سہارا لینا پڑا۔

نیلی شلوار قمیض والے شخص کا نام شناور تھا اور وہ بہت اونچے دام لے کر کسی پارٹی کے لیے کام کرتا تھا۔ خالہ کے گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتا ہوا گاڑی سے اُتر کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر لاک پر جھکنے کے بعد اس نے مشکل سے ایک منٹ ہی صرف کیا ہو گا کہ لاک کھل گیا۔

لاک کھولنے والا یہ شخص بہت ماہر نقب زن تھا اور نقب زنی کی بڑی بڑی وارداتوں میں خفیہ لاکرز کے پیچیدہ ترین لاکس کو بھی بڑی کامیابی سے کھولنے یا توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس جیسے شخص کے سامنے بھلا ایک گھر کے گیٹ پر موجود لاک جو بے شک مکینوں کے خیال میں خاصا مضبوط تھا، کیا اہمیت رکھتا تھا۔ ایک منٹ سے بھی قلیل وقت میں لاک کھولنے کے بعد اس نے گاڑی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے کامیابی کا اشارہ کیا تو شناور، پہلوان اور ان کا ایک اور ساتھی گاڑی سے اُتر آئے۔ ان کے اُترتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ سب دندناتے ہوئے گھر کے اندر جا گھسے۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ ایک کمرے میں سوئی ہوئی خالہ کے سوا انہیں وہاں کوئی دوسرا ذی نفس نظر نہیں آیا۔

"اوپر کی منزل چیک کرو۔" شناور نے حکم دیا تو پہلوان اور ایک آدمی اوپر چڑھ گئے۔

"اوپر بھی پورا گھر خالی پڑا ہے۔ کوئی موجود نہیں ہے۔" ذرا دیر بعد نیچے آ کر انہوں نے اطلاع دی تو شناور سوچ میں پڑ گیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ بابر نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور مرتے مرتے جھوٹ بول گیا ہو؟" اس نے پہلوان سے رائے لی۔

"ایسا لگتا تو نہیں۔ اس کی اطلاع میں کوئی تو سچائی تھی۔ اس گھر کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ لوگ رہتے ہیں اور فی الحال کہیں گئے ہوئے ہیں۔" پہلوان نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے رائے دی۔

"ایسا کرو کہ اس بڑھیا کو اُٹھا کر اس سے پوچھو۔ اگر وہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں تو اسے ضرور معلوم ہو گا۔" پہلوان کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے شناور نے حکم دیا۔

"اے بڑی بی!..... بہت سو لیں۔ اب اُٹھ جاؤ۔" حکم ملنے پر ایک آدمی نے بدتمیزی سے خالہ کو جھنجوڑ کر

جگایا۔ وہ بے چاری بلڈ پریشر کی دوا کھا کر سوئی تھیں اسی لیے گھر میں مچی ہلچل سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھیں۔ اس طرح جگائے جانے پر ہڑبڑا کر اٹھیں اور اپنے اردگرد موجود ان چاروں افراد کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''کک.....کون ہو تم لوگ؟'' انہوں نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل یہ سوال کیا۔

''ہم جو بھی ہیں، تم بتاؤ کہ وہ ماسٹر کہاں ہے جسے تم نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے؟'' شناور نے آگے بڑھ کر ان کی گردن دبوچتے ہوئے پوچھا تو خالہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بابر نے آفتاب اور کشور کو یہاں بھیجتے ہوئے سرسری سا ذکر تو کیا تھا کہ انہیں اپنے کچھ دشمنوں سے بچنے کے لیے پناہ کی ضرورت ہے لیکن وہ دشمن ایسے خطرناک ہوں گے کہ آدھی رات کو تالا توڑ کر ان کے گھر آ گھسیں گے، اس کی انہیں اُمید نہیں تھی۔

''جلدی بتا بڑھیا! کہاں ہیں وہ لوگ؟'' شناور نے خالہ کی گردن پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی منہ پر ایک تھپڑ بھی دے مارا۔ اس بے چاری بوڑھی عورت کے لیے اتنا تشدد بھی بہت تھا۔

''اُو..... پر۔'' انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بمشکل بتایا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔'' اس ڈر سے کہ کہیں بڑھیا کچھ بتانے سے قبل ہی مر نہ جائے، شناور نے ان کے گلے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وہ اوپر ہی ہیں۔'' گلا چھوڑے جانے پر خالہ پہلے کھانسیں۔ کھانسی قابو میں آئی تو بڑے وثوق سے زور دے کر بولیں۔ ویسے انہیں حیرت تھی کہ آفتاب اور کشور کہاں چلے گئے ہیں جو ان لوگوں کو نہیں ملے؟ اس حیرت میں یہ خوشی بھی شامل تھی کہ وہ دونوں ان دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ اُن کے دشمنوں سے بچ جانے پر دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتی وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔ ''میں خود اوپر جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ دونوں وہیں ہوں گے۔'' ان کے اس اعتماد کو دیکھتے ہوئے شناور نے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

''یہ میرے بیٹے کا کمرہ ہے اور اس کمرے میں آفتاب اور اس کی بیوی ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' اوپر پہنچ کر انہوں نے اس انداز میں شناور کو بتایا جیسے انہیں اب بھی پختہ یقین ہو کہ آفتاب اور کشور کمرے میں ہی موجود ہوں گے۔ ان کے پُریقین لہجے نے شناور کو بھی تذبذب میں ڈال دیا کہ کہیں تلاشی کے لیے اوپر آنے والوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ کیا معلوم کہ وہ دونوں کمرے میں ہی کسی ایسی جگہ چھپ گئے ہوں جہاں اس کے آدمیوں کا دھیان نہ گیا ہو۔ وہ کچھ چوکنا سا خالہ کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

خالہ خود کچھ پریشان سی کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پوری طرح سے روشن کمرے کا منظر بالکل واضح تھا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ اور الماریوں کے کھلے پٹ بتا رہے تھے کہ وہاں کی بہت اچھی طرح تلاشی لی جا چکی ہے۔ خالہ نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ نہ تو الماری میں آفتاب اور کشور کا سامان ہے اور نہ ہی میز پر کتابوں اور کاغذات کا وہ پلندا جو سارا دن آفتاب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔

کمرے کی واحد کھڑکی جس کے بارے میں انہوں نے گمان کیا تھا کہ دشمنوں کے گھر کے اندر آ گھسنے سے واقف ہو جانے کی وجہ سے وہ دونوں میاں بیوی پھاند کر فرار ہو گئے ہوں گے، اندر سے بند تھی۔ اس صورت حال پر وہ خود خاصے تذبذب کا شکار نظر آنے لگیں۔ آثار تو یہی بتا رہے تھے کہ آفتاب اور کشور پہلے ہی اپنا سامان سمیٹ کر خاموشی سے وہاں سے چلے گئے ہیں۔ یک دم ہی ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور دوپہر والا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ وہ دونوں اس واقعے کی وجہ سے ہی اچانک وہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ دل شکستہ سی رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر ٹِک گئیں اس وقت ان کی نظروں میں پیپر ویٹ کے نیچے دبا وہ کاغذ آ گیا۔



انہوں نے کاغذ نکال کر اس پر لکھی تحریر پڑھی۔ وہ تحریر کشور کی طرف سے تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''پیاری خالہ!

میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو اطلاع دیئے بغیر ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اصل میں آفتاب نے دوپہر والا واقعہ دیکھ لیا تھا اور اب وہ ایک دن بھی یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں، فی الحال مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ کبھی موقع ملا تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارے آنے والے بچے کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے گا۔ آپ کی شرمسار بیٹی، کشور۔''

خالہ نے یہ مختصر رقعہ پڑھنے کے بعد شناور کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مشکل سے آخری لائن پڑھ سکا تھا کہ ڈور بیل زور زور سے بجنے لگی۔

''نیچے چلو۔'' کچھ نہ ملنے کا یقین ہو جانے پر شناور نے انہیں حکم دیا تو انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ان کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ شناور نیچے پہنچا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو تذبذب کے عالم میں پایا۔

''کیا ہوا؟.....کون ہے باہر؟'' اس نے ان تینوں سے دریافت کیا۔

''لگتا ہے اس بڑھیا کا بیٹا ہے۔ کم بخت نشے میں ہے اور بڑا شور مچا رہا ہے۔ کہیں شور سن کر محلے والے جمع ہو جائیں۔'' پہلوان نے تشویش سے جواب دیا تو شناور نے بھی اپنے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔

''دروازہ کھولو.....کوئی اُلّو کا پٹھا مجھے اس گھر میں آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ میری ماں بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتی۔ جس کے لیے اس نے میری بے عزتی کی ہے، اس کا میں حشر خراب کر دوں گا۔ خود کو سمجھتی کیا ہے وہ آوارہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت۔ میں بیچ چوراہے پر لے جا کر اس آوارہ کی عزت خراب کروں گا۔'' اس سے آگے گالیوں کا ایک طوفان تھا جو وہ مسلسل کسی نامعلوم عورت کو دے رہا تھا۔

شناور جس نے کشور کا خط پڑھ لیا تھا، کافی حد تک معاملے کو سمجھ گیا تھا لیکن اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ باہر موجود اس شرابی کا کیا، کیا جائے جسے یہ بھی ہوش نہیں تھی کہ دروازہ غیر مقفل ہے اور ذرا سا دھکا دینے پر کھل جاتا ہے۔ وہ بس اپنی ہی دھن میں بیل بجانے اور گالیاں دینے میں مصروف تھا۔

''ٹھیک ہے۔ مت کھولو دروازہ۔ میں لاک ہی توڑ دوں گا۔'' شناور نے اپنے ایک آدمی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ باہر سے بدر کی دھمکی سنائی دی اور اگلے ہی لمحے فائر کی آواز گونجی۔ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھنے والا آدمی اس گولی کی زد میں آ گیا اور اس کے حلق سے زوردار چیخ بلند ہوئی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

اسی پل بدر نے گھر میں قدم رکھا۔ اپنے ساتھی کو لگنے والی گولی نے شناور کو طیش دلا دیا تھا چنانچہ اس نے ہاتھ میں موجود گن سیدھی کی اور لگاتار کئی گولیاں بدر کے ڈگمگاتے وجود میں اُتار دیں۔ اس انتقامی کارروائی کے بعد وہ اور اس کے ساتھی وہاں رُکے نہیں اور اپنے زخمی ساتھی کو اُٹھا کر باہر کی جانب بھاگے۔ ڈرائیور سمیت کچھ فاصلے پر کھڑی ان کی گاڑی فوراً ہی نزدیک آئی اور وہ سیکنڈوں میں اس میں سوار ہو کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس سارے شور ہنگامے پر بیدار ہو جانے والے محلے دار فرار ہوتے مجرموں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے البتہ دوڑ کر خالہ کے گھر تک پہنچے۔ گیٹ سے دو قدم اندر ہی بدر کی اپنے خون میں نہائی ہوئی لاش پڑی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹے سے اس کی آوارہ گردی پر سدا نالاں رہنے والی ماں گری ہوئی اپنی زندگی کی

آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اپنے لختِ جگر کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر اس کا دل ہمت ہار بیٹھا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی ماں کا دل تھا جو بیٹے پر گھر کے دروازے تو بند کر سکتی تھی، دل کے دروازے نہیں۔

❀----✪----❀

''آپ کی کارکردگی قابلِ اطمینان ہے۔ میں واپس جا کر ڈیوڈ کو رپورٹ دوں گی تو وہ بہت خوش ہوگا۔ ورنہ پچھلے دنوں آپ جس بے پروائی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ تشویش کا شکار ہو گیا تھا اور آپ کی جگہ کسی اور کو دینے پر غور کر رہا تھا..... لیکن میں نے اسے روکا کہ میں خود جا کر چودھری صاحب کو دیکھتی ہوں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ چودھری صاحب میری خاطر بھی کام پر توجہ نہ دیں۔ اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے نا اُمید نہیں کیا۔''

وہ لوگ کاشت شدہ پوست کا جائزہ لے کر واپس پلٹ رہے تھے جب لِنڈا نے چودھری کے ساتھ چلتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں اس سے یہ باتیں کہیں۔ اس کے موجودہ لہجے کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل یہی عورت اپنی حاکمیت ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور چودھری جیسے بندے سے پُر رعونت انداز میں بات کر رہی تھی۔ چودھری نے اس کا یہ لگاوٹ بھرا لہجہ سنا لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔

''اپنا موڈ ٹھیک کر لیں چودھری صاحب! آپ اس طرح خاموش رہیں گے تو شکار کا کیا خاک مزا آئے گا؟'' لِنڈا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ایک ادا سے ٹوکا تو اس کے لمس کی سنسناہٹ چودھری کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جانے اس عورت میں کیا جادو تھا کہ جب چاہے مرد کو ایک پل میں چاروں شانے چت کر دیتی تھی۔

''فکر نہ کرو ڈارلنگ! ہم تمہیں ایسا شکار کروائیں گے کہ ہمیشہ یاد رکھو گی۔ لیکن خود ہم افسردہ ہیں کہ ہمارا شکار ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ جب تک ہم اس ماسٹر کے بچے اور اپنی باغی بیٹی کو ان کے انجام تک نہیں پہنچا دیتے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔'' لِنڈا کے ہاتھ کی نرمی اور حدت کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے جواب دیا۔

''اب یہ تو آپ کی بدقسمتی ہے نا کہ وہ دونوں پہلے ہی نکل گئے تھے۔ ورنہ ہم نے تو آپ سے دوستی نبھاتے ہوئے آپ کو بالکل صحیح کلیو دیا تھا۔ حالانکہ اس طرح کے مسائل حل کرنا ہمارے اور آپ کے درمیان ہونے والے ایگریمنٹ میں طے بھی نہیں ہوا ہے۔'' بے نیازی سے شانے جھٹکتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ چودھری جواباً کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ آفتاب اور کشور والا معاملہ اس کا نجی مسئلہ تھا جسے حل کرنے کی ذمے داری ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی تھی۔

''یہاں جنگل میں شکار کی کیا صورتِ حال ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بہت زیادہ وقت برباد کرنا پڑے۔ میں چار پانچ گھنٹوں سے زیادہ یہاں رکنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میرا شیڈول کافی سخت ہے۔ پرسوں صبح تک مجھے ہر صورت روانہ ہونا ہے۔''

چودھری کی خاموشی کو بھانپ کر لِنڈا نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ وہ لوگ شکار کے بہانے ہی جنگل میں آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر ایک مناسب مقام پر انہوں نے جیپیں روکیں اور ملازموں کو خیمے نصب کرنے اور شکار کے سلسلے میں دیگر تیاریاں کرتا ہوا چھوڑ کر پیدل اس سمت نکل گئے جہاں پوست کی کاشت کی جا رہی تھی۔ ان کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی تھے جو اب بھی کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ خود چودھری کے شانے



سے بھی اس کی شکاری بندوق لٹک رہی تھی۔ گاؤں کی طرح جنگل میں بھی اس کا راج چلتا تھا اس لیے اس سے زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

''شکار یہاں بہت ملتا ہے۔ دو تین گھنٹوں میں بھی ہم اچھا خاصا شغل کر لیں گے۔ اس حوالے سے تم پریشان مت ہو۔'' چودھری نے اسے تسلی دی اور پھر خود یک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

''کیا ہوا چودھری صاحب؟'' اُس کے اس طرح ٹھٹکنے پر لِنڈا نے بھی اپنے قدم روک لیے اور پوچھا۔

''شش.....'' چودھری نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند فٹ کے فاصلے پر موجود جھاڑیوں پر نظر گاڑتے ہوئے شانے پر لٹکی بندوق اُتاری۔

''ان جھاڑیوں کے پیچھے ایک ہرن چھپا ہوا ہے۔'' بندوق سیدھی کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں لِنڈا کو بتایا تو وہ غور سے جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی نظروں نے بھی ہرن کو گرفت میں لے لیا۔

''مجھے دیں بندوق۔ میں اسے شکار کروں گی۔'' اس نے چودھری کے ہاتھوں سے بندوق جھپٹ لی لیکن اس دوران ہرن نے خطرے کی بُو سونگھ لی تھی چنانچہ اس کے لبلبی دبانے سے پہلے ہی جھاڑیوں سے نکل کر بھاگا۔ اس کے بھاگنے کی پروا نہ کرتے ہوئے لِنڈا نے بندوق سیدھی کی اور پورے سکون کے ساتھ فائر داغ دیا۔ بھاگتا ہوا ہرن گولی کھا کر اُچھلا اور زمین پر گر گیا۔ ان کے پیچھے چلنے والے چودھری کے ملازم تیزی سے اس ہرن کی طرف دوڑے۔

''بہت خوب! بھاگتے ہوئے جانور کا اتنا سچا نشانہ لینا بڑے کمال کی بات ہے۔'' چودھری نے اسے بے ساختہ سراہا۔

''میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا چودھری صاحب!'' لِنڈا نے ایک ادا سے سر جھٹکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں جواب دیا اور بندوق واپس چودھری کو تھما دی۔

''یہ تو خیر ماننے والی بات ہے۔'' چودھری مسکرایا۔ وہ اپنے سابقہ موڈ سے نکل آیا تھا اور پوری طرح لِنڈا کی طرف متوجہ تھا۔ لِنڈا نے اس کے مزاج میں در آنے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور زیرِلب مسکرائی۔ اس کی موجودگی میں کوئی مرد زیادہ دیر تک اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، اس بات کا اسے خاصا تجربہ تھا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ کل شام اے سی اور دوسرے خاص خاص لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کر لیں۔ ذرا مل کر دیکھتے ہیں آپ کے اے سی صاحب کو کہ موصوف کتنے پانی میں ہیں۔'' وہ لوگ اس جگہ سے زیادہ دُور نہیں تھے جہاں ان کے خیمے نصب تھے، تب لِنڈا نے چودھری سے کہا۔

''میں نے معلوم کروایا تھا۔ اے سی آج کل چھٹیوں پر اپنے گھر لاہور گیا ہوا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں دوسرے لوگوں کو انوائٹ کر لیتا ہوں۔''

''نہیں۔ پھر رہنے دیں۔ مجھے تو صرف اے سی سے ہی ملنے کا اشتیاق تھا۔'' لِنڈا نے انکار کیا۔ اس کے پاس شہریار سے متعلق جو خبریں پہنچتی رہی تھیں، انہیں سن سن کر اس کے دماغ میں اس سے ملنے اور اسے تسخیر کرنے کا سودا سما گیا تھا لیکن اب چودھری نے اسے جو اطلاع دی تھی، اسے سن کر وہ نہ صرف مایوس ہوئی تھی بلکہ یہ بھی سوچا تھا کہ شہریار کی قسمت اچھی ہے جو اس کے حُسن کے جال میں پھنسنے کے لیے موجود ہی نہیں۔ اس گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور پھر وہ تین خیموں کے درمیان موجود سب سے بڑے خیمے میں گھس گئے۔

''تھکن سی ہو گئی ہے۔ ذرا کچھ پینے کو تو نکالیں۔'' اندر پہنچ کر وہ ایک نرم میٹرس پر گرنے کے انداز میں

بیٹھی اور شکار کی مناسبت سے پہنی گئی چمڑے کی جیکٹ اُتار کر دُور پھینکتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔ جیکٹ کے نیچے اُس نے سفید رنگ کا نہایت مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا۔ انگڑائی لینے کے عمل میں بلاؤز کا اختصار کچھ اور بھی واضح ہو گیا۔ چودھری نے للچائی ہوئی نظروں سے اس کے سنہری دمکتے جسم کی ہوش رُبائیوں کو دیکھا اور شراب کی بوتل اور جام لے کر اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کے عریاں بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''اگر تھک گئی ہو تو تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اپنے حصے کا شکار تو تم نے ویسے بھی مار گرایا ہے۔''

لِنڈا نے فوراً اس مشورے کو قبول کر لیا اور ایک جام حلق سے اُتارنے کے بعد آرام کے لیے دراز ہو گئی۔ آزاد معاشرے کی اس آزاد ترین عورت کا آرام جامے کی قید میں تو ممکن نہیں تھا، چنانچہ جب وہ میٹرس پر دراز ہوئی تو چودھری کے حیوانی جذبات مکمل طور پر بھڑک چکے تھے۔

''میں تمہارے پاؤں دباتا ہوں۔'' کسی کو خاطر میں نہ لانے والا، کسی پالتو کتے کی طرح اس کے قدموں میں جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ ان لمبی سڈول ٹانگوں کو دبانے لگا جو لِنڈا کی شخصیت میں سب سے نمایاں اور خوب صورت تھیں۔ چند لمحوں کے لیے ہی ٹانگیں دبانے کے بعد اس کے ہاتھوں نے بہکنا شروع کر دیا۔ چت لیٹی لِنڈا کی طرف سے کوئی تعرض نہیں ہوا چنانچہ چودھری کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

''کل صبح ایک گاڑی ڈرائیور سمیت میرے حوالے کر دیجیے گا۔ میں آپ کے گاؤں کی سیر کروں گی اور یہاں رہنے والوں سے ملاقاتیں بھی۔'' لِنڈا نے فرمائش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' چودھری نے بنا کسی سوال کے ہامی بھر لی۔ ان لمحوں میں اگر وہ کوئی بادشاہ ہوتا اور لِنڈا اس سے اس کا تاج و تخت مانگ لیتی تو وہ، وہ بھی دے دیتا۔ اتنی معمولی سی فرمائش کے لیے تو کسی حجت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھری ہوئی شراب کی بوتل سے بڑھ کر نشیلی عورت..... جس کا نشہ چھلکا پڑ رہا ہو، بڑے بڑے پارساؤں اور عقل مندوں کی مت مار دیتی ہے۔ چودھری جیسا نفس پرست تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتا تھا جسے وقت کے اس حصے میں اگر کوئی فکر تھی تو بس اتنی کہ کسی طرح ان لمحات کو طویل سے طویل تر کیا جا سکے۔

⊛-----✪-----⊛

''اگر اپنے وطن سے محبت کرتے ہو تو کیفے شان میں گیارہ بجے مجھ سے ملنے آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے اجنبی نہیں۔ اُمید ہے کہ تم دیکھتے ہی پہچان لو گے۔'' مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کو تیسری چوتھی مرتبہ پڑھنے کے باوجود سرمد اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ اسے یہ عجیب و غریب پیغام کس کی طرف سے ملا ہو گا۔ اسے ملنے والا یہ خط کوریئر سے آیا تھا اور لفافے کے باہر صاف لکھائی میں اس کا نام لکھا تھا، چنانچہ وہ یہ شک نہیں کر سکتا تھا کہ کسی اور کا خط اس تک پہنچ گیا ہے۔

''یہ کس کا خط لے کر گم صم بیٹھے ہو؟ کسی پرانی محبوبہ نے تو نہیں پکار لیا؟'' نیلم کمرے میں آئی تو اسے مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر چھیڑا۔ سرمد نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ تو بڑا عجیب سا پیغام ہے۔'' مختصر تحریر کو پڑھنے کے بعد اس نے تبصرہ کیا۔

''اسی لیے تو میں پریشان ہو گیا ہوں۔ بھلا یہ کون ہو سکتا ہے جو مجھے جانتا ہے اور میری وطن سے محبت کو آزمانا چاہتا ہے؟''

''کہیں تمہارا کوئی دوست تو نہیں؟..... ہو سکتا ہے کسی دوست نے تمہیں یہاں دیکھ لیا ہو اور اسے مذاق سوجھا ہو کہ تمہیں تنگ کرے۔'' نیلم نے خیال ظاہر کیا۔



''ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن یہ کوئی پکی بات تو نہیں۔ کچھ اور بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔'' سرمد تشویش کا شکار تھا۔ ...م سے شادی کے بعد اس نے جب سے لاہور چھوڑا تھا، کبھی کسی پرانے دوست سے نہیں ملا تھا۔ بس ایک ...امر تھا جس سے کبھی کبھی فون پر رابطہ ہو جاتا تھا اور اس کی طرف سے ایسا پیغام ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ عامر ...ہا خاصا سنجیدہ مزاج تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ سرمد اپنے اور نیلم کے گھر والوں سے سامنا نہیں کرنا چاہتا اس ...ماضی کے تمام دوستوں کو چھوڑ کر کراچی میں بیٹھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اسے اس طرح کا مبہم پیغام بھیجنا، ...پریشان کر دینے کے مترادف تھا اور وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ایسا کرو کہ تمہیں جہاں بلایا گیا ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہ جو بھی ہے، بھرے بازار میں تو تمہارا کچھ نہیں ...تا۔''

نیلم کے نزدیک یہ کسی دوست کی ہی شرارت تھی اور پھر پیغام بھیجنے والے نے بلایا بھی ایک پُرہجوم بازار ...واقع کیفے میں تھا، اس لیے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

''میرے خیال میں جانا تو پڑے گا ہی ورنہ خوامخواہ ذہن اُلجھا رہے گا۔'' سرمد نے ہامی بھر لی لیکن اس کی ...ل جس کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ خط کے پیغام کو اپنی موجودہ ملازمت کے تناظر میں دیکھ رہا تھا اور ...صورت میں یہ صورتِ حال کافی گمبھیر لگ رہی تھی۔

''میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔ ابھی سوا دس بجے ہیں۔ چائے پی ...تم نکلو گے تو آرام سے ...ارہ بجے تک وہاں پہنچ جاؤ گے۔'' اسے جانے کے لیے آمادہ دیکھ کر نیلم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ سرمد چائے ...شوق سے پیتا تھا اس لیے جب بھی وہ اسے خوش کرنا چاہتی یا اس کا دھیان بٹانا مقصود ہوتا تو گرما گرم ...ے کی پیالی تیار کر کے پیش کر دیتی۔

''نہیں رہنے دو۔ اور اگر تمہیں اندر بیگم صاحبہ کے کسی کام سے نہیں جانا تو تھوڑی دیر یہاں میرے پاس ...جاؤ۔''

سرمد یہاں ڈرائیور تھا جبکہ نیلم کچن کا کام سنبھالتی تھی۔ سرمد کو نیلم کا کام کرنا پسند نہیں تھا لیکن یہاں ...ت کی شرط ہی یہ تھی کہ کوئی ایسا جوڑا ہو جو یہ دونوں کام سنبھال لے چنانچہ نیلم نے ازخود کچن کی ذمے داری ...ہامی بھر لی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو انہیں بڑی مشکل ہو جاتی۔ وہ لاہور سے کراچی آتے وقت جو رقم ...ساتھ لائے تھے، وہ تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی اور ملازمت نہ ملنے کی صورت میں اُنہیں رہائش اور ...نے پینے دونوں کا مسئلہ ہو جاتا جبکہ یہاں یہ دونوں ہی مسئلے آرام سے حل ہو رہے تھے۔

''بیگم صاحبہ بارہ بجے سے پہلے اُٹھتی ہی کب ہیں جو مجھے ان کا کوئی کام کرنا ہو گا۔ اور اُٹھ کر بھی انہوں ...یا کھا لینا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گلاس جوس اور اس بدذائقہ براؤن بریڈ کے دو پیس ہی کھائیں گی۔ تو ...کے لیے مجھے کون سے ہل جوتنے ہیں۔ اِدھر حکم دیں گی، اُدھر میں دو منٹ میں لے جا کر سامنے رکھ دوں ...'' نیلم برے برے منہ بنا کر تبصرہ کرتی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئی۔

''ایسا کھانا کھاتی ہے بیگم صاحبہ تب ہی تو اسمارٹ اور خوب صورت ہے۔ تُو نے تو پراٹھے کھا کھا کر خود پر ...چڑھا لیا ہے۔'' سرمد نے اس کے فربہی مائل جسم کی طرف دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''تو مجھے کون سا بیگم صاحبہ کی طرح سارے شہر کے لوگوں کا دل لبھانا ہے۔ میں اِدھر تیرے لیے اپنا آپ ...ل کر بیٹھی ہوں۔ اگر تجھے، مجھے سوکھا چمڑ خ دیکھنا ہے تو بول۔ آج سے ہی فاقے شروع کر دوں گی۔'' نیلم ...ک کر اس کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

''تُو تو برا مان گئی۔ میں کیوں تیرے سے فاقے کرواؤں گا؟ جو دل میں آئے، کھایا پیا کر۔ مجھے تُو ہر حال میں اچھی لگتی ہے۔''

اس نے تعریف کے کارگر ہتھیار سے پل بھر میں بیوی کا موڈ بحال کر دیا۔ وہ اس کی بات سن کر خوشی سے مسکرانے لگی۔

''اچھا سن! میں کیفے پہنچ کر تجھے وہاں سے فون کروں گا۔ اگر کوئی دوست ہوا تو لازمی ہے، منع نہیں کرے گا ورنہ تُو سمجھ جانا کہ میں کسی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ ادھر چوکیدار وغیرہ کو خبر کر دینا۔'' اپنے اندر اُبھرتے اندیشوں اور خدشات کے پیشِ نظر اس نے نیلم کو ہدایت کرنا ضروری سمجھا۔

''ہائے سرمد! اگر کسی گڑبڑ کا ڈر ہے تو مت جا۔ رہنے دے۔ جس کو ملنا ہوگا، وہ آپ یہاں آ جائے گا۔'' اس کی ہدایت سن کر نیلم خوف زدہ ہوگئی اور اسے روکا۔

''لے..... ابھی تو خود کہہ رہی تھی کہ اتنے ہجوم میں کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اور اب مجھے روک رہی ہے۔ پاگل! میں تو صرف احتیاط کے طور پر ایسا کہہ رہا ہوں۔ ورنہ کسی نے میرا کیا بگاڑنا ہے۔ میری واحد دشمن تیری سوتیلی ماں ہے اور اس کی اتنی پہنچ نہیں کہ اِدھر کراچی میں مجھے اور تجھے ڈھونڈ کر نکال سکے۔'' اس نے خدشات کے برعکس وہ ہلکے پھلکے لہجے میں نیلم کو تسلی دینے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر تُو مجھے پہنچتے ہی فون ضرور کر دینا۔'' وہ رضامند ہوگئی۔ سستے سے سیکنڈ ہینڈ موبائل فون دونوں ہی میاں بیوی کے پاس موجود تھے اس لیے ایک دوسرے سے رابطے میں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

''اچھا تو پھر میں نکلتا ہوں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ دوست سے ملنے گیا ہوں۔'' سرمد گھڑی میں وقت دیکھتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے نکل کر کیفے شان پہنچنے میں بیس سے پچیس منٹ تو لگ ہی جاتے اور اب ساڑھے دس بج چکے تھے۔ بیگم صاحبہ سے اجازت لینے کی اسے اس لیے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ عموماً شام کے بعد ہی گھر سے نکلتی تھی۔ کبھی دن میں کہیں جانا ہوتا تو اسے ایک دن پہلے یا صبح صبح پیغام مل جاتا۔ آج کے لیے ایسا کوئی پیغام نہیں تھا۔ وہ نیلم کو خدا حافظ کہہ کر آرام سے بنگلے سے روانہ ہوگیا۔ توقع کے مطابق گیارہ بجے سے ایک دو منٹ قبل ہی کیفے شان پہنچ گیا۔ کیفے میں زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو کر وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لینے لگا لیکن اسے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔'' یک دم ہی کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اس کی طرف دیکھا۔ شناخت کے مراحل طے کرنے میں اسے چند پل سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

''اے سی صاحب! آپ..... آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے؟'' اس نے تحیر سے سوال کیا۔

''پہلے وہاں چل کر بیٹھو پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔'' شہریار نے اس سے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اس میز کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

''ایک منٹ..... میں اپنی بیوی کو خیریت کا فون کر دوں، پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔'' کرسی سنبھالتے ہی اسے نیلم یاد آئی۔ چنانچہ شہریار سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولتے ہوئے موبائل نکال کر نیلم کا نمبر ملایا۔ ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''ہاں نیلم! دیکھو، میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دوست کے ساتھ ہوں۔ تم کسی سے کچھ کہنا۔'' اس نے مختصراً بات کر کے فون بند کر دیا۔



''میں نے آپ کو دوست کہا، آپ برا مت مانیے گا۔ میری اور آپ کی دوستی کا بھلا کیا سوال..... لیکن دس والوں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں بیوی سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بول دوں۔'' سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں شہریار کو وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں، میں نے برا نہیں مانا۔'' شہریار نے اپنے مختصر پنے تلے لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر غور سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اُس کے اس طرح دیکھنے سے سرمد نروس ہونے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں سر؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کیا؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے خط کے الفاظ پڑھ کر واقعی اپنا جذبۂ حب الوطنی ثابت کرنے آئے ہو یا محض تجسس دُور کرنے۔''

''گھر سے نکلا تھا تو دماغ میں دونوں ہی باتیں تھیں لیکن اب آپ کو سامنے دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ وطن سے محبت کے دعوے کو سچ ثابت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ آپ حکم کریں، میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔'' موتی والا کے ڈرائیور کی حیثیت سے وہ شہریار کے کردار سے کافی حد تک واقف تھا اس لیے خلوص سے بولا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ آج کل تم جس عورت کے ہاں ملازمت کر رہے ہو، اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ کس کردار کی عورت ہے؟'' شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''وہ کچھ مشکوک سے کردار کی عورت ہے۔ اس کا مردوں سے آزادانہ میل ملاپ ہے۔ کبھی کبھی مجھے شک گزرتا ہے کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو کوٹھوں سے اُٹھ کر کوٹھیوں میں چلی آئی ہیں۔ لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سا رعب و دبدبہ ہے جو اسے طوائف کہنے سے روکتا ہے۔ عام طوائفوں کی طرح وہ راگ رنگ کی محفلیں بھی نہیں سجاتی۔ لیکن راتوں کو اکثر غیر مرد بنگلے پر رُکنے کے لیے آتے ہیں۔ ان مردوں کو دیکھ کر ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ بڑی اونچی حیثیت کے مالک ہیں۔ ایک دو وزیروں کو تو میں نے خود بھی پہچانا ہے۔'' سرمد نے خوب سوچ کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا وہاں آنے والوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کا مستقل آنا جانا لگا رہتا ہو؟''

''جی ہاں..... ایک دو بندے ایسے ہیں جو وہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان سے بیگم صاحبہ کی دوستی بھی بہت ہے۔''

''میں تمہیں ایک آدمی کا حلیہ بتا رہا ہوں۔ اس شخص کو ابھی دو تین دن پہلے ہی تمہاری بیگم صاحبہ کے ساتھ بنگلے میں دیکھا گیا ہے۔ ذرا اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ تم اس بندے کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں؟'' اس نے سرمد کو مہا گرو کا وہ حلیہ بتایا جس حلیے میں ماہ بانو نے اسے راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر سے دیکھا تھا۔

''یہ تو چوہان صاحب کا حلیہ ہے۔ وہ بیگم صاحبہ کے خاص دوست ہیں اور اکثر ان سے ملنے آتے رہتے ہیں۔'' حلیہ سن کر سرمد نے جوش سے بتایا۔

''مجھے تمہارے ان چوہان صاحب سے ہی غرض ہے۔ اس شخص کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔ تمہاری بیگم صاحبہ اگر اس کی دوست ہے تو یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بیگم صاحبہ کے ذریعے چوہان نامی اس شخص تک پہنچ سکوں۔ اس سلسلے میں میرا منصوبہ ہے کہ کسی طرح اس عورت کو اغوا کیا جائے اور پھر اس سے چوہان کا پتہ اُگلوایا جائے۔ تم کیونکہ اس کے ڈرائیور ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہی آتی جاتی ہے تو تمہاری مدد سے میں یہ کام بہت آسانی سے کر سکتا ہوں۔'' اس

نے سرمد کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔

''اگر آپ کو چوہان کا پتہ چاہئے تو اس کے لیے اتنے لمبے چوڑے بکھیڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دو بار بیگم صاحبہ کو چھوڑنے اس کے گھر گیا ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔'' سرمد نے اسے اطلاع فراہم کی تو وہ کھِل اُٹھا۔ قدرت خود ہی اس کے کام کو آسان بناتی جا رہی تھی۔ اس نے سرمد سے چوہان کا پتہ اچھی طرح سمجھ لیا۔ یہ ایک ایسے رہائشی پروجیکٹ کا پتہ تھا جہاں لگژری اپارٹمنٹس تعمیر کیے گئے تھے۔

''تھینک یُو سو مچ سرمد! تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ تم ذہین آدمی ہو اور یقیناً مجھے تم سے یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے۔ اپنی بیوی کو بھی یہ مت بتانا۔ عورتیں ہلکے پیٹ کی ہوتی ہیں، اگر اس کی زبان سے کچھ نکل گیا تو دشمن ہوشیار ہو جائیں گے۔'' اس نے سرمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

''میں سمجھتا ہوں سر! میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا جس سے میرے وطن کے دشمنوں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل سکے۔'' سرمد جذباتی لہجے میں بولا۔

''گڈ۔'' شہریار نے اسے سراہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھائے۔ ''یہ رکھ لو۔ گھر جاتے ہوئے بیوی کے لیے کوئی تحفہ لے جانا اور اس سے کہنا کہ یہ تحفہ تمہارے دوست نے اس کے لیے دیا ہے۔''

''نہیں سر! میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ اگر میں نے آپ سے یہ روپے لے لیے تو مجھے لگے گا کہ میں نے اپنے وطن کی ایک معمولی سی خدمت کرنے کا بھی معاوضہ وصول کر لیا۔'' سرمد نے نوٹ لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔

''میں تمہیں معاوضہ نہیں دے رہا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ میری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔''

''آپ کی بڑی مہربانی سر! لیکن اس موقع پر میں نے کوئی تحفہ بھی قبول کیا تو میرے اندر یہی احساس اُبھرے گا کہ میں نے معاوضہ لیا ہے۔ اس لیے بس آپ رہنے دیں۔'' وہ کسی صورت اس سے رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شہریار نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ درحقیقت سرمد کے انکار نے اسے ایک طرح سے یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس نے کسی غلط آدمی پر اعتماد نہیں کیا ہے اور معاملہ راز میں ہی رہے گا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اس لیے مزید اصرار نہیں کروں گا۔'' اس نے سرمد سے مصافحہ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور ساتھ ہی اسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ مہاگرو، چوہان یا پھر کوئی اور شناخت رکھنے والے اس دشمن پر گرفت کرنے کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر اقدامات کرنے تھے۔ سرمد کو رخصت کرنے کے بعد وہ کیفے سے روانہ ہوا تو اس کا ذہن اسی سلسلے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ پیچھے میز پر کافی کی دو پیالیاں اَن چھوئی ہی رکھی رہ گئی تھیں جو اس نے سرمد سے گفتگو کے دوران آرڈر کی تھیں۔ گفتگو کی گمبھیرتا میں ان دونوں کو ہی کافی پینے کا خیال نہیں آیا تھا۔

❀----✪----❀

''کیا بات ہے؟..... آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟'' کشور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر آفتاب کے پاس آ کر بیٹھنے کے خیال سے کمرے میں آئی تو اسے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ نماز کے لیے دوسرے کمرے میں جانے سے قبل تو وہ اسے بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئی تھی۔ نئے فلیٹ میں



ان کا پہلا دن تھا۔ رات کو تو وہ کافی دیر سے وہاں پہنچے تھے، پھر اسٹیٹ ایجنٹ سے کرائے اور ایڈوانس کے معاملات نمٹانے اور بے حد مختصر سامان کے ساتھ آنے کے سلسلے میں وضاحت پیش کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہو گیا تھا۔

ایجنٹ کو رخصت کرنے کے بعد بھی دونوں ہی کو بہت دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ نتیجتاً ان کے دن کا آغاز اس وقت ہوا جب یقیناً لوگ اپنے گھروں میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ ان کے پاس کچن میں استعمال ہونے والا ساز و سامان اور کھانے پینے کی اشیاء تو تھیں نہیں کہ کچھ پکایا جا سکتا۔ آفتاب نے بہت ضروری اشیاء کی فہرست بنائی اور بلڈنگ کے چوکیدار کو وہ فہرست مع رقم دے کر اس سے یہ چیزیں منگوا لیں۔ اس کام کی تکلیف اور بیوی کے پردہ دار ہونے کے علاوہ شہر سے ناواقف ہونے کا عذر اس موقع پر ان کے کام آیا تھا۔ منگوائی جانے والی چیزوں میں پکا پکایا کھانا اور آج کا اخبار بھی شامل تھا۔

چونکہ انہوں نے رات کے کھانے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے کھانا اخبار سے پہلے توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ کھانے کے بعد کشور تو نماز پڑھنے کے لیے اُٹھ گئی جبکہ آفتاب نے اخبار تھام لیا اور اب کشور واپس آئی تھی تو اخبار ایک طرف رکھا تھا اور آفتاب چہرے پر غم و غصہ لیے پریشان بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو زبان سے جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا۔ جلد ہی وہ دونوں خبریں کشور کی نظر میں بھی آ گئیں جنہوں نے آفتاب کو اس کیفیت میں مبتلا کیا تھا۔

اخبار میں ان کی محسن خالہ کے گھر کے برباد ہونے کی خبر کے ساتھ ساتھ سینئر صحافی بابر رضا کے قتل کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ اسلام آباد سے شائع ہونے والا اخبار تھا لیکن بابر کے صحافی ہونے کی وجہ سے اس کے قتل کی خبر نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ تفصیلات کے مطابق بابر رضا شام کے وقت دفتر سے نکلنے کے بعد اغوا کیا گیا تھا اور پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش رات گئے ایک کچرا گھر کے پاس سے ملی تھی جبکہ گاڑی ایک پُر رونق شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑی پائی گئی تھی۔ گاڑی کے لاک کے ساتھ کی گئی گڑبڑ نے ہی پولیس کو اس امکان پر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ بابر کو شاپنگ سینٹر کے سامنے سے اغوا کیا گیا تھا۔

خبر کے مطابق پولیس اغوا اور قتل کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ مجرموں تک پہنچا جا سکے۔ دوسری طرف خالہ کے گھر ہونے والے حادثے کو ڈکیتی کی ناکام واردات قرار دیا جا رہا تھا جو اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ عین وقت پر خالہ کا بیٹا بدر گھر پہنچ گیا تھا۔ اہلِ محلہ کے مطابق بدر جس وقت گھر پہنچا، نشے میں تھا اور شاید اسی وجہ سے گھر میں پہلے سے موجود ڈاکوؤں سے بھڑنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ڈاکوؤں نے مشتعل ہو کر اسے گولی ماری اور خود فرار ہو گئے۔ خالہ بے چاری بیٹے کی موت کا صدمہ نہ سہار سکیں اور ہارٹ فیل کا شکار ہو کر موقع پر ہی چل بسیں۔

یہ دونوں خبریں اخبار میں الگ الگ جگہ پر شائع ہوئی تھیں اور کسی عام قاری کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں خبروں کے درمیان کوئی ربط موجود ہے۔ لیکن کشور نے اس ربط کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے باپ کے گماشتے کسی طرح بابر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تشدد کے ذریعے بابر سے ان دونوں کا پتہ اُگلوایا پھر اُسے قتل کر کے رات گئے خالہ کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ وہ تو ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے ورنہ بے خبری میں مارے جاتے۔ اب بھی اگر وہ بچ گئے تھے تو اپنی خوش قسمتی کے احساس سے زیادہ اپنے محسنوں کی موت کا ملال دل پر حاوی تھا اور دل گہری اُداسی میں ڈوب گیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ بیٹھے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے۔ صرف کشور کے ہونٹوں سے نکلنے والی سسکیاں تھیں جو کمرے میں خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ورنہ آفتاب کا تو یہ حال تھا کہ وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ جب کشور کی سسکیاں زیادہ تیز ہو گئیں تو اس کے ساکت وجود میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے کشور کو مزید بکھیر دیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ لوگ مرے، ان سے احسان کا تعلق تو تھا ہی لیکن خالہ تو ایک ایسی ہستی تھیں جن کے وجود میں اس نے ممتا کا احساس پایا تھا اور اس چند روزہ ممتا کے کھو جانے پر وہ بری طرح دل گرفتہ تھی۔

''بس کریں۔ اس طرح تو آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آپ کی جو حالت ہے، اس میں آپ کو پُرسکون رہنے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے لیکن حالات مسلسل ایسے ہیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی آپ کو یہ دونوں چیزیں مہیا نہیں کر پا رہا ہوں۔'' آفتاب اسے سمجھاتے ہوئے خود بھی بڑا افسردہ تھا۔

''اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے اور یہاں لوگ اتنے بے درد کس لیے ہیں کہ دو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ من پسند زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے؟ میں نے ابا جی کی حویلی، ان کی دولت و جائیداد سب کچھ چھوڑ دیا ہے تو پھر وہ کیوں میرا پیچھا چھوڑ کر مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیتے۔ کیوں ان کے گرگے ہر جگہ میری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں؟'' وہ ایسے سوالات کر رہی تھی جن کا جواب مبہم نہیں تھا اور خود بھی بخوبی جانتی تھی۔ دنیا میں ہر ظلم اور زیادتی کے پیچھے صرف اور صرف فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ خس و خاشاک سے بھی کم حیثیت رکھنے والا انسان ذرا اقتدار اور اختیار پا کر خود کو کُل کائنات کا مالک سمجھنے لگتا ہے اور پھر اس زعم میں وہ حرکتیں کرتا ہے جو اسے زیب نہیں دیتیں۔

''خود کو سنبھالیں کشور! ابھی حالات ہمارے لیے ناموافق ہیں۔ لیکن یہ حالات سدا ایسے ہی نہیں رہیں گے۔ اللہ نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا جب ہم اس دربدری اور خوف کی زندگی سے آزاد ہو کر کہیں کسی سکون سے رہ سکیں گے۔'' وہ اسے وہی خواب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا جن سے وہ ہمیشہ بہل جاتی تھی۔

''معلوم نہیں مجھے قبر سے باہر سکون کا وہ دن کبھی نصیب ہو گا بھی یا نہیں..... لیکن میں سچ کہوں آفتاب میں اس دنیا میں بہت زیادہ نہیں لیکن اتنا ضرور جینا چاہتی ہوں کہ ہمارے پیار کی نشانی آپ کو دے سکوں۔ میں ایک بار..... صرف ایک بار اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بہت خوفزدہ اور مایوس تھی۔

''پھر وہی مایوسی کی باتیں؟ شاید پہلے بھی ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ ایسی باتیں آئندہ نہیں ہوں گی۔'' آفتاب نے خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''میں کیا کروں؟ میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتی لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں۔'' وہ کسی معصوم بچے کی بے بسی سے بولی تو آفتاب نے بے اختیار اسے چوم لیا اور بولا۔

''میری جان! حالات کبھی سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ہمارے حالات بھی بدلیں گے اور ہم بھی انشاء اللہ ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔''

''سچ؟'' کشور نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل سچ۔ آپ میرا یقین کریں۔'' آفتاب نے اسے یقین دلایا تو وہ گویا مطمئن ہو کر اس کی گود میں سر رکھے وہیں فرش پر دراز ہو گئی اور شاید کوئی نیا خواب بُننے لگی۔ لیکن اسے یہ تسلی دینے والا آفتاب خود کہاں مطمئن تھا۔ اسے یاد تھا کہ خالہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے کشور ان کے نام ایک رقعہ لکھ کر آئی تھی۔ وہ رقعہ چودھری



انہوں کے ہاتھ بھی لگا ہو گا۔ یہ کوئی امکان سے باہر کی بات نہیں تھی اور اس رقعے کو پڑھ کر نہ صرف اس کی اور کشور کی وہاں موجودگی کنفرم ہوئی ہو گی بلکہ یہ اندازہ بھی لگا لیا گیا ہو گا کہ وہ دونوں اسلام آباد کی حدود میں ہی موجود ہیں۔

چودھری جس نے نامعلوم کس طریقے سے بابر تک رسائی حاصل کر لی تھی، اسلام آباد میں اسے اطلاع دینے پر ٹل جاتا تو یہ کوئی ناممکن تو نہیں تھا کہ اس کے فلیٹ تک بھی پہنچ جاتا۔ کوئی بھی ہوشیار شخص کسی اجنبی شہر میں باہر سے آئے ہوئے افراد کو ڈھونڈنے کے لیے ہوٹلوں وغیرہ کے بعد ان اسٹیٹ ایجنٹوں کی طرف ہی متوجہ ہوتا جن کے ذریعے جائیداد کی خرید و فروخت اور کرائے پر چڑھائے جانے کے معاملات طے پاتے ہیں۔ وہ اور کشور جن مشکوک حالات میں اس فلیٹ پر آئے تھے، اس سے ان کا اسٹیٹ ایجنٹ پہلے ہی واقف ہوا تھا اور بظاہر اس نے آفتاب کا یہ بہانہ قبول کر لیا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی جلدی میں مختصر سامان کے ساتھ وہاں آ گئے ہیں اور ان کا دیگر سامان ایک ہفتے بعد پہنچے گا لیکن حقیقت میں تو وہ مطمئن نہیں ہو گا اور کسی سے معلوم کرنے پر فوراً اُگل دے گا کہ ایک مشکوک جوڑا فلاں فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سے آگے کی ناگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو، اس فلیٹ کو چھوڑ دیں۔ ایڈوانس میں دی ہوئی بھاری رقم کی وجہ سے اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ رقم کی قربانی دے کر کسی معقول بہانے کے ساتھ رقم نکلوا سکتا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کشور کے ساتھ کسی چھوٹے سے گم نام گاؤں یا قصبے میں پڑاؤ ڈال دیتا۔ اس کے لکھنے لکھانے کا کام تو کہیں بھی رہ کر جاری رہ سکتا تھا۔

اپنے ذہن میں یہ ساری منصوبہ بندی کرنے کے بعد اس نے اپنی گود میں سر رکھے آنکھیں موند کر لیٹی کشور کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور نرمی سے اس کے نقوش کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھونے لگا۔ ایک عورت کی محبت میں وہ بے شک اپنے مقصدِ حیات سے دُور ہٹ کر جینے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن سچ یہ تھا کہ اسی عورت نے اسے محبت کی اس شدت سے آشنا کروایا تھا کہ اسے اکثر خود پر رشک آنے لگا تھا۔ وہ لوگ جنہیں کوئی اپنا سب کچھ مان کر خود سے بڑھ کر چاہے، کم خوش قسمت تو نہیں ہوتے اور آفتاب کو بہرحال اپنی خوش قسمتی کا یقین تھا۔

⊛----✪----⊛

ابھی صبح کا اُجالا پوری طرح سے پھیلا نہیں تھا اور مناظر کو صبح دم گرنے والی دُھند نے اپنی لپیٹ میں لے کر قدرے چھپا رکھا تھا۔ اتنی صبح بس چند مخصوص لوگ ہی تھے جو راستے پر سے گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سڑک پر کوئی گاڑی بھی بہت وقفے کے بعد نمودار ہوتی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں دُھند کی چادر کو چیرتی ہوئی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔

اس دُھندلی صبح میں ایک کالا بھجنگ جوڑا فٹ پاتھ پر پیدل چلا جاتا تھا۔ عورت دُبلی پتلی اور مناسب قامت کی تھی اور اس نے اپنے جسم پر ایک پرانی سی سوتی ساڑھی لپیٹ رکھی تھی۔ ساڑھی کا پلو اس کے سر پر تھا جس نے اس کا آدھا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے پشت پر سے دیکھتا تو اس کی متناسب جسامت پر بھی ساڑھی کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اسی شخص کو سامنے سے اس عورت کو دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی۔ بے تحاشا سیاہ رنگت نے اس کے پورے وجود کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر ڈالنے کے بعد دوسری کی خواہش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ چلتا اسی جیسی رنگت والا مرد لمبے قد کا مالک

تھا۔ اس نے بے حد پرانی جینز کے ساتھ اس سے بھی زیادہ گھسی ہوئی سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور
اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ٹی شرٹ کی ہاف آستینوں سے جھانکتے اس کے بازوؤں پر کہاں آستینیں ختم ہو
ہیں۔ جسامت اس کی بھی البتہ بہت شان دار تھی اور دیکھنے والے برملا کہہ سکتے تھے کہ وہ یا تو باقاعدگی
ورزش کرنے کا عادی ہے یا پھر کوئی ایسا مشقت کا کام کرتا ہے جس کے باعث اس کے جسم پر کہیں ذرا
اضافی گوشت نہیں چڑھ پاتا۔

''تم نے سچویشن کو پوری طرح سمجھ لیا ہے نا؟ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟'' فٹ پاتھ پر سیدھے چلتے ہو
اس نے اپنی ہم قدم عورت سے سوال کیا۔

''میں سب سمجھ گئی ہوں اور مجھے ڈر بھی نہیں لگ رہا۔'' ساڑھی کے پلو کے اندر سے خوب صورت اور
آواز اُبھری۔

''اگر تمہیں لگے کہ گڑبڑ ہے اور سچویشن تمہارے ہاتھ سے نکل رہی ہے تو بلا دریغ گولی چلا دینا۔ آگے
معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔ میرا دیا ہوا پسٹل تم نے احتیاط سے اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہے نا؟'' ان
گفتگو اور انداز کسی بھی طرح ان کے موجودہ حلیے سے میل نہیں کھا رہے تھے اور حقیقت بھی یہ تھی کہ ان کا یہ
دراصل بہروپ تھا۔ وہ ماہ بانو اور شہریار عادل تھے جو ساتھ ساتھ چلتے فلک سٹی کی طرف جا رہے تھے۔ فلک
کے بلاک بی میں سیکنڈ فلور پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں سرمد کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق مہا گرو، چو
کے نام سے رہائش پذیر تھا۔ شہریار نے اپنے طور پر ان معلومات کی تصدیق کر لی تھی اور ان معلومات کی رو
میں ہی اس نے ایک منصوبہ تشکیل دیا تھا۔

اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس کا کل کا سارا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ ماہ بانو کو بھی اپنی
کے لیے بلانا پڑا تھا لیکن کچھ پریشان تھا کہ جانے یہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی صحیح طریقے سے اپنا کردار ادا کر
سکے گی یا نہیں۔ وہ اسے کوئی نقصان پہنچنے کے خیال سے بھی ڈر رہا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ یہاں اس شہر
ماہ بانو سے بڑھ کر کسی اور پر اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ماہ بانو نے اس کے بنائے ہوئے منصوبے میں شامل ہونے کے لیے ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر
جھجک ہامی بھر لی تھی۔ اور اب اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے شک اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا لیکن
شہریار کے سامنے اپنی اس کیفیت کو ظاہر کرنے سے مکمل گریز اں تھی۔

''آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک خطرناک مجرم اور قاتل کو اس کے انجام تک پہنچانے کے
اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنا پڑی تو مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنی طرف سے شہریار کو اطمینان دلایا

''گڈ..... ہم جو کام کرنے جا رہے ہیں اس کی کامیابی کے لیے اسی اسپرٹ کی ضرورت ہے۔ لیکن
اس بات کو دھیان میں رکھنا کہ تمہاری جان کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ اس لیے بلاوجہ خود کو خطر
میں مت ڈالنا اور میری ہدایت پر عمل کرنا۔'' مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ادا کیے گئے ان الفاظ میں اگرچہ
جذبے کی آمیزش کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا پھر بھی ماہ بانو کا دل دھڑک اُٹھا اور یہ اندازہ ہونے کے باوجود
شہریار یہ الفاظ اپنے کسی بھی پرانے ساتھی کے لیے ادا کر سکتا تھا، اس نے خود کو کچھ دیر کے لیے خوش فہمی میں
رکھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں فلک سٹی کے مین گیٹ تک جا پہنچے۔ گیٹ پر مو
چوکیدار نے انہیں سرتاپا دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم لوگ؟''



''یہ روپ وتی ہے، پاروتی کی بہن۔ اور میں اس کا گھر والا، مہندر ہوں۔ پاروتی کی ساس کا کل شام
انتقال ہو گیا تھا اس لیے وہ اور اس کا پتی اس کا کریا کرم کرنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے پاروتی
اپنی بہن روپا سے کہہ گئی تھی کہ ہم پتی پتنی ایک دو دن کے لیے ان کے حصے کا کام سنبھال لیں، اس لیے ہم یہاں
آئے ہیں۔ ہمیں آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟'' لہجے میں زمانے بھر کی عاجزی سموتے ہوئے شہریار نے اپنی
بنائی ہوئی کہانی سنائی اور آخر میں بڑی فکرمندی سے سوال بھی کر ڈالا۔

''دیر تو خیر نہیں ہوئی۔ لیکن پاروتی اور کمار کو چاہیے تھا کہ جانے سے پہلے خود اطلاع دے جاتے۔''
چوکیدار نے اعتراض کیا۔

''بات تمہاری بھی ٹھیک ہے بھائی! لیکن ذرا سوچو کہ ایسی پریشانی میں منش کا دماغ کام ہی کہاں کرتا ہے
ان پتی پتنی کو سوجھا، ہمیں بول گئے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں اندر جا کر کام کرنے دو گے یا ہم یہیں سے واپس
چلے جائیں؟ پر یاد رکھنا کہ ایسی صوت میں ان دونوں کی پگار (تنخواہ) میں سے کچھ نہیں کٹنا چاہیے۔ پہلے ہی کمار
کے چکر میں پھنسا ہوا ہے، پگار میں سے رقم کٹی تو اور مشکل میں پڑ جائے گا۔'' اس بار اُس نے لہجے کی عاجزی کو کم
کر کے تھوڑا جارحانہ رویہ اپنا لیا تھا۔

''میں کیوں روکوں گا تمہیں کام سے؟ تم شوق سے کام کرو۔ میں دوسرے چوکیدار کو بھیج کر چیک کرواؤں
گا کہ صحیح سے صفائی ہوئی ہے یا نہیں؟'' چوکیدار نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا اور ایک سمت میں اشارہ
کرتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر اے بلاک کی سیڑھیوں کے نیچے جھاڑو اور دوسرا ضرورت کا سامان رکھا ہے، وہاں
سے نکال لو۔ اور کام ختم کرنے کے بعد جانے سے پہلے ساری چیزیں واپس اسی جگہ پر رکھ دینا۔''

اُس کی ان ہدایات پر سر ہلاتے ہوئے ماہ بانو اور شہریار خاموشی سے اشارہ کی سمت میں بڑھ گئے۔ ذرا دیر
بعد ان کے ہاتھوں میں بھاری جھاڑو اور کھجور کی ٹوکریوں کے علاوہ صفائی سے متعلق دوسرا سامان بھی نظر آ رہا تھا۔
فلک سٹی سے چوہان کے اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شہریار نے جن کرداروں کا انتخاب کیا تھا، وہ
یہاں خاکروب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بلڈنگ کے برآمدوں، سیڑھیوں اور کمپاؤنڈ کی زیادہ تر صفائی کمار
کرتا تھا جبکہ اس کی پتنی پاروتی نے دو تین چھوٹے چھانٹ مردوں کے گھروں کی صفائی کا کام سنبھال رکھا
تھا۔ ان مردوں میں سے ایک مرد چوہان بھی تھا جس کے اپارٹمنٹ کی پاروتی صبح سب سے پہلے صفائی کرتی
تھی۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے لیے شہریار کو ان دونوں میاں بیوی کو اپنا مہمان بنانا پڑا تھا۔

کل جب وہ فلک سٹی کا جائزہ لینے آیا تھا تو اُس نے اس خاکروب جوڑے کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ ان
دونوں کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس خاکروب جوڑے کا تو بلڈنگ کے ہر بلاک اور فلور پر آنا جانا ہوگا اور وہ تمام
باشندوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے..... تو کیوں نہ اُنہیں چوہان نامی شخص کے بارے میں معلومات
حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس نے اُن دونوں کا پیچھا کیا اور رقم کا لالچ دے کر ان سے چوہان
کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں جو کہ بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسے پتہ چلا کہ پاروتی، چوہان کے
اپارٹمنٹ میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے اور علی الصباح سب سے پہلے وہیں جاتی ہے۔ پاروتی کے مطابق
چوہان صبح خیز تھا اور اس کے پہنچنے سے بھی پہلے جاگ جاتا تھا۔ وہ جب تک صفائی ستھرائی کا کام نمٹاتی، چوہان
اپنے فلیٹ کی کھڑکیاں کھولے ورزش اور یوگا وغیرہ میں مصروف رہتا اس دوران کمار بھی بلاک کے دیگر اپارٹمنٹس
سے کچرا اکٹھا کرتا اور سیڑھیوں کی صفائی کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا۔ پاروتی، چوہان کے اپارٹمنٹ کا کوڑا کرکٹ اس
کے حوالے کرتی اور خود بھی اس کے ساتھ اگلے بلاک میں کام کرنے کے لیے چلی جاتی۔

شہریار نے جو میاں بیوی کا یہ معمول سنا تو فوری طور پر اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل پا گیا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پاروتی اور کمار اگلے دن اپنی ڈیوٹی پر نہ پہنچیں۔ وہ ان دونوں کو بہلا پھسلا کر زبیر کے بنگلے پر لے گیا اور انہیں مزید رقم کا لالچ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اگلے دن ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ خاکروب جوڑا بے اولاد تھا اس لیے اسے انہیں بنگلے پر روکے رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ماہ بانو کو وہ خود اس کے ہاسٹل سے جا کر لے آیا تھا اور اسے تمام تفصیلات سمجھانے کے ساتھ اس کا حلیہ بدلنے میں بھی مدد دی تھی۔

اب وہ دونوں پاروتی کے بہن بہنوئی کے روپ میں فلک سٹی میں موجود تھے اور پاروتی اور اس کا شوہر کمار، زبیر کے بنگلے میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے ان دونوں کی طرف سے تعاون کے وعدے کے باوجود شہریار نے احتیاطاً انہیں کھانے میں خواب آور دوا ملا کر کھلا دی تھی اور انہیں کمرے میں لاک کر کے آیا تھا تاکہ وہ کسی پریشانی کا باعث نہ بن سکیں۔

''میں تمہارے چوہان کے اپارٹمنٹ میں جانے کے پانچ منٹ بعد ہی گھنٹی بجا دوں گا۔ تم جلدی سے آ کر دروازہ کھول دینا۔ اس کے بعد کی ساری سچویشن میں خود سنبھال لوں گا۔'' بلاک بی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ہدایت دی۔ اصل میں وہ چوہان یا مہا گرو کو اس کے اپارٹمنٹ کے اندر ہی گھیرنا چاہتا تھا اس لیے اسے ماہ بانو کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اپارٹمنٹ میں گھسنے میں آسانی ہو جاتی ورنہ وہ جانتا تھا کہ چوہان جیسے لوگ اتنے ہوشیار رہتے ہیں کہ کسی اجنبی کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

سیکنڈ فلور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ دانستہ تھوڑا سا پیچھے رہ گیا جبکہ ماہ بانو آگے بڑھ کر چوہان کے اپارٹمنٹ کے سامنے جا ٹھہری۔ ڈور بیل کا بٹن دبانے کے بعد اس نے ذرا سا رُخ موڑ لیا تاکہ اگر چوہان ڈور آئی سے جھانک کر دیکھے تو اسے اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہ آئے۔ حسبِ توقع دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ ماہ بانو کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی جبکہ چوہان اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اندر کی طرف بڑھ گیا۔ حقیقتاً ماہ بانو خود بھی اس کی صرف پشت ہی دیکھ سکی تھی اور لمبے بالوں کی پونی ٹیل نے تصدیق کر دی تھی کہ یہ وہی ہے جس کو اس نے راحیلہ کے پڑوس میں دیکھا تھا۔

اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی، ساتھ ہی اس نے شکر بھی کیا کہ وہ شخص وہاں رک کر اس سے مخاطب نہیں ہوا ہے، اگر وہ رک جاتا اور پاروتی کی جگہ اسے دیکھ کر اس سے سوال جواب کرتا تو وہ اسے بھی وہی جوابات دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی جو نیچے شہریار نے چوکیدار کو دیئے تھے۔ مگر خیر گزری اور ایسی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی کیونکہ پاروتی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ سب سے پہلے کچن ہی کی صفائی کرتی تھی۔

کچن میں پہنچ کر اس نے بے ترتیب پڑی چیزوں کو ترتیب وار رکھنا شروع کر دیا۔ اُس کا اس شخص کے کچن میں کام کرنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اگر وہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑی رہتی تو خاموشی کے باعث وہ چونک بھی سکتا تھا۔ ناچار اسے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی پڑ رہی تھی لیکن کان مسلسل ڈور بیل کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ دروازے کا آٹومیٹک لاک اُس کے اندر پہنچنے پر خود بخود بند ہو گیا تھا اور اب شہریار اسی صورت اندر آ سکتا تھا کہ وہ اس لاک کو کھولتی۔ پانچ منٹ کا وہ مختصر سا دورانیہ بڑی مشکل سے گزرا اور جیسے ہی ڈور بیل کی آواز اس کے کانوں میں اُبھری، وہ دروازے کی طرف دوڑ گئی۔

''ارے.....کون ہو تم؟.....رُکو۔'' خلافِ معمول بجنے والی گھنٹی کو سن کر چوہان خود بھی اپنی یوگا کی مشقیں



ادھورا چھوڑ کر آ گیا تھا اور اس موقع پر اس نے نوٹ کر لیا تھا کہ جو عورت دروازہ کھولنے کے لیے بھاگی ہے، وہ پاروتی نہ ہو بلکہ کوئی اور ہے۔ اس نے فوراً ہی جست لگائی اور ماہ بانو کو جا لیا۔ وہ جو لاک پر ہاتھ رکھ چکی تھی اور انگلیوں کی ذرا سی جنبش سے لاک کھول سکتی تھی، اس صورتِ حال پر گھبرا گئی۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں.....کون ہو تم؟'' چوہان نے اپنی انگلیاں سختی سے اس کے بازو میں گاڑتے ہوئے سرد مہری سے پوچھا۔

''میں پاروتی کی بہن روپ ولی ہوں جی۔ وہ اپنی سوَرگ باشی ساس کے کریا کرم کے لیے گاؤں گئی ہے اس لیے اُس نے مجھے اور میرے پتی کو اس جگہ کام پر بھجوا دیا ہے۔ باہر شاید میرا پتی ہی کچرا لینے آیا ہے۔'' وہ گھبرائی گھبرائی سی وہ کہانی سنانے لگی جو یہاں آنے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی لیکن چوہان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا جو بلڈنگ کے چوکیدار کی طرح آرام سے بہل جاتا۔ وہ کھٹک گیا تھا اور اس کے تربیت یافتہ دماغ کو خطرے کی سگنل دینے والی آنکھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ماہ بانو کی جلد کی سیاہی اوریجنل نہیں ہے اور اسے میک اپ کے ذریعے یہ روپ بخشا گیا ہے۔

''جھوٹ بولتی ہے سالی۔'' اس نے ایک زوردار تھپڑ ماہ بانو کے رخسار پر رسید کیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ ماہ بانو کا گال اندر سے پھٹ گیا اور اس نے منہ کے اندر خون کا ذائقہ محسوس کیا۔

اسی وقت بے حد عجلت میں گھنٹی دوبارہ بجائی گئی۔ گھنٹی کی آواز سن کر ماہ بانو کا پست پڑتا حوصلہ ایک بار پھر جاگا اور اس نے ابھی تک لاک پر جمی اپنی انگلیوں کو جنبش دے ڈالی۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ لاک کھلتے ہی باہر سے دروازہ پوری قوت سے دھکیلا گیا۔ چونکہ ماہ بانو اور چوہان دونوں ہی دروازے کے عین سامنے موجود تھے، اس لیے دونوں ہی زد میں آ گئے اور دروازے کے دھکے سے دُور جا گرے۔ اگلے ہی لمحے شہریار اپارٹمنٹ کے اندر تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب اندر کی آوازیں باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ دوسری طرف چوہان نے بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کیا اور نیچے گرتے ہی فوراً سنبھلنے کے بعد تقریباً اُڑتا ہوا شہریار پر آ پڑا تھا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے شہریار نے بائیں جانب جھکائی دی لیکن پھر بھی چوہان کی لات کا چھلتا ہوا وار اس کے دائیں شانے پر لگ ہی گیا۔ اس تنگ سی راہ داری میں وہ اس سے زیادہ اپنا بچاؤ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس نے چوٹ کھانے کے بعد بھی بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور گھومتے ہوئے بائیں ہاتھ کا گھونسہ چوہان کی گردن پر دے مارا۔ یہ نپا تلا گھونسہ اگر کسی عام آدمی کی گردن پر پڑا ہوتا تو وہ فرش پر لمبا لمبا لیٹا نظر آ رہا ہوتا۔ البتہ چوہان منہ سے ہلکی سی اوغ کی آواز نکالتا ہوا فوراً ہی سنبھل کر اس پر حملہ آور ہوا اور شہریار کے پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کی۔ اس وار کو کرتے ہوئے اس نے شاید اپنی پوری جسمانی قوت استعمال کر ڈالی تھی۔ شہریار کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے پیٹ پر کوئی اینٹ دے ماری ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے دُہرا ہو گیا خود چوہان بھی اپنے ہی وار کے ردِعمل میں پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ یہ لڑائی میں آنے والا پہلا لمحہ تھا جو دونوں فریقوں میں سے کسی نے بھی فوری طور پر ایک دوسرے پر وار نہیں کیا تھا۔

اس مختصر لمحے میں خاموش تماشائی بنی ماہ بانو حرکت میں آئی۔ دروازے کا دھکا لگ کر گرنے کے بعد اسے سنبھل کر کھڑا ہونے میں چوہان کے مقابلے میں کچھ وقت لگا تھا۔ کھڑے ہونے کے بعد بھی وہ لڑائی میں دخل دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی اور ایک دیوار کے ساتھ چپک گئی تھی۔ البتہ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال لیا تھا جو یہاں آنے سے پہلے شہریار نے اسے دیا تھا۔ شہریار اور چوہان کو ایک دوسرے

سے ذرا فاصلے پر پا کر اس نے اس پسٹل کو استعمال میں لانے کی جرأت کی اور اس کا رُخ چوہان کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''ہینڈز اپ۔ اگر حرکت کی تو گولی ماردوں گی۔'' اُس کی اِس دھمکی پر چوہان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایک نظر ہی اسے یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اسے دھمکی دینے والی بے شک پسٹل چلانا جانتی ہے لیکن اس کام میں مہارت نہیں رکھتی۔ ماہ بانو کے ہاتھوں میں موجود خفیف سی لرزش اس کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی، چنانچہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے یک دم ہی اس پر چھلانگ لگا دی۔ اگلے پل شہریار نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا۔ چنانچہ وہ چوہان کو ماہ بانو کی طرف چھلانگ لگاتا دیکھ کر حرکت میں آیا اور خود چوہان پر چھلانگ لگا دی۔ ان دونوں کے جسم فضا میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دونوں ہی نیچے زمین پر آرہے۔ چوہان کی بدقسمتی کہ نیچے گرتے ہوئے اس کا سر پوری قوت سے راہداری کی دیوار سے ٹکرا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچنے لگے۔ اُس کی اس حالت کا شہریار نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کھڑکی ہتھیلی کا ایک نپا تلا وار اُس کے سر پر مزید رسید کر دیا۔ اس وار نے چوہان کی رہی سہی سدھ بدھ بھی چھین لی اور وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ شہریار نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

''یہاں کی کھڑکیاں بند کر دو۔'' چوہان کو لاؤنج سے گھسیٹ کر ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو حکم دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے حکم پر عمل کرنے لگی۔ کھڑکیاں بند ہونے کے بعد اپارٹمنٹ ایک طرح سے ساؤنڈ پروف ہو گیا تھا۔ تنہائی پسند اور اپنی پرائیویسی کے لیے سخت کانشس رہنے والے طبقے کے لیے تعمیر کیے گئے ان اپارٹمنٹس کی بناوٹ میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ اندر کی آوازیں باہر نہ جائیں اور باہر کی آوازیں اندر نہ آسکیں۔ چنانچہ اب اس اپارٹمنٹ میں جو کچھ ہوتا، اس کا باہر والوں کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر تھوڑی بہت آوازیں باہر جاتیں بھی تو سننے والے زیادہ سے زیادہ یہی گمان کرتے کہ اندر بلند آواز میں ٹیلی ویژن چل رہا ہے۔

''تم دوسرے کمرے میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔'' کھڑکیاں بند کرنے کے بعد ماہ بانو بھی اس کمرے میں گئی تھی جو شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شہریار جو کہ چوہان کو نائیلون کی ڈوری کی مدد سے ایک کرسی سے باندھ رہا تھا، اس کی موجودگی کو محسوس کر کے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ اس وقت وہ ایک قطعی بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا جس کے چہرے سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ قدرے سفاکی بھی چھلک رہی تھی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد شہریار، چوہان کو باندھنے سے فارغ ہوا تو اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پتلا سا تیز دھار چاقو باہر نکال لیا۔ اس چاقو کی دھار کی چمک نے اس کے چہرے پر موجود سفاکی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا۔ اس کی نرم خوئی اور قانون پسندی کو پے در پے ملنے والی ناکامیوں اور ظالموں کی بالادستی نے وقتی طور پر سُلا دیا تھا اور پھر یہاں تو سامنے تھا بھی وہ شخص جس نے اس کی معصوم اور کم عمر بھتیجی شینا کو نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا۔ سجاد رانا کی موت کی ذمے داری بھی یقیناً اسی شخص پر عائد ہوتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے بارے میں شک تھا کہ وہ ملک کا دشمن ہے جو یہاں رہ کر پڑوسی ملک کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے کسی رو رعایت سے کام لیے بغیر چاقو کی نوک چوہان کے رخسار پر رکھی اور تقریباً دو انچ لمبی ایک لکیر کھینچ دی۔ خون کی اس سرخ لکیر کے اُبھرتے ہی چوہان نے ہلکی سی سسکاری لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔



''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' آنکھ کھلتے ہی اس نے بے خوفی سے شہریار سے سوال کیا۔

''سوال تم نہیں، میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔'' شہریار اس کے زخمی رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے غرایا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ چوہان کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' چوہان کے لمبے بالوں کی پونی ٹیل پکڑ کر اس کا منہ سیدھا کرتے ہوئے شہریار نے سوال کیا۔

''چوہان خان۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا اور شہریار کے چہرے کو جانچتی ہوئی نظروں سے ٹٹولنے لگا۔ ایک دم ہی اس کی آنکھوں میں چمک اُبھری اور وہ زیرلب مسکرا دیا۔ اُس نے سیاہی کے پیچھے چھپا اصلی شہریار عادل کا چہرہ شناخت کر لیا تھا۔

اصل نام بتاؤ۔'' شہریار نے جنون کے عالم میں پے در پے کئی مکے اس کے منہ پر دے مارے۔ ان مکوں نے چوہان کے کئی دانت توڑ ڈالے اور اس نے ابکائی لیتے ہوئے ان دانتوں کے ساتھ بہت سا خون بھی اگل ڈالا۔

''مجھے اپنا صحیح نام بتاؤ ورنہ میں تمہارے جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیڑ ڈالوں گا۔ اور ہاں، اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ''را'' کے ایجنٹ ہو جس کے جرائم کی لسٹ اتنی لمبی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں جاتے ہی سیدھے پھانسی کے پھندے پر لٹکائے جاؤ گے۔'' اس نے ضروری سمجھا کہ چوہان پر اس کی حیثیت واضح کر دے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر! میں ایک پاکستانی شہری ہوں۔ تم چاہو تو میرا شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہو۔'' اس نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کی آواز بہت عجیب سی نکل رہی تھی۔

''تمہاری مرضی۔ اگر تم میرے ہاتھوں اپنا حلیہ بگڑوانے پر ہی مُصر ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' شہریار کو اس کا جواب پسند نہیں آیا اور اس نے چاقو کی نوک چوہان کے سر پر عین اس جگہ رکھ دی جہاں کچھ دیر قبل دیوار سے ٹکرا جانے کے باعث بڑا سا گومڑ بن گیا تھا۔ چاقو کی نوک کو اس مقام پر رکھنے کے بعد اس نے اسے گھمانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ نوک سوراخ بناتی ہوئی اندر اُترنے لگی۔ بننے والے سوراخ سے خون نکل کر چوہان کے چہرے پر بہنے لگا۔ ابتدائی ایک ڈیڑھ منٹ تک اس نے ضبط سے کام لیا اور ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا لیکن پھر اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلتی چلی گئیں۔

شہریار نے اس کی چیخوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ چاقو کی نوک آدھے انچ سے زیادہ اندر جا چکی تھی اور وہ جس مستقل مزاجی سے یہ کام کر رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چاقو کا ہاتھ دستے تک چوہان کے سر میں اسی پُر اذیت طریقے سے اُتارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوہان نے اس کا یہ ارادہ بھانپ لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

''رُک جاؤ..... تم جو کچھ پوچھو گے، میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر شروع کرتے ہیں۔ تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ جہاں تمہاری زبان رُکی، وہاں میرا ہاتھ چلنا شروع ہو جائے گا۔''

''پہلے مجھے پانی پلا دو۔'' اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے فرمائش کی۔

''تم نے میری معصوم بھتیجی کو اپنی پتھر کی مورتی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے پانی پلایا تھا

جو اپنے لیے پانی مانگ رہے ہو؟'' شہریار اس کی فرمائش سن کر ایک بار پھر مشتعل ہو گیا اور پونی ٹیل سے پکڑ کر اس کے سر کو کئی جھٹکے دیئے۔

''اوکے..... مت پلاؤ پانی۔ جو پوچھنا ہے پوچھو۔'' اپنے لیے کوئی رعایت نہ پا کر اس نے سپر ڈال دی اور نڈھال سے لہجے میں بولا۔

''نام؟'' شہریار نے یک لفظی سوال کیا۔

''ورما۔''

''را کے لیے کب سے پاکستان میں کام کر رہے ہو؟''

''تقریباً تین سال سے۔''

''لاہور میں سیٹھ سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں خواجہ سراؤں کو جمع کر کے دیوی کے چرنوں میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو بھینٹ چڑھانے کا جو ڈرامہ کھیلا گیا، اس کے پیچھے کیا مقصد تھا؟''

''میں نے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کی مدد سے ہندو خواجہ سراؤں کا ایک گروہ تشکیل دیا تھا۔ چند ایک کے سوا گروہ کے تمام افراد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے لیکن میں نے مہا گرو کی حیثیت سے ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ ہندو ہونے کے ناتے ان کی ساری وفاداریاں بھارت ماتا کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ میں ان کا مذہبی پیشوا بھی بنا ہوا تھا اور میں نے یہ ریت ڈالی تھی کہ اگر ہم دیوی ماں کے چرنوں میں پابندی سے ہر پورن ماشی کی رات ایک جوان کنیا کی بھینٹ چڑھائیں اور پرارتھنا کریں تو دیوی ماں ان جیسے ادھورے وجودوں کو جنم دینا چھوڑ دے گی۔ اس طریقے سے وہ لوگ ذہنی طور پر میرے غلام بن گئے تھے اور میں جو کچھ کہتا تھا، اس پر عمل کرتے تھے۔ ان میں سے کئی خوب صورت خواجہ سراؤں نے میرے حکم پر کئی شوقین مزاج سرکاری عہدے داروں کو اپنے دام میں گرفتار کر کے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں لیکن پھر میری جاری کردہ رسم ہی نے میرے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔

خواجہ سراؤں کا ایک گروہ انجانے میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو اغوا کر کے لے آیا۔ میں نے بھی لڑکی کا بائیو ڈیٹا جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجے میں سجاد رانا نے پیچھا پکڑ لیا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے خود اپنے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا پڑا اور میں گروہ کو منتشر کر کے بنا بنایا سیٹ اپ ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔'' وہ جانتا تھا کہ کسی عدالت کے سامنے اقبالی بیان نہیں دے رہا ہے جو اس بیان کی بنیاد پر اسے کوئی سزا سنا دی جائے۔ یہ بیان ایک ایسے شخص کے سامنے دیا جا رہا تھا جو پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا اور زبان بند رکھنے کی صورت میں فوری طور پر بھی اس کی جان لے سکتا تھا۔ چنانچہ اپنے لیے مہلت حاصل کرنے کے لیے بولتا جا رہا تھا۔ بعد میں جب اسے کسی حکومتی ادارے کی تحویل میں دیا جاتا تو وہ ہر بات سے مکر جاتا۔ لمبی عدالتی کارروائیوں اور پیشیوں کے دوران کوئی ایسا موقع بھی مل سکتا تھا جب وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن ابھی وہ اپنی زبان بند رکھ کر اس جنون میں مبتلا شخص کے اشتعال کو اتنا بڑھانے کا رِسک بھی نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار دے۔

بھارت ماتا کے لیے جان وار دینے کا سبق ان لوگوں نے صرف اپنے نیچے کارکنوں کو پڑھایا تھا۔ خود اسے اور اس کے لیول کے دوسرے لوگوں کو اپنی جانیں بہت عزیز تھیں چنانچہ وہ سب سے پہلے خود کو ہی بچانے کی کوشش کرتے تھے اور خود کو اور دوسروں کو بہلانے کے لیے یہ دلیل ہوتی تھی کہ ہم زندہ رہیں گے تو اپنی دھرتی کے لیے بہت کچھ کر سکیں گے۔



''ڈی آئی جی سجاد رانا کو بھی تم نے ہی قتل کروایا تھا؟'' ورما کا اعترافی بیان سنتے ہی شہریار نے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سجاد رانا کا قتل ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن وہ ہماری راہ پر اس طرح لگ گیا تھا کہ اگر ہم اس سے اپنی جان نہ چھڑاتے تو وہ ہمیں تباہ کر دیتا۔ اس لیے ہمیں مجبوراً اُس کا پتا صاف کرنا پڑا۔'' ورما نہیں جانتا تھا کہ اس کا ہر اعتراف شہریار کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز کرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اس یقین کی بنیاد پر کہ بالآخر اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے گا، اعتراف پر اعتراف کیے جا رہا تھا۔

''اپنے ساتھیوں کے نام اور ان کا پتہ ٹھکانہ بتاؤ۔'' اس کے تسلسل سے ''ہم'' اور ''ہمیں'' کا صیغہ استعمال کرنے پر شہریار نے اس سے فرمائش کر ڈالی لیکن اس سوال کا جواب آسانی سے دے دینا ورما کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے یک دم ہی ہونٹ بھینچ لئے۔

''بتاؤ، ورنہ میں تمہارا قیمہ کر ڈالوں گا۔'' اس کی خاموشی شہریار کے لیے قابلِ برداشت تھی۔ وہ چپ ہوا تو اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور اس نے پے در پے کئی وار ورما کے دونوں بازوؤں پر کر ڈالے۔ یہ وار کھا کر ورما کسی ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ اس کی یہ چیخیں ہی تھیں جو ماہ بانو کو دوسرے کمرے سے یہاں لے آئیں۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئیں۔ خون میں نہایا ہوا ورما اور زندگی پر اُترا شہریار اُس کی نرم خو طبیعت کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ ایک پل کے لیے اس منظر کو دیکھ کر پلٹنے کے بعد وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور شہریار کے ورما کے جسم پر گھاؤ لگانے کے لیے ایک بار پھر بلند ہوتے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''نہیں سر!..... ایسا مت کریں۔ یہ بہت زخمی ہو گیا ہے، اب اور زخم لگے تو مر جائے گا۔'' وہ بولتے بولتے شہریار سے چمٹ گئی۔ اُس کے بدن کے لمس نے شہریار کے اندر حیرت انگیز تبدیلی رونما کی اور اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ایک نظر خود سے لپٹ کر کانپتی ہوئی ماہ بانو پر ڈالی اور اس کے گرد بازو کا گھیرا بنا کر ورما سے دور ہٹ گیا۔

⊛----✪----⊛

''میں تمہیں کیا کہوں جوان! میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایک طرف دیکھا جائے تو تم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن حقیقت میں تم نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے قانون کو ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ ان نے کتنی مشکل سے اس سچویشن کو ہینڈل کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔'' آئی جی مختار مراد کے لہجے میں اس کے لیے بہ یک وقت شفقت اور ناراضگی دونوں موجود تھیں۔ ان کا شکوہ سن کر وہ ہنس پڑا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ اس سچویشن کو ہینڈل کر لیں گے اسی لیے تو میں نے آپ کو کال کی تھی۔ ورنہ وہ سیٹ تو گیا تھا میرے ہاتھ سے۔''

''اب بھی اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے جسم سے خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود ڈاکٹرز تک حتمی طور پر اس کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔'' مختار مراد نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ ایسے ڈھیٹ لوگ اتنی آسانی سے دنیا کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بچ جائے گا۔ نہیں بھی بچا تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے جو اعترافات کروانے تھے، وہ اس سلوک کے بغیر کر ہی نہیں

سکتا تھا جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔'' شہریار کا لہجہ بے لچک تھا۔ ورما سے اس کی نفرت کے پیچھے کوئی ایک وجہ نہیں تھی اور تمام ہی وجوہات ایسی تھیں جن کے بدلے وہ اس کی جان لینا درست سمجھتا تھا۔ وہ تو ماہ بانو عین وقت پر اس کے سامنے آگئی اور اسے اپنا ہاتھ روکنا پڑا ورنہ ورما کی جان تو چلی ہی جاتی۔

ماہ بانو نے اسے روکا تو وہ اپنی جنونی کیفیت سے باہر نکل آیا اور مختار مراد کو فون کر کے مختصراً ساری صورت حال بتائی۔ مختار مراد کے لیے لاہور میں بیٹھ کر کراچی میں درپیش اس صورت حال کو ہینڈل کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر فون گھمائے اور کراچی کی انتظامیہ حرکت میں آگئی۔ زخمی ورما کو اس کے اپارٹمنٹ سے ایمبولینس میں ہسپتال منتقل کرنے سے لے کر اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے اور کلفٹن کے بنگلے سے اس کی ساتھی عورت کو گرفتار کروانے تک کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے تھے۔

شہریار اور ماہ بانو، پولیس کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔ اس نے ماہ بانو کا حلیہ درست کروا کر پہلے اسے اس کے ہوسٹل پہنچایا پھر زبیر کے بنگلے میں موجود پاروتی اور اس کے شوہر کمار کو انعام و اکرام سے نوازنے کے بعد اس دھمکی سمیت کہ جو کچھ ہوا وہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی۔ اور اگر ان دونوں میاں بیوی نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ بھی دھر لیے جائیں گے، رخصت کر دیا۔

ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ کراچی سے لاہور جانے والی پہلی فلائٹ کے ذریعے روانہ ہو گیا۔ زبیر کو بھی اس نے فون پر اپنے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے ایئرپورٹ پہنچنے کا کہا تھا۔ بے چارہ زبیر بھاگم بھاگ ایئرپورٹ پہنچا تو اس نے اسے اس کے بنگلے کی چابیاں تھمائیں اور آئندہ کبھی فرصت میں اس کے گھر آنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر بھی اس نے مشکل سے تین چار گھنٹے لیاقت رانا کی کوٹھی پر گزارے اور پھر وہاں سے نور کوٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ نتیجتاً اگلی صبح وہ ٹھیک وقت پر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے دفتر میں موجود تھا۔ مختار مراد کی یہ کال اسے دفتر میں ہی موصول ہوئی تھی اور وہ گزرے ہوئے کل کے مقابلے میں آج بہت پُرسکون ہو کر ان سے بات کر رہا تھا۔

''میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں کہ ورما سے تم نے جو اعترافات کروائے، وہ اسی سلوک کے ساتھ ممکن تھا۔ لیکن تمہارے سامنے کیے گئے اعترافات کی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک ورما ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ سب کچھ قبول نہیں کر لیتا۔ البتہ اس کے اپارٹمنٹ سے ملنے والے دستاویزی ثبوتوں اور اس کی گرفتار ہونے والی ساتھی کی وجہ سے ہمیں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ان ثبوتوں کی روشنی میں ہی ورما پر کافی مضبوط کیس بنے گا۔ میرے محکمے کے لوگ بھی اگر میری تاویلیں قبول کر رہے ہیں تو اس لیے کہ ملنے والی دستاویزات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ورما مبینہ طور پر بھارتی جاسوس ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے تمہارا اقدام پسند نہیں آیا۔'' انہوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔

''حالانکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ میری وجہ سے آپ کے محکمے کی ساکھ بھی تھوڑی سی بہتر ہو گئی۔ سنا ہے آپ کا وہ آفیسر تو بہت خوش ہے جسے میری جگہ اس کارنامے کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے۔'' شہریار نے لطیف سے لہجے میں ان پر طنز کیا۔

''وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ تم نے خود اپنے لیے کتنا بڑا رسک لیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ سب کچھ تمہارے طے کردہ منصوبے کے مطابق ہی ہوتا۔ بازی اُلٹ بھی سکتی تھی۔ وہاں کراچی میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہمیں خبر بھی نہ ہو پاتی۔ تم تو جانے سے پہلے کسی کو ذرا سی ہوا بھی نہیں لگا کر گئے تھے۔ ہم زیادہ سے زیادہ



کر پاتے تو یہی کہ تمہاری لاش کی کھوج نکالتے۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے ہمیں ان ملتا؟ اور مل بھی جاتا تو تمہیں کھونے کے بعد ہمیں کیا حاصل ہوتا؟ ہم بوڑھوں کے حال پر رحم کرو بیٹا! میں اور رانا نے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی اپنے بوڑھے شانوں پر دو جوان جنازوں کا بوجھ سہا ہے۔ ہم دونوں کے اعصاب ان ٹوٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس واحد تم بچے ہو اور ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔'' مختار مراد کے الفاظ اور لہجے نے اسے اس جذباتی بحران کا احساس دلایا جس سے وہ گزرے تھے۔ وہ اس کی وجہ خوف سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی شرمندہ ہو گیا۔

''آئی ایم سوری انکل! آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا۔'' اسے بجائے یہ دلیل دینے کے کہ جو رات قبر میں لکھی ہے، وہ کسی صورت باہر نہیں گزاری جا سکتی، اس نے سیدھے سیدھے معذرت کر لینا مناسب سمجھا۔ ہمیشہ مختار مراد کی باتوں سے قائل ہو کر نہیں اختیار کی گئی تھی بلکہ اس محبت کے لیے خراجِ تحسین تھی جو ہر حال میں بہت قابل احترام تھی۔

''میں نے تمہاری بات پر بالکل بھی یقین نہیں کیا کیونکہ ایسے لیکچرز میں پہلے بھی تمہیں بہت دے چکا ہوں اور ان کا اثر بھی میں نے دیکھ رکھا ہے۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو میری پوسٹ پر کام کرنے والے کسی شخص سے ایسی حماقتیت کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بہرحال ہم پولیس اور آرمی وغیرہ کے لوگ بھی آخر ہوتے تو انسان ہی ہیں اور انسان جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا۔'' اس کی فرماں برداری سے کی گئی معذرت کے جواب میں مختار مراد ہنس پڑا اور اس پر واضح کر دیا کہ بہرحال وہ اس سے بہت سینئر ہے اور اس کے اندر انسانوں کو پڑھ لینے کی صلاحیت اس سے کہیں زیادہ موجود ہے۔

''تھینک گاڈ کہ آپ نے میری بات پر یقین نہیں کیا ورنہ مجھے خوامخواہ وعدے کی پاسداری کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا پڑتا۔'' اس کا موڈ تبدیل ہوتا محسوس کر کے وہ خود بھی ہنس پڑا اور یوں ان کے درمیان جاری گمبھیر گفتگو ہلکے پھلکے انداز پر ختم ہوئی۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے عبدالمنان کو اپنے دفتر میں کال کر لیا۔ ''اس سے اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے حالات کی رپورٹ بھی تو لینا ضروری تھا۔''

''سب کچھ معمول پر رہا سر! تمام پروجیکٹس بارش سے متاثر ہونے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے جاری ہو چکے ہیں۔ پیر آباد کے اسکول کو بھی مرمت کے بعد اس لائق کر دیا گیا ہے کہ وہاں تدریسی سلسلہ جاری ہو سکے۔ مسز جوزف وہاں پڑھانا شروع بھی کر چکی ہیں۔ ان کے ساتھ فی الحال کوئی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی گئی البتہ آپ کے لیے ایس پی صاحب کی طرف سے ایک پیغام ملا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ ان کی ذاتی فرمائش پر ٹھنڈے دل سے اس آفر پر غور فرمائیں۔'' عبدالمنان اس کے بلاوے پر اندر آیا اور اس کے حکم پر اسے مختصراً رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''ایسی کون سی آفر لے کر آئے ہیں ایس پی صاحب میرے لئے؟'' اس نے ٹیبل پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ اگر آپ اور چودھری صاحب چاہیں تو وہ عدالت سے باہر آپ دونوں کی صلح کروا کر آؤٹ آف کورٹ سیٹل منٹ کروا سکتے ہیں۔ آپ چودھری صاحب پر منیب اور دوسرے ٹیچرز کے قتل کے کیس سے دستبردار ہو جائیں، جواب میں چودھری صاحب بھی آپ پر کیے گئے مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ بقول ایس پی صاحب، جان تو دونوں طرف کے کیسز میں نہیں ہے۔ آپ دونوں ہی ایک دوسرے کو عدالت میں مجرم ثابت نہیں کر سکیں گے اس لیے بے کار کی کھینچا تانی سے کیا حاصل؟ بہتر ہے آپس میں صلح کر لیں اور شیر اور بکری کے

ایک گھاٹ پر پانی پینے کی مثال قائم کریں۔'' عبدالمنان نے ذرا سا مسکراتے ہوئے اسے ایس پی کا پیغام سنایا۔

''مگر یہ کیسے طے ہوگا کہ ہم دونوں میں سے شیر کون ہے اور بکری کون؟'' ورما کی گرفتاری نے اس کے موڈ پر بڑا ہی خوشگوار اثر ڈالا تھا اس لیے اس پیغام کو سن کر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر بزلہ سنجی سے سوال کیا۔

''سوری سر! مجھے یہ اتنا ٹیکنیکل سوال پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ اگر آپ کہیں تو ابھی ایس پی صاحب سے وضاحت طلب کر لی جائے؟'' اس کا موڈ بھانپ کر عبدالمنان نے خود بھی شوخ انداز اختیار کیا۔

''نہیں، رہنے دو۔ شیر کبھی کسی سے اپنی شناخت پوچھتا ہے نہ بیان کرتا ہے۔ اس کا عمل خود بتا دیتا ہے کہ وہ شیر ہے۔ تم ایس پی صاحب کو جوابی پیغام بھجوا دو کہ کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ بے شک اس کیس کا فیصلہ عدالت میں نہ ہو سکے لیکن یہ کیس حق باطل کی جنگ کی علامت کے طور پر کھلا رہے گا۔'' ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''او کے سر! میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔'' عبدالمنان نے بھی فوراً سنجیدگی اختیار کر لی۔

ویسے آج کل اپنے چودھری صاحب کی مصروفیات کیا ہے؟ پچھلے دنوں ان کے جو نقصانات ہوئے ان کے دکھ سے تو وہ باہر نکل آئے ہوں گے؟'' ایک فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

''آپ کی غیر موجودگی میں چودھری صاحب کی تالیفِ قلب کے لیے بڑا شان دار انتظام ہو گیا۔ ان کو کوئی امریکن دوستِ ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ میں نے خاتون کو دیکھا تو نہیں لیکن ان کے حسن کی شہرت بہت سنی۔ معلوم نہیں کہ وہ واقعی حسین ہیں یا ہمارے ہاں کے لوگوں کی عادت کے مطابق ہر گوری میم کی طرح حسین لگی ہیں۔ بہر حال، سنا ہے کہ چودھری صاحب خاتون کے ساتھ خوب گھومے پھرے، انہیں جنگل میں شکار کے لیے بھی لے جایا گیا۔ شکار کس کا ہوا، یہ اطلاع نہیں مل سکی۔ البتہ خاتون کے گاؤں میں ذوق شوق سے گھومنے پھرنے کی اطلاعات ملتی رہیں۔ مسز جوزف کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی ہے کہ چودھری صاحب کی مہمان لیڈی گاؤں کے اسکول کی تشریف لے گئی تھیں جہاں انہوں نے اسکول کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے مسز جوزف کو اچھے خاصے ڈالرز امداد کی مد میں دیئے ہیں جو انہوں نے امانتاً اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہاں سے کوئی جائے تو اس کے حوالے کیے جائیں یا پھر یہاں سے جو ہدایات ملیں ان کے مطابق خرچ ہوں۔'' عبدالمنان نے اسے بتایا۔

''کاش میں چودھری کو ان دونوں عورتوں کی مثال دے کر کوئی اچھی سی نصیحت کر سکتا۔ وہ غیر مذہب کی قوم کی ہو کر یہاں کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتی ہیں جب ہی تو ایک اسکول میں پڑھا لکھا کھڑی ہے اور دوسری امداد دے گئی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ چودھری صاحب پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ انہیں دولت اور اختیار کے ساتھ فرعونی صفات بھی اپنے اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور وہ جب تک اس عمل پر قائم رہیں گے، اس وقت تک کوئی موسیٰ کا وارث بن کر ان کے سامنے ڈٹ کر نہیں کھڑا ہو گا۔'' اس نے افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا جسے سن کر عبدالمنان کچھ بولا نہیں لیکن اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ضرور ڈالی۔ روشن پیشانی اور بے ریا آنکھوں والے اپنے اس باس کو وہ کسی سے بھی تشبیہہ نہ دے سکا۔

⊛----✪----⊛



''پھر آج تم میرے ساتھ گھر چل رہی ہو نا؟..... میں نے بھائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر ہی رہیں، مجھے مہرین کو آپ سے کچھ اہم ٹاپکس سمجھنے ہیں۔ محترم کچھ نخروں سے مانے لیکن مان گئے۔ آخر سامنے بھی تو میں تھی۔'' اس کے برابر میں بیٹھ کر سوال کرتے ہوئے راحیلہ خود ہی اپنے کارنامے پر اترائی اور فرضی کالر کھڑے کرنے لگی۔

اگر وہ مصروف تھے تو تمہیں ان کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک ڈاکٹر کی مصروفیت سے ان کی کتنی ٹف روٹین ہو گی۔ ایسے میں ان کے آف ڈے پر ہم زبردستی ان کے سر پر مسلط ہو جائیں تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' ڈاکٹر طارق کے مشکل سے راضی ہونے کا سن کر وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔ اصل میں وہ جس وقت شہریار کے کہنے پر کالج کی چھٹی کر کے اس کے ساتھ ورما کے اپارٹمنٹ پر گئی تھی، اس روز اس کے کئی اہم لیکچرز مس ہو گئے تھے۔ اس نے اگلے روز راحیلہ سے ان لیکچرز کے نوٹس لے لیے اور اس سے مشکل پوائنٹس سمجھانے کی درخواست بھی کر ڈالی۔ اب معلوم نہیں راحیلہ کے سمجھانے میں کچھ کمی تھی یا وہ ورما کے اپارٹمنٹ پر ہونے والی کارروائی سے ذہنی طور پر اتنی ڈسٹرب تھی کہ باوجود کوشش کے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ راحیلہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو آفر کر دی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق سے گھر چل کر پڑھ سکتی ہے۔ ماہ بانو کو ڈاکٹر طارق کے پڑھانے کا مؤثر انداز پسند آیا تھا اس لیے اس نے اس آفر کو قبول کر لیا لیکن اب راحیلہ کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ وہ مشکل سے آمادہ ہوا ہے، ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

''یہ فضول تکلف کی باتیں جانے دو۔ بھائی کی ساری نخرے بازی میرے لیے ہوتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اصل میں مہرین کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ویسے بھی تم کافی پسند آئی ہو انہیں۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے راحیلہ کا انداز کچھ معنی خیز تھا لیکن اپنی دھن میں بیٹھی ماہ بانو نے غور نہیں کیا۔ آج کل اس کا دماغ کچھ یونہی اُڑا اُڑا سا رہ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس سے اچانک آ کر ملنے والا اور پھر اسے ایک اہم مشن میں شامل کر لینے والا شخص شہریار ہی تھا۔ وہ تو بس ایک خواب کی طرح سے آ کر چلا گیا تھا۔

شہریار سے اس کی ہونے والی یہ غیر متوقع ملاقات اتنی سنسنی خیزی سے بھرپور تھی کہ کہیں کوئی رومانس کا چانس نکلتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی اسے بار بار وہ لمحے یاد آ جاتے تھے جب وہ ورما کو شہریار کی جنوں خیزی سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اُس کے اس عمل نے یک دم ہی شہریار کے جنون کو قابو میں کر لیا تھا اور وہ ورما سے دور ہٹ گیا تھا۔ لیکن ماہ بانو کے لیے ایک خوش فہم سا سوال ضرور جنم لے چکا تھا۔ ''کیا میں شہریار عادل کے لیے اتنی اہم ہوں کہ وہ میرے کہنے پر اپنے غصے کو قابو کر گئے؟''

کبھی اسے لگتا کہ یہ سچ ہے اور واقعی وہ شہریار کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کبھی وہ خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیتی اور یہ دلیل دیتی کہ وہ جس کیفیت میں مبتلا تھا، میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی طرف سے یہی ردِعمل کا اظہار ہوتا۔ اس اُدھیڑ بُن نے اُس کے ذہن کو اچھا خاصا منتشر کر دیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے کھوسی جاتی تھی۔

''اچھا چلو اُٹھ جاؤ اور زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ بھائی کو پتہ چلا کہ تم میری بات سن کر گھر آنے سے انکاری ہو گئیں تو وہ مجھ سے سخت خفا ہوں گے۔'' راحیلہ کو اس کی اندرونی کیفیت کا بھلا کیا علم تھا۔ وہ اپنے اندازوں سے جو سمجھ رہی تھی، اس کے مطابق ہی بولتی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' ماہ بانو اس کے مسلسل اصرار پر ہتھیار ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ حسبِ سابق

انہوں نے رکشے پر راحیلہ کے گھر تک کا سفر طے کیا۔

''پچھلی بار تم نے ہمارے برابر والے بنگلے میں جس عورت کو دیکھا تھا، اسے پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ راحیلہ کے گیٹ پر اُترنے کے بعد اس کی نظریں بے ساختہ اس کے پڑوس کے بنگلے پر اُٹھ گئی تھیں۔ یہیں تو اس نے مہا گرو کو دیکھ کر اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کیا تھا۔

''کیوں؟..... پولیس نے اس عورت کو کیوں گرفتار کیا؟'' وہ سب جانتی تھی لیکن اصولی طور پر اسے راحیلہ سے سوال کرنا چاہئے تھا چنانچہ اس نے کیا۔

''واضح طور پر تو کوئی وجہ سامنے نہیں آئی، بہت خاموشی سے ریڈ کیا گیا تھا۔ بعد میں اخبارات تک میں کوئی ذکر نہیں آیا۔ لیکن میرا جہاں تک خیال ہے، وہ عورت کوئی کال گرل ہی تھی۔ کسی نے مخبری کردی ہوگی اس لیے پولیس نے ریڈ کر ڈالا۔ لیکن ایسی عورتیں پھنس جائیں تو نکلنے کے سو گر جانتی ہیں۔ اُن کے عاشقوں کی کمی تو ہوتی نہیں۔ دیکھنا چند دن بعد ہی باہر ہوگی اور شان سے اپنا کاروبار چلائے گی۔'' اس سے باتیں کرنے کے دوران راحیلہ نے دروازے کی گھنٹی بھی بجائی تھی اور چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر وہ دونوں اندر بھی داخل ہوگئی تھیں۔ اپنی پڑوسی عورت کے بارے میں راحیلہ نے جو خیال آرائیاں کی تھیں، ماہ بانو نے ان پر کوئی جواب تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا ورنہ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ وہ عورت جس چکر میں گرفتار کی گئی ہے، وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔

''دیکھیں خاتون! میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتی ہیں۔ آپ کی بہن کس کے ساتھ اور کہاں گئی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری اس سے آخری بار ہسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے نہ تو اسے دیکھا اور نہ ہی کہیں ملاقات کے لیے بلایا۔'' وہ دونوں ابھی لاؤنج کے دروازے پر ہی تھیں کہ انہیں اندر سے ڈاکٹر طارق کی سخت آواز سنائی دی۔

اس کے اور راحیلہ کے قدم ٹھٹک گئے اور وہیں رک گئیں۔ کھلے دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ سامنے ڈاکٹر طارق چہرے پر غصے کی سرخی لیے کھڑا نظر آرہا تھا جبکہ اس کے مقابل ایک فربہی مائل عورت بیٹھی تھی جس کی دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ البتہ پشت پر موجود اس کے بالوں کی موٹی سی چوٹی کی سیاہ رنگت اتنا ضرور بتا رہی تھی کہ عورت جوان العمر ہے۔

لیکن روبی نے خود گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر طارق یعنی آپ سے ملنے جارہی ہے۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ میں نے اس کے لیے ہمیشہ بڑی بہن سے زیادہ سہیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ جب سے اس کی زندگی میں آئے تھے، میں تب سے ہی آپ کو جانتی ہوں۔ روبی نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا۔ کل شام بھی وہ تیار ہوکر گھر سے نکلی تھی تو اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹر طارق کی سالگرہ ہے اور انہوں نے خاص طور پر مجھے انوائٹ کیا ہے۔ میں رات دس ساڑھے دس بجے تک تشویش اس کا انتظار کرتی رہی کہ ڈنر وغیرہ سے فارغ ہونے میں اتنا ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے۔ پھر روبی نے بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر طارق خود مجھے چھوڑنے گھر تک آئیں گے اس لیے بھی مجھے خاص فکر نہیں تھی۔ لیکن روبی رات بھر گھر نہیں آئی۔ میں اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بند تھا۔ میں نے کئی بار آپ کا نمبر بھی ملایا۔ آپ کا نمبر بھی نہیں مل سکا۔ رات بھر پریشانی میں گزار کر میں صبح ہسپتال گئی تو معلوم ہوا کہ آپ نائٹ ڈیوٹی کر کے گھر واپس جاچکے ہیں۔ میں ہسپتال سے آپ کے گھر کا پتہ لے کر یہاں پہنچی تاکہ آپ سے روبی کے بارے میں معلوم کرسکوں لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ اب آپ



بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کہاں سے اپنی بہن کو ڈھونڈ کر لاؤں؟'' اپنی بات کے اختتام پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مجھے افسوس ہے خاتون! کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ آپ نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ روبی مسلسل آپ سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کل میری سالگرہ کا دن ہی نہیں تھا تو میں اسے کیسے ڈنر پر انوائٹ کرسکتا تھا؟ ہوسکتا ہے روبی کا کسی اور شخص سے افیئر چل رہا ہو اور وہ شخص اس لائق نہ ہو کہ وہ اسے گھر والوں کے سامنے پیش کرسکے اس لیے اس نے اپنے وقت بے وقت باہر آنے جانے کے لیے ایک اچھے جواز کے طور پر آپ کے سامنے میرا نام لے لیا ہو۔ بہرحال، میں آپ پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میرا روبی سے کوئی ایسا تعلق تھا اور نہ ہی وہ اس حساب سے میرے معیار پر پوری اترتی تھی کہ میں اس کے بارے میں ایسا کچھ سوچتا۔'' طارق کا انداز بے حد دوٹوک بلکہ ایک طرح سے بے رحم تھا۔

''میں نہیں مان سکتی۔ میری بہن ایسی لڑکی نہیں ہے کہ اس قسم کے جھوٹ بولے۔'' خاتون نے روتے ہوئے طارق کی بات کو رد کیا۔

''بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں محترمہ! اس بات کی گواہی تو میں بھی دے سکتی ہوں کہ کل شام میں یہ آٹھ بجے تک گھر پر ہی تھے اور اس کے بعد اپنی ڈیوٹی کے لیے ہسپتال چلے گئے تھے۔ اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے آپ کی بہن کو کہیں بلایا ہو۔'' ماہ بانو کے ساتھ دروازے پر ہی رُکی راحیلہ بے دم ہی لاؤنج میں داخل ہوئی اور اپنے بھائی کی حمایت میں بیان دیا۔

''تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟'' خاتون کی آواز میں نمایاں بے بسی تھی۔

''وہ جہاں بھی گئی ہو، کم از کم یہاں نہیں آئی۔ اس لیے پلیز آپ یہاں سے تشریف لے جائیں اور کہیں اور اسے تلاش کریں۔ میں اپنی بہن کی موجودگی میں اس بے ہودہ موضوع کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتا۔'' خاتون نے سوال تو جانے کس سے کیا تھا لیکن جواب طارق نے نہایت خراب موڈ کے ساتھ دیا۔ اُس کے اس رویے کے بعد خاتون کے لیے وہاں رُکنا ہر صورت میں بے کار تھا۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی ماہ بانو کے قریب سے گزر کر بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئیں۔ پینتیس سے چالیس کی درمیانی عمر کی وہ قبول صورت سی خاتون جس حال کے عالم میں وہاں سے نکلی تھی، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا لیکن بات وہی تھی کہ خاتون جس مسئلے سے دوچار تھیں، اس میں وہ ان کی کوئی مدد بھی نہیں کرسکتی تھی۔

''یہ کون محترمہ تھیں بھائی! جو اس طرح منہ اٹھا کر آپ پر الزام دھرنے چلی آئی تھیں؟'' خاتون کے جانے کے بعد ڈاکٹر طارق سر تھام کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ راحیلہ نے اپنے ہاتھ میں موجود کتابیں اور فائلیں وغیرہ میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھیں اور تیز لہجے میں اس سے سوال کیا لیکن انداز سے صاف ظاہر تھا کہ لہجے کی یہ تیزی بھائی کے لیے نہیں بلکہ ان خاتون کے لیے ہے جو ابھی ابھی وہاں سے روانہ ہوئی تھیں۔

''پہلے اپنی سہیلی کو تو اندر بلا کر بٹھاؤ پھر یہ تفتیش کر لینا۔'' ابھی تک دروازے کے قریب تذبذب کے عالم میں کھڑی ماہ بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق نے راحیلہ کو ٹوکا۔

''اوہ، سوری مہرین! پلیز تم اندر آکر آرام سے بیٹھو۔ اصل میں گھر میں گھستے ہی ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ دماغ کچھ کام نہیں کر رہا۔'' وہ جلدی سے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے اندر آکر بیٹھنے کے بعد ایک بار پھر بھائی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تم تو اس طرح مجھے گھور رہی ہو جیسے میری نانی جان ہو۔ بہر حال، تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ روبینہ عرف عربی اس ہسپتال میں نرس ہے جہاں میں جاب کرتا ہوں۔ ایک دو دفعہ میں فرمائش پر اس کی بیمار والدہ کا چیک اپ کرنے اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ روبینہ کے والد یا کوئی نہیں ہے۔ پہلے اس کی والدہ ملازمت کرتی تھیں پھر بڑی بہن نے ایک گارمنٹس فیکٹری میں جاب کر کے ساتھ دینا شروع کر دیا۔ روبینہ نے بھی نرسنگ کی ٹریننگ لے کر دو سال پہلے جاب کا آغاز کیا تھا۔ والدہ بیماری کی وجہ سے بہت عرصے سے ملازمت چھوڑ چکی تھیں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ان لوگوں سے ملا تو مجھے بے بس اور تنہا خاندان محسوس ہوا اور ہمدردی کے جذبے کے تحت میں کبھی کبھار روبینہ کے گھر فون کر کے والدہ اور بہن سے خیر خیریت لینے لگا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری اس ہمدردی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نے گھر میں کیا کہانی سنائی اور میری آڑ لے کر کس سے ملنے جاتی رہی۔ اس کی بہن سے میری جو بات ہوئی ہے، وہ تم لوگوں نے بھی سنی ہے اس لیے میرے خیال میں ہمیں اب مزید اس موضوع کو ڈسکس کر ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں آرام سے بیٹھو، میں ابھی تھوڑی دیر میں کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آتا خاتون کی آمد کی وجہ سے میں پہلے باہر نہیں نکل سکا تھا۔'' مختصراً ساری بات بتا کر ڈاکٹر طارق باہر چلا گیا۔

''آج کل جانے لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس راہ پر چل رہی ہیں۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد راحیلہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح تبصرہ کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ماہ بانو کو ایسے کئی قصے رہی جن میں گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کا ذکر تھا۔ ماہ بانو بے دلی سے یہ قصے سنتی رہی۔

ڈاکٹر طارق کے واپس آ جانے کے بعد ان لوگوں نے کھانا کھایا لیکن ہر شخص اپنی جگہ اعصابی دباؤ تھا۔ اس لیے کسی نے بھی اچھی طرح کھانا نہیں کھایا۔

''میرے خیال میں آج میں تم لوگوں کو یکسوئی سے نہیں پڑھا سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ کسی اور دن پروگرام رکھ لو۔'' کھانے کے بعد ڈاکٹر طارق نے اعلان کیا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس صورت میں، میں مزید یہاں رکنے کے بجائے ہاسٹل پسند کروں گی۔ روز روز ہاسٹل سے دیر تک باہر رہ کر میں کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتی۔'' بات سن کر ماہ بانو یک دم ہی کھڑی ہو گئی۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے یار! تھوڑی دیر ٹھہر کر چلی جانا۔'' راحیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''مہرین ٹھیک کہہ رہی ہے راحیلہ! یہ ہاسٹل میں رہتی ہے اس لیے اسے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' ماہ بانو کے کچھ کہنے سے قبل ڈاکٹر طارق نے بہن کو جواب دیا اور پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آئیں مہرین! میں آپ کو ہاسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت وہ علاقہ بالکل ہی سنسان ہوتا ہے اس آپ کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ ایسا کرو راحیلہ! تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔''

راحیلہ کو ساتھ چلنے کا کہہ کر اس نے ماہ بانو کے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی چنانچہ وہ ایک ساتھ گھر سے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر طارق کے پاس سواری کے لیے موٹر سائیکل تھی جس پر ظاہر ہے وہ تینوں ایک ساتھ نہیں جا تھے۔ انہیں ٹیکسی کے لیے خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے روڈ تک جانا پڑا۔ اُمراء کے اس علاقے میں جہاں اپنی ذاتی سواریوں کے مالک ہوتے ہیں، ٹیکسی کا اس بھری دوپہر میں ملنا بھی ایک کارِ دشوار تھا۔

انہیں انتظار میں کھڑے کھڑے تقریباً دس منٹ گزر گئے لیکن کسی ٹیکسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ سڑک



پر بھی گاڑیاں گزر رہی تھیں، وہ لوگوں کی ذاتی ملکیت تھیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر کوفت زدہ سے کھڑے وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے بوریت سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنے قریب بریکس کی چرچراہٹ سن کر چونک گئے۔ تینوں نے بیک وقت نظر اٹھا کر اپنے قریب رکنے والی گاڑی کو دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لکیر جیسی پتلی مونچھوں والا ایک لمبا چوڑا آدمی بیٹھا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر ماہ بانو کی روح فنا ہونے لگی۔ وہ چودھری کے اہم کارندوں میں سے ایک کارندہ شیدا تھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے انگلی سے یوں اشارہ کیا جیسے اُسے اپنے پاس بلا رہا ہو۔ چودھری کے خاص ملازمین اتنے سر چڑھے تھے کہ اپنے اشارے کو بھی حکم کا درجہ دیئے جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر ماہ بانو میں اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں اپنے قدموں کو حرکت دے پاتی۔ سرد ہوتے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ وہ وہیں کھڑے کھڑے بھربھری مٹی کی طرح نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

''مہرین! کیا ہوا؟'' ہوش کھونے سے قبل اس نے ڈاکٹر طارق کی تشویش بھری آواز سنی۔

''مہرین!..... اُٹھو مہرین! آنکھیں کھولو۔''

اُسے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بہت دُور سے آوازیں دے رہا ہو۔ فوری طور پر تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ پکارنے والا اسے پکار رہا ہے۔ حالات نے اسے ماہ بانو سے مہرین بن کر رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ پوری طرح اپنے اس دوسرے نام کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا تک سفر کرتے ہوئے اس کا ذہن بہت مشکل سے یاد کر سکا کہ مہرین کے نام کی یہ پکار دراصل خود اس کے لیے ہے۔

اُس نے بڑی مشکل سے بوجھل پلکوں کو کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں نے سب سے پہلے ڈاکٹر طارق کے چہرے کو گرفت میں لیا۔ وہ اس کی بائیں کلائی کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لیے دائیں ہاتھ سے دھیرے دھیرے اس کا رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ ڈاکٹر طارق کے پیچھے ہی راحیلہ کچھ پریشان سی کھڑی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آشنا در و دیوار نے اسے بتایا کہ وہ راحیلہ کے بنگلے میں اس کے بیڈ روم میں موجود ہے۔ لیکن اس حال میں کیوں موجود ہے؟ اس سوال کا جواب اسے کچھ دیر بعد یاد آیا۔ یاد آتے ہی وہ ہڑبڑا سی ہو کر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

''ریلیکس مہرین!'' ڈاکٹر طارق نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''وہ..... وہ کہاں ہے؟'' وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے ابھی کمرے کی کوئی دیوار شیدے کو اُگل دے گی۔ وہ شیدے کو دیکھ کر ہی تو بے ہوش ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ڈاکٹر طارق اور راحیلہ اسے ہاسٹل چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ لوگ ٹیکسی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑے تھے، جب شیدے نے اپنی گاڑی عین اس کے سامنے لا کر روکی تھی اور پھر اسے اشارے سے بلایا بھی تھا۔ شیدے کے ہاتھ لگ جانے کا مطلب تھا، وہ ایک بار پھر چودھری کے چنگل میں جا پھنستی۔ بہت عرصے بعد تو گرداب میں پھنسی اس کی زندگی میں یہ دن آئے تھے کہ وہ اپنی من پسند زندگی کا ایک حصہ گزار رہی تھی۔ اس زندگی میں اپنے گھر والوں کی جدائی تو ضرور تھی لیکن اسے اپنے ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''تم کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟'' ڈاکٹر طارق نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ شیدا..... چودھری افتخار کا کارندہ۔'' اس نے اسی ڈرے ڈرے انداز میں جواب دیا۔

''کون چودھری افتخار؟..... ذرا کھل کر تفصیل سے بتاؤ۔'' ڈاکٹر طارق نے اسے ٹوکا تو اسے یک دم جھٹکا سا لگا اور وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''بتاؤ نا مہرین! یہ شیدا اور چودھری افتخار کون ہیں؟ تمہارے ساتھ آخر ایسا کیا مسئلہ ہے کہ تم اچانک بالکل مختلف طریقے سے بی ہیو کرنے لگتی ہو۔ کیا تمہاری کسی سے کوئی دشمنی ہے جس کی وجہ سے تم راہ چلتے یکا خوفزدہ ہو جاتی ہو؟..... اس دن کالج کے سامنے تم خواجہ سرا سے ڈر گئی تھیں اور اب ایک راہ گیر سے اتنی خ زدہ ہوئیں کہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہی ہو گئیں۔ تم اپنے اس خوف کی وجہ بتاؤ تو شاید ہم تمہاری کچھ کر سکیں۔'' راحیلہ جواب تک خاموش کھڑی تھی، اس کے قریب آ کر بہت اصرار سے پوچھنے لگی۔

''میں اگر تمہیں سب کچھ بتا بھی دوں تو تم لوگ میری مدد نہیں کر سکتے۔ میرا دشمن بہت طاقتور اور با اث ہے۔ تم اس کی پہنچ کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں کہیں بھی جا کر چھپ جاؤں، چند دن سے زیادہ چھپی نہ رہ سکتی۔ اس کے ہرکارے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ان لوگوں نے یہاں بھی سراغ لگا لیا ہے۔ وہ شخص جس نے ہمارے قریب گاڑی لا کر روکی تھی، میرے دشمن کا خاص ملازم تھا اب مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھے اس سے بچا کر یہاں تک کیسے لائے ہو؟''

''لیکن وہ تو صرف کسی کا ایڈریس معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس رکا تھا۔ تم اچانک بے ہوش ہو گئ تو بھائی نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں گھر تک چھوڑ دے۔ وہ بے چارہ شرافت سے ہمیں یہاں چھوڑ چلا گیا۔ اُس کے رویے سے بالکل بھی ظاہر نہیں ہوا کہ وہ تمہیں جانتا ہے یا تم سے اسے کوئی پُرخاش ہے۔'' ماہ بانو کی بات سن کر راحیلہ نے اسے بتایا۔

''ہو سکتا ہے وہ ایکٹنگ کر رہا ہو۔ وہ اکیلا تھا اس لیے اس نے بیچ راستے میں کوئی جھگڑا کھڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔ وہ مدد کے بہانے تم لوگوں کا گھر دیکھ گیا ہے، مناسب موقع دیکھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے گا اور مجھے لے جانے کی کوشش کرے گا۔'' راحیلہ کی بتائی ہوئی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں اور وہ اسی خوف سے بھرے لہجے میں یقین سے بولی۔

''میرے خیال میں مہرین! تمہارا اندازہ درست نہیں ہے۔ اس شخص نے واقعی تمہیں نہیں پہچانا تھا۔ تم اپنے چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ چلتی گاڑی میں سے نظر پڑنے پر کوئی شخص کسی نقاب لڑکی کو شناخت کر سکتا ہے۔'' ڈاکٹر طارق نے ان دونوں کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ایک ایسی دلیل دی جس پر ماہ بانو کو قائل ہونا پڑا۔ اپنے خوف کے باعث اسے اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا کہ وہ چار دیواری سے نقاب کا استعمال کرنے لگی ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کوئی اسے شناخت نہ کر سکے۔

''آپ یقیناً ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اصل میں، میں شیدے کو دیکھ کر اتنی بری طرح ڈر گئی تھی کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔'' اس نے شرمندگی کے ساتھ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یقیناً تمہارے حالات ایسے ہوں گے کہ تم بلا ارادہ اس طرح ری ایکٹ کر گئیں۔ غیر معمولی حالات میں انسان کس طرح کے رویوں کا اظہار کرے گا، اس کا اندازہ کوئی دوسرا شخص تو کیا، خود وہ شخص بھی نہیں لگا سکتا جو ان حالات سے گزر رہا ہو۔ میرے حساب سے تو تم ایک بہت بہادر اور باہمت لڑکی ہو جو مشکل حالات میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اتنی بہادر لڑکی نے اگر ایک چھوٹی سی بزدلی کا مظاہرہ کر دیا ہے تو یہ قابل گرفت بات نہیں۔'' بے حد نرمی سے یہ سب کہتے ہوئے ڈاکٹر طارق آخری جملے کی ادائیگی کے دھیرے سے مسکرایا تو ماہ بانو جھینپ گئی۔

''چلیں محترمہ! آپ کو تو بیٹھے بٹھائے بھائی کی طرف سے بہادری کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اب آپ ذرا



اپنے حالات بھی بتا ڈالیں تاکہ ہم یقین کر سکیں کہ سرٹیفکیٹ غلط جاری نہیں ہوا۔'' راحیلہ نے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ماہ بانو سے اصرار کیا۔

''راحیلہ کے اصرار سے تم خود کو کسی دباؤ میں محسوس نہیں کرنا۔ اگر مناسب سمجھو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔ میں نہایت خلوص سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے با اختیار دشمن کے مقابلے میں ہم تمہاری کوئی مدد بے شک نہ کر سکیں لیکن مخلص دوستوں سے اپنے مسائل شیئر کر کے نہ صرف تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گی بلکہ ہمارا مان بھی بڑھ جائے گا کہ تم نے ہمیں کسی لائق سمجھا۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی لیکن ڈاکٹر طارق کی بات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان سے اپنے حالات کہہ ڈالے۔ آہستہ آہستہ وہ ان واقعات کو بیان کرنے لگی جن کے گرداب میں گھری اس کی زندگی ہر روز اسے ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر طارق اور راحیلہ بنا کوئی سوال دیے اس کے ہونٹوں سے نکلتا ایک ایک لفظ بہت غور سے سنتے رہے۔

⊛----✪----⊛

سست روی سے درختوں کے درمیان سے گزرتے اکو پر گہری یاسیت طاری تھی۔ اس کے سانولے اور دلکش چہرے پر موجود آنکھوں میں ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سیاہی مائل موٹے موٹے ہونٹ اس میں اس طرح پیوست تھے کہ گویا کبھی مسکراہٹ نے ان ہونٹوں کو چھوا ہی نہ ہو۔ اسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ شاید گویائی سے محروم ہو گا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی۔ وہ بھی ایک ہنستا مسکراتا، خوش گپیاں کرنے والا، زندگی سے بھرپور جوان ہوا کرتا تھا۔ لیکن رانی کی موت نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ رانی جو اس کی منگیتر تھی اور اس کے ساتھ اس نے اپنی پوری زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے..... یوں اچانک اس کی زندگی سے نکال دی گئی کہ اسے خود کو ہزار بار باور کروانے کے باوجود اس حادثے پر یقین نہیں آتا تھا۔ حالانکہ اس نے رانی کا لہولہو جسم کو قبر میں اُتارے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے قبرستان میں اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر گزارتا تھا مگر محبت کرنے والوں کی مخصوص بے یقینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ ہر عاشق کی طرح وہ یہ یقین کرنے سے گریزاں تھا کہ اس کا محبوب اسے بیچ سفر میں چھوڑ گیا ہے۔ اسے ہر دم یہی لگتا کہ ایک دن رانی کہیں سے نمودار ہو گی اور بڑی ادا سے ہنستے ہوئے کہے گی۔

''دیکھا اکو! میں نے تمہیں کیسا بے وقوف بنایا۔ جھلّے! میں تو صرف تمہیں آزما رہی تھی۔ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہیں کیسے جا سکتی ہوں؟''

وہ اس سے اسی طرح شوخی سے بات کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت اصرار کر کے اسے ملاقات کے لیے بلاتا تھا تو بھی وہ اسے ستانے سے باز نہیں آتی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر ملاقات کے لیے طے شدہ جگہ پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ رانی کا کوئی اتا پتہ ہی نہیں ہے۔ وہ بے قراری سے ٹہلتا، راستے کو گھور گھور کر دیکھتا کہ شاید وہ آتی ہوئی نظر آ جائے اور پھر بہت دیر گزر جانے پر جھنجلاتا ہوا واپسی کے لیے پلٹنے لگتا تو وہ کسی خفیہ مقام سے نکل کر ایک دم ہی نکل کر سامنے آ کھڑی ہوتی اور پھر خوب کھلکھلا کر ہنستی۔ اکو اُس کی اس حرکت پر مصنوعی غصے سے خوب گھورتا لیکن پھر ہار مان کر خود بھی ہنس پڑتا۔

رانی کی کھلکھلاہٹ میں اس کی ہنسی شامل ہوتی تو لگتا کہ سارے منظر مسکرانے لگے ہوں۔ لیکن قسمت نے اس کے ساتھ عجیب ہی کھیل کھیلا تھا۔ اس کی رانی کسی سے وفاداری نبھاتے نبھاتے خود اس کے ساتھ بے وفائی کر گئی تھی۔ رانی نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن جان اپنی کشور بی بی پر لٹا بیٹھی تھی۔

اگرچہ وہ نہیں جانتا تھا کہ رانی کی موت کن حالات میں ہوئی اور وہ کس کس طرح چودھری کے عتاب کا نشانہ بنی لیکن اس بات کا اسے یقین تھا کہ وہ کشور کا ساتھ دینے کے جرم میں ہی زندگی سے محروم کر دی گئی ہے۔ وہ کشور کی دیوانی تھی۔ کشور کی نرم خوئی اور مہربان طبیعت نے اسے کشور کا اتنا گرویدہ کر رکھا تھا کہ وہ سارا وقت اسی کے نام کی مالا جپتی رہتی تھی۔ وہ..... جس نے ہمیشہ کشور کی اُترن بڑے ذوق وشوق سے پہنی تھی، اس کے حصے کی موت کو بھی بہ خوشی گلے لگا بیٹھی تھی۔

اکّو ایک کمزور آدمی تھا اور چودھری سے رانی کے قتل کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح چودھری کیفر کردار تک پہنچ جائے۔ رانی کے قتل کے الزام میں نہ سہی، اسے کسی اور جرم کی ہی سزا ضرور ملے۔ اسی خواہش کی وجہ سے اس نے آفتاب کے اغوا کی اطلاع منیب تک پہنچائی تھی۔ اس اطلاع کے نتیجے میں آفتاب کو تو بچا لیا گیا لیکن چودھری سزا سے محفوظ رہا۔ قسمت کی خرابی کہ جس رات منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کو قتل کیا گیا، وہ تیز بخار کے باعث گھر میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اس لیے اسے گاؤں میں بپا ہونے والے ہنگامے کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے ظلم کے خلاف گاؤں بھر میں سے کسی نے گواہی نہیں دی تو بہت افسردہ ہوا اور رہ رہ کر کفِ افسوس ملتا رہا کہ میں کیوں اس رات اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ اگر اس نے وہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے گواہی دینے سے نہیں روک سکتی تھی۔ لیکن شاید ابھی قدرت چودھری کو ڈھیل دینا چاہتی تھی۔

اس واقعے کے بعد اکّو پر چھائی اُداسی مزید گہری ہو گئی اور وہ ہر طرف سے تقریباً بے گانہ ہی ہو گیا۔ وہ تانگہ جس سے اس کی اور گھر والوں کی روزی روٹی کا سلسلہ بندھا تھا، فارغ کھڑا رہنے لگا۔ گھر کا چولہا کسی طرح جل رہا ہے اور جل بھی رہا ہے کہ نہیں، اسے پروا نہیں رہی۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ ماں چند لقمے زبردستی منہ میں ڈال دیتی تو حلق سے نیچے اُتار لیتا ورنہ پورا پورا دن گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہتا۔ ماں کے مسلسل کھانسنے کی آواز بھی اس کے کانوں سے ٹکرا کر بے اثر پلٹ جاتی تھی۔

لیکن کل رات عجیب ہی معاملہ ہوا۔ وہ اپنی مخصوص کیفیت میں سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا رانی کے مرنے کا سوگ منا رہا تھا، اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ آج پورے دن اس کے حلق سے ایک لقمہ تک نیچے نہیں اُترا ہے کہ اچانک ہی حکیم جی وہاں چلے آئے اور پھر انہوں نے اسے جو بے نقط سنانی شروع کیں تو بہت دیر تک خاموش نہیں ہوئے۔

وہ چپ چاپ حکیم جی کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر وہ بے چارے بکتے جھکتے مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلے گئے لیکن اصل بات یہ تھی کہ ان کا بکنا جھکنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اکّو کی سمجھ میں کم از کم اتنی بات تو آ گئی تھی کہ اس کی ماں شدید بیمار ہے اور اس کے علاج کے لیے خالص شہد درکار ہے۔ حکیم جی کے جانے کے بعد اس نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ گھر کا نعمت خانہ بالکل خالی پڑا ہے اور رقم کے نام پر ماں کے پاس چند سکّے بھی باقی نہیں بچے ہیں۔ ایسے میں خالص شہد کی فراہمی کیونکر ممکن ہو پاتی۔

کسی سے مانگنا اس کی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ چنانچہ رات بھر کی سوچ بچار کے بعد اسے یہی حل سوجھا کہ جنگل کا رخ کیا جائے اور کسی درخت پر لگے شہد کے چھتے کو اُتار لیا جائے۔ چھتے سے شہد نکال کر ماں کا علاج بھی ہو جاتا اور بچا کھچا شہد بیچ کر تھوڑی سی رقم بھی مل جاتی۔ مسئلے کے اس فوری حل کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنا تانگہ چلانا شروع کر دیتا تو حالات آہستہ آہستہ دوبارہ سنبھل جاتے۔

اپنی سوچ پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور سیدھا



جنگل کا رخ کیا۔ اتنی صبح وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا۔ جنگل کے مخصوص ماحول میں چرند پرند کی آوازوں کے سوا جو آواز سنائی دیتی تھی، وہ ان سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز تھی جو اس کے قدموں تلے آ کر روندے جاتے تھے۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر طرح کی آوازوں سے بے نیاز تھا۔ اس کے کان اگر کچھ سنتے تو اس کی کھلکھلاہٹ اور گنگناہٹ سنتے تھے جو اپنی ذرا سی چھب دکھا کر کسی درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپتی تھی۔ وہ ہر جگہ تھی اور کہیں بھی نہیں تھی۔ اکّو کبھی نیلے کپڑوں میں اس کا عکس جھلملاتا دیکھتا تو کبھی وہ سبز پتوں میں پتوں کی آڑ میں چھپ جاتی۔ رانی کے آنکھ مچولی کھیلتے تصور سے دل کو بہلاتا وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال سکا کہ جنگل میں اس کی آمد کا مقصد ماں کے لیے شہد کا حصول ہے۔ یاد آنے پر وہ ایک جگہ رک کر اردگرد کے درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ سال کے اس حصے میں شہد اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ یہ وہ موسم تھا جب شہد کی مکھیاں اپنا تیار کردہ شہد پی کر چھتے کو چھوڑ جاتی تھیں۔

جائزہ لینے پر اسے ایک بھی درخت ایسا نظر نہیں آیا جس پر شہد کے چھتے کا امکان ہو۔ تلاش میں ناکام ہو کر اس نے ایک بار پھر چل پڑا۔ اس کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔

بے خیالی میں وہ پہلے ہی کافی آگے تک جا چکا تھا اور اب یہ سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا کہ جہاں اتنا فاصلہ طے کیا ہے، وہاں ماں کی خاطر تھوڑی سی کوشش اور کر لینی چاہئے۔ اس سوچ کے پیچھے یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ اس کے خیالوں میں ڈوب کر جنگل کی ہولناکی نظر نہ آ سکی تو پھر ماں کے لیے کیوں اس ہولناکی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا؟ اس کا ذہنی انتشار اسے آگے بڑھاتا رہا ورنہ اس سے قبل وہ کبھی جنگل میں اتنا آگے نہیں آیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح وہ جنگل کے ابتدائی حصے تک ہی محدود رہتا تھا۔ اندر تک وہی لوگ جاتے تھے جن کے پاس مناسب اسلحہ اور ساز و سامان ہوتا تھا اور یہ لوگ عام طور سے چودھری کے کارندے ہی ہوتے تھے۔

چلتے چلتے اسے یک دم ہی اپنی ناک کی پھنک پر شدید درد کا احساس ہوا اور پھر فوراً ہی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ اس کی نظروں نے آواز کا تعاقب کیا تو زرد رنگ کی شہد کی مکھی اُڑتی نظر آئی۔ اس مکھی نے ہی اس کی ناک پر ڈنک مارنے کی جسارت کی تھی۔

مکھی کی اس جسارت پر غصے یا تکلیف کا اظہار کرنے کے بجائے وہ بے تابی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ بالآخر اس کی نظروں نے ایک بہت بلند درخت کی شاخوں کے آس پاس چند مزید زرد مکھیوں کو بھنبھناہٹ کے ساتھ چکراتے دیکھ لیا۔ شاخوں کے آس پاس چکراتی یہ مکھیاں نشان دہی کر رہی تھیں کہ وہاں کوئی چھتا موجود ہے۔ وہ درخت کے نیچے رک گیا اور اوپر چڑھ کر چھتا اتارنے کی تیاری کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے نیچے گرے سوکھے پتے اور گھاس پھونس جمع کر کے ایک گٹھر سا بنایا اور اس گٹھر کو رسی کی مدد سے باندھ کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے چہرے کو گردن میں پڑے ہوئے کپڑے سے اچھی طرح ڈھانپا اور چپلیں اُتار کر درخت پر چڑھنے لگا۔ اتنے بلند درخت پر چڑھنا آسان نہیں تھی لیکن گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح اس کا بچپن بھی اسی طرح کی سرگرمیوں میں گزرا تھا اس لیے اسے بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور وہ تنے پر پنجے جماتا چند منٹوں میں ہی کافی بلندی پر پہنچ گیا۔ اب چھتا نظر آنے لگا تھا اور چھتے سے چمٹی بے شمار مکھیوں کو دیکھ کر یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ چھتا شہد سے بھرا ہوا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے ماچس کی ڈبیہ نکالی اور ایک تیلی جلا کر گٹھر کو آگ دکھا دی۔ گٹھر فوراً ہی سلگنے لگا اور ذرا دیر میں وہاں دھواں سا بھر گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے مکھیاں بے چین ہو

گئیں۔ وہ دھواں چھوڑتے اس گٹھر کو بے پناہ احتیاط سے سنبھالے چھتے تک کا باقی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دھوئیں سے پریشان دو چار مکھیاں اس کی طرف لپکیں اور اس کے بازوؤں میں اپنے ڈنک اُتار دیئے۔ اس کے بازوؤں میں ناک کی پھنک کی طرح مرچیں سی بھر گئیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا رہا۔

چھتے تک اس کی رسائی حاصل کرنے تک شہد کی مکھیاں دھوئیں کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپائی اختیار کر چکی تھیں اور کافی فاصلے پر چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شہد سے بھرا چھتا اپنے قبضے میں کیا اور شاپر سے لٹکتے پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں منتقل کر لیا۔ اس عمل میں اس کی انگلیاں شہد سے لتھڑ گئی تھیں۔ درخت سے چند پتے توڑ کر وہ ان لتھڑی ہوئی انگلیوں کو صاف کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران اس نے یونہی اپنی نظروں کو اِدھر اُدھر دوڑایا تو بہت دُور نظر آتے ایک منظر کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ لکڑی کا ایک مکان تھا جس سے نکلتے ہوئے تین چار افراد کو وہ فاصلے کے باوجود دیکھ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے جیسی چیزیں اٹھا رکھی تھیں۔ اگو حیران رہ گیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل کے اس حصے میں کیا کر رہے ہیں؟ ایک بار اسے خیال آیا کہ شاید یہ وہ ڈاکو ہیں جن کی دہشت اردگرد کے سارے دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن جانے کیوں ان لوگوں کے انداز سے اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈاکو ہو سکتے ہیں۔ ان کے ڈاکو ہونے کا امکان رد کرنے کے بعد ان افراد کے بارے میں اس کا تجسس مزید گہرا ہونے لگا۔ عام لوگوں کے جنگل کے اس حصے میں ہونے اور باقاعدہ مکان بنا کر رہنے کی وجہ سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ اتنے بلند درخت پر موجود نہ ہوتا تو اس کو وہ لوگ نظر بھی نہ آپاتے۔ ان کے نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود جس حصے میں موجود تھے، وہاں درخت وغیرہ بہت ہی کم تھے اور جنگل چھدرا محسوس ہو رہا تھا۔

تجسس میں مبتلا اگو واپس گاؤں کی طرف لوٹنا بھول گیا اور درخت سے اُتر کر اس سمت چل پڑا جہاں اسے وہ مکان اور آدمی نظر آئے تھے۔ درخت کی بلندی سے نظر آنے والی وہ جگہ اچھے خاصے فاصلے پر تھی۔ اسے یہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لکڑی کے اس مکان کی پشت تک پہنچ گیا جس سے اس نے چند آدمیوں کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

مکان کا رقبہ ساٹھ ستر گز سے زیادہ نہیں تھا اور اس کی پچھلی طرف دو عدد جالی دار کھڑکیاں موجود تھیں۔ اگو نے ایک کھڑکی کے قریب جا کر مکان کے اندر جھانکا۔ جھانکنے پر اسے اندازہ ہوا کہ مکان اندر سے کمروں وغیرہ میں منقسم نہیں ہے بلکہ ایک ہال سا تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین پر بستر بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بستروں کے ساتھ ہی ٹین کے چھوٹے سائز کے صندوق بھی رکھے ہوئے تھے جو یقیناً ان بستروں پر سونے والوں کی اشیائے ضرورت رکھنے کے کام آتے ہوں گے۔ ہال نما کمرے کے ایک کونے پر دو بڑے پاتیلے کے مٹکے اور کھانا پکانے اور کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مکان کا یہ غریبانہ منظر ظاہر کرتا تھا کہ مکان محنت کشوں کے استعمال میں ہے جو دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اسے صرف شب بسری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سوال وہی تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل میں کس قسم کا کام کر رہے ہیں؟''

ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ مکان کی سائیڈ سے ہوتا ہوا اگلی جانب پہنچا۔ اگلی جانب مکان کے سامنے اینٹیں رکھ کر چولہے بنائے گئے تھے۔ ان چولہوں کے لیے ایندھن کا کام دینے والی ادھ جلی لکڑیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں باقاعدگی سے کھانا پکایا جاتا ہے۔ وہ اس جگہ کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آوازوں سے سمت کا تعین کرتا ہوا وہ مزید آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر کار اس کی نظروں نے حرکت کرتے ہوئے انسانی جسموں کو دیکھ لیا۔ وہ کسان تھے اور



مالی تن دہی سے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔

اگو مزید قریب پہنچا تو اسے ان لوگوں کے چہرے بھی دکھائی دینے لگے۔ یہ چہرے اس کے لیے شناسا تھے۔ وہ ان میں سے تقریباً ہر ایک کو ہی جانتا تھا۔ یہ لوگ چودھری کی زمینوں پر کاشت کیا کرتے تھے اور یہاں بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ چودھری کو اپنی ڈھیر ساری زمین چھوڑ کر جنگل میں کاشت کروانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

اس نے آنکھیں سکیڑ کر زمین سے سر اٹھاتے ننھے پودوں کا جائزہ لیا اور پھر اُچھل پڑا۔ اگر اس سے اندازے کی غلطی ہو رہی تھی تو وہ یقینی طور پر پوست کے پودے تھے۔ یعنی جنگل کے اس حصے میں چودھری اپنے ملازموں کے ذریعے خفیہ طور پر پوست کاشت کروا رہا تھا۔

اگو کا خون اس حقیقت کو جاننے کے بعد تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔ یہ زیر کاشت پوست چودھری کی مجرمانہ سرگرمیوں کا ایک بڑا ثبوت تھی۔ اگر وہ کسی طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذمے داران کو یہاں تک لانے میں کامیاب ہو جاتا تو چودھری کے لیے اپنی گردن چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

جوش میں بھرا وہ تیزی سے وہاں سے جانے کے ارادے سے پلٹا تو یکبارگی اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ شاید حوائج ضروریہ کے لیے درختوں کے جھنڈ میں گیا تھا اور اب اپنی شلوار کا ازار بند باندھتا ہوا واپس پلٹ رہا تھا۔ اگو نے اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ چودھری کے خاص ملازمین میں سے ایک تھا۔ اس شخص نے بھی اگو کو دیکھ لیا اور ایک پل کے لیے ازار بند باندھنا بھول کر حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگو اُس کی اس حیرت کا فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگنے پر اس شخص کو بھی ہوش آیا۔

''پکڑو..... پکڑو..... جانے نہ پائے۔'' شور مچاتا ہوا وہ خود بھی اپنی شلوار سنبھالتا اس کے پیچھے دوڑا۔ اگو کو معلوم تھا کہ اگر وہ ان لوگوں کی گرفت میں آ گیا تو چودھری کو قانون کے شکنجے میں پھنسوانے کی خواہش تو ایک طرف رہی، وہ اپنی جان بھی نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ کئی دنوں کی کم خوراکی کے باعث ہونے والی جسمانی کمزوری کے باوجود وہ پوری قوت سے بھاگتا چلا گیا۔

جس جگہ اسے دیکھا گیا تھا، وہاں تو درخت نہ ہونے کے برابر تھے لیکن خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے اس حصے کا رخ کیا جہاں جنگل گھنا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے سکتا تھا۔ حیوانات و نباتات سے بھرے جنگل میں وہ جان بچانے کے لیے کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح دوڑتا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں اسے جنگلی جانوروں کا خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے تعاقب میں جو لوگ تھے، وہ جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک درندے تھے۔ ان درندوں سے بچنے کے لیے وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس کے پاس موجود پلاسٹک کا وہ تھیلا جس میں اس نے شہد کا چھتا رکھا تھا، اس بھاگ دوڑ میں جانے کب اور کہاں گر گیا تھا۔ وہ ماں کی صحت کا سامان کرنے کے لیے جنگل میں آیا تھا اور اب اپنی ہی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔ زندگی سے اسے پیار نہیں تھا کہ رانی کے بعد اس کے لیے دنیا کی ہر شے سے کشش ختم ہو گئی تھی لیکن وہ رانی کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتا تھا اور اس کے خیال میں قدرت نے اسے ایک بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ اگر کسی طرح کسی ذمے دار شخص تک پہنچ جاتا تو اسے جنگل میں خفیہ طور پر کاشت کی جانے والی پوست کے بارے میں اطلاع دے کر چودھری کو پھنسوانے کا سامان کر سکتا تھا۔

چودھری کے گرگے اُس کے تعاقب میں تھے اور وہ ان سے چھپتا ہوا ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنی تمام تر پریشان حالی کے باوجود اُس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بے سمت نہ ہونے پائے اور اس راستے پر ہی

دوڑے جو اسے جنگل سے باہر لے جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ جنگل کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا۔ وقت کے ان لمحات میں اس دیوانے کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود بہت تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ گھنے جنگل سے نکلنے تک اس نے اپنا تعاقب کرنے والوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ چھدرا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس جگہ اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دیکھ لیا گیا تو جان بچانا مشکل ہو گی۔ وہ اپنی ٹانگوں کا بہترین استعمال کر کے بے شک متعاقب دشمنوں سے کافی دور نکل آیا تھا لیکن یہ فاصلہ کسی دور مار رائفل سے نکلی گولی کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور چودھری کے بندے خالی ہاتھ تو ہو نہیں سکتے تھے۔ ان حالات میں اس کا آبادی تک پہنچنا بہت مشکل تھا اور پہنچ بھی جاتا تو وہاں چودھری کی راج دھانی میں محفوظ کیسے رہتا؟

درختوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے اس کے ذہن سے تیزی سے یہ سارے خیالات گزر رہے تھے۔ اچانک ہی اس کی نظر دُور نظر آتے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر پڑی اور یک دم ہی اُمید کی کرن جاگ اُٹھی۔ وہ اس بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو فاریسٹ آفیسر کو اعتماد میں لے کر اسے سب کچھ بتا سکتا تھا۔

اس خیال کے آنے پر اس نے اپنے بے دم ہوتے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کر دی لیکن اب اسے آڑ فراہم کرنے والے درخت بہت کم رہ گئے تھے۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ کھلے میں آ جاتا تھا اور یہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ پیچھے سے آنے والے متوقع فائر کے ڈر سے وہ درمیانی فاصلہ زِگ زیگ انداز میں بھاگتے ہوئے طے کر رہا تھا۔ اپنی اس حکمتِ عملی کی افادیت کو اُس نے اس وقت خوب محسوس کیا جب فضا میں فائر کی زوردار آواز گونجی اور ایک گولی اس سے کچھ فاصلے پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا فائر ہوا تو وہ درخت کی آڑ میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس نے پل بھر رک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والے وہ افراد تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں دور مار رائفل تھی جبکہ دوسرا نہتا نظر آ رہا تھا۔

اُس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، البتہ بھاگتے رہنے میں اس بات کا کسی حد تک امکان تھا کہ وہ خود پر چلائی جانے والی گولیوں سے بچ کر بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا، چنانچہ آڑ سے نکل کر ایک بار پھر بنگلے کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔

اس بار قسمت نے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی۔ اسے لگا کہ اس کے بازو میں انگارے دہک اُٹھے ہوں۔ اس نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں اپنے ہی خون میں تر بتر ہو گئیں لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور بھاگنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یوں بھی اب بنگلہ چند گز کے فاصلے پر ہی رہ گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے یہ فاصلہ طے کرنے تک پیچھے سے مزید کوئی فائر نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی تمام تر توانائیوں کا استعمال کرتے ہوئے بالآخر بنگلے کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار اس کے ابتر حلیے اور بہتے خون کی وجہ سے چونک اٹھا۔

''اے..... کون ہے تُو؟'' اُس نے اکّو کی دھول مٹی میں اٹی شکل کو گھور کر پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا لیکن وہ بے چارہ اتنی بری طرح ہانپ رہا تھا کہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

''کیا گل ہے؟..... تُو کدھر سے بھاگ کر آ رہا ہے؟..... کون تیرے پیچھے پڑا ہے؟'' اس کی ابتر حالت کی وجہ سے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے چوکیدار اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پے در پے سوالات کرتا چلا گیا۔



''صاحب ہیں؟..... مجھے صاحب سے ملنا ہے۔'' اکّو بولنے کے قابل ہوا تو اس نے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تعاقب کنندہ نہ جانے کہاں رہ گئے تھے جو نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید اس کے بنگلے تک پہنچ جانے کی وجہ سے انہوں نے پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

''صاحب سے کیوں ملنا ہے؟..... پہلے مینوں دسّو، فیر میں صاحب کو بتاؤں گا۔ ان کی مرضی ہوئی تو تجھ کو مل لیں گے۔'' چوکیدار نے قطعی لہجے میں اسے جواب دیا۔

''دیکھ بھرا! مجھے صاحب سے ملنے دو۔ میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں، دیر ہو گئی تو شاید فیر مجھے موقع ہی نہ ملے۔'' اکّو نے سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی، ساتھ ہی اس کی نظریں مسلسل اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کب اور کس سمت سے گولی آ کر اسے چاٹ جائے گی۔

''پر میں تجھ پر کیسے اعتبار کروں؟..... ہو سکتا ہے تُو صاحب کا کوئی دشمن ہو۔'' چوکیدار پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس کی طرف سے مشکوک ہی رہا۔

''اللہ پاک کی قسم! میری صاحب سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے تو بس انہیں ایک ضروری گل دسنی (بتانی) ہے۔'' مسلسل بہتے خون کی وجہ سے اکّو پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ چنانچہ اُسے یہی حل نظر آیا کہ قسم کھا کر چوکیدار کو یقین دلانے کی کوشش کرے۔ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی، اس سے قبل ہی گیٹ کے اندرونی حصے سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار، اکّو کو چھوڑ کر پھرتی سے مڑا اور گیٹ وا کیا۔ ہارن دینے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر فاریسٹ آفیسر عابد انصاری براجمان تھا۔ اکّو دیوار سے ہٹ کر گیٹ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا کہ عابد انصاری کے لیے گاڑی نکال لے جانے کا راستہ نہ رہا۔

''چوکیدار! یہ آدمی کون ہے؟'' عابد انصاری نے اسے کچھ کہنے کے بجائے چوکیدار کی طرف چہرے کا رخ کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ضرور تھا لیکن اس میں سختی یا برہمی کا نام و نشان نہیں تھا۔

''مالوم نہیں صاحب کون ہے؟..... کام بھی نہیں بتاتا۔ بس آپ سے ملنے کی ضد کیے جا رہا ہے۔'' چوکیدار نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟'' عابد انصاری حیرت سے زیرِ لب بڑبڑایا، پھر بولا۔ ''اچھا، اسے اندر آنے دو۔ میں اس کی بات سن لیتا ہوں۔'' گاڑی وہیں چھوڑ کر وہ نیچے اُتر آیا اور اکّو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کا مہربان رویہ دیکھ کر اکّو کو کافی حوصلہ ملا اور یقین ہونے لگا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔

''تم اس کے لیے جلدی سے مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔ یہ اتنا زخمی ہے کہ تمہیں کسی بحث میں پڑنے کے بجائے سب سے پہلے اس کی مرہم پٹی کرنی چاہئے تھی۔'' اکّو ڈگمگاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھا تو اس نے چوکیدار کو حکم دیتے ہوئے قدرے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن اس کا لہجہ بہرحال اب بھی نرم ہی تھا۔

چوکیدار یہ حکم سن کر تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا۔ جبکہ خود اس نے آگے بڑھ کر اکّو کو سہارا دیا۔ اکّو کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی اتنے بڑے افسر کو ایسا مہربان دیکھا تھا۔ اے سی شہریار کی نیک دلی کی بھی بہت لوگ تعریف کیا کرتے تھے لیکن اکّو نے اس کی شخصیت میں بھی ہمیشہ ایک رعب و دبدبہ سا محسوس کیا تھا جس کی وجہ سے اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ عابد انصاری اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے تک پہنچ گیا۔ وہاں چار کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ اس نے اکّو کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

''مجھے آپ کو وڈی ضروری گل دسنی تھی صاحب! اُدھر جنگل میں.....'' اکّو نے بیٹھتے ہی اسے بتانے کی

کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

''اپنی مرہم پٹی کروالو، پھر بات کرنا۔ پہلے ہی تمہارا کافی زیادہ خون بہہ چکا ہے۔'' عابد انصاری نے اس سے کہتے ہوئے فرسٹ ایڈ بکس لے کر آنے والے چوکیدار کو اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو دیکھنے لگا۔

''اندر گولی ہے صاحب! اسے تو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔'' چوکیدار نے اس کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد عابد انصاری کو اطلاع دی۔

''اوہ.....'' اس کے ہونٹ فکرمندی کے اظہار کے لیے سکڑے، پھر وہ بولا۔ ''ابھی تو تم پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کرو۔ پھر اسے ہسپتال بھی لے جاتے ہیں۔''

چوکیدار اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ عابد انصاری کے کہنے پر اس نے اگو کو درد کش دوا بھی کھلا دی۔ پھر فرسٹ ایڈ بکس اُٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

''آپ کے کہنے پر میں نے مرہم پٹی کرالی ہے صاحب! لیکن ہسپتال جانے سے پہلے آپ کو میری گل سننی ہوگی۔ جو کچھ مجھے آپ کو بتانا ہے، وہ میری زندگی سے زیادہ اہم ہے۔'' چوکیدار کے جاتے ہی عابد انصاری کے حکم کے احترام میں اب تک خاموش بیٹھے اگو نے اس سے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہاری بات نہیں ٹالوں گا۔ تم جو کچھ بتانا چاہتے ہو، بتاؤ۔'' عابد انصاری نے گویا اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے ہمہ تن گوش دیکھ کر اگو نے اسے اپنے حالات سے مختصراً آگاہ کرتے ہوئے جنگل جانے اور وہاں جو کچھ نظر آیا، اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی لیے اُس کی ہر بات غور سے سنتا رہا۔ اگو خاموش ہوا تو وہ بولا۔

''تم نے اپنی جان پر کھیل کر جو اطلاع مجھ تک پہنچائی ہے، اس کے لیے میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ فاریسٹ آفیسر کی حیثیت سے جنگل میں ہونے والی ہر سرگرمی کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے، میں اکیلا پورے جنگل پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ اس کام کے لیے مجھے اپنے اسٹاف کے تعاون کی ضرورت ہے اور جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میرا اسٹاف میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے چودھری کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ بہرحال، میں خاموشی سے جنگل میں جا کر خود جائزہ لوں گا، پھر اوپر والوں کو رپورٹ کروں گا۔ تم تسلی رکھو..... مجرم کسی صورت بچ نہیں سکیں گے۔''

''ایسا ہو گیا تو یہ ہم غریبوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا صاحب!'' اگو کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ چودھری کو پوست کاشت کروانے کے جرم میں کیا سزا مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ چودھری جیسا بااختیار شخص کچھ عرصہ جیل کی ہوا کھالے۔ اس طرح اس کی مظلوم رانی کی روح کو کچھ تو سکون حاصل ہو جاتا۔

''احسان کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اپنا فرض ادا کروں گا۔ اب تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں ہسپتال پہنچانے کا بندوبست کر کے ابھی آتا ہوں۔'' عابد انصاری نے اسے جواب دیا اور خود تیزی سے چلتا ہوا بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اگو نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ نقاہت اور پین کلر کے اثر کی وجہ سے اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

''چلو بھئی، تمہارے لیے گاڑی آ گئی ہے۔'' اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ چوکیدار نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے یہ اطلاع دی تو وہ غنودگی سے باہر آیا۔ چوکیدار اسے سہارا دے کر باہر کی طرف لے



گیا۔ گیٹ کے قریب جہاں اس نے عابد انصاری کی گاڑی دیکھی تھی، اب وہاں کوئی دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ چوکیدار نے اسے گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی شکل اس کے لیے آشنا نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس آدمی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکال لی۔ پیچھے چوکیدار نے فوراً ہی گیٹ بند کر لیا۔

دھیمی رفتار سے چلتی گاڑی نے مشکل سے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ رُک گئی اور کوئی بہت تیزی سے پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر اگو کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اگو کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس نے اس ساری کارروائی کو محسوس کر لیا اور صورتِ حال کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنکھیں کھلتے ہی اسے برابر میں بیٹھے شخص کی شکل نظر آئی جس پر نظر پڑتے ہی اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

⊛-----✪-----⊛

آفتاب کی کرسی پر اُس کی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کشور کے چہرے پر کچھ حیرت سی پھیلی ہوئی تھی تاہم اس حیرت کے باوجود وہ بہت دلچسپی سے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذات پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں مصروف تھی ہر طرف کتوں کی طرح بُو سونگھتے چودھری کے گُرگوں سے بچنے کے لیے انہوں نے اب ایک چھوٹے اور قدرے پسماندہ ترقی یافتہ گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس گاؤں میں ان کے مشاغل کافی محدود ہو گئے تھے۔ یہاں نہ موبائل سروس کام کرتی تھی، نہ انٹرنیٹ اور کیبل کی سہولیات تھیں۔ ٹیلی ویژن پر صرف پی ٹی وی کی نشریات دکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس نئے ٹھکانے پر ٹیلی ویژن رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کو بھی انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کب تک یہاں چھپے رہنے میں کامیاب رہیں گے اور کب اچانک یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا؟ اس لیے بہت زیادہ ساز و سامان جمع کرنے سے گریز کیا تھا۔ جو سامان خریدا گیا تھا، وہ بھی بلا ہینڈ تھا۔

کالم نگاری کے عوض آفتاب کو معاوضہ تو خاصا مناسب ملتا تھا لیکن اس معاوضے کا بیشتر حصہ اسکول پر لگانے کے باعث اس کے پاس زیادہ جمع جتھا نہیں تھا۔ ان حالات میں ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ احتیاط سے کام لیں تاکہ معاشی مسائل کا شکار نہ ہوں۔ کشور کے آرام کے سلسلے میں البتہ آفتاب نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ گھریلو امور انجام دینے کے لیے گاؤں ہی کی ایک عورت جز وقتی طور پر ملازم رکھ لی تھی۔ وہ عورت سارا کام کاج نمٹا کر دوپہر تک واپس چلی جاتی تھی۔

کشور کے پاس اپنی فراغت کا یہی علاج تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزارے۔ آفتاب جس دن شہر جاتا، اس کے لیے کتابیں لے کر آ جاتا۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ آفتاب کے لکھے کالمز اور روزانہ کا اخبار بھی پابندی سے پڑھتی تھی۔ کالمز وہ عموماً چھپنے سے پہلے ہی پڑھ لیا کرتی تھی۔ آج آفتاب صبح سے گیا ہوا تھا۔ جب تک کام کرنے والی عورت گھر میں رہی، کشور اس کے ساتھ مصروف رہی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آ کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ اس کام کے دوران ہی اس کے ہاتھ میں وہ صفحات آئے جنہیں وہ یونہی وقت گزاری کے لیے پڑھنے لگی۔ اور پھر اتنی دلچسپی محسوس ہوئی کہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ دلچسپی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت اس لیے محسوس ہو رہی تھی کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی تھی، اسے آفتاب نے لکھا ہے..... اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اتنے ذوق و شوق سے کیا پڑھا جا رہا ہے کہ آپ کو اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔'' لکھے ہوئے صفحات میں سے ایک دو صفحات ہی پڑھنا رہ گئے تھے جب وہ آفتاب کی آواز سن کر چونکی۔

''ارے آپ.....آپ کیسے اندر آئے؟'' اس نے تحریر پر سے نظر ہٹا کر آفتاب سے پوچھا۔

''باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔'' آفتاب نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اُف.....'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں شاید کام والی کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔''

''آپ کو خیال رکھنا چاہئے۔ ہمارے حالات اتنے سازگار نہیں ہیں کہ ہم ایسی بے احتیاطی کے متحمل ہو سکیں۔'' آفتاب کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''سوری آفتاب! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔'' کشور نے فوراً اس سے معذرت کر لی۔ اُس کے اس انداز پر آفتاب فوراً ہی موم ہو گیا۔

''آپ کو مجھ سے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو جو کچھ کہا، اس کا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ مجھے آپ کی فکر ہے اور میں آپ کے معاملے میں کوئی کوتاہی، چاہے وہ آپ سے ہی سرزد ہوئی ہو، برداشت نہیں کر سکتا۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ کشور پر اس کے جذبات کا گہرا اثر ہوا اور وہ بے ساختہ ہی اس کے سینے سے آ لگی۔ آفتاب کا ہاتھ خودکار انداز میں اس کے دوپٹے سے لپٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کشور کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے پر رکھا اس کا چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔

''یہ کیا؟.....آپ رو رہی ہیں۔ شاید آپ کو میری بات بری لگ گئی ہے۔''

''اُوں ہوں۔'' کشور نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میری آنکھیں تو اپنی خوش قسمتی محسوس کر کے بھر آئی ہیں۔ مجھے زندگی میں کبھی کوئی اتنا چاہے گا، میں نے سوچا تک نہیں تھا۔''

''ابھی تو یہ ابتدا ہے، آگے آگے دیکھئے گا، ہوتا ہے کیا؟'' اس کا جواب سن کر آفتاب کو اطمینان ہوا تو اس کے بالوں کی ایک لٹ کھینچتے ہوئے شوخی سے بولا۔

اس کے انداز پر کشور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں، میں تب تک کھانا لگاتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے، مجھے بھی اب بھوک لگ رہی ہے۔'' اس کی بات سن کر آفتاب فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا تو کشور کھانا لگا چکی تھی۔

''آپ نے جن کتابوں کے نام نوٹ کروائے تھے، وہ میں لے آیا ہوں۔ میرے بیگ میں رکھی ہیں، نکال لیجئے گا۔'' کھانا کھانے کے دوران اس نے کشور کو بتایا۔

''ٹھیک ہے، میں نکال لوں گی۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ جس وقت آپ آئے، میں آپ کا لکھا ہوا ہی پڑھ رہی تھی۔ وہ تو کالمز سے ہٹ کر بالکل الگ چیز ہے۔''

''وہ.....'' آفتاب مسکرایا۔ ''آج کل میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اس ناول کا نام منجدھار ہو گا۔''

''مجھے اسی لیے تو حیرت ہو رہی تھی کہ آپ جیسا بندہ جو سیاسی اور معاشرتی مسائل پر تجزیاتی کالمز لکھتا ہو، ناول نگاری کی طرف کہاں چلا گیا۔ یہ تو آپ کا میدان نہیں ہے۔''

''میرے کالمز کی طرح میرا ناول بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ہی مبنی ہو گا۔ جو کچھ کالمز میں بہ راہ نہیں لکھا جا سکتا یا جسے چھاپنے سے اخبار کے ایڈیٹرز و مالکان مصلحتاً گریز کرتے ہیں، وہ فرضی کرداروں کے ساتھ ناول میں آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا کام تو ظلم، ناانصافی، معاشرتی تفریق اور دیگر مسائل کو اجاگر کر کے عوام کو باشعور ہی بنانا ہے نا۔ اب چاہے اس کے لیے کالم نگاری کا سہارا لیں یا ناول نگاری کا، اصل مقصد



پورا ہو جاتا ہے۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ میں صرف کالم نگار نہیں ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں، میں نے کئی افسانے لکھے تھے جو مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ بعد میں، میں صحافت کے ساتھ اتنا زیادہ انوالو ہو گیا کہ افسانہ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پیر آباد میں اسکول کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد رہی سہی فرصت بھی ختم ہو گئی۔ اب عرصے بعد فرصت ملی ہے تو میں نے سوچا کہ چلو یہ کام کر لیتے ہیں۔ اس جگہ نیٹ کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے یوں بھی کرنٹ افیئرز سے فوری طور پر آگاہ نہیں ہو پاتا۔ الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں صرف اخبار پڑھ کر گزارہ نہیں ہوتا، خصوصاً صحافت کی دنیا میں پاؤں جما کر رکھنے کے لئے۔ پچھلی بار میری اپنے ایڈیٹر سے فون پر بات ہوئی تھی تو ہمارے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ میں ہفتے میں دو کے بجائے صرف ایک کالم لکھا کروں گا۔ اس حساب سے ظاہر ہے میری انکم بھی آدھی رہ جائے گی لیکن فکر کی بات نہیں، ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔ بعد میں جب میں یہ ناول مکمل کر لوں گا تو کوئی بھی اچھا پبلشر اسے ٹھیک ٹھاک رائلٹی دے کر چھاپنے پر تیار ہو جائے گا۔ مطالعہ کرنے والوں کے حلقے میں میرے نام کی اچھی شہرت ہے اس لیے مجھے ایسی کوئی فکر نہیں کہ میرا ناول چھپ نہیں سکے گا۔ ناول چھپے گا تو جہاد بالقلم کا حق بھی ادا کرے گا اور ہمارے گھر کو آسودگی بھی دے گا۔''

اس نے کشور کی بات کا جو تفصیلی جواب دیا، اس نے کشور کو بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ اس بات کا بھی احساس دلایا کہ آنے والا وقت ان کے لیے معاشی تنگ دستی بھی لا سکتا ہے۔ وہ جن آسائشوں سے بھری حویلی کو ٹھوکر مار کر آئی تھی، اس کے مقابلے میں تو اب بھی کچھ میسر نہیں تھا۔ لیکن ان مادی آسائشوں کے بدلے اسے جو محبت کی دولت ملی تھی، اس نے اسے اتنا مالا مال کر دیا تھا کہ وہ خود کو اس عورت سے بھی زیادہ خوش قسمت تصور کرتی تھی جس کے لیے ایک شہنشاہ نے تاج محل تعمیر کروایا تھا۔ اس کے لیے آفتاب کی سنگت میں یہ چھوٹا سا دو کمروں کا معمولی مکان بھی تاج محل سے بڑھ کر تھا۔ مگر یہ احساس کہ اس کی خاطر آفتاب کو بار بار کوئی نہ کوئی قربانی دینی پڑتی ہے، اسے رنجیدہ کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے، آپ نے کھانا کھانا کیوں چھوڑ دیا؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے آفتاب نے اسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔ بس میں یہ سوچنے لگی تھی کہ آپ کا ناول نہ جانے کتنے عرصے میں مکمل ہو گا۔ میں نے آپ کے لکھے جو چند صفحات پڑھے ہیں، ان کو پڑھ کر دل چاہ رہا تھا کہ جلد سے جلد پورا ناول پڑھنے کو مل جائے۔'' اس نے خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے آفتاب کو جواب دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اس کی رنجیدگی ظاہر ہو۔ پہلے بھی بعض مواقع پر اس نے اپنی اس طرح کی کیفیات کا اظہار کیا تھا تو آفتاب کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ہرگز یہ بات پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اتنی محبت سے جو کچھ اس کے لیے کرتا ہے، وہ اسے کوئی احسان سمجھے یا شرمندہ ہو۔

''اللہ نے چاہا تو ننھے مہمان کی آمد سے قبل میں اپنا یہ ناول ضرور مکمل کر لوں گا۔'' آفتاب کے دیئے جواب نے کشور کی کیفیت کو یکسر بدل دیا اور وہ ایک ننھے ہمکتے وجود کے خیال سے یوں کھل اُٹھی کہ کچھ دیر پہلے دل کو گھیر لینے والی رنجیدگی پل بھر میں اُڑن چھو ہو گئی۔ آفتاب نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی خوب صورت مسکراہٹ کو دیکھ کر اپنے دل میں گہرا اطمینان محسوس کیا۔ کشور نے اپنی خاموشی کی وجہ اس سے چھپانے کی کوشش کی تھی، اس کے باوجود وہ اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اور اسے ٹوکے بغیر غیر محسوس طور پر اس کی سوچ کا دھارا ایسے رخ پر موڑ دیا تھا کہ وہ مسکرائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

ایک مریض کی کیس ہسٹری پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر نقوی نے فائل پر سے نظریں ہٹائیں اور سامنے لگے کلاک میں وقت دیکھا۔ آٹھ بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ ہسپتال سے اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ روانگی سے آدھا گھنٹہ قبل وہ پرائیویٹ روم میں موجود اپنے مریض کا حال معلوم کرنے کے لیے ان روم کا ایک راؤنڈ ضرور لگاتا تھا۔ یہ اس کا برسوں کا معمول تھا جس میں بڑی ایمرجنسی کے پیش نہ آنے کی صورت میں کبھی ردوبدل نہیں ہوتا تھا۔ پابندیٔ وقت کی یہ عادت اس نے اپنے کیریئر کے آغاز سے ہی اختیار کر لی تھی جو اب اس کے ہسپتال کے سب سے سینئر سرجن بن جانے کے بعد حد پختہ ہو چکی تھی۔

اب بھی اس نے گھڑی دیکھ کر یہی اطمینان کیا تھا کہ اس کے پاس راؤنڈ لینے کے لیے دس منٹ باقی ہیں اور وہ اس عرصے میں زیر مطالعہ کیس ہسٹری کو باآسانی پڑھ لے گا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرتا، اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے میز پر اپنے بائیں ہاتھ کے قریب رکھے موبائل کو اٹھانے سے پہلے اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسکرین پر اس کی اکلوتی بیٹی عائشہ صرف عاشی کا نام جگمگا رہا تھا۔ عاشی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل اُٹھایا اور ریسیور کا بٹن پش کیا۔ عاشی اور اس کی بیوی ہسپتال کے اوقات میں کبھی بھی سخت ضرورت کے بغیر اسے فون کرنے کی عادی نہیں تھیں۔ اس لیے اپنے کام میں خلل محسوس کرنے کے باوجود اس نے کال ریسیو کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

''ڈیڈی.....!'' اس نے ابھی ''ہیلو'' کہا ہی تھا کہ عاشی نے بڑے کرب بھرے لہجے میں اسے پکارا اور پھر ایک سسکی لی۔

''کیا بات ہے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟ گھر پر سب خیریت تو ہے نا؟'' عاشی کا لہجہ اور پھر سسکی سن کر وہ بے قرار سا ہو گیا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

''شوبی اسکول سے واپس گھر نہیں پہنچا ڈیڈی!'' عاشی نے اسے جواب دیا اور پھر پلک پلک کر رونے لگی۔ اس کا جواب سن کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس کی بے حد لاڈلی اور کسی حد تک خودسر بیٹی سے نوجوانی میں ایک غلطی ہوئی تھی اور اس کی غلطی کی سزا انہیں اب بھی وقتاً فوقتاً بھگتنی پڑتی تھی۔ عاشی کی اس غلطی کا نام کامران تھا۔ کامران اس کا کلاس فیلو تھا جس کی محبت میں وہ اس بری طرح گرفتار ہو گئی کہ اسے ماں باپ کی محبت پر بھی یقین نہیں رہا تھا۔ جب اس نے پہلی بار کامران کو اپنی پسند کی حیثیت سے والدین سے متعارف کروایا تھا تو گویا دل میں یہ ٹھان چکی تھی کہ ہر حال میں اپنی پسند کو اپنا کر رہے گی اور اگر والدین میں سے کسی نے مخالفت کی تو اس مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑی تو وہ بھی اٹھا لے گی۔

ڈاکٹر نقوی اور ان کی بیگم دونوں ہی پڑھے لکھے اور باشعور تھے جو بلاوجہ بیٹی کی پسند کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کامران سے ہونے والی پہلی ملاقات میں اس کے لیے دل میں ناپسندیدگی محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی نے عاشی سے اس کا رشتہ کرنے سے فوراً انکار کرنے کے بجائے بہت سوچ بچار سے کام لیا اور ایک ہفتے کامران کے متعلق چھان بین کرتا رہا۔ اس چھان بین کے نتیجے میں اسے کامران کے کردار کے بارے میں تو ایسی کوئی بات سننے کو نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ اسے ریجیکٹ کر سکتا۔ لیکن بہرحال، وہ اسے اپنے اکلوتے داماد کی حیثیت سے کچھ اچھا بھی نہیں لگا۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے کامران کے بہن بھائیوں کی تعداد آدھا درجن تھی اور وہ جس چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، وہاں عاشی کی شادی ہونے کی صورت میں



اسے کہاں رکھا جاتا؟ اس بات کا جواب ڈاکٹر نقوی کو کم از کم نہیں سوجھا تھا۔

کامران کے خاندان میں تعلیم کا بھی کچھ خاص رجحان نہیں تھا۔ اس کے والدین قطعی ان پڑھ تھے اور بہن بھائی بھی بس یونہی رسمی سی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خود کامران بھی زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا اور اب ایوسط درجے سے ہی کامیاب ہوتا رہا تھا۔ اس کے ان کوائف سے ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں بھی کسی اچھے مقام اور اچھی ملازمت وغیرہ کے حصول میں ناکام رہے گا۔ کامران سے شادی کرنے کی صورت میں عاشی کو اپنے باپ کے گھر کے مقابلے میں بہت مشکل زندگی گزارنی پڑتی لیکن ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی اس بات نہیں سمجھا سکے۔ اس پر عشق کا وہی بھوت سوار تھا جو ماں باپ کو بھی ظالم سماج کی قطار میں کھڑا کر رہا ہے۔ عاشی کی ضد دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نقوی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن شادی سے قبل کامران کے سامنے یہ شرط ضرور رکھی کہ وہ عاشی کو علیحدہ گھر میں رکھے گا۔ یہ گھر اس نے ایک لگژری فلیٹ کی صورت میں عاشی کے جہیز میں دیا اور کافی حد تک مطمئن ہو گیا کہ بیٹی کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے وہ شادی کے بعد بھی مستقل تحائف کی صورت میں اور کبھی کبھار بذریعہ کیش اس کی مالی معاونت کرتا رہتا تھا۔ کئی ماہ تک والدین کے سامنے اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کا ڈھونگ کرتی رہی لیکن پھر ایک دن اس ڈرامے کا اینڈ سین ہو گیا۔

ایک روز وہ اور اس کی بیوی ایک تقریب سے واپسی میں اچانک عاشی سے ملاقات کے لیے اس کے فلیٹ پر پہنچے تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایسا پہلے بھی دو چار بار ہو چکا تھا جس کے جواب میں عاشی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کامران کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس بار بھی تالا دیکھ کر انہوں نے یہی گمان کیا اور واپسی میں یہ طے کرتے ہوئے کہ آئندہ عاشی سے فون پر پوچھے بغیر اس کے گھر نہیں آئیں گے، واپس پلٹنے لگے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ دونوں لفٹ تک پہنچتے، ایک نوعمر لڑکی نے انہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اس نے جو انکشافات کیے، انہیں سن کر دونوں میاں بیوی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لڑکی کے مطابق عاشی اندر ہی موجود تھی اور اس کا شوہر روزانہ کی طرح اسے تالے میں بند کر کے گیا تھا۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ کامران، عاشی کو روزانہ زدوکوب کرتا ہے اور وہ بہت تکلیف دہ زندگی گزار رہی ہے۔ یہ سب جان لینے کے بعد ڈاکٹر نقوی ایکشن میں آ گیا اور بالآخر عاشی کی شادی کامران سے خلع کی صورت میں انجام تک پہنچی۔ بعد میں عاشی نے ہی اسے بتایا تھا کہ کامران ایک بے پناہ لالچی اور پست ذہنیت کا مالک تھا جو اسے نہ صرف باپ سے رقم مانگنے پر مجبور کرتا تھا بلکہ اس پر شک بھی کرتا تھا۔ وہ خود چند ماہ میں کامران سے اُکتا گئی تھی لیکن چونکہ اپنی ضد سے شادی کی تھی، اس لیے کامران کی مار پیٹ اور گالم گلوچ کے باوجود باپ پر اس کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ یہ دراصل اس کی ایک اور حماقت تھی۔ لیکن بہرحال اسے کچھ بھی جتائے بغیر ڈاکٹر نقوی نے اسے کامران نامی مصیبت سے نجات دلا دی۔ کامران سے علیحدگی کے وقت عاشی پریگنینٹ تھی۔ بیٹا پیدا ہونے کے بعد مسز نقوی نے بچے کی ذمے داری خود سنبھال لی اور عاشی نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

زندگی اچھی خاصی معمول پر آ گئی تھی۔ عاشی کے فارغ التحصیل ہونے تک اس کا بیٹا بھی اسکول جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی کا ارادہ تھا کہ عاشی کو سمجھا بجھا کر اس کی دوسری شادی کر دیں گے۔ لیکن کچھ بھی ہونے سے قبل کامران ایک بار پھر منظر پر آ گیا۔ اس نے عاشی کو فون کر کے تنگ کرنا شروع کر دیا اور اسے تجدید تعلق پر راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عاشی کے مسلسل انکار پر ایک روز وہ انتقاماً شعیب کو اس کے اسکول

سے لے کر غائب ہو گیا اور چند گھنٹے بعد جب عاشی رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی، خود ہی اسے واپس بھی چھوڑ چلا گیا۔

اس حرکت کے بعد وہ وقتاً فوقتاً عاشی کو فون کر کے اسے دھمکی دیتا رہتا تھا کہ اگر وہ اس کی بات ماننے کے لیے راضی نہ ہوئی تو وہ بچے کو اس سے جدا کر دے گا۔ اس دھمکی سے عاشی بہت گھبرا گئی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی نے اسے تسلی دی کہ کامران میں اتنا دم نہیں۔ ایک بار وہ بچے کو اسکول سے بے خبری میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، آئندہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس نے اسکول انتظامیہ کو ہدایت کر دی تھی کہ بچے کو اس کے ڈرائیور کے سوا کسی کے حوالے نہ کیا جائے۔ ڈرائیور کو بھی الرٹ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یوں ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ ایک سال کا عرصہ بہ خیر و خوبی گزر گیا تھا۔ اب جو عاشی نے اسے اطلاع دی کہ شعیب اسکول سے واپس نہیں آیا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کامران نے پھر کوئی شرارت کی ہے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ عاشی نے اسے اتنی دیر سے اطلاع کیوں دی ہے؟ شعیب اسکول سے دو بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا! میں کچھ کرتا ہوں۔ لیکن تم نے مجھے اطلاع دینے میں اتنی دیر کیوں کی؟ اگر تم پہلے فون کر دیتیں تو میں اب تک شوبی کو تلاش کروا چکا ہوتا۔'' اس نے پہلے بیٹی کو تسلی دی پھر اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلایا۔

''آپ کی بیٹی نے ہمارے کہنے پر آپ کو اطلاع نہیں دی ڈاکٹر صاحب!'' اسے دوسری طرف سے ماں کے بجائے مردانہ آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟ اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ میں ابھی پولیس کو فون کر کے اطلاع دیتا ہوں'' وہ اب تک اسی گمان میں مبتلا تھا کہ شوبی کو غائب کرنے کی حرکت کامران نے کی ہے اور یہ اس کا ہی کوئی ساتھی ہے جو اس کے گھر بھی پہنچا ہوا ہے اس لیے زیادہ خائف ہوئے بغیر غصیلے لہجے میں اسے دھمکی دی۔

''ایسا کرنے کی غلطی بھی مت کیجیے گا ڈاکٹر صاحب! ورنہ آپ اپنے نواسے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ آپ کے دیش کی پولیس کتنے کام کی ہے، یہ آپ خود بھی جانتے ہیں۔''

اس کی دھمکی کے جواب میں دوسری طرف سے نہایت سنگین لہجے میں جو کچھ کہا گیا، اس نے ڈاکٹر نقوی کو چونکا دیا۔ بولنے والے نے اپنے الفاظ سے اسے یہ جتایا تھا کہ وہ پاکستان کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے لہجے نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کس ملک کا سپوت ہے لیکن اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک غیر ملکی کو شوبی اغوا کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس کا لہجہ خود بہ خود دھیما ہو گیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص کوئی معمولی غنڈہ یا بدمعاش نہیں ہے جسے وہ اپنے تعلقات کے بل پر زیر کر لے گا۔ وہ شخص جو کام تھا، کسی بہت مربوط منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا جب ہی تو دوپہر سے اب تک کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد اسے شعیب کے اغوا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ بھی یقیناً اس وقت جب اغوا کاروں نے ایسا چاہا تھا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص اور شاید اس کے کچھ ساتھی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے گھر پر قابض تھے اور انہوں نے عاشی اور اس کی بیوی کو اس بات کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اس کو اس حادثے کی اطلاع دے پاتیں۔

''ہمیں اسپیشل روم میں موجود پیشنٹ ورما چاہیے۔'' اس کے سوال کے جواب میں دوسری طرف سے مطالبہ کیا گیا، اسے سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا، وہ واقعی معمولی غنڈے نہیں تھے۔ ایک غیر ملکی ایجنٹ کا مطالبہ کرنے والے یقینی طور پر اس کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔



''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ سخت سکیورٹی میں ہے۔ تمہیں وہ شخص چاہیے تھا تو متعلقہ لوگوں سے مطالبہ کرتے۔ میں تو صرف ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں بھلا اسے تمہارے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

''تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور یقیناً اپنے پیارے نواسے کی زندگی بچانے کے لیے کرو گے بھی۔ کرنا ہے، یہ میں خود تمہیں بتاتا ہوں۔'' دوسری طرف سے اسے جواب دیا گیا اور پھر اس کی رضامندی جانے بغیر ہی وہ بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جو کچھ ڈاکٹر نقوی سے کہا، اسے سن کر اس کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ وہ لوگ ایک مربوط منصوبے پر کاربند ہیں۔

''اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟'' اس کے دل میں موجود جذبۂ حب الوطنی نے جوش مارنے کی کوشش کی۔

''تو یہ تمہاری اپنی چوائس ہو گی۔ تم کتنے ہی ماہر سرجن سہی مگر یہ تو طے ہے کہ اپنے نواسے کے شریر کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتے۔ تمہاری پتنی اور بیٹی کو البتہ میں اور میرے ساتھی جیتا چھوڑ دیں گے، وہ خود شرم کے مارے آتما ہتیا کر لیں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' بہت اطمینان کے ساتھ اسے جواب دیا گیا، اسے سن کر اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کے پیاروں کی زندگی اور عزت دونوں داؤ پر لگی تھیں۔ اس نے خود کو پل بھر میں ٹٹول لیا۔ وہ اس حد تک محبِ وطن نہیں تھا جو اتنے بڑے بڑے نقصانات سہہ سکتا۔

''او کے! تم جو کہو، وہ میں کرنے کے لیے راضی ہوں۔'' اسے فیصلہ سنانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ویسے اس نے خود کو یہ تسلی دے لی تھی کہ ورما کی نگرانی پر موجود سکیورٹی اہلکار خود ہی اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔ اسے جو کچھ کرنے کو کہا جا رہا ہے، وہ ایسا بہر حال نہیں کہ وہ خود کو ورما کے فرار میں براہِ راست شامل سمجھ سکے۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر تم فوراً اپنے آفس سے نکل کر راؤنڈ کے لیے نکل پڑو۔ پہلے ہی تم دو منٹ لیٹ ہو چکے ہو۔'' اس کے رضامندی ظاہر کرتے ہی دوسری طرف سے حکم سنایا گیا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ حسبِ معمول اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر اس کا منتظر تھا۔

''شاید آج میری گھڑی دو منٹ آگے چل رہی ہے۔'' ڈاکٹر نقوی کو دیکھ کر اس نے خوشگوار لہجے میں تبصرہ کیا۔

''بالکل نہیں، میں دو منٹ لیٹ ہوں۔ اصل میں گھر سے بیگم کا فون آ گیا تھا۔ انہیں کچھ سامان منگوانا تھا جس کی وہ مجھ سے لسٹ بنانے بیٹھ گئی تھیں اور اس بات کو تو ہر شادی شدہ بندہ سمجھ سکتا ہے کہ جب ہوم منسٹری احکامات جاری کر رہی ہو تو اپنے تمام ذاتی اصول و قواعد کو سائیڈ پر رکھ کر اسی کی سننی پڑتی ہے۔'' اس نے بھی اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے جواب دیا۔ یہ ساری گفتگو ان دونوں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نہیں کی تھی بلکہ اس دوران بالائی منزل پر لے جانے والی لفٹ میں سوار ہو چکے تھے۔ لفٹ سے نکل کر انہوں نے سیدھا ورما کے کمرے کا رخ کیا۔

کمرے کے دروازے پر موجود سکیورٹی اہلکاروں نے ان دونوں کے اندر جانے سے پہلے میٹل ڈیٹکٹر سے انہیں چیک کیا پھر وہ اندر داخل ہو سکے۔ اندر بھی ڈیوٹی نرس کے علاوہ ایک سادہ لباس والا سکیورٹی کا بندہ موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر نرس الرٹ ہو گئی اور وہ ورما کے چیک اپ کے دوران اس سے جو سوالات کرتے رہے، وہ ان کے جواب دیتی رہی۔

"کچھ امپروومنٹ آئی تو ہے، یہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہا ہے۔ میرے خیال میں ری اسکین کروا لیتے ہیں تاکہ صورتِ حال مزید واضح ہو جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے ورما کے چیک اپ سے فارغ ہو کر اپنی رائے دینے کے ساتھ ساتھ اپنے اسسٹنٹ سے بھی پوچھا۔

"جیسا آپ کہیں سر!" ڈاکٹر نقوی جیسے سینئر ڈاکٹر کی رائے سے وہ بھلا کیسے اختلاف کر سکتا تھا؟

"آپ اسٹاف کو بلا کر پیشنٹ کو نیچے لیب میں بھجوا دیں۔ صبح میں ہسپتال آؤں تو رپورٹس میری ٹیبل پر موجود ہونی چاہئیں۔" اس نے نرس کو حکم دیا اور ورما کے کمرے سے نکل کر دوسرے پرائیویٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے روزانہ کے معمول کو دہراتے ہوئے اس نے خود کو اس مہارت سے سنبھال رکھا تھا کہ دیکھنے والوں کے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟

⊛----✪----⊛

میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کافی اور چیز سینڈوچز تیار کر دو۔ فارغ بیٹھ کر بوریت ہو رہی ہے۔ کھانے پینے میں کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔" ایک سنگل صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے پانڈے نے عاشی کی طرف دیکھ کر اس انداز میں فرمائش کی جیسے وہ گھر کا ہی کوئی فرد ہو اور اسے یہ بے تکلفانہ فرمائش کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو رہا ہو۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" مسز نقوی نے عاشی کے سفید چہرے پر نظر ڈالی اور کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

"جوان، خوب صورت کنیا کے ہوتے ہوئے ہم بوڑھے جھری دار ہاتھوں کا تیار کیا ہوا بھوجن کھائیں، یہ ہمیں گوارا نہیں۔ ہماری فرمائش تو سندری عاشی کو ہی پوری کرنی ہو گی۔" پانڈے نے اوباشانہ لہجے میں کہتے ہوئے مسز نقوی کو واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عاشی کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر عاشی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور لرزتے قدموں سے کچن کی طرف جانے لگی۔ پانڈے کا ایک مسلح ساتھی نگرانی کے لیے اس کے پیچھے تھا۔ اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر عاشی کچن میں پہنچ گئی اور پانڈے کی فرمائش کے مطابق کافی اور سینڈوچز تیار کرنے کے لیے کیبنٹس سے سامان نکالنے لگی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے ساری چیزیں کچن کاؤنٹر پر رکھنے کے بعد اس نے کچن ہی میں موجود بڑے سے فریج کی طرف رخ کیا اور اس میں سے چیز نکال کر واپس پلٹی۔ اس کی نگرانی کے لیے سر پر مسلط آدمی کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ عاشی کی معمولی سے معمولی جنبش بھی اس کی نظروں سے محفوظ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا چاہتی تو ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے عاشی کا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی نہیں۔ اپنے بیٹے کی زندگی کے تحفظ کے لیے وہ ایسا کوئی ارادہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تک اس کی فیملی کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا، اسے سامنے رکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کا جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، وہ بہت خطرناک ہیں۔

وہ لوگ تقریباً دو بجے نقوی ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب صفائی ستھرائی کرنے والی ملازمہ اپنا کام نمٹا کر جا چکی تھی۔ اور گیٹ پر موجود رہنے والے چوکیدار کے سوا گھر پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ یوں بھی انہوں نے اپنے گھر میں ملازموں کا ہجوم جمع نہیں کیا تھا۔ مسز نقوی کچن کا کام ہمیشہ خود کرنا پسند کرتی تھیں۔



اور اوپر کے کام کرنے والی جز وقتی ملازمہ کے علاوہ ان کے ہاں ہفتے میں دو دن لان کی دیکھ بھال کے لیے ایک مالی آتا تھا۔ آج مالی کے آنے کا بھی دن نہیں تھا۔ ڈرائیور، شوبی کو لینے اسکول گیا ہوا تھا چنانچہ آنے والوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو زیر کرنے کے بعد آسانی سے پورے گھر کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان کی اسٹنگ سے ظاہر تھا کہ وہ مکمل معلومات کے بعد یہاں آئے ہیں۔

مسز نقوی اور عاشی جو کہ اس وقت شعیب کی اسکول سے واپسی کی منتظر ہوا کرتی تھیں، مسلح افراد کو اپنے سر پر موجود دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی تھیں اور فوری طور پر انہیں یہی خیال آیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور انہیں لوٹنے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن چند منٹ کے اندر ہی ان کے لیڈر نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ڈاکٹر نقوی سے اپنا ایک مطالبہ منوانے کے لیے شعیب کو اغوا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے گھر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ ان نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے گھر کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس نے مسز نقوی اور عاشی کے موبائل فونز بھی اپنے قبضے میں لے لیے گئے تھے۔

اس کے اور اس کے ساتھیوں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نہایت سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مسز نقوی کا تیار کردہ لنچ بڑے مزے سے ہڑپ کر لیا تھا۔ مسز نقوی اور عاشی کو بھی اس لنچ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی لیکن ان کی بھوک پیاس تو شوبی کو اغوا کیے جانے کی خبر سن کر ہی اُڑ گئی تھی۔ عاشی نے البتہ ہمت کر کے اتنا مطالبہ ضرور کیا تھا کہ شوبی کے اغوا کو ثابت کرنے کے لیے اس کی ان لوگوں سے بات کروائی جائے۔ جواب میں اس سے کہا گیا کہ وہ صرف دس منٹ انتظار کر لے تو اسے ثبوت پیش کر دیا جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد نقوی ہاؤس کی ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی تو پانڈے نے عاشی سے کہا کہ وہ گیٹ پر جائے اور آنے والا اسے جو پارسل دے، اسے وصول کر کے واپس آ جائے۔ عاشی اس کی ہدایت پر گیٹ تک گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک مسلح شخص گیٹ کے اندرونی جانب موجود ہے۔ یقینی طور پر وہ شخص آنے والے پارسل کو خود بھی وصول کر سکتا تھا لیکن عاشی کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے پوری طرح اندازہ ہو جائے کہ ان کا گھر مکمل طور پر ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔

عاشی ہیلمٹ پہنے موٹر سائیکل سوار سے پارسل وصول کر کے واپس پلٹی تو اسے ایک دیوار کی جڑ میں پڑے چوکیدار کی پشت نظر آئی۔ اس کے سر اور گردن پر بہہ کر جم جانے والا خون نظر آ رہا تھا۔ عاشی کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ مر چکا ہے یا صرف بے ہوش ہے۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ پارسل لے کر اندر آئی اور اسے پانڈے کے حوالے کر دیا۔

پانڈے نے اس پارسل کو کھولا تو اس میں سے ایک فون برآمد ہوا۔ یہ جدید ساخت کا کیمرے والا موبائل تھا۔ پانڈے نے مسز نقوی اور عاشی کو قریب بلایا اور موبائل کے چند بٹن دباتے ہوئے انہیں اس کی اسکرین کی طرف دیکھنے کی ہدایت کی۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو سب سے پہلے انہیں شعیب کے اسکول کی عمارت نظر آئی۔ پھر اس عمارت کا گیٹ کھلا اور بچے باہر آنے لگے۔ یہ وہ بچے تھے جن کے گھر سے کوئی انہیں لینے آتا تھا اور گیٹ پر موجود چوکیدار آنے والے کو پہچاننے کے بعد بچے کو گیٹ سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر چند ماہ پہلے ہی یہ احتیاط برتنی شروع کی تھی۔ اسکول وین سے واپس گھر جانے والے بچوں کو بھی پوری احتیاط کے ساتھ ان کے گھر تک چھوڑا جاتا تھا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر آیا کہ ان کے ڈرائیور نے چوکیدار کو اسکول کی طرف سے جاری کردہ پاس دکھایا تو اس نے اندر سے شوبی کو بلا کر ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔

ڈرائیور، شوبی کا بیگ ایک ہاتھ میں اٹھا کر اور دوسرے سے اس کی انگلی تھام کر گاڑی تک آیا اور شو
پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسکرین پر حرکت کرتی ہوئی گاڑی کی
سائیڈ نظر آئی۔ اس کے بعد جب گاڑی دوبارہ اسکرین پر ظاہر ہوئی تو اس کا فرنٹ ویو نظر آ رہا تھا۔ اس کے
جانے کیا ہوا کہ حرکت کرتی ہوئی گاڑی بری طرح لہرائی اور پھر رک گئی۔ ڈرائیور صورتِ حال جاننے کے
نیچے اُترا تو اگلے ہی لمحے جھٹکا کھا کر نیچے گر پڑا۔ اس کی پیشانی پر بننے والے سوراخ سے خارج ہوتے لہو
واضح کر دیا کہ وہ کسی قاتل گولی کا نشانہ بنا ہے۔ ڈرائیور کے نیچے گرتے ہی دو نقاب پوش منظر میں شامل ہو
اور پچھلی سیٹ پر حیران پریشان بیٹھے شوبی کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ یہ آخری منظر تھا جو مسز نقوی اور عاشی
موبائل کی اسکرین پر دیکھا تھا اور اس کے بعد انہیں مزید کسی ثبوت کو مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ بے چون و چرا ان لوگوں کا ہر حکم مان رہی تھیں۔ پانڈے کے حکم کے مطابق
نے ڈاکٹر نقوی کو فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کال سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شعیب کے اغوا کا سبب یہ تھا
وہ لوگ ڈاکٹر نقوی سے اپنا مطالبہ منوا سکیں اور ان کا مطالبہ تھا کہ اسپیشل روم میں موجود مریض ورما کو کسی بہا
نیچے گراؤنڈ فلور تک بھیج دیں۔

ڈاکٹر نقوی کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہسپتال کی لیبارٹری گراؤنڈ فلور پر تھی اس لیے ورما کو
ٹیسٹ کے بہانے آسانی سے وہاں تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ نواسے کی سلامتی کی خاطر ڈاکٹر نقوی نے یہ مطالبہ
تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے، معاملہ مریض کو گراؤنڈ فلور تک پہنچانے تک تو محدود نہیں رہتا۔ اس سار
کھٹ راگ کے پیچھے ان لوگوں کا کوئی تو ایسا مقصد تھا جو یقینی طور پر اتنا خاص تھا کہ وہ یوں منظم انداز میں متحرک
ہو گئے تھے۔ عاشی کو ان لوگوں کے مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ بس اتنا چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا صحیح سلامت
گھر واپس آ جائے اور اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کی ہر بات مانتی جا رہی تھی۔

اس وقت بھی اس نے بے پناہ اعصابی دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود بڑی محنت اور توجہ سے کافی اور
سینڈوچز تیار کیے اور ٹرالی میں سب چیزیں رکھ کر لیونگ روم تک پہنچ گئی۔ وہاں موجود لوگ اسی پوزیشن میں
موجود تھے جس میں وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اُس نے ٹرالی پانڈے کے قریب لے جا کر روکی اور خود بھی اپنی
سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔ پانڈے نے ایک نظر ٹرالی پر ڈالی اور اپنے موبائل پر مصروف ہو گیا۔

''ہاں جی تھری! کیا پوزیشن ہے؟'' وہ کسی کو کوڈ نیم سے پکارتے ہوئے اس سے رپورٹ لے رہا تھا۔

''ایک ایک لڑکے کو اپنی نظر میں رکھنا۔ سب کا وہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ اگر کوئی نکلنے میں ناکام رہے
تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟'' دوسری طرف کا جواب سن کر نئی ہدایات دیتے ہوئے پانڈے کا لہجہ
بے حد سرد تھا۔

''کیا کہا..... ورما صاحب کو نیچے لایا جا رہا ہے؟ تمہارے کمانڈوز ایکشن میں آنے کے لیے بالکل
تیار ہیں؟'' بات کرتے کرتے پانڈے کا لہجہ جوشیلا ہو گیا اور اس نے ٹرالی میں سے کافی کا کپ اٹھا کر ایک
گھونٹ بھرا۔

''زبردست!'' گھونٹ بھرتے ہی اس کی زبان سے ستائشی لہجے میں یہ لفظ نکلا۔ لیکن سننے والوں کے لیے
سمجھنا مشکل تھا کہ یہ ستائش کافی کے لیے تھی یا دوسری طرف سے ملنے والی کسی خبر کا ردِ عمل۔

⊛----✪----⊛



ورما کو لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر لے جانے والوں میں ہسپتال کے عملے کے علاوہ اس کی سکیورٹی پر
اہلکار بھی شامل تھے۔ یہ اہلکار مسلح تھے اور ان کی نگاہیں تیزی سے گردش کرتی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔
اہلی حیثیت کی وجہ سے اس کے ساتھ ہسپتال میں بھی ترجیحی سلوک کیا جا رہا تھا اور جن ٹیسٹوں کے لیے ممکن
اس سے متعلق مشینری اس کے کمرے میں ہی لے جا کر ٹیسٹ کر لیے جاتے تھے۔ اب تک اسے صرف
اسکیننگ کے لیے لیب تک لے جایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک ایسی ضرب لگی تھی جس نے اس کی
کو کافی متاثر کیا تھا۔ اسی چوٹ کے بارے میں جاننے کے لیے وہ ٹیسٹ کروایا گیا تھا اور اب بھی ڈاکٹر
نے اسی چوٹ کا بہانہ بنا کر اسے ری اسکیننگ کے لیے بھیجا تھا۔

ورما کو لانے والی لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچی تو اس کا اسٹریچر لفٹ سے باہر لانے سے پہلے سکیورٹی پر مامور
اہلکار باہر نکلے اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ طویل کوریڈور میں دائیں جانب وہ لیبارٹری تھی جہاں ورما کو لے جایا
تھا۔ کوریڈور کا یہ حصہ بالکل سنسان پڑا تھا جبکہ بائیں جانب استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر قطار
کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کرسیاں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھیں کہ ہسپتال میں آنے والے افراد جو
استقبالیہ کاؤنٹر سے کوئی انفارمیشن حاصل کرنا چاہتے ہوں، کاؤنٹر پر رش لگانے کے بجائے وہاں بیٹھ کر انتظار
اور اپنی باری آنے پر کاؤنٹر تک جائیں۔ ہسپتال میں موجود سکیورٹی کا عملہ اس بات پر سختی سے عمل کرواتا
اس وقت بھی کاؤنٹر پر موجود استقبالیہ کلرک کے دائیں جانب نیلی وردی میں ایک سکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔

سادہ لباس میں ورما کی سکیورٹی پر موجود دونوں اہلکاروں کی نظریں کوریڈور کے بائیں جانب ہی کا جائزہ
لے رہی تھیں۔ یہاں سے ہسپتال کی مرکزی عمارت کا دروازہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے پر بھی دو
وردی سکیورٹی گارڈز موجود تھے جو آنے جانے والوں کو سرسری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ گارڈز ہسپتال
آنے والوں کی تلاشی وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا کام صرف ان پر نظر رکھنا اور کسی شخص کے مشکوک ہونے پر
سے پوچھ گچھ کرنا تھا۔ یا ان افراد میں سے اگر کوئی کسی قسم کی ڈسٹربنس پیدا کرتا تھا، تب یہ سکیورٹی گارڈز
میں آتے تھے۔

ورما کی سکیورٹی پر مامور اہلکاروں نے ماحول میں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں کیا تو ہسپتال کے عملے کے
کو ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ جس وقت اسٹریچر لفٹ سے باہر لایا جا رہا تھا،
پر بیٹھے افراد میں سے ایک نوعمر لڑکا اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔
نوعیت کی عام سی فائل تھی جسے لوگ عموماً کسی قسم کا ریکارڈ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لڑکے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے سادہ لباس سکیورٹی اہلکاروں کو غور سے دیکھا۔
اہلکاروں میں سے ایک کی نظروں نے اس کا یہ دیکھنا محسوس کر لیا اور الرٹ ہو گیا۔ لیکن لڑکے نے ایک نظر ڈالنے
کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنے ہاتھ میں موجود فائل وہاں رکھ دی اور استقبالیہ
کلرک سے کچھ پوچھنے لگا۔ اُس کی اس بے نیازی نے سکیورٹی اہلکار کو مطمئن کر دیا۔ لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔
استقبالیہ کلرک سے بات کرتے ہوئے لڑکے نے اچانک ہی فائل کھولی اور درمیان میں رکھا ہوا پسٹل باہر نکال
اس کے پسٹل نکالتے ہی کرسیوں پر بیٹھے افراد میں سے ایک فرد اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیض کے
بندھی بیلٹ سے ریوالور کھینچ کر نکال لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر نکال کر کوریڈور
دائیں جانب موڑا جا رہا تھا۔ دونوں مسلح لڑکوں کے ہتھیاروں نے بیک وقت شعلے اُگل کر سکیورٹی اہلکاروں کو
بنایا۔ عین اسی وقت دو ڈھاٹا پوش مرکزی دروازے پر موجود سکیورٹی گارڈز کو اپنی کلاشنکوفوں سے بھونتے

ہوئے اندر داخل ہوئے اور بھاگتے ہوئے کوریڈور کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں ورما کا اسٹریچر موجود
ان کی کلاشنکوفوں نے اس بار استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب کھڑے سکیورٹی گارڈ کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ
موجود کلرک کو بھی چاٹ لیا۔

کوریڈور میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور عام افراد میں سے بھی کئی لوگ بے تحاشا چلتی گولیوں کی زد
گئے۔ گولیاں چلانے والوں نے البتہ اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ کوئی گولی ورما کی طرف رخ نہ کر
ورما کی سکیورٹی پر موجود اہلکاروں میں سے ایک اہلکار کو لگنے والی گولی جان لیوا ثابت نہیں ہوئی تھی اور اس
جوابی فائر کر کے خود کو زخمی کرنے والے نوجوان کو نشانہ بنالیا تھا۔ اس کی چلائی گئی گولی نوجوان کے پیٹ
تھی اور وہ کوریڈور کے فرش پر گرا تڑپ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اس کا یہ حال دیکھا اور اسے فرار کے
پا کر ایک گولی اس کے بھیجے میں اُتار دی۔ تڑپتا ہوا نوجوان فوراً ہی ساکت ہو گیا۔ باقی حملہ آوروں
طرف دھیان دیئے بغیر اپنی کارروائی جاری رکھی۔

بچ جانے والا سکیورٹی اہلکار پوری کوشش کر رہا تھا کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے لیکن وہ اکیلا کب
ان کے مقابل ٹھہر سکتا تھا۔ سینے پر گولی کھا کر گرتے ہوئے اس کی یہ اُمید بھی دم توڑ چکی تھی کہ فائرنگ کی
سن کر باہر کہیں پولیس موبائل میں موجود افراد حرکت میں آئیں گے تو ان حملہ آوروں کا راستہ روک لیں
مرتے مرتے اس کے کانوں نے بیرونی حصے سے آتی فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر
لگتا تھا کہ دو مسلح گروپ آپس میں متصادم ہو گئے ہوں..... یعنی ہسپتال پر کیا جانے والا حملہ بے حد منظم تھا۔

سادہ لباس سکیورٹی اہلکار کے دم توڑتے ہی ایک حملہ آور بھاگ کر اسٹریچر تک پہنچا۔ فائرنگ کا
شروع ہوتے ہی ورما اسٹریچر سے اُتر گیا اور اسٹریچر کو کھینچ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے ایک دیوار سے
لی۔ یہ حکمتِ عملی اس نے خود کو فائرنگ کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے اختیار کی تھی۔ جب کوریڈور
پہلا فائر ہوا تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے۔ لیکن پھر حملہ آوروں کے انداز
بھانپ گیا کہ آنے والے اس کے لیے آئے ہیں۔ خود کو دی جانے والی اسپیشل ٹریٹ منٹ کی وجہ سے اس
زخم تیزی سے مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ بہت زیادہ بھاگ دوڑ کر
چنانچہ اسٹریچر کی آڑ میں دبک کر بیٹھا رہا۔ سکیورٹی اہلکاروں کے مارے جانے کے بعد جب ایک کلاشنکوف
بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''یہاں سے نکلیں سر!'' کلاشنکوف بردار نے پکارنے کے ساتھ ہی سہارا بھی دیا۔ ورما نے بڑی
مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا لیکن فوراً ہی اس کے پیٹ میں درد کی لہریں اُٹھنی شروع ہو گئیں۔
کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کلاشنکوف بردار نے اسے اپنے کندھے پر ڈالا اور دوڑ پڑا۔ وہ لحیم شحیم اور طاقتور آدمی
چنانچہ اسے ورما کو اٹھا کر بھاگنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ منصوبہ سازوں نے اسے یہ ذمہ
سونپی بھی اس لیے تھی۔ وہ اپنے سورسز استعمال کر کے یہ جاننے میں کامیاب تو ہو گئے تھے کہ ورما اب روپوش
ہے اور اسے ہسپتال سے نکال لے جانے میں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ لیکن انہوں نے ساتھ
اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ اگر ورما کو نقل و حرکت میں دشواری پیش آئے تو فوری طور پر اس مسئلے کا تدارک
کیا جا سکے۔ ان کی یہ دور اندیشی اس وقت کام آ رہی تھی۔ لحیم شحیم آدمی ورما کو کاندھے پر ڈال باہر کی طرف
جا رہا تھا جبکہ اس کے مسلح ساتھی انہیں کور دینے کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ لوگ دروازے سے باہر نکلے تو
سے اسٹارٹ ایک گاڑی کھلے دروازوں کے ساتھ ان کی منتظر تھی۔ ورما کو اس گاڑی میں منتقل کرتے ہی



فوراً میں آ گئی اور گولی کی طرح ہسپتال کے احاطے سے نکلتی چلی گئی۔

گاڑی کے نکلتے ہی فائرنگ کا سلسلہ بھی زور توڑنے لگا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد پانڈے
کے ماتحت بہت تیزی سے وہاں سے فرار ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے فرار کا طریق کار بھی پہلے سے طے کر
رکھا تھا، چنانچہ جب تک پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں ہسپتال کے سامنے پہنچیں، وہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے
تھے۔ انہوں نے اس ساری کارروائی کے دوران جدید اسلحے کے ساتھ ساتھ بہترین گاڑیاں اور جدید مواصلاتی
آلات بھی استعمال کیے تھے اور ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں رہے تھے۔ راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بھی
انہوں نے مرکزی شاہراہوں کے بجائے ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا استعمال کیا تھا اور اس طرح منتشر ہو گئے تھے
کہ کسی کو ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ورما کو لے جانے والی گاڑی بھی ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ہی ہسپتال کے سامنے والی شاہراہ کو چھوڑ کر ایک
ذیلی سڑک پر مڑی اور پھر وہاں سے ایک گلی میں گھس گئی۔ یہاں ایک گاڑی پہلے سے منتظر کھڑی تھی۔ ہسپتال
سے فرار کے لیے استعمال کی جانے والی گاڑی کو چھوڑ کر وہ لوگ اس گاڑی میں منتقل ہو گئے۔ شہر میں جابجا
نصب کیمروں نے اگر پہلے والی گاڑی کی فلم بنائی بھی تھی تو وہ اس پتلی سی گلی میں اس گاڑی سے نجات حاصل کر
چکے تھے اور یہاں بہرحال ایسا کوئی کیمرہ موجود ہونے کا امکان نہیں تھا جو اس سارے منظر کو قید کر سکتا۔ ورما کو
لے جانے والی یہ دوسری گاڑی گلی چھوڑ کر باہر نکلی تو لحیم شحیم آدمی نے پانڈے سے رابطہ کیا۔

''مشن کامیاب رہا سر!..... ورما سر میرے ساتھ ہیں اور ہم پوائنٹ فور کی طرف جا رہے ہیں۔''

''بہت خوب!'' اس اطلاع کو سن کر پانڈے نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اسے داد دی اور پھر اگلے ہی
لمحے تحکمانہ سرد مہری سے بولا۔ ''ڈاکٹر نقوی کے نواسے کو اس کے گھر پہنچا دو۔ ہم نے اسے وچن دیا تھا کہ اسے
اس کا نواسا ضرور ملے گا۔''

''او کے سر!'' حکم کے غلام نے تابعداری سے جواب دیا اور اس حکم پر عمل کروانے کے لیے اپنے ہی جیسے
ایک دوسرے غلام سے رابطہ کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

''آپ نے ورما کو ٹیسٹ کے لیے نیچے لیبارٹری میں کیوں بھجوایا تھا ڈاکٹر نقوی؟'' تفتیشی افسر نے اندر
تک اُتر جانے والی نظروں سے ڈاکٹر نقوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس کے پیٹ پر لگنے والی ضرب سے متاثر ہونے والی آنتوں کی موجودہ کنڈیشن جاننا چاہتا تھا
تاکہ ری اسکیننگ کے ذریعے دواؤں کے اثرات کا جائزہ لے سکوں۔'' ڈاکٹر نقوی نے ذرا تفصیل سے جواب
دیتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ گھنٹہ بھر قبل جو واقعہ پیش آیا تھا، اس نے اسے ہلا کر
رکھ دیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق راؤنڈ مکمل کر کے اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر
رہا تھا جب اسے گراؤنڈ فلور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں کو سن کر اسے احساس ہوا کہ جس
مقصد کے تحت شوبی کو اغوا کر کے اسے استعمال کیا گیا ہے، اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ اپنے اندر طاری
ہو جانے والے سناٹے کے باوجود وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اس سے اوروں کی
طرح قطعی انجان ہے، اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارے ہسپتال میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ خوف زدہ بھی تھے اور حیران بھی کہ یہ سب کیا ہو رہا

ہے؟ کئی افراد نے پولیس کے ایمرجنسی نمبرز پر مدد کے لیے کال بھی کر دی تھی۔ چند منٹوں کی فائرنگ میں لوگوں میں بے پناہ خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ڈاکٹر نقوی بھی زرد پڑتے چہرے کے ساتھ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب اس واقعے کی تحقیقات ہوں گی تو وہ بھی تفتیش کی زد میں آئے گا لیکن وہ کیا کرتا۔ نواسے کی محبت نے اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے حکم دینے والوں نے اسے مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ کچھ غور و خوض کر سکتا۔ لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں نے ہسپتال کا گھیراؤ کرنے کے بعد باہر جانے کے سارے راستے بند کر دیئے اور پابندی عائد کر دی کہ ان کی طرف سے اجازت ملنے سے قبل کوئی شخص ہسپتال کی عمارت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ پولیس کی کارروائی شروع ہوئی تو پہلے مرحلے میں زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے ساتھ مرنے والوں کی گنتی اور ان کی شناخت کا کام ہونے لگا۔ ہسپتال کے عملے کو خوف زدہ ہونے کے باوجود حرکت میں آنا پڑا۔ زخمیوں کی زندگی بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں ڈاکٹر نقوی بھی شامل تھا۔

اس واقعے میں استقبالیہ کلرک اور سکیورٹی گارڈز کے علاوہ ہسپتال کی عمارت میں موجود پانچ عام شہریوں کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ زخمی افراد کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ڈاکٹر نقوی ان سب کی اموات اور تکالیف کا بوجھ اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے ضمیر کے لیے بھی بوجھ تھا اور اس کی نیک نامی کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پوری طرح شک کی زد میں تھا، اس حقیقت کا ادراک اسے تفتیشی افسر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بخوبی ہو رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوا ڈاکٹر نقوی! کہ حملہ آوروں نے ٹھیک اس وقت ایکشن لیا جب ورما کو اسکیننگ کے لیے لیبارٹری کی طرف لے جایا جا رہا تھا؟'' اس کی وضاحت کو خاطر میں لائے بغیر تفتیشی افسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

''اسے ایک اتفاق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟'' ڈاکٹر نقوی نے اس سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''اتفاق.....'' تفتیشی افسر نے طنز بھرے لہجے میں یہ لفظ ادا کیا اور پھر سرد مہری سے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں ڈاکٹر نقوی! کہ اس ایک اتفاق کی وجہ سے کتنا بڑا مجرم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے..... کتنے بے قصور لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں؟'' اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر نقوی نے خاموشی اختیار کر لی۔

''خاموش رہنے سے آپ کی جان نہیں چھوٹے گی ڈاکٹر! آپ کو بتانا ہو گا کہ آپ نے حملہ آوروں کا ساتھ کیوں دیا؟ آپ ان کے ساتھی ہیں یا پھر انہوں نے کسی طریقے سے آپ کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا؟'' تفتیشی افسر اسے کسی طور بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ذرا سی دیر کی تحقیق میں ہی اس کے سامنے یہ بات آ گئی تھی کہ ورما کو ڈاکٹر نقوی کے حکم پر نیچے بھجوایا گیا تھا اور اس کے نیچے پہنچتے ہی وہاں کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کی ذات کو شک سے کس طرح بری سمجھا جا سکتا تھا؟ ایک نہایت قابل اور معزز ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اس وقت سب سے زیادہ مشکوک فرد شمار ہو رہا تھا۔

''آپ مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں آفیسر! میں ایک باعزت ڈاکٹر ہوں اور آپ مجھ سے کسی مجرم کا سا سلوک نہیں کر سکتے۔'' تفتیشی افسر سے یہ سب کہتے ہوئے اس نے چاہا تھا کہ اپنا لہجہ تیز رکھے لیکن اندر موجود



[illegible] نے اسے اس خواہش میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

''آپ بے قصور ثابت ہو گئے تو میں آپ سے اپنے رویے کی معذرت کر لوں گا لیکن آپ کو فی الحال تو [illegible] کی وضاحت کرنی ہو گی کہ عین اس وقت جبکہ آپ نے مجرم کو اسکین کے لیے نیچے بھجوایا، اس کے [illegible] نے اسے فرار کروانے کے لیے اتنا منظم حملہ کیوں کیا؟'' تفتیشی افسر کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ [illegible] نقوی کو سمجھ نہیں آیا کہ ایسا کیا کہے جو اس افسر کو مطمئن کر سکے۔ وہ اسے کوئی جواب دیتا، اس سے قبل ہی [illegible] موبائل کی رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ یہ رنگ ٹون اس کے موبائل کی تھی جو اس وقت تفتیشی افسر کے قبضے [illegible] تھا۔ اس نے موبائل اسکرین پر آنے والا نام دیکھا اور ریسیور کا بٹن پُش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اسپیکر [illegible] آن کر کے بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر نقوی نے بھی اس کے [illegible] عمل کرنے سے پہلے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھا۔ یہ اُس کی بیوی کی کال تھی۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع [illegible] سے قبل وہ کئی بار گھر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب اُس کی بیوی [illegible] آیا بھی تھا تو ایسے وقت جب وہ اپنے گھر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بہت بے چین ہونے کے [illegible] اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بات کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس بند کمرے میں موجود تفتیشی افسر [illegible] اس کے پیچھے کھڑے مسلح اہلکار کی نظریں اس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''ہیلو طاہرہ! کہو کیسے فون کیا ہے؟ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔'' اس نے اپنی سی کوشش کی کہ کسی [illegible] بیوی کو کچھ ایسا بولنے سے روک سکے جو اس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے گی لیکن دوسری طرف وہ [illegible] کی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

''شوبی گھر واپس آ گیا ہے نقوی۔'' اس نے رُندھی ہوئی آواز میں اطلاع دی تو نواسے کی واپسی کا سن کر [illegible] میں اطمینان محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی کو اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

''شاید خوشی کی شدت نے طاہرہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی پیدا کر دی ہے۔ بہت زیادہ خوشی بھی تو بعض [illegible] انسان کو رُلا ڈالتی ہے۔'' اس نے خود ہی ایک جواز تراش لیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بولا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے طاہرہ! اس سے کہنا سوئے نہیں۔ میں گھر واپس آتے ہوئے اس کے پسندیدہ [illegible] سے پیزا لیتا آؤں گا۔'' اس نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے ایک بہت ہی حساس معاملے کو [illegible] انداز میں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹیلی فونک گفتگو سے شوبی کے اغوا کا معاملہ تفتیشی [illegible] کے علم میں آ سکے۔

''شوبی ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے نقوی! اب وہ کبھی آپ کا لایا ہوا پیزا نہیں کھا سکے گا۔'' وہ بلک بلک کر [illegible] لگی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو طاہرہ؟'' ڈاکٹر نقوی حلق کے بل دھاڑا۔ بیوی کی بات کا جو مفہوم سمجھ آ رہا تھا، وہ [illegible] سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جذبات کی شدت نے اسے ساری مصلحت پسندی بھی بھلا دی تھی اور وہ تفتیشی [illegible] کی موجودگی کو فراموش کر کے اصل صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ ظالم، شوبی کی لاش گھر کے سامنے پھینک کر چلے گئے ہیں۔ عاشی کی حالت [illegible] خراب ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ آپ فوراً گھر واپس آ جائیں نقوی! میں اکیلی سب کچھ نہیں [illegible] سکتی۔'' وہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی تو گویا ہر صدا سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ جسے [illegible] کے لیے وہ اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھا تھا، وہ انہیں اس حال میں لوٹایا گیا تھا کہ اس کے وجود میں زندگی کی

رمق نہیں رہی تھی۔ یہ کیسا ایفائے عہد تھا؟ یہ کیسی سودے بازی تھی؟ یہ کیسا ظلم تھا؟ اپنے ذہن میں اُبھرے احتجاجی سوالوں کا جواب ملنے سے قبل ہی اُس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے سامنے کی طرف جھکتا چلا گیا۔

⊛----✪----⊛

''بہت خوب پانڈے! تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے تمہیں خصوصی انعام دینا چاہئے۔ میں اوپر بات کروں گا۔ تم دیکھنا، تمہارے فارن اکاؤنٹ میں جلد ہی ایک بڑی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔'' تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز ورما نے شیمپین سے بھرا جام ہونٹوں سے جدا کرتے ہوئے پانڈے کو سراہا۔ ہسپتال سے فرار ہو کر ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ورما کا ایک قابل ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا گیا تھا۔ ڈاکٹر انہی کا آدمی تھا اور اکثر اس طرح کی خدمات انجام دیتا رہتا تھا۔ اس نے چیک اپ کے بعد یہ تسلی دے دی تھی کہ ورما کا کوئی بھی زخم اتنا خطرناک نہیں رہا ہے اور وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔ لیکن کچھ دن اسے مکمل آرام کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے پیشِ نظر ورما اس وقت بستر پر نظر آ رہا تھا اور بستر ہی پر دراز اپنی آزادی کا جشن منانے کے لیے شراب نوشی کر رہا تھا۔

''آپ کی مہربانی ہے سر! ورنہ میں نے تو اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔'' عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانڈے کا خوشی سے تمتماتا چہرہ بتا رہا تھا کہ ملنے والے انعام کی نوید ہی دراصل اس کی محنت کا اصل ثمر ہے۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم ڈیوٹی کو یاد رکھتے ہو۔ ویسے بھی حالات بتا رہے ہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے خاصا سخت ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں کی انٹیلی جنس کے ہاتھ میں بہت سی معلومات آ گئی ہیں۔ اب ان کے لیے ہمارے سیٹ اپ کو سمجھنا مشکل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں مزید ہاتھ پیر بچا کر کام کرنا ہوگا اور کوئی نیا سیٹ اپ تیار کرنا ہوگا۔ اپنے سارے آدمیوں سے کہہ دو کہ پوری طرح چوکنا رہیں۔'' سنجیدگی سے بولتے ورما کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں لہراتی نظر آ رہی تھیں۔

''آپ چنتا نہ کریں سر! میں پہلے ہی سب کو ہدایت دے چکا ہوں۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی کہ جس وقت آپ کو اریسٹ کیا گیا، ہمیں فوراً پتہ لگ گیا۔ جگدیش آپ کے بلانے پر ہی آپ کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ اس نے پولیس موبائل وغیرہ نظر آئیں تو چونک گیا اور پھر اس نے فوراً ہی معلوم کر لیا کہ پولیس نے آپ کے اپارٹمنٹ پر ریڈ کیا ہے۔ اسی نے مجھے انفارم کیا اور میں نے فوراً اپنے سارے بندوں کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کو کہہ دیا۔ ڈولی کو نہیں بچا سکے۔ ہمارے ہوشیار کرنے سے پہلے ہی پولیس اسے اریسٹ کر چکی تھی۔ اس کو چھڑانے کے لیے ہم اب بھی کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ میری ساری توجہ آپ کی طرف تھی۔ بڑی مشکل سے معلوم ہو سکا کہ آپ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پلان کر کے آپ کو ہسپتال سے نکلوایا۔'' تفصیل سے ورما کو بتانے لگا۔

''ڈاکٹر نقوی کی فیملی میں سے کوئی فرد تم لوگوں کو پہچان تو نہیں لے گا؟..... اس کے نواسے کی عمر کیا ہے؟ کہیں یہ نہ ہو کہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جس کی مدد سے ہمارا کوئی سراغ لگایا جا سکے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا سر! ہم لوگ بالکل بدلے حلیوں میں ڈاکٹر نقوی کے گھر گئے تھے۔ رہی اس کے نواسے کی بات تو اسے ہم نے واپس ضرور بھیجا ہے لیکن مُردہ حالت میں۔ ہم نے ڈاکٹر نقوی کو اس کا نواسا پہنچانے کا وچن دیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے زندہ بھی دیکھ سکے گا۔'' پانڈے کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ



اب سن کر ورما بھی مطمئن ہو گیا اور نہایت طمانیت سے بولا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ رہا ڈولی کے گرفتار ہونے کا مسئلہ تو اسے چھوڑ دو۔ ڈولی سے انٹیلی جنس والے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کر سکیں گے کہ ہم پہلے ہی جان گئے ہیں۔ ڈولی اب ہمارے لیے ایک ناکارہ پُرزہ ہے۔ اس کا متبادل جلد مل جائے گا۔ جو ہو گیا، اسے بھول کر اب نئی پلاننگ کرنی ہوگی اور اس پلاننگ میں شہریار ہماری ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر ہوگا۔''

''کون شہریار؟..... کیا وہی جو سجاد رانا کا کزن ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ پر کام کر رہا ہے؟'' پانڈے نے چونکا۔

''ہاں وہی۔ اس کی وجہ سے پہلے بھی ہم کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ تمہارے اللہ آباد کے مدرسے والا معاملہ اب بھی اسی کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ اگر وہ اتنی ایکٹویٹی نہیں دکھاتا تو تم آرام سے شاہنواز کے روپ میں اپنے مشن پر کام کرتے رہتے۔ اس کی وجہ سے پیر آباد کے مدرسے پر سے بھی ہمارا کنٹرول ختم ہوا اور اللہ آباد میں لگایا گیا سرمایہ بھی ڈوب گیا۔ مجھے پھنسوانے والا بھی وہی تھا۔'' ورما، پانڈے کو بتانے لگا کہ کس طرح شہریار اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور اس کی گرفتاری کا سبب بنا۔

''وہ بالکل بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اگر وہ سجاد رانا کی بیٹی والے معاملے پر بات نہ کرتا تو میں بہت مشکل سے اسے پہچان پاتا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ میں اسے غور سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ماہ بانو نامی وہی لڑکی تھی جس کو پیر آباد کا چودھری ایک عرصے تک تلاش کرتا رہا ہے۔''

''اسے تلاش کیا جا سکتا ہے سر!..... اور شہریار تو ہے ہی ہمارے سامنے۔ آپ بس حکم دیں کہ کب اس کا کام تمام کرنا ہے۔'' ورما کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر پانڈے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ورما اس سے بہت خوش تھا اس لیے اسے اس کی چاپلوسی کرنی پڑ رہی تھی لیکن دل ہی دل میں وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے، اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اس طرح اوپر والوں کے سامنے پیش کرے گا کہ وہ ورما کے ناکارہ ہونے پر اس کو بٹھا دیں گے۔

''ہم گولی سے شہریار کا کام تمام نہیں کریں گے۔ ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر میں نے اس کے بارے میں کچھ سوچا تھا اور میں بہت کچھ طے بھی کر چکا ہوں۔ اب بس اس پر عمل ہونا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔'' ورما کی آنکھوں میں جیسے کوئی شیطانی خواب کروٹیں لے رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آخر یہ ہوا کیسے؟..... کیا تم نے ٹھیکیدار پر چیک نہیں رکھا تھا؟'' شہریار نے اپنے سامنے نظریں جمائے بیٹھے عبدالمنان سے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''سوری سر! میں بس اعتبار کر کے مار کھا گیا۔ ٹھیکیدار سے میری برسوں کی علیک سلیک ہے۔ کئی بار میں نے اس سے چھوٹے موٹے کام بھی کروائے، کبھی اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ اس اعتماد کی وجہ سے ہی میں نے اسے اپنے پروجیکٹ میں شامل کیا تھا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کر گزرے گا۔ وہ تو پیر آباد کے چودھری صاحب کو ہی کچھ شک گزرا تو انہوں نے میری توجہ اس طرف دلوائی اور میں نے چیک کیا تو دال کافی گھپلا تھا۔ میں شرمندہ ہوں لیکن یہ معاملہ آپ کے سامنے لائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔'' عبدالمنان

ے الفاظ اور تاثرات دونوں سے گہری شرمندگی جھلک رہی تھی۔ نور پور میں اسکول اور ہسپتال کی تعمیر
پروجیکٹ جاری تھا، اس کے سلسلے میں ٹھیکیدار کی بدعنوانی کے سامنے آنے کے بعد وہی سب سے زیادہ ذ
بھی ٹھہرتا تھا۔

''صرف شرمندہ ہونے سے کام نہیں چل سکتا عبدالمنان! ان پروجیکٹس پر جو رقم خرچ ہو رہی ہے
ہمارے پاس امانت ہے۔ سیٹھ موتی والا مرحوم نے اپنی جائیداد اگر ہمارے حوالے کی تھی تو صرف اس لیے
سمجھتے تھے کہ ہم اس بات کے اہل ہیں کہ امانت کا حق ادا کر سکتے ہیں اور ان کی رقم اسی طرح خرچ ہو گی
طرح وہ چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنے فرض کی ادائیگی میں جو غفلت کی ہے، وہ ایک مرے ہوئے انسان کے
کو دھوکا دینے کے زمرے میں ہی آتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر! اور تلافی کی جو بھی صورت نکلے، اس کے لیے تیار ہوں۔'' اس کی بات
عبدالمنان کی شرمندگی اور بھی گہری ہو گئی اور وہ پورے خلوص سے بولا۔

''میں تنہا تمہیں ہی ذمے دار نہیں ٹھہرا رہا ہوں غلطی شاید میری بھی ہے۔ میں اس معاملے کو کلی
تمہارے حوالے کرنے کے بجائے اگر خود بھی مسلسل رابطے میں رہتا تو یہ صورتِ حال پیش نہیں آ
بہر حال جو ہوا سو ہوا، اب پہلا کام یہ کرنا ہو گا کہ ٹھیکیدار کو گرفتار کیا جائے اور پھر اس سے ہضم کی گئی
رقم نکلوائی جائے۔ اس کے بعد چھان پھٹک کر کسی دوسرے آدمی کو یہ ذمے داری سونپی جائے گی۔ اس سا
عمل سے گزرتے ہوئے جو وقت برباد ہو گا، اس کا البتہ کوئی حل نہیں اور اس کے لیے بہر حال ہمیں ہمیشہ شر
رہنا ہو گا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!'' عبدالمنان نے اس کی تائید کی پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
''میں ڈی ایس پی منظور کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔ ٹھیکیدار کی گرفتاری کا کام وہ اپنی نگرانی میں کروا دے گا۔''
نے سامنے رکھے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور اٹھانے سے قبل ہی فون بج اُٹھا۔ عبدالمنان نے
ریسیو کی اور لحہ بہ لحہ گہری ہوتی سنجیدگی کے ساتھ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے
سوالات بھی کیے جنہیں سن کر شہریار نے اندازہ لگایا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا ہے۔ عبدالمنان نے
مکمل کر کے فون رکھا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''بری خبر ہے سر! تانگے والے اُلّو کی جنگل سے لاش مل ہے۔ لاش کی حالت بہت خراب ہے اور
طور پر تو یہی لگتا ہے کہ اسے جانوروں نے چیر پھاڑ کر مار ڈالا ہو۔ ایک ہاتھ تو سرے سے غائب ہے۔ شا
طاقتور جانور نے اس کے جسم سے اکھاڑ دیا ہے۔ حتمی نتیجہ بہر حال پوسٹ مارٹم کے بعد ہی نکل سکے گا۔'' ا
دوسری طرف سے ملنے والی رپورٹ اختصار کے ساتھ بیان کی۔

''مجھے اس معاملے میں گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ اُلّو کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ اپنی منگیا
کی موت کا ذمے دار چودھری کو سمجھتا تھا اور اس کے خلاف ہمارا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تیار تھ
حالات میں یہ بھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش رکھنے کے لیے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔
بھی چودھری نے جنگل کو اپنی جاگیر سمجھ کر اپنے مخالفین کے لیے مقتل گاہ بنا ڈالا ہے۔ کتنی لاشیں ہیں جو ا
جنگل سے دریافت ہوئی ہیں اور یہ سارے وہ لوگ تھے جن سے چودھری کا کچھ نہ کچھ اختلاف تھا۔''

اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے شہریار کے لہجے میں غصے کی لہر در آئی تھی۔ ٹھیکیدار کی بدعنوانی
معاملے نے یوں بھی مزاج مکدر کر رکھا تھا، یہ ایک اور بری خبر سنی تو خود بہ خود ہی غصے میں اضافے کا س



ایسے میں اس کے ذاتی موبائل کی رنگ ٹون بجی تو اس نے قدرے بیزاری سے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں
نام کے بجائے ایک نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ اس نمبر کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نمبر کی سم اس نے خود ماہ
کے نام ریڈ کر دی تھی اور احتیاطاً نمبر کو اس کے نام کے ساتھ اپنے موبائل کی فون بک میں ایڈ نہیں کیا تھا۔ ماہ بانو
نمبر سے کال آتے دیکھ کر وہ چونک گیا اور ایک طرح کی تشویش نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس کی طرف
احتیاط برتنے کی ہدایت کی وجہ سے وہ بلا ضرورت اسے فون نہیں کرتی تھی، اب جو اس کی طرف سے فون
آیا تو وہ قدرتی طور پر پریشان ہو گیا اور پریشانی کے عالم میں اس کی کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم سر!'' اس کی ''ہیلو'' کے جواب میں ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!..... خیریت؟..... کیسے فون کیا؟'' اس کے سلام کا جواب دے کر وہ فوراً ہی پوچھنے لگا۔

''جی خیریت ہے۔ بس دل گھبرا رہا تھا اس لیے آپ کو فون کر لیا۔'' اس نے دھیمی آواز میں بتایا تو جہاں
شہریار کو اس کی طرف سے اطمینان ہوا، وہیں غصہ بھی آنے لگا کہ اس نے اس کی ہدایت کے برخلاف بلاوجہ
فون کیوں کیا؟ خوشگوار موڈ کے ساتھ اسے ماہ بانو کی یہ نافرمانی اتنی بری نہیں لگتی لیکن اس وقت مزاج پہلے ہی
برہم تھا چنانچہ وہ بے چاری خود بہ خود ہی لپیٹ میں آ گئی اور وہ نہایت روکھے پن سے اجنبی لہجے میں بولا۔

''دیکھو بی بی! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ بے مقصد باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اگر
کوئی اہم مسئلہ ہو تو مجھے کال کیا کرو۔ یہ بیکار کی باتیں سننے کے لیے میرے پاس فرصت نہیں۔''

''سوری سر!'' اتنی سخت بات سننے کے بعد ظاہر ہے ماہ بانو اس سے مزید کچھ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتی
تھی، چنانچہ فوراً ہی فون بند کر دیا۔ شہریار کے عین سامنے بیٹھے عبدالمنان نے بھی اس کا یہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔
دوسری طرف سے فون کرنے والی ہستی کون تھی، یہ تو وہ بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا لیکن یہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ آج
شہریار صاحب خراب موڈ میں ہیں۔

''مجھے اجازت ہے سر! میں اپنی سیٹ پر جاتا ہوں۔ وہیں سے ڈی ایس پی کو بھی فون کر دوں گا۔'' اس
نے نظر سے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ شہریار نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔

عبدالمنان کے باہر جانے کے بعد وہ اپنے رویّے کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا تو ماہ بانو
کے ساتھ اپنا رویہ ضرورت سے زیادہ سخت محسوس ہوا۔ شاید ٹھیکیدار کی بدعنوانی اور اُلّو کی موت کی خبریں سن کر وہ
کل طور پر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ جس راہ پر چل رہا تھا، ڈرتا تھا کہ محبت کے پیچ و خم میں پھنس کر وہ راہ
سے ہٹ نہ کر بیٹھے۔ اندر کا یہ ڈر اسے محتاط روی پر اُکساتا تھا چنانچہ وہ کسی صورت خود کو ماہ بانو کے نزدیک نہیں
آنے دیتا تھا۔

''ڈاکٹر ماریہ تشریف لائی ہیں سر! آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' وہ کسی کام میں مصروف ہو کر اپنا دھیان بٹانا
چاہتا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا اور عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

عموماً وہ غیر طے شدہ ملاقاتوں سے گریز کرتا تھا لیکن بعض افراد اس پابندی سے مستثنیٰ تھے، خاص طور پر
سرکاری امور سے منسلک افراد۔ جن لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی تھی، وہ ایسے جاگیردار یا عہدیداران
تھے جو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے اس سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہش مند ہوتے تھے۔ ڈاکٹر
کا معاملہ ہر طرح کے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ اگرچہ چودھری کے جبر سے مجبور ہو کر سہی لیکن اس کے قائم
کردہ مرکزِ صحت میں بڑی دل جمعی سے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ایک مخلص اور اچھی ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ
قدر تھی، سو تھی..... شہریار کے لیے تو اس لیے بھی بہت اہمیت رکھتی تھی کہ اس نے اس کے لیے ایک محسن کا

ا ار ادا کیا تھا۔ اگر ڈاکٹر ماریہ ساتھ نہ دیتی تو وہ چودھری کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی قابلِ اعتراض تصویر
ے ا ہیلنڈل میں پھنس چکا ہوتا۔ ڈاکٹر ماریہ اگر اس وقت اس سے ملنے کے لیے خود اس کے آفس تک چل کر آ
تھی تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے تمام مصروفیات ترک کر کے فوراً اسے بلوا لیا۔

''ہیلو سر! کہیں میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟ آپ کی مصروفیت کا سوچ کر یہاں آنے کی ہمت نہ
ہ ہی تھی۔ لیکن پھر سوچا کہ ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ اندر آئی تو اس کے چہرے
نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

''مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی آپ سے ملنے سے انکار کیا ہو۔ پھر بھلا ہمت کیوں نہیں ہو
تھی؟'' اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے جواب دیا اور خوش دلی سے مسکرانے لگا۔

''انکار تو واقعی نہیں کیا لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کبھی
ئی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کس طرح سے بی ہیو کریں گے۔''

''ارے نہیں بھئی، اب میں اتنا بھی موڈی یا رُوڈ انسان نہیں ہوں کہ ایک معزز خاتون اتنی دور سے
ے ملاقات کے لیے آئیں اور میں انکار کر دوں۔'' ڈاکٹر ماریہ کے ڈر کی وجہ جان کر وہ دھیرے سے ہنسا
ے جواب دیا۔

''یہ تو میرے لیے بڑے آنر کی بات ہے کہ آپ میرا شمار معززین میں کرتے ہیں۔ ورنہ جس طر
ہ اعزاز افتخار نے مجھے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے، میں خود اپنے آپ سے گھن محسوس کرنے لگی ہوں۔
ا الٹر ماریہ کے لہجے میں اُداسی در آئی۔

''اس جال سے تو آپ خود رہائی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ورنہ میں نے تو آپ کو کئی بار حوصلہ
ا ہے۔ آپ اگر تھوڑی سی ہمت کریں تو چودھری کے چنگل سے نکل سکتی ہیں۔'' شہریار نے اسے اُکسایا۔

''اس موضوع پر ہم کئی بار بات کر چکے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں کبھی آپ کی باتوں سے قائل نہیں
ہو سکی۔ بہتر ہے کہ ہم یہ بحث ہی چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے جو جواب دیا، اسے سن کر شہریار نے خاموشی
اختیار کر لی۔ کچھ دیر اُن کے درمیان یہ خاموشی قائم رہی، پھر ڈاکٹر ماریہ نے اس خاموشی کو توڑا اور ذرا شوخ
میں بولی۔

''آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں صرف آپ سے ملنے کے لیے پیر آباد
یہاں آئی ہوں تو جناب یہ غلط ہے۔ اصل میں، میں اپنی ایک فرینڈ کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور جا رہی
تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی خراب ہو گئی۔ لاہور جانے والی دوسری بس ایک گھنٹے بعد نکلے گی اس لیے میں
سوچا کہ کچھ وقت آپ سے ملاقات کر کے گزار لیا جائے۔'' اس کا جواب سن کر شہریار کو سمجھ آیا کہ آج وہ معمو
ے سادہ حلیے کے مقابلے میں نک سک سے کیوں تیار ہے۔

''ایک اسسٹنٹ کمشنر کو وقت گزاری کے لیے استعمال کرنا تو بڑی بری بات ہے۔'' وہ ماہ بانو کے بعد
دوسری خاتون کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ برا ماننے کے بجائے خود بھی خوش دلی
جواب دیا۔

''نہیں بھئی، میں ایسی گستاخی ہرگز بھی نہیں کر سکتی کہ آپ کو وقت گزاری کے لیے استعمال کروں۔
نے تو صرف یہ سوچا تھا کہ آپ کے ساتھ ہیلتھ یونٹ سے متعلق کچھ ڈسکشن بھی کر لوں گی اور میرا ایک گھنٹہ
ضائع نہیں ہوگا۔'' شہریار کے لہجے کی خوشگواری کے باوجود اس نے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔



''وائے ناٹ..... لیکن پہلے میں چائے کے لیے کہہ دوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انٹرکام کی طرف
ھ بڑھایا لیکن کچھ آرڈر کرنے سے قبل ہی عبدالمنان دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

''وظل اندازی کے لیے معذرت چاہتا ہوں سر! لیکن بات ایسی ہے کہ آپ کو بتانے میں دیر نہیں کی جا سکتی
تھی۔'' اس نے شہریار کی اپنی طرف اُٹھی نظروں کے جواب میں جلدی سے وضاحت پیش کی اور پھر بات کو
ادھورا رکھتے ہوئے بولی۔ ''خبر آئی ہے کہ ایم این اے لیاقت رانا کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے۔ فائرنگ کے
وقت ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔ کہا یہی جا رہا ہے کہ فائرنگ سے گاڑی میں سوار کسی شخص کو نقصان نہیں
پہنچا لیکن رانا صاحب کی اپنی فیملی سمیت ہسپتال میں موجود ہونے کی بھی اطلاع ہے۔'' عبدالمنان جانتا تھا کہ
لیاقت رانا اس کے سگے ماموں ہیں، اس لیے خبر اس تک پہنچانے میں بہت پھرتی دکھائی تھی۔ اس خبر کو سن کر
شہریار کا پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ فوراً ہی اپنا موبائل اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

عبدالمنان سے اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ مزید کوئی خبر
ہوتی تو وہ سوال کیے بغیر ہی سنا چکا ہوتا۔ اس نے لیاقت رانا، آفرین رانا اور مریم تینوں کے نمبر پے در پے ملا کر
رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تینوں ہی نمبر بند جا رہے تھے۔ اس طرف سے مایوسی کے بعد اس کے پاس یہی حل
رہ جاتا تھا کہ آئی جی مختار مراد سے رابطہ کرے۔ اس سے بہتر پورے لاہور شہر میں کوئی اسے صحیح صورتِ حال
سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔

''اِٹس شہریار عادل..... آئی جی صاحب سے بات کروائیں۔'' دوسری طرف سے مختار مراد کے پی اے
نے کال ریسیو کی تھی۔ اس نے مختصر تعارف کے بعد اسے حکم دیا تو فون فوراً ہی مختار مراد صاحب کے ہاتھ
میں منتقل ہو گیا۔ ہر پی اے کی طرح ان کا پی اے بھی جانتا تھا کہ صاحب کن افراد کی کال سننے سے انکار
نہیں کرتے۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں انکل! ماموں جان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی ہے؟..... سب خیریت تو ہے نا؟''
ان کے ''ہیلو'' کہتے ہی اُس نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔

''پریشان مت ہو بیٹا! الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔ گاڑی پر فائرنگ ضرور ہوئی ہے لیکن کوئی بھی فرد اس کی زد
میں نہیں آیا ہے۔ ویسے گاڑی کی جو حالت ہے، اسے دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی معجزے نے ہی ان لوگوں
کو گولی میں آنے سے بچا لیا ہے۔ ورنہ حملہ آوروں نے کسر بالکل نہیں چھوڑی تھی۔'' مختار مراد نے پہلے اسے تسلی
دی، پھر تفصیلات بتائیں۔

''ماموں جان وغیرہ ہسپتال میں کیوں ہیں؟ میں کال کر رہا ہوں تو ان کے نمبرز بھی بند مل رہے ہیں۔''

''نمبرز لیاقت صاحب نے خود جان بوجھ کر بند کروا دیے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ایسے حالات
میں میڈیا والے کس بری طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے اُلٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے انہوں نے
ایسا کیا ہے۔ رہی ان لوگوں کے ہسپتال میں ہونے کی بات تو اصل میں بھابی صاحبہ نے اس حملے کا بہت اثر لیا
ہے اور ہسٹیریا کی سی کیفیت میں ہیں۔ اس لیے انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔ تم فکر مت کرو۔ میں یہاں ہوں،
سب کچھ دیکھ لوں گا۔''

وہ اس کی لیاقت رانا اور اس کی فیملی سے شدید وابستگی سے پوری طرح واقف تھا اس لیے گاہے بہ گاہے
تسلی دینے کا فریضہ انجام دیتا جا رہا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ انکل!'' اس نے مختار مراد کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کر کے عبدالمنان کی طرف متوجہ

ہوا۔ ''گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی لاہور کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔''

''گاڑی ریڈی ہے سر! لیکن آپ کا ڈرائیور غائب ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے قبل اپنے کسی ذاتی کام سے
تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈرائیو کر لیتا ہوں۔'' عبدالمنان نے جھجکتے ہوئے اسے اطلا
دینے کے ساتھ پیشکش کی تو وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی اصول پسند طبیعت کے باوجود عملے کے ا
میں سے کوئی نہ کوئی غفلت دکھا ہی دیتا تھا۔ بے شک آج کے شیڈول میں اس کا آفس سے کہیں باہر جانا
نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ڈرائیور اسے مطلع کیے بغیر اپنے ذاتی کام سے نکل کھڑا ہوتا.....
بھی اتنے طویل دورانیے کے لئے۔ ڈرائیور کی اس غفلت نے اسے مشابرم خان کی یاد دلا دی۔ وہ کتنا ذ
اور کام کا آدمی تھا۔ اس نے مختصر عرصے میں ہی شہریار کا دل جیت لیا تھا اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا
بلتستان کے پہاڑوں میں قائم شدت پسندوں کے ٹھکانے کو دریافت کر کے اسے نیست و نابود کرنے کا سہرا
دلیر آدمی کے سر جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ خود اس ٹھکانے پر زخمی حالت میں پایا گیا تھا، اس لیے ابھی تک آ
انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں تھا۔ اس کی رہائی کے سلسلے میں شہریار مسلسل کوشش کر رہا تھا اور امید تھی کہ وہ جلد رہا
دیا جائے گا۔ لیکن اس وقت تو بہر حال وہ نہیں تھا اور اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

''تم یہیں رہ کر یہاں کے معاملات دیکھو۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کر لوں گا۔'' اس نے عبدالمنان کی پیشکش
مسترد کر دی۔ عبدالمنان کو خود بھی یہی اُمید تھی۔ پہلے بھی شہریار کئی بار اکیلے ہی خود ڈرائیو کر کے لاہور جا چکا تھ

''آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔ لاہور پہنچ کر کسی جگہ اُتر جائیے گا جہاں سے آپ کو اپنی فر
کی شادی میں پہنچنے کے لیے سہولت سے ٹیکسی مل سکے۔'' وہ لمحوں میں جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد منٹوں
روانگی کے لیے تیار بھی کھڑا تھا لیکن اس ساری صورتِ حال میں خاموش تماشائی بنی بیٹھی ڈاکٹر ماریہ کو فراموش
نہیں کیا تھا۔ اس پیشکش کو سن کر وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو پیون نے ایک
سا بیگ لا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔

''اس بیگ میں میرا سامان ہے۔ ایکچوئیلی میں دو تین دن رُکنے کے خیال سے لاہور جا رہی تھی اس
اتنا سامان رکھنا پڑا۔'' ڈاکٹر ماریہ نے بیگ کے بارے میں بتایا جس پر شہریار نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا
خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ریلیکس سر! اس رفتار سے ڈرائیو کریں گے تو کوئی ایکسیڈنٹ بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ کچھ
خاموش رہی، پھر اسٹیئرنگ گھما کر اس کے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت رسان سے بولی تو
شرمندہ ہو گیا۔

''سوری..... میں جذبات میں اپنے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال رہا تھا۔'' گاڑی
اسپیڈ کم کرتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

''میں اپنی وجہ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ مجھ سے کہیں زیادہ قیمتی آپ کی زندگی ہے۔ میرا کیا ہے، میری
کوئی بھی دوسرا ڈاکٹر لے سکتا ہے لیکن آپ جیسا مخلص، مستعد اور بہادر اے سی اس علاقے کے لوگوں کو دوبا
شاید ہی مل سکے۔'' ڈاکٹر ماریہ کا ہاتھ اب بھی تسلی آمیز انداز میں اس کے ہاتھ پر دھرا تھا۔

''آپ نے تو میری تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔'' اس کے چہرے کے نقوش میں نرمی سی اُتری۔

''میں نے تو صرف حقیقت بیان کی ہے۔ آپ کی زندگی ہم سب کے لیے واقعی اہم اور ضروری ہے
کسی صورت ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، آپ کو دوسری طرف سے کو



ہ ری خبر سننے کو نہیں ملی۔ اس لیے اس بے احتیاطی کی گنجائش نکلتی نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں خلوص ہی
ل ہرا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن شاید میں ایک ہی دن میں کئی بری خبریں سن کر ٹینس ہو گیا ہوں اس لیے
طرح بی ہیو کر رہا تھا۔'' شہریار نے وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ کافی پیتے ہیں۔ میرے ہاتھ کی بنی کافی پی
آپ اچھا فیل کریں گے۔'' اس نے جھک کر عقبی نشست پر موجود بیگ اٹھایا اور اس میں سے پلاسٹک کی
ل میں احتیاط سے رکھا چھوٹا سا تھرماس اور دو پیپر کپ نکالے۔

''لانگ رُوٹ پر سفر کرتے ہوئے مجھے کافی پینا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے ساتھ تھرماس میں
ل لے کر چلتی ہوں۔'' کپ بھر کر شہریار کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بتایا۔

''تھینکس۔ آپ کی یہ عادت اس وقت میرے لیے نعمت ثابت ہوئی ہے۔ میں خود بھی طلب محسوس کر رہا
'' شہریار نے اس کا بڑھایا ہوا کپ تھاما اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''زبردست..... آپ تو بہت اچھی کافی بناتی ہیں۔'' پہلا گھونٹ پیتے ہی اس نے بے ساختہ داد دی تو
ے کے ہونٹوں پر بڑی جان دار سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ کہتے ہیں کہ سفر میں لوگ ایک دوسرے پر کھلتے ہیں تو
ے کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اپنے پیشوں کو بھول کر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے لاہور کی طرف
ام سفر تھے۔ ماریہ کا دلچسپ اندازِ گفتگو شہریار پر اثر انداز ہو رہا تھا اور وہ جس ٹینشن کے ساتھ دفتر سے نکلا تھا،
استہ آہستہ ریلیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوش گوار ماحول میں سفر کرتے ہوئے وہ کافی آگے نکل آئے، تب
ار نے محسوس کیا کہ ماریہ نے گفتگو میں حصہ لینا کم کر دیا ہے اور اس کے چہرے پر تکلیف بھرے تاثرات نظر
ے ہیں۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بتایا۔

''تو کوئی میڈیسن لے لیں نا۔''

''ہوں..... دیکھتی ہوں۔'' شہریار کے مشورے پر وہ اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے
ل کا سلسلہ روک دیا اور مایوسی کے عالم میں نفی میں سر ہلایا۔ یعنی اس کے بیگ میں ایسی کوئی دوا موجود نہیں تھی
اس کے درد کا درماں بن سکتی۔

''آپ اپنا میڈیکل باکس ساتھ نہیں رکھتیں؟'' شہریار حیرت اور جھنجلاہٹ دونوں کا شکار ہوا۔ جواباً ماریہ
ے چہرے پر شرمندگی نظر آنے لگی اور اس نے زبان سے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

''آگے ایک ہوٹل پڑتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں سے کچھ مل جائے۔'' شہریار نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا
ر ایک امکان پیش کیا۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک تکلیف میں مبتلا شخص کو مزید شرمندہ کرنے
ے بجائے اسے تسلی دی جائے۔ اس بار ماریہ نے کوئی بھی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر
آنکھیں موند لیں۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے اور ابھی لاہور بہت دُور تھا۔ وہاں تک
پہنچتے یقیناً اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ وہ فکرمند سا ڈرائیونگ کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے اب وہ ہوٹل زیادہ
دور نہیں رہا تھا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ یہ کوئی بہت عمدہ ہوٹل نہیں تھا۔ ہائی وے پر سفر کرنے والے عموماً
وڑی دیر کے لیے یہاں رک کر کھاتے پیتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ لمبے وقت کے لیے صرف وہی

لوگ رکتے تھے جن کے ساتھ گاڑی کی خرابی یا کسی دوسری نوعیت کا مسئلہ پیش آ جاتا تھا۔

شہریار کو اُمید تھی کہ ہوٹل کے ساتھ بنے پان کے کیبن سے وہ ماریہ کے لیے کوئی پین کلر حاصل
میں کامیاب ہو جائے گا۔ پان سگریٹ کے کیبن پر سونف سپاری ٹافیوں اور بسکٹ جیسی چیزوں کے علا
چھوٹی موٹی دوائیں بھی بکنا ایک عام معمول ہے کیونکہ اس انگوٹھا چھاپ پنواڑی سے کوئی پوچھنے والا نہیں
کون سا قانون آپ کو اس طرح کی دوائیں بیچنے کی اجازت دیتا ہے؟

''کون سی ٹیبلٹ لے کر آؤں آپ کے لئے؟'' گاڑی ہوٹل کے سامنے روک کر اس نے مار
پوچھا۔ انگوٹھا چھاپ پنواڑی بے شک پورے اعتماد سے مختلف امراض کی دوائیں بیچتا ہو لیکن وہ ایک ڈا
موجودگی میں اس کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جواباً ماریہ نے اسے ایک ایسی ٹیبلٹ
بتایا جو اس کے لیے قطعی نامانوس تھا۔

''یہاں تو عام سی دوائیں ہی مل سکتی ہیں۔ آپ جو نام لے رہی ہیں، وہ دوا ملنا تو مشکل ہے۔'' اس
کچھ بے بسی سے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی عام پین کلر سے یہ درد ٹھیک ہونا ممکن نہیں۔'' ماریہ نے کراہتے ہوئے بتایا۔

''او کے..... میں کوشش کرتا ہوں۔'' اسے امید نہیں تھی لیکن پھر بھی دروازہ کھول کر گاڑی سے
نکلنے لگا۔

''ایکسکیوزمی شہریار!'' ماریہ نے اسے پکارا تو وہ ہینڈل پر جما اپنا ہاتھ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہاں واش روم کی سہولت تو ہو گی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ اس سوال پر شہریار کے حلق
کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خاتون کو اپنے ساتھ سفر کی دعوت دینا مہنگا پڑا تھا۔ وہ جس ہوٹل کے سامنے رُکے
بہت معمولی تھا اور اس کا کسی ہوٹل میں خاتون کے ساتھ جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اسے یہ سو
کوفت ہو رہی تھی کہ وہ ماریہ کو اس ابتر حالت میں لے کر اندر جائے گا تو بھانت بھانت کے لوگوں کی نظر
سامنا کرنا پڑے گا۔

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اس کا مزاج اور
اپنی جگہ لیکن اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتا تھا کہ فطری ضروریات کے آگے انسان مجبور ہوتا ہے۔ ہوٹل کے اندر جا
آنے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے۔

''ٹیبلٹ یہاں نہیں ملی۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا ہے کہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ پر ایک میڈیکل ا
موجود ہے، وہاں سے ٹیبلٹ مل جائے گی۔ آنے جانے کا وقت ملا کر چالیس منٹ بنتے ہیں۔ ہوٹل والا
ایک ملازم کو موٹر سائیکل پر بھیج کر دوا منگوانے پر تیار ہے۔ ہمیں یہ وقت ہوٹل میں ہی گزارنا ہو گا۔ آپ
سے باہر آ جائیں، ہم ہوٹل کے اندر چلتے ہیں۔'' واپس آ کر شہریار نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا تو وہ دروا
کھول کر باہر آ گئی۔ لیکن اس کی دگرگوں حالت سے ظاہر تھا کہ اس کے لیے بغیر سہارے کے چلنا مشکل
اس نے خود ہی سہارے کے لیے شہریار کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ پیچھے نہیں ہٹ سکا۔ وہ دونوں اس
ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھے کہ ماریہ نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے بازو سے
چمٹ کر چل رہی تھی۔ ایک جوان اور خوب صورت عورت کی اس قدر قربت نے شہریار کو بے چین سا کر دیا
اپنی کیفیات میں عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ خواتین سے آزادانہ میل جول اس کی کلاس میں ایک عا
بات تھی لیکن اس وقت وہ خود کو جس قدر وحشت زدہ محسوس کرنے لگا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا



ہر جسم سے کوئی برقی رو نکل رہی ہے جو اس کے ایک ایک عضو میں دوڑتی جا رہی ہے۔ کمال یہ تھا کہ اسے
یہ کیفیت بری بھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ ماریہ کی اس قربت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''باہر موجود عجیب و غریب افراد کے درمیان آپ کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں
تھوڑی دیر کے لیے یہ کمرہ بُک کروا لیا ہے۔ کمرے میں اٹیچ باتھ ہے۔ آپ اسے استعمال کرنے کے علاوہ
آنے تک تھوڑی دیر آرام بھی کر سکتی ہیں۔'' انہیں اندر آتا دیکھ کر ہوٹل کا ایک ملازم راہنمائی کے لیے
ساتھ ہو لیا تھا۔ اس کی معیت میں ایک کمرے تک پہنچ کر شہریار نے وضاحت پیش کی۔

''تھینک یو ویری مچ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی آپ سے یہی درخواست کرنے والی تھی۔
اس کیٹگری کے لوگ موجود ہیں، مجھے خود بھی وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔'' ماریہ نے اسے جواب دیا اور پھر
کا سہارا چھوڑ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس انداز میں چل رہی تھی، اسے دیکھ کر شہریار کو ڈر محسوس ہوا
کہیں وہ گر ہی نہ جائے۔

''دروازہ اندر سے بولٹ مت کیجئے گا۔'' اس نے کوئی خدشہ سا محسوس کرتے ہوئے ماریہ کو ہدایت کی جس
اس نے عمل بھی کیا۔ شہریار ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواروں کا رنگ و روغن خاصی خراب حالت میں تھا۔ فرنیچر کے نام پر اس
کمرے میں دو کرسیاں، ایک میز اور ایک بیڈ موجود تھا۔ بیڈ پر دُھلی ہوئی لیکن خاصی پرانی چادر بچھی ہوئی تھی۔
عام حالات میں شہریار کبھی ایسی جگہ قیام کرنا پسند نہ کرتا لیکن ماریہ کی حالت کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا اور اب
کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عورت، آدمی کو کتنی بے بسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ باہر کھڑی گاڑی سے اس کمرے
تک پہنچنے میں انہیں ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن ڈیڑھ منٹ میں ہی اسے اچھی خاصی
آزمائش سے گزرنا پڑا تھا اور اب بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ جسم کا جو جو حصہ ماریہ سے مس ہوا ہے، وہاں ایک
ہلکی سی آگ بھڑک اُٹھی ہے۔ اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھا کر
پنکھا اس کی طرف لگانا چاہا لیکن پھر واش روم سے سنائی دینے والی ''دھم'' کی زوردار آواز پر بے چین ہو کر
کھڑا ہو گیا۔

''آر یو آل رائٹ ماریہ؟'' واش روم کے دروازے کے قریب جا کر اس نے ماریہ کو پکارا۔ جواب میں
اسے اس کی کراہیں سنائی دیں۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ دروازہ کھول کر صورتِ
حال معلوم کرے۔ جھجکتے ہوئے اس نے دروازے کے پٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ماریہ
فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کا لباس خاصا بے ترتیب تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ ماریہ ایک
گداز جسم کی مالک ہے۔ اس ہوشربا جسم کی مالک عورت کو فی الحال اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ شہریار آگے
بڑھا اور اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ ماریہ دھیمی آواز میں مسلسل کراہے جا رہی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر بیڈ تک
لے گیا اور جھک کر اسے اس پر لٹا کر سیدھا ہونا چاہا لیکن اپنی قمیض کا کالر ماریہ کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے
ایسا نہ ہو سکا۔ اس نے شاید گرنے کے خدشے کے باعث اس کا کالر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا اور اب نیم
بے ہوش پڑی اس کے لیے آزمائش بنی ہوئی تھی۔ شہریار نے اس کے وجود میں بے بس کر دینے والی کشش
محسوس کی۔ اس کی قربت مسلسل اس کے جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے ضبط کی حدیں ٹوٹنے لگی
ہیں اور پورے جسم میں ایک وحشت سی بھر گئی ہے۔ یہ وہ وحشت تھی جو آدمی سے اس کا سیلف کنٹرول چھین لیتی

...ہی بے قابو ہو گیا اور اپنے اندر بھڑکنے والی آگ کو بجھانے کے لیے ماریہ کے آنچ دیتے وجود میں ...ونا چاہا۔

⊛----✪----(۲)

رات کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ ...رات ماہ بانو کی آنکھوں کے آنسو چرا کر بھیگی بھیگی سی تھی۔ شام سے شر... والی برسات کا یہ عالم تھا کہ ...ی صورت رُکنے کو تیار نہیں تھی اور اب بھی کن من، کن من پھوار کا سلسلہ ...ہا ہی تھا۔ خود ماہ بانو کا بھی یہی حال تھا۔ جب سے شہریار سے فون پر بات ہوئی تھی، اس کی آنکھیں مسلسل ...ہی تھیں۔ اسے شہریار سے اتنی ...کا لگی اور رُکھائی کی اُمید نہیں تھی۔ وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس سے غلطی سرزد ...تھی۔ شہریار جیسے مصروف بندے کو اسے اس طرح بلاوجہ فون نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن اس سے یہ غلطی بے اختیا... ہوئی تھی۔ جب سے اس نے چودھری کے کارندے کو کراچی میں دیکھا تھا، دل پر گھبراہٹ سی طاری ...اس نے راحیلہ کے سامنے بھی اپنی اس کیفیت کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی تھی ...اس پر طاری ہونے والی گھبراہٹ ختم نہیں ہو سکی تھی۔ ایسے میں اس کا دھیان خود بہ خود شہریار کی طرف چلا ...وہ دنیا کا واحد فرد تھا، جس کا ...تسلی اس کے دل کو قرار دے سکتا تھا لیکن اس نے اطمینان سے اس کی ...بات سننے کے بجائے ...س طرح کا ردِعمل ظاہر کیا تھا، اس نے ماہ بانو کے دل کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ جنہیں زیادہ عزیز رکھے، ان کی پہنچائی ہوئی معمولی سی ٹھیس پر بھی کسی آبلے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ اس ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اپنا گھر، رشتے ناتے، دوست احباب اور آزادی گنوا کر اس کے پاس جو واحد چیز سہارا باقی رہ گیا تھا، اس کا نام شہریار تھا۔

اگرچہ شہریار نے اس سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوتی لیکن اس ...نرم خوئی اور مہربان رویے کی تو عادی تھی۔ اب جو اس نے بے گانگی برتی تو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ حالانکہ خود بھی اپنے آپ کو شہریار کی طرف سے صفائی پیش کر چکی تھی۔ اس کی مصروفیات، مسائل اور پریشانیوں سے کچھ بھی اُس کے اس رویے کا سبب ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ اُداس تھی اور اس اُداسی نے اس کی نیند چھین ...تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کہیں شہریار کا مزاج بدلنے تو نہیں لگا ہے؟ ورما کے ساتھ اس نے شہریار کو ...فالی سے پیش آتے دیکھا تھا، اسے وہ اب تک بھولی نہیں تھی۔ شہریار کا وہ روپ اس کے لیے انجانا تھا تو ...کا رویہ بھی قطعی اجنبی۔ اور بے شک وہ شہریار کو اپنا بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کا اجنبی بنا ...منظور نہیں تھا۔ اس کی اجنبیت و بے گانگی اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

''اب تو سو جاؤ یار! کب تک اس طرح روتی رہو گی؟ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل رو رہی ہو اور رو... وجہ بھی نہیں بتاتیں۔'' اس کی روم میٹ جو کافی دیر پہلے اسے چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی، اچانک کھلنے پر جاگی تو اسے اسی طرح روتے دیکھ کر قدرے ناراضگی سے بولی۔

''سوری..... میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہو رہی ہو۔'' ماہ بانو نے اس سے معذرت کی اور اس کی طرف اپنا منہ پھیر کر اس طرح لیٹ گئی کہ وہ اس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

''یہ لو..... یہ گولی کھا لو۔ تمہیں نیند آ جائے گی تو پُرسکون ہو جاؤ گی۔'' اسے اپنے پیچھے ہلکی ہلکی کھٹ... کی آوازیں سنائی دیں اور پھر اس کی روم میٹ پانی کا گلاس اور ایک ٹیبلٹ لے کر اس کے سر پر آ کھڑی ہو... اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔



...ٹرنکولائزر لے لینا ہی اس وقت میرے لیے سب سے بہترین ہے۔ کچھ دیر سو جاؤں گی تو اس کیفیت ...باہر آ جاؤں گی۔' اس نے یہ سوچتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور گولی منہ میں رکھ کر پانی کا پورا گلاس پی گئی۔

''اب آرام سے لیٹ جاؤ۔'' اس کی روم میٹ نے اسے مشورہ دیا۔ اس نے خاموشی سے اس مشورے ...مان لیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ ٹرنکولائزر نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور اس کی پلکیں نیند ...بوجھل ہونے لگیں۔ نیند کی وادی میں اُترتے ہوئے اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ جو اس نے اپنے لیے سب ...بہترین سمجھا ہے، وہ بدترین ثابت ہونے والا ہے۔ گرداب میں پھنسے انسان کے لیے بچ نکلنا یوں بھی ...آسان نہیں ہوتا۔ لیکن بے خبری تو انسان کو ہاتھ پیر مارنے کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ...ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

وہ بے حد شرمندہ اور پشیمان بیٹھا تھا۔ جو شرمندگی آج اس کے حصے میں آئی تھی، اس سے ساری عمر کبھی ...واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے اپنے کردار کی بلندی پر جو فخر تھا، آج وہ فخر بری طرح ٹوٹا تھا اور وہ خود کو اتنی پستی میں پا ...رہا تھا کہ اسے لگتا تھا، اب کتنی ہی کوشش کر لے، اس پستی سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اس کے احساسِ گناہ کو ...گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ڈاکٹر ماریہ کے آنسو دو چند کیے دے رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان ...آنسوؤں کا مداوا کس طرح کرے۔ جرم اتنا بڑا سرزد ہوا تھا کہ اس کے سامنے معافی کے تمام الفاظ ہیچ تھے۔ لیکن ...خاموش رہ کر اپنے جرم سے نظر بھی تو نہیں چرائی جا سکتی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ کچھ ایسا جس سے سامنے ...بہتے آنسو بہاتی ڈاکٹر ماریہ کو اس کی شرمندگی کا احساس ہو سکے۔ بڑی مشکل سے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر کے ...اس نے اسے پکار ہی لیا۔

''ماریہ.....!'' اس کی دھیمی، ندامت سے چُور آواز ماریہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے نظر اٹھا کر ...اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں درد اور شکوہ بھرا ہوا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں ڈاکٹر ماریہ!..... میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں نے تو ...کبھی خواب میں بھی ایسی گری ہوئی حرکت کا تصور نہیں کیا تھا۔ آپ ہمیشہ میرے لیے بہت قابلِ احترام رہی ...بلکہ میں ہر عورت کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ تو کیا، میں کبھی کسی کے ساتھ بھی یہ سب کرنے ...کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ لیکن رات جانے کیا ہوا کہ میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا۔'' وہ بے حد ...شرمندہ ہوا تھا۔ گزشتہ شب اس نے جس طرح اپنے سارے اختیار کھوئے تھے، وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ...اس کی عمر کی پارسائی داغ دار ہو کر رہ گئی تھی۔

اپنی اس بے اختیاری کی وجہ اسے کسی طور سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کوئی ایسی غیر معمولی عورت نہیں تھی ...وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھتا۔ اس کی کلاس فیلوز، فرینڈز، رشتے دار خواتین میں سے کئی ایسی تھیں جن کے حُسن ...پر مچے تھے اور ان میں سے کئی اس پر بری طرح فدا بھی تھیں لیکن کبھی کسی کی ترغیب نے اس کے قدم نہیں ...لڑکھڑائے تھے۔ اور اب وہ بری طرح گر پڑا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی عورت کی خاطر جسے وہ بارہا دیکھ چکا تھا اور کبھی ...کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا تھا لیکن گزشتہ روز جانے ایک دم ہی اسے اس میں ایسی کیا ...کشش محسوس ہوئی کہ اپنے حواس گنوا بیٹھا۔ وہ تو اپنے ماموں لیاقت رانا کی گاڑی پر فائرنگ کی خبر سن کر بہت ...رات میں لاہور کے لیے نکلا تھا۔ پھر جانے کیسے جذبات کا رُخ بدل گیا؟..... پھر وہ سب ہو گیا جس کے بعد

اس کے ہوش وحواس ہی اُڑ گئے۔ اب ہوش آیا تھا تو صبح ہونے والی تھی۔

آنکھ کھولنے کے بعد اس کی نظروں نے جو سب سے پہلی چیز دیکھی تھی، وہ آنسو بہاتی ڈاکٹر ماریہ تھی روکر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں اور چہرہ بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔ گزشتہ شام سہیلی کی شادی میں شرکت لیے پہنا گیا نفیس سوٹ اپنی ابتر حالت کے ساتھ گواہی دے رہا تھا کہ سوٹ پہننے والی کے ساتھ کیا کچھ بیتا شہریار کو اپنی مدہوشی میں پیش آنے والے واقعات بس دھندلے سے ہی یاد تھے۔ اس کے آؤٹ آف کنٹ ہونے کے بعد شاید ماریہ نے کچھ مزاحمت کی تھی لیکن وہ اس کے لیے اپنے اندر اتنی بے پناہ کشش محسوس تھا کہ لگتا تھا اگر طلب پوری نہ ہوئی تو شاید موت ہی واقع ہو جائے گی۔ وہ صحرا میں پیاس سے مرتا مسافر تھا جس کے سامنے جیسے ہی پانی کا پیالہ آیا، وہ غٹاغٹ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اسے چڑھا گیا۔ اور پھر بے دم ہو کر سویا کہ صبح کے قریب ہی آنکھ کھل سکی۔ مدہوشی میں حیا کھو دینے والی آنکھ، ہوش آیا تھا تو اُٹھنے دقت محسوس کر رہی تھی لیکن بہر حال اس نے کسی نہ کسی طرح ہمت کی اور ڈاکٹر ماریہ سے مخاطب ہوا تا کہ صورتِ حال سے نکلا جا سکے۔ اپنے تمام تر احساسِ شرمندگی کے باوجود وہ جانتا تھا کہ جو کچھ پیش آ چکا ہے، خود اس کو ہی فیس کرنا ہے چنانچہ ڈاکٹر ماریہ سے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں سر! آپ واقعی بہت باکردار انسان ہیں اور عورتوں کا بہت احترام بھی کر ہیں۔ لیکن شاید میں بطور ڈاکٹر تو آپ کے لیے قابلِ احترام تھی، بطور عورت نہیں۔ آپ جن عورتوں کا احترام کرتے ہیں، وہ آپ کی نظر میں باعزت اور پارسا ہوتی ہوں گی لیکن میرے بارے میں تو آپ جانتے ہیں میں ایک پارسا عورت نہیں ہوں۔ میری پارسائی کو چودھری افتخار داغ دار کر چکا ہے۔ اس داغ دار دامن پر ایک داغ آپ نے بھی لگا دیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ گندگی کے ڈھیر پر تھوڑی سی گندگی اور پھینک دو تو کسی معلوم ہوگا۔ لیکن آپ کو اپنے بارے میں کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ آپ کا مقام بہت بلند تھا میری نظروں لیکن اب.....'' ڈاکٹر ماریہ نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا اور سسکنے لگی۔ اُس کی باتیں سن کر شہریار کا جھکا ہوا سر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تو بہت دکھ کے ساتھ بولا۔

''مجھے علم ہے کہ میں آپ کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ اپنے بارے میں جو کچھ کہا، میں اس سے قطعی متفق نہیں ہوں۔ اگر میں یہ جانتا ہوں کہ چودھری نے آپ عزت کو داغ دار کر دیا ہے تو یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کس طرح اس شیطان کے شکنجے میں پھنس کر بے بس ہیں۔ اور بخدا آپ کی بے بسی پر غصہ آنے کے باوجود میں نے کبھی آپ کو بری عورت نہیں سمجھا۔ اگر آپ عورت ہوتیں تو بھی میں آپ کے ساتھ برا نہیں کر سکتا تھا..... لیکن اصل بات تو یہی ہے کہ میں نے آپ ہمیشہ بہت شریف اور محترم تصور کیا ہے۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے۔

''رہنے دیں شہریار صاحب! یہ سب باتیں زبانی ہیں۔ حقیقت وہی ہے جو آپ اپنے عمل سے ثابت چکے ہیں۔'' اس کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ تلخی سے بولی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے جو کچھ پیش آ چکا ہے، اس کے بعد آپ کے لیے میری کسی بات پر یقین کرنا ممکن بھی تو نہیں ہوگا۔ میری وجہ سے آپ کا اتنا شدید نقصان ہو گیا ہے کہ اس کا مداوا بھی ممکن نہیں۔'' شہریار نے بے بسی سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مُکا مارا۔

''اگر مداوا ممکن ہوتا تو کیا آپ کرتے؟'' ڈاکٹر ماریہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''بالکل۔'' اس نے ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر جواب دیا۔



''تو پھر مجھ سے شادی کر لیں۔'' ڈاکٹر ماریہ کا یہ مطالبہ اتنا اچانک تھا کہ وہ ہڑبڑا کر رہ گیا۔

''کیوں..... نہیں کر سکتے نا؟..... اپنی لائف پارٹنر کے طور پر تو آپ کسی اعلیٰ خاندان کی خوب صورت، پڑھی لکھی اور پارسا عورت کا انتخاب کریں گے۔'' اس نے طنز سے کہتے ہوئے لفظ ''پارسا'' پر خاص طور پر زور دیا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان موجود مذہب کے فرق نے مجھے اس رخ پر نہیں سوچنے دیا، ورنہ شاید میں خود آپ کو یہ آفر کرتا۔'' شہریار نے خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''مذہب کے فرق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے مذہب میں مرد کو اہلِ کتاب عورت سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور میں اہلِ کتاب ہوں۔'' ماریہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ شہریار کو چیلنج کر رہی ہو۔

''اگر مداوے کی یہی صورت ہے تو پھر مجھے قبول ہے۔ میں آپ سے شادی کروں گا۔'' شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''کیسی شادی؟..... وہی جو آپ جیسے امیر زادے ہماری کلاس کی عورتوں سے کیا کرتے ہیں؟..... شادی کے نام پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑا کر عورت کو ایک طرف بٹھا دیتے ہیں اور پھر وہ عورت اس کاغذ کو ہاتھ میں پکڑ کر شوہر کو اس کی ہم پلہ کسی عورت کے ساتھ فخر سے گھومتا دیکھتی رہتی ہے۔ معاف کیجیے گا شہریار صاحب! میں ایسی نام نہاد شادی سے۔ ایسی شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں چودھری کی رکھیل بنی رہوں۔ وہ شخص برا ہے، کم از کم ویسا نظر تو آتا ہے۔'' ڈاکٹر ماریہ کی تلخی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے آخری جملے نے تو شہریار کو سر تا پا جھلسا کر رکھ دیا۔ یعنی اب وہ اتنا گیا گزرا ہو گیا تھا کہ چودھری افتخار جیسے ذلیل شخص کو بھی اس پر ترجیح دی جائے۔

''بس کرو ماریہ! تم جو کچھ کہہ رہی ہو، اپنے اندازوں اور مفروضوں کی بنیاد پر کہہ رہی ہو۔ میں نے اگر تم سے شادی کے لیے ہامی بھری ہے تو پھر تمہیں پوری عزت اور مقام بھی دوں گا۔ اگر یقین نہیں آتا تو ابھی میرے ساتھ لاہور چلو۔ میں تمہیں اپنے ماموں اور ممانی سے ملواؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ اس لڑکی کو میں نے اپنی لائف پارٹنر چنا ہے۔'' وہ بہت جوش سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا میں اسی حال میں آپ کے ساتھ چلوں؟'' ڈاکٹر ماریہ نے اس کی توجہ اپنے حلیے کی طرف کروائی۔ رات۔ چند گھنٹوں کے لیے ساتھی عورت کی خرابیٔ طبیعت کا بتا کر کمرہ کرائے پر لینے کے بعد وہ رات بھر کے لیے یہاں ٹِک گئے تھے تو اس صورتِ حال پر ہی جانے ہوٹل کے ملازمین میں کتنی چہ میگوئیاں ہوئی ہوں۔ اب ماریہ کو اس حلیے میں لے کر باہر نکل جاتا تو سونے پر سہاگا ہو جاتا۔

''آپ کی گاڑی میں میرا بیگ رکھا ہے، وہ لے آئیں۔ اس میں میرے کپڑے ہیں۔'' آخر ماریہ نے ہی کوشش کیا تو وہ جھنجلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے خود اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ جانے اس کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے کہ بالکل سامنے کی باتیں بھی سمجھ نہیں آ رہیں۔

ہوٹل کے استقبالیہ کے سامنے سے گزر کر وہ اپنی گاڑی کی طرف گیا تو اسے لگا کہ استقبالیہ پر بیٹھا ہوٹل کا ملازم اور گاہکوں کو آرڈر سرو کرتے ملازمین اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان نظروں کی زبان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہوا وہ باہر نکل گیا اور گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھا ڈاکٹر ماریہ کا بیگ نکال کر ہوٹل کے اندر آیا۔

''سر! ناشتہ بھجوادوں آپ کے کمرے میں؟'' وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا جب ہوٹل مالک نے اسے پکار کر سوال کیا۔ سوال سے زیادہ اس کے چہرے پر موجود معنی خیز مسکراہٹ نے شہریار کو دیا۔ اس مسکراہٹ کے ذریعے گویا وہ اسے جتا رہا تھا کہ ساتھی خاتون کی بیماری کا بہانہ کر کے چند گھنٹوں لیے کمرہ کرائے پر لینے والے نے رات وہاں کیوں گزاری، میں جانتا ہوں۔

''تھینکس۔ ناشتے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہریار نے سرد مہری سے جواب دے کر آگے بڑھ جانا چاہا

''اچھا جی، جیسی آپ کی مرضی۔ پر یہ دوا تو لیتے جائیں۔ کل میرا آدمی وقت پر لے آیا تھا۔ میں آپ کمرے میں دینے بھی گیا تھا لیکن جناب نے دستک پر دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں نے بھی سوچا کہ آپ لوگ کے آرام میں دخل نہ دوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو آپ خود ہی کسی وقت دوا مانگ لو گے، پر شاید ضرورت نہیں تھی۔'' وہ دو ٹکے کا شخص باتوں باتوں میں اسے بہت کچھ کہے جا رہا تھا اور اس کی مجبوری تھی کہ اسے وہ سب سننا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر کھائی تھی اور اس ٹھوکر نے اسے ذلت کے ایسے گڑھے میں گرا دیا تھا جس سے نکلنے کا طریقہ اسے خود بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ بل بنا کر بھیج دیں، میں پے کر دوں گا۔'' ہوٹل مالک کی ساری بکواس کے جواب میں اس نے صرف ایک بات کہی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں موجود ماریہ نے اس کی عدم موجودگی میں خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ شہریار نے اسے بیگ تھمایا تو وہ اس میں سے اپنے کپڑے نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اس کے فارغ ہو کر باہر نکلنے تک ہوٹل کا ایک ملازم بل لے آیا تھا۔ اسے بل کی ادائیگی کر کے وہ لوگ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

لاہور تک کا باقی سفر انہوں نے بے حد خاموشی سے گزارا۔ ماریہ نے کئی بار نظر اٹھا کر شہریار کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور وہ اس سے قطعی بے نیاز ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ اس کے ہونٹوں پر لگا چپ کا تالا اتنا مضبوط تھا کہ وہ اپنے موبائل پر آنے والی کالز بھی ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک مکمل طور پر گونگے بہرے شخص کی طرح برتاؤ کر رہا تھا۔

لاہور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد صرف چند لمحوں کے لیے اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ اس نے اپنے موبائل سے کال کر کے یہ معلوم کیا تھا کہ مسز آفرین رانا اب بھی ہسپتال میں ہی ہیں یا گھر شفٹ ہو گئی ہیں۔ دوسری طرف سے اسے کیا جواب دیا گیا، ماریہ نہیں جان سکی۔ لیکن جب سفر کے اختتام پر وہ ایک کوٹھی کے سامنے جا کر رکے تو اس نے جان لیا کہ وہ شہریار کے ماموں، ایم این اے لیاقت رانا کی رہائش گاہ پر پہنچ چکے ہیں۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر شہریار نے ہارن دیا تو چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان کر ہاتھ کے اشارے سے زوردار سلام کرتے ہوئے مستعدی سے پورا گیٹ کھول دیا۔ شہریار تیزی سے گاڑی اندر لے گیا۔

''آئیں میرے ساتھ۔'' پورٹیکو میں گاڑی روک کر اُترتے ہوئے اس نے ماریہ سے یہ چند لفظی جملہ کہا اور اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔ ماریہ دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر نکل آئی۔ اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ اب تک بے یقینی کا شکار ہے اور یہاں تک پہنچ جانے کے باوجود امید نہیں رکھتی کہ شہریار نے اس سے کچھ ہوٹل میں اس سے کہا تھا، اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔ اس کے تاثرات سے بے نیاز شہریار اسے اپنے ساتھ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا رخ اپنے ماموں ممانی کے بیڈ روم کی طرف تھا۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دی۔



''یس کم اِن۔'' اندر سے مسز آفرین رانا کی بوجھل سی آواز آئی۔ وہ دروازہ بے آواز کھول کر اندر داخل ہوا۔ ماریہ بھی خودکار انداز میں اس کے ساتھ تھی۔

''شیری.....'' آفرین رانا جو شاید کسی ملازم کی آمد کی توقع کر رہی تھیں، اسے اچانک سامنے پا کر خوشی سے نہال ہوئیں اور فوراً ہی بستر سے اُٹھتے ہوئے اس کے لیے اپنی بانہیں وا کر دیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر انہیں خود سینے سے لگا لیا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی وہ سسکنے لگیں۔

''پتہ نہیں کون ہے جو ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ پہلے شینا گئی، پھر سجاد اور اب جانے کس کو نشانہ بنانا چاہا تھا انہوں نے۔ پوری گاڑی گولیوں سے چھلنی ہو گئی ہے۔ دیکھو شیری! میں بتا رہی ہوں کہ اگر اب کسی کو کچھ ہوا تو میں برداشت نہیں ہو گا۔'' وہ روتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں۔ یہ ایک ایسی عورت کے جذبات تھے جس نے اپنی نومر پوتی اور اکلوتے بیٹے کی موت کا دکھ سہا تھا۔ اس شکستہ دل عورت کے لیے واقعی اب مزید کچھ اور برداشت کرنا مشکل تھا۔

شہریار دھیرے دھیرے ان کی پشت سہلاتا انہیں چپ کروانے کی کوشش کرتا رہا۔

''لیک اِٹ ایزی ممانی جان! اگر آپ اس طرح روتی رہیں تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''ہونے دو میری طبیعت خراب۔ اپنے بچوں کے بعد اب میں جی کر کروں گی بھی کیا؟'' وہ بہت زیادہ اعصابی تناؤ کا شکار تھیں۔

''کیوں، میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں کیا؟ آپ میری خاطر جینے کا کیوں نہیں سوچتیں؟'' شہریار نے شکوہ کیا۔

''تم تو میری جان ہو۔ اگر تم نہیں ہوتے تو میں سجاد کے بعد ایک سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ تم ہی تو ہو جن کی خاطر میرے اندر تھوڑی سی زندگی باقی ہے۔'' انہوں نے شہریار کے شکوے کے جواب میں اس کی بلائیں لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ان سے شکوہ کیا تھا اس لیے تھا کہ ان کا دھیان بٹ سکے اور وہ اعصابی تناؤ سے تھوڑا سا باہر آ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر رہی اور وہ رونا دھونا بھول کر اس کی فکر میں مبتلا ہو گئیں۔

''میں بھی بے وقوف ہوں۔ تم اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو، بجائے تمہاری خاطر مدارات کرنے کے رونے لگ گئی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو منگواتی ہوں۔'' انہوں نے گویا ممانی کی کوشش کی۔ وہ شہریار میں اتنی بری طرح اُلجھی ہوئی تھیں کہ اب تک انہوں نے کمرے میں ماریہ کی موجودگی کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

''یہ سب کرتی رہیے گا۔ لیکن پہلے ان سے تو ملیں۔ یہ ڈاکٹر ماریہ جوزف ہیں۔'' شہریار نے خود ہی انہیں ماریہ کی طرف متوجہ کیا۔

''مجھے کسی ڈاکٹر واکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ماموں جان بھی مجھے ہسپتال میں ایڈمٹ کروانے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں ہرگز ہسپتال میں نہیں رہوں گی۔ آپ کو شوق ہے تو آپ خود رہیں۔'' ماریہ کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ سن کر انہوں نے یہی گمان کیا کہ شہریار اسے ان کے علاج کے لیے ساتھ لے کر آیا ہے اس لیے فوراً احتجاج کرنے لگیں۔

''اس ڈاکٹر کو اب آپ کو ساری زندگی برداشت کرنا پڑے گا۔'' ان کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے شہریار نے انہیں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکیں۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ ماموں جان کہاں ہیں؟'' ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے سے پوچھا۔

''وہ مختار بھائی سے ملنے گئے ہیں۔'' انہوں نے اس کے سوال کا جواب تو دے دیا لیکن ماریہ پر ٹکی ا ہوئی نظریں بتا رہی تھیں کہ ان کا ذہن شہریار کی بات میں ہی اٹکا ہوا ہے۔

''ادھر آئیں، یہاں بیٹھیں۔'' شہریار ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر انہیں ایک ٹوسیٹر تک لے گیا۔ ما بھی اس نے اشارے سے ایک سنگل صوفے پر بیٹھنے کا کہہ دیا تھا۔ اس کشادہ بیڈ روم میں وسیع و عریض بیڈ علاوہ روم ریفریجریٹر اور مکمل صوفہ سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ گھر کے افراد بعض اوقات ان کے بیڈ روم میں جمع ہو تھے تو اس سیٹنگ کی وجہ سے اُٹھنے بیٹھنے میں آسانی رہتی تھی۔

''آپ بہت دنوں سے اصرار کر رہی تھیں کہ نا کہ اب مجھے.....'' اس نے ماریہ سے شادی کا فیصلہ سنا لیے گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور مریم سجاد رانا کمرے میں داخل ہوئی ما

''مجھے معلوم ہوا کہ شہریار آیا ہے تو میں ملنے کے لیے چلی آئی۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہو لیکن یہ مسکراہٹ بے حد پھیکی تھی۔ شینا اور سجاد رانا کی موت نے اسے بالکل گھلا کر رکھ دیا تھا۔ بہت زیا نہ ہونے کے باوجود وہ بوڑھی سی دکھائی دینے لگی تھی۔

''السلام علیکم بھابی! آئیں بیٹھیں۔ اچھا ہوا کہ آپ خود آ گئیں۔ ورنہ میں آپ کو بلانے ہی والا تھا شہریار نے خوشگوار انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اس خوشگواری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اسے اپنے آپ پر خاصا جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں اس کے ساتھ جو کچھ پیش آ چکا تھا، وہ اس کے لیے اتنا ہولناک کہ اگر اسے اپنے پیاروں کی پروا نہ ہوتی تو وہ عمر بھر مسکرانا ہی چھوڑ دیتا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے بڑے امتحان سے گزر رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کا اتنا اہم رشتہ اس طرح جوڑ کہ اس رشتے کی بنیاد نہ تو محبت پر ہوگی، نہ ہی پسند پر۔ وہ یہ اہم ترین رشتہ خود سے سرزد ہونے والے گنا تلافی کے لیے جوڑنے جا رہا تھا۔

''لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔'' مریم نے بیٹھتے ہوئے وہاں موجود ماریہ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بولی یقیناً ایک اجنبی لڑکی کی آفرین رانا کے بیڈ روم میں شہریار کے ساتھ موجودگی خاصی معنی خیز تھی۔

''بات تو خاص ہی ہے۔ میں آپ کی ہونے والی دیورانی کو آپ سے ملوانے لایا تھا۔'' آخر کار شہریار وہ خبر سنا ہی دی جو خاصی دھماکا خیز تھی۔ خصوصاً مسز آفرین رانا کے لئے۔ انہیں بہت اچھی طرح یاد تھا کہ شہر نے اس لڑکی کا تعارف ماریہ جوزف کے نام سے کروایا تھا، یعنی وہ اپنی شریکِ حیات کے طور پر ایک غیر مس لڑکی کا انتخاب کر چکا تھا۔ اگرچہ یہ بات ان کی کلاس میں اتنی انوکھی نہیں تھی لیکن خود رانا خاندان میں کبھی ا اتفاق پیش نہیں آیا تھا۔

⊛----✪----⊛

آنکھ بند ہونے اور کھلنے کے درمیان زندگی میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہو جائے گا، یہ ماہ بانو نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

رات وہ اپنی روم میٹ کی دی ہوئی ٹرنکولائزر کھا کر سوئی تھی تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ہاسٹل کے بجائے کم اور جگہ آنکھ کھلے گی۔ کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہیں آ سکا کہ ہاسٹل کا وہ بے رونق چھوٹا سا کمرہ اس سجے سجائے کشا



گئے میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟ لیکن پھر جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ صرف کمرے کا نقشہ اور حدودِ اربع نہیں ا بلکہ سب کچھ بھی بدل گیا ہے۔

وہ جس کمرے میں تھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کمرہ تو بے شک اجنبی تھا لیکن ا پر ٹنگی فریم شدہ تصویر تعارف کروا رہی تھی کہ کمرے کا مالک کون ہے اور ایک بار پھر کس کی قید میں پہنچ چکی ا کلف لگے شلوار کُرتے میں، سر پر اونچے شملے کی پگڑی باندھے وہ سو فیصد چودھری افتخار عالم شاہ ہی تھا اس کی اندرونی خباثت تصویر میں بھی چہرے سے جھلک رہی تھی۔

ماہ بانو متوحش انداز میں بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیر کی طرح دروازے تک پہنچی۔ دروازہ باہر سے بند ا ہینڈل سے کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد جب وہ تھک گئی تو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ اُس کی اس ا کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور دروازے کے دوسری طرف یوں خاموشی چھائی رہی جیسے وہاں کوئی موجود ہی ا۔ آخر کار ماہ بانو کو تھک ہار کر یہ کوشش بھی ترک کرنی پڑی۔ وہ واپس آ کر بیڈ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ وہ تو شہریار کی بے رُخی کے سوگ میں رت جگا منا ا تھی کہ اپنی روم میٹ کے مشورے پر اس کی دی ہوئی ٹرنکولائزر کھا کر سو رہی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس پر کیا گزری اور وہ کیسے یہاں تک پہنچی؟ اگر وہ اس وقت پیر آباد میں تھی تو کراچی سے پیر آباد کا ا اتنا مختصر تو نہیں تھا کہ وہ صرف ایک گولی کے نشے کے زیر اثر سوتی رہتی، وہ بھی اس عالم میں کہ سرے سے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔

اس صورتِ حال پر اس کے ذہن میں خود بخود یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ شاید اس کی روم میٹ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور ٹرنکولائزر کے نام پر کوئی ایسی طاقتور نشے کی گولی دی تھی جس نے اسے بے ہوش ہی کر ڈالا ا لیکن اس صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر چودھری نے اس کے ہاسٹل تک رسائی کیسے حاصل کی؟ کیا چودھری کے اثر و رسوخ کے سامنے ان کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں؟ وہ اس کا نام بدل کر رہنا، باہر نکلنے کے لیے نقاب استعمال کرنا، اپنے کسی جاننے والے سے رابطہ نہ کرنا، سب بے کار چلا گیا تھا۔ اور وہ جس ا سے بھاگتی پھر رہی تھی، پھر اس کے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔ شاید اس کے دل کو اس انہونی کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی جب ہی تو مسلسل گھبرائے جا رہا تھا اور اسی گھبراہٹ کی وجہ سے اس نے شہریار کی طرف سے عائد ا پابندی کو نظر انداز کر کے اسے فون کرنے کی جسارت کر لی تھی۔ لیکن اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں اور اب وہ یہاں تھی۔ چودھری کے نہ جانے کس ٹھکانے پر۔ معلوم نہیں کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچ بھی پاتا یا نہیں؟

وہ سانپوں کی طرح ڈستے کئی سوالوں کے درمیان پھنسی عجیب اُدھیڑ بُن میں بیٹھی تھی کہ دروازہ ہلکی آواز کے ساتھ کھلا۔ اس نے آواز پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کھلے دروازے سے چودھری اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''بلّے بھئی بلّے..... یہ تو اپنی ماہ بانو بیگم صاحبہ ہے۔'' اس سے نظر ملتے ہی وہ طنز بھرے لہجے میں بولا تو ماہ ا نے نفرت سے اپنے چہرے کا رخ بدل لیا۔

''نہ کُڑیے! ایسے منہ نہ موڑ..... اس بُوتھے کو دیکھنے کے لیے تو ہم نے جانے کدھر کدھر کی خاک چھانی ہے۔ بہت بھاگے ہیں تیرے پیچھے۔ فیر سنا کہ تُو پہاڑوں پر دھماکے میں مر گئی ہے۔ مت پوچھ تیرے مرنے کا ن کر دل پر کیا گزری تھی۔ ایسا سوہنا چہرہ اور مکھن ملائی سا بدن ہم سے داد پائے بغیر ہی ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا..... ن کر کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔'' وہ ماہ بانو کے رخ پھیرنے پر مزید ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے قریب چلا

آیا اور اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

''دُور رہو مجھ سے غلیظ آدمی!'' ماہ بانو نے یوں اس کے ہاتھ جھٹکے جیسے وہ انسانی ہاتھ نہ ہوں، رینگتے ہوئے کیچوے ہوں۔ ویسے اسے چودھری کی معلومات پر حیرت تھی۔ اسے اس کے بارے میں ساری خبریں تھیں۔

''واہ بھئی واہ..... تُو تو اب بھی ویسی ہی تیکھی ہے۔'' چودھری خباثت سے ہنسا پھر بولا۔ ''ویسے تیرا کرنا بنتا ہے۔ آخر اے سی شہریار کا ہتھ ہے تجھ پر۔ اب تک وہی تو مرغی کی طرح تجھے اپنے پروں میں چھپا ہے..... پر دیکھ لے، ہماری لگن بھی سچی تھی۔ ہم تجھے وہاں سے بھی نکال لائے جہاں کسی کا دھیان ہی نہیں سکتا تھا۔ مہرین..... واہ بھئی واہ! کیا سوہنا نام چنا تھا تُو نے اپنے لئے۔ ویسے صحیح بتا، تُو نے چنا تھا یا اپنے صاحب نے؟..... آدمی وہ بھی کم باذوق نہیں ہے۔ ایسے ہی ہمارا رقیب نہیں بن گیا۔ اس کا بھی دل آ گیا تیرے جیسی سوہنی کُڑی پر۔'' چودھری مسلسل اس کے ساتھ ٹھٹھول کر رہا تھا۔

اس کی بات سن کر ماہ بانو کا دل بھر آیا۔ ایک یہی تو یقین نہیں تھا اس کے پاس کہ شہریار نے بھی اپنا دل کے آگے ہارا ہوگا۔ وہ مہربان بھی ہوتا تو اس طرح کہ انسانیت کے نام پر ہمدردی کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا جذبے کا تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا جسے محبت کا نام دیا جا سکے۔

''تمہیں میرے بارے میں کس نے اطلاع دی کہ میں کراچی میں ہوں؟'' تمام باتوں سے اپنا دھیان ہٹاتے ہوئے اس نے اس شخص کا نام جاننا چاہا جو اس کی اسیری کا سبب بنا تھا۔

''اطلاع..... ہا..... یہ بھی خوب سوال پوچھا تُو نے۔ گل یہ ہے بی بی! کہ جدھر پیسہ ہو، اُدھر سب کام چلا آتا ہے۔ پیسے کے لیے یہ لوگ اپنے باپ کو بیچ دیتے ہیں، خبریں پہنچانا کون سی وڈی گل ہے۔'' چودھری جو جواب دیا، اس سے ماہ بانو کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔ البتہ اس نے اتنا ضرور سمجھ لیا کہ اس کی جان پہچان کسی شخص نے ہی مخبری کی ہے۔ وہ صبر سے چودھری کی بڑھکیں سننے لگی کہ شاید وہ شیخی میں مخبر کا نام بھی بتا دے لیکن اس سے قبل ہی چودھری کا موبائل بجنے لگا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کال شاید کسی خاص شخص کی طرف سے تھی۔ وہ جوش و خروش سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔

''کیا دس رہے ہو تسی۔ یہ تو بہت ہی وڈی خبر ہے۔'' فون کرنے والے نے نہ جانے کیا خبر سنائی تھی چودھری پھڑک اُٹھا۔

''بہت بہت مبارک ہو جی! آپ کو اے سی داماد مل رہا ہے۔'' چودھری زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ماہ بانو کو نظر انداز کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی دروازے کے قریب کھڑے ایک گن نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اگر اس وقت دروازہ کھلا بھی رہ جاتا تو ماہ بانو کسی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر رہتی اس کا ذہن تو چودھری کے جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

جانے فون پر کون تھا جسے چودھری، اے سی داماد ملنے پر مبارکباد دے رہا تھا۔ ملک بھر میں صرف شہریار ہی اے سی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پوسٹ پر بہت سے لوگ کام کر رہے تھے لیکن وہ تو بس شہریار کو ہی جانتی تھی۔ اور اگر وہ کسی اور کا بننے جا رہا تھا تو یہ خبر اس کے دل میں چٹکی محبت کی نوخیز کلی کے لیے سخت آندھی کی طرح تھی۔ اس تند و تیز آندھی کی زد میں آ کر وہ نوخیز کلی بری طرح لرز رہی تھی۔ محبوب کو نہ پا شاید کبھی بھی اتنا بڑا حادثہ نہیں ہوتا جتنا اس کا کسی اور کے ہو جانے سے صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی صدمے کی زد میں تھی۔

⊛----✪----⊛



مختار مراد بے یقینی کے انداز میں آئی جی مختار مراد کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مختار مراد نے اسے ورما کے فرار کی خبر سنا دی تھی۔ ایک ایسا شخص جس سے اس کی صرف ذاتی دشمنی ہی نہیں تھی بلکہ وہ ملک و قوم کا بھی مجرم تھا، اس کے بعد اتنی آسانی سے بھاگ نکلا تھا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ورما کی گرفتاری کے لیے اس نے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے اس شخص کو شکنجے میں کسا تھا۔ اس کا ورما کی گرفتاری کی خاطر کراچی جانا اور پھر ماہ بانو کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر چھاپہ مارنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس سرگرمی کے نتیجے میں وہ خود بھی ورما کے ہاتھ سے نقصان اٹھا سکتا تھا۔ کسی کے علم میں آنے پر اس کی نوکری بھی جا سکتی تھی لیکن اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر صرف اور صرف ورما کو پکڑنا ضروری سمجھا تھا اور اب اسے پتا چلا تھا کہ ورما فرار ہو چکا ہے۔ وہ تو خود کو ملنے والے ایک دھمکی آمیز پیغام کو مختار مراد سے ڈسکس کرنے آیا تھا۔ آج لاہور پہنچنے کے صرف دو گھنٹے بعد اسے ایک عام سے لفافے میں کوریئر سروس کے ذریعے یہ پیغام مل گیا تھا۔ لفافے میں موجود کاغذ پر ایک مختصر تحریر درج تھی۔

''خود کو ہمارے معاملات سے الگ رکھو۔ ورنہ اپنے پورے خاندان کو کھو دو گے۔ ابھی ہم نے تمہیں صرف وارننگ دی ہے۔''

اس تحریر کو پڑھ کر وہ اُلجھ گیا تھا کہ اسے یہ دھمکی دینے والا کون ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس نے اپنے لیے خاصی دشمنیاں پال لی تھیں۔ ایک طرف اگر چودھری افتخار عالم شاہ سے اس کے ڈھیروں اختلافات تھے تو دوسری طرف وہ ''را'' والوں کو بھی چھیڑ بیٹھا تھا۔ دشمنی میں چودھری کے بھی حد سے گزر جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ورما کی گرفتاری کی شکل میں اس کی حالیہ جھڑپ ''را'' والوں سے ہوئی تھی۔ پھر لیاقت آباد کی گاڑی پر جس منظم طریقے سے فائرنگ کی گئی تھی، اس سے بھی یہی لگتا تھا کہ اس کام کے پیچھے عام غنڈے بدمعاشوں کے بجائے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ اس لیے اس کا زیادہ شک ''را'' کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اپنے شک کی تصدیق کرنے کے لیے وہ مختار مراد سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں تو ایک اور ہی خبر اس کی منتظر تھی۔ مختار مراد نے اس کے شکوک کی تائید کرتے ہوئے اسے بتایا کہ حملہ یقیناً ''را'' والوں کی طرف سے ہی کیا گیا تھا کیونکہ ورما کے فرار کے بعد انہیں یہ علم ہو گیا ہوگا کہ اسے گرفتار کرنے والا شہریار ہے۔

''آپ نے اتنی بڑی خبر مجھ سے چھپا کر رکھی۔'' کچھ دیر بعد وہ بولنے کے لائق ہوا تو اس نے مختار مراد سے شکوہ کیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہ خبر سن کر بہت پریشان ہو جاؤ گے اس لیے میں نے تمہیں خبر نہیں دی لیکن یہ جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور تمہیں دھمکی آمیز پیغام ملا ہے، اس کے بعد مجھے لگا کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ تم اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے محتاط ہو جاؤ۔ میں تو شروع ہی سے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ خود کو ایسے معاملات میں ملوث نہیں کرو۔ رانا صاحب کی فیملی کے لیے تم بہت اہم ہو۔ سجاد کو کھونے کے بعد ان کے پاس تم ہی بچے ہو۔ نہ وہ تمہیں کھونا برداشت کر سکتے ہیں، نہ تمہیں ان میں سے کسی کا نقصان برداشت ہو گا۔ تمہارے دشمن بھی یہ بات سمجھتے ہیں اور رانا صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کروا کر وہ اسے باور بھی کرا چکے ہیں۔'' مختار مراد ہمیشہ کی طرح اسے نصیحتیں کرنے لگا۔ وہ ہونٹ بھینچے اس کی ساری باتیں سنتا گیا۔ اندر اُبلتا ہوا لاوا اپنی جگہ لیکن مختار مراد کی حیثیت اس کے لیے ایک بزرگ کی سی تھی جس سے اختلاف ہونے کے باوجود اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

''ورما کس طرح فرار ہوا؟ کیا اس کی سکیورٹی کا انتظام صحیح طرح نہیں کیا گیا تھا؟'' مختار مراد کے خاموش

ہونے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''اصل میں وہ ابھی تک کراچی پولیس کی ہی کسٹڈی میں تھا۔ اسے اس نوعیت کے زخم آئے تھے کہ طور پر یہاں شفٹ کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اسے ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال کے اسپیشل روم میں رکھا تھا۔ سکیورٹی کا بھی ٹھیک ٹھاک انتظام تھا لیکن اس کے ساتھیوں نے گیم ایسا کھیلا کہ سکیورٹی والے بھی گئے۔ انہوں نے ہسپتال کے سینئر سرجن ڈاکٹر نقوی کو ٹریپ کر کے اس طرح کی سچویشن کری ایٹ کی کہ ورما کو فرار کروانے میں کافی آسانیاں مل گئیں۔'' وہ اسے تفصیل بتانے لگا کہ کس طرح ڈاکٹر نقوی کے نواسے اسکول سے واپسی میں اغوا کیا گیا اور پھر اس کے گھر کی خواتین کو ہراساں کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے کیا گیا کہ اگر اپنے نواسے کی واپسی چاہتے ہو تو ہمارے احکامات کی تعمیل کرو۔

اپنے اکلوتے نواسے کی خاطر ڈاکٹر نقوی نے ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بننا قبول کر لیا اور جو کچھ اس کہا گیا، اس پر عمل کر ڈالا..... لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ظالموں نے اس کا نواسا اس صورت میں واپس کیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ انویسٹی گیشن ٹیم کے سامنے جو سچویشن آئی تھی، اس سے انہیں شک تو ہو گیا ورما کے فرار میں ڈاکٹر نقوی نے مدد دی ہے لیکن خود ڈاکٹر نقوی اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا..... نواسے موت کی اطلاع ملی تو وہ ہمت ہار بیٹھا اور اس نے تفتیشی افسر کو سب کچھ بتا دیا۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ صحیح اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ اس سے کرنے کو کہا جا رہا ہے، اس کا کیا ری ایکشن سامنے آئے گا۔ اس صرف یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کسی بہانے سے ورما کو ہسپتال کے گراؤنڈ فلور تک بھجوا دو۔ ہسپتال میں ہر نوعیت لیبارٹریز گراؤنڈ فلور پر ہیں چنانچہ ڈاکٹر نقوی نے اسکیننگ کے بہانے اسے نیچے بھجوا دیا۔ وہاں ورما کے وزیٹرز کے بہروپ میں پہلے ہی سے تیار تھے۔ انہوں نے اچانک ہی اس طرح حملہ کیا کہ سکیورٹی اہلکار سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' مختار مراد نے اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''یہ بہت برا ہوا۔ اب دوبارہ ورما پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو گا۔ وہ مکمل طور پر چھپ کر بیٹھ جائے گا اور کارروائیاں کرتا رہے گا۔'' شہریار کا افسوس کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''کرنے دو اسے کارروائیاں۔ وہ کوئی ایک تو نہیں ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو ہمارے درمیان ہمارے ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح کا گیم تو ساری دنیا میں کھیلا جا رہا ہے۔ ہر ملک نے اپنی ایجنسیز کو دوسرے ملکوں میں پھیلا رکھا ہے۔ ان کے ایجنٹ جاسوسی کے ساتھ ساتھ تخریبی کارروائیاں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے دشمن سے پڑا ہے جو کینہ پرور اور کم ظرف ہے۔ ہمارے لیے مسائل بھی زیادہ کھڑے کرتا ہے۔ تم اتنی ٹینشن مت لو۔ ہمارے افسران کوشش کر رہے ہیں کہ طرح ورما کو دوبارہ گرفت میں لیا جا سکے۔ انشاء اللہ بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ تم سب بھول بھال کر اس وقت اپنی خوشی میں خوش رہو۔ میری مریم سے بات ہوئی تھی، اس نے مجھے بتایا ہے کہ کوئی لڑکی پسند کر لی ہے اور جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوئی اور میں چاہتا کہ تم بھی خوش رہو۔ شادی انسان کی زندگی کا بہت اہم موقع ہوتا ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اس بھرپور طریقے سے انجوائے کرو۔ بہت بڑے بڑے صدمے سہنے کے بعد رانا فیملی ایک خوشی دیکھنے ہے۔ اگر اس موقع پر تم ہی آپ سیٹ رہے تو باقی لوگ کس طرح انجوائے کریں گے؟ یہ زندگی ہے بیٹا! بہت کچھ ہماری مرضی اور خواہش کے برخلاف ہوتا ہے اور ہمیں اسے نظر انداز کر کے خود کو حالات کے ڈھالنا پڑتا ہے۔'' اس کے لہجے میں بزرگانہ شفقت اور خلوص جھلک رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، شہریار



اس سے کتنا قریب تھا، خود اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن خود شہریار کی اندرونی کیفیت رقیق ہو رہی تھی۔ اس زندگی میں جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ ہونے جا رہا تھا، وہ اس کی مرضی اور خواہش کے کتنا برخلاف تھا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار لڑکھڑانے والے قدموں نے اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا تھا اس کی پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر سمندر کے سے سکوت کے ساتھ سب کچھ خود ہی سہہ رہا تھا۔

اگر ماریہ کو اپنی پسند قرار دے کر اس نے اس کے غیر مسلم ہونے کا اعتراض بھی رد کر ڈالا تھا۔ رانا ہاؤس اس کے اس فیصلے کو قبول کر لیا گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اتنے خوش نہیں ہیں جتنے ماریہ کے مسلمان ہونے کی صورت میں ہوتے۔ ان کی یہ نیم دلی خود اس کے لیے بہت دکھ کا سبب تھی لیکن وہ مجبور تھا..... بے حد مجبور تھا کہ وہ اس مرحلے پر ماریہ کو اپنانے سے انکار کر کے اپنے ضمیر کی مار نہیں سہہ سکتا تھا۔ اس کے پاس دو راستے تھے، اگر وہ اپنے دل کی خوشی دیکھتا تو ماریہ کو اس کے حال پر چھوڑ سکتا تھا۔ کون تھا جو اس کا گریبان پکڑتا؟ لیکن وہ تو ضمیر کی عدالت میں پھنس گیا تھا۔ ضمیر اسی صورت میں مطمئن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گناہ کا ازالہ کرے۔ چنانچہ اس نے دل کی خوشی کے مقابلے میں ضمیر کے اطمینان کو منتخب کر لیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''میرے پپو نے حد کر دی ہے تاجور! حیاتی گزر گئی، اُس کی عیاشیاں دیکھتے اور برداشت کرتے۔ وہ مجھ پر سوکن لا کر بٹھاتا گیا، میں نے سہہ لیا۔ طوائفوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا، میں کچھ نہیں بولی۔ وہاں وہ میم آ کر حویلی میں رہی، تب بھی زبان بند رکھی..... پر اس ماہ بانو کی بچی کو نہیں برداشت کر سکتی۔ میں نے اس لیے برداشت کر لی تھیں کہ وہ خاندانی عورتیں تھیں، کسی کمی کمین کو تیرے باپ نے حویلی میں لا کر نہیں بٹھایا تھا۔ پر اب وہ ایسا کرنے لگا ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والوں کی اولاد اگر حویلی میں آ جائے گی تو فرق ہی کیا رہے گا ہم میں اور اُس میں؟..... تیرا پپو اگر اُسے رکھیل بنا کر رکھتا تو میں کہتی کہ آخر اس کا طوائفوں کے پاس جانا بھی تو برداشت کرتی ہوں۔ ہر وڈے زمیندار کی گھر والی کو برداشت کرنا بھی پڑتا ہے، پر طوائف سے دل بہلانے اور بیچ خاندان کی عورت کو بیوی بنانے میں وڈا فرق ہوتا ہے۔ میں نے تو شکر کیا تھا کہ وہ چڑیل کہیں دفعان ہو گئی اور تیرے پپو کے سر سے ایک ہور ویاہ رچانے کا بھوت اترا۔ لیکن وہ تو اُسے فیر لے آیا ہے اور لا کر رکھا بھی حویلی کے مہمان خانے میں ہے..... جس کا مطلب ہے کہ وہ اس کل کی چھوکری سے ویاہ ضرور رچائے گا۔''

وڈی چودھرائن اپنی بڑی بیٹی تاجور کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ اگرچہ چودھری نے بہت پہلے پر ماہ بانو کو مہمان خانے میں رکھا تھا لیکن وڈی چودھرائن تو پھر وڈی چودھرائن تھی۔ حویلی کا انتظام و انصرام اس کے ہاتھ میں تھا تو ایسے ہی نہیں تھا۔ اس کے جاسوس حویلی میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعے کی اطلاع بھی اس تک پہنچاتے تھے۔ عملی طور پر حویلی کی عورتوں کا مہمان خانے سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اسے حویلی نے والے مہمانوں کے بارے میں سب معلوم ہوتا تھا کہ کون کب آیا اور کب تک ٹھہرا۔ ماہ بانو وہاں لا گئی تھی تو بھی اس سے چھپ نہیں سکا۔ ماہ بانو کی حویلی میں موجودگی کا سن کر اسے پتنگے لگ گئے لیکن اس معاملات میں چودھری سے بھڑنے کے بجائے اپنی مشیر خاص تاجور کو بلا بھیجا۔ بڑی بیٹی ہونے کے ناتے وہ اسے بہت قریب تھی اور وہ اکثر اس سے مشاورت کرنا پسند کرتی تھی۔ اس وقت بھی وڈی چودھرائن نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد ماں کی طرف دیکھا تو اس کی

آنکھوں میں ایک واضح خیال چمک رہا تھا۔

''میرا خیال ہے اماں! ہمیں یہ مسئلہ اشرف شاہ کے سامنے رکھنا چاہئے۔ اباجی کا ایک ہور ویاہ تو بھی برداشت نہیں ہوگا۔ اباجی ہور ویاہ کر کے جائیداد کے وارثوں میں اضافہ کریں، یہ ہم میں سے کسی نہیں۔ اشرف شاہ کو ملوم ہے کہ اباجی کے بعد جاگیر کا سارا انتظام دامادوں کے ہاتھ ہی آنا ہے۔ بھائی امریکہ سے واپس پلٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور بہزاد شاہ کسی کم جوگا نہیں۔ اپنے بھلے کا سوچ کر اشرف چنگا ہی مشورہ دے گا۔''

''تُو کہتی ہے تو فیرا سے یہاں بلوا کر اس سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ تیرے ساتھ ہی آیا ہے نا؟'' چودھرائن نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساتھ ہی ہیں۔ مردانے میں رک گئے تھے کہ اباجی سے ملاقات کر لیں گے۔'' تاجور نے بتایا۔ چودھرائن نے ایک ملازمہ کو پکار کر اسے حکم دیا کہ اشرف شاہ کو مردانے سے بلا لائے۔ ملازمہ حکم کی تعمیل کے لیے پلٹ گئی تو ماں بیٹی ایک بار پھر باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

''چھوٹی اماں کہاں ہیں، نظر نہیں آئیں۔ پچھلی واری بھی آئی تھی تو ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔'' تاجور نے چودھرائن ناہید کے بارے میں دریافت کیا۔

''پڑی رہتی ہے کسی کمرے میں منہ چھپا کر۔ بیٹی نے کسی کو منہ دکھانے جوگا چھوڑا ہی کہاں ہے۔'' وڈی چودھرائن نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔ ساری زندگی حویلی کی سب سے با اختیار عورت کی حیثیت سے گزارنے کے باوجود اس کے دل میں سوکن کے لیے حاسدانہ جذبات ہی رہے تھے اور اب جبکہ وہ بیٹی کے سے معتوب ٹھہرائی گئی تھی تو اس کے دل کو ایک سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

''کم تو وڈا دکھایا ہے کشور نے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس ماسٹر سے عشق لڑاتی رہی اس کے ساتھ نکل بھی گئی..... پر اتنا تو مجھے بھی ملوم ہے کہ اباجی اسے چھوڑیں گے نہیں۔ انہوں نے اپنے ان دونوں کی تلاش میں لگا رکھے ہوں گے۔ جس دن دونوں ہاتھ لگے، دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔ اباجی ٹوٹے کروا دیں گے ان کے۔'' تاجور نے تبصرہ کیا۔

''ہوتا رہے جو ہونا ہے۔ مجھے تو اب اس نئی مصیبت کی فکر لگی ہے جو تیرا پیو میرے سر پر ڈالنے والا۔'' وڈی چودھرائن نے بیزاری سے جواب دیا۔ اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تو ماں بیٹی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

''سلام پھپھی!'' اگلے لمحے اشرف شاہ اندر داخل ہوا اور وڈی چودھرائن کو سلام کیا۔

''جیتا رہے میرا پتر۔ آ اِدھر بیٹھ۔ وڈے دن گزرے تجھ سے ڈھنگ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' چودھرائن نے لہجے میں شیرینی سموتے ہوئے اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

''ہم مردوں کے دھندے ہی اتنے ہوتے ہیں کہ کسی سے گل بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ ان کی زنانیوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لڑاتے رہے تو چل چکے ہمارے دھندے۔'' اشرف شاہ وڈی چودھرائن کا صرف داماد ہی نہیں، سگا بھتیجا بھی تھا لیکن بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں وہی نخوت تھی جو چودھرائن کا خاصہ تھا۔

''تُو ٹھیک کہہ رہا ہے پُتر! پر بعض دفعہ زنانیاں بھی ایسی عقل کی گل کرتی ہیں جو مردوں کے لیے (فائدے) کی ہوتی ہیں۔ ابھی میں نے تجھے ایسی ہی گل کے لیے بلایا تھا۔'' وڈی چودھرائن نے اپنے



لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

''اچھا..... میں بھی تو سنوں کہ ایسی کون سی گل ہے؟'' اشرف شاہ اپنی جگہ پر سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''اسی کُڑی ماہ بانو کا قصہ ہے۔ ڈھونڈ نکالا ہے تیرے پھپھا نے اُسے فیر سے۔ اس بڈھے ویلے اُس کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ مرا جا رہا ہے اس کُمی ذات سے ویاہ کے لئے۔ ویاہ ہو گیا اور عشق کی زور آزمائی میں کوئی بچہ بھی پیدا ہو گیا تو مطلب ہے جائیداد کا ایک وارث ہور آ گیا۔ میں کہتی ہوں ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی کوئی حل سوچو۔ کسی طرح کام تمام کرو اس کُڑی کا۔ جان چھڑاؤ اس سے۔'' چودھرائن نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھی۔

''تو فکر ہی نہ کر پھپھی! بس سمجھ کہ تیری جان چھوٹ گئی اس مصیبت سے۔ ایسا غیب کرواؤں گا اسے کہ فیر کبھی دوبارہ اس کی شکل نظر نہیں آئے گی کسی کو۔'' اشرف شاہ گویا لمحوں میں سب کچھ سوچ بیٹھا تھا۔

''جیتا رہ میرا پُتر! میں بھی تو سنوں کہ تُو نے ایسا کیا حل سوچا ہے؟'' وڈی چودھرائن نے خوشی سے باچھیں کھلاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ میرا مسئلہ ہے پھپھی! تُو بس اتنا کر کہ مہمان خانے میں آج کل ڈیوٹی دینے والے نوکروں میں سے کسی ایسے نوکر کو بلا لے جو جی دار بھی ہو اور لالچ میں آ کر ہمارا کام بھی کر دے۔ اصل مسئلہ کُڑی کو مہمان خانے سے نکالنے کا ہے۔ وہ وہاں سے نکل گئی تو سمجھ فیر ایسی غیب ہو گی کہ کسی کو اس کا نام و نشان نہیں ملے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں حجو اور اس کی گھر والی کو بلا لیتی ہوں۔ حجو کی دِھی کا ویاہ ہونے والا ہے، اس کے لیے رقم کی ضرورت تو ہو گی۔ وہ جلدی راضی ہو جائے گا۔'' چودھرائن اشرف شاہ کا پورا منصوبہ تو نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اتنا بہرحال اسے بھی سمجھ آ رہا تھا کہ ماہ بانو کو منظر سے غائب کرنے کے لیے اسے مہمان خانے کی محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکالنا ضروری ہے۔ اس نے فوراً ایک ملازمہ کے ذریعے حجو کی بیوی کو بلوا بھیجا۔ دونوں میاں بیوی کو ایک ساتھ بلوانا مناسب نہیں تھا کہ ایک ساتھ آتے ہوئے وہ دوسرے ملازمین کی نظر میں آ جاتے اور ماہ بانو کے غائب ہونے کے بعد جب چودھری تحقیق کرتا تو اس کے لیے معاملے کی تہ تک پہنچ کر اس واقعے کے پیچھے چودھرائن کا ہاتھ ڈھونڈ لینے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ حجو کی بیوی بلاوے پر فوراً ہی چلی آئی اور سلام کر کے ایک طرف خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ لیکن اس کے چہرے پر موجود حیرانی صاف پڑھی جا رہی تھی۔ یقیناً اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وڈی چودھرائن نے اپنی بیٹی اور داماد کی موجودگی میں اسے کس کام سے بلایا ہے۔

''سنا ہے تیری دِھی کا ویاہ ہونے والا ہے۔ تیاری شیاری ہو گئی تم لوگوں کی یا نہیں؟'' اشرف شاہ نے خود گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''دو چار کپڑے لتوں کے سوا ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اور حجو وڈے پریشان ہیں کہ باقی کی تیاری کیسے ہو گی؟ لڑکے والوں سے گل کی تھی کہ تھوڑی مہلت ہور دے دیں، پر اُدھر لڑکے کی ماں بیمار ہے۔ اسے جلدی ہے کہ بہو گھر لے آئے اس لیے اس نے ہماری گل نہیں مانی۔ اب ربّ کے بھروسے پر بیٹھے ہیں کہ وہ آپ ہی کچھ مدد کرے گا ہم غریبوں کی۔'' حجو کی بیوی کے لہجے میں وہی بے بسی اور عاجزی تھی جو ازل سے اس کے طبقے کا نصیب ہے۔

''تو فیر سمجھ کہ ربّ نے تیری سن لی۔ تیری دِھی کے ویاہ کا سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا۔ تُو ایسا جہیز دینا اپنی دھی کو کہ سارے پنڈ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں۔'' اشرف شاہ نے مچھلی کو چارہ ڈالا۔

''وڈی مہربانی سرکار! آپ کا یہ اتنا وڈا احسان میں نمانی کبھی بھی نہیں اُتار سکتی۔'' حجو کی بیوی کی آواز بھرا

گئی اور وہ اشرف شاہ کے قدموں میں جھکنے کے لیے آگے بڑھی۔

''تُو ہمارا یہ احسان اُتار سکتی ہے..... بس اس کے بدلے میں تجھے ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرنا اشرف شاہ نے مکاری سے کہا۔

''میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں سرکار!'' مجو کی بیوی اب زمین پر بیٹھ چکی تھی اور اس کے ہاتھ شاہ کے پیروں کو چھو رہے تھے۔

''تجھے مہمان خانے میں موجود لڑکی کو وہاں سے نکال کر حویلی کے باہر بھیجنا ہوگا۔'' اشرف شاہ نے طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ مجو کی بیوی سے ساری بات چیت وہ اکیلے ہی کر رہا تھا۔ تاجور اور وڈی چ کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی تھی۔

''وڈے چودھری مجھے جان سے ماردیں گے۔'' اشرف شاہ کی فرمائش سن کر وہ خوف سے پیلی پڑ گئی

''ابھی تو تُو کہہ رہی تھی کہ اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔'' اشرف شاہ نے اسے اس کا وعدہ یاد دلا چپ سی رہ گئی۔

''فکر نہ کر..... تجھے اور تیرے گھر والے کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارا ہاتھ تیرے سر پر رہے گا۔ اپنے کرنے والوں کا ہم پورا خیال رکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے سرکار! میں راضی ہوں۔ مجو بھی میرے کہنے پر مان جائے گا۔ وڈی کی خوشیوں کی خاط اپنی جان دینی بھی پڑی تو دے دیں گے۔ ہمارا کیا ہے، بہت جی لئے۔ بڈھے ہونے کو آئے ہیں۔ اب دس پندرہ برس بعد تو مرنا ہی ہے۔'' وہ خالصتاً ایک ماں کے انداز میں سوچ رہی تھی۔ مجو کے بجائے بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ عورتیں جذباتی انداز میں سوچتی ہیں اور اگر کسی سوچ پر قائم ہو جائیں تو مرد اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہیں۔ اب مجو چاہے لاکھ بیوی کو باز رکھنے کی کوشش کرتا لیکن آخر کار اسے اس کی ماننی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ فیر کل رات تیار رہنا۔ میں بعد میں تجھے بتاؤں گا کہ کب اور کیا کرنا ہے۔'' ا رضامندی پا کر اشرف شاہ نے اس سے کہا اور رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔ مجو کی بیوی اسے جھک کر سلام ہوئی وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کی پشت پر نظر جما کے بیٹھے اشرف شاہ کے ہونٹوں پر معنی خیز سی مسکرا رینگ گئی۔

⊛----✪----⊛

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم نے اتنی ایمرجنسی میں شادی کا فیصلہ کیوں کیا؟ ایک ہفتے کے نوٹس پر بھی شادیاں ہوا کرتی ہیں؟ اتنے ارمان تھے میرے دل میں تمہاری شادی کے لئے۔ سوچا تھا ایسی بَری بناؤں لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ایسی دھوم سے بارات جائے گی کہ دُور دُور تک شہنائی کی آواز سنائی دے گی بھی پتہ نہیں کیا کیا منصوبے تھے میرے ذہن میں۔ تمہاری جلدی نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔'' فو دوسری طرف آفرین رانا تھیں جو اس سے شکوے پر شکوے کیے جا رہی تھیں۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ا سارے شکوے سن رہا تھا لیکن جب ان کے خاموش ہونے کے بعد خود بولنا شروع کیا تو لہجے میں نر شگفتگی تھی۔

''آپ کو کون روک رہا ہے ارمان نکالنے سے؟ جیسی چاہیں بَری بنائیں اور جتنی دھوم سے چاہیں ہا



''آپ تو لڑکے کی ماں ہیں نا اور میں نے سنا ہے کہ لڑکے والوں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ کیا کہتی والی بڑھیاں..... لڑکے کی بَری بازار میں کھڑی۔ تو بس بازار جائیں اور کھٹا کھٹ جو چاہیں خرید ڈالیں۔ ارینج منٹ کے لیے بھی ایسے کئی ادارے کام کر رہے ہیں جو ایمرجنسی میں بھی آپ کو بہت عمدہ سروسز بہا کر سکتے ہیں۔''

''وہ تو میں خود بھی جانتی ہوں۔ تمہارے مفت مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جو مزہ مجھے اطمینان تمہاری شادی کی تیاری کرنے میں آتا، وہ ایک ہفتے میں کیسے آ سکتا ہے؟ مجھے تو ڈر ہے کہ جلد بازی کسی شخص انوائٹ کرنے سے نہ رہ جائے۔ اتنی مصروفیت میں انسان کا دماغ صحیح طرح سے کام ہی کہاں کرتا ہے۔'' وہ بدستور اس سے خفا تھیں۔

''چلیں تو پھر میں آپ کی خوشی کی خاطر ایک شادی اور کرلوں گا۔ ''اُس'' شادی میں آپ ''اِس'' شادی کی والے والی کسر نکال لیجئے گا۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو دوسروں کی خوشی میں ہی خوش ہو جاتے ہیں۔'' اس نے لہجے سوتے ہوئے انہیں چھیڑا۔

درحقیقت وہ خود بھی آفرین رانا کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے والدین کی کے بعد اسے بالکل سگی ماں کی طرح پالا تھا، سو اس کے لیے جذبات اور ارمان بھی سگی ماؤں جیسے ہی رکھتی ں۔ اس نے اپنی مرضی سے ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کا فیصلہ سنا کر ایک طرح سے انہیں ہرٹ کیا تھا۔ اگر ڈاکٹر ماریہ کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ اپنے سرکل کے لوگوں کو فخر سے اپنے سمدھیانے متعارف کروا پاتیں۔ خود شہریار ڈاکٹر ماریہ اور اس کی والدہ کے سوا ان کی فیملی کے کسی فرد سے واقف نہیں ا۔ اگر اس کے سر میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا سودا نہ سمایا ہوتا تو وہ خود بھی کبھی اس شادی کے بارے میں ں سوچ سکتا تھا۔

''شیری! تم خوش تو ہو نا بیٹا؟'' اُس کی شوخی کے جواب میں مسز آفرین رانا نے تشویش سے پوچھا۔

''وائے ناٹ، ڈاکٹر ماریہ مجھے پسند ہے۔ میں اپنی مرضی سے اس سے شادی کر رہا ہوں۔'' اس نے انہیں ین دلانے کی کوشش کی۔

''معلوم نہیں کیوں، مجھے تم خوش نہیں لگتے۔ میرا دل مجھے تمہاری خوشی کی گواہی نہیں دیتا۔'' انہوں نے ے احساسات کا اظہار کیا۔

''اصل میں آپ کا دل اس خیال سے اُداس ہے کہ بیٹا کسی اور کا ہونے جا رہا ہے اس لیے آپ خوشی کو وس ہی نہیں کر پا رہی ہیں۔'' اس نے انہیں چڑانے کی کوشش کی۔

''فضول مت بولو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اس انداز میں سوچنے والی عورت نہیں ہوں۔ تمہیں خود بھی ی طرح یاد ہوگا کہ جب سجاد کی شادی ہوئی تھی تو میں نے خود اس کو اور مریم کو الگ گھر میں شفٹ ہو جانے کو ا تھا تا کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ ویسے بھی ہم جیسی ماؤں کو بہوؤں کے آنے نہ آنے سے کیا فرق تا ہے؟ ہمارے بیٹے ایک جگہ ٹِک کر بیٹھتے ہی کب ہیں جو ہم انہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھ سکیں۔ خود کو ہی لو۔ لاہور سے اتنی دور بیٹھے ہو۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں، تب کہیں جا کر تمہاری شکل دکھائی دیتی ہے۔ بیوی ے پہلے ہی تم اپنی نوکری کو پیارے ہو گئے ہو۔ بہو بے چاری کو کیوں مفت میں بدنام کروں؟ اس کے آنے ے تو مجھے سکون ملے گا کہ کوئی تمہارا خیال رکھنے کے لیے تمہارے پاس موجود ہے۔'' اس کی چھیڑ چھاڑ ے جواب میں آفرین رانا نے ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی۔

''چلیں جناب! میں نے مان لیا کہ آپ ایک آئیڈیل ساس ہیں اور میرے خیال میں مجھے اتنی ساس کا وقت بالکل بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بہو کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے گزار سکے۔'' وہ ایک بار پھر انہیں چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''یہ کہو کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ لگے ہوں گے دس کام تمہاری جان سے اور تم سوچ رہے ہو ممانی جان سے نجات پاؤں تو اس طرف توجہ دوں۔'' وہ بھی اس کی ہی ممانی تھیں اس لیے جوابی جملہ کسنے سے نہ چوکیں۔

ان کی بات سن کر شہریار ہنس پڑا۔ پوری گفتگو میں یہ پہلی ہنسی تھی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔

''شکر ہے تمہاری ہنسی تو سنائی دی۔ اب مجھے کچھ سکون ملا ہے اور میں ذرا اطمینان سے شاپنگ کر سکتی ہوں۔ تم مجھے اجازت دو۔ میرے پاس پہلے ہی وقت کم ہے۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا تو شہریار اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن پھر دوبارہ بجنے والی گھنٹی نے توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

''کراچی سے کوئی مسز رضوی بات کر رہی ہیں سر! کہتی ہیں انہیں آپ سے ضروری کام ہے۔ آپ کی موجودگی میں پہلے بھی دو تین بار کال کر چکی ہیں۔'' دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی تو وہ چونک گیا۔ رضوی اس ہاسٹل کی وارڈن تھیں جہاں ماہ بانو مقیم تھی۔ ان کا بار بار کال کرنا خاصا تشویش ناک تھا۔

''بات کروائیں۔'' تشویش میں گھرے ہوئے اس نے جواب دیا تو آپریٹر نے فوراً ہی لائن کنیکٹ کر دی۔

''السلام علیکم سر! میں مسز رضوی بات کر رہی ہوں۔ ایک اہم اطلاع دینے کے لیے میں مسلسل آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن معلوم ہوا کہ آپ کسی نجی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہیں۔ اور چونکہ مہرین کے بارے میں تھی، اس لیے میں نے آپ کی سخت ہدایات کے پیش نظر کسی اور کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔''

مسز رضوی کو اپنے دفتر کا نمبر دیتے ہوئے اس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر کبھی ماہ بانو کے سلسلے میں کوئی خاص گفتگو کرنی ہو تو وہ اس نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں لیکن اس کے سوا کسی دوسرے شخص سے ہرگز بھی رابطہ نہ کریں۔ اب ان کی کال اور لہجے میں موجود سنسنی اسے احساس دلا رہی تھی کہ کوئی بڑا واقعہ پیش آ گیا ہے۔

''آپ مجھے کیا اطلاع دینا چاہتی ہیں مسز رضوی! مہرین خیریت سے تو ہے؟'' ماہ بانو کراچی میں مہرین کے فرضی نام سے مقیم تھی اس لیے اس نے وہی نام لے کر سوال کیا۔

''میں آپ کو اُس کی خیریت کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ اب وہ میرے ہاسٹل میں مقیم نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟.....وہ ہاسٹل میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟'' شہریار بری طرح اُلجھا۔

''وہ کہاں ہے، میں یہ بھی نہیں بتا سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کچھ لوگ رات کے آخری پہر چوکیدار کو بے بس کر کے ہاسٹل میں داخل ہوئے اور مہرین کو اغوا کر کے لے گئے۔ انہوں نے یہ ساری کارروائی اتنی خاموشی سے کی کہ کسی کو خبر نہیں ہو سکی۔ صبح چوکیدار کو گیٹ سے غیر حاضر پا کر تلاش کیا گیا تو وہ ایک باتھ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بندھا ہوا پایا گیا۔ اس واقعے کی اصل وجہ جاننے کے لیے ہم نے مزید جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ جس کمرے میں مہرین مقیم تھی، اس کا دروازہ باہر سے بند ہے۔ دروازہ کھولنے پر مہرین غائب پائی گئی جبکہ اس کی ساتھی لڑکی اس حالت میں ملی کہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا



گیا۔ لڑکی نے ہی ہمیں بتایا کہ رات کے آخری پہر کچھ نقاب پوش وہاں آئے تھے اور مہرین کو اٹھا کر لے گئے۔ وہ کسی وجہ سے ٹینس ہونے کے باعث ٹرنکولائزر لے کر سوئی تھی اس لیے شور شرابا نہیں کر سکی۔ اس کی ساتھی کو اغوا کنندگان نے اسلحے کے زور پر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور پھر بعد میں اسے باندھ کر چھوڑ گئے۔ وہ بے چاری بھی شور نہیں مچا سکی۔ اب بھی وہ کافی خوف زدہ ہے۔ اس کے والدین نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ پولیس میں رپورٹ لکھواتے وقت ان کی بیٹی کو اس واقعے سے الگ رکھا جائے اس لیے مجھے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ میں یہ معاملہ پولیس کے نوٹس میں ہی نہ لے کر آؤں۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا تھا نا کہ مہرین کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آنے کی صورت میں صرف اور صرف آپ کو آگاہ کیا جائے، کسی اور سے کچھ نہ کہا جائے۔ اس کام میں مشکل تو بہت پیش آئی لیکن میں نے آپ کی ہدایت کے خلاف کچھ نہیں کیا۔''

مسز رضوی بے حد تفصیل سے گفتگو کرنے والی ایک باتونی عورت تھی جس کی فطرت میں لالچ کا عنصر بھی شامل تھا۔ شہریار نے اچھی خاصی رقم کے عوض اس کا یہ تعاون حاصل کیا تھا اور اب اس کا اس قدر احسان جتانا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مزید کی بھی طالب ہے۔

''میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں مسز رضوی! میری طرف سے جلد ہی آپ کو چیک مل جائے گا۔'' ماہ بانو کی گمشدگی کی خبر سن کر اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اپنی اس کیفیت پر جیسے تیسے قابو پا کر اس نے رضوی سے کرید کرید کر کئی سوالات کر ڈالے اور یہ جاننے کے بعد کہ ماہ بانو کے اغوا کا واقعہ اسی رات پیش آیا تھا جب اس نے اسے فون کیا تھا تو دل میں ڈھیروں افسوس اُتر آیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ماہ بانو نے اس سے دل گھبرانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس نے اسے ڈانٹ کر ٹال دیا تھا۔ کاش، وہ اس کی بات سن لیتا۔ بات کے ہونے والا واقعہ تو بے شک نہیں ٹلتا لیکن دل کو یہ افسوس تو نہ ہوتا کہ اس نے اسے اتنی اپنائیت سے بلایا اور جواباً وہ بے حد اجنبیت سے پیش آیا تھا۔ لیکن اب کاش کہنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ اس کی زندگی میں کاش آج کل بہت سے کاش جمع ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ بھی سوچتا تھا کہ کاش اس روز لیاقت رانا کی گاڑی پر سفر کا واقعہ پیش نہیں آیا ہوتا۔ کاش اس نے ماریہ کو اپنا ہمسفر نہ بنایا ہوتا۔ کاش اس کے قدم نہ بہکے ہوتے۔ وہ اپنے سے کچھ بدلا تو نہیں کرتا۔ جو کچھ پیش آنا تھا، وہ پیش آ چکا تھا۔ حالات نے کچھ اس طرح سے کروٹ لی تھی کہ وہ زندگی کے اَن چاہے مراحل سے گزرنے پر مجبور تھا۔ یہ زندگی تھی جو اُسے ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ ایک اَن چاہی لڑکی کو اپنانے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہ لڑکی جو دل پر دستک دیتی تھی، نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔

⊛----✪----⊛

''سنا تھا تُو ہمیں یاد کر رہی ہے۔ بشیرن نے تیرا پیغام ہمیں پہنچایا تو ہم پہلی فرصت میں تیرے پاس چلے آئے۔ ورنہ آج تو ہمارا کچھ اور ہی پروگرام تھا۔ ایک بہت اڑیل گھوڑی کو لگام ڈالنی تھی لیکن تیرے بلاوے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تُو بھی کسی سے کم تو نہیں ہے۔ فیر ہے بھی چودھری بختیار کی سگی بہن۔ چودھری نور پور کا چودھری، جو بس نام کا ہی چودھری ہے۔ لنگڑے کے پلّے کچھ نہیں ہے۔ کبھی کوشش کرتا تھا چودھری لگنے کی لیکن اب اس میں اتنا بھی دم خم نہیں ہے کہ اپنی بہن سے ہماری مرضی کے خلاف مل بھی سکے۔''

ٹانگ چڑھا کر کرسی پر بیٹھا چودھری افتخار اپنے سامنے بیٹھی فریدہ سے تمسخرانہ انداز میں مخاطب تھا۔

اس کے الفاظ اور اندازِ گفتگو دونوں ہی ایسے تھے کہ فریدہ توہین سے سلگ اُٹھے۔ لیکن خلافِ توقع فریدہ

نے اس کی باتوں پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اُس کے اس
چودھری نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گرد ایک بڑی سی چادر لپیٹے بالکل پُرسکون بیٹھی
تھی لیکن اس کا انداز اس سمندر کا سا تھا جو اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے ہوئے ہو اور اچانک ہی
کو غرق کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ چودھری سوچ میں پڑ گیا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو فریدہ نے
اختیار کر لیا ہے۔ اس کا خود چودھری کو پیغام بھیج کر بلانا یوں بھی خاصا معنی خیز تھا۔ دور دور تک سوچ کے گھ
دوڑانے کے باوجود وہ فریدہ کے رویے کے پیچھے چھپی وجہ تک نہیں پہنچ سکا تو ایک بار پھر اس کا غور سے
لیا۔ اس جائزے کے دوران اس کی نظریں فریدہ کی نظروں سے چار ہوئیں تو اس نے وہاں ایک طر
بے خوفی اور باغیانہ پن دیکھا۔ اُسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی فریدہ ہے جو اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ
سرکار کے مزار پر پناہ لینے آئی تھی اور پھر اس عاشق کی جو کہ دراصل اس کے بھائی چودھری بختیار کا
سازش کا شکار ہو کر چودھری کے پنجوں میں پھنس گئی۔

چودھری کی اس کے بھائی سے پرانی دشمنی تھی۔ چودھری بختیار نے ایک بار اس سے بغاوت کی
تھی اور حسبِ روایت سالانہ عرس کے موقع پر مزار پر چڑھائی جانے والی سونے چاندی کے تاروں
چادر چڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کا چودھری وقتاً فوقتاً کئی بار بدلہ لے چکا تھا لیکن پھر بھی اس
نہیں ہوئی تھی اور پھر اس نے فریدہ کے عاشق قربان کی مدد سے چودھری بختیار کو ایسی زک پہنچائی کہ وہ
ہل کر رہ گیا۔ فریدہ نے بھی عزت کا جوہر گنوانے کے بعد بھائی کے در پر واپس جانا گوارا نہیں کیا اور
کے ذہنی معذور بیٹے بہزاد شاہ سے دکھاوے کی شادی کو قبول کر لیا۔ مکروہ کردار کے مالک چودھری
ذہنی معذور بیٹے کی منکوحہ کو اپنی داشتہ بنا چھوڑا۔ وہ یہ گھناؤنا فعل کئی ماہ سے بڑی کامیابی سے کھیل رہا تھا
تک کسی کو اس پر شک نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فریدہ نے بھی کسی کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت
تھی۔ لیکن اب جانے اس ہاری ہوئی بزدل لڑکی میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ بنا پلکیں جھپکائے
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

''کیا گل کرنی ہے تجھے میرے ساتھ؟'' چودھری نے سرسراتے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''ایک خوشخبری سنانی ہے۔'' فریدہ نے اب بھی پلکیں جھپکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''کیسی خوشخبری؟ کیا تیرا عاشق فیر سے تجھے مل گیا ہے؟..... پر وہ تو خود ڈھائی لاکھ میں میرے سا
سودا کر کے گیا تھا۔ وہ واپس پلٹا بھی تو تجھے کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔'' چودھری نے ایک بار پھر
تمسخر اُڑایا۔

فریدہ نے اس کی ساری باتیں اَن سنی کر دیں اور نہایت دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُرسکون
بولی۔ ''میں ماں بننے والی ہوں۔''

''کیا بکواس کرتی ہے؟'' فریدہ نے جس سکون سے اطلاع دی تھی، چودھری کو اتنی ہی زور کا کرنٹ
''بکواس کہو یا کچھ اور۔ لیکن سچ یہی ہے۔'' فریدہ کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس بار چودھری
باانداز دیگر اُس کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ فریدہ پہلے کے مقابلے میں کافی صحت مند ہو گئی ہے
کے سراپا میں ایسی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے خود کو چادر میں ملفوف کر رکھا
وہ چند لمحوں تک فریدہ کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا رہا پھر خود کو پُرسکون ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''اس سچ کو مٹایا بھی جا سکتا ہے۔''



''بہت وقت گزر چکا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے۔'' فریدہ جانتی تھی کہ وہ ایسی ہی کوئی بات کہے گا اس لیے
اب جواب دیا۔

''اگر یہ ممکن نہیں ہے تو تجھے تو دنیا سے گزارنا ممکن ہے۔ تیرے ساتھ یہ مصیبت بھی ختم ہو جائے گی۔''
سکون کے پردے میں چھپا چودھری کا اشتعال ایک بار پھر ظاہر ہونے لگا۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا
فریدہ نے اسے یہ اطلاع اتنی دیر سے دی ہی اس لیے ہے کہ کچھ کرنا ممکن نہ ہو۔ خود اسے کافی عرصے سے
اس کے پاس آنے کی فرصت نہیں ملی تھی، اس لیے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم جیسا کمینہ آدمی ایسی ہی گل کرے گا اس لیے میں نے پہلے ہی سارا بندوبست کر لیا
ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو تمہاری جان مصیبت میں آ جائے گی۔ میں نے اپنے کچھ ہمدردوں کو وصیت کر دی ہے
کہ اگر میں مری تو اس کا ذمے دار چودھری افتخار عالم شاہ ہو گا۔ وہ لوگ میری لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے سے
نہیں مجھے دفن بھی نہیں کرنے دیں گے..... اور پوسٹ مارٹم سے تو وہ گل کھل کر سامنے آ ہی جائے گی جسے تم
چھپانا چاہتے ہو۔'' فریدہ کے اندازِ گفتگو سے واضح تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ مبنی بر حقیقت ہے ورنہ گاؤں
کی ایک نیم خواندہ لڑکی کو بھلا کیا معلوم تھا کہ پوسٹ مارٹم کیا بلا ہے..... اور حقیقت یہ تھی کہ اسے ڈاکٹر ماریہ
نے یہ ساری ٹپس دی تھیں جن کو وہ اس وقت بڑی مہارت سے استعمال کر رہی تھی۔

''بکواس نہ کر۔ تجھ میں اتنا دم نہیں کہ حویلی سے باہر کوئی خبر بھیج سکے۔'' چودھری نے حقیقت سے نظریں
چرانے کی کوشش کی۔

''تمہاری حویلی کی دیواریں اتنی اونچی نہیں ہیں چودھری! یہ گل اب تو تمہیں سمجھ لینی چاہیے۔ جن
دیواروں کو پھلانگ کر تمہاری جوان دھی بھاگ نکلی، ان دیواروں سے کسی خبر کا نکل جانا کون سا مشکل ہے۔''
چودھری کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر فریدہ نے تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے انداز سے یہ لگتا تھا کہ
وہ چودھری پر جوابی حملے کر رہی ہو اور درحقیقت اس کا یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ چودھری اپنی جگہ پر ٹِک کر
نہ رہ سکا اور غراتا ہوا فریدہ کی طرف لپکا۔

''کتیا بھونکتی ہے۔'' اس نے فریدہ کا گلا پکڑ لیا۔ جواباً فریدہ نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر اسے
اس سے پیچھے دھکیلا۔ چودھری کو اس ردِعمل کی امید نہیں تھی اس لیے وہ لڑکھڑا گیا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت
فریدہ کی گردن آزاد ہو گئی۔

''اگر میں نے بھونکنا شروع کر دیا تو میری آواز بہت دور دور تک جائے گی اور دنیا تمہارے منہ پر تھوکے
گی کہ تم نے اپنے پاگل بیٹے کی بیوی کو اپنی رکھیل بنا رکھا ہے۔'' وہ گویا آج ہر خوف سے آزاد تھی اور جو منہ میں آ
رہا تھا، وہ بولے جا رہی تھی۔ اُس کی اس بے خوفی نے چودھری کو سوچ میں ڈال دیا۔ کوئی کمزور عورت یونہی تو
شیر نہیں ہو جاتی۔ یقیناً فریدہ کو کوئی ایسا آسرا مل گیا تھا جس کے بل بوتے پر وہ اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔

''تو اس بچے کو دنیا کے سامنے کس طرح لائے گی؟..... کیا کہے گی، یہ کس کی اولاد ہے؟'' وہ ذرا ٹھنڈا ہو
کر پیچھے ہٹ گیا اور اس سے سوال کیا۔

''دنیا اسے اسی کی اولاد کہے گی، جس کی اس کی ماں بیوی کہلاتی ہے۔ اس بچے کو بہزاد شاہ کا نام ملے گا
اگر تم نے مان لیا تو فیر کون ہو گا جو اسے بہزاد شاہ کی اولاد ماننے سے انکار کر سکے۔ جب بہزاد شاہ کا ویاہ ہو
گیا ہے تو فیر اولاد بھی ہو سکتی ہے۔'' فریدہ پہلے سے ہی سب کچھ طے کر کے بیٹھی تھی۔

''چل جیسی تیری مرضی۔ میں تیری خوشی میں خوش ہوں۔'' اپنی دال نہ گلتی دیکھ کر چودھری نے فی الحال

ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

⊛----✪----⊛

''چل کُڑیے! چھیتی کر۔ اُٹھ نکل یہاں سے۔ تیری نجات کا راستہ کھل گیا ہے۔'' ماہ بانو کو ذرا سی اونگھ آئی تھی کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا اور یہ الفاظ کہے۔

ماہ بانو ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے سامنے وہ ملازمہ کھڑی تھی جو روزانہ اسے تینوں وقت کا کھانا اور دیگر ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے کی ذمے دار تھی۔ یقیناً وہ چودھری کی قابلِ اعتماد ملازمہ ہی رہی ہوگی جو اس نے اسے اتنی اہم ذمے داری سونپی تھی۔ لیکن ابھی اس نے غنودگی میں ملازمہ کے جو الفاظ سنے تھے، ان سے تو یہی گمان ہو رہا تھا کہ وہ چودھری سے نمک حرامی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ ایک غیر یقینی سی بات لگتی تھی چنانچہ اس نے سوچا کہ اس نے جو کچھ سنا، وہ نیند کے غلبے میں محسوس کی جانے والی ایک خوش فہمی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ سو بھی تو بہت کم رہی تھی۔ چودھری کے کسی بُری نیت سے آنے کا دھڑکا اُسے ڈھنگ سے سونے نہیں دیتا تھا۔ آج رات بھی اس نے جاگتے رہنے کا ہی فیصلہ کیا تھا چنانچہ بستر پر لیٹنے کے بجائے وہ ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ لیکن نیند کی شدت اُس کے ارادے پر اس طرح غالب ہوئی کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھ گئی۔ اور اب ملازمہ کے اُٹھانے پر جاگی تو ہڑبڑاہٹ میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''نی کُڑیے! ایسے ٹکر ٹکر شکل نہ دیکھ۔ چھیتی کر۔ اگر تُو نے دیر لگائی تو کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔'' اس کی گم صم کیفیت دیکھ کر ملازمہ نے اسے ٹوکا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔''

''میں تجھے یہاں سے نکال رہی ہوں۔ تجھے اِس قید سے نجات مل رہی ہے۔'' ملازمہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''مگر کیوں اور کس کے کہنے پر؟'' ماہ بانو کا دل اس خوشخبری کو سن کر بری طرح دھڑکنے لگا۔ زندگی میں جب بھی کوئی آسانی پیدا ہوتی نظر آتی تھی، دھیان سیدھا شہریار کی طرف جاتا تھا۔ اب بھی آزادی کا مژدہ سنا تو یہی لگا کہ شہریار کو اس کے ہاسٹل سے غائب ہونے کی اطلاع ملی ہوگی تو اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا ہوگا کہ اس کام کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہے اور پھر اس نے کسی طرح سے بندوبست کر ڈالا ہوگا کہ چودھری کی حویلی کی اونچی دیواروں میں نقب لگا کر ماہ بانو کو وہاں سے نکالا جا سکے۔

''میں ان سب سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ تُو یہاں سے نکل کر باہر پہنچے گی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس نے یہ سارا بندوبست کیا ہے۔'' ملازمہ نے اسے جواب دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''بس اب نکلنے کی کر۔ کسی ہور نوکر کی آنکھ کھل گئی تو مشکل پڑ جائے گی۔''

اس بار ماہ بانو نے دیر نہیں لگائی اور شانوں پر پڑا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔ مہمان خانے کے بیشتر کمرے تاریک پڑے ہوئے تھے۔ بس وہ دونوں جہاں سے گزر رہی تھیں، اس راستے پر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ماہ بانو ملازمہ کے ساتھ چلتی رہی۔

''یہاں سے آگے تجھے میرا گھر والا لے جائے گا۔'' ایک دروازے کے قریب پہنچ کر ملازمہ نے اسے سرگوشی میں بتایا پھر بے حد احتیاط سے کنڈی کھول کر دروازے کا ایک پٹ بے آواز کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ماہ بانو کے چہرے سے ٹکرایا اور خود بخود ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ ہوا اسے اپنی آزادی کا پیامبر محسوس ہوا تھا۔



''تمہارا بہت بہت شکریہ ماسی!'' دروازے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے اس نے ادھیڑ عمر ملازمہ کا ہاتھ دباتے ہوئے دھیمی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر باہر نکل گئی۔

باہر کھلا آسمان اس کا منتظر تھا۔ آسمان پر چمکتے ستارے رات کی تاریکی کو مٹانے میں ناکام ثابت ہونے کے باوجود بہت دلفریب لگ رہے تھے۔ صرف ایک نظر آسمان پر ڈالنے کے بعد ماہ بانو اس آدمی کی طرف متوجہ ہوگئی جو منہ کو ایک بڑے سے رومال سے ڈھانپے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

''دبے قدموں میرے ساتھ چلی آؤ۔'' اپنی ساکت کیفیت سے حرکت میں آتے ہوئے اس آدمی نے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

''چادر میں چہرہ چھپا لے۔'' چلتے چلتے اس نے اسے دوسری ہدایت دی جس پر ماہ بانو نے فوراً عمل کیا۔ وہ رہائش کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہ لگا چکی تھی کہ یہ مہمان خانے کا پچھلا حصہ ہے۔ اس طرف روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا تھا اور چند ایک ہی بلب روشن تھے اس لیے ماحول نیم تاریک سا تھا۔ اس نیم تاریکی میں چلتے ہوئے وہ دونوں تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک کسی طرف سے ایک شخص نکل آیا۔

''کہاں جا رہے ہو حجو؟..... تیرے ساتھ یہ زنانی کون ہے؟'' اس شخص نے دوپٹے کو ڈھاٹے کی طرح منہ پر پھیلا کر لی ہوئی ماہ بانو پر ایک نظر ڈال کر اسے ساتھ لے جانے والے ملازم سے پوچھا۔

''میری دِھی ہے بھرا! ذرا اسے پچھواڑے تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ اسے ادھر زبیدہ کی کھولی میں جانا ہے۔'' حجو کے نام سے پکارے جانے والے ملازم نے اسے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

''زبیدہ میری سالی کا نام ہے۔ وہ اُدھر حویلی کے پچھواڑے ملازموں کے لیے بنی کھولی میں رہتی ہے۔'' حجو کے ساتھ چل کر پچھلی طرف جاتے ہوئے اسے بھی وہ کھولیاں نظر آ گئیں جو حویلی کے مستقل ملازموں کے استعمال میں تھیں۔ ان کھولیوں کو سرونٹ کوارٹرز کی جگہ تعمیر ضرور کیا گیا تھا لیکن ان کی باہر ہی سے مخدوش نظر آنے والی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رہنے والے کس حالت میں زندگی گزارتے ہوں گے۔ اسے ان کھولیوں سے کئی کترا کر آگے لے گیا۔ قریب سے گزرنے میں احتمال تھا کہ کہیں کسی اور ملازم سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ حجو کی معیت میں بالآخر وہ ایک ایسے دروازے تک پہنچ گئی جس پر ایک بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ حجو نے اپنی بوسیدہ سی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی باہر نکالی اور قفل کھول دیا۔

''یہاں سے نکل کر سیدھی چلتی جا۔ تیرے ہمدرد خود تجھ سے آن ملیں گے۔'' قفل کھولنے کے بعد حجو نے سرگوشی میں بتایا تو وہ تیزی سے دروازہ پار کر گئی۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے گزر کر اس سے قبل کئی بار کشور ماہ بانو سے ملنے جا چکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کشور کے لیے اس کی جاں نثار ملازمہ رانی بڑی تگ و دو کے بعد یہ دروازہ کھولنے کا انتظام کرتی تھی جبکہ حجو کو خود وڈی چودھرائن نے اس دروازے کے تالے کی چابی عطا کی تھی۔

اپنے گرد بُنے جانے والے سازش کے ایک اور جال سے بے خبر ماہ بانو اس پرندے کی طرح جو دانہ دیکھ کر اس کی طرف لپکتا ہے اور پھر جال میں پھنس جاتا ہے، حجو کی ہدایت کے مطابق سیدھی چلتی چلی گئی۔ کچے اور ناہموار راستے پر چلتے ہوئے اسے مشکل سے دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آنے والے دوست تھے یا دشمن، اسے خبر نہیں تھی چنانچہ دوپٹے کو چہرے کے گرد کچھ اور بھی

مضبوطی سے لپیٹ کر خود کو آنے والی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرنے لگی۔ گھڑ سوار اگر کے نجات دہندہ نہیں تھے تو انہیں کیسے ٹالنا ہوگا، وہ تیزی سے اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ لیکن ایسی نوبت ہی نہیں آئی اور تاریکی میں ظاہر ہونے والے گھڑ سواروں نے اس کے قریب پہنچتے ہی اپنے گھوڑوں باگیں کھینچ لیں۔

''آ جاؤ ماہ بانو!'' ایک گھڑ سوار نے آہستہ سے اسے پکارا اور سہارا دینے کے لیے جھک کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس شخص کے آہستہ بولنے کے باوجود ماہ بانو نے اس کے لہجے کے کھردرے پن کو بہ خوبی محسوس کیا دل میں کوئی بھی وہم لائے بغیر اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اسے سہارا دینے والا ہاتھ سے بھی زیادہ کھردرا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے صرف اس لیے قابلِ بھروسہ تھا کہ وہ اسے چودھری کے چنگل چھڑا کر لے جا رہا تھا۔

''مجھے مضبوطی سے پکڑ لو ورنہ تم گھوڑے سے گر بھی سکتی ہو۔'' اس کے سوار ہو جانے کے بعد گھڑ سوار اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً ہی عمل کر ڈالا۔ اس لمحے اس کا ہاتھ گھڑ سوار کے شانے سے لٹکتی رائفل ٹکرایا لیکن پھر بھی اس کے اندر کوئی گھنٹی نہ بج سکی اور اس نے یہی سوچا کہ اسے لینے کے لیے آنے والے کا مسلح ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس کی غلط فہمیوں پر ماتم کناں ہوا تیز آواز سے سرسراتی رہی۔ ہوا کی رفتار سے انجان ماہ بانو اجنبیوں کو اپنا ہمدرد جان کر انجانی راہوں پر آگے بڑھتی رہی۔

⊛----✪----⊛

''اُٹھ جائیں بھئی۔ کب تک سوتے رہیں گے؟ آج جمعہ بھی ہے۔ ناشتہ کرنے اور نہا کر تیار ہونے ہی نماز کا ٹائم ہو جائے گا۔ دیر ہوگئی تو پھر آپ خود ہی افسوس کریں گے کہ جماعت نکل گئی۔'' یہ کوئی تیسرا تھا جو کشور نے آفتاب کو نیند سے جگانے کی کوشش کی تھی اس لیے اس کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ آئی تھی۔

''اتنے غصے سے اُٹھائیں گی تو میں بالکل بھی نہیں جاگوں گا۔ مجھے آپ کی ہنستی مسکراتی صورت ہے۔ آنکھ کھولتے ہی غصے والی شکل دیکھوں گا تو پورا دن خراب گزرے گا۔'' آفتاب نے آنکھیں موندے جواب دیا تو کشور اس بات پر مطمئن ہو کر کہ وہ جاگ چکا ہے، وہاں سے جانے لگی۔ آج اس کے کام کاج نمٹانے والی ملازمہ نہیں آئی تھی اس لیے وہ خاصی مصروف تھی۔

''ایسی کیا بے رخی سرکار! کہ شکوے کا جواب دینا بھی گوارا نہیں۔'' آفتاب نے اس کا آنچل تھام کے جانے کی راہ مسدود کی اور آنچل اپنے چہرے پر پھیلا لیا۔

''آپ ستا بھی تو بہت رہے ہیں۔ بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی چھوٹے بچے کو صبح صبح اسکول جانے لیے نیند سے جگا رہی ہوں۔'' راہِ فرار نہ پا کر کشور اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئی اور جوابی شکوہ کیا۔

''میں آپ کو پریکٹس کروا رہا ہوں تاکہ ہمارا سونو مونو سا بچہ جب اسکول جاتے ہوئے آپ کو ستا آپ کو اسے ہینڈل کرنے میں پریشانی نہ ہو۔'' وہ اس کے آنچل کی نرماہٹیں اپنے چہرے پر محسوس کرتے بنا آنکھیں کھولے بولا۔

''پہلے اسے دنیا میں تو آنے دیں۔ آپ تو ڈائریکٹ اس کے اسکول جانے کے بارے میں ہی لگے۔'' بچے کا ذکر سن کر کشور کے ہونٹوں پر بھی دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی ورنہ وہ آج صبح سے بڑی ٹینشن



میں۔

''صرف اسکول جانے کا کیا ذکر؟..... میں تو ابھی سے اپنے ذہن میں ان مہمانوں کی لسٹ بھی تیار کرنے لگی ہوں جنہیں اس کی شادی میں انوائٹ کیا جائے گا۔'' کہنیوں پر زور دے کر اُٹھتے ہوئے اس نے بڑے سے بتایا۔

''آپ تو بڑے دیوانے ہیں۔'' اس کی بات سن کر کشور ہنس دی۔

''چھوٹے دیوانے ہوتے تو آج یہاں نہ ہوتے۔ کسی سے عشق کرنے کے لیے بڑے دیوانے پن کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔'' آفتاب نے ترنت جواب دیا۔

''مگر میں نے آپ کو بڑا ہوش مند آدمی جان کر آپ سے شادی کی تھی۔ میرے ساتھ تو یہ سراسر دھوکا ہو گیا'' کشور کو شرارت سوجھی۔

''دھوکا کھایا ہے تو اب اس کا نتیجہ بھی بھگتیں۔ یہ دیوانہ تو اب آپ کو ساری عمر ستاتا رہے گا۔'' اس کی شرارت کے جواب میں آفتاب نے یک دم ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پے در پے چومتا ہی چلا گیا۔

''بس کر دیں۔ غلطی ہوگئی جو آپ کو دیوانہ کہہ دیا۔ میری توبہ جو آئندہ ایسی کوئی بات زبان سے نکالی۔'' بے اختیار آنے والی ہنسی کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے آفتاب کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟..... اتنی جلدی ہار بھی مان لی۔'' آفتاب نے اسے چومنا تو بند کر دیا لیکن اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد نہیں کیا۔

''اس وقت میرے حوصلے کی آزمائش سے زیادہ آپ کو گھڑی کی سُوئیوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ذرا غور سے گھڑی دیکھیں۔ تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے نمازِ جمعہ کے لئے۔ رات بھر جاگ کر کام کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ دن سو کر گزار دیں۔ چلیں شاباش اُٹھیں۔ اچھے بچوں کی طرح اُٹھ کر نہائیں اور فریش ہو کر نماز ادا کریں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہوا ناشتہ کھلاؤں گی۔'' کشور نے اسے کسی چھوٹے بچے ہی کی طرح پچکارا۔

آج کل آفتاب پر اپنا ناول جلد از جلد مکمل کرنے کی دُھن سوار تھی چنانچہ جب بھی وہ موڈ میں ہوتا تھا، اس کے لیے طویل نشست سنبھال لیتا تھا۔ گزشتہ رات بھی اس نے لکھنے میں گزاری تھی اس لیے اب دن چڑھے تک پڑا سو رہا تھا۔ لیکن سونے سے قبل اس نے کشور کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اسے نمازِ جمعہ کے لیے جگا دیا جائے۔ وہ پنج وقتہ نمازی تو نہیں تھا لیکن جمعے کی نماز کے لیے خصوصی اہتمام ضرور کرتا تھا۔

''آپ کے ہاتھ سے تیار کردہ ناشتہ تناول کرنا میری خوش قسمتی سہی لیکن فی الحال میں نے آپ کو کسی بھی کام کے لیے منع کر رکھا ہے۔ آپ کو گھریلو کام کاج کرنے کی عادت نہیں ہے۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ بہتر ہے کہ ابھی آپ خود کو زحمت میں نہ ڈالیں۔ فارغ ہو جائیں تو پھر آرام سے اپنے شوق پورے کرتی رہیے گا۔ میں خود فرمائش کر کے آپ سے اپنی پسند کے کھانے بنوایا کروں گا۔'' کشور کے ناشتہ تیار کرنے سے منع کر کر آفتاب اسے سمجھانے لگا۔

''مجھے آپ کی ساری ہدایات اچھی طرح یاد ہیں لیکن آج مجبوری ہے۔ کام والی عورت کے خاندان میں افسوس ناک حادثہ پیش آ گیا ہے اس لیے وہ کام پر نہیں آ سکی۔ اس نے صبح سویرے ہی ایک عورت کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا تھا۔'' کشور نے افسردگی سے جواب دیا۔

''خیریت، کیسا حادثہ پیش آ گیا اس کے خاندان میں؟'' آفتاب نے اس کی افسردگی کو دیکھتے ہوئے

تشویش سے پوچھا۔

''اس کے بھانجے کو کل دوپہر کسی نے اغوا کرلیا تھا۔ گھر والے دن بھر بچے کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ صبح گاؤں کی ایک عورت کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تو اسے وہاں بچے کی لاش آئی۔ اس عورت نے بچے کے گھر اطلاع دی۔ ان لوگوں نے جا کر لاش دیکھی تو اندازہ ہوا کہ معصوم نہایت بربریت کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔'' کشور نے اپنے علم میں موجود معلومات اسے فراہم کیں۔

''ویری سیڈ۔ یہ تو واقعی بہت افسوس ناک حادثہ ہے۔ میں بچے کے باپ سے افسوس کرنے اس کے جاؤں گا۔'' ساری تفصیل سن کر آفتاب کو بھی بہت دکھ ہوا۔ اس قسم کے حادثات اکثر و بیشتر سننے میں آتے تھے لیکن سن کر ہر بار نئے سرے سے دکھ ہوتا تھا کہ یہ قومِ لوط کی باقیات ہمارے زمانے میں کہاں سے آگئیں۔

''افسوس کے سوا اب اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟ بہرحال، آپ اُٹھ کر نہانے جائیں، میں اس دوران آپ کا ناشتہ تیار کردیتی ہوں۔'' کشور اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''کسی بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک پیالی چائے بنا دیں۔ میں اس وقت ناشتہ کرنے کے بجائے اب نماز کے بعد دوپہر کا کھانا ہی کھاؤں گا۔ اس کے لیے بھی آپ خود کو زحمت میں نہ ڈالیے گا۔ میں دیکھوں گا کہ باہر سے کوئی کھانے کی چیز مل جائے ورنہ پھر فروٹس اور بسکٹس وغیرہ پر گزارہ کرلوں گے۔'' آفتاب کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اسے کشور کا کس درجے تک خیال تھا۔

''کھانے کی فکر نہ کریں، میں قیمہ پکا چکی ہوں۔ صرف روٹیاں رہتی ہیں، وہ آپ تندور سے لے آئیں گا۔ اسلام آباد والی خالہ کے ساتھ رہ کر میں نے جو تھوڑا بہت ان سے سیکھا تھا، آج اس کی آزمائش ہے۔ امید ہے کہ آپ کو میرے ہاتھ کا بنا قیمہ ضرور پسند آئے گا۔'' اسے جواب دیتے ہوئے کشور نے خالہ کا ذکر کیا تو دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی۔ خالہ مہربان خاتون تھیں جن سے کشور نے خانہ داری کے چند اہم امور بھی سیکھ لیے تھے لیکن پھر انہیں عجلت میں ان کا گھر چھوڑ کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ پھر اسلام آباد میں ہی انہوں نے قیام گاہ تلاش کی لیکن پھر اس قیام گاہ کو بھی چھوڑ کر اس نواحی گاؤں میں اُٹھ آئے تھے۔ یہاں زندگی کی سہولتیں اگرچہ کم تھیں لیکن وہ لوگ زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ اور سکون محسوس کررہے تھے۔ آج جو اچانک ہی خالہ کا گھر چھوڑا تو جہاں زندگی کے بہت سے مصائب یاد آئے، وہاں مہربان خالہ کی یاد نے دل کو دُکھی کردیا۔

''خالہ کتنی اچھی خاتون تھیں نا۔ بے چاری ہماری وجہ سے ماری گئیں۔'' اس نے آفتاب کے سامنے میں آئے خیال کا اظہار کیا۔

''اب آپ اس بات پر خود کو دُکھی مت کریں۔ خالہ کا احسان میں بھی مانتا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے جس کا وقت جب اور جیسے لکھا ہے، وہ اسی طرح دنیا سے جائے گا۔'' آفتاب نے اسے سمجھاتے ہوئے پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور نے بھی خود کو سنبھالتے ہوئے اس کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ آفتاب کے نہا کر نکلنے تک وہ اس کے لیے چائے تیار کرکے نکال چکی تھی۔ آفتاب نے جلدی سے چائے پی اور عجلت میں مسجد کی طرف چلا گیا۔

گاؤں کی واحد مسجد میں آج معمول سے زیادہ رش تھا۔ جمعے کے دن یوں بھی نمازیوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن آج مقتول بچے کی نمازِ جنازہ کی وجہ سے بھی کافی زیادہ لوگ آئے تھے۔ آفتاب نے بچے کے سات سال باپ کو غم سے نڈھال دیکھا تو خود بھی افسردہ ہوگیا۔ جس بچے کو اس نے کسی ننھے سے پودے کی طرح پال کر اس لائق کیا تھا کہ وہ تنہا اسکول اور مدرسے جانے لگا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹاتا



تھا، وہ کسی ظالم کے ظلم کا شکار ہوکر جڑ سے اُکھڑ گیا تھا تو اس باپ کی صدمے سے بُری حالت ہی ہونی تھی۔ آفتاب طبعاً ایک حساس آدمی تھا جس کا دل ہر ظلم و زیادتی کو دیکھ کر کڑھتا تھا اور اب جبکہ وہ خود باپ بننے والا تھا تو اُس نے اس غم زدہ باپ کے دکھ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔

اس روتے بلکتے شخص کو تھوڑی دیر گلے لگا کر تشفی کے چند الفاظ کہنے کے بعد وہ ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اندازہ تھا کہ اس وقت کسی کی تسلی اور دلاسا اس شخص کے غم کو کم نہیں کرسکتی۔ چند لمحے وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ باقی لوگ بھی اب یہی کررہے تھے۔ جمعے کا خطبہ شروع ہوچکا تھا جسے وہ دھیان سے سنتا رہا۔

''آج امام صاحب واپس آگئے ہیں اور جمعے کی نماز کے علاوہ خیرو کے پُتر کا جنازہ بھی وہی پڑھائیں گے۔'' اس کے برابر میں بیٹھے شخص نے نہ جانے کس سے یہ الفاظ کہے جو اس کی سماعتوں تک بھی پہنچ گئے۔ وہ اب تک سر جھکائے بیٹھا تھا، اس اطلاع کو سن کر تجسس سے خطبہ دینے والے شخص کو دیکھنے لگا۔ اسے گاؤں والوں کی زبانی یہی معلوم ہوا تھا کہ امام مسجد کچھ عرصے کے لیے رخصت پر گئے ہوئے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں گاؤں کا ایک شخص جو دوسروں کی نسبت دین کی زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے، یہ فرض انجام دے رہا ہے۔ وہ زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی حقیقتاً چند سورتوں کا حافظ تھا جو جماعت کروا دینے کے علاوہ دیگر دینی امور کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔

آفتاب اس سے قبل جب نماز پڑھنے یہاں آیا تھا تو اس شخص سے ملاقات کی تھی اور چند باتوں سے ہی اس کی علمی استعداد کا اندازہ لگا لیا تھا البتہ اس شخص نے امام مسجد کی علمی بساط اور اخلاق کی اس درجے تعریف کی تھی کہ خود آفتاب کے دل میں اس سے ملاقات کا تجسس پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ امام مسجد تشریف لاچکے ہیں اور خود جماعت کروا رہے ہیں تو خود بخود ہی اس کی نظر خطیب کی طرف اُٹھ گئی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے سفید براق لباس زیب تن کر رکھا تھا اور سر پر عمامہ لیے ہوئے تھا۔ اس شخص کے چہرے پر موجود داڑھی کے بال مہندی کی سرخی سے رنگے ہوئے تھے اور یہ داڑھی اتنی گھنی تھی کہ اس کا چہرہ بہت واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ اس کے لیے آشنا ہے۔ دل میں اندر اُبھرنے والے اس احساس کی وجہ سمجھنے کی اسے مہلت نہیں مل سکی اور خطبہ ختم ہوکر نماز جمعہ کے لیے صفیں ترتیب دی جانے لگیں۔

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد مقتول بچے کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نماز کے بعد امام مسجد نے رقت زدہ لہجے میں دعا کی جس میں اللہ سے بچے کے والدین کے لیے صبر جمیل کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا ظلم کرنے والے شخص کے نیست و نابود ہوجانے کی بھی استدعا کی گئی۔

آفتاب کا ذہن نیند کی کمی اور دکھ کے باعث پوری طرح چوکنا نہیں تھا پھر بھی کوئی خیال تھا جو اس کے ذہن سے ٹکرا کر امام مسجد کے لیے آشنائی کا احساس پیدا کرتا رہا۔ وہ اس احساس کی وجہ سمجھنے کے لیے ان سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس کے فارغ ہوتے ہی گاؤں والوں نے جس طرح ان کے گرد جمگھٹا لگا لیا، اس سے اندازہ ہوا کہ اسے ڈھنگ سے ملاقات کا موقع نہیں ملے گا۔ چنانچہ وہ ملاقات کے خیال کو پھر کسی وقت کے لیے ٹال کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کی رہائش گاہ مسجد سے ذرا زیادہ فاصلے پر تھی چنانچہ پیدل چل کر جانے میں کچھ وقت لگتا تھا۔ اپنی اس پیدل مارچ کے دوران بھی وہ امام مسجد کے لیے اُبھرنے والے آشنائی کے احساس کے بارے میں غور کرتا رہا۔

غور کرتے کرتے اس کے ذہن میں یک دم ہی ایک نام گونجا اور وہ اپنی جگہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ اگر اس ذہن میں اُبھرنے والا نام درست تھا تو پھر وہ انجانے میں ایک اہم آدمی تک پہنچ گیا تھا۔ اس نام کے ذہن آنے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ یونہی واپس گھر لوٹ جاتا۔ اسے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خیال تصدیق کرنی تھی اور تصدیق اسی صورت ممکن تھی کہ وہ اس شخص کو ایک بار پھر اچھی طرح قریب سے دیکھے چنانچہ گھر کی طرف جانے والے اس کے قدم اپنا راستہ بدل کر ایک بار پھر مسجد کی طرف پلٹ گئے۔

⊛----✪----⊛

چودھری کسی زخمی شیر کی طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے اُسے زِک پر زِک اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ اس کی زمینوں کا سیلابی پانی کی زد میں آنا، بالے کا ناکارہ ہو کر ہسپتال میں جا پڑنا، کشور کا آفتاب کے ساتھ فرار اور اس کے بعد ہر بار ہاتھ آتے آتے نکل جانا، فریدہ کا ماں بننے کی خبر دینا اور اب ماہ بانو کا اس مہمان خانے سے نکل بھاگنا، ساری ایسی باتیں تھیں جو اس کے خلاف جاتی تھیں۔ وہ برسوں سے حکم کرنے اور اپنی منوانے کا عادی تھا۔ اب جو خلافِ مرضی اتنے سارے واقعات پیش آئے تو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ خصوصاً ماہ بانو کا مہمان خانے سے فرار ہو جانے کا تازہ ترین واقعہ تو اس کے لیے سخت اشتعال کا باعث بنا تھا۔ ایک رات میں وہ دو کمزور عورتوں کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور ہوا تھا۔ پہلے فریدہ نے اپنے ماں کی خبر سنا کر اسے طیش دلایا تھا اور وہ اتنی پُر اعتماد تھی کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی با اثر ہستی کی پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ فریدہ سے ہونے والی گفتگو نے اسے اتنا بدمزہ کیا تھا کہ اس نے ماہ بانو کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دراصل خود ماہ بانو حویلی سے نکل گئی ہے۔ صبح اسے منشی نے اطلاع دی کہ مہمان خانے سے ماہ بانو غائب ہے اور ساتھ ہی وہ دونوں ملازم میاں بیوی بھی جن کے ذمے ماہ بانو کی نگرانی کا کام لگایا گیا تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی چودھری کا پارہ ہائی ہو گیا۔ اس نے پہلے منشی کو ڈھیروں گالیوں سے نوازا، پھر اس گن مین کو اپنے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا جو صرف اور صرف مہمان خانے کی نگرانی پر مامور تھا۔ اس وقت وہ اسی گن مین کے انتظار میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اسے ٹہلتے ہوئے تین منٹ گزرے تھے کہ منشی دوڑتا دوڑتا اندر داخل ہوا۔ چودھری کی توقع کے خلاف اس کے ساتھ گن مین موجود نہیں تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے منشی کو گھورا۔

''میں نے فون کر دیا ہے سرکار! شکورا ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوگا۔ مین گیٹ والے چوکیدار نے بتایا ہے کہ وہ رات سے ڈیرے پر گیا ہوا ہے۔'' منشی نے دھیمی آواز میں بتایا۔

''کیوں؟..... اُدھر کیا اُس کی گھر والی مجرا کر رہی تھی جسے دیکھنے گیا تھا؟'' چودھری دھاڑا۔

''وہ آئے گا تو اصل گل کا پتہ لگے گا۔ چوکیدار سے تو یہی بول کر گیا تھا کہ اسے چودھری صاحب نے ڈیرے پر جانے کا کہا ہے۔'' منشی نے ادب سے جواب دیا۔

''اور حجو کی کیا خبر ہے؟..... کیا وہ بھی میرا نام لے کر کہیں دفعان ہو گیا ہے؟''

''اُس کی کوئی خبر نہیں سرکار! اس کے گھر پتہ کروایا تھا میں نے۔ اُدھر صرف اُس کی دِھی اور کاکا ہے۔ دونوں بولتے ہیں کہ اماں ابا حویلی ہی میں ہیں، ہمیں کہیں اور جانے کا بتا کر نہیں گئے۔ میں نے ان دونوں کو حویلی میں بلوا لیا ہے اور دو بندوں کو گھر کی تلاشی لینے کو کہا ہے۔ وہ دونوں آ جائیں تو پتہ لگے گا کہ کہیں کسی رقم کے لالچ میں تو حجو اور اس کی گھر والی نے نمک حرامی نہیں کی۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ حجو کی دِھی کا ویاہ ہونے والا



ہے پاس رقم نہیں ہے۔ اس لیے آج کل وہ گاؤں میں سب سے قرض مانگتا پھر رہا ہے۔''

منشی نے اپنی پوری کارگزاری سنائی تو چودھری ہونہہ کر کے رہ گیا اور منقش تخت پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ منشی نے فوراً آگے بڑھ کر حقے کی نے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ ناک سے گڑگڑ گڑگڑانے لگا۔ اس کا حقہ گڑگڑانے کا انداز ایسا تھا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے سے اُبل رہا ہے اور اس غصے کی زد میں کچھ بھی آ سکتا ہے۔ اس کا مزاج آشنا منشی اس کی کیفیت کو سمجھتا ایک طرف ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ادب سے کھڑا رہا۔ پندرہ منٹ کا دورانیہ گزرنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ گن مین شکورا آ چکا ہے۔

''شکورا آ گیا ہے سرکار! اسے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟'' اطلاع ملنے پر اس نے چودھری سے استفسار طلب کی۔

''اور نہیں تو کیا فیر کورٹ سے سمن جاری ہونے کا انتظار کرے گا؟'' چودھری برہم ہوا۔ اس کی برہمی دیکھ کر منشی جلدی سے باہر کی طرف دوڑا۔ اگلے ہی لمحہ شکورا اس کے ساتھ چودھری کی خدمت میں حاضر تھا۔

''ہاں بھئی شکورے! کدھر تھا تُو؟'' چودھری نے گن مین کو شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ڈیرے پر تھا سرکار! رات حجو نے مجھے آپ کا پیغام دیا تھا کہ چودھری صاحب کہہ رہے ہیں آج رات ڈیرے پر ڈیوٹی دے دے، اُدھر نفری کم ہے۔ تو میں اُدھر چلا گیا۔'' غلطی نہ ہونے کے باوجود شکورے نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ چودھری کے مزاج کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ غیظ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی سزا کا حق دار ٹھہرا دے۔

''ہونہہ! اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا اس میں حجو کا ہاتھ تھا۔ وہ کسی کے ہاتھوں بِک گیا تھا اس لیے اس نے تجھے وہاں سے ہٹانے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ تجھے ڈیرے پر بھیج دے۔ اسے کسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ڈیرے پر پہرہ دینے والوں کی نفری کم ہو گئی ہے۔'' چودھری پُرسوچ لہجے میں بولا۔ اس کے انداز پر شکورا کی رُکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔ اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ کم از کم اسے قصوروار نہیں سمجھا جا رہا۔

''چودھری صاحب! حجو کے گھر کی تلاشی لینے والے بندے واپس آ گئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔'' اسی وقت کسی ملازم نے آ کر منشی کے کان میں سرگوشی کر کے اسے کچھ بتایا تو وہ سنسنی خیز لہجے میں چودھری سے بولا۔

''بلاؤ ان دونوں کو۔'' چودھری نے تیز لہجے میں حکم دیا۔ منشی کے پاس اطلاع لے کر آنے والا ملازم اس کے اشارے پر باہر کی طرف دوڑا۔ اگلے لمحے دونوں ملازمین وہاں موجود تھے۔

''ہاں بھئی، کیا خبر لائے ہو؟'' چودھری نے ان میں سے ایک کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''خبر نہیں سرکار! خبریں ہیں۔ پہلی خبر یہ ہے کہ حجو کے گھر کی تلاشی لینے پر ایک پیٹی میں سے یہ دس ہزار روپے ملے ہیں۔'' اس نے نوٹوں کی ایک گڈی چودھری کے سامنے کی جسے منشی نے تھام لیا۔ گڈی سو اور پانچ سو کے استعمال شدہ نوٹوں پر مشتمل تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حجو کو رقم دینے والا شخص بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔

''دوسری خبر؟'' گڈی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد چودھری نے اسی آدمی سے دریافت کیا۔

''نہر کے پاس اسکول کی عمارت کے پیچھے حجو اور اس کی گھر والی کی لاشیں ملی ہیں۔ دونوں کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا ہے۔ لاشیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھیں اس لیے فوری طور پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ اسکول بھی کئی دنوں سے بند پڑا ہے۔ سنا ہے وہ عیسائی اُستانی اپنی دِھی ڈاکٹر ماریہ کے ویاہ کے چکر میں مصروف ہے اس

لیے اسکول نہیں آ رہی ہے ورنہ بچے ہی کھیلنے کودنے نکلتے تو لاشیں دیکھ لیتے۔ وہ تو آوارہ کتے لاشوں کی
وہاں جا نکلے اور انہوں نے لاشیں گھسیٹ کر جھاڑیوں سے باہر نکال لیں۔ کتوں کے بھونکنے اور شور
کھیتوں میں کام کرنے والوں نے اس طرف دھیان دیا تو انہیں لاشیں نظر آئیں۔ کتوں نے اچھا خاصا
ادھیڑ ڈالا تھا لاشوں کا لیکن گاؤں والوں نے مجو اور اس کی گھر والی کو پہچان لیا۔ ہم مجو کے گھر سے تلاشی
نکلے ہی تھے تو لاشیں ادھر پہنچیں اور ہم ساری تفصیل معلوم کر کے آپ کو اطلاع دینے چلے آئے۔"

اس آدمی نے تفصیل سے سب کچھ بتایا تو چودھری کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ کسی ہوشیار اور
آدمی نے مجو اور اس کی گھر والی کو استعمال کیا ہے، وہ بھی اس طرح کہ اب وہ دونوں اس کا نام بتانے
زندہ نہیں بچے ہیں۔ آج کل اسے پہنچنے والے ہر نقصان کے پیچھے ایک ہی شخص ہوتا تھا اور وہ تھا شہریار
اور ماہ بانو کی پشت پناہی شہریار کر رہا ہو، اس بات کا قوی امکان تھا۔ فریدہ کے بھائی چودھری بختیار
کے ٹھیک ٹھاک تعلقات تھے۔ چودھری بختیار سے دوستی نبھانے کے لیے وہ اس کی بہن سے ہمدردی کر
فریدہ نے کسی ذریعے سے اس سے رابطہ کیا ہوگا تو اس نے فریدہ کو یقین دلا دیا ہوگا کہ وہ اس کا پورا
دے گا۔ یہ سوچنا تو اب غیر ضروری تھا کہ فریدہ نے کس ذریعے سے شہریار سے رابطہ کیا ہو گیا۔ ملازمین
حرامی اس کے سامنے تھی۔ اگر مجو اور اس کی گھر والی اپنے کسی مفاد کے لیے بک گئے تھے تو کوئی اور
بک سکتا تھا۔ فریدہ کا ساتھ دینے کے لیے شہریار کے پاس دوسری اہم وجہ چودھری سے دشمنی تھی۔ اس
نبھانے کے لیے لئے بھی وہ فریدہ کا ساتھ دے سکتا تھا بلکہ وہ تو منتظر ہوگا کہ کب فریدہ منظر عام پر آتی
میڈیا کے ذریعے ساری دنیا کو چودھری کے کرتوت بتاتی ہے۔

دوسری شخصیت ماہ بانو کا تو وہ عرصے سے ساتھ دے ہی رہا تھا۔ اسی کی مدد سے ماہ بانو پیر آباد
کامیاب ہوئی اور پھر اِدھر اُدھر جو چھپتی پھری تو اسے چھپنے کے لیے پناہ گاہیں فراہم کرنے والا بھی
تھا۔ شہریار ہر بار اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے قانونی طریقہ استعمال کرے گا، یہ بھی اب ضروری نہیں
پہلے بھی وہ اس کے ڈیرے پر غنڈوں کے ذریعے حملہ کروا کر آفتاب کو وہاں سے آزاد کروا چکا تھا۔ پھر
زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جانے کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کیس میں بھی شہریار
عناصر کا استعمال کیا تھا۔ چودھری شواہد حاصل نہیں کر سکا تھا کہ یہ کارگزاری شہریار کی ہے، اس کے باوجود
یقین تھا کہ یہ سب اسی نے کروایا ہے۔ اب ماہ بانو کے مہمان خانے سے غائب ہو جانے کے پیچھے
شہریار کا ہی ہاتھ لگ رہا تھا۔

شہریار جیسے متمول آدمی کے لیے مجو کو رقم کا لالچ دے کر استعمال کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس
میں جو واحد چیز اسے کھٹک رہی تھی، وہ مجو اور اس کی بیوی کا قتل تھا۔ اب تک اس نے شہریار کی فطرت
تک سمجھا تھا، اس سے یہی سمجھ آتا تھا کہ وہ کسی بے قصور اور غیر متعلقہ شخص کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن
کے علاوہ کوئی دوسرا نام بھی فی الحال اس کے ذہن میں نہیں تھا جن کے بارے میں وہ کہہ سکے کہ
ماہ بانو سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ماہ بانو کو تو بس شہریار ہی اس سے چھین کر لے جا سکتا تھا اور یہ بات اس
ناقابلِ برداشت تھی۔ لیکن فی الحال وہ شہریار کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ شہریار اُس کا کوئی مزار
جس کے گھر پر وہ اپنے کارندوں کے ذریعے حملہ کروا کر ماہ بانو کو بازیاب کروا لیتا۔ اسے ماہ بانو کو شہر
واپس حاصل کرنے کے لیے اسی صفائی سے کام کرنا تھا جس صفائی سے وہ اس کی حویلی سے اسے نکال
تھا۔



"مجو کی بیوی اور پُتر اُدھر حویلی میں ہی ہیں نا؟" حالات پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد اس نے منشی سے
دریافت کیا۔

"جی سرکار! اگر آپ کا حکم ہو تو میں ان دونوں کو آپ کی خدمت میں پیش کروں؟" منشی نے مستعدی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں، اس کی کوئی لوڑ نہیں۔ میں نے ان دونوں کے لیے کچھ ہور سوچا ہے۔ مجو اور اس کی گھر والی نے
میرے ساتھ جو نمک حرامی کی ہے، اس کی سزا اس کی نسل کو بھی بھگتنی پڑے گی۔ آخر وہ بھی تو ہمارا ہی نمک کھا کر
پلے ہیں۔ اس نمک کے ساتھ بے وفائی کرنے والے کو ہم کسی صورت معاف نہیں کر سکتے۔ ہم مجو کی
اولاد کا وہ حشر کریں گے کہ وہ اُدھر دوسری دنیا میں بھی تڑپ اُٹھے گا۔ ہور آئندہ ہمارا کوئی ملازم ہم سے نمک
حرامی کا سوچے گا بھی تو اس کے سامنے اپنا عبرت ناک انجام آ جائے گا۔" قہر آلود لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے
ہوئے چودھری نے منشی کو وہ سزا بتائی جو وہ مجو کی اولاد کے لیے تجویز کر چکا تھا۔ بے ضمیر منشی نے اس لرزہ خیز سزا
کو اطمینان کے ساتھ سنا اور اس پر عمل کروانے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے چودھری کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی
کوشش کرتا رہا۔ چودھری کی بھڑاس بھی کچھ نہ کچھ نکل ہی گئی تھی چنانچہ جب اس کے سامنے ام الخبائث سے بھرا
ہوا جام پیش کیا گیا تو وہ اس جام کو گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

⊛----✪----⊛

"کیا تمہیں سو فیصد یقین ہے کہ ماہ بانو اب چودھری کی حویلی میں نہیں ہے؟" دیوار پر نظریں جمائے بیٹھے شہریار نے فون پر دوسری طرف موجود عبدالمنان سے پوچھا۔

ماہ بانو کے بلتستان سے نکل کر کراچی پہنچائے جانے کے بارے میں اس نے عبدالمنان کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ ماہ بانو زندہ ہے اور کراچی کے کسی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہے۔ اس کو کچھ نہ بتانے کی وجہ بداعتمادی نہیں تھی بلکہ شہریار نے احتیاط کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا تھا کہ کم سے کم لوگوں کو اس راز میں شریک کیا جائے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ ماہ بانو ہاسٹل سے اغوا کی جا چکی تھی اور اس کی تلاش کے لیے اسے اپنے جن وسائل کو استعمال کرنا تھا، ان میں عبدالمنان کی حیثیت بڑی اہم تھی۔ عبدالمنان مقامی معاملات سے باخبر رہنے والا ایک ایسا آدمی تھا جو چودھری کی حویلی کے اندر تک سرایت لگا کر وہاں سے خبر نکال کر لا سکتا تھا چنانچہ اس نے عبدالمنان کو ہی یہ ذمے داری سونپ دی تھی۔ خود وہ تو آج کل یوں بھی بڑا مصروف تھا۔ ممانی جان نے اصرار کر کے بلکہ باقاعدہ حکم دے کر اسے لاہور بلوا لیا تھا اور اسے لے کر مختلف بازاروں میں پھرتی رہی تھیں۔ اس کے لیے شادی کا جوڑا انہوں نے ایک مشہور ڈریس ڈیزائنر سے ارجنٹ میں منہ بولی قیمت پر تیار کروایا تھا لیکن پھر بھی مطمئن نہیں تھیں اور ان کا یہی کہنا تھا کہ اس ایمرجنسی شادی کی وجہ سے ان کے کئی پروگرام ادھورے رہ گئے ہیں۔

رشتوں کی زنجیر میں جکڑا شہریار ان کی محبت کے آگے بے دست و پا تھا اور یہاں بیٹھ کر ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ اس نے کراچی سے بھی درست معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی تھی اور اس آدمی سے اسے اب تک جو رپورٹس ملی تھیں، ان سے یہی پتہ چل سکا تھا کہ کچھ لوگوں نے اچانک ہی ہاسٹل میں گھس کر ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کر لیا تھا۔ اس کی روم میٹ اس معاملے میں قطعی بے قصور پائی گئی تھی۔ اور جیسا کہ اس پر شک کیا جا رہا تھا کہ شاید اس نے ماہ بانو کا اتا پتہ چودھری کو دیا ہو تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بے چاری تو خود بہت خوف زدہ اور ہراساں تھی اور ابھی تک اس لائق نہیں ہوئی تھی کہ کالج جوائن کر سکے۔ شہریار نے اس آدمی کے ذمے ماہ بانو کی دوسری قریبی لڑکیوں کو ٹٹولنے کی ذمہ داری لگا دی تھی لیکن چونکہ اسے یقین تھا کہ اس کے اغوا کے معاملے میں چودھری کا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے، اس لیے اس کا سارا زور بھی اسی طرف تھا۔ اس کی ہدایت پر چودھری کے اردگرد کی سُن گُن لیتے پھرتے عبدالمنان نے یہ معلوم کروا لیا تھا کہ ماہ بانو کو واقعی چودھری نے ہی اغوا کروایا تھا اور حیرت انگیز طور پر اسے کسی خفیہ ٹھکانے پر چھپانے کے بجائے اپنی حویلی کے مہمان خانے میں رکھا تھا۔ شاید اس نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ گزرے اور ڈھونڈنے والے ماہ بانو کو اس کے کسی خفیہ ٹھکانے پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہیں اور ماہ بانو وہاں سے بھی غائب ہو گئی تھی اور اس وقت عبدالمنان نے اسے یہی اطلاع دی تھی جس پر اسے یقین آ گیا تھا۔



"بالکل سر! میں نے حویلی میں مستقل کام کرنے والے ایک ملازم سے یہ ساری معلومات حاصل کی ہیں اور یہ معلومات کی تصدیق ماہ بانو کی نگرانی پر مامور ملازم اور اس کی بیوی کی ہلاکت سے بھی ہو رہی ہے۔" عبدالمنان نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"کیا ان دونوں ملازم میاں بیوی کو چودھری نے مروایا ہے؟" شہریار نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"یس سر! یہ کسی اور کا ہی کارنامہ ہے۔ مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق کسی نے رشوت دے کر ان ملازمین کو استعمال کیا اور پھر راز نہ کھلے، اس لیے انہیں ہلاک کروا دیا۔ ان دونوں ملازمین کی ہلاکت سے یہ بات ایک معمہ بن گئی ہے کہ ماہ بانو کو کس نے اور کیوں حویلی سے فرار کروایا۔ اس کا ایسا کون ہمدرد تھا جس کا اثر و رسوخ تھا کہ پہلے ملازمین کو رشوت دے کر اسے فرار کروانے میں کامیاب ہوا اور پھر ملازمین کو ہلاک بھی کروا دیا۔" عبدالمنان کا ہوم ورک ہمیشہ کی طرح مکمل اور جامع تھا۔ اس نے اگر بتایا تھا کہ ماہ بانو اب حویلی میں نہیں ہے تو واقعی وہ اس بات کی اچھی طرح تصدیق کر چکا تھا۔

"شیری! کیا ہے بیٹا؟ تم نے ابھی تک تیار ہونا شروع نہیں کیا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ تمہارے ماموں اور ممانی وقت کے کتنے پابند ہیں۔ وقت پر بارات روانہ نہیں ہوئی تو وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن مجھ پر سخت خفا ہو جائیں گے۔" وہ عبدالمنان کے ساتھ اپنی گفتگو کا سلسلہ مزید آگے بڑھاتا، اس سے قبل ہی آفرین رانا کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے فون پر باتیں کرتا دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔

"ٹھیک ہے عبدالمنان! تم اس معاملے پر نظر رکھو اور اگر کوئی اہم بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع دے دینا۔" اس نے جلدی سے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے عبدالمنان سے کہا اور فون بند کر کے آفرین رانا کی طرف متوجہ ہوا۔

"عبدالمنان! تمہارا پی اے ہے نا؟ تم نے اسے اپنی شادی میں انوائٹ نہیں کیا؟" آفرین رانا نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔" وہ سنجیدگی سے جواب دیتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور وارڈ روب کی طرف آ گیا۔ آج کی تقریب میں پہننے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ سوٹ بڑے سلیقے سے ہینگر میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بڑے بے نیاز انداز میں ہینگر سمیت سوٹ باہر نکالا۔ آفرین رانا اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور ان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ شہریار یہ شادی اپنے دل کی خوشی سے نہیں بلکہ کسی مجبوری کے تحت کر رہا تھا۔ وہ مجبوری کیا تھی، وہ سمجھنے سے قاصر تھیں اور شہریار کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ ویسے اگر وہ انہیں اب کچھ بتا بھی دیتا تو وہ کیا کر سکتی تھیں؟ اب جبکہ بالکل آخری لمحات آ گئے تھے اور شادی کی تقریب شروع ہونے ہی والی تھی تو کچھ تبدیل بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس تقریب میں شہر بھر کے خاص خاص افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ وزیراعظم اور صدر تک کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، تو ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کسی فلم کی طرح عین کلائمیکس پر جا کر اعلان کر دیا جائے کہ خواتین و حضرات! آپ لوگ جس شادی میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، وہ کینسل کر دی گئی ہے یا پھر اس کے دولہا دلہن تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ زندگی کی کہانی اور فلمی کہانی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ فلمی کہانی کا انجام اس طرح کیا جاتا ہے کہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جائے۔ زندگی کی کہانی سمجھوتوں کے سہارے جگ ہنسائی سے بچنے کی کوشش میں چلتی رہتی ہے۔ شہریار کو بھی شاید اپنی زندگی میں ایک بڑا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا اور وہ اس کے لیے

صرف خوشی کی دعا کر سکتی تھی۔ اب بھی وہ زیرِ لب یہ دعا کرتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئیں۔ ان کے جا
آدھے گھنٹے بعد شہریار بھی تیار ہو کر باہر آ گیا۔ لیونگ روم میں آفرین رانا اور مریم کے علاوہ خاندان
اور خواتین بھی موجود تھیں۔ ان خواتین نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا اور جانے کون کون سی رسو
کرنے لگیں۔

بے دلی سے ان رسومات کو بھگتانے کے باوجود شہریار نے کسی قسم کا نقطۂ اعتراض نہیں اُٹھایا۔ البتہ
یہ بات پہلے ہی واضح کر دی تھی کہ وہ عام روایتی دولہا کی طرح سہرا وغیرہ ہرگز نہیں باندھے گا چنانچہ اس
اس کے گلے میں صرف ایک عدد پھولوں کا ہار تھا اور اس واحد ہار نے بھی اس کی شخصیت میں اتنی تبدیلی
دی تھی کہ آفرین رانا اس کی بلائیں لیتے نہیں تھکتی تھیں۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ نظر لگ جانے کے
بار بار اس پر سے نوٹ وار کر ملازمین میں تقسیم کرتی جا رہی تھیں۔ رسومات کی ادائیگی کے بعد گاڑیوں کے
کی شکل میں رانا ہاؤس سے اس کی بارات روانہ ہوئی۔ تقریب کا اہتمام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا
اس وقت ڈاکٹر ماریہ، اس کی والدہ مسز جوزف اور ان کی جان پہچان کے دیگر لوگ موجود تھے۔ شادی کی
تقریب کے لیے سارا انتظام اور اہتمام آفرین رانا نے خود کیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ڈاکٹر ماریہ کی مالی
ایسی نہیں کہ وہ ان کے اسٹیٹس کے مطابق انتظامات کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے اس معاملے میں ان لوگ
زحمت بھی نہیں دی تھی۔

بارات ہوٹل پہنچی تو یوں لگا کہ وہاں رنگ و نور کا ایک طوفان اُمڈ آیا ہو۔ دھیمے سُروں میں بجتی
خوبصورت ترتیب سے کی گئی لائٹنگ، اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو، اِدھر سے اُدھر دوڑتے باوردی بیرے،
تعینات سکیورٹی گارڈز سب مل کر بتا رہے تھے کہ شہر کی کسی ممتاز شخصیت کی شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔
اہتمام و انصرام لیاقت رانا کی حیثیت کی وجہ سے تھا۔ ان کی مضبوط سیاسی پوزیشن کی وجہ سے ان کے
جاننے والے تھے جنہیں اس قسم کے مواقع پر یاد رکھنا ضروری بھی تھا۔ خود شہریار ابھی اپنے کیریئر کے ا
مراحل سے گزر رہا تھا اور لیاقت رانا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے لوگوں سے روابط بڑھیں اس لیے اس کی
نہ ہونے کے باوجود انہوں نے بہت سے لوگوں کو بلا رکھا تھا اور اب وہ ایک ایک سے اس کا تعارف بھی
رہے تھے۔ نئے نئے ملنے والوں سے تعارف اور پرانے آشناؤں سے علیک سلیک کے مراحل طے کرتا
ایک ٹیبل پر چودھری افتخار عالم شاہ کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چند اہم کاروباری شخصیات کے ساتھ بیٹھا ہوا
اور جیسا کہ اس کی عادت تھی، حقے کو چھوڑ کر شہری تقریبات وغیرہ میں سگار کا استعمال کرتا تھا..... تو اس
بھی سگار پی رہا تھا۔

''مبارک ہو اے سی صاحب!..... آخر آپ بھی پھنس ہی گئے۔ مجھے تو آپ کی شادی کا سن کر دلی
ہوئی اور باوجود دس کام ہونے کے، میں دعوت نامہ ملنے پر شادی میں شرکت کے لیے چلا آیا۔'' شہریار کے
کو محسوس کر کے وہ خود ہی آگے بڑھ کر اس سے ملا اور چہکتے ہوئے بتایا لیکن شہریار اپنی جگہ حیران تھا کہ چودھ
کو آخر دعوت نامہ بھیجا کس نے؟ خود اس نے تو لیاقت رانا کے کہنے کے باوجود اس کا نام لسٹ میں سے کٹوا
تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ وقت گزر چکا ہے جب وہ مصلحتاً چودھری سے تعلقات نبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب
اس کی چودھری سے کھلی جنگ تھی اور دشمن کو کسی خوشی میں شامل کرنے کا کیا سوال تھا؟

''اتنے حیران ہو کر نہ دیکھیں اے سی صاحب! بخدا ہم بغیر دعوت کے یہاں نہیں آئے ہیں۔ آپ
طرف سے نہ سہی، لڑکی والوں کی طرف سے ہمیں مدعو کیا گیا ہے۔ آپ کی شریکِ حیات کے ساتھ ہمار



مراسم ہیں۔ ہمیں مدعو کیے بغیر وہ بیاہ رچا لیتیں، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔'' چودھری کے انداز میں بڑی
محسوس کر کے شہریار کا چہرہ احساسِ توہین سے سلگ اُٹھا اور وہ تیزی سے وہاں سے پلٹ گیا۔
کے حوالے سے کوئی بھی مرد کوئی ایسی ویسی بات سننا گوارا نہیں کرتا اور ماریہ کے بارے میں تو وہ اچھی
تھا کہ چودھری نے اسے اپنا کھلونا بنا رکھا تھا۔ خود ماریہ نے اس کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا
اس نے چودھری کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو وہ اس کی والدہ مسز جوزف کو قتل کروا دے گا۔ ماں کی
خاطر ماریہ، چودھری کی ہوس پوری کرتی رہی تھی اور اس وقت چودھری نے اسے یہی بات جتائی بھی
خون کے ساتھ وہ تمام مہمانوں کو نظر انداز کر کے ایک بالکل الگ تھلگ خالی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ اس
میں یہ خیال کروٹیں لے رہا تھا کہ کہیں میں نے جذبات میں ماریہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر کے کوئی
نہیں کر دی۔ لیکن مسئلہ اس کے اپنے ضمیر کا تھا۔ ماریہ کا وجود پہلے سے ہی کتنا داغ دار تھا، اسے اس بات
فرق نہیں سی، وہ تو صرف اس داغ کو دھونے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے لگایا تھا..... اور جو خود اس
پر بھی لگ کر اسے اس کی اپنی ہی نظروں میں داغ دار کر گیا تھا۔

''ارے بھئی نوشے میاں! تم سب سے کٹ کر یہاں اکیلے کہاں آ بیٹھے ہو؟ قاضی صاحب نکاح پڑھانے
بیٹھے ہیں اور دولہا کی عدم موجودگی پر سخت پریشان ہیں کہ بغیر دولہا کے نکاح کیسے ہو گا؟'' وہ اپنے
کے گرداب میں نہ جانے کب تک گھرا رہتا کہ آئی جی مختار مراد نے قریب آ کر اس سے خوشگوار لہجے
کہا۔ انہوں نے آج پولیس یونیفارم یا رسمی ڈنر سوٹ کے بجائے سیاہ رنگ کی شیروانی زیب تن کر رکھی تھی اور
آئے تھے۔ شہریار کی شادی ان کے نزدیک گھر کی شادی تھی جس میں انہوں نے خوب بڑھ چڑھ کر
لیا تھا اور اب بھی کسی مشفق بزرگ کی طرح اس سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر اس نے رخ موڑ کر
کی طرف دیکھا۔ وہاں ماریہ بھاری کام دار جوڑے اور خوب صورت میک اپ کے ساتھ بڑی شان سے
تھی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کافی اچھی بھی لگ رہی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ اسے بہ حیثیت
انسان پسند کرنے کے باوجود اس کا دل اس کی طرف کھنچتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے دنیا میں موجود بے شمار
میں سے ایک عورت تھی جس کے ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ
کہ اس عام سی عورت نے اس سے اس کا زعمِ پارسائی چھین لیا تھا۔ جانے وہ رات کیسی تھی جب وہ ماریہ کے
بے ایمان ہو گیا تھا اور اپنی ساری حدود پار کر بیٹھا تھا۔ ایسا تو کبھی ماہ بانو کی موجودگی میں بھی نہیں ہوا تھا.....
کہ ماہ بانو تو وہ لڑکی تھی جس کے لیے اس نے پہلی بار اپنے دل میں کوئی کشش محسوس کی تھی۔ اس کشش کے
اس کے قدم ماہ بانو کی موجودگی میں کبھی بہکنے نہیں پائے تھے۔

''کس سوچ میں گم ہو بیٹا!..... رانا صاحب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب نکاح ہو جانا
تاکہ تقریب وقت پر ختم ہو سکے۔'' اسے خاموش پا کر مختار مراد نے اسے ٹوکا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا
ان کی معیت میں اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی نکاح کی رسمی کارروائی شروع ہو گئی اور پھر چند
کی ادائیگی سے وہ ماریہ کا بن گیا۔ نکاح کے بعد حسبِ روایت لوگ دولہا دلہن کو مبارکبادیں دینے لگے۔
ڈنر بھی شروع کروا دیا گیا۔ بے پناہ مصروفیت کے ان لمحات میں ہوٹل کا ایک ملازم شہریار کے قریب آ
اس سے مخاطب ہوا۔

''سر! آپ کے لیے کال ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود کارڈلیس کو نمایاں کرتے ہوئے اسے
اطلاع دی۔

''میرے لیے کال؟.....وہ بھی ہوٹل کے نمبر پر؟'' شہریار حیران ہوا۔ ''کون بات کر رہا ہے؟ نام کال کرنے والے نے؟'' کارڈلیس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے اس نے دریافت کیا۔

''نو سر!.....کال کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے آپ کو کوئی بہت اطلاع دینی ہے۔'' ملازم نے مؤدبانہ اسے بتایا۔

''اوکے، میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے ملازم کے ہاتھ سے کارڈلیس لے کر ماؤتھ پیس میں ''ہیلو''

''شادی مبارک ہو جناب!'' اُس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے چہکتے ہوئے کہا گیا۔

''آپ مجھے کون سی اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں؟'' اس کی مبارک باد کو نظر انداز کرتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں آپ کو ایک افسوس ناک واقعے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔'' اس آدمی کا لب ولہجہ ہرگز نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ جس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دینا چاہتا ہے، اس پر اسے کوئی افسوس ہے۔

''میں سن رہا ہوں، فرمایئے۔'' شہریار نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے ہموار لہجے میں اس سے اس فون کال کو نمٹانے کے لیے وہ باقی لوگوں سے الگ ہو کر ٹہلتا ہوا ایک خالی گوشے میں آ گیا تھا۔

''یہ واقعہ پیر آباد میں پیش آیا ہے۔ میں آپ کو اس واقعے کی اطلاع اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ کے پیچھے موجود وجہ سے براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔'' فون کرنے والے نے اصل واقعہ سنانے سے تمہید باندھی۔ شہریار کچھ بھی کہے بغیر اس کی باقی بات سننے کا منتظر رہا، البتہ پیر آباد کا نام سن کر اسے اندازہ تھا کہ اس کے لیے واقعی کوئی بُری خبر موجود ہے۔

''میری معلومات کے مطابق آپ نے چودھری افتخار کی حویلی سے ایک لڑکی ماہ بانو کو فرار کروانے کے لیے ان کے ملازم میاں بیوی کو استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی بعد میں پراسرار طور پر مُردہ پائے گئے۔ چودھری افتخار پر یہ واضح ہونے کے بعد کہ ان دونوں مقتول ملازمین نے اس کے ساتھ نمک حرامی کی ہے، ان کے نوجوان بیٹے بیٹی کو گھر سے اُٹھوا لیا اور ابھی دو گھنٹے قبل ان دونوں بہن بھائیوں کو ماں باپ کے قتل کی سزا دینے کے لیے برہنہ حالت میں منہ کالا کر کے پورے گاؤں میں گدھے پر بٹھا کر گھمایا گیا ہے۔ لڑکا عمر میں بہن سے چھوٹا تھا لیکن بہرحال اتنا سمجھ دار ضرور تھا کہ بے عزتی کو محسوس کر سکے۔ اس سے اپنی اور اپنی بہن کی تذلیل برداشت نہیں ہوئی اور وہ اپنے نہتا ہونے کی پروا کیے بغیر چودھری کے کارندوں پر حملہ آور ہوا۔ اُس کی یہ جرأت ظاہر ہے ان لوگوں کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے رائفلوں کے بٹ مار مار کر لڑکے کی کمر توڑ ڈالی۔ مجھے جو آخری اطلاع ملی ہے، اس کے مطابق لڑکی اپنی رسوائی اور بھائی کی موت کا دکھ برداشت نہیں کر سکی اور اس نے اپنے آپ کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ میرے خیال میں شادی جیسے اہم موقع پر یہ خبر سن کر آپ سخت بدمزہ ہوئے ہوں گے لیکن آپ کی پیر آباد کے لوگوں سے ہمدردی دیکھتے ہوئے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو فوری طور پر یہ خبر پہنچا دی جائے۔'' خبر سنانے والے کا لہجہ آخر میں خاصا طنزیہ ہو گیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ خبر کسی نیک نیتی کے بجائے صرف اس کی خوشی برباد کرنے کے لیے سنا تا رہا ہے۔ ممکن تھا کہ وہ چودھری کے اشارے پر ہی یہ کام کر رہا ہو۔

''کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گے؟'' شہریار نے سلگتے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''سوری سر! میں خود کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے؟ میرا اصل کام تھا آپ



کو خبر کرنا، سو وہ میں نے کر دیا۔'' اس شخص نے جواب دیا اور پھر یک دم ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ پہلے ہی سے ذہنی طلاطم سے بڑھ جانے والا دورانِ خون کنپٹی پر ٹھوکریں مار مار کر اسے کچھ کر گزرنے پر اُکسا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے چودھری کا قتل کر ڈالے تاکہ کرۂ ارض پر سے ایک فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کسمساتے ہوئے انداز میں کارڈلیس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بھینچتے ہوئے اس نے چودھری کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ اسے فوراً ہی نظر آ گیا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ اس کی نظریں اس پر ہی ٹکی ہوئی تھیں اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ چودھری کا یہ انداز دیکھ کر اُس کے اس شبے کی تصدیق ہو گئی کہ اس تک خبر پہنچانے والا چودھری کا ہی کوئی گماشتہ تھا۔ بہت تاک کر ایک طے شدہ وقت پر اس تک یہ خبر پہنچانے کا مقصد یقیناً اُسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا تھا اور واقعی وہ بری طرح تپ گیا تھا۔ چنانچہ ہر طرح کی مصلحت اور رکھ رکھاؤ کو بالائے طاق رکھتا ہوا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چودھری تک پہنچا اور اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ چودھری نے دور سے ہی اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا لیکن کوئی مزاحمت اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ جانتا تھا، اس ہجوم میں شہریار اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا بلکہ اُلٹا اس کے خلاف ہی ایک اسکینڈل بن جائے گا۔ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جیسے ہی شہریار نے اس کا گریبان پکڑا، ایک شور سا مچ گیا اور کئی لوگ بیچ بچاؤ کروانے کے لیے آگے بڑھے۔

''چھوڑ دو مجھے۔ یہ شخص اس لائق نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔'' بپھرا ہوا شہریار کسی کے قابو میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ کئی افراد نے مل کر اسے چودھری سے الگ کیا اور پھر اسے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے۔

''یہ کیا بے وقوفی تھی شہریار! اپنی نہیں تو کچھ میری ہی عزت کا خیال کرتے۔ کل صبح کے اخبارات میں تمہاری اس حرکت کی خبر تصویروں سمیت لگی ہو گی۔ بلکہ صبح کا بھی کیسا انتظار؟ الیکٹرانک میڈیا تو ابھی تھوڑی ہی دیر میں نمک مرچ لگا کر یہ خبر نشر کرے گا۔'' لیاقت رانا شاید زندگی میں پہلی بار اس سے اس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ درحقیقت زندگی میں پہلی بار ہی ایسا ہوا تھا کہ انہیں شہریار کی وجہ سے شدید سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا، ورنہ وہ تو ہمیشہ ان کے لیے باعث فخر رہا تھا اور کبھی بھی اس نے اپنا سیلف کنٹرول اس طرح سے نہیں کھویا تھا۔

''ہونے دیں خبر نشر۔ میں خود میڈیا والوں کو چودھری کے کرتوت بتاؤں گا۔'' اس کا غصہ ابھی اُترا نہیں تھا اور وہ بدستور جذباتیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''تم اس کے بارے میں سچ بتاؤ گے اور وہ جواب میں جھوٹ گھڑ گھڑ کر تمہیں بدنام کرے گا۔ میڈیا والوں کو سچ اور جھوٹ دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انہیں بس چٹ پٹی مسالے دار خبریں چاہئے ہوتی ہیں جن سے ان کے چینل کا کاروبار چلتا رہے۔'' لیاقت رانا نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''سوری ماموں جان! واقعی مجھ سے جذبات میں ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔'' ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اعتراف کیا۔

''مجھ سے سوری کہہ دینے سے مسئلہ حل تھوڑی ہو جائے گا؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری اس حرکت پر لوگوں کے سامنے کتنی اور کیا کیا وضاحتیں دینی پڑیں گی۔ وہ تو شکر ہے کہ صدر اور وزیراعظم صاحب اپنے مصروف شیڈول کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کر سکے ورنہ مجھے ان کے سامنے بھی سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔'' ان کا موڈ سچ مچ بڑا خراب تھا۔

''میں واقعی بہت شرمندہ ہوں ماموں جان! بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔'' اس نے انہیں منانے کی کوشش کی۔

"تمہیں بچپن سے ناقابلِ برداشت باتوں کو برداشت کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ اگر تمہارے جیسے لوگ یوں اپنا ٹیمپر لُوز کرتے رہیں تو عوام کو تو ہر روز ایک تماشا دیکھنے کو ملے گا۔ بہرحال، فی الحال میں اس حرکت کے لیے معاف کر رہا ہوں، وہ بھی صرف اور صرف اس وجہ سے کہ آج تمہاری شادی ہے۔" رانا اس سے یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ وہاں تنہا رہ گیا۔ تنہائی ملتے ہی وہ بے دم سا ہو کر ایک پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ بند کمرے کی یہ عافیت عارضی ہے۔ باہر ایک ہجوم موجود ہے، زبانوں پر بہت سے سوال مچل رہے ہوں گے۔ اسے ان سوالوں کے معقول جواب بھی سوچنے تھے اور کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل بھی بنانا تھا جس پر عمل کر کے چودھری کے شر سے نمٹا جا سکے۔

⊛----✪----⊛

بڑے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی ماہ بانو نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، اس کچھ فاصلے پر ایک کنواں تھا اور ایک آدمی کنوئیں سے پانی نکال رہا تھا۔ اُس کی پھرتی اور جفاکشی دیکھ کر ا ہوتا تھا کہ وہ ایک سخت جان آدمی ہے۔ اس نے گھیردار شلوار قمیض کے ساتھ سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی چہرے پر خوب بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں تھیں۔ اس جیسے حلیے کے یہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور کے علاوہ ان کے درمیان جو قدر مشترک تھی، وہ ان کا پیشہ تھا۔

دو دن ان لوگوں کے درمیان گزارنے کے بعد وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ سب پیشہ ور ڈاکو ہیں یہاں جنگل میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ اُن کی اس پناہ گاہ میں زندگی کی تمام بنیادی ضروریات پوری کر انتظام تھا۔ وہ یہاں کافی ٹھاٹ باٹ سے رہ رہے تھے اور کیوں نہ رہتے کہ ان کے پاس لوگوں سے لوٹا ہوا سا مالِ مفت ہونے کے علاوہ روپیہ بھی تھا جو انہیں سپورٹ کرنے والے وڈیرے اور جاگیردار بڑی فراخ سے فراہم کرتے تھے۔ بدلے میں یہ ڈاکو ان کے احکامات کی تعمیل کر دیا کرتے تھے۔ وہ کسی ایک کے وفا ملازم نہیں تھے۔ جو ان کو رقم فراہم کرتا، اس کی خدمت بجالانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وہ کس سازش کا ہو کر یہاں تک پہنچائی گئی ہے، اسے صحیح سے علم نہیں تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ آ گیا تھا کہ حویلی کے مہمان خانے نکلتے ہوئے وہ جس خوش فہمی کا شکار تھی، وہ سراسر غلط تھی۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی میں موجودگی کا پتہ چلا کر شہریار نے اس کی رہائی کا بندوبست کیا ہے۔ خود کو لینے کے لیے آنے والوں کے وہ کافی دیر تک اسی خیال کے تحت سفر کرتی رہی تھی لیکن پھر ان کے سفر کی سمت دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تار راہوں پر گھوڑے دوڑاتے وہ لوگ جنگل میں داخل ہو گئے تھے اور کسی قسم کی دشواری یا جھجک کے بغیر آ بڑھتے جا رہے تھے۔

رات کے اندھیرے میں جنگل کے اندر ہونے والے اس سفر نے ماہ بانو کو خوف زدہ کر دیا اور اس اپنے آگے موجود گھڑسوار سے استفسار کیا۔ اس استفسار کے جواب میں اسے بے ہوشی کی کوئی دوا سونگھا دی اور دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو وہ اس جگہ موجود تھی۔ یہ انوکھی جگہ تھی۔ یہاں جنگلی بیل بوٹوں کی خوشبو بھی تھی پرندوں کی چہکاریں بھی۔ تازہ ہوا بھی تھی اور ٹھنڈا پانی بھی لیکن پھر بھی کسی خوب صورتی کے بجائے وحشت احساس ہوتا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کو اچھا خاصا وقت ایک تنگ جھونپڑی نما جگہ پر گزارنا پڑا اسے وقت پر کھانا فراہم کر دیا جاتا تھا۔ اس کے لیے کھانا لے کر آنے والی ایک عورت نے ہی اس کے پو اسے بتایا تھا کہ وہ جنگل میں ڈاکوؤں کے ایک ڈیرے پر موجود ہے اور کسی وڈیرے سے سودے بازی کے



یہاں پہنچائی گئی ہے۔ وہ وڈیرا کون تھا، اس بات کا عورت کو خود بھی علم نہیں تھا۔ خود ماہ بانو بھی درست اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔

وہ چودھری افتخار عالم شاہ کی قید میں تھی اور وہاں سے اسے بہت پُراسرار طریقے سے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ کام چودھری کا تھا تو اسے اتنا لمبا چوڑا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سیدھے سادے طریقے سے ان لوگوں کے حوالے کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ تو خود اس کا متمنی تھا۔ اس سے بھلا یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ اسے کسی اور کے حوالے کر دے۔ یہ کسی دوسرے ہی شخص کا کام تھا جو کسی نہ کسی طرح کا دشمن تھا اور اسے زک پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بہرحال اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ وہ کون ہو سکتا اور اس کے لیے اس سوال کا جواب جاننے سے زیادہ اہم اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا تھا۔

قسمت و حالات کے گرداب میں پھنسی وہ ایک مصیبت سے نکلتی تھی تو دوسری میں اُلجھ جاتی تھی۔ حالات نے ایسا بے دست و پا کر دیا تھا کہ وہ ایک عام فرد کی طرح معمول کی زندگی گزارنے سے قاصر تھی۔ پچھلے شہریار کے تعاون سے اس نے ایسی زندگی کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زندگی کا دورانیہ بہت مختصر ثابت ہوا اور وہ ایک اور نئے جال میں پھنس گئی۔

ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر پہنچنے کے بعد اسے تقریباً ڈیڑھ دن بعد جھونپڑی سے باہر آنے کی اجازت دی گئی اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے دونوں پیروں کے درمیان ایک زنجیر تھی۔ اس زنجیر کا طول اتنا کم تھا کہ وہ تو بے شک سکتی تھی لیکن بہت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر۔ یہ انتظام یقیناً اسے فرار سے روکنے کے لیے کیا تھا۔ چلنے پھرنے کی آزادی کیوں دی گئی، وہ اس نے اس وقت جانا جب اسے جھونپڑی سے نکالنے کے ایک اوپن ایئر کچن میں پہنچایا گیا اور ایک بڑا سا تھال بھر کر آٹا گوندھنے کے بعد روٹی پکانے کا حکم ملا۔ اتنی مقدار میں آٹا گوندھنے اور روٹیاں پکانے کا یہ اس کی زندگی میں پہلا اتفاق تھا۔ اَن گنت روٹیاں پکا پکا کر اس کے ہاتھ اس جانے لگے اور اسے یوں لگا کہ وہ انسانوں کے بجائے جنوں کی خوراک کا بندوبست کرنے پر مامور کر گئی ہو۔ روٹیاں پکا کر فارغ ہوئی تو اس کی کمر تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور جسم کے ایک ایک مسام سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس نے خود کو واپس جھونپڑے میں لے جانے کے لیے آنے والے ڈاکو سے درخواست کی کہ اسے کھلی ہوا میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ ڈاکو جو اپنے حلیے اور چال ڈھال سے باقی سب سے مختلف نظر آتا تھا، اس کی یہ بات مان گیا اور اب وہ اس بڑے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے یہاں بیٹھنے کی اجازت دینے والا ڈاکو بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور بڑی تن دہی سے اسلحہ کی صفائی کر رہا تھا۔

ماہ بانو یونہی اس کا جائزہ لینے لگی۔ ڈاکو جوان العمر آدمی تھا اور اس نے باقی سب کی طرح گھیردار شلوار قمیص کے بجائے گھسی ہوئی جینز اور ٹی شرٹ کے اوپر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر موجود داڑھی بھی خاصی نفاست سے ترشی ہوئی تھی اور چہرے پر وحشت کے بجائے قدرے نرمی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے بلکہ ان سے مختلف کوئی پڑھا لکھا انسان ہے۔ لیکن لگنے سے کیا ہوتا ہے، تھا تو بہرحال وہ ان ڈاکوؤں کا ہی ایک ساتھی۔

"اے لڑکی! چل ادھر آ اور کپڑے دھونے میں اس کا ہاتھ بٹا۔" وہ جانے کب تک اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ ایک کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے آواز کی سمت میں دیکھا۔ کنوئیں میں سے پانی نکالنے والا ڈاکو اس سے مخاطب تھا۔ کچھ دیر قبل جب اس نے اس کی طرف دیکھا تھا تو وہ تنہا تھا لیکن اب اس

کے قریب ایک مدقوق سی عورت کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عورت کے جسم پر معمولی گھسا پٹا لباس تھا جو اس کے
پتلے لاغر جسم پر خاصا ڈھیلا ہو رہا تھا۔ ماہ بانو پکارنے والے کے حکم کی تعمیل کے لیے اپنی جگہ سے کھڑی ہوا
زنجیر میں جکڑے پیروں سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اس کی سمت بڑھ گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے
کنوئیں کے قریب ہی ایک بڑا سا چبوترا بنا ہے جس پر دُھلنے والے کپڑوں کا ایک گٹھڑ رکھا ہوا ہے۔

''میں کپڑوں کو صابن لگا لگا کر دیتی جاتی ہوں، تم انہیں کھنگال لینا۔'' مدقوق الحال عورت نے
طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر گٹھڑ کھولنے لگی۔ ماہ بانو کا کام فی الحال شروع نہیں ہوا
لیے وہ کھڑی عورت کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ کافی
معلوم ہو رہی تھی۔ شاید کام کی زیادتی نے ہی اسے چڑچڑا بھی کر دیا تھا۔ اپنی حالت کے برخلاف وہ
پھرتی سے کام کر رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ماہ بانو نے اس سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''لیلیٰ۔'' عورت نے مختصر جواب دیا اور ایک قمیض کو برش سے رگڑنے لگی۔ اس کا انداز دیکھتے ہو
بانو کو اندازہ ہوا کہ وہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ خود بھی خاموشی سے کام میں لگ گئی۔
روٹیاں پکانے سے زیادہ محنت طلب اور دشوار تھا۔ کپڑے نہ صرف بے حد میلے تھے بلکہ ان سے شدید بد
رہی تھی۔ ماہ بانو کو کئی بار ان کی بُو سے ابکائی سی آ گئی۔

''بہت مشکل کام ہے یہ تو۔ بندہ اس بُو سے مر بھی سکتا ہے۔'' ایک گھیر دار شلوار کو زور لگا کر نچوڑتے ہو
وہ بڑبڑائی۔

''یہاں موت اتنی آسان نہیں ہے۔ تم صرف کپڑے دھونے سے گھبرا گئیں، جب ان کے بدبودار جسم
کو برداشت کرنا پڑے گا، تب کیا کرو گی؟'' اس کی ساتھی عورت نے اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں طنز
پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' ماہ بانو متوحش ہوئی۔

''مطلب بہت جلد تمہیں خود سمجھ آ جائے گا۔'' عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر وہ دُھلے ہو
کپڑوں سے بھری بالٹی اُٹھا کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ فاصلے پر زمین میں بانس گاڑھ کر ان کے ساتھ
رسیاں باندھی گئی تھیں۔ لیلیٰ نامی وہ عورت کپڑے جھٹک جھٹک کر رسیوں پر پھیلانے لگی۔ ماہ بانو کچھ دیر
اسے یہ کام کرتا دیکھتی رہی، پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ اس مشقت سے دُکھ چکا تھا اور
وہ اپنے لیے مخصوص جھونپڑی میں جا کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔

چلتے چلتے اس کی نظر یونہی اس طرف گئی جہاں سب سے منفرد نظر آنے والا ڈاکو بیٹھا اپنی رائفل صاف
رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی کہ وہ ڈاکو اپنا کام چھوڑ کر بہت محویت کے ساتھ اسے تک رہا ہے۔ ماہ بانو سے نظر
تو اس نے آہستہ سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا لیکن اس کی چوری تو بہرحال وہ پکڑ ہی چکی تھی۔ ڈاکو کی محو
نے لیلیٰ کی کچھ دیر قبل کہی ہوئی بات کے ساتھ مل کر اس کو بُری طرح ہراساں کر دیا۔ زندگی میں پے در پے
آنے والے کئی واقعات نے مل کر اسے اس کم عمری میں ہی یہ بات سمجھا دی تھی کہ مرد مفت میں ہاتھ آئی عورت
کو بخشنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

وہ اوڑھنی کو اور بھی اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی تیز تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی
پیروں میں پڑی زنجیر اس تیزی کو قائم رکھنے میں اگرچہ رکاوٹ ڈال رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے حتی الامکان



ظاہرہ کیا تھا۔

جھونپڑی میں پہنچ کر اس نے قدرے سکون کا سانس لیا اور زمین پر بچھی ترپال پر گرنے کے انداز میں
مشقت سے تھکے ہوئے جسم نے اسے بہت دیر تک سوچنے کا موقع نہیں دیا اور جلد ہی وہ نیند کی آغوش
سوتے ہوئے وقت کا کتنا بڑا حصہ گزر گیا، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بہت گہری نیند سوتے ہوئے
سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے بری طرح ڈنگ لگا
اچھل کر اپنی جگہ پر اُٹھ بیٹھی۔

جھونپڑی میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کونے میں جلتی چھوٹی سی لالٹین کی مدھم لو نے ماحول کو بس اتنا
تھا کہ وہاں موجود اشیاء سائے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ ماہ بانو نے ماحول کو سمجھنے کی کوشش بھی
کی۔ اس کے ذہن نے سب سے پہلے اس احساس کا تجزیہ کیا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ
ہاتھ کا لمس تھا جسے وہ اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کر سکتی تھی۔ متحرک ہاتھ کا کھردرا پن اور سختی صاف بتا رہی
کہ وہ مردانہ ہاتھ ہے۔ لمحہ بھر میں مکمل ہونے والے تجزیے کا نتیجہ سامنے آتے ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے
اُٹھی۔ اُس کے ہاتھ پر متحرک ہاتھ اس کے اس ردِعمل پر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

ماہ بانو نے آنکھیں پھاڑ کر تاریکی کی چادر میں چھپے اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ذرا سی کوشش سے
اول سے ہم آہنگ ہو جانے والی اس کی نظروں نے جس شخص کو شناخت کیا، وہ اس کی توقع کے بالکل
خلاف تھا۔ چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے اس شخص کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں سے
مختلف ہے۔ لیکن شاید صرف اس کا ظاہر ہی ان لوگوں سے مختلف تھا۔ باطن میں وہ بھی وہی تھا جو اس کے
دوسرے ساتھی تھے۔ اپنے مختلف پہناوے کی وجہ سے وہ دوسروں سے کچھ منفرد محسوس ہوا تھا اور ماہ بانو نے اس
وجہ سے آسانی سے شناخت بھی اسی لیے کر لیا تھا کہ وہ دوسرے ڈاکوؤں کی طرح گھیر دار شلوار قمیض کے
بجائے جینز اور شرٹ پہنے ہوئے تھا لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ حلیے سے دوسروں سے الگ نظر آنے والا،
کردار کے معاملے میں بالکل مختلف ثابت ہوا تھا۔ اس کے ساتھی اگر دن بھر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے
تھے تو وہ بھی اپنی ہوس پوری کرنے رات کی تاریکی میں اس تک پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو کو خود کو اس کے ناپاک
ارادے سے محفوظ رکھنا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنے لگی۔

''آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔'' وہ کچھ سوچ پاتی، اس سے قبل ہی اندھیرے کی
اوٹ کے اس پار سے ایک آواز سفر کرتی ہوئی اس تک پہنچی اور اپنے الفاظ سے اسے پہلے سے بھی زیادہ چونکا
گئی۔ بولنے والے کا لہجہ بہت صاف اور نرم تھا اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس شخص کی ہر خصوصیت سے بڑھ کر ماہ بانو کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس
اس کی وہاں موجودگی کی وجہ جان سکے۔ کیونکہ اس کی جس حرکت کی وجہ سے اس کی نیند خراب ہوئی تھی، وہ
نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔

''میں اس لیے یہاں آیا ہوں کہ صرف مجھے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ میں یہاں آ سکوں بلکہ یہ کہنا زیادہ
مناسب ہوگا کہ میں نے یہ اختیار خود اپنے لیے حاصل کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ماہ بانو نے اُلجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے چہرے کے نقوش بھی
واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے، تاثرات سمجھنا تو بہت دور کی بات تھی۔

''مطلب.....'' اس نے سوچنے والے انداز میں کہا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ماہ بانو اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ آخر اس نے کچھ دیر بعد اپنے لبوں پر پڑا خاموشی کا قفل کھول ہی دیا۔

''ہم ڈاکو ہیں اور ان جنگلات میں پناہ گزین ہیں، یہ بات تو تم نے جان ہی لی ہوگی۔'' اس نے گویا گفتگو سے قبل تمہید باندھنے کے لیے یہ سوال کیا۔

''ظاہر ہے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی یہ بات جانتی ہوں کہ ان جنگلات میں ڈاکوؤں کا ٹھکانہ ہے جو وقتاً فوقتاً اردگرد کے معصوم دیہاتیوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں میرے لیے یہ اندازہ لگانا کیا مشکل تھا کہ تم لوگ ڈاکو ہو۔ ویسے اگر میرے علم میں یہ بات نہ بھی ہوتی تو تم لوگوں کا وضع قطع اور اسلحہ دیکھ کر بھی سمجھ جاتی۔'' ماہ بانو نے اسے جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یقیناً تم نے ہمیں دیکھتے ہی ہمارے بارے میں جان لیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے اس جنگل میں اپنے لیے زندگی کی ممکنہ سہولیات جمع کر لی ہیں اور آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہاں ایک چیز کی بہت کمی ہے اور اس چیز کے بغیر رہنا مرد کے لیے مشکل ہے۔''

ماہ بانو نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہاں اتنے بہت سارے مردوں کے درمیان اس نے عورت کی شدید قلت دیکھی تھی۔ اپنے علاوہ یہاں اس نے صرف دو عورتیں دیکھی تھیں۔ ایک وہ موٹی تڑنگی عورت جو اسے کھانا وغیرہ پہنچاتی رہی تھی اور دوسری وہ سوکھی چمڑخ جس کے ساتھ مل کر اس نے آج ان ڈاکوؤں کے میلے کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ وہ دو عورتیں یقیناً اتنے سارے مردوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ پھر ان کا جو حال تھا، اسے دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی مرد کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی ہوں گی وہ بس مجبوراً ہی ان سے کام چلا رہے ہوں گے۔ ایسے میں ماہ بانو کا تازہ گلاب سا شاداب وجود دیکھ کر ان کی رال ٹپکنا تو لازم تھا اور اس کے سامنے موجود شخص یقیناً اس کا پہلا طلب گار بن کر یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی باقی دونوں عورتوں کی طرح سب کی مشترکہ جاگیر بن جاتی۔ ان عورتوں کے ساتھ وہاں کیا سلوک روا رکھا جا رہا تھا، اس بارے اندازہ اس نے خود ہی لگا لیا تھا اور اب خود کو بھی انہی حالات میں محسوس کر کے اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز اس کی تنہائی میں آنے والے نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

''اپنی زندگی میں موجود اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہاں کچھ نہ کچھ بندوبست کیا جاتا رہتا ہے۔ کسی واردات کے وقت جسے موقع لگے، وہ استفادہ کر لیتا ہے۔ کبھی یہ لوگ کہیں سے کوئی لڑکی اُٹھا لاتے ہیں، کبھی کبھار کسی پیشہ ور طوائف کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سارے چانسز مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف کبھی بھی کسی کو دل بھر کر اپنی حسرتیں نکالنے کا موقع نہیں دیتا۔ ہمارا ایک ساتھی اس معاملے میں بہت ہی بے صبرا تھا اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بڑی پابندی سے ایک طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ وہاں کسی نے مخبری کر دی۔ پولیس نے چھاپہ مار کر اسے کوٹھے پر سے گرفتار کر لیا۔ ہم تک بھی اس کی گرفتاری کی اطلاع پہنچ گئی۔ پورے گروہ میں کھلبلی مچ گئی کہ جانے کب اس ساتھی کے ذریعے پولیس ہمارے ٹھکانے تک پہنچ جائے۔ ہم سارے روپوش ہونے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ لیکن ہمارا وہ ساتھی بھی جوان بچہ نکلا۔ پولیس کا تشدد سہتے سہتے اس نے اپنی جان دے دی لیکن زبان نہیں کھولی۔'' وہ اسے ایک بار پھر تفصیل بتاتے بتاتے دوسرے معاملے کو چھیڑ بیٹھا اور اپنے ساتھی کی تعریفیں کرنے لگا۔



''تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ مجھے تمہارے ان سب معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اچھی خاصی خوف زدہ ماہ بانو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں دلچسپی لینی چاہئے۔ اب تم ہمارے درمیان ہو اور یقیناً تمہیں ایک طویل عرصے ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ ویسے بھی میں نے یہ سب کچھ تمہیں خود سے بتانا شروع نہیں کیا ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے اور میں تمہیں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اسے اپنا ٹوکا جانا ناپسند آیا اور کچھ ناراضی سے اسے جواب دیتے ہوئے بولا۔

''میں تو یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میں یہاں کیسے اور کس وجہ سے پہنچی ہوں۔ کیا تم مجھے میرے ان سوالوں کے جواب دو گے؟'' اس شخص کا رواں لہجہ اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا اور ایک ہی چیز ماہ بانو کی امید دلا رہی تھی کہ وہ ڈاکو ہونے کے باوجود قدرے مہذب ثابت ہو سکتا ہے اس لیے اس کی ناراضگی کے باوجود حوصلہ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں اٹکے سوالات بھی کر ڈالے۔ یوں بھی وہ جس تواتر سے بول رہا تھا، دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ گفتگو کی روانی میں وہ اسے بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

''تم جو جاننا چاہتی ہو، میں تمہیں وہ بھی بتا دوں گا لیکن پہلے تم مجھے اپنے پچھلے سوالوں کا جواب مکمل کرنے دو۔ میں کبھی بھی ادھورے پرچے حل کرنے کا عادی نہیں رہا۔'' اس کے اس جملے نے ماہ بانو کا یقین اور بھی پختہ کر دیا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہے جو نہ جانے کس طرح ان اجڈ ڈاکوؤں کے ساتھ آملا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم اپنی بات مکمل کر لو پھر مجھے میرے اس سوال کا جواب دے دینا۔'' اس نے قدرے نرم اور متوازن لہجے میں گویا اسے اجازت دی۔ اس پر چھا جانے والا خوف بھی اب بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

''میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ کچھ نہ ملے تو یہاں ڈیرے پر موجود دونوں عورتوں میں سے ہی کسی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ ان میں اپنے ساتھیوں میں وہ واحد شخص ہوں جس نے خود کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں عورت کا خانہ بالکل خالی رہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر کوئی خواہش نہیں ہے یا میں زاہد خشک ہوں۔ میں بھی ہر مرد کی طرح اپنے دل میں ایک عورت کی تمنا رکھتا ہوں لیکن اس معاملے میں میرا نفس کسی اور کی طرح بے لگام نہیں ہے۔ اصل میں جمالیاتی ذوق اتنا بلند ہے کہ کوئی معمولی عورت کبھی میرے معیار پر پوری ہی نہیں اُتر سکی۔ میرے ساتھی میری اس بات کو نہیں مانتے تھے اور اکثر اس شک کا اظہار کرتے تھے کہ میں اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ میں نے کبھی ان کے شکوک دور کرنے کے لیے بھی خود کو اپنے معیار سے نیچے لانا پسند نہیں کیا لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے لگا کہ میرا انتظار ختم ہو گیا ہے اور تم ہی وہ عورت ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے نمبردار سے کہہ کر تمہیں اپنے لیے مانگ لیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ تمہیں میرے سوا کوئی اور نہیں چھوئے گا۔ کیونکہ میں نے پہلی بار کسی عورت کے لیے دلچسپی کا اظہار کیا تھا، اس لیے نمبردار نے میری بات ماننے سے انکار نہیں کیا اور وعدہ کر لیا کہ جب تک میرا تم سے دل نہیں بھر جاتا یا میں خود اجازت نہیں دے دیتا، تب تک گروہ کا کوئی دوسرا شخص تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

وہ نہایت اطمینان سے جو کچھ بتا رہا تھا، اسے سن کر ماہ بانو کا اپنا سارا اطمینان رخصت ہو گیا اور وہ سمجھ گئی کہ وہ ایک بار پھر ان حالات میں پھنس گئی ہے جن سے اب تک بچتی رہی ہے۔ چودھری افتخار سے لے کر اس لمحے تک اس نے مردوں کے کئی روپ دیکھے تھے۔ وہ سارے زبان، لباس اور پیشے وغیرہ کے اعتبار سے تو ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن عورت کے معاملے میں سب کا ندیدہ پن یکساں تھا۔ وہ اللہ کی مہربانی سے اب تک

ان [illegible] مردوں سے بچتی رہی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ اب اس جنگل بیابان میں اس کے ساتھ کیا [illegible] ایک ایسی جگہ پر جہاں سب ہی عورت کے معاملے میں بھوکے درندوں کی طرح تھے، کوئی اس کا [illegible] ہوتا تو کیسے؟

''میں تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' خوف زدہ ہو[illegible] ہوا اس نے اپنے مالک بنے بیٹھے [illegible] کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تو میں تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب دے رہا ہوں [illegible] میں تم پر پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں ادھورے پرچے حل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس نے [illegible] کی بات کو کسی دخل اندازی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اسے جواب دیا اور اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری [illegible] ہوئے بولا۔

''تم نے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیسے اور کس کی وجہ سے پہنچی ہو تو اس سوال کا جواب یہ کہ تمہیں [illegible] پہنچانے کا ذمے دار چودھری کا داماد اشرف شاہ ہے۔ کسی وجہ سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری شادی چودھری [illegible] ہو۔ اس لیے اس نے تمہیں حویلی سے غائب کرنے کا بندوبست کر دیا۔ وہ چاہتا تو تمہیں ہلاک بھی کروا سکتا [illegible] لیکن اس نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے تمہیں تحفے کے طور پر سردار کے حوالے کر دیا۔ سردار کی اشرف شاہ سمیت [illegible] چودھریوں سے اچھی دوستی ہے اور اس دوستی کو نبھانے کے لیے ان کے درمیان [illegible] مفادات کے سلسلے میں اس طرح کے کام ہوتے رہتے ہیں۔ اب تم اپنا معاملہ ہی لے لو۔ اشرف شاہ نے [illegible] خواہش کے مطابق تم سے جان بھی چھڑا لی اور سردار کو تحفہ بھیج کر اسے خوش بھی کر دیا۔ اب آئندہ اشرف [illegible] سردار سے اپنا کوئی کام کہے گا تو سردار انکار تھوڑی کر سکے گا۔''

اس کا جواب سن کر ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی کہ آخر اشرف شاہ کو اس سے کیا دشمنی تھی کہ اس نے اسے [illegible] ڈاکوؤں کے درمیان بھیج دیا..... لیکن سوچنے پر بھی اسے دشمنی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ البتہ یہ ضرور سوچنے [illegible] مجبور ہو گئی کہ اس کی چودھری سے شادی ہونے کی صورت میں یقیناً اشرف شاہ کے کسی مفاد پر ضرب پڑتی [illegible] اس لیے اس نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ بہرحال وہ تو اس کے لیے بیک وقت نجات دہندہ بھی ثابت ہوا تھا [illegible] دشمن بھی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف وہ چودھری کے چنگل سے نکلی تھی تو دوسری طرف اس جنجال میں آ پھنسی تھی [illegible]

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اندھیرے کے باوجود اس نے ماہ بانو کی کیفیات بھانپ لیں اور اس سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔'' ماہ بانو نے اسے اپنی سوچوں سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

''شاید تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔'' اس نے کافی حد تک درست اندازہ لگایا۔

''جو شخص میری عزت کے درپے ہے، کیا مجھے اس سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے؟'' جواباً وہ تیز [illegible] میں بولی۔

''نہیں۔ کم از کم تمہیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے جو کچھ کیا، وہ تمہاری عزت بچانے کے لیے کیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ تم وہ پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور [illegible] کی تمنا میرے دل میں جاگی ہے۔ لیکن میں سردار سے تمہیں مانگنے کے بعد مسلسل تمہارے بارے میں سوچتا [illegible] ہوں۔ میں نے بہت غور کیا، فطری طلب بھی مجھے اُکساتی رہی لیکن بے شمار برائیوں میں مبتلا ہو جانے کے باوجود میں خود کو اتنا گرانے کی ہمت نہیں کر سکا کہ اپنے ہاتھوں کسی عورت کی عزت پامال کر سکوں۔ تم [illegible]



[illegible] ابھی جب میں نے تمہارے ہاتھ تھام رکھے تھے تو میرے دل کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا لیکن [illegible] قربت کا میں سوچ بھی نہیں سکا۔'' وہ اتنا کہہ کر ایک دم ہی رخ موڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ [illegible] ماہ بانو اُس کے اس طرح اچانک چلے جانے پر ناسمجھی کے عالم میں پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''تم دونوں ہنی مون کے لیے کہاں جا رہے ہو؟'' وہ سب شام کی چائے پر جمع تھے، تب اچانک آفرین [illegible] نے شہریار اور ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا۔

''میں نے کچھ سوچا نہیں۔'' شہریار گویا ہڑبڑا کر کسی خیال سے باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر ماریہ سے شادی [illegible] کی تلافی کے لیے کی تھی۔ اپنے گناہ کا تاوان ادا کرتے ہوئے ذہن میں ہنی مون جیسے خوبصورت [illegible] کا رہنا ممکن ہی نہیں تھا، اسی لیے آفرین رانا کے سوال نے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

''[illegible] جانیں تو اب سوچ لو۔ ماریہ کیا سوچے گی کہ اس کا کس قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ آج کل تو [illegible] سے پہلے ہنی مون پلان کر لیتے ہیں اور تمہیں شادی شدہ ہو جانے کے بعد بھی ہوش نہیں۔'' آفرین [illegible] آڑے ہاتھوں لیا۔ جواباً شہریار نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس موقع پر ماریہ اس کی مدد کے لیے [illegible]۔

''آپ میرے سوچنے کی فکر نہیں کریں آنٹی! میں جانتی ہوں کہ شہریار کس قسم کے آدمی ہیں۔ مجھے ان کی [illegible] کا بھی اندازہ ہے۔ ان کا شیڈول جتنا ٹائٹ ہے، اس میں انہوں نے شادی کا وقت نکال لیا، یہی [illegible] ہے۔ ہنی مون وغیرہ کے لیے ان کے پاس فی الحال وقت نہیں ہے، یہ میں جانتی ہوں اس لیے اس [illegible] میں نے خود بھی کچھ نہیں سوچا ہے۔''

''[illegible] چاہیے تھا۔ اگر تم اسے اسی طرح ڈھیل دیتی رہی تو تمہاری زندگی بالکل خشک اور رُوکھی پھیکی [illegible] گی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ جنون کی حد تک اپنے کام کے ساتھ انوالو ہو جانے کا عادی ہے اور بیوی کی [illegible] سے اس کی یہ عادت تمہیں بہت پریشان کرے گی۔'' انہوں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے گویا ماریہ کو [illegible] کی کوشش کی۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ میں ہر بار انہیں اس طرح نہیں چھوڑوں گی۔ ہمارا ہنی مون ان پر ڈیو رہے گا اور [illegible] ہی میں سب سے پہلے ان سے اپنی پسندیدہ جگہوں پر جانے کا اصرار کروں گی۔ ابھی تو فی الحال میں [illegible] کافی مصروف ہوں۔ پیر آباد کے ہیلتھ سینٹر میں میرے علاوہ کوئی دوسری لیڈی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ [illegible] جانے سے پہلے مجھے اپنی جگہ کسی دوسری ڈاکٹر کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔''

[illegible] بہت سبھاؤ سے شہریار کا دفاع کر رہی تھی۔ شہریار خاموشی سے بیٹھا ہونے کے باوجود اس بات کو اچھی [illegible] محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں ماریہ کا شکر گزار بھی تھا۔ شادی کے بعد اس نے اس کے لیے کوئی بھی [illegible] گڑی نہیں کی تھی۔ وہ ذرا بھی ڈیمانڈنگ نہیں تھی۔ کوئی فرمائش کرنا تو کُجا، اس نے شہریار کے لیے دیے [illegible] بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ماریہ سے قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود وہ اُس کے اس رویے پر تہ دل سے اس [illegible] تھا۔ ورنہ آج کل اس کے قلب و ذہن کی جو حالت تھی، اس کے ساتھ اگر ماریہ بھی اس کے لیے کوئی [illegible] گڑی کرتی تو وہ بہت ڈسٹرب ہو جاتا۔ پہلے ہی پے در پے ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے جن کی وجہ [illegible] وہ غصے کا شکار تھا۔ اوّل بڑی جدوجہد کے بعد ہاتھ آیا ''را'' کا ایجنٹ ورما پولیس کی نااہلی کی وجہ سے

ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ دوم اچھی بھلی سکون سے کراچی کے ہاسٹل میں مقیم ماہ بانو کو اغوا کرلیا۔ سوم اس کی ساری زندگی کی پارسائی کا بھرم ٹوٹ گیا۔ یہ سارے واقعات کوئی معمولی نہیں ہے اس کی چہیتی بھتیجی شینا کا قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کا دشمن بھی تھا۔ اس نے اب تک جانے کتنے نقصان پہنچائے تھے اور اب آزادی ملنے کے بعد کتنے پہنچانے والا تھا، کچھ معلوم نہیں تھا۔

ماہ بانو بھی ایسی غائب ہوئی تھی کہ ابھی تک اس کا کچھ اتا پتہ تھا اور نہ ہی اب تک یہ معلوم ہوسکا تھا کہ کس طرح اس تک چودھری کی رسائی ممکن ہوسکی۔ اس نے چاہے اب تک واضح طور پر خود سے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ ماہ بانو کی محبت میں مبتلا ہے لیکن دل میں اس کے لیے جو جذبہ تھا، وہ خود اسے ماہ بانو کے لیے تڑپاتا تھا، بے چین ہو جاتا تھا کہ وہ جہاں بھی، جس بھی مشکل میں گرفتار ہے، اسے اس سے نجات دلا کر ایک پُرسکون خوشیوں بھری زندگی دے سکے۔ وہ اس کی زندگی میں اپنے ساتھ کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ ماہ بانو کے دل میں جو جذبہ تھا، وہ قطعی بے غرض اور بے لوث تھا۔ اور اب اس کی زندگی میں جو اتنا بڑا حادثہ پیش آیا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ کی خواہش کرتا۔ ماریہ کے معاملے میں اس کے قدم جس طرح ڈگمگائے تھے اور وہ خود ہی اپنی نظروں میں گرا تھا، اس کے بعد تو زندگی گناہ کا کفارہ ادا کرتے ہوئے ہی گزرنی تھی اور وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی ہی سمجھ رہا تھا کہ ماریہ بہرحال سمجھ دار اور پڑھی لکھی لڑکی ہے جس کا ساتھ اسے قلبی خوشی بے شک نہ دے سکے لیکن وہ اس کے لیے مسائل نہیں کھڑے کرے گی۔

''آپ کا موبائل بج رہا ہے شہریار!'' وہ اپنی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ ماریہ نے اُس کے شانے کو ہاتھ سے ہلاتے ہوئے اس کی توجہ موبائل کی طرف مبذول کروائی۔ اس نے موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ یہ کال اس آدمی کی طرف سے تھی جسے اس نے کراچی میں ماہ بانو کے اغوا کی تحقیقات کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

''ایکسکیوز می۔'' اس نمبر کو دیکھ کر وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ رانا کی کوٹھی کا لان خاصا خوب صورت تھا۔ وہاں مختلف اقسام کے کئی پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ پودوں کی شاخیں ہمہ وقت پھولوں سے لدی رہتی تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے خوب صورت نظارہ پیش کرتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ کسی نظارے سے لطف اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اس کال کی طرف تھی جسے سننے کے لیے وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر یہاں آیا تھا۔

''ہاں بولو! کیا بات ہے؟'' کال ریسیو کرتے ہی اس نے سوال کیا۔

''میں نے اچھی خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں سر! ماہ بانو کی روم میٹ بالکل کلیئر ہے، البتہ اس نے اس کی ایک کلاس فیلو کی نشاندہی کی تھی جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ماہ بانو کی اس لڑکی سے کافی دوستی تھی اور وہ کئی بار اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو کچھ ایسی قابل غور باتیں معلوم ہوئیں جن سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ ماہ بانو کے اغوا میں اس کی وہ قریبی دوست ملوث ہوسکتی ہے۔''

''کہیں اس لڑکی کا نام راحیلہ تو نہیں ہے؟'' اس کے علم میں تھا کہ ماہ بانو اپنی ایک کلاس فیلو راحیلہ کے بھائی ڈاکٹر طارق سے اسٹڈیز میں مدد لینے کے لیے اس کے گھر جاتی رہی ہے اس لیے فوراً ہی سوال کیا۔ ماہ بانو کے راحیلہ کے گھر جانے کی وجہ سے ہی تو وہ خواجہ سراؤں کے مہا گرو کا روپ دھار کر رہنے والے ''رانا



ورما تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ماہ بانو نے راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر سے پڑوس کی کوٹھی میں ورما کو دیکھ کر شناخت کرلیا تھا اور پھر اسے اطلاع دی تھی جس کے بعد وہ ورما تک پہنچ کر اسے گرفتار کروانے میں کامیاب ہوسکا تھا۔

''بالکل سر! یہی نام ہے اس لڑکی کا۔ ماہ بانو کی روم میٹ کی نشان دہی پر جب میں نے اس لڑکی سے ملنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ آج کل کالج نہیں آرہی ہے۔ میں کالج ریکارڈ میں سے ایڈریس نکلوا کر اس کے گھر پہنچا تو وہاں اس کے والد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ راحیلہ اور اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر طارق آج کل کلفٹن میں اپنے ایک عزیز کے گھر رہ رہے ہیں۔ ان کے وہ عزیز کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے انہوں نے ان لوگوں کو اپنے گھر کی حفاظت کے خیال سے وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ میں راحیلہ کے والد سے پتا لے کر کلفٹن پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بہن بھائی آج کل وہاں موجود نہیں ہیں۔ ان دونوں کی غیر موجودگی نے مجھے ٹھٹکا دیا۔ میں نے چوکیدار کو ٹٹولا اور تھوڑی بہت معلومات اِدھر اُدھر سے حاصل کیں تو ڈاکٹر طارق کے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کی روشنی میں، میں اس شخص کو مشکوک قرار دے سکتا ہوں۔

''وہ انتہا درجے کا فلرٹ آدمی ہے اور اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی کے قصے مشہور ہیں۔ خود وہاں کے چوکیدار کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق کے ساتھ اکثر و بیشتر مختلف لڑکیاں بنگلے پر آتی رہتی تھیں۔ وہ جس ہسپتال میں جاب کرتا تھا، وہاں بھی اس کی ریپوٹیشن زیادہ اچھی نہیں ہے اور معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں اس کی ایک ساتھی نرس لاپتہ ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر طارق نے اس نرس سے اپنی دوستی کو باقی اسٹاف سے پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب وہ لاپتہ ہوئی تو اس کی بڑی بہن نے واویلا مچا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن ڈاکٹر طارق سے ملنے کا بتا کر گھر سے نکلی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ ڈاکٹر طارق نے ایسی کسی بات کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔ نرس کے گھر والے غریب لوگ ہیں اس لیے تھوڑا سا شور مچا کر چپ ہوگئے اور طارق کی جان چھوٹ گئی لیکن مجھے شک ہے کہ اس قسم کے کردار کا مالک شخص ماہ بانو کے لیے بھی کسی طور مخلص ثابت نہیں ہوا ہوگا اور اس نے ایسی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کی ہوگی جس کی وجہ سے ماہ بانو کو نقصان پہنچا۔ ہوسکتا ہے اس نے ماہ بانو کی کراچی میں موجودگی کی خبر چودھری تک پہنچا کر بدلے میں اس سے رقم وصول کرلی ہو۔ موجودہ حالات میں اس کی بہن کی بہت روپوشی میرے اس شک کو اور بھی تقویت دے رہی ہے۔'' اس بندے نے واقعی اچھا خاصا کام کیا تھا اور اس کی روشنی میں جو نتائج اخذ کیے تھے، وہ بھی کافی درست محسوس ہو رہے تھے۔ شہریار بھی خود کو اس سے متفق محسوس کر رہا تھا چنانچہ یہ سب سن کر بولا۔

''ڈاکٹر طارق اور راحیلہ کے والدین کے گھر پر پولیس ریڈ کرواؤ۔ ہوسکتا ہے وہ دونوں بہن بھائی اپنے ہی گھر پر رہ رہے ہوں اور ان کے والد نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ اگر وہ دونوں اپنے گھر پر نہ ملیں تو ان کے گھر والوں سے اُگلوانے کی کوشش کرو۔ مجھے بہرحال ہر حال میں ان لوگوں تک پہنچنا ہے جنہوں نے ماہ بانو کے اغوا میں مدد کی اور اسے مشکل میں پھنسوایا۔ اس کی بازیابی کے ساتھ ساتھ میرے لیے اس کے مجرموں تک پہنچنا اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچانا بھی بہت اہم ہے۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہو نا؟ کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی کو کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اگر راحیلہ اور اس کے بھائی نے ماہ بانو کے لیے مارِ آستین کا کام کیا تھا تو وہ کسی صورت انہیں بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''او کے سر! آپ فکر نہ کریں۔ جیسا آپ کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔'' دوسری طرف سے اسے یقین

ہانی کروائی گئی تو اس نے قدرے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا اور موبائل اپنی جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا تو بالکل پیچھے کھڑی ماریہ کو دیکھ کر چونک گیا اور قدرے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تم کب یہاں آئیں؟''

''بالکل ابھی ابھی۔ آپ فون پر اتنی بری طرح مصروف تھے کہ آپ کو میرے آنے کا بالکل پتہ نہ چل سکا۔ کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟ آپ کا موڈ خاصا آف لگ رہا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کے بالکل اچانک خاموشی سے پیچھے آ کھڑے ہونے پر بُرا لگنے کے باوجود شہریار اسے سخت جواب نہیں دے سکا اور ٹالنے والے انداز میں بولا۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ آفیشل پرابلمز تھیں جنہیں سب کے سامنے ڈسکس کرنا مناسب نہیں اس لیے میں وہاں سے اُٹھ کر آ گیا تھا۔''

''اوہ سوری۔ پھر تو مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اصل میں آفرین آنٹی پوچھ رہی تھیں کہ رات کے کھانے پر کیا بنواؤں تو میں نے ان سے کہا کہ آپ سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔ ابھی مجھے آپ کی پسند ناپسند کا اندازہ نہیں ورنہ خود ہی کچھ بتا دیتی۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی وہاں آمد کی وجہ بتائی۔

''ممانی جان کو میری پسند ناپسند کا اچھی طرح علم ہے اور وہ مجھ سے پوچھے بغیر خود میری پسند کا کھانا کروا دیتی ہیں۔ تم اپنے لیے جو چاہو، وہ بنوا لو۔ اور ہاں، اپنے سامان کی پیکنگ بھی کر لینا۔ کل ہم ارلی مارننگ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر تمہیں کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو ممانی جان کے ساتھ جا کر کر سکتی ہو۔ میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' اس نے جیب سے پرس نکال کر اپنا کریڈٹ کارڈ اسے تھمایا۔

''تھینکس۔ میں دیکھوں گی۔ اگر موڈ بن گیا تو اکیلی ہی شاپنگ کے لیے چلی جاؤں گی۔ لاہور میرا بھالا شہر ہے اس لیے مجھے آفرین آنٹی کو تنگ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کریڈٹ کارڈ اپنی جیب میں دباتے ہوئے اسے جواب دیا اور وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اسی لمحے شہریار کا موبائل ایک بار پھر بجنے لگا۔ شہریار نے اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا۔ نمبر اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے سوچا کہ اس کال کو ریسیو کیا جائے یا نہیں پھر ''یس'' کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ اندر جاتی ماریہ کے قدم بھی رنگ ٹون سن کر رک گئے تھے۔ اس کے رُکنے پر شہریار نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ شہریار بھی سر جھٹک کر دوسری طرف سے آتی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماریہ کی ان حرکتوں پر اُلجھن محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے رعایت دینے پر مجبور تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ماریہ بے شک پڑھی لکھی لڑکی ہے لیکن طبقاتی فرق کی وجہ سے اسے ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت لگے گا اور وہ اس کی کلاس میں رائج ایٹی کیٹس آہستہ آہستہ ہی سیکھ سکے گی۔

''کیا حال ہیں اے سی صاحب! شادی کے بعد کیسی گزر رہی ہے؟'' اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے اس سے پوچھا گیا۔

''کون صاحب؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہم سے اپنا نام تو آپ خود طے کریں گے۔ اگر ہماری ہدایت کے مطابق آپ ہم سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھیں گے تو ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ ہمارے آپ کے درمیان دشمنی کا ناتا پکا ہے۔'' دوسری طرف سے جو جواب دیا گیا، اسے سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کال کرنے والے کا تعلق کہاں سے ہے۔



اس نے ورما کو گرفتار کروایا تھا، ''را'' والے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ کچھ عرصہ قبل لیاقت رانا کی گولیوں کا نشانہ بنا کر بھی اسے تنبیہہ کی گئی تھی اور اب پھر دھمکی کو دہرایا جا رہا تھا۔

''میری نظر میں ہمارے درمیان دشمنی کا تعلق کسی بھی طور مشروط نہیں ہے۔ ہمیں یہ دشمنی ورثے میں ملی ہے اور جب تک تم لوگ میرے وطن کے خلاف سازشیں کرتے رہو گے، دشمنی کا یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔''

''دوسرے شبدھوں (الفاظ) میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے راستے سے نہیں ہٹیں گے؟'' اس کا لہجہ بگڑا۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔'' شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سوچ لیں اے سی صاحب! ابھی کچھ دن تو ہوئے ہیں آپ کے فیملی ممبرز میں اضافہ ہوئے۔ کہیں آپ کی ضد کی وجہ سے ان میں کمی نہ ہو جائے۔ اس نے بہت واضح دھمکی دی۔

''میرا خاندان نسلوں سے وطن کے لیے قربانیاں دیتا آ رہا ہے۔ اس بار بھی ہم پیچھے نہیں رہیں گے۔''

اس کے ان لمحات میں گویا وہ ہر طرح کے خدشات سے آزاد ہو گیا تھا اور اسے دوبدو جواب دے رہا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جو ہو گا، وہ آپ خود دیکھ لیں گے۔'' دوسری طرف سے دھمکی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو شہریار نے بھی شانے اچکاتے ہوئے اپنا موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ ''را'' جیسی ایجنسی کے افراد اتنے بھونڈے انداز میں کیسے کام کر رہے ہیں؟ ان کا رویہ سیکرٹ ایجنٹس کے بجائے بالکل تھرڈ کلاس غنڈوں جیسا تھا۔ بس وہ لوگ اسے کال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کال کسی ایسے نمبر سے کی جائے جس کی سم غیر قانونی ہو اور نمبر کے ذریعے انہیں ٹریس نہیں کیا جا سکے۔ سابقہ تجربے کی روشنی میں شہریار چونکہ یہ بات سمجھ چکا تھا، اس لیے اس نے اپنے موبائل پر آنے والا نمبر ٹریس کروا کے وقت ضائع کرنا غیر ضروری سمجھا تھا۔

⊛----✪----⊛

''شہریار صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔'' اخبار کا صفحہ کشور کے سامنے رکھتے ہوئے آفتاب نے اسے اطلاع دی۔

''واقعی؟.....دکھائیں تو کیسی ہے ان کی بیگم؟'' کشور اشتیاق سے اخبار پر جھکی۔

''تم اُنہیں جانتی ہو۔ شہریار صاحب نے ڈاکٹر ماریہ سے شادی کی ہے۔'' آفتاب نے اسے بتایا۔ اس دوران کشور خود بھی اخبار کے صفحے پر چھپی تصویر دیکھ چکی تھی۔ یہ ایک فیملی فوٹو تھا جس میں دولہا دُلہن کے علاوہ مسٹر اینڈ مسز لیاقت رانا، مریم سجاد اور آئی جی مختار مراد نمایاں نظر آ رہے تھے۔

''بیوی تو اے سی صاحب نے اچھی ڈھونڈی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ بڑی سمجھ دار اور نیک فطرت خاتون ہیں۔ ان پر تو انہوں نے بڑا احسان کیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے لیے اپنی اور اپنے بچے کی زندگی بچانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب مجھے مسلسل ہونے والی اُلٹیوں پر مشکوک ہو کر بڑی بی نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ جب تک ڈاکٹر ماریہ میرا چیک اپ کرتی رہیں، مجھے یہی ڈر رہا کہ اب میرے اور آپ کے تعلق کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ لیکن انہوں نے نہ صرف سب کے سامنے بات بنا دی بلکہ بعد میں بھی میری مدد کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے جو دوائیں وغیرہ دی تھیں، ان سے میری حالت سنبھلنے اور راز کو راز رکھنے میں بڑی مدد ملی تھی۔ مجھے اے سی صاحب سے ان کی شادی کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی

حیرت بھی ہے کہ ان دونوں نے بالکل مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باجود شادی کا فیصلہ کس طرح کیا۔ کبھی کوئی ایسی بات بھی سننے میں نہیں آئی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ شہریار صاحب اور ڈاکٹر ماریہ کے درمیان پسندیدگی کا کوئی سلسلہ چل رہا ہو۔'' تصویر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کشور اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کرتی جا رہی تھی۔ اُس کے ایک ساتھ اتنے سارے نکات پر گفتگو کرنے پر آفتاب مسکرا دیا اور اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''آپ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک طرف آپ کو ڈاکٹر ماریہ سے شہریار صاحب کی شادی کی حیرت ہے تو دوسری طرف ان کے غیر مسلم ہونے پر اعتراض بھی ہے۔''

''میں نے اعتراض نہیں کیا ہے، صرف حیرت کا اظہار کیا ہے۔'' کشور نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

''حیرت بھی بے کار ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں۔ انہوں نے ہم سے فیصلہ کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ رہی ان کے پسندیدگی کے سلسلے کے سامنے نہ آنے کی بات تو وہ کوئی فلمی ہیرو ہیروئن تو ہیں نہیں کہ کھیتوں کھلیانوں میں ڈوئٹ گاتے پھرتے اور دور دور تک ان کی محبت کے قصے پھیل جاتے۔ انہیں ہماری طرح کسی ظالم سماج کا بھی سامنا نہیں تھا اس لیے بھی کوئی فلمی سچویشن کری ایٹ نہیں ہوئی اور انہوں نے سیدھے سیدھے، بزرگوں کی سرپرستی میں بیاہ رچا کر شہر بھر کو دعوت کھلا دی۔'' آفتاب اب بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''بڑی شوخیاں سوجھ رہی ہیں جناب کو..... حالانکہ جب سے آپ نے امام صاحب کو دیکھا ہے، مسلسل پریشان ہی نظر آتے رہے ہیں۔''

''پریشان تو میں اب بھی ہوں اور میری خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد شہریار صاحب کو اس شخص کی یہاں موجودگی سے باخبر کر دوں لیکن ان سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب اخبار دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ آج کل کہاں مصروف ہیں۔'' وہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

''پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ شہریار صاحب چند دن کی چھٹیوں پر ہی گئے ہوں گے، آپ ٹرائی کرتے رہیں، کسی دن تو آپ کا ان سے رابطہ ہو ہی جائے گا۔'' کشور نے اسے تسلی دی۔

''یہ زیادہ دن انتظار کرنے والا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس شخص کے بارے میں بتایا تھا نا کہ کس طرح یہ پیر آباد کی مسجد میں بہروپ بھر کر مولوی غلام محمد بنا ہوا تھا اور وہاں اس نے کئی معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ ماہ بانو کا چھوٹا بھائی تو بے چارہ اس کی ہوس کا شکار ہو کر موت کے منہ میں ہی چلا گیا تھا۔ اب یہاں بھی اس نے ایک معصوم بچے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اتنے مکروہ کردار کے شخص کو تو ویسے ہی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زمین پر آزادی سے چل پھر سکے۔ اور اس شخص کے بارے میں تو یہ بھی شبہ تھا کہ یہ ''را'' کا کوئی ایجنٹ ہے۔ آپ کو نور پور میں ہونے والا بم دھماکا یاد ہے نا؟..... اس دھماکے میں خودکش حملہ آور لڑکے کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے شہریار صاحب، اللہ آباد کے ایک مدرسے تک پہنچ گئے تھے۔ اس مدرسے کو شاہنواز نام کا ایک آدمی چلا رہا تھا اور اپنی دریا دلی اور نرم مزاجی کی وجہ سے گاؤں میں اس شخص کی بہت عزت تھی۔ وہ لڑکا بھی شاہنواز کے بہت قریب تھا۔ لیکن بعد میں تحقیقات سے ثابت ہوا کہ شاہنواز نام کا وہ شخص حقیقت میں ملک دشمن ایجنٹ تھا جو دین دار آدمی کا بہروپ بھر کر معصوم بچوں کو ورغلانے کا کام کر رہا تھا۔ شاہنواز کے اس ٹھکانے پر غلام محمد کی موجودگی کے بھی ثبوت ملے تھے جس سے یہی اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ بھی ''را'' کا ہی ایجنٹ ہے اور اب اسے یہاں ایک بار پھر بہروپ میں دیکھ کر مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ شخص واقعی



''را'' کا کوئی ایجنٹ ہے جو مسلسل اپنے مشن پر ڈٹا ہوا ہے۔'' آفتاب کے لہجے میں واضح تشویش تھی۔

''آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔ اللہ ظالم کی رسی بے شک دراز کرتا ہے لیکن پھر اس کے لیے اللہ کی پکڑ بھی بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کالے کرتوتوں والا بہروپیا بے شک بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اِنشاء اللہ اب ضرور پکڑا جائے گا۔ معصوم بچوں کا خونِ ناحق اس بار اسے کہیں نکلنے دے گا۔''

کشور کے پُریقین لہجے میں آفتاب کے لیے بڑی ڈھارس تھی۔ آفتاب نے اپنے دل میں ایک سکون سا محسوس کیا اور دھیرے سے مسکرا کر اپنی شریکِ حیات کو دیکھا۔ اس عورت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت کچھ کھویا تھا۔ خصوصاً پیر آباد کے اسکول کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہونے کا صدمہ اس کے دل کو اب بھی اندر میں ڈبو دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی وہ پچھتاوے میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ کشور اس لائق تھی کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی۔ اسے یقین تھا کہ کشور کی ہمراہی میں ایک دن وہ، وہ سب کر پائے گا جو اس کا مقصدِ حیات ہے اور جسے انجام دیئے بغیر اس کا دل سچی خوشی سے محروم رہے گا۔

''آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اچھا خاصا سفر کر کے آئے ہیں، تھکن تو ہو گئی ہوگی۔ آرام کرنے کے بعد فریش ہو جائیں گے تو پھر سکون سے اپنا کام کیجئے گا۔ آپ کو اپنا ناول بھی تو جلد از جلد مکمل کرنا ہے۔'' گاؤں میں سہولیات کی قلت کی وجہ سے آفتاب کو ضروری فون کالز کرنے اور اپنے مطلب کے اخبار و جرائد کے حصول کے لیے گاؤں سے باہر جانا پڑتا تھا۔ آج بھی وہ انہی دونوں مقاصد کے لیے گیا تھا۔ شہریار سے بات کرنے میں تو کامیابی نہیں ہو سکی لیکن اس کی شادی کی خبر مل گئی۔ اس خبر نے جہاں ان دونوں میاں بیوی کو خوش کیا، وہیں اس رابطے نہ ہو سکنے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ موجودہ حالات میں یہ رابطہ بہت ضروری تھا اور تاخیر سے کوئی بڑی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ آفتاب کی طرح کشور بھی اس بات کو سمجھتی تھی لیکن اس کے سامنے پریشانی کا مظاہرہ کر کے اسے ٹینشن میں مبتلا کرنے کے بجائے مسلسل خوش امیدی کا اظہار کر رہی تھی۔

''آپ کا مشورہ تو مناسب ہے۔ واقعی میں اس وقت آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر سو جاؤں گا تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' آفتاب نے اس سے اتفاق کیا اور سونے کے ارادے سے اُٹھ گیا۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے چند سیکنڈز کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر کچھ اضطرابی انداز میں کھول کر کشور کی طرف دیکھا۔ کشور جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی، اس کے اضطراب کو محسوس کر کے اس کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف بیٹھ کر اپنی نرم ملائم انگلیوں سے اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔ آفتاب نے انگلیوں کے اس لمس سے بے حد فرحت محسوس کرتے ہوئے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا اور اس کے غیر مصروف بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس دہکتے ہونٹوں کے لیے شبنم کا احساس دینے لگا اور جادو جگاتی ان انگلیوں کی ٹھنڈک اور سکون کو اپنے اندر اُتارتا وہ کب نیند کی وادی میں جا پہنچا، اسے خود بھی خبر نہیں ہوئی۔ وہ ڈسٹرب نہ ہو، اس خیال سے کشور نے بھی وہاں سے اُٹھنا پسند نہیں کیا اور اپنی بے آرامی کی پروا کیے بغیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

شاید وہ آفتاب کے جاگنے تک اسی طرح بیٹھی رہتی لیکن دروازے پر اُبھرنے والی دستک نے اسے اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ دستک کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا کہ باہر موجود فرد پہلے سے زور سے دستک دیتا اور اس دستک کی آواز آفتاب کی نیند خراب کر دیتی۔ اس کی نیند خراب ہونے سے پہلے کے لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنی گود میں رکھا اس کا سر نرمی سے تکیے پر رکھ کر

دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران میں دوسری دستک دی جا چکی تھی جو کہ پہلے کی نسبت قدرے بلند
''کون ہے؟'' دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھول کر باہر جھانکنے کے بجائے اس نے اندر
دریافت کیا۔ شروع سے پردے میں رہنے کی وجہ سے اسے یوں بھی ہر ایک کے سامنے آنے کی عادت
اس پر سے اس روپوشی کی زندگی نے اسے مزید محتاط بنا دیا تھا چنانچہ وہ کسی کے بھی سامنے بلا جھجک آ
گریز کرتی تھی۔

''احمد صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں کیا؟'' باہر سے مہذبانہ انداز میں دریافت کیا گیا۔ اس
میں آفتاب نے اپنے نام کے دوسرے حصے سے ہی سب سے اپنا تعارف کروایا تھا اس لیے لوگ اسے
نام سے ہی جانتے تھے۔

''آپ کون صاحب؟'' باہر موجود ملاقاتی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کشور نے
دریافت کیا۔ باہر موجود شخص کے لہجے نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ اس گاؤں کا رہائشی نہیں ہے، اس
نے یہ احتیاط برتی تھی۔

''خاتون! میں پیش امام ہوں اور احمد صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری غیر موجود
یہاں آ کر مقیم ہوئے تھے اس لیے میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ گاؤں والوں کی زبانی ان کا تذکرہ
دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان سے ملا جائے اور مل کر ان کے مشاغل پر گفتگو ہو۔ سننے میں تو یہی آیا ہے
بڑے لائق اور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں احمد صاحب..... تو پھر بھلا ہم کیوں ایسے لائق فائق آدمی
ملاقات کرنے سے محروم رہیں؟'' باہر سے تعارف کے ساتھ نہایت تفصیلی جواب دیا گیا لیکن اس کے
نے کشور کے سارے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ یہ شخص پہلے بھی گاؤں کے ایک فرد کے ذریعے آفتاب کو ملا
کا پیغام بھجوا چکا تھا۔ آفتاب کو اندیشہ تھا کہ جس طرح اس نے اسے مولوی غلام محمد کی حیثیت سے شناخت
ہے، اس طرح وہ بھی اسے ماسٹر آفتاب کے طور پر پہچان لے گا اور یہ اس کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہوگی

''میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ احمد کچھ دیر قبل ہی سفر سے واپس آئے ہیں اور بہت زیادہ
سو رہے ہیں۔ میں ان کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتی۔'' وہ جس کردار کا مالک تھا، اس سے عزت و احترام
ساتھ بات کرنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال نرمی برتی جائے اور رو
ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ وہ ان لوگوں کے لیے ایک ناپسندیدہ ہستی ہے۔

''ماشاء اللہ! احمد صاحب بڑے خوش قسمت آدمی ہیں کہ انہیں آپ جیسی خیال رکھنے والی بیوی ملی
مجھے آپ کی شوہر پرستی اچھی لگی خاتون! اگر آپ حرج نہ سمجھیں تو احمد صاحب کے جاگنے پر انہیں مطلع کر
کہ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا۔ وہ مناسب سمجھیں تو مجھے یہ شرف بخش دیں۔'' اس شخص کے
ولہجے سے صاف مصنوعی پن جھلک رہا تھا اور کشور جیسی محدود ماحول میں رہ کر پلنے پڑھنے والی لڑکی بھی محسوس
سکتی تھی کہ وہ نری چاپلوسی سے کام لے رہا ہے، ورنہ اس کے الفاظ میں خلوص کا نام و نشان تک موجود نہیں

''میری تعریف کے لیے شکریہ۔ میں آپ کا پیغام اپنے شوہر تک پہنچا دوں گی۔ لیکن آپ کو اتنا بتاتی
کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں اور ہفتہ دس دن سے پہلے کسی سے شاید ہی ملاقات کر سکیں۔ اُمید ہے کہ
ان کی مجبوری کو سمجھیں گے اور تاخیر کے لیے برا نہیں مانیں گے۔'' اس نے نہایت چابک دستی کا مظاہرہ کر
ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس سے آفتاب کو کچھ مہلت مل جاتی۔ یقیناً اس مہلت میں وہ شہریار سے
کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور اس بہروپیے کا انجام سامنے آ جاتا۔



''چلیں جیسے آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ آدمی تو ہم بھی عزت دار ہیں اور سارا گاؤں ہمیں سر آنکھوں پر
ہے۔ لیکن احمد صاحب شاید کچھ زیادہ ہی خاص آدمی ہیں جو کسی کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ بہر حال،
ملاقات اپنی جگہ ہے۔ اگر وہ اس بندۂ حقیر کے لیے کبھی وقت نکال سکیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اب
اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!'' کچھ دل گیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

کشور نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے اپنا ٹالا جانا اچھا نہیں لگا اور وہ خاصا خفا ہو کر یہاں
گیا ہے۔ اس کی گاؤں والوں کی نظروں میں جو عزت تھی، اسے دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کا
ناکام ہونا کوئی اچھا شگن نہیں ہے لیکن فی الحال انہیں جو مہلت درکار تھی، اس کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی
مناسب تھا۔ بعد میں اس آدمی کی اصلیت کھل جاتی تو پھر سارے مسئلے خود بخود ہی حل ہو جاتے۔

اندر سے سخت تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ زبردستی خود پر بے نیازی طاری کرنے کی کوشش کرتی
دروازے سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ آفتاب ابھی تک گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ یونہی
گزاری کے لیے اخبار کا جائزہ لینے لگی۔ شہریار اور ماریہ کی شادی کی خبر کے سوا وہ کوئی دوسری خبر نہیں پڑھ سکی
لیکن اپنی فراغت کا فائدہ اٹھا کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔ جلد ہی اس کی نظروں نے اس خبر کو اپنی گرفت
میں لے لیا جو شہریار کی شادی کی خبر کے ساتھ ساتھ ہی لگی تھی۔ اس خبر میں شہریار کے شادی کے موقع پر بے قابو
ہو کر پہاڑی افتار سے الجھ جانے کا واقعہ بیان کیا گیا تھا۔ خبر پڑھ کر وہ افسردہ ہو گئی۔ شہریار جیسے بندے کے اس
طرح بے قابو ہو جانے کا مطلب تھا کہ اس کے باپ نے کوئی نہایت گری ہوئی حرکت کی ہوگی جسے وہ
برداشت نہیں کر سکا۔ اپنے باپ کے کردار پر دُکھی وہ اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ بے شک اس
کا باپ تھا لیکن تھا تو ظالموں کے اس قبیل میں سے ہی جن کی رسی فی الحال دراز تھی اور وہ کبھی بھی اللہ کی پکڑ میں
آ سکتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ کل والے پتھر پر ہی بیٹھی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ اس کے قریب چلا آیا
اور بے تکلفانہ لہجے میں سوال کیا۔

''تم لوگوں کے بدبودار کپڑے دھو دھو کر سر چکرانے لگا تھا اس لیے تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینے کے
لیے آ گئی تھی۔ یہاں سانس لینے پر بھی پابندی ہے کیا؟'' اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دے کر پوچھا۔

پابندی تو نہیں ہے لیکن میں اسے تمہارے لیے مناسب بھی نہیں سمجھتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہاں
سب عورت کے بھوکے ہیں۔ تم جتنی دیر ان کی نظروں کے سامنے رہو گی، ان کی اشتہا اتنی ہی بڑھے گی۔ بہتر
ہے کہ احتیاط کرو اور کم سے کم وقت ان لوگوں کے سامنے گزارو۔'' اس نے اردگرد پھرتے اپنے ساتھیوں کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ کچھ چپ سی ہو گئی پھر کچھ دیر بعد بے چارگی سے بولی۔

''وہ جھونپڑی بہت تنگ و تاریک ہے۔ زیادہ دیر وہاں رہوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس کا جواب سن کر وہ تھوڑی دیر سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا تو ماہ بانو بے چون و
چرا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور پھر اس کی راہنمائی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔
اس کے پیروں کے درمیان بندھی زنجیر قدموں کو تیز رفتاری سے حرکت دینے میں رکاوٹ تھی، اس لیے آہستہ چلنا
پڑ رہا تھا۔ وہ بھی یقیناً یہ بات سمجھتا تھا چنانچہ خود بھی بہت آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کا رخ درختوں کے

اس قطار، قطار سلسلے کی طرف تھا جہاں سے آگے بھی یقیناً گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسے بہت آگے تک لے گیا اور درختوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر پہنچ کر رک گیا جہاں زمین کا ایک ٹکڑا درختوں سے خالی تھا بڑی ترتیب سے چھوٹی قامت کے خوش رنگ و خوشبو دار پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ پودوں درمیان موزوں فاصلے اور ترتیب سے ظاہر تھا کہ یہاں انسانی ہاتھوں نے کارروائی کی ہے۔

"اس جگہ کو میں نے اپنے لیے سجایا سنوارا ہے۔ مجھے اپنے لیے یہ چھوٹا سا گوشۂ سکون تیار کرنے کے کافی محنت کرنی پڑی تھی تمہیں یہاں جو خالی جگہ نظر آ رہی ہے، یہ بھی درختوں اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی میں نے خود اپنی محنت سے اسے صاف کیا اور پھر یہاں یہ پھول دار پودے لگائے۔ جب کبھی میرا دل سب سے اکتا جاتا ہے تو چپ چاپ، سکون سے بیٹھنے کی خواہش کرتا ہے تو میں یہاں چلا آتا ہوں۔ سردار سمیت میرے ساتھی جانتے ہیں کہ میں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کی آمد کو پسند نہیں کرتا اس لیے جب تک کوئی بہت ضروری کام نہ ہو، کوئی یہاں آ کر مجھے ڈسٹرب نہیں کرتا۔ تمہیں میں خاص طور پر اجازت دے رہا ہوں کہ جب زیادہ گھبرائے اور کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھنے کا دل چاہے تو یہاں آ جایا کرو۔" وہ نہایت نرم لہجے میں اس سے رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں قدرت کی کرشمہ سازی کی معترف ہو رہی تھی۔ یہ اسی معبود کا کرشمہ ہی تو تھا کہ نے ان اجڈ ڈاکوؤں کے درمیان ایک شخص کے دل کو اس کے لیے موم کر دیا تھا اور اس کے لیے سختی میں آ پیدا ہو گئی تھی۔

"میں نے ان دونوں درختوں کے درمیان ایک مچان بھی بنائی ہے۔ شکار وغیرہ کا تو مجھے اتنا خاص نہیں لیکن اس مچان پر سے دُور تک کا نظارہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس مچان پر چڑھنے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم جتنی دیر چاہو آرام سے وہاں بیٹھ سکتی ہو۔" انگلی سے اشارہ کر کے اسے مچان دکھا کے ساتھ ساتھ اس نے آفر بھی کی جسے ماہ بانو نے فوراً قبول کر لیا۔ مچان اچھی خاصی بلندی پر تھی جس تک کے لیے لکڑیوں اور رسّی کی مدد سے ایک سیڑھی لٹکائی گئی تھی۔ اگر اس کے پیروں میں زنجیر نہ بندھی ہوتی تو منٹ میں اس سیڑھی کی مدد سے اوپر چڑھ جاتی۔ لیکن اس وقت اس کے سہارے کی محتاج تھی۔ وہ سہارا دے اسے اوپر لے گیا تو وہ وہاں کی صفائی ستھرائی دیکھ کر اور بھی حیران رہ گئی۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں کئی گھنٹے تک آ سے رہا جا سکتا تھا۔ کونے میں رکھی مٹی کی صراحی اور اس پر موجود سلور کے گلاس سے ثابت ہوتا تھا کہ اپنے یہ مچان بنانے والا یہاں اچھا خاصا وقت گزارتا ہے۔ مچان کے ایک گوشے میں شیشے کی بوتل میں ایک نازک سبز بیل لگائی گئی تھی۔ اس بیل کے سبز پتوں میں سے جھانکتے ننھے ننھے کاسنی پھول آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک تازگی بخش رہے تھے۔ ایک طرف دو تین کتابیں بھی رکھی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کتابوں کو اٹھایا کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں سے دو شاعری کے نسخے تھے جبکہ ایک میں حالاتِ حاضرہ پر مبنی ٹی وی کے پروگرام کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔

"تم تو بڑے باذوق قسم کے ڈاکو ہو۔ تمہارے اس گوشۂ عافیت کو دیکھ کر تو کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کی تعمیر میں کسی ڈاکو کا ہاتھ ہے۔" ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔

"میں کوئی ماں کے پیٹ سے تو ڈاکو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس زندگی سے پہلے بھی میری ایک زندگی تھی میں، میں واپس نہیں جا سکتا لیکن جس کا کچھ حصہ میں نے یہاں اپنے لیے تخلیق کر لیا ہے۔" اس نے سے جواب دیا۔

"اپنی اس زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ نا۔" وہ اب اس سے خوف زدہ نہیں تھی اس لیے



نے فرمائش کی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ صرف تمہیں یہاں تک پہنچانے آیا تھا۔ تمہارا جب تک دل چاہے، واپس آ جانا۔ چڑھنے کی نسبت یہاں سے اُترنا آسان ہے اس لیے تمہیں خود سے واپس آنے میں ہو گی۔ البتہ تمہیں دیر ہو گئی ہو تو پھر میں خود تمہیں لینے کے لیے آ جاؤں گا، پریشان مت ہونا۔" اسے تسلیاں دیتے ہوئے اس نے ایک طرف لٹکی دوربین اتار کر اپنے کندھے سے لٹکا لی۔ یقیناً وہ نہیں کہ ماہ بانو اس دوربین کی مدد سے زیادہ دور تک کا جائزہ لے سکے۔

"جانے سے پہلے اتنا بتا دوں کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس جنگل میں بہت دور دور تک ہے اور میرے ساتھی جگہ جگہ پہرا دیتے رہتے ہیں۔ بالفرض اگر تم ان سے بچ کر نکلنے میں کامیاب بھی اس جنگل سے نہیں نکل سکو گی اور بھٹک کر یا تو بھوکی پیاسی مر جاؤ گی یا پھر کسی درندے کی بھوک مٹانے جاؤ گی۔" جاتے جاتے اس نے اسے تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔ ماہ بانو کو اس کی کسی بات کو ماننے میں تامل نہیں تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اسے اتنے آرام سے یہاں آزادی سے چھوڑ کر جا رہا ہے تو اسی لیے حفاظتی نظام سے پوری طرح مطمئن ہے۔

"میں یہ سب سمجھتی ہوں۔ تمہیں مجھے دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے نہایت رسان سے

"اچھا گرل۔ تو پھر ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" اس نے مچان سے لٹکی سیڑھی پر قدم رکھا۔

"بات سنو۔" اس کے دوسرا قدم نیچے رکھنے سے پہلے ماہ بانو نے اسے پکارا تو وہ اپنی جگہ ٹھہر کر اس کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اپنا نام تو بتا دو۔" اس نے فرمائش کی۔

"اسلم..... اسلم تنیو ہے میرا نام۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے سیڑھی اُتر گیا۔ ماہ بانو اسے جاتا ہوا دیکھ رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کی نظریں ایک بار پھر وہاں موجود پھولوں کے پودوں پر بھٹکنے لگیں۔ گلابی، سرخ، کاسنی اور زرد رنگوں کے وہ پھول دار پودے جن ہاتھوں نے اُگائے تھے، اس کے صاحبِ دل پر کوئی شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مگر اس دل والے کی زندگی میں کون سا حادثہ رونما ہوا تھا کہ وہ رنگ والوں کی دنیا سے نکل کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اسلم تنیو کی زندگی کے ایسے حادثے کے بارے میں سوچ کر دل ہی دل میں افسردہ ہوتی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر اِردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ کھڑے ہونے پر اسے اس پھلواری سے ہٹ کر بھی جنگل کا منظر نظر آ رہا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے جنگل کا جو حصہ تھا، وہاں درختوں کی اتنی زیادہ بہتات نہیں تھی اور یوں محسوس ہو کہ اس حصے سے درختوں کو کاٹا گیا ہے۔ ایسا یقیناً ان ڈاکوؤں نے ہی کیا ہو گا تاکہ ان کی قیام گاہ تک نگاہ بن سکے اور قرب و جوار پر نظر رکھی جا سکے۔ لیکن انہوں نے اتنی چالاکی ضرور کی تھی کہ درختوں سے خالی والی زمین پر خودرو پودوں اور جھاڑیوں کو اُگنے سے نہیں روکا تھا۔ اس طرح کوئی باہر کا بندہ اگر وہاں آ تو گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جنگل کے اس حصے میں انسانی ہاتھوں نے کارگزاری دکھائی ہے۔ وہ خود بھی اس لیے اندازہ لگا سکی تھی کہ خود یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان قیام پذیر تھی اور کچھ کچھ ان لوگوں کے میں سمجھنے لگی تھی۔ ابھی تک یہاں اس کا اسلم کے سوا ایسے کسی آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جسے دیکھ کر یہ کہ وہ مجبوراً یا حادثاتی طور پر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہوا ہو گا۔

چلتے سوچتے اور اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا دھیان اپنی کلائی پر محسوس ہونے والی جلن کی
گیا۔ اس کی کلائی بہت زیادہ نہیں جلی تھی لیکن پانی میں کام کرنے کی وجہ سے جلی ہوئی جلد کو نقصان پہ
اچھی خاصی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ جلن کے اس احساس نے اسے گزرا ہوا ماضی یاد دلا دیا اور بے ساختہ
لی آنکھیں بھیگ گئیں۔

بے بے، جس نے اسے گود لیا تھا، اس کے کیسے کیسے ناز اُٹھاتی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر پہننے
اور گھومنے پھرنے تک اس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ دسویں جماعت میں آنے تک بے بے نے اسے
ے جھمیلوں سے بھی دور رکھا تھا۔ لیکن پھر اردگرد کی عورتیں اسے ٹوکنے لگیں۔ بے بے کو محلے والیوں کی
بھ آ گئی اور اس نے اسے گھر داری کی تربیت دینا شروع کر دی۔ وہ خود ہمیشہ سے بے بے اور ابا کی
کرنے کی خواہش مند رہا کرتی تھی چنانچہ خوشی خوشی گھر داری کے ہنر سیکھنے لگی۔

اس کی تربیت کا دوسرا ہی ہفتہ شروع ہوا تھا کہ ایک شام اس نے بے بے سے ضد کی کہ آج
روٹیاں میں پکاؤں گی۔ اس کی ضد کے آگے بے بے مجبور ہو گئی اور وہ اس کی زیرِ نگرانی روٹیاں پکانے
کوئی تجربہ تو تھا نہیں۔ شوئ قسمت وہ پہلی آڑی ترچھی روٹی بیل کر توے پر ڈالنے لگی تو ہاتھ گرم توے
ٹکرایا۔ پھر تو اس کی ہائے ہائے تھی اور بے بے کی تدبیریں کہ کسی طرح اس کی تکلیف کم ہو جائے۔ را
اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو وہ متاثرہ ہاتھ پر مرہم کی تہ جمائے بیٹھی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں
رہے تھے۔ ابا نے اس کی تکلیف دیکھی تو بے بے کو ڈھیروں باتیں سنا ڈالیں جس نے اس کی لاڈلی
ہانڈی کا کام لینے کی جسارت کی تھی۔ پہلے سے دُکھی بے بے، ابا کی ڈانٹ کھا کر رونے لگی اور اعلان
اب ماہ بانو سے گھر کا کوئی کام نہیں لے گی۔

وہ بیتے لمحوں کی گرفت میں آئی تو بے ساختہ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کا یہ
جانے کب تک جاری رہتا کہ وہ ایک نسوانی چیخ سن کر چونک پڑی۔ یہ چیخ بہت زوردار نہیں تھی لیکن کہیں
ہی سے اُبھری تھی اس لیے اس کی سماعتوں نے اسے واضح طور پر سنا۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں گھما کر چیخنے والی
کرنے لگی۔ مسلسل آوازوں نے اس کی راہنمائی کی۔ چیخنے والی کے انداز میں خوف کے بجائے احتجا
لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔

ماہ بانو کو اس عورت کو شناخت کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ وہ وہی مدقوق سی عورت تھی
ساتھ مل کر اس نے کل کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ اسے ایک مرد کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے جا رہا
تسلسل سے اسے گالیاں دیتی ہوئی چیختی چلاتی اس کے ساتھ جانے سے مزاحمت کر رہی تھی۔ لیکن
ناکامی پر ہی اس نے جھلا کر مرد کو کاٹ لیا تھا۔ لیکن اس کا یہ احتجاج اسے مہنگا پڑا اور مرد نے ایک زنا
اس کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ مارنے کے بعد وہ اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا۔

سُن سی کھڑی یہ سب دیکھتی ماہ بانو کو کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اسی جگہ
سر دے کر بیٹھ گئی۔ عورت ذات کی جتنی تذلیل اس نے اس جگہ دیکھی تھی، اس سے کہیں اور سابقہ نہیں
وہاں موجود کُل دو عورتیں ان سارے مردوں کی جاگیر تھیں۔ اس وقت جنگل میں دن دہاڑے
گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ خود اس کے ساتھ ایسی کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ خوفزدہ تھی کہ درند
درمیان رہ کر کب تک محفوظ رہ سکے گی؟ اگرچہ اسلم تنویر اس کے لیے ایک ڈھال بنا ہوا تھا لیکن درندوں
تو بہر حال نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کوئی اپنے سفلہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس پر ٹوٹ پڑتا تو



اس کا دفاع کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی
درختوں کے اس جھنڈ پر بھٹکنے لگیں جہاں اس نے ان دونوں مرد و زن کو غائب ہوتے دیکھا
گزرے تھے کہ اسے وہاں سے مرد برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ وہ کسی بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا
ماہ بانو نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی تھا جو گزشتہ روز کپڑوں کی دُھلائی کے دوران اسے للچائی
سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا اس جانب مڑ گیا جہاں ان
رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے حرکت میں
سے سیڑھیاں اتر کر پھلواری سے گزرتی ہوئی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ
عورت موجود تھی۔

اس عورت نے اب تک اس کے ساتھ کوئی اچھا رویہ نہیں رکھا تھا اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی تھی لیکن
وہ اس کا ہر رویہ بھلائے اس کی ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی سمجھ آ رہا تھا کہ عورت کے
رویے کے پیچھے اس کے حالات کارفرما ہیں۔ وہ یہاں جو ذہنی اور جسمانی مشقت اٹھا رہی تھی، اس کے
طور پر اس لائق نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی سے خوش اخلاقی و خوش گفتاری کا مظاہرہ کر سکے۔ عورت کے
تجزیہ کر کے اس سے مزید ہمدردی محسوس کرتی ہوئی وہ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئی تو اس کے دل
سا لگا۔ عورت زمین پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی اور اس کے بال اس بری طرح نوچے کھسوٹے گئے
بری طرح بکھر کر رہ گئے تھے۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچی اور اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے پر بکھرے
بالوں کو ہٹایا۔ وہاں ایک اور دردناک منظر اس کا منتظر تھا۔ عورت کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان تھے
رسنے والا خون اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش نہیں تھی لیکن بالکل بے دم سی پڑی آنکھیں
ہولے ہولے سسک رہی تھی۔

"سنو! آنکھیں کھولو۔" اس نے دھیرے سے عورت کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تو اس نے
پھڑکتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ان پوری کھلی ہوئی آنکھوں کو قریب سے
پر ماہ بانو پر انکشاف ہوا کہ وہ آنکھیں اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی خوب صورت ہیں جو یقیناً کبھی
کے سراپا کو بہت پُرکشش بنا دیتی ہوں گی لیکن اب آنکھوں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھی ویرانی نے ان کی
صورتی اور کشش کو ماند کر دیا تھا۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا، مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو ان سارے درندوں کو
کھڑا کر کے گولی مار دیتی۔" عورت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنے دلی جذبات بھی
کیے۔

"تم کیوں افسوس کر رہی ہو؟ یہ درندے تمہیں تو کچھ نہیں کہتے۔ تم تو اسلم کی چہیتی ہو اور اپنی چہیتی کی
وہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھنے دے گا۔" اس نے کچھ جلے کٹے لہجے میں اسے جواب دیا۔ لہجے کی یہ تپش
اپنی بدقسمتی اور ماہ بانو کی خوش قسمتی کی وجہ سے تھی۔ وہ دونوں عورتیں تھیں لیکن ایک کسی کی منظورِ نظر ہونے کی
محفوظ و مامون تھی تو دوسری سب کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ مجھے اپنے اردگرد کے لوگوں کا
خیال رہتا ہے۔ تم بے شک میرے لیے اجنبی ہو لیکن ہو تو میری ہم جنس ہی اور اب ہم ایک جگہ ہی رہ

رہے ہیں۔ اس لیے مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔'' عورت کی بات کا بُرا مانے بغیر اس نے رسا
جواب دیا۔

''خالی خولی ہمدردی سے مجھے کیا ملنا ہے۔ تمہاری یہ ہمدردی میرے حالات تو نہیں بدل سکتی۔''
ترک کر چکی تھی اور اب اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماہ بانو نے سہارا دے کر اُس کی اس
کامیاب بنایا۔ اُس کے اس طرح سہارا دینے پر قدرتی طور پر عورت کا دل اس کی طرف سے قدرے نرم
اور وہ آہستہ سے بولی۔ ''شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔ انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں۔''

''ایک مدت گزری، لگتا ہے انسانوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' یاسیت زدہ لہجے میں بولتے ہو
نے ایک درخت کے تنے سے پیٹھ ٹکالی۔

''تم یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے پہنچیں؟'' ماہ بانو کے تجسس نے اسے سوال کرنے پر اُکسا

''قسمت کو تو دوش نہیں دوں گی، میری اپنی ہی کوتاہیاں تھیں جو مجھے یہاں لے آئیں۔'' اس کے
چہرے پر پچھتاوے رقص کر رہے تھے۔

''اگر تم چاہو تو مجھے اپنے حالات بتا سکتی ہو۔ میں بے شک تمہاری مدد نہ کر سکوں لیکن کبھی کبھی کسی
حال کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔'' ماہ بانو نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہو

''میرا بوجھ تو قیامت تک نہیں اُترنے والا۔ ہاں، میں تمہارا تجسس دُور کرنے کے لیے اپنے حالا
سکتی ہوں۔'' اس کے چہرے پر ایک اُداس سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہوگئی۔

''تجسس تو مجھے واقعی ہے کیونکہ جن حالات سے گزر کر میں یہاں پہنچی ہوں، ان کو سامنے رکھتے
یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بھی غیر معمولی حالات میں ہی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ تمہاری بات چیت کے
سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تم ان ڈاکوؤں سے الگ ہو اور کہیں باہر سے ہی یہاں لائی گئی ہو۔''

''تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے تو میری خودسری اور نافرمانی یہاں تک لے آئی، ورنہ میں تو
عزت دار ماں باپ کی اولاد تھی۔ میرے والد نے میری پیدائش پر بہت محبت سے میرا نام غزالہ رکھا تھا
آنکھیں بہت خوب صورت تھیں نا اس لئے۔ میرے والد بڑا شاعرانہ مزاج رکھنے والے ایک پڑھے لکھے
آدمی تھے۔ انہیں ادب سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ایک پرائیویٹ کالج میں اُردو کے استاد تھے۔ میرے
بہنیں اور تھیں لیکن میں بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے والد کی بہت زیادہ لاڈلی تھی۔ امی بھی مجھ سے
کرتی تھیں لیکن انہوں نے مجھے باقی دونوں بہنوں پر کبھی فوقیت نہیں دی تھی۔ وہ اولاد میں مساوات کی
تھیں۔ ان کے مقابلے میں ابو مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ گھر میں آنے والی ہر اچھی چیز پر سب سے پہلے
حق ہوتا تھا، اس کے بعد ہی چھوٹی دونوں بہنوں کو کچھ مل پاتا تھا۔ اس ترجیحی سلوک نے مجھے خاصا ضدی
خودسر بنا دیا تھا لیکن میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی اس لیے میرے مزاج کے باوجود دونوں بہنوں کے مقا
میں ہر جگہ مجھے ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت بڑھ
حصہ لیتی تھی۔ خاندان، محلے اور کالج میں میری خوبصورتی اور ذہانت کے چرچے تھے۔ کالج میں کوئی فنکشن
تو میں سب سے نمایاں ہوتی۔

ایک بار سالانہ فنکشن کے موقع پر میں نے ایک ڈرامے میں حصہ لیا اور انارکلی کا کردار ادا کیا۔ ہر ایک
کہنا تھا کہ میں کردار کے لیے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھی۔ فنکشن میں شریک ایک فلم پروڈیوسر نے



اس کی تصدیق بھی کر دی۔ وہ میرا پتہ حاصل کر کے ہمارے گھر تک آ پہنچا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر
اس نے یہ آفر ابو کے سامنے ہی کی تھی۔ ابو بڑے وضع دار آدمی تھے۔ انہوں نے پروڈیوسر کی خاطر
تو خوب کی لیکن میرے کام کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم سیدھے سادے عزت دار لوگ ہیں
قطعی اچھا نہیں لگے گا کہ میری بیٹی فلموں میں ناچنے گانے کا کام کرے۔ اس پر اُس پروڈیوسر نے بتایا کہ
فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کی وجہ سے اب فلموں پر زیادہ سرمایہ کاری کرنے کے بجائے دوسری طرف
دے رہا ہے اور سائیڈ بزنس کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول رکھی ہے۔ ابو اجازت دیں تو وہ
کمرشلز میں بک کر سکتا ہے۔ اس نے ابو کو لالچ بھی دیا کہ کمرشلز میں کام کر کے میں بہت کم وقت میں اتنا کما
ہوں کہ گھر کے حالات بدل جائیں گے۔ ایک چند ہزار کی نوکری کرنے والے استاد کے لیے جس کے سر پر
تین بیٹیوں کا بوجھ ہو، یہ ترغیب بڑی کشش رکھ سکتی تھی لیکن ابو نے اپنا فیصلہ بدلنا پسند نہیں کیا۔

ابو کے فیصلے کے سامنے میں بھی بظاہر چپ رہی لیکن حقیقت میں مجھے یہی لگا کہ ابو نے مجھے زندگی میں
والا ایک بہترین چانس میرے ہاتھ سے نکال دیا ہے۔ اپنی دوستوں سے جب میں نے اس بات کا ذکر کیا
میں سے اکثر نے افسوس کیا کہ میں اتنا سنہری موقع ضائع کر رہی ہوں۔ اپنی ذاتی خواہش اور دوستوں
کے مشوروں نے مجھے اُکسایا کہ میں خود اس فلم پروڈیوسر سے رابطہ کروں۔ اپنا وزیٹنگ کارڈ وہ دے کر ہی گیا تھا۔
نے اس پر چھپے نمبر پر کال کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ٹی وی کمرشل میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ وہ
خوش ہوا اور اس بات پر بھی راضی ہو گیا کہ جب تک میں اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپانا چاہتی ہوں،
کالج ٹائمنگ میں مجھ سے کام لے گا۔ بس پھر اس دن سے یہ ہونے لگا کہ میں گھر سے تو کالج کے لیے نکلتی
وہاں پہنچنے کے بجائے ایڈورٹائزنگ ایجنسی پہنچ جاتی۔ ابتدا میں میری گرومنگ کی گئی اور ایک ماڈل کی
چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے گئے۔ اس کے بعد میرا حلیہ تبدیل کیا جانے لگا۔ بے شمار
سروسز کے ساتھ ساتھ کٹنگ کر کے میرا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کر دیا گیا۔ امی ان تبدیلیوں پر چونکیں اور مجھ
پوچھ تاچھ کی۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ میری ایک دوست پارلر کا کورس کر رہی ہے، اسے پریکٹس کے لیے کسی
کی ضرورت تھی اس لیے اُس نے میرے ساتھ یہ سب کر ڈالا۔ امی تب بھی بہت غصہ ہوئیں کہ کیا ضرورت
سہیلی کی محبت میں اپنا یہ حال کر دینے کی۔ انہیں میرا ماڈرن حلیہ قطعی پسند نہیں آ رہا تھا۔

اس موقع پر ابو میری ڈھال بن گئے اور مجھے امی کے عتاب سے بچایا لیکن جس دن ٹی وی پر میرا پہلا
کمرشل چلا، ابو ہی سب سے زیادہ دُکھی ہوئے۔ صدمے کی وجہ سے وہ دو دن تک کچھ کھا پی سکے، نہ ڈھنگ
سوئے۔ دو دن بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ تم نے ایک کمرشل میں کام کر کے اپنا شوق
پورا کر لیا ہے لیکن آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ لیکن مجھ پر تو نئی نئی شہرت اور پیسے کا نشہ طاری ہو چکا تھا۔ میں
نے ابو کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنی من مانی کرتی رہی۔ اب چھپ چھپا کر بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں
تھی اس لیے میں دھڑلے سے سرِ شام تیار ہو کر گھر سے نکلتی۔ میری اس خودسری نے ابو کو سانپ سونگھا دیا۔ البتہ
امی خوب باتیں سناتیں اور بڑبڑاتیں۔ انہوں نے دونوں بہنوں کو بھی مجھ سے بات چیت کرنے سے روک دیا
لیکن ان دنوں مجھے کسی کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ میں بن ٹھن کر گھر سے نکلتی اور رات گئے واپس آتی۔ مجھے
واپس گھر پہنچانے کی ذمے داری پروڈیوسر نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔

ایک رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب میں اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں شوبز کی ایک تقریب سے واپس آ
رہی تھی تو ایک سنسان سڑک پر ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا اور اغوا کر کے یہاں لے آئے۔ اصل میں تو ان کا شکار

وہ پروڈیوسر ہی تھا جسے انہوں نے تاوان کے لیے اغوا کیا تھا۔ میں مالِ غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ لگ گئی
انہوں نے اس مالِ غنیمت سے خوب خوب استفادہ کیا۔ بعد میں پروڈیوسر کے گھر والوں نے منہ مانگا تاوان
کے اسے تو چھڑوا لیا لیکن میں یہیں پھنس گئی۔ سردار نے تاوان کی وصولی کے ساتھ ساتھ اس کی رہائی
یہ شرط بھی رکھ دی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد کسی کو یہ نہیں بتائے گا کہ اغوا کے وقت اس کے ساتھ
میں بھی تھی۔ اسے اپنی جان پیاری تھی چنانچہ بڑی آسانی سے یہ شرط مان گیا۔ ویسے بھی میں اُس کی کیا لگتی تھی
وہ میرے لیے فکرمند ہوتا۔ پہلے بھی اس نے اپنے فائدے کے لیے مجھے غزالہ سے لتی بنا کر استعمال کیا تھا
مجھے چند ہزار دے کر خود لاکھوں کمائے تھے۔ جب اپنی جان پر بنی تو وہ میری قربانی دے کر خود اُڑن چھو ہو گیا
ظاہر ہے، زندگی رہتی تو وہ مجھ جیسی شوبز کی چکا چوند سے اندھی ہو جانے والی دوسری کئی لڑکیوں کو پھنسا کر تاوان
میں دی گئی رقم سے زیادہ کما لیتا۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اب میں اپنے ماں باپ کا دل دُکھانے کی
ہمت رہی ہوں۔"

غزالہ عرف لتی کی داستان بڑی افسوس ناک اور سبق آموز تھی اور خود وہ عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھی۔

ماہ بانو کو اس کی داستان سن کر دلی افسوس ہوا۔ اس نے اپنی نافرمانی و خودسری کی بہت بڑی سزا پائی تھی
مسلسل اذیت میں مبتلا تھی۔ کچھ دیر قبل اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، کسی عورت کے لیے اس سے بڑی تکلیف
حالت کی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی خواہش مند وہ لڑکی اتنے گہرے پاتال
میں گری تھی کہ اب شاید وہاں سے نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ حساس دل ماہ بانو کو چپ سی لگ گئی۔

"تم نے تو دل پر ہی لے لیا۔ اتنی افسردہ نہ ہو۔ میں نے اپنے حالات کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر لیا
ہے۔ پہلے پہل روتی دھوتی تھی، اب تو چپ چاپ ہر رات اس اذیت سے گزر جاتی ہوں۔ اس کتے کو برداشت
کرنا بہت مشکل ہے، اب میرے اندر بڑی برداشت آ گئی ہے لیکن اس کمینے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔
اسے تو وہ موٹی حمیداں ہی سہہ سکتی ہے۔" اس کا اشارہ یقیناً ڈیرے پر موجود اس دوسری عورت کی طرف تھا۔

"حمیداں یہاں کیسے ہے؟ دیکھنے میں تو وہ بڑی مرد مار عورت لگتی ہے اور اس کی یہاں موجود ان ڈاکوؤں
سے بنتی بھی خوب ہے۔ تمہاری طرح وہ اس ماحول سے بیزار بھی نہیں لگتی؟"

"وہ کیوں بیزار ہو گی؟ اس کا اپنا مرد اس گروہ میں شامل تھا۔ وہ اپنے مرد کے ساتھ مزے سے یہاں رہتی
تھی۔ ایک واردات میں وہ مارا گیا تو یہ سب کی بیوی بن گئی۔ ایک بیٹا بھی ہے اس کا۔ شہر میں ہاسٹل میں رکھ کر
پڑھا رہی ہے۔ ادھر جو خدمتیں کرتی ہے، اس کے بدلے بیٹے کو بھر بھر کر نوٹ بھیجتی ہے۔ سال میں ایک بار اسے
مہینے بھر کی چھٹی بھی ملتی ہے، ان چھٹیوں میں وہ شہر جا کر بیٹے کے ساتھ رہتی ہے اور خوب موجیں کرنے کے
ساتھ ساتھ مال دار پارٹیوں کے بارے میں کھوج بھی لگا کر آتی ہے۔ اس کی مخبری پر ان لوگوں نے بڑے
بڑے ڈاکے مار کر خوب مال کمایا ہے۔ وہ تو چاہتی ہے ان لوگوں کی۔" لتی نے قدرے طنز اور نفرت کے ساتھ
حمیداں کے بارے میں بتایا تو زندگی کے نئے نئے بھیدوں کے خود پر کھلنے پر حیران ماہ بانو اسے دیکھتی کی دیکھتی
رہ گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال بڑی بے خبری میں معصوم معصوم خواہشوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے
ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزارے تھے لیکن اب زندگی عجیب ہی ڈھنگ کے ساتھ اس پر منکشف ہو رہی تھی۔
وہ جہاں جاتی تھی، وہاں زندگی کا ایک حیران کن رُوپ دیکھنے کو ملتا تھا۔

"تو تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں سمجھا کہ میرے سمجھانے کے باوجود کوئی ایڈونچر کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو اور
اب جنگل میں بھٹکتی پھر رہی ہو گی۔" اسلم کب وہاں آیا، اسے اور لتی کو پتہ نہیں چلا۔ وہ اس کی آواز سن کر ہی چونکیں۔



"میں بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر یہاں سے بھاگنا اتنا آسان ہوتا تو کوئی بھی عورت
یہ کر ذلت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ اسلم پہلے اسے اپنی بنائی ہوئی پھلواری میں
نہیں گیا ہو گا اور اس کے وہاں نہ ملنے پر تشویش زدہ ہو کر اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے نکلا ہو گا۔

"اب واپس چلو، کافی دیر ہو گئی ہے۔" اسلم نے ایک بے نیازانہ نظر دگرگوں حالت میں بیٹھی لتی پر ڈالی اور
ماہ بانو سے بولا۔

ماہ بانو نے خاموشی سے اس کے حکم کی پیروی کی اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسلم سے بگاڑ کر وہ
اتنے بڑے سپورٹر سے محروم ہونا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس کی بات ماننے میں ہی بھلائی تھی۔ وہ
دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ سے نکلتے چلے گئے۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی
لتی ان کی پشت کو گھورتی آنکھوں نے اس پل جتنے رنگ بدلے، وہ ان دونوں کو ہی نظر نہیں آئے۔

⊛----✪----⊛

"چودھری کی حویلی سے کوئی خبر ملی عبدالمنان؟"

"نو سر! فی الحال تو ایسی کوئی خبر نہیں ہے جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔ میں نے حویلی کی جس
ملازمہ کو مخبری پر لگایا ہوا ہے، اس نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ چودھری صاحب آج کل بہت غصے میں ہیں اور
انہیں ابھی تک اس شخص کی تلاش ہے جس نے حویلی کے ملازموں کی مدد سے ماہ بانو کو وہاں سے نکالا ہے۔
ابتدا میں وہ آپ پر ہی شک کر رہا تھا لیکن اب اسے کسی وجہ سے یہ یقین آ چکا ہے کہ آپ کا اس معاملے سے
تعلق نہیں ہے اس لیے وہ دن رات اپنے قریبی ملازموں پر برس رہا ہے کہ اصل مجرم کا سراغ لگانے کے ساتھ
ساتھ ماہ بانو کو بھی تلاش کریں لیکن فی الحال وہ لوگ بھی ناکام ہیں۔" عبدالمنان نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

"سمجھ نہیں آتا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ادھر کراچی سے بھی کوئی خوش کُن اطلاع نہیں مل
رہی ہے۔ ڈاکٹر طارق اور اس کی بہن کا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ ان کے والدین کے گھر پر ریڈ کروا کر بھی دیکھ لیا
ہے۔ ان کے والد کو پولیس کسٹڈی میں لے کر بھی۔ پولیس نے ان کے والد سے ٹھیک ٹھاک تفتیش کی ہے لیکن ان
کا یہی جواب ہے کہ انہیں اپنے بیٹے اور بیٹی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے جس بندے کو اس کام
پر لگایا ہے، اس کا کہنا ہے کہ مجھے بڑے میاں سچے لگ رہے ہیں۔ وہ کافی اچھی شہرت رکھنے والے آدمی ہیں جن
کی شرافت کی آس پڑوس والوں نے بھی گواہی دی ہے۔ کسی شریف آدمی کا عموماً پولیس کی تفتیش کے سامنے
زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہیں ہوتا اور اسے سچ اُگلنا ہی پڑتا ہے۔"

"آپ پریشان نہیں ہوں سر! انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل ہی آئے گی۔" عبدالمنان نے
تسلی دی۔

"اُمید تو میں بھی یہی رکھتا ہوں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا بھی مجھے پسند نہیں۔ ہم کوشش کریں گے
تو ہی تو اللہ بھی ہماری بہتری کرے گا۔ بے عمل انسان تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"ممکنہ کوشش تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ اللہ کامیابی بھی ضرور عطا کرے گا، بس اس کا طے کیا ہوا وقت آ جائے۔
آج بھی ایک اچھی خبر آپ کی منتظر ہے۔"

"کون سی اچھی خبر؟" شہریار چونکا۔

"میں آپ کو وہ خبر سنانے کے بجائے دکھانا پسند کروں گا۔" عبدالمنان ایک دم اُٹھ کر آفس سے باہر نکل

گیا، پھر دو منٹ بعد وہ دستک دے کر اندر آیا تو اکیلا نہیں تھا۔

''مشابرم خان۔'' عبدالمنان کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

''جی سر جی! یہ ہم ہے۔'' وہ خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا۔

''تمہیں دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم اتنی اچانک کیسے آ گئے۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔'' اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''مہربانی تو آپ کی ہی ہے صاحب! آپ کی کوششیں شامل نہیں ہوتیں تو ان سے ہماری جان اتنی آسانی سے کہاں چھوٹتی؟ بس اللہ کا کرم یہ ہوا کہ ادھر میجر ذیشان بھی ہماری مدد کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ ہمارا ہاتھ صاف تھے اس لیے سب کوششیں کامیاب رہیں۔ میجر ذیشان نے ہی ہم سے کہا تھا کہ اے سی صاحب پہلے سے خبر دینے کے بجائے اچانک ان کے سامنے پہنچ جاؤ تو وہ زیادہ خوش ہوں گے۔'' مشابرم خان نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا۔ اس کی صحت کافی متاثر ہوئی تھی۔ شمال کے پہاڑوں کے درمیان درندہ پسندوں کا خفیہ ٹھکانہ تباہ ہوتے ہوئے جہاں بہت سی انسانی زندگیوں کا چراغ بجھ گیا تھا، وہاں مشابرم خان کو کافی زخمی ہوا تھا۔ بعد میں علاج معالجہ تو ہوا لیکن اسے وہاں اپنی موجودگی کے اسباب بیان کرنے اور اپنی صفائی دینے کے لیے کافی عرصہ تحقیقاتی اداروں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر ماہ بانو اس کے حق میں گواہی دیتی اور شہریار اس کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے متحرک نہ ہوتا تو وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔

''تو تم نے اور میجر صاحب نے مل کر مجھے سرپرائز دیا ہے۔'' شہریار مسکرا کر بولا۔ حقیقتاً اسے مشابرم خان کو سامنے دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ وقتی طور پر اپنی ساری ٹینشن فراموش کر بیٹھا تھا۔

''ہم نے جو کیا، وہ میجر صاحب کے کہنے پر کیا ورنہ ہمیں یہ سرپرائز ور پرائز کا کیا خبر؟'' مشابرم خان شرمایا۔ ''میجر صاحب نے کہا تھا کہ اپنے صاحب سے کہنا مجھ سے رابطے میں رہیں۔'' اُس نے اس کا پیغام پہنچایا۔

''اوکے! میں اُنہیں فون کر لوں گا۔'' شہریار نے اُسے جواب دیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو عبدالمنان نے کال ریسیو کی اور آپریٹر سے بات کرنے لگا۔

''سر! کوئی منشا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں بھی ان کا فون آیا لیکن انہوں نے کوئی پیغام دینا پسند نہیں کیا تھا۔'' آپریٹر کی بات سن کر اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

''بات کرواؤ۔'' شہریار نے فوراً اجازت دی۔ اسے معلوم تھا کہ ماسٹر آفتاب کا قلمی نام، اے اے ملا ہے اور اس کے بار بار فون کرنے سے ظاہر تھا کہ اسے کوئی خاص کام ہے۔

''اوکے سر!'' عبدالمنان نے آپریٹر سے لائن ملانے کا کہا اور شہریار کے اشارے پر ریسیور اسے دیا۔ مشابرم خان کو لے کر باہر نکل گیا۔

''ہیلو۔'' شہریار کال ملتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''السلام علیکم سر! آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا؟'' دوسری طرف سے آفتاب کی آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام! کہو آفتاب، کیسے یاد کیا ہے؟'' اس نے اپنے جواب سے باور کروا دیا کہ اس کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے کہ وہ اس کا قلمی نام بھول گیا ہو۔

''آپ کو ایک بہت اہم اطلاع دینی تھی۔ کیا آپ کے دفتر کا نمبر محفوظ ہے؟'' وہ بہت محتاط لگ رہا تھا۔ شہریار اس کے انداز پر چونک گیا۔ وہ آفتاب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ غیر ضروری باتیں کرنے والا کم عقل نہیں تھا۔



اگر وہ اس کے دفتر کے نمبر کے محفوظ ہونے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس واقعی کوئی بہت ہی اہم خبر موجود ہے۔

''تم کہاں ہو؟ مجھے اپنا نمبر دو، میں خود تم سے رابطہ کرتا ہوں۔''

''میرے پاس اپنا ذاتی فون نہیں ہے۔ میں آپ کو پی سی او سے کال کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

''کوئی تو ایسا نمبر ہوگا جس پر تم سے رابطہ کیا جا سکے؟''

''نمبر.....'' شہریار کے پوچھنے پر وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں آپ کو ایک بک شاپ کا نمبر دیتا ہوں۔ آپ پانچ منٹ بعد مجھے اس نمبر پر کال کر لیں۔ مجھے یہاں سے اُس شاپ تک پہنچنے میں دو تین منٹ ہی لگیں گے۔ وہاں آپ مجھے احمد کے نام سے بلوائیے گا۔'' اس نے ایک نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اس نمبر پر اپنے موبائل سے رابطہ کیا۔ کال کسی اجنبی نے ریسیو کی۔

''مجھے احمد صاحب سے بات کرنی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس نمبر پر مجھے ملیں گے۔'' اس نے اجنبی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''جی، وہ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ بات کر لیں۔'' فون آفتاب کے ہاتھ میں منتقل کر دیا گیا۔

''اگر تمہارے نزدیک بات بہت زیادہ اہم ہے تو ابھی کچھ مت بتاؤ۔ میں تمہیں اپنا خفیہ موبائل نمبر دیتا ہوں۔ کسی محفوظ جگہ سے اس نمبر پر کال کر لو۔'' آفتاب کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے بلا تمہید اس سے کہا۔

''آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔'' آفتاب کے مختصر جواب نے ظاہر کر دیا کہ بات بہت اہم ہے۔

''اوکے.....نوٹ کرو۔'' شہریار نے اسے اپنا نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ اپنے اس موبائل نمبر کے سلسلے میں محتاط رہتا تھا اور چند لوگوں کے سوا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں تھا اسی لیے اس نے بک شاپ پر بھی اس نمبر پر کال کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ آفتاب نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ دس منٹ بعد شہریار کے اس موبائل نے وائبریٹ ہو کر کال آنے کا اشارہ کیا۔

''اب ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں سر!''

''ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کیا اہم خبر ہے؟'' شہریار نے اسے اجازت دی۔

''آپ کا ایک مفرور مجرم اتفاق سے مجھے مل گیا ہے۔''

''کون.....؟'' وہ چونکا۔ مفرور مجرم کا سن کر اس کا ذہن فوری طور پر ورما کی طرف ہی گیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ آفتاب اس کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔

''پیر آباد کی مسجد میں مولوی غلام محمد بن کر رہنے والا خبیث آدمی۔'' آفتاب کی دی گئی اطلاع بھی کم نہیں تھی۔ غلام محمد بھی مبینہ طور پر ''را'' کا ہی ایجنٹ تھا۔ اگر وہ ہاتھ آ جاتا تو اس سے ورما کا ٹھکانہ اُگلوایا جا سکتا تھا۔

''تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔'' وہ فوراً پُر جوش ہو گیا۔ جواب میں آفتاب نے اسے تفصیل کہہ سنائی کہ کہاں، کب اور کیسے اس نے غلام محمد کو شناخت کیا۔

''اوکے، تم محتاط رہنا۔ میں جلد از جلد اُس موذی کو پکڑنے کا کوئی انتظام کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنا مکمل پتا بتا دو۔'' ساری تفصیل سن کر اس نے آفتاب سے کہا تو اس نے اسے اپنا پتہ نوٹ کروا دیا۔ پتہ لینے کے بعد اس نے لائن منقطع کر دی اور خود سوچ میں پڑ گیا۔ اس بار اسے کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ مجرم ہاتھ آئے تو پھر

ئی صورت فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

⊛----✪----⊛

چودھری اپنے سامنے رکھے کاغذ کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کاغذ پر مہک بک شاپ، واہ کینٹ کے الا
علاوہ ایک فون نمبر بھی لکھا تھا۔ اسے یہ پتہ اور فون نمبر لکھا کاغذ اس اطلاع کے ساتھ پہنچایا گیا تھا کہ اس
شاپ سے آفتاب کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور اگر وہ اسے اور کشور کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس کلیو سے فائدہ ا
ہے۔ وہ تو عرصے سے انتظار میں تھا کہ اپنی غیرت کو للکارنے والے معمولی ماسٹر اور اپنی باغی بیٹی کو ان
کی سزا دے سکے۔ چنانچہ حاصل شدہ معلومات سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔

''آپ نے کچھ سنا چودھری صاحب؟'' ابھی وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وڈی چودھرائن
کانپتی وہاں پہنچی اور اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پُر جوش انداز میں سوال کیا۔ وہ اتنی
پُر جوش تھی کہ قاعدے کے مطابق چودھری کے کمرے میں آنے سے قبل اس سے اجازت بھی نہیں ل
چودھری نے اُس کی اس جسارت پر اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''کی گل اے چودھرائن! ایسی کون سی خبر سنانی ہے جس کے لیے تُو یوں دوڑی چلی آ رہی ہے؟''

''خبر ہی ایسی ہے چودھری صاحب! آپ سنیں گے تو سن کر آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔''

''کیوں خوامخواہ پہیلیاں بجھوا رہی ہے؟ جو بھی گل ہے، دَس دے۔'' چودھری کے سامنے اتنا اہم مسلا
غور تھا اس لیے اسے چودھرائن کی یہ بے وقت آمد بے حد ناگوار گزر رہی تھی۔

''اپنے بہزاد شاہ کی گھر والی ماں بننے والی ہے۔'' وڈی چودھرائن نے اپنی دانست میں دھماکا کیا۔

''تو فیر؟'' چودھری نے اسے گھورا۔

''آپ کو سن کر حیرت نہیں ہوئی چودھری صاحب؟'' چودھرائن بے چاری پہلے خود پر ہونے وا
انکشاف پر حیران تھی اور اب چودھری کے پُرسکون رہنے پر حیرت زدہ ہو رہی تھی۔

''تُو تو ایسے حیران ہو رہی ہے جیسے فریدہ کے بجائے بہزاد کے حاملہ ہونے کی خبر سن لی ہو۔ ویاہ کے
عورت ماں بنتی ہی ہے، اس میں نیا کیا ہے؟'' چودھری مکمل تجاہل برت رہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر بہزاد کا بچہ.....'' چودھرائن نے اپنے ادھورے جملے سے پورا مفہوم ظاہر کر دیا۔

''کیوں..... بہزاد کا بچہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ مرد ہے وہ۔ تھوڑا دماغ کمزور ہے، پر اس کا مطلب یہ
کہ وہ پوری طرح ناکارہ ہے۔'' اس بار چودھری اس پر چڑھ دوڑا۔ چودھری کی بلند آواز کے سامنے اس کی ا
نہیں تھی کہ مزید کچھ کہہ سکتی چنانچہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی ورنہ یقین تو اسے ابھی بھی نہیں تھا کہ فریدہ بہزاد شاہ
بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔ ایک ملازمہ سے یہ خبر سننے کے بعد وہ فریدہ کے پاس بھی گئی تھی اور اس پر ا
ظاہر کرتے ہوئے دھمکانے کی کوشش بھی کرتی رہی تھی لیکن فریدہ اس کی دھمکیوں پر ذرا بھی ہراساں نہیں ا
اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ جو چاہو کر ڈالو۔ وڈی چودھرائن کو اُس کی اس جرأت نے بہت برا لگا
اور وہ فوراً ہی چودھری کو اطلاع دینے پہنچ گئی لیکن اُس کا ردِعمل بھی اُس کی توقعات کے برخلاف تھا اور وہ ما
مایوس ہوئی تھی۔

''ہور کچھ کہنا ہے تجھے؟'' چودھری نے اُس کی لٹکی ہوئی شکل دیکھی، اس کے باوجود کھردرے لہ
دریافت کیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔



''تو فیر جا ادھر سے، ہور آئندہ خیال رکھنا کہ ایسے ہی منہ اٹھا کر میرے سامنے نہ آ جانا۔ میں کوئی فارغ
ہوں کہ بیکار کی بکواس سن کر تم زنانیوں کی طرح ان پر مغز کھپاتا رہوں۔'' وہ ایسی کوئی کسر نہیں رہنے
تا تھا کہ چودھرائن پھر دوبارہ اس موضوع پر گفتگو کر سکے۔ اگر اس کا شک برقرار رہتا تو وہ کھوج میں لگ
اور اس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اصل بات تک پہنچ جاتی۔ اصل بات معلوم ہوتی تو خود چودھری پکڑا
انگوں اور مزارعوں کی عورتوں کی بات الگ تھی لیکن ذہنی طور پر پسماندہ بیٹے کی بیوی کے ساتھ اگر اس کا
ہر ہو جاتا تو چودھرائن بھلے اُس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی، پر وہ اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا۔

فی الحال تو نتیجہ اس کے حسبِ توقع ہی نکلا تھا اور چودھرائن سر جھکائے مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکل
لیکن چودھری نہیں جانتا تھا کہ اُس کے اس جھکے ہوئے سر میں موجود دماغ میں کیا خیالات سرسرا رہے
والی چودھرائن کے نام سے پکارے جانے والی کا دل بالکل بھی بڑا نہیں تھا اور وہ اپنی اولاد کے سوا کسی کو
گیر میں حصے دار بنانے کی روادار نہیں تھی۔ بہزاد شاہ تو اُس کی اس سوکن کا بیٹا تھا جس سے اسے سب سے
حسد رہا تھا۔ اب تک اس نے بہزاد شاہ کو برداشت کیا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے اس ذہنی مریض لڑکے
کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اب جبکہ وہ باپ بننے جا رہا تھا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر
اگر اسے جاگیر کا ایک اور وارث برداشت ہی کرنا ہوتا تو ماہ بانو کو کیوں یہاں سے نکلوانے کا انتظام کرتی۔

''میں نے ساری حیاتی تیرے کرتوتوں کو بہت سہہ لیا چودھری! پر یہ طے ہے کہ اس جاگیر پر صرف میری
اور ان کے بچے راج کریں گے۔ میں کسی ہور سانجھے دار کو اس دنیا میں ساہ ہی نہ لینے دوں گی۔'' زیرِ لب
اگر اپنے زہریلے خیالات کا اظہار کرتی وہ عورت کے بجائے ایسی زہریلی ناگن لگ رہی تھی جو کسی بھی لمحے
سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

''کیا بات ہے، آپ کو نیند نہیں آ رہی کیا؟'' آفتاب نے غنودگی بھری آواز میں اپنے پہلو میں لیٹی کشور
چھا۔ وہ آج پنڈی تک جا کر واپس آیا تھا اور اس کے بعد لکھنے کا بھی ٹھیک ٹھاک کام کیا تھا چنانچہ تھکن کی
سونے کے لیے بستر پر لیٹتے ہی نیند غالب آ گئی اور وہ سو گیا لیکن پھر کروٹ بدلتے ہوئے اسے احساس
اس کے ساتھ لیٹی کشور ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اُس کی اس بے چینی کا سبب جاننے کے لیے ہی اس
سے سوال کیا۔

''پتہ نہیں کیوں عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں اتنی کوشش کر رہی ہوں، اس کے باوجود سو نہیں پا
'' اس نے بے بسی سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟..... کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' آفتاب فوراً ہی گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کشور جس
میں تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر لگی رہتی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس گاؤں میں طبی سہولیات
ہونے کے برابر تھیں۔ اگر چودھری کا ڈر نہیں ہوتا تو وہ کبھی اسے اس حالت میں یہاں نہیں رکھتا۔ اب
ارادہ یہی تھا کہ آخری دنوں میں کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے گا جہاں بہترین طبی سہولیات موجود ہوں لیکن
وقت کشور کے ساتھ کوئی گڑبڑ تھی تو اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ یہاں سے شہر تک پہنچنا اتنا آسان
تھا۔ سب سے پہلے تو رات کے اس پہر سواری کا انتظام کرنا ہی مسئلہ بن جاتا۔

''کیا کہیں درد ہو رہا ہے؟'' وہ کشور کو چھو چھو کر اس کی تکلیف کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے صحت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ صرف دل گھبرا رہا ہے۔'' اس کی بات بدلتے ہوئے کشور نے اسے تسلی دی۔

''دل بلاوجہ تو نہیں گھبراتا۔'' آفتاب کی تشویش برقرار تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں صرف حالات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ غلام محمد کو پکڑوانے کے چکر میں ہم سامنے نہ آجائیں۔ بڑی مشکل سے کوئی ایسی جگہ ملی ہے جہاں ہم سکون سے دن گزار رہے ہیں۔'' اس نے اپنی پریشانی کی وجہ آخر کہہ ہی ڈالی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اپنے ذہن پر زور مت ڈالیں۔ زیادہ ٹینشن لینا آپ کے لیے ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' آفتاب نے اسے سمجھایا۔

''میں جان کر یہ سب نہیں سوچ رہی ہوں، بس خود بخود ہی خیالات ذہن میں آتے چلے جارہے ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''خود کو سوچ سوچ کر ہلکان مت کریں۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ شہریار صاحب بہت محتاط اور ذہین آدمی ہیں۔ وہ ہرگز اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ایسی کوئی پلاننگ نہیں کریں گے جس سے ہم پر آنچ آئے۔ ہمارے حالات کا اچھی طرح علم ہے اس لیے وہ ہمارے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔'' آفتاب نے اسے تسلی دی۔

''اتنا بھروسہ ہے آپ کو ان پر؟'' کشور نے مسکرا کر پوچھا۔

''مخلص آدمی ہمیشہ بھروسے کے لائق ہوتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں بھی پریشان نہیں ہوتی اور آرام سے سو جاتی ہوں۔ آپ بھی سو جائیں، صبح اٹھ کر آپ کو اپنے ناول پر کام کرنا ہے اس لیے ضروری ہے کہ صحیح سے نیند لیں۔ فریش موڈ کے ساتھ کام کریں گے تو اچھا لکھا جائے گا۔'' اس نے آفتاب کو لیٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر خود اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آفتاب نے اپنا دوسرا بازو اس کے گرد حمائل کر کے اسے خود سے اور بھی قریب کر لیا۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں۔ وہ فقط اس لیے نہیں سو رہا تھا کہ کشور جاگ رہی ہے۔ اُس کی اس کیفیت کو محسوس کر کے کشور نے اپنی آنکھیں موند لیں اور آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہونے کے باوجود سوتی بن گئی۔ اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر جلد ہی آفتاب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

کشور بھی کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح نیند مہربان ہو جائے۔ اُس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب ہونے لگی تھی اور وہ ہلکی ہلکی سی غنودگی محسوس کر رہی تھی کہ ہلکے سے کھٹکے کی آواز نے اسے ایک بار پھر پوری طرح بیدار کر دیا۔ اسے بالکل ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس طرف آ رہا ہے۔ وہ کان لگا کر سننے لگی کہ اس کا احساس درست ہے یا پھر وہ کسی واہمے میں مبتلا ہے۔ کسی حتمی نتیجے سے قبل ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر کشور کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی چیخ سن کر آفتاب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور پھر بنا کسی سوال کے خود ہی اس کے چیخنے کا سبب سمجھ گیا۔ سیاہ چست لباس میں ملبوس، چہرے کو نقاب میں چھپائے وہ شخص اپنے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑے بالکل سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے پسٹل کا رخ انہی کی طرف تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے تھر تھر کانپتی کشور کو خود سے لگاتے ہوئے آنے والے سے پوچھا۔ درحقیقت اس مسلح آدمی کو اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔



''حیرت ہے، تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ تم مجھے پہچان چکے ہو اسی لیے میرا سامنا کر رہے ہو۔'' اس شخص نے استہزائیہ لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس کے الفاظ اور آواز نے آفتاب کو بتا دیا کہ وہ کون ہے؟

''اگر میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے تو تمہیں کیا پریشانی ہے؟ جس طرح میں تمہیں پہچان کر خاموشی سے یہاں رہ رہا ہوں، تم بھی انجان بن جاؤ۔ ہم دونوں ہی کو اپنے پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے اجنبی بن کر یہاں خاموشی سے رہیں تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' آفتاب سمجھ گیا تھا کہ اس نے جس طرح اس مفرور کو پہچان لیا تھا، اسی طرح وہ بھی اسے شناخت کر چکا تھا۔

''مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔ تم اے سی شہریار کے چہیتے ہو اور اسے میری یہاں موجودگی کی خبر ضرور دو گے۔''

''اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو پہلے ہی کر چکا ہوتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں، میں خود بھی یہاں نہیں رہوں گا اور میرے دشمن مجھ تک پہنچ جائیں گے۔'' آفتاب نے دلیل دے کر اسے بے ضرر ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر میں خود بھی حیران ہوں۔ آخر تم یہاں کیوں رہ رہے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ لمبی کہانی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ پیر آباد کے چودھری صاحب کسی وجہ سے میرے جانی دشمن بن گئے ہیں اور میں ان سے اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر چھپتا پھر رہا ہوں۔'' اسے یقین دلانے کے لیے آفتاب نے زور دے کر کہا۔

''شاید اس کی وجہ یہ خوب صورت لڑکی ہے۔ کہیں تم چودھری کی کُڑی کو تو نہیں لے اُڑے؟'' کشور کی طرف اشارہ کر کے سوال کرتے ہوئے اس نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ جواب میں آفتاب خاموش رہا۔

''گاؤں والوں کی زبانی یہ سن کر کوئی شہری بندہ جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے..... یہاں آ کر رہ رہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کوئی شہری باشندہ بلاوجہ تو اس پسماندہ گاؤں میں آ کر نہیں رہ سکتا۔ ضرور کوئی ایسی وجہ ہوگی جو تم یہاں آ کر رہنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ وہ وجہ جاننے کے لیے میں نے تم سے ملاقات کی کوشش کی لیکن تم یقیناً پہلے ہی مجھے دیکھ کر پہچان چکے تھے اس لیے میرا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک بار کے بہانے پر تو میں نے یقین کر لیا لیکن پھر سمجھ گیا کہ تم جان کر ایسا کر رہے ہو۔ مجھ پر دھن سوار ہو گئی کہ کسی طرح تم سے سامنا ہو جائے۔ آج صبح بھی میں نے ایک آدمی تمہارے پاس بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم شہر گئے ہوئے ہو اور شام تک واپس آؤ گے۔ میں عصر کے بعد ہوا خوری کے بہانے نکل کھڑا ہوا اور بس اڈے سے تمہارے گھر کی طرف آنے والے راستے پر انتظار کرنے لگا۔ بسیں چونکہ مقررہ اوقات پر ہی یہاں آتی جاتی ہیں اس لیے حساب کتاب لگا کر ہی نکلا تھا، اس لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تم نے اپنا حلیہ کافی تبدیل کر لیا ہے اور پہلی نظر میں تمہارا کوئی جاننے والا تمہیں پہچان نہیں سکتا لیکن میری نظروں سے تمہاری اصلیت چھپی نہیں رہ سکی۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہارا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ہے۔ میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں گولی مار سکتا تھا لیکن اس صورت میں تمہاری بیوی بچ نکلتی اور میں ایسے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جو میرے لیے مشکلات پیدا کر سکے۔ اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

اس نے ایک پل کے لیے بھی ان دونوں کو پسٹل کے نشانے پر سے نہیں ہٹایا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے آفتاب مسلسل بچاؤ کی تدبیر سوچتا رہا تھا کیونکہ غلام محمد بے شک نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے ایک بدکردار اور قاتل کے علاوہ

''را'' کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی جانتا ہے لیکن خود اسے معلوم تھا کہ ''را'' کے ایجنٹس کتنے شقی القلب ہیں۔ وہ اپنی کوششوں سے اپنے لیے تھوڑی مہلت تو حاصل کر سکتا تھا لیکن جان بخشی کی اسے کوئی اُمید نہیں اس کے لیے اسے خود ہی کوئی تدبیر کرنی تھی اور تدبیر اس نے یہ طے کی کہ مطالعے کے لیے سرہانے رکھی کتاب اٹھا کر اس کے پسٹل پر دے ماری۔ اس کی یہ تدبیر اس اعتبار سے کارگر رہی کہ پسٹل غلام محمد سے نکل گیا۔ لیکن پسٹل ہاتھ سے نکلنے سے قبل وہ گولی چلا چکا تھا۔ آفتاب کے حرکت میں آ جانے کی وجہ اسے تو گولی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی کشور زد میں آ گئی۔ گولی جسم میں پیوست ہوتے ہی اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اس کی چیخ اور پھر بھل بھل بہتے خون نے آفتاب کو سخت مشتعل کر دیا۔ وہ سادہ آدمی تھا اور اس کا لڑنے بھڑنے سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن اس پل وہ جنونی ہو کر غلام محمد سے جا ٹکرایا۔

اس نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر غلام محمد کے پیٹ میں ماری۔ ٹکر زوردار تھی جس نے اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا اور وہ پیچھے دروازے کے ساتھ جا کر ٹکرایا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنا آپ سنبھال لیا اور آفتاب پر جھپٹ لگا کر اسے اپنے نیچے دبا کر رگیدنے لگا۔ وہ اسے ٹکر مار کر دور جا گرنے والے پسٹل کو اپنے قبضے میں لینے کے چکر میں تھا۔ غلام محمد اس پر سوار ہوا تو اسے یوں لگا کہ اس کا جسم کسی پہاڑ کے نیچے دب گیا ہو۔ اس کے مقابلے میں ''را'' کے تربیت یافتہ ایجنٹ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ پسٹل ہاتھ میں آ جانے کے باوجود کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

غلام محمد نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اسے رگیدنے کے ساتھ ساتھ اب اس کا نرخرہ بھی اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لیا تھا اور وہ اپنی رُکتی سانسوں کے ساتھ خرخر کی آوازیں نکالنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے اور اب وہ اس دنیا میں چند سانسوں کا مہمان رہ گیا ہے۔ اسے کہیں بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اپنی اپنی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو مجتمع کیا اور اپنی داہنی ٹانگ موڑ کر گھٹنے کی پوری قوت سے غلام محمد کی ناف کے نیچے ضرب لگائی۔ موت کے بالکل قریب کھڑے کسی زندگی کے ساتھ جڑے رہنے کی یہ آخری کوشش تھی جس نے کام دکھایا اور اس کے جسم پر سے غلام محمد کے دباؤ کم ہونے کے علاوہ اس کا نرخرہ بھی اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ لیکن وہی بات تھی کہ اس کا واسطہ تربیت یافتہ ایجنٹ سے پڑا تھا جو ذرا سا ڈگمگایا تو ضرور لیکن پھر سنبھل کر حملہ آور ہوا اور نہایت ہوشیاری سے اس کے ہاتھ سے پسٹل چھین لیا۔ پسٹل ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر آفتاب کا سارا جوش و خروش دھیما پڑ گیا۔

وہ جس گھر میں رہائش پذیر تھے، وہ گاؤں کی دوسری آبادی سے اتنا ہٹ کر بنا ہوا تھا کہ وہ یہ بھی امید نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں ہونے والے ہنگامے کو سن کر کوئی ان کی مدد کے لیے آئے گا۔ مگر خدا بھی اپنے وجود کا احساس ہی لمحے میں منواتا ہے جہاں بندہ مایوس ہو جاتا ہے۔ غلام محمد نے پسٹل ہاتھ میں آ جانے کے بعد اس کا رخ چلانے کے لیے تانا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے ایک نظر اپنی ہتھیلی میں ہو جانے والے سوراخ اور اس سے بہتے خون پر ڈالی اور پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا تھا جسے وہ تو نہیں پہچان سکا لیکن آفتاب کے چہرے پر رونق آ گئی۔

''سیدھی طرح کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ورنہ ہم دوسرا گولی تمہارے بھیجے میں مارے گا۔'' اور بے خوف مشابرم خان نے اسے اس لہجے میں دھمکایا کہ اسے یقین ہو گیا کہ اگر اس نے اس کے کہے پر عمل نہیں کیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ اس نے آفتاب کو چھوڑ کر کھڑے ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔



[illegible] سے آزاد ہوتے ہی آفتاب بستر پر پڑی کشور کی طرف لپکا اور اس کی نبض چیک کی۔ وہ بے ہوش تھی [illegible] اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ سانسوں کا سلسلہ کب تک جاری رہ سکے گا۔

''تم آفتاب اور اس کی بیوی کو لے کر فوری طور پر ہسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤ مشابرم خان! یہاں کی صورت حال کو ہم خود ہینڈل کر لیں گے۔'' مشابرم خان کے پیچھے سے نمودار ہونے والے شہریار کے الفاظ نے [illegible] آفتاب کے چہرے کو رونق بخشی، وہیں غلام محمد کا چہرہ بالکل تاریک پڑ گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ شہریار تنہا نہیں [illegible] اس کے ساتھ جدید اسلحے سے لیس چند دوسرے افراد بھی موجود ہیں اور وہ جتنا بھی اچھا فائٹر سہی، بہرحال [illegible] وہ کمرے کے اندر اتنے سارے مسلح افراد سے نہتا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آپ ابھی تک سوئے نہیں بابا؟'' ادھیڑ عمر آدمی کتاب پر سے نظر ہٹا کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔ [illegible] کی جواں سال بیٹی تھی جو رات کے اس پہر بھی اس کے جاگنے پر سوال کر رہی تھی۔

''بس بیٹی! یہ حصہ مکمل کر لوں تو پھر سوتا ہوں۔ اصل میں کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے چھوڑ کر سونے کا [illegible] نہیں چاہ رہا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دیا۔

''میں نے آپ کی طرح کسی دوسرے شخص کو کتابوں کی محبت میں گرفتار نہیں دیکھا۔ دن بھر کتابوں میں گھرے رہتے ہیں پھر بھی دل نہیں بھرتا۔ گھر آ کر بھی انہی میں گم رہتے ہیں۔'' اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔

''کیا کروں بیٹی! میں نے زندگی میں دو ہی چیزوں سے محبت کی ہے۔ ایک تم سے اور دوسری کتابوں سے۔ اس محبت نے ہی تو مجھے مہک بُک شاپ کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں، اس سے پہلے میں نے ذرا چھوٹے پیمانے پر یہ بُک شاپ کھولی تھی اور شاپ کا نام رکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر میرے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام مہک رکھوں گا۔'' اس نے سینکڑوں بار کی بتائی ہوئی بات بیٹی کے سامنے دہرائی۔

''میں جانتی ہوں بابا! لیکن آپ کو اپنی صحت کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔ پچھلے کئی روز سے آپ کا بلڈ پریشر مسلسل ہائی رہ رہا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آرام کا خیال نہیں رکھا تو آپ کا بی پی کیسے کنٹرول ہو گا؟''

''او کے میری جان! بس دس منٹ اور دے دو پھر میں سو جاؤں گا۔'' اس نے بیٹی کو منانے کی کوشش کی۔

''صرف دس منٹ..... یاد رکھیے گا۔'' اس نے انگلی اٹھا کر باپ کو تنبیہہ کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ صبح [illegible] کالج جانا تھا اس لیے زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتی تھی۔ بیٹی کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیٹی نے اس سے دس منٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور ڈیڑھ گھنٹہ یوں گزرا کہ اسے لگا فقط چند منٹ ہی گزرے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی وہ دروازے کی گھنٹی بجنے پر چونکا۔ اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا۔

''کون؟'' دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے احتیاطاً پوچھا۔

''آپ شفیق صاحب ہیں نا؟'' دوسری طرف سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے اس سے پوچھا گیا۔

''جی ہاں مسٹر! آپ کون؟'' اس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اگر آنے والا اس کا کوئی واقف کار ہوتا تو یہ سوال ہرگز بھی نہیں کرتا۔

''میں آپ کو اطلاع دینے آیا تھا کہ آپ کی بُک شاپ میں آگ لگ گئی ہے اور کوشش کے باوجود بجھائی

نہیں جا رہی۔'' یہ اطلاع ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے ہوش وحواس قائم رکھ پاتا۔ اس نے فوراً ہی تڑپ کر دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''کک.....کون ہو تم؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اندر چلو، فیر بتائیں گے۔'' ان میں سے ایک نے بیرونی دروازہ بند کر دیا اور اسے دھکیلتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔

''دیکھو تم لوگوں کو جو کچھ چاہیے، لے لو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔ میں تم لوگوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کروں گا۔'' رات کے اس پہر گھر میں داخل ہونے والے مسلح افراد کو وہ ڈاکو ہی سمجھا تھا چنانچہ اسی حساب سے ان سے بولا۔

''ہمیں روپیہ پیسہ نہیں بلکہ ماسٹر آفتاب کا پتہ چاہیے۔'' جواباً اس سے جو مطالبہ کیا گیا، وہ اسے حیران رہ گیا۔

''کون ماسٹر آفتاب؟''

''وہی جس کے لیے آج تمہاری دکان پر نور کوٹ سے اے سی شہریار کا فون آیا تھا۔''

''یقین کرو، میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میرے بے شمار کسٹمرز ہیں جن میں سے کئی دکان کا فون استعمال کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ماسٹر آفتاب بھی ہو لیکن میری اس شخص سے ذاتی واقفیت نہیں۔'' وہ سچ کہہ رہا تھا کہ اسے آفتاب کے بارے میں علم نہیں۔ آفتاب نے اس سے اپنا تعارف احمد کے ذریعے سے کروایا تھا چنانچہ وہ کیسے انہیں کچھ بتا سکتا تھا۔

''ہمیں یہ ساری بکواس نہیں سننی۔ ہمیں تم سے صرف ماسٹر آفتاب کا پتہ چاہیے۔'' اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا گیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ پھر اسی ایک تھپڑ پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ وہ لوگ اسے بے تحاشا مارتے ہوئے ایک ہی مطالبہ کرتے رہے کہ انہیں ماسٹر آفتاب کا پتہ بتایا جائے۔ ہائی بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب کے مریض شفیق کے لیے وہ مار سہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا پہلے سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر یک دم ہی شوٹ کر گیا اور وہ سینہ مسلتے ہوئے نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

''یہ بڈھا تو کام سے گیا۔'' ان میں سے ایک بڑبڑاتا ہوا اپنے ساتھی سے بولا۔

''بہتر ہے ہم ادھر سے نکل چلیں۔ اس کی حالت تو اب ایسی نہیں ہے کہ اس سے کچھ بھی معلوم کیا جا سکے۔'' شفیق کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ چنانچہ وہاں مزید رُکنا بے کار جانا، راہِ فرار اختیار کر لی۔ فرش پر گرے زندگی سے دور جاتے شخص سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بس اس کی خوشنودی کے خواہاں تھے جس کے کہنے پر انہوں نے پنڈی میں آفتاب کی تلاش کی مہم شروع کی تھی۔ وہ اس شخص تک آفتاب کو زندہ یا مردہ پہنچا کر خود سرخرو ہونا چاہتے تھے۔

⊛-----✪-----⊛

''آپا حمیداں! تمہارا بیٹا کس جماعت میں پڑھتا ہے؟'' آٹا گوندھتے گوندھتے اس نے یک دم ہی آگ جلانے کے لیے چولہا تیار کرتی حمیداں سے پوچھا۔ چھوٹی بڑی لکڑیوں کو مخصوص ترتیب سے رکھ کر چولہا تیار کرتی حمیداں اس سوال پر چونک پڑی۔

''تجھے کس نے میرے پُتر کے بارے میں بتایا ہے؟''



''میں بھی تو یہاں تم لوگوں کے درمیان ہی رہ رہی ہوں۔ جو بات دوسروں کو معلوم ہے، وہ مجھے بھی اخبار پتہ چلنی ہی تھی۔'' اس نے للی کا نام لینے کے بجائے گول مول جواب دیا۔

''اسلم نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ تجھ پر بڑا فدا ہے۔ ایسے تیرے ناز اُٹھاتا ہے جیسے تُو اُس کی رکھیل کے بجائے گھر والی ہو۔ ہاہ..... یہ بھی سب نصیبوں کے کھیل ہیں ورنہ تو لوگ اپنی نکاحی بیوی کو بھی پیر کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں۔'' وہ اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھی جبکہ وہ خود اپنے لیے رکھیل کا لفظ سن کر اندر تک سلگ کر رہ گئی۔

''رکھیل ہونے سے پیر کی جوتی بن کر رہنا اچھا ہے اور رکھیل بھی وہی عورت بنتی ہے جو اندر سے کمزور اور لاچار کی ہوتی ہے۔ عزت دار عورت اپنی اس تذلیل سے پہلے جان دینا پسند کرتی ہے۔'' اس نے حمیداں کو جتایا کہ وہ اس کے لیے رکھیل کا لفظ غلط استعمال کر رہی ہے۔ اس کا اسلم سے جو بھی تعلق ہو لیکن وہ اس کی رکھیل نہیں ہے۔

''تُو تو برا مان گئی..... پر یاد رکھ، مرد کے پاؤں کی جوتی بن کر رہنا بھی بڑا اوکھا کام ہے۔ مرد پیار کرنے والا اور عزت دینے والا نہ ہو تو عورت خود اپنے لیے چور راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔'' ماہ بانو کے اخلاقی اصول اس کی زندگی کے تجربات سے متصادم تھے چنانچہ اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

''اس بحث کو جانے دو اور مجھے اس بات کا جواب دو جو میں نے تم سے پوچھی ہے۔'' اس نے حمیداں کو ٹوکا۔

''بارہویں میں پڑھتا ہے میرا پُتر۔ آگے اس نے وکیل بننے کا سوچا ہے۔ رب اس کی تمنا پوری کرے۔'' اسے فخر سے بتاتے ہوئے اس نے دعا بھی کی۔

''چلو اچھا ہے..... اگر کبھی تمہارا یہ گروہ پکڑا گیا تو کوئی مقدمہ لڑنے والا تو ہوگا۔ آخر جن کی کمائی پر تمہارا بچہ پڑھ لکھ رہا ہے، ان کا نمک بھی تو حلال کرنا ہوگا۔ ویسے معلوم نہیں کہ حرام کی کمائی کرنے والوں کا نمک حلال کرنا ضروری بھی ہے یا نہیں؟'' وہ اس طرح کی گفتگو کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن پھر بھی طنز کا تیر چلا گئی۔

''ایسی گل نہ کر کُڑیے! وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب بندے کا کس طرح امتحان لے۔'' حمیداں نے اسے ٹوکا تو وہ چپ ہو کر رہ گئی۔ واقعی وقت کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آدمی کے ساتھ کیا کرے۔ گفتگو کے دوران آٹا گوندھنے کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ حمیداں نے چولہے پر توا رکھا اور وہ دونوں مل کر روٹیاں پکانے لگیں۔

''اسلم تجھ سے محبت کرنے لگا ہے نا؟'' روٹی توے پر ڈالتے ہوئے حمیداں نے اس سے سوال کیا۔

''معلوم نہیں۔'' اس نے تجاہل برتا۔ اسلم کی محبت سے بہت سی رعایتیں حاصل کرنے کے باوجود وہ اس کی محبت کو قبول کرنے سے گریزاں تھی۔ وہ دل جو پہلے ہی کسی کا اسیر ہو، وہ بھلا کسی دوسری محبت کو کہاں قبول کر سکتا ہے؟

''تجھے نہیں معلوم تو میں تجھے بتا دیتی ہوں۔ اتنے برسوں سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ کبھی اسے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ لیکن تیرے لیے تو وہ سردار کے سامنے اڑ گیا۔ میں نے اسے عورت تو کیا، کبھی کسی چیز کے پیچھے بھاگتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی واردات کے بعد اپنے حصے کی رقم کی پروا نہیں کرتا، پر تیرے لیے تو جیسے اس نے ضد باندھ لی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سردار کو منانے کے لیے اب تک جمع ہونے والا سارا مال بھی سردار کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس کی ضد دیکھ کر سردار کو اس کی گل ماننی ہی پڑی۔'' حمیداں اسے جو کچھ بتا رہی تھی، وہ اس کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلم نے اسے بھی اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا اور سردار سے اسے اپنے لیے مانگنے کا بھی بتایا تھا لیکن اسے پانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے، یہ نہیں بتایا تھا۔ اُس کی ایسی شدت کی چاہت کا سن کر وہ ساکت سی رہ گئی۔ ایسی محبت جس میں سامنے والا اپنا سب کچھ

لٹا دے اور بدلے میں کچھ طلب نہ کرے، کتنا بلند مقام رکھتی ہے اور کتنی قابلِ قدر ہوتی ہے، وہ جانتی تھی، مگر وہ راضی کہ اس چاہت کو شرفِ قبولیت نہیں بخش سکتی تھی۔ بعد میں حمیداں اس سے کیا کچھ کہتی رہی اور بتاتی رہی لیکن وہ سن نہیں سکی، بس ایک معمول کی طرح روٹیاں پکانے میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

اس کام سے فارغ ہوئی تو اسلم کی بنائی پھلواری کا رخ کرلیا۔ رنگ برنگے پھولوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے یہاں اسلم کے ساتھ اپنی پہلی بار آمد کو یاد کیا۔ اس پھلواری اور اوپر لگی مچان پر رکھی کتابوں کو دیکھ کر اس نے اسلم کو سراہتے ہوئے صاحبِ ذوق قرار دیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ صرف صاحبِ ذوق نہیں صاحبِ دل بھی تھا۔ کتابوں اور پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ کوئی عام لوگ ہوتے بھی نہیں۔ پھر جو اسلم کے ساتھ کیا حادثہ گزر رہا تھا کہ وہ اپنے اصل سے ہٹ کر ان ڈاکوؤں میں شامل ہوگیا۔ محبت نہ سہی، وہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں ایک اُنسیت سی محسوس کر رہی تھی اور عجیب سے احساسات میں گھری وہاں پھولوں کے درمیان ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس کی اس کیفیت سے نسوانی چیخوں کی آواز نے باہر نکالا۔ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی اور وہ یہ بھی اندازہ کرسکتی تھی کہ آواز درختوں کے اسی جھنڈ کی طرف سے آرہی ہے جہاں اس نے پہلے بھی جمرو کو للّی کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ للّی کی چیخیں بتا رہی تھیں کہ آج بھی اس کے ساتھ وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

وہ طیش کے عالم میں اُٹھی اور پھلواری سے نکل کر حتی المقدور تیزی سے جھنڈ کی طرف بڑھی۔ راستے میں اسے درخت کی ایک مضبوط شاخ پڑی نظر آئی تو وہ بھی اٹھالی۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی اسے جمرو اور للّی نظر آگئے۔ ان دونوں کے درمیان جاری کشمکش بتا رہی تھی کہ جمرو پر آج بھی دورہ پڑا ہے اور للّی اس کی بات ماننے سے گریزاں ہے۔ عورت کی اتنی تذلیل اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ان دونوں کے قریب پہنچ کر اپنا ہاتھ گھمایا اور عقب سے جمرو کے سر پر سوکھی شاخ کا وار کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اس سے دست و گریباں للّی نے عین وقت پر جمرو کو زوردار دھکا دے ڈالا۔ ماہ بانو کا پوری قوت سے کیا وار بس چھچھلتا ہوا ہی جمرو کے بازو پر پڑا مگر وہ اس معمولی چوٹ پر بھی غضب ناک ہوکر للّی کو چھوڑ کر اس کی طرف جھپٹا۔

"مجھے روکتی ہے کُتیا!..... تیرے سر پر اس کی ہمدردی کا بھوت چڑھا ہے تو پھر ٹھیک ہے، اس کی جگہ تُو آجا۔ بڑا بچا کر رکھا ہے نا تجھے اسلم نے..... پر آج تُو مجھ سے نہیں بچ سکے گی۔" وہ طیش کے عالم میں بولتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے شاخ چھین کر دور پھینک دی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے کہنے پر عمل بھی کرگزرے گا۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ جسمانی قوت سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اگر ایک بار وہ اس کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر وہ اسے اپنے تنومند جسم کے نیچے کسی حقیر چیونٹی کی طرح رگڑ ڈالتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے بہترین حل فرار ہی تھا چنانچہ وہ سمت کا تعین کیے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پیروں میں بندھی زنجیر کی وجہ سے بھاگنا یوں بھی بہت مشکل تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہی دوڑ پڑنے والی للّی یک دم ہی اس سے ٹکرا گئی۔ ٹکرانے کے بعد وہ دونوں ہی زور سے گریں۔

ماہ بانو نے کوشش کی کہ سنبھل کر دوبارہ کھڑی ہوسکے لیکن اس کے اُٹھنے سے قبل ہی جمرو نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا دور تک اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بدبودار وجود کی گرفت میں بے بسی سے مچلتی ماہ بانو کو لگا کہ کچھ دیر قبل اس نے حمیداں کے سامنے جتنے بڑے بول بولے ہیں، ان کی سزا آج اور ابھی ہی جمرو کی صورت میں اسے ملنے والی ہے۔



جمرو کے بوجھ تلے اس کا نازک بدن حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا لیکن پھر بھی وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح خود کو اس گرفت سے آزاد کروا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہاتھ پیر چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ایک گرانڈیل مرد کے آگے اس کی کوششوں کی کیا حیثیت تھی۔ وہ بس مچل کر رہ گئی۔

دوسری طرف جمرو کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ماہ بانو کی قمیض کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ قمیض کمر پر سے پھٹ گئی اور اس کا شانہ عریاں ہوگیا۔ اپنی عریانیت کے احساس پر وہ اندر سے کٹ کر رہ گئی اور اس وقت میں جمرو کے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جنبش دے کر اس کی بڑی مونچھوں کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اُس کے اس عمل میں اتنی شدت تھی کہ جمرو کی مونچھوں کے کئی بال اُکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگئے اور وہ بلبلا کر رہ گیا اور غصے میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ طمانچہ اتنا شدید تھا کہ اس کی انگلیوں کے نشان ماہ بانو کے نرم و شفاف رخسار پر ثبت ہوکر رہ گئے اور اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل پڑی۔

"میں تو اسلم کی وجہ سے مجبور ہوکر تیرے قریب نہیں آرہا تھا لیکن تُو نے خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کرلی ہے۔ اب تُو مجھ سے کسی صورت نہیں بچ سکتی۔" وہ خونخوار لہجے میں کہہ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ عزت اور زندگی داؤ پر لگتی دیکھ کر اس کے حلق سے پے در پے چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ لیکن پھر جمرو کا آہنی ہاتھ اس کے منہ پر آجما اور اس کی چیخوں کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ جمرو نے اپنا ہاتھ کچھ اس انداز سے اس کے منہ پر رکھا تھا کہ منہ کے ساتھ ساتھ ناک بھی اس کے بڑے سے ہاتھ کے نیچے دب گئی تھی۔ منہ اور ناک دونوں پر جمے اس کے ہاتھ کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہوجائے گی۔ جسم کو توانائی فراہم کرنے والی آکسیجن کے رک جانے کے بعد وہ اب ڈھنگ سے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہی تھی اور قریب تھا کہ کسی بھی لمحے بے بس ہوجائے گی کہ اچانک ہی اس کے بدن پر موجود بوجھ ہٹ گیا اور تازہ ہوا نے رک جانے والی سانسوں کا سلسلہ بحال کردیا۔

اس نے نیچے زمین پر پڑے پڑے ہی اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کی اور اس کی نظر اسلم پر پڑی۔ وہ اس کے قریب کھڑا کینہ توز نظروں سے کچھ فاصلے پر پڑے زمین چاٹتے جمرو کو گھور رہا تھا۔ جمرو اور اسلم کے جسموں کا ظاہری تقابلی جائزہ لیا جاتا تو یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ دُبلے پتلے نظر آنے والے اسلم نے تنومند جمرو کو ماہ بانو پر سے اٹھا کر دور پٹخ دیا تھا۔

ماہ بانو نے یہ منظر دیکھا اور ہمت کرکے اٹھ بیٹھی۔ چند ہی لمحوں میں جمرو نے اسے بری طرح رگید ڈالا تھا۔ اس کا نازک بدن ایک طرف جمرو کے وزن تلے آکر کچل سا گیا تھا تو دوسری طرف جنگل کی زمین پر بچھی گھاس جھنکاڑ نے اس کے جسم پر کئی خراشیں ڈال دی تھیں مگر اس وقت وہ ان تکالیف سے زیادہ اپنے عریاں ہونے والے شانے کے باعث خود کو مجروح محسوس کر رہی تھی۔ مردوں کے اس معاشرے میں وہ جہاں بھی گئی کسی نہ کسی مرد نے اس سے اس کے عورت ہونے کا خراج لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی محفوظ چاردیواری کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا لیکن قسمت کے گرداب میں پھنس کر جب سے اس چاردیواری سے نکلی، قدم قدم پر اس سے اس کی چادر چھیننے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ اپنی اس بے بسی کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور وہ آنکھوں سے بہتے اس پانی کے پار اس دلدلائے منظر کو دیکھنے لگی جس میں اسلم اور جمرو آپس میں نبرد آزما تھے۔

وہ دونوں ہی یقیناً غضب کے لڑاکے تھے اور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے لیکن اسلم کے

حملوں میں ایک جنونی سی کیفیت تھی۔ وہ مسلسل بڑبڑاتا ہوا جمرو پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا۔ جمرو کی کوشش تھی کہ کا وار روکنے کے ساتھ ساتھ اسے جوابی ضرب بھی لگا سکے۔ کبھی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا اور ناکام رہتا۔ کامیابی اور ناکامی کے اس سلسلے میں وہ دونوں ہی لہولہان ہو رہے تھے لیکن دونوں میں سے ایک پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا وہ جانی دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے۔

اچانک ہی جمرو کا داؤ چل گیا اور اس نے اسلم کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اسلم ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا۔ ٹکرانے سے اس کی کمر پر چوٹ لگی اور وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ لڑھکنا اس کی جان بچا گیا۔ جمرو نے موقع ملتے ہی اپنا پسٹل نکال لیا تھا اور پے در پے کئی فائر بھی کر ڈالے تھے۔ اسلم کا جسم متحرک ہونے وجہ سے اس کا ہر نشانہ خطا گیا تھا اور اسلم کو موقع مل گیا کہ خود کو ایک درخت کی آڑ میں چھپا سکے۔

''باہر آ جا اسلم! ورنہ میں تیری اس معشوقہ کو گولی مار دوں گا۔'' اسے چھپتے دیکھ کر جمرو نے اپنے رخ ماہ بانو کی طرف کر لیا اور دھمکی دی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ فوراً ہی سامنے آ گیا۔ اسے اپنے دیکھ کر جمرو مسکرا دیا اور پسٹل کا رخ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''تُو تو مجنوں کے کنبے کا بندہ لگتا ہے۔ معشوقہ کی جان خطرے میں دیکھ کر کس بے جگری سے سامنے آ ایسی بے وقوفی تو کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔ چل تجھے اپنی دیوانگی مبارک۔ آج تُو بھی محبت کے شہیدوں شامل ہو جائے گا اور اس کے بعد تیری یہ معشوقہ ہم سب کا دل بہلانے کے کام آئے گی۔ یہ نیا آئٹم دیکھ کر خوش ہو گیا تھا لیکن تُو اکیلا ہی اس کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اب مزہ آئے گا۔'' وہ خباثت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ طرف کھڑی ماہ بانو اس صورتِ حال پر سخت متوحش تھی۔ اس نے جمرو کی دھمکی پر اسلم کا اپنی جان کی پروا فوری طور پر سامنے آ جانا بھی دیکھا تھا اور ایک بار پھر حیران ہوئی تھی کہ اس شخص کے دل میں اس کے لیے شدید چاہت ہے کہ وہ اپنا سارا مال اس کے لیے لٹا دینے کے بعد اب جان بھی قربان کرنے کو تیار ہے۔

اسلم کے جذبے کی اس شدت کو محسوس کرتی وہ موجودہ صورتِ حال میں اپنے کردار کا تعین کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس نے یک دم ہی اسلم کو گولی کی سی تیزی سے جمرو کی طرف چھلانگ لگاتے دیکھا۔ وہ پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی دبا دی۔ فضا میں فائر کی آواز گونجی لیکن ماہ بانو یہ کر متحیر رہ گئی کہ اسلم نے فضا میں ہی قلابازی کھا کر اپنا رخ بدل ڈالا اور جمرو کی چلائی ہوئی گولی اسے چھوئے بغیر ہی گزر گئی۔ ناکامی پر جمرو نے ایک فائر اور کرنا چاہا لیکن پسٹل سے گولی کے بجائے ٹھک کی آواز نکل کر گئی۔ اسلم جس کے قدم زمین سے لگ چکے تھے، فوری طور پر جمرو پر جھپٹا۔ گولیاں ختم ہو جانے پر گھبرا جانے جمرو فوری طور پر اپنی طرف بڑھنے والی اس آندھی سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور اسلم نے اس کے بال کر اس کا سر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا دیا۔ اس نے یہ کام بہت زیادہ قوت سے کیا تھا لیکن جمرو کی خوش سے درخت کا تنا کھوکھلا تھا جو اس کے سر کے ٹکرانے سے ''چرر'' کی آواز سے ٹوٹتا چلا گیا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹنے سے محفوظ رہی۔

''میں آج تیری یہ کھوپڑی ہی توڑ دوں گا تاکہ تُو پھر کوئی شیطانی بات سوچ ہی نہ سکے۔'' جنون میں اسلم نے ایک بار پھر اسے بالوں سے جکڑ کر اس کا سر کہیں ٹکرانا چاہا لیکن ایک گونجیلی آواز اس کے ارادے کی میں رکاوٹ بن گئی۔

''رک جاؤ اسلم!'' آواز میں رعب اور اتنا تحکم تھا کہ اسلم جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے منظر ایک سیاہ پوش داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چند اور مزید افراد بھی تھے۔



''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اس سیاہ پوش نے اسلم اور جمرو کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس اسلم کے بچے کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے سردار! اپنی معشوقہ کی خاطر یہ میری جان لینے پر ہے۔'' جمرو نے پہل کی اور اپنی باچھوں سے بہنے والا خون آستین سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے سردار!.....واقعی میرے سر پر بھوت سوار ہے اور یہ بھوت اس خبیث کی جان لے کر ہی جائے گا۔'' اسلم نے جمرو کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے بے خوفی سے جواب دیا۔

''دیکھا سردار! یہ خود اپنے منہ سے مان رہا ہے۔'' جمرو کو تو جیسے موقع مل گیا اپنی بات ثابت کرنے کا۔

''مان رہا ہوں، بالکل مان رہا ہوں کیونکہ میں تیری طرح بزدل اور حریص نہیں ہوں جو دوسروں کے مال پر نظر رکھوں۔'' اسلم نے دوبدو جواب دیا۔

''تیری اس گل کا کیا مطلب ہے اسلم؟'' سردار نے جمرو کے کچھ کہنے سے قبل اس سے پوچھا۔

''مطلب صاف ہے سردار! میں نے اس لڑکی کو اپنے لیے تم سے اس شرط پر مانگا تھا کہ گروہ کا کوئی دوسرا اس پر انگلی بھی نہیں لگائے گا اور تم نے میری شرط قبول کر کے سارے گروہ کو حکم دیا تھا کہ کوئی اس پر نظر نہ رکھے اس جمرو کمینے نے اس پر ہاتھ ڈالا۔ اگر میں ٹھیک وقت پر یہاں نہیں پہنچ جاتا تو یہ اپنا گھناؤنا ارادہ پورا کر لیتا۔'' اس نے سردار کو مختصراً سارا واقعہ بتایا۔ ایک طرف بدن چرائے کھڑی ماہ بانو اپنے بارے میں کی گئی گفتگو سن رہی تھی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ لڑکی خود میرے پیچھے آئی تھی۔ میں تو صرف ہوا خوری کے لیے آیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کہتی تھی اسلم جیسے نامرد کے ساتھ میرا جی نہیں لگتا، بس تو پھر میں آ گیا۔ عورت خود بلائے تو کون انکار کر سکتا ہے۔'' جمرو نے نہایت خباثت سے کہانی بنا کر سنائی۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں تو اسلم کی پھلواری میں بیٹھی تھی کہ مجھے للی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں اس کی طرف کر دوڑی تو دیکھا یہ شخص اس کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ میں پہلے بھی اس کی للی کے ساتھ بدتمیزی کو دیکھ چکی تھی اس لیے مجھے غصہ آ گیا اور میں نے للی کو اس سے بچانے کی کوشش کی جس پر یہ غصے میں مجھ پر ہی حملہ آور ہو گیا۔ اگر اسلم وقت پر یہاں پہنچ کر مجھے اس سے نہیں بچاتا تو یہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جاتا۔'' ماہ بانو نے صاف جھوٹ پر اب تک خاموش تماشائی بنی کھڑی ماہ بانو خاموش نہیں رہ سکی اور تڑپ کر فوراً ہی بولی۔

''للی کہاں ہے؟'' اس کا بیان سن کر سردار نے سوال کیا تو اسے پہلی بار للی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا اس کے لیے اس نے خود کو مشکل میں ڈالا تھا۔ وہ اس کی مشکل میں کوئی مدد کرتی ہوئی نظر نہیں آئی تھی بلکہ سرے سے منظر سے ہی غائب ہو گئی تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے تو وہ یہیں تھی۔ شاید کسی کو مدد کے لیے بلانے گئی ہو۔'' اس نے خوش گمانی سے کام لیا۔

''تم تینوں میرے ساتھ آؤ۔'' سردار نے اسلم، جمرو اور ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے ساتھ آنے والوں میں سے ایک کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''للی کو دیکھو کہاں ہے اس سے کہو کہ فوراً میرے پاس پہنچے۔'' احکامات صادر کرنے کے بعد وہ لمحہ بھر بھی وہاں ٹھہرے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں کوئی اس کے حکم کی سرتابی کی جرأت نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اس نے للی کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، وہ فوراً ہی روانہ ہو گیا اور باقی نے ان تینوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ تینوں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ اسلم نے اپنی شرٹ ماہ بانو کو پہننے کے لیے دے دی تھی تاکہ اس کا عریاں جسم چھپ سکے۔ جب وہ لوگ جنگل سے نکل کر اس مقام پر پہنچے جہاں ان کی رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھی اور زندگی کا دیگر کاروبار بھی جاری رہتا تھا تو اِدھر اُدھر

بکھرے اپنے کاموں میں منہمک لوگ پلٹ پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں تجسس تھا۔ یقیناً وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ سب کیا تھا لیکن ان میں سے کسی نے زبان سے سوال کرنے کی نہیں کی۔

وہ سب خاموشی سے چلتے ہوئے سردار کی رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔ رہائش گاہ بھی جھونپڑی کی طرح ہوئی تھی۔ سردار ان سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا اور ایک رنگین پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس ان تینوں کو ہاتھ سے اشارہ کر کے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ زندگی کے لوازمات کے ساتھ ان ڈاکوؤں کے جنگل میں قیام سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں باقاعدگی سے ساز و سامان رہتا ہے اور ظاہر ہے ایسا بیرونی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

انہیں انتظار میں بٹھا کر سردار خود ناؤنوش میں مصروف ہو گیا۔ یقیناً وہ للّی کے انتظار کے لمحات کو سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس وہ تینوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ اسلم اور جمرو البتہ وقتاً دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔ سردار کے حکم کے باعث وہ للّی کی آمد تک وہاں ایک ساتھ مجبور تھے اور للّی تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی اور اس آدمی کو مل بھی سکی تھی یا اسے بلانے کے لیے گیا تھا۔

آخر اللہ اللہ کر کے ان کا یہ انتظار ختم ہوا اور للّی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے سے قطرہ قطرہ پانی بہہ کر اس کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی غسل کیا ہو اور سر بلانے پر بغیر بال خشک کیے سیدھی یہاں چلی آئی ہو۔

''کدھر تھی للّی!..... آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی؟'' سردار نے انگور کی بیٹی کا جام ایک سانس میں کر اس سے پوچھا۔

''نہا رہی تھی سردار! نورے نے تمہارا پیغام دیا تو بغیر بال خشک کیے جو ہاتھ لگا پہن کر سیدھی یہاں گئی۔'' اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔ اس کی ادائے بے نیازی دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یہاں جو عدالت لگی اس میں وہ اپنے گواہ کے کردار سے قطعی ناواقف ہے۔

''اس سے پہلے تو کدھر تھی؟'' سردار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اپنی جھونپڑی میں جا کر ذرا دیر لیٹ گئی تھی۔ چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹتے کاٹتے کمر تھی۔ میں نے سوچا ذرا دیر لیٹ کر کمر سیدھی کر لوں۔'' اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر لہراتے ہوئے جواب اس کی ان اداؤں کو دیکھتے ہوئے ماہ بانو حیران تھی کہ کیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس کے سامنے مظلومیت کا رونا رویا تھا۔ اس وقت تو وہ کسی ستم زدہ سے زیادہ مردوں کو لبھانے کے لیے ادائیں دکھاتی طوائف لگ رہی تھی۔

''کیا جمرو تجھے اپنے ساتھ زبردستی جنگل میں لے کر گیا تھا؟''

''پردہ کس لئے؟..... جمرو کو بھلا میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سردار کے اس نے بے پناہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اسے سن کر ماہ بانو دنگ رہ گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو للّی؟ میں نے خود جمرو کو تمہارے ساتھ زبردستی کرتے دیکھا تھا۔ تمہیں بچانے لیے غصے میں اس پر وار بھی کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ تمہارے ساتھ ایسا کر چکا ہے۔ اس وقت بھی میں کی پھلواری میں موجود تھی اور تمہاری چیخ و پکار سن کر وہاں پہنچی تھی تو تم نے روتے ہوئے مجھے اپنے



سنائے تھے کہ کیسے تم یہاں تک پہنچیں اور یہاں تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔'' وہ گویا للّی کی کھو ہوئی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم کدھر کی باتیں کر رہی ہو؟ کہیں تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟ میں نے تمہیں اپنے یہاں پہنچنے کا سنایا تھا لیکن جنگل میں نہیں بلکہ کپڑے دھونے کے دوران بات چیت کرتے ہوئے۔'' وہ کسی پکے والے گواہ کی طرح جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔

''تم سچ کیوں نہیں بول رہی ہو للّی؟ کیا تمہیں کسی کا ڈر ہے؟'' ماہ بانو کی خوش گمانی اسے یہ قبول کرنے رہی تھی کہ وہ للّی کو جھوٹا سمجھ سکے۔

''میں کسی سے کیوں ڈرنے لگی؟ جو سچ ہے وہی بول رہی ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں آنکھیں جواب دیا تو وہ بالکل ہی گنگ ہو گئی۔ اتنے سفید جھوٹ کے سامنے اس کا سچ بھلا کہاں چل سکتا تھا؟ لیکن تھی کہ للّی ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے تو اس کے ساتھ بھلائی ہی کی تھی اور اس بھلائی کا یہ صلہ ہرگز ہو سکتا تھا کہ اسے سردار کے سامنے یوں جھوٹا ثابت کیا جاتا۔

''جو ہم دونوں کو بتانا تھا، وہ ہم بتا چکے ہیں سردار! اب تمہاری مرضی ہے کہ تم ہمیں سچا مانو یا نہیں۔ فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' ماہ بانو، للّی کو سچ بولنے پر اکسانے کے لیے شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن اسلم نے یک دخل اندازی کرتے ہوئے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روکا اور خود سردار سے مخاطب ہو کر

سردار ان سب کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران کسی قسم کی دخل اندازی قطعی نہیں کی تھی لیکن ہر کہا ایک ایک لفظ بہت توجہ سے سنا تھا۔ جب اسلم نے بحث ختم کر کے فیصلے کے لیے بال اس کے کورٹ ڈال دی تو وہ جمرو اور للّی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم دونوں کو کچھ اور کہنا ہے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔ دونوں نے ہی نفی میں گردن ہلا دی۔

''تم لوگوں کے درمیان کیا ہوا اور کیا نہیں، اس کی حقیقت جاننے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی ہم سے کسی ایک کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے اپنے گروہ میں پھوٹ نہیں چاہئے۔ تم لوگ زنانیوں کے پیچھے آپس میں لڑو مرو گے تو میں انگلی واری کوئی گل سنے بغیر ان سب کو ہی گولی مار دوں گا۔'' سردار نے بڑے طمطراق سے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔ وہ سب اس کا فرمان کر سر جھکائے کھڑے رہے۔ جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ فی الحال ان میں سے کسی کو کوئی سزا نہیں دی جا رہی اور صرف تنبیہہ کر کے چھوڑا جا رہا ہے۔

''جاؤ اب جا کر اپنے اپنے دھندوں سے لگو۔'' سردار کا بارعب حکم ان سب کے لیے پروانۂ آزادی تھا۔ فرمان لینے کے باوجود ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ سردار کی طرف سے اجازت ملے بغیر وہاں سے جا اجازت ملتے ہی وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہاں سے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر جمرو تو تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا لیکن اسلم نے للّی کو جا لیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا۔

''آئندہ ایسی اوچھی حرکت مت کرنا۔'' وہ للّی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

''محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے ڈارلنگ!'' اس نے ایک آنکھ دبا کر اسے جواب دیا۔

''تو پھر جان لو کہ میں سب سے پہلے تمہارا قتل جائز سمجھوں گا۔'' اسلم نے قہر آلود لہجے میں دھمکی دی۔

''تمہارے ہاتھوں ماری بھی گئی تو غم نہیں ہوگا۔'' اس پر جیسے اسلم کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''تجھے نہ سہی، پر یہ جو تیرے اتنے سارے خصم ہیں، انہیں تو غم ہوگا۔ کیوں بے موت مر کر ان
رنڈوا کرے گی؟'' اسلم کے لہجے میں واضح طنز اور حقارت تھی۔ للی کے چہرے کا رنگ پل بھر کے لیے
پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اگر کسی ایک نے ہمیں اپنا لیا ہوتا تو آج یہ طعنہ نہیں سننا پڑتا۔'' اس کا جواب سن کر اسلم کی اس
گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''جو کچھ ہوا، اس کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہوا کہ تم نے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ہمارا ہاتھ تو تھاما
اٹھلا پڑتا دیکھ کر وہ یک دم شوخ ہوئی۔

''ذرا سا منہ کیا لگا لو، سالی گلے ہی پڑنے لگتی ہے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بڑبڑاتا ہوا اسے دھکا دے
سے ہٹ گیا۔

''مار ڈال ظالم! تیرے ہاتھوں مری تو سمجھوں گی کہ امر ہو گئی۔'' وہ ایک سسکاری سی لے کر
خود فراموشی کے عالم میں اپنا وہ بازو نہایت پیار سے سہلانے لگی جو کچھ دیر قبل اسلم کی گرفت میں
سارے قصے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ماہ بانو ہکا بکا سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ للی کی شخصیت
غریب رنگوں نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ عورت بیک وقت شعلہ و شبنم تھی لیکن کس کے لیے کب شعلہ
گی اور کس کے لیے شبنم، یہ جاننا ذرا مشکل تھا۔

⊛----✪----⊛

آفتاب پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ رات میں کشور کو لے کر
پہنچا تھا اور ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔ ہر بار سوال کرنے پر عملے کی طرف سے یہی
ملتا تھا کہ ہم اپنی کوشش کر رہے ہیں، آپ دعا کریں۔ مریضہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے اس لیے فی الحال
کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وہ گھنٹوں سے کسی اچھی اطلاع کے انتظار میں ہسپتال کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک
کچھ دیر کے لیے کسی بینچ پر بیٹھ جاتا۔ گزرتی رات کا ہر پل کسی بھیانک خواب کی طرح اس کے ذہن سے
تھا۔ ''را'' کے مبینہ ایجنٹ غلام محمد کا چوری چھپے رات گئے ان کے گھر میں داخل ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں
عجیب معاملہ تھا کہ وہ اور غلام محمد دونوں اپنی شناخت چھپا کر اس چھوٹے سے گاؤں میں آ بسے تھے اور
ہی ایک دوسرے کو شناخت کر لینا ان کے اپنے حساب سے ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے درمیان
تو یہ کہ آفتاب اور کشور اپنے دشمنوں سے چھپ کر یہاں آ بسے تھے اور غلام محمد دشمنی کرنے کے لیے یہاں
تھا۔ ''را'' کے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ ہر پاکستانی کا دشمن تھا اور دشمنی کے اس رشتے کو نبھانے کے لیے اس
بہت چالاکی سے ایک پارسا اور پرہیزگار آدمی کا روپ اختیار کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ خطرناک
دوسروں پر گولیاں چلا کر انہیں قتل کر ڈالتے ہیں۔ گولیاں چلانے والے تو صرف انسانی جسموں کے قاتل
جبکہ وہ ذہن اور روح کو قتل کر ڈالنے میں مصروف تھا۔ جانے اس نے کتنے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر
کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انہیں اپنا معمول بنا ڈالا تھا۔ اس شخص نے پیر آباد میں بھی
کارنامہ انجام دیا تھا اور اب اس گاؤں میں بھی یہی کر رہا تھا۔

آفتاب نے اسے شناخت کر لیا تھا اور چاہتا تھا کہ شہریار کو اطلاع دے کر اس کے خلاف کوئی کا



خود کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھے۔ لیکن اس کی اسی احتیاط نے غلام محمد کو ٹھٹکا دیا اور وہ اس کے
جاننے کے لیے رات گئے خاموشی سے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے آفتاب کو اس کے
حلیے کے باوجود شناخت کر لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی آفتاب کے بجائے کشور کو جا لگی۔ کشور کو
آفتاب جنون میں اس سے جا ٹکرایا۔ لیکن اس کا اور ایک تربیت یافتہ ایجنٹ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔
شہریار اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تو نہ صرف غلام محمد پر قابو پا لیا گیا بلکہ کشور کو بھی طبی
پنڈی کے اس ہسپتال تک پہنچانا ممکن ہو سکا۔

کے ساتھ ہسپتال آنے والے شہریار کے ساتھیوں نے ہی ہسپتال کے معاملات نمٹائے۔ اب وہ جس
میں مبتلا تھا، وہ کشور کے بارے میں خوشخبری سنے بغیر کسی صورت ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ رشتوں کے
میں بہت مفلس آدمی تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث وہ ان کے انتقال کے بعد اس دنیا
میں تنہا رہ گیا تھا۔ کشور اس کا واحد رشتہ تھی اور اپنے وجود میں پلتے بچے کے ذریعے اسے ایک اور
رشتہ دینے جا رہی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو وہ ان دونوں رشتوں سے محروم ہو جاتا۔ اس نے کشور کو
خاطر بہت کچھ کھویا تھا اور اب اسے کھونے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھا لیکن اس کی بدستور تشویش ناک
اور ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی کے بجائے ڈرا سہما، خوف زدہ انسان تھا
اس کی خواہش کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

اور پریشانی کے عالم میں بیٹھے نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے تھے کہ نسوانی سسکیوں کی آواز نے اسے
متوجہ کیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جو اس کے ساتھ والی بینچ پر
زار و قطار رو رہی تھی۔ یہ ہسپتال تھا اور ہسپتال میں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہی رہتے تھے۔ لوگ اپنے
کی زندگیاں بچانے کے لیے ہسپتالوں میں لاتے ہیں لیکن ہر ایک زندگی کی نوید لے کر جائے، یہ
نہیں ہوتا۔ اس بے چاری کے ساتھ بھی یقیناً ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا اور یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی
اس کی طرف مستقل متوجہ رہتا۔ اس کی توجہ اصل میں ان دو پولیس والوں نے کھینچی تھی جو اس لڑکی کے
تھے۔

''یہ پانی پی لو بی بی! اور ذرا حوصلے سے کام لے کر بتاؤ کہ تمہارے والد کے ساتھ کیا ہوا اور انہیں کن
نے قتل کیا؟'' وہ جوان العمر پولیس انسپکٹر کافی مہذب تھا جو اس کی حالت کو سمجھ کر اس سے نرم لہجے
مخاطب تھا ورنہ پولیس کی نوکری میں ہر طرح کے کیسز بھگتاتے وہ لوگ عموماً اتنے سخت دل ہو جاتے ہیں کہ
کے مرنے جینے سے قطع نظر انہیں بس اپنا کام نمٹانے سے غرض ہوتی ہے۔ پولیس انسپکٹر کی ہدایت پر
نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے ساتھی کا بڑھایا ہوا گلاس تھاما اور مشکل سے دو گھونٹ پانی پی کر
واپس کر دیا۔ لیکن پانی کے یہ دو گھونٹ بھی کافی کارآمد ثابت ہوئے تھے اور اس کی سسکیاں بہت دھیمی پڑ
گئیں۔

''تمہارا نام کیا ہے بی بی؟'' اسے بہتر حالت میں پا کر پولیس انسپکٹر نے سوال کیا۔ فاصلہ زیادہ نہ ہونے
وجہ سے آفتاب ان کی ساری گفتگو آسانی سے سن رہا تھا۔

''مہک..... مہک شفیق۔'' اس نے رُندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

''تمہارے والد کے ساتھ جو ہوا، اس کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانتی ہو، بتا دو۔''

''میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ تو ایک بہت سیدھے سادے اپنے کام سے کام رکھنے

والے آدمی تھے۔ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی جانے وہ کون ظالم تھے کہ ان کی جان لے گ
نے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''تم ہمیں واقعے کی تفصیل بتاؤ، باقی مجرموں تک پہنچنا ہمارا کام ہے۔'' انسپکٹر نے مثالی تحمل کا
کرتے ہوئے ایک اور زاویے سے اپنا سوال دہرایا۔

''رات کو جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو بابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے
جانا تھا اس لیے میں سوگئی۔ نیند میں مجھے ایسا لگا کہ ہمارا دروازہ بج رہا ہے لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے
دھیان نہیں دیا۔ پھر شاید مجھے کچھ لمحوں کے لیے جھپکی سی آ گئی اور دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھر کے اندر
کی چاپ سنی یہ ایک سے زیادہ افراد کے چلنے کی آواز تھی اس لیے مجھے حیرت ہوئی اور میں یہ دیکھنے کے
اتنی رات گئے کون بابا سے ملنے آیا ہے، اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ آوازوں سے مجھے اندازہ ہو گیا
والوں کو بابا اپنے کمرے میں ہی لے گئے ہیں چنانچہ میں اس طرف ہی چلی گئی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ آ
جانے کون ہیں اور بابا میرا ان کے سامنے آنا پسند بھی کریں گے یا نہیں، میں باہر ہی رک گئی اور اندر کی
سننے لگی۔ وہ لوگ بابا سے کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

لڑکی کا یہ جملہ سن کر آفتاب بری طرح چونکا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے لیے
تھی۔ اس نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا، اس نام کے کسی شخص سے بھی وہ واقف نہیں تھا پھر وہ لوگ
کا اتا پتہ معلوم کرنے وہاں پہنچ گئے تھے؟..... یا پھر وہ کوئی دوسرا ماسٹر آفتاب تھا جسے تلاش کیا جا رہا
کے اندر اٹھتے سوالوں سے بے خبر لڑکی اپنا بیان دینے میں مصروف تھی۔

''بابا نے انہیں بتایا کہ وہ کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتے لیکن انہوں نے بابا کی بات نہیں مانی اور
ساتھ مار پیٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میں نے ہمت سے کام
خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تا کہ پولیس کو فون کر سکوں۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پہلے لینڈ لا
فون کرنے کی کوشش کی لیکن ریسیور اٹھاتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ ہمارا فون کل سے ڈیڈ پڑا ہے اور کمپلین
کے باوجود ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے اپنا سیل فون بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں کمرے میں
اُدھر اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ پھر مجھے اپنے بیگ میں دیکھنے کا خیال آیا۔ بیگ میں مجھے اپنا سیل فون مل
سیل فون ملتے ہی میں نے جلدی سے ایمرجنسی پر کال کر کے آپ لوگوں کو اطلاع دی۔ اس وقت مجھے ا
ہوا کہ آنے والے واپس جا رہے ہیں۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا، وہ دو آدمی تھے جو بھاگتے
باہر جا رہے تھے۔ میں جلدی سے بابا کے کمرے میں گئی تا کہ انہیں دیکھ سکوں۔ وہ نیچے فرش پر گرے ہو
اور صاف لگ رہا تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ میں نے ان کے قریب جا کر انہیں بہت آوازیں دیں
انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' بہت حوصلے سے پورا واقعہ سناتی لڑکی اس مقام پر آ کر ایک بار پھر
پھوٹ کر رونے لگی۔

اس سے آگے کا ماجرا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لڑکی نے باپ کے زندہ ہونے کی امید پر کسی نہ کسی
انہیں ہسپتال پہنچانے کا بندوبست کیا ہوگا اور وہ بے چارہ آدمی نہ جانے گھر پر ہی مر گیا تھا یا ہسپتال پہنچ کر
کی بازی ہارا تھا۔ اور اب اس کی بیٹی بیٹھی پولیس والوں کو اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔ آفتاب اس کے
سے اندازہ لگا چکا تھا کہ ان باپ بیٹی کے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا فرد نہیں تھا، جب ہی وہ لڑکی تنہا
صورتِ حال سے نمٹ رہی تھی۔ اسے اس پر بڑا رحم آیا۔ کسی اکیلی لڑکی کا اس طرح کے حالات سے نمٹنا



وہ تو پھر بھی غنیمت تھا کہ اس کا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر معقول آدمی تھا ورنہ تو پولیس والے تو اچھے
کے چھکے چھڑا دیتے ہیں، ایک لڑکی کی ان کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی۔ کشور کی طرف سے تشویش میں
کے باوجود وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس نے اپنے بیان
آفتاب کا نام استعمال کیا تھا۔ جانے وہ ماسٹر آفتاب وہ خود تھا یا کوئی اور؟ حقیقت جاننے کے لیے اسے
کرنی ہی تھی۔ اگر شفیق کے قاتل واقعی اسے ڈھونڈ رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اور کشور، چودھری
سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

''کیا تم خود کسی ماسٹر آفتاب نامی شخص کو جانتی ہو؟'' لڑکی کی حالت سے قطع نظر پولیس کے لیے کیس کی
زیادہ ضروری تھی چنانچہ انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ جواب میں لڑکی نے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو انگلی سے
کرتے ہوئے محض نفی میں سر ہلا دیا۔

''تمہارے والد کی کسی سے کوئی دشمنی تھی کیا؟''

''نہیں، وہ دشمنیاں پالنے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ تو اپنے نام ہی کی طرح بہت شفیق تھے۔'' لڑکی نے
دل گیر لہجے میں جواب دیا۔

''پھر بھی، ہو سکتا ہے کوئی کاروباری دشمنی ہو؟'' پولیس انسپکٹر نے اسے اکسایا۔

''ایک بک شاپ چلانے والے آدمی کی کسی سے کیا کاروباری دشمنی ہو سکتی ہے؟'' لڑکی کا جواب سن کر
آفتاب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ شفیق نامی ایک شخص کو جانتا ہے۔ وہ شخص مہک بک
کا مالک تھا لیکن عموماً لوگ اسے خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے اس لیے اس کے ذہن میں فوری طور پر
کا خیال نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ انسپکٹر کے پوچھنے پر لڑکی نے اپنا نام مہک بتایا تھا۔ باپ نے بیٹی
ہمت میں اپنی بک شاپ کا نام بیٹی کے نام پر رکھ ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ اسے ڈھونڈنے والے شفیق
کے گھر کیوں پہنچے۔ اس نے شہریار کو رابطے کے لیے مہک بک شاپ کا ہی ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔ یقیناً اس
دفتر میں چودھری کا کوئی مخبر تھا جس نے اس کے اور شہریار کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر نمبر چودھری
پہنچا دیا اور اس کے گرگے فوراً ہی اسے ڈھونڈتے ہوئے شفیق کے گھر پہنچ گئے۔ لیکن بے چارہ شفیق خان
انہیں کسی ماسٹر آفتاب کے بارے میں بتا سکتا تھا؟ وہ اسے اس نام سے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس سے تو
آفتاب نے خود کو احمد کے نام سے متعارف کروایا تھا اور اس تعارف نے جہاں اسے اور کشور کو بچا لیا تھا، وہیں
بے چارہ شفیق خان بے قصور مارا گیا تھا۔ شفیق کی موت پر دلی رنج محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دل
شہریار کی معاملہ فہمی کو بھی سراہا۔ اس نے اسے اپنے دفتر کے نمبر پر زیادہ تفصیلی بات کرنے ہی نہیں دی تھی
فون نمبر لے کر موبائل سے کال کی تھی اگر وہ یہ احتیاط نہیں کرتا تو غلام محمد کے معاملے جیسا حساس ایشو بھی کھل
جاتا۔

''مبارک ہو سر! آپ کی مسز اب خطرے سے باہر ہیں اور آپ کا بے بی بھی سیو ہے۔'' وہ اس معاملے پر
غور کر ہی رہا تھا کہ ایک نرس نے قریب آ کر اسے خوشخبری سنائی۔

''تھینکس گاڈ۔'' آفتاب کے لبوں سے بے ساختہ ہی شکرانے کے الفاظ نکلے۔ اطلاع لے کر آنے والی
مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

''شکر ہے میرے مالک! تُو نے مجھے ایک اتنی بڑی مشکل سے نکال دیا۔ آگے بھی تُو ہی میری مدد فرما۔''
اس کے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب ہوا۔ لیکن وہ جانتا تھا، بے شک فی الحال کشور

خطرے سے نکل آئی ہے لیکن چودھری نام کا خطرہ تو بہر حال مسلسل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

❁----✪----❁

''میں للّی کو سمجھ نہیں سکی۔ بڑی عجیب وغریب عورت ہے۔ اپنے یہاں تک پہنچنے کی جو داستان سنائی تھی، اسے سن کر تو یہی لگا تھا کہ وہ بہت مظلوم ہے لیکن سردار کے سامنے اس نے جس طرح رنگ حیران رہ گئی۔ اس کے اور جمرو کے درمیان جو کچھ ہوا، وہ اسے نہ جانے کیوں سردار سے چھپا گئی۔ وہ ڈرتی ہے یا اس نے اور جمرو نے مل کر کوئی ڈرامہ کھیلا تھا، مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا۔ آخر اسے ضرورت تھی میرے ساتھ یہ ڈرامہ کرنے کی؟'' وہ اسلم کے ساتھ اس کی لگائی گئی پھلواری میں بیٹھی تھی اور گزرے ہوئے واقعے پر بات کر رہی تھی۔

''تمہاری سب سے خاص بات ہی یہ ہے کہ تم بہت خالص ہو اور اپنے اس خالص پن کی دوسروں میں موجود کھوٹ کو پہچان نہیں سکتیں۔'' اسلم نے پورے وثوق سے تبصرہ کیا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟ تم تو مجھے ڈھنگ سے جانتے بھی نہیں ہو۔'' اسلم کی بات سن کر اس نے ہوئے گویا اس کا خود پر کیا جانے والا تبصرہ قبول کرنے سے انکار کیا۔

''کسی کو جاننے کے لیے ماہ وسال کی گنتی بے کار ہے، خاص طور پر تمہارے بارے میں تو بہت آسا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی شفاف اور حیادار آنکھیں تو بس اسی انسان کی ہو سکتی ہیں جو اندر سے بہت خالص اس کے پاس اپنی رائے کے حق میں دلیل موجود تھی جسے سن کر وہ مزید جھینپنے پر مجبور ہو گئی۔ اسلم کے ا جذبات اب اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اسے کتنی شد چاہتا ہے اور قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران بھی تھی۔ جس شخص کی چاہت کے لیے اس کے دل نے تمنا وہ تو کبھی اس پر کھلا نہیں تھا اور یہاں اس جنگل بیابان میں ایک شخص اس حد تک اس کی محبت میں گرفتار ہوا اپنا سب کچھ اس پر لٹا دینے کے لیے تیار تھا۔

''میرے بارے میں تبصرہ کرنا چھوڑو اور مجھے للّی کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیا؟'' اسلم کو مزید کسی طرح کے اظہار سے روکنے کے لیے اس نے للّی کو ہی موضوعِ گفتگو بنانے کی کوشش

''للّی نے اپنے ماضی کے بارے میں تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس میں جھوٹ شامل ہوگا۔ وہ واقعی ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اندر برائی کا عنصر بھی موجود موقع ملتے ہی بڑی شدت سے اُبھرتا ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی کر کے شوبز کی رونقوں کو اپنا لینے کا سیدھی سادی اور نیک فطرت لڑکی کسی صورت نہیں کر سکتی۔''

''ایسا تو بہت لڑکیاں کر جاتی ہیں اور عموماً یہ وہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو بہت معصوم اور سادہ ہوتی گھاگ شکاری انہیں آسانی سے شکار کر لیتے ہیں۔'' اس نے اسلم کے للّی کے بارے میں کیے گئے تبصرے قبول کرنے سے انکار کیا۔

''چلو پہلی بار کے لیے میں اسے رعایت دے دیتا ہوں لیکن یہاں آنے کے بعد وہ جس طرح کے ہاتھوں میں کھلونا بنی، اس بارے میں تم کیا کہو گی؟ آئی ایم شیور کہ اتنی ذلت آمیز زندگی تو کسی طوائف منظور نہیں ہوگی، کسی شریف لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شریف لڑکیاں تو ایسی زندگی پر موت کو ترجیح ہیں۔'' وہ للّی کے بارے میں اپنی رائے پر ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا تھا۔



''اگر تمہیں میری بات غلط لگ رہی ہے تو بتاؤ کہ کیا تم اپنے لیے ایسی زندگی کو قبول کر لیتیں؟''

''ہرگز نہیں۔ میں ایسی زندگی کے بجائے اپنے لیے موت کو قبول کرتی۔'' اس نے اسلم کے سوال کا تیزی جواب دیا۔

''تو پھر ثابت ہوا کہ للّی ایک کرپٹ عورت ہے۔''

''میں تمہیں للّی کو کریکٹر سرٹیفکیٹ ایشو کرنے کا نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں صرف اس کے رویے کی وجہ جاننا ہوں۔'' اسلم کی بات سن کر اس نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وجہ میں ہوں۔'' وہ بڑی فرصت میں تھا چنانچہ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''بات بہت واضح ہے۔ للّی کے مطابق وہ میری محبت میں مبتلا ہے۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو شروع میں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے عورت ذات سے حد تک دلچسپی نہیں ہے کہ نفس کی تسکین کے لیے کسی بھی عورت کو قبول کر لوں۔ للّی بھی میرے مطلب کی نہیں ہے اس لیے اسے میری طرف سے مایوسی اٹھانی پڑی۔ مایوس ہو کر اس نے میرے پیچھے پڑنا بھی دیا لیکن جب سے تم یہاں آئی ہو، اس کی میرے لیے سوئی ہوئی محبت پھر جاگ گئی ہے۔ درحقیقت وہ تم ہلس ہے اور اسی جیلسی میں اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اور جمرو دونوں مل کر اپنے مفاد کے لیے ڈرامہ کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں میں جمرو عورت کے بارے میں سب سے زیادہ ندیدہ ہے۔ تم یہاں پہنچی تھیں تو تمہیں دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی لیکن جب سردار نے میری فرمائش قبول کر لی تو وہ طرح تلملایا۔ یقیناً وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح تمہیں حاصل کر سکے اور اس کے لیے یہ موقع للّی سازشی ذہن نے پیدا کر دیا۔ تمہیں جمرو کے ہاتھوں ذلیل کروا کر وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اگر وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی تو مجھ سے بڑے طنز سے کہتی کہ جس عورت کو تم نے بہت پاکیزہ سمجھ کر اپنے لیے انتخاب کیا تھا، اب وہ بھی میلی ہو گئی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا اور جمرو اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو جیسے ابھی للّی نے سردار کے سامنے اس کا ساتھ دیا تھا، ویسے تب بھی وہ اس کے حق میں گواہی دیتی اور کہتی کہ جو کچھ ہوا، تمہاری مرضی سے ہوا۔ لیکن اس طرح ان دونوں مقصد بھی پورا ہو جاتا اور کسی کو سزا بھی نہیں بھگتنی پڑتی۔'' اسلم نے جس طرح صورتِ حال واضح کی، اسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے تو ہمیشہ یہی سنا تھا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں لیکن اس کی سنی سنائی کے برخلاف یہاں بھی سازش کا بازار گرم تھا۔

''اتنی گم صم کیوں ہو گئیں؟'' اس کی کیفیت دیکھ کر اسلم نے اسے ٹوکا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ للّی نے میرے ساتھ اتنی بڑی دشمنی باندھ لی ہے۔''

''تم ہو ہی ایسی کہ یا تو آدمی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جائے یا پھر حسد میں مبتلا ہو کر دشمنی پر اُتر آئے۔'' اسلم نے پُرمزاح انداز میں کہتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن میں نہ تو کسی سے دشمنی کر سکتی ہوں اور نہ ہی کسی کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہوں۔'' ماہ بانو نے سوچا کہ اسلم پر واضح کر دے کہ وہ اس کے لیے وہ جذبات نہیں رکھتی جو وہ اس کے لیے رکھتا ہے۔

''دشمنی تو میں جانتا ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے بس کا کام نہیں لیکن محبت..... محبت سے کیوں گریز ہے

تمہیں؟'' اس نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

''مجھے محبت سے گریز نہیں لیکن اپنا یہ جذبہ میں نے ایک شخص کے لیے مختص کر دیا ہے۔ میری اس کی امانت ہے۔ اگر زندگی نے موقع دیا تو میں اسے اس کی یہ امانت سونپ دوں گی ورنہ یہ خزانہ میرے میں ہی دفن رہے گا۔'' وہ اسلم کو خود سے مایوس کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

''کون ہے وہ خوش نصیب؟'' اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

''یہ راز میں اپنے دل میں ہی رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔ اسلم کا پہلا رنگ بدلتا چہرہ گواہ تھا کہ وہ بڑی تکلیف محسوس کر رہا ہے لیکن اسے تاریکی میں رکھنا مزید بڑا ظلم ہوتا۔

''اور اگر تمہیں یہاں سے نکل کر اس شخص تک پہنچنے کا موقع نہ ملا تو؟'' اسے شاید اب بھی کوئی اُمید تھی۔

''میں اس سوال پر اس صورت میں غور کرتی کہ اگر میں نے اسے پانے کا سوچا ہوتا۔ میری محبت پانے پانے کی قید سے آزاد ہے۔''

''تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟'' وہ کچھ جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم بہت زیادہ آگے تک جاؤ۔'' اس نے اپنی صاف گوئی کو جاری رکھا۔

''دور تو میں بہت نکل گیا ہوں اور اب مشکل ہی ہے کہ اپنے قدم واپس موڑ سکوں۔ ہاں، اتنی کوشش ضرور کروں گا کہ تمہاری طرح بے لوث محبت کر سکوں۔'' وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رُکا نہیں اور تیز تیز قدموں سے ہوا پھلواری سے باہر نکل گیا۔ اُس کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرتی ہوئی ماہ بانو کی نظریں اِردگرد کے پھولوں پر بھٹکنے لگیں۔ آج ان پھولوں کے رنگوں کی شوخی بھی ماند تھی۔ شاید وہ اس شخص کے لیے اُداس تھے جس کے ہاتھوں نے انہیں سینچا اور سنوارا تھا۔

❀----✪----❀

''ہاں بھئی آفتاب! کیا حال ہے؟..... تمہاری مسز تو خیریت سے ہیں نا؟'' غلام محمد کی گرفتاری کے بعد اب پہلی بار آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے سر!..... سب خیریت ہے۔ بہت سیریس حالت تھی کشور کی۔ اگر انہیں بروقت ہسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو جان بچانا مشکل تھی۔ مجھے تو اس واقعے کے بعد اللہ کی قدرت پر مزید یقین ہو گیا ہے۔ اتنی ٹائمنگ سے اپنے بندے کی مدد کا بندوبست وہی کر سکتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو پہنچنے میں دو تین منٹ اور لگ جاتے تو شاید میں غلام محمد کے ہاتھوں مارا جاتا۔

''اس کا نام اشیش ہے آفتاب! غلام محمد کا تو اس نے صرف بہروپ بھرا تھا۔'' ایک مکروہ کردار کے مالک کافر شخص کا غلام محمد کے نام سے پکارا جانا دل کو ناگوار گزر رہا تھا اس لیے شہریار نے دھیمے لہجے میں آفتاب کو بتایا۔

''تو اس نے اپنی اصلیت اُگل دی؟'' اس کے جملے سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے آفتاب جوش سے بولا۔

''ابھی صرف اس کا نام سامنے آیا ہے۔ باقی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ کسی تربیت یافتہ ایجنٹ سے اس کی حقیقت اُگلوانا آسان نہیں ہوتا..... لیکن مجھے امید ہے کہ ہمیں اشیش سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں وہ اچھا خاصا سخت جان ثابت ہوگا۔'' آفتاب نے قیاس آرائی کی۔



''یقیناً اس طرح کے لوگ بہت ڈھیٹ واقع ہوتے ہیں۔'' شہریار نے نپے تلے انداز میں کہا۔ ''اور ہاں، میرے خیال میں تم اپنی رہائش کے لیے کسی پسماندہ گاؤں کے بجائے چھوٹے شہر کا انتخاب کرو۔ گاؤں میں تمہاری کار رہنا اس لیے مناسب نہیں کہ تمہارا جو کام ہے، وہ گاؤں کے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے اور تم وہاں زیادہ نمایاں ہو جاتے ہو۔ کسی چھوٹے شہر میں رہنے کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تم کم از کم ٹیکنالوجی سے تو فائدہ اٹھا سکو گے۔'' اس نے آفتاب کو مشورہ دیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں سر! موجودہ جگہ تو اب ویسے بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ کب چودھری کے بندے وہاں پہنچ جائیں۔ پنڈی تک تو انہوں نے ہمارا کھوج لگا ہی لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟ کیا تمہیں پنڈی میں چودھری کے گرگے نظر آئے تھے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن وہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو جس بُک شاپ کا فون نمبر دیا تھا، وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے اس بُک شاپ کے مالک تک پہنچ گئے تھے۔'' اس نے ہسپتال میں اتفاقیہ علم میں آنے والی مہک بُک شاپ کے مالک شفیق خان کے قتل کی تفصیلات شہریار کے گوش گزار کر دیں۔ شہریار دھیان سے سب سنتا رہا۔ جو کچھ آفتاب بتا رہا تھا، اس سے تو یہی ظاہر تھا کہ اس کے دفتر سے مخبری ہوئی ہے۔ وہ تو اس کی احتیاط پسندی کام آ گئی تھی ورنہ بات مہک بُک شاپ کے فون نمبر سے آگے نکل گئی ہوتی۔ اب بھی جو کچھ ہوا وہ خاصا افسوس ناک تھا۔ ایک بے گناہ آدمی قتل ہو گیا اور اس کے قتل کے بعد اس کی اکلوتی بیٹی یقیناً بہت مشکل میں پڑ گئی تھی۔ لیکن چودھری جیسے لوگوں کا انسانیت سے تعلق ہی کہاں ہوتا ہے جو وہ کسی انسان کی زندگی کے لیے جھجکیں۔

''تم نے مجھے بہت اہم بات بتائی ہے۔ اب میں اپنے دفتر میں اس کالی بھیڑ کو تلاش کروں گا جو یہاں کی خبریں چودھری تک پہنچا رہا ہے۔'' اندرونی طور پر بہت غضب ناک ہونے کے باوجود اس نے ہموار لہجے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ آفتاب جواب میں خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے شہریار کو کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بہت سے مسائل خود ہی حل کر لیتا ہے۔ اس نے تو موجودہ حالات میں بھی اتنی حاضر دماغی سے کام لیا تھا کہ اشیش کی گرفتاری جیسے اہم معاملے میں اُلجھنے کے باوجود اس کا بندوبست کر دیا تھا کہ آفتاب کے پاس ایک نیا سیل فون سم سمیت پہنچ جائے تاکہ وہ جب چاہے اس سے رابطہ کر سکے۔

''اوکے۔ پھر تم اپنا خیال رکھو اور اردگرد سے باخبر رہنے کی کوشش کرو۔ کشور کے سفر کے قابل ہوتے ہی تم رابطہ کر لینا۔ اس سلسلے میں اگر میری مدد درکار ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔'' اس نے آفتاب کو ہدایات دیتے ہوئے کال منقطع کر دی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نور کوٹ اب زیادہ دور نہیں تھا لیکن بہرحال اتنا وقت تھا کہ وہ میجر ذیشان سے بات کر سکے۔ یہ میجر ذیشان ہی تھا جس کے تعاون سے وہ اشیش کی گرفتاری اتنے خفیہ طور پر کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میجر ذیشان نے تو اسے یقین دلایا تھا کہ یہ کام اس کے آدمی آرام سے کر لیں لیکن وہ اس موقع پر خود موجود رہنے کا خواہش مند تھا۔ اس کا اصرار دیکھتے ہوئے میجر نے اس کے سفر کے انتظامات کروا دیئے تھے۔ وہ نور کوٹ سے لاہور تک اپنی ہی گاڑی میں گیا تھا لیکن اس سے آگے کے انتظامات میجر ذیشان نے کیے تھے۔ اس مشن سے مشابرم خان کے سوا کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ مختصر سے میں اپنی ایمان داری اور وفاداری کو منوا لینے والا مشابرم خان اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور اب بھی وہی گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے مشابرم خان پر اتنا اعتماد تھا کہ اس کے سامنے کوئی بھی بات کرتے ہوئے یہ خدشہ

نہیں ہوتا تھا کہ بات لیک آؤٹ بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے پور۔ طمینان سے آفتاب کی تھی اور اب میجر ذیشان کا نمبر ملا رہا تھا۔

''جی میجر صاحب! کچھ بتایا اشیش نے؟'' دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جاتے ہی اس نے سلیک کے بجائے براہِ راست سوال داغا۔ وہ اس معاملے میں اتنا پُر جوش تھا کہ اشیش کو اپنی کسٹڈی چاہتا تھا لیکن میجر ذیشان نے اس کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اشیش ایک جاسوس اس کا انٹیلی جنس کے قبضے میں رہنا ہی بہتر ہے۔ البتہ اس نے شہریار سے اتنا وعدہ ضرور کر لیا تھا کہ حاصل ہونے والی معلومات کو اس سے ضرور شیئر کرے گا چنانچہ اب وہ اسے فون کر کے یہی جاننا چاہتا تھا تک اشیش سے کیا کچھ اُگلوایا جا سکا ہے۔

''فی الحال تو ہم اس سے کچھ خاص معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں، اس نے اس لڑکے کے قتل کا اعتراف ضرور کر لیا ہے۔'' میجر ذیشان کا اشارہ اس لڑکے کی طرف تھا جسے اشیش کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جمعے کی نماز کے بعد اس بچے کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی تھی اور آفتاب نے اشیش کو شناخت کر لیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے پیر آباد میں ماہ بانو کے چھوٹے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر ڈالا تھا۔

''اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی ہے میجر صاحب! آپ کوئی بھی طریقہ استعمال کریں لیکن سے سب کچھ اُگلوا کر چھوڑیں۔ اور ہاں، یاد رکھیے گا کہ اس سے ورما کا پتہ معلوم کرنے کے بعد آپ بتائیں گے۔'' اس نے ایک بار پھر میجر ذیشان کو یاد دہانی کروانا ضروری سمجھا۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن میں آپ کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اس میں اچھی طرح سوچ لیں۔ آپ کی نیک نیتی اپنی جگہ لیکن قانونی طور پر یہ سب کرنے کی اتھارٹی نہیں کے پاس۔ یہ نہ ہو کہ آپ اپنوں کے ہاتھوں ہی دھر لیے جائیں۔'' میجر ذیشان نے اسے سمجھایا۔

''اپنی نیک نیتی کی وجہ سے ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں گرفت میں نہیں آ سکوں گا اور بھی گیا تو میرے پاس یہ اطمینان ہوگا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے میں نے اپنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ آپ شاید میری کیفیت کو پوری طرح سمجھ نہ سکیں لیکن حقیقت یہ نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پہنچ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ہر کام تھرو پراپر ضروری نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ جن لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے عناصر پر گرفت وہ یا تو خود ان کے محافظ بن کر بیٹھے ہیں یا پھر بے پروائی برت رہے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر دار لوگ بھی ہیں لیکن اتنے سارے بے ایمانوں کی وجہ سے وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' یہ سب اس کی نظروں کے سامنے شینا اور سجاد رانا کی لاشیں گھوم رہی تھیں۔ ان دونوں کے قاتل ابھی تک نہیں سکے تھے۔ مختار مراد آئی جی پنجاب ہونے کے باوجود اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک پہنچنے میں ناکام ایسا صرف اس لیے تھا کہ ان کا ماتحت عملہ ان کے ساتھ پوری طرح تعاون نہیں کر رہا تھا۔

''شاید آپ کا نظریہ درست ہی ہے۔'' میجر ذیشان نے کھوئے ہوئے لہجے میں اس سے اتفاق بھی تو شہریار کے ساتھ تعاون کر کے ایک طرح سے غیر قانونی کام ہی کر رہا تھا لیکن اسے اطمینان ہو رہا ہے، وہ غلط نہیں ہو رہا۔ طریقِ کار چاہے جو بھی تھا، شہریار بہرحال ملک دشمن عناصر کے خلاف رہا تھا۔ اگر اس کا ایملی کے نام سے ملنے والی لِنڈا سے واسطہ نہیں پڑا ہوتا تو شاید وہ خود بھی کبھی اس



ساتھ نہیں دیتا جیسے اب دے رہا تھا۔ لِنڈا نے اسے اپنے حُسن کے جال میں پھنسا کر ایسا کام دکھایا تھا معلومات اُگل بیٹھا تھا۔ اس عورت کے ہاتھوں چوٹ کھا کر وہ اندر سے بری طرح تلملایا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ ہر ملک دشمن کو نیست و نابود کر ڈالے۔ اس کی اسی کیفیت نے اسے شہریار کے ساتھ تعاون پر مجبور کیا تھا۔ ان کا یہ ساتھ کس حد تک اور کب تک رہتا..... یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

⊛----✪----⊛

فریدہ نے بیڈ پر رکھے زرق برق سبز رنگ کے لباس کو دیکھا اور عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ یہ لباس اسے وڈی چودھرائن نے بھجوایا تھا۔ لباس لے کر آنے والی عورت وہ ملازمہ تھی جو بہزاد شاہ کی اور اس کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھنے پر مامور تھی۔ ملازمہ نے اسے لباس اس اطلاع کے ساتھ دیا تھا کہ وڈی چودھرائن نے کہا ہے، کل اس لباس کو پہن کر تیار رہیں، آپ کی گود بھرائی کی رسم ادا کی جائے گی۔ وڈی چودھرائن کا یہ حکم سن کر وہ حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ وہ جب سے بہزاد شاہ کے نام سے اس حویلی میں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی قابل سمجھا گیا تھا ورنہ اس سے قبل وہ کسی معاملے میں نہیں کی گئی تھی۔ اسے حویلی کی بالائی منزل پر یہ الگ تھلگ گوشہ دے کر سب سے کاٹ دیا گیا تھا۔ صرف تھی جس سے وہ تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتی تھی اور جس کے ذریعے اسے اردگرد کے حالات کی ملتی رہتی تھیں۔

''چل فریدہ!..... آج یہ دن بھی دیکھ لے کہ کیسے وڈی چودھرائن اپنے شوہر کے ناجائز بچے کی ماں کی گود کرتی ہے۔'' سبز زرتار لباس پر نظریں جمائے وہ آہستہ سے بڑبڑائی پھر ہاتھ بڑھا کر لباس اٹھا لیا۔ لباس حویلی کے بعد اس نے وہ زیورات بھی پہن لیے جو اس کے ساتھ ہی بھیجے گئے تھے اور آئینے کے سامنے ہو کر گنگناتے ہوئے میک اَپ کرنے لگی۔

آج اس کی تیاری بڑی بھرپور تھی۔ اسے یاد آیا کہ آخری بار اتنے بھرپور طریقے سے وہ اس دن تیار کی تھی جب اس کا اور بہزاد شاہ کا ولیمہ ہوا تھا لیکن اُس دن میں اور آج کے دن میں بڑا فرق تھا۔ اس دن اسے خود اہتمام کرنا پڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ جسم سے ایک ایک زیور اور لباس نوچ کر پھینک دے۔ سنگھار کے سارے لوازمات اسے چودھری کے ہاتھوں اٹھائی گئی شکست اور ذلت کی یاد دلا رہے تھے۔ آج کا سنگھار اس سے مختلف تھا کہ آج وہ چودھری کو اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر چکی تھی۔

آج جب وہ بن ٹھن کر چودھری کے سامنے جاتی تو وہ اندر ہی اندر جلبلا کر رہ جاتا۔ اسے شدت سے اپنی کمی کا احساس ہوتا۔ کیونکہ فریدہ نے اسے اپنے امید سے ہونے کی خبر ہی اتنی دیر سے دی تھی کہ وہ کسی طور بچے سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس کے پاس دوسرا حل یہ تھا کہ وہ فریدہ کو ہی جان سے مار ڈالے لیکن اس لیے بھی اس نے چودھری کو باور کروا دیا تھا کہ اس کی موت کی صورت میں کچھ لوگ متحرک ہو جائیں گے جو اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروا کے اس کے حاملہ ہونے کا پتہ چلا لیں گے بلکہ یہ راز بھی ساری دنیا کے فاش کر دیں گے کہ بے شک فریدہ منکوحہ بہزاد شاہ کی تھی لیکن درحقیقت چودھری نے اسے اپنی رکھیل تھا۔ اس نے چودھری کو بتا دیا تھا کہ اس کا تحریری بیان ایک معتبر شخصیت کے پاس بطور امانت موجود ہے جو کی موت کی صورت میں اس بیان کو میڈیا کے سامنے پیش کر دے گا۔ اپنی ان ساری باتوں کے جواب میں نے چودھری کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی جھلک دیکھی تھی اور دل ہی دل میں بڑی محظوظ ہوئی تھی۔

آنے والے کل میں جب چودھری کی اپنی اولاد اس کے پوتے کی حیثیت سے حویلی میں پلتی بڑھتی تو وہ بھی جھنجلاتا

''آہ..... ہا..... تم دُلہن بنی ہو۔'' اچانک ہی بہزاد شاہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور یوں تیار دیکھ کر تالی بجاتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے موجود اس کے عکس کو دیکھا اور دھیرے سے مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

''تم وڈی سوہنی لگ رہی ہو۔'' اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور قریب آ کر اس کی کلائی میں جڑاؤ چوڑیوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک بچکانا سا ادا تھی۔ اس دیوانے کو ذرا بھی شعور نہیں تھا کہ بن ٹھن کر کھڑی یہ بھرپور عورت اس کے نام سے اس حویلی میں لائی گئی ہے اور وہ نہ صرف اس کا شوہر کہلائے بلکہ آنے والے وقت میں اس کے بچے کا باپ بھی کہلائے گا۔

فریدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف بھرا ایک گہرا سانس لیا۔ خود اس تجربے سے گزرنے کے باوجود اسے اب تک یہ یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ کوئی شخص اتنا گرا ہوا اور مکروہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی تسکین کے لیے اپنے ذہنی معذور بیٹے کو استعمال کرے۔ وہ جن حالات میں چودھری کے ہاتھ لگی تھی تو اس کے بھائی چودھری بختیار سے اس کے لیے اپنا رشتہ بھی مانگ سکتا تھا۔ چودھری بختیار اس کے بے بس ہو چکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہامی بھرنی پڑتی۔ لیکن شاید ایک طرف تو چودھری اپنی زندگی میں کوئی نیا ہنگامہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اسے اس کے بھائی چودھری بختیار کو زیادہ ذلیل کرنا مقصود تھا جو یہ گھٹیا طریق کار اختیار کیا۔

''تم کہاں جا رہی ہو دُلہن؟'' بہزاد شاہ شاید اپنے سوال کو کئی بار دہرا چکا تھا اور وہ خیالات میں گم ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکی تھی اس لیے اس نے اس بار زور سے ہلا کر دریافت کیا۔

''کہیں نہیں۔ ادھر حویلی میں ہی ایک دعوت ہے۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔ چودھری کا ذہنی معذور ہونے کے باوجود وہ ذہنی پسماندہ لڑکا اسے کبھی برا نہیں لگا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اس سے سختی سے پیش آئی تھی۔ ہاں، ابتدا میں یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے سوچا تھا کہ بہزاد شاہ کے ذریعے چودھری کو مروا دے گی۔ اس ذہنی معذور شخص اگر چودھری کو بلندی سے دھکا دے دیتا یا اس کے سر پر کسی بھاری شے سے وار کر کے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالتا تو کوئی اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بہزاد شاہ کو خود سے قریب کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی یا کوئی کھیل کھیلنے لگ جاتی۔ گھر والوں کی ترسا ہوا، ملازموں کے سہارے پروان چڑھنے والا بہزاد شاہ اس کی توجہ پا کر کھِل اُٹھتا۔ فریدہ نے یہ بھی کیا تھا کہ بہزاد شاہ اس کا ہر حکم بڑی فرماں برداری سے بجالاتا تھا۔ یہ اس کے منصوبے کے لیے بڑی مثبت بات تھی لیکن اس سے قبل کہ وہ اس پر عمل کرتی، اسے اپنے پریگنینٹ ہونے کا احساس ہو گیا اور پھر اس کا لائحہ عمل بدل ڈالا۔ اس نے سوچا کہ یہ بچہ ضرور پیدا کرے گی اور اس کے ذریعے چودھری کو بلیک میل کرے گی۔ ڈاکٹر ماریہ کی زبانی اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ اب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بچے کا باپ کون ہے۔ ڈاکٹر ماریہ دو تین بار ہی اس کے پاس آئی تھی لیکن اس نے اسے بہت تسلی دی تھی اور وقت پڑنے پر مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ اس لائق ہو سکی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

''حویلی میں دعوت ہے۔ فیر تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وڈے پروہنے آئیں گے۔ میں ان



کو ملوں گا۔'' حویلی میں دعوت کا سن کر بہزاد شاہ بہت خوش ہوا اور ساتھ ہی اپنا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا۔

''تم دعوت میں نہیں جا سکتے۔ ادھر صرف عورتیں ہوں گی، ہور پروہنے بھی زیادہ نہیں آ رہے۔ بس تمہاری بہنوں کے علاوہ دو تین زنانیاں ہور ہوں گی۔'' اس نے بہزاد شاہ کو سمجھایا۔

''یہ بھی کوئی دعوت ہوئی۔ دعوت تو وہ ہوتی ہے جس میں ڈھیر سارے لوگ آتے ہیں۔ جیسے دادا جی کے ہوتے ہیں۔ تم ہی جاؤ ایسی بکواس دعوت میں۔'' وہ ذہنی طور پر معذور تھا لیکن حویلی میں ہونے والی دعوت کو بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا اس لیے فریدہ کی زبانی ہونے والی دعوت کا حال سن کر اسے کچھ مزہ نہیں آیا اور اسی دعوت میں شرکت کے مطالبے سے دست بردار ہو گیا۔

''آپ کی تو وڈی دوستی ہے چھوٹے شاہ جی کے ساتھ۔'' اسی وقت ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہاتھوں میں ایک تھال لیے وہاں پہنچی اور فریدہ کو بہزاد شاہ کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر بولی۔ یہ ادھیڑ عمر ملازمہ ماسی رحمتے کے بعد وڈی چودھرائن کے سب سے زیادہ قریب تھی اور رحمتے کے منظر سے غائب ہوتے ہی اس نے کمر سنبھال لی تھی۔ رحمتے تو اپنی دونوں جوان بیٹیوں کو کھونے کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی تھی۔ نچھی جو کبھی اپنی ماں کے ساتھ وڈی چودھرائن کی ناک کا بال بنی رہتی تھیں اور حویلی میں ہونے والے ہر کھوج میں رہتی تھیں، کشور کے فرار کے بعد معتوب ٹھہری تھیں اور چودھری کی طرف سے موت کی سزا پا کر انجام کو پہنچی تھیں۔ ان دونوں بہنوں اور ان کی ماں رحمتے نے مل کر کشور کے لیے بڑی مشکل پیدا کر دی تھی۔ اگر اس کی وفادار ملازمہ رانی کا ساتھ نہ ہوتا تو ان تینوں ماں بیٹیوں کی جاسوسی کے نتیجے میں کشور ابتدا میں پھنس جاتی اور اسے جیتے جی حویلی کے زنداں سے نکلنے کا موقع نہیں ملتا۔

''یہ کیا لائی ہو ماسی؟'' فریدہ نے ملازمہ کے ہاتھوں میں موجود تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ تھال میں پھول ہی پھول بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''یہ پھول وڈی چودھرائن نے آپ کے لیے بھجوائے ہیں۔ لائیں میں آپ کو پہنا دوں۔'' اس نے تھال میز پر رکھا اور اس میں رکھا پھولوں کا زیور ایک ایک کر کے اسے پہنانے لگی۔ گجرے، کنگن اور بازو بند جسم پر سجے تو فریدہ سچ مچ دُلہن لگنے لگی۔ ملازمہ نے اسے پھولوں کے زیورات پہنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک بکے بھی اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بھاری لباس اور زیورات کے ساتھ اس بکے کو بھی سنبھالنے کے لیے اسے اپنے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑے۔ اس فراوانی سے اسے پھولوں سے لادنے کے باوجود ملازمہ کے پاس پھولوں کا ذخیرہ ختم نہیں ہوا تھا اور تھال میں اب بھی اچھے خاصے پھول بغیر پروئے ہوئے یا پتیوں کی صورت میں موجود تھے۔

''ان کا کیا کرو گی؟'' فریدہ نے ملازمہ سے دریافت کیا۔

''وڈی چودھرائن کا حکم ہے کہ جب آپ اوپر سے نیچے اُتریں تو میں آپ کے پیچھے پیچھے یہ پھول برساتی جاؤں۔'' ملازمہ نے جواب دیا جسے سن کر فریدہ کے دل میں خواہش اُبھری کہ کاش وہ اس حویلی میں کسی اچھے شخص کے ساتھ بیاہ کر آئی ہوتی اور کسی کے جائز بچے کی ماں بن رہی ہوتی تو یقیناً آنے والے مہمان کی پذیرائی پر کھِل اُٹھتی۔

''چنگی گل ہے۔'' اپنی اُداس ہوتی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پھر ملازمہ سے پوچھا۔ ''کیا اب چلیں؟''

''ہاں بی بی!'' اس نے جواب دیا۔ پھر اس کی اور بہزاد شاہ کی ملازمہ کی طرف رخ کر کے بولی۔ ''میں

بی بی کو رسم کے لیے نیچے لے جا رہی ہوں، تُو چھوٹے شاہ جی کا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ وہ شوق میں نیچے آ
اور فیر کوئی ہنگامہ کریں۔ یاد ہے نا ایک بار انہوں نے وڈے سرکار کے پروہنوں کے سامنے جا کر کیسی تو
مچائی تھی، فیر بعد میں وڈے سرکار نے اس ملازمہ کی کھال اُدھیڑ ڈالی تھی جس کی غفلت سے چھوٹے شاہ
اُترے تھے۔''

''فکر نہ کرو ماسی! میں چھوٹے شاہ کا خیال رکھوں گی۔'' بیس بائیس سالہ ملازمہ نے خوف زدہ
میں جواب دیا۔

''چلیں بی بی!'' بہزاد شاہ کی طرف سے مطمئن ہو کر وڈی چودھرائن کی چہیتی ملازمہ نے فریدہ کو مخا
تو وہ حرکت میں آ گئی۔ بھاری شرارہ نما لباس پہن کر چلنے میں اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔ سیڑھیوں پر
اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو لباس بار بار پیروں میں آ کر اُلجھ رہا تھا، دوسرے دونوں ہاتھوں میں موجود پھولوں
سے وہ اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ پیچھے اس سے ایک قدم کے فاصلے سے پھول برساتے ہوئے
اُترتی ملازمہ کو گویا اس کی مشکل کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں پھول برسانے کے ساتھ
کوئی دعائیہ گیت الاپنے میں مصروف تھی۔ اس مگن کیفیت میں اچانک ہی اس کا پیر مڑا اور وہ خود سے آگے
فریدہ سے جا ٹکرائی۔ فریدہ کے پاس سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ سیدھی سیڑھیوں
کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر وڈی چودھرائن کے علاوہ اس کی دونوں بیٹیاں تاجور،
چھوٹی چودھرائن اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ فریدہ سیڑھیوں سے لڑھکی تو ان سب کے حلق
نکل گئیں۔ ان چیخنے والوں میں سے کس کس کی آنکھوں سے مسرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں، یہ د
کوئی نہیں تھا۔

❀----✪----❀

''تم ان لوگوں میں کیسے شامل ہوئے اسلم؟''

وہ اسلم کی لگائی پھلواری میں درخت پر بنی مچان پر اس کے ساتھ موجود تھی۔ مچان سے دُور تک
جنگل کا منظر دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس منظر سے وہ بہت کم ہی لطف اندوز ہو پاتی تھی۔ اس کی
اس کے پیروں میں موجود زنجیر تھی۔ دونوں پیروں کے درمیان موجود اس زنجیر کی وجہ سے وہ بغیر کسی
کے مچان تک پہنچانے والی سیڑھیاں چڑھنے سے معذور تھی چنانچہ صرف اسی وقت مچان تک پہنچ سکتی تھی
اسلم اس کے ساتھ ہو۔ جب سے جمرو والا واقعہ پیش آیا تھا، وہ پھلواری میں بھی اکیلے آنے سے گریز کر
تھی۔ خود اسلم نے بھی اسے ہدایت کی تھی کہ آئندہ اگر پھلواری تک جاؤ تو پہلے مجھے اطلاع دے دینا تا
نظر رکھ سکوں۔ لیکن وہ احتیاطاً اس طرف آئی ہی نہیں تھی۔ آج اسلم نے خود اسے چلنے کی پیشکش کی تو
اور اب وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ اسے یہاں لانے کے بعد اسلم اس سے بے نیاز ہو گیا تھا اور ایک کتاب
ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ خاموش طبع تو وہ تھا ہی لیکن ماہ بانو نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اس نے اسلم
سامنے اپنے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اظہار کیا تھا، اس کی خاموشی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔
ساتھیوں سے بھی بالکل الگ اور کٹا کٹا سا رہنے لگا تھا۔

اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے اپنے دل میں اس کے لیے سخت افسوس محسوس کیا تھا لیکن
کرتی؟ دل کے معاملات میں زبردستی یا مروّت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ اخلاقاً بھی اسلم کی محبت کی پذیر



ی۔ اخلاقاً یا مروّتاً تو رہا ایک طرف، وہ تو مصلحتاً بھی ایسا نہیں کر سکی تھی ورنہ یہاں سے نجات کی ایک
بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے لیے اسلم کے جذبات کا فائدہ اٹھاتی اور اسے بے وقوف بنا کر یہاں سے
اہ ہموار کر لیتی۔ اس جیسی لڑکی کے لیے کسی کے سچے جذبات کو اس طرح کا دھوکا دینا گوارا نہیں تھا۔
اس کے لیے محبت بہت خالص تھی اور ایسی محبت کی اگر پذیرائی نہ کی جا سکے تو رسوائی بھی نہیں کرنی
ہاں اگر وہ نفس کا مارا کوئی ہوس پرست آدمی ہوتا تو پھر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا سکتا تھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' وہ جو ابھی تک جنگل کے مناظر پر ہی نظر جمائے ہوئے تھی،
طرف سے جواب نہ پا کر رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا سر ابھی تک کتاب پر ہی جھکا ہوا تھا لیکن
ظاہر تھا کہ وہ کچھ پڑھ نہیں رہا ہے۔

''تم یہ جان کر کیا کرو گی؟'' آخر کار اس نے اپنی زبان کھولی لیکن جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال
یا۔

''اگر تو شاید کچھ نہیں سکتی لیکن میرے اندر ایک تجسس سا ہے کہ تم جیسا آدمی ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے
تم ان سب سے بہت مختلف ہو اور کوئی حادثہ ہی تمہیں ان تک پہنچا سکتا ہے۔''

''جیسے تم حادثاتی طور پر یہاں پہنچ گئیں۔ ورنہ شاید اس شخص کے ساتھ ہوتیں جسے تم نے اپنے دل میں بسا
ہے۔'' وہ اُداسی سے مسکرایا۔

''جسے چاہو اس کا ساتھ بھی مل جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا۔'' اس نے حسرت زدہ سے لہجے میں جواب
لم سمجھ نہیں سکا کہ اس نے اپنی محرومی بیان کی ہے یا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''تو تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟'' ماہ بانو نے یک دم ہی سر جھٹک کر اپنی کیفیت سے باہر نکلتے
اس سے پوچھا۔

''تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو بتا دوں گا ورنہ سچ پوچھو تو میں خود بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا کہ میں یہاں کس
پہنچا۔''

''اگر وہ بات دہرانے سے تمہیں تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو رہنے دو۔ میری طرف سے کوئی زبردستی
ہے۔'' اسلم کا جواب سن کر اُس کے تجسس پر جذبۂ ہمدردی غالب آ گیا اور وہ اپنی خواہش سے دست بردار

''اپنی زندگی کے اس حادثے کو میں کبھی بھول ہی نہیں سکا اس لیے دُہرانے نہ دُہرانے سے تکلیف کے کم
ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' اس کی آنکھوں میں سرخی سی اُترنے لگی۔

''میں اور میری بہن آمنہ اپنے والدین کی بس دو ہی اولاد تھے۔ ہمارے والد قلی تھے۔ جب میں تقریباً
دہ سال کا تھا تو ان کا ریل کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں سبی کے ایک گاؤں کا رہنے والا
ہمارے علاقے میں زندگی کی سہولیات کا بہت فقدان ہے۔ یہاں تک کہ پانی جیسی بنیادی ضرورت کی
بے حد قلت ہے۔ وہاں لوگ بارش کا پانی ذخیرہ کر کے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا
پھر وہاں لوگوں کا دارومدار جیکب آباد سے آنے والی اس ریل گاڑی پر ہوتا ہے جس میں آٹھ سے دس واٹر
ہوتے ہیں۔ یہ ریل گاڑی ہر چار دن بعد آتی ہے۔ تم خود سوچو کہ تقریباً ایک ہزار کی آبادی والے اس
کے لوگوں کے لیے پانی کی اتنی محدود مقدار میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے
اؤں کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ آبادی بھی اسی وجہ سے اتنی گھٹ گئی ہے۔ میرے والد اسی گاؤں میں پیدا

ے تھے اور انہیں اپنے گاؤں سے بہت محبت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا گاؤں خوش حال ہو اور
ہے۔ وہ خود تو ایک معمولی سے قلی تھے اور جانتے تھے کہ اس حیثیت میں وہ اپنے گاؤں کے لیے کچھ نہیں کر
اس لیے انہوں نے اپنی ساری امیدیں مجھ سے باندھ لی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی بڑا
ہاؤں اور اپنے گاؤں کے لیے کچھ کروں۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود وہ میری تعلیم پر پوری توجہ دیتے
ب ان کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ اب ان کا کوئی خواب پورا نہیں ہو سکے گا اور مجھے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع
ے گا۔

لیکن اس موقع پر میری ماں اور بڑی بہن نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ وہ دونوں سلائی کڑھائی کے لیے
ماہر تھیں۔ خصوصاً سندھی کڑھائی تو انہیں اتنی عمدہ آتی تھی کہ دیکھنے والے داد دیئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے
گاؤں کی کسی دوسری عورت کے ہاتھ میں میری ماں کے ہاتھ جیسی صفائی نہیں تھی اور آمنہ کو بھی ماں
مہارت ورثے میں ملی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اس ہنر کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ وہ دونوں خوب صورت
تک کڑھائی والے کپڑے تیار کرتیں اور ایک ایجنٹ کے ذریعے دوسرے شہروں میں بکوا دیتیں۔ ماں،
ان رات کی محنت کے عوض میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ میں نے انٹر کرنے کے بعد کراچی
ے کا فیصلہ کر لیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد سی ایس ایس کا امتحان
اور لوئی نمایاں پوزیشن حاصل کروں۔ یہ ایک لمبا پروسیجر ضرور تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ میرے والد میرے
ے جو خواب دیکھتے تھے، وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ میں حکومتی مشینری کا حصہ بن جاؤں۔ میری
اور بہن نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی اور یوں میں نے کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا۔

میرے گاؤں سے روانہ ہونے سے قبل میری بہن کی منگنی گاؤں کے ہی ایک لڑکے سے کر دی گئی۔
لوگ ہمارے مقابلے میں خاصے خوشحال تھے اور لڑکا بھی دیکھنے میں معقول لگتا تھا اس لیے میں بہن کے
رشتے پر بہت خوش تھا۔ شادی کے لیے یہی طے پایا تھا کہ کم سے کم میں بی اے کر لوں تو پھر ہی یہ فریضہ انجام
جائے گا۔ میں دل میں بہت سے عزائم لے کر کراچی چلا گیا اور نہایت محنت سے کام کر کے بی اے کا
امتحان فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ٹیوشنز کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا
تاکہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکوں۔ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا بلکہ کچھ رقم جوڑ کر بہن کی شادی
لیے بھی چند چیزیں خرید لی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے اخراجات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد
نے آمنہ کی شادی کے لیے رقم جوڑنا شروع کر دی تھی، چنانچہ اُمید یہی تھی کہ ہم عزت کے ساتھ اسے اس کے
رخصت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے اپنا ایم اے میں داخلے کا فارم جمع کروایا اور آمنہ کے لیے خریدے گئے تحائف لے کر گاؤں
گیا۔ میری ماں کا بھی یہی خیال تھا کہ اب آمنہ کی شادی ہو جانی چاہئے۔ اس کے سسرال والوں سے اس
میں عندیہ لیا گیا وہ لوگ بھی شادی کے لیے تیار تھے لیکن بالکل اچانک ہی انہوں نے ہمارے سامنے
ایک لسٹ رکھ دی اور واضح کر دیا کہ شادی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب مطلوبہ اشیاء فراہم کی جائیں گی۔
اور ماں اس صورتِ حال پر بھونچکے رہ گئے۔ تقریباً تین سال قائم رہنے والی منگنی کو توڑنا بھی آسان نہیں
خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ آمنہ اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ
ہے۔ ایک عام گھریلو لڑکی کی طرح اس نے منگنی ہوتے ہی اپنے سارے خواب اپنے منگیتر سے وابستہ کر
تھے۔ منگنی ٹوٹتی تو نہ صرف اسے زبردست دھچکا لگتا بلکہ ہمیں بھی اس کے لیے کوئی دوسرا بر ڈھونڈنے میں



آتی۔ ایک تو پہلے ہی ہماری روایات کے خلاف اس کی شادی میں بہت تاخیر ہو گئی تھی۔ دوسرے
کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جانا ایک طرح سے اس کا عیب دار ہو جانا تھا۔"
تک اپنی داستان سنا کر اسلم خاموش ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کو
دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری ہو گئی تھی اور چہرے کی لکیروں میں درد کروٹیں لیتا نظر آ
ماہ بانو نے محسوس کر لیا کہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے اسلم کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ہو گا۔ ایک ایسی
نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی ماہ و سال بھائی کی خاطر محنت کرتے ہوئے گزار دیئے تھے، جب زندگی
ترین دور سے گزر رہی ہو گی تو کیا بھائی کا دل چاہا ہو گا کہ اب وہ اپنے حصے کا فرض ادا کرے اور بہن
خوشیوں سے بھر دے۔

میں نے ماں سے کہا کہ لڑکے والوں سے شادی کے لیے کچھ مہینے کی مہلت لے لو۔ میں کوشش کروں گا
عرصے میں کہیں سے رقم کا بندوبست کر سکوں۔ ماں نے ایسا ہی کیا۔ لڑکے والے بھی مہلت دینے پر
گئے اور میں واپس کراچی لوٹ گیا۔ میری ایم اے کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں لیکن ہمیشہ کی طرح میں
پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ سارا وقت ذہن میں یہی سوال گونجتا رہتا کہ کہاں سے اتنی رقم کا بندوبست
کہ بہن کے سسرالیوں کے مطالبات پورے ہو سکیں۔ کبھی خیال آتا کہ تعلیم چھوڑ کر کوئی ملازمت کر لوں۔
یہ بھی جانتا تھا کہ ملازمت کر کے بھی میں چند ہزار سے زیادہ جمع نہیں کر سکوں گا جبکہ میری ضرورت
کی تھی۔ ایک دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں کسی سے قرض لے لوں اور بعد میں آہستہ آہستہ اُتارتا رہوں۔ لیکن
تھا کہ قرض مانگا کس سے جائے؟

میری اس اُلجھی ہوئی کیفیت کو سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ کئی کلاس فیلوز اور ٹیچرز نے مجھ سے پوچھا بھی
کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟ میں سب کو مسکرا کر ٹال جاتا لیکن جب میرے ایک کلاس فیلو راشد ڈوگر نے
یہ سوال کیا تو میں اسے ٹال نہیں سکا۔ راشد نے سب کی طرح مجھ سے سرسری لہجے میں یہ سوال نہیں کیا
مجھے اپنے ساتھ زبردستی کیفے ٹیریا تک لے گیا تھا اور وہاں چائے اور سموسوں سے میری تواضع کرنے
بڑی ہمدردی سے یہ سوال کیا تھا۔ راشد پڑھنے میں تو بس گزارے لائق تھا لیکن اپنی شوخ اور ہمدرد
کی وجہ سے سارے ڈیپارٹمنٹ میں بہت مقبول تھا۔ اس کے رہن سہن سے لگتا تھا کہ وہ خاصے خوش
رانے کا فرد ہے۔ بعض اوقات یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس نے کسی کے پاس رقم نہ ہونے کی صورت میں
سمسٹر فیس جمع کروا دی یا کسی اور طرح کی مالی معاونت کر دی۔ جب اس نے مجھ سے اتنی ہمدردی سے
مسئلہ پوچھا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ راشد سے ہی بہن کی شادی کے لیے قرض مانگ لوں۔ میں نے
مسئلہ بتا دیا اور ساتھ ہی جھجکتے ہوئے قرض کے لیے بھی درخواست کر دی۔ میری بات سن کر وہ تھوڑی دیر
سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"دیکھ جگر! مجھے تجھ سے ہمدردی ہے لیکن میں تجھے اتنی بڑی رقم قرض نہیں دے سکتا۔ آٹھ دس ہزار کی بات
میں تیرے کہنے سے پہلے ہی دے دیتا لیکن ڈیڑھ دو لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ میرے ابا کے کوئی کارخانے
چل رہے جو میں تجھے اتنی بڑی رقم ہمدردی میں تھما دوں۔"

مجھے راشد سے اس طرح کے جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سے
کی کہ وہ مجھے یہ رقم دے دے اور واپسی کے بارے میں فکر نہیں کرے۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے اس کی
رقم واپس کر دوں گا۔ میری یہ بات سن کر وہ ہنسا اور بولا۔

''تُو جتنا عرصہ لگائے گا رقم واپس کرنے میں، اتنے عرصے میں تو ہوسکتا ہے میں دوسری دفعہ جاؤں.....اور صاف صاف بات ہے میرے بھائی! کہ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس لیے کماتا ہوں کہ دوسروں کے کام نکلتے رہیں۔ میں اپنی موج مستی کے لیے ہاتھ پیر چلاتا ہوں۔ تجھے بھی کی شادی کرنی ہے تو خود ہاتھ پیر مار۔ دوسروں کے آگے رونے گانے مت بیٹھ۔''

اس کا جواب سن کر میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ آخر وہ ایسا کیا کام کرتا ہے جس کے ذریعے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ وہ یوں ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ اس کا باپ کوئی بڑا اعلیٰ عہدے دار ہے لیکن راشد نے خود صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے مال پر عیش نہیں کر رہا بلکہ اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ میں نے اس سے اس کا ذریعۂ آمدنی پوچھا۔ میرا سوال سن کر اس نے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

''اگر میں تجھے اپنے کام کے بارے میں بتادوں تو کیا تُو وہ کام کرے گا؟'' میں نے کہا کہا بالکل کیونکہ مجھے چند مہینوں کے اندر بہن کی شادی کے لیے رقم جوڑنی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''تُو اپنی بہن کی کر سکتا ہے؟''

میں نے جواب دیا کہ بہن کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ اس پر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ اچھی بات ہے۔ کیونکہ جو کام میں کرتا ہوں اس میں جان خطرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔''

میں حیران ہوا کہ ایسا بھلا کون سا کام ہے۔ میری حیرت دیکھ کر راشد اور بھی زیادہ زور سے ہنسا بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈاکے مارتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر میرا منہ کھلا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ شاید مجھے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے لیکن راشد سنجیدہ تھا۔ اس نے مجھے کچھ اور کھل کر بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی مل کر لوگوں کے موبائل، پرس اور گاڑیاں چھیننے سے لے کر شاپنگ مالز میں ڈاکے مارنے تک سارے کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے میں ایک شریف اور پڑھ لکھ کر سیدھے راستے سے ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔

فوری ردِعمل کے طور پر میں نے اس کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ میرا انکار سن کر وہ طنزیہ بولا۔ ''ابھی تو تم بہن کی خاطر جان دینے کا دعویٰ کر رہے تھے اور اب ایک منٹ میں تمہاری ہوا کھسک گئی۔''

میں نے کہا کہ واقعی میں بہن کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن جس طرح کا کام تم کرتے ہو اس سے نہیں ہوسکتا۔ جواب میں وہ بولا۔

''تو پھر لکھ لو کہ تم اپنی بہن کو اس کے گھر رخصت کر کے نہیں بھیج سکتے۔ اس ایک طریقے کے علاوہ کسی اور طریقے سے اتنی جلدی اتنی رقم کما سکتے ہو اور نہ ہی کوئی تمہیں اتنا قرض دے گا۔''

اس کا کہنا بھی درست تھا۔ میں چپ سادھ گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر وہ بولا۔ ''آج کی رات اچھی طرح سوچ لو جگر! بہن بیاہنی ہے تو ہمارے ساتھ شامل ہو جانا ورنہ ساری عمر اسے گھر بٹھا کے رکھنا۔'' میں چپ چپ رہا۔ اس نے بھی مجھے مزید نہیں چھیڑا اور چائے سموسوں کا بل ادا کر کے وہاں سے رخصت ہوتے جاتے جاتے وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''اگر تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہو تو ہم تمہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے لیکن اگر تمہارا ارادہ بنے تو جو کچھ ابھی مجھ سے سنا ہے، اسے بھول جانا۔ کیونکہ اگر تم نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو پھر تمہارے ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ میں اندر



تک لرز گیا۔ مجھ جیسا سیدھا سادہ لڑکا جو کبھی ہاف ٹائم میں اسکول سے نکل کر بھی نہ بھاگا ہو، اس طرح کے آدمی کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ راشد ڈوگر نے مجھ سے جس لہجے میں بات کی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک قتل کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔ ایک خوش مزاج اور ہمدرد نظر آنے والے شخص کا یہ روپ دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔

کچھ دیر بعد جب میں شاک سے باہر آیا تو واپس اپنے ہاسٹل چلا گیا۔ سارا دن اور رات میں نے راشد کی پیشکش کے بارے میں سوچتے ہوئے وقت گزارا۔ ایک طرف میرا دل کہتا تھا کہ جو راہ راشد نے اختیار کی ہے وہ غلط ہے اور اس پر چل کر میں اپنی زندگی تباہ کر لوں گا لیکن دوسری طرف بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ راشد نے صحیح کہا تھا کہ میں کسی اور طریقے سے بہن کی شادی کے لیے اتنی بڑی رقم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میرے گھر کی خواہش کے آگے بہن کی خوشیاں اور اس کی آس بھری نگاہیں دیوار بن کر کھڑی ہوگئیں۔ جب میں گھر سے آ رہا تھا تو میری بہن کی آنکھوں میں آس کے دیے روشن تھے۔ اسے امید تھی کہ اس کا بھائی اس کی خاطر کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ بس پھر جب مجھے اس کی وہ نگاہیں یاد آئیں تو میری ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور میں نے راشد کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے خود کو تسلی دی تھی کہ بس میں تھوڑا عرصہ ہی ان لوگوں کے ساتھ شامل رہوں گا جتنے عرصے میں بہن کے جہیز کے لیے رقم جمع ہو جائے۔ لیکن میں خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک جھوٹی تسلی ہے۔ میں جس گڑھے میں گرنے جا رہا ہوں، اس سے زندگی بھر نکل نہیں سکوں گا۔ بہرحال، میں نے اپنے تمام خدشات کو پس پشت ڈال کر راشد کو اپنی رضامندی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ میرا فیصلہ سن کر بہت خوش ہوا اور مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملانے لے گیا۔

شروع کا ایک مہینہ ایک طرح سے انہوں نے میری ٹریننگ کی اور مجھ سے چھوٹی موٹی وارداتیں کرواتے رہے۔ ان وارداتوں سے مجھے رقم تو بہت معمولی ملی لیکن مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ میں فطری طور پر ایک بہادر اور نڈر آدمی ہوں۔ میرے ساتھیوں نے بھی یہ بات بھانپ لی چنانچہ جب میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اس رقوم سے میرا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور وہ مجھے کسی بڑی واردات میں شامل کریں تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ چند دن بعد ہم نے ایک سپر اسٹور پر کامیاب ڈاکہ مارا۔ اس واردات میں میرے حصے میں چالیس ہزار کی رقم آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ایسی ہی تین چار وارداتیں اور کر لی جائیں تو بہن کی شادی کے لیے اچھی خاصی رقم جمع ہوسکتی ہے۔

میں نے ماں کو خط لکھ دیا کہ وہ چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ لے لے۔ رقم کے سلسلے میں، میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ میرا ایک دوست قرض دینے پر تیار ہوگیا ہے۔ ماں کو خط لکھنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے مطالبہ کیا کہ اب ہمیں جلدی جلدی بڑا ہاتھ مارنا چاہیے۔ گروپ لیڈر اس بات کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم وقفے سے کی جانے والی بڑی وارداتیں ہمیں مشکل میں ڈال دیں گی۔ وہ سنبھل کر اور ٹھنڈا کر کے کھانے کا قائل تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ راشد بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی گروپ لیڈر پر زور دیا کہ میرے مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے وہ لوگ اپنے اصول سے ہٹ کر طریقِ کار اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر کار فیصلہ میرے حق میں ہوا۔ اور یوں ہم نے جلدی جلدی وارداتیں کرنا شروع کر دیں۔

بہن کی شادی سے مہینہ بھر پہلے ہم نے جو آخری واردات کی، اس سے اچھی خاصی رقم ہاتھ آنے کی اُمید تھی۔ یہ رقم مل جاتی تو آمنہ کی شادی کے لیے مطلوبہ رقم پوری ہو جاتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ میری آخری

واردات ہوگی اور اس کے بعد میں آئندہ یہ غلیظ کام نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر میں کراچی
تو میرے ساتھی میری جان نہیں چھوڑیں گے اس لیے میں نے خاموشی سے یہ بھی انتظام کرلیا تھا کہ میرا
داخلہ پنجاب یونیورسٹی میں ہو جائے۔ بہن کی محبت میں، میں نے جرم کا راستہ ضرور اپنایا تھا لیکن اپنے والد
اپنے والد کے خواب کو نہیں بھولا تھا۔ راشد اور میرے دوسرے ساتھیوں کو علم نہیں تھا کہ میں کس علاقے کا
والا ہوں اس لیے بھی مجھے یقین تھا کہ میں اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن قسمت کی تیز ہوا
زد پر آ کر میرے یقین کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔

میں جس واردات کو اپنی مجرمانہ زندگی کا اختتام سمجھ رہا تھا، وہ درحقیقت میرے ایک مستقل مجرم
آغاز بن گئی۔ ایک طرف سے میں نے اور میرے ساتھیوں نے واردات کی پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم
جیولری شاپ کو لوٹنے جا رہے تھے، اس کے گارڈ اور مالک کے پاس اسلحے کی نوعیت تک کا ہمیں اچھی طرح
تھا۔ ان دونوں افراد کو ہم نے پہلے ہی مرحلے پر کنٹرول کرلیا تھا۔ کوئی بھی واردات کرتے وقت ہم اس بات
خاص خیال رکھتے تھے کہ ہمارے ہاتھوں کسی بندے کی جان نہ جائے۔ قتل کی صورت میں جرم کی نوعیت
سنگین ہو جاتی ہے اس لیے ہم اس عمل سے دور ہی رہتے تھے۔ جیولری شاپ پر بھی ہم اس مقصد میں کامیاب
رہے۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہاں موجود گاہکوں میں سے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی ہے۔ وہ افسر مسلح
ہماری زیادہ توجہ چونکہ جیولری شاپ کے اسٹاف کی طرف تھی اور ہم نے وہاں موجود گاہکوں کو صرف دھمکا دینا
کافی سمجھا تھا، اس لیے اس فوجی افسر کو اپنا اسلحہ نکال کر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی فائرنگ کی زد میں
جو دو افراد آئے، ان میں سے ایک میں تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو چھوڑ کر ہمارے باقی ساتھی افراتفری میں فرار ہو
گئے۔ میری ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ میں زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ تعاقب میں لگی بدقسمتی نے اس موقع پر بھی
ایک وار اور کیا۔ انہی دنوں میری بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کراچی گھومنے پہنچ گیا۔ اس
نیوز چینلز پر چلنے والی خبروں میں مجھے دیکھ کر شناخت کرلیا اور گاؤں واپس جا کر یہ خبر اپنے گھر پہنچانے کے ساتھ
ساتھ پورے گاؤں میں پھیلا دی۔ اس موقع پر وہ لوگ جن کی کمینگی کی وجہ سے میں جرم کی راہ پر چلنے پر مجبور ہوا
تھا، سب سے زیادہ عزت دار بن گئے اور انہوں نے یہ کہہ کر منگنی ختم کردی کہ ہم ایک ڈاکو کی بہن کو اپنے گھر کی
بہو نہیں بنا سکتے۔

ایک تو میری مجرمانہ زندگی اور گرفتاری کی خبر نے ہی میری ماں بہن کو ہلکان کر دیا، دوسرے رشتہ ٹوٹ گیا۔
میری بہن نے اس بات کا اتنا صدمہ لیا کہ برداشت نہیں کرسکی اور خودکشی کرلی۔ مجھے حوالات میں اپنی بہن کے
مرنے کی اطلاع ملی اور میں نے درخواست کی کہ مجھے ایک بار اپنے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔

میرے کیس کا تحقیقاتی افسر اچھا آدمی تھا۔ میری داستان سن کر اسے افسوس بھی بہت ہوا تھا۔ اس کی
خصوصی کوشش سے مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں پولیس کی نگرانی میں جب اپنے گاؤں پہنچا تو میری
بہن کی تدفین ہو چکی تھی۔ میں نے چاہا کہ ماں کے گلے لگ کر اس کے ساتھ اس غم پر آنسو بہا سکوں اور اس
سے اپنے کیے کی معافی مانگوں۔ لیکن ماں نے مجھ سے ملنا گوارا نہیں کیا اور میں اپنے ہی گھر کی دہلیز سے واپس
لوٹا دیا گیا۔ جب میں وہاں سے مایوس واپس پلٹ رہا تھا تو مجھے اپنی بہن کا منگیتر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ
کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس نے میری یہ حرکت نوٹ کرلی اور جواب میں
اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھ پر پھبتیاں کسنے لگا۔

میں پہلے ہی غم و غصے کا شکار تھا چنانچہ برداشت نہیں کرسکا اور اس پر حملہ کر بیٹھا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے



سپاہی جب تک مجھے سنبھالتے، تب تک میں اس خبیث کو اپنے ہاتھوں میں پڑی زنجیر سے گلا گھونٹ
کر چکا تھا۔ اس شخص کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں وہاں سے فرار ہو گیا اور کئی دن تک بھوکا پیاسا ویرانوں
میں پھرتا رہا۔ ایک دن جنگل میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ایک سنسان جگہ پر درخت کی چھاؤں میں لیٹا تھا
کہ ایک آدمی وہاں چلا آیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے کھلایا پلایا اور مجھ
سے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ذہنی طور پر اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کی ذرا سی ہمدردی پا کر اسے اپنا
احوال کہہ سنایا۔

میری داستان سن کر وہ بولا کہ اب تمہارا واپس جانا تو ممکن نہیں ہے۔ اگر واپس جاؤ گے تو قتل کے الزام
میں گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے اور تمہاری بوڑھی ماں کو جوان بیٹی کے بعد بیٹے کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا
پڑے گا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم واپس جانے کے بجائے کسی طاقتور آدمی کی پناہ میں چلے جاؤ۔ اس آدمی
نے بتایا کہ اس کے کچھ ایسے لوگوں سے روابط ہیں جو مجھے اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں۔ پھر اس نے اپنے
موبائل کو استعمال کر کے مجھے خاموشی سے سندھ سے نکال کر پنجاب میں پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ میں
جس تالاب میں گرا تھا، اب اس سے نکل کر سمندر میں پہنچ گیا ہوں۔ قسمت نے مجھ سے عجیب مذاق کیا
تھا۔ میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے کراچی سے نکل کر پنجاب یونیورسٹی میں ٹرانسفر کروانے کا سوچ رہا تھا
مگر مسافر ہو گیا جرائم کی یونیورسٹی میں۔ اپنی کم اعصاب زدگی میں، میں نے اس صورتِ حال کے سامنے ہتھیار
ڈال دیے اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ شامل ہو گیا۔''

اپنی داستان کے اختتام پر اسلم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے جنہیں ماہ بانو سے چھپانے کے لیے وہ رخ
موڑ کر بیٹھ گیا۔

''اور تمہاری ماں..... تمہیں ان کی کچھ خبر ہے؟'' اس کے لیے دل میں گہرا درد محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو
نے اس سے پوچھا۔

''وہ زندہ ہے، یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں گاؤں سے فرار ہونے کے بعد اس کی شکل دوبارہ نہیں دیکھ
سکا۔ جس شخص کو میں نے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے قسم کھا کر بیٹھے ہیں کہ اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ
مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں ان کی اس دھمکی سے تو خیر نہیں ڈرا اور ایک بار رات کی تاریکی میں گاؤں پہنچ
گیا کہ کسی طرح ماں سے مل سکوں۔ لیکن ماں نے اس وقت بھی مجھے مایوس لوٹا دیا۔ وہ بہت ضدی عورت ہے
عہد کر کے بیٹھی ہے کہ جیتے جی نہ مجھے اپنی شکل دکھائے گی اور نہ ہی میری شکل دیکھے گی۔ ماں کی اس ضد کی
وجہ سے میں دوبارہ گاؤں کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ اب بری بھلی جیسی بھی میری ان لوگوں کے ساتھ
گزر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی تاریک رات جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ واردات کے لیے نکلوں تو پھر
واپس نہ آسکوں اور جرم کی اس دنیا سے نکل کر موت کی آغوش میں سکون سے سو جاؤں۔''

پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسلم کے چہرے پر اتنا درد تھا کہ ماہ بانو کو اپنا دل کٹتا
محسوس ہوا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اسلم جیسا شخص واقعی اس بات کا حق دار ہے کہ تاریک راہوں میں
خاموشی سے مارا جائے؟

⊛----✪----⊛

''تجھے کس نے کہا تھا یہ سب کرنے کو؟ وڈے ارمان پھوٹ رہے تھے تیرے دل میں؟'' فریدہ جب
چھتوں سے گری یا گرائی گئی تو اس وقت چودھری حویلی میں موجود نہیں تھا۔ منصوبہ بندی کرنے والوں نے اس

بات کا خاص طور پر خیال بھی رکھا تھا لیکن قدرت کو ان کی چال ناکام بنانا منظور تھی کہ ادھر فریدہ لڑھکتی آخری سیڑھی تک پہنچی، اُدھر چودھری کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی۔ حویلی میں ہنگامہ بپا تھا اور ظاہری سب بڑے پریشان نظر آ رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی یہ کوشش نہیں کر رہا تھا کہ فریدہ کو فوری طبی امداد پہنچ چودھری وہاں پہنچا تو فریدہ کو اس حال میں دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ جو کچھ ہوا، وہ اس لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ فریدہ اسے پہلے ہی دھمکی دے چکی تھی کہ اس کی حادثاتی موت کی صورت میں کے ہمدرد متحرک ہو جائیں گے اور چودھری کو کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔ اس دھمکی کے باعث وہ خود چاہ باوجود فریدہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اب جو یہ منظر دیکھا تو اسے اپنی فکر پڑ گئی۔ فوری طور پر اس نے ا ماریہ کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے حویلی پہنچنے کی درخواست کی۔

ڈاکٹر ماریہ شادی کے سلسلے میں چند چھٹیاں کرنے کے بعد دوبارہ مرکزِ صحت پر ڈیوٹی دینے آنے لگی چودھری کا فون ملتے ہی وہ فوراً حویلی پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک مڈوائف بھی تھی اور وہ ضرورت کا تمام سامان بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس وقت وہ مڈوائف کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے میں فریدہ کی بچانے کی کوشش میں مصروف تھی جبکہ باہر چودھری وڈی چودھرائن سے اُلجھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نیا تو نہیں کیا چودھری صاحب! حویلی کی ریت ہے یہ۔ بھلے سے فریدہ آپ کے دشمن بہن ہے لیکن بہزاد شاہ تو حویلی کے وارثوں میں سے ہے۔ بے شک اسے ہوش نہیں پر ہمیں تو ہوش ہے نا کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ میرے لیے تو وہ اپنے مراد شاہ کی طرح ہی ہے۔ بھلے آپ یقین کر کرو لیکن میں نے کبھی مراد شاہ اور بہزاد شاہ میں فرق نہیں سمجھا ہے۔ اگر بہزاد شاہ کی ماں زندہ ہوتی تو ہور لیکن ابھی تو مجھے ہی ساری رسمیں ریتیں پوری کرنی تھیں، پر مجھے کیا ملوم تھا کہ ایسی مصیبت سر پر آ پڑے اور کُڑی سیڑھیوں سے گر جائے گی۔''

وہ چونکہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق کر رہی تھی اس لیے اسے چودھری کے سامنے وضاحت پیش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ چودھری کا عین وقت پر حویلی پہنچ جانا البتہ اس کے منصوبے کے خلاف ورنہ وہ فریدہ کو طبی امداد تو ضرور پہنچاتی لیکن اتنی تاخیر سے کہ پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اب بھی وہ پُر امید کہ اسے کامیابی حاصل ہو گی اور بے شک فریدہ کی جان بچ جائے لیکن اس کی کوکھ میں پلتا بچہ نہیں بچ سکے گا اس کی اصل دشمنی تھی بھی اس بچے سے ہی۔ وہ زندہ رہتا تو اس کی اولاد کے ساتھ جائیداد کا وارث اور حصے ٹھہرتا۔ جبکہ وہ کسی صورت اپنی اولاد کے سوا کسی اور کو اس جائیداد پر عیش کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''میرے سر پر دس مصیبتیں پڑی ہیں، ہور تجھے رسموں ریتوں کی پڑی ہے۔ کیا دیا ہے مجھے حویلی کے ان وارثوں نے؟ ایک کو کسی گل کا ہوش نہیں ہے، ہور دو جا بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ جا کر بیٹھ گیا ہے۔ دو دھیاں عزت سے بیاہ دی تھیں اور تیسری کے لیے سوچا تھا کہ اس کے جوڑ کا ہَر خاندان میں نہیں تو کوئی گل نہیں، میرے نال کوئی کمی تو ہے نہیں کہ دِھی کو کھلا پہنا نہ سکوں۔ حویلی میں عیش سے رہ کر ساری حیاتی گزار لے گی، لیکن وہ تو میری ناک ہی کٹوا کر چلی گئی۔ جب تک میں اسے ہور اُس کے نامراد عاشق کو پکڑ کر ٹوٹے ٹوٹے نہیں کر ڈالتا، اس حویلی پر ساری خوشیاں حرام ہیں۔ کان کھول کر سن لے چودھرائن! کہ اب یہاں خوشی شادیانے تب ہی بجیں گے جب کشور کا جنازہ اُٹھے گا۔'' غضب ناک چودھری نے حکم صادر کیا۔

''ہاں چودھری صاحب! جو آپ کا حکم۔'' چودھرائن نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا لیکن اس درحقیقت اس کا ذہن اس کمرے کی طرف لگا ہوا تھا جہاں فریدہ اور اس کے بچے کی زندگی کا فیصلہ ہونے



طرف چودھری دُہرے ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے کشور اور آفتاب کے سلسلے میں مہک بُک شاپ کا ، وہ بے کار ہو گیا تھا۔ اس کے آدمی بُک شاپ کے مالک شفیق کی جان لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر مالک کے علاوہ انہوں نے دکان کے ملازمین کو بھی کھنگالا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ماسٹر آفتاب سے واقف نہیں تھا۔ اس کے آدمیوں نے بُک شاپ کے مالک کی بیٹی مہک کی نگرانی کر کے بھی دیکھ لیا آفتاب ان لوگوں کا واقف کار ہے تو شفیق خان کی موت پر اس کی بیٹی سے تعزیت کرنے ضرور آئے گا نگرانی بھی بے سود گئی تھی۔ آفتاب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

ان حالات میں چودھری اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ یا تو اسے ملنے والا کلیو غلط تھا یا پھر آفتاب کوئی اور نام کر کے رہ رہا تھا جس کی وجہ سے کوئی اسے نام سے شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن وہ پر بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور اس کے چنگل میں آتے آتے قسمت ان دونوں کا ساتھ دے رہی تھی اس لیے وہ ہر بار ہاتھ آتے آتے رہ جاتے تھے۔ دوسری وہ ماہ بانو کے حویلی سے غائب ہو جانے پر برافروختہ تھا۔ اسے ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ حویلی میں کس طرح کامیاب ہوئی۔ جن ملازمین نے اسے نکالنے میں مدد دی تھی، وہ مردہ پائے گئے تھے۔ اپنا غصہ ملازمین کے بچوں کو بے عزت کر کے ان کی ہلاکت کی صورت میں ہی نکال سکا تھا لیکن ماہ بانو نہیں چل سکا تھا۔ اور اب یہ فریدہ کی مصیبت سر پر آ پڑی تھی۔ عام حالات میں اسے فریدہ یا اس کے زندگی یا موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن فریدہ کی دھمکی تلوار کی صورت اس کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ صورت میڈیا کی یلغار کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ اور فریدہ کی زندگی بھی بچ گئی ہے۔'' چودھری چودھرائن اپنی اپنی فکروں اور سوچوں میں غلطاں کسی خبر کے منتظر بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر ماریہ نے وہاں آ کر اتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔ اس اطلاع پر جہاں چودھری نے سکون کا سانس لیا، وہیں چودھرائن کے میں آگ لگ گئی لیکن وہ اپنے دلی جذبات چھپاتے ہوئے منافقانہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''مبارک ہو چودھری صاحب! آپ کی نسل جاری رکھنے والا ایک ہور پُتر آ گیا۔ میں ابھی منشی جی کو اتی ہوں کہ درگاہ پر صدقے کی دیگیں چڑھوا دیں۔'' وہ جوش و خروش سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''آپ کو جو کچھ کرنا ہے کریں لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ ماں اور بچے کی جان ابھی مکمل طور پر رے سے باہر نہیں ہے۔ فریدہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے جبکہ بچہ چونکہ پری میچور ہے اس لیے اسے بھی زیادہ کیئر کی ضرورت ہے۔ مجھ سے وقتی طور پر جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ میں کر چکی ہوں لیکن اب آپ کو فوری پر ماں اور بچے کو کسی بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنا ہو گا۔ دونوں کی زندگی بچانے کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ رنے کی صورت میں کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔'' چودھرائن کے جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماریہ نے براہِ راست چودھری کی طرف رخ کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں اسے بتایا۔

''میں ابھی گڈی نکلواتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر چودھری جلدی سے بولا۔

''اس کے مقابلے میں ایمبولینس زیادہ بہتر رہے گی۔ اس میں آکسیجن سلنڈر اور فوری طبی امداد کا دوسرا ان موجود ہے۔ راستے میں اگر کوئی پریشانی پیش آئی تو اس سے نمٹا جا سکے گا۔'' ماریہ نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کہیں۔'' چودھری کے لیے فریدہ کی زندگی بہت اہم تھی۔

''اور ہاں..... خیال رہے کہ فریدہ کے ساتھ ہسپتال میں آپ کا کوئی قابلِ اعتماد شخص رہے۔ فریدہ نے

شک ظاہر کیا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والا حادثہ اس کے قتل کی سازش بھی ہو سکتی ہے اور آئندہ کے لیے اپنی اور اپنے بچے کی جان خطرے میں محسوس کر رہی ہے۔'' یہ جملے کہتے ہوئے ڈاکٹر ماریہ کی نظریں چودھری وڈمی چودھرائن دونوں کے چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اپنی اپنی جگہ احساسِ جرم میں مبتلا وہ دونوں ہی نظریں چرا گئے۔ ڈاکٹر ماریہ جن دو افراد سے فریدہ کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنے کو کہہ رہی تھی، اسے ان دونوں سے ہی سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا لیکن ان دونوں کی فریدہ سے مخاصمت کی وجوہات مختلف تھیں کہ دونوں ہی ایک دوسرے پر اسے ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

⊛----✪----⊛

راحیلہ سکتہ زدہ سی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی اور بے یقینی کے عالم میں اس کاغذ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دائیں ہاتھ میں موجود سفید لفافے سے نکلا تھا۔ یہ لفافہ کچھ دیر قبل ہی ایک ویٹر دے کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا اس لفافے میں اس کے لیے کوئی پیغام ہے اور وہ حیران رہ گئی تھی کہ یہاں کون اسے پیغام بھیج سکتا ہے؟ اس ہوٹل میں موجودگی کا علم تو اس کے ماں باپ کو بھی نہیں تھا۔ بہر حال، اس نے ویٹر سے لفافہ وصول کر لیا کہ لفافے پر واضح طور پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھول کر اس نے اس میں تہ کر کے رکھا گیا کاغذ کھولا تو تحریر پڑھے بغیر ہی جان گئی کہ اسے یہ بھیجنے والا اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہے۔ لفافے کے اوپر لکھے نام سے اس نے طارق کی لکھائی کو اس شناخت نہیں کیا تھا کہ اس بات کی توقع ہی نہیں کر رہی تھی کہ برابر والے کمرے میں مقیم طارق اسے کوئی پیغام بھیج سکتا ہے لیکن اب چند لفظوں کے مقابلے میں باقاعدہ کئی سطور لکھی دیکھ کر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ طارق کی لکھائی کو شناخت نہ کر سکے۔ گھر میں وہی طارق سے سب سے زیادہ قریب تھی اور اپنی تعلیم سے لے کر دوسرے معاملات تک میں اسی سے مدد لیتی تھی۔ طارق بھی اسے عموماً اپنے ساتھ ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔

دونوں بہن بھائی کی اس قدر قربت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ کراچی چھوڑ کر یہاں اسلام آباد بھی آ گئی تھی اور ہوٹل کے اس کمرے میں تقریباً قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ طارق نے اس سے یہی کہا تھا کہ اس کا غیر ضروری طور پر باہر نکلنا اس کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ طارق اسے کچھ بھی کھل کر نہیں بتا رہا تھا۔ اس کا انداز بہت پُر اسرار تھا اور اب اس نے اسے یہ خط بھیج دیا تھا۔ راحیلہ نے اس کی اس حرکت پر حیران ہوتے ہوئے خط کے الفاظ پڑھے اور مزید حیران ہو گئی۔ ڈاکٹر طارق نے لکھا تھا۔

''ڈیئر سس!

تم مجھے اپنی ذہانت اور سمجھ داری کی وجہ سے ہمیشہ بہت عزیز رہی ہو۔ تم نے کبھی میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کی بلکہ ہمیشہ مجھے تم سے مدد ہی ملی ہے۔ یہ آخری مدد تم نے میری کی ہے، اس کے لیے میں دل سے تمہارا مشکور ہوں کیونکہ اگر یہ سب نہیں ہوتا تو مجھے اپنا مستقبل بنانے کا ایسا سنہری موقع نہ ملتا اور میں فوری طور پر یہاں سے امریکہ روانہ ہونے کے قابل نہیں ہو پاتا۔

تم شاید میری بات پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی ہو گی..... تو چلو میں تمہاری اُلجھن دور کر دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے کا کتنا شوق تھا۔ میرے اس شوق کی راہ میں وسائل کی کمی رکاوٹ بن کر کھڑی تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نے بڑے ہاتھ پیر مارے، یہاں تک کہ لڑکیوں کی خرید



والے ایک آدمی کو لڑکیاں سپلائی کرنا تک منظور کر لیا۔ تمہیں میرے ساتھ جاب کرنے والی وہ نرس تو یاد ہو گی جس کی بہن ہمارے گھر آئی تھی اور جس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن میرے ساتھ ڈنر پر گئی تھی اور واپس گھر نہیں آئی۔ میں نے اس عورت کو غلط قرار دے کر گھر سے روانہ کر دیا لیکن درحقیقت وہ عورت غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی بہن کو سپلائی کر دیا تھا لیکن وہ شخص بڑا بے ایمان نکلا اور طے شدہ رقم سے کم رقم دے کر مجھے ٹال دیا۔ میں اس کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اسے کسی نہ کسی طرح باہر تو جانا ہی تھا۔

انہی دنوں تم مہرین کو اپنے ساتھ لے کر گھر آنے لگیں۔ مجھے وہ لڑکی اچھی لگی۔ وہ بہت خوب صورت اور معصوم تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اسے بھی اپنے جال میں گرفتار کر کے اس آدمی تک پہنچا دوں گا لیکن اس بار معاملے میں دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے مہرین کی تصویر دکھا کر پہلے ہی اس سے آدھی رقم وصول کر لی اور باقی آدھی رقم کے لیے میں مہرین کو اپنے جال میں جکڑتا، اس سے قبل ہی حادثاتی طور پر یہ بات علم میں آ گئی کہ وہ لڑکی درحقیقت مہرین نہیں، ماہ بانو ہے اور ایک وڈیرے سے بچنے کے لیے مہرین بن کر یہاں چھپی ہوئی ہے۔ میں نے اس وڈیرے سے رابطہ کیا اور بھاری رقم کے عوض اسے مہرین یا ماہ بانو جو بھی کہہ لو، اس کا پتہ بتا دیا۔ تم نے بھی میرے ساتھ ہی ماہ بانو کی داستان سنی تھی اس لیے یہ بھی جانتی ہو گی کہ ماہ بانو کی پشت پر بھی بااثر شخصیت موجود تھی۔ اس شخصیت سے بچنے کے لیے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں ملک سے باہر نہیں نکل جاتا، تب تک ہمارا چھپ کر رہنا ضروری ہے۔

تمہیں میں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ تمہارے ذریعے ان لوگوں کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں ملک سے باہر جانے کے چکر میں ہوں۔ وہ میرا نام ای سی ایل میں ڈلوا دیتے تو مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اب جبکہ معاملات بہ خیر و خوبی طے ہو گئے ہیں اور میں صبح تمہارے جاگنے سے پہلے روانہ ہو چکا ہوں گا تو تمہارے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ فوری طور پر گھر کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ ہوٹل کا بل میں نے جمع کروا دیا ہے۔ تمہارے پاس رقم بھی ہے کہ اسلام آباد سے کراچی تک کا سفر با آسانی کر سکو۔ وہاں جا کر تم میرا یہ خط سب کو دکھا سکتی ہو، کسی طرح تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ رہا میں تو مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میرا اب کبھی واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تمہارے بے حد تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ یور لونگ برادر..... ڈاکٹر طارق۔''

شروع سے آخر تک سارا خط کئی بار پڑھنے کے بعد بھی راحیلہ کی حیرانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ طارق کے حالات نے اسے سُن کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خود غرض ہے، یہ بات وہ پہلے بھی جانتی تھی لیکن اس خود غرضی میں اپنی سگی بہن کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرے گا، یہ بات وہ پہلے کبھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ طارق کا کہنا کہ کامیابی کے لیے کچھ بھی کر گزرو۔ تو واقعی وہ اس بات پر عمل کر گیا تھا۔ وہ خود بھی کافی حد تک طارق کے فلسفے پر عمل کرتی تھی۔ ماہ بانو سے دوستی بھی اس نے اپنی غرض سے کی تھی۔ ماہ بانو کے کالج جوائن کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں اس نے یہ بات جان لی تھی کہ وہ ایک محنتی اور ذہین طالبہ ہے چنانچہ اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس دوستی سے بھرپور استفادہ کر سکے گی اور نوٹس وغیرہ لینے کی زحمت سے بچ جائے گی۔ اس دوستی کو مزید گہرا کرنے اور اس پر اپنا اعتماد زیادہ سے زیادہ قائم کرنے کے لیے وہ اسے لے کر اپنے گھر بھی چلی گئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جو ان کے ایک عزیز ملک سے باہر کے وقت وقتی طور پر انہیں دے گئے تھے اور اس گھر میں صرف وہ اور طارق رہائش پذیر تھے۔ ان کے والد اس گھر میں قیام پسند نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف بھائی کی محبت اور اچھے گھر میں رہنے کے شوق میں وہاں آ گئی

تھی لیکن طارق یقیناً اس لیے وہاں رہ رہا تھا کہ لڑکیوں کو اپنی اچھی مالی پوزیشن دکھا کر متاثر کر سکے تا
آسانی سے اس کے جال میں پھنس جائیں۔

بہرحال وہ ایک آدھ بار سے زیادہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن
ملاقات کے بعد ہی طارق نے اس سے اصرار شروع کر دیا کہ وہ اپنی سہیلی کو اپنے ساتھ وہاں لایا کرے
اس اصرار پر اسے خیال گزرا کہ ماہ بانو اسے پسند آگئی ہے۔ لیکن اب سمجھ آ رہا تھا کہ وہ اسے پسند تو آ
ن پسندیدگی کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر کہیں فروخت کرنے کا سو
رہا۔ لیکن یہ اتفاق ہی ہوا کہ ان کے علم میں یہ بات آگئی کہ وہ کسی چودھری سے ڈر کر بھاگی ہوئی ہے
طارق نے اپنا منصوبہ بدل لیا اور چودھری سے سودے بازی کر لی۔

وہ ان سب باتوں سے واقف نہیں تھی لیکن جب طارق نے اچانک ہی اسے اپنے ساتھ اسلام آباد
لہا اور گھر والوں کو بتانے سے بھی منع کر دیا تو وہ چونک پڑی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ طارق سے کوئی غلط
سرزد ہوئی ہے۔ وہ طبعاً کافی نڈر تھی۔ اس لیے نہ تو گھبرائی اور نہ ہی ساتھ جانے سے انکار کیا۔ اس کے
یں یہ بات بھی تھی کہ بھائی کا ساتھ دے کر وہ اس کا اعتماد جیت سکتی ہے تاکہ آنے والے وقت میں بھا
اسے فائدہ پہنچاتا رہے۔ لیکن بھائی اس کی توقعات سے بڑھ کر خود غرض ثابت ہوا اور اسے اس اجنبی شہر
چھوڑ کر خود اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے امریکہ چل پڑا۔ اُس کی اس خود غرضانہ روش پر وہ کچھ دیر تو بے
حرکت بیٹھی حیران ہوتی رہی لیکن پھر آخر کار اسے حرکت میں آنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے اس کمرے میں تنہا زیا
تک نہیں رک سکتی تھی۔ اسے واپس اپنے گھر جانا تھا۔ وہ گھر..... جو بہت چھوٹا تھا اور اس کے باپ نے
حلال کی کمائی سے بنایا تھا لیکن اس کے بڑے بڑے خواب اس چھوٹے سے گھر میں نہیں سما پائے تھے۔

⊛----✪----⊛

''یہ لیجیے، یہ ہے آپ کا نیا گھر۔''

دو کمروں کے ایک کشادہ سے صحن والے مکان پر ایک پُرسکون نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے آفتاب
کشور سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے نقاہت زدہ چہرے پر یہ مسکراہٹ
عجیب لگی۔

وہ جس حادثے سے گزری تھی، اس میں اس کی اور بچے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن اس کی صحت پر
اثر پڑا تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑ جانے والے سیاہ حلقے اور پچکے ہوئے رخسار اُس کی
کمزوری کی گواہی دیتے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کے لیے ڈیلیوری تک مکمل بیڈ ریسٹ تجویز کیا تھا لیکن وہ
جس مشکل کا شکار تھے وہ انہیں ایک جگہ سکون سے ٹکنے بھی تو نہیں دیتی تھی۔

چودھری کے گرگوں کے پنڈی تک پہنچ جانے کے بعد وہ پنڈی یا اس کے گرد و نواح میں کہیں بھی
میں خطرہ محسوس کر رہے تھے چنانچہ شہریار کی تجویز قبول کرتے ہوئے سندھ کا رخ کیا اور اب وہ دونوں
خاص میں موجود تھے۔ یہاں تک آنے کے لیے کشور کو پہلے برقع میں ملبوس کراچی تک بائی ایئر سفر کرنا پڑا
وہاں سے آگے آفتاب اسے ایک جدید سہولیات سے لیس ایمبولینس میں لے کر بائی روڈ یہاں پہنچا تھا
انتظام کرنے میں شہریار نے اس کی مدد کی تھی اور اپنے کسی ذریعے سے اس کے لیے یہ گھر حاصل کر کے
اطلاع دی تھی۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد آفتاب نے اس شخص سے فون پر رابطہ کیا جس کا نمبر



اسے دیا تھا۔ اس شخص نے اسے گورنمنٹ گرلز کالج تک پہنچنے کی ہدایت کی اور پھر وہاں سے ان دونوں کو
ساتھ لے کر اس گھر تک پہنچا دیا۔

اس شخص کے روانہ ہوتے ہی کشور نے چہرے پر پڑا نقاب اتار کر پھینکا اور ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔
ں، صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ باقی گھر بھی اچھی حالت میں تھا اور وہاں ضرورت کی تمام بنیادی چیزیں
ں۔ یہ سارا انتظام آفتاب کی استدعا پر کیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کشور کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ گھر
کام و انصرام سنبھال سکے۔ وہ خود بھی اس جھنجٹ میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کچھ زائد رقم خرچ کرنا
سمجھا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی کتاب کا سیکنڈ ایڈیشن شائع کرنے کا بھی پبلشر نے حال ہی میں
لٹ کیا تھا اس لیے اسے رقم کی طرف سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ اب وہ یکسو ہو کر اپنے کالمز کے ساتھ
ناول کی تکمیل کا ارادہ رکھتا تھا۔ ناول اختتامی مراحل میں تھا اور اسے پوری امید تھی کہ بچے کی دنیا میں آمد
ل اشاعت کے لیے پریس میں چلا جائے گا۔ اس کا پبلشر رائلٹی کا چیک تو مسودہ ہاتھ میں آتے ہی تھما دیتا
اسے بے فکری تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تو اس کے پیش نظر
ے اہم مسئلہ کشور کی صحت اور زندگی کا تھا۔ چنانچہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ بے فکری اور آرام مہیا کرنا چاہتا
اب بھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے اسکواش کا ٹھنڈا گلاس تیار کر کے لایا تھا اور گلاس اسے تھماتے
اس سے خوشگوار لہجے میں یہ جملہ کہا تھا لیکن جواب میں کشور کی مسکراہٹ بہت عجیب تھی۔

''شاید آپ کو یہ گھر پسند نہیں آیا؟'' اس کی مسکراہٹ سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''عارضی ٹھکانے کے لیے پسند ناپسند کا کیا سوال؟ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جسے آپ میرا نیا گھر کہہ
ہیں، جانے مجھے اس میں کتنے دن رہنا نصیب ہوگا۔ زندگی نے عجیب ہی موڑ لیا ہے۔ کہاں تو حویلی کی
اری سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا تھا اور کہاں اب سارا وقت اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔
یاد ہے نا کہ آپ سے ملنے کے لیے مجھے کتنے جتن کرنے پڑتے تھے۔ کبھی رات کی تاریکی میں اپنی جان
لگا کر چپکے سے رانی کی مدد سے آپ تک پہنچتی تھی تو کبھی لاہور والی کوٹھی جانے کے لیے بہانے تلاش کرتی
ایک خواب تھا دل میں کہ آپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں سکون کی زندگی گزاروں گی۔ لیکن ایسا
ہے کہ قسمت کو میرا یہ چھوٹا سا خواب بھی پورا کرنا منظور نہیں۔'' وہ ایک بار پھر ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ
اندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی، اس میں عورت ویسے ہی بہت نازک احساسات کی مالک ہو جاتی ہے
تو پھر بڑے غیر معمولی حالات سے گزر رہی تھی۔

''آپ کو حویلی کی وہ جامد زندگی اچھی لگتی تھی یا میرے ساتھ یوں مارے مارے پھرنا صحیح لگتا ہے؟''
آپ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ یاسیت کا شکار کشور اس سوال کو
چونک گئی۔ آفتاب کے سوال سے ظاہر تھا کہ اسے اس کی زود رنجی بری لگی تھی۔

''آپ کا ساتھ تو مجھے ہر حال میں اچھا لگتا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اب ہم کہیں سکون سے رہ سکیں۔
اک دوڑ بچے کی زندگی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پھر بعد میں جب بچہ دنیا میں آ جائے گا تو اور بھی مشکل ہو
گی۔ کیا وہ بے چارہ بھی ہمارے ساتھ یونہی اِدھر اُدھر بھاگتا رہے گا؟'' آفتاب کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار
لاتے ہوئے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ ساتھ خدشات کا بھی اظہار کیا۔

''آپ کی ہر خواہش، ہر خواب ضرور پورا ہوگا۔ ہمارا یہ مشکل وقت ہمیشہ ٹھہرا نہیں رہے گا۔ جیسے ہر رات
ضرور ہوتی ہے اسی طرح ہماری زندگی میں بھی خوشیوں کا سورج ضرور چمکے گا۔'' اسے اپنے ساتھ لگاتے

ہوئے آفتاب نے دلاسہ دیا۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن اس سورج کے نکلنے تک جانے کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہو جائیں گے۔ دل پر بڑا بوجھ ہے آفتاب! کتنے لوگ ہیں جو ہم پر قربان ہو گئے ہیں۔ رانی، افضل بھائی، بابر، اسلام، خالہ اور ان کا بیٹا اور اب وہ انجان شخص شفیق خان۔ اپنے باپ کی موت کے بعد تو اس کی بیٹی دنیا میں تنہا رہ گئی ہو گی۔ کیا اس نے اپنے دل میں ہمیں کوسا نہیں ہو گا کہ ہماری وجہ سے اس کے باپ کی جان چلی گئی۔ اس بے چاری کو اس کے باپ کی موت کا پُرسہ تک نہیں دے سکے۔'' وہ ٹھیک ٹھاک ڈپریشن کا شکار تھی۔

''میں اس لڑکی سے تعزیت کرنے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے خطرہ تھا کہ چودھری صاحب کے آدمی اردگرد ہی منڈلا رہے ہوں گے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اگر میرا شفیق خان سے کوئی تعلق ہے تو میں موت پر اس کی بیٹی سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ بس اسی ڈر اور احتیاط کی وجہ سے میں وہاں نہیں گیا۔ لیکن یقین رکھیں کہ مہک سے تعزیت اور معذرت دونوں کرنا مجھ پر قرض ہے۔ مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا یہ قرض ضرور ادا کروں گا۔ باقی بھی جو لوگ ہماری خاطر اپنی جان سے گئے، میرے دل میں بھی ان کے رنج ہے لیکن پھر میں خود کو یہ کہہ کر بہلا لیتا ہوں کہ اللہ نے سب کی موت کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ لوگ بھی اپنے وقت پر ہی اس دنیا سے گئے ہوں گے، بس حیلہ ہماری ذات بن گئی۔ اس طرح سوچنے کا مطلب نہیں کہ مجھے ان لوگوں کی قربانی کا احساس نہیں ہے۔ میں دل سے ان سب کا احسان مند ہوں۔ میرے پاس اس احسان کو اُتارنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں اور اللہ سے ان کے لیے جنت کے باغوں میں ہر نعمت عطا کر دینے کی درخواست کروں۔'' اس کا اپنا لہجہ بھیگنے لگا۔ جو لوگ مارے گئے تھے، اس کے لیے یہ بوجھ سہنا آسان نہیں تھا۔ لیکن وہ برداشت سے کام لے رہا تھا تو صرف کشور کی خاطر۔ وہ ہی حوصلہ چھوڑنے لگی تو اس کے اپنے دل کا درد بھی زبان پر آ گیا۔ کشور کے دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا اور فوراً ہی خود کو سنبھال کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ اُداس نہ ہوں آفتاب! میرا دل بس یونہی ذرا سا گھبرا گیا تھا اس لیے میں ایسی باتیں کر رہی تھی۔ میرا مقصد آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔'' آفتاب وہ شخص تھا جسے اس نے بے تحاشا چاہا تھا۔ اس کی کُل کائنات آفتاب کی ذات تک محدود تھی۔ وہ اسے کیسے اُداس اور پریشان دیکھ سکتی تھی؟ سو فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگی۔

''دل کو سمجھایا کریں نا۔ آپ کا دل پریشان رہے گا تو اس کا اثر ہمارے چھوٹو پر بھی پڑے گا۔ بے چارہ بال بال بچا ہے۔ اب تو ہمیں اس کی اور بھی زیادہ حفاظت کرنا ہو گی اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ اپنا خیال رکھیں۔ خوش رہیں اور اچھی خوراک لینے کے ساتھ ساتھ آرام بھی کریں۔ آپ کو ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ اب آپ کو بہت احتیاط کرنی ہے لیکن آپ خیال نہیں کرتیں اور بے احتیاطی کرتی ہیں۔'' اس نے خود بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کشور کو سمجھانے لگا۔

''میں اپنا خیال کیوں رکھوں؟ آپ ہیں نا میرا خیال رکھنے کے لئے۔'' دل رُبائی سے کہتے ہوئے اس نے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

''وہ تو میں رکھوں گا ہی۔ آپ مجھے عزیز نہیں ہوتی تو آج ہم یہاں نہیں ہوتے۔ لیکن میری جان! اگر میرے ساتھ تعاون بھی تو کرنا ہو گا۔ یہ اُداس اُداس رہنا اور اُلٹی سیدھی سوچوں میں اُلجھے رہنا تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا کر دے گا۔ آپ پہلی بار میں ہی خود کو اتنا نڈھال کر لیں گی تو اس فوج کا کیا بنے گا جو میں



میں تیار کرنے کا سوچ رکھا ہے۔'' اسے سمجھاتے سمجھاتے وہ کچھ شرارت پر اُتر آیا تو کشور نے اسے ناراضی سے گھور کر دیکھا۔

''آپ تو مجھے ایسے گھور رہی ہیں جیسے آپ کا تعلق محکمۂ بہبودِ آبادی سے ہے جنہیں دو سے زیادہ بچے اچھے نہیں لگتے۔'' آفتاب نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔

''بچے تو میرے خیال میں ماں کو کتنے بھی ہوں، اچھے ہی لگیں گے۔ لیکن بچوں کی فوج تیار ہونے کی صورت میں بچوں کے ابّے بُرے لگنے لگتے ہوں گے۔'' وہ بھی شرارت پر اُتر آئی۔

''بھئی، یہ تو ہمیں کسی صورت منظور نہیں کہ ہم آپ کو بُرے لگیں۔ اس لیے میرے خیال میں بچے دو ہی اچھے رہیں گے۔'' وہ فوراً تائب ہوا اور پھر دونوں کی ہنسی کی آواز کمرے میں گونج اُٹھی۔ اس ہنسی نے اُداسی کے بھانٹ دیئے جو کچھ دیر قبل وہاں چھائے ہوئے تھے اور زندگی تو نام ہی اس دھوپ چھاؤں کا ہے۔

⊛----✪----⊛

ڈاکٹر طارق کی بہن راحیلہ گھر پہنچ گئی ہے سر! اس کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق اسے اچانک ہی کراچی سے لے گیا تھا۔ اس نے بہن سے کہا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے اس لیے فوری طور پر کراچی ضروری ہے۔ راحیلہ کے مطابق وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران مسلسل طارق سے پوچھتی رہی کہ اسے کیا خطرہ ہے لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بعد میں وہ راحیلہ کے نام ایک خط چھوڑ کر خاموشی سے کہیں روانہ ہو گیا۔ راحیلہ نے اپنی بات کے ثبوت کے طور پر وہ خط مجھے دکھایا ہے۔ خط کی تحریر سے ثابت ہے کہ چودھری کو ماہ بانو کی کراچی کے گرلز ہاسٹل میں موجودگی کی خبر دینے والا ڈاکٹر طارق ہی تھا۔ میں آپ کو کاپی بھجوا دوں گا، فی الحال اس کے خاص خاص نکات زبانی بتا دیتا ہوں۔'' شہریار نے جس آدمی کو راحیلہ کی نگرانی پر متعین کر رکھا تھا، وہ اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا۔ شہریار خاموشی کے ساتھ بڑے انہماک سے اس کی بات سنتا رہا۔

''میرے لیے مزید کیا حکم ہے سر؟'' رپورٹ دینے کے بعد اس آدمی نے دریافت کیا۔

''تم فی الحال چھٹی کرو۔ آئندہ کوئی کام ہو گا تو میں تمہیں بتاؤں گا۔'' ڈاکٹر طارق کے فرار کے بعد کچھ کرنے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں ہوتا تو اسے اس حرکت کی پاداش میں سخت سزا بھگتنی پڑتی لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ طارق ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ای سی ایل میں اس کا نام ڈلوا دیتا لیکن اسے یہ خیال اس لیے نہیں آیا تھا کہ ایک تو یہ کنفرم تھا کہ اس تک اطلاع پہنچانے والا وہی ہے، دوسرے اس پر شک کرنے کے باوجود وہ یہی سوچ رہا تھا کہ طارق معاملہ ٹھنڈا ہونے کے انتظار میں اندرونِ ملک ہی کہیں عارضی طور پر چھپ کر رہ رہے ہیں اور منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ اس کی توقع کے مطابق ایسا ہوا بھی تھا لیکن صرف راحیلہ سامنے آئی تھی اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں وہ طارق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور راحیلہ اس سے بے قصور نظر آ رہی تھی۔ اس کا جو تھوڑا بہت قصور تھا، اس کی سزا بھی وہ بھائی کی طرف سے ملنے والی کی صورت میں بھگت چکی تھی چنانچہ نگرانی پر مامور آدمی کو فارغ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''یس سر۔ ایز یو وِش۔'' اس کا جواب سن کر دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ موبائل رکھ کر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر موبائل

اٹھایا اور جگو کا نمبر نکال کر اسے ڈائل کرنے لگا۔ ماہ بانو کے مسلسل غیاب نے اس کے دماغ میں چنگاریاں دی تھیں اور وہ ہر اس شخص کو سخت سزا دینا چاہتا تھا جو اس معصوم لڑکی کی زندگی کو بے سکون کرنے کا سبب نے دوسری بیل پر ہی اس کی کال ریسیو کر لی۔

''سلام صاحب! فرمایئے کیسے یاد کیا خادم کو؟'' اس کے انداز میں انکساری تھی۔ وہ کئی بار اس آنے کے باوجود اب بھی اس کے اس احسان کو نہیں بھولا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی زندگی بچہ بروقت ہسپتال پہنچ گیا تھا۔

''یاد تو تمہیں ایک کام سے ہی کیا ہے جگو! مجھے جس دشمن کا سامنا ہے، اس پر حملہ کرنے کے لیے بہتر آدمی نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے جگو کے سامنے اعتراف کیا۔

''یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کی مزاج پرسی کرنی ہے۔'' وہ فوراً ہی سمجھ گیا۔ ''آپ حکم دیں کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ کام کی گارنٹی میں آپ کو ابھی سے دیتا ہوں۔'' وہ بڑا پُراعتماد تھا۔ وہ جس سیاسی پا لیے غنڈہ گردی کرتا تھا، آج کل اس کا ستارہ عروج پر تھا چنانچہ پارٹی لیڈر کے علاوہ کارکنوں اور پالتو بھی موجیں ہو رہی تھی۔ جگو کی تو پھر بات ہی الگ تھی۔ وہ تو پارٹی لیڈر کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

''کیا کرنا ہے، یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ بس مجھے کام ایسا چاہئے کہ چودھری بلبلا اُٹھے۔'' اس خواہش جگو تک پہنچائی۔ اس وقت وہ اپنے اسٹڈی روم میں تھا اس لیے بہت کھل کر بات کر رہا تھا۔ اعتماد ہونے کے باوجود وہ صرف اس خدشے کی بنیاد پر کہ عورت کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا کہ کون سی بات ڈالے، اس سے اپنے معاملات پوشیدہ رکھتا تھا۔ راتوں کو بیڈروم چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے اسٹڈی میں گزار پیچھے ایک وجہ رازداری تھی جبکہ دوسرا سبب اس کی وہ دلی کیفیت بھی تھی جو ماریہ کو اپنا ہم سفر بنا لینے کے اسے اس کی قربت اختیار کرنے سے روکتی تھی۔ جانے کیوں اس کا دل اچھی خاصی خوبرو ماریہ کے لیے کو رغبت محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔

''میں سمجھ گیا سر! اطمینان رکھیں۔ کام آپ کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔'' دوسری طرف سے تسلی دے رہا تھا۔

''سچ پوچھو تو میری مرضی تو یہ ہے کہ چودھری جیسے بندے کے بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کر میں جانتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چودھری نہیں ہوگا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا لے لے گا اور معلوم ہی ہے کہ یہ سارے ہی ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو بار بار پہنچائی جائے کہ ان کا غرور ٹوٹ جائے اور یہ لوگ جو خود کو اس زمین پر خدا سمجھنے لگے ہیں، یہ سوچیں کہ ان کی مرضی سے ہی ہونا ممکن نہیں ہے۔'' جگو جس طرح اس سے تعاون کر رہا تھا، وہ اس سے غنڈہ باوجود اپنے دلی جذبات شیئر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''یہ زمینی خدا تو ہر جگہ ہیں سر! جس کا جہاں زور چلتا ہے، وہ اپنا کام دکھا دیتا ہے۔ کون سا جو.....'' جگو اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا لیکن ایک احساس نے شہریار کی توجہ اس کی بات سے ہٹا یوں لگا تھا کہ اسٹڈی کے دروازے سے باہر کوئی موجود ہے۔ بہت معمولی سی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس پہر کسی ملازم کی وہاں موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ملازمین رات دس بجے تک فارغ اپنے ٹھکانوں تک محدود ہو جاتے تھے اور صرف اسی صورت میں متحرک ہوتے تھے کہ انہیں حکم دیا پھر وہ کون تھا جو اسٹڈی کے باہر موجود تھا۔ کیا اس کا کوئی ملازم چپکے سے اس کی باتیں سننے کی کوشش



کے فون پر ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہو جانے کے بعد سے وہ سخت کا نشیس ہو گیا تھا اور ہر ایک کو شک نظروں سے دیکھ رہا تھا چنانچہ اب گھر میں موجود قابل اعتماد ملازمین بھی پہلے کی طرح قابل بھروسہ نہیں رہے۔

وہ اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھا تاکہ وہ جو کوئی ہے، اسے پکڑ سکے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول سامنے جو منظر تھا، وہ اس کے لیے قطعی ناقابلِ یقین تھا۔

اس کے سامنے ماریہ کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کی نہایت مہین کپڑے کی نائٹی تھی۔ یہ نائٹی کچھ انداز میں سلی ہوئی تھی کہ اس میں آستینوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور شانے پر دو پتلی پتلی ڈوریوں کی مدد کی ہوئی تھی۔ ایک تو اس کا حلیہ، دوسرے اس کی دروازے پر موجودگی نے شہریار کا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ دونوں کی شادی جیسے بھی حالات میں ہوئی تھی لیکن اب حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی بیوی کہلاتی تھی اور وہ ہرگز یہ بات پسند نہیں کر سکتا تھا کہ اگر کوئی ملازم اتفاق سے اس طرف آ جائے تو اس حلیے میں اس کی نظر اس کی پڑے۔ دوسرے اس کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سر سرایا کہ کیا ماریہ چپکے سے میری گفتگو سننے کی کوشش کر رہی ہے؟

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے نہایت سرد لہجے میں ماریہ سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے اے سی صاحب! کہ آپ اس وقت یہاں اسٹڈی میں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اُلٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''تمہارے اس سوال کا میں کیا مطلب سمجھوں؟'' اس کا لہجہ بدستور سرد ہی تھا۔

''مطلب بہت واضح ہے۔ آپ کو رات کے اس پہر اسٹڈی میں نہیں، اپنے بیڈروم میں ہونا چاہئے۔''

''مجھے کب کیا کرنا ہے، یہ میں خود طے کرتا ہوں۔ مجھے اپنے کاموں کے لیے کسی سے ڈکٹیشن لینا پسند نہیں۔'' اس نے گویا ماریہ کو اس کی حدود کے اندر رہنے کی تنبیہہ کی۔

''لیکن میں کسی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ سے شادی کی ہے اور آپ کو میرے حقوق ادا کرنے ہوں گے۔'' تلملا کر بولی۔

''کون سے حقوق؟..... میں نے تمہیں کیا نہیں دے رکھا؟ زندگی کی ہر سہولت تو حاصل ہے تمہیں۔'' اس قدم پیچھے ہٹ کر ماریہ کو اندر آنے کا راستہ دیا اور خود پر نہایت ضبط کرتے ہوئے لہجے کو قدرے نرم کر کے جواب دیا۔

''مجھے آپ حاصل نہیں ہیں شہریار! میرے پاس ہر شے موجود ہے لیکن آپ مجھے نہیں ملتے۔'' وہ ہسٹیریٹ لگی۔

''بیٹھو۔'' شہریار نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ اب وہ کچھ کچھ ماریہ کی کیفیت رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر اس قسم کے لباس میں اس کے پاس کیوں آئی ہے۔ نے جو نائٹی پہن رکھی تھی، اس میں سے اس کا شاداب جسم چھلکا پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے حسن کا جلوہ دکھا کر شوہر طرف راغب کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس طرح کی اداؤں کے جال میں پھنسنے والا آدمی تھا ہی نہیں۔ اسے میں کبھی حسن محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار بھی جانے کیسے ماریہ کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اسے کبھی وہ رات یاد آتی تھی تو وہ حیران رہ جاتا کہ آخر اتنی بڑی غلطی اس سے سرزد کیسے ہو گئی؟ اُس

رات جانے اس کا نفس اتنا سرکش کیسے ہو گیا کہ اس نے ماریہ کے وجود کو روند ڈالا۔ اپنی اس غلطی، اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس نے کوئی قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود ماریہ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا ڈالا لیکن تمام تر اچھائی کے باوجود اسے وہ محبت اور توجہ دینے سے قاصر تھا جس کی وہ ایک بیوی کی حیثیت سے طلب حق دار تھی۔ اس وقت بھی وہ جس طرح اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرنے آئی تھی، اس پر اس کوشش کا بالکل بھی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ عریانیت کے اس مظاہرے پر اسے بے ساختہ ہی نیلے پھولوں والی چادر کے حلقے میں لپٹا وہ سادہ سا چہرہ یاد آیا تھا جو بنا ہار سنگھار کے بھی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔

ماہ بانو..... جانے کہاں تھی وہ چھوٹی سی لڑکی جس سے وہ اپنی زندگی میں حقیقی معنوں میں متاثر ہوا تھا لیکن اسے یہ بات بتا نہیں سکا تھا۔ اور اب حالات اس نہج پر تھے کہ وہ مل بھی جاتی تو وہ اسے کچھ بتا نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے دل کی بات اب ہمیشہ اپنے دل میں ہی رکھنی تھی۔ ماہ بانو دل کے چاہے جتنے بھی قریب تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب صرف ماریہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی توجہ اور محبت کی حق دار ٹھہرے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اگر اسے محبت نہیں بھی دے سکتا تھا تو خوش خلقی سے پیش آنا تو اس کا فرض تھا۔ چنانچہ ماریہ کے کمرے پر بیٹھنے کے بعد خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر نرم رسان سے بولا۔

''دیکھو ماریہ! تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار عورت ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں جس پوسٹ پر کام کر رہا ہوں اس کس ذمے داری کی حامل ہے۔ اپنی ان ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے مجھے زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ میں ایک عام آدمی کی طرح گھر اور بیوی کو وہ توجہ دے سکوں جس کی تم مجھ سے خواہش کر رہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے تمہیں یہ بات سمجھانی نہیں پڑے گی لیکن آج تم نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے۔''

''میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ ایک بے حد مصروف آدمی ہیں۔ میں آپ کی اس روٹین کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی پوری کوشش کرتی بھی رہی ہوں لیکن مجھے آپ کا اپنے آپ کو بالکل ہی اگنور کر دینا اچھا نہیں لگتا۔ یہ روّیہ مجھے احساس دلاتا ہے کہ آپ نے مجھے مجبوراً اپنا لائف پارٹنر بنایا ہے۔'' اس نے اپنے دل میں پلتا شکوہ اس سے بیان کیا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟ میں نے تو کبھی تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کیا۔''

''میں مس بی ہیویر کی بات کر بھی نہیں رہی ہوں۔ میں اگنورینس کی بات کر رہی ہوں۔ آپ مجھے بتائے بغیر شہر سے باہر تک چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔'' اس نے شکایت کی تو وہ سمجھ گیا کہ ماریہ اس کے پچھلے دنوں لاہور جانے کا ذکر کر رہی ہے۔ بلکہ لاہور کا تو نام ہی تھا، حقیقت میں وہ اشیش کمار کی گرفتاری کے لیے اس پسماندہ گاؤں گیا تھا جہاں آفتاب اور کشور نے چودھری سے چھپنے کے لیے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو وہ ماریہ سے کسی صورت شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماریہ کو ایک اچھی مسلمان سمجھنے کے باوجود ابھی تک ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی سچائی اور ایمان داری کو آزما سکے۔ چنانچہ فی الحال اس سے سب کچھ پردے میں رکھنا ہی مناسب تھا۔

''سوری ڈیئر! مجھے بہت ایمرجنسی میں جانا پڑا تھا اس لیے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ لیکن عبدالمنان سے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں انفارم کر دے۔ کیا اس نے تمہیں انفارم نہیں کیا تھا؟'' اپنے لہجے کو پہلے سے کہیں زیادہ نرم کر کے اس نے اس کے سامنے اپنی صفائی دیتے ہوئے پوچھا۔



''جی ہاں، اس نے مجھے انفارم کیا تھا کہ آپ لاہور گئے ہیں لیکن جب میں نے رانا ہاؤس فون کر کے آپ سے بات کرنی چاہی تو وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ وہاں پہنچے ہی نہیں ہیں۔ میں آپ سے آپ کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ کبھی نہیں ہو سکا۔ آخر آپ ایسی کس جگہ پر تھے جہاں کوئی آپ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا؟'' وہ کچھ جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

''میں لاہور گیا ضرور تھا لیکن ماموں جان اور ممانی سے ملنے کے لیے نہیں۔ مجھے اپنے کچھ آفیشل کام تھے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے ایسا کیا کام تھا جو اتنی شدومد سے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی؟'' اس نے سرسری سی وضاحت دے کر اس سے پوچھا۔

''میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ مجھے حق دیتا ہے کہ میں بغیر کسی کام کے بھی آپ سے رابطہ کر سکوں۔'' ماریہ نے اسے جتایا۔

''میں مانتا ہوں۔ چلو اب چل کر سو جائیں۔ ورنہ یہیں بیٹھے بیٹھے گلے شکوے کرنے میں رات گزر جائے گی۔ مجھے آفس بھی جانا ہے۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ماریہ کو دونوں شانے تھام کر کھڑا کیا اور اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اسٹڈی سے باہر نکلا۔ قلبی جذبات جو بھی تھے، اسے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ڈھول کو بہر حال بجانا تو تھا ہی۔ فی الحال تو وہ اس لیے بھی ریلیکس ہو گیا تھا کہ ماریہ کو اسٹڈی کے دروازے کے باہر پا کر جن شکوک و شبہات نے جنم لیا تھا، وہ دور ہو گئے تھے چنانچہ اب وہ محبت کو ترسی ہوئی اس عورت کو جو قسمت کے اُلٹ پھیر سے اس کی بیوی کے عہدے پر فائز ہو گئی تھی، بہلانے کا فریضہ سرانجام دینے لگا۔

⊛----✪----⊛

''آپ کے لیے کچھ اہم خبریں ہیں سر!'' شہریار کو دفتر پہنچے دیر نہیں گزری تھی کہ عبدالمنان اس کے کمرے میں آیا اور کچھ جوش سے بولا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے پاس جو بھی خبریں ہیں، وہ بڑی زبردست ہیں۔ شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ماہ بانو کے بارے میں علم ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہے۔'' اسے متوجہ دیکھ کر عبدالمنان نے سنسنی خیز لہجے میں اطلاع دی۔

''کہاں ہے؟'' شہریار کا جسم یہ خبر سن کر تن گیا اور اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر۔''

''وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟'' عبدالمنان کے جواب نے اسے حیران کیا۔

''حویلی میں کی جانے والی زنانہ سازشوں کے نتیجے میں۔''

''کیا مطلب؟ کھل کر بتاؤ۔'' اس نے وضاحت چاہی۔

''آپ کو یہ تو علم ہے ہی کہ میں نے حویلی کی ایک ملازمہ کو وہاں ہونے والی گفتگو اور واقعات کی سن گن لینے پر لگا رکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ماہ بانو حویلی سے غائب ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ حویلی ہی کا کوئی شخص اس کام میں شامل ہے۔ میری ہدایت پر وہ ملازمہ کوشش میں لگی رہی کہ اسے کسی طرح کچھ علم ہو جائے۔ رواج میں اس کا زیادہ زور مردانے پر تھا اس لیے وہ کچھ پتہ نہیں کر سکی لیکن پھر بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ کے آنے والے حادثے نے اسے لیڈیز پارٹی کی طرف متوجہ کر دیا۔ فریدہ والے معاملے کا تو آپ کو علم ہو گا

ں۔'' بات کرتے کرتے اس نے سوال کیا۔

''ہاں، مجھے ماریہ سے معلوم ہوا تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ رات کو ہی تو اسے ماریہ نے بتا

یدہ سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاں قبل از وقت بچے کی پیدائش ہوئی ہے

نے دستیاب وسائل کے ساتھ کامیاب ڈیلیوری کروانے کے بعد ماں اور بچے دونوں کو لاہور کے کسی

پتال میں منتقل کروا دیا ہے۔ ماریہ نے شک ظاہر کیا تھا کہ فریدہ کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ کسی سا

تیجہ ہوسکتا ہے۔ شہریار خود بھی اس بات سے متفق تھا اور اب عبدالمنان بھی اسے کچھ بتانے جا رہا تھا۔

''میں نے جس ملازمہ کو ذمے داری سونپ رکھی تھی، اس نے بتایا ہے کہ جب فریدہ سیڑھیوں سے

اس وقت وہ خود بھی وہاں موجود تھی اور اس نے صاف یہ بات محسوس کی تھی کہ فریدہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں

لر آنے والی ملازمہ نے جان بوجھ کر خود کو اس انداز میں گرایا تھا کہ اس کا دھکا لگنے سے فریدہ بھی گر پڑے

رکت کرنے والی ملازمہ بڑی چودھرائن کے بہت قریب ہے چنانچہ میرے لیے کام کرنے والی عورت

میں مبتلا ہوگئی کہ کسی طرح حقیقت معلوم کرے۔ اس نے کوشش شروع کر دی کہ وڈی چودھرائن کے آس

رہ کر اس کی باتیں سن سکے۔ اس کی یہ کوشش کامیاب رہی اور چودھرائن اور اس کی بیٹیوں کی گفتگو سے اس

انکشاف ہوا کہ ان ماں بیٹیوں نے مل کر یہ سازش کی تھی کہ کسی طرح فریدہ کا ہونے والا بچہ ضائع ہو جائے

ماں بیٹیوں کی خواہش تھی کہ ان کے اور ان کی اولادوں کے سوا چودھری کا کوئی اور وارث پیدا نہ ہو

معلوم ہونے کے بعد کہ بہزاد شاہ کے ہاں اولاد ہونے والی ہے، انہوں نے سازش تیار کی کہ کسی طرح

میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے لیکن وہاں وہی معاملہ پیش آیا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ فریدہ

کے بچے کے بچ جانے پر ماں بیٹیاں بہت بھنائی ہوئی تھیں اور ارادہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اگر بچہ ہسپتال سے

یاب ہو کر واپس حویلی آ بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح اسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ اسی گفتگو کے دوران ماں

کے درمیان ماہ بانو کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ اس ذکر سے چوری چھپے گفتگو سننے والی ملازمہ کو علم ہوا کہ ماہ

چودھری کے شادی کرنے کا ارادہ جان کر وڈی چودھرائن کو یہ تشویش ہوگئی تھی کہ کہیں ماہ بانو حویلی کو

وارث نہ دے دے چنانچہ چودھرائن نے اپنے بڑے داماد اشرف شاہ کی مدد سے اسے حویلی سے

ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ ہر طرف اپنی حکمرانی کا سکہ چلانے والے چودھری کو حویلی میں ہونے

سازش کا علم ہی نہیں ہوسکا اور وہ ابھی تک بیٹھا لکیر پیٹ رہا ہے کہ ماہ بانو حویلی سے نکلی تو کس طرح؟''

عبدالمنان نے صبح صبح اسے واقعی بہت زبردست خبریں دی تھیں۔ ایک طرف یہ کنفرم ہوا تھا کہ فر

ساتھ پیش آنے والا حادثہ سچ مچ ایک سازش کا نتیجہ تھا تو دوسری طرف قطعی لاپتہ ہونے والی ماہ بانو کے

میں علم ہوگیا تھا۔ ماہ بانو، جو اس کے دل میں بسنے والی ایسی خاموش مکین تھی جس نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں

لیکن دل خود اس کے لیے مطالبے کرتا تھا۔ یہ بڑا عجیب اور انوکھا معاملہ تھا۔ دنیا کا اصول ہے کہ مکین

سجاتا سنوارتا ہے لیکن یہاں مکانِ دل خواہش کرتا تھا کہ اس کا مکین ہنستا بستا، خوش و خرم اور آباد رہے۔

بظاہر پُرسکون بیٹھے شہریار کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا دل کس بری طرح مچل رہا ہے کہ اگر

جائے اور کسی طرح ماہ بانو کو ڈاکوؤں کی قید سے آزاد کروا لائے۔

''یہ بہت بڑی کامیابی ہے عبدالمنان! اور اسے میں تمہارے خلوص نیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ

معمولی بات نہیں ہے کہ جس سازش کا علم چودھری کو نہیں ہوسکا، وہ ہم جان گئے۔ کوشش تو چودھری نے

نہیں کی ہوگی لیکن اسے کامیابی نہیں ملی۔ اس نے غصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔ مجھے ہرگز بھی وہ بہن بھا



ن کے ماں باپ کے جرم کی پاداش میں چودھری نے انہیں بے عزت کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا

اس کا اشارہ اس ملازم جوڑے کے بچوں کی طرف تھا جس نے ماہ بانو کو حویلی کے مہمان خانے سے فرار

ا تھا اور بعد میں خود بھی مردہ پایا گیا تھا۔

''چودھری کے ظلم کی داستانیں کون بھول سکتا ہے سر! آپ تو ابھی یہاں آئے ہیں، میں تو برسوں سے اس

ایت کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔ وہ انسانوں کو اپنے سامنے جھکائے رکھنے کا شوقین ہے اور جو جھکنے کے

ار نہ ہو، اسے کسی صورت بخشنے کو تیار نہیں ہوتا۔'' عبدالمنان نے تبصرہ کیا۔

''کوئی بات نہیں عبدالمنان! کہتے ہیں نا کہ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ اُتارا ہے..... تو یقین

ہ چودھری کے لیے بھی وقت یوم حساب لے کر ضرور آئے گا۔ جو سمجھانے پر نصیحت نہیں پکڑتے پھر انہیں

ب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کچھ لوگوں کی رسّی ڈھیلی ضرور چھوڑ دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ

لق کی طرف سے غافل ہوگیا ہے۔''

''بے شک سر! اب آپ بتائیں کہ کیا اقدامات کرنے ہیں؟ دونوں ہی لڑکیوں کا معاملہ گمبھیر ہے۔ اگر ہم

الخیر کی تو کہیں کچھ بُرا نہ ہو جائے۔'' اس کی تائید کرتے ہوئے عبدالمنان نے آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

''فریدہ کے معاملے میں تو مجھے چودھری بختیار سے بات کرنی ہوگی۔ اپنی بہن کے تحفظ کے لیے اسے خود

ھری سے بات کرنی ہوگی۔ میں دیکھتا ہوں کہ چودھری بختیار اس کام کے لیے راضی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ

ل ہوگیا تو ہمیں دخل اندازی کی ضرورت نہیں پڑے گی ورنہ دوسری صورت میں ہمیں فریدہ سے بات کر کے

قانونی تحفظ فراہم کرنا پڑے گا۔ رہا مسئلہ ماہ بانو کا تو اس کا واحد حل جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن

ا ہے۔ میں شروع سے اس آپریشن کا خواہش مند رہا ہوں لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اب تک یہ کام نہیں

ا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب اس معاملے کا مزید ٹالا جانا مناسب نہیں ہے۔'' وہ منٹوں میں سارے

کر چکا تھا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' عبدالمنان نے دریافت کیا۔

''تم اسٹاف پر نظر رکھو۔ ہمیں اندازہ ہونا چاہئے کہ ہمارے اسٹاف میں سے کوئی اور فرد تو چودھری کا

ادار نہیں ہے۔'' جب سے اس کی اور آفتاب کی ٹیلی فونک گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تھی، وہ اپنے اسٹاف کے

لے میں سخت کانشس ہوگیا تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ٹیلی فون آپریٹر چودھری کے لیے جاسوسی کے

ض انجام دے رہا ہے۔ لیکن وہ لوگ اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایسا شہریار

ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپریٹر کے خلاف کوئی کارروائی کر کے دوسروں کو چونکایا جائے۔

اسٹاف میں آپریٹر کے علاوہ بھی کوئی جاسوس تھا تو وہ اس صورت میں ہوشیار ہو جاتا۔

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی ایکٹیو ہوں۔ ایک کلرک پر مجھے شک بھی ہے لیکن کنفرم ہونے سے پہلے کچھ

ابیکار ہے۔''

''او کے! جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ معاملہ اچھی طرح سنبھال لو گے۔'' اس نے

المنان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

''تھینک یو سر! میں آپ کے اس یقین کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔'' جواباً وہ بڑے عزم سے بولا۔ پھر شہریار کا

رہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد شہریار نے آئی جی مختار مراد کا نمبر ملایا۔ اس کا نام سن کر ان

پی اے نے فوراً ہی اس کی ان سے بات کروا دی۔

''کیسے ہو شیری بیٹا!'' مختار مراد نے کال ریسیو کر کے پُر جوش انداز میں پوچھا۔

''فائن انکل! آپ سنائیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کہو کیسے یاد کیا ہے؟'' وہ سمجھتا تھا کہ دفتری اوقات میں اس کے کال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی نہ کسی خاص کام سے اسے یاد کیا ہے۔ چنانچہ بجائے مزید رسمی گفتگو میں اُلجھنے اور الجھانے کے اس سے دریافت کیا۔

''میں نے آپ سے کافی دن پہلے ایک بات کہی تھی، اسی کی یاد دہانی کروانی تھی۔'' اس نے تمہید باندھی۔

''کیسی بات؟''

''جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کی۔''

''کیا پھر کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟'' وہ چونکا۔ شہریار کے اس ایشو کو دوبارہ چھیڑنے سے ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے۔

''جب تک ہم ڈاکوؤں کو ان کے ڈیرے میں آرام سے رہنے دیں گے، مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ کافی بڑا آپریشن ہوگا۔ اتنے وسیع علاقے کو کور کرنا اور وہاں ڈاکوؤں کو پکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کام کے لیے بہت بڑی فورس اور جدید اسلحے کی ضرورت ہے۔ میں اس معاملے کو اگنور نہیں ہوں۔ یہ کیس انڈر پروسس ہے۔ ہم جلد اس آپریشن کے لیے اپنی تیاری مکمل کر لیں گے۔'' مختار مراد نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''آپ کی تیاریاں مکمل کرنے سے قبل اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟'' وہ وہی پرانی کہانی سن کر تھوڑا سا جذباتی تھا، اس لیے جذباتی ہو گیا۔

''کون؟..... کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔ اس کا سوال سن کر اسے اپنا جذباتی پن کا احساس ہوا چنانچہ خود کو سنبھال کر لہجے کو ہموار کیا اور بولا۔

''آپ کو وہ لڑکی تو یاد ہوگی جسے میں نے سجاد بھائی کے گھر میں ٹھہرایا تھا اور جس کے ذریعے ہم شینا تک پہنچے تھے۔''

''ماہ بانو۔'' مختار مراد فوراً ہی بولا۔ ماہ بانو کو بھولنے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہی تو تھی جس نے اسے اس کی پیاری نواسی تک پہنچایا تھا۔ بس بدقسمتی یہ تھی کہ وہ شینا کو زندہ حالت میں نہیں پا سکا تھا۔ وہ اور خواجہ سراؤں کے اس جنونی گروپ کے جنون کا شکار ہو گئی تھی جس کا سرغنہ ''را'' کا ایجنٹ ورما تھا۔ ورما خود اس خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان خواجہ سراؤں کا مہا گرو بنا بیٹھا تھا اور عجیب و غریب رسمیں رائج کر کے گروپ کے تمام ارمان کے دل و دماغ اپنے قابو میں کر رکھے تھے۔ وہ ان خواجہ سراؤں کو عیش پرست سرکاری افسران اور دیگر اہم شخصیات کے پاس بھیج کر ان سے جاسوسی کے کام لیتا تھا۔ اس نے ہی یہ رسم رائج کی تھی کہ اگر وہ لوگ پورن ماشی کی رات میں دیوی ماں کے چرنوں میں ایک کنواری لڑکی کو بھینٹ چڑھا کر یہ پرارتھنا کریں کہ اے بھگوان ان جیسے نامکمل انسانوں کو اس سنسار میں نہ بھیجے تو بھگوان ان کی سن لے گا۔ اپنی اس رسم کو پورا کرنے کے لیے چند خواجہ سراؤں نے شینا کو کالج جاتے ہوئے راستے میں اغوا کر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی اور آئی جی مختار مراد کی نواسی ہے۔ انہوں نے اس ادھ کھلی کلی جیسی لڑکی کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ دے دی۔



ماہ بانو نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ان دنوں ان ظالموں کی قید میں تھی۔ قسمت سے اس قید سے فرار ہوئی اور شہریار تک پہنچی تو شینا کی تصویر دیکھ کر اسے شناخت کر لیا۔ اس شناخت کے بعد اس کی شینا کو تلاش کرنے کی جدوجہد تو اپنے اختتام کو پہنچی لیکن اس کے قاتلوں کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کل کے اس سفر میں سجاد رانا اپنی جان سے چلا گیا جبکہ شہریار کی جدوجہد ابھی جاری تھی اور وہ خود کئی بار موت سے دوچار ہو چکا تھا۔

''کیا ماہ بانو ڈاکوؤں کی قید میں ہے؟'' مختار مراد نے اندازہ لگایا۔

''جی ہاں۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔ ''وہ وہاں کیسے پہنچی؟'' اس نے شہریار سے دریافت کیا تو جواباً اس نے سارے حالات سمجھا دیے۔

''اوکے، میں کوشش کرتا ہوں کہ کچھ کر سکوں لیکن ایک لڑکی کے لیے جو کہ کوئی خاص سوشل اسٹیٹس بھی نہیں رکھتی، سرکاری طور پر اتنا بڑا آپریشن شروع کرنا مشکل ہوگا۔'' مختار مراد نے صاف گوئی سے اس پر صورتِ حال واضح کی۔ اس جواب پر وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ بے شک ماہ بانو کسی خاص سماجی رتبے کی حامل نہیں ہے لیکن خود اس کے لیے بڑی خاص ہے۔

''میں نے تمہیں انکار نہیں کیا ہے، صرف یہ واضح کیا ہے کہ یہ کام مشکل ثابت ہوگا۔ باقی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' شہریار کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ اس سے بولا۔

''تھینک یو انکل! مجھے آپ سے پورے تعاون کی امید ہے۔'' شہریار نے اس پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

''اور مجھے امید ہے کہ میں جلد تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔'' مختار مراد نے اسے یقین دہانی کروائی۔

''میں بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کروں گا۔'' اس نے یہ کہنے کے بعد اجازت لے کر فون بند کر دیا۔ رابطہ منقطع کرتے ہی وہ اپنی کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے موجود دیوار کو گھورنے لگا۔ مختار مراد سے بات کرتے ہوئے اسے اپنی قلبی کیفیات کو چھپانے کے لیے بڑے ضبط سے کام لینا پڑا تھا ورنہ اس کا بس چل رہا تھا کہ اس سے گھڑی کی چوتھائی میں آپریشن کا آغاز کر دینے کی فرمائش کر ڈالے۔ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا لیکن دل ایسی باتیں کب سمجھتا ہے؟ اس کا کام تو اپنی بے چینی کو جسم کے باقی حصوں میں منتقل کر دینا ہے۔ شہریار کے دل نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ وہ بظاہر پُرسکون بیٹھا ہوا تھا لیکن درحقیقت اس کے سارے اعصاب تنے ہوئے تھے اور اس کا دماغ مسلسل گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا کہ ایسی کیا تدبیر کرے کہ ماہ بانو کی آزادی کا سامان ہو سکے۔

⊛----✪----⊛

آج صبح سے ماہ بانو کو ڈیرے پر کچھ غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اپنی رائفل کو تیل دے رہا تھا کوئی میگزین کی پیٹی چیک کر رہا تھا۔ اسلم سمیت آٹھ دس افراد ایسے تھے جو زیادہ مصروف نظر آ رہے تھے۔ ان سب نے صبح اُٹھتے ہی ٹھیک ٹھاک ورزش کی تھی اور پھر ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنے اسلحے کے ساتھ صاف ہو گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا معمول سے کچھ جلدی کھایا گیا تھا اور کھانے کے بعد قیلولہ کر کے وہ آٹھ دس افراد لباس کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے جسم پر اسلحہ سجانے لگے تھے۔

آج اسلم نے بھی اپنی جینز اور ٹی شرٹ کو ترک کر کے سب کی طرح سیاہ گھیر دار شلوار قمیض پہنی تھی۔ اس کی وجہ سمجھ آ رہی تھی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کے حلیے کی وجہ سے اس کے باقی ساتھیوں سے

الگ شناخت کیا جا سکے۔ ان ساری تیاریوں کو دیکھ کر ماہ بانو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ڈاکوؤں
ڈیرے پر تھی اس لیے اس کے لیے ان تیاریوں کو دیکھ کر یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لوگ کسی واردات
لیے جا رہے ہیں۔ اسے اسلم کا اس مہم میں شامل ہونا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ حقیقت یہ تھی کہ اسلم
ایک ڈاکو تھا اور کافی عرصے سے ان ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈال رہا تھا لیکن اس نے اسلم کا جو اصل
دیکھا تھا، اسے دیکھنے کے بعد اس کا دل اسے ڈاکو ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتا تھا۔ حالات کی ستم
اسے یہاں لے آئی تھی تو یہ بھی ممکن تھا کہ قسمت کی مہربانی اسے یہاں سے نکال لے جاتی۔ قسمت کی
مہربانی تک اگر وہ اپنے کھاتے میں مزید جرائم درج نہ کرواتا تو یہی بہتر ہوتا۔ لیکن وہ اسلم کو روک بھی کس
سے سکتی تھی؟ بے شک وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اس چاہت میں کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی چاہت
فائدہ اٹھانے یا اپنی بات منوانے کا حق تو اسی کو ہوتا ہے جو خود بھی جواب میں اسے اتنا ہی چاہے۔ کم از کم
تو یہی سمجھتی تھی چنانچہ اسے اسلم کو روکنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

اسلم خود ہی روانگی سے کچھ دیر قبل اس کے پاس آیا۔ جینز اور ٹی شرٹ کی طرح اس پر سیاہ گھیر دار
قمیض بھی کافی جچ رہی تھی لیکن ماہ بانو نے اسے اس لباس میں پسند نہیں کیا۔ یہ لباس ان ڈاکوؤں کی پہچان
بلاتفریق ہر کسی کو لوٹ لیتے ہیں۔ لٹنے والا کوئی سرمایہ دار ہے یا وہ ریٹائرڈ باپ جس نے اپنی کل پونجی
رخصت کے لیے سنبھال کر رکھی ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

''تم سمجھ تو گئی ہو گی کہ یہاں کیا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس کچھ دیر بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ
ہونے والا ہوں۔'' اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا وہ یہ جملے کہتے ہوئے اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

''تمہارا جانا ضروری ہے کیا؟'' ماہ بانو نے اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ہاں، ضروری ہے۔ کب کس جگہ کس کو جانا ہے، اس بات کا فیصلہ سردار کرتا ہے اور ہم میں سے
سردار کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' اس نے بتایا پھر کچھ چونک کر پوچھنے لگا۔ ''کہیں تم میرے
سے اس لیے تو پریشان نہیں ہو کہ میری غیر موجودگی میں کوئی یہاں تم سے بدتمیزی کرے گا؟''

''نہیں..... جس سے زیادہ خطرہ رہتا ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہی جا رہا ہے۔'' اس کا اشارہ جمرو کی طرف
تھا۔ سردار نے اس مہم کے لیے اس کا نام بھی منتخب کیا تھا۔

''پھر..... پھر تم کیوں نہیں چاہتیں کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاؤں؟'' اس نے حیرت سے
''کیونکہ تم جنہیں اپنا ساتھی کہتے ہو، وہ حقیقت میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔ تم ان سب سے
مختلف ہو۔''

''میں ان سے مختلف تھا لیکن اب نہیں رہا۔ اب تو میں انہی کا حصہ ہوں۔'' اس نے فوراً ہی ماہ بانو کی
تردید کی۔

''تم نے کبھی تیل اور پانی کو ایک ہوتے دیکھا ہے اسلم؟ ان دونوں چیزوں کو اگر ایک برتن میں ڈال
یہ ایک نہیں ہوتے۔ پانی پر تیل کی تہ الگ نظر آنے لگتی ہے۔ تم ابھی ان کے درمیان ضرور رہ رہے ہو لیکن حقیقت
میں ان کے ساتھ یکجان نہیں ہوئے ہو۔ تم چاہو تو اب بھی ان سے الگ ہو سکتے ہو۔'' وہ اسے اپنی محبت کا
دے کر نہیں روک سکتی تھی لیکن جو سچ تھا، وہ تو سمجھا سکتی تھی چنانچہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''میں ابھی اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ابھی سردار
آخری ہدایات لینے کے لیے اس کے پاس بھی جانا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم اس بحث کو پھر کسی وقت کے



ا۔''

اسلم نے اس کے پاس مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس کا جواب سن کر وہ چپ سادھ گئی۔ وہ خود ہی
ں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''اب اجازت دو۔ جانے دو۔ پھر دوبارہ ہماری ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں۔ میں روانگی سے پہلے تم سے
ی لیے آیا تھا کہ تمہارا چہرہ اپنی آنکھوں میں سما کر لے جاؤں۔'' اس کے لہجے میں وہی آنچ تھی جو اس کی
محبت کا اظہار بن جاتی تھی۔ ماہ بانو کی مجبوری تھی کہ اسے اس محبت سے نظریں چرا کر ہی رہنا پڑتا تھا البتہ
نے اتنا ضرور پوچھ لیا۔

''کیا کسی بہت خطرناک کام کے لیے جا رہے ہو؟''

''ہمارا کام ہے ہی خطرے کا۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ کہیں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور کہیں کم۔ آج ہم جہاں جا
ہیں، وہاں ذرا زیادہ مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''افسوس کہ میں تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ جس کام کے لیے جا رہے ہو اس میں کامیابی حاصل
ہو۔'' ماہ بانو نے تاسف کا اظہار کیا۔

''میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔ یوں بھی دعا ہونٹوں پر بہت بعد میں آتی ہے، دل پہلے سے خود ہی دعا
ہو جاتا ہے اور اصل بات ہوتی ہی دل کی ہے۔ میرا تمہارے دل پر تو یوں بھی اختیار نہیں ہے۔'' وہ اپنی بات
کر فوراً ہی اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ ماہ بانو کی
ں اس کے دور ہوتے وجود پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ خوب صورت شخصیت کے مالک اسلم کے قدموں کی جنبش
ں بڑی مضبوطی تھی۔ اس کا اٹھتا ہر قدم بتا رہا تھا کہ وہ اپنے جسم میں شیر کا سا دل رکھتا ہے اور کوئی خطرہ اس کے
موں میں لڑکھڑاہٹ پیدا نہیں کر سکتا۔

''اے اللہ!..... اس شخص کو زندہ سلامت یہاں واپس لانا۔'' ماہ بانو کے دل نے بے ساختہ ہی دعا کی۔
اسلم کو اس کی دعا کی خبر ہو جاتی تو وہ پھولے نہیں سماتا۔ وہ تو اس وقت صرف دو باتوں کے بارے میں سوچ
تھا۔ ایک آج کی مہم کے بارے میں جو یقیناً کچھ دشوار ثابت ہوتی اور دوسرے ماہ بانو کے بارے میں اگر
اسے کچھ ہو جاتا ماہ بانو کے لیے ڈیرے پر بڑی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ عورت کے وجود کو ترسے ہوئے
کے ساتھی اس کی موت کی صورت میں کبھی بھی ماہ بانو کو نہیں بخشتے اور اسلم جانتا تھا کہ اس لڑکی کے لیے اپنی
ت کا جوہر کھو دینا سب سے زیادہ اذیت ناک تجربہ ہو گا۔ سردار کی جھونپڑی میں ہدایتیں سنتے ہوئے بھی اس
ہن مسلسل اس مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔

''آج کی کارروائی میں اسلم تم لوگوں کا سردار ہو گا۔'' ساری ہدایات جاری کر دینے کے بعد سردار نے
ان کیا اور مزید بولا۔ ''تم میں سے ہر ایک کو اسلم کی گل بالکل ایسے ہی سننی ہو گی جیسے یہ اسلم نہیں، میں
ں۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے سردار نے بطور خاص جمرو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس ہدایت کو سن کر اپنی جگہ پہلو
کر رہ گیا۔

''تم سب باہر جاؤ۔ میں اسلم سے اکیلے میں بات کروں گا۔'' آخر میں سردار نے حکم سنایا تو سب لوگ
ایک کر کے باہر نکل گئے۔ صرف اسلم اپنی جگہ پر رکا رہا۔

''خیال رکھنا اسلم! اس کارروائی میں زیادہ مال ہاتھ آئے یا نہیں، کام اس طرح سے کرنا کہ واردات بڑی
آئے۔ اس کام کے لیے اپنا معاوضہ ہم وصول کر چکے ہیں۔ جو مال اوپر سے ہاتھ لگا، وہ ہمارا بونس ہو گا۔ اس

کے لیے کسی کو بھی زیادہ لالچ میں نہیں پڑنے دینا۔ جمرو اور جیدا ذرا زیادہ لالچی فطرت کے ہیں۔ ان دو
خاص نظر رکھنا۔ عورت کے معاملے میں، میں پہلے ہی سختی سے کہہ چکا ہوں کہ کسی کو لالچ نہیں دکھانا ہے۔ ا
لوگوں میں سے کوئی زیادہ سرکشی دکھائے تو میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ اس سے جتنی چاہے
نمٹنا۔'' سردار نے اسے اختیارات سونپے۔

''فکر نہیں کرو سردار! جیسا تم نے کہا ہے، سب ویسے ہی ہوگا۔ میں کسی کو تمہاری ہدایت کے خلاف
نہیں مارنے دوں گا۔ لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننی پڑے گی۔''

''وہ کیا؟'' اسلم کا مطالبہ سن کر سردار چونکا۔

''کوئی زیادہ بڑی فرمائش نہیں ہے۔ میں تم سے ماہ بانو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''واپس آ کر گل کر لینا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔'' سردار نے کچھ جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''یہی تو وقت ہے بات کرنے کا..... بعد میں جانے کیا ہو؟ ہمارے کام کا کوئی بھروسہ تو ہے نہیں۔
واپس آنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔''

''تُو ڈر رہا ہے اسلم؟'' سردار نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ڈر نہیں رہا، حقیقت پسندی سے کام لے رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اچھا بول، کیا گل ہے؟'' سردار نے بے نیازی سے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم ماہ بانو کا پورا خیال رکھنا۔ میرے بعد اس کی عزت
آنچ نہیں آنا چاہیے۔ اگر کبھی تمہیں لگے کہ یہ کام مشکل ہے تو پھر بے شک ماہ بانو کو گولی مار دینا لیکن اسے
حیدان نہ بنانا۔'' سردار سے یہ سب کہتے ہوئے اسلم کی آواز لرز رہی تھی۔

''تُو فکر نہ کر..... میں خیال رکھوں گا۔ ہور یہ تو مجھے بھی ملوم ہے کہ میرا شیر نا کام نہیں رہے گا۔ ابھی
مان نے وہ لال نہیں جنا جو میرے شیر کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔ تُو جا، میں اِدھر تیرا انتظار کر رہا ہوں۔
تیری ماہ بانو بالکل چنگی بھلی ملے گی۔'' سردار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی تو وہ مطمئن
کر باہر نکل گیا۔ باہر اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے۔ قریب ہی وہ گھوڑے بھی کھڑے تھے جن پر سوار ہو
انہیں یہاں سے جانا تھا۔ ان تازہ دم گھوڑوں کو مالش وغیرہ کر کے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ جیسے ہی اسلم
نکل کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا، باقی ساتھی بھی الرٹ ہو گئے اور اس کے رکاب میں پیر رکھتے ہی خود
اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ جنگل کے ماحول سے آشنا گھوڑوں نے تیزی سے اپنا سفر شروع کر دیا۔ را
کا اندھیرا اس سفر میں قطعی رکاوٹ نہیں تھا کہ سواری اور سوار دونوں اس ماحول میں رچ بس چکے تھے اور ا
ان راستوں پر چلنے کے لیے روشنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھپ اندھیرے میں اپنے تجربے کی
پر سفر جاری رکھ سکتے تھے اور آج تو خوش قسمتی سے چاندنی رات تھی۔ گھنے جنگل میں درختوں کے پتوں سے
چھن کر آتی چاندنی نے ان کے راستے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔

وہ بڑی خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ ان کی منزل طے شدہ تھی اور کام کا طریقہ کار بھی، اس لیے نی ا
انہیں ایک دوسرے سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جنگل کی ان راہوں میں جنگلی جانوروں کے بو
اور ہوا کی سرسراہٹوں کے علاوہ اگر کوئی آواز سنائی دے رہی تھی تو وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ ایک آ
سے سنائی دینے والی ان آوازوں نے فطرت کی آوازوں کے ساتھ مل کر موسیقی کا روپ دھار لیا تھا لیکن
موسیقی نہیں تھی جس سے سننے والے کو خوشی اور سکون کا احساس ہو۔ یہ ہارر فلموں میں ماحول کی خوفناکی کے تا



اگر دینے والی موسیقی تھی لیکن وہ سارے کے سارے اس کی خوفناکی سے بے نیاز تھے کیونکہ وہ خود بہت
اک تھے اور ان کی دہشت اردگرد کے دیہاتوں کے رہائشیوں کے دل لرزا دیتی تھی۔ وہ جہاں جاتے
اں کے لوگوں کے جان، مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی تھی۔

ایڑھ گھنٹے کے قریب سفر کرنے کے بعد وہ ایک مقام پر رک گئے۔ رکنے کے بعد اسلم نے اپنی جیب سے
ٹالی اور اس کا رخ شمال کی طرف کر کے وقفے وقفے سے تین بار جلائی بجھائی۔ جب تیسری بار جلنے کے
رخ بھی تو شمال کی طرف سے روشنی کی ایک لکیر سفر کرتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ یہ کسی کے ہاتھ میں روشن
ارچ کی روشنی تھی۔ اس روشنی کے نظر آتے ہی اسلم اور اس کے دو تین ساتھیوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر
یں اب ماحول اتنا روشن تھا کہ وہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ پنسل ٹارچ روشن کرنے والا تنہا
تھا، اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔

''جیپیں ریڈی ہیں؟'' اسلم نے دریافت کیا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ۔'' جواب ملا اور اس کی طرف چابیاں اچھال دی گئیں۔ اسلم نے پھرتی سے انہیں کیچ کر
ایک چابی اپنے پاس رکھنے کے بعد دوسری جمرو کی طرف اچھال دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ایک
وہ خود چلائے گا جبکہ دوسری جمرو کو چلانی ہوگی۔ چابیوں کی وصولی کے بعد وہ لوگ گھوڑوں سے نیچے اترے
ک طرف کھڑی جیپوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں سے آگے انہیں جیپوں میں سفر کرنا تھا۔ ان کی واپسی تک
ے گھوڑے یہیں رہتے۔ جن افراد نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں، وہ ان کی واپسی تک گھوڑوں کی دیکھ
گرتے اور پھر ان کے حوالے کر دیتے۔ یہ ان لوگوں کا مخصوص طریقِ کار تھا۔ اگر انہیں اردگرد کے کسی
ت میں کارروائی کرنی ہوتی تو اپنے گھوڑوں پر دندناتے ہوئے دیہاتوں میں گھس جاتے لیکن اگر دیہاتوں
ٹ کر کسی چھوٹے یا بڑے شہر میں جانا ہوتا تو جیپوں کا استعمال لازمی تھا۔ ان جیپوں کا انتظام وہ کسی نہ کسی
گر لیتے تھے۔ ان کے اپنے ذرائع بھی تھے اور کبھی کام لینے والی پارٹی بھی سہولت فراہم کر دیتی تھی۔ اسلم
شارہ کیا تو وہ سب ایک ایک کر کے جیپوں میں سوار ہونے لگے۔ اسلم کھڑا نگرانی کرتا رہا اور آخر میں ان
افراد سے جنہوں نے انہیں جیپیں فراہم کی تھیں، ہاتھ ملا کر خود بھی ایک جیپ میں سوار ہو کر اس کی
گ سیٹ سنبھال لی۔ کچھ دیر کے لیے رک جانے والا ان کا سفر دوبارہ شروع ہوا تو بے شک سواری بدل گئی
ن ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سب اب بھی بالکل خاموش تھے۔ ماحول کی ہولناکی بھی قائم
رق پڑا تھا تو صرف اتنا کہ اب گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور چونکہ وہ جنگل سے باہر نکلتے جا رہے
ں لیے جنگلی جانوروں کی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی جگہ انجن کی
گھرر نے لے لی تھی۔ وہ اپنے اس سفر کو اتنا خفیہ رکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے احتیاطاً ہیڈ لائٹس بھی آن
کی تھیں اور صرف چاند کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ تیز رفتار جیپیں راستے کی طوالت کو بڑی خوبی سے
رتی چلی جا رہی تھیں۔

آخر کار وہ نور کوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ نور کوٹ میں ان کا رخ اس بنگلے کی طرف تھا جس میں
ر رہائش پذیر تھا۔ بنگلے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی جیپیں روک لیں۔ دونوں جیپیں ایک دوسرے سے
اصلے پر تھیں۔ چونکہ وہ طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔
یپ کو جمرو ڈرائیو کر رہا تھا، اس میں سے تین افراد اُترے اور بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ دیوار
چائی اچھی خاصی تھی اور کوئی شخص اکیلا اپنے بل بوتے پر اسے نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ ان تین میں سے ایک

اکڑوں بیٹھ گیا اور دوسرا اس کے شانوں پر پیر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اکڑوں بیٹھا ہوا شخص آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا اس کے کھڑے ہونے کے نتیجے میں اس کے شانوں پر سوار آدمی کے ہاتھ بلند دیوار کی منڈیر کو پکڑنے کے ہو گئے لیکن دیوار پر خاردار تار بچھے ہوئے تھے چنانچہ جیسے ہی اس نے منڈیر کو پکڑ کر خود کو اوپر اٹھانا چاہا، اس انگلیوں میں لوہے کے کئی تار چبھ گئے۔ اس نے زیرلب ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پیچھے ہٹایا اور پھر اپنے سر پر موجود بڑے سے پگڑ کو کھولنے لگا۔ پگڑ کھول کر اس نے اسے دیوار پر بچھایا۔ کے تہ دار کپڑے نے کافی آسانی پیدا کر دی اور وہ زور لگا کر اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دیوار اوپر تھا۔ دیوار پر چڑھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر بجنے والی گھنٹی کی آواز سنی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ پر موجود اس کے ساتھی حرکت میں آ گئے ہیں۔ ڈور بیل بجانے کا مقصد بنگلے کے چوکیدار کا دھیان بٹانا چوکیدار کے بارے میں انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ رات بھر بنگلے کے احاطے کا وقفے وقفے سے چکر لگاتا ہے۔ بیل کی آواز سن کر وہ مین گیٹ کی طرف چلا جاتا تو وہ آسانی سے عقبی دیوار پھاند کر بنگلے کے احاطے داخل ہو جاتا۔

بنگلے میں چوکیدار ہی وہ واحد شخص تھا جو مسلح رہتا تھا۔ باقی ملازمین روزمرہ کے کام انجام دیتے انہیں اسلحہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چوکیدار کے علاوہ مزید حفاظتی عملہ رکھنا شہریار نے خود پسند نہیں چنانچہ انہیں بس اسے ہی سب سے پہلے قابو کرنا تھا۔ عقبی سمت میں چوکیدار کی غیر موجودگی کی یقین دہانی جانے کے بعد اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگا دی یہ ایک کچی تلی چھلانگ تھی چنانچہ معمولی سی ہی آواز ہوئی۔ اس کے دیوار پھلانگ جانے کے بعد ان کا تیسرا ساتھی بھی اسی ترکیب کے مطابق اوپر چڑھا اور اس قریب ہی چھلانگ لگا کر بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ اب ان کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ چند قدم آگے جاتے ہی انہیں چوکیدار نظر آ گیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا شریر لڑکوں کو کوس رہا تھا جن کو رات کے اس پہر بھی چین نہیں تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس گھنٹی بجا کر اسے گیٹ تک دوڑانے والے علاقے کے شریر لڑکے نہیں بلکہ گھاگ ڈاکو ہیں۔ اپنی ہی دھن چلتا ہوا وہ بالکل بے خبری میں گھات لگا کر بیٹھے ان ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا جو اس کے لیے پروانۂ اجل آئے تھے۔ ان میں سے پہلے دیوار پھلانگنے والے نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑی اور اس زور سے کہ وہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ قاتل لاش کو سنبھال کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لٹانے میں مصروف ہو گیا جبکہ اس کا ساتھی تیزی سے مین گیٹ طرف بڑھ گیا اور گیٹ کی کنڈی کھول کر اسے پوری طرح سے وا کر دیا۔

گیٹ کھلتے ہی باہر منتظر ان کے ساتھی ڈاکو تیزی سے اندر آنے لگے۔ اندر آ کر ان میں سے کچھ تو سرا کوارٹرز کی طرف بڑھ گئے جبکہ کچھ نے بنگلے کی مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ پیدل اندر داخل ہونے والوں اسلم اور جمرو شامل نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے اندر آنے کے بعد آخر میں جیپوں سمیت اندر آئے۔ اندر آتے ہی گیٹ ایک بار پھر بند کر دیا گیا۔ اسلم اور جمرو جیپوں سے چھلانگ لگا کر اُترے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملے جو مرکزی عمارت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے پاس موجود وسامان کی مدد سے دروازے کا لاک بڑی مہارت سے کھول لیا تھا اور اب مزید ہدایات کے منتظر تھے۔

''تم دونوں پیچھے کی طرف جا کر دھیان رکھو۔ باقی لوگ میرے ساتھ اندر جائیں گے۔'' اسلم نے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا اور خود دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے باقی ساتھی اس



لے۔

''تم کچن کی طرف جاؤ۔'' اندر پہنچ کر اس نے جیدے نامی ڈاکو کو حکم دیا۔ جیدے کو اس نے کچن کی طرف بھیجا تھا کہ ان کے پاس موجود معلومات کے مطابق ملازمین میں سے صرف بٹلر وہ واحد شخص تھا جو کوارٹر کے بجائے کچن سے ملحق کمرے میں رہتا تھا اور دن رات کے کسی بھی حصے میں خدمت بجا لانے کو رہتا تھا۔ بٹلر کی طرف سے کسی گڑبڑ سے بچنے کے لیے اسے پہلے سے قابو کر لینا ضروری تھا۔

''تم لوگ نیچے کے کمروں کی تلاشی لے کر جو بھی قیمتی مال ہاتھ لگے، اسے جمع کر لو۔ ہم تینوں اوپر جائیں گے۔'' جمرو اور ایک دوسرے ساتھی کو اپنے ساتھ اوپر جانے کا فیصلہ سنا کر اس نے باقی لوگوں کو حکم دیا تو وہ سب انداز میں حرکت میں آ گئے۔ اسلم نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خود اوپر کا رخ کیا۔ جمرو اور اس کے حکم کے غلام بنے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہ ابھی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے ہی تھے کہ انہیں شب خوابی کے لباس میں ملبوس شہریار ایک کمرے دروازے سے باہر آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا پسٹل تھا۔ یقیناً اس نے بنگلے میں سرگرمیوں کے نتیجے میں ہونے والی کھٹ پٹ کی آہٹ پا لی تھی اور اب پسٹل ہاتھ میں لیے جائزہ لینے رہا تھا۔ باہر آتے ہی اس کی نظر اسلم اور اس کے ساتھیوں پر پڑ گئی۔ تین نقاب پوشوں کو اپنے سامنے دیکھ وہ بری طرح ٹھٹکا اور قریب تھا کہ ردِعمل کے طور پر فوراً فائر کر دیتا کہ اسلم نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور کی چلائی ہوئی گولی نے شہریار کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دور جا گرایا۔ فائر بے آواز تھا اس لیے کسی بیرونی مداخلت کا امکان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''اسمارٹ بننے کی ہرگز بھی کوشش مت کیجئے گا اے سی صاحب! میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ آپ کو اپنی کسی حرکت کے نتیجے میں گولی کھانی پڑے گی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کسی ہتھیار سے نکلنے والی گولی کے جسم میں چھید کر کے اسے عالم بالا بھی پہنچا سکتی ہے، ورنہ کم از کم بھی زخمی ہونے اور خون بہنے کا امکان ہوتا ہی ہے۔'' شہریار کی نظروں نے پسٹل ہاتھ سے نکلتے ہی اس سمت میں سفر کیا تھا جہاں پسٹل جا کر گرا تھا اسلم نے فوراً ہی اسے تنبیہہ کر ڈالی۔

''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' نہایت ہموار لہجے میں اس سے یہ سوال کرتے ہوئے شہریار کے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی دھمکی سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوا ہے۔''

''ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، یہ آپ ہمارے واپس جانے تک جان لیں گے۔ فی الحال آپ واپس چلیں۔''

اس نے ریوالور کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا جس کی شہریار نے خاموشی سے پیروی کی۔ اور جمرو اسے زد میں لیے ہوئے خود بھی پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی پہلے ہی جا چکا تھا اور اس نے بیڈ پر ٹانگیں سمیٹ کر خوف زدہ سی بیٹھی ہوئی ماریہ کو زد میں لیا ہوا تھا۔ گلابی مہین نائٹی اپنے سنہری کھلے بالوں کے ساتھ بیٹھی ماریہ کے وجود میں کسی مرد کی توجہ کھینچ لینے کا پورا سامان تھا۔ جمرو کی اس کے وجود پر پڑی تو وہیں چپک کر رہ گئی۔

''لاکر کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم یہاں سے صرف نقدی اور زیور لے کر جائیں گے۔ آپ ہمارے کام میں مداخلت نہیں کی تو مالی نقصان کے علاوہ دوسرا کوئی نقصان نہیں اٹھائیں گے۔ دوسری صورت میں ہر قسم کے نتائج کی ذمے داری آپ پر ہی ہوگی۔'' رواں لہجے میں بولتا ہوا وہ شہریار کو مسلسل چونکا رہا

تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔

''اوکے، تم جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ ہم تمہارے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔'' سے یہ کہنے کے بعد اس نے ماریہ کی طرف رخ کیا اور بولا۔ ''چابیاں دے دو۔''

اس کا حکم سن کر ماریہ نے جھک کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا اسٹا پرس نکالا۔ پرس نکالنے کے لیے جھکنے کے نتیجے میں اس کی نائٹی کا کشادہ گریبان مزید کشادہ ہو گیا تھا۔ نظریں گاڑ کر رکھے جمرو کے جذبات اس نظارے کے بعد مزید متلاطم ہو گئے۔ ماریہ نے پرس سے چابیاں گچھا باہر نکالا تو اس نے سب سے پہلے جھپٹ کر اس سے چابیاں لے لیں۔ چابیاں لینے سے قبل اس نے بوجھ کر ماریہ کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور نرم گداز ہاتھ کی گرماہٹ سے مزید اپنے جذبات کو برانگیختہ کر لیا۔

''لاکر کہاں ہے؟'' جمرو کی حرکت کو نظرانداز کرتے ہوئے اسلم نے ماریہ سے پوچھا۔

''اندر ڈریسنگ روم میں۔'' اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ ان کے ڈریسنگ روم میں جاؤ اور نقدی اور زیورات لے آؤ۔'' یہ حکم بھی جمرو لیے تھا۔

''چل بی بی!'' اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ ماریہ کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ کچھ سہمی ہوئی کے ساتھ چل پڑی۔

''تم لوگ اپنے حق میں کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ شاید تمہیں پوری طرح سے اندازہ نہیں ہے کہ ڈاکہ زنی کی اس واردات کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔'' جمرو اور ماریہ کے دروازے کے پیچھے ہوتے ہی شہریار، اسلم سے مخاطب ہوتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

''آپ ہماری فکر نہ کریں اے سی صاحب! ہم سارا حساب کتاب کر کے ہی اپنا کام کرتے ہیں۔'' نے ناک پر سے مکھی اُڑانے والے انداز میں اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

''بعض اوقات آدمی کا حساب غلط بھی ہو جاتا ہے۔'' شہریار بولا۔

''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے کام میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے بہت محتاط رہتے ہیں۔'' اسلم کی طرف سے ترنت جواب آیا۔ شہریار سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس پر گہری نظر بھی رکھے ہوئے تھا اور اس کے پاس حرکت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

''احتیاط کے باوجود جانے کب آدمی کی قسمت ساتھ چھوڑ جائے، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا۔'' شہریار اسے ڈرایا۔

''قسمت کے لکھے سے کون بچ سکتا ہے؟ جب سر پر پڑے گی تو ہم بھی بھگت لیں گے۔'' وہاں غضب اطمینان تھا۔

اس وقت دو ایسے افراد مدِمقابل تھے جو اپنی جگہ بے حد پُراعتماد تھے اس لیے کوئی کسی کو نہیں ڈرا سکتا تھا۔

شہریار صرف اس لیے ایکشن میں نہیں آیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں بہادری دکھانا بے وقوفی زمرے میں آتا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ جو تین افراد اس کے بیڈ روم تک آئے ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی بنگلے میں موجود ہیں۔ وہ کسی طرح ان تین سے نمٹ بھی لیتا تو باقی کا کیا کرتا؟ اسے ان میں سے کسی کا پوزیشن تو معلوم نہیں تھی البتہ اتنا طے تھا کہ اس کے بنگلے پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے وہ لوگ بے حد تیاری کے آئے ہوں گے۔ وہ ماریہ کی وجہ سے بھی خاموش تھا۔ ڈاکا زنی کی وارداتوں میں خواتین کے ساتھ بدسلوکی



بات اس کے علم میں تھے چنانچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی حرکت ان لوگوں کی ماریہ کے ساتھ کا جواز فراہم کر دے۔ لیکن اس کی یہ احتیاط پسندی بے کار گئی اور ڈریسنگ روم سے ماریہ کی چیخ سنائی شہریار نے مضطرب ہو کر بے ساختہ ہی اس کی طرف قدم بڑھائے۔ اسلم نے اسے روکا نہیں بلکہ خود بھی اس جانب لپکا۔

اور حسبِ توقع جمرو کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ ماریہ کی نائٹی کا کشادہ گلا چاک ہونے کے بعد بالکل غائب تھا اور سارے پوشیدہ راز عیاں کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ جمرو کی زبردستی سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کر رہی۔

''ڈاکٹر صاحبہ کو چھوڑ دو۔'' شہریار کے کچھ کرنے سے قبل اسلم نے جمرو پر ہتھیار تانتے ہوئے اسے سرد لہجے میں حکم دیا۔

''تم اس معاملے میں نہ پڑو۔'' عورت کی طلب میں مبتلا وہ اس کی بات سننے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

''تم سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور اس کا انجام اچھی طرح جانتے ہو۔'' اسلم غرایا۔

''سردار کو میں خود جواب دے لوں گا۔ تم میری فکر نہ کرو۔'' اس نے باغیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''جواب مجھے بھی سردار کو دینا ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں کوئی بھی کام اس کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں خود مار دوں گا۔'' اسلم نے اسے دھمکی دی۔

''مار سکتا ہے تو مار دے۔'' وہ گویا ضد میں آیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماریہ کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی حرکت پر تلملا کر اسلم نے لبلبی دبا دی۔ اس کے ہتھیار سے نکلنے والی گولی جمرو کی لو اُڑاتی ہوئی ایک الماری میں پیوست ہو گئی۔

''تو جانتا ہے کہ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ میں نے تجھے لاسٹ وارننگ دی ہے۔ اگلی گولی تیری کھوپڑی بھیدا کرے گی۔'' کچھ گولی کی دہشت تھی اور کچھ اسلم کے لہجے کی خوفناکی کہ جمرو، ماریہ کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ خوف زدہ ماریہ فوراً ہی ایک طرف سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار اس ساری کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ اس کی خاموشی کے پیچھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسلم خود ہی اس صورتِ حال سے نمٹ رہا تھا اور دوسری یہ کہ وہ مسلسل ان کے تیسرے ساتھی کے نشانے پر تھا۔ آپس میں جھگڑنے کے باوجود وہ اس کی طرف غافل نہیں ہوئے تھے۔

''زیور اور نقدی کہاں ہے؟'' جمرو، ماریہ کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تو اسلم نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں اس نے ایک جانب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کر دیا۔

''بیگ اُٹھا کر باہر جاؤ۔'' اسلم نے اپنا نیا حکم سنایا جس کی اس نے اندر ہی اندر کھولنے کے باوجود فوراً تعمیل کی۔ اسلم کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس سے اب مزید جھگڑا مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہ جس موڈ میں تھا، اسے گولی مارنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتا۔

''تعاون کے لیے شکریہ اے سی صاحب! امید ہے کہ آپ نے اپنی بیگم کو شادی میں قیمتی زیورات گفٹ کیے ہوں گے اور ہماری محنت ضائع نہیں جائے گی۔ اب آپ کو ہم سے آخری تعاون کرنا ہوگا۔ آپ کو بے ہوش کرنا پڑے گا۔ صبح تک آپ دونوں آرام سے ہوش میں آ جائیں گے اور ہم بھی بغیر کسی مداخلت کے آپ کی پہنچ سے دور نکل جائیں گے۔'' جمرو کے باہر نکلتے ہی وہ شہریار سے مخاطب ہوا اور بالکل اچانک ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی بوتل باہر نکالی۔

شہریار کچھ سمجھتا، اس سے قبل ہی وہ بوتل کا رخ اس کی طرف کر کے بے ہوشی کی دوا اسپرے کر چکا
نہایت سریع الاثر تھی چنانچہ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہونے کے بعد انہوں نے ما
ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر تیزی سے الماریوں کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ سب وہاں سے روانہ ہوئے تو اپنے کام کی کوالٹی سے پوری طرح مطمئن
نقدی اور زیورات کے علاوہ اور بھی کئی قیمتی اشیاء اپنے ساتھ مالِ غنیمت کی طرح بٹور کر لے جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

نور کوٹ کی وہ صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار کے بنگلے پر ہونے والی ڈاکا زنی کی وا
کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔

پولیس کو واردات کی اطلاع کافی تاخیر سے ملی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ جب شہریار مقررہ وقت پر
پہنچا تو عبدالمنان کو تشویش ہوئی۔ اپنی تقرری کے بعد سے وہ ہمیشہ وقت پر دفتر پہنچتا تھا اور اگر کبھی تاخیر کا
ہوتا تھا تو پہلے ہی سے فون کر کے آگاہ کر دیتا تھا۔ آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے
عبدالمنان نے بنگلے کے فون پر کال کی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ مسلسل کوشش کرتا رہا
نتیجہ ایک ہی تھا۔ اسے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔

اس نے تشویش محسوس کرتے ہوئے شہریار کا موبائل نمبر ملایا، نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ اس بار اس کی
میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور اس نے مشابرم خان کے ساتھ خود بنگلے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ دفتر آنے جانے
لیے شہریار عام طور پر خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا اس لیے اس نے مشابرم خان کو اپنے بنگلے پر مستقل رہ
ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور وہ دفتر ہی میں رہتا تھا۔ راستے میں عبدالمنان نے اسے شہریار کے
صورتِ حال بتائی تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دفتر سے بنگلے کا فاصلہ یوں بھی زیادہ نہیں تھا، مشابرم خا
برق رفتاری نے اسے اور بھی مختصر کر دیا۔ بنگلے کے گیٹ پر گاڑی روکنے کے بعد اس نے ہارن دیا لیکن
معمول اندر سے چوکیدار نے ذیلی دروازہ کھول ں جھانکا جس سے انہیں مزید یقین ہو گیا کہ اندر کوئی
گڑبڑ ہو چکی ہے۔

''آپ ٹھہریں جناب! میں اندر دیکھ کر آتا ہوں۔'' مشابرم خان نے عبدالمنان سے کہا اور گاڑی
گیا۔ خود عبدالمنان سے بھی اندر بیٹھا نہیں گیا، سو وہ بھی باہر نکل آیا۔ بند گیٹ کے قریب پہنچ کر مشابرم خا
ذیلی دروازے کو ہلکے سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھامتے ہو
محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔ عبدالمنان غیر مسلح تھا پھر بھی اس کے پیچھے ہی اندر گھس گیا۔ گیٹ کے
چوکیدار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

''پچھلی طرف جا کر چوکیدار کو دیکھو۔'' عبدالمنان نے اسے حکم دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ خود عبدالمنا
مرکزی عمارت کا رخ کیا۔ یہاں کا دروازہ بھی صرف بھڑا ہوا تھا چنانچہ ذرا سا دھکا دینے پر کھل گیا۔ عبد
متذبذب سا اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے وہاں پھیلی بے ترتیبی نظر آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جنگلی جانور گھس
جس نے ہر شے تہس نہس کر کے رکھ دی تھی۔ نچلی منزل کا یہ حال دیکھ کر وہ اوپر کے بارے میں سوچنے
اچھی طرح واقف تھا کہ شہریار کا بیڈ روم اوپر کی منزل پر ہے اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نیچے اتنی گڑبڑ ہو تو او



ہے۔ وہ مضطرب سا سیڑھیوں کی طرف بڑھا پھر اسے بٹلر کا خیال آیا۔ اس کا خیال آنے پر وہ رخ موڑ کر
طرف مڑ گیا۔ بنگلے میں پھیلی خاموشی سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ یہ ساری تباہی پھیلانے والے وہاں
ہو چکے ہیں اور اب ان لوگوں کا حال معلوم کرنا ہے جو اس بنگلے کے رہائشی ہیں۔ وہ کچن کے ساتھ
کمرے میں پہنچا تو وہاں اسے بستر پر بٹلر کی لاش پڑی نظر آئی۔

اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر گولی کا سوراخ تھا جس نے اس کے لباس کو داغ دار کر دیا تھا۔
لگتا تھا کہ وہ بے چارہ سوتے میں مارا گیا ہے۔ حقیقت میں ہوا بھی یہی تھا۔ اسلم کے حکم پر جیدا اسے بے
والے آیا تھا اور لاش میں تبدیل کر کے چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس سوتے ہوئے شخص کو ہاتھ پیر باندھ کر یا بے
کر کے بھی گزارہ ہو سکتا تھا لیکن جیدے کی فطرت میں تشدد کا رجحان زیادہ تھا۔ وہ انسانوں کی اس قسم سے
رکھتا تھا جن کے منہ کو خون لگ جاتا ہے اور وہ انسان کے بجائے درندے بن جاتے ہیں بلکہ شاید درندوں
زیادہ گئے گزرے..... کہ درندے بھی بہر حال بے وجہ قتل نہیں کرتے۔ ان کے پیش نظر بھی اپنے پیٹ
بجھانا یا محسوس ہونے والے خطرے سے نمٹنا ہوتا ہے۔ جیدے نے تو بے چارے بٹلر کو بے وجہ ہی قتل
کر ڈالا تھا۔

''باہر چوکیدار کی لاش پڑی ہے جناب! اسے گردن کی ہڈی توڑ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' وہ بٹلر کی لاش کا
والے ہی رہا تھا کہ مشابرم خان وہاں پہنچ گیا اور اسے اطلاع دی پھر اس کی نظر بھی لاش پر پڑ گئی۔

''خانہ خراب..... یہ بھی گیا۔'' وہ بے ساختہ ہی بولا۔

''ہاں، آؤ اوپر چل کر اے سی صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھتے ہیں۔'' عبدالمنان نے گہری سنجیدگی کے
جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر اس راستے کا رخ کیا جہاں سے وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر جا
والے۔ اس بار مشابرم خان اس کی پیروی کرتے رہنے کے بجائے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا آگے نکل
اس کی شہریار سے بے پناہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ محبت یونہی نہیں تھی۔ شہریار نے خود کو اس کا اہل
ثابت کیا تھا۔ یہ وہی تھا جو اس کی غیر موجودگی میں بلتستان کے ہسپتال میں زیرِ علاج اس کی ماں کو اسلام
کے ایک جدید ہسپتال میں لے آیا تھا اور اس کے علاج کے سارے اخراجات اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا۔

وہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا شہریار کے بیڈ روم تک پہنچا تو اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا، البتہ کمرے کی
ضرور نچلی منزل کی طرح خراب تھی۔ اصل فکر شہریار کی تھی لیکن وہ اور اس کی بیگم خلافِ توقع وہاں موجود
تھے۔

''اندر ڈریسنگ روم میں چل کر دیکھتے ہیں۔'' کچھ لمحوں کے توقف سے عبدالمنان بھی وہاں پہنچ گیا اور
کی صورتِ حال دیکھ کر بولا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ ڈریسنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھے۔ شہریار
اکثر ماریہ ڈریسنگ روم کے فرش پر رسیوں سے بندھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ کسی نے جاتے جاتے
کے جسم پر ایک چادر ڈال دی تھی جو اسے گردن سے پیروں تک ڈھانپے ہوئے تھی۔ مشابرم خان تڑپ کر
کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نظر نہ آنے کے باوجود وہ اسے بے حس و حرکت دیکھ کر تشویش میں
گیا تھا۔ قریب جا کر اس نے اس کی نبض تھامی تو زندگی کے آثار مل گئے۔

''صاحب زندہ ہیں۔ ایمبولینس بلائیں منان صاحب! انہیں فوراً ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔'' وہ
خیز آواز میں چیخا تو پہلی بار عبدالمنان کو اپنی جیب میں موجود موبائل کو استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ورنہ
کی صورتِ حال دیکھ کر اس کا دماغ اس بری طرح ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ ابھی تک پولیس کو کال کرنے کا

بھی نہیں سوچ سکا تھا۔ مشاہرم خان کے کہنے پر اس نے یکے بعد دیگرے ہسپتال اور پولیس اسٹیشن
ڈالے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر بنگلے کی خاموش فضا میں ہنگامے جاگ اُٹھے۔ شہریار اور ماریہ کو طبی امد
لیے لے جانے کے علاوہ چوکیدار اور بٹلر کی لاشیں بھی ہسپتال منتقل کر دی گئیں۔ پولیس نے پورے بنگلے کی
لی تو سرونٹ کوارٹرز میں موجود ملازموں کو بھی نجات ملی ان بے چاروں کو ہتھیاروں کے زور پر بے بس
ہاتھ پیر باندھنے کے بعد منہ میں کپڑا ٹھونس کر معذور کر دیا گیا تھا۔ وہ نہ تو اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتے تھے اور
کے لیے چلا سکتے تھے۔ ہوش میں ہوتے ہوئے کئی گھنٹے اس حالت میں پڑے رہنے سے ان پر بہت
تھا اور ایک دو تو باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ خصوصاً چوکیدار اور بٹلر کی
اطلاع نے ملازمین میں خاصی سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ پولیس نے ملازمین سے جو بیانات لیے اور
صورتِ حال نظر آئی، اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکے کہ بنگلے پر ڈاکا زنی کی بڑی منظم واردات کی گئی ہے۔

اصل صورتِ حال جاننے کے لیے انہوں نے شہریار اور ماریہ کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا
دونوں کے بیان نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ ڈاکہ زنی کی ہی واردات تھی۔ پولیس اپنے ضابطے کی کارروا
کرنے لگی۔ ایس پی ضلع، شہریار کی آئی جی صاحب سے خصوصی وابستگی سے واقف تھا چنانچہ اس نے ایل
مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ کرنے کو تو عبدالمنان بھی یہ کام کر سکتا تھا لیکن اس نے شہ
اجازت کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ جانتا تھا کہ شہریار کو
پریشان کن خبر اپنے فیملی ممبرز سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ایس پی کی مہربانی سے مختار مراد کو
خبر مل گئی۔ میڈیا والوں کو فی الحال اس معاملے سے الگ رکھا گیا تھا، اس لیے نیوز چینلز فی الحال خاموش
ویسے بھی اس پسماندہ ضلع کی خبریں تفصیل کے ساتھ چینلز پر چلنے تک خاصا وقت لگ جاتا تھا اِلّا یہ کہ
کرنے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا۔

مختار مراد کو واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً شہریار کو فون کیا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا لیکن ابھی
میں ہی تھا۔ بے ہوش کرنے کے لیے جو دوا استعمال کی گئی تھی، وہ بہت طاقتور تھی اس لیے وہ کئی گھنٹے تک
میں نہیں آ سکا تھا اور اب بھی ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اسے اور ماریہ کو کچھ وقت ہسپتال میں گزارنا چاہیے
عادت سے ہٹ کر اس نے یہ مشورہ مان لیا تھا چنانچہ اس وقت ہسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

عبدالمنان اس کے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ ماریہ کو دوسرے کمرے میں رکھا گیا تھا کیونکہ وا
اطلاع ملتے ہی کئی لوگ شہریار سے ملنے ہسپتال کی طرف دوڑے آئے تھے۔ فی الحال کسی کو ملاقات کی ا
نہیں دی گئی تھی لیکن چند منٹ کے لیے سہی، ان لوگوں سے ملنا تو پڑتا۔

''کیا بات ہے ینگ مین! یہ ہر تھوڑے عرصے بعد ہسپتال کو رونق بخشنے کیوں پہنچ جاتے ہو؟'' مختار
کال عبدالمنان نے ریسیو کی تھی، اس کے ہاتھ سے موبائل سیٹ شہریار کے ہاتھ میں پہنچا تو اس کی ہیلو
مختار مراد بولا۔

''میں تو نہیں آنا چاہتا لیکن کچھ کرم فرماؤں کی مہربانیاں پہنچا دیتی ہیں۔'' اس نے بھی انہی کے انداز
جواب دیا۔

''اسی لیے میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ محتاط رہو اور ہر معاملے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ لیکن تمہیں بھی
نہیں ہے۔'' انہوں نے محبت بھری خفگی کا اظہار کیا۔

''آپ نے صحیح کہا اور یقین جانیں کہ شینا اور سجاد بھائی کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر



ین نہیں آئے گا۔ بلکہ سچ پوچھیں تو یہ معاملہ نمٹ بھی گیا تو میں پھر بھی چین سے اس لیے نہیں بیٹھ سکوں
اپنے وطن اور ہم وطنوں سے محبت ہے۔ میں ناانصافی اور ظلم کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس
ظالموں کی نظر میں کھٹکتا رہوں گا۔''

''تم تو جذباتی ہو گئے یار! چلو فی الحال اس بحث کو جانے دو اور حالیہ واقعے پر بات کرو۔ ایس پی نے مجھے
ب دی ہے، اس کے مطابق تو یہ خالصتاً ڈاکا زنی کی واردات تھی اور یقیناً اس وجہ سے کی گئی تھی کہ کسی
اکوؤں کو یہ سن گن مل گئی ہو گی کہ تمہاری شادی پر ماریہ کو بہت قیمتی زیورات چڑھائے گئے تھے۔ ایس پی
ابق بنگلے میں کوئی بھی قیمتی شے نہیں چھوڑی گئی ہے۔'' مختار مراد نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے خود ہی
رخ حالیہ واقعے کی طرف موڑ دیا۔

''لیکن میرے خیال میں یہ خاص ڈاکا زنی کی واردات نہیں ہے۔ میرے دشمن نے اس واردات کی آڑ
پیغام دیا ہے کہ جس طرح ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہارا مال و اسباب لوٹ سکتے ہیں اور تمہارے
کو ہلاک کر سکتے ہیں، اسی طرح تمہاری جان اور عزت بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے مختار مراد کی
اختلاف کرتے ہوئے اپنا خیال پیش کیا۔

''تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟ کیا تمہیں غیر ملکی ایجنسی پر شک ہے؟'' انہوں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''نہیں، یہ اندر کے دشمنوں کا کام ہے۔ اور میں یہ بات بے بنیاد نہیں کہہ رہا ہوں، میرے پاس اس کی
اجہ موجود ہے۔ آپ کو وہ واقعہ تو یاد ہو گا جب مجھے اغوا کروا لیا گیا تھا اور میں نے بعد میں یہ شک ظاہر کیا
اس جنگل میں ڈاکوؤں کی قید میں تھا؟'' اس نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں..... ہاں، بالکل یاد ہے۔ وہ کوئی بھولنے والی بات تو ہے بھی نہیں۔'' مختار مراد نے فوراً جواب دیا۔

''میرے اغوا کے وقت جو شخص اغوا کاروں کو لیڈ کر رہا تھا، وہی شخص حالیہ واردات میں بھی ان کا لیڈر
اس نے انکشاف کیا۔

''کیا تم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم نے دونوں وارداتوں
بیان دیا ہے، اس کے مطابق تمام ڈاکو نقاب پوش تھے پھر تم کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہے ہو؟'' انہوں نے
سے وضاحت چاہی۔

''میں نے اس شخص کو اس کی شکل وصورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ لب و لہجے سے پہچانا ہے۔ پہلی بار جب وہ
مخاطب ہوا تھا تو میں اس کی گفتگو سن کر چونک گیا۔ اس کا لب و لہجہ صاف بتاتا ہے کہ وہ پنجاب سے تعلق
رکھتا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں، وہ سندھ کے کسی علاقے کا رہنے والا ہے لیکن میں یہ بات بھی
یقین سے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہت صاف ستھری اُردو بول رہا تھا اور اس کے طرزِ گفتگو سے ظاہر
وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میری رہائش گاہ پر جب وہ دوبارہ مجھ سے ٹکرایا تو میں چونک پڑا اور میں نے اس
قامت اور باڈی لینگویج پر غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جو میرے اغوا میں بھی ملوث تھا۔
اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکوؤں کے جتھے میں موجود کسی منفرد خصوصیت کے شخص کو شناخت کرنا میرے لیے
کل ثابت نہیں ہوا ہو گا۔'' اس نے اپنے دعوے کے حق میں دلائل دیئے تو مختار مراد بھی قائل ہو گئے۔

''میں تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ دشمنی کا وہی سلسلہ ہے جو شاید تم نے اپنی جاب کے
ن سے مول لیا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے تو میں نے مصلحتاً کافی مروّت

سے کام لیا تھا مگر اب میرے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنے اوپر پے در پے کیے جانے وا
کے بعد بھی خاموش رہ کر یہ تاثر نہیں قائم کرنا چاہتا کہ میں کسی سے کمزور ہوں۔ میرے پاس اینٹ کا
سے دینے کے لیے قانونی راستہ بھی ہے اور دوسرا بھی۔ اگر قانون نے میرا ساتھ نہیں دیا تو مجھے مجبوراً
اختیار کرنا پڑے گا۔'' یہ ایک واضح دھمکی تھی جسے سمجھنا مختار مراد کے لیے مشکل نہیں تھا۔

''کوئی بھی جذباتی قدم نہیں اٹھانا شہریار! میں آپریشن کی تیاریاں کروا رہا ہوں اور یقین کرو کہ تمہا
پر ہونے والی واردات آپریشن کے فیصلے کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی ہے۔ اب میر
اتنے ٹھوس جواز جمع ہو گئے ہیں کہ کوئی مجھے کارروائی کرنے سے نہیں روک سکتا۔'' وہ اسے کسی بھی عمل
رکھنے کے لیے سمجھانے لگے۔

''مجھے آپ سے یہی امید تھی انکل! بس اب آپ جلدی سے ایکشن میں آجائیں۔ میں آپ کا سا
کے لیے یہاں تیار بیٹھا ہوں۔'' اس نے مختار مراد کے فیصلے کو سراہا اور ایک طرح سے یہ اشارہ بھی
ان کی طرف سے کارروائی شروع ہونے تک وہ خود خاموش رہے گا لیکن خود اس کا ذہن سوال کر
ڈاکوؤں کے ڈیرے پر آئی جی مختار مراد آپریشن شروع کروا بھی دیں گے تو اس سے چودھری کی صحت
پڑے گا؟ وہ ایک گروہ کی بیخ کنی کے بعد دوسرا گروہ پال لے گا۔ دوسرے یہ کہ آپریشن شروع ہوتے ہو
کچھ دن لگ جاتے جبکہ وہ چودھری کو فوری طور پر منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا۔ یہ جواب دینے کے لیے ا
پاس ایک بہت ہی اچھا ہتھیار تھا..... جگو!

⊛----✪----⊛

''سرکار! نور پور سے چودھری بختیار آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' وہ اپنے مخصوص تخت پ
گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقے کے کش لے رہا تھا کہ منشی اللہ رکھا نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ا
حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر پشت پر کھڑے ملازم کی طرف بڑھائی اور کچھ اس انداز میں منشی کی طرف
لگا جیسے اس کی بات سن نہ سکا ہو۔

''چودھری بختیار ملاقات کے لیے آیا ہے سرکار!'' اس کی ایک ایک ادا سے واقف منشی نے اطلا
دُہرایا۔

''میں نے سن لیا ہے منشی! پر اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ سدھی صاحب خود چل کر حویلی کی چو
تک آئے ہیں۔ وہ تو اتنے ناک والے ہیں کہ اپنی بہن کا ولیمہ کھانے بھی ادھر نہیں آئے تھے۔'' اس کی
پر تمسخر کا رنگ غالب تھا۔

''ناک والوں کی ناک کٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے سرکار! چودھری بختیار کی آپ کے آگے اوقات
ہے؟ ایک نہ ایک دن تو اسے گھٹنے ٹیکنے ہی تھے۔'' منشی نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔

''تُو ٹھیک بولا منشی! پر تجھ سے اور مجھ سے کچھ غلطی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا وہ خود چل کر حویلی آیا ہے
نے گھٹنے ٹیکنے کی گل کی..... پر بے چارہ بختیارا تو دونوں ہی کم (کام) نہیں کر سکتا۔ چلنا اور گھٹنے ٹیکنا اس لنگ
کے بس میں ہے ہی کدھر؟'' اپنی بات کہہ کر اس نے خود ہی زوردار قہقہہ لگایا تو منشی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''چل بلا لے اسے۔ ملوم تو ہو کہ وہ لنگڑا کیوں آیا ہے..... پر نہیں ابھی فوراً نہ بلانا۔ ذرا بیس پچیس
انتظار کروا کر ادھر لا۔ میں کوئی ایسا فارغ بھی نہیں بیٹھا کہ ہر ملاقاتی سے فوراً ملنے بیٹھ جاؤں۔'' اجازت



نے اچانک اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا اور ایک شان سے اپنا بایاں بازو پھیلایا۔ حقے کی نے تھام کر ایک
جانے والا ملازم فوراً آگے بڑھا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دوبارہ سے نے تھما دی۔ چودھری
سے کش لگانے لگا۔ اس کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنتا منشی کمرے سے باہر نکل کر اس طرف بڑھ گیا
دھری بختیار اپنی گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ حویلی پہنچ کر اس نے گاڑی سے اُترنا پسند نہیں کیا تھا اور منشی کو
کا مقصد بتا کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ شاید اسے بھروسہ نہیں تھا کہ چودھری افتخار اس سے ملنا پسند بھی
گا یا نہیں۔ چودھری کی کم ظرفی پر بھروسہ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

''آپ اندر چل کر بیٹھیں، چودھری صاحب اس وقت ذرا مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ سے
گریں گے۔'' منشی نے گاڑی کے قریب جا کر اسے اطلاع دی تو وہ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد
نے کے لیے راضی ہو گیا۔ ویسے بھی یہ بات تو اسے خود بھی تسلیم کرنی پڑ رہی تھی کہ جب یہاں تک آ ہی
تو انا کیسی؟ فریدہ سے بے حد ناراضگی کی وجہ سے اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا کہ اب ساری زندگی اس
تعلق نہیں رکھنا ہے لیکن پھر دل میں دبی بہن کی والہانہ محبت نے اسے اپنا یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ فیصلے
میں تبدیلی میں شہریار کا بھی خاصا ہاتھ تھا اس نے اسے قائل کر لیا تھا کہ فریدہ کتنی بھی قصوروار سہی لیکن ہے تو
بہن ہی، اس لیے اسے کسی طور یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بہن کو چودھری کی حویلی میں مرنے کے لیے
مددگار چھوڑ دے۔ کچھ بہن کی محبت نے اور کچھ شہریار کے اصرار نے اسے اس حویلی تک آنے پر مجبور
تھا اور نہ وہ کبھی چودھری افتخار جیسے آدمی سے ملنے آنا گوارا نہ کرتا۔

''آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟'' منشی اسے ایک بیٹھک میں بٹھا کر غائب ہو گیا تھا، کافی دیر بعد واپس آیا
سے دریافت کیا۔ اندر ہی اندر بری طرح کھولتے چودھری بختیار نے خود پر ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر
ہلایا۔ اس کی معذوری نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے ملازم کا سہارا لے کر حرکت کرے۔ چنانچہ اسے ملازم کو
اپنے ساتھ بیٹھک تک لانا پڑا تھا لیکن اندر سے سخت خفت محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ملازم بھی اس کے ساتھ
کھے جانے والے سلوک کا نظارہ کر رہا ہے۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ لمبے سفر سے آئے ہیں، پیاسے ہوں گے۔''
تو منشی ادب سے ہی بات کر رہا تھا لیکن اس کے مؤدبانہ الفاظ کے ساتھ لہجے میں جو طنز کے تیر پوشیدہ تھے،
کے گھاؤ چودھری بختیار کس طرح برداشت کر رہا تھا، وہی جانتا تھا۔

''میری پیاس کی فکر نہ کرو اور چودھری صاحب سے جا کر پوچھو کہ اور کتنی دیر لگے گی انہیں فارغ ہونے
۔ اگر وہ آج سارا دن ہی مصروف ہیں تو میں کل کسی وقت آ جاؤں گا۔'' کچھ کھردرے پن سے اس نے منشی
واب دیا۔

''کل کا کیا بھروسہ؟ چودھری صاحب اتنے مصروف آدمی ہیں، ہو سکتا ہے کل ان کے پاس بالکل ہی وقت
۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں، وہ جیسے ہی فارغ ہوتے ہیں میں آپ کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔'' منشی
اسے تسلی دی اور وہاں سے چلا گیا۔ ناچار اسے ایک بار پھر انتظار کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اس بار منشی پندرہ
بعد واپس آیا۔ کہنے کو یہ اتنا طویل دورانیہ نہیں تھا لیکن چودھری افتخار کی بیٹھک میں بیٹھ کر اسے خاصا
لگا۔

''آیئے، چودھری صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' منشی نے اس سے کہا تو وہ اپنے ملازم کے
ے کھڑا ہو گیا۔

معذور ہونے کے بعد بھی وہ عرصے تک اپنے کام خود ہی کر لیتا تھا اور کسی سے سہارا لینے کی کوشش نہ
تھا لیکن اب وہ پہلے سی ہمت نہیں رہی تھی۔ خصوصاً فریدہ نے اسے بری طرح توڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بے
اور چہیتی بہن تھی جسے اس نے بہن سے بڑھ کر بیٹی سمجھا تھا۔ اپنی چہیتی کی وجہ سے اسے پہلا صدمہ اس
جب اس نے یہ جانا کہ وہ اس کے جانی دشمنوں کے خاندان سے محبت کا ناتہ جوڑ بیٹھی ہے۔ ابھی وہ اس
سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ فریدہ اس کی عزت اور محبت کا خیال کیے بغیر اس لڑکے کے ساتھ گھر کی دہلیز
گئی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنی اس حرکت کے بعد اس نے کچھ بھی نہیں پایا اور وہ لڑکا اسے چودھری کے
چھوڑ کر خود الگ ہو گیا اور دوسری جگہ بیاہ بھی رچا بیٹھا۔ لیکن چودھری بختیار اس بے عزتی کو کبھی نہیں بھول
جو اس نے فریدہ کی شادی چودھری افتخار کے ذہنی معذور بیٹے سے کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ اپنے
فیصلہ کر چکا تھا کہ اب زندگی بھر فریدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن خون کی کشش نے اسے مجبور کر دیا۔
بہن کو مرنے کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا چنانچہ نہ چاہنے کے باوجود حویلی میں موجود

''آؤ چودھری بختیار! یہاں آ کر بیٹھو۔ تم میری حویلی میں آئے، سن کر وڈا چنگا لگا۔ آخر تم ہمارے
پر تمہاری یہ گل ہمیں اچھی نہیں لگی کہ تم نے ادھر کچھ کھانا پینا پسند نہیں کیا۔'' اس کے کمرے میں داخل ہو
چودھری نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ہی بیٹھا ہوا تھا اور حقے کی نے
ملازم اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

''ہمارے ہاں دِھی کے گھر کھانے پینے کا رواج نہیں ہے۔'' چودھری بختیار نے سنجیدگی سے جواب
''چلو ٹھیک ہے۔ ویسے مجھے تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے ہاں دِھی کے
میں آنے کا بھی رواج نہیں ہے۔'' چودھری نے طنز کا تیر چلایا۔

''میں فریدہ کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے مختصراً
بیان کیا۔

''اتنے عرصے بعد تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟ تم نے تو شاید فریدہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے
دیئے تھے؟'' چودھری کب باز آنے والا تھا۔

''گھر کے دروازے بند کر بھی لو تو دل کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ فریدہ میری وڈی لاڈلی بہن
ہور میں اسے یہاں بے بسی سے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے سیدھی
بات کی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ الزام لگا رہے ہو کہ ہم تمہاری بہن کا خیال نہیں رکھتے اور وہ یہاں ظلم
کا شکار ہے؟'' چودھری برا مان گیا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور کوئی وضاحت دیئے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

''ہم ایسے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں چودھری بختیار! اگر ہم ایسے ویسے ہوتے تو آج تمہاری بہن
بھانجا علاج کے لیے لاہور کے مہنگے ترین ہسپتال میں داخل نہیں ہوتے۔'' اس نے گویا اپنے حق میں دلیل
''پر میرا خیال ہے کہ اگر اس حویلی میں اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہوتے تو میری بہن ہسپتال تک
ہی نہیں۔'' چودھری بختیار نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا تم الزام لگا رہے ہو؟'' چودھری طیش میں آیا۔

''صرف الزام نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس حویلی میں میری بہن کو قتل کرنے کی کوشش کی
ہے اور یہ کوشش دوبارہ بھی کی جا سکتی ہے، اس لیے میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''



ان سے جواب دیا۔

''تم اتنے وثوق سے ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟ آخر یہاں کسی کو فریدہ کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟''
یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''یہ ضرورت اسی شخص کو پڑ سکتی ہے جو حویلی کے وارثوں میں اضافے کو پسند نہیں کرتا ہو۔ بہر حال، یہ
اندرونی معاملہ ہے۔ مجھے تو اپنی بہن اور بھانجے کی زندگی عزیز ہے اس لیے میں انہیں اپنے ساتھ لے
جاتا ہوں اور یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ فریدہ اور اس کے بچے کو میں ہسپتال سے سیدھا اپنے گھر لے
گا۔'' اس نے چودھری کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ دوسری طرف چودھری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ فریدہ
ہونے والا حادثہ اب اسے بھی سازش محسوس ہو رہا تھا اور اس سازش کے تانے بانے جوڑنے والی کا
اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے چودھری صاحب؟..... آپ کے پاس سوچنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں چاہتا تو فریدہ
ہسپتال سے بھی سیدھا اپنے گھر لے جا سکتا تھا لیکن میں نے آپ کو پہلے اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ اب آپ
اجازت دیں۔ اور ہاں، دوبارہ فریدہ کو اسی وقت لینے آیئے گا جب آپ یہاں اس کی زندگی کی حفاظت کا
کر لیں۔''

یہ وہی چودھری بختیار تھا جس کو کچھ دیر قبل سمدھی کی عزت دینے کے بجائے ایک عام ملاقاتی کی طرح
اذیت سے گزارا گیا تھا۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ چودھری سے بات کر رہا تھا اور چودھری کوئی
دینے کے بجائے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چودھری بختیار اپنی بات کہنے کے بعد وہاں رُکا نہیں اور ملازم
سہارے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

''میں تجھے چھوڑوں گا نہیں چودھرائن! تُو نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر فریدہ مر جاتی
میں مشکل میں پڑ جاتا۔'' وہ دانت کچکچاتا ہوا اپنے دل میں بولا۔ برسوں کی حکمرانی نے اس کے اندر جو
تکبر بھر دیا تھا، وہ کسی صورت اسے خود کو نیچا دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن بار بار اسے اسی صورتِ حال
گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنی ناکامیوں اور ذلت کے اس سلسلے کو وہ شہریار سے منسوب کرتا تھا کیونکہ جب وہ اس
گرایا تھا، تب ہی سے وہ مشکلات کا شکار تھا۔ اس کے خیال میں یہ شہریار ہی تھا جس کی شہ پا کر بہت سے
اس کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت کرنے لگے تھے۔ اگر شہریار نہ ہوتا تو ماہ بانو پیر آباد کی
سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ نہ ہوتا تو ماسٹر آفتاب اتنا مضبوط نہ ہو پاتا کہ اس کی بیٹی کو ہی حویلی
لے اُڑتا۔ یہ شہریار ہی تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں تعلیم اور صحت کا شعور اُجاگر ہونے لگا تھا اور وہ اپنی
حقوق اور مسائل کے لیے چودھری کے علاوہ بھی کسی اور طرف دیکھنے لگے تھے۔ پہلے وہ چودھری کو ہی سب
سمجھتے تھے چنانچہ اس کا بدترین سلوک بھی سر جھکا کر سہہ لیتے تھے۔ اب انہیں ایک اور در نظر آنے لگا تھا۔ وہ
اور اپنی اولاد کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ یہ عمل بہت برق رفتار نہیں تھا لیکن چودھری آنے والے
کی بُو سونگھ رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے اپنے دشمن کو کھلی چھوٹ دے دی تو آنے والے وقت میں
حکمرانی کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا۔ وہ اپنے تخت، اپنی حکومت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور جو
ذہن میں آتی تھی، اس پر عمل کر ڈالتا تھا لیکن مسائل تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

اب یہ چودھری بختیار ایسے ہی تو حویلی نہیں آیا تھا۔ یقیناً اس کے پاس پکی خبر تھی کہ فریدہ کے ساتھ کیا
کی گئی اور کمال یہ تھا کہ وہ خود اپنی حویلی میں ہونے والی اس سازش کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا

کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اپنی بیوی اس کے ساتھ ایسی چال چلے گی۔ لیکن اسے چودھری
دلیل میں جان محسوس ہوئی تھی کہ اپنے مفاد کے لیے وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔ اولاد کی محبت کسی سے بھی
سکتی ہے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب عورتوں نے اپنی اولاد کو تخت و تاج کا مالک
لیے سازش کے خونی جال تیار کیے تھے۔ اس کی حویلی میں کچھ نیا تو نہیں ہو رہا تھا، بس اسے خبر کچھ دیر
تھی اور اب اسے سازشیوں کے لیے سزا تجویز کرنی تھی۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ اس سزا پر غور
تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر بٹن دبا کر کال ریسیو کر لی۔

''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو چودھری؟'' اپنی ''ہیلو'' کے جواب میں اسے دوسری طرف سے یہ
دیا۔ بات اگرچہ اُردو میں ہی کہی گئی تھی لیکن لب و لہجے نے اسے چونکا دیا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ
طرف ڈیوڈ موجود ہے اور کافی غصے میں ہے۔

''میں کیا کر رہا ہوں جس پر تمہیں اعتراض ہے؟'' ڈیوڈ کے انداز پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے
خود بھی قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ ڈیوڈ کی طاقت اور اس سے ملنے والی رقم اگرچہ اسے اس
جھکائے رکھتی تھی لیکن تھا تو وہ بہرحال چودھری افتخار عالم شاہ..... جس سے کسی اور کا اپنے سامنے اونچی آواز
بولنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''میں تمہارے حالیہ کارنامے کی بات کر رہا ہوں۔ تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اے سی کو چھیڑنے کی''
ڈیوڈ بدستور غصے میں تھا۔

''یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اور اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم مجھے جس کام کی پے منٹ کر رہے ہو
صحیح طریقے سے کروا رہا ہوں۔ باقی میں کیا کرتا ہوں کیا نہیں، اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''
نے اکڑ کر جواب دیا۔

''کیسے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے؟ تمہارے اس کارنامے کی وجہ سے جنگل میں آپریشن کلین اپ
کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں؟ تمہاری حرکت کی وجہ سے ہمارا
اہم پروجیکٹ خطرے میں پڑ گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ مجھے تمہارے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''
ڈیوڈ دھاڑا۔ اس بار چودھری کو بھی اسے فوری طور پر کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ اس نے تو صرف
نیچا دکھانے کے لیے اس کے بنگلے پر ڈاکا ڈلوایا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا اتنا شدید ری ایکشن سامنے
آئے گا۔

''اب چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ کہ تمہاری حماقت کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے، اس سے بچاؤ کے لیے کیا
سکتی ہے؟'' ڈیوڈ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''آپ پریشان مت ہوں مسٹر ڈیوڈ! جنگل کے جس حصے میں ڈاکو پناہ گزین ہیں اور جہاں ہمارا
جاری ہے، وہ ایک دوسرے سے بہت الگ الگ ہیں۔'' آخر اسے ڈیوڈ کی تسلی کے لیے ایک دلیل مل ہی گئی۔

''اور اس بات کی کیا گارنٹی دے سکتے ہو تم کہ پولیس جنگل کے صرف اسی حصے تک محدود رہے گی
ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے؟ وہ سرچ آپریشن کریں گے تو سرچنگ کے دوران لازمی ہے کہ جنگل کے ہر حصے کو کھنگالیں
گے۔ ڈاکوؤں کا ڈیرا ان کی خالہ کا گھر تو ہے نہیں کہ وہ سیدھے وہاں جائیں گے اور سب کو کان سے پکڑ کر
آئیں گے۔'' ڈیوڈ طنز پر طنز کر رہا تھا۔ ''کیا یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ جب پولیس آپریشن کے لیے جنگل
داخل ہوگی تو پھر اس کے قدم کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں؟ تمہیں وہ لڑکا اگو یاد نہیں ہے جو اچانک ہی ہمارے علاقے



تھا۔ اگر وہ لڑکا عابد انصاری تک پہنچنے کے بجائے کسی اور طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو
کیا جاتا۔ وہ ایک اکیلے لڑکے کا معاملہ تھا، اس لیے آسانی سے ہینڈل کر لیا گیا لیکن اتنی بڑی فورس کا
گے ہم؟'' وہ پریشان بھی تھا اور غضب ناک بھی اس لیے چودھری سے بلالحاظ بات کر رہا تھا۔

پولیس فورس کے لیے ڈاکوؤں کا ڈیرہ خالہ کا گھر بنایا جا سکتا ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ
ک کی سیدھ میں وہاں جائے گی اور اپنا کام مکمل کر کے ناک کی سیدھ میں ہی واپس آ جائے گی۔'' ڈیوڈ
چودھری تقریر کے جواب میں چودھری نے اسے اطمینان دلایا۔

''اپنی بات کی وضاحت کرو۔'' ڈیوڈ نے اسے حکم دیا۔

''ہمارے ہاں پولیس کا آدھا کام مخبروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ میں پولیس کو وہ مخبر فراہم کروں گا جو انہیں
ڈیرے پر پہنچا دے گا۔ پولیس آسانی سے ڈیرے پر پہنچ گئی تو اسے جنگل میں اِدھر اُدھر منہ مارنے کی
ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

وہ اس قبیل کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا جو اپنے مطلب کے حصول کے لیے دوسرے کے گلے پر چھری
چلانے میں دیر نہیں لگاتے۔ ڈاکوؤں سے اگر اس کی دوستی تھی یا وہ اس کے کام آتے تھے تو اس کے نزدیک ان
کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف اس بات کی کہ اس کے اپنے مفاد پر ضرب نہ پڑے۔ جنگل
کی کاشت سے اسے جتنا بڑا فائدہ حاصل ہو رہا تھا، اتنا ڈاکوؤں سے نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے ان
کو آسانی سے بھینٹ چڑھایا جا سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''آپ ایڈمٹ ہو جائیں۔ آپ کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ ہم آپ کو گھر جانے دیں۔'' وہ اپنی طبیعت
خرابی محسوس کر رہی تھی اس لیے آفتاب اسے چیک اَپ کے لیے ہسپتال لایا تھا۔ چیک اَپ کے فوراً بعد
ڈاکٹر نے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ دونوں میاں بیوی ہی پریشان ہو گئے۔

''کیا کوئی پیچیدگی ہے ڈاکٹر صاحبہ! جو آپ انہیں ایڈمٹ کرنے کی بات کر رہی ہیں؟ ورنہ ہمارے
پاس تو ابھی کافی وقت باقی ہے؟'' آفتاب نے پریشانی سے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کوئی مسئلہ ہے جب ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اس لڑکی کی حالت ایسی ہے کہ اس کے ہاں نارمل
ڈلیوری ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جانے آپ لوگ عورتوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں جو وہ مُردوں جیسی حالت کو پہنچ
جاتی ہیں اور پھر اس مُردہ بدن سے آپ اپنی اولادیں بھی پیدا کرواتے ہیں۔ ذرا رحم نہیں آتا آپ لوگوں کو عورت
پر۔ یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ جس کے بطن سے نئی زندگی کو جنم لینا ہے، اس کا بھی خیال رکھا
جائے۔ اپنی بیوی کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ فاقے کرتی رہی ہے۔ خون تو ہے ہی نہیں اس
جسم میں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ! میرے شوہر بہت خیال رکھنے والے ہیں۔'' کشور نے اپنی طرف
سے آفتاب کی صفائی پیش کی

''تم چپ رہو بی بی! تم عورتوں کو بہت شوق ہوتا ہے نیک پروین بننے کا۔ تمہاری انہی فضول طرف
داریوں کی وجہ سے تو مردوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی اچھا آدمی ہے تمہارا شوہر تو اب سے پہلے چیک
اَپ کے لیے یہاں کیوں نہیں لایا؟ آج پہلی بار میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔'' ڈاکٹر صاحبہ کا تعلق شاید حقوقِ

نسواں کے لیے کام کرنے والی کسی تنظیم سے تھا جو کسی بھی وضاحت وصفائی کو خاطر میں لائے بغیر بے
رہی تھیں۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنے شوہر کی بے جا حمایت نہیں کر رہی ہوں۔ یہ سچ
خیال رکھنے والے آدمی ہیں۔ میرا چیک اَپ بھی پابندی سے کرواتے ہیں۔ آپ کے پاس ہم پہلی بار
آئے ہیں کہ ہمیں یہاں اس شہر میں شفٹ ہوئے بہت تھوڑے دن گزرے ہیں'' اتنی سی بات کرنے
کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اگر یہ آفتاب کی صفائی دینے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی اتنا نہیں بول سکتی تھی۔

''خیر، جو بھی بات ہو مجھے اس سے کیا۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ آپ فوری طور پر ایڈمٹ
کر چارجز وغیرہ جمع کروا دیں۔ بچے کی دھڑکن بہت کم ہے، ہمیں آپریشن کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر ان لوگوں
سے تھی جو ہر حال میں اپنی ہی بات کو اوپر رکھتے ہیں چنانچہ اس کی دی ہوئی صفائی کو قبولیت کا درجہ دینا پسند
کیا اور منہ بناتے ہوئے اپنی ہی کہی۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ! آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی چارجز وغیرہ جمع کروا دیتا ہوں۔ آپ کو جو
لگتا ہے، آپ ویسا ہی کریں۔'' کشور اور لیڈی ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی بحث اس کے لیے قطعی بے
تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کشور کتنی عزیز ہے۔ باقی کوئی اور اس حقیقت کو تسلیم کرتا یا نہیں، اس بات سے اسے
فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ کشور خود اس کی محبت سے واقف تھی اور اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب بھی اس
لیڈی ڈاکٹر کی کسی بھی بات کا برا مانے بغیر نہایت معتدل لہجے میں اس سے یہ سب کہا اور خود تیز تیز قدم
باہر نکل گیا۔ کشور نے جتاتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ بے نیازی سے منہ موڑ گئی۔

کشور نے بھی تھک کر آنکھیں موند لیں اور اس کا ذہن اپنے آنے والے بچے کے بارے میں سوچنے
یہ بچہ اس کی محبت کی نشانی تھا۔ وہ اس نشانی کو ایک تحفے کی صورت آفتاب کو دینا چاہتی تھی۔ یقیناً دنیا
عورت ماں بننے کے مرحلے سے گزرتے ہوئے اپنے بچے کی خیر و عافیت کی دعا مانگتی ہو گی اور اس کی زندگی
اپنی زندگی پر ترجیح دیتی ہو گی لیکن اس کی خواہش کی شدت دُگنی تھی۔ صرف اپنے بچے کی محبت میں نہیں بلکہ
شخص کی محبت میں بھی بے تحاشا مبتلا تھی جو اس بچے کا باپ تھا۔ اس کا دل بڑی شدت سے خواہش کرتا تھا
آفتاب کو اس کی محبت کے بدلے میں کوئی ایسا تحفہ دے جو انمول ہو اور اولاد سے بڑھ کر انمول نعمت اور
ہو سکتی تھی؟ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ بچے کی سلامتی کی دعا کرتی رہی۔ آخر کار وہ وقت آ پہنچا جب اسے
تھیٹر میں لے جایا جانے لگا۔

''آپ میرے لیے اس دنیا میں موجود ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہیں۔ میں اس یقین کے ساتھ آپ
دروازے کے پار بھیج رہا ہوں کہ جب دوبارہ یہ دروازہ کھلے گا تو آپ میرے بچے کے ساتھ اس دروازے
باہر آئیں گی۔''

آپریشن تھیٹر کے دروازے پر آفتاب نے اسٹریچر کے قریب کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ تھام کر یہ الفاظ
اس کے سارے وجود میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور آنکھوں میں دیے جلنے لگے۔ جواب میں زبان
کچھ کہے بغیر اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ سجالی۔ اس مسکراہٹ کی روشنی کے ہالے میں
کا اسٹریچر پر موجود وجود تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اس کے نظروں سے غائب ہوتے ہی آفتاب ایک دیوار
ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سراپا دعا بن گیا۔ انتظار کا یہ وقت منٹوں پر محیط تھا یا گھنٹوں پر، وہ نظر انداز نہیں کر
کیونکہ خود اس پر تو ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔



''مبارک ہو مسٹر! اللہ نے آپ کو بڑی پیاری سی بیٹی دی ہے۔'' آپریشن تھیٹر سے برآمد ہونے والی نرس
اب یہ خوشخبری سنائی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ بہنے والے یہ آنسو خود
دے رہے تھے کہ ہم خوشی اور شکر گزاری کا نتیجہ ہیں چنانچہ نرس کو ایسا کوئی شک نہیں گزرا کہ تنگ نظر
ماں کی طرح وہ بھی بیٹی کی پیدائش پر مایوسی اور اُداسی میں مبتلا ہے۔

''پھر آپ اسٹاف کے لیے مٹھائی پہنچا رہے ہیں نا سر؟'' اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کرتی نرس
اس سے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں؟ آپ کی مٹھائی ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی۔ آپ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ میری مسز
کیا حال ہے؟ اور میں اپنی بچی کو کب دیکھ سکوں گا؟'' اس نے مسکرا کر ہامی بھرتے ہوئے ایک ساتھ دو
سوال کیے۔

''آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آ جائے گا تو ہم انہیں روم میں شفٹ کر
گے۔ بے بی کو ابھی نرسری میں رکھا جائے گا۔ بچی کمزور ہے اس لیے کچھ دن اسے وہیں رکھنا ہو گا۔ جیسے ہی
وہاں شفٹ ہوتی ہے، میں آپ کو بتا دوں گی۔'' نرس نے با اخلاق لہجے میں اسے جواب دیا اور وہاں سے
گئی۔

نرس کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی اسے اپنی بیٹی اور کشور کو دیکھنے میں کچھ وقت لگے گا چنانچہ
باہر نکل گیا اور مسجد کا رخ کیا۔ ہسپتال کے ساتھ بنی مسجد میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد وہ مٹھائی کی
ان پر گیا اور ڈھیروں مٹھائی کے ساتھ ہسپتال واپس لوٹا۔ پہلی بار باپ بننے کے تجربے نے اس کے دل میں
مسرت کی کلیاں کھلا دی تھیں اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کر لے۔ لیکن
کا مقام یہ تھا کہ وہ اور کشور دونوں ہی عام لوگوں کی طرح اپنے کسی پیارے سے اس خوشی کو نہیں بانٹ سکتے
وہ خود رشتوں کے معاملے میں قلاش تھا اور کشور کا اپنا خاندان جانی دشمن بنا ہوا تھا لیکن آج وہ ان سب
کو بھلا کر اپنی خوشی کو منانا چاہتا تھا۔ چنانچہ خوشی خوشی ہسپتال پہنچا اور مٹھائی عملے کے افراد کے حوالے کر کے
نرسری کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر قبل اسے بیٹی کی اطلاع دینے والی نرس نے اس کے واپس ہسپتال لوٹتے ہی اسے یہ اطلاع بھی
دی تھی کہ بچی کو نرسری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نرسری پہنچا تو وہاں موجود ایک نرس نے اُس کی اس کاٹ
راہنمائی کی جس میں اس کی بیٹی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کاٹ کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور بچی کا جائزہ لینے لگا۔
نازک سی گندمی رنگت والی وہ بچی گلابی تولیے میں لپٹی آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ بچی نے اپنی ماں کے
نقش چرائے تھے اس لیے اسے کچھ اور بھی پیاری لگی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر بے حد احتیاط سے اسے کاٹ سے باہر نکالا اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد اس کے
پر نرمی سے بوسہ دیا۔ باپ کا پیار بھرا لمس پا کر بچی سوتے میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نے آفتاب کے
لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کے کان میں اذان دینے لگا۔ اس فریضے سے فارغ
نے کے بعد اس نے بچی کو ایک بار اور پیار کیا اور پھر اسے کاٹ میں لٹا کر نرسری سے باہر نکل گیا۔ اب اسے
کو دیکھنا تھا۔ جب وہ بچی کو دیکھنے آ رہا تھا تو اسے اطلاع دی گئی تھی کہ کشور کو ہوش آ چکا ہے اور کچھ دیر بعد
روم منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس کے اندازے کے مطابق اب تک یہ کام ہو جانا چاہئے تھا۔ وہ پرائیویٹ روم میں پہنچا تو اس کے

اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ سامنے ہی کشور بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں پیوست سے گلوکوز کی شکل میں قطرہ قطرہ توانائی جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ نرس جو گلوکوز کی بوتل میں کوئی دوا انجکٹ رہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی اور اپنا کام مکمل کر کے باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی وہ کشور کی طرف بڑھا۔

''مبارک ہو، ہم بڑی ہی پیاری بیٹی کے اماں ابا بن گئے ہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے کشور کا بایاں ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' کشور کے ہونٹوں پر مسرت بھری شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ ''آپ نے بیٹی کو دیکھ لیا..... کیسی لگی آپ کو؟'' شدید نقاہت کے باوجود وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُر اشتیاق لہجے میں اس سے پوچھنے لگی۔

''بہت پیاری، بالکل آپ جیسی ہے۔'' اس نے برجستگی سے جواب دیا تو وہ مزید شرما گئی۔ خوشی کے یہ لمحے ایسے تھے جس میں وہ ہر دکھ اور پریشانی کو بھول گئے تھے۔ آج انہوں نے وہ موتی پایا تھا جس سے قیمتی شے اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''اس کا نام کیا سوچا ہے آپ نے؟'' کشور نے ایک اور سوال کیا۔

''اُمید..... ہماری بیٹی کا نام اُمید ہوگا اور ہم اس اُمید کے ساتھ اس کی پرورش کریں گے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہم اپنی بیٹی کے ساتھ بلاخوف وخطر خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے۔'' اس نے بنا کسی توقف کے جواب دیا پھر کوئی خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔

''آپ کو اس نام پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ اگر آپ کو اس کے سوا کوئی اور نام پسند ہو تو رکھ سکتی ہیں میں بغیر برا مانے آپ کے حق میں دست بردار ہو جاؤں گا۔''

''نہیں، مجھے آپ کے رکھے نام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے۔'' کشور نے اس کی پسند سے اتفاق کیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''بچی کو فیڈ کروانا ہے۔'' آفتاب کی ''کم اِن'' کے جواب میں ایک نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

''بالکل کروائیں۔ میں باہر جانے ہی والا ہوں۔'' نرس کی گود میں موجود بچی پر محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے اس نے جواب دیا تو وہ کشور کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ آفتاب ماں بیٹی کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست و مگن چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

ہسپتال سے باہر اس کا رخ ایک کوریئر سروس کے آفس کی طرف تھا کہ خوشی کی خبر دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمن تک نہ پہنچے تو خوشی ادھوری لگتی ہے۔

⊛----✪----⊛

اپنے حصے کا کام نمٹانے بعد اس نے پھلواری کا رخ کیا تو جسم کا جوڑ جوڑ دُکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تھکن کے اس احساس کو مٹانے کے لیے ہی پھلواری کی طرف جا رہی تھی۔ اس پورے ماحول میں وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں جا کر اپنی قید اور بے بسی کا احساس ماند پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کا نظارہ اور خوشبو کچھ دیر کے لیے ہی سہی، جسم و جان میں تازگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔

اپنی ہی دھن میں چلتی وہ پھلواری کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی تھی کہ اچانک ہی جمرو اس کے



راستے میں حائل ہو گیا۔ قوی الجثہ جمرو کو اچانک ہی اپنی راہ میں کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ جمرو اس کے لیے دورخی دشمن تھا۔ اوّل اس کی ہوس پرست فطرت اس کے حُسن کی طرف لپکتی تھی تو دوم وہ اس کی من پسند ہونے کے ناتے جمرو کی دشمنی کی حق دار ٹھہری تھی۔ اب بھی اس نے اس کی راہ روکی تو وہ اندر تک دہل کر رہ گئی کہ جانے یہ شیطان فطرت شخص اپنا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ لیکن اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی اور کچھ دیر اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ راستے سے ہٹا تو ماہ بانو نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔ اس کا رخ اب بھی پھلواری کی طرف ہی تھا اور ایسا اس لیے تھا کہ اس نے کچھ دیر اسلم کو بھی اسی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اگر اسے وہاں اسلم کی موجودگی کا یقین نہیں ہوتا تو موجودہ صورتِ حال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس طرف قدم بڑھا سکتی۔

''جتنی ملاقاتیں کر سکتی ہے اپنے یار سے، کر ڈال۔ ہو سکتا ہے چند دن بعد تُو اس کی شکل ہی نہ دیکھ سکے۔'' وہ چند قدم ہی آگے چلی تھی کہ اسے اپنی پشت سے جمرو کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسے لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی بددعا پھنکار رہا ہو۔ اسے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور پلٹ کر دیکھے بغیر تیزی سے پھلواری کی طرف بڑھ گئی۔ پیر میں بندھی زنجیر نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے جاتی۔ جمرو کے لہجے نے اس پر ایسی ہی دہشت طاری کی تھی جیسے کسی سانپ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔

''کیا بات ہے، کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی ہو؟'' پھلواری میں اسلم موجود تھا اور ایک پودے کی چھٹائی کر رہا تھا۔ وہ وہاں پہنچی تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور ایک نظر میں ہی بھانپ گیا کہ کوئی مسئلہ ہے۔

''ہاں بس..... اصل میں، میں یہاں آ رہی تھی تو جمرو اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔'' اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں بتایا۔

''اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟'' اسلم کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور وہ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''بدتمیزی تو ایسی کوئی خاص نہیں کی۔ بس راستہ روک کر پہلے گھورتا رہا، بعد میں تمہاری جان لینے کی دھمکی دے رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''کھسیانی بلی کھمبا نوچنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے؟ ابھی میرے ہاتھوں کن کٹا ہوا ہے، کل کو اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے سر کٹا بن جائے گا۔'' مطمئن سے لہجے میں کہتا ہوا وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے انداز میں ایسی بے نیازی تھی کہ جیسے جمرو کی دھمکی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔

ماہ بانو البتہ اس کی بات سن کر چونک پڑی۔ جمرو کا زخمی کان اس نے بھی دیکھا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ گولی کا ہے لیکن وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ لوگ جس واردات کے لیے گئے تھے، یہ اس کی ہی نشانی ہے۔ یہ تو اب زبانی معلوم ہوا تھا کہ یہ اس کا کارنامہ تھا۔

''تم نے جمرو پر گولی کیوں چلائی تھی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے سردار نے اختیار دیا تھا کہ اگر کوئی نہ کرے تو میں اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہوں۔ یہ تو تم میری مہربانی سمجھو کہ میں نے جمرو کا کان اُڑایا۔ میں چاہتا تو اس کے سینے میں گولی بھی مار سکتا تھا۔'' وہ اپنے کام میں مصروف اسی اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔

''کہیں ایسا تم نے جان بوجھ کر دشمنی نکالنے کے لیے تو نہیں کیا؟'' ماہ بانو نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

''میں نہ تو اتنا گھٹیا ہوں اور نہ ہی اتنا کمزور کہ اپنے دشمن پر چھپ کر یا دھوکے سے وار کروں۔ ...ی کی بنیاد پر جمرو کو نقصان پہنچانا ہوا تو علی الاعلان ایسا کروں گا۔'' اس نے کچھ برا مان کر جواب دیا۔

''تو آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہیں اس پر گولی چلانی پڑی؟'' وہ بھی بال کی کھال اُتارنے پر تُلی ہوئی تھی۔

''ہونا کیا ہے؟ حسبِ معمول جمرو کی نیت عورت پر خراب ہوگئی تھی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا ...میرے ساتھی عورت کے معاملے میں بڑے حریص ہیں اور اگر کسی ڈاکے کے دوران انہیں کوئی جوان عورت ...ل جائے تو اسے کسی صورت نہیں چھوڑتے۔ لیکن اس بار سردار نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صرف مال وا... ...لینا ہے اور تھوڑی توڑ پھوڑ مچانی ہے لیکن کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا، پر جمرو کو یہ بات ...سمجھ آتی ہے؟ جوان اور خوب صورت عورت دیکھ کر تو وہ سب بھول جاتا ہے۔ وہاں بھی اس کی نیت خراب ...اور میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود وہ اپنی ہوس پوری کرنے پر اڑا رہا۔ آخر کار مجھے اس کا ایک کا... ...کر اسے قابو میں کرنا پڑا۔' ایک طرف بیٹھ کر اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ساری تفصیل بتائی۔

''جب تمہارے لوگوں کا معمول ہے کہ وہ زر کے ساتھ زن کو بھی نہیں چھوڑتے تو اس بار سردار نے ...کیوں لگائی؟'' وہ خود بھی اس کے برابر میں آ بیٹھی اور سوال کیا۔

''یہ سب تو سردار خود ہی جانتا ہوگا۔ ہم میں سے کسی نے سوال نہیں کیا البتہ میرا اندازہ ہے کہ طاقتور ...دیکھ کر سردار نے یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ مالی نقصان تو عام طور پر لوگ خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن عز... ...ہاتھ ڈالا جائے تو انتقامی کارروائی شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ کسی اسسٹنٹ کمشنر کو چھیڑنا جبکہ اس کا تعلق ...بہت اونچے خاندان سے ہو، کوئی معمولی بات تو نہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ سردار نے اے سی ...بنگلے پر ڈاکا ڈالنے کا سوچا ہی کیسے؟ اگر ہمارے ہاں سوال کرنے کی اجازت ہوتی تو میں اس سے یہ بات ...پوچھتا۔ ویسے میرا خود کا خیال ہے کہ سردار نے یہ کام کسی اور کے کہنے پر کیا ہوگا۔ کسی دوسری بڑی پارٹی ...سردار کو اس واردات کے لیے ہائر کیا ہوگا۔'' وہ قیاس آرائیاں کر رہا تھا جبکہ ماہ بانو کے کان اسسٹنٹ کمشنر کا ...سن کر کھڑے ہوگئے تھے۔

''کس اسسٹنٹ کمشنر کی بات کر رہے ہو تم؟ نام کیا ہے ان کا؟'' اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

''اسی ضلع کے اے سی ہیں۔ شہریار عادل نام ہے ان کا۔'' اسلم نے بتایا۔

''اے سی شہریار عادل.....'' ماہ بانو نے زیرِ لب وہ نام دہرایا جسے سن کر ہی اس کی دھڑکنوں میں ارت... ...سا پیدا ہوگیا تھا اور پھر ذرا سخت لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''تم نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟''

''مالی کے علاوہ تو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچایا۔ اور میرے خیال میں اس سے اے سی صاحب کو تو ...فرق نہیں پڑا ہوگا۔ سنا ہے بڑا مال ہے ان کے پاس۔'' ماہ بانو کی دلی کیفیت سے بے خبر وہ مزے سے ...رہا تھا۔

''شہریار صاحب کے بنگلے پر جمرو کی نیت کس عورت پر خراب ہوئی تھی؟'' وہ جانتی تھی کہ شہریار خا... ...کے بغیر تنہا وہاں رہ رہا ہے، اس لیے کھوجنے والے انداز میں پوچھا۔

''ان کی بیگم پر۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی عورت ہے۔ شاید تم نے خود بھی اسے دیکھا ہو۔ پیر آبا... ...مرکزِ صحت میں کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ نام ہے اس کا۔'' اسلم نے گویا اس کی سماعتوں میں کوئی دھماکا کر...

''لیکن اے سی صاحب تو غیر شادی شدہ ہیں۔'' اس نے کسی مبہم سی امید کے سہارے یہ جملہ کہا۔

''غیر شادی شدہ تھے، اب نہیں رہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی ان کی شادی ہوئی ہے۔ بری میں بہت ...



...حا یا تھا انہوں نے اپنی بیگم کو۔ سب کا سب ہم لوگ وہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ موقع ملنے پر کبھی بیچنے ...گے تو اس کی صحیح قیمت معلوم ہو سکے گی۔'' وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا لیکن اس کے حواس تو گویا اس خبر کو سن کر ...ی چھوڑتے جا رہے تھے۔ شہریار کو ہمیشہ ناقابلِ حصول سمجھنے کے باوجود ہر محبت کرنے والے کی طرح اس ...ل میں آس کا دِیا جلتا تھا کہ شاید وہ اسے پالے۔ اسلم سے ملنے والی اطلاع نے اس دِیے کو بجھا دیا تھا اور ...اس کے دل میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ یہ دھواں اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔ وہ سانس لینے میں مشکل محسوس ...کر رہی تھی۔

''تمہاری باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم اے سی صاحب کو کافی اچھی طرح جانتی ہو۔'' اس کی ...سے بے خبر اسلم نے قیاس آرائی کی لیکن وہ اسے کوئی جواب دینے کے قابل ہی کب تھی۔ رُکتی ہوئی ...سانسوں نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا کہ وہ مزید بیٹھی نہ رہ سکی اور دھڑام سے گر پڑی۔

اسے اس طرح بے ہوش ہوتے دیکھ کر اسلم بھونچکا رہ گیا اور پھر اسے آوازیں دیتے ہوئے ہلانے جُلانے ...لگا۔ وہ تو ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ پریشان سا اسلم اپنی کوشش میں ناکام ہو کر تیزی سے اس درخت کی ...ال بڑھا جس کی شاخوں پر اس نے اپنا مچان نما ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ رسّی کی سیڑھی سے مچان پر پہنچنے کے بعد اس ...ماہاں رکھی صراحی اُٹھائی اور واپس سیڑھیاں اُتر کر ماہ بانو کی طرف بھاگا۔ صراحی اُلٹی کر کے اس نے اس میں ...سارا پانی ماہ بانو پر اُنڈیل دیا۔ اتنا ڈھیر سارا پانی چہرے اور جسم پر گرنے سے وہ ہڑبڑا کر بے ہوشی سے ...ل میں آئی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بالکل ویران تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں کھول لینے کے باوجود ...ل حواس کی دنیا میں واپس نہ لوٹی ہو۔

''آر یو او کے ماہ بانو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اچانک تمہیں کیا ہوگیا تھا؟'' اس کے رخسار نرمی سے ...تھپکتے ہوئے اسلم نے دریافت کیا۔

''میں اپنی جھونپڑی میں واپس جاؤں گی۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ کسمساتی ہوئی ...اٹھ بیٹھی اور فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ اسلم نے بھی اسے اس وقت چھیڑنا اور کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا ...سہارا دے کر پھلواری سے باہر لے آیا۔ اسے ماہ بانو کو اس طرح سہارا دے کر جھونپڑی تک لے جاتے دیکھ ...بہت سی آنکھوں میں سوال جاگے۔ لیکن ان دونوں ہی کے پاس کسی کی نظروں میں موجود سوالوں کو پڑھنے کی ...ت نہیں تھی۔ ایک اپنے سب سے بڑے نقصان کے لیے دل میں ماتم کناں تھا تو دوسرے کو فکر تھی کہ وہ جس ...کو سہارا دے کر لے جا رہا ہے، اسے کچھ ہو نہ جائے۔ ماہ بانو کی اچانک بے ہوشی نے اسے بے حد تشویش ...مبتلا کر دیا تھا لیکن وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مناسب یہی ...وہ کچھ دیر آرام کرے۔

''تم آرام کرو۔ میں دو گھنٹے بعد آ کر تمہاری خیریت معلوم کروں گا۔'' جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر ...نے مکمل سکوت میں موجود ماہ بانو سے کہا اور خود نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے پلٹنے لگا۔

''ایک منٹ رُکو اسلم!'' ماہ بانو کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

''ہاں بولو۔ کوئی کام ہے کیا؟'' وہ اس کی طرف واپس پلٹا۔

''تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔'' وہ اس پر نظر جما کر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

''پوچھو۔'' وہ ذرا حیرت زدہ سا ہمہ تن گوش ہوا۔ اگلے ہی لمحے ماہ بانو نے اس سے جو سوال کیا، اس ...کی حیرت کو دوچند کر دیا اور وہ بھونچکا سا کھڑا سوچنے لگا کہ کیا میری قوتِ سماعت ٹھیک طرح سے کام کر

رہی ہے؟

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اسلم؟" اسلم ابھی تک گومگو کی حالت میں کھڑا تھا جبکہ ا
وال کا جواب پانے کی جلدی تھی۔ حیرت اور خوشی کی شدت سے گنگ رہ جانے والے اسلم نے سوال د
ہانے پر نظریں اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر قبل اسلم نے ہوش میں لانے کے لیے اس کے اوپر صرا
پانی انڈیلا تھا چنانچہ اب وہ اس کے سامنے بھیگی ہوئی کھڑی تھی لیکن اسلم کو لگ رہا تھا کہ صرف اس کا لبا
بھیگا ہوا نہیں ہے بلکہ پلکیں بھی بھیگی بھیگی سی ہیں۔ شاید اس کے اندر کہیں بہت زور کا ساون برس رہا تھا جس
اس کی پلکوں کو بھی بھگو دیا تھا۔

"تم کچھ بول کیوں نہیں رہے اسلم؟" اس کی مسلسل خاموشی پر ماہ بانو نے ایک بار پھر اس سے پوچھا

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے، تم نے مجھ سے وہی سوال کیا ہے یا مجھ سے کوئی
ہی ہے۔" آخر اس نے اپنی خاموشی کو توڑا اور بے بسی میں بولا۔

"اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میں اپنا سوال ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔ میں نے تم سے پوچھا ہے کہ
مجھ سے شادی کرو گے؟" اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ اپنی زندگی کا یہ اہم
فیصلہ اس نے بہت قلیل وقت میں کیا تھا۔ اسلم کے ساتھ پھلواری سے یہاں تک آنے میں جو وقت صرف
ہوا تھا، بس اتنے ہی وقت میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔

پھلواری میں جب وہ شہریار کی شادی کی خبر سن کر فوری صدمے سے سنبھل نہیں سکی تھی اور بے ہوش
ہوئی تھی تو یہ اسلم ہی تھا جو اسے ہوش میں لایا تھا اور پھر بڑی محبت سے سہارا دے کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اسلم
کے سہارے یہاں تک آتے ہوئے اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ زندگی صرف خوشیوں اور خواہشوں کے
لیے جیتے رہنے کا تو نام نہیں ہے۔ اپنی ذات سے دوسرے کو خوشی دے کر بھی تو جیا جا سکتا ہے اور
سامنے والا شخص اسلم جیسا ہو تو اس کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

اسلم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا تھا؟ یہ اسلم ہی تو تھا جس کی وجہ سے وہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے
عزت بچا کر رہ رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں اس کی محبت کا شکار ہوا تھا اور پھر اپنی اس محبت میں اس حد تک
بڑھ گیا تھا کہ اپنا سارا مال و اسباب لٹا ڈالا تھا۔ گروہ میں اپنے لیے دشمن بنا لیے تھے اور ہر دم و ہر پل اس پر
نثار کرنے کو تیار رہتا تھا۔ جسے وہ چاہتی تھی وہ تو اس کی دسترس سے پہلے ہی بہت دور تھا اور اب ڈاکٹر ماریہ
کے بعد مکمل طور پر ناقابل حصول بھی ہو گیا تھا۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ اس شخص کا دامن خو
سے بھر دیتی جو بڑی شدت سے اس کے ساتھ کا خواہاں تھا..... اور وہ جانتی تھی کہ اس خواہش میں اتنی
ہے کہ وہ اس کی یہ خواہش پوری کرنے کے عوض اس سے اپنی کوئی بھی شرط منوا سکتی ہے۔ خود اس کی اپنی
کے لیے ایسی کوئی تمنا نہیں تھی جو اسلم پوری کر سکتا لیکن وہ اسلم کے لیے یہ خواہش رکھتی تھی کہ یہ شخص ڈاکوؤں
اس گروہ سے الگ ہو جائے اور ایک اچھی شریفانہ زندگی گزارے۔

یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے کئی بار خود سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دل جس کی محبت میں مبتلا ہے
کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہونا لیکن آج وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی تھی تو صرف یہ سوچ کر کہ
پانے کی تمنا میں ناکام ہونے کے بعد ساری زندگی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے گزارنے سے کہیں بہتر ہے
کسی کی بن کر اس کی زندگی سنوار دی جائے۔

وہ اسلم کو برائی کی دلدل سے نکال کر شریفانہ زندگی کی طرف لے جاتی تو یہ اس کی اتنی بڑی کامیا



ہی عرفی اسے اپنی ناکام محبت کے دکھ سے نکال دیتی۔ یہ ساری باتیں اس نے ذرا سی دیر میں سوچ لی تھیں
ہی طور پر اسلم کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وہ زبان سے تسلیم کرتی یا نہ کرتی لیکن اس
بات کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ اس نے شہریار کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد جذباتی پن میں یہ فیصلہ
کیا ہے۔

"تم نے مجھ سے جو سوال کیا ہے، درحقیقت تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تم جانتی ہو کہ
آج کل روز سے تمہارا خواہش مند ہوں اور اگر تم میری بن گئیں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کوئی
بات ہو ہی نہیں سکتی۔" اسلم جواب تک حیرت سے ساکت تھا، اس کی خواہش کو دہرائے جانے پر خوشی سے
بھری آواز میں بولا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" ماہ بانو نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ خود اس کی اپنی یہ کیفیت تھی کہ وہ
ہر ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی اور کسی روبوٹ کی طرح غیر جذباتی لہجے میں بول رہی تھی۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" اسلم نے ایک لمحہ لگائے بغیر جواب دیا اور بڑے جذب سے بولا۔
"تمہارے کہنے پر تو میں اپنی جان بھی بغیر سوچے سمجھے قربان کر سکتا ہوں۔"

"تمہیں میری خاطر اس ڈکیت گروپ کو چھوڑنا ہو گا اور ہم شادی تب کریں گے جب اس جنگل سے نکل
کر کسی مہذب آبادی میں پہنچ جائیں گے۔" اس نے اپنی شرط بیان کی جسے سن کر اسلم کے چہرے پر سایہ سا لہرا
کر دوسری طرف وہ اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، کسی نے
پکارا۔ اس نے پکارنے والے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"سردار تجھے بلا رہا ہے۔" پکارنے والے نے اسے اطلاع دی تو وہ فوری طور پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں
سے چل پڑا۔ ماہ بانو کی نظریں اس کے تیز رفتار قدموں سے لپٹی اس اُلجھن میں مبتلا رہ گئیں کہ جانے اسلم کا
کیا ہو گا۔

⊛----✪----⊛

"مبارک ہو چودھری صاحب! آپ نانا بن گئے ہیں۔ امید ہے آپ کو یہ خبر سن کر خوشی محسوس ہوئی ہو
ہمیشہ بڑوں کو کہتے سنا ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی محبت اپنی اولاد سے
محسوس ہوتی ہے، چنانچہ میں آپ سے یہ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی نواسی کی خوشی میں ہماری جان بخشی کر
دیں گے اور ہمارے پیچھے اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بجائے ہمیں ہماری دنیا میں سکون سے رہنے دیں گے۔"

کوریئر سروس کے ذریعے حویلی پہنچنے والا وہ خط اگرچہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن چودھری پر بری طرح
اثر ہوا تھا اور یہ اثر منفی تھا۔ خط بھیجنے والا کتابوں کی دنیا کا فرد تھا چنانچہ بدترین حالات میں بھی لوگوں سے
امیدیں رکھتا تھا۔ اب بھی اس نے اپنی ایسی ہی امید کے سہارے یہ خط حویلی بھیج ڈالا تھا لیکن اس کی
امید کے برخلاف اس خط کو پڑھ کر چودھری سخت طیش میں آ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس خط کے ذریعے آفتاب
نے اس کا مذاق اڑایا ہے اور اسے چیلنج کیا ہے کہ لو، دیکھ لو..... تمہارے تمام تر اختیارات اور رعب و دبدبے
کے باوجود میں نہ صرف تمہاری بیٹی کو تمہاری ناک کے نیچے سے نکال کر لے گیا بلکہ اسے ایک بچی کی ماں بھی بنا
دیا اور تم اتنے سارے پٹھوؤں کے ہوتے ہوئے میری گرد بھی نہیں پا سکے۔

اس سوچ کے بعد اس کا چراغ پا ہونا لازمی تھا، سو وہ کسی زخم خوردہ درندے کی طرح سرخ آنکھیں لیے
اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس تک خط پہنچانے والا منشی اللہ رکھا ایک جانب مؤدب کھڑا تھا۔ اسے تجسس تھا کہ خط

کے مضمون کو جان سکے لیکن چودھری کا غصہ اس کے تجسس کو سوال بن کر زبان پر آنے سے روک رہا تھا۔ اس
لفافے کی پشت پر واضح طور پر لکھا آفتاب کا نام پہلی ہی نظر میں پڑھ لیا تھا اور اس نام کو پڑھ کر بری طرح
چین ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو چودھری کو لفافہ پہنچانے سے قبل خود اسے کھول کر دیکھ لیتا۔ لیکن
ہے، یہ ممکن نہیں تھا اور اب بھی وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا
میں کوئی ایسی بات تحریر ہے جس نے چودھری کی انا کو ٹھیس لگائی ہے جو وہ یوں بلبلایا ہوا نظر آ رہا ہے۔

''اللہ رکھا.....!'' ٹہلتے ٹہلتے چودھری اچانک رکا اور اسے پکارا۔

''حکم سرکار!'' منشی نے فوراً کسی نازک موقع پر اختیار کیے جانے والے مخصوص غلامانہ انداز میں
سے پکار کا جواب دیا۔

''ذرا وہ لفافہ تو اٹھا کر دے۔'' طیش کے عالم میں اس نے خط کو پڑھنے کے ساتھ ہی پُرزہ پُرزہ
لفافے سمیت اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ خط کے پُرزے پنکھے کی ہوا کے زور سے کمرے میں اِدھر اُدھر بکھر
جبکہ لفافہ ایک جانب دیوار کے قریب پڑا تھا۔ اس کا حکم سنتے ہی منشی پھرتی سے لفافے تک گیا اور جھک کر
اٹھانے کے بعد اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔

لفافہ ہاتھ میں لے کر اس نے اس پر چھپے مونوگرام کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک مشہور کوریئر کمپنی کا
تھا۔ اس مونوگرام کے علاوہ لفافے پر حویلی کا پتہ اور آفتاب کا نام درج تھا۔ ظاہر ہے، آفتاب نے
کے ساتھ اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ اسے ایسی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لفافے کو دیکھتے ہو
مشکل ہی سہی لیکن ایسا راستہ ڈھونڈ چکا تھا جس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچا جا سکتا تھا۔

''اس کوریئر کمپنی کے دفتر جا کر چھان بین کرواؤ کہ یہ خط کہاں سے بھیجا گیا ہے۔ علاقے کا معلوم
تو ہمارے لیے اس مردود ماسٹر تک پہنچنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنے ہم راز و دستِ راست
حکم دیا۔

''جو حکم سرکار!'' منشی بوتل کے جن کی طرح حکم کی بجا آوری کے لیے وہاں سے غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چودھری نے حویلی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ زنان خانے میں اس کی
چھوٹی چودھرائن ناہید کا کمرہ تھی۔ کشور کے حویلی سے فرار ہونے کے بعد وہ اس کی ماں ہونے کے ناتے
معتوب ٹھہری تھی اور سزا کے طور پر اسے حویلی کے معاملات سے عملی طور پر بے دخل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ
زیادہ تر اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی تھی۔ اس سزا کو اس نے اس لیے زیادہ دل پر نہیں لیا تھا کہ اس کے
میں اختیارات پہلے ہی محدود تھے اور اصل کرتا دھرتا وڈی چودھرائن ہی تھی لیکن اسے کشور کے اقدام سے
دکھ پہنچا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس جرم کی سزا میں اسے اپنی جان گنوانی پڑے گی اور وہ جیسی بھی سہی، ماں تھی۔ اگر
نے ضرورت سے زیادہ عیش و آرام میں پڑ جانے کے باعث کبھی اپنی اولاد کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت
نہیں کی تھی اور ہمیشہ اس بات کو کافی سمجھا تھا کہ بے تحاشا دولت اور خدمت گار اس کی اولاد کو آرام پہنچا
ہیں لیکن اب اپنی تمام تر بے پروائی اور کاہلی کے باوجود وہ اس غم میں مبتلا رہنے لگی تھی کہ جلد یا بدیر اس کو
ماری جائے گی۔ اس کا حال اس ملزم کی ماں کا سا تھا جسے عدالت سے سزائے موت سنائی جا چکی ہو اور
دن کے ٹلنے کی دعا کر رہی ہو، جب سزا پر عمل درآمد کا دن آئے گا۔ چودھری اس کے کمرے میں داخل ہوا
اسے دیکھ کر چونک پڑی اور عجلت میں اس کے استقبال کے لیے مسہری سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔



''جا ناہید! مجھے تجھ سے ایک ضروری گل کرنی ہے۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے چودھرائن ناہید کو
پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود ایک اونچے پایوں والی منقش کرسی پر بیٹھ گیا۔

''حکم کریں چودھری صاحب!'' چھوٹی چودھرائن ناہید اس کے حکم پر بیٹھ تو گئی لیکن اندر سے وہ سخت
میں مبتلا تھی کہ جانے چودھری کون سی ضروری بات کرنے آیا ہے۔ اس کا دل تو آج کل کشور میں ہی اٹکا
اور وہ اس خیال سے ہولتی رہتی تھی کہ جانے کب کشور کے بارے میں کون سی خبر حویلی پہنچ جائے۔

''حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ تجھے ایک خوشی کی خبر سنانی ہے۔''

''خوشی کی خبر؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''وہ کیا؟''

''نانی بن گئی ہے۔ ابھی ابھی میرے پاس خبر آئی ہے کہ کشور کے ہاں دِھی پیدا ہوئی ہے۔'' چودھری
جو خبر سنائی، اسے سن کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ بھلا کیسے یقین کر سکتی تھی کہ آج تک جو شخص کشور کے خون
اور رہا تھا، آج وہ اس کی بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر خوش ہو سکتا ہے۔ پھر اسے یہ خبر ملی کیسے تھی؟ کیا وہ
پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ یہ خیال آتے ہی اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا اور اس نے خوف زدہ
سے چودھری کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ جیسی سختی و کرختگی چھائی ہوئی تھی اور کہیں بھی خوشی
معمولی سی رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا چودھری صاحب! کیا کشور آپ کو مل گئی ہے؟'' آخر کار وہ اپنے خدشے کو حیرت
میں سوال بنا کر ہونٹوں پر لے آئی۔

''نہیں، کشور مجھے نہیں ملی۔ یہ خبر جو میں نے تجھے سنائی ہے اس کے شوہر نے خط میں لکھ کر بھیجی ہے۔''
نے اسے جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر ناہید کو کافی سکون محسوس ہوا اور وہ دل ہی دل میں شکر ادا
کی کہ چودھری خود کشور تک نہیں پہنچ سکا۔

''میرا دل کرتا ہے کہ اس خوشی میں تجھے کوئی تحفہ دوں۔'' وہ جس خوشی کا اظہار کر رہا تھا، اس کی کوئی جھلک
چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

''آپ نے اپنا دل کشور کے لیے نرم کر لیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ہور کوئی تحفہ نہیں چاہئے مجھے۔'' اس
ہری کی بات کے جواب میں کہا۔

''پر میرا جی کرتا ہے کہ میں تجھے کوئی ہور تحفہ بھی ضرور دوں۔ چل ایسا کرتا ہوں کہ اس حویلی کے سارے
ات تیرے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ تُو حویلی کے اندر کے سارے معاملات دیکھنا۔ آج سے تیرا حویلی
میں مقام ہوگا جو وڈی چودھرائن کا ہے۔'' چودھری کی بات کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس بات کو سن کر
تو سکتہ زدہ سی بیٹھی رہ گئی پھر ذرا ہمت کرتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''لیکن چودھری صاحب! وہ وڈی آپا.....؟'' اس کے ادھورے جملے میں ہی پورا سوال تھا۔ وہ جانتی تھی
چودھرائن خود کو اس حویلی کا مالک سمجھتی ہے اور کسی کو بھی اپنے اختیارات میں دخل دینے کی اجازت نہیں
تی۔

''وہ کچھ عرصہ آرام کرے گی۔ اسے آرام کی وڈی ضرورت ہے۔'' یہ جواب دیتے ہوئے چودھری کے
میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی۔ چودھرائن نے اس جواب کو سن کر اپنے اندر ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی
کی اور مزید کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔

⊛----✪----⊛

''میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی خبر ہے سر!'' اس کے پاس ایس پی کا فون آیا تو علیک سلیک کے بعد اس نے یہ جملہ کہا تو وہ چونک پڑا۔ جنگل میں جو آپریشن شروع کیا جانے والا منصوبہ بندی میں ایس پی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اچھی خبر کا سن کر اسے فوراً ہی یہ خیال آیا کہ آپریشن سے ہی ہے۔

''خبر اچھی ہے تو سنانے میں دیر مت کیجیے ایس پی صاحب! یہاں اچھی خبریں ویسے بھی مشکل سننے کو ملتی ہیں۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں ایس پی کو جواب دیا۔ یہ ایس پی سابقہ ایس پی معظم تارڑ سے میں کافی بہتر آدمی تھا اس لیے وہ اسے پسند کرتا تھا حالانکہ اس شخص نے بعض مواقع پر اسے مایوس بھی خاص طور پر ماسٹر منیب اور اس کے دوسرے ساتھی اساتذہ کے سفاکانہ قتل کے موقع پر وہ جس طرح چودھری سامنے بے دست و پا نظر آیا تھا، اس چیز نے اسے کافی تکلیف پہنچائی تھی۔

اس موقع پر ایس پی نے کھل کر اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے یہ کوشش کی تھی کہ چودھری اور درمیان صلح ہو جائے اور وہ خود ہاتھیوں کی لڑائی میں روندے جانے سے محفوظ رہے۔ اس نے ایس بات ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی مجبوری کو بھی قبول کر لیا تھا۔ وہ بے چارہ اس لیے معاملات سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا کہ اسے اس کی جوان بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ وہ اور بزدل تھا لیکن سابقہ ایس پی معظم تارڑ کی طرح کرپٹ نہیں تھا۔ معظم تارڑ تو پولیس کی وردی میں تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کی وجہ سے جنگل سے بڑے پیمانے پر درختوں اور جانوروں کی اسمگلنگ کی گئی تھی۔ فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ بھی اس جرم میں برابر کا شریک رہا تھا۔ اقبال باجوہ شریک چودھری کے ہاتھوں موت کے گھاٹ پہنچا اور معظم تارڑ بیرونِ ملک فرار ہو گیا۔ ان دونوں کی جگہ وہ موجودہ ایس پی اور نئے فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کو لایا تھا اور ان کی طرف سے خاصا مطمئن تھا۔ خاص طور پر اسے اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر درخت کاٹ کر اسمگل نہیں رہے ہیں اس لیے اس کے ان دونوں سے تعلقات بھی کافی خوشگوار تھے خاص طور پر وہ عابد انصاری کو خاصا کرنے لگا تھا۔

''خوشخبری یہ ہے جناب! کہ ہمیں ایک ایسا مخبر مل گیا ہے جو ہمیں جنگل میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بتا سکتا ہے اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ جائیں گے اور افرادی قوت کم ہو جائے گی۔'' اس پی بھی خاصا خوش لگ رہا تھا۔

''خبر تو واقعی اچھی ہے لیکن ایسا کام کا آدمی آپ کے ہاتھ آیا کیسے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا خود سے کوئی تعلق ہو اور وہ ہمیں بھٹکانے کے لیے منظر پر آیا ہو۔'' اس نے شک کا اظہار کیا۔

''ایسا نہیں ہے جناب! اس آدمی کو پولیس والے جانتے ہیں۔ وہ کوئی سادھو قسم کا آدمی ہے۔ سارا ادھر سے اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ کبھی آبادی میں نظر آتا ہے تو کبھی مہینوں کے لیے جنگل میں غائب ہے۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہے لیکن جب موڈ میں ہو تو اپنے بارے میں بھی بتانے لگتا ہے اس کی باتوں سے لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے غیاب کے عرصے میں کہاں بھٹکتا رہا..... جنگل کے کس حصے میں رہا... کھایا پیا اور کیا کچھ دیکھا۔ لوگ اس کی باتوں کو بہت زیادہ توجہ سے نہیں سنتے ہیں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ کل جب وہ اپنی خاموشی کا روزہ توڑ کر بولنا شروع ہوا اور جنگل میں اپنے بسیرے کی داستان سناتے سناتے ڈاکوؤں کو دیکھنے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے ڈیرے پر پہنچنے کی داستان سنا رہا تھا تو قریب ہی موجود پولیس کے



نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ اس سادھو کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گیا اور اس سے ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں خاصی معلومات اُگلوا لیں۔'' ایس پی نے جوش و خروش کے ساتھ اسے اس سے آگاہ کیا۔

''آپ کے خیال میں ہم اس قسم کے کسی آدمی کے بیان پر اتنے بڑے آپریشن میں اپنا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں؟'' ایس پی کے جوش و خروش کے باوجود وہ بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''آئی تھنک سر! بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے آدمیوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کے مطابق بابا فاتر العقل نہیں ہے۔ وہ بس تنہائی پسند ہے اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ایک بار گاؤں کی ایک بچی گم ہو گئی تھی اور ہر طرف ڈھونڈنے کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایسے میں سادھو بابا جنگل سے برآمد ہوا اور اس نے بتایا کہ بچی جنگل میں ہے اور وہاں ایک درخت کے نیچے سو رہی ہے۔ لوگوں نے سادھو سے جگہ کے متعلق معلومات حاصل کیں اور دوڑ پڑے۔ بچی عین اسی جگہ ملی جس کی سادھو نے نشان دہی کی تھی۔''

''اوہ..... اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے یہ بہت ہی بہتر ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے، آپریشن کے دوران اسے اپنے ساتھ رکھیں گے یا نہیں؟'' ایس پی کے بیان پر اسے خود بھی سادھو کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے سوال کیا۔

''ساتھ تو خیر نہیں رکھ سکتے۔ وہ من موجی آدمی ہے، ہمارے کہنے پر ہمارے ساتھ چلنے کو راضی نہیں ہو سکتا اگر راضی ہو بھی گیا تو جانے کب راستے میں ہی اپنا رخ بدل لے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے یہی طے کیا ہے کہ جو کچھ اس نے بتایا ہے، اس کی اس سے مزید تصدیق و تفتیش کر لی جائے تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے اور ہم صحیح مقام پر پہنچ سکیں'' ایس پی نے ذرا وضاحت کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''اوکے! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ لیکن یہ بتائیں کہ سادھو کا آپ کیا کریں گے؟'' وہ پولیس کسٹڈی میں ہی رہے گا یا اسے آزاد کر دیا جائے گا؟'' اس نے ذہن میں اُبھرنے والے کسی خیال کے تحت ایس پی کو کریدا۔

''جب تک پولیس فورس جنگل میں داخل نہیں ہو جاتی، وہ احتیاطاً پولیس کسٹڈی میں رہے گا، اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں کہ اسے قید میں رکھا جائے۔ ہماری فورس کے جنگل میں داخل ہونے کے بعد وہ قطعی بے ضرر بھی ہو جائے گا۔ ویسے بھی اس پر جس طرح خاموشی کے دورے پڑتے ہیں، اس کے پیش نظر یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ بتائے گا یا اگر بتا بھی دے گا تو زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکے گا کہ وہ ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے اور اس نے یہ بات پولیس کو بتا دی ہے..... تو اس سے ہمارے آپریشن پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہماری اپنی پلاننگ تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی نا!'' ایس پی نے اسے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ایس پی صاحب! آپ مطمئن ہیں یہ کافی ہے۔ اس سارے معاملے کو دیکھنا تو آپ ہی کو ہے۔ باہر سے جو لوگ آپ کی مدد کے لیے آئیں گے، وہ تو آپ کے آرڈرز کو ہی فالو کریں گے۔'' اس نے ایس پی پر اپنے بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو کو سمیٹ دیا۔

''اوکے سر! یہ سب آپ کے پرسنل انٹرسٹ کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو اپ ڈیٹ کر دوں ورنہ آپ کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ اس معاملے کو مجھے اور میرے عملے نے ہی

دیکھنا ہے۔ اچھا، اب اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اب کامیابی کی خوشخبری کے ساتھ ہی دوبارہ بات چیت ہو۔" ایس پی نے خوش خلقی سے کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ اس کی کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ موبائل کی بج اٹھی۔

"السلام علیکم ممانی جان! کہیے سب خیریت ہے نا؟ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟" اسکرین پر آفرین کا نمبر دیکھ کر اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کال ریسیو کی اور خوش دلی سے بات کرنے لگا۔

"میرے مزاج تو اچھے ہیں لیکن میں اور تمہارے ماموں جان تمہاری مزاج پرسی کے لیے پریشان ہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر کب تک پہنچ رہے ہو؟" جواباً وہ رعب سے بولیں تو وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔

"کیا واقعی آپ دونوں یہاں پر ہیں؟" اس کی حیرت و خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے بھی ہوا۔

"تو تمہارے خیال میں، میں تمہیں بغیر موقع کے اپریل فول بنا رہی ہوں؟" آفرین رانا نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

"ناراض مت ہوں۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے ان سے کہا۔ لائن کاٹ کر اپنی جگہ سے اٹھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا۔

"سر! فاریسٹ آفیسر عابد انصاری آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔" دوسری طرف سے عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

"اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عابد انصاری اس کا شخص نہیں تھا کہ وہ اس کی ملاقات کی خواہش کو ٹال سکتا۔ چند لمحوں کے بعد عابد انصاری اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حسب معمول سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر نفیس فریم کی عینک تھی۔

"آپ کیا لینا پسند کریں گے انصاری صاحب! ٹھنڈا یا گرم؟" وہ دفتر میں بیٹھ کر لوگوں کی خاطر داری سے عموماً پرہیز ہی کرتا تھا لیکن عابد انصاری کی بات ذرا الگ تھی۔

"ان تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے شہریار صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ایک چھوٹی سی بات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، وہ کام ہو جائے تو آپ سے اجازت چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خاصے مصروف آدمی ہیں اس لیے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔" اس نے بہت رکھ رکھاؤ سے شہریار سے کہا۔

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں انصاری صاحب! اب میں ایسا بھی مصروف آدمی نہیں ہوں۔ چلیں ایسا کرتا ہوں کہ چائے منگوا لیتا ہوں۔ ہم دفتری کام کرنے والوں کو تو چائے ہر موسم میں ہی اچھی لگتی ہے۔ اور ایک پیالی چائے پینے میں وقت بھی زیادہ نہیں لگتا۔" اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اسے جواب دیا اور انٹرکام پر چائے کا آرڈر دینے لگا۔

"جی اب فرمائیے کہ آپ نے کس چھوٹی سی بات کے لیے یہاں آنے کی تکلیف فرمائی؟" چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ مسکراتا ہوا عابد انصاری سے مخاطب ہوا۔

"بات یہ ہے اے سی صاحب! کہ مجھے کچھ درخت یہاں سے باہر بھجوانے ہیں۔ آپ کے علم میں یہ بات ہو گی کہ کسی بھی جنگل میں درختوں کی کٹائی اور جانوروں کے شکار پر پابندی ہونے کے باوجود مخصوص اوقات میں محدود پیمانے پر ان دونوں باتوں کی اجازت دی جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت میں نے جنگل سے کچھ درختوں کو کٹوایا ہے اور اب یہ کٹے ہوئے درخت ٹرکوں پر لوڈ ضلع سے باہر جانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ٹرکوں



جانے والے افراد کے پاس باقاعدہ پرمٹ موجود ہوں گے اور یہ ایک قطعی قانونی کام ہے، اس کے لیے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے علم میں یہ بات لے آؤں تاکہ اوّل تو میرے عملے کو راستے میں غیر ضروری تفتیش اور چیکنگ کا سامنا نہ کرنا پڑے، دوسرے میری ذات کسی قسم کے شک وشبے کی زد میں نہ آئے کہ میں بھی سابقہ فاریسٹ آفیسر کی طرح درختوں کی اسمگلنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" عابد انصاری نے سنجیدہ ہوئے لہجے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں انصاری صاحب! اگر کوئی کام قانونی طریقے سے کیا جائے گا تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا اور میں کیوں آپ پر کسی قسم کا شک کروں گا؟ آپ بے فکر ہو کر سامان بھجوائیے، میں پولیس اسٹیشن پر پیغام بھیج دوں گا کہ آپ کے عملے کو پریشان نہ کیا جائے۔" اس نے عابد انصاری کو اطمینان دلایا۔

"میں اس تعاون کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں گا۔" اس نے انکساری سے جواب دیا۔

"شکریے کی کوئی بات ہی نہیں ہے، اگر آپ اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں۔" اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"جی نہیں شکریہ۔" اس نے انکار کیا۔

"تو پھر آیئے چائے پیتے ہیں۔" ملازم اسی وقت دروازے پر دستک دے کر چائے سمیت اندر آیا تو وہ عابد انصاری سے بولا۔

چائے کے دوران وہ دونوں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ معلومات کی دونوں طرف کوئی کمی نہیں تھی اس لیے دونوں کو ہی گفتگو میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا بھئی! اب اجازت دیجیے۔ میں چند منٹ کی ملاقات کا سوچ کر آیا تھا اور اب اچھا خاصا وقت گزر گیا ہے۔" آخر عابد انصاری کو ہی خیال آیا تو اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا اور اس سے اجازت چاہی۔

"آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا انصاری صاحب! وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" اس نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا اور پھر بڑے وقار سے چلتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا نہیں اور خود بھی دفتر سے باہر نکل گیا۔ اسے اچھی طرح سے احساس تھا کہ وہ آفرین رانا سے پانچ منٹ میں گھر پہنچنے کا کہہ کر اچھا خاصا لیٹ ہو گیا ہے۔

"نور کوٹ میں پانچ منٹ اتنے طویل ہوتے ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا۔" گھر پہنچ کر وہ سلام دعا کے مرحلے سے فارغ ہوا تو حسبِ توقع آفرین رانا نے پہلی فرصت میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس انداز پر وہ مسکرا دیا اور شرارت سے بولا۔

"اصل میں یہاں ہم نے وقت کو اپنے کنٹرول میں کرنے کا جادو سیکھ لیا ہے۔ ہم جب چاہے منٹوں کو گھنٹوں میں اور گھنٹوں کو منٹوں میں بدل سکتے ہیں۔"

"یہاں آ کر سیکھ لینے کی کیا بات کر رہے ہو۔ یہ ہنر تو سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ بے وقوف تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو تمہاری بات کا یقین کر لیتے ہیں۔" انہوں نے منہ بنا کر اس کی بات کا جواب دیا تو سب ہنس پڑے۔ پھر لیاقت رانا اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولے۔

"برخوردار! یہ جو تمہاری ممانی جان ہیں، انہوں نے اپنی زندگی ان ہی دو کیٹگریز کے لوگوں کو بھگتتے ہوئے گزاری ہے اس لیے یہ خوب جانتی ہیں کہ ہمارا تمہارا کچا چٹھا کیا ہے۔"

''اسی لیے تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری پیاری ممانی جان میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہیں۔'' وہ بڑے سے بولا اور لاڈ سے آفرین رانا کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''بلیوی ممانی جان! جب میں نے آپ سے فون پر کہا کہ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں تو یقین میں پانچ منٹ میں ہی یہاں پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن عین وقت پر ایک ایسے ملاقاتی آفس پہنچ گئے کہ صورت انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ان سے فارغ ہوتے ہی میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا! میں جانتی ہوں ان مسائل کے بارے میں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔'' حسبِ عادت انہوں نے اس کے لیے اپنا دل فوراً ہی کشادہ کر لیا۔ ویسے بھی ان کی ناراضگی مصنوعی تھی۔ سے لے کر شوہر کے گھر تک انہوں نے مردوں کی یہی مصروفیات دیکھی تھیں اس لیے اس طرح کی خوب سمجھتی تھیں۔

''کھانا لگ گیا ہے۔ آپ لوگ کھانے کے لیے آجائیں۔'' ماریہ جو اس گفتگو کے دوران خاموشی کمرے سے باہر چلی گئی تھی، واپس آکر بولی۔

''آپ لوگ چلیں پلیز۔ میں بس دو منٹ میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ دفتر میں پہنے جانے پُرتکلف لباس میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہا تھا چنانچہ ان لوگوں سے بولتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کو اپنی معیت میں ڈائننگ روم میں لے گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پُرتکلف کھانے سے سجی ہوئی تھی۔ ماریہ اپنے سسرالی رشتے داروں کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس اہتمام کو دیکھ کر آفرین رانا خوشی سے مسکرائیں شہریار کے ماریہ سے شادی کے فیصلے سے وہ جتنی ناخوش تھیں، وہ احساس آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگا ماریہ ایک پروفیشنل ڈاکٹر ہونے کے باوجود اچھی خاتونِ خانہ ثابت ہو رہی تھی البتہ ماریہ کا غیر مسلم ہونا ان کے لیے اب بھی باعثِ خلش تھا۔ شہریار ان کے لیے شوہر کے بھانجے سے بڑھ کر بیٹے کی سی حیثیت رکھتا تھا تشویش میں مبتلا تھیں کہ ان کی آنے والی نسل ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں پرورش پا کر نکلے گی۔

''بڑا تکلف کر ڈالا تم نے۔ تمہارے ماموں جان تو پرہیزی کھانا کھاتے ہیں اور خود مجھے کھانے پینے کا زیادہ شوق رہا نہیں ہے۔'' کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے ماریہ سے کہا تو ان کے جملے کے آخر میں اُداسی کا رنگ بھی تھا جو ایک جوان بیٹے کو گنوا دینے والی ماں کی گفتگو کا لازمی جز ٹھہرا تھا۔ صبر اور وضع داری کے تقاضے نبھانے کے لیے انہوں نے بے شک خود کو سنبھال لیا تھا لیکن سجاد رانا کی موت نے جو زخم ان کے دل پر لگایا وہ کبھی مندمل ہونے والا نہیں تھا۔

''آپ لوگ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ اتنی مہمان نوازی تو میرا فرض بنتی ہے۔ انکل کے پرہیز کا مجھے ہے۔ اس لیے میں نے ان کے لیے الگ سے کھانا بنوایا ہے۔ باقی آپ کو میری خاطر ہر ڈش ضرور چکھنی گی۔'' اس نے محبت بھرے اصرار سے کہا تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مسکرا دیں۔ اپنی قلبی کیفیت جو بھی تھی لیکن وہ بڑی با مروّت اور وضع دار خاتون تھیں جنہیں دوسروں کا خیال اپنی ذات سے کچھ بڑھ کر رہتا تھا۔

لیاقت رانا اس گفتگو کے دوران خاموش رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ بولنے والے آدمی نہیں تھے۔ شیخ سجاد رانا کی موت کے صدمے کے بعد پے در پے گھیر لینے والی بیماریوں نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا اور وہ کی نسبت اور بھی کم بات کرنے لگے تھے۔



ے، آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا؟'' شہریار اپنے کہے کے مطابق دو منٹ میں ہی ڈائننگ روم میں پہنچ چکا تھا۔

تمہاری بیگم نے اہتمام ہی اتنا کر ڈالا ہے کہ سمجھ نہیں آ رہا کہاں سے شروع کریں۔'' آفرین رانا نے اس کی بات کا جواب دیا۔

مشکل میں آسان کر دیتا ہوں۔'' وہ ان کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ سے ان کی کھانا ڈالنے لگا۔

''آپ بھی شروع کریں نا انکل!'' ماریہ نے لیاقت رانا سے کہا تو انہوں نے اپنے سامنے رکھے پرہیزی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دوسری طرف آفرین رانا اور شہریار کے درمیان لاڈ پیار کا سلسلہ جاری تھا۔

''اتنا کھانا..... تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں نے ہفتے بھر سے کچھ نہیں کھایا؟'' وہ مختلف ڈشز سے اپنی پلیٹ میں نکال کے ڈالنے والے کھانے کو دیکھ کر شہریار سے احتجاج کر رہی تھیں۔

''کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کی حالت دیکھ کر پتہ چل رہا ہے کہ آپ کافی عرصے سے کھانا کھانے کے بجائے صرف سونگھنے پر اکتفا کر رہی ہیں۔ اگر آج بھی آپ نے اپنی یہ روش برقرار رکھی تو بے چاری ماموں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس نے اتنا اہتمام آپ ہی کے لیے تو کیا ہے، ورنہ مجھے کہاں اتنا پُرتکلف کھانا کھانے کو ملتا ہے۔'' وہ ماموں، ممانی کو اپنے گھر میں پا کر دلی خوشی محسوس کر رہا تھا اس لیے لہجے میں بھی کچھ شوخی تھی۔ اسے ماریہ کا اپنے عزیزوں کا اتنا خیال رکھنا بھی اچھا لگا اور اس کی خوبیوں میں ایک اور پلس پوائنٹ کا اضافہ ہو گیا۔

''یہ اتنی باتیں اس کے سامنے بنانا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ میں نے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا مجھے نہیں معلوم کہ تم کس طرح کا کھانا کھاتے ہو؟ یہ بے چاری اگر تمہارے لیے اہتمام کروا بھی لے تو ناخوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں کہاں اچھے لگتے ہیں یہ کوفتے کباب اور نہاری قورمہ جیسے کھانے۔ تم جو پھیکے ذائقے پسند کرتے ہو، وہ تو تمہارے ماموں جان کے پرہیزی کھانے میں ہی مل سکتے ہیں۔'' انہوں نے اچھی خاصی کھچائی کر دی لیکن کھانے کا سلسلہ بہر حال جاری تھا۔ وہ اپنی عادت اور خواہش کے برخلاف ماریہ کو خوش کرنے کے لیے کھانے سے رغبت کا اظہار کر رہی تھیں۔

''آپ لوگ یہاں آ رہے تھے تو مریم بھابی کو بھی ساتھ لے آتے۔ فیملی کے سب لوگ ایک ساتھ جمع اچھا لگتا ہے۔ وہ ہوتیں تو اس وقت فیملی مکمل ہو جاتی۔'' کھانے کے دوران اسے خیال آیا تو اس نے رانا سے کہا۔

''مریم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکی۔ لیکن تمہاری خواہش اس طرح سکتی ہے کہ تم لوگ ہمارے ساتھ لاہور چلو۔ ہم بھی کچھ دن سکھ سے رہیں کہ ہمارے بچے ہماری نظروں منے ہیں اور خیریت سے ہیں۔'' اس کی بات سے سرا پکڑتے ہوئے آخر کار آفرین رانا اپنے مطلب کی آ گئیں۔

ن کی بات سن کر شہریار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں کا یوں چلے آنا خالی از علت نہیں ہے۔ اب ان کے الفاظ سن کر اسے اچھی طرح سمجھ آ گیا کہ وہ لوگ اس کے ہونے والی ڈیکیتی کا سننے کے بعد پریشان ہو کر یہاں پہنچے ہیں اور لیاقت رانا کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ جو رین رانا کہہ رہی ہیں، وہ اس سے متفق نہیں بھی ہیں تو واقف ضرور ہیں۔

"میں کوشش کروں گا کہ فرصت ملتے ہی لاہور پہنچوں۔ فی الحال یہاں کچھ معاملات ایسے ہیں جن
دیکھنا ضروری ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ماریہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ کچھ دن آپ کے ساتھ رہے
میں بعد میں اسے لینے آؤں گا تو خود بھی ایک دو دن کے لیے رک جاؤں گا۔" غیر محسوس انداز میں
ہوئے اس نے بہت تنسبھل کر یہ تجویز پیش کی تا کہ آفرین رانا کو قائل کر سکے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی
کیفیت کو اس سے چھپا رہی ہیں اور درحقیقت اندر سے بے حد مضطرب ہیں لیکن وہ اس کے اندازے
زیادہ جذباتی بحران کا شکار تھیں اور کچھ اور ہی ٹھان کر یہاں آئی تھیں چنانچہ بڑے دوٹوک انداز میں بولیں۔

"میں تم لوگوں کو چند دن کے لیے لاہور آنے کی دعوت نہیں دے رہی ہوں۔ میں تمہارے لا
مستقل قیام کی بات کر رہی ہوں۔ چھوڑو اس نوکری کو۔ اتنا پیسہ چھوڑ کر گئے ہیں تمہارے ماں باپ۔ تمہارے
ماموں جان کے پاس بھی جو کچھ ہے، وہ تمہارا ہی ہے۔ اس رقم سے کوئی اچھا سا بزنس کرو۔ ہر وقت کی
جھک جھک اور مارا ماری سے تو جان چھوٹے گی۔" وہ گویا سب کچھ طے کر کے آئی تھیں۔ ان کی تجویز
ہکا بکا رہ گیا اور سوالیہ نظروں سے لیاقت رانا کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے شانے اچکا کر رہ گئے۔ یعنی
آفرین رانا کہہ رہی تھیں، وہ خود ان کی اپنی سوچ تھی اور وہ شاید خاموش رہنے کا وعدہ کر کے آئے تھے۔

"آپ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں ممانی جان! ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ میں نوکری چھوڑ چھاڑ کر
طرف ہو کر بیٹھ جاؤں اور اپنی شکست کا اعتراف کر لوں۔" آخر جب یہ طے ہو گیا کہ اسے اپنی وکالت
کرنی ہے تو وہ پوری طرح سنبھل کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم مجھے بتا دو کہ اب کیا ہونا باقی رہ گیا ہے؟ جب سے تم نے یہ نوکری کی ہے، کیا کیا نہیں ہوا؟ کل
زخمی ہوئے، تمہیں اغوا کیا گیا۔ دھمکی آمیز فون کالز اور خطوط آنے لگے۔ اور اب رہی سہی کسر اس ڈکیتی
پوری کر دی۔ کیا تمہاری جان و مال اور عزت تینوں خطرے میں نہیں پڑ گئے تھے؟..... وہ تو اللہ کا شکر
معاملہ مال پر ہی ٹل گیا۔ اگر اس بچی کی عزت چلی جاتی تو پھر کیا ہوتا؟ تم لاکھ سر پٹختے رہتے لیکن کھوئی
عزت تو کسی صورت واپس نہیں آتی یا پھر اگر وہ ڈاکو تمہیں قتل کر ڈالتے تو کیا اس نقصان کا کوئی مداوا ہو سکتا
ہم نے ثنینا اور سجاد کو کھویا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اپنی اولاد کو کھونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جن ہاتھوں سے
کو پروان چڑھایا جاتا ہے، وہ ہاتھ اپنی پلی پلائی اولاد کو قبر میں اتارتے ہوئے کانپ جاتے ہیں اور ہر
ہاتھوں سے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صرف کرتے ہوئے دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

وہ اس کے اندازے سے کہیں بڑھ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ وہ سب لوگ کھانے سے پہلے ہی
روک چکے تھے۔ آفرین رانا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تو وہ اپنی جگہ سے سیدھا بیٹھا نہ رہ سکا اور دائیں طرف
سا جھک کر ان کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔ ماریہ بھی لپک کر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے بائیں طرف آ کھڑی
اور ٹشو پیپر کی مدد سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی

"میرے خیال میں لیونگ روم میں چلتے ہیں۔ کھانا تو اب مزید کسی سے بھی نہیں کھایا جائے گا۔" لیا
رانا نے نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی جس پر سب نے صاد کیا۔ ڈائننگ روم میں بٹلر کا آنا جانا بھی لگا
تھا اور یہ قطعی مناسب نہیں تھا کہ ان کی اتنی نجی نوعیت کی گفتگو کسی ملازم کے علم میں آ جائے۔ ماریہ، آفرین
سہارا دے کر لیونگ روم میں لے آئی اور انہیں پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ کچھ پُرسکون محسوس کرنے لگیں۔

"سوری ممانی جان! میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئیں لیکن یقین کریں کہ صورتِ حال اتنی خراب نہیں
جتنی آپ محسوس کر رہی ہیں۔" آفرین رانا لیونگ روم میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ



کے قریب عین ان کے قدموں میں کارپٹ پر بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں
م کر نہایت رسانیت سے بولا۔ آفرین رانا کے سامنے اس طرح بیٹھا وہ صرف ایک محبت کرنے والا بیٹا
ہو رہا تھا جسے اپنی ماں جیسی ممانی کے قدموں میں بیٹھ کر ساری افسرانہ شان بھول گئی تھی۔

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو شیری! یہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی عملی میدان میں نہیں اُتری اور میں نے
ساری زندگی ایک گھریلو عورت کی طرح گزار دی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ مجھ جیسا فیملی بیک گراؤنڈ
والی عورت اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی کہ حالات کا درست تجزیہ کر سکے۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں کی
کون کرتا ہے اور وہ کس کے اشارے پر کام کرتے ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے تمہارے گھر
والی ڈکیتی کو ایک عام ڈکیتی کی واردات تسلیم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس موقع پر ڈاکوؤں
واسباب لوٹنے کے سوا اگر کچھ اور نہیں کیا تو صرف اس لیے کہ تمہارا دشمن تمہیں وارننگ دینا چاہتا تھا۔
نے اس وارننگ کو نہیں سمجھا تو آگے چل کر معاملہ اور بھی گمبھیر ہو جائے گا۔"

وہ بالکل درست تجزیہ کر رہی تھیں۔ اس بار شہریار انہیں کوئی طفل تسلی نہیں دے سکا اور مناسب یہی سمجھا کہ
کھل کر بات کر لی جائے چنانچہ ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"ممانی جان! آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، میں اس کے درست ہونے سے انکار نہیں کروں گا۔ ڈکیتی کے
میں جو اندازہ آپ نے قائم کیا ہے، وہی میرا بھی اندازہ ہے۔ میں نے خود کو دی جانے والی وارننگ بھی
طرح سمجھ لی ہے لیکن میں ڈر کر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ اسے میری ضد یا انا کا معاملہ مت
گا۔ اگر یہ ضد ہوتی تو میں آپ کے ایک اشارے پر اس سے دست بردار ہو جاتا لیکن میں جس سوچ کے
اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہوں، وہ مجھے قدم پیچھے ہٹانے نہیں دیتی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اس سیٹ پر ہوں تو
ملک کا کم از کم ایک ضلع تو کرپٹ افسر سے محفوظ ہے۔ میرے جیسے چند ایک اور بھی ہوں گے لیکن ان میں
کمی اور کو میرے جیسی سہولیات یا فیملی بیک گراؤنڈ شاید ہی میسر ہو۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اگر اس نے مجھے
باطل میں فرق کا شعور دیا ہے تو ایسے اسباب بھی مہیا کیے ہیں جن کی مدد سے میں اپنی جنگ کو جاری رکھ
ں۔ اور یہ اللہ کا اصول ہے کہ جسے نوازتا ہے، اسے آزمائش میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں
آزمائش میں ناکام ہو جاؤں؟ ہزاروں انسانوں کی بھلائی کو بھول کر صرف اپنی جان کی سلامتی کا سوچوں اور
رے اسباق فراموش کر دوں جو آپ نے مجھ میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کے لیے پڑھائے تھے؟.....
اگر ضد کریں گی تو میں ہو سکتا ہے صرف آپ کی خاطر پیچھے ہٹنے کو تیار ہو جاؤں لیکن کیا یہ بہت سے لوگوں
ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی؟ میں تو اپنی اس بزدلی پر اپنے ضمیر کے طعنے سن سن کر ہی مر جاؤں گا۔" وہ بات
تے کرتے خاصا آزردہ ہو گیا۔ اس موقع پر لیاقت رانا نے اس گفتگو میں دخل دیا اور اس کی حمایت میں آواز
تے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے آفرین! یہ ہمارے ہاتھ کا پلا ہوا بچہ ہے۔ ہم سے بڑھ کر کون اسے سمجھ سکتا ہے؟ اگر
ہم نے زبردستی اسے اس کی جاب سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا تو اس کے اندر توانائی کا جو سرچشمہ ہے، وہ
جائے گا۔ ہم اسے اپنے قریب تو رکھ لیں گے لیکن شہریار عادل کے اصل کو کھو دیں گے۔ میری مانو تو اسے
کے حال پر چھوڑ دو اور اسے وہ جنگ لڑنے دو جو شاید ہم میں سے ہر ایک پر فرض ہے۔ لیکن ہم مسلسل ظلم
گے سر جھکانے کی روش اختیار کر کے اس جنگ میں شامل ہونے سے کتراتے ہیں۔ یہ جنگ کسی نہ کسی کو تو
ہے تو پھر وہ ہمارا یہ بیٹا کیوں نہ ہو کہ ہم بھی فخر سے سر بلند کر سکیں اور بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہوں کہ ہم نے

اس مجاہد کی پرورش کی تھی جو اللہ کے حکم کے عین مطابق باطل کو مٹانے کے لیے لڑا۔ اگر میری مانو تو تم اسے نہیں روکو کیونکہ یہ کچھ کچھ کرنا چاہتا ہے وہ فرضِ کفایہ ہے جو کسی نہ کسی کو تو ادا کرنا ہی ہے ورنہ جواب طلبی تو ہی سے ہوگی۔''

لیاقت رانا خاموش ہو چکے تھے لیکن ان کے لفظوں کی آنچ اب بھی ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ آفرین رانا اپنی جگہ بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھیں۔

''آپ اجازت دیں ممانی جان! میں اپنے حصے کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بہت قرض ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لیے کچھ کرنا ہے..... اور ان قاتلوں تک بھی پہنچنا ہے جنہوں نے میری شینا اور سجاد بھائی کی زندگیوں کا چراغ گل کیا ہے۔ ان قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت قرار نہیں آئے گا۔'' اب بھی آفرین رانا کے قدموں میں بیٹھا تھا اور جلتی آنکھوں سے ان سے مخاطب تھا۔ آفرین رانا نے جواب میں زبان سے کچھ نہیں کہا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے سیاہ گھنے بالوں سے ڈھکے سر پر رکھ دیا۔ یہ ان کا خاموش اجازت نامہ تھا جسے پا کر وہ کھل اُٹھا۔

''تھینک یو سو مچ مائی سویٹ ممانی جان!'' اس نے کسی نوعمر لڑکے کی طرح خوشی کا اظہار کیا اور پھر ماریہ کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''ذرا اچھی سی چائے تو بنواؤ۔ ممانی جان کے مان جانے کی خوشی کو ہم خوشبودار خوش ذائقہ چائے کے ساتھ انجوائے کریں گے۔'' اس کے لہجے کی شوخی واپس لوٹ آئی تھی۔ اس ساری صورتِ حال میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے والی ماریہ حرکت میں آئی اور انٹرکام کی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے چائے کے لیے آرڈر دے دیا۔

''اوکے! تو پھر ہم اپنے اسی پروگرام پر واپس آ جاتے ہیں۔ ماریہ آپ کے ساتھ لاہور جائے گی اور میں بعد میں فرصت ملتے ہی وہاں پہنچوں گا۔''

''لیکن میرا ہیلتھ یونٹ؟'' ماریہ ذرا سٹپٹاتے ہوئے بولی۔

''تم تو پہلے ہی ڈکیتی کے بعد سے وہاں نہیں جا رہی ہو، کچھ دن اور چھٹی کر لو۔ میں تمہارے کسی متبادل کا بندوبست کر دوں گا۔'' وہ اتنے حتمی لہجے میں بات کر رہا تھا کہ ماریہ کے لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اندر سے سخت جز بز ہونے کے باوجود اسے اس فیصلے کو مسکراتے ہوئے قبول کرنا پڑا۔

⊛----✪----⊛

اپنی لگائی پھلواری میں کھڑا اسلم ایک ایک پودے کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ان پھول پتوں سے اسے ایک خاص اُنسیت تھی۔ یہ اس کی تنہائی کے ساتھی تھے اور انہوں نے اس کے اندر اس گوشے کو سلامت رکھنے میں معاونت کی تھی جو ڈاکو اسلم کے اندر اسلم تنیو کی باقیات تھا۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے وہ جس سفاکی اور بے رحمی پر مجبور تھا، اس پر اس کے اندر کا اسلم تنیو روتا تھا اور وہ اس روتے ہوئے اسلم تنیو کو بہلانے کے لیے اس پھلواری میں لے آتا تھا۔ یہاں نظروں کو تسکین دینے والے ان رنگ برنگے پھولوں کے علاوہ وہ مچان بھی تھی جہاں بیٹھ کر کبھی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا اور کبھی دُوربین کی مدد سے جنگل میں دور تک کا نظارہ۔ اب اسے یہ سب کچھ چھوڑ کر کسی نئی منزل کی طرف جانا تھا کہ یہی حکم یار ٹھہرا تھا۔ ماہ بانو نے بہت اچانک اسے شادی کی پیشکش کرتے ہوئے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اس سے شادی اسی صورت میں کرے گی جب وہ اس جنگل سے نکل کر کہیں اور شریفانہ زندگی اختیار کرے گا۔



اس نے ماہ بانو کی یہ شرط بنا کسی سوال جواب کے مان لی تھی اور ان شکوک و شبہات کو ذرا خاطر میں نہیں لایا جو اس کے دل میں سر اُبھارتے رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ابھی کچھ دن قبل ہی ماہ بانو نے اس کی محبت کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے خود کے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اعتراف کیا تھا اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے، وہ اسے ملے یا نہ ملے وہ اپنی زندگی اسی کے نام پر گزار دے گی۔ لیکن پھر اچانک ہی اس نے اپنا یہ فیصلہ بدل کر اسے شادی کی پیشکش کرنے کے ساتھ ساتھ جنگل سے نکلنے کی شرط رکھ دی تھی۔

اس مشروط پیشکش نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کیا تھا کہ شاید وہ اس قید سے نجات کے لیے اس کی محبت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اپنے دل و دماغ میں اُبھرتے اس شک کو خاطر میں نہیں لایا کہ وہ ایسا ہی دیوانہ عاشق تھا جس کا عشق اُسے بنا سوچے سمجھے آگ میں کود جانے پر اُکساتا تھا۔ اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے شک کو اس دلیل سے دبا دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھے تاریک راہوں میں مارا ہی جانا ہے تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر کچھ کر گزروں جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ الجھن میں مبتلا رہا تھا کہ اس کی زندگی اس کے اپنے پیاروں کے کام نہیں آ سکی تھی۔ وہ ایک ایسا بے بس بھائی ثابت ہوا تھا جس سے اپنی بہن کی خوشیوں کا بندوبست نہ ہو سکا تھا اور وہ موت کی آغوش میں پناہ لے بیٹھی تھی۔ وہ ایسا بیٹا تھا جس کی ماں آج بھی ایک ایسے گاؤں میں جہاں پانی جیسی بنیادی سہولت بھی دستیاب نہیں تھی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی اور اس سے ناراض، اس سے ملنے سے بھی انکاری تھی۔ اپنے ان دونوں رشتے داروں سے جدا ہونے کے بعد وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ اس کے دل کی سرزمین محبت کی فصل کے لیے بنجر ہو گئی ہے۔ لیکن پھر اس کی زندگی میں ماہ بانو آئی۔ ماہ بانو اس کے لیے ایک ایسی لڑکی ثابت ہوئی تھی جس کے سامنے وہ پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بنجر ہو جانے والی سرزمینِ دل پر محبت کی کونپل پھوٹتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس کونپل نے اتنی تیزی کے ساتھ سر اُبھارا تھا کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی کہ ماہ بانو کسی اور سے محبت کرتی ہے، مرجھانے نہیں دی اور آج اسی محبت کو سرخرو کرنے کا وقت آیا تھا تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے گروہ سے بغاوت کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

اس نے ماہ بانو کو بتا دیا تھا کہ آج کی رات وہ لوگ وہاں سے نکل پڑیں گے چنانچہ وہ ذہنی طور پر سفر کے تیار رہے۔ وہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہونے والے عمومی راستے سے ہٹ کر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس سلسلے میں کچھ ضروری تیاریاں بھی کرنا تھیں۔ اس نے پھلواری کی طرف آتے ہوئے چپکے سے ماہ بانو کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ بھی وہیں آ جائے۔ چنانچہ اب اپنے سجائے اس گلستان سے الوداعی ملاقات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو وہ بھی وہاں آتی نظر آئی۔ پیروں میں پڑی زنجیر کی وجہ سے وہ کافی آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے پیروں میں پڑی اس زنجیر نے اسے ہمیشہ بہت تکلیف دی تھی۔ ماہ بانو کا کسی جانور کی طرح زنجیر کیا جانا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ سردار کو قائل نہیں کر سکا تھا۔ اب آج کی رات وہ اس زنجیر سے بھی نجات پانے والی تھی۔

''تمہارے کام ختم ہو گئے یا ابھی کچھ باقی ہے؟'' وہ اس کے نزدیک آئی تو اس نے اس کے ماتھے پر چمکتے ہوئے جیسے پسینے کے قطروں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ختم ہی سمجھو۔ کھانا پک چکا ہے۔ کپڑوں کی دُھلائی کو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ آج طبیعت کچھ

ٹھیک نہیں لگ رہی، اس کام کو کل پر اُٹھا رکھتے ہیں۔'' اس نے رپورٹ دی۔

''یہ تم نے اچھا کیا۔ ہمیں جو سفر کرنا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کچھ دیر آرام کرلو۔ سفر طو
ہے اور مشکل بھی۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر ایسے راستے سے جانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی طرف
دھیان جانا مشکل ہی ہے لیکن وقت کا کیا پتہ۔ جب یہاں ہمارے غائب ہونے کا علم ہوگا تو سردار ہماری
میں ہر طرف بندے دوڑا دے گا۔ اگر کوئی تلاش میں آنے والا ہماری راہ پر لگ گیا تو اس سے بھی مقابلہ
گا۔ بہرحال وہ میرا اپنا مسئلہ ہے، تم یہ چیزیں اپنے پاس رکھ لو۔ آدھی رات کے بعد تیار رہنا۔'' اس نے
ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھمایا ماہ بانو نے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں
جوڑی ربڑ کے نرم جوتے اور مردانہ جوڑا تھا۔ یہ جوڑا گہری نیلی جینز اور دھاری دار سیاہ ہاف آستین کی ٹی
پر مشتمل تھا۔ اس نے اس سامان کو دیکھ کر اسلم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ جوتے اور کپڑے میں نے آپا حمیداں کے سامان میں سے غائب کیے ہیں۔ جوتے آپا حمیداں
ہیں۔ تمہیں سائز میں کچھ بڑے ہوں گے، آگے کوئی کپڑا وغیرہ پھنسا کر پہن لینا۔ کپڑوں کا جوڑا اس کے
ہے۔ وہ ایک بار غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ رکھ کر لے آئی تھی اور میرے سامنے اس کا ذکر کیا تھا۔
ذہن میں یہ بات رہ گئی اس لیے جب مجھے سفر کے لیے تمہارے کپڑوں کا خیال آیا تو میں یہ کپڑے لے آیا
حمیداں کا بیٹا دُبلا پتلا بوٹے سے قد کا لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے کپڑے پورے آجائیں گے
اس نے وضاحت کی۔

''لیکن یہ کپڑے؟..... میرا مطلب ہے کہ میں نے کبھی اس قسم کا لباس نہیں پہنا ہے۔'' اس نے
ہوئے بتایا۔

''مجھے اندازہ ہے لیکن ہمیں جو سفر درپیش ہے، اس میں اسی قسم کا لباس مناسب رہے گا۔ تمہارا ڈھیلا
لباس اِدھر اُدھر اٹک کر مشکل پیدا کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لباس لہراتا ہوا دُور سے ہی نمایاں ہو جا
اس لیے فی الحال تمہیں حالات کے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑے گا۔ ایک بار ہم یہاں سے نکل جائیں تو پھر تم
ہو..... جو جی چاہے پہننا۔'' اسلم نے اسے سمجھایا تو اس نے وقت کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر
زندگی میں یوں بھی تو بہت کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا تو پھر ایک لباس کے معاملے میں
کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اگر زندگی اسے چوائس کا حق دیتی تو وہ نیلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کو کبھی
وجود سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی جو شہریار نے ایک بیرے سے خرید کر اسے دی تھی۔ اِدھر سے اُدھر بھاگے
منتقل ہونے میں اس کا سامان جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ اس سامان میں وہ چادر بھی تھی جو
بہت عزیز تھی لیکن وہ پھر بھی اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی۔ اور یہی تو انسان کی بے اختیاری و بے بسی
اسے اپنی عزیز از جان چیزوں پر بھی اختیار نہیں ہوتا اور تقدیر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ اگر یہ
بے اختیاری نہ ہوتی تو بے جان چیزوں کی کیا بات..... آدمی اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر صبر کیونکر کر پاتا؟

''میرے خیال میں اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ آرام کے لیے جتنا وقت مل جائے، مناسب
ورنہ آگے چل کر شاید ہی آرام کا وقت مل سکے۔ تم اب اپنے جھونپڑے میں جاؤ۔ میں آدھی رات سے کچھ
تمہارے پاس آؤں گا اور کچھ وقت گزاروں گا۔ اس کے بعد ہم مناسب وقت پر نکل پڑیں گے۔ میں پہ
داروں کو یہ تاثر دے کر آؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ شب گزاری کا ارادہ رکھتا ہوں، اس طرح وہ مشکوک
ہوں گے۔'' اسلم نے اسے اپنے منصوبے کی مزید تفصیلات سے آگاہ کیا جنہیں سن کر اس کا چہرہ شرم سے



وہ خاموش رہی۔ اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی اسلم وہ کر رہا تھا جو بہتر سمجھتا تھا۔ اسے یہاں
ئے بہرحال اتنا طویل عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ہر بات سے واقف ہوتی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار ملوں گی۔'' اس نے اسلم کو رضامندی کا عندیہ دیا اور واپسی کے لیے پلٹی۔
وہ بری طرح چونکی۔ اس کی طرف متوجہ اسلم بھی چونک پڑا۔ اس کی نظروں نے بھی وہ منظر دیکھ لیا جو ماہ
چونکنے کا سبب بنا تھا۔

ایک درخت کی آڑ سے بالکل ہی اچانک لِلّی نکل کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ تھی، وہ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ اس نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی
اسلم اور ماہ بانو کچھ بھی کہے بغیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ لِلّی جس قسم کی عورت تھی، انہیں ضرورت ہی
کہ وہ اس سچویشن میں اپنی زبانوں کو زحمت دیتے۔ اب تو جو کہنا تھا، وہ لِلّی کو ہی کہنا تھا۔ ان کی یہ توقع
ہوئی اور وہ کچھ دور سے ہی ان دونوں کو گھورتے رہنے کے بعد ماہ بانو کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتی ہوئی
مین مقابل آکھڑی ہوئی۔

''تو تم یہاں سے جا رہے ہو؟'' اسلم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر جما
کہا۔

اسلم خاموش رہا۔ تصدیق یا تردید کی گنجائش نہیں تھی۔ لِلّی یقیناً سب کچھ سن چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے سے
موجود تھی یا ماہ بانو کا پیچھا کرتی ہوئی ٹوہ لینے کے لیے آئی تھی۔

''سچ سچ.....'' اس نے اسلم کی خاموشی سے شہ پاتے ہوئے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ ''تم دونوں کا تو
ان ٹین ایجرز جیسا حال لگ رہا ہے جو نئے نئے عشق کے مرض میں مبتلا ہوئے ہوں اور دنیا والوں
کر اپنی الگ دنیا بسانے کا ارادہ کرتے ہوئے گھر سے بھاگنے کو تیار ہوں لیکن عین وقت پر دھر لیے
ویسے تم دونوں کو دیکھ کر مجھے انڈین فلم قیامت سے قیامت تک یاد آرہی ہے۔ اس میں بھی تو ہیرو اور
بھاگ کر نئی دنیا بسانے نکلے تھے۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ شہر سے بھاگ کر جنگل میں پہنچے تھے، تم جنگل
بھاگ کر شہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''تم اسی انداز میں سوچ سکتی ہو۔ تمہارا فلمی ہیروئن بننے کا خواب تو پورا نہیں ہوا لیکن افسوس کہ تمہارے
فلموں کا بھوت اب بھی سوار ہے۔'' اسلم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''فلموں کا بھوت بھی اور تمہارے عشق کا بھوت بھی۔ میں بہت ضدی عورت ہوں اور جو چیز میرے سر پر
جائے، اس کو کبھی بھولتی نہیں ہوں۔'' اس کے طنز کو خاطر میں لائے بغیر لِلّی بولی۔

''فضول بکواس بند کردو، وہ کہو جو کہنا چاہتی ہو۔'' اسے اندازہ تھا کہ ان کے راز سے واقف ہونے کے
بلیک میلنگ ضرور کرے گی اس لیے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے پوچھا۔ ماہ بانو دخل
کیے بغیر ان کے درمیان ہونے والی مکالمے بازی سن رہی تھی۔ ان کی گفتگو کے حتمی نتیجے پر اس کے
کا بھی دارومدار تھا اس لیے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

''تمہیں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔'' لِلّی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''کیا کہا تم نے.....؟'' اسلم اس کا مطالبہ سن کر چراغ پا ہوا۔

''میں نے کوئی اتنی زیادہ مشکل بات نہیں کہی ہے جو تمہیں سمجھ نہ آئے۔ بہت سیدھا اور صاف
ہے میرا۔ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے ایک بار پھر اپنی

بات دُہرائی۔

''اور اگر میں نے تمہارا یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو.....؟'' اسلم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

''پھر سیدھی سی بات ہے، تم دونوں بھی یہاں سے نہیں جا سکو گے۔'' اس نے شانے اچکاتے

دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ اور یہ تو اسلم بھی جانتا تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ اس نے مشورہ

انداز میں ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی یہی لکھا تھا کہ فی الوقت لگی سے بگاڑنے کی کوئی

نہیں ہے۔ آخر وہ اس مدقوق نظر آنے والی لیکن درحقیقت اندر سے بے حد شاطر عورت کے سامنے اپنی

کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''او کے! تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ ہمارا سارا پلان تو تم نے سن ہی لیا ہے۔ اپنے لیے تم خود

انتظام کرنا کہ کیا اور کیسے کرنا ہے۔ میں صرف تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا ذمے دار ہوں۔''

''اتنا ہی کافی ہے۔ باقی راستے نکالنا مجھے خود آتا ہے۔'' وہ کمال کی خود اعتماد تھی۔

''اور ہاں..... یاد رکھنا کہ ہمارا ساتھ بس یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے جتنا ہی ہوگا۔ اس کے

اپنے راستے جانا اور ہم اپنے راستے۔'' اس نے مناسب سمجھا کہ حفظِ ماتقدم کے تحت اسے پہلے ہی اس کی

سے آگاہ کر دے۔

''کون کس راستے جاتا ہے، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ تمہیں اس بارے میں سوچ کر ابھی سے اپنا

ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی وہاں

جانے لگی۔ اسلم اس کی پشت کو گھورتے ہوئے فقط بے بسی سے دانت ہی کچکچا سکا۔

❀----✪----❀

''کھانا کھا لیں بی بی!'' ملازمہ نے کھانے کی ٹرے وڈی چودھرائن کے سامنے رکھی تو اس نے نظر

ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھا۔ دو عدد موٹی روٹیوں اور پتلی پانی جیسی بے رونق دال نے بے سا

اس وسیع و عریض خوان کی یاد دلائی جس پر ایک وقت میں اتنی اقسام کے کھانے ہوتے تھے کہ بعض اوقات

کھانے کو چکھ بھی نہیں پاتی تھی۔ اور یہاں اس قید خانے میں اسے وہ کھانا فراہم کیا جا رہا تھا جسے کھانا تو

بات، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے سامنے زندگی میں کبھی کھانے کے نام پر ایسی کوئی چیز

جا سکتی ہے۔

اس سے قبل بھی اس کے لیے کچھ اسی قسم کا کھانا لایا گیا تھا۔ بس اس کھانے میں دال کی بجائے آلو

تھی۔ اس نے نفرت سے اس کھانے کو ٹھکرا دیا تھا اور نتیجے میں بھوکی رہی تھی۔ اب پھر کھانا دیکھ کر اسے

تھا کہ اسے ایک بار پھر بھوکا رہنا ہوگا۔ اس کے لیے اس قید خانے کو منتخب کرنے والا جتنا بے رحم شخص

سے اسی سلوک کی امید کی جا سکتی تھی لیکن وہ بھی تو وڈی چودھرائن تھی۔ حویلی کے ایک بے انتہا آرام

سے اس قید خانے تک منتقل ہونے میں بے شک اس کے غرور کو زبردست دھچکا لگا تھا لیکن اس کا وہی حال

رسّی جلنے کے بعد بھی بل نہیں گئے تھے۔

''لے جا اپنا یہ کھانا اور لے جا کر کچرے میں ڈال دے۔ تُو کھانے کے نام پر جو کچھ میرے لیے

آتی ہے، وہ تو میں اپنے پالتو جناور (جانور) کو بھی نہ کھلاؤں۔'' اس نے نخوت سے منہ پھیرتے ہو

سے کہا۔



''کھا لیں بی بی! چودھری صاحب کا حکم ہے کہ اگر آپ نے اب کھانا لوٹایا تو غیر دوبارہ آپ کو کھانا بھجوایا

جائے گا۔'' ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے اسے چودھری کا حکم سنایا۔ اس کے سامنے ایک معزول ملکہ تھی

اوقات اب دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی لیکن اس بے چاری نے اپنی ساری زندگی وڈی چودھرائن سے

ڈرتے گزاری تھی، سو ایک دم سے اس خوف سے کیسے نجات پاتی۔

''تیرا چودھری بھی اپنی اس حرکت کا مزہ چکھ لے گا۔ کوئی لاوارث اور مجبور ملازمہ نہیں ہوں میں چودھری

وہ مجھے یہاں قید کر کے مار ڈالے گا اور کوئی اس سے کچھ پوچھے گا ہی نہیں۔ میرے پیکے والے حویلی کی

سے اینٹ بجا دیں گے اور میرا پُتر مراد شاہ، باپ کا گریبان پکڑے گا کہ مجھے میری ماں کا پتہ بتاؤ۔'' اس

نہیاں اپنی جگہ قائم تھیں۔

''ایسا تو جب ہوگا نا بی بی! جب کسی کو پتہ چل سکے گا کہ آپ کہاں ہو؟ چودھری صاحب نے سب سے

ہے کہ آپ کو گلے کا کینسر ہو گیا ہے اور انہوں نے آپ کو علاج کے لیے ولایت بھجوایا ہے۔'' ملازمہ نے

آواز میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی پھر ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری

بولی۔

''دیکھ پینو! تُو ایسا کر کہ میرے بھرا کی حویلی میں یہ گل کسی طرح پہنچا دے کہ چودھری نے مجھے قید کر کے

کے قید خانے میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے بس یہ پیغام پہنچانا ہوگا، آگے وہ لوگ خود ہی سب کچھ دیکھ لیں

تیرا نام بھی کہیں نہیں ہوگا۔ اور میں یہاں سے نکلنے کے بعد تجھے وڈا سارا انعام دوں گی۔'' اس نے ملازمہ

لالچ دی لیکن وہ ڈر کر پیچھے ہو گئی اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہ بی بی! نہ۔ چودھری صاحب تو میرے ٹوٹے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔''

''میں کہہ رہی ہوں نا کہ تیرا نام کہیں نہیں آئے گا۔ اور تجھے انعام بھی ملے گا۔ تُو نے میرے کنگن دیکھے

نا اور وہ چوڑیاں بھی۔ میں اپنے کنگن اور بارہ کی بارہ چوڑیاں تجھے دے دوں گی۔'' وڈی چودھرائن کی

ل بہت بڑی تھی۔ ملازمہ کی نظریں بے ساختہ ہی اس کی کلائیوں پر گئیں۔ بھاری گول کلائیاں جو ہر دم

کے کنگنوں اور چوڑیوں سے بھری رہتی تھیں، بالکل سُونی پڑی تھیں۔ وڈی چودھرائن کو اس قید خانے میں

سے قبل تن کے لباس کے علاوہ ہر شے سے محروم کر دیا گیا تھا اور ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ

سے نکل کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر سکے گی۔

ہو سکتا تھا کہ اس کے میکے والے اگر اس کی حالت سے باخبر ہو جاتے تو اس کی کچھ مدد کرتے لیکن یہ

ایک امکان تھا جبکہ چودھری کو دھوکا دینے کی صورت میں اسے یقینی اندوہناک انجام سے دوچار ہونا

اس انجام کا سوچ کر وہ اندر تک کانپ گئی اور بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''مجھے مافی (معافی) دے دیں بی بی! میں آپ کی لونڈی ہوں لیکن مجھ میں بڑے سرکار سے بغاوت

کی ہمت نہیں ہے۔''

''ہمت کر جھلیے! ہمت کرے گی تو مال مال ہو جائے گی ورنہ اِدھر تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔ چودھری کی

کر کے اس کا نمک حلال کرنے میں تیرے ہاتھ فاقوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔'' ملازمہ کو عقل سکھاتی

ن کو قطعی یاد نہیں تھا کہ اب سے پہلے وہ خود اس قبیل میں شامل تھی جو اپنی تجوریاں بھر کر اپنے زیردست

ں فاقے بانٹ دیتا ہے۔

''مینوں ماف کرو بی بی! میں بہت بزدل ہوں۔'' ملازمہ ہاتھ جوڑے جوڑے پیچھے ہٹ گئی۔ اس پر

چودھری کی اتنی شدید دہشت طاری تھی کہ کسی قسم کا لالچ اس دہشت پر غالب نہیں آ سکا تھا۔

وڈی چودھرائن نے ملازمہ کی اس بزدلی پر خوب دانت کچکچائے لیکن اس وقت وہ خود اتنی بے بس تھی ملازمہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ البتہ اسے دوبارہ قائل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی چنانچہ زبردستی کرتے ہوئے بولی۔

''چل ٹھیک ہے، جیسی تیری مرضی۔ میں کوئی تیرے نال زبردستی تھوڑی کر رہی ہوں۔''

''وڈی مہربانی بی بی!'' ملازمہ پلٹ کر واپسی کے راستے پر چلی گئی۔ چودھرائن کے کہنے کے باوجود کھانے کی ٹرے اپنے ساتھ واپس نہیں لے گئی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ چودھری کی طرف سے جو حکم گئی ہے، اس پر عمل بھی ضرور ہوگا۔ لرزتی کانپتی وہ جب تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو وہاں منشی رکھا اس کا منتظر تھا

''یہ تُو نے اچھا کیا کہ لالچ میں نہیں پڑی۔ ورنہ ادھر سے باہر نکلتے ہی تیری لاش چیل کوؤں کی دعوت کام آتی۔'' منشی اللہ رکھا کی بات نے اسے سہما کر رکھ دیا۔ منشی کی اس بات کا یہ مطلب تھا کہ اس نے تہ خانے میں چودھرائن سے جو کچھ بھی بات کی تھی وہ اس نے کسی ذریعے سے سن لی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے لالچی نہ پڑنے پر شکر ادا کرتی وہ اپنے راستے پر چل دی۔

دوسری طرف چودھرائن ابھی تک اکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ وہ صرف ضد میں کر رہی تھی ورنہ بھوک کا تو یہ عالم تھا کہ لگتا تھا کوئی اندر بیٹھا آنتوں کو نوچ رہا ہے۔ کبھی اس طرف کا کھانا بھی نہ چھوڑنے والی کے لیے یہ فاقہ کشی بہت مشکل تھی۔ اس نے تو کبھی رمضان کے روزے نہیں رکھے تھے تو اس فاقے کو کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ بس زبردستی خود پر جبر کیے بیٹھی تہ خانے کی دیواروں کو تکتی رہی۔

یہ تہ خانہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا جب اس تہ خانے میں کشور کی ملازمہ خاص رانی کو قید کیا گیا تھا۔ وہ رانی پر تشدد کے سارے ظالمانہ حربے آزما کر اس سے کشور کا پتہ اُگلوانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تہ خانے کے در و دیوار سے اب بھی رانی کی وہ چیخیں ٹکراتی اور ٹکرا کر گونجتی محسوس ہو رہی تھیں جو اس کے حلق سے بہیمانہ تشدد کے نتیجے میں نکلی تھیں۔ اسی تہ خانے میں رانی نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں لیکن اس وقت وڈی چودھرائن کے دل میں ذرا درد نہیں جاگا تھا۔ اسے کسی قسم کی ندامت نہیں ہوئی تھی کہ ایک زندگی سے بھرپور لڑکی یوں دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں جا سوئی ہے۔ آج وقت نے اسے ان دیواروں کے بیچ لے آیا تھا۔ کل اگر وہ صیاد تھی تو آج اس تہ خانے کی قیدی اور زندگی کی ساری بہاریں دیکھ لینے کے باوجود اس قید سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ حویلی میں راج کرتے کرتے وہ اچانک اس سیلن زدہ تہ خانے میں فریدہ کو قتل کرنے کی سازش کے نتیجے میں پھینکی گئی تھی۔ چودھری نے اس سے اس کے جرم کی وضاحت نہیں مانگی تھی، بس براہِ راست سزا سنا کر یہاں ڈلوا دیا تھا۔ سازش تیار کرتے ہوئے وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکی تھی کہ معاملہ کھل جانے پر اس کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ خود کو حویلی کے معاملات سے الگ کر کے خواب گاہ تک محدود کیے جانے کا تصور کر سکتی تھی لیکن چودھری نے زیادہ ہی غضب ناکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید وہ اسے باور کروانا چاہتا تھا کہ حویلی میں کسی بھی شخص کو چاہے کتنے بھی اختیارات حاصل ہوں لیکن حاکم بہر حال وہی ہے اور ایک جھٹکے میں سارے اختیارات چھین لینے کی طاقت رکھتا ہے۔



ہوں یہاں سے نکلنے دے چودھری! میں تیری ساری چودھراہٹ تیری اپنی اولاد کے ہاتھوں نکلوا دوں

اروں کو گھورتے ہوئے وہ غصے سے بڑبڑائی اور اپنی نظروں کا زاویہ اس ٹرے پر مرکوز کر لیا جس میں لیے آیا ہوا کھانا رکھا تھا۔

کھانے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر موجود نفرت بھرے تاثرات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہ کھانا چودھری کی بھرپور اظہار تھا۔ وہ ایک بار پھر دانت کچکچانے لگی اور ٹرے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ لیکن آخر کب نفس کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کی برداشت کی حدیں تو ویسے بھی بہت محدود تھیں۔ کھا کھا ہو جانے والا جسم بھوک کی سختی کو زیادہ دیر برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے لیے فرش پر چٹائی پر نڈھال سی لیٹ گئی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی جا رہی اس کیفیت میں لحہ بہ لحہ شدت آتی جا رہی تھی۔ آخر کار اس کی ضد ٹوٹ گئی اور وہ کہنیاں ٹکا کر اپنے بھاری اٹھا کر بیٹھی۔ بیٹھنے کے بعد اس نے خود کو کھانے کی ٹرے کی طرف کھسکایا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ٹرے اپنی سرکا لی۔

لے میں موجود روٹی کو توڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کافی دیر گزر جانے کے باعث روٹی سوکھ گئی اب وہ بھوک کی شدت سے اتنی بے حال تھی کہ سوکھی روٹی کے لیے بھی آمادہ ہو گئی اور روٹی کو دال میں پہلا لقمہ منہ میں رکھا۔ دال دیکھنے میں جتنی بے رونق تھی، کھانے میں اتنی ہی بدذائقہ محسوس ہو رہی تھی۔ یا بات تھی کہ ہمیشہ مرغ مسلّم کھانے والی کی زبان دال کے ذائقے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ لقمے کو نگلتے ہوئے اس نے بہت برا سا منہ بنایا لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ دوسرا لقمہ توڑنے کے لیے آگے ا۔ سچ ہے کہ پیٹ میں لگی آگ زبان کو لگے ذائقے کی چاٹ پر حاوی ہونے میں کمال رکھتی ہے۔ اں کو دانے دانے کو ترسانے والی آج خود پیٹ کی آگ سے مجبور ہو کر ایک نہایت ناپسندیدہ کھانا تناول کر لی۔ ایک روٹی سے کچھ اوپر کھا کر یہ آگ ذرا سرد پڑی تو اس نے سکون کا سانس لیا اور ٹرے ذرا پرے سرکا ارہ چٹائی پر ڈھیر ہو گئی۔ کھانے کے بعد اسے شدت کی پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی کمرے کے انے میں رکھے مٹی کے گھڑے میں موجود تھا لیکن ساری عمر ہل کر پانی نہ پینے والی کو اس گھڑے تک جا کر سخت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ آخر کار بھوک کی طرح پیاس کی شدت نے بھی اسے زیر کر دیا اور اپنی ہڈ کے باوجود اسے اُٹھ کر پانی پینے کے لیے جانا پڑا۔ ایک ساتھ دو گلاس پانی چڑھا کر وہ واپس چٹائی پر آ کر پیٹ کی حالت عجیب ہو رہی تھی اور اس میں سے گڑگڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان اں نے شدت اختیار کر لی اور وہ اپنے پیٹ میں درد کی لہریں سی اُٹھتی محسوس کرنے لگی۔ ہمیشہ تر نوالہ نے والی کو سوکھی روٹی اور دال ہضم نہیں ہو سکی تھی۔ تہ خانے کے در و دیوار نے بہت کم مدت میں مکافاتِ عمل ک چھوٹی سی مثال دیکھی تھی۔ کچھ عرصہ ہی تو گزرا تھا انہیں مظلوم رانی کی چیخیں سنے اور اب اس پر ظلم نے والی جابر چودھرائن کی چیخیں سن رہے تھے۔

❀----✪----❀

وہ جیپ طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ اسی رفتار سے چلتی جب وہ آبادی میں داخل ہوئی تو ے لوگ خود کو بچانے کے لیے گھبرا گھبرا کر ایک طرف ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں ربلب یا با آواز بلند بھی جیپ والوں کو گالیوں سے نوازا لیکن جیپ سواروں کو فی الحال ان کی فکر نہیں تھی۔ وہ

بہت دور سے آئے تھے اور کسی راہ گیر سے اُلجھنے کے بجائے سیدھے اس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں اصل شکار موجود تھا۔ ان کا رخ ایک ہسپتال کی طرف تھا۔

جوں جوں ہسپتال کی عمارت نزدیک آتی جا رہی تھی، ان کے جوش وخروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وقت جیپ میں ایک موبائل فون کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اس گھنٹی کو سن کر ایک شخص نے پھرتی سے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

''سلام منشی جی!'' نمبر وہ دیکھ چکا تھا اس لیے کال ریسیو کرتے ہی سلام جھاڑا۔

''کیا رپورٹ ہے شیدے؟'' اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے منشی نے سوال کیا۔ جب سے اس کے آدمیوں کے ہاتھوں بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے بعد چارپائی سے لگا تھا، شیدا چودھری کا پال ہو گیا تھا۔ نئی نئی ہونے والی اس ترقی پر نازاں اسے ذرا احساس نہیں تھا کہ وہ جس مقام کو پا کر اترا رہا ہے کبھی اس مقام پر بالا بھی رہا تھا اور آج بالے کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ وہ جب تک چودھری کے کام کا لائق تھا، چودھری اسے نوازتا رہا۔ اور اب ناکارہ ہو کر چارپائی سے لگا تھا تو کوئی اسے پوچھنے والا نہیں۔ شیدا ناکارہ ہو جاتا تو چودھری اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا اور کسی استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتا لیکن فی الحال شیدا اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''ہم لوگ بس پہنچ چکے ہیں۔ مجھے سامنے ہسپتال کے دروازے پر کھڑا سومرو صاف نظر آ رہا ہے۔''

''کام صفائی سے کرنا۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' منشی نے اسے ہدایت دی۔

''تسی فکر ہی نہ کرو منشی جی! تھوڑی دیر میں، میں فون کر کے آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔'' وہ بہت پُراعتماد رہا تھا۔ اس سارے معاملے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ چودھری کو کوریئر کے ذریعے آفتاب کا پتا ملا تھا، اس سے یہ تو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ خط میرپور خاص سے بھیجا گیا ہے۔ ان دنوں شیدا، چودھری کے کام سے کراچی میں تھا چنانچہ اسے حکم دیا گیا کہ باقی کی معلومات حاصل کر کے آفتاب کے بارے میں مطلع کیا جائے۔ معلومات کے لیے سب سے اچھا ذریعہ ہسپتال ہی تھا کہ قوی امید یہی تھی کہ بچی کی پیدائش جس ہسپتال میں ہوئی ہوگی، وہاں آفتاب نے فرضی نام کے بجائے اپنا اصل نام ہی لکھوایا ہوگا کیونکہ کوئی بھی باپ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی اولاد کے نام کے آگے اس کے نام کے سوا کسی دوسرے کا نام لکھا جائے۔

یہ آئیڈیا بہت ہی عمدہ ثابت ہوا۔ شیدے کے میرپور خاص میں کچھ ذاتی رابطے تھے چنانچہ اس نے کراچی سے روانہ ہونے سے قبل ہی ہسپتالوں کو چیک کروا لیا تھا۔ ایک چھوٹے شہر میں جہاں ہسپتال محدود تعداد میں ہوں اس قسم کی معلومات حاصل کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ اسے راستے میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ آفتاب کی بیٹی کی پیدائش کس ہسپتال میں ہوئی ہے اور بچی کے نرسری میں ہونے کی وجہ سے کشور بھی ابھی اسی ہسپتال میں ہی مقیم ہے۔ آفتاب کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت ہسپتال میں ہی گزارتا ہے اور صرف کسی ضرورت کے تحت ہی باہر جاتا ہے۔ اس نے یہ ساری معلومات فوری طور پر منشی رکھا کو پہنچا دی تھیں۔ جواباً اس نے کچھ ہدایات دی تھیں اور اب پھر اس سے تازہ ترین حالات جاننا خواہش مند تھا۔

''دیکھ بھال کر کام کرنا شیدے! سرکار آج کل وڈے خراب موڈ میں ہیں۔ اب کی واری اگر ناکامی ہوئی جانے ان کا غصہ کیا دکھلائے۔'' شیدے کے اعتماد کے باوجود منشی نے اسے تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔

''میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے تسلی دی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔



ان کی جیپ ہسپتال کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔ جیپ کو رکتے دیکھ کر سامنے کھڑا سومرو تیزی سے نزدیک آیا۔

''کیا خبر ہے سومرو! وہ لوگ یہیں موجود ہیں نا؟'' شیدے نے اس سے پوچھا اور جیپ سے اُتر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

''بالکل بابا! وہ لوگ سو فیصد اندر ہیں۔ ہم نے پوری خبر رکھی ہے ان کی۔'' سومرو نے جواب دیا تو شیدا سر ہلاتا اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی پٹھو بھی ظاہر ہے اس کے پیچھے ہی تھے۔ ان کا انداز واضح طور پر جارحانہ تھا اس لیے وہ جیسے ہی ہسپتال سے اندر داخل ہونے لگے، وہاں موجود چوکیدار نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''کون ہو بابا تم لوگ اور کدھر منہ اٹھا کر جا رہے ہو؟'' وہ لپک کر ان کے راستے میں آیا۔

اس کے اس سوال کا جواب زبان سے دینے کے بجائے رائفل کے بٹ سے دیا گیا۔ سر پر لگنے والی کاری ضرب نے بے چارے چوکیدار کو مزید کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور وہ بغیر آواز نکالے بے ہوشی وادی میں چلا گیا۔

چوکیدار سے فارغ ہو کر وہ لوگ ایک بار پھر دندناتے ہوئے چل پڑے۔ اب انہوں نے چادر کی بکل میں چھپائے اپنے اسلحے باہر نکال لیے تھے چنانچہ جیسے ہی وہ مرکزی عمارت میں داخل ہوئے، ریسپشن پر بیٹھی لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شیدے نے فوراً ہی ایک ہوائی فائر کیا۔

''خاموش..... نہ کوئی حرکت کرے اور نہ ہی آواز نکالے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری گل مانی تو کسی کو کچھ نہیں ہوگا ورنہ دوسری صورت میں اپنی جان سے جاؤ گے۔'' نہایت بھیانک لہجے میں یہ اعلان کر کے اس نے اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں۔ وہاں موجود لوگ یوں ساکت ہو گئے تھے جیسے کسی نے جادوئی کی چھڑی گھما کر انہیں پتھر کے مجسموں میں تبدیل کر دیا ہو۔ گولی اور گالی، شریف لوگوں کے لیے ایسی ہی زود اثر ہوتی ہیں۔ بے چارے ان دونوں چیزوں کا مقابلہ نہیں کر پاتے اور چپ سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''تم یہیں ٹھہر کر ان پر نظر رکھو۔'' جائزے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا اور پھر اس نے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ سومرو کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں کشور اور آفتاب موجود تھے۔

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اسے زور سے دھکا دیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اصل میں اندازہ کچھ اس قسم کا تھا جو اندر سے تو صرف لٹو گھمانے پر کھل جاتا تھا لیکن باہر سے کھولنے والے کے لیے چابی کا استعمال لازمی تھا۔ چنانچہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس ناکامی پر مشتعل ہو کر شیدے نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ وہ گاؤں میں اپنے غنڈہ راج کی وجہ سے اسی انداز سے کام کرنے کا عادی تھا۔ حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی اس کے مزاج میں شامل نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ چودھری کا پٹھو ہے۔ چودھری کی دہشت سے کانپنے والے گاؤں کے بے چارے مکین تو ایک اشارے پر ہی چودھری کے آدمیوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جاتے تھے لیکن اندر موجود افراد ظاہر ہے چودھری کی بے بس رعایا میں شمار نہیں ہوتے تھے۔

دروازے کو لگنے والے پہلے دھکے پر ہی آفتاب بری طرح چونک گیا تھا اور اس نے خودکار انداز میں حرکت کرتے ہوئے سب سے پہلے دروازے کی چٹخنی لگائی اور پھر ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ اسے

دروازے کے باہر کھڑے مسلح افراد فوراً ہی نظر آ گئے۔ وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے
دروازہ نہ کھلنے کی صورت میں اس کے لاک پر فائر کیا جائے گا تا کہ لاک توڑا جا سکے۔ اس کوشش میں
دروازہ پار کر کے سامنے موجود شخص کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی۔

''کک..... کون ہے؟'' کشور کو انجکشن لگانے کی تیاری کرتی نرس اس صورتِ حال پر سخت متو
اور دہشت زدہ سی سوال کر رہی تھی۔

''ہمارے کچھ دشمن یہاں گھس آئے ہیں، کیا اس کمرے سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے؟'' آفتا
جواب دیتے ہوئے نرس سے سوال کیا۔ یہ وہی نرس تھی جس نے اسے بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری سنا کر
فرمائش کی تھی۔ دہشت زدہ نرس کیا جواب دیتی، خود آفتاب کے دماغ نے ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ اس
اور اس کے پیچھے والے کمرے کے درمیان میں ایک مشترکہ باتھ روم تھا۔ باتھ روم کے دو دروازے تھے
اس کمرے میں اور دوسرا پچھلے کمرے میں۔ جس کمرے کے مکین باتھ روم استعمال کرتے وہ دوسری
دروازہ بند کر دیتے۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ مشترکہ باتھ روم انہیں فرار کے لیے بہترین راہ فراہم
تھا۔ اس نے فوراً حرکت میں آتے ہوئے کشور کے بیڈ کا رخ کیا۔ وہ صورتِ حال کو سمجھ چکی تھی اور کسی
طرح کوشش کر کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ بھی چکی تھی۔ آفتاب نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور باتھ روم کی
بڑھا۔ نرس بھی اس کے پیچھے لپکی۔ غنیمت یہ تھا کہ باہر موجود افراد نے پہلے دستک دینے اور پھر دھکے
دروازہ کھولنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کر دیا اور ان لوگوں کو تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ پہلی گولی اس
چلائی گئی جب آفتاب باتھ روم میں گھس کر دروازے کی چٹخنی لگا چکا تھا۔ دروازے کا لاک ٹوٹنے کے
ٹوٹنے میں کتنی دیر لگتی۔ چنانچہ اس نے مزید تیزی سے کام لیا اور دوسرے کمرے میں کھلنے والا باتھ روم کا در
کھول کر اس کمرے میں پہنچ گیا۔

کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس میں موجود مریض کو شاید آج ہی ڈسچارج کیا گیا تھا ورنہ تو ان کو کمرے اور
روم کا درمیانی دروازہ کھلا ملنا مشکل تھا۔ مشترکہ باتھ روم ہونے کی وجہ سے عام طور پر لوگ باتھ روم کا در
اپنی طرف سے بند کر لینا پسند کرتے تھے۔ ان بدترین حالات میں یہ چھوٹی سی خوش قسمتی بھی اس وقت غنیمت
تھی۔ آفتاب نے کمرے سے نکلنے سے قبل کمرے اور باتھ روم کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ وہ لوگ کمرے
باہر نکلے تو بالکل الگ کوریڈور میں موجود تھے لیکن محفوظ بہر حال نہیں تھے کہ جس راستے سے وہ اس کوریڈور
پہنچے تھے، اسی راستے سے ان کے دشمن بھی پہنچ سکتے تھے۔ انہیں بس چند منٹوں کی سبقت حاصل تھی۔

''سسٹر! کیا آپ ہمیں یہاں سے کسی محفوظ راستے سے باہر نکال سکتی ہیں؟'' اس نے کوریڈور میں رک
اِدھر اُدھر جائزہ لیتے ہوئے لرزتی کانپتی نرس سے پوچھا۔

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''اُدھر ڈاکٹر کرمانی کے روم سے ایک دروازہ باہر
طرف کھلتا ہے۔''

''اوکے..... تو پھر وہیں سے نکلتے ہیں۔'' آفتاب نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ پیچھے سے
آتی آوازیں اسے بتا رہی تھیں کہ درمیانی دروازوں کو توڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور ان کے پاس زیادہ مہلت
نہیں ہے۔

ڈاکٹر کرمانی اپنے کمرے میں موجود تھا اور کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اپنے کمرے
دروازہ اچانک کھلنے پر چونک کر دیکھا اور ایک اسٹاف نرس اور ایسے آدمی کو دیکھ کر جس کی بانہوں میں ایک عور



حیران رہ گیا۔

کیا بات ہے؟..... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں نرس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

سر!..... وہ.....'' نرس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر خود اس
کو بھی صورتِ حال واضح نہیں تھی اس لیے وہ اسے کیا بتا پاتی۔ اسی وقت ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

مسٹر پلیز! ہیلپ می۔'' ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کے دروازے کی بھی چٹخنی چڑھا کر آفتاب نے التجائیہ
نرس سے کہا تو وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکی اور خود آگے بڑھ کر وہ دوسرا دروازہ کھول دیا جو ایک کھلے
میں کھلتا تھا۔

سوری ڈاکٹر!'' آفتاب حیران پریشان ڈاکٹر سے کہتا ہوا تیزی سے نرس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس کے
دروازے کو باہر سے بند کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی ورنہ وہ اسے بھی بند کرتے ہوئے جاتے۔

''ادھر اسٹاف کے کوارٹرز ہیں۔ میں بھی وہیں رہتی ہوں۔'' نرس نے اشارے سے بتایا تو وہ اسی طرف
ادھر نرس اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ قطار سے بنے کوارٹرز کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ایسے
کے سامنے پہنچے جس کے دروازے کے آگے سفید رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی تھی۔ نرس نے انہیں وہیں
اشارہ کیا اور خود دروازے پر دستک دی۔ دستک کافی بلند تھی۔

''کون؟'' جواب میں اندر سے ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو نازیہ!..... میں ہوں، شبانہ۔'' نرس نے جواب دیا۔

''تم تو ایسے دروازہ بجا رہی ہو جیسے تمہارے پیچھے کتے لگے ہیں۔'' نازیہ نے بولتے ہوئے دروازہ کھول
اس کے پیچھے اس حالت میں کھڑے ہوئے آفتاب کو دیکھ کر کہ اس نے کشور کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا
ہوا تھا، گنگ رہ گئی۔

''اندر آ جائیں۔'' نازیہ نامی اس لڑکی کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے نرس شبانہ نے آفتاب سے کہا
اس کے اندر آتے ہی فوراً دروازہ بند کر لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جو بیڈ روم اور نسبتاً بڑے لاؤنج پر
تھا۔ باتھ روم اور کچن کے دروازے اسی لاؤنج میں کھل رہے تھے۔ یہاں ایک سترہ انچ کا کلر ٹی وی بھی
ہوا تھا جس کے عین مقابل ایک آرام دہ کاؤچ پڑا تھا۔ ٹی وی آن تھا اور اس پر کوئی نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ ان
کی آمد سے قبل یقیناً نازیہ کاؤچ پر بیٹھی خبریں دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے کشور کو اسی کاؤچ پر لٹا دیا۔ ایک تو
پریشانی، دوسرے وزن اٹھا کر بھاگنا..... وہ بے چارہ پسینہ پسینہ ہو گیا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ کشور آپریشن
کے پیدا ہونے کی وجہ سے اس وقت بھاگ دوڑ کرنے کے لائق نہیں تھی چنانچہ اسے یہ طریقِ کار
کرنا پڑا۔ کشور کو کاؤچ پر لٹانے کے بعد وہ خود بھی نیچے فرش پر پڑے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے
لینے لگا۔ صورتِ حال کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود نازیہ نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف رکھے
سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر لے آئی۔

''تھینک یو۔'' آفتاب نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے ممنونیت سے کہا اور پھر بہت زیادہ
ہونے کے باوجود ٹھہر ٹھہر کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ نازیہ نے کشور اور نرس شبانہ کو بھی پانی سے
گلاس تھما دیئے تھے۔

''یہ میری کزن نازیہ ہے۔ جامشورو یونیورسٹی میں بوٹنی پڑھاتی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہوئی تھی۔
دیر بعد اسے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اگر موجودہ سچویشن نہیں ہوتی، تب بھی میں آپ کی مسز کو انجکشن

لگانے کے بعد اسے رخصت کرنے یہاں آتی۔'' پانی پینے کے بعد نرس شبانہ نے اپنے کوارٹر میں
تعارف کروایا۔

''باہر جو گاڑی کھڑی ہے انہی کی ہے؟'' آفتاب نے سوال کیا۔

''ہاں، یہ پبلک ٹرانسپورٹ کے بجائے اپنی ذاتی سواری پر ہی آنا جانا پسند کرتی ہے۔'' شبانہ نے
دیا اور پھر چونک کر بولی۔ ''آپ لوگ ایسا کریں کہ نازیہ کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ یہ حیدرآباد
ہوئے آپ کو جہاں آپ کہیں گے، ڈراپ کر دے گی۔''

''مشورہ تو اچھا ہے۔'' آفتاب نے اس سے اتفاق کیا۔ دشمن کی یہاں تک رسائی کے بعد اس کے
اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب اس چھوٹے سے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں ہے اور انہیں رختِ سفر
پڑے گا۔

''میری بچی آفتاب!..... میری اُمید۔'' ترتیب پاتے اس پروگرام کو سن کر کشور نے اپنی نومولود
یاد دلائی۔

''آپ کی بچی نرسری میں حفاظت سے ہوگی۔ فی الحال آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں اور میرا
ساتھ لے جائیں۔ کسی محفوظ جگہ پہنچ کر آپ مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔ میں آپ کی بچی کو آپ تک پہنچا دوں گی۔''
شبانہ نے تجویز پیش کی جو موجودہ حالات میں مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن کشور ایک ماں تھی۔ اس
لیے اپنی بچی کو یوں چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ وہ بری طرح رونے لگی۔

''آپ روئیں نہیں۔ میں اُمید کو لانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اس کے آنسوؤں نے حسبِ معمول آفتاب
بے قرار کر دیا اور وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نن..... نہیں۔ باہر آپ کے لیے خطرہ ہوگا۔'' کشور نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر جانے
روک لیا۔ اگر بیٹی عزیز تھی تو شوہر بھی کم محبوب نہیں تھا۔ بیٹی کی خاطر وہ اس کی جان خطرے میں کیسے ڈالتی؟
''خطرہ آپ کے لیے یہاں بھی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ کے پیچھے کون لوگ لگے ہوئے ہیں لیکن
صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔ شکر ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ میں بھی آپ
کے ساتھ ہوں۔ واحد ڈاکٹر کرمانی ہیں جنہوں نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ بہت غصے والے آدمی
لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے آپ کے دشمنوں کو ہرگز بھی یہ بات نہیں بتائی ہوگی۔ مگر آپ
بہت دیر تک یہاں نہیں چھپ سکتے۔ اگر ان لوگوں کو شک ہو گیا تو وہ زبردستی یہاں کے ہر کوارٹر کی تلاشی
سکتے ہیں۔'' شبانہ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان دونوں کو سمجھایا تو وہ دونوں ہی سوچ میں پڑ گئے۔

''بچی کے بارے میں، میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی بچی آپ تک پہنچا دوں
میری طرف سے یہ صرف ایک تجویز ہے۔ زبردستی میں آپ کے ساتھ کر بھی نہیں سکتی۔ اتنا ساتھ بھی اس
دے رہی ہوں کہ آپ لوگ مجھے اچھے لگے ہیں ورنہ موجودہ حالات میں تو مجھے خود پریشانی کا سامنا کرنا
گا۔ ہسپتال کی مینجمنٹ مجھ سے وضاحت مانگے گی کہ میں نے خود کو اس سچویشن میں کیوں انوالو کیا؟'' شبانہ
بات میں سچائی تھی۔ آفتاب فوراً نتیجے پر پہنچ گیا۔

''ٹھیک ہے، ہم نازیہ صاحبہ کے ساتھ یہاں سے نکل رہے ہیں۔ آپ میرا فون نمبر رکھ لیں اور اپنا
دیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی واپس آیا۔
موبائل بھاگ دوڑ میں کہیں گر چکا تھا۔



آپ میرا نمبر رکھ لیں۔ اگر کسی وجہ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا، تب بھی آپ کے لیے مجھ تک پہنچنا
ہوگا۔ میں تو مستقل یہیں ہوتی ہوں۔'' شبانہ ذہین لڑکی تھی اس لیے فوراً سمجھ گئی کہ آفتاب کا موبائل
پاس نہیں رہا ہے، چنانچہ جھٹ نیا مشورہ دے دیا۔ آفتاب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ ایک کاغذ پر فون نمبر
دینے کے بعد شبانہ کوارٹر کی کھڑکی تک گئی۔ یہ کھڑکی کوارٹر کی پشت پر تھی اور یہاں سے ڈاکٹر کرمانی
کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حملہ آور نکل آئے ہیں لیکن
سے ابھی انہوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔ پھر اس کے کوارٹر کا دروازہ بھی اس طرف سے
پڑتا تھا کہ اگر آفتاب اور کشور دروازے سے باہر نکلتے تو فوراً نظروں میں آ جاتے

''آپ لوگوں کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہئے۔ اگر کچھ دیر اور گزر گئی تو میرے لیے آپ کی کوئی بھی مدد
ممکن نہیں ہوگا۔'' باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کیا اور اپنا رخ
کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''اوکے، ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔'' آفتاب نے فوراً اعلان کیا۔

''انہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی شبانہ؟'' نازیہ کا اس صورتِ حال میں بڑا اہم کردار تھا۔ انہیں اس کی
میں ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن شاید اس کے اور شبانہ کے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے اپنی
سے کہیں اختلاف نہیں کیا تھا اور خاموش رضامندی سے اپنی دوستی کا مان رکھا تھا لیکن اس کی طرف سے
کا شکار تھی۔

''میری طرف سے بے فکر رہو۔ یہ ہسپتال میرا گھر ہے اور یہاں میرا خیال رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔''
نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا پھر وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''تھینک یو سو مچ مس شبانہ! آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔'' اس بار آفتاب نے کشور کو
میں اٹھانے کے بجائے صرف سہارا دیا ہوا تھا اور نہایت ممنونیت سے شبانہ سے کہہ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں سر!..... انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور فوراً
کی طرف سے توجہ ہٹا کر کشور کی طرف رخ موڑ گئی۔

''ہمت سے کام لیجئے گا اور اپنا خیال رکھئے گا۔ اتنا چاہنے والا زندگی کا ساتھی سب کو نہیں ملتا چنانچہ جسے
اسے قدر کرنی چاہئے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا چاہئے۔ کیونکہ آپ کے پاس زندہ
کی ایک بہت ہی خوب صورت وجہ موجود ہے۔'' اس کی یہ نصیحت سن کر کشور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے
سے مسکرا دی اور اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ نازیہ بھی باہر نکلنے سے قبل اس سے گلے ملی اور پھر وہ
باہر نکل گئے۔

کشور کو انہوں نے گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ اس طرح وہ آرام سے بھی رہتی اور باہر سے دیکھنے
کو نظر بھی نہ آتی۔ آفتاب، نازیہ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے جسم کو دُہرا کر
بالکل جھکا لیا تھا۔ اب نازیہ گاڑی لے کر نکلتی تو دُور سے دیکھنے والوں کو یہی تاثر ملتا کہ وہ اکیلی گاڑی میں جا
ہے۔ گاڑی حرکت میں آئی تو شبانہ نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ہلایا اور اس وقت تک ہلاتی رہی جب
گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ اپنے کوارٹر میں
ور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس پل اُس کی دائیں آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ
یہ قطرہ اس خاموش محبت کا گواہ تھا جو ایک اجنبی کے لیے اس کے دل میں جاگی تھی اور اظہار کی جرأت نہ پا

سکی تھی کہ وہ شخص تو پہلے ہی پور پور کسی اور کا تھا ورنہ اس پل جب آفتاب نے کہا تھا کہ میں آپ کا زندگی بھر نہیں بھولوں گا، اس کا دل چاہا تھا اس سے کہے کہ اور میں آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی... محبت کے معاملات ہوتے ہی دنیا کے ہر معاملے سے انوکھے ہیں۔ بڑی بڑی سمندر جیسی گہری محبتیں چند لفظوں سے محروم رہ جاتی ہیں اور شاید محبت کو اس کی حاجت ہوتی بھی نہیں ہے۔

⊛----✪----⊛

شیدا شدید غصے اور پریشانی کا شکار تھا۔ جس کام کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا، اسے سرانجام دینے میں طرح ناکام رہا تھا۔ کشور اور آفتاب کا پتہ مل جانے پر اس نے تو یہی سوچا تھا کہ بس سیدھا وہاں پہنچے بندوق کے بل پر دونوں کو قابو کر کے اپنے ساتھ لے آئے گا۔ لیکن اسے تو ان دونوں کی شکل بھی دیکھنے نہ ملی۔ وہ کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے ایسے غائب ہوئے تھے کہ وہ بس ان کی آہٹوں کے پیچھے بھاگتا رہ گیا۔

کشور کے کمرے اور دونوں کمروں کے مشترکہ باتھ روم کے دروازے کھولنے میں انہیں کچھ وقت لگا اس کے بعد وہ جب پچھلے کمرے سے گزر کر کوریڈور میں پہنچے تو فوری طور پر اندازہ نہیں لگا سکے کہ ان کا شکار کس طرف گیا ہے۔ کوریڈور میں بہت سے کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ وہ لوگ ایک ایک کر کے ہر کمرے کو دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کا دروازہ تھا۔ انہوں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند ملا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ ان کا شکار اسی کمرے میں ہے دروازے کے لاک کو گولی سے اُڑانے کے بعد وہ اندر لگی چٹخنی گرانے کے لیے اس پر زور آزمائی کرنے لگے ان کی کامیابی سے پہلے دروازہ خود ہی کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کا غصے سے بھرا چہرہ نظر آیا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' ان کے ہاتھوں میں موجود اسلحے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ شیدا اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ اس کے چیلے بھی تھے لیکن خلافِ توقع کمرہ خالی تھا۔

''کہاں ہیں وہ دونوں؟'' وہ ڈاکٹر کرمانی کی طرف منہ کر کے غرّایا۔

''چلے گئے۔'' ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

''کہاں چلے گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''آئی ڈونٹ نو۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا۔'' ڈاکٹر کرمانی جو کچھ سنکی سا آدمی تھا، اسی اطمینان سے بولا۔ دروازہ کھولتے وقت اس کے چہرے پر جو غصہ تھا، اب اس کا نام ونشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو انجوائے کر رہا ہے۔

''استاد! اس طرف ایک دروازہ اور ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ اس دروازے سے باہر نکل گئے ہیں۔'' شیدا کا ایک ساتھی وہ دروازہ دریافت کر کے چلّایا جو کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے بڑے سے مشترکہ پردے کی وجہ سے فوراً نظر میں نہیں آیا تھا۔ دروازہ کھولا گیا تو سامنے کھلا ایریا نظر آیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہو گئی کہ فرار ہونے والے اسی راستے سے گئے ہیں۔

''مین گیٹ کی طرف دیکھو۔'' شیدے نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ایک تو وہ اتنا ذہین نہیں تھا دوسرے اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں کے پیچھے ہے، انہیں کسی نرس کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اس نے



سوچ سکا تھا کہ وہ لوگ مین گیٹ سے گزر کر ہسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ مین گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ پولیس کی آمد اتنی بعید از امکان نہیں تھی کہ وہ لوگ ہسپتال میں موجود ہر شخص کو اپنے کنٹرول میں نہیں لے سکتے تھے۔ کوئی بھی شخص پولیس کو کال کر سکتا تھا اس بات کی انہوں نے اتنی زیادہ فکر اس لیے نہیں کی تھی کہ ان کے نزدیک ان کا کام صرف چند منٹوں کا تھا چند منٹوں میں وہ پولیس کی آمد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہاں تو چال ہی اُلٹی پڑ گئی۔ وہ کشور اور آفتاب کی گرد کو بھی نہیں پا سکے، الٹا خود مشکل میں پڑنے والے تھے۔

شیدے نے موبائل پر کال کر کے ہسپتال کے اندر موجود ساتھیوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا اور پھر وہ لوگ اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ سومرو اپنی الگ گاڑی میں آیا تھا اور اب انہیں اس کے ساتھ جانا تھا۔ جونہی انہیں پولیس کی گاڑی کی جھلک دکھائی دی، اندر موجود دونوں بندے بھی ان سے آن ملے۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی وہ برق رفتاری سے وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان حالات میں ان کا دھیان اس سفید سوزوکی مہران کی طرف جانا ممکن ہی نہیں تھا جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔

''بہت برا ہوا سومرو!..... بہت ہی برا ہوا۔ اس ناکامی پر تو چودھری صاحب میرے ٹوٹے ٹوٹے کر دیں گے۔'' شیدا، سومرو کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ لوگ پولیس سے ذرا محفوظ فاصلے پر پہنچے تو اس نے ہاتھ ملتے ہوئے سومرو سے کہا۔

''برا تو خیر ہوا بابا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اتنے تیز ہیں ورنہ میں تمہیں ایسے ڈائریکٹ حملہ کرنے کے لیے ذرا سوچ سمجھ کر انہیں گھیرنے کا مشورہ دیتا۔'' سومرو نے جواب دیا۔

''کوئی صورت نکالو سومرو! سوچو کہ وہ ہسپتال سے نکل کر کدھر جا سکتے ہیں؟ اس شہر میں ان کا کوئی ٹھکانہ تو ہے؟'' شیدے کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے چنانچہ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

''ہسپتال کے ریکارڈ سے میں نے اس گھر کا پتہ نکلوا لیا تھا جدھر آج کل وہ لوگ رہ رہے تھے۔ ادھر چیک کر لیتے ہیں لیکن اگر وہ لوگ اتنے ہشیار (ہوشیار) ہیں تو مشکل ہے کہ واپس گھر کا رخ کریں وہ سب سے پہلے گھر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔'' سومرو نے اسے بتاتے ہوئے خیال آرائی کی۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتے سومرو! تم نے بتایا تھا نا کہ ان کی بچی ہسپتال کی نرسری میں ہے۔ وہ ابھی جان بچا کر بھاگے ہیں لیکن بچی کو لینے کے لیے تو واپس آئیں گے۔ اگر کسی طرح وہ بچی ہمیں مل جائے تو اس کے ذریعے ہم ان پر قابو کر سکتے ہیں۔'' شیدے کے دماغ نے بھی اب کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

''بچی کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے ہسپتال سے نکلوا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے رقم خرچ کرنی پڑے گی۔'' سومرو نے جواب دیا۔

''رقم کی فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ تم بس یہ کام کرواؤ۔'' اس نے سومرو سے کہا تو وہ ڈرائیونگ کے دوران ہی فون پر مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف شیدے نے بھی منشی اللہ رکھا کو فون کر کے اب تک کی رپورٹ دی اور اگلے مرحلے کے لیے ڈرتے ڈرتے رقم کی فراہمی کا مطالبہ کر ڈالا۔ منشی نے رپورٹ سن کر خوب بُرا بھلا کہا لیکن رقم کی فراہمی کے لیے رضامندی دے دی۔

''کیا ہوا، بچی کب تک ملے گی؟'' جس دوران وہ منشی سے بات کر رہا تھا، سومرو فارغ ہو چکا تھا چنانچہ اس نے بے تابی سے سومرو سے پوچھا۔

''آدھ گھنٹے میں کام ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو اتنی دیر میں ہم ماسٹر کے گھر کو دیکھ لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ادھر ہی چلتے ہیں۔'' اس نے ہامی بھر لی اور گاڑیوں کا رخ آفتاب کے گھر کی طرف ہو گیا۔ حسبِ توقع وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گھر میں موجود مختصر سامان کو بری طرح توڑا پھوڑا اور ایک نسبتاً پڑھے لکھے آدمی سے یہ تحریر لکھوا کر کاغذ دیوار پر چسپاں کر دیا۔

''اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگتے پھر رہے ہو۔''

اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سومرو کے گھر واپس لوٹ گئے۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد بچی کو ان تک پہنچ گئی۔ گلابی کپڑوں اور گلابی ہی چادر میں لپٹی وہ نازک سی بچی اتنی پیاری تھی کہ دیکھنے والوں کے دل موہ لے لیکن اسے دیکھنے والوں کے پاس دل تھے ہی کہاں؟ وہ تو بس پیسوں کے پجاری اور غلام ابنِ غلام تھے جن کی ساری حسیات مر چکی تھیں۔

بچی ہاتھ آئی تو شیدے نے منشی کے حکم کے مطابق فوراً روانگی کا اعلان کر دیا۔ ان کے ساتھ کوئی عورت تھی نہیں۔ بچی کی ضرورت کی چند اہم چیزیں اپنے ساتھ لے کر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں یہاں سے کراچی تک کا سفر بائی روڈ طے کرنا تھا پھر وہاں سے صرف شیدا بچی کو لے کر بائی ایئر لاہور پہنچتا۔ منشی کی ہدایت تھی کہ اگلا کوئی حکم آنے تک بچی کو لاہور والی کوٹھی میں رکھا جائے۔ وہاں کے ملازمین میں ایک عورت بھی شامل تھی چنانچہ بچی کی دیکھ بھال کا مسئلہ حل ہو جاتا لیکن فی الحال وہ سارے اس ذرا سی بچی کی وجہ سے ہلکان تھے۔ ان میں سے ایک اسے اپنی گود میں لے کر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہتھیاروں کو اُٹھانے والے ہاتھوں کو کیا معلوم تھا کہ ایک معصوم بچی کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ لینے والے اناڑی ہاتھوں کی گرفت نے بچی کو بے چین کر دیا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔

''اوئے یار! چپ کرواؤ اس کو۔ متھا پہلے ہی گھوما ہوا ہے، اس پر سے اس کی ریں ریں سن کر ہور بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد شیدا اپنے ساتھی پر بگڑا۔

''چپ کروانے کی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن اس کا بھونپو کسی طرح بند ہی نہیں ہو رہا۔'' بچی کو ہاتھوں میں جھلا جھلا کر اسے خاموش کروانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے شخص نے جواب دیا۔

''اس کے منہ میں دودھ کی بوتل ٹھونس دو۔'' شیدے نے غصے سے مشورہ دیا جس پر عمل کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ لیکن بچی بھوک کے بجائے کسی اور مسئلے سے دوچار تھی اس لیے بوتل منہ میں لینے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

''اگر چودھری صاحب نے اسے زندہ سلامت نہ مانگا ہوتا تو یہیں اس کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے چپ کروا دیتا۔'' ناکام و نامراد شیدا سارا غصہ معصوم بچی پر نکال رہا تھا۔ وہ بچی چودھری افتخار عالم شاہ کی نواسی تھی لیکن چونکہ اس کی مرضی کے خلاف اس دنیا میں آئی تھی اس لیے اس کے معمولی ملازم بھی اس معصوم پر غرا رہے تھے۔ ابھی جو اگر وہ اپنے نانا کی آنکھ کا تارا ہوتی تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اسے اُف بھی کہہ پاتا۔ سارے کے سارے چودھری کی خوشنودی کے لیے اس پر اپنی جان نثار کر رہے ہوتے۔ رویوں کے فرق سے ناواقف اور نومولود بچی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی اپنی اور دوسروں کی جان ہلکان کر رہی تھی۔ اس کے رونے نے ان کی توجہ بانٹ دی تھی چنانچہ وہ نوٹ ہی نہیں کر سکے کہ ایک گاڑی بہت دیر سے ان کے تعاقب میں ہے۔ وہ تو جب اس گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانکنے والی کلاشنکوفوں نے شعلے اُگلے اور جیپ کے سواروں میں سے تین کو شکار کر لیا تو انہیں ہوش آیا لیکن سنبھلنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ گولیوں کا شکار ہونے والے تینوں افراد میں سے ایک بھی اس لائق نہیں تھا کہ جوابی فائر کر سکے۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شیدا اور بچی کو گود میں لے کر بیٹھنے والا شخص



گولیوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے یا پھر شاید انہیں نشانہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔

شیدے نے جب دیکھا کہ وہ لوگ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو جیپ کی رفتار مزید بڑھا کر اسے نکل جانے کی کوشش کی لیکن اب حملہ کرنے والی گاڑی ان کی جیپ کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شیدے نے ایک نظر اس گاڑی کی طرف ڈالی تو ایک ہتھیار بردار شخص نے اسے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ ہتھیار سے لیس شخص جب کسی کو نشانے پر لے کر اشارہ کرے تو اشارہ صرف اشارہ نہیں رہتا، حکم بن جاتا ہے۔ شیدے کے پاس بھی بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے گاڑی روک کر سائیڈ پر لگانی پڑی۔

''ہمارے پاس کوئی مال و دولت نہیں ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو، تمہیں ہم سے کچھ نہیں ملے گا۔'' موٹی عقل کا مالک سمجھنے سے قاصر تھا کہ جنہیں مال چاہئے ہو، وہ پہلے ہی سے اتنی بے دردی سے قتل و غارت نہیں کرتے۔

''بکواس بند کراوئے۔ ہمیں تیری اوقات اچھی طرح پتہ ہے۔ ہمیں مال نہیں، یہ بچی چاہئے۔'' شیدے نے ماتھے پر بٹ مار کر اس کا تھوبڑا ٹیڑھا کرتے ہوئے اسے جواب دیا گیا۔

''نہیں۔ میں یہ بچی تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر تم اسے لے گئے تو چودھری صاحب میری کھال کھچوا دیں گے۔'' خود کو لگنے والی چوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے شیدے نے مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ پہلی گولی پر ہی اسے چودھری کے اچھے خاصے عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بچی ہاتھ سے نکل جاتی تو اس کا وہ حشر کیا جاتا کہ دیکھنے والے لرز اُٹھتے۔ خود کو اس انجام سے بچانے کے لیے اس نے مزاحمت کی کوشش کی جو سراسر ناکام رہی۔

''اگر تُو نے ہماری راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہم تیری کھال کھچوانے کے ساتھ اس میں بھُس بھی بھر دیں گے۔'' اس کے شانے پر ایک زوردار ضرب لگا کر راستے سے ہٹاتے ہوئے جواباً کہا گیا اور بچی کو جھپٹ لیا گیا۔ تمام تر کوششوں سے چپ نہ ہونے والی بچی فائرنگ کی آواز پر رونا بند کر چکی تھی۔ شاید وہ ننھی سی جان حیران تھی کہ یہ مجھے کس دنیا میں سانس لینے کو بھیج دیا گیا ہے؟

''تمہیں اس بچی کو ساتھ لے جانے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔'' ٹھیک ٹھاک چوٹ کھانے کے باوجود شیدے کا دم خم باقی تھا۔ دوسرے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جان اس کی ہر حال میں خطرے میں ہے۔ اگر وہ بچی سے ہاتھ دھو کر چودھری کے پاس پہنچتا تو بڑی دردناک موت سے دوچار ہوتا۔ چنانچہ بہتر تھا کہ یہیں تھوڑی سی جدوجہد کر لی جائے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو چودھری کی طرف سے تھوڑی رعایت مل جائے گی ورنہ کم از کم وہ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں ہی نسبتاً آسان موت مارا جائے گا۔

''اسے جان پیاری نہیں ہے یارا! یہ اتنی ضد کر رہا ہے تو اس کا کام تمام ہی کر دو۔'' بچی کو گود میں لے لینے والے نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا اور واپس گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی پشت پر فائر کی آواز سنی لیکن پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہوا تھا، اسے وہ بغیر دیکھے بھی جان سکتا تھا۔ شیدے کا واحد سالم ساتھی جس کی گود میں تھوڑی دیر قبل بچی تھی، حیرت سے یوں گنگ ہوا تھا کہ مجسمہ ہی بن گیا تھا۔ موت کے ہرکاروں کو موت سے دوچار کرنے والے اپنی گاڑی میں واپس بیٹھے اور گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ آفتاب اور کشور کی ننھی اُمید ان کے ساتھ تھی اور نہیں جانتی تھی کہ جن کے ساتھ سفر کر رہی ہے، وہ اس کے دوست ہیں یا دشمن۔ ابھی تو اسے ان دونوں جذبوں کے درمیان فرق کرنا بھی نہیں آتا تھا۔

⊛----✪----⊛

جنگل پر رات اُتر آئی تھی اور رات کے اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاریکی جنگل کی ہیبت ناکی اور دہشت کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

جنگل کا یہ حصہ جسے ڈاکوؤں نے اپنی رہائش کے لیے کاٹ چھانٹ کر ذرا کم گنجان کر لیا تھا، دن کی روشنی میں کچھ کچھ خوب صورت بھی محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کچھ اس لیے کہ یہاں موجود ڈاکوؤں کے جھونپڑوں نے اس خوب صورتی کو داغ دار کر دیا تھا اور انسانی ہاتھوں کی غیر جمالیاتی چھیڑ چھاڑ نے جنگل کے اس حصے کی خوب صورتی میں سے کافی کچھ چھین لیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ ظالم و مظلوم سب کے لیے ایک ہی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ یہاں ظلم کا بازار گرم رکھنے والا جمرو بھی تھا اور اپنے خواب اور مقصدِ حیات کھو دینے والا اسلم بھی۔ باہر سے دیکھنے والا ان دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن دونوں میں فرق تو تھا جب ہی آج اسلم اس جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

طے کردہ پروگرام کے تحت وہ آدھی رات کے قریب اپنے جھونپڑے سے نکلا۔ باہر نکل کر اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ آسمان پر چمکتے چاند نے بھی ابھی اپنی عمر کی کچھ منزلیں ہی طے کی تھیں اس لیے آدھا ادھورا تھا۔ شاعری کے کسی بھی استعارے و تمثیل میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چاند کی اس بے حد مدھم روشنی میں چلتا وہ ماہ بانو کے جھونپڑے کی طرف بڑھا تو اپنے ایک ساتھی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''کی گل ہے سوہنیو! آج یہ ہمارا شہزادہ اس وقت کدھر چہل قدمی کرتا نظر آ رہا ہے؟'' اس نے اسے مسکراتے ہوئے اسلم سے سوال کیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں مسکرانے پر نظر آنے والے اس کے چوڑے چوڑے پیلے دانت اور بھی بدنما محسوس ہو رہے تھے۔

''شہزادہ بھی کہتے ہو اور پھر ایسے سوال بھی کرتے ہو۔ جانتے نہیں ہو کہ شہزادوں کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور وہ کبھی بھی، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

اسلم نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا جسے سن کر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا پھر ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے رازداری سے بولا۔

''سچ کہو، اُدھر جا رہے ہو نا جدھر جانے پر باقی سب کے لیے پابندی ہے؟'' اس کے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے اسلم نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھیوں کے لیے یہی تاثر سب سے مناسب تھا کہ وہ سمجھیں کہ وہ ماہ بانو کے ساتھ شب بسری کے لیے جا رہا ہے۔

''جا فیر عیش کر۔'' اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اس کے شانے پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ اسلم نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً چل پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے اسے للّی نظر آئی۔ وہ جنگل کے مشرقی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے اسلم نے جو معاملات طے کیے تھے، اس کے مطابق للّی نے مشرقی حصے میں پہرہ دینے والے کو خود سنبھال لینے کا دعویٰ کیا تھا اور اسلم جانتا تھا کہ وہ ایسی چلتا پُرزہ عورت ہے کہ یہ کام آسانی سے کر گزرے گی۔

للّی کے اس معاملے میں شامل ہونے پر وہ شروع میں تو تھوڑا سا اُلجھا ہوا تھا لیکن بعد میں اسے احساس ہوا تھا کہ للّی کی شمولیت سے اس کا کام تھوڑا آسان ہو جائے گا۔ اب بھی اسے مخصوص سمت میں جاتے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان اُترا۔ خود اس نے ماہ بانو کے جھونپڑے کے باہر پہنچ کر دھیرے سے دستک دی۔

''آ جاؤ۔'' اندر سے اس نے جواب دیا۔ وہ فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں کھڑی نظر آ رہی تھی اور روشنی کی کمی نے بھی اس کی سندرتا پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لباس



میں رہنے والا اس کا جسم پہلی بار تنگ جینز اور ٹی شرٹ سے آشنا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یہ ناری جس خزانے کو لیے پھرتی ہے، لو آج تم نے اس کے دیدار کی ایک صورت نکال ہی لی۔ اگرچہ یہ دیدار اب بھی ادھورا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ جس خزانے کو چھپا چھپا کر رکھا جاتا ہے، وہ واقعی بڑا قیمتی اور نایاب ہے۔ وقت کے لمحوں میں اسلم ذرا دیر کے لیے تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔ وہ بس مبہوت سا کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا اور اُس کے اس انہماک پر وہ اپنی اس اوڑھنی کو جو اُس نے اس خالصتاً مغربی لباس پر بھی پہن رکھی تھی، مزید پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن چھپ پھر بھی نہیں پا رہی تھی۔

''کب تک نکلنا ہے؟'' آخر اس نے اسلم کا انہماک توڑنے کے لیے اس سے پوچھا تو وہ ہوش میں آیا بولا۔

''بس ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور جھونپڑے کے ساتھ ہی چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا کہ اندر جلتی لالٹین کی روشنی باہر آ کر اسے عیاں نہ کر سکے۔ اس طرح تاریکی کا حصہ بن کر چپ چاپ کھڑے ہونے کی دو وجوہات تھیں، وہ انتظار کر رہا تھا۔ اس سے روانگی سے قبل دو واقعات ظہور پذیر ہونے لازمی تھے۔ اس کا یہ انتظار رائیگاں نہیں گیا۔ حسبِ توقع اس کو جو اسے راستے میں ملا تھا اور رات کو پہرہ دینے والوں میں سے ایک تھا، اس طرف آتا نظر آیا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے قدموں کی آواز کو بالکل ہی دبا لیا اور دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بھی یہاں موجود ہوس پرستوں میں سے ایک تھا جو مال ہاتھ نہ آنے پر صرف آنکھوں کی ہوس کے ذریعے ہی اپنے نفس کی کچھ نہ کچھ تسکین کر لینا چاہتا تھا۔ اپنی اس جدوجہد میں مگن اسے علم ہی نہیں ہو سکا کہ کب تاریکی کا حصہ بنا اسلم سانپ کی سی پھرتی سے اس پر آن پڑا اور اس کا منہ اور ناک اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ سوائے پھڑ پھڑانے کے کچھ نہیں کر سکا اور کچھ دیر میں ہی بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گیا۔

وہ صرف ہوش سے بیگانہ ہوا تھا یا زندگی کی بازی ہار گیا تھا، یہ دیکھنے کی اسلم کے پاس فرصت نہیں تھی۔ اس نے بازوؤں میں جھولتے آدمی کو ایک طرف ڈالا اور مشرق کی طرف آسمان پر نظر جمائی۔ اس کی منتظر نظروں کو زیادہ دیر زحمت نہیں کرنی پڑی اور روشنی کی ایک لکیر سی تین بار اندھیرے میں جھلملا کر غائب ہو گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ للّی نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے اور اس طرف موجود شخص بھی اتنا غفیل ہو چکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ پہلے للّی نے اس کی ہوس کو جگایا ہو گا اور جب وہ ہوس میں مبتلا ہو کر اپنے ارد گرد سے بے خبر ہوا ہو گا تو اس کا کام تمام کر دیا ہو گا۔ یہ اشارہ پا کر وہ تیزی سے اندر گیا۔ ماہ بانو اس کی ہی منتظر رہی تھی۔ آج اس کے پیر اس زنجیر سے آزاد تھے جو یہاں آنے کے بعد سے مستقل اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ زنجیر کا تالا کھولنے والی چابی اسے اسلم نے ہی فراہم کی تھی اور اسے آزاد دیکھ کر خوشی سی محسوس ہوئی تھی لیکن یہ آزادی ابھی نامکمل تھی۔ آزاد تو وہ تب ہوتی جب اس جنگل کی فضا سے دُور کسی مہذب دنیا میں جاتی۔

''کیا ہوا؟..... چلیں؟'' اسلم کو دیکھتے ہی اس نے استفسار کیا

''ہاں۔'' اس نے صرف ایک لفظی جواب دیا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی اوڑھنی کو حتی الامکان مزید پھیلا لیا تھا۔ اسلم چاہتا تھا کہ اسے یہ اوڑھنی اُتارنے کا کہہ دے تاکہ دوڑ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے لیکن اس کی جھجک اور شرم و حیا دیکھ کر نہ کہہ سکا۔ باہر نکل کر وہ دبے

قدموں چلنے لگے۔ اسلم پوری طرح چوکنا تھا۔ انہوں نے صرف دو پہرے داروں کو خاموش کروایا تھا تیسرے سے سامنا ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا۔ خیر گزری کہ وہ جب تک جھونپڑوں کے درمیان کراس مقام تک نہیں پہنچے جہاں للی ان کی منتظر تھی، تب تک ان کا کسی اور سے سامنا نہیں ہوا۔ سامنا اتنی اچانک کہ پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اسلم کو معلوم نہیں ہو سکا اور ایک رائفل کی نال اس سے آ لگی۔

''کون ہے؟'' رائفل بردار ایک تو اس کی پشت سے آیا تھا اور دوسرے روشنی بھی نہ ہونے کے اس لیے وہ اسلم کو فوری طور پر پہچان نہیں سکا۔

''میں ہوں، اسلم۔'' اس نے بغیر گھبرائے جواب دیا۔

''اسلم! تُو ادھر کیا کر رہا ہے؟ اور تیرے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟'' رائفل کی نال اس کے سر سے اور تعجب سے پوچھا گیا۔

''بس ایسے ہی ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔'' وہ جواب دیتا ہوا پلٹا اور یک دم ہی پوچھنے والے پر حملہ لیکن وہ اپنے اور اس کے مابین فاصلے کا درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا اس لیے وار چھچلتا ہوا پڑا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا تُو؟'' اس شخص نے خود کو گرنے سے سنبھالا اور غصے سے پوچھنے لگا لیکن اسلم کے زبان سے جواب دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ سے جواب دینے کی کوشش کی اور اس شخص پر اس بار اس شخص نے بھی رعایت نہیں کی اور نیچے گر جانے والی رائفل اٹھا کر اس کو دے ماری۔ رائفل اسلم کے شانے پر پوری قوت سے لگا۔ اگر وہ زمانۂ طالب علمی والا اسلم ہوتا تو اس وار کو کھا کر لمبا لمبا لیٹا ہوا رہا ہوتا لیکن اس جنگل میں گزارے ماہ و سال نے اسے بہت سخت جان بنا دیا تھا۔ چوٹ کھا کر وہ بس ڈگمگایا اور پھر سنبھل گیا۔ اس بار اس نے اپنی لات گھما کر رکاوٹ بننے والے شخص کے منہ پر رسید کی اور اس پر اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ ٹوٹے ہوئے جبڑے کو تھام کر وہ یک دم ہی گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ اسلم نے اسے سنبھلنے کی ذرا بھی مہلت دیئے بغیر ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل جانے والی رائفل جھپٹ کر اُٹھائی اور اسے پکڑ کر پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری کھوپڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ شخص کوئی بھی نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

''شاباش میرے شیر! تم نے تو دل خوش کر دیا۔ یہ دل ایسے ہی تو سب کو چھوڑ کر تم پر نہیں مرتا تمہارے سامنے ان سالے ساروں کی مردانگی پانی بھرتی ہے۔'' وہ جس جگہ موجود تھے وہاں للی کی موجود متوقع تھی لیکن وہ انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ روکنے والے آدمی کے زمین پر گرتے ہی وہ جانے کہاں سے نکل اور اسلم سے چمٹ کر اسے بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

''دُور مر۔'' اسلم نے فوراً ہی اسے دھکیل دیا

''کتنا ہی دُور ہٹاؤ، رہوں گی تو میں تمہارے ساتھ ہی۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''مار کر ابھی یہیں دفن کر دوں گا۔'' وہ غرایا۔

''کوشش کر دیکھو۔ مرنے سے پہلے اتنا شور مچاؤں گی کہ ڈیرے کے سارے لوگ ادھر جمع ہو جائیں گے پھر نکل کر دکھانا اپنی محبوبہ دلنواز کے ساتھ یہاں سے۔'' اس نے طنز کیا۔

''یہ جھگڑا چھوڑو۔ جب طے ہے کہ للی ہمارے ساتھ جائے گی تو پھر بے کار کی بحث کس لئے؟'' مرحلے پر ماہ بانو نے ثالث کا کردار ادا کیا تو اسلم نے بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کیا اور وہ تینوں بے آواز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں جلد از جلد اس جگہ سے نکل کر پہاڑی سلسلے میں داخل ہونے کی فکر تھی۔ اگر وہ اس سلسلے میں داخل ہو جاتے تو انہیں ڈھونڈنا آسان نہیں رہتا لیکن اصل مرحلہ تو اس سلسلے تک پہنچنے کا تھا۔ وہ ابھی کافی فاصلے پر ہی تھے کہ انہیں اپنی پشت پر فائرنگ کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ شاید پہرے داروں کی لاشیں دریافت کر لی گئی تھیں اور اب پہرے داروں کو، جنہوں نے لاشوں میں تبدیل کیا تھا، تلاش کیا جا رہا تھا۔

''بھاگو!'' اسلم نے ان دونوں سے کہا اور خود ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر بھاگ پڑا۔ اُس کے پاس ایک پسٹل، اور پہرے دار کی رائفل کے علاوہ مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ للی کے پاس بھی شاید ایک ریوالور موجود تھا لیکن ان افراد اتنے محدود اسلحے کے ساتھ ڈھیر سارے لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم اس کھلے حصے میں بالکل بھی نہیں۔ اس لیے ان کے لیے بہتر تھا کہ جتنی تیزی سے ممکن ہو، بھاگیں اور پہاڑی سلسلے میں پناہ لیں۔ پہاڑوں کی آڑ مل جاتی تو محدود اسلحے کے ساتھ بھی مقابلے کا امکان تھا اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑتے جا رہے تھے اور ان کی پشت پر اُبھرتی فائرنگ کی آوازیں بھی اسی تناسب سے زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ ہم نہیں یہ جنگل انہیں اپنی قید سے آزاد ہونے بھی دیتا یا نہیں؟ ان کے پاس ذہنوں میں اُبھرتے اس سوال کا جواب موجود نہیں تھا لیکن وہ اپنی پوری کوشش کر لینا چاہتے تھے۔ اس پرندے کی طرح، جس کے پنجرے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا ہو اور وہ اپنے پوری طرح پروان نہ چڑھنے والے پروں کے باوجود ایک اونچی اُڑان اُڑنا چاہتا ہو تاکہ آزادی کا ذائقہ چکھ سکے۔

فائرنگ کی آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں اور اسی حساب سے ان کے دوڑتے قدموں کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''رُک جاؤ۔'' اچانک ہی اسلم نے بلند آواز میں کہا تو اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی للی اور ماہ بانو کے پاؤں کو بریک لگ گئے۔ اسلم خود بھی رک گیا اور سماعت پر زور دے کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اس خیال میں پُر یقین ہو گیا جس نے اسے رُکنے پر مجبور کیا تھا۔

''کیا ہوا؟..... تم رک کیوں گئے؟'' اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے للی نے دریافت کیا۔

''فائرنگ کی آوازیں سن رہی ہو؟''

''ظاہر ہے۔ فائرنگ ہو رہی ہے تو سن بھی رہی ہوں..... لیکن تم رک کیوں گئے ہو؟ کیا ان لوگوں کو موقع دینا چاہتے ہو کہ وہ ہمارے سروں پر پہنچ جائیں؟'' اس کے سوال کے جواب میں للی نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''ہمارے سروں پر تو وہ تب پہنچیں گے جب ہمارے پیچھے آئیں گے۔ ذرا فائرنگ کی آوازوں کو غور سے سنو۔ یہ آوازیں بلند تو ہو رہی ہیں لیکن ہمارے قریب نہیں آ رہیں۔ اس بات کا مطلب ہے کہ فائرنگ کرنے والے ہمارے پیچھے نہیں آ رہے۔ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ جتنی شدت سے فائرنگ کی جا رہی ہے، اس سے یوں لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اگر یہ تماشہ ہماری وجہ سے ہو رہا ہوتا تو فائر کرنے والے ہمیں للکارتے اور گالی کا کہتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو آوازوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے دو مسلح گروپوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ تو واقعی کوئی زوردار مقابلہ ہو رہا ہے۔'' اس کے کہنے پر للی نے بھی کان لگا کر غور کیا اور بالآخر اس سے متفق ہو گئی۔

''لیکن یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ایک گروپ تو لازمی ڈیرے والوں کا ہے مگر یہ دوسرا گروپ کس کا ہے جو

ان سے مقابلہ کر رہا ہے؟'' اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ واقعی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں مسلح گروپوں کے درمیان لڑائی کا نتیجہ ہیں، اس نے حیرت سے سوال کیا۔ وہ اچھے خاصے طویل عرصے ڈاکوؤں کے اس ٹھکانے پر مقیم تھی۔ اتنے عرصے میں اس نے کبھی کسی کو ان لوگوں سے اُلجھتے ہوئے نہیں تھا۔ ان کا گروہ اس علاقے کا واحد ڈکیت گروہ تھا اس لیے اپنے ''ہم پیشہ'' افراد سے تو تصادم کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا خیال پولیس کی طرف جاتا لیکن یہ بھی ذرا حیرت کی بات تھی۔ پولیس نے کبھی جنگل گھس کر ان لوگوں سے مقابلے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ تو کسی واردات کے متوقع پر بھی ان کی راہ میں بننے سے گریز کرتے تھے۔ پھر ان کے سرپرستوں کا تعاون بھی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پولیس فورس اگر کسی وجہ سے جنگل میں داخل بھی ہوتی تھی تو انہیں پہلے ہی اطلاع کر دی جاتی تھی تاکہ وہ لوگ ہوشیار رہیں اور ان کی پولیس سے مڈبھیڑ کی نوبت ہی نہ آئے۔

''میرا خیال ہے پولیس نے ڈیرے پر ریڈ کیا ہے۔ اگر تم لوگ غور سے سنو تو فائرنگ کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی کسی کی لاؤڈ اسپیکر پر بولنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ جہاں تک مجھے سمجھ آ رہا ہے، پولیس والے ڈیرے والوں کو ہتھیار ڈالنے کا کہہ رہے ہیں۔'' اب تک خاموش رہنے والی ماہ بانو اچانک ہی بڑے وثوق سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ پہلے لمحے میں وہ فائرنگ کی آوازیں سن کر گھبرا گئی تھی اور اسے یہی ڈر ہوا تھا کہ ڈیرے والوں کو ان کے فرار کی خبر ہو گئی ہے اور وہ انہیں پکڑنے کے لیے ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ لیکن اسلم کی خیال آرائی کے بعد اس نے خاموش رہ کر بہت توجہ سے سنائی دینے والی آوازوں پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔

''کہہ تو تم صحیح رہی ہو۔ پھر بتاؤ کہ کیا خیال ہے؟ کیا ہم یہیں رک کر اس ہنگامے کے تھمنے کا انتظار کریں اور پھر فائرنگ رکنے کے بعد واپس جا کر میں پولیس کو گرفتاری دے دوں؟ تم دونوں تو ظاہر ہے خود مظلوم ہو۔ دونوں پولیس کی حفاظت میں آرام سے اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاؤ گی۔ دوسری صورت میں تو راستہ بہت دُشوار اور پُر پیچ ہے اور تم دونوں کو بلاوجہ اتنی تکلیف اُٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ میں ہرگز بھی تمہارا پولیس کے ہاتھ آنا پسند نہیں کروں گی۔ تم پر اتنے الزامات ہیں کہ تمہاری تو ساری زندگی مقدمات بھگتنے اور سزا کاٹنے میں گزر جائے گی۔'' اسلم نے ماہ بانو کی طرف رخ کر کے سوال کیا تھا لیکن جواب فوری طور پر لِلّی کی طرف سے آیا۔ وہ واقعی اس پر مرتی تھی اور اسے کسی طور نقصان ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اسلم کی سوالیہ نظریں تو ماہ بانو پر جمی تھیں۔ اندھیرے کے باعث وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے، پر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اسلم کو اس کے جواب کا انتظار ہے۔

''لِلّی ٹھیک کہہ رہی ہے اسلم! اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو زندگی کا بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے گا اور میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ قدرت تمہیں ایک اچھی زندگی گزارنے کا جو موقع فراہم کر رہی ہے، اسے ہاتھ سے جانے نہ دو۔'' اس کے جواب نے اسلم کی سماعتوں میں رس گھول دیا اور وہ جو کہیں دل میں اندیشہ تھا کہ ماہ بانو صرف یہاں سے نکلنے کے لیے اسے شادی کا جھانسہ دے رہی ہے، وہ مکمل طور پر دل سے نکل گیا تھا۔

''اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر چلو یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا بیکار بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر پولیس نے ڈیرے والوں پر قابو پا لیا تو اس کے بعد سرچ آپریشن بھی کرے گی اس لیے



ہے کہ ہم جلد از جلد یہاں سے دور نکل جائیں۔'' وہ سرخوشی کے ساتھ بولا اور پھر ان تینوں کے قدم آگے کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ قدم انہیں کہاں لے جاتے، یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن اپنی اپنی ہی مطمئن تھے کہ جینے کی ایک کوشش کرنے کا موقع تو بہر حال مل ہی گیا ہے۔

⊛----✪----⊛

کتنا راستہ باقی ہے؟'' اس نے اپنے دائیں پہلو میں چلتے گھوڑے پر سوار سادھو سے پوچھا۔ یہ ہندو ایس پی کے مطابق ہر وقت اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتے رہنے کے باعث ویرانوں اور آبادیوں کے رازوں سے واقف تھا اور پولیس کو ڈاکوؤں کے ڈیرے کی صحیح نشان دہی کرنے والا مخبر ثابت ہوا تھا، کا اہم سفر بنا تھا کہ اس نے ایس پی سے درخواست کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا اور بظاہر تارک دنیا ولی رقم کی ترغیب دے کر اس کام کے لیے راضی کر لیا تھا کہ وہ ڈیرے تک پہنچنے والے راستے کی اس رہ کر راہنمائی کرے گا۔ سو اب وہ چاند کی بے حد مدھم روشنی میں گھوڑوں پر سوار جنگل میں سفر کر رہے سفر میں نڈر، بے باک اور قابل بھروسہ مشاہرم خان بھی اس کے ساتھ تھا۔

پولیس فورس ان سے بہت پہلے روانہ ہو چکی تھی۔ پولیس فورس میں کئی ایسے مقامی افراد بھی شامل تھے کو جنگل سے واقف تھے اس لیے انہوں نے سادھو کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب اپنی بولتی بند کر لیتا ہے تو پھر کسی طرح زبان کھولنے کے لیے ہوتا۔ ایسے من موجی آدمی کو ساتھ رکھ کر فائدہ اٹھانا ذرا مشکل ہوتا ہے اس لیے اسے ساتھ لے جانے آپریشن کی تکمیل تک پولیس کسٹڈی میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جہاں سے وہ شہریار کی خواہش پر اس دیا گیا تھا۔

اس نے سادھو سے بند کمرے میں طویل مذاکرات کیے تھے۔ ابتدا میں تو وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ ایک ہے جسے دنیا داری کے جھمیلوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن جوں جوں شہریار کی طرف سے کی جانے کی پیشکش میں ہندسوں کا اضافہ ہوتا رہا، اس کی بے نیازی کا خول چٹختا چلا گیا اور بالآخر وہ پوری طرح سے باہر آ کر شہریار کا ساتھ دینے کے لیے راضی ہو گیا۔ رقم کے لالچ نے اس کی وہ ساری بے نیازی اُڑن چھو کر دی جس کا ڈھونگ رچا کر وہ لوگوں میں باعزت بنا پھرتا تھا۔ شہریار کو اس سے پہلے ہی ہی۔ اسے اندازہ تھا کہ عام طور پر اس طرح کے لوگ بہروپیئے ہوتے ہیں اور کمانے کے مروّجہ طریقے کے بجائے ایسی راہ ڈھونڈتے ہیں جس سے لوگوں کو لوٹا جا سکے۔

اس سادھو کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ مخبری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ لوگوں کی اندھی سے فائدہ اٹھا کر بھی مال سمیٹتا ہوگا۔ بہر حال اسے فی الحال اس سادھو کے کردار سے کچھ لینا دینا نہیں تو وہ اسے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پہچانتا تھا جو اسے ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچا سکتا تھا چنانچہ قسم کی بحث میں اُلجھے بغیر اس سے سودے بازی کر لی تھی اور نتیجتاً اب وہ لوگ جنگل کے پُر پیچ راستوں رہے تھے۔ سادھو ان کا راہنما تھا، اسی لیے اس نے اس سے راستے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

''ابھی تو وڈا لمبا رستہ ہے سوہنیو! کیا تھک گئے ہو جو ابھی سے پوچھ تاچھ کر رہے ہو؟'' سادھو کی شخصیت کی آ چکی تھی لیکن ظاہر ہے وہ ایک مخصوص انداز میں بات کرنے کا عادی تھا اور یہ عادت چند گھنٹوں میں ختم ہو سکتی تھی چنانچہ اس سے ابھی بھی اسی ٹون میں بات کر رہا تھا جیسے وہ بڑا گیانی ہو۔

''یہ جو جنگل ہے نا، یہ وڈا انوکھا جادو ہے۔ یہ اتنی آسانی سے کسی کو اپنے اندر رستہ نہیں دیتا۔ م
بھول بھلیوں میں بھٹکا کر رکھ دیتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو جو میرا ساتھ مل گیا ورنہ کہیں بھی نہیں پہنچ
اس کی لن ترانیاں جاری تھیں اور وہ قطعی بھول چکا تھا کہ جس بات کا احسان جتا رہا ہے اس کے لیے
پوری پوری قیمت وصول کی ہے اور وہ بھی ایڈوانس۔ رقم لینے کے بعد وہ شہریار سے چند گھنٹوں کی مہلت
گیا تھا کہ رقم اپنے گھر والوں تک پہنچا کر واپس آ جاؤں گا اور حسبِ وعدہ واپس بھی آ گیا تھا۔ رقم لے کر
کا یقیناً اس نے اس لیے نہیں سوچا تھا کہ اے سی ضلع سے بگاڑ کر کہاں جائے گا۔

''میں نے تمہیں اتنی رقم باتیں بنانے کے لیے نہیں دی ہے۔ رقم میں نے اس لیے خرچ کی ہے کہ
فورس سے پہلے یا کم از کم ان کے ساتھ ساتھ ڈیرے پر پہنچ سکوں۔ لیکن جس انداز میں تم مجھے لے جا
اس سے تو یہی لگتا ہے کہ پولیس ہم سے سبقت لے جائے گی۔'' سادھو کی فضول گوئی کو وہ ایک
برداشت کر سکتا تھا چنانچہ فوراً ہی اس کی اوقات یاد دلا دی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں، پر فرق تو پڑے گا۔ پولیس والے ہم سے پہلے کے نکلے ہوئے ہیں اور
میرے بتائے ہوئے راستے سے ہوں گے۔ اب آپ کی شرط کے مطابق ان سے ٹاکرا ہوئے بغیر
پہنچنے کے لیے مجھے تھوڑا سا راستہ بدلنا پڑا ہے تو فیر ٹیم (ٹائم) تو لگے گا نا۔ ویسے آپ بتاؤ آپ ادھر کیا کر
رہے ہو، وہ بھی ایسے چپکے سے؟ جانا ہی تھا تو آپ پولیس والوں کے ساتھ بھی جا سکتے تھے۔ آپ تو
آدمی ہو۔'' سادھو نے بڑے پتے کا سوال پوچھا تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔

وہ تو بس ایک دیوانگی تھی، ایک آشفتہ سری تھی، تن من میں آگ لگی تھی جو اسے کچھ بھی سوچے
عہدے کا لحاظ کیے بغیر جنگل میں لیے جا رہی تھی۔ چنانچہ کوئی وضاحت دینے کے بجائے سرد لہجے میں
''فضول سوالات کرنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ وہاں جا کر میں کیا کروں گا اور کیا
میرا مسئلہ ہے۔''

''جیسی تہاڈی مرضی سرکار! بندہ تو بے دام غلام ہے۔'' جواباً سادھو نے دانت نکالتے ہوئے
مظاہرہ کیا۔ اپنی مرضی کے دام وصول کرنے کے بعد خود کو بے دام غلام کہنا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا تھا۔ لیکن
نے اسے کچھ جتانا ضروری نہیں سمجھا اور ان کا سفر جاری رہا۔

جنگل کی ہولناکی میں جاری یہ سفر کب ختم ہوتا، یہ تو انہیں لے جانے والا سادھو ہی جانتا تھا، وہ تو بس
جا رہے تھے کہ کبھی تو منزل پر پہنچیں گے۔ وہ اور مشابرم خان دونوں ہی جنگل سے واقف نہیں تھے اور
سادھو کے رحم و کرم پر تھے۔

چلتے چلتے اچانک ہی مشابرم خان کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر آ رہا۔ شہریار نے فوراً
گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ان لمحات میں وہ سادھو کی طرف سے بالکل بے
اور وہ مکار سادھو تو یقیناً تھا ہی موقع کی تلاش میں۔ فوراً ہی اپنے گھوڑے سے اچھل کر اس کے پیچھے
گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور اپنے جھولے نما لباس میں سے کہیں سے ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی
لگا دی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اس صورتِ حال پر سٹپٹا جانے کے باوجود شہریار نے اس سے سخت لہجے میں
''بدتمیزی نہیں، مجبوری ہے۔ مجھے حکم ہے کہ آپ کو ہلاک کر دوں۔'' سادھو نے جواب دیا۔

''یہ حکم دینے والا کون ہے؟'' اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔ سوالات کے



اپنے ساتھ اُلجھائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اس دوران بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکے۔ غنیمت تھا
خوش صورت سادھو نے فوری طور پر اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے تھوڑی سی مہلت مل

''میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔'' سادھو نے اس کے سوال کے جواب میں اپنی معذوری ظاہر کی۔

''بہت خوب، تم تو بڑے کمال کے آدمی ہو۔ مجھ سے اتنی موٹی رقم لے کر مجھے ہی قتل کرنے پر تلے ہو۔ کیا
تمہیں میرے قتل کا حکم دیا ہے، وہ تمہیں اور بھی زیادہ رقم دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔
جان بچانے کے لیے تمہیں اس سے ڈبل رقم دوں گا۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کے
نیچے گر جانے والا مشابرم خان خود کو سنبھال چکا ہے اور بڑی احتیاط سے حرکت میں بھی آ گیا ہے اس
مزاج لایعنی گفتگو کو طول دینے لگا۔

''کتنی رقم.....؟'' سادھو کا لہجہ حرص و طمع سے لتھڑا ہوا تھا۔

''بتایا تو ہے کہ جس کے کہنے پر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو، اس سے ڈبل رقم دوں گا۔'' اس نے نہ چاہتے
بھی نرمی سے جواب دیا۔ ریوالور کی نال کنپٹی سے لگی ہونے کے باعث وہ صرف ایک ہی سمت میں دیکھتے
پر مجبور تھا اور نہیں دیکھ سکتا تھا کہ مشابرم خان کا متحرک جسم اب کہاں ہے۔ شاید وہ ان لوگوں کی پشت پر چلا
اس لیے نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میں جس کے کہنے پر تمہیں قتل کرنے والا ہوں، وہ بس کام لینا جانتا ہے۔ تمہاری طرح میں اس سے منہ
رقم نہیں لے سکتا۔ اس کی مرضی ہوتی ہے کہ جو چاہے دے دے، اور اگر نہ بھی دے تو کسی کو شکایت کرنے
ہمت نہیں ہوتی۔'' سادھو اس کی خواہش کے مطابق باتوں میں اُلجھ گیا تھا۔ شاید وہ اس سطح کا آدمی تھا ہی نہیں
سطح کا کام اسے سونپ دیا گیا تھا۔

''تم جس کے کہنے پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، اس کا نام بتا بھی دو گے تو کیا حرج ہو گا؟ مرنے کے بعد میں
کچھ بگاڑ تو نہیں سکوں گا۔'' اس نے ایک بار پھر سادھو کو کریدنے کی کوشش کی۔

''ہو سکتا ہے تمہارا ساتھی.....'' جواب میں سادھو جانے کیا کہنے جا رہا تھا، یک دم ہی اسے احساس ہو گیا
مشابرم خان جس جگہ گرا تھا اس جگہ موجود نہیں ہے۔ اس نے بھڑک کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن
مشابرم خان اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ اپنے اس پھرتیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے
کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا ریوالور والا ہاتھ اپنے قابو میں کر کے اس کو گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ سادھو
نیچے گرتے ہوئے ایک خوف زدہ سی چیخ ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گرا تھا اور اب وہ
نہتا مشابرم خان کے رحم و کرم پر تھا۔

مشابرم خان نے بنا کسی رو رعایت کے اس کا چہرہ گھونسوں کی زد پر رکھ لیا اور تابڑ توڑ اتنے گھونسے اسے
کیے کہ وہ خون اُگلنے لگا۔ اس خون کے ساتھ اس کے بدنما اور پیلے دانت بھی باہر نکل کر گرے۔ مشابرم
کے گھونسوں نے اس کی بتیسی کے کئی دانت جڑ سے اُکھاڑ دیئے تھے۔ اگر شہریار اسے اشارے سے نہ روکتا
شاید وہ منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دینے والا محاورہ سچ کر دکھاتا۔

''اگر تم اس شخص کا نام بتا دو جس نے تمہیں مجھے قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہم
مزید کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تم زندہ سلامت یہاں سے لوٹ سکو گے۔'' مشابرم خان کو روکنے کے بعد وہ
گھٹنوں کے بل بیٹھے خون تھوکتے ہوئے سادھو سے مخاطب ہوا۔

''اگر میں نے آپ کو اس شخص کا نام بتا دیا تو وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ظالم ہے اور اس کے حکم پر اس کے کارندے، بندے کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں۔'' سادھو نے خوف زدہ اور کمزور آواز میں جواب دیا۔ اس وقت وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ شہریار پر ناکام قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد وہ یہ اُمید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ اس سے کوئی اچھا سلوک کریں گے۔ دوسری طرف اس کو اس کام پر مامور کرنے والا بھی یقیناً کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں ہو سکتا تھا۔ لالچی سادھو کو قتل جیسے جرم پر آمادہ کرنے کے لیے اس نے موٹی رقم اور اثر و رسوخ دونوں ہی کا استعمال کیا ہوگا جب ہی تو وہ اپنی حیثیت بھلا کر ایک اسسٹنٹ کمشنر کو قتل کرنے چلا تھا۔

''اس طرف سے تم اطمینان رکھو۔ تم اگر مجھے اس شخص کا نام بتا بھی دو گے تو میں اس معاملے میں تمہارا نام کہیں نہیں آنے دوں گا۔ نہ ہی ایسی کوئی حرکت کروں گا جس سے وہ یہ سمجھے کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔'' اس نے سادھو کی بزدلی اور خوف کا علاج نرم لہجے میں کیے جانے والے ایک وعدے سے کرنے کی کوشش کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اپنے منہ سے نکلنے والا خون روک لینے کی کوشش میں مصروف سادھو اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟ یہ نہ ہو کہ تم اپنے وعدے سے پھر جاؤ۔'' وہ میلا کچیلا سادھو ''آپ'' اور ''تم'' کے درمیان بڑی تیزی سے قلابازیاں کھا رہا تھا۔ عادت اسے ''تم'' کا صیغہ استعمال کرنے پر مجبور کر رہی تھی جب کہ اے سی کے عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ شہریار سے ''آپ'' کہہ کر مخاطب ہو۔

''مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں جھوٹے وعدے کرنے والا آدمی ہوں۔'' اس کے بے حد روکھے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ خوف میں لپٹے سادھو کو اس کا یقین کرنا پڑا اور وہ دانتوں سے محروم ہو جانے والے اپنے زخمی مسوڑھوں پر زبان پھیرتا ہوا سچ اُگلنے پر تیار ہو گیا۔

''مجھے اس کام کے لیے چودھری افتخار عالم نے کہا تھا۔ چودھری صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ مجھے ڈاکوؤں کے ڈیرے کا راستہ دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اصل راستے پر لے جانے کے بجائے جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکاتا رہوں اور فیر جیسے ہی موقع ملے آپ کو قتل کر ڈالوں۔''

''چودھری کو کیسے معلوم ہوا کہ تم میرے ساتھ جانے والے ہو؟'' اس نے بصارت کو محدود کر دینے والی تاریکی کی چادر کے پار سادھو کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ سوال و جواب کے اس سیشن کے دوران مشابرم خان نے تینوں گھوڑوں کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا تھا اور اب خود خاموش لیکن ہوشیار کھڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ اب وہ سادھو کو ایسا کوئی موقع نہیں دے گا کہ وہ شہریار پر حملہ کر سکے۔ پہلے بھی وہ اس کی طرف سے ہوشیار ہی رہا تھا لیکن اتفاق سے اس کے گھوڑے کو لگنے والی ٹھوکر نے سادھو کو موقع فراہم کر دیا تھا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ بات ان کے حق میں بہتری ثابت ہوئی تھی۔ لمحاتی برتری حاصل کرنے کے بعد اب سادھو ان کے سامنے پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور اس امر پر مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی زبان کھول دے۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے کوئی بہتر موقع مل جاتا اور وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

''انہیں میں نے ہی بتایا تھا۔ میں جب آپ سے گھر والوں کو رقم دینے کا بہانہ کر کے گیا تھا تو چودھری صاحب کے پاس بھی گیا تھا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے اس اعتراف نے شہریار کو بری طرح چونکا دیا۔ اس اعتراف سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چودھری اور سادھو کے درمیان کوئی خاص گٹھ جوڑ ہے۔



''کیوں؟..... تم چودھری کو یہ بتانے کیوں گئے تھے؟'' اس نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔

''میں انہیں بتائے بغیر یہ کام کیسے کر سکتا تھا؟ ان کی مرضی کے بغیر اگر میں آپ کو راستہ دکھانے چل پڑتا تو وہ میری چمڑی بھی اُدھیڑ سکتے تھے۔'' اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

''تو کیا پولیس کو بھی تم نے چودھری کی اجازت سے راستہ بتایا ہے؟'' اس نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے اندیشے کے تحت پوچھا۔

''اجازت کیا جی، ان کے حکم پر ہی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مخبر بن کر پولیس والوں کو بتا دو کہ جنگل میں اس جگہ رہ رہے ہیں تو میں نے بتا دیا۔ ان کا حکم نہ ہوتا تو میں بھلا زبان کھول سکتا تھا؟ مجھے تو برسوں سے معلوم ہے کہ ڈاکو کدھر رہ رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں تھوڑا سا تفاخر در آیا تھا۔

''چودھری کو ڈاکوؤں کی مخبری کروانے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟'' وہ ذرا حیرت سے با آوازِ بلند بڑبڑایا۔ اُس کی اس بڑبڑاہٹ کو سادھو نے اپنے لیے نیا سوال تصور کیا اور بے نیازی سے بولا۔ ''یہ تو مجھے نہیں معلوم جی۔ میں تو بس حکم کا غلام ہوں۔ وہ جو حکم دیتے ہیں، میں بجا لاتا ہوں۔'' اس کے بے نیازانہ جواب نے واضح کر دیا کہ وہ سادھو، چودھری کا کوئی باقاعدہ ملازم یا کارندہ ہے جو کسی مصلحت کے تحت اپنی اصلیت چھپاتا ہے۔

''کیا تم چودھری اور ڈاکوؤں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے ہو؟'' اس نے اپنے ذہن میں سرسرانے والے خیال کو سوال کا روپ دیا۔ اس سوال نے اب تک روانی سے بولتے سادھو کو خاموش کر دیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ بول چکا ہے اور یہ بڑبولا پن اسے نقصان دے سکتا ہے۔

''سنائی نہیں دیا کہ صاحب نے کیا پوچھا ہے؟'' اس کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش کھڑے مشابرم خان نے رائفل کی نال سے اسے ٹھوکا دیا۔

سادھو کچھ دیر قبل ہی اس کے طوفانی مکوں کو سہہ کر اپنی بتیسی کے کئی دانتوں سے محروم ہو چکا تھا اور دانتوں سے محروم عجیب سی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے رائفل کی نال سے ٹھوکا دیا تو وہ سر پر کھڑی اس بلا سے جان چھڑانے کے لیے ایک بار پھر رواں ہونے کے لیے تیار ہو گیا لیکن کوئی بھی نیا انکشاف کرنے سے پہلے اس نے اپنے تحفظات کی ضمانت چاہی اور گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں تم لوگوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ پر آپ کو بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا ہوگا کہ چودھری صاحب کے سامنے کہیں میرا نام نہ آنے پائے۔'' اُس کی ''آپ'' اور ''تم'' کے درمیان قلابازیاں مسلسل جاری تھیں۔

''ایک بار کے کہے کو کافی سمجھو۔ تمہارے سامنے تمہارا حرام خور اور بد دیانت چودھری نہیں کھڑا ہے جو تمہیں وعدہ خلافی کا ڈر ہو۔ یہ اے سی شہریار عادل ہیں۔ ان کی سچائی اور دیانت داری کی گواہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ تمہارے بدذات آقا کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں اور وہ تم جیسوں کے ذریعے انہیں ختم کرنے کے ناپاک منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اپنے ان منصوبوں پر اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے لیکن باز نہیں آتا۔'' شہریار کے بجائے مشابرم خان نے اسے جواب دیا اور ایک چھوٹی سی جذباتی تقریر کر ڈالی جس کا سادھو پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔

''کل یہ ہے جی کہ میرا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے۔ ہم لوگ اِدھر اُدھر گھوم کر اور مانگ تانگ کر کھانے کے عادی ہیں۔ محنت مزدوری سے جان چراتے ہیں لیکن ہر وقت گھومتے پھرتے رہنے کی وجہ سے جنگلوں اور ویرانوں سے نہیں ڈرتے۔ میں بھی جب دل میں آتا تھا، جنگل میں نکل جاتا تھا۔ چودھری

صاحب کو کسی طرح میرے بارے میں خبر ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ میری ملازمت میں آ جا۔ کام یہی ہو
ابھی کرتا ہے۔ ہر طرف گھومنا پھرنا، پر اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا۔ جدھر میرے خلاف کوئی گل ہو
دینا۔ میں راضی ہوگیا تو فیر انہوں نے مجھے دُوجا کام بتایا۔ یہ کام جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پیغام
لے جانے کا تھا۔ میرے لیے اس میں بھی کوئی مشکل نہیں تھی اس لیے یہ بھی آرام نال کرنے لگا۔
صاحب جو کچھ دیتے تھے، وہ اپنی جگہ تھا اور لوگ عقیدت سے جو تھما دیتے تھے، وہ اپنی جگہ۔ میں نے
والوں کو برادری سے توڑ کر ادھر پیر آباد میں ہی بسا لیا۔ آپ نے مجھے جو رقم دی تھی، وہ میں نے اپنے گھر
پہنچا کر چودھری صاحب تک آپ کے پروگرام کی خبر پہنچا دی تھی۔ جواب میں انہوں نے مجھے آپ کو قتل
کا حکم دیا۔ اس حکم پر میں ڈر گیا، پر انکار کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو چودھری صاحب آپ
پہلے میرا جنازہ اُٹھنے کا بندوبست کر دیتے اسی لیے میں مان گیا، پر اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک طرف
جان بچا کر نکلا تو دوسری طرف سے پکڑا گیا۔ آپ کی مرضی ہے کہ معافی دے دو یا سزا دے ڈالو۔''

وہ ایک بار پھر رونے والا ہوگیا تھا لیکن وہ سادھو کی حالت سے زیادہ موجودہ حالات کے تجزیے میں
ہوا تھا۔ یہ بات قطعی ناقابل فہم تھی کہ چودھری نے ڈاکوؤں کی مخبری کیوں کروائی۔ وہ تو اس کے پالتو پٹھو
سے ابھی کچھ عرصہ قبل اس نے شہریار کے بنگلے پر ڈاکے کا کام بھی لیا تھا۔ شاید ان ڈاکوؤں نے اس کی کوئی
عدولی کی تھی جس کی وجہ سے وہ بھڑک گیا اور کوشش کی تھی کہ ڈاکو پولیس کے ہاتھوں آپریشن میں مارے جائیں
یہ باغی ٹولہ ختم ہوتا تو وہ نئی بھرتیاں آرام سے کر سکتا تھا۔ نئے آنے والے ڈاکو بھی اس کے فرماں بردار
لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں تھیں۔ شہریار کو تو فی الحال موجودہ صورتِ حال سے نمٹنا تھا۔

''ہم ڈیرے سے کتنی دور ہیں؟'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے سادھو سے دریافت کیا۔

''بہت دور ہیں۔ آپ کو اصل راستے سے بھٹکانے کے لیے میں جنگل میں اِدھر اُدھر لے کر پھر رہا تھا، اس
چکر میں ہم ڈیرے تک جانے والے راستے سے کافی دور نکل آئے ہیں۔'' اس نے شرمندہ سی آواز میں بتایا۔

''او کے..... جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ اب تم ہمیں کسی ایسے راستے سے لے کر جاؤ گے کہ ہم کم سے کم
میں ڈیرے تک پہنچ سکیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں سادھو کو حکم سنایا جسے ظاہر ہے اسے قبول ہی کرنا تھا۔
ڈیرے پر جانے کا فیصلہ ہوگیا تو وہ لوگ ایک بار پھر سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار وہ اور مشابرم خان
دونوں ہی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط تھے۔ ایک بار سادھو کے وار سے بچنے کے بعد وہ اسے دوبارہ
کوئی موقع فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ چودھری کے لیے کام کرنے والا یہ ڈھونگی
سادھو کب دوبارہ اپنے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تُل جاتا۔ دوبارہ شروع ہونے والا یہ سفر واقعی
طویل ثابت ہوا لیکن انہیں یقین تھا کہ سازش کھل جانے کے بعد سادھو دوبارہ انہیں بھٹکانے کی کوشش نہیں
کرے گا۔ ان کا یہ یقین غلط نہیں تھا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں نے تصدیق کر دی کہ
سادھو انہیں درست سمت میں لے کر جا رہا ہے۔ ان سے بہت پہلے نکلنے والی پولیس فورس یقینی طور پر ڈیرے تک
پہنچ کر اس کا محاصرہ کر چکی تھی اور اب پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ جاری تھا۔ سادھو کے علاوہ
اب یہ آوازیں بھی ان کی راہنما بن چکی تھیں۔ وہ ایک جوش کے عالم میں سفر کر رہے تھے۔ جوش کی اس کیفیت
میں بھی وہ سادھو کی طرف سے بے خبر نہیں ہوئے تھے۔ خیر گزری اور اس نے مزید کوئی گڑبڑ نہیں کی۔

''بس اب یہاں سے ڈیرا تھوڑی ہی دور ہے۔ ہمیں اب ہور آگے نہیں جانا چاہئے ورنہ ہم میں سے کسی کو
گولی بھی لگ سکتی ہے۔'' کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد سادھو نے ایک مقام پر اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ



اس کا کہنا درست ہی لگ رہا تھا۔ اس مقام پر فائرنگ کی آواز اتنی بلند تھی کہ لگتا تھا ابھی چند گولیاں اس
آئیں گی اور انہیں چاٹ لیں گی۔ فائرنگ کی آواز سے یہ صاف ظاہر تھا کہ دو گروہوں کے درمیان مقابلہ
ہے۔ یقینی طور پر ڈاکو پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے مقابلے پر اُتر آئے تھے اور یہ مقابلہ کسی
فریق کے پسپائی اختیار کرنے تک جاری رہنا تھا۔

شہریار کے نزدیک پولیس فورس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے کیونکہ انہوں نے باقاعدہ منصوبہ
کے ساتھ ڈیرے پر چڑھائی کی تھی اور جدید اسلحے سے لیس تھے۔ اسلحے کی تو خیر ڈاکوؤں کے پاس بھی کوئی
میں ہوگی لیکن ان کی بے خبری میں ہونے والا یہ آپریشن پولیس فورس کو ان پر برتری دلانے میں اہم کردار
سکتا تھا۔ دوسری طرف سے وہ چودھری کی سازش کا بھی شکار ہوئے تھے۔ وجہ جو بھی رہی ہو، لیکن حقیقت
چودھری نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا اور برسوں کی دوستی کے بدلے میں آج خود انگلی پکڑا کر پولیس کو
کی کمین گاہ تک لے آیا تھا۔ اگر چودھری کا یہ تعاون جو کہ اس نے سادھو کی صورت میں کیا تھا، شامل نہ ہوتا تو
کو اس ٹھکانے تک پہنچنے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا۔ اب وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی وہاں
تھی اور آرام سے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔

وہ لوگ جس جگہ کھڑے تھے، وہاں سے فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کی نقل و حمل
صاف محسوس ہو رہی تھی اور اس جگہ سے آگے جانا یقیناً رسکی ہوسکتا تھا لیکن وہ اتنا سفر طے کر کے صرف دور
تماشا دیکھنے تو نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے طور پر بھی کچھ کرنا تھا چنانچہ سادھو کے مشورے پر کان دھرے بغیر اٹل
میں بولا۔

''ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔''

''م..... مگر آگے خطرہ ہے۔'' سادھو خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ہم جس جگہ آئے ہیں، اس کے بارے میں پہلے ہی سے جانتے ہیں۔
کیسے ہوسکتا ہے کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جہاں پولیس آپریشن جاری ہے، خطرہ نہ ہو؟ ہمیں اسی خطرے کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا ہوگا اور یہ کام ہم تمہاری مدد سے کریں گے۔ تمہیں ہمیں کسی محفوظ
راستے سے ڈیرے کے اندر تک پہنچانا ہوگا۔''

''ہم بے کار میں مارے جائیں گے صاحب! گولی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ کدھر کا بھی رخ کر لیتی ہے
اور کسی کو بھی لمبا لٹا دیتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' سادھو گھگیایا۔

''اگر انکار کرو گے، تب بھی مارے جاؤ گے۔ ادھر سے چلنے والی گولیوں سے بچنے کا پھر بھی چانس ہے
لیکن یہ گولی تو سیدھی تیرے بھیجے کو ہی اُڑائے گی۔'' سادھو کی حجت بازی کا علاج کرنے کے لیے مشابرم خان
نے رائفل کی نال اس کی پیشانی کے عین وسط میں ٹکا دی۔ موت سے ڈرنے والا وہ سادھو خوفناک رائفل کی
نال اپنے ماتھے پر پا کر بادل ناخواستہ راضی ہوگیا۔

اس کی راہنمائی میں وہ ایک ایسی پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو بہت واضح نہیں تھی اور کہیں کہیں سے راستہ بالکل
ہی معدوم معلوم ہوتا تھا لیکن سادھو جس اعتماد سے اس راستے پر چل رہا تھا، اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس
راستے کو بارہا استعمال کر چکا ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے وہ تینوں محتاط قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔
اندھیرے میں انہیں کبھی کبھار پولیس والوں میں سے کسی کی جھلک نظر آ جاتی تھی لیکن ابھی تک کسی سے براہِ راست
سامنا نہیں ہوا تھا۔ بعض گولیاں بھی ان کے بالکل قریب سے سنسناتی ہوئی گزریں اور ہر بار سادھو کا دم حلق میں

آ گیا لیکن مشابرم خان نے اسے رکنے نہیں دیا۔ وہ بے جگر آدمی تھا اور شہریار کا ساتھ نبھاتے ہوئے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی کہ خود اس کی اپنی جان بھی خطرے میں تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور سنسناہٹ کے کسی قدر عادی ہوتے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک کان پھاڑ دھماکے نے ان کے قدموں کو لرزا دیا۔ پہلے ہی سے خوف زدہ سادھو اس دھماکے کے اثر سے زمین پر گر گیا۔

''شاید ڈاکو محاصرہ توڑنے کے لیے ہینڈ گرنیڈ استعمال کر رہے ہیں۔'' اس نے خود کو سنبھال کر دھماکے کی آواز سے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے تبصرہ کیا جس کے جواب میں مشابرم خان نے اپنے سر کو تائیدی جنبش دی۔

''میں اب ہور آگے نہیں جاؤں گا صاحب!'' زمین پر گرے خوف زدہ سادھو نے روہانسی آواز میں اطلاع دی۔ وہ اس کی آواز پر کان دھرتے اس سے قبل فضا پے در پے دھماکوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی کسی مقام پر آگ بھڑک اُٹھی اور ماحول قدرے روشن ہو گیا۔

''یہ احمق کیا کر رہے ہیں؟ اس طرح تو بہت زیادہ لوگ مارے جائیں گے اور جنگل الگ تباہ ہو گا۔'' اندازہ کرنے کے بعد کہ دھماکے پولیس کی کارروائی کا نتیجہ ہیں، وہ زور سے بولا اور اس سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جہاں اسے پولیس والوں کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ مشابرم خان بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دوڑا تھا۔ سادھو کو انہوں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نہتا ہونے کی وجہ سے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ اس کی پہلی کوشش یہی ہو گی کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے فرار ہو جائے۔

''ہینڈز اَپ۔'' وہ دونوں جیسے ہی پولیس والوں کے قریب پہنچے، کئی رائفلیں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

''فرینڈز۔'' شہریار نے بلند آواز میں بتایا۔

''کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''یہ میں ڈی ایس پی منظور کو بتاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ارے یہ تو اپنے اے سی صاحب ہیں۔'' اس اثنا میں کسی نے اسے شناخت کر لیا اور حیرت بھرے لہجے میں انکشاف کیا۔ شناخت کر لیے جانے کے بعد سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس کی فرمائش پوری نہ کی جاتی۔ اسے اور مشابرم خان کو ڈی ایس پی منظور کے پاس پہنچایا گیا۔ اس آپریشن کو وہی لیڈ کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر موجود چمک بتا رہی تھی کہ وہ کامیابی کے قریب ہے۔ دوسری طرف سے ہونے والی فائرنگ میں واضح کمی بھی اس کی کامیابی کا اعلان کر رہی تھی۔ چند لمحوں قبل جو زوردار دھماکے سنائی دیئے تھے، انہوں نے پولیس کی اس برتری میں یقیناً بڑا کردار ادا کیا تھا۔

''آپ یہاں سر؟'' ڈی ایس پی منظور اسے اپنے سامنے پا کر سخت حیران ہوا۔

''ہاں، مجھے یقین تھا کہ تم کوئی نہ کوئی حماقت ضرور کرو گے اس لیے میں خود اس آپریشن کی نگرانی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اس آپریشن کے لیے تمہارا انتخاب میری سفارش پر ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی شرمندگی اُٹھانی پڑے۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔

''آپ کو خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا سر! ہم کامیابی کے بالکل قریب ہیں۔ ایک دو راکٹ لانچر مزید فائر کریں گے تو ان سب کا قیمہ بن جائے گا۔'' اس نے جوش سے بتایا اور ساتھ ہی مزید راکٹ لانچر فائر کرنے کا حکم دینے لگا۔

''رک جاؤ احمق! وہاں صرف ڈاکو نہیں ہیں۔ وہاں کچھ مغویوں کی موجودگی کی بھی اطلاع ہے۔ کیا تمہیں اس سلسلے میں بریفنگ نہیں دی گئی تھی؟'' وہ غصے سے بولا تو ڈی ایس پی منظور کے چہرے پر شرمندگی کے آثار



ابھرے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ اہم بات فراموش کر چکا تھا۔

''مجبوری تھی سر! اگر ہم انہیں جواب نہیں دیتے تو وہ ہینڈ گرنیڈز کی بارش کرتے ہوئے یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس وقت ہماری حکمتِ عملی نے ان کے قدم اُکھاڑ دیئے ہیں اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہیں۔'' اس کے پاس اپنے عمل کا جواز موجود تھا۔

''اور اگر ڈاکوؤں کے پسپا ہونے تک یہ جنگل ہی تباہ ہو گیا تو پھر؟..... کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہاں لگنے والی آگ کتنے بڑے نقصان کا سبب بنے گی؟'' اس کا غصہ مزید بڑھا۔ ملکی املاک اور افراد کی سلامتی کے لیے وہ ویسے ہی بڑا حساس تھا اور یہاں تو معاملہ ہی الگ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر ماہ بانو بھی موجود ہے بلکہ ماہ بانو کی وہاں موجودگی ہی تو اسے یہاں کھینچ کر لائی تھی ورنہ اس قسم کے کسی آپریشن میں شامل دینا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا۔ اس نے اگر اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا تو صرف ماہ بانو کی سلامتی کے لیے۔ اور یہاں جس انداز میں کارروائی کی جا رہی تھی، اس سے ماہ بانو کی سلامتی کو شدید خطرہ تھا۔ آگ اور بارود کے کھیل میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون زد میں آ جائے۔ یہ کھیل ظالم و مظلوم دونوں کے لیے یکساں خطرناک ہوتا ہے۔ اگر ماہ بانو کو کچھ ہو جاتا تو وہ زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ آپریشن شروع ہی اس کے ایما پر ہوا تھا۔

''اس آپریشن کو شروع کرنے سے پہلے یہ خدشہ تو ذہنوں میں تھا ہی سر! اس لیے ہم اس سلسلے میں احتیاطات کر کے چلے تھے۔ اللہ نے چاہا تو ہماری کارروائی کے نتیجے میں کوئی بڑا نقصان نہیں ہو گا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیے کہ اب ہم مزید راکٹ لانچر یا ہینڈ گرنیڈز استعمال نہیں کریں گے۔ آپ فائرنگ کی آواز پر غور کریں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ دوسری طرف سے فائرنگ میں واضح کمی ہوئی ہے۔ یقیناً اب وہاں ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ میں میگا فون پر اعلان کرواتا ہوں کہ باقی بچ جانے والے افراد ہتھیار ڈال دیں تو انہیں مکمل قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔'' اس کے اعتراضات کے جواب میں اس کی تسلی کروا کر ڈی ایس پی منظور اپنے کسی ماتحت کی طرف رخ موڑ گیا اور اسے ہدایات دینے لگا۔

شہریار کے ساتھ اس کی مکالمہ بازی کے دوران بھی یہی ماتحت اس کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا۔ ہدایت میں میگا فون پر اعلان کیا جانے لگا۔ اعلان کئی بار دُہرایا گیا اور ڈاکوؤں کی یقین دہانی کے لیے پولیس کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔

اس حکمتِ عملی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ڈاکوؤں کی طرف سے کی جانے والی جوابی فائرنگ کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اس خاموشی کا مطلب تھا کہ وہ لوگ گرفتاری دینے پر آمادہ ہیں۔ عرصۂ دراز سے ترقی کے خواہاں ڈی ایس پی منظور کا چہرہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال پر خوشی سے چمکنے لگا۔ اتنی بڑی کامیابی اس کے کریڈٹ پر آ جانے کے بعد کوئی اس کی ترقی کو نہیں روک سکتا تھا۔ ترقی اور انعام ملنے کے ساتھ میڈیا پر اس کی جو ''واہ واہ'' ہوتی، وہ اپنی جگہ تھی۔ یقینی طور پر اس وقت وہ خود کو ایک ہیرو تصور کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے یہ ہیروشپ دلانے میں ان تیاریوں کا بڑا ہاتھ تھا جو اس آپریشن کے آغاز سے قبل کی گئی تھیں۔ آئی جی مختار مراد نے اس آپریشن کے لیے اسلحے سے لے کر افرادی قوت تک سب کچھ بڑے پیمانے پر فراہم کیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی منظور کی خوش قسمتی تھی کہ اس مہم کے لیے اس کا چناؤ کیا گیا تھا۔

آخر کار ہاتھ سر سے اوپر بلند کیے پہلا ڈاکو نمودار ہوا۔ وہ قطعی غیر مسلح تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی اسے راہی گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پھر تو جیسے سلسلہ ہی بن گیا۔ وہ کل آٹھ ڈاکو تھے جنہوں نے پولیس کو

گرفتاری پیش کی تھی۔ گرفتاری کا یہ عمل مکمل ہونے تک سورج کی پہلی کرن نمودار ہوگئی۔ اس کرن ہونے کے ساتھ گرفتار شدہ ڈاکوؤں کو پولیس کی ایک ٹیم کے ساتھ روانہ کر دیا گیا جبکہ دوسری ٹیم تمام تدابیر کے ساتھ ڈیرے کی تلاشی لینے کے لیے میدان میں اُتر پڑی۔ اس ٹیم کے افراد کا پوری طرح اس لیے ضروری تھا کہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہیں کوئی ڈاکو چھپا بیٹھا ہو اور اچانک ہی حملہ کر دے۔ تیسری ڈیرے کے اردگرد کے علاقے میں سرچ آپریشن کرنا تھا تاکہ اگر کوئی ڈاکو ڈیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہو تو اسے بھی گرفتار کیا جاسکے۔

شہریار اور مشابرم خان دوسری ٹیم کے افراد کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اس موقع پر اسے ڈی ایس پی نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس ڈر تھا کہ شہریار کو کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن وہ کسی طور رُکنے پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ گرفتاری دینے والے ڈاکوؤں کے ساتھ ماہ بانو ڈیرے سے باہر نہیں آئی تھی اور ڈاکوؤں نے اس کے بارے میں کوئی خبر بھی نہیں دی تھی چنانچہ وہ خود اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی منظور بھی اسی ٹیم کے ساتھ تھا۔ اس کی قیادت میں ڈیرے کی تلاشی کا عمل شروع ہوا تو کئی لاشیں اور زخمی سامنے آئے۔ زخمی ہونے والوں میں ایک موٹی عورت بھی شامل تھی اور وہ اس ڈیرے پر واحد نسوانی وجود ثابت ہوئی تھی۔ اس عورت کے پیر میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت کافی نازک تھی۔ اس سے ڈیرے پر مزید عورتوں کی موجودگی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ ڈیرے پر للی نام کی ایک لڑکی کے علاوہ حال ہی میں اغوا کر لی جانے والی ماہ بانو بھی موجود تھی لیکن آپریشن شروع ہونے کے بعد جب ڈیرے پر بھگدڑ مچی اور اس نے دونوں خواتین کے ساتھ مل بیٹھنے کی کوشش کی تو اسے ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں مل سکی۔ ان کے نہ ملنے پر اس نے یہی گمان کیا کہ بھگدڑ میں وہ دونوں اِدھر اُدھر ہوگئی ہیں لیکن پولیس کو پورا ڈیرا چھان مارنے کے بعد وہ دونوں کہیں نہیں ملی تھیں جس پر یہی تصور کیا گیا کہ وہ دونوں کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ اب ان کے ملنے کا واحد امکان یہی تھا کہ وہ ڈیرے کے اردگرد سرچ آپریشن کرنے والوں میں سے کسی کو مل جاتیں۔ فی الحال تو شہریار کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جس کے لیے یوں کسی بھی شے کی پروا کیے بغیر یہاں تک دوڑا آیا تھا، وہی غائب تھی۔ دن چڑھے جب وہ تھکا ماندہ جنگل سے واپس لوٹ رہا تھا تو بالکل خاموش تھا۔ قسمت ایک بار پھر اسے دھوکا دے گئی تھی اور وہ تمام تر کوشش کے باوجود ماہ بانو کو نہیں پا سکا تھا۔ اسے کہ اس گل بدن کو پانا اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

''آفتاب! میری اُمید.....؟'' وہ دونوں نرس شبانہ کی کزن نازیہ کے ساتھ حیدر آباد چلے آئے۔ حالات اس نہج پر آ گئے تھے کہ ان کا مزید میر پور خاص میں رُکنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ چودھری کے جن گرگوں نے ہسپتال پر حملہ کیا تھا، وہ ان کی تلاش میں اس گھر تک بھی ضرور پہنچے ہوں گے جو ان کی رہائش تھی۔ چودھری کے گرگوں کے تیور دیکھنے کے بعد ان کا میر پور خاص میں ہی رُکے رہنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہ اگر کسی دوسری جگہ چھپتے بھی تو چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے جلد دھر لیے جاتے۔ چودھری کے گرگے بُو گیر کتوں کی طرح ہر جگہ ان کی بُو سونگھتے پھرتے۔ میر پور میں ہی رُکے رہنا خود کو چوہے دان میں پھنسانے کے مترادف تھا۔ ہاں ان کے پاس کوئی ایسا قابل ذکر ٹھکانہ بھی نہیں تھا کہ جہاں وہ طویل عرصے رُکے رہتے۔ اس لیے سب سے زیادہ مناسب یہی تھا کہ اس سے قبل کہ شہر سے نکاسی کے راستے پر چودھری



ڈیرہ ڈالتے، وہ وہاں سے نکل جاتے۔

بات یہ تھی کہ میر پور والے گھر میں ان کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جس کے ہاتھ سے نکل جانے سے نقصان کا احساس ہوتا۔ وہ پہلے ہی بہت کم ساز و سامان کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے۔ ضروری شناختی کارڈ، اے ٹی ایم و کریڈٹ کارڈز اور رقم جیسی ضروری چیزوں کو حالات کے پیشِ نظر آفتاب وقت اپنے ساتھ رکھنے کی عادت بنا لی تھی اور اس وقت بھی یہ ساری چیزیں اس کی قمیض کے نیچے ایک میں محفوظ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھیں۔

تصنیف ناول کا مسودہ پہلے ہی پبلشر کو بھجوا چکا تھا۔ اپنی خواہش کے مطابق وہ بیٹی کی پیدائش سے قبل انے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا لیکن مسودہ تقریباً تیار تھا جسے وصول کر کے پبلشر نے اس کی ساکھ کی لی چیک بھی دے دیا تھا۔ گھر پر اس کی اگر کوئی خاص شے رہ گئی تھی تو وہ ایک آدھ ادھورا کالم تھا۔ اس وہ باقی استعمال کے سامان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ وہ چیزیں ضرورت کے مطابق مزید خریدی جاسکتی اصل مسئلہ ان کی نوزائیدہ بیٹی اُمید کا تھا۔ وہ افراتفری میں اسے ہسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ کر مجبور ہوگئے تھے لیکن اس سلسلے میں بھی ان کے پاس ایک مضبوط دلاسا موجود تھا۔ نرس شبانہ نے وعدہ کہ وہ بچی کو اپنی تحویل میں لے کر کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچا دے گی اور اب وہی ان کی اُمیدوں کا مرکز یدر آباد پہنچ کر انہوں نے نازیہ کو کسی مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کیا تھا اور شکریے کے ساتھ اس سے الگ یا نے درجے کے ایک ہوٹل میں آ ٹھہرے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے کشور کو بستر پر لٹایا کے ہونٹوں سے پہلا سوال اپنی بیٹی کی بابت نکلا۔ راستے میں بھی یقیناً وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی زبان سے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ اُس کے اس ضبط کا بندھن اگر ٹوٹا بھی تھا تو بس اس حد تک کہ قفے سے اس کی آنکھیں بار بار چھلک پڑتی تھیں مگر اب جبکہ وہ ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے تو اس میں داشت کا یارا نہیں رہا تھا چنانچہ سوال اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ میرے پاس شبانہ کا نمبر ہے۔ میں ابھی اسے فون کر کے امید کے بارے میں ہوں۔ آپ اس دوران ریلیکس کریں۔ انشاء اللہ جلد ہماری بچی ہمارے پاس ہوگی۔'' آفتاب نے اسے یا اور خود فون کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ خود اس کا موبائل تو بھاگ دوڑ میں کہیں گر گیا تھا ایک بار پھر رابطوں سے محروم خالی ہاتھ تھا۔ اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ شبانہ از خود فون کر ے امید کے بارے میں خبر دے دیتی لیکن اب تو ہر صورت میں اسے ہی رابطہ کرنا تھا۔ وہ اپنے کمرے کر سیڑھیاں طے کر کے ہوٹل کی نچلی منزل پر پہنچا۔ یہاں ریسپشن پر فون کرنے کی سہولت تھی لیکن اس کے فون کو استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پہلے ایک بار سنگین غلطی کر چکا تھا اور نتیجے میں اپنے محفوظ سے محروم ہوگیا تھا۔ چنانچہ اب کسی بداحتیاطی کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔

میر پور خاص سے حیدر آباد تک کا راستہ طے کرنے میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ چودھری کے گرگے اس کی طی کی وجہ سے ہسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یقینی طور پر چودھری کو کوریئر کے ذریعے بھیجا والا خط اسے ان کا سراغ دے گیا تھا اور اس نے فوراً اپنے گرگوں کو ہسپتال پر چڑھا دیا تھا۔ لفظوں کی دنیا ق رکھنے والے آفتاب کی ہر خوش اُمیدی چودھری کے اس ردِعمل کے بعد دم توڑ گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس سوچ لیا تھا کہ نواسی کی اطلاع پا کر چودھری کا دل نرم ہو جائے گا اور وہ بے شک کشور کو دوبارہ اپنانے پر یں ہو سکے گا لیکن اس حد تک تو ضرور نرم پڑے گا کہ اس کا پیچھا کرنا چھوڑ کر انہیں ان کی دنیا میں سکون

سے رہنے دے گا۔ مگر اب اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ چودھری کی فطرت سانپ کی سی ہے جو اپنے ہی
بچوں کو ہڑپ کر ڈالتا ہے۔ اب وہ آئندہ اس سے بے انتہا محتاط رہنا چاہتا تھا چنانچہ ہوٹل سے نکل کر
تک پیدل چلتا چلا گیا اور پھر ایک پبلک کال آفس نظر آنے پر اس کا رخ کرلیا۔ اس کی خواہش پر وہاں
لڑکا اُٹھ کر باہر چلا گیا اور اسے نمبر ملانے اور بات کرنے کی مکمل آزادی دے دی۔ کال چارجز کی اسے
فکر نہیں ہوگی کہ بعد میں یونٹ چیک کر کے وہ آرام سے اس سے چارجز وصول کرسکتا تھا۔ لڑکے کے
کے بعد اس نے شبانہ کا دیا ہوا فون نمبر جیب سے نکالا اور اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
گھنٹیوں کے بعد شبانہ نے اس کی کال وصول کرلی۔

''ہیلو، کون بات کررہا ہے؟'' آواز سے وہ کچھ خوف زدہ اور بجھی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

''مس شبانہ! میں آفتاب احمد بات کررہا ہوں۔ مجھے آپ سے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ آپ
نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ بچی کو ہسپتال کی نرسری سے نکال کر مجھ تک پہنچانے میں مدد کریں گی۔ میں
سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوسکی یا نہیں؟'' وہ اپنی بیٹی کی طرف سے
متفکر تھا کہ شبانہ کی خیریت دریافت کرنے یا کسی دوسری رسمی گفتگو میں اُلجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور براہ راست
اپنے مطلب پر آگیا۔

''سوری آفتاب صاحب! میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔'' اس کو دوسری طرف سے
جو جواب سننے کو ملا، اسے سن کر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یہ تو وہی معاملہ تھا کہ جن پر تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے
لگے۔ تعاون کا بھرپور یقین دلانے والی شبانہ یوں صاف انکار کر ڈالے گی، اس کی تو اسے ذرا اُمید نہیں تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس شبانہ؟ ہم نے تو آپ کے بھروسے پر آپ کا مشورہ قبول کرتے ہوئے
چھوڑا تھا۔'' وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں غصے کی جھلک نمودار ہونے سے نہیں روک سکا۔

''میں مجبور ہوں آفتاب صاحب! ورنہ یقین جانئے کہ مجھے خود آپ کی مدد کر کے دلی خوشی ہوتی۔'' شبانہ کی
آواز رُندھ گئی۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟'' اس کا غصہ فوری طور پر
تشویش میں ڈھل گیا۔

''نہیں، یہاں بالکل بھی خیریت نہیں ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں آفتاب صاحب! کہ میں آپ کو
بُری خبر سنانے جارہی ہوں۔'' شبانہ کے الفاظ پر اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ یقیناً صورتِ حال اتنی
تھی کہ شبانہ کو تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔

''میں سن رہا ہوں مس شبانہ! جو بھی بات ہے، آپ مجھے کھل کر بتا دیں۔'' آخر اس نے اپنا تمام تر حوصلہ
مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے پوچھا۔

''آپ لوگوں کے نکلنے کے بعد آپ کے پیچھے آنے والے غنڈے بھی ہسپتال سے فرار ہوگئے تھے۔
نے پولیس کو اطلاع کردی تھی اس لیے انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میں منتظر تھی کہ پولیس والے آئیں تو
موقع دیکھ کر بچی کو نرسری سے نکال لوں لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کرمانی نے مجھے کال کرلی
انہوں نے مجھ سے ساری صورتِ حال معلوم کی۔ مجھے جس حد تک معلوم تھا، میں نے انہیں بتا دیا۔ ساری بات
سن کر بھی انہیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں نے ہسپتال کے عملے میں شامل ہوتے ہوئے اس قسم کی کسی سرگرمی
میں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوری طور پر اپنا استعفیٰ لکھ کر ان کے حوالے کردوں ورنہ وہ



وہ اس ساری پچویشن میں میرے کردار سے پولیس کو آگاہ کردیں گے۔ پولیس والوں کو تو آپ
۔ مجھ جیسی تنہا لڑکی ان کی تفتیش کا سامنا کرنے کی قطعی اہمیت نہیں کرسکتی چنانچہ میں نے اپنا استعفیٰ لکھ
کرمانی کے حوالے کردیا۔ استعفیٰ دیتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں اسٹاف میں موجود اپنی کسی دوست
سے آپ کی بچی کو نرسری سے نکلوا لوں گی لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ ناخوشگوار واقعہ پیش آ
بہت روانی سے سب کچھ بتاتی شبانہ اس مرحلے پر آکر ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

کیسا واقعہ؟..... میری بیٹی تو خیریت سے ہے نا مس شبانہ؟'' اس کے رکنے پر آفتاب نے بے تابی
کہا۔

آئی ایم سوسوری سر! میں آپ سے وعدہ کرنے کے باوجود آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکی۔ آپ کی بچی
کچھ کرنے سے قبل ہی نرسری سے پراسرار طور پر غائب ہوگئی ہے۔ یہاں ہسپتال میں بچی کے غائب
کی وجہ سے ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ اسٹاف سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ مجھے خود پولیس والوں کی تفتیش کا
کرنا پڑا ہے۔'' شبانہ نے اس کے کانوں میں کوئی صور پھونکا تھا۔ وہ بچی کے اس پراسرار غیاب کے پیچھے
محرکوں سے واقف تھا۔ جو لوگ کھلے عام ہسپتال پر چڑھائی کر کے ان تک پہنچنے کی کوشش کرسکتے تھے، ان
ایک بچی کو غائب کرلینا کیا مسئلہ تھا۔ لیکن خود اس کی حالت تو یہ خبر سن کر تباہ ہونے لگی تھی۔ اپنی بیٹی کے
ان آشام بھیڑیے کی گرفت میں چلے جانے کا سوچ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔

''یقین کریں آفتاب صاحب! مجھے اس بات کا دلی افسوس ہے اور اگر میں اب بھی آپ کے لیے کچھ کر
سکی تو ضرور کروں گی۔'' دوسری طرف سے شبانہ پورے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

''شکریہ مس شبانہ! مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ یقیناً بے بس
ہوں گی۔ ہمارا دشمن ہے ہی اتنا خطرناک کہ میں اچھے خاصے تعلقات رکھنے کے باوجود اس کے مقابلے
کو کمزور پارہا ہوں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ ہماری خاطر آپ اپنی اچھی بھلی ملازمت سے محروم ہوگئیں۔
کی خاطر آپ کو مزید کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور نہ ہی کسی ایسے کام کا کہنا چاہتا ہوں جو آپ کے لیے
تکلیف کا باعث بنے۔ ہاں اگر ہوسکے تو آپ تک اس سلسلے میں کوئی خبر پہنچے تو وہ مجھے بھی پہنچا دیں۔ میں
کو اس ہوٹل کا فون نمبر دے دیتا ہوں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم یہاں ہیں، آپ اس نمبر
اطلاع دے سکتی ہیں۔ بعد میں، میں آپ کو اپنا کوئی مستقل رابطہ نمبر دے دوں گا۔''

اس نے خود کو مجتمع کرتے ہوئے شبانہ سے یہ سب کچھ کہا۔ شبانہ کے خلوص اور تعاون کا معترف ہونے
باوجود وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا کہ اس یکہ و تنہا لڑکی کے دل میں چپکے سے اس کی محبت کا پھول کھل
ہے۔ اور جو محبت کرتے ہیں، انہیں کب اپنے محبوب کا کوئی کام زحمت یا مشقت لگتا ہے۔ محبت کرنے
کے لیے تو اپنے محبوب کے لیے اٹھائی جانے والی ہر مشکل اور پریشانی رحمت اور کیف آگیں ہوتی ہے۔
اگر اس کے لیے کچھ کرپاتی تو دلی خوشی محسوس کرتی چنانچہ اس کی پُرتکلف باتیں اور معذرتی انداز سن کر
تھی اور نہایت رقت سے بولی۔

''آپ بلاوجہ تکلف سے کام لے رہے ہیں آفتاب صاحب! یقین جانئے کہ اگر میں آپ کے کسی کام آ
مجھے خود دلی خوشی محسوس ہوگی۔ رہی ملازمت جانے کی بات تو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے، میرے
سنگ کی تعلیم اور تجربہ ہے۔ کسی اور جگہ کوشش کروں گی تو آرام سے ملازمت مل جائے گی۔ ڈاکٹر کرمانی
سے جبری استعفیٰ ضرور لکھوایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ مہربانی بھی کی ہے کہ میرا نام بدنام نہیں ہونے دیا۔ میرا

سروس ریکارڈ بے داغ ہے اس لیے مجھے چند دن ملازمت کی تلاش میں گزارنے کے سوا کوئی دوسرا نہیں اُٹھانی پڑے گی.....اور ملازمت کی مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ برسوں سے کام کر رہی ہوں۔ اچھا بہانے کچھ دن کا ریسٹ مل جائے گا۔''

''شکریہ مس شبانہ! آپ نے میرے دل کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ اچھا، اب مجھے اجازت دیں پلیز جیسے ہی کوئی اطلاع ملے مجھے کال کر دیجئے گا۔'' اس نے شبانہ کو ہوٹل کا ٹیلی فون نمبر، اپنا کمرہ نمبر لکھوایا جو اس نے کمرے کے حصول کے لیے ہوٹل کے رجسٹر میں درج کروایا تھا۔

فون بند کر کے وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُمید کا نرسری سے غائب ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا ہونے کے ناتے وہ اس خبر کو سن کر بری طرح تڑپ اُٹھا تھا۔ دوسری طرف اسے کشور کی بھی فکر تھی۔ اس تو یہ خبر بہت ہی ہولناک ثابت ہوتی۔ وہ پہلے ہی بچی کے لیے تڑپ رہی تھی، اگر جو یہ پتہ چلتا کہ بچی لا ہے تو جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، کشور اندوہناک خبر چھپا کر رکھے گا اور اپنے طور پر اُمید کی بازیابی کے لیے کوشش کرتا رہے گا۔ ابھی تو اسے نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے سلجھائے؟ اس کے پاس ایک تدبیر تو یہ تھی کہ اپنی صحافی برداری درخواست کرے لیکن وہ لوگ تحریر اور تقریر کی مدد سے شور مچانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ چودھری نے کروا کر جانے کہاں رکھا ہوگا۔ پولیس میں تو اتنا دم بھی نہیں تھا کہ اس کی حویلی کا محاصرہ کر کے خانہ تلاشی سکے۔ اگر کسی طرح یہ کام ہو بھی جاتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ بچی کو حویلی میں ہی رکھا گیا ہوگا۔ کے پاس دسیوں ٹھکانے تھے، وہ بچی کو کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے سے محبت کا تعلق جڑنے کے بعد وہ بارہا مشکل کا شکار ہوا تھا۔ بعض اوقات جان پر بھی بن گئی تھی لیکن اب تھا، وہ سب سے سوا تھا۔ کیونکہ معاملہ اپنی اولاد کا تھا اور اولاد سے آدمی اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا سے پیاری چیز ہاتھ سے نکل جانے پر کسی شخص کی جو حالت ہو سکتی تھی، وہ اس وقت اس کی بھی تھی۔ ایسا کہ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

''کیا بات ہے جناب! کیا آپ کا نمبر نہیں ملا؟'' پی سی او والا لڑکا جو باہر کھڑا شیشے کے دروازے دیکھ رہا تھا، اسے کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر اندر آیا اور اس سے دریافت کیا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس دوران کوئی اور شخص فون کرنے وہاں نہیں آیا تھا ورنہ وہ پہلے ہی اندر آ کر اسے ٹوک دیتا۔

''نمبر مل گیا تھا لیکن مجھے ابھی ایک کال اور کرنی ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کر لو، پھر میں ایک ساتھ دونوں کالز کے چارجز ادا کر دوں گا۔'' اس کی مداخلت پر آفتاب چونکا اور پھر ذہن میں یک دم ہی اُبھرنے والے ایک خیال کے تحت بولا۔

''پیسوں کی بات نہیں ہے بھائی صاحب! میں اس لیے فکرمند ہو گیا تھا کہ آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے تھے۔'' لڑکے نے خلوص سے کہا اور پھر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ''آپ آرام سے بات کرو، میں باہر کھڑا ہوں۔''

اس کے باہر نکل جانے کے بعد آفتاب، شہریار کے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کے باعث کئی ضروری فون نمبرز بھی اس سے مس ہو گئے تھے لیکن شہریار کے دفتر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا اس لیے آرام سے ڈائل کر لیا۔

''اے سی صاحب تو آج ابھی تک دفتر نہیں آئے ہیں۔ آپ اپنا میسج نوٹ کروا دیں، وہ آئیں گے تو



کر دوں گا۔'' شہریار سے بات کروانے کی فرمائش پر دوسری طرف سے اسے یہ جواب سننے کو ملا تو کا احساس ہوا۔ شہریار اس کے لیے ہمیشہ ہی بہت مہربان ثابت ہوا تھا اس لیے موجودہ حالات میں اسی کی طرف گیا تھا کہ شاید وہ اُمید کی تلاش کے سلسلے میں اس کی کچھ مدد کر سکے۔ یہ خیال اس لیے تھا کہ شہریار تو پہلے ہی چودھری کے خلاف سرگرم رہتا تھا۔ وہ اپنے مسئلے کے لیے اس سے مدد مانگتا تو وہ اس کی مدد کی کوشش کرتا

''آپ انہیں بس اتنا بتا دیجئے گا کہ اے اے منشا کا فون آیا تھا۔ بعد میں، میں خود ان سے رابطہ کر لوں نے اپنے قلمی نام کے حوالے سے یہ پیغام نوٹ کروایا اور سلسلہ منقطع کر کے شیشے کے دروازے کے نے والے لڑکے کو اشارہ کر کے اندر بلایا۔

کے کو کال چارجز ادا کر کے وہ پی سی او سے باہر نکلا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے ایک ایک قدم من من بھر ہو۔ ہوٹل کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کشور کا سامنا کرنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن کے اور بہت سارے امتحانوں کی طرح اس امتحان کا سامنا بھی کرنا ہی تھا، چنانچہ اپنے شکستہ وجود کو لتے ہوئے وہ اس امتحان سے گزرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا اور بوجھل قدموں سے ہوٹل کی طرف ا۔

⊛----✪----⊛

''ڈی ایس پی منظور کی کال ہے سر!'' وہ اپنے دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ آپریٹر نے اسے اطلاع دی۔

''بات کرواؤ۔'' اس نے ہموار لہجے میں جواب دیا لیکن اندر سے بری طرح مضطرب ہو گیا کہ ڈی ایس پی منظور اسے کیا خبر سناتا ہے۔ وہ خود تو ڈیرے پر ہونے والے آپریشن کے بعد فوراً ہی واپس آ گیا تھا لیکن پولیس پارٹی کا سرچ آپریشن جاری تھا۔ پولیس جنگل میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کرتی رہی تھی جو آپریشن کے دوران ڈیرے سے فرار ہو گئے تھے۔ ماہ بانو کے بارے میں بھی یہی خیال کیا گیا تھا کہ کوئی مفرور ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

آپریشن کے دوران زخمی حالت میں ملنے والی حمیداں نامی عورت نے بھی ماہ بانو سے متعلق استفسار کے جواب میں یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلم نامی ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ حمیداں کو مُردہ زندہ ڈاکوؤں کی جو شناختی پریڈ کروائی گئی تھی، اس کے بعد اس نے صاف بتا دیا تھا کہ زندہ مُردہ دونوں طرح کے ڈاکوؤں میں اسلم موجود نہیں ہے۔ حمیداں کی مدد سے مُردہ، گرفتار اور مفرور تینوں طرح کے ڈاکوؤں کے ناموں کی فہرست بنائی گئی تھی۔ اس فہرست سے ظاہر تھا کہ ماہ بانو، للی اور سات عدد ڈاکو ڈیرے پر نہیں مل سکے ہیں جن کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ پولیس یہ کام کر رہی تھی جبکہ شہریار مشاہرم خان کے ساتھ واپس لوٹ کر آ گیا تھا اور اب اس کی امیدوں کا مرکز و محور ڈی ایس پی منظور کی طرف سے ملنے والی رپورٹ تھی، اسی لیے اس کا فون آنے کی خبر سن کر وہ بے چین ہو اُٹھا تھا۔

''ہاں منظور! کیا خبر ہے؟'' ڈی ایس پی کے لائن پر آتے ہی اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''کافی حوصلہ افزا خبریں ہیں سر! جنگل کے مختلف حصوں سے ہم نے پانچ ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا ہے، البتہ دو ڈاکوؤں اور قیدی خواتین کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کی تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔'' اس نے جو رپورٹ دی، وہ واقعی صورتِ حال کے مطابق کافی اچھی تھی لیکن خود شہریار کو تو ماہ بانو سے غرض تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے جنگل میں اسے کہاں اور کیسے تلاش کرے۔ بس پولیس کے سر پر آپریشن سے ہی ساری اُمیدیں باندھ رکھی تھیں۔

''تلاش کا سلسلہ ابھی جاری رکھو۔ دونوں خواتین اور ڈاکوؤں کی بازیابی ضروری ہے۔ اس کام کے علاوہ تم اپنا ریکارڈ بھی مین ٹین رکھو۔ جنگل سے ملنے والے پانچوں ڈاکوؤں کے نام نوٹ کر لیے ہیں یا نہیں؟'' اس نے ڈی ایس پی کو ہدایات دیتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''یس سر! یہ کام ہو گیا ہے اور اب ہماری ساری توجہ باقی دو ڈاکوؤں اور خواتین کی طرف مبذول ہے۔ اس سلسلے میں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوئی، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً جواب



آج کل وہ بہت زیادہ ایفی شینسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کامیاب آپریشن نے اس کا سینہ پھلا دیا تھا۔ میڈیا کی طرف سے بھرپور کوریج ملنے کے علاوہ اسے اس کامیابی پر نقد انعام اور ترقی کی بھی امید تھی، چنانچہ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ شہریار کے سامنے اس ایفی شینسی کا مظاہرہ اس لیے ضروری تھا کہ اس کے آئی جی پنجاب مختار مراد سے قریبی تعلقات سے واقف تھا۔

''جو دو ڈاکو غائب ہیں، ان کے کیا نام ہیں؟'' اس نے یونہی اس کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے دریافت کیا۔ باقی دو ڈاکوؤں کے نام جان کر اسے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ اگر ان دو ڈاکوؤں کی اپنے دیگر ساتھیوں کے سلسلے میں کچھ اہمیت تھی تو صرف اتنی کہ امکان تھا کہ ماہ بانو اور ڈیرے پر موجود دوسری عورت شاید ان دونوں کے ساتھ تھیں۔

''ان دونوں کے نام اسلم اور جمرو ہیں سر!'' ڈی ایس پی منظور نے فوراً ہی جواب دیا پھر اسے مزید متاثر کرنے کے لیے بات کو اور بھی آگے بڑھایا اور بتانے لگا۔

''حمیداں نے اسلم نامی ڈاکو کے بارے میں بڑے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں سر! اس کا کہنا ہے کہ اسلم بڑا پڑھا لکھا اور شریف لڑکا ہے جسے حالات نے ڈاکو بنا دیا ہے لیکن ڈاکو بننے کے باوجود اس کی شرافت برقرار قائم ہے اور وہ عورت ذات کا احترام کرتا ہے۔ اس نے ڈیرے پر موجود کسی عورت کو کبھی غلط نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی بازاری عورت کے ساتھ ٹائم پاس کرنا پسند کیا ہے۔ البتہ جب سے ماہ بانو ڈیرے پر آئی تھی، وہ اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ساری دولت دے کر سردار کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ جب تک اس کی مرضی شامل نہیں ہو گی، ڈیرے کا کوئی شخص ماہ بانو کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

ڈی ایس پی منظور کی فراہم کردہ یہ معلومات اس کے لیے بڑی اہم تھیں۔ اسلم کے بارے میں معلوم ہونے والی باتوں نے اسے بھی چونکا دیا تھا اور اسے بے ساختہ ہی وہ ڈاکو یاد آیا تھا جو اس کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے والے گروہ کی کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ شخص اپنے لب و لہجے سے ہی تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑا مول لے کر ماریہ کی عزت لٹنے سے بچائی تھی۔ یہ دو خصوصیات بتا رہی تھیں کہ مفرور ڈاکو اصل میں وہ شخص ہے جس نے ایک بار اسے اغوا کر کے جنگل میں رکھا تھا اور دوسری بار اس کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے آیا تھا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو کہ اسلم اور جمرو کو ہر حال میں تلاش کریں۔ دونوں خواتین ان دونوں ہی کے ساتھ نکلی ہیں اور ان کا ملنا کتنا ضروری ہے، اس کے لیے میرا تمہیں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ اگر ہمیں ڈیرے پر موجود خواتین کی موجودگی کا علم نہ ہوتا تو یہ آپریشن ابھی کچھ عرصہ اور التوا میں پڑا رہتا۔'' اس نے سخت لہجے میں ڈی ایس پی کو جتایا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا سر!'' وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

''ایسا کر کے تم اپنے حق میں ہی اچھا کرو گے۔ ترقی کی منازل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتیں، یہ تو تم بھی جانتے ہو گے۔'' اس کو مزید دباؤ میں لے کر اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنی ٹیبل پر رکھے اس نوٹ پیڈ کا جائزہ لینے لگا جس پر نام کے ساتھ اس کی غیر موجودگی میں آنے والی فون کالز کے پیغامات درج تھے۔ عبدالمنان کو آج کسی ذاتی کام کے سلسلے میں جانا تھا اس لیے وہ اس کی اجازت سے دفتر سے جلدی نکل گیا اور تمام اہم پیغامات نوٹ کر کے اسکی میز پر چھوڑ گیا تھا۔

فون کرنے والوں کے نام اور پیغامات دیکھتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر اے اے منشا کے نام پر پڑی، وہ

چونک گیا۔ اے اے منشا کا مطلب تھا، آفتاب احمد منشا اور آفتاب کا فون دفتر کے نمبر پر آنے کا مطلب [illegible] کوئی ضروری کام ہے ورنہ وہ بے احتیاطی ہرگز بھی نہ کرتا اور اس کا موبائل آن ہونے کا انتظار کرتا۔ [illegible] اضطراری طور پر موبائل نکال کر سب سے پہلے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو [illegible] اور ایک نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہالو.....کون سالا بول رہا ہے؟.....صبح صبح میری نیند کیوں خراب کی ہے؟'' زبان کی لڑکھڑاہٹ [illegible] علاوہ اس کے جملے سے بھی ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے ورنہ پورا دن گزر جانے کے بعد صبح صبح اٹھائے [illegible] شکوہ نہ کرتا۔

''مجھے مسٹر منشا سے بات کرنی ہے۔'' امید نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ادھر کوئی انشا اور منشا نہیں ہوتا۔ یہ اپن کا نمبر ہے۔ اپن یعنی اے ایس آئی خالد۔'' دوسری طرف [illegible] جواب ضرور دیا گیا لیکن جواب دینے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ڈھنگ سے بات کرنے اور سوالوں [illegible] جواب دینے کے لائق نہیں ہے۔

شہریار نے بیزار ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا لیکن خود تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے آفتاب کے ساتھ [illegible] گزری ہے جو اس کا موبائل کسی اے ایس آئی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آفتاب کے موبائل کی کسی پولیس [illegible] کے پاس موجودگی کی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی وجہ ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کا موبائل جیب سے گر گیا ہو [illegible] اُچکے نے چھین لیا ہو۔ اگر بات اتنی ہی تھی تو خیر تھی لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی [illegible] مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ چودھری افتخار جیسا شخص اگر کسی کا دشمن ہو تو اس کے بارے میں کسی بھی [illegible] واقعے کا خدشہ ہی رہتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کے کتے، آفتاب اور کشور کی بُو سونگھتے [illegible] ان کی پناہ گاہ تک پہنچ گئے ہوں اور انہوں نے آفتاب کے ساتھ وہ سلوک کیا ہو کہ وہ کسی ہسپتال کے مُردہ [illegible] میں یا کم از کم شدید نگہداشت کے کمرے میں پڑا ہو اور اس کے پرس سے لے کر موبائل تک ہر شے پولیس [illegible] قبضے میں ہو.....اور یہ تو پولیس کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی مقتول، زخمی یا مظلوم فریادی کے مال پر اپنا پورا پورا حق [illegible] ہے۔ اس سے مخمور لہجے میں بات کرنے والا اے ایس آئی خالد بھی یقیناً پولیس کی صفوں میں موجود رہا [illegible] بدعنوان اہل کاروں میں سے ایک تھا۔ ورنہ ایک اے ایس آئی کی جائز تنخواہ میں نشے کی علت پالنے کی [illegible] گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ وہ جانے انجانے جیسے بھی اس عادتِ بد کا شکار ہوا تھا، یہ طے تھا کہ اپنی اس [illegible] پورا کرنے کے لیے اسے ناجائز طریقے ہی اپنانے پڑتے ہوں گے۔

بہر حال، اے ایس آئی کی عادات اور کردار فی الحال اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے تو آفتاب کی طرف [illegible] لاحق ہو گئی تھی۔ اس کی خبر گیری کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس شخص سے رابطہ کرتا جس کی مدد سے اس نے [illegible] خاص میں آفتاب کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ موبائل پر کال وصول کرنے والے اے ایس آئی خالد سے [illegible] وقت رابطہ کرنا بالکل فضول ہی تھا۔ وہ شخص ہوش میں ہوتا تو اسے انفارم کرنے کے لیے نہ سہی، اپنی معلو[illegible] میں اضافے کے لیے ہی سہی اس سے کوئی استفسار ضرور کرتا۔ لیکن وہ تو اپنی نیند خراب کیے جانے کے غم میں [illegible] تھا۔ نشہ اُترنے کے بعد اسے خود کو موصول ہونے والی فون کال یاد بھی رہتی یا نہیں، اس سلسلے میں کچھ بھی [illegible] سے کہنا مشکل تھا۔ تمام تر امکانات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اس اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ [illegible] جس کے ذریعے آفتاب کو گھر دلایا تھا۔ چھوٹے شہروں میں خبریں ویسے بھی جلد پھیلتی ہیں اور اسٹیٹ ایجنٹ واقفِ حال ہونے کا اس لیے بھی زیادہ امکان تھا کہ کسی حادثے کی صورت میں پولیس نے اگر اپنی تفتیش شر[illegible]



[illegible] تو وہ آفتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس اسٹیٹ ایجنٹ تک ضرور پہنچی ہو گی۔ [illegible] سوچ کر اس نے اسٹیٹ ایجنسی کا نمبر ملا ڈالا۔

''مجھے شمسی صاحب سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے ''ہیلو'' سنائی دیتے ہی اس نے اپنا مدعا [illegible] کیا۔

''بات کر رہا ہوں۔ آپ بولو کہ آپ کون ہو؟'' شمسی نے جواب دینے کے ساتھ ہی سوال بھی کیا۔

''میں شہریار عادل بات کر رہا ہوں شمسی صاحب!'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''ارے صاحب آپ.....میں تو خود آپ کو فون کرنے والا تھا۔ یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے [illegible] پاس دو پولیس والے آئے تھے اور مجھ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہے تھے جسے میں نے آپ [illegible] کہنے پر مکان دلایا تھا۔ مجبوراً مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑا۔ پولیس والوں سے پہلے کچھ لوگ اور بھی [illegible] تھے۔ وہ شہر کے چھٹے ہوئے غنڈے تھے، ان سے اپنی گردن بچانے کے لیے بھی مجھے آپ کے بارے [illegible] بتانا پڑا تھا۔ میرا خیال ہے آپ میری مجبوری کو سمجھیں گے اور برا نہیں مانیں گے۔'' اس کا نام سنتے ہی شمسی [illegible] گیا اور بغیر سیاق و سباق کے اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا۔

خود شہریار کے لیے اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اسٹیٹ ایجنسی سے اس کا [illegible] آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ خود اس حوالے سے خود سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو آسانی سے ٹال [illegible] تھا۔ غنڈوں کو تو خیر اسے جواب دہی کرنی ہی نہیں تھی۔ اگر وہ چودھری کے گرگے تھے تو اسے یہ معلوم ہو [illegible] نے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ آفتاب اور کشور کو اس کی سپورٹ حاصل ہے۔ یہ راز وہ پہلے ہی اس کے دفتر میں [illegible] فون آپریٹر کی صورت میں پائے جانے والے اپنے جاسوس سے جان ہی چکا تھا۔ رہی پولیس تو پولیس والوں [illegible] بھی وہ آرام سے یہ بات بتا سکتا تھا کہ واقفیت کی بنیاد پر آفتاب نے مکان کے حصول کے سلسلے میں اس سے [illegible] کی درخواست کی تھی چنانچہ اس نے انسانی ہمدردی کے ناتے اس کا یہ کام کروا دیا، باقی وہ آفتاب یا اس کی [illegible] کے ہر فعل و کردار سے بری ہے۔ اصل بات جو وہ جاننا چاہتا تھا، وہ یہ تھی کہ آفتاب کن حالات کا شکار ہے [illegible] اور اس نے آخر اسے کیوں فون کیا تھا، چنانچہ شمسی کی وضاحت کے جواب میں رسان سے بولا۔

''میں آپ کی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں شمسی صاحب! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن [illegible] یہ تو بتائیں کہ آخر ایسی کیا افتاد آ گئی جو شہر کے غنڈے اور پولیس بہ یک وقت میرے آدمی کو ڈھونڈنے نکل [illegible] کھڑے ہوئے؟''

''پورا چکر تو مجھے نہیں معلوم، بس اتنا پتہ چلا ہے کہ احمد کی بیوی، بچی کی پیدائش کی وجہ سے ہسپتال میں [illegible] داخل تھی۔ خود احمد بھی وہیں موجود تھا کہ اچانک ہی ہسپتال پر غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ دونوں میاں بیوی [illegible] حالت میں ہسپتال سے فرار ہو گئے اور جلدی میں اپنی بچی ہسپتال کی نرسری میں ہی چھوڑ گئے جہاں سے بچی [illegible] پراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ پولیس والے اس سلسلے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے مکان کا بھی [illegible] جائزہ لیا ہے جہاں سے انہیں احمد کے لیے ایک دھمکی آمیز پیغام ملا ہے لیکن پیغام سے یہ ظاہر نہیں کہ پیغام بھیجنے [illegible] والا کون ہے۔ البتہ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ پیغام کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ دشمن، احمد کے لیے اجنبی [illegible] نہیں ہے۔'' شمسی نے اپنی معلومات جلدی جلدی اس کے کانوں میں انڈیل ڈالیں۔

''ٹھیک ہے شمسی صاحب! آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اگر کسی نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔''

اس نے کال منقطع کردی اور آفتاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ فرضی نام کے ساتھ ایک چھوٹے قیام کرنے کے باوجود وہ اپنے دشمنوں کی نظر سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا اور ان لوگوں نے اسے نہ صرف وہاں بھاگنے پر مجبور کردیا تھا بلکہ اسے اس کی بچی سے بھی جدا کردیا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا کہ ہسپتال سے پراسرار طور پر غائب ہونے والی بچی چودھری کے گرگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اسی وجہ سے آفتاب نے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد اسے فون کیا تھا۔ لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ موبائل اس کے قبضے سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اب وہ صورت میں اس سے بات کرسکتا تھا کہ وہ خود اسے فون کرتا۔ ابھی تو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آفتاب میر ہی ہے یا وہاں سے نکل چکا ہے۔

ماہ بانو کی تلاش میں ناکامی کے بعد یہ دوسرا مسئلہ تھا جس نے اسے بری طرح ڈسٹرب کردیا۔ اچھے وسائل کا مالک ہونے کے باوجود وہ چند لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام تھا اور ان بے چاروں پر وطن کی زمین ہی تنگ پڑ گئی تھی۔

اس کے نزدیک اس مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر دیتا۔ ملک سے باہر نکلنے کے بعد آفتاب کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی نشریاتی ادارے میں ملازمت اختیار کرکے سکون سے زندگی گزار سکتا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے ضرور مشکل ہو جاتی۔ چھوٹے شہر اور سلیم گھرانے میں پلنے والی وہ لڑکی جانے بالکل مختلف ماحول میں اکیلی سروائیو کر بھی پاتی یا نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اسے ایک بھیڑیے سے بچاتے بچاتے اپنے ہاتھوں سے بھیڑیوں کے غول میں دھکیل دیتا۔ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے ایسے کسی خیال پر عمل پیرا ہونے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں اچھی طرح سوچنا ضروری تھا۔ پھر ابھی تو اصل میں ماہ بانو کا ملنا باقی تھا۔ وہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی؟ یہ خیال جب بھی دل میں آتا تھا، درد کی ایک لہر سی تن بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ وہ اسے چاہ کر پا نہیں سکا تھا لیکن اس کے خیر و عافیت سے رہنے کی پُرخلوص خواہش بڑی شدت سے رکھتا تھا۔ اس خواہش کو کامیابی حاصل ہوتی یا نہیں لیکن اس وقت ایک شکست کا سبب بننے والی ماریہ کا نمبر موبائل کی اسکرین پر اُبھرتے دیکھ کر بری طرح جھنجلا گیا۔ مگر دل نہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کرنی ہی تھی۔ سو مسلسل بجتی گھنٹی کا گلا گھونٹنے کے لیے ''یس'' کا بٹن پش کردیا۔

''کہاں غائب تھے آپ؟ آپ سے کسی طرح رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ گھر اور دفتر دونوں جگہ سے جناب کی غیر موجودگی کا پتہ چلا اور موبائل بھی آف کر رکھا تھا آپ نے۔ آخر ایسا کیا مسئلہ ہوگیا تھا کہ آپ رابطے کا ذریعہ بند کرکے بیٹھے تھے؟'' ماریہ کے لہجے میں بیویوں والے استحقاق کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کی شکایت اس کا حق تھا۔ بیوی کی حیثیت سے وہ جب چاہے، اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن اس کے اُلجھے ہوئے ذہن پر غصہ چھا گیا اور وہ جب بولا تو اس کا لہجہ کافی خراب تھا۔

''تمہیں مجھ سے ایسا کون سا کام آپڑا تھا کہ ہر طرف میری ڈھونڈ مچادی۔ میں تمہارا شوہر ہوں، کوئی پالتو کتا نہیں جس کی ایک ایک حرکت تمہاری مرضی کے تابع ہو۔ میری بہت سی ذاتی اور پیشہ ورانہ مصروفیات ہیں جن کی تفصیل سے میں تمہیں آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ اس پر تقریباً اُلٹ ہی پڑا۔ گھر پر اور دفتر میں دونوں جگہ اسے ماریہ کے فون کے بارے میں علم ہوگیا تھا لیکن اس نے ان فون کالز کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی اور یہی سوچا تھا کہ فرصت ملنے پر آرام سے اس سے بات کرلے گا۔



آپ کا موڈ اتنا آف کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کی۔ میں آپ کی بیوی ہوں ق ہے کہ میں جب چاہے، آپ سے رابطہ کرسکوں۔'' اس کی خفگی کو محسوس کرکے ماریہ نے بھی جوابی خفگی س پر اسے اپنے رویے کی خرابی کا احساس بھی ہوگیا۔ لیکن ماہ بانو کا معاملہ ایسا تھا جس پر وہ ماریہ سے ات کرنے میں گھبراتا تھا اور کھل کر کچھ بتائے بغیر کسی عام سی لڑکی کے لیے بھٹکتے پھرنے کی کوئی دلیل ں جاسکتی تھی چنانچہ جارحیت کو بہترین مدافعت سمجھتے ہوئے اس نے اپنا لہجہ تبدیل کرنا مناسب نہیں سمجھا ان میں بولا۔

میں جانتا ہوں کہ تم میری بیوی ہو۔ اس بات کو بار بار یاد دلا کر مجھے اری ٹیٹ کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ میں تمہیں خود سے رابطہ کرنے سے بھی نہیں روک رہا ہوں لیکن اس بات کی بھی اجازت نہیں دے تم میرے لمحے لمحے پر نظر رکھو۔ بیوی اور تھانے دارنی میں کچھ فرق ہونا چاہئے۔ بہتر ہے کہ تم یہ فرق سمجھ لو ہ مہذب لوگوں کی طرح ایک دوسرے کی شخصی آزادی کو سلب کیے بغیر پُرسکون زندگی گزار سکیں۔'' اسے ر دینے کے بعد اس نے مزید بات جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اپنے بگڑے ہوئے موڈ کو پوری طرح بحال بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ی اسکرین پر کسی اور کال کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا جگو کا نمبر دیکھا اور کال ر لی۔

''سلام صاحب! مجھے ملوم ہے کہ میں نے آپ کی فرمائش پوری کرنے میں خاصی دیر کردی ہے لیکن ایسی ں کہ آپ سن کر خوش ہو جائیں گے۔'' اس کی آواز سنتے ہی جگو نے بولنا شروع کیا تو اس کا چڑھا ہوا پارا دھیرے دھیرے نیچے آنا شروع ہوگیا۔ مسلسل مختلف لوگوں سے جاری رہنے والی ٹیلی فونک گفتگو میں یہ پہلی جو کال کرنے والے نے اسے کسی خوشخبری کے بارے میں بتایا تھا۔ ورنہ اب تک اس کی جس کسی سے چیت ہوئی تھی، کوفت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

''اگر ایسی بات ہے تو فوراً خبر سنا ڈالو۔ یہاں اچھی خبروں کا سخت قحط پڑا ہوا ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے ہوگیا۔

''تھوڑی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ تفصیل کے بغیر جلدی سے خبر سنانے میں کچھ نہیں رکھا ہے۔'' جواباً جگو اتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کھردرے مزاج کا غنڈہ جو ایک سیاسی پارٹی کے لیے غنڈہ گردی کرتا تھا اور سائل رکھتا تھا، اس کے سامنے موم ہوا تھا تو صرف اس احسان کے بدلے جو اس نے کیا تھا۔

وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تفصیل ہی سنا دو۔ میں تمہاری تفصیل کے لیے ال لوں گا۔''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری پر ایک زوردار ضرب لگانی ہے۔ میں چاہتا تو اپنے آدمی پیر آباد بھیج بھی کرواسکتا تھا لیکن وہ کارروائی بس ایسی ہی ہوتی جس سے چودھری کو مالی نقصان پہنچتا یا پھر دو چار لڑکے زخمی ہو جاتے۔ اور یہ تو آپ کو بھی ملوم ہے کہ چودھری کے پاس ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہیں اس لیے میں نے ذرا الگ طریقہ اپنایا اور اپنا ایک بندہ چودھری کے خاص کارندے شیدے کے پیچھے لگا ب میں آپ کو ایک مزے کی گل بتاؤں کہ شیدا جو ہے، وہ چودھری کے حکم پر اس کی بھاگی ہوئی دھی اور اس ہر کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔ اب جو اس نے میرپور خاص میں ان لوگوں پر ہاتھ ڈالا تو میرے بندے مجھے خبر کردی۔''

جگو کی بات سن کر شہریار کی پیشانی پر تفکر آمیز بل پڑ گئے اور آفتاب کا موبائل اس کے پاس موجود [illegible] کا کچھ کچھ سبب سمجھ آنے لگا لیکن ساتھ ہی ذہن میں ڈھیروں اندیشے بھی جاگ اُٹھے۔ چودھری کے [illegible] میر پور خاص میں آفتاب اور کشور تک جا پہنچنے کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پھر آفتاب کا موبائل تھا [illegible] کسٹڈی میں جس کا مطلب تھا کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ جانے کیا نکلا تھا۔ [illegible] بھی سکتا تھا کہ اس ہنگامے میں آفتاب زخمی یا پھر ہلاک ہو گیا ہو اور موبائل سمیت اس کی ساری زیر [illegible] اشیاء پولیس کی تحویل میں چلی گئی ہوں۔ اپنی تمام تر بے چینی اور تشویش کے باوجود وہ جگو کے ٹوکے [illegible] بیان کردہ تفصیلات سنتا رہا۔

''مجھے جب پتہ چلا کہ شیدا، چودھری کی بیٹی اور داماد پر ہاتھ ڈالنے جا رہا ہے تو میں نے اپنے آدمی [illegible] کہہ دیا کہ شیدے کو کامیابی نہیں ہونی چاہیے۔ دشمن کو نقصان پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ دشمن [illegible] دشمن سے دوستی نبھائی جائے۔ بدقسمتی سے میرا آدمی اکیلا تھا اور اسے اپنے ساتھیوں کو جمع کرنے میں تھوڑا [illegible] لگ گیا۔ اتنی دیر میں شیدے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس ہسپتال پر حملہ کر دیا جدھر چودھری کی [illegible] داخل تھی۔ قسمت سے وہ اپنے خاوند کے ساتھ ادھر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اس کی بچی ادھر [illegible] کی نرسری میں ہی رہ گئی۔''

جگو داستان کے اس موڑ پر پہنچا تو شہریار کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہی ایک اطمینان بھری سانس [illegible] ہوئی۔ یہ اطمینان آفتاب کے زندہ سلامت ہونے کی خبر سن کر محسوس ہوا تھا اور اب وہ موبائل کے [illegible] تحویل میں چلے جانے کے سلسلے میں بھی بالکل درست اندازہ لگانے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ [illegible] دوڑ میں موبائل آفتاب کی جیب سے گر گیا ہو گا اور بعد میں پولیس کو مل گیا۔

''چودھری کے گرگے بھی اسی کی طرح ظالم ہیں۔ جب ماں باپ ہاتھ نہیں آئے تو انہوں نے [illegible] ہسپتال کی نرسری سے غائب کر لی۔'' جگو کی داستان پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ ''اس وقت [illegible] آدمی اپنے ساتھیوں کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس نے فون پر مجھے تفصیل بتائی تو میں نے اس سے کہا کہ [illegible] لوگوں سے چھین لو اور ان کا حلیہ اتنا بگاڑ دو کہ چودھری انہیں پہچان بھی نہیں سکے۔ میرے خیال میں وہ لوگ [illegible] کافی دن تک بستر سے اُٹھ کر اپنے آقا کا کام کرنے کے لائق نہیں ہو سکیں گے۔''

جگو نے واقعی اسے ایسی خبر سنائی تھی کہ سن کر اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ وہ پہلے بھی چودھری کے ایک [illegible] گرگے بالے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور کر کے بستر سے لگا چکا تھا اور اب دوسرے کے بارے میں بھی [illegible] اطلاع دے رہا تھا۔ بے شک چودھری کے پاس بندوں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنے غنڈوں میں سے خاص [illegible] غنڈوں سے محروم ہونے پر وہ تلملاتا تو ضرور اور کچھ نہ کچھ کمزور بھی پڑ جاتا۔ دوسرے وہ اس لیے بھی خوش [illegible] آفتاب اور کشور کی بیٹی، چودھری کے قبضے میں جانے سے بچ گئی تھی۔ وہ بچی کو ہسپتال سے اٹھائے جا [illegible] مطلب سمجھتا تھا۔ بچی کے ذریعے چودھری آفتاب کو بلیک میل کر کے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا [illegible] ایک بار آفتاب اس کے ہاتھ آ جاتا تو پھر وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ منتقم مزاج چودھری کے [illegible] تو آفتاب نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور جسارت کی پاداش میں وہ آفتاب کی تکا بوٹی کر ڈالنے کے [illegible] بے چین تھا۔

''بچی کہاں ہے؟'' اس نے جگو کی داستان سننے کے دوران پہلی بار کوئی سوال کیا۔

''بچی فی الحال کراچی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل ہے۔ بہت کمزور بچی ہے، اس پر سے اس



[illegible] سلوک ہوا اس سے وچاری اور بھی ڈھے گئی۔ ہسپتال والوں نے کہا ہے کہ کم سے کم آٹھ دس دن ہسپتال [illegible] گے، تب جا کر اس میں کچھ بہتری آئے گی۔ میں نے سوچا آپ کو ساری تفصیل سنا دوں، فیر آپ جو [illegible] گے وہ کر لیں گے۔ بچی کے ماں باپ کا پتہ ملوم نہیں ہے۔ جانے وہ لوگ میر پور سے نکل کر کدھر چلے [illegible] میں کوشش کروں گا کہ ان کا پتہ ٹھکانہ ملوم کر کے آپ کو بتا دوں۔'' جگو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''تھینک یو جگو! تم نے بڑا کام کیا ہے۔ آفتاب کا ایڈریس معلوم کر سکو تو اچھی بات ہے ورنہ تو مجھے امید [illegible] وہ خود بھی مجھ سے رابطہ کرے گا۔ تم مجھے ہسپتال کا نام پتہ وغیرہ نوٹ کروا دو۔ اگر آفتاب نے مجھ سے [illegible] تو میں اسے انفارم کر دوں گا۔ اور ہاں، ہسپتال کا جو بل وغیرہ بنے، وہ بھی مجھے بھجوا دینا۔ بل میں پے کر [illegible]۔'' اس نے جگو سے کہا۔

''بل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اے سی صاحب! میرے پاس اتنا تو ہے کہ میں بل کے چند ہزار بھر سکوں۔'' [illegible] بات سن کر جگو فوراً بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بل مجھے ہی ادا کرنا چاہیے۔ تم میرے کہنے پر میرے لیے جو کچھ کر رہے ہو، میرے [illegible] کافی ہے۔ میں تم پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم اپنی رقم اپنے بال بچوں پر خرچ کرو، یہی [illegible] ہو گا۔ بلکہ بات نکل ہی گئی ہے تو میرے خیال میں، میں اپنے ذہن میں موجود ایک بات تم سے کہہ ہی [illegible]۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات پر غور کرو گے۔'' اس نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی۔

''آپ کہہ کر تو دیکھیں اے سی صاحب! مجھے ملوم ہے کہ آپ نے کوئی بھلی گل ہی سوچی ہو گی۔ آپ تو [illegible] دُوجے کا بھلا سوچنے والے آدمی۔'' جگو نے اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ شہر لے جا کر کسی اچھے اسکول میں داخل کرواؤ۔ یہاں گاؤں [illegible] اس کی اچھی تعلیم و تربیت ہونا مشکل ہے۔ تمہارے پاس مواقع ہیں تو پھر کیوں تم اپنے بیٹے کو یہاں چھوڑ کر [illegible] مستقبل خراب کر رہے ہو؟ بچہ اچھے اسکول میں پڑھے گا تو کارآمد شہری بنے گا۔ ورنہ دوسروں کے لیے [illegible] بت ہو گا۔'' اس نے اپنے دل میں پلتا خیال جگو کے سامنے ظاہر کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی سوچتا ہوں اے سی صاحب! لیکن اس کی ماں کا سوچ کر عمل نہیں کر پاتا۔ میں بچے کو [illegible] ساتھ لے جاؤں گا تو وہ تنہا رہ جائے گی۔ میں دیکھنے میں جتنا بھی ظالم سہی، پر ہوں اصل میں نرم دل کا۔ [illegible] سے اس کی ماں کا تڑپنا برداشت نہیں ہو گا اس لیے اپنی سوچ پر عمل نہیں کر پاتا۔'' اس نے وجہ بیان کرتے [illegible] اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں۔ تم بچے کی ماں کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جا کر کرائے کے کسی گھر میں رکھ سکتے [illegible] آخر تمہاری دوسری بیوی بھی تو وہاں رہ رہی ہے، تم پہلی کو بھی لے جاؤ۔ میں بہر حال اس سے زیادہ تمہارے [illegible] معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ ایک خیال میرے ذہن میں تھا، وہ میں نے تمہارے سامنے بیان کر [illegible] آگے تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں۔'' وہ کسی کی ذاتیات میں ضرورت سے زیادہ دخل دینا [illegible] سب نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اب بھی فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ کی گل میرے دل کو لگی ہے اے سی صاحب! میں اس پر غور کروں گا، فیر اپنا فیصلہ سناؤں گا۔'' جگو دھیمے لہجے میں جواب دیا جس کو سن کر اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور ہسپتال کا فون نمبر اور پتہ وغیرہ لے کر [illegible] منقطع کر دیا اور فوراً ہی اپنے دائیں جانب رکھے گلاس کو اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ مسلسل ہونے والی ٹیلی فونک [illegible] گفتگو نے [illegible] کا حلق خشک کر دیا تھا اور پھر ایک اندرونی تھکن کا بھی احساس تھا۔ جس کی خاطر، جس کی [illegible]

میں اس نے اتنے بڑے آپریشن کا بندوبست کروایا تھا، وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور شاید واقف بھی نہیں تھا کوئی اتنی شدت کے ساتھ اسے کھوج رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

چودھری چوٹ کھائے ہوئے درندے کی طرح اِدھر سے اُدھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے وہ غرا رہا ہو۔

پے در پے ناکامیوں نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر حکم کو پورا ہوتا دیکھنے کا عادی تھا لیکن اب جانے اس کے ساتھ کیا ہونے لگا تھا کہ تمام تر کوشش کے باوجود اس کے احکامات کی تعمیل نہیں ہو پاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی راجدھانی میں اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ پہلے کشور نے آفتاب کے ساتھ نکاح کر کے حویلی سے فرار ہو کر اس کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ آج تک اس چوٹ کی شدت سے بلبلاتا پھرتا تھا۔ پھر وڈی چودھرائن نے سازشوں کے جال بُننے شروع کر دیئے۔ یہ وڈی چودھرائن کی ہی سازش تھی کہ فریدہ زندہ سلامت اولاد کو جنم نہ دے سکے اور اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلا جائے۔

قدرت کی مہربانی سے چودھرائن کی سازش ناکام رہی اور فریدہ اور اس کا بچہ دونوں ہی بچ گئے۔ وہ دونوں ابھی ہسپتال میں ہی تھے اور چند دن میں واپس آنے والے تھے۔ چودھری کو اس سازش سے فریدہ کے بھائی چودھری بختیار نے باخبر کیا تھا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ وہ فریدہ کو اس کے ساتھ میکے بھجوا دے۔ وہ اپنی بہن کی جان حویلی میں خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ چودھری نے وڈی چودھرائن کو اس کے مقام کے باوجود اس جرم کی پاداش میں حویلی کے تہ خانے میں ڈلوا دیا۔ تہ خانے کی صعوبتوں میں وڈی چودھرائن نے نہ صرف اپنا جرم تسلیم کیا بلکہ یہ انکشاف بھی کر ڈالا کہ ماہ بانو کو حویلی سے فرار کروا کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچانے کا کارنامہ بھی اسی کا ہے جو اس نے اپنے بڑے داماد چودھری اشرف شاہ کی مدد سے سرانجام دیا تھا۔

اس انکشاف پر چودھری بڑا بھنّایا۔ اگر اسے شروع میں ہی یہ بات پتہ چل جاتی تو وہ ڈاکوؤں کے سردار سے سودے بازی کر کے خود ماہ بانو کو حاصل کر لیتا لیکن افسوس کہ اسے یہ سب آپریشن شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا تھا اور اس موقع پر وہ اپنے سارے اختیارات کھو چکا تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے چودھرائن کو خوب زدوکوب کیا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر تو واپس آنے سے رہا۔ دوسری طرف وہ سادھو بھی غائب تھا جسے اس نے شہریار کو ہلاک کرنے کا کام سونپا تھا۔ پولیس میں موجود اپنے مخبروں کے ذریعے اسے آپریشن کی ساری تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ ان تفصیلات میں بالکل اچانک شہریار کے موقع پر پہنچ جانے کا ذکر بھی موجود تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے کا مطلب تھا کہ سادھو نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور شہریار کو قتل کرنے کے بجائے اسے ڈیرے تک پہنچا کر غائب ہو گیا۔

چودھری کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپریشن کے دوران ڈیرے پر اور اس کے اردگرد کسی لڑکی کو تلاش کیا جاتا رہا تھا اور یہ کام شہریار کے حکم پر کیا جا رہا تھا لیکن لڑکی ہنوز لاپتہ تھی۔ چودھری اتنا عقل مند تو تھا ہی کہ اس بات کو سمجھ سکتا کہ شہریار جس لڑکی کو تلاش کروا رہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ یقیناً اسے کسی ذریعے سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔ شہریار کی اس باعلمی پر بھی وہ بری طرح تلملایا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ حویلی کا ایک راز تھا جس کے شہریار کے علم میں ہونے کا مطلب تھا کہ حویلی میں اس کا کوئی ایسا مخبر موجود



اسے یہاں کی خبریں دیتا ہے۔

اس سوچ کے بعد جہاں وہ اس مخبر کو پکڑنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا، وہیں اس کے دل میں موجود چودھرائن کے لیے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے وڈی چودھرائن کو اس وقت تک کوڑے لگواتا جب تک وہ اپنی جان سے نہ چلی جاتی۔ لیکن وہ اندر کی بات اندر ہی دبانے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی عزت بیچ چوراہے پر نہیں لے جا سکتا تھا۔ دوسروں کی عورتوں کو برہنہ کر کے گاؤں میں گھمانے والے کی ناک اپنی عزت کے معاملے میں بہت لمبی تھی لیکن وہ اپنے مجرموں کو معاف کر دینے کا بھی عادی نہیں تھا۔ وڈی چودھرائن کے لیے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اذیت اور تکلیف میں گزارے گی۔ اس جیسی تعیشات کی عادی عورت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے ہر آسائش سے محروم کر کے تہ خانے کی تاریکی میں رُوکھی سوکھی کھا کر زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔

وڈی چودھرائن کے لیے واقعی وہ سزا بڑی سخت تھی اور وہ اُلٹے سیدھے کھانوں کی بدولت پیٹ کی بیماریوں کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئی تھی لیکن چودھری کو اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ فی الحال وہ وڈی چودھرائن کے چاہنے والوں اور خود اپنی ہی اولاد کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ورنہ تو شاید اب تک چودھرائن کی موت کا حکم ہی صادر کر چکا ہوتا۔ اب بھی اس نے چودھرائن کے شدید بیماری کے باعث بیرونِ ملک علاج کے لیے روانہ ہونے کا عذر پیش کر کے سب کے منہ بند کر دیئے تھے۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بہانہ زیادہ دن نہیں چل سکے گا اور اس سے وڈی چودھرائن کی علاج گاہ کا نام پتہ بتانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اس نے چودھرائن کے بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اس لیے ابھی اسی طرح کام چلا رہا تھا۔ فیصلہ ہو جاتا تو پھر وہ آگے منصوبہ بندی کر کے دوسروں کے سامنے کوئی کہانی پیش کرتا۔ اس کی پیش کردہ کہانی کو سچ سمجھا جاتا یا نہیں اس کی طاقت اور اختیار کے سامنے سب ہی سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے۔

فی الحال وہ چودھرائن والے مسئلہ پر سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ دیر قبل ہی شیدے اور اس کے ساتھیوں کی ناکامی کی خبر ملی تھی۔ وہ لوگ آفتاب اور کشور کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے اور پھر یہ اطلاع بھیجی تھی کہ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ لوگ ان کی بچی کو اپنے ساتھ لے کر آ رہے تھے۔ چودھری کا خیال تھا کہ بچی کو چارے کے طور پر استعمال کر کے وہ اپنے مفرور مجرموں کو اپنے قدموں میں جھکانے پر مجبور کر دے گا لیکن پھر اچانک ہی شیدے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ آخری اطلاع تک بچی اس کے قبضے میں آ چکی تھی اور وہ میرپور سے روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ اس سے رابطہ ٹوٹ گیا اور اب کئی گھنٹوں بعد معلوم ہوا تھا کہ شیدا اور اس کے ساتھی شدید زخمی حالت میں ہائی وے پر پڑے ملے تھے جہاں سے ان کی ایک گشتی پارٹی نے انہیں ہسپتال پہنچایا۔ ہسپتال میں ایک زخمی چل بسا تھا جبکہ باقی زیرِ علاج تھے۔ ان کا علاج زخمیوں سے چودھری کا تعلق بنتا تھا چنانچہ اسے پولیس کے ساتھ مُک مُکا کرنا پڑا اور خاصی بڑی رقم خرچ کر کے اس معاملے کو دبائے رکھنے میں کامیاب ہوا۔

ان حالات میں اس کا طیش میں ہونا قابلِ فہم تھا۔ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اور یہ بات سامنے آئی تھی کہ بچی کو کوئی دوسری پارٹی لے اُڑی ہے۔ اس دوسری پارٹی کا تعلق کس سے تھا، یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی تھی لیکن یہ تو واضح تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس کے مخالفین میں سے ہے۔ اور اس کے مخالفین میں آج کل سب سے اوپر شہریار کا ہی نام تھا۔ شہریار کے آفس میں اس کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دینے والے ٹیلی فون آپریٹر نے اس سلسلے میں اپنی واقفیت سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس خدشے کا بھی

اظہار کیا تھا کہ شاید اسے ایک مخبر کی حیثیت سے پہچان لیا گیا ہے اور دفتر کے فون سے کوئی ضروری کال کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال، وہ اس معاملے میں سو فیصد پُر یقین نہیں تھا اس لیے اسے اپنی جگہ ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

حالات و واقعات کا یہ سارا تسلسل چودھری افتخار شاہ کے لیے ناخوشگواری اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے اس کا غضب سمجھ میں آنے والا بھی تھا۔ شدید غصے اور طیش کے باعث اس کا بلڈ پریشر کافی ہائی ہو گیا لیکن وہ خود پر قابو پانے میں ناکام تھا اور منشی کی کئی بار کی استدعا کے باوجود دوا کھانے پر بھی تیار نہیں تھا۔ اس کی کیفیت میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر ڈیوڈ کا نام اُبھرا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کے بل پڑ گئے لیکن بہرحال ڈیوڈ ایسا بندہ تھا جس سے وہ خود بھی دبتا تھا اور اس کی کال کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ بادل ناخواستہ ہی سہی، کال ریسیو کر لی۔

''کیا بات ہے؟..... کیا بات کرنے کا موڈ نہیں تھا؟'' ڈیوڈ جیسے چالاک اور ہوشیار شخص سے اس کی آواز میں موجود ناگواری کی خفیف سی جھلک بھی چھپ نہیں سکی اور اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ذرا اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہوگا۔'' چودھری نے وضاحت پیش کی لیکن لہجے کو خوشگوار بنانے میں بہرحال کامیاب نہیں ہو سکا۔

''اوکے، تمہارے مسائل تمہارا مسئلہ ہیں ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات ہمارے کام پر اثر انداز ہوں ہمارا کام بہت ہی نازک ہے، اس لیے تمہیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔''

ڈیوڈ کے لہجے میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی۔ چودھری اُس کے انداز پر اندر اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور صرف اتنا بولا۔ ''میں اس بات کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اب تمہارے پاس شکایت کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہی۔ تمہیں یقیناً معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ جنگل میں ہونے والا آپریشن کس انداز میں ہوا اور پولیس تمہارے پروجیکٹ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکی۔

''ہاں، مجھے اس بارے میں سب معلوم ہے اور خوشی ہے کہ تم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اگر پولیس والے اس طرف کا رخ کر لیتے تو ہمیں خاصا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں تمہاری اور عابد انصاری کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ عابد انصاری نے بھی بڑا کام کر دکھایا اور افیم کی پہلی کھیپ بڑی آسانی سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ سننے میں یہی آ رہا تھا کہ جب سے شہریار عادل، اے سی کی پوسٹ پر آیا ہے، علاقے سے کچھ بھی نکال لے جانا مشکل ہو گیا ہے۔ تم تو خود حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ تمہارا لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ والا بزنس تو اے سی نے بالکل ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا نا۔'' ڈیوڈ کا انداز مضحکہ اُڑانے والا تھا اور چودھری کو اپنے انداز برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی، سو تلملا کر رہ گیا اور اپنے بڑبولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اے سی کی کیا حیثیت ہے۔ میں چاہوں تو اس کل کے لڑکے کو مچھر کی طرح مسل کر رکھ دوں۔ لیکن ہمیشہ اس کے بزرگوں سے اپنے پرانے تعلقات کا خیال آ جاتا ہے۔''

''اوہ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں رواداری کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں بڑا حسابی کتابی بندہ پایا ہے۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ تم اپنی آن اور دولت کے علاوہ بھی کسی چیز کو اہمیت دیتے ہو۔'' ڈیوڈ نے اس پر طنز کا ایک اور تیر پھینکا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو اس کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کر لیتا ورنہ ایک آقا کی طرح جس لہجے میں چاہتا گفتگو کرتا۔



''میرا خیال ہے تم یہ ساری فضول باتیں چھوڑ کر مطلب کی بات کرو۔ تم نے کسی کام کے بغیر صرف مجھ سے کہیں لڑانے کے لیے تو فون نہیں کیا ہوگا۔'' اس بار چودھری کا میٹر پوری طرح گھوم گیا چنانچہ وہ کڑوے لہجے اور بداخلاقی سے بولا۔

''تم تو ناراض ہو گئے یار! میں نے تو تمہیں شاباش دینے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہاری حکمت عملی واقعی بڑی زبردست ثابت ہوئی اور پولیس نے اتنا بڑا آپریشن مختصر مدت میں نمٹا لیا۔ اگر پولیس زیادہ عرصہ جنگل میں رہتی تو ہمارے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔''

''تمہیں اس خطرے سے بچانے کے لیے میں نے بڑی قربانی دی ہے۔ گرفتار ہونے والے ڈاکو میرے نمک خوار تھے اور مشکل حالات میں میرے بڑے کام آتے تھے۔'' اس نے احسان جتایا۔

''قربانی کا نام نہ لو۔ تم نے پورا حساب کتاب کر کے ہی قدم اٹھایا ہوگا۔ ہم سے ہونے والے فائدے کا حساب یقیناً تمہارے ڈاکو دوستوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوگا جو تم نے ہمارے مفادات کا خیال ان سے زیادہ رکھا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارے ان نمک خواروں کے قبضے میں تمہاری من پسند ماہ بانو بھی تھی۔ آپریشن کے دوران کوشش کے باوجود تلاش نہیں کیا جا سکا۔ خوب نمک حلالی کا مظاہرہ کیا تمہارے نمک خواروں نے۔ اپنے گاڈ فادر کی محبوبہ کو ہی لے اُڑے۔'' دور بیٹھ کر بھی اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔

''مجھ سے نمک حرامی کر کے انہوں نے اپنے حصے کی سزا پا لی ہے اور میں ان اصل مجرموں تک بھی پہنچ گیا ہوں جنہوں نے میرے وفاداروں کو نمک حرامی پر اُکسایا تھا۔ جلد وہ مجرم بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔'' چودھری نے سنگین لہجے میں اس کے طنز کا جواب دیا۔

''کیا تم مجھے ان اصل مجرموں کا نام بتانا پسند کرو گے؟'' ڈیوڈ کے لیے یقیناً یہ ایک انکشاف تھا کہ چودھری کے نمک خوار ڈاکوؤں نے کسی کے اُکسانے پر ماہ بانو کو اپنے ڈیرے پر رکھا تھا، چنانچہ تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں، وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' چودھری نے سختی سے انکار کر دیا۔

''اوکے، ایز یو وش۔ میں نے تمہیں اس وقت شاباش دینے کے علاوہ ایک اہم معاملے پر گفتگو کے لیے فون کیا تھا۔ خوامخواہ ہماری گفتگو طول پکڑ گئی اور فضول بحث میں اُلجھ کر اصل بات رہ گئی۔'' اس کے انکار کا برا مانے بغیر ڈیوڈ نے یک دم ہی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

''بولو، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔ مجھے کئی اہم کام دیکھنے ہیں۔'' ڈیوڈ پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے وہ رعونت سے بولا جس کی اس نے پروا نہیں کی اور بے نیازی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم سے ہمارے کاروباری مراسم مزید گہرے ہو جائیں۔ پوست کی کاشت کے سلسلے میں تم ہمارے ساتھ جو تعاون کر رہے ہو، اس کے علاوہ بھی ہم تمہارے ساتھ مزید کنٹریکٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیا؟'' چودھری کی رال ٹپکی۔ بے پناہ خاندانی دولت کے علاوہ وہ غریب مزارعوں کا خون چوس کر بھی خوب کماتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی دولت کے لیے ہوس کم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بدنیتی کا دوزخ ہمیشہ دل من مزید کا نعرہ ہی لگاتا رہتا تھا چنانچہ ڈیوڈ نے مزید بزنس کی بات کی تو اس کا ہوس پرست ذہن فوراً آنے والی مزید دولت کا اندازہ لگانے لگا۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا ایک جوتوں کا کارخانہ بھی ہے۔ ہم تمہارے اس کارخانے میں ایک لیب

بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیب میں افیم سے ہیروئن تیار کی جائے گی۔ اس کام کے لیے ہم اپنے دو ایکسپرٹس بھجوائیں گے۔ ہمارے وہ ایکسپرٹس پہلے ہی ایک علاقے میں کام کر رہے ہیں لیکن اب وہاں حالات خدوش ہو چکے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپریشن میں فورس ان علاقوں میں داخل ہو چکی ہے۔ دوسری طرف ایجنسیاں الگ پیچھے لگی رہتی ہیں۔ منشیات کے معاملے میں ان علاقوں کی بدنامی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ وہاں رہ کر خود کو نظروں سے بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم یہ نیا سیٹ اَپ تیار کر رہے ہیں۔'' ڈیوڈ کی اس مختصر بریفنگ نے چودھری پر بہت سے عقدے کھول دیئے۔

اسے سمجھ آنے لگا کہ ڈیوڈ نے اس کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ پیر آباد سے متصل جنگل اپنے خصوصی جغرافیائی، ارضی اور موسمی حالات کی وجہ سے اس قابل تھا کہ وہاں آسانی سے پوست کی کاشت کی جا سکے۔ وہاں بہتا تھا اور نہر کا رواں پانی بھی۔ اس کے علاوہ خاصا طویل پہاڑی سلسلہ الگ تھا۔ ڈیوڈ کے ماہرین نے چھوٹی موٹی جینیاتی تبدیلیاں کر کے آرام سے وہاں پوست کے پودے کو کاشت کے قابل بنا لیا تھا۔ بے حد خفیہ طریقے سے کاشت کی گئی اس فصل سے آرام سے افیم حاصل کی جاتی اور پھر اس کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن بننے کے عمل سے گزر جاتی۔ اگر اس عمل کے دوران کسی قسم کی ناگوار بُو وغیرہ پیدا بھی ہوتی تو جوتوں کے ایک بڑے کارخانے میں جہاں چمڑا رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا، اس بُو کو الگ سے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کارخانے کی وجہ سے جو کور ملتی وہ الگ تھی۔ برسوں سے کام کرتے ہوئے ایک کارخانے پر کون شک کرتا تھا کہ وہاں ہیروئن کی تیاری جیسا مہلک اور خطرناک کام ہو رہا ہے۔ وہ قومِ یہود کے اس نمائندے کی ذہانت اور منصوبہ سازی پر دل ہی دل میں عش عش کر اُٹھا۔ وہ ایسے تباہ کُن دماغ کے مالک تھے، جب ہی تو اتنی تھوڑی سی تعداد کے باوجود دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ امریکہ جیسی سپر پاور بھی ان کے اثر سے محفوظ نہیں تھی۔

''اس کام میں میرے لیے بہت خطرات ہیں۔ اگر کسی وقت سرکاری ایجنسیوں کی نظر پڑ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میری خاندانی عزت اور نیک نامی داؤ پر لگ جائے گی۔'' اپنے بھاؤ بڑھانے کے لیے اس نے فوری طور پر ہامی بھرنے کے بجائے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے حصے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ ہیروئن جیسا زہر کہاں کہاں پھیلے گا اور کس کس کی زندگیاں برباد کرے گا، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ دولت کا ایسا وفادار پجاری تھا جس کی نظریں اپنی مایا دیوی سے ہٹ کر دائیں بائیں کہیں بھی نہیں پڑتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس دیوی کے قدموں میں ہی سر جھکائے رکھنے کو زندگی کی معراج سمجھتا تھا یہ سوچے بغیر کہ زندگی کا دورانیہ ہے ہی کتنا طویل۔ خصوصاً اس جیسے آدمی کے لیے جو تیزی سے ادھیڑ عمری کی منازل طے کرتا ہوا بڑھاپے کی طرف گامزن تھا۔ یوں تو موت کا کوئی وقت معین نہیں اور وہ اپنا وار کر لے، آئے تو ماں کی کوکھ میں پلتے بچے سے لے کر گبھرو جوان تک کسی سے رعایت نہیں کرتی لیکن انسان کو عمر کی منازل طے کرتے ہوئے بھی موت کا خیال ذرا مشکل سے آتا ہے، پر بڑھاپے میں تو سب ہی اس کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ جانے کب موت جسم سے روح کو جھپٹ کر لے جائے اور زندگی کا سارا ہنگامہ پل بھر میں معدوم ہو جائے۔ مگر وہ چودھری افتخار عالم تھا جو زندگی کے ایک ایک لمحے سے کیفِ نشاط نچوڑ لینا چاہتا تھا اور شاید دولت کا کیف ہر شے سے بڑھ کر تھا۔ یہ انسان کے پاس ہو تو وہ سمجھتا ہے دنیا اس کی مٹھی میں ہے۔ چودھری بھی یہ سوچے بغیر کہ وہ چاہے اپنی مٹھی میں ساری دنیا کی دولت سمیٹ لے، آخر کار خالی ہاتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گا، اپنے لیے دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف تھا



کے اس ڈھیر میں مگن اسے تیزی سے ختم ہوتی عمر کی نقدی کا احساس ہی نہیں تھا۔

''خطرات میں تم پہلے سے ہی گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری عزت داؤ پر لگنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے آدمیوں کی مدد سے پوست کاشت کروا رہے ہو۔ کبھی اس جرم میں بھی پکڑے گئے تو جان چھڑانا مشکل ہو گا۔ لیکن یہ تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ تمہارے ملک میں یہ مشکل دولت سے آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ اور عیش کرتے رہو۔ کبھی پکڑے بھی گئے تو دولت کے بل بوتے پر آسانی سے بچ نکلو گے۔'' ڈیوڈ نے اس کی چال میں پھنسنے کے بجائے نپا تلا جواب دیا۔

''تو پھر یہ دولت واقعی زیادہ ہونی چاہئے۔ اس بار تمہیں مجھ سے پہلے سے زیادہ پرسنٹیج پر معاملات طے کرنے ہوں گے۔'' چودھری نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور چاہا کہ ڈیوڈ کی بات پکڑ کر اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لے۔

''نہیں، اس بار تمہیں وہ قبول کرنا ہو گا جو ہم تمہیں دیں۔ پہلی بار ہم نے تمہارا بہت خیال کیا تھا لیکن اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کیا تو ہم خود تمہارے خلاف مخبری کر دیں گے۔ تم یہ سوچ لو کہ تمہارے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارا کوئی آدمی سامنے نہیں ہے۔ ہمارا تھوڑا بہت نقصان ہو گا جسے برداشت کر کے ہم پھر دوبارہ کہیں اور نیا سیٹ اَپ جما لیں گے لیکن تم اور تمہارے آدمی مارے جائیں گے۔ بہر حال ان باتوں سے تم یہ نہیں سمجھو کہ تم ہمارے ساتھ معاملہ کر کے گھاٹے میں رہو گے۔ ہم اضافہ اپنی مرضی کا دیں گے لیکن وہ اتنا ہو گا کہ تم خوش رہو گے۔'' چودھری کو اس کی پوری اوقات بتانے کے بعد اس نے آخر میں ایسی بات بھی کہہ دی کہ اس کی اشک شوئی ہو سکے۔

''دھمکیاں مت دو ڈیوڈ صاحب! ابھی تم خود کہہ چکے ہو کہ ہمارے ملک میں دولت کے بل بوتے پر بچ جانا ایسا مشکل نہیں ہے..... اور جہاں تم اتنا کچھ جانتے ہو، وہاں یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ میرے پاس پیسے کی پہلے بھی کمی نہیں ہے۔''

''لیکن تم اس دولت میں اضافہ تو چاہتے ہو نا اور ہمارا ساتھ تمہاری دولت میں کئی ملین کا اضافہ کرے گا۔'' اس کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ڈیوڈ نے ترنت جواب دیا اور یہ جواب ایسا تھا کہ چودھری کا منہ بند ہو گیا۔ اسے اندازہ لگا چکا تھا کہ اگر ڈیل ڈیوڈ کی مرضی سے ہوئی، تب بھی وہ نقصان میں نہیں رہے گا۔

''اوکے، یہ بتاؤ کہ کام کب سے شروع کرنا ہے؟ کارخانے میں لیبارٹری قائم کرنے کے لیے وہاں کے کام بھی تو کرنا ہو گا۔'' اس نے ایک طرح سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

''ان معاملات کے لیے میرا آدمی آ کر تم سے مل لے گا۔ وہی تمہیں بتائے گا کہ کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ بس اس سے تعاون کرنا ہو گا۔'' اس کے ہامی بھرتے ہی ڈیوڈ کا لہجہ ایک بار پھر تحکمانہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے آدمی کو ویل کم کہنے کے لیے تیار ہوں۔'' چودھری نے جواب دیا۔

''گڈ۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' ڈیوڈ نے اسے شاباشی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور چودھری اپنے غیر ملکی پکچارسن کر آنے والی دولت کے تصور سے مسکرانے لگا۔ اس کے حساب سے آج کے برے دن میں پہلی ایسی خوشخبری ملی تھی جو اس کے لیے نفع بخش تھی۔ اور بھلا انسان وہ بھی پستی میں گرا ہوا انسان کہاں سمجھتا ہے کہ وہ جس شے کو اپنے لیے خیر سمجھ رہا ہے، وہی سب سے بڑا شر ہے۔

⊛----✪----⊛

''بس بھئی، اب رک جاؤ۔ چلتے چلتے پیروں میں درد ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر اور چلے تو میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی۔'' وہ تینوں مسلسل سفر میں تھے۔ پکڑے جانے کے خوف نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد جتنا ممکن ہو سکے، اتنی دور نکل جائیں۔ چنانچہ وہ اپنی تھکن کی پروا کیے بغیر کبھی دوڑ کر اور کبھی چل کر فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ سفر تقریباً بے سمت تھا اور اسلم اپنے اندازوں کی بنیاد پر اب سمت کا تعین کرتا رہا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اب جا کر انہیں کچھ سکون ہوا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا گیا ہے اور اب وہ قدرے محفوظ ہیں۔ شاید تحفظ کا ہی احساس تھا جو للی کی زبان پر اپنی تھکن کا تذکرہ آ گیا تھا اور اس نے کچھ دیر رکنے کی استدعا کی تھی۔

''اگر تم بے ہوش ہو کر گر گئیں تو یہ میرے لیے بڑا خوشی کا مقام ہوگا۔ میں سوچوں گا کہ بڑی مصیبت سے آسانی سے جان چھوٹی اور خس کم جہاں پاک کہہ کر ہاتھ جھاڑتا ہوا آرام سے آگے بڑھ جاؤں گا۔'' اسلم نے اپنے قدم روکے بغیر اسے بے مروتی سے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ چاہے میں تمہیں جتنی بھی بری لگتی ہوں لیکن تمہارا دل اتنا برا نہیں ہے کہ ایک انسان کو اس تنہا و ویران جگہ پر بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر جانے پر آمادہ ہو جاؤ۔'' اس کی بے مروتی کو خاطر میں لائے بغیر للی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور خود اطمینان سے دھپ کر کے ایک پتھر پر براجمان ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر اسلم رک کر اسے غصے سے دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اتنی لڑنے جھگڑنے والی بات نہیں ہے۔ ہم خطرے سے کافی دور نکل آئے ہیں اور کچھ دیر یہاں رک کر آرام کر سکتے ہیں۔'' اب تک خاموش تماشائی بنی ماہ بانو نے ان کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور خود بھی للی کے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

''اگر آپ دونوں خواتین کا یہی اصرار ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم یہاں رک جاتے ہیں اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے ہیں۔ ورنہ تو میرا خیال تھا کہ کچھ وقت اور گزر جائے تو پھر کہیں رکیں گے اور رات کا کھانا کھا کر سو جائیں گے۔ ابھی تو دن کی تھوڑی روشنی باقی ہے۔'' اسلم گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے خود بھی قریب ہی کہیں اپنی رائفل ایک جانب پڑے پتھر سے ٹکا دی۔

''اگر ایسی بات ہے تو پھر چلو چلتے ہیں۔ جہاں اتنی ہمت کی ہے، تھوڑی دیر اور برداشت کر لیں گے۔'' اس کی توجیہہ سن کر للی فوراً کھڑی ہو گئی لیکن اب اسلم کی توجہ بھٹک چکی تھی۔ وہ اردگرد کی ہر شے چھوڑ کر للی کے پیروں کی طرف متوجہ تھا۔ شفاف رنگت والے بھرے بھرے سے پاؤں اس نے ابھی ابھی جوتوں سے نکالے تھے اور طویل مسافت کے گواہ چھالوں کو نرمی سے اپنی مخروطی انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اس کے بھاؤ کو دیکھ کر اسلم کا دل تڑپ گیا۔ ماہ بانو لڑکی تھی جسے وہ ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنا کر بہت پیار سے رکھنا چاہتا تھا۔ عجیب ہی بات تھی کہ وہ آبلہ پا بیٹھی تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''اب خود جم کر بیٹھ گئے ہو۔ میں کہہ رہی ہوں کہ چلو تو تمہیں سنائی ہی نہیں دے رہا۔'' للی کی نظروں نے یہ سارا منظر اچھی طرح دیکھا تھا چنانچہ لہجے میں حسد کی آگ سمو کر تیز لہجے میں اس سے بولی۔

''نہیں، اب رہنے دو۔ اب جب ہم رک ہی گئے ہیں تو ذرا سا وقت اور کیا دیکھنا۔ تم لوگ آرام کرو، میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ صبح ہم ذرا جلدی چل پڑیں گے۔'' نہایت معقولیت سے سفر دوبارہ شروع کرنے سے انکار کرتا ہوا وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور چہرے پر ذرا سی غصے کی سرخی لیے کھڑی للی کی طرف دیکھ کر پہلے مسکرایا اور پھر آسمان پر نظر دوڑاتا ہوا پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے یہاں کہیں قریب ہی پانی ہے۔



اگر تم ان پرندوں کو غور سے دیکھو تو اندازہ ہوگا کہ یہ ایک ہی سمت میں رخ کر رہے ہیں۔''

للی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا لیکن دل میں اس سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دن بھر اُڑانیں بھرنے کے بعد پچھلی شام ڈھلے اپنے مساکن میں واپس لوٹ رہے تھے اور واقعی ایک مخصوص سمت میں اُتر رہے تھے۔

''چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ آج تمہیں کسی پرندے کا مزے دار سا گوشت خود بھون کر کھلاتا ہوں۔ ایسا لذیذ ذائقہ ہوگا کہ زندگی بھر بھول نہیں سکو گی۔'' لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے وہ اپنی رائفل اٹھا کر اس سمت میں آگے بڑھ گیا اور دانستہ اس جانب دیکھنے سے گریز کیا جہاں ماہ بانو بیٹھی تھی۔

وہ برسوں سے للی کو جانتا تھا اور اس کا خوب مزاج آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ اس کا زیادہ التفات ماہ بانو کے لیے للی کے دل میں نفرت کو بڑھا دے گا اور وہ اس کی دشمن بن جائے گی۔ ہم سفروں میں سے کسی کو بھی دشمن بنا کر چلنا بڑی نادانی کی بات تھی، سو وہ یہ نادانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اونچے نیچے ناہموار راستے پر پیر جما کر چلتا ہوا وہ آگے بڑھا تو ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ کر اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ یہاں ایک کافی بڑے گڑھے میں اچھا خاصا پانی جمع تھا، یہ یقیناً بارش کا پانی تھا جس میں ڈھیروں کائی اُگ آئی تھی لیکن اس کے باوجود پانی کا یہ ذخیرہ پرندوں کی پیاس بجھانے کے لیے کافی مدد تھا۔ اب بھی وہاں کئی پرندے جمع تھے اور کنارے پر بیٹھ کر وقتاً فوقتاً اپنی چونچیں پانی میں ڈبو کر پانی پی رہے تھے۔

وہ نہایت خاموشی سے ایک جگہ ٹِک گیا اور اپنی رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے سانس روکے ایک مندمل نما پرندے کا نشانہ باندھنے لگا۔ وہ لوگ جن حالات میں ڈیرے سے نکلے تھے، اپنے ساتھ زیادہ کھانے پینے کا سامان نہیں لا سکے تھے۔ خوراک کے نام پر ان کے پاس چنے، گُڑ کی ڈلیاں اور بس پانی ہی موجود تھا۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ جہاں شکار کا موقع مل سکے، وہاں اس سے استفادہ کیا جائے۔ ڈیرے سے اتنی قلیل خوراک کا ذخیرہ لے کر وہ نکلا بھی اسی بھروسے پر تھا اور اب رائفل سے نشانہ باندھے اپنی نشانہ بازی کی مہارت کا مظاہرہ کرنے ہی والا تھا۔

جیسے ہی اس کا منتخب کیا ہوا پرندہ فوکس ہوا، اس نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ انسان اور اس کی ایجادات کی ہلاکتوں سے محروم پہاڑوں کا یہ ویران سلسلہ جہاں پرندوں کی چہچہاہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا، رائفل کے اس اکلوتے فائر سے گونج اٹھا۔ یک دم ہی وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی اور برسوں بلکہ شاید صدیوں سے بغیر کسی انسانی مداخلت کے وہاں سکون سے بسنے والے پرندے گھبرا کر شور مچاتے ہوئے فضا میں چکرانے لگے۔ اسلم رائفل چھوڑ کر خود اپنی جگہ سے اُٹھ کر تیزی سے اس پرندے کی طرف بھاگا جو اس کی گولی کا نشانہ بن کر زخمی ہوا تھا اور بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پرندے کو اس کے سر سے پکڑ کر اس کے گلے پر چھری پھیر کر حلال کرنے کی نیت سے اس نے اپنے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہاں بندھا خنجر نکال سکے لیکن ایک آواز پر بری طرح چونک کر پلٹا۔ کسی نے بہت زور سے ''اسلم'' کہہ کر پکارا تھا اور پکارنے والی آواز مردانہ تھی اس لیے اس کا اس طرح بھڑکنا سمجھ آتا تھا۔

پلٹتے ہی اس کی نظروں نے ایک بہت ہی خوفناک منظر دیکھا۔ اس کے سامنے للی اور ماہ بانو ساتھ ساتھ کھڑی تھیں اور ایک رائفل کی نال نے انہیں اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پھڑکتے ہوئے پرندے کی گردن چھوٹ گئی اور اس نے بے بسی سے اس سمت دیکھا جہاں اس کی رائفل پڑی تھی۔

رائفل اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ وہ بہت زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا، تب بھی اس حد تک کامیاب نہیں

ہوسکتا تھا کہ لِلّی اور ماہ بانو کو زد میں لیے کھڑے جمرو کی رائفل کے شعلہ اُگلنے سے قبل اس تک پہنچ جاتا۔ ہاں جمرو ہی تھا جو نہ جانے کس طرح ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اب کسی عفریت کی طرح دانت کچ ان کے سروں پر کھڑا تھا۔

''نہ.....نہ میرے ہیرو! رائفل کی طرف بڑھنے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ غلطی کی تو سمجھ لینا کہ اِدھر تُو ہلا اور میں نے گولی چلائی۔ ہاں، یہ تو بتا دے کہ پہلی گولی تیری محبوبہ کی کھوپڑی میں اتاروں یا اس عاشقہ کی جو وچاری فلموں کی ہیروئن بن سکی اور نہ ہی تیری۔ چچ چچ.....وچاری کی قسمت ہی ماٹھی ہے۔ ورنہ شکل کے تو ہم دونوں گواہ ہیں کہ یہ وچاری رج کے سوہنی تھی۔'' جمرو نے اس کی نظروں کا زاویہ پہچان لیا تھا اس لیے فوراً ہی اسے تنبیہہ کر ڈالی۔

''فضول بکواس نہ کر اور جو چاہتا ہے صاف صاف بتا دے۔'' ان دونوں کو رائفل کی زد میں دیکھ کر وہ دل ہی دل سے خاصا پریشان ہوگیا تھا لیکن اپنی اس پریشانی کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

''چاہتا تو میں تیری جان ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتا کہ تُو بغل میں یہ دو دو چڑیاں دبائے کدھر جا رہا تھا؟ یہ تو اتفاق ہے کہ ڈیرے پر پولیس کا ریڈ ہوتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا اور دوسروں کی طرح رک کر مقابلہ کرنے کی حماقت نہیں کی۔ وہ پولیسیے جس طرح فائر پر فائر کر رہے تھے، صاف پتہ لگ رہا تھا کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اور کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے سوچا مارے جانے یا گرفتار ہونے سے بہتر ہے کہ بھاگ چلوں۔ بھاگنے کے لیے اس راستے کو چنتے ہوئے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ اِدھر تم لوگوں سے ملاقات ہو جائے گا۔ وہ تو اچانک ہی یہ دونوں نظر آ گئیں تو میں حیران رہ گیا۔ تُو نے تو سب سے زیادہ پھرتی دکھائی اور سب سے بھاگنے میں۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تُو پولیس والوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ادھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اچانک افراتفری میں بھاگا ہوتا تو ان دونوں کو لے کر نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ فیر تمہارے حلیے بھی بتا رہے تھے کہ تم لوگ پوری تیاری سے بھاگے تھے۔ سچ بتا کہ کہیں تُو نے ہی تو پولیس کو مخبری نہیں کر دی تھی؟..... تجھے معلوم ہوگا کہ پولیس کب ڈیرے پر حملہ کرے گی اس لیے تو پہلے ہی سے بھاگ نکلا۔''

ذرا سی دیر میں جمرو نے جو اندازے قائم کیے تھے، وہ کسی حد تک صحیح تھے لیکن زیادہ تر الزام تراشی زمرے میں آتے تھے۔

اُس کے ان الزامات کو سن کر اسلم بھنّا گیا اور دانت پیستے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید کرنا تمہاری فطرت ہوسکتی ہے، میری نہیں۔ میں گروہ کو چھوڑنے کے ارادے سے ضرور وہاں سے نکلا تھا لیکن غداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غداری بزدلوں کا شیوہ ہے اور میں تیری طرح بزدل نہیں ہوں۔''

''میں نے تجھے بزدل کہا بھی کب ہے؟ تُو تو ہیرو ہے ہیرو۔ جب ہی تو دو دو لونڈیوں کو بغل میں لے کر گھوم رہا ہے۔ یہ سالی لِلّی تو سالوں سے تیری دیوانی ہے پر قسمت دیکھو کہ یہ چار دن کی آئی لونڈیا تیرے دل پر ایسی چڑھ گئی کہ تُو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہوگیا۔ ایسا قبضہ جمایا تُو نے اس پر کہ ہم تو اسے چھونے کو ترس گئے۔ اب میں تیرے سامنے ہی اس کی مٹی پلید کروں گا۔ وڈا ترسایا ہے تُو نے ہمیں اس کے لئے۔ اب میں اپنے دل کے سارے ارمان نکالوں گا۔''

جمرو کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ افراتفری میں بس اپنی رائفل لے کر ہی ڈیرے سے بھاگا ہے اور صرف اس وجہ سے کہ وہ تنہا تھا اور اس کے ساتھ اسلم کی طرح دو نازک اندام خواتین نہیں تھیں، ان



وہ فاصلہ ان سے قلیل وقت میں پاٹ کر وہاں تک آ پہنچا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس کی خباثت روح پر تھی۔ نہ تو اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوس میں فرق آیا تھا اور نہ ہی ہونٹوں پر دوڑتی شیطانی مسکراہٹ ٹل سکی تھی۔ وہ اب بھی وہی جمرو تھا جو ڈیرے پر ہوتا تھا۔

''اگر تُو نے ماہ بانو کو انگلی بھی لگائی تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔'' اس کی باتیں سن کر اسلم کا پارا چڑھ گیا اور وہ اس کے ہاتھ میں دبی رائفل کی پروا کیے بغیر غضب ناک ہو کر اس پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

''وہیں رُک جا اسلم! ورنہ ایک سیکنڈ میں گولی اس کی کھوپڑی کے اندر ہوگی۔'' جمرو نے فوراً ہی رائفل کی نال ماہ بانو کے سر سے لگا دی اور اسے دھمکی دی۔ اسلم نے شدید بے بسی کے احساس کے ساتھ اپنے قدموں کو روکا۔ اسی پل اس کا شکار کیا ہوا پرندہ تڑپنا پھڑکنا چھوڑ کر ساکت ہوگیا۔

''اب تیرا ہیروپن نہیں چل سکے گا۔ زیادہ منہ زوری دکھانے کی کوشش کرے گا تو اس پرندے کی طرح ہی اپنا سر گرا اپنے خون میں لت پت مردہ پڑا ہوگا۔ ادھر اس ویرانے میں کوئی تجھے کفن دفن دینے کے لیے بھی نہ ملے گا۔'' جمرو کا لہجہ کسی درندے کی غرّاہٹ لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن وہ صرف اس لیے خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھا کہ اس کی ذرا سی لغزش ماہ بانو کی زندگی کا چراغ گُل کر سکتی تھی۔ یہ تو اپنی جگہ تھا کہ وہ جیتے جی جمرو کو اس کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دے گا لیکن انتہائی صورت سے پہلے کوئی جذباتی حرکت کرنا جو ماہ بانو کے لیے نقصان دہ ثابت ہو، کسی طور مناسب نہیں تھا۔

''لِلّی جانم ذرا ادھر سے وہ رائفل تو اٹھا کر میرے پاس لے آ۔ یہ اِدھر پڑی رہی تو اپنا ہیرو خوامخواہ اس تک پہنچنے کے لیے پھڑکتا رہے گا۔'' اسلم کو ساکت ہوئے دیکھ کر جمرو نے طنزیہ لہجے میں لِلّی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی اس حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آ گئی اور ایک ایک قدم مضبوطی سے رکھتی ہوئی رائفل کی طرف بڑھی۔ ماہ بانو کے سر سے رائفل کی نال لگائے کھڑے جمرو کی نگاہیں چابک دستی سے اس کی اور اسلم کی بہ یک وقت نگرانی کرتی رہیں۔ لِلّی کے رائفل لے کر واپس پلٹنے تک اس نے کہیں کوئی موقع نہیں دیا کہ اسلم اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکے۔

''شاباش! تجھ میں ایک یہی گُل اچھی ہے کہ کبھی کسی فرمائش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کرتی۔ تُو نے وڈی بھلائی ہے میرے بدن کی۔ تیری اس خدمت کے صلے میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے جان سے نہیں ماروں گا۔'' اسے رائفل سمیت واپس پلٹتا دیکھ کر جمرو نے چہک کر کہا۔

''لیکن میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ تُو اسلم کو کچھ کر سکے، اس سے پہلے ہی میں تجھے جان سے مار دوں گی۔'' اس کی جانب آتی لِلّی یکدم ہی اس سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر رک گئی اور رائفل کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرّائی۔

''یہ تُو کیا کر رہی ہے؟'' جمرو بوکھلا گیا۔

''تُو نے مجھے اسلم کی عاشقہ کہا تھا تو پھر تُو یہ کیوں بھول گیا کہ میں اسلم کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' لِلّی نے اسے جواب دیا۔

''رائفل پھینک دے لِلّی! ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔'' جمرو نے اسے دھمکی دی۔

''مار دے۔ یہ مر گئی تو میری راہ کا کانٹا آپ ہی نکل جائے گا۔'' لِلّی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس کے بعد جمرو کسی نئی حکمتِ عملی سے کام لیتا، اس سے قبل ہی اسلم تقریباً اُڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ لِلّی کی طرف اُس توجہ بٹ گئی اس لیے وہ ایک پل کے لیے اسلم کی طرف سے غافل ہوگیا تھا اور اسلم کے لیے اتنی

مہلت کافی تھی۔ اس نے سب سے پہلے جمرو کے رائفل والے ہاتھ کو ہی قابو میں کیا اور وحشیانہ طاقت لے کر ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

بدحواسی کا شکار ہو جانے والا جمرو فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر گیا۔ اسلم رائفل کو نال کی طرف سے ڈنڈے کی طرح پکڑا اور جمرو پر پل پڑا۔ اس کے چار پانچ ضربیں لگانے تک اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکا اور اِدھر اُدھر لڑھکتا رہا، لیکن پھر اسے بھی ایک موقع مل ہی گیا۔ یہ موقع پتھر کی صورت میں ملا تھا جس کے قریب وہ اتفاقاً جا گرا تھا۔ پتھر بہت بڑا نہیں تھا اور آسانی سے اس کے ہاتھ میں سما گیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ پڑے پڑے اسے پوری قوت سے اسلم کی طرف اُچھال دیا۔ پتھر اس کے پیٹ میں جا کر لگا۔ خوش قسمتی سے وہ پتھر کسی سخت چٹان کے حصے کے بجائے مٹی کا ڈھیلا ثابت ہوا۔ جمرو نے جس طاقت سے اسے اس کی طرف اُچھالا تھا، اس کا حشر نشر ہو جاتا۔ اب بھی وہ لڑکھڑا سا گیا اور تب تک جمرو کو اُٹھ کر کھڑے ہونے کی مہلت مل گئی اور اس کے ایک ہی حملے نے اسلم کے ہاتھوں سے رائفل دی تھی۔

اسلم اور اس کی دشمنی کی بنیاد تب ہی پڑ چکی تھی جب اسلم کا دل ماہ بانو پر اس بری طرح آ گیا تھا کہ اس نے اسے سب کے ہاتھوں کا کھلونا بننے کے بجائے سردار کے قدموں میں اپنا سارا مال و متاع ڈھیر کر کے مامون کر دیا تھا۔ عورت کا رسیا جمرو اس صورتِ حال پر بڑا جھلایا تھا۔ اس کی رال مسلسل ماہ بانو پر ٹپکتی رہی لیکن وہ باوجود کوشش کے اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ماہ بانو کو لے کر شروع ہوئے ان دونوں کے مابین یہ چپقلش دوسرے جھگڑوں کا سبب بھی بنی تھی اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے پیاسے ہو گئے تھے۔ خصوصاً جمرو تو موقع کی تلاش میں ہی رہتا تھا کہ کب اسلم کا کانٹا بیچ سے نکلے اور اس کی ماہ بانو تک رسائی ہو سکے۔ آج بدترین حالات میں بھی جب اسے لگا کہ وہ اسلم کو قابو کر سکتا ہے تو اس نے اس کے خلاف کمر کس لی لیکن اب دونوں کے ہی نہتے رہ جانے کی صورت میں طاقت کا توازن تقریباً برابر ہو چکا تھا اور فتح اسے ہی حاصل ہونی تھی جو خود کو زیادہ بڑا شہ زور ثابت کر دیتا۔ طاقت کے اس توازن کو اگر بگاڑ سکتا تھا تو وہ لالی تھی۔ وہ اسلم کی حمایتی تھی اور اس وقت اسلم کی لوڈڈ رائفل لیے وہاں کھڑی تھی لیکن انگیز طور پر اس نے ان دونوں کے جھگڑے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور خاموشی سے ان کے مابین لڑائی کو دیکھ رہی تھی۔

جمرو نے کھڑے ہوتے ہی اسلم کی طرف چھلانگ لگائی۔ اتفاق سے یہی حرکت اسلم نے بھی کی اور دونوں فضا میں ہی ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے سروں کے درمیان ہونے والی ٹکر کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ ٹکرانے کے بعد وہ دونوں ہی پیچھے کی طرف اُلٹ کر گر پڑے اور دونوں ہی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کر لیا۔ کھڑے ہوتے ہی وہ ایک بار پھر دوسرے پر جھپٹے۔ اسلم کے دائیں ہاتھ کا گھونسہ جمرو کے جبڑے پر پڑا اور اس کی بتیسی ہل کر رہ گئی۔ زخمی ہونے جاری ہونے والا خون اس کی باچھوں سے نکل کر بہنے لگا مگر اسے ان چوٹوں کی پرواہ ہی کہاں تھی۔ اپنی جگہ منہ سے ذرا سی بھی آواز نکالے بغیر اس نے اسلم کے کان پر ایک جوابی گھونسہ رسید کیا۔ یہ گھونسہ خاصی قوت رسید کیا گیا تھا۔ اسلم کو یوں لگا جیسے اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو۔ بری طرح بلبلاتے ہوئے اس نے موڑ کر جمرو کے پیٹ میں مارا۔ اس چوٹ کو کھا کر جمرو بری طرح ڈکرایا لیکن اسلم کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اس سے چمٹ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اسلم کی گردن کو گرفت میں لے کر دبا دے۔



اسلم نے طرح دینے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی گردن جمرو کے ہاتھ میں آ گئی اور اس نے پوری قوت سے دبانا شروع کر دیا۔

جمرو کی اسلم نے بھی اس کے ساتھ یہی حرکت کی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا گلا دبانے پر تلے تھے لیکن خود گرفت میں ہونے کے باعث پوری طرح زور لگانے سے ایک دوسرے کی جان لینے سے قاصر تھے۔

"رائفل لے کر ایسے خاموش کیوں کھڑی ہو؟ اس لڑائی کو ختم کیوں نہیں کرواتیں؟" بہت دیر سے صورتِ حال دیکھ کر ٹوکا۔

"ماہ بانو نے محوِ تماشا لالی کو یہ کہا۔ "لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہاں جمرو کی لاش نہیں گر جاتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ انسان کی لاش گرنے کا ذکر ایسے کر رہی ہو جیسے کسی کیڑے مکوڑے کی بات ہو..... کیا ضروری ہے کہ لاش جمرو کی گرے۔ اسلم کو بھی تو کچھ ہو سکتا ہے۔" ماہ بانو نے برہمی کا اظہار کیا۔

"ہاتھوں مات ہو، اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ادھر اگر کسی کی گرا اسلم شیر ہے۔ اسے کسی سمجھ لو کہ جمرو کا مرنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ اس کے ارادے تم کی تو وہ جمرو ہی ہو گا اور تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

لالی کا جواب سن کر اسے خاموش ہونا ہی پڑا۔ دوسری طرف وہ دونوں ایک دوسرے کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ایک بار پھر ایک دوسرے کو ضربیں لگانے لگے تھے۔ اسلم کے پنچ نے جمرو کا بایاں رخسار ادھیڑ ڈالا تھا اور رخسار سے بہنے والا خون باچھوں سے بہتے خون کے ساتھ مل کر اس کے چہرے کو مزید بھیانک بنا رہا تھا۔ اس زخم کو کھانے کے بعد وہ خود بھی پیچھے نہیں رہا تھا اور اسلم کی ناک پر بری طرح سر مارا تھا کہ اس کی ناک پھوٹ پڑی تھی۔

اس کے ہونٹوں کو تر کر دیا تھا لیکن وہ دونوں ہی اپنی حالت سے بے خبر سے بہنے والے خون نے جانتے تھے کہ یہ زندگی اور موت کی لڑائی ہے۔ اس لڑائی میں جو ذرا ڈھیلا لڑنے میں مصروف تھے۔ وہ صرف اسی میں تھی کہ ہر زخم کی شدت کو حوصلے سے برداشت کر کے لڑائی کو سے جائے گا اس لیے بقا جائے۔

لڑ رہے تھے اور ابھی تک کسی کا پلڑا بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ ایک کی لات دونوں ہی اپنی پوری جان سے پوچھ ڈالتا۔ اب بھی اسلم نے جمرو کی گردن کا نشانہ لے کر کھڑی ہتھیلی کے ہاتھ فوراً ہی اگلے کا گیا اور وار اس کی گردن کے بجائے پشت پر لگا۔ پشت پر محسوس ہونے لیکن وہ عین وقت پر جھکائی کر اس کی گردن زد میں آ جاتی تو گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے محفوظ نہ رہتی۔ کی شدت نے جمرو کو بتایا کہ پیٹ پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ ان کی لڑائی کی ابتدا ہی میں اسلم پیٹ پر گھسے میں جھکے جھکے ہی اسلم پر ایک اور چوٹ لگی تو وہ فوری طور پر خود کو سنبھال نہیں سکا اور پیچھے کی زوردار ضرب کھا چکا تھا، اسی مقام پر اُلٹ گیا۔

جمرو ہی اُچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے سر اور چہرے پر تابڑ پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا فوراً ہی کی زد سے بچانے کے لیے اسلم نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر لیے لیکن مارنے لگا۔ خود کو ان گھونسوں نے گھونسوں کا سلسلہ روک کر اسلم کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑنے کے ہاتھ کہاں رکنے والے تھے۔

کی کوشش کی تاکہ اسے سخت زمین سے ٹکرا کر اس کی کھوپڑی کھول سکے۔ اسلم بھی کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا
چوٹ سہتا ہی چلا جاتا۔ جمرو سے پہلے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر اپنی
تر جسمانی قوت صرف کر کے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ جمرو اس کے اوپر سے گرا ضرور لیکن چاروں
چت نہ ہوا اور فوراً ہی اسپرنگ کی طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اسلم بھی دو چار سیکنڈز کے فرق سے کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ چند سیکنڈ کا فرق لڑائی میں بہت بڑا تھا۔ جمرو نے
اس کا فائدہ اٹھایا اور اس کے کھڑا ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسلم کھڑا ہوا تو اسے حملے کی مہلت
دیئے بغیر اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی للّی پر دے مارا۔ للّی کے لیے یہ حملہ قطعی
متوقع تھا۔ اسے خود کو بچانے یا ایک طرف ہٹنے کی قطعی مہلت نہیں مل سکی اور وہ اسلم کی زد میں آ کر
شانے چت گر پڑی۔

گرنے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ میں موجود رائفل نکل کر اس سے دور جا گری۔ اس بار جمرو نے اسلم پر
حملہ کرنے کے بجائے رائفل کی طرف جست لگائی اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ للّی کے اوپر جا گرے
اسلم جب تک کھڑا ہوا، لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ طاقت کا توازن جمرو کے حق میں جھکا ہوا تھا اور وہ کسی رعایت
کے لیے تیار نہیں تھا۔ رائفل ہاتھ لگتے ہی اس نے اسے سیدھا کیا اور بے دریغ اسلم پر فائر داغ دیا۔ فائر کی گونج
کے ساتھ ہی فضا میں ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی۔

یہ للّی کی چیخ تھی جو اسلم کی طرف فائر ہوتے ہی زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسلم کی طرف جاتی گولی
کو اپنے سینے پر روک لیا تھا۔ حالات کی چکی میں پس کر مدقوق اور بے کشش ہو جانے والی للّی کے سینے سے
ہی خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ زمین پر گر پڑی۔

اسلم کی جگہ للّی کو زد میں آتے دیکھ کر جمرو ایک پل کے لیے گڑبڑا گیا تھا اس لیے دوسرا فائر نہیں کر سکا۔
اُس کی اس پل بھر کی غفلت کا اسلم نے فائدہ اٹھایا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر نکالنے کے بعد برق رفتاری سے
جمرو کی طرف پھینک دیا۔ طویل مشق سے حاصل ہونے والی مہارت نے اس لمحے اسے مایوس نہیں کیا اور خنجر جمرو
کے سینے کی بائیں طرف کی پسلیوں سے گزرتا ہوا سیدھا اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔

دل میں اُتر جانے والے خنجر نے لحیم شحیم جمرو کے سارے کس بل نکال دیئے اور وہ لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔
اُس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دوبارہ زمین پر سے نہیں اُٹھ سکے گا۔ اسلم نے اس کی طرف دیکھنے کی
زحمت بھی نہیں کی اور للّی کی طرف لپکا۔ اس سے قبل ماہ بانو اس کے قریب پہنچ چکی تھی اور اس کا سر اپنی گود میں
لے لیا تھا۔

''یہ تم نے کیا، کیا للّی؟'' اسلم گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے
ہوئے دکھ سے بولا۔

''تمہیں اپنا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو سوچا تم پر قربان ہی ہو جاؤں۔ اب تم خوش رہنا کہ للّی کبھی
تمہاری راہ میں نہیں آئے گی۔'' وہ اپنے پپڑی جمے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ دقت بولی۔

''میں تم سے اتنی نفرت تو نہیں کرتا تھا کہ تمہاری جان کے درپے ہو جاتا۔'' وہ واقعی بہت دُکھی تھا۔

''لیکن میں تو تم سے اتنی محبت کرتی تھی نا کہ تم پر خود کو قربان کر دیتی۔'' شدید تکلیف کے عالم میں بھی وہ
غضب کی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''تم نے مجھے بڑا مقروض کر دیا۔ تمہارے اتنے بڑے احسان کا بدلہ میں کیونکر اُتار پاؤں گا؟'' اسلم کو



بھی نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، وہ بھی ایک ایسی عورت کے لئے جس سے اس
ہمیشہ کراہت محسوس کی تھی۔

''تم میرا سر اپنی گود میں لے کر میرے مرنے تک یہیں بیٹھے رہو۔ میں تمہیں دیکھتے دیکھتے موت کی
میں چلی جاؤں گی تو سمجھوں گی کہ زندگی سے سب کچھ پا لیا۔'' اس نے اپنی خواہش بیان کی۔

ماہ بانو نے آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ اس پہیلی سی عورت کا سر اپنی گود میں اٹھا کر اسلم کے زانوؤں پر
لیا۔ بے حد دل شکستہ سا اسلم دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ یہاں اس ویرانے
وہ اس کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی خواہش کے مطابق بنا سکے۔ للّی
سینے سے جاری خون کا بہاؤ صاف بتا رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندگی سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے میں
اب نہیں ہو سکے گی۔ وہ لوگ کسی آبادی میں ہوتے تو وہ پھر بھی کوشش کرتا کہ للّی کو کسی ہسپتال تک پہنچا دے
وہ تو خود ہی بے سمت تھا۔ اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی سکے گا
یا۔

''اسلم.....'' اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اس پر مرکوز رکھے للّی نے آہستہ سے اسے پکار کر خیالات سے
نکالا۔

''ہوں..... بولو!'' وہ فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اگر..... ہو سکے تو کبھی میرے ماں باپ سے.....'' اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور یوں لگا کہ وہ اپنا
جملہ نہیں کر پائے گی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بہت دھیمی آواز میں بولی۔

''ان سے میرے لیے معافی.....'' جملہ اب بھی ادھورا ہی تھا لیکن مفہوم واضح ہو چکا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں سے نکل سکے گا یا نہیں لیکن ایک مرتے
ہوئے انسان کی موت کو آسان کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر ڈالا۔

اس اثنا میں ماہ بانو چلّو میں تالاب سے پانی بھر لائی تھی۔ اس نے وہ پانی للّی کے خشک ہونٹوں پر ٹپکایا۔
کے چند قطرے اس کے حلق سے نیچے اُترے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ نکلا۔ اب اس میں کچھ بھی بولنے
کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک حسرت بھری نظر ماہ بانو اور اسلم کے چہروں پر ڈالی اور پھر جسم کو لگنے والے
کسی جھٹکے کے ساتھ اس کی وہ بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں جنہیں دنیا میں آ کر پہلی بار کھولنے
کے بعد جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا تو اس نے بڑی محبت سے اس کا نام غزالہ رکھا تھا۔ وہ عزت دار
کی اپنی غزالی آنکھوں والی پہلی اولاد سے بہت محبت کرتا تھا لیکن بیٹی اس چاہنے والے باپ کی عزت کی لاج
نہیں رکھ سکی اور شوبز کی چکا چوند سے اس بری طرح متاثر ہوئی کہ غزالہ سے لیلیٰ اور للّی بن گئی۔ اسے لیلیٰ اور للّی
بنانے والوں میں سے تو کوئی مجنوں کی طرح اس کا دیوانہ ثابت ہو سکا اور نہ ہی کسی نے للّی کا پھول جان کر اس
کی قدر کی۔

خودسری اور عاقبت نااندیشی کا شکار وہ لڑکی بری طرح روندی گئی اور ایک ویرانے میں ایسی موت مری کہ
اس کا کوئی خونی رشتہ اس کے مردہ جسم کے قریب بیٹھ کر نوحہ کرنے والا نہیں تھا۔ دو افسردہ چہرے اگر اس پر آنسو
بہا رہے تھے تو وہ بھی صرف اس لیے کہ اس نے محبت کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے
پر ایک لاش اور بھی پڑی تھی۔ مرنے والا وہ شخص اس سے بھی زیادہ بدقسمت تھا۔ زندگی بھر اس نے جو ظلم کمایا تھا،
اس کے عوض اسے مرتے وقت پانی کے چند قطرے اور کوئی ایک بھی آنسو بہانے والی آنکھ میسر نہیں آ سکی تھی۔

زندگی اپنے آپ کو ڈھنگ سے نہ برتنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ جو لوگ متعین اصولوں سے ہٹ کر زندگی کے ساتھ پیش آتے ہیں، انہیں زندگی اگر عمر بھر ڈھیل دیتی بھی رہے تو خود سے جدا کرتے وقت اس بے دردی سے پیش آتی ہے کہ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنے والا سبق دے ڈالتی ہے لیکن اس سبق کو یاد رکھنے کی فرصت ہی کسے ہوتی ہے۔ اگر انسان دوسروں کے تجربات سے سبق حاصل کر کے سدھرنے والا ہوتا پھر خسارے میں کیوں رہتا؟

⊛----✪----⊛

شبانہ بہت مضطرب تھی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ آفتاب سے وعدہ کرنے کے باوجود اس کی بیٹی کو اس تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اسے اس بات کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس کے کچھ کرنے سے قبل ہی بچی کو ہسپتال کی نرسری سے غائب کر دیا گیا تھا۔ وہ آفتاب کو اس واقعے کی اطلاع دے کر معذرت بھی کر چکی تھی اور آفتاب نے اس کی معذرت کو قبول بھی کر لیا تھا، اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس کا دل اس سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ کچھ ایسا کرے کہ آفتاب اور کشور کو ان کی کھوئی ہوئی خوشی واپس مل جائے۔

آفتاب کے ساتھ اس کے دل کا عجیب ہی معاملہ تھا۔ وہ بہت اچانک ہی اس کی زندگی میں داخل ہوا اور چھا گیا تھا۔ محبت جس طرح اس کے دل پر وارد ہوئی تھی، اس طرح کے واقعات عام نہیں ہوتے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جسے گرفت میں لے کر کہا جا سکتا کہ اس پل محبت نے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے دل میں اُترا تھا۔

دیکھا جائے تو ان کا تعلق بھی بہت سرسری سا تھا۔ اس کا اور آفتاب کا بس چند دن کا تو واسطہ تھا۔ وہ بچی کی پیدائش کے سلسلے میں ہسپتال میں داخل اپنی بیوی کی دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کتنی دیوانہ وار محبت کرتا ہے، یہ اس کے ایک ایک انداز سے پتہ چلتا تھا۔ شبانہ بطور نرس کشور کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دے رہی تھی اور اس قسم کی خدمات انجام دینا اس کا برسوں کا معمول تھا لیکن اس کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی اور کی محبت کو دیکھ کر اتنی بری طرح متاثر ہوئی کہ خود ہی محبت میں مبتلا ہوگئی۔

اپنے دل میں پیدا ہونے والی اس انوکھی محبت کے لیے وہ ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہوسکی تھی کہ آفتاب اور کشور کے دشمن ان تک پہنچ گئے۔ اس موقع پر شبانہ نے ان دونوں میاں بیوی کو غیر معمولی فیور دیتے ہوئے نہ صرف وہاں سے فرار ہونے میں مدد دی بلکہ یہ وعدہ بھی کر لیا کہ نرسری میں داخل ان کی بیٹی ان تک پہنچا دے گی۔ حالات نے اسے یہ وعدہ وفا کرنے کی مہلت نہیں دی البتہ وہ خود ملازمت سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دی گئی۔ ہسپتال کی ملازمت سے فارغ ہونے کا مطلب تھا کہ اسے رہائش کے لیے ہسپتال کی طرف سے ملا ہوا کوارٹر بھی خالی کرنا تھا۔ برسوں سے مقیم ایک جگہ سے منتقلی کے لیے ساز و سامان کو سمیٹنا بھی ایک وقت طلب کام تھا اور اس وقت وہ اسی مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھنے کے بعد اسے بند کرتے ہوئے یکدم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً اپنے کام کو روکا اور اپنی اس کولیگ کو فون کرنے لگی جو ہسپتال میں ریکارڈ کیپر کے فرائض انجام دیتی تھی۔

''روبی! ذرا ریکارڈ میں دیکھ کر مجھے مسز آفتاب کا رہائشی پتہ تو بتا دو۔'' رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنی ساتھی سے مطالبہ کیا۔

''تم اس کے ایڈریس کا کیا کرو گی؟'' اس کی ساتھی نے چونک کر پوچھا۔



''بس کچھ کرنا ہے نا۔ تم یہ بتاؤ کہ مجھے ایڈریس دے رہی ہو یا نہیں؟'' اس نے دوستانہ دھونس سے کام لیا۔

''اچھا میں بتاتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں خود تمہیں فون کر کے ایڈریس نوٹ کروا دوں گی۔''

طرف سے مزید کوئی سوال کیے بغیر فوراً ہامی بھر لی گئی تو اس نے لائن کاٹ دی اور ایک طرف پڑی کرسی پر انتظار کرنے لگی۔

اس کے اردگرد بہت کام بکھرا ہوا تھا لیکن اب یہ سب غیر ضروری ہوگیا تھا اور وہ سب سے پہلے اپنے دل میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ آفتاب کے لیے کچھ نہ کر سکنے کے ملال نے اسے اُکسایا تھا کہ اس کے کسی طرح تو کام آئے اور اس خواہش نے اسے یہ راہ سجھائی تھی کہ وہ آفتاب کی رہائش گاہ پر جا کر ضروری نوعیت کا سامان وہاں سے اٹھا کر اسے پہنچا دے۔

اس تدبیر کے سوجھنے میں یہ لالچ بھی کارفرما تھا کہ اس طرح آفتاب سے ایک اور ملاقات کا موقع میسر آ جائے۔ دل کی باتوں میں آ کر اس نے بہت سے دوسرے نکات فراموش کر دیئے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ آفتاب اور کشور کا معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے اور ہسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے بعد یقینی طور پر پولیس ریکارڈ سے ان کا پتہ لے کر وہاں پہنچی ہوگی۔

اپنی ہی دُھن میں مگن اس نے روبی کا فون آنے تک کا وقت بہ مشکل گزارا اور پھر اس سے پتہ ملتے ہی نکل گئی۔ وہاں بسیں وغیرہ تو چلتی نہیں تھیں، البتہ ہسپتال کے باہر اسے رکشہ ضرور مل گیا۔ رکشے میں سوار ہو کر منزل کی طرف بڑھی۔ راستے سے اس نے ایک لاک میکر کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ اس کے گھر کا بند قفل کھل سکے۔ لاک میکر بھی بے چارہ کہاں جانتا تھا کہ ایک معزز نظر آنے والی خاتون اسے کسی اور کے گھر کا لاک کھولنے لے جا رہی ہے۔

اس نے وہاں پہنچ کر آرام سے لاک کھولا اور اپنے معاوضے کے ساتھ واپسی کا کرایہ لے کر بخوشی واپس ہوگیا۔ شبانہ اس کی روانگی کے بعد گھر میں داخل ہوئی تو وہاں اس گرد سے واسطہ پڑا جو چند دن کسی گھر کے بند رہنے سے اس کا حصہ بن جاتی ہے۔ لیکن یہاں کچھ اور بھی تھا۔ گرد پر بہت سے قدموں کے نشان نمایاں تھے اور ان سے بھی خاصا بکھرا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں نے آ کر تلاشی لی ہے۔ جوش و جذبات میں بہتے اس کے ذہن کو یہ دیکھ کر دھچکا لگا اور عقل نے خطرے کی سیٹی بجاتے ہوئے اسے فوراً وہاں سے نکل جانے کا مشورہ دیا لیکن اسی لمحے اس کی نظر دیوار پر چپکے اس کاغذ پر پڑ گئی جس پر دھمکی آمیز پیغام تحریر تھا۔

''اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگتے پھر رہے ہو۔''

پیغام دینے والے کا کوئی نام پتہ موجود نہ ہونے کے باوجود یقیناً پیغام کے الفاظ اس شخص کے لیے بہت تھے جسے یہ پیغام دیا گیا تھا۔

شبانہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ اس پیغام کو آفتاب تک پہنچایا بھی جائے یا نہیں۔ اگر وہ اسے پیغام پہنچا دیتی تو اس کی محبت میں وہ پیغام دینے والے کے پاس بھاگا جاتا۔ جو شخص بھرے ہسپتال میں اپنے غنڈے بھیج کر مرنے کی کوشش کر سکتا تھا، وہ کس نوعیت کا دشمن ہوگا، شبانہ کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی خاموش محبت آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اسے یہ بھی احساس تھا کہ آفتاب اور اپنی بیٹی کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔

تذبذب میں مبتلا وہ ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑی ہوئی جہاں سے کسی ایک فیصلے پر پہنچنا بہت دشوار محسوس ہوتا تھا۔ شش و پنج کی اس کیفیت میں مبتلا وہ ذہن میں اُبھرنے والے خطرے کے احساس کو بھی فراموش کر

بیٹھی اور اس وقت ہوش میں آئی جب کسی نے چپکے سے اس کے پیچھے آ کر گردن پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ بے ساختہ ردِعمل کے طور پر وہ فوراً ہی بدک کر پیچھے کی طرف پلٹی۔ اس کے عقب میں پولیس کی وردی ملبوس ایک پینتیس چھتیس سالہ آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں دبے پسٹل کا رخ اس کی طرف ہی تھا۔

''کک.....کون ہو تم؟'' شبانہ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو تم مجھے بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور اس طرح اس گھر میں چوری چھپے گھس کر کیا کر رہی ہو؟'' جواباً پولیس والے نے اس سے کڑک دار لہجے میں باز پرس کی۔

''مم.....میں .....میں ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے ایک بودا سا بہانہ پیش کیا۔

''دروازے کا تالا زبردستی کھول کر؟'' پولیس والے نے طنز سے پوچھا تو اس کا حلق خشک ہو گیا اور وہیں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ وہیں چل کر ہم تم سے اُگلوائیں گے کہ تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟'' پولیس والے نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے پسٹل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

''میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ نہ ہی چوری چکاری کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ میرے جاننے والے ہیں اور میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ اگر یہاں ان کا کوئی ضروری سامان ہو تو وہ لے جاؤں تاکہ میں انہیں دے سکوں۔'' تھانے جانے کے نام سے شبانہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی جسے سن کر پولیس والے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یہ ساری وضاحتیں تھانے میں جا کر پیش کرنا بی بی! میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔ مجھے حکم تھا کہ اگر کوئی شخص زبردستی اس مکان میں گھستا ہوا نظر آئے تو اسے گرفتار کر کے تھانے پہنچا دوں۔'' پولیس والے نے سختی سے جواب دیا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگا۔

شبانہ کو چار و ناچار قدم آگے بڑھانے پڑے۔ ایک بڑے ہسپتال کی نرس کی حیثیت سے شہر میں کئی لوگ اس سے آشنا تھے۔ سو اس کے لیے پولیس کی نگرانی میں تھانے پہنچنا رسوائی کا سبب بن سکتا تھا۔ قدرے زیادہ عمر کی ہونے کے باوجود وہ بہرحال تھی تو ایک کنواری لڑکی ہی چنانچہ اس صورتِ حال پر گھبرا کر رونے لگی۔ تھانے پہنچنے تک اس کے آنسوؤں کا تسلسل جاری رہا تھا۔

''اوئے نورے! یہ تُو کسے اٹھا لایا ہے؟'' پولیس والا جو کہ عہدے کے اعتبار سے سنتری تھا، اسے لے کر تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کرسی پر اکڑ کر بیٹھے شخص نے سوال کیا۔

''بڑے کام کی چیز لایا ہوں سر جی! آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔'' نورے کے نام سے پکارے جانے والے سنتری نے خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، اسے پچھلے کمرے میں بند کر دے۔ رات کو دل خوش کریں گے۔ ابھی تو اگر ایس ایچ او صاحب کی نظر پڑ گئی تو وہ قبضہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔'' ایس ایچ او کی غیر موجودگی میں اس کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھے اے ایس آئی نے جواب دیا۔ یہ وہی اے ایس آئی خالد تھا جس سے شہریار کی آفتاب کے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ شہریار نے تو آفتاب سے رابطے کے لیے اس کا نمبر ملایا تھا لیکن دوسری طرف سے شراب کے نشے میں مدہوش اے ایس آئی خالد نے اناپ شناپ بکنا شروع کر دیا تھا۔ اب شبانہ اسی اے ایس آئی کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس نے پہلے مرحلے میں ہی اپنی خبیثانہ فطرت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ پہلے سے ہی خوف سے زرد پڑتی



رنگ اس کا جملہ سن کر مزید زرد پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''آپ اس طرح سے بھی اپنا دل خوش کر لیجئے گا سر جی! پر میں تو آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی ماسٹر کو جانتی ہے۔ ابھی میں اسے اس کے گھر سے ہی پکڑ کر لا رہا ہوں۔ آپ اس سے اُگلواؤ کہ ماسٹر کدھر ہے؟''

سنتری کی اطلاع پر اے ایس آئی خالد کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے اور وہ شبانہ کا اوپر نیچے تک جائزہ لینے لگا۔ ظاہری طور پر تو اے ایس آئی خالد اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے ہسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے متعلق انکوائری پر مامور تھا لیکن اندر سے وہ مقامی غنڈے سومرو سے ملا ہوا تھا۔ وہ وہ شخص تھا جس نے ہسپتال میں ہونے والی ہنگامہ آرائی میں شیدے کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ آفتاب اور کشور کا کوئی کھوج لگے تو شیدے کے آقا چودھری افتخار عالم شاہ سے بڑا انعام حاصل کر سکے۔ اسی لالچ میں اس نے اے ایس آئی سے ساز باز کر رکھی تھی۔

''یہ تو تُو نے بڑا کام کیا۔ چل پھر پہلے اس شہزادی سے یہی معلوم کر لیتے ہیں کہ ماسٹر کہاں ملے گا؟ لیکن اسے پچھلے کمرے میں لے چل۔ یہ میرا اپنا کیس ہے، ایس ایچ او صاحب کو ہوا بھی لگ گئی تو وہ اپنا حصہ بیٹھ جائیں گے۔'' اے ایس آئی خالد نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اپنے ساتھ متوقع سلوک کو دیکھ کر شبانہ نے اے ایس آئی کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا لیکن وہ کانوں میں رُوئی ٹھونس کر بیٹھا تھا، ذرا بھی اس کی درد بھری التجا پر کان نہ دھرے اور اس کا سنتری شبانہ کو کھینچتا ہوا عقبی سمت موجود ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کی کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔ البتہ ایک دیوار پر کیلوں میں رسّی کا گچھا، پلاس، چمڑے کی بیلٹ اور اسی طرح کا کچھ دوسرا سامان لٹکا ہوا تھا۔ شبانہ نے خود کو یہاں کھینچ کر لائے جانے کے دوران چیخنے چلّانے اور مزاحمت کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ایک تنومند آدمی کے آگے اس کی ذرا پیش نہ چلی تھی اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کمرے تک لے آیا تھا۔

''ایس ایچ او صاحب تھانے پہنچ گئے ہیں۔ تم اس کا منہ بند کر کے بٹھاؤ، میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر واپس آتا ہوں۔'' اے ایس آئی خالد جو پیچھے کہیں رک گیا تھا، تیز تیز قدموں سے چلتا وہاں پہنچا اور اپنے ماتحت کو یہ ہدایات دے کر جھپاک سے باہر نکل گیا۔

سنتری نے حکم کی تعمیل میں پھرتی سے کام لیا اور سب سے پہلے شبانہ کے منہ میں اسی کا دوپٹہ چھین کر ٹھونس دیا۔ اب یہ بھی اُمید نہیں رہی تھی کہ وہ چیخ چلّا کر کسی کو اس طرف متوجہ کر سکے۔ ویسے بھی ایس ایچ او کا کردار اس سے ملاقات کیے بغیر بھی اس کے سامنے آ چکا تھا۔ اے ایس آئی خالد نے جن الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا تھا، ان سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی کافی حریص اور بدفطرت ہے۔

اس کی آواز کا گلا گھونٹنے کے بعد سنتری نے اس کے ہاتھ پیر بھی رسّی کی مدد سے باندھ دیئے اور پھر اسے جھلنگا سی چارپائی پر دھکیل کر خود بھی تیزی سے باہر نکل گیا۔ ادھر ایس ایچ او بس یونہی راؤنڈ مارنے کے لیے آیا تھا، اس نے بے دلی سے ایک نظر روزنامچے پر ڈالی، عملے کو بلاوجہ چند سخت سست سنائیں اور پھر کسی ضروری سرکاری کام سے جانے کا بہانہ کر کے تھانے سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اے ایس آئی خالد اور اس کے ساتھی سنتری نے عقبی کمرے کا رخ کیا۔ تھانے میں موجود مختصر عملے میں سے چند کو اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہاں کوئی عورت لائی گئی ہے لیکن انہوں نے دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جو بھی معاملہ ہے، وہ جلد سامنے آ جائے گا اور کسی بھی قسم کے فائدے کی صورت میں وہ محروم نہیں

رہیں گے۔

''اوئے نورے! تُو تو بڑا ظالم ہے۔ اتنی سوہنڑی مس صاحبہ کو ایسے باندھ بوندھ کر ڈال دیا ہے۔ چل نہیں تو اس کا منہ ہی کھول دے۔ اچھی بھلی آواز ہے بے چاری کی اور تُو نے اس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔'' چار پر پڑی شبانہ کو دیکھ کر اے ایس آئی مکاری سے بولا تو سنتری نے آگے بڑھ کر شبانہ کے منہ میں ٹھنسا اس کا رومال نکال لیا۔ منہ کھلتے ہی وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ شاید کپڑے کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہو کر چھل گیا تھا۔

''اسے پانی پلا یار!'' اے ایس آئی نے بیزاری سے حکم دیا جس کی تعمیل میں نورا جست کے ایک گندے سے گلاس میں پانی لے آیا اور شبانہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ نرسنگ کے پیشے سے وابستہ شبانہ جو عام حالات میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا بہت خیال رکھتی تھی، اس گندے گلاس سے غٹاغٹ پانی کے کئی گھونٹ پی گئی۔

''ہاں بھئی شہزادی! اب شروع ہو جا اور بتا کہ وہ ماسٹر کدھر ہے؟'' کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے اے ایس آئی نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس سے سوال کیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ وہ میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہسپتال میں میری ڈیوٹی اس کی بیوی کے کمرے میں تھی، بس میں اسی حوالے سے اسے جانتی تھی۔ بعد میں جب وہ اور اس کی بیوی ہسپتال سے فرار ہو گئے تو انہوں نے فون کر کے مجھ سے اپنی بیٹی کے سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر ہو سکے تو میں اس کے گھر جا کر ایک بار جائزہ لے لوں کہ وہاں کا کیا حال ہے۔'' شبانہ درمیانی وقفے میں اپنے ذہن میں ایک قدرے معقول کہانی تراش چکی تھی لیکن اس کہانی کے ایک نکتے کو پکڑ کر ہی اے ایس آئی نے اس سے ایک نکیلا سوال کر ڈالا۔

''تم اسے کس طرح اطلاع دیتیں؟ تمہیں اس کا ایڈریس یا کوئی فون نمبر وغیرہ یاد ہے؟''

''نن.....نہیں۔'' وہ گڑبڑائی۔ ''اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی کسی وقت فون کرے گا۔''

''میرے خیال میں اس سالی کو مرمت کی ضرورت ہے۔ نورے! تُو ٹائم برباد نہ کر۔ اس کے سارے ناخن پلاس سے پکڑ کر کھینچ لے۔'' تجربہ کار وگھاگ اے ایس آئی نے فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے چنانچہ سرد لہجے میں اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا اور چارپائی پر پڑی شبانہ کے دائیں ہاتھ کی چھنگلی کا ناخن پلاس میں دبا کر پوری قوت سے کھینچ لیا۔ نفاست سے سیٹ کیا نیل پالش سے سجا ناخن جڑ سے اُکھڑ گیا اور اذیت کی ایک لہر سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ شبانہ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح چیخنے لگی۔

''رُکنے کی ضرورت نہیں ہے نورے! جب تک اسے اپنے یار کا پتہ اور فون نمبر یاد نہ آ جائے تُو اس کا ایک ایک ناخن اُکھاڑتا رہ۔'' اس کی چیخوں کو خاطر میں لائے بغیر اے ایس آئی بے رحمی سے بولا۔ نورے نے فوراً ہی شبانہ کا ہاتھ جکڑ کر دوسرا ناخن بھی کھینچ ڈالا۔ یہ ناخن آدھا ہی ٹوٹا تھا لیکن شبانہ کو لگا کہ اس کے جسم سے روح پرواز کر گئی ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔

فوراً ہی اس کے چہرے پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ وہ کراہتی ہوئی ایک بار پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں درد کی بے پناہ لہریں اُٹھ رہی تھیں اور وہ باوجود کوشش کے اس درد کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

''اس کے زخموں پر نمک اور مرچ چھڑکو۔'' اے ایس آئی خالد نے ایک بار پھر بے رحمی سے حکم دیا۔



حکم کی بھی فوری تعمیل کی گئی اور شبانہ کی خونم خون انگلیوں میں گویا انگارے سے بھر گئے۔ وہ اذیت سے

بول ماسٹر کا اتا پتہ بتائے گی یا تیری تیسری انگلی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے؟ پر یاد رکھنا، اب کی مارے ناخن اُکھیڑنے تک رُکے گا نہیں۔'' اے ایس آئی نے سرد اور ظالمانہ لہجے میں اس سے کہا تو اس اندر تک لرز اُٹھی۔ یہ تکلیف ایسی نہیں تھی کہ وہ عام سی لڑکی اسے سہہ پاتی۔ درد بھرے انداز میں روتے لی۔

میرے پاس ان لوگوں کا کوئی پتہ نہیں ہے بس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔ آفتاب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کی بیٹی اُمید کے بارے میں کوئی خبر ملے تو میں اس نمبر پر فون کر کے انہیں اطلاع دے دوں۔''

ٹھیک ہے، وہ فون نمبر بتا۔'' اے ایس آئی نے اسے حکم دیا۔

نمبر میرے موبائل میں ہے اور موبائل اس بیگ میں ہے جو تم لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ہے۔'' اس کچھ اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے جواب دیا۔

جا بھئی نورے! تُو جا کر اس کے موبائل میں نمبر چیک کر، میں اسے چیک کرتا ہوں۔'' اے ایس آئی ات سے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے سنتری کو حکم دیا تو وہ دانت نکالتا ہوا باہر چلا گیا۔

س کے باہر نکلتے ہی اے ایس آئی، شبانہ پر پل پڑا۔ اس کا چیخنا چلانا، رونا دھونا سب بے کار گیا اور وہ رے کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

سوں سے سنبھال کر رکھی دوشیزگی کی دولت یوں لٹی کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکی اور اذیت ناک انداز میں رہی لیکن اسے کہاں معلوم تھا کہ اذیت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم ہونے والا نہیں ہے، اور بھی بہت سے گِدھ ظاہر تو عوام کی خدمت و حفاظت کے لیے جسموں پر وردی سجائے گھومتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی نوچنے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بے بس شبانہ تو ان کا بہترین شکار تھی، وہ اسے کیوں ے۔ چنانچہ وہ بے چاری تھانے کی چاردیواری کے اندر لٹتی رہی اور باہر چور اچکے مزے سے گھومتے کوئی نہیں تھا جو اس مظلوم لڑکی کی دادرسی کرتا، جو اپنی خاموش محبت کے جرم میں اتنی بڑی سزا کاٹ رہی یہاں تک کہ وہ شخص جس کی خاطر وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی، اس سے بہت دُور اپنی محبوب بیوی جوئی میں مصروف تھا۔ شاید خاموش محبتوں کا نصیب ہی یہ ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا اندر سے جل مرتا ن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔

⊛----✪----⊛

''چودھری صاحب! وڈی چودھرائن کی حالت وڈی خراب ہے۔ انہیں کھانا ہضم ہی نہیں ہو رہا، ہور وہ اُلٹیاں کر رہی ہیں۔ جو نوکرانی انہیں کھانا پہنچانے جاتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ کل سے انہوں نے کچھ ایا، صرف پانی پر ہی ہیں، ہور وہ بھی ان کے پیٹ میں نہیں ٹھہر رہا۔ ابھی وہ دوپہر کا کھانا پہنچانے گئی تھی ی تھی کہ وڈی چودھرائن بالکل نڈھال پڑی ہیں اور پکار کا جواب نہیں دے رہیں۔ اب آپ بتائیں صاحب! کہ کیا کرنا ہے؟ اگر کچھ ہو گیا تو کہیں مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔''

شی اللہ رکھا، چودھری کے سامنے دست بستہ کھڑا دھیمی آواز میں اسے تہ خانے میں قید وڈی چودھرائن کی سے آگاہ کر رہا تھا۔

''مرتی ہے تو مر جائے۔ مجھ سے غداری کرنے کا مزہ تو چکھے وہ۔'' چودھری نے غصے سے جواب دیا۔

''دیکھ لیں چودھری صاحب! کہیں مشکل نہ ہو جائے۔ چودھرائن کے پیکے والوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو طوفان اٹھا دیں گے۔ خیر، ان کا آپ کا تو کوئی مقابلہ نہیں، پر اصل پریشانی آپ کی اپنی اولاد کی ہے۔ آدمی دوسرے سے لڑ لے، پر اپنی اولاد کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے چودھری مراد شاہ آپ کے خلاف بھڑک اٹھے تو آپ کو مشکل ہو جائے گی۔'' منشی نے اسے عقل کی راہ دکھائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اسے سوچ بچار میں مبتلا دیکھ کر منشی ایک طرف ہاتھ باندھے خاموش کھڑا ہو گیا۔ اسی اثنا میں اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تو شیدے کے دوست سومرو کا نمبر تھا۔ سومرو کے ذریعے وہ ابھی تک آفتاب اور کشور کو تلاش کروانے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے اس کی کال سننا ضروری تھا۔ کال سننے کے لیے وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہاں بولو، کیا گل ہے؟'' کال ریسیو کر کے اس نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کے لیے خوشخبری ہے۔ آپ کو جن لوگوں کی تلاش تھی، ان کا پتہ مل گیا ہے۔ وہ حیدر آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو ہوٹل کا نام، ٹیلی فون نمبر اور ان دونوں کا کمرہ نمبر بتا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے پہلے آپ کو دو لاکھ ادا کرنے ہوں گے۔ جس اے ایس آئی نے یہ سب معلوم کیا ہے، اس کا یہی مطالبہ ہے۔'' سومرو نے اسے اطلاع دی۔

''رقم مل جائے گی۔ لیکن یاد رکھنا کہ خبر غلط نہیں ہونی چاہیے۔'' منشی نے دھمکی دی۔ چودھری کا دست راست ہونے کی وجہ سے اس کے پاس اتنا اختیار تو تھا ہی کہ وہ دو لاکھ کی رقم اپنی صوابدید پر خرچ کر سکے۔

''آپ کب تک رقم بھجوا دیں گے؟'' سومرو پکا کاروباری تھا، اس کی دھمکی کا اثر لیے بغیر اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

''رقم آج رات سے پہلے تم تک پہنچ جائے گی۔ لیکن تم پتہ تو بتاؤ۔'' منشی نے جھنجلا کر اس سے مطالبہ کیا۔

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اے ایس آئی پہلے رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔''

''اس اے ایس آئی کی تو ایسی کی تیسی۔ جب میں نے کہہ دیا کہ رقم مل جائے گی تو سمجھو مل جائے گی۔ اور کوئی تمہاری طرح تھرڈ ریٹ غنڈے نہیں ہیں کہ اپنی زبان سے پھر جائیں۔'' منشی جھنجلایا۔

''معاف کرنا صاحب! ہم بے شک غنڈے ہیں لیکن ہمارے اپنے اصول ہیں۔ آپ کو ہم سے معلومات اسی صورت میں ملیں گی جب ہم تک رقم پہنچے گی۔'' سومرو اس کے لہجے پر مزید اکڑ گیا اور اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ منشی بکتا جھکتا، گالیاں دیتا واپس چودھرائن کے کمرے میں پہنچا۔

''کی گل اے منشی! وڈا غصے میں دکھائی دے رہا ہے؟'' اندر پہنچنے تک منشی نے اپنی زبان کو تو قابو کر لیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے چودھری نے بھانپ لیا کہ وہ غصے میں ہے۔ جواباً منشی نے اسے ساری بات بتا دی۔

''چنگی گل ہے، تو اُس کتے کو رقم بھجوا دے۔ پہلے اپنا کام ہو جائے، بعد میں اسے اس کی جرأت کا مزہ بھی چکھا دیں گے۔'' تفصیل سن کر چودھری نے سرد لہجے میں اپنا حکم سنایا۔

''چنگا چودھری صاحب!'' منشی فوراً حکم کی بجا آوری کے لیے تیار ہو گیا۔

''تُو اس کام کو نبیڑ، فیر نیچے چل کر چودھری کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' منشی کی عدم موجودگی میں چودھری کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا چنانچہ اس سے بولا۔



جواباً منشی ''ہلاں چودھری صاحب'' کہتا ہوا حرکت میں آ گیا۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ سے بھی کم وقفے میں ہوئی۔ اس دوران چودھری بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ اس کے ماتھے پر کم زیادہ ہوتے بل بتا رہے تھے کہ وہ کسی بخار میں مبتلا ہے۔

منشی واپس آیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ حویلی کے الگ تھلگ گوشے میں تھا اور اس گوشے میں کوئی بھی بلا اجازت قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ منشی نے وہاں پہنچ کر اپنے کُرتے کی جیب سے چابیاں نکالیں اور تالا کھولنے لگا۔ اس کے تالا کھولنے کے بعد وہ اور چودھری سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچے۔ اس علاقے کی فضا والا یہ تہ خانہ چودھری کے بزرگوں میں سے کسی نے تعمیر کروایا تھا اور اس میں الگ الگ کئی کمرے تھے۔

چودھری اور منشی اس کمرے کی طرف بڑھے جس میں وڈی چودھرائن کو رکھا گیا تھا۔ منشی نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری کے لیے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک بھبکا سا آیا۔ چودھری نے فوراً ہی اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر اندر داخل ہوا۔

وڈی چودھرائن فرش پر بچھی چٹائی پر آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹی تھی اور اس کے اردگرد اس کی اپنی اُلٹیوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ کروفر والی وڈی چودھرائن قید کے چند دنوں میں نچڑ کر رہ گئی تھی اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو جسم پر ڈھیروں ڈھیر سونا لادے، بیش قیمت لباس میں ملبوس حویلی پر حکمرانی کیا کرتی تھی۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی چاپوں کی آواز سے کسی کے آنے کا اندازہ کر کے چودھرائن نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی آمد صاف پڑھی جا رہی تھی۔ چودھری کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت لہرا کر دوڑ گئی۔

''دیکھ لیا چودھرائن! مجھ سے غداری کا انجام۔ میں نے تو تجھے حویلی کی مالکن بنا کر رکھا تھا، پر تجھے عزت راس نہیں آئی ہور تُو میری ہی جڑیں کاٹنے لگی۔ اب دیکھ تُو کس حال میں پڑی ہے۔ یہاں پڑے پڑے ہی تُو مر جائے گی ہور کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔'' برسوں سے زندگی کی ساتھی عورت کو اس حال میں دیکھ کر بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں جاگا اور رعونت بھرے لہجے میں بولا۔

''میرا خون تجھے بہت مہنگا پڑے گا چودھری! تُو دیکھ لینا کہ تیری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔'' وڈی چودھرائن کی آواز ٹھیک طرح سے نہیں نکل پا رہی تھی پھر بھی اس کی آواز میں بسی نفرت کی آنچ چودھری تک پہنچ رہی تھی۔

''چل تُو یہی خوش فہمی دل میں لے کر دنیا سے چلی جا۔ اس طرح شاید تیری موت کچھ آسان ہو جائے ورنہ تو مجھے تیری حالت بڑی پتلی نظر آ رہی ہے۔'' چودھری نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے اسے جواب دیا پھر منشی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ نمک حرام مر جائے تو اس کی لاش یہیں دفن کر دینا۔ مجھے اطلاع دینے کی کوئی لوڑ نہیں ہے۔'' یہ حکم دے کر وہ واپس پلٹ گیا۔ ہکا بکا منشی اس کے پیچھے تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ چودھری نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسری طرف بستر پر بے بس پڑی چودھرائن، چودھری کو ننگی ننگی گالیاں دے رہی تھی لیکن اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ کمرے کی فضا تک ہی محدود تھی۔ آخر بولتے بولتے اسے زور کا ٹھسکا لگا تو گالیوں کا یہ سلسلہ تھما اور وہ کھلے تکیے میں منہ دے کر بری طرح کھانسنے لگی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چراغِ آخر ہے جو بس بجھنے کو ہی ہے۔ ادھر چودھری تہ خانے سے نکل کر منشی سے پوچھ رہا تھا۔

''تینوں ملوم ہے نانشی! کہ مینوں لندن جانا ہے۔ اُدھر میں تین چار دن یا بہت ہوا تو ہفتہ بھر رہوں گا۔''

''جی سرکار!'' چودھری کی آنکھوں میں موجود سوچ کی پرچھائیوں کو دیکھتے ہوئے منشی نے تابعدارانہ جواب دیا۔

''میں ادھر سے روانہ ہو جاؤں، تب سب کو یہ گل بتانا کہ وڈی چودھرائن کی حالت بہت خراب ہے اس لیے چودھری صاحب لندن گئے ہیں۔'' اپنے ذہن میں پکتی کھچڑی کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس نے مکمل کلام کا سلسلہ شروع کیا۔

''بہت بہتر سرکار!'' برسوں سے نمک خوار منشی نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ چودھری کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ چودھری نے چودھرائن کے غیاب کے سلسلے میں سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر رکھا ہے کہ وہ شدید بیمار ہے اور لندن کے ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ تہ خانے کی تاریکی میں سزا بھگتتی قریب المرگ چودھرائن کے سلسلے میں مزید پروپیگنڈا کرنا کہ لندن میں اس کی حالت تشویش ناک ہے، اس لیے چودھری صاحب لندن جا رہے ہیں، معنی خیز تھا۔ حالانکہ چودھری درحقیقت ڈیوڈ کے حکم پر لندن جا رہا تھا۔ وہاں چودھری کے جوتوں کے کارخانے میں ہیروئن کی خفیہ لیبارٹری کے قیام کے سلسلے میں کچھ ضروری امور طے ہونے تھے۔ ابتدا میں تو یہ پروگرام تھا کہ ڈیوڈ کا کوئی نمائندہ خود آ کر اس سے ملے گا لیکن پھر اچانک ہی پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے چودھری کو لندن روانگی کے احکامات مل گئے۔ اسے وہاں کس سے اور کہاں ملنا تھا، یہ ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔ حالانکہ مزاج رکھنے والے چودھری کے لیے اس انداز سے کوئی کام کرنا بہت مشکل تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلا کا حریص بھی تھا اور جو خطیر دولت ملنے والی تھی، اس سے محروم ہونا بے وقوفی سمجھتا تھا چنانچہ خلافِ مزاج کام کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔

''چودھرائن کی حالت تُو نے دیکھ لی ہے۔ ایک آدھ دن میں یا تو وہ آپ ہی مر جائے گی یا خود اس کا صفایا کروا دینا۔ میرے پاس یہ چنگا موقع ہے کہ میں اس مصیبت سے جان چھڑا لوں۔ تُو خفیہ طریقے سے اسے تہ خانے سے نکلوا کر شہر پہنچا دینا اور اُدھر کسی برف خانے میں رکھوا دینا۔ میں لندن سے واپس پہنچ کر ایئرپورٹ پر اُتروں گا تو تب حویلی میں خبر دینا کہ وڈی چودھرائن گزر گئی ہے اور چودھری صاحب ان کی میت لے کر حویلی پہنچ رہے ہیں۔''

چودھری کا منصوبہ واضح تھا۔ مزید جزئیات بھی وقت کے ساتھ طے کی جا سکتی تھیں۔ اصل میں چودھری غصے میں چودھرائن کے لیے تہ خانے کی قید کی سزا نافذ کر کے پھنس گیا تھا۔ اب اگر وہاں سے اسے زندہ سلامت کر آزاد کر دیا جاتا تو وہ انتقام پر اُتر آتی اور اس کے لیے مشکلات کھڑی کر دیتی اس لیے موجودہ صورت حال سے نمٹنے کا سب سے اچھا حل یہی تھا کہ چودھرائن کا وجود ہی مٹا دیا جائے۔ اس طرح نہ بانس رہتا اور نہ بانسری بجتی۔

''تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! میں سب سمجھ گیا ہوں۔ آپ سرکار جب لندن سے واپس آئیں گے تو یہاں سب ٹھیک ملے گا۔'' رمز شناس منشی کے لیے اتنی تفصیلات کافی تھیں، باقی کام وہ خود انجام دے لیتا۔ چودھری کے لیے کام کرنے والے ایسے نمک خواروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جو صفائی سے یہ سارا کام نمٹا دیتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو پاتی۔

''مجھے تجھ پر بھروسہ ہے منشی! ایک تُو ہی ہے جسے کوئی بھی کام کہہ کر میرا بوجھ آدھا ہو جاتا ہے۔'' چودھری نے اس کا اعتراف کیا۔



''میں آپ کا نمک خوار ہوں سرکار! وقت پڑا تو آپ پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ مجھے تو یہ ہاتھ کے کام کرنے والے بندوں کی نااہلی آپ کے سامنے شرمندہ کروا دیتی ہے ورنہ میرا بس چلے تو آپ کی زبان سے کلمہ نکلنے سے پہلے اس کی تعمیل ہو جائے۔'' منشی نے فوراً خوشامد کی۔ اس خوشامدانہ رویے کی وجہ سے بھی وہ چودھری کا منظورِ نظر تھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ مینوں ملوم ہے کہ تُو کوئی مار دھاڑ کرنے والا بندہ نہیں ہے، نہ ہی اب تیری ایسی عمر ہے کہ بالوں کی طرح بھاگ دوڑ کر سکے۔ پر تُو اتنا خیال رکھا کر کہ ان منڈوں کی رسّی کھینچ کر رکھ۔ اب یہی لے کہ پچھلے دنوں شیدے اور اس کے سنگیوں نے کیسی بے پروائی دکھائی ورنہ تو اب تک ہمارا مسئلہ حل ہو چکا۔'' چودھری اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اپنے مخصوص کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شیدے کی نااہلی کا اسے اتنا غصہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی آفتاب کی بیٹی اُمید کو لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں کسی نے اُنہیں آ لیا۔ اس کارروائی میں شیدا اتنا شدید زخمی ہوا تھا کہ اگر جلد ہسپتال نہیں پہنچایا جاتا تو زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیتا۔ اب بھی اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ باقی بھی شدید زخمی تھے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر صاف ظاہر تھا کہ حملہ آوروں نے انہیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی پوری کوشش کی تھی۔

وہ لوگ چلتے ہوئے چودھری کے خاص کمرے تک پہنچے تو باہر مؤدب کھڑے ایک ملازم نے پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ چودھری پورے کروفر کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا جبکہ اس سے ایک قدم پیچھے چلتے منشی نے ملازم نے اشارے سے روک لیا۔ روکنے کے بعد ملازم نے اسے جو خبر دی، اسے سن کر منشی خوش ہو گیا اور اس کی جل و خروش میں بھرا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

اس دوران چودھری نے اپنے شاہانہ تخت پر نشست جما لی تھی اور حقے کی نے منہ سے لگائے اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھا۔ حقہ پینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگرچہ بڑی پارٹیوں میں یا شہری افسران سے ملاقات کے دوران سگار اور پائپ سے بھی شغل کر لیتا تھا لیکن حقہ اسے سب سے بڑھ کر محبوب تھا۔

''ایک خوشخبری ہے چودھری صاحب!'' منشی نے اندر داخل ہوتے ہی اس سے کہا۔

''سنا ڈال، آج کل ویسے بھی اچھی خبریں کم ہی ملتی ہیں۔'' حقے کی نے منہ سے ہٹا کر چودھری نے اس سے کہا۔

''وہ سادھو پکڑا گیا ہے۔ وہ اپنی گھر والی اور دِھی کے ساتھ گجرات جانے والی بس میں بیٹھا تھا کہ ہمارے بندوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے پاس سے اچھی خاصی رقم بھی ملی ہے۔ ملوم ہوا ہے کہ اس نے یہ رقم شہر بار سے میرے کا پتہ بتانے کے لیے لی تھی پر اس کا کہنا ہے کہ وہ فرماں بردار حضور ہی کا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ شہریار کو راستے سے بھٹکا کر موقع ملتے ہی جان سے مار دے لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی اور وہ سرکار کے خوف سے بھاگ نکلا۔'' ابھی جو تفصیلات دروازے پر راستہ روکنے والے ملازم نے اس کے گوش گزار کی تھیں، وہی اس نے چودھری کے سامنے دہرا دیں۔

''ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو، پر اب ہمارے لیے وہ بیکار ہے۔'' ساری بات سن کر چودھری رعونت سے بولا۔

''فیر کیا حکم ہے سرکار! اس کا کام تمام کر دیا جائے؟'' منشی نے اس کا موڈ بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

''کرنا تو یہی پڑے گا پر ہم اسے آسان موت نہیں دینا چاہتے۔ اس نے ایک طرح سے ہمارے سا
غداری کی ہے اور غداروں کو نمونۂ عبرت بنانا ضروری ہوتا ہے۔ تو ایسا کر کہ اس کی گھر والی اور دِھی کو تو حویلی
خدمت گاروں میں شامل کر دے ہور اسے وہ جو گاؤں کی پرلی طرف سوکھے کنوئیں کے ساتھ برگد کا درخ
ہے، اس کے ساتھ باندھ کر ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھکوا دے۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی یاد سے ٹھنسوا دیا
چودھری کے اذیت پسند اور شیطان فطرت دماغ نے سزا کا ایک نیا ڈھنگ نکال لیا۔

اس نے سادھو کو سزا دینے کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، وہاں لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ بالکل
نہیں تھا۔ کوئی اتفاقاً ہی اُدھر جا نکلتا تو الگ بات تھی ورنہ کنوئیں کا پانی خشک ہو جانے کے بعد وہ متروک ہو گیا
اور برگد کا درخت آسیب زدہ مشہور تھا چنانچہ گاؤں والے کچھ خوف کے باعث اور کچھ ضرورت نہ ہونے
سبب اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اس پر سے جب سادھو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جاتا تو وہ کسی کو
مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ وہاں یقیناً ایک اذیت ناک موت مرتا اور جانے اس کے مرنے کے
عرصے بعد اس کی لاش دریافت ہوتی۔ چودھری کے لیے یہ سب اہمیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود لندن کی آ
فضاؤں کے لیے پرواز کرنے والا تھا جہاں عیش وعشرت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ مزید دولت اس کی منتظر تھی
وہ لندن میں رہ کر مزے لوٹ کر واپس آتا تو یہاں وڈی چودھرائن کا کانٹا بھی نکل چکا ہوتا۔ دیکھا جائے تو
اب بھی پورے مزے میں تھا۔ اگر ایک کشور والی پھانس سینے میں نہ گڑی ہوتی تو راوی اس کے لیے چین ہی
چین لکھتا۔

⊛----✪----⊛

''آپ کے لیے کسی منشا صاحب کا فون ہے سر!''

''او کے ملا دو۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اگلے ہی لمحے لائن ملا دی گئی۔ دوسری طرف حسبِ توقع آفتاب ہی تھا جو یقینی طور بہت پریشانی میں مبتلا
چنانچہ رسمی گفتگو کے بجائے براہِ راست بولا۔

''مجھے آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے سر!''

''میرا موبائل نمبر نوٹ کر لو اور اس پر کال کرو۔'' اس نے آفتاب کو مزید گفتگو کا موقع دیے بغیر سنجی
کے ساتھ حکم دیا اور تیزی سے اپنا نمبر نوٹ کروایا۔

ٹیلی فون آپریٹر کے چودھری کا مخبر ہونے کا شک ہو جانے کے بعد سے وہ کوئی بھی اہم نوعیت کی گفتگو
لائن پر کرنے سے گریز کرنے لگا تھا۔ عبدالمنان نے مشورہ بھی دیا تھا کہ آپریٹر اور مشتبہ کلرک کو کہیں اور ٹرانسفر
دیا جائے لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ موجودہ مخبران کی نظروں میں تھے اس لیے وہ ان سے آرام سے احتیاط
سکتے تھے، بعد میں چودھری کوئی نیا مخبر بناڈالتا اور وہ نظر میں نہ آپاتا تو پریشانی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

''سوری سر! میں اپنا موبائل کھو بیٹھا ہوں اور آپ کا موبائل نمبر میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہا اس
مجبوراً مجھے دفتر کے نمبر پر کال کرنا پڑی۔'' چند لمحوں میں ہی اس کے موبائل پر آفتاب کی کال آ گئی اور اس
معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا۔

''مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں کس سلسلے میں میرے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے
اس نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔



''یعنی آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میری بیٹی، چودھری کے قبضے.....'' آفتاب کی آواز رندھ سی گئی۔

''تمہاری بیٹی چودھری کے قبضے میں نہیں ہے۔ اسے چودھری تک پہنچنے سے پہلے ہی آزاد کروا لیا گیا تھا۔
ات وہ کراچی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ میں تمہیں ایک کاٹیکٹ نمبر دے رہا ہوں، اس
رابطہ کر کے تم کراچی پہنچ جاؤ۔ میرا آدمی تمہیں تمہاری بیٹی تک پہنچا دے گا۔'' اس نے آفتاب کی کیفیت کو
ہوئے فوری طور پر اسے اُمید کے بارے میں بتایا۔

''تھینک یو ویری مچ سر! آپ کے مجھ پر پہلے ہی بہت احسان ہیں لیکن یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں
ں بھی تو کبھی نہیں اُتار سکوں گا۔'' آفتاب جذباتی ہو گیا۔ بیٹی کے زندہ سلامت اور محفوظ ہونے کی خوشی اتنی
ی کہ اس نے تفصیلات جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ حقیقتاً کشور کے اُمید کے بارے میں سوال جواب
ا اپنی ذاتی کیفیات کی وجہ سے وہ اس اسٹیج پر پہنچ گیا تھا کہ خود سے اپنے آپ کو چودھری کے سامنے پیش
ے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شہریار کو اس نے اپنے اس ارادے سے باخبر کرنے اور مشورہ کرنے کے لیے ہی فون
ا۔

''میں تمہیں تمہاری بہت سی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں آفتاب! تم چودھری جیسے شخص کے سامنے
کر جس طرح پیر آباد میں اسکول چلا رہے تھے، اس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اگر تم اپنے مخصوص
ے سے ہٹ کر دوسری سمت میں نہ جا نکلتے تو ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے معاون ثابت ہوتے۔
ال، اب تم جن حالات کا شکار ہو، ان سے بچاؤ کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم کچھ سالوں کے لیے
چھوڑ کر باہر چلے جاؤ۔ تم ایک ذہین اور مخلص آدمی ہو اور ایسا شخص جان بچا بچا کر بھاگنے کے چکر میں ایک
لک کر نہیں بیٹھے گا تو ضائع ہو جائے گا۔ فی الحال تم اپنے اسکول والے پروجیکٹ پر کام کرنے کے قابل
رہے ہو لیکن تمہارے پاس قلم کی طاقت تو ہے نا۔ یہاں سے دُور کہیں سکون سے بیٹھو گے تو اپنے قلم اور
کا بہتر استعمال کر سکو گے۔'' اس نے بہت سنجیدگی کے ساتھ آفتاب کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! مجھے اب اسی نہج پر سوچنا ہوگا۔ اگرچہ میں پڑھے لکھے افراد کے بیرونِ ملک
ہونے کا شدید مخالف رہا ہوں لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں ملک میں رہ کر تو نہیں البتہ یہاں سے دور
کچھ نہ کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔ کچھ بھی نہ کرنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ میں کچھ تو کر سکوں۔''
ب شاید خود بھی پہلے سے اسی نہج پر سوچ رہا تھا چنانچہ اس سے فوراً ہی متفق ہو گیا۔

''وِش یو آل دا بیسٹ۔ جا کر اپنی بیٹی سے ملو اور پھر بیرونِ ملک منتقلی کے سلسلے میں کارروائی شروع کر دو۔
یں پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو بتا دینا، میں جو کر سکا ضرور کروں گا۔'' اس نے اتنا کہہ کر گفتگو کا
لہ منقطع کر دیا اور آفتاب سے اجازت چاہی۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالمنان سے اندر آنے کا کہا۔

''یس سر!'' وہ فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

''پیر آباد چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کافی دن ہو گئے، وہاں کا دورہ نہیں کیا۔ چودھری سے تھوڑی
چھاڑ ہی کر لیں گے۔ ذرا پتہ تو چلے کہ حالیہ ناکامی نے اس پر کیا اثر ڈالا ہے۔''

''او کے سر! میں مشابرم خان سے گاڑی تیار کرنے کا کہہ دیتا ہوں۔ آپ بتا دیں کہ کب تک نکلنا ہے۔''
لمنان فوراً مستعد ہو گیا۔

''بس پندرہ منٹ بعد نکلتے ہیں۔'' اس نے بتایا تو عبدالمنان باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد اس

نے میجر ذیشان کا نمبر ملایا۔

''کیا خبریں ہیں میجر صاحب! آپ کی طرف سے بالکل خاموشی ہے۔ ہم نے جو بندہ آپ کے حوالے کیا تھا، اس سے کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں یا نہیں؟'' سلسلہ ملنے کے بعد اس نے پہلے تو رسمی علیک سلیک کی، پھر استفسار کیا۔ اس کا یہ استفسار اشیش کمار المعروف غلام محمد کے بارے میں تھا۔

اشیش کمار مبینہ طور پر ''را'' کا ایجنٹ تھا جو مولوی کا روپ دھار کر چھوٹے گاؤں دیہاتوں کے علاقوں میں معصوم ذہنوں کو بھٹکانے اور دین کی غلط تصویر کشی کر کے انہیں شدت پسند بنانے کے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی شاہنواز کے بھی اللہ آباد میں اسی جرم میں ملوث ہونے کے شواہد ملے تھے۔ شاہنواز تو گرفتار ہونے سے قبل ہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرار کے وقت اشیش بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ یہاں سے نکل کر ایک اور دیہات میں روپ بدل کر اپنے مشن پر جت گیا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ آفتاب اور کشور پناہ کے لیے اسی دیہات تک پہنچ گئے۔ یوں اشیش کی وہاں موجودگی کا انکشاف ہوا اور شہریار نے میجر ذیشان کی مدد سے اسے گرفتار کر لیا۔

میجر ذیشان بلتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے شدت پسندوں کے ایک اہم ٹھکانے سے انکوائری کرنے والی انٹیلی جنس کی ٹیم میں شامل تھا۔ ''موساد'' کی خاص ایجنٹ لنڈا نے اپنے حسن کے جادو سے اسے زیر کیا اور بہت سی اہم معلومات حاصل کر کے اُڑ گئی۔ میجر ذیشان یوں بھی محبِ وطن تھا، اس واقعے کے بعد احساسِ شرمندگی نے اسے مزید اُکسایا کہ وہ دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شہریار سے تعاون قبول کر لیا۔ اُس کی اس حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے شہریار نے اشیش کو اس کے حوالے کرنا منظور کر لیا تھا لیکن مسلسل یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ معاملہ اب کہاں تک پہنچا۔

''ہم اس سے زیادہ کارآمد معلومات حاصل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس نے اعتراف ضرور کر لیا ہے کہ شاہنواز اس کا ہی ساتھی تھا جس کا اصل نام انیل پانڈے ہے اور انیل پانڈے وہی آدمی ہے جس نے اپنے ٹرینڈ کیے ہوئے لڑکوں کی مدد سے نہ صرف نور پور میں خودکش دھماکا کروایا تھا بلکہ وہ بھی کئی مقامات پر ایسا کروا چکا ہے اور اب بھی مسلسل اس کام میں مصروف ہے۔ لیکن اس نے پانڈے کے ٹھکانے سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ وہ حقیقت میں بے خبر ہے یا کافی سخت جان ثابت ہو رہا ہے کہ ہم اس سے پانڈے کا پتہ اُگلوانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ بہرحال، جو بھی ہو آپ اطمینان رکھیں کہ ہم ان ملک دشمنوں کی گردن تک ضرور پہنچیں گے۔'' میجر ذیشان نے اسے مختصر الفاظ میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''میرے ڈرائیور کا خیال ہے کہ انٹیلی جنس والے بہت سست جا رہے ہیں۔ اگر میں پانڈے کو آپ کے بجائے اس کے حوالے کرتا تو وہ چند گھنٹوں میں ہی اس سے سب کچھ اُگلوا لیتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے موقع پر پیش کیے جانے والے مشابرم خان کے خیالات سے آگاہ کیا۔

''ہو سکتا ہے کہ واقعی ایسا ہو لیکن ہم اپنی جگہ مجبور ہیں۔ اشیش کے ملک دشمن ہونے کے باوجود ہم اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتے۔ کم از کم مجھے اپنی وردی کا بہت پاس رہتا ہے اور اس وردی کو پہن کر کوئی بھی کام قانون یا ضابطے سے ہٹ کر کرنا مشکل سے ہی پسند کرتا ہوں۔ کبھی لگا کہ وردی میرے مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے تو پھر اسے اُتار کر میدان میں اُتروں گا۔'' اس کے ہلکے پھلکے جملے کا میجر ذیشان بھرپور سنجیدگی سے جواب دیا۔



''مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے میجر صاحب! لیکن بس سینے میں ہر دم ایک آگ سی جلتی رہتی ہے جو مجبور کرتی ہے کہ کسی ملک دشمن کو اس سرزمین پر چلنے پھرنے اور سانس لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے کبھی کبھی میں خود بھی اپنے ڈرائیور ہی کی طرح جذباتی ہو جاتا ہوں۔'' اس نے فوراً ہی وضاحت دی۔

''میں سمجھتا ہوں۔ میرے اپنے جذبات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں لیکن فوجی تربیت اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ جس روز لگا کہ میں حدود و قیود میں رہ کر کام نہیں کر سکوں گا، اس روز اس کو زنجیروں سے آزاد کروا لوں گا۔'' میجر ذیشان کا لہجہ سنجیدہ مگر نرم تھا۔

''میری خواہش ہے کہ ایسی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے آرمی اپنے شوق سے ہی جوائن کی ہو گی۔ اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بہرحال آپ ایک اچھے اور محبِ وطن آفیسر ہیں اور ہمارے اداروں کو ہر جگہ آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ پھر آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں وطنِ عزیز کا کثیر سرمایہ بھی تو خرچ ہوا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ہماری فوج آپ سے محروم ہو۔ بہرحال مجبوری اور حالات کے تحت آپ کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔'' اس نے میجر ذیشان کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر ایک آدھ مزید رسمی جملے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ عبدالمنان نے اسے گاڑی تیار ہونے کی اطلاع دے دی۔ وہ چودھری سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے خیال سے مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اور چودھری کے درمیان جو جنگ جاری تھی، اس میں ابھی تک کسی کو واضح برتری حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کبھی چودھری اس پر ضرب لگا دیتا اور کبھی وہ اسے زک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک طرف اگر اپنی طاقت اور گھمنڈ کا بت سلامت رکھنے کے لیے ہر حربہ آزمایا جا رہا تھا تو دوسری طرف وہ اس بت کو پاش پاش کر دینے کی خواہش میں شدت سے کوشاں تھا۔

پہلے وہ قانونی راستے سے چودھری سے نمٹنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن جب چودھری نے اس پر کئی اوچھے وار کر ڈالے تو وہ خود بھی انگلیاں ٹیڑھی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کام میں اسے جگو کا زبردست تعاون بھی میسر آ گیا تھا۔ جگو کے شدید بیمار بیٹے کی خاطر اپنا دورہ منسوخ کر کے اسے ہسپتال پہنچاتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ جو کام وہ انسانی ہمدردی کے باعث کر رہا ہے، وہ آگے چل کر اس کے لیے کتنا سودمند ثابت ہو گا۔ اس کے اکلوتے احسان کے بدلے میں جگو اس کا ایسا گرویدہ ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ حالانکہ وہ شہر میں رہ کر جس سیاسی پارٹی کے لیے غنڈہ گردی کر رہا تھا، یقیناً اس کی بھی بہت سی ذمے داریاں اس کے سر پر ہوں گی مگر شہریار کے کام کے آگے اس نے کبھی اپنی کسی مصروفیت کا عذر پیش نہیں کیا تھا اور ہر بار فوراً ہی لبیک کہتا تھا۔

دفتر سے نکل کر پیر آباد پہنچنے میں جو طویل وقت صرف ہوا، اس میں وہ عبدالمنان کے ساتھ ضلع میں جاری ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ نور پور میں کام مکمل ہو چکا تھا۔ اسکول اور ہسپتال کے لیے عملے کا انتخاب بھی کیا جا چکا تھا اور امید تھی کہ چند ایک روز میں وہاں درس و تدریس اور علاج معالجہ شروع ہو جائے گا۔ اللہ آباد میں انہوں نے شاہنواز کے خالی کیے ہوئے مدرسے کی عمارت کو ہی ٹھیک کروا کر وہاں فوری طور پر دو اساتذہ کا تقرر کر دیا تھا۔ اس طرح وہاں ایک طرح سے اسکول شروع ہو گیا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے اس کا دائرہ کار بہت وسیع نہیں تھا۔ اگر وہ مضبوط خاندانی پس منظر کا مالک نہ ہوتا تو جو کچھ کر رہا تھا، وہ بھی کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے کے باوجود اپنے نیچے والوں سے غافل نہیں ہو پاتے اور خواہش مند رہتے ہیں کہ بے چارگی کی زندگی گزارنے والے ان افراد کو

کم از کم بنیادی انسانی حقوق تو حاصل ہو جائیں۔ اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ برسرِ پیکار تھا لیکن اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے ان پروجیکٹس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے کے علاوہ دوسرے محاذوں پر بھی لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف چودھری اور اس کے گرگے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے تو دوسری طرف ''را'' کے ایجنٹوں سے بھی وقتاً فوقتاً مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔

اندرونی اور بیرونی ان دشمنوں سے نمٹنے کے چکر میں وہ اپنی توجہ کسی ایک نقطے پر مرکوز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر اس کی ذاتی زندگی بھی ایک بڑے طوفان سے گزری تھی۔ اس کے دل نے جسے چاہا تھا، وہ اس پر اپنی چاہت کے اظہار کا ابھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ بالکل حادثاتی طور پر ماریہ اس کی زندگی میں آ گئی۔ ماریہ پڑھی لکھی باشعور عورت تھی جسے ناپسند کرنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا کہ وہ کم عمر، نازک سی، قدرے کم تعلیم یافتہ دوشیزہ پر مرمٹا تھا اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ وہ راحتِ دل خود نہ جانے کن مصائب میں پھنسی اِدھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اگر ماہ بانو کی زندگی میں ہی کچھ ٹھہراؤ اور سکون آ جاتا تو اس کے دل کو چین آ جاتا اور وہ یہ سوچ کر کہ بے شک میں اسے اپنا نہیں سکا لیکن وہ جہاں ہے خوش ہے، صبر کر لیتا۔ اب تو یہ صورتِ حال تھی کہ اس نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے بہانے ماہ بانو کی تلاش میں اتنا بڑا آپریشن کروا ڈالا تھا لیکن ماہ بانو ہی غائب تھی۔ اس کے ساتھ ہی جمرو اور اسلم نامی ڈاکو کے علاوہ ایک اور قیدی عورت للی بھی غائب تھی۔ وہ چاروں جانے کہاں اور کس سمت میں نکل گئے تھے کہ جنگل میں سرچ آپریشن کرنے والی پولیس پارٹی بھی ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

اپنی سوچوں میں غلطاں پیر آباد تک کا سفر کیسے طے ہوا، معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ وہ اس وقت چونکا جب مرکزِ صحت کے باہر لگی لوگوں کی بھیڑ پر نظر پڑی۔ بھیڑ میں شامل لوگوں کے چہروں پر دور سے ہی غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی اور وہ زور زور سے بول رہے تھے۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' وہ مضطرب ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ماریہ وہاں آئی ہوئی ہے اور اس کی موجودگی میں مرکزِ صحت کے باہر نظر آنے والے اس ناخوشگوار منظر نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید کسی مریض کی موت واقع ہو گئی ہے اور مریض کے لواحقین اس کے مرنے کا الزام ماریہ یا دوسرے ڈاکٹر کے سر دھر کر ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

مشابرم خان نے اس کے حکم پر گاڑی اسی مقام پر روک لی اور وہ گاڑی سے اُتر کر ہجوم کی طرف بڑھا۔ مشابرم خان بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی چپک گیا۔ اس نے اپنی اسٹین گن بھی گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے نکال کر ساتھ ہی لے لی تھی تاکہ اگر کوئی شہریار کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو ڈر کر دبک جائے۔ عبدالمنان اگرچہ غیر مسلح تھا پھر بھی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے بائیں جانب چوکنا ہو کر چل پڑا۔

''لو، وڈے صاحب آ گئے۔ اب ان کے سامنے مامله رکھو۔'' ہجوم میں سے کسی نے شہریار کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

''یہ تو ڈی چنگی گل ہے۔ اب یہ آپ ہی اپنی گھر والی سے نمٹ لیں گے۔'' زہرخند لہجے میں یہ جملہ نہ جانے کس نے ادا کیا تھا لیکن شہریار کو اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے خدشات کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کا رخ اگرچہ مرکزِ صحت کے دروازے کی طرف تھا لیکن دو بزرگ صورت دیہاتیوں کے سامنے آ جانے پر قدم روکنے پڑے۔



''سلام صاحب!'' ان دونوں نے اس سے باقاعدہ کلام کا آغاز کرنے سے پہلے سلامتی بھیجی جس کا اس نے باآواز بلند جواب دیا اور پھر خود ہی پوچھ لیا۔

''کیا مسئلہ ہے بزرگو! آپ لوگ اس طرح یہاں کیوں جمع ہیں؟''

''ہم یہاں اس بدمعاش زنانی کے لیے کھڑے ہیں جسے ہسپتال والوں نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس عورت نے بہت وڈا جرم کیا ہے ہور ہم چاہتے ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم گناہ گارن کو آپ سزا دے لیں گے۔ باقی ہمارا ہسپتال والوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔'' دونوں میں سے ایک نے کسی حد تک معاملے کی وضاحت کی۔ شہریار کے سامنے ادب کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کے لہجے سے طیش جھلک رہا تھا۔

''کون ہے وہ عورت؟ اور اس نے کیا جرم کیا ہے؟'' اس نے ہموار لہجے میں سوال کیا۔ خود سے ہم کلام ہونے والے کے الفاظ نے اسے کسی حد تک یہ یقین تو دلا دیا تھا کہ درپیش مسئلے کا براہِ راست ماریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک کھٹک سی تو تھی کیونکہ ہجوم میں سے کسی نے واضح طور پر اس کی گھر والی یعنی ماریہ سے اس کے نمٹنے کا ذکر کیا تھا۔

''شہزادی نام ہے جی اس عورت کا ہور اور اس کا جرم اتنا وڈا ہے کہ آپ بھی سن کر کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ ساری حیاتی گزر گئی پر پہلے کبھی ایسی گھناؤنی حرکت کرنے والی عورت سے سامنا نہیں ہوا۔ وہ تو عورت کے نام پر دھبا ہے دھبا۔'' عمر رسیدہ شخص اپنی کان کی لو کو ہاتھ لگا کر بولا اور ساتھ ہی عورت کو ایک موٹی سی گالی بھی دے ڈالی۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہو گی بزرگو! اگر آپ مجھے اس عورت کا جرم بھی بتا دیں۔'' ابھی تک اصل معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور وہ دونوں سسپنس ہی پھیلانے میں لگے ہوئے تھے اس لیے اس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ پھر بھی اس نے اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر بڑی رسان سے سوال کیا۔

''وڈا گھناؤنا جرم کیا ہے جی اس نے۔ اس سے پہلے تو یہ فیر بھی سننے میں آیا تھا کہ لوگ مُردوں کا کفن چرا لیتے ہیں لیکن وہ ڈائن تو کفن چوروں سے بھی بڑھ کر نکلی۔ اُس بلا نے تو مُردے ہی چرانے کی کوشش شروع کر دی۔'' بزرگ کا وہ انکشاف یقیناً بہت ہولناک تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس جرم میں ایک عورت ملوث پائی گئی تھی۔

''یہ کب کا واقعہ ہے؟ اس عورت کو آپ لوگوں نے کب پکڑا؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے جرائم تو عام طور پر رات کی تاریکی میں انجام دیئے جاتے ہیں لیکن یہاں آثار بتا رہے تھے کہ عورت دن کی روشنی میں یہ کام کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔ اگر وہ رات میں پکڑی گئی ہوتی تو یہاں مرکزِ صحت میں اسے پناہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ جس طرح مشتعل نظر آ رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ رات میں گرفتار ہوئی ہوتی تو اب تک اس کا بھرکس نکالا جا چکا ہوتا۔

''زیادہ دیر نہیں گزری جی۔ بس یہی کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہو گا۔ گل یہ ہے کہ دو دن پہلے مختار موچی کا نو دس سال کا پُتر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ چھوٹا سا بچہ تھا، اس لیے کوئی قُل وغیرہ کروانے کی لوڑ ہی نہیں تھی کہ کوئی فاتحہ وغیرہ پڑھنے بچے کی قبر پر جاتا، پر کاکے کی ماں اچانک ہی مچل گئی کہ مجھے اپنے کاکے کی قبر پر جانا ہے۔ اس کی ضد دیکھ کر مختار اسے قبرستان لے گیا۔ دوپہر کے وقت اُدھر کوئی مشکل سے ہی جاتا ہے۔ کسی کو اپنے مُردے کے لیے فاتحہ پڑھنی بھی ہو تو وہ عصر مغرب کے درمیان ادھر کا رخ کرتا ہے شاید اسی وجہ سے شہزادی نے اپنے

گندے کام کے لیے وہ وقت چنا تھا۔ مختار اور اس کی گھر والی قبرستان پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں کے کاکے کی قبر پائینتی سے کھلی ہوئی ہے اور شہزادی ایک تیز چھرے سے اس کی ٹانگ کاٹ رہی ہے۔ ان کی چیخ و پکار سن کر وہ قبرستان سے بھاگ نکلی۔ شاید اس کا ارادہ گاؤں سے باہر نکلنے کا تھا لیکن مختار بھی ہوا اس کے پیچھے ہی دوڑ پڑا۔ مختار کی ٹانگ میں ہلکا سا لنگ ہے اس لیے وہ بہت تیز نہیں بھاگ سکتا، پر شور مچانے پر اِدھر اُدھر کام کرتے لوگ چوکنے ہو گئے اور شہزادی کو جا لیا۔ مختار نے پکڑنے والوں کو سارا تو انہوں نے غصے میں آ کر شہزادی کی ٹھکائی شروع کر دی۔ ہو سکتا تھا وہ موقع پر ہی جان سے ماری جا اسی وقت آپ کی بیگم صاحبہ کی گڈی ادھر پہنچ گئی۔ انہوں نے کسی کی کچھ بھی سنے بغیر زبردستی شہزادی کو میں بٹھایا اور ادھر لے آئیں۔ مارنے والے آپ کی بیگم سے تو جھگڑا نہیں کر سکتے تھے نا اس لیے شہزاد کے حوالے کر دیا تھا، پر اب سارے گاؤں کا یہی کہنا ہے کہ شہزادی کا جرم بہت گھناؤنا ہے اور اسے ایسے نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر صاحبہ کو اسے ہمارے حوالے کرنا ہو گا فیر ہم خود اسے دیکھ لیں گے۔''

اس شخص نے سارا قصہ مع اپنے مطالبے کے اس کے سامنے بیان کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر وہ لوگوں کے جذبات اور ماریہ کی دخل اندازی دونوں کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ لوگوں کے نزدیک شہزادی نامی جرم انسانیت سوز اور ناقابل معافی تھا جبکہ ماریہ جیسی پڑھی لکھی عورت کسی بھی انسان کو ماورائے عدا دینے کی قائل نہیں ہو سکتی تھی۔

''اگر آپ لوگ تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں اندر جا کر صورت حا کرتا ہوں، پھر آپ لوگوں سے مزید بات کروں گا۔'' اس نے نہایت خلیقانہ انداز میں ان لوگوں بظاہر اس کے مخاطب وہ دونوں بزرگ ہی تھے لیکن اس نے آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ ہجوم میں شامل افراد بھی سن سکیں۔

''اندر جا کر یہ خود بھی اپنی گھر والی سے مل جائے گا۔ افسوس کہ چودھری صاحب پنڈ میں نہیں ہ آپ ہی یہ مامله نبیڑ لیتے۔'' اس باریوں کھلے عام اپنے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والا اس کی نظر میں یقیناً چودھری کا کوئی پٹھو تھا جو اپنے آقا کا نمک حلال کرنے کے لیے مسلسل زہر اُگل رہا تھا جس کا خاص اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے لیے شہریار محض مستقبل کے سہانے سپنے دکھانے والا کو داں نہیں تھا بلکہ ایک ایسا مخلص اور ایمان دار افسر تھا جس نے ہر موقع پر ان کی عملی مدد کی تھی۔ ایسے خلاف بھڑکنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا چنانچہ ہجوم میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی البتہ اس شخص کی زہر نتیجے میں اسے اتنا علم ضرور ہو گیا کہ چودھری پنڈ سے باہر ہے۔

''پھر مجھے اجازت ہے؟'' اس نے چودھری کے پٹھو کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سامنے کھڑ عمر رسیدہ افراد سے کہا۔

''آہو جی، بالکل..... جیسی تہاڈی مرضی ہے۔'' ایک بااختیار افسر کا اپنے ساتھ عاجزانہ رویہ انہ متاثر کر گیا اور انہوں نے بیک وقت اسے خوشی سے اجازت دے ڈالی۔ اس نے آگے بڑھ کر مرکز دروازے پر دستک دی۔ مشابرم خان اور عبدالمنان اس کی پشت پر اس طرح آ کھڑے ہوئے کہ ہ کے مابین فاصلہ قائم ہو گیا۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ کھلتا تو ہجوم میں سے کوئی فرد ا ہٹائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ان دونوں کی اصل طاقت مشابرم خان کے ہاتھ میں موجود ا جسے اس نے خاص طور پر نمایاں کر رکھا تھا۔



س کی دستک کے جواب میں اندر سے بہت احتیاط کے ساتھ ذرا سا دروازہ کھولا گیا اور ایک مردانہ سرگوشی ں۔ یہ ڈاکٹر داور تھا جو اسے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ شہریار دروازے میں بننے والے مختصر خلا سے اندر داخل ہوا، اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

تھینکس گاڈ کہ آپ یہاں آ گئے ورنہ صورت حال بہت خراب ہو سکتی تھی۔'' ڈاکٹر داور کے چہرے کی اُڑی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اندر کسی درز سے باہر کا منظر دیکھتا رہا تھا جب ہی اس کی پہلی دستک کے ہی میں فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

''آپ کو مجھے فون کر کے انفارم کر دینا چاہئے تھا۔'' اس نے قدرے سرد لہجے میں ڈاکٹر داور کو باور کروایا۔

''ڈاکٹر ماریہ نے کئی بار ٹرائی کیا لیکن نہ جانے کیوں آپ کا نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔'' اس نے جلدی سے پیش کی۔ اس اثنا میں وہ داور کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچ چکا تھا، جہاں ماریہ بستر پر دراز ایک نحیف ت کی نبض دیکھ رہی تھی۔ عورت کے جسم کے مختلف حصوں پر بندھی پٹیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ اچھی ی ہے۔ تاہم وہ ہوش میں تھی اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔

''کچھ معلوم ہوا اس عورت سے کہ وہ کون ہے اور ایسی حرکت کرتے ہوئے کیوں پائی گئی؟'' اس نے خود نہ کیے جانے پر ماریہ سے اُلجھے بغیر مطلب کا سوال کیا۔

''ابھی صرف اس کا اور اس کے خاوند کا نام معلوم کیا ہے۔ لوگوں کی مار پیٹ کے نتیجے میں یہ اچھی خاصی ہو گئی تھی اس لیے میں نے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ سے پہلے اس کی ڈریسنگ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اب گئے ہیں تو اس کیس کو خود ہینڈل کریں۔ میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ذمے داری پوری کر دی اس نے شہریار کو اپنی چھوڑی ہوئی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں بی بی! کون ہو تم اور ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تم نے؟'' اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

جواب میں وہ اسے محض اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ ان آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف، اور مظلومیت تھی۔ آنکھوں کے ان تاثرات کو دیکھ کر اسے خود اپنے اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ وہ کوئی م یا جادو ٹونا کرنے والی عورت ہے۔ مُردوں اور قبرستان سے اس قسم کے کالے علم کرنے والوں کا خصوصی ہوتا ہے اس لیے اسے یہ قصہ سن کر سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا کہ پکڑی جانے والی عورت اسی کیٹگری ق رکھتی ہو گی لیکن وہ تو کوئی بہت ہی مظلوم عورت معلوم ہوتی تھی جو اس کے سوال کے جواب میں محض یکھ کر رہ گئی تھی۔

''اس کا نام شہزادی ہے۔ اس کا شوہر اقبال عرف بالا چودھری کی ملازمت کرتا تھا۔ لیکن پھر کسی جھگڑے میں زخمی ہو کر معذور ہو گیا اور اب مستقل بستر پر زندگی گزار رہا ہے۔''

عورت کے بجائے ماریہ کی طرف سے جواب موصول ہوا جسے سن کر وہ چونک گیا۔ گہنائی ہوئی خوب صورتی کمزور سی عورت بالے کی بیوی ہو گی، اسے ذرا بھی گمان نہیں گزرا تھا۔ عورت کا نہ صرف لباس بہت معمولی چہرے سے بھی غربت برس رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چودھری کے ایک ایسے جاں نثار کی بیوی تھی جو ت مندی کے دور میں چودھری کا بڑا سر چڑھا تھا۔ یقیناً اس جاں نثاری کی اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک ملتی ہو گی پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ جگو کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے معذور ہو جانے والے بالے کی بیوی مختصر میں ہی برسوں کی فاقہ زدہ نظر آنے لگی تھی۔

"بالا کہاں ہے؟" لمحہ بھر عورت کی حالت کے بارے میں سوچنے کے بعد اس نے ایک بار پھر برا
اس سے سوال کیا۔ بے شک بالا معذور تھا لیکن اس کی بیوی جس مذموم حرکت میں ملوث پائی گئی تھی، اس
بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ گاؤں والوں نے اسے یکسر نظر انداز کر ڈالا ہو اور گھر سے یہاں تک اٹھا کر نہ لائے
لیکن ہجوم میں اسے بالے کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔

"وہ اور میری ساس بچوں کو لے کر دو دن سے کسی رشتے دار کے گھر گئے ہوئے ہیں۔" شہزادی نامی
عورت نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائے میرا کاکا..... معلوم نہیں میرا دودھ پیتا بچہ کس حال میں ہوگا۔ اُس کی ظالم دادی تو کاکے کا
برداشت نہیں کرتی، اس کی بھوک پیاس کا کیسے خیال رکھے گی۔" شہزادی کی چپ ٹوٹی تو وہ مسلسل
دیتے ہوئے رونے لگی۔

اس سے باز پرس کرنے کا ارادہ رکھنے والے شہریار کو اندازہ ہوا کہ عورت خود کسی بڑی ٹریجڈی کا
ہے۔ اس نے ماریہ کو اشارہ کیا کہ اسے دلاسہ دے کر پانی وغیرہ پلائے تاکہ وہ مزید بات چیت کرنے کے
ہو سکے۔ اس کے اشارے پر ماریہ حرکت میں آ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے عورت کو اس حد تک سنبھال
کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔

"دیکھو بی بی! تمہارے اوپر ایک سنگین الزام ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چل رہا کہ تمہارے چیتھڑے
رکھ دیں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے تفصیل سے ساری کہانی سنا دو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ تمہارے ساتھ کیا، کیا
ہے۔" اس نے سنجیدہ لیکن نرم لہجے میں عورت سے دریافت کیا تو اس کا بین بند ہو گیا اور وہ دھیمی دھیمی سسکی
کے درمیان بتانے لگی۔

"بالے نے میرے ساتھ اپنی طاقت کے زور پر زبردستی ویاہ کیا تھا۔ ویاہ کے بعد وہ اور اس کی ماں
میرے لیے بڑے ظالم ثابت ہوئے۔ دونوں میں سے جس کا جب دل چاہتا، مجھے بری طرح دھنک کر
دیتا۔ بالا معذور ہو کر بستر سے لگا تو مجھے سکون ملا کہ چلو ظالموں میں سے ایک تو کم ہوا لیکن وہ وڈا ظالم
ہے۔ جب بھی من کرتا ہے، لیٹے لیٹے بھی کوئی چیز پھینک کر مجھ پر دے مارتا ہے۔ میری ساس بھی بڑی
برزہ عورت ہے۔ جب سے بالا معذور ہوا تھا، ہور چودھری نے اس پر سے ہاتھ اٹھایا تھا وہ کوششوں میں لگی
تھی کہ کسی طرح اس کا علاج ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے تو خیر جواب دے دیا تھا اس لیے وہ پیروں فقیروں کے
کاٹ رہی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے وہ جانے کس پیر کے پاس گئی کہ واپسی میں خوشی خوشی آئی ہور اس کے آنے کے
دونوں ماں بیٹا چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ مجھے دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی نہ
کہ مجھے معلوم تھا میرے پوچھنے پر دونوں کچھ بتانے والے نہیں ہیں۔ پر جب دو دن پہلے مختار موچی کا منڈا
بالے نے مجھے وڈے پیار سے اپنے پاس بلایا اور بولا کہ شہزادی! اگر تو مدد کرے تو میرا علاج ہو سکتا ہے ہور
ایک واری فیر اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کما سکتا ہوں۔ مجھے بالے کے علاج سے تو کوئی مطلب نہیں تھا، پر اس
صحت کے ساتھ میرے بچوں کی روٹی جڑی ہوئی تھی اس لیے میں فوراً مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ تب
نے مجھے بتایا کہ اماں ایک بہت پہنچے ہوئے پیر کے پاس گئی تھی جس نے امید دلائی ہے کہ میرا علاج ہو سکتا
لیکن علاج کے لیے کسی ایسے مُردے کی ہڈیوں کا انتظام کرنا ہوگا جو ہفتہ دس دن کے اندر مرا ہو۔ پیر صاحب
ہڈیوں کا سفوف بنا کر اس پر خاص دم کرنے کے بعد دوا تیار کریں گے جس کو کھا کر میں صحیح ہو جاؤں گا۔ سا
کل سن کر مجھے وڈی گھن آئی جی ہور میں نے بالے کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ بھلا ایسی ہڈیاں ہمیں کہا



سے ملیں گی؟ اس پر بالے نے مجھے مختار موچی کے پتر کی یاد دلائی۔ میں نے صاف منع کر دیا کہ میں یہ کام نہیں
کر سکتی۔ مجھے تو پہلے ہی اس کاکے کے مرنے کا وڈا افسوس تھا، اس کی قبر کھود کر ہڈیاں نکالنے کے لیے کیسے راضی
ہوتی؟ میرے انکار پر میری ساس اور بالے نے مجھے وڈا مارا، پر میں نے ہاں نہیں کی۔ مجھے ضد پر اڑا دیکھ کر
دونوں ماں بیٹے نے دُوجی چال چلی۔ وہ دونوں بچوں کو لے کر گھر سے چلے گئے ہور جاتے جاتے بول گئے کہ
اب بچوں کی شکل تب ہی دیکھنے کو ملے گی جب میں ان کا کام کر دوں گی۔ دو دن ہو گئے جی انہیں گئے ہوئے۔
میرا چھوٹا کاکا تو ابھی کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں۔ ملوم نہیں ننھی جان، ماں کے دودھ کے بغیر کیسے جی رہا ہوگا؟" اس
نے ایک بار پھر آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی داستان واقعی بڑی دردناک تھی جسے سن کر وہ اپنے دل
میں افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"تمہاری ساس اور شوہر کہاں گئے ہیں؟" اس نے شہزادی سے دریافت کیا۔

"یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔"

"تو پھر تم انہیں کام ہو جانے کی اطلاع کیسے دیتیں؟"

"میری ساس نے کہا تھا کہ تین دن بعد ایک آدمی آ کر ملوم کرے گا۔ تو ہڈیاں نکال لے تو اس پر سے
گوشت وغیرہ صاف کر کے گھر کے صحن میں دفن کر دینا۔ وہ بندہ تجھ سے ہڈیاں لے جائے گا ہور ہم لوگ بچوں کو
لے کر واپس آ جائیں گے۔ میں ایسا گندا کام کبھی نہ کرتی لیکن ماں ہوں نا، بچوں کی محبت میں مجبور ہو گئی۔" وہ
عورت واقعی مظلوم تھی لیکن باہر موجود ہجوم اس کی مظلومیت سے واقف نہیں تھا اور اسے ظالم اور مجرم سمجھ کر چیر
پھاڑ کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ شہریار نے بہت افسوس سے بستر پر دراز اس آنسو بہاتی عورت کو دیکھا۔ وہ عورت
جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والے ظلم کا شکار ہوئی تھی اور ایک ایسے گھناؤنے جرم میں مبتلا ہو گئی تھی جس کے لیے
شاید قانون کی کتابوں میں تو کوئی بہت سخت سزا مقرر نہیں تھی لیکن معاشرہ جسے ہرگز بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔
اگر شہزادی اور اس کے سسرال والے بے شک پڑھنا لکھنا نہیں جانتے لیکن دین کی سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا رکھتے
تو ہرگز اس حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے۔

اب بالے کے معاملے کو ہی دیکھا جاتا تو اس کی معذوری سراسر ایک طبی مسئلہ تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کو اگر
اس کے لیے کچھ کرنا ہی تھا تو طبی ماہرین سے رائے لیتے اور ان کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتے۔ اگر وہ ان کی
طرف سے مایوس ہو گئے تھے اور دوا کے بعد دعا کا ہی آسرا رہ گیا تھا تو براہِ راست اللہ سے مانگنے میں کیا حرج
تھا۔ وہ جو شہ رگ سے بھی قریب ہے، کیا ان کی پکار نہیں سنتا؟ بہرحال یہ بڑا پیچیدہ معاشرتی اور مذہبی مسئلہ تھا
جس کے بارے میں فی الحال شہریار لب کشائی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو اسے باہر موجود مشتعل ہجوم کو سنبھالنے کا
مسئلہ درپیش تھا ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ لوگ زیادہ دیر گزر جانے کی صورت میں اس کی وہاں موجودگی کا بھی
خیال نہیں کرتے اور مرکزِ صحت کے در و دیوار پر ہلّا بول دیتے۔ دروازے پر کھڑا مسلح مشابرم خان انہیں کہاں
تک قابو کر سکتا تھا۔ اگر ہجوم پیش رفت پر اُتر آتا تو مشابرم خان کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں پر
گولیوں کی برسات کر دیتا۔ وہ سارے بے گناہ لوگ تھے جو ایک نہایت افسوس ناک واقعے پر اپنے غم و غصے کا
اظہار کرنے وہاں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی گولی کا نشانہ بنانا سراسر ظلم ہوتا اور وہ جانتا تھا کہ
اشیش کمار اور پانڈے جیسے ملک دشمنوں کے لیے دل میں سخت نفرت رکھنے والا مشابرم خان باہر موجود لوگوں میں
سے کسی کے ساتھ بھی سخت برتاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور قریب
ہی کھڑے ڈاکٹر داور کو مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''آپ دروازے کے پاس جا کر میرے پی اے کو ہدایت دیں کہ وہ ان دونوں افراد کو اندر بھجوا دے۔ میں سے تھوڑی دیر پہلے میں بات چیت کر رہا تھا۔''

ڈاکٹر داور اس سے ہدایات ملتے ہی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔

''بہتر ہے کہ تم اس خاتون کو کوئی سکون آور دوا دے دو۔ میں اسے ان لوگوں سے بچا کر لے بھی جاؤں تو اس کا ٹھکانہ لاک اپ میں ہی ہوگا۔ مجبوری کے تحت ہی سہی، اس سے ایک بڑا اخلاقی جرم تو ہوا ہے جس کے لیے اسے قانون کا سامنا کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر داور کے باہر جانے کے بعد اس نے ماریہ سے انگریزی میں کہا تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے انجکشن تیار کرنے لگی۔ اسے اس کام میں مصروف چھوڑ کر وہ خود بھی باہر نکل گیا۔ دونوں بزرگان سے اس کمرے سے ہٹ کر بات چیت کرنا ہی مناسب رہتا۔ وہ انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے بیرونی کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ڈاکٹر داور کے پیچھے ان دونوں کی شکلیں نظر آئیں۔ شاید دونوں اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازے کے بالکل قریب ہی کھڑے تھے اس لیے پیغام ملتے ہی فوراً اندر چلے آئے۔

''بات یہ ہے بزرگو!'' انہیں سامنے بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''فی الحال ملزمہ بے ہوش ہے۔ گاؤں والوں کے زدوکوب کرنے کے نتیجے میں وہ خاصی زخمی ہوئی ہے اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس مار پیٹ میں ملوث لوگوں کو بھی قانون کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ عورت چاہے جتنی بھی بڑی مجرم تھی، کسی عام آدمی کو اس پر ہاتھ اُٹھانے اور تشدد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ موجودہ حالت میں یہی بہتر ہے کہ میں اسے یہاں سے لے جاؤں پھر اس کے ہوش میں آنے کے بعد قانون کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔'' نہایت ہموار لہجے اور دھیمی آواز میں ادا کیے ان جملوں میں ایک دھمکی بھی پوشیدہ تھی جسے ان دونوں بزرگ صورت افراد نے فوراً ہی محسوس بھی کر لیا چنانچہ جب ان میں سے ایک نے گفتگو کا آغاز کیا تو اس کا لہجہ بڑا مصالحانہ تھا۔

آخر ان کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ شہزادی کو شہریار اپنے ساتھ لے جائے گا اور وہ دونوں گاؤں والوں کو سمجھانے بجھانے کے ساتھ اس بات کا یقین دلائیں گے کہ شہزادی کو اس کے جرم کی قرار واقعی سزا ملے گی۔ ان دونوں سے اس نے جان بوجھ کر اصل قصے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ذکر کرتا تو یقیناً شہزادی کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی لیکن اس کے اپنے ذہن میں جو منصوبہ پل رہا تھا، اس پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کے باہر روانہ ہونے کے بعد وہ واپس پلٹ کر شہزادی والے کمرے میں آیا۔ اس دوران وہ خواب آور انجکشن کی ڈوز اپنے کے نتیجے میں سو چکی تھی۔ اسے اپنی نگرانی میں ایمبولینس میں روانہ کرنے کے بعد وہ خود بھی روانگی کے لیے پَر تول رہا تھا کہ یکدم ہی ایک نیا ہنگامہ شروع ہو گیا اور منتشر ہو کر اِدھر اُدھر ٹولیوں میں بٹ جانے والے لوگ دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

''کیا ہوا؟..... کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے باہر موجود عبدالمنان سے پوچھا تو اس نے ایک مدقوق سے نوجوان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نوجوان کو مشابرم خان نے گدی سے پکڑا ہوا تھا اور کھینچ کر اسی طرف لا رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' اس نے سخت لہجے میں مشابرم خان سے سوال کرتے ہوئے نوجوان کا جائزہ لیا۔ گاؤں کے مردوں کے عمومی لباس سے ہٹ کر جینز کی گھسی ہوئی پینٹ اور چیک دار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص اس کے دبلے پتلے جسم پر بہت زیادہ ڈھیلی ہونے کے علاوہ سائز میں اتنی بڑی تھی کہ آستین کے کف موڑنے کے باوجود اس کی کلائیاں چھپ گئی تھیں۔ شاید اس نوجوان نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے دیگر خصوصیات کو نظر انداز کر کے محض پسند کی بنیاد پر کسی لنڈا بازار سے یہ قمیص خرید لی تھی اور اچھا خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کی ہیئت کو یہ عجیب و غریب تاثر دینے میں اس کے لباس کے علاوہ بھی دیگر عوامل کارفرما تھے۔ لڑکے کے گال پچکے ہوئے تھے اور بڑی بڑی آنکھیں باہر کی طرف اُبلی اس کے زرد چہرے کو خوف ناک بنا رہی تھیں۔ سر کے لمبے اور اُلجھے ہوئے بالوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ حلیے سے کوئی آوارہ گرد لگنے کے باوجود اس کے چہرے پر ایسی مسکینیت تھی کہ اس پر کسی مجرم کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟..... کون ہو تم؟'' مشابرم خان کی طرف سے جواب وصول ہونے سے قبل ہی وہ لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے صاحب! میں بے قصور ہوں۔'' کپکپاتا ہوا لڑکا اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''یہ دور سے بھاگتا ہوا ادھر آیا ہے اور جانے کیا بولا تھا کہ لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ دور ہونے کی وجہ سے اس کی بات صحیح سے سن نہیں سکے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے دوڑ کر پکڑ لایا۔'' اس بار مشابرم خان نے لب کشائی کی اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ایک سمت میں اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی، کیا بات تھی جسے سن کر لوگ یوں بھاگ کھڑے ہوئے؟'' اس نے نرم گرم سے لہجے میں لڑکے سے دریافت کیا۔

''اُدھر پرانے کنوئیں کے پاس برگد کے درخت سے کسی نے سائیں بابا کو میخیں گاڑ کر رسّی سے باندھا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔'' لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جو انکشاف کیا، اسے سن کر اس کے وجود میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ سائیں بابا کا تخاطب جانے کس شخص کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پولیس کی اور پھر بعد میں خود اس کی راہنمائی کرنے والا سادھو بھی سائیں بابا کہلاتا تھا۔ وہ سادھو، چودھری کا گماشتہ تھا جو جنگل میں اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد موقع ملنے پر فرار ہو گیا تھا پھر کہیں اس کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ سائیں بابا وہی سادھو تھا تو اس کا واضح مطلب تھا کہ اسے اس انجام تک چودھری نے ہی پہنچایا ہوگا۔ شہریار نے بے شک اس سادھو کو غیر متعلقہ اور کم اہم جان کر نظر انداز کر دیا تھا لیکن چودھری نے تو اسے ناکام اور مفرور مجرم ہی جانا ہوگا جس کے سینے میں اس کے کئی اہم راز پوشیدہ تھے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری کو اس رقم کی بھنک مل گئی ہو جو سادھو نے ڈیرے تک کا راستہ دکھانے کے لیے شہریار سے وصول کی تھی۔ اپنے اس باغی اور مفرور مجرم کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے عملی طور پر سُولی چڑھا کر چودھری جیسے بندے کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہی یہ سب کچھ سوچ لینے کے بعد شہریار نے خود اس مصلوب کو دیکھنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

مشابرم خان اور عبدالمنان پیروی کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

مشابرم خان نے لڑکے کی گردن چھوڑ دی تھی لیکن اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا کیونکہ وہ لڑکا جائے وقوعہ تک ان کی راہنمائی کر سکتا تھا۔ گاڑی میں اسے مشابرم خان کے ساتھ آگے والی سیٹ پر بٹھایا گیا جبکہ عبدالمنان کو شہریار کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھنا پڑا۔

وہ لوگ منٹوں میں ہی مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ سامنے ہی ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ برگد کے سن رسیدہ درخت کے چوڑے تنے سے سادھو کو اس طرح سے باندھا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر پوری طرح کھول کر ان میں میخیں

گاڑ دی گئی تھیں۔ لمبی لمبی میخوں نے اعضا کو چھید ڈالا تھا اور جسم میں بننے والے ان سوراخوں سے
رِس کر بہتا درخت کے نیچے کچی زمین میں جذب ہو گیا تھا۔

اگر وہاں سے سادھو کو ہٹا لیا جاتا تو زمین کی حالت دیکھ کر یوں لگتا جیسے وہاں کسی جانور کو ذبح کیا گیا
سادھو کی حالت البتہ ذبح کیے جانے والے جانور سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا اٹھنسا ہوا
زندگی کی رمق سے عاری چہرہ یوں ڈھلکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی سینے سے آ لگی تھی۔ شہریار دیکھ رہا تھا کہ سادھو کی
حالت میں دیکھ کر لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ اتنی بربریت دیکھ کر لوگ
اپنے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے پھر بھی اس نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور لاش کو نیچے اتارنے کا حکم
اس کے حکم کی تعمیل میں مشابرم خان کے ساتھ گاؤں کے دو تین جوان بھی شامل ہو گئے۔ اس موقع پر
گاڑی کی ڈکی میں پڑے وہ اوزار بہت کام آئے جو کسی ایمرجنسی کی صورت میں گاڑی کی مرمت کے خیال
رکھے گئے تھے۔ ورنہ میخیں جس طرح ٹھونکی گئی تھیں، انہیں صرف ہاتھوں کی مدد سے نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔
اُکھاڑنے کے بعد سادھو کے جسم کے گرد لپٹی رسّی کھولی گئی اور پھر اس کا جسم زمین پر رکھنے کے بعد اس
میں ٹھونسا گیا کپڑا باہر نکالا گیا۔ کپڑا نکالتے ہی سادھو کا سینہ تیزی سے پھولا۔

''یہ تو ابھی زندہ ہے صاحب!'' اس کے بالکل قریب موجود مشابرم خان نے پُر جوش لہجے میں
شہریار تیزی سے آگے بڑھا۔

''اس کے منہ میں پانی ڈالو۔'' اس نے اضطراری طور پر حکم دیا۔ متروک کنوئیں کے پاس پانی کہاں
آتا؟ عبدالمنان نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی میں رکھے فلاسک سے پانی نکالا اور سادھو کے
ہوئے منہ میں ڈال دیا۔ منہ میں ڈالے جانے والے پانی کا بیشتر حصہ باہر آ گیا لیکن جو قطرے حلق سے
اُترے، انہوں نے بھی کافی کام دکھایا اور سادھو تیز تیز سانس لینے لگا۔

''اسے ہیلتھ کیئر سینٹر لے چلتے ہیں۔ وہاں سے فرسٹ ایڈ دلوانے کے بعد کسی ہسپتال میں شفٹ کر
گے۔'' سادھو کی سانسوں کا سلسلہ بحال ہوتے دیکھ کر اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ایک انسانی زندگی کو بچا
کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ یقینی طور پر چودھری کے ظلم کا نشانہ
والا سادھو ہوش میں آنے کے بعد اس کے خلاف ایک اچھا گواہ ثابت ہوگا۔ اس کے منہ سے الفاظ
ہدایت پر عمل کیا جانے لگا اور چار پانچ لوگ آگے بڑھے کہ زخمی سادھو کو اس کی گاڑی میں منتقل کر سکیں۔ پہلے
کے ہاتھ لگاتے ہی سادھو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ان کھلی آنکھوں میں سے آنکھ کے سفید سفید ڈیلے
رہے تھے لیکن پتلیوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ لحظہ بھر آنکھیں کھلی رکھنے کے بعد اس نے پھر سے بند کر لیں
پھر اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس جھٹکے کے لگتے ہی اس کا پہلے ہی ڈھیلا پڑ جانے والا جسم بالکل
گیا اور صاف محسوس ہوا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ حقیقتاً اس کی جن علامتوں کو دیکھ کر
لوگوں نے زندگی کی اُمید باندھی تھی، وہ دیے کی بجھتی لو کی آخری پھڑ پھڑاہٹ تھی۔

سادھو کی موت کا منظر دیکھ کر شہریار کے شانے مایوسی اور بے بسی سے ڈھلک سے گئے۔ جانے چو
کی رسّی قدرت نے کتنی دراز کر رکھی تھی کہ کسی طور اسے پکڑائی میں لینے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب سادھو
موت کی تصدیق، اس کے ورثاء کی تلاش اور تدفین کے مراحل ہی باقی رہ گئے تھے جن کے لیے اس کی موجود
کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں چند ہدایات جاری کرنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں
گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔



اطلاع لے کر آنے والا لڑکا کہاں ہے؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے اس لڑکے کا خیال آیا جس
کے بارے میں اطلاع دی تھی اور پھر جس کی راہنمائی میں وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔

فراتفری میں اس پر نظر رکھنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر نکل گیا۔ البتہ میں نے اس
میں لوگوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔'' جواب میں شرمندہ سے عبدالمنان نے وضاحت پیش کی
کردگی کا اظہار کرنے کے لیے بتانے لگا۔

کے کا نام اعظم ہے۔ چند سال پہلے کمانے کے لیے گاؤں سے شہر گیا تھا۔ کچھ نہ کچھ کمانے دھمانے
لیکن ساتھ ہی نشے کی علت میں بھی گرفتار ہو گیا۔ کبھی کبھار ہی گھر والوں سے ملنے کے لیے یہاں آتا
سے اب بھی کل رات سے آیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں بتانے والے کا خیال ہے کہ اپنے نشے کی
کے لیے اس نے آبادی سے ہٹ کر اس طرف کا رخ کیا ہوگا لیکن سادھو کی لاش دیکھ کر گھبرا گیا اور
وں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں سب لوگ جمع تھے۔

عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ سن کر وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی
میں گھوم رہا تھا۔ وہ زیادہ عمر کا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن نشے نے اس کے جسم کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔
دل میں اعظم اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے لیے افسوس کرنے لگا۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا
تھا کہ اس کے نوجوان تیزی سے برباد ہو رہے تھے۔ کسی کو نشے کے زہر نے ناکارہ کر دیا تھا تو کوئی
لیڈروں کے سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھا ہوا تھا۔ سازشوں کے شکار نوجوانوں کی اس بھیڑ میں جو
چند کارآمد بچے تھے، ان میں سے بھی ایک بڑا حصہ مادی ترقی اور روشن مستقبل کی تلاش میں بیرونِ
پسند کرتا تھا۔ ایسے میں ملک کے مستقبل کے لیے کوئی اچھی امید باندھی بھی جاتی تو کس سے؟ خود اس
جیسے سر پھرے تو شاید دو چار ہی تھے اور ان کا ہی دم غنیمت تھا کہ ملک ابھی تک سلامت تھا ورنہ
کے اس اژدھام میں کب کی یہ ناؤ ڈوب چکی ہوتی۔

افسردگی کے بہت گہرے احساس کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ اپنے طور پر تو وہ چودھری سے چھیڑ
خیال سے یہاں آیا تھا لیکن گاؤں میں گھستے ہی پے در پے دو اتنے افسوس ناک واقعات کا سامنا کرنا
بہت ہی مضمحل ہو کر رہ گئی۔

چودھری کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟'' اسے معلوم تھا کہ عبدالمنان اپنی آنکھیں اور
رکھنے کا عادی تھا چنانچہ اس یقین کے ساتھ کہ چودھری کی گاؤں میں عدم موجودگی کا سن کر اس نے
بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کیا ہوگا، اس سے پوچھا۔

چودھری کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی نمبر ون شدید بیمار ہے اور لندن میں زیر علاج
دھری اس کی طرف سے تشویش ناک اطلاعات سن کر لندن گیا ہے۔'' حسبِ توقع عبدالمنان نے اسے
کیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر وہ صرف ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا
سے اچھی طرح یاد تھا کہ چودھری کی پہلی بیوی یعنی وڈی چودھرائن ہی وہ ہستی تھی جس کی وجہ سے ماہ
وں کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔ اس لالچی عورت نے صرف اور صرف اپنی اولاد کو جاگیر کا وارث بنانے
لیے ہر طرح کی گھناؤنی چالیں چلی تھیں اور اب وہ شدید بیماری کی حالت میں لندن کے کسی ہسپتال
لاج تھی تو اسے اس سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔

گاڑی روکو۔'' ابھی انہوں نے گاؤں کی حدود پار بھی نہیں کی تھیں کہ اس نے اچانک مشابرم خان کو حکم

دیا۔ اس نے پھرتی سے بریکیں لگا کر اس کے حکم کی تعمیل کی۔

''تم گاڑی سے اُتر جاؤ۔ یہاں سے آگے عبدالمنان ڈرائیو کرے گا۔'' اُس کے اس عجیب و غریب حکم پر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے۔

''تم واپس گاؤں جا کر بالے کے گھر کی نگرانی کرو اور اس آدمی کو گھیر کر میرے پاس لاؤ جو شہزادی کی مُردے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آنے والا ہے۔'' اُس کے اس جملے نے اس کے حکم کی وضاحت کر دی اور مشابرم خان سر کو تفہیمی جنبش دیتا ہوا گاڑی سے اُتر گیا۔

عبدالمنان نے برابر والی سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی پھر اس کا اشارہ ملتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ بیک ویو مرر میں گاؤں کی طرف جاتا مشابرم خان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ مشابرم خان کامیاب ہوتا تو وہ ایک خطرناک فتنے کی بیخ کنی کے لیے اقدامات کرنے کے لائق ہو پاتا۔ اس نے اے سی کا منصب سنبھالتے ہی جو جنگ لڑنے کا آغاز کیا تھا اس میں چودھری افتخار عالم شاہ ہی اس کا واحد ٹارگٹ نہیں تھا بلکہ وہ تو ہر اس شخص کے خلاف محاذ کھولنے کو تیار تھا جو اس کے دائرۂ کار میں فتنہ و فساد پھیلا رہا تھا۔ یہ جنگ کتنی طویل ثابت ہوتی اور اسے کہاں تک لے جاتی، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے خبر تھی تو بس اتنی کہ وہ اب ایک گرداب میں اُتر چکا ہے اور اب اس سے مقابلہ کرنا ہے۔

⊛----✪----⊛

''تم تھک گئی ہو گی۔ ویسے بھی اب رات سر پر آ گئی ہے، بہتر ہے کہ یہاں رک کر آرام کر لیں۔'' پہاڑی سلسلے میں بے سمت سفر کیے جا رہے تھے۔ اسلم روانہ ہونے سے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر چکا تھا کہ اسے پہاڑی سلسلے میں سے نکل کر کسی آبادی تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں ہے لیکن جنگل کے جانے پہچانے راستوں سے گزر کر جانے میں زیادہ خطرات کا سامنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اندازے سے پہاڑوں میں سفر کیا جائے اور کوشش کر کے کسی بستی تک پہنچا جائے۔ بعد بڑے شہر کا رخ کیا جائے۔ اب وہ اسی تگ و دو میں مصروف تھے اور بے سمت راستوں پر چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ شام کے سائے ڈھلے تو ماہ بانو کی ابتر ہوتی حالت دیکھ کر اس نے یہ تجویز پیش کی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ تھکن اتنی شدید تھی کہ دل میں آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی چاہ نہ ہوتی تو وہ کب کی ہمت چھوڑ کر کہیں بیٹھ گئی ہوتی۔

ڈیرے سے روانہ ہونے کے بعد ان کا بیشتر وقت بھاگنے اور چلنے میں ہی گزرا تھا۔ پہلے یہ ڈر تھا کہ پیچھے سے آنے والا ان کا کوئی دشمن انہیں گھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائے اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑ رہے تھے اور اب پہاڑی سلسلے کی ان بھول بھلیوں سے نکلنے کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ کوششیں ابھی تک کامیاب ثابت نہیں ہو سکی تھیں لیکن ہمت چھوڑ کر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بے عملی کی صورت میں بھوک اور عفریت انہیں کھا جاتا اور شاید اس دنیا میں اس سے بدترین موت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر مرنے والوں کے مقابلے میں فاقہ کشی سے مرنے والوں کو بہت وقت لگتا ہے اور جان کنی کے جتنا وقت گزرے، موت اتنی ہی اذیت ناک ہو جاتی ہے۔

اسلم کی طرف سے رکنے اور آرام کرنے کی پیشکش ملتے ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور ایک قطعہ زمین دیکھ کر وہاں بیٹھ گئی۔ لیٹنے کے لیے بھی اسے اسی جگہ استعمال کرنا تھا۔ وہ جس بے سروسامانی میں تھے، اس میں کسی بستر وغیرہ کے تکلف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ذرا سی صاف اور ہموار جگہ



بہت کافی تھا اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں لمبی تان کر سو جائے۔

''ابھی سونا نہیں، پہلے کچھ کھا پی لو، اس کے بعد آرام سے سو جانا۔'' اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے اسلم نے اسے ٹوکا اور اپنی پشت پر لدا تھیلا کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ روشنی نہ ہونے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اسے کھانے کے لیے کیا دیا گیا ہے۔ یہ ان پرندوں کا گوشت تھا جنہیں اسلم نے تالاب کے کنارے سے شکار کر کے بھون لیا تھا۔ بغیر نمک مرچ کے صرف لکڑیوں کی آگ پر بھونے گئے گوشت کے یہ سادے ذائقے سے قطع نظر محض پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آ رہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ سخت ہو کر کھانے کے اعتبار سے بھی بہت دشوار غذا ثابت ہو رہے تھے لیکن وہی بات تھی کہ جسم و جاں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کچھ تو چاہئے ہی تھا۔ چنانچہ وہ اسلم کے ہاتھ سے گوشت کا وہ ٹکڑا تھام کر آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ خود اسلم بھی اسی عمل میں مصروف ہو گیا۔

شدید بھوک کے باوجود اس کے حلق سے چند نوالوں سے زیادہ نہ نگلے گئے اور اس نے گوشت کا آدھ کھایا ٹکڑا اسلم کی طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک سے کھا لو۔ اتنا کم کھا کر تم اتنے سخت ماحول میں کیسے زندگی کی جدوجہد کر سکو گی؟'' اسلم نے اسے سمجھایا۔

''بس میں اس سے زیادہ نہیں کھا سکتی۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اچھا تو ایسا کرو کہ تھوڑے سے چنے کھا لو۔'' کچھ سوچتے ہوئے اسلم نے اسے پیشکش کی جس پر اس کا فوراً ہی اثبات میں ہل گیا۔ اسلم نے چنوں سے بھری تھیلی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تھیلی میں سے مٹھی بھر کر چنے نکالنے کے بعد اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے یکدم ہی جھجک سی گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اسلم نے یہ چنے ایسے حالات کے لیے سنبھال کر رکھے تھے جب انہیں کوئی اور غذا میسر نہ آ سکے۔ پرندوں کا بھنا ہوا گوشت محفوظ کرتے ہوئے ہی اس نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ جب تک یہ گوشت کھانے کے لائق رہے گا، وہ اسی پر گزارہ کریں گے لیکن ماہ بانو کی گوشت سے بے رغبتی دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس کے لیے اپنی بے پناہ محبت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے کھانے کے لیے چنے پیش کر دیئے تھے۔ اسلم کی اپنے لیے اس بے تحاشا محبت کو محسوس کرتی وہ بہت آہستگی سے مٹھی میں موجود چنے ٹونگنے لگی۔ بہت آہستگی سے کھانے کے باوجود بھی وہ مٹھی بھر چنے جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان کے خاتمے پر اس نے بوتل میں سے تھوڑا سا پانی پیا اور سونے کی نیت سے لیٹ گئی۔ پہلے وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کسی غیر مرد کی موجودگی میں اس طرح کا چست لباس پہن کر لیٹ سکے گی لیکن اسلم سے اس کی جھجک کافی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ دن رات کے اس ساتھ میں اسلم نے خود کو ہر طرح سے قابل اعتماد ثابت کیا تھا اور وہ محسوس کر سکتی تھی کہ دل میں اس کے لیے شدید پسندیدگی کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ کبھی اس کی طرف حریص نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور پھر اب وہ جن حالات سے گزر رہے تھے، وہ اتنے مختلف اور انوکھے تھے کہ معمول کے رویّوں کا اظہار کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ یہ بقا کی جدوجہد تھی جس میں انہیں مرد و زن کی تخصیص کے بغیر اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے لیٹنے تک اسلم بھی اپنا کھانا پینا ختم کر چکا تھا اور اب گہری ہوتی تاریکی میں کسی پہاڑی درندے کے حملے سے بچنے کے لیے الاؤ روشن کر رہا تھا۔

الاؤ جل جانے کے بعد وہ خود بھی ایک سمت کروٹ کے بل لیٹ گیا جبکہ ماہ بانو تو الاؤ سے اُڑتی چنگاریوں کو دیکھتے ہوئے اپنے حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔ شکم پُری کے لیے کھائے جانے والے مٹھی بھر چنوں نے اسے بچپن کی یاد دلا دی تھی۔ بچپن میں اکثر اسکول سے واپسی میں ابا اسے ڈھیروں میٹھے چنوں کے ساتھ

رنگین مرمرے اور بتاشے خرید کر دے دیتے تھے اور وہ راستے بھر مٹھیاں بھر بھر کر مزے سے کھانے کے بعد خالی ہاتھ گھر لوٹتی تو بے بے یونیفارم بدلا کر منہ ہاتھ دھلواتے ہی کھانے کی پلیٹ لیے اس کی خوشامدیں کرنے لگتی کہ تھوڑا سا کھالے۔ چنوں، مرمروں اور بتاشوں سے بھرے ہوئے ننھے سے پیٹ میں گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ وہ بے بے کے اتنی محبت سے منہ میں ڈالے گئے نوالوں کو نگل سکے۔ بس منہ بناتی اِدھر اُدھر بھاگتی رہتی تھی اور بے چاری بے بے سخت تشویش میں مبتلا ہو جاتی کہ کُڑی کھانا ہی نہیں کھاتی۔ اس موقع پر ابا اس کے ساتھ مثالی اتحاد کا مظاہرہ کرتے تھے اور بے بے کے بار بار پوچھنے پر بھی کبھی اعتراف نہیں کرتے تھے کہ اسے اس کی فرمائش پر کچھ کھلا چکے ہیں۔

بچپن کے وہ ناز و نعم سے بھرے دن کب کے لد چکے تھے اور اگر کچھ سامنے تھا تو زندگی کے گرداب اور اُلجھنیں۔ چودھری نے اس کی زندگی کو ایسا بھیانک موڑ دیا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلتی تو دوسرے میں پھنس جاتی تھی۔ اس ظالم بدنظر شخص نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ بے بے اور ابا جن کی وہ لے پالک بیٹی تھی، اس سے محبت کرنے کے جرم میں چودھری کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور اس نے ان سے ان کا اتا پتہ اُگلوانے کے چکر میں انہیں سخت اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ جنم دینے والی ماں الگ پاگل ہو کر گاؤں کی گلیوں میں رُلتی پھرتی تھی۔ ایک بہن اور بھائی کو موت کے سفاک پنجوں نے اپنی گرفت میں لے کر جدا کر دیا تھا جبکہ باقی بچ جانے والی ایک بہن سسرال والوں کی خدمت و اطاعت میں مصروف تھی۔ گھر بار، پڑھائی لکھائی، سہیلیاں ہر شے چھوٹ گئی تھی اور کچھ باقی بچا تھا تو مصائب کا گرداب۔ زندگی کے طوفانوں کو سہارے شہریار سے ملاقات ہوئی تو دل اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا لیکن وہ بھی کسی اور کا ہو گیا۔ اب اگر زندگی میں کچھ باقی بچا تھا تو وہ اسلم کی ذات تھی جو اس سے غیر مشروط محبت کرتا تھا۔ حالات کا ستایا ہوا اسلم جسے زندگی کے مصائب نے ڈاکو بنا دیا تھا، اس سے مل کر اس طرح اس کی محبت میں مبتلا ہوا کہ اس کے مطالبے پر بیک وقت اپنی مجرمانہ زندگی کو ترک کرنے کے لیے راضی ہو گیا اور اب وہ کسی مناسب مقام پر پہنچنے کی جدوجہد میں ان پہاڑوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

جب وہ ڈیرے سے نکلے تو تین تھے اور ان کے ساتھ للی نام کی وہ عورت بھی تھی جو کبھی شوبز میں اپنا مقام بنانے کے چکر میں گھر سے نکل کر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پھنس گئی تھی۔ اسلم کی محبت میں مبتلا للی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا۔ اگر للی عین وقت پر اسلم کے سامنے آ کر اس کی طرف جانے والی گولی اپنے وجود پر نہ کھاتی تو آج اسلم زندہ نہ ہوتا۔ اس نے جمرو سے للی کی ہلاکت کا انتقام لیتے ہوئے اسے جہنم واصل تو کر دیا تھا لیکن خود بھی اس عورت کے لیے اُداس تھا جس کے کردار پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس نے کبھی اس کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔

تھرکتے شعلوں اور رقاص چنگاریوں پر نظر جمائے اپنی زندگی کی کہانی دہراتے دہراتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس گہری نیند سے وہ دو ڈھائی گھنٹے بعد جاگی۔ جاگنے کا سبب ٹھنڈی ہوتی رات میں محسوس ہونے والی حاجت تھی۔ وہ بے چین سی ہو کر اپنی جگہ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ الاؤ اب بھی روشن تھا اور کچھ فاصلے پر اسلم پہلو کے بل لیٹا سو رہا تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور قضائے حاجت کے لیے ایک سمت میں چل پڑی۔ اپنے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ایک چٹان کی اوٹ میں اسے مناسب جگہ نظر آ گئی۔ اس جگہ بیٹھ کر فارغ ہونے کے بعد وہ کھڑی ہوئی تو واپسی کے راستے کو مسدود پایا۔ اندھیرے میں بھی چمکتی وہ دوسری آنکھیں ایسی نہیں تھیں کہ ان سے خوف کھائے بغیر رہا جا سکتا۔ اُس کے پورے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی اور



ساختہ ہی چند قدم پیچھے ہٹی۔ بدقسمتی سے پیچھے ڈھلوان سطح تھی۔ وہ کسی طور اپنے قدموں کو سنبھال نہیں سکی اور طرح چیختی ہوئی لڑھکتی چلی گئی۔

وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا رہی تھی اور اس کی انگلیاں خودکارانہ انداز میں زمین کو ٹٹولتی کسی ایسی شے کو تلاش کر رہی تھیں جسے گرفت میں لے کر وہ اپنے لڑھکتے جسم کی حرکت کو روک سکے لیکن ہر بار سنگ ریزوں اور نوکیلے پتھروں کی چبھن مایوسی کا پیغام دیتی تھی۔ نرم و نازک ہتھیلیوں میں کئی زخم لگ چکے تھے لیکن فی الحال وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ اس تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کی زندگی کے سیکنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ یونہی لڑھکتی رہتی تو یقینی طور پر کسی گہری کھائی میں جا گرتی اور اتنی بلندی سے کسی گہری کھائی میں گرنے کا مطلب تھا کہ اس کی ہڈیاں اتنے حصوں میں تقسیم ہوتیں کہ ان کی گنتی کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

وہ زندگی جو بار بار موت کے منہ سے نکل کر اسے واپس ملتی رہی تھی، آخر ان پہاڑوں میں ساتھ چھوڑنے والی تھی۔ زندگی باوفا تھی تو اسے چودھری کے چنگل سے بھی نجات ملتی رہی تھی اور وہ ڈاکوؤں کے ڈیرے سے بھی نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ بلتستان کے برفانی پہاڑوں میں واقع دہشت گردوں کے کیمپ میں بھی اس کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکی تھی اور وہ وہاں سے فرار کی کوشش میں اس ایوالانچ سے بھی بچ نکلی تھی جس میں اسلم رسیدہ لڑکا عمران پھنس کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے عمران نے اسے زندگی سے مایوس نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ احساس دلایا تھا کہ اللہ اس کی زندگی کی بار بار حفاظت اس لیے کر رہا ہے کہ وہ کسی طور پر اس سے کچھ کام لینا چاہتا ہے۔ وہ خاص کام ابھی تک اس کے سامنے نہیں آ سکا تھا اور وہ یونہی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی لیکن عمران کی وہ بات یاد آتے ہی اس کے موت کے ڈر سے منجمد ہوتے ذہن کو امید کی حرارت میسر آ گئی اور مایوسی کی تاریکی سے نکل کر امید کی روشنی میں سانس لینے کے لیے پہلے ہی لمحے میں قدرت نے اس کی مدد کا بندوبست کر دیا۔ وہ کوئی مضبوط جھاڑی تھی جو اچانک ہی اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں آ گئی تھی۔ جھاڑی گرفت میں آئی تو اس کا تیزی سے نیچے جاتا ہوا جسم جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اس اچانک لگنے والے جھٹکے نے اس کے پورے شانے میں درد کی لہر دوڑا دی لیکن وہ درد زندگی کی اُمید بن کر آیا تھا اس لیے قابل برداشت تھا۔ اس نے بایاں ہاتھ بھی بڑھا کر جھاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اپنے معلق پیروں کو اس ڈھلوان پر کہیں ٹکانے کی کوشش کرنے لگی۔ موجودہ حالت میں بھی وہ کوئی اتنی محفوظ و مامون نہیں تھی لیکن کسی کھائی میں گر کر ہڈیوں کے چور چور ہو جانے کے مقابلے میں یہ حالت بہت بہتر تھی کہ اُمید کی کوئی کرن تو نظر آ رہی تھی۔

اندھیرے میں چمکتی ان سرخ آنکھوں کو دیکھ کر گھبراہٹ میں پاؤں رپٹنے سے لے کر یہ عارضی سہارا میسر آنے تک مشکل سے چند سیکنڈز ہی گزرے تھے، پر ان چند سیکنڈوں میں ہی وہ ایک ایسے تجربے سے روشناس ہوئی تھی جس نے اس کی روح کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانا تھا کہ زندگی کی محبت اور موت کا خوف اللہ نے انسان کی جبلت میں اس حد تک شامل کیا تھا کہ مشکل ترین حالات میں بھی جینے کی خواہش دم نہیں توڑتی تھی۔ اس نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے تھے جو ذرا سی مصیبت پڑنے پر اپنے لیے موت کی بددعائیں مانگتے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ ان حرکتوں میں سے اگر کسی کو بھی اس پہاڑی ڈھلوان سے دھکا دے دیا جاتا تو وہ موت کو سامنے دیکھ کر بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا جس طرح وہ خود کو بچانے کے لیے کوشش کرتی رہی تھی۔

اسے یہ بھی یقین ہو چلا تھا کہ خودکشی کے ذریعے موت کو گلے لگانے والے بھی آخری لمحوں میں موت کے

پنجوں سے بچ نکلنے کی خواہش کرتے ہوں گے۔ یہ اور بات کہ بازی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ان کی خواہش تکمیل کے مراحل سے گزر پاتی ہو۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ عام طور پر ایک بار خودکشی کی کوشش ناکام ہو جانے والے کو دوبارہ ایسی کوشش کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کوئی ایک آدھ خصوصی کیس ہو تو الگ تھی۔ بہرحال وہ دنیا کے دوسرے انسانوں کے طرزِ فکر سے قطع نظر اس وقت اپنی زندگی بچنے کی امید ہونے پر خوش تھی اور تہ دل سے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی اس قابل ہو چکی تھی کہ اپنے اطراف میں اُبھرتی ہوئی آوازوں کو سن سکے۔ وہ چونکہ لڑھکتی ہوئی کافی نیچے آ گئی تھی اس لیے یہ آوازیں بہت واضح نہیں تھیں البتہ اس کا اندازہ ضرور قائم کر سکتی تھی کہ ان آوازوں میں کسی جانور کی غراہٹیں اور ایک سے زیادہ انسانوں کے بولنے کی آوازیں شامل ہیں۔ جانور تو یقیناً وہی تھا جس کی سرخ آنکھیں اچانک نظر آنے پر وہ گھبرا گئی تھی البتہ انسانوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوست تھے یا دشمن۔

سنائی دینے والی ان آوازوں میں سے کوئی ایک آواز اسلم کی بھی ہو سکتی تھی کیونکہ یہ تو کسی طور ممکن نہیں کہ جانور کی غراہٹیں اور اس کی اپنی اضطراری چیخیں اسلم کی نیند میں مخل نہ ہوئی ہوں اور وہ بے سدھ پڑا سوتا ہو۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے اسلم کو پکارنے کا ارادہ کیا تاکہ کم از کم وہ اتنا تو جان لے کہ ماہ بانو زندہ ہے اور مدد کی منتظر ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں وہ اس کی کس طرح مدد کرتا، یہ سوال اپنی جگہ تھا لیکن زندگی بچانے کی وہی جبلی خواہش تھی جو اسے اسلم کو پکارنے پر اُکسا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے پکارتی، اوپر سے اسلم کی تشویش میں ڈوبی ہوئی پکار سنائی دی۔ وہ اس کا نام لے کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی آواز ماہ بانو کے لیے زندگی کا بلاوا تھی چنانچہ اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے اسلم کی پکار کا جواب دیا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا ماہ بانو؟'' اس کے جواب سے اس کے زندہ ہو جانے کا یقین ہو جانے پر اسلم کی آواز میں خوشی کی چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں مگر یہاں پھنسی ہوئی ہوں۔ زیادہ دیر گزری تو میرا ہاتھ چھوٹ جائے گا اور میں نیچے کھائی میں گر جاؤں گی۔'' اس نے کوشش کی کہ مختصر الفاظ میں اسلم کو اپنی حالت سے باخبر کر سکے کیونکہ ان دونوں کے مابین جتنا فاصلہ تھا انہیں ایک دوسرے تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے خاصی قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔

''پریشان مت ہو۔ میں تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اسلم نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد اوپر سے اسے بہت مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ اسلم کسی سے مشاورت کر رہا ہو۔ وہ دوسرا شخص کون تھا جس سے اسلم مشاورت کر رہا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان پہاڑوں میں ان کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ جس جانور سے ڈری تھی اور بعد میں بھی جس کی غراہٹیں سنتی رہی تھی اب اس کے بارے میں بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ کوئی کتا تھا جس کی خوفناک غراہٹیں اب دوستانہ ''بھوں بھوں'' میں بدل چکی تھیں۔ سارا ماحول اندھیرے کی لپیٹ میں ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی اور صرف سماعت پر زور دے کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر کی بھنبھناہٹوں کے بعد اسے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے سخت زمین میں کوئی چیز ٹھونکی جا رہی ہو۔ وہ لوگ خود تو بے سروسامانی کے عالم میں ڈیرے سے نکلے تھے اس لیے وہ یہ اُمید نہیں کر سکتی تھی کہ اسلم اوپر سے کوئی رسّی پھینک کر اسے کھینچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ البتہ دل میں یہ خوش فہمی ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہاں موجود دوسری پارٹی کے پاس ایسا ساز و سامان موجود ہو۔



وہ اپنی بصارت پر زور دیتے ہوئے اندھیرے میں گھور گھور کر ایسی شے کو تلاش کرنے لگی جس پر رسّی کا بل ہو سکے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ البتہ کچھ ٹھونکے جانے کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں اسلم اسے یہاں سے نکالنے کے لیے کیا تدابیر کر رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اپنے پاؤں میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتے اس درد سے بے چین ہونے لگی تھی جو لٹکے رہنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ایک جھاڑی کے سہارے پورے جسم کا بوجھ اٹھانے والے اس کے بازو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شل ہوتے جا رہے تھے۔ کوشش کر رہی تھی کہ پاؤں کسی جگہ ٹکا کر کچھ بوجھ ان کے سہارے بھی برداشت کر سکے لیکن پیروں کو کوئی ایسی جگہ نہیں مل رہی تھی جس پر وہ مسلسل انہیں ٹکا کر رکھ سکے۔ بس لمحہ بھر کے لیے ہی کہیں ٹِک پاتے اور پھر ہوا میں لٹک ہو جاتے۔ اوپر سے وقفے وقفے سے سنائی دینے والی ٹھک ٹھک کی آوازیں اگر زندگی کا پیغام نہ سنا رہی ہوتیں تو اتنی تکلیف دہ حالت سے نکلنا مزید دشوار ہو جاتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ آوازیں نزدیک آتی جا رہی ہیں۔ پھر اسلم کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

''ہمت سے کام لینا ماہ بانو! بس تھوڑی دیر کی بات اور ہے، پھر میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔'' پہلے کے جملے میں وہ اس کے کافی نزدیک سے بولتا ہوا اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

''میری فکر نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے اسلم کی تسلی کروانی چاہی لیکن اس کی آواز اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ جس مشکل میں گرفتار تھی، اس کا عکس اس کی آواز میں بھی جھلک رہا تھا۔ بازوؤں کی طاقت کے بل بوتے پر اپنے پورے جسم کا بوجھ اٹھانا اتنا دشوار کام تھا کہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ہتھیلیوں پر پھوٹنے والے پسینے کے قطرات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے کہ ان کی وجہ سے اسے جھاڑی کو اپنی گرفت میں رکھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ گزرتا وقت جہاں اس کی ہمت کو کم کر رہا تھا، وہیں اندھیرے کی دبیز چادر ہلکی ہونے لگی تھی اور بہت آہستگی سے نمودار ہوتے سپیدۂ سحر میں دھندلے سے مناظر نظر آنے لگے تھے۔ ان مناظر میں سب سے زیادہ قابل توجہ وہ ہیولا تھا جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ یقیناً اسلم تھا اور اس کے طریقِ کار اور جرأت کو دیکھ کر وہ حیرت سے ششدر رہ گئی تھی۔ وہ کسی کوہ پیما کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس جانے وہ کون سی شے تھی جسے وہ زمین میں گاڑ کر ٹھونکتا اُکھاڑتا اس پر ہاتھ یا پیر کا بوجھ ڈالتا نیچے اُتر رہا تھا۔ اس کا کام کسی پیشہ ور کوہ پیما کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا کیونکہ ایک تو وہ اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا تھا، دوسرے اس کے پاس سہارا لینے کے لیے کوئی رسّی بھی موجود نہیں تھی۔

اس بے سروسامانی کی وجہ سے اس کے نیچے اُترنے کی رفتار بھی بہت کم تھی۔ اسلم کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس طریقہ ہرگز بھی استعمال نہ کرتا۔ اسلم نے بھی شاید خود کو اس لیے اتنی مشکل میں ڈالا تھا کہ یہ ماہ بانو کی زندگی کا معاملہ تھا اور وہ اس کی زندگی کو ہمیشہ اپنی زندگی پر ترجیح دیتا آیا تھا۔ اس کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ اپنی جان اس پر نچھاور کرنے کے لیے ہی اس دنیا میں آیا ہے۔ اب بھی وہ جس خطرناک طریقے سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اسے ایک بار پھر تہ دل سے اسلم کی بے پناہ محبت کا قائل ہونا پڑا۔ وہ خود شہریار سے محبت کرتی تھی اور کئی بار یہ بھی محسوس کیا تھا کہ شہریار بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی شہریار بھی اس کے لیے ایسی جاں نثاری کر سکے گا۔ موت اور زندگی کے مابین جھولتے اپنے وجود کے لیے اسلم کی وہ بے تحاشا محبت محسوس کر کے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ان آنسوؤں نے دھندلائے ہوئے منظر کو کچھ اور بھی دھندلا دیا لیکن وہ

مجبور تھی کہ ہاتھ اٹھا کر ان آنسوؤں کو صاف نہیں کر سکتی تھی چنانچہ چپ چاپ انہیں بہنے دیا۔

''اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ ماہ بانو!'' جانے کتنے لمحے اور بیت گئے تھے جب اس نے اپنے بالکل قریب اسلم کی آواز سنی۔ اس نے سر اٹھا کر اسلم کی سمت دیکھا۔ آنکھوں سے ساون برس جانے کے بعد اب سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اس نے اسلم کا اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ بالکل واضح طور پر دیکھا اور پھر پہلی بار اس ہاتھ کو پورے خلوص سے تھام لیا۔

''تمہیں اپنے بازو میرے گرد لپیٹ کر میری پیٹھ پر سوار ہونا ہوگا۔ کیونکہ میرے لیے اپنے ہاتھوں کو آزاد رکھنا ضروری ہے۔'' بے ترتیب سانسوں کے ساتھ اسلم نے اسے ہدایت دی جسے سمجھتے ہوئے اس نے پورا پورا عمل کیا۔ ان لمحات میں وہ اسلم سے اتنی قریب ہوگئی تھی کہ ان دونوں کی سانسیں آپس میں اُلجھنے لگی تھیں اور جس طرح اس کے دھڑ دھڑاتے دل کی آواز اسلم کی سماعتوں میں اُتر رہی تھی، اسی طرح وہ اُس کے جسم کے گرد بازو حمائل ہونے کے باعث اس کے سینے پر رکھے اپنے ہاتھوں پر اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن محسوس کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ نمودار ہوتی روشنی میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اسلم اب تک کسی چیز کو زمین میں ٹھونک کر اس کی مدد سے نیچے اُترتا جا رہا تھا۔ دو دو عدد خنجر تھے جن میں سے ایک تو یقینی طور پر اسلم کا ہی تھا اور دوسرا اس نے اوپر موجود افراد یا فرد سے حاصل کیا تھا۔ ان خنجروں کو وہ ایک پتھر کی مدد سے زمین میں ٹھونک رہا تھا اور ایک چھوٹے سے رسّی کے ٹکڑے میں پھندا لگا کر اُکھاڑتا جا رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود ڈھلان کی زمین زیادہ سخت نہیں تھی اور ڈھلوان بھی اتنی عمودی نہیں تھی کہ سیدھے نیچے جا پڑنے کا شدید خطرہ ہو۔ ہلکی سی روشنی میں بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ جس جھاڑی کو اس نے تھاما تھا، اس کے علاوہ بھی کئی جھاڑی نما پودے وہاں موجود تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی مدد سے ڈھلوان پر اُترنا یا چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اسلم کی پیٹھ پر سوار اس کے اعضا سے اپنے اعضا پیوست کیے اس کا اوپر کی سمت سفر جاری رہا۔ اسلم کا جسم بھی اسی کی طرح سخت مشقت کے باعث پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کے پسینے کی بُو محسوس کرتے وہ اس کشش کو بھی محسوس کر رہے تھے جو اللہ نے آدم و حوا کے مابین تخلیق کی ہے۔ سخت مخدوش حالات میں بھی ان کے جسم سنسنا رہے تھے۔ ماہ بانو کے لیے یہ تجربہ بہت عجیب تھا۔ صنفِ مخالف سے اس قدر قربت کا یہ اس کی زندگی میں پہلا انوکھا موقع تھا اور وہ اندر ہی اندر سکڑنے کے باوجود خود کو اسلم سے جدا کرنے سے قاصر تھی۔

اس موقع سے قبل ایک بار چودھری نے بھی اس کے وجود کو اپنے جسم تلے روندنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ذہن پر چودھری کے بدبودار اور وحشی لمس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد ہوشے کے ایک کیمپ میں ڈیوڈ نامی غیر ملکی سیاح اور بلتستان کے پہاڑی کیمپ میں زیرِ تربیت ایک دہشت گرد نے اور ڈیرے پر جمرو نے بھی اسے پامال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے ایسے ہر موقع پر اس کی عزت کا موتی محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیا تھا لیکن وہ مرد کی قربت کے ہیبت ناک تصور میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

آج کا تجربہ اس کے پچھلے ہر تجربے سے مختلف تھا۔ آج جو مرد اس کے قریب تھا وہ اپنے کسی سفلی جذبے کی تسکین کے لیے اس کے قریب نہیں آیا تھا بلکہ اس کے لیے زندگی کا پیامبر بن کر آیا تھا۔ ان کی آپس کی یہ قربت بھی اتفاقاً اور ضرورتاً تھی لیکن وہ بھرپور طریقے سے اس قربت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس لمس میں بڑی مٹھاس اور چاشنی تھی۔ یہاں تک کہ شہریار کے خیال نے بھی اسے اسلم سے نہیں بھڑکایا تھا، نہ اسے یہ محسوس ہوا



کہ وہ اسلم کے اتنے قریب ہو کر شہریار سے کسی قسم کی بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ شاید اسلم کی بے پناہ محبت تھی جس نے اس کے دل پر شہریار کا قبضہ ہونے کے باوجود بھی وہاں چپکے سے نقب لگا کر کسی گوشے میں جگہ بنا لی تھی۔ ان لمحات میں وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس نے شہریار کی شادی کا سن کر محض جذبات میں اپنی زندگی کا کارآمد بنانے اور اسلم کو سدھارنے کے خیال سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، آج اس فیصلے میں اس کی دلی رضا بھی شامل ہوگئی تھی۔ اگر وہ دونوں ان مہیب حالات سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ یقیناً بہت خوشی سے اسلم کے گھر میں بسنا قبول کر لیتی۔

''آجاؤ دوست! مبارک ہو کہ تم دونوں کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ ورنہ میں تو ڈر ہی رہا تھا کہ کہیں تم بھی اپنی ساتھی کے ساتھ کھائی میں نہ جا گرو۔'' وہ اپنی سوچوں اور تجربوں میں منہمک تھی اس لیے واپسی کا سفر ست ہونے کے باوجود وقت گزرنے کا احساس نہیں کر سکی اور قریب سے سنائی دینے والی اجنبی مردانہ آواز سن کر چونکی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے سہارے کے لیے اسلم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے ہموار سطح پر پہنچنے کے لیے مدد دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ ہموار سطح پر پہنچے، ماہ بانو، اسلم سے الگ ہوگئی۔ اسلم زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ وقت کے اس گزرتے دورانیے میں اس نے زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔ اس جنگ میں اس کے مقابل اپنے جیسا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ وہ پہاڑی ڈھلوان تھی جس پر اگر ایک بار بھی قدم غلطی کر بیٹھتے تو اس کا اور ماہ بانو کا ٹھکانہ اس کھائی میں ہی ہوتا جہاں سے ان کی ہڈیاں بھی ملنی مشکل تھیں۔

ماہ بانو خود بھی اسلم کے قریب ہی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ اگرچہ واپسی کے سفر میں اسے خود کوئی جسمانی مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی اور اسلم نے ہی اس کا سارا بوجھ ڈھویا تھا لیکن موت کے پنجوں سے نکلنے کی بے یقین سی خوشی نے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔

''لو..... پانی پی لو۔'' چند لمحے گزرنے کے بعد اسے اپنے قریب سے وہی اجنبی آواز سنائی دی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑھے ہوئے بالوں اور اُلجھی داڑھی والا ایک سرخ و سفید جواں سال آدمی تھا جو اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھا رہا تھا۔ اسلم کو اس نے شاید اس کی سانسیں سنبھل جانے کا موقع دینے کے لیے پانی کی پیشکش نہیں کی تھی۔ ماہ بانو نے اس کی بڑھائی ہوئی بوتل فوراً ہی جھپٹ لی اور بے تابی سے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے نیچے اُتارنے لگی۔

تقریباً آدھی بوتل پانی پینے کے بعد اس کے حواس ذرا یکجا ہوئے تو اس نے کھسیانے پن کے ساتھ اجنبی کو بوتل واپس کر دی جسے اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ وصول کر لیا۔ اس دوران اسلم بھی خود کو سنبھال چکا تھا اور اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مرد نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھی کافی سارا پانی پی گیا لیکن اس کے انداز میں ماہ بانو کے مقابلے میں کافی ٹھہراؤ تھا۔ کچھ دیر قبل شدید مشقت سے گزرنے کے باوجود اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ یہ سخت جانی ڈیرے پر گزرنے والی زندگی کی دین تھی۔ وہ برسوں ایک ڈاکو کی حیثیت سے اپنے شب و روز گزارتا رہا تھا۔ اس زندگی میں مار پیٹ، بھاگ دوڑ اور ہلچل سے لے کر موسم کی سختیاں سہنے تک سب کچھ شامل تھا۔ اس لیے اس کی قوتِ برداشت ایک عام انسان سے کہیں زیادہ ہو کر تھی۔ پھر کچھ کمال اس کی فطری صلاحیتوں کا بھی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں جب جو کام انجام دینا پڑے، اسے بہت احسن طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ جب وہ ایک طالب علم تھا تو اس حیثیت سے بھی اپنی ذہانت کا لوہا منواتا رہا تھا۔ ڈاکو بنا تو برسوں پرانے اپنے سے کہیں زیادہ تجربہ کار ڈاکوؤں پر بازی لے گیا اور اب ماہ بانو کے محافظ کی حیثیت سے بھی وہ اپنا کردار بخیر و خوبی نبھا رہا تھا۔

''میرے خیال میں یہاں سے ہٹ کر تمہارے پڑاؤ کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں الاؤ جل رہا ہے، اس سے حرارت بھی ملتی رہے گی اور کسی درندے کے حملے کا خوف بھی نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ میں تمہیں مزیدار چائے بھی بنا کر پلاؤں گا۔'' ان دونوں کی حالت سنبھلتے دیکھ کر اجنبی مرد نے ان سے کہا۔ اس کے لہجے میں موجود نرمی نے ماہ بانو کو سمجھا دیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، دوستانہ عزائم رکھتا ہے۔ یوں بھی اگر وہ دوستی کے بجائے دشمنی کا مظاہرہ کرتا تو وہ اور اسلم نہ تو اتنے سکون سے بیٹھ پاتے اور نہ ہی وہ انہیں پینے کا پانی پیش کرتا۔

اسلم نے اجنبی کی تجویز قبول کر لی تھی چنانچہ وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا اور پھر وہ سہ رکنی قافلہ پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے ساتھ بڑے بالوں والا وہ جسیم کتا بھی تھا جس کے اندھیرے میں اچانک سامنے آ جانے سے وہ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اس کا پاؤں ڈھلان پر پھسل گیا تھا۔ پڑاؤ قریب ہی تھا چنانچہ وہ لوگ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے فوراً ہی وہاں پہنچ گئے۔

اسلم کے جلائے گئے الاؤ کی آگ کافی کم ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے پھیلتے صبح کے اجالے میں اب آگ میں مزید اضافے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر اور گزرتی تو ٹھنڈک کا احساس بھی ختم ہو جاتا اور اُجالے میں کسی درندے کے حملے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔ اب بھی موسم بہت شدید ٹھنڈا نہیں تھا لیکن پہاڑی علاقہ ہونے اور کہر کی وجہ سے گرمائش کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج نکلتا تو صورتِ حال میں تبدیل ہو جاتی۔

''تم دونوں میں سے کسی کو گڑ ناپسند تو نہیں ہے؟ میں چائے میں میٹھے کے لیے گڑ استعمال کروں گا۔'' اجنبی نے الاؤ کے قریب پہنچ کر اپنی پیٹھ پر لدا بڑے سائز کا تھیلا اُتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پتیلی اور دیگر سامان نکال کر چائے بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے پوچھے گئے سوال پر اسلم نے گڑ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ دیا تو وہ مطمئن ہو کر ایک بار پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ ان بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں جس بے سروسامانی کا شکار تھے، اس میں کھانے پینے کے لیے جو کچھ بھی مل جاتا، انہیں نعمت ہی لگتا۔ پسند ناپسند کی عیاشی تو صرف ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو اپنے پُرسکون گھروں میں بہتر وسائل کے ساتھ شب و روز گزار رہے ہوں۔

''یہ کون ہے؟'' اجنبی پوری تندہی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا تو ماہ بانو نے اسلم سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں تو تمہاری چیخ سن کر بھاگا تھا اور پھر آواز کی سمت میں دیوانہ وار بھاگ کر وہاں تک پہنچا تو یہ شخص اپنے کتے سمیت نظر آیا۔ تمہیں غیر موجود پا کر شاید میں وحشت کے عالم میں اس سے ٹکرا جاتا لیکن اس نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنے دوست ہونے کا اعلان کیا اور پھر بتایا کہ تمہارا ساتھی میرے کتے سے گھبرا کر نیچے پھسل گیا ہے اور ہمیں آپس میں اُلجھے بغیر پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میرے لیے یہ آدمی اتنا قابلِ بھروسہ نہیں تھا لیکن تمہاری زندگی میرے لیے ہر خطرے سے بڑھ کر اہم تھی۔ میں نے اس کے کہنے پر تمہیں پکارا اور جواب میں تمہاری آواز سن کر پھر سے جی اُٹھا۔ اب سوال یہ تھا کہ تمہیں وہاں سے کیسے نکالا جائے۔ میرے پاس کوئی ایسا انتظام بھی نہیں تھا۔ اس شخص نے خود ہی مجھے تدبیر سجھائی کہ کس پیاؤں کے طریقِ کار پر عمل کرتے ہوئے تم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ایک خنجر میرے پاس تھا، دوسرا اس سے مل گیا۔ بس پھر میں تم تک پہنچنے کے لیے دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود گیا۔ اس شخص نے پیشکش کی تھی کہ وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے لیکن میں تمہارے سلسلے میں کسی پر اعتماد کیسے کر سکتا تھا۔ وہ اگر نیچے اُترتا تو اس کے پیشِ نظر ایک دوسرے انسان کی جان بچانے کا کام ہوتا اور وہ کوئی کوتاہی بھی کر سکتا تھا جبکہ میرے لیے تو یہ اپنی زندگی



والی بات تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے اوپر آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس بھی اس اندھی کھائی میں کُودنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔'' اس نے ساری داستان مختصراً سناتے ہوئے آخر میں اپنے جذبات کا بھی اظہار کر دیا تھا جن کے سچ ہونے میں ماہ بانو کو کوئی شک نہیں تھا۔

''یہ لو بھئی گرما گرم چائے پیو۔ اور اس کے ساتھ یہ روغنی روٹیاں بھی کھاؤ۔ اس ویرانے میں، میں تمہاری اتنی ہی مہمان نوازی کر سکتا ہوں۔'' جتنی دیر میں اسلم نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا، اجنبی نے چائے بنا لی اور اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹی روٹیاں نکال کر چائے کے ساتھ پیش کیں۔ وہ دونوں بھوکے سامنے پا کر کھِل اُٹھے۔ پچھلی رات ان دونوں نے کھانے کے نام پر جو کچھ کھایا تھا، وہ سانسوں کی ڈور سلامت رکھنے کے کام تو آ سکتا تھا لیکن شکم پری بہرحال نہیں ہو سکی تھی۔

''تم بھی تو ہمارا ساتھ دو نا۔'' منہ میں پانی بھر آنے کے باوجود اسلم نے کھانا شروع کرنے سے پہلے اس سے کہا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ چائے صرف ان دونوں کو پیش کی گئی ہے اور خود اس نے اپنے لیے چائے نہیں نکالی۔

''میرے پاس چائے کی مزید پیالیاں موجود نہیں اس لیے میں اچھے میزبان کی طرح مہمانوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پسند کروں گا۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے وجہ بتا دی۔ اس مرحلے پر وہ لوگ یہ شک نہیں کر سکتے تھے کہ اجنبی نے ان کی چائے میں کچھ ملا کر انہیں بے ہوش یا ہلاک کرنے کا انتظام کیا ہو گا۔ وہ تو بالکل اچانک ان سے ٹکرایا تھا۔ اس سے نہ تو اس کی دشمنی تھی اور نہ ہی دوستی۔ اگر وہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو ہوتا تو بھی ان لوگوں کی بے سروسامانی دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے پاس سے اسے کچھ نہیں مل سکے گا چنانچہ اس کوئی شک کرنے کے بجائے وہ پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔

''اگر ہمارا میزبان اس دوران اپنا تعارف بھی کروا دے تو اچھا ہو گا۔ اس ویرانے میں ملنے والے اتنے مہربان میزبان سے تعارف حاصل کر کے ہمیں خوشی ہو گی۔'' دو تین لقمے حلق کے نیچے اتارنے کے بعد اسلم نے اس سے فرمائش کی۔

''میرا نام شفقت راؤ ہے۔ میں ٹاہلی والا پنڈ کا رہنے والا ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے تاجر ہوں اس لیے مستقل اپنے پنڈ میں نہیں رہ پاتا اور زیادہ وقت شہر میں گزارتا ہوں۔'' اس نے اپنا جو مختصر تعارف کروایا اس سے بات واضح ہو گئی کہ اس کا لہجہ اتارواں اور زبان اتنی صاف کیوں ہے، ورنہ اتنی دیر سے اسلم کو اس کی زبان کی وجہ سے ہی اسے کسی گاؤں کا رہائشی سمجھنے میں تامل تھا اور کسی دور دراز شہر سے آنے والے کا ان پہاڑوں میں موجود ہونا سمجھ سے بالاتر۔ ویسے تو کسی گاؤں کے رہائشی کو بھی اس طرف آنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ نامساعد حالات میں اپنے بچاؤ کے لیے اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ واقع کسی گاؤں کا باشندہ اس طرف کا رخ کر سکتا تھا۔

''تعارف کچھ ادھورا سا ہے راؤ صاحب! ان پہاڑوں میں تو آپ اپنے کسی تجارتی دورے پر نہیں ہو سکتے۔'' چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اسلم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ویسے چائے شفقت راؤ کے دعوے کے مطابق واقعی مزے دار تھی اور انہیں اس لیے اور بھی زیادہ مزے کی لگ رہی تھی کہ کافی طویل وقفے کے بعد انہیں کوئی نعمت میسر آ سکی تھی۔

''ابھی تو ملے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیں گے۔ آپ فرمائیں، آپ دونوں کون ہیں؟ اتنا تو میں بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ دونوں بھی عام حالات میں اس طرف نہیں آ

نکلے ہوں گے۔'' شفقت راؤ نے نہایت سہولت سے گفتگو کا رخ ان دونوں کی طرف موڑ دیا۔

''میں اسلم تنیو ہوں اور یہ میری بیوی ماہ بانو ہے۔ آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا کہ ہم عام حالات میں اس طرف نہیں آئے ہیں بلکہ ایک حادثے کی وجہ سے راستہ بھٹک کر یہاں آ نکلے ہیں اور اب ان پہاڑوں سے نکلنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔'' اسلم نے محتاط انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ اسلم کے خود کو بیوی قرار دیئے جانے پر ماہ بانو کے چہرے پر سرخی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ پہلے ہی چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہونے کی وجہ سے بدن چرائے کچھ جھینپی ہوئی بیٹھی تھی، اس تعارف پر مزید جھینپ گئی لیکن موجودہ حالات میں یہ تعارف سب سے مناسب بھی تھا کہ اگر اسلم اسے بیوی کے بجائے کوئی دوست قرار دیتا تو اس کے کردار پر شکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ مرد و زن کی دوستی معاشرے کے بہت زیادہ مغرب کے نقشِ قدم پر چل پڑنے کے باوجود ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر مشرق میں ابھی تک معیوب ہی سمجھی جاتی تھی اور خصوصاً دیہاتوں میں تو اس کے سرے سے کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

''اندھیرے میں تمہاری بیوی کو میں لڑکا سمجھا تھا اور بات چیت کے خیال سے اپنے کتے سمیت ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ پھسل جانے والا شخص لڑکا نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں۔ میں بھابی سے معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔'' وہ بڑے مہذبانہ انداز میں وضاحت پیش کرتا ہوا معذرت کرنے لگا۔

''کوئی بات نہیں راؤ صاحب! کبھی کبھی انسان کسی ایسی غلطی میں ملوث ہو جاتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ آپ بس یہ شکر ادا کریں کہ یہ محفوظ ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں آپ کے بے قصور ہونے کے باوجود بھی آپ کو معاف نہیں کر پاتا۔'' اس بار بھی اسلم نے جواب دیا اور ہلکے پھلکے انداز میں اپنے لیے ماہ بانو کی اہمیت بھی جتا دی۔

''بہت خوش نصیب ہیں بھابی جی کہ انہیں تمہارے جیسا چاہنے والا آدمی ملا۔ یہ تو بتاؤ تم انہیں لے کر یہاں کہاں نکلے ہوئے تھے۔ وضع قطع سے تو اس علاقے کے رہنے والے نہیں لگتے؟'' شفقت راؤ عمر میں اسلم سے بڑا تھا چنانچہ اس کے ساتھ ذرا بے تکلفانہ طرزِ تخاطب سے کام لے رہا تھا۔ ساتھ ہی ان کے بارے میں جاننے کے لیے بھی متجسس تھا اس لیے ایک بار پھر گھما پھرا کر اپنا سوال کر ڈالا۔ اسلم اس دوران اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا لہٰذا اس بار اس کے سوال کو ٹالنے کے بجائے اطمینان سے بولا۔

''ہم کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میں وہاں ایک کراٹے کلب چلاتا ہوں۔ ماہ بانو کو پنجاب کی دیہی زندگی دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میں اسے ان علاقوں میں گھمانے کے خیال سے لے کر نکلا تھا۔ اتفاق سے ہم شروع میں ہی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہم پیر آباد نامی گاؤں میں گھومتے گھومتے جنگل کی طرف نکل پڑے اور وہاں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ انہوں نے ماہ بانو کے زیورات سمیت ہمارا کیمرہ اور دوسری قیمتی اشیاء چھین لیں۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی کہ چلو مال تو گیا، جان و آبرو تو محفوظ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی حرام خور تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں چنانچہ مجھے اپنے ساتھ جو کراٹے کے کمالات دکھانے پڑے۔ میری خاموشی پر وہ لوگ مجھے کاٹھ کا اُلّو سمجھ بیٹھے تھے اس لیے اچانک حرکت میں آنے پر بوکھلا گئے۔ ان کے دو ساتھیوں کو تو میں نے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ ان کی رائفلیں بھی چھین لی تھیں لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مسلح بھی چنانچہ پہلے گھبرا کر بھاگے پھر پلٹ کر فائرنگ کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ماہ بانو رائفل چلا لیتی ہے لیکن اس کا نشانہ زیادہ اچھا



نہیں ہے۔ بس یہی سوچ کر میں فائرنگ کا ہلکا پھلکا جواب دیتا ہوا اسے لے کر بھاگ نکلا۔ بھاگتے ہوئے سمت کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم بے خبری میں ان پہاڑوں کی طرف آ نکلے۔ یہاں سے واپس جنگل میں گھس کر پیر آباد پہنچنے کی کوشش کرنے میں خدشہ تھا کہ دوبارہ ڈاکوؤں سے سامنا نہ ہو جائے اس لیے ہم نے سوچا کہ ان پہاڑوں سے گزر کر کسی اور طرف کی آبادی میں نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے شفقت راؤ کو ایک ایسی کہانی سنا ڈالی جو ان کی وضع قطع کے ساتھ میل کھا سکے۔

''تم خوش قسمت ہو بھائی! کہ ان ڈاکوؤں سے بچ نکلے۔ ورنہ لوٹ مار کرنے اور عورتوں کے معاملے میں ان کی شہرت بڑی خراب ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک خوشخبری سنا ڈالوں کہ پولیس نے جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع کر رکھا ہے۔ میں جب ٹاہلی والا سے نکلا تھا اس وقت یہ خبر ریڈیو پر سنی تھی۔ آگے کیا حالات و واقعات پیش آئے، اس کا مجھے معلوم نہیں۔'' شفقت راؤ نے ڈیرے پر پولیس آپریشن کی تصدیق کر ڈالی جسے سن کر اسلم نے سکون کا سانس لیا کہ وہ خوش قسمتی سے آپریشن شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ دوسری صورت میں یا تو وہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا یا پھر جیل کی تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوتا۔ اور اب جو یہ نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا روشن خواب آنکھوں میں کروٹیں لینے لگا تھا، اس کا کہیں کوئی نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

''آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے ان پہاڑوں میں آ نکلے؟'' شفقت راؤ کو اپنی طرف سے کافی مدت تک مطمئن کرنے کے بعد اس نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''میں بھی کچھ مشکل حالات میں ہی اس طرف آیا ہوں لیکن تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ میں بے سروسامانی کے عالم میں نہیں نکلا بلکہ پوری تیاری کے ساتھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نکلا ہوں اور ان پہاڑی راستوں سے خاصا واقف بھی ہوں۔ بس حالات ایسے تھے کہ میرا ٹاہلی والا میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں وہاں سے کچھ ایسا کر کے نکلا ہوں کہ میرے پیچھے میرے دشمن اپنے زخم چاٹتے پھریں گے بلکہ ان میں سے کئی نیست و نابود ہو گئے ہوں گے۔'' شفقت راؤ کے لہجے میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور آنکھیں غم و غصے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا کوئی خاندانی دشمنی کا معاملہ تھا؟'' اس سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسلم نے اندازے کی بنیاد پر سوال کیا۔ گفتگو کے اس سلسلے میں نہ صرف وہ اور ماہ بانو کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تھے بلکہ شفقت راؤ بھی پیالی خالی ہو جانے کے بعد چائے پی چکا تھا۔ اس نے صرف چائے پینے پر ہی اکتفا کیا تھا اور روغنی روٹیوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''خاندانی دشمنی تو نہیں تھی لیکن ایسے شخص سے دشمنی تھی جس نے میرے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔'' شفقت راؤ کی آنکھوں کی اُداسی اس کے لہجے میں اُتر آئی اور بھڑکیلی آواز مدھم پڑ گئی۔

''زخم خوردہ لگتے ہو۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ کہ تم پر کیا گزری؟'' اسلم نے شفقت راؤ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ماہ بانو بھی شروع ہی سے ان دونوں کی گفتگو توجہ سے سن رہی تھی اور اس وقت اس کے اندر بھی تجسس جاگ اُٹھا تھا کہ شفقت کے حالات سے آگاہ ہو سکے تاہم اس نے زبان سے کچھ کہنے سے گریز ہی کیا تھا اور بنا مداخلت شفقت کی کہانی سننے کی منتظر تھی۔

''چھوڑو یار! کیا کرو گے میرا دکھ سن کر؟ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے پنڈ تک پہنچنے کا راستہ سمجھا دیتا ہوں۔ میں تمہیں ان پہاڑوں میں اتنی واضح نشانیاں بتاؤں گا کہ تم آرام سے ٹاہلی والا تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں

میری بہن کا گھر ہے۔ اس کا خاوند میرا جگری دوست ہے۔ تم ان کے گھر چلے جانا اور انہیں بتانا کہ شفق
کے مہمان ہو۔ وہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھیں گے اور انتظام کر دیں گے کہ تم اپنے گھر یا جہاں کہیں
جا سکو۔'' شفقت راؤ نے موضوع کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں ایک پُرکشش پیشکش کی۔

''آپ کی اس مہربانی کا شکریہ راؤ صاحب! آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ لیکن دل میں ا
سی رہے گی کہ ہم اپنے محسن کا دکھ بھی نہ جان سکے۔'' اسلم نے بہت محتاط انداز میں اصرار کیا جس کا راؤ
خواہ اثر ہوا اور وہ افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔

''میں دکھوں کی تشہیر کا قائل نہیں ہوں لیکن تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو میں مسلسل انکار کر کے تم
آزاری نہیں کر سکتا۔'' وہ جیسے خیالوں میں ڈوب گیا اور اس کے چہرے پر چھائی اُداسی کے بادل مز
ہونے لگے۔ اس کھوئی کھوئی کیفیت میں اس نے اپنی داستان کا آغاز کیا۔

''میں ایک خوش حال اور خوش وخرم گھرانے کا مالک تھا۔ ورثے میں زمینیں ملی تھیں لیکن میں نے
کا پیشہ اپنانے کے بجائے تجارت سے روزی کمانا پسند کیا اور ورثے میں ملی ہوئی زمینیں بیچ کر اپنا کام
دیا۔ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کچھ قسمت بھی مہربان تھی کہ اللہ نے روزی میں وسعت دی۔ والدین نے گ
رواج کے مطابق کم عمری میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ میری بیوی میری چچا زاد تھی او
سے ایک اچھی عورت تھی۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا لیکن وہ اللہ کی بن
پر حرفِ شکایت نہ لاتی بلکہ جب بھی میں پنڈ واپس آتا، ہر ہر طرح سے میری خدمت کرتی۔ اللہ نے
بیٹی اور بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔ بیٹی کو میں نے کم عمری میں ہی اپنی بہن کے بیٹے سے بیاہ دیا۔ بیٹ
چار سال چھوٹا تھا اور اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ میں نے اکلوتے بیٹے کی تعلیم پر خاص تو
اور اسے بورڈنگ میں رکھ کر پڑھوا رہا تھا۔ وہ بس چھٹیوں میں گاؤں آتا تھا اور سب کا بہت لاڈلا تھا
جانو کہ اس جیسا ہونہار اور ذہین لڑکا پورے پنڈ میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں اس کا باپ ہونے کی وجہ سے
نہیں کہہ رہا بلکہ سارا پنڈ یہی کہتا تھا کہ شفقت راؤ کے پُتر کا کوئی اور جوڑی دار نہیں ہے۔ میں جب
تعریفیں سنتا تو میرا سینہ فخر سے پھول جاتا لیکن پھر وہ ہوا جس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔'' وہ د
نکلتے تھے کہ بیٹے کا ذکر آتے ہی شفقت راؤ کی آنکھوں کا کہر کچھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ پھر وہ اپنے بیٹے
مستقل ''تھا'' کا صیغہ استعمال کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کی درد بھری داستان کا سرا اس کے بیٹے
جڑا ہوا ہے۔ ان دونوں کی خود پرجمی نظروں سے بے خبر شفقت راؤ اپنے ہی دکھ میں ڈوبا بولتا رہا۔

''سولہ سال کی عمر کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور والدین اس عمر کی اولاد کو عموماً بچہ سمجھنے کی غلطی کر
لیکن حقیقت میں عمر کا یہی دور سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے اور انہونیاں دکھاتا ہے۔ میرے بیٹے
کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں وہ اپنے اسکول میں آنے والی ایک نئی ٹیچر کے عشق
ہو گیا۔ سولہ سال کے ایک لڑکے کی خود سے چھ سات سال بڑی لڑکی سے وہ محبت بڑی عجیب تھی۔ و
چھٹیوں پر گھر آیا تو گھر پر بھی اپنی اس ٹیچر کا ذکر کرتا رہا۔ اسے اس کا ہنسنا بولنا، پہننا اوڑھنا سب کچھ
تھا اور وہ بات بات پر اپنی رعنا مس کا ذکر نکال بیٹھتا تھا۔ ہم نے اس کی باتیں سنیں لیکن اس تعلق کو عشق
کے گہرے تعلق سے بڑھ کر اہمیت نہیں دی۔ اصل کہانی تو اس وقت پتہ چلی جب پانی سر سے اونچا ہ
آخری بار صداقت چھٹیوں میں گھر رہنے کے لیے آیا تو بہت بجھا بجھا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں
گاؤں میں نہیں رک سکا اور ایک اہم کاروباری معاملے کی وجہ سے شہر چلا گیا۔ میرے پیچھے صداقت



لے لگے اور وہ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ کبھی راتوں کو اُٹھ کر ننگے پاؤں گھر سے نکل جاتا اور کپڑوں
ت ہی تالاب کے ٹھنڈے پانی میں نہانے لگتا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے رونے لگتا اور اپنا سر دیواروں
ٹکرانے لگتا۔ میری بیوی اس کی حالت دیکھ کر بہت گھبرائی۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بھی کچھ چھپا ہوا
ں تھا۔ سب نے یہی رائے دی کہ صداقت پر کسی جن بھوت کا اثر ہو گیا ہے اور اسے علاج کے لیے ٹاہلی
لے پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانا چاہیے۔

پیر سائیں کی وہ خانقاہ زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن اس کے عقیدت مند بہت سارے تھے۔ میری گھبرائی ہوئی
ان بیوی نے سب کی رائے کو مانتے ہوئے ادھر کا رخ کیا۔ میری بیٹی اور داماد نے تھوڑی سی مخالفت بھی کی
گاؤں کا واحد ڈاکٹر، صداقت کی بیماری سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے دعا دم ہی کوئی حرج نہ سمجھتے ہوئے
زانہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور صداقت کی بربادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ بظاہر
قت درگاہ پر حاضری کے بعد سنبھل گیا اور دیوانوں والی حرکتیں چھوڑ کر سکون سے رہنے لگا۔ اس کی شوخی
رجانے کے باوجود یہی کافی سمجھا گیا کہ وہ اب دیوانوں کی سی حرکتیں نہیں کرتا۔ میں کاروباری دورے سے
ں آیا تو مجھے بھی یہ ساری اطلاعات ملیں لیکن آنکھوں سے دیکھنے اور سننے میں فرق ہوتا ہے۔ پیر سائیں پر
ہ نہ ہونے کے باوجود میں نے صداقت کی صحت یابی کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لی اور صداقت چھٹیوں
باقی ماندہ دن گزار کر واپس بورڈنگ چلا گیا۔

وہ جتنا عرصہ گاؤں میں رہا، پابندی سے پیر سائیں کے پاس جاتا رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا، یہ تو بہت بعد میں
میں آیا اور بہت سی باتیں بھی بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب مجھے اس کے بورڈنگ سے فوری طور پر
کے لیے کال کی گئی۔ میں اس وقت لاہور میں تھا۔ بورڈنگ اسکول سے کال آنے پر میں فوراً وہاں پہنچا۔
خت پریشانی تھی کہ آخر اس طرح اچانک بلائے جانے کی کیا وجہ ہے۔ میں صداقت کی ساری فیسیں وغیرہ
ی سے ادا کرتا تھا اور صداقت بھی ایسا بچہ نہیں تھا کہ اس کی طرف سے کسی کو شکایت ملے۔ بہرحال میں
ن پریشان وہاں پہنچا تو پرنسپل سے ملاقات کے پہلے ہی لمحے میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پرنسپل کے چہرے
ناثرات بہت گمبھیر تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے دیکھا کہ وہاں
ں کی وردی میں ملبوس ایک شخص اور بھی بیٹھا ہوا ہے لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس پولیس والے کی وہاں
جودگی اور میرے بلاوے کے درمیان کوئی تعلق بنتا ہے۔ میں نے اسے بھی پرنسپل کا کوئی ملاقاتی تصور کیا جو
ی طرح اپنے بچے کے سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ لیکن جب پرنسپل نے گفتگو کا آغاز کیا تو میری ہر غلط فہمی دور ہو
۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس بار جب صداقت چھٹیوں میں گھر گیا تھا تو کیا میں نے اس میں کوئی
معمولی پن محسوس کیا تھا؟ اس سوال کو سن کر میں سمجھا کہ شاید صداقت کے دوروں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا
چنانچہ میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پرنسپل کو سب کچھ بتایا اور اس سے پوچھا کہ کیا صداقت نے وہاں کسی قسم
پریشانی کھڑی کر دی ہے؟ پرنسپل نے میرے سوال کا براہِ راست جواب نہیں دیا بلکہ ایک گہرا سانس لیتے
ئے بولا کہ راؤ صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے اور بہت سے
ی نہیں جان سکے۔ پھر انہوں نے مجھے صداقت کے اپنی ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہونے کا قصہ سنایا۔ انہیں یہ
ری معلومات اس کے ایک ایسے کلاس فیلو سے حاصل ہوئی تھیں جس سے صداقت کی بہت دوستی تھی۔ کچھ
مس رعنا نے بھی بتائیں۔

ان دونوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق صداقت، مس رعنا کی اسکول میں آمد کے پہلے دن سے ہی

ان پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مس رعنا سے بات چیت کے مواقع نکال سکے وہ اسے ریاضی پڑھاتی تھیں اور صداقت ریاضی میں اچھا خاصا ذہین ہونے کے باوجود کلاس میں سوال سمجھ آنے کا بہانہ کر کے آخری پیریڈز یا بریک ٹائم وغیرہ میں بھی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ مس رعنا اکثر حیران ہوتی تھیں کہ صداقت کو میتھ اتنی مشکل سے سمجھ آتا ہے لیکن وہ ہر ٹیسٹ میں پورے پورے نمبر لیتا ہے۔ لیکن بات ان کے لیے زیادہ عرصہ معمہ نہیں رہی اور اسٹاف روم میں دوسری ٹیچرز سے گفتگو کے دوران انہیں پتہ چل گیا کہ صداقت تو ہمیشہ سے ہی ریاضی میں بہت اچھا ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ صداقت کے اس مضمون میں پورے نمبر نہ آئے ہوں۔ اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد مس رعنا نے صداقت کے دیگر رویوں پر غور کیا تو انہیں سمجھ آ گئی کہ وہ صرف ان سے قریب رہنے کے لیے ریاضی کے سوالات کلاس میں سمجھ آنے کا عذر کر کے فارغ اوقات میں ان کے پاس چلا آتا ہے۔ صداقت تقریباً ہر روز انہیں سرخ گلاب پھول دیا کرتا تھا جسے وہ ایک شاگرد کی استاد سے گہری وابستگی کا اظہار سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ موقع کر ان کے لباس، ہنسنے کے انداز یا آنکھوں کی رنگت وغیرہ کی تعریف بھی کر دیا کرتا تھا لیکن مزاجاً قدرے لاابالی ہونے کی وجہ سے مس رعنا نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب ایک بار وہ صداقت کی طرف سے ٹھٹکیں تو انہیں اس کا ہر روّیہ سمجھ آنے لگا اور اندازہ ہوگیا کہ صداقت کی ان کے لیے پسندیدگی استاد کے لیے شاگرد کی عمومی پسندیدگی نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور ہی زاویے سے انہیں دیکھتا ہے۔ اس اندازے کے بعد وہ اس پر ظاہر کیے بغیر تھوڑی سی محتاط ہوگئیں اور حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے موقع پا کر اپنی منگنی اور عنقریب ہونے والی شادی کے بارے میں بھی اطلاع دے دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس بارے میں جان کر صداقت ان کی طرف سے مایوس ہو جائے گا۔ لیکن اس نے بالکل ہی مختلف ردِعمل کا مظاہرہ کیا اور نہایت بے باکی سے اپنی محبت اظہار کرتے ہوئے ان سے اپنی منگنی توڑ ڈالنے کی استدعا کی۔

مس رعنا نے اسے بہت سمجھایا۔ سختی اور نرمی دونوں سے کام لے کر دیکھا۔ اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود تعلق کی نوعیت کے علاوہ عمروں کے فرق کا بھی احساس دلایا لیکن صداقت کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مس رعنا چاہتیں تو اسکول انتظامیہ سے صداقت کی شکایت بھی کر سکتی تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس شکایت کے بعد میں صداقت کو بورڈنگ اسکول سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ ان کی نرم دلی نے یہ منظور نہ کیا کہ صداقت جیسا ذہین اور لائق طالب علم اپنے اتنے اہم تعلیمی سال میں کسی مشکل سے دوچار ہو چنانچہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ صداقت کی دیوانگی انہیں بدنام نہ کر ڈالے۔ بات اسکول کی حدود سے نکل کر اگر ان کے گھر یا ہونے والے سسرال تک پہنچ جاتی تو ان کے لیے بڑی شرمندگی کا مقام ہوتا۔ ان کے اسکول چھوڑنے کا سن کر صداقت بہت ڈسٹرب ہوا اس نے کوشش کی کہ کسی طرح مس رعنا سے رابطہ کر کے انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے لیکن اس موقع پر مس رعنا نے بہت سختی سے کام لیا اور صداقت کے رابطہ کرنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اتفاق سے اسی عرصے میں چھٹیوں کا بھی آغاز ہوگیا اور صداقت کو پنڈ آنا پڑا۔ آنے سے پہلے اسے یہ اُڑتی خبر بھی مل گئی تھی کہ مس رعنا عنقریب شادی ہونے والی ہے چنانچہ وہ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کے ساتھ گھر واپس آیا تھا۔

اس ذہنی دباؤ نے جہاں اس پر خاموشی طاری کر دی، وہیں اسے دورے بھی پڑنے لگے۔ پنڈ کے لوگوں نے اپنی کم علمی میں ان دوروں کو کسی جن یا بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پیر سائیں کے ڈیرے کی راہ دکھائی۔ حیرت انگیز طور پر صداقت کے دوروں میں افاقہ بھی ہوگیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں پر صداقت کا کوئی



روحانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ اسے نشے کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ اُداس اور دل گرفتہ صداقت کو نشے سے حاصل ہونے والی خود فراموشی میں عافیت محسوس ہوئی اور وہ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد پنڈ سے بورڈنگ جاتے ہوئے اپنا ذخیرہ ساتھ لے کر گیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی ماں سے اپنی پسندیدہ ٹیچر کی شادی پر قیمتی تحفہ دینے کے لیے خاصی رقم حاصل کر لی تھی پھر میری طرف سے اسے کھلا جیب خرچ بھی ملتا تھا جس کا کافی حصہ اس کے پاس جمع تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے اپنی تباہی کا سامان جمع کر لیا اور بورڈنگ جا پہنچا۔ اس کے قریبی دوست نے اسے چوری چھپے سگریٹ پیتے دیکھ کر کئی بار ٹوکا اور اس بری عادت کو ترک کرنے کی نصیحت کی لیکن صداقت ہر بار وعدہ کر کے مکر جاتا۔ درحقیقت وہ اگر کوشش کرتا بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ نشے کی مضرت سے پیچھا چھڑانا اچھے اچھوں کے لیے مشکل ہوتا ہے وہ تو پھر رنج میں مبتلا ایک نوعمر لڑکے کا معاملہ تھا۔ اس کا دوست بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ صداقت نشہ کرنے لگا ہے۔ وہ تو بس اسے سگریٹ نوشی کا عادی ہی سمجھتا تھا اور اس عادت کو مس رعنا کے غم سے منسوب کر کے گزرتے وقت کے ساتھ صداقت کے سدھر جانے کی اُمید لگائے رہا لیکن صداقت کیسے سدھر سکتا تھا؟ اس کی تعلیمی کارکردگی بھی متاثر ہونے لگی جس پر اساتذہ نے اس سے پرس کی تو اس نے چھٹیوں کے دوران اپنی طویل علالت کی کہانی سنا کر ابھی تک ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ نہ ہونے کا بہانہ بنا دیا۔

صداقت کا ریکارڈ اچھا تھا اس لیے اس بہانے کو قبول کر لیا گیا۔ ویسے بھی اس کی گرتی ہوئی صحت خود بھی اس کے بہانے کو تقویت دے رہی تھی۔ یہ حالات شاید لمبے عرصے تک جاری رہتے لیکن ہوا کچھ یوں کہ مس رعنا کو ان کی شادی کی خوشی میں ان کے شوہر کے ساتھ اسکول میں ایک دعوت دی گئی۔ یہ دعوت اسٹاف ممبران کی طرف سے تھی اور اس کا طالب علموں سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بچے اپنی ٹیچر کو بنے سنورے روپ میں ان کے شوہر کے ساتھ دیکھنے کے لیے کلاس رومز سے بے تاب ہو کر نکلنے لگے تو پرنسپل نے مس رعنا کو اجازت دے دی کہ وہ جن کلاسز میں پیریڈ لیتی تھیں، ان میں دو دو منٹ کے چکر لگا لیں۔ وہ صداقت کی کلاس میں بھی گئیں اور اس کے لیے ان کا وہ بنا سنورا روپ دیکھنا غضب ہوگیا۔ اس نے بہ مشکل اسکول ٹائم گزارا اور پھر خود کو نشے میں ڈبو کر اذیت سے نجات حاصل کرنے کے چکر میں اتنی اوور ڈوز لے لی کہ برداشت کی حد ہی جواب دے گئی۔ اسے بہت دیر تک غائب پا کر اس کا دوست جب اسے ڈھونڈتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں بیٹھ کر اس کی دوست میں صداقت محض سگریٹ نوشی کرتا تھا تو وہاں اسے صداقت اس حال میں ملا کہ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے اور ہاتھ پیر ٹیڑھے ہوگئے تھے۔ اس نے فوراً انتظامیہ کو خبر دی اور ان لوگوں نے فوراً اسے ہسپتال منتقل کر دیا لیکن کوئی تدبیر کام نہ آئی اور صداقت نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔"

اس مقام پر آ کر شفقت راؤ کا حوصلہ دم توڑ گیا اور وہ کہانی کے تسلسل کو جاری رکھنے سے محروم ہو کر رونے لگا۔ اسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب گیا اور شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے خاموش دسلا دینے کی کوشش کی۔ ایک ایسے باپ کے سامنے ہمدردی کے الفاظ ہیچ تھے جس نے اپنے اکلوتے اور ہونہار بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہو۔ ماہ رخ بھی یہ الم ناک داستان سن کر دل گرفتہ ہوگئی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے پھر بھی اس نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور شفقت راؤ کے سامان میں ہی سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پیش کی۔ چند گھونٹ پی کر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور کچھ دیر لب سی کر بیٹھ گیا۔

اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی کو حوصلہ نہ ہو سکا کہ اسے داستان آگے سنانے کے لیے کہیں۔ ویسے انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ شفقت کی داستان کسی ایک فرد سے حاصل کردہ

معلومات پر مشتمل نہیں ہے اور اس نے مختلف لوگوں کے بیانات کے علاوہ اپنے قیاسات کی مدد سے بھی
بیٹے کی دردناک داستان کے تانے بانے جوڑے ہیں۔ آخر کار اس نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے
پھر داستان کا منقطع ہو جانے والا سلسلہ جوڑا۔

''تم لوگ شاید اندازہ لگا سکو کہ پرنسپل کی زبانی صداقت کی موت کی اطلاع سن کر مجھ پر کیا گزری
انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ صداقت کی موت نشے کی اوور ڈوز کی وجہ سے واقع ہوئی ہے اور موت
نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا پڑا ہے۔ اس وقت مجھے پرنسپل کے کمرے میں
والے کی موجودگی کا سبب سمجھ آیا۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ کیا میں صداقت کے نشہ استعمال کرنے سے
تھا اور جانتا تھا کہ وہ کن ذرائع سے نشہ حاصل کر رہا ہے؟ میں صداقت کی موت کی خبر سن کر اتنا حواس باختہ
تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی جواب دے گئی تھیں۔ میں انسپکٹر کو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے
صداقت کا جسدِ خاکی لے کر پنڈ واپس آ گیا۔ پورے پنڈ میں کہرام سا مچ گیا۔ صداقت کی ماں، بیٹے کی
دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کا دماغی توازن اب تک درست نہیں ہوا ہے اور وہ سارا وقت یا تو گم صم
رہتی ہے یا پھر خیالوں میں صداقت سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود بھی کئی دن تک ہوش میں
آ سکا تھا۔ بعد میں دوستوں، رشتے داروں کے حوصلہ دینے پر ذرا سنبھلا تو پھر بیٹھ کر سارا حساب کتاب
میں نے تم لوگوں کو صداقت کے نشے کا عادی ہونے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا لیکن درحقیقت یہ بات
بعد میں سمجھ آئی تھی کہ وہ اس علت میں کیسے مبتلا ہوا۔

''چھٹیوں میں اسے پڑنے والے دوروں اور پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانے اور وہاں جا کر
جانے والا معاملہ یاد آنے پر مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ایسی جگہوں پر بھنگ، چرس
افیون جیسے نشوں کا استعمال عام ہے۔ پھر میں کھوج میں پڑ گیا۔ میں نے اپنے کاروبار سمیت ہر شے کو چھوڑ
اس معاملے کی تحقیق شروع کر دی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں پر دیسی نشوں کے علاوہ ہیروئن بھی دستیاب
جس میں ایسے افراد کو مبتلا کیا جاتا ہے جو صاحبِ حیثیت ہوں اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کر سکیں۔ صداقت
موت کے ذمے داروں کو کھوج نکالنے پر مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ مس رعنا کا عشق تو بس ایک بہانہ تھا۔ لوگ
میں لڑکے اس طرح کے معاملات میں پڑ ہی جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ سنبھل بھی جاتے ہیں۔

بالفرض اگر صداقت خود سے نہ سنبھل پاتا تو میں کسی بڑے ماہرِ نفسیات سے اس کا علاج بھی کروا سکتا
لیکن جعلی پیر سائیں نے اس کی ذہنی ابتری کا فائدہ اٹھا کر اسے اور میرے خاندان کو جو ناقابلِ تلافی نقصان
پہنچایا، میں اسے کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خود کو تباہ کرنے والے کو بھی تباہ
ڈالوں گا اور ایسی اذیت ناک موت سے دوچار کروں گا کہ وہ بھی میرے بیٹے کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے
میرے نزدیک پیر سائیں کے ساتھ ساتھ ڈیرے کے دوسرے افراد بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے
لیے ان سب ملعونوں کے ساتھ اس جگہ کا وجود بھی مٹا دیئے جانے کے قابل تھا۔'' شفقت راؤ کی آنکھیں یہ
کہتے ہوئے لہو رنگ ہو گئی تھیں اور لہجے میں آتش فشاں کا سا قہر تھا۔ طویل عرصہ مار دھاڑ اور لوٹ مار
گزارنے والے اسلم کو بھی اپنے بدن میں پھریری سی محسوس ہوئی۔

''اس جگہ کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کرنے کے بعد میں کاروبار کی دیکھ بھال کے بہانے پنڈ سے روانہ
گیا لیکن اسی رات خاموشی سے واپس بھی آ گیا۔ یہ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اپنا کام نمٹانے کے بعد
راستے سے پنڈ سے نکلنے کے بجائے اس پہاڑی سلسلے کا راستہ استعمال کروں گا۔ اپنے اس منصوبے کی وجہ



نے ضرورت کا سارا سامان جمع کر لیا تھا۔ بہانے سے بیٹی سے روغنی روٹیاں بھی پکوالی تھیں۔ یہ سارا چکر
لیے تھا کہ کوئی کارروائی مکمل ہونے کے بعد مجھے گاؤں سے جاتا ہوا نہ دیکھے۔ میں بیٹا کھو چکا تھا لیکن بیوی
بیٹی کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیوی بھی فی الحال اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھی لیکن
یہ بات سمجھتا ہوں کہ عورت کے لیے شوہر اور باپ دونوں کے گھر اہمیت رکھتے ہیں۔ شوہر کے گھر رہ کر اگر
میکے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے تو میکے کا مان اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ میں اپنی بیٹی اور
کو اس عزت اور تحفظ سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ ڈیرے کو تباہ کرنے
کے بعد علی الاعلان ذمے داری قبول کر لوں۔ بہرحال اپنے تحفظات کا خیال رکھتے ہوئے میں نے رات کے
آخری پہر پیش قدمی کی اور ایک کنستر میں پٹرول لے کر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ میرا وفادار کتا اس وقت بھی
میرے ساتھ تھا۔ اگر کہیں سے کوئی مداخلت ہونے کا خطرہ ہوتا تو یہ بھونک کر مجھے پیشگی باخبر کر دیتا لیکن خیر
گزری اور کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی۔ میں نے پیر سائیں کے ڈیرے کے اطراف پٹرول چھڑک کر آگ لگا
دی۔ رات کے اس آخری پہر میں وہاں سناٹا طاری تھا۔ دوسرے یہ بھی ڈر نہیں تھا کہ پیر سائیں اور اس کے
چیلوں کے علاوہ دوسرے افراد بھی موجود ہوں گے اسی لیے میں نے اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اپنے سامان کا
تھیلا میں پہلے ہی پہاڑی سلسلے کے آغاز میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھ چکا تھا اس لیے وہاں سے بھاگ کر
سیدھا اسی طرف گیا۔ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈیرے میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے
ہیں۔ اس آگ نے میرے دل میں لگی آگ کو کافی ٹھنڈ پہنچائی اور اب مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے نہ صرف
اپنے بیٹے کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا بلکہ ایک ایسے ٹھکانے کو بھی تباہ کر ڈالا جہاں سے میرے بیٹے جیسے
معلوم نہ جانے کتنے نوجوانوں کو تباہ و برباد کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔''

یہ الفاظ کہتے ہوئے شفقت راؤ کے لہجے میں اطمینان در آیا تھا اور اب وہ یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کہنے کو
کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ داستان مکمل ہو گئی تھی اور داستان گو کے خاموش ہونے کے بعد ہی سامعین کو بھی اردگرد کا
ہوش آ سکا تھا۔ پو پھٹنے سے شروع ہونے والی اس داستان کی طوالت نے اتنا وقت لے لیا تھا کہ سورج سروں پر
چڑھ آیا تھا اور مسافروں کو یاد دلا رہا تھا کہ یونہی بیٹھے رہنا ان کی منزل کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

⊛----✪----⊛

لندن پہنچ کر چودھری نے ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق میٹرو ہوٹل میں کمرہ بک کروا لیا لیکن اب انتظار کی
کوفت میں مبتلا سخت بوریت کا شکار تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ کا نمائندہ اس سے کب ملنے آئے گا؟ وہ کسی
بھی وقت آ سکتا تھا اور اس کی آمد تک وہ ہوٹل کے کمرے تک محدود رہنے پر مجبور تھا۔ یہ صورتِ حال اسے
جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کا حکمرانی کا عادی ذہن اس صورتِ حال کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ ہی چڑتا
تھا۔ وہ ہمیشہ سے احکامات اور ہدایات جاری کرنے کا عادی تھا لیکن یہاں اسے دوسروں کی ہدایات کا انتظار کرنا
پڑ رہا تھا۔ یہ خواری اس نے دولت کی حرص میں مول لی تھی۔ حالانکہ دولت کی اس کے پاس کوئی کمی بھی نہیں تھی۔
اتنے اثاثوں کا مالک تھا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھیں لیکن حرص اور لالچ کے
دوزخ کا پیٹ کہاں بھرتا ہے۔ دولت کے لیے اس نے ساری زندگی کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ غریب مزارعوں کا خون
چوسنے سے لے کر لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ہر کام وہ بے کھٹک کرتا رہا تھا کہ اس کے خزانوں میں
اضافہ ہوتا رہے۔ اس جیسے شخص کے لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہو کر خطیر دولت کمانے کا موقع ایسا نہیں

تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دے۔ اس موقع سے مستفید ہونے کے لیے اس نے اپنی بالادستی کو قربان کرنا منظور کر لیا تھا اور اب میٹرو ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔

وہ فی الحال لندن کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے سے معذور تھا اس لیے ٹی وی اسکرین پر نظر آنے وا شباب اور سامنے رکھی شراب کی بوتل سے ہی دل بہلانے پر مجبور تھا۔ پُرتعیش کمرے میں موجود بڑی سی گلا دلدو سے باہر کا نظارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ رم جھم برستی برسات میں لندن شہر کے باسیوں کے معمولات جا تھے۔ وہ برسات کے ساتھ ساتھ لمحہ لمحہ بھیگتی رات سے بھی بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر کی طر لندن کے باسیوں کے لیے بھی دن اور رات کا فرق بہت زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ چودھری مضطرب ت یوں تنہائی میں وقت گزارنا اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا کہ نہ یہاں جاہ وجلال دکھانے کے لیے غلام وخدام اور نہ ہی دل بہلانے کے لیے وہ عورتیں جو اپنی بے بسی کی وجہ سے یا پھر دولت کے لالچ میں وقتاً فوقتاً اس بیڈروم کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ تیز اثر وہسکی اور ٹی وی اسکرین پر نظر آتے جلووں نے اس کے جذبات کو بھی زیادہ برانگیختہ کر دیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ انتظار کو ترک کر کے باہر نکل کھڑا ہو کہ اسی دم اس کے کمر کے دروازے پر دھیمی اور مہذبانہ دستک اُبھری۔

''کون؟'' اس نے چونک کر محتاط انداز میں پوچھا۔

''ویٹر سر!'' باہر سے نہایت دھیمی آواز میں اس کے سوال کا جواب دیا گیا۔

''کم اِن۔'' اس نے اُلجھن آمیز انداز میں ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دی۔ فوراً ہی آہستگی سے در کھول کر ایک خوش شکل اور بے داغ وردی والا نوجوان اندر داخل ہوا۔ چودھری زبان سے کچھ کہے بغیر استف بھری نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

''آپ ہمارے ہوٹل میں کسی قسم کی بے آرامی تو محسوس نہیں کر رہے سر؟'' باوردی ویٹر نے خلیقانہ میں سوال کیا۔

''اگر مجھے تکلیف ہوئی تو ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ کر دوں گا۔ تمہیں مجھے اس طرح ڈسٹرب نہیں کرنا چا تھا۔'' چودھری نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارا۔

''سوری سر! آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن آپ تنہا ہیں اور جب سے آئے ہیں کمرے سے بھی نہیں گئے تو میں نے سوچا کہ آپ کو یہیں کوئی تفریح فراہم کرنے کے بارے میں پوچھا جائے۔'' و مؤدبانہ جواب خاصا معنی خیز تھا جسے سن کر چودھری چونک پڑا۔

''کیسی تفریح؟'' اس نے ویٹر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تنہائی میں شراب کی بوتل کے ساتھ ساتھ اگر کوئی خوب صورت ساتھی بھی مل جائے تو اس سے بہتر تف کیا ہو گی؟''

اس کا جواب بڑا واضح تھا۔ انتظار کی کوفت میں مبتلا چودھری سوچ میں پڑ گیا۔ ڈیوڈ کے نمائندے کی کسی بھی وقت متوقع تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں اس سے ملنے آ جاتا۔ وہ آئندہ روز ج سکتا تھا اور بالفرض اگر جلدی بھی آ جاتا تو اس سے نیچے ہال میں ملاقات کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ کمرے کی تن میں ملاقات پر مصر ہوتا تو بھی اس کو کچھ دیر انتظار کروا کر وہ ویٹر کی فراہم کی گئی تفریح کو فارغ کر سکتا تھا۔ یہ سوچنے کے بعد اس نے ویٹر کی طرف پہلی بار ذرا دوستانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

''او کے۔ تم اسے لے آؤ۔ اگر واقعی تمہاری فراہم کردہ تفریح نے میرا دل خوش کر دیا تو تمہیں کمیشن



اوہ بھی انعام ملے گا۔''

''مجھے یقین ہے سر! کہ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔'' ویٹر نے اعتماد سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل ہا۔ اس کے باہر جانے کے بعد چودھری کو خیال آیا کہ لندن جیسے آزاد شہر میں ہوٹل کے ویٹر کو اس طرح کی الی کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ یہاں دوستی کے نام پر بھی سب کچھ ہو جاتا ہے اور پیشہ ور عورتیں بھی اپنا شکار اش کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔

ہوٹل کا یہ ویٹر شاید خاص طور پر ایشیائی افراد کی تاک میں رہتا تھا کہ ان کی اس قسم کی خدمت سرانجام دے راپنا کمیشن کھرا کر سکے۔ معاملہ جو بھی تھا بہر حال، اب تو وہ ویٹر سے ہامی بھر چکا تھا چنانچہ وہسکی کے ساتھ شغل رتے ہوئے آنے والی کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے یہ لمحے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے اور جلد ہی وازے پر دستک کی آواز اُبھری پھر اس کی خمار آلود ''کم اِن'' کے جواب میں آہستگی سے دروازہ کھولا گیا۔ دھری کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا لیکن وہ براہِ راست اس طرف دیکھنے کے بجائے جھک کر اپنے لیے ب تیار کر رہا تھا۔ گلاس میں برف کے کیوبز ڈالتے ہوئے اس کی نظروں نے دو سڈول ٹانگوں کو حصار میں لیا۔ ہ نازک کنپٹیوں والی اونچی ایڑی کی سینڈل میں قید پاؤں کسی بھی قسم کے کپڑوں سے آزاد تھے اور سیاہ سینڈل روں کی گوری رنگت کو بے حد نمایاں کر کے دکھا رہی تھی۔

چودھری کی نظروں نے آہستگی سے اوپر کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ ایڑی سے لے کر گھٹنوں تک وہاں بنا ی رکاوٹ کے نظارہ ہی نظارہ تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کا سفر شروع ہوا تو سیاہ اسکرٹ کی جھلک دکھائی دی اور پھر پر کی سمت سفر کرتے ہوئے اسکرٹ کا بلاؤز بھی یکدم ہی اختصار اختیار کر گیا۔ ٹانگوں ہی کی طرح بے حد بصورت بازو نہ صرف آستین کی جھنجٹ سے آزاد تھے بلکہ شانوں پر بھی کپڑے کی کسی دھجی کا نام ونشان نہیں ا۔ لمبی صراحی دار گردن میں موجود نقرئی نیکلس میں جڑے سیاہ پتھر گردن کے نیچے کے حصے میں جھولتے ہوئے صرف اس حصے کو مزید نمایاں کر رہے تھے بلکہ اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

صراحی دار گردن سے اوپر ایک بے حد حسین چہرہ فٹ تھا جسے چومتی بالوں کی سیاہ لٹیں شرارت پر مائل نظر تی تھیں۔ اس چہرے کو دیکھتے ہی چودھری ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کو رت ومسرت سے تکتے ہوئے کچھ کہنے کی خواہش میں ہونٹوں کو بے ڈھنگے پن سے جنبش دے کر رہ گیا۔ وہ ب کال گرل کی حیثیت سے اس کے سامنے آئی تھی اور آنکھوں اور بالوں کی بدلی ہوئی رنگت کی وجہ سے کافی لف لگ رہی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے سامنے موجود اس قتالہ کو پہچان نہ سکے۔ بلاشک وشبہ وہ لِنڈا تھی جس کے حُسن وشباب سے وہ امریکہ کی رنگینیوں میں رہ کر لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

''ہائے۔'' لِنڈا نے ایک ادا سے کہا اور دروازہ بند کر کے لہراتی ہوئی اس کے قریب آ کر سامنے والی کرسی نبھال لی۔

''ہیلو، واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہوٹل کے اس کمرے میں تم سے ملاقات ہو لے گی۔'' اپنی بے تحاشا خوشی کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری نے گلاس واپس میز پر رکھا اور لِنڈا کی رف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ جیسا سچا چاہنے والا ہو تو ملاقات کا موقع تو نکالنا ہی پڑتا ہے۔'' گہری سرخ لپ اسٹک سے سجے ں کے تراشیدہ ہونٹ مسکرائے اور اس نے چودھری کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو پُرجوش انداز ں تھام لیا۔ چودھری تو گویا اسے سامنے پا کر ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

''موقع تو تم نے خوب نکالا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے جس نمائندے سے ملاقات کے لیے لندن بلایا جا رہا ہے وہ تم ہو گی، وہ بھی اس انداز اور روپ میں۔'' چودھری نے اپنی حیرت و خوشی کا اظہار کیا اور ایک ادا سے پیگ تیار کر کے لِنڈا کی طرف بڑھایا۔

''میں پانی کی طرح ہوں چودھری صاحب! کسی بھی روپ میں ڈھل جاتی ہوں اور ایک نیا نام اپنا لیتی ہوں۔ یہاں آپ کو مجھے پامیلا کے نام سے بلانا ہوگا۔ رہی اس نمائندے کی بات جس سے آپ کو ملاقات کرنی ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔ مجھے آپ درمیانی پارٹی سمجھ لیں۔ اصل معاملات آپ کو کسی اور سے طے کرنا ہوں گے۔'' گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے جواب دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس انداز سے بیٹھ گئی کہ چودھری کو اپنا دل اُچھل کر حلق میں آتا ہوا محسوس ہوا۔

''تم درمیان میں رہو گی، میرے لیے یہ کافی ہے۔ میری طرف سے سارے معاملات تم ہی طے کر لینا۔'' چودھری نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا۔

''معاملات وہ آپ سے ہی طے کریں گے کیونکہ آپ کو ہی ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ میں بس دونوں طرف سے ضامن ہوں۔ آپ کو پے منٹ کرنے کی ذمے داری ہماری ہوگی جبکہ دوسری پارٹی کو میں آپ کی طرف سے یہ یقین دہانی کروا دوں گی کہ آپ کام ان کے مطلوبہ معیار کے مطابق ہی کریں گے۔'' لِنڈا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اوکے، جیسا تم مناسب سمجھو ویسا کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ ابھی کیا پروگرام ہے؟ اگر ڈنر نہیں کیا ہے تو میں روم سروس سے کہہ دیتا ہوں۔ ڈنر کے بعد اطمینان سے پرانی یادوں کو تازہ کریں گے۔ ڈنر سے بریک فاسٹ تک کا وقت یادوں کو تازہ کرنے کے لیے بہت مناسب ہوتا ہے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ اس ہوٹل میں بڑا زبردست بریک فاسٹ سرو کیا جاتا ہے۔'' کال گرل کے روپ میں اپنے کمرے تک آنے والی لِنڈا کو وہ بڑے سلیقے سے شب بسری کی دعوت دے رہا تھا یا پھر کنفرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا ویٹر نے اسے جس تفریح کو فراہم کرنے کا وعدہ کر کے اس کے کمرے تک پہنچایا تھا، اب اس کا کوئی امکان رہا تھا یا نہیں۔

''ڈنر میں نے نہیں کیا ہے۔ وہ میں آپ کے ساتھ ہی کروں گی لیکن یہاں نہیں۔ ہم لوگ ڈنر کے لیے کہیں اور چل رہے ہیں۔ وہیں کام کی بات بھی ہوگی۔'' لِنڈا کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔ اس جواب سے ظاہر تھا کہ وہ کال گرل کے روپ میں یہاں آئی ضرور ہے لیکن شب بسری کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ اس کی اوّلین ترجیح کام ہی ہے۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوتا ہوں۔'' چودھری نے وہسکی کا خالی گلاس میز پر رکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ عمدہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ مغرب لباس زیب تن کیے اس کا یہ روپ اگرچہ بہت سوں کے لیے اجنبی تھا لیکن درحقیقت وہ اس سے قبل بھی یورپی ممالک میں قیام کے دوران ڈنر پارٹیز وغیرہ میں اس لباس کو پہننا پسند کرتا تھا۔

''ویری اسمارٹ۔'' لِنڈا نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اس کی تعریف کی۔

''تھینک یو۔'' چودھری تفاخرانہ انداز میں مسکرایا پھر اس سے پوچھنے لگا۔ ''ابھی کچھ دیر بیٹھنا ہے یا پھر چلیں؟''

''ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔ پہلے آپ ویٹر کو بلا کر اس کے سامنے میرے لیے پسندیدگی کا اظہار کر دیں اور اسے یہ بھی بتا دیں کہ آپ مجھے شاپنگ کے لیے لے جا رہے ہیں۔'' وہ اپنا تیار کردہ پیگ پورا پی چکی تھی



اور اب لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگا رہی تھی۔

چودھری نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی ویٹر کو بلا لیا اور اس سے وہی کچھ کہا جو لِنڈا نے اس سے کہنے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی طے شدہ کمیشن کے علاوہ کچھ اور رقم بھی اسے عنایت کر دی۔ طے شدہ رقم سے زیادہ ملنے پر وہ خوش ہو گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتی لِنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین تھا سر! کہ آپ مجھ سے خوش ہوں گے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کے واپس ہوٹل آنے سے پہلے آپ کے کمرے میں ریڈ وائن کی بوتل پہنچا دوں؟ بارہ بجے کے بعد شفٹ چینج ہو جائے گی اور شاید واپسی میں آپ کی مجھ سے ملاقات نہ ہو سکے۔''

''نہیں، ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوئی، روم سروس سے خود ہی منگوا لیں گے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مس پامیلا کیا پینا پسند کریں گی۔'' اس نے ویٹر کو غیر ضروری طور پر بے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسے بھی اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ لِنڈا واپسی میں اس کے ساتھ ہوٹل آئے گی یا ڈنر سے ہی رخصت ہو جائے گی۔

''اوکے سر! ایز یو وِش۔'' ویٹر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی بے نیازی سے سگریٹ پیتی لِنڈا نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور کھڑی ہو گئی۔ رواج کے مطابق چودھری نے دروازہ کھول کر اسے باہر نکلنے کا موقع دیا اور پھر خود بھی باہر آنے کے بعد اس کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کر لیا۔ بازو کے حصار میں موجود لِنڈا کا ریشم سا جسم اس کے ڈھلتے وجود میں برق سی دوڑا گیا۔

''تم چاہتیں تو مجھ سے براہِ راست بھی ملنے آ سکتی تھیں۔ اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اپنی بے اعتدال ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے لِنڈا سے پوچھا۔

''بس احتیاطی تدبیر سمجھ لیں۔ ہم جو نازک کام کر رہے ہیں، اس میں ہر لمحے احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میدان میں موجود حریف پارٹیوں اور اینٹی نارکوٹکس کے عملے سے بچنے کے لیے احتیاط ہی سب سے مناسب ہے۔ میں جس طرح ویٹر کو گھیر کر آپ تک پہنچی ہوں، کوئی تصور بھی نہیں کر سکے گا کہ یہ عورت کال گرل کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتی ہے۔ واپسی میں میرے پاس موجود ڈھیر سارے شاپنگ بیگز مزید اس امر کی یقین دہانی کروا دیں گے کہ ایک چالاک کال گرل نے اپنی اداؤں کے جال میں پھانس کر بے وقوف ایشیائی کو مزید بے وقوف بنا ڈالا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنے عمل کی توجیح پیش کر رہی تھی۔ لفٹ میں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے بات کر رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ لِنڈا نے اسے جو وضاحت پیش کی تھی، وہ بالکل درست نہیں تھی۔ اس نے جو بہروپ بھرا تھا، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو ''موساد'' کی ٹاپ ایجنٹ لِنڈا پارکر کی لندن میں موجودگی کا علم ہو سکے۔ وہ اور ڈیوڈ ''موساد'' کے وسیع مقاصد کے لیے کام کرنے والے دو اسپیشل ایجنٹ تھے جو ظاہری طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے اور اسی حیثیت سے چودھری سے ملتے بھی رہے تھے لیکن درحقیقت اُن کا اس بزنس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے اور چودھری کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ ان کا ''موساد'' سے کوئی تعلق ہے۔

''تم میں یہی تو خوبی ہے کہ تم حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو ورنہ عورت کے اندر ان دونوں خوبیوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا ہے۔'' لِنڈا کے قرب سے پگھلتے چودھری نے بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے اس کی تعریف کی جسے اس نے ایک پُر یقین مسکراہٹ کے ساتھ وصول کیا۔

''ہم ٹیکسی میں سفر کریں گے۔'' باہر نکل کر چودھری نے پارکنگ کی طرف رخ کرنا چاہا تو لِنڈا نے ا
روک دیا۔

''ٹیکسی میں؟.....مگر کیوں؟''

''احتیاط کی وجہ سے۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے ہوٹل میں کمرہ بُک کروانے کے ساتھ ہی ایک
شاندار کار بھی کرائے پر لے لی ہے اور ہم چاہیں تو اس کار میں سفر کر سکتے ہیں لیکن میں اسے محفوظ نہیں سمجھتی
اس نے بجلیاں گراتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف رخ کیا۔ اگلے پون گھنٹے م
چودھری نے دیکھا کہ وہ کتنی محتاط ہے۔ ہوٹل سے وہ جس ٹیکسی میں چلے تھے، اسے ایک جگہ چھوڑنے کے ب
انہوں نے مزید دو ٹیکسیاں اور تبدیل کی تھیں، تب کہیں جا کر اس تنگ و تاریک اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے جہا
ایک کرخت صورت آدمی ان کا منتظر تھا۔ اس آدمی نے بہت لیے دیے انداز میں ان کا استقبال کیا یہاں تک ک
وہ لِنڈا کے بے تحاشا حُسن سے بھی متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں فضول تکلفات میں پڑنے کے بجائے براہِ راست کام کی بات شروع کر دوں تو
لوگ برا نہیں مانو گے۔'' کمرے میں پڑے بوسیدہ صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے گھر درے ل
میں کہا اور پھر ان کی طرف سے کوئی جواب آنے کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''ہم منشیات کی تجارت میں نمایاں ترین مقام رکھنے والی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہماری تنظیم کی برتر
کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آنے والے وقت اور حالات کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں
افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شمالی علاقے افیون کی کاشت کے لیے بہترین ثابت ہوتے رہے ہیں
اسی لیے ہم نے ان علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے کی لیبارٹریاں غیرہ بھی تعمیر کروائی تھیں لیکن بدلتے ہو
حالات میں تنظیم کے بڑوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہماری فصلیں اور لیبارٹریاں بھی اب حکام کی نظر میں
سکتی ہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب یہ کاروبار کہیں اور شفٹ کیا جائے۔ ان حالات میں ضروری ہے ک
ہمارے پاس کوئی متبادل انتظام ہو اور اسی کے لیے کثیر سرمایہ خرچ کر کے تحقیق کے بعد تمہارے گاؤں سے متصل
جنگل میں افیون کی کاشت کروائی گئی۔ تین مختلف قسم کے ارضی ماحول یکجا ہونے کی وجہ سے وہ جنگل ہماری نظ
میں آیا تھا اور ہم نے کچھ معمولی جینیاتی تبدیلیوں کے بعد وہاں افیون کی کاشت کروائی تھی۔ فصل تیار ہو جانے
کی وجہ سے ہم پہلے مرحلے میں کامیاب رہے۔ لیکن اصل کامیابی تب ہوتی جب اس افیون سے مطلوبہ معیار ک
ہیروئن تیار ہو پاتی۔ اس لیے پہلی فصل تیار ہوتے ہی اسے سب سے پہلے قبائلی علاقے کی لیبارٹری میں پہنچانے
کا انتظام کیا گیا۔ وہاں ہمارے ماہرین نے اس پر کام کیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ معمولی سے فرق کے ساتھ اس
افیون سے کامیابی کے ساتھ ہیروئن تیار کر لی گئی ہے۔ اس کامیابی کے بعد ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکے
ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح تمہاری زمین پر افیون کاشت کی گئی ہے، اسی طرح وہیں ہیروئن کی تیاری کے
لیے لیبارٹری بھی قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں تمہارا جوتوں کا کارخانہ پہلے سے ہی نظر میں تھا۔'' اس کا مخاطب
چودھری تھا اور اپنی پوری گفتگو کے دوران وہ لِنڈا کو نظر انداز کر کے مسلسل اسی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس کی ب
خود اعتمادی اور بے نیازی چودھری کو بے چین کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو لِنڈا ہی بڑی طاقتور عورت تھی
لیکن اگر کوئی شخص اسے نظر انداز کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بھی اونچی پوزیشن پر ہے۔ ایسے شخص
سے یہ امید تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اسے کوئی اہمیت دیتا اور یہی بات چودھری کے لیے سب سے زیاد
تکلیف دہ تھی۔



''مجھے ان میں سے بیشتر باتوں کا علم ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنے کارخانے میں آپ کے
معیار کے مطابق لیبارٹری تعمیر کروا سکوں۔'' احساسِ کمتری سے نکلنے کے لیے اس نے خود کو حالات سے واقف
ظاہر کر کے خود ہی اپنے آپ کو مورل سپورٹ دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں اس سلسلے میں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیبارٹری کی تعمیر اور عملے کی بھرتی ہمارا دوسرا ہے۔
تمہیں صرف ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ فی الحال یہ جان لو کہ تمہارے کارخانے میں آگ لگ گئی ہے جس
میں چار ورکرز سمیت سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جو اطلاع دی اسے سن کر
چودھری اُچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ لِنڈا کی ہدایت پر
ہوٹل سے نکلنے سے قبل اپنا موبائل آف کر چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ اگر کسی نے پاکستان سے اسے اطلاع
دینے کی کوشش بھی کی ہوگی تو کامیاب نہیں ہو سکا ہوگا۔

''موبائل واپس جیب میں رکھ لو۔ تمہارے لوگوں سے زیادہ بہتر اطلاع میں تمہیں دے سکتا ہوں کیونکہ
وہاں آگ میرے کہنے پر ہی لگائی گئی ہے۔'' اس نے سرد آواز میں چودھری کو حکم دیا لیکن مال سے بے حد محبت
کرنے والا چودھری اتنے بڑے نقصان کا سن کر ابھی تک سٹپٹایا ہوا تھا۔

''تم نے وہاں آگ کیوں لگوائی؟ تمہاری اس حرکت سے مجھے بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔''
چودھری نے احتجاج کیا۔

''مجھے علم ہے کہ وہاں کی ہر شے انشورڈ ہے اس لیے تم قطعی نقصان میں نہیں رہو گے۔ اس کے باوجود ہم
تمہیں اس کے بدلے معقول رقم فراہم کر دیں گے۔'' اس نے اپنی مستقل بے نیازی کے ساتھ جواب دیا جسے
سن کر چودھری کا چہرہ کِھل اٹھا۔

''لیبارٹری کی خفیہ تعمیر کے لیے ضروری تھا کہ کارخانے کے عملے کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ تم بلا جواز عملے
کو زیادہ دن کی چھٹیاں نہیں دے سکتے تھے۔ آگ لگنے کے بعد عملے کو گھر بٹھانے کے علاوہ کارخانے کی ازسرِنو
تعمیر کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا ہے۔ تعمیرِ نو کی آڑ میں ہم زیرِ زمین لیبارٹری آرام سے تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کام کے
لیے اعتماد کے بندے فراہم کرنا البتہ تمہاری ذمے داری ہوگی۔ چاہے جتنی بھی رقم خرچ کرنی پڑے، تم اعتماد کے
آدمیوں کی مدد سے یہ کام کروا لینا۔ ہم اپنے مستقبل کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے نفع کے بغیر بھی سرمایہ
کاری کے لیے تیار ہیں۔'' وہ بہت نپے تلے انداز میں بات کر رہا تھا۔ چودھری جیسے دبنگ آدمی کی بھی مجال
نہیں تھی کہ اس کے سامنے زیادہ بول سکے۔ ویسے بھی اس نے کثیر معاوضے کے عوض ان لوگوں کے لیے کام
کرنے کا معاہدہ کر کے ایک طرح سے خود کو ان کی ملازمت میں دے دیا تھا اس لیے عادت کے برخلاف
تابعداری تو کرنی ہی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر اس آدمی کی ہدایات سننے لگا جس نے اسے اپنا نام تک بتانا گوارا
نہیں کیا تھا۔ اس شخص نے ایک فولڈر نکال کر درمیان میں رکھی میز پر پھیلا لیا تھا اور وہ نقشہ دکھا کر اسے سمجھا رہا
تھا کہ کس طرح سے کارخانے کے نیچے لیبارٹری کی تعمیر ہونی ہے۔ چودھری اس نقشے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔
ساتھ ہی اسے ان لوگوں کے وسیع وسائل کا اندازہ بھی ہو گیا تھا جنہوں نے اس کی مدد کے بغیر اس کے کارخانے
کے ایک ایک انچ کے بارے میں نہ صرف معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ ایک نیا تعمیراتی نقشہ بھی بنوا کر اس
کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''تمہیں اپنے آدمیوں کی مدد سے صرف تعمیراتی کام کروانا ہوگا۔ مشینوں اور حفاظتی آلات کی تنصیب کا
کام میرے اپنے آدمی کریں گے۔ ہیروئن کی تیاری کے لیے کام کرنے والے ماہرین بھی ہم ہی بھجوائیں گے

البتہ نچلا عملہ تمہیں خود بھرتی کرنا ہوگا۔ اس بات کا انتظام میں کردوں گا کہ تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملوادوں
کام کے افراد کی بھرتی میں تمہاری مدد کر سکے۔'' وہ پوری تیاری کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے آیا تھا
چودھری خلافِ عادت اس کی ایک ایک ہدایت ذہن نشین کرتا رہا۔

''میں اپنی بات مکمل کر چکا ہوں۔ مزید ہدایات ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً تم تک پہنچتی رہیں گی۔ اگر
کوئی سوال کرنا چاہتے ہو تو کرلو۔'' فولڈر چودھری کی طرف کھسکا کر وہ خود سیدھا بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت
کمر ٹکالی۔

''میں ضرورت پڑنے پر تم سے کہاں رابطہ کر سکوں گا؟ اور یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نام سے پکاروں؟
چودھری نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے تمہیں مکمل تیار پلان
ہے۔ تعمیر کے لیے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی جائے گی۔ اگر رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی تو م
خود تمہیں فون کرلوں گا۔ رہی نام کی بات تو ہمارے ہاں نام نہیں ہوتے، البتہ تم مجھے مسٹر الفا کے نام سے
رکھو۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کوڈ نیم ہے اور کام چلانے کے لیے کافی ہے۔ ایک دوسرے کے اصل نام جاننا ہمار
لیے غیر ضروری ہے۔''

اس نے اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں جواب دیا جسے سن کر چودھری اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور ردِعمل م
خود بھی اسی کی طرح کا سرد لہجہ اپناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہماری ملاقات کا مقصد پورا ہوگیا ہے ا
اب مزید کوئی بات باقی نہیں رہی اس لیے اب ہمیں چلنا چاہئے۔''

''بالکل ٹھیک، اب تم یہاں سے جا سکتے ہو البتہ مس پامیلا کو رُکنا ہوگا۔'' مسٹر الفا نے شانے اچکا
ہوئے جو جواب دیا، اسے سن کر چودھری کو زبردست جھٹکا لگا۔

''لیکن پامیلا میرے ساتھ آئی ہے اور اصولاً اسے میرے ساتھ ہی واپس جانا ہوگا۔'' فوری جھٹکے
سنبھلنے کے بعد اس نے احتجاج کیا۔

''ساتھ آنے والے ساتھ واپس جائیں، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ دنیا میں ایک سا
آنے والے جڑواں افراد بھی کبھی ایک ساتھ دنیا سے واپس نہیں جاتے تو پھر تمہارا اور پامیلا کا اس اپارٹمنٹ
سے ایک ساتھ واپس جانا کیا ضروری ہے؟ یہ یہاں سے میرے ساتھ بھی واپس جا سکتی ہے۔ مجھے اس سے
اہم معاملات طے کرنے ہیں جن پر میں تمہاری موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔'' وہ عجیب سلگا
والے انداز میں بولا تو چودھری کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ پڑ گیا۔

اس کی کیفیت محسوس کر کے لِنڈا نے دخل اندازی کی اور نرمی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔ ''چودھر
صاحب! آپ واپس چلے جائیں۔ بعد میں کسی وقت میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔''

''اور تمہاری اس احتیاط کا کیا ہوگا؟ میں ویٹر سے کہہ کر آیا ہوں کہ ہم شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں ا
واپس ہوٹل ہی آئیں گے۔'' لِنڈا کو رُکنے پر آمادہ دیکھ کر چودھری تنک کر بولا۔

''آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جانے کے بجائے راستے میں کسی پب پر اُتر جائیے گا اور وہاں وقت گز
کر ہوٹل پہنچئے گا۔ اس سے ویٹر کو یہ تاثر ملے گا کہ ہم نے ہوٹل سے باہر ہی کہیں اپنے معاملات نمٹا لیے ہیں ا
آپ اکیلے واپس آگئے ہیں۔ ظاہر ہے کسی کال گرل کو کوئی بھی ہمیشہ تو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔'' لِنڈا نے نرم
میں اسے تدبیر بتائی۔



''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں باہر ہی رک کر تمہارا انتظار کروں اور تم مسٹر الفا سے تنہائی میں بات کر
مجھ سے آملو۔'' وہ کسی صورت لِنڈا کو وہاں چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تم نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ مس پامیلا میرے ساتھ یہاں سے
ائے گی اور ظاہر ہے اس دوسری جگہ میں تمہیں اپنا دُم چھلا بنا کر نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ
ارٹمنٹ میں نے صرف ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لیا تھا اور کچھ دیر میں مجھے اسے چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اور
بری اور آخری بات یہ ہے کہ ہمارے کام میں بحث مباحثے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تم بے شک لینڈ لارڈ ہو لیکن
تنظیم میں شامل ہونے کے بعد تمہیں حکم سننے اور اسے بے چون و چرا تسلیم کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی ورنہ
ت نقصان میں رہو گے۔'' چودھری کی تجویز کا جواب لِنڈا کے بجائے مسٹر الفا کی طرف سے آیا جو کہ خاصا
ت اور اہانت آمیز تھا۔ چودھری دانت کچکچا کر رہ گیا البتہ لِنڈا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی بھی ردِعمل
اظہار سے منع کر کے بے دست و پا کر دیا تھا اس لیے اس بار اس کی زبان بند ہی رہی۔

''او کے چودھری صاحب! تو پھر آپ روانہ ہوں۔ میں ابھی لندن میں ہی ہوں، آپ سے دوبارہ رابطہ کر
ں گی۔'' چودھری کو پسپا ہوتے دیکھ کر اس نے اسے تسلی کے چند حروف بھی پکڑا دیئے جنہیں سن کر وہ خاموشی
ے باہر نکل گیا لیکن غصے اور مایوسی سے مزاج سخت بگڑا ہوا تھا۔ کچھ گھنٹوں قبل رات لِنڈا کے قرب میں گزارنے
خیال سے طبیعت میں جو سرشاری سی پیدا ہوگئی تھی، اب اسے کسی اور کی بانہوں میں جاتا دیکھ کر سخت تکدر
ں بدل گئی تھی۔

⊛----✪----⊛

شہریار کی ہدایت پر مشابرم خان مسلسل بالے کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے اس شخص کا انتظار تھا جو
لے کی بیوی کے بیان کے مطابق کسی پیر سائیں کا نمائندہ یا مرید تھا اور جسے اس سے وہ ہڈیاں وصول کرنے
لیے آنا تھا جنہیں بالے کی بیوی شہزادی نے تازہ قبر کھود کر اس میں دفن بچے کی لاش کے پیر کاٹ کر حاصل
نا تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑی گئی اور قریب تھا کہ گاؤں والے اسے اس
م میں مار مار کر ہلاک ہی کر ڈالتے کہ ماریہ کے موقع پر پہنچ کر مداخلت کرنے سے اس کی جان بخشی ہوگئی۔ اس
فعل پر آمادہ نہ ہونے کے باوجود شہزادی کو صرف اور صرف اس لیے ہی یہ کام کرنا پڑا تھا کہ ہر ماں کی طرح
ں کے لیے بھی اپنے بچوں کی جدائی برداشت کرنا ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی معلوم
ں تھا کہ اس کی ساس اور شوہر بچوں کو لے کر کس جگہ گئے ہیں اور اس طریقے سے علاج کرنے کے دعوے دار
سائیں کہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے شہریار نے مشابرم خان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ جیسے ہی پیر سائیں کا
ارہ ہڈیاں وصول کرنے وہاں پہنچے، اسے گرفت میں لے لیا جائے۔

مشابرم خان نے گھر کی نگرانی کے لیے باہر رہنے کے بجائے دیوار پھاند کر اندر جانا پسند کیا تھا۔ اگر وہ
لے کے گھر کے باہر کھڑا ہو کر نگرانی کرتا تو فوراً ہی نظر میں آجاتا اور گاؤں والوں کے سوال و جواب کا سامنا
نا پڑتا چنانچہ اس نے دیوار پھلانگ کر اندر ہی جانا پسند کیا لیکن کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد ابھی تک کوئی نہیں
تھا۔ وہ کوفت زدہ سا ایک کمرے میں بیٹھ گیا اگر کوئی آتا تو یقیناً دروازے پر ہی دستک دیتا اور وہ بے خبری
اسے آسانی سے چھاپ سکتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے جب بہت ہی زیادہ بوریت ہونے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا

اور اس میں سامان بھی مختصر ہی تھا اس لیے وہاں جائزہ لینے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔ وہ اُکتا کر باہر صحن میں نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صحن میں سے دھپ کی آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا تھا کہ کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کُودا ہے۔ وہ دم سادھ کر اپنی جگہ رک گیا اور دروازے کی جھری میں سے جھانک کر صحن کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کا منظر اس کے سمعی اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا سا لڑکا تھا جو محتاط انداز میں اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ موجود تھا۔ لڑکے کی پیش قدمی دیکھ کر مشابرم خان تیزی سے دروازے کے بائیں جانب کی دیوار سے چپک گیا۔ اب اگر دروازہ کھولا جاتا تو اسے فوری طور پر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا جبکہ وہ آنے والے کو باآسانی عقب سے دبوچ سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد سب کچھ اس کی سوچ کے مطابق ہی ہوا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا لڑکا جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اس نے جھپٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ لڑکے کے لیے وہاں کسی کی موجودگی قطعی غیر متوقع تھی اس لیے وہ بری طرح بھڑکا لیکن مشابرم خان نے اس کا منہ پہلے ہی اپنی ہتھیلی کی مدد سے بند کر دیا تھا اس لیے سوائے معمولی سی غراہٹ کے کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔

''میرے پاس پستول ہے۔ اگر تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ بنا دوں گا۔'' مشابرم خان دھیمی آواز کے باوجود خوفناک لہجے میں غرایا جس کے جواب میں لڑکے نے تیزی سے اس کے سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے کسی بھی قسم کی غلطی نہ کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ اس کی خوف سے اُبلی ہوئی آنکھیں بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ مشابرم خان نے اس کا حال دیکھ کر اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور اسے اپنے پستول کی زد میں لینا کافی سمجھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے لڑکے سے سوال کیا۔

''عثمان۔'' لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' مشابرم خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔

''ادھر ہی گاؤں کا ہوں جی۔ آپ اے سی صاحب کے ڈریور (ڈرائیور) ہونا۔ میں آپ کو پہچانتا ہوں۔'' لڑکے نے اس کی شناخت بتا کر گویا اپنے گاؤں کے رہائشی ہونے کا یقین دلانا چاہا۔

''یہاں اس گھر میں اس طرح کیوں گھسے ہو؟'' ان لوگوں کے سامنے حالات جس طرح آئے تھے، اس کی روشنی میں یہی اندازہ تھا کہ شہزادی سے ہڈیاں وصول کرنے گاؤں کے باہر کا کوئی آدمی آئے گا۔ لیکن یہ تو کوئی گاؤں کا ہی رہائشی تھا اس لیے مشابرم خان کے سوال میں حیرت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

''بس جی، وہ متھا خراب ہو گیا تھا۔ بندہ بشر ہوں نا اس لیے لالچ میں آ کر مت ماری گئی۔'' لڑکے نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا اور چہرے کے تاثرات سے بھی شرمندہ سا نظر آنے لگا۔

''صاف صاف جواب دو کہ ادھر کیا کر رہے تھے؟'' مشابرم خان نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''میں ادھر چوری کے ارادے سے آیا تھا جی۔ بالا اتنے عرصے چودھری صاحب کا خاص کارندہ رہا ہے۔ میرے دماغ میں تھا کہ اس کے گھر میں کچھ نہ کچھ قیمتی سامان تو ہو گا۔ اصل میں جی میری حالت آج کل وڈی پتلی ہے تو ادھر گھر خالی دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ چرا لوں۔ لیکن مجھے کیا ملوم تھا کہ آپ پہلے ہی ادھر موجود ہوں گے۔'' لڑکے نے جو کہانی سنائی اسے سن کر مشابرم خان ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یہاں کسی جعل ساز پیر سائیں کے مرید کو پکڑنے کے لیے بیٹھا تھا اور لالچ کے مارے اس نوجوان سے ملاقات ہو گئی تھی۔

''تمہیں ایسی حرکت کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے تھی۔ ایک گاؤں میں رہنے والے لوگ تو ایک دوسرے



کی جان و مال کے محافظ ہوتے ہیں اور تم موقع دیکھ کر یہاں لوٹ مار کرنے آ گھسے۔'' اس نے لڑکے کو لتاڑا۔

''ماف کر دو جی۔ تہاڈی وڈی مہربانی ہو گی۔ میں نے بتایا نا کہ بس مجبوری کی وجہ سے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ پر اب میں توبہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' لڑکے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر اعدہ کیا۔

''دوبارہ تم کیا کرو گے کیا نہیں، اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن ابھی تم نے میرے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں یہاں ایک آدمی کا انتظار کر رہا تھا، اسے شہزادی سے ملنے کے لیے آنا تھا اور میرے خیال میں اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ اب تک نہیں آیا۔'' مشابرم خان نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''اوہو..... میرے خیال میں تو وہ آدمی آ کر واپس جا چکا ہے۔'' عثمان نامی لڑکا اس کی بات سن کر چونکا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟ کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟'' مشابرم خان نے عجلت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں اس سے ملا تھا۔ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بالے کے گھر کا پتہ پوچھا تھا اور اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ میں نے سوچا بھابی جی مشکل میں ہے۔ اکیلی عورت ذات تھانے کچہری کے چکر کیسے کرے گی؟ پنڈ میں تو سب کے دل میں اس کے لیے اتنا غصہ ہے کہ اگر اے سی صاحب اور ان کی بیگم بیچ میں نہ پڑتے تو سارے مل کر اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر ڈالتے۔ مجھے لگا کہ بھابالے کا دوست ان کے کام آ سکتا ہے اس لیے میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ پر وہ تو سن کر ایسا گھبرایا جیسے بھابی جی کی جگہ اسی کو سزا ملنے والی ہو۔ الٹے پیروں ہی واپس پلٹ گیا۔'' عثمان کی زبانی سارا قصہ سن کر مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نادانستگی میں مجرموں کے ایک ہرکارے کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر بیٹھا ہے۔ وہ اجنبی شخص جو بالے کا پتہ پوچھتا ہوا وہاں آیا تھا، یقیناً پیر سائیں کا بھیجا ہوا آدمی تھا جو شہزادی کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا سن کر سمجھ گیا کہ بازی اُلٹ چکی ہے اور اب کچھ بھی ہاتھ آنے والا نہیں بلکہ وہ اگر زیادہ دیر گاؤں میں ٹھہرا تو خود بھی پھنس سکتا ہے اس لیے فوراً واپسی کی راہ اختیار کی۔

''یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟'' مبہم سی امید کے سہارے اس نے عثمان سے دریافت کیا۔

''تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا۔''

''وہ آدمی اپنی سواری پر آیا تھا یا بس سے؟'' پیر آباد سے مختلف علاقوں کی طرف جانے والی گاڑیاں خاصے وقفے سے چلتی تھیں اس لیے اُس نے اس اُمید پر کہ اگر وہ آدمی بس سے آیا تھا تو ممکن ہے ابھی یہاں سے نہ نکل سکا ہو، عثمان سے تفتیش کی۔

''میرے خیال سے بس سے ہی آیا تھا۔''

''چلو پھر بس اڈے چلتے ہیں۔ تم نے اس آدمی کو دیکھا ہوا ہے۔ اگر وہ اڈے پر موجود ہو تو تم پہچان کر مجھے بتا دینا۔'' مشابرم خان نے اس کا بازو تھام کر فوراً ہی باہر کا رخ کیا۔ اس وقت اس کے لیے سب سے اہم اس آدمی تک پہنچنا تھا اس لیے اس نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا کہ عثمان وہاں چوری کی نیت سے آیا تھا۔ وہ دونوں ممکنہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اڈے تک پہنچے۔ اڈے پر ایک بس ابھی ابھی آ کر رُکی تھی اور اس سے مسافر اُتر رہے تھے۔ اس بس کے علاوہ وہاں دوسری کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اصل میں پیر آباد کا بس اڈہ وہ روایتی بس اڈہ نہیں تھا جہاں مسلسل کوئی نہ کوئی گاڑی موجود رہے۔ اس اڈے سے براہِ راست کوئی بس چلتی بھی نہیں تھی بلکہ لاہور اور دوسرے شہروں تک آنے جانے والی بسیں اس طرف سے گزرتے ہوئے بس تھوڑی دیر کے لیے رُکتی تھیں۔ اس مختصر وقت میں اگر کسی کو بس میں سوار ہونا ہو یا اس سے اُترنا ہو تو یہ کام نمٹا لیا

جاتا تھا ورنہ بعض اوقات تو بس بغیر رُکے بھی گزر جاتی تھی۔

وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچے تو انہیں بس سے اُترنے والے مسافروں اور روزگار کے سلسلے میں اڈے پر بیٹھنے والوں کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا جس سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مطلوبہ آدمی کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کسی دوسری بس میں سوار ہو چکا ہے۔

مشابرم خان کفِ افسوس ملتے ہوئے اڈے پر بیٹھے ہوئے افراد کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان کی مدد سے پیر آباد کے گرو کا حلیہ بتا کر یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اس حلیے کا آدمی کس روٹ کی بس میں سوار ہوا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ لمبے رُوٹ پر سفر کرنے والی ان بسوں کے مسافر راستے میں پڑنے والے قصبوں اور دیہاتوں میں بس رُکوا کر بھی اُتر جاتے ہیں لیکن کچھ نہ کر سکنے سے ممکنہ کوشش کر لینا بہتر تھا، ورنہ دوسری صورت میں اسے شہریار کے سامنے مکمل ناکامی کی خبر لے جاتے ہوئے شدید شرمندگی کا احساس ہوتا۔

''ڈبل ہے استاد۔'' وہ تین چار قدم ہی چلا تھا کہ اڈے پر چند لمحے قبل آنے والی بس کے کنڈیکٹر کی آواز سنائی دی۔ جس کا مطلب تھا کہ بس مسافروں کو اُتارنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو رہی ہے۔ مشابرم خان کا یونہی بے ارادہ پلٹ کر بس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر میں وہ آدمی آ گیا جو جانے اب تک کس کونے میں چھپا ہوا تھا اور اب دوڑتا ہوا بس میں سوار ہونے کی کوشش میں تھا۔

''یہی ہے۔'' عثمان بھی اتنی دیر میں اس شخص کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، چنانچہ اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی۔ جسے سنتے ہی مشابرم خان کے پیروں میں پہیئے لگ گئے۔ وہ برق رفتاری سے اس شخص کے پیچھے لپکا لیکن اپنی بقا کی جدوجہد کر رہا تھا اس لیے اس کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی۔ مشابرم خان کے دیکھتے دیکھتے وہ اُچھل کر بس کے پائدان پر پیر رکھ چکا تھا۔ اسی لمحے بس حرکت میں آ گئی۔ مشابرم خان کے لیے یہ ایک فیصلہ کن گھڑی تھی۔ اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو اس شخص کو فرار کا موقع مل جاتا۔ اسے فرار ہونے سے روکنے کے لیے اس نے لمبی جست لگائی اور بس کا ڈنڈا پکڑ کر پائدان پر کھڑے شخص کو پشت پر سے قمیض پکڑ کر رینگتی بس سے کھینچ لیا۔ اُس کی اس حرکت پر کئی لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ مشابرم خان کے گھسیٹنے کی وجہ سے وہ شخص پختہ سڑک پر گر گیا تھا اور یقینی طور پر اسے کئی چوٹیں بھی آئی تھیں لیکن پھر بھی اس نے کوشش کی کہ خود کو مشابرم خان کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ سکے مگر وہ اسے ایسا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اسے اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ اس ساری کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بس اور موجود لوگوں کے بھاگ کر ان تک پہنچنے تک مشابرم خان اس شخص کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر چکا تھا۔

''چھوڑو یار! کیا کر رہے ہو تم؟ کیوں اس وچارے کو مار رہے ہو؟'' کئی افراد بولتے ہوئے ایک اسے بچاؤ کروانے کے لیے میدان میں اُتر آئے۔ روانہ ہونے والی بس بھی ذرا سا آگے جا کر رک گئی تھی اور اس کے مسافر بھی اتر کر ان دونوں کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی جس کا فائدہ ہوتے شخص کو پہنچ سکتا تھا اور وہ مشابرم خان کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس بات کے لیے تیار نہیں تھا چنانچہ اپنا پستول نکال کر ہوا میں لہرایا اور تیز آواز میں بولا۔

''خبردار! اگر کسی نے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔'' لوگوں کو دھاک بٹھانے کے لیے اس نے ایک ہوائی فائر بھی داغ دیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کے گرد جمع ہونے والا ہجوم ذرا فاصلے پر ہٹ گیا۔

''ارے، یہ تو اے سی صاحب کا ڈریور ہے۔ یہ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے؟'' اس اثنا میں ہجوم



کے کئی افراد نے اسے شناخت کر لیا تھا اور بلند آواز میں اظہارِ حیرت کرنے لگے تھے۔

''یہ آدمی، اے سی صاحب کے بنگلے سے چوری کر کے بھاگا تھا۔ میں نے اُس وقت بھی اسے دیکھا تھا لیکن پکڑ نہیں سکا تھا۔ آج دکھائی دیا تو پکڑ لیا۔ تم لوگ اس معاملے کے بیچ میں نہ پڑو، میں اسے اے سی صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ خود اس کا فیصلہ کر دیں گے۔'' اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو اس شخص کی حقیقت بتانے کے بجائے بہانہ تراشا اگر وہ یہ بتا دیتا کہ یہ شخص اپنے پیر کے ایما پر شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے تو غم و غصے میں مبتلا وہ لوگ شاید اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیتے اور فی الحال اس شخص کا صحیح سلامت رہنا ضروری تھا تاکہ اس سے اس کے پیر کا حدود اربع معلوم کیا جا سکتا۔

''میں چور نہیں ہوں۔ میں تو ادھر کسی سے ملنے آیا تھا۔'' مشابرم خان کی گرفت میں موجود شخص نے اپنے بچاؤ کے لیے آواز بلند کی۔

''کس سے ملنے آئے تھے، اس کا نام بتاؤ؟'' مشابرم خان نے اس کو گھورتے ہوئے بآوازِ بلند پوچھا تو وہ ایک دم ہی چپ سادھ گیا۔ مشابرم خان کو خود بھی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں وہ کبھی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ یہاں بالے کی بیوی سے ملنے کے لیے آیا تھا اور ظاہر ہے اس اجنبی گاؤں میں اس کا کوئی دوسرا شناسا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اس کا نام لے سکے۔

''میں اسے اپنے ساتھ نور کوٹ لے جا رہا ہوں۔ وہاں اس کا فیصلہ اے سی صاحب خود کریں گے۔'' اس شخص کی خاموشی نے مشابرم خان کو خود بخود ہی یہ حق دے دیا کہ وہ حتمی فیصلہ سنا دے۔ اس بار وہاں موجود لوگوں میں سے بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ایک تو ویسے بھی مشابرم خان، شہریار کا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے شناسا اور قابلِ اعتبار تھا، دوسرے اس کے مقابل کی خاموشی نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے بھرا! تم اسے لے جاؤ۔ اے سی صاحب قانون کے مطابق کام کرنے والے آدمی نہیں ہوتے ہیں ان کے مجرم کو ہم خود بھی ٹھیک ٹھاک سبق دے سکتے تھے لیکن ہمیں ملوم ہے کہ ہم نے اسے انگلی بھی لگائی تو اے سی صاحب ناراض ہوں گے اس لیے اس کا مامله ہم تم پر ہی چھوڑتے ہیں۔'' آخر ان میں سے ایک شخص نے وہاں موجود سب لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مشابرم خان کو یہ یقین دہانی کرا دی کہ اس کے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

''بہت بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے اس چور کے مقابلے میں میرا اعتبار کیا۔'' مشابرم خان نے ان سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اس لمحے اُس کی توجہ بٹ گئی اور زیر ہو جانے والے حریف نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یک دم ہی اس کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ مشابرم خان کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور ناک پر ایک زوردار مُکا کھانے کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر مقابل کے ہاتھ میں چلا گیا۔

''اگر کوئی بیچ میں آیا یا میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں گولی چلا دوں گا۔ ابھی اس پستول میں پانچ گولیاں باقی ہیں۔ تم لوگوں کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے میں تم میں سے پانچ کی لاشیں گرا دوں گا۔'' کچھ دیر قبل چہرے پر مظلومیت طاری کیے کھڑا رہنے والا شخص یکدم ہی اپنے تیور بدل چکا تھا اور لوگوں کو دھمکا رہا تھا۔ گاؤں کے ان سیدھے سادھے لوگوں کے لیے جن کی زندگی صرف دال روٹی کمانے کے چکر میں گزرتی تھی اور جن میں اس سے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی، ہتھیار ایک خوف ناک شے کا نام تھا جس کے مقابل

آنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ غربت و افلاس کی چکی میں پسے ان لوگوں کے اندر اگر اس طرح کی کوئی جرأت ہوتی تو وہ دن رات چودھری کے مظالم نہ سہہ رہے ہوتے۔ چودھری آج تک طاقت کے بل پر ہی تو ان پر حکمرانی کرتا رہا تھا۔ اگر ان میں جرأت ہوتی تو مقابلہ کرتے اور اپنے حقوق کے خود ہی محافظ بن جاتے۔ لیکن ان کی بزدلی نے ان کے ساتھ ساتھ ان کی آنے والی نسلوں تک کے حقوق پامال کر دیئے تھے۔ اب بھی وہ سب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور وہ شخص پستول کے زور پر اتنے بڑے مجمع کو روکے رکھنے میں کامیاب ہو کر الٹے پیروں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

اُس کی حرکت کی سمت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بس کی طرف جانا چاہتا ہے۔ شاید وہ اس بس سمیت یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُلٹے قدموں پیچھے کی طرف جاتے ہوئے اس نے مشابرم خان پر خاص نظر رکھی تھی جو کافی بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس جیسے دلیر آدمی کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ پستول کی پروا کیے بغیر فرار ہوتے شخص پر حملہ کر دیتے لیکن اسے وہاں موجود دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ اگر وہ شخص فائرنگ کر دیتا تو کئی بے گناہ زد میں آ جاتے۔ وہ بے بس اسے فرار ہوتا دیکھتا رہا لیکن یک دم ہی عجیب معاملہ ہوا۔ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے شخص کو یکدم ہی ٹھوکر لگی اور وہ بری طرح پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ گرتے ہی اس کے ہاتھ سے پستول بھی نکل گیا۔ اصل میں ایک تو وہ اُلٹے قدموں چل رہا تھا، دوسرے اس نے اپنی ساری توجہ مشابرم خان اور ہجوم پر مبذول کر رکھی تھی اس لیے اچانک ہی اس بڑے پتھر کی زد میں آ کر اُلٹ گیا جو راستے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی مشابرم خان چیتے کی سی پھرتی سے حرکت میں آیا اور اپنی جگہ سے جست لگا کر اسے چھاپ لیا۔ چھاپتے ہی اس نے اسے لاتوں اور گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ بے دردی سے پٹتا وہ شخص واویلا کرنے لگا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے ہمدردی کرتا۔ چند لمحوں میں کوئی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس شخص نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس وقت وہ اپنی دھمکی کا نتیجہ بھگت رہا تھا اور آنے والے وقت میں اسے ایک شقی القلب نام نہاد پیر کا گرگا ہونے کا مزہ چکھنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں گاؤں کے اندر جاتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ جلد از جلد واپس آ سکوں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ وقت لگ جائے گا۔ شفقت راؤ کے بہنوئی اور داماد کو مطمئن کیے بغیر میں انہیں مدد پر آمادہ نہیں کر سکوں گا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے ان سے تفصیلی بات کرنی پڑے گی۔ تم بتاؤ تم یہاں اکیلی رُکنے سے ڈرو گی تو نہیں؟'' ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ان تاروں کی مدھم روشنی میں ماہ بانو کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسلم نے اس سے پوچھا۔

''تم جاؤ، میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کی سختیوں نے مجھے اتنا بہادر تو بنا ہی دیا ہے کہ کچھ وقت اس ویرانے میں تنہا رہ سکوں۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دی۔ مسلسل سفر کی تھکان نے اس کا جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا لیکن اس وقت ایک انسانی آبادی کے قریب موجود ہونے کا احساس اتنا فرحت بخش تھا کہ وہ اپنے اندر ایک نیا حوصلہ اور اُمنگ محسوس کر رہی تھی۔ پہاڑی سلسلے میں اتفاقاً مل جانے والا شفقت راؤ ان کے لیے ایک نجات دہندہ ثابت ہوا تھا جس نے انہیں پہاڑی بھول بھلیوں سے نکلنے کی راہ دکھا دی تھی۔ اس کی راہنمائی کی وجہ سے وہ اس لائق ہو سکے تھے کہ اس وقت ایک گاؤں کے قریب موجود تھے۔

یہ شفقت راؤ کا گاؤں ٹاہلی والا تھا جس کی راہ سجھاتے ہوئے اس نے اپنے خاندان والوں سے مدد



نے کی بھی اُمید دلائی تھی لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ ماہ بانو اپنے موجودہ حلیے میں گاؤں میں ل ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکی فوراً ہی سب کی نظروں میں آ جائے گی اس ی تجویز پیش کی تھی کہ ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد اسلم، ماہ بانو کو وہیں چھوڑ کر خود گاؤں میں چلا جائے اور پھر ں کے بہنوئی تک پہنچ کر اسے شفقت راؤ کا حوالہ دے کر مدد کی درخواست کرے۔ اس کی تجویز معقول تھی اس ے ان لوگوں نے اس پر عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔ شفقت راؤ سے الگ ہونے کے بعد وہ اس مقام تک پہنچ ے تھے اور یہاں سے آگے اسلم کو تنہا سفر کرنا تھا لیکن وہ ماہ بانو کو اس ویرانے میں چھوڑ کر جاتے ہوئے تذبذب ی شکار تھا البتہ ماہ بانو اب کوئی عام لڑکی نہیں رہی تھی۔ مسلسل ہونے والے تجربات نے اسے عام لڑکیوں ے مقابلے میں کافی بہادر اور باہمت بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار کرنے کے ائے اسلم کو اپنی طرف سے بھرپور تسلی دے ڈالی۔

''ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں لیکن تم اردگرد سے ہوشیار رہنا۔ ہتھیار تمہارے پاس ہے۔ اگر کوئی مشکل سر ان پڑے تو اس کے استعمال میں جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں جو بھی ہوگا، میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔'' اس کے لفظ لفظ سے ماہ بانو کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ساری ہدایات یاد رکھوں گی لیکن اب تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔ گاؤں لاتوں میں ویسے ہی اس پہر کھیتوں کے رکھوالے جاگ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ دیر اور گزر گئی تو کھیتوں پر کام رنے والے دوسرے لوگ بھی اپنے گھروں سے نکل آئیں گے اور تمہارا خاموشی سے شفقت راؤ کے داماد کے ر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔'' اس نے نرمی سے اسلم کو ٹوکا تو وہ آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر وہاں سے رخصت لیا۔ یہاں سے وہ ماہ بانو کو اسی صورت میں آگے لے جا سکتا تھا جب شفقت راؤ کے بہنوئی سے مدد حاصل رنے میں کامیاب ہو جاتا۔ کیونکہ وہی شخص اسے ماہ بانو کے لیے مقامی زنانہ لباس فراہم کر سکتا تھا۔ شفقت کے بہنوئی کا بھی عجیب معاملہ تھا۔ بہنوئی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ان نوں کے علاوہ اس سے اس کا ایک رشتہ اور بھی تھا۔ شفقت راؤ کی بیٹی کو اپنے بیٹے سے بیاہ کر اس کا سمدھی بھی بیٹھا تھا۔ لیکن رشتوں کی اس بھیڑ میں دوستی کا رشتہ سب سے نمایاں اور مضبوط تھا اور اسی رشتے پر بھروسہ تے ہوئے اس نے اسلم کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کے بہنوئی کو ان تمام حالات و واقعات سے آگاہ کر دے جن سے اس نے اسے مصلحتاً آگاہ نہیں کیا تھا۔

اسلم اسی مقصد کے لیے اس کے گھر جا رہا تھا۔ راستے یا گھر کے پتے کی اسے فکر نہیں تھی۔ ان دونوں ں کے بارے میں بھی راؤ نے واضح نشانیاں سمجھا دی تھیں۔ وہ دونوں سفر کا پہلا مرحلہ بغیر بھٹکے طے کر لینے بعد خاصے پُراعتماد ہو گئے تھے اور اُمید تھی کہ دوسرے مرحلے میں قطعی نہیں بھٹکیں گے۔ ماہ بانو سے جدا ہو کر قت راؤ کے بہنوئی کے گھر جاتے ہوئے اسے وہ دردبھری داستان بھی یاد آتی رہی جو شفقت راؤ نے اپنے ے کی موت کے سلسلے میں سنائی تھی۔ اب وہ ایک ایسے گھرانے سے مدد مانگنے جا رہا تھا جہاں مرنے والے یب لڑکے صداقت کی ماں بھی موجود تھی اور بہن بھی۔ وہ لوگ اس کی مدد پر آمادہ ہوتے یا نہیں، اسے ان ں سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اس ماں سے ضرور ملے جو اپنے بیٹے کو کھو کر ں وحواس گنوا بیٹھی تھی۔ صداقت کی ماں کی اس بے تحاشا محبت نے اسے اپنی ماں کی یاد دلا دی تھی۔ وہ بھی تو سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حوالے سے ڈھیروں خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ حالات کے نے اسے کچھ اس طرح سے مجبور کیا کہ اس کی ماں کی آنکھوں میں سجے سارے خواب بکھر کر رہ گئے اور مایوس

و دل گرفتہ ماں اس سے روٹھ گئی لیکن اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ رُوٹھنے کے باوجود اس کی ماں کا دل اس
لیے تڑپتا ہوگا اور آنکھیں اسے دیکھنے کے لیے ترستی ہوں گی۔

اپنی اور صداقت کی ماں کی تڑپ اس کے لیے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ایک کا بیٹا منوں مٹی کے نیچے دفن
ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا تو دوسرا جرائم کی دلدل میں پھنس کر ماں کے سامنے جانے کے لائق نہیں رہا تھا۔
اب ایک موہوم سی اُمید جاگی تھی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اس دلدل سے باہر کھینچ لیا تھا
اسے اُمید تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک صاف ستھری زندگی شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رُوٹھی ہوئی ماں
بھی منا سکے گا۔ اس کی اصول پرست اور ضدی ماں بے شک اس کے معافی مانگنے پر نہیں پسیجی تھی لیکن اسے یقین
تھا کہ ماہ بانو اسے منا لے گی۔ وہ اس کے لیے معافی کا در وا کر دے گی اور وہ ایک بار پھر ماں کی محبت
چھاؤں میں بیٹھ سکے گا۔

اسے ماہ بانو کی اثر پذیری کا اندازہ تھا۔ اس لڑکی کو دلوں کے قفل کھولنے کا ہنر آتا تھا لیکن یہ سب ہو
کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسی مقصد کے لیے
شفقت راؤ کے بہنوئی حامد راؤ کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں نظر آنے والی نشانیوں سے ظاہر تھا کہ اس کے سلسلے
سمت بالکل درست ہے۔ وہ بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ کھیتوں میں کام کر
رکھوالوں میں سے کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے اسے اپنے مقصد میں آسانی بھی تھی۔ جہاں
ذرا سا اندیشہ محسوس ہوتا، وہ خود کو زمین پر گرا لیتا۔ بالآخر تقریباً بیس پچیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے
وہ سبز پینٹ والے لوہے کے دروازے کے سامنے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک منزلہ مکان اچھا خاصا بڑا
اور مکان کی پختہ تعمیر سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مکین خاصے خوش حال ہیں۔ مکان کے سرسری سے جائزے
کے بعد ہی یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ بالکل صحیح جگہ پہنچا ہے، اس نے لوہے کے دروازے کی کنڈی بجا
اندر والوں کو اپنی آمد سے باخبر کیا۔ اندر سے فوراً ہی ردِعمل ظاہر ہوا۔

''کون ہے بھائی؟..... آ رہا ہوں۔'' قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی مردانہ آواز سنائی دی اور پھر بے دھڑک
دروازہ کھول دیا گیا کہ شہروں کی طرح گاؤں کے اس مکان کے مکین کو اس پہر اپنے دروازے پر دستک سن کر
تشویش تو ضرور ہوئی ہوگی کہ اس کا کوئی پڑوسی مشکل میں نہ ہو لیکن یہ خدشہ نہ رہا ہوگا کہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو
لوٹنے کے لیے آیا ہوگا۔

''میں حامد راؤ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دروازہ کھول کر باہر آنے والا ایک جواں سال مرد تھا
اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو پا کر حیران نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر دیکھ کر اسلم نے اندازہ لگایا کہ وہ حامد راؤ کا
اور شفقت کا داماد مقصود ہے لیکن شفقت راؤ نے اسے حامد سے مل کر حالات بیان کرنے اور مدد مانگنے کی ہدایت
کی تھی اس لیے اس نے مقصود سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے براہِ راست اس کے باپ سے ملنے
خواہش ظاہر کی۔

''آپ اندر آ جائیں۔ ابا جی تہجد پڑھ رہے تھے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ فارغ ہو گئے ہیں تو آپ کے آ
کی اطلاع دیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟'' مقصود کافی سعادت مند قسم کا برخوردار محسوس ہوتا تھا جس نے با
کے ملاقاتی سے اس پہر ملاقات کا سبب دریافت کرنے کے بجائے عزت و احترام سے اندر لے جانا پسند کیا تھا

''میرا نام اسلم ہے لیکن تمہارے والد صاحب مجھے نام سے نہیں پہچانتے ہوں گے۔ میں ملاقات ہونے
ہی ان سے اپنا تعارف کرا سکوں گا۔'' اس نے جواب دیا جس پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر مقصود اسے ایک ڈرائنگ



م کی طرز پر سجے کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ یہاں بیٹھ کر اسلم کو چند منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور
دروازے سے ایک باریش آدمی اندر داخل ہوا۔ اس آدمی کے چہرے میں شفقت راؤ کی ہلکی سی جھلک تھی لیکن
عمر میں اس سے چند سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔

''السلام علیکم! میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ کوئی اجنبی آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا
دیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' شفقت راؤ کی طرح وہ بھی ستھرے لہجے میں ہی بات کر رہا تھا۔

''سب سے پہلے تو میں ناوقت آپ کو زحمت دینے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ
آپ کو یہ تکلیف دینی پڑی۔'' اسلم کے لہجے میں حقیقی شرمساری تھی۔

''ہمارے ہاں مہمان کو کبھی زحمت نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی اس کے آنے پر تکلیف محسوس کی جاتی ہے۔ ہم
مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں اس لیے اس کی آمد پر ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔'' حامد راؤ نے ٹھہرے ہوئے لہجے
میں اسے جواب دیا۔

''شکریہ حامد راؤ صاحب! مجھے آپ کے بارے میں شفقت راؤ صاحب نے ایسی ہی یقین دہانی کروائی
تھی جب ہی میں یہاں اس وقت آنے کی ہمت کر سکا ہوں۔''

''اوہ! تو آپ کو شفقت نے میرے پاس بھیجا ہے۔ کیسا ہے وہ؟ اس کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے
بہت کوشش کی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا اور دفتر کے نمبر پر فون کرنے پر
معلوم ہوا کہ وہ وہاں پہنچا ہی نہیں۔ سب گھر والے اس کے لیے پریشان ہیں۔ آج میرا بیٹا مقصود اُس کی خیر خبر
لینے کے لیے جانے والا تھا۔'' اس کی زبان سے شفقت راؤ کا نام سن کر حامد مضطرب ہوا تھا۔ اُس کے اس انداز
سے ظاہر تھا کہ شفقت راؤ کا اس کی دوستی پر مان یونہی نہیں ہے۔ وہ واقعی اس سے شدید محبت کرتا ہے جب ہی
وہ ناپریشان بھی نظر آ رہا ہے۔

''وہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی تلاش میں مقصود کا شہر جانا بے کار ہوگا۔ وہ شہر میں موجود نہیں ہیں۔'' اس نے
آہستگی سے جواب دیا۔

اسی پل مقصود کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے والد کو اطلاع دینے کے لیے گیا تھا تو ان کے ساتھ دوبارہ
واپس نہیں آیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کو دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت رک گیا تھا۔

''چاچا جی شہر نہیں گئے تو پھر کہاں ہیں؟'' ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے مقصود نے بے چینی سے پوچھا۔

''اس کے لیے مجھے ذرا تفصیل سے سارے حالات بتانے ہوں گے۔'' اس نے باری باری دونوں باپ
بیٹے کی شکل دیکھی۔

''تو پھر بہتر ہے کہ پہلے تم کچھ کھا پی لو، پھر ہمیں تفصیلات بتاؤ۔ تمہارے چہرے اور حلیے سے ظاہر ہے کہ تم
بہت تھکے ہوئے اور بھوکے ہو۔'' اس نازک موقع پر بھی حامد راؤ نے وضع داری کا دامن نہیں چھوڑا اور اس کی
ٹرے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اسے کھانے کی دعوت دی۔

''آپ کا ہر اندازہ درست ہے لیکن میں اس وقت تک کچھ بھی نہیں کھا پی سکتا جب تک میری عزیز ترین
ہستی بھی میرے ساتھ یہاں موجود نہ ہو اور اسے یہاں تک لانے کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت
ہے۔'' اس نے قطعیت کے ساتھ انکار کیا۔

''آپ بلا تکلف بتائیں کہ ہم کیسے آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟'' اس کا جواب سن کر مقصود نے بے چینی سے
دریافت کیا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ آپ کو حالات سے آگاہ کر دوں تا کہ آپ میری بات سمجھ سکیں۔'' اس نے کہا اور پھر ان لوگوں کو اپنی اور شفقت راؤ کی ملاقات سے لے کر شفقت راؤ کے ڈیرے میں آگ لگانے تک سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

اپنے اور ماہ بانو کے بارے میں اس نے وہی کچھ بتایا تھا جو اس سے قبل شفقت کو بتا چکا تھا۔ وہ لوگ حیرت بھری پریشانی کے ساتھ سب کچھ سنتے چلے گئے۔ ظاہر ہے وہ گاؤں میں رہتے تھے اور آگ لگنے کا واقعہ ان کے علم میں بھی تھا لیکن اس حادثے کا ذمے دار شفقت راؤ ہے، یہ سن کر یقیناً انہیں شاک لگا تھا۔ اسلم ساری تفصیل سنا چکا تو حامد راؤ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر بڑے وقار سے بولا۔

''ان سارے حالات پر ہم بعد میں غور کریں گے، بہتر ہے کہ سب سے پہلے تمہاری بیوی کو گھر لانے کا انتظام کیا جائے۔ تنہا عورت کا اتنی دیر تک ویرانے میں رہنا کسی طور مناسب نہیں۔''

اس کا جملہ سن کر اسلم نے اپنے اندر ایک گہرا اطمینان سا اُترتا محسوس کیا۔

''مقصود بیٹا! جاؤ جا کر انیلا کا کوئی جوڑا اور چادر لے آؤ۔ تمہاری بہن کو گھر لانے کا انتظام کرتے ہیں۔''

وہ اپنا فیصلہ سنا کر فوراً ہی اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اپنے باپ کا حکم سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ لوگ گھر سے باہر موجود تھے اور اس سمت میں جا رہے تھے جہاں وہ ماہ بانو کو چھوڑ کر آیا تھا۔ جب وہ لوگ اس مقام پر پہنچے تو صبح کا اُجالا نمودار ہو چکا تھا اور منظر بہت واضح تھا لیکن اس منظر میں ماہ بانو کا نام ونشان نہیں تھا۔ اسلم بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔

ماہ بانو کو وہاں نہ پا کر اس پر قیامت سی گزر گئی تھی۔ ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ دنیا کی سب سے قیمتی اور اہم لڑکی تھی جس کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ پا کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا میں آکسیجن کا تناسب یک دم ہی کم ہونے لگا ہو اور اسی کمی سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

''پریشان نہ ہو نوجوان! ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟'' اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر حامد راؤ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی لیکن ماہ بانو کا غیاب ایسا معاملہ نہیں تھا کہ کسی کے تسلی دلاسوں سے اس کا اضطراب کم ہو جاتا۔ وہ بے چین سا ہو کر اس کی تلاش میں چل پڑا۔ حامد راؤ اور اس کا بیٹا مقصود بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے دو مختلف سمتوں میں بڑھ گئے۔ اسلم، ماہ بانو کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا اس لیے سب سے پہلے اسے قرب وجوار میں تلاش کرنا ضروری تھا۔ آس پاس دیکھنے پر اگر وہ نہ بھی ملتی تو کچھ نہ کچھ ایسی علامات ضرور نظر آ جاتیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اگر وہ خود اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی تو لازمی بات ہے کہ وہاں کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی۔ کسی حادثے کا شکار ہو جانے کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ کوئی اتفاقاً اس طرف نکل آیا ہو اور ایک جوان خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی، دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ کسی آوارہ وحشی جانور کا نشانہ بن گئی ہو گی۔

خیال میں آنے والا ہر امکان اتنا خوف ناک تھا کہ برسوں ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر بے جگری سے زندگی گزارنے والا اسلم بھی اندر سے تھرّا کر رہ گیا۔ ڈیرے کی تاریک زندگی میں اس نے عزتیں لٹتی بھی دیکھی تھیں اور بکتی بھی۔ وہ انسانی خون کی ارزانی سے بھی واقف تھا اور انسان کی بلبلے جیسی حیثیت سے بھی۔ اسے معلوم تھا کہ کسی چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے شخص کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے، ہاں یہ بات رہ جانے والے ضرور زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے ماہ بانو نہ ملتی تو وہ خود بھی بے روح مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ اس کی زندگی تھی، سو وہ اپنی زندگی کی تلاش میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ اس وا



ب میں اچانک ہی وہ ایک چٹان کی دوسری طرف گیا تو اس کے حلق سے ایک عجیب لایعنی سی آواز نکل گئی۔ ک بے حد پریشان شخص کی خوشی کا اظہار تھا۔ ماہ بانو بالکل سامنے ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے سو رہی ا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بلا ارادہ صرف نیند سے مغلوب ہو کر اچانک ہی سو گئی ہے ورنہ لعلہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ایک نظر میں یہ سب کچھ جانچ لینے کے بعد اسلم کے وجود میں یک دم ہی غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی اس کو منے پا کر جو خوشی محسوس ہوئی تھی، وہ بہت تیزی سے غصے میں تبدیل ہو گئی۔ یہ پریشانی کی انتہا پر پہنچ جانے لے شخص کا ایک فطری ردِعمل تھا ورنہ پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے ماہ بانو کا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ جس ح اس کے دائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا، اس انداز میں وہ سنگِ مرمر سے تراشا ہوا حسین مجسمہ لگ رہی تھی جس پر خاص رخ سے پڑتی سورج کی شعاعیں حُسن میں مزید جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ غصے میں مبتلا اسلم اس ن منظر سے متاثر ہوئے بغیر آگے بڑھا اور ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگی۔

''تم واپس آ گئے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔'' اسے سامنے پا کر وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''تم تو یوں آرام سے سو رہی تھیں جیسے شہزادی صاحبہ اپنے محل میں ہوں۔ ابھی میری جگہ کوئی اور یہاں جاتا تو تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا تھا، اس کا تم خود بھی اندازہ لگا سکتی ہو۔ مانا کہ کم عمر ہو لیکن جن حالات گزرتی رہی ہو، وہ انسان کو عقل سکھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی جگہ سے ہٹیں ں؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں وہاں نہ پا کر میرا کیا حال ہوا؟ قیامت گزر گئی تھی مجھ پر۔ آدمی کسی کی چاہت واقف ہو تو کیا اسے ستانا ضروری سمجھتا ہے؟'' وہ غصے میں بولتا چلا گیا۔ ماہ بانو اُس کی اپنے لیے چاہت بھی واقف تھی اور موجودہ کیفیت کا بھی اندازہ کر سکتی تھی اس لیے اس کے غصے کا ذرا برا نہیں مانا اور نرمی سے حت کرتے ہوئے بولی۔

''سوری اسلم! میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے یاد تو تھا کہ تم نے اپنی جگہ سے ہٹنے سے لیا تھا لیکن مجھے اذان کی آواز سنائی دی تو میں رہ نہیں سکی۔ جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے، وہاں نماز پڑھنے بلکہ نہیں تھی اس لیے میں یہاں آ گئی۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس تو کوئی دوپٹہ یا چادر ہی ہے جسے اوڑھ کر میں نماز ادا کر سکوں۔ اپنی اس بے بسی پر مجھے شدید رونا آیا۔ تم سوچو کہ میرے لیے کتنی ا کا مقام تھا کہ ربّ نے پکارا تھا اور میں اس پکار کے جواب میں اپنے رب کی بارگاہ میں جانے کی اہل نہیں تھوڑی دیر تک میں اس صورتِ حال پر روتی رہی پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں بے بس اور لاچار ، اللہ تعالیٰ میری نیت بھی جانتا ہے اور میری معذوری کو بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہاں حالات کے تحت ی رعایتیں دینے کا بھی اصول ہے۔ جیسے پانی دستیاب نہ ہونے یا کسی بیماری کی صورت میں تیمم کی ت ہے، حالتِ خوف میں نماز قصر کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح وہ میرے عذر کو بھی قبول کر لے گا۔ نے اپنے دل کی گواہی پر جس حال میں تھی، اسی حال میں نماز قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نماز کی ادائیگی کے رے دل کو جو سکون ملا، اسے میں تمہارے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں نماز سے فارغ ہونے ند اس پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور تسبیحات پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے جانے کب اور کیسے اتنی گہری نیند ہ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا اور اب تمہارے اٹھانے پر جاگی ہوں۔ یقین کرو، میں چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوں لیکن اتنا سکون محسوس کر رہی ہوں جیسے رات بھر کی نیند لے کر جاگی ہوں۔''

وہ جیسے جیسے اپنی بپتا سناتی گئی، اسلم کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ اس نے پہلی بار ماہ بانو کا

[illegible] لوٹ کی کہ اس کے رخساروں پر اب بھی آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشانات موجود [illegible] ان کی تصدیق ہو رہی تھی۔

[illegible] سوری۔ بس میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اس لیے مجھے غصہ آ گیا۔'' اس کی ماما [illegible] لوٹی کلام ہی نہیں تھا۔ بس وقتی طور پر غصے سے مغلوب ہو کر اسے چند سخت جملے کہہ بیٹھا تھا [illegible] ہو رہا تھا۔

[illegible] سوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا غصہ فطری تھا۔ بہت زیادہ پریشانی میں انسان [illegible] ایکٹ کر جاتا ہے۔ تم میرے حالات سے واقف نہیں تھے اس لیے تھوڑا سخت بول گئے۔ فکر مت [illegible] برا نہیں مانا۔'' وہ ویسے بھی عام طور پر نرمی سے ہی بات کرتی تھی اور اس وقت تو اس کے [illegible] بہت ہی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سکون جو اس نے اپنی انوکھی نماز سے حاصل کیا تھا، اس کی آواز [illegible] کے تاثرات سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ خاص طور پر گفتگو کے اختتام پر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ [illegible] تھی، اس نے تو اس کے چہرے کو بالکل ہی الوہی سا تاثر دے دیا تھا۔ اسلم مبہوت سا اس کی شکل دیکھتا رہ [illegible] اسے اس کیفیت سے مقصود کی آواز نے نکالا۔ وہ اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ اور اس کا باپ حامد [illegible] ماہ بانو کی تلاش میں مخالف سمت میں گئے تھے اور شاید ناکام ہونے کے بعد واپس پلٹ آئے تھے۔ مقصود کی آ [illegible] سن کر وہ تیزی سے پلٹا۔

''کہو بھائی! تمہیں کامیابی ملی یا نہیں؟ میں اور ابا تو کافی دور تک دیکھ آئے ہیں۔ ابا جی تو اور بھی آگے [illegible] چاہتے تھے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہو سکتا ہے بھائی اسلم کو بھابی جی مل گئی ہوں اور وہ لوگ ہماری راہ [illegible] رہے ہوں اس لیے خوامخواہ اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ پہلے یہاں کا حال معلوم کر لیں۔'' اس سے سا [illegible] ہوتے ہی مقصود نے بولنا شروع کر دیا۔

''تم نے اچھا کیا۔ تمہاری بھابی جی مل گئی ہے۔ وہ اس طرف آڑ میں ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتفاق سے [illegible] لگ گئی اسی لیے اسے ہم لوگوں کے آنے کا پتہ نہیں چل سکا۔'' اسلم نے اسے اطلاع دی۔ ماہ بانو جان بو [illegible] اس کے ساتھ یہاں تک نہیں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسلم اس کے لیے زنانہ لباس کا بندوبست کرنے [illegible] اور اس کی کسی کے ساتھ وہاں آمد کا مطلب تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے اس لیے اس نے منا [illegible] نہیں سمجھا تھا کہ چست جینز اور ٹی شرٹ میں کسی کے سامنے آئے۔ وہ اپنی جگہ رک کر کپڑوں کا انتظار کر رہی [illegible] اسی لیے اسلم اور مقصود کے درمیان سوال و جواب کی یہ نوبت پیش آئی۔ بہ صورتِ دیگر مقصود خود اسے دیکھ [illegible] کسی سوال کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

''چلو یہ تو اچھی خبر ہے۔ تم بھابی جی کو یہ جوڑا پہنچاؤ، تب تک میں ابا جی کو دیکھتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ [illegible] واپس پلٹے تھے لیکن یہاں تک سیدھے آنے کے بجائے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے اس [illegible] یہاں نظر نہیں آ رہے۔'' اسلم کے ہاتھوں میں اپنی بیوی کے لباس والا تھیلا تھما کر مقصود وہاں سے روانہ ہو [illegible] اسلم بھی اس طرف پلٹ گیا جہاں ماہ بانو موجود تھی۔ اسے تھیلا تھمانے کے بعد وہ خود اسی پہلے والی جگہ پر [illegible] مقصود اور حامد راؤ کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ دونوں وہاں آتے نظر آئے۔ اسی وقت [illegible] بانو بھی لباس تبدیل کر کے وہاں پہنچ گئی۔ مقصود کی بیوی انیلا کا لباس لمبائی کے اعتبار سے اسے بالکل ٹھیک آ [illegible] البتہ چوڑائی زیادہ ہونے کی وجہ سے قمیص ڈھیلی ہو رہی تھی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انیلا قد و قامت [illegible] تقریباً ماہ بانو کے برابر ہی ہے لیکن اس کا جسم ذرا فربہ ہے۔



ماہ بانو نے لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ انیلا کی چادر بھی اوڑھ لی تھی۔ میرون رنگ کی رنگ برنگے [illegible] گوں سے کڑھی وہ چادر جس میں جابجا ننھے ننھے شیشے بھی ایک خاص ترتیب سے لگے ہوئے تھے، اس پر [illegible] ب جچ رہی تھی۔ اسلم نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اگر مغربی لباس میں ماہ بانو کا حُسن آنچ دے رہا تھا تو [illegible] اس بڑی سی چادر کے ہالے نے اسے جو تقدس عطا کیا تھا، اس سے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے [illegible] تھے۔ اس کا مغربی انداز اگر اسے شعلہ جوالہ بنا گیا تھا تو خالص مشرقی پن نے چاندنی کی سی ٹھنڈک اور سنہری [illegible] ن عطا کر دیا تھا۔

''السلام علیکم چاچا جی!'' حامد راؤ کو دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھی اور اسے سلام کرنے کے ساتھ ہی اس کے [illegible] سامنے سر بھی جھکا دیا۔

''جیتی رہ دِھی رانی!'' حامد راؤ نے فوراً ہی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی پھر مزید بولا۔ ''آج سے تُو [illegible] ہی میری دِھی ہی ہے۔ میں نے تجھے اپنی بہو کی چادر صرف اوڑھنے کے لیے نہیں دی ہے بلکہ اس چادر کو [illegible] اوڑھتے ہی تُو بھی میری ذمے داری ہو گئی ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی ضرورت پڑے، اپنے چاچے کو آواز [illegible] ے کر دیکھ لینا۔ ہاتھ پیروں سے سلامت ہوتے میں کبھی تیری مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

''شکریہ چاچا جی! آپ نے مجھے اپنا سمجھ کر بڑا مان دیا۔'' ماہ بانو کی آواز بھرا گئی۔

''جھلّی نہ ہو تو..... ایک طرف مجھے چاچا جی بھی کہتی ہے اور پھر غیروں کی طرح شکریہ بھی ادا کرتی ہے۔ [illegible] ہی کے منہ سے شکریے کا لفظ سننا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اُلٹا تکلیف ہوتی ہے۔'' حامد راؤ نے اسے محبت سے [illegible] ڈکا جس پر وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی۔

''میرے خیال میں اب گھر چلتے ہیں ابا جی! باقی باتیں آپ لوگ وہاں پہنچ کر کر لیجیے گا۔'' مقصود نے [illegible] ہیں ٹوک کر وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تو ان کا مختصر سا قافلہ چل پڑا۔ وہاں سے روانہ ہوتے ہی ماہ بانو نے چادر کا پلّو اس طرح منہ پر ڈال لیا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے نکل کر گاؤں کے [illegible] آباد حصے تک انہوں نے خاموشی سے سفر طے کیا۔ وہ گاؤں کی حدود میں پہنچے تو توقع کے مطابق وہاں معمول کی [illegible] چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ کئی نظریں [illegible] ان کی طرف بھی اُٹھیں۔ ان نظروں میں حیرت و تجسّس تھا۔ آخر ایک موڑ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی ان کے سامنے آ [illegible] کھڑا ہوا۔

''کی حال ہے راؤ صاحب! سویرے سویرے کدھر سے آ رہے ہو؟'' اس شخص نے ماہ بانو اور اسلم کے [illegible] بارے میں براہِ راست سوال کرنے کے بجائے حامد راؤ سے بے تکلفانہ انداز میں خیریت دریافت کی۔ البتہ [illegible] اس کی نظریں مسلسل اپنے پنڈ میں نظر آنے والی دو اجنبی شکلوں کا طواف کر رہی تھیں۔

''سب خیر ہے شریف صاحب! شہر سے یہ پروہنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں پہاڑ دیکھنے کا شوق چڑھا تو [illegible] میں اور پتر مقصود منہ اندھیرے انہیں ادھر لے گئے۔ انہیں سیر کرا کر ادھر ہی سے آ رہے ہیں۔''

حامد راؤ نے ایک ایسا معقول جواب دیا جسے سن کر شریف کے نام سے مخاطب کیے جانے والے شخص کے [illegible] پاس مزید سوال جواب کی گنجائش نہیں رہی ورنہ یقینی طور پر اسلم کا حلیہ جو ڈیرے سے فرار ہونے کے بعد پہاڑی [illegible] سلسلے میں بھٹکتے رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہو گیا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کر رہا ہو [illegible] گا۔ لیکن مہمان کے بارے میں اس قسم کا استفسار اس کی بے عزتی تصور کیا جاتا اس لیے اس نے تجسّس کے [illegible] باوجود کچھ پوچھنے سے گریز کیا اور ایک خوش دلانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسلم کی طرف مصافحے کے

لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تسی راؤ صاحب دے پروہنے ہو تو سمجھو سارے پنڈ دے پروہنے ہو۔ جی بھر کر ادھر کی سیریں کرو پیو۔ میں راؤ صاحب نال درخواست کروں گا کہ اپنے پرہنوں نال ایک وقت کی روٹی میرے گھر پر بھی کھائیں

اسلم جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر بس مسکراتا رہا۔ اس بندے سے حا کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں، اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی دعوت قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کرسکتا۔ ویسے وہ یہاں دعوتیں کھانے نہیں آیا تھا۔ یہ تو بس ایک اتفاق ہی تھا کہ قسمت اسے ٹاہلی والا لے آئی تھی اور یہاں مہربان میزبان میسر آ گئے تھے لیکن وہ ان میزبانوں سے زیادہ خاطر مدارات کروانے کا ارادہ نہیں رکھتا اسے جلد از جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے محفوظ مقام کی طرف جانا تھا جہاں وہ ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی ز کا آغاز کرسکے۔

''مہلت ملی تو آپ کی دعوت ضرور قبول کریں گے شریف صاحب! ابھی آپ اجازت دیں۔ گھر پر نا تیار ہوگا اور ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔'' حامد راؤ نے بہت خوب صورتی سے اس کی دعوت ٹالنے کے ساتھ س فوری طور پر جان بھی چھڑانے کا بندوبست کیا۔ وہ یہ جان کر کہ ابھی ان لوگوں کو ناشتہ کرنا ہے، فوراً ہی وہاں روانہ ہوگیا۔

''یہ بندہ پیر سائیں کے عقیدت مندوں میں سے ایک ہے۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی ہوتی کہ تم ا ایسے شخص کی طرف سے بھیجے گئے ہو جو پیر سائیں کی خانقاہ میں آگ لگانے کا ذمے دار ہے تو اس کا رویہ با مختلف ہوتا۔'' شریف کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے قدم آگے بڑھائے تو مقصود نے سرگوشی میں اسلم کو بتایا

''دیکھنے میں تو یہ خاصا معقول آدمی لگتا ہے پھر پیر سائیں جیسے جعل ساز کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟'' نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ان جعلی پیروں فقیروں کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ یہ اپنے داؤ پیچ سے معقول سے معقول آدمی کی عقل ماؤف کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور پھر شریف صاحب کا ہی کیا ذکر، یہاں تو کبھی کسی نے پیر سائیں غلط آدمی نہیں سمجھا۔ خانقاہ کو آگ لگائے جانے کے واقعے پر تقریباً پورا پنڈ ہی سخت مشتعل ہے۔ سب ہی چا ہیں کہ مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ خانقاہ کے جلنے کے بعد ہر ایک نے پیر سائیں کو اپنے گھر قیا دعوت دی تھی لیکن قسمت شریف صاحب کی جاگی۔ اب پیر سائیں انہی کے گھر پر رہ رہے ہیں اور یہ خانقا تعمیر و مرمت کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ کل ابا جی کے پاس بھی آئے تھے اور ہزار کا چندہ وصول کر کے گئے ہیں۔'' مقصود نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ دیگر معلومات فراہم کیں جنہیں سن کر اسے خیال آیا کہ شفقت راؤ کی ساری دوڑ دھوپ بیکار گئی۔ اس نے پیر سائیں کا قلع کرنے کی نیت سے خانقاہ میں آگ لگائی تھی لیکن پیر سائیں زندہ تھا اور اس کی خانقاہ بھی دوبارہ تعمیر کی جا والی تھی۔ ان خیالات میں کھو کے باقی کا راستہ بھی طے ہوگیا اور وہ حامد راؤ کے مکان پر پہنچ گئے۔

گھر کی فضا میں چکراتی پراٹھوں کی خوشبو نے انہیں بتایا کہ حامد راؤ نے ناشتے کی تیاری کے سلسلے شریف سے غلط بیانی نہیں کی تھی، وہاں واقعی ان کے ناشتے کا بندوبست ہو رہا تھا۔

''تم لوگ نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرلو تو پھر ناشتہ لگواتے ہیں۔'' حامد راؤ نے پہلے اس سے کہا اور پھر ف ہی مقصود کی طرف رخ کرلیا۔

''بہن کو اندر زنان خانے میں پہنچا دو پُتر!..... اور اسلم کے لیے اپنا کوئی جوڑا لے آؤ۔ تم دونوں کا نام



ک ہے لیکن اپنے کپڑے دُھل کر سوکھنے تک اسلم کے لیے تمہارے کپڑوں پر گزارہ کرنا مجبوری ہے۔''

مقصود نے باپ کے حکم پر فرماں برداری سے عمل کیا۔ ماہ بانو کو اندر زنان خانے میں پہنچا دیا گیا جبکہ لم کی مقصود نے شلوار قمیض پر مشتمل لباس سمیت ایک غسل خانے کی طرف راہنمائی کر دی۔ وہ دیہات میں وجود ایک گھر کا غسل خانہ تھا لیکن مکینوں کی خوش حالی اور شہر آمد و رفت کی وجہ سے کسی شہری غسل خانے جیسی ت لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو بہت عرصے بعد اس قسم کی کسی جگہ پر غسل کرنے کی عیاشی میسر آئی تھی چنانچہ اس نے دل بھر کر غسل کیا۔

غسل کرنے سے اس کی آدھی تھکن کافور ہوگئی اور جسم ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ایک فرحت بخش لباس کے ساتھ اس نے مقصود کا فراہم کردہ شلوار قمیص زیب تن کیا اور اپنے کپڑے وہیں ایک کھونٹی پر ٹنگے وڑ کر باہر نکل گیا۔ کپڑوں کی تبدیلی کے ساتھ اس نے اپنے لباس میں موجود سامان بھی منتقل کرلیا تھا جس میں ب سے اہم اس کا پسٹل اور پنڈلی پر بندھا رہنے والا خنجر تھا۔ اگرچہ اپنے طور پر وہ مجرمانہ زندگی کو خیر باد کہہ کر ب شریفانہ زندگی گزارنے جا رہا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اس جیسے لوگوں کے لیے شریفانہ دگی کا آغاز اتنا آسان ثابت نہیں ہوتا بلکہ قدم قدم پر مشکلوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے وہ مسلح رہنا ضروری سمجھتا تھا اس لیے اب تک مسلسل اپنے اسلحے کی اظت کا خیال رکھتا رہا تھا۔ ایک رائفل بھی ان کی تحویل میں تھی جسے وہ پہلی بار اکیلے حامد راؤ کے گھر کی طرف تے ہوئے ماہ بانو کے پاس چھوڑ آیا تھا اور بعد میں ماہ بانو اسے اپنی بڑی سی چادر میں چھپا کر یہاں لے آئی ی۔ وہ رائفل اب بھی ماہ بانو کے پاس موجود تھی۔

اس نے غسل خانے سے قدم باہر رکھا تو مقصود کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے اپنی معیت میں لے کر ایک بار پھر ں بیٹھک میں پہنچ گیا جہاں منہ اندھیرے پہنچنے پر اسے بٹھایا گیا تھا وہاں میز ناشتے کے لوازمات چنے ہوئے ے اور ان سے اُٹھتی اشتہا انگیز خوشبو صبر کا پیمانہ لبریز کر رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ اپنے منہ میں پانی آتا محسوس یا اور دل ہی دل میں ہنس دیا۔ مشکل سے چند گھنٹے ہی گزرے تھے جب اسی بیٹھک میں اس کے سامنے ماتے پینے کے لوازمات رکھے گئے تھے لیکن اس نے کسی شے کو چھونا تو درکنار، نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا کیونکہ اس وقت اسے اپنی ہر ضرورت سے بڑھ کر ماہ بانو کی فکر دامن گیر تھی۔ بیٹھک میں پہلے سے موجود حامد ؤ نے اسے دیکھ کر کھانا شروع کرنے کی دعوت دی تو اس بار وہ بلا تکلف کھانے پینے میں مصروف ہوگیا اور ب ایک شے سے انصاف کرنے لگا۔ شہری اور دیہاتی امتزاج کا یہ ناشتہ بے حد لذیذ تھا اور اسے اس لیے اور ی زیادہ مزے کا لگا کہ وہ ایک طویل عرصے بعد کسی گھر کی فضا میں بیٹھ کر کھانے پینے کا شغل کر رہا تھا۔ شکم سیر کر اس نے کھانے کی چیزوں سے ہاتھ کھینچا تو مقصود نے تھرماس سے گرما گرم چائے کا بڑا سا کپ لبالب بھر راسے تھما دیا۔ پیٹ بھرا ہوا ہونے کے باوجود وہ اس بھاپ اُڑاتی، خوشبودار چائے کے کپ کے لیے ہاتھ ھنے سے نہ روک سکا۔ مقصود نے خود اپنے لیے بھی اسی طرح کا ایک کپ تیار کیا تھا البتہ حامد راؤ اس شغل میں ں کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ کچھ چپ چپ سے ہیں؟'' اس نے چائے کا ایک گھونٹ اندر اُتار کر ں سے دریافت کیا۔

''حالات ہی کچھ اس طرح سے سامنے آئے ہیں کہ دل و دماغ کچھ اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ تم نے مجھے شفقت ے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے سن کر بھی یقین کرنے کا دل نہیں چاہ رہا لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی

نہیں ہے۔ بس میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شفقت نے خانقاہ میں آگ لگا کر شدید حماقت اور جذباتیت کا مظاہرہ پیر سائیں سے بھتہ وصول کرتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہے۔ ہم دونوں بھائی بھی ہیں، سمدھی بھی اور سب سے بڑھ کر بچپن کے دوست بھی۔ اگر اسے کسی طرح پتا اس کے علاوہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پولیس کی تفتیش شروع ہونے سے قبل خود پیر سائیں مل گئی تھی کہ صداقت کی موت کا تانا بانا خانقاہ سے جڑا ہوا ہے اور پیر سائیں اس کا مجرم ہے تو اسے کسی بھی آدمی خانقاہ میں داخل ہو گئے ہوں اور انہوں نے سارے شواہد مٹا ڈالے ہوں۔ فی الحال تو صورتِ حال یہ سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن مشورہ کرنا تو درکنار اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔'' حامد راؤ نے پیر سائیں اور ان کے مریدوں کے ساتھ پورے پنڈ کی ہمدردیاں موجود ہیں اور وہ دل و جان سے اس سامنے آنے کے بعد سے اب تک کا وقت مصروفیت میں گزرا تھا اس لیے حامد راؤ کو اپنے جذبات کے اظہار کو سزا دینے کے خواہش مند ہیں جس نے ان کے خیال میں یہ گھناؤنی حرکت کی۔ حقیقت نہ تو کوئی جاننا موقع نہیں ملا تھا، اب موقع ملتے ہی اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے شکوے اور رنجیدگی کا اظہار کرا اور نہ ہی سننا پسند کرے گا۔ شفقت سے بے پناہ قربت اور اُنسیت کے باوجود میں خود اس کے اقدام کی

''ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں آپ کو ملوث کر کے آپ لوگوں کو کسی مشکل میں نہ ڈالنا چاہتے ہوں کرتا ہوں۔ اسے چاہئے تھا کہ اس معاملے کو پولیس کے سامنے رکھتا اور پھر وہ لوگ قانون کے مطابق جو ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بھی تو سوچئے۔ جس شخص کا اکلوتا ہونہار بیٹا اس سے چھن گیا ہو، اس کارروائی کرتے، وہ سب کے حق میں بہتر ہوتی۔'' حامد راؤ نے اس کے سوال کے جواب میں اپنے غصے کی تو کوئی انتہا ہی نہ رہی ہوگی۔ ہوسکتا ہے غصے میں انہیں آپ کی مدد لینے کا خیال ہی نہ آیا ہو..... یا آت کا اظہار کیا۔

وہ یہ سوچ کر آپ سے ذکر کرنے سے گریزاں رہے ہوں کہ آپ انہیں ایسا کچھ کرنے سے روکنے کی ''لیکن ابھی آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔ شفقت صاحب بھی یہ کریں گے جبکہ وہ اپنے طور پر مجرم کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔'' اس نے حامد راؤ کی تسلی و تشفی کے جانتے ہوں گے اس لیے انہوں نے تھانے کا رخ ہی نہیں کیا۔'' اسلم نے فوراً اپنی رائے پیش کرتے ہوئے حالات کا ہر رُخ اس کے سامنے رکھ دیا۔

ت راؤ کی حمایت کی۔

''لیکن افسوس تو یہی ہے کہ اس کی کارروائی کے نتیجے میں اصل مجرموں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا ''شاید یہی بات ہو لیکن میری اب یہی رائے ہے کہ شفقت کو انسانوں سمیت خانقاہ جلانے کی کوشش نہیں دوسرے پنڈ سے علاج کے لیے آیا ہوا ایک معذور شخص آگ میں جھلس کر مر گیا۔'' حامد راؤ کی افسردگی نی چاہئے تھی۔'' حامد راؤ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا اور اس پوائنٹ پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ہوئی یہ اطلاع سن کر خود اسے بھی دھچکا لگا۔

''وہ کیسے؟ شفقت صاحب کا تو یہی کہنا تھا کہ رات کے وقت خانقاہ پر پیر سائیں اور اس کے ''دیکھ پتر! ابھی تک کوئی جھوٹے برتن اٹھانے کے لیے نہیں آیا۔ کہیں تیری ماں اور انیلا مہمان کو بھول تو چانٹوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔''

''اس نے درست کہا تھا لیکن اتفاق سے جو آدمی آگ میں جھلس کر مر گیا، اس کے یہاں موجود ''جی اچھا ابا جی!'' مقصود فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سعادت مندی قابلِ تعریف تھی۔ داروں نے اس کے ساتھ آئی ہوئی اس کی ماں کو تو اپنے گھر پر ٹھہرا لیا تھا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے اسے اور شادی شدہ مرد ہوتے ہوئے بھی وہ باپ کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آتا تھا کہ اس پر کسی نمک خوار سے معذرت کر لی تھی۔ اس آدمی کی ماں کی درخواست پر پیر سائیں نے اسے خانقاہ میں رُکنے کی خصوصی اجازت دی تھی۔'' حامد راؤ نے بتایا۔

''اس واقعے میں پیر سائیں اور اس کے چیلوں کو کچھ نہیں ہوا؟'' اسلم نے دریافت کیا۔

''نہیں، وہ سب بہ خیریت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اصل میں آگ لگتے ہی ایک مجاور کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے شور مچایا تو سب جاگ گئے اور بہ حفاظت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ خانقاہ میں گئے کا خالی کپ اسلم کے سامنے سے اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ عورت کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور وہ کچھ ہوئے اس معذور آدمی کا افراتفری میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا اور ظاہر ہے وہ بے چارہ خود تو وہاں سے کا شکار نظر آتی ہے۔ فوری طور پر اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ وہ حامد راؤ کی آواز پر اس کی طرف اہل نہیں تھا، اس لیے اندر ہی پھنسے رہنے کی وجہ سے جھلس کر مر گیا۔'' حامد راؤ نے افسردگی سے بتایا۔ یقیناً ہو گیا۔

''مجھے انیلا بی بی نے برتن لانے کے لیے بھیجا ہے۔'' اس نے مقصود کو بتایا تو وہ اس کا راستہ چھوڑ کر ایک

خیال سے رنجیدہ تھا کہ اس کے جگری دوست کے ہاتھوں ایک بے بس آدمی موت کا شکار ہو گیا اور ا ''میرے خیال میں اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔ لمبی نیند لے کر اُٹھو گے تو ساری تھکن اُتر جائے گی۔'' جنہیں جہنم واصل کرنے کے لیے یہ سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا، وہ اب بھی دندناتے پھر رہے تھے۔ راؤ اس سے کہہ رہا تھا اور وہ اس کی رائے سے سو فیصد متفق تھا۔ طویل بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے

''آگ لگنے کے واقعے کے بعد پولیس نے اس معاملے کی تفتیش تو کی ہوگی۔ کیا انہیں خانقاہ کی جن اور بھرپور ناشتے نے طبیعت پر گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے آمادہ پا عمارت کا جائزہ لینے کے دوران وہاں ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہاں مقصود اسے اپنے ہمراہ بیٹھک سے باہر لے گیا اور ایک آرام دہ کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے میں ایک ڈبل دھندا بھی کیا جاتا ہے؟''

پڑا ہوا تھا، جس پر خوب صورت پرنٹ والی صاف ستھری بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' حامد راؤ نے شانے اچکائے۔ ''علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ''یہاں تم دل بھر کر بغیر ڈسٹرب ہوئے آرام کر سکتے ہو۔ پانی اور ضرورت کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں اور اکثر خانقاہ میں حاضری دیتا رہتا ہے۔ اب معلوم نہیں یہ سچ مچ کی عقیدت مندی ہے یا وہ زبان بند موجود ہیں۔ مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بھی مجھے بتا سکتے ہو۔'' اسے کمرہ دکھا کر مقصود نے فراخ دلانہ

پیشکش کی۔

''اس وقت تو نیند کے علاوہ کسی شے کی طلب نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو مقصود بھی خوش دلی سے مسکرا دیا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اسلم نے بستر سنبھال لیا۔ نرم تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہی نیند نے اس کے دماغ پر یلغار کر دی۔ لیکن نیند کے ہاتھوں بے بس ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن کا ایک گوشہ اضطراب کا شکار تھا۔ کوئی بات ایسی تھی جو مسلسل اس کے دماغ میں کھٹک رہی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے اس احساس کا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا چنانچہ منٹوں میں گہری نیند میں ڈوب کر اردگرد سے غافل ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''ہاں بھئی مشابرم خان! کل جو بندہ تم پیر آباد سے پکڑ کر لائے تھے، اس نے اپنے اور اپنے پیر کے بارے میں کچھ اُگلا یا نہیں؟'' دفتر پہنچ کر چند ضروری نوعیت کے کام نمٹاتے ہوئے اس نے مشابرم خان کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

''بہت ڈھیٹ بندہ ہے سر! بڑی مار کھانے کے بعد اب تک صرف اپنا نام بتایا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے لیکن اپنے علاقے یا پیر کا اتا پتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں نے بھی ضرورت سے زیادہ سختی اس لیے نہیں کی کہ اگر آگے آپ بندہ پولیس کے حوالے کرنا چاہو تو اس کے جسم پر ٹارچر کے نشان دیکھ کر مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔'' مشابرم خان نے جواب دیا۔

''ہوں.....'' شہریار نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ وہ مشابرم خان کی احتیاط پسندی کو سمجھتا تھا۔ بالے کی بیوی شہزادی ہسپتال میں زیرِ علاج تھی اور اس کا کیس پولیس کے علم میں تھا۔ اصولاً تو اسے چاہیے تھا کہ پیر آباد سے پکڑے جانے والے بندے کو پولیس کے حوالے کر کے خود بری الذمہ ہو جاتا لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت ہی خاص معاملہ ہے جسے پولیس کی سرسری تفتیش کی نذر کر کے اطمینان سے نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پولیس کو بھی اس معاملے میں شامل کر لیتا لیکن فی الحال یہ چاہتا تھا کہ خود بھی لاعلم نہ رہے کیونکہ اس کے باعلم ہونے کی صورت میں پولیس اپنی روایات کے مطابق کاہلی کا مظاہرہ کرنے یا مک مکا کی پالیسی پر عمل کرنے سے گریز کرتی۔ بصورتِ دیگر کوئی بہت ہی گھناؤنا دھندا جاری و ساری رہ سکتا تھا۔

''نام کیا بتایا ہے اس نے اپنا؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''کالے میاں نام بتاتا ہے اپنا۔ اس کے پاس سے ایک موبائل فون اور بٹوہ ملا ہے۔ بٹوے میں صرف رقم ہے، شناختی کارڈ وغیرہ موجود نہیں ہے جس سے اس کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔''

''کل سے اب تک اس کے موبائل فون پر کوئی کال وصول ہوئی ہے یا نہیں؟'' کالے میاں کے پاس موبائل کی موجودگی کا سن کر وہ چونکا اور پوچھا۔

''نہیں، کوئی کال نہیں آئی اور اب تو اس کے موبائل کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو گئی ہے۔ اگر کوئی کال کر بھی رہا ہو گا تو اسے کامیابی نہیں ہو رہی ہو گی۔'' مشابرم خان نے بتایا۔

''تم اس کے موبائل کی بیٹری چارج کرواؤ پھر آدھے گھنٹے بعد مجھ سے آ کر ملو۔ میں خود تمہارے ساتھ کالے میاں کی مزاج پرسی کے لیے چلوں گا۔'' اس نے حکم دیا جسے سن کر مشابرم خان فوراً ہی واپس پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی شہریار نے بھی اپنی توجہ زیرِ مطالعہ فائل کی طرف مبذول کر لی۔ اس کے لیے اس فائل کا فوری



مطالعہ کرنا ضروری نہیں تھا اور وہ تھوڑا سا انتظار بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موبائل کی بیٹری چارج ہونے کے بعد اس پر کوئی نہ کوئی کال ضرور موصول ہو گی۔ کیونکہ اس کے پاس موبائل کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اسے جن لوگوں نے بھیجا ہے، وہ خود بھی اس سہولت سے لیس ہوں گے اور اپنے آدمی کی بروقت واپسی نہ ہونے پر تشویش میں مبتلا ہو کر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے اس قیاس کی بنیاد پر وہ موبائل فون کے کارآمد ہونے کا منتظر تھا۔ آدھے گھنٹے کا وہ دورانیہ تیزی سے ختم ہو گیا اور مشابرم خان حسبِ ہدایت اس کے پاس آ موجود ہوا۔

''چلو چل کر اس سورما کو دیکھتے ہیں۔'' وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''کالے میاں کا موبائل کہاں ہے؟'' دفتر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''میرے پاس ہے سر!'' مشابرم خان نے اپنی بائیں جانب کی جیب تھپتھپائی تو اس نے اظہارِ اطمینان کے لیے اپنا سر ہلا دیا۔

دفتر کی عمارت سے نکل کر وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے اور مشابرم خان نے تین چار منٹ میں ہی اسے اس مکان تک پہنچا دیا جس میں قیدی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا خالی مکان تھا جسے محکمے کے ملازموں کو الاٹ کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے سیوریج کی گڑبڑ اور بجلی کی خراب وائرنگ کی وجہ سے فی الحال یہ مکان کسی کے زیرِ استعمال نہیں تھا اور ان دونوں مسائل کے حل تک اسے خالی ہی رہنا تھا اس لیے اس نے پکڑے جانے والے شخص کو اس مکان میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔

مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد مشابرم خان پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور شہریار کے اُترنے کے لیے عقبی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کر کے وہ مکان کی طرف دوڑا اور اس پر لگے تالے کو چابی کی مدد سے کھول دیا۔ اس کی یہ پھرتی اور چابک دستی قابلِ رشک تھی۔ غیر معمولی حالات ہونے کے باوجود وہ ڈیوٹی کو نہیں بھولا تھا ورنہ شہریار سے اس کی جتنی ذہنی ہم آہنگی ہو چکی تھی اور وہ اس کا جس قدر ہم راز بن چکا تھا، وہ ان کے درمیان تکلف کی دیواریں گرانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن مشابرم خان خود ایک اصول پرست اور کھرا آدمی تھا جس نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور افسر کو افسر ہی سمجھتا تھا۔ مکان کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ مختصر سے دھول اُڑاتے برآمدے کے بعد ایک دروازہ اور تھا جس پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے وہ تالا بھی کھول دیا اور اسے اپنی معیت میں ایک کمرے تک لے گیا۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں چھت سے ذرا نیچے موجود ایک چھوٹے سے روشن دان کے سوا کوئی کھڑکی وغیرہ موجود نہیں تھی اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دینے کے بعد باہر نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دیکھا کہ مشابرم خان نے کالے میاں کے ہاتھ پیر رسّی کی مدد سے نہایت مضبوطی سے باندھ رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔ یہ سارا بندوبست یقیناً اس لیے تھا کہ کہیں وہ شور مچا کر لوگوں کو اس طرف متوجہ نہ کر لے۔ مکان کے آبادی میں ہونے کی وجہ سے یہ ساری احتیاطی تدابیر ضروری بھی تھیں۔ شہریار نے دیکھا کہ کمرے میں بیٹری سے چلنے والا ایک ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے۔ دھول مٹی سے اٹے اس کمرے میں چمکتے دمکتے ٹیپ ریکارڈر کی موجودگی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے استفسار طلب نظروں سے مشابرم خان کو دیکھا۔

''اس سے پوچھ گچھ کرتے وقت ہم نے یہ ٹیپ ریکارڈر بلند آواز سے چلا دیا تھا تاکہ اس کے چیخنے چلانے

کی آوازیں باہر نہ جائیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور خالی گھر میں بلند آواز سے چلنے والے گانوں پر کسی کو کوئی تشویش نہیں ہوئی۔'' اس نے مشابرم خان کو گھورا۔

''ہوئی تھی۔ مجھ سے ایک آدمی نے پوچھا بھی تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں یہ مکان اپنے نام پر الاٹ کروانے والا ہوں اس لیے یہاں کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اب اے سی صاحب کو بھی اپنے ساتھ یہاں لاؤں گا تاکہ وہ اس جگہ کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور مرمت وغیرہ کا انتظام کروائیں۔'' اس نے فخر سے بتایا اور داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''گڈ۔ یہ تم نے اچھا بہانہ بنایا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی خفیہ ٹھکانہ موجود نہیں ہے جسے ہم اس قسم کی کسی صورتِ حال میں استعمال کر سکیں۔ میں عبدالمنان سے کہوں گا کہ ایسی کوئی جگہ تلاش کرے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ہمیں اب اس طرح کے کسی ٹھکانے کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ قانون کی پاسداری اور احترام دل میں رکھنے کے باوجود مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ جس طرح قانون کے محافظ، مجرموں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں، میرے لیے مکمل طور پر قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرنا ممکن نہیں ہے۔'' وہ خاصا بے بس اور جھنجلایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بیوروکریسی کی اُلجھنوں سے واقف ہونے کے باوجود جب وہ خود اس میدان میں داخل ہوا تھا تو اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کے خیالات تھے کہ وہ خود کو ہر طرح سے ایک ایمان دار، امن پسند اور قانون کی حدود میں رہنے والا افسر ثابت کرے گا لیکن مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے خیالات کو بکھرتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں جس قدر گندگی پھیلی ہوئی ہے اسے صاف کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میلے کیے بغیر کام چلنا ممکن نہیں ہے۔ بس اسے اگر کوئی اطمینان تھا تو یہ کہ وہ اپنے ہاتھ گندگی کو صاف کرنے کے لیے میلے کر رہا تھا، اُس کا اس گندگی میں اضافہ کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے خاموش کھڑے مشابرم خان کو حکم دیا تو اس نے بے ہوش کالے میاں کے دائیں رخسار پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ تھپڑ کھاتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یقیناً گہری بے ہوشی میں نہیں تھا اس لیے آنکھ کھلتے ہی اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے لگا جس کا اندازہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت سے لگایا جا سکتا تھا۔

''کہو کالے میاں! تم اپنی زبان کھولنے کے لیے تیار ہو یا ہمیں اسے کھلوانے کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں اس نے یوں گردن کو جھٹکا دے کر رخ موڑا جیسے اگر بس میں ہوتا تو اس دھمکی آمیز سوال کے جواب میں اس کے منہ پر تھوک دیتا۔

''اوکے..... جیسا تم پسند کرو۔ میرے پاس ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کے استعمال سے تمہارے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئے گی لیکن تم خود کو سچ بولنے پر مجبور پاؤ گے۔'' اس نے اپنے لہجے میں سفاکی سموتے ہوئے کہا اور پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''گاڑی کی ڈکی میں ایک آئرن راڈ اور رسّی کا گچھا پڑا ہے، وہ یہاں لے آؤ۔'' اس نے حکم دیا تو مشابرم خان تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دونوں مطلوبہ چیزیں موجود تھیں۔

''ذرا مجھے اس کا موبائل فون تو دینا۔'' کسی قسم کی کارروائی شروع کرنے سے قبل اسے کالے میاں کا موبائل یاد آیا تو وہ مشابرم خان سے بولا۔ اس نے فوراً ہی بائیں جیب سے موبائل نکال کر اس کے سامنے



کیا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی فون بک چیک کرنے لگا۔ فون بک میں چند ایک ہی نمبر موجود تھے جو مختلف ناموں سے فیڈ کیے گئے تھے اور ان میں ایک نام پیر سائیں کا بھی تھا۔ اس نے پہلے اس نمبر پر کال کرنے کا سوچا پھر ارادہ بدل کر اِن کمنگ اور آؤٹ گوئنگ کالز کا ریکارڈ چیک کرنے لگا۔ کالے میاں کے موبائل پر آخری کال واجد کی آئی تھی اور اس کال کو آئے ہوئے بھی تقریباً بیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ خود اس نے چند گھنٹوں کے فرق سے آخری نمبر واجد کا ہی ملایا تھا لیکن ریکارڈ سے ظاہر تھا کہ اس کی واجد سے بات نہیں ہو سکی۔

یہ صورتِ حال ذرا معنی خیز تھی اور یوں لگتا تھا کہ واجد نامی وہ شخص کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے پیر سائیں سے پہلے اسے ہی ٹٹولنے کا فیصلہ کیا اور نمبر ری ڈائل کر دیا لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف خاموشی تھی اور سرے سے بیل ہی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دو بار مزید کوشش کی لیکن صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے پیر سائیں کا نمبر ڈائل کیا۔ ادھر بھی بالکل ویسی ہی صورتِ حال تھی۔ اسے شدید اُلجھن محسوس ہوئی۔ نہ جانے یہ کیا راز تھا کہ کسی سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو چھوڑ کر ''کاکا'' کے نام سے محفوظ کیا گیا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔ ریسیو کرنے والی کوئی عورت تھی جس نے شاید اپنی فون اسکرین پر آنے والا نام دیکھ کر براہِ راست ہی بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں کاکے دے پیو! سب چنگا ہے نا؟ خیر نال ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہو؟'' عورت کے جملوں سے ظاہر تھا کہ وہ کالے میاں کی بیوی ہے اور اس نے بیوی کا نمبر اپنے بیٹے کے حوالے سے محفوظ کر رکھا ہے۔

''معاف کیجیے گا خاتون! میں آپ کا خاوند نہیں ہوں۔'' اس نے یہ بات کہتے ہوئے سامنے موجود کالے میاں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ عملی طور پر اس کی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا اہل نہیں تھا لیکن یہ سب دیکھ اور سن سکتا تھا۔ شہریار کو اپنی بیوی سے بات کرتا دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوڑا سا اضطراب ظاہر ہوا تھا تاہم اس نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''فیر تسی کون بول رہے ہو؟'' عورت کی آواز میں حیرانی اُتر آئی۔

''میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ کو آپ کے خاوند کے متعلق ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے بہت نپے تلے انداز میں گفتگو کو آگے بڑھایا تھا اور جان بوجھ کر کالے میاں کا نام استعمال نہیں کیا تھا کہ مبادا اس کے سامنے بندشوں میں جکڑے شخص نے غلط بیانی سے کام لیا ہو اور اس کا نام کالے میاں نہ ہو۔

''کیہڑی اطلاع جی؟'' عورت واضح طور پر پریشان محسوس ہونے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ اطلاع زیادہ اچھی نہیں ہے۔ یہاں نور کوٹ میں آپ کے خاوند کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل ہیں۔''

''ہائے میرے ربا.....!'' عورت نے پریشانی سے یہ کہتے ہوئے شاید اپنے سینے پر ہاتھ بھی رکھا ہو گا۔

''پر وہ نور کوٹ کیسے پہنچ گیا؟ وہ تو چھٹی گزار کر اپنے سیٹھ کے پاس لاہور گئے تھے۔'' عورت کے وہ جملے خاصے غور طلب تھے۔ اس کی بات سے یہ ظاہر تھا کہ کالے میاں مستقل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتا چنانچہ اس بات کا بھی امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ پیر سائیں کا تعلق اس علاقے سے ہو جہاں اس کی بیوی موجود تھی کیونکہ وہ جس مقصد کے لیے پیر آباد آیا تھا، اس کی تکمیل کے لیے اسے واپس اپنے پیر صاحب کے پاس لوٹنا

تھا اور اس کی بیوی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اور جگہ نوکری کرنے کی وجہ سے گھر سے کافی دنوں تک دور رہتا تھا۔

''دیکھیے خاتون! مجھے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں معلوم۔ مجھے آپ کو جو اطلاع دینی تھی، وہ میں دے چکا ہوں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو نور کوٹ پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا تا کہ آپ خود اپنے خاوند کی دیکھ بھال کر سکیں؟'' اس نے جان بوجھ کر ذرا بے رخی برتی۔

''میں ادھر فیصل آباد میں ہوں۔ ادھر سے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ابھی تو میرے پیو ہور بھرا بھی گھر میں نہیں ہیں۔ میں ان کی دکان پر فون کر کے انہیں گھر بلاتی ہوں، فیر آپ کو فون کرتی ہوں۔ مجھے خود تو نور کوٹ کے بارے میں کچھ ملوم نہیں ہے، آپ میرے بھرا کو اتا پتہ سمجھا دینا کہ کالے میاں کس ہسپتال میں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصر جواب دے کر سلسلہ منقطع کرنے کے ساتھ ہی فون بھی آف کر دیا۔ وہ دوبارہ کالے میاں کی بیوی یا اس کے بھائی سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا البتہ اس کی بیوی سے بات کرنے سے کالے میاں کے نام کی تصدیق ہو گئی تھی لیکن یہ بہر حال ظاہر نہیں ہو سکا تھا کہ کالے میاں کا پیر سائیں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں دو مقامات کے نام سامنے آئے تھے، ایک فیصل آباد اور دوسرا لاہور۔ فیصل آباد کو وہ اپنے اندازوں کی بنیاد پر پہلے ہی رد کر چکا تھا اور لاہور کے بارے میں بھی شک وشبے کا شکار تھا کیونکہ شہزادی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ساس بالے کو علاج کے لیے اپنے کسی عزیز کے گاؤں لے گئی ہے۔ شہزادی کے بچے بھی وہ ساتھ لے گئی تھی چنانچہ یہ امر ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا کہ ایک اکیلی عورت نے ایک معذور آدمی اور بچوں سمیت لاہور تک کا سفر کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر بات تھی بھی کسی گاؤں جانے کی، اس لیے لاہور والی بات ذرا مشکل ہی تھی۔

''ہاں بھئی مشابرم خان! ایسا کرو کہ اپنے کالے میاں کے دونوں پیر رسّی سے باندھ کر انہیں پنکھے کے ساتھ اُلٹا لٹکا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں سکھاؤں گا کہ اس نے اپنے پیٹ میں جو باتیں چھپا رکھی ہیں، وہ کیسے باہر نکلتی ہیں۔'' سارا حساب کتاب جوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گیا اور چند منٹوں میں ہی کالے میاں پنکھے کے ساتھ اُلٹا لٹکا نظر آنے لگا۔ اکیلے شخص کے لیے یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن مشابرم خان نے اسے اپنی زبردست جسمانی طاقت اور تکنیک کی بنیاد پر ممکن کر دکھایا تھا۔

''اب اس راڈ پر کپڑا لپیٹ لو اور اتنی قوت سے اس کے جسم پر ضربیں لگاؤ کہ اندر کے سارے اعضاء ہل کر رہ جائیں۔'' ایک طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے مشابرم خان کو دوسری ہدایت دی اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر یوں اطمینان سے کھڑا ہو گیا جیسے کوئی دلچسپ تماشا شروع ہونے والا ہو۔

مشابرم خان نے اس کی دوسری ہدایت پر بھی من وعن عمل کیا اور آئرن راڈ پر کپڑا لپیٹ کر کالے میاں کے جسم کو نشانہ بنانے لگا۔ اس نے شہریار کی ہدایت کو پوری طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ بہت نپی تلی ضربات لگا رہا تھا۔ راڈ پر کپڑے کی تہ ہونے کی وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کالے میاں کے جسم پر کوئی زخم تو کجا خراش بھی آ سکے البتہ اندرونی طور پر اس کا حشر ہو جانا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام شروع ہو چکا ہے۔ وہ سخت اذیت میں محسوس ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ناک سے خون کی لکیر بہتی ہوئی نظر آئی۔ شہریار نے اشارہ کر کے مشابرم خان کو مزید ضربات لگانے سے روکا اور کالے میاں کی طرف متوجہ ہوا۔



''پھر کیا خیال ہے؟ تم ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے راضی ہو یا ابھی اندر کچھ دم خم باقی ہے اور میں اسے بھی نکلوانے کا بندوبست کر دوں؟'' اس کا لہجہ بے پناہ سرد تھا۔ مشابرم خان کو یاد نہیں تھا کہ اس نے اس سے قبل شہریار کو کبھی ایسے خوفناک موڈ میں دیکھا ہو۔ لیکن شہریار خود جانتا تھا کہ اس پر ایسا جنون ایک بار اس وقت بھی طاری ہوا تھا جب اس کی کراچی کے ایک فلیٹ میں ''را'' کے ایجنٹ ورما سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ورما کی زبان کھلوانے کے لیے غیر انسانی تشدد کا سہارا لیا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ وہ ورما جیسے شخص کو جو ملک دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار بے گناہوں کی زندگی ختم اور برباد کرنے کا ذمے دار تھا، اسی طرح کے سلوک کا حق دار سمجھتا تھا۔ اب کالے میاں کے ساتھ وہ اتنی سختی برت رہا تھا تو وہ بھی اس لیے کہ وہ ایک ایسے جعلی پیر کا چیلا تھا جس کا کردار شہزادی والے کیس سے ہی کافی حد تک کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ایک طرف اس کی وجہ سے شہزادی اپنے بچوں سے دور ہوئی تھی تو دوسری طرف ایک معصوم بچے کی لاش کی بے حرمتی کے ارتکاب پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس مردود آدمی نے بالے کے علاج کے لیے مُردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا، وہ جانے اپنے مریدوں اور چیلوں سے کون کون سے گھناؤنے کام کرواتا رہا ہوگا۔ کوئی دین دار اور نیک آدمی تو ہرگز بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً شیطان کا کوئی چیلا تھا جس نے پیر کے بہروپ میں اپنا شیطانی دھندا جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ اس شیطان تک پہنچ کر اس کی بیخ کنی کرنا ضروری سمجھتا تھا ورنہ معلوم نہیں وہ شخص کتنوں کی دین و دنیا برباد کر ڈالتا۔ کالے میاں کی حالت کافی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کے استفسار پر اس نے تیزی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔

''اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔'' اس نے مشابرم خان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل کیا۔ کپڑا نکلتے ی کالے میاں کے منہ سے خون کا فوارہ سا نکلا۔

''اسے نیچے اُتارو۔'' اس نے فوراً ہی تیز آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔ مشابرم خان کی لگائی گئی ضربیں س کے اندازے سے زیادہ خوف ناک ثابت ہوئی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ کالے میاں کے پھیپھڑے بری رح متاثر ہوئے ہیں۔ کالے میاں کو پنکھے سے اتار کر فرش پر لٹایا گیا تو وہ خود بھی مشابرم خان کے ساتھ اس کی یکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر میں وہ اسے سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے ناک اور منہ سے نے والا خون بند ہو گیا۔ اندرونی زخموں سے زیادہ خون کا وہ اخراج شاید اُلٹا لٹکے رہنے کی وجہ سے تھا جس پر ہوں نے قابو پا لیا تھا اور اب کالے میاں کسی بے جان جسم کی طرح فرش پر پڑا ہولے ہولے ہانپ رہا تھا۔

''ہاں بھئی۔ اب بولنا شروع ہو جاؤ ورنہ یہ بات تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اگر ایک بار پھر اُلٹے لٹکا دیئے ئے تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ تم خون اُگل اُگل کر یہیں مر جاؤ گے اور باہر کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ تمہارا پیر بھی مک ٹوئیاں مارتا رہ جائے گا کہ اس کا چیلا کہاں گیا۔'' اس کے لہجے میں سفاکی نمایاں تھی جسے محسوس کر کے حال کالے میاں کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خاموش رہ کر وہ اپنی جان پر مزید تشدد سہنے کے وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولا۔

''میں تم لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔'' اُس کی ں فرمائش پر شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ مشابرم خان کو آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ئے مشابرم خان نے کالے میاں کے منہ سے پانی کی بوتل لگا دی۔ پانی پی کر اس کی حالت میں کافی بہتری آ اور وہ مشابرم خان کی مدد سے ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور تم اس کے لیے کیا کام کرتے ہو؟'' اس کو

جواب دینے کی پوزیشن میں پا کر شہریار نے پہلے سے کئی گنا زیادہ سخت لہجے میں سوال کیا۔

''پیر سائیں کا نام عبدالحق ہے لیکن کوئی بھی ان کا نام لینے کی جرأت نہیں کرتا اور سب انہیں پیر سائیں ہی کہتے ہیں۔ ان کی خانقاہ ٹاہلی والا پنڈ میں ہے۔ میں بھی وہیں رہتا ہوں ہور خانقاہ کا کام کاج دیکھتا ہوں یا فیر اگر پیر سائیں کبھی کسی کام سے کہیں بھیج دیں تو وہاں چلا جاتا ہوں۔ ادھر پیر آباد بھی پیر سائیں کے کہنے پر ہی آیا تھا۔ ادھر خانقاہ پر ایک مریض بالا علاج کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس کے علاج کے لیے کسی چیز کی لوڑ تھی اور بالے کی ماں کا کہنا تھا کہ وہ چیز اس کی نوں (بہو) کے پاس سے ملے گی۔ میں ادھر وہی لینے آیا تھا۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے اپنا بیان دیا۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود کو اس بات سے لاعلم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آیا تھا۔

''بالے کی بیوی سے تمہیں کیا چیز لے جانی تھی؟'' شہریار بھی اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔

''مینوں خبر نہیں جی۔'' اس نے نظریں کچھ اور بھی جھکاتے ہوئے پست لہجے میں جواب دیا۔

''سچ بول۔ ورنہ دوبارہ اُلٹا لٹکا دوں گا۔'' مشابرم خان کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے نتیجے میں اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور دہانے سے ایک بار پھر خون خارج ہونے لگا۔ اس بار کالے میاں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے فوراً ہی اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیوں کی وصولی کے لیے آیا تھا۔

''ان ہڈیوں سے تمہارا پیر سائیں کس طرح بالے کا علاج کرتا؟'' شہریار نے اس سے پوچھا۔

''علوم نہیں جی۔ پیر سائیں وڈا پہنچا ہوا آدمی ہے۔ اس کے پاس وڈا علم ہے۔ جب وہ اپنے خاص حجرے میں ہوتا ہے تو وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہیں وہ اپنا عمل کرتا ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے کہ اس عمل کے بعد وہ جس کسی کو بھی دوا تیار کر کے دیتا ہے، وہ چنگا بھلا ہو جاتا ہے۔''

کالے میاں کے لہجے میں اعتقاد تھا۔ یقیناً اس نے خانقاہ پر اپنے قیام کے عرصے میں اس طرح کے کئی معجزے دیکھے ہوں گے جبھی وہ پیر سائیں کا معتقد تھا۔ لیکن خود شہریار کو شک ہو رہا تھا کہ عبدالحق نامی وہ پیر حق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوگا اور اس کے پاس جو کرشمے موجود تھے، وہ کسی سفلی علم کی بدولت تھے کیونکہ حق کی راہ پر چلنے والے کسی شخص سے کسی طور یہ اُمید ہی نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کے علاج کے لیے ایسا کوئی طریق کار استعمال کرے جس سے شرعی قوانین اور انسانیت کی نفی ہوتی ہو۔ مُردہ بچے کے جسم کی ہڈیوں کا مطالبہ ایک ایسا ہی معاملہ تھا جس سے اس شخص کے کالے کرتوتوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے یہی بات کالے میاں سے بھی پوچھ ڈالی، جواباً وہ نہایت عالمانہ انداز میں بولا۔

''پیر سائیں کا فرمان ہے کہ زندہ شخص کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر بالے کے علاج کے لیے وہ اسی مُردہ بچے کی ہڈیاں استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس سے اس بچے کے مُردے کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آ سکا اور اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ اسے جنت کے باغوں کا سب سے خوش نما اور خوشبودار پھول بنا دیں گے۔'' کالے میاں کے جواب سے صاف عیاں تھا کہ پیر سائیں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں کو کس بری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ نیکی اور بدی کی اصل روح کو بھول کر اپنے پیر سائیں کے فرمودات کی روشنی میں عقیدوں کو مسخ کر رکھا تھا۔ وہ حق اور ناحق کے اپنے ذاتی اصول بنائے بیٹھے تھے جن سے انہیں ہٹانا شاید اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

''ابھی میں نے تمہاری بیوی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم لاہور میں کسی سیٹھ کے پا



نوکری کرتے ہو اور اس کے خیال کے مطابق اس وقت تمہیں لاہور میں ہونا چاہئے تھا۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو یہ بات نہیں بتائی کہ تم ٹاہلی والا میں رہ کر کسی پیر کی خدمت انجام دے رہے ہو؟ یا اس جھوٹ کے لیے بھی تمہارے پیر سائیں نے کوئی فرمان جاری کر رکھا ہے؟'' اس کا لہجہ خود بخود ہی طنز اور زہر میں ڈوب گیا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ مجھے ہور دوسرے مجاوروں کو اپنے گھر والوں کو سچ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ پیر سائیں کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے بیوی بچوں کو خانقاہ کے بارے میں ملوم ہو گیا تو وہ وہاں بہانے بہانے سے آنا شروع ہو جائیں گے ہور پیر سائیں کے علاوہ ہم سارے مجاور بھی اپنے گھر والوں کے مسائل میں اُلجھ کر خدمتِ خلق کو بھول جائیں گے۔ پیر سائیں وڈے اللہ لوک آدمی ہیں جی۔ انہوں نے اللہ کے بندوں کے کام سنوارنے کے لیے خود بھی ویاہ نہیں کیا اور اپنی خانقاہ کے مجاوروں میں بھی یہ خوبی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے بڑھ کر خدمتِ خلق میں دل لگائیں۔ ہم سب پیر سائیں کے نقشِ قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ خانقاہ پر آنے سے پہلے جن لوگوں کا ویاہ نہیں ہوا تھا، انہوں نے پیر سائیں کی دیکھا دیکھی ساری حیاتی تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو بال بچے والے ہیں، وہ بھی احتیاط کرتے ہیں ہور کبھی کبھار ہی چھٹی لے کر اپنے بال بچوں سے ملنے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے اپنی گھر والی کو طلاق دے کر اس جھنجٹ سے جان چھڑا لی ہے ہور اب آرام سے دن رات خانقاہ میں رہتا ہے۔ میں ذرا کمزور ایمان کا بندہ ہوں اس لیے اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ فیر یہ گل بھی ہے کہ میری گھر والی کے بھرا سے میری بہن کا ویاہ ہوا ہے۔ اگر میں نے اپنی گھر والی کو چھوڑا تو میری بہن بھی اُجڑ جائے گی اس لیے بھی میں خاموش ہوں۔''

ابتدائی مزاحمت کے بعد اب وہ رواں ہو چکا تھا اور ہر سوال کا جواب تفصیل سے دے رہا تھا۔ یہ تفصیل ایسی تھی کہ سن کر شہریار دنگ رہ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ انسان کی جہالت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ اس دور میں جبکہ انسان خلاؤں میں سفر کر رہا تھا اور ستاروں پر کمند ڈال رہا تھا، اس کے ملک کے بعض دیہاتوں میں یہ حال تھا کہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی محروم لوگ اندھے عقیدوں میں گھر کر سچائی اور حق کو سمجھنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔ پہلے اس نے شاہنواز نامی شخص کا کھوج لگایا تھا جو ''را'' کا ایجنٹ تھا۔ بعد میں آفتاب کی مخبری پر غلام محمد نامی شخص جس کا اصل نام اشیش کمار تھا، کو قانون کی گرفت میں لیا تھا۔ ان دو کرداروں کے بعد اب اس کے سامنے پیر عبدالحق کا کردار آیا تھا جو ٹاہلی والا پنڈ میں اپنی خانقاہ بنائے ہوئے بیٹھا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا وہاں کافی اثر و رسوخ ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ٹاہلی والا پنڈ، شہریار کے زیرِ انتظام ضلع میں واقع نہیں تھا اس لیے اسے اپنی اے سی کی حیثیت کو استعمال کر کے وہاں کوئی براہِ راست کارروائی کرنے کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے پیر عبدالحق کے خلاف جو بھی قدم اٹھانا تھا، وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا ورنہ اس کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا تھا۔

''تمہارا خاندان فیصل آباد میں رہتا ہے تو پھر تم ٹاہلی والا کیسے پہنچ گئے؟'' کالے میاں کی بیوی سے ہونے والی گفتگو یاد آئی تو اس نے چونک کر کالے میاں سے پوچھا۔

''یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا۔ میری گردن پر ایک پھوڑا ہو گیا تھا جو کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں سچ مچ لاہور میں ایک سیٹھ کے پاس نوکری کرتا تھا۔ پھوڑے کی تکلیف کی وجہ سے میں نے تنگ آ کر سیٹھ سے چھٹی لی اور فیصل آباد کے لیے نکل گیا کہ گھر جا کر آرام کروں گا اور کسی پرانے حکیم سے علاج کرواؤں گا۔ لیکن گڈی میں مجھے پیر سائیں کا ایک مجاور مل گیا۔ اس نے میرا پھوڑا دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، اسے بتا دیا کہ کب سے اور کتنا پریشان ہوں۔ میری داستان سن کر وہ بولا کہ میرے

ساتھ میرے پیر سائیں کی خانقاہ پر چلو، تمہارا شرطیہ علاج ہو جائے گا۔ میں پریشان تو تھا اس لیے فوراً ہی اس
کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا ہو ربس فیر میری زندگی بدل گئی۔ پیر سائیں نے تین دن کے اندر اپنی کرامت
سے میرے پھوڑے کا علاج کر دیا۔ علاج کے دنوں میں مجھے ساتھ لے جانے والے مجاور نے اپنے ساتھ رکھ
تھا۔ تین دن اس نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ پیر سائیں کا وڈا ماننے والا تھا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میرے
دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اسی کی طرح خانقاہ پر رہوں ہو ر دن رات پیر سائیں کی خدمت کروں
میں نے اپنی یہ خواہش پیر سائیں کے سامنے بیان کی تو انہوں نے وہاں رہنے کی شرائط بتا کر فیصلہ مجھ پر چھو
دیا۔ میں نے ہر شرط مان لی۔ اب میں دن رات خانقاہ میں رہتا ہوں ہو ر بہت خوش ہوں۔ جب پیر صاحب
دیتے ہیں تو بال بچوں سے ملنے چلا جاتا ہوں ہو ر انہیں خرچہ پانی دے آتا ہوں۔''

وہ واقعی اتنا مطمئن لگ رہا تھا کہ ان کی طرف سے کیے گئے تشدد کے نتیجے میں بگڑ جانے والے چہرے
بھی اس اطمینان کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ شہریار حیران تھا کہ یہ انسانی نفسیات کا کون سا پہلو ہے کہ نہایت مکاری
ساتھ کسی کو آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی اس کارروائی سے بے خبر، خوش اور مطمئن رہتا ہے۔

''بیوی بچوں کو خرچہ پانی دینے کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے تمہارے پاس؟'' اس نے کالے میاں سے
ایک اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

''رقم پیر سائیں دیتے ہیں۔ ان پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اللہ غیب کے خزانوں سے انہیں نوازتا ہے ہو
وہ اس میں سے ہمیں عطا کرتے رہتے ہیں۔'' وہاں وہی جہالت بھری عقیدت تھی لیکن شہریار کا تجسس مزید بڑھ
گیا تھا کہ آخر پیر سائیں کیا شے ہے کہ اس کے پاس خفیہ طریقے سے دولت آتی رہتی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ خانقاہ
چڑھاووں وغیرہ کا بھی سلسلہ ہو جس سے آمدنی ہوتی ہو لیکن کالے میاں نے جس طرح غیب کے خزانوں کا ذکر
کیا تھا، اس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پیر سائیں کی آمدنی کے کچھ خفیہ ذرائع بھی ہیں۔ بہر حال اُس نے اس
سلسلے میں کالے میاں کو مزید کریدنے سے گریز کیا اور شہزادی کے کیس پر توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کرتے ہو
اس سے پوچھا۔

''تم تو چھٹی پر فیصل آباد گئے ہوئے تھے، پھر تمہیں شہزادی سے ہڈیاں لانے کا کام کیسے سونپا گیا؟''

''بول بول کر میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔ پہلے مجھے تھوڑا سا پانی ہو ر پلوا دیں۔'' اپنے خون آلود ہونٹ
زبان پھیرتے ہوئے اس نے مطالبہ کیا۔ ہونٹ کو آلودہ کرنے والا یہ خون مشابر م خان کے تھپڑ کے نتیجے میں
دانت ٹوٹنے سے نکلا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دو دانت اب بھی فرش پر پڑے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس
اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں پر ایک حسرت زدہ سی نظر ڈالی اور پھر مشابر م خان کا بڑھایا ہوا پانی منہ سے لگا لیا
پانی پی کر اس کی توانائی خاصی بحال ہو گئی تھی شاید اسی وجہ سے وہ مشابر م خان کو کینہ توز نظروں سے گھورنے
قابل ہو سکا لیکن بہر حال اس سے آگے کچھ کرنے کی اُس میں جرأت نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر زیر دست ہو چکا
اور اسے اپنی اس پوزیشن کا احساس تھا اس لیے شہریار کے اشارے پر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''مجھے واجد نے پیر سائیں کی طرف سے موبائل فون پر اس کام کا حکم دیا تھا۔ ان کا حکم ملنے پر میں فیصل
آباد سے سیدھا پیر آباد پہنچا تھا لیکن وہاں ایک لڑکے کی زبانی مجھے بالے کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی یہ ملوم ہو گ
کہ بالے کی گھر والی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ میں اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا، پراڈے پر گاؤں سے با
جانے والی کوئی گڈی ہی نہیں تھی اس لیے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ فیر گڈی آنے سے پہلے ہی میں نے اس لڑ
کے ساتھ آپ کے ڈریور کو آتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا ہو ر میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ میری ہی تلاش میں آئے ہیں



ں چھپ گیا، فیر اس سے آگے جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو ملوم ہی ہو گا۔''

کالے میاں نے اپنا بیان مکمل کر کے خاموشی اختیار کر لی۔ ویسے اس کا نام بھی خوب تھا۔ اس کی
ریقیوں کو شرماتی کالی رنگت کی وجہ سے یہ نام جانے اس کے ماں باپ نے ہی رکھا تھا یا پھر یہ لوگوں کا
رنامہ تھا۔

''تمہارے موبائل پر آنے والی واجد نامی شخص کی کال میں نے بھی نوٹ کی ہے لیکن اس نمبر پر کوشش
رنے پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ نمبر کسی کے استعمال میں ہی نہیں ہے۔ تمہارے خیال میں
ا کیوں ہو رہا ہے؟'' اس نے ذہن میں چبھتا ہوا سوال کالے میاں سے کر ڈالا۔

''میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔ پیر آباد سے میں نے خود بھی اسے حالات بتانے کے لیے فون کرنے کی
شش کی تھی لیکن ملوم نہیں کیوں نمبر ہی نہیں ملا۔ بعد میں آپ کے ساتھی نے میرا موبائل چھین لیا تو میں کوشش
ں نہیں کر سکا۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''ہو سکتا ہے کہ واجد کا موبائل خراب ہو گیا ہو یا پھر کوئی دوسرا مسئلہ ہو۔ تو اس سے رابطہ نہ ہو سکنے کی
رت میں تم کس سے بات کر سکتے ہو؟'' اس نے کالے میاں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کرنے کو تو میں پیر سائیں سے بھی گل کر سکتا ہوں لیکن ان کی عبادت میں حرج نہ ہو، اس خیال سے ہم
ں سے کوئی بھی اُنہیں فون نہیں کرتا۔ ہم میں سے واجد ہی سب سے زیادہ ان کے قریب ہے اس لیے ہم اسی
ے رابطہ کرتے ہیں۔'' اس نے بتایا پھر گویا اچانک خیال آنے پر بولا۔

''واجد کا چھوٹا بھرا خالد بھی پیر سائیں کے اعتماد کا بندہ ہے۔ میں اسے بھی فون کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر اسی کو فون کر کے دیکھتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ تم فون پر خالد سے بات کرو۔ ذرا دیکھیں تو
ں کہ تمہارے واپس نہ لوٹنے پر ان لوگوں کے ذہن میں کس قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں۔ لیکن خبردار
ے اصل حالات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہئے۔ اسے بھی تم وہی کچھ بتانا جو میں نے تمہاری بیوی کو بتایا ہے۔''

لے میاں کو ہدایات دیتے ہوئے اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ کالے میاں نے جس طرح کا تشدد سہا تھا، اس
، اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے چنانچہ وہ مسلسل تعاون کر رہا تھا۔ اب بھی شہریار کی دھمکی کو محسوس کر
، اس کے چہرے پر یتیمی برسنے لگی۔ درحقیقت وہ ایک عام سا آدمی تھا جو اپنی اندھی عقیدت کے ہاتھوں پیر
یں کے چنگل میں پھنس گیا تھا، ورنہ اس میں پیشہ ور مجرموں جیسا دم خم نہیں تھا کہ سخت تشدد سہہ کر بھی ڈھٹائی
ائم رہیں اور زبان پر پڑا قفل کھولنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ شہریار نے موبائل آن کر کے اسے تھمایا تو اس نے
ں فرماں برداری سے تھام کر خالد کا نمبر ملا دیا۔ ایک طرح سے وہ یکسر مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔
ید اس نے اپنے دل میں یہ بھی سوچ لیا ہو کہ پیر سائیں اپنی کرامات کے سہارے خود ہی اس ناہنجار اے سی
ہنٹ لیں گے چنانچہ خود مکمل طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا اور شہریار کے لیے یقیناً کسی ناگہانی آفت کا منتظر تھا۔

''کیا بات ہے، کیا خالد سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا؟'' وہ کئی بار نمبر ڈائل کرنے کے باوجود بھی دوسری طرف
ں سے بات نہیں کر سکا تو اس کے اُلجھن زدہ تاثرات دیکھ کر شہریار نے پوچھا۔

''خالد کے نمبر پر بھی واجد کے نمبر جیسی ہی خاموشی ہے۔ لگتا ہے ان کے گھر کوئی پریشانی پڑ گئی ہے۔'' اس
مایوسی سے جواب دیا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ اپنے پیر سائیں سے ہی رابطہ کرو۔ یہ کوئی نماز کا وقت تو ہے نہیں کہ تمہارے پیر سائیں کی
دت میں خلل پڑے گا۔'' اس نے سرد لہجے میں حکم صادر کیا۔ حقیقتاً کالے میاں سے معلومات حاصل کرنے

ئے بعد اسے پیر سائیں یا اس کے کسی کارندے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی وہ وہاں والوں سے رابطہ کرنے پر مصر تھا۔ جانے یہ اس کی دماغی رو بہکنے کا نتیجہ تھا یا چھٹی حس جاگ کر کسی غیر معمولی صورتِ حال کا احساس دلا رہی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا لیکن بے چارے کالے میاں کو تو حکم کی تعمیل کرنی تھی، وہ ایک بار پھر موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس کے نمبر ملانے سے قبل ہی کوئی کال آنے لگی۔

''لائن کاٹ دو۔'' وہ اس کے عین سر پر سوار تھا اس لیے اسکرین پر نمودار ہونے والے ''کاکا'' کے الفاظ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کالے میاں کی بیوی فون کر رہی ہے۔ وہ شاید اپنے شوہر کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی خبر ملنے کے بعد مسلسل ہی اس کے نمبر پر ٹرائی کرتی رہی تھی لیکن پہلے موبائل بند ہونے اور بعد میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کی کوششیں بار آور نہیں ہو سکی تھیں۔ اب جو ذرا سا وقفہ آیا تو وہ موبائل کی گھنٹیاں بجانے کی حد تک کامیاب ہو گئی لیکن شہریار کی طرف سے لائن کاٹ دینے کا حکم ملنے کے بعد کالے میاں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کال ریسیو کر کے بیوی کی تسلی تشفی کا کام کرے۔ چنانچہ اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیوی کی کال منقطع کر کے پیر سائیں کا نمبر ملا لیا۔ اس بار بھی اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات نظر آئے۔ ان تاثرات میں مایوسی کے ساتھ ساتھ کچھ حیرانی اور پریشانی بھی شامل تھی۔ اپنے دو قریبی دوستوں سمیت پیر سائیں سے بھی رابطہ نہ ہو سکنے کی صورت میں یقیناً اس کے اندر بھی یہی احساس جاگا ہو گا کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے جب ہی ایک ساتھ اس کا سب لوگوں سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

''او کے۔ لاؤ یہ موبائل مجھے دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے پیر سائیں کے ہاں کیا مسئلہ ہو گیا ہے کہ تمہارا کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہوئے شہریار نے پُرسوچ لہجے میں حکم دیا تو کالے میاں نے موبائل اس کے حوالے کر دیا۔ حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مشابرم خان محض ایک اشارے کا منتظر بالکل تیار کھڑا تھا۔ اب بھی شہریار نے موبائل اپنے قبضے میں لیتے ہوئے اسے کوئی خفیف سا اشارہ کر دیا جس کے نتیجے میں کالے میاں ایک بار پھر بندشوں میں جکڑا گیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر وہ زبان بھی بند کر دی گئی جسے کچھ دیر قبل بصد اصرار کافی جدوجہد کے بعد کھلوایا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

اسلم کی آنکھ کھلی تو گھڑی کی سوئیاں چار بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ یعنی وہ کافی طویل نیند لینے کے بعد جاگا تھا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے آرام دہ بستر نے اسے اس طرح بے سدھ کیا تھا کہ درمیان میں ایک بار بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اب بھی وہ آنکھ کھل جانے کے باوجود کچھ دیر کسلمندی سے بستر پر ہی پڑا رہا لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اس گھر میں مہمان ہے اور مستقل ڈیرا ڈالنے کے لیے یہاں نہیں آیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اب حامد راؤ اور اس کے بیٹے سے رخصت کی اجازت لی جائے۔ یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے میں انہیں اچھا خاصا وقت لگ جاتا پھر یہ سفر بھی ایسا نہیں تھا جس کی منزل پہلے سے طے شدہ ہو۔ وہ لوگ ٹاہلی والا سے نکل کر جہاں بھی پہنچتے، بے گھر ہی ہوتے اور قیام کے لیے کسی نہ کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا چنانچہ اس کی خواہش تھی کہ بہت زیادہ رات نہ ہو۔ کیونکہ رات گئے ہوٹلوں میں پہنچنے والے جوڑے عموماً مشکوک قرار پاتے ہیں۔ اس نے حامد راؤ کے سامنے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ماہ بانو اس کی بیوی نہیں تھی بلکہ ہونے والی بیوی تھی اور یہ رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جو انہیں قانونی تحفظ فراہم کر سکتا۔ ہوٹلوں میں اگرچہ کسی جوڑے کو کمرہ دیتے وقت نکاح نامہ دکھانے کی شرط نہیں رکھی جاتی تھی لیکن با



وہی تھی کہ ناموزوں وقت پر کسی ہوٹل میں پہنچ کر وہ خوامخواہ کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آدمی کو کب کہیں کوئی سر پھرا ٹکرا جائے، اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے موجودہ حالات میں کسی نئے مسئلے سے نمٹنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ان کے ڈیرے سے فرار ہونے کے بعد وہاں سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں پولیس ریڈ کا نتیجہ تھیں۔ اس ریڈ میں اس کے جانے کتنے ساتھی مارے گئے تھے اور کتنے زخمی یا مفرور تھے۔ البتہ یہ بات طے تھی کہ پولیس نے گرفتار شدگان کی مدد سے مفروروں کی فہرست ضرور تیار کی ہو گی اور اب ان کی راہ پر لگی ہو گی۔ ایسے حالات میں وہ کسی بھی طرح پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی خواہش میں اتنا محتاط تھا کہ کسی معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب بھی ذہن میں آنے والے خیال نے اس کی ساری کسلمندی اور سستی کو سیکنڈوں میں اُڑن چھو کر دیا اور وہ مزید سونے کی ترغیب دیتے آرام دہ بستر کو چھوڑ کر ایک چھلانگ میں غسل خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو مقصود کو کمرے میں اپنا منتظر پایا۔

''میں پہلے بھی دو بار آپ کے کمرے کا چکر لگا کر جا چکا ہوں لیکن آپ اتنی گہری نیند میں تھے کہ مجھے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔'' اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بس تھکن ہی ایسی تھی لیکن اگر کوئی کام تھا تو تم مجھے جگا سکتے تھے۔'' مقصود کے پہلے بھی دو بار آنے کا سن کر اسے یہی لگا کہ وہ کسی کام سے یہاں آیا ہو گا اس لیے کچھ تفکر اور گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''ارے نہیں۔'' مقصود اس کے تاثرات بھانپ کر دھیرے سے ہنسا۔ ''میں تو بس یہ دیکھنے آیا تھا کہ اگر آپ جاگ رہے ہوں تو دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھ لوں لیکن آپ نے تو اُٹھنے میں تقریباً شام ہی کر دی۔ ڈھائی تین گھنٹوں میں یہاں رات کے کھانے کا وقت ہو جائے گا اور آپ ابھی تک دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھا سکے جس پر میری والدہ کو سخت تشویش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہمان نے دوپہر کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا تو پھر رات کا کھانا کب کھائے گا؟''

مقصود کے ہلکے پھلکے انداز میں سنائی گئی تفصیل نے اسے بے ساختہ ہی اپنی ماں کی یاد دلا دی۔ دورانِ تعلیم کراچی میں رہائش کے عرصے میں اس کے کھانے پینے کے معمولات بہت زیادہ تبدیل ہو گئے تھے۔ عموماً یونیورسٹی سے واپس آنے میں ہی تین سے اوپر کا وقت ہو جاتا تھا اور وہ دوپہر کا کھانا دیر سے کھانے کے باعث رات کا کھانا بھی تاخیر سے کھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس معمول کی وجہ سے جب وہ ملاقات کے لیے گاؤں جاتا وہاں ماں اور بہن کے معمول کا ساتھ نہ دے پاتا اور ماں تشویش میں مبتلا رہتی کہ اس کے بیٹے نے کس قسم کی عادات اپنا لی ہیں جلدی سونے اور جلدی جاگنے والے گاؤں دیہاتوں کے رہائشیوں کے لیے اس طرزِ زندگی کا تصور ہی محال تھا جو کراچی جیسے بڑے شہر میں رائج تھا۔

''آپ کس سوچ میں ڈوب گئے؟ کہیں میری بات کا برا تو نہیں مان گئے؟ میں نے تو صرف آپ کو اپنی والدہ کے خیالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس بات کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہمارے گھر میں آپ پر کوئی زبردستی کی جائے گی۔ آپ اپنے سونے جاگنے اور کھانے پینے کے معمولات کے لیے بالکل آزاد ہیں۔ اب بھی مجھے صرف آپ کے جاگنے کا انتظار تھا۔ آپ چند منٹ کے لیے انتظار کریں تو میں کھانا لگوا دیتا ہوں۔ رات کا کھانا جب آپ کی خواہش محسوس کریں گے، تب ہی فراہم کر دیا جائے گا۔'' اس کی خاموشی سے کچھ اور ہی معنی اخذ کرتے ہوئے مقصود تھوڑا سا گھبرا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

ایک تو مہمان داری ان کی روایت تھی اور وہ مہمان کو ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دوسرے جتنا برخوردار قسم کا لڑکا تھا، اسے فوراً ہی یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اسلم کے ماتھے پر پڑنے والی کوئی شکن کہیں اس کے والد ماجد کا مزاج برہم نہ کر دے اس لیے فوراً صفائیاں پیش کرنے پر اُتر آیا۔

اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اسلم کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ سی شوخ مسکراہٹ دوڑ گئی پھر وہ فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ مذاق نہ سمجھ سکوں۔ مجھے بس یہ خیال آ گیا تھا کہ تمہاری والدہ بہت دور سوچ رہی ہیں۔ رات کا کھانا ہم کب اور کہاں کھائیں گے، یہ تو میں خود بھی ابھی طے نہیں کر سکا ہوں۔ البتہ طے کر لیا ہے کہ تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ تم مجھے یہاں سے شہر کی طرف جانے والی گاڑیوں کے روٹ اور اوقات وغیرہ بتا دو اور ساتھ ہی اندر زنان خانے میں میری بیوی کو بھی یہ پیغام بھیج دو کہ وہ سفر کے لیے تیار ہو جائے تاکہ ہم شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے یہاں سے نکل سکیں۔''

اس کا پروگرام سنا کر مقصود ہکا بکا رہ گیا۔

''اب کیا ہوا بھائی؟ یقین کرو میں نے کسی کی ناراضگی کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں سنایا بلکہ تمہارے یہاں اس کمرے میں آنے سے پہلے ہی میں اپنا پروگرام طے کر چکا تھا۔'' اس نے فوراً ہی مقصود کی دل جوئی کے لیے وضاحت پیش کی۔

''لیکن ابا جی نے تو کچھ اور ہی سوچا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ کی طرف سے روانگی کا کوئی عندیہ ملے گا تو وہ اپنی پیشکش آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔''

''کیسی پیشکش؟'' وہ حیران ہوا۔

''اصل میں آپ نے شفقت چاچا کے بارے میں جو تفصیلات بتائی ہیں انہیں سن کر ابا جی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کا اندازہ ہے کہ چاچا جی کا کافی دنوں تک منظر پر آنا ممکن نہیں ہوگا۔ ان حالات میں ان کی محنت سے جمایا ہوا کاروبار ٹھپ ہونے کا خدشہ ہے اس لیے ابا جی کی خواہش ہے کہ میں شہر جا کر ان کا دفتر سنبھال لوں۔ وہاں سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ میں چاچا جی کا بھتیجا ہونے کے علاوہ ان کا داماد بھی ہوں اس لیے مجھے وہاں کا کام سنبھالنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ میں کل صبح شہر کے لیے روانہ ہوں گا اور ابا جی کا خیال تھا کہ اگر آپ بھی چاہیں تو میرے ساتھ جا سکتے ہیں۔ اس طرح آپ بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانے سے بھی بچ جائیں گے۔'' مقصود نے اپنا پورا پروگرام اس کے سامنے رکھ دیا جسے سن کر وہ خوش ہو گیا۔ وہ تو اپنے میزبانوں پر بوجھ نہ بننے کے خیال سے یہاں سے روانگی میں اتنی جلدی دکھا رہا تھا لیکن اگر صرف ایک رات کی تاخیر سے وہ لوگ زیادہ سہولت سے سفر کر سکتے تو تھوڑا سا انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا چنانچہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری تجویز کافی اچھی اور قابل عمل ہے ورنہ سچ پوچھو تو میں یہ سوچ کر کہ تمہیں اپنے یہ بن بلائے مہمان وبالِ جان نہ لگیں، یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا چاہتا تھا۔''

''ہم مہمان کو وبالِ جان نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ ہیں۔ آپ چاہیں تو غیر معینہ مدت کے لیے بھی یہاں رک سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' مقصود کے لہجے اور الفاظ میں خلوص کی جھلک تھی جسے محسوس کر کے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فی زمانہ جس قدر نفسا نفسی کا عالم تھا، اس میں حامد راؤ کے گھرانے جیسے وضع دار گھرانے بس انگلیوں پر گنے چنے ہی باقی رہ گئے ہوں گے



اس طرح کے لوگ قابل قدر بھی تھے اور قابل ستائش بھی چنانچہ اس نے کسی بھی قسم کی کنجوسی سے کام لیے بغیر مقصود کے سامنے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ اس کی تعریفیں سن کر مقصود کے چہرے پر خفت بھرے تاثرات اُبھر آئے۔ اس جیسے روایت پرست گھرانے کے لڑکے کے لیے وہ تعریفیں یقیناً کھسیاہٹ کا سبب بن رہی تھیں چنانچہ اسے درمیان میں ہی روک کر شرمیلے پن سے بولا۔

''آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے لیے ایسی کون سی زحمت اٹھائی ہے؟ بس جیسے خود کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں، اس میں آپ کو بھی شامل کر لیا۔'' مقصود کے لہجے میں وہی روایتی عاجزی تھی جو اس جیسے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ پھر اس نے تیزی سے موضوعِ سخن تبدیل کر لیا اور کچھ عجلت سے بولا۔

''باتوں میں لگ کر اصل کام تو رہ ہی گیا۔ آپ بس دو منٹ انتظار کریں، میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔''

''میرے خیال میں اب کھانے کو رہنے ہی دو۔ اس وقت کھانا کھا لیا تو پھر رات کے کھانے پر تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ بہتر ہے کہ میں ابھی چائے پر گزارہ کر لوں تاکہ رات کا کھانا صحیح وقت پر کھا سکوں۔'' اس نے مقصود کو کھانے کے لیے منع کر کے بے تکلفی سے چائے کی فرمائش کر دی۔ جب مہمان اتنا مخلص ہو تو پھر میزبان کے لیے بھی غیر ضروری تکلف بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ البتہ مقصود اس کے ایک وقت کا کھانا گول کر دینے کے خیال سے تذبذب میں پڑ گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اعتراض نہیں کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''ذرا میری بیگم تک بھی کل صبح روانگی کا پیغام پہنچا دینا۔'' اس نے ماہ بانو کے بروقت تیار رہنے کے خیال سے اس کے لیے پیغام نوٹ کروایا۔

''جی بہتر ہے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں بھی بھابی جی کو یہاں بھجوا دوں؟ اماں اور انیلا نے تو دوپہر میں بھی انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو آپ والے کمرے میں سونے کے لیے جا سکتی ہیں لیکن انہوں نے سونے کے مقابلے میں خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنا پسند کیا۔'' فرماں برداری کے مظاہرے کے ساتھ ہی ماہ بانو کو بھیجنے کی پیشکش کے علاوہ اس نے باقی تفصیلات بھی فراہم کر دیں۔

''میرے خیال میں اب بھی وہ خواتین کے ساتھ گپ شپ کو انجوائے کر رہی ہوگی۔ اسے ڈسٹرب کرنے کے بجائے صرف پیغام بھجوانے پر اکتفا کر لیا جائے تو یہ بھی مناسب ہی رہے گا۔'' وہ سمجھ سکتا تھا کہ ماہ بانو تنہا اس کے ساتھ اس کمرے میں سونے سے گریزاں ہوگی اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں مقصود کی پیشکش مسترد کر دی جس پر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے واپس آنے تک اسلم فارغ تھا چنانچہ اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لینے کا بھلہ کیا اور پہلے اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا دھار دار خنجر نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ خنجر کے چند منٹ کے معائنے میں ہی وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ خنجر کے بعد پسٹل کی باری آئی۔ سونے سے پہلے اس نے اپنا پسٹل تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔ پسٹل بھی بالکل صحیح حالت میں تھا اور ایمرجنسی میں سیفٹی کیچ ہٹا کر لبلبی دبانے کی کسر باقی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے پسٹل واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس وقت وہ ایک محفوظ اور معزز گھرانے میں موجود تھا اور یہاں ان ہتھیاروں کی اسے چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے ہتھیاروں کی روزانہ دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کی برسوں سے ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ اس معمول کو ترک کرنا ذرا مشکل تھا۔ وہ تو اس کی رائفل اس کے بجائے ماہ بانو کے اس تھی ورنہ وہ اسے بھی ضرور چیک کرتا۔ پہاڑوں پر سے آبادی میں داخل

ہوتے وقت ماہ بانو نے رائفل اپنی چادر میں چھپا کر ساتھ لے لی تھی اور وہ ابھی تک اسی کے قبضے میں تھی۔ اسلم بیٹا مل کر کھیل رہے ہوں گے اور مقصود اس کی خاطر تواضع کے لیے درمیان سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ اپنے کو اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل کے بارے میں اس نے حامد راؤ کے گھر کی خواتین کو کیا بتایا تھا اور کس طرح خیال میں وہ اس لیے بھی حق بجانب تھا کہ مقصود نے واپس بیٹھک میں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

مطمئن کیا تھا کیونکہ بہر حال یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ رائفل ان لوگوں کی نظر میں نہ آسکی ہو۔ بہت کارآمد ہتھیار ''مجبوری ہے، اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔ مقصود ہر معاملے میں بے حد لائق ہونے کے باوجود شطرنج میں حد ہونے کے ساتھ رائفل میں یہی خرابی تھی کہ اسے چھپانا آسان کام نہیں تھا۔ سے زیادہ نکما ہے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے شطرنج کھیلنی آجائے لیکن نالائق کو آج تک ڈھنگ کی ایک

مقصود کی واپسی تقریباً دس بارہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اسٹیل کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھا چال چلنی نہیں آئی اور اناڑی بندے کے ساتھ کھیلنے میں مجھے مزہ نہیں آتا۔ اس سے بہتر مجھے یہی لگتا ہے کہ رکھی تھی۔ یہ ٹرے جب اسلم کے سامنے رکھی گئی تو اس نے دیکھا کہ ٹرے میں چائے کے برتنوں کے ساتھ ساتھ دونوں طرف سے خود ہی کھیل لوں۔ کم از کم مقابلہ تو برابری کا رہتا ہے۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد راؤ نے خود کو دیگر کئی لوازمات بھی موجود ہیں۔ شاید مقصود نے اس کی بھوک کا خیال کر کے چائے کے ساتھ یہ اہتمام کروایا ہے اور اس موڈ سے نکل آئے ہیں جو صبح ان پر طاری تھا۔ شاید انہوں نے شفقت راؤ کے اقدام پر اور ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہی مصر ہو گیا تھا کہ اس ٹرے میں موجود ہر شے اس کے معدے میں منتقل ہونے کے بجائے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اطمینان اور صبر سے وقت گزارنے کا فیصلہ کر جائے۔ ان لوازمات میں بازاری نمکو وغیرہ کے علاوہ گھر کے بنے ہوئے شامی کباب اور بیسن کا حلوہ بھی شامل تھا۔ شفقت راؤ منظر پر آتا تو ان لوگوں کی بہت سی اُلجھنیں خود بخود ہی دُور ہو جاتیں اور وہ دونوں مل کر یقیناً تھا اور یہ دونوں ہی چیزیں اتنی مزے دار تھیں کہ اسے تکلف برطرف رکھنا پڑا۔ اس کے باوجود مقصود اسے مزید آئندہ کا کوئی لائحہ عمل طے کر لیتے۔ حامد راؤ کی سوچ جو بھی تھی، اس نے جاننے کے لیے دوبارہ اس ناخوشگوار کھلانے پر بضد تھا۔ موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے ذرا شوخی سے بولا۔

''بس میرے بھائی! میرے معدے پر رحم کرو۔ یہ سب چیزیں بے شک بہت مزے کی ہیں لیکن اگر آپ پسند کریں تو ایک گیم میرے ساتھ کھیل لیں۔ مجھے مہارت کا دعویٰ نہیں لیکن پھر بھی آپ اتنا سے سیر ہو کر میں رات کے کھانے سے ہرگز بھی محروم نہیں ہونا چاہتا۔'' اس نے باضابطہ دونوں ہاتھ مقصود کے اناڑی نہیں پائیں گے کہ کھیل سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ تھوڑی بہت اس کھیل کی سوجھ بوجھ مجھے بھی ہے۔'' سامنے باندھ دیئے تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور یوں اس کی کھانے پینے سے گلوخلاصی ہو سکی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کے تھوڑا بہت کھیل جاننے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اباجی بوریت سے بھی ''اگر آپ مزید آرام کرنا چاہیں تو اسی کمرے میں کر سکتے ہیں۔ ورنہ اگر گپ شپ کا موڈ ہو تو بیٹھک میں جائیں گے اور جیت بھی انہی کی ہوگی۔'' مقصود جو ابھی ابھی اس بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا، چلے جائیں، اباجی وہیں ہیں۔ میں بھی یہ برتن اندر پہنچا کر وہیں آتا ہوں۔'' مقصود نے اس کے سامنے دونوں آپشن رکھ دیئے جس میں سے اس نے بیٹھک میں جانے والی پیشکش قبول کر لی۔ جتنا آرام وہ کر چکا تھا، اس سے بولا جس پر حامد راؤ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر منہ پھیر کر مسکراہٹ پر قابو پانے کے بعد رعب دار لہجے میں بولے۔

''تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم مجھ پر یہ الزام لگانا چاہ رہے ہو کہ میں صرف جیتنے کے لیے کے بعد یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رات کو نیند دیر سے ہی آسکے گی۔ مزید آرام کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر ضرورت محسوس بھی ہوتی تو وہ اپنے مخلص میزبانوں کی محبت پر اسے قربان کر دیتا کہ ایسے نادر روزگار لوگوں سے ملتا ہوں؟''

''تو اس میں غلط کیا ہے؟ ہر کھلاڑی جیتنے کی نیت سے ہی میدان میں اُترتا ہے۔'' انہیں اطمینان سے ساتھ روز روز میسر نہیں آتا۔

''اخاہ..... نیند پوری ہو گئی تمہاری۔ آؤ یہاں میرے پاس چلے آؤ۔'' وہ دستک دے کر بیٹھک میں داخل ہوا تو حامد راؤ نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے جا بیٹھا۔ حامد راؤ کے سامنے بساط بچھی ہوئی تھی اور وہ اس پر مہرے سجائے بڑے مصروف نظر آرہے تھے۔

''کچھ کھایا پیا بھی یا سیدھے یہیں چلے آرہے ہو؟'' نظریں مہروں پر جمی ہونے کے باوجود وہ اس کی صلاحیت موجود تھی۔ صبح حامد راؤ کے چہرے پر پریشان کن طرف سے غافل نہیں تھے۔

''آپ کے فرماں بردار صاحب زادے کی موجودگی میں بھلا میرا بھوکا رہنا کیسے ممکن تھا؟ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس دور میں اتنا فرماں بردار اور ذمے دار بیٹا ملا ہے۔'' وہ حامد راؤ کے سامنے مقصود کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا جسے سن کر ان کے ہونٹوں پر بس لمحہ بھر کے لیے فخریہ سی مسکراہٹ جھلکی لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اسلم بھی ان کے مزاج کو کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک سیدھے سادے اور کھرے آدمی جن سے یہ امید کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کی ذرا سی تعریف سن کر سینہ پھلا کر بیٹھ جاتے اور اپنی اقدار تربیت کے گن گانے لگتے۔

''آپ کیا اکیلے ہی شطرنج کھیلنے کے شوقین ہیں؟'' اتنی دیر میں وہ دیکھ چکا تھا کہ حامد راؤ دونوں طرف چالیں خود ہی چل رہے ہیں اس لیے یہ سوال کر بیٹھا ورنہ بیٹھک میں داخل ہوتے وقت تو وہ یہی سمجھا تھا کہ مقصود نے اسلم بیٹا مل کر کھیل رہے ہوں گے اور مقصود اس کی خاطر تواضع کے لیے درمیان سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ اپنے کو اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل کے بارے میں اس نے حامد راؤ کے گھر کی خواتین کو کیا بتایا تھا اور کس طرح خیال میں وہ اس لیے بھی حق بجانب تھا کہ مقصود نے واپس بیٹھک میں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

''مجبوری ہے، اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔ مقصود ہر معاملے میں بے حد لائق ہونے کے باوجود شطرنج میں حد سے زیادہ نکما ہے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے شطرنج کھیلنی آجائے لیکن نالائق کو آج تک ڈھنگ کی ایک چال چلنی نہیں آئی اور اناڑی بندے کے ساتھ کھیلنے میں مجھے مزہ نہیں آتا۔ اس سے بہتر مجھے یہی لگتا ہے کہ دونوں طرف سے خود ہی کھیل لوں۔ کم از کم مقابلہ تو برابری کا رہتا ہے۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد راؤ نے خود کو سنبھال لیا ہے اور اس موڈ سے نکل آئے ہیں جو صبح ان پر طاری تھا۔ شاید انہوں نے شفقت راؤ کے اقدام پر ملنے کڑھنے کے بجائے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اطمینان اور صبر سے وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شفقت راؤ منظر پر آتا تو ان لوگوں کی بہت سی اُلجھنیں خود بخود ہی دُور ہو جاتیں اور وہ دونوں مل کر یقیناً آئندہ کا کوئی لائحہ عمل طے کر لیتے۔ حامد راؤ کی سوچ جو بھی تھی، اس نے جاننے کے لیے دوبارہ اس ناخوشگوار موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے ذرا شوخی سے بولا۔

''اگر آپ پسند کریں تو ایک گیم میرے ساتھ کھیل لیں۔ مجھے مہارت کا دعویٰ نہیں لیکن پھر بھی آپ اتنا اناڑی نہیں پائیں گے کہ کھیل سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ تھوڑی بہت اس کھیل کی سوجھ بوجھ مجھے بھی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کے تھوڑا بہت کھیل جاننے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اباجی بوریت سے بھی جائیں گے اور جیت بھی انہی کی ہوگی۔'' مقصود جو ابھی ابھی اس بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا، اخی سے بولا جس پر حامد راؤ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر منہ پھیر کر مسکراہٹ پر قابو پانے کے بعد رعب دار لہجے میں بولے۔

''تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم مجھ پر یہ الزام لگانا چاہ رہے ہو کہ میں صرف جیتنے کے لیے کھیلتا ہوں؟''

''اب دیتے ہوئے مقصود نے ایک کرسی سنبھال لی۔ اس وقت اس کا اپنے باپ سے رویہ ایسا تھا جیسے کوئی بڑا ہی بچے کو کوئی بات سمجھا رہا ہو۔ پہلی بار اسلم کو احساس ہوا کہ باپ بیٹے میں صرف احکامات کے اجرا اور فرماں برداری کا تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی ہیں۔ البتہ مقصود کے اندر حالات کی اکت کو سمجھنے اور موقع محل دیکھ کر بات کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ صبح حامد راؤ کے چہرے پر پریشان کن ثرات تھے تو مقصود بھی خول میں سمٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب ان کا موڈ بحال ہو گیا تو اس کی بھی رگِ ظرافت

''اس نالائق کی باتوں کو رہنے دو اسلم میاں! آؤ ہم بساط سجاتے ہیں۔'' حامد راؤ نے مصنوعی غصے کے ہار کے لیے منہ پھلایا اور مقصود کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر جوان وں کے درمیان کھیل شروع ہوا تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ کھیلنے کے دوران وہ آپس میں گفتگو بھی رتے جا رہے تھے۔ اس گفتگو کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ مقصود نے ایگری کلچر میں گریجویشن کیا ہوا ہے لیکن ہیں شہر میں رہ کر نوکری کرنے کے بجائے باپ کی فرمائش پر گاؤں میں رہ رہا ہے اور اپنے علم کی روشنی میں اپنی

بنوں پر کام کرنے والے مزارعوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ حامد راؤ بیٹے کی اس فرماں برداری پر بہت خوش تھے ونکہ ان کے خیال میں علم اور محنت جب یکجا ہوں تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آتے ہیں اور ان کے اس خیال پر

مہر تصدیق اس لیے ثبت ہوگئی تھی کہ واقعی جب سے مقصود نے ان کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا تھا، پیداوار بڑھ گئی تھی۔ ان کے کھیتوں اور باغوں میں اُگنے والی سبزیاں اور پھل اتنے عمدہ معیار کے تھے کہ خریدار پیشگی بکنگ کروا دیتے تھے۔

مقصود کے حوالے سے حامد راؤ کی آنکھوں میں چمکتے فخر اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ نے جہاں اسلم کو خوش کیا، وہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں درد کی لہریں بھی اُٹھنے لگیں۔ حامد راؤ کو دیکھ کر اسے بے ساختہ ہی اپنے باپ کی یاد آگئی تھی۔ اس کا سادہ لوح باپ بھی تو اس کے حوالے سے ایسے ہی کچھ خواب دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں بھی یہی خواہش تھی کہ اسلم پڑھ لکھ کر کسی اونچے عہدے پر فائز ہو جائے تاکہ اپنے پسماندہ گاؤں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کچھ کر سکے۔ بدقسمتی سے اس کے باپ کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے زیر سایہ تربیت دیتا۔

باپ کی وفات کے بعد ماں اور بہن نے اَن تھک محنت سے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں ایک بار پھر قسمت انہیں مات دے گئی اور حالات کی ستم ظریفی سے وہ کتاب اور قلم کا ساتھ چھوڑ کر ہتھیار اُٹھانے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی زندگی کے کئی برس حالات کے انہی تھپیڑوں کو سہتے ہوئے گزر گئے تھے اور اسے جس گاؤں کی خوش حالی کے لیے کام کرنا تھا، وہاں قدم رکھنے سے بھی محروم ہوگیا تھا۔ اب ماہ بانو کے زندگی میں آجانے سے اسے یہ سنہری موقع ملا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی زندگی کو بدل سکے۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں تھا۔ ابتدا میں ہی حامد راؤ جیسے شخص سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ خوش امیدی بھی پیدا ہوگئی تھی کہ آگے بھی قدرت اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دے گی۔

''آپ دونوں کا کھیل دیکھ کر تو مجھے لگ رہا ہے کہ رات بھر میں بھی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے میرے خیال میں بہتر ہے کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے۔ پھر اگر آپ لوگ چاہیں تو اپنا کھیل جاری رکھ سکتے ہیں۔'' خیالات میں ڈوبے ہونے کے باوجود اس کا کھیل پر ارتکاز کم نہیں ہوا تھا، تب ہی مقصود کے ٹوکنے پر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے کے باوجود وہ وہاں جم کر بیٹھنے پر مجبور ہو۔ اسے بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

''چلو اسلم میاں! اس کے کہنے پر کھانا کھا لیتے ہیں ورنہ یہ اسی طرح بیٹھ کر جلتا رہے گا۔'' حامد راؤ نے بھی بیٹے کے تاثرات ملاحظہ کیے تھے اور اب اسے چھیڑنے والے انداز میں اسلم سے مخاطب تھے۔

''مجھے جلنے کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے آپ لوگوں کو ٹوکا ہے کہ اسلم بھائی نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بجائے صرف چائے پر اکتفا کیا تھا۔ پھر صبح ہی ہمیں سفر پر نکلنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ رات کا کھانا وقت پر کھا لیا جائے۔'' مقصود نے فوراً ہی وضاحت پیش کی جسے سن کر حامد راؤ بوکھلا گئے۔

''ارے بھئی یہ کیا؟ تم نے دوپہر کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟ اور تم بھی یہ بات اب بتا رہے ہو۔ اگر ایسا کوئی معاملہ تھا تو کھانا اور بھی جلدی لگوا لینا چاہئے تھا۔'' وہ اسلم سے بات کرتے کرتے بیٹے کی طرف متوجہ ہوگئے اور اسے سرزنش کرنے لگے۔

''آپ فکر نہ کریں، میں نے بے شک کھانا نہیں کھایا لیکن چائے کے ساتھ بھی مقصود نے اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ پیٹ اچھا خاصا بھر گیا ہے۔ البتہ مقصود کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہمیں رات کا کھانا کھا لینا چاہئے۔ صبح سفر کے لیے نکلنا ہے اس لیے مقصود کا بھرپور نیند لینا ضروری ہے ورنہ اسے ڈرائیو کرنے میں مشکل ہوگی۔'' اسلم



نے فوراً ہی مقصود کی حمایت کی ذمے داری سنبھال لی جس پر حامد راؤ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ کھانا کھانے کا پروگرام طے ہو جانے کے بعد بساط سمیٹ لی گئی کیونکہ حامد راؤ نے اس کے ساتھ کھیل کر لطف آنے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ سفر تو اسلم کو بھی کرنا ہے اس لیے رات کو جاگ کر کھیلنے کے بجائے اس کا آرام کرنا بھی ضروری ہے، کھیل جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ بساط سمیٹ کر وہ لوگ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر واپس وہاں آکر بیٹھے تو مقصود کھانے کے برتن وغیرہ سجانے کا آغاز کر چکا تھا۔ کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا گیا تھا چنانچہ زنان خانے سے یہاں تک کھانا لانے کے لیے اسے کئی چکر لگانے پڑے۔

اسلم کو اندازہ تھا کہ وہ بے چارہ ان کی وجہ سے اس مشقت میں پڑ گیا ہے ورنہ وہ اور حامد تو ظاہر ہے گھر والوں کے ساتھ ہی کھاتے پیتے ہوں گے اور اس صورت میں دسترخوان پر کھانا چننے کی ذمے داری خواتین کے سر ہی ہوتی ہوگی۔ اس نے زبان سے بھی مقصود کو اپنی وجہ سے ہونے والی اس زحمت کا اظہار کر دیا جسے سن کر حامد راؤ فوراً ہی بول پڑے۔

''زحمت کیسی؟ یہ میرا بیٹا ہے اور مہمان نوازی کی روایت اسے مجھ سے ورثے میں ملی ہے۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ صرف تمہاری خاطر یہاں کچھ انوکھا ہو رہا ہے۔ اللہ کے فضل سے اکثر و بیشتر ہی ہمارے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہوتا ہے۔ ہاں، اتنا ضروری ہے کہ عام دنوں میں یہ سارے کام جو اس وقت تمہیں مقصود کرتا ہوا نظر آ رہا ہے، ایک ملازمہ انجام دیتی ہے۔ صبح ناشتے کے وقت تم نے اس ملازمہ کو دیکھا بھی ہوگا۔ گھر کی خواتین کی مدد اور زنان خانے سے مردانے تک بھاگ دوڑ کی ذمے داری صبح سے شام تک اسی کے سر ہوتی ہے لیکن آج اتفاق سے اس بے چاری کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔''

حامد راؤ کے اس جواب نے اس کی ہر اُلجھن دور کر دی ورنہ اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ صبح نظر آنے والی ملازمہ دوبارہ کیوں نظر نہیں آئی اور مقصود کو ہی سارے کام کیوں انجام دینے پڑ رہے ہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اپنے میزبانوں کی دعوت پر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھانا۔ کھانے کے بعد لیموں والی سبز چائے کی پیالیاں پیش کی گئیں جس سے کھانے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ وہ فارغ ہو کر اس محفل سے اٹھا تو بہت سرشار تھا اور سرشاری کے اس احساس کے ساتھ بے حد مگن سا اپنے لیے مخصوص کیے گئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ابا جی! کہ اچانک اماں کو کیا ہوگیا تھا۔ میری جب ان سے آخری بار بات ہوئی تھی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی کسی تکلیف کا ذکر نہیں کیا تھا پھر بالکل اچانک ہی ایسا کیا ہوگیا کہ انہیں علاج کے لیے لندن بھجوانا پڑا اور وہاں بھی جانبر نہیں ہو سکیں۔ اتنے قابل ڈاکٹر ہیں لندن میں، ان میں سے کسی کو اماں کی بیماری سمجھ نہیں آئی۔ آپ کو مجھے پہلے سے بتانا تو چاہئے تھا۔ میں خود لندن آتا اور وہاں آکر ڈاکٹروں سے بات کرتا۔'' یہ مراد شاہ تھا، چودھری افتخار عالم شاہ کا بڑا بیٹا اور وارث جو ماں کے اچانک چل بسنے کی خبر سن کر فون پر باپ سے شکوے کر رہا تھا۔

''بس پُتر!..... کیا کر سکتے ہیں۔ بیماری اور موت پر آدمی کا زور تھوڑی چلتا ہے۔ تیری ماں کو اچانک ہی

بیماری نے اس طرح لپیٹ میں لیا کہ دنوں میں ہی اس کا حال خراب ہو گیا۔ میں نے تو اسے بچانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر ڈالی۔ جھٹ پٹ لندن بھی بھجوا دیا لیکن جب آدمی کا وقت پورا ہو جائے نا تو ساری دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اس کی زندگی نہیں بڑھا سکتیں۔ ملک الموت جب روح قبض کرنے آ جائے تو فیر خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔'' وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔ لندن کے چند روزہ قیام میں اس نے اپنے لیے دل بھر کر خوشیاں کشید کی تھیں۔ مسٹر الفا کی وجہ سے وہ ایک بار ضرور لنڈا سے محروم ہوا تھا لیکن اس کے بعد لنڈا نے پوری دو راتیں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ لنڈا کی لندن سے روانگی کے بعد بھی وہاں حُسن و شباب کی کوئی کمی نہیں تھی چنانچہ وہ خوب جی بھر کر عیش کرتا رہا تھا۔

ادھر پاکستان اور امریکہ میں اس کے بچے اپنی ماں کی طرف سے فکر مند تھے لیکن اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ روانگی والے دن تک کسی کو وڈی چودھرائن کے مرنے کی اطلاع نہیں دی تھی اور کوشش کرتا تھا کہ کم ہی کسی کی فون کال اٹینڈ کرے۔ کبھی کسی سے بات کر بھی لیتا تھا تو طفل تسلیاں دے ڈالتا تھا۔ اب اچانک اس کی طرف سے چودھرائن کے مرنے کی اطلاع پہنچنے پر سب ہی صدمے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مراد شاہ نے اس المیے کا سب سے گہرا اثر لیا تھا کیونکہ وہ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں کا بہت لاڈلا بھی تھا اور پھر اسے یہ خلش بھی تھی کہ طویل عرصے سے دیارِ غیر میں قیام کی وجہ سے وہ جیتی جاگتی ماں کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔

''آپ کی ہر بات ٹھیک ہے ابا جی! لیکن دل میں خلش سی ہے کہ کچھ نہیں تو کاش آخری دنوں میں مجھے اماں کی خدمت کا موقع ہی مل جاتا۔ آپ نے مجھ پر یہ بڑا ظلم کیا کہ آخر تک اصل صورتِ حال سے آگاہ ہی نہیں کیا۔'' مراد شاہ اس سے شکوے کر رہا تھا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس نے خصوصیت کے ساتھ اسے بے خبر رکھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ ایک مراد شاہ ہی تھا جو اصل صورتِ حال جاننے کے لیے لندن پہنچنے کی کوشش کرتا اور اس کے لندن آنے کا مطلب تھا کہ چودھری کے جھوٹ کا سارا پول کھل جاتا چنانچہ آواز پر رقت طاری کرتے ہوئے مکاری سے بولا۔

''تُو جسے ظلم کہہ رہا ہے نا پُتر! وہ میری محبت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس تکلیف سے میں دن رات گزر رہا ہوں، میری اولاد بھی اس میں مبتلا ہو۔ مجھے تو تیرا اور تیری بہنوں کا اتنا خیال ہے کہ میں نے تیری ماں کے مرنے کے بعد بھی فوراً اطلاع اس لیے نہیں دی کہ میت کے پاکستان پہنچنے تک تم لوگ انتظار کی سُولی پر لٹکے رہو گے۔ میں تنہا اپنی جان پر یہ سب سہتا رہا لیکن تم لوگوں کو پریشان کرنا گوارا نہیں کیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ برسوں سے زندگی کے دُکھ سُکھ میں شریک گھر والی کے بچھڑ جانے پر میرا کیا حال ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ دن رات بس بستر پر پڑا روتا رہوں لیکن تیری ماں کو پاکستان لے جانے کے لیے دوڑ دھوپ بھی تو کرنی تھی۔ روتے بلکتے دل کے ساتھ میں نے یہ کام کیسے نبیڑا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔'' اپنی بات میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے وہ آخر میں بلک بلک کر رونے کی اداکاری بھی کرنے لگا۔

فون کے دوسری طرف موجود بیٹا اس کی آواز ہی سن سکتا تھا، تصویر تو اس کے سامنے تھی نہیں جو حقیقت جان سکتا۔ چنانچہ اس صورتِ حال پر بوکھلا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

''میرا مقصد یہ نہیں تھا ابا جی! اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دُکھا ہے تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں تو بس اپنے دل کی خلش کی بات کر رہا تھا ورنہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کو اماں کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔''

''چل چھڈ اس گل کو۔ یہ بتا کہ تُو حویلی کب تک پہنچے گا؟ تُو آئے گا، تب ہی تیری ماں کی تدفین ہو گی۔



کچھ نہیں تو بدنصیب، بیٹے کے ہاتھوں قبر میں ہی اُتر جائے گی۔ تیرے ولایت رہنے پر ہمیشہ یہی خوف رہتا تھا اسے کہ جانے پُتر جنازے کو کندھا دینے بھی آئے گا یا نہیں۔''

بیٹے کے بوکھلا جانے پر اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ اس سے مزید باز پرس نہیں کر سکے گا چنانچہ بے حد ہوشیاری سے ایک ایسی بات کہہ ڈالی جسے سن کر اس کے دل کا بوجھ مزید بڑھ جائے، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ بے حد دبنگ اور ظالم وڈی چودھرائن کو کبھی مرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا جو وہ اس قسم کی باتیں کرتی۔ وہ تو بڑے ٹھسے سے حویلی پر حکمرانی کر رہی تھی کہ اچانک ہی اپنی ایک غلط چال کے نتیجے میں چودھری کے عتاب کا شکار ہو کر دنوں میں اپنی جان سے چلی گئی۔

اس نے تو اپنی طرف سے بڑی عقل مندی دکھائی تھی کہ بہزاد شاہ کی نام نہاد بیوی فریدہ کو حمل کے انتہائی نازک موڑ پر حادثاتی طور پر مروانے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے بطن سے حویلی کا کوئی نیا وارث جنم نہ لے سکے اور ساری جائیداد اس کی اولاد کے حصے میں ہی آئے۔ اتفاق سے اس کی یہ سازش ناکام رہی اور فریدہ سیڑھیوں سے گرائے جانے کے باوجود نہ صرف خود زندہ رہی بلکہ اس کا بچہ بھی بچ گیا۔ ادھر وڈی چودھرائن کے ستارے گردش میں تھے کہ چودھری کو اس سازش کی خبر مل گئی اور اس نے فریدہ کے ساتھ ظلم سے زیادہ اپنے ساتھ دھوکا دہی پر محمول کرتے ہوئے چودھرائن کو تہ خانے کی ہولناک قید میں ڈال دیا جہاں ناقص غذا، آلودہ پانی، سیلن اور بے آرامی نے اسے فوراً ہی بیمار کر ڈالا۔

غیظ و غضب میں اس کے ساتھ یہ سلوک کرنے والے چودھری کو ذرا ہوش آیا تو یہ احساس ہوا کہ قید خانے سے آزادی ملنے کی صورت میں چودھرائن اس کے ساتھ بغاوت پر اُتر آئے گی اور اپنے میکے والوں کی مدد سے اس کا ناک میں دم کر دے گی۔

اس پریشانی سے بچنے کا بہترین حل یہی تھا کہ چودھرائن کی زندگی ختم کر دی جائے۔ چنانچہ اس نے بہت ہوشیاری سے سارا کھیل کھیلا۔ چودھرائن کے حویلی سے غیاب کو چھپانے کے لیے وہ پہلے ہی اس کے لاہور اور پھر وہاں سے لندن منتقل ہونے کی کہانی سنا چکا تھا چنانچہ جب ڈیوڈ کی طرف سے اسے لندن جانے کا حکم ملا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے لندن میں چودھرائن کے مرنے کا ڈرامہ بھی رچانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس طرح حویلی کے تہ خانے میں ہلاک کی جانے والی چودھرائن کو نہایت رازداری سے ایک مردہ خانے میں منتقل کرنے کے بعد یہ ظاہر کرنے کا بندوبست کر لیا گیا کہ چودھری افتخار عالم شاہ بہ نفسِ نفیس اپنی بیوی کے تابوت کے ساتھ لندن سے پاکستان واپس آ رہا ہے۔ اس کا دستِ راست منشی اللہ رکھا اس سازش میں پوری طرح اس کے ساتھ شامل تھا اور اتنی بھرپور معاونت کر رہا تھا کہ اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں تھا۔

''میں کوشش میں تو لگا ہوا ہوں کہ جلد سے جلد گاؤں پہنچ جاؤں لیکن پھر بھی مجھے پہنچنے میں دو سے تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔'' اس کی مکاریوں سے بے خبر مراد شاہ نے دھیرے سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ چودھری نے اس پر جو نفسیاتی دباؤ ڈالا ہے، وہ پوری طرح اس کے زیرِ اثر آ گیا ہے اور فی الحال باپ کے ساتھ کسی قسم کی جرح نہیں کر سکتا۔

''تو فیر ٹھیک ہے پُتر! اب حویلی میں ہی تجھ سے ملاقات ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تیری یہشتن ماں کی روح تجھے حویلی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔'' نرمی سے بولتے ہوئے وہ بیٹے کو ایک اور چرکا لگانے سے باز نہیں آیا۔ اگرچہ جوان بیٹے سے اس موضوع پر بات کرنے میں اسے دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا لیکن تجربے اور عیاری سے اس نے بیٹے کو اس طرح قابو کیا تھا کہ اس کی بنائی گئی کہانی میں کئی جھول ہونے کے باوجود وہ اس

سے زیادہ بحث نہیں کر سکا تھا اور آئندہ بھی وہ ایسا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رنجیدہ اور شرمسار مراد شاہ نے جب اس سے اختتامی جملے بول کر فون بند کیا تو کچھ دیر قبل رقت زدہ نظر آنے والے چودھری کے ہونٹوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس برطانوی کال گرل کی طرف واپس لوٹا جو اُردو سے ناواقفیت اور بوریت کے باعث وہسکی سے شغل میں مصروف تھی کال گرل اسے فارغ ہوتے دیکھ کر فوراً ہی اپنی پیشہ ورانہ اداؤں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھنے کے ساتھ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے رخساروں اور ٹھوڑی پر بڑھے ہوئے شیو کو سہلانے لگی۔ یہ شیو اس نے قصداً بڑھائی تھی تاکہ جب وہ پاکستان پہنچے تو زیادہ الم زدہ اور تھکا ہوا محسوس ہو۔ اس بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ جب وہ سرخ آنکھوں اور مضمحل کیفیت میں پاکستان پہنچتا تو اس کی اولاد کو کیسے یقین نہیں آتا کہ ان کا باپ ان کی ماں کی دیکھ بھال میں دن رات مصروف رہا تھا اور اب اس کے مرنے پر غم سے بے حال تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ آنکھوں کی یہ سرخی بے تحاشا شراب نوشی اور تھکن کال گرلز کے ساتھ گزری راتوں کا تحفہ تھی۔

اب بھی اس کی روانگی میں محض چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ پھر بھی وہ اس کال گرل کے ساتھ مصروف تھا۔ شاید لندن سے روانہ ہونے سے قبل وہ یہاں سے کیف و سرور کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پی لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ اب حویلی میں بہت سے بے کیف دن اور راتیں اس کی منتظر ہوں گی۔ وڈی چودھرائن کی تدفین کے بعد بھی وہاں افسوس کے لیے آنے والوں کو جو تانتا بندھنا تھا، اس سے آسانی سے جان چھوٹنی مشکل تھی۔ پھر دوسرا مسئلہ مراد شاہ کا بھی تھا۔ چودھریوں سے کافی مختلف مزاج رکھنے والے بیٹے کی موجودگی میں وہ کھل کر عیش نہیں کر سکتا تھا اس لیے آنے والے ''قحط'' کا سوچ کر خوب خوب موجیں کر رہا تھا۔

اس وقت اس کے کمرے میں موجود حسینہ کچھ ایسی خاص حسین نہیں تھی لیکن وہ اس کی گوری چمڑی اور سنہری زلفوں کے باعث اس پر نثار ہوا جا رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتی وہ کال گرل جو اس سے خود ہی آ چمٹی تھی، اسے من مانیوں کے لیے خوب ہی چھوٹ دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کمرے سے رخصت ہوگی تو طے شدہ معاوضے کے علاوہ بھی ایک بڑی رقم اس کے پرس میں منتقل ہو چکی ہو گی۔ اس کے تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ ان مشرقی جاگیرداروں کے لیے سفید چمڑی والی عورتیں کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتیں۔ وہ ان پر جی بھر کر لٹاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اداؤں سے کام لے کر چودھری کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش میں تھی۔ اگر ادائیں کم پڑ جاتیں تو عقل خبط کرنے کے لیے شراب کی بھری ہوئی بوتل بھی وہاں موجود تھی۔ یعنی شکار اس کے سامنے پوری طرح بے بس تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دن رات اپنے مزارعوں کا خون پی کر اپنی تجوریاں بھر لینے والے ہوس پرست چودھری کو اس پر چند ہزار پاؤنڈ خرچ کرنے کے بعد کوئی دکھ ہونے والا نہیں تھا کیونکہ اب تو اس کالے دھن میں ہیروئن سے حاصل ہونے والی خطیر آمدنی بھی شامل ہوگئی تھی۔

❀----✪----❀

شکم پُری کے بعد اسلم بڑی موج میں اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا تھا لیکن کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ وہ ڈبل بیڈ جس پر اب تک وہ سوتا رہا تھا، اس وقت ماہ بانو کے زیر تصرف تھا اور وہ مزے سے سینے تک چادر تانے وہاں سو رہی تھی۔



اس کی یہاں موجودگی پر وہ آنکھیں مل مل کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے شک سا ہو رہا تھا کہ خمارِ گندم کہیں اس کے دماغ پر تو طاری نہیں ہو گیا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے بھی ماہ بانو کو اپنے بستر پر دیکھ رہا تھا، ورنہ خواب میں تو خیر وہ ہر روز اس کے پہلو میں سوتی ہی تھی۔ اُس کی اس بے یقینی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ماہ بانو نیزمی سے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ یقیناً دروازہ کھولے جانے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ حیران پریشان سی اپنے سامنے موجود اسلم کو دیکھ رہی تھی۔

''تم یہاں اس کمرے میں کیا کر رہی ہو؟'' آخر اسلم نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور اس سے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

''سو رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں؟'' کچی نیند سے جاگنے کے باعث اس کی سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور وہ کچھ جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیوں سو رہی ہو؟ یہ کمرہ تو میرے لیے مخصوص ہے۔'' اسلم نے اپنے سوال کو مزید واضح کیا۔

''لیکن انیلا نے تو یہ کمرہ مجھے سونے کے لیے دیا ہے، وہ خود مجھے اس کمرے تک چھوڑ کر گئی ہے۔'' اس نے تردّد سے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔'' اسلم نے اپنی پیشانی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلا۔ ''یہ کمرہ میرے لیے مخصوص ہے، ناشتے کے بعد میں شام تک اسی کمرے میں سوتا رہا ہوں اور اب بھی کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا کہ کوئی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ پھر میرا کمرہ تمہیں کیوں دے دیا گیا؟'' وہ واقعی حیران تھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' ماہ بانو بھی بے یقینی سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''تم دن میں کہاں آرام کر رہی تھیں؟ ایسا کرو کہ اب بھی واپس وہیں جا کر سو جاؤ۔'' اسلم کے ہاتھ گویا اس مسئلے کا حل آ گیا۔

''دن میں زیادہ دیر سوئی ہی نہیں، صرف ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لی تھی اور اس کے لیے انیلا نے مجھے اپنا بیڈ روم دے دیا تھا۔ اب میں وہاں جا کر تو نہیں سو سکتی۔ ظاہر ہے اس وقت بیڈ روم میں اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوگا۔'' نیند خراب ہونے پر برے برے منہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے رُکھائی سے جواب دیا جسے سن کر یک دم ہی اسلم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ان لوگوں سے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا اور اس تعارف کے بعد ان دونوں کو شب بسری کے لیے ایک کمرہ مہیا کیا جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کے میزبانوں نے تو ایک طرح سے انہیں بہترین سہولت فراہم کی تھی لیکن وہ دونوں مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال ماہ بانو کے بھی گوش گزار کرایا۔

''تمہیں اس قسم کا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' وہ سن کر جھلائی۔

''ضرورت یہ تھی کہ میں حقیقت بتا کر تمہیں اور خود کو ان لوگوں کے سامنے مشکوک نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا، ورنہ تم خود ہی سوچو کہ کسی مرد کے ساتھ ماری ماری پھرنے والی عورت کے بارے میں یہ لوگ کس انداز میں سوچتے؟ میرے خیال میں کسی مشکوک کردار کی عورت کو اپنے زنان خانے تک جانے کی اجازت دینا تو دور کی بات، یہ تمہیں اپنی چھت کے نیچے ایک رات بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس وقت ہم یہاں معزز مہمانوں کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو شفقت راؤ کی سفارش کے علاوہ ہمارا غیر مشکوک کردار بھی اس سلسلے میں ایک خاص

حیثیت رکھتا ہے۔'' اس بار وہ اپنے لہجے میں تلخی در آنے سے نہ روک سکا۔

ماہ بانو نے اس تبدیلی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور شرمندہ سی ہو گئی۔ ویسے بھی نیند کے خمار میں ہونے کی وجہ سے اس کا ذہن وہ حقائق سمجھنے سے قاصر رہا تھا جو اسلم نے فوراً ہی اخذ کر لیے تھے چنانچہ فوراً ہی اپنے روّیے کی خرابی کے لیے اس نے معذرت طلب کر لی۔

''معذرت کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری کٹ حجتی سے بس یونہی ذرا سا غصہ آ گیا تھا ورنہ میرے لیے تمہاری طرف سے دل میں کدورت رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔'' وہ فوراً ہی نرم پڑ گیا۔

''اب یہ سوچو کہ ہم کیا کریں؟ میں تو اس طرح یہاں نہیں سو سکتی۔'' اس کا موڈ بحال ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے فوری درپیش مسئلے کی طرف آ گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسلم کے مقابلے میں اس نے بہت کم آرام کیا تھا اور حامد راؤ کی بیوی اور بہو کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہی تھی اس لیے اس وقت اسے بہت زوروں کی نیند آ رہی تھی۔

''ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بیٹھک میں جا کر سو جاؤں لیکن گھر کے کسی فرد نے مجھے وہاں سوتے ہوئے دیکھ لیا تو کوئی اچھا تاثر نہیں ہو گا۔ وہ لوگ یہی گمان کریں گے کہ ہم اتنے جاہل اور اجڈ میاں بیوی ہیں کہ دوسروں کی چھت کے نیچے بھی جھگڑنے اور پھر اپنے جھگڑے کو کمرے کی چار دیواری تک محدود رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔'' اسلم نے معاملے کی نزاکت کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''لیکن میں تمہارے ساتھ تنہا اس کمرے میں نہیں سو سکتی۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

''کیوں؟..... کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟ اتنے دنوں کے ساتھ میں تمہیں میرے کردار کے بارے میں اتنا تو یقین ہو ہی جانا چاہئے کہ میں دھوکے سے تمہاری آبرو پر ہرگز بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو ڈیرے پر مجھے کھلی چھوٹ حاصل تھی۔ پھر ان ویران پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے بھی کئی ایسے مواقع آئے کہ میں تم پر قابو پا سکتا تھا۔ اس ویرانے میں میرا ہاتھ روکنے والا کون تھا؟ تم خود بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہو کہ اگر میں من مانی پر آ جاتا تو تمہارے اندر میرے مقابلے میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ اگر اتنے عرصے تک میں نے اپنی طاقت اور خودمختاری کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی تو اس ایک رات میں کیا قیامت آ جائے گی؟ تم مجھ سے شادی کے لیے ہامی بھر چکی ہو اور آج نہیں تو کل مجھے تمہارے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ جائز طریقے سے حاصل ہو جانے والی چیز کو حرام کر کے کھاؤں۔'' اس نے غصے میں بولنا شروع کیا تو بولتا ہی چلا گیا۔

اس بار ماہ بانو نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر سے پیر تک چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسے اسلم کے اس کمرے میں سونے پر اعتراض نہیں ہے اور وہ اس کے دیئے ہوئے دلائل سے قائل ہو گئی ہے۔

اُس کی اس حرکت پر اسلم نے اسے گھور کر دیکھا لیکن سر سے پیر تک چادر میں محصور ماہ بانو کے لیے یہ گھورنا بیکار تھا۔ وہ زمین پر دھپ دھپ پیر مارتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ وہاں اپنے چہرے پر پانی کے کئی چھپاکے مارنے کے بعد اس کا مزاج اعتدال پر آیا تو وہ واپس کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں اس ڈبل بیڈ کے علاوہ جس پر ماہ بانو محوِ استراحت تھی، کوئی دوسرا ایسا فرنیچر نہیں تھا جسے وہ شب بسری کے لیے استعمال کر سکتا۔ بس فرش پر ایک پتلا سا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اس نے اسی کارپٹ پر شب بسری کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے اپنے کردار کی مضبوطی پر لاکھ یقین سہی، وہ ماہ بانو کے ساتھ بیڈ پر سونے کی غلطی نہیں



کر سکتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ آگ اور تیل کی اس قدر قربت کسی ارادی عمل کے بغیر بھی تباہی لا سکتی ہے۔ اس نے بیڈ پر موجود دوسرا تکیہ اٹھایا اور نیچے کارپٹ پر رکھ کر لیٹ گیا۔

وہ جب کمرے میں آیا تھا تو وہاں کی روشنیاں پہلے ہی سے گل تھیں اور نائٹ بلب کی ہلکی سی خواب آور روشنی نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ اس سحر نے پہلے مرحلے پر اسے اس لیے نہیں گھیرا تھا کہ وہ بالکل غیر متوقع طور پر ماہ بانو کو وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا اور ان کا سارا وقت صورتِ حال پر تبادلہ اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے گزر گیا تھا۔ اب جو وہ ذرا سکون سے لیٹا تو کمرے کے خوابیدہ ماحول نے اسے اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر دیا۔ ابھی تک وہ کارپٹ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ تبدیل ہوتی ذہنی و قلبی کیفیت نے اسے اُکسایا کہ وہ کروٹ لے کر ماہ بانو کی طرف رخ کر لے۔ کروٹ لینے کے بعد اس نے آنکھوں کی جھری سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ نیچے لیٹے ہونے کی وجہ سے وہ واضح طور پر ماہ بانو کو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اتنا بہرحال پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب تک سر سے پیر تک اوڑھی گئی چادر کے حصار میں چھپی ہوئی ہے اور اس احتیاطی تدبیر کے باوجود اندرونی بے چینی کے باعث سونے سے محروم ہے۔ اس بار اس نے غصے میں مبتلا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے ماہ بانو کی کیفیت پر غور کیا تو وہ اسے اپنے طرزِ عمل میں حق بجانب نظر آئی۔ کسی بھی عورت کے لیے اس کی عزت کے آب دار موتی سے زیادہ قیمتی شے کوئی نہیں ہوتی۔ یہ موتی کسی زبردستی، مجبوری یا حادثے کے نتیجے میں اپنا آپ کھو بیٹھے تو عورت پل بھر میں انمول سے بے مول ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اگر اپنے بے مول ہو جانے سے ڈر رہی تھی تو یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی جسے محسوس کر کے وہ اس پر غصہ کرتا۔

اس نے اپنے جن دلائل کی مدد سے اسے یہاں سوئے رہنے پر مجبور کر لیا تھا، اس کمرے کی نیلگوں اور خوابیدہ فضا میں خود اسے ہی بودے معلوم ہونے لگے تھے۔ یہ آرام دہ بند کمرہ ڈاکوؤں کے ڈیرے یا پہاڑی سلسلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر اگر آزادی اور خواہش کے باوجود اس نے ماہ بانو کو نہیں چھوا تھا تو اس عمل میں ماہ بانو کی عزت و تکریم کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی کارفرما تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکوؤں پر عرصے سے اس کی راست بازی اور اعلیٰ کردار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ مٹانا نہیں چاہتا تھا۔ رہا پہاڑی سلسلے میں سفر کا معاملہ تو ایسے مخدوش حالات میں جبکہ بندے کی اپنی جان پر بنی ہوئی ہو، ایسی خرمستیاں کب سوجھتی ہیں۔ اس کا اصل ماحول تو یہاں اس پُرتعیش کمرے میں شروع ہوا تھا جہاں کی رومان پرور فضا مسلسل اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اس نے فوراً ہی مخالف سمت کروٹ لے لی۔ اب ماہ بانو اس کی نظروں سے اوجھل تھی پھر بھی وہ کمرے میں اس کی مہک کو محسوس کر سکتا تھا۔ خود پر بے انتہا جبر کرتے ہوئے وہ اپنا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کوشش میں کتنا وقت گزرا، اس کا تو اسے اندازہ نہیں ہوا لیکن یہ طے تھا کہ ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزرا تھا اور وہ باوجود کوشش کے ایک بار بھی پلک تک نہیں جھپکا سکا تھا۔ شاید اس میں کچھ دخل دن میں لی جانے والی بھرپور نیند کا بھی تھا۔ بہرحال جو بھی بات تھی، اب اس کے لیے ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پر اُٹھ بیٹھا۔

اُٹھتے ہی اس کی نظر ماہ بانو کے بستر کی طرف گئی۔ وہ بالکل بے خبر سو رہی تھی۔ شاید بے چینی اور اضطراب پر نیند کی شدت غالب آ گئی تھی جس نے اسے مزید جاگنے نہیں دیا تھا اور سوتے میں وہ چادر کی قید سے بھی آزاد ہو گئی تھی۔ اسلم اسے اس حالت میں دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ ڈبل بیڈ پر پڑے اس کے جسم کے سارے نشیب و فراز اور خال و خد نیلگوں روشنی کے انعکاس کے ساتھ عجیب ہی سحر پیدا کر رہے تھے۔ اس کا دل بہت شدت سے

ماہ بانو کے قرب کے لیے مچلا مگر اس سے قبل کہ ضبط کے بندھن ٹوٹتے وہ بدحواس سا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کسی بدترین جرم سے بچنے کے لیے فی الحال یہی مناسب تھا۔

باہر نکلنے کے بعد وہ یونہی برآمدے میں آگے بڑھ رہا تھا کہ سیڑھیوں پر نظر پڑ گئی۔ مقصود پہلے اس کے استفسار پر اسے بتا چکا تھا کہ یہ سیڑھیاں چھت پر جاتی ہیں جہاں ان کے پالتو آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بنا سوچے سمجھے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا جہاں رات کی لمحہ بہ لمحہ ٹھنڈی ہوتی ہوا نے اس کے جلتے بدن پر حیرت انگیز اثر کیا اور وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے چھت پر ہی ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ چند منٹ کے لیے چھت پر کھنچی باؤنڈری وال کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور دیوار کی منڈیر پر ہتھیلیاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے کھڑے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ وہ بری طرح چونک گیا۔ یقینی طور پر وہ کچھ انسانی سائے ہی تھے جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لیے جلد چہارم کا مطالعہ کیجیے۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....
جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

چہارم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے



اسے لگا کہ اس کی بصارت اسے دھوکا دے رہی ہے۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا، اس میں اس قسم کا فریب نظر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بقا کے لیے دشمنوں سے بھاگتا شخص تو اپنے سائے سے بھی بھڑکنے لگتا ہے اور ہر ہر آہٹ پر چونک جاتا ہے کہ جانے دشمن کس طرف سے وار کرنے آ رہا ہو۔ چنانچہ حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے وہ سائے بھی اسے اگر اپنا بصری دھوکا لگ رہے تھے تو کچھ غلط نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھتا خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ جو وہ محسوس کر رہا ہے، وہ درست نہیں ہے لیکن سایوں کی بڑھتی تعداد نے اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ جو کچھ اسے دکھائی دے رہا ہے، وہی حقیقت ہے اور وہ کسی قسم کے اشتباہِ نظر کا شکار نہیں ہوا ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جانے وہ کون لوگ تھے اور ان کے عزائم کیا تھے؟ اگر وہ حامد راؤ سے کسی دشمنی کے باعث اسے یا اس کے اہلِ خانہ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو تب بھی وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حامد راؤ اس کا محسن تھا۔ اس شخص نے اسے اور ماہ بانو کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی تھی۔ وہ خود کو اس کے نمک کا مقروض سمجھتا تھا، چنانچہ یہ تو کسی طور ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنے محسن کو مشکل حالات میں تنہا چھوڑ دے۔

چار دیواری سے دور ہٹ کر وہ تیزی سے واپس پلٹا اور سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل حامد راؤ اور مقصود کو آگاہ کرنا اور ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس کے قدم ٹھٹک سے گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حامد راؤ اور مقصود کی خواب گاہیں کون سی ہیں اور ایک ایسے گھر میں جہاں کی خواتین نے اس کے سامنے آنے سے مکمل طور پر گریز کیا تھا، وہ آزادانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مسئلے پر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور ماہ بانو کے لیے مخصوص کی گئی خواب گاہ کا رخ کیا۔ ماہ بانو اب بھی اپنے سابقہ انداز میں سو رہی تھی لیکن اب اس کی اندرونی کیفیات بدل چکی تھیں۔ سر پر منڈلاتے خطرے کے بادلوں نے ساری لطیف حسیات کو سلب کر کے بقا کی جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ ماہ بانو کے ہوش رُبا وجود نے اس کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کی اور اس نے بیڈ کے قریب پہنچ کر ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس طرح جگائے جانے پر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے اسلم کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں عجیب سا ہیجان نظر آ رہا تھا۔

''کک.....کیا ہوا؟'' وہ بہ مشکل ہی اس سے یہ سوال کر سکی۔

''کچھ لوگ اس مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم جا کر حامد راؤ اور مقصود کو جگا دو۔'' اس نے ٹوفناک لہجے میں اسے اطلاع دینے کے ساتھ ہدایت بھی دی۔

PAKISTANIPOINT

''کون لوگ.....؟ کون ہیں وہ لوگ؟'' وہ قدرتی طور پر سراسیمہ ہوگئی۔

''مجھے نہیں معلوم۔ نہ ہی میں اس وقت ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں۔ بس تم سے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ میں واپس چھت پر جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔'' اس نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماہ بانو بھی اب پوری طرح نیند کے خمار سے باہر نکل آئی تھی چنانچہ اپنا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف دوڑی۔ اس کا رخ انیلا اور مقصود کے کمرے کی طرف تھا کیونکہ دن کے وقت اس نے کچھ دیر اسی کمرے میں آرام کیا تھا، اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ خواب گاہ ان دونوں کے زیرِ تصرف ہے۔ خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے زوردار دستک دی۔ اندر سے فوراً ہی ردِعمل ظاہر ہوا۔

''کون.....؟'' نیند کے خمار میں ڈوبی یہ آواز انیلا کی تھی۔

''میں ماہ بانو ہوں انیلا! ذرا مقصود بھائی کو جلدی سے باہر بھیج دو۔'' اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ جواب میں اندر سے کچھ آہٹیں سنائی دیں اور ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں دروازہ کھول دیا گیا اور مقصود کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ یقینی طور پر وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ مقصود کے پیچھے ہی حیران پریشان سی انیلا کھڑی تھی۔

''مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کچھ لوگ آپ کے گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' دونوں میاں بیوی کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی اس نے انہیں اطلاع دی جسے سن کر مقصود کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات پھیل گئے۔

''اسلم خود کہاں ہے؟'' اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''اوپر چھت پر۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ تم اباجی کو جگا کر انہیں بھی وہیں بھیج دو۔'' مقصود نے انیلا کی طرف دیکھ کر کہا اور عجلت میں چھت پر جانے والے راستے کی طرف دوڑ گیا۔

انیلا اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں آج کل حامد راؤ نے اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ جب سے انیلا کی ماں یعنی شفقت راؤ کی بیوی یہاں رہ رہی تھی، اس کی خواب گاہ اس کے اور اس کی اپنی بیوی کے زیرِ استعمال تھی۔ ذہنی ابتری کا شکار انیلا کی ماں کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ خود اپنا خیال رکھ سکے یا اپنے معمول کے کام انجام دے سکے، اس لیے حامد راؤ نے اپنی بیوی کو مستقل طور پر اس کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔ ان کی آپس کی رشتے داریاں اور محبتیں اتنی گہری تھیں کہ اس کی بیوی کو یہ ذمے داری بری نہیں لگتی تھی اور وہ بڑی محبت اور خلوص سے اپنی نند کا خیال رکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے انیلا پُتر! تُو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔ تیری ماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' انیلا کو رات کے اس پہر اپنے دروازے پر دیکھ کر حامد راؤ نے پریشانی سے پوچھا۔

''اماں ٹھیک ہیں ماموں جان! لیکن ایک دوسری گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ماہ بانو کا شوہر اور مقصود اوپر چھت پر سے جائزہ لینے گئے ہیں اور آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔'' اس نے تیز تیز بولتے ہوئے ایک ہی سانس میں اطلاع دی جسے سن کر حامد راؤ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ البتہ وہ زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔ گھبرائی ہوئی انیلا بھی واپس پلٹ گئی۔

آج کل جو کچھ ہو رہا تھا، انوکھا ہی ہو رہا تھا۔ صداقت کی موت کے بعد ان کی زندگیوں میں کچھ بھی نارمل



نہیں رہا تھا۔ نوجوان بھائی کی موت کے بعد اس نے ماں کے پاگل پن کا صدمہ ہی کس طرح سہا تھا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ ان مشکل حالات سے نمٹتے اچانک ہی اسلم اور ماہ بانو سے ملاقات ہوگئی اور ان کی آمد کے ساتھ ہی ایک اور تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ پیر سائیں کے ٹھکانے کو آگ لگانے میں اس کے اپنے باپ کا ہاتھ تھا۔ یہ خبر آج ہی چند گھنٹے قبل مقصود نے سونے سے پہلے اسے سنائی تھی اور اب وہ آدھی رات کو اس اطلاع کے ساتھ جگائی گئی تھی کہ ان کے گھر کو کچھ لوگ گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ گھر جس کی چار دیواری میں وہ خود کو محفوظ و مامون سمجھتی آئی تھی، اچانک ہی غیر محفوظ ہو گیا تھا تو اس کا گھبرانا بجا تھا۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی کی اس کیفیت میں گھری وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچی تو ماہ بانو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اپنی رائفل چاہیے۔'' انیلا کی شکل دیکھتے ہی اس نے مطالبہ کیا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہ رائفل کو بڑی سی چادر میں چھپا کر لائی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے ہتھیار کو گھر کے مالکان سے پوشیدہ رکھا جا سکتا۔ اس نے یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ لمبے سفر میں اپنی حفاظت اور جانوروں کے شکار کے لیے یہ رائفل ساتھ رکھی ہے، رائفل امانتاً انیلا کے پاس رکھوا دی تھی۔ موجودہ حالات واضح نہیں تھے لیکن رات کے اندھیرے میں چوری چھپے ہونے والے محاصرے نے اس کے دل میں یہ خدشہ ضرور پیدا کر دیا تھا کہ یہاں محاذ آرائی کی ضرورت پیش آ سکتی ہے چنانچہ دستیاب ہتھیاروں کا تیار رکھنا مناسب تھا۔

''کیا یہاں لڑائی جھگڑا ہونے والا ہے؟'' اس کے مطالبے پر انیلا نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ارے نہیں، بس میں احتیاطاً ہی تم سے رائفل مانگ رہی ہوں۔'' انیلا کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہو سکی کہ اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے چنانچہ نظر چراتے ہوئے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی ورنہ خود اس کے اندر جانے کون کون سے اندیشے سر اُٹھا رہے تھے۔ وہ مسلسل محاصرین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ ایک امکان تو یہی تھا کہ وہ ان کے میزبان حامد راؤ کے کوئی دشمن رہے ہوں گے جبکہ دوسرا امکان اس سے زیادہ خوفناک تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اسلم کی ڈاکو والی حیثیت ان کے لیے مصیبت نہ بن گئی ہو۔ وہ ایک ایسا مفرور ڈاکو تھا جو صرف پولیس ہی سے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی بھاگا ہوا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ایک اس کی تلاش میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔ پولیس سے تو خیر مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر آنے والے، اسلم کے پرانے ساتھی تھے تو پھر ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا۔ ان لوگوں سے زیر ہو جانے کا نتیجہ ہلاکت یا اسلم کی گروہ میں واپسی کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا اور یہ دونوں ہی صورتیں ناقابلِ قبول تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی اور اپنے حوصلے کی آخری حد تک مقابلہ کرے گی۔

''یہ لو۔'' اپنے خیالوں میں گم اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ انیلا کب وہاں سے گئی اور رائفل لے آئی۔ اس کے مخاطب کرنے پر وہ چونکی اور رائفل دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ ٹھنڈے لوہے کے لمس نے اس کے اندر عجیب سی آگ بھر دی۔

اس وقت وہ مار دو یا مر جاؤ والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ زندگی میں پے در پے پیش آنے والے واقعات نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ مصائب تھے کہ کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک امتحان ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی جبکہ وہ ایک بہت بڑا سمجھوتا کرنے کے بعد اسلم کے ساتھ سُکھ کی زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی، ایک اور مصیبت سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس

مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ اس عزم کے بعد اپنے اندر ایک نیا جوش و ولولہ سا محسوس کرتی وہ کسی سپاہی کی شان سے چل پڑی۔ اندھیرے کے باوجود اس نے چھت پر جانے والی سیڑھیاں بڑے اعتماد سے طے کیں اور کھلی چھت پر پہنچ کر تاروں کی چھاؤں میں نظر آنے والے تینوں سایوں کا جائزہ لینے لگی۔

اگرچہ اسلم اس وقت مقصود کے کپڑوں میں ملبوس ہونے کی وجہ سے ان دونوں باپ بیٹے کی طرح شلوار قمیص ہی پہنے ہوئے تھا، پھر بھی اسے اسلم کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ سیدھی اس کی طرف بڑھتی گئی۔

''کچھ معلوم ہوا کہ کون لوگ گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' اسلم کے قریب پہنچ کر اس نے سرگوشی میں استفسار کیا۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ روشنی نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے کسی کی شکل دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ہم لوگ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ تعداد میں بیس بائیس کے قریب ہیں اور حامد راؤ کے مطابق اپنے لباس اور چال ڈھال سے اسی گاؤں کے رہائشی لگتے ہیں۔ ہم نے فی الحال ان میں سے کسی کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی ہے اور خاموشی سے یہ دیکھتے رہے ہیں کہ وہ کس کس پوزیشن پر موجود ہیں۔'' اس نے ماہ بانو کے قدموں کی موہوم سی چاپ محسوس کر لی تھی اس لیے قریب پہنچ کر اس کے استفسار کرنے پر بنا چونکے اسے جواب دینے لگا۔

''گاؤں کے رہائشی.....'' اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے ایک پُرخیال ہنکارا ابھرا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔''

''وہ ہمارے دشمن ہیں۔'' اسلم نے پُرزور لہجے میں اس کی تردید کی۔ ''میں اپنے محسن کے دشمن کو بھی اپنا ہی دشمن سمجھتا ہوں۔''

''تمہیں سمجھنا بھی چاہیے۔ میں نے جو بات کہی تھی، اس کا مقصد خود کو صورتِ حال سے الگ رکھنا نہیں تھا۔ میں بس اس بات پر اطمینان کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمیں گھیرے میں لینے والوں کا تعلق پولیس یا ڈکیتوں سے نہیں ہے۔'' اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ اس سے قبل کہ اسلم جواب میں کچھ کہتا، نیچے دروازے پر زوردار دستک اُبھری۔ دستک اتنی زوردار تھی جیسے دستک دینے والا سوتے ہوؤں کے بجائے مُردوں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اوپر سے جواب مت دینا۔ نیچے جا کر معلوم کرو کہ کون ہے؟ انہیں پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ان کی نقل و حرکت سے پہلے ہی واقف ہو چکے ہیں۔'' اسلم نے مقصود کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے سرگوشی میں ہدایات دیں جنہیں سن کر وہ تابعداری سے سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف حامد راؤ کسی زخمی شیر کی طرح چھت پر ٹہل رہا تھا۔

''میں ان میں سے کسی کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو بھی لوگ ہیں، انہوں نے حامد راؤ کے گھر کی طرف نظر ڈال کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' ایک دیوار کی منڈیر پر لگی جالیوں میں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد دوسری دیوار کی طرف جاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس کا مخاطب کوئی نہیں تھا لیکن اسلم اور ماہ بانو دونوں ہی نے اس کے الفاظ سنے تھے۔

اسلم کے لیے حامد راؤ کا وہ روپ حیرت انگیز تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے ہر لمحے اسے بہت نرم خُو اور صلح جُو انسان پایا تھا جسے اپنے دوست، کزن اور بہنوئی شفقت راؤ سے تمام تر محبت کے باوجود اس



کے اقدام سے اختلاف تھا۔ جو سمجھتا تھا کہ شفقت راؤ کو انتقام کی اندھی راہ پر چلتے ہوئے براہِ راست ٹھکانے پر آگ لگانے کے بجائے انصاف کے لیے قانون سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اب وہی قانون پسند حامد راؤ غیظ و غضب میں مبتلا تھا۔

''میں گاؤں والوں کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ گاؤں والوں کا مطالبہ ہے کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ ہم ان سے شفقت راؤ کے جرم کا حساب لے سکیں۔'' نیچے مقصود دروازے پر پہنچ چکا تھا اور یقیناً اس نے آنے والے سے اس کی آمد کے بارے میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انہیں یہ مطالبہ سننے کو مل رہا تھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو؟'' مقصود نے یقینی طور پر دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کی تھی لیکن وہ باہر موجود شخص کے مطالبے پر اتنی بری طرح چراغ پا ہوا تھا کہ اس کی بلند غصیلی آواز انہوں نے اوپر چھت تک سنی تھی۔ باہر کھلے میں موجود شخص کی آواز تو چھت پر سنائی دینا کچھ بڑی بات نہیں تھی لیکن گھر کے دروازے کے اندر موجود مقصود کی آواز سنائی دینا اس کے غصے کا گراف بلند ترین ہونے کی نشانی تھی۔

''ہوش میں تو ہم اب آئے ہیں۔ ہمیں ملوم ہی نہیں تھا کہ ہم خانقاہ کو آگ لگانے والے جس خبیث شیطان کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، وہ اپنے ہی گاؤں کا اتنا عزت دار آدمی نکلے گا۔ شفقت راؤ نے جو جرم کیا ہے، اسے ہم کسی صورت ماف (معاف) نہیں کر سکتے۔ اسے تو خیر ہم بعد میں ڈھونڈ کر سخت سزا دیں گے ہی لیکن پہلے اس کی دِھی اور گھر والی کو ہمارے حوالے کرو۔ جب ہم اس کے گھر کی عورتوں کو گنجا کر کے سرعام ان کے سروں پر جوتے برسائیں گے تو شفقت راؤ کی ساری عزت داری مٹی میں مل جائے گی۔ اسے ملوم ہو جائے گا کہ جس پنڈ کے لوگوں نے اسے عزت دے رکھی تھی، ان کے ساتھ دھوکا کرنے کا کیا نتیجہ.....''

باہر موجود شخص شاید کوئی پُرجوش سی تقریر کرنے کے موڈ میں تھا لیکن فضا میں گونجنے والی فائر کی آواز نے اسے اس کا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ یہ حامد راؤ تھا جو اوپر آنے سے پہلے اپنا بڑے بور کا ریوالور ساتھ لے کر چڑھا تھا۔

''اپنی زبان بند رکھ کتے! اب اگر تُو نے اپنی ناپاک زبان سے اس گھر کی عورتوں کا ذکر کیا تو اگلی گولی تیرے بھیجے میں لگے گی۔'' حامد راؤ کی آواز میں قہر برس رہا تھا۔

''تسی اس ماملے سے الگ رہو حامد راؤ صاحب! ہمیں ملوم ہے کہ شفقت نے جو کچھ کیا، تسی اس میں شامل نہیں تھے۔ ہم آپ کو ہور آپ کے گھر والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری دشمنی شفقت ہور اس کے گھر والوں سے ہے۔ ہور انہیں ہم کسی صورت میں ماف نہیں کریں گے۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ایک طرف ہو جاؤ ورنہ خانخاہ (خوامخواہ) زد میں آ جاؤ گے۔'' وہ کوئی بہت ہی منہ پھٹ اور بدتمیز آدمی تھا جو نہایت اُجڈ لہجے میں حامد راؤ سے کہہ رہا تھا۔

''تم بالکل اُلّو کے پٹھے ہو جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جن عورتوں کا مطالبہ کر رہے ہو، وہ صرف شفقت ہی کی نہیں میرے گھر کی بھی عزت ہیں۔ اپنی بہن اور بہو کو میں کیسے بے عزتی کے لیے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں؟ اور اگر ان سے میرا رشتہ نہ ہوتا، تب بھی میں اپنے دوست کی عزت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شفقت نے کوئی جرم کیا ہے تو جا کر اسے تلاش کرو اور سزا دو لیکن اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا ورنہ اپنی آنکھیں کھو بیٹھو گے۔'' بوڑھا شیر پوری قوت کے ساتھ گرج رہا تھا۔

''تہاڈی مرضی راؤ صاحب! اب ہم سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔'' اسی اُجڈ آدمی نے جواب دیا لیکن پھر فوراً ہی

فضا میں اس کی زوردار چیخ گونجی۔ حامد راؤ نے اسے مزید کوئی موقع دیئے بغیر اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیا تھا۔ یقینی طور پر وہ بڑھ چڑھ کر بولنے والا اس وقت خاک وخون میں لوٹ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی حامد راؤ کے شکار کی حالت دیکھنے کی مہلت نہیں رہی تھی۔ پہلا فائر ہوتے ہی دوسری طرف سے گولیوں کی برسات کر دی گئی تھی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور متفرق اسلحے سے لیس تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں انہیں صرف ایک برتری حاصل تھی کہ وہ چار دیواری میں محفوظ ہونے کے علاوہ حملہ آوروں کی پوزیشنز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی دانست میں تو وہ بے خبری میں ان پر شب خون مارنے آئے تھے لیکن محض اتفاقاً اسلم کے چھت پر پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی سازش قبل از وقت بے نقاب ہوگئی اور ان لوگوں کو مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کی مہلت مل گئی۔

فائرنگ شروع ہونے کے بعد مقصود بھی اوپر چھت پر ہی چلا آیا تھا۔ دروازے کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو اطمینان تھا کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے توڑ کر گھر میں گھسنا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر وہ لوگ کسی کو دروازے کے قریب پھٹکنے کی مہلت دیتے تو کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا بھی۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کی طرف سے بہت نپے تلے فائر کیے جا رہے تھے جس کا ثبوت وہ چیخیں اور کراہیں تھیں جو باہر سے وقتاً فوقتاً سنائی دے رہی تھیں۔

فائرنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اسلم نے اپنا پسٹل ماہ بانو کے حوالے کر کے اس سے رائفل لے لی تھی۔ اس کی آزمودہ رائفل اس وقت سب سے زیادہ قہر اُگل رہی تھی۔ وہ چن چن کر کمین گاہوں میں چھپے دشمنوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد محاصرہ کرنے والوں کو اندازہ ہو سکا کہ ان کی کمین گاہیں پوشیدہ نہیں ہیں اور انہیں تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس کوشش میں مزید ایکسپوز ہو گئے۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کو اس بوکھلاہٹ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا لیکن بہر حال وہ تعداد میں زیادہ تھے اور انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ جن بیس پچیس کو وہ دیکھ سکے ہیں، ان کے علاوہ بھی مزید کمک پہنچ چکی تھی چنانچہ کئی کو نشانہ بنا لینے کے باوجود ان کا پلّہ بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ قلیل تعداد اور محدود اسلحے کے باوجود بہترین دفاع کر رہے تھے۔

''ہم بہت زیادہ دیر تک ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی ترکیب ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے نکل سکیں؟'' اسلم کو مسلح مقابلوں کا تجربہ تھا اس لیے وہ اس مقابلے میں اپنی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مقابلے پر موجود لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسے تشویش میں مبتلا کیا تو وہ کھسکتا ہوا مقصود کے قریب پہنچ گیا اور اس خیال سے پوچھا کہ گھر کا مالک وکیل ہونے کی وجہ سے وہ یہاں سے فرار کا راستہ جانتا ہوگا۔

''مکان کی پچھلی دیوار سے ملا ہوا ہمارا گودام ہے۔ وہاں ایک سوزوکی پک اپ بھی موجود ہے۔ مکان اور گودام کے درمیان دروازہ بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہاں کا محاذ چھوڑ کر وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ یہاں فائرنگ رُکے گی تو وہ لوگ گھر پر چڑھ دوڑیں گے۔'' مقصود نے چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا جو بڑا حوصلہ بخش تھا۔

''ہم یہ محاذ نہیں چھوڑیں گے بلکہ ایک ایک کر کے یہاں سے جائیں گے۔'' اسلم نے پہلے ایک فائر داغا پھر اس کی بات کا جواب دیا۔ ''ایسا کرو کہ پہلے تم نیچے جاؤ اور گھر کی خواتین کو لے کر گودام میں پہنچو۔ وہاں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھنے میں تمہیں کتنی دیر لگے گی؟'' اسے ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سوال بھی کیا۔



''زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے تو پھر جاؤ اور اپنا ہتھیار بھی میرے حوالے کر دو۔ پانچ منٹ بعد میں ماہ بانو کو بھیجوں گا۔ البتہ جانے سے پہلے ہمیں گودام کے دروازے کی لوکیشن بتا دو تاکہ ہم بھٹکیں نہیں۔'' اس کی عقابی نظریں مسلسل باہر کا جائزہ لے رہی تھیں پھر بھی وہ مقصود کی طرف متوجہ تھا۔

''اگر میں پہلے اباجی کو نیچے بھیج دوں تو.....؟'' مقصود تذبذب کا شکار تھا۔

''میں نے سوچ سمجھ کر تمہارا نام لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گودام میں پہنچتے ہی اپنی پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر دو اور بالکل ریڈی رہو کہ جیسے ہی ہم میں سے آخری فرد بھی وہاں پہنچتا ہے، فوراً گاڑی باہر نکال لو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں راؤ صاحب کے لیے ڈرائیونگ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت طیش میں ہونے کی وجہ سے بے شک بہت پُر جوش نظر آ رہے ہیں لیکن کسی بھی لمحے ان کی ہمت جواب دے سکتی ہے۔'' اس نے مقصود کو دلیل دی تو وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مقصود کے بعد ماہ بانو کی باری تھی جس نے بنا کسی حیل وحجت کے پانچ منٹ بعد نیچے کا رخ کر لیا۔ راستہ تو انہیں مقصود بتا ہی چکا تھا۔ ماہ بانو کی روانگی کے بعد اس نے حامد راؤ سے نیچے جانے کو کہا۔ اس دوران وہ چھت پر اِدھر اُدھر گھوم کر مختلف سمتوں سے فائر کر چکا تھا۔ فائرنگ کرتے ہوئے اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنے اور مقصود دونوں کے ہتھیار باری باری استعمال کرے تاکہ اگر حملہ آوروں میں سے کوئی اسلحے کا ماہر ہو تو اسے چھت پر موجود نفری میں کمی کا احساس نہ ہو۔ فائر وہ پہلے ہی سنبھل کر محدود تعداد میں کر رہے تھے اس لیے فائرنگ کے تسلسل میں کمی کا احساس کرنا مشکل تھا۔ ان کی نپی تلی فائرنگ نے حملہ آوروں کو ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا لیکن اب وہ بھی سنبھل چکے تھے اور نئی پوزیشنز لے لی تھیں اس لیے کوئی نقصان نہیں اٹھا رہے تھے۔

''میں آخر میں جاؤں گا، تم پہلے جاؤ۔'' اس کی طرف سے نیچے جانے کی ہدایت سن کر حامد راؤ نے جواب دیا۔ یقیناً وہ اپنی روایات اور وضع داری نبھانے کے لیے مہمان کے تحفظ کو مقدم رکھ رہا تھا۔

''یہ وقت بحث کا نہیں ہے راؤ صاحب! آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مجھے اسلحہ استعمال کرنے میں آپ سے زیادہ مہارت حاصل ہے۔ آپ نہ تو میری طرح بیک وقت دو ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں اور نہ ہی مجھ جتنی پھرتی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ آپ میری فکر کیے بغیر آرام سے نیچے جائیں اور گاڑی میں بیٹھیں۔ میں ان شاء اللہ دو تین منٹ میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے صورتِ حال حامد راؤ کے سامنے رکھ دی جس سے وہ یقیناً انکار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ سر جھکا کر نیچے کا رخ کر لیا۔ اب چھت پر صرف اکیلا اسلم موجود تھا جو دوڑ کر کبھی ایک دیوار کے عقب سے فائر کرتا تھا، کبھی دوسری سے۔ اس کی یہ ترکیب کارگر تھی اور حملہ آور ہر طرف سے فائر آتا دیکھ کر گھر کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر تیسرے منٹ پر اس نے بھی چھت چھوڑ دی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کر کے گودام کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔ تیسرا منٹ ختم ہونے سے پہلے وہ گودام میں موجود تھا جہاں مقصود نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا اور وہ لوگ اندر بیٹھے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

''میں گودام کا دروازہ کھولتا ہوں، تم گاڑی نکالتے چلے جاؤ۔ میں چلتی گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا۔'' اس نے مقصود کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہدایت دی اور پھر حامد راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ ہتھیار تیار رکھیے گا راؤ صاحب! اگر دروازے کے باہر کوئی موجود ہوا تو آپ کو ہی اس سے نمٹنا

پڑے گا۔'' اس نے اپنی رائفل پک اپ کے فرش پر پھینک دی لیکن پسٹل ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دیکھا جاتا تو اس وقت اس کی جان سب سے زیادہ خطرے میں تھی لیکن وہ غیر معمولی جرأت مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ آج وہ کسی کو لوٹنے کے بجائے ایک بے گناہ خاندان کی حفاظت کے خیال سے میدانِ کارزار میں اُترا تھا۔ حامد راؤ نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سر ہلا کر اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا اشارہ دیا تو وہ گودام کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دروازہ بھی کافی بھاری اور مضبوط تھا اور خاصی آواز کے ساتھ کھلا تھا لیکن اُمید کی جاسکتی تھی کہ باہر بپا فائرنگ کے شور میں یہ آواز سنائی نہیں دی گئی تھی۔

اس کے دروازہ کھولتے ہی مقصود تیزی سے پک اپ لے کر باہر نکلا۔ وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا پچھلے حصے سے لٹک گیا۔ آگے حامد راؤ مقصود کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پک اپ کے باہر نکلتے ہی بدترین خدشات سچ ہو کر سامنے آ گئے۔ اس طرف بھی حملہ آور موجود تھے چنانچہ گاڑی کے باہر نکلتے ہی ان پر فائر کیا گیا۔ اس فائر کا حامد راؤ نے فوراً جواب دیا۔ دوسری طرف اسلم بھی پیچھے نہ رہا اور بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہاتھ کی مدد سے لٹکے لٹکے دوسرے ہاتھ سے جوابی فائر داغ دیا۔ اس موقع پر مقصود کی کارکردگی بھی لائقِ تحسین تھی۔ اس نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی اور گاڑی کو وہاں سے نکالتا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اس جانب ایک دو سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے اس لیے انہیں وہاں سے نکلنے میں بہت زیادہ مشکل پیش نہ آئی اور سوزوکی اپنے مسافروں کو لیے رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

⊛----✪----⊛

حویلی میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ صنوبر اور تاجور اپنی ماں کی موت کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ کشور کی ماں چودھرائن ایک جانب ساکت سی بیٹھی تھی۔ اصولاً اسے آج اپنی سوکن اور حویلی میں سب سے بڑی حریف کی موت پر آسودہ ہونا چاہئے تھا لیکن وہ سکتہ زدہ تھی اور اس قابل بھی نہیں تھی کہ چودھری کی واحد زندہ بیوی کی حیثیت سے سارے کاموں کی نگرانی کر سکے۔ اپنی اس بے نیازی پر اسے بعد میں چودھری کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کچھ کر سکے۔ وہ تو زبانی احکامات جاری کرنے سے بھی معذور تھی اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ آج اس کے سامنے وڈی چودھرائن کا تابوت میں بند بے جان جسم رکھا ہوا تھا۔ وہ وڈی چودھرائن جس کے حکم کا سکہ پوری حویلی میں چلتا تھا، آج بے بسی کی تصویر بنی لوگوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچائے جانے کی منتظر تھی

چودھرائن ناہید نے حویلی میں وڈی چودھرائن کے اقتدار کا سورج پوری طرح جگمگاتا اور پھر ڈوبتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ حویلی کی کوئی عورت وڈی چودھرائن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی یہاں تک کہ وہ خود چودھری کی بیوی ہونے کے باوجود اپنی سوکن کے برابر حقوق کی حق دار نہیں تھی۔ لیکن پھر اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وڈی چودھرائن، چودھری کے زیرِ عتاب آئی تو کس بری طرح رگڑی گئی۔ وڈی چودھرائن کے حویلی کے تہ خانے میں قید کیے جانے کا واقعہ خود اس کے اپنے علم میں بھی تھا لیکن اس سے آگے وہ وہی کہانیاں سنتی رہی تھی جو چودھری حویلی میں پھیلا رہا تھا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کہانی پر بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وڈی چودھرائن کی جان ہی لے لے گا۔

وہ وڈی چودھرائن کے قتل کی ایک طرح سے واقعاتی گواہ تھی لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور مہر



بہ لب بیٹھی اس بڑے سے ہال میں ہوتی گریہ وزاری سن رہی تھی۔ تاجور اور صنوبر کے علاوہ بھی وہاں رونے والی عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے کچھ رشتے دار عورتیں تھیں اور بہت سی گاؤں کی وہ بے حیثیت و عسرت زدہ عورتیں جنہوں نے وڈی چودھرائن کی زندگی میں جانے اس کی کتنی جھڑکیاں سنی تھیں اور اس کے بے رحمانہ فیصلوں کا شکار ہوئی تھیں۔

ان مظلوم عورتوں کو اس کی موت پر مغموم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی رو رہی تھیں کہ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ذہن یہی جانتا تھا کہ انہیں اپنے آقاؤں کی موت پر غم کا اظہار کرنا ہے، پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس اہم موقع پر جبکہ حویلی کی جملہ خواتین غم سے نڈھال نظر آ رہی ہیں، کچھ نادیدہ نگاہیں ان پر نگراں ہوں گی اور بعد میں کسی وقت وہ صرف اس وجہ سے بھی معتوب قرار دی جاسکیں گی کہ انہوں نے وڈی چودھرائن کی موت پر آنسو نہیں بہائے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی قلبی کیفیات کی پروا کیے بغیر پوری شد و مد سے اظہارِ غم میں مصروف تھیں۔ گاؤں کی ان نادار عورتوں کو مستقل طور پر ہال میں رکنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں آتی تھیں اور تھوڑی دیر آہ و بکا کرنے کے بعد باہر روانہ کر دی جاتی تھیں۔

اس ماتمی فضا کا رنگ اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب مراد شاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی سمیت وہاں پہنچے۔ بہنیں بھائی اور بھاوج کو سامنے پا کر ان سے لپٹ گئیں اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ وہ دونوں بھی غم زدہ تھے لیکن پھر بھی روتی بلکتی بہنوں کو سنبھالنے لگے۔

دُور دیس سے آنے والے بھائی کو اپنا اتنا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ کہنے کو تو اس حویلی میں ایک بھائی اور بھاوج اور بھی تھے لیکن ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بساط ہی کیا تھی کہ بہنیں اس سے اپنا غم بانٹتیں۔ رہی اس کی نام نہاد بیوی فریدہ تو اسے بھی حویلی میں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ اچھوتوں کی طرح حویلی کی بالائی منزل تک محدود رکھی جاتی تھی اور بظاہر بہزاد شاہ کی بیوی ہوتے ہوئے چودھری کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی تھی۔ اس وقت فریدہ بھی اس وسیع و عریض ہال میں موجود تھی لیکن اس کے چہرے پر غم کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس عورت نے اسے اس کی کوکھ میں موجود بچے سمیت ہلاک کرنے کی سازش کی تھی، اس کی موت پر اسے مصنوعی دکھ کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر بھی وہ اپنے بچے میں مگن تھی اور چودھرائن کی گریہ وزاری کرتی اولاد سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس نے ان میں سے کسی سے اظہارِ تعزیت نہیں کیا تھا۔ تاجور اور صنوبر نے اُس کی اس بے نیازی کو بخوبی محسوس کیا تھا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں۔ فی الوقت اسے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہاں سے اٹھا سکتی تھیں۔ البتہ یہ بات خوب محسوس کر رہی تھیں کہ فریدہ درحقیقت وڈی چودھرائن کی میت میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ خود کو حویلی کی بہو باور کرانے کے لیے وہاں موجود ہے اور افسوس کے لیے آنے والی ہر قابلِ ذکر عورت سے خاص طور پر یوں بڑھ چڑھ کر مل رہی ہے جیسے وہ حویلی میں بڑا خاص مقام رکھتی ہو۔

دل ہی دل میں دونوں بہنیں فریدہ سے بعد میں نمٹنے کا عزم باندھ کر موجودہ صورتِ حال کو نبھا رہی تھیں۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے دیکھا تھا کہ ماں کی موت بیٹیوں کے لیے کتنے غم کا سبب بنی ہے۔

اللہ اللہ کر کے آخر میت اُٹھنے کا وقت آیا۔ چودھرائن کا تابوت اپنی آخری آرام گاہ کے لیے روانہ کیا گیا تو گویا کہرام سا مچ گیا۔ غم زدہ تاجور اور صنوبر ایسی بے حال ہوئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تاجور تو شدتِ غم سے بے ہوش ہی ہو گئی۔ عورتوں نے بڑی تدبیریں کر کے اس ہوش دلایا پھر کسی کے مشورے پر انہیں آرام

کرنے کے لیے الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس موقع پر شاہدہ نے رشتے دار خواتین سے درخواست کی کہ انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو دونوں بہنوں کو آرام کا موقع مل جائے گا۔ اپنی بھاوج پر اس لمحے دونوں بہنوں کو بڑا پیار آیا۔ وہ خود بھی دل سے تنہائی کی متمنی تھیں کہ رو رو کر سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور اب دل شدت سے آرام کا خواہاں تھا۔ مراد شاہ کی بیوی شاہدہ انہیں بند کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

''توبہ ہے ربّا!.....رو رو کر حلق خشک ہو گیا۔ ذرا فریج میں جھانک کر دیکھ کہ کوئی جوس وغیرہ پڑا ہو تو مجھے دے۔ اتنی دیر کی محنت سے جان آدھی ہو کر رہ گئی ہے۔'' تاجور نے فوراً ہی نرم گرم بستر پر دراز ہوتے ہوئے چھوٹی بہن سے فرمائش کی جسے سن کر اس نے منہ تو بنایا لیکن انکار نہیں کر سکی اور روم ریفریجریٹر کھول کر اس میں جھانکا۔ اندر ایپل جوس کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس بھر کر بہن کو دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

''تُو نے جنازہ اُٹھتے وقت ابا جی کی شکل دیکھی تھی؟ ایسی رونی صورت بنائی ہوئی تھی جیسے وہ خود ہی سب سے زیادہ غم زدہ ہوں۔'' جوس کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر تاجور نے صنوبر سے دریافت کیا۔

''تم تو اس وقت بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تمہیں کیسے معلوم؟'' صنوبر نے حیرت سے پوچھا۔

''ابا جی کی صورت دیکھ کر ہی تو مجھے بے ہوش ہونے کا خیال آیا تھا۔ میں نے چاہا کہ جب ابا جی جیسا آدمی اماں کی موت پر ایسی غم ناک شکل بنا کر بیٹھا ہے تو میں تو خیر دِھی ہوں۔ میرے صرف رونے دھونے سے کام نہیں بنے گا اس لیے بے ہوش ہو گئی۔'' تاجور نے مزے سے بتایا۔

''ہیں.....تو تُو اداکاری کر رہی تھی؟'' صنوبر کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

''تو ابا جی بھی تو اداکاری کر رہے تھے۔ ورنہ سچ بتا کہ ایسے آدمی کو جو بیوی پر دو دو سوکنیں لایا ہو اور آئے دن بازاری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہو، بھلا بیوی کی موت کا کیا غم ہو گا؟ وہ تو ان کو موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ ماہ بانو کو بھی اماں کی سوکن بنا کر چھوڑتے۔'' تاجور نے بے رحمی سے جواب دیا۔

''سو تو ہے۔'' صنوبر فوراً ہی قائل ہو گئی۔ ''ابا جی کو کبھی بھی اماں سے محبت نہیں رہی۔ اگر اماں کا میکا مضبوط نہ ہوتا تو جانے ابا جی ہور کون کون سے گُل کھلاتے۔ کسر تو خیر انہوں نے اب بھی کوئی نہیں چھوڑی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اماں کا حویلی میں راج تھا اور ان کے ہوتے کسی سوکن میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑی ہو سکتی۔ ہماری ایسی دبنگ اماں کیسے چٹ پٹ ہو گئی، ذرا خبر نہیں ہو سکی۔ مجھے تو اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہی لگتی ہے۔'' صنوبر نے دھیمی آواز میں اپنے شبہات کا اظہار کیا۔

''گڑبڑ تو خیر ہے۔ ابا جی، اماں سے ناراض تھے۔ یہ اطلاع تو پکی ہے، یہ اطلاع دینے والی کو ساری تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ اماں کب بیمار ہوئیں، اس کو یہ بھی خبر نہیں۔ نہ ہی اس نے انہیں علاج کے لیے حویلی سے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا یہی کہنا ہے کہ سارے نوکر چاکر حیران ہیں کہ وڈی چودھرائن کو ایسی کون سی بیماری ہو گئی تھی کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اور انہیں علاج کے لیے حویلی سے روانہ کر دیا گیا۔'' تاجور نے اُس کے شبہات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دونوں ہی بہنیں اپنے گھر کی تھیں لیکن حویلی میں ان کا جاسوسی کا کچا پکا سا نیٹ ورک موجود تھا۔ حویلی کی بعض ملازماؤں کے ذریعے انہیں یہاں کے حالات کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ چودھرائن کے علاج کے لیے بیرونِ ملک مقیم ہونے کا سن کر انہوں نے بہت کوشش کی کہ اصل صورتِ حال سامنے آ جائے لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر یا ٹھوس معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ابا جی کی ناراضگی کا فریدہ والے معاملے سے تعلق ہے۔ وہ جب ہسپتال میں داخل تھی،



تب اس کا بھرا حویلی بھی آیا تھا۔ اس کے واپس جانے کے بعد ہی ملازموں نے ابا جی کو غصے میں دیکھا تھا۔ ہور فیر اچانک اماں حویلی سے غائب ہو گئی۔'' صنوبر کا دماغ بہتر کام کر رہا تھا اس لیے اس نے حالات کا بہت واضح نہ سہی لیکن ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر ڈالا۔

''تیری گل دِل کو لگتی ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ اگر ابا جی کو اس گل کی بھنک پڑی ہے کہ اماں نے جان بوجھ کر فریدہ کو سیڑھیوں سے گروایا تھا تو فیر ہور بھی بہت کچھ ملوم ہو گیا ہو گا۔ یوں سمجھ لے کہ اب اماں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی بھی خیر نہیں ہے۔''

''ایسے ہول بھی نہ دلا وڈی آپا!'' صنوبر بہن کی بات سن کر تھرّائی۔

''ہول تو خود میرے اُٹھ رہے ہیں۔ چلو اماں کی تو کوئی گل نہیں۔ اس نے تو دنیا میں سب دیکھ لیا تھا، خوب جی بھر کر حویلی پر راج بھی کیا تھا ہور اولادوں کی اولادیں تک دیکھ لی تھیں۔ ہمارے تو ابھی اپنے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تیرے کاکے نے تو ابھی دودھ پینا بھی نہیں چھوڑا۔ ذرا سوچ! ایسی بھری جوانی میں دنیا چھوڑنی پڑی تو کتنا دل دُکھے گا۔'' وہ اپنی متوقع موت کے خیال سے اتنی رنجیدہ ہو گئی تھی کہ گلاس میں موجود سیب کے جوس کا آخری گھونٹ پینا بھی بھول گئی تھی۔

سنجیدگی اور رنجیدگی کی اس ملی جلی کیفیت میں دونوں بہنوں کے چہرے خاصے مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن انہیں ہوش نہیں تھا۔ البتہ اوپر کہیں وڈی چودھرائن کی روح تڑپ تڑپ کر بے حال تھی کہ جس اولاد کی خاطر اس نے سازشوں کے جال بُنے، اپنی راج دھانی سے محروم ہوئی اور اذیت ناک موت کو گلے لگایا، وہ اولاد خود غرضی کی اس انتہا پر پہنچی ہوئی تھی کہ ماں کے مرنے کا سرے سے کوئی غم نہیں تھا۔ جتنے آنسو بہائے گئے تھے، دنیا دکھاوے کے لیے بہائے گئے تھے اور اب اپنی فکر دامن گیر تھی۔

⊛----✪----⊛

کاغذ پر قلم چلاتے چلاتے اس نے نظر اُٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اب تک مشابرم خان کو واپس آ جانا چاہئے تھا۔ مشابرم خان اس کے حکم پر کالے میاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ٹاہلی والا کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ٹاہلی والا کے پیر سائیں کا جو مشکوک کردار سامنے آیا تھا، اس نے شہریار کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ پیر سائیں بھی کہیں شاہنواز اور مولوی غلام محمد جیسے لوگوں میں سے نہ ہو جو مذہبی شخصیت کا مقدس لبادہ اوڑھ کر سیدھے سادے معصوم لوگوں کے ذہنوں کو تباہ کرنے کے مشن پر مامور تھے۔ اپنے اس شک اور تجسس کی وجہ سے اس نے مشابرم خان کو ٹاہلی والا روانہ کر دیا تھا کہ وہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر خاموشی سے واپس آ جائے۔ مشابرم خان ایک عام زائر کی طرح وہاں گیا تھا اس لیے اس نے ذاتی گاڑی کے بجائے بس سے سفر کیا تھا۔ اسے پیر سائیں کی خانقاہ پہنچ کر صرف اتنا کرنا تھا کہ خود کو مصیبت میں مبتلا ایسا شخص ظاہر کر کے جو پیر سائیں کی شہرت سن کر حاجت روائی کے لیے وہاں آیا ہو، کچھ دیر خانقاہ میں رکنے کا انتظام کر لے۔ اپنے قیام کے اس مختصر عرصے میں اسے زبان بند رکھ کر صرف آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔

اگر وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ خانقاہ کی آڑ میں کوئی غیر قانونی کام کیا جا رہا ہے تو پھر شہریار اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنے علم میں آ جانے والے ایسے کسی فرد کو جو ملک و قوم کا دشمن ہو، ڈھیل دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ پیری فقیری کی آڑ میں چھوٹی موٹی جعلسازیاں کرنے والوں کو طرح دے جانا اور بات تھی لیکن ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی نہ کرنا یا ان سے صرفِ نظر کر جانا اس کی دانست میں ایک

ایسا جرم تھا کہ جس کے بعد وہ خود اپنے آپ سے نظر ملانے کے قابل نہ ہو پاتا، چنانچہ ذرا سا شبہ ہونے پر ٹاہلی والا کے پیر سائیں کی بو پر لگ گیا تھا۔

پیر سائیں کے معاملے میں اسے آئندہ فیصلے مشابرم خان کی رپورٹ پر کرنے تھے اور اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی سنسنی خیز خبریں لے کر آنے والا ہے۔ صبح سویرے موبائل فون پر ہونے والی گفتگو میں اس نے ہیجان زدہ لہجے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہ خیریت ہے اور جلد واپس لوٹ کر اسے بہت سی حیرت انگیز باتیں بتائے گا۔ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس نے تفصیلی گفتگو کرنے سے معذرت کر لی تھی، چنانچہ اب وہ شدت سے مشابرم خان کے واپس لوٹنے کا منتظر تھا۔ سوئے اتفاق اس وقت عبدالمنان بھی دفتر میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اس کے ساتھ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ عبدالمنان کو اس نے خود چودھری افتخار کی بیوی کے جنازے میں شرکت کے لیے پیر آباد بھیجا ہوا تھا۔ چودھری سے اس کی نفرت اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ با اثر شخص تھا چنانچہ اس کے ساتھ ہونے والے کسی ایسے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ خود شاید اتنی مصلحت پسندی سے کام نہ بھی لیتا لیکن عبدالمنان نے صبح اس سے اچھی خاصی بحث کر کے اس معاملے میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ صرف اس حد تک قائل ہو سکا تھا کہ عبدالمنان اس کے نمائندے کی حیثیت سے اظہارِ افسوس کے لیے پیر آباد چلا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے خاص طور پر اس کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ بے شک وہ خود تو کبھی نہ کبھی تبادلہ ہو کر یہاں سے کسی دوسرے ضلع میں چلا جاتا لیکن عبدالمنان کو تو بہرحال یہیں رہنا اور کام کرنا تھا اس لیے اس کا یہاں کسی سے مکمل بگاڑ مناسب نہیں تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں اس نے اپنی توجہ دوبارہ کام کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے قلم نے کاغذ پر مزید کسی نئے لفظ کا اضافہ بھی نہیں کیا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مشابرم خان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اسے فوری طور پر اندر بھیج دینے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ فائل بند کر کے کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔

مشابرم خان کے آنے کی اطلاع ملی تو طبیعت بالکل ہی اچاٹ ہو گئی چنانچہ اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ مشابرم خان کو اس کے کمرے تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت ملنے کے بعد وہ اندر آیا تو شہریار نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ یعنی گزشتہ شب جو اس نے ٹاہلی والا میں گزاری تھی، کافی سنسنی خیز رہی تھی اور مشابرم خان کسی ایسے کام میں مصروف رہا تھا کہ اسے ذرا دیر بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ وہ ایسا مضبوط آدمی تھا کہ اگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نیند بھی لے لیتا تو تازہ دم ہو جاتا۔ اب بھی صرف اس کے چہرے پر رت جگے کے آثار تھے ورنہ اپنی حرکات و سکنات سے وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

''لگتا ہے خاصی گرما گرم خبریں لے کر آئے ہو۔'' اس نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

''بالکل سر! گرما گرم خبریں ہیں اور آپ کے اندازے سے بھی زیادہ حیرت ناک۔'' مشابرم خان کے جواب نے اس کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔

''تو پھر شروع ہو جاؤ اور بلا کم و کاست سب بتا ڈالو۔''

انکشافات کا سلسلہ ٹاہلی والا میں قدم رکھتے ہی شروع ہو گیا تھا اور کچھ سوالوں کے جواب بھی مل گئے



[illegible] ٹاہلی والا پنڈ میں ٹاہلی کے بہت سے درخت ہیں جن کی وجہ سے اس پنڈ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ آبادی کے [illegible] وہ گاؤں پیر آباد سے چھوٹا ہے۔ کالے میاں کے پیر سائیں کی خانقاہ پنڈ میں داخل ہونے کے تھوڑی [illegible] بعد ہی سامنے آ گئی تھی لیکن میں اس خانقاہ کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور شک ہوا کہ کسی غلط جگہ پہنچ گیا ہوں۔ حالانکہ میں ٹھیک انہی نشانیوں کے مطابق وہاں تک پہنچا تھا جو کالے میاں نے مجھے بتائی تھیں۔'' مشابرم خان [illegible] ڈرامائی انداز میں تفصیلات کا آغاز کیا۔

''غیر ضروری سنسنی پھیلانے کے بجائے ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔'' مشابرم خان کے طرزِ بیان پر اُلجھن [illegible] ہوئے اس نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتا ہوں صاحب!'' وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور مزید تفصیلات بتانے لگا۔

''کالے میاں نے مجھے خانقاہ کا جو پتہ سمجھایا تھا، [illegible] خانقاہ کی جگہ ایک جلی ہوئی عمارت کا ڈھانچہ موجود تھا [illegible] نے وہاں موجود افراد میں سے ایک سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ چند روز قبل [illegible] نے رات کی تاریکی میں پٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے عمارت کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ایک پیروں سے معذور زائر بھی جل کر خاک ہو گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ معذور شخص بالا ہو گا۔'' [illegible] کی کوشش کرنے کے باوجود وہ خود کو رائے زنی سے نہیں روک سکا جس پر شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی اختیار کیے رکھی۔ مشابرم خان اپنی سناتا رہا۔

''حادثے کا سن کر میں نے اس شخص کے سامنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں بہت دور سے صرف پیر سائیں کی شہرت سن کر اپنے مسئلے کے حل کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں نے خود کو اتنا غریب آدمی ظاہر کیا جس کے پاس کرائے کی رقم کے علاوہ مزید کسی خرچ کے لیے رقم موجود نہ ہو۔ میری اداکاری نے اس شخص پر بڑا اثر کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ بے شک خانقاہ جل گئی ہے لیکن پیر سائیں اور ان کے تمام مرید محفوظ ہیں۔ وہ خود بھی پیر سائیں کا مرید تھا جو خانقاہ کی از سرِ نو تعمیر کے لیے جائزہ لینے آنے والی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں تک آیا تھا۔ اس نے مجھ سے رہائش اور پیر سائیں سے ملاقات کا وعدہ کیا اور اپنے ساتھ ایک ایسے گھر میں لے گیا جو اپنی تعمیر کی وجہ سے پنڈ کے چند گنے چنے گھروں میں سے ایک تھا اور جسے دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے مالکان خاصے صاحبِ حیثیت لوگوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر شریف نامی ایک آدمی کی ملکیت ہے جس نے خانقاہ کی بربادی کے بعد پیر صاحب اور ان کے مریدوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ مجھے بھی اس گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ مل گئی۔ مجھے لے جانے والے آدمی نے کھانا پینا بھی فراہم کر دیا لیکن پیر سائیں سے فوری ملاقات کروانے سے معذورت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الحال پیر سائیں کسی بہت اہم معاملے میں اُلجھے ہوئے ہیں اس لیے اگلے دن ہی میری ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس کا جواب سن کر میں افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے شدید تھکن کی وجہ سے مجھے نیند آ رہی ہے۔ میرا میزبان میری حالت دیکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں بستر سے اُتر گیا اور دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تھا تو بھی کافی ہلچل سی محسوس کی تھی لیکن صرف اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ مریدوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے وہ ہلچل کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن دوبارہ چھپ کر جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کچھ غیر معمولی حالات ہیں۔ احاطے میں موجود لوگوں میں سے اکثر کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے اور چہروں پر ایسا جوش تھا جیسے وہ کسی مہم کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

میں سن گن لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن باہر نکلتے ہی ایک آدمی نے مجھے سختی سے ٹوک کر واپس اندر جانے کا حکم دیا۔ میں نے حاجت کا بہانہ بنا کر تھوڑی دیر کی مہلت حاصل کر لی لیکن مسلح افراد کو دیکھنے کے سوا کچھ اور معلوم نہیں کر سکا۔ مجھے کمرے میں واپس جانے کا حکم دینے والا سائے کی طرح مسلسل میرے ساتھ ساتھ تھا اس لیے مجھے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس کمرے میں جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے دروازہ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اسے باہر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی عملی طور پر میں وہاں قیدی ہو چکا تھا اور آپ کے لیے کارآمد معلومات حاصل کرنے سے قاصر تھا۔ بے بسی کی اس کیفیت میں بھی میں نے اپنے کان کھلے رکھے اور جھری سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ رات گئے مجھے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ وہاں موجود لوگوں کی آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں موجود تمام افراد اچانک ہی کہیں روانہ ہو گئے ہوں اور گھر میں چند ایک افراد کے علاوہ کوئی باقی نہ ہو۔ مجھے خیال آیا کہ دروازہ بجا کر کسی کو بلاؤں اور اس سے اس وقت روانگی کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر میں نے انجان بنا رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مسلح افراد کی روانگی کو مشکل سے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ پنڈ کی فضا دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی مسلح گروپ نے اچانک ہی پنڈ پر حملہ کر دیا ہو۔ کافی دیر تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مکان میں دوبارہ ہلچل شروع ہو گئی۔ آوازوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مہم پر جانے والے واپس آ گئے ہیں اور اپنے ساتھ مُردوں اور زخمیوں کو بھی لے کر لوٹے ہیں۔ بہت دیر تک مکان میں چیخ و پکار، بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے کو ہدایات دینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں کمرے میں قید بے بس سا اصل معاملے کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پھر صبح کے قریب مجھے نیند آ ہی گئی۔ تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو وہاں تک پہنچانے والے کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ مجھے نیند سے جگانے اور ناشتے کا پوچھنے آیا تھا۔

میں ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرنے بیٹھا تو اس سے رات ہونے والی ہلچل اور فائرنگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بھرا بیٹھا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ رات بھر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی۔ میرے سوال کرتے ہی اس نے بتایا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ وہ پنڈ کا ہی ایک معزز آدمی تھا جو کئی روز سے غائب تھا لیکن کسی نے اس بات کو اس لیے نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اپنے کاروبار کے سلسلے میں عموماً پنڈ سے غائب ہی رہتا تھا۔ شفقت راؤ نامی اس شخص کے بارے میں انہیں اس طرح معلوم ہوا تھا کہ شریف صاحب نے شفقت راؤ کے کزن اور سمدھی حامد راؤ کے گھر آنے والے ایک مشکوک جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں گھریلو کام کرنے والی ایک عورت کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ٹوہ لے کر بتائے کہ بالکل اچانک مہمان بن کر وہاں آنے والے وہ لوگ کون تھے؟ عورت نے ان کی توقع سے بڑھ کر معلومات حاصل کر ڈالیں۔ حامد راؤ اور اس کے مہمانوں کی گفتگو سن کر اسے معلوم ہوا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والا شخص شفقت راؤ تھا۔ یہ اطلاع پا کر پیر سائیں کے مرید چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے حامد راؤ کے گھر دھاوا بولنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ بے شک حامد راؤ بے قصور ہے لیکن اس کے گھر میں مقیم شفقت کی بیوی اور بیٹی کو نشانۂ عبرت بنا کر شفقت سے انتقام کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں بہت منظم طریقے سے حامد راؤ کے گھر کا محاصرہ کیا اور اس کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کیا لیکن حامد راؤ نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتیں صرف شفقت کی بیوی اور بیٹی ہی نہیں، حامد راؤ کی بہن اور بہو بھی تھیں۔ اس انکار کے بعد نوبت گولیاں چلنے تک جا پہنچی۔ پیر سائیں کے



مریدوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کی فائرنگ کا اتنے منظم طریقے سے جواب دیا جائے گا۔ انہیں بالکل یوں محسوس ہوا کہ مقابل ان کی کمین گاہوں سے بخوبی واقف تھے اور تاک تاک کر انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ میرے میزبان کے مطابق ان کے تین آدمی ہلاک اور کئی شدید زخمی ہوئے پھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور حامد راؤ اپنے اہلِ خانہ اور مہمانوں سمیت پنڈ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے میزبان کا خیال تھا کہ حامد راؤ کے اس فرار کو کامیاب بنانے میں اس کے مہمانوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہو گا ورنہ حامد راؤ اور اس کا بیٹا اتنے تیز لوگ نہیں ہیں کہ اتنے منظم طریقے سے مقابلہ کر پاتے۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے معلوم ہونے والے مہمانوں کے نام بھی مجھے بتائے تھے جنہیں سن کر میں ششدر رہ گیا۔''

روانی سے تفصیلات سناتا ہوا مشابرم خان اس مقام پر آ کر چپ ہو گیا۔ شہریار کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ ویسے بھی ٹاہلی والا سے موبائل فون پر اس نے یہی پیغام دیا تھا کہ واپسی میں وہ اپنے ساتھ بہت سے سوالوں کے جوابات اور کچھ انکشافات لے کر آئے گا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی سنائی گئی تفصیلات میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خانقاہ میں جل کر مر جانے والا شخص بالا ہو گا۔ عرصے تک چودھری کے مظالم کا ساتھ دینے والا بالا جو ہاتھ پیروں سے سلامت رہا تو اپنے ہی جیسے لوگوں کی زندگیاں دوبھر کرتا رہا، زندگی کے آخری دنوں میں عبرت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔ اس بے ضمیر آدمی کی موت بھی بڑی بھیانک ہوئی تھی۔ یقیناً بے بسی کے عالم میں آگ کا ایندھن بنتے ہوئے اس نے وہ ساری چیخیں، آہیں اور سسکیاں سنی ہوں گی جن کا سبب اس کی ذات بنی تھی۔ شاید وہ ان دردناک لمحات میں اللہ کے آگے معافی کے لیے گڑگڑایا بھی ہو لیکن شہریار کو پورا یقین تھا کہ اس کی کوئی دعا اور التجا قبول نہیں کی گئی ہو گی اور مظلوموں کی بددعائیں بدروحوں کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گئی ہوں گی۔

مشابرم خان کی سنائی گئی تفصیلات سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیر سائیں کے پکڑے جانے والے مرید کالے میاں کی کوئی کال اس کے ساتھیوں کی طرف سے کیوں وصول نہیں کی جا رہی تھی۔ خانقاہ میں آگ لگنے کے بعد وہ سب یقیناً افراتفری میں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے۔ اتنے نازک لمحات میں ان میں سے کسی کو اپنے موبائل فونز کا خیال بھی نہیں رہا ہو گا اور نتیجتاً آگ نے انہیں چاٹ کر ناکارہ کر دیا ہو گا۔ ان تفصیلات میں ابھی یہ وضاحت ہونا باقی تھی کہ شفقت راؤ کون تھا اور اس نے خانقاہ کو آگ کیوں لگائی تھی؟ اگر مشابرم خان اپنی گفتگو کا آخری جملہ ادا نہ کرتا تو وہ یقیناً اس سے پہلا سوال اس سلسلے میں کرتا لیکن جس انداز میں اس نے اپنے آخری فقرے ادا کیے تھے، شہریار کو اپنے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بری طرح مضطرب ہو گیا تھا کہ زبان سوال کرنے سے بھی معذور ہو گئی اور کام اس نے اپنی آنکھوں سے لیا تھا۔ مشابرم خان نے بھی اس کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور دھیمی آواز میں بتانے لگا۔

''ان دونوں کے نام ماہ بانو اور اسلم بتائے گئے ہیں۔ تھوڑا بہت حلیہ وغیرہ بھی جو میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، اس سے بھی یہ تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ وہی ماہ بانو اور اسلم ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔''

بالآخر مشابرم خان نے دھماکا کر ہی دیا جس نے شہریار کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے نام پر جنگل میں کیا جانے والا آپریشن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن اپنی ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بھی وہ ماہ بانو کی گرد تک کو بھی نہیں پا سکا اور اب ایک غیر متعلقہ قصے میں اس کا نام اس طرح سامنے آیا تھا کہ وہ ڈاکو اسلم کی ساتھی کی حیثیت سے ٹاہلی والا میں پائی گئی تھی اور اب وہاں بھی

موجود نہیں تھی۔ وہاں سے بھی وہ کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہو چکی تھی۔

''کیا اسلم نے اسے یرغمالی بنا رکھا تھا؟'' اس کا ذہن ماہ بانو کو کسی ڈاکو کا ساتھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اس نے یہ سوال کیا۔

''کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے حامد راؤ کے گھر میں موجود تھے۔'' مشابرم خان کی آواز کچھ اور بھی دھیمی ہو گئی۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔

وہ اتنے دنوں سے اس کے ساتھ تھا۔ ماہ بانو کے اس تک پہنچنے سے لے کر بار بار غائب اور بازیافت ہونے کا ہر واقعہ اس کے علم میں تھا۔ اس نے دیکھا کہ شہریار کس طرح اس لڑکی کے تحفظ کے لیے بے چین اور فکرمند رہتا تھا۔ کافی دنوں تک ماہ بانو بلتستان میں اس کے گھر میں روپوش رہی تھی۔ شہریار کی وفاداری اور اس لڑکی کی ہمدردی میں وہ اپنے بھائی اکرم خان کو گنوا بیٹھا تھا اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی اس کی ماں آج بھی اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ شہریار اپنے جذبات کے اظہار سے لاکھ گریزاں سہی، پر عشق اور مشک چھائے نہیں چھپتے۔ مشابرم خان کو بھی کسی حد تک اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ تھا اس لیے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ شہریار کا ملازم ہونے کے ناتے اس سے وفاداری تو اپنی جگہ تھی ہی، وہ بہ حیثیت انسان بھی اسے بے پناہ پسند کرنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتا تھا اس لیے اس کے جذبات کو ٹھیس لگنے سے خائف بھی تھا۔

''ہو سکتا ہے اسلم نے ماہ بانو کو یرغمال بنا رکھا ہو اور وہ وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جو اسلم اس سے کہتا ہو۔'' خاصے توقف کے بعد شہریار نے کہا۔

''شاید یہی بات ہو۔'' مشابرم خان نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ اسے ٹاہلی والا سے جو خبریں ملی تھیں ان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ ماہ بانو کی حیثیت کسی یرغمالی کی سی ہو اور وہ مجبوراً اسلم کے ساتھ موجود ہو۔ اسے مبینہ طور پر اسلم کی ساتھی بتایا گیا تھا۔

''خیر جو بھی بات ہو گی، کبھی نہ کبھی سامنے آ جائے گی۔ فی الحال تم ٹاہلی والا پر توجہ دو اور دو چار دن بعد دوبارہ وہاں چکر لگا کر مزید سن گن لینے کی کوشش کرو۔ پیر سائیں مجھے بڑا گڑبڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ والوں کے مریدیوں کسی کی ماں بہن کی بے عزتی کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے گھر پر مسلح جتھے کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ مجرمانہ ذہنیت کی عکاسی ہو رہی ہے۔ تم دوبارہ وہاں جاؤ تو خاص طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ شفقت راؤ نامی شخص نے خانقاہ میں آگ کیوں لگوائی۔ وہ گاؤں کا باشندہ تھا اور بے شک پیر سائیں کا معتقد نہ رہا ہو لیکن اس بات سے تو واقف ہو گا کہ گاؤں میں پیر سائیں کے کتنے عقیدت مند موجود ہیں اور اس کی حرکت کے ردِعمل میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کسی معزز آدمی کے اتنی خطرناک حرکت کرنے کا محرک معمولی نہیں ہوتا۔ شفقت راؤ کی حرکت کے پیچھے بھی کوئی بڑی وجہ رہی ہو گی۔ تمہیں پوری کوشش کر کے وہ وجہ معلوم کرنی ہو گی تاکہ پیر سائیں کا کردار واضح ہو سکے۔'' ماہ بانو سے متعلق ملنے والی خبر نے اسے خاصا شدید ذہنی جھٹکا لگایا تھا پھر بھی حالات کا بالکل درست تجزیہ کرتے ہوئے وہ مشابرم خان کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاحب! میں اس گتھی کو سلجھانے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔'' حسبِ معمول مشابرم خان میدانِ عمل میں اُترنے کے لیے دل و جان سے راضی تھا۔



''گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' شہریار نے اسے سراہا اور پھر کھلی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مشابرم خان ملاقات ختم ہونے کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد شہریار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فائل کی طرف توجہ مرکوز کر سکے لیکن ذہن منتشر ہی رہا۔ ماہ بانو کا اسلم ڈاکو کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے پایا جانا اتنا غیر اہم واقعہ نہیں تھا جسے وہ آسانی سے نظرانداز کر سکتا۔ اسے تھوڑی ہی دیر میں اپنی کیفیت کا ادراک ہو گیا اور وہ فائل بند کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی منتشر ذہنی کیفیت میں یہاں بیٹھنے سے بہتر تھا کہ وہ گھر واپس چلا جائے۔ فیصلہ کر کے وہ سیٹ سے اٹھا تو واپس گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس کا ماریہ سے سامنا ہو گیا۔

''خیریت، آج اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟'' اسے بے وقت گھر میں موجود پا کر اس نے سوال کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کوٹ اُتارنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کام کو انجام دینے میں اس کا انداز اتنا دل رُبا تھا کہ وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور دل کو لگنے والی تازہ چوٹ کے باوجود اس سے بے مروّتی برتنے کے بجائے آہستہ سے بولا۔

''طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ سر میں درد سا محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ گھر چل کر کچھ آرام کر لوں۔''

''تھینک گاڈ کہ آپ کو اپنے بارے میں اس طرح سوچنے کا خیال آیا ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ آرام کا لفظ آپ کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں اور آپ نے کام کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔'' بیویوں والے مخصوص لب و لہجے میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ماریہ نے اس کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے گردن سے نکالا اور پھر اس کا بازو تھام کر بیڈ کی طرف لے گئی۔ اس سارے عمل میں وہ اس کے اتنے قریب رہی تھی کہ وہ بہ خوبی اس کے بدن سے اُٹھتی دھیمی سی باڈی اسپرے کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ دھیمی سی اس خوشبو میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ مسحور سا ہونے لگا اور حسبِ معمول فوری طور پر لباس تبدیل کر کے فریش ہونے کے بجائے چپ چاپ ماریہ کے اشاروں پر عمل کرنے لگا۔ بیڈ کے قریب پہنچنے پر ماریہ نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے کنارے پر بٹھا دیا اور خود نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارنے لگی۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے تیزی سے اپنا پیر پیچھے کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔ وہ ماریہ سے یوں بھی اکثر شرمندہ رہتا تھا کہ اس کے تمام تر خلوص کے باوجود اسے وہ توجہ اور محبت نہیں دے پاتا جس کی وہ بطور بیوی حق دار تھی، اس پر سے اس کی اتنی خدمت گزاری نے تو اسے شرمندہ ہی کر کے رکھ دیا۔ اس کی شوہر پرستی کو دیکھ کر تو قطعی طور پر اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے جو خود بھی معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شہریار جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وہاں تو عورتیں عموماً ہاتھ پیر ہلانے کی عادی ہی نہیں ہوتی تھیں اور خود کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے باپ، بھائی یا شوہر کے عہدے کے زعم میں مبتلا خود کو اتنا اعلیٰ سمجھنے لگتی تھیں کہ معمولی سے معمولی کام کرنا بھی انہیں اپنی توہین محسوس ہوتا تھا کجا کہ شوہر کے پیروں سے جوتے اتارنے کا کام۔

''میں وہی کر رہی ہوں جس سے میرے دل کو خوشی ملتی ہے۔ آپ مجھے روک کر میری خوشی سے محروم نہ کریں۔'' اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔ اس بار شہریار نے خود کو بے بس سا پایا۔ جوتے اتارنے کے بعد ماریہ اپنی نرم و ملائم اُنگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کے پیروں کو سہلانے لگی۔ اس کی متحرک اُنگلیوں کی ہر ہر جنبش میں اتنی مشاقی تھی کہ شہریار نے اپنے پورے وجود میں سرور کی لہریں سی دوڑتی ہوئی

محسوس کیں۔ اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے ماریہ نے آہستہ سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر ٹکا لیا اور مخمور سے لہجے میں بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ نے حالات کے جبر کے تحت مجھے اپنایا ہے لیکن اس کے باوجود میرا اور آپ کا رشتہ اٹل ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ ذہن سے ہر ناخوشگوار یاد کو کھرچ کر حال میں جی سکوں۔ میں نے آپ کے اور اپنے رشتے کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے سارے حقوق و فرائض ادا کرنے کی خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں اور کسی عام آدمی کی طرح اپنی بیوی کو زیادہ وقت اور توجہ نہیں دے سکتے لیکن مجھے اتنا تو حق دیا کریں نا کہ قسمت سے جو تھوڑا بہت وقت مجھے مل جائے اس میں، میں اپنے اور آپ کے رشتے کو محسوس کر سکوں۔''

اس کے بے حد نرمی سے کیے شکوے نے جہاں شہریار کو شرمندہ کیا، وہیں دل میں ایک ٹیس سی بھی اُٹھی۔ اسے آج تک وہ رات نہیں بھولتی تھی جب وہ ماریہ کے ساتھ لاہور کی طرف عازمِ سفر تھا اور اچانک ہی ماریہ کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں ایک تھرڈ کلاس سے ہوٹل میں رُکنا پڑا تھا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں اس کے ساتھ رات گزارتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا تھا کہ عمر بھر کا زعم پارسائی جاتا رہا اور وہ ہر حد پھلانگ کر اپنی ہی نظروں میں مجرم ٹھہرا۔ اس جرم کی تلافی کے لیے اس نے ماریہ سے شادی کر ڈالی۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے اور اس کے رشتے کو اس طرح قبول نہیں کر سکا تھا کہ ماریہ کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آتا۔ اس کمی کا ماریہ اکثر اس سے شکوہ کرتی تھی اور وہ خود کو شرمندہ محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے گھٹنوں پر ٹکے ماریہ کے سر کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''تم اتنی دل برداشتہ نہ ہوا کرو۔ میں مزاجاً ہی تھوڑا رُوکھا آدمی ہوں اور تم سے بطورِ خاص بے نیازی سے پیش نہیں آتا۔ نہ ہی تمہارے کسی حق سے انکاری ہوں۔ تم میری بیوی ہو نہ تو اس بات کو جھٹلا سکتا ہوں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ تمہارے ہوتے کسی دوسری عورت کو یہ مقام حاصل ہو سکے۔ تمہیں مجھ پر کم از کم اتنا اعتماد ضرور کرنا چاہیے کہ جتنا بھی سہی مگر میں صرف تمہیں میسر ہوں اور تمہارے حقوق میں کوئی اور حصے دار نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی آپ کے کردار پر شک کیا بھی نہیں لیکن بس کبھی کبھی یہ احساس کہ آپ نے مجبوراً مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے، اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ میں آپ کے ہر رویے کو اسی کے تناظر میں دیکھنے لگتی ہوں اور دُکھی ہو جاتی ہوں۔'' اس نے اپنا سر کچھ اس انداز سے شہریار کے گھٹنوں پر ٹکا رکھا تھا کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آواز کے بوجھل پن سے ظاہر تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

''بلاوجہ خود کو اتنا ٹینس کرنا حماقت ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت بھی انسان کا جینا دشوار کر دیتی ہے۔ چلو شاباش اُٹھو اور مجھے کوئی پین کلر دو تاکہ میں اپنے سر درد سے نجات حاصل کر سکوں۔'' اس نے ماریہ کو دونوں شانوں سے تھام کر سیدھا کیا تو کچھ دیر کے لیے نظریں اس کے چہرے پر جمی ہی رہ گئیں۔ نم ناک پلکوں کے ساتھ آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈوروں اور ناک کی سرخ پڑتی نوک نے اس کے حُسن کو نیا ہی روپ دے دیا تھا۔ شہریار نے اپنا دل اس کے لیے گداز ہوتا محسوس کیا۔ وہ جیسے بھی سہی، اس کی بیوی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا۔

''جسٹ آمنٹ۔ میں ابھی آپ کو کوئی اچھی سی میڈیسن دیتی ہوں۔'' اس کی قلبی کیفیت سے انجان ماریہ بولتی ہوئی اس کے قدموں سے اُٹھی اور پھرتی سے ایک دراز میں سے ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس سمیت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شہریار نے اس کی ہتھیلی پر دھری ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے ساتھ نگل گیا۔



''اب آپ لیٹ جائیں۔'' ماریہ نے پیار سے اسے ہدایت دی۔

''پہلے میں چینج کر لوں ورنہ مجھے قطعی نیند نہیں آئے گی۔'' شہریار نے کہا تو اس بار اس نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بیڈ کے کنارے پر ٹِک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں شہریار ڈھیلے ڈھالے آرام دہ کپڑوں میں ملبوس واپس آ گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں مردانہ وجاہت کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے اور جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر سج جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر پہلے فارمل ڈریسنگ میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا تو اس وقت بھی اس کی وجاہت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھا تو ماریہ کو اس کا ہر قدم اپنے دل پر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی قلبی حالت سے بے خبر وہ تھکن سا آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور ماریہ بے ساختہ ہی اس کے قریب سرک آئی۔ قریب بیٹھ کر اس نے شہریار کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کچھ دوا کا اثر تھا اور کچھ ماریہ کی مشاق انگلیوں کی حرکت کہ اس نے اپنے سر کا بوجھل پن کم ہوتا محسوس کیا۔ ماریہ کی انگلیوں نے بہت آہستگی سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ کنپٹیوں سے رخسار، ٹھوڑی اور گردن کا سفر کرتی اس کی متحرک انگلیاں بہت آہستگی سے سینے تک پہنچ گئیں اور وہاں موجود گھنے بالوں میں اُلجھنے لگیں۔ انگلیوں کی اس جادو اثر حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے شاداب بدن سے اُٹھتی دھیمی دھیمی مہک نے بھی آہستہ آہستہ شہریار کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ زخم خوردہ تھا اور عورت کے فراق میں زخم خوردہ مرد کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا۔ وہ بھی وقتی طور پر سہی، بہلتا جا رہا تھا اور بہلنے کے لیے بہکنا ضروری تھا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا کہ اس کے نشے میں بہک جانے کا انتظام کرتا لیکن ماریہ اس وقت اس کے لیے نشے سے بھری چھلکتی بوتل ہی بنی ہوئی تھی جو بڑی فراخ دلی سے اسے فیض یاب کر رہی تھی۔ مے حُسن سے فیض یاب ہوتا اس وقت وہ بڑا مسرور تھا لیکن جانے دل کے ایک گوشے میں کیسی کسک تھی جو کسی صورت پیچھا چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ بہکنے اور بہلنے کے عمل سے گزرتے ہوئے بھی وہ اس کسک کو محسوس کر سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''رب کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا۔ پر آگے کچھ سوچا ہے راؤ صاحب! آگے ہم کیا کریں گے۔''

اس وقت وہ لوگ شہر میں موجود حامد راؤ کے دو کمروں کے فلیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ دورانِ تعلیم مقصود کے زیرِ استعمال رہا تھا۔ اب بھی اس کا یا حامد راؤ کا کسی کام سے شہر آنا ہوتا تو وہ وہیں قیام کرتے تھے چنانچہ رات کے اندھیرے میں جب وہ لوگ ٹاہلی والا سے اپنی جانیں بچا کر فرار ہوئے تو سیدھے یہیں کا رخ کیا۔ دو کمروں کا وہ فلیٹ اتنا چھوٹا تھا کہ خواتین کا مکمل پردہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے حامد راؤ کی بیوی اس وقت اسلم کی موجودگی میں ہی اس سے بات کر رہی تھی۔ ویسے ان بے چاری خواتین کا پردہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب وہ ٹاہلی والا سے افراتفری میں فرار ہو رہے تھے۔ وہ لمحات اتنے کٹھن تھے کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ تو پھر بے چاری خوف زدہ خواتین پردے کا کیا خاک خیال رکھ پاتیں۔

''ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ جس رب نے جان بچانے کا احسان کیا ہے، وہ آگے کے معاملات بھی خود ہی سنوار دے گا۔'' حامد راؤ نے اپنی بیوی کو تسلی دی اور پھر مقصود کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مقصود پُتر! تھوڑی دیر میں باہر جا کر کھانے پینے کا سامان لے آنا۔ یہاں تو کچھ ہو گا نہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری چھپی بھوک کی کتنی کچی ہے۔ نیند سے جاگے گی تو کھانے کے لیے شور مچا دے گی۔'' حامد راؤ

نے اپنی جیب سے رقم نکال کر مقصود کے حوالے کی۔

یہ تھوڑی سی رقم اتفاق سے ہی اس کی جیب میں پڑی رہ گئی تھی ورنہ وہ لوگ جتنی افراتفری میں وہاں سے نکلے تھے، کسی کو کچھ بھی ساتھ لینا یاد نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مقصود کی جیبیں بھی خالی ہوں گی اس لیے اسے رقم تھمائی اور مقصود نے بنا حجت کے جس طرح وہ رقم تھام لی اس سے اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ بہر حال یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ مقصود کسی وقت جا کر شفقت راؤ کے منیجر سے مل لیتا تو یہ مسئلہ منٹوں میں حل ہو جاتا۔ وہ شفقت راؤ کا داماد تھا اور اپنے داماد کو اس نے اتنی حیثیت تو دے رکھی تھی کہ اس کے مطالبے پر منیجر بے چون و چرا مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر دیتا۔

''اگر رقم کا کوئی مسئلہ ہے تو میں بھی تھوڑی بہت رقم آپ کو دے سکتا ہوں۔'' اسلم کی گہری نظروں نے بھی فوراً مقصود کی خالی جیب کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے اس نے پیشکش کی۔ حامد راؤ کے گھر سے افراتفری میں فرار ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سروسامانی کا شکار اس لیے نہیں تھا کہ ڈیرے سے روانہ ہوتے وقت ہی اس نے اپنے پاس موجود جمع پونجی ایک چرمی تھیلے میں رکھ کر اسے لباس کے نیچے جسم سے باندھ لیا تھا اور وہ چرمی تھیلا مستقل اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ تھیلے میں خاصی معقول رقم موجود تھی۔ اگر اس نے ماہ بانو کی حفاظت کے لیے اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کا مطالبہ کر کے سردار کو منہ مانگی رقم کی پیشکش نہ کی ہوتی تو اس وقت وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہوتا کہ شہر کے کسی بھی حصے میں گھر خرید کر وہاں ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ بہر حال، اب بھی وہ اس لائق تو تھا ہی کہ وقتی طور پر گزارہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور اس نے اپنے محسن حامد راؤ کو بہت کھلے دل سے رقم کی پیشکش کی تھی۔

''نہیں صاحب زادے! رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ رقم موجود ہے اور مزید بھی ضرورت کے مطابق منگوائی جا سکتی ہے۔ البتہ تمہاری پُرخلوص پیشکش کے لیے میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔'' حامد راؤ نے بڑے سبھاؤ سے اسے جواب دیا اور پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولے۔

''بھلی لوک! میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تھوڑی دیر جا کر آرام کر لو۔ ناشتے پانی کا مقصود بازار سے انتظام کر دے گا اس لیے اس طرف سے بے فکر رہنا۔''

''چنگی گل ہے راؤ صاحب!'' حامد راؤ کی سیدھی سادی فرماں بردار بیوی نے اس کا اشارہ پا کر اُٹھنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ماہ بانو کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ انیلا اور اس کی ماں تو پہلے ہی دوسرے کمرے میں تھیں چنانچہ ان دونوں کے جاتے ہی کمرے میں صرف مردانہ نفری ہی رہ گئی۔ اس پل اسلم نے محسوس کیا کہ حامد راؤ اسے کچھ جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ حامد راؤ اس سے کوئی خاص بات کرنے والا ہے لیکن جب کئی منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ زبان سے کچھ نہ بولا تو اسلم کی بے چینی الفاظ کا روپ دھار گئی۔

''کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ میری طرف ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کہیں مجھ سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں ہو گئی؟'' اس نے گھبراہٹ کے عالم میں سوال کیا۔

''تم کون ہو؟'' حامد راؤ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''مم..... میں..... میں آپ کو اپنے بارے میں بتا تو چکا ہوں۔'' اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''لیکن مجھے شک ہے کہ تم نے مجھے اپنے بارے میں سچ نہیں بتایا ہے۔'' وہ بڑے نپے تلے انداز میں بولے۔



''لیکن کیوں؟..... میں نے ایسا کیا، کیا ہے؟'' اس نے پست آواز میں احتجاج کیا۔

''دیکھو برخوردار! بات یہ ہے کہ بے شک میں ایک چھوٹے سے پنڈ کا رہنے والا عام سا آدمی ہوں لیکن بہر حال میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں نے زندگی کو تم سے کہیں زیادہ برتا ہے اس لیے میرا تجربہ بھی وسیع ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں ہمیں سب کچھ نہیں بتایا ہے۔ تمہاری اصلیت اب تک پردے میں ہے۔''

''میں پھر پوچھوں گا کہ آپ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہیں؟'' اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود اس نے اپنا لہجہ ذرا مضبوط کر کے سوال اُٹھایا۔

''ٹاہلی والا میں گزرنے والے آخری لمحات کی بنیاد پر۔ ہتھیار میرے اور مقصود کے پاس بھی تھے لیکن تم جس منظم انداز میں ہتھیار استعمال کر رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ تمہیں ان کھلونوں سے کھیلنے کا وسیع تجربہ ہے۔ پھر تم جس بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں وہاں سے نکال لائے، وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایسی مہارت دو ہی طرح کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اوّل قانون کے محافظ، دوئم قانون کے دشمن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟'' انہوں نے نپا تلا سا تجزیہ اس کے سامنے رکھا تو وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ ہو سکا پھر نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے؟ آپ مجھے کس گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں؟'' اس بار حامد راؤ کے لیے فوری طور پر جواب دینا ممکن نہیں رہا اور وہ ذرا سے توقف سے گلا کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''اگر سچ پوچھو تو عقل اور تجربہ دونوں یہی کہتے ہیں کہ جو راہِ راست پر ہوتے ہیں اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں، انہیں دوسروں سے اپنی پہچان چھپانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بہت فخر سے اپنی پہچان ظاہر کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف میں تمہاری روشن پیشانی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو دل تمہیں غلط ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ حالانکہ تم جن حالات میں مجھ تک پہنچے ہو وہ خاصے مشکوک تھے۔''

حامد راؤ کا جواب سن کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو تجزیہ پیش کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ وہ اس کے بارے میں بالکل جائز تذبذب کا شکار تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اسے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل کر دیا تھا جہاں سے اس نے ہتھیاروں کا استعمال اور لڑنے بھڑنے کا ہنر سیکھا تھا لیکن تھا تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد جس نے پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کرنے کا خواب آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ حالات کی زد میں آ کر اس کا یہ خواب اتنی بری طرح بکھرا کہ وہ خود بکھر کر رہ گیا اور پیشانی پر ڈاکو ہونے کا داغ سجا بیٹھا۔

''اگر تم مناسب نہیں سمجھتے یا ہمیں اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن جھوٹ بولنے سے گریز ہی کرنا۔ تم جو بھی ہو، ہم نے تمہیں دل میں جگہ دی ہے اور اگر کبھی زندگی میں کسی مقام پر تمہارے جھوٹے ہونے کا علم ہوا تو بہت دکھ ہو گا۔'' حامد راؤ نے یہ الفاظ کہہ کر اسے بالکل ہی بے بس کر دیا۔ اپنے ساتھ اتنا خلوص برتنے والے شخص سے کوئی جھوٹ بولنے کا سوچ کر وہ پہلے ہی تذبذب کا شکار تھا اور اب تو ذرا بھی گنجائش نہیں رہی تھی چنانچہ اپنی داستانِ حیات اختصار سے سناتا گیا۔

اس نے ماہ بانو کے ڈیرے پر پہنچائے جانے سے متعلق بھی سب کچھ بتا ڈالا اور اس کے لیے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر دی۔ البتہ اس مقام پر اس نے حامد راؤ سے ایک جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور وہ یہ کہ اس کی اور ماہ بانو کی ڈیرے پر شادی کر دی گئی تھی۔ یہ جھوٹ اس نے صرف اس لیے بولا تھا کہ ماہ بانو کی عزت پر کوئی

حرف نہ آئے اور ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کوئی غلط قیاس نہ کیا جا سکے۔

حامد راؤ نے اس کی داستان کا ایک ایک حرف پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سنا اور کہیں ان کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں اُبھرا جس سے اسے گمان ہوتا کہ وہ اس کی سچائی پر شک کر رہے ہیں۔ البتہ مقصود کی آنکھوں میں ایک جہانِ حیرت بھرا ہوا تھا۔ یقینی طور پر اس کے لیے اسلم کی داستان بہت دلچسپ اور حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔

''تمہاری داستان بہت دل گداز ہے اسلم! ہمارے معاشرتی رسوم و رواج کی بدصورتی اور لوگوں کی بے حسی نے نہ جانے تم جیسے کتنے نوجوانوں کو برباد کیا ہے۔ تمہاری بہن کے سسرالیوں نے تمہاری حیثیت سے زیادہ جہیز مانگ کر جس کم ظرفی اور لالچ کا مظاہرہ کیا تھا جس کی وجہ سے برائی کس حد تک پھیلی، شاید خود انہیں بھی اندازہ نہ ہو۔ ایک طرف اگر تم اور تمہارا گھرانہ برباد ہوا تو دوسری طرف وہ لوگ خود کون سا سُکھ میں رہے۔ جوان بیٹے کے قتل نے ان کی کمر بھی تو توڑ ڈالی ہوگی اور پھر ان متاثرین کا تو کوئی شمار ہی نہیں جو تمہارے ڈاکو بننے کے بعد تمہارے ہاتھوں لٹے ہوں گے۔ لٹنے والوں کی بھی اپنی اپنی داستانیں ہوں گی۔ کہیں کسی کی بیٹی کی شادی کے لیے رکھا ہوا اسباب لٹ گیا ہوگا تو کہیں کسی بیمار کے علاج کے لیے رکھی رقم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی ایسی کسی رقم پر ہاتھ ڈال دیا ہو جو کسی بے سہارا جوڑے نے اپنے بڑھاپے کے لیے سنبھال کر رکھی ہو یا پھر کسی نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے کے واسطے مختص ہو۔ اور اس کے خواب بھی تمہاری طرح بکھر گئے ہوں۔''

حامد راؤ کے الفاظ نے اسے گہری شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے کبھی اس نے اس انداز سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی نظر میں تو وہ اب تک اس معاشرے سے انتقام لیتا رہا تھا جس نے اسے برباد کیا تھا لیکن اب ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہا تھا تو اپنا کردار مظلوم سے بڑھ کر ظالم کا نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی نے اس پر ظلم ڈھایا تھا تو وہ بھی تو کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا خود کو برباد کرنے والے افراد کو تو وہ آسانی سے انگلیوں پر شمار کر سکتا تھا لیکن جو اس کے ہاتھوں برباد ہوئے تھے، ان کا اس کے پاس کوئی شمار کب تھا۔ ندامت کے شدید احساس سے اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔

''میں نے یہ سب تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔'' حامد راؤ اس کی کیفیت فوراً ہی بھانپ گئے۔ ''میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری داستان سن کر دلی رنج ہوا ہے اور میں پوری شدت سے اس بات پر کُڑھ رہا ہوں کہ محض کسی کے لالچ کی وجہ سے کتنی بربادی ہوئی۔ تم تو خود حالات کا شکار ایک ستم رسیدہ نوجوان ہو۔ میں تم پر طنز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اب تو تم برائی کی اس دلدل سے نکل ہی آئے ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ایک برے ٹھکانے پر ہونے کے باوجود اللہ نے تم تک ایک ایسی عورت کو پہنچا دیا جو تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں اس جہنم سے نکال لائی ورنہ عورت کے لالچ اور طمع کی بھی بڑی داستانی بکھری ہوئی ہیں۔ ماہ بانو بیٹی قابلِ تعریف ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک مشکل لیکن سیدھی راہ کا انتخاب کیا ورنہ اگر وہ لالچ میں مبتلا ہو جاتی تو ہو سکتا تھا کہ تم اس کی خاطر پہلے سے بھی بڑی بڑی وارداتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔'' حامد راؤ بہت سبھاؤ سے اسے احساسِ شرمندگی سے نکالنے لگا۔

''شکریہ راؤ صاحب! میں نے اپنے بارے میں آپ کو اتنی تلخ سچائی سے شاید اسی لیے آگاہ بھی کر دیا کہ آپ مجھے صاحبِ دل آدمی محسوس ہوئے تھے، ورنہ کوئی عام آدمی تو میرے ڈاکو ہونے کا سن کر ہی بدک جاتا۔'' اس نے رقت آمیز لہجے میں حامد راؤ کا شکریہ ادا کیا۔

''یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے کاروبار میں شامل کر سکتے ہیں۔ ہمارے زراعت اور باغبانی سے متعلق کاروبار سے تو شاید تمہیں اتنی دلچسپی نہ ہو لیکن شفقت کے دفتر میں تمہارے



مطلب کا کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آئے گا۔ میں تمہیں وہاں کھپا دوں گا تاکہ تم اپنی بیوی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکو۔'' انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے اس کا پروگرام جاننا چاہا اور ساتھ ہی ایک پیشکش بھی کر دی۔

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں راؤ صاحب! کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں آپ کی اس پیشکش کو یاد رکھوں گا لیکن فی الحال مجھے اپنی ماں سے ملنے گاؤں جانا ہے۔ میری خطاؤں کی وجہ سے وہ آج تک مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے منانے کی کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکے گی۔ ماہ بانو اسے منا لے گی۔'' اسلم کی آنکھوں میں ایک اُمید سی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' حامد راؤ نے جواب دیا تو اسلم کی آنکھیں جھلملا اُٹھیں۔ آج جانے کتنے برسوں بعد کسی کے لبوں سے اس نے اپنے لیے دعا سنی تھی۔ ماں کی ناراضگی کے بعد تو وہ اس نعمت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ماں اب بھی اس کے لیے دعائیں کرتی ہو لیکن وہ خود ان دعاؤں کو اپنے کانوں سے سن کر حاصل ہونے والی خوشی سے محروم ہو گیا تھا۔ شاید ماہ بانو کا اس کی زندگی میں چلے آنا اس کی ماں کی دعاؤں کا ہی ثمر ہو ورنہ جرم کی راہ پر قدم رکھنے کے بعد تو اسے اپنا ایسا کوئی عمل یاد نہیں تھا جس کے صلے میں وہ اتنی بڑی نعمت کا حق دار ٹھہرتا۔

''کیا سوچنے لگے اسلم بھائی؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اب تک گفتگو میں دخل نہ دینے والے مقصود نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس اپنی خوش فہمی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اتنے برے حالات میں بھی اتنے اچھے لوگوں سے ملوا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''انسان اپنی نیت صاف رکھے تو اللہ خود ہی منزل آسان کر دیتا ہے۔ آپ نے برائی چھوڑنے کا سوچا تو دیکھیں اللہ نے بھی آپ کا ہاتھ تھام لیا۔ بس اب ہمیں انتظار رہے گا کہ آپ کب واپس آ کر ہمیں جوائن کرتے ہیں۔'' مقصود کے چہرے پر بھی بڑی بے ریا اور مخلص مسکراہٹ تھی۔

''اللہ کو منظور ہوا تو میں جلد تمہارے درمیان دوبارہ پہنچ جاؤں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے خود اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ ہم لوگ جس انداز سے گاؤں سے نکلے ہیں، اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پیر سائیں کے معتقدین رات کے اندھیرے میں تمہارے گھر کو گھیر سکتے ہیں تو ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اور کیا کچھ کر گزریں۔ پہلے تو وہ پھر بھی شفقت راؤ سے نالاں تھے اور ان کی فیملی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن اب تو تم لوگ بھی زیرِ عتاب ہو گے۔ ہماری طرف سے چلائی گئی گولیوں نے جانے ان کے کتنے آدمیوں کو زخمی یا ہلاک کیا ہوگا۔ انتقاماً وہ لوگ تمہارے گھر اور زمینوں کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پیر سائیں کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ گاؤں میں اس شخص کے بہت سے عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال تمہاری گھریلو ملازمہ ہے۔ پہلے میں فوری طور پر اس عورت کا کردار سمجھ نہیں سکا تھا لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہو گیا کہ اس عورت نے ہم لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی اس لیے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر چلی گئی۔ اس کی زبان سے یہ جان کر کہ خانقاہ کو آگ لگانے میں شفقت راؤ ملوث تھا۔ پیر سائیں کے معتقدین مشتعل ہو گئے ہوں گے اسی لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں تمہارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر انہیں اس حملے کا بھرپور جواب نہ ملتا تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب محفوظ رہے لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اب ٹاہلی والا میں حالات تمہارے لیے بہت مخدوش ہوں گے۔ ایسے

حالات میں تم کیا کرو گے اور کس طرح اپنا کام جاری رکھو گے؟ میرا جہاں تک خیال ہے، اب تک تو وہ قانون کو بھی تمہارے خلاف متحرک کر چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تم لوگوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔'' اس نے راؤ خاندان کو درپیش خطرات ان لوگوں کے سامنے رکھ دیئے۔

''ان سب باتوں کا تو ہمیں بھی اندازہ ہے۔'' مقصود کے بجائے حامد راؤ نے گلا کھنکھارتے ہوئے جواب دیا۔

''وقتی طور پر تو میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے بیان میں ہم یہ مؤقف اختیار کریں گے کہ رات گئے مسلح افراد کو اپنے گھر کو گھیرے میں لیے دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا تھا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے چنانچہ ہم نے بھی جوابی کارروائی کر ڈالی اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ رہی مشتعل افراد کے ہماری املاک کو نقصان پہنچانے کی بات تو اس معاملے کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نصیب پر یقین رکھنے والا آدمی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جو شے میری ہے، وہ ہر حال میں مجھے ملنی ہے اور جو اللہ مجھے نہیں دینا چاہتا، وہ میں اپنا پورا زور لگا کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔ میں دعا کروں گا کہ جب میں اپنی ماں سے مل کر واپس آؤں تو حالات اس نہج پر ہوں گے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کر سکوں۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔'' وہ حامد راؤ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا چنانچہ پورے دل سے بولا۔ آگے کیا ہونا ہے، یہ فیصلہ تو بہر حال اس تقدیر سے ہی ہونا تھا جس کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا البتہ اللہ کو ماننے والے اپنے حصے کی جدوجہد کرنے کے بعد اس پر شکر اور صبر سے کام لیتے ہیں کہ اسی میں حقیقی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان ایک بار پھر ٹاہلی والا میں تھا۔ شہریار نے اسے پیر سائیں کے متعلق مزید تفتیش کرنے کی ذمے داری سونپی تھی چنانچہ اس نے تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور دوبارہ وہاں چلا آیا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ پیر سائیں سے ملاقات کا بہانہ کر کے ایک بار پھر اس کے اس مرید سے ملنے پہنچ جائے گا جس نے پہلی بار ٹاہلی والا آنے پر اس کی میزبانی کی تھی لیکن پھر خود ہی اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ پچھلی بار ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا میزبان، پیر سائیں کا اندھا معتقد ہے۔ اس شخص سے اسے پیر سائیں کے متعلق جو بھی معلومات حاصل ہوتیں، وہ اتنی قابل اعتماد اس لیے نہیں ہو سکتی تھیں کہ عقیدت مند سچ بیانی سے زیادہ اپنے اعتقاد سے کام لیتا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا جو اسے درست معلومات فراہم کر سکے۔ اس چکر میں وہ ٹاہلی والا میں اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں تعمیرِ نو کا کام بڑی سرعت سے جاری ہے لیکن اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور بغیر رکے سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ٹاہلی والا بھی دیگر دیہاتوں کی طرح ایک عام سا پنڈ تھا جہاں کچے اور نیم پختہ مکانوں کی اکثریت تھی۔ پختہ مکان بس چند ہی تھے جو یقیناً پنڈ کے صاحبِ ثروت لوگوں کی ملکیت تھے۔ ان میں سے ایک مکان چودھری شریف کا بھی تھا جہاں اس نے پچھلی بار قیام کیا تھا اور جہاں پیر سائیں نے بھی آج کل اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا کہ مبادا اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ایسے شخص سے ٹکراؤ ہو جائے جو اس کا صورت آشنا ہو اور پچھلی بار اس کے وہاں قیام سے آگاہی رکھتا ہو۔ چودھری شریف کے مکان کی طرف جانے والے راستوں سے مختلف سمت میں چلتا ہوا وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایک



پختہ مکان تھا جسے بری طرح آتش زنی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مکان کی حالت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ آگ لگائی گئی تھی۔ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی لکڑی کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں رہا تھا اور وہاں بغیر کھڑکیوں دروازوں کا بس ایک ڈھانچا سا کھڑا رہ گیا تھا۔

عمارت کے اتنے برے انجام کو دیکھ کر اس بات کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ روزمرہ استعمال ہونے والے ساز و سامان میں سے کوئی شے سلامت رہی ہو۔ اگر اتفاق سے کچھ باقی بھی رہا ہو گا تو کسی بھی موقع پرست کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ اسے مکان کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ مکان حامد راؤ نامی اس شخص کی ملکیت ہے جو خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص شفقت راؤ کا کزن اور سمدھی ہونے کے ناتے معتوب ٹھہرا تھا۔ اسی مکان میں ماہ بانو اور اسلم کی موجودگی کی بھی اطلاع ملی تھی۔ اب وہ دونوں اپنے میزبانوں سمیت جانے کہاں تھے لیکن اسے اس تباہ شدہ مکان کو دیکھ کر دلی افسوس ہو رہا تھا۔

حالات و واقعات بے شک مختلف تھے لیکن اس گھر کو دیکھ کر اسے اپنے گھر کا اُجڑنا یاد آ گیا تھا۔ کئی مہینوں بعد سہی مگر وہ کبھی کبھی اپنے اس چھوٹے سے گھر جایا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی اکرم خان رہتے تھے۔ اکرم خان اس کی خاطر ماہ بانو کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی جان سے چلا گیا جبکہ ماں کو جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ڈھا گیا۔ وہ آج بھی نیم مردہ حالت میں اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں داخل تھی اور وہ دل میں ان لوگوں کے لیے انتقام کی آگ لیے پھر رہا تھا جن کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا تھا۔ اب ٹاہلی والا میں ایک بار پھر اس نے ایسی صورتِ حال دیکھی تھی کہ ایک نام نہاد پیر کے عقیدت مندوں نے اپنے ہی پنڈ کے رہائشی ایک عزت دار گھرانے کو بے گھر کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

حامد راؤ کے جلے ہوئے گھر کے سامنے سے وہ بڑی بجھی بجھی سی کیفیت میں آگے بڑھا اور بے خیالی میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ مکانوں کی حدود سے نکل کر کھلے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہرے بھرے کھیتوں میں ہی اس نے کافی بڑے قطعۂ اراضی کو اسی حال میں دیکھا جس حال میں وہ ابھی حامد راؤ کا گھر دیکھ کر آ رہا تھا۔ دوسرے کھیتوں کی طرح یقیناً یہاں بھی کھڑی فصلیں موجود ہوں گی لیکن اب تو بس راکھ کا ڈھیر ہی رہ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین کے سینے کو چیر کر اس میں سے ننھی کونپل نکلنے اور پھر اس کونپل کے پنپنے تک اس کے مراحل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتے۔ کسان اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے تب کہیں جا کر زمین وہ رزق دیتی ہے جو انسانوں کے پیٹ کا دوزخ بھر سکے۔ فصل کے تیار ہونے تک اپنے دن رات ایک کر دینے والا کسان اپنے بہت سے خواب اور اُمیدیں بھی ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھاتا ہے۔ اگر حامد راؤ کا گھر تباہ ہوا تھا تو یہ صرف اس کا ذاتی نقصان تھا۔ صاحبِ حیثیت آدمی اس طرح کے نقصانات کو بعد میں کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیتا ہے لیکن کھڑی فصلیں جلائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ غریب مزارع بھی متاثر ہوئے ہوں گے جن کی روزی روٹی ان کھیتوں سے وابستہ ہو گی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد راؤ اپنے خاندان کے ساتھ جہاں کہیں بھی ہو گا، کم از کم فاقہ کشی پر مجبور نہیں ہو گا لیکن اس کے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے گھر تو جلد یا بدیر یہی نوبت آنے والی تھی اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پیر سائیں کی عقیدت کا دم بھرنے والے وہ مشتعل افراد جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، اپنے عمل کی تلافی کرتے ہوئے ان غریبوں کی کفالت کا ذمہ اٹھاتے۔

اس صورتِ حال پر اس کا دل بے حد بوجھل ہو گیا اور اس بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا کہ نظر ایک بوڑھے پر پڑی۔ پھٹی ہوئی بنیان اور میلی دھوتی پہنے وہ بوڑھا دونوں ہاتھ سر پر رکھے جلے ہوئے کھیت

کے درمیان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے سے اس کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اور اس کے باوجود وہ اس کے چہرے پر لکھی حسرت و یاس کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ ہی اس بوڑھے کی طرف اُٹھ گئے۔ بوڑھا اس کی آمد سے بے خبر جلے ہوئے کھیت کے منظر میں اس طرح گم تھا کہ اسے اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ البتہ قریب جانے پر مشابرم خان کو وہ آنسو بھی نظر آ گئے تھے جو بوڑھے کی میل زدہ آنکھوں سے نکل کر بہتے ہوئے اس کی کھچڑی داڑھی میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ اُلجھے ہوئے بالوں والی وہ داڑھی گواہ تھی کہ اس بے چارے نے اپنے شب و روز پسینہ بہاتے ہوئے اتنی مصروفیت میں گزارے تھے کہ اسے اپنے وجود کی صفائی ستھرائی کی بھی مہلت نہ مل پاتی ہوگی۔ وہ بنا کوئی سوال کیے بھی بوڑھے کا کھیت سے تعلق سمجھ رہا تھا چنانچہ دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ بوڑھے کے وجود میں پہلی بار جنبش پیدا ہوئی اور اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا البتہ لب اب بھی خاموش ہی تھے۔

''السلام علیکم بابا!'' مشابرم خان نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ بوڑھے کی آواز تو نہ سن سکا البتہ اس نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دے دیا۔

''آپ کون ہو بابا! اور اس جلے ہوئے کھیت میں کیوں بیٹھے ہو؟'' مشابرم خان نے ہمت نہ ہاری اور خود بھی بوڑھے کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

''جانے کیوں بیٹھا ہوں؟'' بوڑھے کے لب کھوئے کھوئے انداز میں متحرک ہوئے۔ ''سب بولتے ہیں کہ نور بخش! اب ادھر کچھ نہیں رہا۔ تُو اِدھر کیوں آتا ہے؟ پر میرا تو سب کچھ ادھر ہی تھا۔ لیکن ادھر نہ آؤں تو سمجھ نہیں آتا کہ کدھر جاؤں۔''

''کیا یہ کھیت تمہارے تھے بابا؟'' اس نے بوڑھے نور بخش کو کریدنے کے لیے اس سے سوال کیا۔

''میرے نہیں تھے پر میرے ہی تھے۔ میں نے کسی باپ کی طرح اس کے ایک ایک بوٹے کو پروان چڑھایا تھا۔ ادھر سے مجھے اپنی روزی ملنی تھی۔ یہ فصل کٹ کر منڈی میں بکتی تو مالک مجھے میری دِھی کے ویاہ کے لیے روپے دیتا۔ مالک نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ہور وہ وعدے کا بڑا پکا سچا آدمی ہے، پر ظالموں نے تو مالک کو اس کے کنبے کے ساتھ یہاں سے بھگا ڈالا۔ اب میں کس کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلاؤں کہ مجھے میری دِھی کے ویاہ کے لیے روپے دو..... ہور باقی چھ ہور جانیں جو گھر میں بیٹھی ہیں، ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست کرو۔ کوئی سننے والا ہے ہی نہیں بس اس لیے یہاں سینہ کوٹنے کے لیے آ جاتا ہوں۔ اس جلے ہوئے کھیت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے سامنے میرے جوان بیٹے کا لاشہ پڑا ہو۔'' نور بخش اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ دُبلے پتلے نور بخش کا جسم ہچکیوں کے زور سے بری طرح ہل رہا تھا۔ قریب سے اسے دیکھتے مشابرم خان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ درحقیقت وہ اتنا بوڑھا نہیں ہے جتنا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً غم و الم کی شدت نے اس کے حلیے پر وہ بداثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہارے مالک کے کھیت کیوں جلائے گئے؟ کیا وہ کوئی برا آدمی تھا اور اس کی کسی سے دشمنی تھی؟'' وہ ایسے رخ سے سوالات کر رہا تھا کہ بوڑھا خود ہی حقیقت اُگلتا جائے۔ اُس کی یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور وہ بلبلا کر بولا۔

''نہ تو میرا مالک برا آدمی تھا ہور نہ ہی اس کی کسی سے دشمنی تھی۔ وہ وچارہ تو بس رشتے داری ہور دوستی یاری کے چکر کی زد میں آ گیا۔ جو کچھ کیا تھا، اس کے سمدھی نے کیا تھا لیکن یا مُکل لوگ اس وچارے کے گھر پر چڑھ دوڑے ہور اب اُلٹی سیدھی کہانیاں بنا کر اسے بھی مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''



''ارے کہیں تم حامد راؤ کی تو بات نہیں کر رہے؟'' مشابرم خان نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ''میں نے سنا ہے کہ حامد راؤ کے چچازاد بھائی اور سمدھی شفقت راؤ نے خانقاہ میں آگ لگا دی تھی اور حامد راؤ نے اس کے گھر کی عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اس لیے گاؤں والوں نے غصے میں اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔''

''عورتوں کو پناہ دی تھی تو کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ وہ عورتیں اس کی بھی عزت تھیں۔ اگر کسی کو شفقت راؤ سے شکایت تھی تو جا کر اُسے پکڑتا، بے گناہوں کے پیچھے سب ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟ ہور سچ پوچھ تو مجھے یقین بھی نہیں ہے کہ شفقت راؤ پر لگا الزام سچا ہے۔ وہ خود وڈا چنگا آدمی ہے۔ دو برس پہلے میرا پتر بیمار پڑ گیا تھا تو اس نے اپنے خرچ پر شہر سے اس کا علاج کروایا تھا۔ وہ نیک آدمی وچارہ تو خود بڑا دکھی تھا۔ جوان پُت کی موت نے اس کا حال تباہ کر دیا تھا۔ ملوم نہیں صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا یا کچھ ہور ہی چکر تھا؟ تھوڑی اُڑتی پڑتی میرے کانوں میں ایسی گل پڑی تو ہے جس کو سن کر لگتا ہے کہ خانقاہ میں کچھ گڑبڑ ہے۔'' نور بخش روانی میں بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔ شاید غم و غصے کی شدت نے اس کو اتنی بری طرح متاثر کر رکھا تھا کہ وہ مشابرم خان کے اجنبی ہونے کے باوجود بھی تسلسل سے اس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

''کیا چکر تھا خانقاہ میں؟'' نور بخش سے ہونے والی گفتگو اتنے اہم موڑ پر آ گئی تھی کہ اسے اپنے آپ پر قابو رکھنا آسان نہیں رہا اور وہ یک دم ہی بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

''اوئے تم کون ہو اور مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کی بداحتیاطی نے آخر گڑبڑ کر ہی دی اور بڑی آسانی سے سب کچھ بتاتا نور بخش چونک کر اس سے پوچھنے لگا۔

''مم..... میں تمہارا ہمدرد ہوں۔'' مشابرم خان سٹپٹا گیا۔

''ہمدرد؟..... کدھر سے آئے ہو؟'' بوڑھا پوری طرح بدکا ہوا تھا۔

''میری بات آرام سے سنو نور بخش بابا! میں حامد راؤ صاحب کے ہمدردوں میں سے ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اصل میں یہاں کیا ہوا تھا۔ ہمیں خود بھی یہی شک ہے کہ خانقاہ میں کوئی غلط کام ہو رہا تھا جس کی وجہ سے شفقت راؤ نے وہاں آگ لگا دی ورنہ اس کے بارے میں ہمارے پاس بھی یہی رپورٹ ہے کہ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔'' مشابرم خان نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور نور بخش کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر بہت طریقے سے رام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم پولیس والے تو نہیں ہو؟'' بوڑھے نے اسے گھورا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''ہمیں ماپھی (معافی) دے دو صاحب! ہم بہت گریب (غریب) آدمی ہیں۔ پہلے ہی ہمارا بہت کچھ برباد ہو چکا ہے۔ اب پولیس کو گواہی اور بیان دینے کے چکر میں پڑیں گے تو بالکل ہی برباد ہو جائیں گے۔ جو پاگل لوگ ہمارے مالک جیسے بڑے آدمی کا یہ حال کر سکتے ہیں کہ اس کا مکان اور کھیت جلا دیں، وہ ہماری تو تکا بوٹی کر دیں گے۔ مالک تو یہاں سے نکل کر کہیں نہ کہیں پھر بھی آرام سے رہ ہی لے گا، پر ہم اس پنڈ سے نکل کر کدھر جائیں گے؟ ہمیں تو مرنے کے لیے بھی یہاں کے سوا کہیں زمین نہیں ملے گی۔'' وہ کافی خوف زدہ لگ رہا تھا۔

''تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ تمہیں کہیں گواہی یا بیان کے لیے بلایا جائے گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ میں کسی کو بھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔'' مشابرم خان اسے یقین دہانی کروانے لگا لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے اور وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن مشابرم خان نے اسے اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''ہمیں ماپھی دے دو صاحب! ہور ادھر سے جانے دو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''نہیں۔'' مشابرم خان سختی سے بولا۔ ''تمہیں مجھے سچ بتانا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے سچ نہیں بتایا تو جو ظلم ابھی ہوا ہے، وہ بار بار ہوگا۔ تم اتنے خودغرض نہ بنو کہ صرف اپنی گردن بچانے کے لیے ظالموں کے بارے میں زبان بند کر کے رکھ لو۔ پھر جب میں تمہیں اس بات کی ضمانت دے رہا ہوں کہ تمہارا نام سامنے نہیں آئے گا تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' نور بخش کے بازو پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ انگلیاں اس کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ نور بخش بے بس سا ہو کر دوبارہ وہاں بیٹھ گیا۔

''مجھے کچھ زیادہ ملوم نہیں ہے۔ بس میرے وڈے پُتر نے اناپ شناپ کچھ تھوڑا سا بتایا تھا۔ اب کون جانے کہ بچے نے صحیح بھی کہا تھا یا نہیں۔'' وہ گویا اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''تمہیں جو اور جتنا معلوم ہے مجھے بتا دو۔ باقی سچ جھوٹ معلوم کرنا میرا اپنا کام ہے۔'' مشابرم خان نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔ نور بخش اسے پولیس کا آدمی سمجھ رہا تھا تو اس نے اس کے اندازے کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کچھ پولیس والوں جیسا ہی انداز اختیار کر کے اس کے حلق سے سچ اُگلوانے کی کوشش میں تھا۔

''میرے پُتر ہور شفقت راؤ کے پُتر صداقت میں تھوڑی دوستی تھی۔ شروع میں دونوں ادھر ہی اسکول میں پڑھتے تھے، بعد میں شفقت راؤ نے صداقت کو پڑھنے کے لیے شہر بھجوا دیا تو دونوں کا ملنا جلنا کم ہو گیا، پر صداقت وڈا ہیبا بچہ تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں پنڈ آتا تھا تو میرے پُتر سے ضرور ملتا تھا۔ مجھ سے بھی دعا سلام ضرور کرتا تھا لیکن آخری بار وہ پنڈ آیا تو کسی سے ملا جُلا ہی نہیں۔ فیر سنا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے اور خانقاہ میں پیر سائیں اس کا علاج کر رہے ہیں۔ یہ بھی ملوم ہوا کہ پیر سائیں کے علاج سے اسے فیدہ (فائدہ) ہوا ہے، ہور اس کا آسیب چلا گیا ہے۔ انہی دنوں میرے پُتر کو پنڈ سے ذرا پرے ادھر ملا جہاں سے آگے پہاڑ شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پُتر اصل میں صداقت کا پیچھا کرتا ہوا ہی ادھر گیا تھا۔ اس نے ادھر دیکھا کہ صداقت جیب سے کوئی پڑیا نکال کر اسے سگریٹ میں بھر کر پی رہا ہے۔ اسے وڈی حیرت ہوئی کہ صداقت جیسا پڑھنے لکھنے والا منڈا سگریٹ کب سے پینے لگا۔ وہ تو کبھی شوق میں بھی پان چھالیا کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے صداقت کو پکڑ لیا ہور سگریٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر صداقت ہنسنے لگا اور بولا کہ یہ جادو کی پڑیا مجھے پیر سائیں نے دی ہے اور یہ سگریٹ میں ڈال کر پینے سے ہی اپنا اصل اثر دکھاتی ہے اس لیے میں مجبوراً سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرے پُتر نے اس سے پڑیا کے بارے میں بہت سوال کیے لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اپنی دوستی کا واسطہ دے کر کہا کہ یہ گل کسی کو نہیں بتانا اور یاد رکھنا کہ میرا آسیب اسی پڑیا سے قابو میں رہتا ہے۔ میرے پُتر نے وعدہ کر لیا پر جب صداقت کے مرنے کی خبر ملی تو وہ چپ نہیں رہ سکا ہور میرے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس نے شک ظاہر کیا کہ صداقت نشہ کرنے لگا تھا، پر میں نے اس کی زبان سختی سے بند کر دی ہور یہی حکم دیا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے کیونکہ مجھے ملوم تھا کہ اگر اس نے کسی ایسی ویسی گل کے ساتھ پیر سائیں کا نام لیا تو پیر سائیں کے مرید اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سارے ہی وڈے جنونی ہیں۔ ایک واری پنڈ کے ایک لڑکے نے مذاق میں دوستوں میں بیٹھ کر پیر سائیں کو جعلی پیر کہہ دیا تھا تو بعد میں اس کے مریدوں نے لڑکے کی زبان گدی سے کھینچ لی تھی۔ میرے پُتر کو بھی وہ واقعہ یاد تھا اس لیے میرے منع کرنے پر اس نے اپنی زبان بند کر لی، پر مجھے لگتا ہے کہ شفقت راؤ کو بھی کسی نہ کسی طرح اس ماملے کی خبر ہو گئی تھی اسی لیے اس نے خانقاہ کو آگ لگا دی۔ فیر اس کے بعد جو ہوا، وہ تو آپ کو بھی ملوم ہی ہے۔



''ہوں۔'' مشابرم خان نے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ وہ جس سرے کی تلاش میں یہاں آیا تھا وہ اسے مل گیا تھا اور آخر کار شہریار کے شک کے مطابق پیر سائیں کی شخصیت کے بارے میں ایک اہم انکشاف ہو ہی گیا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ حامد راؤ کے گھر کو آگ لگانے کے بعد اب اس کے بارے میں غلط سلط کہانیاں بنائی جاری ہیں۔ وہ کہانیاں کیا ہیں؟''

''پیر سائیں کے چاہنے والے اصل ماملے کو چھپانے کے چکر میں ہیں۔ انہوں نے شفقت راؤ کا ذکر ہی کہانی سے نکال دیا ہے اور کہانی یہ بنائی ہے کہ حامد راؤ نے اپنے گھر میں ڈاکوؤں کو چھپا رکھا تھا۔ پنڈ والوں کو ملوم ہوا تو انہوں نے حامد راؤ کا گھر گھیر لیا ہور اس سے ڈاکوؤں کو باہر نکالنے کا مطالبہ کیا، پر حامد راؤ نے یہ گل ماننے کے بجائے نہتے لوگوں پر فائرنگ کروا دی بندے مرے ہور زخمی ہوئے تو غصے میں لوگوں نے اس کے گھر اور کھیتوں کو آگ لگا دی۔ اب پولیس رپٹ میں حامد راؤ ہور اس کے گھر والے ڈاکوؤں کے ساتھی ہور قاتل بن گئے ہیں، پر میں جانتا ہوں کہ میرا مالک حامد راؤ ایسا بندہ ہی نہیں ہے کہ اس کے ڈاکوؤں سے تعلقات ہوں۔ یہ ساری چکر بازی پیر سائیں ہور اس کے مریدوں کی ہے۔'' نور بخش نے بے لاگ تبصرہ کرتے کرتے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی لہرا گئیں۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے مشابرم خان نے تیزی سے پیچھے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیاب ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اس کا ذہن تیزی سے تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔ مکمل بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کانوں نے جو آخری آواز سنی وہ گولی چلنے کے دھماکے کی تھی۔

⊛----✪----⊛

''ایک بار اور سوچ لو ماہ بانو! میرے خیال میں تو تمہارا اکیلے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے نہ ہی میں اپنی بچت کے لیے تمہیں خطرے میں ڈالتے ہوئے خود کو مطمئن محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم اپنی ضد چھوڑ دو تو ہم دونوں ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ وہاں جو بھی اور جیسے بھی حالات پیش آئیں گے، ہم مل کر ان کا سامنا کر لیں گے۔ کم از کم ایک دوسرے کے حالات کی طرف سے بے خبری تو نہیں ہوگی۔ ابھی تم اکیلی وہاں جاؤ گی تو میں یہاں بیٹھا پریشان ہی ہوتا رہوں گا کہ نہ جانے تمہارے ساتھ وہاں کیا پیش آ رہا ہوگا۔''

سر سے پیر تک چادر اوڑھے ماہ بانو باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھی جب کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا اسلم اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا۔ وہ دونوں حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ سے رخصت ہو کر آج ہی جیکب آباد پہنچے تھے اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ یہاں سے انہیں دوپہر کے کھانے کے بعد اسلم کے گاؤں روانہ ہونا تھا لیکن کھانے سے قبل ہی ماہ بانو نے تجویز پیش کی کہ وہ اکیلی اسلم کے گاؤں جا کر اس کی ماں کو منانے کا فریضہ انجام دینا چاہتی ہے۔ اس کا استدلال تھا کہ گاؤں میں اسلم کے لیے خطرات تھے اس لیے اس کا وہاں نہ جانا ہی مناسب تھا۔

اسلم نے اس کی یہ تجویز فوری طور پر مسترد کر دی لیکن ماہ بانو نے اسے اپنی قسم دے کر مجبور کر دیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ماہ بانو روانگی کے لیے تیار تھی اور اسلم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف وہ اس کی دی ہوئی قسم نہیں توڑ سکتا تھا تو دوسری طرف اسے اکیلے بھیجنے پر بھی دل کو راضی نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی اس جذباتی کشمکش میں اس سے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا گیا۔ ماہ بانو اس کے اضطراب کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی لیکن بظاہر انجان بنی ہوئی تھی۔ اب اسلم نے بالکل نکلتے وقت گفتگو چھیڑ دی تو ماہ بانو کو بھی اپنی خاموشی کو توڑنا پڑا۔

''دیکھو اسلم! ضد میں نہیں، تم کر رہے ہو۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہئے کہ میری اکیلی ذات کے لیے تمہارے گاؤں میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں خود کو دور دراز کی کوئی رشتے دار ظاہر کرتی ہوئی تمہاری ماں تک پہنچ جاؤں گی اور انہیں منانے کی کوشش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے منانے پر ماں جی اپنی ناراضگی بھول جائیں گی۔ اس کے بعد یہ میری ذمے داری ہے کہ میں انہیں کیسے گاؤں سے لے کر یہاں تک آتی ہوں۔ تم یقین رکھو کہ یہ سب کرنے میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم ساتھ چلے تو ہم وہاں قدم رکھتے ہی مشکلات میں گھر جائیں گے۔ تمہارے دشمن پہلے مرحلے پر ہی تمہیں گھیرنے اور مارنے کی کوشش کریں گے اور میں تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے خود بہ خود ہی ان کی زد میں آجاؤں گی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اپنے اور میرے تحفظ کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنے سے گریز کرنا چاہئے۔''

''کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟ کیا تمہارے خیال میں، میں تمہاری حفاظت کرنے کا اہل نہیں ہوں؟ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے تو تمہاری طرف۔ اگر کسی نے تمہیں رتی برابر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کی لاش گرادوں گا۔'' اسلم گویا بپھر سا گیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم ایسا کر سکتے ہو، تمہارے لیے کسی کی لاش گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن یہ سوچا ہے کہ ایسی کسی حرکت کا انجام کیا ہوگا؟ تم پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہو، کوئی اور اُلٹا سیدھا واقعہ پیش آگیا تو وہ لوگ ایک بار پھر تمہاری بُو پر لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ یا تو تم لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کر دیئے جاؤ گے یا پھر بھاگ کر ایک بار پھر ڈاکوٹیروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ اور میں..... میں ایک بار پھر بے آسرا ہو جاؤں گی۔'' کاٹ دار لہجے میں تیز تیز یہ سب کہتے ہوئے ماہ بانو کا سانس پھول گیا تھا اور آنکھوں میں در آنے والی ہلکی سی نمی سے ظاہر تھا کہ وہ بیک وقت غم و غصے کا شکار ہوگئی ہے۔ اسلم نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی۔

''آئی ایم ویری سوری ماہ بانو! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ میں تم سے جو بھی مطالبہ کر رہا تھا، اپنے وسوسوں کی وجہ سے کر رہا تھا۔ میں تمہیں اکیلے گاؤں بھیجتے ہوئے ڈر رہا تھا لیکن تم واقعی درست کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ جانے سے واقعی خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے منصوبے پر عمل کرو۔'' مجبوراً ہی سہی، اسلم کو اسے اجازت دینی پڑی کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔ تم یہاں سکون سے بیٹھ کر میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کرنا۔'' اسلم کے پسپائی اختیار کرتے ہی اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

''ماہ بانو.....!'' ابھی وہ دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ اسلم کی پکار نے اسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے رکتے ہی اسلم نے قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ طے کیا اور ایک دم ہی اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اُس کی اس بے ساختہ حرکت پر ماہ بانو پوری جان سے لرز اُٹھی۔ اُسے اسلم کے قریب رہتے کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن ایسی جسارت اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی سختی سے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر کھڑا تھا کہ وہ حرکت بھی کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اس کا کنوارا جسم ایک مرد کی اتنی قربت کی وجہ سے بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا اور کمال یہ تھا کہ وہ اسلم کو خود سے دُور دھکیلنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ اس کے جذبات کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والے کا وہ بے ساختہ اظہار تھا جو اسے کسی مشکل میں پڑتے دیکھ کر ساری دنیا سے چھپا لینے کا خواہش مند تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔



اسلم کی قربت میں لرزتی کانپتی ماہ بانو اس وقت اسے یہ رعایت دینے پر مجبور پا رہی تھی اور شاید یہ اس کی خاموشی کا ہی نتیجہ تھا کہ اسلم نے ایک جسارت اور کر ڈالی۔ اس کے دہکتے ہونٹوں کا پُرجوش سا بوسہ ماہ بانو کے گلابی نرم رخسار پر ثبت ہوا تو اسے ایسا لگا کہ اس کا رخسار جل اُٹھا ہو۔ وہ اسلم کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے دھکیلتی ہوئی پیچھے ہٹی تو وہ بھی گویا ہوش میں آگیا اور اپنی بے خودی پر شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔ ایمان ماہ بانو اس کا شرمندہ چہرہ دیکھنے کے لیے وہاں رکی نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسلم اسے گاڑی میں بٹھانے اس کے ساتھ جانا چاہ رہا تھا لیکن جو گستاخی کر چکا تھا، اس کے بعد اسے جرأت نہ ہو سکی کہ ماہ بانو کا سامنا کر سکے۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا جبکہ ماہ بانو بغیر رُکے تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

ٹکٹ اسلم اسے پہلے ہی لا کر دے چکا تھا۔ وہ بس اڈے پر پہنچی تو اپنی مطلوبہ بس کے بارے میں معلوم کر کے اس میں سوار ہوگئی۔

بس کی نشستیں ابھی پوری طرح پُر نہیں ہوئی تھیں۔ اسے کھڑکی کے ساتھ جو سیٹ ملی، اس کے برابر میں فی الحال کوئی دوسرا مسافر موجود نہیں تھا۔ وہ تقریباً گرنے والے انداز میں نشست پر ڈھیر ہوگئی اور آنکھیں بند کر کے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ دل ابھی بھی اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اسلم کی بانہوں میں جکڑی ہوئی ہو۔ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا دیانت دارانہ تجزیہ کیا۔ شرم و حیا کے تقاضے اپنی جگہ تھے لیکن یہ حق تھا کہ اسے اسلم کی جسارت بہت زیادہ ناگوار نہیں گزری تھی۔ البتہ دل میں ایک خلش سی ضرور تھی اور اس خلش کو تو شاید زندگی بھر اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

شہریار سے مایوس ہو کر اسلم کی محبت کی شدت کے سامنے سر جھکا دینے کے باوجود وہ اس حقیقت کو تو کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی کہ اس کا دل شہریار کا اسیر ہے۔ دل میں گھر کرنے والی وہ پہلی پہلی محبت اتنی معمولی نہیں تھی کہ کسی دوسری محبت کے مل جانے پر اس کے رنگ ماند پڑ جاتے۔ شہریار اب بھی پوری آب و تاب سے اس کے دل میں موجود تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اسلم کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال کر اسے بھی اپنی زندگی میں جگہ دینے پر راضی ہوگئی تھی۔ شاید اس رضامندی کے پیچھے کچھ ہاتھ اس کی مجبوریوں کا بھی تھا۔ وہ اپنے اس رشتے کو کھو چکی تھی جس سے اسے تحفظ ملنے کی اُمید ہوتی۔ ایک طرف اسے دل سے لگا کر پالنے پوسنے والے چچا بے اور ابا دنیا سے چلے گئے تو دوسری طرف اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار اس کے ماں باپ خود تباہ حال تھے۔ ماں اکلوتے بیٹے کی موت کے غم میں پاگل ہوگئی تھی تو باپ بھی بس زندگی کو گھسیٹنے پر مجبور تھا۔ وہ دو کمزور اور بوڑھے وجود جو اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج تھے، بھلا اس کا سائبان کیسے بنتے؟ اور وہ لاکھ بہادر اور باہمت سہی، تھی تو بہر حال ایک لڑکی ہی جو کسی محفوظ چھت کے نیچے سکون سے زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔

اسلم کے سلسلے میں خود کو راضی کرنے کے لیے اس کے پاس ایک مضبوط دلیل یہ بھی تھی کہ اپنی قربانی کے ذریعے وہ اسلم جیسے انسان کو برائی کی دلدل سے نکال کر ایک بڑا کارنامہ انجام دے سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک انسان کی زندگی کو بچانا بہت بڑی نیکی تھی تو انسان کی انسانیت کو بچا لینا اس سے بھی بڑا کارِ ثواب تھا۔ اسلم کی محبت کو قبول کر کے اگر اس نے اپنے لیے ایک پناہ گاہ کا بندوبست کیا تھا تو اسے بھی اس کے اصل کی طرف لا کر نئی زندگی دے دی تھی۔ لین دین کے اس سودے میں اگرچہ دونوں ہی کو مکمل آسودگی ملنے کا امکان نہیں تھا..... ایک فریق جانتا تھا کہ وہ جسے قبول کر رہا ہے، اس سے محبت نہیں کرتا اور دوسرا واقف تھا کہ جو اسے قبول کر رہا ہے، اسے اپنی تمام تر محبت دینے کے باوجود پوری طرح پانے سے قاصر رہے گا۔ دونوں کے درمیان

تلخ حقائق اپنی جگہ تھے لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ ماہ بانو، شہریار کا نام لیے بغیر اسلم کو بتا چکی تھی کہ وہ کسی اور کی محبت کی اسیر ہے اور اسلم نے بڑی اعلیٰ ظرفی سے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

''ادی! ذرا ادھر ہو کر میرے کو جگہ تو دینا۔'' وہ اپنے خیالات میں نہ جانے کتنی دیر تک غلطاں و پیچاں رہتی کہ ایک زنانہ آواز نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پچیس چھبیس سال کی قدرے فربہ سانولی سی عورت تھی جس نے سندھی کڑھائی والی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر بھی اسی طرح کی کڑھی ہوئی بڑی سی چادر موجود تھی۔ عورت کی گود میں تقریباً پانچ چھ ماہ کا ایک کمزور سا بچہ بھی موجود تھا۔ نشست پر کھسک کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے اپنا جائزہ مکمل کر ڈالا۔ عورت فوراً ہی خالی جگہ پر بیٹھ گئی اور بچے کو گھٹنوں پر بٹھانے کے بعد اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود چھوٹی سی پوٹلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ادی! یہ تم پکڑ لو تو وڈی مہربانی ہوگی۔ اس میں روٹی ہے ورنہ میں نیچے پیروں میں رکھ لیتی۔'' اس کی استدعا پر ماہ بانو نے خاموشی سے پوٹلی لے کر اپنی گود میں رکھ لی۔ خود اس کے اپنے پاس تو ایک شولڈر بیگ کے سوا کوئی سامان تھا بھی نہیں جو اسے پوٹلی تھامنے میں مشکل پیش آتی۔ قدرے میلے سے کپڑے کی اس پوٹلی میں سے آم کے اچار کی خوشبو آ رہی تھی۔ پوٹلی گود میں رکھ کر وہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ باہر اجنبی چہرے والے لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ بہت دور سے ایک چہرہ ایسا نظر آیا جس پر اسلم کا گمان گزرا لیکن گمان یقین میں بدلتا، اس سے قبل ہی بس حرکت میں آ گئی اور تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ برابر میں بیٹھی عورت اپنے بچے میں مگن تھی اور پوری بس کے منظر میں اس کے لیے کہیں ایسی کوئی کشش نہیں تھی کہ وہ خود کو اس ماحول میں شامل کر سکے۔ چنانچہ پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ نیند نہ بھی آتی تو وہ آنکھیں موند کر کچھ دیر سکون سے بیٹھ تو سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

بے ہوشی کا دورانیہ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چار دیواری میں قید پایا۔ اونچی دیواروں والے اس کمرے میں آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ موجود تھا جو یقینی طور پر باہر سے بند تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں کسی کھڑکی کا نام و نشان موجود نہیں تھا، البتہ عقبی دیوار پر کافی بلندی پر ایک ہوادان ضرور نظر آ رہا تھا۔ لکڑی کے فریم والے اس ہوادان میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا لیکن وہ جتنی بلندی پر تھا، وہاں تک کسی سیڑھی وغیرہ کی مدد کے بغیر رسائی ممکن نہیں تھی اور اس خالی کمرے میں ایسی کسی شے کا ہونا تو ایک طرف، استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی موجود نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اسے بھی کسی جانور کی طرح کمرے کے ننگے فرش پر لا کر ڈال دیا گیا تھا۔ بے ہوشی کے دورانیے میں ٹھنڈے فرش پر پڑے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس طرح یہاں لانے والے اس کے بہی خواہ تو تھے نہیں کہ ان سے کوئی اچھی امید کی جاتی۔ انہوں نے تو اسے اتنی بے دردی سے یہاں قید کیا تھا کہ پانی کا کوئی برتن تک کمرے میں رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک فرش پر ہی بیٹھا اردگرد کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ حالات کا بھی تجزیہ کرتا رہا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ پیر سائیں کے مریدوں کی قید میں تھا جنہوں نے اسے حامد راؤ کے مزارع کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھ کر بے ہوش کر کے اغوا کر لیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے اس کے اور مزارع کے درمیان ہونے والی گفت و شنید کا کچھ حصہ بھی سن لیا ہو اور اسے اپنی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھ کر یہاں اٹھا لائے ہوں۔



اس پر بہر حال عقب سے وار کیا گیا تھا اس لیے وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

خود پر گزرے حالات کا سوچتے سوچتے اسے یک دم ہی فائر کی وہ آواز یاد آئی جو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے سنی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی مضطرب سا ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ حسبِ توقع دروازہ باہر سے بند تھا۔ عالمِ اضطراب میں اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی سوہانِ روح تھا کہ اس کی وجہ سے وہ غریب مزارع کسی نقصان سے دوچار کیا گیا ہو۔

''کیا گل ہے؟ کیوں دروازہ توڑنے پر تلے ہوئے ہو؟'' اس کی مسلسل دستک کے جواب میں باہر سے کسی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو، مجھے تم لوگوں سے بات کرنی ہے۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''صبر کرو، ابھی وڈا صاحب آئے گا تو خود تم سے گل کرے گا۔'' باہر سے اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

''تمہارا وڈا صاحب معلوم نہیں کب آئے گا۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے، تم دروازہ کھولو۔'' اسے گمان ہوا کہ وہ جس جگہ موجود ہے، وہاں اس کی نگرانی کے سوا کوئی اور شخص موجود نہیں ہے اس لیے باہر نکلنے کے لیے بہانہ گھڑا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اکیلے آدمی کو آسانی سے قابو میں کر لے گا۔

''دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر تم سے برداشت نہیں ہو رہا تو کمرے کے کسی کونے میں فراغت حاصل کر لو۔ بعد میں ہم تم ہی سے صفائی کروا لیں گے۔ باہر سے بڑی بے نیازی کے ساتھ مشورہ دیا گیا جسے سن کر اس کا پہاڑی خون جوش مارنے لگا اور غصے کے عالم میں اس نے اپنے مضبوط کندھوں سے دروازے پر ضربات لگانا شروع کر دیں۔

''آرام سے بیٹھو ورنہ تمہارا انجام برا ہوگا۔'' باہر موجود شخص غرایا لیکن اس نے اس کے حکم کی تعمیل ضروری نہیں سمجھی۔ ویسے ہی چند ضربات کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دروازہ بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے اور تھوڑی سی محنت سے اسے توڑا جا سکتا ہے۔ پھر اسے باہر موجود نگران کے اکیلے ہونے کا بھی گمان تھا چنانچہ پیچھے ہٹ کر دوڑتا ہوا آیا اور پوری قوت سے دروازے کو ایک اور ٹکر ماری۔ اس کے حساب سے یہ ٹکر فیصلہ کن تھی لیکن جب ردِعمل میں اس کا جسم پوری قوت سے اُڑتا ہوا واپس کمرے کے فرش پر گرا تو ہر اندازہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ گرنے کے بعد وہ ابھی سنبھل کر اُٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ کئی مسلح افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے اور اسے بری طرح زدوکوب کرنے لگے۔ مارنے کے لیے وہ ہاتھوں پیروں کے ساتھ ساتھ اپنے ہتھیاروں کے بٹوں اور دستوں کا بھی استعمال کر رہے تھے اور جسم کے ہر حصے پر بلا تخصیص ضربات لگا رہے تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ جب اس نے دروازے پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے خیال سے جست لگائی تھی، عین اسی وقت ان لوگوں نے بھی کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ چنانچہ ردِعمل میں وہ دروازے کی ٹکر کھا کر پیچھے کی طرف اُلٹ گیا اور اب وہ لوگ اُسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع نہیں دے رہے تھے۔

آخر کار جب وہ بالکل ادھ موا ہو کر فرش پر گر پڑا تو ان کے مشین کی طرح مسلسل چلتے ہاتھ بھی خودکار انداز میں رُک گئے۔ وہ اسے اتنا مار چکے تھے کہ وہ فوری طور پر خود کو سیدھا کرنے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں پا رہا تھا چنانچہ اُلٹا پڑا ہی ہانپتا رہا۔

''امید ہے کہ تمہارے سارے کل پُرزے اپنی جگہ صحیح بیٹھ گئے ہوں گے اور اب تم کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کیے بغیر آرام سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ گے۔'' وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی ایک کرخت آواز سنائی دی۔

اس نے اپنی گردن گھما کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ پستہ قامت کا سانولی رنگت والا پکی عمر کا آدمی تھا جس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ بوسکی کی قمیص پر چوخانے والے تہ بند میں ملبوس اس آدمی کو دیکھ کر دل میں کوئی اچھا تاثر نہیں اُبھر رہا تھا۔ مشابرم خان اسے کوئی جواب دیئے بغیر یک ٹک گھورتا رہا۔ اس کی یہ جسارت آنے والے کو اچھی نہیں لگی اور وہ اکڑ کر چلتا ہوا اس کے اتنے قریب آ کر کھڑا ہوا کہ اس کے نوک دار کھسّوں کی نوک مشابرم خان کی ناک کو چھونے لگی۔ اس سے قبل کہ مشابرم خان کچھ سمجھ پاتا، اس نے پوری قوت سے اس کی ناک پر ٹھوکر دے ماری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی مگر پھر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پستہ قامت نووارد کی طرف دیکھا۔

''کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اپنی ناک سے نکلنے والے خون کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نووارد سے پوچھا۔

''سوال تم نہیں، میں کروں گا۔ چلو شاباش اب سیدھی طرح بتاتے چلے جاؤ کہ تم کون ہو اور کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟'' اس نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

''میرا نام مشابرم خان ہے، میں یہاں کسی بُری نیت سے نہیں آیا تھا۔ میرا ایک مسئلہ تھا جس کے حل کے لیے میں پیر سائیں کی شہرت سن کر یہاں آیا تھا۔ میرا یہاں کا دوسرا چکر ہے۔ پہلے خانقاہ میں آگ لگنے اور دوسرے مسائل میں گھرے ہونے کی وجہ سے میری پیر سائیں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اس لیے میں دوبارہ یہاں آیا ہوں۔ تم چاہو تو تمہارے گاؤں کا ہی ایک بندہ میری بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔'' وہ اپنی خالی جیبیں دیکھ چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے بنیادی کوائف سے تو اچھی طرح واقف تھے چنانچہ نام وغیرہ کے سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔

''پیر سائیں سے مسئلہ حل کروانے آئے تھے تو ادھر جلے ہوئے کھیت میں بیٹھ کر نور بخش سے انٹرویو کیوں کر رہے تھے؟'' پستہ قامت نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''میں دوسری بار ہی یہاں آیا ہوں اس لیے راستہ ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور میں بھٹک کر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک جلے ہوئے کھیت میں نور بخش اُداس بیٹھا نظر آیا تو ہمدردی میں اس سے دو چار باتیں کرنے بیٹھ گیا۔'' اس نے بڑی سادہ سی وضاحت پیش کی۔

''لگتا ہے تُو سیدھی طرح سے زبان نہیں کھولے گا۔ مجھے تجھے بتانا ہی پڑے گا کہ تُو جب ہمارے پنڈ میں داخل ہوا تھا، تب سے ہی ہمارے آدمیوں کی نظر میں ہے۔ تُو پیر سائیں سے ہی ملنا چاہتا تھا تو جب خانقاہ کی طرف گیا تھا، تب ہی وہاں سے کوئی بندہ پکڑ سکتا تھا کہ وہ تجھے پیر سائیں تک پہنچا دے۔ لیکن تُو تو وہاں سے کنی کترا کر نکل گیا ہو رسیدھے حامد راؤ کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں سے تُو کھیتوں میں پہنچ کر نور بخش سے پوچھ تاچھ کرنے بیٹھ گیا ہو رمعصوم ایسا بن رہا ہے جیسے سچ مچ وڈا سیدھا سادہ بندہ ہو۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے جن جگہوں کا ذکر کیا، میں وہاں گیا تھا لیکن اس میں اتفاقات کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ خانقاہ تو میں صرف اسی تجسس کی وجہ سے گیا تھا کہ دیکھوں کہ وہاں تعمیر کا کام کہاں تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں سے سیدھا شریف صاحب کے گھر تک پہنچ جاؤں گا اس لیے کسی سے مدد لینے کی کوشش نہیں کی لیکن بدقسمتی سے میں راستہ بھٹک گیا اور راستے میں جلا ہوا مکان دیکھ کر ٹھٹکا تو تھوڑی دیر وہاں رک گیا۔ کھیتوں کی طرف بھی میں اتفاقاً ہی جا نکلا تھا ورنہ نہ تو میں حامد راؤ کو جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی ہے۔''



پستہ قامت کی جارحانہ تقریر کے مقابلے میں اس نے مدافعانہ لہجہ اختیار کیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

''تُو تو وڈی ڈھیٹ شے ہے بھئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے فیر بھی جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں تیری چمڑی کو ابھی مزید دھنائی کی ضرورت ہے۔ چل ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں تیری یہ خواہش بھی پوری کروا دیتا ہوں، کہیں بعد میں تُو شکوہ کرے۔'' پستہ قامت نے اپنے الفاظ سے ظاہر کر دیا کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ پر بھی یقین نہیں رکھتا ہے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ اپنے مسلح غلاموں کی طرف مڑ گیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''چلو بھئی میرے شیرو! اس پر ٹوٹ پڑو اور اس وقت تک مارتے رہو جب تک یہ سچ بولنے پر راضی نہ ہو۔'' اس کی زبان سے الفاظ ادا ہوتے ہی مسلح افراد پُرجوش نظر آنے لگے اور ان میں سے ایک قدرے آگے بڑھ آیا اور ادب سے بولا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اس پر ترکیب نمبر ایک یا دو میں سے کوئی ایک آزما کر دیکھیں؟ سالا دو منٹ میں سیدھا ہو جائے گا ہور فر فر سب بتا دے گا۔''

''نہ اتنی جلدی نہ کر..... ابھی اسے تھوڑا موقع دے۔ چنگا ہے کہ یہ دو چار ہڈیاں تڑوا کر ہی سب کچھ اُگل دے۔ تیری ترکیبوں میں سے کوئی ایک بھی آزمائی گئی تو وچارا دنیا سے نہ بھی اُٹھا تو جیتے جی مر جائے گا۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اتنا بے رحم بندہ نہیں ہوں۔'' پستہ قامت کے لفظ لفظ سے مکاری ٹپک رہی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے مشابرم خان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔

''کوشش کر کہ یہ آسانی سے سب کچھ اُگل دے۔ ہاں، میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے تیری ترکیب نمبر ایک ہور دو کی تفصیل بتا دیتا ہوں تاکہ یہ خود بھی سمجھ داری سے کام لے سکے۔'' اپنے ساتھی سے بات کرتے کرتے وہ مشابرم خان کی طرف پلٹ گیا۔

''دیکھ بھائی خاناں! یہ جو آدمی ہے نا، وڈا سخت ہے ہور اس کی ترکیبیں بھی نرالی ہیں۔ اگر اس نے ترکیب نمبر ایک آزمانے کا سوچا تو تیرے ہاتھوں کو رسّی سے باندھ کر چھت پر لگے کنڈے سے لٹکا دے گا ہور نیچے آگ جلا دے گا۔ آگ تیرے بدن کو چھوئے بغیر تیرے ماس ہور ہڈیوں کو ایسے گلائے گی جیسے پائے گلتے ہیں۔ تُو اذیت سے چیخے گا، چلائے گا لیکن موت بھی وڈی مشکل سے آئے گی۔'' وہ گویا کسی غیر مرئی پردے پر سارا منظر دیکھتا ہوا اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اس کی ترکیب نمبر دو ہور بھی انوکھی ہے۔ سالا مٹی کے مٹکے میں چھوٹے سے چوہے کو گھسا کر مٹکے کا منہ بند کر کے پیٹ پر اُلٹ دیتا ہے اور زمین میں میخیں گاڑ کر چاروں ہاتھ پیر ایسے باندھ دیتا ہے کہ آدمی حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ اب تُو سوچ کہ بند مٹکے میں قید چوہے کو جب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا تو وہ کدھر کا رخ کرے گا؟ مٹکے کی پکی دیواریں تو اس کے دانتوں سے ٹوٹنے سے رہیں۔ فیر لازمی ہے کہ وہ ادھر ہی زور آزمائی کرے گا جدھر آسانی لگے گی۔ اب یہ تُو خود سوچ سکتا ہے کہ جب چوہا تیرے بدن میں سرنگ بنا کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کرے گا تو تیرا کیا حال ہو گا۔ اللہ میری توبہ..... میں تو خود پر ایسے ظلم کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور پھر گال بھی پیٹنے لگا۔

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مشابرم خان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ اداکاری کر رہا ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ پہاڑوں کے اس بیٹے کا عزم و حوصلہ بھی پہاڑوں جیسا ہے۔ بلتستان کے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ کو تن تنہا تباہ کر ڈالنے والے مشابرم خان کو کسی دھمکی سے متاثر کر دینا اتنا آسان نہیں

تھا۔ البتہ اس کے سامنے تشدد کے جن حربوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، انہیں سن کر اسے اپنے دشمنوں کی سفا کی اور بربریت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت پر کیا جانے والا شک واقعی درست ہے۔ ورنہ کسی روحانی شخصیت کے پیروکاروں یا مریدوں سے تو اتنی سفاکیت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ روحانی پیشواؤں کی تو اوّلین ترجیح ہی نرم خوبی و نرم دلی ہوتی ہے ورنہ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر ہی نہیں سکتے۔

''واجد بھائی! آپ کو پیر سائیں یاد کر رہے ہیں۔'' پستہ قامت اسے مزید مرعوب کرنے یا دھمکیاں دینے میں کامیاب ہوتا، اس سے قبل ہی ایک آدمی عجلت میں وہاں آیا اور اسے پیغام دیا۔

''اوہ..... مجھے تو پیر سائیں کے وڈے ضروری کام سے جانا تھا۔'' پیغام سن کر واجد کے نام سے مخاطب کیا جانے والا پستہ قامت چونکا پھر ترکیب نمبر ایک یا دو استعمال کرنے کا مشورہ دینے والے شخص کی طرف پلٹا۔

''ابھی اسے سوچنے کے لیے تھوڑا ٹیم (ٹائم) دے دے۔ چنگا ہے کہ اس کے متھے میں گل آ جائے۔ ورنہ فیر تجھے اجازت ہے ہے کوئی سی بھی ترکیب آزما ڈال۔'' عجلت میں ہدایت دے کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''چل بھئی..... بھائی کی مہربانی سے تجھے تھوڑی مہلت مل گئی ہے۔ اگر عقل مند ہوا تو خود ہی اپنی آسانی کا فیصلہ کرے گا ورنہ ہم تو سچ اُگلوانے کے لیے تیار ہی ہیں۔'' درشت رو شخص نے واجد کی روانگی کے بعد اس سے کہا اور اپنے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اشارہ پاتے ہی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

''ہور سن.....'' اس نے باہر نکلنے سے قبل مشابرم خان کے پہلو میں ایک ٹھوکر ماری۔ ''اب کوئی لفڑا کرنے کی کوشش نہ کرنا ہور سکون سے یہاں پڑے رہنا۔ اگر اب تُو نے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کی تو میرے بندے تیری ہڈیوں کے اتنے ٹوٹے کریں گے کہ گنے بھی نہ جا سکیں گے۔'' اس نے مشابرم خان کے دروازہ توڑنے کی کوشش یاد آنے پر یہ دھمکی دی تھی جس پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے فرش پر پڑا اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور وہیں پڑے پڑے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سامنے وہی خالی سپاٹ دیواروں والا کمرہ تھا جس میں باہر کی روشنی اور ہوا اندر پہنچانے کے لیے صرف ایک ہوادان موجود تھا اور اس ہوادان کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ وہ کسی طور اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

احساسِ بے بسی سے اس نے اپنا دایاں ہاتھ زور سے زمین پر مارا اور پھر خود ہی بلبلا اٹھا۔ ظالموں نے اتنی بے دردی سے اس کی ٹھکائی کی تھی کہ چند منٹوں میں ہی سارا جسم دُکھتا ہوا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا اور آگے وہ اس پر جو طبع آزمائی کرنے والے تھے، اس کی تو سنی جانے والی تفصیل ہی لرزہ خیز تھی۔ عملاً اسے کسی تجربے سے گزرنے والا کس عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وہ بہادر اور باہمت تھا اور یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ ایذا رسانی کی کسی ترکیب کے سامنے ہتھیار ڈال کر زبان نہیں کھولے گا لیکن بہرحال اس کے دل میں یہ ایک فطری سی خواہش موجود تھی کہ اسے کسی ایسے دردناک تجربے سے نہ گزرنا پڑے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بچاؤ کی تدبیر کیا ہو گی؟ اگر اپنے سابقہ بیان پر ڈٹا رہتا تو وہ لوگ لازماً اسے تشدد کا نشانہ بناتے اور اگر کوئی نئی کہانی تراش لیتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اس کی کہانی پر یقین کر لیا جاتا۔

وہ عجیب ہی شش و پنج کے عالم میں زمین پر پڑا رہا پھر خیال آیا کہ اس طرح پڑے پڑے تو چوٹ کھایا ہوا جسم بالکل ہی اکڑ جائے گا، چنانچہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کے طول و عرض میں آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگا۔ ابتدا میں اسے اس عمل میں کافی تکلیف محسوس ہوئی لیکن پھر آخر کار ہاتھ پیر کھلنے لگے۔ ساتھ ہی یہ



اطمینان بھی ہو گیا کہ ضربات شدید ہونے کے باوجود اس کی ہڈیاں سلامت ہیں۔

''شش.....'' چہل قدمی کا سلسلہ جاری تھا کہ اس نے کمرے کی فضا میں ہلکی سی ششکار سنی۔ اس نے بے ساختہ ہی نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آخر کار اس کی نظر ہوادان کے چوکھٹے میں جا ٹھہری۔ وہاں ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے کی شکل نظر آ رہی تھی۔ اس سے نظر ملتے ہی لڑکا خوش نظر آنے لگا پھر اس نے گچھے کی شکل میں لپٹی رسّی کو اس کی طرف پھینکا۔ رسّی تیزی سے کھلتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔ اس وقت مشابرم خان نے پہلی بار یہ دیکھا کہ رسّی کے ایک سرے پر آنکڑا موجود ہے جو ہوادان میں پھنسا ہوا ہے جبکہ آزاد سرے کو لڑکے نے اس کی طرف پھینک دیا تھا۔ وہ خود بھی یقیناً اسی رسّی کی مدد سے وہاں تک پہنچا تھا۔ اسے حیرت ہونے لگی کہ بھلا تاہلی والا میں اس کا ایسا کون سا ہمدرد نکل آیا جو اسے اس قید خانے سے نجات دلانے کے لیے سرگرم ہو گیا ہے۔

''سوچ کیا رہے ہو، جلدی سے رسّی پکڑ کر اوپر آ جاؤ۔'' اسے مخمصے میں پڑے دیکھ کر لڑکے نے دھیمی آواز میں جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا اور رسّی کی مدد سے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

''لاؤ یہ رسّی اب مجھے دے دو۔ پہلے میں نیچے جاؤں گا۔ فیر تم آ جانا۔ نیچے پہنچ کر میں رسّی کو تین جھٹکے دوں گا۔ تم سمجھ لینا کہ اب تم رسّی کھینچ سکتے ہو۔'' جونہی وہ اتنی بلندی پر پہنچا کہ اس کے ہاتھ ہوادان کے فریم کو گرفت میں لے سکیں، لڑکے نے اسے ہدایات دینا شروع کر دیں۔ اس کی بات تھی بھی معقول۔ ہوادان اتنا وسیع نہیں تھا کہ اس میں بیک وقت دو آدمی سما سکتے۔ لڑکا وہاں سے ہٹتا، تب ہی اس کے لیے جگہ بن سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی رسّی چھوڑ کر ہوادان کا فریم گرفت میں لے لیا۔ دوسری طرف لڑکے نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور رسّی کی مدد سے دیوار کی دوسری طرف اُترنا شروع کر دیا۔ ہوادان کے چوکھٹے میں چڑھ کر بیٹھ جانے پر مشابرم خان کو باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکا رسّی کی مدد سے جس جگہ اُتر رہا تھا، وہاں ایک خشک نالہ تھا جس میں بہت سا گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ جمع تھا۔ قریب ہی ایک گدھا گاڑی کھڑی تھی جس کا گدھا ہر طرف سے بے نیاز ہو کر جھاڑیوں کے پتوں پر منہ مارنے میں مصروف تھا۔ اسے اچھی طرح جائزہ لینے پر بھی دور تک کوئی اور انسان نظر نہیں آیا۔

سارے منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ ایک بار پھر لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے قدم زمین پر ٹک چکے تھے اور وہ رسّی کو جھٹکے دے رہا تھا۔ پھر اسے متوجہ دیکھ کر اس نے جھٹکے دینا چھوڑ دیا اور ہاتھ سے اسے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ مشابرم خان اپنے اس کم سن ہمدرد کی ہدایت پر فوراً ہی عمل پیرا ہو گیا۔ ہوادان سے زمین کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اگر وہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد چھلانگ لگا دیتا تو کوئی دشواری پیش آتی۔ اس نے رسّی چھوڑ کر چھلانگ لگانے کا ارادہ بھی کیا لیکن پھر اس خوف سے ملتوی کر دیا کہ کہیں نیچے موجود جھاڑ جھنکاڑ میں نکیلے کانٹے نہ ہوں اور اس کے پیروں کو زخمی کر دیں۔ اسے قیدی بنانے والوں نے اس کے جوتوں سمیت ہر شے اپنے قبضے میں کر لی تھی اور وہ تن کے کپڑوں کے سوا ہر شے سے محروم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر قبل ہونے والی مار پیٹ نے ویسے ہی اس کا جوڑ جوڑ ہلا ڈالا تھا، چنانچہ وہ ذرا سی بداحتیاطی سے اپنے پیروں کو زخمی کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''جلدی کرو بھائی! یہاں زیادہ دیر رکنے سے گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔'' جیسے ہی اس کے قدم زمین سے ٹکے، لڑکے نے اس سے کہا۔

''تم کون ہو؟ اور مجھے یہاں سے کیوں نکالا ہے؟'' مشابرم خان نے اپنے ذہن میں مسلسل اٹھنے والا سوال اس سے کر ڈالا۔

''یہ ساری تفصیل بھی ہوتی رہے گی لیکن پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔''

لڑکے کے انداز میں واضح عجلت تھی۔ وہ تھوڑا سا خوف زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے حواریوں کے قیدی کو فرار کروانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ اور وہ کم سن لڑکا اگر کسی بھی وجہ سے یہ جرأت کر بیٹھا تھا تو اسے بہر حال اپنی سلامتی کی فکر تو دامن گیر ہونی ہی تھی۔

''میں تمہیں پنڈ سے باہر نکال دوں گا اس سے آگے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہوگی۔'' خشک نالے سے نکل کر گدھا گاڑی کی طرف جاتے ہوئے لڑکے نے اسے بتایا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟..... کم از کم اتنا ہی بتا دو تا کہ بات چیت کرنے میں آسانی رہے۔'' حالات کو سمجھتے ہوئے اس نے لڑکے کا تفصیلی حدود اربعہ معلوم کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

''علی بخش۔'' لڑکے نے مختصر جواب دیا جسے سن کر وہ چونک پڑا۔ پیر سائیں اور حامد راؤ کی شخصیت کے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کرنے والے مزارع کا نام نور بخش تھا اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ لڑکے کی اس سے کوئی نسبت ہے۔ ویسے تو گاؤں دیہاتوں میں اس قسم کے نام رکھنا ایک عام سا رواج ہوتا ہے لیکن ٹاہلی والا اس کے لیے ایک بالکل اجنبی پنڈ تھا جہاں وہ یہی امید کر سکتا تھا کہ جلے ہوئے کھیتوں میں ملنے والے نور بخش کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے ہوں اور اس نے اپنے کسی رشتے دار کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔

لڑکے کی عمر دیکھتے ہوئے وہ یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ نور بخش کا بیٹا ہوگا کیونکہ اپنی گفتگو میں نور بخش نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس کا بیٹا، شفقت راؤ کے بیٹے کا ہم عمر اور ابتدائی درجوں کا ہم جماعت تھا۔ اس حساب سے علی بخش نامی وہ لڑکا نور بخش کا بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی، فی الحال وہ صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔ تصدیق یا تردید اسی وقت ہوتی جب لڑکا اس سے گفتگو پر آمادہ ہوتا۔

''تم اس گدھا گاڑی پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے اوپر گھاس وغیرہ پھیلا دوں گا۔ اس طرح کوئی تمہیں دیکھ نہیں سکے گا۔''

گدھا گاڑی کے قریب پہنچ کر علی بخش نام بتانے والے لڑکے نے اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً عمل درآمد کر ڈالا۔ لڑکا پھرتی سے اس کے اوپر گھاس کے گٹھر پھیلانے لگا۔ یہ گٹھر یقینی طور پر اس کے منصوبے کا ایک لازمی حصہ تھے جن کا اس نے پیشگی انتظام کر رکھا تھا۔ گٹھر پوری طرح اس پر جمانے کے بعد علی بخش اُچک کر گدھا گاڑی پر سوار ہو گیا اور گدھے کو چابک رسید کر کے چلنے کا اشارہ دیا۔ اس آخری منظر کو مشاہرم خان نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا بلکہ محض آوازوں اور حرکت سے تصور میں لایا تھا کیونکہ گھاس کے گٹھروں کے نیچے دبے ہونے کی وجہ سے نہ صرف وہ خود دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا بلکہ خود بھی کسی کو دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہچکولے کھاتی گدھا گاڑی پر شروع ہونے والا سفر اتنا خوش گوار نہیں تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کے نتھنوں میں گھاس کی خوشبو گھسی جا رہی تھی اور سانس لینے کے لیے ہوا کی خاصی قلت تھی۔ اس پر سے مستزاد یہ کہ اسے اپنے وجود پر گھاس کے گٹھروں کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کے لیے یہ صورتِ حال قابل قبول تھی کیونکہ یہی اس کی آزادی کی راہ تھی۔ ایک ایسی جگہ پر ہاں اس کا کوئی آشنا یا دوست موجود نہیں تھا اور وہ اپنے موبائل سمیت ہر شے سے محروم کر دیئے جانے کے بعد بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا،



آزادی کی اس صورت کا نکل آنا غیبی امداد ہی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس غیبی امداد پر کسی قسم کا اعتراض کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

گدھا گاڑی کا جھٹکوں اور ہچکولوں سے بھرپور وہ سفر جانے کتنی دیر جاری رہا۔ پھوڑے کی طرح دُکھتے جسم کے ساتھ اسے تو یہ سفر خاصا طویل ہی لگا تھا چنانچہ جب گدھا گاڑی رکی تو اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے گٹھر ہٹا کر اٹھ بیٹھنے کی شدید خواہش پر قابو پاتے ہوئے علی بخش کی طرف سے اشارہ ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اس کی ذرا سی بھی بد احتیاطی کسی بڑی مصیبت کو دعوت دے سکتی ہے۔

''میں گٹھر ہٹا رہا ہوں۔'' اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت سے نہیں گزرنا پڑا اور کان میں علی بخش کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ سرگوشی کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے اوپر سے گٹھر ہٹتے محسوس کیے اور بالآخر کھلا آسمان بھی دکھائی دے ہی گیا۔

''بہت بہت شکریہ علی بخش! آج تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ تم جو بھی ہو اور تم نے جس بھی وجہ سے میری مدد کی ہے، میں اس احسان کے بدلے میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں۔'' اس نے گدھا گاڑی پر بیٹھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کیے۔

''تمہارا شکریہ میں بعد میں وصول کرتا رہوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' اچانک ہی علی بخش نے بالکل ہی بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ اس سے یہ سوال کیا تو وہ چونک پڑا اور بہت تیزی سے یہ خیال ذہن میں آیا کہ کہیں یہ لڑکا بھی پیر سائیں کے ہرکاروں میں سے ایک نہ ہو جسے اس سے سچ اُگلوانے کے لیے اس طریقے سے استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن لڑکے کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سادگی ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے کی تردید کر رہی تھی۔ وہ دُبلا پتلا لڑکا جس کی ابھی صرف مسیں بھیگی تھیں، کسی طرح ان کرخت صورت اور مکار لوگوں میں سے محسوس نہیں ہو رہا تھا جنہیں پیر سائیں کے مرید ہونے کا دعویٰ تھا۔

''میں تمہارے انداز کی تبدیلی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ کچھ دیر پہلے تم مجھے اپنے ہمدرد محسوس ہو رہے تھے اور اب مجھ پر یہ کلہاڑی تانے کھڑے ہو۔'' اس نے دزدیدہ نظروں سے علی بخش کے ہاتھ میں موجود چمک دار پھل والی کلہاڑی کو دیکھ لیا۔ یہ کلہاڑی اس نے گدھا گاڑی میں سوار ہوتے وقت بھی ایک جانب پڑی دیکھی تھی لیکن یہ گمان نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے خود اسی کی ذات پر آزمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

''فی الحال میں تمہارا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ دوستی اور دشمنی کا فیصلہ اسی وقت ہوگا جب میں یہ جان لوں گا کہ میرے باپ کی موت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ ابھی تم یہ جان لو کہ ہم جس جگہ پر موجود ہیں یہاں عام طور پر کوئی نہیں آتا اس لیے اگر میں تمہیں قتل بھی کر ڈالوں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں تمہارا قتل کر کے کسی مشکل میں نہیں پھنسوں گا بلکہ میرے اس کارنامے کے بدلے پیر سائیں کے چاہنے والے میری پیٹھ ہی تھپکیں گے۔ ہاں اگر تم بے گناہ ہو تو یہ بھی بتا دوں کہ اس جگہ سے تمہیں پنڈ کے باہر کسی محفوظ مقام تک پہنچانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

اپنے باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کی آواز بھرائی تھی اور آنکھوں میں نمی سی ظاہر ہوئی تھی لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور دوٹوک انداز میں اس پر اس کی پوزیشن واضح کرنے لگا۔

''دیکھو بچے! تم مجھ سے کھل کر بات کرو۔ تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو اور میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن تمہارا سوال مجھ پر واضح نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ تو پھر

اس کی بات کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' اس نے نرمی اور تحمل سے کام لیتے ہوئے علی بخش کو جواب دیا۔

''تم میرے باپ کو نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ اتنی دیر تک کھیتوں میں بیٹھے باتیں کیوں کر رہے تھے؟'' اس نے چیخ کر سوال کیا۔

''اوہ.....تو تم نور بخش کے بیٹے ہو۔'' اندازہ تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا، اب تصدیق ہونے پر دانستہ لہجے میں تحیر پیدا کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں اسی نور بخش کا بیٹا ہوں جسے تمہاری موجودگی میں گولی ماری گئی تھی اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے باپ کا آخر قصور کیا تھا؟'' اس بار اس کی آواز کی بھرّاہٹ اتنی نمایاں تھی کہ مشابرم خان کو لگا کہ وہ اگلے ہی پل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا۔ ساتھ ہی اسے گولی چلنے کی وہ آواز بھی یاد آئی جو اس نے بے ہوشی میں جاتے ہوئے سنی تھی۔ وہ حقیقتاً مضطرب ہوا تھا۔

''تو کیا نور بخش کو قتل کر دیا گیا؟''

''ہاں..... میں نے اپنی نظروں کے سامنے اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ نہیں کر سکا۔ وہ لوگ اسے قتل کرنے کے بعد تمہیں اٹھا کر دیدہ دلیری کے ساتھ فرار ہو گئے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا میرے باپ کے قتل سے کیا تعلق ہے؟ ان لوگوں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر اسے کیوں مار ڈالا؟'' علی بخش کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ خود مشابرم خان کو نور بخش کے قتل کا سن کر شدید افسوس ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس غریب مزارع کو صرف اس جرم میں کہ وہ اسے چند حقائق سے آگاہ کر بیٹھا تھا، جان سے مار دیا گیا تھا۔

''مجھے نور بخش کی موت پر شدید افسوس ہے۔'' اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر تم چاہو تو مجھ اپنے باپ کے قتل کا ذمے دار سمجھ کر مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔'' وہ بلا کم و کاست علی بخش کو اپنی ٹاہلی والا میں آمد سے لے کر نور بخش سے ملاقات کی تفصیل تک سب سناتا چلا گیا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ اس معاملے میں شہریار کا نام استعمال کرنے کے بجائے خود کو کسی خفیہ ادارے کا ملازم ظاہر کیا تھا۔ اتنا کچھ بھی وہ اس لیے بتا گیا تھا کہ اسے یہ چھوٹا سا لڑکا بہت اچھا اور قابلِ اعتماد لگا تھا۔ پھر نور بخش نے صداقت والے معاملے میں اس کا جس طرح سے ذکر کیا تھا، اس سے بھی ظاہر تھا کہ وہ خاصی فہم و فراست کا مالک ہے اور اسے کچھ بتا دینا نقصان دہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ جو بھی بات ہو گی، اس میں اصل قصور پیر سائیں کے غنڈوں کا ہی ہو گا۔ مجھے معاف کرنا بھرا! اپنے غم میں، میں تمہارے ساتھ تھوڑی بدتمیزی کر گیا۔'' تفصیلات سن کر اس نے فوراً ہی معافی مانگ لی۔

''نہیں میرے بھائی! تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کیا، اپنی جگہ صحیح کیا بلکہ میں تمہاری جرأت اور ہوشیاری پر حیران ہوں۔ تم اتنے چھوٹے ہو کر جس طرح ان غنڈوں کے خلاف عمل میں آئے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' مشابرم خان نے دل کی گہرائیوں سے اسے سراہا جس پر علی بخش کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ اُداس سے لہجے میں بولا۔

''سچ بات یہ ہے بھائی! کہ جب انسان کے دل میں آگ لگی ہو تو جرأت اور ہوشیاری خود بہ خود ہی آ جاتی ہے۔ میں اپنے باپ کی دردناک موت پر اتنا دُکھی ہوں کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تم مجرم نکلے تو تمہیں مار ڈالوں گا ورنہ اگر تم میرے باپ کے دوست ہو تو تمہیں بچانا اور اس کی موت کا اصل سبب جاننا بھی میرا فرض ہے۔ زیادہ شک تو مجھے یہی تھا کہ اصل مجرم پیر سائیں کے غنڈے ہی ہیں۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ تھانے میں ابا کے قتل کی جو رپورٹ درج ہوئی ہے، اس میں تمہیں مفرور قاتل ظاہر کیا گیا ہے اور ثبوت میں جائے وقوعہ سے



تمہارا موبائل اور شناختی کارڈ ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس رپورٹ کی مخالفت کرنا چاہتا تھا لیکن میری ماں نے مجھے روک دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ شوہر کے قتل کے بعد وہ اپنے بچوں کو نہیں کھونا چاہتی، اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔ ماں کے احترام میں، میں نے سر جھکا دیا لیکن میں کسی طرح اپنے باپ کے قتل کو نہیں بھول سکتا تھا اس لیے حرکت میں آ گیا۔'' علی بخش نے اسے تفصیل سے بتایا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں قید ہوں؟ پھر تم ٹھیک اسی کمرے کے ہوادان تک پہنچ گئے جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔'' مشابرم خان بھی اپنی ساری اُلجھنیں دُور کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

''تمہیں جہاں رکھا گیا تھا، وہ مکان باقی گاؤں سے کافی ہٹ کر ہے اور آسیب زدہ مشہور ہے اسی لیے اس کے آس پاس کا علاقہ بھی ویران ہی رہتا ہے۔ ہمارے پاس چند پالتو بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ ہیں۔ میں ان کے لیے چارے کا بندوبست کرنے کبھی کبھی اس طرف بھی نکل جاتا تھا اس لیے میری نظر میں یہ بات آ گئی کہ اس مکان میں پیر سائیں کے مریدوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے انہیں وہاں کچھ رکھتے یا نکالتے بھی دیکھا ہے۔ ڈبے میں پیک وہ کیا چیز ہوتی ہے مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے ابا کی تدفین کے بعد جب تمہیں تلاش کرنے کے بارے میں سوچا تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ پیر سائیں کے غنڈے تمہیں وہیں لے گئے ہوں گے۔ میں گھر سے جانوروں کے لیے چارہ لانے کا بہانہ کر کے نکلا اور مکان کے قریب چھپ کر نگرانی کرنے لگا۔ جب میں نے پیر سائیں کے واجد نامی چہیتے مرید کو اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں آتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم وہیں ہو۔ خوش قسمتی سے دو سال تک ہمارے اسکول میں ایک ایسے استاد نے بھی پڑھایا تھا جنہوں نے ہمیں اسکاؤٹس بننے کی تربیت دی۔ اسی تربیت کی وجہ سے میں رسّی کی مدد سے اوپر ہوادان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ تم اسی کمرے میں موجود تھے۔ مکان کا پچھلا حصہ ہونے کی وجہ سے کسی نے مجھے وہاں دیکھا بھی نہیں اور میں آرام سے تمہیں وہاں سے نکال لایا۔''

علی بخش کی بتائی ہوئی ہر بات اس کے ذہن میں اُٹھتے ہوئے سوالوں کا جواب بنتی جا رہی تھی چنانچہ وہ سکون بھرا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے امید ہے کہ اب تمہارا مجھ پر سے شک دور ہو گیا ہو گا اور اب تم مجھے گاؤں سے باہر نکالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھو گے۔''

''بالکل..... کیوں نہیں؟ لیکن تمہیں ایک بار پھر گھاس کے گٹھروں کے نیچے لیٹنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ میں جس راستے سے تمہیں گاؤں سے باہر نکالنے والا ہوں، وہ عام گزرگاہ نہیں ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔'' علی بخش نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔'' وہ فوراً ہی راضی ہو گیا اور ایک بار پھر پہلے والے انداز میں لیٹ گیا۔ علی بخش اس کے جسم پر گھاس کے گٹھر جمانے لگا۔

''ایک بات سنو علی بخش!'' اس نے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اسے پکارا۔

''ہاں بولو بھائی!'' وہ فوراً ہی متوجہ ہو گیا۔

''میں تم پر زور نہیں دے رہا۔ نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں پڑے لیکن اگر تم اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا چاہتے ہو تو اتنا کر سکتے ہو کہ اپنے ہاتھ پیر بچاتے ہوئے ان لوگوں پر نظر رکھو کہ یہ پیری مریدی کے بھیس میں اصل کام کیا کر رہے ہیں۔ کسی دن میں یا میرا کوئی آدمی آ کر تم سے معلومات لے لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ذرا سی کوشش کی جائے تو ہم ان بہروپیوں کی اصلیت جان کر انہیں بے نقاب کر

دیں گے اور تمہارے گاؤں کے سادہ لوح لوگ ان کے شر سے محفوظ ہو جائیں گے۔'' مشابرم خان نے بہت سبھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر علی بخش نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر فوراً ہی اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے حامی بھرنے پر وہ خوش ہو گیا۔ پھر علی بخش کو اپنے چہرے کے سامنے گٹھر رکھتے دیکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ٹاہلی والا میں بہت مشکل وقت گزارنے کے باوجود وہ یہاں سے بالکل ہی ناکام واپس نہیں جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ جتنی کارگزاری وہ دکھا سکا ہے، اسے بھی شہریار کی طرف سے سراہا جائے گا۔

⊛----✪----⊛

''بات سننا بہن!'' ماہ بانو بس سے اُتری تو اس کے ساتھ اُترنے والوں میں وہ عورت بھی شامل تھی جو اپنے بچے کے ساتھ اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی اور راستے بھر وقفے وقفے سے روٹی کے ٹکڑوں کو آم کے اچار سے کھاتی رہی تھی۔ اپنے مطلوبہ بس اڈے پر اس عورت کو اُترتے دیکھ کر اس نے بہتر سمجھا کہ اسی سے اسلم کے گھر کا اتا پتہ معلوم کر لے تاکہ بغیر بھٹکے سیدھی وہاں پہنچ سکے۔

اسلم نے اسے بس اڈے سے اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے کچھ نشانیاں تو بتائی تھیں لیکن پھر بھی وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسا کوئی نظام بھی نہیں تھا کہ کسی کا گھر تلاش کرنے کے لیے مکان نمبر یا گلی نمبر کا استعمال کیا جا سکے۔ یہاں یہ طریقہ رائج ہی نہیں تھا۔ چھوٹے سے گاؤں کی مختصر سی آبادی میں لوگ ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے کہ باپ دادا کے ناموں تک سے بھی واقف تھے۔ یہ بات اسلم نے اسے بطورِ خاص بتائی تھی۔ وہ خود بھی گاؤں دیہاتوں کے اس طرزِ زندگی سے واقف تھی۔ اس لیے اپنی ساتھی مسافر کو اپنے ساتھ ہی اُترتے دیکھ کر اسے مخاطب کر بیٹھی۔ وہ عورت اس کی طرح تنہا نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ بس سے ایک مرد بھی اُترا تھا۔ دُبلا پتلا، گہری رنگت اور دراز قامت والے اس مرد کے چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں جس کی وجہ سے چہرے پر کرختگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عمر میں عورت سے لگ بھگ دس بارہ سال بڑا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیہڑی گل ہے ادی؟'' اس کے پکارنے پر عورت متوجہ ہوئی تو مرد بھی قدرے فاصلے پر رک کر دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کے چھوٹے علاقوں میں تنہا عورت خود بہ خود ہی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

''یہاں اس گاؤں میں اسلم تیلی کی ماں رہتی ہے۔ مجھے اس کے گھر تک جانا ہے۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر عورت کوئی جواب دیئے بغیر ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''اسلم کا باپ اکرم تیلی ریلوے میں ملازمت کرتا تھا اور کئی سال پہلے مر چکا ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس نے خودکشی کر لی تھی۔'' عورت کے تاثرات سے وہ یہ سمجھی کہ وہ اس کا مدعا نہیں سمجھ سکی ہے اس لیے مزید حوالے دینے لگی۔

''آپ زینت بی بی کا تو نہیں پوچھ رہی ہیں؟'' عورت کے کچھ بولنے سے قبل مرد نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس کے دوبدو ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہاں وہی.....'' اسے یاد آ گیا کہ اسلم نے اپنی ماں کا یہی نام بتایا تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلو۔ میں آپ کو زینت بی بی کا گھر دکھا دوں گا۔'' مرد نے فوراً ہی پیشکش کی جسے اس نے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا اور ان کا بس اڈے سے پیدل سفر شروع ہو گیا۔ حسبِ توقع سفر لمبا تھا۔

''آپ اسلم کی کون ہو؟'' راستے میں مرد نے اس سے دریافت کیا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا۔



''میں ان لوگوں کی دور کی رشتے دار ہوں اور کراچی سے آئی ہوں۔ مجھے کسی سے اطلاع ملی تھی کہ زینت بی بی، بیٹی کی موت اور بیٹے کے فرار کے بعد بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ میں بھی کراچی میں اکیلی ہی رہتی ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ زینت بی بی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کی ہی تنہائی دور ہو جائے گی۔'' اس نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی اسے سنا ڈالی۔

''تم اکیلی کیوں رہتی ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟'' مرد نے فوراً ہی ایک دوسرا سوال داغ دیا۔

''میرے شوہر ملک سے باہر ہیں اور سال چھ مہینے میں ہی چکر لگاتے ہیں اسی لیے میں زینت بی بی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے تحمل سے جواب دیا۔

''تمہارے بچے نہیں ہیں؟'' وہ اس کا مکمل انٹرویو لینے پر تلا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ مختصر جواب دیا۔ مرد کے مقابلے میں عورت نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھائے چپ چاپ چلتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتے مرد کو اتنی تکلیف بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیدل چلنے کی اس مشقت میں کم از کم عورت کو بچے کے بوجھ سے آزاد کر کے اسے اپنی گود میں لے لے۔

''لاؤ بہن! تھوڑی دیر کے لیے بچہ مجھے تھما دو۔'' کچھ عورت کی ہمدردی میں اور کچھ مرد کے سوالات سے بچنے کے لیے اس نے عورت کو پیشکش کی۔

''نہیں ادی! تم پریشان نہ ہو۔ مجھے عادت ہے بچہ گود میں اٹھا کر چلنے کی۔'' فوراً ہی اس کا مقصد سمجھتے ہوئے عورت نے جواب دیا۔

جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں پل بھر کے لیے ماہ بانو کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہنے سے معذور ہو۔

''یہ ٹھیک بول رہی ہے بی بی! ہماری عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک مزاج نہیں ہوتیں کہ ذرا سا بچہ گود میں لے کر چلنے سے کمر میں بل پڑ جائے۔'' مرد نے اپنی دخل اندازی ضروری سمجھتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ جواب میں ماہ بانو نے بحث نہیں کی۔ اس اجنبی گاؤں میں جہاں وہ اسلم کے حوالے کے ساتھ آئی تھی، کسی سے بھی غیر ضروری مخالفت مول لینا مناسب نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی معمولی نظر آنے والی باتیں بھی آگے چل کر بڑی بڑی مصیبتوں کو جنم دیتی ہیں اس لیے بہتر تھا کہ وہ حتی الامکان احتیاط سے کام لیتی۔

''پہلے میں اپنی زنانی کو گھر چھوڑوں گا، پھر تمہیں زینت بی بی کا مکان دکھاؤں گا۔'' چلتے چلتے جب وہ لوگ ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے مکانات نظر آنے لگے تو مرد نے اس سے کہا۔ جواب میں اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ مکانات کا سلسلہ شروع ہوا تو مرد کے قدموں میں تیزی آ گئی اور وہ ان دونوں سے چند قدم آگے بڑھ گیا۔ ماہ بانو کی نظر اسی پر تھی اس لیے جب چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے بائیں ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا تو بری طرح چونک گئی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی عورت تھی جس نے اس کے بائیں ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالا تھا۔

''تمہیں اسلم نے یہاں بھیجا ہے نا؟'' اس نے بے حد مدھم آواز میں اس سے سوال کیا۔ سوال بھی کیا تھا اس کو یا ایک یقین سا تھا اس کے الفاظ میں اور وہ ماہ بانو سے محض تصدیق چاہ رہی تھی۔ اُس کے اس قدر درست اندازے پر وہ ششدر سی رہ گئی۔

''تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اسلم مشکل میں پڑ جائے گا۔'' شاید ماہ بانو کے تاثرات نے ہی تصدیق کا کام

کر دیا تھا جو وہ اس کی زبان سے جواب سنے بغیر عجلت میں بولی۔

''تم کون ہو، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہے؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ لیکن عورت کو جواب دینے کا موقع نہیں ملا اور مرد نے پلٹ کر اسے ڈپٹا۔

''کیا مرے مرے قدموں سے چل رہی ہے۔ گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا کیا؟'' اس کے لہجے میں ایسی تندی اور کاٹ تھی کہ عورت کے قدم برق رفتاری سے حرکت میں آ گئے اور پل بھر میں ہی وہ اس سے کئی قدم آگے بڑھ گئی۔ ماہ بانو ہکا بکا اسے دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ ایک پختہ مکان کے دروازے میں داخل ہو کر غائب بھی ہو گئی۔

''چلو بی بی! اب میں تمہیں زینت بی بی کا گھر دکھا دیتا ہوں۔'' اس سے قبل کہ وہ عورت کے دیئے مشورے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتی، مرد اس کی طرف پلٹا۔ وہ بھی سر جھٹک کر اس کے پیچھے ہو لی۔ اب جبکہ یہاں تک آ ہی گئی تھی تو واپس پلٹنا بے کار تھا۔ رہی خطرہ مول لینے والی بات تو خطرہ تو اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر کے پہلے ہی مول لے لیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' مرد کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔

''نواز چانڈیو۔'' اس نے بتایا پھر پوچھنے لگا۔ ''تم میرا نام کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''بس..... میں نے سوچا کہ زینت خالہ سے ملوں گی تو انہیں بتاؤں گی کہ مجھے ان تک پہنچانے والے مہربان لوگ کون ہیں۔'' اس نے بے پروا سا انداز اختیار کر کے جواب دیا۔

''ضرور بتانا۔ وہ میرا نام سن کر بہت خوش ہو گی۔'' نواز چانڈیو کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جسے دیکھ کر ماہ بانو کو اس کی بیوی کی تنبیہہ یاد آ گئی اور دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید وہ بہت زیادہ خطرے میں گھر گئی تھی لیکن اب کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب تو کوئی جائے فرار بھی نہیں رہی تھی۔

''وہ دیکھو، وہ رہا زینت بی بی کا گھر۔ تم جا کر اس سے مل لو۔ میں واپس جاتا ہوں۔'' اس کے دل میں پیدا ہوتے خدشات کے برخلاف نواز چانڈیو اسے دور ہی سے ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے واپس پلٹ گیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اسے وہاں سے جاتا دیکھتی رہی پھر اس مکان کی طرف متوجہ ہوئی جس کی جگہ وہ اشارہ کر گیا تھا۔

مکان باہر سے دیکھنے میں بالکل ویران اور بے آباد لگ رہا تھا۔ ایک ایسا مکان جو اپنے مکینوں سے محروم ہو گیا ہو اور وہاں صرف ایک بوڑھی غم زدہ عورت باقی رہ گئی ہو۔ اسے ایسا ہی ویران اور وحشت زدہ نظر بھی آنا چاہئے تھا۔ اس نے بوجھل ہوتے دل کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی لیکن کئی بار کی دستک کے جواب میں بھی اندر سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ البتہ وہ اتنا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے اور اسے ہاتھ سے دھکیل کر کھولا جا سکتا ہے۔

کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس نے یہی طریقہ استعمال کیا۔ پرانا بوسیدہ دروازہ اس کے دھکا دیتے ہی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا اور اس نے ایک بار پھر دستک دینے کے بعد قدم اندر رکھا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی قوتِ شامہ نے اندازہ لگا لیا کہ یہ دروازہ بہت دنوں بعد کھلا ہے اور اندر صفائی وغیرہ کا کوئی معقول انتظام بھی نہیں ہے۔ گرد سے اٹے فرش پر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑتی ہوئی وہ اندر کا جائزہ لینے لگی۔

گھر چھوٹا سا تھا اور اس میں باورچی خانے اور غسل خانے کے علاوہ صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں جھانکنے پر اسے چارپائی پر پڑا مدقوق سا وجود نظر آ گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی وہ عورت جس کی آنکھیں



دروازے پر جمی تھیں، اسلم کی ماں ہے، یہ سوچ کر اسے سخت صدمہ ہوا۔

اسلم ایک دن باتوں باتوں میں اس کے سامنے ذکر کر چکا تھا کہ وہ شکل وصورت میں اپنی ماں سے مشابہ ہے۔ لیکن اس کے سامنے جو عورت لیٹی تھی، اس کے نین نقش تو جانے کہاں کھو گئے تھے؟ گوشت سے محروم چہرے پر ہڈیوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بس سیاہ آنکھیں تھیں جو دو گڑھوں میں دھنسی دروازے کی جانب نگراں تھیں۔ وہ لپک کر عورت کے قریب پہنچی اور اس کا ہاتھ تھام کر ہاتھوں سے لگاتے ہوئے رو پڑی۔ روتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے بس ایک لفظ نکل سکا۔

''ماں جی.....!'' اور آگے آنسوؤں کے حلق میں پھنسے گولے نے اسے کچھ بولنے نہیں دیا۔

''اس.....لم.....!'' جواباً انہوں نے بالکل ہی دھیمی، نقاہت زدہ آواز میں ایک لفظ پکارا، وہ بھی ٹکڑوں میں۔ صاف ظاہر تھا کہ کمزوری اتنی زیادہ ہے کہ انہیں بولنے کا بھی یارا نہیں رہا۔

''میں آپ کو اسلم کے پاس لے جانے کے لیے آئی ہوں ماں جی!'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ان سے کہا۔

جواباً انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا جس سے وہ یہی سمجھی کہ وہ اس حالت میں بھی اپنی ضد پر قائم ہیں اور بیٹے سے ملنے کے لیے راضی نہیں۔

''اسے معاف کر دیں ماں جی! وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ آپ کی ناراضگی کا خیال اسے سکون سے جینے نہیں دیتا اور وہ دن رات آپ سے ملنے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں ان سے استدعا کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر انہوں نے گویا اپنی تمام تر ہمت اور توانائی کو یکجا کرتے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دی۔

''ما.....معاف کر دیا اُسے..... پر اب.....'' ان کی آواز دھیمی سے دھیمی ہوتی چلی گئی۔ ماہ بانو نے اپنے کان ان کے متحرک ہونٹوں سے تقریباً چپکا لئے۔ وہ ان کی زبان سے نکلنے والے ایک بھی لفظ کو سننے سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھی۔

''ملنے کا وقت.....'' انہوں نے اپنا جملہ مکمل کرنا چاہا لیکن نہ کر سکیں۔ البتہ ماہ بانو نے ان کی بات کا مفہوم سمجھ لیا۔ وہ اسلم کو دل سے معاف کر چکی تھیں لیکن انہیں اپنی حالت کی وجہ سے امید نہیں تھی کہ بیٹے سے مل سکیں گی۔ پہلے بھی اشارے میں شاید انہوں نے اسے یہی بات سمجھانی چاہی تھی۔

''ایسی باتیں نہ کریں ماں جی! میں آپ کو اس کے پاس لے کر چلوں گی۔ ابھی آپ کو بہت دن جینا ہے تاکہ ہم آپ کی دعاؤں کے سائے میں زندگی گزار سکیں۔ ہم شادی کرنے والے ہیں ماں جی! اور اس موقع پر آپ کا موجود ہونا بہت ضروری ہو گا۔ آپ کی دعاؤں کے بغیر اسلم کیسے دولہا بنے گا؟'' وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اس تنِ مُردہ میں جان ڈال دے۔ بس دل میں یہی خیال تھا کہ اسلم کو دل و جان سے چاہنے والی ماں اس کی خوشی کا سن کر پھر سے جی اُٹھے گی اس لیے شرم وحیا کو بھلا کر ان کے سامنے اپنی اور اسلم کی متوقع شادی کا ذکر کر ڈالا۔

اس ذکر کو سن کر بوڑھی نحیف آنکھوں میں خوشی کی رمق سی جاگی اور انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا۔ ان کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنا سر ممکنہ حد تک جھکا لیا تاکہ انہیں زیادہ زحمت نہ کرنی پڑے۔ ان کا ہاتھ بس پل بھر کے لیے اس کے سر پر ٹکا اور واپس گر گیا۔ وہ فوراً ہی سر اٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ گہری گہری سانسیں لیتی وہ اس بری طرح ہانپ رہی تھیں جیسے نہ جانے کتنی مشقت سے گزری ہوں۔

اس نے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پلنگ کے بالکل قریب ہی اسے پھلوں کی دو پیٹیوں کو اوپر تلے رکھ کر بنائی گئی عارضی سی میز نظر آ گئی۔ وہاں دیگر سامان کے ساتھ پانی کا ایک کٹورا بھی رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے وہ کٹورا اٹھایا۔ اس میں بس تھوڑا سا ہی پانی تھا اور وہ بھی کچھ اتنا صاف نہیں لگ رہا تھا کہ وہ عام حالات میں کسی انسان کو پلانے کا سوچتی۔ لیکن یہاں حالات سخت مخدوش تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس دور دراز گاؤں میں پانی کی کس قدر قلت ہے۔ جیکب آباد سے مال گاڑی کے ذریعے ہفتے میں صرف دو دن آنے والے پانی تک اس بوڑھی کمزور عورت کی پہنچ ہونا ناممکن تھا چنانچہ اس نے دل پر جبر کر کے وہی کٹورا ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کے محض چند قطرے ان کے منہ کے اندر گئے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ گیا اور اس سے قبل کہ وہ مزید پانی پلانے کی کوشش کرتی، انہیں ایک جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئیں۔

اس نے ہراساں سی ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ساکت تھیں اور نیم وا آنکھوں کی پتلیاں غیر متحرک نظر آ رہی تھیں۔ وہ ششدر سی ان کے وجود کو ٹٹولنے لگی۔ نہ کہیں دھڑکن تھی اور نہ ہی سانسوں کی آمد و رفت۔ وہ اتنی آسانی اور خاموشی سے دنیا کو خیر باد کہہ گئی تھیں کہ وہ قریب ہونے کے باوجود اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ نزع کی تکلیف کا اس نے بہت ذکر سنا تھا۔ خود بھی اپنی آنکھوں کے سامنے کئی لوگوں کو مرتا دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کسی کی روح اتنی آسانی سے نکلتے نہیں دیکھی تھی۔ اسلم کی ماں زینت بی بی یقیناً کوئی نیک خاتون تھیں جن کی روح قبض کرتے ہوئے فرشتۂ اجل نے بھی بہت نرمی سے کام لیا تھا۔ اس حادثے پر وہ کئی منٹ تک حیران و پریشان سی بے یقینی کے عالم میں وہیں بیٹھی رہی۔ پھر خیال آیا کہ زندگی کی ضرورتوں سے آزاد ہو جانے والی زینت بی بی کو بے گور و کفن تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ان کے پڑوسی ہی اس کے سب سے بہترین معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ان کے گھر سے باہر نکلی اور بالکل دیوار سے جڑے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہو بی بی؟'' ایک ادھیڑ عمر عورت دروازے پر آئی اور اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

''میں آپ کے برابر والے گھر سے آئی ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ زینت بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے اسلم کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کو اطلاع دی جسے سن کر اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات اُبھرے لیکن پھر وہ بڑی بے رخی سے بولی۔

''ابھی میں مصروف ہوں، بعد میں آ جاؤں گی۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں دی اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ ایسی سرد مہری اور بے اعتنائی تو اس نے شہروں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ لوگ کسی کی خوشیوں میں شامل ہوں نہ ہوں لیکن ایسے برے وقت میں تو بہر حال تھوڑا بہت ساتھ دے ہی دیتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کی تو پھر بات ہی الگ ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی خوشیوں اور غموں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں جانے کیا بات تھی کہ زینت بی بی کی قریب ترین پڑوسن نے بھی اس کے مرنے پر بے رخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ مایوس اور افسردہ سی تھکے تھکے قدموں سے واپس اسلم کے گھر کی طرف چل پڑی۔ دھول مٹی میں اٹے اس گھر میں اسلم کی ماں کی لاش موجود تھی اور وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

زینت بی بی کے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ چند لمحے پہلے جس پڑوسن نے شدید بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ زینت بی بی کے مُردہ جسم سے لپٹی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگی۔ آخر کچھ دیر میں عورت نے خود کو سنبھال ہی لیا اور سیدھی بیٹھ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔



''معاف کرنا بیٹی! میں نے مجبوری میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا تھا۔ مجھے تمہارے پیچھے کافی فاصلے پر نواز چانڈیو کھڑا ہوا نظر آ گیا تھا اس لیے میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا۔ وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ فوراً ادھر آ جاتی تو وہ میری بچی کا جینا اور بھی مشکل کر دیتا۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں خالہ!'' اس کے لیے عورت کے وہ جملے واقعی ناقابلِ فہم تھے اس لیے بے بسی سے بولی۔

''ہاں، تم کیسے سمجھو گی؟'' عورت نے ایک گہرا سانس لیا پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''تم زینت بی بی کی کون ہو؟ میں نے اس سے پہلے کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔''

جواب میں اس نے وہی کہانی دہرا دی جو اس سے قبل نواز چانڈیو کو سنائی دی۔

''خیر..... تم جو بھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم زینت اور اس کے بیٹے کی ہمدرد ہو اس لیے تمہیں تفصیل بتاتی ہوں۔'' عورت کا انداز ایسا تھا جیسے اسے ماہ بانو کی بات پر یقین نہ آیا ہو لیکن اس نے بحث نہیں کی اور گفتگو پر آمادہ نظر آنے لگی۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہو گا نا کہ زینت کا بیٹا اسلم ایک بھاگا ہوا مجرم ہے اور یہاں اس کے خون کے پیاسے آج بھی اس کا انتظار کر رہے ہیں؟'' اس نے شاید بہت لمبی تفصیل میں جانے سے بچنے کے لیے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ ماہ بانو نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس سارا کھیل ہی اس انتقام کا ہے۔ اسلم نے جسے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے آج بھی بدلہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔ اسلم کے یہاں سے بھاگنے کے بعد انہوں نے بے چاری زینت بی بی کا جینا مشکل کر دیا تھا۔ اسے مزدوری بھی بہت مشکل سے ملتی تھی اور پینے کے پانی کا کوٹا بھی۔ میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کرتی تھی۔ زینت کا مجھ پر ایک احسان بھی تھا کہ اس نے میری بیٹی فاخرہ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ فاخرہ کی پیدائش پر میں اتنی بیمار ہو گئی تھی کہ اسے دودھ ہی نہیں پلا سکی تھی۔ دودھ کے رشتے سے فاخرہ بھی زینت سے بالکل ماں جیسی محبت کرتی تھی اور ہر وقت اس کی خدمت کے لیے تیار رہتی تھی۔ دشمنوں کو اس کی یہ ادا اچھی نہیں لگی اور ظالم نواز چانڈیو نے میری بچی کو اغوا کر کے ہمیں یہ پیغام بھجوا دیا کہ لڑکی کا میرے ساتھ نکاح کر دو ورنہ میں اس کی عزت برباد کر دوں گا۔ نواز چانڈیو عمر میں فاخرہ سے بہت بڑا ہے پھر اس کی پہلے سے شادی بھی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ ہم اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ اگر نہ مانتے تو عزت بھی جاتی اور فاخرہ کی کہیں شادی بھی نہ ہو پاتی۔ شادی کے بعد اس ظالم نے میری پھول جیسی بچی پر بہت ظلم کیا اور ہمیں بھی پیغام بھجوا دیا کہ اگر ہم نے زینت بی بی کے ساتھ میل جول رکھا تو وہ فاخرہ کے ساتھ اور ظلم کرے گا۔ اس لیے پھر ہم نے مجبوراً زینت سے کھلے عام ملنا چھوڑ دیا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہماری برسوں کی گہری محبت کی وجہ سے دونوں گھروں کے درمیان ایک کھڑکی موجود تھی۔ میں اس کھڑکی سے ہی کبھی کبھار زینت سے بات کر لیا کرتی تھی اور تھوڑی بہت مدد بھی کر دیتی تھی۔ زینت بڑی ہمت والی عورت تھی۔ میں نے کئی بار اسے کہا بھی کہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلی جائے لیکن وہ اپنا علاقہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی اور جو بھی تھوڑی بہت رُوکھی سوکھی کما کر کھا سکتی تھی، اس پر گزارہ کرتی رہی۔

شاید بیٹے سے ناراضگی کے باوجود اسے یہ آس بھی تھی کہ ایک دن وہ لوٹ کر آئے گا۔ بیچ میں ایک بار وہ آیا بھی تھا لیکن تب حالات اتنے برے نہیں تھے اس لیے زینت کی ضد بھی قائم تھی۔ بہر حال قصہ مختصر یہ کہ زینت یہاں رہتی رہی اور حالات کی چکی میں پستی رہی۔ پچھلے ایک مہینے سے اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بیماری میں نہ دوا تھی اور نہ غذا..... نہ ہی کوئی خدمت کرنے والا۔ میں ہی ڈرتے ڈرتے ایک آدھ چکر لگا لیتی تھی

لیکن صفائی وغیرہ نہیں کرتی تھی کہ کہیں اچانک چانڈیو خاندان کا کوئی فرد ادھر آ جائے اور صاف ستھرا گھر دیکھ کر شک میں پڑ جائے۔ آج پورے دن سے بھی میرا یہاں آنا نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج زینت کی زندگی کا آخری دن ہے۔ ورنہ کسی طرح آ ہی جاتی۔''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے پھر سے رونا شروع کر دیا جبکہ ماہ بانو کے ذہن کی بہت سی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اسے سمجھ آ گئی کہ نواز چانڈیو کے ساتھ موجود عورت فاخرہ ہی تھی جس نے اسے یہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ نہ تو تب اس مشورے پر عمل کر سکی تھی اور نہ ہی اب کر سکتی تھی۔ اس کے لیے اسلم کی ماں کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانا منظور نہیں تھا اس لیے اس کی باعزت تدفین تک یہیں رکنا چاہتی تھی۔

''اب ان کی تدفین کا انتظام کیسے ہوگا؟'' اس نے عورت سے پوچھا۔

''میں مجبور ہوں بیٹی! کچھ نہیں کر سکتی۔ تم گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بات کر کے دیکھو۔ میں تو اب یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ کسی اور نے مجھے دیکھ لیا تو نواز کو بھی خبر ہو جائے گی۔'' وہاں سے بے بس سا جواب آیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ جائیں۔ میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔'' ماہ بانو نے پُرخیال انداز میں عورت سے کہا اور خود گھر سے باہر کا رخ کر لیا۔ عام حالات میں لواحقین اپنے مُردے کو تنہا چھوڑنا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ خود اسے بھی زینت بی بی کی لاش کو تنہا چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس کے باہر نکلے بغیر ان کی باعزت تدفین ممکن ہی نہیں تھی۔ اپنے ذہن میں آئے منصوبے کے تحت وہ وہاں سے نکل کر نواز چانڈیو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی اور اس کے دروازے پر پہنچ کر زوردار دستک دی۔ دستک کے جواب میں نواز سے مشابہ مگر عمر میں چند سال کم، ایک آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔

''مجھے نواز چانڈیو سے ملنا ہے۔'' اس نے اس آدمی کے سوال کرنے سے قبل ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

''میں یہاں ہوں بی بی!..... کیا گل ہے؟'' فوراً ہی اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواز اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا، یعنی اسلم کی پڑوسن صحیح کہہ رہی تھی۔ وہ اسلم کے مکان کے اردگرد ہی کہیں چھپ کر اس کی نگرانی کرتا رہا تھا اور اسے اپنے گھر کی طرف آتا دیکھ کر پیچھے ہی آ گیا تھا۔

''مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا اس لیے یہاں آئی تھی۔'' اپنے اندر اُٹھتی ناگواری کی لہر کو دباتے ہوئے اس نے تحمل سے بات کا آغاز کیا۔

''ضرور کرو جی۔ لیکن پہلے اندر تو آؤ۔ اوئے سرفراز!..... راستہ دے بی بی کو۔'' اس نے اسے پیشکش کرنے کے ساتھ اب تک دروازے میں کھڑے شخص کو حکم دیا۔

''چنگا بھرا!'' اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن ماہ بانو نے قدم آگے نہیں بڑھائے اور لجاجت سے بولی۔

''میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے فوراً زینت بی بی کے گھر واپس جانا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن وہ بے چاری تو میرے گھر میں قدم رکھتے ہی مر گئی، اب میں اس کے لیے اور تو کچھ نہیں کر سکتی اس لیے اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں گاؤں میں میری آپ کے سوا کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے اس لیے آپ کے گھر چلی آئی۔ زینت خالہ کی پڑوسن تو بہت عجیب عورت تھی۔ میری بات ڈھنگ سے سنی بھی نہیں اور دروازہ بند کر لیا۔'' نواز چانڈیو سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس نے دانستہ پڑوسن کا ذکر کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نواز نے اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس ذکر کو گول کر کے اپنے بارے میں شک کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔



''اوہ..... تو آخر بڑھیا مر ہی گئی۔'' نواز کے کوئی جواب دینے سے قبل سرفراز نے نفرت سے کہا لیکن ماہ بانو نے دیکھا کہ نواز نے اسے آنکھ کا اشارہ کر کے خاموش رہنے کو کہا اور خود اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھیک ہے بی بی!..... تم جو چاہتی ہو کرو۔ ہم تمہیں روکنے ٹوکنے والے کون ہوتے ہیں؟''

''میرا مطلب یہ تھا کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ کفن دفن پر جو خرچہ ہوگا، وہ تو میں خود دے دوں گی لیکن ظاہر ہے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کون لوگ یہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ میری ایسے لوگوں سے ملاقات کروا دیں۔'' وہ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر بردباری اور سمجھ داری سے کام لے رہی تھی۔

''ایرے غیروں سے کیا مدد لینا بی بی! فون کر کے بڑھیا کے بیٹے کو بلوا لو۔ ساری حیاتی اِدھر اُدھر موج کرتے ہوئے گزار لی۔ اب کم سے کم اپنی ماں کو آ کر قبر میں تو اتار دے۔'' نواز چانڈیو کی بہت بے نیازی سے کہی اس بات میں بڑی گہرائی تھی۔ ماہ بانو کا دل سن کر زور سے دھڑکا۔ یعنی نواز نے بھی اس کی کہانی کو قبول نہیں کیا تھا اور اس شک میں مبتلا تھا کہ اسے اسلم نے یہاں بھیجا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ اسلم سے رابطے میں تو ضرور ہی ہے۔

''میں کہاں سے اسے فون کروں؟ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں؟'' اس نے ذرا تیز لہجے میں نواز کی بات کا جواب دیا۔

''تمہارا بھی عجیب ہی قصہ ہے۔ نہ جانے اچانک کہاں سے زینت بی بی کی رشتے دار بن کر ٹپکی ہو ورنہ دیکھنے میں تو کسی طرح اس کی برادری کی نہیں لگتیں۔ تمہاری تو بول چال بھی بالکل الگ ہے۔'' جواباً نواز نے بھی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بات کہی، اس سے اس کے اندر کا شک اور بھی ظاہر ہو گیا۔

''میرے شوہر کا تعلق پنجابی خاندان سے ہے۔ ان سے شادی ہونے کی وجہ سے میری بول چال پر بھی اثر پڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھے زینت خالہ کا رشتہ دار ماننے سے انکار کر دو۔ اگر میری ان سے رشتے داری نہ ہوتی تو آخر مجھے کیا ضروری پڑی تھی کہ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آتی۔ ان کی کون سی یہاں زمینیں جائیدادیں ہیں جن پر مجھے قبضہ کرنا ہے یا اپنا حصہ لینا ہے۔'' اس نے حاضر جوابی سے کام لے کر اپنے دفاع میں دلائل دیے۔

''مجھے یہی تو حیرت ہے کہ اتنے برسوں بعد تم یہاں پہنچیں کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا کہ زینت بی بی اکیلی ہے؟'' اس کی بحث ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ماں بانو اس کی ساری حجت کا مقصد سمجھ رہی تھی۔ وہ اس سے بحث کر کے کسی نہ کسی طرح یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں سچائی بھی ہے یا پھر وہ اسلم کی طرف سے ہاں بھیجی گئی ہے۔

''رشتے داروں کو آپس میں ایک دوسرے کے حالات معلوم ہو ہی جاتے ہیں۔ مجھے بھی کافی عرصے سے زینت خالہ کے بارے میں معلوم تھا لیکن تم اسے میری خودغرضی سمجھ لو کہ اب جبکہ میں خود تنہا رہ رہی ہوں تو مجھے اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے ان کا خیال آ گیا، ورنہ شاید میں اب بھی یہاں کا رخ نہ کرتی۔'' اس نے بالکل حقیقی اداکاری کرتے ہوئے خود کو ایک ایسی خودغرض رشتے دار ظاہر کیا جسے اپنی غریب خالہ ضرورت کے وقت ہی یاد آئی تھی لیکن اب وہ اس کی موت کے بعد اپنے روّیے پر شرمسار تھی۔ اس کی اداکاری اور الفاظ کے چناؤ نے شاید نواز چانڈیو کو بھی متاثر کیا تھا کیونکہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''میں لاکھ خودغرض سہی لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں زینت خالہ کو کفنائے دفنائے بغیر یہاں سے چلی جاؤں۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں جلد از جلد اس کام سے فارغ ہو کر آج ہی یہاں سے روانہ ہو سکتی

ہوں۔ زینت خالہ کا گھر میں نے دیکھا ہے۔ اس کی حالت تو اتنی خراب ہے کہ بندہ دو چار گھنٹے بھی گزار لے تو بڑی بات ہے، پوری رات گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگانے کی کوشش کی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ یہاں عدم تحفظ کے احساس کے علاوہ اسے اسلم کے پاس بھی وقت پر واپس لوٹنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے واپس پہنچنے تک وہ بے کل رہے گا۔

''چنگی گل ہے بی بی! تمہارے کہنے پر ہم سارا بندوبست کر دیتے ہیں۔ ورنہ فرض تو یہ بڑھیا کے بیٹے کا بنتا تھا کہ آ کر اپنی ماں کو مٹی دیتا، پر ایسے ڈاکوئیروں کو ماں بہنوں کی فکر ہی کہاں ہوتی ہے۔'' نواز چانڈیو نے اس پر احسان جتاتے ہوئے آخر ہامی بھر ہی لی۔

ماہ بانو نے اس سے اخراجات کا تخمینہ لگوا کر اپنے شولڈر بیگ سے رقم نکال کر اسے تھمائی اور واپس زینت بی بی کے گھر کی طرف چل دی۔ آہستہ آہستہ وہاں گاؤں کی عورتیں بھی جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ ان عورتوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی کی اور زینت بی بی کو آخری سفر کے لیے غسل دے کر کفن پہنا دیا۔ ماہ بانو ہر کام میں ان عورتوں کے ساتھ پیش پیش رہی۔

اس دوران اسے عورتوں کی دبی دبی زبان میں کی جانے والی گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ گاؤں میں زینت بی بی کے مرنے کی خبر عام کرنے والا نواز چانڈیو ہی تھا۔ عورتوں کو اس امر پر حیرت تھی کہ نواز چانڈیو سب سے بڑا دشمن ہو کر زینت بی بی کی تجہیز و تدفین میں کیسے پیش پیش ہے؟ کوئی اسے خوفِ خدا تو کوئی نئی چال گردان رہی تھی۔

انہی عورتوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ چانڈیو گھرانے کے سب ہی مرد بڑے غصیلے اور ہتھ چھٹ ہیں اسی وجہ سے گاؤں کے زیادہ تر لوگ ان سے دبتے تھے اور زینت بی بی کے معاملے میں کبھی کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکے تھے۔

وہ بلا تبصرہ ان عورتوں کی باتیں سنتی رہی۔ ان عورتوں کو اس کے بارے میں بھی بہت تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور کس حوالے سے زینت بی بی کی رشتے دار ہوتی ہے؟ اس نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو نواز چانڈیو کو بتا چکی تھی اور زیادہ گہرائی میں جا کر معلومات حاصل کرنے کا موقع دیئے بغیر قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ اس طرح اسے عورتوں کے سوال جواب سے بھی نجات مل گئی اور اسلم کی ماں کی بے بس موت پر مضمحل ہوتے دل کو بھی خاصا سکون ملا۔

اس کی خواہش کے مطابق نواز چانڈیو نے سارے مراحل سرعت سے مکمل کروا دیئے تھے اور زینت بی بی کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد بھی اتنی مہلت تھی کہ وہ وہاں سے روانہ ہو سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نواز چانڈیو خود بھی کسی وجہ سے اس کی وہاں سے جلد از جلد روانگی کا متمنی ہے، جب ہی اس کے بولے بغیر خود ہی واپسی کا ٹکٹ بھی لے آیا۔

اس نے کسی قسم کے شک کا اظہار کیے بغیر قیمت ادا کر کے شکریے کے ساتھ ٹکٹ وصول کر لیا۔ بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ جب وہ اس چھوٹے سے گاؤں سے روانہ ہو رہی تھی جہاں سے اسلم کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا تو تمام تر اندرونی کیفیات کے باوجود پوری طرح الرٹ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہاں سے اس کا تعاقب کر کے کوئی اسلم تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن اپنے اردگرد اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ نواز چانڈیو بھی اسے سوار کروانے کے بعد الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔



اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بس چل پڑی اور تھکی ہاری، غم زدہ ماہ بانو نے بھی آخر کار آنکھیں بند کر کے سر پشت گاہ سے ٹکا لیا۔ اس بس کو لگے بندھے مخصوص راستوں پر چل کر طے شدہ منزل پر ہی پہنچنا تھا چنانچہ کوئی اس کے تعاقب میں تھا یا نہیں، اس بارے میں خود کو فی الحال ہلکان کرنا بے کار تھا۔

⊛----✪----⊛

''تمہاری کارکردگی ہماری توقعات سے بہت کم ہے مسٹر چودھری! کوئی بڑا کام کرنا تو دور کی بات، تم تو ابھی تک اپنے کارخانے میں بھروسے کے نچلے درجے کے ملازمین کا بھی ڈھنگ سے بندوبست نہیں کر سکے ہو۔ میرے آدمی کام شروع کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں لیکن جب تک ان کی سکیورٹی کا ڈھنگ سے بندوبست نہیں ہوتا، میں انہیں وہاں نہیں بھیج سکتا۔ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے ڈالروں کی برسات کر کے ایک ایک ایکسپرٹ کو تیار کیا ہے۔ اگر تمہاری غفلت نے انہیں ذرا سا بھی گزند پہنچایا تو میں تمہاری بنیادیں تک ہلا کر رکھ دوں گا۔ ہم وہ لوگ ہیں جو چاہیں تو حکومتوں کے تختے اُلٹ دیں، تمہارے جیسے فیوڈل لارڈز کو تو ہم پیروں کی خاک بھی نہیں گردانتے۔ اگر کبھی تم پر ہمارا غضب نازل ہوا تو سمجھو زمین پر تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔''

دوسری طرف مسٹر الفا کے نام سے اپنا تعارف کروانے والا وہ کٹ کھنا بلا تھا جس نے لندن میں اس سے ملاقات کی تھی اور بڑی آسانی سے لِنڈا کو اس کے پہلو سے نکال کر لے گیا تھا۔ مسٹر الفا نے اسے لندن بلا کر تفصیلی ملاقات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس کے جوتوں کے کارخانے کو آگ لگا دی گئی ہے تاکہ وہاں تعمیرِ نو کے بہانے ایک ایسا تہ خانہ بنایا جائے جو زیرِ زمین ہیروئن کی تیاری کے لیے لیبارٹری کا کام دے سکے۔ لیبارٹری کا نقشہ بھی اس نے تیار کروا دیا تھا اور وہاں ضروری مشینوں کی تنصیب اور عملے کی فراہمی بھی اپنے ذمے رکھی تھی۔

چودھری کو صرف اتنا کرنا تھا کہ وہاں کی حفاظت اور کام کاج کے لیے ایسے افراد کا بندوبست کر دے جو وفادار بھی ہوں اور لڑنے بھڑنے میں ماہر بھی۔ اس لیبارٹری میں پیر آباد سے متصل جنگلات میں کاشت کی جانے والی افیون سے ہیروئن سازی کا کام ہونا تھا۔ چودھری کے ہی تعاون سے کاشت کی جانے والی اس افیون کو وہ لوگ پہلے ہی تجربے کی بھٹی سے گزار کر پرکھ چکے تھے کہ اس سے تیار ہونے والی ہیروئن کسی طرح معیار میں اس ہیروئن سے کم نہیں جو شمالی علاقہ جات میں کاشت کی گئی افیون سے تیار کی جاتی رہی ہے۔ چودھری نے اندازہ لگایا تھا کہ الفا اور اس کے دوسرے ساتھی بہت چالاک ہیں اور انہوں نے اس امر پر پوری طرح نظر رکھی ہوئی ہے کہ اگر کبھی شمالی علاقہ جات میں ان کے قدم اُکھڑ جائیں تو مستقبل میں انہیں اپنا کاروبار چلانا مشکل نہ ہو۔ پنجاب کے ایک منفرد خصوصیات رکھنے والے جنگل میں افیون کی کاشت سے لے کر چودھری کے کارخانے کو ہیروئن سازی کی لیبارٹری میں تبدیل کرنے تک ان کے منصوبہ ساز ذہن کی ساری ہوشیاری نمایاں تھی۔ وہ مہینوں یا سالوں کے بجائے نسلوں تک کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ تھے جنہوں نے آنے والے خطرات کو قبل از وقت بھانپ کر اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ لیکن چودھری اپنے خانگی مسائل میں اُلجھ جانے کے باعث قابلِ اطمینان کارکردگی نہیں دکھا سکا تھا اور اب تک اپنی صرف ''ہیلو'' کے جواب میں الفا کی نان اسٹاپ پھٹکار سن رہا تھا۔

یہ ذلت دولت کے لالچ میں اس نے خود مول لی تھی اور آقا سے محکوم بننے کے ذلت آمیز تجربے سے گزر رہا تھا۔ پھر بھی ممکن تھا کہ یہ ذلت بڑے محدود پیمانے پر ہے اور صرف وہ خود ہی اس سے واقف ہے ورنہ باقی لوگوں پر تو اس کا سکّہ اب بھی پہلے ہی جیسا چلتا ہے۔ اس محدود ذلت کے مقابلے میں اس کے لیے ڈالروں میں

بڑھتے بینک بیلنس کی زیادہ اہمیت تھی جو ماضی میں تمام تر بے ایمانی اور مظالم کرنے کے باوجود کبھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھا تھا، چنانچہ اپنے بدیسی آقا کو منانے کے لیے خوشامدی لہجے میں بولا۔

''آپ کو تو معلوم ہے سر! کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ذرا اس کی آخری رسومات وغیرہ کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، اب دوبارہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

''دوبارہ شکایت ہوئی تو میں تمہارا اطمینان رخصت کر دوں گا کیونکہ مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہاری بیوی کی موت کے طبعی ہونے کا امکان بہت کم ہے اور ائرپورٹ سے تم جو تابوت لاد کر اپنے گاؤں تک لے گئے تھے، وہ برطانیہ تو کیا کسی بھی بیرونِ ملک سے نہیں لایا گیا۔ میرے خیال میں اگر میں اس سلسلے میں تمہارے بیٹے کو بریف کر کے تمہاری بیوی کی قبر کشائی اور پوسٹ مارٹم پر اُکساؤں تو ایسے کچھ انکشافات ہوں گے جن کے بعد تمہارے لیے اپنے بیٹے سے سامنا کرنا ممکن نہیں رہے گا۔'' اس کا لہجہ حد درجے زہریلا تھا۔

چودھری پہلی بار صحیح معنوں میں اندر تک کپکپا گیا۔ نیویارک جاتے ہوئے ڈیوڈ سے ٹکراؤ ہونے سے لے کر اب تک وہ لوگ اس پر دو ہی حربے آزماتے رہے تھے۔ ایک لالچ، دوسرا بلیک میلنگ..... لیکن آج کی بلیک میلنگ سب سے سوا تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے یہ راز کسی صورت کھلتے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے خود وڈی چودھرائن کو ہلاک کروایا ہے۔ وہ لاکھ مہذب و مؤدب سہی لیکن اپنی ماں کے قتل کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری کو اندازہ تھا کہ مسٹر الفا نے اسے جو دھمکی دی ہے، وہ قطعی کھوکھلی نہیں ہوگی۔ وہ لوگ لندن میں بیٹھے بیٹھے اس کے کارخانے کو آگ لگوا دیں اور عمارت کا پرانا نقشہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نیا نقشہ بھی بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں، ان کی رسائی اور اختیار کے بارے میں کوئی شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

''میں نے کہا ہے نا سر! کہ میری طرف سے آپ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ میری بات پر یقین رکھیں۔'' اس نے کنپٹی سے بہہ کر گردن کی طرف جاتی پسینے کی لکیر کو صاف کیے بغیر ہکلاتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''اچھی بات ہے۔ اب تم ذرا دوبارہ سے اپنے لیے مقرر کیے ہوئے کام ذہن نشین کر لو۔ آدمیوں کی تقرری کے بعد تمہیں ایسے افراد سے رابطہ کرنا ہوگا جو ہماری تیار کی گئی ہیروئن کی مقامی مارکیٹ میں کھپت کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک سپلائی میں بھی کام آسان کریں۔ پہلی کیٹگری کے لیے بظاہر عزت دار لیکن جرائم کی دنیا سے وابستہ لوگوں سے رابطہ کرنا مناسب رہے گا جبکہ دوسری کیٹگری کے لیے مکمل طور پر عزت دار مناسب رہیں گے۔ آگے تم خود اپنی صوابدید کے مطابق بھی کام کر سکتے ہو۔ مجھے اصل غرض نتائج سے ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ مارکیٹ میں ہیروئن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پہلے سے موجود لوگوں کی موجودگی میں ہمارے مال اور آدمیوں کو اپنی جگہ بنانے میں مشکل ہوگی۔ اور ہاں، یہ خیال رکھنا کہ ہمارے کچھ آدمی پہلے ہی سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ تم بے خبری میں کہیں ان سے اُلجھ مت بیٹھنا۔'' اسے مکمل طور پر دبا لینے کے بعد مسٹر الفا نے اپنی ہدایات اور احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔

''او کے سر! باقی سب کچھ تو میں آپ کی ہدایات کے مطابق کر لوں گا لیکن مارکیٹ میں پہلے سے اپنے آدمیوں کی موجودگی والی بات نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں ان آدمیوں سے واقف نہیں ہوں اس لیے لاعلمی میں ہمارے آدمیوں کے آپس میں تصادم کی نوبت آ سکتی ہے۔'' چودھری نے اسے اپنی مشکل کا احساس دلایا۔

''پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ تمہیں کوئی بالکل نچلے درجے پر کام نہیں کرنا ہے۔ نہ ہی تم چھوٹے موٹے جرائم



[illegible] افراد سے رابطے میں رہو گے۔ تمہیں ان معزز مجرموں سے رابطے میں رہنا ہے جو مختلف طرح کی تجارت یا [illegible] کی آڑ میں ہیرا پھیری کے کام کرتے ہیں، یا ذرا سے لالچ کے لیے کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ [illegible] وہ اپنے کانٹیکٹس خود بنائیں گے۔ البتہ تمہارا ہر ایک سے باعلم ہونا ضروری ہے۔ رہی آپس میں تصادم [illegible] بات تو یہ یاد رکھنا کہ براہِ راست اور فوری تصادم سے ہر حال میں گریز کرنا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال [illegible] آنے پر پہلے کنفرمیشن ضروری ہے۔

''یہاں میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ جلد میں تمہیں ایک اسپیشل موبائل فون بھجوانے والا ہوں۔ اس فون کی [illegible] یہ ہے کہ اس کی کالز ٹریس کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ موبائل میں خاص طور پر ایک ایسا سسٹم [illegible] لگا لیا گیا ہے کہ اگر کسی نے کال ٹریس کرنے یا ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تو خود بخود رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ [illegible] موبائل سیٹ سے تم محدود پیمانے پر میسجز بھی بھیج سکتے ہو۔ یوں سمجھ لو کہ تم اس سے جو میسج سینڈ کرو گے، وہ [illegible] مخصوص لوگوں تک ہی جا سکے گا۔ کسی مسئلے کی صورت میں تمہیں میسج کا ہی استعمال کرنا ہوگا۔ مجھ سمیت چند [illegible] خاص لوگ اس میسج کو پڑھ سکیں گے اور تمہیں بروقت ہدایات مل جائیں گی۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو میں [illegible] تمہیں بتا دی ہیں، باقی جب سیٹ تمہارے ہاتھ آئے گا تو تم خود بھی اس کی خصوصیات جان لو گے۔ بعد میں، [illegible] اسی وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں آگاہ کرتا رہوں گا۔'' الفا کا لہجہ اب خاصا نرم ہو گیا تھا جس پر چودھری نے [illegible] کا سانس لیا۔

''شکریہ سر! میں بے چینی سے آپ کے اس تحفے کا انتظار کروں گا۔'' الفا کے نرم لہجے کے باوجود وہ اس [illegible] موبائل فون سیٹ کو بھیجنے کے وقت اور طریقے کے بارے میں استفسار نہیں کر سکا۔

''او کے، بائے۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور چودھری بے ساختہ ہی رومال کی مدد سے چہرے پر بہنے [illegible] پسینے کی لکیریں صاف کرنے لگا۔

''میں اندر آ جاؤں ابا جی!'' وہ مراد شاہ تھا جو دروازے کے باہر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''آہو پُتر! آ جا۔ تینوں بھلا اجازت لینے کی کی لوڑ ہے۔'' اپنے ولی عہد کی آواز سن کر وہ بری طرح چونکا [illegible] اس گھبراہٹ میں کہ کہیں اس نے اس کی ٹیلی فونک گفتگو نہ سن لی ہو، جلدی سے بولا۔

''کیا کروں ابا جی! فرنگیوں کے ساتھ رہ کر ان کی بہت سی عادتیں بھی اپنا لی ہیں۔ خاص طور پر اچھی [illegible] باتیں۔'' وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور باپ کے اشارے پر ایک نشست سنبھال لی۔

''چل یہ بھی چنگی گل ہے کہ تُو نے اُن کی چنگی گلاں ہی سیکھی ہیں ورنہ تُو جتنے عرصے سے اُدھر رہ رہا ہے، [illegible] فرنگی بھی بن سکتا تھا۔'' مراد شاہ کا مزاج اعتدال پر دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے اس کی گفتگو [illegible] نہیں سنی ہے چنانچہ ہلکا پھلکا سا ہو کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''میں اتنا بودا نہیں ہوں جو آسانی سے کسی کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ جن کی شخصیت کمزور ہو وہ تو یہاں [illegible] رہ کر بھی فرنگی بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔''

''جیوندا رہ میرا پُتر! مجھے بھی معلوم ہے کہ میرا شیر کسی سے دبنے والا یا اس کے پیچھے چلنے والا نہیں ہے۔ میں [illegible] تجھ سے تھوڑا مذاق کر رہا تھا۔ تُو چھوڑ اس قصے کو اور بتا کہ ادھر آرام نال تو ہے نا؟ کسی چیز کی کمی ہو تو منشی [illegible] پیغام بھجوا دے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں وہ تیرا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے۔'' چودھری کو لگا کہ مراد کو اس کی بات بری لگی [illegible] اس لیے فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

''کسی شے کی ضرورت نہیں ہے ابا جی! حویلی میں ہر وہ سہولت موجود ہے جو کسی بڑے اور ترقی یافتہ شہر

کے گھر میں ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کون سا ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ میں آپ کے پاس آیا ہی اس لیے تھا کہ آپ سے واپسی کے سلسلے میں اجازت لے سکوں۔ باہر کے باہر ہی دو چکر مار کر گیا ہوں لیکن آپ بڑی لمبی بات چیت میں مصروف تھے اس لیے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''ہاں، وہ ایک ضروری کاروباری فون تھا، اس لیے مجھے تھوڑا ٹیم (ٹائم) لگ گیا۔'' اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دے کر بات کو ٹالنا چاہا۔

''آپ بات کرتے ہوئے کافی پریشان لگ رہے تھے۔ اس لیے مجھے تھوڑی تشویش ہونے لگی تھی۔'' وہ بھی گویا اس موضوع کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''کاروباری پریشانی ہی تھی پُتر..... میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میرا کارخانہ جل گیا ہے، اب ادھر اس کی دوبارہ تعمیر ہو رہی ہے اور ٹھیکیدار کا کہنا ہے، میری وہاں موجودگی ضروری ہے۔ پر میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔ ابھی تیری ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو میں خود کو سنبھال کر ان مصروفیتوں میں اُلجھ سکوں۔'' اس نے نہایت غم زدہ شکل بنا کر اپنی فرضی مشکل کا ذکر کیا حالانکہ درحقیقت وہ صرف شہر جانے کے لیے جواز پیدا کر رہا تھا۔

''زندگی نام ہی اسی کا ہے ابا جی! آدمی کو بڑے سے بڑا غم سہہ کر بھی خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو آپ شہر چلے جائیں تو مصروفیت میں آپ کا دل بہل جائے گا۔ میں خود بھی اسی وجہ سے یہاں سے جلد روانہ ہونے کا خواہش مند ہوں۔ نیویارک پہنچ کر اپنی جاب کر مصروفیت میں اُلجھوں گا تو ذہن بٹ جائے گا۔ ورنہ یہاں تو ہر دم اماں کا ہی خیال ذہن پر سوار رہتا ہے۔ انہیں اپنے سامنے لحد میں اُتارنے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ وہ اس طرح اچانک دنیا سے چلی گئی ہیں۔ کہتے ہیں مرنے سے قبل قدرت انسان کے منہ سے ایسی کوئی نہ کوئی بات کہلواتی ہے جو بعد میں یاد آئے تو لواحقین کو خیال آتا ہے کہ مرنے والے کو اپنی موت کے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے، جب ہی ایسا کہہ گیا۔ لیکن مجھے تو بہت یاد کرنے پر بھی اماں کی ایسی کوئی بات یاد نہیں آتی جس سے لگے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھیں۔ وہ تو زندگی سے بڑی محبت کرنے والی اور ایک ایک لمحہ اپنی مرضی سے گزارنے والی خاتون تھیں۔ وہ کیسے اتنی خاموشی سے چلی گئیں، یقین نہیں آتا۔''

مراد شاہ نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا، وہ ذرا نازک تھا۔ اگر وہ تفصیل سے وڈی چودھرائن کی موت پر گفتگو کرنے بیٹھ جاتا تو وہ مشکوک حالات ضرور زیر بحث آتے جس سے چودھری گریز ہی کرنا چاہتا تھا چنانچہ تیزی سے پینترا بدلتے ہوئے رقت زدہ لہجے میں بولا۔

''بس پُتر! اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے۔ تُو بھی صبر کر، میں بھی صبر کی کوشش کرتا ہوں ورنہ سچ پوچھ تو حال ایسا ہے کہ راتوں کو ڈھنگ سے نیند نہیں آتی اور دل میں درد کی لہریں سی اُٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کارخانے کا کام دیکھنے لاہور جاؤں گا تو اپنا مکمل چیک اَپ بھی کروالوں گا۔''

''ایسی بات تھی تو آپ کو پہلے ذکر کرنا چاہئے تھا ابا جی! میں آپ کو خود ہسپتال لے کر چلتا۔'' حسبِ توقع مراد کا دھیان ماں کی طرف سے ہٹ گیا اور وہ اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہونے لگا۔

''او نہیں اوئے۔ ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ تو صدمے کی وجہ سے میں ذرا ڈھیلا پڑ گیا ہوں ورنہ تُو جانتا ہے کہ تیرا پیو ابھی اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا کہ سہارے تلاش کرے۔ ہور فیر تیرا سہارا کیا لینا۔ تُو ٹھہرا دو دن کا مہمان۔ آگے بھی تو میں نے اپنے سارے کم آپ ہی دیکھنے ہیں تو فیر بے کار میں عادت کیوں خراب کروں؟''

مراد شاہ کے ساتھ لاہور جانا اس کے کاموں میں رکاوٹ بن سکتا تھا اس لیے فوراً ہی انکار کر دیا۔ ساتھ ہی وہ



پر طنز کے تیر چلانے سے بھی باز نہ آیا تھا کہ اس طرح ایک طرف تو اپنے دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی تو دوسری طرف اگلا بھی دباؤ میں آ کر کچھ بولنے کے قابل نہ رہتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ مراد شاہ گردن جھکائے چپ بیٹھا رہ گیا اور وہ خود دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس ہوشیاری پر داد دیتا بظاہر ناراض سا اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

⊛----✪----⊛

شہریار پریشان سا اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا۔ مشابرم خان اُس کی خواہش پر ٹاہلی والا گیا تھا اور وہاں سے واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ واپس نہ آنا اتنا تشویش ناک نہ ہوتا اگر وہ وہاں اس سے رابطہ کر لیتا لیکن اس نے تو پلٹ کر اپنی کوئی خبر ہی نہیں دی۔ خود شہریار کی اپنی کوششیں بھی بارآور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ مشابرم خان کا فون مسلسل بند جا رہا تھا اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

موبائل بند ہونے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایسے حالات کا شکار ہے کہ اس کے لیے اپنا موبائل استعمال کرنا ممکن نہیں۔ اب یہ حالات کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ رازداری اور احتیاط کے باعث اس نے خود ہی اپنا موبائل بند کر دیا ہو۔ یا پھر کسی وجہ سے وہ اپنا سیٹ کھو بیٹھا ہو۔ یہ دونوں اُمکانات ذرا قابل اطمینان تھے لیکن تیسرا امکان بہت دہشت ناک تھا۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ کسی وجہ سے مشابرم خان مخالفین کی نظر میں آ گیا ہو اور انہوں نے اس کا سیٹ چھین کر اسے آف کر دیا ہو اور اب وہ کڑے پوچھ گچھ کے مراحل سے گزر رہا ہو۔ خود اس کے سامنے کالے میاں کی مثال موجود تھی۔ پیر سائیں کے اس چیلے کو گھیرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اس کے سیٹ پر ہی قبضہ کیا تھا اور بعد میں حقائق اُگلوانے کے لیے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ زخمی کالے میاں ابھی تک نور کوٹ کے سرکاری ہسپتال میں زیر علاج تھا اور اس کے کمرے کے باہر پولیس کے سپاہی متعین تھے۔ اس کی استدعا پر ایس پی نے کالے میاں کا کیس منظرِ عام پر نہیں آنے دیا تھا اور شہریار کی طرف سے اشارہ ملنے تک اس کی گرفتاری کو صیغۂ راز میں ہی رکھا جانا تھا۔

شہریار نے سوچ لیا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت کو بے نقاب کرنے کے بعد کالے میاں کے جرم کا صحیح تعین کرتے ہوئے اس کی رہائی یا اسیری کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر ابھی وہ اسے منظرِ عام پر لے آتا تو پیر سائیں اور اس کے ساتھی ہوشیار ہو جاتے اور انہیں حقائق معلوم ہونا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن ابھی تو اصل مسئلہ مشابرم خان کا تھا۔ اسے کسی طرح اس کی خیر خبر لینی تھی لیکن وہ طریقِ کار کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔

ایک طریقہ تو اس کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ضلع کے اے سی سے جس میں ٹاہلی والا گاؤں موجود تھا، رابطہ کرتا اور اسے اعتماد میں لیتے ہوئے اس سے مشابرم خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی استدعا کرتا۔ لیکن یہ طریقِ کار کئی وجوہات کی بنا پر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اوّل تو وہ وہاں اپنے ہم منصب کی شخصیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ آیا وہ کوئی ایماندار اور فرض شناس افسر ہے یا پھر بہت سوں کی طرح بس کرسی پر بیٹھ کر راج کر رہا ہے۔ کسی بے ایمان اور راشی افسر سے مدد ملنا تو دُور کی بات، مشابرم خان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہونے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مشابرم خان کو وہاں بھجوائے جانے کا مقصد اگلے بندے کو پسند نہیں آتا اور وہ اسے اپنی حدود میں مداخلتِ بے جا گردانتا۔ یہ اعتراض ایماندار اور بے ایمان دونوں طرح کا افسر کر سکتا تھا اور اس میں کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ حقیقت تو اپنی جگہ تھی کہ شہریار اپنی حدود سے باہر نکل کر ہی کام کر رہا تھا چنانچہ اپنے ذہن میں آنے والے اس خیال کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا۔

اس خیال کو مسترد کر دینے کے بعد اس کے پاس دوسری راہ یہ رہ جاتی تھی کہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے

آدمی کو مشابرم خان کے سلسلے میں سن گن لینے کے لیے ٹاہلی والا بھیجے لیکن ایسا آدمی آتا کہاں سے؟ یہاں اس کے پاس قابلِ اعتماد بندے تھے ہی کتنے؟ مشابرم خان کے بعد ایک عبدالمنان ہی رہ جاتا تھا اور وہ اپنے تمام تر خلوص کے باوجود ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا کہ اس پر اس قسم کے کسی کام کا بوجھ ڈالا جاتا۔ لے دے کر ایک جگو ہی رہ جاتا تھا لیکن اسے بھی وہ کتنی بار زحمت دیتا۔ جگو خود ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور ان کے لیے غنڈہ گردی کرتا تھا۔ اسے بھی بار بار اس کی ڈیوٹی سے ہٹا کر اپنے کاموں کے لیے بلانا صحیح نہیں تھا۔ اس قسم کی سرگرمیوں میں مبتلا لوگوں کا کچھ پتہ تھوڑی تھا کہ کب ان کے پیچھے خفیہ ایجنسی کے بندے لگ جائیں اور پھر خود اس کی راہ پر بھی ہو لیں۔

وہ جو کچھ کر رہا تھا، بے شک وطن کی محبت میں کر رہا تھا لیکن قانون کہتا تھا کہ وہ سب اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتا۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا تھا اور ابتدا میں کوشش بھی کرتا رہا تھا کہ ہر کام طریقِ کار کے مطابق ہو لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہر جگہ اتنی کالی بھیڑیں تھیں کہ کام بننا ہی مشکل ہو جاتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی بے بسی تسلیم کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک طرف ہو بیٹھیں۔ وہ انسانیت اور اپنے وطن کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا وہ ضرور ہی کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تو اصل مسئلہ تھا کہ مشابرم خان کا احوال کیسے معلوم ہو؟ وہ ایک بار پھر شدت سے اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اپنی ایک بڑی اور فعال ٹیم تشکیل دے سکے تاکہ وقتِ ضرورت آدمیوں کا ایسا کال محسوس نہ ہو۔

فی الحال تو اس نے سوچ لیا تھا کہ چند گھنٹے مزید اگر مشابرم خان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تو وہ تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر خود نکل کھڑا ہوگا۔ مشابرم خان اس کے کہنے پر ٹاہلی والا گیا تھا اس لیے وہ ساری ذمہ داری بھی اپنے ہی شانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہوا تو اپنے دفتر کا طول و عرض ناپنے کا سلسلہ چھوڑ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی چیخی۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اسے کال کرنے والا میجر ذیشان تھا۔ وہی میجر ذیشان جس نے مولوی کا بہروپ دھارے ''را'' کے ایجنٹ کو گرفتار کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہ ایجنٹ اس کی کسٹڈی میں زیرِ تفتیش تھا۔

''السلام علیکم میجر صاحب! مزاج بخیر..... آج کیسے آپ نے ہمیں یاد فرمایا؟'' اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود اس نے بات کرنا شروع کی تو لہجہ ہموار اور شگفتہ تھا۔

''وعلیکم السلام اے سی صاحب! مزاج بالکل بخیر ہے۔ رہی آپ کو یاد کرنے کی بات تو وہ تو ہم اکثر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن فون کرنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب آپ کو بتانے کے لیے کچھ خاص موجود ہو، ورنہ آپ جس طرح اُداس ہوتے ہیں، مجھے اپنی نااہلی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔'' اس کے ہر سوال کا ترتیب وار جواب دیتے ہوئے میجر ذیشان کا لہجہ بھی خوشگوار تھا بلکہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

''ایسی کوئی بات ہے تو فوراً بتا دیجیے۔'' شہریار اس کی کال کا مقصد سمجھ کر بے چین ہو گیا۔

''اشیش پر کام کرتے رہنے سے ہمیں بڑی کامیابیاں ملی ہیں اور ہم سخت محنت کرنے کے بعد اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتانے کے ساتھ ساتھ ایسے منصوبوں کے بارے میں بھی اعتراف کیا ہے جن سے بھارت کی پاکستان دشمنی کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ میں فون پر آپ کو اتنی زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ مل بیٹھنے کا موقع نکلا تو پھر آگاہ کروں گا۔'' میجر ذیشان کے پاس اس کے لیے واقعی بڑی خبریں تھیں۔



''تو پھر جلد از جلد یہ موقع نکالتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے، اس کی بنیاد پر بھی بھارت پر کافی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ آپ اشیش کو میڈیا کے سامنے لے آئیں تاکہ ساری دنیا بھارت کے عزائم سے آگاہ ہو سکے۔'' وہ بہت کم اتنا جذباتی ہوتا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

''اسے میڈیا پر لانا تو خیر ممکن نہیں ہے۔ بھارتی فوراً ہی اسے ہمارا پروپیگنڈا قرار دیتے ہوئے اشیش سے لاتعلقی ظاہر کر دیں گے، البتہ اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اس کے ساتھیوں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔'' میجر ذیشان نے اسے بڑا پتا ٹلا جواب دیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ واقعی اس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں ہے۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اب آپ لوگوں کو بالکل بھی دیر نہیں کرنا چاہیے۔ ڈائریکٹ ایکشن لیں ان لوگوں کے خلاف۔ پہلے ہی اشیش کی زبان کھلوانے میں اتنی زیادہ دیر لگ گئی ہے۔ وہ لوگ کہیں ہوشیار ہو کر بھاگ ہی نہ نکلے ہوں۔'' اس نے ایک اور مشورے سے نوازا۔

''اندیشہ تو ہمیں بھی یہی ہے لیکن بہرحال ہم اوپر والوں کے حکم کے محتاج ہوتے ہیں اور اپنی مرضی سے کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔'' میجر ذیشان نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اوپر والوں کے فیصلے اور احکامات تو جانے کن بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ اوپر والوں کی ڈھیل کی وجہ سے تو بھارت کو کھلی بدمعاشی دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ ہم عجیب بدنصیب قوم ہیں کہ ہماری قومی سلامتی کے فیصلے اوپر والوں کے مفادات کی نذر ہو جاتے ہیں۔'' اسے بہت شدت کے ساتھ غصہ آیا تھا ورنہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف حکومت کو کوستے رہنے پر اکتفا کر کے خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''یہ تو بہت کھلے حقائق ہیں جنہیں ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟'' میجر ذیشان نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

''اور کوئی نہیں لیکن کم از کم فوج تو کچھ نہ کچھ کر سکتی ہے۔ ہماری قوم پاک فوج سے اندھی عقیدت رکھتی ہے۔ لوگوں کے دل میں یہ یقین ہے کہ برے وقت میں ان کی فوج کا ہر سپاہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ان کی راہ میں کھڑا ہو جائے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر مخلص لوگ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بس ایک ایسے ونگ کی تشکیل کی ضرورت ہے جو آزادانہ ملکی مفادات کے لیے کام کرتے ہوئے دشمن کو نیست و نابود کر سکے۔'' اس نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والا آئیڈیا میجر ذیشان کے گوش گزار کر دیا۔

''میں کچھ کچھ آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ یعنی آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ذاتی حیثیت میں چند لوگوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں اسی طرح فوج کے کچھ لوگ بھی کرنے لگیں۔'' میجر ذیشان چونک کر بولا۔

''بالکل..... میں بالکل یہی چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہم جس طرح کے حالات کا شکار ہیں، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملکی مفادات کے لیے اس طرح کے اقدامات اٹھانے ہی ہوں گے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس افراد و وسائل دونوں کی کمی ہے۔ اگر فوجی قیادت اس طرح کا کوئی ونگ تشکیل دے دیتی ہے تو اس سے مجھ جیسے افراد کو بھی سپورٹ مل جائے گی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں جس راستے پر چل پڑا ہوں، آگے چل کر معاملات بہت گمبھیر ہو جائیں گے اور مجھے کسی مضبوط سپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔ یہ تو آپ کے بھی سامنے ہے کہ تھوڑی سی ہی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں میرا ''را'' کے ایجنٹوں سے واسطہ پڑ چکا ہے اور آگے بھی جانے کن کن ملک دشمنوں کو بے نقاب ہونا ہے۔'' وہ اپنی تجویز کے حق میں دلائل دیتا چلا گیا۔

''آئیڈیا تو شاندار ہے لیکن معلوم نہیں کہ عمل بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ اس قسم کی خفیہ تنظیم کو بنانا، پھر اس سے اس طرح سے کام لینا کہ ہم اس کے وجود کو خفیہ رکھیں، کچھ اتنا قابلِ عمل نہیں لگتا۔'' میجر ذیشان خود بڑا محبِ وطن

آدمی تھا اور دل سے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ ملک کے دشمنوں کو نیست و نابود کر ڈالے لیکن فوجی پابندیوں کی وجہ سے اکثر بس پَر پھڑ پھڑا کر ہی رہ جاتا تھا اس لیے اسے اس کا آئیڈیا پسند آیا لیکن ساتھ ہی وہ اس سلسلے میں شکوک وشبہات کا بھی شکار تھا۔

''انسان کرنا چاہے تو سب کرسکتا ہے۔'' شہریار نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''میں کرنل صاحب سے بات کروں گا۔ وہی اس معاملے کو آگے بڑھا سکتے ہیں ورنہ خود میری تو کوئی ایسی حیثیت نہیں کہ میں اتنا بڑا کام کرواسکوں۔''

''آپ کام کے آغاز کے لیے جو معمولی سی کوشش کریں گے وہ بھی بہت اہم ہے۔ مشین کا کوئی بھی پُرزہ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، کبھی ناکارہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے نہ ہونے سے مشین ضرور ناکارہ ہوسکتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ اس آئیڈیا پر عمل ہوسکے۔ آپ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا۔'' میجر ذیشان کی آواز پُرعزم ہوگئی۔

''اِن شاء اللہ!..... بلکہ میں صرف دعا ہی نہیں کروں گا، خود بھی کوشش کروں گا۔ میرے بھی کچھ اہم افسران سے ذاتی روابط ہیں۔ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو سمجھیں ہمیں اپنے حق میں کئی اہم ووٹ مل جائیں گے۔'' اس نے میجر کی ہمت بڑھائی۔

''بس تو پھر اِن شاء اللہ اگلی بار بات ہونے پر ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے اچھی خبریں ہوں گی۔ تب تک کے لیے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ!'' میجر ذیشان نے اختتامی جملے ادا کر کے کال منقطع کردی تو اس نے بھی زیرلب اللہ حافظ کہتے ہوئے موبائل واپس میز پر ڈال دیا۔ میجر ذیشان سے آج اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اتنی اہم اور حوصلہ بخش تھی کہ مشابرم خان کی گمشدگی سے طاری ہونے والا اعصابی دباؤ بھی کافی کم محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بے اختیار ہی تھوڑا ریلیکس ہوکر بیٹھ گیا۔ اسی دم انٹرکام بول اٹھا۔

''سر! مشابرم خان کافی خراب حالت میں دفتر پہنچا تھا اور آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ میں نے زبردستی اسے ہسپتال روانہ کردیا ہے لیکن اس کا اصرار تھا کہ آپ کو ضرور اس کی آمد سے آگاہ کردیا جائے۔'' دوسری طرف عبدالمنان تھا جو ہیجان زدہ لہجے میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔

''میری گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی اسی وقت ہسپتال جاؤں گا۔'' مشابرم خان کی واپسی کی اطلاع نے اس کو بالکل الرٹ کردیا اور اس نے فوری طور پر خود بھی ہسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔

''اوکے سر!'' عبدالمنان کے اس دولفظی جواب کا مطلب تھا کہ اس کے احکامات پر فوری عمل ہوگا چنانچہ اس نے بھی فوراً ہی سیٹ چھوڑ دی۔ ایک طرف اگر یہ ایکسائٹمنٹ تھی کہ مشابرم خان، ٹاہلی والا سے کون کون سی خبریں لے کر لوٹا ہے تو دوسری طرف اس کی حالت کی طرف سے بھی تشویش تھی کہ جانے وہ وہاں کیا کچھ سہہ کر آیا ہے۔

اپنے دفتر سے نکل کر ہسپتال پہنچنے میں اسے چند منٹوں سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن ہسپتال میں اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ڈاکٹرز، مشابرم خان کی مرہم پٹی کررہے تھے۔ اس مرحلے سے فارغ ہوکر وہ اس کے سامنے پہنچا تو باوجود تکلیف کے مسکرا رہا تھا۔ شہریار کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی آمد کی اطلاع سن کر اس نے ڈاکٹر کو اپنے جسم میں سکون آور دوا انجیکٹ نہیں کرنے دی تھی تاکہ پہلے اس سے پورے ہوش وحواس کے ساتھ ملاقات کرسکے۔

''کیسے ہو یار مشابرم خان! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' شہریار نے شاید پہلی بار اس کے سامنے ایسی



بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ رُتبے کے اعتبار سے وہ بہت نیچے کا آدمی تھا۔ ایک ڈرائیور کو یہاں پوچھتا ہی کون ہے مگر شہریار کے لیے وہ صرف ایک عام سا ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ اس کے مشن پر کام کرنے والا سب سے فعال اور فرض شناس سپاہی تھا جسے وہ کسی بھی قیمت پر کھونے کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ بڑے مشتبہ حالات کے بعد اس کے واپس لوٹنے پر جذباتی ہونا سمجھ میں آتا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں سر! بس ذرا پھنس گیا تھا اس لیے آپ کو انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی۔'' اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''بے وقوف آدمی! مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہورہا تھا۔'' شہریار نے اسے ڈپٹا تو اس کی آنکھوں میں اس محبت بھری ڈانٹ پر نمی سی آگئی جسے چھپا کر وہ اپنے اوپر گزرنے والے حالات کی تفصیل سنانے لگا۔

ٹاہلی والا سے نکل کر بھی وہ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا تھا کہ نہ کرائے کی رقم تھی اور نہ ہی رابطے کا کوئی ذریعہ۔ پھر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ پیچھے سے کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا نہ آرہا ہو۔ اس لیے بہت احتیاط سے کام لینا پڑا تھا۔ وہ کچھ فاصلے کے لیے لفٹ لے کر اور کافی راستہ پیدل چل کر یہاں تک پہنچا تھا اس لیے پیر سائیں کے ملازموں سے مار کھایا ہوا جسم اور بھی بدحال ہوگیا تھا۔

شہریار اس کی سنائی گئی تفصیل کا ایک ایک لفظ غور سے سنتا رہا اور اس کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ ہوگیا کہ اس نے میجر ذیشان کے سامنے جس خفیہ ونگ کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی، ان حالات سے نمٹنے کے لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔ اب اسے اپنی تجویز پر عمل درآمد کروانے کے لیے اور بھی زیادہ شدت سے کوشش کرنی تھی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے تک بھی وہ چپ ہوکر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ٹاہلی والا میں پیری مریدی کی آڑ لے کر منشیات کا خطرناک دھندا کرنے والے ملک دشمن کو جلد اور بروقت سبق سکھانا بے حد ضروری تھا اور اس سلسلے میں اس کا ذہن فوری طور پر منصوبہ بندی کرنے کے لیے متحرک ہوگیا تھا۔

⊛----✪----⊛

حبیب آباد کے اس اڈے پر اُتر کر اس نے اردگرد طائرانہ نظر ڈالی۔ اپنے اطراف میں اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا جسے وہ مشکوک قرار دے سکے۔

بس میں اس کے ساتھ موجود مسافروں میں سے بھی کچھ راستے میں ہی مختلف مقامات پر اُتر گئے تھے اور باقی یہاں اس کے ساتھ اُترنے کے بعد اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ان سب کو یقیناً اپنی پہلے سے طے شدہ منزل کی طرف جانا تھا اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے خود بھی اس ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا جہاں اسلم ٹھہرا ہوا تھا اور یقیناً بڑی شدت سے اس کی واپسی کا بھی منتظر تھا۔

ہوٹل تک کے سفر کے لیے اس نے تانگے کا انتخاب کیا۔ ویسے تو وہ یہ فاصلہ پیدل بھی طے کرسکتی تھی لیکن گاؤں تک کے سفر اور پھر وہاں پیش آنے والے واقعات نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا اس لیے اس میں پیدل چلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اپنی کیفیت اور حالات کے اعتبار سے اسے تانگا ہی سب سے موزوں سواری محسوس ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ پیدل چلنے کی زحمت سے بھی بچ جاتی اور اردگرد پر نظر رکھنا بھی ممکن رہتا۔

وہ تانگے پر سوار ہوئی تو اس کے ساتھ مرد وزن اور دو بچوں پر مشتمل ایک خاندان بھی سوار ہوگیا۔ اس نے

ان سے کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر کوئی اس کے پیچھے ہوا بھی تو وہ اکیلا مرد ہی ہوگا۔ کم از کم بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کوئی اس قسم کی مہم جوئی کے لیے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔

تانگہ حرکت میں آیا تو اس کی آنکھ کی متحرک پتلیاں بھی اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ دور دور تک ایسا کوئی فرد یا سواری نہیں تھی جسے وہ اپنے تانگے کے تعاقب میں محسوس کرتی۔ اس کے ساتھ تانگے میں سوار ہونے والا خاندان بھی ایک مقام پر تانگہ رُکوا کر اُتر گیا۔ اس سے آگے ہوٹل تک کا راستہ بھی خیریت سے گزرا۔

اس نے ہوٹل پہنچ کر اپنے اور اسلم کے لیے مخصوص کمرے کے دروازے پر دستک دی تو فوری طور پر اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے سے اس نے دوبارہ دستک دی لیکن جواب ندارد۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ موجود نہیں تھی اور اسلم لمبی تان کر سو گیا ہو۔ پھر اس خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ اسے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے وہ باتھ روم میں ہو اور فوری طور پر جواب دینے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ اس خیال پر اسے قدرے اطمینان محسوس ہوا اور وہ ذرا صبر سے انتظار کرنے لگی۔

انتظار کا دورانیہ طویل ثابت نہیں ہوا اور مزید ایک منٹ گزرنے سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ سامنے اسلم موجود تھا جو سر پر تکونا رومال باندھے کھڑا تھا۔ اس کی پتلون کے پائنچے بھی ٹخنوں سے اوپر تک مڑے ہوئے تھے۔ ماہ بانو کو دیکھ کر اس نے بے قرار نظروں سے اس کے عقب میں کچھ تلاشا اور پھر مایوس سا ہو کر پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

تھکی ہوئی اور اعصاب زدہ ماہ بانو پیر گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں اس کی نظر ایک کونے میں بچھی جانماز پر پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسلم اس کی سلامتی اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور سربسجود تھا، اسی لیے اسے دروازہ کھولنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ اسلم کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمکین پانی بھرنے لگا جسے چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی وہ وہاں بچھی ایک چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''ناکام واپس آئی ہونا؟..... میری ماں نے تمہارے کہنے پر بھی مجھے معاف نہیں کیا نا؟'' وہ دل گرفتگی سے کہتا ہوا اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر گرے شفاف قطرے کو دیکھنے لگا۔ یہ قطرہ ماہ بانو کی آنکھ سے ٹپکا تھا جس سے اس نے اس کی ناکامی کو اخذ کیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے اسلم! ماں جی نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ بلکہ میرے جانے سے پہلے ہی وہ میری سفارش کے بغیر تمہیں معاف کر چکی تھیں۔ وہ لاکھ ضدی اور اصول پرست سہی لیکن تمہاری ماں تھیں اسلم! یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ تمہیں معاف نہ کرتیں۔ انہوں نے خود میرے سامنے تمہارے لیے معافی کا اعلان کیا تھا۔'' وہ بھیگی آواز سے اسے بتانے لگی۔

''تو پھر وہ تمہارے ساتھ آئیں کیوں نہیں؟ وہ مجھ سے ناراض نہیں تو انہیں تمہارے ساتھ آنا چاہئے تھا۔'' اس نے کسی رُوٹھے ہوئے ضدی بچے کی طرح مچل کر احتجاج کیا۔

''وہ مجبور تھیں۔ شاید ان کے دل میں بھی تم سے ملنے کے لیے آنے کی خواہش تھی لیکن وقت نے انہیں مہلت.....'' اسے اپنا جملہ مکمل کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب؟..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اسلم نے اسے جھنجوڑا۔ لیکن ماہ بانو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ہراساں نظروں سے اس کی پشت پر موجود دروازے کو دیکھ رہی تھی جسے اسلم اپنے اضطراب میں کھلا ہی چھوڑ آیا تھا۔

کھلے دروازے کے اس پار نظر آنے والے چہرے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ نواز چانڈیو اور اس کا



بھائی سرفراز چانڈیو تھے جو خون آشام نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

ماہ بانو کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ اس کی محتاط روی کے باوجود وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یقیناً ان دونوں بھائیوں نے یہ کام بے حد ہوشیاری اور چالاکی سے کیا تھا، جب ہی وہ گاؤں سے یہاں تک ان میں سے کسی کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔

اسے متوجہ دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے اور اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اب تک تمام تر صورتِ حال سے بے خبر اسلم دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر پلٹا اور اپنے دیرینہ دشمنوں کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''آخر ہم نے تجھے ڈھونڈ ہی لیا اسلم! تُو بہت بھاگا اپنی موت سے لیکن آج تیرا وقت پورا ہو ہی گیا۔'' نواز چانڈیو نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا وقت پورا نہیں ہوا بلکہ تمہاری موت کھینچ کر تمہیں یہاں تک لائی ہے۔'' وہ فوری جھٹکے سے سنبھل چکا تھا چنانچہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بے خوفی سے بولا۔

''میرے ہتھیار کے سامنے تُو خالی ہاتھ کھڑا ہے اور دھمکی دے رہا ہے۔ کیا کہنے بھئی تیرے۔'' اپنے بزدل کی نمائش کرتے ہوئے نواز چانڈیو نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

''ہتھیاروں پر بھروسہ تیرے جیسے نامرد کرتے ہیں۔ تیری گردن توڑنے کے لیے تو میرے بازوؤں کی طاقت ہی کافی ہے۔'' اسلم اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

''میں نامرد ہوتا تو تیری اس دودھ شریک بہن کو ماں نہ بنا پاتا۔ افسوس کہ تجھے مہلت نہیں ملے گی ورنہ میں تجھ سے کہتا کہ کبھی گوٹھ جا کر اپنی بہن سے پوچھ کہ کیسے نواز چانڈیو نے اسے اغوا کر کے اپنے نکاح میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ بڑی اڑیل گھوڑی تھی تیری بہن، پر آج میرے گھر میں میری چپلیں سیدھی کرتی ہے اور میرے بچوں کو پالتی ہے۔''

وہ اسلم کو کچوکے لگانے کی نیت سے بولا اور جس تیزی سے اسلم کے چہرے کی رنگت سرخ پڑی، اس سے ظاہر ہوگیا کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہے۔ ابھی تک ہونے والی گفتگو میں اس کے بھائی سرفراز نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، وہ اسلم پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ دوسری طرف ماہ بانو بھی بالکل خاموشی سے یہ مکالمے بازی سن رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سچویشن میں خاموش تماشائی کے علاوہ اور کون سا کردار ادا کرے۔

''میری بہن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی ایک ایک بوند کا حساب تجھے اپنے خون کے قطروں سے دینا ہوگا۔ تیرا بھائی تو بہت آسان موت مرا تھا، تجھے میں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔'' اسلم کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ ماہ بانو اس کا یہ انداز دیکھ کر اندر سے کانپ اُٹھی۔

''میرے بھائی کی موت کے بدلے کے لیے تو تیری ماں کی دردناک موت ہی کافی ہے۔ سسک سسک کر مری ہے بڑھیا۔ آخری وقت تیری یہ رکھیل وہاں پہنچ گئی ورنہ تو اس کے حلق میں پانی کی دو بوند بھی ٹپکانے والا کوئی نہ ہوتا۔''

نواز چانڈیو کے الفاظ نے جہاں اسلم کو کرنٹ لگایا، ہاں ماہ بانو بھی بے بسی کے شدید احساس سے تلملا کر رہ گئی۔ جس خبر کو وہ بہت قرینے سے اسلم تک پہنچانا چاہتی تھی، نواز چانڈیو نے بڑی بے رحمی و بے دردی سے اسے سنا ڈالی تھی۔ اس وقت تو وہ اسلم کی شکوہ کناں نظروں کے جواب میں اپنی پلکیں جھکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی

تھی۔ اسلم نے بھی بس پل بھر کے لیے ہی اس کی طرف دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نواز پر جھپٹا۔ ہتھیار بند نواز چانڈیو جو نہتے اسلم کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھ رہا تھا، بجلی کے اس کوندے سے کسی طور بچ نہیں سکا اور اسلم نے اسے لمحہ بھر میں ہی زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی اس کا پسٹل بھی ہاتھ سے نکل گیا اور چارپائی سے نیچے جا گرا۔

''بس سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ یہ لڑکی اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' اب تک خاموش کردار بنا سرفراز چانڈیو، بھائی کو زیر ہوتے دیکھ کر فوراً حرکت میں آیا اور تیزی سے ماہ بانو کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لیا کہ اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش ماہ بانو کی گردن کا منکا توڑ سکتی تھی۔ اس کی دھمکی سن کر اسلم اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ دنیا میں اپنی ماں، بہن کے علاوہ اس نے جس عورت کو بے تحاشا چاہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ ماں اور بہن کو تو وہ کھو چکا تھا اب صرف ماہ بانو بچی تھی جسے وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا تھا چنانچہ خود ہی نواز چانڈیو پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر نواز نے فوراً ہی اسے اپنے اوپر سے دھکیلا اور کھڑے ہو کر اس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔

''سوچ سمجھ کر ہاتھ پیر چلا نواز! میں ابھی بے بس ہوں تو یہ نہ سمجھ کہ آگے بھی یہی صورتِ حال رہے گی۔ میں تیرا حشر بگاڑ کر رکھ دوں گا۔'' اسلم نے قہر برساتی آواز میں اسے دھمکی دی۔

''تو دیکھے گا کہ کہ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔'' جواب میں نواز نے بھی نفرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور دے مارا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اسلم کے گال کا اندرونی حصہ پھٹ گیا اور منہ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ خون دیکھ کر ماہ بانو کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''آواز بند کر ورنہ یہیں گلا گھونٹ کر پھینک دوں گا۔'' اسے گرفت میں لیے کھڑا سرفراز غرایا۔

''یاد رکھ سرفراز! کہ اس لڑکی کا بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تم لوگوں کی زندگی کی ضمانت ہے۔ اسے کچھ ہوا تو تم دونوں بھائیوں کا وہ حال کروں گا کہ لاشیں بھی پہچانی نہیں جائیں گی۔'' اسلم کی غراہٹ سرفراز چانڈیو کی غراہٹ سے کئی گنا قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے تو وہ دونوں بھائی بھی اپنی برتری کے باوجود اندر سے لرز کر رہ گئے مگر اچانک ہی دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔

''کون ہے؟'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد نواز چانڈیو نے پوچھا۔

اس اثنا میں سرفراز، ماہ بانو کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے آواز نکالنے سے محروم کر چکا تھا جبکہ اسلم کو بھی اس نے آنکھ کے اشارے سے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اس کا بولنا ماہ بانو کو نقصان پہنچا دے گا۔

''میں ہوٹل کا مالک ہوں۔ اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟'' باہر سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''کچھ نہیں بھائی صاحب! سب خیریت ہے۔ ہم ذرا اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے تھے، اس لیے تھوڑا شور شرابا ہو گیا۔ اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم جاؤ۔'' نواز نے اپنی آواز کو نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میں اندر آ کر دیکھ سکتا ہوں کہ تم لوگوں نے فرنیچر کی کیسی سیٹنگ کی ہے؟'' ہوٹل کے مالک کی سوچتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''نہیں بھائی صاحب! اندر ہماری پردے دار زنانی موجود ہے، ہم تمہیں اندر نہیں بلا سکتے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔



''ٹھیک ہے۔ لیکن اب مجھے یہاں سے کوئی شور شرابا سنائی دیا تو میں تمہیں اپنے ہوٹل سے نکال دوں گا۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے جو تم یہاں اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے ہو۔'' ہوٹل کے مالک نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر یوں محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے چلا گیا ہو۔

''یہ آدمی کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے بھائی جی! ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہئے۔'' سرفراز نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا تو اس نے گردن ہلا دی اور اسلم کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''سیدھی طرح، کوئی گڑبڑ کیے بغیر ہمارے ساتھ چلے گا تو تجھے چند سانسوں کی مہلت اور مل جائے گی ورنہ میں ہر انجام سے بے پروا ہو کر بھرے مجمع میں تجھے اور اسے گولی مار دوں گا۔ یہ تیری کتنی چہیتی ہے، یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ ویسے ایک گل میں مانتا ہوں کہ تُو نے عورت بڑی زبردست ڈھونڈی ہے اپنے لئے۔ سالی ہوشیار بھی بڑی ہے۔ اس کی ہوشیاری دیکھ کر ہی میں اور سرفراز بس میں اس کے ساتھ آنے کے بجائے ریل گاڑی سے یہاں پہنچے تھے۔ پھر بس اڈے پر پہنچ کر پہلے سے دو تانگوں میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ تیسرے تانگے نے ہم نے ساز باز کر لی تھی کہ لڑکی اگر اس کے تانگے میں بیٹھے تو وہ ہمیں اس کا پتہ بتا دے۔ ہماری ترکیب کامیاب رہی ورنہ چوکنی ہرنی تو ایسے گردن گھما گھما کر اڈے پر چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے خطرے کی بُو سونگھ رہی ہو۔

نواز چانڈیو کی بے وقت کی راگنی نے ماہ بانو کی یہ اُلجھن دور کر دی کہ وہ دونوں اُس کی تمام تر احتیاط کے باوجود آخر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب کیسے ہو گئے۔

''میرا اور اس کا جو معاملہ ہے، وہ ہمارے درمیان ہے۔ تُو یہ یاد رکھ کہ اب تُو اپنے غلیظ منہ سے اس کے لیے کوئی گالی نہیں نکالے گا ورنہ میں بھی ہر انجام کو بھول کر یہیں تیرا مُردہ دفن کر دوں گا۔'' اسلم کی کنپٹیوں پر ابھری رگیں اس کے غصے کی شدت کا پتہ دے رہی تھیں۔

''اس کی بڑھکوں کو چھوڑو بھائی جی! پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ اس کی بکواس کا مزہ ہم اسے بعد میں چکھائیں گے۔'' سرفراز چانڈیو کی چھٹی حس نے شاید کسی خطرے کی بُو سونگھ لی تھی جو مسلسل یہاں سے روانگی پر اصرار دے رہا تھا۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ ہوٹل کے مالک کی وارننگ محض وارننگ نہیں تھی بلکہ وہ واقعی پولیس کو یہاں بلا سکتا تھا۔

''چل پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔'' غصے میں ہونے کے باوجود نواز کو بھائی کی بات سمجھ آ گئی۔ اس موقع پر اسلم نے بھی کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ ترکِ جرم کا عہد کرنے کے باوجود وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ قانون کی نظر میں وہ اب بھی ایک مفرور ڈاکو ہے جسے کسی بھی طور معاف نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی زندگی کے بہت سے سال ضائع ہو جانے کے بعد اب مزید ماہ و سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ زندگی کے بہت سے سال گزارنے کے بعد اب کہیں جا کر اس کی آنکھوں نے خواب بُننے شروع کیے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس دنیا میں حقیقت میں بسنا چاہتا تھا..... چنانچہ بے حد محتاط تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے وہ اس ترتیب سے باہر نکلے کہ نواز نے اسے اپنے ساتھ رکھا تھا جبکہ ماہ بانو اور سرفراز پیچھے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہوا تھا جیسے وہ چاروں آپس میں شناسا ہوں۔ لیکن یہ تو اسلم کو معلوم تھا کہ نواز چانڈیو کا دایاں ہاتھ جو کہ اس کی جیب کے اندر ہے، ایک بھرے ہوئے پسٹل کو گرفت میں لیے ہوئے ہے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کرنے پر اسے استعمال کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرے گا۔ اسلم نے اپنی زندگی کے پچھلے چند سالوں میں اسلحے کا اتنا استعمال کیا تھا کہ اس کے لیے پسٹل کی

حیثیت محض ایک کھلونے کی سی تھی۔ وہ چاہتا تو جس وقت وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے جا رہے تھے اور گاہکوں سے بھرے ہوٹل کے ہال سے گزر رہے تھے تو کسی بھی لمحے نواز اور سرفراز کو چابکدستی سے زیر کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پھرتی اور طراری کے سامنے وہ دونوں بھائی ٹِک ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ پنجاب کے ایک جنگل سے فرار ہونے والے اسلم کو سندھ میں بھی کوئی شناخت کر لیتا اور اس کے بعد تو انجام بس جیل کی کوئی سیلن زدہ، تاریک کوٹھڑی ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوٹل سے باہر نکلتا چلا گیا۔ باہر ایک تانگہ موجود تھا۔ نواز کے اشارے پر وہ لوگ تانگے پر سوار ہو گئے۔ ماہ بانو نے پہچان لیا کہ اس تانگے کا کوچوان وہی شخص ہے جس نے بس اڈے سے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔

''چلو۔'' وہ چاروں تانگے میں بیٹھ چکے تو نواز نے کوچوان کو حکم دیا۔ اس نے فوراً ہی گھوڑے کو چابک رسید کیا اور گھوڑا حرکت میں آ گیا۔

گھوڑا، ہوٹل سے چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ انہوں نے موٹر سائیکل پر سوار دو پولیس سواروں کو ہوٹل کے سامنے رُکتے ہوئے دیکھا۔ سرفراز نے معنی خیز نظروں سے نواز کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی معاملہ فہمی پر بڑے بھائی سے داد طلب کر رہا ہو اور یہ تھی بھی حقیقت کہ اگر وہ لوگ چند منٹ اور ہوٹل کے کمرے میں رکے رہتے تو پولیس والوں سے ٹکراؤ ہونا لازمی تھا۔ وہ جو ایک شک سا تھا کہ ہوٹل کا مالک محض وارننگ پر اکتفا نہیں کرے گا، سچ ثابت ہوا تھا۔

''دیکھو صاحب! کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں غریب آدمی ہوں اس لیے تھوڑے پیسوں کے لالچ میں تمہارے کام کے لیے راضی ہو گیا لیکن کسی پھڈے میں نہیں پڑ سکتا۔ تمہاری کسی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے جیل جانا پڑا تو پیچھے میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔'' گھوڑا گاڑی کچھ اور آگے بڑھی تو کوچوان نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا۔ اپنے لباس اور چہرے مہرے سے وہ واقعی غریب آدمی محسوس ہو رہا تھا جو لالچ میں آ کر خطرہ تو مول لے بیٹھا تھا لیکن انجام سے خوف زدہ تھا۔

''چپ کر کے تانگہ چلا بڈھے! جب ایک بار میں نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ تجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی تو ہمیں ہماری مرضی کی جگہ پر چھوڑنا اور اپنی مرضی کی رقم لے کر واپس پلٹ جانا تو تجھے پھر کس چیز کا ڈر ہے؟ تجھ جیسے ڈیڑھ پسلی کے آدمی سے میں کوئی تو پیں تو چلوا نہیں سکتا۔ تُو بس اتنا کرنا بعد میں اگر کوئی تجھ سے ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ سواریوں کو بس اڈے کے قریب اُتار دیا تھا۔ تُو خود ہی پریشانی سے بچا رہے گا۔'' نواز چانڈیو نے سخت لہجے میں کوچوان کو جواب دیا جس پر وہ چپ سادھ کر اپنے گھوڑے کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ البتہ اُس کے بشرے سے تشویش کے آثار اب بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو اوکھلی میں سر تو دے بیٹھا تھا لیکن اب موصلوں سے خوف زدہ تھا۔

مختلف کچی پکی سڑکوں سے گزرتا ہوا تانگا آخر کار شہر کے آباد حصے کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف بڑھنے لگا۔ ویرانے میں پہنچتے ہی ماہ بانو کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ نواز اور سرفراز، اسلم کے جانی دشمن تھے جو ظاہر ہے اسے کسی نیک ارادے سے تو اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے۔ دوسری طرف اسلم کو اطمینان محسوس ہونے لگا۔ کسی ویرانے میں وہ آبادی کے مقابلے میں ان دونوں سے زیادہ اچھی طرح نمٹ سکتا تھا۔ نواز اور سرفراز بھی یقیناً ایسا ہی کچھ سوچ رہے تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں مگن تانگے کے ان سارے سواروں کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ویرانے کی خاموشی میں اُبھرتی گھوڑے کی ٹاپیں بند ہو گئیں۔



''بس صاحب! اس سے آگے میں نہیں جا سکتا۔'' کوچوان نے تانگہ روکنے کے ساتھ ہی اعلان کیا۔

''ٹھیک ہے۔ زیادہ آگے جا کر ہمیں بھی واپسی میں مشکل ہوگی۔'' نواز چانڈیو نے اعتراض کیے بغیر اس کی بات مان لی اور وہ سب تانگے سے اُتر گئے۔

نیچے اُترنے کے بعد نواز چانڈیو نے کوچوان کو رقم تھمائی۔ یہ ایسا موقع تھا جب اس کی توجہ اسلم کی طرف سے لمحہ بھر کے لیے ہٹ گئی۔ اگر اسلم چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے زیر کر سکتا تھا لیکن اس نے مناسب سمجھا کہ تانگے والے کو اپنے تانگے سمیت وہاں سے نکل جانے دے۔ وہ غریب آدمی تھا اور تھوڑے سے لالچ میں آ کر اس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔ اس بے چارے کا مزید کسی مشکل سے دوچار ہوئے بغیر ہی یہاں سے نکل جانا مناسب تھا۔ آخر کار وہ اپنا تانگا لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے تانگے کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی چنانچہ جلد ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں اور وہ سب پورے ارتکاز کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سرفراز اور نواز کی آنکھوں سے نکلتی نفرت کی چنگاریاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

اسلم کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا بلکہ اس کا نقصان تو کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دونوں نے تو صرف اپنا ایک بھائی کھویا تھا جبکہ اسلم نے اپنی ماں اور بہن کو کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد ہوتی دیکھی تھی۔ پھر ایک ستم رسیدہ فاخرہ بھی تھی جسے اس کی دودھ شریک بہن ہونے کے جرم میں نواز چانڈیو جیسے بھیڑیے کی بیوی بننا پڑا تھا۔ وہ دونوں اس سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے آئے تھے لیکن اگر وہ حساب کرتا تو اس کا نقصان ہر صورت زیادہ تھا۔ ماہ بانو الگ سراسیمہ تھی۔ اسلم سے محبت نہ کرنے کے باوجود وہ اس کی خیر خواہ تھی اور ہر صورت اس کی بھلائی چاہتی تھی۔ وہ ان بھلائیوں کے ہاتھوں زیر ہو کر مارا جاتا تو بھی اسے دکھ ہوتا اور انہیں زیر کر کے جرمِ قتل کا مرتکب ہوتا تو بھی تکلیف محسوس کرتی۔

''میں چاہوں تو ایک گولی تیرے بھیجے یا دل میں اُتار کر ایک پل میں تیرا کام تمام کر دوں لیکن اس طرح میرے دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ پوری طرح نہیں بجھے گی۔ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا تب ہی میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔'' آخر کار نواز چانڈیو نے ہی بولنے میں پہل کی اور اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ یہ نفرت اس کے چہرے پر بھی لکھی ہوئی تھی۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ چنانچہ اس ویرانے میں وہ چاروں ایک دوسرے کے تاثرات بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ ماہ بانو نے بھی دیکھا کہ نواز چانڈیو کی بکواس کے جواب میں اسلم نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا لیکن اس کے چہرے پر کسی زخمی درندے کی سی وحشت اُتر آئی۔ اور پھر جیسے کوئی کوندا لپکتا ہے، بالکل اسی طرح اس نے پھرتی سے اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر کھینچا اور نواز کے پسٹل والے ہاتھ پر دے مارا۔ اس کا نشانہ اتنا درست تھا کہ خنجر کے اِدھر اُدھر جا کر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواز چانڈیو کے ہاتھ سے پسٹل نکل کر دُور جا گرا اور اس نے زوردار چیخ مارتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے خون آلود ہاتھ تھام لیا۔

دوسری طرف خود ماہ بانو نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور جھکائی دے کر سرفراز سے خاصے فاصلے پر چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر اسلم کو اپنی وجہ سے ان لوگوں کے سامنے مجبور ہوتا دیکھ چکی تھی، اب اتنی جلدی اس صورتِ حال کو دوبارہ دیکھنے اور سہنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے اس کی ذہنی اور جسمانی چابکدستی زوروں پر تھی۔ جھکائی دے کر اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اس نے اس بات کو ذہن میں رکھا تھا کہ نواز کا پسٹل کس سمت میں گرا ہے چنانچہ اس نے اسی طرف کا رخ کیا اور پسٹل اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

''اپنی اپنی جگہ پر سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔'' نہایت مہارت سے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے دھمکی دی تو اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ دوڑ گئی

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تم مجھے ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لینے دو ورنہ یہ بار بار میری راہ میں آ کر کھڑے ہوتے رہیں گے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم اپنی حفاظت کے علاوہ کسی بھی دوسری صورت میں اس ہتھیار کا استعمال نہیں کرو گی۔ یہ مردوں کی لڑائی ہے اور میں اسے مردانہ وار ہی لڑنا چاہتا ہوں۔''

اسلم کی بات نے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا لیکن پھر اسے لگا کہ اس کے پاس اس کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ زبانی دھمکی دینا الگ بات تھی لیکن اس کے لیے نواز اور سرفراز کو گولی مار کر ان کا قصہ ختم کر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ شدید مجبوری کے علاوہ کسی انسان پر گولی چلا ہی نہیں سکتی تھی۔ اور یہاں تو اسلم موجود تھا سب سے نمٹنے کے لئے۔ چنانچہ وہ اپنی رضامندی کے اظہار کے لیے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ان پر اسلحے کا استعمال نہیں کیا جائے گا، دونوں بھائی نڈر ہو گئے اور بیک وقت اسلم پر چھلانگ لگا دی۔

اسلم کی عقابی نظریں اُن کے بدن کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ دونوں بھائی دائیں بائیں سے اس پر حملہ آور ہوئے، وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور ان دونوں کے ٹکرانے سے قبل ہی جھکائی دے کر ذرا فاصلے پر جا گرا۔ دونوں بھائی اپنے ہی زور میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بلبلاتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ انہیں اٹھنے کی مہلت دیئے بغیر اسلم حرکت میں آیا اور ان کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے اپنی بائیں ٹانگ کو اس طرح گھمایا کہ وہ پہلے نواز کے جبڑے کا مزاج پوچھتی ہوئی سرفراز کی ٹانگ سے جا ٹکرائی۔ پیروں میں موجود سخت تلے والے جوتوں کی وجہ سے دونوں ہی نے ضرب کی تکلیف کو شدت سے محسوس کیا اور حلق سے نکلنے والی چیخوں کو کسی طرح نہ روک سکے۔ خاص طور پر سرفراز زیادہ تڑپا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ نتھنوں سے بہہ کر ہونٹوں پر آتے خون کا نمکین ذائقہ وہ اپنی زبان پر محسوس کر سکتا تھا۔ اپنے ہی خون کے ذائقے نے اس کو وحشت زدہ کر دیا اور وہ کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر غراتا ہوا اسلم کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں اتنی وحشت تھی کہ اسلم اپنی تمام تر پھرتی کے باوجود خود کو اس کے وار سے نہ بچا سکا اور سرفراز کا پتھر جیسا سر اس کے پیٹ سے ٹکرا گیا۔ ضرب شدید تھی چنانچہ اس کے قدم اُکھڑ گئے۔ اسی لمحے نواز بھی سنبھل کر اس پر حملہ آور ہوا اور دونوں بھائیوں نے مل کر اسے پچھاڑ لیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور ایک نے اس کے پیر اور دوسرے نے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ دونوں بھائی اس پر حاوی آ چکے ہوں لیکن وہ اسلم تھا۔ خطروں اور مشکلوں کو خاطر میں لائے بغیر ان سے بچ نکلنے کی تدبیر کرنے والا۔ اپنی خراب پوزیشن کے باوجود اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ نواز کی گرفت اپنے زخمی ہاتھ کی وجہ سے ذرا کمزوری ہے۔ حقیقت میں تو وہ اس ہاتھ کو جس پر اسلم نے خنجر سے وار کیا تھا، استعمال کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ نواز کی یہ کمزوری بھانپتے ہی اس نے پھرتی سے اپنے جسم کے بالائی حصے کو حرکت دی اور لیٹے لیٹے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر پوری قوت سے سرفراز پر دے مارا۔ نواز کے جسم کے زور سے سرفراز پیچھے کی طرف الٹ کر گرا۔ اسلم ایک لمحہ لگائے بغیر پھرتی سے کھڑا ہوا اور ان دونوں پر جا پڑا۔ اب ان کے پاس خود کو بچانے کے لیے کوئی مہلت نہیں تھی۔ اسلم کے



چاروں ہاتھ پیر چل رہے تھے اور تابڑ توڑ ان کے جسموں پر پڑ رہے تھے۔ وہ دو ہونے کے باوجود اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی اس افتاد سے بچنے کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ جسم کے ایک حصے کو بچانے کے لیے ہاتھ مارنے کرتے تو دوسرا حصہ زد میں آ جاتا اور وہ یوں تڑپ اُٹھتے جیسے کسی بھاری ہتھوڑی سے کوٹا جا رہا ہو۔ اندھا دھند لگائی جانے والی ان ضربوں میں سے ایک ضرب اس شدت سے سرفراز کی کنپٹی پر پڑی کہ وہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر نواز کی گھگھی بندھ گئی اور وہ جو تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا، اس سے بھی گیا۔

''بہت تڑپا تڑپا کر مارا ہے نا تُو نے میری ماں کو۔ اب بتا کہ تجھے کون بچائے گا؟ تُو نے اپنے لیے جگہ کا انتخاب خود کیا ہے۔ یہاں میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دوں گا تو کوئی تیری چیخ و پکار سن کر بچانے والا نہ ہو گا۔'' دایاں پیر اس کی گردن پر جما کر وہ جس سفاکی سے بولا، اسے محسوس کر کے نواز چانڈیو تو کیا، ذرا فاصلے پر کھڑی محوِ تماشا ماہ بانو بھی پوری جان سے تھرّا گئی۔

''مجھے معاف کر دو اسلم! اب میں تیری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔'' کچھ دیر قبل بڑھکیں مارنے والا نواز چانڈیو اس وقت کسی حقیر کیچوے کی طرح زمین پر پڑا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے مضروب ہاتھ کے علاوہ بھی جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ جبڑے پر لگنے والی ضرب نے تو ایسا کام دکھایا تھا کہ وہ اپنے اندرونی کان تک میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اسے صحیح سے بولنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

''تجھے معاف کر دوں..... تجھے؟..... تُو نے اور تیرے خاندان نے مل کر میری زندگی تباہ کر دی۔ یہ تم ہی لوگ تھے نا جن کے لالچ کی وجہ سے مجھے ہاتھوں سے قلم چھوڑ کر ہتھیار اٹھانا پڑا۔ میں اعلیٰ افسر بننے کے خواب بھول کر لٹیرا بن گیا۔ اور جب میں اس جرم میں پکڑا گیا تو تم نے میری بہن کا رشتہ اپنے بھائی سے ختم کر کے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے میں قاتل بھی بنا اور ڈاکو بھی۔ میری زندگی کے کتنے قیمتی سال کسی درندے کی طرح جنگلوں کی خاک چھانتے گزر گئے اور اس پر بھی تم لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تم نے ایک طرف فاخرہ جیسی معصوم لڑکی کی زندگی برباد کی تو دوسری طرف میری بوڑھی بے بس ماں کو تڑپا تڑپا کر مارا۔ اتنا سب کچھ کرتے ہوئے تمہیں رحم نہیں آیا تو پھر آج مجھ سے معافی کی اُمید کیوں رکھتے ہو؟ میں تو تم دونوں کی بوٹی بوٹی الگ کر کے چانڈیو خاندان کو تحفے میں بھیجوں گا کہ اگر ان میں سے اب بھی کسی سورما میں دم ہے تو اسلم کے سامنے آئے اور اپنا انجام دیکھ لے۔''

وہ گویا قہر و غضب میں بپھرا ہوا سمندر تھا جو سب کچھ پاش پاش کر کے رکھ دینا چاہتا تھا۔ اپنے اس جنون میں اس نے نواز کی گردن پر سے پیر ہٹا کر اس کی مضروب ہتھیلی کی انگلیوں کو پاؤں کے نیچے دبایا اور پوری قوت سے آر پار ہو جانے والے خنجر کو کھینچ لیا۔ خنجر نکلتے ہی اس کے ہاتھ سے ایک بار پھر تیزی سے خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اسلم کو گویا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بہت چمکتی ہوئی نظروں سے اپنے محبوب خنجر کی دھار کو پرکھ رہا تھا۔ ہمہ وقت اس کی پنڈلی سے بندھا رہنے والا یہ خنجر کئی نازک مواقع پر اس کے کام آیا تھا۔ خوش قسمتی سے آج بھی نواز اور سرفراز میں سے کسی کو ہوٹل سے روانہ ہونے سے قبل اس کی جامہ تلاشی کا خیال نہیں آیا تھا چنانچہ نہ صرف خنجر پکڑا جانے سے بچ گیا تھا بلکہ وہ رقم بھی محفوظ رہی تھی جسے احتیاط کے پیشِ نظر وہ کپڑوں کے نیچے اپنے جسم سے باندھ کر رکھتا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خنجر کا جائزہ لینے کے بعد اس کا ہاتھ اٹھا اور قوس بناتا ہوا نواز چانڈیو کے جسم کی طرف بڑھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور تکلیف کے خیال سے اس نے پہلے ہی ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''بس اسلم! تم اسے نہیں مارو گے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔'' خنجر نواز چانڈیو سے چند انچ کی دوری پر تھا کہ ماہ بانو نے لپک کر اسلم کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ نازک ہاتھوں کی یہ گرفت اسلم کے لیے بڑی مضبوط تھی۔ بے پناہ طیش میں ہونے کے باوجود وہ چند انچ کا باقی رہ جانے والا فاصلہ اپنے خنجر کو طے نہ کروا سکا۔

''مجھے مت روکو ماہ! اس شخص کے کھاتے میں اتنے مظالم ہیں کہ اسے اس کے انجام تک پہنچائے بغیر میرے دل میں ٹھنڈک نہیں پڑے گی۔'' اس نے نہایت بے بسی سے ماہ بانو سے درخواست کی۔ آج پہلی بار اس نے اس کے لیے یہ طرزِ تخاطب استعمال کیا تھا اور نہایت مخدوش حالات کے باوجود ماہ بانو کے دل کو اس کا یہ طرزِ تخاطب پسند آیا تھا لیکن یہ وقت اپنی پسند ناپسند کے اظہار کا نہیں بلکہ بپھرے ہوئے اسلم کو سنبھالنے کا تھا۔

''تم میرے سامنے جرائم سے مکمل طور پر کنارہ کش ہونے کا وعدہ کر چکے ہو اسلم! اور میں یہ کسی طور گوارا نہیں کر سکتی کہ تم میرے سامنے کسی کی جان لو۔ اگر معاملہ دفاع کا ہوتا اور تم اس کا کوئی وار بچاتے ہوئے اسے ہلاک کر دیتے تو میں نظر انداز کر دیتی لیکن اب یہ بالکل نہتا اور بے بس تمہارے قدموں میں پڑا ہے اور تم سے اپنی جاں بخشی کا طالب ہے۔ اب کسی طور اس بات کی گنجائش نہیں نکلتی کہ تم اسے کوئی نقصان پہنچاؤ۔'' وہ بہت ٹھوس لہجے میں اپنے عمل کے حق میں دلائل دے رہی تھی۔

''یہ آج بے بس ہے اس لیے اس کا سر کچل دینا بہتر ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تو پھر یہ مجھ پر وار کرنے کے لیے کبھی نہ کبھی میرے سامنے آ کھڑا ہوگا۔'' اس نے جوابی دلیل دی۔

''اللہ، رسولؐ، قرآن جس کی چاہے قسم لے لو اسلم! آج کے بعد میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ اگر کبھی اتفاق سے بھی تمہارا سامنا ہو گیا تو نظر چرا کر گزر جاؤں گا۔'' نواز جو ذہنی طور پر اپنی موت کے لیے تیار ہو گیا تھا، مایوسی کے گھپ اندھیرے میں نظر آنے والی اُمید کی کرن کو دیکھ کر جھٹ بول پڑا۔ اس کی بات ایسی تھی کہ اسلم بھی ٹھٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نواز کے خاندان کے لوگ لاکھ لالچی اور کینہ پرور سہی لیکن اس درجے ذلیل نہیں تھے کہ اللہ، رسولؐ یا قرآن کی قسم کھا کر کوئی جھوٹا وعدہ کر سکیں۔

''اس کی بات کا یقین کر لو اسلم! یہ درمیان میں جو حوالے لے آیا ہے، ہم انہیں رد کر ہی نہیں سکتے اور پھر فاخرہ کا بھی سوچو۔ چاہے زور زبردستی کے نتیجے میں ہی سہی، لیکن تمہاری منہ بولی بہن، اس کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو فاخرہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم ہو جائے گا۔'' اسے نرم پڑتا دیکھ کر ماہ بانو نے ایک ضرب اور لگائی۔ وہ پہلے ہی قائل ہونے لگا تھا، فاخرہ کا ذکر آنے پر بالکل ہی ڈھے گیا۔ رشتوں کا احترام اور محبت اس کی گھٹی میں موجود تھے۔ وہ کیسے اس بات کو نظر انداز کر دیتا۔

''ٹھیک ہے لیکن اسے یہ وعدہ بھی کرنا ہوگا کہ فاخرہ کو آئندہ اس کی ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور یہ پوری عزت اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کا ہر حق اپنا فرض سمجھ کر ادا کرے گا۔'' اس نے شرط عائد کی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تم میں سے کسی کا گاؤں آنا ہو تو فاخرہ سے مل کر خود معلوم کر لینا کہ میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہوں۔ تمہیں میری طرف سے کوئی شکایت سننے کو نہیں ملے گی۔'' وہ گویا کسی قبر کے کنارے کھڑا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اسلم کی کوئی بھی بات ماننے سے لمحہ بھر کی بھی دیر کی تو وہ لات مار کر اسے قبر میں دھکیل دے گا چنانچہ جلدی جلدی بنا کسی تاخیر کے اس کی ہر شرط قبول کرتا جا رہا تھا۔

''میں نے تیرے ہر وعدے پر یقین کر لیا۔ اگر کبھی تیری یا تیرے بھائی کی طرف سے کوئی وعدہ خلافی ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں تجھے اتنی مہلت بھی نہیں دوں گا کہ تُو مجھ سے رحم کی بھیک مانگ سکے۔'' سفاکی سے کہتا ہوا



وہ پیچھے ہٹا اور اپنا خنجر اس کے کپڑوں سے صاف کر کے واپس پنڈلی سے باندھ لیا۔ خنجر کی دہشت زدہ کر دینے والی لوک نظروں کے سامنے سے ہٹی تو نواز چانڈیو کی جان میں جان آئی۔

''تمہارا بہت شکریہ اڈی! تمہاری وجہ سے ہماری جانیں بچ گئیں۔'' کچھ دیر قبل ماہ بانو کے لیے حقیر ترین الفاظ استعمال کرنے والا اسے بہن کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ یہ بھی ایک کمال تھا۔

''مجھے اڈی کہہ کر پکارا ہے تو پھر اس لفظ کا بھرم بھی رکھنا۔ میں نے سنا ہے تمہاری قوم میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو اڈی کہہ دے تو پھر ساری زندگی اس لفظ کی لاج رکھتا ہے۔ چاہے اپنی جان سے ہی کیوں نہ چلا جائے۔''

''تم ہمیں انہی غیرت مندوں میں سے پاؤ گی۔ آج کے بعد تمہیں یا اسلم کو ہماری طرف سے کوئی تکلیف پہنچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر تم کسی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو تو اپنے اس بھائی کو مدد کے لیے پکار لیتی ہو۔'' وہ کافی تکلیف میں تھا اس لیے بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ زندگی بچ جانے کی خوشی نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔ اس وقت وہ خود کو ان کا سب سے بڑا خیر خواہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

''اب چلو ماہ! کیا اس مردود سے مذاکرات کرنے میں ہی ساری رات گزار دو گی؟'' اسلم اس کی خواہش پر ان دونوں بھائیوں کی جان بخشی تو کر چکا تھا لیکن بہر حال، اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا کہ خود کو اتنے ڈھیر سارے نقصانات پہنچانے والے شخص سے اسے باتیں کرتا دیکھ کر اپنے خون کو کھولنے سے روک سکے چنانچہ اسے ٹوک ہی دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے، ہم اب چلتے ہیں۔'' وہ فوراً ہی اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس ویرانے سے نکلنے کے لیے ان کے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے یہ طے تھا کہ اچھا خاصا فاصلہ انہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ نواز اور سرفراز کو بھی اسی طریقِ کار پر عمل کرنا پڑتا لیکن ان کی روانگی فوری طور پر متوقع نہیں تھی۔ سرفراز بے ہوش تھا۔ نواز کو اسے ہوش میں لانے میں کچھ دیر لگتی پھر دونوں ہی کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ وہاں سے نکلتے تو گرتے پڑتے ہی وہ فاصلہ طے کر پاتے۔ اچھے خاصے زخمی ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ماہ بانو اور اسلم کی رفتار سے سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ انہیں ایسا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ واپسی کے سفر میں وہ دونوں ان کے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکیں۔ احتیاطاً روانگی سے قبل اسلم نے دونوں کی جامہ تلاشی بھی لے لی تھی لیکن پہلے ہی ماہ بانو کے قبضے میں آ جانے والے پسٹل کے علاوہ ان کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا تھا۔

یقیناً ان دونوں سے اسلم کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی تھی اور وہ محض اپنے دو ہونے کے زعم میں بغیر مناسب تیاری کے ہی اس کے مقابل اُتر آئے تھے۔ اب نتیجہ خود ان کے سامنے تھا۔ اسلم ان کی جاں بخشی کا احسان ان کے سر رکھ کر انہیں اس ویرانے میں چھوڑ کر خود نہایت اطمینان سے وہاں سے جا رہا تھا۔

''ہوٹل کے کمرے میں تمہاری کوئی خاص چیز تو موجود نہیں ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ ہم سامان لینے کے لیے ہوٹل جائیں اور کسی مشکل میں پڑ جائیں۔'' وہ لوگ جب اتنا فاصلہ طے کر چکے کہ انہیں دونوں بھائی نظر آنا بند ہو گئے تو اسلم نے اس سے پوچھا۔

''ہم اس وقت ہوٹل کے بجائے کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کی بات سن کر ماہ بانو نے حیرت سے استفسار کیا۔

''میں آج رات ہی یہ شہر چھوڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں۔ نواز کے وعدے پر یقین ہونے کے باوجود میں کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ زندگی نے بہت مشکل سے مجھ پر تھوڑا مہربان ہونا شروع کیا ہے اور میں اپنا

سب کچھ گنوا دینے کے بعد اب تھوڑا سا سکون چاہتا ہوں اس لیے ہماری آج رات ہی یہاں سے روانگی ضروری ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل کر بس اڈے تک پہنچنے کے لیے اتنی مہلت مل جائے گی کہ آخری روانہ ہونے والی بس میں سوار ہو سکیں۔'' وہ پورا پروگرام طے کر چکا تھا۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نہ ہی ہوٹل کے کمرے میں میری ایسی کوئی چیز موجود ہے جس کی خاطر میں وہاں جانا چاہوں۔'' ماہ بانو نے حامی بھر لی۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' وہ مطمئن ہو گیا۔ اپنے طور پر تو وہ جانتا ہی تھا کہ چند جوڑے کپڑوں کے علاوہ روزمرہ استعمال کی بس چند اشیا ہی ان کے اسباب میں شامل ہیں اس لیے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ اپنا اسلحہ بھی حامد راؤ کے پاس امانتاً رکھوا کر آیا تھا اور رقم کا کافی بڑا حصہ بھی۔ شناختی کاغذات سے وہ اور ماہ بانو دونوں ہی فی الحال محروم تھے اس لیے سامان میں ان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ویرانے سے آبادی تک کا یہ سفر پیدل طے کر کے آخر کار وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے انہیں ایک آٹو رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ بس اڈے پہنچ گئے۔ آخری بس روانہ ہی ہونے والی تھی اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس میں چند سیٹیں خالی تھیں۔

ٹکٹ اور کھانے پینے کی چند چیزیں خرید کر اسلم اس کے ساتھ بس میں سوار ہو گیا۔ ان کے سوار ہوتے ہی بس چل پڑی۔ ماہ بانو نے بس کے اندر جلتی لائٹوں میں پہلی بار اسلم کے چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہاں بے تحاشا حزن و ملال ثبت تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کی یہ کیفیت اپنی ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے اور پھر نواز و سرفراز کو انتقام لیے بغیر چھوڑ دینے کی وجہ سے ہے۔ اس کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اسلم کے گھٹنے پر رکھے اس کے دائیں ہاتھ پر رکھا۔ اتنے سے عمل میں ہی اس کی انگلیاں کپکپانے لگی تھیں۔ اس کی اس انوکھی حرکت پر اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''سوچ سوچ کر خود کو اتنا نڈھال نہ کرو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں کہ میں جب تمہارے گاؤں پہنچی تو وہاں کیا حالات پیش آئے۔ دکھ تو بالکل فطری بات ہے لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم بہت سی باتیں جان کر اطمینان بھی محسوس کرو گے۔'' وہ خود ہی اسے ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرتی چلی گئی۔ البتہ اس تفصیل کو بیان کرتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ دکھ دینے والی باتوں کا تذکرہ سرسری ہی رہے۔ اسلم نے اس کا ہر لفظ پوری توجہ سے سنا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی سرخی البتہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہے۔

سب کچھ سن لینے کے بعد اس نے اپنا سر پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بہت دیر وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماہ بانو میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے مخاطب کر سکتی۔ وہ یونہی بس میں موجود مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں اکثریت مردوں کی تھی۔ جو چند ایک عورتیں تھیں بھی تو اتنے سخت پردے میں کہ ان کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ایسے میں محض چادر میں لپٹی ماہ بانو کا وجود بہت سوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان حریصانہ نظروں کی چبھن سے شدید اُلجھن محسوس کرتی ہوئی وہ ایک بار پھر اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بند آنکھوں کے باوجود نہ جانے کیسے اس نے اس کا متوجہ ہونا محسوس کر لیا اور نہایت آہستہ آواز میں اسے پکارا۔

''ماہ.....!'' چند گھنٹوں میں وہ دوسری بار اس کے لیے یہ طرزِ تخاطب استعمال کر رہا تھا۔

''ہوں۔'' اسے لگا کہ اسلم کی وہ پکار کچھ غیر معمولی ہے اس لیے خود بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں اسے جواب دیا۔



''ہم یہاں سے حامد راؤ کے گھر پہنچتے ہی نکاح کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' دل کی دھڑکن کچھ معدوم سی ہونے لگی تھی اس کے باوجود اس نے اسے اثبات میں جواب دیا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔ ''لیکن حامد راؤ کے سامنے تو آپ نے ہمارے رشتے کے بارے میں کچھ اور ہی بتایا تھا۔ ہم ان کے گھر میں کس طرح نکاح کر سکتے ہیں؟''

''ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔'' اسلم نے حل بتایا۔ وہ دونوں بے حد احتیاط سے بس اتنی آواز میں بات کر رہے تھے کہ ان کی آوازیں کسی تیسرے کے کانوں میں نہ پڑ سکیں۔ یوں بھی خوش قسمتی سے ان کے آگے والی سیٹ خالی پڑی ہوئی تھی۔

''ہمارے پاس تو شناختی کاغذات بھی نہیں ہیں۔ ہم کورٹ میرج کیسے کر سکتے ہیں؟'' اس نے اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

''تو پھر ہم کسی مسجد کے مُلّا کو پکڑ لیں گے کہ بس جناب شرعی تقاضے پورے کر دیں، باقی دنیاوی و قانونی مسائل سے ہم بعد میں نمٹتے رہیں گے۔'' اس کے پاس کوئی مسئلہ لاینحل نہیں تھا۔

''ہاں ایسا تو ہو سکتا ہے لیکن اتنے اہم موقع پر کسی اپنے کو تو موجود ہونا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کو جو ہماری خوشی میں خوش ہو سکے۔'' وہ کچھ اُداس سی تھی۔ یقینی طور پر اس نے بھی ہر لڑکی کی طرح اپنی شادی کے حوالے سے کچھ خواب بُن رکھے تھے اور ایسی عجیب سی شادی کے خیال سے دُکھی ہو رہی تھی۔

''میرا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کوئی اپنا باقی ہی نہیں رہا۔ ہاں اگر تمہارا کوئی ایسا اپنا ہے جسے تم اپنی خوشی میں بلا سکو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' وہ بہت کُول موڈ میں تھا۔ البتہ ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی۔ بے جی اور ابا جو اس کی شادی پر سب سے زیادہ خوش ہوتے، چودھری کے کارندوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ سگی ماں پاگل ہو چکی تھی اور باپ اس کے پیچھے خوار تھا۔ ایک بھائی اور بہن زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور جو ایک بہن بچی تھی، وہ بھی اپنے سسرال والوں کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔ سکھی سہیلیاں تو بس ویسے ہی چھوٹ چکی تھیں۔ غرض یہ کہ چودھری سے پالا پڑنے کے بعد اس سے اس کے سارے اپنے چھوٹ گئے تھے۔ اپنوں کی اس قحط سالی میں ایک شخص ملا تھا جو دل کو اپنا لگا تھا لیکن پھر معلوم ہوا کہ وہ بھی ڈاکٹر ماریہ کا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال دل میں آنے پر وہ بے چین سی ہو گئی۔ کوئی عہد و پیمان نہ ہونے کے باوجود آج بھی دل میں یہ یقین تھا کہ وہ اسے پکارے گی تو وہ ضرور آئے گا۔ اس نے فی الحال اسلم سے کچھ نہیں کہا لیکن دل میں یہ ضرور طے کر لیا کہ وہ اپنے اس یقین کو آزمائے گی ضرور

⊛----✪----⊛

''کہاں کی تیاری ہے جناب!'' وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے ماریہ کا عکس نظر آیا۔ وہ بڑے دلربا انداز میں مسکراتی ہوئی اس سے سوال کر رہی تھی۔

''بس.....ایک دوست سے ضروری ملاقات کرنی تھی۔'' اس نے سرسری سا جواب دیا۔

''یہاں آ کر بھی آپ کے ضروری کاموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ میری نہ سہی، ممانی جان کی محبت میں آپ گھر میں ٹِک کر بیٹھیں گے اور کچھ وقت فیملی کو دیں گے لیکن آپ کا تو وہی پرانا حال ہے۔ نور کوٹ ہو یا لاہور، آپ کو رہنا سرکاری افسر ہی ہے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، فائلوں میں سر دیئے اور میٹنگوں میں مصروف۔'' اس نے شکوہ کیا۔

وہ لوگ آج صبح سویرے ہی لاہور پہنچے تھے۔ لاہور آنے کا یہ پروگرام شہریار نے رات گئے اچانک ہی

طے کرلیا تھا اور اب چند گھنٹوں بعد ہی گھر سے نکل پڑنے کو تیار تھا۔

''ہر محبت کا اپنا مقام ہوتا ہے بیگم صاحبہ! ممانی جان کے لیے بے شک میرے دل میں بہت محبت ہے لیکن اس وقت وطن کی محبت کا تقاضا ہے کہ میرا اپنے دوست سے ملنے کے لیے جانا ضروری ہے۔ بلکہ تم یہ سمجھو کہ میری لاہور آمد کا اصل مقصد ہی یہی تھا۔ سوچا ساتھ میں ماموں اور ممانی سے بھی مل لیتے ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات ہی نہیں ہوسکی تھی۔ ایک موقع نکلا تو میں نے اسے ضائع نہ کرنا مناسب سمجھا۔'' اب وہ سامنے سجی پرفیوم کی شیشیوں میں سے اپنے لیے کوئی خوشبو منتخب کر رہا تھا۔ ماریہ نے اس کا انتخاب مکمل ہونے سے پہلے نیلگوں محلول والی ایک بوتل اٹھائی اور اسپرے کا بٹن دبا دیا۔

''اگر آپ کا دوست کوئی فی میل نہیں ہے تو یہ خوشبو بہت مناسب رہے گی۔'' اس کے لہجے اور انداز میں کچھ شوخی تھی۔

''دوست فی میل بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں البتہ اگر کوئی گرل فرینڈ ہوتی تو الگ بات تھی۔'' اس نے ماریہ کی بات کا برا مانے بغیر ذومعنی لہجے میں جواب دیا۔

''میرے ہوتے ہوئے آپ گرل فرینڈ بنائیں گے؟'' اس نے ہلکا سا مکا شہریار کے بازو پر مارا۔ ابتدائی دنوں کے مقابلے میں ان دونوں کے تعلقات کافی خوشگوار ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصی بے تکلفی سے پیش آنے لگے تھے۔

''افسوس کہ مجھے تمہارے نہ ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کام کی فرصت نہیں مل سکی۔'' اس نے چہرے پر خوامخواہ کی اُداسی طاری کی۔

''اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ جائیے اب جا کر اپنے میل فرینڈ سے ہی ملاقات پر اکتفا کیجیے۔'' اس کی اداکاری پر ماریہ کو ہنسی آ گئی۔

''وہ تو میں جا ہی رہا ہوں۔ تمہیں دھکے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

''خوامخواہ کی الزام تراشی مت کیجیے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کو روکنا بھی چاہا تو آپ ہرگز نہیں رُکیں گے۔'' ماریہ نے حقیقت بیان کی تو وہ مسکرا دیا۔

''اچھا تو پھر اجازت؟''

''بالکل اجازت ہے جناب! لیکن آپ کی تیاری میں کچھ کمی سی لگ رہی ہے۔'' اس نے شہریار کا تنقیدی جائزہ لیا۔

''کیسی کمی؟''

''ٹائی کے ساتھ ٹائی پن نہیں ہے۔ آپ ایک منٹ رُکیں، میں لے کر آتی ہوں۔ پچھلی بار آپ کے لیے خریدی تھی لیکن دینی یاد نہیں رہی۔'' وہ لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوبارہ واپس آئی تو اس کی مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خود ہی وہ پن شہریار کی ٹائی میں لگا دی۔ اس نے آئینے میں جائزہ لیا۔ گٹار کی شکل کی وہ ٹائی پن اپنی بناوٹ کے اعتبار سے خاصی نفیس تھی لیکن اسے اپنے ذوق سے کافی ہٹ کر کچھ بچگانہ سی لگی۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریہ کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ جبراً مسکرا کر تھینکس کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کر کے لاہور لایا تھا۔ مشابرم خان کے ٹاہلی والا سے زخمی حالت میں واپس آنے کی وجہ سے اس نے اسے اتنی لمبی ڈرائیو کے لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور



اسے نورکوٹ میں آرام کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت بھی اسے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے فور اسٹار ہوٹل جانا تھا جہاں میجر ذیشان سے اس کی ملاقات طے تھی۔

کل رات میجر ذیشان نے ہی اسے فون کر کے یہاں ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ خاصا پُرجوش محسوس ہو رہا تھا اور گفت و شنید کے لیے سیل فون کو نامناسب قرار دیتے ہوئے بالمشافہ ملاقات کا خواہش مند تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چونکہ آج کل لاہور میں موجود ہے اس لیے ملاقات کے لیے یہ وقت خاصا مناسب ہے۔ شہریار کے لیے بھی لاہور کا ایک مختصر دورہ ترتیب دینا ایسا کوئی خاص مشکل نہیں تھا چنانچہ وہ یہاں پہنچا ہوا تھا اور اب میجر ذیشان سے ملنے جا رہا تھا۔

طے شدہ ہوٹل تک پہنچنے میں اسے مشکل سے بیس منٹ لگے۔ گاڑی پارکنگ میں روک کر اُترتے ہوئے اس نے اپنی رِسٹ واچ پر نظر ڈالی اور مطمئن ہو گیا کہ وہ دیئے گئے وقت سے چند منٹ قبل ہی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے پارکنگ سے نکلتے ہوئے بچگانہ محسوس ہونے والی ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ کر اسے پہلی تفصیلی نظر میں ہی میجر ذیشان ایک میز پر دکھائی دے گیا۔ پابندیٔ وقت وہاں بھی عروج پر تھی۔

''بہت اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کر۔'' سلام دعا سے فارغ ہو کر اس نے میجر ذیشان سے بے تکلفی سے کہا۔ یہ بات پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ آپ جناب کا تکلف ترک کر کے ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح بات کریں تاکہ ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ آسانی رہے۔

''اچھا تو مجھے بھی لگا تمہارے شہر میں آنا۔'' وہ جانتا تھا کہ شہریار اصل میں لاہور کا رہائشی ہے جو ملازمت کے سلسلے میں نورکوٹ میں مقیم ہے اس لیے خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا پھر اپنی بات کو مزید آگے بڑھایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھے دیکھنے سے زیادہ اس خوشخبری کو سن کر زیادہ خوشی ہوگی جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

''یعنی میں نے تمہیں جو اسپیشل فورس کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیا تھا، اس میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟'' اس نے دبے دبے جوش سے کہتے ہوئے فوراً اندازہ لگایا۔

''نہیں۔'' میجر ذیشان نے اطمینان سے انکار کیا۔

''تو پھر کیا خوشخبری ہو سکتی ہے؟'' وہ اُلجھا کہ اس نے تو یہی کام اس کے ذمے لگایا تھا۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو چاہتے تھے وہ میرے یا تمہارے کچھ کہنے سے قبل ہی ہو چکا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ہمارے بڑوں میں ابھی تک کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو اس وطن اور اپنے ہم وطنوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ کارنامہ ایسے ہی کچھ گنے چنے کرنلوں اور جنرلوں نے مل کر انجام دیا ہے۔'' وہ خود تفصیل سنانے کے لیے بے چین تھا لیکن ویٹر کو قریب آتے دیکھ کر اسے اپنی گفتگو کا سلسلہ روکنا پڑا۔ اسے آرڈر نوٹ کروانے کے بعد انہوں نے ٹوٹا ہوا گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑ لیا۔

''میں تمہاری دی ہوئی تجویز پر بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ ایک دن کرنل صاحب نے فوج سے میرا استعفیٰ طلب کر کے حیران کر دیا۔ میں ان کے اس مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا لیکن جب انہوں نے وجہ بتائی تو میں نے بہ خوشی اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیا۔

''یعنی اب تم پاکستان آرمی میں نہیں ہو۔'' اسے صدمہ سا ہوا۔

''ظاہراً۔ ورنہ آج بھی اپنے وطن کا ایک سپاہی ہوں۔'' میجر ذیشان اطمینان سے مسکرایا۔

''اصل میں قصہ کیا ہے، فوراً بیان کرو۔'' اس نے عجلت دکھائی۔

''وہ ہی سنانے جا رہا ہوں۔ ہوا کچھ یوں کہ جب میں نے کرنل صاحب کے مطالبے پر حیرت اور پریشانی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میری حب الوطنی اور بہادری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے میرے لیے کوئی اور فیصلہ کرلیا ہے اور یہ فیصلہ تھا مجھے اس اسپیشل فورس میں شامل کرنے کا جن کے زیادہ تر ملازمین فوج سے یا پھر پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ سویلینز بھی ہیں لیکن ان سے زیادہ حساس نوعیت کے کام نہیں لیے جاتے۔ کرنل صاحب نے مجھے بتایا کہ اس اسپیشل فورس کا قیام چند سال قبل ہی ناگزیر حالات میں عمل میں لایا گیا ہے جس سے پاکستان کی سیاسی قیادت کا تعلق نہیں ہے۔ فورس کے قیام کی تجویز ان محبِ وطن افسران نے پیش کی تھی۔ حفاظتِ وطن کے لیے بنائی گئی اس فورس کو خاصا خفیہ رکھا گیا ہے اور یہ لوگ بظاہر ایک سکیورٹی ایجنسی کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ اس ایجنسی کی کئی برانچز ملک کے تقریباً ہر اہم شہر میں موجود ہیں۔ بہت زیادہ معاوضے پر کام کرنے والی اس سکیورٹی ایجنسی کے ملازمین کو اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ یا ادارے ہی ہائر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک تو اخراجات کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جاتا ہے دوسرے ان افراد تک رسائی ہو جاتی ہے جو ملک کے خلاف سازشوں کے جال بُن رہے ہیں۔ ہر برانچ میں مختلف درجوں کی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کام کر رہے ہیں۔ کہاں کس کی ڈیوٹی لگانی ہے، یہ ضرورت دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ کسی وزیر، سفیر وغیرہ نے خدمات طلب کی ہوں تو اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کا انتخاب ہوتا ہے جو اپنے ظاہری فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہم معاملات پر بھی نظر رکھ سکیں۔ کچھ وہ افراد ہیں جنہیں فورس کے اندرونی معاملات سے باخبر نہیں رکھا جاتا اور وہ خود کو حقیقتاً صرف سکیورٹی گارڈ ہی سمجھتے ہیں۔ البتہ ان کا انچارج ان سے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ لیتا رہتا ہے۔ ہر جگہ متعین گارڈز کو شفٹ تبدیل ہونے کے بعد پہلے دفتر آ کر تحریری رپورٹ جمع کروانی ہوتی ہے، پھر ہی اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہوتا ہے چونکہ ہماری ایجنسی میں باقی تمام جگہوں کے مقابلے میں بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں اس لیے کوئی اس ٹف روٹین پر اعتراض بھی نہیں کرتا۔''

میجر ذیشان نے جو تفصیلات بتائیں انہیں سن کر اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات اُبھر آئے لیکن زبان سے فوری طور پر اس لیے اظہار نہ کر سکا کہ ان کی ٹیبل پر دیا گیا آرڈر سرو ہو رہا تھا۔ ویٹر آرڈر سرو کر کے مؤدبانہ ایک طرف کھڑا ہوا تو ذیشان نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

''یہ تو بہت زبردست ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے درد مند لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو اس ملک کی سلامتی کے لیے سوچتے ہیں ورنہ یہاں تو جتنا بڑا افسر ہے اتنا ہی بڑا سپر پاور کا غلام ہے۔''

''میں بھی کچھ اسی طرح کی سوچ رکھتا تھا۔ لیکن CFP کے وجود نے ہر شکوہ دور کر دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ابھی چند محبِ وطن افراد عوام کے علاوہ خواص میں بھی موجود ہیں اسی لیے تو ہمارا وطن اب تک قائم ہے۔'' میجر ذیشان نے اس کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اور انشاء اللہ تا قیامت قائم رہے گا۔'' اس نے فوراً ہی ٹکڑا لگایا۔

''انشاء اللہ۔'' چمچہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے میجر ذیشان نے بھی کہا۔

''تمہارا تقرر کس شہر میں ہوا ہے؟'' شہریار نے بھی کھانے سے انصاف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت وہ خود کو جتنا ریلیکس محسوس کر رہا تھا، اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

''یہیں لاہور میں۔ ابھی کل ہی تو میں نے آفس جوائن کیا ہے۔ میرے ذمے دن بھر جمع ہونے والی رپورٹس میں سے اہم رپورٹوں کو پڑھنا اور ضرورت کے مطابق احکامات جاری کرنا ہے۔ کوئی بڑا معاملہ ہو تو مجھے



اپنے سینئر کو اطلاع دینی ہوگی۔'' اس نے بتایا۔

''ویری گڈ۔ مجھے امید ہے کہ اپنے اس عہدے پر کام کرتے ہوئے تم میری بھی خاطر خواہ مدد کر سکو گے۔'' شہریار نے امید ظاہر کی۔

''شیور..... میرے آدمی ہر طرح سے ٹرینڈ ہیں۔ خاموش نگرانی سے لے کر مار دھاڑ تک ان سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ کرنل صاحب سے تمہارا تعارف تو ہے ہی۔ میں خود بھی ان سے سرسری تذکرہ کر چکا ہوں۔ اپنے اعلیٰ اختیارات سے ہٹ کر اگر کوئی بڑا معاملہ پیش آیا تو میں ان سے باقاعدہ اجازت بھی لے سکتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ پاکستان کی حفاظت کی خاطر تمہیں CFP کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی۔

''سی ایف پی.... اس سکیورٹی ایجنسی کا نام میرا سنا ہوا تو ہے لیکن یہ حروف کس کا مخفف ہیں، یہ معلوم نہیں۔''

''سی ایف پی کا مطلب ہے کیئر فار پاکستان (Care for Pakistan) اسی لیے جو شخص بھی پاکستان کی فکر کرتا ہو ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔'' آج میجر ذیشان کی گفتگو کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد لگ رہا تھا۔

''اس طرف آ جانے سے تم اشیش کمار والے معاملے سے الگ ہو گئے ہو گے۔ میں اس شخص کو کسی صورت نہیں بھول سکتا کیونکہ وہ مجھے ان لوگوں تک پہنچا سکتا ہے جو ملک و قوم کے ہی نہیں میرے ذاتی مجرم ہیں۔ میرا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے سجاد بھائی اور شینا کے کفن میں لپٹے ہوئے وجود یاد نہ آتے ہوں۔'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

''ریلیکس یار! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ اور تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے اشیش والے معاملے سے الگ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی معاملے کی وجہ سے میں سی ایف پی میں شامل ہوا ہوں۔ اشیش سے ہمیں جو کلیوز ملے ہیں ان ہی پر کام کرنے کے لیے مجھے لاہور بھیجا گیا ہے۔ کراچی والی برانچ میں بھی اس معاملے پر کام ہو رہا ہے بلکہ الرٹ تو ساری ہی برانچز کو کیا گیا ہے لیکن ورما اور پانڈے وغیرہ کی زیادہ تر موومنٹ چونکہ ان دونوں شہروں میں دیکھی گئی ہے اس لیے یہاں خاص طور پر کام کیا جا رہا ہے۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی تو کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

''تھینک یو..... یہ تم نے مجھے ایک اور اچھی اطلاع دی ہے۔ اس معاملے میں جو بھی پیش رفت ہو، تم مجھے اس سے باخبر رکھنا۔''

''بالکل، تمہیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' ذیشان نے یقین دہانی کروائی اور پھر کچھ چونکتے ہوئے بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ مجھے تمہارے چودھری صاحب کے بارے میں بھی ایک خبر دینی تھی۔ ویسے تو خبر ایسی خاص نہیں ہے اور شاید مجھ تک بھی نہ پہنچتی اگر تسلسل سے چودھری افتخار کا نام میرے لوگوں کے سامنے نہ آتا۔ آج صبح ہی مجھے اس بارے میں بتایا گیا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے لاہور میں موجود کارخانے کے لیے ہماری سکیورٹی ایجنسی سے خدمات حاصل کی ہیں۔ ان کا مؤقف ہے کہ پچھلے دنوں اپنے کارخانے میں لگنے والی آگ کے سلسلے میں وہ تشویش کا شکار ہیں کہ کہیں یہ کسی دشمن کی کارروائی نہ ہو اس لیے وہاں تربیت یافتہ گارڈز رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہری طور پر یہ ایک عام سا معاملہ تھا اس لیے میرے ماتحت نے وہاں عام گارڈز کی ڈیوٹی لگا دی لیکن دوسری طرف کچھ ایسے چھوٹے تاجروں سے بھی چودھری کے ربط ضبط کی خبریں ملی ہیں جن کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو اسمگل شدہ کپڑے، الیکٹرونکس آئٹمز اور خشک میوہ جات سے لے کر اسلحے

تک سب کچھ فروخت کرتے ہیں۔ چودھری کا سابقہ ریکارڈ جیسا ہے اس کی روشنی میں اس کا اس طرح کے بے ایمان تاجروں سے ربط ضبط سمجھ تو آتا ہے لیکن فی الحال یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس چکر میں ہے۔

''اس شخص کی ہوس کا پیٹ کسی صورت نہیں بھرتا۔ کہنے کو تو اللہ نے بے تحاشا دولت نوازا ہے لیکن وہ پھر بھی حرام راستوں سے کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اب بھی کسی کالے دھندے کے چکر میں ہوگا۔ معاملہ سامنے آئے تو تم خود نمٹ لینا۔'' اس نے چودھری کے ذکر پر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ کھانے کے ساتھ ساتھ کئی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ سلسلہ تھما تو انہیں احساس ہوا کہ دو ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

شہریار نے اپنی گاڑی پارکنگ سے نکالی ہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آتا نمبر چیک کیا تو بالکل اجنبی نمبر دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کا یہ موبائل نمبر چند بہت ہی خاص لوگوں کے پاس تھا اس لیے اس نمبر پر کسی اجنبی نمبر سے کال آنا اچنبھے کی بات تھی۔ حیرت کے باوجود اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''السلام علیکم اے سی صاحب! میں ماہ بانو بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ بہک سا گیا۔

''کیا ہوا سر! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کو میری آواز آ رہی ہے نا؟'' اس کی خاموشی پر وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

''تم کہاں ہو ماہ بانو؟ کہاں چلی گئی تھیں تم؟ مجھے اپنا پتہ بتاؤ۔'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ماہ بانو سے کہا۔

''میں یہیں لاہور میں ہوں سر! لیکن فی الحال آپ کو اپنا کوئی پتہ نہیں بتا سکتی۔ اصل میں یہاں میرا ایسا کوئی ٹھکانہ ہے ہی نہیں جہاں میں آپ کو ملاقات کے لیے بلا سکوں لیکن میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''تمہیں جہاں بھی ملنے کی سہولت ہو، مجھے بتا دو۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے فوراً ہی کہا۔ ماہ بانو کو اس نے کبھی فراموش کیا ہی نہیں تھا اور اب اچانک اس کی آواز سن کر ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جواب میں ماہ بانو نے اسے جگہ کا نام بتا دیا۔ وہ جگہ اس مقام سے کافی دور تھی جہاں وہ اس وقت موجود تھا، چنانچہ بولا۔

''میں ایک گھنٹے کے اندر وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا۔'' اس کے بعد اس نے خلاف عادت گاڑی بھگانی شروع کر دی۔ رش والی جگہوں پر مجبوری تھی لیکن جہاں بھی سڑک خالی ملتی، وہ گاڑی کی رفتار تیز کر دیتا۔ اس مارم ماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حسبِ وعدہ اس فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تک پچاس منٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا پتہ ماہ بانو نے اسے بتایا تھا۔

ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ جانے وہاں ماہ بانو کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ لیکن اس کا ہر خوف اور وسوسہ اس وقت دور ہو گیا، جب اس نے ڈائننگ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک میز کے سامنے بیٹھے دیکھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور ہو گئی تھی لیکن اس کی دلکشی و دلربائی وہی تھی جس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا اسیر کر لیا تھا اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا دامن اس کی محبت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''کیسی ہو ماہ بانو؟'' اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے سوال کیا۔



''زندگی کے طوفانوں سے نمٹتی ابھی تک جی رہی ہوں۔ کب کوئی موج غرق کر دے، نہیں معلوم۔ آپ اپنی سنائیں۔ کس حال میں ہیں؟..... بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے حزنیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ اچھے خاصے طویل عرصے تک منظر سے غائب رہنے کے باوجود وہ اس کی شادی سے واقف تھی، یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔

''سب ٹھیک ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ مجھے تمہارے بارے میں جو آخری اطلاع ملی، وہ یہ تھی کہ تمہیں ٹاہلی والا نام کے کسی گاؤں میں دیکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے بھی یقیناً بہت کچھ پیش آیا ہوگا۔ کراچی کے ہاسٹل سے اغوا ہونے کے بعد جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچنے سے لے کر ٹاہلی والا اور پھر یہاں لاہور کا سفر آسان تو نہ ہوگا۔ میں اس سارے سفر کا احوال جاننا چاہتا ہوں۔''

اس نے حکم دیا اور ماہ بانو کے لیے اس کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ وہ اسے سب کچھ سناتی چلی گئی۔ اس آپ بیتی میں اسلم کا ذکر ناگزیر تھا لیکن وہ فوری طور پر یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ اسلم سے شادی کا وعدہ کر کے اس کے ساتھ جنگل سے فرار ہوئی تھی۔

''تمہاری سہیلی راحیلہ کے ڈاکٹر بھائی پر مجھے بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو اسی شخص نے چودھری کو تمہارے بارے میں اطلاع دی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کافی چھان بین بھی کروائی تھی جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ شخص خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے بیوپار میں بھی ملوث ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ملک سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پیچھے اس کی بہن ملی تھی لیکن وہ خود اپنے بھائی کی اصلیت کھلنے پر حیران پریشان تھی اس لیے اس نے اس کی چھوٹی موٹی خطائیں معاف کر دیں۔''

''اچھا کیا۔ راحیلہ تو بس ایک سبب تھی۔ میرے نصیب نے مجھے جہاں لے جانا تھا، وہاں لے جا کر رہا۔'' اس کے اندازِ گفتگو سے شہریار کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مختصر دورانیے میں ہی اپنی عمر کے کئی سال طے کر گئی ہو۔

''اب بھی یقیناً تم اسلم کے ساتھ ہی کہیں رہ رہی ہو اسی لیے اس کی گرفتاری کے ڈر سے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتہ نہیں بتایا۔'' اس نے ماہ بانو سے ایک نازک سوال کیا۔

''آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔'' اس نے انکار نہیں کیا۔ ''اسلم اور میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن ایسے مسائل سے دوچار ہیں جن کے حل کے لیے اپنے میزبانوں سے مدد نہیں لے سکتے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے اور اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''کیسی مدد چاہیے تمہیں؟'' شہریار نے یہ پوچھتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی، کوئی ایسی تبدیلی جس کی وجہ سے وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

''میں اور اسلم شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں۔ آپ ہمیں وہ کاغذات بنوا کر دیں گے۔'' آخر کار اس نے دھماکا کر ہی دیا۔

''تم ایک ڈاکو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''میرے لیے وہ میری عزت کا محافظ پہلے ہے، ڈاکو بعد میں۔ ویسے بھی وہ اپنی مرضی سے ڈاکو نہیں بنا تھا۔ اسے حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنی اس زندگی کو ترک کرنا چاہتا ہے تو میں اس کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں شہریار کو جواب دیا۔

''انسانی ہمدردی اچھی چیز ہے لیکن تم اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رہی ہو؟ وہ شخص قانون کو مطلوب ہے۔ جلد

یا بدیر گرفتار ہو جائے گا پھر تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟'' اسے گمان ہوا کہ ماہ بانو اپنی ہمدردفطرت کی وجہ سے اسلم سے شادی کرنا چاہتی ہے اس لیے اسے اس کے فیصلے کے مضمرات سے آگاہ کرنے لگا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر! میں ہمدردی میں اسلم سے شادی نہیں کر رہی ہوں۔ میں اس لیے اس کا ساتھ قبول کر رہی ہوں کہ وہ اس دنیا کا واحد شخص ہے جو دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتا ہے اور مجھے میری تمام تر خامیوں اور مسائل کے ساتھ قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' بڑی بے دردی سے سپاٹ لہجے میں یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہریار کو اس کی بات سے کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے لیکن وہ کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کا کہنا بھی ایک طرح سے درست ہی تھا۔ وہ اسے چاہنے کے باوجود اپنانے کا فیصلہ بروقت اسی لیے تو نہیں کر پایا تھا کہ وہ عمر، تعلیم اور سماجی رُتبے کے اعتبار سے اسے خود سے کافی پیچھے معلوم ہوئی تھی۔ اس کے احساسات سے بے خبر ماہ بانو کہتی جا رہی تھی۔

''رہی اس کی گرفتاری کی بات تو میں نے آپ کو اسی لیے مدد کے لیے بلایا ہے۔ آپ ہم دونوں کو ایک نئی شناخت کے ساتھ پاکستان سے باہر نکلنے میں مدد دیں گے تاکہ ہم بلاخوف وخطر اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکیں۔''

''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟'' شہریار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاید اس لیے کہ آپ پہلے بھی ہر مشکل میں مدد کرتے رہے ہیں۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''وہ الگ معاملہ تھا۔ میں تمہیں مظلوم اور بے قصور سمجھ کر تمہاری مدد کرتا رہا لیکن اب ایک مبینہ ملزم کے فرار کا معاملہ ہے۔ میں کیسے کسی مفرور ملزم کا مددگار بن سکتا ہوں؟'' اس نے اعتراض کیا۔

''آپ کو ایسا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے۔ اسلم اور میں دونوں حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ اور آپ کا تعاون ہمارے مستقبل کو محفوظ کر دے گا۔ ہم محفوظ و مامون ہو گئے تو شاید کبھی اس دنیا میں کوئی کارآمد کردار بھی ادا کر سکیں۔ اسلم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر بہرحال آپ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیں گے۔'' وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں مضبوطی سے بات کر رہی تھی۔ شہریار نے خود کو اس کے سامنے مجبور پایا۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کے دلائل مضبوط تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ماہ بانو تھی جس کی خوشی اسے دل و جان سے عزیز تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا یہ کام کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟'' وہ ہتھیار ڈال رہا تھا لیکن لہجہ سپاٹ اور کٹھور تھا۔

''ہاں، ایک کام اور ہے۔'' اس نے کہا اور پھر پل بھر کے توقف سے بولی۔ ''آپ کو میرے نکاح میں شریک ہونا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی تو اپنا اس موقع پر میرے پاس موجود ہو۔'' نہ چاہنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ گئے۔ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس کے دل کو کتنا اپنا لگتا ہے۔

''میں آ جاؤں گا۔ تم مجھے دن اور وقت بتا دینا بلکہ اس سلسلے میں جو بھی انتظامات کرنے ہوں، وہ بھی میں کروں گا۔'' اس کے آنسوؤں نے شہریار کو موم کر دیا۔

''تھینک یو سر!.....اب میں چلتی ہوں۔'' اس کے لیے مزید شہریار کے سامنے رُکنا ممکن نہیں رہا۔ شہریار نے بھی اسے نہیں روکا۔ نہ ہی اس کے جانے کے بعد فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ یہاں تک کہ اس کا پیچھا کر کے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں رہ رہی ہے۔ اتنے عرصے بعد ماہ بانو کے ملنے کی ساری خوشی اس کے تازہ فیصلے نے برباد کر دی تھی۔ وہ خودغرض نہیں تھا کہ ماہ بانو کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا



لیکن اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ حالات کے گرداب سے نکلنے کی خواہش میں کر ڈالا ہے لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ کسی اور گرداب میں نہ پھنس جائے۔ وہ اسے اس کے فیصلے سے باز بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھی۔ اب اسے صرف اس کی مدد کرنی تھی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کہ وہ خوش رہے۔ حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ خود بھی ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل رانا ہاؤس تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس کا آفرین رانا سے سامنا ہو گیا۔

''تم دونوں میاں بیوی ہم سے ملنے آئے ہو یا دوستوں سے ملاقاتیں کرنے؟'' اسے دیکھتے ہی انہوں نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

''ماریہ بھی کہیں گئی ہوئی ہے کیا؟'' اس کے جملے سے اندازہ لگاتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''ہاں اسے بھی اپنی کسی فرینڈ سے ملنا تھا۔ مریم کی گاڑی لے کر گئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ لیکن اس نے کہا کہ میں خود ہی ڈرائیو کر لوں گی۔'' انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''پہلے وہ لاہور میں ہی تو رہتی تھی۔ ظاہر ہے یہاں اس کی سہیلیاں بھی ہوں گی۔ اچھا ہے، ملنے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ تب تک میں آپ کو کمپنی دے دیتا ہوں۔''

حقیقتاً اس وقت وہ مکمل تنہائی کا خواہش مند تھا لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ سجاد اور شینا کے انتقال کے بعد وہ بہت زیادہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہیں اور اب واحد اس کی ذات ہی ہے جس سے انہوں نے اپنی ساری خوشیاں اور خواہشیں وابستہ کر رکھی ہیں اس لیے اپنے احساسات کو پسِ پشت ڈال کر ان کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

''ارے نہیں بیٹا! میں تم سے شکایت نہیں کر رہی تھی۔ بس ایسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ تم جاؤ جا کر آرام کرو۔'' وہ اس سے ماں جیسی محبت کرتی تھیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان سے اس کے دل کی خواہش چھپی رہ جاتی۔ انہوں نے فوراً ہی اسے اپنی طرف سے ریلیکس کر دیا۔

''آرام بھی کر لوں گا۔ پہلے آپ چائے تو بنوائیں۔ ساتھ بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پیتے ہیں، پھر آرام بھی ہو جائے گا۔'' وہ وہیں لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ اگر اس کے لیے ممتا کے جذبات رکھتی تھیں تو خود وہ بھی انہیں سگی ماں سے بڑھ کر ہی درجہ دیتا تھا کہ مائیں تو سب ہی اپنی اولاد سے پیار کرتی ہیں لیکن آفرین رانا وہ ہستی تھیں جنہوں نے اسے بچپن میں اس کے والدین کی حادثاتی موت کے بعد بے پناہ محبت اور شفقت سے نوازا تھا۔ ان کے لیے اگر اسے اپنی طبیعت پر تھوڑی دیر جبر کرنا پڑتا تو بھی گوارا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ کھل اُٹھیں اور خوشی خوشی ملازم کو بلا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے پاس بہت سے موضوعات تھے۔ خصوصاً وہ رانا کی بیماری اور مریم کی تنہائی کی طرف سے بہت فکرمند تھیں۔ خود وہ بھی ان دونوں کے لیے دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا۔ دیکھا جائے تو حالات نے سب سے زیادہ انہیں ہی متاثر کیا تھا لیکن انہوں نے کمزور عورت ہونے کے باوجود ظاہری طور پر خود کو بہت سنبھال لیا تھا۔ وہ انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا گفتگو کا رخ بہت ہوشیاری سے موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ چائے آنے تک وہ خاصے لائٹ موڈ میں آ چکی تھیں۔ چائے کے دوران بھی وہ دونوں ہلکے پھلکے موضوعات پر ہی گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران ماریہ بھی واپس آ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

''جاؤ اب تم دونوں جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ دوبارہ رات کے کھانے کے بعد نشست جمائیں گے۔''

آخر آفرین رانا ہی کو خیال آیا تو انہوں نے ان دونوں سے کہا۔ اس بار شہریار نے بھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ و
فارمل ڈریس میں خود کو تھوڑا سا بے آرام محسوس کر رہا تھا اس لیے خود بھی چینج کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ او
ماریہ ساتھ ساتھ چلتے اپنے لیے مخصوص کمرے میں آئے

''آپ کی ٹائی پن کہاں ہے؟'' کمرے میں پہنچ کر وہ کوٹ اُتارنے لگا تو ماریہ نے اس سے سوال کیا۔
اس کا ہاتھ بے ساختہ ہی اپنے کوٹ کی جیب کی طرف رینگ گیا لیکن جیب خالی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی
ساری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پارکنگ سے نکلتے ہوئے اس نے ٹائی پن نکال کر اپنے کوٹ
کی جیب میں ڈالی تھی لیکن اب وہ وہاں موجود نہیں تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹائی پن جیب میں رکھنے کے
بجائے کہیں گرا بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ماریہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کچھ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''سوری ڈیئر! شاید وہ کہیں گر گئی ہے۔'' اس نے معذرت کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

''میں نے اتنے پیار سے آپ کو وہ ٹائی پن گفٹ کی تھی اور آپ نے ذرا بھی قدر نہیں کی۔'' اس کا مو
آف ہو گیا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری ڈارلنگ! مجھے واقعی نہیں پتہ چلا کہ وہ کہاں اور کب گری۔'' اس وقت وہ سخ
ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ ماہ بانو سے ہونے والی ملاقات نے اس کے اندر تہلکہ مچا رکھا تھا لیکن قسمت کی
ظریفی سے اسے ایسے نازک وقت میں ہی ہر رشتے کے نخرے اٹھانے پڑ رہے تھے۔

''آدمی کو کسی کے دیئے گفٹ کی قدر ہو تو وہ اسے جان سے لگا کر رکھتا ہے۔ آپ کے نزدیک میرے گفٹ
کی اہمیت ہی نہیں تھی تو آپ اسے سنبھالتے کیسے؟''

ماریہ کا شکوہ برقرار تھا۔ اس میں مزید حوصلہ نہیں رہا کہ وہ اسے منانے کے لیے کچھ کہہ سکے۔ وہ منہ پھلا
ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے خود وہیں رک گیا اور خلافِ مزاج کوٹ اُتا
کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ نیم دراز حالت میں ہی اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی
اور پھر مکمل طور پر لیٹ کر ایک تکیے سے سر اور منہ بھی چھپا لیا۔

اگر اس وقت آفرین رانا اسے دیکھ لیتیں تو انہیں سخت دھچکا لگتا اور وہ سمجھ لیتیں کہ وہ کسی بہت بڑے نقصا
سے دوچار ہوا ہے کیونکہ اس انداز میں تو وہ بس صرف بچپن کے ان دنوں ہی تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹتا تھا جب
اس کے والدین کا انتقال ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیا پروگریس ہے چودھری؟'' چودھری کو الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل فون پیر آباد میں
گیا تھا۔ اب جبکہ وہ لاہور میں رہ کر اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا، پہلی بار اس موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی۔
کال ریسیو کرنے سے پہلے ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ دوسری طرف کون ہو گا۔ فون ریسیو کرنے کے بعد اس
اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

دوسری طرف الفا اپنے مخصوص حاکمانہ اور اکھڑ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ حکم چلانے والے چودھری
اس کا یہ لہجہ سخت ناگوار گزرتا تھا لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہوسِ زر کے علاوہ ا
دوسری مجبوریاں بھی اس کے دامن سے لپٹ گئی تھیں۔

پچھلی بار بات ہونے پر الفا اسے صاف طور پر دھمکی دے چکا تھا کہ کسی بھی قسم کی خلاف ورزی کی صو



ا ا ا ا ڈی چودھرائن کی پُراسرار موت کے سلسلے میں چند ایسے شواہد فراہم کر دے گا جس کے بعد اس کے لیے
ا ہیٹے کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے بلیک میلنگ کے اسی واحد ہتھکنڈے پر اکتفا
نہیں کیا تھا۔ موبائل فون کے ساتھ اسے ایک سربمہر لفافہ بھی موصول ہوا تھا اور اس لفافے میں موجود تصویریں
دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ جدید کیمرے سے کھینچی گئی ان تصویروں میں وہ لنڈا کے علاوہ ان کال گرلز
کے ساتھ بھی نظر آ رہا تھا جن کے ساتھ وہ لندن میں قیام کے عرصے میں رنگ رلیاں مناتا رہا تھا۔ خاص بات یہ
تھی کہ تصویروں پر تاریخیں اور وقت بھی پرنٹ تھا۔ اور ظاہر ہے یہ ایک بیّن ثبوت تھا کہ جن دنوں وہ وڈی
چودھرائن کے علاج کے بہانے لندن میں رہ رہا تھا، حقیقتاً وہاں اس کی کیا مصروفیت تھی۔ تصویروں کے ساتھ
کوئی خط وغیرہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اس سے فون پر ان کے متعلق کچھ کہا گیا تھا لیکن وہ تصویریں خود چیخ چیخ کر
اعلان کر رہی تھیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ! تمہارے پَر کھینچ دیئے گئے ہیں اس لیے اب اُڑنے یا اُڑنے کی
کوشش نہ کرنا۔

''پروگریس بہت اچھی ہے جناب! کارخانے کی حفاظت کا معقول انتظام کر لیا گیا ہے۔ میرے ذاتی
ملازمین کے علاوہ تربیت یافتہ گارڈز بھی موجود ہیں۔ مارکیٹ میں بھی میں نے تیزی سے روابط قائم کر لیے ہیں
اور کئی ایسے لوگوں سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو ہمارے بزنس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔''
اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

حقیقی معنوں میں آج پہلی بار وہ مکمل طور پر زیر ہو کر بات کر رہا تھا۔ ورنہ اس سے قبل لالچ میں مبتلا ہونے
کے باوجود کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی دل میں موجود رہتا تھا کہ جب چاہے ان کے مال کو ٹھوکر مار کر خود کو ان سے
الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی صورت ان کے چنگل سے نہیں بچ سکتا۔

''گڈ!..... تم اچھے جا رہے ہو۔ مقامی منڈی میں تمہاری کارکردگی سے بھی مطمئن ہوں لیکن تمہیں اصل
کام مال کو بیرونِ ملک ایکسپورٹ کرنے کے سلسلے میں کرنا ہو گا۔ مقامی منڈی میں تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا
ہوں کہ میرے آدمی آل ریڈی کام کر رہے ہیں۔'' الفا کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا۔ البتہ اپنی گفتگو سے وہ اس پر یہ
ظاہر کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ اس کی طرف سے بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس سے
اچھی طرح واقف ہے اور یہ بات چودھری کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس حد
تک زیرِ نگرانی ہے اور اس کی کون کون سی سرگرمیاں ان لوگوں کے علم میں ہیں یا آتی رہیں گی۔

''ہمیں کن ممالک میں مال ایکسپورٹ کرنا ہو گا؟'' سارے وسوسے اور اندیشے اپنے آپ تک محدود
رکھتے ہوئے اس نے کام کا سوال کیا۔

''امریکہ..... ہمارا اصل ہدف یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ ہو گا۔'' الفا کے جواب نے اس کے چھکے چھڑا
دیئے۔ دوسرے ملکوں کا معاملہ الگ تھا لیکن امریکن ایئرپورٹس پر جس سختی سے چیکنگ کی جاتی تھی، وہاں سے
مال نکالنا بہت مشکل تھا۔

''یہ تو بہت مشکل کام ہو گا۔ اس کے لیے تو خصوصی تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹس کی ضرورت ہو گی اور
مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسے لوگ نہیں ہیں۔'' اس نے ہمت کر کے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کر ہی دیا۔

''اوہ..... اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے پاس لوگوں کی کمی ہو سکتی ہے لیکن میرے پاس ان یادگار
تصویروں کے بے شمار پرنٹس موجود ہیں جو تمہیں یقینی طور پر موصول ہو چکی ہوں گی اور تم انہیں دیکھ کر خاصے محظوظ
بھی ہوئے ہو گے۔ بائی دا وے تصویریں صاف تو آئی ہیں نا؟ گزرے ہوئے خوب صورت لمحات کی ان

ہاکاروں کو سنبھال کر رکھنا۔ ویسے اگر نہ بھی سنبھال سکو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس تو کئی پرنٹس ہیں۔ تمہیں
ب ضرورت پڑے، مجھ سے منگوالینا۔'' وہ بڑے میٹھے لہجے میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

''میں نے آپ کو انکار نہیں کیا ہے مسٹر الفا!'' اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ اپنا شملہ اتار کر اس کے
قدموں میں رکھ دیتا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ مغربی تہذیب کا پروردہ الفا، شملہ قدموں میں رکھنے کا مطلب سمجھتا بھی
تھا یا نہیں۔

''مشکلات کا رونا نہیں رویا جاتا، عقل سے کام لے کر ان کا حل نکالا جاتا ہے۔ اس بار میں تمہیں ایک
ترکیب بتا دیتا ہوں، آئندہ کے لیے تم اپنا دماغ خود لڑانا۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا پھر ذرا سے توقف
کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہیروئن کی ترسیل کے لیے تم بچوں کے ڈائپرز استعمال کر سکتے ہو۔ عام طور پر ان ڈائپرز کی اندرونی سطح
سفید ہی ہوتی ہے۔ تمہیں ایک ایسے ماہر کاریگر کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو ڈائپرز کے جاذب میٹریل کی
جگہ مہارت سے ہیروئن کا سفوف بچھا سکے۔ اس سلسلے میں احتیاط یہ کرنی ہوگی کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ
ہیروئن کی مقدار ایک حد سے تجاوز نہ کرے ورنہ بڑھا ہوا وزن شکوک کو جنم دے سکتا ہے۔ پچاس پیئر والا کسی بھی
کمپنی کا تیار کردہ ڈائپرز کا پیک اس کام کے لیے کافی ہوگا۔ کیریئر کے طور پر تمہیں کسی ایسی عورت کا انتخاب کرنا
ہوگا جس کا چھ ماہ سے لے کر ڈھائی سال تک کا بچہ اس کے ساتھ سفر کر سکے۔ ایسی عورت ڈائپرز کا یہ پیک اپنے
ظری بیگ میں با آسانی لے جا سکتی ہے۔ پیک کو کھلا ہی رہنے دینا اور اوپر کے چند پیسز کو ان کی اصلی حالت
میں رکھنا۔ کسی بہت حفاظت سے پیک کی گئی چیز کے مقابلے میں کھلا ہوا پیک کسٹم والوں کو اپنی طرف کم متوجہ
کرے گا۔ کسٹم پر موجود بُو گیر کتوں سے بچنے کے لیے سفری بیگ میں تیز خوشبو والے پرفیوم کی ایسی بوتل رکھی جا
سکتی ہے جو معمولی سی چٹخی ہوئی ہو۔ کاسمیٹکس کے دیگر سامان کے ساتھ موجود ایسی بوتل کے بارے میں یہی سمجھا
جائے گا کہ سامان رکھنے اُتارنے میں بوتل چٹخ گئی ہے۔ لیکن ہمارا کام ہو جائے گا اور تیز خوشبو بُو گیر کتوں کو ڈاج
دینے میں کامیاب رہے گی۔''

الفا کی بتائی ترکیب سن کر چودھری اَش اَش کر اُٹھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ مقامی مارکیٹ میں بھی
الفا ترکیب سے مال سپلائی کرے گا۔ اس طرح کسی کو اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں اصل
دھندا کیا ہو رہا ہے۔

''شکریہ مسٹر الفا! آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ بس آپ مجھے وقت کا تعین کر کے بتا دیجئے گا، باقی
سارے انتظامات میں خود کر لوں گا۔'' وہ فوراً ہی چہکنے لگا۔

''یاد رکھنا کہ یہ ترکیب ایک آدھ بار استعمال ہوگی۔ بار بار اس کا اعادہ کیا گیا تو وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں
گے۔ آئندہ کے لیے تمہیں خود ترکیبیں سوچنی ہوں گی۔ البتہ عمل سے پہلے مجھ سے ڈسکس کر سکتے ہو۔'' اس نے
چودھری کے چہکنے کو محسوس کر کے فوراً ہی تنبیہہ کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔'' چودھری نے فوراً ہی فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ جواباً دوسری طرف
سے الفا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کا یہ انداز چودھری کو سخت طیش دلاتا تھا لیکن وہ سوائے اپنی جگہ پیچ و تاب
کھانے کے کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا چنانچہ سر جھٹک کر آئندہ انجام دیئے جانے والے کاموں کے بارے میں
سوچنے لگا کہ کون سا کام کس کے ذمے لگانا ہے۔ کل کا دن اسے مراد شاہ کے ساتھ گزارنا تھا۔ کل وہ واپس
نیویارک روانہ ہونے والا تھا اس لیے وہ اسے وقت دینا چاہتا تھا۔ وقت نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ سے



زیادہ کام آج ہی نمٹا لے چنانچہ وہ مصروف ہو گیا۔

⊛-----✪-----⊛

وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ چائے کا دور جاری تھا کہ
شہریار کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے موبائل نکال کر چیک کیا تو دوسری طرف موجود شخص کی نشاندہی ہو
گئی۔ وہ مشابرم خان تھا جو اسے کال کر رہا تھا۔ وہ ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر سب کے درمیان سے اُٹھ گیا۔

''سوری سر! ایک اہم اطلاع تھی اس لیے میں نے آپ کو اس وقت فون کیا ہے۔'' اس کی آواز سنتے ہی
مشابرم خان نے معذرت خواہانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔ اس کے لہجے کا دبا دبا جوش بتا رہا تھا کہ اطلاع واقعی
اہم ہے۔

''تکلفات میں پڑے بغیر سنا ڈالو۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں نے آپ سے ٹاہلی والا کے علی بخش کا ذکر کیا تھا نا، وہی لڑکا جس نے مجھے وہاں سے نکالا تھا اور
ہمارے لیے مخبری کا کام کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ وہ لڑکا میرے پاس آیا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پیر سائیں
کے خفیہ ٹھکانے پر کچھ لوگ ایک گاڑی میں بہت سے بند ڈبے لے کر پہنچے ہیں۔ وہ لوگ ڈبے اُتار ہی رہے
تھے کہ علی بخش اپنی گدھا گاڑی لے کر اطلاع دینے آ پہنچا۔ مجھے امید ہے کہ ہم فوری طور پر ٹاہلی والا پہنچ جائیں تو
پیر سائیں کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور حاصل کر لیں گے۔'' مشابرم خان خاصا پُر جوش تھا۔

''تم انتظار کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا، کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع
کر دیا اور خود میجر ذیشان کا نمبر ملانے لگا۔ اس سے رابطہ ہونے کے بعد اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اطلاع تو اہم ہے لیکن ٹائمنگ کا مسئلہ ہے۔ اس مخبر لڑکے کو ٹاہلی والا سے نورکوٹ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے
ہوں گے۔ اب ہم کسی کارروائی کے لیے وہاں جائیں گے تو ہمیں بھی پہنچنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔ مجھے ڈر
ہے کہ اس وقت تک وہاں کچھ نہیں بچے گا اور ہماری ساری بھاگ دوڑ بے کار جائے گی۔'' اس کی بات سن کر
ذیشان نے خدشات کا اظہار کیا۔

''یہ سب باتیں تو میرے ذہن میں بھی ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ہمیں کچھ نہ
کچھ تو کرنا ہوگا۔'' وہ خاصا بے چین ہو رہا تھا۔

''فوری اور بروقت ایکشن کی تو ایک ہی صورت ہے کہ ہم وہاں کی پولیس کو ایکشن میں لائیں اور انہیں اس
جگہ کا محاصرہ کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد خود پیچھے سے روانہ ہو جائیں۔'' ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے تجویز
پیش کی۔

''اب تک میرے سامنے جو حالات و واقعات آئے ہیں، ان سے ٹاہلی والا کی پولیس ناقابلِ اعتبار محسوس
ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہاں کے تھانے دار کو پیر سائیں کا پٹھو سمجھا جاتا ہے۔''

''پھر تو ہم وہاں کی پولیس سے کام نہیں لے سکتے۔'' ذیشان فکر مند ہوا۔

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمہارے اختیارات کی حد کہاں تک ہے اور تم کن کن
لوگوں سے کام لے سکتے ہو۔'' اس نے پُر سوچ انداز میں بولنا شروع کیا۔

''تم تجویز تو بتاؤ۔ جو کچھ ہو سکا، میں ضرور کروں گا۔'' ذیشان فوراً بولا۔

''اگر ہم پولیس فورس کے بجائے ٹاہلی والا سے قریب ترین کسی چیک پوسٹ وغیرہ پر موجود فوج یا رینجرز
کے جوانوں سے کام لے سکیں تو زیادہ اچھا رزلٹ آ سکے گا۔''

''اوہ یس۔ یہ اچھی تجویز ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں کہ وہاں سے قریب ترین علاقے میں فوج کا کوئی یونٹ کام کر رہا ہے یا نہیں۔ تم اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہو تو تیاری رکھو۔ میں اس طرف سے کوئی پازیٹو رسپانس ملنے پر تمہیں فون کروں گا۔ پھر اگر ضرورت ہوئی تو ہم خود وہاں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔'' ذیشان نے سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ خود تیاری کے لیے چل پڑا۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور بھی ہولسٹر میں رکھ لیا۔ کسی ممکنہ مہم جوئی کے خیال سے اس نے فارمل ڈریس کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا اور اسی مناسبت سے جوتے بھی جوگرز پہنے تھے۔ اپنی تیاری کی طرف سے مطمئن وہ گھر سے نکلنے کو تیار تھا کہ ماریہ کمرے میں چلی آئی۔

''خیریت، آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کی تیاری دیکھتے ہوئے اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''ضروری کام ہے۔ ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کی تیاری سے تو کچھ عجیب سا ہی احساس ہو رہا ہے۔ میں نے پہلے تو کبھی آپ کو دوستوں سے اس حلیے میں ملاقات کے لیے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

ماریہ نے فوراً ہی اعتراض جڑا تو وہ دل میں خود کو ہی کوس کر رہ گیا۔ بچپن سے کچھ ایسے ماحول میں تربیت ہوئی تھی کہ وہ ملنے جلنے کے لیے ہمیشہ فارمل ڈریسنگ ہی کرتا تھا اور ظاہر ہے ماریہ بیوی کی حیثیت سے اُس کی اس عادت سے واقف تھی چنانچہ فوراً ہی اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا۔

''اوکے یار! میں مانتا ہوں کہ میں کسی دوست سے ملنے نہیں جا رہا ہوں لیکن ضروری کام سے بہر حال جا رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے وہاں کتنا وقت لگے گا اور میں واپس لاہور آ بھی سکوں گا یا نہیں۔ تم ایسا کرنا کہ پروگرام کے مطابق صبح نور کوٹ کے لیے روانہ ہو جانا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ڈائریکٹ وہیں پہنچوں۔'' اس نے آدھا ادھورا سا اعتراف کیا۔

''ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا شہریار! کہ آپ ایک فون کال پر اچانک ہی اُٹھ کر چل پڑنے کے لیے تیار ہیں اور جا بھی لاہور سے باہر رہے ہیں۔ آپ کو کم از کم ماموں اور ممانی جان کو تو بتا کر جانا چاہیے۔'' وہ خفگی کا اظہار کرنے لگی۔

''انہیں بتایا تو وہ تم سے بھی زیادہ سوال جواب کریں گے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں میرے جانے کے بعد بتا دینا۔''

''لیکن بتاؤں کیا؟ مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں کہ آپ کہاں، کس کے ساتھ اور کیوں جا رہے ہیں؟'' اس کی آواز تھوڑی سی بلند ہوئی۔

''جتنا تمہیں معلوم ہے بتا دینا۔ بعد میں، میں خود ان دونوں سے بات کر لوں گا۔'' وہ کسی طور کھلنے پر راضی نہیں تھا۔

''آپ مت جائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کے انداز سے ظاہر ہے کہ آپ کسی خطرناک کام کے لیے جا رہے ہیں۔'' وہ یک دم ہی روہانسی ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

''یہ کیا بچپنا ہے ماریہ! تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو؟ انشاء اللہ کل تم مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں نور کوٹ میں دیکھو گی۔'' اس نے نرمی سے ماریہ کو ٹوکتے ہوئے اس کا شانہ سہلایا۔

''آپ صرف مجھے تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی تو گڑبڑ ہے۔'' وہ کسی طور مطمئن ہو کر نہیں دے رہی تھی۔



''ٹھیک ہے، کوئی گڑبڑ ہے اور شاید تھوڑا سا خطرہ بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں۔ خطروں سے لڑنا تو مرد کی شان ہوتی ہے اور جب معاملہ بہت سی انسانی زندگیوں کے تحفظ کا ہو تو کسی نہ کسی کو تو خطرہ مول لینے کی ہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ مجھے جانے دو۔ اللہ نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔'' اس نے نرمی سے کہتے ہوئے ماریہ کے بازو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تو جواباً وہ مزید اس سے چپک گئی اور اس کے لبوں کا ایک بھرپور بوسہ لے ڈالا۔

''یہ بوسہ آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ آپ کو کسی کی خاطر واپس لوٹنا ہے اس لیے اپنا بہت خیال رکھیے گا۔'' وہ نہایت جذباتیت سے کہتی ہوئی اس سے الگ ہوئی۔ جواباً وہ صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کر سکا کیونکہ اس کے موبائل پر ذیشان کی کال آنے لگی تھی۔

''مبارک ہو شہریار! ٹاہلی والا کے ایک قریبی علاقے میں موجود رینجرز والوں کو ٹارگٹ کی طرف موو کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ سارے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے۔ اب تم بتاؤ کہ ان کی طرف سے رپورٹ آنے کا انتظار کرنا ہے یا ابھی یہاں سے روانہ ہونا ہے؟'' ذیشان نے اسے یہ خبر سناتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں تو فوری روانگی چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے کچھ نہ کچھ کامیابی ملنے کا پورا یقین ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ ہم نے بھی روانگی کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔'' ذیشان نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اوکے ڈیئر! میں چلتا ہوں۔'' وہ ماریہ کے گال کو ہلکے سے تھپتھپاتا ہوا چل پڑا۔ سی ایف پی کا دفتر وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ یہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر سی ایف پی کا دفتر تھا جبکہ باقی عمارت میں دیگر مختلف نوعیت کے دفاتر تھے۔

''سر نیچے اپنے دفتر میں ہیں۔ آپ بھی وہیں چلے جائیں۔'' وہ دفتر پہنچا تو ایک شخص نے اس کا تعارف سننے کے بعد اسے اطلاع دی۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ گراؤنڈ فلور پر واقع اس دفتر کے علاوہ زیر زمین بھی تعمیر کی گئی ہے اور وہاں بھی سی ایف پی والوں کا قبضہ ہے۔ اہلکار کی راہنمائی پر سیڑھیاں اُتر کر نیچے جاتے ہوئے اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دفتر کا یہ حصہ ساؤنڈ پروف ہے اور یقیناً سی ایف پی کی اصل سرگرمیوں کا مرکز بھی۔ ممکن تھا کہ وہ مشکوک افراد سے معلومات کے حصول کے لیے بھی اس حصے کو استعمال کرتے ہوں۔ زیر زمین موجود عمارت کے اس ساؤنڈ پروف حصے میں اگر کسی پر سخت جسمانی تشدد بھی کیا جاتا تو اس کی چیخیں باہر سنائی نہیں دیتیں۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ ہی اپنی سوچوں میں بہت زیادہ مگن تھا یا نیچے سے اوپر کی طرف تیزی سے بڑھتا وہ سیاہ پوش اہلکار بے پروائی کا مرتکب ہوا تھا جو ان دونوں کا تصادم ہو گیا۔ تصادم شدید تھا۔ اسے اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن خیر گزری کہ سیاہ پوش نے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی سنبھال لیا اور ''سوری سر'' کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یہ سب اتنے مختصر دورانیے میں ہوا تھا کہ وہ اس کی شکل بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھ سکا۔ نیچے پہنچتے ہی اس کا ذیشان سے سامنا ہو گیا۔ وہ بھی چست سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم بس نکلنے ہی والے ہیں۔ گاڑی بالکل تیار ہے۔'' وہ اس سے مصافحہ کرتا ہوا بولا اور پھر اپنے ساتھ ہی لے کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

ذیشان کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اردگرد کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ کافی وسیع و عریض رقبے پر قائم دفتر کے اس حصے میں متعدد بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ دروازوں کے پیچھے کیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا سکتا تھا کہ وہ لوگ خاصے منظم طریقے سے کام کر رہے تھے۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ جس جگہ لے گیا وہ ایک بڑا گیراج تھا جہاں بیک وقت تین سے چار گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس وقت بھی وہاں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک پراڈو اور دوسری لینڈ کروزر۔ اس وقت لینڈ کروزر کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ پچھلی سیٹیں بھی آباد نظر آ رہی تھیں۔

''آ جاؤ۔'' ذیشان نے کھلے دروازے سے اندر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی لینڈ کروزر حرکت میں آ گئی۔

''وہاں کی سچویشن کو تو رینجرز والے کنٹرول کر لیں گے۔ میں احتیاطاً اپنے ساتھ یہ تین بندے لے جا رہا ہوں تاکہ ہم اپنے طور پر جو کچھ کرنا چاہیں، آسانی سے کر سکیں۔'' لینڈ کروزر زخم دار چڑھائی سے گزر کر عمارت کے پچھلے حصے سے باہر نکل رہی تھی جب ذیشان نے اسے بتایا۔

اس نے جواباً تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہی ان کا سفر خاموشی سے گزرا ہوگا کہ پچھلی سیٹ پر موجود دو افراد میں سے ایک ذیشان سے مخاطب ہوا۔

''ٹاہلی والا سے کال آ رہی ہے سر!''

''لاؤ بات کرواؤ۔'' ذیشان نے فوراً اس سے سیٹ لے لیا اور بات کرنے لگا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف رینجرز کا کوئی ذمے دار ہے جو اپنے ٹاہلی والا کے قریب پہنچنے کی اطلاع دینے کے بعد مزید ایکشن کے لیے اجازت لے رہا تھا۔ ذیشان نے اسے اپنی جلد آمد سے آگاہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے اور ایکشن لینے کی اجازت دے دی۔

اس کال کے بعد آگے کا پون گھنٹہ پھر خاموشی کا تھا۔ تیزی سے سفر کرتی لینڈ کروزر کے اردگرد کے مناظر بھی اسی رفتار سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے لیکن گاڑی میں موجود ان پانچ نفوس میں سے شاید کسی کی بھی توجہ ان معمولی تبدیلیوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب چشم تصور سے ٹاہلی والا میں ہونے والی کارروائی دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ذیشان کے ہاتھ میں موجود سیٹ ایک بار پھر جاگا تو ہر ایک ہمہ تن گوش ہو گیا۔ خصوصاً اس کے ساتھ بیٹھا شہریار۔ ذیشان گہری سنجیدگی سے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا

''ٹھیک ہے۔ حراست میں لیے گئے تمام افراد کو فی الحال ایک کمرے میں بند کر دیں اور وہاں موجود سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ میں ایکسپرٹس کی موجودگی کے بغیر وہاں سے کسی چیز کو ہٹانا مناسب نہیں سمجھتا۔'' نہایت سنجیدگی سے یہ ہدایات دینے کے بعد وہ اپنے سیٹ پر کہیں اور رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے جو گفتگو کی، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ بارودی مواد ہتھیاروں غیرہ سے متعلق ماہرین کی خدمات کے لیے کسی سے درخواست کر رہا ہے۔

وہ اپنی اس گفتگو کو نمٹا کر فارغ ہوا تو شہریار کی بے چین سوالیہ نظروں سے سامنا ہو گیا۔

''ٹاہلی والا میں رینجرز نے آپریشن شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے دو گروہوں میں کارروائی کی۔ ایک گروہ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے کام کر رہا تھا اور دوسرا اس مشکوک عمارت کی طرف گیا تھا۔ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے جانے والوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ نہ تو خانقاہ میں موجود تھا اور نہ ہی اس گھر میں جہاں آج کل اس کی رہائش بتائی جا رہی ہے۔ بہرحال ممکنہ حد تک گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا ہے اور کوشش یہی ہے کہ اب



وہ اب تک گاؤں سے نہیں نکل سکا ہے اور وہیں کہیں چھپا ہوا ہے تو اسے نکلنے نہ دیا جائے۔ اس کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی۔ دوسری طرف عمارت پر ریڈ کرنے والوں کو بڑی کامیابی ملی ہے۔ تمہیں شبہ تھا کہ وہ عمارت منشیات کے ذخیرے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے لیکن معاملہ اتنا نہیں ہے۔ وہاں سے بہت سا بارودی ذخیرہ اور خودکار ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں نے رینجرز والوں کو زیادہ اٹھا پٹخ اور چھیڑ چھاڑ سے روک دیا ہے۔ ہم نے رینجرز کے جس یونٹ سے مدد لی تھی، وہ فعال اور فرض شناس تو ثابت ہوا ہے لیکن افسوس کہ ان کے پاس زیادہ جدید آلات اور سہولیات موجود نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ اہم باقی کام اپنی نگرانی میں کروائیں۔''

ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ جو اطلاعات فراہم کیں انہیں سن کر وہ بھی ششدر رہ گیا۔ دشمن جانے کہاں کہاں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیاں ہی کیا کم تھیں کہ اب تسلسل سے مختلف گاؤں دیہاتوں میں ان کی موجودگی کے آثار ملنے لگے تھے۔ شاید شہروں سے پہلے انہوں نے ان چھوٹے موٹے علاقوں میں ہی اپنے قدم جمائے تھے جہاں انتظامیہ کی کمزور گرفت اور رہائشیوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے طویل عرصے تک ان کی موجودگی کا پتہ ہی نہیں چل سکا اور وہ دیمک کی طرح دھیرے دھیرے اپنا کام کرتے رہے۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کو ان چھوٹے علاقوں میں ہی بیٹھ کر کنٹرول کیا جا رہا ہو اور یہیں دہشت گرد بھی تیار کیے جا رہے ہوں۔

طبقاتی تفریق، معاشی بدحالی اور تعلیم و صحت کی سہولیات سے عاری کسی معاشرے میں ایسے نوجوانوں کو اغوا کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ دشمن چالاک، کینہ پرور اور بے رحم تھا۔ جیتے جاگتے، صحت مند و خوب صورت جوانوں کو موت کی وادی میں دھکیل دینا بے رحمی نہیں تو اور کیا تھا۔ لیکن محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کا نعرہ لگانے والوں کو اپنی اس بے رحمی کا ادراک ہی کہاں تھا؟ یوں بھی دشمن سے رحم کی امید رکھنا بے کار تھا۔ اصل کام تو اپنے دفاع کو مضبوط کرنا تھا اور دفاع صرف فوج اور ہتھیاروں سے ہی نہیں ہوتا۔ اپنے لوگوں کو شعور و آگہی کی روشنی بھی دینی پڑتی ہے۔ لیکن لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والے ایسی غلطی کیونکر کرتے؟ وہ تو ممکنہ حد تک کھاؤ پیو اور جمع کرو بلکہ جمع کرتے ہی چلے جاؤ کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے تھے۔ ایک جاتا نہیں تھا تو دوسرا اپنی باری کے لیے بے چین رہتا۔ ایسے میں ملک بھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں، اس کا کھوج کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔

وہ راستے بھر اسی طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔ سفر خاصا طویل تھا لیکن وہ نورکوٹ سے لاہور تک اکثر سفر کرتے رہنے کا عادی تھا۔ ٹاہلی والا تک کا وہ سفر مشکل سے مزید پندرہ بیس منٹ ہی طویل ثابت ہوا ہوگا۔ راستے میں ایک دو بار ذیشان نے رینجرز والوں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایات دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت گاؤں والوں کو اپنے مکانات تک محدود رکھنے کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ دوسری بار بات ہونے پر رینجرز کو لیڈ کرنے والے ان کے افسر نے بتایا تھا کہ مسجد سے اس سلسلے میں اعلان کر دیا گیا ہے اور گاؤں والوں نے اس ہدایت پر عمل درآمد بھی کیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں گھر گھر تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا تھا تاکہ اگر پیر سائیں اپنے کسی چیلے کے ساتھ گھر میں روپوش ہو تو اسے بازیاب کیا جا سکے۔ سفر طے ہونے تک انہیں اس سلسلے میں کسی کامیابی کی نوید نہیں ملی تھی اور اب وہ ٹاہلی والا میں داخل ہو رہے تھے۔

گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں ٹاہلی کے درخت نظر آنا شروع ہو گئے۔ یہی درخت گاؤں کی وجہ تسمیہ بھی تھے۔ اب تک بت کی طرح ساکت بیٹھا شہریار گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی اپنے خون میں

جوش سا محسوس کرنے لگا اور اس کی نظریں گاڑی کے شیشوں سے باہر اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔

طویل شاہراہوں پر فراٹے بھرنے والی لینڈ کروزر کی رفتار بھی گاؤں کی حدود میں پہنچنے پر کافی کم ہو گئی تھی۔ اردگرد کے مناظر پہلے کی طرح پلک جھپکنے میں نظروں سے غائب نہیں ہو رہے تھے، تب ہی اس کی جائزہ لیتی آنکھوں نے ٹاہلی کے درختوں کے جھنڈ میں حرکت سی محسوس کی۔ پل بھر کو دکھائی دینے والی وہ متحرک شے نیلے رنگ کی تھی یعنی وہ کوئی جانور نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یقینی طور پر کوئی انسان تھا جس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

''گاڑی روکو۔'' اس نے بلند آواز میں کہا تو ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اہلکار نے فوراً بریک لگا دیئے۔ ابھی لینڈ کروزر پوری طرح رُکی بھی نہیں تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکا اور ٹاہلی کے اس جھنڈ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس کے حساب سے اگر اس جھنڈ میں کوئی شخص موجود تھا تو وہ مشکوک تھا کیونکہ کسی عام دیہاتی کو گھر تک محدود رہنے کا حکم ملنے کے بعد یوں چوری چھپے یہاں موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تم جو کوئی بھی ہو، فوراً ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔ دیر کرنے کی صورت میں سخت نقصان اٹھاؤ گے۔'' اندازے سے اس جگہ کے قریب پہنچنے پر جہاں اس نے مشکوک فرد کو غائب ہوتے دیکھا تھا، وہ با آواز بلند بولا اور اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ چند سیکنڈ گزر گئے لیکن دوسری طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے قدم بڑھاتے ہی ایک شعلہ سا لپکا اور فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ وہ خوش قسمت تھا جو اس فائر سے بچنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اس کے اضطراری طور پر نیچے گرتے ہی گولی عین اس مقام سے گزری جہاں اس کا سر تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اندازے سے ان دو درختوں کے درمیان فائر جھونک دیا جہاں اس کے خیال کے مطابق وہ شخص موجود تھا اور اب اس فائر کے بعد اس کے مشکوک ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ فائر کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ ٹھہرا نہیں رہا بلکہ تیزی سے قلابازیاں کھا کر ایک موٹے تنے کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس درخت کا انتخاب اس نے بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اس کے پیچھے چھپنے سے ایک تو وہ جوابی فائر سے بچ گیا تھا دوسرے اس کے اور حملہ آور کے درمیان فاصلہ بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی مقابلے میں اس کی پوزیشن بھی پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ پہلے اس کا مقابل چھپا ہوا تھا اور وہ اس کی نظروں میں تھا۔ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مقابل کی درست پوزیشن جاننے کے لیے اس نے ایک بار پھر اسی سمت فائر کیا۔ فوراً ہی پے در پے دو جوابی فائر داغے گئے لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ وہ فائر پہلے کے مقابلے میں زیادہ فاصلے سے کیے گئے تھے اور باقاعدہ سوچ سمجھ کر نہیں کیے گئے تھے لیکن اسے محض یہ باور کروایا گیا تھا کہ اس کا مدِمقابل ابھی موجود ہے لیکن حقیقتاً وہ وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی تیزی سے حرکت میں آ گیا اور درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگا۔

ذیشان اور اس کے ساتھی بھی یقیناً اس کے پیچھے جھنڈ میں داخل ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے اب تک اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں دیا تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس طرف موجود ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت تو وہ پورے ارتکاز سے فرار ہوتے شخص کی آہٹوں اور سرسراہٹوں کو محسوس کرتا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور اسے ایک بار پھر نیلے کپڑوں کی جھلک دکھائی دے گئی۔ اس نے فوراً ہی اس سمت دو فائر جھونک دیئے لیکن یہ دونوں ہی فائر صرف اس شخص کو خوف زدہ کرنے کے لیے



کیے گئے تھے اور مقصد صرف اسے خوف زدہ کرنا تھا۔ جواب میں فوراً ہی کئی فائر ہوئے۔ اس نے کیے گئے ہر فائر کی گنتی یاد رکھی تھی اس لیے اس وقت وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے مقابل کا ریوالور اب خالی ہو چکا ہے اور وہ مزید فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔

اس بات کا یقین ہوتے ہی وہ بالکل بے خوف ہو گیا اور اندھا دُھند اُٹھ کر اس کی سمت دوڑا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ مقابل کے پاس واقعی مزید گولیاں نہیں بچی تھیں اس لیے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بدحواس سا ہو کر بھاگا لیکن اب شہریار اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی اپنے چھریرے ورزشی بدن کی وجہ سے اسے اس بے ڈھب پستہ قد آدمی پر فوقیت حاصل تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ایک لانگ جمپ لگائی اور سیدھا اس پر جا پڑا۔ اس کے حملے کے زور میں وہ زمین پر گر گیا۔ خود شہریار بھی اس پر جا پڑا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹھکائی کرنے لگا۔ بدحواس آدمی نے پہلے تین چار وار تو خاموشی سے سہہ لیے پھر وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے حرکت میں آیا اور شہریار کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

بے شک وہ پھرتیلا نہیں تھا لیکن اس کے موٹے جسم میں بلا کی طاقت تھی۔ شہریار کو یوں لگا کہ اس کی گردن کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنی گردن کے گرد موجود اس شکنجے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن موٹی موٹی انگلیوں والے بے ڈھب ہاتھ تو جیسے کسی طاقتور سلوشن کی مدد سے اس کی گردن سے چپک گئے تھے اور لمحہ بہ لمحہ اس کے لیے سانس لینے کے عمل کو دشوار بناتے جا رہے تھے۔ اس نے اس شکنجے سے خود کو آزاد کروانے کی آخری ترکیب کے طور پر اپنے جسم کی تمام تر توانائی کو یکجا کیا اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا آگے کی طرف موڑ کر پوری قوت سے مقابل کی ناف پر دے مارا۔ اس کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور موٹے ٹھگنے نے تڑپ کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ گردن آزاد ہوتے ہی شہریار نے اس کی ناک پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔

''بس اتنا کافی ہے۔ اب ہمیں اسے اریسٹ کرنے دو۔'' وہ ابھی اسے دو چار ہاتھ اور جڑنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ قریب سے ذیشان کی آواز سنائی دینے پر چونک گیا اور پھر فوراً ہی موٹے سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے پیچھے ہٹتے ہی ذیشان کے دو اسلحہ بردار ماتحت آگے بڑھے اور اسے اپنی زد میں رکھتے ہوئے ایک نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔ ہتھکڑی پہنانے کے بعد انہوں نے موٹے کو اُٹھنے کا حکم دیا۔ خوفناک اسلحے کی موجودگی میں اسے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لیے وہ کراہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''آپ کا ریوالور سر۔'' ان میں سے ایک نے شہریار کا زمین پر گرا ریوالور اٹھا کر اسے مؤدبانہ پیش کیا تو اس نے خاموشی سے ریوالور تھام کر دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔ جوش میں اس نے فوراً ہی ریوالور ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور مقابل کو خالی ہاتھ زیر کرنے بیٹھ گیا تھا ورنہ سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتا اور اپنے حکم کی تعمیل کروا لیتا۔

''میں اور میرے یہ دونوں ساتھی تمہارے پیچھے ہی اس جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے لیکن تم دونوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میں نے اس موقع پر مداخلت کرنی مناسب نہیں سمجھی کیونکہ تم بہت پُرجوش تھے اور ہماری مداخلت پر کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بھڑک سکتے تھے۔ ہم تینوں نے تم دونوں کے درمیان ہونے والی ہاتھ پیروں کی لڑائی بھی اچھی طرح دیکھی ہے۔ اگر تم چند سیکنڈ اور اپنی گردن اس شخص کے ہاتھ سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو پاتے تو پھر مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے ہم میں سے کوئی تمہارا ساتھ دینے کے لیے سامنے آ جاتا۔'' نیلے کپڑوں والے موٹے کو اپنے ساتھ لیے لینڈ کروزر کی طرف واپس جاتے ہوئے ذیشان

آہستہ آواز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا، جسے وہ ہونٹ بھینچے سنتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ ذیشان اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت اس نے کافی احمقانہ انداز میں بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اندھا دھند دوڑ پڑنے کے بجائے ان لوگوں کو بھی آگاہ کر دیتا تو اس شخص کو زیادہ آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ کسی فائر کی زد میں نہیں آیا ورنہ حماقتیں تو اس نے کئی ایک کی تھیں۔

ان کے لینڈ کروزر میں واپس بیٹھتے ہی ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی جبکہ ایک اہلکار اسپرٹ میں بھیگی رُوئی سے زخمی ملزم کی ناک سے بہتا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ذیشان نے اسے گھورتے ہوئے وہیں اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔

''واجد جناب۔'' اس نے نہایت فرمانبرداری سے بتایا۔ اس نام کو سن کر شہریار چونک گیا۔ کچھ دن قبل پیر آباد سے گرفتار ہونے والے کالے میاں جو کہ بالے کی بیوی شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا تھا۔ اس نام کے شخص کو پیر سائیں کا خاص کارندہ بتا چکا تھا۔ مشابرم خان کی تحقیقات کے نتیجے میں بھی یہ نام سامنے آیا تھا اور اب جن مشکوک حالات میں وہ شخص انہیں ملا تھا، اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ وہی واجد ہے جس کا ذکر وہ سنتا رہا ہے۔

''ادھر جھنڈ میں کیا کر رہے تھے؟'' ذیشان نے کچھ اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''سخت حاجت ہو رہی تھی صاحب! اس لیے گیا تھا۔'' اس نے خود پر کچھ اور معصومیت طاری کر لی۔

''کیوں، تم نے اعلان نہیں سنا تھا کہ سب گاؤں والے اپنے گھر تک محدود رہیں۔''

''مجھے ذرا کم سنائی دیتا ہے صاحب! مجھے نہیں معلوم کسی کا اعلان کا۔'' اس نے پکے منہ کے ساتھ جھوٹ بولا جسے سن کر ذیشان کا میٹر گھوم گیا۔ اس نے اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

''جھوٹ بولتا ہے سالا۔ میری ہر بات کا فرفر جواب دے رہا ہے اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ہونے والا اعلان سنائی نہیں دیا۔''

''ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں سر!'' اسی وقت ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے اطلاع دی۔

''اسے بھی اتارو گاڑی سے اور دوسرے زیرِ حراست افراد کے ساتھ رکھو۔ بعد میں، میں اس سے پوچھ ہوں کہ اسے کیا سنائی دیتا ہے اور کیا نہیں؟'' غصیلے لہجے میں حکم صادر کرتا ہوا ذیشان لینڈ کروزر سے اُترنے لگا، شہریار بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

''واجد نام کا یہ شخص اہم ہے اور پہلے ہی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہے۔'' اس نے ذیشان کو دھیمی آواز میں آگاہ کیا جس پر اس نے محض سر ہلایا اور رینجرز کے کمانڈ کرنے والے افسر کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے استقبال کے لیے پیش قدمی کر چکا تھا۔ ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وہی معلومات دہرا شروع کر دیں جن سے وہ راستے میں بھی آگاہ کرتا رہا تھا۔ ان معلومات میں محض اتنا اضافہ ہوا تھا کہ رینجرز کے جوان مختصر آبادی والے گاؤں کے بیشتر مکانات کی تلاشی لے چکے تھے لیکن کہیں سے بھی پیر سائیں کو برآمد نہیں کیا جا سکا۔ معلومات کے اس تبادلے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے گیا۔ آسیب زدہ مشہور اس عمارت کے ایک کمرے میں گتے کے چند چھوٹے ڈبوں کے ساتھ لوہے کی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گتے کے دو تین ڈبوں کے علاوہ لوہے کی ایک پیٹی کھلی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ گتے کے ڈبوں میں سفید سفوف کی پڑیاں موجود ہیں جبکہ پیٹی میں بارودی مواد کا ذخیرہ تھا۔ منشیات اور اسلحے کے اس تباہ کن ذخیرے کو یکجا دیکھ کر وہ سب ہی اپنے اندر سنسنی سی محسوس کرنے لگے۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے نام سے مشہور



شخص کسی خطرناک دشمن ملک کا ایجنٹ تھا جو روحانی پیشوا کے بہروپ میں اپنا گھناؤنا کام سرانجام دے رہا تھا۔

''اس پیر سائیں کو ہر حال میں گرفتار ہونا چاہئے آفیسر! اصل بندہ وہی ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا تو کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔'' اس سارے ذخیرے کو دیکھ کر ذیشان اضطراری طور پر بول اٹھا۔

''میں نے ملنے والے احکامات اور ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ہے جناب! اگر وہ بندہ یہاں ہوتا تو میں ضرور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن اس کا تو پورے گاؤں میں کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔'' رینجرز آفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ کسی نے عین وقت پر مخبری کر دی تھی۔ کیونکہ ہم پروگرام کے مطابق دو گروپس میں دونوں طے شدہ ٹارگٹس تک پہنچے تھے۔ آپ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جس مکان میں پیر سائیں کے ہونے کا امکان تھا، ہم نے اسے گھیر کر اچھی طرح تلاشی لی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ خانہ بھی اس بات سے واقف نہیں تھے کہ پیر صاحب اپنے مخصوص کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس کے غائب ہونے کو اس کی کوئی روحانی کرامت سمجھا تھا کہ وہ خود تک خطرے کے پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ لیکن میرے حساب سے کسی نے مخبری کر کے عین وقت پر اسے فرار کروا دیا تھا۔ وہ مخبر کون ہو سکتا ہے، یہ کھوج لگانا آپ کا کام ہے۔ کیونکہ مخبر کا آپ میں سے ہی ہونا یقینی ہے۔ میں یا میرے آدمی تو چند گھنٹے سے پہلے اس ساری صورتِ حال سے مکمل طور پر باخبر تھے۔''

رینجرز آفیسر سپاٹ لہجے میں جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ قرین از قیاس تھا۔ پیر سائیں کا اتنی اچانک ٹاہلی والا سے غائب ہو جانا واقعی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مخبری کر دی گئی ہے۔ وہ بھی اتنے عین وقت پر کہ اسے منشیات اور بارود کے ذخیرے کو وہاں سے نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی اور وہ محض اپنے آپ کو بچا کر لے گیا۔

''واجد کو پکڑو۔ اس سے معلوم کرو۔ وہ اس بہروپیے کا سب سے قریبی ساتھی ہے۔ وہ ضرور اس کے اور اس کے دھندوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔'' اس گمبھیر صورتِ حال میں شہریار کو تاریکی سے نکلنے کی جو راہ سجھائی دی وہ اس نے اوروں کو بھی سجھائی۔

''ٹھیک ہے، اسے دیکھتے ہیں۔'' ذیشان نے جواب دیا اور فوراً ہی رینجرز آفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ آفیسر! اب جبکہ ساری صورتِ حال انڈر کنٹرول ہے تو باقی معاملات میں اور میرے ساتھی خود دیکھ لیں گے۔'' اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ آگے کے معاملات میں رینجرز والوں کی شمولیت نہیں چاہتا ہے۔

''اوکے، میں اپنے جوانوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جاتا ہوں۔'' وہ اس کا اشارہ بھانپ کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''ایک بار پھر تھینک یو سو مچ۔'' ذیشان نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شہریار نے بھی اس کی تقلید کی۔

''آؤ اب واجد کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میرے باقی آدمی یہاں پہنچ کر جب تک اپنا کام شروع کرتے ہیں، اتنا وقت ہے کہ اتنی دیر میں ہم اس شخص کو بھی ٹٹول لیں۔ ہم یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے جتنی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اتنا بہتر رہے گا کیونکہ اس طرح ہم حاصل شدہ معلومات پر فوری ایکشن بھی لے سکیں گے۔'' رینجرز آفیسر کی روانگی کے بعد ذیشان نے اس سے کہا اور پھر زیرِ حراست افراد کے لیے مخصوص کمرے میں جانے کے لیے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی وہ بری طرح چونکا اور اس کے شانے کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی ٹی شرٹ پر چپکی کسی ہم رنگ شے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی

مدد سے الگ کیا۔ شہریار ششدر سا اس منظر کو دیکھتا رہ گیا۔

شہریار نے حیرت سے ذیشان کے ہاتھ میں موجود شے کو دیکھا۔ وہ کیکڑے کی شکل کی ایک چپٹی سی شے تھی جسے ذیشان نے اس کی شرٹ پر سے اُکھاڑا تھا۔ اس شے کی رنگت اس کی ٹی شرٹ جیسی ہی تھی اس لیے پہلی نظر میں اسے وہاں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ذیشان بھی اگر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے کے نتیجے میں محسوس ہونے والے اُبھار پر غور نہ کرتا تو اسے اس شے کی وہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شہریار خود اس شے کی موجودگی پر حیران اور پریشان تھا کہ آخر اس نے اس کی ٹی شرٹ تک کیسے اور کب رسائی حاصل کی۔ اپنی اسی اُلجھن میں اس نے ذیشان سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اس کیکڑے نما شے کا غور سے جائزہ لیتا رہا۔ آخر کار ڈیڑھ دو منٹ کے جائزے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس سے بولا۔

''تم قیدیوں والے کمرے کی طرف چلو شہریار! میں ابھی دو منٹ میں وہاں آتا ہوں۔''

شہریار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہو گیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں دوسرے کئی افراد کے ساتھ ساتھ واجد کو بھی قید کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر اب رینجرز کے کسی اہلکار کے بجائے ان کے ساتھ آیا ہوا CFP کا اہلکار موجود تھا۔ اس کے اشارے پر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں آٹھ افراد بند تھے جن کے ہاتھ پیروں کو رسّی کی مدد سے باندھ کر انہیں بے بس کر دیا گیا تھا۔

''ہم بے قصور ہیں صاحب! ہمیں آپ نے یہاں کیوں بند کر دیا ہے؟'' اسے اندر آتا دیکھ کر ان میں سے ایک فرد نے تیز لہجے میں کہا تو شہریار نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ اس شخص کی ڈھٹائی واقعی بڑے کمال کی تھی کہ وہ اسلحے اور منشیات سے بھرے ایک آسیب زدہ مشہور مکان میں پایا گیا تھا پھر بھی خود کو بے قصور قرار دے رہا تھا۔ اسے گھورتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس آدمی کے نقش و نگار کچھ آشنا سے محسوس ہو رہے ہیں۔ فوری طور پر اسے وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ وہ شخص کافی حد تک واجد سے مشابہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں ذرا کم موٹا اور عمر میں چند سال چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے سخت لہجے میں احتجاج کرنے والے سے دریافت کیا۔

''خالد جناب!'' اس نے بتایا۔

''واجد کے بھائی ہو؟'' اس نے کمرے میں ہی موجود نیلے لباس میں ملبوس موٹے واجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''ٹھیک ہے، تم ان دونوں بھائیوں کو یہاں سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے چلو۔'' اس بار اس نے سی ایف پی کے اہلکار کی طرف رخ کرتے ہوئے حکم دیا اور خود باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ واجد اور خالد دونوں اس کی یادداشت میں اچھی طرح محفوظ تھے اور اسے یاد تھا کہ پیر آباد سے پکڑے جانے والے کالے میاں نے سخت تفتیش کے نتیجے میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پیر سائیں کا سب سے خاص گرگا واجد ہے جبکہ اس کا بھائی خالد بھی اپنے بڑے بھائی کا معاون و مددگار ہے۔ اس لیے اسے یہی مناسب معلوم ہوا تھا کہ تفتیش کا آغاز ان دونوں بھائیوں سے ہی کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔

''میں ان دونوں کو اس سامنے والے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آپ ان سے بات چیت کرنے میں مدد دیں گی۔'' سی ایف پی کا اہلکار بھی ذرا سے وقفے سے کمرے سے باہر آ



اور اس سے بولا۔ اہلکار کے ساتھ ساتھ واجد اور خالد بھی کمرے سے نکلے تھے۔ لیکن اس طرح کہ ان کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے انہیں حرکت کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقِ کار استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ خالد اپنی آپس میں جوڑ کر بندھی ہوئی پنڈلیوں کے باعث اُچھل اُچھل کر آگے بڑھ رہا تھا جبکہ واجد موٹا ہونے کی وجہ سے اس طریقِ کار پر عمل نہیں کر سکتا تھا اور کسی جانور کی طرح گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ عمل بھی کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ اسے اپنے آپس میں بندھے ہوئے ہاتھوں پر کافی زور ڈال کر جسم کو آگے کھسکانا پڑ رہا تھا۔ سی ایف پی کا اہلکار مسلح تھا اور چاہتا تو ان دونوں کے پیر کھول کر انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آسانی سے منتقل کر سکتا تھا۔ اسلحے کی موجودگی میں دونوں بھائیوں کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو شاید اس لیے کہ پہلے مرحلے پر ہی ان دونوں کے کس بل نکالنے کا انتظام ہو سکے۔

شہریار کھڑا دونوں بھائیوں کی یہ درگت دیکھ رہا تھا کہ ذیشان واپس لوٹ آیا۔

''گڈ۔'' اپنے سامنے جاری تماشے کو دیکھ کر اس نے بے ساختہ ہی اپنے ماتحت کو داد دی۔

''میں نے رینجرز کے آفیسر سے بات کر کے چند سپاہیوں کو یہیں روک لیا ہے۔ ہمارے پاس نفری بہت کم ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ باہر نگرانی کے لیے چند مسلح افراد موجود رہیں۔'' اس نے شہریار کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے اسے اطلاع دی لیکن اس وقت شہریار کا اُلجھا ہوا ذہن اس شے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جس کی موجودگی پر ذیشان خاصا چونکا ہوا نظر آیا تھا۔ ذیشان نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''باقی معاملات پر بعد میں بھی تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہمیں فوری درپیش مسائل سے نمٹنا ہو گا۔''

شہریار کے پاس اس کی تائید کرنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کیکڑے نما کیا شے تھی؟ یہ ذیشان ہی جانتا تھا اور اگر فی الوقت وہ اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا تو اس کے لیے بھی بہتر تھا کہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر موجودہ کاموں کی طرف توجہ دے۔ واجد اور خالد دوسرے کمرے میں منتقل کیے جا چکے تھے چنانچہ ان دونوں نے بھی اس کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں کئی ایسی اشیاء موجود تھیں جنہیں تشدد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

''ہاں بھئی! اب فوراً شروع ہو جاؤ اور بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں یہاں اپنی پیری کی آڑ میں کون کون سے دھندے کر رہا تھا؟'' اپنے ماتحت کو اشارے سے واپس اپنی پہلے والی ڈیوٹی پر جانے کی ہدایت کرتے ہوئے ذیشان نے سخت لہجے میں تفتیش کا آغاز کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا، نہ میرا اس مکان سے کوئی تعلق ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے زبردستی ٹاہلی کے جھنڈ سے پکڑ کر یہاں پہنچایا ہے، ہو اب زبردستی ہی الزام لگا رہے ہو۔'' موٹے واجد نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

''الزام تو ہم نے ابھی تک کوئی لگایا ہی نہیں مسٹر! ابھی تو ہم صرف تم سے تمہارے پیر سائیں کے دھندوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' ذیشان نے اسے جواب دیا۔

''اور تم ہرگز بھی یہ نہ کہنا کہ پیر سائیں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے پیر سائیں نے کالے میاں

نامی جس شخص کو شہزادی سے مُردہ بچے کی ہڈیاں لینے پیر آباد بھیجا تھا، وہ ہماری حراست میں ہے اور نہ صرف ہمیں اس کے موبائل پر تمہارا نمبر ملا ہے بلکہ اس نے خود بھی ہمیں بتایا ہے کہ واجد، پیر سائیں کا سب سے خاص بندہ ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ اس نے تمہارے اس بھائی کا بھی نام لیا ہے۔''

اسے جھوٹ پر کمربستہ دیکھ کر شہریار نے دخل اندازی کی ضرورت سمجھی اور چند ایسے حقائق اس کے سامنے رکھ دیئے کہ اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش کم سے کم ہی رہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی زبان سے کالے میاں کا نام سن کر واجد کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا تھا اور وہ یوں ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا جیسے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لیے جھوٹ تراشنا چاہتا ہو لیکن فوری طور پر ایسا کرنے سے قاصر ہو۔ سی ایف پی کے اہلکار کی عجلت آمیز آمد نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔

''سر! باہر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے ذیشان کو اطلاع دی۔

''اوہ..... مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا۔'' اطلاع سن کر وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر اپنے ماتحت سے بولا۔ ''ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔ باہر پہرے پر جو سپاہی ہیں، انہیں پیغام دے دو کہ ہجوم کو مکان سے دور ہی رکھیں لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کریں کہ لوگ مشتعل ہو جائیں۔''

''او کے سر!'' ماتحت فوراً واپس پلٹ گیا۔

''میں ابھی باہر والوں سے نمٹ کر آتا ہوں۔ تم دونوں بھائی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سوچ لو کہ تمہیں سیدھے طریقے سے ہمارے سامنے حقائق اُگلنے ہیں یا ہم اپنے طریقِ کار سے تمہاری زبانیں کھلوائیں۔ یہ بات بہرحال یاد رکھنا کہ سچ تمہیں اُگلنا ہی ہوگا۔ اپنی کھال بچا کر آسانی سے اُگل دو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے ورنہ ہمارے لیے تمہاری زبانیں کھلوانا کچھ مشکل نہیں ہے۔'' ماتحت کے باہر نکلنے کے بعد اس نے واجد اور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سفاک لہجے میں یہ سب کہا اور پھر شہریار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

مکان کے اردگرد رینجرز کے چوکس جوان پھیلے ہوئے تھے اور کچھ فاصلے پر وہ ہجوم تھا جو ان لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں کافی زیادہ تھے لیکن وردی پوش مسلح رینجرز اہلکاروں کی وجہ سے قابو میں تھے ورنہ بصورتِ دیگر مکان پر ہلّا بھی بول سکتے تھے۔ ذیشان نے شاید ایسے ہی کسی خطرے کے پیشِ نظر ان جوانوں کو روک لیا تھا۔

''آپ میں سے صرف تین افراد آگے آئیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کہہ دیں۔'' دروازے سے ذرا آگے جا کر کھڑے ہوتے ہوئے ذیشان نے دبنگ لہجے میں حکم صادر کیا جس پر ہجوم میں ذرا دیر کے لیے کھلبلی سی مچی اور پھر تین مرد آگے بڑھے۔ یہ تینوں ہی عمر رسیدہ تھے اور چہرے مہرے اور لباس سے خوش حال محسوس ہو رہے تھے۔

''ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے پنڈ میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے آئے ہیں اور ان کے نہ ملنے پر شریف صاحب کو ان کے گھر سے گرفتار کر لیا ہے۔ شریف صاحب کے علاوہ پنڈ کے ہور بھی کچھ لوگ آپ کی قید میں ہیں۔ آپ کے سپاہیوں نے گھر گھر تلاشی لے کر ہم سب کی بے عزتی کی ہے۔ ہم سب عزت دار لوگ ہیں، کوئی چور اچکے نہیں کہ ایسا برتاؤ برداشت کر سکیں۔ ہمارے نوجوان بہت غصے میں ہیں لیکن ہم نے صرف سرکاری وردی کے احترام میں انہیں قابو میں رکھا



ہوا ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس کے بارے میں وضاحت دیں ورنہ جوشیلے نوجوان ہمارے قابو سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔'' تین میں سے ایک باریش شخص نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

ذیشان نے اس کا یہ انداز محسوس کرنے کے باوجود نظرانداز کر دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بزرگوار! جو کچھ ہوا، اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ یقیناً آپ لوگوں نے اپنے گھروں میں ہمارے سپاہیوں کے داخل ہونے کا برا مانا ہوگا لیکن ہم اپنی ڈیوٹی سے مجبور تھے۔ ہمارے پاس اطلاع تھی کہ یہاں ایک مشکوک ملک دشمن آدمی، پیر سائیں کا بہروپ بھر کر اپنی مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہے اس لیے ہمیں اس شخص کی گرفتاری کے لیے یہ آپریشن کرنا پڑا۔ ہمیں شریف صاحب کے گھر میں اس کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ شریف صاحب کو ہم نے صرف شبے میں گرفتار کیا ہے۔ اگر تفتیش کے بعد وہ بے قصور ثابت ہوئے تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمیں آپ کے گھروں کی تلاشی کیوں لینی پڑی۔ ہمیں شک تھا کہ مفرور مجرم کو آپ میں سے اس کے کسی عقیدت مند نے اپنے گھر میں پناہ نہ دے رکھی ہو اس لیے بہ حالتِ مجبوری ہمیں آپ لوگوں کی خانہ تلاشی لینی پڑی۔''

''یہ بکواس ہے۔ تم پیر سائیں پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے تمہارے ناپاک قدموں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی انہیں خبردار کر دیا۔'' اس کی بات ختم ہوتے ہی ان تینوں میں سے ایک جو شاید عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا، جوش سے چلّایا۔

''مجھے ایسا کوئی جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں اور میرے سپاہی اتنے فارغ ہیں کہ فضول معاملات میں اپنی ٹانگ اڑائیں۔ ہم نے پکی مخبری پر یہاں ریڈ کیا تھا اور اب ہمارے پاس ایسے ٹھوس ثبوت ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد آپ ہمیں جھٹلا نہیں سکتے۔ میں آپ کے اطمینان اور گاؤں کے معصوم لوگوں کے اذہانوں پر سوار عقیدت کی اندھی عینک اُتارنے کے لیے آپ کو بھی وہ ثبوت دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ میرے ساتھ اندر چل کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔''

ذیشان ایک جھٹکے سے مڑ گیا۔ وہ تینوں بھی لمحہ بھر تو تذبذب کا شکار نظر آئے پھر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ان کے ساتھ اندر کی طرف جاتا ہوا شہریار دل ہی دل میں ذیشان کی فہم و فراست کو سراہ رہا تھا۔ اتنے بڑے ہجوم میں چند سپاہیوں اور اسلحے کے زور پر نمٹنا واقعی مشکل تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ سب لوگ معصوم اور بے گناہ ہیں اور صرف اندھی عقیدت اور وقتی اشتعال کے تحت سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک فرد کو بھی گولی ماری جاتی تو یہ ظلم ہوتا۔ چنانچہ ان سے نمٹنے کے لیے سب سے بہترین راستہ وہی تھا جو ذیشان نے اختیار کیا تھا۔

''یہ اسلحے اور بارود کا ڈھیر آپ لوگ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان آتشیں ہتھیاروں کے علاوہ یہاں اس سفید زہر کا بھی ذخیرہ ہے جو لوگوں کو ہتھیاروں سے بھی زیادہ مہلک اور دردناک موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ گولی کھا کر مرنے والا تو صرف ایک بار میں مر جاتا ہے لیکن نشے کی لعنت میں مبتلا لوگوں کا حال تو آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ نشئی آدمی نہ صرف اپنی صحت، دولت اور عزت گنواتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا پورا خاندان بھی برباد ہو جاتا ہے۔ آپ کے درمیان پیر سائیں کا بہروپ دھار کر رہنے والا سفاک درندہ لوگوں میں یہی موت بانٹ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی آنکھوں سے اتنا سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اب آپ

کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔'' ان تینوں کو منشیات اور بارود کے ذخیرے سے بھرے کمرے میں لے جا کر ذیشان نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی تھا جو حقیقتاً اس وقت اپنے ہم وطنوں کی بے وقوفی اور جاہلانہ عقیدت مندی پر سخت غصے میں تھا لیکن باہر اس نے محض اس لیے خود کو قابو میں رکھا تھا کہ بات بڑھنے کے بجائے سنبھل جائے۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے جناب! لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں کا ان سب چیزوں سے کوئی تعلق ہے؟ یہ مکان تو آسیب زدہ مشہور تھا اور پیر سائیں کبھی اس مکان میں نہیں آئے۔ وہ تو اپنی خانقاہ سے بھی بہت کم باہر نکلتے تھے۔'' کچھ دیر پہلے ذیشان کی باتوں کو الزام تراشی قرار دینے والا ایک بار پھر بہروپیے پیر کی حمایت میں دلیل دینے لگا۔ لیکن اب اس کا لہجہ پہلے جتنا بلند نہیں تھا۔

''پیر سائیں یہاں نہیں تو کیا ہوا؟ اس کے آدھے درجن سے زیادہ خاص مرید تو یہیں ہیں نا۔ ان کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں نہیں کھل رہیں یا پھر عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔'' ذیشان جھنجلایا۔

''ایک منٹ..... میرے خیال میں ہم ان کے رہے سہے شکوک و شبہات دور کرنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ اگر ہمارا کہا نہیں مان رہے تو واجد اور خالد کی زبان سے حقائق سن کر ضرور یقین کر لیں گے۔'' اس موقع پر شہریار نے دخل اندازی کی اور پھر براہِ راست ان تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ تینوں ہمارے ساتھ آئیں۔'' وہ انہیں اس جگہ سے باہر لے کر اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں واجد اور خالد کو رکھا گیا تھا۔

''اندر پیر سائیں کے سب سے خاص بندے واجد اور خالد موجود ہیں۔ ہم ان سے تفتیش کریں گے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ بغیر کوئی آواز نکالے بالکل خاموشی سے اندر کی باتیں سنتے رہیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کون غلطی پر ہے۔'' کمرے کے دروازے پر پہنچ کر شہریار نے سرگوشی میں ان تینوں سے کہا اور پھر انہیں رضامند پا کر ذیشان کے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ اس نے جان بوجھ کر پوری طرح بند کرنے کے بجائے اس میں ہلکی سی جھری چھوڑ دی تھی تاکہ باہر موجود تینوں افراد آسانی سے اندر کی آوازیں سن سکیں۔ ان تینوں کی نگرانی کے لیے البتہ سی ایف پی کا مسلح اہلکار ان کے سروں پر ضرور مسلط تھا تاکہ اگر ان کے عمر رسیدہ جسموں میں جوانی کی کوئی رمق جاگے تو انہیں کنٹرول سے باہر کرنے لگے تو اسے قابو کیا جا سکے۔

''ہاں بھئی..... کیا فیصلہ کیا تم دونوں بھائیوں نے؟..... سچ بولنا ہے یا پھر ہم بولنا سکھائیں؟'' اندر پہنچ کر شہریار نے ہی واجد اور خالد سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ذیشان نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن وہ کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، ہم آپ کو سچ سچ بتا دیں گے لیکن اس کے لیے ہماری بھی ایک شرط ہے۔'' دونوں بھائیوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر واجد سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''کیسی شرط؟'' شہریار غرایا۔

''آپ کو ہمیں سلطانی گواہ بنانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔'' شہریار کو تذبذب میں دیکھ کر ذیشان نے اسے جواب دیا۔ وہ کسی صورت اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں بھائی پیر سائیں کے قریبی ساتھی تھے اس لیے ان سے بڑے انکشافات کی امید تھی۔ وہ خود بھی اگر بہت بڑے مجرم تھے تو ان سے وعدہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سی ایف پی



کوئی عام حکومتی اداروں کی طرح تو کام کرتی نہیں تھی کہ وہ لوگ خود کو کسی کا پابند محسوس کرتے۔ یہ تو ان کی اپنی صوابدید پر ہوتا تھا کہ کس مجرم کو تھانے میں بند کروانا ہے، کسے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے اور کسے خود ہی سزا دینی ہے۔ ان کی دی ہوئی سزا عموماً سزائے موت ہی ہوتی تھی کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی جیل وغیرہ تو تھی نہیں جہاں اپنے مجرموں کو قید میں طویل عرصے تک رکھ سکیں۔ سزائے موت کے علاوہ وہ اگر خود سے کوئی سزا دیتے تھے تو وہ قطعی غیر روایتی ہوتی تھی ورنہ قانون میں لکھی ہوئی روایتی سزاؤں کے لیے دیگر محکمے تھے ہی۔

''پیر سائیں کے نام سے مشہور یہ بندہ کئی سال پہلے ہمارے پنڈ میں آیا تھا۔ اس وقت بھی یہاں ایک خانقاہ موجود تھی لیکن وہ موجودہ خانقاہ سے بہت چھوٹی اور معمولی تھی۔ اس وقت اس میں رہنے والے پیر سائیں بھی اتنے مشہور نہیں تھے لیکن تھے سچ مچ اللہ والے۔ بے چارے خاموشی سے اپنی عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کوئی عقیدت مند اپنی حاجت لے کر آتا تو اسے دعا سے نواز دیتے۔ باقی انہیں کوئی لالچ وغیرہ نہیں تھا۔ موجودہ پیر سائیں ان کے پاس ایک غریب، نادار اور دنیا سے بیزار شخص بن کر آیا اور ان کا مرید بن کر رہنے لگا۔ بڑے پیر سائیں کے مقابلے میں وہ بڑا چرب زبان اور ہوشیار تھا۔ آہستہ آہستہ خانقاہ میں آنے والے لوگوں پر اس کا جادو چلنے لگا۔ وہ بڑے پیر سائیں کی طرح صرف دعا نہیں دیتا تھا بلکہ اس کے پاس کچھ سفوف وغیرہ موجود ہوتے تھے جن سے وہ ٹونے ٹوٹکے کر کے لوگوں کا علاج معالجہ بھی کر دیتا تھا۔ ہمارا باپ پنڈ کے قبرستان کا گورکن تھا اس لیے میرا اور خالد کا قبرستان میں کافی آنا جانا تھا۔

ایک رات میں نے دیکھا کہ پیر سائیں قبرستان میں ہے اور وہاں ایک کھلی ہوئی قبر سے ہڈیاں جمع کر رہا ہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور بجائے گھبرانے یا شرمندہ ہونے کے خود چل کر میرے پاس آ گیا اور بولا کہ اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو بہت فائدے میں رہو گے۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجھے یہ دھمکی دیتے ہوئے اس نے اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر میں ڈر گیا کہ اگر میں نے اس کی گل نہ مانی تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔ فیر میں تھا بھی غریب گھر کا بندہ۔ ہمیں ڈھنگ سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی گل مان کر مجھے چار پیسے مل گئے تو میرا بھلا بھی ہو جائے گا اور جان بھی بچ جائے گی۔ ویسے بھی وہ قبرستان سے پرانی گلی سڑی ہڈیاں ہی تو لے رہا تھا جس سے کسی کا کیا بگڑنا تھا۔ میں نے اس کی گل ماننے کی ہامی بھر لی۔ وہ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور بولا۔

''یہ تُو نے اپنے حق میں وڈا چنگا فیصلہ کیا ہے۔ تُو دیکھنا کہ آنے والے دنوں میں، میں کیا سے کیا ہو جاؤں گا ہور اگر تُو نے اس وقت بھی میرا ساتھ دیا تو عیش کرے گا عیش۔''

مجھ سے یہ کہنے کے بعد اس نے مجھے تھوڑی سی رقم بھی دی اور قبرستان سے چلا گیا۔ مجھے پیسے ملنے کی خوشی تھی ہور اس خوشی میں، میں نے اس کے کہے پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب دو دن بعد وڈے پیر سائیں کے مرنے کی خبر ملی اور ان کی جگہ نئے پیر سائیں نے سنبھال لی تو مجھے شک گزرا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ وچارے وڈے پیر سائیں تو تھے بھی بالکل اکیلے آدمی۔ ان کے بال بچے ہوتے تو ان کی اچانک موت پر غور کرتے۔ پنڈ والوں نے تو اپنا اتنا فرض ادا کیا کہ عزت کے ساتھ انہیں دفنا دیا۔ مگر مجھے چونکہ کھد بد لگ گئی تھی، اس لیے میں پیر سائیں کے پاس جا پہنچا اور صاف صاف اپنے شک کا اظہار کر دیا۔

اس نے میرے شک کی تصدیق تو نہیں کی لیکن بولا کہ اگر تم اُلٹی سیدھی بکواس کرنے کے بجائے میرے مرید بن جاؤ تو میں تمہیں بہت فائدہ پہنچاؤں گا۔ میں پہلے بھی ایک بار اس سے رقم حاصل کر چکا تھا، اس لیے لالچ میں آ گیا اور خانقاہ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ وڈا عجیب آدمی تھا نماز قرآن پڑھتا کبھی نظر نہیں آیا۔

بس جب دیکھو، تب ایک کوٹھری میں گھسا رہتا تھا ہور جانے کون سے جنتر منتر کرتا رہتا تھا۔ اس کے پاس جانے کون کون سے ٹونے ٹوٹکے تھے کہ آنے والے لوگ نامراد نہیں رہتے تھے۔ فیر میں بھی تھا جو اس کی کرامات کے ایک سے چار کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ پر آنے والوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ اسی حساب سے نذرانے بھی خوب آتے تھے ہور میرا اس میں ٹھیک ٹھاک حصہ ہوتا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ یہ بندہ جو کر رہا ہے، کرنے دو۔ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں ہور ہا بلکہ اُلٹا لوگ فائدے میں ہی ہیں۔"

واجد ذرا دیر کے لیے سانس لینے کو رُکا پھر ان دونوں کی مستقل خود پر جمی نظروں کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بولنا شروع ہو گیا۔

"میں پیر سائیں کا خاص مرید تھا لیکن رات کے وقت مجھے بھی خانقاہ میں رُکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ گزرتے برسوں میں خانقاہ کی عمارت وڈی شاندار ہو گئی تھی ہور ادھر بہت سی جگہ تھی۔ پیر سائیں نے باہر سے بندے بلوا کر نئی عمارت بنوائی تھی۔ اس عمارت میں ایک تہ خانہ بھی ہے، یہ مجھے معلوم تھا لیکن اس کا مقصد میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے بس یہی شک تھا کہ وہ جنتر منتر کرتا ہوگا اس لیے کسی کو خانقاہ میں ٹکنے نہیں دیتا۔ سچ پوچھیں تو اتنے سالوں میں، میں اسے کسی نیک بزرگ کے بجائے سفلی علم کا ماہر سمجھنے لگا تھا اور میرا یہ شک اتنا غلط بھی نہیں تھا لیکن وہ اس کے علاوہ ہور کون کون سے دھندے کرتا ہے، یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس نے دیکھا کہ میں اس کا وفادار ہوں تو وہ آہستہ آہستہ مجھے اپنے رازوں میں شامل کرتا چلا گیا۔ یہ زیادہ پرانی گل نہیں ہے۔ بس ڈیڑھ دو سال پہلے ہی کی گل ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ پیر سائیں ہیروئن ہور اسلحے کا دھندا بھی کرتا ہے بلکہ اس کا اصل دھندا تھا ہی یہ۔ پیری کا ناٹک تو اس نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا ہوا تھا۔ رات کے وقت خانقاہ میں اس سے ملاقات کے لیے اس کے گاہک اور سپلائرز آتے تھے اس لیے وہ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مجھے بھی اس نے ہم رازیوں بنایا کہ اکیلے سارے معاملات دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ خانقاہ کے علاوہ بھی پنڈ میں اسے ایسا کوئی ٹھکانہ مل جائے جہاں وقتِ ضرورت وہ اپنا مال رکھ سکے۔ یہ مکان برسوں سے خالی پڑا تھا ہور پنڈ والے اسے آسیب زدہ سمجھتے تھے اس لیے میں نے اسے استعمال کرنے کا مشورہ دیا، ہور فیر کچھ اپنے شعبدے بھی دکھائے کہ پنڈ والوں کو مکان کے آسیب زدہ ہونے کا یقین ہو گیا ہور انہوں نے مکان کے قریب پھٹکنا بالکل ہی بند کر دیا۔ مجھے اس ساری خدمت اور رازداری کی وڈی قیمت ملتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ اپنے بھرا خالد کو بھی شامل کر لیا۔ ہمارا پچھلے چار پانچ سال ہوئے دنیا سے گزر چکا ہے اس لیے کوئی ہم سے پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں تھا ہور کوئی کچھ پوچھنا بھی چاہتا تو نہیں پوچھ سکتا تھا کیونکہ ہم پیر سائیں کے سب سے خاص مرید تھے۔ پیر سائیں کی عقیدت کے علاوہ ہمارے پالے ہوئے غنڈوں کا بھی ڈر تھا جو لوگوں کو ہم سے دور رکھتا تھا۔ یہ غنڈے ہی خانقاہ کے خادم بن کر دن رات وہاں رہتے تھے ہور دھندا سنبھالنے کے علاوہ آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھتے تھے۔"

واجد کا اعترافی بیان یہاں تک پہنچا تھا کہ دروازے کے باہر شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شہریار فوری طور پر اس شور کا مطلب سمجھتا ہوا باہر نکل گیا اور دروازہ باہر جا کر بند کر دیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق دروازے سے کان لگائے کھڑے تینوں افراد غیظ و غضب میں مبتلا تھے اور کمرے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن سی ایف پی کے اہلکار نے انہیں ان کی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور دروازے سے کافی دور ہٹا لے گیا تھا۔

"کیا تماشا ہے؟ کیوں آپ لوگوں نے یہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے؟" اس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ پوچھا۔



"ہمیں اندر جانے کی اجازت دیں صاحب! ہم اس مردود کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیں گے۔" کچھ دیر قبل پیر سائیں کا سب سے بڑا حمایتی بننے والا غضب ناک لہجے میں بولا۔

"فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہمارے کام کا بندہ ہے جس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کو اس سے ہونے والی گفتگو سنانے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ آپ سچ خود اپنے کانوں سے سن لیں اور والی گاؤں والوں کو بھی کنٹرول میں رکھیں کہ ہم نے کسی کی دل آزاری یا بے حرمتی کے لیے یہ آپریشن نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے نیکوکار بن کر رہنے والے ایک بڑے مجرم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے شک مجرم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کا ایک اہم ٹھکانا بھی ختم ہو گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اب آئندہ کبھی آپ ایسے کسی فرد کو اپنے درمیان ٹھکانہ بنانے بھی نہیں دیں گے۔" اس نے ان لوگوں کو دھیمی آواز میں سمجھایا۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ کہیں واجد اور خالد تک اس کی آواز نہ پہنچ جائے اور وہ اپنی زبانیں بند کر لیں۔

"ہمیں صاحب کی گل ماننی چاہئے۔ یہ سرکاری افسر ہیں۔ ان کا حکم ماننا ہمارا فرض ہے۔" مذاکرات کے لیے آئے ہوئے تینوں معززین میں سے جو شخص اب تک بالکل خاموش رہا تھا، وہ اس موقع پر بول پڑا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی خوشی سے اس کی تائید کر ڈالی۔

"میری آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ باہر جا کر لوگوں کو بے شک پیر سائیں کے بارے میں سب کچھ بتا دیں لیکن فی الحال واجد اور خالد کے بارے میں زبان نہیں کھولیے گا۔ وہ پیر سائیں کے خلاف بہت اہم گواہ ہیں اس لیے ان کا زندہ سلامت رہنا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان کے بارے میں بتائیں تو لوگ اشتعال میں انہیں قتل کرنے چڑھ دوڑیں۔ انہیں قتل کر کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو گا لیکن ہم بہت سی اہم معلومات حاصل کر لیں گے۔" انہیں قائل ہوتا دیکھ کر اس نے دھیمی آواز میں ایک اور استدعا کی جو قبول کر لی گئی اور وہ تینوں سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں لوٹا۔ دونوں بھائی سراسیمہ نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"کیا گل ہے سر! کون لوگ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے؟" اسے دیکھتے ہی واجد نے سوال کیا۔ وہ عمر میں بڑا تھا اور پیر سائیں سے اس کے تعلقات بھی زیادہ قریبی اور دیرینہ تھے۔ اس لیے اب تک ساری گفتگو وہی کر رہا تھا۔ خالد کسی سعادت مند چھوٹے بھائی کی طرح ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

"گاؤں کے کچھ مشتعل افراد اندر آ گھسے تھے۔ کسی طرح باہر یہ خبر پھیل گئی ہے کہ اس مکان میں منشیات اور اسلحے کا ذخیرہ موجود ہے چنانچہ گاؤں والے ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے خواہش مند ہیں جنہیں یہاں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔" اس نے انہیں ہراساں کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کیا۔ ان کے چہروں پر موجود دہشت نے بتا دیا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

"تم اتنے پریشان نہ ہو۔ فی الحال میں نے ان لوگوں کو ٹال دیا ہے کہ مجرموں سے نمٹنا قانون کا کام ہے اس لیے ہم کسی شخص کو آپ لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اب تمہارا بھی فرض ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ ورنہ دوسری صورت میں ہم تمہیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں گے۔ ہم مصروف لوگ ہیں اور خوامخواہ کا بوجھ ڈھوتے پھرنے کے قائل نہیں۔ اگر تم ہمارے لیے بیکار ثابت ہوئے تو ہم تمہیں یہیں پھینک جائیں گے اور یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے پنڈ کے لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کر سکتے ہیں۔" وہ لوہا گرم دیکھ کر اس پر مزید چوٹیں لگانے سے باز نہ آیا۔ ذیشان ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور اس کی کارکردگی سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں سر! اب تک ہم نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، بالکل سچ بتایا ہے۔ آگے بھی جہاں تک

ہو سکا، ہم آپ سے تعاون کریں گے۔'' واجد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ وہ بے شمار لوگوں کے ہاتھوں اپنی تکا بوٹی ہونے کے خیال سے ہی لرز رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت خالد کی تھی۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔ ہم خود فیصلہ کرلیں گے کہ تم ہمارے لیے کتنے مفید ہو۔'' اس بار ذیشان نے گفتگو میں مداخلت کی اور اپنے سیٹ پر آنے والا پیغام پڑھنے لگا۔

''ہور کیا سر! ساری گل تو میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ پیر سائیں کیا دھندا کر رہا تھا، وہ آپ خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ادھر ہم مال وصول کرتے تھے، ہور بعد میں وہ اسے آگے سپلائی کر دیتا تھا۔ اگر سپلائی کرنے میں ٹیم (ٹائم) ہوتا تو مال خانقاہ کے تہ خانے میں رکھ دیا جاتا ورنہ ادھر سے ہی آگے بڑھا دیتے۔ اس واری بھی ارجنٹ سپلائی تھی اس لیے ہم نے مال یہاں سے اٹھایا نہیں تھا۔ اب ملوم نہیں کہ آپ لوگوں کو کیسے خبر ہوگئی۔ میرے پاس بالکل اخیر میں پیر سائیں کا فون آیا تھا کہ واجد! پنڈ سے نکل جاؤ۔ ادھر چھاپہ پڑنے والا ہے۔ لیکن مجھے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا ہور رینجرز والے پہلے ہی پہنچ گئے۔ میں بچنے کے لیے ٹاہلی کے جھنڈ میں چھپ گیا جدھر سے آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔'' اس نے گویا قصہ ختم کر دیا۔

''تمہارا پیر سائیں یہاں سے کب فرار ہوا تھا اور کیسے؟ رینجرز والوں نے تو پنڈ میں داخل ہوتے ہی اس مکان پر ریڈ کیا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا لیکن انہیں اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملا۔'' اس کی رکی ہوئی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے شہریار نے سوالوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ذیشان خاموشی سے یہ کارروائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے سیٹ پر بھی مصروف تھا۔

''میرے خیال میں وہ پہلے ہی ادھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے پاس ایک شان دار گھوڑا تھا جسے وہ کبھی کبھار اردگرد آنے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہ اسی گھوڑے پر گیا ہوگا۔ خود کو بچانے کی فکر میں اسے میرا خیال بھی بعد میں آیا ہوگا اس لیے اس نے مجھے دیر سے فون کیا۔ میں خود ایسا بدحواس تھا کہ خالد تک کو فون کرنا بھول گیا۔'' واجد نے جواب دیا۔

''پیر سائیں کا فون نمبر بتاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔

''نمبر اس موبائل میں ہے جو آپ کے ساتھیوں نے تلاشی میں میری جیب سے نکالا تھا۔ اس نمبر پر میں نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔'' واجد نے بتایا تو وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے امید تھی کہ اب وہ بھگوڑا پیر سائیں کبھی اس نمبر کو استعمال نہیں کرے گا۔

''تمہارے اس پیر سائیں کا نام کیا تھا؟''

''ملوم نہیں جی۔ نام اس نے کبھی بتایا نہیں۔ وڈے پیر سائیں کی زندگی میں خود کو فقیر کہلواتا تھا پھر پیر سائیں بن کر بیٹھ گیا۔ سب اسے یہی کہتے تھے ہور اس نے کبھی پوچھنے پر بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا۔''

''مال پہنچانے والوں اور لے جانے والوں میں سے تم جن جن افراد کو جانتے ہو، ان کے نام پتے بتاتے جاؤ۔'' اس نے تفتیش کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''ان میں سے کوئی میری جان پہچان کا نہیں ہے۔ لانے اور لے جانے والے دونوں ہی کی طرف کے بندے خاموشی سے آکر اپنا کام نمٹا لیتے تھے۔ ہمیں آپس میں گل بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مال کدھر سے آرہا ہے، کون لا رہا ہے یا کدھر جائے گا ہور کون لے جائے گا، یہ سارے ملے پیر سائیں آپ نمٹاتا تھا۔ ہم لوگ تو صرف نگراں اور مزدور تھے۔'' واجد نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''پھر بھی تم ان میں سے کچھ لوگوں کو تو پہچانتے ہو گے؟ ہر بار سارے نئے لوگ تو تمہارے سامنے نہیں



آتے ہوں گے..... کچھ لوگوں سے بار بار بھی تمہارا واسطہ پڑتا ہوگا۔'' اس نے ہمت نہیں ہاری اور تحمل سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ہاں، تھے تو ایسے کچھ لوگ پر ان کے بارے میں بھی میں آپ کو زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ بس ان کے حلیے الیرہ ہی بتا سکتا ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی رہنے دو۔ یہ باتیں ہم تم سے بعد میں تفصیل سے پوچھیں گے۔ تم اپنا ذہن بنا لو۔'' اس نے مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے ذیشان نے گفتگو میں دخل دیا پھر شہریار کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے آدمی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کے ماہرین بھی موجود ہیں۔ ہمیں پہلے ان کے ساتھ مل کر یہاں کے معاملات نمٹانے ہوں گے۔ ان لوگوں سے باقی تفتیش ہم بعد میں اپنے مرکز پہنچ کر کریں گے۔''

''اوکے، ایز یو وِش۔'' وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ ان کے کرنے کے لیے وہاں بے شمار کام تھے جنہیں وہ نہایت مستعدی اور برق رفتاری سے نمٹا رہے تھے۔ ذیشان بھی ان کے ساتھ مصروف تھا اور مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس دوران اس کا اپنے افسرانِ بالا سے بھی وقتاً فوقتاً رابطہ ہوتا رہا تھا اور وہ انہیں بھی یہاں کی رپورٹس پہنچا رہا تھا۔

اس موقع پر شہریار کو ایک طرف ہو جانا پڑا۔ وہ کتنا ہی محبِ وطن اور وفادار سہی لیکن سی ایف پی کا ملازم نہیں تھا اس لیے اس کا براہِ راست ان کے معاملات میں دخل دینا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ بس خاموش تماشائی بنا وہاں ہونے والی کارروائیاں دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ان کے نظم وضبط اور مہارت کو سراہتا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کر لی اور واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ ہیروئن اور اسلحے وغیرہ کا اسٹاک رینجرز کی نگرانی میں روانہ کیا گیا۔ ان چیزوں کو ٹھکانے لگانا انہی لوگوں کے ذمے تھا۔ اس ذخیرے کو پکڑنے کا کریڈٹ بھی انہیں ہی ملتا۔ سی ایف پی کو ایسے کسی کریڈٹ سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ انہیں میڈیا پر آکر اپنے کارنامے کی تشہیر کرنی تھی۔ درحقیقت ان کے نزدیک یہ کوئی کارنامہ تھا بھی نہیں۔ ان کا اصل کام تو شروع ہی یہیں سے ہوا تھا۔ انہیں ان ذخائر سے زیادہ ان افراد میں دلچسپی تھی جو اس کے پیچھے اصل کردار ادا کر رہے تھے۔ سازش کی بنیاد تک پہنچے بغیر ایسی چھوٹی موٹی کامیابیاں حاصل کرنا ان کے نزدیک غیر اہم اور بے معنی تھا۔

اس موقع پر انہوں نے واجد اور خالد کے علاوہ دیگر گرفتار شدگان کو بھی رینجرز کے ہی حوالے کر دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کرتے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ روانگی کے وقت ہی یہ بات بھی شہریار کے علم میں آئی کہ مقامی تھانے کے چھ افراد پر مشتمل عملے کو بھی معطل کر کے زیرِ حراست لیا جا چکا ہے۔ یہ کام بھی ان کے ٹاہلی والا میں داخلے سے قبل ذیشان کی ہدایت پر رینجرز اہلکاروں نے ہی انجام دیا تھا۔

خاص بات یہ ہوئی تھی کہ تھانے دار کو بھی سی ایف پی نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ عملے کی گرفتاری سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ شہریار بہت غور سے ان لوگوں کے طریقِ کار کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اہم نکات کو فوکس کر کے بڑی سرعت سے کام کرنے والے لوگ تھے جن کی کارکردگی قابلِ تعریف تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کئی گھنٹے گزارنے کے بعد واپسی کے راستے پر عازمِ سفر ہوا تو ذہن کئی سمتوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اگر ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ ایک قابلِ قدر ادارہ ملکی سلامتی کے لیے فعال ہے، دوسری طرف دشمنوں کے بارے میں بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ ان کی جڑیں بہت گہرائی تک اُتر چکی ہیں اور وہ کسی عفریت کی طرح اس وطن کو کھانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اُن کے ان ناپاک

عزائم کو کامیاب بنانے کے لیے ٹاہلی والا کے تھانے دار، واجد اور خالد جیسے کئی بے ضمیر و لالچی لوگ مددگار و معاون تھے۔ اسے اس کیکڑے نما شے کی طرف سے بھی تشویش تھی جسے ذیشان نے اس کی ٹی شرٹ سے علیحدہ کیا تھا اور پھر نہایت خاموشی سے اُٹھا کر باہر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ ٹاہلی والا سے باہر نکلے تو اس کی اُلجھن زبان پر آ گئی۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ذیشان.....!''

''وہ ایک جدید ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور سنی جا رہی تھی۔ میں نے باہر لے جا کر اسے ضائع کر دیا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ پیر سائیں کی گرفتاری میں ہونے والی ناکامی کے پیچھے اسی ڈیوائس کا ہاتھ ہوگا۔'' اس کے لبوں سے سوال ادا ہونے سے پہلے ہی ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ اسے مختصر جواب سے نواز دیا جسے سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی کوئی ڈیوائس مجھ تک کیسے پہنچی؟'' اس نے بیک وقت حیرانی اور پریشانی سے سوال کیا۔

''یہ تم سوچ کر بتاؤ اور غور کرو کہ اس مشن پر نکلتے وقت کن افراد سے تمہارا اس طرح سے واسطہ پڑا تھا کہ وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر ڈیوائس تمہاری ٹی شرٹ پر چسپاں کر سکتے؟ یہ خیال رکھنا کہ اس ڈیوائس کو تمہارے ساتھ نتھی کرنے کے لیے بس چند سیکنڈوں ہی کی ضرورت تھی۔ اسے بہت آسانی سے کسی اسٹیکر کی طرح تمہارے کپڑوں کے ساتھ چپکایا جا سکتا تھا۔'' ذیشان سنجیدہ تھا لیکن اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جس سے وہ یہ اندازہ لگاتا کہ وہ اس پر شک کر رہا ہے۔ وہ بہت بردباری کے ساتھ اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کے ساتھ مشوروں سے نواز رہا تھا۔ اس کے رویے کا کمال تھا کہ شہریار اچانک لگنے والے شاک سے فوراً ہی سنبھل گیا اور غور کرنے لگا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔

غور کرتے ہوئے اسے سی ایف پی کا وہ اہلکار یاد آیا جس سے اس کا سی ایف پی کے دفتر میں زیرِ زمین عمارت میں جاتے ہوئے سیڑھیوں پر ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ لمحاتی ٹکراؤ تھا لیکن مقابل کو اتنی مہلت بہر حال ملی تھی کہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ٹی شرٹ پر وہ ڈیوائس چسپاں کر دیتا۔ اس شخص کے علاوہ اس کا صرف ماریہ سے قریبی واسطہ پڑا تھا۔ وہ اسے رخصت کرتے وقت کچھ دیر کے لیے جذباتی ہو گئی تھی اور اس طرح سے اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی کہ اس کے لیے ڈیوائس کو اس کے ساتھ اٹیچ کرنا بے حد آسان تھا۔

ماریہ کا خیال ذہن میں آنے کے باوجود وہ اس پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی شریکِ حیات تھی اور شادی شدہ زندگی کے مختصر دورانیے میں ہی خود کو ایک اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ انسان دوست بھی ثابت کر چکی تھی۔ ذرا سی دیر میں ایسے کئی واقعات اس کے ذہن سے گزر گئے جب اس نے ماریہ کی اچھائی کا مشاہدہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود ستم رسیدہ تھی۔ چودھری نے اپنی بدمعاشی سے اسے پیر آباد والے مرکزِ صحت میں کام کرنے کے لیے راضی کیا تھا اور وہ اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی لاہور سے اپنی پریکٹس چھوڑ کر وہاں آنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ چودھری کے ہاتھوں جسمانی استحصال اور بلیک میلنگ کا بھی شکار ہوتی رہی تھی۔ وہ تو شہریار سے شادی کے بعد اس کی جان چھوٹی اور ایک مضبوط سہارا ملنے کے بعد چودھری نے اس کا پیچھا چھوڑا۔

اگر وہ جرائم پیشہ افراد کے کسی اتنے مضبوط نیٹ ورک سے جڑی ہوتی تو چودھری کے ہاتھوں کھلونا ہرگز بھی نہ بنتی۔ دل ہی دل میں ماریہ کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے اچانک ہی ایک بات یاد آئی۔ اس سے قبل



ابھی جب وہ ذیشان سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا تو ماریہ نے گٹار کی شکل کی ایک ٹائی پن اس کی ٹائی میں لگائی تھی۔ بچگانہ محسوس ہونے کی وجہ سے اس نے وہ ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھی لیکن سوئے اتفاق کہ وہ ٹائی پن جیب میں جانے کے بجائے باہر ہی کہیں گر گئی۔ ذیشان سے ملاقات کے بعد وہ گھر واپس پہنچا تو ماریہ نے اس سے ٹائی پن کے بارے میں استفسار کیا اور اس کے کھو جانے کا سن کر ناراض بھی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ٹائی پن بھی کوئی ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ماریہ اُس کی اور ذیشان کی ملاقات کا حال جاننا چاہتی تھی؟ یا پھر واقعی وہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے محبت بھرا تحفہ تھا؟ اس کا ذہن اُلجھ سا گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت وہ اس سلسلے میں ذیشان سے کچھ نہیں کہے گا اور اپنے طور پر ماریہ کو چیک کرے گا۔ البتہ سی ایف پی کے اہلکار سے اپنے ٹکراؤ کے بارے میں اس نے ضرور بتا دیا۔

''کیا تم اس کو پہچان لو گے؟'' اس کی بات سن کر ذیشان نے فوراً ہی سوال کیا۔

''نہیں، اس وقت چونکہ میں جلدی میں تھا اس لیے اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔'' اس کا جواب ذیشان کے لیے مایوس کن تھا۔

''تم نے مجھے بہت بڑی اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میرے نزدیک سی ایف پی ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ہر رکن مخلص، ایماندار اور محبِ وطن ہے۔ یہاں کسی ایسے شخص کا وجود جسے کالی بھیڑ کہا جا سکے، میرے لیے بے حد تشویش ناک ہے۔ پھر ہم اس شخص کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو میرے لیے میرا ہر ماتحت مشکوک ہو جائے گا۔ تم خود سوچو کہ ان حالات میں، میں اپنی ٹیم کے ساتھ کس طرح کام کر سکوں گا؟'' ان کی واپسی اسی لینڈ کروزر میں ہو رہی تھی لیکن ڈرائیور کے علاوہ اب عملے کا کوئی فرد ان کے ساتھ نہیں تھا اس لیے وہ سرگوشیوں میں سہی لیکن کھل کر اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''میں نے صرف ایک شبہ ظاہر کیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو اور وہ ڈیوائس کسی اور شخص نے میرے کپڑوں سے اٹیچ کی ہو۔''

''سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے؟'' ذیشان اس کی بات سن کر بولا تو اس کے تصور میں ایک بار پھر ماریہ کا چہرہ اُبھرا لیکن اس نے اس بار بھی ذیشان سے اپنے اندیشے کا ذکر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی اور کھڑکی کے شیشوں کے پار تیزی سے گزرتے مناظر کو خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ دیکھتا رہا۔

⊛----✪----⊛

حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس وقت جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سب پورے جوش و خروش کے ساتھ مختلف چینلز سے نشر کی جانے والی خبریں دیکھ رہے تھے۔ ان خبروں کا تعلق ٹاہلی والا سے تھا۔ نیوز کاسٹر نے جو تفصیلات بتائی تھیں، ان کے مطابق ٹاہلی والا میں قائم خانقاہ کا سارا کچا چٹھا کھل گیا تھا۔ برسوں سے لوگوں کو اپنی اندھی عقیدت میں مبتلا رکھنے والا پیر سائیں ایک اسمگلر اور ملک دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا جس نے صرف اپنے مکروہ کاروبار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے پیر سائیں کا بہروپ اختیار کر رکھا تھا۔ خبروں میں بار بار منشیات، اسلحے اور بارود کے ذخائر کی فوٹیج دکھائی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پاک رینجرز کی کارکردگی کو بھی خوب سراہا جا رہا تھا جس نے اتنی بڑی سازش کا پتہ چلا کر کارروائی کی۔ سی ایف پی حسبِ روایت اپنا اصل کام انجام دینے کے بعد پسِ پردہ چلی گئی تھی اور سارا کریڈٹ رینجرز والوں کو ملا تھا۔

رینجرز کے افسران کی اکڑی ہوئی گردنیں فوٹیج میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھیں اور راؤ فیملی ان مناظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ خبروں میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ اس سارے دھندے کو چلانے میں خانقاہ پر

رہنے والے مریدوں کے ساتھ ساتھ مقامی تھانے کا عملہ بھی پوری طرح شامل تھا۔ مریدوں اور پولیس اہلکاروں کی گرفتاری کی خوش خبری کے ساتھ یہ ایک بری خبر بھی سنائی گئی تھی کہ اس سارے واقعے کا اصل کردار پیر سائیں اور اس کے ٹکڑے کھا کر سرکار سے نمک حرامی کرنے والا تھانے دار، ریڈ سے قبل ہی ٹاہلی والا سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان دونوں مجرموں کے فرار ہونے پر ان سب کو بہت دکھ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ خوش تھے کہ وہ بہت سے مسائل سے خود بخود ہی نکل آئے ہیں۔ ٹاہلی والا میں ان کے مکان اور کھیتوں کو بے شک نذرِ آتش کر دیا گیا تھا لیکن وہ اتنے باحیثیت اور باہمت تھے کہ واپس اپنی جگہ پر لوٹ کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ واپس لوٹنے کا ارادہ تو خیر وہ پہلے بھی رکھتے تھے لیکن خود اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں کافی ہاتھ پیر مارنے پڑتے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ پیر سائیں کے وحشی مرید اور اندھے عقیدت مند ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اب مرید تو گرفتار ہو چکے تھے اور یقیناً عقیدت مندوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھل چکی تھی، اس لیے واپسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ لوگ خبریں دیکھتے ہوئے جلد از جلد گاؤں واپس لوٹنے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ امید بھی کی جا رہی تھی کہ شفقت راؤ تک بھی جب یہ خبریں پہنچیں گی تو وہ جلد ان سے آ ملے گا۔

''کیوں بھئی اسلم پُتر! تمہارا کیا ارادہ ہے؟..... میرے ساتھ واپس پنڈ چلو گے یا یہیں رہ کر کام کاج کرنے کا ارادہ ہے؟ ہم نے انتخاب تم پر چھوڑ دیا ہے۔ تم جہاں چاہو رہ کر ہمارے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ یا اگر چاہو تو ہم سے الگ بھی کہیں اور کام دھندا دیکھ سکتے ہو۔ ہماری طرف سے تمہیں فیصلے کا پورا اختیار ہے۔ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے، جو چاہو کرو۔ ہمارے گھر اور دل کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

ٹی وی پر کمرشل بریک چلنے لگا تو حامد راؤ نے اپنی توجہ وہاں سے ہٹا کر اسلم کی طرف مبذول کی اور اس سے دریافت کرنے لگے۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے چاچا جی! ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔'' اسلم فوری طور پر ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تذبذب میں پڑ گیا تو ماہ بانو نے خود جواب دینے کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس نے یہ مہلت اس لیے مانگی تھی کہ اسے شہریار کے جواب کا انتظار تھا۔ اگر وہ لوگ اس کے تعاون سے ملک سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ ان کے لیے سب سے بہتر ہوتا ورنہ یہاں رہنے میں مسلسل ان کے سروں پر خطرے کی تلوار ہی لٹکی رہتی کہ جانے کب چودھری کا کوئی پٹھو اس تک رسائی حاصل کر لے یا اسلم کو ایک مفرور ڈاکو کی حیثیت سے شناخت کر کے گرفتار کر لیا جائے۔

''جیسا تم دونوں مناسب سمجھو۔ ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔'' حامد راؤ نے مہلت طلب کرنے پر کسی قسم کے تجسس کا اظہار نہیں کیا اور کھلے دل سے انہیں فیصلے کی آزادی دے کر خود مسعود کی طرف متوجہ ہو گئے جو ٹی وی پر خبریں دیکھنے کے ساتھ ساتھ فون پر اپنے ذرائع سے بھی ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ فون بند کر کے فارغ ہوا تو وہ اسے ہدایات دینے لگے کہ پنڈ واپسی سے قبل انہیں کن کن امور پر غور کرنا ہوگا اور وہاں گھر کے تباہ ہو جانے کے باعث خواتین کی واپسی کو کتنے عرصے تک مؤخر کرنا پڑے گا۔

تھوڑی سی تشویش انہیں وہاں سے فرار ہوتے وقت کی جانے والی فائرنگ سے زخمی اور ہلاک ہونے والوں کی طرف سے تھی۔ یقیناً انہیں وہاں لوٹ کر ان مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا لیکن بہرحال یہ اُمید ضرور تھی کہ سیلف ڈیفنس میں کی جانے والی اس کارروائی پر وہ زیادہ مشکل میں گرفتار نہیں ہوں گے۔

دونوں باپ بیٹے کو گفتگو میں منہمک دیکھ کر اسلم نے ماہ بانو کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ دونوں



وہاں سے نکل کر علیحدہ کمرے میں پہنچے تو معمولی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا۔

''آخر تمہیں راؤ صاحب کی پیشکش قبول کرنے میں کیا قباحت محسوس ہو رہی ہے؟ میرے خیال میں تو ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں یہ ایک اچھی پیشکش ہے۔ رہائش اور روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور راؤ صاحب اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ہمارے شناختی کاغذات بھی بنوا دیں گے۔''

''یہ سب تو ہو جائے گا لیکن تم ان لوگوں کو کیوں بھول رہے ہو جو بُو گیر کتوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ٹاہلی والا، پیر آباد سے اتنی دور نہیں ہے کہ چودھری کے کتے میری تلاش میں وہاں تک نہ پہنچیں۔ میں نے اس ملک کے طول و عرض میں بہت بھاگ کر دیکھ لیا ہے اسلم!..... میرے دشمن ہر جگہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔ اب میں یہاں سے کہیں بہت دور نکل جانا چاہتی ہوں تاکہ کچھ تو سکھ سے رہنے کی صورت بنے۔''

اس نے دل گیر لہجے میں اسلم کی بات کا جواب دیا تو وہ چونک گیا۔

''ملک سے باہر تم کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''کچھ معلوم نہیں، بس جہاں قسمت لے جائے۔'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''لیکن کیسے؟..... یہ سب کیسے ہوگا؟ ہمارے پاس ایسے وسائل ہی کہاں ہیں جو یہ کام ہو سکے؟ پھر میں پولیس کو بھی مطلوب ہوں۔ اگر ایئرپورٹ پر ہی دھر لیا گیا تو؟'' اسلم نے سوالات اٹھائے۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ مشکل کام ہے لیکن پھر بھی اُمید سی ہے کہ جس سے مدد کے لیے درخواست کی ہے، وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ رہی تمہارے ایئرپورٹ پر دھر لیے جانے کی بات تو میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں تم سے بہت بڑے بڑے مجرم آسانی سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے جس شخص کے ذمے یہ کام لگایا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم کون ہو اور تمہاری حقیقت کیا ہے۔ وہ خود ہی دیکھ بھال کر سارا انتظام کر دے گا۔''

''آخر وہ کون ہے جس پر تمہیں اتنا اعتماد ہے؟'' اسلم نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہی جسے میں اپنے نکاح کے موقع پر بلانا چاہتی ہوں۔ میں نام نہیں بتاؤں گی، تم اسی روز اُن سے مل لینا۔''

''لگتا ہے وہ تمہارا کوئی بہت ہی قریبی عزیز ہے۔'' اسلم کے لہجے میں خود بخود حسد کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہو گئی۔

''تم جو بھی سمجھ لو لیکن بس مجھے اس شخص پر بھروسہ ہے۔ اگر اس نے میرے یقین کو توڑا تو پھر ہمیں اس سیکنڈ آپشن، راؤ صاحب کی پیشکش کو ہی قبول کرنا ہوگا۔ اسی لیے میں نے احتیاطاً انہیں کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ ہم بہت نازک حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو کچھ دیر تو اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی لیکن پھر اندرونی بے چینی نے زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیا اور وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اس بات سے انکار نہیں تھا کہ اسلم کے اندیشے درست بھی نکل سکتے ہیں۔ وہ تو بس ایک انجانے سے احساس کے تحت شہریار پر بھروسہ کیے بیٹھی تھی، ورنہ بہرحال شہریار اس کا پابند نہیں تھا کہ اس کی ہر خواہش اور مطالبہ پورا کر دیتا۔

کمرے کے مختصر طول و عرض میں چکر پر چکر لگاتی وہ مسلسل اپنے یقین اور اسلم کے اندیشوں کا موازنہ

WWW.PAKSOCIETY.COM پاکستانی پوائنٹ PAKISTANIPOINT

کرتی رہی اور بالآخر بے چینی اس حد تک بڑھی کہ وہ شہریار کا خصوصی موبائل نمبر ڈائل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کی گئی۔

''السلام علیکم!'' شہریار کی آواز سن کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ یہ طے تھا کہ وہ دونوں الگ الگ راہوں کے مسافر ہیں پھر بھی دل اُس کی آواز سن کر اپنی دھڑکن کی ''لے'' بدلنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو؟'' اس نے متانت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ سے ایک کام کہا تھا، اس کے بارے میں پوچھنا تھا۔'' وہ ہمت کر کے فوراً ہی اصل مطلب پر آگئی۔

''کام تم نے ایک نہیں، کئی کہے تھے..... لیکن فکر نہیں کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ نکاح کا پروگرام کب ہے؟ تاکہ تمہاری فرمائش پر میں اس میں شرکت کے لیے تیار رہ سکوں اور اس دن اپنا کوئی پروگرام نہ رکھوں۔''

''شناختی کاغذات کے بغیر قانونی کارروائی میں پریشانی ہوگی اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے یہ کام ہو جائے۔'' اسے لگا کہ شہریار کا لہجہ کچھ عجیب سا ہے پھر بھی حقیقت بیان کر دی۔

''تمہاری راہ کی یہ رکاوٹ تو سمجھو دور ہوگئی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا لیکن جب میں نے تمہیں کراچی میں ایڈمیشن دلوایا تھا تو مہرین کے نام سے تمہارے نئے شناختی کاغذات بھی تیار کروائے تھے۔ اسلم کے لیے بھی میرا خیال ہے کہ نئے کاغذات بنوانے کے بجائے اس کے پرانے کاغذات وغیرہ کی ہی ڈپلیکیٹ نکلوا دوں۔ یہ کام ایک دو دن میں ہو جائے گا۔ میں ذرا دوسرے معاملات میں اُلجھ گیا تھا اس لیے تھوڑی سی تاخیر ہوگئی۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے بتانے لگا۔

''آپ کا بہت شکریہ سر! مجھے آپ پر یقین تھا اسی لیے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔'' اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے فوراً ہی ممنونیت کا اظہار کیا۔

''تمہارے اس یقین پر پورا اُترنے کے لیے مجھے اپنے اصولوں کو توڑنا پڑا ہے۔'' شہریار کی آواز میں شکوہ اُتر آیا۔

''سوری سر! میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں لیکن سکون سے جینے کی ایک راہ نظر آئی تو تھوڑی سی خودغرضی پر اُتر آئی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

''اوکے! تم خوش رہو، میرے لیے یہی سب سے اہم ہے۔'' اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ لیکن ماہ بانو کا دل ایک بار پھر بے طرح دھڑکنے لگا۔ روانی میں شہریار یہ کیا کہہ گیا تھا؟ کیا واقعی وہ اس کے لیے اتنی اہم تھی کہ اس کے لیے اس کی خوشی ہر شے سے بڑھ کر تھی۔

''ٹاہلی والا سے متعلق خبروں کا تمہیں علم تو ہو گیا ہوگا۔ رینجرز نے وہاں کافی بڑی کارروائی کی ہے۔ اور میرے خیال میں تمہارے محسنوں کی بھی بہت سی مشکلات اب دور ہو جائیں گی۔'' ابھی وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو پوری طرح سنبھال بھی نہیں پائی تھی کہ شہریار نے گفتگو کا موضوع یکدم ہی بدل دیا۔

''جی مجھے معلوم ہے۔ تقریباً تمام نیوز چینلز نے اس خبر کو گہری دلچسپی کے ساتھ دکھایا ہے۔'' اس نے جواب دیا پھر یکدم چونک کر بولی۔ ''کہیں اس آپریشن کے پیچھے آپ کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ میرے خیال میں آپ نے جن معاملات میں اُلجھے ہونے کا ذکر کیا تھا، وہ یہی ہیں۔''

''وہ رینجرز کا کارنامہ ہے بی بی! تم نے خبریں ٹھیک طرح سے دیکھی اور سنی نہیں شاید۔ میں ایک چھوٹے



ضلع کا اے سی ہوں۔ میرے کہنے پر بھلا رینجرز والے اتنا بڑا آپریشن کیونکر کر سکتے ہیں؟'' اس نے جان بوجھ کر خود کو اس معاملے سے الگ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''آپ انکساری سے کام لیں تو الگ بات ہے ورنہ پیرآباد کے جنگل میں ہونے والا آپریشن اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔'' وہ ذہین تھی اس لیے اسے جتانے سے باز نہ آئی کہ وہ اس بظاہر چھوٹے سے افسر کی پہنچ سے خاصی واقف ہے۔

''میں تمہاری سوچ پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہو سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔ تمہارا کام بہرحال ہو جائے گا۔ تم نے جس نمبر سے مجھے کال کی ہے، اسے آن رکھنا۔ میں اسی پر تمہیں اطلاع دوں گا۔'' شہریار نے اس سے بحث کیے بغیر گفتگو کا موضوع ایک بار پھر بدل دیا بلکہ گفتگو کو ایسی نہج پر لے آیا کہ اب مزید بات چیت جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے اسے فون کیا تھا، اس کا جواب مل چکا تھا اس لیے اب اجازت طلب کر لینا ہی بہتر تھا۔ اس نے یہی کیا لیکن خود کو بہت دیر تک اس کی آواز کے سحر سے آزاد نہیں کر سکی۔

⊛----✪----⊛

''گرفتار شدگان پر کام کرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟..... اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟'' وہ پھر ایشان سے رابطے میں تھا اور اس سے استفسار کر رہا تھا۔

''مجھے ان لوگوں سے بہت زیادہ کام کی باتیں معلوم ہونے کی امید نہیں تھی۔ بس اس لیے ساتھ اٹھا کر لے گیا تھا کہ انہیں ان کے لالچ کا ٹھیک ٹھاک مزہ چکھا سکوں۔ اب اگر ان میں سے کوئی زندہ رہا بھی تو باقی زندگی اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے گزارے گا۔ ان میں سے کوئی اس قابل بھی نہیں رہا ہوگا کہ خود سے بھیک مانگ سکے۔ ہاں، ان کی حالت دیکھ کر کوئی خود سے چند سکے ان کے آگے ڈال کر چلا جائے تو الگ بات ہے۔'' ایشان نے نہایت سفاکانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم لوگ اس طرح کے کام بھی کرتے ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس ملک کے لیے کرتے ہیں۔ چنانچہ جو اس ملک کے ساتھ برا کرتا ہے، ہم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے، ایز یو لائک۔ لیکن کچھ معلومات تو حاصل ہوئی ہوں گی ان لوگوں سے؟ کوئی بہت معمولی سا کلیو بھی ہمارے کام کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے۔ ہم ٹاہلی والا میں ان کے صرف ایک ٹھکانے کو ختم کر کے اپنے پر تو اکتفا نہیں کر سکتے۔ اس سازش کے پیچھے چھپے اصل چہروں کو دیکھنے کے لیے ہمیں ہر طرف ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے۔'' اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''اس بات کو میں اور میرے بڑے بھی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لوگ ٹاہلی والا کی کارروائی کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور وہ کر رہے ہیں۔'' ذیشان کا جواب بڑا مبہم سا تھا۔ اس بار وہ ذرا چونک پڑا۔ گفتگو کی ابتدا ہی سے ذیشان اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے وہ اسے خود سے الگ سمجھ رہا ہو اور کھل کر اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں ہو۔

''کیا بات ہے، تم کچھ اُکھڑے اُکھڑے لگ رہے ہو؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟'' اس نے فوراً ہی اس سے اس کے رویے کی وجہ دریافت کی۔

''میرے پرابلمز کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تم نے ڈیوائس کے معمے کو حل کیا یا نہیں؟'' ذیشان کے سوال نے اس

کے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگایا۔

''کیا تم مجھے ناقابل اعتبار سمجھ رہے ہو؟ تمہیں ڈر ہے کہ مجھے کچھ بتانے کی صورت میں تمہارے سیکرٹس اوپن ہو جائیں گے؟'' اس نے صدمے کی سی کیفیت میں دریافت کیا۔

''اعتبار اور بے اعتباری کا معاملہ بھی عجیب ہے دوست! تمہارے معاملے نے تو برسوں سے خدمات انجام دیتے کئی افراد کو مشکوک افراد کی لسٹ میں کھڑا کر دیا ہے۔ تم ہمارے درمیان موجود سیاہ بھیڑ کو شناخت نہیں کر سکتے لیکن تم نے اس کی موجودگی کا شک ظاہر کر کے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم خود سوچو کہ چارج سنبھالتے ہی میں کس مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اگر تمہارے حوالے کے ساتھ ایسا کوئی شک ظاہر کر کے تحقیقات شروع کرتا ہوں تو خود کئی سوالوں کی زد میں آ جاؤں گا۔ سب سے پہلے تو مجھ سے یہی پوچھا جائے گا کہ میں نے باہر کے آدمی کو اپنے ساتھ شامل کیوں کیا؟''

''یہ سوال کون پوچھے گا؟ جو تم سے اوپر ہے، وہ میری شمولیت سے واقف ہے اور اس پر معترض بھی نہیں۔''

وہ ذیشان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی باتوں سے گہرا صدمہ پہنچا تھا چنانچہ اپنے لہجے میں اُترنے والی سرد مہری کو کسی طور محسوس نہیں کر سکا۔

''ٹھیک ہے..... لیکن اوپر والوں میں سے بھی کوئی یہ پسند نہیں کرے گا کہ تمہارے ذریعے ہمارے راز باہر نکلیں۔ اب بھی میں کہہ نہیں سکتا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور نہیں سنی جا رہی ہو گی۔'' وہ کچھ زیادہ ہی صاف گوئی اور بے مروّتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''او کے۔ اگر تمہیں میری طرف سے اتنے ہی زیادہ خدشات ہیں تو مناسب ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ مجھے تو کام کرنا ہے۔ تم میرا ساتھ دو یا نہیں دو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی بساط کے مطابق اپنے مشن پر ڈٹا رہوں گا۔ البتہ مجھے یہ افسوس رہے گا کہ ہم ایک اچھی ٹیم بنتے بنتے رہ گئے۔'' ذیشان بے مروّتی پر اُتر آیا تھا تو اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ خود کو اس سے الگ کر لیتا۔ چنانچہ یہ الفاظ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھنے کے بعد اور کچھ بس نہیں چلا تو اپنی ہی ہتھیلی کو اپنے داہنے ہاتھ کے زوردار مکے کا نشانہ بنا لیا۔ اس ٹکراؤ سے اچھی خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی لیکن بہرحال، اس نے اپنے موبائل کی میسج ٹون سن لی۔ اگر یہ موبائل نمبر چند مخصوص لوگوں کے لیے ہی مختص نہ ہوتا تو وہ میسج ٹون کو نظر انداز کر دیتا لیکن اب دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ میسج ذیشان کی طرف سے تھا اور محض ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ وہ لفظ تھا۔ ''احتیاط۔'' اس پیغام کو پڑھ کر اس پر سوچ کے نئے در وا ہو گئے اور وہ ذیشان کی ساری گفتگو کو مختلف تناظر میں دیکھنے لگا۔

ذیشان نے اس سے ایسے لب و لہجے میں شاید اس لیے گفتگو کی تھی کہ اگر کسی ذریعے سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی بھی جا رہی ہو تو اوّل تو کسی قسم کی معلومات دشمن تک منتقل نہ ہو سکیں اور دوم یہ کہ اپنے مخالف کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ اب ان دونوں کا گٹھ جوڑ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ ایک نہیں رہے ہیں۔

یہ سارے خیالات ذہن میں آنے پر وہ پُرسکون ہو گیا اور دل ہی دل میں ذیشان کو اس کی ذہانت پر داد دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو..... اس نے صرف احتیاطاً ہی نہیں، سچ مچ بھی انہی خدشات اور مشکلات کی وجہ سے جن کا وہ ابھی ذکر کر رہا تھا، اس سے بدتہذیبی سے بات کی ہے تو وہ اس کا حق ہے۔ ذہن سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو وہ دیگر امور کی طرف توجہ دینے کے بھی قابل ہوا۔



اسے یاد آیا کہ ٹاہلی والا میں ڈیوائس پکڑے جانے پر اس کا شک ماریہ پر بھی گیا تھا لیکن اس شک کو رفع کرنے کے لیے وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکا تھا۔ نورکوٹ واپس آتے ہی اسے دفتری امور میں اُلجھنا پڑا تھا پھر ماہ بانو سے متعلق مسائل بھی تھے جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں وہ ماریہ کو پرکھنے کا کام کیسے کرتا؟ وہ خود خاصی مصروف عورت تھی اور لاہور سے واپس آتے ہی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ پیر آباد والے مرکزِ صحت گئی ہوئی تھی۔ اس کے مرکزِ صحت جانے کا خیال آیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے جب وہ ماریہ کی غیر موجودگی میں اس کے سامان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ وہ فوراً ہی اپنی رہائش گاہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ملازمین اسے معمول سے ہٹ کر گھر آتا دیکھ کر حیران ضرور ہوئے لیکن کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ سیدھا اپنے اور ماریہ کے مشترکہ بیڈروم میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے بیڈروم کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ وہاں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی جسے وہ مشکوک قرار دے سکتا۔ بیڈروم کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے ڈریسنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں اس کے اور ماریہ کے کپڑوں کے علاوہ آرائش سے متعلق دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ اس بے تحاشا سامان کا جائزہ لینا اتنا آسان نہیں تھا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اسے تن تنہا ہی یہ کام کرنا تھا۔ وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ماریہ سے اس کی شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی تھی، بہرحال وہ اس کی شریکِ حیات اور عزت تھی اور وہ محض شک کی بنیاد پر اسے کسی ایک بھی شخص کے سامنے ذلیل نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کو اپنی زبان سے کسی کے سامنے مشکوک قرار دینا اس کے نزدیک اسے ذلیل کرنے ہی کے مترادف تھا چنانچہ وہ خود تنہا سارا کشٹ اُٹھا رہا تھا۔

کپڑوں کے ڈھیر سے لے کر جوتے، جیولری، ہیئر کلپس، ٹائی پنز اور کف لنکس تک اس نے ہر ہر شے کھنگال ڈالی۔ کہیں ایسا کچھ نہیں تھا جو مشکوک لگتا۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ کئی گھنٹوں کی اس مشقت سے وہ سخت اوب گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جو خوامخواہ اپنی بیوی پر شک کر کے خود کو اس جنجال میں پھنسا بیٹھا ہے۔ بہرحال، ہمیشہ کے لیے دل میں شک کا کانٹا لیے بیٹھے رہنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ ایک بار اپنی تسلی کر ہی لیتا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے ایک بار پھر کمر کسی اور میدان میں اُترنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بیڈروم اور ڈریسنگ روم کے بعد اس کی اسٹڈی ہی رہ جاتی تھی جہاں کسی خفیہ اور حفاظتی نقطۂ نظر سے خاص شے کو رکھا یا چھپایا جا سکتا۔ ان تین مقامات کے علاوہ باقی پوری رہائش گاہ میں ملازمین کا بلا روک ٹوک آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے کسی بھی آلے کے نظر میں آنے یا ضائع ہو جانے کا بہت زیادہ خطرہ تھا۔

وہ ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دے کر اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈھیروں کتابوں سے بھرے شیلفس میں کہیں بھی ایک چھوٹی سی ڈیوائس چھپا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس طرح کی کوئی ڈیوائس جو ٹاہلی والا میں اسے اپنی ٹی شرٹ پر چسپاں حالت میں ملی تھی۔ حقیقتاً ایسی کسی شے کو اسٹڈی میں تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاشنے کے مترادف تھا لیکن اسے یہ کام کرنا ہی تھا۔ ایک بار میں نہ سہی، مختلف اوقات میں وہ قسطوں پر یہ کام کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دائیں طرف کی دیوار میں موجود شیلفس سے کام شروع کرے گا۔ وہ اس شیلف کی طرف بڑھتا، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

یس کم اِن۔'' اسے یاد آ گیا کہ اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا تھا چنانچہ اسے اندر آنے کی اجازت دینے کے ساتھ خود رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ مؤدب ملازم نے اس کے سامنے چائے

لا کر رکھی اور اس کی طرف سے واپس جانے کا اشارہ ملنے پر فوراً ہی باہر کی طرف رخ کر لیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتا ہوا ایک بار پھر اپنی اسٹڈی کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کتابوں کا شروع ہی سے بہت شوق تھا۔ گھر سے ملنے والی تربیت نے اس شوق کو اور بھی زیادہ پنپنے کا موقع دیا۔ نتیجتاً اس کے پاس کتابوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ یہاں پوسٹنگ کے وقت جہاں وہ اپنی پسند کا فرنیچر وغیرہ ساتھ لے کر آیا، وہیں اپنی بیشتر کتابیں بھی یہیں منتقل کر لیں۔ یہ کتابیں اس کی بہترین رفیق تھیں جن کے ساتھ وہ بے تحاشا مصروفیت کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب انہی ہمدم و ہم ساز کتابوں کے بیچ اس کے کسی دشمن کی کسی سازش کے پیچھے چھپے ہونے کا امکان تھا اور اسے بہت تحمل کے ساتھ اس سازش کو بے نقاب کرنا تھا ورنہ ان قیمتی کتابوں کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا۔

چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ بے خیالی میں ٹیبل پر رکھے کرسٹل کے اس پیالے میں گردش کر رہا تھا جس میں بہت سے رنگ برنگے موتی بھرے ہوئے تھے۔ وہ بغیر دیکھے پیالے میں سے ایک موتی اٹھاتا اور پھر اسے چھوڑ کر دوسرا اُٹھا لیتا۔ یکے بعد دیگرے کئی موتی اس طرح اس کے ہاتھ سے گزر چکے تھے اور ان کے ایک ردھم سے پیالے میں گرنے سے خوشگوار سا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر موتی گرنے سے پیدا ہونے والی آوازوں کے ردھم میں ڈوبا وہ یکدم ہی چونک گیا اور اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ دبے موتی کو غور سے دیکھنے لگا۔

وہ ایک سرخ رنگ کا چمک دار موتی تھا۔ اس رنگ اور سائز کے اور بھی بہت سے موتی پیالے میں موجود تھے لیکن اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس کے ہاتھ سے گزرنے والے موتیوں کے مقابلے میں اس موتی کا وزن قدرے مختلف ہے۔ اس نے موتی ہٹا کر ایک جانب احتیاط سے رکھ دیا اور پیالے میں موجود سرخ رنگ کے موتی چن چن کر نکالنے لگا۔ پہلے نکالے گئے موتی کو ملا کر ان کی کُل تعداد بارہ بنتی تھی۔ پہلے نکالے گئے موتی کے مقابلے میں اسے ان گیارہ موتیوں کے وزن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ پہلا موتی باقیوں کی نسبت وزنی تھا۔ وہ اپنے شک کی مضبوطی کو جانچنے کے لیے ایک ایک کر کے باقی رنگ کے موتیوں کا بھی جائزہ لینے لگا۔ نتیجہ وہی تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چائے پینی تو وہ کبھی کا بھلا چکا تھا۔ اب پوری طرح اس مشکوک موتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ باقی موتیوں کی طرح اس موتی میں بھی کوئی سوراخ نہیں تھا اور پوری سطح پر چمکدار و ہموار سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ وہ نہایت احتیاط سے انگوٹھے کے ناخن کی مدد سے موتی پر سے وہ رنگ کھرچنے لگا۔ آہستہ آہستہ سرخ رنگ بالکل غائب ہو گیا اور سفید رنگ کا پلاسٹک کا خول نظر آنے لگا۔ اس خول کو بہت غور سے دیکھنے پر اسے ایک باریک سی لکیر نظر آئی۔ یہ لکیر واضح طور پر موتی کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ یعنی وہ موتی دو کرّوں میں مل کر بنا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ عام طور پر موتی جیسی ساخت کی اشیا کو بنانے کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا تھا لیکن وہ جس طرح کھوج میں مبتلا تھا اور جس شک کی بنیاد پر اس موتی کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، وہ اسے آخری حد تک جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ آخری حد یہی تھی کہ وہ جوڑ سے موتی کو کھول کر دیکھتا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور پیپر کٹر کی معمولی سے مدد سے اس موتی کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

دو حصوں میں تقسیم ہو جانے والے موتی نے اس کے چھکے چھڑا دیئے۔ موتی اندر سے خالی نہیں تھا بلکہ اس کے کھوکھلے کرّے میں کوئی شے موجود تھی۔ سائنسی ایجادات و آلات کے بارے میں بہت زیادہ وسیع معلومات نہ رکھنے کے باوجود وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا شے تھی۔ یقیناً وہ ویسی ہی کوئی ڈیوائس تھی جو اس سے قبل



والی والا میں اس کی ٹی شرٹ پر چسپاں پائی گئی تھی۔ کوئی تھا جو اس کی مصروفیات سے واقف رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور یقینی طور پر وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی دسترس اس کی نجی استعمال کی اشیا تک بہت آسانی سے تھی۔ تو کیا واقعی وہ ماریہ تھی جو اس کی بیوی کے روپ میں دشمن کی آلۂ کار بنی ہوئی تھی؟ سانپ کی دُم سے ہلنے والے کوڑے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا اور اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے پورے وجود میں اٹھی۔ اگر یہ ماریہ کا کارنامہ تھا تو وہ اس کے ہاتھوں اپنے برے انجام سے کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال چکرا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ اس نے جلدی سے دو ٹکڑوں میں منقسم موتی کو ڈیوائس سمیت اپنی جیب میں منتقل کر لیا اور دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کھلا اور ماریہ خوشبو کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس نے خوب صورت لباس زیب تن کر رکھا تھا اور مناسب میک اپ اور جیولری کے ساتھ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔ ''مجھے معلوم ہوا کہ آپ گھر آئے ہوئے ہیں اور خاصا وقت اوپر بیڈروم میں گزارنے کے بعد اب اسٹڈی میں ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ سے خیریت معلوم کر لوں۔ آپ کی بے وقت دفتر سے واپسی آدمی کو ذرا تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے کہ نصیبِ دشمناں کہیں طبیعت وغیرہ خراب نہ ہو۔'' وہ شہریار کی خود پر جمی نظروں سے بے خبر اپنی ہی بولتی جا رہی تھی۔ بولتے بولتے اس کی نظر میز پر رکھے رنگوں کے اعتبار سے الگ الگ کر کے رکھے گئے موتیوں پر پڑی تو حیران نظر آنے لگی۔

''آپ کیا یہاں بیٹھ کر کوئی گیم کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

''نہیں۔ لیکن گیم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' شہریار نے چبھتے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں ہیلپ کروں؟ ویسے کیا کوئی نیا گیم ہے؟'' وہ خود بھی ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور تجسس سے پوچھنے لگی۔

''گیم تو یقیناً پرانا ہے لیکن میرے علم میں ابھی آیا ہے۔'' وہ جواب دیتے ہوئے بہت غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں حیرت اور تجسس تو بے شک تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر خائف ہو۔ اس کا ردِعمل ایک مکمل طور پر انجان شخص جیسا تھا۔ کہیں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کرسٹل باؤل میں موجود کسی مشکوک موتی سے واقف ہو۔ اُس کے رویے پر وہ ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور اس معاملے کو دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماریہ کا اس سارے چکر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جو لوگ اس کی کھوج میں لگے ہیں، انہوں نے یہ سارا بندوبست کیا ہو۔ سی ایف پی کے دفتر میں سیڑھیوں پر اس سے ٹکرانے والا اہلکار بھی ان کا ساتھی ہو سکتا تھا اور اس کے گھر پر کام کرنے والے ملازمین میں سے بھی کسی کو چھوٹی موٹی خدمت کے بدلے میں بڑا لالچ دے کر راضی کیا جا سکتا تھا۔ صفائی کے لیے اسٹڈی میں آنے والے ملازم کے لیے نظر بچا کر باؤل میں سے ایک موتی نکال کر لے جانا اور اس کی جگہ دوسرا لا کر رکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اگر کوئی اسے وہ موتی اٹھاتا ہوا دیکھ بھی لیتا تو اتنی معمولی سی شے کی چوری کے الزام میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ ماریہ اگر اس معاملے میں ملوث ہوتی تو اس کے لیے بہت آسان ہوتا کہ کسی زیادہ محفوظ اور خفیہ مقام کا انتخاب کرتی۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے وہ اس گھر کی مالکن تھی اور ہر جگہ بلا روک ٹوک اور بلا جواز جتنا چاہے وقت گزار سکتی تھی۔

''کن خیالوں میں ڈوب گئے؟ مجھے کچھ بتائیں نا اپنے گیم کے بارے میں۔'' ماریہ کی آواز اسے گہری سوچ سے باہر لائی۔

''چھوڑو بھی، تم کس چکر میں پڑ گئیں؟ میں تو بس وقت گزاری کے لیے اس کام میں لگ گیا تھا۔ آج طبیعت تھوڑی سست ہو رہی تھی، اس لیے دفتر میں دل نہیں لگا اور گھر واپس آ گیا کہ کچھ دیر آرام کر لوں گا لیکن بے وقت آرام کی عادت نہیں ہے اس لیے زیادہ دیر بستر پر لیٹ نہیں سکا۔ تم تھکی ہوئی آئی ہو، جا کر فریش ہو جاؤ اور کچھ کھاؤ پیو۔ میں بھی واپس دفتر جاتا ہوں۔ میرے چلے آنے سے وہاں کئی کام رک گئے ہوں گے۔'' اس نے تیزی سے خود کو سنبھال کر خلافِ عادت تھوڑی لمبی وضاحت دی اور پھر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر دفتر جانے کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ ماریہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ کوشش کامیاب نہیں رہے گی۔ شہریار کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے پروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور اس کے مشورے پر عمل کرنے چل پڑی۔

⊛----✪----⊛

''اپنی کارکردگی کی رپورٹ دو سنتھیا! ہمارے بڑے آج کل تم سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مراعات حاصل کرنے کے باوجود کافی طویل عرصے سے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر رہیں۔ بہتر ہے کہ اس سے قبل کہ تمہیں ریٹائر کر دیا جائے، تم خود کو مزید کام کرنے کا اہل ثابت کرو۔''

پُر رعونت لہجے میں کہے گئے یہ الفاظ سن کر ادھیڑ عمر سنتھیا کو پتنگے لگ گئے اور وہ چیخ کر بولی۔

''میں اپنی مرضی سے ایک طرف ہو کر نہیں بیٹھی ہوں۔ بڑوں ہی نے میرے میرج بیورو والے سیٹ اپ کا بھانڈا کھل جانے پر مجھے انڈر گراؤنڈ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے صرف اس مشورے پر عمل کیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ میں نہایت خاموشی سے خام مال پر کام کر رہی ہوں۔ میرا طریقِ کار ذرا سست ہے لیکن تم دیکھنا کہ اس کے کتنے زبردست نتائج حاصل ہوں گے۔''

''اوہ پلیز! اب تم مجھ پر اپنے استانی بننے کا رعب مت جھاڑو۔ جو کچھ تم کر رہی ہو، وہ ہمارے آدمی پہلے ہی سے کر رہے ہیں اور ان کے نتائج بھی بہت واضح اور تیز رفتار ہیں۔'' دوسری طرف سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

''تیز رفتار نتائج دینے والے تمہارے وہ جعلی مُلّا تیز رفتاری سے پکڑے بھی جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کم از کم ایسا نہیں ہوگا۔'' سنتھیا نے تیزی سے جواب دیا۔

''کرنے کو میں تم سے اس معاملے پر لمبی بحث بھی کر سکتا ہوں کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک طرف تو ہم نے انہیں دہشت گردی کا شکار کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان مسلمانوں کو ساری دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا..... پاکستان کے اندرونی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی معاشی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے بہرحال، اس وقت میں تمہیں یہ سب نہیں گنوانا چاہتا۔ میرے کال کرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔''

''تو پھر بہتر ہے کہ تم وہ مقصد بیان کر دو۔'' سنتھیا نے رُوکھے پن سے کہا۔

''پرابلم یہ ہے کہ ہمارا ایک بندہ غائب ہے۔ اس بندے کا نام ہے اشیش کمار۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور چونکہ لمبے منصوبے پر کام کر رہا تھا اس لیے ہمیں ڈیلی رپورٹ دینے کا پابند نہیں تھا۔ اسے اس کی جگہ سے ایک رات اچانک چھاپہ مار کر اٹھا لیا گیا لیکن بدقسمتی سے ہمیں وقت پر خبر نہیں ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو کافی دن ہو گئے تھے۔ ہم نے دوڑ دھوپ کر کے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ اس چھاپے کے پیچھے آرمی انٹیلی جنس تھی اور ہمارا آدمی ابھی تک انہی کی کسٹڈی میں ہے۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اس عرصے میں انہوں



نے اس پر ہر طرح کا ٹارچر کر کے معلومات اُگلوانے کی کوشش کی ہوگی۔ اشیش کس حد تک ٹارچر کو سہہ سکا ہوگا اور اس نے اب تک کیا اُگلا ہوگا، ہمیں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں۔ بس ہم نے احتیاطاً اپنے وہ سارے ٹھکانے بدل لیے ہیں جو اشیش کے علم میں تھے لیکن پھر بھی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اشیش کو انٹیلی جنس والوں کی گرفت سے نکالا جائے اور اسی سلسلے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔'' وہ یہاں تک بتا کر رک گیا۔

''کیسی مدد؟ تم بولتے جاؤ۔ میں تمہاری بات توجہ سے سن رہی ہوں۔'' سنتھیا کے لہجے سے اس کی گہری دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہم معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اشیش کا کیس کرنل توحید کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے کرنل کی مصروفیات کو مسلسل اپنی نظر میں رکھا ہے۔ ہم موقع کی تلاش میں رہے ہیں کہ کسی طرح کرنل کو گرفت میں لے سکیں اور اب وہ موقع مل گیا ہے۔ کرنل اپنے کسی قریبی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے چار دن کی چھٹی پر لاہور آ رہا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی موقع تلاشنا ہے کہ اس تک تمہاری کوئی ٹرینڈ لڑکی پہنچ جائے۔ اگر وہ لڑکی کرنل کو نشے میں اتارنے میں کامیاب رہی تو اس سے اشیش کے متعلق بہت کچھ اُگلوا سکتی ہے ہمیں ایک بار اشیش کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے تو سمجھو مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم اپنی پوری کوشش کر کے اسے وہاں سے نکال لائیں گے۔ اور اگر نکالنے میں ناکام رہے تو اسے دیش پر قربان ہونا پڑے گا۔ ہم اپنا اتنا اہم ایجنٹ پاکستانی انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں نہیں چھوڑ سکتے۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کُن اور سفاکیت سے بھرپور تھا۔ عرصے سے ان کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے سنتھیا اُن کے اس طریقِ کار سے واقف تھی۔ وہ غیروں کی طرح اپنوں کو بھی خوب جی بھر کر استعمال کرنے کے بعد کوئی برا وقت پڑنے پر ٹھوکر لگانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی آدمی بس اس وقت تک اہم رہتا تھا جب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ دوسری صورت میں وہ اسے کسی ٹشو پیپر کی طرح ہاتھ پونچھ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتے تھے۔

''میں نے تمہاری ساری بات سمجھ لی ہے۔ لیکن تم خود اچھی طرح یہ بات جانتے ہو کہ میرا وہ پرانا سیٹ اپ بکھر چکا ہے۔ ارمیلا، گیتا اور جولی کے انجام سے تم واقف ہو۔ میری وہ تینوں قابل لڑکیاں اب میرے پاس کہاں، اس دنیا میں ہی نہیں رہی ہیں۔ جولی کو تو مجھے خود مروانا پڑا تھا کہ وہ سجاد رانا کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اب میرے لیے جو لڑکیاں کام کر رہی ہیں، وہ کند ذہن اور عیاش سیاست دانوں کو تو بے وقوف بنانے کے لیے ٹھیک ہیں لیکن آرمی انٹیلی جنس کے کرنل کو قابو کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان میں سے کسی کو میں نے ڈیوٹی سونپ دی تو وہ کرنل کو ہاتھ میں لینے کے بجائے خود بھی اس کے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں تم اس کے بجائے کوئی اور طریقہ سوچو۔'' اس نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔

''مجھے چلانے کی کوشش مت کرو سنتھیا! میں ورما ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا سب سے اہم مہرہ ابھی سلامت ہے۔ تم اسے یہ ڈیوٹی سونپ دو تو وہ ہر حال میں کامیاب لوٹے گی۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''تم اتنے ہی حالات سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ پہلے ہی ایک اہم کام میں مصروف ہے اور اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ پہلے ہی اس کے لیے حالات بہت مشکل ہیں۔'' سنتھیا نے سختی سے جواب دیا۔

''مجھے اس کے حالات کا اچھی طرح علم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چاہے تو کسی بھی بہانے دو چار دن کے لیے خلاصی پا سکتی ہے۔ اشیش ہمارے لیے اتنا اہم نہیں ہوتا تو میں تم پر زور نہیں دیتا۔ مجھے اشیش والا مسئلہ ہر صورت حل کرنا ہے۔'' سنتھیا پر اپنی باخبری کا رعب جھاڑنے کے بعد وہ آخر میں کچھ نرم پڑ گیا۔

"اوکے! میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ پھر جو بھی سچویشن ہوئی، تمہیں اس سے آگاہ کر دوں گی۔" اس بار سنتھیا نے بھی نرم رویہ اختیار کیا۔ وہ ایک مانی ہوئی سیکرٹ ایجنٹ تھی جو برسوں سے "را" اور "موساد" دونوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ آج تک اس کی ڈبل ایجنٹ والی حیثیت نہیں کھل سکی تھی۔ درحقیقت وہ "موساد" کے لیے کام کرتی تھی اور "را" میں اس کی شمولیت کا مقصد محض "موساد" کے مفادات کا تحفظ تھا۔ "را" کے اعلیٰ سطحی افسران اس کی خدمات کو سراہتے تھے کیونکہ وہ پاکستان میں رہ کر بڑی کامیابی سے پاکستان کے خلاف کارکردگی دکھاتی رہتی تھی۔ "موساد" کی طرف سے بھی اسے کچھ اسی قسم کی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں لیکن ان ذمے داریوں میں کچھ اضافہ اس حوالے سے ہو جاتا تھا کہ اسے "را" والوں کے تمام اقدامات سے "موساد" کے بڑوں کو آگاہ رکھنا ہوتا تھا۔ یقیناً موساد میں بھی کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو درحقیقت "را" کے مفادات کے لیے کام کرتے ہوں گے۔ سنتھیا بہرحال ایسے کسی مشکوک فرد سے واقف نہیں تھی اور پوری تندہی سے اپنی ذمے داریاں پوری کر رہی تھی۔ ان ذمے داریوں میں سے ایک بظاہر الگ تھلگ رہ کر افیون کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری کے سلسلے میں چودھری کی کارکردگی پر نظر رکھنا بھی شامل تھا۔ وہ ان دنوں جس قسم کی زندگی گزار رہی تھی، کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک عورت ہے۔ اس کی بظاہر سادہ اور بے ضرر شخصیت کے پیچھے جو سیکرٹ ایجنٹ موجود تھی، اس تک کسی کا پہنچنا آسان نہیں تھا اور وہ مزے سے اعلیٰ افسران سے اہم ملکی راز اُگلوانے سے لے کر بم دھماکے کروانے تک سب کچھ کر گزرتی تھی۔

"صرف کوشش ہی نہیں کرنی، ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔" اس کے نرم پڑتے ہی ورما نے مزید زور دیا۔

"اوکے! تم بے فکر رہو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔" بالآخر اس نے ہامی بھر ہی لی۔

"تھینکس! تم نے ہاں کر دی ہے تو اب میں سچ مچ بے فکر ہو گیا ہوں۔" اس بار ورما خوش ہو گیا اور چند ایک مزید رسمی جملے بول کر فون کال کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ورما سے جان چھوٹتے ہی وہ دوسری اہم کالز میں مصروف ہو گئی۔ اسے اشیش کمار سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کی خاطر اپنی کسی اہم ایجنٹ کو مشکل میں ڈالتی لیکن مجبوری یہ تھی کہ ایک طرف اسے "را" سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنا تھا تو دوسری طرف وہ کرنل توحید کو نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس پر کام کر کے وہ پاکستان کے کئی اہم راز معلوم کر سکتی ہے۔ چنانچہ رسک لینا مجبوری تھا۔

⊛----✪----⊛

"تم نے مجھے جو ڈیوائس بھجوائی تھی، میں نے اس کا معائنہ کروا لیا ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا۔ وہ واقعی ایک نہایت حساس نوعیت کا مائیکروفون ہے جس کی مدد سے کافی طویل فاصلے سے بھی تمہاری گفتگو سنی جا سکتی تھی۔" ذیشان اسے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا اس کے باوجود دھچکا سا لگا۔ وہ تو اپنی دانست میں پوری رازداری سے دشمنوں کے خلاف برسرپیکار تھا لیکن اب یہ جان کر کہ دشمن تو کب کا اس کے گھر میں نقب لگا چکا ہے، اپنی ہی جگہ چور سا بن گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہ کھیل کب سے کھیلا جا رہا ہے اور اس کے کون کون سے راز ہیں جو دشمنوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔

"میں تمہیں ایک ڈیٹیکٹر بھجوانے والا ہوں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مائیکروفون اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے دیگر آلات کو بڑی مہارت سے پکڑ لیتا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے جو طریقِ کار استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے توڑ کے لیے میرا بھیجا ہوا ڈیٹیکٹر بہت کارآمد ثابت ہوگا۔" دوسری طرف ذیشان نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔



"تھینک یو ذیشان! مجھے واقعی ایسی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"تمہیں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہماری صفوں میں شامل ہو اس لیے تمہارے مسائل کو حل کرنا ہمارا فرض ہے۔" ذیشان نے اسے جواب دیا اور مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے قرب و جوار میں کسی شخص کو تلاش کرو جو یہ سب کر رہا ہے۔ یہ مت سوچو کہ تمہارے اردگرد موجود سارے لوگ تمہارے وفادار ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ قریب ترین لوگ ہی غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تمہارے شک ظاہر کرنے پر میں نے سی ایف پی کے اپنے یونٹ میں موجود ایک ایک فرد کو کھنگالنا شروع کر دیا ہے۔ اس یونٹ میں موجود ہر شخص ایسا ہے جس کے کریڈٹ پر کوئی نہ کوئی کارنامہ موجود ہے اور وہ ادارے اور ملک سے اپنی وفاداری کو ثابت کر چکا ہے۔ لیکن تمہارے شک ظاہر کرنے کے بعد میرے لیے ہر شخص مشکوک ہو گیا ہے۔ اب میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنے درمیان موجود اس غدار کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا یا پھر یہ کہ میرے لوگ بے قصور ثابت ہو جائیں گے۔" ذیشان بہت گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جب سے ذیشان نے سی ایف پی کو جوائن کیا تھا، بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ ذمے دار محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں تمہارے مشورے پر عمل ضرور کروں گا۔ درحقیقت حالات ایسے ہیں کہ میں خود اسی نہج پر سوچنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔" اس نے ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

"وش یو گڈ لک۔ اُمید رکھو کہ حالات تمہارے قابو میں آ جائیں گے اور کسی صورت اپنا مورال گرنے نہ دو۔" ذیشان یقینی طور پر اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا چنانچہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے اسے حوصلہ دینا ضروری سمجھا۔ اس کے خلوص کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بنگلے کے اندرونی حصے میں جانے کے لیے پلٹ گیا۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس فون کال کے لیے اس نے اندر کسی کمرے تک محدود رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور لان کی کھلی فضا میں ذیشان سے گفت و شنید کی تھی۔

"آپ کہاں تھے؟ میں آپ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی اسٹڈی میں جھانک کر آئی ہوں کہ آپ زیادہ تر وہیں پائے جاتے ہیں لیکن آپ شاید کہیں باہر نکل گئے تھے۔" وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، ماریہ نے اسے دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ اس نے اس دوران غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی دھوکا دہی کر رہی ہے۔ وہی معمول کا لب و لہجہ تھا اور وہی چہرے پر موجود سادگی اور سنجیدگی۔ وہ اس کو مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کے باوجود اس پر شک کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔

"کہیں گم نہیں ہوا۔ میں بس ذرا دیر کے لیے لان میں چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ایک نشست سنبھال لی۔ موبائل پر گفتگو کا ذکر اس لیے بھی جان بوجھ کر گول کر دیا تھا کہ یہ نمبر بس مخصوص لوگوں کے لیے ہی تھا۔ دفتری امور اور میل جول کے لیے وہ الگ موبائل استعمال کرتا تھا۔ ماریہ کے بیوی ہونے کے باوجود اس نے کبھی اسے یہ نمبر دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح سے احتیاط ہی برتتا رہا تھا کہ کبھی یہ سیٹ کسی کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اپنی اسی احتیاط کی وجہ سے اسے خاصا اطمینان تھا کہ یہ نمبر کسی غیر محفوظ ہاتھ تک نہیں پہنچا ہوگا۔

"اصل میں، میں آپ کو انفارم کرنا چاہ رہی تھی کہ کل میرا لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔ جس ہاسٹل میں، میں جاب کرتی تھی، وہاں کی انتظامیہ کی کوششوں سے ڈاکٹرز کا ایک سیمینار منعقد کیا جا

رہا ہے۔ موضوع اچھا ہے اور میری اس میں دلچسپی بھی ہے تو میں نے سوچا کہ شرکت کر لی جائے۔ نالج کے ساتھ ساتھ پرانے فرینڈز اور کولیگز سے ملاقات کا موقع بھی مل جائے گا۔''

''ایز یو وِش۔ مشابرم خان تمہیں لاہور پہنچا دے گا۔'' اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اسے اجازت دے دی۔ ویسے بھی وہ اس سے اجازت نہیں مانگ رہی تھی، صرف اطلاع دے رہی تھی۔ اور وہ اُس کے اس رویّے پر یوں بھی معترض نہیں تھا کہ ابتدا سے ہی اس نے ماریہ پر اس قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی تھیں کہ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس سے اجازت طلب کرے۔ اس کے نزدیک ماریہ ایک باشعور، سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت تھی جسے پوری پوری شخصی آزادی حاصل ہونی چاہئے تھی۔

''تین روزہ سیمینار ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دو دن میں مزید وہاں دوستوں کے ساتھ گزاروں۔ اتنے دن مشابرم خان وہاں رُکا تو آپ کو پریشانی ہوگی۔'' اس نے کسی خیال رکھنے والی بیوی کی طرح فکرمندی کا اظہار کیا۔

''مشابرم خان تمہیں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔ وہاں ماموں جان کا ڈرائیور ہوگا۔ تم کہیں بھی آنے جانے کے لیے اس کے ساتھ چلی جانا۔ واپسی کے لیے دیکھ لیتے ہیں کہ کیا صورت بنے گی۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین دن میں خود میرا لاہور کا چکر لگ جائے ورنہ تم فون کر دینا تو میں مشابرم خان کو بھجوا دوں گا۔'' وہ بہت سہولت سے اس کے سامنے تجاویز پیش کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسا کوئی شائبہ نہیں تھا کہ وہ اسے شک کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ابھی تک دل سے اس پر یقین نہیں کر رہا تھا۔

''سوری، میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ ممی کا بھی میرے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ کتنی سوشل خاتون تھیں اور انہیں صرف اور صرف میری وجہ سے یہاں ایک گاؤں میں آکر رہنا پڑ رہا ہے۔ بے شک وہ اپنی زبان سے شکوہ نہیں کرتیں لیکن مجھے تو احساس ہے کہ میری وجہ سے ان کی زندگی بالکل چینج ہوگئی ہے۔ اسی لیے جب میرا لاہور جانے کا پروگرام بنا تو میں نے انہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی آفر کر دی۔ میرا خیال تھا کہ جتنا وقت میں اپنی مصروفیت میں گزاروں گی، ممی اپنے احباب سے ملاقات کر لیں گی۔ باقی بچا کھچا وقت ہم دونوں ماں بیٹی ایک ساتھ گزار لیں گی۔ انہوں نے میری آفر قبول کر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہم کسی ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ ایکچوئلی انہیں ماموں جان کے گھر میں رُکنا اچھا نہیں لگ رہا۔ ظاہری طور پر کافی ماڈرن نظر آنے کے باوجود وہ مشرقی ویلیوز کو اہمیت دیتی ہیں۔ اس لیے بیٹی کے سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے وقت بے وقت آنے جانے سے ماموں جان وغیرہ ڈسٹرب ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، جب تم سب کچھ طے کر ہی چکی ہو تو میں تمہارے پروگرام کو خراب کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ البتہ یہاں سے لاہور تک تم مشابرم خان کے ساتھ جانا کیونکہ مجھے تمہارا پبلک ٹرانسپورٹ سے جانا بالکل اچھا نہیں لگے گا اور میرے خیال میں تمہاری ممی بھی اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کریں گی۔'' اس نے نہایت سکون سے ماریہ کی ساری بات سنی اور آخر میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''تھینک یو شہریار! مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔ میرے ساتھ ممی کی مجبوری نہیں ہوتی تو میں خود بھی ماموں جان کی کوٹھی پر رُکنا پسند کرتی۔ آفرین آنٹی اتنا خیال کرنے والی خاتون ہیں کہ ان سے مل کر ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ اب بھی مجھے جیسے ہی موقع ملا، ان سے ملاقات کے لیے ضرور جاؤں گی۔'' اس نے مشابرم خان کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ارادے سے بھی آگاہ کیا۔



''اس سلسلے میں میری طرف سے تمہارے اوپر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تمہارا دل چاہے اور تم محسوس کرو تو ممانی جان سے ملنے چلی جانا ورنہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ مجھے یہ فکر ضرور رہے گی کہ تم وہاں کنوینس کے لیے پریشان رہو گی۔''

''پریشانی کیسی؟ میں کرائے پر کوئی کار لے لوں گی یا پھر ہوٹل سے بھی ایسی کوئی سہولت مل جائے گی۔ آج کے دور میں اس قسم کی باتوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا تو شہریار اُس کی اس ادا کو دیکھتا رہ گیا۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی وہ ڈاکٹر جو اس سے شادی کے نتیجے میں اپر کلاس میں داخل ہوئی تھی، کیسے اسے بتا رہی تھی کہ پیسے کے بل بوتے پر کون سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور کیسی سہولتیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

''ٹھیک ہے، جو مناسب سمجھو کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے کُل اختیارات ماریہ کو سونپ دیئے تو وہ خوش ہوگئی اور فرطِ جذبات سے اس کے قریب چلی آئی۔

''تھینک یو سو مچ شہریار! آپ سچ مچ بہت اچھے ہیں۔'' صوفے پر اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''اور تم اس بہت اچھے شوہر کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' اس نے بھی شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''دو چار دن کی تو بات ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں نہیں جاتی۔'' وہ اس کے کچھ اور بھی قریب ہو بیٹھی اور اپنی ٹھوڑی اس کے بازو پر ٹکاتے ہوئے ایک ادا سے بولی۔ قربت کے ان لمحات میں شہریار نے اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس کی۔

یہ عورت اس کی بیوی تھی اور انہوں نے خلوت میں ایک دوسرے کے بھیدوں کو خوب جانا تھا لیکن شاید کچھ بھید ایسے تھے جو دل کے نہاں خانوں میں ہی چھپے رہ گئے تھے اور ان بھیدوں تک رسائی کے لیے اسے ماریہ کو اجازت دینی ہی تھی۔ چنانچہ خود کو سنبھالتا ہوا نرمی سے بولا۔

''میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں زبردستی کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں اپنی خاطر تمہیں قطعی نہیں روکوں گا۔''

''سو کیوٹ۔'' ماریہ نے چہک کر اس کا رخسار چوما۔ ''مجھے معلوم تھا کہ آپ کا یہی جواب ہوگا۔'' وہ بہت خوش تھی۔

''سارے شریف شوہر بیوی کی بات مانتے ہیں۔ میں نے کون سا کمال کیا ہے؟'' اس نے بھی ہنس کر جواب دیتے ہوئے خوش مزاجی کا ثبوت دیا۔ موجودہ حالات میں دل کی ہر بات دل میں ہی رکھنی ضروری تھی کیونکہ اگر ماریہ مجرم تھی تو اسے اس کی کسی بات پر شک میں مبتلا ہو کر چوکنا ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہئے تھا۔ بصورتِ دیگر یہ راز، راز ہی رہتا تو اچھا تھا۔ ورنہ ایک شک کا اظہار اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کر ڈالتا۔

''آپ کی شرافت کی گواہ ہوں، جب ہی تو یہاں بیٹھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوں۔'' ہنسی میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے ماریہ نے اس کے بازو پر ہلکی سی چٹکی لی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی شرارت نے اسے کچھ اور بھی دل رُبا بنا دیا تھا۔ شہریار پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایسا کچھ تو تھا اس عورت میں کہ وہ اس سے محبت نہ کرنے کے باوجود اس کی قربت میں زندگی گزار رہا تھا۔

''ایسے نہ دیکھیں۔ یہ ہمارا بیڈروم نہیں ہے۔'' وہ کچھ اور شریر ہوئی۔

''تو پھر چلو وہیں چلتے ہیں۔'' اس نے بھی جوابی وار کیا۔

''آپ چلیں، مجھے تو اپنے لاہور کے سفر کے لیے پیکنگ کرنی ہے۔'' اس نے یکدم ہی ہری جھنڈی دکھا دی اور ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ وہ خود کون سا خواہش مند تھا، سو وہیں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ ماریہ کے لاہور کے سفر کے لیے اسے خود بھی تو تیاری کرنی تھی اور سوچنا تھا کہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

⊛----✪----⊛

ماریہ اور اس کی ممی سویرے ہی مشابرم خان کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہوگئی تھیں۔ اس نے مشابرم خان کو اچھی طرح اس کی ڈیوٹی سمجھا دی تھی۔ بظاہر وہ ان دونوں کو ان کے پسندیدہ ہوٹل تک ڈراپ کرنے کے بعد واپس آجاتا لیکن حقیقت میں اسے وہیں رہ کر ان دونوں کے معمولات کی نگرانی کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ شہریار کی گاڑی کو رانا ہاؤس میں چھوڑ دیتا اور خود اپنے لیے موٹر سائیکل کرائے پر لے لیتا۔ شہریار کی گاڑی، ماریہ کے لیے جانی پہچانی ہونے کی وجہ سے نگرانی کے لیے غیر موزوں تھی۔ اس گاڑی کو استعمال کرنے کی صورت میں مشابرم خان فوراً ہی نظر میں آجاتا۔ موٹر سائیکل کے استعمال کا یہ فائدہ تھا کہ ایک تو موٹر سائیکل سوار کے لیے خود کو کسی کونے کھدرے میں چھپا لینا آسان تھا اور تعاقب کرتے ہوئے بھی وہ ہیلمٹ کے استعمال سے اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا۔

مشابرم خان اس کی ساری ہدایات بغیر کسی حیل وحجت کے سنتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اسے شہریار کے اپنی بیوی کی نگرانی کروانے پر حیرت یا کسی قسم کا تجسس ہے۔ وہ واقعی اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک نہایت وفادار آدمی تھا جس کے لیے حکم کی بجا آوری ہی سب سے اہم تھی۔ اس کے باوجود شہریار اس کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ زبان وتاثرات سے کسی قسم کا اظہار نہ کرنے کے باوجود مشابرم خان کے ذہن میں سوالات نے جنم تو ضرور لیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سوچ رہا ہو کہ صاحب کو اپنی بیوی کے کردار پر شک ہے اور یہ ایک قابل شرم بات تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریہ والے معاملے کو نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ اگر بات اس کے ذاتی مفاد کی حد تک ہوتی تو شاید وہ طرح دے بھی جاتا لیکن یہ ملکی سالمیت کا معاملہ تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جس طرح کے واقعات سامنے آتے رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ملک دشمن ایجنٹس خصوصاً ''را'' کے پٹھو پوری طرح سے سرگرم ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے درپے ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس قسم کے لوگوں سے نمٹنا اس کے فرائض منصبی میں شامل نہیں تھا لیکن ایک محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے وہ خود کو اس جنگ سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے اسی ملک میں جینا مرنا تھا تو وہ اس ملک کے لیے جینے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا تھا۔ ملکی مفادات کے آگے اسے کوئی شخص اور رشتہ عزیز نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اپنی ناک بچانے کے لیے اس معاملے کو مزید ٹال سکتا تھا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ ذیشان کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے بجائے مشابرم خان سے کام لے رہا تھا کیونکہ مشابرم خان اس کے لیے ہر فرد سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر دو صورتوں میں بات اس کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی اور اگر ماریہ بے قصور ثابت ہوئی تو وہ اپنی ازدواجی زندگی کو پہلے ہی کی طرح چلاتا رہے گا۔ دوسری صورت میں ماریہ کو اس کے بدترین انجام سے بھی کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اس معاملے کو ہر زاویے سے سوچ لینے کے باوجود وہ شدید اضطراب کا شکار تھا۔ دفتری امور بھی اسی بے چینی کے ساتھ انجام دیئے جا رہے تھے۔ عبدالمنان نے تجویز پیش کی تھی کہ آج نور پور کا دورہ کر لیتے ہیں تاکہ وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا جا سکے لیکن اس نے یہ ذمے داری اس کے شانوں پر ڈال کر خود جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معمول کے کاموں کی انجام دہی کے دوران ماہ بانو اور اسلم کے شناختی کاغذات بھی



اس تک پہنچ گئے اور مشابرم خان کا فون بھی آگیا کہ وہ ماریہ اور اس کی ممی کو لاہور پہنچا چکا ہے۔ اس موقع پر شہریار نے اسے ہدایت دی کہ وہ خود ہوٹل کے سامنے سے ہٹ کر گاڑی رانا ہاؤس پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کام کے لیے وہ رانا ہاؤس فون کر کے کسی ملازم کو بھیج دے گا اور وہی ملازم اس کے لیے موٹر سائیکل بھی فراہم کر دے گا۔

اس نے یہ نئی ہدایت اس خیال سے دی تھی کہ یہ نہ ہو کہ مشابرم خان گاڑی پہنچانے رانا ہاؤس جائے اور اس دوران ماریہ اپنی ممی کے ساتھ کہیں روانہ ہو جائے۔ یہ احکامات جاری کرنے کے بعد اسے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ جلد یا بدیر بلی تھیلے سے باہر آجائے گی لیکن بہرحال، وہ مکمل طور پر پُرسکون نہیں ہو سکتا تھا۔ اضطراب کی اس کیفیت سے گزرتے ہوئے اسے ماہ بانو کی کال موصول ہوگئی۔

''تم نے بہت اچھے موقع پر فون کیا ہے۔ تمہارے کاغذات مجھ تک پہنچ چکے ہیں اور اب تم دونوں جب چاہو سول میرج کر سکتے ہو۔'' اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

''ہم تو فوری طور پر یہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ آپ کا ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ میری شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔'' ماہ بانو نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تم جب کہو گی، میں پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دل میں ایک ملال سا تھا۔ وہ اسے نہیں پا سکا تھا، یہ دکھ اپنی جگہ لیکن اسے ماہ بانو کا بہن ساتھی کے طور پر ایک مفرور ڈاکو کو منتخب کرنا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ آج ہی تو کیا آپ آجائیں گے؟'' وہ جانے کیوں اسے آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔

''ہاں، مجھے تھوڑی مشکل تو ضرور ہوگی لیکن میں ضرور آجاؤں گا۔'' اس نے صاف لہجے میں جواب دیا تو کچھ دیر کے لیے لائن پر خاموشی چھا گئی پھر ماہ بانو کی نم ناک سی آواز سنائی دی۔

''تو پھر آجائیں۔ دیر ہوگئی تو کہیں میرے لیے اپنے وعدے کی پاسداری کرنا مشکل نہ ہو جائے۔'' اس ایک جملے میں کیا نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ تڑپ سا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کے جذبے کوئی اس سے پوشیدہ تو نہیں تھے جو وہ اس کی کیفیت کو محسوس نہ کر سکتا یا اسے اتنی بات سمجھ نہیں آتی کہ اس کا اسلم سے شادی کا فیصلہ محض ایک سمجھوتہ ہے۔

''جب دل نہیں مانتا تو خود پر جبر کیوں کرتی ہو؟ مت کرو یہ شادی۔ میں تمہیں تنہا ہی ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ باہر رہ کر تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرنا اور جب تمہیں اپنے معیار کا کوئی شخص ملے تو اس سے شادی کر لینا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔'' اس نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

''وقت کی بات رہنے دیں، اے سی صاحب! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ساری زندگی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتا اور کبھی زندگی بھر کے فیصلے ایک لمحے میں ہو جاتے ہیں۔ رہی میری کم عمری کی بات تو یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میں اتنی سی عمر میں جتنے تجربات سے گزر چکی ہوں، عام طور پر لڑکیاں ساری زندگی میں بھی اتنے تجربات سے نہیں گزرتیں۔ اس لیے مجھ میں انسانوں کی پرکھ بھی عام لڑکیوں کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ ہے۔ آپ کا فون چاہے اسلم کو کسی بھی نام سے پکارے، میرے نزدیک وہ حالات کا مارا ہوا ہے جو بہت آسانی سے سنبھل جائے گا اور اپنی مثبت خصوصیات کے ساتھ زندگی گزار سکے گا۔'' وہ کسی جہاندیدہ عورت کی طرح اس کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

''اگر تم اسلم کو صرف ہمدردی میں اپنا رہی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس سے شادی کیے بغیر بھی اسے ملک سے باہر نکلوا دوں گا تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔'' وہ ہر حال میں اسے اس کے غلط فیصلے سے روک لینا چاہتا تھا۔

''میں اسلم کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کی نئی زندگی کے آغاز کے لیے میرا وجود آکسیجن کی طرح لازم و ملزوم ہے۔ اس نے بڑی شدت سے میرے ساتھ جینے کا خواب دیکھا ہے۔ میں اسے نہ ملی تو وہ جی نہیں سکے گا۔'' اس نے نہایت دردمندی سے بتایا۔

''لگتا ہے اسے بہت قریب سے جاننے لگی ہو؟'' جانے کیوں وہ طنز کر گیا۔ جواباً ماہ بانو کچھ نہیں بولی تو اسے خود ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

''سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہوں۔ تم مجھے ایڈریس بتاؤ کہ میں کہاں پہنچوں؟ میں ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر تمہاری تقدیر میں لکھا ہے تو تمہاری شادی آج ہی کی تاریخ میں اسلم سے ہو گی۔'' شرمندگی کا اظہار کرتے کرتے آخر میں اس کا لہجہ پُرعزم ہو گیا۔

''آپ ایسا کیجیے کہ مینارِ پاکستان پر پہنچ جائیں۔ پھر جہاں بھی جانا ہو گا، ہم ساتھ چلیں گے۔'' ذرا دیر سوچنے کے بعد ماہ بانو نے اس سے کہا تو اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا اور خود عبدالمنان کو بلا کر اسے ہدایات دینے لگا۔ ان ہدایات میں عبدالمنان کو آج کے دن نور پور جانے سے منع کرنا بھی شامل تھا۔ یہ کام اس کے بجائے دفتر کا کوئی دوسرا بندہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں البتہ عبدالمنان کا یہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ اسے ہدایات دینے کے بعد اس نے چند ایک مزید ضروری امور نمٹائے اور حسبِ وعدہ آدھے گھنٹے میں دفتر سے روانہ ہو گیا۔

اس کی ذاتی گاڑی میں تو اس وقت مشابرم خان، ماریہ کو لاہور چھوڑنے گیا ہوا تھا اس لیے ناچار اسے دفتر کی گاڑی استعمال کرنی پڑی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا اور عبدالمنان کی پیشکش کے باوجود اس نے کسی اور ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا تھا۔ مشابرم خان کی بات پھر بھی الگ تھی۔ لیکن اس وقت وہ جس نجی نوعیت کے کام سے جا رہا تھا، کسی دوسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جانا گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ماہ بانو کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے سائے پر بھی بھروسہ کرنے سے ڈرتا تھا۔ وہ خانماں برباد لڑکی اگر اس کی کسی کوتاہی کے سبب مزید مشکل میں پڑ جاتی تو وہ سخت پچھتاوا اور ندامت محسوس کرتا۔ اس پچھتاوے سے بچنے کے لیے ہی تو وہ اس کے لیے بہت کچھ قانون کی حدود سے نکل کر بھی کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ اگر وہ آباد ہو جاتی تو اسے اپنے دل کی بربادی کا ذرا ملال نہ رہتا۔

خیالوں میں غلطاں وہ مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا لیکن پھر تھکن کا سا احساس ہونے لگا۔ یہ تھکن اس سفر کی نہیں تھی۔ کئی دن سے اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ کل رات بھر بھی وہ ماریہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اعصابی کشیدگی نے اسے ڈھنگ سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا تھا اور وہ پہلے دفتری مصروفیات کے بعد اب اس سفر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ گاڑی بھی ذاتی نہیں تھی اس لیے چلانے میں تھوڑی سی اُلجھن ہو رہی تھی۔ اس نے مناسب سمجھا کہ راستے میں رُک کر کہیں سے گرما گرم چائے پی لے تاکہ طبیعت تھوڑی فریش ہو جائے۔ عام حالات میں وہ جب بھی لمبے سفر پر نکلتا تھا، راستے کی ضروریات کے مطابق سامان رکھوا لیتا تھا، لیکن آج کچھ عجلت کے باعث اور کچھ اپنی ذہنی کیفیت کے سبب ایسی کوئی تیاری نہیں کی تھی اور گاڑی میں سوائے سادہ پانی کی بوتل کے خورد و نوش کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔



ذہن میں رکنے کا خیال آیا تو اس نے آنے والے پہلے ہوٹل پر ہی گاڑی روک لی۔ اس ہوٹل پر اُترنے کے بعد اسے یاد آیا کہ یہ وہی مقام ہے جہاں سے اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ ماریہ سے شادی کا فیصلہ اس ہوٹل کے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں قیام کا مرہونِ منت تھا۔ یہاں اس نے اپنی ذات کا فخر و غرور لٹا دیا تھا اور پھر تاوان میں عمر بھر کے لیے ماریہ کا ساتھ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آج بھی اپنی زندگی کے ان تاریک لمحوں پر حیران ہوتا تھا جب ماریہ کے وجود نے اس سے اس کی ساری سدھ بدھ چھین لی تھی۔ مانا کہ وہ حسین اور پُرکشش تھی لیکن اس کی زندگی میں خوب صورت لڑکیوں کی کون سی کمی رہی تھی جو وہ ماریہ کے ساتھ تنہائی ملتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ قدموں کی وہ لغزش آج اس کے جی کا جنجال بنی ہوئی تھی اور وہ ماریہ کو گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی کی طرح نہ تو نگل سکتا تھا اور نہ اُگل سکتا تھا۔

''یہ لو صاحب! اسپیشل دودھ پتی ہے۔'' اس کی فرمائش پر نہایت پھرتی سے اس کی ٹیبل تک چینک اور پیالی پہنچانے والے ہوٹل کے چھوٹے نے مخصوص لب و لہجے میں اس کے قریب آ کر کہا تو وہ سامنے دھری چائے کی طرف متوجہ ہو گیا چھوٹا آرڈر پورا کر کے فوراً ہی وہاں سے ہوا ہو گیا تھا۔ یہ ایک خاصا مصروف ہوٹل تھا جہاں پرائیویٹ کاروں سے لے کر عام بسوں میں سفر کرنے والے مسافروں تک سب ہی رُکتے تھے۔ اسی وجہ سے ہوٹل کے مختصر سے عملے کو خاصا فعال رہنا پڑتا تھا۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا یونہی اپنے اردگرد پھیلی افراتفری کا جائزہ لینے لگا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ زیادہ تر لوگ چائے پینے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔ اس اکا دُکا ہی افراد ایسے تھے جن کے آگے کھانے کی پلیٹیں نظر آ رہی تھیں۔ کھانے کا اصل وقت ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوتا۔ پھر یقیناً ترتیب اُلٹ جاتی اور وہاں چائے نوشوں کے بجائے کھانا تناول کرنے والوں کا شور ہو جاتا۔

اپنی فراغت اور تنہائی کے باعث آزادی سے اردگرد کی ٹیبلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود ایک چہرے کو دیکھ کر وہ ذرا چونک گیا۔ وہ چہرہ اسے کچھ شناسا لگا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس سے نظر ملتے ہی وہ شخص کچھ بوکھلا سا گیا اور فوراً ہی چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا کر منہ پھیر لیا۔

اس شخص کے اس ردِعمل نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ جب اس شخص کی طرف متوجہ ہوا تھا تو وہ پہلے اسے دیکھ رہا تھا لیکن نظر ملنے پر نہ صرف فوراً ہی انجان بن گیا بلکہ کچھ اس طرح سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اس کی سرے سے شہریار کی طرف توجہ ہی نہ ہو۔ اُس کے اس ردِعمل پر بے چینی محسوس کرنے کے باوجود وہ انجان بن گیا اور چائے ختم کر کے اس کا بل ادا کرنے تک دانستہ خود کو انجان ہی ظاہر کرتا رہا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جب وہ بل کی ادائیگی کے بعد وہاں سے اٹھا تو اس شخص نے بھی بہ عجلت اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس سے بھی زیادہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہریار باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص بھی پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس شخص کا انداز ایسا تھا کہ شہریار چونک گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے باوجود تذبذب کے باعث انجن اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ پچھلی گاڑی میں موجود شخص نے البتہ اس کا انتظار نہیں کیا اور اپنی گاڑی آگے نکال لے گیا۔ اس کی اس حرکت سے شہریار کے دل میں جو موہوم سا اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ شاید وہ شخص اس کا تعاقب کر رہا ہو، وہ دور ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی اُلجھن ہنوز اپنی جگہ موجود تھی۔

اس نے گاڑی ہوٹل سے آگے بڑھا لی تھی، اس کے باوجود اس شخص کا خیال اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اس شخص کی صورت اسے شناسا کیوں محسوس ہو رہی تھی؟ آخر

آدھے گھنٹے کی مغز ماری کے بعد اس کے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ اس شخص کو وہ اس سے قبل بھی مذکورہ ہوٹل میں ہی دیکھ چکا تھا۔ شاید وہ وہاں ویٹر تھا اور جس روز وہ ماریہ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہاں رکا تھا، یہی شخص ماریہ کی مطلوبہ دوائیں لینے کسی قریبی قصبے وغیرہ تک گیا تھا لیکن آج تو اس کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ کہیں سے بھی اس معمولی ہوٹل کا ملازم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت لباس تھا اور وہ جس گاڑی میں گیا تھا، وہ بھی لاکھوں کی مالیت کی تھی۔ جانے قلیل عرصے میں اُس کی ایسی کیا کایا پلٹ ہوئی تھی کہ وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ مزید سوچتا رہا لیکن پھر یہ خیال آنے پر کہ خوامخواہ اپنی توانائیاں ایک غیر متعلق شخص کے متعلق سوچنے میں برباد کر رہا ہے، آنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ لیکن دماغ کو چین ہی کہاں تھا! کبھی ماریہ کی تصویر پردۂ خیال پر اُبھرتی تو کبھی ماہ بانو کی متوقع شادی کا خیال آجاتا اور دل ہی دل میں وہ اسلم پر رشک کرنے لگتا جسے اتنا انمول اور معصوم حُسن ملنے والا تھا۔ جانے وہ دُلہن بن کر کیسی لگتی۔ بری لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس یہ سوچنا تھا کہ اُس کے حُسن کے سامنے چاند شرما کر بادلوں میں چھپ جاتا ہے یا سورج کو اپنی ضیا کم لگتی ہے۔ اس کے معصوم حُسن کے سامنے تو مس ورلڈ کا نپاٹلا اور کئی ججوں کی آرا سے مستند ٹھہرایا ہوا حُسن بھی بے معنی تھا۔ پھر دُلہن کے روپ کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ عام سی لڑکی بھی جب ارمانوں کے ساتھ سہاگ کا جوڑا پہنتی ہے تو بھلی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جانے ماہ بانو کے لیے کسی نے وہ خصوصی جوڑا خریدا بھی تھا یا نہیں۔

اس نے اسے مینارِ پاکستان بلوایا تھا اور ظاہر ہے اس عوامی جگہ پر تو وہ سولہ سنگھار کیے، دُلہن کے روپ میں جلوہ افروز نہیں ہوسکتی تھی۔ یعنی وہ بغیر سج دھج کے ہی دُلہن بننے جارہی تھی۔ یہ خیال ذہن میں آیا تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔ آخر ہر لڑکی کی طرح اسے بھی تو حق تھا کہ سہاگ کا سرخ رو پہلا جوڑا پہنے۔ لیکن اس کا ایسا کوئی عزیز تھا ہی کب جو اس کے لیے یہ اہتمام کرتا۔ وقت کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کا ہر رشتہ تو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کے پیاروں میں سے کسی کو موت نے نگل لیا تھا اور کچھ ویسے ہی اس سے جدا ہو گئے تھے۔ شاید اپنی اسی شدید تنہائی کی وجہ سے اس نے اپنی شادی کے اہم موقع پر اسے مدعو کیا تھا۔ یقیناً اپنا واحد عزیز مان کر..... تو پھر اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ اس کا مان رکھتے ہوئے بے نام رشتے کا حق ادا کرتا۔

وہ لاہور کی حدود میں داخل ہوا تو اس کی گاڑی کا رخ خود بخود ہی ایک بڑے شاپنگ سینٹر کی طرف ہوگیا۔ اس شاپنگ سینٹر میں ایسے کئی بوتیکس تھے جہاں وہ بھاری رقم کے عوض فوری طور پر تیار شدہ برائیڈل ڈریس خرید سکتا تھا۔ گاڑی شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں کھڑی کر کے اس نے رِسٹ واچ میں وقت دیکھا، وہ کافی رفتاری سے آیا تھا اس لیے وقت کی خاصی بچت ہوگئی تھی اور ماہ بانو سے مینارِ پاکستان پر ملنے وہ دن کی روشنی میں آرام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بات کا اطمینان ہوگیا تو اس نے قدم ایک مشہور بوتیک کی طرف بڑھا دیئے۔ ماضی میں اسے اس قسم کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا یہاں تک کہ اس کی اپنی شادی کے موقع پر بھی ساری خریداری آفرین رانا نے ہی کی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ماہ بانو کے لیے ایک عمدہ عروسی جوڑے کا انتخاب کرنے میں کامیاب رہے گا۔

وہ بوتیک میں داخل ہوا تو سیلز گرل نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خریداری کی نوعیت جان کر مہذب لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں آپ کو کیٹلاگ دکھا دیتی ہوں۔ کیٹلاگ کی مدد سے آپ اپنی پسند کے ڈریس کا آرڈر دے سکتے ہیں اور اس میں اپنی پسند کے مطابق ردوبدل بھی کروا سکتے ہیں۔ ہمارا ایک طے شدہ وقت پر آپ کا آرڈر تیار کردے گا۔''



''نہیں، میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ میں ابھی ابھی بالکل تیار شدہ ڈریس خریدنا چاہتا ہوں۔''

ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہونا چاہیے تھا جسے سن کر سیلز گرل نے ذرا سا تامل کیا اور پھر اپنی ایک ہیلپر کی مدد سے اسے تیار شدہ عروسی جوڑے دکھانے لگی۔ وہ سارے ہی جوڑے یقینی طور پر خوبصورت اور بیش قیمت تھے لیکن اسے کوئی ایک بھی ماہ بانو کے لیے نہیں جچ رہا تھا۔ سیلز گرل خنداں پیشانی سے اس کی ریجیکشن برداشت کر رہی تھی۔ اس کی ہیلپر بھی تن دہی سے ڈبے نکال نکال کر لا رہی تھی۔

اتفاق سے اسی وقت سیلز گرل کے موبائل پر کوئی کال آنے لگی اور وہ اسے ایکسکیوز کرتی ہوئی ایک سائیڈ پر ہو کر کال سننے لگی۔ اس دوران ہیلپر لڑکی نے اسے انتظار کی زحمت سے دوچار نہیں کیا اور خود ملبوسات نکال کر دکھانے لگی۔ اس کے دکھائے ہوئے ایک سرخ عروسی جوڑے نے شہریار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ قندھاری انار جیسے سرخ رنگت والے اس جوڑے کا کپڑا بے حد نفیس تھا جسے رنگ برنگے پتھروں کے امتزاج سے بوجھل کیا گیا تھا۔ جوڑا سلی ہوئی حالت میں بالکل تیار تھا اور اسے دیکھ کر شہریار کو یوں لگا تھا جیسے یہ ماہ بانو کے لیے ہی تیار کیا گیا ہو۔

''مجھے یہ ڈریس خریدنا ہے۔'' اس نے فوراً ہی لڑکی کو اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

''اوہ ایمن! تم نے یہ سوٹ کیوں دکھایا؟ اسے تو مسز تنویر نے اپنی بیٹی کے لیے آرڈر پر تیار کروایا ہے۔'' اسی اثنا میں کال سننے کے لیے ایک سائیڈ پر ہو جانے والی سیلز گرل نے واپس آکر اپنی ہیلپر کو ٹوکا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''سوری سر! میری اسسٹنٹ نے غلطی سے آپ کو کسی اور کا آرڈر کیا ہوا ڈریس دکھا دیا ہے۔ آپ اس کے علاوہ کوئی اور ڈریس دیکھ لیں۔ ہمارے بوتیک پر اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور قیمتی برائیڈل ڈریسز موجود ہیں۔ یقیناً آپ کو ان میں سے کوئی ضرور پسند آئے گا۔''

''سوری مس! مجھے یہی چاہیے۔ آپ اپنی اونر سے معلوم کرلیں، ہوسکتا ہے وہ اس سلسلے میں کچھ کرسکیں۔ بہرحال یہ سوٹ ابھی اور ہر قیمت پر چاہیے۔'' اس نے اپنا مافی الضمیر پوری وضاحت سے بیان کر دیا جسے سن کر سیلز گرل کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل سے گئے اور وہ نہایت خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''آپ ضد کر رہے ہیں تو میں میڈم سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ آپ پلیز کچھ دیر یہاں بیٹھ کر ویٹ کرلیں۔'' وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی اور اپنی اسسٹنٹ سے بولی۔ ''ایمن! ان صاحب کو ان کی پسند کے مطابق چائے، کافی یا جو بھی یہ لینا چاہیں سرو کرو۔ میں ابھی میڈم سے ڈسکس کر کے آتی ہوں۔''

اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایمن نامی لڑکی شہریار کی خدمت پر کمربستہ نظر آنے لگی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے صاف لفظوں میں انکار کر کے یونہی بیٹھا رہا اور بے مقصد اِدھر اُدھر نظریں گھمانے لگا۔ بوتیک کی بناوٹ خوب صورت تھی اور تعمیر میں شیشوں اور آئینوں کا بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ شیشوں والی دیواروں کی وجہ سے باہر سے ہی اندر موجود ملبوسات نظر آنے لگتے تھے اور گاہک خود بخود ہی اندر کھنچے چلے آنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جبکہ آئینوں کا استعمال یقیناً اس لیے کیا گیا تھا کہ خواتین ملبوسات کو اپنے ساتھ لگا کر اندازہ کرسکیں کہ کون سا رنگ اور جوڑا ان پر سج رہا ہے۔ مقصد بہرحال جو بھی رہا ہو، وہ تو اس وقت ایک آئینے میں اس چہرے کی جھلک دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جسے دورانِ سفر بھی ہوٹل پر دیکھ چکا تھا لیکن پھر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس چہرے کا آج ہی کے دن میں اتنی جلدی دوبارہ نظر آنا محض اتفاق نہیں ہوسکتا تھا۔

'کیا یہ شخص میرا تعاقب کر رہا ہے؟.....لیکن کیوں؟' اُس کے ذہن میں سوالات اُبھرے۔ وہ تو ہوٹل سے اس کے گاڑی آگے نکال لے جانے پر اس کی طرف سے قطعی بے پروا ہو گیا تھا لیکن اب حالات بتا رہے تھے کہ یہ بے پروائی مناسب نہیں تھی۔ اب بھی وہ بے شک آئینے میں اس کے چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا لیکن یہ ضروری تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہے۔

''مبارک ہو سر! میں نے میڈم کو آپ کے حق میں راضی کر لیا ہے۔ ہم مسز تنویر کو ان کا آرڈر دوبارہ تیار کر کے دے دیں گے لیکن ظاہر ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہمیں کافی مشکلات اور اخراجات کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے لیے آپ کو زحمت اٹھانی پڑے گی۔'' بوتیک کی مالکن سے مذاکرات کے لیے جانے والی سیلز گرل نے اسے خوشخبری سنانے کے ساتھ ساتھ کاروباری سی تمہید بھی باندھنا شروع کر دی۔

وہ اس تمہید کا مقصد سمجھ سکتا تھا چنانچہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ مجھے پرائس بتا دیں۔''

جواباً سیلز گرل نے اسے ایک ہوشربا رقم بتائی جو یقیناً عام حالات میں اس جوڑے کی قیمت سے دُگنی تگنی ہی تھی لیکن وہ کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خاموشی سے کریڈٹ کارڈ کی مدد سے پے منٹ کر دی اور پیک شدہ عروسی جوڑے کا ڈبہ لیے بوتیک سے باہر نکل گیا۔

اب اسے پروگرام کے مطابق مینارِ پاکستان کی طرف جانا تھا لیکن اس طرف کا رخ کرنے سے پہلے اسے اپنے تعاقب کار کو بھی دیکھنا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو موبائل پر اپنی لاہور آمد کے بارے میں باخبر کر دیا تاکہ وہ کسی اندیشے کا شکار نہ ہو لیکن فوری طور پر مینارِ پاکستان تک پہنچنے سے منع کر دیا اور اسے ہدایت دے دی کہ وہاں آنے کے لیے وہ اس کے فون کا انتظار کرے۔

اس طرف سے فارغ ہو کر وہ پوری طرح اپنے تعاقب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بہت جلد اس کی نظروں نے اس کلٹس کو تلاش کر لیا جو کافی فاصلے سے اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ تعاقب کرنے والا بہت ہوشیاری سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اگر اس نے بوتیک کے آئینے میں اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ لی ہوتی تو کبھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس شخص سے پیچھا چھڑانے کے بجائے اچھی طرح نمٹنا ہے تاکہ کھل کر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ اپنے پاس پسٹل کی موجودگی کی یقین دہانی کرنے کے بعد اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ گاڑی معروف شاہراہوں کے بجائے ایسے راستے پر ڈال دی جہاں کم سے کم ٹریفک تھا اور پھر بالکل ہی سنسان راستے کی طرف نکل پڑا۔ کلٹس اس کے پیچھے تھی اور فاصلہ کافی زیادہ ہونے باوجود وہ درمیان میں دوسری گاڑیاں نہ ہونے کے سبب اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔

اس موقع پر اس نے ایک خطرناک قدم اٹھایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس سڑک سے گزر رہا ہے، آگے جا کر اس پر دائیں جانب ایک راستہ نکلے گا۔ اس نے یکدم ہی اپنی گاڑی کی رفتار بہت تیز کر دی اور جیسے ہی دائیں جانب جانے والا وہ راستہ نظر آیا، سیدھی چلتی گاڑی کو اس پر موڑ لیا اور پھر گاڑی بیک کر کے پہلے والے راستے پر واپس آیا۔ لیکن اب اس کی گاڑی آگے کے بجائے واپس پیچھے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ یعنی اب اس کی گاڑی اور کلٹس کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔

کلٹس کو ڈرائیو کرنے والا یقیناً صورتِ حال میں آنے والی اس اچانک تبدیلی پر کچھ گڑبڑا گیا تھا اور خود کو انجان ظاہر کر کے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا اس لیے ہارن پر ہارن دے کر شہریار کو راستہ دینے کا اشارہ کرنے لگا لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سڑک کی چوڑائی کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی تھا اور



گاڑی کے بالکل درمیان میں ہونے کی وجہ سے کلٹس والے کے پاس یہ گنجائش نہیں تھی کہ وہ دائیں یا بائیں سے نکل سکے۔ دونوں گاڑیوں کا تصادم ہونے سے قبل اس نے بریک لگا کر جھٹکے سے اپنی گاڑی روک لی۔ کلٹس ڈرائیور نے بھی عین اسی وقت یہی قدم اٹھایا۔ یقینی طور پر وہ ڈر گیا تھا کہ کہیں یہ پاگل آدمی اپنی گاڑی کو میری گاڑی سے نہ ٹکرا دے۔

''یہ کیا جہالت ہے؟.....کیا تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مارنا چاہتے ہو؟ تم جیسے پاگل آدمی کو گاڑی چلانے کی اجازت کس نے دی ہے؟'' دونوں گاڑیاں چند فٹ کی دوری سے ایک دوسرے کے سامنے رُکیں تو کلٹس والا دہاڑتا ہوا باہر آیا۔ وہ اپنے رویے سے بالکل ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ اس سے قطعی انجان ہو اور سڑک پر ایک انجان آدمی کی فاش غلطی پر اسے غصے سے ٹوک رہا ہو۔ اس کے ہر ردِعمل سے بے نیاز شہریار پُرسکون انداز میں اپنی گاڑی سے باہر آیا اور اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ اس کی دائیں جانب کی اُبھری ہوئی جیب میں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

''میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ اپنی گاڑی ایک طرف کرو تاکہ میں اپنی گاڑی آگے نکال سکوں۔'' اس کے پُرسکون انداز نے اس شخص کو تھوڑا سا گڑبڑا دیا تھا لیکن وہ اپنی کیفیت کو طیش دکھا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو مسٹر! میں نے تو تمہارے ساتھ تعاون کے لیے گاڑی روکی ہے۔ مجھے تم پر رحم آ رہا تھا کہ خوامخواہ پچھلے کئی گھنٹوں سے میرے پیچھے گھومنے میں اپنا پٹرول پھونک رہے ہو۔ ایسا کرو کہ تم میری گاڑی میں ہی آ کر بیٹھ جاؤ۔ اس طرح تم زیادہ زحمت سے بچ جاؤ گے۔'' اس کا لہجہ بے شک پُرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا لیکن انداز میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ شخص بوکھلا کر رہ گیا۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تمہارے پیچھے گھوموں؟'' وہ بظاہر اپنی مدافعت کر رہا تھا لیکن اس کا جسم اس طرح سے تن گیا تھا کہ لگتا تھا وہ ضرورت پڑنے پر کچھ بھی کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''میرے پاس اس غلط فہمی کی بڑی ٹھوس وجہ ہے۔ میں اتنے زیادہ اتفاقات کا قائل نہیں ہوں کہ یہ مان سکوں کہ تم اتفاق سے اس ہوٹل میں میرے ساتھ تھے، اتفاق سے میرے ساتھ ساتھ لاہور پہنچ گئے، اتفاق سے اس شاپنگ سینٹر میں بھی پائے گئے جہاں میں موجود تھا اور اب اتفاق سے ہی اس سڑک پر بھی میرے ساتھ موجود ہو۔ صاف صاف بتاؤ کہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'' آرام سے بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ بالکل سرد ہو گیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتے ہوئے وہ اپنے مؤقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

''میں اپنی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ اگر میری تسلی ہو گئی تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' وہ اس وقت بالکل مختلف موڈ میں تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اس شخص نے ہیجان زدہ ہو کر جیب سے ریوالور نکال لیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ مار دو گولی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ اب وہ بے چارہ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ یقیناً ان کی ڈیوٹی صرف تعاقب اور نگرانی تک تھی اور وہ کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن یہاں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو دفعتاً اپنے ریوالور کا رخ اوپر کی طرف کیا اور چند ہوائی فائر کر دیے۔ شہریار گویا موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پھرتی سے اس شخص پر جست لگائی اور ایک زوردار گھونسا اس

کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ وہ شخص لڑکھڑایا اور اس سے قبل کہ سنبھلتا، شہریار نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود بھی مقابلے پر ڈٹ جاتا۔ چنانچہ پلٹ کر شہریار پر حملہ آور ہوا۔ وہ یقیناً اس کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا لیکن وہ عین وقت پر جھکائی دے گیا اور دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مقابل دُبلا پتلا اور درمیانی قامت کا تھا۔ پھر شہریار باقاعدہ ورزش کا عادی، مارشل آرٹس کا تربیت یافتہ تھا، چنانچہ بازو گرفت میں آئے تو پھر اسے بخشا نہیں اور دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اپنے سر سے گزارتے ہوئے عقب میں پٹخ دیا۔ عقب میں پھینکے گئے دشمن کا انجام دیکھنے کے لیے وہ فوراً ہی اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف رخ کیا۔ اتنی بے دردی سے پھینکے جانے پر اس کا خاصا برا حشر ہوا تھا۔ پکی سڑک سے ٹکرا کر سر پھٹ گیا تھا اور ہاتھ پیروں میں بھی خراشیں آئی تھیں۔

''بہتر ہے کہ اب تم شرافت سے میری گاڑی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہو جاؤ ورنہ ابھی صرف ڈینٹ پینٹ ہی پڑے ہیں، مزید گڑبڑ کرنے کی صورت میں تمہیں کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔'' اس نے مار دھاڑ کے سلسلے کو طول دینے کے بجائے جیب سے پسٹل نکالا اور اسے سرد مہری کے ساتھ حکم دیا۔

''میں بے قصور ہوں۔ تم خوامخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' وہ سڑک پر اٹھ بیٹھا تھا اور سر سے بہتے خون کو آنکھوں میں جانے سے روکنے کے لیے بازو کو ماتھے پر پھیلا لیا۔ اپنی ہیئت کذائی کے بعد بھی وہ اس بات پر مُصر تھا کہ شہریار اسے ایک غیر متعلق شخص مان کر چھوڑ دے لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔ چنانچہ بے پروائی کے انداز میں بولا۔

''چلو خوامخواہ ہی سہی، لیکن اب جبکہ میں تمہارے پیچھے پڑ ہی گیا ہوں تو اپنی تسلی کیے بغیر ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ چلو اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ مت سوچنا کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے آ جائے گا۔ میں لاہور کی پیداوار ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس راستے پر مشکل ہی سے کوئی گاڑی آتی ہے۔ اور آئی بھی تو یقین کرو کہ آنے والا صورتِ حال دیکھ کر دُور ہی سے پلٹ جائے گا۔ کوئی نہیں بھی پلٹا تو تم یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے میں تمہارے مقابلے میں بہت مضبوط پوزیشن میں ہوں۔ اور ہاں، تمہاری طرح میں ہتھیار کا استعمال کرنے میں بھی کسی تردّد کا شکار نہیں ہوں گا۔ میرے پسٹل سے اگر فائر ہوا تو وہ لازماً تمہارے جسم کے کسی حصے میں چھید کرے گا، آگے تمہاری مرضی ہے کہ کیا کرتے ہو؟''

وہ واضح طور پر اسے دھمکا رہا تھا اور مقابل کو بھی اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہو چکا تھا چنانچہ چپ چاپ پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی شہریار نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے۔ اس سے مار دھاڑ میں لباس کی حالت پہلے ہی تھوڑی سی خراب ہو گئی تھی، اب رسّی کی عدم موجودگی کے باعث ٹائی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

''آگے بڑھو۔'' اس نے حکم دیا تو وہ ناچار آگے بڑھا۔

''پائدان میں جھک کر بیٹھ جاؤ۔'' گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اس نے ایک اور نادر شاہی حکم جاری کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کے زخمی تھوبڑے کی وجہ سے راستے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اس لیے اس کا پائدان میں ہی فٹ ہونا مناسب تھا۔ اس شخص نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس



کی طرف سے مطمئن ہو کر شہریار نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آگے کلٹس کی موجودگی کے باعث وہ سیدھا گاڑی نکال کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ چنانچہ ریورس گیئر میں ڈال کر دائیں جانب کے موڑ تک گیا اور پھر وہاں سے گاڑی کو سیدھی سڑک پر ڈال دیا۔ اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس شخص کو کہاں لے جائے؟ لاہور میں اس کا واحد ٹھکانہ، رانا ہاؤس تھا جہاں کا وہ ظاہر ہے رخ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے میں اُس کا دھیان ذیشان کی طرف گیا اس نے فوراً اسے کال ملا دی۔

''میں ایک مشتبہ شخص کو پوچھ گچھ کے لیے کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ کیا میں تمہارے گھر کا رخ کر سکتا ہوں؟'' بنا کسی رسمی گفتگو کے اس نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا تم لاہور میں ہو؟'' ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں کچھ دیر قبل ہی ایک نجی کام سے یہاں پہنچا ہوں لیکن یہاں پہنچتے ہی ایک مصیبت گلے پڑ گئی۔ میرے خیال میں اس شخص سے کافی کارآمد معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن میں ایسے کسی ٹھکانے سے محروم ہوں جہاں اسے رکھ سکوں۔ اس لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مختصراً اپنا مقصد بیان کیا۔

''چلے آؤ۔ پچھلی طرف کے گیراج کا دروازہ تمہیں اپنے لیے کھلا ملے گا۔'' ذیشان نے حسبِ توقع امید افزا جواب دیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موبائل آف کر دیا اور پوری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کر لی۔

راستوں کو دھیان میں رکھ کر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کے ذہن میں ماہ بانو کا بھی خیال تھا۔ وہ یقیناً اس کی منتظر ہو گی اور تیزی سے گزرتا وقت اسے تشویش میں مبتلا کر رہا ہو گا۔ لیکن وہ جس جنجال میں پھنس گیا تھا، اس سے جان بھی تو نہیں چھڑا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ فوری طور پر اس شخص سے پوچھ گچھ میں اُلجھنے کے بجائے اسے ذیشان کے حوالے کرے اور پھر خود ماہ بانو سے رابطہ کرے۔

اسی نوعیت کی سوچوں میں اُلجھا وہ ذیشان کے دفتر کا راستہ طے کرتا رہا۔ اس دوران پائدان میں پھنسا شخص اگر ذرا بھی ہلتا جلتا تو وہ اپنے پسٹل کی نال اس کی پیٹھ میں چبھو کر اسے احساس دلا دیتا کہ وہ اس سے غافل نہیں ہے اس لیے وہ کسی حماقت کی کوشش نہ کرے۔ آخر کار راستہ تمام ہو گیا اور ذیشان نے خود گیراج میں اس کا استقبال کیا۔

''کسے اٹھا لائے؟'' اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خوش دلی سے دریافت کیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھ موجود ماتحت کو اس کی گاڑی میں موجود شخص کو اتارنے کا اشارہ بھی کیا۔

''حدود اربع تو فی الحال مجھے بھی موصوف کا معلوم نہیں۔ بس اس لیے اٹھا لایا ہوں کہ جناب منکر نکیر کی طرح میرے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔'' اس نے بھی جواباً خوش گوار لہجہ اختیار کیا۔ حالانکہ وہ اندرونی طور پر اچھا خاصا ڈسٹرب تھا اور ماہ بانو کے نکاح کی ٹینشن اس کے سر پر سوار تھی۔

''حدود اربع ہم ابھی تمہارے سامنے اُگلوا لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تاریخ و جغرافیے کے بڑے بڑے حلق موجود ہیں جن کے سامنے بندے کے لیے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہتا۔'' ذیشان نے ذومعنی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ کام تم اپنی نگرانی میں کروا لو۔ میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہاں پہنچنے میں پہلے ہی کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔'' اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے رُکنے سے معذوری ظاہر کی۔

''ہاں، تم نے بتایا تو تھا کہ کسی ذاتی کام سے لاہور آئے ہو۔ خیریت..... فیملی میں سب ٹھیک ٹھاک تو

ہیں؟'' وہ اس کے فیملی ممبرز سے زبانی ہی سہی، خاصا واقف ہوگیا تھا اس لیے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''الحمدللہ، سب ٹھیک ہیں۔ میں تو یہاں ایک شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شادی میں آئے ہو تو پھر جلدی کس بات کی؟ اس وقت تو شادی ہالز میں میزبان خود بھی نہیں پہنچتے۔'' ذیشان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جلدی اس لیے ہے کہ یہ شادی کسی ہال وغیرہ میں نہیں بلکہ کورٹ میں انجام پانی تھی اور میں شاید واحد مہمان ہوں جسے مدعو کیا گیا ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تو کورٹ بند ہو چکا ہوگا اس لیے مجھے اپنی تاخیر کے ازالے میں خود کوئی متبادل انتظام کرنا ہوگا۔''

''اوہ! یہ تو بڑی عجیب شادی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دلہن یا دولہا میں سے کوئی ایک یقیناً بہت خوش قسمت ہے جس کے بلاوے پر تم نے اتنی دور سے دوڑ لگائی ہے۔'' وہ لوگ ابھی تک گیراج میں ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے البتہ اس کا لایا ہوا آدمی اندر کہیں منتقل کیا جا چکا تھا۔

''تمہیں وہ لڑکی ماہ بانو تو یاد ہوگی جسے بلتستان کی پہاڑیوں میں قائم دشمنوں کے ایک خفیہ کیمپ میں قید کیا گیا تھا اور وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونے کے بعد تمہارے پاس پہنچ گئی تھی؟'' اس نے سوچا کہ اس معاملے میں ذیشان کو شریکِ راز کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اوہ یس، مجھے اچھی طرح وہ لڑکی اور تمہارا ڈرائیور مشابرم خان یاد ہیں۔ تم نے ان دونوں کو انٹیلی جنس کی تحویل سے چھڑانے کے لیے سخت جدوجہد کی تھی۔'' ذیشان کو فوراً ہی یاد آ گیا۔

''بالکل، میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔ دراصل وہ ایک تنہا اور پریشان حال لڑکی ہے جس کا اپنوں سے رابطہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے لیے کسی شخص کا انتخاب کرلیا ہے اور چونکہ یہ اس کی خواہش اور میرا وعدہ تھا کہ میں اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں گا، سو میں تمہیں یہاں نظر آ رہا ہوں۔ لیکن جس نا ہنجار کو میں اپنے ساتھ لایا ہوں، اس نے میرا سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اب مجھے اکلوتے مہمان کے علاوہ منتظم کی ذمے داریاں بھی سنبھالنی ہوں گی اور نکاح خواں وغیرہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔'' اس نے ذیشان کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''اگر یہ مسئلہ ہے تو میں اسے حل کر دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ اندر چلو اور چائے شائے پیو۔ نکاح خواں اور گواہان کا بندوبست میرے ذمے۔ لیکن دولہا اور دلہن بہرحال تمہیں ہی فراہم کرنے ہوں گے۔'' ذیشان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی طرف لے جانے لگا۔

''کیا یہ کام اس جگہ ہوگا؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''کیا حرج ہے؟ سی ایف پی والے بھی آخر کار انسان ہیں۔ انہیں بھی حق ہے کہ ایسی خوشی کی تقریبات میں شرکت کرسکیں۔ اپنے کرنل توحید بھی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کوئی دنیا سے ماورا لوگ نہیں ہیں۔ جو کام تم اور دوسرے لوگ کر سکتے ہیں، ہم بھی کر سکتے ہیں۔'' وہ اسے اپنے کمرے تک لا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر سب تمہارے ہاتھ میں دیا۔ دولہا، دلہن کو میں ہدایت دے دیتا ہوں۔ تمہیں اپنا کوئی آدمی گاڑی سمیت مینارِ پاکستان پر بھیج کر انہیں یہاں بلوانا ہوگا۔ پہچان کے لیے کوئی شناختی علامت اور مالک



درست مقام کا تعین کر کے میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں تاکہ تمہارے آدمی کو بھٹکنا نہ پڑے۔ تم بھی مجھے بھیجے جانے والے آدمی اور گاڑی کا مختصر تعارف کروا دو تاکہ میں دوسری پارٹی کو آگاہ کرسکوں۔''

اتنی آسانی سے اور انوکھے انداز میں اپنے مسئلے کو حل ہوتا دیکھ کر وہ پُرجوش ہوگیا۔ پھر گویا بہت سے کام خود بخود ہی ہوتے چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اور ذیشان اپنے اپنے موبائلز پر خاصے مصروف رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد جب ماہ بانو اور اسلم کو وہاں پہنچایا گیا تو پھولوں اور مٹھائیوں کے ساتھ کئی دوسری اشیائے خورد و نوش بھی آ چکی تھیں جنہیں وہ اہلکار ٹیبل پر سجا رہے تھے۔

وہ دونوں ان کے کہنے پر یہاں آ تو گئے تھے لیکن کچھ حیران پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ البتہ ماہ بانو نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قسم کے سوال جواب نہیں کیے کہ وہ اس پر جس طرح کا اعتماد کرتی تھی، اس میں ایسی کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی اس نے اپنی اُلجھن کا اظہار کرنے کے بجائے اس کا اور اسلم کا باہمی تعارف کروانا شروع کر دیا۔ میجر ذیشان اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اسے بھی فاخت کر لیتی اور وہ بھی اس رسمِ تعارف میں شامل ہو جاتا۔ بہرحال، اس وقت اس نے ان دونوں کو باہم تعارف کروایا۔

''ماہ بانو سے آپ کا کافی ذکر سنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سے اس اہم موقع پر ملاقات بھی ہوگئی۔'' اسلم نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ اس کی آواز سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ یہ آواز اپنی انفرادیت کے ساتھ اس کے لیے شناسا تھی۔

''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔ اس سے قبل بھی ہم دو بار مل چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں مواقع پر آپ نے اپنا تعارف کروانا پسند نہیں کیا تھا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ در آئی کیونکہ اسلم کی آواز سنتے ہی اسے وہ دونوں ناخوشگوار واقعات یاد آ گئے تھے۔ اسے تقریباً سو فیصد یقین تھا کہ ایک بار جب اسے اغوا کر کے جنگل میں رکھا گیا تھا اور دوسری بار جب اس کے لاہور کوٹ والے بنگلے پر ڈاکا پڑا تھا، یہی شخص تھا جو حملہ آوروں کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھا۔

''آپ کی یادداشت یقیناً اچھی ہے لیکن میں اپنی زندگی کے وہ ابواب اپنی کتابِ زندگی سے پھاڑ کر پھینک چکا ہوں اور اب میرا آپ سے واحد تعارف یہی ہے کہ آپ ماہ بانو کے ہمدرد ہیں۔ اور چونکہ ماہ بانو مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے اس لیے میرے لیے آپ بھی واجب الاحترام ہیں۔ ماضی میں آپ کو مجھ سے جو بھی تکلیف پہنچی اس کے لیے میں آپ سے صرف معذرت ہی طلب کر سکتا ہوں۔'' اسلم نے اس کے اندازے کی تردید نہیں کی بلکہ بہت شائستگی سے سب کچھ قبول کرتے ہوئے معافی بھی مانگ لی۔ البتہ ماہ بانو ذرا سی ہونق ہوگئی تھی کہ یہ کیا چکر ہے۔ اسے اسلم کے شہریار کے بنگلے پر ڈاکا مارنے کا تو علم تھا لیکن دوسرے واقعے سے ناواقف تھی اس لیے حیران ہو رہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شہریار وارداتوں کے وقت نقاب میں رہنے والے اسلم کو صرف آواز کی وجہ سے پہچان چکا تھا۔

''تم احمقوں کی طرح یہاں کیا کھڑی ہو؟ اتنی سادہ اور سج دھج سے عاری دلہن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ قاضی صاحب بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم ساتھ والے کمرے میں جا کر جلدی سے لباس تبدیل کرلو۔ میں اندازے سے تمہارے لیے ویڈنگ ڈریس لایا ہوں۔ امید ہے کہ تمہیں صحیح آ جائے گا۔'' شہریار نے اسے کمرے کا تو وہ اسی طرح حیران و پریشان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

''ماہ بانو آپ کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ آپ نے اس کی فرمائش پر ہماری شادی میں

شرات پر ہامی بھر لی ورنہ وہ بہت اُداس ہوتی۔'' ماہ بانو کے جانے کے بعد اسلم نے اس سے کہا۔ اب وہ دونوں کمرے میں موجود نشستیں سنبھال چکے تھے اور واقعی ہر پرانی بات بھول کر نئے حوالے سے ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔

''میرے لیے بھی وہ بہت اہم ہے۔ مجھے اس کا اُداس ہونا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس سے شادی کر رہے ہو تو خیال رکھنا کہ اسے خوش بھی رکھ سکو۔'' اسلم کی بات کے جواب میں ہی سہی اس کی زبان سے اظہار کے چند لفظ پھسل گئے تھے جنہیں وہ خود محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن اسلم نے ان الفاظ کو اپنی پوری معنویت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ البتہ اسی وقت ذیشان، قاضی صاحب کے ساتھ وہاں آ گیا تو ان کی گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا۔ قاضی صاحب، شہریار کے فراہم کردہ شناختی کاغذات کی مدد سے نکاح نامے کا فارم پُر کرنے لگے۔ فارم پُر ہونے تک ماہ بانو بھی وہاں چلی آئی۔ بھاری عروسی جوڑے کا دوپٹہ اس کے سر پر تھا۔ اس سرخ عروسی لباس کے علاوہ اس نے کسی قسم کا زیور یا میک اپ استعمال نہیں کیا تھا پھر بھی اس پر ٹوٹ کر دُلہناپے کا روپ آیا تھا اور وہ اجنبی مردوں کے درمیان ذرا شرمائی لجائی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسلم تو اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا البتہ شہریار نے دھیرے سے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ اب وہ اس روپ کو اپنی نظروں میں سمونے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا البتہ اسے یہ اندازہ تو خوب اچھی طرح تھا کہ وہ اس لباس میں کیسی قیامت ڈھائے گی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جسے بہت دن قبل اس نے بشام ہوٹل کے ایک ویٹر سے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر خرید کر دی تھی تو وہ اس عام سی چادر میں بھی چودھویں کے چاند کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس بیش قیمت و خوب صورت عروسی لباس کی تو بات ہی الگ تھی۔

ماہ بانو کے اندر آتے ہی ذیشان نے اسے احترام سے ایک خالی کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی اور پھر قاضی صاحب نے اس کی اجازت سے نکاح کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نکاح میں شہریار اس کے وکیل کے طور پر شریک تھا جبکہ گواہان کے لیے ذیشان سمیت سی ایف پی کے اہلکار موجود تھے۔

نکاح کی کارروائی شروع ہوئی تو حسبِ قاعدہ سب سے پہلے دُلہن کی اجازت کے حصول کے لیے اسے کاغذات پیش کیے گئے۔ شہریار چونکہ دُلہن کا وکیل تھا، اس لیے نکاح کا فارم اور قلم اس نے ہی ماہ بانو کے سامنے رکھے تھے۔ اس سے یہ دونوں چیزیں وصول کرتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی نظریں جھکا رکھی تھیں۔

''ان کاغذات پر دستخط کر دیں بیٹی! تاکہ نکاح کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے۔'' کاغذات ہاتھ میں لینے کے باوجود ماہ بانو نے ان پر دستخط نہیں کیے تو قاضی صاحب نے اس کے گریز کو فطری شرم و حیا پر محمول کرتے ہوئے شفقت سے ہدایت دی۔

اس موقع پر شہریار اس کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس کی انگلی فارم پر اس جگہ رکھی ہوئی تھی جہاں ماہ بانو نے اپنے دستخط ثبت کرنے تھے۔ قاضی صاحب کی آواز سن کر وہ گویا سکتے کی سی کیفیت سے باہر نکلی اور نظریں اٹھا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی پل قلم اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر نیچے جا گرا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ بس ایک نظر ہی کی تو بات تھی جس نے اس پر کیسے کیسے راز افشا کر دیے تھے۔ اسے آج پہلی بار صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ وہ جس کی چاہت دل میں لیے پھرتی ہے، وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے نہ سہی لیکن عمل سے تو تعلق خصوصی کا ثبوت ایک عرصہ سے دیتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن وہ اُس کی اس توجہ کو، اُس کے خلوص اور ہمدردی پر ہی محمول کرتی رہی تھی۔



اور نہ وہ کون سا موقع تھا جب شہریار نے اس کا خیال نہ رکھا ہو۔

پیر آباد سے پہلی بار چودھری کے چنگل سے بچنے کے لیے فرار ہونے سے لے کر اب تک وہ اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی کہ وہ اس کی ایک فون کال پر اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اتنی دُور اُڑا چلا آیا تھا اور اس وقت اس کا وکیل بنا اس سے نکاح کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ لیکن اس پل اس کی آنکھوں میں جو کرب تھا، اس نے ماہ بانو کو رُلا دیا تھا۔ کرب کی یہ تحریر صاف بتا رہی تھی کہ وہ اسے کسی اور کا بنتے دیکھ کر کتنا آزردہ ہے اور یہ آزردگی ہی تو اس کی چاہت کی گواہ تھی۔ لیکن یہ گواہی سامنے آنے میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ وہ عروسی جوڑا پہنے کسی اور کے نکاح میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

آج اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ شہریار کی ماریہ سے شادی کسی مجبوری کے باعث ہوئی ہو گی لیکن وہ پہلے یہ بات سمجھ ہی نہیں سکی اور جذبات میں اسلم سے شادی کا وعدہ کر بیٹھی۔ اب اس کے لیے اپنا وہ وعدہ نبھانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن کیا کوئی جائے فرار تھی؟ کیا وہ قاضی اور گواہوں کی موجودگی میں نکاح نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر سکتی تھی؟ کیا وہ اسلم کی محبت اور احسانات کو فراموش کر کے اسے ایک بار پھر تنہائیوں کے حوالے کر سکتی تھی؟ ان تنہائیوں کے حوالے جو اسے ایک بار پھر برائی کی دلدل میں گھسیٹ لے جاتیں؟

سوالات کا ایک ریلا سا تھا جو اس کے ذہن سے گزر رہا تھا لیکن انگلیوں میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ذرا سی جنبش کر کے نکاح نامے پر دستخط کر دیتیں۔ ہاتھ سے گر جانے والا قلم اب بھی اس کے قدموں میں پڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے نکاح نامے کے اوراق کو تر کر کے وہاں ایک ایسی داستان رقم کر دی تھی جسے پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان تھی جو حالات کے گرداب میں ڈوبتی اُبھرتی کسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی لیکن زندگی اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ زبان سے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔

''دستخط کر دو ماہ بانو! قاضی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔'' شہریار نے جھک کر اس کے قدموں میں پڑا قلم اٹھا کر نکاح نامے کے فارم پر رکھا اور آہستہ سے کہا۔

اس کا یہ چھوٹا سا جملہ ماہ بانو کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا لیکن انگلیوں میں لرزش اس قدر تھی کہ قلم تھامنے کی تاب ہی نہیں رہی۔ شہریار نے خاموشی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ یکایک اسے اپنا وجود کسی تناور درخت کے سائے میں آیا محسوس ہوا۔ آنسو تھم گئے اور جسم کی لرزش رک گئی۔ اگر یہی محبوب کا حکم تھا تو پھر سرِ تسلیم خم تو کرنا ہی تھا۔

اس نے قلم مضبوطی سے انگلیوں کی گرفت میں لیا اور ایک ایک کر کے ہر بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کرتی چلی گئی۔ اس کے دستخط کرتے ہی قاضی صاحب نے کارروائی آگے بڑھائی۔ مختصر سے خطبۂ نکاح اور دعا کے بعد وہاں مبارک سلامت کا شور اٹھ گیا۔ تمام حاضرین نے اسلم کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔

''تمہیں اللہ نے اپنی بہت بڑی نعمت کا تحفہ دیا ہے۔ اس تحفے کی ہمیشہ قدر کرنا۔'' شہریار نے اسلم سے گلے ملتے ہوئے اسے نصیحت کی۔

''اطمینان رکھیے۔ مجھے خود بھی اپنی خوش نصیبی کا احساس ہے۔'' اس نے مسکرا کر اس کی تسلی کروائی۔

اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرد حضرات دل کھول کر اشیائے خورونوش سے انصاف کرنے لگے۔ ماہ بانو ایک تو دُلہن تھی اور دوسرے وہاں موجود واحد خاتون۔ اس کے لیے کچھ بھی کھانا پینا دشوار ہو رہا تھا۔ سب کے بہت اصرار پر وہ بس ذرا سی گلاب جامن ہی چکھ سکی۔

شہریار نے بھی حسبِ عادت بہت ناپ تول کر بس ذرا سا ہی کھایا۔ وہ اپنے معمول کا اتنا پابند تھا کہ وقت بے وقت کھانا پینا ہمیشہ ہی ناپسند کرتا تھا اور اس وقت تو طبیعت بھی کچھ بوجھل سی تھی۔ اس وقت تو وہ اس محفل میں بس رسمِ دنیا نبھانے کو شامل تھا ورنہ دل تو تنہائی کا خواہاں ہو رہا تھا۔

بیس پچیس منٹ میں وہ لوگ اس سلسلے سے بھی فارغ ہو گئے۔ قاضی صاحب کو ان کی فیس کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ نکاح کی تقریب سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں پہنچنے والے سی ایف پی کے اہلکار بھی اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے۔ دو ملازمین کھانے پینے کے سلسلے میں ہو جانے والے پھیلاوے کو سمیٹنے لگے۔ ایسے میں شہریار ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے تم دونوں کے لیے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اسپیشل رُوم بُک کروا دیا ہے۔ ڈرائیور تم لوگوں کو وہاں پہنچا دے گا۔ روم چوبیس گھنٹے کے لیے تمہارے ناموں سے بُک ہے۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم وہاں کتنا وقت گزارتے ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔'' اس نے بولتے ہوئے اپنی نظریں زیادہ تر اسلم کے چہرے پر ہی مرکوز رکھی تھیں۔ گلے میں موٹا سا پھولوں کا ہار ڈالے وہ خاصا پُرکشش لگ رہا تھا۔ خوشی نے اس کے چہرے کو عجیب سی رونق عطا کر دی تھی۔

''میری طرف سے یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔'' اس بار وہ ماہ بانو کی طرف مڑا اور ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے شہریار صاحب! پہلے ہی آپ نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔'' لفافہ دیکھ کر اسلم نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ تکلف نہیں، میری خوشی ہے۔ اب تم دونوں یہاں وقت ضائع مت کرو اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔ ڈرائیور تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔'' اس نے بزرگانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حکم دیا تو اسلم، ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''یہاں سے جا کر اس جگہ کو بالکل بھول جانا۔ یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔ آئندہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام ہو تو براہِ راست مجھ سے ہی رابطہ کرنا۔'' اس نے ضروری سمجھا کہ انہیں نصیحت کر دے۔ اس کی خاطر ذیشان نے اگر سی ایف پی کے اس ٹھکانے کو استعمال کروا لیا تھا تو اس کا بھی فرض تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے احتیاط سے کام لے۔

''جیسا آپ کا حکم۔'' اسلم نے جواب دیا۔ ماہ بانو البتہ بالکل خاموش تھی۔ نکاح کے بعد سے اس نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مبادا نظر اُٹھے اور اس چہرے پر پڑ جائے جسے دیکھنا اب وہ اپنے لیے جائز نہیں سمجھتی تھی۔ اسلم کے نکاح میں آنے کے بعد اب وہ بس اس کی وفادار بن کر رہنا چاہتی تھی اور وفاداری کے لیے احتیاط ضروری تھی۔

''تمہارے مہمان تو گئے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' ذیشان جو کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا تھا، ان دونوں کی روانگی کے ساتھ ہی واپس آیا اور اس سے استفسار کرنے لگا۔

''واپس نورکوٹ جانا ہے۔'' اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کرو، تم اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ کر کسی ٹرک یا ویگن وغیرہ کے ڈرائیور بن جاؤ۔ جس حساب سے تم گھنٹوں ڈرائیو کرتے رہتے ہو، تمہارے لیے یہ کام بہت بہتر رہے گا۔'' اس کا جواب سن کر ذیشان نے جل کر جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔



''اچھا پھر تم بتاؤ کہ کیا کروں؟''

''یہاں ایک ریسٹ روم ہے۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کر لو۔ تمہارے لائے ہوئے بندے پر بھی کام ہو رہا ہے۔ وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا ہے تو پھر تمہیں اس کی کہانی اس کی زبانی سناتے ہیں۔ پھر آگے دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ فوراً ہی ذیشان کے پروگرام سے متفق ہو گیا۔ اعصاب اتنے بوجھل ہو رہے تھے کہ کچھ دیر کے لیے تنہائی اور آرام کی شدت سے خواہش ہو رہی تھی۔ تنہائی ملتی تو وہ اپنے عہدے اور بڑے پن کے خول سے نکل کر خود سے یہ اعتراف کرنے کی جرأت کر پاتا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے جس کا دل اس وقت احساسِ زیاں سے لہولہو ہے۔ یہ لہو اگر پانی بن کر آنکھوں سے نہ بہتا تو شاید اس کے جسم و جاں کے پرخچے اُڑ جاتے اور اسے بہرحال زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنوں کے لیے اور اپنے وطن کے لئے۔

⊛----✪----⊛

سیاہ جینز پر سیاہ اور سرخ دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنے وہ لڑکی غضب کی پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس لباس نے اس کی دراز قامت اور خوب صورت فگر کو خوب نمایاں کر کے دکھایا تھا۔ دمکتی رنگت پر شانوں سے ذرا نیچے آتے براؤنش بال بھی خوب جچ رہے تھے اور ہونٹوں پر جمی چمکتی سرخ رنگ کی لپ اسٹک نے تو گویا غضب ہی ڈھا رکھا تھا۔ اس کے کبوتر جیسے سفید پیروں میں سیاہ رنگ کی نازک سی اونچی ایڑھی کی سینڈل تھی۔ اس اونچی ایڑھی پر وہ کھٹ کھٹ کرتی چلتی ہوئی بڑے انہماک سے شیلفس میں رکھی مختلف چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب کوئی چیز اس کی نظرِ انتخاب میں آ جاتی تو وہ بایاں ہاتھ اٹھا کر اسے ٹرالی میں منتقل کر لیتی جسے وہ اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

اپنی خریداری میں وہ اتنی منہمک تھی کہ اطراف سے بالکل بے خبر معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ نہ تو اسے شیلفس کے بالکل آخری سرے پر مصروف ادھیڑ عمر گریس فل سے آدمی کی موجودگی کی خبر ہے اور نہ ہی اپنے پیچھے پیچھے چلتے ان دو جوان العمر، حلیے سے ذرا اوباش لگنے والے لڑکوں کی۔ وہ لڑکے بھی لگتا تھا کہ موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ کچھ نکالنے کے لیے جیسے ہی شیلف کی طرف پلٹی، ان میں سے ایک نے اپنا پسٹل نکال کر اس کی پشت پر رکھ دیا۔

''سیدھی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ تمہیں ڈھیر کر دیں گے۔'' اوباش لڑکے کی سرد آواز سن کر لڑکی ایک جھٹکے سے مڑی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ لیکن اس نے لڑکے کی ہدایت پر عمل کر کے خاموش رہنے کے بجائے ایک دہشت زدہ سی چیخ ماری اور اپنی اونچی ایڑھی کے باوجود بگ ٹٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی سمت بھاگی تھی جہاں ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس کے چیخنے کی آواز پر وہ شخص فوراً ہی اس طرف متوجہ ہو گیا اور بھاگتی لڑکی کے ساتھ پسٹل لہراتا لڑکا اور اس کا ساتھی بھی اس کی نظر میں آ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس صورتِ حال پر کوئی قدم اٹھاتا، لڑکی برق رفتاری سے درمیانی فاصلہ طے کر کے اس کے قریب آ پہنچی اور اس سے لپٹ گئی۔

''پلیز ہیلپ..... ہیلپ پلیز۔'' وہ اس سے لپٹی خوف زدہ آواز میں درخواست کرنے لگی اور اسے یہ بھی خبر نہیں ہو سکی کہ دھمکانے والے بدمعاش اسے کسی دوسرے شخص کی پناہ میں جاتے دیکھ کر فوراً ہی مخالف سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک بڑا سپر اسٹور تھا جہاں سکیورٹی کا بھی مناسب انتظام تھا۔ شاید اسی لیے معاملہ گڑبڑ ہوتا دیکھ کر ان اوباشوں نے فوراً ہی راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔

"کیا ہوا سر! کیا مسئلہ ہے؟" فوراً ہی وہاں ایک سکیورٹی اہلکار برآمد ہوا اور ادھیڑ عمر شخص سے دریافت کرنے لگا جو لڑکی کے ابھی تک خود سے لپٹے ہونے کی وجہ سے جز بز نظر آ رہا تھا لیکن صرف اس کے خوف کی وجہ سے برداشت سے کام لے رہا تھا۔

"کچھ بدمعاش ان خاتون کو تنگ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نہیں بتا سکتا۔" لڑکی کو خود سے الگ کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"میں دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ پلیز ریلیکس رہیں۔" سکیورٹی اہلکار فوراً ہی پلٹ گیا۔

"آپ ٹھیک ہیں مس؟" ادھیڑ عمر شخص نے گہرے گہرے سانس لیتی لڑکی سے دریافت کیا۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ آس پاس ہی نہ چھپے ہوئے ہوں۔" اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا اور بری طرح ہانپنے کی وجہ سے پیدا ہونے والا سینے کا زیر و بم چست ٹی شرٹ میں خوب محسوس ہو رہا تھا۔

وہ یقینی طور پر تباہ کن حد تک حسین دپُرکشش تھی جس کے لیے کسی بھی اوباش کی نیت خراب ہو سکتی تھی اور شریف آدمی کے دل میں ہمدردی کی لہر اُٹھ سکتی تھی۔ اس شریف آدمی نے بھی اسے نظر انداز نہیں کیا اور نرمی سے بولا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ آئیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر آپ مزید شاپنگ کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔"

"نہیں، اس وقت شاپنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس آپ میرے ساتھ چل کر بل بنوا دیں۔ مجھے اکیلے یہاں سے باہر نکلتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا ہے۔" لڑکی نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر ہامی بھر لی اور وہ دونوں اپنی اپنی ٹرالیوں کے ساتھ آگے چل پڑے۔

"مجھے یہاں کے سکیورٹی انچارج سے ملنا ہے۔" بل بنوانے کے لیے ٹرالیاں سامنے کرتے ہوئے انہوں نے بارعب لہجے میں کہا جس پر انہیں مین گیٹ پر بنے ایک کیبن کی طرف گائیڈ کر دیا گیا۔

وہ لڑکی سمیت اس جگہ پہنچے تو وہاں وہ سکیورٹی اہلکار پہلے ہی موجود تھا جس سے واقعے کے فوراً بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ یقینی طور پر وہ اپنے افسر کو واقعے کی رپورٹ دے رہا تھا۔

"سر یہ ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا۔" ان دونوں کو دیکھتے ہی سکیورٹی گارڈ نے اپنے افسر کو مطلع کیا۔

"واقعہ ان خاتون کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نزدیک ہونے کی وجہ سے اتفاقاً اس میں شامل ہو گیا ہوں۔" ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے گویا صورتِ حال واضح کی۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو زحمت ہوئی۔ میں خود اس واقعے کی تفتیش کروں گا۔" انچارج نے ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو افسوس ہونا بھی چاہیے۔ اتنے بڑے سپر اسٹور میں مسلح افراد کا گھس آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ مسلح آدمی اندر کیسے آئے؟ کیا آپ کے پاس اسلحے کو اندر آنے سے روکنے کے لیے متعلقہ آلات نہیں ہیں؟" اس بار ان کا لہجہ سرد اور بارعب تھا۔ سکیورٹی انچارج نے خود کو ان کے سامنے کافی کمزور محسوس کیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

"میں خود اس سلسلے میں حیران ہوں سر! ہمارا سکیورٹی سسٹم بہت اچھا ہے اور کوئی چاہے بھی تو ہتھیار چھپا



کر اندر نہیں لے جا سکتا۔ ان حالات میں تو میں یہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کوئی کھلونا پسٹل تھا جس سے خاتون کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی۔"

"ہو سکتا ہے ایسی ہی کوئی بات ہو۔ میں اچانک ان دونوں کے آ جانے سے بہت خوف زدہ ہو گئی تھی اس لیے کس قسم کی ججمنٹ نہیں کر سکی۔ ویسے بھی مجھے ہتھیاروں کی کوئی خاص پہچان نہیں ہے۔" لڑکی نے فوراً ہی اس کے خیال سے اتفاق کر لیا جس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اپنی صفائی دینے کے لیے مزید بولا۔

"میرے ماتحت نے صرف خاتون کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ وہ کسی کو وہاں سے بھاگتا ہوا نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی کسی اور سکیورٹی گارڈ نے اسٹور سے کسی شخص کو افراتفری میں نکلتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ کوئی مشکوک بات سامنے آنے پر ہم خود ہی فوری ایکشن لے لیتے ہیں۔"

"اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں اب بھی اسٹور میں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور ذرا سی کوشش سے انہیں پکڑا جا سکتا ہے۔" ادھیڑ عمر آدمی پُرخیال انداز میں بولا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت اسٹور میں جتنے کسٹمرز موجود ہیں، انہیں خاتون کے سامنے شناختی پریڈ کروائی جائے؟" سکیورٹی انچارج نے اچنبھے سے پوچھا۔

مجرموں تک پہنچنے کے لیے ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟" ادھیڑ عمر شخص نے مضبوطی سے جواب دیا۔

"اس ایکشن کا اسٹور کی ساکھ پر بہت برا اثر پڑے گا۔ ہمارے معزز کسٹمرز اسے اپنی انسلٹ سمجھیں گے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ خاتون کے ہراساں ہونے کے سوا کوئی بڑی بات ہوئی بھی نہیں۔ اگر انہیں کسی قسم کا جسمانی یا مالی نقصان پہنچتا تو ہم اس قسم کے سخت اقدامات اٹھا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اسٹور کے مختلف حصوں میں نصب کیمروں میں موجود ویڈیو آپ دونوں کو دکھا دوں تاکہ اگر کسی کیمرے کی گرفت میں ان مشکوک افراد کے چہرے آئے ہوں تو آپ انہیں پہچان لیں۔" سکیورٹی انچارج نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ایک متبادل تجویز پیش کی۔

"رہنے دیں۔ میں کسی ایسے جھنجٹ میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جو ہونا تھا، ہو چکا مجھے خوشی ہے کہ میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور میں صحیح سلامت اپنے گھر جا سکتی ہوں۔" لڑکی نے اچانک مداخلت کر کے معاملہ ہی ختم کر دیا تو ادھیڑ عمر شخص بھی شانے اچکا کر رہ گیا۔ لڑکی کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اس کا کچھ کہنا 'مدعی سست گواہ چست والا' معاملہ ہو جاتا۔

وہ دونوں سکیورٹی انچارج کی طرف سے سوفٹ ڈرنکس کی پیشکش کو مسترد کر کے گارڈ روم سے باہر آ گئے۔ اس دوران ان کی بلنگ کا کام ہو چکا تھا اور خریدی ہوئی اشیا تھیلوں میں منتقل کی جا چکی تھیں۔

"آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ سر! ہو سکتا ہے آپ کو میرے رویے سے مایوسی ہوئی ہو لیکن میں نے جان بوجھ کر اس معاملے کو طول دینا پسند نہیں کیا۔ مجھے تنگ کرنے والے اوباش جو بھی ہوں، میں ان کو بھیجنے والے سے واقف ہوں اس لیے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔" ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ ساتھ باہر نکلتے ہوئے لڑکی نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے رویے کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ..... یعنی یہ ذاتی دشمنی کا کیس ہے؟" انہوں نے پوچھا جس پر لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم کسی ریسٹورنٹ میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ پھر میں آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گی۔"

"چائے پینے میں، وہ بھی اتنی خوب صورت خاتون کے ساتھ، کوئی حرج تو نہیں ہے..... لیکن بڑی عجیب

ں بات ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ابھی تک متعارف نہیں ہوئے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ نجی معاملات تک آ
ہنچا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر احساس دلایا تو لڑکی کے لب بھی کھل اُٹھے اور ایسا لگا کہ سرخ پنکھڑیوں کے
درمیان رکھے موتیوں کی سفید لڑی نے اپنی جھلک دکھائی ہو۔

''میں فلک ہوں..... فلک خان۔ اور آپ؟'' اس نے تعارف کروانے میں پہل کرتے ہوئے ان کی
طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''توحید احمد۔'' ادھر سے مختصر جواب آیا۔ اس دوران وہ لوگ چلتے ہوئے پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔
اتفاق سے دونوں کی گاڑیاں ایک دوسرے سے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ فلک کے پاس سفید رنگ کی سوزوکی
مہران کا کافی پرانا ماڈل تھا جبکہ توحید احمد کے پاس شاندار پجیرو تھی۔ اس نے اپنا سامان سوزوکی مہران کی پچھلی
سیٹ پر رکھ کر دروازہ دوبارہ لاک کیا اور توحید احمد کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس دوران وہ بھی سامان رکھنے کا کام کر
چکے تھے۔

''میری گاڑی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں، میں آپ کی طرف آ جاتی
ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے توحید احمد سے کہا۔

''میں اس قسم کی سوچ کا مالک نہیں ہوں لیکن تمہارے میری گاڑی میں بیٹھنے سے میری گاڑی کی شان
بڑھ جائے گی اس لیے واقعی تم میرے ساتھ آ جاؤ۔'' انہوں نے اسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جو ایک خوش شکل
اور خوش لباس لڑکی کے سامنے کسی مرد کے لیے لازم تھا۔ فلک ایک ادا سے ہنستی ہوئی ان کی گاڑی کی
طرف بڑھی۔

''آپ خاصے خوش مزاج اور ہینڈسم آدمی ہیں۔'' جوابی تعریف گویا اس کا فرض بن چکا تھا۔

''حُسن کے آگے تو سب ہی خوش مزاج ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان بدمعاشوں پر حیرت ہے کہ انہوں نے
تمہیں ہراساں کرنے کی گستاخی کیسے کی؟'' وہ اب بھی مائل بہ شوخی تھے۔

''ان کا ذکر رہنے دیں۔ وہ کرائے کے پٹھو تھے اور اپنا کام کر کے بھاگ گئے۔'' اس نے ہونٹوں کو
سکوڑتے ہوئے بیزاری کا اظہار کیا اور فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی توحید احمد نے گاڑی
پارکنگ سے نکال لی۔

''آپ کیا جاب کرتے ہیں؟'' گاڑی چلتے ہی فلک نے ان سے سوال کیا۔

''میں تو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ اب اس عمر میں کیا جاب کروں گا؟'' انہوں نے بات اڑائی۔

''میں نہیں مانتی۔ اوّل تو آپ اتنے عمر رسیدہ لگتے نہیں ہیں، دوسرے آپ جتنے فٹ ہیں، کوئی ریٹائرڈ
پرسن ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ان کی بات ماننے سے انکار کیا۔

''تم مجھے مسلسل خوش کر رہی ہو لڑکی! یہ نہ ہو کہ خوشی میں میرا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو جائے کہ مجھے ہارٹ
اٹیک ہی ہو جائے۔'' انہوں نے گویا اسے تنبیہہ کی جسے سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تمہاری طرح تمہاری ہنسی بھی بہت خوب صورت ہے۔'' توحید احمد نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو
اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں لیکن وہ انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''اصل میں یہ آپ کا حُسنِ نظر ہے۔ اگر میں اتنی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی تو میرا سابقہ شوہر مجھ پر دوسری
عورتوں کو ترجیح کیوں دیتا؟'' اس کی انکساری نے جملے کے آخر میں اُداسی کا رنگ اختیار کر لیا۔

''اوہ..... تو چوٹ کھائی ہوئی ہو۔ اندر چلو، پھر تمہاری داستان بھی سنتے ہیں کہ کس بدنصیب نے اتنی



پیاری لڑکی کی ناقدری کی۔'' انہوں نے قریبی ریستوران کا انتخاب کیا تھا اس لیے فاصلہ فوراً ہی طے ہو گیا۔
ریستوران کی فضا بڑی خواب ناک تھی۔ دھیمے سُروں میں چھڑی موسیقی نے بڑا خوشگوار سا تاثر پیدا کر رکھا
تھا۔ ان دونوں نے ویٹر کی راہنمائی میں ایک ٹیبل پر پہنچ کر قبضہ کر لیا اور توحید احمد نے فوراً ہی اسنیکس کے ساتھ
چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔

''میں نے آپ کو آفر کی تھی اس لیے یاد رکھیے گا کہ میزبان میں ہوں اور بل میں ہی پے کروں گی۔'' ویٹر
کے جاتے ہی اس نے فوراً انہیں ٹوکا۔

''خوب صورت خواتین کی میزبانی بس اس حد تک اچھی لگتی ہے کہ وہ چائے بنا کر پیش کر دیں۔ ان سے
بل کوئی بدذوق ہی پے کروا سکتا ہے۔ اور میں کم از کم اتنا بدذوق نہیں ہوں۔'' انہوں نے بات ٹالی۔

''آپ بہت جولی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ جوانی میں تو آپ لیڈی کلر رہے ہوں گے۔'' اسے شاید بہت
زیادہ ہنسنے کی عادت تھی اس لیے ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

''چلو اسی بہانے تم نے مجھے بوڑھا تو تسلیم کر لیا۔'' انہوں نے گویا اس کی زبان پکڑی۔

''بوڑھے تو خیر آپ نہیں ہیں، بس میچورڈ کہلا سکتے ہیں۔ ویسے بھی میرے نزدیک چھچھورے نوجوانوں
سے بڑھ کر آپ جیسے خوش مزاج اور گریس فل شخص کی صحبت زیادہ اچھی ہے۔ اگر جوانی میں اتنی کشش ہوتی تو
میں سال بھر کے اندر اپنے شوہر کو چھوڑ کر نہ جاتی۔'' اس نے شانے جھٹکتے ہوئے انہیں جواب دیا تو جیسے انہیں
بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''ارے ہاں، تم کچھ بتا رہی تھیں اپنے شوہر کے بارے میں۔ ذرا بتاؤ تو وہ کون احمقِ اعظم تھا جس نے
تمہاری قدر نہیں کی؟''

''احمق وہ نہیں، میں تھی۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور میں اس کی دولت اور خوب صورتی سے
مرعوب ہو کر اس کی بن گئی۔ حالانکہ میری فیملی نے اس شادی کی بہت مخالفت کی تھی۔ میرے والد اور بھائی کا
کہنا تھا کہ ہم خود سے اتنے زیادہ ہائی اسٹیٹس کے بندے سے رشتہ نہیں نبھا سکتے۔ پھر وہ تھا بھی فیوڈل بیک
گراؤنڈ کا بندہ..... جس کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہیں تھی۔ میری آنکھوں پر اس وقت عشق کی پٹی
بندھی تھی اس لیے میں نے کسی کی ایک نہ سنی اور مجبوراً میرے گھر والوں نے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ دینے کے
اعلان کے ساتھ میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد مشکل سے دو مہینے وہ شرافت کے جامے میں رہا پھر اِدھر اُدھر
کی بازاری عورتوں پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بہت سمجھایا، لڑی جھگڑی لیکن اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ مجبور
ہو کر میں نے طلاق مانگ لی جسے اس نے اپنی توہین سمجھتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ میں بھی ضد میں آ گئی اور
اس کا گھر چھوڑ کر اس گھر میں شفٹ ہو گئی جو مجھے اس نے مہر میں دیا تھا۔ یہ بھی میرے والد کی مہربانی تھی کہ
انہوں نے خفگی کے باوجود میری سیفٹی کا خیال کرتے ہوئے اس سے مہر میں مکان لکھوا لیا تھا۔ اپنے مکان میں
شفٹ ہو کر میں نے کورٹ میں خلع کی درخواست دائر کر دی۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی اور اب وہ مختلف
حربوں سے کوشش کر رہا ہے کہ میں درخواست واپس لے لوں۔ کبھی دھمکی آمیز فون ملتے ہیں۔ کبھی گھر سے نکلتے
وقت میری گاڑی کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اور آج جو ہوا، وہ آپ نے بھی دیکھ لیا۔'' وہ جیسے تھک کر چپ ہو گئی۔

''تمہیں چاہیے تھا کہ اپنے میکے چلی جاتیں۔'' انہوں نے سب سن کر مشورہ دیا۔

''وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ والد کا میری شادی کے پندرہ دن بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال
کے بعد بھائی بھی جاب کے لیے کینیڈا چلا گیا۔ ان دونوں کے سوا میری فیملی میں کوئی تیسرا فرد تھا ہی نہیں۔

باقی دور کے رشتے داروں کا تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ آج کل کوئی کسی کے پھڈے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جو بھی حالات ہیں، مجھے ان سے تنہا ہی مقابلہ کرنا ہے۔'' مایوسی سے بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''پلیز رونا نہیں۔ مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جائے گا۔'' انہوں نے فوراً اسے ٹوکا تو وہ ہنس دی۔ اسی وقت اس کی ٹیبل پر چائے سرو کی جانے لگی۔ چائے اور اسنیکس سے انصاف کرتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے اور بھی گھل مل گئے۔ دونوں ہی کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں اور ایک دوسرے کی کمپنی کو انجوائے کر رہے ہیں۔

''تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر پر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ رات ہونے والی ہے، تمہارا اکیلا جانا مناسب نہیں۔ تمہاری گاڑی میں کسی سے کہہ کر تمہارے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔'' ریستوران سے نکل کر وہ واپس توحید احمد کی گاڑی میں ان کے پہلو میں آ کر بیٹھی تو انہوں نے پیشکش کی۔

''آپ بہت اچھے ہیں۔ دل کی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔ میں خود بھی آپ سے یہی کہنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔'' اس نے بے ساختہ ہی ان کے بازو کو دونوں ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے تشکر کا اظہار کیا اور اپنا سر ان کے شانے سے ٹکا لیا۔ انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

''میں اس دنیا میں بہت تنہا رہ گئی ہوں۔ آج آپ کے ساتھ وقت گزار کر ایسا لگا جیسے مجھے میرا کوئی اپنا مل گیا ہو۔'' وہ ان کے شانے سے سر ٹکائے خوابیدہ لہجے میں بولنے لگی ایک تو اُس کا حُسنِ بے مثال، پھر اس کے بدن سے پھوٹتی مہک اور اس پر سے خود سپردگی کا یہ انداز..... گاڑی کی فضا بڑی رومان پرور ہو گئی۔ توحید احمد اس کی باتیں سنتے اس کی بتائی ہوئی سمتوں میں گاڑی دوڑاتے رہے۔ آخر کار ایک اپر مڈل کلاس ایریا کے مکان پر پہنچ کر ان کا سفر اختتام پذیر ہوا۔

''اندر چلیے نا۔ جانے کیوں آج خالی مکان میں تنہا جاتے ہوئے روزانہ سے زیادہ وحشت ہو رہی ہے۔'' گاڑی رُکی تو اس نے بجائے نیچے اُترنے کے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''اوکے..... ایز یو وِش۔'' توحید احمد نے اسے مایوس نہیں کیا اور گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ وہ دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ اس کے ساتھ ساتھ تھے اور جانے اسے تنہائی کی وحشت سے نجات دلانے کے لیے کیا کرنے والے تھے۔

⊛----✪----⊛

فائیو اسٹار ہوٹل کا وہ کمرہ کسی خواب کی تعبیر کی طرح تھا۔ کمرے کو دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے خصوصی طور پر تیار کروایا گیا ہے۔ پورے کمرے میں پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن کی بھینی بھینی خوشبو نے کمرے کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

''آپ کے کمرے میں پھل، دودھ، مٹھائیوں اور مشروبات وغیرہ سے بھری ٹرالی پہنچا دی گئی ہے۔ اگر آپ کو کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو انٹرکام پر ہمیں مطلع کر سکتے ہیں۔ مطلوبہ شے فوراً آپ تک پہنچا دی جائے گی۔'' وہ انتظامیہ کا کوئی فرد تھا جو ریسپشن سے ان کے ساتھ یہاں تک آیا تھا اور اب کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا احترام سے کہہ رہا تھا۔ کمرے میں موجود بے شمار پھولوں کے علاوہ پھولوں کا ایک گلدستہ اس نے بھی ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے پیش کیا تھا جو اس وقت ماہ بانو کے ہاتھوں میں تھا۔

''تھینکس! اگر ہمیں ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور آپ کو مطلع کریں گے۔'' اسلم نے اسے نرمی سے جواب



دیا۔ یہ ایک طرح سے اس کے لیے اشارہ بھی تھا کہ اب وہ وہاں سے جا سکتا ہے۔

''وِش یو گڈ لک۔'' وہ بھی عقل مند تھا، اشارہ پاتے ہی فوراً پلٹ گیا۔ اسلم دروازہ بند کر کے کمرے کے وسط میں کسی مجسمے کی طرح ایستادہ ماہ بانو تک آیا۔

''ایسا لگتا ہے کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہم خانماں بربادوں کو بھی ایسا خوب صورت حجلۂ عروسی نصیب ہوگا، سوچا ہی نہیں تھا۔ میرا تو بس یہ خیال تھا کہ ہمارا نکاح ہوگا اور ہم واپس فلیٹ پر لوٹ جائیں گے۔ لیکن محترم اے سی صاحب نے تو اس جنت میں پہنچا دیا۔'' اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ فرطِ محبت سے بھرپور لہجے میں بولا۔

آج کا دن اس کے لیے بڑا مرادوں والا تھا۔ جسے دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھا تھا، آج وہ پورے حقِ ملکیت کے ساتھ اس کے ہمراہ اس خوب صورت خلوت کدے میں موجود تھی۔ دل چاہتا تھا بہک جائے اور اسے بھی اپنے ساتھ جذبات کی تیز رو میں بہا لے جائے مگر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ بیش قیمت عروسی جوڑا، نکاح کا بھرپور انتظام، مہنگے ترین ہوٹل میں یہ سجا سجایا خوب صورت کمرہ اور اس کے پرس میں پڑا بھاری مالیت کے چیک کا لفافہ..... یہ سب کیا تھا؟ اس سے تعلقِ خصوصی کا اظہار یا پھر کوئی مداوا؟

اس نے ہوٹل آتے ہوئے راستے میں شہریار کے دیے لفافے کو کھول کر دیکھ لیا تھا اور اس میں موجود چیک پر لکھی رقم دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا تحفہ ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جاتا۔ نہ ہی ہمدردی میں اس حد تک جایا جاتا ہے۔ یہ تو بس اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سامنے والا دینے والے کو بہت عزیز ہو۔ آج ایک دن میں شہریار نے اسے اپنی محبت کے اتنے ثبوت دیے تھے کہ اس کے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب اپنے یقین کا وہ کیا کرتی؟ اب تو اسے سوچنا بھی جرم تھا۔ وہ اب اسلم کی بیوی تھی اور قانوناً و مذہبی طور پر اس سے وفا نبھانے کی پابند۔ فرضِ وفاداری کا تقاضا تھا کہ اب اس کے سوا کسی دوسرے کے خیال کو بھی ذہن سے نہ گزرنے دیا جائے اور اس وقت وہ خود سے اسی جنگ میں مصروف تھی۔

''لوگ اپنے محبوب کو ساری زندگی پھولوں بھری راہ گزر پر چلانے کی خواہش کرتے ہیں۔ تم مجھے اتنی عزیز ہو کہ میرا دل چاہتا ہے، تمہیں اتنی بھی زحمت نہ کرنی پڑے اور میں تمہیں اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلاتا رہوں۔''

اس کی کیفیت سے انجان اسلم نے یکایک اسے زمین سے اٹھا کر اپنی بانہوں میں تھام لیا اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے آہستگی سے پھولوں کی پتیوں سے بھرے نرم بستر پر اُتار دیا۔ پھر وہ خود بھی گرنے والے انداز میں اس کے قریب ہی دراز ہو گیا۔ ماہ بانو اس کے بہکے بہکے تیور دیکھ رہی تھی لیکن آج وہ اسے کسی صورت نہیں روک سکتی تھی۔ آج وہ پورے حق سے اس کے قریب آیا تھا۔ وہ فطری حیا سے محجوب ہوتی ہوئی سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے مزید پیش قدمی کی اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماہ بانو کا ہاتھ کانپنے لگا۔

''بالکل چھوئی موئی ہو۔'' اس کی حالت دیکھ کر وہ سرشاری سے ہنسا پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''حسبِ قاعدہ مجھے اس وقت تمہیں منہ دکھائی میں کچھ دینا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے، اس کے باوجود میں کوئی انتظام نہیں کر سکا..... تو جانِ من!..... اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ لوٹ کا مال ہے جسے میں انتہائی ضرورت کے لیے تو پھر بھی مجبوراً استعمال کر رہا ہوں لیکن ان انمول لمحوں میں تمہیں کوئی یادگار تحفہ دینے کے لیے

ہرگز وہ رقم خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہارا تحفہ مجھ پر ادھار ہے۔ جب میرے پاس حق حلال کی آمدنی ہوگی تو میں ضرور تمہیں پیارا سا تحفہ دوں گا۔ ابھی تو میرے پاس بس میری خالص محبت ہے جسے میں تمہارے قدموں میں رکھ کر قبولیت کی درخواست کرسکتا ہوں۔'' وہ بڑی دل سوزی سے سب کچھ کہتا چلا گیا۔ اب ماہ بانو کے لیے اپنی خاموشی کو برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے اپنے لب وا کیے۔

''مجھے خوشی ہے اسلم! کہ آپ نے اس انداز میں سوچا۔ میں نے زندگی میں کبھی مادّی چیزوں کو اہمیت نہیں دی۔ میرے نزدیک انسانی جذبات کو وہ نور ہیرے سے بھی بڑھ کر قیمتی ہیں۔ آپ نے میری انگلی میں موجود یہ انگوٹھی دیکھی ہے نا۔ یہ زہر مہرہ پتھر کی انگوٹھی ہے جو مجھے مشابرم خان کی ماموں زاد بہن نے دی تھی۔ اس بظاہر معمولی اور بھدی انگوٹھی کو میں اس دن سے مسلسل اپنی انگلی میں پہن کر اس لیے رکھتی ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے خلوص نے بہت متاثر کیا تھا۔ پھر آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔'' روانی سے بولتے ہوئے اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے ذرا مسکرا کر بولی۔

''محبت قدموں میں رکھنے والی چیز نہیں ہوتی جناب! اسے دل میں بہت عزت و احترام سے رکھا جاتا ہے۔ میں نے بھی آپ کی محبت کو یہی مقام دیا ہے۔'' اس کے شوہر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی اس نے اس کے ساتھ اپنا طرزِ تخاطب بدل لیا تھا اور ''تم'' کا صیغہ چھوڑ کر اسے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت کے لیے کچھ جگہ نکل آئی۔ ورنہ تم تو صاف انکار کر چکی تھیں۔'' اسلم نے اس کی ماضی میں کہی بات کے حوالے سے کہا۔

''ہاں..... اس وقت مجھے یہی لگا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جذبات و خیالات میں بھی وقت کے ساتھ کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ پھر محبت تو بہتے پانی کی طرح ہے۔ جیسے بہتا پانی اپنی جگہ بنا لیتا ہے، اسی طرح محبت بھی خود بخود اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ سچ بھی یہی تھا کہ بے شک وہ شہریار کی محبت کی اسیر تھی لیکن اسلم کی محبت کے تند و تیز ریلوں نے کچھ مقامات پر ایسی دراڑیں پیدا کر دی تھیں کہ وہ خود کو بہت سے دلائل سے قائل کرنے کے بعد ہی سہی، اس سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی تھی اور آج اس کی بیوی کی حیثیت سے اس خلوت کدے میں موجود تھی۔

''میرا مقصد تمہیں کچھ جتانا نہیں تھا۔ میں تو بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ آج میں کتنا خوش ہوں اور آج دنیا کا ہر غم بھول کر خود کو بس تمہاری ذات میں گم کر لینا چاہتا ہوں۔'' اس کا لہجہ یک دم ہی مخمور ہوگیا اور ماہ بانو کے لیے پھر ممکن نہ رہا کہ مئے محبت پی کر بہکتے ہوئے اس شخص کے جذبات کے آگے بند باندھ سکے۔ وہ بس اس منہ زور سمندر میں ڈوبتی اُبھرتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ میرے پاس نئی پرانی شرابوں کی کئی اقسام ہیں۔'' توحید احمد اور فلک کے درمیان بے تکلفی کے مراحل اس تیزی سے طے ہوئے تھے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ بیڈ روم تک لے آئی تھی اور اب ایک الماری کھولے ان سے پوچھ رہی تھی۔

''گویا تم یہ شغل بھی کرتی ہو؟'' وہ بہت آرام سے اس کے نرم و گداز بستر پر بیٹھے ہوئے اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس نے ان کی پسند پوچھی تو کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرا شوہر ایک لینڈ لارڈ کا بیٹا تھا۔ اس طبقے میں شراب اور شباب کے فراوانی سے استعمال سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ شروع شروع میں، میں اس کے اصرار پر صرف اسے



خوش کرنے کے لیے پیتی تھی، بعد میں عادی ہوگئی۔ اب تو یہ مجھے اپنی دوست لگتی ہے جس میں ڈوب کر میں وقتی طور پر ہی، اپنے سارے دکھ اور پریشانیاں بھول جاتی ہوں۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں اُداسی کے رنگ جھلکنے لگے۔

''اوہ پلیز نو۔ اُداس مت ہونا۔ قسمت سے اگر مجھے تم جیسی حسینہ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو میں اسے ہنس کھیل کر گزارنا چاہتا ہوں۔'' توحید احمد نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

''او کے جناب! میں اُداس نہیں ہوتی۔ آپ بتائیں کہ کیا پینا پسند کریں گے؟'' وہ سر جھٹک کر فوراً ہی اُداسی کے نرغے سے نکل آئی اور ان سے ان کی پسند پوچھنے لگی۔

''تم میزبان ہو۔ جو پلا دو، مجھے منظور ہوگا۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ شراب سے زیادہ تم مدہوش کر دینے والی چیز ثابت ہوگی۔ اور تمہارے ہاتھ سے تو سادہ پانی پی کر بھی بندے کو نشہ ہو جائے گا۔''

سپر اسٹور میں نظر آنے والی ان کی بارعب شخصیت کہیں دب کر رہ گئی تھی اور اب صرف ایک ٹھیٹ عاشق نظر آ رہا تھا۔ فلک نے ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف دھیمے سُروں میں ہنسنے پر اکتفا کیا اور ٹرے میں شراب کی بوتل کے ساتھ دیگر لوازمات سجا کر ان کے مقابل آ بیٹھی۔

''آپ شاید یقین نہ کریں کہ آج بہت عرصے بعد میں یوں کھل کر ہنسی ہوں۔'' گلاسوں میں شراب ڈال کر اس میں سوڈے اور برف کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان سے کہا اور ایک گلاس انہیں تھما دیا۔

''ہماری دوستی کے نام۔'' گلاس منہ سے لگانے سے قبل توحید احمد نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور پھر ان دونوں نے بیک وقت سنہری رنگ کا وہ آتشیں محلول اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ فلک نے فی الحال دونوں کے لیے ہی چھوٹا پیگ تیار کیا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے گلاس خالی کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ فلک نے فوراً ہی دوبارہ ساقی گری کی ذمے داری سنبھال لی اور اس بار ڈبل پیگ تیار کیا۔

''تمہارے سابقہ شوہر کا ذوق بہت عمدہ ہے۔ شباب سے لے کر شراب تک اس نے ہر عمدہ شے جمع کی ہے۔'' فلک کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم پر ایک حریصانہ سی نظر ڈالتے ہوئے توحید احمد نے شاید شراب کی تعریف میں وہ کلمات ادا کیے تھے۔

فلک نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''آپ انجوائے کریں توحید صاحب! میں ذرا چینج کر آؤں۔ اصل میں ان کپڑوں میں، میں کچھ ایزی فیل نہیں کر رہی ہوں۔''

''او کے جاؤ۔ لیکن ذرا جلدی آنا۔'' توحید نے ٹھیٹ عاشقوں کے انداز میں کہا اور گلاس ایک بار پھر لبوں سے لگا لیا۔ فلک لہراتی ہوئی ملحقہ باتھ روم میں گھس گئی۔ چھ سات منٹ لگا کر وہ واپس آئی تو اس حال میں تھی کہ بڑے بڑے زاہدوں کا ایمان ڈگمگا جائے۔ ٹی شرٹ اور جینز کی جگہ کپڑے کے جن دو چیتھڑوں نے لے لی تھی، وہ کہیں سے بھی لباس کہلائے جانے کے لائق نہیں تھے اور اس کا کندن سا بدن کسی کھلی کتاب کی طرح توحید احمد کے سامنے ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کی یہ محویت نوٹ کی اور یہ دیکھ کر مزید مطمئن ہوگئی کہ درمیانی وقفے میں انہوں نے اپنا گلاس خالی کر لیا ہے۔

''آہ..... شہزادہ سلیم نے تمہارا یہ روپ دیکھ لیا ہوتا تو انارکلی کو بھول جاتا۔ میرا بڑی شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں کسی ملک کا بادشاہ ہوتا اور اپنا تخت و تاج تمہارے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔'' توحید احمد نے لب کشائی کی تو الفاظ میں اس کے لیے پذیرائی ہی پذیرائی تھی۔

''اصل میں مجھے بہت زیادہ کپڑے پہن کر سکون سے نیند نہیں آتی۔'' وہ جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''اور تمہیں اس حال میں دیکھ لینے والوں کی عمر بھر کی نیندیں اُڑ جاتی ہوں گی۔'' وہ برجستہ بولے۔

''مجھے اس حال میں میرے شوہر کے سوا صرف آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں کوئی بازار میں بیٹھی طوائف نہیں جو سب مجھے یوں دیکھ سکیں۔'' اس کی ادائیں کچھ کہہ رہی تھیں اور زبان پر کچھ تھا۔ توحید احمد نے اس سے بحث نہیں کی اور اس کے اپنے قریب بیٹھنے پر اسے مخمور نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس نے غیر محسوس طور پر ایک جام اور تیار کر کے ان کے لبوں سے لگا دیا۔

''آپ میں کچھ انوکھا ہے جو آپ کے مختلف ایج گروپ کے ہونے کے باوجود مجھے آپ کی طرف کھینچ رہا ہے۔ آپ مجھ سے اپنا تفصیلی تعارف کروائیے نا۔ میں بھی جانوں کہ خاص دِکھنے والے اس شخص کا ظاہر ہی اتنا شان دار ہے یا پھر بیک گراؤنڈ میں بھی کچھ ایسا ہے جو آپ کو خاص بنا رہا ہے۔'' انہیں اپنے ہاتھوں سے پلاتی وہ بہت لاڈ سے پوچھ رہی تھی۔ توحید احمد کے غبارے میں گویا ہوا بھر گئی اور وہ سرشاری سے ہنس دیئے۔

''تم نے دیکھا ہی کیا ہے جانِ من! جب ہم جوانی میں فوج کی یونیفارم پہنتے تھے تو لڑکیوں کے غول کے غول ہم پر منڈلانے لگتے تھے۔ کوئی اِدھر گرتی تھی تو کوئی اُدھر..... اور ہم یوسفِ ثانی بنے بے نیازی سے گزرتے چلے جاتے تھے۔'' ہاتھ سے لڑکیوں کے اِدھر اُدھر گرنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان کی زبان میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ یقینی طور پر بنتِ انگور نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

''اب آپ کس عہدے پر ہیں؟'' ان کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے فلک نے تجسس سے پوچھا۔

''اب ہم آرمی انٹیلی جنس میں کرنل کے عہدے پر کام کرتے ہیں۔ بڑا نام ہے ہمارا آرمی میں بھی۔ صدر اور وزیر اعظم تک ہمارا دم بھرتے ہیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا ہے۔'' ایسا لگتا تھا کہ وہ فلک کے سامنے اپنی شان بڑھا چڑھا کر بیان کرنا چاہتے ہوں۔ حالت بتا رہی تھی کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ نشہ گہرا ہوتا جا رہا ہے لیکن وہ پینے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فلک بھی پوری مستعدی سے انہیں پلا رہی تھی اور ان کا گلاس خالی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

''آپ تو واقعی سچ مچ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ آپ نے تو بڑے بڑے مجرموں کو ٹھکانے لگایا ہوگا؟'' پلانے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں چڑھانے کا کام بھی کر رہی تھی۔

''یہ تو ہے۔ میری سروس بھری پڑی ہے ایسے کارناموں سے۔'' انہوں نے ایک ہچکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ان مجرموں میں ''را'' کے جاسوس بھی ہوتے ہوں گے؟'' یہ یقین ہونے پر کہ ان کا نشہ گہرا ہو چکا ہے اور دماغ مخصوص سمت میں چل رہا ہے، اس نے گفتگو کو نازک مرحلے میں داخل کیا اور خود ان سے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

''''را'' کے کتے تو میرا خاص شکار ہیں۔ جہاں ملیں، انہیں چُن چُن کر پکڑتا ہوں اور پھر ان کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتا ہوں۔'' انہوں نے نفرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''سنا ہے پچھلے دنوں آپ نے اشیش کمار نامی کسی ''را'' کے ایجنٹ کو پکڑا ہے؟'' وہ ان پر پوری طرح لد گئی اور واضح سوال کیا۔

''اشیش..... کو..... مار..... یہ سالا کون ہے؟'' انہوں نے اپنی کنپٹی کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

''ہو سکتا ہے اس نے آپ کو اپنا نام غلط بتایا ہو۔ یہ وہ شخص ہے جسے آپ لوگوں نے پنڈی سے کافی دور



پسماندہ گاؤں سے پکڑا تھا۔ وہاں وہ مولوی کے بھیس میں رہ رہا تھا۔'' فلک نے اس کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اشارے دیئے۔

''آ..... چھا۔ وہ اشیش کو..... مار..... وہ سالا تو ابھی بھی میرے پاس ہی ہے۔'' وہ مکمل طور پر بہکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''ہاں، وہی اشیش کمار۔ آپ نے اسے کہاں رکھا ہے؟ اس تک پہنچنے کا طریقہ بتائیں؟'' اس نے دیکھا کہ کرنل اتنا مدہوش ہو گیا ہے کہ غنودگی میں جانے لگا ہے تو اس کا کالر پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ریلیکس ڈارلنگ! ریلیکس..... تمہیں اتنی بے تابی ہے تو میں خود تمہیں ہی اشیش کمار تک پہنچا دوں گا۔'' یکدم ہی کرنل سیدھا ہو بیٹھا اور صاف لہجے میں سنجیدگی سے بولا تو فلک اُچھل پڑی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ آنکھوں کی سرخی کے علاوہ کرنل توحید کہیں سے بھی شراب کے نشے میں محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ مجھے ''را'' کی کس ایجنٹ سے شرفِ ملاقات حاصل ہو رہا ہے؟'' اس کی حیرت ملحوظ ہوتے ہوئے انہوں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ میں کسی ''را'' کے ایجنٹ کو نہیں جانتی۔'' وہ بدکی۔

''ساری جان پہچان ہم خود اُگلوا لیں گے۔ میں اور میرے آدمی اس کام میں ایکسپرٹ ہیں۔'' انہوں نے اسے اپنی نظروں میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہا۔'' وہ ان سے دُور سرک کر تقریباً بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔

''لیکن میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم سپر اسٹور میں زبردستی میرے گلے پڑ گئی تھیں۔ تمہارا ایکٹ کیا ہوا ڈرامہ کافی بھونڈا تھا۔ پھر پارکنگ میں کھڑی تمہاری جعلی نمبروں والی گاڑی نے بھی مجھے احساس دلایا کہ تم کچھ گڑبڑ چیز ہو۔ اس لیے تمہاری حقیقت جاننے کے لیے میں جان بوجھ کر تمہارے جال میں پھنستا چلا گیا۔ تم نے اپنے شباب اور شراب کے نشے میں ڈبونا چاہا تو بھی میں نے خود کو تمہارے سامنے بے بس ظاہر کیا اور الاطر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ تم کِن لوگوں کے لیے کام کر رہی ہو، یہ تو میں جان ہی چکا ہوں۔ اپنا باقی ایڈریس تم خود بتاؤ گی یا ٹارچر روم میں، یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔''

وہ بہت اطمینان سے بول رہے تھے۔ فلک جو بیڈ کے کنارے تک کھسک آئی تھی، یکدم ہی تیزی سے حرکت میں آئی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ اٹھا کر انہیں کھینچ مارا۔ وہ ریلیکس نظر آنے کے باوجود ہوشیار تھے اس لیے فوراً جھکائی دے گئے اور پھرتی سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف دوڑتی فلک کو چھاپ لیا۔ اس کا نازک جسم ان کے لمبے چوڑے وجود کے نیچے پس کر رہ گیا لیکن وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی جو فوراً ہار مان لیتی۔ اس نے الٹا گرے گرے ہی اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کہنی کی زوردار ضرب کرنل کے پہلو میں پڑی۔ اس نے ایک ضرب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگاتار اپنے ہاتھوں پیروں اور سر کو حرکت میں لاتی چلی گئی۔ یقینی طور پر وہ ایک ماہر لڑاکا تھی جو انتہائی خراب پوزیشن میں ہونے کے باوجود اپنے دفاع سے دست بردار نہیں ہوئی تھی۔

کرنل کو مجبوراً اسے چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا اور انہوں نے بائیں پیر کی ایک زوردار ضرب اس کی کمر پر لگائی۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرائی اور یہ یقینی طور پر اس کی بدقسمتی تھی کہ دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بری طرح چکرا گئی۔ کرنل نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھایا اور ہتھیلی کی ایک جچی تلی ضرب اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ وہ لہرا کر فرش پر گر گئی۔ کرنل نے حقارت سے اس کے بے ہوش وجود کو دیکھا اور اپنے پاس موجود آپریٹس کا بٹن

پُش کیا۔

''اندر آ جاؤ۔'' مختصر حکم دے کر انہوں نے آپریٹس واپس رکھ لیا اور خود اطمینان سے دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے شراب کی بوتل کھول کر منہ سے لگا لی۔ گلاس اور دیگر سامان تو ان کی ہاتھا پائی میں اِدھر اُدھر گر کر برباد ہو گیا تھا لیکن بستر پر لڑھک جانے والی بوتل محفوظ رہی تھی اور اب وہ مزے سے نیٹ ہی پی رہے تھے۔ ان جیسے بادانوش کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی اور دو چار پیگ تو ان کے لیے پانی کی طرح بے ضرر ثابت ہوتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے سامنے فرش پر پڑی حسینہ کو آسانی سے مات دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''اس کی تلاشی لو اور کپڑوں کو چھوڑ کر معمولی سے معمولی شے بھی الگ کر کے اپنے قبضے میں لے لو۔ دانت وغیرہ بھی اچھی طرح چیک کر لینا کہ کہیں اس نے کسی کھوکھلی داڑھ میں کوئی زہریلا کیپسول وغیرہ نہ چھپا رکھا ہو۔ لیکن مجھے یہ لڑکی ہر حال میں زندہ سلامت چاہئے، اس لیے خیال رکھنا کہ کسی صورت اسے سوسائیڈ کا موقع نہ ملے۔ اسے مقامی یونٹ پہنچانے کے بعد اپنے انچارج سے کہو کہ مجھے رپورٹ کرے۔'' وہ مفت ہاتھ آئی بوتل کا کام تمام کرنے میں لگے تھے کہ قدموں کی آہٹ اُبھری اور ایک نوجوان، سکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ نوجوان نے اندر آتے ہی فوجی انداز میں انہیں سیلیوٹ مارا۔ وہ فوراً ہی اسے تفصیلی احکامات جاری کرنے لگے۔ ان کی ہدایات کو مستعدی سے ذہن نشین کرتا وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ کرنل بنتِ انگور سے لطف اندوز ہوتے خاموشی سے اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہے۔

⊛----✪----⊛

وہ بالکل چت لیٹا ہوا تھا۔ اپنے جذبات کو قابو کر لینے کے لیے اسے کافی مہلت مل گئی تھی اور اب اس کا طوفان کے گزر جانے کے بعد کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں اس کے موبائل کی وائبریشن سے معمولی سا ارتعاش پیدا کیا۔ رنگ ٹون اس نے جان بوجھ کر بند کی ہوئی تھی کہ وہ اس وقت اپنے اندر کی آوازوں کے سوا کوئی آواز نہیں سننا چاہتا تھا لیکن ماحول پر چھائے جمود کو توڑنے کے لیے صرف وائبریشن ہی کافی ہوئی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نام دیکھا۔ مشابرم خان کی طرف سے کال آ رہی تھی۔ اسے یکدم یاد آیا کہ اس نے مشابرم خان کو ایک اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی لیکن خود اس بُری طرح اُلجھ گیا تھا کہ اسے فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔ اتنے گھنٹوں بعد مشابرم خان کے کال کرنے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے، اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

''ہاں خان! بولو کیا بات ہے؟''

''صاحب! میں آپ کے حکم پر مسلسل بیگم صاحبہ کے پیچھے ہوں اور کسی بھی معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر ان پر نظر رکھ رہا ہوں۔ وہ کدھر کدھر گئیں، یہ تفصیل بتانے کا تو ابھی موقع نہیں ہے۔ ابھی میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کئی گھنٹے پہلے وہ ایک پجیرو والے آدمی کے ساتھ ایک گھر میں گئی تھیں۔ گھر کی چابی ان کے پاس تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ خود اس آدمی کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ کافی دیر ہو گئی، میں باہر چھپ کر ان کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن وہ باہر نہیں آئیں۔ البتہ سکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں ایک آدمی جو پتہ نہیں کہاں چھپا ہوا تھا، ابھی ابھی اندر گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اندر کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر کے اندر جا کر دیکھوں؟'' مشابرم خان نے جلدی جلدی اسے مختصراً حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''ابھی باہر رہ کر ہی نگرانی کرو اور مجھے گھر کا پتہ لکھوا دو۔ میں خود وہاں آ رہا ہوں۔ اس دوران اگر کوئی گڑبڑ نظر آئے تو تم مجھے انفارم کر کے حرکت میں آ جانا۔'' شہریار نے اسے ہدایات دیں۔



''آپ ادھر لاہور میں ہی ہیں سر؟'' مشابرم خان حیران ہوا۔

''ہاں لیکن تم پہلے کام کی بات کرو اور مجھے پتہ بتاؤ۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔ مشابرم خان نے گڑبڑا کر فوراً ہی پتہ بتا دیا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ رابطہ منقطع کر کے جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ اسی وقت ذیشان دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

''میں تو تمہیں جگانے کے لیے آیا تھا لیکن لگ رہا ہے کہ تم تو پہلے ہی سے جانے کی تیاری کر رہے ہو۔'' اس نے ایک نظر میں ہی اس کی حرکات کو بھانپ لیا۔

''ہاں، مجھے جانا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کچھ دیر رک جاتے تو ہم تمہارے لائے ہوئے بندے کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم قیدی سے تمہاری موجودگی میں ہی تفتیش کر ڈالتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ کرنل صاحب آج کل لاہور میں ہی ہیں اور کرنل صاحب نے ہی اس آفت کی پرکالہ کو پکڑا ہے۔ اس وقت وہ ماڈل ٹاؤن کے ایک مکان میں موجود ہے اور تھوڑی ہی دیر میں میرا آدمی اسے لے کر پہنچ جائے گا۔'' ذیشان کے کہے کو غیر دلچسپی سے سنتا وہ ماڈل ٹاؤن کا نام سن کر چونک پڑا۔ مشابرم خان نے بھی تو اسے ماریہ کی ماڈل ٹاؤن کے کسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

''مکان کا نمبر معلوم ہے تمہیں؟..... ذرا مکان نمبر تو بتاؤ؟'' اس نے بے تابی سے ذیشان سے پوچھا تو وہ حیرت زدہ تو ضرور ہوا لیکن جواب دے گیا۔ اس کے جواب نے تصدیق کر دی کہ ذیشان جس آفت کی پرکالہ کا ذکر کر رہا ہے، وہ ماریہ ہی ہے۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں واپس بیٹھ گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی وائبریشن پھر محسوس ہوئی۔ کال کرنے والا مشابرم خان ہی تھا۔

''پجیرو والا اکیلا واپس جا رہا ہے سر! لیکن اس نے ابھی اپنی گاڑی آگے نہیں بڑھائی ہے۔ سکیورٹی گارڈ کی گاڑی بالکل مکان کے دروازے کے ساتھ لگی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ پجیرو والا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ بتائیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟'' مشابرم خان کا لہجہ سخت ہیجان زدہ تھا۔

شہریار سمجھ گیا کہ ماریہ کو مکان سے نکال کر یہاں لانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور کرنل صاحب یہ کام اپنی زیرِ نگرانی کروا رہے ہیں۔

''تم خاموشی سے وہاں سے نکل کر رانا ہاؤس چلے جاؤ خان! میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔'' اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دے کر فون بند کیا اور ذیشان کی طرف متوجہ ہو کر اسے مخاطب کیا۔

''پرل کانٹی نینٹل کے روم نمبر سلسٹی ایٹ (68) پر ریڈ کرواؤ ذیشان! ممکن ہے وہاں سے ایک اور مجرم تمہارے ہاتھ لگ سکے۔

''کون؟..... کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' ذیشان حیران ہوا۔

''مسز جوزف۔ کرنل صاحب کی طرف سے بھجوائی جانے والی قیدی ڈاکٹر ماریہ جوزف کی ماں اور یقینی طور پر شریکِ جرم۔'' وہ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔ ماریہ کے مشکوک ہونے کو محسوس کر لینے کے باوجود اس وقت وہ شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ شاید آج کا دن اس کے لیے تھا ہی سخت کہ اسے ایک کے بعد ایک امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

ذیشان نے چاہے اس کی بات کا بیک گراؤنڈ پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن فوراً ہی حرکت میں آ گیا اور ایک

سہ رُکنی پارٹی کو پرل کانٹی نینٹل کی طرف دوڑا دیا۔ شہریار البتہ سر تھامے ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان حالات کا سامنا کیسے کرے؟ ماریہ کا جو کردار سامنے آیا تھا، وہ اس کے نیک نام خاندان کی عزت کو داغ لگانے کے لیے کافی تھا۔ یہ بے عزتی لیاقت رانا اور آفرین کے لیے ایک اور بڑا صدمہ ثابت ہوتی۔ وہ بے چارے پہلے ہی اتنے صدمے سہہ کر بیٹھے تھے، اس نئے صدمے سے جانے ان پر کیا گزرتی۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

''کیا بات ہے شہریار! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

''میں تمہیں گواہ بنا کر کچھ کہنا چاہتا ہوں ذیشان!'' اس نے یکدم ہی اپنا سر اوپر اٹھایا۔ ''میں تمہیں گواہ بنا کر اپنی بیوی کو بقائمی ہوش وحواس طلاق دیتا ہوں۔ آج سے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مجھ پر حرام ہے۔'' وہ بہت روانی سے کہتا چلا گیا۔

''مگر کیوں دوست؟'' ذیشان حیران پریشان تھا کہ وہ اتنی اچانک اور اتنا ذاتی فیصلہ آخر اسے کیوں سنا رہا ہے؟

''وہ اس لیے کہ جب تم ڈاکٹر ماریہ جوزف سے تفتیش کا آغاز کرو تو اسے صرف ملک دشمن کی حیثیت سے دیکھو اور میرا اس سے رشتہ تمہیں پریشان نہ کرے۔'' اس کا لہجہ بہت صاف تھا۔

''تو کیا ماریہ جوزف تمہاری.....؟'' ذیشان نے حیرت سے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں، وہ میری بیوی تھی۔ اپنی صفوں میں موجود غدار کو تلاش کرتے کرتے اس کا مشکوک کردار میرے سامنے آ گیا تھا۔ اسی لیے آج کل میں اس کی نگرانی کروا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل میرے آدمی نے مجھے اس کی اسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی جہاں سے بقول تمہارے ایک اہم مجرمہ کو گرفتار کر کے لایا جا رہا ہے۔'' اس نے ذیشان کو مختصراً آگاہ کیا۔

''اوہ.....آئی ایم سوری۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔'' اس مختصر تفصیل نے ہی ذیشان کو اس کی کیفیت سمجھا دی۔

''تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میری حماقت تھی کہ میں اپنے گرد بُنے جانے والے جال میں پھنستا چلا گیا۔ ماریہ میری زندگی میں بالکل اچانک آئی تھی اور حقیقتاً اُس نے اس شادی کے لیے مجھے باقاعدہ ٹریپ کیا تھا۔'' ذیشان کو یہ بتاتے ہوئے وہ وقت کسی فلم کے منظر کی طرح اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا جب جانے کیسے وہ ماریہ کے حُسن کے آگے بے بس ہو گیا تھا اور پھر اپنی غلطی کی تلافی کے لیے اس سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت وہ اتنا شرمندہ تھا کہ اپنے بہکنے پر شدید حیران ہونے کے باوجود یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ اس کے خلاف کوئی چال چلی گئی ہے۔ شاید اس روز ماریہ نے اپنے فلاسک میں سے اسے جو کافی پلائی تھی، اس میں ایسی کوئی دوا شامل تھی جس نے اس کے جذبات کو بھڑکا ڈالا تھا اور وہ جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔ یہ بات اسے اس روز سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج بہت اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی۔

''میں تمہارے معاملے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ ہمارے دشمن بہت فعال ہیں اور اس طرح سے جال پھینکتے ہیں کہ بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھنس جاتا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ بلتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے دہشت گردوں کے اڈے والے کیس پر کام کرتے ہوئے ایک ایسی قتالہ مجھ سے ٹکرائی تھی جو صرف چند گھنٹوں میں مجھے بے وقوف بنا کر مجھ سے کافی



معلومات اُڑا لے گئی تھی۔ میں آج تک ایملی پارکر نامی اس حسینہ کا دیا زخم بھول نہیں سکا ہوں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسلم ممالک کو چھوڑ کر دنیا بھر کی سیکرٹ سروسز، عورتوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تسخیر حقیقت ہے کہ عورت کے حُسن اور چالبازیوں کے سامنے بڑے بڑے سورما ہار مانتے آئے ہیں۔ یہود و ہنود تو اس معاملے میں خصوصاً بڑے بے غیرت ہوتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو غیر مردوں کی بانہوں میں بھیج کر ان کے ذریعے اہم رازوں تک پہنچنا ان کا بڑا پرانا ہتھکنڈا ہے۔ ہم مسلمان اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے اس انداز میں کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیکرٹ سروس میں خواتین کام بھی کرتی ہیں تو بہت محدود پیمانے پر۔ اور وہ بھی زیادہ تر دفاتر کے اندر۔'' ذیشان دلائل اور مثالوں سے اس کا احساسِ شرمندگی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اپنے کرنل صاحب اس جال میں پھنسنے سے کیسے بچ گئے؟'' اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال ٹینشن کو جھٹک کر خود کو ماحول کا حصہ بنا لے تاکہ کم از کم ذیشان کی تسلی ہو جائے اور وہ ماریہ کے ساتھ اسی طرح پیش آ سکے جس کی وہ مستحق تھی۔

''اپنے کرنل صاحب بڑے عجیب وغریب بندے ہیں۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں پھر بھی نشے میں آؤٹ آف کنٹرول نہیں ہوتے۔ عورت کے بارے میں البتہ شریعت کے سخت پابند ہیں۔ بغیر نکاح کے کسی عورت سے تعلق قائم کرنے کو سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ اس لیے تین خواتین کو اپنی زوجیت میں لے رکھا ہے۔'' ذیشان نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور بولا۔ ''تم خود ہی سوچو، ایسے بندے کو روایتی ہتھکنڈوں سے بھلا کیسے زیر کیا جا سکتا ہے؟ اگلوں کو مات تو ہونی ہی تھی۔''

''تمہارا آدمی ابھی تک پہنچا نہیں؟ میرے خیال میں ماڈل ٹاؤن سے یہاں تک کا راستہ اتنا زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے اتنی دیر لگ گئی۔'' باتوں کے دوران شہریار کو خیال آیا تو اس نے ذیشان کو احساس دلایا۔

''نارمل حالات میں اسے اب تک پہنچ تو جانا چاہئے تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ ٹریفک میں کہیں پھنس گیا ہو۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔'' اطمینان سے جواب دے کر وہ رابطے کی کوششیں کرنے لگا لیکن دوسری طرف سے اس کی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اسی وقت ایک شخص دستک دے کر اندر داخل ہوا اور رپورٹ دی۔

''پرل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی طرف سے رپورٹ آئی ہے سر! ہمارا ٹارگٹ وہاں سے ہٹ چکا ہے۔ روانگی سے قبل اس نے ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ نہیں کیا تھا لیکن ہمارے آدمی کمرے کی تلاشی لے کر دیکھ چکے ہیں کہ وہاں سے زنانہ کپڑوں سے بھرے ایک بیگ کے سوا سب کچھ ہٹا لیا گیا ہے۔ وہ بیگ ہمارے آدمی اپنے ساتھ لے کر آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو واپس آنے دو۔ فی الحال ہمیں ایک دوسرا بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ میں اشرف کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا۔ اسے ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔'' ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو وہ فوراً ایڑیوں کے بل واپس گھوم گیا۔

''میرے خیال میں ہم آپریشن روم میں چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں فوری رپورٹس ملتی رہیں گی اور میرے ماتحتوں کو بار بار بھاگ کر رپورٹ دینے یہاں تک نہیں آنا پڑے گا۔'' ماتحت کے روانہ ہوتے ہی وہ خود بھی کھڑا ہو گیا اور شہریار سے بولا تو اس نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آپریشن روم میں پہنچے۔ اس کمرے میں دو افراد پہلے سے موجود تھے جبکہ کمرہ مختلف قسم کے مواصلاتی آلات اور کمپیوٹرز وغیرہ سے

بھرا پڑا تھا۔

''سر! اشرف کی کسی اجنبی نمبر سے کال آئی ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی حالت میں ہاسپٹل میں موجود ہے۔'' ذیشان کو دیکھتے ہی ایک آدمی نے ہیجان زدہ لہجے میں اطلاع دی۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ لمحے قبل اسے پل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی ناکامی کی خبر سنانے آیا تھا۔

''اوہ، پھر تو ہمیں بھی ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔'' ذیشان فوراً الرٹ ہوگیا اور ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر وہ لوگ فوراً وہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں اس نے کرنل توحید کو بھی حالات سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اشرف کی جگہ ایک دوسرا شخص ان کی موجودہ قیام گاہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ اصل میں ذیشان، کرنل توحید کی سکیورٹی کی طرف سے بہت محتاط تھا اس لیے اُس نے ہی زبردستی اصرار کر کے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ جب تک لاہور میں ہیں، سی ایف پی کا ایک اہلکار ان سے دُور رہ کر ان کی حفاظت کرتا رہے گا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اس کا فیصلہ مناسب تھا۔ کھیل شروع ہو گیا تھا اور اب وہ لوگ تیزی سے ہسپتال کی طرف جا رہے تھے۔

وقت کی اہمیت سے واقف ڈرائیور نے چند منٹوں میں ہی انہیں منزل تک پہنچا دیا۔ ذیشان نے شہریار کے علاوہ اپنے ایک ماتحت کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ گاڑی رُکتے ہی وہ لوگ تیزی سے اُتر کر شعبۂ حادثات کی طرف بڑھ گئے۔ ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اشرف تک پہنچنے میں کامیابی ہوگئی۔ وہ برے حال میں تھا۔ اسے چار گولیاں لگی تھیں، دو پیروں میں، ایک بازو پر جبکہ ایک گولی نے کان کی لَو اُڑا دی تھی۔ وہ ہوش میں تھا لیکن کافی تکلیف میں اور نقاہت زدہ محسوس ہو رہا تھا۔

''تھینک گاڈ، آپ لوگ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مجھے تکلیف سے بچانے کے لیے ٹرنکولائزر دینے والا تھا لیکن میں آپ کو رپورٹ دینے تک ہوش وحواس میں رہنا چاہتا تھا۔'' اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے یقیناً وہ شدید تکلیف برداشت کرنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اگر اس کا احساسِ فرض اتنی شدت سے نہ جاگ رہا ہوتا تو یقیناً وہ تکلیف سے بچ کر مسکن دوا کے زیرِ اثر سو رہا ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ سی ایف پی کا رُکن ہی کیوں ہوتا؟ اس ادارے میں تو شامل ہی ان لوگوں کو کیا جاتا تھا جن کی حب الوطنی اور ایمان داری کا یقین ہوتا تھا۔

''شاباش اشرف! اب جلدی جلدی مجھے ساری رپورٹ دے دو تاکہ تم ریسٹ کر سکو۔'' ذیشان نے اسے سراہا۔

''پہلے آپ برن وارڈ کے آئی سی یو پر کسی کی ڈیوٹی لگا دیں۔ میں جس عورت کو لے کر مرکز پہنچ رہا تھا، وہ اس وقت وہیں موجود ہے۔'' اس نے ایک اہم اطلاع دی جسے سن کر ذیشان کے ماتھے پر شکنیں اُبھریں لیکن اس نے زبان سے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے ماتحت کو اشارہ کر دیا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ اب وہاں صرف تینوں ہی تھے۔ طبّی عملے کو پہلے ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

''اب بتاؤ۔'' ذیشان نے اشرف سے کہا تو وہ شروع ہوگیا۔

''میں اور کرنل صاحب اپنی اپنی گاڑیوں میں اس مکان سے ساتھ ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ ماڈل ٹاؤن سے نکلنے کے بعد کرنل صاحب اپنے راستے پر چلے گئے اور میں مرکز کی طرف چل پڑا۔ اس مرحلے میں میں اطراف سے ہوشیار رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا ہے لیکن پھر ایک نسبتاً سنسان سڑک پر میرا یہ یقین غلط ثابت ہوا اور اچانک ہی سامنے سے ایک گاڑی نے آ کر راستہ روک لیا۔ گاڑی رکتے ہی ان لوگوں نے بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ میرا کان اور ہاتھ زخمی ہوگیا لیکن میں نے ہمت کی اور گاڑی سے



کراس کی آڑ لیتے ہوئے خود بھی جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور میں تنہا۔ اس لیے وہ مجھ پر بھاری پڑ رہے تھے۔ مجھے دو گولیاں مزید لگ گئی تھیں۔ اتفاق سے آپریٹس اور موبائل دونوں ہی گاڑی میں رہ گئے تھے اس لیے میں کسی کو کال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو سمجھیں غیبی مدد پہنچی اور فائرنگ کی آوازیں سن کر پولیس کی ایک موبائل نے وہاں کا رخ کرنے کی ہمت کر لی۔ پولیس موبائل کا سائرن سن کر حملہ آور فرار ہو گئے لیکن جاتے جاتے انہوں نے شدید فائرنگ کی اور میرے خیال میں جان بوجھ کر پٹرول کی ٹینکی کو نشانہ بنایا۔ فوراً ہی گاڑی میں آگ بھڑک اُٹھی۔ میں معاملہ بھانپ کر دور نہ ہٹ گیا ہوتا تو خود بھی اس آگ کی زد میں آ سکتا تھا۔ میرے شور مچانے پر جانے کس طرح جلتی ہوئی گاڑی سے قیدی لڑکی کو نکالا گیا لیکن اتنی دیر میں وہ اچھی خاصی جھلس چکی تھی۔ ہمیں ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ پولیس والے میرا بیان لینا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یہ بات سمجھائی کہ یہ پولیس کا کیس نہیں ہے۔ میری درخواست پر مجھے ٹیلی فون فراہم کر دیا گیا اور اس طرح میں آپ تک اطلاع پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے پولیس آفیسر سے لڑکی کی حفاظت کے لیے برن وارڈ کے باہر سپاہی تعینات کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ اس نے میری بات مان لی ہو گی۔'' اشرف نے بہت ہمت کر کے پورا قصہ سنا دیا تھا لیکن اس کی نقاہت زدہ آواز بتا رہی تھی کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔

''او کے جوان! تم نے اپنا کام کر دیا۔ اب دل بھر کر آرام کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔'' ذیشان نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہریار بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا اور حیرت زدہ تھا کہ اس کی کسی کوشش سے قبل ہی کس طرح ماریہ کے لیے اذیت ناک سزا کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

''تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟ وہاں کیا ہوا ہوگا؟'' کمرے سے نکل کر برن وارڈ کی طرف جاتے ہوئے ذیشان نے اس سے اس کی رائے جاننی چاہی۔

''میرے خیال میں ماریہ سے کام لینے والوں کو کسی طرح بازی پلٹنے کی خبر ہوگئی تھی۔ ہو سکتا ہے ماریہ کی کرنل توحید کے ساتھ موجودگی کے دوران وہ ایسا کوئی آلہ استعمال کر رہے ہوں جس کی مدد سے وہاں ہونے والی گفتگو سنی جا رہی ہو۔ اسی لیے مسز جوزف بھی ہوٹل سے غائب ہوگئی اور کچھ لوگوں نے شاید ماریہ کو چھڑانے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ انہیں ناکامی ہوئی ہے تو پٹرول ٹینکی میں گولیاں مار کر ماریہ کی موت کا انتظام کر گئے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن معلوم نہیں کچھ بتانے کے لائق بھی ہے یا نہیں۔'' اس نے حالات کا تجزیہ پیش کر دیا۔

''میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ اب اللہ کرے کہ وہ اس قابل ہو کہ ہمیں کچھ کام کی باتیں بتا سکے۔'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے خواہش ظاہر کی۔ جواباً وہ خاموش رہا لیکن ظاہر ہے اس کی بھی یہی خواہش تھی۔

''اِز ایوری تھنگ او کے؟'' آئی سی یو پہنچ کر اپنے آدمی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ذیشان نے پوچھا۔

''یس سر! لیکن پولیس والوں سے پتہ چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے یہاں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کسی آدمی نے ڈیوٹی نرس کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ اس کا دیا ہوا انجکشن مریضہ کو لگا دے تو بدلے میں اسے بھاری رقم ملے گی۔ نرس ڈر گئی اس لیے اس نے اس آدمی کو انکار کر دیا اور یہاں موجود پولیس والوں کو اطلاع دے دی۔ اس اطلاع پر نرس کی مدد سے اس مشکوک آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہ آ سکا۔'' انہیں جو کچھ سننے کو ملا، اس سے ظاہر تھا کہ ماریہ کے سر پر ست موت کا تحفہ لیے سائے کی طرح اس کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

''بی کیئر فل۔ جب تک ہم اس کا بیان حاصل نہیں کر لیتے اس کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ چاہو تو کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا لو۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اندر پرندہ بھی پَر نہ مار سکے۔'' سخت لہجے میں کہتا ہوا ذیشان اسے ساتھ لیے اندر گھس گیا۔ اندر ڈاکٹر اور ایک نرس موجود تھی۔

''میں اسپیشل برانچ سے ہوں اور مجھے مریضہ کا بیان لینا ہے۔'' ڈاکٹر کو اپنا کارڈ پیش کرتے ہوئے ذیشان نے اس سے کہا۔

''میں آپ کو چند منٹ سے زیادہ اجازت نہیں دے سکتا۔ مریضہ ہوش میں ہے لیکن اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اتنی شدید تکلیف میں اسے زیادہ بولنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔'' ڈاکٹر نے شاید اس کا کارڈ دیکھ کر ہی بادل ناخواستہ انہیں بیان لینے کی اجازت دے دی تھی لیکن واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آ رہی ہے۔

''زیادتی کرنے والوں کو کبھی نہ کبھی خود بھی زیادتی برداشت کرنی پڑتی ہے ڈاکٹر صاحب! بہر حال، آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب آپ ہمیں ہمارا فرض ادا کرنے دیں۔ ذیشان نے ایک طرح سے ڈاکٹر کو وہاں سے جانے کا اشارہ دیا اور خود بیڈ پر دراز ہو کر ماریہ کی طرف متوجہ ہوا۔ شہریار پہلے ہی اس طرف متوجہ تھا۔ سوختہ حال ماریہ کے جسم کو کچھ ایسی ترکیب سے ڈھانپا گیا تھا کہ جسم کو ڈھانپنے والی چادر اس کے جسم سے چپکی نہیں ہو رہی تھی۔ اور صرف چہرہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کا بایاں رخسار بُری طرح جھلسا ہوا تھا اور بھویں غائب تھیں۔ ہونٹوں پر اب تک موجود سرخ سرخی نے اس ہیئت کذائی کے ساتھ مل کر اسے کسی خون آشام بلا کا سا روپ دے دیا تھا۔ اس حُسن کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں تھا جس کے زور پر وہ جانے کتنوں کو فتح کرتی رہی تھی۔

''مسٹر شہریار کو میرے ساتھ دیکھ کر تم یہ بات تو اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی کہ تمہارا بھانڈا پوری طرح سے کھل چکا ہے اور تمہیں کہیں سے کوئی تحفظ نہیں مل سکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی جاؤ۔'' ذیشان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

''تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں اُگلوا سکو گے۔ یہ بات تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ جتنی شدید تکلیف میں، میں اس وقت ہوں، اس سے زیادہ اذیت تم مجھے نہیں دے سکتے۔ اگر کوشش کی تو میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔'' یقینی طور پر وہ بے پناہ تکلیف میں تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے بری طرح جھلسے ہوئے جسم پر وہ آخر اور کیا تشدد کر سکتے تھے۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ اس کے چھالوں پر نمک چھڑک دیا جاتا لیکن ظاہر ہے کہ اس عمل سے وہ اتنی اذیت محسوس کرتی کہ فوری طور پر مر بھی سکتی تھی۔ پھر یہ کہ اس ترکیب سے وہاں جو شور مچتا، وہ الگ مسائل کا سبب بنتا۔ ملاقات کے لیے چند منٹ سے زیادہ کی اجازت نہ دینے والا ڈاکٹر تو ہنگامہ مچا دیتا اور پھر یہ میڈیا کا دور تھا۔ میڈیا والے تو ویسے ہی ہر جگہ اپنی ناک گھسانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس معاملے کی حساس نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی بے وقوف رپورٹر چٹ پٹی اسٹوری بھی بنا سکتا تھا۔

ذیشان نے لحظہ بھر ان مسائل کے بارے میں سوچا اور پھر دروازے پر جا کر اپنے آدمی سے بولا۔ ''سوڈیم پینٹوتھل منگوا لو۔ ہم اس کا استعمال کریں گے۔''

''آپ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ مریضہ کی حالت پہلے ہی بہت خراب ہے۔ وہ اپنی جان سے بھی جا سکتی ہے۔'' ڈاکٹر شاید آئی سی یو کے باہر ہی منڈلا رہا تھا۔ ذیشان کا حکم سن کر اس نے فوراً احتجاج کیا۔

''تم ہمیں کسی بات سے نہیں روک سکتے۔ میرا کارڈ دیکھ کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمیں ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔'' ذیشان نے اسے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے تختی سے بولا۔



''لیکن یہ غیر انسانی سلوک ہے۔ بے شک یہ عورت کوئی مجرم ہو گی لیکن اس وقت یہ ایک مریضہ ہے جسے بہترین طبی امداد پہنچانا ہمارا فرض ہے۔'' ڈاکٹر پر فرض شناسی کا دورہ پڑا ہوا تھا اس لیے وہ اعتراض سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''انسانی سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، درندوں کے ساتھ نہیں۔ یہ عورت کتنے بھیانک جرائم میں ملوث ہے، تمہیں اندازہ نہیں اگر ہم اس کی جان لے بھی لیں تو ان بے شمار لوگوں کے خون کی تلافی نہیں ہو سکتی جن کی جانیں اس کی وجہ سے گئی ہیں۔ ویسے بھی یہ موت کے قریب ہے۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو ہو سکتا ہے طبعی موت مر جائے۔ ورنہ اس کے اپنے ساتھی تو گھات لگائے بیٹھے ہی ہیں۔ اسے مروانے کی ایک کوشش تو کی ہی جا چکی ہے۔ اب کیا تم اس بات کے منتظر ہو کہ وہ ہسپتال کے اس حصے کو ہی اُڑا ڈالیں؟'' ذیشان نے تلخی سے جواب دیا۔

''پھر بھی ایک ڈاکٹر کس طرح یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے اس کی مریضہ کو.....'' ڈاکٹر منمنایا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ شہریار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سی ایف پی کے اہلکار ہاتھ میں کسی محلول سے بھری چھوٹی سی بوتل اور سرنج لیے کھڑا تھا۔

''ایک شیشی گاڑی میں موجود میڈیکل باکس میں ہی موجود تھی اس لیے مجھے آفس سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔'' اس نے سرنج اور بوتل تھماتے ہوئے بتایا۔

''او کے! ذرا تم اس ڈاکٹر کو سنبھالو۔ ہم اپنا کام کر لیں۔'' ذیشان فوراً ہی مصروف ہو گیا۔

''یقیناً تم اس کے اثر سے واقف ہو گی؟'' محلول سرنج میں بھر کر وہ ماریہ کے قریب گیا اور اس کا جھلسا ہوا بازو چادر سے باہر نکالا۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی حالت اتنی بُری تھی کہ ذرا سی حرکت پر ٹوہی کراہ اُٹھی اور بے بس ہو کر مغلظات بکنے لگی۔ ذیشان نے اَن سنی کر کے سُوئی اس کے بازو میں چبھو دی۔

''عام طور پر منجھے ہوئے سیکرٹ ایجنٹس کو اس کا زیادہ ڈوز دینا پڑتا ہے لیکن اس کی خراب حالت کی وجہ سے میں نے بہت معمولی ڈوز دیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے لیے اتنی مقدار کافی ہو گی۔'' وہ شہریار کو آگاہ کرنے لگا البتہ نظریں ماریہ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ فی الحال اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ جلد آنکھیں کھول دے گی۔ شہریار خاموشی سے لیکن دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کافی عرصے سے ان ملک دشمنوں کے خلاف برسر پیکار ہونے کے باوجود اس کے لیے یہ طریقِ کار نیا تھا کیونکہ بہر حال وہ کوئی تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ نہیں تھا اور سی ایف پی کے ساتھ اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

آخر ماریہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں شعور کی کوئی رمق نہیں تھی اور دھندلاہٹ سی اتری ہوئی تھی۔

''تمہارا اصل نام کیا ہے؟'' ذیشان نے سوالات کا آغاز کیا۔

''کلارا اینڈرسن۔'' اس نے خوابیدہ سے لہجے میں جواب دیا جسے سن کر وہ لوگ چونک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اصلاً ہندو ہو گی لیکن اس کا جواب تو کچھ اور ظاہر کر رہا تھا۔

''تمہیں ''را'' کے لیے کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''دورانِ تعلیم ہی میں نے ان کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ممی اس سے بھی پہلے سے ان کے لیے کام کر رہی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''ہم یہودی ہیں۔'' اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

''پھر تمہیں ''را'' میں کیسے شامل کیا گیا؟'' ذیشان نے اضطراب سے پوچھا۔

''میری ممی کے سیکنڈ شوہر ایک ہندو تھے اور ''را'' کے لیے کام کرتے تھے۔ انہی کی وجہ سے پہلے ممی کو وہاں کام کرنے کا موقع ملا اور پھر میں بھی شامل ہوگئی۔''

''خود تمہارے والد یہودی تھے؟''

''ہاں۔'' اس نے تصدیق کی۔

''یعنی تم خود بھی ایک یہودی ہو۔ پھر تم نے ہندوؤں کی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرنا کیوں قبول کیا؟''

''عظیم اسرائیل کے مفاد کے لئے۔ میری ممی نے اپنے پہلے شوہر کے مرنے کے بعد انیل مکرجی سے شادی کی ہی اس لیے تھی کہ وہ جانتی تھیں کہ انیل مکرجی ''را'' کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں رہ کر ''را'' کے لیے کام کرتا ہے۔'' انہیں اس سے تفتیش تو دوسرے پہلو پر کرنی تھی لیکن ابتدا ہی میں گفتگو کچھ ایسے رخ پر چلی گئی تھی کہ حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے۔

''یعنی تمہاری ممی حقیقت میں ''موساد'' کی ایجنٹ ہیں اور تم بھی؟'' ذیشان نے فوراً نتیجہ اخذ کرلیا۔

''ہاں۔'' جواب دیتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔

''یہ اپنے حواسوں میں واپس آ رہی ہے۔ اسے مزید ڈوز دینی پڑے گی۔'' ذیشان بڑبڑایا اور پہلے کے مقابلے میں ذرا زیادہ دوا اس کے بازو میں انجیکٹ کردی۔

''تم ماں بیٹی ڈبل ایجنٹ بن کر رہ رہی ہو اور ''را'' کے ساتھ تمہارا معاملہ اس لیے چل رہا ہے کہ دونوں ہی طرف کے لوگ پاکستان کے دشمن ہیں؟''

''ہاں، ہم مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہر صورت انہیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''اس مقصد کے لیے تمہاری کیا حکمتِ عملی ہے؟'' ذیشان نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تمہارے لوگوں کے ذہنوں کو برباد کردیں گے۔ ہم نے تمہارے ملک میں نشے اور اسلحے کی وبا اس بری طرح پھیلا دی ہے کہ اب تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کردو گے۔ ''را'' کے تعاون سے ہم نے تمہارے کئی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں اپنے ایسے ایجنٹس پھیلا دیئے ہیں جو ناپختہ ذہنوں میں بغاوت کا بیج بو کر انہیں دہشت گرد بنا رہے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں یہ شدت پسند تمہارے ملک کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ تم دنیا میں اتنے بدنام ہو جاؤ گے کہ عالمی برادری تمہاری دشمن بن جائے گی۔ خاص طور پر طرّم خان بننے والا امریکہ جو پہلے ہی تمہارا دوست نہیں، اور بھی دشمن بن جائے گا۔'' وہ فخر سے بتاتی جا رہی تھی۔

''کیسے؟'' ذیشان نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

''جب تمہارے ہاں سے بھاری مقدار میں وہاں ہیروئن سپلائی کی جائے گی تو وہ کیسے تمہیں بخشے گا؟''

''امریکہ تو تمہارا سب سے بڑا سپورٹر ہے پھر تم لوگ وہاں کیوں ہیروئن پھیلا رہے ہو؟''

''اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے۔'' یکدم ہی اس کی آواز ڈوبنے لگی اور تنفس بے ترتیب ہونے لگا۔

ذیشان نے لب بھینچ لیے پھر ڈاکٹر کی طرف مڑا۔

''اسے دیکھو ڈاکٹر!'' ڈاکٹر پہلے ہی ماریہ جو کہ اصل میں کلارا اینڈرسن تھی کی حالت دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا، اس نے جلدی سے اسے آکسیجن ماسک لگایا اور پہلے سے جاری ڈرپ کے کینولا میں ہی دو تین



انجکشن پے در پے داخل کردیئے۔ ذرا دیر کے لیے لگا کہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے اور سانس ہموار ہوتی جا رہی ہے لیکن پھر اچانک ہی اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا اور ڈاکٹر کی کوششوں کے باوجود وہ ایک ڈیڑھ منٹ کے دورانیے میں ساکت ہوگئی۔

''شی از نو مور۔'' ڈاکٹر نے پلٹ کر مایوسی سے بتایا۔

''مجھے اندازہ تھا۔ اس حالت میں اگر اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو دو منٹ بھی ہمارے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتی تھی لیکن یہ کلارا اینڈرسن تھی، ''موساد'' کی وفادار رہ کر ''را'' کے لیے کام کرنے والی ڈبل ایجنٹ۔ اس کے اعصاب عام عورتوں کے مقابلے میں بہت مضبوط تھے جو یہ اتنا بھی جی گئی۔'' ڈاکٹر کی بات سن کر ذیشان نے تبصرہ کیا پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے امید ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس عورت سے انسانیت کی عمومی قدروں سے ہٹ کر اس طرح پیش آنا کیوں ضروری تھا۔ اگر یہ ہمیں کچھ بھی بتائے بغیر مر جاتی تو یہ ملک و قوم کے حق میں کسی صورت مناسب نہیں ہوتا۔ اب بھی یہ بہت سے راز اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ اس عورت سے حب الوطنی کا سبق سیکھنا اور جو کچھ سنا اسے بالکل بھول جانا۔ اگر اس کمرے میں ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! میں اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہوئے اس گفتگو کو ہمیشہ راز رکھوں گا۔'' ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا پھر خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔ ''ڈیڈ باڈی کا کیا کرنا ہے؟ کیا اسے آپ کے لوگ اپنے ساتھ لے جائیں گے؟''

''اس لاش کو لاوارث لاشوں میں شامل کردو۔'' ذیشان کے جواب دینے سے قبل شہریار نے سرد مہری سے جواب دیا تو اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا کر اس کے فیصلے کی توثیق کردی۔ زبردستی اس کی زندگی میں شامل ہونے والی اس دھوکے باز عورت کا یہی انجام مناسب تھا۔

⊛----✪----⊛

''کلارا تو اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گئی ہے۔ اس سے ہمیں یہ تو معلوم ہوگیا کہ ''موساد'' والے ''را'' کی مدد سے یہاں کیا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمیں اس سے ان کے طریقِ کار اور خاص آدمیوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اشیش کمار سے بھی ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ اتنی بارآور ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے جن ٹھکانوں کے بارے میں بتایا تھا، وہ خالی پڑے ہیں۔ مسلسل ہاتھ پیر مارنے کے باوجود ہمارے آدمیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔'' وہ دونوں ذیشان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ذیشان کے لہجے میں شدید افسوس تھا۔

''میرے خیال میں اگر ہم تھوڑی احتیاط سے کام لیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ کلارا کو صرف ایک آدمی کے ساتھ یہاں بھیجنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔ اگر اشرف کو کور دینے کے لیے کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہوتے تو حملہ آوروں سے بہتر طریقے سے نمٹا جا سکتا تھا۔'' شہریار نے خیال آرائی کی۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کرنل صاحب کو خود بھی افسوس ہے کہ انہوں نے عجلت میں یہ قدم اٹھا لیا۔ بس اس وقت ان کے ذہن میں یہ تھا کہ جلد از جلد لڑکی کو ہماری تحویل میں پہنچا دیا جائے۔'' ذیشان خود کفِ افسوس مل رہا تھا۔

''گھر کی تلاشی لینے پر بھی کچھ نہیں ملا؟''

''ہاں، وہ گھر صرف ہفتے بھر پہلے اسٹیٹ ایجنسی کی مدد سے کرائے پر لیا گیا تھا اور کرائے پر لینے والے نے اپنے جو کوائف ظاہر کیے، وہ جعلی ثابت ہوئے ہیں۔ ابھی رات بیتی نہیں تھی لیکن سی ایف پی والوں نے تیزی سے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ رات گئے تک کھلی رہنے والی اسٹیٹ ایجنسی سے معلومات حاصل کر کے ان کی تصدیق کا کام بھی کر چکے تھے۔''

''ایسا تو ہونا ہی تھا۔ دنیا کا کوئی بھی سیکرٹ ایجنٹ کوشش کرتا ہے کہ اپنے پیچھے کوئی کلیو نہ چھوڑے۔ یہاں تو ''را'' کے ساتھ ساتھ ''موساد'' کے ایجنٹ بھی برسرِ پیکار تھے۔'' شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہاں، ''موساد'' والے ''را'' کے ایجنٹس سے کہیں زیادہ ذہین اور بہادر ہوتے ہیں۔ کلارا کی جامہ تلاشی سے حاصل ہونے والا سامان اگرچہ گاڑی کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی جیولری وغیرہ کی آڑ میں خودکشی کا کوئی سامان اور حساس مائیکروفون ضرور ہو گا جب ہی تو اس کی ماں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا..... اور کلارا کو بھی چھڑانے اور ناکامی کی صورت میں مروانے کی کوشش کی گئی۔''

ذیشان نے اس کی تائید میں دلیل پیش کی پھر ذرا پُرخیال انداز میں بولا۔ ''شہریار!..... میں ایک پوائنٹ پر غور کر رہا ہوں۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ ان لوگوں نے تم پر اتنی خاص نظر رکھنا ضروری سمجھا کہ کلارا سے تمہاری شادی ہی کروا ڈالی؟''

''میں انجانے میں ان کی راہ پر لگ گیا تھا۔ نور پور میں ہونے والے بم بلاسٹ کے بعد میں نے اللہ آباد کے اس مدرسے کو دریافت کر لیا تھا جہاں ''را'' کا ایک ایجنٹ شاہنواز کے روپ میں گاؤں کے معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی برین واشنگ کر رہا تھا۔ پھر میں ورما تک بھی جا پہنچا تھا اور اشیش کمار کی گرفتاری میں بھی میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ شامل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ آخر اس علاقے میں وہ لوگ اتنے سرگرم کیوں ہیں؟ کلارا تو چلو تمہاری نگرانی کر رہی تھی لیکن اس کی ماں کیوں پیر آباد میں رہ رہی تھی؟ وہ کلارا سے کہیں زیادہ سینئر اور منجھی ہوئی ایجنٹ تھی پھر اسے کیوں ایک گاؤں میں ڈال دیا گیا؟ اسکول میں ٹیچنگ کے ذریعے بچوں کے ذہنوں کی برین واشنگ کرنے والا کام بھی مجھے اس کے اسٹینڈرڈ کا نہیں لگتا۔ پیر آباد میں یقیناً کچھ اور بھی خاص بات ہے جو سنتھیا جوزف وہاں موجود تھی۔'' ذیشان کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پیر آباد میں تو چودھری افتخار کا ہی سکّہ چلتا ہے بلکہ وہ اتنا بااختیار ہے کہ اردگرد کے دیہاتوں کے دوسرے چودھری بھی اس سے دبتے ہیں۔ میری اصل جنگ تو شروع ہی چودھری سے ہوئی تھی۔ میں اس کے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہوا تھا اور پھر پتہ نہیں کیسے یہ ''را'' اور ''موساد'' کا چکر شروع ہو گیا۔'' وہ خود بھی اُلجھنے لگا۔

''ایک منٹ..... ایک منٹ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چودھری خود بھی درونِ خانہ ان ملک دشمن ایجنٹوں سے ملا ہوا ہو؟ تم نے کلارا کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کلارا کو تم تک پہنچانے میں چودھری کا پورا ہاتھ تھا۔ بظاہر تمہیں اپنی مظلومیت کی کہانی سنا کر تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے والی کلارا شاید شروع ہی سے چودھری سے تعاون کر رہی تھی یا پھر یہ کہ چودھری اس سے تعاون کر رہا تھا اور اصل منصوبہ اسی کا تھا۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے گرد بہت خوب صورتی سے جال بُنا گیا۔ تمہاری نیچر کے بارے میں تو چودھری شروع میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ تمہیں کسی بازاری عورت کے ذریعے قابو میں نہیں کیا جا سکتا اس لیے انہوں نے تمہیں شادی کے جال میں پھانس کر اپنی ایک اہم ایجنٹ کو تمہارے قریب کر دیا تاکہ تمہارے ہر عمل



پر نظر رکھ سکیں۔ اب تم غور کرو کہ تمہاری وجہ سے چودھری کو کہاں کہاں رکاوٹ کا سامنا تھا اور اپنی شادی کے بعد کن معاملات سے تمہاری نظر ہٹ گئی۔'' ذیشان بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا، خود وہ بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

''بنیادی طور پر میرے چودھری سے دو ہی اختلافات ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ خاص طور پر تعلیم کا سخت مخالف ہے۔ دوسرے میں نے سابقہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی کے گٹھ جوڑ سے کی جانے والی لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ پر سخت پہرہ لگوا دیا ہے۔ موجودہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی دونوں ہی پہلے والوں سے بہت بہتر ہیں اس لیے چودھری کا دھندا ٹھپ ہو گیا ہے۔'' سوچتے ہوئے اس نے چودھری سے اپنے اختلافات کی وجوہات بیان کیں۔

''نہیں یار! یہ دونوں ہی پوائنٹ ایسے نہیں ہیں جن کی وجہ سے موساد والے تمہاری راہ پر لگ جائیں۔ تعلیم اور ترقی کے معاملے میں چودھری کا جو رویّہ ہے، وہ ہمارے جاگیرداروں کے ہاں عام ہے۔ رہی اسمگلنگ والی بات تو لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ سے بھی ''را'' یا ''موساد'' جیسی ایجنسیوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ یہ سارے ہمارے اندرونی مسائل ہیں جو ہر جگہ ہیں۔ اس لیے بالخصوص تمہارے علاقے میں ان کے سرگرم ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔'' ذیشان نے دونوں ہی پہلوؤں کو فوراً رد کر دیا۔

''بات تمہاری بھی صحیح ہے لیکن اگر چودھری کے ''را'' یا ''موساد'' میں سے کسی سے روابط ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ بے شک چودھری کا اعلیٰ افسران میں اُٹھنا بیٹھنا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کی ایسے اہم ملکی رازوں تک پہنچ ہو گی جن سے کسی غیر ملکی خفیہ ایجنسی کو دلچسپی ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہے تو اس صورت میں تو انہیں بالکل بھی مجھے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا تاکہ جو کام خاموشی سے چل رہا ہے، وہ چلتا رہے۔'' اس نے فوراً قائل ہوتے ہوئے خود ہی صورتِ حال کا تجزیہ کیا۔

''یہ ملکی راز اِدھر سے اُدھر کرنے والا معاملہ نظر نہیں آتا۔ اگر تم کلارا کی باتوں کو یاد کرو تو ہمیں ان کے تین پہلو نظر آتے ہیں۔ کسی بھی قسم کی تعلیم کے ذریعے ذہنوں کی برین واشنگ کرنا۔ ہیروئن کے پھیلاؤ اور اسلحے کے ذریعے دہشت گردی کا فروغ۔ اور دیکھا جائے تو ان تینوں طریقوں سے بھی وہ ایک ہی ہدف حاصل کر رہے ہیں..... ہماری یوتھ کو ناکارہ بنانا۔ اب اگر ہم ان معاملات میں چودھری کے کردار کو دیکھیں تو صرف وہ ایک اکیلا ہی کیا، اس کے دوسرے بھائی بند بھی اپنی رعایا کو جدید تعلیم سے محروم رکھ کر پہلے ہی ان سے تعاون کر رہے ہیں۔ چودھری اگر ان سے تعاون کر سکتا ہے تو ہیروئن اور اسلحے کے پھیلاؤ کے سلسلے میں۔ اور اب تک ان دونوں معاملات میں اس کے ملوث ہونے کی کوئی سن گن نہیں ملی ہے۔ اس لیے فی الحال ہم اس امکان کو بھی نظر انداز دیتے ہیں۔ ویسے بھی جہاں تک میں سمجھا ہوں، چودھری کو جو بھی اہمیت ہے، وہ علاقے کے حوالے سے ہے اور تم وہ واحد بااثر شخص ہو جو اختیارات کے معاملے میں چودھری سے ٹکر لے سکتے ہو اس لیے وہ تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''اور علاقے میں سب سے اہم شے ہے پیر آباد سے متصل جنگل۔'' وہ خود بھی ذیشان کے تجزیے میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

''بالکل صحیح..... اور اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہاں جنگل میں ایسی کیا خاص بات ہے جو ''موساد'' والے براہِ راست دلچسپی لے رہے ہیں۔ کلارا کی ماں جس کا نام ہم فی الحال سنتھیا جوزف ہی مان لیتے ہیں، پیر آباد میں آخر کس لیے سکونت پذیر تھی؟ وہاں ایسا کیا ہو رہا ہے کہ ''موساد'' کی ایک ایجنٹ کی وہاں مستقل موجودگی کو

ضروری سمجھا گیا؟'' ذیشان نے سوالات اٹھانے شروع کیے تو اس کا ذہن بھی کھلتا گیا اور یہ بات بھی یاد آ گئی کہ جب وہ اقبال باجوہ کی جگہ کسی ایمان دار فاریسٹ آفیسر کی تقرری کے لیے کوشاں تھا تو اسے ماریہ نے ہی عابد انصاری کا نام تجویز کیا تھا۔ موجودہ حالات میں سوچا جا سکتا تھا کہ بظاہر ذمے دار اور ایمان دار آفیسر نظر آنے والا عابد انصاری انہی کا ایجنٹ ہوگا۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔

''تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔ اب ہمیں اتنا کرنا ہے کہ عابد انصاری کی خفیہ نگرانی کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے تعاون سے مخبروں کا ایسا جال بچھا دیں جو ہمیں اندر کی خبر لا کر دے سکیں۔ اس سلسلے میں تم ہی زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو اس لیے کہ تمہارے مقامی آبادی میں روابط ہیں۔'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کر دیا۔

''ڈونٹ وری۔ میں یہ معاملہ سنبھال لوں گا۔ اب میرا یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے کہ کس طرح میرے راز لیک آؤٹ ہو رہے تھے اس لیے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ کانفیڈنٹ ہوں۔'' اس نے ذیشان کو تسلی دی تو وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''چلو یہ معاملات تو طے پا گئے۔ بہتر ہے کہ کچھ دیر نیند لے لی جائے۔ صبح پھر تمہیں روانہ ہونا ہوگا اور مجھے بھی باقی کی بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔''

شہریار نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ اس کمرے تک لے گیا جہاں وہ کچھ گھنٹے قبل بھی موجود تھا اور خود کو ماہ بانو کی شادی کے صدمے سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کہاں جانتا تھا کہ چند گھنٹوں بعد خود اس کی اپنی شادی شدہ زندگی ختم ہو جائے گی اور اسے ایک اور بڑے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔

''ایک بات پوچھوں شہریار؟'' کمرے کے دروازے پر رک کر ذیشان اس سے مخاطب ہوا تو وہ زبان سے کچھ کہے بغیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے لیکن میں صرف اس وجہ سے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ ایک دوست کی حیثیت سے اگر تمہیں ضرورت محسوس ہو تو میں تمہاری مدد کر سکوں۔'' وہ سوال کرنے سے جھجک رہا تھا اس لیے تمہید باندھی۔

''کیا تم ماریہ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟'' شہریار نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

''ہاں، ہم نے اسے لاوارث لاشوں میں شامل تو کروا دیا لیکن ظاہر ہے لوگ اسے تمہاری بیوی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ تم اس کے اچانک غائب ہو جانے کی کیا وضاحت دو گے؟''

''تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟'' اس نے ذیشان کو غور سے دیکھا۔

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ تم اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی تسلی کے لیے یہ کہہ سکتے ہو کہ ماریہ کا ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ماں کی خواہش پر اس کی تدفین پاکستان کے بجائے امریکہ میں کی جائے گی۔ اس طرح تم ماں بیٹی کی عدم موجودگی کا جواز پیدا کر سکو گے۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ماریہ کے مرنے کی خبر پھیلا دی تو میرے گرد افسوس کرنے والوں کا ہجوم لگ جائے گا اور مجھے اس عورت سے اتنی نفرت ہے کہ میں اس کے لیے خود کو جھوٹ موٹ بھی افسردہ ظاہر نہیں کر سکتا۔'' اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

''پھر..... اس کے علاوہ کیا کرو گے تم؟''



''میں بتا دوں گا کہ میں نے ڈاکٹر ماریہ کو ذاتی وجوہات کی بنا پر طلاق دے دی ہے اور وہ طلاق کے بعد اپنی ماں کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد کسی میں یہ جرأت نہیں ہوگی کہ مجھ سے طلاق کی وجوہات دریافت کر سکے۔'' وہ بڑے بے تاثر لہجے میں اپنا پروگرام بتانے لگا جس سے ذیشان کو اندازہ ہوا کہ سارا وقت اس کے ساتھ مصروف رہنے کے باوجود اس کا ذہن اپنے مسئلے کے حل کے لیے بھی سوچتا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم مناسب سمجھو۔'' وہ اس کا شانہ تھپک کر واپس مڑ گیا تو شہریار بھی اندر جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر پر لیٹ کر گھڑی پر نظر پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ صبح ہونے ہی والی ہے۔ اسے خیال آیا کہ گزری رات میں اس کے علاوہ یقیناً ماہ بانو نے بھی رت جگا ہی منایا ہوگا لیکن فرق اتنا تھا کہ وہ آباد ہوئی تھی اور وہ خود برباد..... لیکن اس کے لیے ماہ بانو کی آبادی اپنی بربادی سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ دل میں ایک اطمینان سا محسوس کرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور حیرت انگیز طور پر نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شاید اس لیے کہ آج وہ ایک بوجھ کی طرح زندگی میں شامل رہنے والے رشتے سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

سنتھیا جوزف کسی زخمی شیرنی کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے اس کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہوئے گزری تھی۔ وہ برسوں سے اپنے عزیز و اقارب سے کٹ کر اپنے وطن سے اتنی دور تھی۔ اپنے عزیز شوہر اینڈرسن کی موت کے بعد دلی جذبات کے برخلاف ''را'' کے ایک ایجنٹ سے شادی کرنا اور پھر ''را'' میں اپنے لیے جگہ بنانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ کئی بار اپنی آبرو کی قربانی بھی دے چکی تھی۔ ایک عام عورت جیسی معمولی نوعیت کی لیکن انمول خوشیاں تو کبھی اس کا مقدر بن ہی نہیں سکی تھیں۔ سیکرٹ ایجنٹ کی زندگی نے اس سے ایک گھریلو عورت کا سکھ چھین لیا تھا لیکن وہ پھر بھی خوش تھی کہ وہ اپنے وطن کے لیے کچھ کر رہی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے دل میں بھی اسرائیل کی محبت پروان چڑھائی تھی چنانچہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معاون و مددگار بھی بن گئی تھی۔

کلارا کو اپنے ڈھب سے پالنے میں اسے اس لیے مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس کا دوسرا شوہر انیل مکرجی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے عموماً گھر سے دور ہی رہتا تھا پھر شادی کے صرف پانچ سال بعد وہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا تو اس کی راہ کی ہر دیوار ہٹ گئی۔ انیل مکرجی چونکہ پاکستان میں جوزف کے نام سے عیسائی بن کر رہ رہا تھا، اس لیے اسے مسز سنتھیا جوزف کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جبکہ اپنی بیٹی کلارا اینڈرسن کو اس نے ہر جگہ ماریہ جوزف کا ہی نام دیا تھا۔ کاغذات کی رُو سے وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی لیکن سنتھیا نے اپنے بڑوں سے وعدہ لے رکھا تھا کہ جب بھی ماریہ اسرائیل واپس جانے کی خواہش کرے گی، اسے وہاں کلارا اینڈرسن کے نام سے شہریت دے دی جائے گی۔

اپنی زندگی کے خشک تجربے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کلارا کو طویل عرصہ وطن سے دور رہ کر جاسوسی کرنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ چند سال میں اسرائیل واپس بھیج کر وہاں کسی معقول شخص سے اس کی شادی کروا دے گی۔ اس نے بہت سال کام کیا تھا اور آنے والے وقت میں ریٹائر ہو کر اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ زندگی کا لطف لینا چاہتی تھی لیکن اس کا ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ کلارا کے دنیا میں نہ رہنے سے اس کے لیے آنے والے کل کے لیے کوئی پلاننگ، کوئی خوشی باقی نہیں رہی تھی اور یہ دکھ اس کے لیے ناقابل

برداشت تھا۔

''بیٹھ جاؤ سنتھیا! تمہارے اس طرح ٹہلنے سے ماریہ واپس نہیں آئے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن ایسا تو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم جو کام کر رہے ہیں، اس میں جان کی بازی ہارنے کا سب سے زیادہ ڈر رہتا ہے۔'' اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ورما کچھ دیر تو اسے ٹہلتا ہوا دیکھتا رہا لیکن پھر ٹوکنے پر مجبور ہوگیا۔ اسے سنتھیا اور ماریہ کی ''موساد'' سے وابستگی کا قطعی علم نہیں تھا لیکن ''را'' کی ایجنٹس کے علاوہ ان کے ماں بیٹی ہونے سے بہرحال واقف تھا۔

''ماریہ کے واپس آنے کا تو میں تب سوچوں گی جب مجھے اس کے چلے جانے کا یقین آئے گا۔ مجھے بتاؤ ورما! کہ میری بیٹی کیسے مرگئی؟ میں نے تمہارے کہنے پر اسے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا تو کیا تمہارا فرض نہیں بنتا تھا کہ اس کی پروٹیکشن کا بھی خیال رکھتے۔ وہ اتنے اہم مشن پر تھی اور تمہارا کوئی آدمی اسے کور دینے کے لیے قرب و جوار میں موجود نہیں تھا۔ کرنل کے اس کی اصلیت جان لینے کے بعد اس گھر سے روانہ ہونے تک تمہیں اتنی مہلت ملی تھی کہ اگر تمہارے آدمی کہیں نزدیک میں ہوتے تو اٹیک کر کے ماریہ کو چھڑا سکتے تھے۔ لیکن تم نے تو میری بچی کو موت کے منہ میں اکیلا ہی چھوڑ دیا تھا۔'' وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور ٹیبل پر ایک ہاتھ ٹکاتے ہوئے غصے سے بولی۔

''مجھے ماریہ کی صلاحیتوں پر پورا وشواس تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ کرنل کو اس طرح قابو کرے گی کہ وہ اس کے آگے بے بس ہو جائے گا۔ لیکن وہاں تو کہانی ہی اُلٹ ہوگئی۔ پھر بھی میں نے جو کچھ کرنا ممکن تھا، وہ کیا۔ میرے آدمی بہت تیزی سے ماریہ کی مدد کے لیے پہنچے تھے اور انہوں نے اس گاڑی کو گھیر بھی لیا تھا۔ انہیں مقابلے میں کامیابی بھی مل جاتی لیکن اسے ماریہ کی بیڈ لک کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو وہاں پولیس موبائل پہنچ گئی اور دوسرے اتفاقاً ہی ایک گولی گاڑی کے پٹرول ٹینک میں لگ گئی۔ مجھے خود اپنی اتنی ذہین ورکر کو کھونے کا دُکھ ہے لیکن میں اس کا نصیب تو نہیں بدل سکتا تھا نا۔'' چہرے پر افسردگی سجائے ورما نے اسے صفائی پیش کی۔ حالانکہ وہ اتنا معصوم نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ماریہ کی مدد کے لیے بھیجتے وقت ہی انہیں یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر وہ ماریہ کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو اسے موت کے گھاٹ اُتار دیں اور اس کی ہدایت ہی ماریہ کی اذیت ناک موت کا سبب بنی تھی۔

''تم نہیں سمجھ سکتے ورما! تم کبھی اس تکلیف کو محسوس ہی نہیں کر سکتے جس سے میں ماریہ کے پکڑے جانے سے لے کر اب تک گزر رہی ہوں۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی وہاں کی آوازیں سن رہی تھی۔ اس کرنل نے بہت چالاکی سے میری بچی کو بے وقوف بنایا تھا۔ میں نے ہوٹل سے فرار ہونے سے بھی پہلے تمہیں ماریہ کی مدد کے لیے کال کر دی تھی لیکن تم نے دیر کر دی اور وہ اتنی بھری جوانی میں موت کے منہ میں چلی گئی۔ اس کی موت کا دکھ ایک طرف، مجھے یہ غم بھی مار رہا ہے کہ میری جان سے بھی پیاری بیٹی ایک لاوارث لاش کی حیثیت سے ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر تم اسے مرنے سے نہیں بچا سکے تو کم از کم اس کی ڈیڈ باڈی تو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس کا لاوارثوں کی طرح دفن ہونا برداشت نہیں کر سکوں گی۔'' اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ پُرزور مطالبہ کر رہی تھی۔

''بے وقوف مت بنو سنتھیا! یہ ایک ٹریپ بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان انٹیلی جنس کے آدمی مُردہ خانے کے اردگرد ہی منڈلا رہے ہوں اور ہم لاش لینے جائیں تو وہ ہمارے آدمیوں کو ہی چھاپ لیں۔ میں ایک لاش کے لیے اپنے جیتے جاگتے قابل آدمیوں کو کسی صورت نہیں گنوا سکتا۔'' ورما نے سختی سے اسے انکار کر دیا



اور وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

یہاں ''موساد'' کے ورکرز اتنی تعداد میں نہیں تھے کہ وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے انہیں حرکت میں لا سکتی۔ عموماً اپنے کاموں کے لیے وہ لوگ ''را'' والوں ہی کو استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی کام راز میں رکھنا ہو تو اس کے لیے کرائے کے آدمی استعمال ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ کرائے کے آدمی استعمال کرتی تو ''را'' والے چونک جاتے کہ اس کا ان کے علاوہ کن لوگوں سے رابطہ ہے اور وہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیونکر کر سکتی ہے۔ پھر یہ رسک تو واقعی تھا کہ جو بھی ماریہ کی لاش لینے جاتا، اس کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ کرائے کے کسی آدمی کی صلاحیتوں پر ایک حد سے زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انٹیلی جنس سے تربیت یافتہ جوانوں کے مقابلے میں ان کی ناکامی کا امکان بہت زیادہ تھا۔ پہلے ہی وہ اپنے اس آدمی کے غائب پر پریشان تھی جسے شہریار کی نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے جو آخری رپورٹ پہنچائی تھی، اس کے مطابق شہریار نورکوٹ سے لاہور کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ آدمی رابطے میں نہیں رہا تھا اور یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پکڑا جا چکا ہے۔ اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہسپتال میں شہریار کو دیکھا گیا تھا۔ وہ کے آخری لمحات میں وہ اس کے کمرے میں تھا اور اس کے بعد اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر مُردہ خانے میں ڈال دیئے جانے کا مطلب تھا کہ بہت سے راز افشا ہو چکے ہیں اور اب تک خود کو انجان ظاہر کر کے وہ انہیں دھوکا دیتا رہا ہے۔

وہ لوگ یہ تو پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ شہریار کو اپنی نگرانی کے لیے استعمال کی جانے والی ڈیوائسز کے بارے میں علم ہوگیا ہے لیکن اس نے اپنے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ماریہ پر شک کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ فکرمند تھی اور سنتھیا کے سامنے تشویش کا اظہار کر چکی تھی۔ سنتھیا نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ جیسے ہی وہ محسوس کرے کہ شہریار اس پر شک کر رہا ہے، فوراً منظر سے غائب ہو جائے لیکن اس معاملے کی تصدیق یا تردید ہونے سے قبل ہی درمیان میں کرنل توحید والا معاملہ نکل آیا اور ماریہ کی کہانی ہی ختم ہوگئی۔ اور یہ تو طے تھا کہ پہلے چاہے شہریار اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوسکا ہو لیکن اب بہت کچھ جان گیا ہوگا۔ اس لیے اسے خود بھی اب اس سے دور رہنا تھا اور اپنے اوپر والوں کو بھی رپورٹ دینی تھی کہ پیرآباد میں رہ کر وہ جو ذمے داریاں نبھا رہی تھی، وہ کسی اور کو سونپ دی جائیں۔

''صبر کرو سنتھیا! ماریہ کی موت کا مجھے بھی افسوس ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکایا جائے گا۔ لیکن ماریہ کی ڈیڈ باڈی سے محروم رہنا ہماری مجبوری ہے۔ اُس کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف کے باوجود ہم اس کی آخری رسومات اعزاز سے انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور یہ بات تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ کسی سیکرٹ ایجنٹ کا ایسا انجام خلافِ معمول نہیں ہے۔ ہم اپنے من میں تو اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا سکتے ہیں لیکن سرِعام اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کر سکتے۔'' اسے خاموش پا کر ورما نے اپنا لہجہ بدلا اور نرمی سے سمجھانے لگا۔ سنتھیا نے یونہی سر ہلا کر اس کی تائید کی پھر ذرا وقفے سے بولی۔

''ورما!..... میں دو بندوں کو اس زمین پر زیادہ عرصے تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایک کرنل توحید اور دوسرا اے سی شہریار عادل۔ میں نے اور میری بیٹی نے عمر بھر جو خدمات اور قربانیاں دی ہیں، ان کے بدلے میں مجھے جلد از جلد ان دونوں کی موت چاہیے۔ اور میرے خیال میں تمہارے لیے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ تمہارے تربیت یافتہ خودکش حملہ آور آسانی سے یہ کام کر ڈالیں گے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ لیکن آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے ہی ممکن ہوا، ہم یہ کام کر گزریں گے۔'' ورما نے شاید اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''موقع ابھی موجود ہے۔ کرنل توحید جس شادی میں شرکت کے لیے آیا ہے، وہاں گھات لگاؤ ورنہ دوسرا موقع نہ جانے کب ملے۔ شہریار کے معاملے میں البتہ تم سہولت سے پلاننگ کر سکتے ہو۔ وہ ایسا ٹارگٹ ہے جو ہمارے سامنے ہے اور ہم کبھی بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اس کا تربیت یافتہ ذہن اپنا کام کر رہا تھا اور وہ پوری مستعدی سے انتقامی کارروائی کا سوچ رہی تھی۔

''تم جلد بازی سے کام لے رہی ہو ستھیا!'' ورما نے اسے ٹوکنا چاہا۔

''نہیں، میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ بروقت ایکشن لینا کتنا ضروری ہے، ورنہ دیر ہو جائے گی۔ پاکستانی انٹیلی جنس کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ''را'' کے کسی ایجنٹ کا خون اتنا ارزاں نہیں ہے کہ انہیں اس کی قیمت نہ چکانی پڑے۔ انہیں اپنے کیے کی بھاری قیمت چکانی ہوگی۔'' وہ بہت ٹھوس لہجے میں بول رہی تھی۔ ورما کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ستھیا کے اوپر تک تعلقات ہیں۔ اگر وہ انکار کر دے گا تو وہ اوپر سے منظوری حاصل کر لے گی۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی تعاون کی ہامی بھر لے۔

⊛----✪----⊛

''ماسی! مجھے کوئی کام دلوا دے۔ منشی جی کی تو حویلی میں وڈی گل ہے۔ چودھری صاب کا تو سنا ہے نوالہ منہ میں نہیں جاتا ان سے مشورہ کیے بغیر۔ وہ سفارش کریں گے تو مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔'' شہزادی کی گود میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور وہ بے خیالی میں بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتی منشی اللہ رکھا کی بیوی سے درخواست کر رہی تھی۔

''دیکھ شہزادی! تیرا ماملہ وڈا نازک ہے۔ پنڈ میں کوئی تیری شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ تُو نے جو حرکت کی تھی اسے کون بھول سکتا ہے؟ ایسے میں، میں تیری سفارش کروں گی تو لوگوں کا دل مجھ سے بھی برا ہو جائے گا۔ تیری خاطر میں سارے پنڈ سے بھلا کیوں بُری ہوں؟'' ماسی نے منہ ٹیڑھا کر کے اسے جواب دیا۔

''میں نے تجھے بتایا ہے نا ماسی! کہ اس ماملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اماں اور بالے نے مجھے مجبور کیا تھا۔ بالا جس ڈبا پیر کے چکر میں پڑ گیا تھا، اسی نے اسے اُلٹی سیدھی پٹی پڑھائی تھی اور اماں میرے سر ہو گئی تھی کہ کسی بھی طرح مُردہ بچے کی ہڈیاں لا کر دے ورنہ ساری حیاتی کے لیے تجھے تیرے بچوں کی شکل سے ترسا دوں گی۔ اب تُو ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بتا کہ کوئی ماں اپنے بچوں کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟ میں نے بھی بہت مجبور ہو کر وہ کام کیا تھا۔ اب تو ویسے بھی ساری گل کھل گئی ہے۔ پولیس والوں نے بھی مجھے بے قصور جان کر چھوڑ دیا ہے۔ فیر پنڈ والے تو میرے اپنے ہیں۔ میں ان کے سامنے بچی سے جوان ہوئی ہور فیر ماں بنی۔ کیا ان لوگوں کو نہیں ملوم کہ شہزادی کوئی بری عورت نہیں ہے۔ مجبوری میں بندے سے غلطی ہو جائے تو اللہ بھی بخش دیتا ہے فیر پنڈ والے کیوں ماف نہیں کریں گے؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر روانی سے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ بولتی جا رہی تھی۔

ٹاہلی والا میں ہونے والی کارروائی نے اس کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف جہاں سائیں کا پول کھلا تھا، وہیں بالے کی ماں بھی شرمسار ہو کر پوتوں کو سینے سے لگائے روتی پیٹتی پیر آباد واپس آ گئی تھی اور رو رو کر گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ جہاں وہ بیٹے کی معذوری دور کرنے کے لیے بڑی آس سے گئی تھی وہاں اس کی زندگی کھو کر آ رہی ہے۔ بالے کی چودھری سے وابستگی کے عرصے میں اس نے جس طرح گاؤں کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رکھا ہوا تھا، لوگ ویسے ہی اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن خوف کی وجہ سے دب کر رہتے



کرنے پر مجبور تھے۔ چودھری نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹایا تو گاؤں والے بھی اس سے بے رخی برتنے لگے۔ اس پر سے شہزادی کے مُردہ بچے کی ہڈیاں قبر سے نکالنے کا واقعہ پیش آ گیا تو بالے کے خاندان سے ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب بالے کی ماں اور شہزادی بچوں سمیت گاؤں واپس تو آ گئے تھے لیکن گاؤں والوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ شہزادی کو حالات سے لڑنے کا کوئی اور حل نہ سوجھا تو وہ گاؤں کی بااثر عورتوں میں سے ایک منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس مدد کی درخواست لے کر پہنچ گئی۔

''اچھا چل میں دیکھوں گی۔ پر ابھی تو تُو عدت میں ہے۔ عدت پوری ہو جائے تو فیر میرے پاس آنا۔ اس وقت مجھ سے جو بن پڑا، کروں گی۔'' اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اس نے ذرا نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کیسی عدت ماسی! گھر میں بچوں کے کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ تُو ہی بتا، مرنے والوں کے ساتھ بھلا کون مرتا ہے؟ ہور زندہ آدمی کے ساتھ تو پیٹ لگا ہوا ہے۔ مجھ سے ہور اپنے بچوں کا بھوک سے بلکنا نہیں دیکھا جائے گا۔ تُو دیکھنا میں پہلے انہیں گلے دبا کر ماروں گی فیر خود بھی نہر میں چھال (چھلانگ) مار کر اپنی جان دے دوں گی۔'' روتے روتے اس نے عزائم کا اظہار کیا تو ماسی گھبرا گئی۔

''کیسی گل کر رہی ہے کُڑیے؟ معصوم جانوں کا کیا قصور ہے جو تُو ان کی جان لے لے گی۔ ذرا صبر سے کام لے۔ منشی جی آتے ہیں تو میں ان سے گل کرتی ہوں۔ وہ تیرے لیے ایسا کوئی کام دیکھیں گے کہ تیرا پنڈ کی عورتوں سے زیادہ سامنا ہی نہ ہو۔ ابھی میں تجھے اپنے پاس سے آٹا اور دال دے دیتی ہوں۔ گھر لے جا کر پکا کر خود بھی کھا اور بچوں کو بھی کھلا۔ کل تک اللہ نے چاہا تو میں تجھے خوش خبری سناؤں گی۔''

اس کی خودکشی کی دھمکی کام کر گئی تھی چنانچہ ماسی گھبرا کر وعدہ کرنے لگی۔ اس کی بات سن کر شہزادی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''یہ تو وڈی چنگی گل ہوگی ماسی! کہ مجھے پنڈ کی دوسری عورتوں سے الگ کام مل جائے۔ میں سامنے رہوں گی تو وہ مجھے طعنے دینے سے باز نہیں آئیں گی ہور کیا پتہ کہ کبھی غصے میں میرے منہ سے بھی کچھ اُلٹی سیدھی نکل جائے، انہیں تو سمجھو موقع ہی مل جائے گا۔ سب کی سب مل کر میری گردن ہی مروڑ دیں گی۔'' وہ گویا ماسی کو اس بات پر پکا کر رہی تھی کہ اسے باقی عورتوں سے ہٹ کر کوئی کام دیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ تھی بھی حقیقت کہ اسے گاؤں کی عورتوں کی بدسلوکی کا خدشہ تھا لیکن اس اصرار کے پیچھے ایک وجہ شہریار کی طرف سے سونپی گئی ذمے داری بھی تھی۔ اس نے اسے اسی شرط پر رہائی دلوائی تھی کہ وہ چودھری کے خلاف شواہد جمع کرنے میں اس کی مدد کرے گی اور وہ یہ اسی صورت کر سکتی تھی کہ اسے چودھری کے ہاں ملازمت مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنی تنگ دستی کی داستان لے کر منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اللہ رکھا کی بیوی اس کی ماں کی رشتے کی بہن بھی ہوتی تھی۔ اس لیے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اسے اپنے حق میں ہموار کر لے گی اور اس کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے اور بچوں کے فاقے کرنے کا سن کر پسیج گئی تھی حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس کے حالات جان کر شہریار نے پہلے ہی اے سی آفس سے وظیفہ جاری کروا دیا تھا لیکن شہریار ہی کی وجہ سے اسے چودھری کے ہاں ہر صورت ملازمت کی راہ نکالنی تھی۔

''اچھا جا، زیادہ بک بک نہ کر۔ وڈی آئی غصے والی۔ اتنے برسوں میں اپنے مرد ہور ساس کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ وہ دونوں جب چار چوٹ کی مارتے تھے تو تیرا غصہ کدھر چلا جاتا تھا؟ ان سے ڈر کر تو تُو نے اپنے لیے ایسی مشکل پیدا کر لی ہے کہ کوئی تیری شکل دیکھنے کو راضی نہیں۔ ہور تُو اپنے غصے کا ڈراوا دیتی ہے۔'' ماسی

اس کی بات سن کر بڑبڑانے لگی۔

''وہ الگ گل ہے ماسی! پر تُو نے دیکھ لیا نا کہ مجھے ستانے والوں کو اللہ نے سکھ سے نہیں رہنے دیا۔ مجھ سے زبردستی ویاہ اور خوب مار کٹائی کرنے والا خود تڑپ تڑپ کر مرا اور اس کی ماں آج میرے آسرے پر پڑی ہے۔ میں چاہوں تو بڑھیا کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں..... پر نہیں، میرے دل میں رب سوہنے کا ڈر ہے۔ میں کیوں بھلا کسی کے ساتھ برا کروں؟ جس کو جو سزا دینی ہوگی، میرا رب خود دے دے گا۔'' وہ اپنے اندر کی سچائی بیان کر رہی تھی۔ ماسی نے اس بار کوئی تبصرہ نہیں کیا اور دال، آٹے کے تھیلوں کے علاوہ گھی کا ایک چھوٹا ڈبا بھی اس کے آگے رکھ دیا۔

''تہاڈی وڈی مہربانی ماسی!.....رب سائیں تینوں ساری حیاتی خوش رکھے۔'' وہ چیزیں دیکھ کر خوش ہوگئی اور چھوٹے کاکے کے ساتھ اس سارے سامان کو سنبھالتی ہوئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

⊛----✪----⊛

اس سبزہ زار پر رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی۔ کہیں لہراتے آنچل تھے تو کہیں قیمتی ڈنر سوٹوں میں اکڑی ہوئی گردنیں۔ بلند و بانگ مردانہ قہقہوں کے درمیان سریلی ہنسی کی آوازیں اُبھرتیں تو جلترنگ سا محسوس ہونے لگتا۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کے درمیان سگار و پائپ کا کثیف دھواں بھی چکراتا پھر رہا تھا لیکن اس کثافت کو مختلف قسم کے پکوانوں کی مہک نے زیر کر رکھا تھا۔

اصل میں یہ ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب تھی جس میں کرنل توحید احمد بھی شریک تھے اور بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ان کا عزیز و اقارب سے کم ہی ملنا ہو پاتا تھا۔ اس لیے آج وہ سب کے گلے شکوے دور کرنے کی کوشش میں ہر ایک سے ہی بڑے تپاک سے مل رہے تھے۔ اعزاء میں بعض نوجوان چہرے تو ایسے تھے جنہیں وہ شناخت بھی نہیں کر سکے تھے اور انہیں خود اپنا تعارف کروانا پڑا تھا کہ وہ ان کے فلاں کزن یا فلاں عزیز کے بچے ہیں۔

اس خالص نجی تقریب میں انہیں ذیشان کے اصرار پر سی ایف پی کے چار جوانوں کو بھی شرکت کی اجازت دلوانی پڑی تھی۔ ان میں سے دو جوان انہیں مسلسل اپنے آس پاس منڈلاتے نظر آ رہے تھے جبکہ دو فی الحال نظروں سے اوجھل تھے۔ نوٹس میں آ جانے والے جوانوں سے وہ جان بوجھ کر بے نیازی ظاہر کر رہے تھے اور عزیز و اقارب کے درمیان کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایسے میں انہیں اپنی بیگم کا پیغام ملا کہ خاندان کی کچھ بزرگ خواتین ان سے ملاقات کی خواہش رکھتی ہیں تو وہ زنانہ حصے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کا خاندان ذرا روایت پسند تھا اس لیے جہاں آج کل مخلوط محافل کا رواج ہو چلا تھا، ان کے ہاں اب بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ مردانہ اور زنانہ حصے الگ ہی رکھے جائیں۔ مرد حضرات عموماً رسومات کے موقع پر یا خصوصی بلاوے پر ہی زنانہ حصے کا رخ کرتے تھے جیسا کہ اس وقت توحید احمد کو کرنا پڑا تھا۔

وہ جیسے ہی وہاں پہنچے، قریبی رشتے دار خواتین نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان خواتین سے دعا سلام اور خیر و عافیت کا سلسلہ نمٹاتے ہوئے انہوں نے ان دونوں خواتین کا نوٹس بھی لے لیا تھا جو زنانہ حصے میں ان کی آمد کے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے لیکن غیر محسوس طور پر ان کے دائیں بائیں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ لمبے قد اور چھریرے جسموں والی ان خواتین نے زرق برق شلوار قمیض زیبِ تن کر رکھے تھے اور شادی کی تقریب کی مناسبت سے میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ پھر بھی کرنل توحید کو انہیں دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی اور وہ اس ہنسی کو خاندان کی



خواتین سے خوش خلقی نبھانے میں خوب استعمال کر رہے تھے۔

''ہمارا توحید تو فوج کو ایسا پیارا ہوا کہ برسوں گزر جاتے ہیں، ہمیں ڈھنگ سے اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ پتہ نہیں اسے یاد بھی ہے کہ بچپن میں یہ گھنٹوں میری گود میں چڑھا رہتا تھا۔ آج اپنے پوتا پوتی کو دیکھتی ہوں تو توحید کا بچپن یاد آ جاتا ہے۔'' ایک نہایت عمر رسیدہ خاتون نے پیار سے گلہ کرتے ہوئے ان کے بچپن کا دور یاد کیا۔

''میں وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں پھپھی جان!..... وہ تو میری زندگی کا سنہری دور تھا۔ اور آپ میری سب سے لاڈلی پھپھی۔ ملازمت ہی ایسی ہے کہ مجھے مجبوراً آپ سب سے دُوری سہنی پڑتی ہے۔'' وہ بہت خوش اخلاقی سے خاتون کے شکوے کا جواب دینے لگے۔

اسی وقت جانے کیا ہوا کہ ان کے بائیں طرف موجود خاتون نے انہیں ایک زوردار دھکا دیا اور اگلے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ مہمان خواتین میں یک دم ہی کھلبلی سی مچ گئی اور خواتین اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتی چیخیں مارنے لگیں۔ توحید احمد نے بھی فوراً ہی کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

''ابھی یہیں بیٹھے رہیں سر!.....نواز کی طرف سے کلیئرنس مل جائے تو پھر میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گی۔'' فوراً ہی ان کے قریب سے سرگوشی اُبھری تو انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ یہ وہی خاتون تھی جس نے انہیں دھکا دے کر نیچے گرایا تھا اور ان کے گرتے ہی فوراً وہاں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ البتہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خاتون کے منہ سے برآمد ہونے والی آواز خالصتاً مردانہ تھی جسے سن کر وہ ان مخدوش حالات میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے اور ان کی مسکراہٹ نے خاتون کو جھینپ جانے پر مجبور کر دیا۔ اصل میں وہ عورت کے بہروپ میں سی ایف پی کا ہی ایک نوجوان اہلکار تھا جس کو خوب کھرچ کھرچ کر شیو بنانے کے بعد میک اَپ اور زنانہ لباس پہنا کر اس تقریب میں شامل کر دیا گیا تھا۔

ذیشان ان کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد اتنا کانشیس تھا کہ ان کی سکیورٹی کے سلسلے میں ذرا بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ جب اسے ان کی اس روایت کا پتہ چلا کہ خواتین کے حصے میں مردوں کو بلا روک ٹوک جانے کی اجازت نہیں ہوتی تو اس نے فورس میں خواتین کی کمی کا سدِباب کرتے ہوئے فوراً ہی اپنے دو نوجوان اہلکاروں کو عورت کے بہروپ میں تقریب میں شامل کرنے کا بندوبست کر ڈالا۔ اور اب حالات بتا رہے تھے کہ یہ بندوبست کتنا مناسب اور ضروری تھا۔

''آپ کا اور بیگم صاحبہ کا یہاں سے فوراً نکل جانا مناسب ہے سر! آپ کی گاڑی ریڈی ہے۔ ہم آپ کو گاڑی تک پہنچا دیتے ہیں۔ یا سر اور کاشف آپ کے ساتھ جائیں گے۔ جبکہ میں اور نواز یہاں رک کر معلومات نمٹائیں گے۔'' فائرنگ کی آواز یقیناً مردانہ حصے میں بھی سنی گئی تھی اور وہاں موجود سکیورٹی اہلکار فوراً دوڑ کر اس طرف آ گئے تھے۔ ان اہلکاروں میں سے ہی ایک ان سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ انہیں اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ سخت سکیورٹی میں وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی دیکھا کہ میزوں کے درمیان ایک عورت کی لاش پڑی ہے اور سی ایف پی کے اہلکار لوگوں کو اس لاش سے دور رہنے کی ہدایات دے رہے ہیں۔

''معافی چاہتا ہوں سر! میری وجہ سے تمہاری تقریب خراب ہوگئی۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں خاندانی تقریبات میں شرکت سے اتنا گریز کیوں کرتا ہوں۔'' گاڑی کی طرف جاتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے

اپنے اس عزیز کے قریب رُکے جس کے بے حد اصرار پر اس کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور معذرت کرنے لگے۔ حقیقتاً انہیں اپنی وجہ سے اس خوشیوں بھری تقریب کے رنگ میں بھنگ پڑنے پر دلی افسوس تھا۔

''کوئی بات نہیں توحید بھائی! جو بھی نصیب میں لکھا تھا، سو ہوا۔'' اس شخص نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ شاید کچھ اور لوگ بھی اس گفتگو میں شریک ہوتے لیکن یاسر اور کاشف نے کسی کو موقع نہیں دیا اور انہیں ان کی بیگم سمیت ہاں سے لے کر نکلتے چلے گئے۔

''وہاں کیا ہوا تھا؟'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی چل پڑی تو انہوں نے سنجیدہ چہرے سے یاسر نامی نوجوان سے جو اس وقت بھی لڑکیوں والے حلیے میں تھا، دریافت کیا۔

''آپ اپنی رشتے دار خاتون سے بات کر رہے تھے تو میری نظر یکدم ہی اس عورت پر پڑی جو ایک قریبی میز پر سے اچانک ہی کھڑی ہوئی تھی اور آپ کو نشانہ بنانا چاہتی تھی۔ میں نے فوراً ہی آپ کو اس کی زد پر سے ہٹانے کے لیے دھکا دے دیا اور اس کی طرف ایک فائر بھی کر ڈالا۔ میرے خیال میں میری چلائی ہوئی گولی اس کے بازو پر لگی تھی لیکن وہ گولی کھا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے تیزی سے میز کے پیچھے سے نکلی اور اس سمت میں دوڑ کر آنے لگی جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر کوئی رِسک لینا ممکن نہیں تھا اس لیے نواز نے اس کے سینے میں گولی ماردی۔ میرا اندازہ ہے کہ گولی ٹھیک دل میں لگی تھی اس لیے اسے دوبارہ اُٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔'' یاسر فوراً ہی انہیں رپورٹ دینے لگا۔

''کیا اس عورت کا کوئی دوسرا ساتھی وہاں موجود نہیں تھا؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''کوئی دوسرا مشکوک شخص سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ عورت خودکش حملہ آور تھی جو اپنا فائر ناکارہ جانے کے بعد آپ کے قریب پہنچ کر خود کو بلاسٹ کر لینا چاہتی تھی۔ نواز کی سینے پر ماری گئی گولی نے اسے مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہاں بڑے پیمانے پر تباہی پھیل سکتی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

اسی وقت کرنل توحید کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے دوسری طرف ذیشان کی موجودگی کے باعث فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

''آپ خیریت سے تو ہیں سر؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''الحمدللہ! تمہارے جوانوں نے بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا ورنہ شاید اس وقت تمہیں مجھ سے بات کرنی نصیب نہیں ہوتی۔'' انہوں نے کھل کر سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارکردگی کو سراہا۔

''ہمارے ہر جوان کے پیچھے آپ ہی کی محبت اور منصوبہ بندی ہے سر! بس مجھے یہ خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی تربیت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ مجھے ایسے کسی حملے کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں کلارا اینڈرسن کے انجام نے ''را'' اور ''موساد'' دونوں کو بلبلانے پر مجبور کر دیا ہوگا اس لیے کسی نہ کسی طرف سے تو انتقامی کارروائی لازمی تھی۔ میں ایسے ہی کسی حملے کے ڈر سے آپ کی حفاظت کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں دو ہی افراد قابلِ شناخت تھے۔ ایک آپ اور دوسرا شہریار..... باقی ہم سارے تو پسِ پردہ ہیں۔ آپ کا معاملہ اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ آپ انٹیلی جنس سے وابستہ ہیں اور کلارا آپ کو پھانسنے کے چکر میں اپنی جان سے گئی۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''اندازہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں ایک فیملی فنکشن کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آدمی کی خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اور میرے حصے میں خوامخواہ کی ندامت آ گئی۔ اب میں ان لوگوں سے کتنی ہی



معذرت کر لوں لیکن جس طرح ان کی تقریب برباد ہوئی ہے، اس کا تو کوئی مداوا ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

''یہ حقیقت تو اپنی جگہ ہے سر! میرے ماتحت نے مجھے وہاں کی جو رپورٹ دی ہے، وہ واقعی قابلِ افسوس ہے۔ معاملہ صرف فائرنگ کا بھی ہوتا تو افراتفری اور بدمزگی سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن حملہ آور لڑکی کے جسم پر موجود خودکش جیکٹ نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم تقریب کے منتظمین سے شادی لان خالی کروا لینے کی درخواست کریں۔ مجھے نواز نے فون پر جیسے ہی رپورٹ دی تھی، میں نے بم ڈسپوزل اسکواڈ اور مزید نفری کو اس طرف روانہ کر دیا تھا۔ بم کو ناکارہ بنانے اور ایکسپرٹس کی دیگر کارروائی کے لیے ضروری تھا کہ وہاں سے لوگوں کا رش ختم کیا جائے۔ اس لیے جو کچھ ہوا، بہت مجبوری میں ہوا۔ آپ میری طرف سے بھی اپنے عزیز سے معذرت کر لیجیے گا لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی سمجھائیے گا کہ شکر ہے زیادہ بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہمارے لوگ الرٹ نہ ہوتے تو اس وقت وہاں کئی بے گناہوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ شادی کا کیا ہے، وہ لوگ گھر جا کر سادگی سے بھی دُلہن کو رخصت کر سکتے ہیں..... یا اگر ایسا قابلِ قبول نہ ہو تو پھر کسی دن فنکشن ارینج کر سکتے ہیں۔ آدمی زندہ سلامت ہو تو رکے ہوئے کام تو کسی نہ کسی طور نمٹا ہی لیتا ہے۔ البتہ انسانی جان کے نقصان کی تلافی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔'' ذیشان ایک آفاقی حقیقت بیان کر رہا ہے۔

''تمہاری بات درست ہے۔'' انہوں نے اس کی تائید کی اور مزید بولے۔ ''تمہارے لوگ کارروائی مکمل کر لیں اور لڑکی کی شناخت وغیرہ ہو جائے تو مجھے رپورٹ کر دینا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح ہی لاہور سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جب حالتِ جنگ میں ہی رہنا ہے تو پھر دوسروں کو کیوں اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹا جائے۔ ہم اپنی رُوکھی پھیکی زندگی میں ہی ٹھیک ہیں۔'' آزردگی سے کہتے ہوئے انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سبک رفتاری سے دوڑتی گاڑی کے شیشے سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر پر نظریں جما لیں۔ گاڑی میں موجود دیگر لوگوں میں سے کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ انہیں مخاطب کر سکتا۔

⊛----✪----⊛

''میں تہاڈے نال آنے کی تیاری کر رہا ہوں پُتر! کچھ ملوم نہیں کہ دو چار دن میں پہنچ بھی جاؤں۔'' چودھری افتخار فون پر اپنے بیٹے مراد شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

''ضرور ابا جی! کیوں نہیں۔ یہاں بھی آپ کا ہی گھر ہے۔ جب دل چاہے آئیں اور جب تک چاہیں رہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس بار آپ اتنی جلدی دوبارہ کیسے آ رہے ہیں؟ میں خود ابھی تو وہاں سے آیا ہوں۔'' اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ مراد شاہ نے حیرت کا اظہار بھی کیا۔ وہ برسوں سے امریکہ میں تھا لیکن پہلے کبھی چودھری نے اتنے مختصر وقفے سے وہاں کا دورہ نہیں کیا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ابھی کچھ دن قبل ہی تو وہ بیوی سمیت پاکستان میں رہ کر آیا تھا۔

''بس پُتر! اِدھر دل نہیں لگتا۔ تُو تھا تو فیر بھی حویلی میں تھوڑی رونق تھی۔ اب تو جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ تیری ماں کے بعد میرا دل ہی نہیں لگتا۔ اس لیے سوچا کہ تھوڑے دن تیرے پاس آ کر رہ لیتا ہوں۔'' اس نے لہجے میں افسردگی بھرتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔

اب وہ بیٹے کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اپنے نئے آقا مسٹر الفا کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ میری طرف سے کلیئرنس ملے تو واپس آ جانا۔ اس حکم کا پس منظر کیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا لیکن اس نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور واپس حویلی جانے کے بجائے لاہور سے ہی سیدھا اسلام

آباد پہنچ گیا تھا۔ ویزا لگتے ہی وہ فوراً امریکہ کے لیے فلائی کر جاتا۔ جاگیر کے کاموں کی طرف سے اسے اتنی فکر نہیں تھی۔ منشی اللہ رکھا تجربہ کار اور قابلِ بھروسہ آدمی تھا جو اس کے پیچھے سارے انتظامات بخیر و خوبی سنبھال لیتا۔

''حوصلے سے کام لیں ابا جی! آپ تو بڑے مضبوط دل کے آدمی ہیں، آپ سے مجھے یوں ہمت ہار جانے کی اُمید نہیں تھی۔ آپ کا سایہ حویلی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اماں کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن اور بھی لوگ ہیں جنہیں وہاں آپ کی ضرورت ہے۔ تاجور، صنوبر، بہزاد شاہ، اس کی بیوی بچہ اور چھوٹی ماں۔ یہ سارے لوگ بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔'' مراد شاہ اسے احساس دلانے لگا۔

''چھڈ دے پُتر! میں سب کو جانتا ہوں۔ تاجور، صنوبر اپنے سسرالیوں کے ساتھ مل کر جائیداد ہتھیانے کے لیے میرے خلاف سازشوں میں شامل رہی ہیں۔ بہزاد شاہ سے میں کیا دل بہلاؤں، اسے اپنا ہوش نہیں۔ رہ رہی چھوٹی چودھرائن تو اس سے میرا دل سب سے زیادہ کھٹا ہے۔ اس کی جنی اولاد نے مجھے ایسا دکھ دیا ہے کہ میں جب بھی بستر پر لیٹتا ہوں، لگتا ہے کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پُرکھوں کی بنائی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اُس اُلودی پنچھی نے۔ ایک واری میرے ہاتھ آ جائے تو میں اس کا گلا ہی دبا ڈالوں۔'' چودھری کے لہجے میں نفرت کا زہر بھر گیا۔

''جانے دیں ابا جی! اب معاف کر دیں کشور کو۔ دیکھا جائے تو اس کے ساتھ زیادتی بھی ہو رہی تھی۔ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا گھر بار ہو۔ وہ اپنے بچوں کو پالے پوسے۔ پر آپ نے تو عمر بھر اس کی شادی نہ کرنے کا ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں اسے جو راہ دکھائی دی، وہ اس پر چل پڑی۔'' اس نے حقائق جتاتے ہوئے باپ کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔

''تُو زیادہ فلسفہ نہ بگھار۔ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی رشتہ تھا ہی کہاں جو میں اس کا ویاہ کرتا۔ مجھے بھی احساس تھا اس کے دکھ کا۔ اس لیے اسے تاجور اور صنوبر سے بڑھ کر آزادی دی تھی۔ پر اسے میری دی ہوئی آزادی ہضم نہیں ہوئی ہور وہ میرے ہی منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔'' چودھری دہاڑا۔

''اگر آپ خاندان میں رشتہ جوڑنے کی شرط ہٹا کر کسی دوسرے ہم پلّہ خاندان میں اسے بیاہ دیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ آدمی کو حالات دیکھ کر تھوڑی بہت اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔'' باپ کا مزاج جاننے کے باوجود وہ اسے آئینہ دکھانے سے باز نہیں آیا۔ ادھر حسبِ توقع چودھری کا مزاج برہم ہو گیا۔

''تُو تو امریکہ میں رہ کر بے غیرت ہو گیا ہے مراد! پر میں تیرے جیسے کل کے چھوکرے کے کہنے میں آ کر اپنے بزرگوں کی ریت رواج نہیں بھول سکتا۔ ہم نے نسلوں سے کبھی اپنی دِھی غیر برادری میں بیاہ کر اپنا سر کسی کے آگے نیچے نہیں ہونے دیا۔ ہور اگر کسی نے کشور کی طرح بغاوت کی کوشش کی تو اس کا سر کچل دیا۔ کشور بھی بھاگنا چاہے بھاگ لے لیکن ایک دن تو میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے گا ہور وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔'' اس نے نہایت سفاکی سے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''توبہ کریں ابا جی! آپ کتنے آرام سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی باتیں کرتے ہیں۔'' مراد شاہ نے جھرجھری سی لے کر اسے ٹوکا۔

''ہمارے اپنے قاعدے قانون ہیں مراد شاہ! ہم دوسروں کے بنائے ہوئے قانون پر نہیں چلتے۔ کشور کی سزا طے ہے، بس مجھے موقع ملنے کی دیر ہے۔ تُو میرا پیو بن کر مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش نہ کر ہور سن لے..... اگر تُو نے ایسی ہی گلاں کرنی ہیں تو فیر میں اِدھر آ کر تیرے نال نہیں رہوں گا۔ پچھلی واری کی طرح کسی ہوٹل میں کمرہ بک کروا لوں گا۔'' چودھری نے آخر میں اسے دھمکانا ضروری سمجھا۔ اس کی دھمکی سن کر مراد شاہ کو



وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے باپ کو سنہری بالوں والی ایک بے باک عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی اور دل چاہا کہ مری ہوئی بیوی کے لیے ضرورت سے زیادہ محبت جتانے والے باپ کو اس کی آوارگی یاد دلا دے۔ لیکن پھر رشتے کا احترام مانع آ گیا اور اس نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

''ناراض نہ ہوں ابا جی! ٹھیک ہے، میں آپ سے بحث نہیں کرتا۔'' اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بس تو فیر خدا حافظ۔ میں نے تجھے صرف اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا..... تُو نے آپ ہی لمبی بحث چھیڑ دی۔'' اس نے فون بند کر دیا اور سامنے رکھی بوتل سے سنہری سیال گلاس میں انڈیل کر اپنے لیے جام تیار کرنے لگا۔

مراد شاہ کی تلخ باتوں نے اس کا موڈ سخت آف کر دیا تھا اور اس خراب موڈ کی بحالی کے لیے شراب ضروری تھی۔ شراب نوشی کے دوران موبائل کی گھنٹی نے اسے ڈسٹرب کر دیا لیکن دیکھنا تو تھا کہ کس کی کال ہے۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے اپنے زیرِ استعمال رہنے والا نمبر فی الحال بند کر رکھا تھا اور ایک نئے نمبر کی سم لے کر بس گنتی کے چند لوگوں کو جن سے رابطہ ضروری تھا، یہ نمبر دے دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بادل ناخواستہ موبائل اٹھا کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا تو شیخ صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔

شیخ صاحب طبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے آلات کی سپلائی کا کام بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ اور اس کاروبار سے ان کی ٹھیک ٹھاک انکم بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن جب چودھری نے ڈالرز کا لالچ دیا تو ہیروئن فروشی میں بھی کوئی عذر نہیں جانا۔ ویسے بھی وہ اپنا کام کون سا ایمان داری سے کرتے تھے۔ جہاں موقع ملتا تھا، سامنے والی پارٹی کو چونا لگا ہی دیتے تھے اس لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہونے پر ان کے ضمیر نے انہیں ذرا ملامت نہیں کی اور چودھری سے ان کی گاڑھی چھننے لگی۔

''فرمائیے شیخ صاحب! کیسے یاد کیا آپ نے؟ آپ کا آدمی تو خیریت سے پہنچ گیا نا؟'' لیس کا بٹن پش کرتے ہی اس نے بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

''نہیں چودھری صاحب! گڑبڑ ہو گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی لندن ایئرپورٹ پر پکڑے گئے ہیں اور اب ان سے ایک بند کمرے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔'' دوسری طرف سے شیخ صاحب کی پریشان آواز سنائی دی تو چودھری کا دماغ اُڑ گیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے شیخ صاحب! ہم نے تو اتنا اچھا بندوبست کیا تھا۔ کہیں آپ کا آدمی گھبراہٹ کی وجہ سے تو کسٹم والوں کی نظر میں نہیں آ گیا؟'' چودھری سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

''اسے تو میں نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا، بس جیولری بکس دے کر یہی کہا تھا کہ جب تم لندن پہنچ کر ہوٹل میں ٹھہرو گے تو جن صاحب کی یہ امانت ہے، وہ خود آ کر اسے وصول کر لیں گے۔ رواج کے مطابق میں نے جیولری بکس کو گفٹ پیپر میں پیک بھی اسی لیے نہیں کروایا تھا کہ بند پیکٹ ایک تو لے جانے والے بندے کا ذہن اُلجھا دے گا، دوسرے کسٹم والے بھی کھوج میں پڑ جائیں گے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے ہماری منصوبہ بندی ناکام رہی اور مال پکڑا گیا۔'' شیخ صاحب کی پریشانی بھی کم نہیں تھی۔ وہ واقف تھے کہ پہلی کھیپ پیپرز کی آڑ میں امریکہ پہنچائی جا چکی ہے اس لیے چودھری کی طرح ان کا اعتماد بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔ مسٹر الفا کی ہدایت پر چودھری نے پیپرز والی تدبیر دوبارہ نہیں دہرائی تھی اور اس بار نیا طریقِ کار استعمال کیا تھا۔ انہوں نے پلاسٹک کی مدد سے ایک ایسا جیولری بکس تیار کروایا تھا جو دیکھنے میں بالکل سنگِ مرمر کا لگتا تھا۔ اس جیولری بکس میں ایک ایسا خلا رکھا گیا تھا جس میں ہیروئن بھر دی گئی تھی۔ ظاہری شکل و صورت اور وزن کی وجہ سے بہت غور کیے

بغیر کوئی شک نہیں کرسکتا تھا کہ وہ جیولری بکس سنگِ مرمر کا نہیں، پلاسٹک کا ہے۔ اس جیولری بکس کو شیخ صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے بھجوانے کا بندوبست کیا تھا اور وہ ملازم اسے لندن پہنچا دیتا تو وہاں سے اسے دوسرے ذریعے سے امریکہ بھجوایا جاسکتا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے جس ملازم کو استعمال کیا تھا، وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا جس سے وہ زیادہ تر مارکیٹنگ کا کام لیتے تھے۔ نوجوان قابل اور محنتی تھا اس لیے شیخ صاحب اس کی اکثر دوسروں کے سامنے تعریف بھی کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حال ہی میں ہونے والی اس کی شادی کے تحفے کے طور پر اسے لندن کا ٹکٹ اور ویزہ دلوایا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے تئیں شیخ صاحب کی مہربانی کے طفیل ہنی مون منانے لندن جا پہنچا۔ اب یہ تو اسے لندن ایئرپورٹ پر معلوم ہو رہا ہوگا کہ غریب آدمی کو اس قسم کے ہنی مون کا خواب کتنا مہنگا پڑتا ہے۔

''مال جس طرح بھی پکڑا گیا ہو، گردن تو میری پھنسے گی۔ تم تو پتہ نہیں کیسے ہوا کہہ کر ایک طرف بیٹھ سکتے ہو لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' چودھری کا موڈ ایک بار پھر بہت خراب ہو چکا تھا اور اس کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے نہایت بے مروّتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن کاٹی اور پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل نکال کر دھڑکتے دل سے اس ناکامی کی خبر ایس ایم ایس کے ذریعے بھجوا دی۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ خبر الفا کو بہت بری لگے گی اور وہ کٹ کھنے بلّے کی طرح اس پر چڑھ دوڑے گا۔ وہ خائف سا خود کو ہونے والی بے عزتی کے لیے تیار کرنے لگا۔

ادھر موبائل نے کال کی آمد کا اعلان شروع کر دیا۔ اس نے مرے ہوئے ہاتھوں سے یس کا بٹن پش کیا۔

''مال پکڑے جانے کی اطلاع تمہارے پیغام سے پہلے ہی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ میرے آدمی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تمہارے کیریئر کی زبان بند کرنے کا بندوبست ہو سکے۔ لڑکا بہت گھبرایا ہوا ہے، اسے تھوڑا ریلیکس کرنے کے لیے انویسٹی گیشن آفیسر نے کافی منگوائی ہے۔ کافی کے مگ میں ڈالی جانے والی ایک گولی اس لڑکے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دے گی۔ لڑکی فی الحال بے ہوش ہے لیکن یہی اندازہ ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں اس لیے اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔'' اس کی کچھ بھی سنے بغیر الفا خود اسے سپاٹ سے لہجے میں بتاتا چلا گیا۔ اس کی اتنی باخبری اور مستعدی نے چودھری کو بے حد مرعوب کر دیا۔

''میں شرمندہ ہوں سر! معلوم نہیں میرے آدمی کی کس غلطی کی وجہ سے مال پکڑا گیا۔'' الفا کی طرف سے برہمی کا اظہار نہ ہونے کے باوجود اس نے معذرت ضروری سمجھی۔

''مال پکڑے جانے کی فکر مت کرو۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہاری پلاننگ اتنی خراب نہیں تھی لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اتفاقاً ہی جیولری بکس کسٹم آفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور اس کے ٹوٹنے کی وجہ سے مال باہر نکل آیا۔ عام طور پر ہم کیریئرز کی اتنی فکر نہیں کرتے ہیں لیکن ابھی تم ناتجربہ کار ہو اس لیے ہمیں تمہارے کیریئرز پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔ یاد رکھو، کیریئر بھلے پکڑا جائے لیکن کسی بھی انویسٹی گیشن آفیسر کو اس کے ذریعے تم تک نہیں پہنچنا چاہیے۔'' آج الفا کسی خرانٹ باس سے ہٹ کر مربیانہ لب و لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''بہت بہتر سر! آئندہ میں پورا خیال رکھوں گا۔'' چودھری کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا تو وہ مستعدی سے بولا۔

''فی الحال تو تم اپنا خیال رکھو۔ تمہارے علاقے میں ہماری اسپیشل ایجنٹ ماریہ ماری گئی ہے اور مسز جوزف کو فرار ہونا پڑا ہے۔ ہمیں امید تو نہیں ہے کہ مرنے سے پہلے ماریہ نے تمہارے بارے میں زبان کھولی ہوگی پھر بھی تمہارا محتاط رہنا ضروری ہے۔ وقتی طور پر ساری سرگرمیاں روک دینا مناسب ہے۔ آگے حالات واضح ہوں



گے تو پھر کام شروع کیا جاسکتا ہے۔'' اس بار الفا نے جو اطلاعات فراہم کیں، انہیں سن کر چودھری کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ خاص طور پر ڈاکٹر ماریہ کی موت کی خبر اس کے لیے کسی دھماکے سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔

''وہ کب اور کیسے ماری گئی سر! یہاں تو کہیں اس بارے میں کوئی خبر ہی نہیں سننے میں آئی۔'' اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ اور یہ حیرت ٹھیک بھی تھی۔ شہریار کی بیوی کی حیثیت سے تو ماریہ کی موت کی خبر بہت تیزی سے پھیلنی چاہیے تھی لیکن وہاں تو بالکل خاموشی تھی۔

''اس کی موت میں پاکستانی انٹیلی جنس شامل ہے اور جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ شہریار کے بھی انٹیلی جنس سے روابط ہیں۔ ماریہ کی موت کے وقت وہ اس کے پاس ہی موجود تھا لیکن اس کے باوجود ماریہ کی ڈیڈ باڈی لاوارث لاشوں کے درمیان رکھ دی گئی جس کا مطلب ہے کہ اس نے ماریہ کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے۔ بہرحال جو بھی بات ہے، وہ دو چار دن میں سامنے آجائے گی۔ اسے اپنی بیوی کے سلسلے میں پبلک کے سامنے کچھ نہ کچھ جواب دہی تو کرنی پڑے گی۔'' وہ جس اسپیشل موبائل پر بات کر رہے تھے، اس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ ان کی کال ٹریس نہیں کی جاسکے گی اس لیے کھل کر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید ماریہ کی موت کا ہی اثر تھا کہ الفا اس سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا ورنہ پہلے کبھی اس نے چودھری کو اس لائق کب سمجھا تھا۔

''اُس اے سی کا پتا صاف کروائیں جی..... خوامخواہ خدائی فوجدار بن کر ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ جب سے ہمارے علاقے میں پوسٹ ہوا ہے، ناک میں دم کر کے رکھا ہوا ہے۔'' چودھری کے دل میں شہریار کے لیے پرانا بغض تھا اس لیے وہ موقع ملتے ہی الفا کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔

''اس کے بارے میں فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ جلد نتیجہ سامنے آجائے گا۔ لیکن یاد رکھو کہ اے سی کی موت ہمارے مسائل کا واحد حل نہیں ہے۔ وہ مر بھی گیا تو انٹیلی جنس والے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ہماری راہ پر لگ چکے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بہت ہوشیار رہیں اور ہر لمحے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔'' الفا نے اسے نصیحت کی۔

''ٹھیک ہے سر! اب ہم پہلے سے زیادہ احتیاط کریں گے۔'' اس نے یقین دہانی کروائی۔

''بس اب مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ گڈ بائے۔'' الفا کی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس فون کال سے فارغ ہو کر چودھری نے ایک بار پھر پینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ ٹھہر ٹھہر کر اور پُرتفکر انداز میں پی رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''دشمن کی جسارتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں توقع نہیں کرسکتا تھا کہ کرنل توحید پر اتنا کھلا حملہ کیا جائے گا۔'' ایشان کی زبانی سارے حالات جان کر اس نے تبصرہ کیا۔

''میرے لیے یہ حملہ خلافِ توقع نہیں تھا۔ چوٹ کھایا ہوا دشمن بلبلا کر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ پھر ٹارگٹ بھی سامنے تھا۔ روٹین سے ہٹ کر کسی نجی تقریب میں ان کے لیے کرنل صاحب کو نشانہ بنانا زیادہ آسان تھا، اس لیے انہوں نے جوابی وار کرنے میں دیر نہیں کی۔ وہ تو شکر ہے کہ میرے لوگ الرٹ تھے ورنہ ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''حملہ آور عورت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، عورت کو شناخت کیا جا چکا ہے۔ دو سال قبل اس عورت کا شوہر اور بچے ایک جلوس میں شامل تھے

کہ وہاں بم بلاسٹ ہوگیا اور اس حادثے میں وہ لوگ ہلاک ہوگئے۔ ظاہر ہے عورت کو شدید صدمہ پہنچا ہو
حیرت انگیز طور پر یہ اچانک ہی اپنے گھر سے غائب ہوگئی۔ عزیز و اقارب نے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی
لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اب جبکہ وہ ایک خودکش حملہ آور کے طور پر سامنے آئی ہے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ
اسے کسی دہشت گردوں کے گروہ نے ٹریپ کرلیا ہوگا اور برین واشنگ کے ذریعے حکمرانوں اور انتظامیہ کے
خلاف اس کے اندر زہر بھر دیا ہوگا۔ کسی صدمے سے بے حال عورت کے دماغ میں اس قسم کے خیالات بھرنا
زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ چنانچہ جب اسے اپنی جان داؤ پر لگا کر کرنل صاحب کے خاتمے کا مشن سونپا گیا ہوگا
تو وہ دل و جان سے راضی ہوگئی ہوگی۔'' ذیشان نے حالات کا تجزیہ کیا۔

''تم درست کہہ رہے ہو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے ان ملک دشمنوں کے کام کرنے کا طریقہ دیکھ
ہوں۔ میرے ذہن سے آج تک اللہ آباد کا وہ لڑکا نہیں نکل سکا جسے اپنے خاندان کے ساتھ ہونے والے ظلم
نے اتنا مشتعل کیا تھا کہ وہ اپنے جسم سے بارودی مواد باندھ کر بھرے مجمع میں گھس گیا تھا اور مجھ سمیت
کرسی اور سیاست سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے میں کئی بے گناہ
مارے گئے تھے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ مجھ سمیت اسٹیج پر موجود دیگر افراد کو معمولی زخموں کے علاوہ کوئی نقصان
نہیں پہنچا تھا۔'' اس نے ایک گزرا ہوا واقعہ دہرایا۔

''تمہیں اب بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں نے تمہیں فون کیا ہی اس تاکید کے
لیے ہے کہ اپنا خیال رکھو۔ کرنل صاحب کے بعد دشمنوں کا دوسرا ٹارگٹ تم ہی ہو سکتے ہو۔'' اس نے شہریار کو
اپنے اندیشے سے آگاہ کیا۔

''جب اوکھلی میں سر دیا تو موصلوں سے کیا ڈرنا۔ حالات میرے بھی سامنے ہیں لیکن اب میں ڈر کر خود
کسی خانہ دار خاتون کی طرح گھر کی چاردیواری تک تو محدود نہیں کر سکتا۔'' اس نے ہنسی میں بات اُڑانے
کوشش کی اور اپنی ذات کو مزید موضوعِ گفتگو بننے سے بچانے کے لیے فوراً ہی اگلا سوال کر دیا۔

''اس بندے کا کیا ہوا جسے میں نے اپنا تعاقب کرتے ہوئے پکڑا تھا؟ پے در پے پیش آنے والے
واقعات میں وہ بندہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ اُگلا کہ وہ کون ہے اور کس کے کہنے پر
کر رہا تھا؟''

''وہ ایک کرائے کا ٹٹو ہے اور ہمارے لیے قطعی ناکارہ۔ اس کا شمار ان جرائم پیشہ افراد میں ہوتا ہے جو
کے لیے کسی بھی پارٹی کا کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ تمہارے سلسلے میں اس سے فون پر معاملات
کیے گئے تھے اور معاوضے کی رقم بھی بندلفافے میں کسی نہ کسی طریقے سے اس تک پہنچ جاتی تھی۔ یعنی پارٹی
کے سامنے نہیں تھی اور وہ صرف اتنا بتا سکا ہے کہ فون پر اسے کسی عورت سے ہدایات ملتی تھیں۔ جو فون نمبر
سے ملا ہے، وہ بھی بے کار ہے کیونکہ سم کسی فرضی نام سے خریدی گئی تھی۔ میں نے اس بندے کو اس کے سا
ریکارڈ کی بنیاد پر پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ پولیس والے خود ہی حسبِ توقع اس کی خاطر مدارات کر
گے۔'' ذیشان نے مفصل جواب دیا۔ اس جواب سے اتنا تو بہرحال واضح ہوگیا تھا کہ اس بندے کو اس
پیچھے ماریہ یا اس کی ممی نے ہی لگوایا تھا۔

''اس کا مطلب ہے، ہمارے پاس لے دے کر ایک اشیش کمار ہی بچا ہے جس کی مزید دھنائی کر کے
اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''اس پر تو خیر کام جاری ہی ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چودھری صاحب اور عابد انصاری پر نظر رکھنی



تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ چودھری مسلسل منظر سے غائب ہے اور کہیں سے اس کی کوئی سن گن نہیں مل رہی۔''

''یہ تو واقعی بڑی افسوس ناک خبر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ واقعی ملک دشمنوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا تھا
اب ہی حالات بگڑتے ہی منظر سے غائب ہوگیا۔ تم اس کا نام ای سی ایل میں ڈلوانے کی کوشش کرو۔ کم از کم
اسے ملک سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''یہ کام میں ابھی کر دیتا ہوں۔ تم بتاؤ، تمہاری طرف سے کیا خبریں ہیں؟..... تمہاری مخبر نے کچھ کام دکھایا
ہے؟'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے استفسار کیا۔

''وہ میری توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اسے منشی اللہ رکھا کی سفارش پر
عابد انصاری کے بنگلے پر کام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد اس کی طرف سے اہم اطلاعات آنی
شروع ہو جائیں گی۔'' اس نے خوشخبری سنائی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ تم احتیاط سے اپنے حصے کا کام کرتے رہو۔ میں یہاں رہ کر معاملات پر نظر رکھتا
ہوں۔ ضرورت پڑنے پر ہم فوراً حرکت میں آجائیں گے۔ میں نے اپنی فورس کو ہائی الرٹ کر رکھا ہے اس لیے
وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آنے کی پوزیشن میں ہیں۔'' ذیشان نے اسے بتایا اور پھر ان دونوں
کے درمیان چند ایک مزید باتیں ہونے کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ شہریار نے بھی اپنی توجہ دفتری امور
کی طرف مرکوز کر لی۔ اسے احساس تھا کہ دوسری سرگرمیوں میں الجھنے کی وجہ سے وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں
پہلے کی طرح بھرپور طریقے سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس لیے اس وقت پوری توجہ اسی طرف مرکوز تھی۔ آج
صبح ہی اس نے عبدالمنان کو یہ احکامات بھی جاری کر دیئے تھے کہ وہ اللہ آباد اور نور پور کے دورے کرے گا
اس لیے گاڑی تیار رکھوائی جائے۔ اس دورے پر وہ مشابرم خان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا کیونکہ مشابرم کو
اس نے اس سے زیادہ اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی جسے نبھانے کے لیے وہ صبح صادق سے پہلے روانہ ہوگیا
تھا۔ اب یہ عبدالمنان کا مسئلہ تھا کہ وہ اس کی جگہ کسے ڈرائیونگ کی ذمے داری سونپتا۔ ایک متبادل ڈرائیور تو
بہرحال دفتر میں موجود ہی تھا۔

''ایک بجنے میں چند منٹ ہی باقی ہیں سر! آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کے لیے گاڑی تیار
کروا دی ہے۔ آپ ٹھیک ایک بجے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔'' وہ نہایت انہماک سے فائلوں میں اُلجھا ہوا
تھا کہ عبدالمنان نے اسے مؤدبانہ اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم یہ فائلیں بھی گاڑی میں رکھوا دو۔ راستہ لمبا ہے۔ میں راستے میں انہیں دیکھ لوں گا۔'' اس
نے ہدایات جاری کیں۔ دو منٹ بعد ہی وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ اپنی غیر موجودگی میں کچھ
ضروری کاموں کی نگرانی کی خاطر وہ عبدالمنان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔ اس کی طرف سے اشارہ ہوتے
ہی گاڑی آگے بڑھ گئی اور وہ ایک بار پھر فائلوں میں کھو گیا۔ ڈرائیور ماہر تھا اس لیے گاڑی بڑی سبک رفتاری
سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے انہماک کی وجہ سے وہ وقت اور فاصلے کا تعین رکھنے سے قاصر تھا لیکن جب
گاڑی کے ایک سلسلے کے درمیان گزرتے ہوئے گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو وہ چونک گیا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''میں دیکھتا ہوں سر!'' ڈرائیور جواب دیتا ہوا فوراً نیچے اُتر گیا اور بونٹ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ شہریار کے لیے
یہ ایک کوفت میں مبتلا کر دینے والی صورتِ حال تھی۔ اس نے شروع ہی سے اپنے عملے کو ان معاملات میں
الرٹ کر رکھا تھا کہ کہیں کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو۔ لیکن جانے کیسے اس ڈرائیور نے غفلت برت دی تھی کہ گاڑی بیچ

راستے میں داغِ مفارقت دے گئی تھی۔

''انجن گرم ہو گیا ہے سر! میں ابھی قریبی ٹیوب ویل وغیرہ سے پانی لاتا ہوں۔'' ڈرائیور نے اسے اطلاع دی اور اسے تادیب کا موقع دیئے بغیر بوتل اٹھا کر سیدھا کھیتوں میں گھس گیا۔ کوفت زدہ شہریار کے پاس فی الحال برداشت سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈرائیور مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ مڑ کر دیکھا تو شہریار کی غضب ناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انتہائی کوفت محسوس کرنے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

ادھر ڈرائیور کافی فاصلہ طے کر چکا تھا اور کھیت میں موجود اس کنوئیں کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں دو کھیت مزدور پہلے ہی سے کھڑے شاید کسی موضوع پر آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے اور ان کی توجہ ابھی تک اس کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔

ڈرائیور ان سے بہ مشکل دو قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا کہ فضا میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا۔ ڈرائیور سمیت ان دونوں کھیت مزدوروں نے بھی اپنے قدموں تلے زمین لرزتی ہوئی محسوس کی۔ چند ثانیوں بعد جب وہ اپنے حواس میں واپس آئے تو ان کی نظروں نے جو پہلی چیز فوکس کی، وہ دور سڑک پر بلند ہوتے آگ کے شعلے تھے۔ آگ کے یہ شعلے اس گاڑی سے بلند ہو رہے تھے جس سے ابھی کچھ دیر قبل ہی ڈرائیور اُتر کر کھیتوں کی طرف آیا تھا اور جس کی پچھلی نشست پر شہریار براجمان تھا۔

''صاحب.....!'' ڈرائیور دیوانہ وار چیختا ہوا اس سمت بھاگا جہاں گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے کے سوا شاید اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

⊛----✪----⊛

بیچ راستے میں خراب ہونے والی گاڑی نے شہریار کو سخت کوفت میں مبتلا کر دیا۔ ڈرائیور کی غفلت پر برہم ہونے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا تھا اور خود اس کی گوشمالی کرنے کے بجائے واپس جانے کے بعد یہ کام عبدالمنان کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہی مناسب تھا کہ عملے کی کارکردگی کو عبدالمنان خود ملحوظ کرے۔ چنانچہ ڈرائیور کو خاموشی سے پانی لانے کی اجازت دے دی اور خود اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جس کوفت کا شکار ہوا تھا، اس کے باعث زیرِ مطالعہ فائل پر سے بھی فی الحال توجہ ہٹ گئی تھی اس لیے اردگرد کے مناظر کا جائزہ لینے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا کام تھا ہی نہیں۔ اس کی گاڑی جس کچی پکی سڑک پر رُکی تھی، اس کے دونوں طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا ڈرائیور پانی لینے کے لیے بائیں طرف کے کھیت میں گیا تھا۔ اس خاموش اور پُرسکون مقام پر پھیلے ان ہرے بھرے کھیتوں کا نظارہ آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک اور تازگی کا احساس بخش رہا تھا۔

بے ساختہ ہی اس کا دل مچلا کہ وہ گاڑی میں چلتے ایئر کنڈیشنر کی مصنوعی خنکی سے نکل کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس بخشتی کھیتوں کی ہریالی میں اُتر جائے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی اور اتنی تیزی سے اس کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکا اور گھٹنوں پر رکھی فائل کو سیٹ پر رکھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دائیں طرف پھیلے کھیتوں کا رخ کیا۔ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کو چھوڑ کر باہر نکلنے کی صورت میں اسے اپنے چہرے پر گرم ہوا کا تھپیڑا سا لگتا ہوا محسوس ہوا لیکن اے سی کی ٹھنڈک کے مقابلے میں یہ گرم ہوا زیادہ فرحت بخش تھی۔ وہ دل ہی دل میں قدرت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہوا کھیتوں میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب تک اسے وہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ دفعتاً اسے مدھم انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سماعت



زور دے کر آوازوں کو سننے لگا۔ وہ مرد و زن کا کوئی جوڑا تھا جو سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھا۔

''چھوڑو نا کمال! کیا کرتے ہو؟ مجھے گھر جانے میں دیر ہو گئی تو تیری اماں کی دس باتیں سننی پڑیں گی۔ پہلے ہی وہ الزام لگاتی ہے کہ میں نے اُلّو کا گوشت کھلا کر اس کا پُتر اس سے ہتھیا لیا ہے۔'' اسے عورت کی ناز بھری آواز سنائی دی۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اتنی صاف تھی کہ اسے ایک ایک لفظ واضح سنائی دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں اس کے بالکل قریب ہی موجود ہیں۔ اس نے کھڑی فصل کے دو نازک تنوں کو ہاتھوں سے دائیں بائیں کرتے ہوئے آواز کی سمت میں دیکھا۔ اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔ عورت نے زرد رنگ کے شلوار قمیض پر کئی رنگوں پر مشتمل دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جبکہ مرد کے جسم پر نیلا کُرتہ اور سفید دھوتی تھی۔ دھوتی کی سفیدی پر مٹی کے داغ دھبے نمایاں تھے۔

''میری اماں غلط تو نہیں بولتی۔ تُو نے اس کا پُتر تو واقعی ہتھیا لیا ہے۔ اب تیرے سوا میرا کسی چیز میں جی ہی نہیں لگتا۔'' مرد شوخی پر مائل تھا۔ بولتے بولتے اس نے عورت کے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ مرد اور عورت دونوں ہی نوجوان تھے جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی نو بیاہتا جوڑا ہے۔ اس پریمی جوڑے کی تنہائی میں مخل نہ ہونے کا سوچ کر اس نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے نازک تنوں کو چھوڑ دیا۔ عین اسی لمحے فضا میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔ ساتھ ہی اسے عورت کی خوف و دہشت میں ڈوبی سریلی چیخیں بھی سنائی دیں لیکن اس وقت اس کی توجہ پوری طرح آگ کا گولہ بنی اپنی گاڑی کی طرف مبذول تھی۔ مشکل سے دو ڈھائی منٹ پہلے وہ اس گاڑی میں موجود تھا۔ اگر اپنے اندر پیدا ہونے والی شدید خواہش پر اس نے گاڑی نہ چھوڑی ہوتی تو خود بھی یقیناً اس جلتی گاڑی کا ایک حصہ ہوتا۔ شدید شاک میں ہونے کے باوجود اسے احساس ہوا کہ گاڑی سے اُتر کر کھیتوں میں آنے کی خواہش درحقیقت غیبی مدد تھی۔ وہ جو زندگی اور موت کا مالک ہے، اسے ابھی اس کی موت منظور نہیں تھی۔ جب ہی اس نے ایک معمولی سی خواہش کے ذریعے اس کے جینے کی سبیل پیدا کر دی تھی۔

دل ہی دل میں وہ ربِّ کائنات کا شکر ادا کرتا ہوا پنجوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ جو کچھ ہوا، وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے اور اس سازش میں اس کے ڈرائیور کے بھی شامل ہونے کا قوی امکان تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ ڈرائیور کی نظروں میں نہ آئے اور وہ یہی سمجھتا رہے کہ دھماکے سے اُڑنے والی گاڑی کے ساتھ ساتھ اے سی شہریار عادل کے بھی پرخچے اُڑ گئے ہیں اور اب آگ میں اس کی باقیات جل رہی ہیں۔

وہ بیٹھے بیٹھے ہی کھیت میں پیچھے کی طرف سرکنے لگا۔ اتفاقاً اس کا رخ اسی طرف تھا جہاں وہ پریمی جوڑا موجود تھا۔ دھماکے نے ان دونوں کو خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ اب جو انہوں نے کھیتوں میں سے ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو برآمد ہوتے دیکھا تو اور بھی متوحش ہو گئے۔

''شش..... شور مت کرنا۔ مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے نوجوان عورت کو ایک بار پھر چیخنے کے ارادے سے منہ کھولتا دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اس نے اپنا کھلا ہوا منہ سختی سے بند کر لیا اور پھر یوں مرد کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس صورتِ حال سے تم ہی نمٹ سکتے ہو۔ میرے دماغ نے تو کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

''آپ کون ہو باؤ جی؟ ادھر کھیتوں میں کیا کر رہے ہو؟'' مرد ہمت کر کے دو قدم آگے بڑھا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔

''یہ جو گاڑی تباہ ہوئی ہے، میری ہی ہے اور میرے دشمنوں نے تباہ کی ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں اپنے دشمنوں سے بچ کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔'' اس نے مختصر الفاظ میں کمال نامی اس مرد کو بتایا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دینے لگا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شہریار نے گردن موڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ اس کی گاڑی اب تک آگ کا گولہ بنی ہوئی تھی۔ البتہ اب وہ اس آگ کے گولے کے پس منظر میں اپنے ڈرائیور اور کچھ کھیت مزدوروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کے چہروں پر تشویش تھی لیکن وہ جلتی ہوئی گاڑی کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے میں سے کوئی جلتا ہوا ٹکڑا ان کے اوپر نہ آ گرے۔ گاڑی جس طرح جل رہی تھی، یہ امکان کم ہی تھا کہ آگ جلد بجھ سکے گی۔ جب تک آگ جلتی رہتی اور کوئی قریب سے آ کر جلی ہوئی گاڑی کا جائزہ لینے کے قابل نہ ہوتا، یہ بات صیغۂ راز میں رہ سکتی تھی کہ وہ حادثے کے وقت گاڑی میں موجود نہیں تھا اور اسے اسی غیر یقینی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس کا جائے حادثہ سے جلد از جلد دور نکل جانا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے مرد کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''کیا تم مجھے کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے گاؤں سے باہر نکال سکتے ہو؟''

''نکال تو سکتا ہوں باؤ جی!..... پر راستہ بہت لمبا ہے۔ پیدل آپ کو دیر بھی لگے گی اور تھکن بھی بہت ہو جائے گی، پر مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔'' مرد نے جواب دیا تو اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں اُبھر آئیں۔ پیدل چلنا یا تھکن ہو جانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود وہ شروع ہی سے ایسی عادات کو اپنائے ہوئے تھا کہ اس کا اسٹیمنا خاصا مضبوط ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے دور میں اس نے کرکٹ، فٹ بال، ٹینس اور گھڑ سواری سمیت ایسے ہر کھیل میں حصہ لیا تھا جس میں جسمانی مشقت کے بغیر کامیابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی واقف تھا اور آج بھی پابندی سے ورزش اور جاگنگ کو اپنا معمول بنائے ہوئے تھا۔ لیکن اس وقت اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ اسے یہاں سے نکلنے میں جتنا کم وقت لگتا، اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا۔

''سواری تو مل سکتی ہے کمال!..... تُو میرے ابا سے جا کر ان کا تانگہ مانگ لے۔'' اب تک خاموش کردار بنی عورت نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔ لگتا تھا، وہ دھماکے کے اثر سے نکل آئی ہے اور اب گفتگو میں حصہ لینے کے قابل ہے۔

''تیرا ابا اتنی آسانی سے تانگہ دینے والا نہیں ہے۔ پہلے دس سوال کرے گا فیر ہی کل مانے گا۔'' کمال نامی مرد نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''تُو اس سے کہنا کہ شاہدہ کی طبیعت خراب ہے، اسے ہسپتال لے کر جانا ہے۔ وہ میری طبیعت کا سنے گا تو فوراً راضی ہو جائے گا۔'' اس کے لہجے میں وہی مان تھا جو ایک بیٹی کو اپنے میکے پر ہوتا ہے۔

''چل ٹھیک ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ تُو باؤ جی کو لے کر ادھر پرلی طرف آ جانا۔ میں تانگہ لے کر ادھر ہی آؤں گا۔'' کمال نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ فوراً ہی وہاں سے روانہ بھی ہو گیا۔

''آ جاؤ باؤ صاحب! کمال ابھی تانگہ لے کر آ جائے گا۔ میرا ابا مجھے بہت چاہتا ہے۔ میری طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ تانگہ ضرور دے گا۔'' تیقن سے بولتے ہوئے اس نے شہریار کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو وہ خودکار انداز میں اس الہڑ مٹیار کے ساتھ چل پڑا جو شاید خود بھی اپنے وجود کی حشر سامانیوں سے پوری طرح واقف نہیں



تھی۔ مناسب مقامات سے بھرے ہوئے جسم کے ساتھ لچکیلی پتلی کمر اور اس کمر کے دائیں بائیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھولتی اس کی سیاہ موٹی سی چٹیا میں ایسا جادو تھا کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جائے۔ لیکن وہ مکمل طور پر بے نیاز تھی اور ہرے بھرے کھیتوں میں اپنے زرد لباس کے ساتھ سرسوں کے پھول کی شبیہہ بنی متحرک تھی۔ شاید عورتوں کی اس قسم میں سے تھی جنہیں اپنے خاوند کے علاوہ نہ تو کسی دوسرے مرد کی ستائش کی چاہت ہوتی ہے، نہ وہ کسی کی للچائی نظروں سے خوف کھاتی ہیں۔ جن کے لیے اپنے کردار کی مضبوطی ہی سب سے بڑی حفاظتی ڈھال ہوتی ہے اور انہیں یقین ہوتا ہے کہ کتنا ہی بڑا سورما مقابل آ جائے، انہیں زیر نہیں کر سکے گا۔ ایسی عورتوں میں اپنی جان دے کر بھی اپنی عزت کی حفاظت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

وہ تیزی سے سوچتا ہوا شاہدہ کے رحم و کرم پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کھیت کے جس حصے سے وہ اسے گزار کر لے جا رہی تھی، وہاں کھڑی فصل کی قامت اتنی بلند تھی کہ سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کے باوجود دور سے انہیں دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔

''آپ اِدھر ہی رُکو باؤ جی! میں ابھی آئی۔'' چلتے چلتے شاہدہ نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب جو بھی تھا، اسے ان دونوں میاں بیوی پر ہی تکیہ کرنا تھا۔

انتظار کے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ شاہدہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھام رکھا تھا۔

''میں آپ کے لیے یہ کپڑے لائی ہوں۔ کمالے کی دھوتی اور کُرتہ ہے۔ میں نے اُدھر نہر پر دھو کر کھیتوں میں سوکھنے کے لیے ڈالا تھا۔ آپ یہ بدل لو۔ کوٹ پینٹ پہن کر نکلو گے تو فوراً ہی سب کی نظروں میں آ جاؤ گے۔'' اس نے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کپڑے اس کی طرف بڑھائے اور خود پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

شہریار نے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کا کڑھائی والا کُرتہ اور خوب اُجلی سفید دھوتی تھی۔ کپڑوں کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ کئی بار کے پہنے اور دُھلے ہوئے ہیں لیکن ان کا اُجلا پن شاہدہ کے نازک ہاتھوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ شاہدہ کی دلیل کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے وہ لباس پہننے کا فیصلہ کر لیا۔ کوٹ، ٹائی اور شرٹ اتار کر کُرتہ پہننے کا مرحلہ تو آسانی سے طے ہو گیا لیکن دھوتی کو پینٹ کی جگہ دینا دشوار تھا۔ دھوتی پہننے کا تجربہ اسے تو کیا، شاید اس کے آباؤ اجداد میں سے بھی کسی کو نہ تھا۔ وہ جتنا اس نامعقول لباس کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔

''جلدی کریں باؤ صاحب! کمال تانگہ لے کر پہنچتا ہی ہو گا۔'' تاخیر ہوئی تو پیٹھ موڑ کر کھڑی شاہدہ نے اسے پکارا۔

''کیا کروں، یہ دھوتی کسی طرح بندھ کر ہی نہیں دے رہی۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا تو شاہدہ کی کھنکناتی ہوئی ہنسی نے فضا میں جلترنگ سا بکھیر دیا پھر وہ آہستہ سے اس کی طرف پلٹی۔

''لائیں میں آپ کی مدد کروں۔'' اس نے خود ہی آگے بڑھ کر قرینے سے اس کی دھوتی باندھنی شروع کر دی۔ وہ جھینپا ہوا سا اس کی کارگزاری دیکھتا رہا۔ شاہدہ تر و تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح بڑے بھرپور شباب کی مالک تھی اور اس کی قربت کسی بھی مرد کو مسحور کر سکتی تھی۔ لیکن اپنی ازلی شرافت کے باعث شہریار نے اسے کسی بری نیت سے نہیں دیکھا۔ وہ خود ہی اپنا کام مکمل کر کے ذرا پیچھے ہٹی اور تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''واہ باؤ جی! اپنے کمالے کے بعد آپ دُوجے مرد ہو جس پر میں نے یہ لباس اتنا سجتا ہوا دیکھا ہے۔''

شہریار اس کے ریمارکس پر مسکرا دیا۔ دیکھا جائے تو کمال اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ کمال اس کی نسبت کافی دبتی ہوئی شخصیت کا مالک تھا لیکن وفا شعار شاہدہ نے اپنے شوہر کو ہی پہلا نمبر دیا تھا..... یا شاید اس محبت کا کمال تھا جسے نظروں میں بھر کر وہ کمال کو دیکھتی ہوگی اور وہ اسے دنیا کا سب سے خوبرو مرد دکھائی دیتا ہوگا۔

''بڑی محبت کرتی ہو تم کمال سے؟'' اس نے انتظار کے لمحات بتانے کے لیے شاہدہ سے پوچھا۔

''بالکل جی۔ پیدا ہوتے ہی چاچا نے مجھے کمال کے لیے مانگ لیا تھا۔ آپ یوں سمجھو کہ کمال کا نام سن سن کر ہی بڑی ہوئی ہوں۔ ابھی دو چار ماہ پہلے ہی ہمارا ویاہ ہوا ہے۔ کمال بھی مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے، پر چاچی کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ سمجھتی ہے میں نے اس سے اس کا پتر چھین لیا ہے۔ گھر میں ہمیں دو گھڑی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیتی۔ میں کمال کو روٹی دینے ادھر آتی ہوں تو ہم تھوڑی دیر دل کی بات کر لیتے ہیں۔ چاچی کے گوڈوں گٹوں میں اتنی دور چل کر آنے کے لیے دم ہوتا تو وہ مجھے روٹی بھی نہیں لانے دیتی۔ بس گھر بیٹھ کر ایک ایک منٹ گنتی رہتی ہے۔ ہور جو مجھے کچھ زیادہ دیر لگ جائے تو خوب منہ بھر کے گالیاں دیتی ہے۔ پر میں برا نہیں مانتی جی۔ میرے لیے میرے کمال کی محبت کافی ہے۔ باقی چاہے بھلے کوئی کچھ کہتا رہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کے پوچھنے کی دیر تھی، وہ فوراً شروع ہوگئی اور اس کے سامنے اپنی زندگی کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا۔ باوجود پریشانی میں مبتلا ہونے کے، وہ اس کی بے ساختگی پر مسکرا دیا۔ وہ بڑی زندہ دل لڑکی تھی جس کی آواز میں زندگی کی چہکار اور مستی بھری ہوئی تھی۔

''آج تو تمہاری چاچی بہت ناراض ہوگی۔ میری وجہ سے تمہیں یہاں بڑی دیر لگ گئی ہے۔'' اس نے مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے چھیڑا۔

''کوئی گل نہیں جی۔ کسی کے کام آنا بھی نیکی ہے۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا۔ اسی وقت انہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

''لو جی، کمال آ گیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرا ابا مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے۔ میری بیماری کا سن کر وہ فوراً اپنا تانگہ دے دے گا۔'' شاہدہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی جس سے اس کی گندمی رنگت کچھ اور بھی دمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ان دونوں نے آواز کی سمت جھانک کر دیکھا۔ وہ واقعی کمال تھا جو تانگے میں سوار اس طرف آ رہا تھا۔

''چلیں باؤ جی! ادھر سے نکلتے ہیں۔'' شاہدہ جوش سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں وہ گٹھڑی بھی تھام رکھی تھی جس میں اس نے باتوں کے دوران اس کا پینٹ کوٹ اور شرٹ وغیرہ تہ کر کے باندھ دیا تھا۔ گٹھڑی باندھنے کے لیے اس نے کندھے پر ڈالے جانے والے بڑے سے مردانہ رومال کو استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کمال نے تانگے کو روکا تھا۔ تانگے کے پچھلے حصے میں چادر لگا کر پردہ سا باندھ دیا گیا تھا جسے دیکھ کر وہ خوش ہوگیا۔ اب اس کے لیے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل جانا مزید آسان ہوگیا تھا۔ وہ اور شاہدہ دونوں تانگے کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے اور کمال نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔

''چاچا روٹی کھانے گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے تانگہ مانگا تو تیری طبیعت کی خرابی کا سن کر خود بھی ساتھ آنے کے لیے اُٹھنے لگا۔ میں نے دلاسا دیا کہ زیادہ پریشانی کی گل نہیں ہے۔ تُو آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا، میں اور شاہدہ چار چھ گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔'' وہ تانگہ بھگاتے ہوئے بلند آواز میں اپنی بیوی کو حالات سے آگاہ



کرنے لگا۔

''میرے خیال میں یہاں سے پکی سڑک پر پہنچنے کے لیے اتنا زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ تانگے میں دو اڑھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''وہ تو آپ اپنے حساب سے سوچ رہے ہو باؤ جی! مجھے ہسپتال میں لگنے والے وقت کا بھی تو حساب رکھنا تھا اس لیے اتنی دیر کا بولا ہے۔ آپ کو لاری اڈے پر چھوڑ کر ہم دونوں کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور تھوڑی گپ شپ کر لیں گے۔'' شہریار نے دیکھا کہ اس کی بات پر اس کے ساتھ بیٹھی شاہدہ کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی ہے۔ یقینی طور پر کمال نے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی تھی جس سے کچھ دیر قبل وہ اسے کھیتوں میں مستفید کر رہا تھا۔ اس نے دونوں میاں بیوی کے نجی معاملے پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''دھماکے کی آواز تمہارے گاؤں میں نہیں سنی گئی کیا؟''

''نہیں جی، گاؤں کی آبادی ذرا دور ہے اس لیے وہاں اتنی زور کی آواز نہیں گئی۔ البتہ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں نے ضرور آواز سنی ہوگی۔ میں نے کئی لوگوں کو بھاگ کر ادھر سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اسی لیے میں آپ کو پرلی طرف سے گھما کر لے جا رہا ہوں۔ ادھر سے راستہ تھوڑا لمبا تو ضرور ہو جائے گا لیکن آپ حفاظت سے نکل جاؤ گے۔'' کمال نے اسے بتایا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ کمال! مجھے تم دونوں میاں بیوی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہو سکا تو میں کبھی تم سے ملنے یہاں ضرور آؤں گا، ورنہ یہ تو مجھے ہمیشہ یاد ہی رہے گا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک ہنسوں کا جوڑا سا جوڑا تھا جس نے صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ اپنے وطن پر بھی ایک احسان کیا ہے۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔

''احسان وحسان کی کوئی گل نہیں جی۔ بندہ بندے کے کام آتا ہے تو دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم آپ کے کام آئے۔ باقی آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہم سے ملنے آؤ یا نہ آؤ۔ اگر آئے تو ہمیں آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ ورنہ تو کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا تو شہریار دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آج کے دور میں اس طرح کے بے غرض لوگ تقریباً عنقا ہی ہوتے جا رہے تھے لیکن بہرحال اس دنیا میں موجود تھے، جب ہی اب تک دنیا سلامت تھی ورنہ شاید قیامت ہی برپا ہو چکی ہوتی۔

''میں ایک بار پھر تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح تم مجھے رازداری سے یہاں سے نکال رہے ہو، اسی طرح آگے بھی یہ راز اپنے سینوں میں ہی رکھو گے کہ تم نے مجھے یہاں سے نکالنے میں مدد دی تھی۔ اس میں تمہاری اور میری دونوں کی بھلائی ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ میرے دشمن اپنی ناکامی پر جھلا کر تم دونوں کو سزا دینے کے لیے کچھ اُلٹا سیدھا کر گزریں۔'' اسے افسوس تھا کہ وہ اس سادہ لوح جوڑے کو ڈرا رہا ہے لیکن اپنے یہاں سے نکلنے کی بات کو راز میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

''ٹھیک ہے باؤ جی! آپ کو لاری اڈے چھوڑنے کے بعد ہم ایسے آپ کو بھول جائیں گے جیسے کبھی آپ سے ملے ہی نہیں تھے۔'' کمال نے اس سے فوراً ہی وعدہ کر لیا۔ جب سے اس کے اور شہریار کے درمیان مکالمات شروع ہوئے تھے، شاہدہ نے گفتگو میں قطعی دخل نہیں دیا تھا اور خاموشی سے بیٹھی اپنی لمبی چوٹی کو ہاتھ سے بل دیتی رہی تھی۔ باقی کا راستہ بھی چھوٹی موٹی باتوں میں گزرتا چلا گیا۔ ان باتوں سے شہریار کے علم میں

ان کے سارے حالات آ گئے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ شاہدہ کا باپ تانگہ چلاتا تھا جبکہ کمال، اس کا باپ اور بھائی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کھیت ان کی ملکیت نہیں تھے اس لیے محنت کے مقابلے میں انہیں بہت کم آمدنی ہوتی تھی۔ کم آمدنی کے باوجود وہ گھرانہ قناعت وصبر کی وجہ سے شکر گزاری سے زندگی گزار رہا تھا اور انہیں کاتبِ تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں مست تھے۔ خصوصاً کمال، شاہدہ سے شادی کے بعد بہت خوش تھا۔ یہی حال شاہدہ کا تھا۔ اپنی گھریلو ذمے داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ معاوضے پر کشیدہ کاری وغیرہ کرتی تھی تاکہ شوہر کی ذمے داریوں میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔

اسے یہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے۔ تانگے کے تھکا دینے والے سفر کو ختم کر کے وہ لوگ لاری اڈے کے قریب پہنچے تو اس کے دل پر ان دونوں کا بہت خوب صورت سا نقش ثبت ہو چکا تھا۔

''میرے لیے یہاں سے لاہور تک کا ٹکٹ لا دو۔'' اس نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہی کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک نوٹ نکال کر کمال کے حوالے کیا۔ موجودہ حالات میں اسے براہِ راست نور کوٹ واپس جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور جانے کے متعلق بھی اس نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ سوچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے وہاں کا ٹکٹ منگوایا تھا۔ اس موقع پر وہ ذیشان سے مشاورت کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کرنل توحید کے بعد دشمنوں کا دوسرا نشانہ خود اس کی اپنی ذات ہو سکتی ہے۔ ماریہ کی موت کے بعد وہ دونوں ہی ممکنہ ہدف تھے جو دشمن کے سامنے تھے اور جنہیں انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ کرنل توحید ذیشان کی بہتر حکمتِ عملی اور سکیورٹی کی وجہ سے خود پر ہونے والے حملے سے محفوظ رہے تھے جبکہ وہ ماضی کی طرح اب بھی صرف اور صرف اپنی خوش قسمتی کے بل بوتے پر زندہ تھا اور ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ قدرت کو اس سے کچھ اہم کام لینے منظور ہیں، جب ہی اس کی زندگی کی حفاظت کا انتظام خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

تانگے کے سفر کے دوران وہ مسلسل اپنے موبائل پر سگنلز بھی چیک کرتا رہا تھا لیکن کہیں بھی اسے سگنلز نہیں ملے تھے۔ لاری اڈے پہنچ کر اس نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ کمزور ہی سہی لیکن سگنلز ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کا نمبر ٹرائی کیا۔ بیل جانے کی مخصوص آواز سنائی دی پھر کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف سے ذیشان کی بہت دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''تمہارا اندیشہ درست ثابت ہوا ہے۔ مجھ پر بھرپور قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور میری گاڑی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔'' ذیشان کی آواز سنتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔ لیکن جب ردِعمل میں مسلسل ذیشان کی ''ہیلو ہیلو'' ہی سنائی دیتی رہی تو سمجھ گیا کہ کمزور سگنلز کی وجہ سے اس کی آواز اس تک نہیں پہنچ پا رہی۔ مایوس ہو کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ذیشان کو کچھ دیر بعد دوبارہ کال کرنے کا ٹیکسٹ میسج کر ڈالا۔ اس دوران کمال اس کے لیے ٹکٹ لے آیا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ دس منٹ بعد لاری وہاں سے روانہ ہو جائے گی۔ اس نے ٹکٹ شہریار کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ رقم بھی اس کی طرف بڑھا دی۔

''رہنے دو یار! یہ تم رکھ لو۔ بلکہ یہ کچھ رقم اور بھی ہے میرے پاس۔ یہ بھی تم لے لو۔'' اس نے انکار کرتے ہوئے اپنا پرس نکالنا چاہا۔

''معاف کرنا باؤ جی! ہم کوئی اسٹیشن پر مزدوری کرنے والے قلی نہیں ہیں جو صاحب لوگوں سے بخشش لے کر خوش ہوں۔ آپ کو ہم نے اپنا پروہنا سمجھا تھا اور پروہنے کی ہم خدمت کرتے ہیں، ان سے کچھ لیتے نہیں۔'' کمال اس کی بات کا اچھا خاصا برا مان گیا تو اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا اور اس نے خاموشی سے



ہاتھ بڑھا کر اس غریب لیکن خوددار دیہاتی سے باقی رقم واپس لے لی۔ اگر غربت کے باوجود اس کی خودداری سلامت تھی تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اسے اس نعمت سے محروم کر دے۔

''آپ ٹھہرو، میں ذرا گنے کے رس والے سے تین گلاس پکڑ لاؤں۔ حلق خشک ہو گیا ہے، رس پی کر ذرا سکون ملے گا۔'' کمال نے بھی اس کے رقم واپس لینے کو کافی جانا اور فوراً ہی بولتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار ابھی تک تانگے کی پچھلی نشست پر ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہدہ بھی موجود تھی۔

''اچھا کیا کہ آپ نے روپے واپس لے لئے۔ ویسے تو کمال وڈا چنگا بندہ ہے لیکن کسی گل وِچ مزاج بگڑ جائے تو فیر کسی کے قابو میں نہیں آتا۔'' کمال کے جاتے ہی شاہدہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں روپے دے دیتا ہوں۔ بہت زیادہ نہیں ہیں پھر بھی تم لوگوں کے کام آ سکتے ہیں۔'' اس نے شاہدہ کو پیشکش کی۔

''توبہ کریں جی۔ میں کوئی ایسی زنانی تھوڑی ہوں جو اپنے شوہر کے پیچھے غیر مردوں سے روپے لیتی پھروں۔'' اس نے باقاعدہ اپنے گال پیٹ ڈالے اور تھوڑی ناراض نظر آنے لگی۔

اس دوران کمال گنے کے رس سے لبالب بھرے کنگ سائز کے گلاس لے کر واپس آ چکا تھا اس لیے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے کمال کا بڑھایا ہوا گلاس تھام لیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد کانشس ہونے کے باوجود وہ اس کے خلوص کی وجہ سے کسی صورت انکار نہیں کر سکا تھا۔ ورنہ یوں راہ چلتے ایسی کسی جگہ سے کچھ لے کر کھانا یا پینا اس کی فطرت وتربیت دونوں ہی کے خلاف تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ گنے کا رس سچ مچ بہت مزے دار تھا یا اسے پیاس ہی شدید لگ رہی تھی کہ وہ تین چار منٹ میں پورا گلاس خالی کر گیا۔ کمال نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا البتہ ناراض سی شاہدہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے بھی اپنا گلاس خالی کر لیا تو کمال پھرتی سے گلاس سمیٹ کر واپس کر آیا۔ اب گاڑی روانہ ہونے کا بھی وقت ہو گیا تھا اس لیے کمال نے اسے تانگے سے اترنے کو کہا اور شاہدہ کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

''اپنی بیوی کی ہمیشہ بہت قدر کرنا کمال! اس جیسی مخلص اور نیک عورت تمہیں دوسری نہیں مل سکتی۔ مجھے اب بھی موقع ملا، میں اپنی اس چھوٹی بہن کا حال معلوم کرنے ضرور تمہارے پنڈ کا چکر لگاؤں گا۔'' تانگے سے اترنے سے قبل اس نے کمال سے کہا اور شاہدہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے الفاظ و انداز نے شاہدہ کی ناراضگی دور کر دی اور اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

''اللہ کی امان میں جاؤ بھرا! تمہاری بہن تمہارے لیے دعا کرتی رہے گی۔'' اس نے اسے دعاؤں سے نوازتے ہوئے رخصت کیا۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو بھی اس کا ذہن اپنی زندگی میں آنے والے ان دو کرداروں میں الجھا ہوا تھا جنہیں مشکل گھڑیوں میں اس کا مددگار بنا کر بھیجا گیا تھا۔ بہت معمولی حیثیت رکھنے والے ان دو کرداروں نے اسے باور کروایا تھا کہ ''را'' اور ''موساد'' جیسے طاقتور ادارے کتنی ہی کوشش کر لیں، اللہ کو جب تک اس کی زندگی منظور ہے، وہ اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ وہ بھی ان لوگوں کے ذریعے جن کی اصل بڑی قوتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کیونکہ کوئی انسان بظاہر کتنا بھی قوی نظر آئے، اس ہستی کے سامنے ہرگز نہیں ٹھہر سکتا جو طاقت وقوت کا اصل سرچشمہ ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں عزت، ذلت، موت، زندگی سمیت ہر ہر شے موجود ہے۔

⊛----✪----⊛

قیمتی فرنیچر اور نازک آرائشی اشیا کی نہایت توجہ سے جھاڑ پونچھ کرتی شہزادی کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھا دی۔

وہ کرسٹل کے ایک نازک سے گلدان کو اچھی طرح چمکانے کے بعد تپائی پر رکھنے کے لیے پلٹی تو اس درشت چہرے والے مرد کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ اور گلدان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ سامنے موجود شخص اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ کئی بار اسے بالے کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ چودھری کا ہی نمک خوار ہے اور چودھری کے کسی نمک خوار کی فاریسٹ آفیسر کے بنگلے میں موجودگی خاصی معنی خیز تھی۔

شہریار نے اس کے ذمے کام بھی یہی لگایا تھا کہ وہ کسی طرح چودھری اور فاریسٹ آفیسر کے گٹھ جوڑ کی وجہ کا کھوج لگا کر بتائے۔ خوش قسمتی سے اس کی درخواست پر منشی اللہ رکھا نے اسے نوکری دلائی بھی تو فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر..... ورنہ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے حویلی میں کوئی کام مل جائے گا اور اسے وہاں رہ کر شہریار کی سونپی گئی ذمے داری اٹھانی پڑے گی۔ لیکن بنگلے پر کام ملنے سے جہاں اس کی راہیں آسان ہو گئی تھیں، وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ بظاہر چودھری سے الگ نظر آنے والے عابد انصاری کے حویلی والوں سے خصوصی مراسم ہیں ورنہ منشی اللہ رکھا اتنی آسانی سے اسے یہاں کیونکر ملازمت دلا پاتا۔

چودھری کے ایک نمک خوار کی یہاں موجودگی نے اس تعلقِ خاطر کو مزید ثابت کر دیا تھا لیکن فی الحال وہ ان معاملات پر نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت تو ایک عورت کی حیثیت سے بند کمرے میں کسی آدمی کے ساتھ موجودگی نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا اور وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

''جی لگ گیا تیرا یہاں؟ کام زیادہ مشکل تو نہیں ہے؟'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے وہ لطف اندوز ہونے والے انداز میں مسکرایا تو اس کا کریہہ چہرہ کچھ اور بھی مکروہ لگنے لگا۔

''جی سب ٹھیک ہے، کام بھی ٹھیک ہے۔'' اس سے عجیب سی گھن محسوس ہونے کے باوجود شہزادی نے سلگتے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ اس قسم کے سوال جواب کوئی با اختیار بندہ ہی کر سکتا تھا۔

''میرا نام بہرام ہے۔ میں یہاں کا سپروائزر ہوں۔ تُو نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ ادھر کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن میں نے منشی جی کے کہنے پر صاحب سے تیری خاص سفارش کر کے تجھے ادھر رکھوایا ہے اور میں جب چاہوں تجھے یہاں سے نکلوا بھی سکتا ہوں اس لیے ذرا ہوشیار رہنا کہ مجھے تجھ پر غصہ نہ آئے۔'' وہ اسے دھمکا رہا تھا۔

''چنگا جی۔'' اس نے مختصر جواب دے کر اپنی جان چھڑانا مناسب سمجھا پھر اجازت طلب کرنے والے انداز میں بولی۔ ''میں ادھر باورچی خانے میں جا کر خانساماں سے پوچھتی ہوں کہ اسے کوئی کام تو نہیں کروانا۔''

''اُدھر کا کام بعد میں دیکھ لینا، پہلے یہ پھیلاوا تو سمیٹ۔ ملوم ہے تُو نے کتنا قیمتی گلدان توڑ ڈالا ہے سال بھر بھی تیری تنخواہ سے کٹوتی کرواؤں تو قیمت ادا نہیں ہو گی۔ پر جانے دے، تیری خاطر میں صاحب سے شکایت نہیں کروں گا۔'' وہ اطمینان سے ایک صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''شکریہ جی۔'' شہزادی نے اس کا احسان تسلیم کرتے ہوئے نیچے بیٹھ کر ٹوٹ جانے والے گلدان کی کرچیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔

''تیرا حال دیکھ کر وڈا جی کُڑھتا ہے۔ بالے سے تیرا ویاہ ہوا تھا، جب تُو کتنی سوہنی تھی لیکن بد بخت نے تیرا سارا حُسن ہی برباد کر ڈالا۔ میں نے پہلی واری تجھے دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ہور سچ بولوں اگر بالے کی



جگہ تُو مجھے ملی ہوتی تو میں تجھے سچ مچ کی شہزادی بنا کر رکھتا۔ خیر، اب تو مجھے موقع مل گیا ہے۔ تُو یہاں آرام سے رہ۔ چنگی طرح کھا پی۔ کام کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا بہت بھی کر لے گی تو کافی ہو گا۔ میں نے سب کو سمجھا دیا ہے کہ تیرے ساتھ کوئی زور زبردستی نہ کریں۔ تُو دیکھنا، یہاں کے آرام اور کھلائی پلائی سے تیرا حُسن چند دن میں ہی دوبارہ واپس آ جائے گا۔''

بظاہر تو وہ اس سے بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا لیکن ایک عورت کی جبلّت اسے بتا رہی تھی کہ یہاں اس کی عزت خطرے میں ہے اور بہرام شاہ قربانی کے بکرے کی طرح اسے کھلا پلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ موقع ملتے ہی وہ اسے ذبح کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ کسی عورت کے لیے اپنی عزت کا گوہر کھو دینا ذبح ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

''آپ کا شکریہ جی، پر میں نے نوکری کی ہے تو حلال کر کے ہی کھاؤں گی۔ بڑے صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔'' اس نے ایک ہی جملے میں واضح کر دیا کہ اس کے لیے بہرام کی پیشکش میں کوئی کشش نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ خود کو بہرام کی نہیں بلکہ فاریسٹ آفیسر کی ملازمہ سمجھتی ہے۔

''ادھر تھوڑے دن رہے گی تو حلال حرام سب بھول جائے گی۔ یہ فاریسٹ آفیسر صاحب کا بنگلہ ہے اور وہ ادھر جنگل کا قانون ہی چلاتے ہیں۔ جنگل کا قانون تو تجھے ملوم ہی ہو گا۔ جس میں دم ہوتا ہے، وہ اپنے سے کمزور کو شکار کر کے کھا جاتا ہے۔'' وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کھڑا ہوا اور اس کے عین سامنے آ کر رک گیا۔

''ساری فکریں وکریں چھوڑ دے۔ موج سے رہ۔ بے فکری سے رہے گی تو پھر سے پہلے والی گلاب سی شہزادی بن جائے گی۔ ہور مجھے اسی وقت کا انتظار ہے۔'' اس کی کلائی پکڑ کر اسے جھٹکے سے اپنے قریب کرتے ہوئے اس نے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں کو اپنی کھردری انگلیوں سے چھوتے ہوئے گویا افسوس کا اظہار کیا۔

''کم بخت نے تیرا سارا رس ہی چوس لیا ہے، پر کوئی گل نہیں۔ ادھر رہے گی تو تھوڑے دن میں فیر دوبارہ نکھر جائے گی۔'' اس بار وہ اپنی بات کہہ کر وہاں مزید رُکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہزادی اپنی جگہ سُن سی کھڑی رہ گئی۔ بہرام کے الفاظ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ لیکن ظاہر ہے بالے کو چودھری کے نزدیک جو مقام حاصل تھا، اس کے باعث وہ کبھی اپنی بدنیتی کو ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اب بالے کی موت اور اسے یہاں ملازمت دلانے کے بعد وہ اسے اپنے لیے نوالہ سمجھ رہا تھا اس لیے فوری طور پر جھپٹ پڑنے کے بجائے انتظار کے لیے بھی راضی تھا۔

وہ خوف زدہ سی سمٹی ہوئی کرچیاں ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر نکل آئی۔ کرچیاں کچرے کے ڈبے میں ڈالنے کے بعد اس نے سیدھا اس کمرے کا رخ کیا جو بنگلے کی مرکزی عمارت سے ذرا ہٹ کر اسے رہائش کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس بچے کے لیے اس نے خصوصی اجازت حاصل کی تھی جبکہ باقی بچے اپنی دادی کے ساتھ گاؤں میں ہی رہ رہے تھے۔

بچے کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی ہوئی وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگی۔ شہریار نے اسے جو کام سونپا تھا، وہ ابتدا میں ہی اس کے لیے خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ بس اطمینان تھا تو اتنا کہ بہرام فوری طور پر اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ چاہتی تو اپنی کارکردگی کی رفتار تیز رکھتے ہوئے جلد اصل مقصد حاصل کر سکتی تھی۔ مقصد کے حصول کے بعد اسے مزید یہاں رُکنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جب چاہتی، آرام سے نوکری چھوڑ جاتی کیونکہ مالی مسائل حل کرنے کا تو شہریار نے وعدہ کر ہی رکھا تھا

اور اسے یقین تھا کہ اے سی ایک ایمان دار آدمی ہے جو اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

اپنے حالات کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد اس نے فی الحال پریشان کن سوچوں کو جھٹک دیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگی۔

⊛----✪----⊛

''خوش آمدید..... خوش آمدید۔ تمہیں اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر جو دلی خوشی ہو رہی ہے، اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔''

وہ ذیشان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کا والہانہ استقبال کیا اور پھر مزید پیش رفت کرتے ہوئے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کا یہ انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ شہریار کو اپنا دل گداز ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد ماموں، ممانی نے پرورش کی اور سجاد رانا کزن سے بڑھ کر بڑے بھائی کی حیثیت سے محبت و شفقت سے نوازتے رہے۔ سجاد رانا کی موت کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا لیکن آج ذیشان کی بے ساختگی دیکھ کر اسے بالکل ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو..... جسے اپنے بھائی کے کسی مصیبت سے صحیح سلامت بچ نکلنے کی اتنی بے تحاشا خوشی تھی کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

شاہدہ اور کمال کی معاونت سے ان کے گاؤں سے نکلنے کے بعد اس نے راستے میں ایک بار پھر ذیشان سے رابطہ کیا تھا اور اس نے اسے سیدھا لاہور آنے کے بجائے فیصل آباد چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ فیصل آباد کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لیے بازار سے ایک سلا سلایا شلوار قمیض کا جوڑا خریدا اور خود کو دھوتی کُرتے سے نجات دلائی۔ عادی نہ ہونے کے سبب وہ لباس اس کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہدہ نے اسے یہ لباس فراہم کر کے اس پر بڑا احسان کیا تھا۔ اور وہ دیہاتی ماحول میں اپنے پینٹ کوٹ کی وجہ سے نمایاں ہونے سے بچ کر آسانی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کمال کا دھوتی کُرتہ اُس نے احتیاط سے تہ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا تاکہ اگر کبھی اس کے گاؤں جانے کا موقع ملے تو اس کی امانت واپس کر دے۔

فیصل آباد کے ہوٹل میں اسے زیادہ دیر قیام نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ذیشان کو اپنے ٹھکانے سے آگاہ کر دیا تھا اور ذیشان نے فوراً ہی کچھ ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ ایک آرام دہ گاڑی ڈرائیور سمیت اسے لینے کے لیے پہنچ گئی تھی اور اسی گاڑی کی مدد سے وہ لاہور میں واقع سی ایف پی کے دفتر میں پہنچ گیا تھا جہاں ذیشان کھلی بانہوں سے اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔

''تمہارے خلوص کا شکریہ یار! موت اور زندگی کی یہ آنکھ مچولی تو ہمارے ساتھ چلتی ہی رہتی ہے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے، موت کو اسی طرح شکست ہوتی رہے گی۔ ورنہ وقت پورا ہو گیا تو پھر کوئی بھی معمولی سا سبب موت کا بہانہ بن جائے گا۔'' اس نے ذیشان سے علیحدہ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی اپنے جذبات پر قابو پا کر مسکرایا اور بولا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگیاں ذرا زیادہ قیمتی محسوس ہوتی ہیں۔ کرنل توحید اور تمہارا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں ہی پے در پے ہونے والے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور یقیناً دشمن اس وقت اپنی ناکامیوں پر اپنے سر کے بال نوچ رہا ہو گا۔''



''دشمن کی ناکامی کی خوشی اپنی جگہ لیکن ہمارے لیے اصل لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ ہمارا دشمن اتنا مضبوط ہے کہ ہمارے گھر میں ہی گھس کر ہم پر حملے کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ کسی خاص فرد کا خوش قسمتی سے بچ نکلنا باعثِ خوشی سہی لیکن قوم کی تقدیر پر تو سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ہم کب، کہاں اور کس نوعیت کا نقصان اٹھا بیٹھیں، ہمیں معلوم ہی نہیں ہے جبکہ دشمن یقیناً مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ میدان میں اُترا ہوا ہے۔'' اس نے نہایت تفکر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد بھی ماضی کی طرح ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آ سکا ہے۔ حالانکہ میں فوری طور پر حرکت میں آ گیا تھا اور خوش قسمتی سے ہم نے تمہارے ڈرائیور کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ لیکن حسبِ معمول وہ صرف کرائے کا آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس سے تفتیش کے نتیجے میں ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق کسی اجنبی نے اس سے ملاقات کر کے ایک بڑی رقم کے عوض اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اسے ایک پیکٹ دیا گیا تھا کہ جب کبھی مشابرم خان کی غیر موجودگی کے باعث وہ تمہاری گاڑی ڈرائیو کرے تو یہ پیکٹ گاڑی کی ڈِکی میں رکھ دے اور پھر موقع دیکھ کر کسی مناسب جگہ پر گاڑی روک کر خود دور جا کر ریموٹ کنٹرول کی مدد سے بم بلاسٹ کر دے۔ ہم نے اس سے ریموٹ کنٹرول برآمد کر لیا ہے اور ساتھ ہی ہمارے آدمیوں نے موقع کا جائزہ بھی لیا ہے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ تمہاری گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے ہیں اور زمین پر کئی فٹ گہرا گڑھا بن گیا ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم گاڑی میں موجود ہوتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ میرے خیال میں تو ہمارے لیے تمہارے سارے ٹکڑوں کو یکجا کرنا بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔''

ذیشان نے اس کے سامنے صورتِ حال واضح کی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ قائم کر چکا تھا۔ البتہ اس وقت اسے ذیشان کی ٹیم کی کارکردگی نے خوش کیا تھا کہ ایک طرف انہوں نے اسے سہولت سے فیصل آباد سے لاہور پہنچا دیا تھا تو دوسری طرف جائے وقوعہ پر بھی کام کرتے رہے تھے۔

''چلو، یہ اچھا ہوا کہ میں نے بم کے ساتھ پھٹنے سے بچ کر تمہیں زحمت سے بچا لیا۔ ورنہ واقعی اس وقت تم میرے ٹکڑے جمع کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہوتے۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مذاق کیا۔

''بکواس مت کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اگر سچ مچ ایسی نوبت آ جاتی تو مجھ پر کیا گزرتی۔'' ذیشان نے اسے تنبیہہ کی اور پھر فوراً ہی دستک کی آواز کے ساتھ کمرے میں آنے والے ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے حکم پر ہی چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لیے وہاں پہنچا تھا۔ ملازم چائے تیار کر کے ان کے سامنے پیالیاں رکھ کر واپس چلا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''میں نے کرنل توحید کو بھی اس واقعے کی رپورٹ دے دی تھی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم جیسے ہی پہنچو، انہیں اطلاع کر دی جائے۔ وہ خود تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہاری گاڑی دفتر کے سامنے پہنچتے ہی انہیں اطلاع کر دی تھی اور انہوں نے جو وقت دیا تھا، اس کے مطابق وہ ٹھیک دس منٹ بعد یہاں موجود ہوں گے۔ اس دوران تم چائے وغیرہ پی کر فارغ ہو جاؤ تاکہ ان سے اطمینان سے ملاقات کر سکو۔''

ذیشان کی دی ہوئی اطلاع اس کے لیے اہم تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس پر شدید قاتلانہ حملہ ہوا تھا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل توحید اس سے بنفسِ نفیس ملاقات کے لیے کیوں تشریف لا رہے ہیں۔ فی الحال وہ ذیشان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چائے اور اسنیکس سے مستفید ہونے لگا۔

لاری اڈے پر کمال کے پلائے ہوئے گنے کے رس کے بعد کھانے پینے کی کوئی شے اس کے حلق سے نیچے نہیں اُتری تھی۔ وہ اتنی بری طرح اُلجھ گیا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ پھر یوں بھی اسے فیصل آباد

ے ہوٹل میں کچھ دیر کے لیے قیام کے سوا کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا ہی کب تھا۔ زیادہ تر وقت تو سفر میں ہی گزر گیا تھا چنانچہ اس وقت جو کچھ سامنے تھا، اس سے فیض یاب ہونا مناسب تھا۔

دس منٹ کا دورانیہ کھانے پینے اور ذیشان سے گفتگو کرنے میں تیزی سے گزر گیا۔ ذیشان کو خود بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کرنل توحید اس سے کس مقصد کے تحت ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنی جگہ شدید تجسس کا شکار تھا۔

دسواں منٹ گزرتے ہی کرنل توحید وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بلیک ٹراؤزر پر سرمئی اور نیلی دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور شہریار اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اگر وہ بلتستان میں اسے فل فوجی یونیفارم میں بہت باوقار لگے تھے تو اس رف حلیے میں بھی شاندار لگ رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر جچنے لگتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ جو لباس پہن لیں، اس لباس کی شان بڑھ جاتی ہے۔ ان دونوں نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ذیشان نے فی الفور اپنی نشست ان کے لیے خالی کر دی۔

''اوہو، تو یہاں چائے کا دور چل رہا تھا..... بہت خوب۔'' انہوں نے نشست پر براجمان ہوتے ہوئے ایک نظر میز پر ڈالی اور بے تکلفی سے بولے۔ سی ایف پی کے اس دفتر آتے ہوئے وہ صرف اپنی فوجی یونیفارم ہی نہیں چھوڑ کر آئے تھے بلکہ لہجے کا وہ کلف بھی غائب تھا جو ایک فوجی افسر کی شان کا اظہار کرتا ہے۔

''جی سر! اصل میں شہریار کافی لمبا سفر کر کے آیا تھا تو میں نے اسے ریفریش کرنے کے لیے یہ بندوبست کروا دیا۔ آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے چائے منگوا لوں۔'' ذیشان نے انہیں جواب دیتے ہوئے فوراً پیشکش کی۔

''نہیں بھئی۔ میرا اس وقت چائے کا موڈ نہیں ہے۔ میرے لیے تم لائم جوس منگوا دو۔'' انہوں نے اسی بے تکلفی سے جواب دیا جسے سن کر ذیشان فوراً ہی انٹرکام پر مصروف ہو گیا۔

''اور ینگ مین! تم سناؤ..... کیسا لگ رہا ہے ایک اور قاتلانہ حملے سے بچ نکلنا؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے براہِ راست شہریار سے سوال کیا۔

''تھوڑی سی اُلجھن کا شکار ہوں۔ میری فیملی یہ خبر سن کر بری طرح ڈسٹرب ہو گئی ہو گی۔ دفتر میں بھی ہلچل مچی ہوئی ہو گی۔ لیکن میں نے ذیشان کی ہدایت پر اب تک کسی سے رابطہ کر کے تسلی نہیں ہے اور اپنا موبائل بھی آف کر دیا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یہ ضروری تھا۔ دشمنوں کو اس اُلجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں ہو۔ اور فی الحال یہاں آرام سے رہو۔ رہی تمہاری فیملی کی بات تو انہیں اطمینان دلا دیا جائے گا۔ دفتر کے عملے کو مطمئن کرنا اتنا ضروری نہیں ہے۔'' انہوں نے دوٹوک لہجے میں اسے جواب دیا۔

''اوکے..... ایز یو وِش۔'' شہریار نے شانے اُچکا کر بے فکری کا اظہار کیا اور مؤدبانہ بولا۔ ''میرے لیے مزید کیا حکم ہے؟''

جواب میں کرنل توحید اسے بغور دیکھنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اندر تک کھنگال لینا چاہتے ہوں۔ اپنے اس جائزے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر اچانک ہی بولے۔

''تمہارے لیے اے سی شہریار عادل کی کتنی اہمیت ہے؟''

سوال عجیب تھا اور وہ اس سوال کا مقصد بھی نہیں سمجھ سکا تھا لہٰذا اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔



''ہر انسان کے لیے اس کی شخصیت اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ اسی حوالے سے پہچانا اور شناخت کیا جاتا ہے۔ میرے والدین نے میرا نام شہریار عادل رکھا تھا اس لیے مجھے یہ نام دل و جان سے عزیز ہے۔ رہی اے سی کے عہدے کی بات تو یہ عہدہ میں نے رعب داب یا افسری کی چاہ میں حاصل نہیں کیا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر صورت کوشاں رہوں گا۔ اب چاہے میں ترقی پا کر اے سی سے ڈی سی بن جاؤں یا اس عہدے سے محروم ہو کر کوئی نچلے درجے کا کام کرنے لگوں..... میرا مقصد کسی صورت تبدیل نہیں ہو گا۔''

''مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی اور اس جواب کو ذہن میں رکھ کر میں تمہارے سامنے دو تجاویز لے کر آیا ہوں۔'' کرنل توحید اپنی نشست پر کچھ اور اطمینان سے بیٹھ گئے لیکن شہریار مسلسل ان کی نظروں کے حصار میں تھا۔ اسی وقت ملازم دستک دے کر اندر آیا اور ان کا فرمائش کردہ لائم جوس کا گلاس ان کے سامنے لا کر رکھا۔ ملازم کی واپسی تک کمرے میں خاموشی رہی پھر شہریار نے اس خاموشی کو توڑا۔

''آپ نے مجھے بے حد تجسس میں مبتلا کر دیا ہے سر!''

جواباً کرنل توحید دھیرے سے مسکرائے اور پھر بولے۔

''بات یہ ہے ینگ مین! کہ تمہاری کارگزاریاں دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ تم بیورو کریسی کے گورکھ دھندے کو چھوڑو اور ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ لیکن اس کے لیے تمہیں شہریار عادل کی شناخت سے محروم ہونا پڑے گا۔ کیونکہ تم پیچھے جو کچھ کر چکے ہو، اس کے نتیجے میں دشمنوں کے براہِ راست نشانے پر ہو۔ شخصیت کی تبدیلی سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تم ان کے سامنے سے غائب ہو جاؤ گے اور دوسرے کھل کر ملک کی سلامتی کے لیے کام کر سکو گے۔ تمہارے جذبے کو دیکھتے ہوئے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ تم ہم میں شامل ہونے سے انکار نہیں کرو گے اسی لیے میں نے دو تجاویز کا ذکر کیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''میں ہمہ تن گوش ہوں سر!'' اس نے ایک طرح سے ان کے یقین کو پختگی بخشی۔

''ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم حالیہ واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منظر سے غائب ہو جاؤ اور دشمن کو اس اُلجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں گئے؟ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم خود کو منظر پر لا کر یہ بیان کر دو کہ کچھ نامعلوم افراد کی طرف سے تم پر مسلسل قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ تمہارا یہ بیان ریکارڈ پر آ جانے کے بعد ہم تم پر ایک جعلی قاتلانہ حملہ کروائیں گے اور اس کے بعد یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ ہم تمہیں مُردہ ظاہر کر دیں یا پھر یہ اعلان کر دیں کہ حملے میں تمہیں کچھ ایسے کاری زخم آئے ہیں جن کے باعث تم کومے میں چلے گئے ہو۔ تمہارے نام پر کوئی بھی مریض ہسپتال میں زیرِ علاج رہے گا اور تم اپنا کام کرتے رہو گے۔ یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنے میں تمہیں یہ ایڈوانٹیج حاصل ہو گا کہ تم جب کبھی منظر پر آنا چاہو گے، تمہارے ہوش میں آنے اور تندرست ہونے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔''

وہ بولتے جا رہے تھے اور شہریار ان کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا ذہن بھی حساب کتاب کرنے میں لگا ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی موجودہ پوزیشن میں وہ دشمنوں کے لیے ایک کھلا نشانہ بنا ہوا تھا اور اس کے لیے آنے والے دنوں میں آزادی سے کام کرنا مزید دوبھر ہو جاتا۔ اس لیے اگر وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا تو سی ایف پی میں شمولیت کی پیشکش بے حد پُرکشش تھی، صرف اسے طریقِ کار کا انتخاب کرنا تھا۔ پہلی

صورت میں اس کے دشمن کسی طور چین سے نہیں بیٹھتے اور مسلسل اس تگ و دو میں لگے رہتے کہ اگر وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر جلنے سے بچ گیا ہے تو کہاں ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے پیچھے اس کا جواز تلاشنے کی کوشش کرتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس طریقے کو استعمال کر کے دشمن کو ہر لحہ اپنی کھوج میں لگائے رکھنے سے گریز کرے۔

دوسرا طریقہ منظرِ عام پر آ کر دوبارہ کسی حادثے میں مرنے یا کومے میں چلے جانے کا ڈرامہ کرنا تھا۔ فطری طور پر اسے مرنے والی بات پسند نہیں آئی۔ کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہریار عادل کو کھو بیٹھتا۔ البتہ کومے میں چلے جانے کا ڈرامہ کرنے کی صورت میں اس کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ کسی ایسے موقع پر جب اسے محسوس ہوتا کہ سی ایف پی کو اس کی ضرورت نہیں رہی، یا وہ اب مزید ان کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں رہا، اپنی اصل حیثیت سے منظر پر آ سکتا تھا۔

''مجھے آپ کی سب سے آخری تجویز منظور ہے۔'' اس نے بہت تیزی سے اپنا تجزیہ مکمل کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کے فیصلے کو سن کر کرنل توحید کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جاگی جبکہ ذیشان کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔

''مجھے یقین ہے کہ سی ایف پی میں تمہارا اضافہ بڑا خوش آئند ثابت ہوگا اور ہم مل کر دشمن کے دانت کھٹے کر دیں گے۔'' ذیشان نے بے ساختہ ہی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''تمہاری خوش اُمیدی واقعی سچ ثابت ہوئی تو میں اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا۔ لیکن بہر حال ہمارا دشمن بھی کم نہیں ہے۔ چالاکی اور عیاری کے ساتھ ساتھ اسے ٹیکنالوجی میں بھی ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً ''موساد'' کے بارے میں تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہمارے لیے کتنا سخت حریف ثابت ہوگا۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا چنانچہ ذیشان کی بات کا جواب دے کر ایک بار پھر کرنل صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میرے خیال میں آپ میرے گھریلو حالات سے واقف ہوں گے۔ سجاد بھائی اور ان کی بیٹی شینا کی ڈیتھ کے بعد ماموں اور ممانی میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ وہ کوئی اور صدمہ برداشت کر سکیں۔ ان کی زندگی کا محور و مرکز میری ذات ہی ہے۔ میری زندگی میں ایک بڑا حادثہ ماریہ کی صورت میں گزر چکا ہے جس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوں گے۔ ایسے میں اگر کوئی ڈراما پلے کرنے سے پہلے انہیں قبل از وقت مطلع نہیں کیا گیا تو خدانخواستہ صدمے سے خود انہیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے تمام تر رازداری کے باوجود ہمیں انہیں لازماً شریکِ راز کرنا ہوگا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رانا صاحب اور ان کی مسز کو میں پرسنلی جانتا ہوں۔ رانا صاحب کا شمار گنتی کے ان چند سیاست دانوں میں ہوتا ہے جو خوش قسمتی سے محبِ وطن ہیں اور میں ان سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس اہم ملکی راز کو راز ہی رکھیں گے لیکن ساتھ ہی میرے کچھ تحفظات بھی ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ تم انہیں سی ایف پی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ اور دوسرے یہ کہ تمہیں آپس میں آزادانہ رابطے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ہم رانا صاحب کی فیملی کی خیر خبر رکھیں گے اور موقع اور وقت کی مناسبت سے تمہاری آپس میں بات چیت یا ملاقات کا بندوبست کروا دیں گے۔''

کرنل توحید بھی اب ہلکے پھلکے موڈ کو بھول کر پوری سنجیدگی اختیار کر چکے تھے اور اب شرائط و ضوابط سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ شرائط سخت ہونے کے باوجود غلط اس لیے نہیں تھیں کہ ایک اہم قومی ادارے کا تحفظ اسی میں تھا۔ شہریار نے لحہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور ہامی بھر لی۔



''مجھے منظور ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں ایک دوسرا مسئلہ بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ بطور اے سی میں نے اپنے علاقے کے کئی دیہاتوں میں ترقیاتی پروجیکٹس شروع کر رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحبِ حیثیت شخص نے اپنی ساری پراپرٹی مرنے سے قبل میرے اختیار میں دے دی تھی اس لیے مجھے اپنے منصوبوں پر کام کے لیے حکومتی فنڈ کے علاوہ بھی کافی سہولت حاصل تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد یہ سارے منصوبے کھٹائی میں پڑ جائیں۔ اس لیے آپ کو یہ بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ میری جگہ جو دوسرا شخص تعینات ہو، وہ اتنا مخلص ضرور ہو کہ ان منصوبوں کو جاری رکھ سکے۔ نیز آپ کو وقتاً فوقتاً اس کی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔

''ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ کام بھی ہو جائے گا..... اور کچھ؟'' انہوں نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''نہیں بس اتنا ہی۔ آگے میں آپ کے حوالے ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''اعتماد کے لیے شکریہ۔ اب سب سے پہلے تو تمہیں یہ کرنا ہے کہ میڈیا والوں سے رابطہ کرو اور اپنے زندہ ہونے کا اعلان کر دو۔ کیونکہ تمہاری گاڑی کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر میڈیا پر آ چکی ہے اور ہر چینل تمہاری پُراسرار گمشدگی کے بارے میں اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہا ہے۔ تم سامنے آ کر حقائق بیان کر دو گے تو سب اپنی اپنی بولیاں بند کر دیں گے۔ اس دوران ہمارے سادہ پوش آدمی تمہاری حفاظت کرتے رہیں گے۔ اس مرحلے کے بہ خیر و خوبی طے ہو جانے کے بعد اُس ایکسیڈنٹ کا بندوبست کیا جائے گا جس کے نتیجے میں تمہارا انتہائی خراب حالت میں ہاسپٹل پہنچنا شو کیا جا سکے۔ پھر دو ایک روز میں تمہارے کومے میں چلے جانے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس دوران تم بالکل انڈر گراؤنڈ رہو گے اور پلاسٹک سرجری اور کاسمیٹک سرجری کے ذریعے تمہارے حلیے میں اتنی تبدیلی کر دی جائے گی کہ خود تمہارے قریبی لوگوں کے لیے تمہیں پہچاننا آسان نہیں ہو گا۔'' اس کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی کرنل توحید نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

''آپ کی باتوں سے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کسی خصوصی مشن پر بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' وہ ذہین تھا اس لیے یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ صرف اس کی جان کی حفاظت کے لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا جا رہا ہے۔ اس لیے ذہن میں اُبھرنے والے خیال کو زبان پر لے آیا۔ اس کا سوال سن کر کرنل توحید نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

''کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے لیکن فوری طور پر میں تمہیں کہیں بھیجنے کا نہیں سوچ رہا ہوں۔ بس ذہن میں ایک اندیشہ سا ہے کہ جس طرح کے حالات پیش آ رہے ہیں اور ان کے پیچھے ''را'' اور ''موساد'' جیسی ایجنسیاں موجود ہیں، آنے والے وقت میں ہمیں اور بھی سخت امتحانوں سے گزرنا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ پہلے سے اپنے دفاع کے لیے کچھ تیاریاں کر لی جائیں۔''

''او کے سر! مجھے کسی بھی صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرے آباؤ اجداد میں سے بھی کئی لوگوں نے اس وطن کے لیے اپنے لہو کی قربانی دی تھی اور میں بھی اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس پاک سرزمین کی خاطر بہانے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے مجھ سے جیسے بھی طریقے سے کام لیا جائے گا، میں انکار نہیں کروں گا۔'' اس کی آواز میں میدانِ جنگ میں اُترنے والے سپاہی کا سا عزم و حوصلہ تھا جسے کرنل توحید اور ذیشان دونوں ہی نے پوری طرح محسوس کیا اور اس بار ذیشان اسے گلے لگانے کی خواہش کو ضبط نہیں کر سکا اور بانہیں پھیلائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے خود بھی ذیشان کی گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے ہی دیا۔ لیکن اس وقت ٹھٹک

کیا جب ذیشان سے الگ ہونے کے بعد اس نے کرنل توحید کی بانہیں بھی اپنے لیے وا دیکھیں۔ دل میں فخر و خوشی کی اُٹھتی لہر کو محسوس کرتا ہوا وہ اس شان دار شخص کے چوڑے سینے سے جا لگا جو شاید ہر محبِ وطن کے لیے اپنی بانہیں وا رکھتا تھا۔"

⊛----✪----⊛

ماہ بانو نے ٹی وی اسکرین پر نظر آتے چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا شادیِ مرگ طاری ہو گیا کہ بصارت کے سارے قویٰ عارضی طور پر مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ وہ جہاں، جس انداز میں بیٹھی تھی، بیٹھی رہ گئی اور ایک ٹک ٹی وی اسکرین کو تکتی رہی۔ یہ کام وہ اتنی یکسوئی سے کر رہی تھی کہ لگتا تھا نظر آنے والے چہرے کے صرف نقوش ہی نہیں بلکہ ایک ایک رُواں تک وہ حفظ کر لینا چاہتی ہو۔ وہ اس کے ہلتے لب تو دیکھ رہی تھی لیکن وہ کیا کہہ رہا ہے، یہ سننے سے قاصر تھی۔ اپنی محویت میں اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اسلم کمرے میں داخل ہوا اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"ریلیکس ماہ!..... اللہ کا شکر ہے کہ اے سی صاحب منظر پر آ گئے ہیں اور صحیح سلامت ہیں۔" بہت دھیرے سے اس کے گرد اپنا دایاں بازو پھیلاتے ہوئے اسلم نے اسے خود سے قریب کیا اور بائیں ہاتھ سے اس کی نم ہتھیلیوں کو سہلانے لگا۔

اسلم کی اس مداخلت پر وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تو احساس ہوا کہ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ شہریار کی گاڑی کے بم دھماکے میں تباہ ہو جانے کے ساتھ اس کی پراسرار گمشدگی کی خبر سننے کے بعد سے وہ بُری طرح بے کل رہی تھی۔ اس کا رُواں رُواں شہریار کی سلامتی کی دعا مانگتا رہا تھا۔ کہیں کسی شے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کی اسلم سے ابھی حال میں ہی شادی ہوئی ہے اور وہ بہ حیثیت شوہر اُس کی توجہ اور محبت کا متقاضی ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر اُس کی اس کیفیت کے دوران اسلم نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا اور بغیر کسی گلے شکوے کے خود اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا اور بہت ہی نرمی سے اسے اتنی بڑی خوشخبری کے شاک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اس کا یہ جذباتی سہارا بڑا جادو اثر تھا۔ ماہ بانو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"بس کرو میری جان! اس طرح آنسو بہا کر ناشکری مت کرو۔ یہ تو مقامِ شکر ہے کہ بغیر کسی نقصان کے اے سی صاحب کی زندگی سلامت ہے۔" اب وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا لیکن سینے کے مقام پر ماہ بانو کے آنسوؤں سے تر ہوتی قمیض نے اُس کے دل میں کیا طوفان اُٹھا رکھا تھا، یہ تو بس وہ خود ہی جانتا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ابھی شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں۔" وہ یک دم ہی اس سے الگ ہوئی اور رُندھی ہوئی آواز میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ خود اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شکرانے کے یہ نفل خاصے طویل ثابت ہوں گے۔ اس خوشخبری کے ملنے سے قبل وہ صلوٰۃ الحاجات میں بھی اس کے طویل سجدوں اور دعاؤں کو دیکھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں شہریار کی خوش نصیبی پر رشک بھی کیا تھا جس کے لیے ماہ بانو جیسی لڑکی کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ وہ اس سے کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی یوں شدت سے اس کے لیے محوِ دعا رہی تھی۔ خود اس کے لیے ماہ بانو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر قیمتی تھی جسے پا کر وہ بے حد مسرور تھا لیکن خود کو بہر حال اس شخص سے کچھ کم ہی خوش قسمت سمجھتا تھا جس نے ظاہری طور پر تو ماہ بانو کو نہیں پایا تھا لیکن جو اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا تھا۔

ماہ بانو اور شہریار کے تعلق کی نوعیت سے تو وہ جنگل میں ہی اس وقت واقف ہو گیا تھا جب اس نے ماہ بانو



کے سامنے شہریار عادل کی بیوی کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کی شادی ہو جانے کی خبر سن کر پہلے تو صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی پھر بعد میں بالکل اچانک خود ہی اس سے شادی کی ہامی بھر لی تھی۔ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان دونوں کی حرکات و سکنات سے اسے اندازہ ہوتا رہا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے دل میں محبت کے گہرے جذبات رکھتے ہیں لیکن کسی وجہ سے اس محبت کو اظہار کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے ان کی محبت کی پاکیزگی کا بھی اندازہ تھا۔ سفلی جذبات سے محروم محبت کا وہ جذبہ جسے یقیناً اللہ نے ان کے دلوں میں اُتارا تھا، کسی طور قابلِ گرفت نہیں تھا کہ وہ ماہ بانو سے کوئی شکوہ کرتا۔

اس نے تو شہریار کا نام لیے بغیر بہت پہلے ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اس کا دل کسی اور کا اسیر ہے۔ اس کے باوجود اگر اس نے ماہ بانو سے شادی کرنے کے فیصلے کو برقرار رکھا تھا تو یہ اس کا اپنا انتخاب تھا اور اسے اپنے اس انتخاب پر کوئی پچھتاوا یا ملال نہیں تھا۔ ازدواجی زندگی کے اس مختصر سے عرصے میں ماہ بانو نے خود کو ایک وفادار بیوی ثابت کیا تھا اور اس کی ہر ضرورت اور خواہش کا جی جان سے خیال رکھتی رہی تھی۔ بدلے میں وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ جہاں آ کر وہ بے بس ہو جاتی تھی اور خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی تھی، وہاں اسے تھوڑی سی رعایت دیتے ہوئے گرفت کرنے سے گریز کرے۔ اور اس نے یہی کیا بھی تھا۔ لیکن خود اس کے اپنے دل کو جو تکلیف پہنچی تھی، وہ بھی فطری تھی۔ اور اس تکلیف کو وہ وسیع القلبی سے نظر انداز تو بے شک کر سکتا تھا لیکن اتنا بااختیار نہیں تھا کہ دل کو اس تکلیف میں مبتلا ہی نہ ہونے دے۔

موجودہ حالات میں اُس نے اس بات پر بھی شکر کیا تھا کہ حامد راؤ کی فیملی کے تمام افراد واپس اپنے گاؤں ٹاہلی والا چلے گئے ہیں ورنہ ماہ بانو کی یہ کیفیت خواتین کو لازماً ٹھٹکا دیتی۔ حامد راؤ کی طرف سے ان کے لیے گاؤں یا شہر میں مرضی کے مطابق قیام اور ملازمت کی پیشکش اب بھی برقرار تھی لیکن ماہ بانو کے ایما پر اس نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی اور خالی فلیٹ میں بیکار بیٹھا شہریار کی طرف سے گرین سگنل ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں جب یہ خبر سننے کو ملی کہ شہریار کی گاڑی کو بم دھماکے سے اُڑا دیا گیا ہے اور وہ خود پُراسرار طور پر موقع سے لاپتہ ہے تو قدرتی طور پر ان دونوں ہی کو شاک لگا لیکن ماہ بانو کی کیفیت ہی الگ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جب تک شہریار کی خیریت کی خبر نہیں ملے گی، وہ خود سُولی پر لٹکی رہے گی۔ اور اب وہ خوشخبری مل گئی تھی تو بھی اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے ہوش دلانے پر وہ سنبھلی تھی اور اب شکرانے کے نفل ادا کر رہی تھی۔ جبکہ وہ خود عجیب سی کیفیت میں گھرا بالکل ساکت بیٹھا تھا۔

ڈور بیل کی آواز نے اُسے اس کیفیت سے باہر نکالا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

"کون؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دریافت کیا۔

"کوریئر سروس۔" باہر سے مختصر جواب دیا گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر صاف ستھرے لباس میں کھڑے جس شخص پر پڑی، وہ کہیں سے بھی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں لگ رہا تھا لیکن بہر حال اس کے ہاتھ میں ایک کافی پھولا ہوا لفافہ موجود تھا جو اس نے فوراً ہی آگے بڑھا دیا۔

"اسلم صاحب.....؟" اس کا انداز تصدیق کرنے والا تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے لفافہ تھام لیا۔

"یہ آپ کے لیے شہریار عادل صاحب نے بھجوایا ہے۔ تفصیلات آپ کو لفافہ کھول کر معلوم ہو جائیں گی۔" اس نے نپے تلے انداز میں اسے بتایا اور پھر اس کی طرف سے کسی ردِعمل کا انتظار کیے بغیر تیزی سے پلٹ گیا۔

اسلم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ شخص واقعی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں تھا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لیے واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں اب بھی ٹیلی ویژن چل رہا تھا لیکن خبروں کا سلسلہ روک کر اب کمرشلز چلائے جا رہے تھے۔ کچھ دیر قبل شہریار سے متعلق جو خبر چلی تھی، اس میں اسے لائیو دکھایا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے سے پہلے ان لوگوں کا کام نمٹا کر گیا تھا۔

''کون تھا اسلم؟..... کون تھا دروازے پر؟'' اسی وقت ماہ بانو نماز کے مخصوص انداز میں دوپٹہ لپیٹے ہوئے وہاں چلی آئی۔ اب وہ کافی پُرسکون اور مطمئن محسوس ہو رہی تھی۔

''شہریار صاحب نے یہ لفافہ بھجوایا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا، لائیں دکھائیں کیا ہے اس میں؟'' اس کا چہرہ کھِل اُٹھا اور وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

لفافے میں ان دونوں کے پاسپورٹ اور کچھ دیگر سفری کاغذات کے علاوہ ایک مختصر سا خط بھی موجود تھا جس میں شہریار نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مخاطب کیے بغیر یہ اطلاع دی تھی کہ ان کی روانگی کے سلسلے میں تمام ممکنہ کارروائی کی جا چکی ہے اور اب انہیں ویزے کے حصول کے لیے کل اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پہنچ کر انٹرویو دینا تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ لاہور سے اسلام آباد تک کے ایئر ٹکٹ بھی موجود تھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ویزہ مل جانے کے بعد ان کے سفر کے لیے دیگر انتظامات بھی کر دیئے جائیں گے۔ ان دونوں کے لیے یہ اطلاع جہاں خوش کن تھی، وہیں یہ احساس بھی دلا گئی تھی کہ اپنی تمام تر مصروفیات اور مشکلات کے باوجود شہریار اُن کی طرف سے غافل نہیں ہے اور شاید اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھے گا جب تک ماہ بانو کو اس کی فرمائش کے مطابق یہاں سے بیرونِ ملک روانہ نہیں کر دیتا۔

⊛----✪----⊛

''السلام علیکم سر! کیا حال ہے آپ کا؟..... میری طرف سے آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔ میں آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ کا نمبر بند تھا۔ پھر خبروں سے پتہ چلا کہ آپ کی گاڑی کو بم دھماکے سے اُڑا دیا گیا ہے اور آپ پُراسرار طور پر لاپتہ ہیں۔ اب خبروں ہی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ آپ اللہ کے کرم سے خیر خیریت سے ہیں تو میں نے سوچا ایک بار پھر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر لی جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس بار میری کوشش کامیاب رہی اور آپ کی آواز سننے کو مل گئی۔''

وہ اس وقت رانا ہاؤس میں موجود تھا اور مسلسل جاننے والوں اور عزیز و اقارب کی فون کالز نمٹا رہا تھا۔ کچھ قریبی لوگ اس سے ملنے کی خواہش میں رانا ہاؤس بھی چلے آئے تھے لیکن سوائے آئی جی مختار مراد کے کسی پر بھی اس کی یہاں موجودگی کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور آنے والے مہمانوں کو آفرین رانا خود ہی مناسب خاطر مدارات کے ساتھ نمٹاتے ہوئے خوش اسلوبی سے روانہ کرتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں جگو کی کال آنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ کر وہ اس سے تعلق کی بنیاد پر فون کر سکتا تھا۔ لیکن اہم بات یہ تھی کہ وہ کوئی بھی خبر منظر پر آنے سے پہلے ہی اس سے رابطے کی ناکام کوششوں کا ذکر کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی اہم بات کرنی تھی ورنہ اس سے خاصی محبت کرنے کے باوجود جگو نامی وہ غنڈا غیر ضروری طور پر رابطہ نہیں کرتا تھا۔ اب جانے ایسا احترام میں تھا یا وہ احتیاط پسند واقع ہوا تھا۔ لیکن فی الحال اس کے لیے غور طلب بات یہ تھی کہ جگو اس سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا۔



''تھینک یو جگو!..... یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے بات کرنے کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟'' اس نے فوراً ہی اپنا تجسس دور کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع تھی سر! اطلاع ایسے شخص کے بارے میں ہے کہ مجھے یقین ہے آپ اس میں خصوصی دلچسپی لیں گے۔''

''ایسی بات ہے تو فوراً وہ اطلاع مجھے دے دو۔'' اس نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں سر! کہ میرا تعلق کس قسم کے لوگوں سے ہے، البتہ میں ایک اہم سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی بندوں سے ذرا اونچے لیول کا بندہ ہوں۔ پھر بھی میری یہ کوشش رہتی ہے کہ سیاسی حلقوں سے ہٹ کر زیرِ زمین دنیا میں ہونے والے واقعات سے آگاہ رہوں۔ میرے چند قابلِ اعتماد مخبر میرے لیے یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ اپنے انہی مخبروں کے ذریعے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چودھری افتخار عالم منشیات کے دھندے میں شامل ہو گیا ہے۔ وہ یہ کام بہت ہوشیاری سے کر رہا ہے اور نچلے درجے کے مجرموں اور منشیات فروشوں کے بجائے ایسے تاجروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو ظاہری طور پر عزت دار ہیں لیکن پیسے کے حصول کے لیے ناجائز دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ چودھری ان تاجروں کو مال، بچوں کے ڈائپرز میں چھپا کر منگواتا ہے اور سوائے اعتماد کے بندوں کے کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں کون سا دھندا کیا جا رہا ہے۔ میرے مخبر کو بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہو پاتا لیکن اتفاق سے چودھری نے مال کی اس طریقے سے ترسیل کے لیے تیاری کے سلسلے میں جن کاریگروں کو ہائر کیا، ان میں سے ایک میرے مخبر کا دوست ہے اور اسی کے ذریعے اسے یہ ساری اطلاعات ملی ہیں۔ خبر دلچسپ تھی اس لیے اس نے مجھ تک بھی پہنچا دی۔ اور اب میں آپ کو بتا رہا ہوں۔''

جگو کی دی ہوئی اطلاع واقعی چونکا دینے والی تھی جسے وہ کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

''چودھری ڈائپرز کی تیاری کا کام کہاں کروا رہا ہے؟'' اس نے فوراً ہی جگو سے پوچھا۔

''یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اصل میں جس کاریگر سے میرے آدمی کو یہ اطلاع ملی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے اور دیگر کاریگروں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جگہ لے جایا اور لایا جاتا ہے اس لیے وہ صحیح پتہ تو کیا، علاقے کا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ اس جگہ ان پر اتنی پابندی ہے کہ انہیں اپنے سونے اور کام کرنے کی جگہ کے علاوہ کہیں بھی آزادانہ حرکت کی اجازت نہیں ہے۔ چھٹی بھی ہفتے میں صرف ایک دن بارہ گھنٹے کے لیے ملتی ہے، اس کے علاوہ وہ لوگ دن بھر وہیں رہتے ہیں۔ البتہ اس نے اتنا اندازہ ضرور لگایا ہے کہ جس جگہ وہ کام کرتا ہے، وہ کسی بڑی عمارت کا تہ خانہ ہے جہاں شاید اوپری منزل پر بھی کوئی کام ہوتا ہے کیونکہ اوپر سے انہیں مسلسل چلنے پھرنے، مشینوں کے چلنے اور سامان وغیرہ کے گھسیٹے جانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود تہ خانہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصے میں وہ اور اس کے ساتھی کاریگر عام ڈائپرز کی تیاری کے ساتھ کچھ مخصوص ڈائپرز میں ہیروئن بھرنے کا کام کرتے ہیں۔ اُن کے اس کام کی نگرانی کوئی غیر ملکی کرتا ہے۔ البتہ عام ڈائپرز کی تیاری کے وقت وہ موجود نہیں رہتا اور تہ خانے کے دوسرے حصے میں چلا جاتا ہے۔ اس حصے میں جانے کی کاریگروں کو اجازت نہیں ہے البتہ انہوں نے وہاں چند غیر ملکیوں کو دیکھا ہے اور وہاں سے آنے والی آوازوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس حصے میں بھی کوئی کام ہو رہا ہے۔ شاید وہاں ہیروئن ذخیرہ کی جاتی ہے کیونکہ وہاں اسی جگہ سے نکال کر مال ڈائپرز میں بھرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔''

جگو نے اسے تفصیلی جواب دیا جسے سن کر اس کے ذہن میں بہت سی باتیں تازہ ہونے لگیں۔ ان باتوں پر

غور کرنے کے لیے اسے ارتکاز کی ضرورت تھی اس لیے جگو سے اجازت لینا ضروری تھا۔

''تھینک یو جگو! تم نے مجھے بہت کام کی باتیں بتائیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں بھی کچھ اور یاد آئے یا کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع ضرور دینا۔ فی الحال میں انہی اطلاعات پر کام کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سر! میں ہر لمحے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ وہ شخص بھی اپنی نوعیت کا انوکھا ہی کردار تھا۔ شہریار کی وجہ سے ایک بار اس کے بیٹے کی جان کیا بچی، وہ اس کا بے دام غلام بن کر رہ گیا۔ کہنے کو وہ ایک غنڈا تھا اور ایک بڑی سیاسی جماعت کے لیے کام کرتا تھا لیکن شہریار کی طرف سے ملنے والے معمولی سے معمولی احکامات کی تکمیل یوں کرتا تھا جیسے یہی اس کا اصل فریضہ ہو۔ اس بار تو اس نے کچھ اور بھی آگے بڑھ کر کام کیا تھا اور اس کی فرمائش یا حکم پر میدان میں اُترنے کے بجائے صرف یہ جاننے کے باعث کہ وہ چودھری کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا ہے، اسے اس کے ایک انتہائی اہم راز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اسے جگو کی دی ہوئی اطلاعات پر غور کرنا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے بھی اس کے سامنے چودھری کے تاجر حلقے میں بڑھتے ہوئے رسوخ کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے آدمی اب تک یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے۔ انہوں نے تو اب تک سیدھے سادے کاروبار کی ہی اطلاع دی تھی کیونکہ وہ ان تاجروں کے لیے بس سکیورٹی گارڈ کا کام کرتے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی انہیں اپنا شریکِ راز نہیں کیا تھا۔ سی ایف پی کے لیے کام کرنے والے ان دوسرے درجے کے اہلکاروں کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ تھے جو آج کل لاہور میں ہی واقع چودھری کے جوتوں کے کارخانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چودھری نے ان سکیورٹی گارڈز کو اس لیے ہائر کیا تھا کہ اسے خدشہ تھا، کچھ عرصہ قبل اس کے کارخانے میں لگنے والی آگ کسی دشمن کی کارروائی تھی۔ کارخانے کی ازسرِ نو تعمیر کے بعد اس نے وہاں اپنے آدمیوں کے علاوہ ان تربیت یافتہ سکیورٹی گارڈز کی موجودگی ضروری سمجھی تھی اور ان گارڈز کے لیے کمپنی کو بھاری معاوضہ ادا کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ ہو نہ ہو، اس میں کوئی راز ہے۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔ وہ اس کی بات سن کر پُرجوش ہو گیا۔

''تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو شہریار!..... واقعی وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جو ڈیلی رپورٹ دی ہے، اس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ چودھری کے جوتوں کے کارخانے کے تہ خانے میں ڈائمرا بنانے کا کام کیا جاتا ہے لیکن ظاہری طور پر یہ کوئی قابلِ گرفت بات نہیں تھی اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ تمہاری دی ہوئی اطلاع کی روشنی میں، میں وہاں ڈیوٹی دینے والے گارڈز سے خود معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد ہی ہم کوئی ایکشن لے سکیں گے۔'' وہ جس جگہ کا پتہ جگو سے معلوم نہیں کر سکا تھا، ذیشان سے بات کرنے کے نتیجے میں منٹوں میں اس سے آگاہ ہو گیا۔

''میرے خیال میں تم ساتھ ساتھ فوری ایکشن کی تیاری بھی کر لو۔ کیونکہ تمہارے آدمی جو بھی بتائیں، اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ قبلہ چودھری صاحب ہیروئن کے کاروبار سے بھی منسلک ہیں، اس لیے اب اس شخص کو کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے۔ کارخانے پر ریڈ کے ساتھ ہی ہمیں چودھری کی گرفتاری کا کام بھی کرنا ہوگا۔ تم نے ای سی ایل میں اس کا نام تو ڈلوا دیا تھا نا؟'' ذیشان کو مشوروں سے نوازتے ہوئے اس نے ایک اہم سوال کیا۔



''سوری یار! مجھے تمہیں بتانا یاد نہیں رہا تھا۔ اصل میں ہوا یہ کہ ہمارے ای سی ایل میں نام ڈلوانے سے پہلے ہی چودھری یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے پاس جو انفارمیشنز تھیں، ان کے مطابق وہ امریکہ جانے کے لیے پَر تول رہا تھا لیکن پھر شاید کسی طرح اس نے خطرے کو بھانپ لیا اور اچانک ہی دبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں سے اس کے امریکہ جانے کی اطلاع بھی ہمارے پاس ہے۔ یعنی اگر ہم صاف لفظوں میں بات کریں تو چودھری ہماری حد سے نکل چکا ہے اور فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔''

ذیشان نے اسے جو اطلاع دی، اسے سن کر اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ چودھری کے فرار کی صورت میں اب وہ صرف اس کے کارخانے پر ریڈ ہی کر سکتے تھے۔ وہاں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوتی، یہ ابھی واضح نہیں تھا۔ کچھ اُمید تھی تو وہاں غیر ملکیوں کی موجودگی کی وجہ سے تھی۔ یقیناً وہ غیر ملکی کچھ اہم لوگ رہے ہوں گے اور خفیہ طریقے سے تہ خانے کے خفیہ حصے میں رہائش پذیر تھے۔

''ٹھیک ہے۔ پھر جو مناسب سمجھو کرو۔ میں بہرحال ہر وقت خدمت کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں ذیشان سے کہا۔ چودھری کو قانون کی گرفت میں لینے کا ایک اہم موقع ہاتھ سے نکل جانے پر وہ حقیقتاً بہت رنجیدہ تھا۔ وہ شخص اگر گرفت میں آ جاتا تو بہت سارے لوگوں کی تقدیریں بدلنے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ پیر آباد اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں اس کا گہرا اثر و رسوخ تھا اور وہ اپنے اس اثر و رسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے لوگوں کا مسلسل استحصال کر رہا تھا۔ وہ درمیان سے ہٹ جاتا تو وہاں کے لوگوں کی تعلیم و ترقی کے لیے راہیں کھل جاتیں۔ لیکن شاید ابھی ان بے چاروں کی قسمت میں مزید انتظار لکھا تھا۔

''تمہیں اس مشن سے عملی طور پر علیحدہ رہنا ہوگا۔ کیونکہ ہم تمہارے لیے جو منصوبہ بندی کر رہے ہیں، اس کے مطابق اب تمہارا کہیں بھی نظر آنا مناسب نہیں ہے۔ آج کے دن تم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دل بھر کر باتیں کرو، ان کے ساتھ وقت گزارو۔ پھر بعد میں شاید تمہیں ایسے مواقع بہت مشکل سے دستیاب ہو سکیں۔ میں انشاء اللہ جلد تمہیں کامیابی کی نوید سناؤں گا۔''

''اوکے، وِش یُو گڈ لک۔'' ذیشان کا جواب سن کر اس نے کسی قسم کی بحث نہیں کی اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک دے کر آفرین رانا اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے آئی جی مختار مراد بھی تھے۔

''السلام علیکم انکل! ہاؤ آر یُو؟'' اس نے فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ان کا تپاک سے استقبال کیا۔

''جیتے رہو برخوردار..... اور یہ بتاؤ کہ آج کل تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تمہارے ماموں، ممانی تمہارے لیے بہت پریشان ہیں اور بھابی نے خاص طور پر مجھے تاکید کی ہے کہ تمہیں سمجھاؤں کہ ایسے کام نہ کرو جن سے تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے۔'' وہ اس کے شانے پر ایک شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جبکہ آفرین رانا نے ان دونوں کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا۔

''فکر نہ کریں ممانی جان! آدمی کی جان طے شدہ وقت پر ہی جاتی ہے۔ زندگی ہو تو آدمی میدانِ جنگ سے بھی صحیح سلامت لوٹ آتا ہے اور زندگی ہی کم لکھی ہو تو پھر ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بھی کوئی فرشتۂ اجل کو روح قبض کرنے سے نہیں روک سکتا۔'' مختار مراد کی بات سن کر اس نے آفرین رانا کو تسلی دی۔

''زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔'' انہوں نے اسے خفگی سے گھورا۔ ''میں خود بھی الحمدللہ مسلمان ہوں اور یہ بات سمجھتی ہوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہر انسان پر فرض ہے اور ایسا کوئی

شخص نہیں ہوتا جو جان بوجھ کر ریل کی پٹریوں پر جا لیٹے کہ زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گا اور ریل کو خود پر سے گزر جانے دے۔ اگر کوئی شخص ایسی حماقت کرتا ہے تو اسے دیوانہ ہی سمجھا جائے گا اور میں بھی تمہیں تمہاری دیوانگی سے باز رہنے کی نصیحت کر رہی ہوں۔'' وہ خفا خفا سی بولتی چلی گئیں۔ اس نے مدد طلب نظروں سے مختار مراد کی طرف دیکھا۔

''میری طرف مت دیکھو بھئی، اس وقت میں بھابی کا وکیل ہوں۔'' انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اس کی مدد سے انکار کر دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، میں خود ہی اپنی وکالت کا فریضہ انجام دوں گا۔ آپ لوگ مجھ پر فردِ جرم عائد کریں۔'' وہ بھی گویا کمر کس کر میدان میں اُتر آیا۔

''فردِ جرم کیا عائد کرنی ہے بیٹا!..... بس ہمیں تم سے شکوہ ہے کہ تم اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے اور بے خوف و خطر ہر معاملے میں کود پڑتے ہو۔ ایسا کرتے ہوئے تمہیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ تمہارے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں جو پہلے ہی سے زخم خوردہ ہیں اور جن کے دل تمہیں کچھ ہو جانے کے خیال سے دہلتے رہتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے تم نے مجھے بھی اعتماد میں لینا چھوڑ دیا ہے اور بالا ہی بالا جانے کن سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اپنی سرگرمیوں سے تم اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ تم کچھ نہ کر رہے ہو اور تم پر اتنا زبردست قاتلانہ حملہ کر دیا جائے۔ اگر خوش قسمتی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو شاید آج تم ہمارے سامنے نہیں بیٹھے ہوتے۔ اور ہاں..... تم مجھے اتنا بے خبر بھی نہ جانو۔ میں جانتا ہوں کہ حادثے کے وقت تمہارے قابلِ اعتماد ڈرائیور کے بجائے دوسرا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور دھماکے کے وقت وہ گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں بھی وہ منظر سے غائب ہے اور صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ حادثے کی تحقیقات کے لیے پولیس کو بہت دیر بعد اجازت دی گئی اور کسی خفیہ ادارے کے لوگ وہاں منڈلاتے پائے گئے۔ ان ساری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تم کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو جو تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے ہٹ کر ہے اور یقینی طور پر خطرناک بھی۔

مختار مراد ایک تجربہ کار آدمی تھے جنہوں نے بہ حیثیت ایک پولیس آفیسر جانے زمانے کے کتنے سرد و گرم دیکھے تھے۔ اس کے معاملے میں ان کا تجزیہ غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ اس سے شکوہ کرنے میں بھی بالکل حق بجانب تھے۔ کیونکہ انہوں نے اس سے کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ مرحوم سجاد رانا کے سسر تھے اور اس رشتے سے بھی بڑھ کر انہوں نے اس کی خلوصِ نیت کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ اس کی معاونت کی تھی۔ ایسے میں وہ ان سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا تو ان کا محسوس کرنا لازمی تھا۔ اور اب اس کا فرض بنتا تھا کہ ان کی دل جوئی کرے۔ چنانچہ کسی حیلے بہانے سے کام لینے کے بجائے سچ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان سے معذرت کرنے لگا۔

''آئی ایم ریئلی سوری انکل! واقعی آپ کے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔ لیکن بس اچانک ہی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ میرا آپ سے رابطہ ٹوٹ گیا، ورنہ آپ نے میری جس قدر مدد کی ہے، اس کے لیے میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔''

''ان سب باتوں کو رہنے دو بیٹا! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کسی بھی معاملے میں تمہاری مدد کر کے تم پر احسان کیا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ ملک کی خاطر کیا یا پھر سجاد اور شینا کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے..... اور یہ دونوں ہی معاملات ایسے ہیں جن سے مجھے خود بھی ذاتی دلچسپی تھی۔ اور اگر ایک طرح سے دیکھا



جائے تو میں نے تمہاری نہیں بلکہ تم نے میری مدد کی تھی۔ خاص طور پر جنگل میں آپریشن کے نتیجے میں ڈاکوؤں کے اتنے بڑے گروہ کی گرفتاری کے بعد تو میرے محکمے کا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے اس لیے میں خود تمہارا احسان مند ہوں۔ لیکن یہ میں بھی سمجھتا ہوں اور تم بھی کہ ہمارے درمیان ایک دوسرے پر احسان جتانے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے مفادات بھی ایک ہیں اور مقاصد بھی۔ سجاد اور شینا کے قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ گئے تو ہم سب کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہم تمہیں کسی صورت داؤ پر نہیں لگانا چاہتے۔ تم ہم سب کے لیے بہت اہم ہو۔''

بات گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس کا خاندان مل کر کوشاں تھا کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے، وہاں سے واپس پلٹ آئے۔ اس ساری گفتگو میں بغیر مداخلت کے وہاں بیٹھی رہنے والی آفرین رانا کی خاموشی بھی تائید کر رہی تھی کہ جو کچھ مختار مراد کہہ رہے ہیں، وہی ان کی بھی خواہش ہے۔ بلکہ مختار مراد کے الفاظ یقینی طور پر ان کی خواہش کے ہی عکاس تھے۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔

''میں آپ لوگوں کی اپنے لیے بے تحاشا محبت سے واقف بھی ہوں اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بھی کہ اگر اس نے مجھے بچپن میں ماں باپ جیسی نعمت سے محروم کیا تھا تو آپ بزرگوں کی صورت میں اس محرومی کا بہت اچھی طرح ازالہ بھی کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار بھی نہیں ہے کہ آپ کی محبتوں میں اتنی طاقت ہے کہ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خود کو اس چار دیواری تک محدود کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں، میں نہ رہوں گا، بس ایک چلتا پھرتا مُردہ بن جاؤں گا جو روح اور دل دونوں سے محروم ہو۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ زندگی انسان کو صرف ایک بار ہی ملتی ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم چاہے کتنی بھی احتیاط سے کام لیں، لیکن ایک دن بہر حال مرنا ہے..... تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ اس طرح جی کر مریں کہ جینے کا حق ادا ہو جائے اور ہمارے مرنے پر لوگوں کو یہ نہ لگے کہ زمین کو ایک ناکارہ بوجھ سے نجات مل گئی۔'' اس نے اپنے حق میں بہت مختصر دلائل دیئے تھے لیکن لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ مختار مراد اور آفرین رانا اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہ گئے۔

''میرا بیٹا بالکل درست کہہ رہا ہے۔ یہ وہ نمائشی پرندہ نہیں ہے جسے آپ سنہری پنجرے میں قید کر کے خود کو اور اور اپنے مہمانوں کو اس کی خوب صورتی سے محظوظ کر سکیں۔ یہ شاہین ہے جس کی شان ہی اُونچی اُڑان بھرنے میں ہے اور یہ خوش رنگ و قیمتی پنجرے کے بجائے چٹانوں کی سخت زندگی میں ہی خود کو زیادہ خوش اور آرام دہ محسوس کرتا ہے۔''

ان تینوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کب لیاقت رانا وہاں پہنچے تھے۔ ان کی آواز نے کمرے میں چھایا سکوت توڑا تو ہی وہ تینوں چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہریار لپک کر ان کے قریب پہنچ گیا اور انہیں سہارا دیا۔ پے در پے صدموں اور طویل علالت نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنے کمرے سے یہاں تک آنے اور تھوڑا سا بولنے میں ہی بُری طرح ہانپ گئے تھے۔

''آپ کو یہاں اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں بلوا لیتے۔ خدانخواستہ اگر چکر آ کر گر جاتے تو کیا ہوتا؟'' آفرین رانا بھی ان کے قریب پہنچیں اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا دوسرا بازو تھام لیا۔ شہریار اور وہ مل کر انہیں صوفے تک لے آئے۔ انہوں نے بیگم کی خفگی کے جواب میں انہیں صرف ایک مسکراہٹ سے نوازنے کے سوا کچھ نہیں کہا اور ان کا پیش کردہ پانی کا گلاس تھام کر اس میں سے دو گھونٹ

بھرے اور گلاس واپس کرتے ہوئے براہِ راست انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''تمہیں معلوم ہے آفرین!..... ابھی جب شہریار نے مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا تھا تو مجھ بوڑھے کو یہ سہارا بہت اچھا لگا تھا لیکن پھر بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے لیے اسے اس کے مشن سے روک لوں۔ کیونکہ اگر میں نے اس وقت یہ قربانی دے دی تو یقیناً مجھ جیسے بہت سے دوسرے بوڑھے والدین سے ان کے سہارے چھننے سے بچ جائیں گے۔'' ان کے الفاظ نے آفرین رانا کو نظریں جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔

''ٹھیک ہے رانا صاحب! ہمیشہ کی طرح آپ جیتے، میں ہاری۔ میں نے اپنا مشقتوں سے پالا بیٹا آپ کے کہنے پر دوسری ماؤں کے کلیجے ٹھنڈے کرنے کے لیے آزاد کیا۔''

ان کی آواز اگرچہ صاف تھی لیکن شہریار جانتا تھا کہ ان کی جھکی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ہوگی۔ اس نے بے ساختہ ہی انہیں گلے سے لگا لیا۔ وقت کے ان لمحوں میں لفظ خاموش تھے لیکن قربانی کی ایک ایسی لازوال داستان رقم ہو رہی تھی جسے شاید کبھی تاریخ کے صفحوں کا حصہ نہیں بننا تھا لیکن وقت خود گواہ رہتا کہ شہریار عادل کے خاندان نے ارضِ وطن کے لیے کیا داؤ پر لگایا تھا۔

⊛----✪----⊛

''فصل کا کام کیسا چل رہا ہے بہرام؟''

''ایک دم فسٹ کلاس صاحب! زمین بالکل تیار ہے۔ آپ چاہو تو راؤنڈ مار کر دیکھ سکتے ہو۔'' بہرام کی خوشامدانہ آواز سنائی دی۔

''ہاں، راؤنڈ تو مجھے مارنا پڑے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ چودھری صاحب ملک سے باہر ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہوگا۔''

یہ عابد انصاری تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے شکن لباس اور آنکھوں پر لگے خوب صورت فریم کے چشمے کے ساتھ نہایت معزز اور نفیس نظر آنے والا آدمی..... جس سے ملتے ہی لوگ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات محسوس کرتے تھے۔

شہزادی کو بھی وہ کافی اچھا آدمی لگا تھا اور اس کے بنگلے پر ملازمت کے مختصر عرصے میں وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ شہریار نے آخر اسے عابد انصاری پر نظر رکھنے کی ذمے داری کیوں سونپی ہے؟ اُس کا ذہن تسلیم ہی نہیں کر سکا تھا کہ یہ اتنا اچھا نظر آنے والا آدمی بھی کوئی مجرم ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ حتی الامکان شہریار کے حکم کی پیروی کر رہی تھی۔ یہاں اسے خصوصیت سے کوئی بہت بڑی ذمے داری نہیں سونپی گئی تھی اور ایسا بہرام کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن وہ بنگلے کے مختلف حصوں میں اپنی موجودگی کا جواز بنائے رکھنے کے لیے ہاتھ میں صفائی کا کپڑا تھامے فرنیچر وغیرہ کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ بنگلے کے اس حصے میں رہے جہاں عابد انصاری موجود ہو۔ اب تک اس کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ البتہ اُس نے اپنی کوشش جاری رکھی تھی۔

اب بھی وہ عابد انصاری کے کمرے کی کھڑکی کے بالکل قریب کھڑی ایک شوپیس کو کپڑے سے رگڑ کر چمکاتی ہوئی اس کی بہرام کے ساتھ جاری گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھی اور ابتدا میں ہی حیران ہو گئی تھی کہ عابد انصاری کو کسی فصل سے کیا غرض ہے؟ چودھری اگر گاؤں میں موجود نہیں بھی تھا تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا اکثر ہی اِدھر اُدھر آنا جانا لگا رہتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں منشی اللہ رکھا اس خوبی سے سارے انتظامات سنبھالتا تھا کہ کسی مزارعے کو ذرا بھی تساہل کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ چودھری کی موجودگی کی صورت



میں بھی عموماً سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور خود چودھری کو کبھی کسی نے ان معاملات میں زیادہ سر کھپاتے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ اب چودھری کی عدم موجودگی میں عابد انصاری کا فصل کے لیے فکرمند ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ویسے تو اسے چودھری اور انصاری کی دوستی کی وجہ بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس کے نزدیک وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف لوگ تھے۔ اس لیے ان کی دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی ان کی دوستی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی اور اسے اسی وجہ تک پہنچنا تھا۔ دوسری طرف بہرام اور عابد انصاری کے درمیان گفتگو جاری تھی۔

''آپ فکرمند مت ہوں صاحب! پہلے کی طرح سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ آپ چودھری صاحب کو تو جانتے ہی ہیں۔ اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ سب کی چمڑی گرا دیں گے۔'' بہرام جو کہہ رہا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ بالے کی بیوی کی حیثیت سے شہزادی خود ایسے کئی واقعات سے واقف تھی۔ چودھری کے اکثر معتوبین کو بالے ہی کے ہاتھوں سزا ملتی تھی۔ وہ تھا بھی ذرا اذیت پسند آدمی چنانچہ دل کھول کر ظلم ڈھاتا تھا۔ بعد میں اللہ نے اس کی رسّی کھینچی تو وہ دردناک انجام سے دوچار ہوا۔

شہزادی کو اس کی معذوری کے وہ دن یاد تھے جب وہ بے بس سا اپنی چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ ان دنوں اس سے دن رات کام لینے والے چودھری نے بھی اسے فراموش کر دیا تھا اور اس کے علاج معالجے کے لیے کسی قسم کی مدد نہیں کی تھی۔ مایوسی بالے کو ٹاہلی والا کے جعلی پیر کی خانقاہ تک لے گئی اور وہ خانقاہ میں لگائی جانے والی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ یوں اسے اپنے ڈھائے گئے مظالم کی ٹھیک ٹھاک سزا دنیا میں ہی مل گئی۔ آگے حشر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا، یہ تو اللہ ہی جانتا تھا۔

''یہ بات تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ چودھری صاحب کتنے سخت مزاج بندے ہیں۔ لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ مجھے جنہیں جواب دینا ہوتا ہے، وہ کیسے لوگ ہیں۔ اسی لیے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا۔'' عابد انصاری خاصا متفکر محسوس ہو رہا تھا پھر اس کی بات بھی چونکا دینے والی تھی۔ بھلا چودھری کی فصل کے سلسلے میں عابد انصاری کس کے سامنے جواب دہ تھا؟ شہزادی اُلجھن میں پڑ گئی۔

''ہم تو اپنی طرف سے پورا خیال رکھتے ہیں صاحب! آگے آپ خود بھی اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔'' اس بار بہرام کا جواب بھی خاصا محتاط تھا۔ گویا وہ خود بھی اپنے اوپر مکمل ذمے داری لینے سے ڈر رہا تھا۔

''ہوں.....'' عابد انصاری نے ہنکارا بھرا اور ذرا سے توقف کے بعد بولا۔

''پہرے کا کام تو صحیح طریقے سے چل رہا ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ اس لڑکے اکّو کی طرح پھر کوئی کھیتوں کی طرف آ نکلے۔ اکّو کا تو کوئی والی وارث نہیں تھا، اس لیے اس کی موت پر زیادہ ہنگامہ بھی نہیں ہوا۔ لیکن ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔ جنگل میں آنے والا کوئی اور شخص بھی اکّو جیسے انجام سے دوچار ہوا تو لوگوں کی توجہ اس طرف ہو جائے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے۔ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ فصل کو خفیہ رکھنے کے لیے ہی چودھری صاحب نے اپنے نمک خوار ڈاکوؤں کی قربانی دی تھی۔ انہیں جان بوجھ کر اپنے آدمی کے ذریعے پولیس کو مخبری کروانی پڑی تھی کہ ڈاکو جنگل کے کس حصے میں رہ رہے ہیں، ورنہ اگر پولیس خود منہ اٹھا کر چلی آتی تو ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کا چپہ چپہ چھان مارتی اور اسے ہمارے اتنے اہم راز سے آگاہی ہو جاتی۔ ایسا ہو جاتا تو ہم سب بے موت مارے جاتے۔ ایک طرف قانون پکڑ کرتا تو دوسری طرف وہ لوگ خون کے پیاسے ہو جاتے جن کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں افیون کی کاشت کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ شمالی پہاڑی علاقوں کی اس فصل کو یہاں اُگانے کے لیے جو تجربات کیے گئے ہوں گے، ان پر بے اندازہ سرمایہ خرچ ہوا ہوگا اور ہماری غفلت سے

اگر ان کا سرمایہ ڈوب جاتا ہے تو سمجھو ہماری خیر نہیں ہے۔"

اپنے مخصوص نرم و دھیمے لہجے میں بولتا عابد انصاری جو انکشافات کر رہا تھا، انہوں نے شہزادی کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

اسے غریب اکّو کی موت یاد تھی۔ اپنی منگیتر رانی کی پُراسرار موت کے بعد وہ نیم دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ اکّو غائب ہے اور گاؤں میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ اگلے روز جنگل سے اس کی لاش ایسی حالت میں ملی کہ جانوروں نے اس کے جسم کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ لوگوں نے یہی خیال کیا کہ دیوانہ اپنی دُھن میں جنگل میں جا نکلا ہوگا اور حادثے کا شکار ہو گیا۔ لیکن یہ تو عابد انصاری کی زبان سے سن کر اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اکّو کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے جنگل میں بنائے گئے افیون کے کھیت دیکھ لیے تھے۔ شہزادی لاکھ سادہ لوح اور اَن پڑھ سہی لیکن یہ بات تو جانتی تھی کہ اس طرح چھپ کر افیون کاشت کرنا غیر قانونی کام ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک نہایت اہم راز سے واقف ہو گئی ہے، ایک ایسے راز سے جس کو جاننے کی پاداش میں اکّو کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے اور شاید یہی وہ کام تھا جو شہریار نے اسے سونپا تھا۔

وہ جان گئی تھی کہ چودھری اور عابد انصاری میں کس قسم کا گٹھ جوڑ تھا اور اب اس کا مزید اس بنگلے میں رہنا ضروری نہیں تھا جہاں بہرام اس کی عزت کے درپے تھا۔ فیصلہ کرتے ہی وہ تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت میں آئی لیکن اس لمحے وہ یہ فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک نازک ڈیکوریشن پیس موجود ہے۔ اس کی ذرا سی غفلت سے ڈیکوریشن پیس اس کے ہاتھ سے پھسلا اور فرش پر گر کر چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ فوراً ہی عابد انصاری کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بہرام کسی خوں خوار درندے کی طرح باہر نکلا۔

"تُو یہاں کیا کر رہی ہے؟" شہزادی کو دروازے کے قریب پا کر اس نے غرّا کر پوچھا۔

"صفائی..... صفائی کر رہی تھی۔" اس نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

"تجھے کس نے کہا تھا صفائی کرنے کو؟ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو سارے بنگلے کی صفائی ہوئی تھی۔" بہرام کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"مم..... میں خود ہی کر رہی تھی۔ کاکا سویا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں تو ایسے ہی جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔" اس نے خاصا معقول جھوٹ گھڑا لیکن گھبراہٹ پر قابو نہ پا سکی کہ اکّو کی سوختہ لاش اب بھی اس کی یادداشت میں تازہ تھی۔

"جب تجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا تو تجھے کیا لوڑ پڑی تھی؟ آئندہ زیادہ اپنی مرضی چلائی تو گدّی سے پکڑ کر نوکری سے باہر کر دوں گا۔" بہرام نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

"بس کرو بہرام! کیوں بے چاری کو ڈانٹے جا رہے ہو؟" اچانک ہی عابد انصاری نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اس کی گلوخلاصی کروائی اور پھر براہِ راست اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جاؤ، ذرا میرے لیے اچھی سی چائے تو بنوا لاؤ۔"

"جی چنگا صاحب!" شہزادی کی گویا جان میں جان آئی۔ وہ حکم ملتے ہی سرپٹ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

"اسے تم نے ملازمت پر رکھا تھا نا بہرام؟" اس کے جانے کے بعد عابد انصاری نے پُرخیال انداز میں بہرام سے دریافت کیا۔



"جی صاحب! آپ کو بتایا تھا نا کہ منشی اللہ رکھا نے اس کی سفارش کی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے یہ عورت گڑبڑ لگتی ہے۔" عابد انصاری نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"ارے نہیں صاحب! ایسے ہی بے قوف سی عورت ہے۔ پہلے اس کا گھر والا چودھری صاحب کے پاس کام کرتا تھا۔ ان کا بڑا خاص بندہ تھا۔ وہ مر گیا تو اس پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اسی لیے منشی جی نے سفارش کر کے اسے یہاں کام دلوا دیا۔" بہرام نے فوراً ہی اس کے خیال کی تردید کی۔

"وہ سب اپنی جگہ ہے۔ لیکن میں بلاجواز اس پر شک نہیں کر رہا۔ یہ دیکھو کہ ڈیکوریشن پیس میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب ٹوٹا ہے جبکہ جس کارنس پر یہ رکھا تھا، وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ اس بات کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ صفائی کے بہانے وہ تمہاری اور میری باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

عابد انصاری کے پُردلیل شک پر بہرام کا منہ کھل گیا اور خود یقین نہ ہونے کے باوجود وہ شہزادی کے دفاع میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"فی الحال خاموش رہو اور اس عورت پر نظر رکھو۔ جو بھی حقیقت ہوئی، وہ خود ہی کھل کر سامنے آ جائے گی۔" عابد انصاری نے اسے مشورہ دیا جس کو سن کر اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔ شہزادی کو پانے کی تمنا برسوں سے اس کے سینے میں مچل رہی تھی اور اب جبکہ یہ موقع ملنے والا تھا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ انصاری کا شک درست ثابت ہونے کی صورت میں اسے ہر حال میں شہزادی کو موت کے گھاٹ اُتارنا پڑتا اور یوں اس کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں اپنی موت آپ مر جاتیں۔ وہ سخت بے مزہ ہو گیا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے شہزادی چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اسی طرف آتی دکھائی دے رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

"یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جوتوں کے کارخانے کی آڑ میں چودھری جو گھناؤنا کام کر رہا ہے وہ اس کے وارنٹ جاری کروانے کے لیے کافی ہے۔" شہریار اس وقت سی ایف پی کے دفتر میں موجود تھا اور ذیشان کی زبانی چودھری کے کارخانے پر مارے جانے والے چھاپے کی تفصیلات سن کر اس نے یہ تبصرہ کیا تھا۔

چھاپہ بہت کامیاب رہا تھا اور انہیں اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ تہ خانے میں اُتر کر تو وہ لوگ دنگ رہ گئے تھے۔ کیونکہ وہ تو صرف یہ خیال کر رہے تھے کہ وہاں بڑی مقدار میں ہیروئن کا ذخیرہ موجود ہوگا جسے ڈائپرز میں چھپا کر خفیہ طریقے سے مارکیٹ میں بھیجا جاتا ہوگا..... لیکن وہاں صرف اتنا معاملہ نہیں تھا۔ انہیں وہاں تیار شدہ ہیروئن کے علاوہ اس کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام مال کی بھی بھاری مقدار ملی تھی اور ساتھ ہی ایسے آلات و مشینری بھی جن کی مدد سے ہیروئن سازی کی جا سکتی تھی۔ یعنی وہ کارخانہ صرف ہیروئن کی ایک ذخیرہ گاہ ہی نہیں تھا بلکہ ہیروئن سازی کے لیے بھی استعمال ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے دشمن پر بے حد کاری وار کیا تھا اور یقینی طور پر اسے اس وار سے اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"وارنٹ تو بے شک جاری ہو جائیں گے لیکن گرفتاری کے لیے چودھری دستیاب بھی تو ہو۔ وہ چالاک لومڑ تو پہلے ہی خطرہ دیکھ کر بھاگ نکلا ہے۔" اس کی بات کے جواب میں ذیشان نے اسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ کب تک بھاگے گا۔ لوٹ کر اسے واپس تو یہیں آنا ہے۔ اور اگر نہیں بھی آیا تو ہم انٹرپول کے ذریعے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ منشیات کے کاروبار سے منسلک کسی شخص کو دنیا میں کہیں بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ جب ہم چودھری کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت پیش کریں گے تو

امریکہ خود اسے کان سے پکڑ کر ہمارے حوالے کرے گا۔ اگر فرض کرو کہ ایسا نہ بھی ہوا تو اب کم از کم چودھری ساری زندگی یہاں واپس نہیں لوٹ سکے گا۔ اگر ہم نے ڈھنگ سے کوشش کی تو اتنے خطرناک مجرم کی املاک بحقِ سرکار ضبط بھی کی جاسکتی ہیں۔ تم سوچو کہ ایسا ہوگیا تو کتنوں کا بھلا ہو جائے گا۔ میری تو پوری کوشش ہوگی کہ ساری زمینیں مزارعوں میں تقسیم ہو جائیں تاکہ وہ اپنی محنت کا ڈھنگ سے معاوضہ تو حاصل کرسکیں۔'' وہ اب بھی بے حد پُر جوش اور پُر امید تھا۔ اس کے منصوبے سن کر ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کی طرف کسی بزرگ کی سی شفقت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میری دعا ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری ہو۔ لیکن سچ کہوں تو میں خود بہت زیادہ پُر اُمید نہیں ہوں۔ میرا انٹیلی جنس کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ چودھری جیسا ہر بڑا مجرم اپنے بچاؤ کے لیے پہلے ہی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ رکھتا ہے۔ حالات بھی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ چودھری کو خطرے کا ادراک تھا جب ہی وہ خود پر کوئی برا وقت آنے سے پہلے ملک سے فرار ہوگیا۔ اور یہ مت سوچنا کہ وہ عجلت میں اپنا سارا مال و متاع یونہی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہوگا۔ جو آدمی پیسے سے اتنی محبت کرے کہ اس کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر ڈالے، وہ کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کرسکتا کہ اپنی کسی چُوک کے نتیجے میں اپنی دولت سے محروم ہو جائے۔ چودھری بھی اس بات کا معقول انتظام کر چکا ہوگا کہ جو کچھ، چاہے جس بھی طریقے سے اس نے کمایا ہے اس کا ہی رہے۔ رقم تو یقیناً اس نے ویسے بھی ایک حد سے زیادہ اپنی تحویل میں نہیں رکھی ہوگی اور کہیں باہر کے ملک میں منتقل کر دی ہوگی۔ رہے کھیت اور باغات وغیرہ تو دیکھتے ہیں ان کا کیا معاملہ ہے؟'' ذیشان نے اپنے خیالات سے اسے آگاہ کیا تو وہ بھی کچھ فکرمند نظر آنے لگا لیکن پھر فی الحال اس موضوع کو آئندہ کے لیے چھوڑ کر درپیش صورتِ حال پر گفتگو کرنے لگا۔

''موقع سے جو غیر ملکی قرار ہوا ہے، اس نے کچھ بتایا؟''

''وہ کچھ بتانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص مکمل طور پر گونگا اور بہرا ہے۔ ہم نے اسے دوسرے دو غیر ملکیوں کی لاشیں دکھا کر دھمکایا ہے جس کے نتیجے میں اس نے ایک کاغذ پر لکھ کر جواب دیا ہے۔ اپنے جواب میں اس نے بتایا ہے کہ وہ ہیروئن سازی کا بہت بڑا ماہر ہے جو ایک پارٹی کے کہنے پر اپنے دو معاونین کی مدد سے وہاں ہیروئن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے ساتھی گرفتار ہونے لگے ہیں تو یہی مناسب سمجھا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دونوں معاونین کو گولی مار دی تھی اور اب ہیروئن تیار کرنے کا فارمولا صرف اس کے ذہن میں موجود ہے اور ہم اس لیے اس کی زبان نہیں کھلوا سکتے کہ وہ بول ہی نہیں سکتا۔ تشدد کے ذریعے بھی اسے کاغذ پر سب کچھ لکھ کر دینے کے لیے اس لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خاصا سن رسیدہ ہے اور چار برس پہلے اوپن ہارٹ سرجری سے گزر چکا ہے۔ زبردستی کی صورت میں وہ اپنی جان سے چلا جائے گا اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' ذیشان کی بات سن کر وہ منہ بنا کر بڑبڑایا۔ ''دنیا بھی عجیب ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ بڈھا جب کسی قابل ہی نہیں ہے تو قبر میں لٹکے ہوئے پیروں کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟ اس عمر میں دولت کما کر وہ کیا کرے گا؟'' اسے گویا شدید شکوہ تھا۔

''ضروری نہیں کہ وہ یہ سب پیسے کے لیے کر رہا ہو۔ وہ کسی کاز سے بھی منسلک ہوسکتا ہے۔ وطن اور مذہب کے نام پر بعض دفعہ لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔ تم اپنی مثال سامنے رکھو۔ ہم نے تم سے کتنی بڑی قربانی مانگی ہے لیکن تم بغیر کسی لالچ کے صرف اس لیے تیار ہوگئے کہ تم اپنے ملک و قوم کی



خاطر کچھ کرنا چاہتے ہو۔ ایسے ہی وہ بھی کسی مقصد سے جڑا ہوگا۔''

''میرا معاملہ الگ ہے۔ میں کسی کا برا نہیں چاہتا بلکہ صرف برائی کا خاتمہ چاہتا ہوں۔'' اس نے ذیشان کے خیال سے اختلاف کیا۔

''ایسا تم سوچ رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کا ہیرو عام طور پر دوسری قوم کا ولن ہوتا ہے۔ ''را'' اور ''موساد'' والے ایسے ہی تو تمہاری جان کے درپے نہیں ہوگئے۔ ان کے نزدیک تم ایسے شخص ہو جس نے انہیں نقصان پہنچایا ہے اور جس سے انہیں مزید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اسی لیے وہ تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔'' ذیشان نے دلیل دی تو اسے قائل ہونا ہی پڑا اور وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اب یہ سوچو کہ اگر وہ گونگا بہرا ہمیں کچھ نہیں بتائے گا تو ہم مزید کس طرح آگے بڑھیں گے؟ ہماری اصل جنگ تو ان لوگوں سے ہے جو اس سارے کھیل کے پیچھے ہیں لیکن ہر بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم چند مہروں کو پیٹنے کے بعد پھر اندھیرے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اشیش کمار کی گرفتاری ہو یا ٹاہلی والا میں کی جانے والی کارروائی، ہمارے ہاتھ دو چار کرائے کے ٹٹوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں آپاتا۔'' وہ کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔

''دشمن چالاک ہو تو ایسے ہی حالات پیش آتے ہیں۔ مجھے اور کرنل صاحب کو بھی احساس ہے کہ ہماری اب تک کی کارروائیاں زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ ہم ان کی صفوں میں انتشار بپا کرنے میں تو بے شک کامیاب رہے ہیں لیکن انہیں جڑ سے اُکھاڑ کر نہیں پھینک سکے ہیں۔ ہماری تمام تر کوشش کے باوجود واقعی ایسا ہوتا ہے کہ ہم چند قدم چلنے کے بعد اندھیرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور شاید اپنی اس ناکامی کے سدِباب کے لیے کرنل صاحب نے تمہیں اندھیرے کا تیر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں سے روانگی سے قبل کرنل صاحب نے مجھے مختصراً جو کچھ بتایا ہے، اس سے مجھے یہی اندازہ ہوسکا ہے کہ وہ تمہاری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بہت خاموشی سے تمہیں دشمن کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا کر رہے ہیں اور اپنی فورس کے جوانوں کو بچانا چاہتے ہیں۔ میری ان سے تمہارے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، اس میں انہوں نے تمہارے خلوص کو بے حد سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو اسپرٹ انہوں نے تمہارے اندر دیکھی ہے، وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ اور یہ ہے بھی حقیقت..... تمہاری جگہ اگر کوئی اور بندہ ہوتا تو سکون سے اپنی لگی بندھی نوکری کرتا۔ یہ جو تم ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑاتے پھرتے ہو نا تو ایسا تمہاری بے چین روح کی وجہ سے ہے۔ ایک اے سی کی کرسی نہیں سنبھال سکتی۔ تم جیسا بندہ آزاد رہ کر جس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرسکتا ہے، لگی بندھی نوکری میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ذیشان کھل کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

''یہ سب تو تم لوگوں کا خیال ہے۔ لیکن میں اتنا بھی آزاد نہیں ہوں۔ کچھ رشتے دار لوگ دنیا میں ایسے ہیں ان کی فکر سے میں جیتے جی خود کو آزاد نہیں کرسکتا اس لیے تم لوگوں کو میری عدم موجودگی میں ان کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔'' اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کوئی سپر مین نہیں ہے جو انسانی کمزوریوں سے آزاد ہو۔

''اس سلسلے میں تم فکر نہ کرو۔ کرنل صاحب پہلے ہی تمہیں یقین دہانی کروا چکے ہیں۔ میں خود بھی ذاتی طور پر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جن لوگوں کی تمہیں فکر ہے، سی ایف پی ہر ممکن طریقے سے ان کا خیال رکھے گی۔'' ذیشان نے فوراً اس سے وعدہ کیا۔

''مجھے یقین ہے۔ اسی لیے تو میں اتنی بڑی بازی کھیلنے کے لیے تیار ہوگیا ہوں..... لیکن بار بار یقین دہانی

اس لیے چاہ رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، میں ایک گرداب میں داخل ہونے والا ہوں جس سے باآسانی باہر نہیں آ سکوں گا اور نہ ہی مجھے اتنی مہلت مل سکے گی کہ میں اپنے پیاروں کا ذاتی طور پر خیال رکھ سکوں۔ اس لیے ان کی طرف سے مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے اس بار بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''میری اور تمہاری دوستی اگرچہ بہت پرانی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس دوستی کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کر سکو۔ تمہیں یا تمہارے پیاروں کو کسی بھی صورت میں تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔ کم از کم مجھے تم ہر صورت میں اپنا خیر خواہ پاؤ گے۔'' ذیشان اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی قربانی دینے جا رہا تھا تو اسے اتنا تو حق حاصل تھا کہ اپنے لیے کچھ یقین دہانیاں جمع کر لے، اس لیے وہ ممکن طریقے سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے لیے یہ کام ناممکن ہے یا تم کسی قسم کے شکوک وشبہات کا شکار ہو تو میرے سامنے کھل کر اس کا اعتراف کر سکتے ہو۔ ابھی صرف ایک منصوبہ بنایا گیا ہے، عملی طور پر کوئی خاص اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے تم اگر چاہو تو پیچھے بھی ہٹ سکتے ہو۔ کرنل صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔'' ذیشان نے ایک ایسی بھی بات کہہ دی کہ اگر اس کے دل میں کہیں کوئی شک ہو تو کھل کر سامنے آ جائے اور وہ مجبوری میں کوئی قدم نہ اٹھائے۔

''مجھے اگر پیچھے ہٹنا ہوتا تو ہامی ہی نہیں بھرتا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو وقتی جذبات کے تحت بلا سوچے سمجھے کمزور فیصلے کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ خود بخود سرد ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ذیشان کی پیشکش میں اس نے اپنے لیے ہتک محسوس کی ہو۔ بہرحال، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''میں نے کرنل صاحب سے جو وعدہ کیا، اس پر قائم ہوں۔ اسی لیے اپنی کچھ ذمے داریاں نمٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنی فیملی کے مفادات کے بارے میں سوچنے کے علاوہ میں نے اپنے دو خاص بندوں مشابرم خان اور جگو کو تمہارا نمبر اس ہدایت کے ساتھ نوٹ کروا دیا ہے کہ اگر میں دستیاب نہ ہوں یا کسی حادثے وغیرہ کا شکار ہو جاؤں تو وہ ہر وہ اطلاع جو مجھے دی جانے والی ہو، تمہیں دے دیں۔ میں نے انہیں یہ بھی ہدایت کر دی ہے کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کریں اور تمہارے احکامات کی بھی اسی طرح پیروی کریں جیسے میرے کیے پر عمل کرتے ہیں۔''

''تھینک یو سو مچ شہریار! تمہارے اس خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' ذیشان نے فوراً اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' اس کا لہجہ اب بھی رُوکھا تھا۔

''آئی ایم ویری سوری یار! مجھے معلوم ہے کہ تم ہرٹ ہوئے ہو لیکن بعض باتوں کا وقت پر ہی واضح ہونا بہتر ہوتا ہے، ورنہ آنے والے وقت میں آدمی کے پاس صرف پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔'' ذیشان نے کھلے دل سے اس سے معذرت طلب کر لی۔

''اِٹس اوکے۔ اب ہمیں یہ باتیں چھوڑ کر اصل موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ چودھری کے کارخانے پر کامیاب ریڈ اپنی جگہ لیکن میں حیران ہوں کہ وہاں سی ایف پی کے گارڈز ہونے کے باوجود معاملہ پہلے کیوں نہیں کھلا؟ اور ہمیں اطلاع باہر سے کیوں ملی؟'' اس نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ سی ایف پی ایک پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں کام کر رہی ہے۔



چنانچہ یہاں ہمارے خاص آدمیوں کے علاوہ بہت سے عام لوگ بھی ملازمت کرتے ہیں۔ چودھری نے جب اپنے کارخانے کی سکیورٹی کے لیے گارڈز کی درخواست کی تو اسے ایک عام نوعیت کا معاملہ سمجھا گیا۔ چنانچہ خاص ملازمین کے بجائے عام افراد کو ہی ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا۔ چودھری نے ان گارڈز میں سے دو کو پیسے کے بل بوتے پر خرید لیا۔ یہ گارڈز دن اور رات کی شفٹوں میں تہ خانے والے حصے کے باہر ڈیوٹی دیتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی ڈیلی رپورٹ میں اس بات سے تو آگاہ کر دیا کہ کارخانے کے تہ خانے کو بچوں کے ڈائپرز کی تیاری کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن دیگر مشکوک حرکات وسکنات کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں دی۔ بلکہ یہ سمجھو کہ وہ وہاں چودھری کے مفادات کا بھرپور تحفظ کر رہے تھے اور ان کی موجودگی کے باعث کسی کی مجال نہیں تھی کہ بلا اجازت تہ خانے میں داخل ہو سکے۔'' ذیشان نے اس پر صورتِ حال واضح کی۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو میں سمجھ گیا۔ لیکن ابھی تک مجھ پر اپنے کام کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے۔ میرا نام اور حلیہ بدل کر آخر مجھ سے کیا کام لیا جائے گا؟'' اس نے بے شک کرنل صاحب کے سامنے ہامی بھر لی تھی لیکن فطری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کی وجہ سے سوال کرنے پر مجبور تھا۔

''کام تم وہی کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو لیکن تمہارے دائرہ کار اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا اور واضح ہدف تو چودھری کی شکل میں ہی ہے۔ وہ وطن سے واپس آ جاتا ہے تو اس بار ہم نے اس پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی بھی سطح کے ردِعمل کی پروا کیے بغیر ہم اسے خاموشی سے اٹھا لیں گے اور پھر اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کارروائی کی جائے گی جس میں تم کلیدی کردار ادا کرو گے..... کیونکہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ چودھری کے انکشافات کی روشنی میں جو لوگ سامنے آئیں گے، ہم ان پر قانونی طریقے سے ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے اور جو بھی کیا جائے گا، خفیہ طریقے سے ہی کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چودھری یہاں کے حالات اپنے لیے ناموافق دیکھ کر واپس ہی نہ آئے ایسے میں تمہیں اس کے پیچھے جانا ہو گا۔ ہر دو صورتوں میں تمہیں تمہاری ڈیمانڈ کے مطابق افرادی قوت اور دیگر سہولیات فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔''

ذیشان نے پہلی بار کھل کر اسے بتایا تو اس پر بہت کچھ واضح ہو گیا۔ اپنی اصل شخصیت کے ساتھ وہ دشمن عناصر کے خلاف برسرِ پیکار تو تھا لیکن اس کی نظروں میں آنے کی وجہ سے ایک طرف تو جہاں اس کے لیے خطرات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، وہیں وہ کھل کر ان کے خلاف کچھ کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ پچھلے دنوں اورکوٹ سے لاہور آتے ہوئے اس کی گاڑی کا تعاقب اور اس کی سرگرمیوں سے واقف رہنے کے لیے مسلسل استعمال کی جانے والی ڈیوائس اس حقیقت کا بیّن ثبوت تھے۔ ماریہ کے اپنے انجام تک پہنچنے کے باوجود وہ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ بھی اسے گھیرنے کے لیے کوئی اور حربہ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا کہ ''موساد'' نے اسے قابو میں رکھنے کے لیے اپنی خوب رو اور ذہین ایجنٹ کلارا اینڈرسن کو اگر ماریہ کے روپ میں کس چالاکی کے ساتھ اس کی زندگی میں شامل کیا تھا اگر کچھ ایسے اتفاقات نہ ہوتے کہ وہ ماریہ کی ذات پر شک نہ کر پاتا تو آج بھی وہ نہایت چالاکی سے اپنا کام انجام دیتی رہتی۔ یہ وہی تو تھی جس کی سفارش پر اس نے عابد انصاری کی بطور فاریسٹ آفیسر تعیناتی کی حمایت کی تھی۔ عابد انصاری کی ظاہری شخصیت کچھ ایسی نفیس تھی کہ وہ دھوکا کھا گیا تھا اور اس کے ساتھ پچھلے فاریسٹ آفیسر باجوہ کی طرح کی سختیاں روا نہیں رکھی تھیں۔ یہاں تک کہ اس نے چند درختوں کو قانون کے مطابق کاٹ کر ضلع سے باہر بھیجنے کی اجازت دی تھی تو اس نے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے معمول کی چیکنگ بھی نہیں کروائی تھی۔ اب یہ تو عابد انصاری اور

اس کے ساتھی ہی جانتے تھے کہ بظاہر قانون کے دائرے میں رہ کر وہ لوگ کون سے گل کھلا رہے تھے لیکن جو بھی بات تھی، یہ طے تھا کہ گڑبڑ خاصی بڑی نوعیت کی ہے ورنہ اتنا بڑا گیم نہ کھیلا جاتا۔

ماریہ کا خیال ذہن میں آتے ہی اسے یاد آیا کہ ابھی تک اس نے اس کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اس کی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا البتہ ماموں اور ممانی کو شریکِ راز کر لیا تھا..... اور اب انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے ذیشان کی مدد سے باقی منصوبے پر بھی عمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد ذیشان سے مخاطب ہوا۔

''بات کافی واضح ہو گئی ہے اس لیے میں بھی تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے میدانِ عمل سے غائب ظاہر کرنے کے لیے مجھ پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ کرنے کے مقابلے میں اتفاقی حادثے کا سہارا لینا زیادہ مناسب رہے گا کیونکہ میرے جتنے بھی دشمن ہیں، ان سب کا کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ ہے۔ اس لیے جعلی قاتلانہ حملہ ظاہر کرنے کی صورت میں وہ فوراً اندازہ لگا لیں گے کہ ہم کوئی گہری منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اتفاقی حادثے نے اگر انہیں چونکایا بھی تو بالآخر وہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہیں یقین دلانے کے لیے ٹھوس ثبوتوں کی فراہمی تو تم نے یقینی بنانے کا سوچ ہی لیا ہوگا۔''

''ہاں، اس سلسلے میں ہماری تیاری مکمل ہے۔ اتفاق سے قسمت نے بھی ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا کہ اشیش کمار نے ہماری کسٹڈی میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ خودکشی کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ تو تھا ہی نہیں اس لیے اس نے دیواروں سے ہی بری طرح اپنا سر اور چہرہ ٹکرا کر مرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کامیاب تو نہیں ہو سکا لیکن سر پر ایسی شدید ضرب لگی کہ وہ کوما میں چلا گیا۔ اپنی کوشش کے نتیجے میں اس نے چہرے کے خدوخال الگ خراب کر ڈالے لیکن ہمارے لیے خاصی آسانی ہو گئی ہے۔ اس کا قد و قامت ایسا ہے کہ ہم آسانی سے اسے تمہاری جگہ دے سکتے ہیں۔ اس کے فنگر پرنٹس پہلے ہی تفتیش کی سختیوں سے گزرتے ہوئے ضائع ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ ہم اسے تمہاری جگہ دے دیں گے تو ثبوت کی تلاش کرنے والوں کو کسی طور یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ ہسپتال میں داخل شخص تمہاری جگہ کوئی اور ہے۔ باقی نگرانی وغیرہ سخت رکھی جائے گی تو کسی کو زیادہ مداخلت کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔''

ذیشان خاصا مطمئن لگ رہا تھا، البتہ اس کے لیے اشیش کمار کے بارے میں ملنے والی اطلاع تھوڑی سی مایوس کن تھی۔ لیکن پھر اس نے خود کو یہ سمجھا کر مطمئن کر لیا کہ اتنے عرصے میں اشیش سے جتنی معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں، کی جا چکی تھیں اور وہ معلومات اس اعتبار سے زیادہ سودمند بھی ثابت نہیں ہوئی تھیں کہ اشیش کے بتائے ہوئے کسی بھی ٹھکانے پر وہ اس کے کسی ساتھی کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ چالاک دشمن نے اپنے ساتھی کے پکڑے جانے کی خبر ملتے ہی اپنا ہر ٹھکانہ چھوڑ دیا تھا۔

''اوکے..... یہ تمہارے مسائل ہیں۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم انہیں کس طرح ہینڈل کرو۔ مجھے اپنے مسائل سے نمٹنا ہے اور ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ماریہ کی غیر موجودگی کا جواز پیش کرنا ہے۔ میں نے پچھلی تاریخوں میں اس کا طلاق نامہ تیار کروا لیا ہے۔ اس طلاق نامے کی کاپی میں ممانی جان کو دے دوں گا، اس طرح وہ بعد میں لوگوں کو ماریہ کی عدم موجودگی کا جواز آسانی سے دے سکیں گی۔ میڈیا کی انوالومنٹ کی صورت میں بھی ایک مربوط کہانی تیار ملے گی اور میری فیملی کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر کوئی بھی تبصرہ کرنے کے بجائے اس نے گفتگو کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔

''میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے پیچھے ہم تمہاری فیملی سے غافل نہیں رہیں گے۔



سی ایف پی کے ملازم کے علاوہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں بھی ان لوگوں کا پورا پورا خیال رکھوں گا اور کسی صورت تمہارے مفادات پر ضرب نہیں پڑنے دوں گا۔''

ذیشان کی پُرخلوص یقین دہانی نے اسے خاصا مطمئن کر دیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اتنا کمزور نہیں ہے کہ آسانی سے کوئی ان پر دباؤ ڈال سکے یا کسی طرح کا نقصان پہنچا سکے لیکن پھر بھی اسے اپنی فیملی کے لیے بے تحاشا محبت کی وجہ سے ان کی فکر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑھاپے اور صدموں سے کمزور ہو جانے والے ماموں اور ممانی کو زیادہ امتحانوں سے گزرنا پڑے۔ اسی لیے بار بار ان کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت اس نے خود کو خاصا مطمئن محسوس کیا۔ بہت دنوں بعد ایسا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ بھی نہیں تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ اپنے لیے ایک راہ کا تعین کر چکا تھا ورنہ ذیشان کی بتائی ہوئی مختصر تفصیل سے ہی واضح تھا کہ آنے والا وقت اپنے جلو میں اس کے لیے بہت سے تہلکے اور ہنگامے لے کر آ رہا ہے..... پھر بھی وہ خوش تھا کہ اپنی فطرت کے مطابق کھل کر وہ سب کچھ کر سکے گا جو کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مہم جو فطرت اے سی کے خول کو توڑ کر باہر نکل آنے کے خیال سے بہت خوش تھی۔

⊛----✪----⊛

پاکستان سے ملنے والی خبریں چودھری کے لیے پریشان کُن تھیں۔ اس کی فیکٹری سیل کر دی گئی تھی اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے تھے۔

منشی اللہ رکھا نے اسے فون پر تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چھاپہ کسی خفیہ سرکاری ایجنسی کے اہلکاروں نے مارا تھا جنہوں نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی اور اپنی کارروائی کرنے کے بعد یک دم ہی پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ظاہری طور پر اب یہ کیس پولیس کے پاس تھا لیکن یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ خفیہ ایجنسی نے اس معاملے پر اپنی نگاہ رکھی ہو گی۔ منشی خود احتیاطاً روپوش ہو گیا تھا۔ ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ چودھری کی غیر موجودگی میں اسے ہی گرفتار کر لیا جاتا۔ جیسا کہ فیکٹری کے منیجر کو حراست میں لے کر زیرِ تفتیش رکھا گیا تھا۔ چودھری کو اس کی فکر نہیں تھی کیونکہ منیجر کچھ جانتا ہی نہیں تھا اور اس کا دائرۂ کار جوتوں کے کاروبار تک ہی محدود تھا۔ لیکن وہ خود اپنی فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس کے پاس دولت کی بے شک کوئی کمی نہیں تھی اور فارن بینکوں میں بھی ٹھیک ٹھاک رقوم موجود تھیں لیکن اصل راج پاٹ تو پاکستان میں ہی تھا۔ سونا اُگلنے والی زمینیں اور نوٹوں کی بارش کرنے والے کارخانے اور فیکٹریاں چھوڑ کر وہ کس طرح کہیں اور رہ سکتا تھا؟ پھر دولت کمانے کی جو ایک اور راہ اسے ملی تھی، اس کا انحصار بھی اسی بات پر تھا کہ وہ پاکستان میں رہتا۔ ہیروئن کی تیاری اور اسمگلنگ کے لیے اس کی خدمات لینے والوں نے اس کا انتخاب کیا ہی اس لیے تھا کہ وہ پیر آباد کا بڑا چودھری تھا جس کا اثر و نفوذ اپنے گاؤں کے علاوہ اردگرد کے علاقوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ اگر اس سے پیر آباد کے چودھری اور مطلق العنان حاکم ہونے کا اعزاز ہی چھن جاتا تو پھر اسے ڈھیروں کے حساب سے ڈالرز سے نوازنے والے کیونکر گھاس ڈالتے؟ اس صورتِ حال میں وہ الفا سے بات کر کے اسے مطلع کرنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہی کوئی راہ سجھا دیتا۔

پریشانی کے عالم میں وہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ نیویارک پہنچ کر اس نے حسبِ وعدہ مراد شاہ کے ساتھ ہی رہائش رکھی تھی اور اس وقت بھی اسی کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اسے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی تو پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑ گئی۔

''گڑیا! کیوں دادا ابو کے کمرے کا دروازہ ناک کر رہی ہو؟ وہ ڈسٹرب ہوں گے۔'' دستک کے جواب میں کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی اسے دروازے کے پار سے اپنی بہو کی آواز سنائی دی۔

''مجھے دادا ابو کے پاس جانا ہے ماما!..... ان سے پاری (پیار) لینی ہے۔'' ننھی سی آواز میں معصوم سا مطالبہ سنائی دیا۔

''دادا ابو خود باہر آئیں تو آپ اُن سے پاری لے لینا۔ ابھی آپ نے انہیں تنگ کیا تو وہ آپ سے ناراض



ہو جائیں گے اور ماما کو بھی بہت ڈانٹیں گے۔'' شاہدہ نے بچی کو سمجھایا اور پھر کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے شاہدہ زبردستی بچی کو دروازے سے دور لے جا رہی ہو۔ چودھری نے اس مسئلے کے ٹل جانے پر زور سے سر جھٹکا اور ایک بار پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

اس کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اپنی معصوم پوتی کی خواہش سن کر فوراً ہی دروازہ کھول دیتا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر خوب پیار کرتا۔ لیکن وہ چودھری افتخار عالم شاہ تھا جو عام انسانی جذبات اور رشتوں کی قدر کرنا جانتا ہی نہیں تھا، خصوصاً اگر ان رشتوں اور جذبات کا تعلق عورت سے ہو۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی، بہو اور پوتی کسی بھی رشتے میں اس نے کبھی عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے نزدیک عورت ہر روپ میں پیر کی جوتی ہی تھی جس سے وہ اپنے حساب کتاب کے مطابق ہی برتاؤ کرتا تھا۔ کشور کے فرار کے بعد تو اس کا دل اور بھی زیادہ سخت ہو گیا تھا۔

اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے بنائے ظالمانہ قوانین اور فیصلے بیٹی کے فرار کا سبب بنے تھے۔ اسے یہی لگتا تھا کہ اس نے اپنی باقی دونوں بیٹیوں کی نسبت کشور کو جو تھوڑی سی آزادی دی تھی، اس نے اس کا دماغ خراب کیا تھا اور وہ اس کی عزت کو روند کر حویلی کی دہلیز پار کر گئی تھی۔

اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کو چھین کر بدلے میں دی جانے والی تھوڑی سی سہولیات نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں۔ اپنی جاہلانہ اور جاگیردارانہ سوچ کے زیرِ اثر کشور والے واقعے کے بعد اس کے دل میں عورت کے لیے نفرت مزید گہری ہو گئی تھی۔ جب تک نفرت کا یہ زہر کشور اور آفتاب کی رگوں میں اتار کر وہ انہیں زندگی سے محروم نہ کر دیتا، اسے کسی صورت سکون نہیں ملتا۔ لیکن وہ دونوں اس کی دسترس میں ہی نہیں رہے تھے اور فی الحال تو وہ دوسرے سنگین نوعیت کے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس اُلجھن کا حل ہی پانے کے لیے وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ حل تو نہیں سوجھا مگر اس کے خاص موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔

گھنٹی کی آواز سن کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ یقینی طور پر دوسری طرف الفا ہی ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کے لیے اس سے بات کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن بات نہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لیے اس نے ناخواستہ کال ریسیو کر لی۔

''کیا کر رہے ہو چودھری؟'' الفا نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر!'' وہ اتنا ہی جواب دے سکا۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ تمہارے کارخانے پر ریڈ ہو چکا ہے اور وہاں سے مشینوں، آلات اور مال کی روانگی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہنری کو بھی گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے، تم کچھ نہیں کر سکے؟'' الفا کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

''میں اس خبر پر بہت پریشان ہوں سر! اور سمجھ نہیں آ رہا کہ کس طرح اس صورتِ حال سے نمٹوں۔ آپ کا نقصان ہوا ہے سو ہوا ہے، مجھے خود ذاتی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میں تو واپس اپنے وطن بھی نہیں جا سکتا۔'' اس کے لیے الفا کا لہجہ خاصا ناگوار تھا چنانچہ اس سے کافی حد تک دبنے کے باوجود وہ اسے اپنا نقصان جتائے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہیں ایسا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ ہم جب کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے حالات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارے جس کارخانے پر ریڈ پڑا ہے، قانون کی رو سے وہ تمہاری ملکیت ہی نہیں

ہے اس لیے کوئی تم پر گرفت بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب؟" الفا کے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔

"ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ کاغذات کے ذریعے تم یہ ثابت کر سکو کہ کچھ عرصہ قبل تم نے اپنا کارخانہ فروخت کر دیا تھا۔ کارخانے کے نئے مالک کا نام سردار وہاب خان درج ہے جو ریکارڈ کے مطابق بیرونِ ملک رہائش پذیر ہے۔ اس طرح تم اس سارے بکھیڑے سے مکمل طور پر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ سردار وہاب خان کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے اسے کوئی گرفتار بھی نہیں کر سکتا۔ یوں معاملہ آسانی سے رفع دفع ہو جائے گا۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا ذاتی نقصان کہاں ہوا؟ تم تو مکمل طور پر محفوظ ہو۔"

الفا کی بات سن کر چودھری حیرت اور خوشی سے دم بخود رہ گیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" الفاظ بہت مشکل سے اس کی زبان سے نکلے۔

"تمہارے ملک میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جتنے بے ایمان تم لوگ ہو، پیسے کے بل بوتے پر تم سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔" الفا نے گویا اس کے منہ پر طمانچہ مارا لیکن چودھری جیسے ہوس پرست کے لیے اس قسم کی طعنہ زنی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے مفادات سے آگے کچھ بھی سوچنے کا اہل نہیں تھا۔

"میری سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔" اس نے اپنی شکر گزاری اور خوشی کا اظہار کیا۔

"تم پہلے اپنی پوزیشن کلیئر کرو پھر ہم آگے کے معاملات دیکھیں گے۔ ایک کارخانے پر پڑنے والے اثر سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے، ہمارا اصل پروجیکٹ محفوظ رہنا چاہیے..... تم اس کی فکر کرو۔ افیون کے کھیت کسی طور کسی کی نظر میں نہیں آنے چاہئیں۔ ان کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے، کر گزرو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" خلافِ توقع الفا نے بہت جلد اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا اور اس سے ابتدائی ترش روی سے بات نہیں کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر!..... جیسا آپ کا حکم۔" چودھری خوشی میں کچھ اور بھی فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہا تھا، فون بند ہوا تو اس کی پیشانی پر پھیلا تفکر کا جال مٹ چکا تھا اور اس کی جگہ شادابی نے لے لی تھی۔

⊛----✪----⊛

بچے کو تھپک تھپک کر سلاتی شہزادی کی نظریں اپنے مختصر سے کوارٹر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آج رات ہی یہاں سے نکلنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس لیے دیکھ رہی تھی کہ اس کا کوئی سامان تو اِدھر اُدھر نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے تو وہ بہت مختصر سامان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس سامان میں اس کے اور بچے کے کپڑوں کے علاوہ بچے کی ضروریات کے حوالے سے ہی چند چیزیں موجود تھیں جنہیں وہ پہلے ہی سمیٹ کر رکھ چکی تھی اور اب بس اس بات کی منتظر تھی کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل جائے۔ بنگلے سے نکل کر اسے بس تھوڑی دیر کی پریشانی ہوتی، پھر آگے ایک مخصوص مقام پر اسے مشابرم خان مل جاتا۔

اسے یہاں بھیجنے سے قبل ہی شہریار نے سارا منصوبہ طے کر دیا تھا۔ مشابرم خان کو ہر رات مخصوص اوقات میں بنگلے سے نزدیک ایک محفوظ مقام پر موجود رہنا تھا۔ شہزادی کو کوئی خاص معلومات حاصل ہوتیں یا وہ کسی وجہ سے ضرورت محسوس کرتی تو اس جگہ پہنچ کر مشابرم خان سے مل سکتی تھی۔ ابھی تک اسے ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اتفاق سے آج وہ جو کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی، وہ اطلاع بہت خاص تھی جسے وہ بلا تاخیر مشابرم خان تک پہنچا دینا چاہتی تھی۔ دوسری پریشانی اسے بہرام کی طرف سے تھی۔ یوں تو



نے اسے اپنی صحت بہتر کرنے اور رنگ و روپ نکھارنے تک مہلت دی تھی لیکن بدنیت آدمی کا کیا بھروسہ ہوتا ہے کہ کب اس کی نیت خراب ہو جائے اور وہ موقع ملتے ہی شب خون مار بیٹھے۔ وہ بہرام کی نیت بدل جانے کا خطرہ مول لیے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے یہاں جو کام کرنا تھا، وہ کر چکی تھی اس لیے مزید رکنا بے کار تھا۔ اپنے اچانک فرار کی وجہ وہ منشی اللہ رکھا کی بیوی کو بتا کر معذرت طلب کر سکتی تھی۔ مالی مسائل کے حل کے لیے پہلے ہی شہریار نے وعدہ کر رکھا تھا اس لیے ملازمت کی تو اسے ویسے بھی پروا نہیں تھی۔ بس اسے کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا اور وہ بھی فوری طور پر۔ کیونکہ اردگرد بظاہر کوئی بڑا خطرہ نظر نہ آنے کے باوجود وہ اس بنگلے میں عجیب سی وحشت محسوس کر رہی تھی اور یہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش اتنی شدت سے اسے بے چین کر رہی تھی کہ اس کے لیے مزید ایک دن بھی یہاں رُکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس کی تھپکیوں اور ہلکوروں سے معصوم بچہ جونہی نیند کی آغوش میں پہنچا، وہ اسے چارپائی پر لٹا کر خود اٹھ کھڑی ہوئی اور کوارٹر کی واحد کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔

معمول کے مطابق رات کے ابتدائی حصے میں ہی بیرونی حصے کی لائٹیں بند کر دی گئی تھیں اور ملازمین کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا تھا۔ عابد انصاری صبح جلدی اُٹھنے اور رات کو جلدی سونے کا عادی تھا اور اس نے یہی معمول اپنے ملازمین کے لیے بھی مقرر کیا تھا، اس لیے رات کے کھانے کے بعد بنگلے میں چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔

اپنے چند دن کے قیام میں اس معمول سے واقف ہو جانے والی شہزادی نے احتیاطاً کھڑکی سے جھانک کر اپنی مزید تسلی کر لی تو پٹ بند کر کے واپس چارپائی کے قریب آئی اور پہلے سے وہاں باندھ کر رکھی اپنے سامان کی گٹھڑی اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکائی، پھر سوئے ہوئے بچے کو بھی اپنی آغوش میں بھر لیا۔ بچہ گہری نیند میں تھا۔ اٹھائے جانے پر تھوڑا سا کسمسایا تو ضرور لیکن ماں کے وجود کی گرمی محسوس کر کے ایک بار پھر بے خبر ہو گیا۔

شہزادی بنا آواز کے محتاط قدموں سے باہر نکلی اور کوارٹر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں اسے وہاں اپنے سوا کسی دوسرے متنفس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا اور تسلی ہو جانے پر اس نے اپنے قدموں کو ایک بار پھر حرکت دے دی۔ اس کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کے بجائے پچھلی جانب تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مین گیٹ پر ہر وقت مسلح چوکیدار موجود رہتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں عقبی حصے میں موجود ایک چھوٹا سا دروازہ عموماً صرف کنڈی لگا کر بند کر دینے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ اس دروازے کو عموماً ملازمین جنگل میں آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ آمد و رفت لکڑی کے حصول، چھوٹے جانوروں کے شکار یا جنگل سے گزرتی نہر سے مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں ہوتی تھی اور کوئی ان ملازمین سے پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ شہزادی خود بھی ایک بار خانساماں کی بیوی کے ساتھ اس راستے سے لکڑیاں چننے جنگل میں جا چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرف سے جانے میں اسے بنگلے کا پورا چکر کاٹ کر اس راستے پر جانا پڑے گا جہاں سے اسے مشابرم خان تک پہنچنا ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ رات کے اس پہر مین گیٹ سے کسی طور نہیں گزر سکتی تھی اس لیے یہی راستہ اختیار کرنا بہتر تھا۔

ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اسے واہمہ سا ہو رہا تھا کہ وہ یہ آواز اپنے کانوں سے سن رہی ہے۔ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتی وہ دروازے پر پہنچی اور احتیاط سے دروازے کی بھاری کنڈی کھلی۔ خاموش فضا میں کنڈی کھولے جانے سے ارتعاش سا پیدا ہوا۔ وہ اپنی جگہ بری طرح سہم گئی لیکن جب کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس کا حوصلہ

بڑھ گیا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

آگے گھور جنگل پھیلا ہوا تھا جسے دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جنگل کی ہولناک تاریکی سے نظر چراتی ہوئی بنگلے کی دیوار کے ساتھ چلنے لگی۔ سامنے کے رخ پر ایک پگڈنڈی تھی جس پر سے وہ بغیر ٹھوکر کھائے گزر سکتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے اختتام پر اسے پانچ منٹ مزید چلنا پڑتا پھر وہ اس مقام تک پہنچ جاتی جہاں اس کی مشابرم خان سے ملاقات ہو جاتی۔ بچے کو سینے سے لگائے وہ سہمی سہمی سی اس راستے پر سے گزرتی رہی۔

پگڈنڈی پر قدم رکھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر موجود اسلحہ بردار چوکیدار کا سایہ دیکھا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ چوکیدار اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ پگڈنڈی کے اختتام پر جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ چوکیدار کی حدِ نگاہ سے نکل آئی ہے تو اس نے اپنی گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر کچھ نکالا۔ یہ ایک پنسل ٹارچ تھی جو اسے مشابرم خان نے ہی ایسے کسی موقع کے لیے فراہم کی تھی۔ پنسل ٹارچ کی روشنی نے اس کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ پگڈنڈی کے صاف اور ہموار راستے کی طرح وہ اس مقام سے صرف اندازے کی بنیاد پر نہیں گزر سکتی تھی۔ یہ راستہ ناہموار اور کچا تھا جہاں پتھر اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ یہاں تک جنگلی جانوروں کی پہنچ نہیں تھی اور وہ جنگل سے نکل کر یہاں کا رخ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے خرگوش، گلہری اور چوہوں جیسے چھوٹے اور بے ضرر جانور اس حصے میں پھدکتے پھرتے تھے..... اور گاؤں کی پروردہ شہزادی اتنی بزدل نہیں تھی کہ ان بے ضرر جانوروں سے خوف زدہ ہو جاتی۔

وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی، پنسل ٹارچ کی محدود روشنی میں آگے بڑھتی رہی اور آخر کار اس مقام تک پہنچ گئی جہاں برگد کے تین گھنے اور سن رسیدہ درخت پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔

ان درختوں میں سے ایک پر مشابرم خان نے مچان نما ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ شہزادی نے حسبِ ہدایت ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر کے اسے تین بار جلایا بجھایا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے بعد مشابرم خان کو اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس کے سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن جب چند منٹ کے انتظار کے باوجود اس کی وہاں موجودگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ سو فیصدی اس یقین کے ساتھ بنگلے سے نکلی تھی کہ مشابرم خان وہاں موجود ہو گا۔ یہاں آتے وقت اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر مشابرم خان مخصوص مقام پر موجود نہ ہوا تو وہ کیا کرے گی؟

گھبراہٹ کے عالم میں اس نے ایک بار پھر ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر کے کاشن دینا شروع کیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ اس کی پنسل ٹارچ کی محدود روشنی کے ساتھ ہی وہاں بہت تیز روشنی پھیل گئی تھی اور وہ دیکھ سکتی تھی کہ یہ روشنی اس طاقتور سرچ لائٹ سے نکل رہی ہے جسے بہرام نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ بہرام کے ساتھ ہی اس کا ایک اسلحہ بردار ساتھی بھی کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کر رہی ہے تُو یہاں؟'' بہرام نے کرخت آواز میں اس سے پوچھا لیکن شہزادی اس لائق نہیں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دے سکتی۔ خوف کی زیادتی سے اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''حق نواز! روشنی کر کے دیکھ کہ اوپر یہ اپنے کس یار کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر اسے لے کر واپس بنگلے چلتے ہیں۔'' شہزادی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور خود شہزادی کی گدی پکڑ کر اس کے بال کھینچے۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخ پڑی۔ اس بار اس کی آغوش میں سوئے بچے کی نیند برقرار نہ رہ سکی اور وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ بچے کی آواز سن کر وہ اور بھی سراسیمہ ہو گئی۔ اسے اپنی نازک پوزیشن کا اور بھی شدت سے اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا ننھا بچہ بھی شدید خطرے کی زد میں تھا۔ اس نے اضطراری طور



وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے بال اب بھی بہرام کی گرفت میں تھے۔ بھاگنے کی کوشش میں اسے اس ایک زوردار جھٹکا ہی لگ سکا اور وہ جہاں کی تہاں ہی رہی۔ البتہ بہرام کا طیش مزید بڑھ گیا اور اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ خوف سے ادھ موئی ہوئی شہزادی کے لیے یہ تھپڑ بھی بہت تھا۔ وہ اس کے بعد مزید کوئی کوشش نہیں کر سکی اور وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ اس دوران حق نواز نامی کارندے نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔

''ادھر درخت پر تو وڈی زبردست مچان بندھی ہوئی ہے بہرام! لگتا ہے کوئی بندہ پابندی سے ادھر وقت گزارتا ہے۔ مچان پر پانی کا برتن اور بھنی ہوئی مکئی بھی رکھی ہے۔ برتن میں رکھا پانی زیادہ باسی نہیں لگتا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو بھی ادھر آ کر بیٹھتا ہے، وہ کل یا پرسوں بھی ادھر آیا ہو گا اور برتن میں تازہ پانی بھرا ہو گا۔'' ٹارچ سمیت درخت کے اوپر چڑھنے والا حق نواز پُرجوش انداز میں بہرام کو رپورٹ دینے لگا جسے سن کر شہزادی مزید اندر ہی اندر لرزتی رہی۔ اس کی بنگلے سے رات کے اس پہر چوری چھپے نکل کر یہاں تک پہنچنے والی حرکت کے لیے ایسے ثبوت ملنے شروع ہو گئے تھے کہ وہ کوئی جھوٹا بہانہ بھی نہیں گھڑ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تُو ادھر ہی رہ کر نگرانی کر۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا خصم تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے۔ میں اسے لے کر بنگلے جاتا ہوں فیر وہاں سے تیری مدد کے لیے کسی ہور کو بھی بھیج دوں گا۔''

بہرام نے رپورٹ سن کر حکم صادر کیا اور پھر شہزادی کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگا کر بولا۔

''چل اُٹھ، بنگلے چل کر تیرا حساب کتاب کرتا ہوں۔''

ٹھوکر کھا کر شہزادی بری طرح بلبلا گئی لیکن بہرام کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لیے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے کھڑی ہوئی اور سارے منظر میں بیک گراؤنڈ موسیقی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک جیسے سُر میں روتے اپنے بچے کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگی۔ معصوم بچے کے لیے نیند میں پڑنے والا خلل خاصا تکلیف دہ تھا اس لیے وہ آسانی سے بہلنے کو راضی نہیں تھا۔

''اگر یہ تجھ سے چپ نہیں ہو رہا تو مجھے بتا، میں اس کا گلا دبا کر ہمیشہ کے لیے آواز بند کر دیتا ہوں۔'' اسے بازو سے پکڑ کر بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر گھسیٹتے ہوئے بہرام غرایا۔

شہزادی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ بچے کے منہ پر رکھ لیا تاکہ اس کی آواز بہرام کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اس وقت وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ یہ سوچنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی کہ اس کا عمل بچے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بنگلے کا مختصر راستہ جلدی طے ہو گیا اور وہ گیٹ پر الرٹ کھڑے چوکیدار کے سامنے پہنچ گئے۔

''آ گئے بہرام! لگتا ہے یہ یہاں سے نکل کر زیادہ دور نہیں گئی تھی۔'' اسے اپنے سامنے دیکھ کر چوکیدار نے تبصرہ کیا۔

''جا بھی کیسے سکتی تھی؟ اس جنگل میں اپن کا راج ہے۔ یہاں وہی آتا ہے اور یہاں سے وہی واپس جاتا ہے جسے ہم اجازت دیں۔ یہ ہماری اجازت سے آئی تھی تو ہم اسے اپنی اجازت کے بغیر جانے کیسے دیتے؟'' چوکیدار کو جواب دیتے ہوئے بہرام نے اسے دھکیلا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی دوبارہ اس قید خانے میں داخل ہو گئی جہاں سے کچھ دیر قبل اپنے تئیں بڑی آسانی سے فرار ہو گئی تھی۔ لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے صیاد بھی اتنے غافل نہیں تھے جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ ان کی فی الفور برگد کے درختوں کے نیچے آمد سے ظاہر تھا کہ وہ ابتدا ہی سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ورنہ

انہیں کیسے پتہ چلتا کہ وہ بنگلے سے نکل کر سیدھی کہاں گئی ہے۔

''اب بتاؤ کہ تم کہاں اور کیوں گئی تھیں؟'' اسے گھسیٹ کر بنگلے کے ایک کمرے میں لے جانے کے بعد بہرام نے درشت لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

''تیری زبان کھلوانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تجھ سے زبردستی سچ اُگلوانے کے چکر میں تیری ہڈیاں شڈیاں ٹوٹ جائیں۔'' بہرام نے اسے دھمکی دی جسے سن کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تو اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ شہزادی نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا اور بے اختیار ہی حلق کے بل چیخنے لگی۔ یہ اس کی چیخوں کا ہی اثر تھا کہ عابد انصاری اپنے بیڈروم سے نکل کر گاؤن کے بند باندھتے ہوئے سیدھا اسی کمرے میں چلا آیا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ماں اور بچے دونوں کو ایک تسلسل سے روتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا صاحب! یہ موقع دیکھ کر بنگلے سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر میں آپ کے کہنے پر پہلے سے ہی اس کی نگرانی نہ کروا رہا ہوتا تو یہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی۔'' بہرام نے اسے اطلاع دی۔

''اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا بھی یا نہیں؟ یہ کس کے لیے کام کر رہی ہے؟'' اس نے فوراً ہی دوسرا سوال داغا۔

''یہ تو اس سے اُگلوانا پڑے گا صاحب! ہم نے اسے ادھر برگد کے درختوں کے پاس سے پکڑا ہے۔ وہاں شاید کوئی اس سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔'' بہرام نے جواب دیا۔

''تم رہنے دو، یہ کام میں خود ابھی دو منٹ میں کر لیتا ہوں۔'' وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں شہزادی بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر خاموش کروا چکی تھی۔

''اس سے بچہ لے لو بہرام! جن سوالوں کے جواب دینے میں اسے مشکل ہو گی، ان کا جواب ہم بچے کی مدد سے آسانی سے لے لیں گے۔'' الماری کھول کر اس میں سے کچھ نکالتے ہوئے عابد انصاری نے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بہرام کو حکم دیا تو اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر بچے کو اس کی بانہوں سے کھینچ لیا۔

مامتا کی ماری نے بچہ دینے میں مزاحمت کی کوشش کی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کا اوپری دھڑ بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور وہ خود اس کی ٹانگیں پکڑی رہ گئی۔ دونوں طرف کی کھینچا تانی میں بچے کے نازک بدن میں زبردست کھچاؤ پیدا ہوا اور وہ تکلیف سے بلبلا کر رونے لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شہزادی نے بچے کے پیر چھوڑ دیئے۔ بچہ پوری طرح بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور مچل مچل کر رونے لگا۔

''اللہ کے لیے صاحب! مجھے مافی دے دو۔ مجھے میرے بچے کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔'' وہ تڑپ کر عابد انصاری کے قدموں میں جا گری جو بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں بڑے سائز کی گہرے رنگ کے شیشے والی بوتل لیے کھڑا تھا۔

''اس بوتل کو غور سے دیکھ شہزادی! اس میں ایک بڑا زہریلا سانپ موجود ہے۔ اسے میں جس پر چھوڑ دوں، اسے ڈس ڈالتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کے نشانے پر کوئی معصوم ننھا منا سا بچہ ہے۔'' وہ اسے بڑی واضح دھمکی دے رہا تھا۔

''مینوں مافی دے دے صاحب! مجھے میرے بچے کی زندگی بخش دو۔ بدلے میں آپ جو حکم دو گے، میں



مانوں گی۔'' قدموں میں تو وہ پہلے ہی جھکی ہوئی تھی، اب اپنا سر بھی اس کے پیروں پر رکھ کر زمین پر پٹخنے لگی۔

''یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ اگر کسی کڑیل جوان کو کاٹ لے تو اسے بھی پانی تک مانگنے کی مہلت نہیں مل پاتی۔ چھوٹے بچے کی تو ایک سے دوسری سانس بھی نہ آ سکے گی۔'' اس کی التجاؤں سے بے نیاز وہ اپنی ہی بکواس میں لگا ہوا تھا جسے سن کر وہ بے چاری اور بھی ہول رہی تھی۔

''رحم کرو صاحب!.....رحم کرو۔ میرے کاکے کو کچھ مت کہو۔ تم جو پوچھو گے، میں بتاؤں گی۔ جو کہو گے، وہ کروں گی۔ بس تم میرے بچے کو چھوڑ دو۔'' وہ بری طرح بلبلا رہی تھی۔

''تم کس کے لیے کام کر رہی ہو.....؟'' بوتل کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''اے سی صاحب کے لئے۔ انہوں نے مجھے ڈیوٹی دی تھی کہ بنگلے میں رہ کر مجھے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے، معلوم کر کے انہیں بتاؤں۔ ادھر برگد کے درخت کے پاس ان کے ڈرائیور کو میری مدد کے لیے موجود رہنا تھا پر معلوم نہیں وہ کدھر چلا گیا۔''

اس نے رونے سے سڑسڑ کرتی ناک کو اوڑھنی کے پلو سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا تو عابد انصاری نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لیا اور سمجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''آج تم نے میری اور بہرام کی باتیں سن لی تھیں نا؟''

جواب میں شہزادی نے اثبات میں سر ہلایا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے مافی دے دو صاحب! میں مجبور تھی۔ اے سی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ میں پہلے ہی مشکل میں پھنسی ہوئی تھی، اگر ان کی گل نہ مانتی تو اپنے بچوں کو رُلتا چھوڑ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑتا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے سی تو بڑا انصاف پسند مشہور ہے۔'' عابد انصاری حیران ہوا۔

''وہ گل اپنی جگہ ہے، پر میری بھی مجبوری تھی۔ اگر میں ان کی گل نہ مانتی تو قبر کھود کر اس میں سے مُردہ بچے کی ہڈیاں نکالنے کے جرم میں جیل میں بند رہتی۔ اے سی صاحب نے اس شرط پر مجھے وہاں سے نکلوایا کہ میں ان کی مدد کروں گی۔'' اس نے بتایا۔

''تو تم قبر سے مُردوں کی ہڈیاں بھی چراتی ہو؟'' عابد انصاری نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نہ جی، پر وہ جرم بھی الگ مجبوری میں ہو گیا تھا۔''

وہ تفصیل بتانے لگی کہ کس طرح بالے کی ماں ڈاکٹری علاج سے مایوس ہو کر ٹاہلی والا گاؤں کی خانقاہ پہنچ گئی تھی جہاں کے جعلی پیر نے علاج کے لیے مُردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی ساس نے ہڈیوں کی فراہمی کا کام جبراً اسے سونپ دیا تھا اور اسے مجبوراً اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کے حصول کے لیے وہ نازیبا حرکت کرنی پڑی تھی۔ بدقسمتی سے وہ قبر کھودتے ہوئے پکڑی گئی اور گاؤں والے اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ ڈاکٹر ماریہ اور اے سی شہریار کی مداخلت سے اس کی گلوخلاصی ہوئی لیکن تھانے کچہری کے چکر نے اسے خوار کر کے رکھ دیا۔ اس چکر سے نکلنے کے لیے اس نے شہریار سے تعاون کی ہامی بھر لی اور اب اس کے لیے ایک اہم اطلاع لے کر یہاں سے فرار ہو رہی تھی۔ جس مقام پر اسے پکڑا گیا تھا، وہاں اصولاً اے سی کے ڈرائیور مشابرم خان کو موجود ہونا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں تھا اور وہ خود بہرام کے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اس سے ساری تفصیلات سن کر عابد انصاری نے زوردار ہنکارا بھرا شہزادی کے بارے میں اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ آج ہی اسے شک ہوا تھا کہ وہ اس کی اور بہرام کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی

تھی اور آج ہی ثبوت بھی مل گیا تھا۔ لیکن اس کے لیے اصل تشویش کی بات یہ تھی کہ اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود شہریار کو اس پر شک ہو گیا تھا جب ہی اس نے ملازمہ کے روپ میں اپنا ایک جاسوس اس کے بنگلے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ملازمہ اس تک کوئی کارآمد اطلاع پہنچانے سے قبل پکڑی گئی تھی لیکن اب آئندہ اسے اور بھی زیادہ محتاط رہنا تھا۔

ان خطوط پر سوچتے ہوئے اس نے شہزادی کو تیز نظروں سے گھورا تو وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ ہمیشہ نرم خو اور مہذب نظر آنے والے عابد انصاری کی آنکھوں میں اس وقت کسی درندے کی سی سفاکی تھی۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی، عابد انصاری نے بوتل کا ڈھکن نکالا اور اس میں سے نہایت مہارت سے سیاہ چمکتی جلد والے سانپ کو نکال کر اس پر پھینک دیا۔

سانپ کو دیکھ کر وہ دہشت سے چیخی اور پھر لگاتار چیختی چلی گئی۔ لیکن چیخوں کا یہ سلسلہ زیادہ دراز نہیں ہو سکا۔ سیاہ کوڑیالے سانپ کے نکیلے دانتوں سے بدن میں اُتر جانے والے زہر نے منٹوں میں ہی اسے چٹ پٹ کر دیا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں یہ دیکھنے کے لائق بھی نہیں رہیں کہ اس کی زندگی کا چراغ گُل کرنے والا وہ سیاہ عفریت اب اس کے جگر گوشے سے زندگی کی حرارت چھیننے جا رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

شام کا وقت تھا۔

مشابرم خان نے گرما گرم چائے کی پیالی ختم کرنے کے بعد باہر کا رخ کیا۔ شہریار نے اسے ذمے داری سونپی تھی کہ ہر روز شہزادی کی خبر گیری کے لیے جایا کرے۔ اس نے شہزادی کو مطلع کر کے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے سے ممکنہ حد تک قریب اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ برگد کے گھنے درخت پر خاصی اونچائی پر بنائی جانے والی وہ مچان اسے خاصا محفوظ رکھتی تھی۔ وہاں وہ کسی کی نظروں میں نہیں آتا تھا اور اب تک کا سارا عرصہ عافیت میں گزرا تھا۔ لیکن روزانہ کی یہ کڑی ڈیوٹی اس اعتبار سے خاصی کوفت کا باعث تھی کہ ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور شہزادی نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بہرحال اسے اپنی ڈیوٹی تو انجام دینی ہی تھی۔ اس لیے حسبِ عادت وہ روانگی سے قبل گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے لگا۔

اس کی خصوصی توجہ کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی گاڑی فرسٹ کلاس حالت میں تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس پلٹا تاکہ وقت گزاری اور تھکن کے توڑ کے لیے تیار کروایا جانے والا چائے کا تھرماس نکال کر گاڑی میں رکھ سکے۔ عمارت کے اندر داخل ہوا تو وہاں اسے عجیب سی ہلچل محسوس ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ابھی چند منٹ قبل تو وہاں سب ٹھیک تھا۔ پھر اب لوگ کیوں پریشان نظر آ رہے ہیں؟

''خان!.....صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ بہت بری حالت میں ہسپتال میں داخل ہیں۔''

اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی ایک نائب قاصد نے اسے اطلاع دی تو وہ بھاگتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ پریشان عبدالمنان فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

''سر! اے سی صاحب.....'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں عبدالمنان سے بس اتنا ہی کہا۔

وہ فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''دعا کرو مشابرم خان! میری لاہور میں آئی جی صاحب کے پی اے سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایکسیڈنٹ بہت خطرناک تھا۔ ٹرک تقریباً گاڑی پر چڑھ ہی گیا تھا۔ گاڑی کی جو حالت ہوئی ہے، اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اندر موجود شخص کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اے سی صاحب کو سخت تشویش ناک حالت میں



سروسز ہسپتال میں بھجوایا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے فی الحال ان کی زندگی کی کوئی امید نہیں دلائی ہے۔ اس وقت انہیں سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔''

عبدالمنان نے سخت افسردہ لہجے میں اسے اطلاع دی جسے سن کر مشابرم خان جیسے اونچے پورے مرد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میں لاہور جا رہا ہوں منان صاحب!'' اگلے ہی پل اس نے فیصلہ کیا اور بغیر کچھ سنے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر پوری قوت سے ایکسلریٹر کو دباتے ہوئے اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اسے جلد از جلد شہریار کے پاس لاہور پہنچنا ہے۔ وہ شہزادی سمیت دنیا کے ہر کام کو فراموش کر چکا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تم لوگ حامد راؤ کی فیملی سے ملاقات کے لیے ٹاہلی والا تو نہیں جا سکتے۔ بہتر تھا کہ فون پر انہیں اپنی روانگی کی اطلاع دے دیتے۔''

ماہ بانو اور اسلم دونوں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اس نے کسی بھی ایک کو مخاطب کیے بغیر یہ بات کہی تھی۔ اس وقت وہ حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ان دونوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ابتدا میں جب حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ بھی اسی فلیٹ میں مقیم تھے تو ماہ بانو نے اسے یہاں کا پتہ نہیں دیا تھا۔ اسلم سے نکاح کے بعد جب تیزی سے ان دونوں کے امریکہ جانے کی کارروائی ہونے لگی تو مختلف امور کے لیے رابطے کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے خود ہی اسے یہاں کا پتہ دے دیا۔ لیکن وہ آج پہلی بار ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے قبل جو بھی کام پڑتا تھا، سی ایف پی کا کوئی اہلکار آ کر نمٹا دیتا تھا۔ اس نے خود یہاں آنے سے گریز اس لیے کیا تھا کہ ایک تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے لگے دشمنوں میں سے کسی کی یہاں تک رسائی ہو سکے۔ ایسی صورت میں ماہ بانو اور اسلم مشکل میں پڑ جاتے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اتنا مصروف اور اُلجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس کسی سے ملاقات کے لیے وقت کی شدید قلت تھی۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ اپنی تمام تر میچورٹی اور اخلاص کے باوجود ماہ بانو کو اسلم کی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ دیکھنا ایک تکلیف دہ عمل تھا اس لیے وہ اس عمل سے گریز کرتا رہا لیکن آج کی یہ ملاقات ناگزیر تھی۔

چند گھنٹوں بعد ہی ان دونوں کو نیویارک کے لیے روانہ ہو جانا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اب آئندہ زندگی میں پھر کبھی ان سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں.....اس لیے ہر بات کو بھول کر اس الوداعی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔

ان دونوں کے یہاں سے نکلتے ہی اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کر دیا جاتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاتے جاتے ماہ بانو اپنے ساتھ کوئی ایسا دکھ یا پریشانی لے کر جائے جو بعد میں بھی اسے برقرار رکھے اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ذیشان کے ساتھ ٹائمنگ طے کی تھی اور خود یہاں ایک مختصر سی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کے سفری بیگ بالکل تیار حالت میں لاؤنج میں ہی رکھے تھے اور انہیں دس پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکل جانا تھا۔ انہیں ایئرپورٹ پہنچانے کے لیے بھی سی ایف پی کا ہی کوئی اہلکار گاڑی سمیت باہر پارکنگ میں منتظر تھا اور شہریار کے یہاں سے جاتے ہی انہیں بھی روانہ ہو جانا تھا۔

''میں نے راؤ صاحب کو فون کر دیا تھا۔ افسردہ ہو رہے تھے کہ ہم بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں۔ مسعود نے تو خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ وہ خود ملاقات کے لیے ایئرپورٹ پہنچ جائے گا لیکن میں نے اسے ٹال دیا کہ

کہاں اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آؤ گے۔ فون اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہمارے امریکہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم وہاں جا کر بھی تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔ وہ سمجھ دار لڑکا ہے، زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ہمارے حالات بھی کسی حد تک ان لوگوں کے علم میں ہیں اس لیے یقیناً وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم ایئرپورٹ پر اپنے اردگرد کسی جاننے والے کو نہیں دیکھنا چاہتے تاکہ بعد میں کسی اتفاق کی وجہ سے ان کے ذریعے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی جا سکے۔'' اسلم نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''بالکل صحیح۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں خود بھی اپنی سکیورٹی سے متعلق احتیاطی تدابیر کا احساس ہے۔'' اس نے فوراً ہی اسلم کو سراہا۔ ماہ بانو سے اس کی شادی کا سخت مخالف ہونے کے باوجود اس سے چند ملاقاتوں میں ہی قائل ہو گیا تھا کہ اسلم ایک عمدہ انسان ہے جسے معاشرے کی ستم ظریفی ڈاکو نہ بناتی تو یقیناً وہ اتنا اہل تھا کہ خود اس کے لیول کی کوئی ملازمت کر رہا ہوتا اور اس کا اپنا ایک مقام ہوتا۔ اسے خوشی تھی کہ ماہ بانو کی فرمائش پر اس نے اسلم کے ڈاکو ہونے کو نظرانداز کرنے کی جو غیر قانونی حرکت کی تھی، آج وہ اسے اپنے اوپر بوجھ نہیں لگتی تھی۔ اس نے ایک اچھے انسان کی زندگی کے مزید ماہ و سال برباد ہونے سے بچا کر اسے نئے سرے سے زندگی کے آغاز کا موقع دے دیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ نئی زندگی اس کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوگی۔ ماہ بانو جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی کے ناخوشگوار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

''تمہیں یاد ہے نا کہ نیویارک سے تمہیں کنیکٹڈ فلائٹ سے آرلینڈو جانا ہے اور وہاں میرے اس دوست سے ملنا ہے جس کا ایڈریس میں نے تمہیں دیا ہے۔ میرا وہ دوست آرلینڈو میں سیٹل ہونے میں تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن یاد رکھنا کہ تم لوگ نہ تو خود وہاں جا کر مجھ سے رابطہ کرو گے اور نہ ہی اس کے ذریعے رابطے میں رہنے کی کوشش کرو گے۔ بس سمجھ لو کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ بعد میں کبھی قسمت نے سامنا کروا دیا تو الگ بات ہے، ورنہ جانتے بوجھتے نہ تو میں تم سے رابطہ کروں گا اور نہ ہی تم دونوں کو رابطے کی اجازت دوں گا۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ایک دوسرے سے کٹ کر رہنے میں ہی ہماری بقا ہے۔''

اس نے دیکھا کہ اس کے الفاظ نے ماہ بانو کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک پیدا کر دی ہے لیکن اس نے جان کر نظرانداز کر دیا۔ وہ اسے جن تکالیف سے بچانا چاہتا تھا، اس کے لیے یہ تکلیف سہہ جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔

''ہم آپ کی ہدایت پر پورا پورا عمل کریں گے لیکن ساتھ میں یہ اُمید بھی رکھیں گے کہ ایک نہ ایک روز ہماری پھر سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی..... تو بس جب تک سانس ہے، ملنے کی آس بھی رہے گی۔'' آج ماہ بانو بالکل خاموش تھی اور گفتگو کی ساری ذمے داری اسلم نبھا رہا تھا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ لیکن اس دنیا میں زندگی سے زیادہ بے بھروسہ کوئی اور شے نہیں ہے۔ سانسوں کا سلسلہ کب، کہاں ٹوٹ جائے، کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ اس لیے اس زندگی سے زیادہ اُمیدیں بھی نہیں لگانی چاہئیں۔'' وہ جو پیش بندیاں کر رہا تھا، اس کی وجہ تو ماہ بانو کو سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن وہ اپنے دل میں سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ تکلیف کی اس شدت کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لیے اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو بے دردی سے دانتوں تلے دبا ڈالا۔

''جانے دیں سر! اس موضوع پر ہمارے درمیان ایک طویل بحث چھڑ سکتی ہے۔ لیکن فی الحال اس کا موقع نہیں ہے اس لیے میں ہی ہار تسلیم کر لیتا ہوں۔'' اسلم نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اسے جواب دیا تو وہ بھی مسکرا دیا۔



''اوکے، پھر مجھے اجازت دو۔ تم لوگوں کی سہولت کے لیے جو ممکنہ انتظامات میں کر سکتا تھا، وہ میں نے کر دیئے ہیں۔ کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اس کے لیے ابھی معذرت کر لیتا ہوں۔ آگے تو مجھے اس کا بھی موقع نہیں ملے گا۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے جو الوداعی جملے ادا کیے ان سے بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں واقعی ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ اس بار ماہ بانو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر ڈھلک گئے۔ وہ فوراً ہی نظر چرا گیا۔

''شرمندہ مت کریں شہریار صاحب! آپ نے جس بے غرضی سے ہماری مدد کی ہے، اس کے لیے تو ہمارے پاس شکریے کے الفاظ تک نہیں ہیں، آپ سے کسی قسم کا شکوہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، میں ذاتی طور پر آپ سے ان تکالیف کے لیے معذرت خواہ ہوں جو میری ذات سے آپ کو پہنچیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں جانے انجانے میں آپ کے لیے بار بار تکلیف کا باعث بنتا رہا ہوں۔''

اسلم کے الفاظ بہت سادہ لیکن لہجہ بہت خاص تھا۔ الفاظ سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کا اشارہ ان واقعات کی طرف ہے جب وہ ایک ڈاکو کی حیثیت سے چودھری کا آلۂ کار بن کر اس کے خلاف کام کر رہا تھا۔ لیکن لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اور تکلیف کا ذکر کر رہا ہے۔

اس کے لہجے نے شہریار کو چونکا دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا اسلم اس کے اور ماہ بانو کے درمیان موجود تعلقِ خصوصی سے واقف تھا؟ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے بغور اسلم کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن اب وہ اس سے بالکل انجان بنا اس چھوٹے سے ہینڈ بیگ کا جائزہ لے رہا تھا جس میں ان دونوں کے سفری کاغذات موجود تھے۔

شہریار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسلم کا یہ انجان بننا ہی بھید کھول گیا تھا کہ معاملہ وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اسلم کی یہ آگاہی اس کی اپنی ذہانت اور زبردست قوتِ مشاہدہ کی وجہ سے تھی یا ماہ بانو نے خود اس کے ساتھ اپنے جذبات کو شیئر کر لیا تھا..... کیونکہ بعض صاف گو لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ اپنے ماضی کی وابستگیوں کو اپنے شوہر سے چھپانا بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ ماہ بانو کو اس قسم کی شیئرنگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی تھا، وہ ہمیشہ اَن کہا رہا تھا اور اس اَن کہے جذبے کا تقدس اسی میں تھا کہ اسے کہیں بھی عیاں نہ کیا جائے۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر مجھے اجازت۔ تم لوگوں کو بھی اب فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہئے۔ میں نیچے جا کر ڈرائیور کو اوپر بھیجتا ہوں تاکہ وہ سامان وغیرہ گاڑی تک پہنچانے میں تم لوگوں کی مدد کر سکے۔''

اس معاملے پر مزید سوچنا بے کار سمجھتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹکا اور اسلم کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

''اللہ حافظ سر!..... سی یُو اگین۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتا وہ گویا اسے باور کروا رہا تھا کہ چاہے وہ کچھ بھی کہے لیکن خود وہ دوبارہ ملنے کی اُمید رکھتا ہے۔

اس کے انداز پر شہریار دھیرے سے مسکرایا اور لحظہ بھر کے لیے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔

''اللہ حافظ!''

''اللہ حافظ!'' جواب میں اس کے لبوں نے جنبش ضرور کی لیکن کپکپاتے لبوں سے نکلنے والے الفاظ شہریار کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ بنا سنے بھی اس کی ہر بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اب ان کے بیچ کہنے سننے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ حالات انہیں جس موڑ پر لے آئے تھے، وہاں سے

کچھ کہے سنے بغیر ہی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا بہتر تھا۔ چنانچہ وہ مزید رُکے بغیر وہاں سے نکل گیا۔

⊛----✪----⊛

ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر خاصا توجہ کھینچ لینے والا تھا۔ اسکرین پر ایک گاڑی اس حال میں نظر آ رہی تھی کہ اس کی باڈی بری طرح تباہ ہوگئی تھی اور کھڑکیوں کے شیشوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی بالکل غائب تھی۔ بری طرح اندر دھنسے بونٹ اور ٹیڑھے ہو جانے والے اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ گاڑی کو چلانے والے شخص کا حشر خراب ہوگیا ہوگا۔

ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ اور پائیدان میں پھیلا ڈھیروں خون اس اندازے کو تقویت بخش رہا تھا۔ منظر کے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ سے سنائی دیتی نیوز رپورٹر کی آواز وضاحت کر رہی تھی کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ شہریار کے اپنے ذاتی حوالوں کے ساتھ ساتھ اس کے لیاقت رانا کے خاندان سے تعلق کا بھی حوالہ دے کر بتایا جا رہا تھا کہ جواں سال اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کی کار کو لاہور سے نور کوٹ جاتے ہوئے بدترین حادثہ پیش آیا ہے۔ گاڑی ایک ہیوی ٹرک کی زد میں آنے کی وجہ سے بری طرح تباہ ہوگئی ہے اور گاڑی کو خود ڈرائیو کرتا شہریار عادل بے حد نازک حالت میں سروسز ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بارے میں حسبِ معمول یہی رپورٹ تھی کہ وہ موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر ایسے تھے کہ ٹی وی اسکرین کے سامنے صحیح سلامت بیٹھے شہریار کو بھی گمان ہو رہا تھا کہ واقعی اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ رہی سہی کسر نیوز رپورٹر کے الفاظ اور لہجے کی سنسنی سے پوری ہو رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ حادثہ کس وقت پیش آیا اور شہریار عادل کی حالت اس وقت کتنی نازک ہے۔

ڈیڑھ دو منٹ پر محیط اس رپورٹ کے بعد اسٹوڈیو میں موجود نیوز اینکر اسکرین پر نظر آنے لگی تھی۔ فل میک اپ اور لہراتے بالوں والی خوش پوش نیوز اینکر ناظرین کو بتا رہی تھی کہ اس وقوعے پر بات کرنے کے لیے لیاقت رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اتنے صدمے اور پریشانی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میڈیا کے کسی بھی فرد سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیاقت رانا کی طرف سے انکار ہونے کے بعد انہوں نے آئی جی مختار مراد سے رابطہ کیا جنہوں نے زیادہ تفصیلی بات کرنے کے بجائے صرف مختصراً اتنا ہی کہا کہ حادثے کے ذمے دار ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے شہریار کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کی بھی درخواست کی۔ نیوز اینکر کے اس سوال کا کہ کیا یہ حادثہ شہریار پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کا تسلسل ہے؟ انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا اور اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ ان کا جواب سن کر نیوز اینکر نے دو تین جملوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا اور پھر دوسری خبریں پڑھنے لگی۔

اپنے متعلق چلنے والی خبر ختم ہوتے ہی اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی بند کر دیا لیکن تاریک پڑی اسکرین پر بھی گویا اسے وہی مناظر نظر آ رہے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ مناظر اس کے چاہنے والوں کے لیے کتنے تکلیف دہ ہوں گے۔ حقیقت سے واقف لیاقت رانا اور آفرین کو اس نے پہلے ہی خبریں دیکھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ان لوگوں کو اس چیز سے تکلیف ہوگی۔

وہ اس بات پر بھی مطمئن تھا کہ اس نے یہ سب سامنے آنے سے پہلے ماہ بانو کو پاکستان سے روانہ کر دیا تھا۔ ماہ بانو اور اسلم یقینی طور پر اس وقت نیویارک کی طرف جانے والی پرواز میں سفر کر رہے تھے اس لیے ان



تک یہ خبر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہاں سے انہیں مزید آگے کا سفر کرنا تھا اور پھر اس کے بعد نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کی جدوجہد۔ اس لیے اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ یہ خبر کبھی ماہ بانو کے کانوں تک پہنچ سکے۔ اور جب خبر نہیں پہنچتی تو اسے تکلیف بھی نہ ہوتی۔

اپنے قریبی فیملی ممبرز اور ماہ بانو کو تکلیف سے بچانے کے بعد بھی وہ جانتا تھا کہ ان کے علاوہ بھی ایسے دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی۔ مشابرم خان، عبدالمنان اور ملازمین کے علاوہ اس فہرست میں وہ دیہاتی بھی شامل تھے جو تھوڑے سے عرصے میں اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ رشتے داروں اور دوست احباب کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے اپنے پیاروں کو یہ تکلیف دینی ہی تھی کہ اسے اب ان کے لیے کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کرنا تھا۔

آج سے شہریار عادل کا وجود دنیا کے لیے میدانِ عمل سے نکل گیا تھا۔ اب نہ جانے کتنی مدت تک ہسپتال کے کمرے میں ہوش و حواس سے بیگانے بگڑے چہرے والے بے شناخت اشیش کمار کو شہریار عادل سمجھا جانا تھا اور خود شہریار عادل شخصیت کی تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے لیے سی ایف پی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھا۔

آج سے اسے بیرونی دنیا سے اپنا تعلق ختم کر دینے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں سیل فون آف تھے اور اب وہ ایک خاص مدت تک یہاں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اسے یہاں پہنچانے کے بعد ایک طے شدہ شیڈول تھما دیا گیا تھا جس میں تفصیل سے ساری ہدایات درج تھیں۔ یہاں اسے مخصوص اوقات میں سونا جاگنا، کھانا پینا تھا۔ ورزش، مارشل آرٹس کی مشقوں، لب و لہجے اور چال ڈھال میں تبدیلی کی تربیت، جدید اسلحے اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے آلات کا استعمال سکھانے کے لیے باقاعدہ ایک انسٹرکٹر مقرر کیا گیا تھا جس نے یہاں پہنچتے ہی اس سے ملاقات کی تھی اور مختصر سی اس ملاقات میں شہریار کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خاصا سخت گیر اور خشک مزاج آدمی ہے۔ اس نے اپنی نپی تلی گفتگو میں اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اسے دیئے ہوئے شیڈول کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی اور چند سیکنڈوں کی تاخیر بھی قابلِ گرفت سمجھی جائے گی۔

ان تربیتی مراحل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خدوخال کی تبدیلی کے عمل سے بھی گزرنا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ چند دن کے بعد ایک ماہر سرجن اس کے اوپر کام شروع کر دے گا اور جب وہ شہریار عادل کے چولے سے نکل کر ایک نئی شخصیت میں ڈھل جائے گا تو دوسرا اور اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں وہ اپنے اہداف کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترے گا اور وہ سب کچھ کر سکے گا جو شاید اس کے لیے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے روپ میں کرنا کسی صورت بھی ممکن نہ ہو پاتا۔

⊛----✪----⊛

شہزادی اور اس کے معصوم بچے کی لاشیں گھر کے صحن میں بچھی چارپائیوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کے گرد اس کے بڑے بچے بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے اور بار بار ماں کو آواز دے کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف اس کی ساس بھی بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اسے یہ غم ستا رہا تھا کہ اس بڑھاپے میں جب وہ خود دوسروں کی محتاج تھی، کیسے شہزادی کے بچوں کو پالے گی؟

بیٹے کی زندگی میں بڑے ٹھسّے سے رہنے والی وہ عورت جس نے مظلوم بہو کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، اب بیٹے کے مرنے کے بعد اپنی زندگی کے بچے کھچے دن مشقت و پریشانی کی نذر ہوتے دیکھ کر خوف زدہ تھی اور یہ خوف ہی اسے رونے اور بین کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

آج صبح ہی بہرام اور فاریسٹ آفیسر کے تین مزید ملازمین نے یہ لاشیں شہزادی کے گھر پہنچائی تھیں۔ ان کے بیان کے مطابق شہزادی اور اس کے بچے کو رات کے کسی پہر زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ صبح جب شہزادی مقررہ وقت پر کوارٹر سے نہیں نکلی تو بنگلے کی ایک ملازمہ اسے جگانے کے لیے گئی تھی اور اسی نے ماں بچے کی منہ سے جھاگ نکلتی لاشیں دیکھی تھیں۔ دونوں کے جسموں پر سانپ کے کاٹنے کے واضح نشانات ملے تھے، اس لیے موت کی وجہ کا فوراً ہی تعین ہو گیا اور لاشیں تعزیتی پیغام اور کچھ رقم کے ساتھ گاؤں بھجوا دی گئیں۔ شہزادی کو قابلِ نفرت سمجھنے کے باوجود گاؤں کی عورتیں اس کے گھر پہنچ گئی تھیں اور اب مختلف ٹولیوں میں بیٹھی تبصرے اور تجزیے کر رہی تھیں۔

کسی کو اس کی جوان جہان موت پر افسوس تھا تو کوئی اس کے تنہا رہ جانے والے بچوں کے لیے فکرمند تھی۔ البتہ اس بات پر ان میں سے ہر ایک متفق تھی کہ شہزادی کو اس کے کیے کی سزا ملی ہے۔ کچھ عرصے قبل چاہے مجبوری اور دباؤ کے باعث ہی اس نے قبر سے مُردہ بچے کے اعضا چوری کرنے کی جو قبیح حرکت کی تھی، اسے کسی نے فراموش نہیں کیا تھا اور سب کا یہی خیال تھا کہ اس پر اپنی حرکت کی وجہ سے اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا۔

تبصرے کرتی عورتیں بار بار اپنے کانوں اور گالوں کو ہاتھ لگا کر استغفار پڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کے علاوہ گھر کے باہر مرد بھی جمع تھے اور ان کی گفتگو بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل تھی۔ انہی میں سے کسی نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا کہ ایسی گناہ گار عورت کی تجہیز و تکفین ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں کی جا سکتی، نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس خیال کے سامنے آتے ہی بہت سے لوگ فوراً ہی قائل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میتوں کے پہنچائے جانے کے بعد کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک دونوں لاشیں بے غسل و کفن پڑی ہوئی تھیں۔

آخر کار بات گاؤں کے تھانے تک بھی پہنچ گئی۔ تھانے دار نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے دو کام کیے۔ اوّل یہ کہ اس نے لاشوں کی حفاظت کے لیے دو سپاہی بھیج دیے۔ دوم واقعے کی اطلاع اے سی آفس میں کر دی۔ وہاں سے اسے ہدایت ملی کہ لاشیں مرکزِ صحت منتقل کر کے ان کی کڑی نگرانی کی جائے اور اس وقت تک کسی کو وہاں نہ پھٹکنے دیا جائے جب تک ان کی طرف سے بھیجی جانے والی ایمبولینس وہاں پہنچ کر لاشوں کو وصول نہ کر لے۔

تھانیدار نے فوراً اس حکم پر عملدرآمد کروایا جبکہ دوسری طرف حکم جاری کرنے والا عبدالمنان اس اطلاع کو سن کر پریشانی اور تشویش کا شکار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی، شہریار کے لیے کام کر رہی تھی اور مشابرم خان اسی کام کی وجہ ہر شام پیر آباد تک دوڑ لگانے پر متعین تھا۔ لیکن کل شہریار کو پیش آنے والے حادثے کا سن کر وہ اپنے حواسوں کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور اپنی ڈیوٹی بھول کر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہ لاہور میں ہی موجود تھا اور ڈاکٹرز کی طرف سے مریض کو دیکھنے کی پابندی کے باوجود ہسپتال میں ہی ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔

عبدالمنان کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ لاہور پہنچ جائے لیکن اس کا نور کوٹ میں رہ کر یہاں کے معاملات پر نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ وہ خود پر جبر کر گیا تھا لیکن مشابرم خان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا جس کے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں تھی اور ہر بار اس کے استفسار کے جواب میں وہ یہی بتاتا تھا کہ شہریار کو ہنوز ہوش نہیں آیا ہے۔

پریشانی کے اس عالم میں شہزادی کی حادثاتی موت کی خبر نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے



نہیں معلوم تھا کہ شہزادی کو کیا ٹاسک دے کر فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر بھیجا گیا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ مشابرم خان کی پہلی ہی غیر حاضری میں وہ اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کوئی اتفاق تھا یا وہ جان بوجھ کر شکار بنائی گئی تھی۔ حقائق جاننے کے لیے اس نے لاشیں نور کوٹ منگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کے بعد صورتِ حال واضح ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے مشابرم خان کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی۔ اطلاع سن کر وہ بھی سخت پریشان ہوا تھا اور تھوڑی سی شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بے توجہی کی وجہ سے شہزادی کی جان چلی گئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہریار کے حادثے کے بعد اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں وہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

اس وقت تو وہ سب سے زیادہ شہریار کے لیے فکرمند تھا اور مسلسل ایسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ اسے لگتا تھا کوئی اس کے دل کو بری طرح مسل رہا ہے۔ اس کیفیت سے وہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی اکرم خان کی موت اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی ماں کی حالت پر بھی اس کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح ہاتھ پیر مارنے کے باوجود اپنے پیاروں کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا اور اب بھی بے بسی کا شکار تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شہریار کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ صرف حادثہ نہیں بلکہ قاتلانہ حملہ تھا۔ لیکن ابھی تک شہریار کے کسی قریبی رشتے دار نے اس کے خیال کی تائید نہیں کی تھی۔ وہ سب اسے حادثہ ہی سمجھ رہے تھے اور اسی خیال کے مطابق پولیس بھی اپنا کام کر رہی تھی۔

مشابرم خان اس صورتِ حال پر مطمئن نہیں تھا لیکن فی الحال ہسپتال سے ہٹ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جب تک اسے شہریار کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل جاتی، اس کے لیے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ پریشانی اور دکھ کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے البتہ اسے اتنا ضرور یاد آ گیا کہ کسی خاص موقع پر اپنی عدم دستیابی کی صورت میں شہریار نے اسے ذیشان سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔

یہ بات یاد آتے ہی اس نے فوراً اپنے موبائل میں فیڈ ذیشان کا نمبر ڈائل کیا اور اسے واقعے کی اطلاع دے دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس معاملے کو دیکھ لیتا ہوں۔ تم میری طرف سے کوئی ہدایت ملنے سے قبل اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھانا۔“

ساری بات سن کر ذیشان نے اسے سنجیدگی سے حکم دیا۔ جس کے جواب میں وہ صرف ”یس سر“ ہی کہہ سکا۔ فی الحال تو اس کا خود بھی یہاں سے ہٹ کر کہیں جانے اور کچھ کرنے کا پروگرام نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

”مبارک ہو سنتھیا!..... اب تو تم خوش ہو گی۔ جس کا ہم اور تم مل کر کچھ نہیں بگاڑ سکے، اس سے اوپر والے نے انتقام لے لیا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کروایا ہے۔ شہریار کی حالت بہت نازک ہے۔ پورے جسم پر شدید زخموں کے علاوہ اس کے سر پر بھی چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے وہ مستقل بے ہوش ہے اور ڈاکٹرز اس کی زندگی کی طرف سے خاصی تشویش کا شکار ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کی زندگی بچا بھی لی گئی تو وہ کسی دوسرے بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتا ہے۔ اس نقصان میں اس کا ذہنی توازن بگڑ جانے سے لے کر طویل مدت کے لیے کوما میں چلے جانے تک کچھ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ تاہم ابھی کوئی حتمی رائے دینے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ طے ہے کہ ہماری راہ کا ایک کانٹا نکل گیا ہے اور اب تم اس بات پر غم زدہ نہیں رہو گی کہ تمہاری بیٹی کو موت کے منہ میں دھکیلنے والا خود مزے سے زندہ ہے۔“ سنتھیا نے کھنکتی آواز میں بولتے ورما

کا ہر لفظ بہت سکون سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ کہا اور دکھایا جا رہا ہے وہ سچ ہے؟''

''کیا مطلب؟'' ورما گویا اُچھل پڑا۔ ''کیا تمہیں شک ہے کہ یہ کوئی ڈراما ہے؟''

''نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔ لیکن اتنی آسانی سے کسی بات کو قبول کر لینا ہماری تربیت کا حصہ نہیں۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ تم نے میڈیا پر نشر کی جانے والی خبر کی اپنے ذرائع سے بھی تصدیق کی کوشش کی ہوگی۔'' وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

''آف کورس..... میں نے ایسا کیا ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ حادثہ جس سڑک پر پیش آیا، وہاں سے صرف پرائیویٹ گاڑیاں اور لوڈرز وغیرہ ہی گزرتے ہیں۔ شہریار کی گاڑی کو ایک ایسے ٹرک نے ٹکر ماری جس پر دوسرے شہر بھجوایا جانے والا الیکٹرونکس کا سامان لوڈ تھا۔ حادثے کی اطلاع بعد میں وہاں پہنچنے والے معیز نامی ایک کار سوار نے دی۔ میں نے اس شخص کا بھی پورا بائیوڈیٹا معلوم کر لیا ہے۔ وہ ایک عام سا کاروباری شخص ہے جس نے اپنی کار میں وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کار کو ٹرک سے زبردست حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اور ٹرک ڈرائیور موقع سے مفرور جبکہ کار سوار شدید زخمی ہے۔ اس نے سب سے پہلے ایمبولینس کے لیے کال کی اور پھر پولیس کو حادثے کی اطلاع دی۔

ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی دونوں آگے پیچھے وہاں پہنچیں اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کون ہے، اس لیے انہوں نے اسی حساب سے معاملے کو ہینڈل کیا۔ میں نے ایمبولینس سروس کے دفتر کے ریکارڈ سے بھی حادثے کے وقت کی تصدیق کر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حادثے کا ذمہ دار مفرور ٹرک ڈرائیور پہلے بھی کوئی اچھا ریکارڈ نہیں رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس پر دو اس قسم کے حادثات کا الزام ہے لیکن وہ جس ٹرانسپورٹر کے لیے کام کرتا ہے، وہ بہت پہنچ والا ہے اس لیے دونوں بار اس نے اپنے آدمی کو بڑی دیدہ دلیری سے بچا لیا۔ اسے اپنے کام میں زیادہ مشکل اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ ان دونوں حادثات کا شکار ہونے والے متوسط طبقے کے لوگ تھے جن میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس ٹرانسپورٹر کے سامنے ٹِک سکتے۔ اس لیے اس کا چہیتا ڈرائیور بغیر کسی سزا اور حساب کتاب کے آرام سے سڑکوں پر دندناتا رہا۔ لیکن ظاہر ہے اب سچویشن مختلف ہے۔ پولیس اس ڈرائیور کو گرفتار کرنے کے لیے پورا زور لگا دے گی اور وہ پکڑا گیا تو سزا سے بھی نہیں بچ سکے گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا آقا اسے بچانے کے لیے علاقہ غیر کی طرف بھگا دے اور وہ پھر کبھی منظر پر ہی نہ آئے۔''

ورما نے اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں تفصیل سے بتایا لیکن وہ جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے بیٹھی کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔

''مجھے بتاؤ کہ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ اتنا سب کچھ سن لینے کے بعد بھی مجھے تم مطمئن نہیں لگ رہیں۔'' پیپر ویٹ کو اضطراری طور پر گھماتے ہوئے ورما بولا تو اس کے لہجے سے جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

''صاف بات ہے کہ مجھے یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں لگ رہا۔ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ شہریار کے ہاتھ پیر بری طرح کچلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ چہرے پر بھی گہرے زخموں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے اور یہ چیز مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہے۔ اگر تم دماغ پر ذرا زور دو تو یہ بھی تو سوچ سکتے ہو کہ اس طرح کی انجریز کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شناخت کو چھپایا جا سکے۔ فرض کرو، انہوں نے شہریار کے بجائے کسی دوسرے بندے کو قربانی کا بکرا بنا دیا ہو تو وہ اس کی شناخت چھپانے کے لیے کیا اقدامات کریں گے؟ آدمی کی



سب سے پہلی شناخت ہوتی ہے اس کا چہرہ۔ جب چہرہ ہی مسخ ہو گیا تو ہسپتال میں پڑے بندے کو دیکھ کر کون جان سکے گا کہ وہ شہریار ہی ہے یا اس کی جگہ کوئی اور۔ اب آتے ہیں ہم تصدیق کے دوسرے ذریعے یعنی فنگر پرنٹس کی طرف۔ تو مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے ذریعے بھی تصدیق نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ حادثے میں اس کے ہاتھ پیر بری طرح کچلے گئے ہیں۔'' وہ جوں جوں بولتی جا رہی تھی، ورما کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

''یُو آر جینئس سنتھیا! واقعی ایسا تو ممکن ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سارے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ کسی بھی وجہ سے یہ ڈراما کر سکتا ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ اس طرح وہ ہماری نظروں سے چھپ کر خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ کیونکہ آدمی کتنا ہی بہادر اور جی دار ہو، اپنی جان اسے بہرحال پیاری ہوتی ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جب وہ سامنے ہی نہیں ہو گا تو ہم اسے نشانہ کیسے بنائیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ پس پردہ رہ کر آرام سے ہمارے خلاف کارروائی کرتا رہے اور ہمارا دھیان اس کی طرف جا نہ سکے۔ اصل وجہ جو بھی ہو گی وہ تو وہ خود جانتا ہو گا..... اور ہونے کو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے سارے شک و شبہات غلط ہوں اور واقعی وہ حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال میں پڑا ہو۔ لیکن اس بات کو بغیر تصدیق کے میں نہیں مان سکتی۔ ہمیں ہر حال میں تصدیق کرنی ہو گی کہ وہ شخص شہریار ہی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی میں مطمئن ہو سکوں گی۔''

اس کا انداز بڑا دوٹوک تھا اور ورما اس سے سینئر ہونے کے باوجود دل میں تسلیم کرتا تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ ذہین اور بیدار مغز عورت ہے۔ اس لیے اس کے کسی بھی ارادے سے اختلاف کرنے کے بجائے میز پر ذرا آگے کی طرف جھک کر بیٹھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ کس طرح چیک کرو گی کہ وہ بندہ شہریار ہے یا نہیں؟''

''میں اُس کا ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤں گی۔ تم جانتے ہو کہ ماریہ ایک ڈاکٹر تھی اور بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس موقع تھا کہ شہریار کا ڈی این اے ریکارڈ حاصل کر سکے اس لیے اس نے احتیاطاً یہ کام کر ڈالا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس اب بھی وہ ریکارڈ موجود ہے اس لیے تصدیق کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہم کوشش کر کے ہسپتال میں داخل شخص کا ڈی این اے سیمپل حاصل کر لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا اور زخمی کے شہریار ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کے لیے اس نے جو تدبیر سوچی تھی، وہ بھی بالکل درست تھی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں سمجھ گیا۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہسپتال سے بلڈ وغیرہ کے نمونے حاصل کرنا میرا کام ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد یہ کام نمٹا لوں تاکہ ہماری اُلجھن دور ہو سکے اور آگے کی پلاننگ کی جا سکے۔'' ورما نے اسے اطمینان دلایا تو پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ورما کے ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کرنے پر بے ساختہ ہی اسے ماضی کے وہ روز و شب یاد آ گئے تھے جب وہ جوان تھی اور اپنے نام نہاد شوہر کی لاعلمی میں ورما کے ساتھ کتنے ہی رنگین و سنگین لمحات گزارتی تھی۔ اس کے حُسن اور ذہانت کے سامنے ورما ہمیشہ ہی ہتھیار ڈال دیتا تھا اور ''را'' کے ایسے کئی راز اس کے علم میں آ جاتے تھے جنہیں عالمِ ہوش میں ورما کبھی اپنی زبان پر نہ لاتا۔ ورما کے علاوہ دوسرے اور بھی افسران تھے جنہیں اس نے اپنے ان ہتھیاروں سے زیر کر رکھا تھا لیکن پھر جب وقت نے اپنی چال چلی اور وہ جوانی کے ساتھ ساتھ اس کی مشرسامانیوں سے بھی محروم ہو گئی تو اس کے چاہنے والے بھی بھیڑ کی طرح چھٹ گئے۔ اس موقع پر اس نے

اپنی ذہانت کا ہتھیار اور بھی تیز کر لیا اور کئی ایسے کارنامے انجام دیئے کہ ''را'' میں اس کی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوگئی۔ باقی جن معاملات میں حُسن و جوانی کی محتاج تھی، وہ ماریہ نے سنبھال لیے لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ بہت جلد ماری گئی اور اپنی ماں کی طرح ''موساد'' کے لیے اَن گنت خدمات انجام نہیں دے سکی۔ ماریہ کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ ورما کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں معلوم ہے ورما! کہ شہریار نے ماریہ کے بارے میں کیا مؤقف اختیار کیا تھا؟ اس کے فیملی ممبر ماریہ کے بارے میں لوگوں کے استفسار کے جواب میں بتا رہے ہیں کہ شہریار اس حادثے سے کئی دن قبل ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ماریہ کو طلاق دے چکا تھا اور اب ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ ماریہ کہاں ہے۔ لیاقت رانا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید ماریہ اپنی ممی کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ دیکھی تم نے اس کی چالاکی..... کتنی آسانی سے اس نے خود کو میری بیٹی کے قتل کے الزام سے بچا لیا۔ ایسے شخص کے بارے میں کسی بھی بات کو کیسے آسانی سے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ جب وہ اتنے اہم رشتے سے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے اس شخص کے زندہ یا مُردہ دونوں حالتوں میں مجھے یہ ثبوت چاہئے کہ وہ شہریار عادلی ہے یا نہیں۔ نہ ہونے کی صورت میں، میں اسے ہر صورت تلاش کروں گی اور ویسی ہی دردناک موت دوں گی جو میری بیٹی کے حصے میں آئی۔'' فرطِ جوش سے اس کا وجود کانپنے لگا۔

''ریلیکس سنتھیا! تم جو چاہو گی اور جیسا چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔ اب تم جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ جیسے ہی کوئی اچھی خبر ملی، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔'' پرانے تعلقات کے لحاظ میں ورما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ خود سنتھیا کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اپنی عادت سے کہیں زیادہ بڑھ کر جذباتیت کا مظاہرہ کر چکی ہے، چنانچہ فوراً ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی اور بہت تیزی سے اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگئی۔

''سوری، میں ذرا جذباتی ہوگئی تھی۔'' ورما سے مختصر سی معذرت کر کے وہ اُٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکلی تو وہی باوقار اور باحوصلہ سنتھیا لگ رہی تھی جسے سب جانتے تھے۔ لیکن وہ خود یہ بات جانتی تھی کہ اپنی اکلوتی بیٹی کلارا اینڈرسن المعروف ماریہ جوزف کی موت نے اسے اندر سے کس بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

⊛----✪----⊛

''میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے سر!'' ہسپتال کے اس کمرے میں جہاں اشیش کمار، شہریار کے نام سے داخل تھا، باری باری ڈیوٹی دینے والی دو نرسوں میں سے ایک نے ذیشان سے رابطہ کر کے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ چونک گیا۔

حقیقتاً اس خاص کمرے میں شفٹوں میں ڈیوٹی دینے والی دونوں ہی نرسیں سی ایف پی کا حصہ تھیں اور انہیں حکم تھا کہ روزانہ کی رپورٹ دینے کے علاوہ اگر کوئی بات بہت خاص محسوس ہو تو فوری طور پر رابطہ کریں۔ اس وقت نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس نے اس سے رابطہ کیا تھا اور بتا رہی تھی کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔

''بتاؤ۔'' اس نے نرس کو صرف ایک لفظی حکم دیا۔

''کچھ دیر پہلے مجھ سے کسی آدمی نے میرے موبائل پر رابطہ کیا ہے۔ اس نے مجھے آفر کی ہے کہ اگر میں اسے مسٹر شہریار کے بال اور بلڈ سیمپل پروائیڈ کر دوں تو مجھے بدلے میں پانچ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔''

''گڈ..... اچھی آفر ہے۔ تم نے اسے کیا جواب دیا؟''



''میں رشوت خور نہیں ہوں سر!'' وہ گویا برا مان گئی لیکن پھر سنبھل کر بتانے لگی۔ ''فی الحال میں نے سوچنے کا وقت لے کر اس آدمی کو ٹال دیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ مجھے پھر فون کرے گا۔ اب آپ جیسا کہیں، میں اسے ویسا جواب دے دیتی ہوں۔''

''تم اس کی آفر قبول کر لو۔ بلکہ چاہو تو رقم پر تھوڑی سی بحث کر کے اس میں اضافہ بھی کروا سکتی ہو۔ اس طرح اسے یقین ہو جائے گا کہ تم کوئی لالچی عورت ہو اور پیسے کی خاطر اس کا کام کرنے کے لیے تیار ہو۔''

''او کے سر! جیسی آپ کی مرضی۔'' اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''اس آدمی نے تمہیں جس نمبر سے کال کی تھی، اس کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟''

''وہ کسی پبلک کال آفس کا نمبر تھا اور اس سے اسے ٹریس کرنے میں کسی کامیابی کا امکان نہیں ہے۔'' اس نے ذیشان کے سوال کے جواب میں دوٹوک رائے دی۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ اگلی کال وہ یقیناً پھر کسی نئے نمبر سے کرے گا۔ بہرحال، تم اسے اثبات میں جواب دے دینا۔ بال اور خون کے نمونے تھوڑی دیر میں تم تک پہنچا دیئے جائیں گے۔ پہنچانے والا خود باہر ہی موجود رہے گا۔ تم نمونوں اور رقم کے تبادلے کا طریقِ کار طے ہوتے ہی مجھے انفارم کر دینا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔'' وہ نرس کو ہدایات دینے لگا۔

''ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گئی۔''

''کوئی اور خاص بات تو نہیں ہے؟'' ذیشان نے فون بند کرنے سے پہلے اس سے دریافت کیا۔

''نو سر! کوئی اور بات ہوئی تو میں آپ کو انفارم کر دوں گی۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ذیشان نے کال منقطع کر دی اور تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ اس جگہ جا رہا تھا جہاں شہریار رہائش پذیر تھا۔ راستے میں فون کر کے اس نے وہاں موجود انچارج کو فون کر کے دونوں نمونے حاصل کر کے ہسپتال کی طرف روانہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان چیزوں کا مطالبہ کرنے والا نرس کو کتنی مہلت دے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ اس کے دوبارہ رابطہ کرنے سے پہلے دونوں چیزیں ہسپتال پہنچ جائیں۔ بیس سے پچیس منٹ کی ڈرائیو کر کے وہ وہاں پہنچا تو شہریار اس کا منتظر تھا۔

''میرے بالوں اور خون کی اچانک کیا ضرورت پڑ گئی تھی جو تم نے مجھے کھانے کی میز پر سے اُٹھوا دیا؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد شہریار نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔

''مجھے خیال نہیں تھا کہ تم اس وقت کھانا کھا رہے ہو گے۔ ویسے اگر معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو چار بال اور چندسی سی خون لینے کے لیے میں تمہارے ڈنر ختم کرنے کا انتظار ہرگز نہیں کرتا کیونکہ دونوں کام تو کھانا کھاتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر بھی آسانی سے نمٹائے جا سکتے تھے۔ کرنا کیا تھا، ایک بندہ تمہاری کرسی کے قریب کھڑا ہو کر تمہارے سر سے دو چار بال نوچتا اور پھر ایک ہاتھ میں سُوئی گھسا کر سرنج بھر لیتا۔ تمہیں کھانا روکنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی، آرام سے کھاتے رہتے۔''

مختصر عرصے کی دوستی میں ہی وہ شہریار کی عادات و اطوار سے واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ خاصا نفاست پسند بندہ ہے اس لیے اسے چھیڑنے کے لیے مزے سے بولا۔

''وہ جو گھڑی کی سوئیوں سے بندھا ایٹی کیٹس کا مارا انسٹرکٹر تم نے میرے سر پر مسلط کیا ہوا ہے، وہ مجھے ایسی حرکت کرنے دے سکتا تھا؟ تمہارا فون ملتے ہی اس نے مجھے ٹیبل سے اٹھایا اور سیدھا لے جا کر لیب میں بٹھا دیا۔ میں تو ڈر گیا کہ کہیں مجھے بتائے بغیر بالکل اچانک ہی تو میرے کل پرزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع

نہیں ہونے والی۔'' وہ ذیشان کا مذاق سمجھ گیا تھا اس لیے خود بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''ہاں یار! اُس انسٹرکٹر کا ساتھ تو تمہارے لیے کریلا اوپر سے نیم چڑھا والا حساب ہو گیا ہے۔ تم پہلے ہی ماشاء اللہ کم نہیں تھے، اب اس کی تربیت کے بعد جانے کیا بن جاؤ گے۔'' ذیشان نے اس طرح منہ لٹکا کر کہا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اب یہ اداکاری بند کرو اور بتاؤ کہ اصل کہانی کیا ہے؟ تھوڑی دیر بعد میری اگلی کلاس کا ٹائم ہو جائے گا تو انسٹرکٹر صاحب تمہاری موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔'' اس نے ذیشان کو دھمکایا تو وہ پہلے تو برے برے منہ بنانے لگا، پھر سنجیدہ ہو کر بتانا شروع کیا۔

''ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ دشمنوں نے ہماری طرف سے جاری کی جانے والی حادثے کی خبر کو کافی نہیں سمجھا اور وہ اپنے طور پر تصدیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والا شہریار عادل ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تمہارے بال اور خون کا نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اُنہیں اس کوشش میں کامیاب کروا کر ان کی تسلی کا انتظام کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد انہیں یقین ہو جائے گا کہ ہسپتال کے بستر پر بے بس پڑا آدمی شہریار عادل ہی ہے اور اس کے بعد تم ان کے دل و دماغ سے نکل جاؤ گے۔''

''مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ جتنے مکار ہیں، آسانی سے ہماری چال میں نہیں آئیں گے۔ تم نے اچھا کیا کہ ان کی تسلی کا سامان کر دیا۔ ویسے انہوں نے اس کام کے لیے رابطہ کس سے کیا تھا؟'' اس نے ذیشان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تو جواب میں اس نے تفصیل کہہ سنائی۔

''بالکل ٹھیک۔ آگے یقیناً تمہارے آدمی اس شخص کا تعاقب کرنے کے لیے تیار ہوں گے جو اس نرس سے سیمپل لینے آئے گا۔'' اس نے اندازہ لگایا۔

''یقیناً موجودہ حالات میں جبکہ ہم تقریباً اندھیرے میں کھڑے ہیں، وہ شخص ہمیں دشمنوں میں سے کسی اہم دشمن تک پہنچا سکتا ہے۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن اپنے آدمی سے کہنا کہ بے حد محتاط رہے۔ کیونکہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ بنا بنایا کھیل بھی بگڑ جائے گا۔ دشمن یہ جاننے کے بعد کہ نرس سے رابطہ کرنے والے آدمی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ایک بار پھر شکوک و شبہات میں گھر جائے گا۔'' اس نے ذیشان کو مشورہ دیا۔

''میں خود بھی یہ بات سمجھتا ہوں۔ اس لیے اپنے بہت قابل اور ہوشیار ماتحت کو یہ ڈیوٹی سونپی ہے۔ اب دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ بہرحال، تم جاؤ جا کر اپنی کلاس لو۔ میں آج کی رات یہیں ہوں۔ جیسے جیسے میرے پاس اطلاعات آتی رہیں گی، میں تمہیں بتاتا رہوں گا۔ اس سارے کھیل میں چونکہ تمہیں سب سے اہم کردار ادا کرنا ہے، اس لیے تمہارا ہر بات سے باخبر رہنا سب سے زیادہ ضروری بھی ہے۔'' ذیشان نے ایک طرح سے اس پر اپنے یہاں تک دوڑے چلے آنے کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں کلاس لے کر آتا ہوں۔ جب تک تم اس معاملے کو ہینڈل کرو۔'' شہریار وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ذیشان کے سیٹ پر کال آنے لگی۔

''ہاں تہمینہ! کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے نمبر دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کی۔

''اس نے دوبارہ کال کی تھی سر! میں نے بحث کر کے چھ لاکھ کے عوض کام کرنے کی ہامی بھر لی ہے۔ اس



نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے دونوں چیزیں لے کر ہسپتال کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں عموماً مریضوں کے عزیز و اقارب رات گزارتے ہیں۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ مجھے پہچانتا ہے اور خود ہی مجھ سے مل کر دونوں نمونے وصول کر لے گا۔ رقم بھی وہ یہیں پر میرے حوالے کرے گا۔'' نرس نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ اس نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں، ان پر عمل کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔'' اس نے تہمینہ کو ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور اس آدمی سے رابطہ کرنے لگا جس کی اس نے ہسپتال میں ڈیوٹی لگائی تھی۔ اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد فارغ ہوا تو کافی کی طلب ہونے لگی۔ وہاں موجود خدمت گار کو گھنٹی بجا کر بلانے کے بعد اسے کافی بنانے کا حکم دیا اور خود اس لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس مصروفیت کے دوران کافی بن کر آ گئی۔ وہ گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنا کام نمٹاتا رہا۔

کام کے دوران بھی اسے گھڑی کی سوئیوں کے سفر کا دھیان تھا۔ آدھا گھنٹہ گزرا تو اس کا ذہن حساب کتاب کرنے لگا کہ اب تہمینہ اس خصوصی پرائیویٹ روم سے نکلی پڑی ہو گی جس میں بظاہر شہریار لیکن حقیقتاً اشیش کمار داخل ہوا تھا اور جس کے دروازے پر ایک مسلح پہرے دار ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس مسلح پہرے دار کے علاوہ بھی سی ایف پی کا کوئی نہ کوئی اہلکار غیر محسوس طور پر اس اسپیشل روم کے اردگرد ٹہلتا رہتا تھا تاکہ کوئی غیر معمولی بات محسوس ہونے پر فوراً حرکت میں آ جائے۔

اس انتظام کی وجہ سے تہمینہ کی غیر موجودگی میں وہاں کسی گڑبڑ کا کم ہی احتمال تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس بات کا بھی اندازہ لگایا کہ تہمینہ کو مقررہ مقام تک پہنچنے میں کتنی دیر لگی ہو گی۔ پھر وہ تصور کی آنکھ سے کسی اجنبی کو اس سے ملتا اور چیزوں کا تبادلہ کرتا دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اسے اپنے تخیل پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی اور اس کے ماتحت کی کال آ گئی۔

''میں نے تہمینہ سے ملنے کے لیے آنے والے آدمی کو دیکھ لیا ہے سر! اور اب اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔'' ماتحت عجلت میں تھا اس لیے مختصر رپورٹ دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کال کو وصول کرنے کے بعد ذیشان کا جوش اور اعصابی تناؤ دونوں ہی بڑھ گئے۔ اپنے ماتحت کی کامیابی کی صورت میں وہ اس لائق ہو سکتا تھا کہ دشمن پر ہاتھ ڈال سکے کیونکہ تہمینہ سے شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے وصول کر کے لے جانے والا یقیناً کسی خاص شخص کا ہی نمائندہ ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اس خاص شخص تک پہنچ جاتے تو پھر آگے بہت سی راہیں کھلتی جاتیں۔

ذہن کو مصروف رکھنے کی کوشش کے باوجود وہ بے چینی سے اگلی رپورٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کو سہل کرنے کے لیے اس نے ایک پیالی کافی مزید منگا لی۔ اس دوران شہریار بھی واپس آ گیا۔

''کیا خبریں ہیں؟'' آتے کے ساتھ ہی اس نے ذیشان سے پوچھا۔ وہ اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ شہریار نے بغیر کسی تبصرے کے اس کی پوری بات خاموشی سے سنی اور پھر خود بھی انتظار میں شامل ہو گیا۔ تقریباً پینتیس منٹ بعد ذیشان کے پاس اس کے ماتحت کی کال آئی۔

''میں اس وقت لبرٹی کے علاقے میں ہوں سر! میں جس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں، وہ ایک بڑے جنرل اسٹور پر آ کر رکا ہے اور وہاں جا کر کاؤنٹر سنبھال لیا ہے۔ جنرل اسٹور میں اس کے علاوہ دو لڑکے اور بھی ہیں لیکن اس شخص کے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اسٹور کا مالک یا کم از کم انچارج ضرور ہے۔

ا ندر پہنچنے کے بعد اس نے کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کی ہے اور شاید حساب کتاب میں مصروف ہو گیا ہے۔ ا ندر خاصا چلتا ہوا ہے اور یہاں مسلسل گاہکوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ علاقے کی رونق اور اردگرد کی کھلی ہوئی دکانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گیارہ بجے سے پہلے اسٹور بند نہیں ہوگا۔ شاید اسٹور بند ہو جانے کے بعد ں وہ مال کی ڈیلیوری کے لیے جائے۔'' ماتحت نے اسے تفصیلی رپورٹ مع اپنی رائے کے دی۔

''ٹھیک ہے، تم اس پر نظر رکھو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اسٹور پر آ کر ہی اس سے وصولی کر لے۔ ں سری صورت میں تمہیں اسٹور بند ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ وہاں سے نکل کر وہ کسی جگہ یہ چیزیں پہنچانے جا سکتا ہے یا کوئی اس کے گھر پر بھی وصولی کے لیے آ سکتا ہے۔ تم ہر امکان کو ذہن میں رکھ کر نگرانی کرو۔ اور یاد رکھنا کہ ہمارا اصل ہدف یہ شخص نہیں بلکہ وہ ہوگا جو اس سے وصولی کرے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہاری مدد کے لیے شاہد کو بھی بھیج دیتا ہوں۔ تم دو بندے ہو گے تو کسی مشکل پچویشن سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔ بس یاد رکھنا کہ تمہیں جنرل اسٹور والے کو قطعی نہیں چھیڑنا ہے اور نہ ہی کسی طرح اس کی نظروں میں آنا ہے۔ وہ ریلیکس رہے گا تو ہمارے لیے بھی آسانی رہے گی۔'' وہ رپورٹ سن کر اپنے ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شاہد نامی ماتحت کو کال کر کے اسے بھی وہاں پہنچنے کا حکم دیا جہاں پہلے والا ماتحت موجود تھا۔ شاہد کو کال کرنے کے بعد اس نے سیٹ ہاتھ سے رکھا بھی نہیں تھا کہ اس پر کال آنے لگی۔ نمبر دیکھ کر وہ چونکا اور شہریار کو اطلاع دی۔

''مشابرم خان کال کر رہا ہے۔'' پھر خود کال ریسیو کر لی۔

''ادھر ہسپتال میں گڑبڑ ہے سر! وہ خانہ خراب نرس جو شہریار صاحب کے کمرے میں ڈیوٹی دیتی ہے، ادھر ایک بندے سے ملی ہے اور اسے کچھ دے کر اس سے کالے رنگ کا ایک بیگ وصول کیا ہے۔ مجھے وہ صورت حرام بندہ گڑبڑ لگ رہا تھا اس لیے میں نے فوراً آپ کو اطلاع دینے کے بجائے اس کا پیچھا کیا اور اب ادھر لبرٹی کے علاقے میں موجود ہوں۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ گدی پکڑ کر اس صورت حرام بندے سے ساری تفصیل معلوم کر لوں۔ لیکن سوچا پہلے آپ کی اجازت لینا ضروری ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آپ کا نمبر ہی مصروف جا رہا تھا۔''

مشابرم خان نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس سے جو کچھ کہا، اسے سن کر اس کی کھوپڑی ناچ اُٹھی۔ اگر مشابرم خان اپنے کہے پر عمل کرنے کھڑا ہو جاتا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

''تم کچھ نہیں کرو گے خان! اس معاملے سے بالکل الگ رہو اور وہاں سے ہٹ جاؤ۔'' اس نے سرد اور جھلائی ہوئی آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔

''لیکن صاحب.....'' مشابرم خان اس کا حکم سن کر متذبذب ہوا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے، اس پر عمل کرو۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے اور میرے بندے خود اسے دیکھ رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں کسی صورت تمہیں نہیں بخشوں گا۔'' ذیشان کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

''میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا کرنا ہے۔ آپ جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔'' وہ اب بھی وہاں سے لوٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

''تم صرف یہ کرو کہ وہاں سے اپنی شکل گم کر لو۔ اگر دو منٹ بعد بھی تم وہاں دکھائی دیئے تو میں اپنے آدمی



سے کہوں گا کہ تمہیں گولی مار دے۔'' ذیشان کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔

''ٹھیک ہے سر! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں ہسپتال چلا جاتا ہوں۔'' آخر کار مشابرم خان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''تمہاری مرضی ہے۔ ویسے میری مانو تو اب ہسپتال کا پیچھا چھوڑ دو۔ ہسپتال میں سوائے وقت برباد کرنے کے تم کچھ نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے صاحب کا علاج ڈاکٹرز کر سکتے ہیں اور وہ کر رہے ہیں۔ تمہارا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔'' ذیشان نے اسے تلخی سے جواب دیا۔

''میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا سر! مجھے معلوم ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی میں صاحب کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔'' مشابرم خان نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا تو ذیشان نے اس سے مزید کچھ کہے بغیر لائن کاٹ دی اور لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے ساری بات سنتے شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

''ایک تو یہ بڑا مسئلہ ہے۔ تمہارے دشمنوں کے ساتھ ساتھ تمہارے چاہنے والوں سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ شخص تو تمہارے لیے بالکل پاگل ہے۔ حال سے بے حال مستقل ہسپتال میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ میا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شکر ہے کہ اس نے کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے رابطہ کر لیا ورنہ بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیتا۔'' وہ ابھی تک جھلاہٹ کا شکار تھا۔

''ایزی یار! مشابرم خان بڑے کام کا بندہ ہے۔ فی الحال وہ میرے ساتھ حادثہ پیش آنے کا سن کر شاک میں ہے۔ تھوڑے دنوں میں سنبھلے گا تو تم دیکھنا تمہارے لیے بڑے کام کا بندہ ثابت ہوگا۔ تم نے عدم کا وہ شعر تو سنا ہوگا

خلوص کے بندوں میں ایک ہی کمی ہے عدمؔ
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

تو بس سمجھو کہ خان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ ورنہ آدمی وہ زبردست ہے۔'' وہ ذیشان کو سمجھانے لگا۔

''ہمارے کام میں یہ جذباتیت نقصان دہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتانے والا تھا کہ اس آدمی کے جذباتی پن نے کہیں اور بھی گڑبڑ کر دی ہے۔ تمہیں وہ عورت شہزادی تو یاد ہوگی نا جسے تم نے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا؟''

''ہاں ہاں، بالکل یاد ہے..... بلکہ میں منتظر تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رپورٹ ملے۔''

''انتظار کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ شہزادی مر چکی ہے۔'' ذیشان نے انکشاف کیا۔

''کیوں؟..... کیسے؟'' وہ چونک پڑا۔

''زیادہ تفصیل نہیں معلوم، بس یہ معلوم ہوا ہے کہ رات کو سوتے ہوئے اس کو اور اس کے بچے کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ صبح لاشیں گاؤں پہنچا دی گئیں۔ عبدالمنان نے لاشیں اپنی تحویل میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ ہلاکت کا سبب وہی ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے جس بات نے تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حادثہ اسی رات پیش آیا ہے جس روز تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر نشر کی گئی اور مشابرم خان جذبات میں آ کر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے جانے کے بجائے لاہور بھاگا آیا۔ اب اگر اس معاملے کو شک کی نظر سے دیکھو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہزادی کوئی خاص اطلاع دینے کے لیے بنگلے سے نکلی ہو اور پکڑی گئی ہو۔ مشابرم خان وہاں موجود ہوتا تو اس کی کچھ مدد کر پاتا۔ کمزور عورت کو پکڑ کر انہوں نے آسانی سے سب کچھ اُگلوا لیا ہوگا اور پھر اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے

کے لیے سانپ سے ڈسوانا کون سا مشکل کام تھا۔ میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اس کیس کی جو تھوڑی بہت تحقیق کروائی ہے، اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بے شک شہزادی کے جسم پر تشدد وغیرہ کے نشانات نہیں تھے لیکن اس کے پیروں پر چند ایسی خراشیں تھیں جن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ جھاڑیوں وغیرہ سے گزری ہو۔ اس کے علاوہ اس کے کپڑوں پر مٹی اور تھوڑی سی گھاس پھونس بھی پائی گئی ہے جس سے یہ شک ہوتا ہے کہ وہ بنگلے سے باہر نکلی تھی۔ سب سے اہم اور قابلِ غور جو کلیو ملا ہے، وہ یہ کہ برگد کے جس درخت پر مشابرم خان نے اپنے لیے مچان باندھی تھی، اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ افراد کے قدموں کے نشانات پائے گئے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے، وہاں مشابرم خان کے علاوہ بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ اب اگر سوچو تو یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ ہوسکتا ہے اس رات شہزادی کوئی اہم اطلاع لے کر پہنچی ہو لیکن مشابرم خان وہاں نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں اسے کچھ لوگوں نے دھرا تو اس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ بے چاری بے موت ماری گئی۔ اس طرح کے قتل جو بظاہر حادثہ لگیں، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں حالات کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھتا ہوں کہ شہزادی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے سوچ سمجھ کر قتل کیا گیا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ ہمارے لیے کام کر رہی تھی۔''

ذیشان نے بے لاگ تجزیے اور تبصرے پر مبنی تفصیل اسے کہہ سنائی جسے سن کر وہ خود سخت افسوس میں مبتلا ہو گیا۔ جذبات میں آ کر مشابرم خان سے جو کوتاہی ہوئی، وہ اپنی جگہ تھی لیکن اس وقت وہ خود کو شہزادی اور اس کے معصوم بچوں کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ وہ چودھری اور عابد انصاری کے درمیان تعلق ڈھونڈنے کے چکر میں اتنا دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے ایک کمزور عورت کو بھیڑیوں کی کچھار میں اُترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اگر ذیشان کا تجزیہ درست تھا تو پھر بے چاری شہزادی ان بھیڑیوں کی سفاکی کا شکار ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے اس کے باقی بچ رہنے والے بچے ظالم دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔

''ایک کام کرنا ذیشان! کوشش کر کے شہزادی کے بچوں کو حکومتی تحویل میں لے لینا اور انہیں ایسے کسی ادارے میں داخل کروا دینا جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہو سکے۔'' وہ مرنے والی کو تو واپس نہیں لا سکتا تھا اس لیے اب مداوے کی واحد صورت یہی تھی کہ شہزادی کے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی۔

''تم فکر نہیں کرو۔ یہ کام ہو جائے گا۔'' ذیشان نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی اپنے جارحانہ لہجے کو تبدیل کر لیا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اس تکلیف دہ موضوع کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اس کے دوسرے پہلو کو چھیڑ دیا۔

''شہزادی کے انجام سے ظاہر ہے کہ وہ کسی خاص راز تک پہنچ گئی تھی اور چونکہ وہ عابد انصاری کے بنگلے میں ملازمت کر رہی تھی، اس لیے یہ بات بھی خود بخود ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ بندہ گڑبڑ ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہم معاملات تک خفیہ طور پر پہنچنے کی کوشش ترک کر کے براہِ راست ایکشن لیں اور عابد انصاری کو اٹھا لائیں۔ جب میرے آدمیوں کے ہاتھوں پیٹ بھر کر مار کھائے گا تو خود ہی سب اُگل دے گا۔'' ذیشان نے جو تجویز پیش کی، وہ اسے قابلِ غور لگی اور وہ خود بھی اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیونکہ اگر عابد انصاری واقعی کسی خطرناک کام میں ملوث ہے تو پھر اس نے اپنے اردگرد انہی لوگوں کو جمع کر رکھا ہوگا جو اس کے نزدیک قابلِ بھروسہ ہوں گے۔ اس کے بھروسے کے کسی آدمی کو توڑنا ہمارے لیے مشکل ہے اور اپنے کسی آدمی کو اس کی صفوں میں شامل کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ شہزادی



والے واقعے کے بعد اب وہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہوگا۔

''پھر طے ہو گیا کہ ہمیں عابد انصاری کو اٹھانا ہے۔ ابھی جو قصہ چل رہا ہے، اسے نمٹا لیں پھر آگے کی پلاننگ کریں گے کہ انصاری کو اٹھانے کے لیے کیا طریقِ کار استعمال کیا جائے۔''

ذیشان ابھی یہ الفاظ ادا کر ہی رہا تھا کہ لمبے قد اور مضبوط جسامت کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ صورت ہی سے بارُعب نظر آنے والا یہ آدمی شہریار کا انسٹرکٹر تھا اور جس جگہ وہ لوگ موجود تھے، وہاں اسی کا حکم چلتا تھا۔ یہاں موجود افراد کو ہر کام کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت پڑتی تھی۔

''آیئے عمر فاروق صاحب! کہیں آپ اپنے شاگرد کو ڈانٹ ڈپٹ تو کرنے نہیں آئے کہ یہ بنا اجازت اتنی دیر تک یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے اور اصولاً اسے اب تک سو جانا چاہیے۔'' اس آدمی کو دیکھتے ہی ذیشان نے شوخی سے پوچھا۔ لیکن شہریار محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی شوخی میں بھی احتیاط اور احترام موجود ہے۔

''میرا شاگرد اتنا نالائق نہیں ہے کہ بغیر اجازت لیے ہی قواعد و ضوابط کے خلاف عمل کر سکے۔ رہی بات روٹین خراب ہونے کی تو یاد رکھو، روٹین کی پابندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وقت کے حساب کتاب میں گڑبڑ سے کسی کا وقت برباد نہ ہو ورنہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جس نوعیت کا کام کرتے ہو، اس میں ہمیشہ کسی طے شدہ معمول پر چلنا ممکن نہیں ہوتا..... بلکہ بعض اوقات تو دن رات کا فرق بھی مٹ جاتا ہے اور بغیر کھائے پیئے اور سوئے کئی کئی دن تک نامساعد حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔'' عمر فاروق کے نام سے پکارے جانے والے انسٹرکٹر نے نرم سی سنجیدگی کے ساتھ ذیشان کی بات کا جواب دیا تو وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اپنے سیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی، کیا رپورٹ ہے؟ اب تو گیارہ سے اوپر کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا اب تک اس نے اسٹور بند نہیں کیا؟'' رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے اپنے ماتحت سے دریافت کیا۔

''میں خود آپ کو کال کرنے والا تھا سر! اسٹور بند ہو گیا ہے اور اس کا مالک اپنے گھر جا چکا ہے۔ میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا ہوں۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کے رنگ و روغن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مالک مکان اچھا خاصا خوش حال آدمی ہے۔ میں نے دروازے پر لگی نیم پلیٹ بھی دیکھی ہے۔ نیم پلیٹ پر اس کا نام رائے چند لکھا ہوا ہے۔ رائے چند نے نہ تو اسٹور میں کسی سے ملاقات کی تھی اور نہ ہی وہ راستے میں کہیں رُکا ہے، اس لیے مجھے لگتا ہے کہ اس سے وصولی کے لیے آنے والا یہیں گھر پر ہی کسی وقت آئے گا۔'' ماتحت نے فوراً تفصیلی رپورٹ دے دی۔

''تم اپنا کام جاری رکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے گھر کی نگرانی سے غافل نہ ہونا۔ صبح چھ بجے تک تمہاری وہاں پر ڈیوٹی ہے۔ اس دوران اگر کچھ نہیں ہوا تو دوسرا بندہ تمہاری جگہ سنبھال لے گا۔'' ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر مسکراتا ہوا شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

''لو بھئی، اپنی تو رات کالی ہونے کا بندوبست ہو گیا۔ تم ایسا کرو کہ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ جو بھی حالات ہوں گے، میں صبح تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ صبح سے تمہیں پھر عمر فاروق صاحب کی مشقِ ستم کا سامنا کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ نیند لے کر فریش ہو جاؤ۔''

''نہیں، آج رات شہریار کو سونا نہیں ہے۔ یہ بھی تمہارے ساتھ ہی جاگیں گے اور صبح جب روٹین کا آغاز ہوگا تو انہیں بالکل ویسا ہی فریش نظر آنا ہوگا جیسے کوئی شخص بھرپور نیند لینے کے بعد نظر آتا ہے۔'' اس سے قبل کہ شہریار کی طرف سے کوئی ردِعمل ہوتا، عمر فاروق اچانک ہی بول پڑے۔ اور یہ تو طے تھا کہ ان کا کہا اٹل تھا۔ ویسے

بھی ان دونوں میں سے کوئی بھی ان سے اختلاف کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عمر فاروق کی ہر ہدایت اور حکم پر عمل کر کے ہی شہریار کندن بن سکے گا۔

⊛----✪----⊛

''عابد انصاری کو آف کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے ایس جے! اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی لانے کی کوشش کی جائے گی۔''

''لیکن وہ کیوں؟ انصاری تو کام کا بندہ تھا اور اب تک سب اس کی طرف سے مطمئن تھے۔'' سنتھیا جو ''موساد'' میں عموماً ایس جے کے مخفف سے ہی پکاری جاتی تھی، اس فیصلے کو سن کر حیران ہوئی۔

''انصاری نے الفا کو رپورٹ دی تھی کہ شہزادی نامی ایک عورت کے ذریعے اس کے بارے میں کھوجنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اتفاق سے اسے اس عورت پر شک ہو گیا اور اس نے اس کی نگرانی شروع کروا دی۔ نگرانی اور بعد کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ اس عورت کو شہریار نے وہاں جاسوسی کے لیے بھجوایا تھا اور اس عورت نے ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں کہ اگر وہ شہریار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارا سارا کھیل بگڑ جاتا۔''

یہ ڈیوڈ تھا، ''موساد'' کا وہی خطرناک ایجنٹ جو لِنڈا نامی قتالہ کے ساتھ امریکہ میں بیٹھ کر اس کے اس سارے کھیل کی نگرانی کر رہا تھا۔ عمر میں کم ہونے کے باوجود وہ سنتھیا سے عہدے میں کچھ اوپر تھا لیکن سنتھیا کو اپنی برسوں کی خدمات کے صلے میں جو اہمیت حاصل تھی، اس کے سبب اس کے اوپر کے عہدیدار بھی اس سے عزت و احترام سے ہی بات کرتے تھے۔

''اب تو شہریار والا باب ہی بند ہو گیا۔ وہ ہسپتال میں جس حالت میں پڑا ہے، اس کے بعد یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کبھی میدانِ عمل میں اُتر سکے گا۔ شہریار کے نان ایکٹیو ہو جانے کے بعد اس کے ہرکاروں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔'' سنتھیا نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کیا۔ شہریار کے نام کے ساتھ ہی اسے ماریہ کی دردناک موت یاد آ جاتی تھی۔ ہر ممکنہ طریقے سے تصدیق کر لینے کے باوجود کہ ہسپتال میں پڑا مریض شہریار ہی ہے، اس کے اندر بے چینی اور بے قراری تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی بیٹی کی موت کے ذمے داروں میں سے ایک شہریار کو وہ سزا نہیں مل سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ خصوصاً یہ بات سامنے آنے پر کہ شہریار نے حادثے سے قبل ہی ماریہ کو طلاق دے دی تھی اور اس کے بارے میں مکمل طور پر لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا تھا کہ وہ کہاں ہے، اس کے دل میں موجود شہریار کی نفرت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

''شہریار کے باب کو اس لیے بند نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ خود تو بے شک میدان سے باہر ہو گیا ہے لیکن اس کے انٹیلی جنس والوں سے روابط کوئی رنگ دکھا سکتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے نان ایکٹیو ہونے کے باوجود اس کا کون سا آدمی اب تک کام کر رہا ہے اور انٹیلی جنس کو معلومات دے رہا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم اس بندے کو ہی اُڑا دیں جس کے ذریعے ہم تک پہنچا جا سکتا ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے صورتِ حال سمجھائی۔ وہ لوگ اس وقت اسی طرح کے اسپیشل سیٹ سے بات کر رہے تھے جو چودھری کو الفا نے فراہم کیا تھا اس لیے انہیں کال ٹریس ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

''اگر ایسا ہے تو انصاری کے ساتھ ساتھ چودھری بھی ایسے ہی سلوک کا حق دار ہے۔ اس کے کارخانے پر ہونے والے ریڈ کے بعد تو وہ واضح طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث ثابت ہو چکا ہے۔ اور اگر کسی نے اس پر ہاتھ ڈال دیا تو وہ انصاری سے زیادہ حقائق اُگل سکتا ہے۔'' اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔



''چودھری کی قانونی حیثیت مضبوط ہے۔ وہ اپنے وکیل کے ذریعے ثابت کر چکا ہے کہ جس کارخانے پر ریڈ کر کے منشیات کا ذخیرہ اور اسے تیار کرنے والی مشینیں وغیرہ پکڑی گئی ہیں، وہ اصل میں اس کا ہے ہی نہیں اور وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کر چکا ہے۔''

''یہ بات اپنی جگہ لیکن انٹیلی جنس والے ایسی چالوں سے خوب واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی صورت چودھری کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔'' سنتھیا نے اسے ٹوکا۔

''یہ بات ہم بھی سمجھتے ہیں اس لیے چودھری کو فی الحال واپس جانے سے روک دیا گیا ہے۔ وہ یہاں بیٹھ کر بھی ہمارے لیے بہت کام کر سکتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کے وفادار سارا کام سنبھال لیں گے۔ اب بھی انصاری کو قتل کرنے کی ذمے داری چودھری کے ایک وفادار بہرام کو ہی سونپی گئی ہے۔ بہرام اسے بالکل اسی طریقے سے قتل کرے گا جیسے اس نے شہزادی اور اس کے بچے کو مروایا تھا۔ اس طرح شہزادی کی موت ہی کی طرح اس کی موت پر بھی قتل کا شبہ کرنا مشکل ہو گا۔''

''تمہارا کام تم ہی جانو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے اب کیا کرنا ہے؟ کلارا کے بعد مجھے جس طرح اپنے پروجیکٹ سے الگ ہونا پڑا ہے، میں اپنے آپ کو بالکل بے کار سمجھ رہی ہوں۔ اس بے کاری میں مجھے کلارا کی موت کا غم اور بھی زیادہ ستاتا ہے۔'' وہ افسردہ ہو گئی۔

''خود کو ناکارہ مت سمجھو ایس جے! تم آج بھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہو۔ بس تمہیں وقتی طور پر اس لیے روپوش ہونے کا کہا گیا ہے کہ تم پریشانی سے بچ سکو۔ باقی ''را'' والوں سے تو تم رابطوں میں ہو ہی۔ ان کے ساتھ رہ کر ماضی کی طرح عظیم اسرائیل کے لیے کام کرتی رہو۔ ہاں اگر تم خود یہ سمجھتی ہو کہ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور تمہارے لیے یہ کام کرنا ممکن نہیں رہا تو کسی کو تمہاری ریٹائرمنٹ پر اعتراض نہیں ہو گا اور عظیم اسرائیل میں کھلی بانہوں سے تمہارا استقبال کیا جائے گا۔'' ڈیوڈ نے اسے کھلی پیشکش کی۔

''ابھی میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ شہریار کا حساب تو خود بخود ہی بے باق ہو گیا لیکن ابھی کرنل توحید باقی ہے۔ اس کا انجام ہونے سے پہلے میں ریٹائرمنٹ نہیں لے سکتی۔'' وہ نہایت عزم سے بولی۔

''او کے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں نے تو صرف ایک پیشکش کی تھی۔'' ڈیوڈ نے بات ختم کر دی اور نیا موضوع چھیڑتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں پروفیسر ہنری کی طرف سے خاصی تشویش ہے۔ چودھری کے کارخانے پر ہونے والی ریڈ میں ہمارا سب سے بڑا نقصان ہی یہ ہوا ہے کہ پروفیسر ہنری کو وہاں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس گرفتاری کو کسی بھی سطح پر تسلیم نہیں کیا گیا لیکن حالات بتاتے ہیں کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں کیونکہ موقع پر ان کے معاونین کی گولیوں سے ہلاک شدہ لاشیں تو ملی ہیں لیکن خود ان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اگر وہ وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہم سے رابطہ ضرور کرتے۔ ان کے رابطہ نہ کرنے کی صورت میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں اور یقیناً ان کی تفتیش کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔''

''رہنے دو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انٹیلی جنس والے سر کے بل کھڑے ہو کر بھی ان سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کریں گے تو کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تم خود پروفیسر کو اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کتنے ضدی آدمی ہیں۔ تشدد کے نتیجے میں تو کچھ اُگلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کسی اور طریقے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولیں گے۔ تم جانتے ہو کہ انہیں اپنے برین کو بلاک کر لینے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت

حاصل ہے۔ ایسے بندے پر نہ تو ہپناٹزم اثر کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوا۔ وہ مر جائیں گے لیکن کچھ نہیں بتائیں گے۔'' اس کے لہجے میں گہرا تیقن تھا۔

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اصل پریشانی یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے انہیں آزاد کروانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت میں نے تم سے اسی امکان پر گفتگو کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا ہم پروفیسر کو انٹیلی جنس کے قبضے سے چھڑا سکتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے اس سے پوچھا۔

''سوری، یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم براہِ راست انٹیلی جنس والوں سے ٹکر لے سکیں۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ پروفیسر کو کہاں رکھا گیا ہے لیکن یقینی سی بات ہے کہ وہ جگہ خاصی محفوظ ہو گی۔ جہاں سے انہیں نکالنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور تم جانتے ہو کہ یہاں ہمارے پاس اپنا ذاتی مسلح جتھا نہیں ہے۔ عموماً ہم اپنے مقاصد کے لیے کرائے کے لوگوں یا پھر ''را'' والوں سے مدد لیتے ہیں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ کرائے کے لوگوں کی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور ''را'' والوں کو ملوث کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے معاملات میں ان کے ساتھ شرکت کرنے کے باوجود یہ راز ان کے ساتھ کسی طور شیئر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم یہاں کسی خفیہ مقام پر افیون کی کاشت کر کے ہیروئن تیار کروا رہے ہیں۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

''یہ سب میرے بھی علم میں ہے اسی لیے میں پریشان ہوں کہ کیا کروں؟'' ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

''کچھ مت کرو۔ پروفیسر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہم لوگ برسوں سے عظیم اسرائیل کے لیے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ پروفیسر بھی بخوشی یہ قربانی دے دے گا۔ جب میری جوان بیٹی، جس نے ابھی اس دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا، اپنی جان کی قربانی دے سکتی ہے تو پروفیسر جیسا بوڑھا جو کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور لطافتیں کشید کر چکا ہے، کیوں قربانی نہیں دے سکتا؟'' اس کا لہجہ بے حد سفاک ہونے کے باوجود اس کی بات ڈیوڈ کے دل کو لگی۔ سنتھیا جیسی سفاکی سے نہ سہی لیکن کچھ عقلی دلائل کے ساتھ وہ پروفیسر کی بازیابی کے لیے مطالبہ کرنے والوں کو قائل کر سکتا تھا اور کچھ نہیں تو تاخیری حربے تو ضرور ہی آزما سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''یہ بہت عجیب خبر ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اسے اتفاق سمجھا جائے یا طے شدہ منصوبہ۔ شہزادی کے بعد عابد انصاری کی بھی بالکل اسی طریقے سے ہلاکت نے میرے ذہن کو اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں، وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں سچ مچ کوئی ایسا موذی سانپ موجود ہو جو انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن رہا ہو اور اس سانپ نے پہلے شہزادی اور اس کے بچے کو پھر اب عابد انصاری کو اپنا نشانہ بنا لیا ہو۔''

ذیشان کی زبانی عابد انصاری کی سانپ کے ڈسنے سے ہلاکت کو سن کر وہ اپنی جگہ دم بخود رہ گیا۔ وہ لوگ تو اپنی جگہ پوری منصوبہ بندی کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور اگلے ایک آدھ دن میں عابد انصاری کے اغوا کے منصوبے پر عمل درآمد ہونے والا تھا لیکن یہاں تو کہانی ہی اُلٹ گئی تھی۔ ان کے کچھ کرنے سے قبل عابد انصاری خود لقمۂ اجل بن گیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوئی ہے۔

''اس طرح سے سوچا تو جا سکتا ہے لیکن میرا ذہن اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہے۔ شہزادی کی موت حادثاتی نظر آنے کے باوجود جو چند چھوٹی موٹی واقعاتی شہادتیں ہمیں ملی تھیں، وہ اس بات پر دلیل دے



رہی تھیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس کے بعد اب انصاری کو بھی بالکل ویسی ہی موت نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا دشمن ہمارے دماغ سے ہی سوچ رہا ہو۔ انہیں نظر آ رہا ہو کہ چودھری کی غیر موجودگی میں جو واحد ٹارگٹ ہمارے سامنے ہے، وہ انصاری ہے اور ہم کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہمارا راستہ مسدود کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھ سے اپنا مہرہ پیٹ ڈالا ہو۔ تم خود دیکھو کہ انصاری کی موت کے بعد ہمارے پاس اب کون سا راستہ رہ گیا ہے۔ ایک رائے چند کا کلیو ملا تھا لیکن اس کی مسلسل نگرانی کے باوجود ہمارے آدمی یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ وہ تہمینہ سے بالوں اور خون کے جو نمونے لے کر گیا تھا، وہ اس نے کس کے حوالے کیے۔ ظاہر ہے، یہ دونوں چیزیں وہ اب تک اپنے پاس تو نہیں رکھ کر بیٹھا ہو گا۔ اس نے کسی نہ کسی کو تو وہ چیزیں دی ہوں گی لیکن نہ جانے کس ہوشیاری سے یہ کام کیا کہ نگرانی کرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چل سکا۔ بظاہر تو نہ ہی کوئی اس سے ملنے آیا اور نہ ہی وہ خود کسی سے ملنے گیا۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ دونوں چیزیں لے جانے والا اس کے اسٹور پر گاہک کے روپ میں آیا ہو اور اس نے اتنی اچھی اداکاری کی ہو کہ نگرانی کرنے والے کو پتہ ہی نہ چل سکا ہو کہ وہ روزمرہ استعمال کی اشیا کے ساتھ کچھ اور بھی وصول کر کے لے گیا ہے۔ بہرحال، اس طرح کے امکان ہو سکتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا پڑے گا کہ ہمارا دشمن ہماری سوچ سے زیادہ چالاک اور شاطر ہے۔ اس لیے کوئی معاملہ چاہے کتنا ہی سیدھا نظر آئے، وہ مشکوک ہی سمجھا جانا چاہیے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اپنے دلائل سے اس کے خیال کو رد کر دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم رائے چند کو بھی فی الحال نہیں چھیڑ سکتے۔ اس کے ذریعے دشمن تک پہنچنے کی کوئی فوری کوشش کرنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ اسے تو فی الحال نگرانی میں ہی رکھو اور وہ بھی اس طرح کے اسے شک نہ ہو سکے۔ آگے کہیں جا کر اس کی نگرانی ہمارے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ فی الحال اسے چھیڑنا کچا پھل توڑنے کے مترادف ہو گا۔'' ذیشان سے متفق ہوتے ہوئے اس نے اپنی رائے دی۔

''ہم سب کا اس بات پر اتفاق ہے۔ اب آ جاتے ہیں اپنے سامنے موجود دوسرے ٹارگٹ چودھری کی طرف..... تو اس کا رویہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ کارخانے کے بارے میں یہ ثابت کر کے وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کر چکا ہے، اس نے اپنی قانونی پوزیشن محفوظ کر لی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ بات سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہے، ہم اس کی بات پر یقین نہیں کریں گے اور وہ جب بھی پاکستان واپس آیا، اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لیے وہ یہاں کا رخ ہی نہیں کر رہا ہے اور آرام سے نیویارک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مستقبل قریب میں واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔''

''وہ نہیں آیا تو ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔'' شہریار نے کہا۔

''رائٹ، کرنل صاحب! اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ ٹاسک تمہیں ہی دیا جائے گا اور تم خود فی الحال انڈر پروسس ہو۔ تمہارے حلیے میں ابھی مزید تبدیلیاں لائی جانی ہیں۔ کرنل صاحب خود ڈاکٹر یوسفی اور ڈاکٹر پاشا سے رابطے میں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تمہاری ایک دو سرجریز اور ہوں گی۔ اس کے بعد بالوں اور جلد کی رنگت کی تبدیلی کا پروسس ہے تو تم فوراً تو اُٹھ کر امریکہ نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ بہت سی کاغذی کارروائیاں بھی کرنی ہیں۔ تمہارے یہاں کے ریکارڈ میں سے تمہارے فنگر پرنٹس وغیرہ میں تبدیلی کا پروسس بھی جاری ہے تاکہ آئندہ بھی کسی طور تمہیں شہریار

عادل کے طور پر شناخت نہیں کیا جا سکے۔ میرا مطلب ہے کہ اس وقت تک جب تک تم اپنے اس بہروپ کو چھوڑ کر دوبارہ واپس اپنے روپ میں آنے کا فیصلہ نہیں کر لیتے۔ اس وقت پھر تمہارے لیے نئے سرے سے زندگی گزارنے کے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور وہ سارے ضروری اقدامات کیے جائیں گے جو تمہارے مفاد میں ہوں۔'' ذیشان نے اس کے سامنے ساری صورتِ حال کھول کر رکھی تو وہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا پھر جیسے اچانک کوئی خیال آنے پر بولا۔

''ذیشان! ایسا کرو کہ خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر ایک بار پھر کام شروع کرواؤ۔ سجاد بھائی اپنے قتل سے پہلے جولی نامی ایک کال گرل سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ اس کال گرل نے بھی اگلے ہی دن خودکشی کر لی تھی لیکن حالات و واقعات کے تجزیے سے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ جولی کی خودکشی اصل میں اس کے قتل پر پردہ ڈالنے کی کوشش تھی۔ اسے اپنے اشاروں پر نچانے والے سمجھ گئے تھے کہ سجاد بھائی اس کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید بہت کچھ جان بھی چکے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے ان کی زندگی کا چراغ گل کیا تو دوسری طرف اپنی اس ساتھی کو بھی ٹھکانے لگا دیا جس کے ذریعے ان کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ خواجہ سراؤں کا قصہ بھی میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ ''را'' والوں نے معاشرے کے اس مظلوم طبقے کو ان کی محرومیوں کی مدد سے خوب استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ مذہب کی بنیاد پر انہیں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف ان کے ذہنوں میں ایسی خرافات بھر دیں کہ وہ انتہا پسندی کو ہی اپنا مذہب سمجھنے لگے۔ مذہب ہی کی وجہ سے ہندو خواجہ سراؤں نے پاکستانی شہری ہونے کے باوجود ''را'' کا آلۂ کار بننا منظور کر لیا۔ میرے اتفاقاً ان لوگوں تک پہنچنے کی وجہ سے وہ انتہا پسند گروہ منظر سے غائب ہو گیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ گروہ کا وجود اب بھی باقی ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافی عرصے سے ہمارے اس طرف متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اب ہماری ان میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اس لیے وہ ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں شروع کر چکے ہوں۔'' وہ دُور کی کوڑی لایا تھا لیکن ذیشان فوراً ہی اس سے متفق ہو گیا کیونکہ اس کی سجھائی راہ اندھیرے میں اُبھرنے والی روشنی کی کرن کے مانند تھی۔

''تم نے اچھی تجویز دی ہے۔ واقعی ہم ان دونوں گروپس پر کام کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ میں اپنے جوانوں کو براہِ راست ان کے درمیان داخل کر دوں گا تو وہ کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کریں گے۔'' ایک راہ سجھائی دیتے ہی ذیشان پُرجوش نظر آنے لگا۔

''مشابرم خان اور جگو کی صلاحیتوں کو بھی وقتِ ضرورت کام میں لاتے رہنا۔ مشابرم خان کو تو میں نے خود تاکید کر دی تھی کہ میری عدم موجودگی میں تمہاری ہدایات پر عمل کرے۔ البتہ جگو سے تمہیں خود رابطہ کر کے اس سے فائدہ اٹھانا ہو گا۔ مشابرم خان کا معاملہ الگ ہے۔ وہ سرکاری ملازم ہے اور ملک سے وفاداری اس کے خون میں رچی بسی ہے۔ البتہ جگو ذرا مختلف بندہ ہے۔ وہ جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہے، وہ ظاہری طور پر تو ملک کے خدمت گار اور خیر خواہ ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کام ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔ ان کا اصل مذہب پیسہ ہے۔ وہ پیسے کو پوجتے ہیں اور اسی سے وفاداری نبھاتے ہیں، چاہے اس چکر میں انسانیت کا خون ہو جائے۔ جگو اتنا بڑا بدمعاش نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی بدمعاشی کو چھپانے کے لیے شرافت کا چولا نہیں چڑھا رکھا ہے۔ لیکن ایک طرح سے ہے تو وہ بھی پیسے ہی کا غلام جو پیسے کی خاطر اپنے آقا کا ہر حکم آنکھ بند کر کے بجا لاتا ہے۔ البتہ اس کی ہوس کا برتن حکمرانوں کی عمر و عیار کی زنبیل جیسا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر تم میرے حوالے سے کسی موقع پر اس سے مدد مانگو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔''



وہ جس جگہ رہ رہا تھا، وہاں ذیشان کے سوا اس سے بات چیت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ملازمین صرف احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور انسٹرکٹر عمر فاروق احکامات کا اجرا..... اس لیے وہ خود نسبتاً کم گو ہونے کے باوجود کسی سے گفتگو کے لیے ترس جاتا تھا۔ ذیشان سے بھی روز روز ملاقات نہیں ہو پاتی تھی چنانچہ جب بھی وہ میسر آتا، وہ اپنی زبان کی گرہوں خوب خوب کھولتا اور یقین کر لیتا کہ اس کے جبڑے جام نہیں ہوئے ہیں۔ گفتگو کی یہ طوالت اس کی محرومی ہی کی دین تھی۔ ذیشان بھی سمجھتا تھا کہ خاندان، دوستوں، ملازمت اور دیگر عملی سرگرمیوں سے محروم یہ بالکل تنہا زندگی اس کے اعصاب کے لیے امتحان تھا اس لیے اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا۔

''میری جگہ کسی دوسرے بندے کی تعیناتی عمل میں آئی یا نہیں؟'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے ذیشان سے دریافت کیا۔

''بندے کا انتخاب ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے پوسٹ نہیں کیا گیا۔ ابھی کچھ دن تو ہمیں اس بات کا انتظار کرنا ہو گا کہ ڈاکٹروں کی طرف سے تمہارے لیے مکمل نا اُمیدی کا اعلان کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس بندے کو وہاں بھیجا جائے گا۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''عمیر آفندی نام ہے۔ اچھا پُرجوش جوان ہے۔ فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت ٹھیک ٹھاک ہے اس لیے فی الحال تو یہ اُمید نہیں کی جا رہی کہ پیسے کی خاطر بِک جائے گا۔ باقی اس پر چیک رکھنے اور اسے مورل سپورٹ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔'' ذیشان نے اسے مزید آگاہ کیا۔

''اور نیا فاریسٹ آفیسر؟..... انصاری کے بعد نئے فاریسٹ آفیسر کی تعیناتی کے لیے کچھ ہوا یا نہیں؟

''نہیں، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ چند نام زیرِ غور ہیں لیکن کسی کے بارے میں ابھی فائنل فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ باجوہ اور انصاری دونوں فاریسٹ آفیسر اتنے مختصر عرصے اور مشکوک حالات میں موت کا شکار ہوئے ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لے لیا ہے۔ پھر جنگل میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کیا جانے والا آپریشن بھی کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے واقف کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر اسے اس جگہ پوسٹ کیا گیا تو اس کا مطلب ہو گا، اسے خاصے مشکل حالات میں کام کرنا ہو گا اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو وہاں بھیجنے کی کوشش کریں تو وہ انکار کر دے۔ اس لیے اس معاملے کو ذرا دیکھنا پڑے گا۔ پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ عابد انصاری کی ڈیتھ کے باوجود ڈاک بنگلے پر ابھی تک چودھری افتخار کے آدمی موجود ہیں۔ غیر سرکاری لوگوں کا کسی سرکاری عمارت میں اس حد تک عمل دخل خاصا قابلِ غور ہے اور ان شکوک کو اور بھی تقویت دے رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے آدمی تحقیق کے لیے وہاں بھیجتے ہیں تو وہ فوراً ہی نظر میں آ جائیں گے اور کچھ حاصل ہونے کے بجائے اُلٹا ہمارے لوگوں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے لوگ بے شک وطن پر اپنی جان قربان کر دینا فخر سمجھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی بہت قیمتی ہے اور ہم اسے آسانی سے نہیں گنوا سکتے۔'' ذیشان نے بہت تفصیل سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ تو میں خود بھی سمجھتا ہوں۔ البتہ میرے پاس ایک دو تجاویز ہیں جو اگر تمہیں قابلِ عمل لگیں تو ان پر عمل کر دیکھنا۔'' اس نے کچھ دیر قبل ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کا گھونٹ بھر کر کپ واپس میز پر رکھا اور خود صوفے پر قدرے پیچھے ہوتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ اس کے سامنے بیٹھا ذیشان بھی چائے پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا جو اس عرصے میں اس کی شخصیت میں کی گئی

تھی۔ یہ تبدیلیاں بہت معمولی نوعیت کی تھیں لیکن وہ پہلے سے قدرے مختلف محسوس ہونے لگا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں صرف اس کے خدوخال یا حلیے کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی تھی بلکہ نشست و برخاست اور دیگر عادات واطوار میں بھی تبدیلیاں لائی جارہی تھیں تاکہ وہ ہر طرح سے ایک مختلف روپ میں ڈھل جائے اور قریب سے اسے جاننے والے بھی اندازہ نہ لگا سکیں کہ وہ شہریار عادل ہے۔

''تم اپنے لوگوں کو براہِ راست چھان بین کے لیے بھیجنے کے بجائے کوئی کور دے کر بھیج سکتے ہو۔ مثلاً پیشہ ور شکاریوں یا جنگلی حیات کا مطالعہ کرنے والی تحقیقاتی ٹیم کے روپ میں..... ورنہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم ایک بار پھر پولیس کو جنگل میں اُتاریں کہ پہلے آپریشن میں ڈاکوؤں کی مکمل سرکوبی نہیں ہوسکی اس لیے جنگل میں کوئی سرچ آپریشن کیا جارہا ہے۔'' اس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔

''ایسا ہوتو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں پہلی دو تجاویز میں سے کسی ایک پر عمل کرنا مناسب رہے گا۔ اس معاملے میں پولیس کی انوالومنٹ کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ نہ ہی مجھے ان کی صلاحیتوں پر زیادہ اعتبار ہے۔ ہم لوگ کسی معاملے میں انہیں اسی وقت شامل کرتے ہیں جب دیگ پک کر تیار ہو اور وہ جا کر دعوت اُڑا لیں۔ بلکہ یہاں یہ عالم ہے کہ ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ گڑبڑ کیا ہے اور کس چیز کی تلاش کرنی ہے؟ ہمارے آدمیوں کے تربیت یافتہ ذہنوں کی بات الگ ہے، وہ صحیح جگہ پر پہنچ گئے تو خود گڑبڑ کی بُو سونگھ لیں گے۔ پھر مجھے ان میں سے کسی سے کرپشن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ انہیں کچھ ملا تو وہ مجھ تک اطلاع ضرور پہنچائیں گے جبکہ پولیس والوں کا ریکارڈ تمہارے سامنے ہے۔ ان کا منہ بند کرنا کبھی بھی مجرموں کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوتا۔''

ذیشان جو کہہ رہا تھا، وہ سو فیصد نہ سہی لیکن پھر بھی بڑی حد تک صحیح تھا۔ راشی اور بے ایمان لوگوں کی اکثریت نے پولیس کے محکمے کا تاثر اتنا خراب کردیا تھا کہ وہاں موجود مٹھی بھر ایمان دار افراد بھی انہی جیسے سمجھے جاتے تھے۔

''میں نے صرف تجاویز پیش کی ہیں۔ کس پر عمل کرنا ہے اور کس پر نہیں اس کا اختیار کلی طور پر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میرے اختلاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنا کام مجھ سے بہتر جانتے ہو۔'' اس نے کھلے دل سے ذیشان کو جواب دیا۔

''نہیں بھئی، اب ایسا بھی نہیں ہے کہ تم کچھ جانتے ہی نہیں یا میں تم سے بہت زیادہ قابل ہوں۔ ہمیں باہمی افہام وتفہیم سے ہی مسائل کا حل نکالنا ہے۔ ایک بات جو تمہیں بہتر لگتی ہے، تم کہہ دیتے ہو اور جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں بتا دیتا ہوں۔ تمہیں خود سے کم تر سمجھنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میں کچھ خاص ہے جب ہی تو کرنل صاحب جیسے جہاندیدہ شخص نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہ ایسے شخص نہیں ہیں جو سی ایف پی کے فنڈز کو ضائع کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ وہ تم پر کثیر سرمایہ کاری کررہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں تم پر بھروسہ ہے اور وہ تم سے بہت سی اُمیدیں رکھتے ہیں۔ اس لیے میں تو خود بخود ہی تمہارے ''متاثرین'' میں شامل ہوگیا ہوں۔'' آخری جملہ اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا جسے سن کر شہریار بھی ہنس پڑا اور بولا۔

''اب میں جواب آں غزل کے طور پر تمہاری تعریف ہرگز نہیں کروں گا۔ ویسے بھی وقت ہوگیا ہے کہ میں اپنے انسٹرکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں ورنہ ان کا بھروسہ نہیں کہ وہ مجھے نااہل قرار دے دیں اور میں 'خدا ملا، نہ وصالِ صنم ہوا' کی تصویر بن جاؤں۔ مستقبل میں کمشنر وغیرہ بننے کا تو ویسے ہی اب کوئی امکان نہیں رہا، یہ نہ ہو کہ جو کرنل صاحب مجھے بنانا چاہ رہے ہیں، میں وہ بھی نہ بن سکوں۔''

''وہ تو خیر تمہیں بننا ہی پڑے گا۔ عمر فاروق صاحب وہ بندے ہیں جو کسی کام کو ہاتھ میں لے لیں تو مکمل



کیے بغیر چھوڑتے نہیں ہیں۔ رہی تمہیں نااہل قرار دینے کی پریشانی تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ عمر فاروق صاحب نے تمہیں اپنی شاگردی میں قبول کرلیا ہے تو سمجھ لو کہ تمہیں اہلیت کا سرٹیفکیٹ ٹریننگ سے پہلے ہی مل چکا۔ نااہل بندے کو تو وہ ایک دن بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔'' ذیشان نے نہایت سچائی سے حقیقت بیان کی تو وہ طمانیت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا ایک کوہِ گراں اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہوا وہاں سے اُٹھ گیا۔

⊛-----✪-----⊛

''یہ دیکھیں آفتاب! یہ ریڈ فراک کتنی خوب صورت ہے۔ اُمید پہنے گی تو بہت پیاری لگے گی۔''

''فراک پہن کر پیاری لگے گی سے کیا مراد؟ میری بیٹی ویسے ہی بہت پیاری ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اگر میری بیٹی نے یہ فراک پہن لی تو اس فراک کی شان بڑھ جائے گی۔''

''ہاں بھئی۔ آپ کی بیٹی کے کیا کہنے۔ آپ کی بیٹی جیسا دوسرا کوئی اس دنیا میں ہے ہی کہاں؟''

''نہیں خیر ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اس جیسا ایک پیس اللہ میاں نے بہت سال پہلے اس کی ماں کی صورت میں اس دنیا میں اُتارا تھا۔ مجھے تو آج بھی اپنی زندگی کا وہ دن نہیں بھولتا جب سرخ عروسی جوڑے میں ایک آسمانی تحفہ مجھے عطا کیا گیا تھا۔ تمہیں بھی تو یاد ہوگا نا وہ وقت.....؟'' اس چھوٹے سے سوال نے جواں سال عورت کے چہرے پر گلال بکھیر دیا۔

''بس یہی ادا تو ہے جو میری بیٹی کی ماں کو سب سے ممتاز کردیتی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ بولتا ہوا اسے ایک ٹک گھورتا رہا۔

''میرے خیال میں ہم شاپنگ کے لیے آئے ہیں اور اس قسم کی گفتگو کے لیے یہ جگہ قطعی ناموزوں ہے۔'' وہ اس کی نظروں سے پزل ہوئی۔

''یہ نیویارک ہے میری جان! یہاں گفتگو چھوڑ اگر میں اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ بھی شروع کردوں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

''آپ اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ کسی کو تو اعتراض ہوگا۔'' وہ سمجھ گئی تھی کہ سامنے والا اسے پزل کرنے کی کوشش کررہا ہے، یک دم ہی خود کو سنبھال کر بھرپور اعتماد سے بولی۔

''اچھا..... کون ہے وہ جو اعتراض کرے گا؟''

''میں۔'' اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا تو فضا میں زوردار مردانہ قہقہہ گونج اٹھا جس میں نسوانی ہنسی کا مدھر جھنکار بھی شامل تھی۔

یوں ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے سے گفتگو کرتے جوڑے کو قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ نیویارک کے اس معروف شاپنگ سینٹر میں کسی کی نگاہوں کا خصوصی مرکز ہیں۔ وہ اپنی بچی کو گود میں اٹھائے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مگن اور خوش تھے۔

''اچھا یہ پنک ٹاپ اور ٹراؤزر دیکھیں۔ یہ تو اُمید پر بہت ہی اچھا لگے گا۔'' ایک ایک لباس کو تنقیدی نظروں سے جانچتی وہ ایک اور بے بی سوٹ پر رُکی تو رائے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی جگہ پتھر ہوگئی۔ وہ اس کی توقع نہیں کررہی تھی، وہ چہرہ سامنے تھا۔

''آپ.....؟'' اس کے تھرتھراتے لب بس یہی ایک لفظ ادا کرسکے۔

''کیسی ہو کشور؟'' بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا گیا۔

''اچھی ہوں..... اور آپ؟'' وہ بے حد نروس تھی اور سامنے کھڑے شخص کے عقب میں آفتاب کو تلاشنے

کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس سے بہت دُور اُمید کو گود میں اٹھائے کھلونوں سے بھرے شوکیس کی طرف متوجہ تھا اور یقیناً بیٹی کے پاس کھلونوں کا ایک اچھا خاصا ڈھیر ہونے کے باوجود اسے کوئی نیا کھلونا دلانا چاہتا تھا۔ کشور کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ بے شک یہ نیویارک تھا جہاں قانون سے ہر شخص ڈرتا تھا لیکن پیر آباد کی جاگیر کا وارث اگر غیرت میں آ کر اسے قتل کرنے پر تُل جاتا تو یہ سب نہیں سوچتا۔

بہت دن پہلے جب اس نے آفتاب سے محبت اور خفیہ شادی کی تھی، پھر اس کی خاطر حویلی بھی چھوڑ دی تھی تو اس وقت اسے مرنا اتنا مشکل نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ خوشیوں بھری زندگی کے ان چند دنوں کے بدلے میں اگر موت کا سامنا کرنا پڑا تو بخوشی اس کی آغوش میں سما جائے گی۔ لیکن اب جبکہ اپنی خوشیوں کی پائیداری پر یقین آنے لگا تھا اور لگتا تھا کہ وہ سب کی پہنچ سے بہت دور آ گئی ہے تو اب اچانک پھر موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اتنی پیاری زندگی کو چھوڑ کر قبر کے اندھیروں میں سو جانے کے خوف سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ سامنے والے سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں رہی اور وہ نہایت رسان سے بولا۔

''ڈرو مت کشور! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو بس تمہیں دیکھ کر بے اختیار ہی ملاقات کے لیے چلا آیا۔ میں کافی دیر سے تم لوگوں کو دور سے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ خوش دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے ورنہ تو دل ڈرتا ہی تھا کہ جانے جس کے لیے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا، وہ تمہیں خوش بھی رکھتا ہوگا یا نہیں؟''

''آفتاب بہت اچھے انسان ہیں بھاجی! اگر مجھے اباجی کے مان جانے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو میں اس طرح سے کبھی حویلی سے قدم نہ نکالتی۔ آفتاب نے میری خاطر بڑی پریشانیاں اُٹھائی ہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے اور ہمیں ملک سے باہر نکل آنے کا موقع مل گیا، ورنہ اباجی تو ہماری جان کے درپے ہو گئے تھے۔ اگر ہم دن اور پاکستان میں ہی رہتے تو شاید اباجی مجھے اور آفتاب کو بچی سمیت ختم کروانے میں کامیاب ہو جاتے۔'' اس نے ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ مراد شاہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں جانتا ہوں۔ اباجی کے مزاج اور ہمارے خاندان میں رائج اُلٹی سیدھی رسموں سے میں جتنا الرجک ہوں، وہ مجھے ہی معلوم ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارا قدم سخت ناپسندیدہ ہونے کے باوجود تمہارے حالات کے اعتبار ناگزیر تھا۔ لیکن یاد رکھو کہ تمہیں اپنی ساری زندگی نہایت احتیاط سے گزارنی ہوگی۔ اس لیے کہ اباجی آج بھی تمہاری جان کے درپے ہیں۔ ان کے دل میں تمہارے لیے بھڑکتا نفرت کا الاؤ اس وقت تک سرد ہونے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر تمہارے خون کے چھینٹے نہ پڑیں۔ وہ اس سلسلے میں میری بھی کوئی بات سننے کو راضی نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں بے شرم فرنگیوں کی صحبت میں رہ کر میں خود بھی بے غیرت ہو گیا ہوں۔ بہر حال، تم محتاط رہو..... خصوصاً اس لیے بھی کہ اباجی آج کل نیویارک میں ہی ہیں۔ جس طرح آج میری نظروں میں آئی ہو، کل کو اتفاقاً ان سے بھی سامنا ہو سکتا ہے۔'' مراد شاہ نے بہن کو سمجھایا۔

''اباجی نیویارک میں ہیں..... لیکن کیوں؟..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ کچھ عرصہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے اتنے مختصر عرصے میں دوبارہ آپ کے پاس چکر لگایا ہو۔'' مراد شاہ کے نرم لہجے کی وجہ سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی اس لیے ذہن بھی ٹھیک ٹھاک کام کرنے لگا اور اس نے برملا اپنی حیرت کا اظہار کر ڈالا۔

''ہاں، اصل میں حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ تمہیں تو یقیناً معلوم نہیں ہوگا کہ اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ بقول اباجی، اماں کے بعد ان کا حویلی میں دل نہیں لگ رہا اس لیے وہ گھبرا کر میرے پاس یہاں آ گئے ہیں۔



مراد شاہ نے اسے بتایا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہو گئی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''وڈی ماں جی کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اصل میں آفتاب کا کام ایسا ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے ہمیشہ باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان سے متعلق خبروں پر ان کی خصوصی توجہ رہتی ہے اس لیے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وڈی ماں جی کا اچانک ہی انتقال ہو گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنی بہنوں وغیرہ کو فون کر کے ان سے تعزیت کر سکتی ہوں لیکن میں نے خود ہی رابطہ نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے فون کرنے سے اباجی کو پتہ چلے کہ میں نیویارک میں ہوں۔ ہم تو اتنے محتاط رہتے ہیں کہ اپنے دوستوں اور محسنوں سے بھی رابطے میں احتیاط ہی کرتے ہیں۔'' وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ میں تو بس تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے رہا تھا۔''

''اور میں آپ کا جواب سن کر حیران ہوں۔ اباجی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں کسی کے مرنے سے کوئی فرق پڑتا ہو۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، معاملہ کوئی اور ہے۔ شاید وہ اپنے کارخانے پر پڑنے والے چھاپے کی وجہ سے یہاں منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔ واپس جائیں گے تو قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا چلا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ نیویارک میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے متعلق معلومات پر بے خبر نہیں ہے۔

''تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میری اس سلسلے میں اباجی سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اس خبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ کارخانہ وہ پہلے ہی کسی کو فروخت کر چکے تھے لیکن نئے مالک نے نہ تو اس کا نام تبدیل کیا اور نہ ہی ملازمین پر اس تبدیلی کو ظاہر کیا گیا۔ اس لیے ان کا نام اس معاملے میں آ گیا۔ میں نے اس بارے میں خود بھی معلوم کروایا تھا۔ اباجی کے اس بیان کی تصدیق ہو چکی ہے اور اب اس بندے کی جو کارخانے کا موجودہ مالک ہے، تلاش کی جا رہی ہے۔ لیکن وہ غائب ہے۔''

''اور یقیناً تا قیامت غائب ہی رہے گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی بندے کا وجود ہی نہیں ہے۔'' مراد شاہ کے عقب سے آواز اُبھری تو اس نے مڑ کر بولنے والے کو دیکھا۔ آفتاب، بچی کو گود میں لیے وہاں کھڑا تھا۔

''ماموں جان کو سلام کرو بیٹا!'' خود مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے بچی کو بھی نصیحت کی لیکن بچی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ باپ کی بات پر عمل کرنے کے بجائے ٹکر ٹکر اپنے سامنے موجود اجنبی شخص کو گھورتی رہی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرے بھاجی ہیں؟'' ادھر کشور بھی حیران تھی۔

''ان کی شکل چودھری صاحب سے بہت ملتی ہے۔ پھر تم مجھ سے ذکر بھی کر چکی تھیں کہ تمہارے بھاجی یہاں نیویارک میں ہی رہتے ہیں اس لیے میں انہیں تمہارے قریب کھڑا دیکھ کر سمجھ گیا کہ محترم کون ہیں۔ بالفرض اس لیے نہیں کی کہ چلو بہن بھائی پہلے اکیلے میں کھل کر ایک دوسرے سے حال احوال پوچھ لیں..... لیکن آپ دونوں کی گفتگو کا سلسلہ تو دراز ہی ہوتا جا رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں اپنی اور اپنی بیٹی کی موجودگی کا احساس دلا دوں۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہمیں بھول کر بھائی صاحب کی محبت میں انہی کے ساتھ چل پڑیں۔

وہ مسکراتے ہوئے بہت خوشگوار لہجے میں یہ سب کہہ رہا تھا اس لیے مراد شاہ کو اس کی گفتگو پر طنز کا شائبہ نہ ہوا، ورنہ لہجے میں ذرا سی تبدیلی سے اس کے الفاظ کو دوسرے معنوں میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

"خیر، یہ تو ممکن نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بہن آپ کے ساتھ کتنی خوش ہے۔ اسے اتنا خوش میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی اچھی بھلی خوشیوں سے بھری زندگی کو چھوڑنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔" مراد شاہ نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کا تجزیہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ آف وائٹ اور براؤن کمبی نیشن کے لباس میں ملبوس بڑا سا دوپٹہ اچھی طرح سر پر اوڑھے کھڑی کشور..... جس نے لباس کے ہی ہم رنگ آویزے اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں، اتنی نکھری ہوئی اور آسودہ محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی بھی شخص اس کی خوشیوں بھری زندگی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"اِٹس آ کمپلیمنٹ فارمی۔ آئیں چلیں کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ یہاں اس طرح کھڑے کھڑے کب تک بات کرتے رہیں گے؟" آفتاب کو ہی خیال آیا تو ان لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ وہ بلاوجہ شاپنگ ایریا میں کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ احساس ہوتے ہی انہوں نے وہاں سے ایک ریستوران کا رخ کیا۔

"تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے کشور! اسے دیکھ کر تمہارا بچپن یاد آ رہا ہے۔ نام کیا رکھا ہے تم نے اپنی بیٹی کا؟" ریستوران میں پہنچ کر انہوں نے ایک میز سنبھالی تو مراد شاہ نے بچی کے رخساروں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"اُمید..... ہم نے اپنی بیٹی کا نام بہت سوچ سمجھ کر اُمید رکھا ہے۔ اس وقت جب موت ہمارے تعاقب میں بھاگتی آ رہی تھی اور ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم کسی بھی لمحے اس کے ہاتھوں زیر ہو جائیں گے، ہماری بیٹی ہمارے لیے زندگی کی اُمید بن کر آئی تھی۔ اس کے آنے سے خاص طور پر میں نے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا تھا اور اب بھی مجھے امید ہے کہ میری بیٹی کی تقدیر مجھ سے بہت اچھی ہوگی۔ یہ میری طرح اپنی زندگی کے بہت سے سال بے جا پابندیوں اور بندشوں میں گزارنے کے بجائے ایسے ماحول میں گزارے گی جہاں اسے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو نکھارنے اور بروئے کار لانے کے مواقع مل سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب میں اپنی "اُمید" کو لے کر ابا جی کے سامنے کھڑی ہوں گی تو میری آنکھوں میں فخر ہوگا اور میں ان سے کہہ سکوں گی کہ میں نے اپنی بیٹی کو اس سے بہت اچھا ماحول اور تربیت دی ہے جو آپ نے اپنی بیٹیوں کو دی تھی۔ ابا جی کی کوئی بھی بیٹی مجھ سمیت، میری بیٹی کے مقابلے کی نہیں ہوگی۔" وہ گویا مستقبل کو کسی جادوئی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

"اللہ تمہاری ساری نیک اُمیدیں اور خواہشات پوری کرے۔" مراد شاہ نے اسے دھیرے سے دعا دی۔

اس کے بعد بھی وہ لوگ کافی اور اسنیکس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیگر بہت سی باتیں کرتے رہے۔ آفتاب کی دلچسپی کا تو اصل مرکز تھا ہی پاکستان اور وہ صرف مجبوری میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا اس لیے اس کی پاکستان کے بارے میں معلومات قابلِ رشک تھیں۔ جبکہ مراد شاہ بھی آبائی وطن ہونے کے حوالے سے وہاں کے متعلق باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے وہ آپس میں گفتگو کرنے بیٹھے تھے۔ باہمی دلچسپی کے بہت سے موضوعات نکلتے ہی چلے گئے، البتہ آفتاب نے دوبارہ چودھری افتخار کے موضوع کو نہیں چھیڑا۔ وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ مراد شاہ لاکھ روشن خیال اور باپ کا مخالف سہی لیکن باپ کی برائی سننا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"تم لوگ میرا فون نمبر اور ایڈریس رکھ لو۔ فی الحال تو ابا جی یہاں ہیں اس لیے میں تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دے سکتا البتہ فرصت ہو تو فون پر رابطہ رکھنا اور ابا جی کے واپس جانے کے بعد ملنے بھی آنا۔ شاہ جی کو بھی تم سے مل کر خوشی ہوگی۔"



ملاقات آخری مرحلے میں داخل ہونے لگی تو مراد شاہ نے ایک کارڈ آفتاب کی طرف بڑھایا۔ اس موقع پر کشور کا بھی دل چاہا کہ وہ بڑے بھائی کو اپنا فون نمبر اور پتہ نوٹ کروا دے۔ اتنے عرصے بعد اس کے میکے سے ملنے والا وہ پہلا فرد تھا اور خوش قسمتی سے اس نے اسے لعنت ملامت کرنے کے بجائے اس کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اس لیے قدرتی طور پر وہ اس کی طرف اپنا جھکاؤ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ آفتاب نے خاموشی سے مراد شاہ کا کارڈ لے کر رکھ لیا ہے اور جواب میں ایسی کوئی اخلاقیات نہیں دکھائی تو دل پر جبر کر کے خاموش ہو بیٹھی۔

"یہ میری طرف سے اُمید کے لیے رکھ لو۔ آج پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے لیکن یہ ملاقات اتنی اچانک ہے کہ رواج کے مطابق میرے پاس اپنی بھانجی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے۔ میری طرف سے یہ تحفہ تم لوگ خود لے لینا، البتہ اگلی ملاقات پر انشاء اللہ میں خالی ہاتھ اس سے نہیں ملوں گا۔"

ٹیبل سے اٹھنے سے قبل مراد شاہ نے اپنا پرس نکالا اور بغیر گنے بہت سے ڈالرز نکال کر کشور کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ لاکھ انکار کرتی رہی لیکن مراد شاہ کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ آفتاب نے بھی بہن بھائی کے درمیان دخل انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ مراد شاہ ان سے رخصت ہو کر گیا تو کشور کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔

"آپ نے تو ثابت کر دیا کہ شوہر بے چارہ چاہے بیوی کو خوش رکھنے کی کتنی بھی کوشش کر لے لیکن عورت کو اصل خوشی میکے والوں سے مل کر ہی ہوتی ہے۔" آفتاب نے اس کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر مسکراتی آنکھوں سے چھیڑا۔

"میکے کا مان کیا ہوتا ہے، یہ تو شادی شدہ عورت ہی سمجھ سکتی ہے آفتاب! آپ نے مجھے جتنی خوشیاں دی ہیں، ان سے میں انکار کر ہی نہیں سکتی۔ لیکن خونی رشتوں کی محبت تو انسان کے خمیر میں شامل ہوتی ہے۔ ہم عورتیں کسی مجبوری کے تحت اپنے ان رشتوں سے دُور رہ تو لیتی ہیں لیکن وجود میں ایک خلا، ایک ادھورا پن سا رہتا ہے۔ آج بھاجی سے مل کر میرے اندر کا وہ احساس ہلکا ہو گیا ہے۔" کشور نے نہایت سچائی سے اعتراف کر لیا پھر ذرا شکایتی لہجے میں بولی۔ "بھاجی نے اتنی محبت سے آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن آپ نے نہ تو جواب میں انہیں ایسی ویسی کوئی دعوت دی اور نہ ہی اپنا فون نمبر اور پتہ وغیرہ بتایا۔"

"سوری، مجھے احساس ہے کہ آپ کو میری یہ حرکت بری لگی لیکن میری بھی مجبوری تھی۔ بے شک فی الحال ہمیں لگتا ہے کہ ہم خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ مراد شاہ ہم سے جتنی محبت اور خلوص سے ملے، اس نے مجھے بھی متاثر کیا ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں صحافی ہوں اور ایسے بے شمار قصوں سے واقف ہوں جہاں اپنوں نے ہی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دل نے ننانوے فیصد مراد شاہ کو اچھا آدمی تسلیم کیا ہے لیکن ایک فیصد شک بہرحال مجھے ہے۔ کیا معلوم کب ان کا جاگیردار خون جوش میں آ جائے۔ یا پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے ابا جی کے مقابلے میں زیادہ عقل مند ہوں اور خوامخواہ بڑھکیں مار کر اور غصہ دکھا کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے پیار سے اپنا مقصد پورا کر لینے کے قائل ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی مکمل تسلی سے پہلے کسی قسم کا رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔" آفتاب کی دلیل میں وزن تھا اس لیے کشور نہ صرف یہ کہ کچھ کہہ نہ سکی بلکہ بجھ سی بھی گئی۔ بھائی سے ہونے والی ملاقات کی خوشی کو اس مہیب اندیشے نے مٹا دیا تھا کہ کیا معلوم واقعی وہ دشمن ہو کر دوست کے روپ میں ملا ہو۔

"اتنی اُداس نہ ہوں۔ میں نے جو بھی خدشات بیان کیے، وہ بس ایک احتیاط تھی ورنہ جب تک امید

ہمارے ساتھ ہے، ہمیں یہی سوچنا ہے کہ ایک نہ ایک دن حالات ہمارے حق میں بہتر ہو جائیں گے۔ اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے، کیا آگے وہ ہماری اس امید کو پورا نہیں کرے گا؟ وہ بہت مہربان ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ اپنے رحم وکرم کے سائے میں ہی رکھے گا۔ بس اس کے لیے ہمیں اس کی نافرمانی سے بچنا ہوگا۔ باقی چھوٹی موٹی خطاؤں اور غلطیوں کے لیے ہم اس کی بخشش اور رحم کی امید لگا کر رکھیں گے۔'' آفتاب نے مایوسی میں گھرتے اس کے دل میں امید کا ایک دیا روشن کر دیا۔

⊛----✪----⊛

''کیا بات ہے؟ بہت اُداس لگ رہی ہو؟'' وہ ایک بہت روشن صبح تھی۔ زمین پر ہر سُو پھیلی ہریالی اور کہیں کہیں سفید بالوں سے سجے نیلے آسمان کو دیکھ کر کسی خوب صورت پینٹنگ کا گمان ہوتا تھا لیکن اس منظر کو بے جان پینٹنگ اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ بار بار فضا میں اُڑان بھرتے پرندوں کے غول منظر کو متحرک کر دیتے تھے۔

ماہ بانو اپنی قیام گاہ کی کھڑکی میں کھڑی کب سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آرلینڈو کی ایک صبح تھی اور وہ شہریار کے دوست کے اچھے خاصے وسیع گھر کی انیکسی میں مقیم تھے۔ شہریار کے اس دوست کا نام مصطفیٰ خان تھا اور وہ خاصے طویل عرصے سے یہاں مقیم تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کو یہاں بھیجتے ہوئے شہریار نے نہ صرف انہیں مصطفیٰ خان کا پتہ دیا تھا بلکہ ساتھ ہی ایک خط بھی دیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد مصطفیٰ خان نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور انہیں اپنے گھر کی انیکسی میں ٹھہرا دیا تھا۔

اگلے دو دن میں وہ ان کے لیے ایک سپر اسٹور میں ملازمت کا بھی بندوبست کر چکا تھا۔ ان دنوں کے دوران مصطفیٰ خان کی بیوی انہیں باقاعدگی سے کھانا بھجواتی رہی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج عورت تھی جس نے ماہ بانو کو گھر داری شروع کرنے اور ملازمت کے ساتھ اسے منظم کرنے کے کئی مفید مشورے دیے تھے۔ اس کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ماہ بانو، اسلم کے ساتھ جا کر کئی ایسی اشیاء خرید کر لے آئی تھی جنہیں کم وقت میں پکایا جا سکے۔ یہاں انہیں نامعلوم مدت کے لیے رہنا تھا اس لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مصطفیٰ خان اور اس کی بیوی بلقیس کو زیادہ زحمت نہیں دیں گے اور خود سے اپنی ذمے داریاں نبھانے کی کوشش کریں گے۔

اس کوشش کا آغاز انہوں نے اپنی ملازمت کے پہلے دن سے ہی کر دیا تھا اور آج ماہ بانو نے خود ہی ناشتہ تیار کیا تھا۔ ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا چائے کا کپ لے کر انیکسی کی ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے بہت دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے دیکھتے ہی وہ اُداسی میں گھر گئی تھی اور اس کے پیچھے ہی وہاں آ کھڑے ہونے والے اسلم نے اس کی اُداسی کو بھانپ کر اس سے اس کا سبب پوچھا تھا۔

''یہ ہریالی اور شفاف آسمان دیکھ کر مجھے پیر آباد کی یاد آ گئی ہے۔ میں فیصل آباد میں جس جگہ رہتی تھی، وہ بہت تنگ محلّہ تھا۔ گھر سے باہر نکلو تو گندے پانی کی نالیاں اور کچرے کے ڈھیر ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔ میں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے گھر کے آنگن میں ایک کیاری بنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ چھ سات گملے بھی تھے جنہیں دیکھ کر مجھے خوشی تو ہوتی تھی لیکن جب میں اس کا مقابلہ پیر آباد کی ہریالی سے کرتی تھی تو کچھ اُداس ہو جاتی تھی۔ پیر آباد میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی موجودگی کے باوجود مجھے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن میں جب بھی وہاں جاتی تھی، وہاں کی ہریالی میں کھو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میں وہاں سے



اتنی دُور امریکہ کی ایک ریاست میں پہنچ جاؤں گی اور وہ جگہ پیر آباد سے کئی گنا زیادہ خوب صورت ہوگی۔ آبادی سے بس ذرا ہی فاصلے پر موجود اس جنگل نے مجھے پیر آباد سے متصل جنگل کی یاد دلا دی ہے۔ اس جنگل میں، میں نے اپنی زندگی کے جو شب و روز بتائے تھے، انہوں نے میری زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہاں مجھے آپ ملے اور آپ کے ساتھ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ نہ جانے اب کبھی مجھے اپنے وطن کی فضاؤں میں سانس لینا نصیب ہوگا بھی یا نہیں؟ میں اپنے پیاروں کی شکلیں دوبارہ دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے جس کی وجہ سے سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا۔

''تمہاری اُداسی بالکل درست ہے۔ ہم جن حالات میں وہاں سے نکلے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی سوچا جا سکتا ہے کہ شاید اب ہمیں ساری زندگی اس دیارِ غیر میں ہی گزارنی ہوگی۔ لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہ کبھی حالات ایسی کروٹ ضرور لیں گے کہ ہم اپنے وطن واپس لوٹ سکیں گے۔'' اسلم نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' ماہ بانو کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ چمکی۔

''نہیں، اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔'' اس نے فوراً ہی تردید کر دی۔

''دل کبھی کبھی خوش گمانی میں بھی تو مبتلا ہو جاتا ہے۔''

''میرے خیال میں تو دل کو ہمیشہ خوش گمانی میں ہی مبتلا رکھنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ اچھا سوچو گے تو اچھا ہوگا۔'' وہ دونوں بہت سویرے جاگ گئے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے فوراً ہی ناشتہ بھی کر لیا تھا اس لیے ملازمت پر جانے کے لیے ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اور وہ مزے سے اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے۔

''اچھا سوچنے کے ساتھ ساتھ انسان کو عمل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ قدرت نے کتنی منصفی کے ساتھ ہمیں اور یہاں والوں کو نوازا ہے۔ قدرتی ماحول کے اعتبار سے اس جگہ اور پیر آباد میں کتنی مماثلت ہے۔ جنگل، ہریالی، بہتا پانی، انواع و اقسام کے چرند پرند..... کیا ہے جو یہاں ہے اور وہاں نہیں ہے؟ لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں والوں نے اپنی ہر چیز کو سنبھالا اور سنوارا ہے جبکہ ہم نے صرف اور صرف اپنی چیزوں کو اُجاڑا ہے۔ بلقیس باجی بتا رہی تھیں کہ یہاں جانوروں کے تحفظات کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر ڈرائیونگ کے دوران کوئی جانور سڑک پر آ جائے تو ڈرائیور گاڑی روک کر پہلے اسے گزرنے کا موقع دیتا ہے۔ حکومت بھی اس معاملے میں بہت سخت ہے اور کسی جانور کو نقصان پہنچانے کی صورت میں بھاری جرمانہ عائد کر دیتی ہے۔ اُدھر ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ جو ذمے دار ہوتے ہیں نگہبانی اور تحفظ کے، وہی لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ غیر قانونی شکار سے لے کر لکڑیوں اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ایسا کون سا کام ہے جو اربابِ اختیار کی زیرِ نگرانی نہیں ہوتا۔ تعمیر و ترقی سے تو گویا ہمارے اوپر مسلط لوگوں کو چڑ ہے۔ میں اس جگہ کو دیکھتے ہوئے پیر آباد کو سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے۔ یہاں سب کچھ کتنا منظم اور صاف ستھرا ہے۔ اور اُدھر پیر آباد کا یہ حال ہے کہ پرائمری اسکول اور مرکزِ صحت قائم کرنے کے لیے بھی شہریار صاحب کو باقاعدہ ایک جنگ لڑنا پڑی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے والے راستے کو بھی انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے پختہ کروایا تھا۔ اُمید تھی کہ وہ چند سال اپنی سیٹ پر ٹِک گئے تو پیر آباد سمیت پورے ضلع کا نقشہ بدل دیں گے۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ جانے کب وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ آخر ان کا بھی گھر بار ہے۔ ان کے عزیز و اقارب اور بیگم سے کب تک برداشت ہوگا کہ وہ یوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہیں۔''

وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ یہ سب بولتے ہوئے اسے علم ہی نہیں تھا کہ شہریار کی ازدواجی زندگی کا اختتام اسی روز ہو گیا تھا جس روز وہ اسلم کی دلہن بنی تھی۔ بعد کے حالات بھی اس کے علم میں نہیں تھے ورنہ سب کی طرح اس وقت اسے بھی معلوم ہوتا کہ شہریار شدید زخمی ہو کر کومے کی حالت میں ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ شہریار نے اس پر اپنے حالات کو کھوجنے اور رابطہ کرنے پر پابندی ہی اس لیے عائد کی تھی کہ وہ کسی بری خبر کو سن کر ڈسٹرب نہ ہو اور سکون سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔

''تم نے جو کچھ کہا، وہ غلط نہیں ہے۔ تمہاری طرح میں بھی حالات گزیدہ ہوں۔ تمہاری ہی طرح میں نے بھی دربدری کا عذاب سہا ہے لیکن زندگی جس طرح مجھ پر مہربان ہوئی ہے، میں نے جان لیا ہے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن کہیں سے نمودار ہو کر سب کچھ بدل سکتی ہے۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب حالات کے جبر نے میرے ہاتھ سے قلم چھین کر بندوق تھما دی تھی۔ میں اپنے باپ کی خواہشات کو بھول کر ڈاکو بنا لوگوں کو لوٹتا پھر رہا تھا اور گمان تھا کہ اب مرتے دم تک یہی کام کرتا رہوں گا..... لیکن پھر تم میری زندگی میں چلی آئیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے برائی کی دلدل سے باہر نکلنے کی ہمت کی اور بعد میں شہریار صاحب نے سہارا دے کر اس قابل کر دیا کہ میں اپنے ارادے پر قائم رہ سکوں۔ یہ سب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہمارے ملک میں بہت ظلم اور بے ایمانی ہے لیکن ان برے لوگوں کے درمیان شہریار صاحب جیسے چند اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ اور جب تک ایسے لوگ موجود ہیں، ہم اپنے ملک کے مستقبل سے نا اُمید نہیں ہو سکتے۔ انشاء اللہ ایک وقت آئے گا جب ہمارے ملک کے حالات بدلیں گے۔ وہاں بھی تعمیر و ترقی ہو گی اور ظالموں اور بے ایمانوں کا احتساب ہو گا۔''

اسلم کے لہجے میں وہ اعتماد بول رہا تھا جو وقت نے اسے عطا کیا تھا۔ بہت سے مایوس کن دن گزارنے کے بعد زندگی نے اسے اپنا جو رخ دکھایا تھا، وہ اس کے لیے اتنا خوش گوار تھا کہ وہ ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

''چلیں بھئی، آپ جیتے میں ہاری۔ کیونکہ ایک تو آپ کا زندگی کے بارے میں تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، دوسرے اب ہمیں اسٹور کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کرنی چاہئے۔ میں پہلے ہی دن تاخیر سے پہنچ کر وہاں اپنا تاثر خراب نہیں کرنا چاہتی۔ ویسے بھی ہم بحیثیت قوم اس معاملے میں خاصے بدنام ہیں اور میرے دل میں بے شک پاکستانیوں کے لیے بہت سے شکوے ہیں پھر بھی میں نہیں چاہتی کہ ایک پاکستانی ہو کر اپنے وطن کی بدنامی میں کوئی کردار ادا کروں۔''

ماہ بانو نے ہنس کر کہتے ہوئے خود ہی ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی اور پھر وہ دونوں ہی تیار ہونے کے لیے سامنے پھیلے خوب صورت منظر کو چھوڑ کر کھڑکی سے ہٹ گئے۔

⊛----✪----⊛

''آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا بوبی جی.....؟'' نہایت نرمی سے پوچھے گئے سوال پر زرق برق لباس، گہرے میک اَپ اور بھاری زیورات سے لدے وجود کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔ پھر وہ اپنی بھاری آواز میں بولا یا شاید بولی۔ ''ابھی تو میں قدرت کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔ میں ناکارہ وجود جسے تم لوگ کسی قابل نہیں سمجھتے اور جسے جسم سے سانسوں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کبھی بھری سڑک پر تمہاری تفریح کا سامان بننا پڑتا ہے تو کبھی گڑگڑا کر بھیک مانگنی پڑتی ہے، آج اس لائق کیسے ہو گئی کہ حکومت کی کسی خفیہ ایجنسی کو میری ضرورت پڑ گئی؟''



''دیکھیں بوبی جی! آپ لوگوں کے ساتھ ہمارے معاشرے کا جو رویہ ہے، اسے میں خود بھی قابلِ مذمت سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہر تعلیم یافتہ اور باشعور فرد میرا ہم خیال ہو گا..... لیکن اس کے باوجود میں نہایت شرمندگی سے اعتراف کرتا ہوں کہ آپ جو کہہ رہی ہیں، وہ واقعی درست ہے۔'' سی ایف پی کا وہ نوجوان اہلکار خواجہ سراؤں کے اس پُراعتماد گروہ کے سامنے بیٹھا خود کو خاصا چغد محسوس کر رہا تھا پھر بھی اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس کو اپنے حق میں ہموار کر سکے۔

''درست نہ ہوتا تو میں کہتی ہی کیوں؟'' لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بوبی صاحبہ نے اپنی دائیں ٹانگ کو بائیں پر جمایا اور ایک زوردار کش لیتے ہوئے اچھے خاصے پُراعتماد بندے کا اعتماد متزلزل کرنے کی کوشش کی۔

''بے شک۔'' نوجوان اہلکار نے اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ اس وقت ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کے مقولے پر عمل پیرا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ ایک شخص جو قدرت کی طرف سے کسی کمی بیشی کو لے کر دنیا میں آیا ہے، بالکل ناکارہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بھی صلاحیتوں کا ایک خزانہ چھپا ہوتا ہے اور ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اس خزانے کو دریافت کر کے اسے استعمال میں لایا جائے۔'' اس نے کھنکھارتے ہوئے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کے لیے اپنی تمہید کا آغاز کیا۔

''اور تم آج یہ کام کرنے آئے ہو۔'' بوبی نے اس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

''نہیں، میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ میں تو آپ سے صرف درخواست کر رہا ہوں کہ چاہے آپ سے کتنی بھی ناانصافیاں کی گئی ہوں، آپ کے حقوق کو پامال کیا گیا ہو لیکن آپ اس بات سے انکار تو نہیں کر سکتیں نا کہ یہ ملک آپ کا بھی ہے..... اور آج جب اس ملک کو آپ کی ایک چھوٹی سی خدمت کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو انکار نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ آج اگر آپ مظلوموں میں شامل ہیں تو کل ظالموں میں شامل ہوں گی۔ میری بات نہ مان کر بحیثیت ایک انسان اور ایک پاکستانی آپ کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ آپ جب کبھی کسی دھماکے، کسی تخریب کاری کے بارے میں سنیں گی تو آپ کو پچھتاوا ہو گا کہ کاش ان ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کے لیے آپ نے ہمارا ساتھ دیا ہوتا تو یقیناً کئی انسانی زندگیاں بچ جاتیں۔'' وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سلجھے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ بوبی کے سخت چہرے پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم بہت چالاک ہو لڑکے!''

''وہ تو ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو میرا محکمہ اس کام کے لیے میرا انتخاب کیوں کرتا؟'' پہلی بار نوجوان کے چہرے پر بھی شوخ مسکراہٹ جگمگائی۔

''تو چلو پھر ایک بار اور بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بوبی نے شاہانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق خواجہ سراؤں کے مختلف گروہوں میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو شدت پسند ہندو خواجہ سراؤں پر مشتمل ہے۔ سابق ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب کی نوعمر بیٹی اس گروہ کے ہاتھ لگ کر اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی کسی ظالمانہ رسم کی ادائیگی کے لیے اسے ایک دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ پولیس اپنی کوشش کے باوجود اس گروہ تک اس لیے نہیں پہنچ سکی کہ اس واقعے میں ملوث جن خواجہ سراؤں کے نام سامنے آئے، ان سب کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں ڈی آئی جی سجاد رانا بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن گئے اور ان کے بعد اس کیس کی تحقیقات میں وہ تیزی نہ

رہی جو ہونی چاہئے تھی۔ شاید پولیس خود بھی ایک طرح سے مجبور ہی ہے کہ ابھی ایک واقعے سے نمٹ نہیں پاتی کہ دوبارہ پھر کہیں اسی نوعیت کا یا اس سے بھی بڑا سانحہ پیش آ جاتا ہے۔ بہرحال، اس کیس میں جو سب سے اہم بات سامنے آئی تھی، وہ یہ تھی کہ انتہا پسند خواجہ سراؤں کے اس گروہ کے رابطے ''را'' جیسی بدنام بھارتی ایجنسی سے بھی ہیں اور یہ بات ہر محبِ وطن پاکستانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی جگہ ''را'' کام کر رہی ہے تو اس کا مطلب ہے وہاں پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کارروائیاں بھی ضرور کی جا رہی ہیں۔

ایک پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض بنتا ہے کہ ان ملک دشمن عناصر سے نمٹنے میں ہماری مدد کریں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کی اس مدد کو ذاتی طور پر آپ کا احسان بھی تسلیم کروں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی بھی شخص آپ کی خاطر کوئی کام کرتا ہے یا قربانی دیتا ہے تو یہ اس کا اپنے وطن پر احسان نہیں بلکہ ایک فرض اور ضرورت ہے۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے حقوق نہ بھی مل رہے ہوں، تب بھی اس پر سے اپنے وطن کی سلامتی اور حفاظت کی ذمے داری ختم نہیں ہو جاتی..... کیونکہ وطن سلامت رہے گا، تب ہی تو وہ یہ اُمید کر سکے گا کہ کبھی نہ کبھی اسے اس کا حق مل جائے گا۔''

''تم یہ بات کر سکتے ہو لڑکے! کیونکہ تم نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا ہوگا۔'' بہت غور سے اس کی بات سنتا بوبی نامی وہ خواجہ سرا اس کے آخری جملوں پر بدمزہ ہو کر بولا۔

''آپ نے بالکل صحیح کہا کہ میں یہ بات کہہ سکتا ہوں لیکن اس لیے نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا بلکہ اس لیے کہ بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود میرا جذبۂ حُبّ الوطنی زندہ ہے۔ میرے والد پاکستان آرمی میں تھے۔ میں جب صرف چار سال کا تھا تو انہیں سیاچن کے محاذ پر بھیج دیا گیا اور پھر وہ کبھی وہاں سے واپس نہ آ سکے۔ قاتل پہاڑ پر چلائی جانے والی دشمن کی ایک گولی نے انہیں شہید، میری ماں کو بیوہ اور مجھے یتیم کر دیا۔ آپ نے شاید یہ تو سنا ہوگا کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی ان کے پیچھے جیتے جی مر جانے والوں کو نہ دیکھا ہوگا۔ میرا باپ کوئی لاوارث شخص نہیں تھا لیکن اس کے بعد میں لاوارث ہو گیا۔ میرے چچاؤں نے بجائے مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کے میرے والد کے حصے کی زمین بھی ہتھیا لی اور میری ماں کو مجھ سمیت دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کے لیے تنہا زندگی کی جنگ لڑنا ہمارے معاشرے میں کتنا مشکل ہے، یہ ہر شخص جانتا ہے۔ میری ستم رسیدہ ماں نے رزقِ حلال کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ مجھے کتنی مشکلوں سے پالا ہوگا۔ اپنی ماں کی قلیل آمدنی کی وجہ سے میں ہمیشہ موسم کے پھلوں، اچھے کپڑوں، جوتوں اور بے شمار خواہشات کے لیے ترستا رہا لیکن پھر بھی اس وطن سے نفرت نہ کر سکا جس کی حفاظت کی خاطر مجھ سے میرا باپ چھن گیا تھا۔ میری بہادر ماں نے مجھے محرومیوں سے لڑ کر جینا سکھایا اور ساتھ ہی میرے دل میں جذبۂ حب الوطنی کی آبیاری کرتی رہی۔ وہ اتنی حوصلہ مند تھی کہ اس وطن کے دفاع پر اپنا سہاگ قربان کر دینے کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھیجنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے ہر طرح کی اہلیت اور بہت سا جذبہ رکھنے کے باوجود میں اپنی ماں کی یہ خواہش اس لیے پوری نہیں کر سکا کہ میرا قد مطلوبہ معیار سے صرف آدھا انچ کم تھا۔ میں بہت رویا، بہت گڑگڑایا لیکن پھر بھی پاکستان آرمی میں شمولیت کا حق دار نہ ٹھہر سکا۔ لیکن پھر زندگی میں پہلی بار تقدیر کو مجھ پر رحم آ گیا۔ جانے کیسے میں ایک خفیہ ایجنسی کے ذمے داروں کی نظر میں آ گیا اور انہوں نے ضروری تربیت کے بعد مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میری بدقسمتی دیکھیں کہ میری ماں کو میری یہ کامیابی دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ کینسر کے موذی مرض سے لڑتے لڑتے آخر کار موت کی گود میں جا سوئی۔ آج میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ کوئی رشتہ، کوئی محبت میرے ساتھ نہیں ہے لیکن پھر



بھی میں کسی کو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے لیے مجرم نہیں ٹھہراتا اور صرف اکیس سال کی عمر میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ اگر دفاعِ وطن کی خاطر میری جان جاتی ہے تو چلی جائے۔''

بہت تسلسل سے بولتا وہ یک دم خاموش ہوا تو دیکھا کہ بوبی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''تم نے میرا دل جیت لیا لڑکے!'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں یہ جملہ کہا پھر بولی۔ ''تم جو چاہتے ہو بتاؤ، میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے ہندو خواجہ سراؤں کے اس گروہ تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ آپ بس مجھے ان تک پہنچا دیں۔''

''میں اس کام میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی خدمت چاہئے تو بتاؤ؟'' بوبی نے جواب دیا۔

''بس اتنا ہی کافی ہے۔'' سی ایف پی کا اہلکار جاوید علی مسکرا کر بولا۔ بوبی پر کی گئی اپنی محنت کو رنگ لاتا دیکھ کر وہ بہت خوش تھا۔

⊛----✪----⊛

رنگ، روشنی، خوشبو، قہقہے، خمار، مستی اور جانے مزید کیا کیا تھا جو اس محفل کا حصہ تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ ایک صوبائی وزیر کے بیٹے کی تقریبِ ولیمہ تھی۔

وزیر موصوف نے شراب، شباب اور کباب جیسے تعیشات اس محفل میں جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قابلِ ذکر آدمی کو مدعو کر رکھا تھا۔ وزیرِ اعظم سے لے کر ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم افراد اس محفل میں شریک تھے اور ظاہر ہے اسی حساب سے سکیورٹی بھی درکار تھی۔ حکومتی محکموں پر اچھا خاصا اختیار رکھنے کے باوجود اس خاص موقع پر سرکاری آدمیوں کے علاوہ پرائیویٹ سکیورٹی گارڈز کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً وہ خود بھی سرکاری محکموں کی ناقص کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے اس موقع پر کوئی رِسک لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اس وقت وہاں سی ایف پی کے جوان اپنی مخصوص یونیفارم کے علاوہ سادہ لباس میں بھی اِدھر اُدھر بکھرے اپنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

موقع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ذیشان خود بھی وہاں موجود تھا اور ایک ایک شے کو اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھا، چنانچہ وہ شعلہ جوالہ جلد ہی اس کی نظر میں آ گئی جو تتلی بنی پوری محفل میں منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اس نے نہایت مہین کپڑے کا سیاہ فراک نما لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا نیچے جا کر ختم ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس کی سفید سڈول پنڈلیاں تھیں جو ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔ توجہ کا مرکز بننے کے لیے اس نے اور بھی بہت اہتمام کر رکھا تھا۔ آستینوں کے تکلف سے آزاد اس کی گوری بانہوں میں ایسی کشش تھی کہ ہر کس و ناکس کو ہم آغوشی کی دعوت دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ کانوں میں موجود بڑے بڑے دلکش آویزے جب اس کی کسی جنبش کے نتیجے میں اس کے عریاں شانے کو پل بھر کو چومتے تو دیکھنے والی آنکھوں کو خود بخود ہی ان بے جان موتیوں سے بنے آویزوں پر رشک آنے لگتا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ اس کے گلے میں پڑے نازک سے نیکلس کے اس موتی کی خوش بختی پر عش عش کرنے لگتے جو اس مقام تک رسائی حاصل کر رہا تھا جہاں سیاہ مہین لباس کے پردے نے صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بن کر آتشِ شوق کو بھڑکانے کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔

اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ قدرت نے اگر اسے بے حساب حُسن کی دولت سے نوازا ہے تو وہ اس حُسن کی نمائش کا سلیقہ بھی خوب رکھتی ہے۔ یاقوتی ہونٹوں کی دلکش مسکراہٹ، ابروؤں کا چڑھانا، آنکھوں کی رنگین

پتلیوں کو اِدھر سے اُدھر گھمانا اور لہروں کی شکل میں کٹے بالوں کو جھٹکنا..... سب کچھ اتنے ردھم میں تھا کہ کہیں کسی ادا پر بازاری پن کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کوئی شریف زادی بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ شریف زادیوں کو کہاں ایک ساتھ اتنے گُروں پر کمال حاصل ہوتا ہے۔ یقینی طور پر وہ کوئی بہت ہائی لیول کی کال گرل تھی جو عام بازاری عورتوں اور شریف زادیوں کا حسین امتزاج بنی بے حساب دلوں کو لبھا رہی تھی۔

یہ بھی طے تھا کہ وہ بازار میں رکھی کسی عام جنس کی طرح ہر ایک کے لیے برائے فروخت نہیں ہوگی۔ نہ ہی نوٹوں سے بھرا پرس جیب میں رکھنے والا ہر شخص اسے خرید سکتا ہوگا۔ وہ ایسی انوکھی شے تھی جسے منتخب کرنے والے گاہک تو بہت سے ہو سکتے تھے لیکن خود کو خوش نصیب وہی گردانتا جس کے ہاتھ پکنے کو وہ خود راضی ہوتی۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ذیشان کی نظر اس پر گئی تھی۔

سی ایف پی کے اہلکار سکیورٹی گارڈز کے بہروپ میں جس قسم کے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے، وہ انہی میں سے محسوس ہو رہی تھی۔ عورتوں کے ناز و ادا اور چلتروں کی کارستانیوں کی تو تاریخ گواہ تھی۔ عورت کے پیچھے جانیں بھی لٹائی گئی تھیں، جنگیں بھی لڑی گئی تھیں، مال و اسباب بھی داؤ پر لگائے گئے تھے اور بڑی بڑی یادگاریں بھی تعمیر ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کے دلوں پر راج کرنے والی وہ عورتیں کچھ ایسی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی ہوں گی جیسی اس وقت ایک خوش رنگ تتلی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔ ایسی عورت تو بڑے بڑے زاہدوں کے قدم ڈگمگا سکتی تھی پھر یہاں اس محل میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک عیاش گھوم رہا تھا، اس کا داؤ کیسے نہ چلتا۔ یہاں تو وہ جس کی طرف اشارہ کر دیتی، وہ اس کا بندۂ بے دام بن کر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، چاہے اس سب کچھ میں ملکی سلامتی و امن بھی شامل ہوتا۔

سکیورٹی کے انتظامات پر نظر رکھنے کے بہانے وہ اس قتالہ سے مل بیٹھنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ آخر اسے یہ موقع اس وقت مل گیا جب وہ اسے تقریب کے میزبان وزیر اور آئی جی مختار مراد کے ساتھ کھڑی دکھائی دی۔ وہ خود بھی مسکراتا ہوا اس تکون کی طرف بڑھ گیا۔ میزبان وزیر نے اسے جوابی مسکراہٹ سے نوازا۔ ممکن تھا کہ اس مسکراہٹ کے بعد وہ اسے نظر انداز کر دیتا لیکن ذیشان کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا ہوا ان تینوں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

''آپ ہماری کارکردگی سے مطمئن ہیں نا سر!..... کہیں کوئی کمی تو نظر نہیں آ رہی؟'' اس نے وزیر موصوف سے دریافت کیا۔

''نہیں بھئی، آپ لوگوں نے تو سکیورٹی کا صحیح معنوں میں فول پروف انتظام کیا ہے۔ میں دوسروں سے بھی سفارش کروں گا کہ اہم مواقع پر آپ کی سکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کریں۔'' وزیر صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں مختار صاحب! آپ کے محکمے کے ہوتے ہوئے یہ ایک غیر سرکاری ادارے کے گُن گا رہے ہیں۔'' اس سے قبل کہ ذیشان تعریف کے بدلے میں شکریہ ادا کرتا، اس حسینہ نے چڑانے والے انداز میں مختار مراد کو پن کیا۔

''شرارت نہیں موہنی! مختار صاحب ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں ان کے محکمے سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن ان کے لوگوں پر کام کا بوجھ اتنا ہے کہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر مزید بوجھ ڈالا جائے۔'' وزیر صاحب نے جہاں اسے بہت پیار سے ٹوکا، وہیں مختار مراد کی دل جوئی میں ایک بہانہ گھڑ دیا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ محکموں کے درمیان اختلاف کا شور سنتے ہمارے کان اس وقت باہمی اتفاق اور خیال



داری پر مبنی کوئی جملہ سن رہے ہیں۔ مختار صاحب کو اس وقت اطمینان محسوس ہو رہا ہوگا کہ کوئی تو ہے جو اُن کے محکمے کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور ان کے جوانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔'' اپنے وہاں کھڑے رہنے کا جواز بنائے رکھنے کے لیے اس نے گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ من موہنی صورت رکھنے والی موہنی اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''آپ کی تعریف.....؟''

''مجھے ذیشان کہتے ہیں۔ پہلے آرمی میں ہوا کرتا تھا لیکن وہاں کی لگی بندھی زندگی سے طبیعت اوب گئی تو ملازمت چھوڑ کر ایک سکیورٹی ایجنسی کو جوائن کر لیا۔ آج کل وہیں کام کر رہا ہوں اور اسی ملازمت کی بدولت آج ایک ایسی محفل میں شامل ہوں جہاں من موہنے چہروں کا راج ہے۔'' اس نے ذومعنی انداز سے موہنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جواباً وہ اتنی دلکشی سے مسکرائی کہ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں اور چہرے کا ایک ایک نقش مسکرانے لگا۔

''دیکھیں ذیشان صاحب! بات یہ ہے کہ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ پولیس کی کارکردگی پر لگا سوالیہ نشان یونہی نہیں ہے۔ مختار صاحب کو برا نہ لگے تو میں نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی کہوں گی کہ جس محکمے کا ایک اعلیٰ افسر اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک آج تک نہ پہنچ سکا، وہ محکمہ دوسروں کے لیے کیا کر سکے گا؟ چلیں اس قصے کو جانے دیں۔ یہ ماضی کا حصہ ہوا لیکن ابھی حال ہی میں ان کے ایک عزیز شہریار عادل صاحب کو ایک ٹرک ڈرائیور ہٹ کر کے فرار ہو گیا اور یہ ابھی تک اس معمولی ٹرک ڈرائیور کو گرفتار نہیں کر سکے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی مختار صاحب! کیا اس مفرور ڈرائیور کے بارے میں کوئی سن گن ملی ہے آپ کے محکمے کو؟''

وہ بڑے کٹیلے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور ذیشان نہایت غور سے اس کے اور مختار مراد کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختار مراد کی سرخ پڑتی رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ بے پناہ ضبط سے کام لے رہے ہیں۔ جبکہ موہنی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ انہیں اُکسا کر ان سے کچھ اُگلوانے کی خواہش مند ہو۔ مشکوک وہ اسے پہلے ہی لگی تھی، اس انداز پر وہ مزید چونک گیا۔

''ہمارا محکمہ اپنا کام کر رہا ہے۔ بہت جلد ہم مفرور ڈرائیور کو گرفتار کر کے منظر پر لے آئیں گے اور آپ سمیت بہت سوں کی تسلی ہو جائے گی۔ لیکن مس موہنی! میں آپ کو بتا دوں کہ اس ٹرک ڈرائیور کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا جو ہمیں شہریار کو کھو کر ہوا ہے۔ وہ ایک نہایت ذہین شخص تھا جسے کومے کی حالت میں پڑا دیکھ کر مجھ سمیت سارے خاندان کے ہر فرد کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اسے اس حالت میں پہنچانے والے کو انجام تک پہنچانے کی خواہش جس شدت سے میرے دل میں ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں..... لیکن پولیس کے محکمے کے پاس کوئی الٰہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے ہی ہر کام ہو جائے۔ ہم اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں، نتیجہ بھی انشاء اللہ جلد سامنے آ جائے گا۔''

مختار مراد کے جواب اور فطری اداکاری نے ذیشان کا دل خوش کر دیا۔ وہ اسے اس کی اصل حیثیت میں نہیں جانتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں شامل ہیں جنہیں اس بات کا علم تھا کہ ہسپتال کے کمرے میں بستر پر پڑا شخص شہریار عادل نہیں ہے۔ شہریار عادل کسی بڑے مقصد کے لیے منظر سے غائب ہو گیا ہے۔ اس پر بھی ان کا انداز بالکل حقیقی تھا اور وہ ایک طرح دار حسینہ کو بھی اپنے مقابل پا کر ذرا غفلت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔

''ایکسکیوزمی! مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔'' وہ مزید ٹھہرے بغیر وہاں سے ہٹ گئے۔

''تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتی ہو موہنی! میں نے تمہیں اپنا پی آر او اس لیے تو نہیں بنایا کہ تم لوگوں سے میرے تعلقات بہتر بنانے کے بجائے انہیں ختم کر دو۔ اب تمہاری وجہ سے مجھے مختار صاحب سے معذرت کرنی پڑے گی۔'' صورتِ حال پر ہکا بکا وزیر نے اپنی پبلک ریلیشنگ آفیسر سے شکوہ کیا اور پھر خود بھی مختار مراد کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ موہنی کھڑی اسی مطمئن انداز میں مسکراتی رہی۔

''نائس..... میں پہلی بار حُسن اور جرأت مندی کو یکجا دیکھ رہا ہوں۔ آئی جی پولیس کے منہ پر ایسی بات کہنے کی جرأت تو سچ کے علم بردار نیوز اینکرز بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہوں گے۔'' ذیشان نے اسے سراہا۔

''لیکن میں کہہ دیتی ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میری بات کا لوگ مشکل ہی سے برا مانتے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا اور قریب سے گزرتے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر فوراً ہی ٹرالی لیے نزدیک چلا آیا۔ ٹرالی میں انواع و اقسام کی شرابوں کے ساتھ ساتھ سوفٹ ڈرنکس کی بھی بڑی مقدار موجود تھی۔ موہنی نے اپنے لیے ایک سنہری سیال سے بھرا جام منتخب کیا جبکہ ذیشان کا انتخاب اورنج جوس تھا۔

''ڈرنک نہیں کرتے آپ؟'' اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''جہاں مدہوش کرنے کا پہلے ہی اتنا سامان ہو، وہاں مزید پینا بیکار ہے۔'' اس نے ذومعنی لہجے میں جواب دیا تو وہ مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ حسین کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے اور اس کا اشارہ سمجھ چکی ہے۔

''ڈرتے ہیں؟''

''ڈرنا بھی چاہیے۔ میں غافل ہو گیا تو بہت سوں کی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔'' اس کا جواب اب بھی ذومعنی ہی تھا لیکن موہنی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ اسے ایک سکیورٹی ایجنسی کے ذمے دار کا بیان ہی سمجھتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سی ایف پی اصل میں کیا بلا ہے۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ سوفٹ ڈرنک پی کر ہوش میں رہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی انجام دیں۔ ہم ان کے پاس جاتے ہیں جو مدہوش ہو کر ہی خوشی محسوس کرتے ہیں۔'' وہ اٹھلا کر کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

''کوئی نشانی اور پتہ تو دیتی جائیں کہ کبھی ہمیں مدہوش ہونے کی فرصت ہو تو آپ سے رابطہ کر سکیں۔'' ذیشان نے اسے پکارا۔

''جانے دیں۔ کیونکہ ہم خود بڑے مصروف لوگ ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو فرصت ملے تو ہم خود مصروف ہوں۔'' وہ اسے طرح دے گئی۔ ظاہر ہے اس کے معیار پر کسی سکیورٹی ایجنسی کا ملازم کیونکر پورا اتر سکتا تھا۔ وہ جو چند لمحے اس کے ساتھ گزار گئی تھی تو وہ بھی شاید اس لیے کہ شاندار تیاری کے ساتھ ذیشان اس وقت جتنا پُرکشش لگ رہا تھا، صنفِ مخالف کے لیے اسے نظر انداز کر دینا آسان نہیں تھا۔

''ابھی بلیک ڈریس والی جس عورت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس پر نظر رکھنی ہے۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی تاحکمِ ثانی اس کی نگرانی کرتے رہنا ہے۔ رپورٹ ڈائریکٹ مجھے دینا۔'' موہنی کے ہٹتے ہی وہ ٹہلنے کے انداز میں اپنے ایک اہلکار کے قریب پہنچا اور اسے یہ حکم دے کر پلٹ گیا۔

⊛----✪----⊛

''میں تمہیں جس گرو سے ملانے کے لیے جا رہی ہوں، اس کا نام شالنی ہے۔ ذرا نک چڑھی اور نخریلی ہے اور مشکل سے ہی کسی کو منہ لگاتی ہے۔ لیکن میرا لحاظ کرتی ہے۔ کیونکہ میں کوئی معمولی خواجہ سرا نہیں ہوں،



سارے لاہور کے خواجہ سرا مجھے جانتے اور میری عزت کرتے ہیں۔ اگر شالنی یا اس جیسی کوئی دوسری میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے تو میرے سارے چاہنے والے مل کر اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔'' بوبی اپنے چہرے پر جلدی جلدی پاؤڈر کا پف مارتے ہوئے سی ایف پی کے نوجوان اہلکار جاوید علی کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ جاوید علی جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔

بوبی نے خواجہ سراؤں کے حقوق کی آواز اُٹھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ مسلسل لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ خواجہ سرا بھی عام انسانوں جیسے احساسات اور جذبات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے دی گئی ایک کمی کی وجہ سے خود کو تماشا بنا کر جینے میں خوشی نہیں ملتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں عام لوگوں کی طرح پڑھنے لکھنے، رہنے سہنے اور ملازمتیں کرنے کا حق ملے۔ اس نے خواجہ سراؤں کو اچھوتوں کی طرح معاشرے سے کاٹ کر رکھ دینے کے عمل کی شدید مذمت کی تھی اور لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ محرومی کا شکار یہ انسان پہلے ہی کتنے دُکھی ہیں، اس لیے انہیں مزید اپنے رویّوں سے دکھ دینے سے گریز کریں۔

اُس کی ان کوششوں کو خواجہ سراؤں کے حلقے کے علاوہ عام باشعور افراد کی طرف سے بھی سراہا جا رہا تھا اور اس کی کوششوں کا اتنا نتیجہ تو سامنے آیا تھا کہ میڈیا کی آواز اس کی آواز کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ بوبی کو اُمید تھی کہ اس کی زندگی میں نہ سہی، آنے والے وقت میں ہی لوگ اتنے باشعور ہو جائیں گے کہ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کر سکیں گے۔

جاوید علی نے اس کی رہائش گاہ پر مختصر قیام کے عرصے میں ہی اسے بہت قریب سے جان لیا تھا۔ بطور انسان بوبی کی اچھائی اور نیک دلی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بہت ہمدرد فطرت کی مالک تھی اور اپنے دُکھوں کو بھلا کر ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ اس نے جاوید علی کو اپنی درد بھری داستان بھی سنائی تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ اس کا جاگیردار باپ اس کی دنیا میں آمد سے قبل بہت خوش تھا کہ اس کی جاگیر کا وارث آنے والا ہے۔ جب اس کے دنیا میں آنے کا وقت ہوا تو جہاں زچگی کے لیے دستیاب ماہر دائیوں کو حویلی میں جمع کر لیا گیا، وہیں ڈومنیاں وغیرہ بھی پہلے سے حویلی کے آنگن میں آ بیٹھیں اور مبارک سلامت کے گیت گانے لگیں۔ انہیں یقین تھا کہ وارث کی پیدائش کے بعد وہ اپنی جھولیاں بھر کر حویلی سے روانہ ہوں گی۔ آثار بھی یہی بتا رہے تھے۔

بچہ ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا اور اپنی ماں کو دردِ زہ سے تڑپا رہا تھا لیکن حویلی کے باہر مبارک بادی کے لیے آنے والے مہمانوں کی ضیافت اور عام لنگر کے لیے دیگیں چڑھ گئی تھیں۔ حلوائی کو بھی تازہ مٹھائیاں بنانے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا اور جاگیردار صاحب شام کو حویلی میں دیسی گھی کے چراغ جلا کر اپنی خوشی اور امارت کا بیک وقت اظہار کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

ایسے میں بچہ دنیا میں آیا تو سب خاک میں مل گیا۔ کہاں کا لنگر اور کہاں کی مٹھائی؟ زچگی کروانے والی دائیوں کو بھی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ وہ باپ کو بچے کی پیدائش کی خبر دے دیں۔ وہ تو اپنا عوضانہ وصول کرنے کے لیے بھی نہ رُکیں اور خاموشی سے حویلی سے باہر روانہ ہو گئیں۔

خوشخبری کے منتظر جاگیردار صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ ایسا کیا ہو گیا کہ دائیوں کی زبانوں کو مہر لگ گئی۔ دل میں خدشہ سا جاگا کہ کہیں نومولود کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟ گھبرائے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف دوڑے۔ بچے کے رونے کی آواز پہلے ہی قدم پر سنائی دے گئی اور پہلا اندیشہ خود بخود ہی دور ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بیٹے کی

جگہ بیٹی تو پیدا نہیں ہوگئی؟ یہ ایک ایسی بات تھی جو انہیں مایوسی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی بہر حال انہیں خبر تو دی جانی چاہئے تھی۔

لمحوں میں بہت کچھ سوچتے ہوئے وہ بیوی کے پلنگ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ چت لیٹی ہوئی تھی اور بازو آنکھوں پر رکھے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نومولود بھی اس کے پہلو میں پڑا ماں کے سُروں سے سُر ملا رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ ماں بیٹا دونوں اپنی تقدیر پر گریہ کر رہے ہیں۔ پھر جاگیردار صاحب کو وہ خبر ملی جو ان کے گمان میں دُور تک بھی نہیں تھی۔ غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ وہ یوں منہ موڑ کر کمرے سے نکلے کے پھر کبھی ماں اور بچے کی طرف توجہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔

پیدائش سے قبل بچے کا نام بابر سوچا گیا تھا۔ اگر وہ نارمل بچہ ہوتا تو اس کا یہی نام رکھا جاتا لیکن وہ نہ تو لڑکا تھا نہ لڑکی۔ مامتا کی ماری دُکھی ماں نے اسے بوبی کا نام دے دیا۔ بوبی حویلی کا پہلا بچہ ہونے کے باوجود کسی کی محبت اور توجہ کا حق دار نہ ٹھہرا۔ جاگیردار صاحب کا حکم تھا کہ اسے اس کی ماں کے کمرے تک محدود رکھا جائے، سو اسے اپنے باپ کے گھر میں ہی قیدِ تنہائی دے دی گئی۔ ماں کو ایسا بچہ پیدا کرنے کی یہ سزا ملی کہ اس پر سوکن آ گئی۔ سوکن بھی ایسی کہ اس نے آتے ہی سال کے سال بیٹوں کی لائن لگا دی۔ بوبی کی پیدائش سے پہلے حویلی پر راج کرنے والی اس کی ماں یہ سب دیکھتی تو کبھی اسے گلے سے لگا کر رو پڑتی اور کبھی معصوم بچے کو بری طرح پیٹ ڈالتی جس کی وجہ سے اس سے اس کا راج پاٹ چھن گیا تھا۔

معصوم بوبی کی زندگی پیدائش کے فوراً بعد ہی درد والم کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کی مصیبتوں میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اس کے سوتیلے بھائیوں نے چلنا سیکھا۔ بچے لاکھ روکنے پر بھی نہ رُکتے اور بوبی کے ساتھ کھیلنے کے لیے پہنچ جاتے۔ پھر جیسا کہ معمول ہوتا ہے، بچے کھیلتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن بوبی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ پیدائشی ہی معتوب تھا۔ اس لیے قصور چاہے جس بھی بچے کا ہوتا، سزا اسی کے حصے میں آتی۔ یوں بہت کم عمری میں ہی اسے جسمانی اذیت سے آگہی ہوگئی۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس اذیت سے بھی بڑی ایک اذیت اس کی منتظر ہے۔

باپ کی سنائی قیدِ تنہائی کو روندتا وہ باغی ہو کر کمرے سے باہر بھی نکل کر کھیلنے لگا۔ نتیجے میں ایک طرف اسے جہاں باپ کی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا تو دوسری طرف وہ تضحیک کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے ادراک ہوگیا کہ وہ عام لوگوں جیسا نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ اسے قبول کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں گھٹ کر رہ گیا۔ اسے ماں کے رویوں کے تضادات کی وجہ بھی سمجھ آنے لگی اور یوں وہ اس کی طرف سے زیادتی ہونے کے باوجود بھی اس سے پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگا اور خود کو اسی حد تک محدود کر لیا۔ لیکن سکون اب بھی دور تھا۔ وہ جس ماں کو کائنات مان کر بیٹھا تھا، وہی ایک رات سوتے میں اسے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔

ماں کے بعد حویلی کے در و دیوار اس کے لیے اور بھی تنگ ہو گئے اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ حویلی چھوڑ کر اپنے جیسوں میں شامل ہو جائے۔ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے اس نے بھیک بھی مانگی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچا بھی اور فاقے بھی کئے۔ یہ سب کرتے اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا کہ وہ ایک ایسا بدنصیب تھا جس کے باپ کی زمینوں پر ڈھیروں کے حساب سے اناج پیدا ہوتا تھا اور وہ اس کی جائیداد کے حق داروں میں سے ایک حق دار ہوتے ہوئے چند لقموں کے لیے دربدر پھرتا تھا۔

وقت نے کروٹ لی اور بڑھتی عمر کے ساتھ اس نے غم کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا کر جینے کا ہنر سیکھ لیا۔ اس نے اس بات پر کڑھنا بھی چھوڑ دیا کہ اللہ نے اسے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟ وہ اپنی منفی سوچوں کو قابو



میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس جدوجہد میں مصروف ہو گیا کہ اسے اور اس جیسوں کو معاشرے میں ان کے بنیادی حقوق مل سکیں۔ اور آج وہی بوبی جسے اس معاشرے سے بہت سے شکوے تھے، سی ایف پی کے ایک نوجوان کی تحریک پر اس معاشرے اور ملک کو بچانے کے لیے ایک فریضہ انجام دینے چلا تھا۔

''آپ یہ بتائیں کہ شالنی مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار تو ہو جائے گی نا؟..... باقی اور کسی قسم کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں سب برداشت کر لوں گا۔'' اس کی مصروفیت کا دلچسپی سے جائزہ لیتے ہوئے جاوید علی نے اس سے پوچھا۔

''وہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ شالنی کے پاس جا کر تمہارا کام بن جائے گا۔ میں نے صرف اس وجہ سے اس کا انتخاب کیا ہے کہ خواجہ سراؤں کے جتنے گروہ یہاں کام کر رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ آسودہ اسی کا گروہ ہے..... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے گروہ کے خوبصورت اور نوعمر خواجہ سرا عیاش لوگوں کی دل بستگی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔''

''تو بس ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں میرا کام بن جائے گا ورنہ میں بہانے سے اس کا گروہ چھوڑ کر کسی اور گروہ میں شامل ہونے کے لیے آپ کے پاس چلا آؤں گا۔'' جاوید علی نے جو کہ اس وقت خود بھی زنانہ لباس اور میک اپ وغیرہ کے ساتھ ایک خوب صورت خواجہ سرا لگ رہا تھا، شوخی سے اسے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر بوبی نے اسے گھورا اور ہنس پڑی۔

''میں نے تمہارے بارے میں بالکل صحیح رائے دی تھی لڑکے!..... تم واقعی بہت چالاک ہو۔''

''میں نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا بھی نہیں تھا۔'' اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

''تو چلو چلتے ہیں شالنی سے ملنے۔ دیکھتی ہوں کہ تم کیسے اسے چالاکی سے اپنے قابو میں کرتے ہو۔'' ساڑھی کا پلو شانے پر ڈالتی ہوئی بوبی کھڑی ہوگئی۔ جاوید علی نے فوراً اس کی پیروی کی اور پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بوبی کی رہائش گاہ سے باہر نکل آئے۔

شالنی کی قیام گاہ تک کا سفر انہوں نے ہلکی پھلکی گفتگو میں گزارا۔ جس علاقے میں شالنی رہتی تھی، وہ تنگ و تاریک گلیوں پر مشتمل تھا لیکن شالنی کا گھر اندر سے اس سے بہت مختلف ثابت ہوا جیسا کہ ان گلیوں میں موجود کسی گھر کے متعلق خیال کیا جا سکتا تھا۔ باہر سے پرانا اور خستہ حال نظر آنے والا گھر اندر سے بہت خوب صورت اور سجا ہوا تھا۔ فرش پر بچھے قالین سے لے کر کارنس پر سجے آرائشی گلدانوں تک ہر چیز خوب صورت اور بیش قیمت تھی۔ جاوید علی نے اس بات کو خاصی معنی خیزی کے ساتھ نوٹ کیا۔ کیونکہ ابھی کچھ دیر قبل وہ بوبی جیسے خواجہ سرا کے گھر سے اُٹھ کر آیا تھا۔ خواجہ سراؤں کے گرو اور لیڈر کے طور پر بوبی خاصی مشہور شخصیت تھی لیکن اس کے گھر میں اسے یہ سج دھج نظر نہیں آئی تھی۔ بوبی کے گھر کی تزئین و آرائش میں معمولی اشیاء استعمال کی گئی تھیں جبکہ اس گھر کو دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں معاشرے کے پسے ہوئے محروم طبقے کا کوئی فرد رہتا ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر ایک خواجہ سرا کے ذرائع آمدنی کیا تھے جن کی وجہ سے یہ ٹھاٹھ باٹ ممکن ہو سکے تھے۔

اپنے ذہن میں یہ سارا حساب کتاب جوڑتا وہ بوبی کے ساتھ ایک نرم ملائم آرام دہ صوفے پر بیٹھا شالنی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے اس کمرے تک اسے شالنی کا ایک ملازم خواجہ سرا بٹھا کر گیا تھا۔ وہ خواجہ سرا بوبی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور نہایت عزت و احترام سے انہیں یہاں بٹھانے کے بعد خود شالنی کو ان کی آمد کی اطلاع دینے گیا تھا۔ ذرا دیر میں شالنی وہاں چلی آئی تھی۔

''او مائی گاڈ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟..... بوبی دیدی خود چل کر میرے گھر تک آئی ہیں؟'' کمرے میں قدم رکھتے ہی شالنی نے اپنی خوشی اور حیرت کا مظاہرہ کیا لیکن جاوید علی نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں مصنوعی پن ہے۔

''میں کوئی پہلی بار تو یہاں نہیں آئی ہوں۔'' بوبی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے ملتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے گلے ملنے کا منظر دیکھتے ہوئے جاوید علی نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا کہ شالنی کا لباس اور زیورات بوبی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہیں۔ شکل صورت کے اعتبار سے بھی وہ بوبی سے زیادہ خوبصورت تھی۔

''بن بلائے تو پہلی بار ہی آئی ہیں۔ اس سے پہلے تو بس ہولی، دیوالی کے فنکشن پر میرے بلانے پر ہی آتی تھیں۔'' شالنی نے شکوہ کیا۔

''تمہیں تو میری مصروفیت کا معلوم ہی ہے۔ ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہوں۔ آج یہاں ہوں تو کل کہیں اور۔ دن کہاں گزر جاتے ہیں، کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔'' بوبی نے جواب دیا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں دیدی! آپ کی مصروفیت کا تو ہمیں بھی پتہ چلتا رہتا ہے۔ دو تین بار آپ کو ٹی وی پر بھی دیکھا ہے۔ بڑا کام کر رہی ہیں آپ اپنی برادری کے لئے۔ بھگوان آپ کی مدد کرے۔ آپ کامیاب ہوگئی تو ہم سب کا بھلا ہو جائے گا۔''

''بس تم دعا کرتے رہو، ایک نہ ایک دن ہمارے دن بھی پھر ہی جائیں گے۔'' بوبی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اب وہ لوگ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے۔ جاوید علی نے گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموشی سے بوبی کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے دیدی؟'' وقفے وقفے سے جاوید علی کو پُرتجسس نگاہوں سے دیکھتی شالنی نے آخر کار اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''یہ رنجنی ہے۔ اسی کی خاطر وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ امید ہے کہ تم اس کے سلسلے میں میری فرمائش کو رد نہیں کرو گی۔'' بوبی بھی موقع کی تلاش میں تھی، فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

''حکم دیں دیدی! آپ کو انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شالنی کے لہجے میں بناوٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''رنجنی جھنگ سے آئی ہے۔ اس کا سارا کنبہ وہیں رہتا ہے۔ یہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگوں کا اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے گھر والے اسے لڑکا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پرچون کی دکان بھی کھول کر دے رکھی تھی۔ لیکن گھر والوں کی کوشش سے کیا فرق پڑتا ہے، جب اللہ نے ہی اسے مکمل مرد نہیں بنایا تو یہ کیسے عام مردوں جیسا برتاؤ کر سکتی تھی۔ اوپر سے محلے کے لڑکے بالے بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ ایک طرف بے چاری شریر لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنتی تو دوسری طرف گھر میں باپ سختی اور مار کٹائی کرتا کہ لڑکیوں والے ناز و انداز چھوڑ دے۔ روز کی جھک جھک بے چاری کے لیے عذاب بن گئی۔ جب تک کم عمر تھی، گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی لیکن آخر کار اس کی برداشت جواب دے گئی اور ایک دن یہ گھر چھوڑ کر نکل بھاگی۔ جھنگ سے نکل کر مجھ تک پہنچنے تک بے چاری بڑی خوار ہوئی اور دھکے کھائے۔ میری ہی ایک شاگرد اسے لے کر میرے پاس آئی تھی۔ میں نے رحم کھا کر رکھ لیا کہ سماج کے دھتکاروں کو اگر ہم ہی سہارا نہیں دیں گے تو یہ بے چاریاں کہاں جائیں گی،



اپنے طور پر میں نے کوشش بھی کی کہ یہ میرے پاس آرام سے رہے۔ لیکن میرے ہاں کا ماحول تمہیں معلوم ہے۔ لڑکیاں چاہے کچھ کریں لیکن نماز روزے کی پابند ہیں۔ یہ بے چاری ٹھہری ہندو ذات۔ میرے پاس نہ اس کے لیے بھگوان کی مورت ہے نہ تصویر۔ کرنے کو میں انتظام کر دیتی لیکن میری والیوں کو اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے یہ خود بھی وہاں ان سب کے بیچ عجیب سا محسوس کرتی ہے۔ میں نے کہا چل تجھے شالنی کے پاس لے چلتی ہوں۔ اگر اس نے تجھے قبول کر لیا تو تیری مشکل آسان ہو جائے گی۔ اب تُو بتا کہ میری بات رکھ کر اسے قبول کرے گی یا نہیں؟'' بوبی نے سوچی سمجھی کہانی سناتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں دیدی! آپ اسے اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں تو مجھے تو اسے سویکار کرنا ہی ہے۔ آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔'' شالنی نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

''لو بھئی رنجنی! مبارک ہو۔ تمہارا کام تو بن گیا۔ یہاں آرام سے رہو۔ میری یاد آئے تو شالنی کو بتا دینا، یہ تمہیں مجھ سے ملوانے کے لیے لے آئے گی۔'' بوبی نے فوراً جاوید علی کی طرف رخ کر کے اسے مبارکباد دی۔

''دھنے واد جی۔'' جاوید علی نے شرمیلے انداز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کی آواز اور انداز دونوں میں خواجہ سرا والی بات تھی۔ اور یہ بوبی کی کروائی مشق کا نتیجہ تھا۔ اس نے جاوید کو قلیل عرصے میں اچھی خاصی ٹریننگ دے دی تھی۔ وہ تھا بھی ذہین اس لیے جلد ہی بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔

''تیرا نام شروع سے رنجنی تو نہیں ہوگا۔ گھر والے لڑکا بنا کر رکھنا چاہتے تھے تو کوئی مردانہ نام ہی رکھا ہو گا؟'' شالنی نے براہِ راست اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔

''جی..... پتا جی نے میرا نام رنجیت رکھا تھا اسی لیے میں نے اسے بدل کر رنجنی کر لیا۔'' جاوید علی نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

''جھنگ میں کس جگہ رہتے ہیں تمہارے گھر والے؟'' کائیاں شالنی، بوبی سے ہامی بھرنے کے باوجود اس طرح تفتیش کر رہی تھی جیسے اپنی تسلی کرنا چاہتی ہو۔

''کیوں جی، آپ کہیں مجھے ان کے پاس واپس تو نہیں بھیج دیں گی؟'' جاوید علی بھی کم نہیں تھا۔ خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کا جواب گول کر دیا۔ اس موقع پر بوبی نے بھی اس کی مدد کی اور بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولی۔

''تُو فکر نہ کر شالنی! میں نے اس کا سب آگا پیچھا معلوم کر لیا ہے، تب ہی تو یہاں لے کر آئی ہوں۔ اگر مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا تو اسے لے کر آتی بھلا؟''

''ٹھیک ہے دیدی! آپ اس کی گارنٹی دے رہی ہو تو پھر میں کچھ نہیں پوچھتی۔ اسے رکھنے کے لیے تو میں پہلے ہی ہاں کر چکی ہوں۔'' شالنی نے سوال جواب کا سلسلہ روک دیا۔ اسی وقت اس کی ملازمہ خاص لوازمات اور چائے سے لدی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی شالنی!'' بوبی نے بھری ٹرالی دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''ایسا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے دیدی! آپ اطلاع دے کر آتیں تو میں آپ کے لیے خصوصی پکوان تیار کرواتی۔ ابھی تو جو کچھ گھر میں تھا، وہ سیوا کے لیے حاضر کر دیا ہے۔'' شالنی کی انکساری لوازمات سے بھری ٹرالی کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھی اور وہاں انکساری تھی بھی کہاں؟ ایک جتاتی ہوئی سی کیفیت تھی کہ دیکھو ہم بن بلائے اچانک چلے آنے والے مہمانوں کی بھی کیسے ضیافت کرتے ہیں۔

''چلیں بس اب تکلف نہ کریں اور میری خوشی کے لیے اچھی طرح کھائیں پئیں۔'' اسی بناوٹی لہجے میں اس

کا اصرار جاری تھا کہ ایک اور خدمت گار اجازت لے کر اندر داخل ہوئی اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

''شما کیجئے گا دیدی! ایک ضروری فون آیا ہے، سن کر ابھی حاضر ہوتی ہوں۔ آپ جب تک آرام سے چائے وغیرہ پئیں۔'' ملازمہ کی سرگوشی سن کر وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور رسمی سا جملہ بول کر باہر نکل گئی۔

اس کی غیر موجودگی میں اس کی ملازمۂ خاص نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور اصرار کر کے بوبی اور جاوید علی کو مختلف اشیاء کھلاتی رہی۔ شالنی کی فون کال خاصی طویل ثابت ہوئی تھی۔ وہ کئی منٹ گزار کر واپس آئی تو ایک بار پھر معذرت کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں شالنی! مجھے معلوم ہے کہ کوئی ضروری فون ہوگا۔ جب ہی تم نے اتنا وقت لگا دیا۔ بہر حال، اب تم مجھے اجازت دو۔ مجھے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔ رنجنی کی ذمے داری اب تمہارے حوالے۔'' بوبی نے وقار سے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''آپ کو اتنی جلدی جانے دینے کو من تو نہیں چاہ رہا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ کا وقت کتنا قیمتی ہے۔ بس میں یہی کہوں گی کہ یہاں سے بالکل شانت ہو کر جائیں۔ رنجنی آپ نے میرے حوالے کی ہے، میں اسے من سے لگا کر رکھوں گی۔'' شالنی نے جواباً ایک بار پھر اس سے اپنی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا اور پھر اسے رخصت کرنے کے لیے باہر تک اس کے ساتھ گئی۔

بوبی کے جانے کے بعد وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی۔ جاوید علی ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ شالنی اس کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنا دایاں پیر میز پر رکھ دیا پھر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ اس سارے عمل کے دوران اس کی نظر ایک پل کے لیے بھی جاوید علی پر سے نہیں ہٹی تھی۔ سر جھکا کر سامنے بیٹھا جاوید علی کن انکھیوں سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

''رنجنی.....!'' شالنی نے ایک اور کش لینے کے بعد اسے پکارا تو وہ زبان سے کچھ بولنے کے بجائے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں آج شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلوں گی۔ تُو وہاں ہماری دوسری ساتھیوں کے ساتھ رہنا۔''

اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ وہ تو یہاں پھیلے ان کے نیٹ ورک کو ٹریس کرنے کے لیے ان میں شامل ہوا تھا اور وہ اسے کراچی بھیجنے کی بات کر رہی تھی۔

''چنتا نہ کر۔ وہاں یہاں سے اچھا ماحول ہے۔ ویسے بھی میں گرو ہوں اور تجھے یہ تو بوبی نے بتا ہی دیا ہوگا کہ گرو کی بات ماننی کتنی ضروری ہوتی ہے۔ گرو کو انکار کرنے والوں کی گروہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

ادھر جاوید علی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بوبی کے جاتے ہی شالنی کے تیور یک دم ہی بدل گئے تھے اور وہ اس سے کچھ عجیب ہی طرح کا برتاؤ کر رہی تھی۔

'کہیں شالنی کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا؟' اچانک ہی یہ خیال اس کے دماغ میں اُبھرا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا اس صورتِ حال سے نکلنے کی تدبیر کرنے لگا۔

شالنی اسے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی جبکہ جاوید علی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح کراچی جانے سے بچنے کی تدبیر سوجھ جائے۔

''کیا بات ہے رنجنی! تُو کس سوچ میں پڑ گئی ہے؟..... تجھے کراچی جانے والی بات پسند نہیں آئی کیا؟''



شالنی نے اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات نہیں ہے دیدی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن میرا لاہور چھوڑنے کو من نہیں کرتا۔ یہاں رہوں گی تو جب من کرے گا، بوبی دیدی سے ملنے چلی جایا کروں گی۔ کراچی تو اتنی دُور ہے۔ وہاں سے یہاں آنا تو بڑا مشکل ہوگا۔'' اس نے ایک عذرِ لنگ پیش کیا۔

''بڑا پریم ہو گیا ہے تجھے بوبی سے۔'' شالنی نے طنز کا تیر پھینکا۔

''پریم تو ہوگا ہی جی۔ انہوں نے اتنے تھوڑے سے دنوں میں میرا جتنا خیال رکھا، اتنا تو میری سگی بہن بھی نہیں رکھتی تھی۔ اگر دھرم کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں کبھی ان کا گھر نہ چھوڑتی۔'' جاوید علی نے جواب دیا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تجھے دھرم کا اتنا خیال ہے۔ دھرم کو سب سے اوپر رکھنے والے بھگوان کو بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ تُو دھرم کی ایسی ہی پابندی کرے گی تو مرنے کے بعد سوَرگ میں تیرا ٹھکانا ہوگا۔ پر مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تُو ہندو جاتی کی ہو کر ایک مسلمان سے اتنا پریم جتا رہی ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان پلید ہوتے ہیں۔'' شالنی نے پہلے اسے سراہا اور پھر ملامت کی۔

اس بار جاوید علی محتاط ہو گیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے خواجہ سراؤں کے ایسے گروہ تک پہنچنا تھا جو ہندو شدت پسندوں پر مشتمل ہو اور شالنی کی بات سن کر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں کامیابی کے قریب پہنچ گیا ہے۔

''بھگوان مجھے شما کرے۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ پلید مُسلوں سے دُور رہنا کتنا ضروری ہے۔ اصل میں بوبی دیدی نے مجھ سے جو برتاؤ کیا تھا، اس نے مجھے یہ بات بھلا ہی دی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔'' وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''بوبی کے جھوٹے پریم کے چکر میں نہ پڑنا۔ اس کا پریم وریم سب دکھاوا ہے۔ بڑی ڈرامے باز ہے۔ اپنے چیلوں کو بھی دکھاوے کے لیے نمازوں کی عادت ڈال رکھی ہے۔ اصل میں تو وہ ان سے دھندا کرواتی ہے۔ تجھے بھی اتنے لاڈ سے اس لیے اپنے پاس رکھا ہوگا کہ تُو بڑی سوہنی ہے۔ تُو رام ہو جاتی تو وہ تجھے بھی دھندے میں لگا دیتی۔ پر اتنے دن اس نے تجھے اپنے پاس رکھ کر دیکھ لیا ہوگا کہ تُو اس کے لیے کام کرنے کو تیار نہیں ہوگی اس لیے اپنا بوجھ میرے اوپر پھینک گئی۔ پر تُو چنتا نہ کر۔ میں تجھے بوجھ تھوڑا ہی سمجھوں گی۔ یہاں تیری بڑی اچھی دیکھ بھال ہوگی۔'' بوبی کے سامنے اس کے قدموں میں بچھ جانے کو تیار شالنی اب اس کے خلاف زہر اُگل رہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے سے نظر آنے والا میک اپ سے لتھڑا اس کا چہرہ اس نفرت کی وجہ سے بگڑا ہوا لگ رہا تھا۔

''پر آپ تو مجھے خود سے دُور کراچی بھجوا رہی ہیں۔'' جاوید علی نے باقی کسی بھی بات پر تبصرہ کیے بغیر اس کے آخری جملوں کو پکڑ کر شکوہ کیا۔

''وہ تو میں تیرے بھلے کے لیے بھجوا رہی ہوں۔ تُو جھنگ کی رہنے والی ہے اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آئی ہے۔ اگر تیرے گھر والے تیری تلاش میں نکلے تو سب سے پہلے لاہور ہی کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تُو یہاں سے دُور چلی جائے۔ رہی تجھے خود سے دُور بھجوانے کی بات تو اس کی تُو چنتا نہ کر۔ میرا کراچی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تیری میری ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھر فون کس لیے ہے۔ تجھے وہاں کوئی پریشانی ہو یا دل گھبرائے تو فون پر مجھ سے بات کر لینا۔'' شالنی نے اس پر فرار کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے۔

''ٹھیک ہے دیدی! اگر آپ سمجھتی ہیں کہ کراچی جانے میں ہی میری بھلائی ہے تو میں راضی ہوں۔''

آخر کار جاوید علی نے ہامی بھر ہی لی۔ اس سے زیادہ بحث شالنی کو برہم بھی کر سکتی تھی اور وہ طیش میں آ کر اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیتی تو یہ اس کے حق میں کسی طرح مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا قیافہ تھا کہ وہ درست جگہ پر پہنچ گیا ہے اور یہاں اسے کامیابی ملنے کا امکان ہے۔ رہی بات کراچی جانے کی تو یہ کیا ضروری تھا کہ وہ لاہور میں رہ کر ہی کام کرتا۔ اگر شالنی کا گروہ ہی اس کا مطلوبہ گروہ تھا تو ان کی سرگرمیاں صرف لاہور تک ہی تو محدود نہیں ہوتیں۔ وہ کراچی میں رہ کر بھی وہی سب کر رہے ہوتے بلکہ امکان تھا کہ زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہوں..... کراچی جیسا ملی جلی آبادی والا شہر بہت سی وجوہات کی بنا مجرموں کے لیے جنت بنا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

ذیشان نے اپنے سامنے بیٹھے مشابرم خان کا جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال، ملگجا لباس، سرخ آنکھیں اور چہرے پر چھائی تھکن اور اُداسی دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ شخص کسی شدید دکھ یا مشکل میں گرفتار ہے۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر جہاں اسے افسوس ہوا، وہاں شہریار کی خوش بختی پر رشک بھی ہوا کہ ایسا کیا تھا اس شخص میں کہ لوگ اسے اتنا بے تحاشا چاہتے تھے۔ ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں تو یہ عالم ہو چلا تھا کہ لوگ اپنے خونی رشتوں سے بھی دُور ہوتے جا رہے تھے۔ ترقی کی راہ میں لگائی جانے والی دوڑ نے ہر ایک کو اتنا مصروف کر دیا تھا کہ ڈھنگ سے اپنی خوشیاں اور غم بھی منانے کی فرصت نہیں رہی تھی۔

مشابرم خان کی حالت اتنی خستہ لگ رہی تھی کہ ایک دفعہ تو اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو حقیقت سے آگاہ کر دے لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ وہ جس شعبے سے وابستہ تھا اور اس کے شانوں پر جو بھاری ذمے داری تھی، وہ اسے اس قسم کی جذباتیت کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ اس نے مشابرم خان کی حالت پر مزید غور کرنے کے بجائے اسے یہاں بلانے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کرنا مناسب سمجھا۔

''کیسے ہو مشابرم خان؟'' لہجے کو بے حد سرسری بناتے ہوئے اس نے پوچھا اور براہِ راست اسے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر نظروں کو بھٹکاتا رہا۔ اس وقت وہ لوگ ایک معمولی درجے کے ہوٹل میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے اس ہوٹل کا تعین اس نے خود کیا تھا اور جگہ کے اعتبار سے معمولی سا شلوار قمیض زیبِ تن کر رکھا تھا۔ مشابرم خان کو تو خیر کسی ہدایت کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اپنی خستہ حالت میں وہ ویسے ہی اس ہوٹل کے معمولی حیثیت کے گاہکوں سے میل کھا رہا تھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے سر! میں ٹھیک ہوں۔ لیکن مجھے شہریار صاحب کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اتنے دن ہو گئے ان کے ایکسیڈنٹ کو لیکن ابھی تک ڈاکٹروں نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی ہے۔ جب بھی پوچھو یہی سننے کو ملتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہاں کے نالائق ڈاکٹر کچھ کہنے کے لائق نہیں ہیں تو رانا صاحب، شہریار صاحب کو علاج کے لیے باہر کیوں نہیں بھجوا دیتے؟ وہ تو اتنی حیثیت والے آدمی ہیں۔ ان کے لیے باہر کے ملک سے علاج کروانا کیا مشکل ہے؟ ایسی مجبوریاں تو ہم غریبوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

اس کے انداز میں غصہ اور حسرت دونوں تھے۔ ایک طرف شہریار کے لیے اپنی بے تحاشا محبت کے سبب جہاں وہ اس کے لیے پریشان تھا، وہیں شاید اسے عرصے سے ہسپتال میں داخل اپنی ماں بھی یاد آ گئی تھی۔ اس کے بھائی اکرم خان کی جوان موت کے بعد وہ صدمے کے باعث جو کومے میں گئی تھی تو ابھی تک ہوش میں نہیں



آ سکی تھی۔ اس کے علاج پر ہسپتال کے جو بھی اخراجات آتے تھے، ان کا بل اب تک شہریار ہی ادا کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی معمولی تنخواہ کے ساتھ وہ ماں کے علاج پر اتنا خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

''مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے خان! میں جانتا ہوں کہ تم شہریار سے بہت محبت کرتے ہو لیکن تمہیں اس سے وابستہ دوسرے لوگوں کی محبت پر بھی شک نہیں ہونا چاہئے۔ رانا صاحب کو بھی اس کا بہت خیال ہے۔ وہ خود بھی اسے لندن یا امریکہ کے کسی بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں لیکن اس کی جو کنڈیشن ہے، اسے دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز نے اجازت نہیں دی۔ ان کے خیال میں شہریار کے لیے کسی بھی قسم کا سفر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ یہاں کے ڈاکٹرز کا لندن کے قابل ترین ڈاکٹرز سے رابطہ ہے۔ شہریار کی ساری رپورٹس انہیں بھی جا چکی ہیں۔ اور ان کے مشوروں کی روشنی میں اس کی صحت یابی کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ بات تو تم بھی سمجھتے ہو کہ انسان کے اختیار کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے، اس حد کے آگے وہ قدرت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ تم جو جملہ سن کر یہاں کے ڈاکٹروں سے ناراض ہو، وہی رائے لندن کے ڈاکٹرز کی بھی ہے۔ وہ بھی شہریار کی حالت کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں اور انہوں نے اسے سفر سے منع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تفصیل سن کر تمہاری تسلی ہو گئی ہو گی کہ شہریار کے علاج کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی یا بے پروائی نہیں برتی جا رہی..... لیکن قدرت کے سامنے ہم سب مجبور اور بے بس ہیں۔''

وہ نہایت نرم لہجے میں مشابرم خان کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ سب جو اس نے مشابرم خان کو بتایا تھا، تکنیکی اعتبار سے غلط بھی نہیں تھا۔ ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے یہ سارا سلسلہ سچ مچ جاری تھا۔ شہریار کے کوائف کے ساتھ بہت سی جعلی رپورٹس لندن کے ماہرین کو بھجوائی گئی تھیں اور نہایت سنجیدگی سے ان رپورٹس پر ماہرین سے تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا تھا۔

''میری تسلی تو صرف اسی صورت ہو سکتی ہے کہ شہریار صاحب صحت یاب ہو کر ہسپتال سے باہر آ جائیں اور دوبارہ سے اپنی سیٹ سنبھال لیں۔ اس ملک کو ان کی بہت ضرورت ہے۔ ان جیسا ایمان دار اور بہادر افسر میں نے اپنی ملازمت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کر کے دل کو خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جسے اس ملک اور اس کے لوگوں کا خیال ہے، ورنہ یہاں تو زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہے جو ملک بیچ کر بھی اپنی تجوریاں بھرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔'' مشابرم خان نے شہریار کے لیے اپنے خالص جذبات کا اظہار کیا پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اتنے سارے بے ایمانوں اور چوروں میں ایک ایمان دار آدمی آ جائے تو وہ انہیں اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور سارے مل کر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ شہریار صاحب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ ان کے دشمنوں نے بارہا انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی اور وہ قسمت سے بچتے رہے لیکن آخر دشمنوں کا داؤ چل ہی گیا۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''حوصلے سے کام لو مشابرم خان! جو کچھ ہوا، وہ واقعی بے حد افسوس ناک ہے۔ لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سچ مچ کسی دشمن کی کارروائی تھی یا شہریار حقیقتاً حادثے کا شکار ہوا ہے۔ جو بھی معاملہ ہوا، اسے ہم کھوج نکالیں گے۔ لیکن جو سب سے بڑی حقیقت سمجھانے کے لیے اس وقت میں نے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے، وہ یہ ہے کہ شہریار کے میدانِ عمل سے نکل جانے سے دنیا کا کاروبار ختم نہیں ہو گیا ہے۔ یہاں ازل سے خیر و شر کی جنگ جاری ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہم شہریار کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد حوصلہ ہار دیں اور اپنی

اپنی ذمے داریاں بھول کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں..... بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ شدومد سے ان کے خلاف برسرِ پیکار ہو جانا چاہیے۔ اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے ہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ شہریار کی جگہ ایک نئے بندے کو دے دی جائے گی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہریار نے اپنے علاقے پر بہت زیادہ محنت کی تھی اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ اس کی جگہ ایک ایسا شخص لایا جائے جو اس کے شروع کیے پروجیکٹس کو محنت اور ایمان داری سے جاری رکھ سکے۔ ہمارا انتخاب ایک ینگ افسر عمیر آفندی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم عمیر کے لیے بھی ویسی ہی محنت سے کام کرو جیسے اب تک شہریار کے لیے کرتے رہے ہو۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے ساتھ کام کر کے تم نا اُمید نہیں ہو گے۔'' اس نے مشابرم خان کو بلانے کا مقصد بیان کیا۔

''میرا دل شہریار صاحب کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔'' مشابرم خان نے اُداسی سے جواب دیا۔

''اگر تم ایک سچے اور محبِ وطن پاکستانی ہو تو اس انداز سے سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ وطن کی محبت کسی فردِ واحد سے مشروط نہیں ہوتی۔ مانا کہ تم شہریار کی شخصیت اور اس کی خوبیوں سے بہت متاثر ہو لیکن شہریار کوئی واحد شخص تو نہیں ہے جسے اس وطن سے محبت تھی۔ آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی لیکن اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو وطن سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بھلے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ عمیر کو شہریار کی جگہ دی ہی اس یقین کی بنیاد پر جا رہی ہے کہ وہ شہریار کے مشن کو لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

اس بار ذیشان نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں تھوڑی سی تلخی بھر لی۔ وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کے ذہن میں لگی گرہ کو کھولنے کے لیے نشتر زنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ مشابرم خان کے چہرے کا بدلتا رنگ گواہ تھا کہ اس کی حکمتِ عملی ناکام نہیں رہی ہے۔ اس نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کے خیال سے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

''شہریار نے ہمیشہ مجھ سے تمہاری بہت تعریف کی۔ وہ تمہیں آخری سانس تک لڑنے والا سپاہی قرار دیتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اگر میں ملکی مفاد میں تمہیں کوئی کام کرنے کا کہوں گا تو تم کبھی انکار نہیں کرو گے۔''

''انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔'' مشابرم خان نے جھکے سر کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''تو بس اس وقت ملکی مفاد میں سب سے اچھی خدمت جو تم انجام دے سکتے ہو، وہ یہی ہے کہ تم اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاؤ۔ عمیر کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے پہلے سے ایک مضبوط ٹیم تیار ملے اور اس کا وقت قابلِ اعتبار لوگوں کی تلاش میں برباد نہ ہو۔ دوسرے تم وہاں ہو گے تو عمیر پر چیک بھی رہے گا۔ اس کے ڈرائیور کی حیثیت سے تم ہر جگہ اس کے ساتھ رہو گے تو اس کی کوئی بھی بے ضابطگی فوراً ہی تمہاری نظروں میں آ جائے گی۔'' اب پھر وہ اپنے لہجے کو اعتدال پر لے آیا تھا اور نہایت متانت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''آپ کی بات مجھے سمجھ تو آ رہی ہے لیکن یہاں سے جانے کو دل بھی نہیں مان رہا۔ میں ہر وقت ہسپتال میں موجود رہتا ہوں تو مجھے تسلی سی رہتی ہے۔ ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا تو یہاں کی فکر لگی رہے گی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ اپنے تئیں تم دن رات ہسپتال میں ڈیرا ڈال کر شہریار کی سکیورٹی کے فرائض انجام دے رہے ہو لیکن یقین کرو کہ تمہیں یہ تکلیف اُٹھانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ شہریار کے معالجین سمیت وہاں موجود پورا اسٹاف ہمارے لیے قابلِ اعتماد ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس کی



سکیورٹی کا مناسب انتظام کر رکھا ہے۔ اس بات کا اندازہ تم اس دن کے واقعے سے بھی لگا سکتے ہو جب میں نے تمہیں فون کر کے معاملے سے الگ رہنے کی ہدایت کی تھی۔'' ذیشان نے اسے اس واقعے کا حوالہ دیا تھا جب رائے چندنا می ''را'' کا ایک مبینہ ایجنٹ اشیش کمار کے کمرے میں ڈیوٹی دینے والی نرس سے رقم کے عوض شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے لے گیا تھا۔

''اس واقعے نے تو ابھی تک مجھے اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے خود مجھ سے ذکر کر دیا۔ ورنہ میں آپ سے پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا اور اس رات وہاں کیا ہو رہا تھا؟'' مشابرم خان فوراً ہی ذہن میں اٹکا وہ سوال جسے اب تک ذیشان کے لحاظ میں نہیں پوچھ سکا تھا، زبان پر لے آیا۔

''کچھ مجبوریوں کی وجہ سے میں تمہیں اس واقعے کی تفصیلات اور حقائق سے آگاہ نہیں کر سکتا لیکن اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس واقعے سے شہریار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ فائدے میں ہی رہا ہے۔'' ذیشان نے نہایت سنجیدگی سے اس انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا کہ اسے مزید اس موضوع پر جرح کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی اور وہ گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے سر!..... میں آپ کے حکم پر واپس ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہوں۔ شہریار صاحب آپ کو جو اہمیت دیتے تھے، اس کی وجہ سے میں آپ کے حکم سے انکار کی جرأت نہیں رکھتا۔''

''گڈ..... مجھے تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔'' ذیشان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے سامنے دھری چائے کی پیالی پر نظر ڈالی۔ میلے سے کپ میں ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کسی طور اس لائق نہیں تھی کہ وہ اسے پینے کی جرأت کر سکتا۔ مشابرم خان نے بھی اس چائے کو منہ نہیں لگایا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ایسا اس نے ناپسندیدگی کی وجہ سے کیا تھا یا ذیشان کو چائے کو ہاتھ نہ لگاتے دیکھ کر خود بھی احتراماً اس کی تقلید کی تھی۔

''کام جو میں نے تمہیں بتایا ہے، تم آسانی سے کر لو گے کیونکہ تمہیں اس کا خاصا تجربہ ہے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ میں وقتاً فوقتاً تم سے کچھ اور بھی کام لیتا رہوں۔ امید ہے کہ تم اس صورت میں بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے۔'' ذیشان نے بات کو آگے بڑھایا۔

''فی الحال آپ میرے لیے شہریار صاحب کے قائم مقام ہیں، میں نے صاحب کو کبھی کسی کام سے انکار نہیں کیا اس لیے آپ کو بھی نہیں کروں گا۔'' مشابرم خان کا جواب بہت سادہ اور واضح تھا۔

''میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شہریار کی طرح میری بھی کسی ہدایت پر عمل کر کے تمہیں کبھی پچھتاوا یا افسوس نہیں ہو گا۔ البتہ خیال رکھنا کہ اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے جذباتیت کا شکار نہ ہو۔ میں تمہیں جتانا نہیں چاہتا لیکن شہزادی کی موت کی مثال دے کر یہ سمجھانا ضرور چاہتا ہوں کہ جذباتیت سے بعض اوقات بہت بڑے بڑے نقصان ہو جاتے ہیں۔ اگر تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو تو اس روز تم نے شہریار کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر لاہور کی طرف دوڑ لگا کر کوئی عقل مندی نہیں کی تھی کیونکہ یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا، تم اس میں اپنا کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے تھے جبکہ یہاں آنے کے بجائے اگر تم اس روز اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہوتے تو ہو سکتا تھا، شہزادگی کی زندگی بچ جاتی۔ مارنے والوں نے اس کے قتل کو حادثے کی شکل دینے کے لیے بے شک بہت بھرپور کوشش کی تھی لیکن ہمیں بہت سے ایسے واقعاتی ثبوت ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بے چاری کو قتل کیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر اس رات تم اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اور کچھ نہیں تو شاید وہ تمہیں وہ معلومات پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی جنہیں اس کے سینے میں ہی دفن کر دینے کی خاطر اسے اور اس کے معصوم بچے کو قبر کے اندھیروں میں اتار دیا گیا۔''

ذیشان بول رہا تھا اور مشابرم خان منہ کھولے سن رہا تھا۔ شہزادی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر اس تک بھی پہنچی تھی اور اسے شک بھی ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی سازش کا شکار نہ ہوگئی ہو لیکن بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ منظر پر آنے پر اس نے اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا دماغ شہریار کی وجہ سے اتنی بری طرح اُلجھا ہوا تھا کہ وہ بہت زیادہ اس معاملے پر غور نہیں کر سکا تھا۔

''جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ گیا وقت دوبارہ واپس نہیں آسکتا۔ لیکن آئندہ کے لیے خود کو سنبھال کر اپنی غلطی کی تلافی کر سکتے ہو۔'' اس کی کیفیت دیکھ کر ذیشان نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ جواب میں وہ صرف اثبات میں سر ہی ہلا سکا۔ ذیشان اُس کی ایک ایک حرکت کا غور سے جائزہ لے رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مشابرم خان پر کی جانے والی اس کی محنت ضائع نہیں جا رہی ہے۔

''تم جگو سے بھی اچھی طرح واقف ہو گے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس سے رابطے میں رہو اور اس سے ملنے والی کوئی بھی اطلاع فوراً مجھ تک پہنچا دیا کرو۔ ویسے تو میں خود براہِ راست بھی اس سے رابطہ کر سکتا ہوں لیکن مناسب یہی ہے کہ بلا ضرورت میں کسی کے سامنے نہ آؤں۔ شہریار کے بعد اس کے حصے کی ذمے داریاں بھی میرے شانوں پر آ گئی ہیں۔ اس لیے میں بزدل نہ ہونے کے باوجود تھوڑا سا محتاط رہنا مناسب سمجھتا ہوں۔'' مشابرم خان کو ایک اور نئی ہدایت دیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر ایک ایسی بات کہی جس سے اسے یہ پیغام مل سکے کہ شہریار کی عدم موجودگی میں اب وہی سب سے اہم ہے تاکہ دانستہ بھی وہ کہیں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہو سکے۔

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کی ہر بات پر عمل کروں گا۔'' مشابرم خان کا لہجہ و انداز گفتگو کے آغاز کے مقابلے میں کافی تبدیل ہو گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر کام کرنے کی آمادگی پیدا ہو گئی ہے۔

''میں بھی تمہیں نا اُمید نہیں کروں گا۔''

ذیشان نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مشابرم خان نے بھی اس کی تقلید کی۔

''تمہارے لیے میرے پاس ایک خبر اور تھی۔ وہ یہ کہ اے سی کی حیثیت سے شہریار جو کچھ کر رہا تھا، وہ سب تو انشاء اللہ! عمیر سنبھال لے گا۔ البتہ اس کے ذاتی پروجیکٹس کو خود رانا صاحب نے اپنی نگرانی میں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہاری والدہ کے علاج کی ذمے داری بھی اب رانا صاحب ہی اٹھائیں گے۔ اس لیے تمہیں اس سلسلے میں آئندہ بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے کھڑے ہی اس نے یہ اطلاع دی اور پھر یک دم ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

مشابرم خان پُرنم آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ ان حالات میں بھی شہریار کی ذات سے اسے پہنچنے والے فیض کا سلسلہ رُکا نہیں تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل کو گداز ہوتا محسوس نہیں کرتا۔ وہ پورے خلوص اور محبت سے دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ شہریار دوبارہ میدانِ عمل میں آ جاتا تو اس سے زیادہ کوئی اس بات پر خوش نہیں ہو سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

شالنی اور جاوید علی لاہور سے بائی ایئر کراچی پہنچے تھے۔ اس سفر کے دوران جاوید علی کو اپنی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا۔ لاہور ایئرپورٹ سے لے کر کراچی تک اسے لوگوں کی جو نظریں، معنی خیز جملے اور مسکراہٹیں برداشت کرنی پڑی تھیں، ان کی وجہ سے وہ اچھی خاصی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اسے بڑی شدت سے



احساس ہوا تھا کہ معاشرہ اس تیسری جنس کے ساتھ کتنا بے ہودہ سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔

اس موقع پر اس نے ان خواجہ سراؤں کو بھی تھوڑا قصور وار سمجھا تھا۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے لیے جن بھڑکیلے کپڑوں، میک اپ اور چال ڈھال کا سہارا لیا تھا، اس کی وجہ سے خود ہی تماشا بن بیٹھے تھے۔ اتنے بھڑکتے حلیے میں تو کوئی عام عورت بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی تو پھر وہ کیسے محفوظ رہ سکتے تھے؟ اسے یقین تھا کہ اس نے اور شالنی نے جس حلیے میں سفر کیا تھا، اگر اس کے بجائے وہ عام سے سادہ لباس پہنے ہوتے تو اتنا زیادہ مرکزِ نگاہ نہ بنتے۔ بہرحال، موجودہ حالات میں وہ اپنے ان خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ساڑھی کا پلو لہرا کر بے نیازی سے چلتی شالنی کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔

ان دونوں کے پاس کوئی قابلِ ذکر سامان نہیں تھا۔ اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھا ہوا تھا اور یہ بیگ اس کے شانے سے لٹک رہا تھا جبکہ شالنی کے پاس بھی ایک بڑے ہینڈ بیگ کے سوا کچھ اور نہیں تھا اس لیے انہیں لاؤنج سے نکل کر پارکنگ میں جانے کے لیے کسی ٹرالی وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے، ایک سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ رینگ کر ان کے قریب آ گئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ ڈرائیور گاڑی روک کر تیزی سے باہر نکلا اور ''نمستے دیدی!'' کہتا ہوا شالنی کے قدموں میں جھک گیا۔ شالنی نے بڑی شفقت سے اسے آشیرباد دیا البتہ جاوید علی دلچسپی سے ڈرائیور کا جائزہ لیتا رہا۔

نوجوان اور خوب صورت ڈرائیور کو مخصوص یونیفارم اور سر پر موجود کیپ کی وجہ سے پہلی نظر میں دیکھ کر کسی نوعمر لڑکے کا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ بولا تو جاوید علی پر اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی اور پھر گہری نظروں سے لیے جانے والے جائزے نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ ڈرائیور کی یونیفارم میں درحقیقت وہ ایک خواجہ سرا تھا۔

''ٹھیک تو ہے آشا؟'' شالنی ڈرائیور کے گال کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''جی دیدی! اچھی ہوں۔ آپ کے آنے کی خبر سن کر تو من ویسے ہی بہت خوش ہو جاتا ہے۔'' ڈرائیور نے شرمائے ہوئے انداز میں شالنی کی بات کا جواب دیا تو اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی لیکن زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور جاوید علی کو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنا بیگ سنبھال کر فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''یہ رنجنی ہے۔ یہ بھی اب ادھر تم لوگوں کے ساتھ ہی رہے گی۔'' گاڑی چلی تو شالنی نے تعارف کی رسم نبھائی۔

''خوشی ہوئی تم سے مل کر۔'' آشا نے جاوید علی پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے رسمی سے لہجے میں کہا۔

''رنجنی بہت دُکھی ہے۔ تم سب کو اس کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ خاص طور پر تجھے آشا! تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ پر سب سے زیادہ وشواس رکھتی ہوں۔'' اس کا انداز دیکھ کر شالنی نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

''آپ چنتا نہیں کریں دیدی! رنجنی کا کھلی بانہوں سے سواگت ہوگا۔ اس کا خیال رکھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اسے آپ اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں۔'' آشا نے سنبھل کر فوراً یقین دہانی کروائی پھر جاوید علی کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آج سے تُو اور میں سکھی ہیں۔ تُو اپنا ہر دُکھ سُکھ مجھ سے بانٹ سکتی ہے۔ دیکھ، تکلف کر کے شالنی دیدی کے سامنے میرا سر نہ جھکانا۔''

''دھنے واد آشا!.....بھگوان نے مجھ پر کرپا کی ہے کہ یہاں آتے کے ساتھ مجھے اتنی پیاری سکھی مل گئی ہے۔ میں بھی ہمیشہ تیری قدر کروں گی۔'' جاوید علی نے فوراً ہی نہایت انکساری کے ساتھ اسے جواب دیا۔ وہ ایک خواجہ سرا کا کردار بڑی خوبی سے نبھا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے لے کر بول چال تک میں کوئی ایسی کسر نہیں رہ گئی تھی کہ اس پر شک کیا جا سکتا۔ اس کامیابی میں اس کی فطری ذہانت اور صلاحیت کے علاوہ بوبی کی تربیت کا بھی عمل تھا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں متعدد بار اس کا شکریہ ادا کر چکا تھا۔

''ارے بھئی کہیں یہ نہ ہو کہ دونوں سکھیاں مل کر مجھ نگوڑی کو بھول جائیں۔'' شالنی نے یوں تو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی گفتگو میں حصہ لیا تھا لیکن آشا کو گویا کرنٹ لگ گیا۔

''ایسا سوچنا بھی نہیں دیدی! میں ایسی سو سکھیاں آپ پر سے وار کر پھینک دوں۔ آپ کی جو جگہ میرے من میں ہے، وہ کسی دوسرے کو کبھی نہیں مل سکتی۔'' وہ بڑی تڑپ کے ساتھ شالنی کے آگے وضاحت کر رہی تھی۔

''تُو بھی نا آشا!.....بس ذرا سی بات من پر لے لیتی ہے۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہی تھی ورنہ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تُو مجھے کتنا چاہتی ہے اور میری جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔'' پچھلی نشست پر بیٹھی شالنی نے ذرا جھک کر آشا کا شانہ تھپتھپایا تو اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہوئے اور وہ ایک بار پھر پوری توجہ سے گاڑی چلانے لگی۔

جاوید علی بہت گہری نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ آشا کی شالنی سے والہانہ محبت کی کیا وجہ تھی؟ وہ سمجھ نہیں سکا تھا لیکن اس کے دل میں ایک عجیب بے نام سا احساس ضرور جاگ گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ آنے والے وقت میں اسے وجہ بھی سمجھ آ جاتی، ابھی تو ابتدا تھی۔ وہ جس بھید بھری دنیا میں داخل ہونے والا تھا، وہاں جانے اسے کن کن حقائق اور حیرتوں کا سامنا کرنا تھا۔

سبک رفتار سے دوڑتی گاڑی نے بہت آرام سے انہیں ایک پوش علاقے میں پہنچا دیا۔ اپنی متنازعہ جنس سے قطع نظر آشا بہت اچھی ڈرائیور ثابت ہوئی تھی اور اس نے کراچی کے منہ زور ٹریفک میں اتنی مہارت سے گاڑی چلائی تھی کہ کہیں انہیں ایک جھٹکا نہ لگنے دیا تھا۔ پوش علاقے میں داخل ہونے کے بعد گاڑی جلد ہی ایک بڑی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے جا رکی۔

کوٹھی باہر سے ہی اتنی خوب صورت نظر آ رہی تھی کہ مکینوں کی امارت کے بارے میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ حقیقتاً یہاں پہنچ کر جاوید علی کو تھوڑی حیرت بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں تو شالنی اسے یہاں بھی ایسے کسی تنگ گلیوں والے محلے کے کسی گھر میں لے جانے والی تھی، جیسے گھر میں وہ لاہور میں رہتی تھی۔ لیکن اس کے اندازے کے بالکل برعکس وہ ایک عالیشان کوٹھی تک پہنچ چکا تھا۔ آشا نے ہارن بجایا تو کوٹھی کا بڑا سا آہنی گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔

اس بار اس نے گیٹ کے قریب کھڑے چوکیدار کے حلیے اور لباس سے کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ وہ بھی سو فیصدی ایک خواجہ سرا ہی تھا۔ یعنی وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا تھا جہاں خواجہ سراؤں کی حکمرانی تھی لیکن کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر موجود نام نے اسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہاں کسی نواب نوازش علی کا نام لکھا تھا۔ نام سے جنس اور مذہب دونوں ہی کی وضاحت ہو رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مسلمان نواب صاحب کا ہندو خواجہ سراؤں کے اس ہجوم سے کیا تعلق تھا؟ ڈرائیور اور چوکیدار کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوٹھی کے دوسرے ملازمین بھی اسی صفت سے تعلق رکھنے والے ہوں گے۔

گاڑی آہستگی سے دوڑتی سرخ بجری سے بنی روش سے گزر کر کوٹھی کی مرکزی عمارت کے سامنے جا رکی۔



وہاں استقبال کے لیے پہلے ہی ایک خواجہ سرا موجود تھا۔ یہ خواجہ سرا بہت خوب صورت تھا اور اس نے چوڑی دار پاجامے اور فراک پر مشتمل نہایت خوب صورت و بیش قیمت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ جاوید علی کا یہاں پہنچنے کے بعد تیسرے خواجہ سرا سے سامنا ہو رہا تھا۔ اور تینوں میں یہ خصوصیت مشترک تھی کہ وہ بہت خوب صورت تھے۔ خود جاوید علی نے اپنی ذات پر غور کیا تو اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس کے انتخاب کی بھی وجہ یہی ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے بڑی فراوانی سے خوب صورتی عطا کی گئی تھی۔ اس خوب صورتی اور اپنی کم عمری کا فائدہ اٹھا کر اس نے خود کو نہایت آسانی سے خواجہ سرا کے روپ میں ڈھال لیا تھا اور اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں شاید کسی نے خواجہ سراؤں کی اِندر سبھا سجا رکھی تھی۔

''پرنام شالنی جی! نواب صاحب کی طرف سے میں آپ کا سواگت کرتی ہوں۔'' آشا نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو شالنی باہر نکلی اور وقار سے چلتی ہوئی سامنے آنے والے نئے نمونے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جاوید علی بھی اس کے پیچھے تھا اور دلچسپی سے اس پروٹوکول آفیسر نما شے کو دیکھ رہا تھا جس کے شوخ لباس کے باوجود لہجے میں خاصی متانت تھی۔

''کیا نواب صاحب کوٹھی میں تشریف نہیں رکھتے ہیں؟'' شالنی نے پوچھا۔ اس وقت وہ اس بے تکلفی سے گریز کر رہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے ڈرائیور آشا کے ساتھ کیا تھا۔

''نواب صاحب! ابھی ابھی ایک میٹنگ سے واپس آئے ہیں اور فریش ہو رہے ہیں۔ آپ کے لیے ان کی تاکید تھی کہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ان کے آنے تک خاطر مدارت کی جائے۔'' اس نے احترام سے شالنی کے سوال کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر وہیں چلتے ہیں۔'' اس کا جواب سن کر شالنی نے قدم آگے بڑھا دیے۔ جاوید علی کو تو اس کی تقلید ہی کرنی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اُس کا اس کوٹھی میں آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔

کوٹھی کا ڈرائنگ روم شان دار اور ان تمام لوازمات سے مزین تھا جن سے صاحبِ خانہ کی امارت اور خوش ذوقی کا اظہار ہو سکے۔

ان دونوں کے وہاں بیٹھتے ہی مشروبات پیش کر دیے گئے۔ شالنی خاموشی سے ایک گلاس تھام کر اس میں سے گھونٹ گھونٹ مشروب اپنے حلق سے نیچے اُتارتی رہی۔ اس کی خاموشی کی صورت میں جاوید علی نے بھی تکلم کو نامناسب جانا۔ اس کے ذہن میں بے شک بہت سے سوالات اُٹھ رہے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب کے لیے صبر سے انتظار کرنا ہی مناسب تھا۔ ابھی اسے ان میں شامل ہوئے دیر ہی کتنی گزری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کب اور کیا بات کرنا مناسب ہے۔ البتہ اس نے اتنا ضرور محسوس کر لیا تھا کہ گاڑی سے اُترتے ہی شالنی نے شوخی اور بے تکلفی کو بھلا کر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اس وقت بھی ڈرائنگ روم کی فضا کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔

بوجھل سی خاموشی کے چند منٹ رینگ رینگ کر گزرے تو ڈرائنگ روم کے دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر سرخ و سپید رنگت والا ایک پچپن سے ساٹھ سال کے درمیان وجیہہ آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے وجیہہ سراپا پر سفید کُرتہ پاجامہ خوب جچ رہا تھا اور بغیر کسی تعارف کے بھی یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ وہی نواب نوازش علی ہے۔ شالنی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر نواب صاحب کو تعظیم دی۔ جاوید علی کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

''تشریف رکھیے شالنی جی!'' نواب صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود بھی ایک گداز صوفے پر نشست سنبھال لی اور گمبھیر لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ اس بار آپ کی آمد کی وجہ خوشگوار نہیں ہے۔''

''افسوس تو مجھے بھی ہے نواب صاحب! پر بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چل سکتی ہے؟ وہ جیون دیتا ہے تو واپس بھی لے لیتا ہے۔ بس غم ہے تو یہ کہ رتی بڑی بھری جوانی میں سنسار چھوڑ کر سورگ باشی ہوگئی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔'' شالنی کے چہرے پر غم کے سائے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آنے لگی تھی۔

جاوید علی نے ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ کسی خواجہ سرا کی موت واقع ہوگئی ہے اور یقینی طور پر وہ خواجہ سرا اس کوٹھی میں ہی مقیم تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس خواجہ سرا سے شالنی کا کیا تعلق تھا کہ وہ اس کے مرنے کی اطلاع سن کر اتنی ایمرجنسی میں لاہور سے کراچی پہنچ گئی۔ تعلق جو بھی تھا، وہ تو بالآخر اسے معلوم ہو ہی جاتا لیکن اس وقت وہ شالنی کے رویوں میں لحہ بہ لحہ ہوتی تبدیلیوں پر حیران تھا۔ لاہور میں جب اس نے اسے کراچی جانے کا فیصلہ سنایا تھا، اس وقت سے لے کر دورانِ سفر اور آشا سے لاڈ بھری گفتگو تک کہیں اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا کہ وہ کسی المناک خبر کو سن کر یہاں آئی ہے اور کسی بات پر دُکھی ہے لیکن اب وہ سراپا غم نظر آ رہی تھی۔ کمال یہ تھا کہ نہ تو اس نے آنسو بہائے تھے، نہ لبوں سے سسکی نکلی تھی اور نہ ہی زبان پر کوئی حرفِ شکایت لائی تھی..... پھر بھی مجسم غم نظر آ رہی تھی۔

''ہمیں خود بھی رتی کی جوان موت پر بہت دکھ ہے۔ اس نے تھوڑے سے عرصے میں ہمیں بہت سُکھ دیا تھا اور ہمارے بہت قریب ہوگئی تھی۔ ہم نے بھی بدلے میں اسے نوازنے میں کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمیں جتنا نہال کیا تھا، ہم نے اسے اس سے زیادہ نوازا تھا۔ لیکن ہم کسی کی قسمت بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔ وہ جتنی عمر لکھوا کر لائی تھی، اتنا ہی جی۔ ڈینگی بخار تو سمجھو کہ موت کا بہانہ بن گیا۔ ورنہ تو ہم نے کتنوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد صحت یاب ہوتے دیکھا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو تو اتنا اچھا ٹریٹمنٹ بھی نہیں ملتا جتنی توجہ سے ہم رتی کا علاج کروا رہے تھے۔''

''میں سب جانتی ہوں نواب صاحب! آپ کی میری کوئی آج کی جان پہچان نہیں ہے جو میں آپ کی دریا دلی کو نہ جانتی۔ پر جب اس بے چاری کا وقت ہی پورا ہوگیا تھا تو آپ کیا کر سکتے تھے؟'' شالنی نے فوراً نواب صاحب کی دل جوئی کی ذمے داری لی۔ خاموش سامع بنے جاوید علی نے اس بار غور کیا تو اسے نواب صاحب، شالنی سے بھی بڑھ کر دُکھی نظر آئے۔ اگر یہ ان کی شان کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس وقت وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہوتے۔

''ہم رتی کی کمی کو بہت محسوس کریں گے۔'' شالنی کے تسلی دینے کے باوجود نواب صاحب سخت آزردہ نظر آ رہے تھے۔

''مجھے آپ کے دل کی حالت معلوم ہے نواب صاحب! اسی لیے رتی کا بدل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔'' شالنی کے الفاظ نے جاوید علی کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ صورتِ حال خاصی حد تک اس کے سامنے واضح تھی۔ بظاہر وجیہہ اور بارعب نظر آنے والا نواب نوازش علی یقینی طور پر اخلاقی ابتری کا شکار تھا اور اپنی اس اخلاقی پستی کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے گرد ملازموں کے روپ میں خوب صورت خواجہ سراؤں کا ہجوم جمع کر لیا تھا۔



''یہ تو وقت بتائے گا کہ یہ رتی کا بدل ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ فی الحال آپ جائیں اور آرام کریں۔ رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے آپ کا تازہ دم ہونا ضروری ہے۔'' نواب صاحب نے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے شالنی کو جواب دیا۔ اس ایک نظر میں جو کچھ تھا، اسے محسوس کر کے جاوید علی مرد ہونے کے باوجود اندر سے کٹ کر رہ گیا۔

''دھنے واد نواب صاحب! واقعی مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ بھی آرام کریں۔ اگر کہیں تو رنجنی خدمت کے لیے آپ کے ساتھ آپ کی خواب گاہ میں چلی جائے گی۔'' اس سے کچھ بھی پوچھنے یا اسے بتانے کی زحمت کیے بغیر شالنی نے فراخ دلی سے نواب صاحب کو پیشکش کی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تین دن تک رتی کے مرنے کے سوگ میں اپنے ہر شغل سے دور رہیں گے۔'' نواب نوازش علی نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے ہاتھ سے بھی اشارہ کیا۔ اس کا جواب سن کر جاوید علی کے وجود میں سکون کی لہر سی دوڑ گئی ورنہ تو وہ ڈر گیا تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی صورتِ حال سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

''جیسی آپ کی اِچھا۔ بندی تو حکم کی غلام ہے۔'' شالنی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر درباری انداز میں اپنی تابعداری کا اظہار کیا۔

''ہم اب آرام کریں گے۔ رتی کے کریا کرم کے لیے آپ کو جس قسم کی بھی ضرورت ہو، ہمارے سیکرٹری کو بتا دیجیے گا۔ وہ آپ سے مکمل تعاون کرے گا۔''

نواب صاحب اتنا کہنے کے بعد کمرے میں مزید رُکے نہیں۔ جاوید علی نے اس بار ان کا دوسرے زاویے سے جائزہ لیا تو ان کے قدم غم کے باعث بوجھل محسوس ہوئے۔

''چل رنجنی! تُو بھی چل کر تھوڑا آرام کر لے۔ رات کو رتی کا کریا کرم کرنا ہے اس لیے آرام کا سمے ملنا مشکل ہو جائے گا۔'' نواب صاحب کے جاتے ہی شالنی نے جاوید علی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر کا رخ کیا۔ باہر ان کا اسی خوب رو خواجہ سرا سے سامنا ہوا جسے جاوید علی نے یہاں کا پروٹوکول آفیسر قرار دیا تھا۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں کاجل! تم رنجنی کے لیے کسی کمرے کا انتظام کر دو۔'' شالنی نے اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے شالنی جی! میں ایسا کرتی ہوں کہ اسے ابھی آشا کے کمرے میں بھیج دیتی ہوں۔ بعد میں اسے رتی کا کمرہ دے دیا جائے گا۔'' کاجل نے اسی متانت سے جواب دیا جس کا مشاہدہ جاوید علی یہاں آتے وقت ہی کر چکا تھا۔ اسے کاجل کے حوالے کرنے کے بعد شالنی خود آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد کاجل نے کسی ملازمہ کو آواز دی اور اسے رنجنی یعنی جاوید علی کو آشا کے کمرے تک پہنچانے کی ہدایت کی۔ ملازمہ فوراً ہی اسے لے کر چل پڑی۔

جاوید علی کی توقع کے خلاف وہ اسے کوٹھی کی مرکزی عمارت سے ہٹ کر کسی سرونٹ کوارٹر وغیرہ پر مشتمل حصے میں نہیں لے گئی تھی بلکہ مرکزی عمارت کی ایک بغلی گلی سے گزر کر اس کے پچھلے حصے میں لے گئی تھی۔ اس حصے میں قطار سے آمنے سامنے بنے کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ انہی دروازوں میں سے ایک پر اس نے دستک دی تو دروازہ کھول کر آشا سامنے آ گئی۔ وہ اس وقت بھی ڈرائیور کے یونیفارم میں تھی۔ البتہ سر پر کیپ موجود نہیں تھا اور اس کے بوائے کٹ بال نظر آ رہے تھے۔ یونیفارم کے ساتھ یہ ہیئر اسٹائل اس پر خاصا جچ رہا تھا۔

''کاجل دیدی نے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ آج یہ تمہارے کمرے میں ہی رہے گی۔ پھر کل سے اسے رتی کا کمرہ دے دیا جائے گا۔'' ملازمہ نے آشا کو پیغام دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ملازمہ کو مختصر جواب دیا اور مسکراتے ہوئے جاوید علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''آؤ رنجنی! اندر آجاؤ۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں خود اکیلے رہنے سے گھبرا رہی تھی۔ بہت اچھا ہوا کہ کاجل دیدی نے آج کے لیے تمہیں میرا مہمان بنا دیا۔'' وہ ہاتھ تھامے تھامے اسے اندر لے گئی۔ یہاں موجود خواجہ سراؤں کا جو عجیب وغریب کردار ذرا سی دیر میں اس کے سامنے آیا تھا، اس کے پیشِ نظر اسے آشا کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کی وجہ سے بڑی اُلجھن محسوس ہو رہی تھی لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر برداشت کرے۔

''بڑے سخت ہاتھ ہیں تمہارے۔ کیا اب تک اینٹیں ڈھونے کا کام کرتی رہی ہو؟'' وہ سی ایف پی کا ایک تربیت یافتہ نوجوان تھا جسے لڑائی بھڑائی اور ہتھیار چلانے جیسے مردانہ اوصاف سکھائے گئے تھے، اس کے ہاتھوں کو سخت تو ہونا ہی تھا اور یہ بات آشا نے فوراً ہی محسوس کر کے اسے ٹوک دیا تھا۔

''اینٹیں تو نہیں ڈھوئیں لیکن بڑی مشقت میں جیون بتایا ہے اس لیے ہاتھ تو سخت ہونے ہی تھے۔'' جاوید علی نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں اسے جواب دیا۔ ساتھ ساتھ وہ آشا کے کمرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ فردِ واحد کی ضروریات کے اعتبار سے سجایا گیا یہ کمرہ کسی بھی طرح ایک ملازم کا کمرہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں ٹیلی ویژن سے لے کر روم ریفریجریٹر تک ہر سہولت موجود تھی۔ فرش پر بچھا قالین اور کھڑکیوں پر پڑے پردے بھی خاصے بیش قیمت تھے۔ غرض بغیر تعارف کے اس کمرے میں داخل ہونے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی ملازم کے کمرے میں آیا ہے۔

''دُکھیاری معلوم ہوتی ہو۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ یہاں تھوڑے دن رہو گی تو سارے غم بھول جاؤ گی۔ یہاں جیون کا ہر سُکھ موجود ہے۔ بس ایک نواب صاحب کا من جیت لو، پھر کوئی پریشانی تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔'' اسے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آشا نے خود ایک کرسی سنبھال لی۔

''ان کا من جیتنے کا گُر تو تم ہی مجھے سکھانا۔ میرے لیے تو یہ بڑی انوکھی دنیا ہے اور مجھے یہاں کی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ شالنی دیدی اتنی جلدی میں مجھے یہاں لے کر آئی ہیں کہ انہیں کچھ بتانے اور مجھے پوچھنے کا سے ہی نہیں ملا۔ مجھے تو نام کے علاوہ نواب صاحب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔'' اس نے پلکیں جھپکا کر نہایت معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتیاط سے آشا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے؟ میں تمہیں بتا دیتی ہوں نواب صاحب کے بارے میں۔ نواب صاحب کا تعلق بھارت کی ایک ریاست سے ہے۔ ان کے آباؤ اجداد وہاں رہتے تھے۔ پاکستان بنا تو ان کے ماتا پتا اپنا سب مال اسباب سمیٹ کر یہاں چلے آئے۔ نواب صاحب اپنے ماتا پتا کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ماتا پتا دونوں کا ہی دیہانت (انتقال) ہو چکا ہے۔ نواب صاحب اپنے سُورگ باشی ماتا پتا دونوں سے ہی بڑا پریم کرتے تھے اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند سے دو الگ الگ عورتوں سے بیاہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں رہتی ہیں۔ بڑی بیگم کے دو بیٹے ہیں اور دونوں مری کے کسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ چھوٹی بیگم کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی یہیں رہتی ہے جبکہ بیٹا مری میں پڑھ رہا ہے۔ نواب صاحب کے پریوار میں عورتوں کو پردہ کروانے کا رواج ہے اور شروع ہی سے یہ ریت چلی آ رہی ہے کہ زنان خانے میں کسی مرد ملازم کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ ان کی جگہ خواجہ سراؤں سے



کام لیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے پرکھوں کی اس ریت کو قائم رکھا اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پوری کوٹھی میں کسی مرد ملازم کا گزر نہیں ہے۔ ڈرائیور، خانساماں، مالی، چوکیدار سب کے سب خواجہ سرا ہیں۔ نواب صاحب کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا مرد رہتا ہے تو وہ ان کا بڈھا سیکرٹری ہے۔ اسے بھی بغیر نواب صاحب کی اجازت کے کوٹھی کی مرکزی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اور وہ پیچھے انیکسی کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ نواب صاحب کے بہت کم دوست ایسے ہیں جنہیں انہوں نے کوٹھی پر آنے کی اجازت دے رکھی ہو۔ جنہیں اجازت ہے، وہ بھی انیکسی میں بنے ڈرائنگ روم تک ہی آتے ہیں۔ باقی پوری کوٹھی میں ہم لوگوں ہی کا راج ہے۔''

آشا نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں جو اضافہ کیا، اس سے نواب نوازش علی کا کردار اور بھی اُلجھ گیا۔ وہ عجیب ہی آدمی تھا جس نے دو دو بیویوں اور بچوں کے ہوتے ہوئے کوٹھی میں یہ اِندر سبھا سجا رکھی تھی۔ شاید بیٹوں کو یہاں سے دُور مری میں رکھ کر تعلیم دلوانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ ان کے سامنے باپ کا کردار نہ کھل سکے۔ رہی بیٹی اور بیویاں تو یقینی طور پر ان خواتین کو اس نے اتنی پابندیوں میں جکڑ رکھا ہو گا کہ وہ کوٹھی کے اوپری پورشن سے نیچے اُترنے کی بھی جرأت نہ کر پاتی ہوں گی۔

''پہلی بار ایسے کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔ سن کر بڑا عجیب لگ رہا ہے۔'' اس نے آشا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''نواب صاحب عجیب ہیں پر بڑے دیالو ہیں۔ ایسا عیش تمہیں یہاں کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا۔ یہ میرا کمرہ تم دیکھ رہی ہو۔ اس کوریڈور میں موجود سارے کمرے ایسے ہی بلکہ بعض اس سے بھی زیادہ شاندار ہیں۔ میرے سامنے والا کمرہ رتی کا ہے۔ آئندہ تم وہاں رہو گی۔ اور جانتی ہو کہ رتی کا کمرہ میرے کمرے سے بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ رتی، نواب صاحب کی بہت لاڈلی تھی اور یہ تمہاری لک ہے کہ تم بغیر کسی محنت کے اس کی جگہ لے رہی ہو۔'' آشا کے لہجے میں اس کے لیے ایک غیر محسوس سا حسد تھا۔

''یہ تو شالنی دیدی کی مہربانی ہے۔ وہ ہی مجھے رتی کی جگہ لے کر آئی ہیں۔'' اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

''جب ہی تو کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ شالنی دیدی ہم سب کی محسن ہیں۔ انہی کی وجہ سے ہم سڑکوں پر ماری ماری پھرنے کے بجائے یہاں عیش سے رہ رہی ہیں۔ وہ یہاں جس کو جو چاہے، جگہ دلوا دیں۔ ہم میں سے کوئی ان کے سامنے منہ نہیں کھولتا۔'' آشا نے اسے بتایا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔

''شما کرنا، باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ تمہاری کچھ خاطر کرنی چاہیے۔ کہو تو اورنج جوس دے دوں؟ کیونکہ میرے خیال میں ابھی تم کچھ اور تو پینے کی عادی نہیں ہوئی ہو گی؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''اورنج جوس ٹھیک ہے۔'' اس کی بات پر کوئی کمنٹ دیے بغیر جاوید علی نے محتاط جواب دیا۔

وہ اس کے لیے اورنج جوس کا ٹن پیک نکال کر لے آئی جبکہ خود اپنے لیے اس نے جس سنہری سیال کا انتخاب کیا تھا، اس کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ ام الخبائث ہے۔

''ڈیوٹی ٹائم میں مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن نواب صاحب نے بتا دیا ہے کہ اب وہ کل دوپہر سے پہلے کہیں نہیں جائیں گے۔ اس لیے میں آزاد ہوں۔'' وہ اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''نواب صاحب رتی کی موت پر بہت دُکھی معلوم ہوتے ہیں۔'' جاوید علی نے مزید جاننے کی خواہش میں یہ چھوٹا سا فقرہ ادا کیا۔

"چنتا نہ کرو۔ چند دن کا دکھ ہے۔ تم نے انہیں سنبھال لیا تو پھر وہ بھول کر بھی دوبارہ رتی کا نام نہیں لیں گے۔ یہاں تو یہی چلتا ہے۔ جو موجود ہے، وہ سب کچھ ہے..... جو چلا گیا اسے کوئی یاد نہیں کرتا۔" آشا نے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"یہ رتی کیا شالنی دیدی کی کوئی رشتے دار ہے جو وہ اتنی دور سے اس کے کریا کرم کے لیے آئی ہیں؟" آشا کو شغل میں مصروف ہوتا دیکھ کر اس نے اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ ترنگ میں آ کر اسے جتنا بتا دیتی، وہ جاننے کے لیے شاید اسے یہاں کئی دن سر کھپانا پڑتا۔ اور یہاں کے جو حالات تھے، انہیں دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ نواب صاحب اسے رتی کی جگہ دینے پر تُل جاتے تو وہ ان سے اپنی اصلیت کیونکر چھپا پاتا۔ اور اصلیت کھل جانے کے بعد اس کا یہاں ایک پل کے لیے بھی ٹکنا ممکن نہیں تھا۔

"شالنی دیدی کا ہم میں سے کسی سے بھی کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے لیکن وہ ہمارے لیے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ وہی ہیں جن کے کارن ہم میں سے کئی کا جیون بدلا۔ تمہیں یہاں جو ملازمائیں نظر آ رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر شالنی دیدی کی مہربانی سے ہی یہاں پہنچی ہیں۔ تم ہم میں سے ہو اس لیے اچھی طرح جانتی ہو گی کہ سماج ہمارے ساتھ کتنا برا سلوک کرتا ہے اور ہمیں کیسے ترس ترس کر جیون بتانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر ہمارا ہر دُکھ، سُکھ میں بدل گیا اور اس احساس کے بدلے اگر ہمیں شالنی دیدی پر اپنا جیون بھی وارنا پڑے تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔" آشا کچھ زیادہ ہی شالنی سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

جاوید علی کو اندازہ تھا کہ چالاک اور مکار شالنی کے لیے ان ٹھکرائی ہوئی انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لینا کتنا آسان ثابت ہوا ہو گا اور یقیناً اس کی یہ ساری جدوجہد بے مقصد نہیں تھی۔ اس سارے سیٹ اپ کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا اور اسے اسی راز تک پہنچنا تھا۔

"مجھے تو شالنی دیدی اور نواب صاحب کی دوستی بھی عجیب لگ رہی ہے۔ نواب صاحب اتنے کٹر مسلمان ہیں کہ اس دور میں بھی اپنے گھر کی عورتوں کو پردہ کرواتے ہیں، ایسے میں ان کی ایک ہندو خواجہ سرا سے اتنی دوستی سمجھ نہیں آتی۔" اورنج جوس کا گلاس خالی کرتے ہوئے اس نے آشا کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"کٹر مسلمان....." آشا استہزا سے ہنسی۔ "اپنے نواب صاحب کی ساری مسلمانی بس عورتوں کو پردہ کروانے تک ہی ہے۔ عیدوں کے علاوہ میں نے کبھی انہیں نماز کے لیے جاتے نہیں دیکھا۔ روزوں کو وہ اپنی صحت کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ شراب ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔ باقی بھی ہر وہ شغل فرماتے ہیں جس سے ان کا دھرم روکتا ہے۔ یہاں ہم خواجہ سراؤں کی اتنی بڑی نفری دیکھ کر بھی کیا تمہیں نواب صاحب کے مزاج کی سمجھ نہیں آئی؟" نواب صاحب کی شخصیت پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے آشا نے اس سے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن پیسے والوں کے اپنے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ میں نے تاریخ میں ایسے کئی سورماؤں کے قصے پڑھے ہیں جو کہنے کو تو اسلام کی سربلندی کے لیے ساری عمر لڑتے رہے لیکن ان کے سارے شوق و مشاغل وہی تھے جو تم نے جناب نواب صاحب کے بتائے ہیں۔" جاوید علی کے پاس معقول جواب موجود تھا۔

"بس تو سمجھ لو کہ نواب صاحب بھی انہی دوغلے لوگوں میں سے ہیں۔ شالنی دیدی سے انہیں ان کے کسی دوست نے ملوایا تھا۔ دیدی کو معلوم پڑا کہ نواب صاحب اپنی کوٹھی پر صرف جوان اور خوب صورت خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنا پسند کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے پاس سے انہیں دو ملازمائیں تحفے میں بھی دیں۔ بس اس کے



بعد سے یہ سلسلہ چل پڑا۔ اب نواب صاحب بس اسی خواجہ سرا کو ملازم رکھتے ہیں جس کی سفارش شالنی دیدی نے کی ہو۔ نواب صاحب پچیس چھبیس سے اوپر کی ملازمہ کو پسند نہیں کرتے اس لیے یہاں آنے والوں کو جلدی ریٹائرمنٹ مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کسی ملازمہ سے نواب صاحب کا دل بھر جائے تو وہ اسے عمر سے پہلے بھی ریٹائر کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہر ایک اتنا کما لیتی ہے کہ بعد میں بھی زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ خود شالنی دیدی یہاں سے ریٹائر ہونے والیوں کو اپنے پاس رکھ لیتی ہیں یا پھر اپنے جاننے والوں میں سے کسی کے ہاں جگہ دلوا دیتی ہیں۔" آشا اسے بڑی کارآمد معلومات فراہم کر رہی تھی۔

"تمہاری زبانی شالنی دیدی کے بارے میں سن کر میں تو ان کی گرویدہ ہو گئی ہوں۔ وہ واقعی مہان ہیں جو انہیں اپنی برادری کا اتنا خیال ہے۔ اب دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ وہ کوئی ناتا نہ ہونے کے باوجود اتنی دور سے رتی کے کریا کرم میں شامل ہونے کو آئی ہیں۔" جاوید علی نے جان بوجھ کر ایسے جملے ادا کیے جن سے آشا کو لگے کہ واقعی وہ شالنی سے بہت متاثر ہو گیا ہو۔

"دیدی ایسی ہی ہیں۔ میں جب سے یہاں ہوں، یہی دیکھ رہی ہوں کہ وہ ہمارے ہر دُکھ سُکھ میں جی جان سے شریک ہوتی ہیں۔ انہیں تو ہماری ان ضرورتوں کا بھی خیال ہے جنہیں عام لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں تیسری صنف میں رکھنے والوں کو لگتا ہے کہ ہم ہر جذبے سے عاری ہیں اور ہمیں کسی آسودگی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن دیدی اس بات کو سمجھتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی نواب صاحب سے تعلق پر اعتراض نہیں ہے۔ جواب میں دیدی نے ہمیں ان سے اجازت دلوا رکھی ہے کہ وہ ہمارے آپس کے تعلق پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک خوش ہے۔ نواب صاحب اگر ہمیں اپنے کسی دوست کے پاس بھیجیں تو بھی ہمیں انکار نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سے بھی ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ میں بائیس سال کی ہوں۔ ابھی میرے پاس تین سے چار سال اور ہیں۔ اس عرصے میں، میں جتنا کما سکتی ہوں، کما لوں گی۔ کمائی کے علاوہ دوسرے مزے اپنی جگہ ہیں۔ پھر بعد میں تو مجھے شالنی دیدی کے چرنوں میں ہی جا کر بیٹھنا ہے۔ ان کا ساتھ جو مزہ دیتا ہے، وہ آج تک مجھے کہیں نہیں ملا۔"

آشا نے آنکھیں میچ کر چٹخارا لیا تو جاوید علی نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ وہ بوبی کے پاس کئی دن رہا تھا لیکن اس کی رہائش گاہ پر اسے ایسی کسی خرافات کی ذرا سی بھی سن گن نہیں ملی تھی بلکہ اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے بوبی نے اس کے دل میں اپنے لیے خاصی عزت بنا لی تھی۔ جبکہ شالنی کو اس نے ملاقات کے پہلے لمحے میں ہی ناپسند قرار دے دیا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ اسے یہاں آ کر سمجھ آ رہی تھی۔ شیطانی کھیل کھیلنے والی شالنی یقینی طور پر شیطان کے ان چیلوں میں سے تھی جن کی کارکردگی پر شیطان جھوم جھوم اُٹھتا ہو گا لیکن پاکیزہ روحوں کے لیے تو ان کے وجود کی بو بھی ناگوار تھی۔

"باتوں میں بہت سے بیت گیا۔ تُو تھوڑی دیر آرام کر لے۔ تیری وجہ سے میرا من بہل گیا ورنہ سامنے والی کے خالی کمرے سے تو مجھے ہول آ رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی اس کا بھوت نکل کر یہاں آ گھسے گا۔" جاوید علی کی طرف سے مزید کوئی سوال نہ اٹھائے جانے پر خاموشی کا وقفہ آیا تو آشا کو اس کے آرام کا خیال آیا۔

"کیا رتی کی لاش ابھی اس کے کمرے میں رکھی ہے؟" اس کی بات سن کر جاوید علی نے پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ آشا جس دھرم سے تعلق رکھتی ہے، وہاں مُردوں سے بڑا ڈرا جاتا ہے اور وہ لوگ مرنے کے بعد اپنے ہی پیاروں کا بھوت چمٹ جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان سے یہ بدعقیدگی مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئی تھی اور اس نے ایسے کئی مسلمانوں کو دیکھا تھا جو مُردے کے ساتھ تنہا کمرے میں بیٹھتے ہوئے خوف

کھاتے تھے۔ حالانکہ روح نکل جانے کے بعد باقی رہ جانے والے خاک کے پُتلے میں تو اتنی سکت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو ہی اُڑا سکے۔ کسی کو نفع ونقصان پہنچانے کا تو کیا ہی سوال تھا۔

''رتی کی لاش سامنے کمرے میں رکھی ہوتی تو میں تمہیں ہرگز بھی یہاں نظر نہیں آتی۔ اسے تو تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہی شالنی دیدی کے کچھ جاننے والے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ اسے اشنان وغیرہ کروا کر پوری تیاری کے ساتھ رات کو ادھر لائیں گے۔ پھر یہاں سے ہم سب اسے اپنے ساتھ شمشان گھاٹ لے جا کر اگنی دیں گے۔'' آشا کے جواب سے اس پر باقی کا پروگرام بھی واضح ہو گیا۔

''اچھا تُو آرام کر، میں جا کر شالنی دیدی سے پوچھ لوں کہ اُنہیں کوئی کام تو نہیں ہے۔'' باتونی آشا اسے خاصی معلومات فراہم کر چکی تھی اس لیے اس نے اسے روکا نہیں۔ یوں بھی اسے اندازہ تھا کہ شالنی اور اس کے درمیان جس نوعیت کے تعلقات ہیں، وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گی اور روکے نہیں رُکے گی۔

اسے ایئرپورٹ پر ہونے والی ان دونوں کی ملاقات میں عجیب وغریب رویّے کی وجہ بھی اب اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آشا اپنے باتونی پن کی وجہ سے اسے اتنا سب کچھ بتا گئی تھی یا پھر شالنی نے خاص طور پر اسے آگاہ کرنے کی ذمے داری آشا کو سونپی تھی کہ اگر اس کی طرف سے کوئی اعتراض یا رکاوٹ ہو تو اس کے علم میں آ جائے۔ لیکن جاوید علی نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی ناگواری کا اظہار ہو سکتا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر ہی ان کے درمیان رہ سکتا تھا لیکن یہ تھا بہت نازک کام۔ اسے اپنی حقیقت کھلنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کر سکے۔ لیکن پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت کم مہلت ہے۔ وہ مصنوعی سہاروں سے بہت دن تک انہیں دھوکا دے کر ان کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا۔

❀-----✪-----❀

ہینگرز میں لگے ملبوسات کو اِدھر سے اُدھر سرکاتے ہوئے ذیشان نے کچھ فاصلے پر موجود حسینہ کو دیکھا۔ وہ موہنی تھی۔ وہی قتالہ جس سے وہ ایک وزیر موصوف کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ پر ملا تھا اور اس کی حرکات وسکنات دیکھتے ہوئے اسے شک گزرا تھا کہ یہ عورت دشمن کی جاسوس بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہود وہنود دونوں کا ہی وتیرہ تھا کہ وہ مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے عورتوں کے حُسن اور مکارانہ اداؤں کو جنگی حکمتِ عملی سمجھتے ہوئے ان کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ موہنی اسے اسی قبیل کی فرد لگی تھی اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو اس کی مستقل نگرانی پر مامور کر دیا تھا اور نگرانی کے نتیجے میں یہ حقائق سامنے آئے تھے کہ اس کا اہم حکومتی شخصیات اور سیاست دانوں سے قریبی تعلق تھا۔ وہ ان میں سے کئی کے ساتھ تواتر سے دیکھی گئی تھی اور بعض ملاقاتوں کے بعد کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں جنہیں سامنے رکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ ان بارسوخ شخصیات کو صرف دادِ عیش دینے کے لیے ان سے ملتی تھی۔ وہ محض پیسے کے لیے کام کرنے والی کال گرل سے کہیں اوپر کی چیز لگتی تھی۔ آخری بار اس نے جس شخصیت سے ملاقات کی تھی، اس نے پاکستان اور بھارت کے مابین قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس تبادلے کا جو سب سے قابلِ اعتراض نکتہ تھا، وہ یہ تھا کہ پاکستان کی طرف سے پندرہ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا جبکہ بھارت جواب میں صرف چھ قیدی رہا کر رہا تھا۔ ذیشان نے بھارت کے رہا کیے جانے والے قیدیوں کی فہرست اپنے پاس منگوالی تھی اور ان کے بارے میں دیگر معلومات بھی۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا کہ رہائی کے لیے جن قیدیوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں دو نام ایسے بھی ہیں جن پر جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا تھا لیکن خاطر خواہ ثبوت حاصل



نہ ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی گئی۔

ان دونوں کا کہنا تھا کہ وہ ماہی گیر کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا بیان کتنے فیصد درست تھا، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ مبینہ طور پر دشمن کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے اور انہیں موقع ملتا تو وہ ایسی کارروائی کرتے جس سے ملک کو نقصان پہنچایا جا سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کو اگر سخت سزا نہ بھی دی جاتی تو بہرحال وہ اس لائق تو نہیں تھے کہ انہیں آزاد کر دیا جاتا۔ اس طرح تو دشمن کے حوصلے بلند ہو جاتے کہ وہ جب چاہتے شر پسند عناصر کو پاکستان کی حدود میں داخل کر دیتے اور جب چاہتے نکال کر لے جاتے۔ اس واقعے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ موہنی کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ موہنی جیسی ساحروں کے توڑ کے لیے ابھی کچھ لوگ پاکستان میں موجود ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی آخری سانس تک پاکستان کی سلامتی کے لیے لڑتے رہیں گے۔

آج وہ موہنی جیسے فتنے کے سدِباب کے لیے ہی اس شاپنگ مال میں موجود تھا۔ موہنی کی نگرانی پر مامور افراد کو اس کی ہدایت تھی کہ جب بھی انہیں موہنی کسی پبلک پلیس پر تنہا نظر آئے، اسے آگاہ کر دیا جائے۔ اتفاق سے یہ موقع جلد ہی مل گیا تھا اور اب وہ یہاں اس کے قریب موجود تھا۔ ملبوسات دیکھتی ہوئی موہنی قدم اٹھاتی اسی جانب آ رہی تھی جہاں وہ ایک ہینگر اسٹینڈ کے پیچھے کھڑا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ اسٹینڈ کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''واٹ آفنٹاسٹک سرپرائز! آپ کو یہاں دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔'' اس کا حیرت وخوشی کا ملا جلا اظہار بڑا بے ساختہ تھا۔ موہنی نے اس کی آواز پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور چند ثانیوں میں پہچان کے مراحل طے کر گئی۔

''یقین نہ آنے کی کیا بات ہے؟ ساری خواتین کی طرح مجھے بھی شاپنگ کا شوق ہے اس لیے میرا کسی شاپنگ سینٹر میں موجود ہونا کوئی اتنا ناقابلِ یقین واقعہ نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کر تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے آپ کی یہاں موجودگی پر حیرت نہیں ہے بلکہ میں اس اتفاق پر خوش ہو رہا ہوں کہ ہم دونوں ایک وقت میں یہاں موجود ہیں ورنہ اس رات فنکشن میں جس طرح آپ نے مجھے ہری جھنڈی دکھائی تھی، مجھے اُمید نہیں رہی تھی کہ میں پھر کبھی آپ سے مل سکوں گا۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار جاری رکھا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ہمارا دوبارہ ملنا اس اتفاق کے سوا ذرا مشکل ہی تھا۔ ایکچوئیلی میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ آج بھی بڑی مشکل سے شاپنگ کے لیے وقت نکال سکی ہوں..... بلکہ سچ پوچھیں تو سب سے چھپ کر بھاگ نکلی ہوں ورنہ کوئی نہ کوئی جان کو اٹک ہی جاتا ہے۔ بے شک میں بہت سوشل ہوں لیکن کبھی کبھی تو بندے کا اکیلے رہنے کا بھی ول چاہتا ہے، خصوصاً شاپنگ میں اکیلے کسی کے عمل دخل کے بغیر کرنا پسند کرتی ہوں۔'' وہ جس لیول کی عورت تھی، ایک سکیورٹی ایجنسی کے منیجر کی حیثیت سے ذیشان اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لیے صاف لفظوں میں بہت کچھ جتا گئی۔

''اوہ.....'' اس کی بات سن کر ذیشان نے افسردگی سے چہرہ لٹکا لیا۔ ''میں تو خوش ہو گیا تھا کہ اگر آپ یہاں شاپنگ کر رہی ہیں تو میری بھی تھوڑی سی ہیلپ کر دیں گی۔ اصل میں، میں اپنی سسٹر کے لیے کوئی اچھا ڈریس خریدنے کے لیے آیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایک خاتون کی پسند مجھ سے بہتر ہو گی۔'' موہنی کا موڈ دیکھنے کے باوجود اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کے قریب رہنے کا موقع نکال سکے۔

''سوری مسٹر! ایک تو میرے پاس خود اپنی شاپنگ کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لیے آپ کی ہیلپ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ دوسرے میرا اندازہ ہے کہ میرے اور آپ کی سسٹر کے ٹیسٹ میں بہت فرق ہو گا۔ مجھ جیسی ماڈرن لڑکی کے لیے کسی گھریلو خاتون کے ڈریس کی خریداری میں مدد دینا کسی طور ممکن نہیں ہے۔''
اس نے صاف انکار کیا۔ اب ذیشان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مزید اصرار کر سکتا چنانچہ 'بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے' کی تفسیر بنے اس سے رخصت لینا ہی مناسب سمجھا۔

''ٹھیک ہے موہنی جی! جیسی آپ کی خوشی۔ آپ آرام سے اپنی شاپنگ کیجیے، میں بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گا۔'' مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ وہاں سے چل پڑا اور اس حد تک دُور ہٹ گیا کہ موہنی کو نظر نہ آ سکے۔ لیکن حقیقتاً اب بھی اس کی نظریں موہنی کی نگرانی کر رہی تھیں اور وہ نیا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ اصل میں اس نے طے کر لیا تھا کہ اب موہنی کو مزید ڈھیل دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے آج اسے اغوا کرنے کا سوچ کر ہی روانہ ہوا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ کسی بہانے موہنی کے ساتھ نتھی ہو جائے گا اور ادھر اس کے آدمی پارکنگ میں کھڑی موہنی کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کر دیں گے۔ موہنی کے ساتھ ہونے کی صورت میں وہ اس کے ساتھ ہی پارکنگ تک پہنچتا اور جب وہ گاڑی کی خرابی کی وجہ سے اسے اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہتی تو وہ فوری طور پر اسے لفٹ کی پیشکش کر دیتا۔ اس طرح بغیر کسی ہنگامے کے بہت آسانی اور خاموشی سے اس کا اغوا عمل میں آ جاتا لیکن موہنی نے تو پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیا تھا اور کسی صورت اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ صورتِ حال میں اسے نئی حکمتِ عملی سے کام لینا تھا۔ ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کے عادی اس کے دماغ نے فوراً ہی متبادل حل سوچ لیا اور وہ باہر موجود اپنے آدمیوں کو کوڈ ورڈ میں احکامات جاری کرنے لگا۔

اس دوران بھی اس کی نظریں موہنی سے نہیں ہٹی تھیں اور وہ اسے مسلسل نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ پے در پے کئی ملبوسات دیکھنے کے باوجود ابھی تک اس نے کسی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک مخصوص حصے سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور بار بار انہیں ملبوسات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھی۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر اسے یہاں کچھ پسند نہیں آ رہا تھا تو وہ کسی اور پورشن کا رخ کر لیتی۔ اتنے بڑے شاپنگ سینٹر میں یہ واحد جگہ نہیں تھی جہاں زنانہ ملبوسات دستیاب تھے۔ اور بھی کئی جگہ اس سے اچھی ورائٹی موجود تھی لیکن جب سے شاپنگ سینٹر پہنچی تھی، ایک خاص حصے تک ہی محدود تھی۔ اگلے دو تین منٹوں میں اس کی یہ اُلجھن بھی سلجھ گئی۔ وہ درمیانی عمر کا جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک آدمی تھا جو بظاہر وہاں خریداری کی غرض سے ہی آیا تھا لیکن جب وہ اس اسٹینڈ پر پہنچا جہاں موہنی ملبوسات دیکھ رہی تھی تو اس نے موہنی سے کچھ کہا۔ موہنی نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ اس آدمی کے وہاں پہنچتے ہی اس کے چہرے پر موجود کوفت بھرے تاثرات غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔

موہنی کی مسکرا کر کہی بات کے جواب میں وہ ایک بار پھر کچھ بولا اور اس بار موہنی نے کچھ کہے بغیر اپنے شانے پر لٹکے اسٹائلش سے پرس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پرس کی زپ کھولنے کے بعد اس کا ہاتھ رینگتا ہوا اندر گیا اور پھر پرس میں سے کوئی شے نکل کر جینز والے کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔ وہ کیا چیز تھی، یہ تو ذیشان نہیں دیکھ سکا لیکن اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ دراصل اسی شے کی منتقلی کے لیے موہنی شاپنگ کے بہانے یہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ملاقات کا مقام طے ہو گا اس لیے وہ ایک مخصوص ایریے سے باہر نہیں نکلی تھی اور جو کچھ اسے آنے والے کو دینا تھا، وہ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد دے چکی تھی۔ وہ آرمی انٹیلی جنس سے براہِ راست سی ایف پی میں آیا تھا اس لیے خاص اشیاء کے تبادلے کے لیے اس قسم کا طریقِ کار اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔



اس نے فوراً ہی اپنے ماتحت سے رابطہ کیا۔

''نیلی جینز اور خاکی ٹی شرٹ میں ایک بندہ یہاں موجود ہے۔ اس کی ناک کی پھنگ پر ایک موٹا سا مسا ہے۔ اس شخص پر پوری نظر رکھنی ہے اور موقع ملتے ہی قابو کر کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کام کے لیے تمہیں زیادہ افراد کی ضرورت پڑے اس لیے پلان نمبر ون پر کام کرنے کے لیے میں خود آ رہا ہوں۔ یوسف سے کہو کہ وہ گاڑی سے باہر نکل آئے۔'' اس نے صرف وقت بچانے کے لیے آپریٹس کا استعمال کیا تھا ورنہ اس کے قدم تیزی سے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بات پوری ہونے تک وہ سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ چکا تھا اور اب تقریباً بھاگتا ہوا پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ماتحت کو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیوں تک آ جائے تاکہ مطلوبہ شخص نظر میں آئے بغیر وہاں سے نکل نہ سکے۔

پارکنگ ایریا میں رک کر انتظار کرنے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ شخص کسی سواری پر نہ آیا ہو اور پیدل ہی یہاں سے نکل جائے۔ وہ سیڑھیوں سے اُتر کر پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے اپنے ماتحت کو سیڑھیوں کے قریب دیکھ لیا تھا۔ وہ خود تیزی سے پارکنگ میں پہنچا۔ وہاں اس کا ماتحت موجود تھا۔

''وہ بلیک کرولا سر!'' اس نے موہنی کی گاڑی کی نشاندہی کی۔ ذیشان تیزی سے آگے بڑھا اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کے بعد اپنے جسم کو سمیٹ کر پائیدان میں سما گیا۔ گاڑی کے دروازے کا لاک کھولنے کا کارنامہ یقیناً اس کے کسی ماتحت نے ہی انجام دیا تھا۔ پہلے ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس کا کوئی ماتحت موہنی کی گاڑی میں چھپ جائے گا اور موقع دیکھ کر راستے میں اسے قابو میں کر لے گا۔ باقی لوگ الگ الگ گاڑی میں ان کا پیچھا کرتے۔ تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں مدد کر سکیں۔ لیکن شاپنگ سینٹر میں موہنی سے ملنے والے مشکوک شخص کے سامنے آنے کے بعد اس نے پروگرام میں فوری تبدیلی کر لی تھی۔ اب وہ اکیلا موہنی کو قابو میں کرتا جبکہ اس کے ساتھی اس دوسرے آدمی سے نمٹتے۔ پائیدان میں پڑا وہ پوری طرح سے چوکنا تھا اور موہنی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی آ جائے گی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق وہ جس مقصد کے تحت شاپنگ سینٹر آئی تھی، وہ پورا ہو چکا تھا۔

اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد ہی اس نے گاڑی کے قریب قدموں کی آواز سنی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی فرنٹ ڈور کا لاک کھول رہا ہے۔ لاک کھلتے ہی اس کے نتھنوں سے وہ خوشبو ٹکرائی جو تھوڑی دیر پہلے وہ شاپنگ سینٹر میں موہنی کے وجود سے اُٹھتی محسوس کر چکا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے اطمینان سے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی پارکنگ سے باہر لے آئی۔ ذیشان چپ چاپ پائیدان میں دبکا رہا۔ وہ پُرہجوم جگہوں سے نکلنے سے قبل اسے نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ شور مچا دیتی اور خواتین کی ہمدردی میں مبتلا کچھ سورما خوامخواہ اس معاملے میں کود پڑتے۔ وہ اس قسم کی کسی اُلجھن سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ انتظار کرتا رہا۔

موہنی خاصے خوشگوار موڈ میں تھی اور ٹیپ ریکارڈر پر انگریزی گانوں کا کیسٹ لگائے خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ جیسی خوش ذوق خاتون نے مجھ جیسے ہینڈسم آدمی کے ساتھ بے رخی کیوں برتی؟ آپ کو تو فوراً سے پیشتر مجھ سے دوستی کر لینی چاہیے تھی۔'' مناسب مقام دیکھ کر وہ پائیدان سے نکل کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

موہنی نے اس کے بولنے سے قبل اسی وقت اس کو دیکھ لیا تھا جب وہ پائیدان سے نکل کر سیٹ پر بیٹھا تھا۔

یقیناً وہ چونکی بھی تھی لیکن کمال پھرتی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد اب چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجائے اسے بیک ویو مرر میں دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اسے خاموش دیکھ کر ذیشان نے اسے چھیڑا۔

''اس طرح لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والے کسی شخص سے دوستی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور آواز میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''میں گاڑی سائیڈ میں کر کے روکتی ہوں۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے نیچے اُتر جائیں اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دینا میرے لیے بہت آسان ہے۔

''میں تمہاری پہنچ کو جانتا ہوں لیکن گاڑی روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے بھی تمہارے خوبصورت بدن میں چھید کرتے ہوئے سخت افسوس ہوگا۔'' اس نے پستول کی نال اطمینان سے موہنی کے پہلو سے لگا دی۔

''اس کھلونے کی تباہ کاری سے تو تم اچھی طرح واقف ہوگی۔ اس میں سے نکلنے والی چند انچ کی گولی کئی فٹ کے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتی ہے.....اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ جن کے بل بوتے پر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو، ان کی ساری دلچسپی تمہارے خوش نما بدن کی گرمی تک محدود ہے۔ تم نہ رہیں تو وہ چند دن تمہارے لیے اُداس رہیں گے اور پھر کسی دوسری سیمیں بدن کے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔'' وہ اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے واقعی اس کا کوئی جنونی عاشق ہو اور اس کے دوستی سے انکار پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہو۔ مگر مقابل بھی موہنی تھی۔ مبینہ طور پر تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ۔ جو کسی طور بھی اس امکان کو رد نہیں کر سکتی تھی کہ کسی دشمن کی نظر میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بیک ویو مرر میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہدایات کے مطابق گاڑی چلاتی رہو۔'' اپنے لہجے میں تبدیلی لائے بغیر ذیشان نے جواب دیا۔

''اگر تم میری قربت کے خواہش مند ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد تم سے رابطہ کر کے تمہیں وقت دوں گی۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ اگر میں واپس نہیں پہنچی تو جلد بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اور تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔'' وہ نرم گرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں جو تمہارے وعدے پر اعتبار کر لوں۔ جو بھی مشکل پیش آئے گی، میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم صرف خاموشی سے میرے کہے پر عمل کرو۔ اور ہاں، اب جو چوراہا آئے، اس سے بائیں طرف گاڑی موڑ لینا۔'' اس نے کسی جنونی ہی کی طرح بے لچک لہجے میں اسے جواب دیا۔ موہنی ہونٹ بھینچ کر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پینترا بدلا اور نرمی سے بولنے لگی۔

''تم واقعی ہینڈسم آدمی ہو۔ مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ میرا کس لیول کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار اور وزراء میرے عاشق ہیں۔ میری وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جیلس بھی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ آپس میں دشمنی مول لینے کی صورت میں نقصان کسی ایک کا نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور ہے کہ خود ہی ٹکراؤ کا نتیجہ بھی جانتا ہے اس لیے میری وجہ سے دلوں میں بغض رکھنے کے باوجود اس بغض کو چھپا کر رکھتا ہے۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تم ان کی ٹکر کے آدمی نہیں ہو۔ اگر میں نے تم سے دوستی رکھی تو وہ سب کے سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اس طرح سے تمہیں غائب



کریں گے کہ مجھے یا تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اس لیے میں نے تم سے کھلے عام دوستی رکھنے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تم سب سے چھپ کر شاپنگ کے لیے نکلی ہو، یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو اور جب کسی کو یہ نہیں معلوم تو یہ بھی نہیں پتہ چل سکتا کہ تم یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ گئیں۔'' ذیشان نے مزے سے اسے جواب دیا۔

''پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ہر حال میں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' موہنی جھنجلائی۔

''ڈھونڈ نکالیں گے، تب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے، میرے ساتھ کریں گے۔ تم آرام سے سارا بوجھ مجھ پر ڈال سکتی ہو کہ میں نے زبردستی تمہیں اغوا کیا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ جواباً موہنی نے عجیب حرکت کی۔ اس نے بالکل اچانک ہی گاڑی کو بریکس لگا دیئے۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے زوردار جھٹکا لگا۔ اور ذیشان کا پستول اس کے پہلو سے ہٹ گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح پلٹ کر اس پر جھپٹی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے ذیشان پہلے ہی اپنا توازن تھوڑا سا کھو چکا تھا، اس حملے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائیدان میں جا گرا۔

''اُترو میری گاڑی سے باسٹرڈ! ورنہ میں تمہارا بھیجہ اُڑا دوں گی۔'' اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال کر اس نے ذیشان پر تانا اور غرّائی۔

''گولی مت چلانا، میں اُتر رہا ہوں۔'' حالات پلٹا کھا چکے تھے لیکن ذیشان نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور نہایت خوف زدہ شخص کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تم نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر کی اُترنے میں تو میں گولی چلا دوں گی۔'' اسے خوف زدہ دیکھ کر وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس وقت وہ اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر گاڑی کے فرش پر تھا جبکہ دوسرے کا گھٹنا موڑ کر اس نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور وہ عقبی نشست کی طرف منہ کیے ذیشان کو کور کیے ہوئے تھی۔

کسی بے انتہا خوف زدہ شخص کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ذیشان نے اس طرح حرکت کی جیسے وہ گاڑی سے اُترنے والا ہو لیکن اس کی نظریں پوری طرح موہنی کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ موہنی کی پسٹل پر گرفت اس کی مشاقی کو ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ اس حد تک ہوشیار نظر نہیں آ رہی تھی جتنا اسے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے مدِمقابل ہونے کی صورت میں نظر آنا چاہیے تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس نے ذیشان کو سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر لیا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے طور پر نمٹ رہی تھی جو اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر ایسی جنونی حرکت کر بیٹھا تھا اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

ذیشان نے اُس کی اس غلط فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اُترتے اُترتے پلٹ کر اس زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ وہ اُلٹ کر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔ اُلٹنے سے اس کا پسٹل والا ہاتھ اوپر کی طرف ہو گیا تھا چنانچہ جھٹکا لگنے سے گولی چلی اور گاڑی کی چھت میں پیوست ہو گئی۔ موہنی نے کوشش کی کہ خود کو سنبھال کر دوسرا فائر ذیشان پر کر سکے لیکن ایک تو وہ اس پوزیشن پر گری تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا، دوسرے ذیشان بھی برق بنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے موہنی کا پسٹل چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آرام سے اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ مجھے تمہارے اس حسین بدن میں چھید کر کے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔''

''تم کون ہو؟'' سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پہلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔'' ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

''یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔'' ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہوگی۔ میں اتنا با اختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی اُدھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔'' ذیشان نے غراتی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''دیکھو، یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔'' ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر ٹکا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔

ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بغیر کسی اُلجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔

وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہوگیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دورانِ سفر ہی سو گئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسبِ توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے مزاحمت پر اُتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو کرنے میں کامیاب ہوگئے۔



تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی۔ اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہوگیا۔''

یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو۔ لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیئے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ انٹیلی جنس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکاران کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا، کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہے اس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہو سکی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی بازیاب ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔''

یوسف بولتا جا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہوگا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابلِ مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آ چکے تھے جن میں غیر مسلم افراد، مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند ثانیوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہر خند کر دیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''لے رنجنی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔''

آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کر لو تا کہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک

حاصل ہونے والی معلومات منتقل کرنے کے ساتھ ہی آج رات کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اور پھر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔

بستر بے حد آرام دہ تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام بھی موجود نہیں تھا چنانچہ آشا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے آرام کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا لیکن وہ اتنی چوکنی نیند سویا تھا کہ آشا کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل جب وہ دروازے کا ہینڈل گھما رہی تھی، اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے آشا کو ایک سیاہ لباس کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں نے بتا دیا کہ وہ یہ لباس اسی کے لیے لے کر آئی ہے۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کے کپڑوں میں سیاہ رنگ کا کوئی لباس موجود نہیں تھا اس لیے از خود بندوبست کر دیا تھا۔

''رتی کی ڈیڈ باڈی کوٹھی پہنچ گئی ہے کیا؟'' وہ انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اُترا اور آشا سے پوچھا۔

''بس پہنچنے والی ہے۔ ابھی شالنی دیدی کے پاس فون آیا تھا کہ دس منٹ میں رتی کو یہاں پہنچا دیا جائے گا۔ سب لوگ تیار ہیں بس مجھے اور تمہیں ہی تیار ہونا ہے۔'' آشا نے اسے جواب دیا۔

''ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کپڑے ہی تو بدلنے ہیں۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ سے لباس لے کر خود جلدی سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اس نے تیار ہونے میں پانچ چھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ آشا بھی اس دوران تیار ہو چکی تھی۔

''تُو تو اس سیاہ لباس میں بھی بڑی پیاری لگ رہی ہے۔'' جاوید علی کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا جس کے جواب میں لازماً اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

''تم خود کون سی کسی سے کم ہو؟..... سچ بولوں تو اگر میں نے تمہاری جگہ یہ پینٹ شرٹ پہن رکھا ہوتا تو ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ تو بس تم ہی ہو جو مردانہ لباس میں بھی خوب جچتی ہو۔''

''کیا کروں، یہ لباس بھی میری مجبوری ہے۔ بے بی کی ڈرائیور ہوں نا، اس لیے ایسے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ ورنہ بے بی صاف کہتی ہے کہ میں کسی ہیجڑے کو اپنے ساتھ لے جا کر تماشا نہیں بننا چاہتی۔ زرق برق زنانہ لباس تو مجھے مشکل سے ہی پہننے کو ملتا ہے۔ ایک نواب صاحب خدمت کے لیے بلاتے ہیں جب اور دوسرے کسی خوشی کے موقع پر بے بی مجھے چھٹی دے دے تب۔'' آشا نے اُداسی سے بتایا۔

''بے بی سے تمہاری مراد نواب صاحب کی بیٹی ہے؟'' جاوید علی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آشا نے سر ہلایا اور مزید بولی۔ ''اصل میں تو میں یہاں بے بی کی ڈرائیور کے طور پر ہی اپائنٹ ہوئی ہوں لیکن بے بی کوئی ہر وقت تو باہر آتی جاتی نہیں ہے اس لیے ضرورت پڑنے پر نواب صاحب مجھے دوسرے کام بھی سونپ دیتے ہیں۔ جیسے آج میں تم لوگوں کو ایئرپورٹ لینے گئی تھی۔ خود نواب صاحب کا ڈرائیور الگ ہے لیکن وہ یہاں کوٹھی میں نہیں رہتا۔ نواب صاحب کو جب کہیں جانا ہو تو اسے فون کر کے بلوا لیتے ہیں یا پھر کبھی کبھار خود بھی اپنی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔''

آشا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ اس موقع پر کچھ اور بھی سوال تھے جو جاوید علی کے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن وہ انہیں زبان پر اس لیے نہ لا سکا کہ کمرے کے باہر خاصی ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ کسی نے دروازے پر دستک دے کر آشا کو آواز بھی دی تھی۔

''چلو، چلنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' آشا اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے باہر لے گئی۔ کوریڈور میں اس وقت سیاہ لباس پہنے کئی خواجہ سرا نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کے سب جوان اور خوب صورت تھے۔



''باہر گاڑی میں چل کر بیٹھو۔'' کوریڈور میں شالنی کی آواز گونجی اور وہ سب فوراً ہی متحرک ہو گئے۔ جاوید علی اور آشا بھی ان میں شامل تھے۔ باہر ایک میت بس کھڑی تھی۔ وہ لوگ بس کے قریب پہنچے تو اس میں سے نواب صاحب کو اُترتے دیکھا۔ انہیں اس خواجہ سرا نے سہارا دے رکھا تھا جس نے کوٹھی آمد کے بعد ان لوگوں کا استقبال کیا تھا۔ وہ خواجہ سرا باقی سب کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟'' شالنی نے قریب پہنچ کر استفسار کیا۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ نواب صاحب اس وقت بہت دُکھی ہیں اور انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ جاوید علی کو نواب صاحب کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضمحل اور اُداس لگ رہے تھے۔ شاید وہ میت بس میں رکھی رتی کی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے یہاں تک آئے تھے اور اُسے مُردہ حالت میں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔

''اچھی بات ہے۔ تم نواب صاحب کا دل بہلاؤ۔ ہم رتی کا کریا کرم کر کے آتے ہیں۔'' شالنی نے اسے جواب دیا تو جاوید علی کو اس کا لہجہ کچھ عجیب کاٹ دار سا لگا لیکن ابھی اپنے محسوسات کی تصدیق کرنے کا موقع نہیں تھا۔ نواب صاحب کے وہاں سے ہٹتے ہی ان سب کو میت بس میں بیٹھنے کا حکم دے دیا تھا۔ ان سب نے ہی تیزی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ بس کے درمیانی حصے میں ایک تابوت رکھا تھا جس میں یقینی طور پر رتی کی لاش موجود تھی۔ وہ سب خاموشی سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جاوید علی، آشا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا لیکن اب وہ اس سے بات چیت کرنے کے بجائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ باقی لوگ بھی اسے یہی کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس لیے وہ دکھاوے کے لیے خود بھی وقفے وقفے سے ہونٹ ہلاتا رہا۔

بس تیزی سے چلتی سفر طے کرتی رہی۔ سی ایف پی کے لاہور یونٹ میں شامل ہونے سے قبل جاوید علی کچھ عرصہ کراچی میں رہ چکا تھا اس لیے اس کے لیے یہاں کے راستے اور علاقے اتنے اجنبی نہیں تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی سے روانہ ہونے والی بس اب کراچی اولڈ سٹی کی طرف رواں دواں ہے۔ بس کو ایک ہٹا کٹا صحت مند آدمی چلا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی چار لحیم شحیم افراد موجود تھے۔ ان میں سے ان میں سے ایک بس کے دروازے پر موجود تھا جبکہ تین نے خواجہ سراؤں سے الگ ڈرائیور کے قریب جگہ سنبھال رکھی تھی۔ بس ایم اے جناح روڈ پر پہنچی تو پولیس کی ایک پیٹرولنگ گاڑی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بغیر کسی حیل و حجت کے گاڑی روک دی اور پولیس والوں سے بات کرنے لگا۔ یقینی طور پر وہ انہیں یہی بتا رہا تھا کہ اندر ایک ڈیڈ باڈی موجود ہے جو کہ ایک خواجہ سرا کی ہے اور اس کے خواجہ سرا ساتھی اس کا کریا کرم کرنے شمشان گھاٹ لے جا رہے ہیں۔

ڈرائیور کی گفت و شنید کے باوجود ایک پولیس والا بس میں چڑھ آیا اور تابوت کے شیشے کے چوکھٹے میں سے جھانک کر اس بات کی تسلی کی کہ وہاں کوئی ڈیڈ باڈی موجود ہے۔ پولیس والے کے آنے اور تصدیق کر کے جانے تک سب لوگ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ واحد شالنی تھی جو چوکنا نظروں سے پولیس والے کو دیکھتی رہی تھی۔ جاوید علی جو کہ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پولیس والے کے اُترتے ہی شالنی کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات اُبھر آئے ہیں۔ وہ اُلجھنے لگا کہ شالنی کے اس رویے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ شہر کے حالات کے سبب رات گئے سفر کرنے والی گاڑیوں کو روک کر پولیس کا چیکنگ کرنا اب اتنی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی جس سے کوئی گھبراتا اور بعد میں مطمئن نظر آنے لگتا۔ ایسے تاثرات تو اسی

شخص کے ہو سکتے تھے جو کسی گڑبڑ میں ملوث ہو اور جاوید علی کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ شالنی کا کردار بہت مشکوک ہے اور وہ اچھی خاصی گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔

پولیس والوں سے خلاصی کے بعد گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس بار سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور وہ لوگ ایک شمشان گھاٹ کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم شمشان گھاٹ تھا۔ گاڑی شمشان گھاٹ پر رُکی تو ڈرائیور اور اس کے ساتھی پھرتی سے حرکت میں آ گئے اور درمیان میں رکھے تابوت کو گاڑی سے نیچے اُتارنے لگے۔ وہ چاروں اچھے خاصے طاقتور نظر آنے کے باوجود تابوت اُتارتے ہوئے مشکل میں دکھائی دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ تابوت خاصا وزنی ہو اور انہیں اسے حرکت دینے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑ رہی ہو۔ لیکن بہرحال انہوں نے تابوت کو نیچے اتار لیا۔ جاوید علی اور بس میں موجود تمام خواجہ سرا شالنی کے حکم کے مطابق تابوت اُتارے جانے تک اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ البتہ شالنی خود بس سے نیچے اُتر گئی تھی اور کسی سپروائزر کی طرح تابوت اُتارنے والوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے انداز میں واضح برتری تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہے جسے معاشرے کا سب سے زیادہ پسا ہوا اور مظلوم طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ ایک حکمراں محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے چاروں گرانڈیل مرد بس اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ شالنی نے انہیں تابوت شمشان گھاٹ کے اندر لے جانے کا حکم دیا تو وہ فوراً ہی عمل پیرا ہو گئے۔ ان چاروں کے تابوت لے جانے کے بعد شالنی نے باقی خواجہ سراؤں کو اجازت دی کہ وہ بھی نیچے اُتر سکتے ہیں۔

سب کے سب نہایت منظم انداز میں نیچے اُتر آئے اور اسی تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے شالنی کی سربراہی میں شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ قبرستانوں اور شمشان گھاٹ وغیرہ کا جو مخصوص ماحول ہوتا ہے، اس سے گھبرا کر تو لوگ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خصوصاً اکیلا آدمی خاصا عجیب محسوس کرتا ہے اور یہاں تو آدھی رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کئی تھے اور ان کی آمد نے وہاں کے جامد سناٹے میں خاصی ہلچل بھی پیدا کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود وحشت کا تاثر قائم تھا۔ دن میں جلائی جانے والی چتاؤں کی بُو پوری طرح سے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جاوید علی کا کسی شمشان گھاٹ آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے اسے ہر شے اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مقابلے میں اسے باقی لوگ بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی یہی کوشش تھی کہ اس کی ناگواری اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ اسے یاد رکھنا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے دوران تو شمشان گھاٹ کیا، مُردہ خانے میں بھی رہنا پڑتا تو وہ رہتا۔ اس نے اپنا دھیان ماحول کی وحشت سے ہٹایا اور وہاں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تابوت سے رتی کی لاش نکال لی گئی تھی اور اب اسے پہلے سے تیار چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ لاش کو چتا پر لٹائے جانے کے بعد شالنی آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کھجور کی ہلکی سی ٹوکری میں سے گیندے اور گلاب کے پھولوں پر مشتمل بڑا سا ہار نکال کر رتی کی لاش کو پہنایا۔ دھان پان سی رتی کا سینہ اور پیٹ وغیرہ اس ہار سے ڈھک گئے۔ اس موقع پر جاوید علی کو تابوت اُتارنے والوں کی محنت و مشقت یاد آئی۔ دھان پان سی رتی کا وزن ہی کتنا تھا کہ اس کا تابوت اتارنے والوں کو اتنی محنت کرنی پڑی۔

سوچنے کو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ تابوت بھاری لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن جاوید علی نے خود جائزہ لیا تھا کہ تابوت کی لکڑی بہت زیادہ عمدہ کوالٹی کی نہیں ہے اس لیے اس کا غیر معمولی بھاری ہونا ایک معمہ سا تھا۔ بلکہ ڈیڈ باڈی کو شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے تابوت کا استعمال بھی ایک طرح سے غیر ضروری تھا۔ تابوت تو عموماً وہ لوگ



استعمال کرتے ہیں جو اپنے مُردوں کو تابوت سمیت قبر میں دفناتے ہیں۔ یہاں تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، اس کے شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی جاری تھی۔ خواجہ سراؤں کے مربّی کی حیثیت سے شالنی کو ان میں سب سے خاص مقام حاصل تھا۔ چنانچہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر جاوید علی نے وہاں موجود خواجہ سراؤں کو خاصا دُکھی پایا۔ رتی کی چتا کو آگ لگتے دیکھ کر ان میں سے کئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے تھے اور کچھ بلند آواز میں تو کچھ سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ جاوید علی نے خود اپنے دل کو بھی اس ماحول میں بوجھل پایا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹا وہ وجود کس کا تھا اور ان کے درمیان مذہب و معاشرت کی کیا تفریق تھی، اس سے قطع نظر وہ اس وقت ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کی زندگی کا سفر ختم ہونے پر اپنے دل کو آزردہ محسوس کر رہا تھا لیکن آزردگی کی اس کیفیت میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان کے ساتھ میت گاڑی میں آنے والے چاروں مردوں نے نہایت خاموشی سے چتا سے کچھ فاصلے پر رکھا خالی تابوت اٹھایا اور وہاں سے جانے لگے۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے تابوت میں خاصا وزن موجود ہو۔ ان چاروں کے حرکت میں آتے ہی اس نے شالنی کو بھی چپکے سے سب کے درمیان سے کھسکتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور خود بھی سب کے درمیان سے نکل کر خاموشی سے اس طرف چل پڑا جہاں شالنی گئی تھی۔

سوگوار خواجہ سراؤں نے ان میں سے کسی کی حرکت کو نوٹ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ شاید کسی نے اس حرکت کو محسوس بھی کیا ہو گا تو اس کے نزدیک اس کی وجہ جاننے کے مقابلے میں اپنی ساتھی کی جلتی چتا کے سامنے کھڑے ہو کر آنسو بہانا زیادہ اہم رہا ہو گا۔

دبے قدموں شالنی کے پیچھے جانے والے جاوید علی نے اسے کنوئیں کے قریب کھڑا دیکھ لیا۔ وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال رہی تھی۔ جاوید علی کوشش کر کے بے آواز قدموں سے اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو سن سکے۔

''مال بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ میرے آدمی صرف چالیس منٹ تک اس کی حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارے آدمی۔ اگر تم اس دوران یہاں پہنچ کر مال نہیں اٹھا سکے تو آگے ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار نہیں ہو گا۔'' شالنی فون پر کسی سے مخاطب تھی۔

''پروگرام کے مطابق سارا مال تابوت میں ہی ہے۔ تم میت گاڑی یا ایمبولینس لاؤ اور مزے سے اپنا مال لے جاؤ۔ اتنی ہچر مچر کی کیا ضرورت ہے کہ یہ ہو گیا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گیا تو کیا کرنا ہو گا۔ ہم نے جتنی پے منٹ لی ہے، اتنا ہی کام کریں گے نا۔'' دوسری طرف سے شاید مزید تعاون کی درخواست کی گئی جس کے جواب میں شالنی نے بے مروّتی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر وہاں سے مزید کچھ کہا جانے لگا جسے سن کر شالنی نے اپنے روّیے میں ذرا سی لچک پیدا کی اور قدرے تحمل سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تابوت پرانے کنوئیں کے قریب ہی رکھا ہے۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچ سکے یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تابوت کو کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ تم لوگ بعد میں اسے نکالتے رہنا۔ اور ہاں، یاد رکھو کہ پانچ منٹ تم مجھ سے بات چیت میں برباد کر چکے ہو اس لیے اب تمہارے پاس صرف پینتیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے شالنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید علی پھرتی سے لیکن بے آواز قدموں سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ شالنی کی یک طرفہ گفتگو سن کر ہی

اس کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے شکوک وشبہات غلط نہیں تھے۔ تابوت کا بھاری پن اسی وجہ سے تھا کہ اس میں رتی کی لاش کے علاوہ بھی کچھ اور موجود تھا۔ یہ کچھ اور، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قوی امکان اسلحے کا تھا۔ کیونکہ ماضی میں بھی ایسی مثالیں ملتی رہی تھیں جب مجرموں نے اسلحے کی نقل وحمل کے لیے جنازوں کا سہارا لیا تھا۔ صورتِ حال کا تیزی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس نے محفوظ مقام پر پہنچ کر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا اور جلدی جلدی انہیں حالات وواقعات کے ساتھ شمشان گھاٹ کی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر گزرتا منٹ اس کے محکمے کے لوگوں کے پاس مؤثر کارروائی کے لیے مہلت کم کرتا جا رہا تھا اس لیے کم سے کم وقت میں اختصار کے ساتھ جامع رپورٹ دے ڈالی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کا کراچی آنا بیکار نہیں گیا تھا اور کراچی میں گزرنے والی پہلی شب ہی خاصی اہم ثابت ہوئی تھی۔ وہ جس ذمے داری کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اسے اپنی استطاعت کے مطابق احسن طریقے سے پورا کر رہا تھا اور یقیناً آگے بھی اس کے لیے خاصا کام نکلنے والا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ خواجہ سراؤں کے جس گروہ میں شامل ہوا ہے، وہاں اپنی حیثیت مشکوک نہ ہونے دے۔ چنانچہ رپورٹ دے کر فارغ ہوتے ہی تیزی سے اس طرف رخ کیا جہاں سارے خواجہ سرا جمع رتی کی چتا کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''تو کہاں تھی رنجنی؟'' وہ ابھی اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ یقینی طور پر فون کال سے فارغ ہو کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور اس نے جاوید علی کی غیر موجودگی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اب اس سے باز پرس کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''وہ دیدی! میں ذرا.....'' جاوید علی نے چھنگلی سے اشارہ کر کے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ کسی جگہ سے بے وقت غائب ہونے کا اس سے اچھا کوئی بہانہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''کوٹھی سے فارغ ہو کر نہیں نکل سکتی تھی؟ لے کر مجھے پریشان کر دیا۔'' شالنی غصے سے بڑبڑائی لیکن ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ اس فطری ضرورت کے آگے تو ہر انسان ہی مجبور ہوتا ہے۔ یہ موقع محل دیکھتی ہے، نہ وقت وحالات۔

''چل، اب چل کر سب کے ساتھ کھڑی ہو۔ پانچ دس منٹ میں ہم یہاں سے واپس چلیں گے۔'' جاوید علی کا جھکا ہوا سر اس کی شرمندگی کا اظہار تھا اس لیے شالنی نے مزید ڈانٹ پھٹکار سے گریز کرتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں اسے اپنا حکم سنایا۔

''ابھی تو چتا بھی ٹھیک سے نہیں جلی دیدی! رتی کی استھیوں کا کیا ہوگا؟'' جاوید علی نے جان کر اس سے پوچھا۔

''چتا جل کر ٹھنڈی ہو جائے گی تو صبح پنڈت مہاراج استھیاں جمع کر کے رکھ لیں گے۔ میں بعد میں ان سے منگوا لوں گی۔ ویسے بھی استھیوں کے لیے اتنی جلدی نہیں ہے۔ اگلے مہینے میری ایک جاننے والی آگرہ جانے والی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے رتی کی استھیاں گنگا میں بہانے کے لیے بھیجوں گی۔'' شالنی نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' جاوید علی نے اس کے فیصلے کو سراہا پھر لہجے کو ذرا سرسری بناتے ہوئے بولا۔ ''پنڈت مہاراج چتا کو آگ دیتے سے نظر نہیں آئے۔ ان کو تو اس سمے یہاں ہونا چاہئے تھا۔''

''مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آ سکے۔'' جاوید علی کے سوال پر سوال کرنے کی



جسارت شالنی کو ناگوار گزری تھی اس لیے اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے جواب دیا اور پھر قدم بڑھا کر جلتی ہوئی چتا کے گرد کھڑے خواجہ سراؤں کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے باآوازِ بلند ان سب کو بھی وہی بتایا جو ابھی جاوید علی کو بتا چکی تھی۔

اس کی طرف سے روانگی کا اعلان ہوتے ہی افسردہ وآبدیدہ کھڑے خواجہ سراؤں میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ حسبِ حکم شمشان گھاٹ سے باہر نکلنے لگے۔ دس منٹ کے اندر اندر ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آ چکی تھی۔ اس دوران جاوید علی گاہے بگاہے شالنی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ بے چین تھی اور بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی جا رہی تھی۔ میت گاڑی واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی کو اس وقت بھی وہی شخص ڈرائیو کر رہا تھا جو یہاں آتے وقت اسے چلا کر لایا تھا۔ البتہ باقی تین آدمیوں کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ تابوت میں موجود مال کی بہ حفاظت ڈیلیوری کے لیے شمشان گھاٹ میں ہی رک گئے تھے۔ سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں اس کے رپورٹ کر دینے کے بعد اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ چشمِ تصور سے آگے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا جاوید علی متعدد خواجہ سراؤں کے ساتھ میت گاڑی میں سوار نواب نوازش علی کی کوٹھی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا جہاں ابھی اسے نامعلوم مدت کے لیے رنجنی کا کردار ادا کرنا تھا۔

⊛----●----⊛

موہنی سے شاپنگ مال میں ملنے والے مشکوک شخص سے برآمد ہونے والی سی ڈی دیکھ کر ذیشان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سی ڈی میں موہنی کے ساتھ وہی وزیر موجود تھا جس کی کوششوں سے پاکستان میں موجود بھارتی قیدیوں کی رہائی کا عمل انجام پا رہا تھا۔ چند منٹوں کی اس فلم میں موہنی اور وزیر صاحب جس حالت میں موجود تھے، وہ اتنی شرم ناک تھی کہ اگر یہ فلم منظرِ عام پر آ جاتی تو وزیر صاحب کا برسوں کی محنت سے بنایا گیا کیریئر چند گھنٹوں میں تباہ ہو سکتا تھا۔ ذیشان سمجھ گیا کہ یہ اس فلم کی ہی کرامت ہے کہ وزیر موصوف نے بھارتی قیدیوں کی رہائی میں اتنی سرگرمی دکھائی تھی اور اپنی عزت اور کیریئر بچانے کے لیے ملکی وقار وسالمیت کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

اُلجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا ملنے پر وہ غصے سے کھول اُٹھا اور انٹرکام اٹھا کر اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر سے باہر نکلا اور اس ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچا جہاں موہنی کو اس کے حکم کے مطابق پوچھ گچھ کے لیے رکھا گیا تھا۔ موہنی اس کمرے کے وسط میں موجود ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر مضبوط بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے اور اس کے سر پر تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ ذیشان کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ موہنی کے چہرے پر تفکر وپریشانی چھائی ہوئی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ ذیشان بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

''کون ہو تم.....؟'' یہ سوال کرتے ہوئے موہنی کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ اس وقت جس ماحول میں موجود تھی، اس سے یہ اندازہ تو لگا سکتی تھی کہ وہ کسی عام شخص کی تحویل میں نہیں ہے۔ پھر اسے گاڑی میں ذیشان سے ہونے والا مقابلہ بھی یاد تھا۔ کوئی عام شخص اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اداؤں اور حسن کے بل بوتے پر مردوں کو زیر کر لینے کے ہتھیاروں سے لیس ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی خاصی ماہر تھی

اور اپنے خیال کے مطابق ذیشان سے صرف اس لیے مات کھا گئی تھی کہ اسے عام شہری سمجھ کر اس کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔

''تمہارا سوال اچھا ہے۔ مجھے خاصا پسند آیا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جواب بھی تم ہی دو گی۔ بغیر کسی بہانے بازی کے سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' ذیشان کا سرد لہجہ بتدریج سخت ہوتا چلا گیا۔

''تم مجھے جانتے ہو۔ ہمارا پہلے بھی تعارف ہو چکا ہے۔'' موہنی نے کنی کترانے کی کوشش کی۔

''محفل میں ہونے والا وہ تعارف ادھورا تھا۔ اب تم مجھے اس سی ڈی کی روشنی میں اپنا تعارف کرواؤ جو تم نے تمہارے ساتھی سے حاصل کی ہے۔'' ذیشان نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی اس کی نظروں کے سامنے نچائی جسے دیکھ کر پل بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اُڑا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ذرا بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔

''یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے اس لیے تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔''

''بکواس بند کرو اور اگر میرے بارے میں اب تک کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو اسے بھی دور کر لو۔ میں اپنے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے کسی شخص کو ذرہ برابر بھی رعایت دینے کا قائل نہیں ہوں۔'' ذیشان غرایا۔

''تم یقیناً اُسی وزیر کے ٹٹو ہو۔ اسی نے تمہیں اس کام پر لگایا ہوگا کہ میری نگرانی کرو اور موقع ملتے ہی مجھ سے یہ سی ڈی حاصل کر لو۔ اُس کنجوس مکھی چوس نے وزارت میں رہ کر اتنا روپیہ بنایا ہے لیکن اپنی ساکھ بچانے کے لیے بھی ایک ڈیڑھ کروڑ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور غنڈوں سے کام لے رہا ہے۔'' موہنی نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس کی وضاحت کرو۔'' اس کے جواب پر اُلجھ جانے والے ذیشان نے سختی سے حکم دیا۔

''وضاحت کیا کرنی ہے؟ دو جمع دو چار کی طرح بات بالکل صاف ہے۔ میں ایک کال گرل ہوں اور ادائیں دکھا کر لوگوں کو لوٹنے کے علاوہ کوئی بہت زیادہ مگنڈی پارٹی مل جانے پر اسے بلیک میلنگ کے سہارے بھی لوٹتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بڑا دولت والا ہے۔ ملک میں جتنی پراپرٹی ہے، اس سے دس گنا زیادہ مال باہر کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ خیال تھا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے خاموشی سے سودے بازی کر لے گا۔ لیکن وہ تو سیانا کوّا نکلا اور غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ حالانکہ میں نے اس پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں بھی بلیک میل کرنے والوں کے ساتھ ملی ہوں۔'' وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ اسے ایک ایسی کہانی سنا رہی تھی جو قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ اس کی چال میں نہیں آیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہاری کہانی عمدہ ہے لیکن افسوس کہ میں کہانیاں سننے کے بجائے حقیقت جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اس لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اس ویڈیو اور بھارتی قیدیوں کی رہائی کے درمیان کیا لنک ہے؟'' اس کے اتنے درست اندازے پر مشتمل سوال کو سن کر موہنی بھونچکی رہ گئی لیکن پھر بھی خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو بالکل بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہے۔ تم چاہو تو میرے بارے میں کہیں سے بھی تصدیق کر سکتے ہو۔ لیکن میں یہ الزام کسی صورت نہیں مانوں گی کہ تم بھارت کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔'' نہایت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے وہ اپنے حیرت بھرے لہجے میں غصے اور طیش کی آمیزش لا چکی تھی۔



''ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں موقع دیا تھا کہ تم بغیر تشدد کے اپنی زبان کھول دو لیکن تمہیں معلوم نہیں تو مجھے بھی ملک دشمن عناصر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے اس ضدی پن کا خمیازہ تمہیں خود بھگتنا پڑے گا۔ مجھے تو بہر حال اپنے مطلوبہ نتائج سے غرض ہے۔'' اس نے نہایت سرد لہجے میں موہنی سے کہا اور ابھی ابھی کمرے میں داخل ہونے والے اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو اپنے ساتھ ایک ٹرالی کھینچتا ہوا لے کر آیا تھا۔ ٹرالی میں ایک شیشے کا جار اور چھوٹی سی ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ شیشے کے جار میں کوئی ایسا محلول موجود تھا جس سے گرم گرم بھاپیں اُڑ رہی تھیں جبکہ ٹرے میں پینٹنگ میں استعمال ہونے والے مختلف برش رکھے ہوئے تھے۔

''یہ خرم ہے۔ اسے انسانی اعضاء خصوصاً چہرے پر نقش و نگار بنانے کا بہت شوق ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے یہ اپنے برش کو رنگوں کے بجائے تیزاب میں ڈبونے کا عادی ہے۔ تمہارے حسین چہرے پر کام کرنے کے لیے اس نے خصوصی طور پر گندھک کا خالص تیزاب منگوایا ہے۔ امید ہے تمہیں اس کا کام پسند آئے گا۔'' وہ ٹرالی لانے والے کا نہایت دوستانہ لہجے میں موہنی سے تعارف کروانے لگا لیکن لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں جو سفاکی تھی، اس نے موہنی کو جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا۔

''پلیز! میرا یقین کرو۔ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے ہراساں لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس خوف و دہشت کے عالم میں اس کا حُسن کچھ اور بھی دمکنے لگا تھا لیکن ذیشان متاثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک بار ایملی پارکر نامی حسینہ کے حُسن کے جال میں پھنسا تھا اور شباب و شراب کے نشے میں چُور اُسے اُس کی مطلوبہ معلومات فراہم کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اسے ایسے احساسِ شرمندگی نے گھیر لیا تھا کہ اب تا زندگی وہ کبھی حسینہ کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔

''اپنا کام شروع کرو خرم!'' موہنی کی درخواست پر کان دھرے بغیر اس نے سفاکی سے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ کسی مشین کی طرح حرکت میں آیا اور دیوار پر لگے سوئچ پینل کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی موہنی کی کرسی کے عین اوپر چھت سے ایک لوہے کا شکنجہ برآمد ہوا اور اس کے سر اور گردن کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دینے سے بھی محروم ہو گئی۔

''میری بات سنو۔ ایسا مت کرو۔ میرا ایسے کسی معاملے سے تعلق نہیں ہے جس کا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔'' گردن و سر کے شکنجے میں پھنستے ہی موہنی کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی لیکن کمرے میں موجود دونوں نفوس تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سماعت سے ہی محروم ہو چکے ہوں۔ ذیشان بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ مشینی انداز میں حرکت کرتا خرم ٹرالی کو موہنی کے بالکل قریب لے گیا تھا اور ٹرالی میں سے اپنی پسند کا برش منتخب کر رہا تھا۔

''آؤٹ لائن کے لیے میں عام طور پر زیرو نمبر کا برش استعمال کرتا ہوں لیکن آپ اتنی حسین ہیں کہ میں آپ کے فیس پر آپ کی جوانی کے مطابق بھی کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ٹرے میں سے ایک برش منتخب کر لینے کے بعد وہ موہنی سے کسی پیشہ ور مصور کی طرح مخاطب ہوا۔

''بند کرو یہ بکواس..... دور لے جاؤ مجھ سے یہ سب کچھ۔'' موہنی غصے اور دہشت سے ملی جلی آواز میں چیخی اور ٹرالی کو عملاً خود سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پیر جکڑے ہونے کی وجہ سے بس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی بل کھا کر رہ گئی۔

''او کے، اگر آپ بتانا پسند نہیں کرتیں تو میں اپنی روٹین کے مطابق ہی کام کا آغاز کر دیتا ہوں۔'' اس کے چیخنے کو خاطر میں لائے بغیر خرم نے نہایت آرام سے کہا۔ برش کو جار میں موجود محلول میں ڈبو کر موہنی کے چہرے

کے قریب لے گیا۔ اس نے بے ساختہ ہی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں اور منہ دونوں ہی کھل گئے۔ چہرے کی شفاف جلد پر تیزاب میں ڈوبے برش سے پڑنے والی لکیر بہت واضح تھی اور موہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ یقیناً اپنے حسین چہرے کے بگڑ جانے کے خوف سے بھی چلا رہی تھی۔

''پینٹنگ کی اس تکنیک کو استعمال کرنے میں لطف ہی اس وقت آتا ہے، جب ماڈل خوف سے چیختا ہے۔ آپ جوں جوں چیخیں مارتی رہیں گی، میرے کام میں تیزی آتی رہے گی۔'' سنجیدہ صورت خرم نے اسے آگاہ کیا اور برش کو ایک بار پھر گندھک کے تیزاب میں ڈبو کر اس کے دوسرے رخسار پر ڈھائی انچ کے قریب لکیر مار دی۔ موہنی کے حلق سے ایک بار پھر چیخیں برآمد ہوئیں۔

''پلیز! مجھے گولی مار دو لیکن میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔'' اس نے دیکھا کہ خرم کا ہاتھ تیسری بار بھی جار کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اس کی چیخوں سے ذرا متاثر نہیں ہو رہا تو خود پر قابو پاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

تیزاب میں ڈوبے برش کی دو باریک سی لکیروں نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے اور مدہوش کر دینے والی آنکھوں کے ساغر آنسوؤں سے لبالب بھرنے کے بعد چھلک پڑے تھے۔ نمکین آنسوؤں کے قطرے رخساروں سے لڑھک کر گزرتے، آگ کی ان دو لکیروں میں مزید جلن کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

''گولی سے بننے والا چھید بالکل بھی آرٹسٹک نہیں ہوتا۔ کم از کم میں اتنے حسین چہرے اور جسم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتا۔ مجھے تو برش سے کیا جانے والا کام ہی پسند ہے۔'' خرم کے اطمینان میں سرِ مو فرق نہیں آیا اور وہ نہایت انہماک سے ایک بار پھر برش کو محلول میں ڈبونے لگا۔

''اسے روکو..... پلیز اسے روکو۔ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اذیت دے دے کر مار رہا ہے۔'' خرم کی طرف سے مایوس ہو کر موہنی نے ذیشان سے رجوع کیا اور ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے رحم کی اپیل کرنے لگی۔

''یہ شخص صرف اسی صورت میں رک سکتا ہے کہ تمہاری زبان سچ اُگلنے لگے۔'' ذیشان نے سرد مہری سے اس کی اپیل کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔'' موہنی نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ کسی حسین عورت کے تشدد کا اس سے زیادہ اذیت ناک طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کا حُسن برباد کر دیا جائے۔ اور یہاں تو بہت ہی ہولناک ترکیب سے اس کے حُسن کو داغا جا رہا تھا۔

''سب سے پہلے تو بتاؤ کہ تم کس ملک کے لیے کام کر رہی ہو؟'' اسے لائن پر آتا دیکھ کر اس نے خرم کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور خود سوال داغا۔ اس کا اشارہ پا کر خرم کسی معمول کی طرح ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ ادھر موہنی نے تھوک گلتے ہوئے اس کے سوال کا ایک لفظی جواب دیا۔

''بھارت۔''

''اوہ..... تو ''را'' کی سورما ہو؟'' ذیشان نے طنز سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''کیا اس وزیر کے ذریعے پاکستانی اور بھارتی قیدیوں کے تبادلے کا مقصد ان دو قیدیوں کو رہا کروانا ہے جن پر بھارتی جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا ہے؟'' اس نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ایک ایسا سوال کیا جس کا مقصد محض اپنے اندازے کی تصدیق تھا۔ جواباً موہنی نے عجلت میں سر ہلا دیا۔ اس کا یہ عجلت بھرا انداز ذیشان کو ٹھٹکا گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ غلط سمت میں سوچ رہا ہے اور موہنی اس بات کا فائدہ



اٹھاتے ہوئے اسے اسی سمت پر چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میرے پاس جو معلومات ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں بہت ینگ ایج میں پاکستان پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تمہارے ملک کے لیے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے تھے۔ پھر تم لوگوں کو ان کی رہائی میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' اس نے موہنی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم اپنے دیش کی رکھشا کے لیے بلیدان دینے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ دونوں بے شک بھارت ماتا کے لیے کچھ نہیں کر سکے لیکن انہوں نے کوشش تو کی اور اس کوشش میں اپنے جیون کے کئی قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیئے۔ اس لیے ان کو قید سے رہائی دلوانا ہم پر فرض تھا۔'' موہنی نے جذباتی لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا یہ جذباتی پن بھی ذیشان کو مصنوعی لگا۔

''میں نہیں مان سکتا کہ تم بنیوں کی قوم نے کوئی کام انسانی ہمدردی میں کیا ہوگا۔ پھر جس طرح تم لوگوں نے اس کو پھانسا وہ خاصا غور طلب ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار یہ کام ہوتا رہا ہے۔ تم لوگ چاہتے تو ایسے کسی بھی موقع پر اپنے من پسند قیدیوں کو رہائی دلوا سکتے تھے۔ لیکن آخر ایسی کیا ضرورت پڑی کہ ایک وزیر کو بلک میل کر کے اچانک اس ڈیل کو طے کیا گیا؟'' موہنی کے چہرے پر پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے ظاہر تھا کہ اب وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔

''مجھے جو کہا گیا، وہ میں نے کیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے کنّی کترانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے خرم! تم اس کے چہرے پر اپنا شوق پورا کرو۔ میں باقی معلومات اس کے پکڑے جانے والے دوسرے ساتھی سے حاصل کرلوں گا۔'' اس کو پٹڑی سے ہٹتے دیکھ کر وہ خرم سے مخاطب ہوا۔

اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بظاہر لاتعلق بنا خرم حرکت میں آ گیا۔ موہنی ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگی۔ اس بار اُس نے نسبتاً بڑے سائز کے فرش کا انتخاب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب اس کے چہرے پر پہلے کی طرح باریک لکیر کے بجائے نسبتاً موٹی لکیر اُبھرے گی۔ لکیروں کی موٹائی اور گہرائی میں اضافے کا مطلب اذیت اور بدصورتی میں بھی اضافہ تھا لیکن وہ جس راز کو افشا کرنے سے خوف زدہ تھی، وہ بھی بہت قیمتی تھا۔ اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''جب تم اس پینٹنگ کا شوق پورا کرلو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں اسے شہر کے سب سے مشہور چوک پر پھنکوا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے چاہنے والوں کو اس کا نیا روپ حیران کر دے گا۔'' اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر ذیشان اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خرم کو مخاطب کر کے سفاکی سے کہتا ہوا جانے کے لیے پلٹنے لگا۔

''تم راون کے چیلے ہو۔ تم میں انسانیت ہے نہ عورتوں سے برتاؤ کی تمیز۔'' اسے پلٹتے دیکھ کر موہنی چیخی اور پھر ایک سانس میں اسے گالیوں سے نوازنے کے بعد زور زور سے چلانے لگی۔

''تم رک کیوں گئے خرم! اپنا کام شروع کرو اور اب اس وقت رُکنا جب کام مکمل ہو جائے۔'' موہنی کے چیخنے چلانے کے دوران اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ مغلظات بکنے کے بعد جب وہ بے بسی سے رونے لگی تو اس نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگانے کے خیال سے خرم سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ موہنی اندر سے ٹوٹ چکی ہے اور کسی بھی لمحے ڈھیر ہو جائے گی۔ اس لیے اس پر نفسیاتی حربے استعمال کر رہا تھا۔ خرم اور اس کے درمیان اس وقت غضب کی انڈر اسٹینڈنگ نظر آ رہی تھی اور وہ بالکل اسی طرح عمل کر رہا تھا جیسا کہ ذیشان خواہش مند تھا۔ اس وقت بھی وہ آہستگی سے برش لہراتا ہوا موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا اور کسی عظیم

مصور کی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

''تمہاری ناک بہت خوب صورت ہے۔ اگر میں اس کھڑی ناک کی نوک سے لے کر پیشانی پر آنکھوں کے درمیان تک ایک لکیر بناؤں اور پھر اس لکیر کے دائیں بائیں باریک لکیریں بناتا چلا جاؤں تو ایسا لگے گا کہ میں نے کسی درخت کا پتا پینٹ کیا ہو۔

''شٹ اپ..... بند کرو اپنی بکواس۔'' اس کے خوفناک ارادے سن کر موہنی رونا چھوڑ کر غصے اور خوف سے چیخی لیکن اب اس کی آواز میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔

''سوری میڈم! میں اپنے باس کے حکم کا غلام ہوں۔ اس لیے یا تو تم ان کی بات مان لو یا پھر اس حلیے میں آنے کے لیے تیار ہو جاؤ جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا ہے۔'' خرم پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت اطمینان سے اسے آگاہ کرتے ہوئے برش کی نوک اس کی ناک کی طرف بڑھائی۔ ذیشان اس دوران کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

''اپنا ہاتھ دُور ہٹاؤ مجھ سے اور بلاؤ اپنے ذلیل باس کو۔ میں اسے سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ رسّی جل گئی پر بل نہیں گئے کہ مصداق تنتناتے ہوئے بولی تو خرم اس سے دور ہٹ گیا اور برش واپس ٹرے میں رکھنے کے بعد دیوار میں نصب انٹرکام پر ذیشان کو موہنی کی رضامندی سے آگاہ کرنے لگا۔ دوسری طرف سے ذیشان نے اس سے کچھ کہا جس کے جواب میں ''اوکے سر'' کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور کمرے میں اس جانب بڑھ گیا جس طرف موہنی کی پشت تھی اور وہ بری طرح جکڑی ہوئی ہونے کی وجہ سے پیچھے مڑ کر یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ خرم وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ چنانچہ دروازے پر نظریں جمائے رہی جہاں سے ذیشان کی آمد متوقع تھی۔ ذیشان فوری طور پر نمودار نہیں ہوا البتہ خرم ایک پورٹیبل میز کو کھینچتا ہوا اس کے قریب لے آیا۔ اس میز پر رکھی مشین کو دیکھ کر موہنی نے اپنے لب بھینچ لئے۔ وہ جانتی تھی کہ اس مشین کی موجودگی میں اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اس کی کیفیت سے انجان بنا خرم نہایت مہارت سے اپنا کام کرتا رہا اور پھر مختلف تاروں کو اس کے جسم سے اٹیچ کر دیا۔ اسی وقت ذیشان بھی کمرے میں چلا آیا اور اس کے سامنے موجود کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''تو مس موہنی! آپ سچ بولنے کے لیے راضی ہیں۔ مجھے آپ کے اس عقلمندانہ فیصلے پر خوشی ہے۔ اور مزید خوشی اس وقت ہو گی جب آپ اس پولی گراف مشین کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مزید عقلمندی کا مظاہرہ کریں گی اور سچ میں جھوٹ ملانے کی کوشش نہیں کریں..... ورنہ اس بات سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف ہوں گی کہ یہ مشین دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا خوب جانتی ہے۔ اب آپ کی زبان سے جھوٹ نکلے گا تو یہ فوراً ہی بتا دے گی۔'' موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے اس نے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''مجھے سب معلوم ہے۔ تمہیں جو پوچھنا ہے پوچھو۔'' وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ دونوں رخساروں پر موجود تیزابی لکیروں میں ہونے والی جلن سے زیادہ اس وقت وہ اپنے زیر ہونے پر تلملائی ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے حُسن اور اداؤں سے اشاروں پر نچانے والی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود بھی زد پر آئے گی اور ایسے لوگوں کے درمیان پھنس جائے گی جس کے لیے اُس کا حُسن کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔

''بات وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ قیدیوں کا جو تبادلہ عمل میں آنے والا ہے، اس میں کیا راز ہے جو سیاسی لیڈرز کے بجائے ''را'' کے سورماؤں کو میدان میں اُترنا پڑا؟'' اس وقت اس کے ذہن میں سب سے



بڑی اُلجھن یہی تھی اسی لیے سوال سے آغاز کیا۔ ان دو مشکوک قیدیوں کی رہائی کے لیے اس ساری بھاگ دوڑ کے امکان کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

''پہلی کوشش سیاسی سطح پر ہی کی گئی تھی لیکن تمہارے وزیر داخلہ فی الوقت اس معاملے میں انٹرسٹ لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے ہمیں یہ کشٹ اٹھانا پڑا۔ اعوان صاحب کے وزیر داخلہ سمیت وزیر اعظم اور آرمی چیف دونوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لیے ہم نے انہیں ٹریپ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہماری ترکیب کامیاب بھی رہی۔ سی ڈی دیکھتے ہی اعوان صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کانٹیکٹ کر کے پوچھ گچھ کی تو میں نے لاعلمی کا اظہار کر کے رونا دھونا مچا دیا کہ کچھ بھی ہو، اس سی ڈی کو منظر پر نہیں آنا چاہئے ورنہ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا اور اپنی اور میری جان بچانے کے لیے وہی کیا جو ان سے کہا گیا۔ انہوں نے ہماری توقع سے بھی زیادہ تیزی سے معاملات طے کروا دیئے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ کام ہوتے ہی اوریجنل سی ڈی انہیں بھجوا دی جائے گی۔ سی ڈی میری کسٹڈی میں تھی اور آج میں اسے اپنے ایک مددگار ماتحت کے سپرد کرنے شاپنگ سینٹر گئی تھی جہاں تم نہ جانے کیسے میری جان سے چمٹ گئے۔'' موہنی نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''اوکے، یہ تفصیل تو ہو گئی کہ تم نے اعوان صاحب کو کس طرح قابو میں کر کے اپنا کام نکلوایا لیکن میرا اصل سوال اب بھی اپنی جگہ پر ہے۔ قیدیوں کے تبادلے کے پیچھے کون سی سازش چھپی ہوئی ہے جو ''را'' اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ موہنی جو اسے باتوں باتوں میں گھمانے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی کوشش میں ناکام ہونے پر مایوسی کا شکار نظر آئی لیکن جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے اپنی زبان کھولنی پڑی۔

''قیدیوں کا یہ تبادلہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے برسوں پہلے پلاننگ کر لی گئی تھی۔ اس تبادلے کا مقصد پاکستان کی قید میں موجود اپنے شہریوں کو آزادی دلوانا نہیں بلکہ بھارت کی قید میں موجود ایک پاکستانی کو پاکستان واپس پہنچانا ہے۔ اعوان سے لسٹ میں دو ایسے بھارتی قیدیوں کے نام شامل کروانا جو مشکوک ہیں، صرف ایک احتیاط تھی کہ اگر تمہاری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس معاملے میں دخل بھی دیں تو انہیں یہی شک ہو کہ ہم اپنے جاسوسوں کو چھڑوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت میں پاکستان صرف یہ کرتا کہ ان دونوں کے نام لسٹ سے خارج کر دیتا جس پر ہماری طرف سے ہلکا پھلکا ری ایکشن تو ظاہر کیا جاتا لیکن ڈیل ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارا اصل مقصد کچھ اور تھا جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔'' موہنی نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا پھر بھی صورتِ حال ابھی پوری طرح واضح نہیں تھی۔

''بھارت کو کسی مخصوص پاکستانی کو واپس پاکستان پہنچانے میں کیا دلچسپی ہے؟ مجھے اس پاکستانی کے بارے میں تفصیل بتاؤ؟'' مبہم سی باتوں کی وضاحت کے لیے اس کے سوال کا جواب بہت ضروری تھا۔

''وہ قیدی ایک پاکستانی مچھیرا تھا جسے صرف چودہ سال کی عمر میں بھارتی سمندری حدود کی خلاف ورزی کرنے والی ایک لانچ پر سے دوسرے مچھیروں کے ساتھ گرفتار کیا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم عرف سلّو ہے اور اس کی گرفتاری کو پورے پانچ سال گزر جانے کے باوجود اب بھی اس کے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں تمہارے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل پر اس کے متعلق ایک رپورٹ بھی دکھائی گئی تھی جس میں سلّو کی ماں اور بہن روتے ہوئے حکومتِ پاکستان سے سلّو کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنے کی درخواست کر رہی تھیں۔ ہم نے سوچا تمہاری حکومت ملکی خزانے کو فارن اکاؤنٹس میں منتقل کرنے میں اتنی بری طرح مصروف ہے، سلّو کی

ماں بہن کی درخواست پر کہاں کان دھرے گی تو چلو ہم خود اسے رہائی دلوا دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ اور استہزا کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اب تم مجھ سے یہ بکواس مت کرنا کہ تمہاری حکومت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سلّو کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی پلاننگ برسوں پہلے کی جا چکی تھی۔'' موہنی کے اندازِ گفتگو پر وہ بری طرح تلملایا چنانچہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ سوال جواب کے دوران اس کی نظر پولی گراف مشین کی طرف بھی تھی۔ وہ اگر ایک طرف اپنی تربیت یافتہ نظر سے اس کے چہرے پر سچ جھوٹ کو پرکھ رہا تھا تو دوسری طرف مشین کی موجودگی سے بھی استفادہ جاری تھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی۔ لیکن تمہیں یہ ضرور بتاؤں گی کہ سلّو اب بس ظاہری شناخت کی حد تک ہی پاکستانی ہے۔ ورنہ گزرے پانچ برسوں میں ہم اسے مکمل طور پر اپنا بنا چکے ہیں اور اب وہ پاکستان سے زیادہ بھارت ماتا کا وفادار ہے۔''

اس نے فخریہ بتایا جبکہ ذیشان کا دماغ اس انکشاف پر جھنجھنا اُٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سلیم عرف سلّو کے ساتھ کیا، کیا گیا ہوگا۔ پانچ سال قبل صرف چودہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والے اس پاکستانی ماہی گیر کو برین واشنگ اور مخصوص دواؤں کے استعمال سے ایسی شخصیت بنا دیا گیا ہوگا کہ وہ جذبۂ حب الوطنی تو کیا، انسانیت کو بھی فراموش کر چکا ہوگا اور صرف ان باتوں پر عمل کرنا جانتا ہوگا جس کا حکم اس کے زبردستی بن جانے والے آقا دیتے ہوں گے۔ بھارتیوں کا یہ ہتھکنڈا کوئی نیا نہیں تھا، اس سے قبل بھی وہ یہ ترکیب استعمال کر چکے تھے..... اب پھر اسی قسم کی ایک اور سازش سامنے آنے پر وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ سازش کا بنیادی طریقِ کار وہی تھا۔ ایک بار پھر پاکستان کے خلاف پاکستانی جوان کو استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے انہوں نے بھارت کی سرزمین پر دہشت گردی کا ڈرامہ رچا کر پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

''سلّو یہاں پہنچنے کے بعد کس کے انڈر ہوگا؟'' لمحوں میں کچھ سوچ لینے کے بعد اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرا کام بس یہیں تک تھا کہ میں سلّو کی پاکستان واپسی کا بندوبست کر دوں۔ آگے وہ کیا کرے گا اور کس کے کہنے پر کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔''

موہنی نے صاف جواب دیا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ ذیشان خود انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں موہنی جیسے افراد کو بس ایک حد تک ہی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور اصل مشن کو کوئی اور ہی ہینڈل کرتا ہے۔

'اوکے، تم ریسٹ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا کیا کرنا ہے۔'' اس نے یک دم ہی موہنی سے سوال جواب کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''موت کے علاوہ تم مجھے کچھ نہیں دے سکتے، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔'' وہ استہزائیہ بولی۔

ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دفتر میں خرم اس کے روبرو تھا۔

''موہنی کا کیس تمہارے حوالے ہے۔ اسے اچھی طرح کھنگال ڈالو۔ بس وقت زیادہ نہیں لینا۔ آٹھ دس گھنٹے میں اس کی لاش شہر کے کسی حصے میں ہونی چاہیے۔ لاش پھنکوانے کے بعد اس بات کا بھی انتظام کر دینا کہ باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے جس ڈاکٹر تک پہنچے، وہ ہماری مرضی کی رپورٹ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ موہنی کے



اغوا اور موت کو ایسا رنگ دیا جائے جس سے یہ تاثر اُبھرے کہ حسین اور تنہا عورت کو دیکھ کر کسی اوباش کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے قتل کر کے پھینک دیا۔''

''اوکے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ جیسا چاہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔'' خرم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ سی ایف پی کا ہر جوان ایسا ہی تھا۔ پُرعزم، حوصلہ مند اور دیئے ہوئے ٹاسک کو پورا کرنے کی اہلیت رکھنے والا۔

''سمیر سے کہہ دو کہ اس دوران موہنی کے ساتھی سے بھی تفتیش مکمل کر لے۔ وہ زبان کھولے گا تو موہنی سے حاصل ہونے والی معلومات کی مزید تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن خیال رکھنا کہ بندہ ایکسپائر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ موہنی اور اس کی لاشیں ایک وقت میں سامنے آ کر دشمن کو ہوشیار کرنے کا سبب بنیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت اسے دی۔

''ٹھیک ہے سر!'' خرم کا جواب اب بھی مختصر لیکن نپا تلا، اعتماد سے بھرپور تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ذیشان نے اسے اپنے دفتر سے باہر جانے کی اجازت دی اور خود دیگر مصروفیات میں اُلجھ گیا جس میں سب سے اہم مصروفیت کرنل توحید کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''واپسی کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے سرکار! اب تو راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ کارخانے کی ملکیت سے انکار کا ثبوت دینے کے بعد پولیس کی مجال نہیں کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکے۔ اور وہ اے سی کا بچہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، کافی ڈھنگ کا بندہ ہے۔ میں نے رواج کے مطابق اس کی آمد کے دن اے سی ہاؤس میں اس کا استقبال کیا تھا اور بہت سے تحفے تحائف بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے استقبال پر بہت خوش ہوا۔ تحائف بھی اسے بہت پسند آئے۔ میں نے اسے آپ کی غیر موجودگی کی وجہ بتا کر کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ چودھری صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں گے تو پھر حویلی میں اس کی شان دار دعوت کی جائے گی۔ اس نے اسی وقت دعوت قبول کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بندہ اپنے مطلب کا ہے اور آگے ہمارے لیے خاصی آسانی رہے گی۔'' منشی اللہ رکھا، چودھری کا سب سے زیادہ سر چڑھا اور مقرب ملازم تھا اس لیے اس سے اتنی طویل بات کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اس کے ذریعے چودھری کو حویلی، کاروبار اور فصل ہر شے کے بارے میں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔

''تُو ٹھیک کہہ رہا ہے منشی! پہلے کے مقابلے میں حالات اب کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ میں آنا چاہوں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن جانے کیوں میرا من راضی نہیں ہو رہا۔ ادھر میرے دوستوں کا بھی یہی مشورہ ہے کہ فی الحال کچھ دن نیویارک میں ہی رہوں اس لیے ابھی واپسی کا کچھ بتا نہیں سکتا تجھے۔ ویسے مجھے ملوم ہے کہ میرے پیچھے تُو چنگی طرح سب سنبھال لے گا۔ نئے اے سی کی طرف سے بھی تُو نے جو خبر سنائی ہے، اسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کہ بندہ اپنے مزاج کا ہے ورنہ خوامخواہ لفڑوں میں پڑ کر ٹائم برباد ہوتا ہے۔'' چودھری نے اپنے منشی کی کارکردگی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میری سات نسلیں آپ پر قربان چودھری صاحب! میرا تو کام ہی آپ کی خدمت ہے۔ آپ جو حکم دیں گے، میں بجا لاؤں گا۔ کہیں کوتاہی ہوئی بھی تو قسمت کی خرابی سے ہوگی، میں غفلت بہرحال نہیں کر سکتا۔'' منشی نے اپنی روایتی خوشامد سے کام لیتے ہوئے چودھری کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

''میں بھی یہی سوچ کر ہمیشہ تجھے چھوٹ دے دیتا ہوں ورنہ ابھی جو شہزادی والا معاملہ ہوا ہے، وہ ایسا معمولی نہیں تھا۔ بس بال بال ہی بچے ہیں سب۔ اگر وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو سب ختم ہو جاتا۔ اس کی

وجہ سے انصاری جیسے کام کے بندے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اب نہ جانے نیا فاریسٹ آفیسر کون آتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کا بندہ نہیں آسکا تو وڈی مشکل پڑ جائے گی۔'' منشی کو اس کی کوتاہی جتانے کے ساتھ اس نے تشویش کا بھی اظہار کیا۔

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں چودھری صاحب! بس میں خوامخواہ شہزادی سے ہمدردی کے چکر میں دھوکا کھا گیا۔ اصل میں اسے ڈاک بنگلے پر نوکری دلواتے ہوئے مجھے بالے کی خدمات کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا، مرنے والا اتنے عرصے تک جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمارے کام آتا رہا، اب اس کے بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں تو چلو ان کی روٹی کا کوئی بندوبست کر دوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ نمک حرام شہزادی در پردہ اے سی سے مل کر بیٹھی ہے اور ہمیں فاقوں کی کہانی سنا کر خود اے سی ہاؤس سے وظیفے وصول کر رہی ہے۔'' منشی کو شرمندگی کے ساتھ ساتھ شہزادی پر غصہ بھی تھا جس کا اظہار چودھری کے سامنے کرنے میں اس نے کوئی حرج نہ سمجھا۔

''چل خیر جو ہوا، سو ہوا۔ آگے کے لیے احتیاط کر۔ یہ خوامخواہ کی ہمدردیاں آدمی کو ایسی ہی مہنگی پڑتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمارے لیے کام کرتا ہے تو اس کی تنخواہ بھی تو لیتا ہے۔ پھر ہم اس سے بعد میں کس لیے ہمدردی کریں؟''

''درست فرمایا چودھری صاحب! آئندہ میں ایسی غلطی دوبارہ ہرگز نہیں کروں گا۔'' منشی نے چودھری کے زریں خیالات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ چنگی گل ہے کہ تُو ایک ہی واری میں سمجھ گیا ہے۔ اب ذرا خیال سے میری گل سن..... میرے پیچھے اب سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اِدھر تیری مدد کے لیے فاریسٹ آفیسر بھی نہیں ہے اس لیے جنگل کی طرف کا خاص دھیان رکھنا۔'' اس کی کوتاہی کو کمال فیاضی سے معاف کرتے ہوئے چودھری نے اسے تاکید کی۔

''ادھر کی آپ فکر نہ کریں۔ میں برابر وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ پہرہ بھی پہلے سے سخت کر دیا ہے۔ ویسے بھی جب تک نیا فاریسٹ آفیسر نہیں آجاتا، جنگل اور ڈاک بنگلے میں ہمارا مکمل راج ہے۔ فاریسٹ آفیسر آ گیا تو پھر اس کے آنے کے بعد بندہ دیکھ کر نئی پلاننگ بھی کر لیں گے۔'' منشی اپنی جگہ مطمئن تھا۔

''ٹھیک ہے فیر..... تُو مطمئن ہے تو تیرے کہنے پر میں بھی فکر نہیں کرتا اور کچھ دن ہور اِدھر ہی رہ کر موج مستی کر لیتا ہوں۔'' چودھری نے اپنی بات کے اختتام پر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''چھوٹے سرکار کو بھی خادم کا سلام بولیے گا۔'' فون بند کرنے سے پہلے منشی نے چودھری سے درخواست کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ مراد شاہ کی حویلی اور گاؤں سے عملاً بے نیازی کے باوجود یہ بات سمجھتا تھا کہ وہ مستقبل کا مالک ہے اس لیے اس کی گڈ بک میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

''چنگی گل ہے..... میں بول دوں گا۔ تُو ذرا حویلی کے اندر کا بھی خیال رکھنا..... فریدہ کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں رہتا..... چودھری بختیار کی بہن ہے، اس لیے اس سے مجھے خطرہ ہی لگا رہتا ہے کہ جانے کب ہاتھ دکھا جائے۔'' فون بند کرتے کرتے بھی اس نے منشی کو ایک اور ہدایت کر ڈالی۔

''میرا دھیان ہے اس طرف۔ آپ فکر نہ کریں۔ پچھلے دنوں نور پور سے ایک بندہ آیا تھا کہ فریدہ بی بی کو کچھ دن کے لیے میکے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے اسے ٹال دیا کہ جب تک چودھری صاحب نہیں آجاتے، یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے فریدہ بی بی آرام سے رہ رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت تو بچے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہے۔ تھوڑا بہت خیال سائیں بہزاد شاہ کا بھی رکھ لیتی ہے۔ ابھی تک اس کی طرف سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے کہ جس کی شکایت کی جا سکے۔''



منشی کے پاس یہاں بھی اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے کی گنجائش موجود تھی۔ چودھری مزید مطمئن ہو گیا کہ غلط بندے پر بھروسہ نہیں کیا ہے۔ منشی اللہ رکھا واقعی کام کا بندہ ہے۔

اس نے فون بند کیا تو بہت ہلکا پھلکا تھا۔ فراغت اور اطمینان کے اس احساس نے اس کے اندر تفریح کی خواہش کو جگا دیا۔ اس کی پسندیدہ تفریحات میں سرِفہرست دو تھیں۔ اوّل شراب، دوم شباب..... شراب تو ہمہ وقت اس کے پاس موجود ہی رہتی تھی البتہ بیٹے کے اپارٹمنٹ میں رہ کر وہ شباب کا لطف نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے لیے اُسے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت موج میں آیا تو لنڈا سے رابطہ کر بیٹھا۔

''کیسے ہیں مسٹر چودھری؟ فرمائیے کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟'' لِنڈا نے فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی اور خوشگوار لہجے میں پوچھنے لگا۔

''یاد تو ہم تمہیں چوبیس گھنٹے ہی کرتے رہتے ہیں لیکن فون کر کے بتانے کی کوشش اس لیے نہیں کرتے کہ تمہاری مصروفیت کا احساس ہے اور تمہیں زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' اس نے بھی جواباً خوش مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''شکریہ، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔'' دوسری طرف سے لِنڈا کی مسکراتی ہوئی کھنک دار آواز سنائی دی۔

''تم بھی تو ہمارا کچھ خیال کرو۔ اتنے دنوں سے میں نیویارک میں ہوں لیکن تم سے تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی۔ ایسا کرتے ہیں کہ آج کسی اچھے سے ہوٹل میں ساتھ ڈنر کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارتے ہیں۔'' چودھری کی خواہش اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ لِنڈا فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

''سوری چودھری صاحب! فی الحال آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ آج کل مسٹر الفا یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے میں بہت مصروف ہوں۔'' اس کی طرف سے صاف انکار تھما دیا گیا تھا لیکن چودھری کے لیے اس وقت اس کے انکار سے زیادہ الفا کی نیویارک میں موجودگی کی خبر اہمیت کی حامل تھی۔ اپنے اس اَن دیکھے آقا سے وہ خاصا مرعوب رہتا تھا اور اس کی طرف سے اپنی حاکمانہ فطرت کو بار بار لگنے والی چوٹوں کے باوجود دل ہی دل میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ الفا کے اندر گُر ہے کہ وہ اس جیسے شخص پر حکم چلا سکے۔

''یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ کیا مسٹر الفا مجھ سے بھی ملاقات کریں گے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ کیا کریں گے اور کیا نہیں، یہ خود انہی کو معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ ملاقات کرنا چاہیں گے تو پہلے سے انفارم کر دیں گے۔'' لِنڈا کا جواب محتاط تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی الفا سے خائف اور مرعوب ہے۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔ مسٹر الفا سے ملاقات کا بھی اور تمہاری فراغت کا بھی۔'' چودھری نے خوش دلی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ الفا کی موجودگی میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ لِنڈا سے ملاقات پر زور دے سکتا۔ حقیقتاً اس وقت تو اس کے دل سے تفریح کا خیال ہی نکل گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ الفا سے اگر ملاقات ہوئی تو وہ کس طرح پیش آئے گا۔ وہ لندن میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا، وہ بھی نقاب میں۔ اس وقت بھی اس نے اس کا لِنڈا کے ساتھ وقت گزارنے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا اور اب بھی وہ اس کی وجہ سے ملاقات سے انکاری ہو گئی تھی۔ یعنی الفا اس کا رقیب ثابت ہو رہا تھا اور رقیب بھی ایسا کہ وہ اس سے دوبدو مقابلہ کرنا تو دور کی بات، فون پر اس کی آواز سن کر ہی خائف ہو جاتا تھا۔ پنگھوڑے سے نکلنے سے بھی

یقیناً وہ چونکی بھی تھی لیکن کمال پھرتی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد اب چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجائے اسے بیک ویو مرر میں دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اسے خاموش دیکھ کر ذیشان نے اسے چھیڑا۔

''اس طرح لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والے کسی شخص سے دوستی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور آواز میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''میں گاڑی سائیڈ میں کر کے روکتی ہوں۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے نیچے اُتر جائیں اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دینا میرے لیے بہت آسان ہے۔

''میں تمہاری پہنچ کو جانتا ہوں لیکن گاڑی روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے بھی تمہارے خوبصورت بدن میں چھید کرتے ہوئے سخت افسوس ہوگا۔'' اس نے پستول کی نال اطمینان سے موہنی کے پہلو سے لگا دی۔

''اس کھلونے کی تباہ کاری سے تو تم اچھی طرح واقف ہو گی۔ اس میں سے نکلنے والی چند انچ کی گولی کئی فٹ کے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتی ہے.....اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ جن کے بل بوتے پر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو، ان کی ساری دلچسپی تمہارے خوش نما بدن کی گرمی تک محدود ہے۔ تم نہ رہیں تو وہ چند دن تمہارے لیے اُداس رہیں گے اور پھر کسی دوسری سیمیں بدن کے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔'' وہ اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے واقعی اس کا کوئی جنونی عاشق ہو اور اس کے دوستی سے انکار پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہو۔ مگر مقابل بھی موہنی تھی۔ مبینہ طور پر تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ۔ جو کسی طور بھی اس امکان کو رد نہیں کر سکتی تھی کہ کسی دشمن کی نظر میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بیک ویو مرر میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہدایات کے مطابق گاڑی چلاتی رہو۔'' اپنے لہجے میں تبدیلی لائے بغیر ذیشان نے جواب دیا۔

''اگر تم میری قربت کے خواہش مند ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد تم سے رابطہ کر کے تمہیں وقت دوں گی۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ اگر میں واپس نہیں پہنچی تو جلد بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اور تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔'' وہ نرم گرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں جو تمہارے وعدے پر اعتبار کر لوں۔ جو بھی مشکل پیش آئے گی، میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم صرف خاموشی سے میرے کہے پر عمل کرو۔ اور ہاں، اب جو چوراہا آئے، اس سے بائیں طرف گاڑی موڑ لینا۔'' اس نے کسی جنونی ہی کی طرح بے لچک لہجے میں اسے جواب دیا۔ موہنی ہونٹ بھینچ کر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پینترا بدلا اور نرمی سے بولنے لگی۔

''تم واقعی ہینڈسم آدمی ہو۔ مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ میرا کس لیول کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار اور وزراء میرے عاشق ہیں۔ میری وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جیلس بھی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ آپس میں دشمنی مول لینے کی صورت میں نقصان کسی ایک کا نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور ہے کہ خود ہی ٹکراؤ کا نتیجہ بھی جانتا ہے اس لیے میری وجہ سے دلوں میں بغض رکھنے کے باوجود اس بغض کو چھپا کر رکھتا ہے۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تم ان کی ٹکر کے آدمی نہیں ہو۔ اگر میں نے تم سے دوستی رکھی تو وہ سب کے سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اس طرح سے تمہیں غائب



کریں گے کہ مجھے یا تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اس لیے میں نے تم سے کھلے عام دوستی رکھنے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تم سب سے چھپ کر شاپنگ کے لیے نکلی ہو، یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو اور جب کسی کو یہ نہیں معلوم تو یہ بھی نہیں پتہ چل سکتا کہ تم یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ گئیں۔'' ذیشان نے مزے سے اسے جواب دیا۔

''پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ہر حال میں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' موہنی جھنجلائی۔

''ڈھونڈ نکالیں گے، تب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے، میرے ساتھ کریں گے۔ تم آرام سے سارا بوجھ مجھ پر ڈال سکتی ہو کہ میں نے زبردستی تمہیں اغوا کیا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ جواباً موہنی نے عجیب حرکت کی۔ اس نے بالکل اچانک ہی گاڑی کو بریکس لگا دیئے۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے زوردار جھٹکا لگا۔ اور ذیشان کا پستول اس کے پہلو سے ہٹ گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح پلٹ کر اس پر جھپٹی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے ذیشان پہلے ہی اپنا توازن تھوڑا سا کھو چکا تھا، اس حملے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائیدان میں جا گرا۔

''اُترو میری گاڑی سے باسٹرڈ! ورنہ میں تمہارا بھیجہ اُڑا دوں گی۔'' اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال کر اس نے ذیشان پر تانا اور غرائی۔

''گولی مت چلانا، میں اُتر رہا ہوں۔'' حالات پلٹا کھا چکے تھے لیکن ذیشان نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور نہایت خوف زدہ شخص کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تم نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر کی اُترنے میں تو میں گولی چلا دوں گی۔'' اسے خوف زدہ دیکھ کر وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس وقت وہ اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر گاڑی کے فرش پر تھا جبکہ دوسرے کا گھٹنا موڑ کر اس نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور وہ عقبی نشست کی طرف منہ کیے ذیشان کو کور کیے ہوئے تھی۔

کسی بے انتہا خوف زدہ شخص کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ذیشان نے اس طرح حرکت کی جیسے وہ گاڑی سے اُترنے والا ہو لیکن اس کی نظریں پوری طرح موہنی کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ موہنی کی پسٹل پر گرفت اس کی مشاقی کو ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ اس حد تک ہوشیار نظر نہیں آ رہی تھی جتنا اسے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے مدِمقابل ہونے کی صورت میں نظر آنا چاہئے تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس نے ذیشان کو سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر لیا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے طور پر نمٹ رہی تھی جو اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر ایسی جنونی حرکت کر بیٹھا تھا اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

ذیشان نے اُس کی اس غلط فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اُترتے اُترتے پلٹ کر اس زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ وہ اُلٹ کر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔ اُلٹنے سے اس کا پسٹل والا ہاتھ اوپر کی طرف ہو گیا تھا چنانچہ جھٹکا لگنے سے گولی چلی اور گاڑی کی چھت میں پیوست ہو گئی۔ موہنی نے کوشش کی کہ خود کو سنبھال کر دوسرا فائر ذیشان پر کر سکے لیکن ایک تو وہ اس پوزیشن پر گری تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا، دوسرے ذیشان بھی برق بنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے موہنی کا پسٹل چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آرام سے اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ مجھے تمہارے اس حسین بدن میں چھید کر کے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔''

یقیناً وہ چونکی بھی تھی لیکن کمال پھرتی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد اب چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجائے اسے بیک ویو مرر میں دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اسے خاموش دیکھ کر ذیشان نے اسے چھیڑا۔

''اس طرح لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والے کسی شخص سے دوستی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور آواز میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''میں گاڑی سائیڈ میں کر کے روکتی ہوں۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے نیچے اُتر جائیں اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دینا میرے لیے بہت آسان ہے۔

''میں تمہاری پہنچ کو جانتا ہوں لیکن گاڑی روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے بھی تمہارے خوبصورت بدن میں چھید کرتے ہوئے سخت افسوس ہوگا۔'' اس نے پستول کی نال اطمینان سے موہنی کے پہلو سے لگا دی۔

''اس کھلونے کی تباہ کاری سے تو تم اچھی طرح واقف ہو گی۔ اس میں سے نکلنے والی چند انچ کی گولی کئی فٹ کے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتی ہے.....اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ جن کے بل بوتے پر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو، ان کی ساری دلچسپی تمہارے خوش نما بدن کی گرمی تک محدود ہے۔ تم نہ رہیں تو وہ چند دن تمہارے لیے اُداس رہیں گے اور پھر کسی دوسری سیمیں بدن کے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔'' وہ اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے واقعی اس کا کوئی جنونی عاشق ہو اور اس کے دوستی سے انکار پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہو۔ مگر مقابل بھی موہنی تھی۔ مبینہ طور پر تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ۔ جو کسی طور بھی اس امکان کو رد نہیں کر سکتی تھی کہ کسی دشمن کی نظر میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بیک ویو مرر میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہدایات کے مطابق گاڑی چلاتی رہو۔'' اپنے لہجے میں تبدیلی لائے بغیر ذیشان نے جواب دیا۔

''اگر تم میری قربت کے خواہش مند ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد تم سے رابطہ کر کے تمہیں وقت دوں گی۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ اگر میں واپس نہیں پہنچی تو جلد بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اور تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔'' وہ نرم گرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں جو تمہارے وعدے پر اعتبار کر لوں۔ جو بھی مشکل پیش آئے گی، میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم صرف خاموشی سے میرے کہے پر عمل کرو۔ اور ہاں، اب جو چوراہا آئے، اس سے بائیں طرف گاڑی موڑ لینا۔'' اس نے کسی جنونی ہی کی طرح بے لچک لہجے میں اسے جواب دیا۔ موہنی ہونٹ بھینچ کر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پینترا بدلا اور نرمی سے بولنے لگی۔

''تم واقعی ہینڈسم آدمی ہو۔ مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ میرا کس لیول کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار اور وزراء میرے عاشق ہیں۔ میری وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جیلس بھی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ آپس میں دشمنی مول لینے کی صورت میں نقصان کسی ایک کا نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور ہے کہ خود ہی ٹکراؤ کا نتیجہ بھی جانتا ہے اس لیے میری وجہ سے دلوں میں بغض رکھنے کے باوجود اس بغض کو چھپا کر رکھتا ہے۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تم ان کی ٹکر کے آدمی نہیں ہو۔ اگر میں نے تم سے دوستی رکھی تو وہ سب کے سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اس طرح سے تمہیں غائب



کریں گے کہ مجھے یا تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اس لیے میں نے تم سے کھلے عام دوستی رکھنے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تم سب سے چھپ کر شاپنگ کے لیے نکلی ہو، یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو اور جب کسی کو یہ نہیں معلوم تو یہ بھی نہیں پتہ چل سکتا کہ تم یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ گئیں۔'' ذیشان نے مزے سے اسے جواب دیا۔

''پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ہر حال میں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' موہنی جھنجلائی۔

''ڈھونڈ نکالیں گے، تب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے، میرے ساتھ کریں گے۔ تم آرام سے سارا بوجھ مجھ پر ڈال سکتی ہو کہ میں نے زبردستی تمہیں اغوا کیا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ جواباً موہنی نے عجیب حرکت کی۔ اس نے بالکل اچانک ہی گاڑی کو بریکس لگا دیئے۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے زوردار جھٹکا لگا۔ اور ذیشان کا پستول اس کے پہلو سے ہٹ گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح پلٹ کر اس پر جھپٹی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے ذیشان پہلے ہی اپنا توازن تھوڑا سا کھو چکا تھا، اس حملے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائیدان میں جا گرا۔

''اُترو میری گاڑی سے باسٹرڈ! ورنہ میں تمہارا بھیجہ اُڑا دوں گی۔'' اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال کر اس نے ذیشان پر تانا اور غرائی۔

''گولی مت چلانا، میں اُتر رہا ہوں۔'' حالات پلٹا کھا چکے تھے لیکن ذیشان نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور نہایت خوف زدہ شخص کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تم نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر کی اُترنے میں تو میں گولی چلا دوں گی۔'' اسے خوف زدہ دیکھ کر وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس وقت وہ اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر گاڑی کے فرش پر تھا جبکہ دوسرے کا گھٹنا موڑ کر اس نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور وہ عقبی نشست کی طرف منہ کیے ذیشان کو کور کیے ہوئے تھی۔

کسی بے انتہا خوف زدہ شخص کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ذیشان نے اس طرح حرکت کی جیسے وہ گاڑی سے اُترنے والا ہو لیکن اس کی نظریں پوری طرح موہنی کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ موہنی کی پسٹل پر گرفت اس کی مشاقی کو ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ اس حد تک ہوشیار نظر نہیں آ رہی تھی جتنا اسے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے مدِمقابل ہونے کی صورت میں نظر آنا چاہئے تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس نے ذیشان کو سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر لیا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے طور پر نمٹ رہی تھی جو اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر ایسی جنونی حرکت کر بیٹھا تھا اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

ذیشان نے اُس کی اس غلط فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اُترتے اُترتے پلٹ کر اس زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ وہ اُلٹ کر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔ اُلٹنے سے اس کا پسٹل والا ہاتھ اوپر کی طرف ہو گیا تھا چنانچہ جھٹکا لگنے سے گولی چلی اور گاڑی کی چھت میں پیوست ہو گئی۔ موہنی نے کوشش کی کہ خود کو سنبھال کر دوسرا فائر ذیشان پر کر سکے لیکن ایک تو وہ اس پوزیشن پر گری تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا، دوسرے ذیشان بھی برق بنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے موہنی کا پسٹل چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آرام سے اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ مجھے تمہارے اس حسین بدن میں چھید کر کے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔''

''تم کون ہو؟'' سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پہلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔'' ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

''یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔'' ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہوگی۔ میں اتنا بااختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی اُدھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔'' ذیشان نے غراتی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''دیکھو، یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔'' ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر ٹکا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔

ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بغیر کسی اُلجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔

وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہوگیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دورانِ سفر ہی سو گئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسبِ توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے مزاحمت پر اُتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو کرنے میں کامیاب ہوگئے۔



تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی۔ اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہوگیا۔''

یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو۔ لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیئے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ انٹیلی جنس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکاران کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا، کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہے اس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہو سکی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی بازیاب ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔''

یوسف بولتا جا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہوگا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابلِ مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آ چکے تھے جن میں غیر مسلم افراد، مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند ثانیوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہر خند کر دیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''لے رنجنی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔''

آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کر لو تا کہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک

حاصل ہونے والی معلومات منتقل کرنے کے ساتھ ہی آج رات کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اور پھر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔

بستر بے حد آرام دہ تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام بھی موجود نہیں تھا چنانچہ آشا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے آرام کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا لیکن وہ اتنی چوکنی نیند سویا تھا کہ آشا کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل جب وہ دروازے کا ہینڈل گھما رہی تھی، اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے آشا کو ایک سیاہ لباس کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں نے بتا دیا کہ وہ یہ لباس اسی کے لیے لے کر آئی ہے۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کے کپڑوں میں سیاہ رنگ کا کوئی لباس موجود نہیں تھا اس لیے از خود بندوبست کر دیا تھا۔

''رتی کی ڈیڈ باڈی کوٹھی پہنچ گئی ہے کیا؟'' وہ انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اُترا اور آشا سے پوچھا۔

''بس پہنچنے والی ہے۔ ابھی شالنی دیدی کے پاس فون آیا تھا کہ دس منٹ میں رتی کو یہاں پہنچا دیا جائے گا۔ سب لوگ تیار ہیں بس مجھے اور تمہیں ہی تیار ہونا ہے۔'' آشا نے اسے جواب دیا۔

''ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کپڑے ہی تو بدلنے ہیں۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ سے لباس لے کر خود جلدی سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اس نے تیار ہونے میں پانچ چھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ آشا بھی اس دوران تیار ہو چکی تھی۔

''تُو تو اس سیاہ لباس میں بھی بڑی پیاری لگ رہی ہے۔'' جاوید علی کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا جس کے جواب میں لازماً اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

''تم خود کون سی کسی سے کم ہو؟..... سچ بولوں تو اگر میں نے تمہاری جگہ یہ پینٹ شرٹ پہن رکھا ہوتا تو ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ تو بس تم ہی ہو جو مردانہ لباس میں بھی خوب جچتی ہو۔''

''کیا کروں، یہ لباس بھی میری مجبوری ہے۔ بے بی کی ڈرائیور ہوں نا، اس لیے ایسے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ ورنہ بے بی صاف کہتی ہے کہ میں کسی ہیجڑے کو اپنے ساتھ لے جا کر تماشا نہیں بننا چاہتی۔ زرق برق زنانہ لباس تو مجھے مشکل سے ہی پہننے کو ملتا ہے۔ ایک نواب صاحب خدمت کے لیے بلاتے ہیں جب اور دوسرے کسی خوشی کے موقع پر بے بی مجھے چھٹی دے دے تب۔'' آشا نے اُداسی سے بتایا۔

''بے بی سے تمہاری مراد نواب صاحب کی بیٹی ہے؟'' جاوید علی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آشا نے سر ہلایا اور مزید بولی۔ ''اصل میں تو میں یہاں بے بی کی ڈرائیور کے طور پر ہی اپائنٹ ہوئی ہوں لیکن بے بی کوئی ہر وقت تو باہر آتی جاتی نہیں ہے اس لیے ضرورت پڑنے پر نواب صاحب مجھے دوسرے کام بھی سونپ دیتے ہیں۔ جیسے آج میں تم لوگوں کو ایئر پورٹ لینے گئی تھی۔ خود نواب صاحب کا ڈرائیور الگ ہے لیکن وہ یہاں کوٹھی میں نہیں رہتا۔ نواب صاحب کو جب کہیں جانا ہو تو اسے فون کر کے بلوا لیتے ہیں یا پھر کبھی کبھار خود بھی اپنی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔''

آشا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ اس موقع پر کچھ اور بھی سوال تھے جو جاوید علی کے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن وہ انہیں زبان پر اس لیے نہ لا سکا کہ کمرے کے باہر خاصی ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ کسی نے دروازے پر دستک دے کر آشا کو آواز بھی دی تھی۔

''چلو، چلنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' آشا اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے باہر لے گئی۔ کوریڈور میں اس وقت سیاہ لباس پہنے کئی خواجہ سرا نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کے سب جوان اور خوب صورت تھے۔



''باہر گاڑی میں چل کر بیٹھو۔'' کوریڈور میں شالنی کی آواز گونجی اور وہ سب فوراً ہی متحرک ہو گئے۔ جاوید علی اور آشا بھی ان میں شامل تھے۔ باہر ایک میت بس کھڑی تھی۔ وہ لوگ بس کے قریب پہنچے تو اس میں سے نواب صاحب کو اُترتے دیکھا۔ انہیں اس خواجہ سرا نے سہارا دے رکھا تھا جس نے کوٹھی آمد کے بعد ان لوگوں کا استقبال کیا تھا۔ وہ خواجہ سرا باقی سب کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟'' شالنی نے قریب پہنچ کر استفسار کیا۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ نواب صاحب اس وقت بہت دُکھی ہیں اور انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ جاوید علی کو نواب صاحب کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضمحل اور اُداس لگ رہے تھے۔ شاید وہ میت بس میں رکھی رتی کی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے یہاں تک آئے تھے اور اُسے مُردہ حالت میں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔

''اچھی بات ہے۔ تم نواب صاحب کا دل بہلاؤ۔ ہم رتی کا کریا کرم کر کے آتے ہیں۔'' شالنی نے اسے جواب دیا تو جاوید علی کو اس کا لہجہ کچھ عجیب کاٹ دار سا لگا لیکن ابھی اپنے محسوسات کی تصدیق کرنے کا موقع نہیں تھا۔ نواب صاحب کے وہاں سے ہٹتے ہی ان سب کو میت بس میں بیٹھنے کا حکم دے دیا تھا۔ ان سب نے ہی تیزی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ بس کے درمیانی حصے میں ایک تابوت رکھا تھا جس میں یقینی طور پر رتی کی لاش موجود تھی۔ وہ سب خاموشی سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جاوید علی، آشا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا لیکن اب وہ اس سے بات چیت کرنے کے بجائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ باقی لوگ بھی اسے یہی کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس لیے وہ دکھاوے کے لیے خود بھی وقفے وقفے سے ہونٹ ہلاتا رہا۔

بس تیزی سے چلتی سفر طے کرتی رہی۔ سی ایف پی کے لاہور یونٹ میں شامل ہونے سے قبل جاوید علی کچھ عرصہ کراچی میں رہ چکا تھا اس لیے اس کے لیے یہاں کے راستے اور علاقے اتنے اجنبی نہیں تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی سے روانہ ہونے والی بس اب کراچی اولڈ سٹی کی طرف رواں دواں ہے۔ بس کو ایک ہٹا کٹا صحت مند آدمی چلا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی چار کیم شحیم افراد موجود تھے۔ ان میں سے ان میں سے ایک بس کے دروازے پر موجود تھا جبکہ تین نے خواجہ سراؤں سے الگ ڈرائیور کے قریب جگہ سنبھال رکھی تھی۔ بس ایم اے جناح روڈ پر پہنچی تو پولیس کی ایک پیٹرولنگ گاڑی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بغیر کسی حیل وحجت کے گاڑی روک دی اور پولیس والوں سے بات کرنے لگا۔ یقینی طور پر وہ انہیں یہی بتا رہا تھا کہ اندر ایک ڈیڈ باڈی موجود ہے جو کہ ایک خواجہ سرا کی ہے اور اس کے خواجہ سرا ساتھی اس کا کریا کرم کرنے شمشان گھاٹ لے جا رہے ہیں۔

ڈرائیور کی گفت وشنید کے باوجود ایک پولیس والا بس میں چڑھ آیا اور تابوت کے شیشے کے چوکھٹے میں سے جھانک کر اس بات کی تسلی کی کہ وہاں کوئی ڈیڈ باڈی موجود ہے۔ پولیس والے کے آنے اور تصدیق کر کے جانے تک سب لوگ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ واحد شالنی تھی جو چوکنا نظروں سے پولیس والے کو دیکھتی رہی تھی۔ جاوید علی جو کہ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پولیس والے کے اُترتے ہی شالنی کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات اُبھر آئے ہیں۔ وہ اُلجھنے لگا کہ شالنی کے اس رویے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ شہر کے حالات کے سبب رات گئے سفر کرنے والی گاڑیوں کو روک کر پولیس کا چیکنگ کرنا اب اتنی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی جس سے کوئی گھبراتا اور بعد میں مطمئن نظر آنے لگتا۔ ایسے تاثرات تو اسی

شخص کے ہو سکتے تھے جو کسی گڑبڑ میں ملوث ہو اور جاوید علی کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ شالنی کا کردار بہت مشکوک ہے اور وہ اچھی خاصی گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔

پولیس والوں سے خلاصی کے بعد گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس بار سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور وہ لوگ ایک شمشان گھاٹ کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم شمشان گھاٹ تھا۔ گاڑی شمشان گھاٹ پر رُکی تو ڈرائیور اور اس کے ساتھی پھرتی سے حرکت میں آ گئے اور درمیان میں رکھے تابوت کو گاڑی سے نیچے اُتارنے لگے۔ وہ چاروں اچھے خاصے طاقتور نظر آنے کے باوجود تابوت اُتارتے ہوئے مشکل میں دکھائی دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ تابوت خاصا وزنی ہو اور انہیں اسے حرکت دینے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑ رہی ہو۔ لیکن بہرحال انہوں نے تابوت کو نیچے اتار لیا۔ جاوید علی اور بس میں موجود تمام خواجہ سرا شالنی کے حکم کے مطابق تابوت اُتارے جانے تک اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ البتہ شالنی خود بس سے نیچے اُتر گئی تھی اور کسی سپروائزر کی طرح تابوت اُتارنے والوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے انداز میں واضح برتری تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہے جسے معاشرے کا سب سے زیادہ پسا ہوا اور مظلوم طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ ایک حکمراں محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے چاروں گرانڈیل مرد بس اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ شالنی نے انہیں تابوت شمشان گھاٹ کے اندر لے جانے کا حکم دیا تو وہ فوراً ہی عمل پیرا ہو گئے۔ ان چاروں کے تابوت لے جانے کے بعد شالنی نے باقی خواجہ سراؤں کو اجازت دی کہ وہ بھی نیچے اُتر سکتے ہیں۔

سب کے سب نہایت منظم انداز میں نیچے اُتر آئے اور اسی تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے شالنی کی سربراہی میں شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ قبرستانوں اور شمشان گھاٹ وغیرہ کا جو مخصوص ماحول ہوتا ہے، اس سے گھبرا کر تو لوگ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خصوصاً اکیلا آدمی خاصا عجیب محسوس کرتا ہے اور یہاں تو آدھی رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کئی تھے اور ان کی آمد نے وہاں کے جامد سناٹے میں خاصی ہلچل بھی پیدا کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود وحشت کا تاثر قائم تھا۔ دن میں جلائی جانے والی چتاؤں کی بُو پوری طرح سے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جاوید علی کا کسی شمشان گھاٹ آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے اسے ہر شے اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مقابلے میں اسے باقی لوگ بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی یہی کوشش تھی کہ اس کی ناگواری اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ اسے یاد رکھنا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے دوران تو شمشان گھاٹ کیا، مُردہ خانے میں بھی رہنا پڑتا تو وہ رہتا۔ اس نے اپنا دھیان ماحول کی وحشت سے ہٹایا اور وہاں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تابوت سے رتی کی لاش نکال لی گئی تھی اور اب اسے پہلے سے تیار چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ لاش کو چتا پر لٹائے جانے کے بعد شالنی آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کھجور کی ہلکی سی ٹوکری میں سے گیندے اور گلاب کے پھولوں پر مشتمل بڑا سا ہار نکال کر رتی کی لاش کو پہنایا۔ دھان پان سی رتی کا سینہ اور پیٹ وغیرہ اس ہار سے ڈھک گئے۔ اس موقع پر جاوید علی کو تابوت اُتارنے والوں کی محنت و مشقت یاد آئی۔ دھان پان سی رتی کا وزن ہی کتنا تھا کہ اس کا تابوت اتارنے والوں کو اتنی محنت کرنی پڑی۔

سوچنے کو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ تابوت بھاری لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن جاوید علی نے خود جائزہ لیا تھا کہ تابوت کی لکڑی بہت زیادہ عمدہ کوالٹی کی نہیں ہے اس لیے اس کا غیر معمولی بھاری ہونا ایک معمہ سا تھا۔ بلکہ ڈیڈ باڈی کو شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے تابوت کا استعمال بھی ایک طرح سے غیر ضروری تھا۔ تابوت تو عموماً وہ لوگ



استعمال کرتے ہیں جو اپنے مُردوں کو تابوت سمیت قبر میں دفناتے ہیں۔ یہاں تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، اس کے شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی جاری تھی۔ خواجہ سراؤں کے مربی کی حیثیت سے شالنی کو ان میں سب سے خاص مقام حاصل تھا۔ چنانچہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر جاوید علی نے وہاں موجود خواجہ سراؤں کو خاصا دُکھی پایا۔ رتی کی چتا کو آگ لگتے دیکھ کر ان میں سے کئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے تھے اور کچھ بلند آواز میں تو کچھ سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ جاوید علی نے خود اپنے دل کو بھی اس ماحول میں بوجھل پایا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹا وہ وجود کس کا تھا اور ان کے درمیان مذہب و معاشرت کی کیا تفریق تھی، اس سے قطع نظر وہ اس وقت ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کی زندگی کا سفر ختم ہونے پر اپنے دل کو آزردہ محسوس کر رہا تھا لیکن آزردگی کی اس کیفیت میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان کے ساتھ میت گاڑی میں آنے والے چاروں مردوں نے نہایت خاموشی سے چتا سے کچھ فاصلے پر رکھا خالی تابوت اٹھایا اور وہاں سے جانے لگے۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے تابوت میں خاصا وزن موجود ہو۔ ان چاروں کے حرکت میں آتے ہی اس نے شالنی کو بھی چپکے سے سب کے درمیان سے کھسکتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور خود بھی سب کے درمیان سے نکل کر خاموشی سے اس طرف چل پڑا جہاں شالنی گئی تھی۔

سوگوار خواجہ سراؤں نے ان میں سے کسی کی حرکت کو نوٹ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ شاید کسی نے اس حرکت کو محسوس بھی کیا ہو گا تو اس کے نزدیک اس کی وجہ جاننے کے مقابلے میں اپنی ساتھی کی جلتی چتا کے سامنے کھڑے ہو کر آنسو بہانا زیادہ اہم رہا ہو گا۔

دبے قدموں شالنی کے پیچھے جانے والے جاوید علی نے اسے کنوئیں کے قریب کھڑا دیکھ لیا۔ وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال رہی تھی۔ جاوید علی کوشش کر کے بے آواز قدموں سے اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو سن سکے۔

''مال بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ میرے آدمی صرف چالیس منٹ تک اس کی حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارے آدمی۔ اگر تم اس دوران یہاں پہنچ کر مال نہیں اٹھا سکے تو آگے ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار نہیں ہو گا۔'' شالنی فون پر کسی سے مخاطب تھی۔

''پروگرام کے مطابق سارا مال تابوت میں ہی ہے۔ تم میت گاڑی یا ایمبولینس لاؤ اور مزے سے اپنا مال لے جاؤ۔ اتنی ہچر مچر کی کیا ضرورت ہے کہ یہ ہو گیا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گیا تو کیا کرنا ہو گا۔ ہم نے جتنی پے منٹ لی ہے، اتنا ہی کام کریں گے نا۔'' دوسری طرف سے شاید مزید تعاون کی درخواست کی گئی جس کے جواب میں شالنی نے بے مروّتی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر وہاں سے مزید کچھ کہا جانے لگا جسے سن کر شالنی نے اپنے روّیے میں ذرا سی لچک پیدا کی اور قدرے تحمل سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تابوت پرانے کنوئیں کے قریب ہی رکھا ہے۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچ سکے یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تابوت کو کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ تم لوگ بعد میں اسے نکالتے رہنا۔ اور ہاں، یاد رکھو کہ پانچ منٹ تم مجھ سے بات چیت میں برباد کر چکے ہو اس لیے اب تمہارے پاس صرف پینتیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے شالنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید علی پھرتی سے لیکن بے آواز قدموں سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ شالنی کی یک طرفہ گفتگو سن کر ہی

''تم کون ہو؟'' سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پہلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔'' ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

''یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔'' ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہو گی۔ میں اتنا با اختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی اُدھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔'' ذیشان نے غراتی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''دیکھو، یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔'' ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر ٹکا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہو گئی۔

ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بظاہر کسی اُلجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔

وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہو گیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دورانِ سفر ہی سو گئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسبِ توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے مزاحمت پر اُتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔



تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی۔ اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہو گیا۔''

یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو۔ لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیئے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ انٹیلی جنس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکاران کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا، کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہے اس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہو سکی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی بازیاب ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔''

یوسف بولتا جا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہو گا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابلِ مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آ چکے تھے جن میں غیر مسلم افراد، مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند ثانیوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہر خند کر دیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''لے رنجنی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔''

آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کر لو تاکہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک

''تم کون ہو؟'' سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پہلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔'' ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

''یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔'' ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہوگی۔ میں اتنا با اختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی اُدھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔'' ذیشان نے غراتی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''دیکھو، یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔'' ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر ٹکا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔

ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بظاہر کسی اُلجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔

وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہوگیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دورانِ سفر ہی سو گئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسبِ توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے مزاحمت پر اُتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔



تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی۔ اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہو گیا۔''

یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو۔ لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیئے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ انٹیلی جنس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکاران کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا، کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہے اس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہو سکی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی بازیاب ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔''

یوسف بولتا جا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہوگا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابلِ مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آ چکے تھے جن میں غیر مسلم افراد، مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند ثانیوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہر خند کر دیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

''لے رنجنی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔''

آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کر لو تاکہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک

شخص کے ہو سکتے تھے جو کسی گڑبڑ میں ملوث ہو اور جاوید علی کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ شالنی کا کردار بہت مشکوک ہے اور وہ اچھی خاصی گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔

پولیس والوں سے خلاصی کے بعد گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس بار سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور وہ لوگ ایک شمشان گھاٹ کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم شمشان گھاٹ تھا۔ گاڑی شمشان گھاٹ پر رُکی تو ڈرائیور اور اس کے ساتھی پھرتی سے حرکت میں آ گئے اور درمیان میں رکھے تابوت کو گاڑی سے نیچے اُتارنے لگے۔ وہ چاروں اچھے خاصے طاقتور نظر آنے کے باوجود تابوت اُتارتے ہوئے مشکل میں دکھائی دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ تابوت خاصا وزنی ہو اور انہیں اسے حرکت دینے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑ رہی ہو۔ لیکن بہرحال انہوں نے تابوت کو نیچے اتار لیا۔ جاوید علی اور بس میں موجود تمام خواجہ سرا شالنی کے حکم کے مطابق تابوت اُتارے جانے تک اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ البتہ شالنی خود بس سے نیچے اُتر گئی تھی اور کسی سپروائزر کی طرح تابوت اُتارنے والوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے انداز میں واضح برتری تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہے جسے معاشرے کا سب سے زیادہ پسا ہوا اور مظلوم طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ ایک حکمراں محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے چاروں گرانڈیل مرد بس اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ شالنی نے انہیں تابوت شمشان گھاٹ کے اندر لے جانے کا حکم دیا تو وہ فوراً ہی عمل پیرا ہو گئے۔ ان چاروں کے تابوت لے جانے کے بعد شالنی نے باقی خواجہ سراؤں کو اجازت دی کہ وہ بھی نیچے اُتر سکتے ہیں۔

سب کے سب نہایت منظم انداز میں نیچے اُتر آئے اور اسی تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے شالنی کی سربراہی میں شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ قبرستانوں اور شمشان گھاٹ وغیرہ کا جو مخصوص ماحول ہوتا ہے، اس سے گھبرا کر تو لوگ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خصوصاً اکیلا آدمی خاصا عجیب محسوس کرتا ہے اور یہاں تو آدھی رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کئی تھے اور ان کی آمد نے وہاں کے جامد سناٹے میں خاصی ہلچل بھی پیدا کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود وحشت کا تاثر قائم تھا۔ دن میں جلائی جانے والی چتاؤں کی بُو پوری طرح سے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جاوید علی کا کسی شمشان گھاٹ آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے اسے ہر شے اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مقابلے میں اسے باقی لوگ بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی یہی کوشش تھی کہ اس کی ناگواری اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ اسے یاد رکھنا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے دوران تو شمشان گھاٹ کیا، مُردہ خانے میں بھی رہنا پڑتا تو وہ رہتا۔ اس نے اپنا دھیان ماحول کی وحشت سے ہٹایا اور وہاں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تابوت سے رتی کی لاش نکال لی گئی تھی اور اب اسے پہلے سے تیار چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ لاش کو چتا پر لٹائے جانے کے بعد شالنی آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کھجور کی ہلکی سی ٹوکری میں سے گیندے اور گلاب کے پھولوں پر مشتمل بڑا سا ہار نکال کر رتی کی لاش کو پہنایا۔ دھان پان سی رتی کا سینہ اور پیٹ وغیرہ اس ہار سے ڈھک گئے۔ اس موقع پر جاوید علی کو تابوت اُتارنے والوں کی محنت و مشقت یاد آئی۔ دھان پان سی رتی کا وزن ہی کتنا تھا کہ اس کا تابوت اتارنے والوں کو اتنی محنت کرنی پڑی۔

سوچنے کو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ تابوت بھاری لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن جاوید علی نے خود جائزہ لیا تھا کہ تابوت کی لکڑی بہت زیادہ عمدہ کوالٹی کی نہیں ہے اس لیے اس کا غیر معمولی بھاری ہونا ایک معمہ سا تھا۔ بلکہ ڈیڈ باڈی کو شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے تابوت کا استعمال بھی ایک طرح سے غیر ضروری تھا۔ تابوت تو عموماً وہ لوگ



استعمال کرتے ہیں جو اپنے مُردوں کو تابوت سمیت قبر میں دفناتے ہیں۔ یہاں تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، اس کے شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی جاری تھی۔ خواجہ سراؤں کے مربّی کی حیثیت سے شالنی کو ان میں سب سے خاص مقام حاصل تھا۔ چنانچہ رتی کی چتا کو اگنی دینے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر جاوید علی نے وہاں موجود خواجہ سراؤں کو خاصا دُکھی پایا۔ رتی کی چتا کو آگ لگتے دیکھ کر ان میں سے کئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے تھے اور کچھ بلند آواز میں تو کچھ سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ جاوید علی نے خود اپنے دل کو بھی اس ماحول میں بوجھل پایا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹا وہ وجود کس کا تھا اور ان کے درمیان مذہب و معاشرت کی کیا تفریق تھی، اس سے قطعِ نظر وہ اس وقت ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کی زندگی کا سفر ختم ہونے پر اپنے دل کو آزردہ محسوس کر رہا تھا لیکن آزردگی کی اس کیفیت میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان کے ساتھ میت گاڑی میں آنے والے چاروں مردوں نے نہایت خاموشی سے چتا سے کچھ فاصلے پر رکھا خالی تابوت اٹھایا اور وہاں سے جانے لگے۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے تابوت میں خاصا وزن موجود ہو۔ ان چاروں کے حرکت میں آتے ہی اس نے شالنی کو بھی چپکے سے سب کے درمیان سے کھسکتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور خود بھی سب کے درمیان سے نکل کر خاموشی سے اس طرف چل پڑا جہاں شالنی گئی تھی۔

سوگوار خواجہ سراؤں نے ان میں سے کسی کی حرکت کو نوٹ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ شاید کسی نے اس حرکت کو محسوس بھی کیا ہو گا تو اس کے نزدیک اس کی وجہ جاننے کے مقابلے میں اپنی ساتھی کی جلتی چتا کے سامنے کھڑے ہو کر آنسو بہانا زیادہ اہم رہا ہو گا۔

دبے قدموں شالنی کے پیچھے جانے والے جاوید علی نے اسے کنوئیں کے قریب کھڑا دیکھ لیا۔ وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال رہی تھی۔ جاوید علی کوشش کر کے بے آواز قدموں سے اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو سن سکے۔

''مال بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ میرے آدمی صرف چالیس منٹ تک اس کی حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارے آدمی۔ اگر تم اس دوران یہاں پہنچ کر مال نہیں اٹھا سکے تو آگے ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار نہیں ہو گا۔'' شالنی فون پر کسی سے مخاطب تھی۔

''پروگرام کے مطابق سارا مال تابوت میں ہی ہے۔ تم میت گاڑی یا ایمبولینس لاؤ اور مزے سے اپنا مال لے جاؤ۔ اتنی ہچر مچر کی کیا ضرورت ہے کہ یہ ہو گیا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گیا تو کیا کرنا ہو گا۔ ہم نے جتنی پے منٹ لی ہے، اتنا ہی کام کریں گے نا۔'' دوسری طرف سے شاید مزید تعاون کی درخواست کی گئی جس کے جواب میں شالنی نے بے مروّتی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر وہاں سے مزید کچھ کہا جانے لگا جسے سن کر شالنی نے اپنے رویّے میں ذرا سی لچک پیدا کی اور قدرے تحمل سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تابوت پرانے کنوئیں کے قریب ہی رکھا ہے۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچ سکے یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تابوت کو کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ تم لوگ بعد میں اسے نکالتے رہنا۔ اور ہاں، یاد رکھو کہ پانچ منٹ تم مجھ سے بات چیت میں برباد کر چکے ہو اس لیے اب تمہارے پاس صرف پینتیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے شالنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید علی پھرتی سے لیکن بے آواز قدموں سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ شالنی کی یک طرفہ گفتگو سن کر ہی

اس کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے شکوک وشبہات غلط نہیں تھے۔ تابوت کا بھاری پن اسی وجہ سے تھا کہ اس میں رتی کی لاش کے علاوہ بھی کچھ اور موجود تھا۔ یہ کچھ اور، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قوی امکان اسلحے کا تھا۔ کیونکہ ماضی میں بھی ایسی مثالیں ملتی رہی تھیں جب مجرموں نے اسلحے کی نقل وحمل کے لیے جنازوں کا سہارا لیا تھا۔ صورتِ حال کا تیزی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس نے محفوظ مقام پر پہنچ کر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا اور جلدی جلدی انہیں حالات وواقعات کے ساتھ شمشان گھاٹ کی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ہرگزرتا منٹ اس کے محکمے کے لوگوں کے پاس مؤثر کارروائی کے لیے مہلت کم کرتا جا رہا تھا اس لیے کم سے کم وقت میں اختصار کے ساتھ جامع رپورٹ دے ڈالی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کا کراچی آنا بیکار نہیں گیا تھا اور کراچی میں گزرنے والی پہلی شب ہی خاصی اہم ثابت ہوئی تھی۔ وہ جس ذمے داری کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اسے اپنی استطاعت کے مطابق احسن طریقے سے پورا کر رہا تھا اور یقیناً آگے بھی اس کے لیے خاصا کام نکلنے والا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ خواجہ سراؤں کے جس گروہ میں شامل ہوا ہے، وہاں اپنی حیثیت مشکوک نہ ہونے دے۔ چنانچہ رپورٹ دے کر فارغ ہوتے ہی تیزی سے اس طرف رخ کیا جہاں سارے خواجہ سرا جمع رتی کی چتا کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''تُو کہاں تھی رنجنی؟'' وہ ابھی اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ یقینی طور پر فون کال سے فارغ ہو کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور اس نے جاوید علی کی غیر موجودگی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اب اس سے باز پرس کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''وہ دیدی! میں ذرا.....'' جاوید علی نے چھنگلی سے اشارہ کر کے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ کسی جگہ سے بے وقت غائب ہونے کا اس سے اچھا کوئی بہانہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''کوٹھی سے فارغ ہو کر نہیں نکل سکتی تھی؟ لے کر مجھے پریشان کر دیا۔'' شالنی غصے سے بڑبڑائی لیکن ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ اس فطری ضرورت کے آگے تو ہر انسان ہی مجبور ہوتا ہے۔ یہ موقع محل دیکھتی ہے، نہ وقت وحالات۔

''چل، اب چل کر سب کے ساتھ کھڑی ہو۔ پانچ دس منٹ میں ہم یہاں سے واپس چلیں گے۔'' جاوید علی کا جھکا ہوا سر اس کی شرمندگی کا اظہار تھا اس لیے شالنی نے مزید ڈانٹ پھٹکار سے گریز کرتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں اسے اپنا حکم سنایا۔

''ابھی تو چتا بھی ٹھیک سے نہیں جلی دیدی! رتی کی استھیوں کا کیا ہوگا؟'' جاوید علی نے جان کر اس سے پوچھا۔

''چتا جل کر ٹھنڈی ہو جائے گی تو صبح پنڈت مہاراج استھیاں جمع کر کے رکھ لیں گے۔ میں بعد میں ان سے منگوا لوں گی۔ ویسے بھی استھیوں کے لیے اتنی جلدی نہیں ہے۔ اگلے مہینے میری ایک جاننے والی آگرہ جانے والی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے رتی کی استھیاں گنگا میں بہانے کے لیے بھیجوں گی۔'' شالنی نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' جاوید علی نے اس کے فیصلے کو سراہا پھر لہجے کو ذرا سرسری بناتے ہوئے بولا۔ ''پنڈت مہاراج چتا کو آگ دیتے سے نظر نہیں آئے۔ ان کو تو اس سے یہاں ہونا چاہئے تھا۔''

''مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آ سکے۔'' جاوید علی کے سوال پر سوال کرنے کی



جسارت شالنی کو ناگوار گزری تھی اس لیے اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے جواب دیا اور پھر قدم بڑھا کر جلتی ہوئی چتا کے گرد کھڑے خواجہ سراؤں کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے باآوازِ بلند ان سب کو بھی وہی بتایا جو ابھی جاوید علی کو بتا چکی تھی۔

اس کی طرف سے روانگی کا اعلان ہوتے ہی افسردہ وآبدیدہ کھڑے خواجہ سراؤں میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ حسبِ حکم شمشان گھاٹ سے باہر نکلنے لگے۔ دس منٹ کے اندر اندر ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آ چکی تھی۔ اس دوران جاوید علی گاہے بگاہے شالنی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ بے چین تھی اور بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی جا رہی تھی۔ میت گاڑی واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی کو اس وقت بھی وہی شخص ڈرائیو کر رہا تھا جو یہاں آتے وقت اسے چلا کر لایا تھا۔ البتہ باقی تین آدمیوں کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ تابوت میں موجود مال کی بہ حفاظت ڈیلیوری کے لیے شمشان گھاٹ میں ہی رک گئے تھے۔ سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں اس کے رپورٹ کر دینے کے بعد اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ چشمِ تصور سے آگے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا جاوید علی متعدد خواجہ سراؤں کے ساتھ میت گاڑی میں سوار نواب نوازش علی کی کوٹھی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا جہاں ابھی اسے نامعلوم مدت کے لیے رنجنی کا کردار ادا کرنا تھا۔

⊛----●----⊛

موہنی سے شاپنگ مال میں ملنے والے مشکوک شخص سے برآمد ہونے والی سی ڈی دیکھ کر ذیشان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سی ڈی میں موہنی کے ساتھ وہی وزیر موجود تھا جس کی کوششوں سے پاکستان میں موجود بھارتی قیدیوں کی رہائی کا عمل انجام پا رہا تھا۔ چند منٹوں کی اس فلم میں موہنی اور وزیر صاحب جس حالت میں موجود تھے، وہ اتنی شرم ناک تھی کہ اگر یہ فلم منظرِ عام پر آ جاتی تو وزیر صاحب کا برسوں کی محنت سے بنایا گیا کیریئر چند گھنٹوں میں تباہ ہو سکتا تھا۔ ذیشان سمجھ گیا کہ یہ اس فلم کی ہی کرامت ہے کہ وزیر موصوف نے بھارتی قیدیوں کی رہائی میں اتنی سرگرمی دکھائی تھی اور اپنی عزت اور کیریئر بچانے کے لیے ملکی وقار وسالمیت کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

اُلجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا ملنے پر وہ غصے سے کھول اُٹھا اور انٹرکام اٹھا کر اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر سے باہر نکلا اور اس ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچا جہاں موہنی کو اس کے حکم کے مطابق پوچھ گچھ کے لیے رکھا گیا تھا۔ موہنی اس کمرے کے وسط میں موجود ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر مضبوط بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے اور اس کے سر پر تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ ذیشان کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ موہنی کے چہرے پر تفکر وپریشانی چھائی ہوئی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ ذیشان بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

''کون ہو تم.....؟'' یہ سوال کرتے ہوئے موہنی کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ اس وقت جس ماحول میں موجود تھی، اس سے یہ اندازہ تو لگا سکتی تھی کہ وہ کسی عام شخص کی تحویل میں نہیں ہے۔ پھر اسے گاڑی میں ذیشان سے ہونے والا مقابلہ بھی یاد تھا۔ کوئی عام شخص اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اداؤں اور حسن کے بل بوتے پر مردوں کو زیر کر لینے کے ہتھیاروں سے لیس ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی خاصی ماہر تھی

اور اپنے خیال کے مطابق ذیشان سے صرف اس لیے مات کھا گئی تھی کہ اسے عام شہری سمجھ کر اس کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔

''تمہارا سوال اچھا ہے۔ مجھے خاصا پسند آیا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جواب بھی تم ہی دو گی۔ بغیر کسی بہانے بازی کے سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' ذیشان کا سرد لہجہ بتدریج سخت ہوتا چلا گیا۔

''تم مجھے جانتے ہو۔ ہمارا پہلے بھی تعارف ہو چکا ہے۔'' موہنی نے کنی کترانے کی کوشش کی۔

''محفل میں ہونے والا وہ تعارف ادھورا تھا۔ اب تم مجھے اس سی ڈی کی روشنی میں اپنا تعارف کرواؤ جو ہم نے تمہارے ساتھی سے حاصل کی ہے۔'' ذیشان نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی اس کی نظروں کے سامنے نچائی جسے دیکھ کر پل بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اُڑا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ذرا بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔

''یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے اس لیے تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

''بکواس بند کرو اور اگر میرے بارے میں اب تک کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو اسے بھی دور کر لو۔ میں اپنے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے کسی شخص کو ذرہ برابر بھی رعایت دینے کا قائل نہیں ہوں۔'' ذیشان غرایا۔

''تم یقیناً اُسی وزیر کے ٹٹو ہو۔ اسی نے تمہیں اس کام پر لگایا ہوگا کہ میری نگرانی کرو اور موقع ملتے ہی مجھ سے یہ سی ڈی حاصل کر لو۔ اُس کنجوس مکھی چوس نے وزارت میں رہ کر اتنا روپیہ بنایا ہے لیکن اپنی ساکھ بچانے کے لیے بھی ایک ڈیڑھ کروڑ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور غنڈوں سے کام لے رہا ہے۔'' موہنی نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس کی وضاحت کرو۔'' اس کے جواب پر اُلجھ جانے والے ذیشان نے سختی سے حکم دیا۔

''وضاحت کیا کرنی ہے؟ دو جمع دو چار کی طرح بات بالکل صاف ہے۔ میں ایک کال گرل ہوں اور ادائیں دکھا کر لوگوں کو لوٹنے کے علاوہ کوئی بہت زیادہ تگڑی پارٹی مل جانے پر اسے بلیک میلنگ کے سہارے بھی لوٹتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بڑا دولت والا ہے۔ ملک میں جتنی پراپرٹی ہے، اس سے دس گنا زیادہ مال باہر کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ خیال تھا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے خاموشی سے سودے بازی کر لے گا۔ لیکن وہ تو سیانا کوا نکلا اور غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ حالانکہ میں نے اس پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں بھی بلیک میل کرنے والوں کے ساتھ شامل ہوں۔'' وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ اسے ایک ایسی کہانی سنا رہی تھی جو قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ اس کی چال میں نہیں آیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہاری کہانی عمدہ ہے لیکن افسوس کہ میں کہانیاں سننے کے بجائے حقیقت جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اس لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اس ویڈیو اور بھارتی قیدیوں کی رہائی کے درمیان کیا لنک ہے؟'' اس کے اتنے درست اندازے پر مشتمل سوال کو سن کر موہنی بھونچکی رہ گئی لیکن پھر بھی خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو بالکل بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہے۔ تم چاہو تو میرے بارے میں کہیں سے بھی تصدیق کر سکتے ہو۔ لیکن میں یہ الزام کسی صورت نہیں مانوں گی کہ تم بھارت کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔'' نہایت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے وہ اپنے حیرت بھرے لہجے میں غصے اور طیش کی آمیزش لا چکی تھی۔



''ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں موقع دیا تھا کہ تم بغیر تشدد کے اپنی زبان کھول دو لیکن تمہیں معلوم نہیں تو مجھے بھی ملک دشمن عناصر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے اس ضدی پن کا خمیازہ تمہیں خود بھگتنا پڑے گا۔ مجھے تو بہر حال اپنے مطلوبہ نتائج سے غرض ہے۔'' اس نے نہایت سرد لہجے میں موہنی سے کہا اور ابھی ابھی کمرے میں داخل ہونے والے اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو اپنے ساتھ ایک ٹرالی کھینچتا ہوا لے کر آیا تھا۔ ٹرالی میں ایک شیشے کا جار اور چھوٹی سی ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ شیشے کے جار میں کوئی ایسا محلول موجود تھا جس سے گرم گرم بھاپیں اُڑ رہی تھیں جبکہ ٹرے میں پینٹنگ میں استعمال ہونے والے مختلف برش رکھے ہوئے تھے۔

''یہ خرم ہے۔ اسے انسانی اعضاء خصوصاً چہرے پر نقش و نگار بنانے کا بہت شوق ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے یہ اپنے برش کو رنگوں کے بجائے تیزاب میں ڈبونے کا عادی ہے۔ تمہارے حسین چہرے پر کام کرنے کے لیے اس نے خصوصی طور پر گندھک کا خالص تیزاب منگوایا ہے۔ امید ہے تمہیں اس کا کام پسند آئے گا۔'' وہ ٹرالی لانے والے کا نہایت دوستانہ لہجے میں موہنی سے تعارف کروانے لگا لیکن لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں جو سفاکی تھی، اس نے موہنی کو جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا۔

''پلیز! میرا یقین کرو۔ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے ہراساں لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس خوف و دہشت کے عالم میں اس کا حُسن کچھ اور بھی دمکنے لگا تھا لیکن ذیشان متاثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک بار ایملی پارکر نامی حسینہ کے حُسن کے جال میں پھنسا تھا اور شباب و شراب کے نشے میں چُور اُسے اُس کی مطلوبہ معلومات فراہم کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اسے ایسے احساسِ شرمندگی نے گھیر لیا تھا کہ اب تا زندگی وہ کبھی حسینہ کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔

''اپنا کام شروع کرو خرم!'' موہنی کی درخواست پر کان دھرے بغیر اس نے سفاکی سے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ کسی مشین کی طرح حرکت میں آیا اور دیوار پر لگے سوئچ پینل کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی موہنی کی کرسی کے عین اوپر چھت سے ایک لوہے کا شکنجہ برآمد ہوا اور اس کے سر اور گردن کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دینے سے بھی محروم ہو گئی۔

''میری بات سنو۔ ایسا مت کرو۔ میرا ایسے کسی معاملے سے تعلق نہیں ہے جس کا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔'' گردن و سر کے شکنجے میں پھنستے ہی موہنی کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی لیکن کمرے میں موجود دونوں نفوس تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سماعت سے ہی محروم ہو چکے ہوں۔ ذیشان بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ مشینی انداز میں حرکت کرتا خرم ٹرالی کو موہنی کے بالکل قریب لے گیا تھا اور ٹرالی میں سے اپنی پسند کا برش منتخب کر رہا تھا۔

''آؤٹ لائن کے لیے میں عام طور پر زیرو نمبر کا برش استعمال کرتا ہوں لیکن آپ اتنی حسین ہیں کہ میں آپ کے فیس پر آپ کی جوانی کے مطابق بھی کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ٹرے میں سے ایک برش منتخب کر لینے کے بعد وہ موہنی سے کسی پیشہ ور مصور کی طرح مخاطب ہوا۔

''بند کرو یہ بکواس..... دور لے جاؤ مجھ سے یہ سب کچھ۔'' موہنی غصے اور دہشت سے ملی جلی آواز میں چیخی اور ٹرالی کو عملاً خود سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پیر جکڑے ہونے کی وجہ سے بس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی بل کھا کر رہ گئی۔

''اوکے، اگر آپ بتانا پسند نہیں کرتیں تو میں اپنی روٹین کے مطابق ہی کام کا آغاز کر دیتا ہوں۔'' اس کے چیخنے کو خاطر میں لائے بغیر خرم نے نہایت آرام سے کہا۔ برش کو جار میں موجود محلول میں ڈبو کر موہنی کے چہرے

کے قریب لے گیا۔ اس نے بے ساختہ ہی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں اور منہ دونوں ہی کھل گئے۔ چہرے کی شفاف جلد پر تیزاب میں ڈوبے برش سے پڑنے والی لکیر بہت واضح تھی اور موہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ یقیناً اپنے حسین چہرے کے بگڑ جانے کے خوف سے بھی چلا رہی تھی۔

''پینٹنگ کی اس تکنیک کو استعمال کرنے میں لطف ہی اس وقت آتا ہے، جب ماڈل خوف سے چیختا ہے۔ آپ جوں جوں چیخیں مارتی رہیں گی، میرے کام میں تیزی آتی رہے گی۔'' سنجیدہ صورت خرم نے اسے آگاہ کیا اور برش کو ایک بار پھر گندھک کے تیزاب میں ڈبو کر اس کے دوسرے رخسار پر ڈھائی انچ کے قریب لکیر مار دی۔ موہنی کے حلق سے ایک بار پھر چیخیں برآمد ہوئیں۔

''پلیز! مجھے گولی مار دو لیکن میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔'' اس نے دیکھا کہ خرم کا ہاتھ تیسری بار بھی جار کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اس کی چیخوں سے ذرا متاثر نہیں ہو رہا تو خود پر قابو پاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

تیزاب میں ڈوبے برش کی دو باریک سی لکیروں نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے اور مدہوش کر دینے والی آنکھوں کے ساغر آنسوؤں سے لبالب بھرنے کے بعد چھلک پڑے تھے۔ نمکین آنسوؤں کے قطرے رخساروں سے لڑھک کر گزرتے، آگ کی ان دو لکیروں میں مزید جلن کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

''گولی سے بننے والا چھید بالکل بھی آرٹسٹک نہیں ہوتا۔ کم از کم میں اتنے حسین چہرے اور جسم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتا۔ مجھے تو برش سے کیا جانے والا کام ہی پسند ہے۔'' خرم کے اطمینان میں سرِ موفرق نہیں آیا اور وہ نہایت انہماک سے ایک بار پھر برش کو محلول میں ڈبونے لگا۔

''اسے روکو..... پلیز اسے روکو۔ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اذیت دے دے کر مار رہا ہے۔'' خرم کی طرف سے مایوس ہو کر موہنی نے ذیشان سے رجوع کیا اور ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے رحم کی اپیل کرنے لگی۔

''یہ شخص صرف اسی صورت میں رک سکتا ہے کہ تمہاری زبان سچ اُگلنے لگے۔'' ذیشان نے سرد مہری سے اس کی اپیل کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔'' موہنی نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ کسی حسین عورت کے تشدد کا اس سے زیادہ اذیت ناک طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کا حُسن برباد کر دیا جائے۔ اور یہاں تو بہت ہی ہولناک ترکیب سے اس کے حُسن کو داغا جا رہا تھا۔

''سب سے پہلے تو بتاؤ کہ تم کس ملک کے لیے کام کر رہی ہو؟'' اسے لائن پر آتا دیکھ کر اس نے خرم کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور خود سوال داغا۔ اس کا اشارہ پا کر خرم کسی معمول کی طرح ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ ادھر موہنی نے تھوک گلتے ہوئے اس کے سوال کا ایک لفظی جواب دیا۔

''بھارت۔''

''اوہ..... تو ''را'' کی سورما ہو؟'' ذیشان نے طنز سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''کیا اس وزیر کے ذریعے پاکستانی اور بھارتی قیدیوں کے تبادلے کا مقصد ان دو قیدیوں کو رہا کروانا ہے جن پر بھارتی جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا ہے؟'' اس نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ایک ایسا سوال کیا جس کا مقصد محض اپنے اندازے کی تصدیق تھا۔ جواباً موہنی نے عجلت میں سر ہلا دیا۔ اس کا یہ عجلت بھرا انداز ذیشان کو ٹھٹکا گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ غلط سمت میں سوچ رہا ہے اور موہنی اس بات کا فائدہ



اٹھاتے ہوئے اسے اسی سمت پر چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میرے پاس جو معلومات ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں بہت ینگ ایج میں پاکستان پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تمہارے ملک کے لیے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے تھے۔ پھر تم لوگوں کو ان کی رہائی میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' اس نے موہنی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم اپنے دیش کی رکھشا کے لیے بلیدان دینے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ دونوں بے شک بھارت ماتا کے لیے کچھ نہیں کر سکے لیکن انہوں نے کوشش تو کی اور اس کوشش میں اپنے جیون کے کئی قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیئے۔ اس لیے ان کو قید سے رہائی دلوانا ہم پر فرض تھا۔'' موہنی نے جذباتی لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا یہ جذباتی پن بھی ذیشان کو مصنوعی لگا۔

''میں نہیں مان سکتا کہ تم بنیوں کی قوم نے کوئی کام انسانی ہمدردی میں کیا ہوگا۔ پھر جس طرح تم لوگوں نے اس کو پھانسا وہ خاصا غور طلب ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار یہ کام ہوتا رہا ہے۔ تم لوگ چاہتے تو ایسے کسی بھی موقع پر اپنے من پسند قیدیوں کو رہائی دلوا سکتے تھے۔ لیکن آخر ایسی کیا ضرورت پڑی کہ ایک وزیر کو بلک میل کر کے اچانک اس ڈیل کو طے کیا گیا؟'' موہنی کے چہرے پر پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے ظاہر تھا کہ اب وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔

''مجھے جو کہا گیا، وہ میں نے کیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے کنّی کترانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے خرم! تم اس کے چہرے پر اپنا شوق پورا کرو۔ میں باقی معلومات اس کے پکڑے جانے والے دوسرے ساتھی سے حاصل کرلوں گا۔'' اس کو پٹڑی سے ہٹتے دیکھ کر وہ خرم سے مخاطب ہوا۔

اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بظاہر لاتعلق بنا خرم حرکت میں آگیا۔ موہنی ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگی۔ اس بار اُس نے نسبتاً بڑے سائز کے فرش کا انتخاب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب اس کے چہرے پر پہلے کی طرح باریک لکیر کے بجائے نسبتاً موٹی لکیر اُبھرے گی۔ لکیروں کی موٹائی اور گہرائی میں اضافے کا مطلب اذیت اور بدصورتی میں بھی اضافہ تھا لیکن وہ جس راز کو افشا کرنے سے خوف زدہ تھی، وہ بھی بہت قیمتی تھا۔ اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''جب تم اس پینٹنگ کا شوق پورا کرلو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں اسے شہر کے سب سے مشہور چوک پر پھنکوا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے چاہنے والوں کو اس کا نیا روپ حیران کر دے گا۔'' اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر ذیشان اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خرم کو مخاطب کر کے سفاکی سے کہتا ہوا جانے کے لیے پلٹنے لگا۔

''تم راون کے چیلے ہو۔ تم میں انسانیت ہے نہ عورتوں سے برتاؤ کی تمیز۔'' اسے پلٹتے دیکھ کر موہنی چیخی اور پھر ایک سانس میں اسے گالیوں سے نوازنے کے بعد زور زور سے چلّانے لگی۔

''تم رک کیوں گئے خرم! اپنا کام شروع کرو اور اب اس وقت رُکنا جب کام مکمل ہو جائے۔'' موہنی کے چیخنے چلّانے کے دوران اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ مغلظات بکنے کے بعد جب وہ بے بسی سے رونے لگی تو اس نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگانے کے خیال سے خرم سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ موہنی اندر سے ٹوٹ چکی ہے اور کسی بھی لمحے ڈھیر ہو جائے گی۔ اس لیے اس پر نفسیاتی حربے استعمال کر رہا تھا۔ خرم اور اس کے درمیان اس وقت غضب کی انڈر اسٹینڈنگ نظر آ رہی تھی اور وہ بالکل اسی طرح عمل کر رہا تھا جیسا کہ ذیشان خواہش مند تھا۔ اس وقت بھی وہ آہستگی سے برش لہراتا ہوا موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا اور کسی عظیم

مصور کی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

''تمہاری ناک بہت خوب صورت ہے۔ اگر میں اس کھڑی ناک کی نوک سے لے کر پیشانی پر آنکھوں کے درمیان تک ایک لکیر بناؤں اور پھر اس لکیر کے دائیں بائیں باریک لکیریں بناتا چلا جاؤں تو ایسا لگے گا کہ میں نے کسی درخت کا پتا پینٹ کیا ہو۔

''شٹ اپ..... بند کرو اپنی بکواس۔'' اس کے خوفناک ارادے سن کر موہنی رونا چھوڑ کر غصے اور خوف سے چیخی لیکن اب اس کی آواز میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔

''سوری میڈم! میں اپنے باس کے حکم کا غلام ہوں۔ اس لیے یا تو تم ان کی بات مان لو یا پھر اس حلیے میں آنے کے لیے تیار ہو جاؤ جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا ہے۔'' خرم پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت اطمینان سے اسے آگاہ کرتے ہوئے برش کی نوک اس کی ناک کی طرف بڑھائی۔ ذیشان اس دوران کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

''اپنا ہاتھ دُور ہٹاؤ مجھ سے اور بلاؤ اپنے ذلیل باس کو۔ میں اسے سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ رسّی جل گئی پر بل نہیں گئے کہ مصداق تنتناتے ہوئے بولی تو خرم اس سے دور ہٹ گیا اور برش واپس ٹرے میں رکھنے کے بعد دیوار میں نصب انٹرکام پر ذیشان کو موہنی کی رضامندی سے آگاہ کرنے لگا۔ دوسری طرف سے ذیشان نے اس سے کچھ کہا جس کے جواب میں ''اوکے سر'' کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور کمرے میں اس جانب بڑھ گیا جس طرف موہنی کی پشت تھی اور وہ بری طرح جکڑی ہوئی ہونے کی وجہ سے پیچھے مڑ کر یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ خرم وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ چنانچہ دروازے پر نظریں جمائے رہی جہاں سے ذیشان کی آمد متوقع تھی۔ ذیشان فوری طور پر نمودار نہیں ہوا البتہ خرم ایک پورٹیبل میز کو کھینچتا ہوا اس کے قریب لے آیا۔ اس میز پر رکھی مشین کو دیکھ کر موہنی نے اپنے لب بھینچ لئے۔ وہ جانتی تھی کہ اس مشین کی موجودگی میں اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اس کی کیفیت سے انجان بنا خرم نہایت مہارت سے اپنا کام کرتا رہا اور پھر مختلف تاروں کو اس کے جسم سے اٹیچ کر دیا۔ اسی وقت ذیشان بھی کمرے میں چلا آیا اور اس کے سامنے موجود کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''تو مس موہنی! آپ سچ بولنے کے لیے راضی ہیں۔ مجھے آپ کے اس عقلمندانہ فیصلے پر خوشی ہے۔ اور مزید خوشی اس وقت ہو گی جب آپ اس پولی گراف مشین کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مزید عقلمندی کا مظاہرہ کریں گی اور سچ میں جھوٹ ملانے کی کوشش نہیں کریں..... ورنہ اس بات سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف ہوں گی کہ یہ مشین دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا خوب جانتی ہے۔ اب آپ کی زبان سے جھوٹ نکلے گا تو یہ فوراً ہی بتا دے گی۔'' موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے اس نے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''مجھے سب معلوم ہے۔ تمہیں جو پوچھنا ہے پوچھو۔'' وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ دونوں رخساروں پر موجود تیزابی لکیروں میں ہونے والی جلن سے زیادہ اس وقت وہ اپنے زیر ہونے پر تلملائی ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے حُسن اور اداؤں سے اشاروں پر نچانے والی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود بھی زد پر آئے گی اور ایسے لوگوں کے درمیان پھنس جائے گی جس کے لیے اُس کا حسن کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔

''بات وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ قیدیوں کا جو تبادلہ عمل میں آنے والا ہے، اس میں کیا راز ہے جو سیاسی لیڈرز کے بجائے ''را'' کے سورماؤں کو میدان میں اُترنا پڑا؟'' اس وقت اس کے ذہن میں سب سے



بڑی اُلجھن یہی تھی اسی لیے سوال سے آغاز کیا۔ ان دو مشکوک قیدیوں کی رہائی کے لیے اس ساری بھاگ دوڑ کے امکان کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

''پہلی کوشش سیاسی سطح پر ہی کی گئی تھی لیکن تمہارے وزیر داخلہ فی الوقت اس معاملے میں انٹرسٹ لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے ہمیں یہ کشٹ اٹھانا پڑا۔ اعوان صاحب کے وزیر داخلہ سمیت وزیراعظم اور آرمی چیف دونوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لیے ہم نے انہیں ٹریپ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہماری ترکیب کامیاب بھی رہی۔ سی ڈی دیکھتے ہی اعوان صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کانٹیکٹ کر کے پوچھ گچھ کی تو میں نے لاعلمی کا اظہار کر کے رونا دھونا مچا دیا کہ کچھ بھی ہو، اس سی ڈی کو منظر پر نہیں آنا چاہئے ورنہ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا اور اپنی اور میری جان بچانے کے لیے وہی کیا جو ان سے کہا گیا۔ انہوں نے ہماری توقع سے بھی زیادہ تیزی سے معاملات طے کروا دیئے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ کام ہوتے ہی اوریجنل سی ڈی انہیں بھجوا دی جائے گی۔ سی ڈی میری کسٹڈی میں تھی اور آج میں اسے اپنے ایک مددگار ماتحت کے سپرد کرنے شاپنگ سینٹر گئی تھی جہاں تم نہ جانے کیسے میری جان سے چمٹ گئے۔'' موہنی نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''اوکے، یہ تفصیل تو ہو گئی کہ تم نے اعوان صاحب کو کس طرح قابو میں کر کے اپنا کام نکلوایا لیکن میرا اصل سوال اب بھی اپنی جگہ پر ہے۔ قیدیوں کے تبادلے کے پیچھے کون سی سازش چھپی ہوئی ہے جو ''را'' اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ موہنی جو اسے باتوں باتوں میں گھمانے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی کوشش میں ناکام ہونے پر مایوسی کا شکار نظر آئی لیکن جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے اپنی زبان کھولنی پڑی۔

''قیدیوں کا یہ تبادلہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے برسوں پہلے پلاننگ کر لی گئی تھی۔ اس تبادلے کا مقصد پاکستان کی قید میں موجود اپنے شہریوں کو آزادی دلوانا نہیں بلکہ بھارت کی قید میں موجود ایک پاکستانی کو پاکستان واپس پہنچانا ہے۔ اعوان سے لسٹ میں دو ایسے بھارتی قیدیوں کے نام شامل کروانا جو مشکوک ہیں، صرف ایک احتیاط تھی کہ اگر تمہاری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس معاملے میں دخل بھی دیں تو انہیں یہی شک ہو کہ ہم اپنے جاسوسوں کو چھڑوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت میں پاکستان صرف یہ کرتا کہ ان دونوں کے نام لسٹ سے خارج کر دیتا جس پر ہماری طرف سے ہلکا پھلکا ری ایکشن تو ظاہر کیا جاتا لیکن ڈیل ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارا اصل مقصد کچھ اور تھا جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔'' موہنی نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا پھر بھی صورتِ حال ابھی پوری طرح واضح نہیں تھی۔

''بھارت کو کسی مخصوص پاکستانی کو واپس پاکستان پہنچانے میں کیا دلچسپی ہے؟ مجھے اس پاکستانی کے بارے میں تفصیل بتاؤ؟'' مبہم سی باتوں کی وضاحت کے لیے اس کے سوال کا جواب بہت ضروری تھا۔

''وہ قیدی ایک پاکستانی مچھیرا تھا جسے صرف چودہ سال کی عمر میں بھارتی سمندری حدود کی خلاف ورزی کرنے والی ایک لانچ پر سے دوسرے مچھیروں کے ساتھ گرفتار کیا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم عرف سلّو ہے اور اس کی گرفتاری کو پورے پانچ سال گزر جانے کے باوجود اب بھی اس کے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں تمہارے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل پر اس کے متعلق ایک رپورٹ بھی دکھائی گئی تھی جس میں سلّو کی ماں اور بہن روتے ہوئے حکومتِ پاکستان سے سلّو کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنے کی درخواست کر رہی تھیں۔ ہم نے سوچا تمہاری حکومت ملکی خزانے کو فارن اکاؤنٹس میں منتقل کرنے میں اتنی بری طرح مصروف ہے، سلّو کی

ماں بہن کی درخواست پر کہاں کان دھرے گی تو چلو ہم خود اسے رہائی دلوا دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ اور استہزا کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اب تم مجھ سے یہ بکواس مت کرنا کہ تمہاری حکومت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سلّو کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی پلاننگ برسوں پہلے کی جا چکی تھی۔'' موہنی کے اندازِ گفتگو پر وہ بری طرح تلملایا چنانچہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ سوال جواب کے دوران اس کی نظر پولی گراف مشین کی طرف بھی تھی۔ وہ اگر ایک طرف اپنی تربیت یافتہ نظر سے اس کے چہرے پر سچ جھوٹ کو پرکھ رہا تھا تو دوسری طرف مشین کی موجودگی سے بھی استفادہ جاری تھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی۔ لیکن تمہیں یہ ضرور بتاؤں گی کہ سلّو اب بس ظاہری شناخت کی حد تک ہی پاکستانی ہے۔ ورنہ گزرے پانچ برسوں میں ہم اسے مکمل طور پر اپنا بنا چکے ہیں اور اب وہ پاکستان سے زیادہ بھارت ماتا کا وفادار ہے۔''

اس نے فخریہ بتایا جبکہ ذیشان کا دماغ اس انکشاف پر جھنجھنا اُٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سلیم عرف سلّو کے ساتھ کیا، کیا گیا ہوگا۔ پانچ سال قبل صرف چودہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والے اس پاکستانی ماہی گیر کو برین واشنگ اور مخصوص دواؤں کے استعمال سے ایسی شخصیت بنا دیا گیا ہوگا کہ وہ جذبۂ حب الوطنی تو کیا، انسانیت کو بھی فراموش کر چکا ہوگا اور صرف ان باتوں پر عمل کرنا جانتا ہوگا جس کا حکم اس کے زبردستی بن جانے والے آقا دیتے ہوں گے۔ بھارتیوں کا یہ ہتھکنڈا کوئی نیا نہیں تھا، اس سے قبل بھی وہ یہ ترکیب استعمال کر چکے تھے..... اب پھر اسی قسم کی ایک اور سازش سامنے آنے پر وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ سازش کا بنیادی طریقِ کار وہی تھا۔ ایک بار پھر پاکستان کے خلاف پاکستانی جوان کو استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے انہوں نے بھارت کی سرزمین پر دہشت گردی کا ڈرامہ رچا کر پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

''سلّو یہاں پہنچنے کے بعد کس کے انڈر ہوگا؟'' لمحوں میں کچھ سوچ لینے کے بعد اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرا کام بس یہیں تک تھا کہ میں سلّو کی پاکستان واپسی کا بندوبست کر دوں۔ آگے وہ کیا کرے گا اور کس کے کہنے پر کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔''

موہنی نے صاف جواب دیا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ ذیشان خود انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں موہنی جیسے افراد کو بس ایک حد تک ہی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور اصل مشن کو کوئی اور ہی ہینڈل کرتا ہے۔

'اوکے، تم ریسٹ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا کیا کرنا ہے۔'' اس نے یک دم ہی موہنی سے سوال جواب کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''موت کے علاوہ تم مجھے کچھ نہیں دے سکتے، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔'' وہ استہزائیہ بولی۔

ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دفتر میں خرم اس کے روبرو تھا۔

''موہنی کا کیس تمہارے حوالے ہے۔ اسے اچھی طرح کھنگال ڈالو۔ بس وقت زیادہ نہیں لینا۔ آٹھ دس گھنٹے میں اس کی لاش شہر کے کسی حصے میں ہونی چاہئے۔ لاش پھنکوانے کے بعد اس بات کا بھی انتظام کر دینا کہ باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے جس ڈاکٹر تک پہنچے، وہ ہماری مرضی کی رپورٹ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ موہنی کے



اغوا اور موت کو ایسا رنگ دیا جائے جس سے یہ تاثر اُبھرے کہ حسین اور تنہا عورت کو دیکھ کر کسی اوباش کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے قتل کر کے پھینک دیا۔''

''اوکے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ جیسا چاہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔'' خرم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ سی ایف پی کا ہر جوان ایسا ہی تھا۔ پُرعزم، حوصلہ مند اور دیئے ہوئے ٹاسک کو پورا کرنے کی اہلیت رکھنے والا۔

''سمیر سے کہہ دو کہ اس دوران موہنی کے ساتھی سے بھی تفتیش مکمل کر لے۔ وہ زبان کھولے گا تو موہنی سے حاصل ہونے والی معلومات کی مزید تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن خیال رکھنا کہ بندہ ایکسپائر نہیں ہونا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ موہنی اور اس کی لاشیں ایک وقت میں سامنے آ کر دشمن کو ہوشیار کرنے کا سبب بنیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت اسے دی۔

''ٹھیک ہے سر!'' خرم کا جواب اب بھی مختصر لیکن نپا تلا، اعتماد سے بھرپور تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ذیشان نے اسے اپنے دفتر سے باہر جانے کی اجازت دی اور خود دیگر مصروفیات میں اُلجھ گیا جس میں سب سے اہم مصروفیت کرنل توحید کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''واپسی کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے سرکار! اب تو راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ کارخانے کی ملکیت سے انکار کا ثبوت دینے کے بعد پولیس کی مجال نہیں کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکے۔ اور وہ اے سی کا بچہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، کافی ڈھنگ کا بندہ ہے۔ میں نے رواج کے مطابق اس کی آمد کے دن اے سی ہاؤس میں اس کا استقبال کیا تھا اور بہت سے تحفے تحائف بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے استقبال پر بہت خوش ہوا۔ تحائف بھی اسے بہت پسند آئے۔ میں نے اسے آپ کی غیر موجودگی کی وجہ بتا کر کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ چودھری صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں گے تو پھر حویلی میں اس کی شان دار دعوت کی جائے گی۔ اس نے اسی وقت دعوت قبول کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بندہ اپنے مطلب کا ہے اور آگے ہمارے لیے خاصی آسانی رہے گی۔'' منشی اللہ رکھا، چودھری کا سب سے زیادہ سر چڑھا اور مقرب ملازم تھا اس لیے اس سے اتنی طویل بات کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اس کے ذریعے چودھری کو حویلی، کاروبار اور فصل ہر شے کے بارے میں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔

''تُو ٹھیک کہہ رہا ہے منشی! پہلے کے مقابلے میں حالات اب کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ میں آنا چاہوں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن جانے کیوں میرا من راضی نہیں ہو رہا۔ ادھر میرے دوستوں کا بھی یہی مشورہ ہے کہ فی الحال کچھ دن نیویارک میں ہی رہوں اس لیے ابھی واپسی کا کچھ بتا نہیں سکتا تجھے۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ میرے پیچھے تُو چنگی طرح سب سنبھال لے گا۔ نئے اے سی کی طرف سے بھی تُو نے جو خبر سنائی ہے، اسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کہ بندہ اپنے مزاج کا ہے ورنہ خوامخواہ لفڑوں میں پڑ کر ٹائم برباد ہوتا ہے۔'' چودھری نے اپنے منشی کی کارکردگی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میری سات نسلیں آپ پر قربان چودھری صاحب! میرا تو کام ہی آپ کی خدمت ہے۔ آپ جو حکم دیں گے، میں بجا لاؤں گا۔ کہیں کوتاہی ہوئی بھی تو قسمت کی خرابی سے ہوگی، میں غفلت بہرحال نہیں کر سکتا۔'' منشی نے اپنی روایتی خوشامد سے کام لیتے ہوئے چودھری کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

''میں بھی یہی سوچ کر ہمیشہ تجھے چھوٹ دے دیتا ہوں ورنہ ابھی جو شہزادی والا معاملہ ہوا ہے، وہ ایسا معمولی نہیں تھا۔ بس بال بال ہی بچے ہیں سب۔ اگر وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو سب ختم ہو جاتا۔ اس کی

وجہ سے انصاری جیسے کام کے بندے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اب نہ جانے نیا فاریسٹ آفیسر کون آتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کا بندہ نہیں آسکا تو وڈی مشکل پڑ جائے گی۔'' منشی کو اس کی کوتاہی جتانے کے ساتھ اس نے تشویش کا بھی اظہار کیا۔

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں چودھری صاحب! بس میں خوامخواہ شہزادی سے ہمدردی کے چکر میں دھوکا کھا گیا۔ اصل میں اسے ڈاک بنگلے پر نوکری دلواتے ہوئے مجھے بالے کی خدمات کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا، مرنے والا اتنے عرصے تک جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمارے کام آتا رہا، اب اس کے بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں تو چلوان کی روٹی کا کوئی بندوبست کر دوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ نمک حرام شہزادی در پردہ اے سی سے مل کر بیٹھی ہے اور ہمیں فاقوں کی کہانی سنا کر خود اے سی ہاؤس سے وظیفے وصول کر رہی ہے۔'' منشی کو شرمندگی کے ساتھ ساتھ شہزادی پر غصہ بھی تھا جس کا اظہار چودھری کے سامنے کرنے میں اس نے کوئی حرج نہ سمجھا۔

''چل خیر جو ہوا، سو ہوا۔ آگے کے لیے احتیاط کر۔ یہ خوامخواہ کی ہمدردیاں آدمی کو ایسی ہی مہنگی پڑتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمارے لیے کام کرتا ہے تو اس کی تنخواہ بھی تو لیتا ہے۔ پھر ہم اس سے بعد میں کس لیے ہمدردی کریں؟''

''درست فرمایا چودھری صاحب! آئندہ میں ایسی غلطی دوبارہ ہرگز نہیں کروں گا۔'' منشی نے چودھری کے زریں خیالات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ چنگی گل ہے کہ تُو ایک ہی واری میں سمجھ گیا ہے۔ اب ذرا خیال سے میری گل سن..... میرے پیچھے اب سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اِدھر تیری مدد کے لیے فاریسٹ آفیسر بھی نہیں ہے اس لیے جنگل کی طرف کا خاص دھیان رکھنا۔'' اس کی کوتاہی کو کمال فیاضی سے معاف کرتے ہوئے چودھری نے اسے تاکید کی۔

''ادھر کی آپ فکر نہ کریں۔ میں برابر وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ پہرہ بھی پہلے سے سخت کر دیا ہے۔ ویسے بھی جب تک نیا فاریسٹ آفیسر نہیں آ جاتا، جنگل اور ڈاک بنگلے میں ہمارا مکمل راج ہے۔ فاریسٹ آفیسر آ گیا تو پھر اس کے آنے کے بعد بندہ دیکھ کر نئی پلاننگ بھی کر لیں گے۔'' منشی اپنی جگہ مطمئن تھا۔

''ٹھیک ہے فیر..... تُو مطمئن ہے تو تیرے کہنے پر میں بھی فکر نہیں کرتا اور کچھ دن ہور اِدھر ہی رہ کر موج مستی کر لیتا ہوں۔'' چودھری نے اپنی بات کے اختتام پر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''چھوٹے سرکار کو بھی خادم کا سلام بولیے گا۔'' فون بند کرنے سے پہلے منشی نے چودھری سے درخواست کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ مراد شاہ کی حویلی اور گاؤں سے عملاً بے نیازی کے باوجود یہ بات سمجھتا تھا کہ وہ مستقبل کا مالک ہے اس لیے اس کی گڈ بک میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

''چنگی گل ہے..... میں بول دوں گا۔ تُو ذرا حویلی کے اندر کا بھی خیال رکھنا..... فریدہ کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں رہتا..... چودھری بختیار کی بہن ہے، اس لیے اس سے مجھے خطرہ ہی لگا رہتا ہے کہ جانے کب ہاتھ دکھا جائے۔'' فون بند کرتے کرتے بھی اس نے منشی کو ایک اور ہدایت کر ڈالی۔

''میرا دھیان ہے اس طرف۔ آپ فکر نہ کریں۔ پچھلے دنوں نور پور سے ایک بندہ آیا تھا کہ فریدہ بی بی کو کچھ دن کے لیے میکے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے اسے ٹال دیا کہ جب تک چودھری صاحب نہیں آ جاتے، یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے فریدہ بی بی آرام سے رہ رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت تو بچے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہے۔ تھوڑا بہت خیال سائیں بہزاد شاہ کا بھی رکھ لیتی ہے۔ ابھی تک اس کی طرف سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے کہ جس کی شکایت کی جا سکے۔''



منشی کے پاس یہاں بھی اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے کی گنجائش موجود تھی۔ چودھری مزید مطمئن ہو گیا کہ غلط بندے پر بھروسہ نہیں کیا ہے۔ منشی اللہ رکھا واقعی کام کا بندہ ہے۔

اس نے فون بند کیا تو بہت ہلکا پھلکا تھا۔ فراغت اور اطمینان کے اس احساس نے اس کے اندر تفریح کی خواہش کو جگا دیا۔ اس کی پسندیدہ تفریحات میں سرِفہرست دو تھیں۔ اوّل شراب، دوم شباب..... شراب تو ہمہ وقت اس کے پاس موجود ہی رہتی تھی البتہ بیٹے کے اپارٹمنٹ میں رہ کر وہ شباب کا لطف نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے لیے اُسے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت موج میں آیا تو لِنڈا سے رابطہ کر بیٹھا۔

''کیسے ہیں مسٹر چودھری؟ فرمائیے کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟'' لِنڈا نے فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی اور خوشگوار لہجے میں پوچھنے لگا۔

''یاد تو ہم تمہیں چوبیس گھنٹے ہی کرتے رہتے ہیں لیکن فون کر کے بتانے کی کوشش اس لیے نہیں کرتے کہ تمہاری مصروفیت کا احساس ہے اور تمہیں زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' اس نے بھی جواباً خوش مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''شکریہ، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔'' دوسری طرف سے لِنڈا کی مسکراتی ہوئی کھنک دار آواز سنائی دی۔

''تم بھی تو ہمارا کچھ خیال کرو۔ اتنے دنوں سے میں نیویارک میں ہوں لیکن تم سے تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی۔ ایسا کرتے ہیں کہ آج کسی اچھے سے ہوٹل میں ساتھ ڈنر کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارتے ہیں۔'' چودھری کی خواہش اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ لِنڈا فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

''سوری چودھری صاحب! فی الحال آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ آج کل مسٹر الفا یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے میں بہت مصروف ہوں۔'' اس کی طرف سے صاف انکار تھا دیا گیا تھا لیکن چودھری کے لیے اس وقت اس کے انکار سے زیادہ الفا کی نیویارک میں موجودگی کی خبر اہمیت کی حامل تھی۔ اپنے اس اَن دیکھے آقا سے وہ خاصا مرعوب رہتا تھا اور اس کی طرف سے اپنی حاکمانہ فطرت کو بار بار لگنے والی چوٹوں کے باوجود دل ہی دل میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ الفا کے اندر گُر ہے کہ وہ اس جیسے شخص پر حکم چلا سکے۔

''یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ کیا مسٹر الفا مجھ سے بھی ملاقات کریں گے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ کیا کریں گے اور کیا نہیں، یہ خود انہی کو معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ ملاقات کرنا چاہیں گے تو پہلے سے انفارم کر دیں گے۔'' لِنڈا کا جواب محتاط تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی الفا سے خائف اور مرعوب ہے۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔ مسٹر الفا سے ملاقات کا بھی اور تمہاری فراغت کا بھی۔'' چودھری نے خوش دلی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ الفا کی موجودگی میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ لِنڈا سے ملاقات پر زور دے سکتا۔ حقیقتاً اس وقت تو اس کے دل سے تفریح کا خیال ہی نکل گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ الفا سے اگر ملاقات ہوئی تو وہ کس طرح پیش آئے گا۔ وہ لندن میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا، وہ بھی نقاب میں۔ اس وقت بھی اس نے اس کا لِنڈا کے ساتھ وقت گزارنے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا اور اب بھی وہ اس کی وجہ سے ملاقات سے انکاری ہو گئی تھی۔ یعنی الفا اس کا رقیب ثابت ہو رہا تھا اور رقیب بھی ایسا کہ وہ اس سے دوبدو مقابلہ کرنا تو دور کی بات، فون پر اس کی آواز سن کر ہی خائف ہو جاتا تھا۔ پنگھوڑے سے نکلنے سے بھی

پہلے حکمرانی کی لت میں مبتلا ہو جانے والے چودھری کو الفانے عمر کے اس حصے میں زندگی کے ایک ایسے ذائقے سے آشنا کیا تھا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''اور بھئی۔ کیا خبریں ہیں؟'' حسبِ معمول ذیشان موقع ملتے ہی شہریار سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ شہریا کو حالات و واقعات سے آگاہ رکھنا بھی ایک طرح سے اس کی ذمے داری تھی۔ اگر وہ لوگ اس سے کوئی کام لینا چاہتے تھے تو اس کا صورتِ حال سے لحہ بہ لحہ واقف رہنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ دوستانہ خواہش کے علاوہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھانے کے لیے بھی گاہے بگاہے اس سے ملتا رہتا تھا۔ خود شہریار عملاً محدود ہو جانے کی وجہ سے اس کا منتظر رہتا تھا چنانچہ اس وقت بھی مصافحے کے بعد کوئی دوسری رسمی بات کرنے کے بجائے یہ سوال کیا۔

''خبریں خاصی ہیں اور زوردار بھی ہیں۔'' ذیشان نے ایک صوفے پر جگہ سنبھالتے ہوئے اسے بتایا اور پھر ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبانے لگا۔

''چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔ مسلسل بھاگ دوڑ میں لگے رہنے سے بعض اوقات کھانے پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آج بھی دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا اس لیے رات کا کھانا ذرا جلدی کھا لیا۔ چائے البتہ نہیں پی تھی کہ یہاں پہنچ کر تمہارے ساتھ پیوں گا۔'' ملازم کی آمد تک اس نے شہریار کو یہ کتھا سنائی اور پھر ملازم کے نمودار ہونے پر اسے چائے کا آرڈر دینے لگا۔

''کیا کارنامہ انجام دے آئے؟'' ملازم کے جانے کے بعد شہریار نے مسکراتے ہوئے مگر تجسس سے پوچھا۔

''یہ کارنامہ تو نہیں لیکن یہ ہے کہ کچھ بڑے معاملات سامنے آئے ہیں۔ تمہیں میں نے بتایا ہی تھا کہ تمہارے مشورے پر میں نے خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر کام شروع کروایا ہے۔ دونوں ہی جانب کام کرنے سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے ہیں۔ میرا ماتحت جاوید علی، خواجہ سرا کے روپ میں ایک گروہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور پہلے ہی قدم پر اس نے بہت کچھ کھوج نکالا ہے۔ یہاں سے وہ شالنی نامی ایک خواجہ سرا کے ساتھ کراچی پہنچ گیا ہے۔ کراچی میں اس کا قیام نواب نوازش علی نامی ایک عجیب و غریب شخص کی کوٹھی میں ہے۔ نوازش علی نے اپنی کوٹھی میں ہر کام کے لیے خوب صورت اور جوان خواجہ سرا بھرتی کر رکھے ہیں اور حیرت انگیز طور پر وہ سب کے سب ہندو ہیں۔ شالنی، نواب کے ہاں ملازم ایک رتی نامی خواجہ سرا کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی گئی تھی۔ اس کام کے لیے آدھی رات کا وقت چنا گیا کیونکہ شالنی کے مطابق یہ خواجہ سراؤں کا رواج ہے کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے مُردوں کا کریا کرم نہیں کرتے۔ بہرحال، جاوید علی جو کہ وہاں رنجنی بن کر رہ رہا ہے، پوری طرح چوکنا تھا اس لیے وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا کہ رتی کو شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے جو تابوت استعمال کیا گیا، وہ کسی خاص مقصد کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نے موقع پر ہی ہیڈ کوارٹر اطلاع دی جس کے حکم پر کراچی میں موجود سی ایف پی کے یونٹ کو فوراً حرکت میں لایا گیا۔ جوانوں نے پوری تیاری کے ساتھ شمشان گھاٹ کا گھیراؤ کر کے تابوت سمیت اس کی لین دین کے لیے موجود افراد کو اپنی حراست میں لے لیا۔ تابوت کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دہری تہ پر مشتمل تھا اور اس کے نچلے حصے میں جدید ساخت کے مہلک ہتھیار موجود تھے۔ یعنی شالنی نے اپنی ایک [illegible] کی موت کو اسلحے کی ڈیلیوری کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو



لوگ پکڑے گئے ہیں، ان سے اس معاملے میں تفتیش کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ خاصے اہم انکشافات ہوں گے۔ شالنی پر البتہ فی الحال ہاتھ نہیں ڈالا گیا ہے اور سختی سے اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نواب نوازش علی کو بھی چیک کیا جا رہا ہے کہ اس شخص کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اس سارے چکر میں شالنی کا شراکت دار ہے یا شالنی نے کسی طرح اسے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ بہرحال، یہ ایک بہت اہم معاملہ سامنے آیا ہے جس پر ہم پوری طرح نظر رکھیں گے۔ میں نے جاوید علی کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ پوری طرح ہوشیار رہے اور خود کو بچاتے ہوئے جو کچھ معلوم کر سکتا ہے، کر ڈالے۔ وہ بہت ذہین اور نڈر نوجوان ہے۔ مجھے امید ہے کہ کامیابی سے اپنے حالات سے نمٹ لے گا۔''

''یہ تو ہوئی ایک خبر جو واقعی شان دار ہے۔ اب موہنی کا قصہ بھی سنا دو۔'' توجہ سے اس کی بات سنتے شہریار نے بے چینی سے پوچھا لیکن ذیشان کے جواب دینے سے قبل ملازم چائے کی ٹرے کے ساتھ آ موجود ہوا۔

''تم جاؤ، چائے ہم خود بنا لیں گے۔'' ملازم نے ٹرے میز پر رکھی ہی تھی کہ شہریار نے اسے حکم دیا۔ وہ تابعداری سے حکم پر عمل کرتا فوراً باہر نکل گیا۔

''موہنی کا قصہ تو اور بھی دلچسپ اور اہم ہے۔'' ذیشان نے خود ہی پیالیوں میں چائے انڈیل کر دودھ، شکر ملانے کا کام شروع کر دیا اور پھر دھیرے دھیرے اسے سارے واقعات سے باخبر کرتا چلا گیا۔

اس کی تیار کردہ چائے کے گھونٹ لیتے شہریار توجہ سے ایک ایک بات سنتا رہا۔

''موہنی کی زبان کھلوانے کے لیے تم نے ترکیب خوب لڑائی۔'' ذیشان چیدہ چیدہ واقعات سنا چکا تو اس نے تحسین آمیز تبصرہ کیا۔

''عورت، خصوصاً حسین عورت کی فطرت کو سامنے رکھ کر میں نے تشدد کا وہ طریقہ سوچا تھا جو اتفاق سے کارگر رہا۔ ورنہ یہ تو میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی بھی خفیہ ادارے کے ایجنٹ کی زبان کھلوانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اگر میرا آدمی تیزاب سے اس کا چہرہ بگاڑنے کے بجائے ہڈیاں توڑنے بیٹھ جاتا تو وہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولتی۔ پھر اس صورت میں ہمارے لیے یہ بھی مشکل ہو جاتا کہ اس کے اغوا اور موت کو خفیہ ادارے کے بجائے کسی ہوس پرست کے کھاتے میں ڈال پاتے۔ اس لیے یہ ہماری خوش نصیبی رہی کہ موہنی نے زیادہ محنت کے بغیر زبان کھول دی۔ اس کے ساتھی کی البتہ ٹھیک ٹھاک مرمت کرنی پڑی ہے، تب کہیں جا کر اس نے سچ اُگلا ہے۔ اس کی بتائی تفصیلات سے موہنی کی باتوں کی تصدیق ہوئی ہے۔ ہم دو چار دن مزید اسے اپنے پاس رکھیں گے، پھر باڈی ٹھکانے لگا دیں گے۔ کسی ملک دشمن کو معافی یا رعایت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ذیشان کا لہجہ بہت سخت تھا۔

''میں تم سے متفق ہوں لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس بندے کو مروانے میں اتنی جلدی مت کرنا بلکہ کوشش کرو کہ کسی کو اس کے غائب ہونے کی خبر ہی نہ ہو سکے۔ اس کی گاڑی بھی فی الحال اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر اس کے بعد موہنی کے ایک ساتھ غائب ہونے کی خبر ان کے اوپر والوں کو ہو گئی تو موہنی کے سلسلے میں تمہارے کری ایٹ کیے ہوئے ڈرامے کے باوجود وہ کھٹک جائیں گے کہ دونوں واقعات کے بیچ میں کوئی لنک ہے۔ اس موقع پر جبکہ دشمن کا سارا منصوبہ ہمارے سامنے ہے، اسے ہوشیار نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ابھی وہ سب کچھ ختم کر دیں گے اور بعد میں ہم اندھیرے میں تیر چلائیں گے۔'' اس نے اچھی طرح سوچتے ہوئے ذیشان کو مشورہ دیا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اب جبکہ ہم بندہ اٹھا چکے ہیں تو کیا، کیا جا سکتا ہے؟ اس کے ساتھ منسلک لوگوں کو خبر تو ہو جائے گی کہ وہ غائب ہے۔'' ذیشان فکرمندی سے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے آقاؤں سے رابطے کے لیے موبائل کے علاوہ کوئی دوسرا مواصلاتی آلہ بھی استعمال کرتا ہوگا۔ اُس کی اس سلسلے میں زبان کھلوا کر آپریٹس اپنے قبضے میں لو اور تمام ضروری اور ممکنہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے کسی ایسے ماتحت کو جو اس کی آواز کی نقل اُتار سکے، اس کا موبائل اور آپریٹس سونپ دو۔ تمہارے ماتحت کا کام یہ ہوگا کہ وہ گرفتار بندے کے آقاؤں کو یقین دلا سکے کہ موہنی کی موت کی خبر سن کر وہ خود احتیاطاً قیدیوں کے تبادلے تک منظر سے ہٹ گیا ہے اور اپنا ٹھکانا چھوڑ کر کسی دوسری خفیہ جگہ پر رہ رہا ہے۔ ایک بار قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آ جائے تو پھر تم اس بندے کے مستقبل کا فیصلہ کر دینا۔'' اس کا مشورہ بڑا صائب تھا جسے سن کر ذیشان کھل اٹھا۔

''تمہارے ساتھ کسی مسئلے کو ڈسکس کرنا کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ واقعی ان حالات میں یہ ایک اچھی ترکیب ہے۔ میں ابھی اس سلسلے میں آرڈر کر دیتا ہوں تاکہ جب ہم موہنی کی لاش منظر پر لائیں تو ہماری یہ کارروائی پوری ہو چکی ہو۔'' شہریار کی تجویز کو سراہتے ہوئے وہ فوراً ہی اپنے ہیڈ کوارٹر فون کر کے اس ماتحت کو ہدایات دینے لگا جس کے ذمے یہ کیس سونپا تھا۔

''یہ تو ہو گیا ایک کام۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا قیدیوں کا تبادلہ خاموشی سے ہو جانے دو گے؟'' ذیشان اپنے ماتحت کو ہدایات دے کر فارغ ہوا تو اس نے اس سے دریافت کیا۔

''یہ ضروری ہے۔ اب میں خود یہ چاہتا ہوں کہ سلّو پاکستان پہنچ جائے۔ کیونکہ اس وقت وہ پہنچا تو ہماری نظر میں ہوگا۔ بعد میں اگر کسی خفیہ طریقہ سے پہنچایا گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''اس سے تو مجھے بھی انکار نہیں ہے لیکن جن دو مشکوک بھارتی قیدیوں کو یہاں سے رہا کروایا جا رہا ہے، وہ مناسب نہیں ہے۔ اس کا جانا روک دو۔'' اس نے تجویز دی۔

''اس صورت میں وہ ڈیل سے انکار بھی کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے ان قیدیوں کو رہا کروانے سے بڑھ کر سلّو کو قابو میں کرنا اہم ہے۔ وہ دونوں تو بس نام کے ہی جاسوس ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے تھے اور آتے ہی دھر لیے گئے تھے۔'' ذیشان نے اسے اپنی ترجیحات سے آگاہ کیا۔

''اس بات سے تم مجھے پہلے بھی آگاہ کر چکے ہو لیکن میں جو مشورہ دے رہا ہوں، وہ کسی اور نقطۂ نظر سے دے رہا ہوں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے بڑے تمام معاملات پر ملک کے خفیہ اداروں کی نظر رہتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور ہم نے ان کے دونوں مشکوک قیدیوں کو خاموشی سے نکل جانے دیا تو وہ کھٹک جائیں گے کہ اس خاموشی کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ اس لیے تھوڑی سی ہچر مچر ضروری ہے۔ موہنی تمہیں بتا ہی چکی ہے کہ بھارت کی طرف سے اس معاملے میں رکاوٹ پر تھوڑی سی ردّ و کد تو ہوگی لیکن ڈیل کینسل نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد بھی سلّو کو پہنچانا ہے۔'' اس نے ذیشان کو سمجھایا تو وہ گویا اُچھل پڑا۔

''زبردست یار! یہ پوائنٹ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ کرنل صاحب نے تمہیں واقعی ایک جوہری کی نظروں سے پرکھ کر منتخب کیا ہے۔ تم تو فطری طور پر خفیہ اداروں کے لیے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ خوامخواہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے بیوروکریسی میں چلے گئے تھے۔ تمہاری اصل جگہ تو یہیں ہمارے درمیان تھی۔'' اُس کی اس تعریف کے جواب میں شہریار فقط مسکرا ہی سکا، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ جہاں بھی تھا اس کا جذبہ ایک ہی رہا تھا۔ وہ سرتاپا وطن کی محبت سے سرشار تھا اور چاہے جہاں بھی رہتا، وطن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتا رہتا۔



''کچھ ادھر کی خبر بھی تو دے دو۔ وہ تمہارا بندہ عمیر آفندی کیا کر رہا ہے؟'' پہلے موضوع کو سمٹتے دیکھ کر اس نے ذیشان سے سوال کیا۔

''اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ عمیر بہت اچھا جا رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ تمہارے نقش قدم پر ہی چلے گا لیکن طریق کار ذرا مختلف ہے۔ اس نے براہِ راست مخالفوں سے ٹکر لینے کے بجائے دوستی کی آڑ میں ان کی جڑیں کاٹنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ مشابرم خان کو بھی میں نے سمجھا بجھا کر واپس ڈیوٹی پر بھیج دیا ہے۔ اس طرح اسے تمہارے غم میں گھلنے سے بھی نجات ملے گی اور عمیر کو اچھا مددگار ملنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھروسے کا ایک نگران بھی حاصل رہے گا۔ میں نے مشابرم خان کو اس کی ڈیوٹی سمجھا دی ہے۔ وہ بہت دُکھی ہے لیکن میری بات سمجھ کر ڈیوٹی پر چلا گیا ہے۔'' ذیشان نے اسے بتایا۔

''مشابرم خان بہت مخلص بندہ ہے۔ مجھے اس کی خود سے محبت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ اگر مصلحت نہ ہوتی تو میں کبھی اُسے اس دُکھ میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہرحال، آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔ اللہ نے آدمی کے اندر بڑی گنجائش رکھی ہے۔ جس کو وہ اپنے لیے ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے، جب اس سے گزر جاتا ہے تو خود بھی حیران رہ جاتا ہے کہ کیسے یہ سب سہہ گیا۔ لیکن قانونِ قدرت یہی ہے اللہ کسی کو دکھ دیتا ہے تو سہنے کا حوصلہ بھی دے دیتا ہے۔ آخر مشابرم خان نے اپنے جوان بھائی کی موت اور ماں کی بیماری کا دکھ بھی تو سہہ ہی لیا تھا۔ میری جدائی کے صدمے سے بھی جلد سنبھل جائے گا۔'' اس نے ذیشان کی بات سن کر دل سوزی سے ایک حقیقت پر مبنی تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہی امید ہے۔ تم بتاؤ، رانا صاحب اور ان کی بیگم کو تمہارا کوئی پیغام دینا ہے؟'' گفتگو کا رخ خود بخود ہی ملکی معاملات سے ہٹ کر ذاتی معاملات کی طرف ہو گیا۔

''بس سلام کہہ دینا اور میری خیریت بتا دینا۔ ملاقات کی تو مجھے پتہ ہے ابھی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں جن تبدیلیوں سے گزر رہا ہوں، ان کی تکمیل سے پہلے خود بھی اپنے کسی آشنا سے سامنا نہیں کرنا چاہتا۔'' اس کا اشارہ اپنے تبدیل شدہ حلیے کی طرف تھا۔ ذہنی اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری حلیے میں جو مستقل تبدیلیاں کی جا رہی تھیں، ان کی وجہ سے وہ خاصا بدلا ہوا لگنے لگا تھا۔ ذیشان کی وہاں مستقل آمد و رفت تھی، اس کے باوجود وہ تسلیم کرتا تھا کہ اس کے سامنے موجود شہریار ماضی کے شہریار سے بہت مختلف ہے۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ ابھی بہت سے معاملات اور بھی دیکھنے ہیں۔'' چائے کی پیالی تو وہ کب کی خالی کر چکا تھا، اس سے کہتا ہوا کھڑا ہوا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی شہریار سوچوں میں گُم بیٹھا رہا۔ اس مختصر ملاقات میں اس کے اور ذیشان کے درمیان بہت سے اہم معاملات پر گفتگو ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن فی الحال پوری طرح سلّو میں اُلجھا ہوا تھا جس کا خمیر اسی وطن کی مٹی سے اٹھا تھا لیکن وہ اس وطن کے لیے ایک عفریت بن کر واپس لوٹنے والا تھا۔

❀----✪----❀

''تُو کیا کر رہی ہے رنجنی؟..... کمرے میں پڑے پڑے تیرا دل نہیں گھبراتا؟ باہر نکلا کر۔ سب سے ملے جلے گی تو یہاں کے طور طریقے بھی سیکھ لے گی اور من بھی بہلے گا۔'' جاوید علی بستر پر دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر اچانک اندر آئی اور بولتی چلی گئی۔

''تجھے کس نے کہا کہ میں سارا وقت کمرے میں ہی پڑی رہتی ہوں؟ میں تو خود یہاں کے طور طریقے سیکھنا چاہتی ہوں اس لیے کسی نہ کسی کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی رسوئی میں مدھو کے ساتھ

کھانا پکانے میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ میری وجہ سے اس کا کام آدھے ٹائم میں ہی پورا ہو گیا۔ اس نے خود ہی مجھے کمرے میں بھیجا تھا کہ جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ جب کھانا پروسا جائے گا تو میں خود تجھے آواز دے لوں گی۔ اس کے کہنے پر میں کمرے میں آ کر لیٹ گئی اور یہ کتاب پڑھنے لگی۔'' جاوید علی نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر وضاحت پیش کی۔

''چل، یہ تو اچھی بات ہے۔ اصل میں آج کل میرا وقت زیادہ تر باہر گزرتا ہے اس لیے یہاں کی خبر نہیں ہو پاتی۔'' آشا اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

''یہ تو میں بھی تجھ سے پوچھنے والی تھی کہ کدھر رہتی ہے؟ صبح ناشتے کے بعد جو غائب ہوتی ہے تو پھر تیری شکل ہی دیکھنے کو نہیں ملتی۔'' جاوید علی نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''سب شازمین بی بی کی مہربانی ہے۔ کبھی کبھی اُنہیں گھومنے پھرنے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ دو چار دن پورے شہر میں بولائی پھرتی ہیں اور ظاہر ہے مجھے ہی ہر جگہ انہیں لے کر جانا ہوتا ہے۔ دو چار دن بعد وہ چین سے بیٹھتی ہیں تو مجھے بھی سکون ملتا ہے۔ آج بھی صبح صبح اٹھا کر پہلے مجھے سی سائیڈ لے گئیں۔ پھر میوزیم کا خیال آیا اور آخر میں مزارِ قائد پہنچ گئیں۔ دیوانی ایسی ہیں کہ نہ خود کھانا کھایا اور نہ مجھے کھلایا۔ پورا دن جوس اور پانی پی پی کر گزر گیا۔'' آشا نے بیزاری سے بتایا۔

''یہ تو بڑی زیادتی کی انہوں نے تمہارے ساتھ۔ نوکروں کو بھی انسان سمجھنا چاہئے۔'' جاوید علی نے اس سے ہمدردی جتائی۔

''میری بات ہمیشہ یاد رکھنا رنجنی! جو بھی بندہ انسان کو اس کی اوقات کے مطابق پیسہ دینے کی طاقت رکھتا ہے، وہ اسے انسان نہیں سمجھتا بلکہ بازاروں میں بکنے والی ان چیزوں میں سے ایک سمجھ لیتا ہے جنہیں وہ قیمت دے کر خرید سکتا ہے اور خریدنے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق برت سکتا ہے۔ مجھے بھی شازمین بی بی سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ انہیں دو تین مہینے بعد ہی ایسا دورہ پڑتا ہے۔ باقی وقت وہ مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتیں، ورنہ ان کے والد جناب نواب صاحب مجھے جو تنخواہ دیتے ہیں، اس تنخواہ میں وہ روزانہ بھی مجھے اتنا ستا سکتی ہیں۔''

آشا کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ اس بار جاوید علی نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے آشا کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس خواجہ سرا کے بارے میں اس کے دل میں کیسے جذبات ہیں۔ ایک طرف تو وہ اسے مظلوم اور معاشرے کی ستائی ہوئی لگتی تھی اور دوسری طرف وہ کردار کے حوالے سے اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ نواب صاحب کے علاوہ اس کے شالنی کے ساتھ جس نوعیت کے تعلقات تھے، ان سے اس کے کردار کا ہلکا پن ظاہر ہوتا تھا پھر شالنی کی ملک دشمن سرگرمیوں اور اس سے قربت کی وجہ سے اسے شک تھا کہ وہ بھی ان سرگرمیوں میں شالنی کے ساتھ شامل ہے اور یہ ایسا معاملہ تھا جسے وہ ذاتی کردار سے بھی زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

''کیا ہوا؟ تو کس خیال میں ڈوب گئی؟'' آشا نے اس کے چہرے کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس بڑے لوگوں کی اداؤں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' جاوید علی نے چونک کر جواب دیا۔

''جانے دے تیرے وچار سے کچھ نہیں ہوتا۔ بیکار کی باتوں میں اُلجھ کر میں بھی اصل بات کرنی بھول گئی۔ تیرے لیے نواب صاحب کا پیغام لائی ہوں۔'' آشا نے یکدم ہی موضوع بدل دیا۔

''کیسا پیغام؟'' وہ حیران ہوا۔



''اتنا حیران کیوں ہو رہی ہے؟..... یہاں آئی ہے اور رتی کے کمرے میں بسی ہے تو اس کی جگہ بھی تو سنبھالنی ہو گی۔ آج رات نواب صاحب نے تجھے اپنی خدمت میں بلایا ہے۔'' آشا کا پیغام غیر متوقع نہیں تھا پھر بھی وہ ساکت رہ گیا۔ نواب صاحب نے اسے جس خدمت کے لیے بلایا تھا، وہ تو وہ کسی صورت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ تو شاید یہ جان کر اسے فوراً ہی شوٹ کر دیتے کہ ایک مرد، خواجہ سرا کے روپ میں انہیں دھوکا دیتا رہا ہے۔ شوٹ نہ کرتے تو کم از کم شالنی کو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے سے ضرور آگاہ کر دیتے۔ اور یہ صورتِ حال جاوید علی کے لیے مزید خطرناک ہوتی۔ شالنی تو فوراً ہی سمجھ جاتی کہ رتی کے کریا کرم والی رات شمشان گھاٹ کو گھیرے میں لے کر قانون کے رکھوالوں نے جو کارروائی کی تھی، اس کے پیچھے کون تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنی جلدی یہ بھید کھلے۔ ابھی اسے کچھ مہلت درکار تھی تاکہ نوازش علی کی کوٹھی کا بھید جان سکے۔ وہ نوازش علی اور شالنی کے درمیان تعلق کی اصل وجہ بھی جاننا چاہتا تھا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ اگر شالنی نے اس کوٹھی میں اتنے بہت سارے ہندو خواجہ سراؤں کو جمع کیا تھا تو یہ جدوجہد بے وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔

''اب زیادہ سوچ بچار نہ کر۔ میں تیرے کپڑے اور زیور بھجوا دیتی ہوں۔ نہا دھو کر اچھی طرح تیار ہو جا۔ اور ہاں، کھانا پروسے جانے سے تجھے باہر آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا کھانا میں یہیں بھجوا دوں گی۔ تُو اب بس اسی وقت کمرے سے باہر نکلے گی، جب نواب صاحب کی طرف سے بلاوا آئے گا۔'' آشا اسے ہدایت پر ہدایت دیتی جا رہی تھی اور وہ غائب دماغی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

''تُو نے اچھی طرح سن لیا ہے نا جو کچھ میں نے کہا ہے؟'' آشا نے بھی شاید اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا اس لیے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

''سن لیا ہے۔ سنوں گی کیوں نہیں؟ میں کوئی بہری تو نہیں ہوں۔'' جاوید علی نے قدرے چڑچڑے پن سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ بجائے ناراض ہونے کے ہنس دی۔

''میں سمجھ گئی۔ یہ تیری پہلی باری ہے نا، اس لیے کنفیوز ہو رہی ہے۔ پر چنتا نہ کر۔ نواب صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔'' وہ اسے تسلی دے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہاں ذرا دیر رک کر نرمی سے بولی۔ ''گھبرانا نہیں۔ شانتی کے ساتھ اشنان کر اور جو دوسری تیاری کرنی ہے، کر لے۔ تیرے کپڑے لئے ابھی آتے ہی ہوں گے۔ تیاری میں کچھ مشکل ہو تو مجھے پکار لینا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ہوں۔ تھکن بہت ہو گئی ہے، تھوڑی دیر آرام کروں گی۔''

وہ وہاں سے چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا دروازہ بھی ازخود بند کر دیا تھا۔ اس لیے منظر سے غائب ہوتے ہی جاوید علی نے اپنی ہتھیلی پر یوں مُکا مارا جیسے اس مکے کی زد میں آشا کا تھوبڑا ہو۔ اور پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ہوئے وہ اس مصیبت سے نکلنے کا حل سوچ رہا تھا۔ ابھی دو چار چکر ہی لگائے تھے کہ ایک ترکیب ذہن میں آ گئی اور وہ ٹہلنا ترک کر کے بستر پر اس انداز سے بیٹھ گیا کہ دونوں پیر سکیڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا رکھے تھے اور چہرہ گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر کوئی اندر داخل ہوا، تب بھی اس نے اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی۔

''ارے رنجنی! تجھے کیا ہوا؟ اس طرح سے کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟'' آنے والی جوہی نے اسے ٹوکا۔

''میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے دیدی!'' اس نے منہ اوپر اٹھاتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر اس وقت واقعی ایسے تاثرات تھے کہ دیکھنے والے کو اس کی تکلیف کا یقین کرنا ہی پڑتا۔ سرخ رنگ کا زرق برق لباس اور زیورات کے ڈبے لانے والا جوہی نامی وہ خواجہ سرا بھی یقین کر بیٹھا۔

''ہائے رام! یہ کیا ہو گیا؟ تیری تو آج حاضری ہے نواب صاحب کی خدمت میں۔'' وہ پریشان سی اس کے قریب چلی آئی۔

''چنتا نہ کرو دیدی! مجھے پیٹ درد کی کوئی گولی لا دو۔ ایک آدھ گھنٹے میں میری طبیعت سنبھل جائے گی تو میں تیار ہو جاؤں گی۔'' اس نے گویا تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر کہے تو کسی ڈاکٹر کو بلا لوں؟'' جوہی ہنوز پریشان تھی۔

''نہیں دیدی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس مجھے گولی بھجوا دو اور تھوڑی دیر خاموشی سے آرام کرنے دو۔'' اس نے اپنی اداکاری جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے زور دینے پر جوہی وہاں سے چلی گئی اور تھوڑی دیر میں پیٹ درد کی گولی کے ساتھ حاضر ہو گئی۔

''اگر گولی کھا کر جلد آرام نہ آئے تو مجھے بتا دینا۔ میں ڈاکٹر کو بلوا لوں گی۔'' اسے گولی کے ساتھ ایک گلاس میں پانی پیش کرنے کے بعد وہ اس ہدایت کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد جاوید علی نے اطمینان سے پانی کا گلاس چڑھایا اور گولی فلیش میں بہا کر آنے کے بعد آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ اب اسے آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔ بیس پچیس منٹ بعد جوہی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''بہتر ہے۔ درد کافی کم ہو گیا ہے۔'' اس نے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے، تُو آرام کر..... میں تیرے کھانے کے لیے کچھ ہلکا پھلکا بھیجتی ہوں۔ جو کھانا پکا ہے، وہ تو تُو کھا ہی نہیں سکتی۔ کھاتی تو انگلیاں چاٹتی رہ جاتی۔ مدھو سے اچھے نرگسی کوفتے میں نے کسی اور کو بناتے نہیں دیکھا۔ اور آج اس نے سب سے خاص ڈش یہی بنائی ہے۔'' جوہی نے جیسے اس کے نرگسی کوفتوں سے محروم رہ جانے پر تاسف کا اظہار کیا اور وہاں سے چلی گئی۔

دس منٹ بعد اس کے لیے دلیہ، ساگودانہ، ڈبل روٹی، دہی وغیرہ جیسی اشیاء پر مشتمل کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس کے حق میں اس وقت یہی بہتر تھا کہ وہ نرگسی کوفتوں اور دیگر پُرتکلف کھانوں کو بھول کر اس پرہیزی کھانے کو صبر و شکر کے ساتھ تناول کر لے، چنانچہ یہی کیا اور مزے سے سب چیزیں ٹھکانے لگا دیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسے کمرے کے باہر آہٹ سنائی دی تو جھپٹ کر ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا اور وہاں سے سن گن لینے لگا۔ کوئی اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ واش بیسن کے سامنے جا کھڑا ہوا اور نل کھول کر منہ سے ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے اسے اُلٹی ہو رہی ہو۔

''کیا ہوا رنجنی! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' باتھ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اور جوہی کی پریشان کُن آواز سنائی دی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پر اس طرح پانی کے چھپکے مارنے لگا کہ بہت سا پانی بہہ کر اس کے کپڑوں کو بھی بھگو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ واٹر پروف میک اپ بہا تو نہیں تھا لیکن اب اس کے چہرے پر ویسی تازگی بھی نظر نہیں آ رہی تھی جیسا وہ ڈیڑھ گھنٹے قبل محسوس ہو رہا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے چہرے کے زاویوں کو کچھ اور بگاڑا اور ہانپتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا۔

''کیا ہوا رنجنی!..... کیا ہوا؟'' پریشان جوہی نے اس کی صورت دیکھتے ہی پوچھنا شروع کر دیا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے نڈھال سا بستر پر جا کر گر گیا۔



''کیا ہوا؟..... تیری حالت تو سنبھلنے لگی تھی۔ پھر یہ اچانک تُو اتنی نڈھال کیسے ہو گئی؟'' پریشان جوہی اپنے سوالوں کے ساتھ اس کے بستر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''معلوم نہیں کیا ہوا۔ آپ نے گولی دی تھی تو درد بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ میں نے آرام سے کھانا کھایا۔ پر کھانا کھاتے ہی حالت بگڑنے لگی۔ پہلے ایک موشن ہوا اور پھر اُلٹیاں شروع ہو گئیں۔ بھگوان کی قسم بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے آنتیں اُلٹ کر منہ سے باہر نکلنے والی ہیں۔'' اس نے ہانپتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں بتایا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ تیری حالت تو بالکل بھی ایسی نہیں کہ تجھے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ میں جا کر بڑی دیدی کو بتاتی ہوں۔'' جوہی جھٹ پٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں بڑی دیدی وہاں موجود تھی۔ یہ وہی خواجہ سرا تھا جس نے پہلے دن کوٹھی میں شانتی اور اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ یہاں منتظم کی حیثیت رکھتا تھا اور سب اسے بڑی دیدی کہہ کر پکارتے تھے۔

''جوہی بتا رہی ہے کہ تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟'' کمرے میں موجود صوفہ سیٹ کے ایک صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا۔

''جی دیدی! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے نواب صاحب کا موڈ خراب ہو جائے گا۔'' جاوید علی نے اس کے احترام کے اظہار کے لیے بیٹھتے ہوئے شرمندگی اور نقاہت سے ملی جلی آواز میں جواب دیا۔

''اس بات کی فکر نہ کرو۔ نواب صاحب کے موڈ کو میں خود سنبھال لوں گی۔ تم اپنی صحت کی فکر کرو۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کر دیتی ہوں۔ ڈاکٹر آ کر تمہیں دیکھ لے گا تو پھر اس کی ہدایات کے مطابق تمہارا صحیح طریقے سے علاج شروع ہو جائے گا۔'' اس نے متانت سے جواب دیا۔

''پلیز دیدی! ڈاکٹر کو مت بلائیے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر آئے گا تو میری حالت کو دیکھتے ہوئے انجکشن اور ڈرپ وغیرہ لگانے پر زور دے گا اور مجھے ان چیزوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں آپ کو کچھ دواؤں کے نام لکھ کر دے دیتی ہوں، آپ مجھے وہ منگوا دیں۔ بھگوان نے چاہا تو دوائیں کھا کر میں کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر آیا تو اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا، اس لیے بہانہ تراشتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''میرا تو خیال ہے کہ تم ڈاکٹر کو آنے دو۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو نواب صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔ پہلے ہی وہ رتی کے صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھلے ہیں۔'' اس نے جاوید علی کو نرمی سے سمجھایا۔

''پلیز دیدی! میری بات مانیں۔ میں دوا کھا کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹروں سے تو مجھے ویسے ہی بڑی اُلجھن ہوتی ہے اور میں اکثر اپنا علاج خود ہی کر لیتی ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر کو نہ بلانے پر زور دیا۔

''ٹھیک ہے، تم دواؤں کے نام لکھ کر دے دو۔ صبح تک طبیعت میں افاقہ نہیں ہوا تو پھر ڈاکٹر بلوانے کے بجائے تمہیں سیدھی ہاسپٹل لے جاؤں گی۔'' اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور جوہی کو اسے کاغذ قلم لا کر دینے کی ہدایت کی۔ جوہی نے اسے دونوں چیزیں لا کر تھمائیں تو وہ کاغذ پر چند ایسی دواؤں کے نام لکھنے لگا جو واقعی پیٹ درد، اُلٹی موشن وغیرہ کے علاج کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

''میں یہ دوا ابھی منگوا کر تمہیں دیتی ہوں۔ اگر دوا کھا کر بھی تمہیں آرام محسوس نہ ہو تو اطلاع کر دینا۔ تمہارے کہنے پر آدھی رات کو بھی ڈاکٹر کو بلا لیا جائے گا۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتی ہوئی کھڑی ہوئی اور وقار سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ جوہی کو

البتہ اُس نے اُس کے ساتھ ہی رُکے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ جوہی وہیں بیٹھ گئی۔ جاوید علی نقاہت اور کمزوری کا ڈرامہ تو پہلے ہی کامیابی سے کر رہا تھا، اسے دکھانے کے لیے ایک دفعہ اور باتھ روم کا چکر لگا آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آشا دواؤں کا لفافے تھامے وہاں آن دھمکی۔

''یہ اچانک ہی تیری طبیعت اتنی خراب کیسے ہوگئی؟ جب میں تیرے پاس آئی تھی، تب تو تُو بالکل ٹھیک تھی۔'' دواؤں کا چھوٹا سا لفافہ اسے تھماتے ہوئے اس نے تشویش سے پوچھا۔

''معلوم نہیں کیا ہوا؟ میں تو خود حیران ہوں۔ تُو گئی تو بس اسی وقت پیٹ میں درد ہوگیا اور پھر معاملہ بگڑتا ہی چلا گیا۔'' جاوید علی نے کمزور سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''اس کا کارن نواب صاحب کی طرف سے بلاوا تھا۔ تُو نے ان کا بلاوا سنا اور فٹ سے بیمار ہوگئی۔'' چمک کر کہے گئے آشا کے اس جملے نے اسے چونکا دیا اور دل میں اندیشہ اُبھرا کہ اس کی اتنی اچھی اداکاری کے باوجود آشا نے حقیقت کو پالیا ہے اس لیے فوراً ہی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟ میں کیا جان بوجھ کر بیماری کا ناٹک کر رہی ہوں؟''

''نہیں میری جان! میں بھلا تجھ پر ایسا الزام کیسے لگا سکتی ہوں؟ بس تیری اچانک طبیعت خراب ہونے کا کارن مجھے سمجھ آ گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے کہ جب وہ اپنے جیون میں کسی نئے تجربے سے گزرنے جا رہے ہوتے ہیں تو گھبراہٹ کے مارے اپنی طبیعت ہی خراب کر بیٹھتے ہیں۔ تیرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تُو گھبرا گئی کہ جانے تیرے ساتھ کیا ہوگا اس لیے ٹینشن سے تیری طبیعت خراب ہوگئی۔ کیوں جوہی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس نے کمرے میں موجود جوہی سے تصدیق چاہی۔

''ٹھیک ہی کہہ رہی ہوگی۔ لیکن اب یہ بھاشن مارنا چھوڑ اور مجھے رنجنی کو دوا کھلانے دے۔ اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ وقت پر دوا دینا ضروری ہے۔'' جوہی نے بیزاری سے اس کی بات کا جواب دیا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ باتونی آشا پر اس کے جھڑکنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ہنس پڑی جیسے جوہی کی جھنجلاہٹ سے بھی لطف اندوز ہوئی ہو۔

جاوید علی کے جذبات البتہ ان دونوں سے مختلف تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اس پر کوئی شک نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس کی خرابیٔ طبیعت کی بہترین وجہ ڈھونڈ لی گئی ہے۔ اطمینان کے اسی احساس کے ساتھ اس نے جوہی کا بڑھایا ہوا پانی کا گلاس تھاما اور بظاہر دوا منہ میں ڈالتے ہوئے ایک گھونٹ پانی سے اسے نگل لیا۔ لیکن اصل میں یہاں اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی اور دوا منہ میں ڈالنے کے بجائے غائب کر دی تھی۔

''جا جوہی! تُو جا کر اپنے دوسرے کام کاج دیکھ لے۔ میں تھوڑی نیند لے کر اُٹھ گئی ہوں۔ آرام سے رنجنی کی دیکھ بھال کر لوں گی۔'' بظاہر جاوید علی دوا کھا چکا تو آشا نے جوہی سے کہا۔ جوہی نے فوراً ہی اس کی بات مان لی۔

''تُو بھی آرام کر۔ میں یہاں بیٹھی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بتا دینا۔'' جوہی کے جانے کے بعد اس نے جاوید علی کو ہدایت کی اور خود ایک صوفے پر نشست جما لی۔ اس کی ہدایت پر جاوید علی نے فوراً ہی عمل کیا۔ عملاً وہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے آرام کر لینا ہی مناسب تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

چند گھنٹوں کی پُرسکون نیند لینے کے بعد وہ اٹھا تو کافی رات ہو چکی تھی اور آشا بھی صوفے پر لڑھک کر سو چکی تھی۔ اس نے یہ سارا منظر دیکھا اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔ دبے قدموں چلتا ہوا وہ کسی کی بھی نظر میں آئے بغیر آسانی سے لان



میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ بے شمار درختوں اور پودوں پر مشتمل لان اس وقت مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ایک کے سوا زیادہ تر لائٹیں بھی بند کر دی گئی تھیں اس لیے خوب صورت پھولوں اور پھلوں سے بھرے اس لان کی دلکشی اس طرح چھپ گئی تھی جیسے کسی حسینہ نے اپنے چاند چہرے کو نقاب میں چھپا لیا ہو۔ لیکن دیکھنے والی نظریں پھر بھی بھانپ لیں کہ اس نقاب کے پیچھے کچھ خاص موجود ہے۔

لان میں قدم رکھنے سے قبل ہی محسوس ہونے والی بھینی بھینی خوشبوئیں بھی اعلان کر رہی تھیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا کچھ غیر معمولی ہے۔ بہرحال اسے اس وقت رات کی خوب صورتی یا بدصورتی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے وہاں آیا تھا کہ تنہائی میسر آ سکے اور وہ ہیڈ کوارٹر کو اپنی آج کی رپورٹ دے سکے۔ اس کے لیے لازم تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار لازماً ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کرے گا تاکہ وہ لوگ اس کی خیریت سے باخبر رہ سکیں۔ دوسری صورت میں اسے کسی مشکل میں تصور کر کے وہاں سے ایکشن لیا جا سکتا تھا۔

آج وہ جس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، اس کے لیے اپنے معمول پر کاربند رہنا ممکن نہیں رہا تھا ورنہ کسی کے کہے بغیر اس نے ازخود یہ معمول بنا لیا تھا کہ رات کے کھانے سے فراغت پا کر جب اپنے کمرے میں جاتا تو ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دے دیتا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس معمول میں فرق آنے سے وہاں تشویش محسوس کی جا رہی ہوگی۔

''خیریت ہے؟ آج تم روٹین سے کافی لیٹ ہو گئے ہو؟'' جیسے ہی اس کا ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ہوا، وہاں سے پہلا سوال یہی کیا گیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا پھنس گیا تھا اس لیے وقت پر رابطہ نہیں کر سکا۔'' اس نے جواباً کہا اور پھر دھیمی آواز میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''گڈ۔ تم نے خاصی حاضر دماغی سے کام لیا..... لیکن یاد رکھو کہ کوئی بھی بہانہ لمبے عرصے تک نہیں چل سکتا اس لیے تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' اس کی کارکردگی کو سراہنے کے ساتھ ساتھ اسے ہدایت کی گئی۔

''میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ یہاں سب سے خاصا گھل مل بھی گیا ہوں لیکن ابھی تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ نواب کے کردار کے بارے میں بھی صرف یہی پتہ چلا ہے کہ وہ تھوڑا سا نفسیاتی اور عیاش طبع شخص ہے..... لیکن اس کے کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہونے کے آثار نہیں ملے ہیں۔ بہرحال میں کوشش کر رہا ہوں، جونہی کوئی خاص بات معلوم ہوئی، آپ کو فوراً مطلع کر دوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے، بائے۔'' دوسری طرف سے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ ایک گہرا سانس لیتا ہوا واپسی کے لیے پلٹا مگر کسی کو پستول بدست دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مدھم روشنی کے باوجود وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک لڑکی تھی جس کا قد پانچ فٹ دو انچ سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں موجود پستول کی نال کا رخ اسی کی طرف تھا۔

''خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گی۔'' اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ غرائی لیکن لہجے میں ایسی لرزش تھی کہ جاوید علی نے بھانپ لیا، یہ دھمکی محض دھمکی ہے اور وہ عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس کے بولنے سے جاوید علی کا یہ ابہام بھی دور ہو گیا تھا کہ جسے وہ لڑکی سمجھ رہا ہے، کہیں کوئی خواجہ سرا ہی نہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کے زنانہ بہروپ میں موجود فورس کے علاوہ اگر کوئی سچ مچ کی لڑکی وہاں موجود ہے تو وہ نواب صاحب کی بیٹی شاز مین ہے۔

لمحوں میں یہ بات سوچ لینے کے بعد اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور جست لگا کر شاز مین پر جا پڑا۔

اسے یقیناً امید نہیں تھی کہ پستول کی موجودگی کے باوجود وہ اس پر حملہ کرنے کی ہمت کر سکے گا اس لیے وہ خود کو بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکی اور جاوید علی اس کو لیے ہوئے زمین پر اس طرح گرا کہ شازمین کا نرم و نازک بدن اس کے نیچے تھا۔

''اُف اللہ!.....ہٹو میرے اوپر سے۔ ورنہ میں دم گھٹ کر مر جاؤں گی۔'' وہ کراہتے ہوئے جھنجلا کر بولی تو جاوید علی کو احساس ہوا، وہ نازک سی لڑکی کس مشکل میں ہے۔ وہ فوراً اس کے اوپر سے ہٹ گیا لیکن اس کے اس ہاتھ کو نہ چھوڑا جس میں لمحہ بھر پہلے پستول دبا تھا۔ پستول اس کے حملے کے نتیجے میں نیچے گر چکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ تھامے تھامے دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا پستول اٹھایا۔

''بالکل جنگلی ہو۔ اتنی بری طرح مجھے گرا دیا اور اس پر سے اپنا پہاڑ جیسا بوجھ لے کر اوپر بھی چڑھ بیٹھے۔ میری کوئی ہڈی وڈی ٹوٹ جاتی تو تم نقصان پورا کرتے کیا؟'' اپنے آزاد ہاتھ سے چھل جانے والی کہنی کو رگڑتے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا۔

جاوید علی نے صاف محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ ضرور ہے لیکن وہ خوف زدہ محسوس نہیں ہو رہی۔ نہ ہی اس کا روّیہ ایسا تھا کہ وہ اس سے عداوت محسوس کر رہی ہو۔ حالانکہ اس نے جاوید علی کی مردانہ آواز سن لی تھی اور اس کے طرزِ تخاطب سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس کی حقیقت کو جان چکی ہے لیکن پھر بھی اس کے انداز میں ایسی کوئی تشویش نہیں پائی جا رہی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ خواجہ سرا کے روپ میں وہاں کسی مرد کو دیکھ کر پریشان ہوئی ہو۔ اس کا یہ غیر معمولی روّیہ خود جاوید علی کے لیے حیران کُن تھا۔

''کون ہو تم؟'' اندازہ لگا لینے کے باوجود اس نے لڑکی سے سوال کیا۔

''اتنے احمق نہیں ہو تم کہ یہاں کسی لڑکی کو دیکھ کر یہ نہ جان سکو کہ یہ لڑکی کون ہے؟'' اس نے جھٹکے دار لہجے میں جواب دیا۔

''شازمین نوازش علی.....؟'' جاوید نے اس سے تصدیق چاہی جس کے جواب میں اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں اتنی رات کو کیا کر رہی تھیں؟'' اس نے گلا سوال کیا۔

''میرے باپ کی کوٹھی ہے یہ، تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟'' اس نے اسی جھٹکے دار لہجے میں جواب دیا۔

''سیدھی طرح جواب دو، ورنہ ابھی گلا دبا کر یہیں دفن کر دوں گا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی کہ نواب نوازش علی کی اکلوتی صاحب زادی اپنے باپ کی کوٹھی میں ہی ایک گڑھے میں دفن ہے۔'' جاوید علی نے جھنجلا کر اسے دھمکی دی۔ ویسے اسے شازمین کے روّیے پر بدستور حیرت ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر مطمئن اور بے خوف تھی۔

''اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لو۔ لیکن یاد رکھنا کہ اس کے بعد تم آسانی سے اس کوٹھی کی ہسٹری معلوم کرنے کا ایک سنہری موقع کھو بیٹھو گے۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے مزے سے جو جواب دیا، اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اس کی ہیڈ کوارٹر سے ہونے والی گفتگو بھی سن چکی ہے۔ یعنی وہ اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ایک طرف تو اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ خواجہ سرا کے روپ میں وہ ایک مرد تھا، دوسرے وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ وہ جاسوسی کے ارادے سے وہاں آیا ہے۔ لاشعوری طور پر شازمین کی کلائی پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔



''میری کلائی توڑو گے کیا؟..... یاد رکھو میں اپنی موت تو تمہیں معاف کر سکتی ہوں لیکن لنگڑا لولا ہونا کسی صورت معاف نہیں کروں گی۔''

اس نے احتجاج کیا تو جاوید علی نے اس کی کلائی ہی چھوڑ دی۔ اتنی دیر میں وہ ویسے بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہی ہے بلکہ ایک طرح سے اس کا انداز دوستانہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ جاوید علی کی وہاں موجودگی اس کے لیے خوشگوار ثابت ہوئی ہو۔

''تھینک یو۔'' اس کی سوچوں سے بے پروا شازمین نے اپنی کلائی کو رگڑتے ہوئے دورانِ خون کو رواں کرنے کی کوشش کی اور بولی۔ ''چلو وہاں اس درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ویسے تو یہاں کوئی نہیں آتا لیکن اگر اتفاق سے آ نکلا تو خوامخواہ کی پنچایت شروع ہو جائے گی۔''

اپنی بات کہنے کے بعد وہ فوراً ہی کھڑی بھی ہو گئی۔ جاوید علی نے کسی معمول کی طرح اس کی پیروی کی۔ ویسے بھی اسے شازمین سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں پیش آ رہی تھی اور اس کا پستول بھی اس کے قبضے میں تھا۔ پستول شازمین کے پاس ہوتا، تب بھی اس کے لیے زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی کیونکہ کچھ دیر قبل ہی وہ اس کا اناڑی پن دیکھ چکا تھا۔ اس نے اس پر پستول تان ضرور رکھا تھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس ہتھیار کے استعمال میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ اس کا یہ اناڑی پن اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں ہے۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی تھیں؟'' وہ دونوں درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ گئے تو جاوید علی نے ایک بار پھر گفتگو چھیڑی۔

''میں نے تم سے بھی تو نہیں پوچھا کہ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے تھے؟'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''تم نے اس لیے نہیں پوچھا کہ تم جان چکی تھیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔'' اس بار اس نے بھی بھڑکے بغیر پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ جب وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ وہ اس کی گفتگو سن چکی ہے تو پھر کھل کر بات کر لینے میں کیا حرج تھا۔ اب اس نے شازمین کے غیر معمولی روّیے پر حیران ہونا بھی ترک کر کے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کوٹھی میں موجود ہر کردار کی طرح وہ بھی عجیب و غریب اور پُراسرار ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس سے کھل کر بات کرے تو اس کی پُراسراریت میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔

''مجھے اکثر رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ جاگتے جاگتے کبھی گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جائے تو کبھی کبھی یہاں لان میں آ جاتی ہوں۔ یہاں آ کر مجھے بہت سکون کا احساس ہوتا ہے۔ آج بھی میں یہاں اسی لیے آئی تھی کہ تمہیں یہاں دیکھ لیا۔ میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ بابا کے کسی ملازم سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم اپنی دانست میں خود کو تنہا سمجھ کر بات کرنے لگے۔ میں نے تمہاری ساری باتیں سن لیں اور چاہتی تو تمہیں بے خبری میں یہاں سے جانے دیتی لیکن میں جان بوجھ کر تمہارے سامنے آئی اور تمہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔''

''لیکن کیوں؟..... تم چاہتیں تو بعد میں بہت آرام سے مجھے پکڑوا سکتی تھیں۔'' جاوید علی نے استفسار کیا۔

''بالکل پکڑوا سکتی تھی لیکن پکڑوانا نہیں چاہتی تھی..... بلکہ تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری صورت میں مجھے ایک ایسا شخص مل گیا جس کا مجھے انتظار تھا، جسے میں تلاش کر رہی تھی اور مجھے قطعی اُمید نہیں تھی کہ وہ شخص مجھے اتنی آسانی سے اپنی ہی کوٹھی کے لان میں اتنی اچانک مل جائے گا۔''

لان میں روشنی کم تھی اس لیے وہ شازمین کے قد کاٹھ کا تو اندازہ لگا سکتا تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش

اس پر پوری طرح واضح نہیں تھے۔ صرف یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نازک سی کم عمر لڑکی ہے البتہ اس کی آواز بڑی لوچ دار اور پُرکشش تھی جس کا سحر وہ پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

''میں تمہاری بات صحیح سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔'' آخر تمہیں میری تلاش کیوں تھی؟ اور تم مجھے دیکھ کر کیوں خوش ہوئیں؟'' اس نے اس کے سحر میں گرفتار ہونے کے بجائے اپنی اُلجھن رفع کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ ایک خاصی طویل داستان ہے جو میں تمہیں ابھی نہیں سنا سکتی۔ البتہ مجھے امید ہے کہ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گی، اسے سن کر تمہاری بہت سی اُلجھنیں دور ہو جائیں گی اور تم میری اُلجھن بھی دور کرنے میں مدد کرو گے۔ لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا صبر کرنا ہوگا۔ کل رات پھر تم اسی وقت یہاں آنا۔ میں تمہیں ساتھ لے کر اپنے کمرے میں جاؤں گی۔ پھر وہاں ہم کھل کر باتیں کریں گے۔'' وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی اور خوشبو کے جھونکے کی طرح آگے بڑھ گئی۔

جاوید علی اسے نہیں روک سکا لیکن اس کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ لان میں موجود انواع و اقسام کے پھول پودوں کی خوشبوؤں میں سے اس کی خوشبو کے کم ہونے کا احساس بڑا واضح تھا۔ ایک نازک، نوعمر اور کنواری دوشیزہ کی وہ خوشبو ہر خوشبو سے منفرد اور معطر تھی جس کی مہک وہ اب بھی اپنی اس ہتھیلی پر محسوس کر رہا تھا جس سے کچھ دیر قبل شازمین کی کلائی کو جکڑ رکھا تھا۔

⊛----✪----⊛

''یہ بہت برا ہوا شالنی! ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ہمارا مال پکڑا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم نے پارٹی سے ایڈوانس لیا تھا اور ڈیلیوری سے پہلے ہی مال پکڑے جانے کا مطلب ہے کہ ہمیں وہ روپے واپس کرنے ہوں گے یا اس کی جگہ دوسرا مال دینا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نقصان ہمارا ہی ہوگا۔''

شالنی کسی مجرم کی طرح ''را'' کے مقامی عہدے دار، ورما کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ مضطرب سا اس سے کہہ رہا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں سر!..... لیکن میرا وشواس کیجئے، اس سب میں میرا دوش نہیں ہے۔ میں نے اپنی طرف سے سب کام ٹھیک کیا تھا۔ مال اس پوائنٹ پر پہنچ گیا تھا جہاں ڈیلیوری ہونی تھی۔ پارٹی کو بھی میں نے سب سمجھا دیا تھا۔ اب یہ بھگوان ہی جانتا ہے کہ بات کیسے لیک ہوئی۔ لیکن مجھے شک ہے کہ گڑبڑ دوسری پارٹی کی طرف سے ہی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان پولیس یا کسی خفیہ ادارے کا جاسوس موجود ہو اور اس نے میری کال کے بعد مخبری کر دی ہو۔ آپ ریڈ کا وقت دیکھیں۔ جس وقت پارٹی ڈیلیوری لینے پوائنٹ پر پہنچی ہے، عین اسی وقت ریڈ ہوا ہے۔ اس سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ پولیس کو وہ لوگ اپنے پیچھے لگا کر لائے ہیں۔''

شالنی نے صفائی پیش کی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد شمشان گھاٹ سے نوازش علی کی کوٹھی پر واپس جانے کے بجائے راستے میں ہی اُتر گئی تھی جہاں سے ایک پرانے آشنا نے اسے پک کر لیا تھا۔ رات اُس آشنا کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ وہیں سے سیدھی ایئرپورٹ پہنچ گئی تھی۔ موڈ غارت نہ ہو اور کوئی ڈسٹرب نہ کرے، اس خیال سے اس نے رات بھر اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ صبح ناشتے اور ایئرپورٹ روانگی کی جلدی میں اسے آن کرنا یاد نہیں رہا۔ افراتفری میں نہ اخبار دیکھنے کا موقع ملا، نہ کوئی نیوز چینل لگا کر دیکھا اور وہ مکمل بے خبری میں کراچی سے لاہور پہنچ گئی۔ یہاں پہنچ کر بھی اس نے موبائل آن کرنے کے بجائے سو کر سفر اور دیگر مصروفیات کی تھکن اُتارنے کو ترجیح دی اور ملازمہ کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت دے کر سو گئی۔

شام کے قریب جاگی تو واقعے کی خبر ہوئی۔ اس نے خبر سن کر اپنا سر پیٹ ڈالا۔ نیوز چینلز نے اس واقعے



کی خبر بہت سرسری انداز میں چلائی تھی اور صرف یہ بتایا گیا تھا کہ کراچی اولڈ سٹی کے ایک شمشان گھاٹ میں کچھ مشکوک افراد کی موجودگی کے شبے میں گشتی پولیس نے کارروائی کر کے چند افراد کو اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ اسلحہ پکڑے جانے کا سرے سے کوئی ذکر نہیں تھا جس سے اسے یہ خوش فہمی ہوئی کہ شاید پولیس کا خطرہ بھانپ کر اس کے آدمیوں نے پہلے ہی اسلحے سے بھرا تابوت کنوئیں میں پھینک دیا ہوگا۔ لیکن ورما کی کال نے اُس کی اس خوش گمانی کو بھی دور کر دیا۔ اس کے پاس پکی رپورٹ تھی کہ فائرنگ کے بھرپور تبادلے کے بعد مال سمیت بندوں کی گرفتاری عمل میں آئی ہے، تاہم اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ گرفتار ہونے والوں میں زندہ، مُردہ اور زخمیوں کی تعداد کتنی ہے۔ خود شالنی کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا حکم دیا گیا۔

ہر قسم کے رابطے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی لیکن وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ موقع ملتے ہی ورما سے ملاقات کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ حکم عدولی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنا بڑا واقعہ ہو جانے کے باوجود اسے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پولیس فوراً اس کی گرفتاری کے لیے بھی دوڑ پڑتی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، اس کا یہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ یا تو پولیس اس کے بندوں کو زندہ گرفتار کرنے میں ناکام رہی ہے یا پھر ابھی تک ان کی زبان نہیں کھلوا سکی ہے۔ اپنے اس یقین کی وجہ سے وہ ورما کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔

راستے میں اس نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط کی کہ کسی کو اپنے پیچھے لگا کر نہ لے جائے۔ بہت دھیان دینے کے باوجود اسے کوئی تعاقب میں نظر نہیں آیا۔ وہ مزید مطمئن ہو گئی کہ شک کی زد میں نہیں ہے۔ ایک طرف کے اس اطمینان کے بعد اس کے لیے دوسرا اور زیادہ اہم مرحلہ ورما کو اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلانا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اپنوں کا مزاج بگڑ جائے تو وہ سخت بے رحمی پر اُتر آتے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے حق میں ہموار کرنا ضروری ہے۔

اسے اپنی رہائش گاہ پر پا کر پہلے تو ورما خوب چیخا چلایا کہ وہ اس کی حکم عدولی کرتے ہوئے منظر پر کیوں آئی ہے۔ بڑی مشکل سے شالنی نے اسے یقین دلایا کہ وہ مشکوک افراد میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں ورما کو یقین آیا یا نہیں لیکن بہرحال اس نے اپنے غصے پر کنٹرول کر لیا اور ذرا مہذب انداز میں اس سے گفتگو پر آمادگی ظاہر کر دی، اس طرح شالنی کو بھی اپنی صفائی دینے کا ایک موقع مل گیا۔

''پارٹی الزام لگا رہی ہے کہ مخبری ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کے سارے لوگ پرانے اور بھروسے کے لائق ہیں اس لیے وہ اپنے لوگوں پر کسی صورت شک نہیں کر سکتے۔'' ورما نے اسے بتایا۔

''وہ تو یہی کہیں گے تاکہ انہیں نقصان نہ ہو اور سارا بوجھ ہمارے اوپر آ جائے۔'' شالنی فوراً ہی چمک کر بولی۔

''اس طرح کے معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ شک دونوں ہی طرف کے لوگوں پر کیا جاتا ہے اس لیے دکھاوے کی الزام تراشی اپنی جگہ لیکن ہمیں اپنی طرف کے بندوں کو چیک تو کرنا پڑے گا۔ تُو بتا، تیرے بندوں میں سے تو کسی کے گڑبڑ کرنے کا ڈر نہیں ہے نا؟'' ورما نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر! سب بھروسے کے لوگ ہیں۔ اور پھر اس ڈیل کا تو میرے سوا کسی کو پتہ ہی نہیں تھا۔ تابوت میں اسلحہ بھرنے سے لے کر شمشان گھاٹ تک پہنچانے تک کا ہر کام آپ کے اپنے بھروسے کے لوگوں نے کیا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ کام کتنی ایمرجنسی میں میرے حصے میں آیا تھا۔ اگر اچانک ہی رتی کی موت نہ ہو جاتی تو کون سوچ سکتا تھا کہ مال کی ڈیلیوری کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جائے گا۔'' شالنی

نے اپنے حق میں دلیل دیتے ہوئے پُرزور لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میرے پاس اطلاع ہے کہ اسی روز تُو ایک نیا پیس لے کر نوازش علی کی کوٹھی پر گئی تھی اور وہ رتی کے کریا کرم میں بھی شامل تھا۔'' ورما کی معلومات سے ظاہر تھا کہ اس نے اپنے ماتحتوں کو بالکل آزاد نہیں چھوڑ رکھا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں اور اسے خبر نہ ہو۔ اس کے اپنے کچھ اور ذرائع بھی تھے جن سے اسے معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔

''وہ تو ایک معمول کی بات تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نواب نوازش علی کو ایسے تحفے دیتی رہتی ہوں۔ رتی اس کو بہت پسند تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ اس کی موت پر نواب بہت اُداس ہوگا اس لیے اتفاق سے اسی روز خود تک پہنچنے والی رنجنی کو نواب کا من بہلانے کے لیے اپنے ساتھ کراچی لے گئی۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے کچھ روز کے لیے وہاں رہنے دوں گی اور پھر بہانے سے واپس بلوا کر اپنے مطلب کی ٹریننگ دے دوں گی۔ ویسے وہاں بھی میں نے آشا کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں اسے بہت کچھ سکھا دے گی۔ جو کسر رہ گئی، وہ میں بعد میں پوری کر دوں گی۔'' اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

''ہوسکتا ہے رنجنی کچھ گڑبڑ ہو۔ کیونکہ وہی تو تم لوگوں کے درمیان نئی تھی اور ہم اس پر پوری طرح وشواس نہیں کر سکتے۔'' ورما نے صاف لفظوں میں اپنے شک کا اظہار کیا تو شالنی کے ذہن کے پردے پر بھی یکدم وہ منظر اُبھر آیا جب اس نے رنجنی کو سب کے درمیان سے غائب پایا تھا اور بعد میں وہ اس بہانے کے ساتھ شمشان گھاٹ کے باہر سے واپس آئی تھی کہ رفع حاجت کے لے گئی ہوئی تھی۔ لیکن وہ یہ بات ورما کو بتا کر اپنی مصیبت کو آواز نہیں دے سکتی تھی، اس لیے جلدی سے بولی۔

''ارے نہیں سر! وہ تو بہت سیدھی سادی ہے۔ چھوٹے علاقے سے آئی ہوئی ہے اس لیے ڈھنگ سے بات تک کرنا نہیں جانتی، مخبری کیا خاک کرے گی؟ ویسے بھی وہاں اسے میں نے مستقل اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی موقع ہی نہیں تھا کہ وہ مخبری وغیرہ کر سکے۔''

''ٹھیک ہے۔ تُو مطمئن ہے تو میں بھی مطمئن ہو جاتا ہوں۔ اب بتا کہ آگے کا کیا حل سوچا ہے؟ پکڑے جانے والے بندوں میں سے کسی نے تیرا نام اُگل دیا تو تُو بری طرح پھنس جائے گی۔' ورما نے سب سے اہم نکتہ چھیڑا۔

''مشکل ہے سر! پولیس والے ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچے تو سمجھ لیں کہ اب تک ہمارے لوگوں کی زبان بند ہے اور اب اتنا وقت گزر چکا ہے کہ سمجھا جا سکتا ہے، ان بے چاروں پر تشدد کا ہر حربہ آزمایا جا چکا ہوگا۔ ہمارے سورماؤں نے جب اب تک کچھ نہیں اُگلا تو آگے بھی نہیں اُگلیں گے۔ ویسے میں احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے انڈر گراؤنڈ رہوں گی۔ ابھی تو اس کارن باہر نکلی تھی کہ آپ سے مل سکوں اور اگر آپ کے من میں میرے لیے کوئی میل آ گیا ہو تو اسے دھو سکوں۔''

شالنی کا سارا زور اس بات پر تھا کہ کسی طرح ورما کو یہ باور کروا سکے کہ وہ ہر طرح سے بے قصور ہونے کے ساتھ ساتھ شکوک وشبہات سے بھی محفوظ ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی ذات سے انہیں خود کو نقصان پہنچنے کا ذرا بھی احتمال ہوا تو وہ خود اسی سے بدک جائیں گے اور اس کا انجام بخیر نہ ہوگا۔

''تُو نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ تیرا انڈر گراؤنڈ رہنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ ایسا کر یہاں سے واپس نہ جا۔ میرا یہ ٹھکانہ محفوظ ہے۔ تُو آرام سے یہاں مہینوں بھی چاہے تو چھپی رہ سکتی ہے۔ کھانے پینے اور تفریح کی تجھے کوئی کمی نہیں ہوگی۔ بس تُو یہاں سے باہر نہیں جا سکے گی۔'' ورما نے فوراً ہی اس سے اتفاق کرتے ہوئے ایک



پیشکش بھی کر دی اور اتنا تو شالنی بھی سمجھتی تھی کہ باس کی پیشکش صرف پیشکش نہیں ہوتی جسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ماتحت کو حاصل ہو۔ وہ ایک حکم ہی تھا جس کی ہر حال میں تعمیل کی جانی تھی۔

''دھنے واد سر! یہ تو میرے لیے بڑے گرو (فخر) کی بات ہوگی کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے دولت کدے پر رہ سکوں۔'' اس نے خوشامدانہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے پیشکش نما حکم کو قبول کر لیا۔

''ٹھیک ہے، تم جا کر گیسٹ روم میں آرام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس معاملے کو کیسے ہینڈل کیا جائے۔ اگر تم سے مشورہ لینے کی ضرورت پڑی تو بلوا لوں گا۔'' ورما نے اسے اجازت دی تو وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ باس کا سامنا کرنا اس کے لیے خاصا اعصاب شکن ثابت ہوا تھا اور ورما کو کافی آسانی سے اپنے دلائل سے قائل کر لینے کے باوجود وہ عجیب سے اضطراب کا شکار تھی۔

گیسٹ روم میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے کیبنٹ میں موجود شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل منتخب کی اور اپنے لیے ڈرنک تیار کر کے غٹاغٹ چڑھا گئی۔ تیز شراب نے اس کے سینے کو جلا ڈالا لیکن وہ اپنی اعصابی کشیدگی کو خاصا کم محسوس کرنے لگی۔ اس نے ایک کے بعد فوراً ہی دوسرا پیگ تیار کر لیا لیکن پہلے کی طرح اسے ایک سانس میں چڑھانے کے بجائے پُرسوچ انداز میں ٹھہر ٹھہر کر پینے لگی۔

آدھا پیگ پینے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون نکال کر آن کیا اور اس پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ورما کی طرف سے موبائل وغیرہ کے استعمال پر پابندی عائد کیے جانے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے آن کر کے اس پر کسی سے رابطہ کر رہی تھی، وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ فون میں پرانی کی جگہ نئی سم ڈال لی تھی۔ یہ کام اس نے یہاں آنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آشا سے رابطہ کر کے کراچی کی خیر خبر لے گی لیکن پھر یہ کام ورما سے ملاقات کے بعد تک کے لیے ٹال دیا۔ ملاقات تو ہو چکی تھی، یہ اور بات ہے کہ وہ اس ملاقات کے بعد واپس نہیں جا سکی تھی۔ لیکن ملاقات میں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں اب کراچی سے رابطہ کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا اس لیے اس نے پہلی فرصت میں آشا کا نمبر ملا ڈالا۔

''ہیلو کون؟'' نیا نمبر دیکھ کر آشا نے محتاط انداز میں کال ریسیو کی۔

''میں ہوں آشا!..... تیری شالنی۔'' اس نے نہایت لگاوٹ سے اپنا تعارف کروایا۔

''نمستے دیدی! کہیں، کیا حال ہیں؟'' آشا اس کی آواز سن کر کھِل اُٹھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تُو اپنی سنا اور اس نئی مینا کی بھی، جسے تیرے حوالے کر کے آئی ہوں۔'' وہ فوراً ہی اصل مطلب پر آ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں دیدی! لیکن رنجنی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔'' آشا اسے تفصیل سے سارا قصہ سنانے لگی۔ شالنی نے توجہ سے اس کی ساری بات سنی اور نواب صاحب کی خدمت میں حاضری کے وقت رنجنی کے اچانک بیمار پڑ جانے کا سن کر مزید مضطرب ہوگئی۔

''میری بات سن آشا! رنجنی پر سخت نظر رکھ۔ وہ کچھ گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔ اس کی وجہ سے میرا ایک بہت خاص کام رک گیا ہے اور جان مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ بچت کی یہی صورت ہے کہ اسے ثبوتوں کے ساتھ پکڑوا دوں۔'' اس نے آشا کو ہدایات جاری کیں تو پریشانی صاف اس کے لہجے سے ہویدا تھی۔

''تھوڑا کھل کر بتائیں دیدی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟..... کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟'' آشا فوراً اس کے لیے پریشان ہوگئی۔

''ابھی تو میں ٹھیک ہوں۔ تُو زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے جو میں نے کہا ہے وہ کر..... اور ہاں، یاد

رکھنا کہ کاجل کو اس بات کی ہوا نہ لگ سکے۔ تجھے معلوم ہے کہ مجھے اس پر شک ہے کہ وہ وہاں رہ کر میرے خلاف جاسوسی کا کام کرتی ہے۔'' شالنی نے ذرا سخت لہجے میں اسے ٹوکتے ہوئے اسے ایک اور ہدایت دی اور پھر سلسلہ منقطع کر کے موبائل آف کر دیا۔

اس وقت وہ آشا کی محبت اور تشویش بھرے استفسارات سننے اور وضاحتیں دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی اس نے موبائل ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ تیزی سے کھلا اور ورما خوفناک منہ والی گن کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''مجھے معلوم تھا کہ اس مصیبت کے پیچھے تُو ہی ہے۔ اگر تُو زندہ رہی تو تیرے پیچھے دوسری مصیبتیں چلی آئیں گی اس لیے تیرا اس سنسار سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور شالنی کی کوئی بھی بات سننے سے قبل فائر کر ڈالا۔ ششدر بیٹھی شالنی اپنے بچاؤ کے لیے جگہ سے ہل بھی نہیں سکی اور گولی سیدھی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس کی موت کا اطمینان ہو جانے پر ورما نفرت سے تھوکتا ہوا باہر نکل گیا۔

شالنی کے قتل کی خبر فوراً ہی ذیشان تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ شالنی اپنی دانست میں بغیر کسی کی نظروں میں آئے ورما سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن اس کی نگرانی پر مامور سی ایف پی کا ایک اہلکار مستقل اس کے تعاقب میں لگا رہا تھا۔ شالنی کے سارے واقعے کے بعد پہلی بار وہ بھی بہت محتاط انداز میں باہر نکلنے پر سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی خاص شخص سے ملاقات کے لیے جا رہی ہے۔ اس نے فوراً دفتر فون کر کے اطلاع دی جہاں سے اس کی مدد کے لیے دوسرا شخص روانہ کرنے کا عندیہ دیا گیا۔ دوسرے شخص کو بھجوانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شالنی جس سے ملاقات کے لیے جا رہی ہے، اس کی بھی نگرانی کی جا سکے۔ لیکن وہاں تو کہانی ہی کچھ اور ہو گئی۔ شالنی جس مکان میں داخل ہوئی، وہاں سے باہر ہی نہیں نکلی۔ سی ایف پی کے دونوں اہلکار بڑے صبر سے انتظار کرتے رہے۔ اگر انہیں غیر ضروری مداخلت سے روکا نہ گیا ہوتا تو شاید وہ مکان کے اندر کُود کر صورتِ حال جاننے کی کوشش کرتے۔ لیکن ہدایات کی روشنی میں اُنہیں صرف نگرانی تک محدود رہنا پڑا۔ اُن کے کان اس وقت کھڑے ہوئے جب انہوں نے مکان کے اندر سے فائر کی آواز سنی۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن بہرحال وہ اتنی اہلیت رکھتے تھے کہ فائر کی آواز اور سمت کا درست تعین کر سکتے۔

دونوں آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب انہیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ دونوں ہی اندر جا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے حق میں تھے لیکن اس کی نوبت نہ آ سکی اور ایک کار بڑی تیزی سے مکان سے برآمد ہوئی۔ کار کی اگلی نشست پر باوردی ڈرائیور موجود تھا جبکہ پچھلی نشست ادھیڑ عمر کے خاصے رعب دار چہرے والے شخص نے سنبھال رکھی تھی۔ کار کے منظر پر آتے ہی سی ایف پی کا بعد میں آنے والا اہلکار مکان کے اندر جانے کا خیال بھول کر اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ کیونکہ اس کی اصل ڈیوٹی بھی یہی تھی۔ اسے اسی مقصد کے لیے وہاں بھیجا گیا تھا کہ شالنی جس شخص سے ملاقات کے لیے گئی ہے، اس کا تعاقب کرے۔ البتہ شالنی کے تعاقب میں آنے والے نے کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مکان کے اردگرد گھوم کر سن گن لینے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ مکان خالی ہے اور شاید ہی وہاں کسی ذی نفس کی موجودگی کا امکان ہو۔ اپنے اندازے کے باوجود وہ بہت احتیاط سے مکان کے اندر داخل ہوا۔ مکان کی اندرونی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہاں باقاعدگی سے صفائی اور دیکھ بھال کا کام نہ ہوتا ہو۔

ایسا اس لیے تھا کہ ورما وہاں مستقل نہیں رہتا تھا۔ مہینے میں صرف دو دن ایسے تھے جب وہ یہاں آیا کرتا تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان مخصوص دو دنوں میں بھی لازماً وہاں آئے۔ اپنی دیگر مصروفیات میں اُلجھ کر اکثر



وہ نہیں بھی آتا تھا۔ بے چاری شالنی نے تو صرف قسمت آزمائی تھی اور قسمت کی خرابی سے ہی ماری گئی تھی، ورنہ شاید اسے کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی۔

عارضی طور پر استعمال ہونے والے اس مکان میں کوئی مستقل ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ ورما یہاں آتا تو اس کے ساتھ آنے والا ڈرائیور ہی جھاڑ پونچھ اور تھوڑی بہت صفائی کا کام کر دیتا۔ مکان میں داخل ہونے والے سی ایف پی کے اہلکار کو وہاں داخل ہوتے ہی جس ویرانی اور بے سروسامانی کا احساس ہوا تھا، وہ اسی وجہ سے تھا۔ اپنے احساس کے باوجود وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا رہا اور بیرونی احاطے کا چکر لگانے کے بعد اندر داخل ہوا۔ اندر کا حال باہر کی نسبت بہتر تھا۔ اسے ایک کمرا اس حالت میں نظر آیا کہ اسے ایک میز اور کرسیوں کی ترتیب سے دفتر کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہاں ٹیلی فون اور کمپیوٹر وغیرہ سمیت دیگر لوازمات موجود نہیں تھے۔ کئی خانوں پر مشتمل ایک کیبنٹ ضرور تھی لیکن اس کے بھی زیادہ تر خانے خالی پڑے ہوئے تھے۔ اگلے دو کمروں میں بھی اسے کچھ نہیں ملا۔ لیکن تیسرا دروازہ کھولتے ہی وہ چونک گیا۔ شالنی کی لاش خون کے چھوٹے سے تالاب میں پڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ فائر کی جو آواز سنی تھی، وہ یقینی طور پر شالنی کی زندگی کا چراغ گُل کرنے کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

اس نے نظر دوڑائی تو اسے لاش کے اردگرد کچھ نظر نہیں آیا۔ حالانکہ اس کا ہینڈ بیگ جو یہاں آتے وقت اس کے ہاتھ میں تھا، اردگرد ہی کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہینڈ بیگ کی غیر موجودگی سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل اسے مار کر وہاں سے فرار ہونے والے اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے واقعے کی خبر دی۔

''تم وہیں رک کر انتظار کرو۔ میں کسی کو تمہاری مدد کے لیے بھیجتا ہوں۔'' اس نے خبر سن کر اپنے ماتحت کو حکم دیا پھر فوری طور پر دفتر میں موجود اہلکاروں میں سے چند کو احکامات دینے لگا۔ شالنی کی لاش کے پاس موجود اہلکار سے بھی پہلے، اس نے اپنے ماتحت کی مدد کے لیے بندہ بھجوایا جو شالنی کے قاتل کے تعاقب میں گیا تھا۔ رابطوں کی آسانی کے اس دور میں یہ ذرا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اس ماتحت کی لوکیشن سے واقف نہ ہو سکے۔ اس کی یہ عقل مندی کام دکھا گئی کیونکہ ورما پہلے ہی چوکنا تھا۔ اسے شک تھا کہ شالنی اپنے پیچھے کسی نہ کسی کو لا کر اس مکان تک پہنچی ہو گی اس لیے فوری طور پر اس کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ورنہ آج وہ خاص طور پر اس لیے وہاں موجود تھا کہ عنقریب پہنچنے والے کچھ خاص ہتھیاروں کو مکان کے تہ خانے میں بہ حفاظت رکھنے کے انتظامات کا جائزہ لے سکے۔ یہ کام تو انجام نہ پا سکا البتہ شالنی کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے اسے کچھ فوری فیصلے کرنے پڑے جن میں شالنی کا قتل اور ہمیشہ کے لیے اس مکان سے دست برداری شامل تھی۔

مکان سے روانہ ہوتے وقت وہ پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے سی ایف پی کا اہلکار اپنی بے حد احتیاط کے باوجود اس کی نظروں میں آ گیا۔ اپنے اندازے کی تصدیق اور اس سے جان چھڑانے کی خاطر اس نے ڈرائیور کو گاڑی بے مقصد اِدھر اُدھر دوڑانے کا حکم دے ڈالا۔ تعاقب کار نے کہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑا لیکن اس دوران اس کا ذیشان سے رابطہ ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو اپنی لوکیشن سے لحہ بہ لحہ آگاہ کرتے ہوئے وہ اس وقت ہٹ گیا جب اس کا ساتھی اس کی جگہ لینے کے لیے آ پہنچا۔ اس کے پیچھے ہٹ جانے نے بوکھلائے ہوئے اہلکاروں کو مطمئن کر دیا کہ انہوں نے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور وہ دوسرے اہلکار کو اپنے ساتھ چپکائے اپنی اصل رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔

ذیشان کو اس کی رہائش گاہ کے پتے سے آگاہ کرنے کے بعد اس کی ہدایت پر کامیاب تعاقب کرنے والا

اہلکار بدستور نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ ذیشان کی زبانی یہ اطلاع شہریار تک بھی پہنچ گئی۔ ذیشان کا خیال تھا کہ شالنی کے ذریعے وہ کسی بڑے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب انہیں مسلسل اس کی نگرانی کروانی چاہئے تاکہ اس کے ذریعے اس کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچا جا سکے۔ شہریار نے اس کے خیال کی تائید یا مخالفت میں کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنے ہی کسی خیال میں گم بولا۔

''اپنے آدمی سے کہو کہ اس مشکوک بندے کا فوٹو لے کر تمہیں Send کر دے۔ تم وہ فوٹو مجھے Send کر دینا۔ اور اپنی قید میں موجود وکرم کو بھی دکھا دینا۔ میرے خیال میں وکرم اسے شناخت کر لے گا کہ وہ کون ہے؟''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ یہ جس قسم کا سیٹ اپ ہے، اس میں پہلے بھی ''را'' کی انوالومنٹ پائی گئی ہے اس لیے اب بھی یہی قوی امکان ہے کہ شالنی کا قاتل ''را'' کا ہی کوئی کرتا دھرتا ہوگا اور تم یا وکرم اسے شناخت کر سکو گے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اس کی بات سے اتفاق کر لیا۔

وہ جانتا تھا کہ ماضی میں شہریار کی ''را'' والوں سے وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہی تھیں۔ بہت ممکن تھا کہ حالیہ منظر پر آنے والے آدمی کو وہ پہچان لے اور وکرم تو تھا ہی ''را'' کا وہ ایجنٹ جسے انہوں نے موہنی کے ساتھ گرفتار کیا تھا اور زندہ رکھ کر اپنے مفاد میں استعمال کر رہے تھے۔

شہریار کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ وکرم سے اس کے آپریٹس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس آپریٹس کے ذریعے وکرم نے اپنے مقامی باس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بخیریت ہے اور موہنی کی لاش ملنے کے بعد احتیاطاً اپنی رہائش گاہ سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہے۔ اس نے موہنی اور وفاقی وزیر کی قابلِ اعتراض فلم پر مشتمل سی ڈی کے بھی اپنے پاس موجود ہونے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے یہ باور کروا دیا تھا کہ اس سے موہنی کی ملاقات بالکل عمومی حالات میں ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا، اس میں ''را'' سے تعلق کے بجائے اس کی خوب صورتی وجہ بنی تھی اور وہ تنہا سفر کرنے والی دیگر بدقسمت حسین خواتین کی طرح کسی کی ہوس کا نشانہ بن گئی تھی۔

دوسری طرف کے لوگوں کے پاس اس کی بات کا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیونکہ سی ایف پی نے انہیں یقین دلانے کے لیے پورا اہتمام کیا تھا۔ جس ویران مقام سے اس کی گاڑی اور لاش برآمد ہوئی، وہاں کا منظر نامہ ایسا تھا کہ پہلی نظر میں ہی دیکھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس عورت کے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی مرضی سے تیار کروائی گئی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ الگ مُہر تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ بہرحال، اس سارے کھیل کا یہ نتیجہ نکلا کہ موہنی کی لاش وصول کرنے اس کا کوئی والی وارث سامنے نہ آیا اور اسی وزیر نے اپنے ایک ملازم کے ذمے اس کی آخری رسومات ادا کرنے کی ڈیوٹی لگا دی جس کی سیکرٹری کے طور پر وہ کام کرتے ہوئے دیگر بارسوخ لوگوں کو شکار کر رہی تھی۔

''موہنی مشن'' سی ایف پی کی کامیابی کا ایک اور ثبوت تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی مختلف تھا اور اپنے قیام سے اب تک اس کا کوئی اہلکار معمولی سی بدعنوانی میں بھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ چودھری افتخار کے کارخانے کے تہ خانے کی نگرانی پر مامور دو اہلکاروں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ وہ بظاہر سی ایف پی کے کارکن تھے لیکن صرف اس سی ایف پی کے، جو لوگوں کو ان کی خواہش پر منہ مانگے داموں سکیورٹی گارڈز فراہم کرتی تھی۔ سکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں کام کرنے والی سی ایف پی کے اصل ملازمین جنہیں حساس ذمے داریاں سونپی جاتی تھیں، بالکل الگ تھے اور ان کی کارکردگی اب تک قابلِ تحسین رہی تھی۔

شہریار کی فرمائش پر ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو اس نے موقع ملتے ہی آدھے گھنٹے بعد اسے ورما کی



تصویر Send کر دی۔ اس نے یہ تصویر فوراً ہی شہریار کو فارورڈ کر دی اور ساتھ ہی وکرم کے پاس شناخت کے لیے گیا۔ وکرم تصویر شناخت نہیں کر سکا۔ اس کا بیان تھا کہ اس کے تعلقات اپنے ہی لیول کے لوگوں تک محدود ہیں اور کسی بڑے نے آج تک اس سے براہِ راست ملاقات نہیں کی۔ جو بھی ہدایات ملتی ہیں، وہ فون یا آپریٹس پر کوڈ ورڈ میں دی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ نہیں جانتا کہ یہ تصویر کس شخص کی ہے۔ البتہ شہریار تصویر دیکھتے ہی اُچھل پڑا۔

ورما کو پہچاننے میں اس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ پہلے کے مقابلے میں بہت تبدیل کر لیا تھا اور اگر راہ چلتے اس پر سرسری سی نظر پڑتی تو وہ شاید اسے پہچان بھی نہیں پاتا۔ لیکن تصویر میں تو وہ پوری فرصت سے اس کے ہر نقش کا جائزہ لے سکتا تھا۔ ورما کے اک بار پھر سامنے آ جانے کے خیال سے اس کے اعصاب تن سے گئے۔ یہی تو وہ شخص تھا جس کے ہاتھوں اس کے خاندان کی تباہی کا آغاز ہوا تھا۔ خواجہ سراؤں کے مذہبی گروہ کی حیثیت سے اس نے پہلے اس کی پیاری بھتیجی شینا کو بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور جب شفقتِ پدری سے تڑپتے سجاد رانا نے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کھوجنا چاہا تو باوجود یہ کہ وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں ڈی آئی جی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خاصے اثر و رسوخ کے مالک تھے، انہیں سرِعام فائرنگ کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا۔

یہ دو حادثے رانا خاندان کے لیے اتنے گہرے زخم چھوڑ گئے تھے کہ اب وہ ساری زندگی اس کی تکلیف سے نجات حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے لیاقت رانا اور بیگم آفرین کے پاس ان صدموں کو سہنے کے بعد اگر حصولِ خوشی کی کوئی واحد شکل رہ گئی تھی تو وہ شہریار کی صورت میں تھی۔ اور اس جنگ میں کودنے کے بعد وہ بھی ان کے لیے ایک ہستی ہو گیا تھا جس کے حوالے سے خوش کُن خواب دیکھنے کے بجائے اب انہیں دن رات بس اس کی سلامتی کی دعائیں ہی مانگنی تھیں۔ رہیں سجاد رانا کی بیوہ مریم تو وہ بے چاری بھی اپنی زندگی کے محض چوتھے عشرے میں ہی زندگی کی گہما گہمی سے محروم ہو گئی تھیں۔ نوعمر اکلوتی بیٹی اور شوہر کو کھونے کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ ان کی ویران آنکھیں ان کے چاہنے والوں کے لیے رات دن جاری رہنے والا ایک امتحان بن گئی تھیں اور کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا جو وہ ان کے دُکھوں کے علاج کے لیے تجویز کر سکتا۔

ورما ایک ایسا شخص تھا جسے وہ نجی اور قومی دونوں سطح پر اپنے دشمن کے طور پر جانتا تھا۔ یہ دشمن ایک بار پہلے بھی اس کے ہاتھ آنے کے بعد نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب دوبارہ سامنے آیا تھا تو اس کے ہاتھ اس کی گردن ناپنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے لیکن اس بار وہ پہلے کی طرح کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے لیے آزاد نہیں تھا۔ ورما تک پہنچنے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ تھی کہ فی الحال اسے اپنی قیام گاہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے تبدیلی کے جس عمل سے گزارا جا رہا تھا، اس کے مکمل ہونے تک وہ اپنے انسٹرکٹر عمر فاروق سے یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسے یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت دیں گے۔

دوسرا مسئلہ سلّو کی آمد کا تھا۔ وہ شدت سے خواہاں تھا کہ یہ نوجوان طے شدہ طریقِ کار کے مطابق پاکستان ضرور پہنچے تاکہ اسے اپنی نظروں میں رکھا جا سکے۔ ورما کو چھیڑنے میں سب سے بڑا خطرہ ہی یہ لاحق تھا کہ موہنی کی موت کے بعد اگر فوری طور پر ''را'' کا ایک اور ایجنٹ نشانہ بن گیا تو ''را'' والوں کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور وہ اپنی برسوں کی محنت اور سرمائے سے تیار کردہ سلّو نامی عفریت کو کھلے بندوں پاکستان بھیجنے سے گریز کریں گے۔ قیدیوں کے تبادلے کی صورت میں پاکستان پہنچنے کے بجائے اگر سلّو خفیہ طریقے سے یہاں آتا تو

بلینا ان کے اس تک پہنچنے سے قبل خاصے نقصان کا احتمال ہوتا۔ وہ اپنے ملک کو یہ نقصان بھی پہنچتے ہوئے نہیں
یکھ سکتا تھا اور ایک دوراہے پر آ کھڑا تھا کہ کیا کرے؟ اگر ایک طرف ورما کو فوری طور پر شکنجے میں کسنے کی
واہش تھی تو دوسری طرف بہت سی ایسی رکاوٹیں جنہیں نظر انداز کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ بے چین
ما اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا کہ شاید اس مسئلے کا کوئی حل دماغ میں آ جائے۔

❀----✪----❀

''میں ٹھیک ہوں آشا!.....تُو اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ تُو میری وجہ
سے خوامخواہ بے آرام ہو۔ کل رات کی بات اور تھی لیکن آج تو میری حالت سنبھل گئی ہے۔ آج مجھے کسی تیماردار
لی ضرورت نہیں ہے۔''

نواب نوازش علی کی کوٹھی میں رات کا کھانا معمول کے مطابق کھایا جا چکا تھا اور سب اپنی اپنی ذمے داریاں
انجام دے کر اپنے لیے مخصوص کمروں میں چلے گئے تھے۔ جاوید علی بھی اپنے کمرے میں جو کبھی رتی کی ملکیت
ہوا کرتا تھا، واپس آ گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرے گا، پھر مقررہ وقت پر شاز مین سے ملنے لان
میں چلا جائے گا۔ لیکن کمرے میں آمد کے فوراً بعد ہی آشا اس کے پیچھے ہی وہاں چلی آئی اور ارادہ ظاہر کیا کہ
آج رات بھی وہ اس کے کمرے میں ہی گزارے گی۔ وجہ اس نے یہی بتائی تھی کہ وہ بیماری کی حالت میں رنجنی
کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی کہ مبادا رات کو سوتے میں اسے کوئی ضرورت پڑے اور اکیلے ہونے کی وجہ سے
پریشانی اُٹھانا پڑے۔

اس کا یہ پروگرام جاوید علی کے لیے کسی طور مناسب نہیں تھا۔ کل رات بھی وہ لان سے واپس آیا تھا تو آشا
جاگ چکی تھی اور اسے اس کے سامنے اپنے باہر جانے کی خاصی وضاحتیں پیش کرنی پڑی تھیں۔ آج بھی اگر وہ
یہاں رہتی تو کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا اور جبکہ وہ آج، کل کے مقابلے میں زیادہ اہم ضرورت کے تحت
مقررہ وقت پر لان میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے آشا کی وہاں موجودگی کھٹک رہی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا
کہ کسی طرح وہ خود اپنے کمرے میں سونے کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن آشا بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ بجائے
اس کے کہ اس کی بات مان لیتی، چمک کر بولی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی ایک دو روز تک تیرے ساتھ اس کمرے میں ہی سوؤں گی۔ یہاں سونے
کے لیے مجھے کوئی کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا بلکہ من کو دلاسا رہے گا کہ میں تیرا خیال رکھنے کو تیرے پاس ہوں۔
ورنہ تُو کتنی بے پروا ہے، یہ میں نے کل رات ہی دیکھ لیا ہے۔ اتنی خراب حالت میں بھی آدھی رات کو اُٹھ کر لان
میں گھومنے چلی گئی تھی کہ من گھبرا رہا تھا۔ بھگوان نہ کرے اگر تُو چکرا کر وہیں کہیں گر جاتی تو صبح تک کوئی تجھے
دیکھنے والا نہیں تھا۔ آج کم سے کم اتنا تو ہو گا کہ اگر تیرا من پھر گھبرائے اور تُو باہر جانا چاہے تو میں تیرا خیال رکھنے
کو تیرے ساتھ چلوں گی۔ تُو میری فکر نہ کر اور آرام سے سو جا۔''

آشا کا کسی صورت وہاں سے ٹلنے کا پروگرام نہیں تھا کیونکہ اسے شالنی کی ہدایت کے مطابق رنجنی پر نظر
رکھنی تھی۔ ادھر جاوید علی اس کا پروگرام سن کر سخت جز بز ہو رہا تھا۔ اگر آشا، شاز مین سے طے کیے گئے وقت سے
قبل سوتی نہیں تو اس کا اپنا پروگرام کھٹائی میں پڑ جاتا۔ آشا کے جاگتے میں وہ لان میں جانے کا قصد کرتا تو وہ
اس کے ساتھ چپک کر وہاں ضرور جاتی اور اس کی موجودگی میں ظاہر ہے شاز مین سے ملاقات نہیں کی جا سکتی
تھی۔ وہ اپنے دل میں اس مصیبت کو ٹالنے کا طریقہ سوچنے لگی۔

ایک حل تو یہی تھا کہ وہ آشا کو زیادہ باتیں بگھارنے کا موقع دیے بغیر فوراً سونے کے لیے لیٹ جائے



تا کہ وہ خود بھی بور ہو کر سو جائے۔ اور اس کے سونے کے بعد اسے باہر نکل جانے کا موقع مل جائے۔ بعد میں وہ
جاگ بھی جاتی تو اس سے محض سوال جواب کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی؟ جاوید علی کو ویسے بھی اندازہ تھا کہ اب
وہ یہاں رنجنی کے کردار میں زیادہ نہیں رک سکتا۔ نواب نوازش علی اسے اس عرصے میں دوبارہ بھی یاد کر سکتا تھا
اور اس کے لیے ہر بار بہانہ بنا کر حاضری کو ٹالنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے یہ ضروری تھا کہ شاز مین کے توسط سے
اسے یہاں کا اسرار جاننے کا جو سنہری موقع مل رہا ہے، اس سے فوری فائدہ اٹھائے اور اپنی جان بچا کر بھاگ
نکلے۔ بعد میں پیچھے اس کے بارے میں کیا سوچا جاتا اور کہا جاتا، یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔

یہ سب سوچ لینے کے بعد اس نے سونے کے ارادے سے اُٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کرنی چاہی اور ابھی
جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور مدھو نامی خواجہ سرا ایک چھوٹی ٹرے میں دو گلاس رکھے اندر
داخل ہوا۔

''یہ دودھ کاجل دیدی نے تم دونوں کے لیے بھیجا ہے۔'' اس نے ٹرے میں سے ایک ایک گلاس اٹھا کر
دونوں کو تھمایا۔ دونوں گلاسوں میں بے شک دودھ ہی موجود تھا لیکن بڑے فرق کے ساتھ۔ جاوید علی کو جو گلاس
تھمایا گیا تھا، اس میں محض سادہ دودھ موجود تھا جبکہ آشا کے گلاس میں موجود دودھ میں کسی مشروب کی گلابی گھلے
ہونے کے ساتھ ساتھ میوہ جات کی موجودگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جاوید علی نے اس فرق کو شدت سے محسوس کیا۔

''آشا کو میوے والا میٹھا دودھ بہت پسند ہے، اس لیے میں اس کے لیے یہ لے کر آئی ہوں۔ لیکن تیرے
لیے اس لیے نہیں لائی کہ تیرا پیٹ ابھی ٹھیک ہوا ہے، زیادہ بھاری غذا سے دوبارہ گڑبڑ ہو سکتی ہے اس لیے ابھی
یہ پی لے، بعد میں جب تُو پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو تجھے بھی ایسا دودھ تیار کر کے پینے کے لیے دوں
گی۔'' مدھو نے محسوس کر لیا کہ جاوید علی کی نظریں دونوں گلاسوں میں موجود دودھ کے فرق میں اُلجھی ہوئی ہیں
اس لیے از خود وضاحت دے کر اسے سمجھانے لگی۔

''اب جب نواب صاحب اسے دوبارہ یاد کریں، تب اسے یہ دودھ پلانا۔ بے چاری کا من پکا ہو گا اور
اب کی طرح ڈر کے مارے بیمار ہو کر بستر پر نہیں پڑے گی۔'' آشا نے ہنستے ہوئے مدھو کو مشورہ دیا جس پر وہ
پہلے مسکرائی اور پھر ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے بولی۔

''تُو بہت چلبلی ہے۔ کسی سے بھی تیری زبان رُکنے کو تیار نہیں ہوتی۔ اسے ذرا قابو میں رکھا کر ورنہ کسی دن
کاجل دیدی سے ڈانٹ کھائے گی۔''

''وہ مجھے کچھ نہیں کہنے والی۔ اسے معلوم ہے نا میں شالنی دیدی کی لاڈلی ہوں۔'' آشا نے اس کی نصیحت
پر کان دھرنے کے بجائے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر مزے سے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

''بہت بڑھیا۔ آج کا دودھ تو ہمیشہ سے زیادہ مزے کا ہے۔ کاجل دیدی کو میری طرف سے دھنّے واد
بول دینا۔'' پہلا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہی اس نے تعریف کی۔

''پر دودھ تو میں نے تیار کیا ہے۔'' مدھو معترض ہوئی۔

''سو تو ہے۔ لیکن اگر دیدی نہ کہتی تو کیا تُو اتنے مزے کا دودھ بن کہے میرے لیے لے کر آتی؟'' آشا
نے چمک کر پوچھا۔

''نہیں لاتی۔ یہ تو دیدی نے کہا کہ آشا، رنجنی کی خاطر اتنی جان ماری کر رہی ہے، اس کی صحت کا بھی خیال
رکھو اور کوئی طاقت کی چیز بنا کر پلاؤ.....تو مجھے یہ دودھ کا شربت بنانے کا خیال آیا۔ شربت میں ڈالنے کے لیے
الائچی کا پاؤڈر دیدی نے خاص اپنے پاس سے دیا تھا۔ کہہ رہی تھیں انہیں یہ پاؤڈر کسی نے تحفے میں دیا تھا اور کہا

تھا کہ الائچی کی اتنی اچھی خوشبو کہیں اور سے نہیں ملے گی۔'' مدھو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''شاید اسی لیے آج کا شربت مجھے زیادہ مزے دار لگ رہا ہے۔'' آشا تفصیل سن کر جھٹ بولی اور پھر جاوید علی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ''یہ سب تیرا کمال ہے رنجنی! کہ دیدی کو میرا خیال آ گیا۔ ورنہ وہ مجھ سے زیادہ خوش نہیں رہتیں۔''

''تیری ٹرٹر کی وجہ سے وہ تجھ سے خفا ہوتی ہیں ورنہ انہیں تو سب ہی کا بہت خیال رہتا ہے۔'' مدھو نے فوراً ہی اس کی تردید کی اور پھر اس اثنا میں خالی ہونے والے گلاس واپس ٹرے میں رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔

''یہ تو چمچی ہے دیدی کی۔ ورنہ میں سب سمجھتی ہوں کہ دیدی مجھ سے جلتی ہے۔'' اس کے باہر نکلتے ہی آشا نے تبصرہ کیا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جماہی لی۔

''چلو بھئی، میں تو سونے لگی ہوں۔ اگر تجھے رات کو اُٹھ کر سیر سپاٹے کرنے کا شوق چڑھے تو مجھے جگا دینا۔'' وہ ایک اور جماہی لے کر نرم و دبیز صوفے پر لیٹ گئی۔ کمرے میں صرف ایک ہی بیڈ تھا اس لیے اسے صوفے پر ٹھکانہ بنانا پڑا تھا۔ اسے دکھانے کے لیے جاوید علی خود بھی بستر پر دراز ہو گیا تھا لیکن اسے حیرت تھی کہ کچھ دیر قبل بالکل تازہ دم نظر آنے والی آشا کو اچانک نیند نے کیوں گھیر لیا؟..... اس کے تربیت یافتہ ذہن نے کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا اور وہ یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھا کہ دودھ میں کوئی گڑبڑ تھی، وہ بھی آشا کے گلاس کی حد تک..... ورنہ وہ خود تو اپنے ذہن کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ البتہ آشا لیٹنے کے ساتھ ہی تیزی سے نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

وہ اس غیر معمولی صورتِ حال پر غور کرنے لگا لیکن کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ کر سکا اور بالآخر وقت آ پہنچا جب اسے شازمین سے ملنے جانا تھا۔ اس نے کمرے سے روانہ ہونے سے قبل غور سے آشا کا جائزہ لیا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ پھر بھی وہ بہت احتیاط سے کمرے سے نکلا اور لان کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ مقررہ مقام پر شازمین اس کی منتظر تھی۔

''آؤ چلو میرے ساتھ۔'' اس نے جاوید علی کا ہاتھ تھام کر اسے ایک سمت میں کھینچا۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط اور پُرجوش تھی۔ جاوید علی پھر اسی مہک میں گھرنے لگا، جسے گزشتہ شب بھی محسوس کرتا رہا تھا۔ شازمین اس کا ہاتھ تھامے ہوئے لان سے نکل کر اس راستے کی طرف لے گئی جہاں کوٹھی کی بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔

وہ دونوں دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ اوپر مکمل خاموشی تھی اور روشنی بھی بس اس حد تک ہی تھی کہ وہ لوگ کسی شے سے ٹکرائے بغیر شازمین کے کمرے تک پہنچ گئے۔ وہ خاصا شاندار کمرہ تھا اور یقینی طور پر وہاں زندگی کی ہر سہولت کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ شازمین نے کمرے میں پہنچتے ہی ایک فانوس روشن کر دیا تھا اس لیے جاوید علی بخوبی وہاں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

''تمہارا کمرہ تو بہت خوب صورت ہے۔'' اس نے بے ساختگی سے تعریف کی۔ اب معلوم نہیں اس تعریف میں واقعی مرعوبیت کا پہلو تھا یا اس نے شازمین سے بے تکلفی قائم کرنے کے لیے ایسا غیر رسمی جملہ ادا کیا تھا۔

''ہاں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر پنجرہ سونے کا ہو تو پرندے کی اُڑنے کی خواہش دم توڑ جاتی ہے۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

''تم یہاں سے آزادی چاہتی ہو؟'' جاوید علی نے اس سے پوچھا۔

''میرے خیال میں کوئی بھی نارمل انسان اس ماحول میں رہنا پسند نہیں کر سکتا۔ ہاں، اگر وہ میری دونوں



ماؤں کی طرح یہاں رہ رہ کر ایب نارمل ہو جائے تو الگ بات ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے وسیع و عریض بیڈ پر کسی شہزادی کی سی شان سے بیٹھ گئی۔ جاوید علی دیکھ رہا تھا کہ وہ خاصی خوب صورت لڑکی ہے۔ سارے نقوش اور گوری رنگت اس نے اپنے باپ سے ورثے میں لیے تھے۔ کل رات وہ لان میں اسے روشنی کی کمی کے سبب ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکا تھا اور بس ایک خوشبو بھرا احساس ہی ساتھ رہ گیا تھا۔ لیکن آج تو آنکھیں چکا چوند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے خیالوں میں بسا کسی مغلیہ شہزادی کا کردار زندہ ہو کر سامنے آ گیا ہو۔ وہ حُسن، معصومیت اور تمکنت کا ایسا امتزاج تھی جو اس سے قبل اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ عمر کے بارے میں بھی وہ یہی اندازہ لگا سکا کہ وہ تقریباً اس کی ہم عمر یا دو ایک سال چھوٹی ہو گی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' شازمین نے سوال داغا تو وہ کسی سحر سے آزاد ہوا اور سنبھل کر جواب دیا۔

''یہاں سب مجھے رنجنی کہتے ہیں۔''

''کہتے ہوں گے، اس لیے کہ وہ تمہیں اپنے جیسا سمجھتے ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم ایک مرد ہو۔'' وہ سر جھٹک کر شاہانہ انداز میں بولتی اسے احساس دلا گئی کہ اتنی بھی سیدھی اور معصوم نہیں ہے جتنی صورت سے محسوس ہو رہی ہے۔

''جاوید علی۔'' وہ بحث میں نہیں پڑا اور اسے اپنا نام بتا دیا۔

''کس خفیہ ادارے کے لیے کام کرتے ہو؟'' اگلا سوال آیا۔

''یہ نہیں بتا سکتا۔ بس اپنی تسلی کے لیے یہ جان لو کہ میرا ادارہ ملک و قوم کی سالمیت کے لیے کام کرتا ہے۔'' اس نے صاف انکار کرتے ہوئے اس کی تسلی کے لیے ایک چھوٹی سی وضاحت دی۔ کیونکہ کل رات ہی شازمین اسے بتا چکی تھی کہ اسے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جسے وہ قانون کا سچا اور ایمان دار رکھوالا سمجھ سکے۔ اس کا جواب سن کر شازمین مسکرائی اور بولی۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم جھوٹ بولنے کے بجائے صاف انکار کر دینے کے عادی ہو۔ بہرحال، اس وقت تو تم اتنا کرو کہ باتھ روم میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہارے ناپ کے کپڑے موجود ہیں۔ اپنے اس گیٹ اپ سے نجات حاصل کر کے مردانہ کپڑے پہنو اور پھر مجھ سے بات کرو۔ میں اس کوٹھی میں ہیجڑوں کو دیکھ دیکھ کر اوب گئی ہوں اور اب ایک مرد کو ہیجڑے کے روپ میں قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس کے جواب کو سراہتے ہوئے اس نے ایک ایسی فرمائش کر دی کہ جاوید علی چکرا گیا۔

''اس بات کو جانے دیں مس! اور مجھے اسی حلیے میں برداشت کر لیں۔ کیونکہ اس گیٹ اپ سے جان چھڑانے اور پھر دوبارہ اس میں آنے کے لیے مجھے خاصی محنت اور وقت صرف کرنا پڑے گا اور ہمارے پاس گفتگو کی مہلت کم رہ جائے گی۔ میری کوشش ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس پہنچ جاؤں کیونکہ آشا وہاں موجود ہے اور اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو میری تلاش شروع کر دے گی اور بعد میں مجھے اس کے سوالوں کے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔'' شازمین کی فرمائش پر جزبز ہوتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس عجیب و غریب ماحول میں رہ کر وہ لڑکی تھوڑی سی کھسک گئی ہے اور اسے نرمی سے قابو کرنا بہتر ہے۔ ورنہ وہ جو کچھ اسے بتانے کا ارادہ رکھتی ہے، ہرگز نہ بتائے گی۔

''آشا کی پروا نہیں کرو۔ اس کا میں نے انتظام کروا دیا ہے۔ صبح دن چڑھے تک سوتی رہے گی اور میرے خیال میں تمہارے لیے اتنی مہلت کافی ہو گی۔'' شازمین نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تو وہ چونک گیا اور

اسے آشا کا دودھ پیتے ہی یک دم غنودگی میں چلے جانا یاد آ گیا۔

''کیا آپ نے ہی اسے دودھ میں کچھ ملا کر پلوایا ہے؟'' فوری طور پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''یقیناً۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ تمہیں یہاں تک آنے میں دشواری پیش آتی۔'' شاز مین نے مسکراتی آنکھوں اور لبوں سے جواب دیا۔

''اور اس کام میں مدھو نے آپ کا ساتھ دیا؟'' اس نے ایک اور اندازہ لگایا۔

''مدھو نے نہیں، کاجل نے۔ وہ میری وفادار اور جاں نثار ہے اور میری ہی وجہ سے شالنی کی سفارش نہ ہونے کے باوجود ابھی تک اس کوٹھی میں ٹکی ہوئی ہے۔ لیکن رکو..... میں تمہیں ابھی سے یہ تفصیل کیوں بتاؤں؟ پہلے تم میری شرط پوری کرو اور انسانوں کے حلیے میں آؤ، تب ہی میں تم سے بات کروں گی۔'' وہ ایک بار پھر پینتر ا بدل کر اپنی فرمائش پر واپس لوٹ آئی۔

جاوید علی نے اندازہ کر لیا کہ اُس کی بات ماننا ضروری ہے ورنہ وقت برباد ہوتا رہے گا اور یہ کوئی کام کی بات بتانے کے لیے راضی نہ ہوگی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں ایک ہینگر میں مردانہ پینٹ شرٹ ٹنگا ہوا تھا۔

رنجنی کے گیٹ اپ سے نجات حاصل کر کے اس لباس کو پہننے میں اسے خاصا وقت لگا۔ ناپ بالکل درست تھا اور شرٹ کے کالر کے ساتھ لگے ٹیگ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ برانڈڈ ڈریس کسی بڑی دکان سے خاصے مہنگے داموں میں خریدا گیا ہے۔

لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے غسل خانے میں موجود قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ کئی دنوں بعد خواجہ سرا کے بہروپ سے نجات پا کر اپنا آپ ایک مرد کے طور پر دیکھنا بہت اچھا لگا اور شاید زندگی میں پہلی بار اس نے شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ وہ ایک خوب صورت اور ہینڈسم جوان ہے۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو بستر پر نیم دراز شاز مین کی نظروں نے اس کے احساس کی تصدیق کر دی۔

''واہ..... زبردست۔'' وہ جیسے ٹرانس کے سے عالم میں اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھی اور بے ساختہ ہی اس کی تعریف کی۔ ''تم تو میرے اندازے سے بھی زیادہ ڈیشنگ نکلے۔''

''آپ نے میرے لیے اتنے صحیح ناپ کا سوٹ کہاں سے برآمد کیا؟..... کوٹھی میں تو واحد فرد جناب نواب صاحب ہی ہیں اور ان کا قد کاٹھ بھی مجھ سے بہت مختلف ہے۔ ویسے بھی میں نے انہیں کبھی اس طرح کے کپڑے پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔'' وہ اپنی تعریف پر ذرا سا جھینپ کر شاز مین سے پوچھنے لگا۔

اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ تنہائی میں موجود تھا اور لڑکی اسے یوں نثار ہونے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنا بچپن مشکل حالات میں گزارا تھا اور کسی قسم کی فضولیات میں پڑے بغیر ساری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی تھی اور قسمت اسے سی ایف پی میں لے آئی تھی۔ اکیس بائیس سالہ زندگی کی اس کہانی میں کہیں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا جہاں اس کا صنفِ نازک سے کوئی لطیف قسم کا ٹکراؤ ہوا ہو۔ اس لیے اب شاز مین کے انداز اسے بوکھلا رہے تھے۔ اسے اپنی ساری ذہانت اور بہادری کے باوجود یہ لڑکی اپنے اوپر حاوی ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور وہ خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے اس کے سحر سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کپڑے میں نے آج ہی خاص طور پر تمہارے لیے خریدے ہیں۔ ناپ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تم سمیت



یہاں موجود ہر ملازم کا ناپ کاجل کے پاس موجود ہوتا ہے۔ میں نے اسی سے تمہارا ناپ معلوم کیا تھا۔'' شاز مین اس کے قریب چلی آئی اور شرٹ کے اوپر تک بند بٹنوں میں سے سب سے اوپری بٹن کھولتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تو کیا آپ نے کاجل کو بھی بتا دیا کہ میں خواجہ سرا نہیں بلکہ.....'' اسے تشویش ہوئی۔

''نہیں، کاجل میری وفادار ضرور ہے لیکن میں کسی شخص پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال کر اسے آزمائش میں ڈالنے کی قائل نہیں ہوں۔ کسی کو بلاضرورت رازوں میں شریک کرنا بھی اسے زیر بار کرنے کے مترادف ہی ہوتا ہے نا۔'' وہ اپنی عمر سے بڑھ کر سمجھ داری کی باتیں کر رہی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن پھر بھی یہ آپ کے لیے ایک خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں اس کوٹھی میں کاجل کی شکل میں کم از کم آپ کو ایک ایسی ہستی تو میسر ہے جس سے آپ اپنے بہت سے کام لینے کے علاوہ راز بھی بانٹ سکتی ہیں..... ورنہ میری معلومات کے مطابق نواب صاحب نے اپنے خاندان کی خواتین کو جتنی پابندیوں میں رکھا ہوا ہے، وہاں آپ کی کوئی فرمائش پوری ہو جانا بھی بہت بڑی بات ہے۔'' جاوید علی نے تبصرہ کیا۔

''بابا ظالم نہیں ہیں۔ بس ان کے ساتھ کچھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ مجھ سے تو وہ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ جو کاجل ہے، میری پیدائش سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اسے بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ مل کر میری چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کرنے کی عادت ہے۔ بعد میں اس کی ماں مر گئی، تب بھی یہ یہاں ہماری خدمت کرتی رہی۔ شروع میں کوٹھی میں صرف خواجہ سرا ملازمین کا رواج نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ یہ تو بعد میں ہوا کہ عورتوں کی جگہ آہستہ آہستہ خواجہ سراؤں نے لے لی۔ تم اسے خوش قسمتی کہو یا بدقسمتی کہ کاجل بے چاری بھی خواجہ سرا تھی، اس لیے اس کی کوٹھی میں جگہ بنی رہی۔ شالنی سے تعلقات کے بعد کوٹھی میں کئی نئے ملازم آئے جو سارے کے سارے خوب صورت اور کم عمر ہوتے تھے۔ لیکن میں نے بابا سے کہہ دیا کہ کاجل کبھی بھی یہاں سے نہیں جائے گی۔ بابا نے میری بات مان لی۔ وہ خود بھی کاجل پر بھروسہ کرتے ہیں، اس لیے اسے تمام ملازمین کا سپروائزر بنا رکھا ہے۔ کاجل بھی بابا کی بہت عزت کرتی ہے لیکن بچپن سے میرے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے مجھ سے بہت محبت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب بھی اسے بابا اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا کہا گیا تو اس کا انتخاب میں ہی ہوں گی۔''

شاز مین نے تیقن سے بتایا۔ گفتگو کے دوران وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ تک لے گئی تھی اور اب وہ اس کے نرم و گداز بستر پر بیٹھا اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گیا کاجل کا تعارف۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے بقول آپ عرصے سے مجھ جیسے کسی شخص کو تلاش کر رہی تھیں تو کیوں؟'' وہ مطلب کی بات پر آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا سوال سنتے ہی شاز مین کی آنکھوں کی شوخی ماند پڑ گئی اور وہ کچھ اُداس اور ہراساں نظر آنے لگی۔

''جو بھی مسئلہ ہے، آپ مجھے کھل کر بتا سکتی ہیں۔ میرا وعدہ ہے کہ پوری کوشش کروں گا کہ آپ پر ذرا بھی آنچ نہ آ سکے۔'' جاوید علی نے پہلی بار خود اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبا کر اسے بولنے کا حوصلہ دیا۔ شاز مین پھر بھی خاموش رہی۔

''آپ نہیں بولیں گی تو وہ موقع کھو بیٹھیں گی جس کی خود آپ کو تلاش تھی۔'' جاوید علی نے ایک بار پھر اُسے اُکسانے کی کوشش کی۔

''میں بولنے سے گریز نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی کچھ چھپانا چاہ رہی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں آپ کی دلچسپی کا اصل محور و مرکز کوٹھی میں جاری موجودہ سرگرمیاں ہیں جبکہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی وجہ جاننے کے لیے آپ کے لیے ہمارے خاندان کا ماضی جاننا ضروری ہے تاکہ جب تک آپ کا محکمہ کوئی کارروائی کرے تو آپ لوگ یہ بات ذہن میں رکھ سکیں کہ میرے بابا اس وطن کے غدار یا دشمن نہیں ہیں بلکہ حالات کے شکنجے میں پھنس کر ایسے مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں کہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ اُداس اور مغموم نظر آنے لگی۔ اور ابتدا میں جاوید علی کو اس میں جو ذرا دل پھینک سی شوخ و چنچل لڑکی دکھائی دی تھی، وہ کہیں پسِ پردہ چلی گئی تھی۔

''یہ صرف آپ کا اندازہ ہے کہ میرا انٹرسٹ کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں۔ لیکن جب آپ سمجھتی ہیں کہ مکمل داستان سنائے بغیر آپ مجھے یہاں کے حالات سے بہتر طور پر آگاہ نہیں کر سکیں گی تو آپ کو تفصیل سے ہی سب کچھ بتانا چاہئے۔ خود میں بھی ذاتی طور پر حالات و واقعات سے مکمل طور پر آگاہ ہونا ہی پسند کروں گا۔'' جاوید علی نے اسے بات کرنے کا حوصلہ دیا جس پر اس نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا اور پھر گلا کھنکھارتے ہوئے بولنے پر آمادہ ہو گئی۔

''اس کہانی کا آغاز بابا کی پیدائش سے پہلے ہوتا ہے۔ میں آپ کو جو حالات و واقعات بتاؤں گی، وہ مختلف اوقات میں، مختلف ذرائع سے میرے علم میں آئے ہیں۔ لیکن میری کوشش ہو گی کہ میں سارے قصے کو مربوط طور پر آپ کو سنا سکوں۔'' اس نے تمہید باندھی اور ذرا سے لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''بابا قیامِ پاکستان سے ذرا پہلے ایک بھارتی ریاست میں پیدا ہوئے۔ نواب خاندان تھا جہاں ان کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں لیکن جانے کیوں اور کس کی سازش سے بابا کے والد یعنی میرے دادا کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ بابا ان کی اولاد نہیں ہیں..... اور دادی نے حویلی کے ایک قابلِ اعتماد ملازم جو کہ وہاں منیجر کے فرائض انجام دیتے تھے، کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ زمانہ ایسا نہ تھا کہ وہ اپنے اس شک کو سب کے سامنے زبان پر لا سکتے، بس اندر ہی اندر کڑھتے اور دادی کو زِچ کرتے۔ وہ ذہنی اُلجھنوں کا شکار ہوتے چلے گئے اور ان کی ذہنی اُلجھن نے جو سب سے اہم کام کیا، وہ حویلی میں کسی بھی مرد کے داخلے پر پابندی تھی۔ حویلی میں جتنے بھی خدمت گار تھے، وہ یا تو خواجہ سرا تھے یا خواتین۔

دادا چونکہ بابا کو اپنی اولاد نہیں سمجھتے تھے اس لیے ان سے بدسلوکی بھی بہت کرتے تھے۔ خاص طور پر بابا کو دادی کے آس پاس دیکھ کر تو ان کا پارہ ہی چڑھ جاتا تھا۔ ان حالات میں دادی نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹے کو ملازمین کے سپرد کر دیں۔ یوں ان ملازمین کے ہاتھوں بابا کی پرورش ہونے لگی۔ ان ملازمین میں ایک جوان اور خوب صورت خواجہ سرا بھی تھا جو اپنی ظاہری شخصیت سے ہٹ کر اندر سے بڑا بدطینت تھا۔ اس نے بہت نوعمری میں ہی بابا کا جسمانی استحصال شروع کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کو نہ سمجھ سکے اور عادی ہوتے چلے گئے۔

ادھر سیاسی حالات الگ خراب تھے۔ پاکستان بنے کئی سال ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں سے ہندوؤں کی دشمنی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دادی نے دادا کو بہت سمجھایا کہ دوسرے رشتے داروں کی طرح ہم بھی پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں لیکن دادا نہ مانے۔ ان کی ضد نے حالات کو اچھا خاصا خراب کر دیا اور حویلی کی وہ شان و شوکت نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں دادا بیمار ہو کر انتقال کر گئے اور دادی جان اسی منیجر کی مدد سے بچا کھچا مال و اسباب جمع کر کے پاکستان پہنچ گئیں۔ بابا کم عمر تھے اور کسی بھی قسم



کے کاروبار کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ دادی بھی مکمل طور پر خانہ دار خاتون تھیں اس لیے اس وقت سمجھ نہیں آتا تھا کہ جو کچھ بچا ہے، اسے کس طرح سنبھالا جائے اور زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھایا جائے۔ ایک وفادار منیجر ہی تھا جو ساتھ دے رہا تھا لیکن اس کے نتیجے میں دادی کے کردار پر انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔

آخر اپنی کسی سہیلی کے مشورے پر دادی نے سب کی زبانیں بند کرنے کے لیے اپنے منیجر سے نکاح کر لیا۔ لیکن اس بات سے بابا کے دل میں گرہ پڑ گئی اور انہوں نے سوچ لیا کہ دادا نے جو الزام دادی پر لگایا تھا، وہ درست تھا۔ وہ اپنے سوتیلے والد سے کبھی اپنے تعلقات اچھے نہیں رکھ سکے بلکہ ان کی ضد میں خود کو برباد کرتے چلے گئے۔ بدکردار خواجہ سرا ویسے بھی کم عمری میں انہیں تباہ کر چکا تھا۔ وہ اسی راستے پر دوڑتے چلے گئے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اس جائیداد کے اکلوتے وارث تھے، جسے ان کے سوتیلے والد نے بڑی محنت اور دیانت داری سے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ بڑھایا بھی تھا۔ چنانچہ بچپن میں ہی اس کی پھوپھی زاد سے ہونے والا ان کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹ سکا۔ ویسے بھی خاندان میں منگنیاں توڑنے کا رواج نہیں تھا لیکن یہاں صورتحال یہ تھی کہ بابا کسی طور شادی پر راضی نہیں ہوتے تھے۔

''تقریباً چالیس سال کی عمر میں جب دادی بسترِ مرگ پر پڑی تھیں، ان کی منت سماجت پر بابا اپنی منگیتر کو بیاہ کر لانے پر راضی ہوئے اور یوں ہماری بڑی امی اس کوٹھی میں آئیں۔ بڑی امی کے یہاں آتے ہی اوّل تو یہاں سے تمام مرد ملازمین کو دیس نکالا ملا اور دوسرے بابا نے اپنے سوتیلے والد کو بھی چلتا کیا۔ بڑی امی یہاں سخت پابندیوں میں رہیں۔ دادی تو ان کی شادی کے مہینہ بھر بعد ہی چل بسی تھیں۔ بابا کو ان کی حرکتوں سے روکتا بھی تو کون؟ بڑی امی نے صبر کر لیا اور ان کے صبر کے نتیجے میں ان کی وفاداری کا یقین کرتے ہوئے شادی کے پانچ سال بعد بابا نے انہیں اولاد کی خوشی دیکھنے کے قابل سمجھا۔ اس موقع پر دادی کی بھتیجی جن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی، کوٹھی میں آ کر رُکیں اور بابا کو اتنی پسند آئیں کہ انہوں نے ان سے شادی کی ضد باندھ لی۔ دولت، خوب صورتی، اختیار سب کچھ ان کے پاس تھا اس لیے ان کی ضد پوری نہ ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا؟ یوں میری امی بھی دُلہن بن کر کوٹھی میں آ گئیں اور بابا نے اپنے جاننے والوں میں خود ہی یہ بات مشہور کر دی کہ انہوں نے ایک شادی اپنے والد کی پسند سے ددھیال میں کی ہے۔ بہرحال جس طور بھی یہ شادیاں انجام پائیں، دونوں سوکنیں ایک ہی جگہ رہنے لگیں۔ دونوں پر ایک سی پابندیاں تھیں اور ایک سے حالات سے گزر رہی تھیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بابا نے خود کو سنبھالا تھا تو بس اس حد تک کہ کاروباری امور خود سنبھال لیے تھے، ورنہ وہ بچپن سے جن بری لتوں میں مبتلا تھے، انہیں کبھی نہیں چھوڑ سکے۔ یہاں تک کہ دو بیویاں اور بچے بھی انہیں نہیں بدل سکے۔ بیویوں سے ان کی دلچسپی بھی بہت واجبی سی تھی اور بہت کم ہی وہ انہیں وقت دیتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں ان کے بھٹکنے کا ڈر بھی زیادہ ہے اور اب وہ ان دونوں کی اچھی خاصی عمریں ہو جانے کے باوجود بھی اعتبار کے لائق نہیں سمجھتے۔ ان پر پہلے ہی کی طرح پابندیاں عائد ہیں۔ اپنی حرکتوں کو اولاد سے چھپانے کی خاطر بابا نے بیٹوں کو تعلیم کے بہانے یہاں سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ میں لڑکی تھی، اس لیے وہ مجھے کسی ہاسٹل وغیرہ بھیجنے کی ہمت نہیں کر سکے اور بیویوں کی طرح مجھے بھی بہت سی پابندیوں کے ساتھ یہاں رکھ لیا۔ بس فرق ہے تو اتنا کہ میرے اپنی اولاد ہونے کے یقین کے باعث وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ محبت مجھے بہت سی سہولتیں بھی دلوا دیتی ہے۔''

جاوید علی نے دیکھا کہ سر جھکائے یہ سب سناتی شازمین کی آنکھیں تسلسل سے آنسو بہا رہی ہیں۔ وہ لڑکی جسے کچھ دیر قبل اس نے تھوڑا بے باک بھی سمجھ لیا تھا، اب اسے خاصی مظلوم نظر آ رہی تھی۔ اس نے جن حالات

میں، شرم ناک حقائق کا سامنا کرتے ہوئے زندگی گزاری تھی، یقیناً ان کی وجہ سے کچھ نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو گئی تھی اور اپنی عمر اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق جنسِ مخالف میں دلچسپی رکھنے کے باوجود ان سے دوری کے باعث کسی چور راستے کی متلاشی تھی۔ جب ہی جاوید علی یعنی ایک مرد کو کوٹھی میں اپنے اتنے نزدیک پا کر اس سے ملنے کے لیے تڑپ گئی۔ کاجل کے تعاون سے وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب بھی رہی اور اب جاوید علی، رنجنی کے گیٹ اپ سے آزاد اپنی بھرپور مردانہ شخصیت کے ساتھ اس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ غسل خانے سے کپڑے بدل کر نکلنے کے بعد اس نے شازمین کی آنکھوں میں لپکتی خواہشوں کو بھی دیکھا تھا لیکن اس کے خدشات کے برخلاف شازمین نے اب تک کوئی ایسی اوچھی حرکت نہیں کی تھی جو اسے سخت ناگوار محسوس ہوتی۔ بلکہ اس آنسو بہاتی لڑکی کو دیکھ کر تو اب اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی بھی آ گئی تھی۔ اب وہ شازمین کو ایک ایسی عورت کے طور پر نہیں دیکھ رہا تھا جو مرد کے قرب کے لیے ترستی کچھ بھی جائز و ناجائز کرنے کو تیار ہو۔ وہ اسے ایک معصوم اور مظلوم لڑکی نظر آ رہی تھی۔ جاوید علی کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

''مت رو اچھی لڑکی! تم نے جو کچھ مجھے بتایا، بدقسمتی سے وہ تمہاری زندگی کا حصہ ضرور ہے لیکن تم اس کے لیے قصوروار نہیں ہو اس لیے تمہیں آنسو بہانے یا شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے خلوص سے بولتے ہوئے پہلی بار اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

''کیا واقعی تم ایسا سوچتے ہو؟'' شازمین نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جواباً اس نے محض سر کی جنبش سے اسے یقین دلایا۔ اس کے یقین دلانے پر وہ بجائے چپ ہونے کے بلک بلک کر رو دی۔ جاوید علی کے لیے یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ابھی تک اسے اصل بات پتہ نہیں چلی تھی اور جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ نواب نوازش کے ماضی کا قصہ تھا جس سے اس کی نفسیات اور کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کے جمِ غفیر کی موجودگی کا تو پتہ چلا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی جیسے ملک دشمن خواجہ سرا کا اس سارے سیٹ اپ سے کیا تعلق ہے؟ رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی والی رات شالنی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسلحے کی ترسیل کی جو کوشش کی تھی، اس کے بعد وہ مبینہ طور پر ملک دشمن قرار پا چکی تھی اور اسے اس ملک دشمن شالنی کا نواب نوازش علی سے جوازِ تعلق تلاش کرنا تھا۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے شازمین کو جذباتی بحران سے نکالنا ضروری تھا چنانچہ اس کے جواب میں صرف زبان ہلانے کے بجائے عملی پیش رفت مناسب سمجھی اور اس کے سامنے سے اٹھ کر بالکل برابر میں بیٹھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے نازک سے وجود کو سمیٹ لیا پھر نہایت سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

''مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی کیا، کوئی بھی دوسرا باشعور انسان تمہارے حالات کے لیے تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ ہی تمہارے حالات سے تمہاری ذاتی اچھائی پر کوئی فرق پڑ سکتا ہے۔ اگر تم ایک اچھی لڑکی نہ ہوتیں تو ہرگز بھی ایسے کسی شخص کی متلاشی نہ رہتیں جس کی مدد سے اپنی کوٹھی میں جاری گڑبڑ کو روکنے کے لیے اقدامات کر سکو۔ قسمت سے میں خود یہاں آ گیا ہوں تو اس موقع کو ضائع مت کرو اور وہ سب بتا دو جو تمہارے اعصاب کے لیے بوجھ بن رہا ہے۔''

ہمدردی کے الفاظ میں وہ اسے اصل بات اُگلنے کی تحریک دے رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کوشش میں وہ خود خاصے بڑے امتحان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ نرم و نازک حسین لڑکی کا اتنا قرب اسے بے چین کر رہا تھا۔ میک اپ کے لوازمات سے عاری اس کے سادہ سے چہرے پر بہنے والے آنسوؤں نے اسے ایسا روپ دے دیا تھا جو بس رات بھر اوس میں بھیگتے گلاب پر صبح دم ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس پر اس کا ہچکولے کھاتا ہوا بدن تھا جو نرم



لچکیلی شاخ کی طرح اس کی بانہوں میں لرز رہا تھا۔ جاوید علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے سنبھالے یا خود کو۔

''میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔'' گھبراہٹ میں اور کچھ نہیں سوجھا تو اس سے دُور ہٹ کر روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ ریفریجریٹر میں انواع و اقسام کے جوسز اور کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں بھری پڑی تھیں لیکن اس نے ان کے بجائے سادہ پانی کی ایک بوتل کا انتخاب کیا اور گلاس سمیت دوبارہ شازمین کے بستر تک واپس لوٹ آیا۔

''یہ لو، پانی پی لو۔'' گلاس میں پانی انڈیل کر اس نے شازمین کی طرف بڑھایا۔ البتہ اس بار اسے کسی بھی طرح چھونے کی غلطی نہیں کی۔ روتی ہوئی شازمین نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا لیکن محض دو گھونٹ پانی ہی حلق سے اُتار سکی۔ دو گھونٹ پانی نے بھی خاصا کام دکھایا اور شازمین سنبھلی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

''سوری، میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔'' خود کو سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلے جاوید علی سے معذرت کی۔

''اِٹس او کے۔ میں تمہاری کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس لیے تمہیں کسی بھی بات پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی نے بڑے حوصلے سے اسے تسلی دی ورنہ کوئی اس سے پوچھتا کہ اسے شازمین کے نارمل ہو کر دوبارہ داستان کا باقی حصہ سنانے کی کتنی بے چینی ہے۔

''تھینک یو۔ تمہارے لفظوں نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے۔ اب بہتر ہے کہ میں بھی تمہیں زیادہ انتظار نہ کرواؤں اور سارا قصہ سمیٹ دوں۔'' شازمین نے بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے خود کو کافی تیزی سے سنبھال لیا اور ایک بار پھر ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

''بابا نے خواتین اور خواجہ سرا ملازمین صرف گھر کے اندرونی امور کی انجام دہی کے لیے رکھے تھے۔ ڈرائیور، چوکیدار اور مالی وغیرہ مرد ہی تھے۔ لیکن جب بابا کی شالنی سے ملاقات ہوئی تو اس نے اتنی تیزی سے انہیں خواجہ سرا ملازمین سپلائی کیے کہ کچھ عرصے میں ہر جگہ یہی نظر آنے لگے۔ خواتین ملازمائیں بھی چلتی کر دی گئیں اور خواجہ سراؤں کی آہستہ آہستہ چھانٹی کر کے ان کی جگہ ہندو خواجہ سرا لائے جانے لگے۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ اب یہاں گیٹ پر موجود چوکیدار سے لے کر میرے ڈرائیور تک ہر ملازمت پر خواجہ سرا موجود ہیں، وہ بھی خوب صورت اور کم سن، جن کی یہاں موجودگی کا مقصد بابا کا دل بہلا کر انہیں اور ان کے گھر کو اپنی مرضی سے چلانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری دونوں ماؤں کو تو اس صورتِ حال کا ادراک نہیں ہے اور وہ ظلم و ناانصافی سہہ سہہ کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہیں۔ لیکن میں نے ان تبدیلیوں کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور کھوج میں لگ گئی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اپنی اس کھوج کے نتیجے میں مجھے واضح طور پر تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ کوٹھی میں کچھ مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔

میں نے راتوں کو یہاں اجنبی لوگوں اور گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ کاجل نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے لیکن ان لوگوں کی حقیقت کو وہ بھی نہیں جانتی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ بابا کی توجہ اس طرف مبذول کروائے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن بابا نے اسے جھڑک دیا کہ اسے خوامخواہ وہم ہوا ہے۔ وہ خود کوٹھی میں رہتے ہیں اور انہوں نے کبھی یہاں راتوں کو کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ بابا کی اس بے خبری پر میں اور کاجل بھی حیران تھے۔ لیکن پھر یہ راز بھی ہمیں سمجھ آ گیا۔ ایسی کسی بھی مشکوک کارروائی کی رات بابا کے کمرے میں لازماً کوئی نہ کوئی خوب صورت اور طرح دار خواجہ سرا موجود ہوتا ہے اور صبح بابا نشے میں اتنی بری طرح دھت ملتے ہیں کہ یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ ان کے دیکھنے، سننے، سوچنے اور سمجھنے کی کوئی صلاحیت کام بھی کر رہی ہوگی۔'' وہ

افسردہ سی جاوید علی کو بتاتی چلی گئی جو بہت غور سے اس کا ہر ہر لفظ سن رہا تھا۔

''تم نے یا کاجل نے کبھی کوشش نہیں کی کہ کوٹھی میں آنے والے مشکوک افراد کی سرگرمیوں کا کھوج لگا سکو؟'' جاوید علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا اور اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کا سوال سنتے ہی شازمین کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی ہے۔

''میں نے ایک بار کوشش کی تھی۔'' وہ تھوک نگل کر خوف زدہ سے لہجے میں بس اتنا ہی بولی اور چپ ہوگئی۔

''پھر.....پھر کیا ہوا؟'' وہ پُر جوش سا پوچھنے لگا۔

''اس واقعے کو دہرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ جب بھی آنکھوں میں وہ منظر آتا ہے، لگتا ہے کوئی مجھے ذبح کر رہا ہے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

''ڈرو مت۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تمہارے پاس ہوں نا۔'' جاوید علی نے کسی معصوم بچی کی طرح سہمی ہوئی شازمین کو حوصلہ دیا تو اس نے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بتانا شروع کیا۔

''یہ جس رات کا واقعہ ہے، اس روز میں دوپہر کے کھانے کے بعد اتنی دیر تک سوتی رہی تھی کہ شام ڈھلے ہی جاگی تھی۔ اتنی طویل نیند لینے کی وجہ سے مجھے رات میں نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ ٹی وی سے دل بہلالوں لیکن ہر چینل سے بور قسم کے پروگرام آرہے تھے۔ مجھے کچھ بھائی نہ دیا تو اُٹھ کر نیچے لان میں چلی گئی۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ رات کو وہاں زیادہ روشنی نہیں ہوتی اس لیے کسی کو میری وہاں موجودگی کا پتہ نہیں چلا لیکن میں نے نوٹ کرلیا کہ کوٹھی میں لوگوں کی آمدورفت جاری ہے۔ آنے والے اپنے حلیے سے خواجہ سرا ہی لگ رہے تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ میرے لیے شناسا نہیں تھا۔ میں پہلے ہی کوٹھی میں رات گئے کسی کی آمدورفت کو محسوس کرچکی تھی۔ ان خواجہ سراؤں کو آتے دیکھا تو تجسس اور بھی بڑھ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ چھپ کر ان لوگوں کی نگرانی کروں گی تاکہ ان کے کوٹھی آنے کا مقصد جان سکوں۔ میں نے بڑی کامیابی کے سے یہ کام کیا اور ان لوگوں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے تک پہنچ گئی۔

ہماری اس کوٹھی کے نیچے بہت بڑا تہ خانہ ہے، جس میں پرانا ساز و سامان پڑا ہوا ہے اور بابا نے ناکارہ ہونے کے باوجود صرف اس وجہ سے نہیں پھنکوایا کہ وہ اسے یادگار تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کبھی وہ اس یادگار سامان کو دیکھنے تہ خانے تک جاسکیں۔ بہرحال، میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میں ان خواجہ سراؤں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے میں اُتر گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ سب وہاں ایک بڑے کمرے میں جمع تھے اور کمرے کے درمیان میں خوفناک شکل والی عورت کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں میں نے تقریباً اپنی عمر کی ایک لڑکی کو دُلہن بنے دیکھا جو نیم بے ہوش تھی اور مجسمے کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سب دیکھتی رہی۔ وہاں باہر سے آنے والے خواجہ سراؤں کے علاوہ کوٹھی میں چند ملازم خواجہ سرا بھی موجود تھے۔

میں ابھی حیران و پریشان اس محفل کو دیکھ ہی رہی تھی کہ مہمان خواجہ سراؤں میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور مجسمے کے قدموں میں پڑی لڑکی کو چھری کی مدد سے ذبح کردیا۔ یہ منظر دیکھ کر میری بہت بری حالت ہوئی۔ ممکن تھا کہ ایسا دہشت ناک منظر دیکھ کر میری چیخیں نکل جاتیں لیکن میں اتنی بری طرح خوف زدہ ہوگئی تھی کہ حلق سے آواز بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ بے ہوش ہوکر ابھی یہیں گر جاؤں گی۔ لیکن اس وقت اللہ نے میری مدد کی اور مجھے احساس ہوا کہ اگر قاتلوں کے اس ٹولے نے مجھے دیکھ لیا تو وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں بہت ہمت اور حوصلہ کرکے تہ خانے سے نکلی اور گرتی پڑتی اپنے کمرے میں



پہنچ گئی۔ میری وہ ساری رات نہایت دہشت کے عالم میں گزری اور میں سر سے پیر تک خود کو کمبل میں چھپائے بستر پر لیٹی رہی۔ مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ کوٹھی میں آنے والے وہ پُراسرار خواجہ سرا کب واپس گئے۔ صبح ہوئی تو میں نیم بے ہوش تھی اور تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ بہت دنوں تک میرا علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹر نے بھی یہی بتایا کہ دماغ پر کسی چیز کا بوجھ ہے۔ سب مجھ سے پوچھتے رہے لیکن میں نے کسی کے سامنے زبان نہ کھولی۔ پھر کاجل نے مجھ سے کچھ اپنے ڈھنگ سے پوچھا تو میں اپنے دل کا بوجھ اس کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میری زبان سے سب کچھ سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا کہ میں جس رات کا ذکر کررہی ہوں، اس رات وہ خلافِ معمول رات کے کھانے کے بعد فوراً ہی سوگئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی اسے اچانک اتنی گہری نیند آگئی تھی کہ برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ غور کرنے پر ہم دونوں سمجھ گئے کہ چند خاص افراد کے علاوہ اس رات کوٹھی میں موجود تمام افراد کو رات کے کھانے میں نیند یا بے ہوشی کی کوئی دوا ملا کر دے دی گئی تھی اس لیے سب رات بھر بے خبر سوئے رہے تھے لیکن میں نے اس رات کھانا کھایا ہی نہیں تھا۔ کھانے کی ٹرے میرے کمرے میں جوں کی توں رکھی رہی تھی کیونکہ ضرورت سے زیادہ سو جانے کی وجہ سے مجھے اپنی طبیعت بوجھل محسوس ہورہی تھی اور میں نے باقاعدہ کھانا کھانے کے بجائے ریفریجریٹر میں رکھے پھل اور مشروبات پر گزارہ کرلیا تھا۔

ہم یہ سب اندازے لگا چکے تو کاجل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی سے بھی اس قصے کا ذکر نہ کروں ورنہ میری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ میں پہلے ہی چپ تھی، اس کے مشورے پر اور بھی محتاط ہوگئی۔ ادھر کاجل نے چپکے چپکے اس واقعے کی چھان بین شروع کردی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تہ خانے میں سچ مچ عورت کا ایک خوفناک مجسمہ موجود ہے لیکن اسے ایسے آثار نہیں مل سکے جن سے یہ ثابت ہوسکے کہ وہاں کسی لڑکی کو ذبح بھی کیا گیا ہے۔ ہم دونوں ہی نے فیصلہ کیا کہ کوئی واضح ثبوت ملنے تک اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔ ویسے بھی ہم کچھ بتاتے بھی تو کسے؟ بابا نے تو ہماری بات پر یقین ہی نہیں کرنا تھا۔ میں اور کاجل مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے لیکن اس واقعے کے بعد میرے اندر کبھی اتنی ہمت پیدا نہ ہوسکی کہ خود اس چھان بین میں حصہ لے سکتی۔ جو کچھ کررہی تھی، کاجل ہی کررہی تھی۔

اس رات کے بعد اس نے یہ احتیاط شروع کردی تھی کہ کسی بھی طرح نشہ آور دوا ملا کھانا پینا اس کے پیٹ میں نہ جاسکے۔ اس کی اتنی احتیاط اور محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے معلوم کرلیا کہ کبھی کبھار راتوں کو یہاں کچھ اجنبی لوگ اور گاڑیاں آتی ہیں اور تہ خانے میں یا تو کچھ سامان رکھا جاتا ہے یا نکالا جاتا ہے۔ خاص بات یہ تھی کہ ایسے ہر موقع پر وہی چند خواجہ سرا سرگرم نظر آتے تھے جنہیں میں نے اس رات تہ خانے میں لڑکی کے ذبح ہونے کے وقت دیکھا تھا۔ یہ باتیں علم میں آنے کے بعد ہم دونوں کو یہی اندازہ ہوگیا کہ کوٹھی کو مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جارہا ہے اور یقیناً اس سب کے پیچھے شالنی ہی موجود تھی..... کیونکہ یہ ساری سرگرمیاں جن افراد کی نگرانی میں کی جارہی تھیں، وہ سب اس کے منظورِ نظر اور چہیتے تھے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے بابا کی کمزوری کو استعمال کرتے ہوئے ان کی کوٹھی پر قبضہ کرلیا تھا اور بابا کو کسی بات کا علم ہی نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ بابا کو کچھ بتانے کا کوئی فائدہ ہونا بھی مشکل ہے اس لیے کسی قابلِ بھروسہ فرد کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگی۔

اس عرصے میں تم یہاں آگئے۔ مجھے اور کاجل کو بھی اوروں کی طرح تمہاری اصلیت کا علم نہیں تھا لیکن جس رات تم لوگ رتی کی لاش کو شمشان گھاٹ لے گئے، اس رات کاجل نے ایک اور کارنامہ انجام دیا اور یہ

جاننے میں کامیاب ہوگئی کہ کوٹھی کے تہ خانے میں رکھی پیٹیوں میں اسلحہ اور بارودی مواد بھرا ہوا ہے۔ اس کی حاصل کردہ ان معلومات کے بعد مجھے اور بھی زیادہ شدت سے ایسے شخص کی تلاش رہنے لگی جسے یہ سب بتانے کا کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے۔ لیکن میں ایسا شخص کہاں سے تلاش کرتی؟ بابا کی خراب شہرت کی وجہ سے خاندان والوں سے برسوں سے ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ سہیلیاں بنانے کی مجھے اجازت نہیں ہے، بس ایک موہوم سی امید پر ہی شہر میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ وہ بھی آشا کے ساتھ جو کہ شالنی کی سب سے چہیتی ساتھی ہے اور جو ان ساری سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ باہر میں کسی دکاندار سے بھی بات کروں تو مجھے یہی لگتا تھا کہ آشا کی نظریں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ اس لیے میں چاہنے کے باوجود کہیں کسی کو کچھ نہیں بتا سکی اور ایک طرح سے مایوس ہی ہوگئی تھی کہ کل رات اللہ نے اپنی مہربانی سے اتفاقاً تم سے ملوا دیا۔ میں حیران رہ گئی کہ جس شخص کی مجھے اتنی شدت سے تلاش تھی، وہ میرے اتنے قریب ہی موجود تھا۔ بس پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ یوں آج تم میرے سامنے موجود ہو اور مجھے امید ہے کہ ہم لوگوں کو اس عذاب سے نجات دلانے میں پوری مدد کرو گے۔''

وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی یہ سب بتاتی رہی تھی۔ قصہ تمام ہوا تو گویا تھک کر چپ سادھ لی لیکن آنکھیں نہیں کھولیں اور مسہری کی پشت گاہ سے پیٹھ اور گردن ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی شخصیت پر چھائے حزن و ملال کے رنگ اور بھی گہرے ہوگئے تھے لیکن ان گہرے ہوتے رنگوں نے اس کے حُسن کو ماند کرنے کے بجائے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ وہ اس کو سوئی ہوئی شہزادی کی طرح لگ رہی تھی جسے جادوئی سُوئیوں کے زور پر سلا دیا گیا تھا اور وہ منتظر تھی کہ کوئی اس کی آنکھوں میں چبھی ہوئی سُوئیاں نکال کر اسے اس نیند سے نجات دلائے۔ جاوید علی کو اس سے دلی ہمدردی ہوئی۔ وہ جن حالات سے گزری تھی، وہ اس کی عمر کے حساب سے بہت سخت تھے اور واقعی وہ اس بات کی حق دار تھی کہ اسے اس عذاب سے نجات دلائی جائے۔ پھر یہاں تو ملکی مفاد کا بھی معاملہ تھا، اسے جذباتی سہارا دینے کے علاوہ بطورِ خاص شازمین کے لیے کچھ نہیں کرنا تھا۔ نواب نوازش علی کو مجرموں کے اس ٹولے سے نجات دلانے کے لیے وہ جو کچھ بھی کرتا، وہ پہلے ہی اس کے مشن کا حصہ تھا۔

''تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا پیاری لڑکی! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری کوئی امید رائیگاں نہیں جائے گی اور میں تم لوگوں کی ہر ممکن مدد کروں گا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر شازمین کے رخساروں پر بہتے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چننے شروع کر دیے۔ یہ وہ شفاف اور قیمتی موتی تھے جن، کے سامنے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالے جانے والے سچے موتیوں کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس کی یہ ہمدردی رنگ لائی اور شازمین کے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ چمکی۔

''اگر میں تمہیں بتاؤں کہ تم میرے لیے نجات دہندہ بن کر آئے ہو اور وہ پہلے شخص ہو جس سے میں اپنی زندگی میں یوں بے تکلفی سے ملی ہوں تو کیا تم یقین کرلو گے؟'' وہ بہت آس سے اس سے پوچھنے لگی۔

''بالکل یقین کرلوں گا بلکہ تم یہ بات مجھ سے نہ بھی کہتیں تو میں تمہارے کہے بنا بھی اس پر یقین رکھتا تھا۔'' جاوید علی کا جواب اور لہجہ غماز تھا کہ ان کے درمیان ہمدردی سے بھی آگے کوئی رشتہ جڑ رہا تھا۔

''تھینکس۔ ورنہ مجھے ڈر تھا کہ تم ایک بُرے کردار کے شخص کی بیٹی کو بھی اسی کے جیسا سمجھو گے۔''

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ نبیوں اور ولیوں سے لے کر عام انسانوں کی زندگی تک ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن میں باپ اور اولاد کو کردار کے حوالے سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف پایا گیا۔ کبھی ولی کے گھر شیطان تو کبھی شیطان کے گھر ولی کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سمجھا دیا کہ کردار و اخلاق کا تعلق رنگ و نسل یا



حسب نسب سے نہیں ہے..... تو پھر ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں قانونِ قدرت کو جانتے ہوئے بھی تمہیں تمہارے والد کے کردار کے حوالے سے جج کروں۔ اور جہاں تک تم نے مجھے حالات بتائے ہیں، وہ خود بھی اپنے عمل کے حوالے سے کسی حد تک قابلِ معافی ہیں کیونکہ ان کے ماضی کے حالات نے ان کے ذہن میں جو نفسیاتی گرہیں لگائی تھیں، وہ کبھی کھل ہی نہیں سکیں اور وہ دولت و خود مختاری کے نشے میں تباہی کے راستے پر چلتے ہی چلے گئے۔ اگر ان کا باقاعدہ علاج ہوا ہوتا تو شاید وہ اپنے مرض اور بے راہ روی دونوں سے نجات حاصل کر چکے ہوتے۔'' وہ ہر ممکن طریقے سے شازمین کی دل جوئی کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔ اتنی اچھی کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہاری باتیں سنتی جاؤں، سنتی جاؤں اور ایسے ہی سو جاؤں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں بہت راتوں سے ڈھنگ کی نیند نہیں سو سکی ہوں۔ سونے کے لیے لیٹتی ہوں تو خوفناک شکلیں اور ہر طرف بکھرا ہوا خون نظر آنے لگتا ہے۔ میں ٹرنکولائزر کی عادی ہوتی جا رہی ہوں لیکن آج دل چاہ رہا ہے کہ سکون سے گہری نیند سو جاؤں۔'' وہ بولتے بولتے اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

''ٹھیک ہے، سو جاؤ۔ میں یہیں تمہارے پاس ہوں۔'' جاوید علی نے اس سے محبت سے کہا اور اس کے ریشمی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ ابھی اسے ان سارے واقعات و حقائق کی اوپر رپورٹ بھی دینی تھی لیکن شازمین کو بھی مایوس کرنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ شازمین سو جائے تو پھر یہ کام کرلے گا۔ ویسے بھی ابھی رات نے اپنا سفر مکمل نہیں کیا تھا اور اس کے پاس جاوید علی سے رنجنی کے روپ میں واپس جانے کے لیے خاصی مہلت تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے شازمین کے بالوں میں اُنگلیاں چلاتا اس کے رخسار کو دوسرے ہاتھ سے تھپکتا رہا۔ وہ بہت جلد نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ سوتے ہوئے وہ کسی بچی کی طرح معصوم لگ رہی تھی اور شاید اس کی موجودگی کی وجہ سے عدم تحفظ کے احساس سے بھی نکل آئی تھی اس لیے خاصی پُرسکون اور آسودہ تھی۔

اسے شازمین کے اپنا حلیہ تبدیل کروانے کی وجہ بھی سمجھ آگئی تھی۔ خواجہ سرا کا روپ اس کے لیے کراہت آمیز تھا اور وہ احساسِ تحفظ نہیں دے سکتا تھا جس کی وہ متلاشی تھی۔ شازمین کے رویّوں کی وجوہات کو سوچتے ہوئے اس نے اس کا سر نرمی سے اپنے زانو سے ہٹا کر تکیے پر رکھا اور باتھ روم میں جا کر دوبارہ رنجنی کا گیٹ اپ اختیار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہوگیا۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کے قدم آگے بڑھتے، کمرے کی فضا میں ایک مترنم سی آواز گونجی۔ اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آواز شازمین کے بیڈ کی سائیڈ پر رکھے انٹرکام سے برآمد ہوئی تھی۔ جانے کوٹھی کا کون سا مکین تھا جو رات کے اس آخری پہر اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جاوید علی کا دھیان فوراً ہی کاجل کی طرف گیا۔ ایک وہی تھی جو جانتی تھی کہ وہ شازمین کے کمرے میں ہے اس وجہ سے شازمین اس وقت بھی جاگ رہی ہوگی۔ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انٹرکام دوبارہ بجے اور شازمین کی پُرسکون نیند میں خلل پیدا ہو۔

''شازمین بی بی! میں ہوں، کاجل..... آپ کو ایک اہم اطلاع دینی ہے۔'' جاوید علی نے ریسیور اٹھا تو لیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ کاجل نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ انٹرکام پر شازمین موجود ہے، اس لیے بغیر تحقیق کے بولنا شروع کر دیا۔

''کاجل! میں رنجنی بات کر رہی ہوں۔ شازمین بی بی سو چکی ہیں اور میں ان کے کمرے سے نکلنے والی ہوں۔ اگر تمہیں ان سے کوئی ضروری کام ہے تو بتا دو۔ میں انہیں اٹھا دوں گی۔'' کاجل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ

اس کے پاس کوئی بہت ہی اہم اطلاع موجود ہے۔ اس لیے جاوید علی نے فوراً رنجنی کے لب و لہجے میں اس سے گفتگو شروع کر دی۔

''تمہیں وہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ باہر تمہارے لیے خطرہ ہے۔ میں نے خود آشا کے موبائل پر آنے والی کال سنی ہے۔ فون کرنے والا میری آواز نہیں پہچانتا تھا اس لیے میرے صرف ''ہیلو'' بولنے پر ہی شروع ہو گیا۔ اس نے مجھے آشا سمجھ کر بتایا کہ لاہور میں شالنی کا قتل ہو چکا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی حکم دیا کہ رنجنی پر کڑی نظر رکھی جائے اور اسے کسی صورت کوٹھی سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ میں نے آشا کے انداز میں اسے یقین دلا دیا کہ اس کی ہدایت پر عمل ہو گا لیکن تم اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہاری شامت آ گئی ہے۔ جو حکم آشا کو ملا ہے، وہ گیٹ پر موجود چوکیدار کو بھی ملا ہو گا اور اب تم اس کوٹھی سے کسی صورت باہر نہیں جا سکو گی۔'' کاجل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے اطلاع دی۔

''تم میری طرف سے بے فکر رہو، بس اتنا خیال رکھنا کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ میں یہاں شازمین بی بی کے کمرے میں ہوں۔'' اس نے رنجنی ہی کے لب و لہجے میں کاجل سے کہا۔ شالنی کا قتل اور ساتھ ہی کہیں سے بطورِ خاص اس پر نظر رکھنے کی ہدایت خاصی معنی خیز تھی۔ اطلاع سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کسی نہ کسی سبب مشکوک سمجھا جا رہا ہے۔ اور اس صورت میں اس کے گرد دائرہ تنگ ہونا لازمی تھا۔ اسے اپنی جان کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی لیکن اس کوٹھی کے کچھ راز اس کے سینے میں پوشیدہ تھے جنہیں جلد از جلد اپنی ہائی کمان تک پہنچانا ضروری تھا رنجنی کے بہروپ میں فوری طور پر واپس آنے کا فیصلہ بدل کر وہ ہیڈ کوارٹر سے رابطے میں جت گیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ شازمین کے بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے بڑوں پر نواب نوازش علی کی کوٹھی کے راز کھول رہا تھا اور اسے ان رازوں سے آگاہ کرنے والی خود میٹھی نیند سو رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''میں نے آپ لوگوں کے لیے کمرے تیار کروا دیئے ہیں۔ آپ لوگ چاہیں تو نہا دھو کر سفر کی تھکان اُتار لیں۔ اتنی دیر میں کھانا میز پر لگ جائے گا۔''

پانچ رُکنی ٹیم کو اپنی راہنمائی میں بنگلے کے اندر لانے کے بعد بہرام خان نے ان سب کو مشترکہ طور پر مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے۔ دیکھا جائے تو اس کے الفاظ بالکل سادہ اور موقع محل کے مطابق تھے لیکن لہجے کا کھردرا پن آنکھوں میں موجود سرد مہری سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے لیے اپنے دل میں اچھے جذبات نہیں رکھتا ہے اور ان کی یہاں آمد کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ یہ پانچ رکنی ٹیم آج ہی وہاں پہنچی تھی۔ ضلع کے نئے اے سی، عمیر آفندی نے خود فون کر کے منشی اللہ رکھا کو اس ٹیم کی آمد سے مطلع کیا تھا۔ عمیر کے مطابق طالب علموں کا یہ گروپ پاکستان کی جنگلی حیات پر تحقیق کر رہا تھا اور ملک کے بہت سے علاقوں کو چھاننے کے بعد اب انہوں نے پیر آباد سے متصل جنگل کا انتخاب کیا تھا۔ اپنے اس دورے کے لیے ان کے پاس باقاعدہ اجازت نامے موجود تھے۔

اس کے باوجود عمیر نے منشی اللہ رکھا سے ذاتی طور پر ان کے ساتھ تعاون کی درخواست کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تحقیقی ٹیم کا گروپ لیڈر اظفر آفندی اس کا فرسٹ کزن ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے اور انہیں آزادی سے جنگل میں کام کرنے کا بھرپور موقع فراہم کیا جائے۔ عمیر کو منشی سے یہ درخواست کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ نئے فاریسٹ آفیسر کی تعیناتی ہنوز نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ ڈاک بنگلے میں ماتحت عملہ موجود تھا اور اس عملے کے بیشتر افراد پیر آباد کے رہائشی تھے اور عمیر کے مطابق اس نے



منشی اللہ رکھا کو اسی لیے ان لوگوں کا خیال رکھنے کی ذمے داری سونپی تھی کہ منشی گاؤں کے ہر فرد کو نہ صرف ذاتی طور پر جانتا تھا بلکہ وہ لوگ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔

منشی نے اسے اپنے تعاون کی مکمل یقین دہانی کرواتے ہوئے نہایت خوش دلی سے یہ ذمے داری قبول کر لی تھی اور پھر بہرام کو بلا کر اسے بھی سمجھا دیا تھا کہ اسے آنے والوں کا کس طرح خیال رکھنا ہے۔ بہرام بنگلے پر کام کرنے والے ملازمین کا انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ چودھری کا وفادار بھی تھا اور عملی طور پر آج کل جنگل میں کاشت کی جانے والی افیون کی دیکھ بھال اسی کے ذمے تھی اس لیے وہ کسی کٹ کھنے بلے کی طرح ہوشیار تھا اور اس نے اس تحقیقاتی ٹیم کی آمد کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے منشی کے سامنے ان کی آمد پر اعتراض بھی کیا تھا۔

''اتنا پریشان نہ ہو پاگلے! یہ تو چنگی گل ہے نا کہ اس ٹیم کی ذمے داری ہم پر ہے۔ تُو اپنی اور اپنے بندوں کی نگرانی میں ان کا کام کروانا، اور اس طرف جانے ہی مت دینا جدھر اپنا کام ہو رہا ہے۔ انہیں ڈرا دینا کہ جنگل کے اس حصے میں خطرہ ہے۔''

منشی نے اس کے اعتراض کے جواب میں اسے سمجھایا تو بات اس کی عقل میں آ گئی لیکن اپنی ناپسندیدگی کو بہرحال وہ ختم نہیں کر پایا۔ چنانچہ ان لوگوں کی بنگلے پر آمد کے بعد ان کا استقبال کرتے ہوئے بھی اس کے انداز سے اس کی اندرونی کیفیت جھلکی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ہم لوگ فریش ہو کر ابھی دس منٹ میں آتے ہیں۔ اگر اتنی دیر میں کھانا لگ جاتا ہے تو پہلے کھانا کھا لیں گے ورنہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر جنگل کا نقشہ ڈسکس کر لیں گے۔'' اظفر نے اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''نقشے پر بھی گل ہو جائے گی صاحب! اتنی جلدی کس لیے ہے؟ پہلے آپ لوگ رج کر کھاؤ پیو، آرام کرو۔ پھر کام شام بھی دیکھ لیں گے۔'' بہرام نے ذرا بے تکلف میزبان کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کھانا پینا اور آرام ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم یہاں کام کے لیے آئے ہیں اس لیے ہماری پہلی ترجیح کام ہی رہے گا۔ آج اور ابھی سے یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو تا کہ نہ تو تم خود کام چوری کر سکو اور نہ ہی ہمیں اس کے لیے اُکساؤ۔'' اظفر نے سخت لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تو بہرام کا موڈ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گیا۔

''ٹھیک ہے صاحب!'' اس نے بادل ناخواستہ جواب دیا لیکن اظفر اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رُکا نہیں اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک ملازم اس کا سامان لے گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس سے بھی پہلے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ بہرام خان کھولتے ہوئے خون کے ساتھ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

''پانچ منٹ میں کھانا میز پر لگ جانا چاہیے۔ اگر ایک منٹ بھی اوپر لگا تو میں تم لوگوں کی کھال گرا دوں گا۔'' سارا غصہ اس نے اپنے ماتحتوں پر اُتارا۔ اس کا انداز دیکھ کر خانساماں اور اس کا معاون بجلی کی رفتار سے حرکت میں آ گئے اور انہوں نے واقعی صرف پانچ منٹ میں کھانے کی میز سجا دی۔ اظفر اور اس کے ساتھی فریش ہو کر اپنے کمروں سے باہر نکلے تو کھانا ان کا منتظر تھا۔

''گڈ۔ تم لوگ وقت کی پابندی کرتے ہو، یہ اچھی بات ہے لیکن آئندہ خیال رکھنا کہ ہمارے لیے اتنے بہت سارے کھانے پکوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور میرے ساتھی سادہ کھانا کھاتے ہیں اس لیے

بہتر ہے کہ کھانے کی میز پر ایک آدھ ڈش سے زیادہ موجود نہ ہو۔ یوں بھی ہم طالب علم ہیں اور صرف کھانے پر اتنا خرچہ کرنا برداشت نہیں کر سکتے۔'' کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اظفر نے ایک نظر میں میز کا جائزہ لیا اور سنجیدگی سے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔

''آپ خرچے کی فکر نہ کریں جناب! یہاں کھانے پینے کا خرچہ آپ سے نہیں لیا جائے گا۔'' بہرام کو اس کا اندازِ گفتگو برا تو لگا لیکن وہ جس حوالے سے مہمان بن کر آئے تھے، ان لوگوں سے بدتہذیبی سے پیش آنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے ذرا نرم لہجے میں اسے جواب دیا۔

''نہیں، خرچہ تو ہم خود ہی ادا کریں گے۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سرکاری مال کو مالِ مفت سمجھ کر بے دردی سے خرچ کریں۔'' اظفر نے اسی بے نیاز لہجے میں جواب دیا جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہا تھا۔ اس نے یہ لب ولہجہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا تاکہ اسے واقعی ایک خبطی اور سنکی محقق سمجھا جا سکے۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں صاحب! آپ کا خرچہ سرکاری فنڈ سے ادا نہیں ہوگا۔ آپ یہاں چودھری افتخار عالم شاہ کے مہمان ہیں اور آپ کی جو بھی خاطر خدمت ہوگی، وہ انہی کے خرچے پر ہوگی۔'' بہرام نے اسے سمجھایا لیکن وہ مزید ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ ہم کہاں سے چودھری صاحب کے مہمان ہو گئے؟ نہ تو انہوں نے ہمیں دعوت دے کر بلوایا ہے اور نہ ہی ہم خود ان سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہیں تو پھر ہماری مہمان داری کا خرچہ زبردستی ان پر کیوں؟''

''یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے شک آپ اپنے کام سے آئے ہیں لیکن چودھری صاحب کی روایت ہے کہ وہ علاقے میں آنے والوں کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔'' بہرام نے کچھ پریشانی سے اس سرپھرے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے چودھری صاحب کی روایات سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں اپنے اصولوں پر چلنے والا بندہ ہوں۔ ویسے بھی میں چودھری کے علاقے میں نہیں ٹھہرا ہوا کہ ان کی روایات کے مطابق ان کا مہمان تصور کیا جاؤں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کیا یہ جنگل تمہارے چودھری صاحب کی ملکیت ہے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں دریافت کیا تو بہرام گڑبڑا گیا۔

''نن..... نہیں سر! جنگل تو سرکار کی ملکیت ہے، بس چودھری صاحب خود ادھر آنے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اس عجیب وغریب کیس سے نمٹے۔ یہ عجیب ہی نمونہ اسے ٹکرا گیا تھا ورنہ اب تک تو وہ یہی دیکھتا آیا تھا کہ لوگ معمولی سے معمولی فائدہ حاصل کرنے پر بھی خوش ہی ہوتے ہیں اور یہ چودھری کی میزبانی کو ٹھکرا رہا تھا۔

''مگر میں نے تو سنا ہے چودھری صاحب آج کل یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ اپنے بیٹے سے ملنے امریکہ گئے ہوئے ہیں۔'' پیشانی پر آ جانے والی ایک لٹ کو پیچھے جھٹکتے ہوئے اظفر نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ ویسے اس ساری گفتگو کے دوران وہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھرپور انصاف کر رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی لبوں پر دبی دبی مسکراہٹیں لیے اس کا پورا ساتھ دے رہے تھے۔

''چودھری صاحب کے نہ ہونے سے روایات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور سب کام اسی طرح چلتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ لوگوں کو منظور نہیں تو میں منشی صاحب کو بتا دوں گا۔'' بیزار ہو کر بہرام نے اس بحث سے جان چھڑانے کے لیے ہار مان لی۔ اظفر نے بھی مزید کچھ نہیں کہا اور یوں خاموشی سے کھانا ختم کر لیا گیا۔ کھانے کے



بعد وہ لوگ نقشے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ بہرام انہیں سمجھانے لگا کہ جنگل کے کس حصے میں کس قسم کا ماحول ہے اور وہاں کیا کیا ملتا ہے۔

''اور یہ یہاں..... یہاں کیسے حیوانات اور نباتات پائے جاتے ہیں؟'' اظفر نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ نقشے کے اعتبار سے یہ جنگل کا ایک ایسا مقام تھا جہاں جنگل میں پائے جانے والے تینوں قسم کے ماحول مل رہے تھے۔ یہاں جنگل کا ہرا بھرا حصہ بھی تھا۔ بہتی ہوئی ندی بھی تھی اور پھر تھوڑا آگے جا کر خشک وبنجر پہاڑی سلسلے کا آغاز ہو رہا تھا۔

''اس حصے کو چھوڑیں صاحب! یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔'' بہرام نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب جگہ ٹھیک نہیں ہے؟ میرے خیال میں تو ہمارے کام کے لیے یہ سب سے آئیڈیل جگہ ہو گی۔ یہاں ہمیں بالکل مختلف قسم کا حیوانیہ اور نباتیہ مل سکتا ہے۔'' اظفر نے فوراً حجت شروع کر دی۔

''حیوانیہ اور نباتیہ تو بعد میں ملے گا، پہلے آپ لوگ ہی غائب ہو جاؤ گے۔'' بہرام نے اس کی حجت بازی پر جھلا کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟'' اظفر اُچھلا۔

''دھمکی تو نہیں دے رہا، سمجھا رہا ہوں۔ جنگل کا یہ حصہ خطرناک ہے۔ ہم لوگ خود بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔'' بہرام ذرا نرم پڑا۔

''کیسا خطرہ؟ میں نے تو سنا ہے کہ یہاں خطرناک قسم کے جانور اور درندے وغیرہ نہیں پائے جاتے۔'' وہ پوری معلومات کے ساتھ وہاں آیا تھا اس لیے آسانی سے بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔

''سنی سنائی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا صاحب! میں پیر آباد کا رہنے والا ہوں اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے جنگل میں جانے والوں کی ایسی لاشیں ملتی دیکھی ہیں جنہیں درندوں نے بری طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا تھا۔'' اس کی بات سے یکسر اختلاف کرتے ہوئے بہرام نے اس پر اپنے تجربے کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے لیکن میں ان مسائل سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ہم اس سے پہلے بھی جنگلوں میں کام کرتے رہے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں موجود خطروں سے کیسے نمٹنا ہے۔'' اظفر کا انداز بے پروا اور کھلنڈرے لڑکوں جیسا تھا جس سے بہرام کے طیش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جتنا اس بندے کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اتنی ہی بے جگری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''میرے خیال میں آپ اپنے پاس موجود اسلحے کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں کہ آپ پرمٹ کے بغیر یہاں ایک پرندے یا مچھلی کو بھی ہلاک نہیں کر سکتے۔ خطرناک سے خطرناک درندے کو ہلاک کرنے کی صورت میں بھی آپ کو بھاری جرمانے اور سزا سے نمٹنا ہوگا۔

''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جو اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے معصوم جانوروں کا خون کرتے پھریں۔ ہم تو ان جانوروں اور پودوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان سے اور انہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' اظفر کسی جھکی محقق کا کردار بخوبی نبھا رہا تھا اور اس نے اپنی دلیلوں سے بہرام کو اچھا خاصا زِچ کر کے رکھ دیا تھا، جب ہی وہ منہ بناتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور خاصے تلخ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے صاحب! آپ کی مرضی۔ میں نے آپ کو سب بُرا بھلا سمجھا دیا ہے۔ آپ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو سارے نفع نقصان کی ذمے داری آپ کے اپنے سر ہے۔ مجھے آپ اپنی روانگی کا وقت بتا دیجئے

گا، میں انتظامات کر دوں گا۔ ویسے اگر خاص طور پر اسی حصے میں جائیں تو دو باتیں ذہن میں رکھیے گا۔ ایک یہ کہ میں یا میرا کوئی آدمی ایسی خطرناک جگہ پر آپ کے ساتھ نہیں جائے گا، دوسرے یہ کہ جنگل کے اس حصے میں آپ کا خطرناک ڈاکوؤں سے بھی سامنا ہو سکتا ہے اور ان سے آپ کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی بھی ذمہ نہیں لے سکتا۔''

''او یار! اب تم نے ڈاکوؤں کی ایک نئی کہانی نکال کر رکھ دی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم ڈر کر یہیں اس بنگلے سے واپس چلے جائیں؟'' اس بار اظفر نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر بہرام تھوڑا سا بوکھلایا۔

''میں ایسا کیوں چاہوں گا جی..... لیکن آپ کو سارے خطروں کی خبر دینا بھی تو میرا فرض ہے۔ آپ میری دی ہوئی کسی خبر کو کہانی سمجھنے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ ادھر جنگل میں سچ مچ ڈاکو ہیں۔ آپ کو ادھر کی اتنی معلومات ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے پولیس نے ادھر آپریشن کر کے ڈاکوؤں کا بہت بڑا گروہ پکڑا تھا لیکن اس گروہ کے سارے لوگ نہیں پکڑے گئے تھے۔ کچھ خطرناک ڈاکو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ڈر ہے کہ یہ ڈاکو ابھی بھی جنگل میں ہی موجود ہوں۔'' بہرام نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا لیا تھا اور ایک بار پھر نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

''یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے اظفر! یہ یہاں کا رہنے والا ہے اور یہاں کے خطروں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمیں اس کی بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ریسرچ کرنی ہے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی خطرناک علاقے میں ہی جایا جائے۔ ہم وہاں سے دُور رہ کر بھی اپنا کام کر سکتے ہیں۔'' اس بار اظفر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے گروپ کے ایک آدمی نے درمیان میں مداخلت کی اور اسے سمجھانے لگا۔

''عدیل بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اظفر! ہم فیملی والے لوگ ہیں۔ تمہاری طرح چھڑے چھانٹ نہیں کہ ہمیں اپنے پیچھے کسی کی فکر ہی نہ ہو۔ اگر تم نے جنگل کے ڈینجر زون میں جانے کا سوچا تو یہ یاد رکھنا کہ وہاں جانے والے تم اکیلے ہی ہو گے، ہم میں سے کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔'' گروپ کا ایک فرد بولا تو دوسرا بھی فوراً اس کا ساتھ دینے لگا اور پھر اگلے دو منٹ میں صورتِ حال ایسی ہو گئی جس سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ پانچ رکنی اس ٹیم میں کوئی بھی اظفر کا ہم نوا نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے بہرام کو خاصا مطمئن کر دیا اور وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایکٹ کر رہے ہیں اور اس کا ایک ایک ردِعمل پوری طرح ان کی نظروں میں ہے۔ پانچ رکنی اس ٹیم میں محقق حقیقت میں صرف ایک ہی تھا۔ باقی چار سی ایف پی کے اہلکار تھے جنہیں جنگل میں چھپے راز کی تلاش کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ اپنی حکمتِ عملی سے جنگل میں داخل ہونے سے قبل ہی یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ انہیں اس وسیع جنگل کے کس حصے سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔

⊛----✪----⊛

صبح شازمین کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو خاصا تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے اتنی پُرسکون نیند نصیب ہوئی تھی اور آنکھ کھلتے ہی نظر آنے والے جاوید علی کے چہرے نے اسے یاد دلا دیا تھا کہ یہ پُرسکون نیند اسی کے مرہونِ منت تھی۔ اس سے اپنی ہر پریشانی کہہ دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

''صبح بخیر۔ تم اب تک یہیں ہو؟ میں تو سمجھی تھی کہ رنجنی بن کر نیچے جا چکے ہو گے؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''رنجنی بن کر نیچے جانے میں خطرہ تھا اس لیے میں یہیں رک گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں جواب دیا۔ لیکن شازمین کے چہرے پر فوراً ہی تشویش کے بادل چھا گئے۔



''کیا ہوا؟ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟'' وہ سراسیمگی سے پوچھنے لگی۔

''گڑبڑ تو ہوئی ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی، کچھ بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟'' شازمین نے اصرار کیا۔ جاوید علی کے تسلی دینے کے باوجود اس کی آنکھیں بدستور تشویش میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''رات میں کسی نے آشا کے موبائل پر کال کر کے اطلاع دی تھی کہ شالنی کا قتل ہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی اس نے آشا کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ رنجنی پر سخت نظر رکھو۔ آشا تو سو رہی تھی۔ فون کا جل نے سنا اور انٹرکام پر مجھے یہ اطلاع دے کر تمہارے کمرے تک محدود رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے مطابق اس وقت میرے لیے سب سے محفوظ جگہ تمہارا کمرہ ہی ہے اس لیے میں اس وقت بھی تمہیں یہاں نظر آ رہا ہوں۔'' اس نے اختصار کے ساتھ شازمین کو حالات سے آگاہ کیا۔

''تم یہاں ہو تو پھر شالنی کے قتل سے تمہارا تعلق کیوں جوڑا جا رہا ہے؟'' شالنی کے قتل کے ساتھ ہی رنجنی پر نظر رکھنے کی اطلاع ایسی تھی جسے سن کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ شاید اسی پر اس قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔ شازمین نے بھی اسی سوچ کے ساتھ یہ سوال کیا تھا۔

''وہ اس لیے کہ شالنی کا قتل تو میں نے نہیں کیا لیکن وہ ماری میری ہی وجہ سے گئی ہے۔ میں نے یہاں رہ کر اس کے ایک جرم کی نشاندہی کر دی تھی جس کے بعد یقیناً اس کے بڑوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ قانون کی نظروں میں آ گئی ہے اور انہوں نے خود ہی اس کا پتا کاٹ دیا۔'' تفصیلات میں جائے بغیر اس نے شازمین کی بات کا جواب دیا اور پھر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔ ''اب تم جلدی سے اچھے بچوں کی طرح اُٹھ کر فریش ہو جاؤ اور ناشتہ وغیرہ منگواؤ۔ رات بھر جاگ جاگ کر اس وقت خاصی شدید بھوک لگ رہی ہے۔''

''اوہ..... تو تم رات بھر سوئے نہیں؟'' شازمین چونکی۔

''میں یہاں پکنک منانے نہیں آیا ہوں محترمہ! کہ آرام سے پڑا سوتا رہتا۔ ویسے بھی اس کمرے میں ایک ہی بیڈ ہے اور اس پر آپ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ میں اگر آپ کے ساتھ سونے کی کوشش کرتا تو گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔'' اس کے شوخی سے جواب دینے پر شازمین جھینپ گئی اور اس کے رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی۔

''بس دو منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی آ کر ناشتہ منگواتی ہوں۔'' وہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ وہاں اس نے چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگایا اور صرف دانت برش کر کے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

''ہاں، اب بتاؤ کہ ناشتے میں کیا کھانا پسند کرو گے؟'' انٹرکام کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''جو کچھ اور جتنی مقدار میں تم کھاتی ہو، وہی منگوا لو۔ معمول سے ہٹ کر کھانے پینے کا سامان نیچے والوں کو چونکا سکتا ہے، خاص طور پر اس لیے کہ میں غائب ہوں اور انہیں میری تلاش ہو گی۔'' جاوید علی نے اس موقع پر بھی عقل مندی سے کام لیا۔

''لیکن میں تو بہت تھوڑا کھاتی پیتی ہوں۔ تمہارا اتنی کم خوراک میں کیسے گزارہ ہوگا؟'' شازمین تذبذب کا شکار ہوئی۔

''فی الحال مجبوری ہے۔ اسی طرح گزارہ کرنا پڑے گا۔ ویسے میں نے تمہارے ریفریجریٹر میں پھل اور جوسز دیکھے ہیں، تھوڑا بہت ان سے بھی آسرا ہو جائے گا۔ یوں بھی مجھے کوئی لمبے عرصے کے لیے تو یہاں رہنا

نہیں ہے۔ جیسے ہی مجھے اپنے لوگوں کی طرف سے اشارہ ملا، ایکشن شروع ہو جائے گا۔''

''اس کے بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟'' اس کی بات سن کر شازمین نے حسرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''جانا تو ہے لیکن کوشش کروں گا کہ بعد میں بھی تم سے رابطہ رکھ سکوں۔'' وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے گال تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی، پھر نرمی سے بولا۔ ''چلو تم ناشتہ منگواؤ۔''

''کاجل سے کہو کہ میرا ناشتہ لے کر میرے کمرے میں آ جائے۔'' شازمین نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انٹرکام پر حکم صادر کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک اُبھری۔ جاوید علی تیزی سے اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ بے شک کاجل اس کی موجودگی سے واقف تھی لیکن وہ اس کے سامنے اپنی اصل شکل میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

''آ جاؤ۔'' اس نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کیا تو شازمین نے دستک دینے والے کو اجازت دی۔

''کاجل کہاں ہے؟ میں نے اپنا ناشتہ لانے کے لیے اس سے کہا تھا۔'' باتھ روم کے اندر سے اس نے شازمین کی غصیلی آواز سنی۔

''بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بی بی! اس لیے میں آپ کا ناشتہ لے کر آئی ہوں۔'' جواب میں کسی نے عاجزانہ لہجے میں وضاحت پیش کی۔

''کیوں..... کیا ہوا اسے؟'' شازمین کے لہجے کا غصہ برقرار تھا۔

''رات سے بخار ہے۔ ابھی دوا کھا کر سو رہی تھی اس لیے میں نے نہیں جگایا۔'' ایک بار پھر اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ وہ جاگے تو اسے میرے کمرے میں بھیجنا۔'' شازمین کی آواز کے ساتھ کسی کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی لیکن جاوید علی اس وقت تک باہر نہیں نکلا جب تک شازمین نے خود آواز دے کر اسے باہر آنے کو نہیں کہا۔ اس نے باہر آ کر شازمین کے سامنے رکھی ٹرے کا جائزہ لیا۔ ڈبل روٹی، مکھن، جیم اور دودھ کے علاوہ ٹرے میں چائے بھی موجود تھی لیکن شازمین خاصی اُلجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ایکتا ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ کاجل کو رات سے بخار ہے اور اس وقت وہ دوا کھا کر سو رہی ہے۔'' اس نے جاوید علی کو بتایا۔

''میں ساری گفتگو سن چکا ہوں اور مجھے شک ہے کہ کاجل کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہو سکتا ہے، انہیں اس پر شک ہو گیا ہو اور اس سے میرے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔'' اس نے اپنا خیال پیش کیا اور ڈبل روٹی کا ایک سلائس اُٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔

''ناشتہ کرو۔ اس مسئلے کو بعد میں دیکھ لیں گے۔'' اس نے شازمین کو ہدایت کی تو وہ بھی بے دلی سے ایک سلائس اُٹھا کر اس پر جیم لگانے لگی۔

''ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تم دوبارہ کاجل سے انٹرکام پر بات کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ خیریت سے ہوئی تو تم سے ضرور بات کرے گی ورنہ ہم فرض کر لیں گے کہ وہ پھنس چکی ہے اور پھنسنے کی وجہ بنے گا وہ نشہ آور دوا ملا دودھ جو تمہارے کہنے پر اس نے آشا کو پلوایا تھا۔ آشا سمجھ جائے گی کہ کاجل نے اسے میرے پہرے سے غافل کرنے کے لیے نشہ آور دودھ پلایا تھا۔ اس شک کو کنفرم کرنے اور اس کے پیچھے موجود وجوہات جاننے کے لیے وہ کاجل سے تفتیش ضرور کرے گی۔'' شازمین نے صرف ایک سلائس کھا کر ہی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور چائے بنا کر پینے لگی تھی۔ جاوید علی نے بھی کچھ اتنی زیادہ رغبت سے ناشتہ نہیں کیا۔



حالانکہ وہ پہلے اچھی خاصی بھوک محسوس کر رہا تھا لیکن کاجل کی طرف سے محسوس ہونے والی تشویش اور شازمین کی بے دلی نے اس کی بھی بھوک مار دی تھی۔ شازمین کی طرح خود بھی چائے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے اس سے یہ الفاظ کہے۔

''کاجل کی خیریت بھی معلوم ہو جائے گی لیکن تم پہلے یہ دودھ تو پی لو۔'' جاوید علی کو اتنی جلدی ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر شازمین نے اسے ٹوکا۔

''نہیں، بس دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے انکار کیا۔

''دل نہیں بھی چاہ رہا، تب بھی پی لو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بھاگ دوڑ والا کام شروع ہونے والا ہے اس لیے تمہارے جسم میں توانائی ہونی چاہئے۔'' اس نے دلیل دی جو خاصی معقول تھی۔ جاوید علی نے مسکراتے ہوئے دودھ کا گلاس تھام لیا۔

''میں رات سے یہاں ہوں لیکن میں نے یہاں کوئی چہل پہل محسوس نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے تمہارے سوا اس پورشن میں کوئی موجود ہی نہ ہو، حالانکہ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کو یہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔'' اس نے بہت دیر سے ذہن میں اُبھرتا خیال شازمین کے ساتھ بانٹا۔

''یہاں رہتے رہتے وہ دونوں بھی اچھی خاصی خبطی ہو گئی ہیں اور اپنے اپنے کمروں سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔'' شازمین نے بیزاری سے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، میں تمہارے کمرے میں بالکل محفوظ ہوں اور جب تک چاہوں یہاں آرام سے چھپ کر رہ سکتا ہوں؟''

''ہاں، یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر مجھے گڑبڑ محسوس ہوئی تو یہاں سے بابا کے بیڈروم میں شفٹ کر دوں گی۔ اس پورشن میں بھی ان کا ایک بیڈروم موجود ہے اور وہاں داخل ہونے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔'' شازمین نے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس اثنا میں وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ شازمین ایک بار پھر انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میں نے ناشتہ کر لیا ہے۔ کاجل سے کہو ناشتے کے برتن لے جائے۔'' اس نے دوسری طرف موجود شخص سے کہا۔

''بڑی دیدی تو ابھی تک سو رہی ہیں بی بی! میں آ کر برتن لے جاتی ہوں۔'' دوسری طرف سے وہی جواب ملا جس کا ڈر تھا۔

''صرف برتن اٹھانے کی بات نہیں ہے، مجھے کاجل سے کچھ اور بھی کام ہے۔ آخر وہ کب تک سوتی رہے گی؟'' شازمین جھنجلا کر بلند آواز میں بولی۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا بی بی! کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کو جو بھی کام ہے، مجھے بتا دیں۔ میں کر دوں گی۔'' اس کے غصے کا جواب نرمی سے دیا گیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہے نا کہ میں کاجل کے علاوہ کسی سے اپنا کام کروانا پسند نہیں کرتی۔'' اس نے ریسیور واپس پٹخ دیا اور جاوید علی کی شکل دیکھنے لگی۔

''گڑبڑ ہے محترمہ!..... گڑبڑ ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے دیکھتا ہوں کہ کیا، کیا جا سکتا ہے۔'' وہ اپنے سیٹ پر مصروف ہو گیا۔

''ہم لوگوں نے کوٹھی کے باہر پوزیشن لے لی ہے۔ کوٹھی کی تلاش کا وارنٹ بھی لیا جا چکا ہے۔ ہماری پہلی

کوشش یہی ہوگی کہ قانونی طریقے سے اندر داخل ہو کر معاملات نمٹا سکیں لیکن اگر کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو بھرپور جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ کارروائی کے لیے رات کے وقت کا انتخاب ہوا ہے۔ لیکن تم کوٹھی میں اپنی یا اپنے کسی ہمدرد کی جان خطرے میں محسوس کرو تو فوراً اشارہ دے دینا، ہم فوراً دھاوا بول دیں گے۔'' اسے جواب دیا گیا۔

''اوکے، تم لوگ تیار رہنا۔ میں تھوڑی دیر میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر شازمین کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کہو کہ کیا، کیا جائے؟ میرے خیال میں تو ہمیں سب سے پہلے یہ کنفرم کرنا چاہئے کہ کاجل سچ مچ خطرے میں ہے بھی یا نہیں، اس کے لیے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو نیچے جا کر حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ میں گیا تو فوراً نظر میں آ جاؤں گا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا کسی بہانے نیچے جا سکتی ہو؟''

''مجھے نیچے لان کے علاوہ کہیں اور جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' شازمین نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچنی ہوگی۔'' جاوید علی سوچ میں پڑ گیا اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کسی نے یک دم دروازہ کھول دیا۔ اس صورتِ حال پر شازمین بری طرح اُچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کھلے دروازے میں کھڑی مدھو صاف نظر آ رہی تھی۔ شازمین اُسے اس جسارت پر کینہ توز نظروں سے گھورنے لگی۔

جاوید علی نے دروازے کی ناب گھمائے جانے کی ہلکی سی آواز سن لی تھی چنانچہ جب تک دروازہ کھلتا، وہ جھپٹ کر آڑ میں ہو چکا تھا اور اب کھلے دروازے کے پٹ کے پیچھے پوری طرح چوکس کھڑا ہوا تھا۔

''مدھو! تمہیں تمیز نہیں ہے کہ پہلے دروازے پر دستک کی اجازت لو، پھر دروازہ کھولو۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے کا دروازہ اس طرح بنا اجازت کھولنے کی؟'' بڑے سخت تیوروں کے ساتھ شازمین آنے والے خواجہ سرا مدھو کی گوشمالی کر رہی تھی۔

''شما چاہتی ہوں بی بی! ذرا پریشان تھی اس لیے دھیان نہیں رہا۔'' مدھو نے فوراً ہی اس سے معافی مانگ لی لیکن حقیقتاً اس کے چہرے پر ذرا بھی شرمندگی کے آثار نہیں تھے اور وہ اپنی آنکھیں گھما گھما کر شازمین کے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم یہاں آئی کس لیے ہو؟'' اس کے انداز پر جھنجلاتے ہوئے شازمین نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... میں ناشتے کے برتن لے جانے آئی تھی۔''

''کیوں..... تم کیوں آئی ہو؟ کاجل کہاں ہے؟'' شازمین نے مزید سختی سے پوچھا۔ ابھی تک اس نے مدھو کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور تیور بھی ایسے رکھے تھے کہ وہ خود سے قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ جاوید علی کے دروازے کے پیچھے مکمل طور پر چھپے ہونے کے باوجود وہ محتاط تھی کہ کہیں مدھو کمرے کے اندر پہنچ کر اندازہ نہ لگا لے کہ وہ وہاں چھپا ہوا ہے۔

''آپ کو تو معلوم ہے جی کہ بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آرام کر رہی ہیں۔'' مدھو نے ادب سے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ ''آپ ہم لوگوں کو سیوا کا ایک موقع دے کر دیکھیں۔ بھگوان کی آگیا سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''بس رہنے دو۔ جب تک کاجل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی، مجبوری ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ بستر سے



اٹھنے کے قابل ہو، اسے فوراً میرے پاس بھیجو۔ میں اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔'' شازمین نے نخوت سے اسے جواب دیا اور یکدم ہی ناشتے کی ٹرالی کھینچ کر دروازے کے قریب لے گئی۔

''یہ لو..... یہ لے جاؤ اور اب جب تک میں نہ بلاؤں، کسی کو بھی یہاں آ کر مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ اس بار وہ دروازے کو لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ دروازہ بند ہو جانے کے باوجود جاوید علی فوراً اپنی جائے پناہ سے نہیں نکلا اور شازمین کو اشارہ کیا کہ وہ کی ہول سے جھانک کر تسلی کر لے کہ مدھو وہاں سے چلی گئی ہے یا ابھی تک ٹوہ لینے کے لیے وہیں کھڑی ہوئی ہے۔ شازمین نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اطمینان ہو جانے کے بعد اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ جاوید علی باہر نکلا تو وہ خود تیزی سے حرکت میں آئی اور ایک دراز سے اسکاچ ٹیپ اور قینچی نکالی۔ قینچی کی مدد سے ٹیپ کا ٹکڑا کاٹنے کے بعد اس نے کی ہول پر چپکا دیا۔

''اب کوئی باہر سے جھانک کر اندر کا جائزہ نہیں لے سکے گا۔'' وہ اپنی کارروائی کے بعد اطمینان سے بولی۔

''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ لوگ یقینی طور پر مجھے کوٹھی میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مدھو کا اچانک تمہارے کمرے میں پہنچنا، اسی تلاش کا ہی ایک حصہ ہو سکتا ہے۔ تم نے اسے کمرے کے اندر نہیں آنے دیا ہے اس لیے اسے شک ہوگا کہ میں یہیں موجود ہوں۔ وہ یا اس کی کوئی ساتھی دوبارہ پھر کسی بہانے سے یہاں کا جائزہ لینے آئے گی اور کی ہول پر چپکا ٹیپ دیکھ کر ان لوگوں کا شک اور بھی پکا ہو جائے گا۔ تم انہیں اپنے کمرے کی تلاشی لینے کا موقع دو تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔ اس دوران تم مجھے نواب صاحب کے بیڈ روم تک پہنچا سکتی ہو۔'' جاوید علی نے اس کی کی گئی کارروائی پر اعتراض کرتے ہوئے تجویز پیش کی تو وہ فوراً قائل ہوگئی اور فوراً اسکاچ ٹیپ کو کی ہول سے ہٹا دیا۔

''مجھے نواب صاحب کے کمرے میں پہنچانے کے بعد تم کاجل کی عیادت کے بہانے نیچے کا چکر لگا کر آ جاؤ تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔'' اپنا رنجنی والا لباس اور اس گیٹ اپ کے لیے استعمال کی گئی دوسری اشیاء سمیٹ کر ایک تھیلے میں ڈالتے ہوئے اس نے شازمین کو مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل کر جائزہ لینے لگی۔ باہر کوئی نہیں تھا اور وہ نہایت رازداری سے جاوید علی کو نواب صاحب کے بیڈ روم میں منتقل کر سکتی تھی۔ منٹوں کے اندر یہ کارروائی انجام پا گئی۔ رنجنی کا لباس وغیرہ جاوید علی خاص طور پر اپنے ساتھ اس لیے لے گیا تھا کہ شازمین کے کمرے کی تلاشی کے دوران کسی کو کوئی کلیو نہ مل سکے۔

''اب میں نیچے جا کر کاجل کا پتہ کرتی ہوں۔'' جاوید علی کو نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا کر شازمین اس سے کہتی ہوئی باہر نکلنے کے لیے پلٹی۔

''ذرا خیال سے شازمین! تمہیں صرف حالات کا جائزہ لینا ہے۔ کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس سے تم خود خطرے میں پڑ جاؤ۔'' جاوید علی نے اسے ہدایت کی۔

''فکر مت کرو۔ میں احتیاط کروں گی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور باہر نکلنے سے پہلے بولی۔ ''تم دروازہ اندر سے لاک کر لو۔ اس دروازے میں ڈبل لاک ہے جس میں سے ایک لاک تو باہر سے چابی لگا کر کھولا جا سکتا ہے لیکن دوسرا لاک صرف اندر سے کھلتا ہے۔ دروازہ ہے بھی بہت مضبوط۔ اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو کئی افراد کو مل کر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔'' وہ گویا اسے آگاہ کر رہی تھی کہ سکیورٹی کے اعتبار سے یہ کمرہ کتنا محفوظ ہے اور وہ یہاں بغیر کسی خوف کے آرام سے وقت گزار سکتا ہے۔ اسے اپنی حفاظت کی تو خیر کیا فکر ہوتی تھی لیکن کمرے کی اس خصوصیت نے اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ضرور دے دیا۔

ادھر شاز مین سیڑھیاں اُتر کر نچلی منزل پر پہنچ چکی تھی اور کوٹھی کے اس حصے میں موجود تھی جہاں خواجہ سراؤں کے لیے خوب صورت و آرام دہ کمرے موجود تھے۔ آمنے سامنے قطار سے بنے ان کمروں میں سے اس کا رخ کاجل کے کمرے کی طرف تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کاجل کے کمرے میں داخل ہو پاتی، آشا کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

''ہیلو بے بی! آپ اس سمے یہاں کیسے نظر آ رہی ہیں؟'' چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر اس نے شاز مین سے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ کاجل بیمار ہے، وہ بھی اتنی شدید کہ میرے کئی دفعہ بلانے کے باوجود میرے پاس نہیں آ سکی تو میں نے سوچا کہ چلو چل کر خود اس کی خیریت معلوم کر لیتی ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں ہی ہے نا؟'' آشا کا اس طرح راستہ روکنا اسے برا لگا تھا لیکن تحمل سے کام لیتے ہوئے آرام سے اس کی بات کا جواب دیا اور کاجل کی بابت دریافت کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانے چاہے لیکن آشا اس کی راہ میں مزاحم تھی۔

''آپ بہت سویٹ اینڈ کائنڈ ہیں بے بی! جنہیں ایک ملازمہ کی اتنی چنتا ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کی ملاقات بڑی دیدی سے نہیں ہو سکے گی۔ اصل میں مجھے ان کی طبیعت زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ اس لیے انہیں ہسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا ہے۔'' آشا کے جواب نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔

یہ تو طے تھا کہ نہ تو کاجل بیمار تھی اور نہ ہی اسے ہسپتال میں داخل کروایا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ وہ ان کی قید میں تھی، زخمی تھی، یا پھر جان سے ہی ماردی گئی تھی؟ اس بارے میں کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

''کون سے ہسپتال میں ایڈمٹ کیا ہے اسے؟.....اور اسے ہسپتال لے کر کون گیا ہے؟ تم تو یہیں موجود ہو۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں خود بخود سختی در آئی۔ بہر حال غصے کے باوجود اس کا سوال تکنیکی اعتبار سے درست تھا۔ آشا ڈرائیور تھی اور اگر کاجل کو کسی ہسپتال لے جایا گیا تھا تو آشا کو اس وقت کوٹھی میں موجود نہیں ہونا چاہئے تھا۔

''میں دیدی کو ہسپتال تک چھوڑ کر واپس آ گئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں جانا چاہیں اور مجھے کوٹھی میں نہ پا کر ناراض ہوں۔ لیکن آپ چنتا نہ کریں، مدھو ہے بڑی دیدی کے ساتھ.....وہ ان کا پورا خیال رکھے گی۔'' آشا نے اسے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے، تم گاڑی نکالو۔ میں کاجل کو دیکھنے ہسپتال جاؤں گی۔'' وہ سب سمجھ رہی تھی لیکن جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانا چاہتی تھی اس لیے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ حکم دیا۔

''شما چاہتی ہوں بے بی!'' آشا نے فوراً ہی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''ابھی میں آپ کو ہسپتال نہیں لے جا سکتی۔ گاڑی کچھ گڑبڑ کر رہی ہے، پہلے میں اسے مکینک کو دکھا لوں، پھر آپ کو ہسپتال لے چلوں گی۔ ورنہ اگر راستے میں بند ہو گئی تو آپ کو برا لگے گا۔''

اس بہانے باز کے پاس ہر بات کے لیے بہانہ موجود تھا۔ شاز مین کا دل چاہا کہ اسے ٹیکسی لا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔

موجودہ حالات میں وہ خود بھی کوٹھی سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ شروع سے مزاج کے اعتبار سے نخریلی تھی، اس لیے ایسے ہی چپ ہو جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ جان بوجھ کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔



''تم لوگ بہت ہڈ حرام ہو گئے ہو۔ میں بابا سے تمہاری شکایت کروں گی۔'' وہ تنتناتی ہوئی وہاں سے چل پڑی۔

''اس سمے نواب صاحب کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں بے بی! نواب صاحب نشے میں ہیں اور اگر انہوں نے آپ کی بات سن بھی لی تو سمجھ نہیں سکیں گے۔'' اسے لگا کہ آشا اس کا مذاق اُڑا رہی ہو لیکن اس بار اسے غصہ آنے کے بجائے سخت احساسِ بے بسی ہوا۔ اگر اس کا باپ اس قماش کا بندہ نہ ہوتا تو کیا مجال تھی کہ اس کوٹھی میں یہ خواجہ سرا اس طرح دندناتے پھرتے۔ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپاتے ہوئے اس نے کوٹھی کے اس حصے کا رخ کیا جہاں نواب نوازش علی کی خواب گاہ تھی۔ عیاش فطرت نواب نے زیریں اور بالائی دونوں منزلوں پر اپنی خواب گاہیں بنا رکھی تھیں۔ اوپر موجود خواب گاہ کو استعمال کرنے کی نوبت تو بہت کم آتی تھی البتہ نچلی منزل کی خواب گاہ اس کا مستقل ٹھکانا تھی جہاں وہ کھل کر عیاشی کرتا تھا۔

آشا کے اطلاع دے دینے کے باوجود اس نے موہوم سی امید کے سہارے نواب صاحب کی خواب گاہ میں جھانکا۔ وہاں وہی منظر تھا جس کی خبر آشا دے چکی تھی۔ نواب نوازش علی اپنے عالی شان بستر پر بے ترتیبی سے اوندھا پڑا ہوا تھا اور بستر کی چادر آدھی سے زیادہ نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ بستر کے قریب ہی اوندھا پڑا جام اور بوتل بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے پلٹ گئی۔ باہر اسے آشا کھڑی ملی۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔'' اس کے مایوس چہرے کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا۔ شاز مین اندر سے کھول کر رہ گئی لیکن بے بس تھی۔ اس کے اپنے باپ کے اعمال ایسے تھے کہ وہ ایک معمولی خواجہ سرا کے سامنے جواب دینے سے قاصر تھی۔ البتہ اسے اس کی اوقات جتانا بھی ضروری تھا چنانچہ سخت لہجے میں بولی۔

''جلد از جلد گاڑی ٹھیک کروا کر لاؤ۔ تاکہ میں کاجل کو دیکھنے ہسپتال جا سکوں۔'' حکم صادر کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور رعونت بھرے انداز میں آگے بڑھ گئی۔ لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اس کا یہ انداز مصنوعی ہے اور وہ اندر سے شکست و ریخت کا شکار ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر واپس بالائی منزل پر پہنچ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ مدھو اس کے کمرے میں موجود تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے سخت لہجے میں مدھو سے دریافت کیا۔

''میں آپ کے کمرے کی صفائی کرنے آئی تھی۔ بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج آپ کا کمرہ میں صاف کر دوں۔'' اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن آشا تو کہہ رہی تھی کہ تم کاجل کے ساتھ ہسپتال میں ہو۔'' اسے اچانک یاد آیا تو اس نے چونک کر پوچھا۔ مدھو لمحہ بھر کے لیے گڑبڑائی، پھر سنبھل کر بولی۔

''آشا کو یاد نہیں رہا ہو گا۔ اس نے مجھے بڑی دیدی کے ساتھ جانے کا کہا تو تھا لیکن پھر اس لیے منع کر دیا تھا کہ میرے پیچھے پچن کون دیکھے گا۔ میری جگہ نندنی وہاں گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری صفائی مکمل ہو گئی ہے تو یہاں سے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر آرام کروں گی۔'' شاز مین نے بحث کرنے کے بجائے بے نیازانہ روّیہ اختیار کیا اور اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں بولی۔

''آپ آرام کریں بی بی! میں نے صفائی کر لی ہے۔ اگر آپ کو کوئی کمی لگے تو بعد میں مجھے بتا دیجئے گا۔'' مدھو تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی شاز مین نے جھپٹ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

''نندنی سے میری بات کرواؤ۔'' انٹرکام پر مخاطب خواجہ سرا کو اس نے حکم دیا۔ لمحہ بھر میں ہی اسے نندنی کی

مؤدبانہ آواز سنائی دی۔

''نندنی! شام کے وقت میرے کمرے میں آنا۔ مجھے تم سے ایک کام کروانا ہے۔'' فوری طور پر اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے نندنی کو یہی حکم دے دیا اور اس کا جواب سننے سے پہلے ہی ریسیور واپس رکھ دیا۔ صورتِ حال پوری طرح اس کے سامنے تھی۔ اسے کاجل کے ہسپتال میں داخل ہونے کے سلسلے میں غلط بتایا گیا تھا۔ آشا کے مطابق کاجل کے ساتھ ہسپتال میں مدھو موجود تھی۔ اس کا یہ بیان غلط ثابت ہونے پر مدھو نے آشا کی یادداشت کے سر الزام رکھ کر نندنی کے ہسپتال میں ہونے کی اطلاع دی تھی لیکن اب یہ اطلاع بھی غلط ثابت ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر فوراً نواب صاحب کی خواب گاہ کی طرف بڑھی اور دروازے پر اسی مخصوص انداز میں دستک دی جس کی جاوید علی نے اسے نصیحت کی تھی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی اور جاوید علی کے دروازہ بند کرنے کے بعد اسے حالات سے آگاہ کرنے لگی۔

''تم ایسا کرو کہ اپنی دونوں والداؤں کو کسی طرح اس بیڈ روم تک لے آؤ۔ ان دونوں سمیت تمہیں اس وقت تک یہاں رہنا ہو گا جب تک میری طرف سے تمہیں اشارہ نہ ملے۔'' سب سننے کے بعد جاوید علی نے پُرسوچ لہجے میں اسے ہدایات دیں تو وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔

''اور تم..... تم کہاں جاؤ گے؟''

''مجھے باہر نکل کر ایکشن میں آنا ہو گا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ جو بھی کارروائی کی جائے، وہ رات کے وقت ہو لیکن موجودہ صورتِ حال میں فوری ایکشن لینا ضروری ہے۔ ہمارا جن لوگوں سے مقابلہ ہے، تم اُنہیں جانتی نہیں ہو۔ تمہارے نندنی کے بارے میں چیک کرنے پر وہ چونک گئے ہوں گے اور انہیں یہ یقین ہو گیا ہو گا کہ مجھے تم نے ہی چھپا رکھا ہے۔ شک وہ پہلے ہی کر رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مدھو صفائی کے بہانے تمہارے کمرے کی تلاشی لینے نہ پہنچتی۔ وہ لوگ تو شاید ابھی تک وہ کاجل کی زبان کھلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ورنہ سیدھا سیدھا تم پر دھاوا بول دیتے۔'' اس نے شاز مین کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

''اگر حالات اتنے خطرناک ہیں تو باہر نکلنے میں تمہارے لیے بھی تو خطرہ ہو گا۔'' ستے ہوئے چہرے کے ساتھ شاز مین نے خدشے کا اظہار کیا۔

''مجھے خطرناک حالات سے نمٹنے کی تربیت دی گئی ہے اس لیے تم میری فکر نہ کرو۔ ویسے بھی باہر میرے لوگ میری مدد کے لیے موجود ہیں۔'' اس نے شاز مین کو تسلی دی۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن دن کی روشنی میں تمہارے لیے نیچے جانا مشکل ہو گا۔ تم سیڑھیاں اُترتے ہی نظروں میں آ جاؤ گے۔''

''تم فکر نہ کرو، میں سیڑھیوں سے نیچے نہیں جاؤں گا۔ تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے اچھی طرح اس کمرے کی لوکیشن کا جائزہ لے لیا ہے۔ میں اس عقبی کھڑکی سے آرام سے چھجے پر اُتر جاؤں گا۔ چھجے سے میرے لیے آم کے اس درخت تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ وہاں سے صورتِ حال کا جائزہ لے کر میں آگے کا لائحہ عمل طے کر گا۔ لیکن پہلے تم دونوں خواتین کو یہاں بلوا لو۔ تم تینوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی میں ایکشن میں آؤں گا۔''

شاز مین کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر زور دیا۔ اصل میں اسے اندیشہ تھا کہ آپریشن شروع ہونے کے بعد کہیں کوٹھی میں موجود مجرم ان خواتین کو یرغمال بنا کر فرار ہونے کی کوشش نہ کریں اس لیے پہلے انہیں محفوظ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔



''میں ابھی دو منٹ میں انہیں لے کر آتی ہوں۔'' شاز مین کو اس کی بات سمجھ آ گئی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر جاتے ہی جاوید علی نے عقبی کھڑکی کی طرف پیش قدمی کی اور چوکھٹ پر ہاتھ جما کر چھجے پر کود گیا۔ کوٹھی کی عقبی سمت ہونے کی وجہ سے اس طرف سناٹا تھا اور اسے کسی کے دیکھ لینے کا احتمال نہیں تھا۔ ادھر شاز مین نے واقعی خاصی تیزی دکھائی تھی اور نہ جانے کس بہانے سے اپنی سگی اور سوتیلی دونوں والداؤں کو لے کر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچ گئی تھی۔ جاوید علی کو غائب پا کر وہ فوراً ہی سمجھ گئی کہ وہ کھڑکی کے راستے چھجے پر موجود ہے۔

''میں جا رہا ہوں۔ تم میری ہدایات یاد رکھنا اور میرے سوا کسی اور کے کہنے پر کسی بھی حال میں کمرے کا دروازہ نہیں کھولنا۔ تم لوگ محفوظ رہو گے تو ہم اپنا کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔'' اس نے سرگوشی میں ایک بار پھر اپنی ہدایات کو دہرایا۔

جواب میں شاز مین نم آنکھوں کے ساتھ صرف گردن کو اثباتی جنبش ہی دے سکی اور آہستگی سے کھڑکی کے پٹ بند کر لئے۔ بغیر گرل کی اس کھڑکی کے پٹ بلٹ پروف شیشے پر مشتمل تھے۔ کھڑکی ایک بار اندر سے بند کر لی جاتی تو اسے باہر سے کسی طور کھولنا ممکن نہیں تھا۔ شیشہ ٹوٹنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بند کھڑکی کے شفاف شیشے سے درخت کی طرف جاتے جاوید علی کو دیکھنے لگی۔ وہ عجیب اجنبی تھا جو صرف ایک رات قبل اسے ملا تھا اور اس قلیل مدت میں ہی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دوبارہ کبھی وہ اس سے مل بھی سکے گی یا نہیں لیکن پھر بھی دل اس کی سلامتی کے لیے دعا گو تھا۔

چھجے سے آم کے درخت پر چھلانگ لگانے سے قبل جاوید علی نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور کھڑکی میں کھڑی شاز مین کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ شاز مین کا دایاں ہاتھ بھی میکانکی طور پر اُٹھ گیا لیکن پھر اس نے فوراً ہی واپس کھینچ لیا۔ اپنی زندگی میں اچانک آنے والے اس شخص کو وہ کسی طور الوداع نہیں کہنا چاہتی تھی۔

⊛----✪----⊛

ایک بڑی جیپ میں سامان لوڈ کیا جا چکا تھا۔ اس سامان میں ٹینٹ، اشیائے خورونوش، اسلحے اور کیمرے سمیت اور بھی بہت کچھ شامل تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی کوئی تحقیقاتی ٹیم ہے جو اپنے تحقیقی اور مطالعاتی دورے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ جنگل میں داخل ہونے کے لیے تیار ہے۔ اظفر کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے جیپ کی پچھلی نشستوں پر قبضہ جما لیا تھا اور اب اظفر اور ایک مقامی شخص ہی جیپ سے باہر کھڑے تھے۔

''میری خواہش تو تھی کہ تم ہمارے ساتھ چلتے۔ لیکن تم نے انکار کر کے مایوس کر دیا۔'' ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوئے بہرام کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اظفر نے کہا۔

''میں انکار نہیں کرتا لیکن میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتا دی ہے۔ نئے افسر کے آنے تک بنگلے کی ساری ذمے داری میرے سر ہے اس لیے میں یہاں سے دور نہیں جا سکتا۔ لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ میں نے آپ کے ساتھ جس بندے کو لگایا ہے، وہ بھی بڑے کام کا بندہ ہے ہور جنگل کو وڈی چنگی طرح جانتا ہے۔ اگر آپ نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو کوئی پریشانی نہیں ہو گی اور آپ حفاظت سے وقت پر واپس آ جائیں گے۔'' اپنے قدرتی اکھڑ لہجے کو نرم بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بہرام نے اسے جو جواب دیا، اس میں ایک

پوشیدہ دھمکی بھی تھی۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری باتوں کو ذہن میں رکھوں لیکن تم بھی یاد رکھنا کہ اگر ہم مقررہ وقت پر واپس نہ پہنچ سکیں تو تم بس صرف دو گھنٹے تک مزید ہماری واپسی کا انتظار کرو گے اور پھر عمیر آفندی کو اطلاع دے دو گے۔ دراصل انہیں بھی جنگل میں ہونے والی حادثاتی اموات کی اطلاع مل چکی ہے اس لیے وہ ہم لوگوں کے لیے تشویش کا شکار ہیں اور انہوں نے خاص طور پر مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جیسے ہی جنگل سے واپس لوٹوں، انہیں رپورٹ ضرور دوں۔'' اظفر ذہین تھا چنانچہ نہایت آرام سے پُرسکون لہجے میں اس کی دھمکی کا جواب دے ڈالا۔

''ٹھیک ہے صاحب! میں خیال رکھوں گا۔'' حیرت انگیز طور پر اس بار بہرام نے کوئی اُلٹی سیدھی بات کرنے کے بجائے تابعداری سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اوکے تو پھر ہم چلتے ہیں۔'' اظفر اس سے مصافحہ کر کے جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی بہرام سے گفتگو کے دوران ان کا گائیڈ کم ڈرائیور جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اظفر نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ بہرام اس وقت تک اپنی جگہ کھڑا جیپ کو دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ جیپ کے غائب ہوتے ہی وہ پلٹا اور بنگلے کے ایک کمرے کا دروازہ چابی کی مدد سے کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

یہ وہ کمرہ تھا جو عموماً اس بنگلے میں رہنے والے افسر کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ افسر اپنی مرضی سے کسی اور کمرے کا انتخاب کر لے تو یہ اس کی مرضی ہوتی تھی لیکن ایسا اب تک شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ یہ کمرہ بنگلے میں موجود دیگر تمام کمروں سے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھا۔ سابق فاریسٹ آفیسر عابد انصاری نے بھی اسی کمرے میں رہنا پسند کیا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی یہاں وہ مواصلاتی آلات وغیرہ موجود تھے جن کی مدد سے رابطے کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اس کمرے کو مقفل کیا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہاں کسی ملازم کی رسائی نہ ہو سکے۔ صرف بہرام تھا جو اس کمرے میں آتا جاتا تھا اور ظاہر ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اس وقت بھی اس نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور الماری کا قفل کھول کر اس میں سے ایک آپریٹس نکال کر کہیں رابطہ کرنے لگا۔

''وہ لوگ جنگل کی طرف روانہ ہوگئے ہیں۔ ویسے تو ان کا تمہاری طرف آنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن ٹیم لیڈر اظفر سر پھرا بندہ ہے۔ اس کے دماغ میں سما گئی تو وہ ادھر کا رخ بھی کر سکتا ہے۔ تم لوگ اپنی جگہ ہوشیار رہنا۔'' رابطہ ہوتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''ٹھیک ہے، ہم خیال رکھیں گے۔ تم بتاؤ کہ تم نے ان کی جیپ میں ٹریکر لگا دیا تھا یا نہیں؟'' دوسری طرف سے اس سے استفسار کیا گیا۔ بولنے والے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اگر بہرام سے اونچے مرتبے کا نہیں تو اس سے نیچے کا آدمی بھی نہیں تھا اور برابری کی بنیاد پر اس سے بات کر رہا تھا۔

''میں نے ٹریکر لگا دیا ہے۔ جیپ جہاں بھی گئی، ملوم ہو جائے گا۔ لیکن ٹریکر پر پورا بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ جیپ جنگل میں ہر جگہ نہیں جا سکتی۔ ان لوگوں کو کہیں نہ کہیں جیپ چھوڑ کر پیدل ہی آگے بڑھنا ہوگا اور پیدل چلتے ہوئے وہ کس طرف نکل جائیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' بہرام تشویش کا شکار تھا۔

''فکر نہ کر۔ اپنی طرف پورا بندوبست ہے۔ تجھے معلوم تو ہے کہ انصاری صاحب کی موت کے بعد جو نیا سسٹم لگا ہے، اس نے ہمارا کام کتنا آسان کر دیا ہے۔ پورا بندہ کیا، اگر چڑیا کا بچہ بھی ہماری حدود میں داخل ہوگا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اگر تیرے شک کے مطابق اظفر اور اس کے ساتھ مشکوک لوگ ہوئے تو سمجھ لے کہ



وہ اس جنگل سے صحیح سلامت واپس نہیں جائیں گے۔ ان کی آنکھیں یہاں جو کچھ بھی دیکھیں گی، اس کو بتانے کے لیے وہ باقی ہی نہیں رہیں گے۔'' دوسری طرف سے اسے تسلی دی گئی۔ یہ دوسرا بندہ تھا جو مقامی ہی تھا لیکن تعلیم یافتہ تھا اور جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا جانتا تھا۔ انہوں نے کھیتوں کی حفاظت کے پیشِ نظر کچھ عرصہ قبل ہی ایسا سسٹم لگایا تھا کہ جیسے ہی کوئی ذی روح ان حدود میں داخل ہوتا، آلات پر اشارہ موصول ہو جاتا۔ اس سسٹم میں یہ خوبی تھی کہ چھوٹی جسامت کے جانوروں اور پرندوں کی آمد پر متحرک نہیں ہوتا تھا، صرف بڑی جسامت کے جانوروں یا انسانوں کی آمد پر ہی سگنل موصول ہوتے۔ سسٹم کی تنصیب کے بعد بڑی جسامت کے جانوروں کو اس تیزی سے ہلاک کیا گیا تھا کہ انہوں نے خود ہی خطرہ بھانپ کر اس حصے کی طرف رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یوں اب نگرانی کا کام کم ہوگیا تھا اور وہ اپنی حدود میں داخل ہونے والے کی بھی مشکوک فرد کو آسانی سے ٹریس کر سکتے تھے۔

اظفر اور اس کے ساتھی ان سب باتوں سے بے خبر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اظفر نے اپنی ٹانگوں پر ایک نقشہ کھول کر پھیلا رکھا تھا۔ رات وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر روٹ طے کر چکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے ظاہری طور پر بہرام کے سامنے اس کی مخالفت کرتے ہوئے جنگل کے اس حصے میں جانے سے انکار کر دیا تھا جسے بہرام نے خطرناک قرار دیتے ہوئے انہیں وہاں جانے سے روکا تھا۔ بنگلے سے نکلتے وقت انہوں نے اس جگہ سے کافی فاصلے پر جنگل کے دوسرے حصے میں جانے کا اعلان کیا تھا اور اب جیپ اسی طرف رواں دواں تھی۔

''یہاں سے دائیں طرف موڑ لو۔'' نقشے کے مطابق جب جیپ اس مطلوبہ مقام پر پہنچ گئی جہاں سے انہیں اپنا راستہ بدلنا تھا تو اظفر نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''ادھر کیوں صاحب؟ ادھر جانے سے تو ہم اپنے راستے سے ہٹ جائیں گے۔'' ڈرائیور نے اعتراض کیا۔

''ہمیں تم سے زیادہ بہتر معلوم ہے کہ کدھر جانا ہے۔ تم بس سیدھے طریقے سے گاڑی چلاؤ۔'' اظفر نے غرا کر اسے جواب دیا۔

''جیسی مرضی صاحب! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ لیکن بتانا فرض تھا۔ کیونکہ آپ اس جنگل کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے۔ جن راستوں سے ہم گزر رہے ہیں، یہ اصل جنگل نہیں ہے۔ یہ بہت صاف جگہ ہے۔ لیکن آگے جا کر گھنا جنگل ہوگا جہاں راستے سمجھنے کے لیے نقشہ وقشہ سب بے کار ہے۔ ادھر صرف تجربہ چلتا ہے اور وہی شخص جنگل سے سلامت نکلتا ہے جو اس جنگل کو جاننے والے کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔'' اس کے حکم کے مطابق ڈرائیور نے جیپ کی سمت تو بدل دی تھی لیکن ساتھ ہی نہایت فلسفیانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟'' اس کی بات سن کر اظفر طیش میں آ گیا۔

''دھمکی کیسی صاحب! میں تو آپ کو سمجھا رہا تھا، آگے آپ کی مرضی کہ مانو یا نہ مانو۔ میں تو خادم ہوں۔ آپ نے جدھر کہا، میں نے گڈی موڑ دی۔'' ڈرائیور نے اطمینان سے جواب دیا۔ اسے ڈیوٹی پر بھیجتے ہوئے بہرام نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ان لوگوں سے زیادہ اُلجھنا نہیں ہے اور نظر رکھنی ہے کہ یہ لوگ جنگل میں کیا کر رہے ہیں۔

''یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم حکم پر عمل کرنا جانتے ہو، آگے بھی اسی طرح عمل کرنا اور اپنی زبان صرف اسی

وقت کھولنا جب تم سے کچھ پوچھا جائے۔"

اظفر مزاجاً کچھ تند خو تھا اور اس وقت تو وہ مبینہ طور پر ایک ایسے فرد سے مخاطب تھا جو مجرموں کا ساتھی تھا اس لیے کسی مصلحت اور رعایت سے کام لینے کو تیار نہیں تھا۔ ڈرائیور نے بھی اس کا انداز دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ جیپ میں ٹریکر لگا ہوا ہے اور وہ جہاں بھی جائیں گے، بہرام کو اس کی خبر ہو جائے گی۔ اس لیے زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں ہے۔

"یہاں روک لو۔" جنگل کا چھدرا پن ختم ہوا اور جیپ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو اسے چلانا مشکل ہونے لگا۔ درحقیقت ماہر ڈرائیور کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا بھی نہیں کر پاتا اور ہمت ہار بیٹھتا۔ لیکن اس کے ساتھ موجود شخص نے مشکل کے باوجود زبان سے اُف نہیں کہا تھا۔ گویا وہ اظفر کے حکم پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ خود اظفر نے ہی محسوس کر لیا کہ آگے جیپ پر سفر جاری رکھنا ان کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اسے جیپ روک لینے کا حکم دے ڈالا۔

ڈرائیور نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ خاموش رہنے کے باوجود اس وقت وہ بے حد چوکنا تھا۔ وہ لوگ جنگل کے جس حصے میں پہنچ چکے تھے، وہاں سے وہ علاقہ زیادہ دور نہیں تھا جہاں افیون کی کاشت کی جاتی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو پیدل چل کر بھی اس جگہ تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن حسبِ ہدایت اسے دخل بالکل بھی نہیں دینا تھا اور صرف نگرانی کرنی تھی۔

"یہاں ٹینٹ لگا لو۔ یہاں رک کر ہم اپنا کام کریں گے۔" جیپ رک گئی تو وہ سب نیچے اُتر آئے اور اظفر نے اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ہدایت دی۔ اس کے ساتھی فوراً ہی حرکت میں آ گئے اور جیپ سے ٹینٹ نکال کر مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیئے۔ پیراشوٹ سے بنے ہلکے پھلکے ٹینٹ تھے جنہیں ذرا سی جدوجہد کے بعد اکیلا شخص بھی نصب کر سکتا تھا۔

"تم یہ ٹینٹ لگا کر ان میں ضرورت کی اشیاء پہنچاؤ۔ ہم ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر اپنا کام کرتے ہیں۔" دو عدد ٹینٹ زمین پر ڈھیر کر دیئے گئے تھے جب اظفر نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے یہ نیا حکم دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی طرف سے چند ہدایات دیئے جانے کے بعد وہ لوگ متحرک ہو گئے۔ ڈرائیور بظاہر خیموں کے ساتھ اُلجھا ان کی ساری کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے شانوں سے جدید ساخت کی گنیں لٹکا رکھی تھیں اور پنڈلیوں کے ساتھ شکاری چاقو بندھے ہوئے تھے۔ ان ہتھیاروں کے علاوہ ان سب کے شانوں کے ساتھ ایک ایک مضبوط تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ ان تھیلوں میں کیا تھا، یہ تو ڈرائیور نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ بڑی تیاری کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔ جنگل میں کسی بھی مقصد کے تحت اُترنے والوں کو تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے لیکن وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان لوگوں کا انداز کسی محقق یا طالب علم جیسا نہیں ہے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور نظم و ضبط سے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح لگتے تھے۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک دو دو کی ٹولیوں میں وہاں سے روانہ نہیں ہو گئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی اس نے ٹینٹ کی تنصیب کا کام چھوڑا اور اپنے لباس میں چھپایا ہوا آپریٹس باہر نکالا اور رابطہ ہونے پر دوسری طرف موجود شخص کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔

"بے فکر رہو..... ہم نے تمہاری جیپ ٹریس کر لی ہے اور جانتے ہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو۔" اسے جواب ملا۔

"لیکن سر! وہ لوگ اب ادھر نہیں ہیں۔ مجھے جیپ اور سامان کے ساتھ چھوڑ کر خود پیدل آگے نکل گئے



ہیں۔ مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ وہ ضرور اسی طرف جائیں گے، جہاں جانے سے ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں۔" اس نے تشویش بھرے لہجے میں مزید اطلاع فراہم کی۔

"اس طرف آ کر وہ خود اپنے حق میں اچھا نہیں کریں گے۔ ہم انہیں ہر حال میں اور آسانی سے روک لیں گے۔" دوسری طرف موجود بندے کو اپنے آپ پر بھرپور اعتماد تھا۔ ڈرائیور بھی مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور اب اس سے آگے اسے کچھ نہیں کرنا اس لیے آپریٹس واپس لباس میں چھپا کر اظفر کے سونپے ہوئے کام کو مکمل کرنے میں لگ گیا۔

اس کے شک کے برخلاف اگر وہ لوگ جنگل کے اس خاص حصے کی طرف نہیں جاتے تو پھر یقیناً انہیں صحیح سلامت واپس آ جانا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ واپس آنے کے بعد اظفر اپنی حکم عدولی پر اسے برا بھلا کہے اس لیے پوری جانفشانی سے ٹینٹ نصب کرنے کے بعد جیپ سے سامان نکال کر وہاں منتقل کرنے لگا۔

ادھر اظفر اور اس کے ساتھی ٹولیوں کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ انہیں وہاں کس چیز کو تلاش کرنا ہے لیکن یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اس جنگل میں جو بھی راز پوشیدہ ہے، اس کا تعلق جنگل کے اسی حصے سے ہے۔ کیونکہ جب سے وہ لوگ یہاں آئے تھے، بہرام سے لے کر اس ڈرائیور تک نے انہیں جنگل کے اس حصے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔

نہایت چابک دستی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے دو مختلف ٹولیوں میں سفر کرنا اس لیے مناسب سمجھا تھا کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ایریا کا جائزہ لیا جا سکے۔ اظفر نے اپنے ساتھ آئے ہوئے وائلڈ لائف کے ماہر اور محقق پروفیسر صاحب کو اپنے ہمراہ رکھا تھا۔ پروفیسر صاحب نے تحقیق اور مطالعے کی غرض سے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جنگلوں اور بیابانوں میں گزارا تھا اس لیے وہ خاصے چاق و چوبند تھے اور جنگل میں پیش آنے والے کسی خطرے سے نمٹنا بھی خوب جانتے تھے۔ لیکن اظفر انہیں اپنی ذاتی ذمے داری پر یہاں لایا تھا اس لیے انہیں اپنے ساتھ رکھ کر خود ان کی دیکھ بھال کرنا چاہتا تھا۔ چلتے چلتے وہ لوگ ایک مقام پر رُک گئے۔ رُکنے کا سبب نظر آنے والا کسی بڑے جانور کا ڈھانچہ تھا۔ پروفیسر صاحب فوراً ہی اس ڈھانچے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"یہاں خون کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جانور حال ہی میں موت کا شکار ہوا ہے۔" انہوں نے نتھنے سکیڑ سکیڑ کر فضا کو سونگھا اور ڈھانچے کی طرف بڑھے۔ ڈھانچے کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے طاقتور ٹارچ نکال لی۔ دن کا وقت تھا اور سورج کی روشنی جنگل میں پہنچ رہی تھی لیکن گھنے درختوں کے پتوں سے چھن کر آنے والی یہ روشنی ناکافی تھی اس لیے انہیں ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

"یہ بڑی جسامت والے ہرن کی لاش ہے جسے کئی جانوروں نے مل کر بھنبھوڑا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو نا کہ ڈھانچے کی ساری ہڈیاں سلامت نہیں ہیں اور کئی اِدھر اُدھر مختلف سمتوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس ہرن کو کل ہی شکار کیا گیا ہے کیونکہ ہڈیوں کے ساتھ لگے بچے کھچے گوشت میں ابھی تازگی باقی ہے۔" وہ ڈھانچے کا نہایت عمیق نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

جائزہ لیتے لیتے وہ اُس کے سر کی طرف متوجہ ہوئے تو بری طرح چونک گئے اور اظفر کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہرن کی کھوپڑی میں گولی کا سوراخ موجود ہے۔ یعنی درندوں کے دانتوں اور پنجوں کا نشانہ بننے سے قبل وہ بے چارہ ہرن کسی ظالم کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن کر موت سے ہمکنار ہو چکا

تھا۔ اگر شکار کرنے والا کوئی پیشہ ور شکاری ہوتا تو لاش کو درندوں کا نشانہ بننے کے لیے یہاں چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ اس خوب صورت جانور کا سر اور کھال کسی طرح محفوظ کر لے اور ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ ہرن کے لذیذ گوشت سے اپنی شکم پری کا بندوبست کرتا۔ لیکن یہاں ملنے والے آثار مختلف تھے۔ ہرن کا سر بھی موجود تھا اور لاش دیکھ کر یہ بھی پتہ چل رہا تھا کہ درندوں کے اس لاش پر دعوت اُڑانے سے قبل اس سے کھال جدا نہیں کی گئی تھی۔

''اس ہرن کو کتوں نے کھایا ہے۔'' ہرن کی ڈھانچہ نما لاش کا جائزہ مکمل کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے چند قدم اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے کے بعد اعلان کیا تو اظفر پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک ماہر تھے اور وہ ان کی کسی بھی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

''میں نے لاش پر موجود دانتوں اور پنجوں کے نشان دیکھے ہیں اور اب اس فضلے کو دیکھ کر مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس ہرن پر کتوں نے دعوت اُڑائی ہے۔'' ان کی ٹارچ کی روشنی نے گھاس پھونس اور پتوں پر پڑے ہوئے فضلے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ فضلے سے ٹارچ کی روشنی ہٹی تو اِدھر اُدھر گردش کرنے لگی اور وہ اس روشنی میں معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اظفر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ ان کتوں کی تعداد تین یا پھر اس سے بھی زیادہ تھی اور وہ اس سمت سے آ کر واپس بھی اسی طرف چلے گئے تھے۔'' انہوں نے اپنے ٹارچ والے ہاتھ کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ کو بھی حرکت دی اور سمت بتانے لگے۔

اظفر ان کی فراہم کردہ معلومات سن کر جوش میں آ گیا۔ کتوں کی ضیافت کا نشانہ بنی لاش دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی اہم کلیو تلاش کر چکا ہے اور اب اس کے لیے اس راز تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں جس تک پہنچنے کے لیے وہ یہاں آیا ہے۔

جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے اظفر کے لیے کامیابی تک پہنچ جانے کا خیال بہت اہم تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے پروفیسر صاحب کی بتائی ہوئی سمت میں آگے بڑھنے لگا۔ خود پروفیسر صاحب اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک اور ڈھانچہ دیکھ کر چونک گئے۔ اس بار پروفیسر صاحب کے بتائے بغیر ہی اظفر نے جان لیا کہ اس جانور کو بھی گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے لیکن لاش کافی پرانی تھی کیونکہ وہاں خون کی بُو سمیت ہڈیوں پر لگا گوشت بھی غائب تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھانچا اب گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔

بڑی محویت سے اس جائزے میں مصروف ان دونوں کو احساس ہی نہیں ہوا اور انجانی سمت سے آ کر کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہو گئی۔ انہوں نے اگر کچھ محسوس کیا تو صرف گردن کی پشت پر پن کی نوک جیسی چبھن اور پھر ہوش و خرد سے بیگانے ہو گئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی اطراف سے چند مسلح افراد برآمد ہوئے اور اطمینان کرنے لگے کہ وہ لوگ یقینی طور پر بے ہوش ہو گئے ہیں یا نہیں۔

''ان کے باقی دو ساتھی بھی مل جائیں تو سب کو ایک جگہ ڈال کر ہمارے دوستوں کی دعوت کا بندوبست کر دو۔ اپنا آج کا کھانا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے۔'' اس دوران ہی ایک اور شخص نمودار ہوا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''وہ دونوں بھی نظر میں آ گئے ہیں صاحب! تھوڑی دیر میں وہ بھی یہیں ہوں گے۔ آپ ہمیں بس اتنا بتا دو کہ یہ کام جنگل کے کس حصے میں کرنا ہے؟'' مسلح افراد میں سے ایک نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا۔



''ان لوگوں کو جیپ سمیت اس طرف سے دور لے جانا اور خالقو سمیت سب کا کام تمام کر دینا۔'' نو وارد نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''خالقو کیوں صاحب؟..... وہ تو اپنا بندہ ہے۔'' حکم سننے والے حیران رہ گئے۔

''عقل سے کام لے مٹھل! اگر خالقو کو چھوڑ دیا تو جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں، اسے حادثہ کون کہے گا؟ ان کے پچھلے تو ہاتھ دھو کر پیچھے جاننے کے لیے خالقو کے پیچھے لگ جائیں گے اور ایک نہ ایک دن وہ ہمیں مروا دے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم خود پہلے اسے ہی مروا دیں۔'' اس نے جو نکتہ بیان کیا، وہ اعتراض کرنے والوں کے لیے قابلِ قبول تھا اس لیے پھر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور انتظار کرنے لگے کہ اظفر کے باقی دونوں ساتھیوں کو بھی یہاں پہنچا دیا جائے۔

انہیں زیادہ دیر زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور چار تنومند آدمی ان دونوں کے بے ہوش جسموں کو اٹھائے وہاں پہنچ گئے۔ چاروں مطلوبہ افراد ایک جگہ جمع ہو گئے تو آگے کی کارروائی کی جانے لگی۔ خالقو جیپ سمیت کہاں موجود ہے، یہ انہیں بتا ہی دیا گیا تھا چنانچہ چاروں بے ہوش افراد کے علاوہ پانچ عدد کتوں سمیت اس جگہ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کتے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اور چاروں بے ہوش افراد کی طرف دیکھ دیکھ کر اس طرح بھونک رہے تھے جیسے اُلجھن کا شکار ہوں کہ ان کا بھوجن سامنے ہوتے ہوئے بھی انہیں کھانے کے لیے کیوں نہیں دیا جا رہا۔

''خیمے اور سامان اٹھا کر واپس جیپ میں رکھ لے خالقو! ان کو یہاں سے دُور لے جانے کا حکم ہے۔'' کتوں کے ساتھ آنے والے مسلح افراد میں سے ایک نے جیپ ڈرائیور سے کہا تو وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ دو اور افراد بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ جلد ہی سارا سامان دوبارہ جیپ میں منتقل ہو گیا اور وہ لوگ عازم سفر ہو گئے۔ سفر کا دورانیہ تقریباً پندرہ منٹ تھا۔ وہ لوگ پہلے کے مقابلے میں زیادہ گھنے جنگل میں پہنچ کر رک گئے اور بے ہوش افراد کو جیپ سے نکال کر نیچے ڈال دیا۔ خالقو اپنے بارے میں کیے گئے فیصلے سے بے خبر اس کام میں پیش پیش تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے، اس بات کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب وہ ہدایت کے مطابق چاروں بے ہوش افراد کو مختلف پوزیشنز میں لٹاتے ہوئے تنہا رہ گیا اور اس کے ساتھیوں نے نہایت خاموشی سے اس سے الگ ہونے کے بعد خونخوار کتوں کو زنجیروں کی قید سے آزاد کر دیا۔ ایک گرانڈیل کتا برق رفتاری سے اس پر جھپٹا۔

''یہ کیا اوئے؟..... اسے روکو۔'' کتے کے وار سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ہم اسے نہیں روک سکتے۔ اوپر سے فیصلہ ہوا ہے کہ آج تُو بھی ان کے بھوجن کا حصہ بنے گا۔'' اسے نہایت سرد مہری سے جواب دیا گیا۔ وہ سارے کے سارے ایسے ہی تھے۔ سدھائے ہوئے پالتو جانوروں کی طرح ان کی اپنی کوئی سوچ یا پسند نہیں تھی۔ وہ بس وہ کرتے تھے جو انہیں کرنے کا حکم ملتا تھا۔ اس حکم کی زد میں ان کا اپنا کوئی ساتھی بھی آ جائے تو انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ کتے کے پے در پے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا خالقو بار بار ان سے مدد اور رحم کی درخواست کر رہا تھا لیکن ان کے کان بند تھے۔ وہ نہایت سپاٹ انداز میں پانچ عدد جیتے جاگتے انسانوں کو خونخوار کتوں کے دانتوں اور پنجوں سے بھنبھوڑے جانے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ منظر ڈیوٹی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ البتہ معصوم چرند پرند تھے جو کتوں کی وحشت ناک غراہٹوں اور دل دوز انسانی چیخوں سے گونجتے جنگل میں متوحش نظر آتے تھے اور

بے قراری سے یوں اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے جیسے کسی طرح اس ظلم کو روکنے کی تدبیر سوچ رہے ہوں۔ وہ تدبیر تو کیا خاک کر پاتے البتہ کتوں کے شکم سیر ہونے کے بعد یہ وحشت ناک شو خود ہی ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ سب معمول پر آنے لگا۔

بپھرے ہوئے کتے بھی حلق تک ٹھونس کر کھا لینے کے بعد سست پڑ کر اپنے رکھوالوں کے پاس واپس پہنچ گئے جنہوں نے ایک بار پھر انہیں زنجیروں میں قید کر دیا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

ادھر بہرام کو یہاں کی پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر بھی فوراً اس تک پہنچ گئی اور وہ یوں اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی اہم فریضہ انجام دیا ہو۔ اپنے طور پر واقعی اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا کہ لوگوں کو جنگل کے اس مخصوص حصے تک نہ پہنچنے دے جہاں افیون کے کھیت موجود ہیں۔ اگر اظفر اور اس کے ساتھی اس جگہ سے دور رہتے تو اس سمیت چودھری کے دیگر وفاداروں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن ان لوگوں نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور کسی اور جگہ جانے کا بتا کر اچانک ہی راستہ بدل کر ممنوعہ حصے کی طرف نکل گئے تھے جس کی سزا انہیں دردناک صورت میں دی جا چکی تھی۔

اس کام کے نمٹ جانے کے بعد بہرام کئی گھنٹوں کے لیے فارغ تھا۔ اظفر نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ لوگ مقررہ وقت پر واپس نہ آسکیں تو دو گھنٹے کے مزید انتظار کے بعد ان کی تلاش شروع کر دی جائے۔ اس حساب سے بہرام کے پاس خاصا وقت تھا۔ اس نے یہ وقت نہایت اطمینان سے گزارا۔ اسے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ اس عرصے میں ان پانچوں لاشوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتوں کے بعد اگر کچھ اور جنگلی جانور بھی ان لاشوں سے مستفید ہو جاتے تو یہ اس کے حق میں اور بھی زیادہ بہتر ہوتا۔

شام ڈھلے اس نے اظفر کی ہدایت کے مطابق نئے اے سی عمیر آفندی سے موبائل کی مدد سے رابطہ کیا۔ پیر آباد میں شہریار کے دور میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کے نتیجے میں اتنی سہولت ہو گئی تھی کہ موبائل کے سگنلز ڈاک بنگلے سمیت جنگل کے کچھ حصے تک مل جاتے تھے اور موبائل سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

''ہاں بہرام! کیا مسئلہ ہے؟'' پی اے کی طرف سے بہرام کی کال کی اطلاع سن کر عمیر فوراً ہی لائن پر آ گیا اور تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ اظفر رشتے میں اس کا کزن لگتا تھا اور اس نے ذاتی طور پر اس سے رابطہ کر کے اس وزٹ کے لیے اجازت نامے کی درخواست کی تھی۔ لیکن بہرحال عمیر جانتا تھا کہ یہ کوئی نجی نوعیت کا دورہ نہیں ہے اور اظفر کسی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے۔ یقینی طور پر یہ کام حساس نوعیت کا تھا اور ایسے کاموں میں خطرہ بھی ہوتا ہے اس لیے بہرام کی کال موصول ہوتے ہی وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''مسئلہ بڑا سنجیدہ ہے سر جی! وہ جو آپ کے بھائی شہر سے آئے تھے، جنگل میں کچھ تحقیق کرنے کے لئے، ان کا اور ان کے ساتھیوں کا کچھ اتا پتہ نہیں ہے۔ ساتھ میں میرا بندہ جو اُن کی جیپ چلا رہا تھا، وہ بھی غائب ہے۔'' بہرام نے اسے اطلاع دی۔

''تو تم کیا کر رہے ہو؟..... مجھے اطلاع دینے سے کیا ہوگا؟ فوراً کوئی سرچ پارٹی تیار کر کے جنگل میں بھیجو۔ اتنا وقت ہو گیا ہے۔ اگر وہ لوگ راستہ بھٹک گئے ہیں تو رات کے وقت انہیں وہاں زیادہ پریشانی ہو گی۔'' اس کے اندیشوں کے مطابق بہرام سے ملنے والی خبر واقعی بری اور تشویش ناک تھی جسے سنتے ہی وہ بہرام پر برسنے لگا۔

''پارٹی تو تیار ہے سر جی! ہو رہ وہ لوگ بس نکل ہی رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اطلاع اس لیے دی ہے کہ



اظفر باؤ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ اگر وہ ٹیم (ٹائم) گزرنے کے دو گھنٹے بعد بھی واپس نہ آئیں تو آپ کو خبر کر دی جائے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میرا جو بندہ ان کے ساتھ گیا تھا، اس کے پاس واکی ٹاکی تھا۔ میں بہت دیر سے اس سے گل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر بندہ جنگل میں بھٹک جائے تو خود سب سے پہلے واکی ٹاکی پر رابطہ کر کے خبر دیتا ہے کہ وہ مشکل میں ہے۔'' بہرام کے جواب نے حالات کی سنگینی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا لیکن عمیر اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا چنانچہ آس بھرے لہجے میں بولا۔

''ہو سکتا ہے واکی ٹاکی خراب ہو گیا ہو یا پھر رینج کا مسئلہ ہو۔''

''ہاں جی، ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو ہر چنگی بُری گل دماغ میں رکھ کر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ اب آپ اجازت دیں تو میں ادھر کی کارروائی دیکھوں۔'' بہرام نے سرسری سا جواب دے کر فون بند کرنے کی اجازت چاہی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ لیکن نہیں، ذرا سنو..... ایسا کرو کہ دو چار بندوں پر مشتمل ایک سرچ پارٹی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ۔ میں اپنے ایک بندے کے ساتھ خود وہاں پہنچتا ہوں۔ اس پارٹی کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔'' اس نے اچانک ہی خود اس کام میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

''جیسی آپ کی مرضی سر! لیکن آپ کا خاصا ٹیم لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جتنی دیر میں آپ ڈاک بنگلے پہنچیں، ہم اپنا کام مکمل کر کے واپس بھی آ جائیں۔'' بہرام نے اسے احساس دلایا کہ وہ کتنی دور موجود ہے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس وقت مجھے وہاں ہونا چاہئے۔ اگر میرے پہنچنے سے پہلے تم اظفر اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کر کے لانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس سے ملاقات کر کے واپس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سر جی! میں اپنے پیچھے چار بندے چھوڑ جاتا ہوں۔ اگر آپ کے پہنچنے تک میں اپنی ٹیم کے ساتھ واپس نہ آؤں تو آپ ان لوگوں کے ساتھ چل پڑنا، باقی آگے اللہ مالک ہے۔'' بہرام نے مکاری سے اسے جواب دیا جبکہ اس کے اپنے ذہن میں اب کوئی اور منصوبہ پل رہا تھا۔ اظفر سمیت ان سب کے انجام سے تو وہ واقف ہی تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی لاشیں اسے جنگل کے کس حصے سے ملیں گی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ خود یہ لاشیں دریافت کرنے کے بجائے ان کی دریافت کا سہرا عمیر کے سر رہے تو زیادہ بہتر ہے۔

ادھر عمیر نے مشابرم خان کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کر کے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ مشابرم خان شروع ہی سے ذمے دار اور فرض شناس آدمی تھا اس لیے گاڑی کو ہمیشہ بہترین حالت میں رکھتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے صرف احتیاطاً گاڑی کا تیل پانی چیک کیا اور وہ لوگ عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شام تو پہلے ہی ڈھل چکی تھی، مشابرم خان کی تیز رفتاری کے باوجود انہیں ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا پوری طرح پھیل گیا۔ بہرام بنگلے پر موجود نہیں تھا البتہ چار افراد ساز و سامان کے ساتھ تیار ان کے منتظر تھے۔

''نہیں صاحب! کوئی پتہ نہیں ملا۔ بہرام ساتھیوں کے ساتھ تلاش میں گیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے واکی ٹاکی پر اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ کوشش کر رہے ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا۔'' عمیر کے استفسار پر ایک آدمی نے اسے تازہ حالات سے آگاہ کیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

''ہم لوگ آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بہرام اور اس کے ساتھی جدھر گئے ہیں، ہم اس سے ہٹ کر دوسرے علاقے میں اظفر صاحب لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔'' عمیر کو خاموش پا کر وہ آدمی ایک بار

پھر بولا تو وہ بھی فوراً متحرک ہو گیا کہ یہاں کھڑے ہو کر پریشان ہونے سے تو کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ جو لوگ جنگل میں لاپتہ ہوئے تھے، انہیں ڈھونڈنے کے لیے جنگل میں داخل ہونا ہی تھا۔

ذرا دیر میں ہی ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس بار وہ اپنی گاڑی کے بجائے محکمۂ جنگلات کی جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے پاس طاقتور سرچ لائٹیں اور بڑی ٹارچیں موجود تھیں جن کی روشنی میں وہ اردگرد کا جائزہ لے سکتے تھے۔ جنگل کی دنیا میں اس بے وقت کی انسانی مداخلت نے وہاں موجود مخلوق کو بے چین کر دیا تھا اور روشنی میں وہ اِدھر اُدھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور باوجود یہ کہ وہ تعداد میں کئی تھے اور ان کے پاس مناسب اسلحے کے ساتھ ساتھ روشنی کا بھی معقول انتظام تھا، خود کو جنگل کی ہولناکی سے بے نیاز محسوس کرنا ممکن نہیں تھا۔

رات ہو جانے کے باوجود جنگل مکمل طور پر سویا ہوا نہیں تھا۔ شب پسند جانوروں کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جنگل کے مکین اپنی راجدھانی میں بیدار ہیں اور انہیں اپنے گھر میں بیرونی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی۔ کئی سوئے ہوئے جانور بھی جاگ گئے تھے اور اپنی اپنی بولیوں میں احتجاج کر رہے تھے۔ اس ہولناک ماحول کے باوجود وہ لوگ واپس جانے کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ انہیں جنگل کی ہولناکیوں میں کھو جانے والے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔

''وہ دیکھو.....اُدھر.....اُدھر کچھ ہے۔''

جیپ درمیانی رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ ایک آدمی ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا چیخا۔ سب کے سب اس طرف متوجہ ہو گئے اور روشنیوں کا رخ اس طرف کر دیا۔

روشنی پڑتے ہی تین چار جانور وہاں سے نکل کر بھاگے۔ ڈرائیور جیپ روک چکا تھا۔ وہ سب تیزی سے جیپ سے نیچے کودے۔ منظر ہولناک تھا۔ اُترتے ہی وہ اُدھڑی ہوئی لاشیں انہیں نظر آ گئی تھیں۔ عمیر نے فوراً ہی ان لاشوں کو اظفر اور اس کے ساتھی پروفیسر کے طور پر شناخت کر لیا۔ اس کے جائزہ لینے کے دوران باقی لوگ اِدھر اُدھر پھیل چکے تھے۔ باقی تین افراد کو بھی جلد ہی تلاش کر لیا گیا۔ زمین پر نصب خیمے اور وہاں موجود ان کی جیپ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جنگل میں پہنچتے ہی تھوڑی دیر بعد ان کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ لاشوں کی اُدھڑی ہوئی حالت دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ اچانک درندوں کے کسی غول کے نرغے میں آ گئے تھے اور انہیں اپنے بچاؤ کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

''کیا یہاں خونخوار درندے بھی پائے جاتے ہیں؟'' عمیر نے سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ سوال کیا۔

''یہاں بھیڑیے اور خونخوار کتے موجود ہیں لیکن وہ عام طور پر دن کی روشنی میں اپنے ٹھکانوں سے نکل کر شکار نہیں کرتے۔ اور ان لاشوں کی حالت دیکھ کر صاف لگ رہا ہے کہ ان کے ساتھ کئی گھنٹے پہلے حادثہ پیش آیا تھا۔'' وہ آدمی جو شروع سے ان کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا، بتانے لگا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ بہرام کو واکی ٹاکی پر واقعے کی اطلاع دینے کے ساتھ اپنی لوکیشن سے آگاہ کر چکا تھا اور اب اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

''یہ بندہ مرا نہیں ہے سر!.....ابھی اس کی سانس باقی ہے۔'' مشابرم خان جو کہ عملے کے افراد کے ساتھ لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے کام میں از خود شامل ہو چکا تھا، اظفر کے ساتھ آنے والے ڈرائیور پر جھکا اور چیخا۔ اس کی آواز پر عمیر اور دوسرے لوگ تیزی سے اس طرف بھاگے۔

ڈرائیور خالقو کا جسم بری طرح زخمی تھا۔ ہاتھ پیروں اور جسم کے دوسرے کئی مقامات پر سے گوشت بالکل غائب ہو چکا تھا اور ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی ایک آنکھ کا ڈیلا بھی باہر آ چکا تھا لیکن اس ہیبت



کذائی کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کی سانس چل رہی تھی۔ سانس کی یہ لے بے حد مدھم تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ڈوب جائے گی۔ لیکن ان پانچ افراد میں سے اس واحد شخص میں زندگی کی رمق پا کر وہ لوگ جوش میں آ گئے۔

''اسے جیپ میں ڈالو خان! اسے فوری طبی امداد ملنی ضروری ہے۔'' عمیر نے چلّا کر مشابرم خان کو حکم دیا جس نے اس کے حکم کی تعمیل میں لمحہ بھی نہیں لگایا۔

''تم لوگ یہاں رُک کر بہرام کا انتظار کرو۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اس بندے کو لے کر جا رہا ہوں۔ تم لوگ ڈیڈ باڈیز لے کر بہرام کے ساتھ آ جانا۔''

عمیر نے کسی کو بھی کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر خود ہی فیصلہ سنایا اور جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ ڈرائیور کو بھی پھرتی دکھانی پڑی۔ پیچھے مشابرم خان نیم جان خالقو کو سنبھالے بیٹھا تھا۔

''تمہاری جیپ میں فرسٹ ایڈ باکس تو ہو گا؟'' جیپ آگے بڑھی ہی تھی کہ عمیر نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''یس سر! پیچھے والی سیٹ کے نیچے ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

عمیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مشابرم خان نے سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لیا۔ لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر زخمی آدمی کو کس طرح طبی امداد دے۔ اس کا پُورپُور زخمی تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مرہم پٹی کا کام کہاں سے شروع کیا جائے۔

آخر اس نے ہمت کر کے اس کی نہایت بھیانک محسوس ہونے والی آگ کے ڈیلے پر دوا میں ڈوبا رُوئی کا پھاہا رکھ کر پٹی باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کام کا آغاز کر دیا۔ عمیر بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اگلی نشست کو پھلانگ کر پیچھے چلا آیا۔ سب سے پہلے اس نے زخمی خالقو کی نبض چیک کی۔ نبض بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا زندگی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ عمیر نے بے تابی سے فرسٹ ایڈ باکس کا جائزہ لیا اور ایک ننھی سی شیشی پر لگا لیبل پڑھنے کے بعد اس کا سرا توڑ کر سرنج میں محلول بھرا۔ چلتی گاڑی اور اس کی محدود روشنی میں یہ کام کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک انسانی زندگی بچانے کی لگن ان دونوں کے ہاتھوں کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے زخمی بازو میں دوا انجیکٹ کرتے ہی فوری ردِعمل ظاہر ہوا اور اس کی سانس کی رفتار یکدم بڑھ گئی۔ لیکن انداز ایسا تھا جیسے کوئی چراغ بجھنے سے پہلے پھڑپھڑا رہا ہو۔

''اس کے منہ میں پانی ڈالو خان!'' اس نے مشابرم خان کو حکم دیا تو اس نے فوراً ہی پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ مشکل سے چند قطرے پانی ہی نیم جان خالقو کے حلق سے نیچے اُتر سکا، باقی دونوں طرف کی باچھوں سے بہہ گیا لیکن چند قطرے پانی نے ہی خاصا کام کر دکھایا اور خالقو کی باقی بچ جانے والی اکلوتی آنکھ کے پپوٹے میں حرکت محسوس ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آنکھ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پا رہا ہو۔

''آنکھ کھولو مین!.....دیکھو تم محفوظ جگہ پر ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' اس کے رخسار پر ہاتھ مارتے ہوئے عمیر دیوانہ وار اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن خالقو کی آنکھ نہ کھل سکی۔ بس ہونٹوں نے یوں جنبش کی جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آواز باہر نکل سکتی۔ عمیر نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے ساتھ بالکل چپکا لیا۔

''چو..... چودھ..... ری..... اف..... اف..... یون.....'' بہت ہی دھیمی سرگوشی میں یہ چند ٹوٹے

ہوئے الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے اور پھر فوراً ہی خالقو کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ جھٹکے کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

عمیر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اُس کے بے جان وجود میں زندگی کی رمق کو محسوس کر سکے لیکن وہاں نہ تو دھڑکن تھی، نہ سانسوں کی سرسراہٹ۔ زندگی کا احساس دلانے والی نبض بھی مکمل طور پر ڈوب چکی تھی۔

''افسوس، یہ بھی نہیں رہا۔'' عمیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس شخص کی زندگی بچانے کی خواہش میں وہ اپنے کزن اظفر کی لاش کو نظرانداز کر کے آ گیا تھا لیکن پھر بھی اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ خالقو کی لاش کو تھامے بیٹھے مشابرم خان نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کا یہ رنگ دیکھ کر اسے شہریار کی یاد آئی۔ ایسے کسی موقع پر وہ بھی انہی کیفیات کا شکار نظر آتا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے سر؟'' پیچھے کان لگائے بیٹھے ڈرائیور کی آواز نے درآنے والے خاموشی کے وقفے کو توڑا۔

''ڈاک بنگلے چلو۔ پیچھے واپس جانا بے کار ہے۔'' عمیر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً اس وقت وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مرتے ہوئے خالقو نے جو آخری الفاظ ادا کیے تھے، وہ بہت اہم تھے اور اسے یقین تھا کہ ان الفاظ کو ڈرائیور نے تو کیا اس کے قریب بیٹھے مشابرم خان نے بھی نہیں سنا ہوگا۔

ادھر ڈرائیور اس کا جواب سننے کے بعد واکی ٹاکی پر مصروف ہو گیا۔ پہلے اس نے بہرام کو خالقو کی موت کی خبر سنائی، پھر بنگلے پر موجود عملے کے کسی فرد کو آگاہ کرنے لگا کہ وہ لوگ واپس آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ لاش موجود ہے۔ اس موقع پر عمیر اور مشابرم خان بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اسی خاموشی کے ساتھ انہوں نے واپسی کا سفر مکمل کیا۔ وہ لوگ بنگلے پر پہنچے تو وہاں پہلے ہی دو آدمی مستعد تھے۔ انہوں نے فوراً ہی خالقو کی لاش جیپ سے اُتار کر ایک طرف رکھی اور اسے ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

''آپ اندر چل کر بیٹھیں سر! بہرام وغیرہ باقی لاشوں کو لے کر واپس آ جائیں تو پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔'' ڈرائیور نے عمیر سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے فوراً ہی یہ تجویز قبول کر لی اور مشابرم خان کو مخاطب کر کے بولا۔ ''آؤ خان! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

مشابرم خان نے خاموشی سے اس کی بات پر عمل کیا۔

''اس حادثے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' دونوں کے نشستیں سنبھال لینے کے بعد عمیر نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔'' مشابرم خان نے فوراً ہی اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

''کیوں..... تم کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہو؟'' عمیر نے اضطراب سے پوچھا۔

''اپنے مشاہدے کی بنیاد پر۔ مرنے والے پانچوں افراد مسلح تھے اور ان کی بہادری اور پھرتی کے بارے میں بھی مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جائے وقوعہ پر کہیں بھی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آئے۔ پانچوں میں سے کسی نے بھی اپنا بارودی اسلحہ استعمال کیا، نہ ہی وہ خنجر جو اب بھی ان کی پنڈلیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ ان پر اچانک افتاد ٹوٹی تھی پھر بھی یہ بات بہت غیر فطری لگتی ہے کہ پانچ مسلح افراد میں سے کسی کو بھی اپنے اسلحے کو استعمال کرنے کا خیال نہیں آیا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ خطرہ ان کے لیے کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی اور جنگل میں داخل ہوتے وقت تو انہیں لازماً ذہنی طور پر کسی بھی بُرے وقت کے



لیے تیار رہنا چاہئے تھا۔'' مشابرم خان نے بلا جھجک اپنا مدلل تجزیہ پیش کر دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ واقعی قتل ہے۔ بالکل ویسا ہی قتل جس طرح پہلے شہزادی کو ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی موت کو حادثاتی رنگ دے دیا گیا تھا۔ شاید وہ بھی ایسے کسی راز سے واقف ہو گئی تھی جس کی تلاش میں یہ چاروں یہاں آئے تھے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان کا اپنا ساتھی کیسے مارا گیا؟'' عمیر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی اُلجھن بیان کی۔

وہ دونوں نہایت دھیمی آواز میں اور احتیاط سے گفتگو کر رہے تھے تاکہ کوئی اور ان کی آواز نہ سن سکے۔

''دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو خالقو غیر اہم اور ناواقف بندہ تھا یا پھر انہوں نے ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنے ہی ساتھی کو بلی چڑھا دیا ہے۔'' مشابرم خان کے پاس جواب موجود تھا جس سے عمیر نے بھی اتفاق کیا۔ اسی وقت انہوں نے بنگلے کے احاطے میں گاڑیاں رکنے کی آوازیں سنیں۔

''شاید وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔'' عمیر بے قراری سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ مشابرم خان نے اس کی پیروی کی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر پہنچے۔ باہر لاشیں اُتاری جا رہی تھیں۔ ایسی لاشیں جن کی حالت دیکھ کر کوئی بھی انسان بشرطیکہ اس کے دل میں انسانیت کی رمق باقی ہو، دکھ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور عمیر کا تو اظفر سے خونی رشتہ تھا، اس نے اپنے دل میں دکھ کی ایسی انی اُترتی محسوس کی جس کا زخم رُوح تک میں اُتر گیا۔

⊛----✪----⊛

''ہمیں نواب نوازش علی سے ملنا ہے۔'' وہ دو سادہ پوش تھے جن کا ہیئر اسٹائل اور باڈی لینگویج ان کے یونیفارم میں نہ ہونے کے باوجود اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔

گیٹ پر موجود چوکیدار خواجہ سرا ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ پہلے ہی رنجنی کے غیاب سے کوٹھی کی فضا خاصی کشیدہ تھی۔ آشا نے اس کی جان کھالی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے رنجنی کوٹھی سے کیسے غائب ہوئی؟ اس نے قسمیں کھا کھا کر آشا کو یقین دلایا تھا کہ وہ ساری رات نہایت چابک دستی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا ہے اور پوری رات کے دوران کسی انسان کا تو کیا، ایک چڑیا کا بچہ بھی کوٹھی سے باہر نہیں گیا۔ لیکن آشا نے پھر بھی اسے نہیں بخشا تھا اور یہی کہتی رہی تھی کہ وہ غفلت کا مرتکب ہوا ہے۔ ان مخدوش حالات میں سادہ پولیس والوں کا نواب صاحب سے ملنے کے لیے آنا خاصا معنی خیز تھا۔

''نواب صاحب تو تشریف نہیں رکھتے۔ آپ لوگ اپنا کارڈ وغیرہ دے جائیں۔ وہ آئیں گے تو انہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر آنے والوں کی پہچان سے تغافل برتتے ہوئے جواب دیا۔ ویسے بھی آج کے لیے آشا کی یہی ہدایت تھی کہ آنے والے ہر ملاقاتی کو باہر سے ہی ٹال دیا جائے۔ کوٹھی میں ان خواجہ سراؤں کا اتنا اثر و رسوخ تھا کہ نواب صاحب کے منیجر کو بھی بلا اجازت انیکسی سے نکل کر کوٹھی کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

''نواب صاحب کہاں گئے ہیں؟'' آنے والوں نے اس کا جواب سنا تو ضرور لیکن عمل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں سوال داغ دیا۔

''مالک کے معاملوں کی نوکر کو بھلا کیا خبر؟..... وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جب چاہیں، جہاں چاہیں جائیں اور جب چاہیں واپس آئیں۔ ہم غریبوں کو ان سے سوال کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟''

PAKISTANIPOINT

اس نے بڑا سیاسی سا جواب دے کر ایک طرح سے واضح کر دیا کہ اگلا کوئی سوال بھی بیکار ہے اور وہ انہیں اپنے مالک کی مصروفیات سے قطعی آگاہ نہیں کر سکتا۔

''ٹھیک ہے، نواب صاحب موجود نہیں بھی ہیں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے پاس کوٹھی کا سرچ وارنٹ موجود ہے اور ہم یہاں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔'' آنے والوں نے یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے کوٹھی کو زیرِ نگرانی رکھے ہوئے ہیں اور جانتے ہیں کہ نواب صاحب کوٹھی سے باہر نہیں نکلے، اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

''شما چاہتی ہوں صاحب! نواب صاحب کی غیر موجودگی میں کسی کو کوٹھی میں آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔''

''تم سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟ ہم صرف قانون کی اجازت لیتے ہیں اور قانون نے ہمیں یہ اجازت دے دی ہے۔'' اس کا جواب سن کر آنے والوں کا غصہ کئی گنا بڑھ گیا اور انہوں نے ترشی سے جواب دیتے ہوئے اس پر اپنی پوزیشن واضح کی۔ پھر ان میں سے ایک نے فضا میں ہاتھ بلند کر کے ایک خاص قسم کا اشارہ کیا تو جانے کن کونے کھدروں میں چھپے مسلح افراد سامنے آ گئے۔ ان مسلح افراد کو دیکھ کر چوکیدار کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

''ایک منٹ رُکیں صاحب! میں اندر سے منیجر کو بلواتی ہوں۔'' چوکیدار خواجہ سرا کی گھبراہٹ لازمی تھی۔ وہ اس کوٹھی کے رازوں سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ پولیس نے اگر کوٹھی کے اندر سرچ آپریشن کیا تو نہ صرف نواب صاحب کو دریافت کر لے گی بلکہ اسلحے کا وہ ذخیرہ بھی نظروں میں آ جائے گا، جسے نواب صاحب کی لاعلمی میں کوٹھی کے تہ خانے میں رکھا گیا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ بلواؤ منیجر کو..... دیکھتے ہیں وہ کتنا طرّم خان ہے اور ہمیں کیسے روکتا ہے؟'' وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ چوکیدار تاخیری حربے آزما کر کسی طرح انہیں سرچ آپریشن سے روکنا چاہتا ہے لیکن ان کی تیاری بھی مکمل تھی اور انہوں نے کوٹھی کے اطراف میں اتنا زبردست محاصرہ کر رکھا تھا کہ کسی کا بھی یہاں سے بچ کر بھاگ نکلنا مشکل تھا۔

''آشا دیدی! منیجر صاحب کو باہر بھیج دیں۔ باہر پولیس والے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوٹھی کی تلاش کا وارنٹ موجود ہے۔'' منیجر کو بلوانے کا تو محض بہانہ تھا، اصل میں اسے اندر کی کمانڈ سنبھالے بیٹھی آشا کو آگاہ کرنا تھا اس لیے بجائے منیجر سے براہِ راست رابطہ کرنے کے آشا کو انٹرکام پر اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، انہیں انتظار کرواؤ۔ منیجر ابھی آتا ہے۔'' آشا نے گمبھیر لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ کئی منٹ کے انتظار کے بعد سن رسیدہ مخنی سا منیجر ہانپتا کانپتا گیٹ پر نمودار ہوا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں سر! آپ نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟'' اس نے نہایت حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنے والوں سے دریافت کیا۔ یہ اور بات کہ اس کی حیرت کے اظہار پر چہرے پر چھایا ہوا خوف غالب تھا۔

''اگر یقین نہیں آتا تو یہ وارنٹ دیکھ لو۔'' آفیسر نے اس کی طرف وہ وارنٹ بڑھایا جس کو چوکیدار نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ منیجر نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر غور سے پڑھا۔

''سرکاری حکم سے انکار نہیں سر! لیکن ذرا سوچیں کہ اگر مسلح افراد نے کوٹھی کی تلاشی لی تو نواب صاحب کی عزت ملیامیٹ ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ آپ کو ان پر



جو بھی شبہ ہے، وہ غلط ہے۔ نواب صاحب ایک امن پسند شہری ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ ان کی عزت کا خیال کریں اور اگر یہ معاملہ کسی اور طرح سیٹل ہو سکتا ہے تو بتائیں۔ ہم آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔'' منیجر نہایت عاجزانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن اُس کی اس عاجزی کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔

''ہمیں لالچ دیتا ہے بڈھے!..... وہ اور لوگ ہوں گے جو چند ٹکوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتے ہوں گے۔ ہم جس کام کی تنخواہ لیتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں، تیسرے جیسوں کے بہکانے پر سیٹل منٹ کرنے نہیں بیٹھ جاتے۔ تُو اپنے عیاش نواب کی عزت کی کیا بات کرتا ہے۔ اس کوٹھی میں زنخوں کی فوج بھرتی کر کے اس نے بہت عزت کمائی ہے جو ہمارے ریڈ کرنے سے خراب ہو جائے گی۔'' ان میں سے ایک نے سخت طیش میں آ کر منیجر کی پتلی سی گردن کو دبوچ لیا۔ مخنی سا منیجر اس کے تیور دیکھ کر بری طرح ہانپنے لگا۔

''اسے موبائل میں ڈلواؤ۔ اب ان لوگوں سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ ہمیں زبردستی کوٹھی کے اندر گھسنا ہو گا۔'' دوسرے افسر نے مشورہ دیا تو پہلے والے نے منیجر کو اپنی پشت پر کھڑے سپاہی کی طرف دھکیل دیا۔ اسی وقت کوٹھی کی طرف سے ایک ہوائی فائر ہوا۔ ردِعمل میں فوراً ہی سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں اور ان دونوں افسران نے بھی بغلی ہولسٹر میں موجود خوفناک گنیں کھینچ لیں۔ لیکن پھر بھی ان سے ذرا سی چُوک ہو گئی تھی اور منیجر سے نمٹنے کے دوران چوکیدار نے برق رفتاری سے اندر گھس کر گیٹ بند کر لیا تھا۔

''بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے دور ہٹ جاؤ۔ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن کسی کو کوٹھی کے اندر داخل ہونے نہیں دیں گے۔'' فائر کی آواز معدوم ہوتے ہی اندر سے کسی نے چیخ کر کہا۔

''قانون کے مقابل آ کر تم لوگ اپنے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہو۔ کوٹھی پوری طرح محاصرے میں ہے اور ہماری نظروں میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ہمیں اندر آنے کا راستہ دے دو۔ ہم اپنا کام بغیر خون خرابے کے خاموشی سے کرنا چاہتے ہیں۔'' ادھر سے جواب دیا گیا۔

''خون خرابہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم لوگ کوٹھی کے آس پاس سے محاصرہ ختم نہ کرو اور ہمیں یہاں سے محفوظ طریقے سے نکلنے سے روکو۔ ہمارے لیے جان دینا اور لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو نواب نوازش علی اور اس کی فیملی بے موت ماری جائے گی۔ اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں ہم انہیں ایک ایک کر کے ہلاک کر دیں گے۔'' اندر سے مزید جارحانہ لہجے میں دھمکی دی گئی۔

''ہم اس دھمکی میں آنے والے نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی چوکیدار نے ہمیں بتایا ہے کہ نواب صاحب کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔'' ادھر والوں کو بھی سب حقیقتِ حال سے آگاہی تھی لیکن محض وقت لینے کے لیے یہ جواب دیا۔

اس بات کا خدشہ تو پہلے ہی موجود تھا کہ اندر والوں نے مزاحمت کی تو سب سے پہلا قدم وہ یہی اٹھائیں گے کہ نواب صاحب اور ان کی فیملی کو یرغمال بنانے کی کوشش کریں۔ جاوید علی نے انہیں حالات سے جس حد تک آگاہ کیا تھا، اس کے مطابق نواب نوازش علی کی فیملی محفوظ تھی لیکن خود ان کی اور ان کے ایک جاں نثار خواجہ سرا کی حفاظت کے لیے جاوید علی کچھ نہیں کر سکا تھا اور وہ بدستور خطرے میں تھے۔

''تم سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ نواب نوازش علی، اس کی فیملی اور اس کی وفادار ملازمہ اب بھی اندر موجود ہے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری بات نہ مانی تو وہ سب اپنی جان سے چلے جائیں گے۔'' اندر سے جواب دیا گیا۔

''ہم تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ تم ثبوت دینے کے لیے نواب صاحب کو کوٹھی کی چھت پر لے آؤ

تا کہ ہم انہیں اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں۔'' ادھر سے مطالبہ کیا گیا۔

''تم نے ہمیں بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟ ہمیں معلوم ہے کہ جیسے ہی ہم میں سے کوئی نواب صاحب کو لے کر کوٹھی کی چھت پر پہنچے گا، تمہارے اسنائپرز اسے شوٹ کر دیں گے۔'' اندر سے چلاتی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ ایک گھنے درخت کی شاخوں میں بیٹھا جاوید علی اس آواز کو شناخت کر سکتا تھا۔ وہ یقینی طور پر آشا تھی جو اس وقت دہشت گردوں کے اس ٹولے کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھی۔

''اس سے کہو کہ نواب صاحب کو چھت کے جائے اوپری منزل کی سامنے والی کھڑکی میں لے کر آئے۔ کھڑکی میں وہ خود کو چھت کے مقابلے میں خاصا محفوظ سمجھے گی۔ آگے میرا کام ہے کہ میں انہیں کس طرح سنبھالتا ہوں۔'' اس موقع پر جاوید علی نے اپنی خاموشی توڑ کر باہر موجود آفیسر سے رابطہ کر کے اسے مشورہ دیا۔

آفیسر نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل مسئلہ نواب صاحب اور ان کے وفادار خواجہ سرا کا ہے۔ اس خواجہ سرا کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خواتین کے بارے میں البتہ معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہیں اور انہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری یہ بات مان رہی ہوں۔ لیکن یاد رکھنا کہ ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' آفیسر کے مطالبے کے جواب میں آشا نے تھوڑا سا توقف کیا پھر دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''دھوکے کی صورت میں فوراً ہی نواب صاحب کو گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد باقی لوگوں کو بھی۔ ہماری جانیں تمہیں کسی صورت سستی نہیں پڑیں گی اور ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے تو کسی اور کا جیون بھی نہیں بچے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم نے سب سن لیا ہے۔ پہلے تم نواب صاحب کو تو سامنے لاؤ پھر ہم دوسرے مسئلوں پر بات کریں گے۔'' مجاز آفیسر نے اسے جواب دیا۔ آشا کی دھمکیوں کے پیچھے موجود خوف اس سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اس معاملے کو نہایت احتیاط سے ہینڈل کرنے کی ضرورت تھی۔

کوٹھی میں محصور مجرم اسی کیفیت سے گزر رہے تھے جن سے کسی بند کمرے میں موجود بلی گزرتی ہے۔ اس محصور و مجبور بلی سے پلٹ کر پنجہ مارنے کا اندیشہ رہتا ہے اور یہاں بھی سب کی نہیں تو کم از کم نواب نوازش علی اور کاجل کی زندگی خطرے میں تھی۔ اخلاقی بے راہ روی کے باوجود ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ نواب صاحب ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہیں بلکہ آثار سے یہی لگتا تھا کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی لاعلمی میں انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔

ادھر درخت پر چھپا جاوید علی پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نواب صاحب کو کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچانے کی تجویز اس لیے پیش کی تھی کہ اسے معلوم تھا، وہاں تک پہنچنے کے لیے اسی راستے سے گزرنا پڑے گا جہاں وہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ امکان یہی تھا کہ نواب صاحب کو بالائی منزل پر آشا خود لے کر جائے گی، البتہ وہ اپنی معاونت کے لیے ایک دو افراد کو ساتھ رکھ سکتی تھی اور محفوظ پوزیشن پر ہونے کی وجہ سے جاوید علی کے لیے دو تین افراد سے بیک وقت نمٹنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ راستے پر آنکھیں جما کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندازے کے برخلاف وہاں سے نواب صاحب اور آشا کے نمودار ہونے کے بجائے دو اسلحہ بردار خواجہ سرا بھاگتے ہوئے آئے۔ اس نے ان کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ حدِ نظر تک کوئی اور موجود نہیں تھا۔ شاید آشا نے خود اوپر جانے سے پہلے ان دونوں کو جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا، یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ اپنے دعوے کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے اوپر موجود خواتین کو اپنی تحویل میں لینے کی کوشش میں اس طرف آئے ہوں۔



جاوید علی چاہتا تو آسانی سے ان دونوں کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کو زک پہنچتے ہی آشا تیار ہو جاتی اور خطرے کو بھانپنے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ بذریعہ طاقت ان لوگوں کے لیے کوٹھی پر قبضہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ وہاں موجود بے گناہ انسانوں کی جانیں کسی صورت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔

ان ساری مصلحتوں کے پیشِ نظر اس نے ان دونوں کو اپنی پہنچ میں ہونے کے باوجود اوپر جانے سے نہیں روکا۔ اوپر موجود خواتین کی طرف سے ویسے بھی اسے اطمینان تھا کہ وہ نواب صاحب کی خواب گاہ میں محفوظ و مامون ہیں۔ نزدیک سے گزرنے پر اس نے خواجہ سراؤں کو شناخت کر لیا تھا۔ وہ مدھو اور نندنی تھیں، مبینہ طور پر مقتول شالنی کی وفادار اور اب آشا کی فرمانبردار۔ مدھو اور نندنی کے وہاں سے جاتے ہی آشا، نواب صاحب کے ساتھ کچھ اس طرح منظر پر آئی کہ اس نے نواب صاحب کو پسٹل کی زد میں لے رکھا تھا اور لڑکھڑاتے ہوئے نواب صاحب ایک دوسرے خواجہ سرا کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔

پسٹل کے علاوہ آشا کے شانے سے ایک خوفناک کلاشنکوف بھی لٹک رہی تھی جبکہ اس کی ساتھی بھی پوری طرح مسلح تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ لوگ مرنے اور مارنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ جاوید علی سنبھل گیا اور اس کے بے آواز پسٹل سے گولی نکل کر آشا کے پسٹل والے ہاتھ میں پیوست ہو گئی۔ پسٹل ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور اس نے کراہتے ہوئے اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ جاوید علی اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے رُکا نہیں تھا۔ بلکہ فوراً ہی دوسرے خواجہ سرا پر گولی داغ دی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ خواجہ سرا اپنے بچاؤ کے لیے نواب صاحب کو چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا اور وہ گولی جو شاید اس کے نچلے جسم کے کسی حصے پر پیوست ہوتی تھی، اُس کے سر میں گھس گئی جس کے جان لیوا ہونے میں کوئی شک ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مدہوش نواب صاحب بھی اس کے سہارے سے محروم ہوتے ہی زمین بوس ہو گئے تھے اور حالت کی سنگینی سے بے خبر خاک چاٹ رہے تھے۔ آشا نے البتہ زخمی ہونے کے باوجود کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور شانے سے کلاشنکوف اُتارنے لگی۔ لیکن اس کی یہ کوشش جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ اس بار اُس کی چلائی ہوئی گولی نے آشا کے بازو کو نشانہ بنایا تھا۔ دونوں ہاتھ زخمی ہونے کے بعد وہ مجبور تھی اور مقابلے پر ڈٹ نہیں سکتی تھی اس لیے شدید تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود بھاگ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش بھی جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ وہ درخت سے چھلانگ لگا کر براہِ راست آشا کے اوپر کودا تو وہ دونوں اس طرح زمین بوس ہو گئے کہ آشا، جاوید علی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔

''تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ صرف ہم دونوں کو زیر کر لینے سے تمہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ ہمارے علاوہ اور بھی ہیں جو نواب صاحب اور ان کی فیملی کو مار ڈالیں گے۔'' مغلوب ہو جانے کے باوجود اس نے جاوید علی کو دھمکانے کی کوشش کی اور مزید بولی۔ ''اوپر میرے ساتھی موجود ہیں۔ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے، اگر انہیں اس کے بارے میں خبر ہو گئی تو نواب صاحب کی بیویاں اور بیٹی اپنی جان سے جائیں گی۔''

اس کے اندازِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ جاوید علی کو رنجنی کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکی ہے۔ ظاہر ہے ایک سجے بنے خواجہ سرا اور زور آور لڑاکے میں مماثلت تلاش کرنا آسان تھا بھی نہیں۔ اس لیے اس کا دھوکا کھا جانا سمجھ آتا تھا۔ یقیناً اس کے بارے میں وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ وہ باہر موجود فورس کا کوئی کمانڈو ہے جو کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

''نواب صاحب کی فیملی کا ذکر چھوڑو اور فی الحال اپنی فکر کرو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میری تیسری گولی سیدھی تمہارے بھیجے میں اُترے گی۔'' آشا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاتے ہوئے اس نے اسے

جواب دیا۔ ردِعمل میں آشا نے اس پر لاتیں چلانے کی کوشش کی۔ وہ چونکہ کوٹھی میں ڈرائیور کے فرائض انجام دیتی تھی اس لیے دیگر خواجہ سراؤں کی طرح زرق برق لباس کے بجائے ڈرائیور کی چست یونیفارم زیب تن کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر یونیفارم موجود تھی۔ جو خون آلود ہونے کے باوجود اسے چستی کا مظاہرہ کرنے میں مدد دے رہی تھی۔ اور بھاری بھرکم زنانہ لباس کی طرح حرکت میں مزاحم نہیں تھی۔ بہرحال اس کی مزاحمت جاوید علی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اپنے بدن پر اس کی ٹانگوں کے وار سہنے کے بعد اس نے آشا کو گھونسوں اور مکّوں پر رکھ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی وہ بے بس نظر آنے لگی۔ ناک سے بہتے خون اور چہرے پر پڑنے والی ضربوں نے اس کے خوب صورت چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔

جاوید علی نے اسے چھوڑا اور پہلے زمین پر خاک چاٹتے نواب صاحب کو گھسیٹ کر پھولوں کے ایک کنج کے پیچھے اس طرح لٹا دیا کہ وہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں ورنہ اگر آشا کے ساتھیوں میں سے کوئی اس طرف آنکلتا تو ایک بار پھر نواب صاحب کو یرغمال بنا کر ان کے لیے مسائل کھڑے کر دیئے جاتے۔ نواب صاحب کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آشا کو پسٹل کی زد پر لے کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ زخمی آشا نے بمشکل اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب جاوید علی کا رخ بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف اس حال میں تھا کہ آشا کو اس نے ڈھال کے طور پر اپنے آگے لگا رکھا تھا اور آشا کی کلاشنکوف اب اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے اسے احساس ہو گیا کہ مدھو اور نندنی، نواب صاحب کی اس خوب گاہ کا دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف ہیں جہاں شازمین اور نواب صاحب کی بیگمات نے پناہ لے رکھی ہے۔ اس نے آشا کو ٹہوکا لگا کر رفتار بڑھانے کا اشارہ کیا۔ اس کے قدموں کی واضح آہٹیں سن کر یقیناً مدھو اور نندنی متوجہ ہو گئی تھیں چنانچہ جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، اس نے مدھو کو سامنے کھڑا پایا۔ لیکن یقینی طور پر وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے تو آہٹیں سن کر یہی سمجھا ہوگا کہ اس کے اپنے ساتھی نواب صاحب کو لے کر اوپر آرہے ہیں۔ لیکن وہاں تو منظر ہی قطعی خلافِ توقع تھا جسے دیکھ کر مدھو کا منہ کھل گیا۔

''تم اور نندنی اپنے ہتھیار پھینک دو، ورنہ یہ اپنی جان سے جائے گی۔'' اس کے سنبھلنے سے پہلے جاوید علی نے اسے حکم دیا۔ اس نے ایک نظر بے بس آشا کو دیکھا اور ہتھیار پھینک دیا۔ باتوں کی آواز سن کر نندنی بھی وہیں آگئی تھی اور اسے بھی اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔

''اب تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔'' جاوید علی نے دوسرا حکم سنایا۔ ناچار اس کی بھی تعمیل کرنی پڑی۔ جاوید علی، آشا سمیت ان کے قریب پہنچا اور پسٹل کا دستہ دونوں کے سروں پر آزما کر انہیں انشاغفیل کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نواب صاحب کی خواب گاہ پر مخصوص انداز میں دستک دی۔ فوراً ہی شازمین نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خاصی خوف زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ خواب گاہ کے محفوظ ہونے کے باوجود شاید اسے ڈر رہا ہوگا کہ کہیں مدھو اور نندنی اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

''تم تینوں خواتین مل کر ان دونوں کو کسی کمرے میں بند کرو اور دوبارہ بیڈروم میں جا کر خود کو بند کر لو۔'' جاوید علی نے اسے ہدایت دی اور خود تیزی سے آشا سمیت ایک کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے بازو میں دبی آشا زخموں سے مسلسل بہتے خون کے باعث کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے مزاحمت کے قابل نہیں رہی ہے۔ لیکن اسے آشا کے بے ہوش ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔ وہ دشمن کی چال اسی پر اُلٹنے جا رہا تھا۔

''کوٹھی میں موجود تمام خواجہ سراؤں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ان کی لیڈر آشا میرے قبضے میں ہے اور اگر تم



لوگوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو یہ اپنی جان سے جائے گی۔'' ایک ایسی کھڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد جہاں کم از کم گیٹ پر موجود چوکیدار واضح طور پر آشا کو دیکھ سکے، اس نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ اس کا یہ اعلان باہر موجود اپنے ساتھیوں کے لیے بھی اشارہ تھا کہ اندر کے حالات کافی حد تک اس کے کنٹرول میں ہیں اس لیے وہ اپنی کارروائی کر سکتے ہیں، فوراً ہی ردِعمل ظاہر ہوا اور باہر موجود مسلح قانون کے رکھوالوں نے کوٹھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ فضا یکدم ہی مختلف قسم کے ہتھیاروں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ اس گونج میں نحیف پڑتی آشا کا قہقہہ منفرد اور چونکا دینے والا تھا۔ جاوید علی حیران سا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم لوگ یہاں سے لاشوں اور ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ باہر موجود میرے ساتھی میری جان بچانے کے لیے ہتھیار ڈال دیں گے۔ میں پہلے ہی انہیں بتا کر آئی ہوں کہ انہیں زیر ہونے کی صورت کیا کرنا ہے۔''

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دھماکے سے سنائی دینے لگے۔ یہ دھماکے ان آوازوں سے قطعی مختلف تھے جو اب تک مختلف ہتھیاروں کے چلنے کی صورت میں سنائی دیتے رہے تھے۔ ان دھماکوں نے صرف فضا کو ہی نہیں لرزا دیا تھا بلکہ کوٹھی کی عمارت کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لرزتی عمارت کے ساتھ جاوید علی نے خود اپنا وجود بھی ڈگمگاتا ہوا محسوس کیا اور بس یہ آخری احساس تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ ڈگمگاتی، ریزہ ریزہ ہوتی عمارت کا ملبہ تھا جو اس پر آگرا تھا اور اس کی سانسوں کا سلسلہ رک سا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

شہریار بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کراچی میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی رپورٹ اسے بھی مل چکی تھی۔ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس کی مدد سے کیے جانے والے سی ایف پی کے ریڈ کے عجیب و غریب نتائج نکلے تھے۔ جاوید علی کی فراہم کردہ معلومات اور حالات کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی تھی، اس کے مطابق نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں کے شکار نواب نوازش علی کو شالنی نے جو کہ مبینہ طور پر ''را'' کی ایجنٹ تھی، کچھ اس طرح سے اپنے جال میں پھانسا تھا کہ عملاً وہ اس کا مطیع ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن اسے خود بھی اس حقیقت کی خبر نہیں تھی۔ خوبصورت خواجہ سراؤں کے جھرمٹ میں اسے احساس ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کی ناک کے نیچے اس کوٹھی میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

شالنی نے کچھ اس طرح سے جال بچھایا تھا کہ نواب کی کوٹھی ایک طرف تو انتہا پسند ہندو خواجہ سراؤں کا ٹھکانہ بن گئی تھی اور دوسری طرف وہ اسلحے کی ذخیرہ اندوزی جیسے خطرناک کاموں کے لیے اس کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے۔ کوٹھی میں موجود تقریباً سارے خواجہ سرا انتہا پسند تنظیم کے رکن تھے۔ صرف چند ایسے تھے جنہیں حقائق کا علم نہیں تھا اور نہایت غیر محسوس طور پر انہیں اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کسی خاص موقع پر جب کوٹھی میں ان انتہا پسند خواجہ سراؤں کا اجتماع ہوتا تو نواب صاحب کو شراب اور کسی خوبصورت خواجہ سرا کے ذریعے مدہوش کر دیا جاتا۔ نواب صاحب کا خاندان تو ویسے ہی عملی طور پر کوٹھی کی نچلی منزل سے کٹا ہوا تھا چنانچہ وہ لوگ مزے سے اپنی کارروائیاں جاری رکھتے۔ کوٹھی کے وسیع و عریض تہ خانے میں انہوں نے اپنی خونی دیوی کا مجسمہ رکھ چھوڑا تھا اور مخصوص تاریخوں پر وہیں اپنی بھیانک رسومات انجام دیتے تھے۔ اس موقع پر باہر سے بھی تنظیم کے کارکن خواجہ سرا جمع ہوتے تھے البتہ کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کو اس محفل سے دور رکھا جاتا تھا۔

یہ تہ خانہ ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے لیے بھی بے حد موزوں جگہ تھی۔ ہتھیاروں کی آمدورفت کے لیے بھی اجتماعات والی ترکیب استعمال کی جاتی۔ بعد میں پکڑے جانے کا ڈر اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ نواب

صاحب کو تو تہ خانے میں جھانکنے کی فرصت نہیں تھی اور ملازمین میں سے بھی صرف چند ایک ہی جو محرمِ راز تھے، اس طرف جا سکتے تھے ورنہ تہ خانہ مقفل رہتا تھا۔

جاوید علی کے کہنے پر جب کوٹھی پر ریڈ کیا گیا تو حالات میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ ان تبدیل شدہ حالات کے بارے میں ایک خواجہ سرا نے معلومات فراہم کیں۔ شالنی کی موت کے بعد ورما نے براہِ راست آشا سے رابطہ کیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ رنجنی نامی خواجہ سرا پر خصوصی نظر رکھے لیکن کاجل کی ملی بھگت سے رنجنی غائب ہو گئی۔ آشا نے اس پر بے حد تشدد کیا کہ کسی طرح وہ رنجنی کے بارے میں معلومات فراہم کر دے لیکن کاجل نے زبان نہیں کھولی۔ تشدد کی انتہا پر جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو اس نے صرف اتنا اعتراف کیا کہ رنجنی کوٹھی میں ہی موجود ہے۔ کہاں؟ اس بارے میں کچھ بتائے بغیر ہی وہ مر گئی۔ ان لوگوں نے اپنے اندازے کے مطابق شازمین کو رنجنی کے غیاب میں ملوث سمجھتے ہوئے اس کے کمرے وغیرہ کی تلاشی لی لیکن وہاں انہیں کوئی نہیں ملا۔

ابھی وہ لوگ غور کر ہی رہے تھے کہ آیا وہ شازمین پر زور زبردستی کر کے رنجنی کے بارے میں کچھ اُگلوا سکتے ہیں یا نہیں کہ کوٹھی پر پولیس کا ریڈ ہو گیا۔ آشا سمیت چند سرکردہ خواجہ سراؤں نے اپنی دیوی کی قسم کھا کر بہت عرصے پہلے شالنی کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ بدترین حالات میں بھی وہ کبھی خود کو زندہ قانون کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے اور تہ خانے سے بھی کوئی کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ جب فورس کے افسر کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ آشا نواب صاحب کو لے کر سامنے آئے تو آشا اس بات پر عمل کرنے سے پہلے اپنے دو معاونین کو یہ حکم دے کر گئی کہ اس کے زیر ہونے کی صورت میں تہ خانے کو تباہ کر دیا جائے۔

نامساعد حالات میں کی جانے والی تباہی کا یہ منصوبہ شالنی کی زندگی سے ہی طے شدہ تھا اور اس کے لیے انتظامات بھی کیے گئے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کو عمل کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگے۔ تباہ ہونے والا اسلحے کا ڈھیر ہولناک تباہی کا سبب بنا۔ کوٹھی کی عمارت لمحوں میں زمین بوس ہو گئی۔ نچلی منزل پر موجود کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔ ملبے کے ڈھیر سے صرف یہی ایک خواجہ سرا شدید زخمی حالت میں زندہ ملا تھا جس نے انہیں یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ بعد میں وہ بھی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا تھا۔

لان میں بے ہوش پڑے نواب صاحب اپنی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے تباہ ہوتی عمارت سے اُڑ کر سر پر لگنے والے ایک نوکیلے پتھر کی وجہ سے زندگی کی جنگ ہار گئے تھے اور شاید یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا ورنہ زندہ رہنے کی صورت میں انہیں جس ذلت اور رسوائی سے گزرنا پڑتا، اسے وہ اپنی تمام تر اخلاقی کج روی کے باوجود سہہ نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ لاکھ بگڑے ہوئے سہی، تھے تو ایک عزت دار خاندان کے چشم و چراغ جن کے ہاں اپنی تمام تر عیش پرستی کے باوجود وطن سے غداری کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی دونوں بیگمات اور بیٹی شازمین اس تباہی میں بالکل محفوظ رہی تھیں۔ وہ تینوں ترچھے ہو کر گرنے والے چھت کے ایک بڑے حصے کے نیچے اس طرح محفوظ ہو گئی تھیں کہ انہیں ایک خراش تک نہیں آئی تھی البتہ دہشت نے انہیں بے ہوش ضرور کر دیا تھا۔ معمولی سی طبی امداد کے نتیجے میں وہ تینوں ہوش میں آ گئی تھیں اور فی الحال انہیں دارالامان بھجوا دیا گیا تھا۔

کانوینٹ میں زیرِ تعلیم نواب صاحب کے بیٹے کراچی پہنچتے تو ماں بہن کی ذمے داری سمیت جائیداد کا قبضہ خود نمٹا لیتے۔ اس پورے آپریشن میں کلیدی کردار ادا کرنے والا جاوید علی بری طرح متاثر ہوا تھا اور شدید زخمی حالت میں ہنوز ہسپتال کے انتہائی نگہداشت والے حصے میں زیرِ علاج تھا کرنل توحید نے بذاتِ خود اس کے علاج کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں اور واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر یہاں اس کا علاج ممکن نہیں ہوا تو علاج



کے لیے اسے بیرونِ ملک بھی بھجوایا جا سکتا ہے۔ ملکی سلامتی کے لیے اپنی جان نثار کر دینے کا عزم رکھنے والا سی ایف پی کا ہر جوان اُن کے نزدیک بہت قیمتی تھا اور وہ ان میں سے کسی کی بھی جان کی خاطر بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتے تھے۔

اس پورے واقعے نے واضح کر دیا تھا کہ دشمن کی جڑیں وطنِ عزیز میں کتنی گہری ہو چکی ہیں۔ جاوید علی ہی کی مدد سے وہ لوگ شمشان گھاٹ میں ہونے والی اسلحے کی ایک ڈیلیوری کو بھی پکڑ چکے تھے۔ پکڑے جانے والے مجرموں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ یہ اسلحہ لسانی، سیاسی اور فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے والے عناصر کو فروخت کرتے ہیں۔ ''را'' کا مقصد چونکہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا تھا اس لیے وہ انتہائی کم نرخ پر ان دہشت گردوں کو فراوانی سے اسلحہ فراہم کرتے رہتے تھے۔ اس میں سے زیادہ تر اسلحہ امریکی ساختہ تھا جو انہوں نے ''موساد'' کے تعاون سے حاصل کیا تھا اور یوں دونوں دشمن ملک کی ایجنسیاں مشترکہ ایجنڈے پر کام کر رہی تھیں۔

یہ کوئی نئی باتیں یا حقائق نہیں تھے جن سے شہریار آشنا ہوا ہو۔ اسے اس بات کا بھی غم نہیں تھا کہ اس معاملے کے حقائق کو ہمیشہ کی طرح عوام سے چھپا لیا گیا تھا اور میڈیا کو یہ بتایا گیا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی کے تہ خانے میں گیس کے کچھ سلنڈر رکھے تھے، اتفاق سے ان میں سے ایک سلنڈر پھٹ گیا اور اس آتش گیر مادے کو زد میں لے لیا جو کوٹھی میں ملازم ہندو خواجہ سراؤں نے آنے والی دیوالی کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ آگ بھڑکی تو باقی ماندہ سلنڈر بھی پھٹ گئے اور یوں ایک ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ کوٹھی کو مکمل طور پر کلیئر کرنے سے قبل میڈیا کے کسی نمائندے کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور نہایت صفائی سے حقائق کو چھپا لیا گیا تھا۔ ایسا ہائی کمان کے حکم پر ہوا تھا جس کے سامنے سب مجبور تھے۔ سی ایف پی والوں کی مجبوری اور بھی زیادہ اس لیے بڑی تھی کہ وہ اپنے وجود کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور ہائی کمان کو بھی یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آپریشن میں خفیہ ایجنسی کے ساتھ دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے شامل تھے۔ اس رازداری کے پیچھے کیا مصلحت تھی، یہ تو ہائی کمان کو ہی معلوم ہو گی لیکن اپنی جان کی بازی لگانے والے اس لیے کُڑھتے رہے تھے کہ اس کے مقابلے میں اگر بھارت میں دہشت گردی کی کوئی معمولی سی بھی واردات ہوتی تو بھارت کھل کر پاکستان پر الزام لگاتا۔

شہریار نے فی الحال اس بات کو بھی نظرانداز کر دیا تھا لیکن وہ ایک بار پھر آنے والے ورما کے نام کو نظرانداز نہیں کر پا رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ ورما کے موجودہ ٹھکانے سے واقف تھا اور فوری طور پر اسے گرفت میں لینے کا خواہش مند بھی تھا لیکن یہاں ذیشان اور کرنل صاحب نے اس سے اختلاف کیا تھا اور فی الحال اسے زیرِ نگرانی رکھنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھے۔ لیکن شہریار کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور وہ ہر صورت ورما کی گردن ماپنا چاہتا تھا۔ اُس کی اس وقت کی بے قراری اسی وجہ سے تھی۔ وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا ذیشان اور کرنل صاحب کی مرضی کے خلاف بھی کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آخر کار وہ تذبذب کی اس کیفیت سے نکل آیا۔ اس نے اس دلیل سے خود کو قائل کر لیا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے، ملکی مفاد میں ہی کر رہا ہے۔ اس لیے اگر ان دونوں کو برا بھی لگا تو یہ ایک وقتی ناراضگی ہو گی جسے وہ جلد فراموش کر دیں گے۔

فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے ٹہلنا موقوف کیا اور نہایت خاموشی سے تیاری کرنے لگا۔ وہ جس حصے میں مقیم تھا، وہاں ملازمین کی آمد اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتی تھی اور رات کے اس پہر تو کسی کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ تیاری کے لیے اس نے

بلب وغیرہ روشن نہیں کیا تھا بلکہ نائٹ بلب کی روشنی میں ہی کام کر رہا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ پر مشتمل گہرے رنگ کا چست لباس زیبِ تن کر لینے کے بعد اس نے پیروں میں نرم سول کے جوتے پہنے اور اپنے سامان میں موجود پسٹل کو نکال لینے کے علاوہ تیز دھار والا پتلا سا چاقو بھی پنڈلی سے باندھ لیا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں جو عکس اس کے سامنے تھا، اس میں شہریار عادل کی جھلک بہت کم ہی رہ گئی تھی اور بہت مشکل تھا کہ کوئی اسے اس حیثیت سے شناخت کر سکتا۔ خود کو درپیش کارروائی کے لیے پوری طرح تیار محسوس کرنے کے بعد وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلا اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر گیٹ پر چوکیدار موجود تھا اس لیے اس طرف سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاڑی بھی لے جانا ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ تن بہ تقدیر عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

اس عمارت کی نگرانی کے لیے چوکیدار کے علاوہ دو عدد تربیت یافتہ کتے بھی موجود تھے جو ساری رات کھلے رہتے تھے۔ لیکن اسے ان کتوں سے اس لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ طویل قیام کے عرصے میں وہ دونوں کتے اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ قدموں کی آہٹ پا کر ایک کتا ذرا سا بھونکا لیکن پھر اس نے شہریار کی خوشبو کو پا لیا اور بھونکنا ترک کر کے اس کے قریب آ کر اس کی ٹانگ سے اپنی تھوتھنی رگڑنے لگا۔ شہریار نے نرمی سے اس کے سر اور پشت کو سہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرا کتا بھی قریب ہی موجود تھا لیکن اپنے ساتھی کے اطمینان کے بعد اس نے کوئی تعرض نہیں کیا اور شہریار آرام سے آگے بڑھتا گیا۔ اس کا رُخ کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف تھا۔ دیوار خاصی بلند تھی لیکن اسے تربیت کے جن مراحل سے گزارا جا رہا تھا، ان سے گزرنے کے بعد اس کے لیے یہ بلندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ نہایت سہولت کے ساتھ دیوار کے پار اُتر گیا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اس علاقے میں دن کے وقت بھی سواری آسانی سے نہیں ملتی تھی، رات کے وقت تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس فاصلے کو جلد از جلد طے کر لینے کی خواہش میں وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ تیز رفتاری کے باوجود جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچا تو نہ ہی سانس پھولا ہوا تھا اور نہ ہی پیروں نے احتجاج کیا تھا۔ اس بات نے اس کے دل میں خوشی کا احساس جگا دیا۔ یعنی عمر فاروق صاحب کی تربیت نے کام دکھایا تھا اور اس کا اسٹیمنا پہلے کے مقابلے میں اور بھی بہتر ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کا انتخاب کیا اور ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں آج کل ورما رہائش پذیر تھا۔ کرائے کے سلسلے میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی حیل و حجت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ رات کے اس پہر ٹیکسی میں سفر کرنے والے عموماً اشد ضرورت کے تحت ہی باہر نکلتے ہیں۔ اس رویے کی وہ عمومی حالات میں کتنی ہی مذمت کرتا ہو لیکن اس وقت اس کے لیے ہر بات سے بڑھ کر ورما تک رسائی اہم تھی اس لیے دُگنے کرائے پر بخوشی راضی ہو گیا۔

ٹیکسی اس کے مطلوبہ علاقے میں پہنچی تو اس نے ورما کی رہائش گاہ سے خاصے فاصلے پر اسے رُکوا لیا اور کرایہ ادا کرنے کے بعد پیدل ہی اس طرف چل پڑا۔ پتہ اُس کے ذہن میں نقش تھا کہ بدترین دشمن اور بہترین دوست کے متعلق کسی چیز کو بھول جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔

مطلوبہ پتے پر پہنچ کر اس نے کچھ دیر باہر ہی رُک کر جائزہ لیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور دیواریں بھی کچھ خاص بلند نہیں تھیں۔ ایسے کوئی آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے کہ گیٹ پر چوکیدار کی موجودگی کا پتہ چلتا۔ چوکیدار



کے علاوہ حفاظتی انتظامات میں عموماً دو ہی چیزوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ایک کتے اور دوسرے برقی رو۔ دیواروں پر تار بچھا کر ان میں برقی رو دوڑانا ایک خطرناک حفاظتی طریقہ تھا جس کے استعمال سے بے گناہ جانوں کے نقصان کا اندیشہ بھی رہتا تھا۔ لیکن ورما جیسے بے ضمیر آدمی سے کسی اخلاقی ضابطے کا خیال رکھنے کی اُمید نہیں تھی۔

دیواروں پر برقی تاروں کی موجودگی کو چیک کرنے کے لیے اُس نے اپنی جیب سے نائیلون کی پتلی سی رسّی نکالی۔ اس رسّی کے سرے پر ایک مضبوط دھاتی آنکڑا موجود تھا۔ بلندی پر چڑھنے کے لیے یہ رسّی بڑی کارآمد شے تھی لیکن اس وقت تو اسے دھاتی آنکڑے سے کام لینا تھا۔ اگر دیوار میں کرنٹ موجود ہوتا تو دھاتی آنکڑے سے ٹکرانے کی صورت میں ردِعمل ظاہر ہوتا اور ننگے تاروں سے دھاتی آنکڑا ٹکرانے کی صورت میں رات کی تاریکی میں چنگاریاں سی اُڑتی صاف نظر آتیں لیکن جب اُس نے تجربہ کیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ احتیاطاً اُس نے تجربے کو ایک بار پھر دہرایا لیکن نتیجہ وہی رہا تو اطمینان سے دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار پر چڑھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور کتوں کی موجودگی کی سن گن لینے کی کوشش کی۔

نیم تاریک احاطے میں اسے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ زیادہ دیر دیوار پر رُکنا مناسب نہیں تھا اس لیے وہ پنجوں کے بل اندر کُود گیا۔ جچی تُلی چھلانگ کے نتیجے میں بہت ہی مدھم آواز پیدا ہوئی لیکن بہرحال اگر وہاں کتے موجود ہوتے تو ضرور متوجہ ہوتے۔ اسے بے حد حیرت ہوئی کہ ورما حفاظتی اقدامات کی طرف سے اتنا بے فکر کیوں تھا؟ پھر اُسے یاد آیا کہ کراچی میں بھی جب اس نے ورما کے اپارٹمنٹ میں گھس کر اسے قابو کیا تھا تو وہاں بھی ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ شاید ورما کو خود پر حد سے زیادہ اعتماد تھا جو اس قسم کا اہتمام غیر ضروری سمجھتا تھا۔ فی الحال اس کے پاس ورما کی نفسیات سمجھنے کی فرصت نہیں تھی چنانچہ کھڑے ہو کر قدم آگے بڑھائے۔

احتیاط کے پیشِ نظر وہ مکان میں کُودتے ہی اپنا پسٹل باہر نکال چکا تھا اور اب اسے تھامے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے دروازے کو چیک کیا۔ حسبِ توقع وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ یہ سلائیڈنگ ونڈوز تھیں جن کے اندر گرل موجود نہیں تھی لیکن یہ اہتمام تھا کہ اندر سے لاک ہو سکیں اور کوئی شخص باہر سے انہیں کھول نہ سکے۔ ہاں کھڑکیوں کا شیشہ تھوڑی سی کوشش سے توڑنا ناممکن تھا لیکن ظاہر ہے اس صورت میں شور ہوتا اور اندر موجود ورما متوجہ ہو جاتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے ساری کھڑکیاں چیک کر لے تاکہ اگر اتفاقاً کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو تو اس سے اندر جایا جا سکے۔ دوسری صورت میں اسے یا تو چھت کا راستہ اختیار کرنا پڑتا یا کھڑکی کا شیشہ توڑنے کا رِسک لینا پڑتا۔ چھت کے بارے میں اسے علم نہیں تھا کہ وہاں سے نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی بھی ہیں یا نہیں۔ اس لیے حُسنِ اتفاق پر بھروسہ کرتے ہوئے سب سے پہلے کھڑکیاں چیک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آخر تیسری کھڑکی پر اس کی اُمید بر آئی۔ یہ کھڑکی اندر سے لاک نہیں تھی اور دروازہ زور لگا کر کھولنے پر شیشہ آسانی سے ایک طرف کھسک گیا تھا۔ اس نے بے دھڑک اندر داخل ہونے کے بجائے پہلے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرہ سٹنگ روم کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہاں جلتی مدھم روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔

کمرے میں ایک کمپیوٹر بھی رکھا تھا جس کی اسکرین اس وقت تاریک تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ جما کر اندر کُود گیا۔ یہاں وہ ورما سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آیا تھا اور امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں محوِ خواب ہو گا اس لیے اس کمرے میں رُکنے کو بے کار جان کر قدم دروازے کی طرف بڑھائے لیکن پھر رُکنا پڑا۔ رُکنے کی وجہ گردن کی پشت پر محسوس ہونے والی لوہے کی ٹھنڈک تھی اور ایسا ہی ایک کھلونا اس کے اپنے ہاتھ میں بھی موجود تھا اس لیے اسے پہچاننے میں مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پسٹل کی نال ہے جو کسی نے

پشت سے اس کی گردن پر رکھی ہوئی ہے۔

''پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' سرد آواز میں حکم دیا گیا جس کی تعمیل کرنے کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اب دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' اسے پسٹل سے محروم کر دینے کے بعد دوسرا حکم دیا گیا۔ گردن پر ٹکی نال کی موجودگی میں انکار کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ اس نے وہی کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ حکم دینے والا جو کہ یقینی طور پر ورما ہی تھا، اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔

شہریار ہونٹ بھینچے بہت مشکل سے یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ وہ ورما کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے کی خواہش دل میں لے کر یہاں تک آیا تھا لیکن جتنی آسانی سے یہاں تک پہنچا تھا، اتنی ہی آسانی اور تیزی سے زیر کر لیا گیا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ ورما پہلے سے ہی گھات لگائے بیٹھا تھا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایکشن میں آ گیا تھا اور اب اپنے نفرت انگیز وجود کے ساتھ اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کام کے لیے وہ اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کر رہا تھا، دوسرے ہاتھ میں اس نے بدستور پسٹل تھام رکھا تھا اور اوپر سے نیچے تک ہاتھوں کے سفر کے ساتھ ساتھ پسٹل کا سفر بھی جاری تھا۔ وہ اس کی جیبوں میں اڑسا سامان نکال چکا تھا اور اب اس کا ہاتھ اس پیر پر متحرک تھا جس کے ساتھ اس نے تیز دھار والا چاقو باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ اس مقام تک پہنچا تو ورما کی مشاق انگلیوں نے فوراً ہی چاقو کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا اور تیزی سے اس کی پینٹ کا پائنچہ اوپر چڑھا کر چاقو کو بے نقاب کر دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شہریار کو محسوس ہوا کہ ورما کی توجہ اپنے پسٹل سے زیادہ اس کے چاقو پر مبذول ہے چنانچہ اس نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر ایکشن میں آنے کا فیصلہ کیا اور چاقو بندھی ٹانگ کو پھرتی سے حرکت دے کر پیچھے کی طرف اس طرح گھمایا کہ تلاشی لیتا ورما اس کی زد میں اچھی طرح آ جائے۔

اُس کے اس غیر متوقع حملے نے ورما کو پیچھے کی طرف اُلٹا دیا جبکہ شہریار نے اُچھل کر فوراً سے پیشتر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اُس کی یہ حکمتِ عملی اُس کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ اگر اسے لمحہ بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو ورما کے پسٹل سے نکل کر دیوار سے ٹکرانے والی گولی خود اس کے بدن میں چھید کر چکی ہوتی۔ دیکھا جائے تو اس نے پسٹل بردار ورما پر اس طرح بنا دیکھے بھالے حملہ کر کے بہت بڑا رِسک ہی لیا تھا۔ ذرا سی کوتاہی یا قسمت کی خرابی سے اسے بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ عالمِ جنون میں کیا تھا ورنہ کوئی ہوش مند آدمی اس طرح کا رِسک لینے سے پہلے دس بار سوچتا ہے۔

اُچھل کر اپنی جگہ چھوڑنے کے بعد وہ اگلی جگہ پر بھی ٹھہرا نہیں تھا بلکہ کسی اسپرنگ کی طرح اُچھل کر دوبارہ اپنی ٹانگ حرکت میں لایا تھا اور اس بار ورما اپنے پسٹل سے محروم ہو گیا تھا۔ پسٹل ہاتھ سے نکل کر جانے کہاں گرا تھا۔ ورما نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور کسی عقاب کی طرح پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوا۔

اس کے حملے سے بچنے کے لیے شہریار نے بائیں جانب جھکائی دی لیکن پوری طرح خود کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور ورما کی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کے شانے پر لگا۔ اس کا شانہ جھنجھنا اُٹھا لیکن اُس کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے ورما کی کلائی کو اپنی فولادی گرفت میں لے کر اس طرح جھٹکا دیا کہ ہڈی چٹخنے کی واضح آواز کے ساتھ وہ اُڑتا ہوا کمپیوٹر پر جا گرا اور اسے لیتا ہوا فرش پر آ گیا۔ نیچے گرنے سے مانیٹر کی اسکرین ٹوٹ گئی اور کرچیاں دور دور تک بکھر گئیں۔ ورما خود ان کرچیوں پر گرا اور بیک وقت کئی کرچیاں جسم میں پیوست ہونے کی وجہ سے کراہ اُٹھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس نے ہار نہ مانی اور اُچھل کر ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اس بار اُس کی ٹانگ نے شہریار کے پیٹ کی مزاج پرسی کی اور وہ زوردار ضرب کے نتیجے میں اُلٹ کر ایک صوفے پر جا گرا۔



ورما نے اسے مہلت دیئے بغیر اس پر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا گلا تھام کر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی گرفت خاصی مضبوط تھی، شہریار کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اضطراری ردِعمل کے طور پر اس نے اپنی انگلیاں ورما کی بائیں آنکھ میں گھونپ دیں۔ ورما کے لیے یہ چوٹ ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ وہ زور سے ڈکرایا اور اس کے گلے کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

شہریار کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے ورما کو نیچے گرایا اور خود اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھنے کے بعد اسے اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ دیا۔ ان فولادی مُکوں نے ورما کی کھوپڑی کو ہلا کر رکھ دیا۔ آنکھ کے زخم نے پہلے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا، مُکوں نے برداشت کی حد ختم کر دی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی شہریار اس کے سینے پر سے اُترا اور ایک ڈھیر کی صورت میں ایک جگہ پڑے اپنے سامان میں سے نائیلون کی رسّی اٹھا کر ورما کے ہاتھ پیروں کو اس رسّی کی مدد سے اچھی طرح باندھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنا سامان واپس اپنی جیبوں میں منتقل کیا اور ساتھ ہی اپنا اور ورما کا پسٹل بھی اٹھا لیا۔ ورما کو ہوش میں لا کر اس سے دو دو ہاتھ کرنے سے قبل وہ ایک بار مکان کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر ورما کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مکان میں موجود ہوتا تو اس ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں ضرور متوجہ ہو کر ادھر کا رخ کرتا۔ لیکن پھر بھی اپنے طور پر تصدیق کرنا ضروری تھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا۔ کچن میں بھی سناٹا تھا۔ البتہ کاؤنٹر پر رکھے ایک مشہور ریسٹورنٹ کے برگر کے ڈبوں اور مشروبات کی بوتلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ دو افراد اس ڈنر سے مستفید ہوئے ہیں یا پھر شاید اکیلا ورما ہی دو افراد کی خوراک ہضم کر گیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی تھی، وہ مکان میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا امکان محسوس کر کے مزید محتاط ہو گیا۔ جس کمرے میں اس نے ورما کو چھوڑا تھا، اس کے علاوہ مکان میں دو کمرے مزید تھے۔ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ کمرہ کسی ذی نفس سے خالی تھا۔ کوئی قابلِ ذکر فرنیچر بھی موجود نہیں تھا۔ بس فرش پر کارپٹ بچھا کر چند فلور کشنز وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے۔ اس نے احتیاطاً پردوں کے پیچھے بھی دیکھ ڈالا کیونکہ اتنا اندازہ تو وہ کر چکا تھا کہ پہلے کمرے میں جب وہ کھڑکی کے ذریعے داخل ہونے کے بعد اسے خالی سمجھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا، اس وقت ورما پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور چپکے سے باہر نکل کر اسے قابو کر لیا تھا۔

بہ احتیاط پردوں کے پیچھے جھانک لینے کے بعد بھی جب اسے وہاں کوئی نہیں ملا تو وہ اس کمرے سے نکل کر اگلے اور آخری کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہینڈل دبا کر دروازہ کھولتے ہی اسے پہلی نظر میں نیلگوں روشنی میں بستر پر محوِ استراحت نیم عریاں لڑکی نظر آ گئی۔ لڑکی شاید گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہی تھی اس لیے اسے مکان کے اندر ہونے والے کسی واقعے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شہریار پھرتی سے اس کے قریب پہنچا اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ لڑکی کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا اور وہ اسی طرح گہری نیند سوتی رہی۔

''اے اُٹھو!'' شہریار نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔

''اوں..... سونے دو نا۔ پہلے ہی تم پے منٹ سے ڈبل وصول کر چکے ہو اور اب پھر تنگ کر رہے ہو۔ بڑے گندے آدمی ہو۔'' اس نے آنکھیں نہیں کھولیں البتہ جھنجلا کر جو کچھ بولی، اس سے شہریار نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی کال گرل ہے جسے ورما شب بسری کے لیے لایا تھا اور خوب اچھی طرح نچوڑ ڈالا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کے نقش و نگار خوب صورت تھے لیکن ساتھ ہی چہرے پر ایسی کرختگی پائی جاتی تھی جو پیشہ ور عورتوں کا خاصا ہوتی ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی عمر کے بارے میں بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں بلکہ پینتیس چالیس کے درمیان کی پختہ عمر عورت ہے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک

سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ کم از کم جسمانی ساخت کے اعتبار سے لڑکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار نے ایک بار پھر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

''او یار! میں نہیں اٹھ سکتی۔ میں نے انجکشن لگا لیا ہے، اب صبح ہی اُٹھوں گی۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی کہہ کر کروٹ بدل لی تو شہریار کو حقیقت سمجھ میں آئی۔ وہ عورت شاید کسی قسم کے نشے کی عادی تھی اور وہ نشہ لے چکی تھی اسی لیے اردگرد سے غافل تھی۔ اس کے اور ورما کے درمیان ہونے والی جھڑپ کی آوازیں اگر اس کے کانوں تک پہنچی بھی ہوں گی تو اس نے نشے میں دھت ہونے کے باعث وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی ہو گی۔

اس کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر ذرا سا جائزہ لینے پر اسے ایک دراز میں رکھی ٹائیاں نظر آ گئیں۔ اس نے دو ٹائیوں کو نکالا اور اس کی مدد سے عورت کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اب وہ اس لائق نہیں رہی تھی کہ بستر سے اٹھ کر اس کے کسی کام میں مداخلت کر سکتی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ یہ کمرہ جو کہ یقینی طور پر ورما کے لیے بیڈ روم کا کام دے رہا تھا، خاص توجہ کا حق دار تھا اور اسے امید تھی کہ یہاں سے اسے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن فی الحال اس کے پاس کمرے کی باریک بینی سے تلاشی لینے کی فرصت نہیں تھی۔

ورما کے بے ہوش اور بندھے ہوئے ہونے کے باوجود وہ زیادہ دیر اس سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھا جو ہوش میں آ جاتا تو بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے باوجود بہت کچھ کر سکتا تھا چنانچہ پہلے اس سے نمٹنا ضروری تھا۔ وہ واپس اس کمرے میں آ گیا، جہاں ورما کو چھوڑا تھا۔ ان دونوں کے ٹکراؤ کے نتیجے میں کمرے کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی اور کئی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں جن میں سب سے قابلِ ذکر زمین بوس ہو جانے والے مانیٹر کی اسکرین کی کرچیاں تھیں۔ موٹے تلے کے جوگرز کی وجہ سے وہ مزے سے ان کرچیوں کو روندتا ہوا ورما کے قریب پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھ پھوٹ جانے کے باعث بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ اس خون میں اس کے نتھنوں سے بہنے والا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور کنپٹی سے بہہ کر نیچے فرش تک پہنچ گیا تھا۔ حقیقتاً اس نے ورما کو بہت بے دردی سے مارا تھا اور ناک کے ساتھ ساتھ اس کا جبڑا بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔ لیکن اپنے اس جنون پر اسے کوئی ندامت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک ورما ایک ایسا شخص تھا جس کی بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جاتی تو کوئی گناہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس کے حکم پر لمحوں میں انسانی جسموں کے چیتھڑے اُڑا دیئے جاتے تھے اور جو معصوم بے گناہ لڑکیوں کو اپنی خونی دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

ورما پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتا ہوا وہ ملحقہ باتھ روم تک گیا اور وہاں سے آدھی بالٹی پانی بھر لایا۔ اس پانی کو اس نے پورا کا پورا ورما پر انڈیل دیا۔ پانی پڑنے پر وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا اور اپنی سلامت رہ جانے والی اکلوتی آنکھ کو کھول کر دیکھا۔

''کون ہو تم؟..... اور کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے تم سے پوچھنا چاہئے کہ تم کون ہو اور میرے وطن میں کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار نے تلخی سے اسے جواب دیا۔

''اوہ..... تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔ میں نے غلطی کی کہ تمہیں کوئی چور اُچکا سمجھا اور آسانی سے اندر آنے دیا۔ ورنہ اس وقت میری جگہ تم یہاں پڑے ہوتے۔'' ورما نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔



''یعنی تم شروع سے جانتے تھے کہ میں تمہارے گھر میں گھسا ہوں؟''

''بالکل، اس مکان میں مختلف مقامات پر کلوز سرکٹ کیمرے موجود ہیں۔ اور جیسے ہی کوئی کھلے گیٹ کے علاوہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے، میری رسٹ واچ میں فکس ایک ڈیوائس اشارہ دے دیتی ہے۔ تم نے بھی جب بیرونی دروازے پر چڑھنے کی کوشش کی تو مجھے اشارہ مل گیا۔ میں سوتے سے اُٹھ کر اس کمرے کی طرف دوڑا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر تمہاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ تم کھڑکی کے اندر آنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی اور جان بوجھ کر اس کمرے کی کھڑکی کا لاک کھول دیا۔ تم چور کے بجائے کچھ اور ہو، اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب تم نے خاموشی سے تلاشی دیتے دیتے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا۔ تمہارے لڑنے کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ تم کوئی تربیت یافتہ آدمی ہو اور میں انجانے میں تمہیں ڈھیل دینے کی غلطی کر چکا ہوں۔'' ورما نے اسے جواب دیا۔

''تمہارا یہ جواب ایک طرح سے اعترافی بیان ہے کہ تم غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔'' شہریار نے اس کی بات سن کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو، کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹوں کا وجود تمہارے لیے کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ یہاں اتنی بڑی تعداد میں مختلف ملکوں کے ایجنٹوں کا جال بچھا ہوا ہے کہ تم اپنے پڑوسی بلکہ سگے بھائی کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمہارے ملک کا وفادار ہے یا غدار۔'' ورما نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔ یہ اس ملک کا المیہ تھا کہ اس پر بسنے والے ہی اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کا وجود کسی ملک میں ہونا اتنی خطرناک بات نہیں تھی جتنا اس ملک کے اپنے باسیوں کا ان ایجنسیوں کے لیے کام کرنا۔ پیسے بلکہ بے تحاشا پیسے کی چمک لوگوں کے ایمان کو اس طرح ڈگمگا دیتی ہے کہ وہ اپنے ضمیر سمیت مادرِ وطن کا سودا کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

''غداروں اور دشمنوں کو نیست و نابود کرنا ہی میری زندگی کا مشن ہے۔ جیسے میں تجھ تک پہنچا ہوں، ویسے ہی دوسروں تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ مجھے طعنے دینے کے بجائے فی الحال تو تُو اپنی خیر منا۔'' ورما سے بے تحاشا نفرت تو اپنی جگہ تھی ہی، اس وقت اس کی بکواس سن کر وہ اور بھی طیش میں آ گیا اور ایک لات گھما کر اسے رسید کی۔

''خیر میں نہیں، تم مناؤ۔ تم مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہو کہ میری جان لے لو لیکن اس کارنامے کے بعد خود تمہیں صحیح سلامت یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہو گا۔'' ورما کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ زخمی آنکھ اور خون سے لتھڑے چہرے کے ساتھ مسکراتا وہ بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا لیکن اصل چیز اس کا اطمینان تھا۔ مخالف حالات کے باوجود وہ پریشان نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شہریار کے ہاتھوں نہیں بلکہ شہریار اس کے ہاتھوں زیر ہوا پڑا ہو۔ اس بات نے شہریار کو چونکا دیا۔ وہ اپنے اردگرد خطرے کی بُو محسوس کرنے لگا۔ اس احساس نے اس کی وحشت کو اور بھی بڑھا دیا اور اس نے زخمی ورما کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

''بتا کیا چکر ہے؟..... تجھے کس کی مدد کا آسرا ہے جو مجھے اس طرح دھمکا رہا ہے؟'' وہ ورما کو مارتا جا رہا تھا اور پوچھتا جا رہا تھا۔ ورما کے منہ سے اس مار پیٹ کے نتیجے میں ہلکی ہلکی کراہوں کے سوا ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں فضا میں فائر کی آواز گونجی۔

''لو..... وہ آ گئے۔'' ورما نے تکلیف کے باوجود سلگانے والی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی سی کی۔ شہریار جو

فائر کی آواز پر پہلے ہی ٹھٹک گیا تھا، اس جملے کو سن کر سمجھ گیا کہ ورما نے کسی طرح اپنے مددگاروں کو یہاں بلوا لیا ہے اور اب وہ یہاں اس مکان میں کسی چوہے کی طرح پھنس گیا ہے۔ اس چوہے دان سے نکلنے کا راستہ کس طرح نکلتا، یہ تو بعد کی بات تھی..... فی الحال اسے ورما سے نمٹنا تھا۔ اس موذی سانپ کو وہ کسی بھی طرح ایک بار پھر آزاد ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے سینے میں دفن رازوں کو اُگلوانے کی خواہش کو پس پشت ڈالتے ہوئے پسٹل کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ فائر کرتا، باہر سے سنائی دینے والے فائروں کی پے در پے آوازوں نے اس کی ٹریگر پر جمی انگلی کو حرکت دینے سے روک دیا۔ سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز بالکل ایسی تھی جیسے دو گروہ آپس میں مقابلہ کر رہے ہوں۔ ان گروہوں میں سے ایک گروہ تو یقینی طور پر ورما کے آدمیوں کا تھا لیکن دوسرے کے بارے میں درست قیاس کرنا ذرا مشکل تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ ورما کے آمی اپنے ساتھ اپنے دشمنوں کو پیچھے لگا کر لے آئے ہیں یا پولیس کی کوئی گشتی گاڑی ان کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

معاملہ جو بھی تھا، وہ اپنے لیے بچت کا ایک معاملہ نکال سکتا تھا۔ اس نے ورما کو فوری طور پر ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کیا اور پسٹل سے ایک زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کر کے اسے بے ہوش کر دیا۔ اب ورما اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پاس موقع تھا کہ وہ اس کو یہاں سے زندہ نکال کر لے جانے کے امکانات کا جائزہ لے سکتا۔ اپنے پاس سواری کی کمی کی موجودگی کا مسئلہ وہ ورما کی گاڑی کے ذریعے حل کر سکتا تھا۔ ذہن میں اُبھرنے والا یہ خیال اسے اتنا اچھا لگا کہ فوراً ہی ورما کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلکہ ایک طرح سے اسے افسوس ہی ہوا کہ اس نے یہاں اتنا وقت کیوں ضائع کیا اور پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں نہیں کر لیا۔ اس نے بے ہوش ورما کو اپنے کندھے پر لادا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں داخل ہوتے وقت وہ دیکھ چکا تھا کہ ورما کی گاڑی احاطے میں داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے۔ ورما کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا کام اس نے سہولت سے پورا کر لیا۔ باہر فائرنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا لیکن اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ اس نے ایک خطرناک چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے نکل جاتا تو ممکن تھا کہ باہم فائرنگ میں مصروف دونوں گروہوں کو چکمہ دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا ورنہ دوسری صورت میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ ورما کو اس کے ساتھیوں کے درمیان دوبارہ واپس نہیں جانے دے گا اور بازی ہاتھ سے نکلتی دیکھ کر فوراً ہی اسے گولی مار دے گا۔

اس منصوبے پر عمل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ بیرونی گیٹ بند تھا۔ اگر وہ گیٹ کھولنے جاتا تو واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھنے تک باہر موجود لوگ متوجہ ہو جاتے۔ چابی کے بغیر گاڑی کھولنا اور چلانا تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ تربیت کے کڑے مراحل سے گزرتے ہوئے اس نے جہاں بہت کچھ سیکھا تھا، وہاں ایک معمولی تار کی مدد سے کسی بھی لاک کو کھول لینا یا چابی کے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ درپیش مسئلے کا بھی آخر ایک حل اسے سوجھ گیا۔ اس نے اپنے پاس موجود نائیلون کی ڈوری نکالی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ فائرنگ کا سلسلہ اب بہت ہی سست ہو گیا تھا۔ اندر وقفے وقفے سے ایک دو فائر سنائی دے رہے تھے۔ اس نے گیٹ کے قریب پہنچ کر اس کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے گیٹ اس نوعیت کا تھا کہ اس کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھلتے۔

اس نے گیٹ پر لگا اوپری بولٹ اور درمیان میں موجود کنڈی کھولی اور نائیلون کی رسّی کا ایک سرا کنڈی



سے باندھنے کے بعد دوسرے سرے پر موجود آنکڑے کو دروازے کے دوسرے پٹ میں اٹکا دیا۔ رسّی خاصی بڑی تھی اور وہ اسے آرام سے گاڑی تک لے جا سکتا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد رسّی کھینچ کر گیٹ کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھینچ کر کھول دے گا اور گاڑی کو تیزی سے نکال کر لے جائے گا۔ اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ابھی وہ رسّی سمیت گاڑی تک پہنچا ہی تھا کہ کوئی دھم سے اندر کُودا۔ اس نے اضطراری ردِعمل کے طور پر فوراً ہی پسٹل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''سی ایف پی۔'' وہ شخص فوراً ہی بلند آواز میں بولا تو شہریار کا پسٹل والا ہاتھ جھک گیا اور ہونٹوں سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ باہر متصادم گروہوں کے بارے میں اب سارے شکوک دور ہو گئے تھے۔ وہ ورما کے ساتھی اور سی ایف پی کے اہلکار تھے جو پچھلے کئی منٹوں سے آپس میں برسرِ پیکار تھے اور اب اس اہلکار کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہمی مقابلے میں سی ایف پی کو برتری حاصل ہو چکی ہے۔

''ورما اس گاڑی میں ہے اور اندر ایک کال گرل موجود ہے۔ اس کے علاوہ مکان میں کوئی اور نہیں ہے۔'' اس نے سی ایف پی کے اہلکار کو اطلاع دی۔

''آپ باہر چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔ یہاں کے معاملات ہم لوگ نمٹا لیں گے۔'' اہلکار نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ورما کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے مشکل تھا لیکن موجودہ حالات میں خود اس کی پوزیشن خاصی آکورڈ ہو گئی تھی۔ اپنے تئیں وہ نہایت خاموشی سے ایک مشن انجام دینے چلا تھا لیکن یہاں ٹھیک ٹھاک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا اور ظاہر تھا کہ اگر سی ایف پی والے اس معاملے میں دخل نہ دیتے تو وہ انجانے میں ورما کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ جوش میں یہاں آتے ہوئے وہ جاننے کے باوجود اس بات کو فراموش کر چکا تھا کہ سی ایف پی کے اہلکار ورما کی نگرانی پر مامور ہیں۔ وہ یہاں پہنچا تھا تو اردگرد کوئی نظر بھی نہیں آیا تھا لیکن حقیقتاً وہ خود ان لوگوں کی نظروں میں آ گیا تھا اور بعد میں انہوں نے سچویشن بگڑتی دیکھ کر دخل اندازی کر کے اسے تحفظ فراہم کیا تھا۔

بالآخر اس نے اہلکار کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا اور باہر کا رخ کر لیا۔ باہر دو تین گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی ایک گاڑی کی طرف راہنمائی کر دی گئی۔ وہ گاڑی کے قریب پہنچا تو اندر بیٹھے عمر فاروق کو دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ شاید وہ واحد شخص تھے جن کا بے حد احترام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ دل ہی دل میں ان سے مرعوب بھی تھا اور ان کے سامنے جواب دہی کو آسان نہیں سمجھتا تھا۔

''بیٹھو۔'' انہوں نے اسے دیکھ کر ایک لفظی حکم دیا جس کی اس نے پھرتی سے تعمیل کی۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر اس نے جان لیا کہ وہ واپس اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا ہے۔ بوجھل سی فضا میں آخر کار یہ سفر بھی تمام ہو گیا۔

''کیا تمہیں سی ایف پی پر اعتبار نہیں ہے؟'' گاڑی سے اُتر کر وہ عمر فاروق کے پیچھے چلتا ہوا اندر پہنچا تو انہوں نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے سامنے نشست سنبھال لی اور اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے سر! اگر مجھے اعتبار نہ ہوتا تو میں آپ لوگوں کے ساتھ کیوں آتا؟'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''اگر تمہیں اعتبار ہوتا تو تم ورما کے سلسلے میں اس طرح نہیں کرتے۔'' انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آئی ایم سوری سر! لیکن ورما جیسے موذی کو میں ذرا بھی ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''تو تمہارے خیال میں ہم نے اسے ڈھیل دی ہوئی تھی اور ہمارے آدمی وہاں اس کی نگرانی کرنے کے بجائے کبڈی کھیل رہے تھے؟'' عمر فاروق تلخ ہو گئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں ورما کو آپ لوگوں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہو جاتا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے تو وہ آپ کے آدمیوں کو چکمہ دے کر نکل جاتا اور میں دوبارہ اس کے غائب ہونے کا رِسک نہیں لے سکتا تھا۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''تمہارا مسئلہ یہ ہے شہریار! کہ تم اس جنگ میں صرف ملکی مفاد میں نہیں، ذاتی انتقام کی خاطر بھی اُترے ہو۔ شاید لاشعوری طور پر ورما سے تمہارے عناد میں وہ قلبی نفرت بھی شامل ہے جو تم اپنی بھتیجی اور کزن کی موت کے باعث اس سے کرتے ہو اور وہ نفرت تم سے کہتی ہے کہ ورما کو نیست و نابود کر ڈالو۔'' عمر فاروق نے اس کی دی گئی صفائی کو قبول کرنے کے بجائے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر!'' شہریار نے احتجاج کرنا چاہا۔

''نہیں، میں غلط نہیں سمجھ رہا بلکہ تم خود اپنے مسئلے کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم انسان ہو شہریار! اور بے شک ایک اچھے انسان ہو۔ لیکن بشری کمزوریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہاری حُبّ الوطنی پر کوئی شک نہیں ہے لیکن تم تسلیم کرو یا نہ کرو، یہ حقیقت ہے کہ تمہارا جذبۂ حُبّ الوطنی بھی تمہارے اندر بھڑکتی ذاتی انتقام کی آگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ ورنہ تم عقل سے کام لیتے ہوئے اس بات کو سمجھتے کہ ہم نے ورما کو فوری گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی پر کیوں اکتفا کر رکھا تھا۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس طرح اور لوگوں کو بھی ٹریس کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے سامنے سلّو والا معاملہ بھی تھا۔ موہنی کی موت کو ہم نے چاہے کتنا بھی حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی ہو، لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ اس کے آقاؤں نے سو فیصد اس بات کا یقین کر لیا ہو کہ وہ حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ ان حالات میں ورما کے خلاف ہونے والی کارروائی انہیں مزید چونکا دے گی۔ ہو سکتا ہے وہ سلّو کو واپس بھجوانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیں۔ اور تم جانتے ہو کہ سلّو کا نظر میں رہنا کتنا ضروری ہے۔'' اس کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر عمر فاروق بولتے چلے گئے۔ اس بار اس نے کچھ نہیں کہا اور سر جھکا لیا۔ شاید وہ خود بھی دل ہی دل میں اپنا تجزیہ کر رہا تھا اور کسی حد تک ان سے متفق تھا۔ اِدھر عمر فاروق کی بات جاری تھی۔

''تم میری اس بات سے اس لیے بھی اختلاف نہیں کر سکتے کہ میں شروع ہی سے تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ تم مجھے اپنا ٹریز ہی نہیں، نبض شناس بھی سمجھو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب تم یہاں سے نکل کر ورما کی رہائش گاہ کی طرف گئے تھے تو میں مستقل تمہارے پیچھے تھا۔ تم کس طرح اندر داخل ہوئے، میں نے وہ بھی دیکھا اور کون سی غلطیاں کیں، یہ بھی میری نظر سے چھپی نہیں رہیں۔ تم جوش میں تھے، اس لیے تمہیں ہوش نہیں رہا کہ ورما جیسا ایجنٹ جو پہلے ایک بار تمہارے ہاتھوں زک اُٹھا چکا ہے، بغیر کسی قسم کے حفاظتی اقدامات کے کیسے کسی جگہ رہ رہا ہوگا۔ اندر کی سچویشن کا میں تمہارے بتائے بغیر بھی اندازہ لگا سکتا ہوں اور اس بات پر خوش بھی ہوں کہ میری تربیت بالکل رائیگاں نہیں گئی اور تم نے مشکل حالات میں بھی اتنے بھرپور طریقے سے جدوجہد کی کہ ورما کو زیر کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ساتھ ہی تمہارے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ اگر میں اور دوسرے ساتھی باہر موجود نہ ہوتے تو تم ورما کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جاتے۔ وہ لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ باہر ہم لوگ موجود ہیں۔ ان کی بے خبری میں ہم نے ان پر حملہ کیا پھر بھی کافی مقابلے کے بعد انہیں زیر نہیں کر سکے۔''



''شاید ورما کے پاس کوئی آپریٹس تھا جس کی مدد سے اس نے اپنے ساتھیوں کو کال کر لیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اسے زیر کر لینے کے باوجود وہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔'' عمر فاروق کے تفصیلات بیان کرنے پر اس نے بھی اپنا اندازہ بیان کیا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔'' انہوں نے تائید کی۔ ''یہ جدید ایجادات کا دور ہے اور مختلف ملکوں کے سیکرٹ ایجنٹس سے نمٹتے ہوئے ہم نے بارہا انہیں ایسی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، تم نے ورما کو بے بس کر کے باندھنے کے ساتھ اس کی مکمل تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا ہوگا یا اگر تلاشی لی بھی ہوگی تو ہتھیاروں وغیرہ پر ہی توجہ مبذول کر رکھی ہوگی۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ایسے شخص سے اس کے استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی لے لی جائے۔ رِسٹ واچ، کف لنکس، والٹ یا پین کسی بھی شے میں ایسی کوئی چھوٹی ڈیوائس فٹ کر دینا جس کے ذریعے ضرورت کے وقت اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا جا سکے یا انہیں کوئی اشارہ دیا جا سکے، اب ایک عام سی بات ہو چلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ورما کے ذاتی سامان کا بغور جائزہ لیں گے تو اس کے پاس سے ایسی کوئی نہ کوئی شے ضرور برآمد ہو جائے گی۔''

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر! آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی غلطیوں کا بھرپور احساس ہو گیا ہے۔ میں ابھی بس خام ہوں جسے کندن بننے کے لیے ابھی آپ سے مزید تربیت لینے کی ضرورت ہے۔'' شرمندہ سے شہریار نے اس بار کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

''نہیں ینگ مین! نہیں..... میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری غلطیوں کے پیچھے تمہاری تربیت میں کمی سے زیادہ تمہارے جذبات کے اندھے پن کا زیادہ دخل ہے۔ اگر تم غصے اور طیش میں نہ ہوتے تو اس سے کہیں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ تم نے مشکل حالات کے باوجود ورما کو زیر کر لیا تھا۔'' انہوں نے اصل مسئلہ بیان کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''جو بھی بات ہو لیکن میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ اس لیے کہ میرے رویّے کو آپ نے سی ایف پی پر بے اعتباری سے تعبیر کیا۔ حالانکہ میرے ذہن میں دُور دُور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔'' اس نے ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''جانے دو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن تمہاری جذباتیت نے ایک بڑا نقصان یہ کیا ہے کہ تم سی ایف پی کے جوانوں کی نظر میں آ گئے ہو جبکہ ہماری خواہش تھی کہ مکمل طور پر تبدیلی کا عمل پورا ہو جانے پر ہی تم یہاں سے نکلو اور اپنا کام شروع کرو۔''

وہ بغیر طیش ظاہر کیے اس کی ایک اور حماقت کو سامنے لائے تو وہ حقیقتاً بے پناہ شرمندگی میں ڈوب گیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اسے تبدیلی کے مراحل سے گزارنے کے لیے کتنا کثیر سرمایہ خرچ کیا جا رہا ہے اور اس کی معمولی سی حماقت اس سرمائے کو ڈبو سکتی ہے۔ شرمندگی اتنی تھی کہ وہ اس بار معذرت بھی نہیں کر سکا۔ لیکن دل میں عہد ضرور کیا کہ آئندہ ممکنہ حد تک ان مخلص لوگوں کا تابعدار رہے گا اور کسی بھی حکم یا ہدایت سے روگردانی کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

''ایک معاملہ بگڑ گیا، سو بگڑ گیا۔ ورما کی خفیہ نگرانی سے شاید ہم زیادہ فوائد حاصل کر سکتے تھے لیکن اب جبکہ وہ ہماری کسٹڈی میں ہے تو بھی کچھ نہ کچھ تو اس سے اُگلوا ہی لیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس لامحدود وسائل اور نفری نہیں ہے لیکن مسائل ہر طرف ہیں۔ اظفر اور اس کی ٹیم کو ہم نے پیر آباد کے ساتھ والے جنگل میں بھیجا تھا اور وہاں سے ہمیں ان کی لاشیں موصول ہوئیں۔ بظاہر وہ سب حادثے کا شکار ہوئے اور جنگلی

جانوروں کا نشانہ بن گئے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کچھ اور کہہ رہی ہے۔ ان لوگوں کی موت تو بے شک جنگلی کتوں کے حملے سے ہوئی ہے لیکن ایسے آثار ملے ہیں جن سے لگتا ہے کہ موت سے قبل ان پر بے ہوش کر دینے والی کسی گیس یا دوا کا استعمال کیا گیا تھا اور ظاہر ہے یہ کام انسان ہی کر سکتے ہیں۔ یعنی اظفر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کو جان بوجھ کر حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ موت کے وقت وہ بے چارے بے ہوش تھے۔ بے ہوش ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر پائے اور بے بسی کی موت مر گئے۔ ان کے ساتھ جانے والے ڈرائیور کے آخری الفاظ بھی بہت معنی خیز ہیں۔ چودھری اور افیون کے حوالے سے کئی قسم کے اندازے لگائے جا سکتے ہیں ان میں سے ایک اندازہ یہ ہے کہ شاید شہر والی فیکٹری میں ریڈ کے بعد چودھری نے جنگل میں افیون سازی کے لیے کوئی ٹھکانہ بنا لیا ہے اور اس ٹھکانے کی حفاظت کے لیے وہ قتل و غارت گری سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ حالات بڑے پیچیدہ ہیں۔ اظفر اور اس کے ساتھ جانے والے اہلکار بہت ہوشیار اور بہادر تھے اور ان کے اتنی آسانی سے نشانہ بن جانے پر ہم سب کو سخت تشویش ہے۔ ہم اب ان جیسی کوئی ٹیم وہاں بھیجنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ کسی تحقیقاتی ٹیم کا کور بھی انہیں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اس کے بعد ہمارے پاس دو راستے بچتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے بھی علم میں لائے بغیر وہاں خفیہ طور پر ٹیم بھیجیں۔ لیکن ایسی ٹیم کے لیے حالات اس لیے زیادہ مخدوش ہوں گے کہ مقامی افراد کی مدد کے بغیر جنگل میں گھسنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔ ہمارے لوگوں میں سے فی الحال کوئی ایسا نہیں ہے جو جنگلی حیات کا بھی ماہر ہو اور وہاں کام کر سکے۔ اس لیے میں تو کم از کم کسی ٹیم کو وہاں بھیجنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اب رہ جاتا ہے دوسرا راستہ یعنی جنگل میں باقاعدہ آپریشن کرنا تو یہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم کسی واضح ثبوت کے بغیر اتنا بڑا آپریشن کروانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے آپریشن کے لیے بڑے وسائل اور نفری درکار ہوتی ہے اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے جو آپریشن ہوا تھا، اسے اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم پولیس ڈیپارٹمنٹ کو دوبارہ اس کام کے لیے آمادہ کر سکیں۔'' وہ اپنی ساری ناراضگی بھلا کر اب بہت دوستانہ انداز میں مسائل کو ڈسکس کر رہے تھے۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اگر ہماری طرف سے ایسی کوئی درخواست کی گئی تو پولیس ڈیپارٹمنٹ کا موقف ہوگا کہ حال ہی میں تو جنگل میں آپریشن ہوا تھا اور اگر وہاں کوئی مشکوک سرگرمی جاری تھی تو اسے آپریشن کے دوران نظر میں آ جانا چاہئے تھا۔'' اس نے عمر فاروق کی بات سے اتفاق کیا پھر کچھ یاد آ جانے پر چونک کر بولا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس آپریشن کے وقت ایک جوگی نما شخص خود بخود ہی پولیس والوں سے آ کر ملا تھا اور اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ پولیس والوں کی سیدھے ڈاکوؤں کے ڈیرے تک راہنمائی کر دے گا۔ ایسا ہوا بھی تھا اور پولیس کو ڈاکوؤں تک پہنچنے کے لیے بالکل بھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ یعنی وہ جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر سیدھے مخصوص علاقے میں پہنچے تھے اور سارا جنگل چھان مارنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بعد میں مفرور ڈاکوؤں کی تلاش میں بھی جو آپریشن ہوا تھا، وہ بھی محدود پیمانے پر ہوا تھا، اس وقت تو مجھے کوئی شک نہیں ہوا لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ آپریشن کو محدود رکھنے کے لیے جان بوجھ کر وہ مخبر پولیس تک پہنچایا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ڈاکوؤں کو بلی چڑھا کر کوئی ان سے زیادہ اہم شے چھپائی گئی تھی اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جنگل میں بسنے والے ڈاکوؤں کی سرپرستی بھی چودھری کرتا ہے اور وہاں جو گڑبڑ ہے، وہ بھی اسی کی سرپرستی میں ہو رہی ہے۔'' وہ حالات کا بالکل ٹھیک تجزیہ کر رہا تھا۔

''یو آر رائٹ۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چودھری امریکہ جا کر بیٹھا ہوا ہے اس لیے فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں



ڈال سکتے۔'' عمر فاروق نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''چودھری پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو کیا ہوا؟ اس کے گرگے تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے کسی اہم مہرے کو قابو کریں اور اس کی زبان کھلوائیں۔ اس طریقے سے مجھے امید ہے کہ ہم کسی بڑے جھنجٹ میں پڑے بغیر زیادہ معلومات حاصل کر سکیں گے۔'' اس نے مشورہ دیا جو عمر فاروق کے دل کو بھی لگا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ذیشان سے یہ معاملہ ڈسکس کروں گا۔ تم اب جاؤ اور آرام کرو۔ رات کا بہت تھوڑا حصہ ہی باقی بچا ہے۔ صبح سے پھر تمہیں اپنی روٹین پر عمل کرنا ہوگا۔'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں حکم دیا تو اس نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''شہریار!'' وہ ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ان کی پکار نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

''یس سر!''

''تم ہمارے لیے بہت قیمتی ہو بیٹا! ہم تمہیں میدانِ جنگ میں اُتارنے کے لیے تیار ضرور کر رہے ہیں لیکن ہمیں تمہاری سلامتی بھی عزیز ہے۔ تم نڈر اور بہادر ہو، یہ اچھی بات ہے لیکن پھر کبھی خود کو اس طرح اندھے خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کرنا۔ خصوصاً اس وقت تک جب تک تمہیں اجازت نہیں دی جاتی۔ تمہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور تمہارے جیسا شخص اپنے ٹیلنٹ کے مطابق کام کیے بغیر ضائع ہو جائے، اس سے زیادہ افسوس ناک بات کیا ہوگی۔'' ان کے انداز میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ اس محبت پر اس نے اپنا دل گداز ہوتا محسوس کیا۔ بہت سے رشتوں سے محروم ہو جانے کے باوجود وہ خوش قسمت تھا کہ محبت سے کبھی محروم نہیں رہا تھا اور وہ کسی نہ کسی شکل میں اسے ملتی رہی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں۔ اب آپ کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اپنے اندرونی جذبات پر قابو پا کر اس نے انہیں جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

⊛----✪----⊛

دارالامان کی فضا دم گھونٹ دینے والی تھی اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی شازمین کے لیے یہاں وقت گزارنا خاصا کٹھن تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے سوا کہیں اور رہنا کسی صورت ان کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ کہنے کو تو ان کے کئی رشتے دار شہر میں مقیم تھے لیکن ایک تو نواب صاحب کا برسوں سے ان سے ملنا جلنا نہیں تھا، دوسرے وہ خود بھی وہاں جانا مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ کسی بھی رشتے دار کے گھر جانے کی صورت میں اسے بہت سے سوالوں کے جواب دینے پڑتے اور وہ لوگ کرید کرید کر اس سے پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات جاننے کی کوشش کرتے اور ظاہر ہے وہ کسی کے سامنے اپنی قابلِ شرم داستان نہیں بیان کر سکتی تھی۔ زندگی بھر اپنے باپ کے شرم ناک کردار سے نفرت کرنے کے باوجود وہ باپ بیٹی کے رشتے کی فطری محبت میں تو بہرحال جکڑی ہوئی تھی اور مرنے کے بعد اب انہیں کسی کے سامنے موضوعِ گفتگو نہیں بنانا چاہتی تھی اس لیے فی الحال یہیں رہنے میں عافیت تھی۔

اس کی سگی اور سوتیلی دونوں والداؤں میں سے بھی کسی نے یہاں سے جانے کی بات نہیں کی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ گم صم تھیں۔ انہوں نے بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی طرح بین کرنے یا رونے دھونے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور عجیب سے شاک کی کیفیت میں نظر آتی تھیں۔ شازمین کو لگتا تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہیں کہ بیوہ ہونے کے غم میں روایت کے مطابق سوگ منائیں یا برسوں کی ایب نارمل زندگی سے نجات ملنے پر خوش ہوں۔ اس کے بھائی بھی ابھی مری سے نہیں آ سکے تھے البتہ انہوں نے فون پر اس سے بات کر لی تھی۔ موسم کی

خرابی اور لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے راستے بند تھے اور کہنا مشکل تھا کہ کب تک وہ کراچی پہنچ سکیں گے۔ فون پر البتہ انہوں نے اسے بہت تسلی دی تھی اور اس نے بھی ان کے اطمینان کے لیے یقین دہانی کروا دی تھی کہ وہ جہاں ہے، وہاں اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گزرنے والے اس حادثے کا دکھ بانٹنے کے لیے وہ کسی اپنے کے شانے پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی۔ سرد خانے میں رکھی باپ کی لاش پر رونے کے سوا ایک اور دکھ بھی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ابھی تک وہ جاوید علی کے بارے میں کوئی خیر خبر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ منہدم ہو جانے والی کوٹھی میں چند لوگ ہی سلامت رہ سکے تھے اور جاوید علی کے بارے میں اسے بڑی مشکل سے صرف اتنی خبر ملی تھی کہ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور سخت پریشان تھی۔ جاوید علی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اور اپنی بہادری اور وجاہت کے باعث اس کے دل میں جگہ بنانے میں بہت تیزی سے کامیاب ہو گیا تھا۔

دل پر پہلی دستک دینے والے اس مرد کے لیے اس کا پریشان ہونا بھی بہت فطری تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی اور خواہش مند تھی کہ کسی طرح اس کا جاوید علی سے رابطہ ہو جائے۔ دل کی اس خواہش میں ایسی شدت تھی کہ دوسری طرف ہلچل ہونا لازمی تھا۔ دل سے دل کے رابطے کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیح بے شک نہ پیش کی جا سکے لیکن اس انوکھے رابطے کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ شازمین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ والداؤں سمیت اپنے لیے مختص کمرے میں مغموم و اُداس بیٹھی تھی کہ ایک ملازمہ نے آ کر اسے اطلاع دی۔

''آپ کے لیے فون ہے۔'' اس اطلاع پر وہ معمول کی طرح اُٹھ کر وارڈن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے کسی بھائی نے اسے تسلی و تشفی دینے کے لیے فون کیا ہو گا لیکن فون اٹھاتے ہی دوسری طرف کی آواز سن کر چونک گئی۔ آواز بہت مدھم اور کمزور تھی پھر بھی اس نے اسے شناخت کر لیا تھا اور خوشی کی ایک لہر سی پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

''آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔'' دوسری طرف سے جاوید علی نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی لیکن اس کی آواز سے تکلیف اور کمزوری مترشح تھی۔

''مجھے تو آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ مجھے جھوٹی تسلی دے رہے ہیں۔'' شازمین نے رُندھی ہوئی آواز میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اب تک وہ بہت ضبط کرتی رہی تھی لیکن اب جاوید علی کی آواز سن کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا اور ساتھ ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے جو جذبات محسوس کر رہی تھی، ان کی گہرائی اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

''جھوٹی تسلی کی بات نہیں ہے شازمین! ان حالات میں، میں زندہ بچ گیا ہوں، یہی ایک بڑا معجزہ ہے۔ آدمی زندہ رہے تو باقی کی ٹوٹ پھوٹ وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جاتی ہے اور تمہاری تسلی کے لیے بھی یہ کافی ہونا چاہیے۔'' وہ بہت سبھاؤ سے اسے سمجھا رہا تھا لیکن آواز میں بار بار در آنے والی تکلیف کو چھپانے سے قاصر تھا۔

''مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہو گا، جب تک آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لوں گی۔'' اس نے آنکھ میں بھر آنے والے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی خواہش بیان کی۔

''ابھی تو یہ بہت مشکل ہے۔ مجھے خفیہ طور پر ایک ہسپتال میں رکھ کر میرا علاج کیا جا رہا ہے۔ میں نے محض



دل سے مجبور ہو کر تمہیں فون کیا ہے کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم میرے لیے پریشان ہو گی۔'' بڑی مختصر ملاقات رہی تھی ان دونوں میں، وہ بھی بہت مخدوش حالات میں، سو ایک دوسرے سے دل کی بات کہنے سننے کی ذرا بھی نوبت نہیں آئی پھر بھی وہ دونوں جیسے بڑے یقین سے ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ تھے اور اقرار و اظہار کی منزل سے گزرے بغیر آگے کے مراحل میں داخل ہو گئے تھے جہاں ایک دوسرے کا خیال اور خوشی سب سے مقدم سمجھی جاتی ہے۔

''میں اب بھی پریشان ہوں اور یہ پریشانی آپ سے ملے بغیر دور نہیں ہو گی۔'' اس نے اصرار کیا۔

''ضد نہیں کرو شازمین! اس وقت میں مجبور ہوں۔'' جاوید علی نے اسے رسان سے سمجھایا۔

''میں بھی بہت مجبور ہوں۔ میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ دکھ اور تکلیف کے ان لمحات میں کسی اپنے کے قریب ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت بھی ہے اور فکر بھی۔ پلیز جاوید! مجھے اپنے پاس آنے دو۔'' لجاجت سے بولتے ہوئے کئی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔ بظاہر اپنے کام میں مگن وارڈن نے ترچھی نظروں سے یہ منظر دیکھا اور معنی خیزی سے سر ہلانے لگی۔ شازمین کے بارے میں تفصیلات کا اسے علم نہیں تھا لیکن وہ عرصے سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی تھی اور اس نے بے شمار لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے لیے ٹسوے بہاتے دیکھا تھا۔ شازمین کو بھی اس نے ان میں سے ایک تصور کیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ آدھے گھنٹے میں، میں تمہارے لیے گاڑی بھجواتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملنے آ جانا۔ لیکن پلیز اب رونا بند کرو۔ مجھے تمہارے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔'' ادھر جاوید علی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

''تھینک یو، تھینک یو سو مچ جاوید! تم گاڑی بھیجو، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولی اور ریسیور رکھ کر وارڈن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میڈم! تھوڑی دیر میں مجھے گاڑی لینے آئے گی۔ پلیز آپ گیٹ پر انفارم کر دیں کہ جیسے ہی گاڑی آئے، مجھے فوراً انفارم کر دیا جائے۔'' اس نے نہایت مہذبانہ لہجے میں درخواست کی۔

''سوری، فی الحال تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں۔'' وارڈن نے رُوکھے لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں؟..... میں کیا کوئی مجرم ہوں جو آپ مجھے یہاں قید کر کے رکھیں گی؟'' شازمین کے نوابی خون نے جوش مارا اور اس نے تنتنا کر وارڈن کو جواب دیا۔

''میرا دماغ مت کھاؤ بی بی! تم یہاں ہماری حفاظتی تحویل میں ہو اور ہمیں آگے تمہارے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ کسی ضمانت کے بغیر میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی۔'' وارڈن کی نگاہ اس کی انگلی میں موجود خوب صورت و بیش قیمت طلائی انگوٹھی پر جمی تھی۔

شازمین نے فوراً ہی اس کی نیت بھانپ لی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ ضمانت کے طور پر میری یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ بہت قیمتی ہے اور اسے لینے کے لیے مجھے ہر حال میں آپ کے پاس واپس آنا پڑے گا۔'' اس نے انگوٹھی اُتار کر وارڈن کے سامنے میز پر رکھ دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس انگوٹھی کو بطورِ ضمانت پیش کر رہی ہے، وہ درحقیقت رشوت کا کام دے گی اور واپس آنے پر کسی صورت اسے واپس نہیں ملے گی۔

''اتنی کوئی خاص قیمتی تو نہیں لگ رہی لیکن تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔'' وارڈن نے انگوٹھی اٹھا کر اس کا جائزہ لیا اور بناوٹی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی میز کی دراز میں رکھ لی۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ گاڑی آئے گی تو میں تمہیں اطلاع کروادوں گی۔'' انگوٹھی قبضے میں کر لینے کے بعد اس کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا تھا۔ شاز مین مطمئن سی ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انگوٹھی بے شک کافی قیمتی تھی لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس بیش قیمت زیورات کا بہت بڑا ڈھیر موجود تھا اور ان میں سے ایک انگوٹھی کم ہو جانے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حالات سنبھلیں گے تو وہ ایک بار پھر اپنی فیملی کے ساتھ ایک آرام دہ اور پُرتعیش گھر میں ہوگی۔ آدھے گھنٹے کا وقت بھی آخر کار گزر گیا۔ اس کے پاس فی الحال ملبوسات وغیرہ موجود نہیں تھے اس لیے تیاری تو کیا کرتی، بس منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو سنوارا اور گاڑی پہنچ جانے کی اطلاع سن کر باہر نکل گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی آگے بڑھی تو کئی گھنٹوں سے دارالامان کے قریب کھڑی ایک سیاہ گاڑی بھی فوراً حرکت میں آ گئی اور شاز مین والی گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگی۔

⊛----✪----⊛

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟..... ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ یوں ایک کے بعد ایک ہمیں اپنے لوگوں کا نقصان اٹھانا پڑا ہو۔ موہنی کی موت، نوازش علی کی کوٹھی پر ریڈ اور اب ورما کی گرفتاری معمولی واقعات نہیں ہیں۔ موہنی کی موت کو حادثہ قرار دے کر ہم نے من کو بہلا لیا تھا لیکن اب حالات بتا رہے ہیں کہ اس کی موت حادثہ نہیں تھی بلکہ اسے باقاعدہ ٹریس کیا گیا تھا۔ دشمن کی قید میں اس نے جانے کیا کچھ اُگلا ہوگا، ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ البتہ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں ہماری راہ پر لگ چکی ہیں جب ہی تو انہوں نے رنجنی کے بہروپ میں اپنا بندہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر بھیج دیا تھا۔ اس رنجنی کی بچی کی وجہ سے ہماری اتنی اہم ڈیل پکڑی گئی اور ہم نواب کی کوٹھی جیسے محفوظ ٹھکانے کے ساتھ ساتھ اپنے کئی ساتھیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ شالنی جیسے اہم مہرے کو ہم خود ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو گئے اور اب ورما صاحب کی گرفتاری..... پتہ نہیں کیسے وہ دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا بیٹھے تھے کہ وہ سیدھا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے اور اچھے خاصے حفاظتی انتظامات کے باوجود پکڑے گئے۔''

''ورما تو اپنی عیاشی کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اس کے مکان سے جو بازاری عورت نکلی ہے، اسی سے سمجھ آتا ہے کہ ورما عیاشی میں مصروف تھا اس لیے بے خبری میں مارا گیا۔'' پانڈے کے تشویش زدہ تبصرے کے جواب میں سامع کا کردار ادا کرتی سنتھیا نے جلبلا کر جواب دیا۔

''تم ایسا نہیں کہہ سکتیں میڈم! اگر ورما صاحب بے خبری میں مارے گئے ہوتے تو مدد کے لیے کال نہ کر پاتے۔ ہماری ہیلپ ٹیم کے لوگوں کا مارا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہاں بہت منظم کارروائی کی گئی تھی۔'' پانڈے نے ورما سے وفاداری نبھاتے ہوئے اس کی حمایت کی۔

''منظم کارروائیاں ایسے ہی نہیں ہوتیں۔ ہر ایجنٹ اپنی غلطی سے مارا جاتا ہے۔ ورما نے غلطی کی ہوگی اسی لیے پکڑا گیا۔'' سنتھیا اپنی رائے پر قائم تھی۔

''اوکے، میں مان لیتا ہوں کہ تم جو کہہ رہی ہو، وہ ٹھیک ہے لیکن اب ہم ہاتھ پر ہاتھ تو دھر کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں اپنے حالات سدھارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔'' پانڈے نے زیادہ بحث کرنے کے بجائے ہار مان لینے میں ہی عافیت سمجھی اور اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب کی ہے تم نے کام کی بات۔ واقعی اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سچویشن میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں اس سارے معاملے پر غور کرتی رہی ہوں اور چند پوائنٹس میرے ذہن میں آئے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ



موہنی کا ساتھ دینے والا ساتھی وکرم اپنی جگہ سے کیوں غائب ہے؟''

''وہ تو اس نے بتایا تھا کہ موہنی کے مرڈر کی وجہ سے وہ احتیاطاً دوسری جگہ شفٹ ہو گیا ہے۔'' پانڈے نے فوراً جواب دیا۔

''تم اس سے اس دوسری جگہ کا پتہ مانگو..... اگر وہ انکار کرے تو اسے کہیں باہر ملنے کے لیے کہو۔ سچ سامنے آ جائے گا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ سچ ہے یا وہ دشمن کی قید میں اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہے۔'' سنتھیا نے بڑے مدلل لہجے میں تجویز پیش کی جسے پانڈے کو قبول کرنا پڑا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔'' پانڈے نے فوراً ہی اپنی میز کی دراز سے ایک چپٹا سا آپریٹس برآمد کیا اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔ مخصوص کوڈز کے تبادلے کے بعد اس نے سنتھیا کی پیش کردہ تجویز کے مطابق وکرم سے گفتگو شروع کر دی۔

''حالات بہت خراب ہیں وکرم! ان حالات میں ہمیں اپنے ساتھیوں کی حفاظت کی فکر ہو گئی ہے۔ تم کئی دن سے غائب ہو اور ہمیں تمہارے ٹھکانے کا بھی پتہ نہیں۔ اپنا ایڈریس بتاؤ تاکہ خفیہ طور پر تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا جا سکے۔''

''مجھے حالات کی ساری خبریں مل رہی ہیں سر!..... لیکن آپ میری فکر نہ کریں۔ میں محفوظ ٹھکانے پر ہوں۔ ایڈریس اس لیے نہیں بتا سکتا کہ اگر یہ کال پکڑی گئی تو میں آپ کی مدد پہنچنے سے پہلے مارا جاؤں گا۔'' مؤدبانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے وکرم نے صاف انکار کیا جسے سن کر سنتھیا نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، تم اپنا ایڈریس مت بتاؤ لیکن میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ آج شام چھ بجے مینارِ پاکستان پہنچ جاؤ۔ میرے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہیں وہاں سے پک کر کے مجھ تک پہنچا دے گا۔'' پانڈے نے فوراً ہی متبادل تجویز پیش کر دی جس کے لیے ظاہر ہے وکرم انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ہچکچاتا ہوا بولا۔

''اوکے سر! اگر ملنا اتنا ضروری ہے تو میں خطرے کے باوجود ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''اوکے، گڈ بائے۔'' پانڈے نے کال منقطع کر دی اور سنتھیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ یہ وکرم نہیں تھا۔ کوئی اور وکرم کی آواز میں بات کر رہا تھا۔ وکرم جانتا ہے کہ جس آپریٹس پر اس سے بات ہو رہی تھی اس کی کال اتنی آسانی سے ٹریس نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے کال ٹریس ہونے والے خدشے کو مان لیا جائے تو پھر اسے مینارِ پاکستان آتے ہوئے بھی ڈرنا چاہئے تھا اور یہ سوچنا چاہئے تھا کہ وہاں اسے اور ہمارے ساتھیوں کو گھیرا جا سکتا ہے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم سے بات کرنے والا وکرم نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا شخص تھا جس نے سوچا ہوگا کہ وہ وکرم کے ذریعے ہمارے ایک اور ٹھکانے تک پہنچ سکتا ہے اس لیے فوراً ہامی بھر لی۔'' سنتھیا نے دوٹوک لہجے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اب یہ بتاؤ کہ شام چھ بجے ہم کیا کریں گے؟'' پانڈے نے تشویش سے پوچھا۔ وہ ورما کے انڈر میں کام کرتا تھا اور نامساعد حالات میں زیادہ تر فیصلے ورما ہی کرتا تھا اس لیے وہ اپنی مرضی سے اکیلا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا اور مسلسل سنتھیا سے مشورے لے رہا تھا۔

''ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وکرم کو لینے کے لیے کسی کو بھیج دیں اور ایک علیحدہ ٹیم اس کی نگرانی پر لگا دیں جو یہ دیکھے کہ کون اس کا تعاقب کرتا ہے۔ لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہمیں براہِ راست اپنے آدمیوں کو

سامنے لانا پڑے گا اور فی الحال یہ مناسب نہیں ہے۔ اس کی جگہ ہم کوئی متبادل ترکیب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔'' وہ ورما کو متبادل ترکیب بتانے لگی۔

''لیکن اس میں تمہارے لیے رِسک ہے۔'' ترکیب سن کر وہ متامل ہوا۔

''میری فکر نہیں کرو۔ میں نے اپنے کیریئر میں اس سے بھی بڑے رِسک لیے ہیں اور اب اس عمر میں تو مجھے مرنے سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔ ویسے بھی ماریہ کے بعد میرے پاس زندہ رہنے کا اگر کوئی جواز ہے تو صرف یہ کہ میں اس کی موت کا سبب بننے والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکوں۔ اس مشن میں اگر میری جان بھی چلی گئی تو مجھے کوئی دکھ نہیں۔''

ٹھوس لہجے میں بولتی سنتھیا کی آنکھوں میں وہ کرب تھا جو اپنی اکلوتی اولاد کو کھو دینے والی کوئی ماں محسوس کرتی ہے۔ لیکن وہ ظالم عورت ماں ہونے کے باوجود یہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس نے ساری زندگی جن زندگیوں کے چراغ گل کرتے ہوئے گزاری۔ وہ مظلوم لوگ بھی کسی ماں کی آنکھوں کا نور، کسی عورت کا سہاگ یا کسی خاندان کے کفیل تھے۔ اس نے صرف اور صرف اپنی بیٹی کے مرنے کا دکھ محسوس کیا تھا اور اس کی موت کو مکافاتِ عمل سمجھنے کے بجائے سراپا انتقام بن گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم مجھ سے سینئر ہو اور زیادہ بہتر فیصلے کر سکتی ہو۔'' پانڈے نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس کی تجویز قبول کر لی۔

''دوسرا کام تم یہ کرو کہ نواب نوازش علی کی بیٹی شازمین کی نگرانی کرواؤ۔ آشا کے ذریعے ہم تک جو آخری اطلاعات پہنچی تھیں، ان کے مطابق اسے بہروپیے خواجہ سرا رنجنی، شازمین اور کاجل کے گٹھ جوڑ کا شک تھا اور اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ رنجنی کوٹھی سے فرار ہونے کے بجائے اندر ہی شازمین کی پناہ میں تھی۔ بعد کے حالات بھی اس کے اس اندازے کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ شازمین کا کوٹھی پر ریڈ کرنے والوں سے کوئی نہ کوئی رابطہ ہوگا یا وہ ان کے بارے میں کوئی معلومات رکھتی ہوگی۔ مستقل نگرانی سے کوئی کام کی بات آ سکتی ہے۔ ایک دوسرا انتظام یہ کرو کہ دارالامان کی وارڈن کو خرید لو۔ شازمین وہاں ہے تو یہ طے ہے کہ ہم وارڈن کے ذریعے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔'' سنتھیا کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ کام بھی میں ابھی شروع کروا دیتا ہوں۔ آگے یہ بھی سوچو کہ ورما صاحب کی رہائی کے لئے کیا، کیا جا سکتا ہے؟ وہ ہمارے قیمتی ساتھی ہیں اور ہم اُنہیں یوں دشمنوں کے قبضے میں نہیں چھوڑ سکتے۔'' پانڈے کو مسلسل ورما کی فکر دامن گیر تھی۔

''پہلے ان دونوں معاملات کو نمٹنے دو۔ ہم کامیاب رہے تو سمجھو کہ ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے جنہوں نے ورما کو اریسٹ کر رکھا ہے اور ہمارے خلاف یہ ساری کارروائیاں کر رہے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اب تک جو بھی کارروائی ہوئی ہے، اس میں پولیس یا رینجرز والے سامنے نظر آتے ہیں لیکن میں اس بات کو نہیں مان سکتی۔ اس طرح کا کام بہت تربیت یافتہ اور کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں اور ہمیں ان تک پہنچنا ہے۔''

سنتھیا کی رائے صائب تھی اس لیے پانڈے کو ماننی پڑی اور ورما اس کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے اپنے کارندوں کو احکامات دینے میں مصروف ہو گیا۔

⊛----✪----⊛



یہ شازمین کی بدقسمتی تھی کہ جب اس سے جاوید علی نے رابطہ کیا، اس وقت تک ''را'' کے گرگے فعال ہو چکے تھے اور انہوں نے دارالامان کی وارڈن سے اپنے معاملات طے کر لیے تھے۔

وارڈن چالاک اور زمانہ شناس عورت تھی۔ ایک طرف اس نے ''را'' والوں سے پیسے کھرے کئے، دوسری طرف شازمین کو باہر جانے کی اجازت نہ دینے کا ڈرامہ کر کے اس سے رشوت میں انگوٹھی ٹھگ لی۔ شازمین کے لیے زروزیور کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اس لیے وہ ایک انگوٹھی کے بدلے جاوید علی تک پہنچنے کا راستہ صاف پا کر خوش تھی۔ لیکن حقیقت میں بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ راستہ صاف نہیں بلکہ باہر خوفناک شکاری اس کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

وہ مقررہ وقت پر جاوید علی کی بھجوائی ہوئی گاڑی میں اس سے ملنے کے لیے ہسپتال روانہ ہوئی تو انجانے میں ''را'' کے گرگوں کو بھی اپنے پیچھے لگا کر لے گئی۔ وارڈن کے تعاون کی وجہ سے چونکہ وہ لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر میں تعاقب کرنے والی گاڑی بدل جاتی تھی، اس لیے تجربہ کار اور مشاق ڈرائیور بھی تعاقب کا اندازہ نہ لگا سکا۔ ہسپتال جیسی عوامی جگہ پر کسی کا داخل ہو جانا اور یہ دیکھ لینا کہ شازمین کس کے کمرے میں داخل ہوئی ہے، کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

اپنے اور جاوید علی کے سر پر منڈلاتے خطرے سے بے خبر شازمین اس کے کمرے کے باہر موجود گارڈ کو اپنی شناخت سے مطمئن کر کے جذبات میں بھری ہوئی اندر داخل ہوئی اور جاوید علی کے زخم زخم وجود کو دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں سفید پٹیاں موجود نہ ہوں۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کینولا لگا ہوا تھا جس کے ذریعے قطرہ قطرہ خون اور گلوکوز اس کے جسم میں اُتارا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوٹھی میں ہونے والے دھماکے میں بری طرح زد میں آیا تھا اور کسی معجزے نے ہی اس کی زندگی بچائی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر شازمین سسک اُٹھی۔ فون پر جاوید علی کی نقاہت زدہ آواز سن کر اُس نے اُس کی حالت کا جو اندازہ لگایا تھا، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ابتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ شازمین کے لبوں سے سسکی نکلی تو اس نے اپنی بند آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا؟..... تم رو رہی ہو۔ میں نے تمہاری ضد پر محض تسلی کے لیے یہاں بلوایا تھا۔ اگر مجھے تمہارا یوں آنسو بہانا ہی منظور ہوتا تو پھر تم وہیں ٹھیک تھیں۔'' اس نے لہجے میں خفگی سموتے ہوئے اسے ٹوکا لیکن وہ بدستور اس کے بیڈ کے قریب کھڑی اشک بہاتی رہی۔ مختصر عرصے میں دل کے بہت قریب آ جانے والے جاوید علی کو اس حال میں دیکھنا اس کے لیے کڑا امتحان تھا۔

''مت رو شازمین! تمہارے رونے سے مجھے اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے جتنی تکلیف میں اپنے زخموں کی وجہ سے محسوس کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر شازمین کا گداز ہاتھ تھاما لیکن اس عمل میں وہ خود بری طرح تڑپ کر رہ گیا۔ اُس کے اس بازو میں فریکچر تھا اور اسے یوں حرکت دینے میں اسے سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''میں جان بوجھ کر نہیں رو رہی ہوں۔ تمہاری حالت دیکھ کر آنسو خود بخود میری آنکھوں سے نکل رہے ہیں۔'' بائیں ہتھیلی سے اپنے بھیگے رخساروں کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا تو ساتھ ہی اس کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی اور رخسار خشک ہونے سے پہلے ہی آنسوؤں کے نئے ریلے نے گلاب سے دہکتے رخساروں کو ایک بار پھر تر کر دیا۔

''تمہارا رونا اس صورت میں جائز ہوتا اگر یہاں اس بستر پر میرے زخمی وجود کے بجائے مُردہ جسم پڑا

ہوتا۔ میں جس فیلڈ میں ہوں، وہاں زخم کھانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہم جیسوں کے عزیزوں کو ہمیں صرف زخمی دیکھ کر شکر ادا کرنا پڑتا ہے کہ چلو زندگی سلامت ہے۔ تھوڑی مرمت کے بعد بندہ آخر کار اُٹھ کھڑا ہو جائے گا۔ سچ کہوں تو ہم تو اپنے پیاروں کو اپنے مرنے کے بعد بھی رونے کی اجازت نہیں دیتے کہ شہیدوں پر رویا نہیں جاتا بلکہ فخر کیا جاتا ہے۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔'' اس کی باتیں سن کر وہ کچھ بے بسی اور جھنجلاہٹ سے چلائی۔

''اور میں تم سے کہوں گا کہ ایک غریب سپاہی سے اپنا دل یوں نہ لگاؤ۔ تم جیسی نواب زادی اور میرے جیسے معمولی آدمی کا کوئی جوڑ نہیں۔'' ایک اُداس سی مسکراہٹ جاوید علی کے ہونٹوں پر اُبھری اور فوراً دم توڑ گئی۔ وہ اتنا زخمی تھا کہ مسکرانے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی اور اس سے بات چیت بھی صرف وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر کر رہا تھا۔

''خود کو معمولی کہہ کر مجھے میری نظروں میں مزید مت گراؤ۔ میرا تعلق تو اس گھرانے سے ہے جو جانے انجانے میں وطن کی تباہی میں شامل تھا جبکہ تم..... تم تو اس ملک کا سرمایہ ہو۔ بغیر کچھ دیکھے بھالے صرف وطن کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والا شخص معمولی کیسے ہو سکتا ہے؟ تم اگر خود کو میری نظروں سے دیکھو تو اتنا عظیم پاؤ گے کہ مجھ جیسی معمولی لڑکی تمہاری تمنا کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ دل بڑی ظالم شے ہے جاوید علی! تمہارے اور اپنے درمیان موجود فرق کو جانتے ہوئے بھی تمہاری طرف ہی لپک رہا ہے لیکن..... لیکن میں تم سے کچھ مانگوں گی نہیں۔ میں خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ تم جیسے انمول انسان کو اپنے لیے مانگ سکوں۔ ہاں، اس جسم میں جب تک جان ہے، میرا دل تمہارے نام پر ہی دھڑکتا رہے گا۔ دل پر انسان کا زور نہیں چلتا اس لیے تم بھی مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتے کہ مجھے خود کو چاہنے سے روک سکو۔'' وہ جذبات میں آ کر بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

''تم پاگل ہو شاز مین!..... اور پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہی ہو۔ تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان اتنا بڑا فرق بھی ڈھونڈ نکالا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ تم بھی اس وطن سے محبت کرتی ہو اور میں بھی۔ فرق ہے تو صرف ہمارے حالات کا۔ میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جس کے ماحول نے مجھے ایسی شاندار ملازمت میں پہنچا دیا جبکہ تم پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھیں اور اس کے باوجود اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں..... تو میرے خیال میں یہ بھی کافی تھا۔ ورنہ یہاں تو لوگ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ عیش و عشرت میں مگن اُنہیں ملک کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ ہمارے خوش حال لوگوں کی اکثریت کھاؤ پیو اور موج اُڑاؤ کے فارمولے پر عمل پیرا ہے اور باقی رہ جاتے ہیں متوسط اور غریب طبقے کے لوگ..... تو وہ بھی اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے کی جدوجہد میں ناکام ہونے پر اُنہیں گالیاں دینے میں مصروف ہیں۔ ایسی نفسا نفسی کے عالم میں تمہارے ہمارے جیسے لوگ جو دل میں ملک کا درد رکھتے ہیں، بہت نایاب ہیں اس لیے ہم میں سے کسی کو بھی معمولی نہیں سمجھا جا سکتا۔ تم بھی میرے لیے بہت انمول ہو اور میں تمہارے لیے اپنے دل میں ایسی قدر محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس وقت اتنا زخمی نہ ہوتا تو ابھی ابھی عملی مظاہرہ کر کے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا ڈالتا۔'' اتنی طویل بات کرتے ہوئے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا لیکن پھر بھی آخری لفظوں میں شوخی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آیا۔ اُداس و ملول شاز مین کے ہونٹوں پر اس کی بات سن کر پہلی بار مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔



''گڈ گرل..... دیکھو مسکراتی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ آئندہ جب بھی ملنا، ایسے ہی مسکراتے ہوئے ملنا۔'' محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جاوید علی نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر جھلک دکھانے والی مسکان کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس مسکراہٹ میں خوشی اور حجاب کے رنگ ملے جلے تھے جو شاز مین کے خوب صورت چہرے کو مزید نکھار بخش رہے تھے۔ جاوید علی اپنے زخم کو بھول کر اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی لڑکی کے دل میں اپنے لیے محبت کے جذبات اتنی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ بن گیا تھا۔ شاز مین خوب صورت تھی، اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں تھا۔ لیکن اس خوب صورتی کو جو نکھار محبت نے بخشا تھا، اس نے اسے بالکل ہی جداگانہ روپ دے دیا تھا۔ جاوید علی کو یقین تھا کہ پرستان سے اگر کوئی پری بھی اُتر کر آ جائے تو شاز مین کی خوب صورتی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ شاز مین کی صورت جو اپسرا اُس کے سامنے موجود تھی، اُس نے اُس مدہوش کر دیا تھا۔ مدہوشی کی اس کیفیت کو دروازے پر اُبھرنے والی دستک کی آواز نے توڑا۔ دستک کے ساتھ ہی دروازہ آہستہ سے کھلا اور سفید براق یونیفارم میں ایک نرس اندر داخل ہوئی۔

''ایکسکیوزمی سر! میں آپ کو یہ یاد دلانے آئی تھی کہ ابھی آپ کو زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہے اور ڈاکٹر نے آپ کے بے حد اصرار پر آپ کو صرف دس منٹ کے لیے اس ملاقات کی اجازت دی تھی اور اب تقریباً بیس منٹ ہونے والے ہیں۔'' نرس نے مہذبانہ لہجے میں اسے مطلع کیا۔

''سوری سسٹر! مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔'' جاوید علی نے فوراً اس سے معذرت کی جسے سن کر نرس کے ہونٹوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ یوں لگا کہ وہ بہ زبانِ مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ جب ملاقاتی اتنا خوب صورت ہو تو وقت کا اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

''میں چلتی ہوں۔'' گھبرائی، شرمائی سی شاز مین نے بھی دل نہ چاہنے کے باوجود اذنِ رخصت چاہا۔

''ٹھیک ہے، جاؤ اور اب پریشان نہ ہونا۔ اگر موقع ملا تو میں تمہیں بلواؤں گا ورنہ فون پر رابطہ رکھوں گا۔ لیکن تمہیں نہ تو رونا دھونا ہے اور نہ ہی اُداس ہونا ہے۔'' رخصت کرنے سے قبل جاوید علی نے اسے نصیحت کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

ہسپتال کے باہر ڈرائیور سمیت وہی گاڑی موجود تھی جس میں وہ یہاں تک آئی تھی۔ ڈرائیور نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہیں ٹھہرے گا تاکہ اسے واپس دارالامان چھوڑ دے۔ وہ سیدھی گاڑی کی عقبی نشست پر جا کر براجمان ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔ ڈرائیور نے سبک رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پچھلی نشست پر بیٹھی شاز مین کو کوئی غرض نہیں تھی کہ گاڑی کن راستوں سے گزر رہی ہے۔ وہ تو جاوید علی سے ہونے والی ملاقات کی جزئیات کو سوچنے میں مصروف تھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ پے در پے ہونے والے دو دھماکوں نے توڑا۔ دھماکوں کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی بری طرح لہرائی اور یوں لگا کہ بے قابو ہو کر سڑک سے اُتر جائے گی۔ اس صورتِ حال پر شاز مین کے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن ڈرائیور نے بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی کو سڑک سے اُترنے سے بچا لیا اور چیخ کر اس سے بولا۔

''سیٹ کے نیچے ہو کر بیٹھ جائیں۔ گاڑی کے دونوں ٹائر گولیاں لگنے سے برسٹ ہو گئے ہیں۔'' خوف زدہ سی شاز مین نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ابھی حال ہی میں تو اس نے اپنی کوٹھی پر ہونے والا خونی کھیل دیکھا تھا چنانچہ ڈرائیور کی زبانی گولیوں کا ذکر سن کر سخت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ البتہ اس نے خود گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی اور یہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ فائر بے آواز ہتھیار سے کیے گئے تھے۔

ادھر ڈرائیور گاڑی روکنے سے پہلے ہی اپنا ہتھیار نکال چکا تھا اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اگر گاڑی کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ نہ کیے گئے ہوتے تو وہ شازمین کی موجودگی میں مقابلے پر ڈٹنے کے بجائے گاڑی نکال لے جانا بہتر سمجھتا۔ لیکن اب مجبوری تھی، ان مخدوش حالات میں مقابلہ کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان پر بہت سوچ سمجھ کر بالکل سنسان راستے پر حملہ کیا گیا تھا اور حملہ کرنے والے زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے سڑک کے دونوں طرف پوزیشنز سنبھال رکھی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ ان کی یقینی واپسی کے ساتھ انہوں نے یہاں گھات لگائی ہوئی تھی۔ ان لمحات میں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ دارالامان سے ہسپتال جاتے وقت ان کا تعاقب کیا گیا تھا اور تعاقب کرنے والوں نے اس سے زیادہ ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے وہ ان کی موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اس وقت اسے تن تنہا ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ جدید ساخت کی گن تھامے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا۔ فوراً ہی بے آواز گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کے سر سے چند انچ کے فاصلے پر سے گزری۔

''گاڑی سے نکلنے کی حماقت نہیں کرنا۔ تم ہمارے نشانے پر ہو اور ہم چاہیں تو گاڑی سمیت تمہیں اُڑا سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ شرافت سے گاڑی میں بیٹھے رہو اور ہتھیار باہر پھینک دو۔'' گولی چلنے کے فوراً بعد ایک جانب سے کسی نے بلند آواز میں احکامات صادر کیے۔ بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔

ڈرائیور نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گن باہر پھینک دی۔ حملہ آور جو بھی تھے، حالات بتا رہے تھے کہ وہ انہیں فوری طور پر ہلاک کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں اس لیے وہ انہیں بھڑکانے کے بجائے کھل کر سامنے آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کے گن پھینکتے ہی دونوں طرف سے مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ساتھ ہی ایک بڑی گاڑی بھی سڑک پر چڑھ آئی۔ مسلح افراد میں سے تین نے ان کی گاڑی کا رخ کیا۔ ایک نے اگلی سیٹ سنبھالی اور دو دائیں بائیں سے دروازہ کھول کر شازمین کو درمیان میں دبوچ کر بیٹھ گئے۔

''گاڑی آگے بڑھاؤ۔ اگر ہوشیاری دکھانے کی حماقت کی تو اپنی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔'' ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے والے شخص نے اس کی پسلیوں میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں حکم دیا تو وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کے حکم پر عمل کرنے لگا۔ ان حالات میں وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان لوگوں سے بھڑنے کی جرأت کر بھی بیٹھتا تو یہ شازمین کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ عام سی لڑکی تھی جو کسی طرح ان مسلح افراد کے مقابلے میں کچھ کرنے کی اہل نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پیچھے وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں انہیں گھیرنے والوں کے بقیہ ساتھی سوار تھے۔

''یہاں گاڑی روک دو اور اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔'' تھوڑا سا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ایک موڑ پر نیا حکم صادر کیا گیا۔ اس نے حسبِ ہدایت گاڑی تو روک دی لیکن آنکھیں بند کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''آنکھیں بند کرو ورنہ یہ چھٹانک بھر کی گولی ہمیشہ کے لیے تیری آنکھ بند کر دے گی۔'' اس کے برابر میں بیٹھا شخص پسٹل کی نال سختی سے اس کے پہلو میں چبھو کر غرایا تو اسے ناچار اس کی بات ماننی پڑی۔ سی ایف پی کے ہر جیالے کی طرح اسے اپنی جان جانے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن بے مقصد بھی زندگی گنوانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زندہ رہ کر شاید اسے کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع مل جاتا ورنہ تو ابھی یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس طرح اچانک گھیر لینے والے کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے۔



آنکھیں بند کرتے ہی اس کی ناک سے کلوروفام میں ڈوبا ہوا رومال لگا دیا گیا۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر دو مسٹنڈوں کے نرغے میں بیٹھی شازمین یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہم ستانے لگا کہ جانے یہ غنڈے اس کے ساتھ کیا کریں گے۔ لیکن پھر اسے زیادہ سوچنے اور پریشان ہونے کی مہلت نہیں ملی اور ایک رومال اس کی ناک سے بھی لگا دیا گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں کتنا طویل راستہ طے کر کے انہیں کس جگہ پہنچایا گیا، کچھ خبر نہیں ہو سکی۔

دوبارہ ہوش آیا تو اس نے خود کو لوہے کی ایسی کرسی پر بیٹھا پایا جس کے ساتھ منسلک کڑوں نے اس کے ہاتھ پیروں کے ساتھ گردن کو بھی جکڑ رکھا تھا اور وہ سر کو دائیں بائیں ذرا سی جنبش دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر بعد ہوش میں آئی ہے، البتہ ہوش آتے ہی یہ ضرور یاد آ گیا تھا کہ اس کے ساتھ ڈرائیور بھی موجود تھا جسے اس سے پہلے بے ہوش کیا گیا تھا۔ ڈرائیور کی تلاش میں اس نے اضطراری طور پر سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ بائیں جانب وہ اسے نظر آ گیا لیکن اس حال میں کہ اسے چھت سے اُلٹا لٹکا دیا گیا تھا اور بالائی جسم سے قمیض غائب تھی۔ بغیر قمیض کے بدن کی حالت دیکھ کر شازمین کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ اس کا جسم یوں خون خون تھا جیسے کسی کانٹے دار کوڑے سے ادھیڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔ زخموں سے رِستا خون قطرہ قطرہ کر کے اس کے چہرے کو بھگوتا ہوا نیچے فرش پر اس کے سر کے عین نیچے چھوٹے سے تالاب کی صورت ڈھیر ہو گیا تھا۔ شازمین اندازہ نہیں کر سکی کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی زخمی ہے یا نہیں۔ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر ہی اوسان کھو بیٹھی اور ایک انسان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر بُری طرح سسک اُٹھی۔ ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ غور سے اس ستم ظریف کا جائزہ لے کر یہ اندازہ کر سکتی کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

''ہیلو بے بی! ابھی سے کیوں رو رہی ہو؟..... ابھی تو تمہارے ساتھی کی سانسیں باقی ہیں۔'' کمرے میں ایک زہریلی نسوانی آواز گونجی تو اس نے رونا بھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی جس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نظروں نظروں میں ہی اسے بھسم کر ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور کیوں ہمیں اغوا کیا ہے؟..... اور اس بے چارے کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟'' شازمین نے خوف زدہ رُندھی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔

''اوہ نو..... دیکھو لڑکی! سوال صرف میں کروں گی جن کے تمہیں صحیح صحیح جواب دینے ہوں گے ورنہ اپنے ساتھی کی طرح تم بھی اسی حال میں لٹکی ہوئی ہو گی۔'' عورت جو کہ سنتھیا تھی، اس کا لہجہ مزید سخت ہو گیا اور اس نے قہر برساتی آواز میں اسے دھمکی دی۔

''آپ مجھ سے پتہ نہیں کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ صرف ایک ڈرائیور ہے۔'' شازمین نے مدافعانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''اس سے تعلق نہیں ہے لیکن اس شخص سے تو ضرور تعلق ہو گا جس سے ملنے تم ہسپتال گئی تھیں۔ مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ۔'' سنتھیا اس کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ گچھ کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ یہ اسی کی تجویز تھی کہ شازمین کو کسی طرح اغوا کر لیا جائے اور اس سے رنجنی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اب یہ شازمین کی بدقسمتی تھی کہ جس وقت سنتھیا کے ذہن میں یہ تدبیر آئی اسی وقت اس نے جاوید علی سے ملاقات کے لیے ہسپتال جانے کا قصد کیا۔ سنتھیا جیسی زیرک عورت

کھٹک گئی کہ یہ کون شخص ہے جس سے ملاقات کے لیے شازمین اتنے مخدوش حالات میں دارالامان سے نہ صرف باہر نکلی ہے بلکہ اس شخص کی طرف سے اسے گاڑی بھی بھجوائی گئی ہے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کا آغاز رنجنی سے متعلق سوال جواب کرنے کے بجائے ہسپتال میں داخل شخص کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے کیا۔

''وہ میرے ایک عزیز ہیں اور میں ان کی عیادت کے لیے گئی تھی۔'' شازمین، جاوید علی کی کسی خفیہ ایجنسی سے وابستگی سے واقف تھی اس لیے فوراً سمجھ گئی کہ اسے اغوا کرنے والے دراصل جاوید علی کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں اور اسی کی وجہ سے وہ اغوا کی گئی ہے اس لیے بات بنانے کی کوشش کی۔

''تمہارے عزیز کا کیا نام ہے؟ اور وہ کس وجہ سے ہسپتال میں داخل ہے؟'' سنتھیا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے اگلا سوال داغا۔

''ان کا نام علی ہے۔ وہ کسی حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔'' شازمین نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور حتی الامکان مناسب جوابات دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہارے یہ علی صاحب کیا کام کرتے ہیں؟''

''وہ بزنس مین ہیں۔'' شازمین نے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ پے در پے جھوٹ بولتے ہوئے اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔

''کیا بزنس کرتے ہیں وہ؟'' سنتھیا اسے ذرا بھی مہلت دینے کو تیار نہیں تھی۔

''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔ اصل میں ہمارا آپس میں اتنا زیادہ ملنا جلنا نہیں ہے۔'' اس بار وہ روانی سے جھوٹ نہ بول سکی اور اٹک اٹک کر وضاحت دی۔

''بڑی عجیب بات ہے کہ تم نے اپنے جن عزیز سے ملنے کے لیے دارالامان کی وارڈن کو ایک نہایت قیمتی انگوٹھی رشوت میں دے ڈالی، تمہیں اس عزیز کے بارے میں کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں معلوم ہے۔ تمہارا بتایا ہوا نام، پیشہ، حادثے کی نوعیت سب ہسپتال کے ریکارڈ سے مختلف ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں تمہیں صحیح سمجھوں یا ہسپتال کے ریکارڈ کو؟'' سنتھیا کا لہجہ طنز و تحقیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شازمین کی بولتی بند ہو گئی۔ پھر وہ بڑی ہمت کر کے بولی۔

''صحیح کام مجھے نہیں معلوم۔ میں جو جانتی تھی، وہ آپ کو بتا دیا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری یہ بات مان لیتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ رنجنی کہاں ہے؟'' سنتھیا کا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ شازمین کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کہیں سامنے بیٹھی عورت کو جاوید علی اور رنجنی کی حقیقت کا علم تو نہیں ہو گیا ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟'' اسے خاموش پا کر سنتھیا چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ رنجنی کون ہے.....؟'' شازمین نے ایک بار پھر سنبھالا لینے کی کوشش کی۔

''بڑی جلدی بھول گئیں اپنے عیاش باپ کی دل لگی کے لیے لائے گئے اس حسین خواجہ سرا کو جسے بعد میں تم نے اپنے کمرے میں پناہ دی تھی۔''

سنتھیا کے جواب پر جہاں شازمین کا چہرہ خفت سے سرخ پڑا، وہاں اسے اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ اس کے سامنے بیٹھی ہستی کی معلومات غضب کی ہیں اور اتنی زبردست معلومات رکھنے والی شخصیت کوئی عام عورت تو ہو نہیں سکتی تھی۔ یقینی طور پر اس کا تعلق انہی لوگوں سے تھا جن کے خلاف جاوید علی اور اس کے



ساتھی برسرِ پیکار تھے۔

''تمہیں ہر معاملے کی اتنی خبر ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرے باپ کے پاس رنجنی کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے خواجہ سرا موجود تھے جنہیں یاد رکھنا میں نے کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ نہ ہی مجھے ان میں سے کسی کو اپنے کمرے میں چھپانے کی کوئی ضرورت پڑی تھی۔ کوٹھی پر جو تباہی ہوئی، اس میں دوسرے خواجہ سراؤں کے ساتھ رنجنی بھی مر کھپ گئی ہو گی۔'' شازمین اب تک نرم اور مدافعانہ لہجے میں ہر سوال کا جواب دیتی رہی تھی لیکن باپ کی عیاشی جتلائے جانے پر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میرے خیال میں تم بھی اپنے ساتھی کی طرح اُلٹا لٹکے بغیر کچھ نہیں اُگلو گی۔ اس نے بھی اُلٹا لٹک کر کھال اُترنے کے بعد ہی تسلیم کیا تھا کہ رنجنی اور وہ شخص جس سے ملنے تم ہسپتال گئی تھیں، کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ ہیں۔ اب یہ تم بتاؤ کہ وہ ایجنسی کون سی ہے اور کس کے ماتحت کام کرتی ہے؟''

سنتھیا نے اپنے قائم کردہ اندازوں کی بنیاد پر اس کے ساتھ بلف کیا، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ڈرائیور کی چمڑی ادھیڑ ڈالنے کے باوجود اس سے کچھ بھی نہیں اُگلوا پائی تھی اور اس کے نیم جان زخمی وجود کو محض شازمین پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے وہاں لٹکا رکھا تھا۔ البتہ اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ بالکل غلط سمت میں کام کر رہی تھی اور شازمین جیسی غیر متعلق لڑکی کو گھیر لیا تھا جو جاوید علی کے نام اور اس کی کسی خفیہ ایجنسی سے وابستگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ آنے والے لمحات میں اس کی یہ خوش فہمی دھری رہ جانی تھی کہ وہ ایک کمزور لڑکی کے ذریعے زیادہ معلومات حاصل کر سکتی ہے۔

''یقین کرو، میں کچھ نہیں جانتی۔'' شازمین کی نظروں کے سامنے ڈرائیور کا اُدھڑا ہوا خون میں لت پت جسم تھا چنانچہ خود بھی اسی تکلیف سے گزرنے کے خیال سے وہ دہشت زدہ سی ہو کر چیخی۔

''تھوڑی دیر میں تم خود ہی فرفر بتانے لگو گی کہ کیا کچھ جانتی ہو؟'' سنتھیا نے سرد مہری سے جواب دیا اور اپنی کرسی کے ہتھے کے ساتھ منسلک ایک بٹن دبایا۔ فوراً ہی کمرے میں ایک قوی الجثہ شخص داخل ہوا اور ہاتھ باندھے سنتھیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''موہن! یہ لڑکی سیدھی طرح سے اپنا منہ کھولنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تم اس سے پوچھو کہ یہ کیا کچھ جانتی ہے؟'' سنتھیا آنے والے سے مخاطب ہوئی۔

''ٹھیک ہے میڈم! میں اسے بھی اس کے ساتھی کے ساتھ لٹکا دیتا ہوں۔'' جب جسم سے کھال اُترے گی تو سب بولنے لگے گی۔'' وہ فوراً مستعدی سے بولا۔

''ارے او قصاب کی اولاد! تجھے عقل نہیں ہے کہ اتنی خوب صورت لڑکی کے جسم کی کھال نہیں اُتاری جاتی بلکہ کچھ اور کیا جاتا ہے۔ دیکھ کتنا خوب صورت کھلونا ہے..... جا کھیل اس کے ساتھ اور کھیل کھیل میں سب معلوم کر لے پھر بھی یہ نہ بولے تو توڑ ڈالنا اس چینی کی گڑیا کو۔'' وہ سفاکی کی انتہا پر تھی۔ اس کی بات سن کر شازمین ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم..... میں کچھ نہیں جانتی۔'' لیکن وہاں موجود نفوس نے اپنے کان مکمل طور پر بند کر رکھے تھے۔ موہن جیسے خبیث مرد کے لیے اگر کمزور چڑیا کی طرح پھڑکتی لڑکی کا واویلا پُرلطف تھا تو سنتھیا اپنی اکلوتی بیٹی کلارا عرف ماریہ کی موت کے بعد سراپا انتقام بن گئی تھی۔ اپنے انتقام کی آگ میں جلتی شاید ہر پاکستانی کو موت کے منہ میں دھکیل دینا چاہتی تھی اس کا سفاک جذبۂ انتقام شازمین کی تڑپ سے تسکین پا رہا تھا۔ موہن نے شازمین کے ہاتھ پیر آزاد کرنے کے بعد اسے کپڑوں کی قید سے آزاد کیا تو وہ یہ سارا منظر اتنے

اطمینان سے دیکھتی رہی جیسے ٹی وی اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہی ہو۔

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا پتہ ہے کہ رنجنی، شالنی کے پیچھے لگ کر ہماری کوٹھی تک پہنچی تھی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رنجنی کوئی خواجہ سرا نہیں بلکہ مرد ہے جو کسی خفیہ ادارے کے لیے کام کرتا ہے۔ اس ادارے کا نام پتہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ ہسپتال میں داخل علی اور رنجنی ایک ہی شخصیت ہیں۔'' اگر شازمین کو چھت سے اُلٹا لٹکا کر اس کی کھال اُتار دی جاتی تو شاید وہ اپنی زبان نہ کھولتی لیکن ہر باعصمت لڑکی کی طرح اپنی عزت پر داؤ لگتے دیکھ کر اس نے آخری کوشش کے طور پر سچائی ظاہر کر دی۔

''گڈ، اچھی امپروومنٹ ہے۔ تم اپنی آگے کی کارروائی کرو۔ یہ ابھی آگے اور بولے گی۔'' سنتھیا نے موہن کو مزید شہ دی اور وہ جانور بالکل آپے سے باہر ہو گیا۔ منٹوں میں اس نے نازک اندام شازمین کا وہ حشر کر ڈالا کہ اس میں چیخنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ سنتھیا کو گڑیا سی اس لڑکی کے ٹوٹ پھوٹ جانے پر کوئی افسوس نہیں تھا لیکن وہ اس بات پر غصے سے کھول رہی تھی کہ اتنا سب ہو جانے کے باوجود شازمین سے اپنی پسند کی معلومات حاصل نہیں کر سکی تھی۔

''گلا گھونٹ کر اسے اور اس کے ساتھی کو کہیں لے جا کر پھینک دو۔'' اس نے ایک نفرت بھری نظر شازمین کے نیم جان وجود پر ڈالی اور یوں حکم صادر کیا جیسے انسانوں کو نہیں، طاعون زدہ چوہوں کو پھینکنے کی بات کر رہی ہو۔ حقیقتاً وہ مسلمانوں کو سمجھتی بھی یہی تھی۔ مسلمانوں سے خون میں رچی ہوئی نفرت نے بیٹی کے انتقام کے ساتھ مل کر اسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں سب کچھ جلا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی۔

⊛----✪----⊛

شازمین کا اغوا بہت دیر تک جاوید علی سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ شازمین کو دارالامان ڈراپ کرنے کے بعد ڈرائیور نے جب وقت پر رپورٹ نہیں کی تو اُس نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے دارالامان فون کیا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ شازمین واپس نہیں پہنچی ہے۔ تشویش زدہ ہو کر اس نے فوراً کراچی یونٹ کے انچارج کو اطلاع دی اور اس نے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر فوراً ہی محکمے کی کار کو ایک پارکنگ میں خالی کھڑا دریافت کروا لیا تھا۔ خالی گاڑی نے شازمین کے ڈرائیور سمیت اغوا کو کنفرم کر دیا۔ صورتِ حال سامنے آتے ہی کراچی یونٹ کا انچارج ایکٹو ہو گیا۔ اُس نے ایک طرف شازمین اور ڈرائیور کے اغوا کاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ٹیم ترتیب دی تو دوسری طرف جاوید علی کے تحفظ کے لیے بھی سرگرمی دکھائی۔

''میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کے ذریعے دشمن کسی طرح تمہاری راہ پر لگ گئے ہیں اس لیے میں تمہیں فوری طور پر اس ہسپتال سے شفٹ کروا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں کسی نہ کسی طور تمہاری نگرانی ہو رہی ہو گی اور موقع پاتے ہی وہ لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔'' اس نے شازمین کی طرف سے سخت تشویش میں مبتلا جاوید علی سے کہا تو اس کا بہت شدت سے دل چاہا کہ وہ انچارج سے کہے کہ وہ اس کی فکر کرنے کے بجائے پہلے شازمین کو بازیاب کروانے کی کوشش کرے لیکن کہہ نہ سکا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فورس کے ڈسپلن میں اس قسم کی جذباتیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شازمین کے لیے جو کچھ کرنا ممکن ہو گا، وہ اس کے کہے بغیر بھی کیا جا رہا ہو گا اور اسے صرف اس پر عمل کرنا ہو گا جو اس سے کہا جا رہا تھا۔

خود اس کا یہ عالم تھا کہ زخموں سے چُور ابھی تک گلوکوز اور دواؤں پر ڈپینڈ کر رہا تھا اور کسی صورت بستر سے



اُتر کر شازمین کی تلاش کے لیے نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ تن بہ تقدیر رہ کر خاموش تماشائی بنے رہنے پر مجبور تھا۔

''مسٹر فیاض! آپ کے پاؤں کے فریکچر کے بارے میں ہمارا اندازہ ہے کہ یہ عام پلاستر سے ٹھیک نہیں ہو گا اور ہمیں اسے آپریٹ کرنا پڑے گا اس لیے ہم نے وقت ضائع کرنے کے بجائے فوری طور پر آپریشن کا فیصلہ کیا ہے۔ کچھ دیر میں آپ کو یہاں سے او۔ٹی میں شفٹ کر دیا جائے گا۔''

ابھی انچارج سے گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کا ڈاکٹر کمرے میں نازل ہو گیا اور اسے اس نام سے مخاطب کرتے ہوئے جو کہ ہسپتال کے ریکارڈ میں درج تھا، مطلع کیا۔ جاوید علی کے پاس اس اطلاع پر ''یس'' کہنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر کے بتائے بغیر وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اسے ہسپتال سے نکال لے جانے کی کوئی ترکیب تھی۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی اس کے کمرے میں دو میل نرس آ گئے جنہوں نے اسے آپریشن کے لیے مخصوص لباس تبدیل کروا کر اسٹریچر پر شفٹ کر دیا اور پھر اسے اس کے کمرے سے نکال کر آپریشن تھیٹر کی طرف چل پڑے۔

''آپریشن کے دوران ایک صاحب کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ ان کی ڈیڈ باڈی گھر بھجوانے کے بہانے ہم آپ کو یہاں سے دوسری جگہ شفٹ کر دیں گے۔'' اندر پہنچ کر دونوں میل نرسوں میں سے ایک نے اسے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ دیر میں اسے کسی مُردے کی طرح سفید چادر سے سر سے پیر تک ڈھانپ کر آپریشن تھیٹر سے باہر لے جایا گیا تھا۔

''ڈیڈی!'' سفید چادر کے نیچے دم سادھے لیٹے اسے کسی لڑکی کے زور سے رونے کی آواز سنائی دی اور یوں لگا کہ وہ اس کے اسٹریچر کے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی ہو۔

''بی بی! ڈاکٹر نے آپ کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ آپ کے والد کی باڈی میں خطرناک قسم کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جو چھونے پر کسی دوسرے شخص کو بھی لگ سکتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کی بات یاد رکھ کر ان سے دُور رہیں اور ہمیں اپنی کارروائی کرنے دیں تاکہ ہم ان کی ڈیڈ باڈی کو محفوظ طریقے سے آپ کے گھر تک پہنچا سکیں۔''

اس کے اسٹریچر کے ساتھ مسلسل موجود میل نرسوں میں سے ایک نے لڑکی کو سخت آواز میں جھڑکا تو اس کا کوئی مرد عزیز اس کے قریب چلا آیا اور اسے سمجھا بجھا کر اسٹریچر سے دور لے گیا۔ جاوید علی کا اسٹریچر ایک بار پھر حرکت میں آ گیا لیکن وہ لڑکی کی سسکیاں اب بھی سن رہا تھا اور اسے شازمین یاد آ رہی تھی۔ زیادہ دیر تو نہیں گزری تھی جب وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے زخمی وجود کو دیکھ کر بری طرح سسک رہی تھی۔ اس کے رونے پر جاوید علی نے اپنے دل میں شدید تکلیف محسوس کی تھی اور یہ وہ خود ہی جانتا تھا کہ جس کا رونا بھی اس کے لیے سخت تکلیف دہ تھا، وہ اغوا ہو کر یقینی طور پر دشمنوں کی تحویل میں چلی گئی تھی تو اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔

اُس کا ایک ایک پل یہ سوچتے ہوئے گزر رہا تھا کہ وہاں اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا جا رہا ہو گا اور وہ کیسے ان حالات سے نمٹ رہی ہو گی۔ اسے سخت افسوس تھا کہ شازمین جیسی دکھی لڑکی جس نے اپنے بچپن سے لے کر نوجوانی تک کا عرصہ اپنے باپ کی عجیب و غریب نفسیاتی اُلجھنوں کی وجہ سے تکلیف میں گزارا تھا، محبت کے دریا میں اُترتے ہی گرداب میں پھنس گئی تھی اور اس کا سبب یقیناً جاوید علی کی ذات تھی۔ ابھی تک حقائق کھل کر سامنے نہ آنے کے باوجود وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ شازمین کو اسی کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے اور دشمن ایک کمزور لڑکی کے سہارے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کمزور سی لڑکی جو اسے بہت عزیز ہو چلی تھی، دشمن کی قید میں تھی اور وہ خود کسی محفوظ جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس بات کا اس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا اور سفید چادر تلے لیٹے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ کوئی لاش ہو جس سے عمل کی طاقت چھین لی گئی تھی۔

بے بسی کے اس عالم میں کب اسے ایمبولینس میں ڈال کر مقررہ جگہ پر پہنچا دیا گیا، پتہ ہی نہیں چلا۔ اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے میل نرس یہاں بھی موجود تھے جنہوں نے اسے ایک کمرے میں آرام دہ بستر پر منتقل کر دینے کے بعد ڈرپ وغیرہ لگانا شروع کر دی۔ آپریشن تھیٹر نے اسے ایک مُردے کی طرح باہر نکالنے کی غرض سے اسے ان چیزوں سے آزاد کر دینا پڑا تھا لیکن اسے ابھی ان کی ضرورت تھی۔ گلوکوز کے ساتھ اسے زخم جلد ٹھیک کرنے کے لیے اینٹی بائیوٹک ادویات وغیرہ بھی شامل کر کے دی جا رہی تھیں۔ اس لیے ایک سُوئی کا ہمہ وقت اس کے جسم میں چبھا رہنا ضروری تھا۔

''یہ جگہ ہسپتال نہیں بلکہ سی ایف پی کا ایک ٹھکانہ ہے۔ ہم دونوں سی ایف پی کے ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرس بھی ہیں اس لیے ہمیں ہسپتال مین آپ کی سکیورٹی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ہم دونوں آپ کی دیکھ بھال کریں گے اور بارہ گھنٹے کے حساب سے ڈیوٹی دیں گے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت محسوس ہو، ہم میں سے ڈیوٹی پر موجود شخص کو بلا جھجک آگاہ کر دیجیے گا۔ ہمیں اوپر سے آپ کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' اب تک خاموش رہنے والے میل نرس نے کام سے فارغ ہو کر اس سے کہا۔

''شکریہ، میں بتا دوں گا۔ البتہ تم میں سے اگر کسی کو شازمین کی بازیابی کے سلسلے میں ہونے والی کارروائیوں کا علم ہو تو کچھ تفصیل مجھے بھی بتا دو۔'' اس نے درخواست کی۔

''سوری سر! ہم ہسپتال میں مصروف تھے اس لیے ہمیں کچھ پتہ نہیں چلا، البتہ شنید ہے کہ انچارج صاحب یہیں موجود ہیں اور آپ سے ملاقات بھی کریں گے۔'' میل نرس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اب اسے یہاں لیٹ کر انچارج کا انتظار کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے انتظار کی یہ گھڑیاں زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئیں اور آدھے گھنٹے میں ہی انچارج اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟'' کسی اور موضوع کو چھیڑنے سے پہلے اس نے مزاج پرسی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''فائن۔'' جاوید علی نے یک لفظی جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے اور تمہیں مکمل آرام کے ساتھ ساتھ بہترین علاج کی بھی ضرورت ہے لیکن سکیورٹی رِسک کی وجہ سے میں نے تمہیں کسی دوسرے ہسپتال شفٹ کروانے کے بجائے یہاں بلوا لیا ہے۔ یہاں تمہارے آرام اور علاج کا پورا خیال رکھا جائے گا۔''

''شکریہ سر!'' جاوید علی نے اس بار بھی سنجیدگی سے مختصر جواب دیا۔

''اس لڑکی شازمین کی گمشدگی کے بارے میں کچھ اہم کلیوز ملے ہیں۔ ہم نے اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کہیں نواب نوازش علی کی کوئی ذاتی دشمنی کی وجہ سے اس کی بیٹی کو اغوا نہ کیا گیا ہو، شازمین کی والدہ سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ایسی کسی دشمنی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن اتفاق سے عین اس موقع پر انہوں نے ہمارے آدمی کے ساتھ موجود دارالامان کی وارڈن کی اُنگلی میں موجود شازمین کی انگوٹھی کو پہچان لیا اور وارڈن سے باز پرس کرنے لگیں کہ ان کی بیٹی کی انگوٹھی اس کے پاس کیسے آئی۔ وارڈن نے بیگم نوازش علی کو تو ٹال دیا لیکن ہمارا بندہ اس کے سر ہو گیا جس کے سامنے اس نے اعتراف کیا کہ اس نے شازمین کو دارالامان سے باہر جانے کی اجازت دینے کے لیے انگوٹھی بطور رشوت لی ہے۔ اس اعتراف کے بعد اس لالچی عورت کے ساتھ مزید سختی سے باز پرس کی گئی جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ کسی اجنبی نے اسے بھاری رقم کے عوض شازمین کی نقل و حرکت اور ٹیلی فونک گفتگو سے آگاہ رکھنے کی ذمے داری سونپی تھی۔



وارڈن کو یہ اطلاع ایک موبائل نمبر پر دینی تھی سو جیسے ہی شازمین کا ہسپتال جانے کا پروگرام طے پایا، اس نے موبائل پر اطلاع دے دی۔ وارڈن سے ملنے والے موبائل نمبر کی ہم نے جانچ پڑتال کروالی ہے۔ وہ جعلی کاغذات کی مدد سے حاصل کی گئی ایک سم کا نمبر ہے جسے اب بند کر دیا گیا ہے اس لیے ہم اس نمبر کے ذریعے مجرموں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔ البتہ ہسپتال سے دارالامان تک کے روٹ کا جائزہ لے کر اس بات کا تعین کر لیا گیا ہے کہ کس جگہ گاڑی روک کر ان دونوں کو اغوا کیا گیا ہوگا۔ اس سڑک سے ہمیں گولیوں کے خول ملنے کے علاوہ سڑک کے دونوں جانب کچے راستے پر ایسے نشانات ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ وہاں موجود تھے اور یقینی طور پر وہ اغوا کار ہی تھے جنہوں نے پہلے سے گھات لگا کر ایک ویران سڑک پر اپنی کارروائی کی تھی۔''

انچارج اسے تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھ رہی تھی کہ کس طرح اس کامنی سی لڑکی کو تلاش کرے جو پہلا پیار بن کر بہت مختصر عرصے میں اس کے دل پر چھا گئی تھی۔ صورتِ حال قدرے غیر واضح ہونے کے باوجود اسے یقین تھا کہ شازمین پر جو کچھ گزری، اسی کی وجہ سے گزری ہے۔ وہ کسی ذاتی دشمنی یا عام مجرمانہ کارروائی کے بجائے اس وجہ سے مصیبت میں پھنسی ہے کہ اس کا جاوید علی سے تعلق بنتا تھا۔ اس جاوید علی سے جس نے رنجنی کے روپ میں ''را'' کا ایک خفیہ ٹھکانہ ختم کروانے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے ہاتھوں اسلحے کا ایک بڑا ذخیرہ تباہ کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ اپنے انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ انچارج کے ہاتھ میں موجود موبائل سیٹ گنگنا اُٹھا۔ انچارج نے کال وصول کی تو اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی کی تہ مزید دبیز ہو گئی۔

''میں آ رہا ہوں۔'' کال سن کر اس نے یہ مختصر جواب دیا اور جاوید علی کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی پر موجود میل نرس ایک وہیل چیئر لیے اندر داخل ہوا۔

''سر آپ کو دوسرے کمرے میں بلوا رہے ہیں۔'' میل نرس نے اسے اطلاع دی اور وہیل چیئر پر منتقل ہونے میں مدد دینے لگا۔ جاوید علی کا دل اس صورتِ حال پر بری طرح تشویش میں گھر گیا۔ یہ بلاوا بہت غیر معمولی تھا۔ کچھ دیر قبل ہی تو انچارج اس کی حالت کے پیشِ نظر خود اس سے مل کر گیا تھا پھر اچانک ہی کیا ہو گیا تھا کہ اس کا وہاں سے بلاوا آ گیا تھا؟

میل نرس وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو بھی تشویش سے اس کا برا حال تھا۔ اسی پریشانی اور اُلجھی ہوئی کیفیت میں اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں انچارج، کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا جہاں کسی ہسپتال کے کمرے کا منظر نظر آ رہا تھا لیکن اس منظر میں موجود انسانوں کے چہرے واضح نہیں تھے۔

''آؤ جاوید! میں نے تمہیں ایک اہم ضرورت کی وجہ سے تکلیف دی ہے ورنہ مجھے تمہاری کنڈیشن کا اچھی طرح اندازہ ہے۔'' اس کے وہاں پہنچنے پر انچارج اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں سمجھتا ہوں سر!'' جاوید علی نے سنجیدگی سے اسے جواب دے کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا جس پر چھائی سنجیدگی کی تہ معمول سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

''جس ہسپتال میں تم ایڈمٹ تھے، وہاں ہمارے آدمی کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے جس پر یہ شک ہو کہ وہ تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔ اس کام کے دوران اتفاق سے ان کی توجہ پولیس کے لائے ہوئے ایک جوڑے کی طرف چلی گئی تھی جس میں سے مرد مر چکا تھا اور لاش کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ

اس پر بے تحاشا تشدد کیا گیا ہے۔ اس مرد کو شناخت کر لیا گیا، وہی ڈرائیور تھا جسے شاز مین کو دارالامان پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس لیے خیال کیا گیا کہ اس کے ساتھ موجود لڑکی شاز مین ہی ہو سکتی ہے۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مارنے والے سے شاید اندازے کی غلطی ہو گئی اور وہ اسے نیم مُردہ حالت میں ایک میدان میں پھینک کر بھاگ گئے۔ ہمارے آدمی کی لاش کے ساتھ اسے میدان میں کرکٹ کھیلنے والے بچوں نے دریافت کیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہے اور فی الحال ڈاکٹرز کہنے سے قاصر ہیں کہ اس کی زندگی بچ سکے گی یا نہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے کہ تم دیکھ کر شناخت کر لو کہ ملنے والی لڑکی شاز مین ہی ہے یا نہیں۔''

انچارج نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا اور دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کی پیڈ پر چند بٹن دبائے۔ اس بار مانیٹر پر ہسپتال کے کمرے میں موجود دیگر افراد کو چھوڑ کر صرف ایک چہرہ واضح ہو گیا جسے جاوید علی آکسیجن ماسک کی موجودگی کے باوجود شناخت کر سکتا تھا۔ وہ شاز مین ہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی قدر ناشناس نے قدرت کے بنائے اس حسین شاہکار کو بری طرح برباد کر کے رکھ دیا ہو۔

''یہ شاز مین ہی ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں تکلیف کے شدید احساس کے ساتھ بمشکل تصدیق کی۔

''اوہ.....'' انچارج کے ہونٹوں نے سکڑ کر نیم دائرہ بنایا۔ ''بے چاری کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ اسے بری طرح زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹرز کا یہ بھی خیال ہے کہ گلا گھونٹنے کے لیے اس کی گردن پر جتنا شدید دباؤ ڈالا گیا ہے، اس سے شاید اس کی قوتِ گویائی بھی متاثر ہوئی ہو۔ بہرحال، فی الحال تو وہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، باقی معاملات اس کے ہوش میں آنے کے بعد واضح ہوں گے۔'' انچارج نے اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بٹن دبا کر مانیٹر کی اسکرین پر موجود شاز مین کے چہرے کو غائب کر دیا لیکن شاز مین کا بے بس اور مظلوم چہرہ جاوید علی کے ذہن کی اسکرین پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے جسم میں بیک وقت رنج و طیش کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

⊛----✪----⊛

''تم نے تیاری کر لی ہے پانڈے؟''

''ہاں، ہمارے آدمیوں نے مینارِ پاکستان کے پاس طے شدہ مقام کے اردگرد پوزیشنز سنبھال لی ہیں اور پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہیں کہ وکرم وہاں کس طریقے سے آتا ہے۔ باقی کا کام بھی وقت پر پورا ہو جائے گا۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ اس کی مخاطب سنتھیا جوزف تھی جسے اوپر سے آنے والے حکم کی وجہ سے فوری طور پر لاہور سے کراچی جانا پڑا تھا۔ کراچی میں اس سے کیا خاص کام لیا جانا تھا، یہ ابھی نہیں بتایا گیا تھا البتہ وہ وہاں جاتے ہی شاز مین والے معاملے میں اُلجھ گئی تھی۔

''وکرم سے ملاقات کے لیے تم نے کسی ڈھنگ کے آدمی کا انتخاب کیا ہے نا؟ میں ہوتی تو خود یہ کام نمٹا دیتی لیکن اب فکر ہے کہ کوئی دوسرا صحیح سے کام کر بھی سکے گا یا نہیں۔'' اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ڈونٹ وری، تمہارے بعد اس کام کے لیے میں خود جاؤں گا۔'' پانڈے نے اسے تسلی دی اور پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''تم سناؤ، وہاں کیا حالات ہیں؟''

''یہاں حالات ابھی تک آؤٹ آف کنٹرول ہیں۔ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر ہونے والے ریڈ کے سلسلے میں انکوائری چل رہی ہے۔ نواب کی بیٹی اور اس کے ساتھ موجود ڈرائیور کو اغوا کرنے کا بھی کوئی خاص فائدہ



نہیں ہوا۔ ڈرائیور کوئی بے انتہا مضبوط اعصاب کا تربیت یافتہ شخص تھا جس نے اپنی جان دے دی لیکن منہ سے کچھ اُگلا نہیں۔ البتہ شاز مین نے اتنا اعتراف ضرور کیا کہ کوٹھی پر ہونے والی تباہی اور اس سے پہلے ہماری اسلحے کی ڈیل پکڑے جانے میں رنجنی نامی اسی خواجہ سرا کا ہاتھ تھا جس پر پہلے ہی ہم شک کر رہے تھے۔ وہ دراصل کسی خفیہ ایجنسی کا بندہ تھا جو خواجہ سرا کا بہروپ بدل کر نواب کی کوٹھی میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہم شاز مین کا پیچھا کرتے ہوئے ہسپتال میں ایڈمٹ جس بندے تک پہنچے تھے، وہ وہی تھا لیکن ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے شاز مین کو اغوا کر کے اسے ہوشیار کر دیا اور اس کے ساتھی بہت چالاکی سے اسے ہسپتال سے نکال لے گئے۔ شاز مین بھی ہمیں انہی چند باتوں کے سوا کچھ نہیں بتا سکی۔ اس اعتبار سے ہماری ساری بھاگ دوڑ بے کار گئی۔'' سنتھیا نے اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''ویری بیڈ..... ایسا لگتا ہے کہ ہمارا اس بار کچھ نئے لوگوں سے پالا پڑ گیا ہے اس لیے ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' پانڈے نے تبصرہ کیا۔

''شاید ایسا ہی ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری طرف کے کام میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔''

''ڈونٹ وری۔ ہم بہت محتاط ہیں۔ کسی گڑبڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' پانڈے نے اسے ایک بار پھر تسلی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ وکرم سے طے کیا گیا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔

''کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے مینارِ پاکستان کے اردگرد مقرر کیے گئے اپنے ماتحتوں میں سے ایک سے رابطہ کیا۔

''سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا ہے اور ابھی تک کوئی مشکوک شخص ہماری نظروں میں نہیں آ سکا ہے۔'' ادھر سے جواب ملا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ پوری طرح ہوشیار رہنا۔ ذرا سی غلطی ہمارے لیے ناکامی بن جائے گی۔'' اس نے سخت لہجے میں ہدایت دی۔

''ہم ہوشیار ہیں سر!'' اسے ویسی ہی تسلی دی گئی جو وہ اب تک سنتھیا کو دیتا رہا تھا۔ اس بار اس نے کچھ بھی کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور خود اپنے دفتر سے اُٹھ کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہاں چست جینز اور سلیولیس ٹاپ میں ایک اسمارٹ سی لڑکی موجود تھی۔ لڑکی کے بال سرخی مائل بھورے تھے جنہیں پونی ٹیل کی شکل میں باندھا گیا تھا۔ گردن کی جنبش سے دائیں بائیں ہلتی پونی ٹیل اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ پانڈے کو دیکھ کر اس نے ذرا مؤدبانہ انداز میں اس کا استقبال کیا۔

''تمہاری تیاری مکمل ہے سنیتا؟''

''یس سر! میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے پانڈے کو مؤدبانہ انداز میں ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ سیدھا اسی کرسی پر جا بیٹھا۔ کرسی کے سامنے ایک بہت بڑا دیوار گیر آئینہ لگا ہوا تھا جس میں پانڈے اپنے عکس کا بہت بھرپور طریقے سے جائزہ لے سکتا تھا۔

''اسٹارٹ کروں سر؟'' اس کے بیٹھتے ہی سنیتا نے پوچھا۔

''شیور، اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' آئینے میں نظر آتے سنیتا کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اجازت دی تو اس کے ہاتھ فوراً حرکت میں آ گئے۔ پارلر کے انداز میں سیٹ کیے گئے اس کمرے میں وہ تمام جملہ لوازمات موجود تھے جو سنیتا کو پانڈے کی منشا کے مطابق ڈھالنے کے لیے درکار تھے۔ سنیتا ایک نہایت مشاق میک اپ آرٹسٹ تھی جسے کسی بھی شخص کا روپ بدل کر ڈالنے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ پانڈے نے

اُس کے اس ہنر کو کئی بار آزمایا تھا، اس کے باوجود ہر بار اسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب بھی سنیتا کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کے ساتھ اپنے حلیے میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں اسے سنیتا کو سراہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ سنیتا کے ہنر کے نتیجے میں وہ بہت تیزی سے ایک سوبر اور ویل آف شخص کے بجائے مفلوک الحال بھکاری کے روپ میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

''اب آپ ڈریس چینج کر لیں سر! تاکہ میں فائنل ٹچز دے سکوں۔'' خاموشی سے اپنا کام انجام دیتی سنیتا نے اس سے کہا تو وہ ملحقہ واش روم میں گھس گیا جہاں اس کا مطلوبہ لباس پہلے ہی موجود تھا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے کمرے میں واپس آ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو اسے وہاں اصل پانڈے کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ البتہ سنیتا کو ابھی اپنے ہنر کا کچھ جادو دکھانا باقی تھا۔ سو وہ ایک بار پھر اس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

''آپ دیکھ لیں سر! کہیں کوئی کمی تو محسوس نہیں ہو رہی؟'' ہاتھوں کو روکنے کے بعد اس نے گھوم پھر کر ہر طرف سے پانڈے کا جائزہ لیا اور پھر اس سے مخاطب ہوئی۔ پانڈے جو مسلسل آئینے کی طرف ہی متوجہ تھا، بے ساختہ بول اُٹھا۔

''پرفیکٹ اینڈ امیزنگ سنیتا! اس سے تو میں بھی وشواس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آئینے میں جو شخص نظر آ رہا ہے، وہ میں ہوں۔''

''تھینک یُو سر!'' سنیتا اس تعریف پر کھِل اُٹھی۔ پانڈے کی تعریف اُس کے لیے اس لیے بھی خوشی کا باعث تھی کہ جب وہ اوپر والوں کو اپنے ماتحتوں کی پرفارمنس رپورٹ بھجواتا تو اس کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کرتا اور ان الفاظ کی بدولت اسے ملنے والی مراعات میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

''میں چلتا ہوں۔ تم پرارتھنا کرنا کہ ہم کامیاب رہیں۔'' پانڈے اس سے کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے کچھ اور ضروری تیاریاں کیں اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس دوران اس نے وقت کا پورا خیال رکھا تھا اور مطمئن تھا کہ وہ لیٹ نہیں ہوگا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈرائیور نے اسے مینارِ پاکستان سے کافی فاصلے پر اُتار دیا۔ یہاں سے اسے پیدل مقررہ مقام تک کا سفر کرنا تھا، وہ بھی بیساکھی کے سہارے۔ وہ بخوبی اس مرحلے سے گزر گیا۔ راستے میں مینارِ پاکستان پر ڈیوٹی دینے والے نے اس سے رابطہ کیا۔

''وکرم پہنچ گیا ہے سر! اور بالکل اکیلا ہے۔ جس گاڑی میں آیا ہے، اسے بھی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔''

''اس کی گاڑی کے آگے پیچھے تم نے کوئی دوسری مشکوک گاڑی دیکھی؟'' اس نے بڑبڑانے کے انداز میں سوال کیا۔ وہ جس ڈیوائس پر اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تھا۔ وہ اتنی مختصر تھی کہ دور سے دیکھنے پر تو کیا، قریب سے جائزہ لینے پر بھی اس کے نظر میں آ جانے کا امکان نہیں تھا۔

''یہاں گاڑیوں کی مسلسل آمد و رفت جاری ہے اس لیے وشواس سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن پھر بھی ہم نے ہر طرف نظر رکھی ہوئی ہے اور ابھی تک ہمیں ایسی کوئی گاڑی یا آدمی نظر نہیں آیا ہے جس پر شک کیا جا سکے۔''

جو جواب ملا، وہ اُلجھا دینے والا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید وکرم کے بارے میں اس کے شکوک و شبہات غلط ہیں اور وہ واقعی ابھی تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا ہے اور اپنے بیان کے مطابق صرف احتیاط کے پیشِ نظر بیک گراؤنڈ میں چلا گیا ہے۔ جو بھی سچ تھا، بہرحال آزمانا تو تھا۔ اپنے آدمی سے رابطہ منقطع کر کے وہ آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں کئی جگہ اس نے کسی پیشہ ور بھکاری کی طرح مختلف لوگوں سے بھیک بھی مانگی۔ بالآخر وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا جہاں وکرم فوراً ہی اس کی نظر میں آ گیا لیکن اس نے براہِ راست اس کے قریب



جانے کے بجائے آس پاس موجود کئی دوسرے افراد کے آگے ہاتھ پھیلا کر ان سے بھیک مانگی۔ ان افراد میں سے کچھ نے اسے بھیک دی اور کچھ نے ''معاف کرو بابا!'' کہہ کر ٹال دیا۔

مختلف افراد سے بھیک طلب کرتا ہوا بالآخر وہ وکرم کے قریب جا پہنچا اور صدا لگاتے ہوئے اپنا کشکول اس کے سامنے کر دیا۔ وکرم جو بیزاری سے اسے ٹالنے والا تھا، یک دم چونک گیا۔ کشکول کی تہ میں ایک ایسا نشان نظر آ رہا تھا جس نے ظاہر کر دیا کہ اس کے سامنے موجود شخص کا تعلق ''را'' سے ہے۔

''خطرہ۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے بھیک مانگنے والے کو دھتکار رہا ہو۔

''بھیک نہیں دینا تو نہ دو صاحب! گالی کیوں دے رہے ہو؟'' پانڈے نے بلند آواز میں کہا اور وکرم کو بازو سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ آگے کی طرف چلتے ہوئے بھی اس کی باآوازِ بلند بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''گالی دیتا ہے۔ فقیر بابا کو گالی دیتا ہے۔ چار پیسے جیب میں رکھ کر خود کو خدا سمجھتا ہے۔ ایسے گھمنڈی کو خدا دو دن میں کنگال کر دے گا۔''

اردگرد موجود راہ گیروں اور تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگوں نے اس کے یہ الفاظ سنے، کچھ نے ملامتی نظروں سے وکرم کو دیکھا لیکن کسی نے اس قصے میں مداخلت بہرحال نہیں کی۔ پانڈے بڑبڑاتا اور چند ایک مزید افراد سے بھیک مانگتا ہوا بڑی ہوشیاری سے منظر سے غائب ہو گیا۔ اس بار اس نے پہلے کی طرح طویل فاصلہ طے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا ڈرائیور گاڑی سمیت قریب ترین محفوظ مقام پر موجود تھا جہاں سے اس نے پانڈے کو پک کرنے کے بعد گاڑی کو فوراً ہی دوڑا دیا۔

''ایسے تمام افراد کو دھیان میں رکھنا جو وکرم کو اُٹھانے اور ہسپتال لے جانے کے لیے آگے بڑھیں۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے نئی ہدایات جاری کرنا شروع کر دیں۔ وکرم کی زبان سے خطرے کا لفظ سنتے ہی پہلے سے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق اس نے بہانے سے وکرم کے بازو میں زہر میں ڈوبی ہوئی سُوئی کی نوک چبھو دی تھی۔ یہ ایک ایسا زہر تھا جو کم مقدار میں بھی بھرپور کام دکھاتا تھا لیکن اس کا اثر ظاہر ہونے میں تین چار منٹ لگ جاتے تھے۔ تین چار منٹ کی یہ مہلت اس کے موقع سے فرار ہو جانے کے لیے کافی تھی اور اب وہ اپنی بچھائی ہوئی بساط پر باقی ماندہ چالیں چلنے میں مصروف تھا۔

اس نے اور سنتھیا نے مل کر جو منصوبہ ترتیب دیا تھا، اس میں یہی طے پایا تھا کہ اگر وکرم زیرِ نگرانی محسوس ہوا تو اس کی بلی چڑھا کر ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی جو اب تک انہیں بے حساب نقصان پہنچا چکے تھے۔ انہیں جاننا تھا کہ یہ افراد کون تھے۔ کیونکہ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ ان افراد تک نہیں پہنچ سکے تھے جن کی وجہ سے انہیں نقصان پہنچ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر پُریقین تھے کہ ان افراد کا تعلق پاکستان کی کسی جانی پہچانی خفیہ ایجنسی سے نہیں ہے، ورنہ اب تک انہیں کوئی نہ کوئی کلیو ضرور مل چکا ہوتا۔

''ہم نے نظر رکھی ہوئی ہے سر! وکرم کے گرنے کے بعد کئی افراد اس کی طرف بڑھے تھے لیکن ان میں سے صرف دو ایسے ہیں جو اسے ٹیکسی میں ڈال کر شاید ہسپتال لے گئے ہیں۔ اس ٹیکسی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ وہاں سے جو بھی رپورٹ ملی، آپ تک پہنچا دی جائے گی۔'' اُسے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا گیا۔

''وہاں کسی نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟'' پانڈے نے ایک اور اہم سوال کیا۔

''نو سر! ہم نے اس طرف خاص نظر رکھی ہوئی تھی۔ کسی نے بھی آپ کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' یہ جواب پانڈے کے لیے خاصا اطمینان بخش تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

اب اُمید ہو چلی تھی کہ وکرم کی بلی دے کر وہ اپنے دشمن تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

⊛----✪----⊛

سی ایف پی کے اہلکاروں نے نہایت مشاقی سے مینارِ پاکستان کے اردگرد پوزیشنز سنبھال رکھی تھیں۔ وہ تعداد میں چار تھے جن میں سے دو ایک گاڑی میں جبکہ دو الگ الگ سواریوں پر وہاں پہنچے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ وہاں تفریح کے لیے آئے ہوں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ دُوربین اور کیمرا وغیرہ بھی لے رکھا تھا اور بظاہر وکرم سے بالکل بے نیاز وہاں گھوم رہے تھے۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ ہوسکتا ہے، وکرم کو بلوانے والے نے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہو کہ اس کی نگرانی کو چیک کیا جا سکے۔ اس لیے انہوں نے بھی اسی حساب سے اپنی منصوبہ بندی کی تھی۔ وکرم کو گاڑی میں تنہا بھیجنا بھی اسی احتیاط کے سبب تھا۔ البتہ اسے وہاں بھیجتے ہوئے یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ گاڑی بگڈ ہے اور اس نے طے شدہ روٹ سے ذرا بھی دائیں بائیں ہونے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔

قید کے دنوں میں وکرم کو جس بے پناہ ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حکم سے روگردانی کرنے کی جرأت کرتا۔ چنانچہ وہ سیدھا طے شدہ جگہ پر جا پہنچا۔ ''را'' والوں کی طرح سی ایف پی کے اہلکار بھی اردگرد پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن ان کی نظریں کسی مشکوک شخص تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ وہ بھکاری کے حلیے میں موجود پانڈے پر بھی شک نہیں کر سکے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ وکرم تک پہنچنے سے قبل پانڈے نے جن افراد سے بھیک مانگی تھی، ان میں سی ایف پی کا اہلکار بھی شامل تھا۔ پانڈے کا میک اپ کچھ اس مہارت سے کیا گیا تھا کہ اسے شک بھی نہیں گزرا کہ وہ بھکاری ''را'' کا ایجنٹ ہوسکتا ہے۔ بھکاری کے وکرم تک جانے اور اس سے جھڑپ ہونے کا منظر بھی اس نے صرف اس لیے نظرانداز کر دیا کہ اس کے خیال کے مطابق وکرم بے پناہ ذہنی دباؤ کا شکار تھا اور اس کا کسی بھکاری کو دھتکار دینا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ چونکا تو وہ اس وقت جب بھکاری بکتا جھکتا وہاں سے آگے بڑھ گیا اور چند منٹ کے وقفے سے وکرم بری طرح لہراتا ہوا زمین پر آ گرا۔

وکرم کا یوں گرنا اس کی نگرانی پر موجود چاروں افراد کے لیے حیرت انگیز تھا لیکن اس موقع پر انہیں لیڈ کرنے والے نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور آپس میں رابطے کے لیے استعمال ہونے والے آپریٹس پر یہ حکم دیا کہ فی الحال ان میں سے کوئی بھی وکرم کے نزدیک نہیں جائے گا۔ بعد میں وکرم کے گردرش لگنے کے بعد لیڈر خود ہجوم میں شامل ہو کر جائزہ لے آیا کہ وہ اپنی جان سے جان چکا ہے۔ بہت سے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی خاموشی سے اس سے دور ہٹ گیا البتہ اس دوران اس نے یہ ضرور سن لیا تھا کہ وکرم کو کس ہسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ ہسپتال کا نام معلوم کرنے کے بعد وہ باقی معلومات اپنے ذرائع سے حاصل کر سکتے تھے۔ وکرم کی لاش کے پیچھے جانا بے معنی تھا۔ ویسے بھی انہیں خاص طور پر وکرم سے دُور رہ کر صرف اس کی نگرانی کا کام دیا گیا تھا تاکہ اس کے ذریعے دوسرے افراد تک پہنچا جا سکے۔ بدقسمتی سے وہ کسی تک نہیں پہنچ سکے تھے اور وکرم کو بھی گنوا دیا تھا۔ اپنی اس ناکام مہم کی خبر انہوں نے ذیشان کو حرف بہ حرف تفصیل کے ساتھ پہنچا دی۔

''تم چاروں کے چاروں احمق ہو۔ آخر تم نے اس فقیر کو نظرانداز کیسے کر دیا؟ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اسی نے وکرم کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ اپنی جان سے چلا گیا۔'' تفصیل سن کر ذیشان ان پر اُلٹ پڑا۔

''سوری سر! اس فقیر کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ ہم کسی طور اس پر شک نہیں کر سکے۔ گڑبڑ کا احساس اس وقت



ہوا، جب وکرم گرا۔ اس وقت تک وہ فقیر وہاں سے غائب ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ہم نے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔'' ٹیم کو لیڈ کرنے والے نے شرمساری سے اپنی غلطی تسلیم کی۔

''ظاہر ہے، وہ تم لوگوں کی طرح احمق تو نہیں تھا کہ ایک بار بچ نکلنے کے بعد ہاتھ آتا۔ اسے تو اپنا کام کر کے اُڑن چھو ہونا ہی تھا۔ یہ تم لوگوں کی نااہلی ہے کہ وہ اتنی آسانی سے اپنا کام کر کے نکل گیا۔ اپنی نااہلی کے لیے تم نے کتنی فضول دلیل دی ہے کہ اس فقیر کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ تمہیں شک ہی نہیں ہوا..... احمقو! وہ ''را'' کا تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، کسی تھیٹر کا تھرڈ کلاس ایکٹر نہیں جو اپنے پھکڑپن سے تمہیں کوئی شک کرنے کا موقع دیتا۔ یہ موقع تو تمہیں خود تلاش کرنا تھا۔ لیکن تم نے اپنی حماقت سے اسے گنوا دیا۔''

ذیشان اپنے ماتحتوں پر بری طرح گرج برس رہا تھا۔ دراصل سی ایف پی میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اس کے اہلکاروں میں سے کسی نے اتنی خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ غلطی کے مرتکب زیرِ عتاب افراد سر جھکائے کھڑے اس کی لعن طعن سنتے رہے۔

''فی الحال میں تم چاروں کو معطل کر رہا ہوں۔ آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھو۔ مستقبل میں تمہیں سی ایف پی میں رکھا جائے گا یا نہیں، اس بات کا فیصلہ بات میں ہوگا۔''

آخر اس نے ایک سخت فیصلہ سنا دیا جس پر احتجاج کرنے کا ان چاروں میں ہی حوصلہ نہیں تھا۔ جھکی نظروں اور سروں کے ساتھ وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد ذیشان نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے اس بات پر اطمینان کا سانس لیا کہ وکرم کو مینارِ پاکستان تک بھیجنے کے لیے جو گاڑی استعمال کی گئی تھی، وہ چوری کی تھی اس لیے گاڑی کے ذریعے ان کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

دوسری اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس کے ماتحتوں نے اپنی پہلی حماقت کے بعد دوسری حماقت نہیں کی تھی اور وکرم سے دور رہے تھے۔ ورنہ وہ جو شکار کرنے گئے تھے، خود شکار ہو جاتے۔ یہ بات تو اب اس پر واضح ہوگئی تھی کہ جیسے وہ وکرم کو چارہ بنا کر ''را'' والوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، بالکل اسی طرح ''را'' والے بھی وکرم کے ذریعے ان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ یقینی طور پر وہ کسی طرح اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ وکرم کا کسی اور جگہ شفٹ ہو جانے کا بہانہ غلط ہے اور وہ دھر لیا گیا ہے۔

وکرم کے ہاتھ سے نکل جانے اور اپنے ماتحتوں کی حماقت کی جھلاہٹ اس حد تک بڑھی کہ وہ اپنے دفتر سے اُٹھ کر سیدھا اس کمرے میں جا پہنچا جہاں ورما کو رکھا گیا تھا۔

گرفتاری کے بعد سے اب تک ورما سے کوئی قابلِ ذکر تفتیش نہیں کی گئی تھی اور فی الحال صرف اتنا کیا جا رہا تھا کہ ایک پل کے لیے بھی اسے سونے نہیں دیا جا رہا تھا۔ ورما کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو بے حال ہو جاتا لیکن اس نے تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خود کو سنبھال رکھا تھا جس پر ایک اور حربے کا استعمال کیا گیا تھا اور وقتاً فوقتاً اسے برف کی سل پر لٹا دیا جاتا تھا۔

ورما نے یہ تکلیف بھی جھیل لی تھی لیکن وہ حیران تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کرنے والے اس سے کچھ پوچھتے کیوں نہیں ہیں؟ وہ منتظر تھا کہ اس سے تفتیش کا آغاز کیا جائے۔ اور ذیشان کی جھلاہٹ نے اس کا یہ انتظار ختم کر دیا۔

''پانی میں سرخ مرچیں اور نمک گھول کر اسپرے گن میں بھر کر لے آؤ۔'' اس نے ورما کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک اہلکار کو حکم دیا اور خود دندناتا ہوا ورما کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ابھی ابھی برف کی

سل پر سے ہٹایا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ نیلا پڑا ہوا تھا۔

''اسے گرمی پہنچاؤ۔'' اس نے سرد مہری سے حکم دیا۔ اس کے حکم پر عمل کیا جانے لگا اور ورما کو الیکٹرک ہیٹر کے سامنے بٹھا دیا گیا۔

گرماہٹ ملنے سے اسے آرام محسوس ہوا تو نیند کے جھونکے آنے لگے۔ لیکن منہ پر پڑنے والے پے در پے تھپیڑوں نے اسے سونے نہیں دیا۔ ابھی وہ تھپیڑوں سے سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ ذیشان نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا ایک پتلا سا چاقو تھا جس سے اس نے ورما کے اوپری عریاں بدن پر جابجا چرکے لگانا شروع کر دیئے۔ ورما لب بھینچے یہ تکلیف سہتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم خون میں نہا گیا۔ لب بھینچے اس کارروائی میں مصروف ذیشان نے ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

چرکے لگانے کے بعد اس نے اپنے ماتحت سے وہ اسپرے گن لی جس میں نمک اور سرخ مرچوں کا محلول موجود تھا اور اس محلول کو ورما کے زخموں پر اسپرے کرنا شرع کر دیا۔ لازم تھا کہ ورما کے زخمی جسم میں شدید جلن پیدا ہو جاتی اور وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔

''ابھی یہ ابتدا ہے ورما! میں تیرے روئیں روئیں میں آگ بھر دوں گا۔'' ذیشان نے نفرت سے کہا اور اسپرے گن کا رخ اس کے دائیں کان کی طرف کر دیا۔ عین کان کے سوراخ پر رکھ کر کیے گئے اسپرے کے نتیجے میں محلول کی دھار سیدھی کان کے اندرونی حصے تک پہنچ گئی۔ اس بار ورما کی کراہ زیادہ بلند تھی لیکن ذیشان نے پروا نہیں کی اور دوسرے کان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ ورما تلملانے لگا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ذیشان سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... بس میں تم سے ان سارے لوگوں کی تکلیف کا بدلہ لینا چاہتا ہوں، جن کی زندگیوں کے [illegible] تمہاری وجہ سے گل ہوئے اور جن کے لواحقین آج بھی اپنے پیاروں کے لیے تڑپتے ہیں۔ میں اس محلول کو تمہاری آنکھوں اور ناک سمیت جسم کے ہر سوراخ میں بھر دوں گا۔ پھر تم سمجھو گے کہ تکلیف کیا ہوتی ہے اور پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ تم جس ملک کے خلاف اپنی ناپاک کارروائیاں کر رہے ہو، اس کے بسنے والے ابھی زندہ ہیں اور اتنی آسانی سے تمہیں چھوڑنے والے نہیں۔''

ورما کو جواب دینے کے بعد ذیشان نے اسپرے گن اس کی ناک کے نتھنے سے لگا دی۔ محلول نازک حصوں میں پہنچا تو سچ مچ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ بری طرح تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔

''بھگوان کے لیے مجھے گولی مار دو۔ مگر میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔'' اس نے گڑگڑا کر ذیشان سے درخواست کی۔

''تمہاری مشکل اسی صورت میں آسان ہو سکتی ہے کہ تم میرے ہر سوال کا جواب بغیر رُکے صحیح صحیح دیتے جاؤ۔'' بالآخر ذیشان مطلب کی بات پر آ گیا۔

''میں تیار ہوں۔'' ورما نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے بعد ذیشان اس سے وہ سب کچھ اُگلواتا چلا گیا جو اس کے علم میں تھا۔

⊛----✪----⊛

''آج کشور اور اس کے شوہر کو رات کے کھانے پر بلا لیتے ہیں مراد!..... میرا بڑا دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے کو۔ اتنے دن سے تو اس لیے نہیں بلا سکی کہ ابا جی یہاں تھے۔ لیکن آج تو وہ کہہ کر گئے ہیں کہ رات واپس



نہیں آئیں گے۔''

ننھی عالیہ کے بالوں کو کنگھے کی مدد سے سنوار کر اس کے بالوں میں رنگ برنگے خوب صورت سے کلپس لگاتے ہوئے شاہدہ نے مراد شاہ سے فرمائش کی۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میرا خود بڑا دل چاہتا ہے کہ اسے گھر بلاؤں اور اسے اس کے شوہر اور بچی کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھوں۔ میرا دل بہت کڑھتا تھا اس کے لئے۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ مجھے تینوں بہنوں میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔ لیکن افسوس کہ میں اس کی خوشیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ ایک دو بار میں نے ابا جی سے بحث ضرور کی کہ اگر خاندان میں کشور کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں ہے تو اسے باہر کسی اچھے خاندان میں بیاہ دیتے ہیں۔ لیکن ابا جی نے میری ایک نہ سنی۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اسے یہاں اپنے پاس بلا کر کسی اچھے سے لڑکے سے چپکے سے بیاہ کر دیتا ہوں۔ لیکن شاید ابا جی کو اس معاملے میں مجھ پر کچھ شک تھا اس لیے وہ میرے بار بار کے اصرار کے باوجود کبھی کشور کو یہاں بھیجنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان حالات میں کشور نے اپنے لیے جو راہ نکالی، وہ کوئی انہونی نہیں ہے۔ شکر یہ ہے کہ اسے اچھا ساتھی مل گیا جو اس سے مخلص اور ہر مشکل میں ساتھ دینے والا ہے۔'' مراد شاہ نے بیوی کی فرمائش کے جواب میں جذباتی لہجے میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''تو پھر طے ہے کہ آج ہم کشور کو اس کی فیملی سمیت اپنے گھر بلا رہے ہیں۔'' شاہدہ نے خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے ماحول کے اس بوجھل پن کو دور کرنے کی کوشش کی جو مراد شاہ کے تلخ حقائق کو دہرانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اسے فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی کوئی ذاتی مصروفیت ہو اور وہ ہماری دعوت قبول نہ کر سکیں۔ تم میرے کنفرم کر لینے کے بعد ہی انتظامات کرنا۔''

مراد شاہ نے اس سے کہتے ہوئے فون سنبھال لیا۔ شروع میں احتیاطاً کشور نے اسے اپنا نمبر نہیں دیا تھا اور خود وقتاً فوقتاً کہیں باہر سے فون کرتی رہی تھی۔ بعد میں اعتماد بحال ہونے پر اس نے اپنے ذاتی نمبر سے فون کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اب مراد شاہ کے پاس اس کا رابطہ نمبر موجود تھا۔

''السلام علیکم بھائی!..... کیا حال ہیں؟'' مراد شاہ کا نمبر دیکھ کر کشور نے خوشی خوشی کال ریسیو کی اور کھلکھلاتی آواز میں بولی۔

''وعلیکم السلام!..... اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔ بس یہ تمہاری بھابی کو اچانک تمہاری یاد ستانے لگی اور مجھ سے کہنے لگیں کہ آج رات کے کھانے پر کشور اور آفتاب کو بلوا لیتے ہیں۔ اگر آج تم لوگوں کی کوئی مصروفیت نہیں ہے تو ہماری طرف آ جاؤ۔'' مراد شاہ نے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق تو ابا جی ابھی تک یہیں ہیں، واپس نہیں گئے۔'' کشور کے جواب نے واضح کیا کہ چودھری کی امریکہ میں موجودگی کو وہ اپنے لیے خطرے کا باعث سمجھتی ہے اس لیے ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح یہ انتظام کر رکھا ہے کہ اس کے یہاں ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں باخبر رہ سکیں۔

''تمہاری معلومات ٹھیک ہیں۔ لیکن ہم نے آج کے دن تمہاری دعوت کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ آج ابا جی کا گھر سے باہر کہیں رات گزارنے کا پروگرام ہے۔ اگر پھر بھی تم یہاں آنا مناسب نہیں سمجھتیں تو انکار کر سکتی ہو۔ میں اور شاہدہ بالکل بھی برا نہیں مانیں گے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں بھائی!..... آپ کا بلانا سر آنکھوں پر۔ ہم ضرور آئیں گے۔'' کشور کو لگا کہ اس کی

بات مراد شاہ کو آزردہ کر گئی ہے اس لیے اس کی دل جوئی کے لیے فوراً ہامی بھر لی۔

''ٹھیک ہے۔ پھر ہم انتظار کریں گے۔'' مراد شاہ خوش ہو گیا اور فون بند کر کے شاہدہ کو دعوت کے لیے انتظامات کرنے کی ہدایت کی اور خود بیٹی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ بہن، بہنوئی پہلی بار اس کے گھر آ رہے تھے اس لیے ان کے لیے کچھ تحائف کی خریداری ضروری تھی۔

بہت دل لگا کر خریداری کرنے کے بعد وہ گھر واپس آیا تو شاہدہ کچن میں مصروف تھی۔ اچھے شوہروں کی طرح وہ اس کی مدد کرنے لگا۔

شام ڈھلنے سے پہلے کشور اپنی فیملی کے ساتھ ان کے گھر پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کیک اور چھوٹے موٹے تحائف بھی لائی تھی۔ شاہدہ اور وہ تو برسوں بعد ملے تھے، سو ایک دوسرے کو گلے لگا کر خوب پیار کرنے کے ساتھ ساتھ اشک بھی بہائے گئے۔ پھر گپ شپ اور پُر تکلف کھانے میں کیسے وقت گزرا، کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی بہت خوش تھے۔ مراد شاہ کی بیٹی عالیہ کو تو اُمید کی شکل میں کوئی جیتی جاگتی گڑیا مل گئی تھی، جس کے ساتھ وہ دل بھر کر انجوائے کرتی رہی۔ اُمید بھی ماموں کے گھر آ کر بہت خوش تھی اور خوب قلقاریاں مار رہی تھی۔

خوشی سے بھری محفل کو برخاست کرنے کا خیال اس وقت آیا جب بچے نیند سے نڈھال ہو کر اپنی اپنی جگہ لڑھک گئے۔

''اب اجازت دیجئے بھائی! اللہ نے چاہا تو پھر ملاقات ہو گی۔'' کشور نے خوشی سے سرشار آواز میں نہ چاہتے ہوئے واپسی کی اجازت طلب کی۔

''ٹھیک ہے گڑیا!..... جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اباجی کل کس وقت گھر آئیں گے ورنہ تمہیں یہی ٹھہرا لیتا۔ اباجی واپس چلے جائیں تو پھر تم بہت سارے دنوں کے لیے میرے پاس رکنے کے لیے آنا۔'' مراد شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں شاہدہ وہ شاپنگ بیگز لے آئی جن میں کشور، آفتاب اور امید کے لیے کئی تحائف موجود تھے۔

''یہ سب کیا ہے بھائی؟'' کشور اندازہ کر سکتی تھی کہ ان شاپنگ بیگز میں ٹھیک ٹھاک قیمتی تحائف موجود ہوں گے اس لیے تھوڑا سا جھجک گئی۔ آفتاب کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنے میکے کی خوش حالی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے ایسے تحائف لینے سے بھی گریزاں تھی جن کا بدل خود نہ دے سکے۔

''تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں میکے آئی بہنوں کو خالی ہاتھ واپس لوٹانے کا رواج نہیں ہے۔ میں غلط رسم و رواج کی شدت سے مخالفت کرتا ہوں لیکن صاحبِ حیثیت ہونے کے ناتے اس رسم کو نبھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ تمہیں ان تحائف کو قبول کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچانا چاہئے کیونکہ اس میں تمہارے بھائی کی محنت کی کمائی کے علاوہ وہ رقم بھی شامل ہے جو مجھے اباجی باقاعدگی سے دیتے رہتے ہیں۔ اور اباجی کے وارثوں میں سے ایک ہونے کے ناتے تمہارا بھی اس رقم پر پورا پورا حق ہے۔'' مراد شاہ نے فوراً ہی اس کی ہچکچاہٹ کا سبب سمجھ لیا تھا چنانچہ اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔

''وارث..... یہ بھی آپ نے خوب کہا۔ اباجی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور ان کے پاس اگر مجھے دینے کے لیے کچھ ہے تو صرف سزائے موت۔ ویسے بھی ہمارے ہاں لڑکیوں کو وارث سمجھنے کا کہاں رواج ہے؟ جائیداد پر تو بس بیٹوں کا حق ہوتا ہے۔'' کشور نے آزردگی سے کہا۔

''اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں غلط رسوم و رواج کا کتنی شدت سے مخالف ہوں۔ جب جاگیر کے



معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے تو میں ہر حق دار کو اس کا حق دوں گا۔ رہی اباجی کے سزائے موت والی بات تو اباجی کوئی خدا نہیں ہیں جو انسانوں کی زندگی موت ان کے ہاتھ میں ہو۔ جس اللہ نے آج تک تمہیں ان سے محفوظ رکھا، وہ آئندہ بھی حفاظت کرے گا۔'' مراد شاہ کا جواب بڑا نپا تُلا تھا۔ آفتاب نے بھی اس کی تائید کی۔

''مراد بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں کشور!..... ہمیں اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔''

''بس اب تم لوگ جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔ چھوٹی بچی ساتھ ہے، خوامخواہ بے آرامی ہو رہی ہے۔ گھر پہنچ کر مجھے اپنی خیریت کا فون کر دینا۔''

مراد شاہ نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے بھائی ہونے کا فرض ادا کیا اور وہ لوگ الوداعی الفاظ کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ مراد شاہ نے خود آگے بڑھ کر ان لوگوں کے لیے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ہر شخص اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

سامنے ہی چودھری افتخار کھڑا تھا جو ان لوگوں ہی کی طرح فوری ردِعمل کے طور پر ساکت رہ گیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور وہ کشور کی طرف جھپٹا۔

امید کو بانہوں میں لیے کھڑی کشور نے چودھری کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ سی چیخ ماری۔ باپ سے بغاوت کر کے گزرنے کے باوجود وہ اس کی سفاکی سے واقف تھی اس لیے اس وقت اسے اپنے روبرو دیکھ کر بے انتہا خوف زدہ ہو گئی تھی۔

''بے غیرت!..... بے حیا!..... میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میرا شملہ نیچے کر کے خود اپنے یار کے ساتھ گل چھرے اُڑاتی پھر رہی ہے۔'' اس نے دیکھتے دیکھتے کشور کی گردن دبوچ لی۔

کشور پر باپ کی اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ ذرا مزاحمت نہیں کر سکی۔ البتہ اس کی گود میں سوئی بچی اس افتاد پر جاگ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔

اسی پل آفتاب اور مراد شاہ حرکت میں آئے اور چودھری کو کھینچ کر کشور کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان دو جوانوں کے لیے یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا۔ ٹھیک ٹھاک عمر ہونے کے باوجود چودھری خاصا توانا اور طاقتور تھا۔ اصل اور عمدہ غذاؤں کے استعمال نے اسے بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی طاقت دے رکھی تھی۔ اور کچھ کمال اس وقت اس کے معدے میں موجود ام الخبائث کا بھی تھا، جس نے اس کی بوٹی بوٹی میں آگ بھر رکھی تھی۔

آج وہ بڑے موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ پروگرام تھا کہ لِنڈا کے ساتھ رات بتائے گا۔ ہوش ربا لِنڈا کی قربت کے خیال سے ہی اس کے رگ و پے میں سرور دوڑنے لگا تھا لیکن جب وہ طے شدہ وقت پر پہلے سے بُک کروائے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو وہ غائب تھی۔ اس نے زیادہ خیال نہ کیا کہ انتظار کروانا تو حسن والوں کی ادا ہوتی ہے اور انتظار کی مشکل گھڑیوں کو گزارنے کے لیے بنتِ انگور سے شغل کرنے لگا جس نے اس کے شوق کو مزید ہوا دینی شروع کر دی۔ لیکن لِنڈا تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ اپنے پاس موجود اس کے نمبرز پر کال کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کسی طور رابطہ نہ ہوا۔ اس چیز نے اس کی بے چینی کو مزید بڑھا دیا اور وہ اندیشے کا شکار ہونے لگا کہ کہیں لِنڈا اس سے وقت طے کرنے کے بعد بھول تو نہیں گئی ہے۔ بے چینی اور اضطراب نے اسے مزید مے نوشی پر مجبور کر دیا لیکن پھر بھی وہ ہوٹل کے اس کمرے سے ہلا نہیں کہ کیا پتہ، لِنڈا کو اپنا وعدہ یاد آ ہی جائے اور وہ یہاں چلی آئے۔

لِنڈا تو نہیں آئی لیکن کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد روم سروس کے ایک ویٹر نے اسے ایک بند لفافہ ضرور لا تھمایا جو اس کے مطابق اس وقت کوئی دے کر گیا تھا۔ چودھری نے بے چینی سے لفافہ کھولا۔ اندر ایک کاغذ پر مختصر پیغام لکھا تھا۔

''سوری ڈارلنگ! میں آج نہیں آسکتی۔ باس کے ساتھ بزی ہوں۔''

اس پیغام کو پڑھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ باس کے لفظ سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو، یہ مسٹر الفا ہے جو پہلے بھی کئی بار اس کی راہ میں روڑے اٹکا چکا ہے۔

غصے، مایوسی اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں وہ ہوٹل سے نکل کر واپس مراد شاہ کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہاں کشور اور آفتاب سے سامنا ہو گیا اور اس کے غصے کو اظہار کا راستہ مل گیا۔ کشور تو اس کی نظر میں ویسے بھی معتوب تھی اور وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا کہ کسی طرح اسے آفتاب سمیت قتل کروا ڈالے۔ لیکن خوبیٔ قسمت سے وہ دونوں ہر بار اس سے بچ نکلے۔ یہاں تک کہ اللہ نے انہیں اُمید دے دی اور بیٹی کے بعد انہوں نے سوچا کہ خطرے میں گھرے ہر وقت بھاگتے رہنے سے بہتر ہے کہ جلاوطنی اختیار کر لیں۔ وہ شہریار کی مدد سے نیویارک پہنچ گئے۔ لیکن یہاں بھی چودھری کسی بھوت کی طرح ان تک آ پہنچا تھا اور کشور کا نرخرہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آفتاب اور مراد نے مل کر اس بپھرے ہوئے سانڈ سے کشور کی جان چھڑائی۔

''تم لوگ جاؤ یہاں سے۔ میں ابا جی کو دیکھ لوں گا۔'' مراد شاہ نے ہانپتے ہوئے آفتاب سے کہا تو وہ کشور کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔

''تُو بے غیرت ہے مراد شاہ!..... تجھ پر لعنت ہے کہ تُو گھر سے بھاگی ہوئی بہن کو اس کے جرم کی سزا دینے کے بجائے اسے اس کے عاشق کے ساتھ اپنے گھر میں گھسائے بیٹھا تھا۔ پر میں تیری طرح بے غیرت نہیں ہوں۔ میں اس بے حیا لڑکی اور اس کے عاشق کی جان لے کر رہوں گا۔'' مراد شاہ کے بازوؤں کی گرفت میں مچلتا چودھری اسے لعنت ملامت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عزائم کا بھی اظہار کر رہا تھا۔ مراد اسے بڑی مشکل سے دروازے سے کھینچ کر اندر لایا تو شاہدہ نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''ہوش کی دوا لیں ابا جی!..... یہ امریکہ ہے، پاکستان نہیں جہاں آپ سرِ عام دس آدمیوں کی جان لے کر بھی اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچ کر نکل سکتے ہیں۔ یہاں تو آپ سیدھے الیکٹرک چیئر پر پہنچا دیئے جائیں گے۔ بلکہ دعا کریں کہ میرے پڑوسیوں میں سے کسی نے آپ کے کھڑے کیے گئے ہنگامے کو سن کر پولیس کو فون نہ کر دیا ہو۔ ورنہ کچھ دیر میں پولیس والے یہاں پہنچ کر ہم سے پڑوسیوں کے آرام میں خلل ڈالنے پر پوچھ گچھ شروع کر دیں گے۔'' مراد شاہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

''تُو کر ان گوروں کی غلامی، ہور ان سے ڈر۔ میں نہیں ڈرنے والا کسی سے۔ تُو دیکھنا، میں ان دونوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ ایسے کام تمام ہو گا دونوں کا کہ نیویارک کی پولیس دیکھتی رہ جائے گی۔ تُو نے کیا سمجھ رکھا ہے اپنے پیو کو۔ تُو سمجھتا ہے کہ میری ٹور صرف پیر آباد تک ہے؟ پر اب تُو دیکھ لینا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ چٹکی بجاتے دونوں کو غائب کروا دوں گا۔''

کچھ شراب کا نشہ تھا، کچھ غصے کی گرمی۔ چودھری اول فول بکنے پر آیا تو بکتا چلا گیا اور اپنے سارے ارادے بھی ظاہر کر دیئے۔ اُس کی یہ دھمکیاں پیر آباد کے حاکم چودھری افتخار عالم شاہ کی حیثیت سے نہیں تھیں بلکہ اس مجرم تنظیم سے وابستگی کے باعث تھیں جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ بہت پہنچ والے لوگ ہیں جن کے لیے نیویارک جیسے بڑے شہر میں بھی کشور اور آفتاب کو ڈھونڈنا کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔



ادھر بے چارہ مراد شاہ اپنے باپ کو پیر آباد کے ظالم حکمراں کے طور پر تو بے شک جانتا تھا لیکن اس کی منشیات کے بین الاقوامی اسمگلرز سے وابستگی سے ناواقف تھا اس لیے اس کی ہر دھمکی کو محض شراب کا اثر ہی سمجھتا رہا اور کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر سونے کے لیے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔

شاہدہ اس ساری کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنی ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور اس کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ پریشان تو مراد شاہ بھی تھا کہ جب چودھری کا نشہ اُترے گا تو اسے کشور اور آفتاب کی اپنے اپارٹمنٹ میں موجودگی کے متعلق وضاحت کرنی پڑے گی۔ یوں تو وہ اپنے مؤقف پر بہت مضبوط تھا اور اپنے باپ کو بے شمار دلائل دے سکتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ دلائل سے قائل ہونے والا شخص نہیں ہو گا اور اپنی ضد کا پکا ہے۔ بس اطمینان تھا تو صرف اتنا کہ نیویارک جیسے شہر میں چودھری کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا آسان نہیں ہو گا۔

⊛----✪----⊛

''کتنی آسانی سے یہ لوگ ہمارے ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ہر بار بس ٹامک ٹوئیاں ہی مارتے رہ جاتے ہیں۔ اتنی دوڑ دھوپ کے بعد بھی ہمارے ہاتھ کوئی بڑی کامیابی نہیں آپائی۔''

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ورما کے ہاتھ آنے کے بعد تو میرا بھی یہ خیال تھا کہ ہم اس کی گرفتاری سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں گے لیکن کچھ حاصل وصول نہیں ہوا اور ہم بس ایسے ہی بھاگ دوڑ کرتے رہ گئے۔''

شہریار کی ہاں میں ہاں ملاتے ذیشان کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی یہاں پہنچا تھا اور کراچی میں شازمین کے اغوا سے لے کر وکرم کی موت اور پھر اس کے بعد ورما سے تفتیش کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اپنی کارروائیوں تک کی ساری تفصیل اسے کہہ سنائی تھی۔

ورما سے اس نے لاہور میں موجود ''را'' کے تین ٹھکانوں کا پتہ اُگلوا لیا تھا اور بہت تیزی سے کارروائی بھی کی تھی لیکن کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پہلا ٹھکانہ ایک کافی پرانے پروجیکٹ میں موجود فلیٹ تھا جہاں انہیں کوئی نہیں ملا تھا اور صرف تھوڑا بہت اسلحہ اور کچھ غیر اہم کاغذات ہاتھ آسکے تھے۔ پڑوسیوں سے بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں اور انہوں نے یہی بتایا تھا کہ اس فلیٹ کا مالک ایک تنہا ادھیڑ عمر کا شخص تھا جو بہت کم وہاں آتا تھا۔ البتہ جب وہ وہاں موجود ہوتا تھا، اس سے ملنے کئی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو وہ شخص عجیب لگتا تھا لیکن کسی نے کبھی شکایت اس لیے نہیں کی کہ انہیں اس شخص سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ ان سب کے خیال میں وہ ایک بے ضرر آدمی تھا جس سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ سفید پوش آبادی کے وہ سادہ لوح افراد ہی نہیں سمجھ سکے تھے کہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا شخص ملک دشمن تھا جس نے حقیقت میں ان کی زندگیاں حرام کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

ورما سے حاصل ہونے والا دوسرا پتہ ایک ون یونٹ بنگلے کا تھا جہاں سے وہ ایک چوکیدار کے سوا کسی کو گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ لمبے چوڑے پٹھان چوکیدار نے تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جس بنگلے کی چوکیداری کر رہا تھا، اس کے مالکان مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے لیکن وہ ان کے پاس موجود جدید اسلحے اور ان کی راتوں کو ہونے والی آمد و رفت کی وجہ سے یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ وہ کوئی ڈاکو وغیرہ ہیں۔ ان کے جاسوس یا دہشت گرد ہونے کا تو اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا اور وہ محض اچھی تنخواہ کے لالچ میں ان کی مجرمانہ سرگرمیوں سے نظر چرائے بیٹھا تھا۔

اس بنگلے سے انہیں کچھ ایسے ثبوت ملے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں اسلحہ بارود وغیرہ ذخیرہ کیا جاتا

رہا ہے۔ انہیں وہاں سے ایک خودکش جیکٹ بھی ملی تھی۔ لیکن چوکیدار صاف انکاری تھا کہ اسے ان سب چیزوں کی وہاں موجودگی کی خبر تھی۔ اس کے مطابق بنگلے میں رہنے والے وہاں جو کچھ بھی لاتے تھے، وہ اسے لوٹ کا مال سمجھ کر نظرانداز کر دیتا تھا۔ اس بنگلے کے اندر بلا اجازت جانے کی ممانعت تھی اور وہ ان خوفناک لوگوں سے اتنا ڈرتا تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی کبھی ٹوہ لینے کی ہمت نہ کر سکا۔

تیسرے ٹھکانے پر البتہ انہیں جزوی کامیابی ہوئی تھی۔ یہ ایک بیوٹی پارلر تھا، جس کی نچلی منزل پر پارلر کی مالکہ رہائش پذیر تھی۔ سنیتا نامی اس عورت نے پہلے تو انہیں بہت چکر دینے کی کوشش کی اور اپنے پارلر میں موجود مختلف وِگوں، کاسٹیکٹ لینسز اور داڑھی مونچھوں وغیرہ جیسی چیزوں کی موجودگی کے بارے میں یہی توجیہہ دیتی رہی کہ اس کے پارلر سے مختلف پروڈکشن کمپنیاں اور تھیٹر وغیرہ والے خدمات لیتے رہتے ہیں اس لیے یہاں ان سب چیزوں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے رہائشی حصے میں موجود بعض خفیہ مواصلاتی آلات کی موجودگی کا جواز پیش نہیں کر سکی اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ''را'' کے لیے کام کر رہی ہے۔

اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ''را'' کا منجھا ہوا ایجنٹ پانڈے وقتِ ضرورت وہاں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات جاری کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ بھی ماننا پڑا کہ وکرم کو موت کا نشانہ بنانے والا پانڈے ہی تھا جسے خود سنیتا نے اپنی مہارت سے ایک بوڑھے اور لنگڑے گداگر کے روپ میں ڈھالا تھا۔ وقتِ ضرورت پانڈے اپنے ساتھیوں کو وہاں جمع کر کے انہیں کسی آپریشن پر بھی آسانی سے بھیج دیتا تھا اور اردگرد والے اس لیے شک نہیں کر پاتے تھے کہ ٹی وی اور اسٹیج کے فنکاروں کے لیے کام کرنے کی وجہ سے سنیتا کے پارلر میں لوگوں کا کثرت سے آنا جانا لگا رہتا تھا اور جن میں سے دو پروڈکشن ہاؤس تو ایسے تھے جنہوں نے اپنا جدید ذاتی میک اپ روم قائم کرنے کے بجائے سنیتا کے پارلر پر ہی انحصار کیا ہوا تھا۔ ان دونوں پروڈکشن ہاؤسز کے فنکار اکثر گاڑیاں بھر بھر کر وہاں سے تیار ہو کر جاتے تھے اور سیٹ پر ان کا میک اپ آرٹسٹ ضرورت پڑنے پر تھوڑی بہت لیپا پوتی کر دیتا تھا۔

یہ کور حاصل کرنے کے لیے سنیتا نے بڑی ہوشیاری سے شوبز کی دنیا میں اپنے تعلقات بنائے تھے اور ہر ایک پر ان ''اچھے تعلقات'' کا احسان رکھ کر بے حد رعایتی نرخ میں ان کا کام کر دیا کرتی تھی۔ بس اس کی واحد شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ خود کہیں نہیں جائے گی اور کام کروانے والوں کو خود اس کے پارلر تک آنا پڑے گا۔ نہایت کم ریٹس پر ملنے والے اچھے نتائج کے چکر میں اس کی یہ شرط قبول کر لی جاتی تھی، سو وہ بڑی کامیابی سے ''را'' والوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کیے ہوئے تھی۔

سنیتا سے حاصل ہونے والی یہ ساری معلومات انکشاف کا درجہ رکھنے کے باوجود اس اعتبار سے زیادہ مفید نہیں تھیں کہ خود سنیتا پانڈے یا اس کے کسی ساتھی کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھی اور اس کے مطابق وہ لوگ ضرورت پڑنے پر خود اس سے رابطہ کرتے تھے۔

اس پر تھرڈ ڈگری کے استعمال کے ساتھ ساتھ اسے پولی گراف مشین سے بھی جانچ کر دیکھ لیا گیا تھا لیکن وہ فراہم کردہ معلومات سے ایک لفظ زیادہ نہیں بتا سکی تھی اور یوں ذیشان کی جھنجلاہٹ مزید بڑھ گئی تھی کہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود اس کے ہاتھ کوئی ایسا کلیو نہیں آ سکا تھا جس کی مدد سے وہ ''را'' والوں کی راہ پر لگ کر ان کی گردن دبوچ سکتا۔ چنانچہ شہریار کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنی ساری کوفت کا اظہار کر ڈالا۔ شہریار بھی پوری طرح اس کا شریکِ غم تھا اور اسے خود ہر وقت یہ غم کھاتا رہتا تھا کہ وہ لوگ اپنے ملک کو دشمنوں سے پاک کرنے کے لیے اس حد تک کام نہیں کر پا رہے جتنی کہ خواہش رکھتے ہیں۔ اس وقت تو ان کے لیے ایک اور صدمہ یہ بھی



ہوا تھا کہ ورما نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے بہت اچانک ہی الیکٹرک ہیٹ کا تار کھینچ کر خود کو برقی کرنٹ کی مدد سے ہلاک کر لیا تھا اور ذیشان کے پاس یہ امکان نہیں رہا تھا کہ وہ اس پر تشدد کا کوئی نیا حربہ استعمال کر کے اس سے مزید حقائق اُگلوا سکے۔

شہریار اپنی جگہ بے یقینی کا شکار تھا کہ شینا کو اپنی ایک دیوی کی بھینٹ چڑھوا دینے والا ورما جس کو وہ بھیانک موت مارنے کی خواہش رکھتا تھا، یوں اچانک اپنے انجام تک پہنچ گیا تھا اور حالات نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ تشدد سے گھبرا کر ورما نے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس سے بہت کم تھا۔ شاید اس نے مہلت حاصل کرنے کے لیے اپنے ان چند ٹھکانوں کے پتے بتا دیئے تھے جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہاں سے سی ایف پی والوں کو کچھ حاصل نہیں ہوگا..... یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے دھر لیے جانے کے بعد اس کے ساتھیوں نے خود ہی ایسی تمام جگہوں سے غائب ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی، اب ورما اس دنیا میں نہیں تھا اس لیے وہ اس سے سچ جھوٹ کچھ بھی نہیں اُگلوا سکتے تھے اور عجیب سی یاسیت کا شکار ہو گئے تھے۔

''مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم دونوں اس انداز میں سوچ رہے ہو اور تمہارا رویہ اتنا غیر عملی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چند جزوی ناکامیوں اور ورما کی موت نے تمہارے پاس کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے اور تم ایسے ناکارہ وجود میں تبدیل ہو گئے ہو جس کے ہاتھ پیر کاٹ کر انہیں کچھ بھی کرنے کے قابل نہ چھوڑا گیا ہو۔''

عمر فاروق کی وہاں انٹری بہت اچانک اور غیر متوقع تھی۔ عموماً وہ وہاں اتنی خاموشی سے رہتے تھے کہ کسی کو ان کی موجودگی کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور وہ محض شہریار کے انسٹرکٹر ہی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت انہوں نے بہت موقع سے دخل دے کر ان دونوں کی مایوسی کو ایک زبردست کوڑا لگایا تھا۔

''ایسی بات نہیں سر! لیکن یہ تو فطری سی بات ہے کہ انسان جب بہت محنت کرے تو اس محنت کے نتائج بھی چاہتا ہے۔'' ذیشان نے گڑبڑا کر اپنے رویے کی وضاحت دی۔

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ انسان کو ہمیشہ حسبِ خواہش نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ خصوصاً ہماری فیلڈ میں۔ کیونکہ ہمارے مقابل وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہم ہی جیسی اسپرٹ اور مقصد کے تحت کام کر رہے ہوتے ہیں۔ جب مقابل برابری کا یا ہم سے زیادہ زبردست ہو تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہماری محنت کا وہ نتیجہ نکلنا ضروری نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم کوئی دو اور دو چار کرنے والے لگے بندھے کاروباری نہیں ہیں جو ایسی احمقانہ توقعات رکھیں۔ ہم وطن کے رکھوالے اور مجاہد ہیں جنہیں اس وطن کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ہمیں ہر لمحے بس یہی دھیان میں رکھنا چاہئے کہ ہم یہ سب داؤ پر لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ حوصلہ زندہ ہے تو سمجھو دشمن تم پر حاوی نہیں ہو سکے گا، چاہے وہ کتنی بھی شدت سے حملہ آور ہو۔ وقتی ناکامیاں کبھی کسی مجاہد کا حوصلہ پست نہیں کر سکتیں بلکہ اسے سبق دیتی ہیں کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ کر پہلے سے زیادہ بہتر لائحہ عمل کے ساتھ میدان میں اُترے۔''

عمر فاروق بولتے جا رہے تھے اور ان کا ہر لفظ ان کے دلوں میں اُتر کر انہیں شرمندہ کر رہا تھا۔

''سوری سر! اصل میں ہمیں کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی اس لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔'' شہریار نے اپنی شرمندگی کا اعتراف کرنے میں پہل کی۔

''راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی تو چلو میں سمجھا دیتا ہوں۔ ابھی تمہارے سامنے سلّو والا ٹارگٹ موجود ہے اور اس کے علاوہ ورما نے خواجہ سراؤں کے بارے میں جو تھوڑی بہت معلومات فراہم کی ہیں، تم ان پر کام کر کے بھی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ تم اپنے حوصلے کو پست نہ ہونے دو۔'' انہوں

نے فوراً ہی انہیں مشوروں سے نواز دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!.....واقعی ہم ان دو لائنز پر کام کر سکتے ہیں۔'' ذیشان پُر جوش ہو گیا۔

''ہم نہیں، صرف تم۔ میں تو ابھی زیر تربیت ہوں اور عمر فاروق صاحب کی اجازت کے بغیر یہاں سے قدم بھی باہر نہیں نکال سکتا۔'' شہریار نے جان بوجھ کر منہ لٹکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا جس پر عمر فاروق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور پہلی بار وہ انسٹرکٹر کی سخت اور بے تاثر نظروں سے اسے دیکھنے کے بجائے محبت سے لبریز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ شیر دشمنوں پر بجلی بن کر گرنے کے لیے کتنا بے تاب ہے۔ لیکن بس مصلحتوں نے مجھے تمہیں پابندی میں رکھنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ لیکن اب خوش ہو جاؤ کہ کرنل توحید نے تمہیں ایک خصوصی مشن کے لیے اجازت دے دی ہے۔'' عمر فاروق کا یہ کہنا تھا کہ شہریار کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''واقعی سر! مجھے کس مشن پر بھیجا جا رہا ہے؟'' وہ جوش سے پوچھنے لگا۔

''اس مشن کے بارے میں تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تمہیں کراچی جانا ہوگا جہاں سلو والے معاملے کو تم ٹیسٹ کیس کے طور پر نمٹاؤ گے۔ پھر آگے بات ہوگی۔'' انہوں نے اسے بتایا۔

''رائٹ سر! میں تیار ہوں۔ اور انشاء اللہ سرخرو ہو کر ہی آپ کے سامنے آؤں گا۔'' وہ بہت پُر جوش تھا کہ اب اسے بھی ہاتھ پیر کھولنے اور کچھ کر دکھانے کا موقع ملنے والا تھا۔ چنانچہ پوری توجہ کے ساتھ عمر فاروق سے تفصیلات و ہدایات حاصل کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

صبح ہونے تک چودھری کا نشہ اُتر چکا تھا لیکن غصہ برقرار تھا۔ رات کشور کا مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں پایا جانا اتنی معمولی بات نہیں تھی جسے وہ نظر انداز کر دیتا۔ اس کے لیے یہ بات قطعی ناقابلِ برداشت تھی کہ اپنی جس بیٹی کو وہ قتل کرنے پر تلا ہوا تھا، مراد شاہ اس سے یہاں تک ربط ضبط رکھے ہوئے تھا کہ وہ اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ رات اس کے گھر پر موجود تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس نے بمشکل حوائج ضروریہ ادا کرنے تک صبر کیا اور دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔

مراد شاہ نک سک سے تیار آفس جانے کے لیے تیار تھا اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔

''مجھے کشور کا ایڈریس دے۔'' چودھری نے اس کے سر پر پہنچ کر مطالبہ کیا۔

''مجھے نہیں معلوم ابا جی! کہ وہ کہاں رہتی ہے۔'' مراد شاہ نے چائے کا ایک کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

''جھوٹ مت بول۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیرا اس سے ملنا جلنا ہو اور تُو اس کے گھر کا پتہ نہ جانتا ہو۔'' چودھری اس کا جواب سن کر غرایا۔

''آپ یقین کریں نہ کریں، آپ کی مرضی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔ وہ ایک بار اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ مجھے شاپنگ مال میں ملی تھی تو میں نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیا تھا۔ کل وہ اتفاقاً مجھ سے ملنے چلی آئی اور بس۔'' مراد شاہ نے سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے باپ کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''بکواس نہ کر اوئے۔ میں کوئی ننھا کاکا نہیں ہوں جو تیرے اس جھوٹ سے بہل جاؤں گا۔ مجھے ملوم ہے کہ تجھ جیسے بے غیرت کو اس بے حیا نے اپنا پتہ ٹھکانہ ضرور بتایا ہوگا۔ تیرے جیسے بے غیرت بھائی سے جو گھر



سے بھاگی بہن سے ہنس ہنس کر ملتا ہے، اسے کون سا ڈر ہوگا کہ وہ تجھ سے اپنا پتہ ٹھکانہ چھپائے گی۔'' چودھری دھاڑا۔

''معاف کیجئے گا ابا جی! مجھے اس بے غیرتی پر آپ کے مظالم نے مجبور کیا ہے۔ اگر آپ کشور کو اس کے حقوق دیتے ہوئے کسی اچھی جگہ شادی کر دیتے تو نوبت یہاں تک کبھی نہ پہنچتی۔ میں بے غیرت نہیں ہوں بلکہ مجبور ہوں کہ کشور کو اس کے عمل میں درست سمجھوں۔ اور جب وہ میرے حساب سے حق پر ہے تو میرے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ میں اس سے خفا ہوں اور اسے ڈراؤں۔''

اس بار مراد شاہ بھی اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں رکھ سکا اور باپ کو ترنت جواب دیا۔

''تف ہے تیری ایسی روشن خیالی پر جس نے تجھے تیری روایات بھلا دی ہیں۔ تجھے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تُو میری اولاد ہے۔'' چودھری اسے ملامت کرنے لگا۔

''اب میں خود کو آپ کی اولاد ثابت کرنے کے لیے لوگوں پر آپ جیسے مظالم تو ڈھانے سے رہا، لہٰذا آپ کی مرضی ہے کہ آپ مجھے اپنی اولاد سمجھیں یا نہیں۔'' اس نے شانے جھٹکتے ہوئے جواب دیا اور اطمینان سے سلائس پر مکھن لگانے لگا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی شاہدہ ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ برادری ہی کی لڑکی تھی اس لیے چودھری کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی اور امریکہ میں مراد شاہ کے ساتھ آ بسنے کے باوجود مکمل طور پر اس کے خوف سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے سسر کا پارا اگر ایک حد سے زیادہ چڑھ گیا تو پھر وہ اپنے سگے بیٹے کو بھی نہیں بخشے گا۔

''زبان کو لگام دے مراد شاہ! اور سیدھے طریقے سے مجھے کشور کا پتہ بتا دے۔'' چودھری کی طیش میں بھری بلند آواز نے شاہدہ کو مزید لرزا دیا اور وہ شکر کرنے لگی کہ اس سارے تماشے سے قبل ہی عالیہ اسکول کے لیے روانہ ہو چکی ہے ورنہ اس کے ننھے ذہن پر بہت بوجھ پڑ جاتا۔

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ابا جی! لیکن سچ یہی ہے کہ مجھے کشور کا پتہ معلوم نہیں ہے۔'' مراد شاہ نے اس بار اپنا لہجہ نرم کر لیا لیکن اپنے مؤقف پر قائم رہا۔

''اگر تُو نے میری بات نہ مانی تو میں تجھے جائیداد سے عاق کر دوں گا۔'' بیٹے کی ہٹ دھرمی دیکھ کر چودھری نے اسے دھمکایا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں نے کبھی زمین جائیداد کا لالچ نہیں کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اتنا کما لیتا ہوں جس میں اپنی بیوی اور بچی کا پیٹ پال سکتا ہوں۔'' باپ کی دھمکی سے متاثر ہوئے بغیر اس نے رسان سے جواب دیا اور کرسی کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں چلتا ہوں، مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔''

''ہاں چلا جا، تجھ جیسے ٹکوں کے لیے غلامی کرنے والے کو کیا ملوم کہ زمین جائیداد کی کیا اہمیت ہے۔'' چودھری کا کچھ بس نہ چلا تو چلّانے لگا۔

''ایسی حکمرانی سے جو آدمی کو اپنی خواہشات کا غلام بنا دے، وہ نوکری بہتر ہے جو انسان کو انسانیت کے دائرے میں رکھے۔''

کسی کی کیا مجال تھی کہ چودھری کے سامنے اتنا کچھ کہہ سکتا۔ لیکن وہ مراد شاہ تھا، اس کی اولادوں میں سے وہ واحد اولاد جسے اس کے بعد اس کی گدی سنبھالنی تھی، چنانچہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا اور مراد شاہ اسے خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی چودھری تن فن کرتا ہوا اپنے کمرے میں واپس گیا اور لنڈا کا نمبر ملایا۔

"اوہ چودھری ڈارلنگ! آئی ایم ریئلی سوری کہ رات میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔ لیکن آئی ہوپ کہ تم میری مجبوری کو سمجھتے ہو۔"

لِنڈا نے اس کی آواز سنتے ہی اپنے ساحرانہ لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ لیکن فی الحال چودھری کو اس کی معذرت سے کوئی غرض نہیں تھی چنانچہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

"ان باتوں کو رہنے دو لِنڈا!..... فی الحال میں نے تمہیں ایک دوسرے کام سے فون کیا ہے۔"

"ایسا کون سا کام ہے جو اتنی صبح مجھے فون کر بیٹھے؟" لِنڈا چونکی۔

"مجھے اپنی جس بیٹی کی تلاش ہے، وہ یہاں نیویارک میں موجود ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اسے انجام تک پہنچانے میں میری مدد کرو۔" اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"دیکھو چودھری! یہ پاکستان نہیں ہے کہ یہاں کوئی بھی غیر قانونی کام اتنی آسانی سے ہو سکے۔ یہاں ہمیں اپنے تنظیمی معاملات ہی بہت دیکھ بھال کر چلانے پڑتے ہیں اس لیے ہم غیر ضروری معاملات میں بالکل بھی نہیں پڑتے۔ خود تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ یہاں ذرا ہاتھ پیر بچا کر رہو۔ ورنہ خود بھی مشکل میں پڑو گے اور ہمیں بھی ڈالو گے۔" لِنڈا نے مرادشاہ والی بات ہی اسے ذرا مختلف لہجے اور انداز میں سمجھائی۔

"تم اس معاملے کو نہیں سمجھ سکتیں لِنڈا! کیونکہ تم چودھری افتخار عالم شاہ نہیں ہو۔ میرے لیے یہ زندگی موت کی طرح اہم بات ہے اور میں کشور کے نظر میں آ جانے کے بعد کسی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر تنظیم اس سلسلے میں میری مدد کرے تو میں اس کے بدلے میں اپنا اگلی دفعہ کا معاوضہ چھوڑنے کو تیار ہوں۔" انتقام کی آگ میں جلتے چودھری نے ایک بڑی پیشکش کی جس پر لِنڈا سوچ میں پڑ گئی۔ رقم کی تو اس کے لیے اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن چودھری کو زیر بار کرنے کا ایک موقع مل رہا تھا تو اسے نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ اس احسان کے بدلے وہ مستقبل میں اس سے اپنے دوسرے کئی کام نکلوا سکتے تھے۔

"تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم نے اپنی بیٹی کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟ پھر میں تمہیں کوئی مشورہ دے سکوں گی۔" اس نے دریافت کیا تو چودھری اسے تفصیل بتانے لگا۔

"یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں شبہ ہے کہ تمہارا بیٹا کشور سے رابطے میں ہے تو سب سے پہلے ایک کام یہ کرو کہ اس کے ٹیلی فون کی سی ایل آئی پر موجود سارے نمبرز نوٹ کر کے مجھے بھیج دو۔ میں ان نمبرز کی مدد سے کشور کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ اس کا ایڈریس مل گیا تو میں تمہاری کسی ایسی پارٹی سے ملاقات کروا دوں گی جو اس قسم کے کام کرتی ہے جو تم کروانا چاہتے ہو۔ لیکن یہ سب میں ذاتی سطح پر کروں گی اور تنظیم اس میں انوالو نہیں ہوگی۔ اس لیے باقی معاملات تمہیں خود دیکھنے ہوں گے۔ اگر بعد میں کوئی گڑبڑ سامنے آئی تو اس سے بھی تم خود نمٹو گے۔" لِنڈا نے اسے راہ سجھانے کے ساتھ ساتھ شرائط سے بھی آگاہ کر دیا۔

"میں راضی ہوں۔" چودھری فوراً تیار ہو گیا۔

"بس تو پھر مجھے ٹیلی فون نمبرز کی لسٹ بھیج دو۔" لِنڈا نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد کے سارے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے۔ اس دن کا اختتام ہونے تک چودھری نہ صرف کشور کا پتہ حاصل کر چکا تھا بلکہ اس کے ایک ایسے گینگ سے معاملات بھی طے پا چکے تھے جو انسانی جانوں کی قیمت وصول کر کے انہیں نہایت صفائی سے ٹھکانے لگاتے تھے۔



جاوید علی دُھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک عام سا کاغذ تھا جو کسی ایسے رائٹنگ پیڈ سے پھاڑا گیا تھا جو عموماً میڈیسن کمپنیاں اپنی اشتہاری مہم کے لیے مختلف ڈاکٹروں کو تحفے میں دیتی ہیں اور ڈاکٹرز ان پر نسخے لکھ کر مریضوں کو تجویز کرتے ہیں۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں موجود کاغذ پر کوئی ڈاکٹری نسخہ نہیں بلکہ ایک چند سطری پیغام لکھا ہوا تھا جس نے اس معمولی کاغذ کو غیر معمولی بنا دیا تھا۔ نیلے بال پوائنٹ کی مدد سے لکھی گئی شکستہ سی تحریر میں اسے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔

"جاوید!

تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے جس سے میں نے بہت مختصر عرصے میں بے تحاشا محبت کی اور بے شمار خواب دیکھے کہ میں تمہارے سنگ اپنی زندگی کیسے بتاؤں گی۔ لیکن میرا ہر خواب میری ذات کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ ظالموں نے میرا جو حال کیا، اس کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تمہاری زندگی میں شامل ہونے کی تو کیا، زندہ رہنے کی بھی خواہش کر سکوں۔ چنانچہ میں نے اس دنیا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تم سے اپنے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مطالبہ نہیں کرتی لیکن یہ خواہش ضرور رکھتی ہوں کہ تم ساری زندگی وطنِ عزیز کے دشمنوں سے برسرِ پیکار رہو گے۔

فقط تمہاری شازمین..... جس کا جسم بے شک تمہارا نہ رہ سکا لیکن جس کے دل کی ہر دھڑکن میں بس تم ہو۔"

یہ خط اسے کچھ دیر قبل ہی اس اطلاع کے ساتھ دیا گیا تھا کہ شازمین نے ہسپتال میں خودکشی کر لی ہے۔ خودکشی کے لیے اس نے سیرپ کی ایک بوتل کو استعمال کیا تھا اور بوتل توڑ کر اس کے تیز دھار نوکیلے شیشے سے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ لی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی اور بہت بہتر حالت میں ہونے کے باعث ڈیوٹی نرس اسے وہاں تنہا چھوڑ کر لنچ کے لیے چلی گئی تھی۔ وہ لنچ کر کے واپس آئی تو شازمین اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور اسے تمام تر کوششوں کے باوجود بچایا نہیں جا سکا تھا۔ شازمین کے تکیے کے نیچے سے نکلنے والے تہ شدہ کاغذ کو دیکھ کر نرس نے بتایا تھا کہ کاغذ اور قلم آج صبح ہی شازمین نے اس سے لیے تھے اور یہ بہانہ بنایا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں آنے والے کسی شاعرانہ خیال کو صفحے پر منتقل کرنا چاہتی ہے۔

اپنا کام کرنے کے بعد اس نے بال پوائنٹ نرس کو واپس کر دیا تھا جبکہ کاغذ تہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ نرس نے اس سے فرمائش بھی کی تھی کہ وہ اپنی شاعری اسے بھی سنائے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ فقط اس کے محبوب کے لیے ہے۔ اس جواب کے بعد نرس مزید اصرار نہیں کر سکی تھی لیکن بعد میں یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ شازمین اس روز خودکشی کا تہیہ کر چکی تھی اور مرنے سے پہلے اس نے جاوید علی کو آخری بار مخاطب کیا تھا۔

سی ایف پی والے، ہسپتال میں زیرِ علاج شازمین کی خفیہ طور پر خبر گیری کرتے رہے تھے اس لیے انہیں فوراً ہی اس واقعے کی اطلاع مل گئی اور انہوں نے وہ خط وصول کر کے جاوید علی تک پہنچا دیا۔ شازمین کی لاش البتہ اس کے بھائیوں نے وصول کی تھی جو اپنے والد نواب نوازش علی کی تدفین کے لیے کراچی پہنچنے کے بعد وہیں مقیم تھے۔ انہوں نے شازمین کی خودکشی پر ہسپتال میں خاصا ہنگامہ کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ڈیوٹی نرس معطل کر دی گئی تھی جو ڈیوٹی آورز میں مریضہ کو تنہا چھوڑ کر لنچ کے لیے جانے جیسی غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اس نرس کا بعد میں کیا ہوتا، وہ ڈیوٹی پر بحال ہوتی یا فارغ کر دی جاتی، اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ پھولوں سی لڑکی شاز مین جسے ظالموں نے مسل ڈالا تھا، اپنے ہاتھوں اپنی زندگی سے محروم ہوگئی تھی اور جاوید علی کے دل پر ایک کبھی نہ بھرنے والا گھاؤ لگا گئی تھی۔

نوجوان جاوید علی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ شاز مین جس تیزی سے اس کا پہلا پیار بن کر اس کی زندگی میں آئی تھی، اسی تیزی سے نکل بھی گئی تھی لیکن اس کے یوں چلے جانے پر وہ جتنی شدت سے تکلیف محسوس کر رہا تھا، اس سے یوں لگ رہا تھا کہ شاز مین کبھی اس کے دل سے نہیں نکل سکے گی اور وہ ساری زندگی اس زخم سے تڑپتا رہے گا۔

''حوصلہ کرو ینگ مین! جنگ کسی بھی درجے پر لڑی جا رہی ہو، اس میں حصہ لینے والوں کو ہر طرح کے نقصان کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بھی تسلی اور دلاسے سے تمہارے غم کا مداوا نہیں ہوگا۔ میں تم سے اس نقصان کے لیے دکھی نہ ہونے کا مطالبہ بھی نہیں کر رہا لیکن تمہیں حوصلہ ضرور کرنا ہوگا کیونکہ بے حوصلہ سپاہی وطن کے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور شاز مین نے اپنے خط میں جو آخری خواہش ظاہر کی ہے، وہ یہی ہے کہ تم دفاعِ وطن کے لیے ہمیشہ ڈٹے رہو گے۔''

وہ اس پسدیدہ خط کو کئی بار پڑھ لینے کے باوجود دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے ایک بار پھر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یونٹ انچارج اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جاوید علی کو اپنے استغراق میں اس کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی تھی لیکن جب وہ بولا تو اسے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ساتھ ہی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی۔

''میں ٹھیک ہوں سر! بس اچانک لگنے والے جھٹکے نے دل پر اثر کیا ہے۔ آپ فرمائیے کیسے زحمت کی؟ اگر کوئی کام تھا تو مجھے کال کر لیتے۔ اب تو میں پہلے سے بہت بہتر ہوں اور خود چل کر آپ کے کمرے تک آ سکتا ہوں۔'' آنسوؤں کی نمی اپنے اندر اُتار کر اس نے بڑے حوصلے سے انچارج سے کہا۔

''مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ میں اپنے ماتحتوں کو اپنی فیملی کی طرح سمجھتا ہوں اور اپنے کسی فیملی ممبر کی خبر گیری کرنے میں زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انچارج نے رسان سے اسے جواب دیا۔

''شکریہ سر!..... میں نے پہلی بار آپ لوگوں کے ساتھ کام کیا اور مجھے بالکل نہیں لگا کہ میں کسی دوسرے شہر میں اپنے یونٹ سے ہٹ کر کام کر رہا ہوں۔'' انچارج کے مہربان رویے پر اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''شہر اور یونٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم سب سی ایف پی کے اہلکار ہیں اور پاکستان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ لاہور سے میجر ذیشان کا فون آیا تھا۔ لاہور سے ایک اسپیشل ایجنٹ کراچی آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے اور ڈرائیور اسے ایئرپورٹ سے لے کر یہاں پہنچنے ہی والا ہوگا۔ تمہارے کارناموں کی خبر لاہور پہنچتی رہی ہے چنانچہ میجر ذیشان کے مطابق وہ اسپیشل ایجنٹ تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں پہلے سے انفارم کر دوں تاکہ اس کے پہنچنے سے پہلے تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسا بہادر سپاہی کسی کے سامنے اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرے گا، خصوصاً ایک اسپیشل ایجنٹ کے سامنے جو یقیناً تمہارے کارناموں سے متاثر اور خوش ہے۔''

انچارج نے اسے اپنے وہاں آنے کی وجہ بتائی تو اس کے دل میں انچارج کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ ظاہری زخموں کے علاوہ انسانی جذبات کا بھی خیال رکھنے والا آدمی تھا اور ایسے لوگ بڑے نایاب ہوتے ہیں۔

''میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کروں گا تو شاید یہ بات آپ کو زیادہ اچھی نہیں لگے گی۔ لیکن پھر بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں اور آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' جاوید علی



نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔ انچارج نے کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے پُرجوش انداز میں اس کے شانے پر تھپکی دی۔

''آؤ، ہم مل کر اس اسپیشل ایجنٹ کا استقبال کرتے ہیں۔'' وہ جاوید علی کو لیے باہر نکل گیا۔

''گیسٹ پہنچ گیا ہے سر!'' وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے، ایک اہلکار نے انچارج کو اطلاع دی۔ انچارج کے قدم مزید تیز ہوگئے اور اس نے جاوید علی سمیت باہر کا رخ کیا۔

جاوید علی بھی بھرپور ملنے والی طبّی سہولیات کی وجہ سے بہت بہتر ہو چکا تھا اس لیے انچارج کا پورا پورا ساتھ دیا۔ عمارت کے پورچ میں انہوں نے لمبے قد کے ایک آدمی کو گاڑی سے اُترتے دیکھا۔ گوری رنگت اور تیکھے نقوش والے اس آدمی نے نیلی جینز پر سیاہ رنگ کی چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا خوب صورت جسم واضح ہو رہا تھا اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ورزش وغیرہ کرنے کا عادی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا تو اس کا ہر قدم ناپا تُلا تھا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھ موجود کراچی یونٹ کا انچارج آنے والے کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ حقیقتاً وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور اسے سامنے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہالی ووڈ کی کسی ایکشن مووی کا ہیرو اسکرین سے ہٹ کر ان کے سامنے آ گیا ہے۔

''کراچی میں خوش آمدید۔'' یونٹ انچارج نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے نہایت گرم جوشی سے تھام لیا گیا۔ اس کے بعد جاوید علی کی باری آئی۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے مقابل کی ہاتھ کی مضبوطی کو بہ خوبی محسوس کیا۔

''یہ یقیناً جاوید علی ہیں جن سے ملنے کی میں نے خواہش ظاہر کی تھی۔'' وہ دیکھ جاوید علی کو رہا تھا لیکن مخاطب یونٹ انچارج سے تھا۔

''یس سر! یہ جاوید علی ہی ہے۔ اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمن کے دانت کھٹے کرنے والا ہمارا قابلِ فخر ساتھی۔'' انچارج نے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

''میں عادل خان ہوں۔ ایک اہم مشن پر کراچی آیا ہوں۔ امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر آپ لوگ مجھ سے تعاون کریں گے۔'' آنے والے نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں سر! ہم ہر وقت اور ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔ فی الحال آپ اندر چلیں اور چاہیں تو فریش بھی ہو جائیں۔ پھر آپ کی مرضی کے مطابق ہم ساتھ بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں گے۔'' مؤدبانہ لہجے میں بولتا یونٹ انچارج اس وقت بہترین میزبان کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے کہنے پر عادل خان نے پورچ سے قدم آگے بڑھائے اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔

''میں چائے سے پہلے فریش ہو کر چینج کرنا پسند کروں گا۔ امید ہے کہ اتنا انتظار آپ کے لیے زحمت نہیں بنے گا۔'' اندر پہنچتے ہی عادل خان نے فرمائش کی۔

''شیور سر! میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاتا ہوں۔ آپ کا بیگ بھی وہیں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ اطمینان سے ری فریش ہوں، آپ کے انتظار سے زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انچارج نے خوش خلقی سے جواب دیا اور جاوید علی کو واپس اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کر کے خود عادل خان کے ہمراہ رہا۔

''جاوید.....!'' عادل خان نے اچانک واپس جاتے ہوئے جاوید علی کو پکارا۔

''یس سر.....!'' اب تک بالکل خاموش جاوید علی نے مؤدبانہ لیکن مستعدی سے اس کی پکار کا جواب دیا۔

''چائے پر تم بھی ہمیں جوائن کرنا۔'' اس نے فرمائش کی۔

''رائٹ سر!'' جاوید علی بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اسے ہدایت دینے کے بعد عادل خان، انچارج کے ساتھ اس کی راہنمائی میں آگے بڑھ گیا۔ انچارج کمرے تک اسے چھوڑ کر واپس پلٹ گیا اور ایک شخص نے اس کا بیگ بھی پہنچا دیا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اطمینان سے اپنے بیگ سے ایک آپریٹس نکالا۔

''ٹیسٹ کامیاب رہا۔ کافی دیر سامنے رہنے کے باوجود وہ مجھے نہیں پہچان سکا۔ اب میں نے اسے پھر اپنے ساتھ چائے پینے کی آفر کی ہے۔ چائے پینے کے دوران میں اس سے زیادہ دیر گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا تا کہ اندازہ ہو سکے کہ وہ مجھ میں شناسائی کی کوئی جھلک ڈھونڈ پاتا ہے یا نہیں۔'' آپریٹس منہ کے قریب لا کر وہ بہت آہستہ آواز میں کسی کو بتانے لگا۔

''بہت خوب۔ اگر وہ تمہیں نہیں پہچان سکا تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم بہت پرفیکشن کے ساتھ عادل خان کے روپ میں ڈھل چکے ہو اور کسی اور کے لیے بھی تمہیں شناخت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔'' اس کی رپورٹ سن کر دوسری طرف سے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

''پہلے مرحلے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکے گا اور میں بہت آسانی اور رازداری سے اپنا کام مکمل کر کے لوٹ آؤں گا۔''

اس کے لہجے میں ٹوٹ ٹوٹ کر بھرے اعتماد کے ساتھ ہونٹوں پر بے حد مطمئن مسکراہٹ بھی تھی۔ جاوید علی کے جُل کھا جانے پر اس کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا اور وہ خود کو آزاد فضاؤں میں اُڑتا محسوس کر رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لیے جلد پنجم کا مطالعہ کیجئے۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....

جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

پنجم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ

ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے



''آپ ان پوائنٹس پر اپنے لوگ پہنچا دیں اور پھر انہیں ایکشن میں لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت آسانی سے پورے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے اور وہاں سے ایک بھی فرد باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔'' شیشے کی میز پر کراچی کا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا تھا اور اس نقشے کو درمیان میں رکھے ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت سنتھیا جوزف تھی جس کا حلیہ ماضی کی اس سنتھیا سے بہت مختلف تھا جسے ڈاکٹر ماریہ کی ماں ہونے کی حیثیت سے شہریار کی ساس ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور وہ کافی عرصے تک پیر آباد میں رہ کر جنگل میں جاری افیون کی خفیہ کاشت کی نگرانی کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ایک استاد کے روپ میں معصوم ذہنوں میں زہر بھرنے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ تو پیر آباد والوں کی قسمت اچھی نکلی کہ ماریہ کی حرکات شہریار کی نظر میں آ جانے کے بعد جہاں وہ اپنے انجام کو پہنچی، وہیں سنتھیا کو بھی دوبارہ پیر آباد جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اگر پیر آباد کا کوئی باسی اس وقت اس پُرتعیش ڈرائنگ روم میں بیٹھی سنتھیا کو دیکھتا تو اس کے لیے اسے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

پلاسٹک سرجری کے ذریعے کی جانے والی خدوخال کی تبدیلی سمیت بالوں کی رنگت اور انداز کی تبدیلی نے اسے بالکل نئی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس نئی شخصیت کے اندر وہی پرانی دشمنی اور نفرت لیے وہ ایک بار پھر اپنے مذموم ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میدانِ عمل میں تھی اور ایک معروف سیاست دان کے ساتھ بیٹھی وہ کام انجام دے رہی تھی، جس کے لیے اسے لاہور سے کراچی بھجوایا گیا تھا۔

یہ معروف سیاست دان ریاض انور کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کرنے یا نہ کرنے، دونوں صورتوں میں ہمیشہ میدانِ سیاست میں ''اِن'' رہتا تھا۔ اُس کی اس مقبولیت کے پیچھے جو سب سے بڑی وجہ نظر آتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ ایک نیوٹرل، مخلص اور محبِ وطن آدمی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جس کا ہر طرح کے فلاحی اور امدادی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اس کا ایک اور پلس پوائنٹ تھا۔ لوگ اسے سیاست دان سے بھی زیادہ ایک فلاحی شخصیت کی حیثیت سے جانتے اور پسند کرتے تھے اور اس وقت وہی ملکی فلاح و بہبود کا علمبردار سنتھیا کے مقابل بیٹھا ایک ایسے نقشے کی طرف متوجہ تھا جس پر جابجا سرخ روشنائی سے گول دائرے بنائے گئے تھے۔ سنتھیا نے ان دائروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہی اس سے اپنی بات کہی تھی۔

''را'' کی پاکستان میں موجودگی کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ اپنی حرکات سے پاکستان کو کمزور کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ہم افسروں اور سیاست دانوں کو پھانس کر ملکی رازوں کے حصول سے لے کر خودکش حملوں اور لسانی فسادات تک سب کچھ کروانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سنتھیا کو اس بار

کراچی میں لسانی فساد کروانے کا مشن سونپا گیا تھا۔ مختلف قومیت کے لوگوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بیٹھا کراچی جسے بجا طور پر منی پاکستان کہا جاتا تھا، اس قسم کے فسادات کے لیے آئیڈیل تھا۔ فسادات کا آغاز کروانے کے لیے اس وقت سنتھیا نے جس علاقے کا انتخاب کیا تھا، وہاں ایک مخصوص زبان بولنے والوں کی اکثریت آباد تھی جن کی دوسری زبان بولنے والوں سے سیاسی کشمکش جاری رہتی تھی۔ اس کشمکش کو باقاعدہ لڑائی کا رنگ دے کر وہ لوگ کراچی کے امن کو آسانی سے تہس نہس کر سکتے تھے کیونکہ ایک بار لسانی فسادات پھوٹ پڑتے تو پھر اس کا سلسلہ طویل ہوتا چلا جاتا اور اس سلسلے کو طویل کرنے کے لیے بھی ''را'' کی طرف سے کمک ملتی رہتی۔ ''را'' کو اس قسم کے کاموں کو انجام دینے کے لیے زیادہ مشکل اس لیے پیش نہیں آتی تھی کہ ان کے پاس بہت سے ایسے وظیفہ خوار موجود تھے جو سوئس بینکوں میں بڑھتے ہوئے اپنے بینک بیلنس کے عوض کتنی ہی معصوم اور بے گناہ زندگیوں کو بھینٹ چڑھا سکتے تھے۔

''ڈونٹ وری میڈم! میں کام کے آدمیوں کو ان جگہوں پر پہنچا کر پورے علاقے کی ناکہ بندی کروا دوں گا اور آپ دیکھیں گی کہ کوئی انسان تو کیا، چڑیا کا بچہ بھی یہاں سے زندہ باہر نہیں نکل سکے گا۔''

''کوشش کرنا کہ یہاں رہنے والوں کا باہر کی دنیا سے رابطہ کٹ کر رہ جائے۔ اس علاقے کی ٹیلی فون لائنز اور موبائل سگنلز بند کرنے کا بھی انتظام کر لینا تاکہ وہ لوگ بُری طرح بلبلا اُٹھیں اور انتقاماً خود بھی ہتھیار ہاتھوں میں اٹھا لیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت جاری کی۔

''علاقے کی لینڈ لائن بند کرنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ موبائل سروس کو مکمل طور پر بلاک کرنا تھوڑا مشکل ہوگا اور ہم جزوی طور پر ہی یہ کام کر سکیں گے۔ البتہ اس سے بڑھ کر دو کام اور کیے جا سکتے ہیں۔ اوّل علاقے کی الیکٹرک سپلائی روک دی جائے گی، دوسرے واٹر ہائیڈرنٹس بھی بند کر دیئے جائیں گے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ گھروں میں رہنے والے لوگ اس کارروائی سے کتنی بری طرح چراغ پا ہوں گے، آپ خود بعد میں ملاحظہ کر لیں گی۔'' وہ گھر کا بھیدی تھا جو اچھی طرح جانتا تھا کہ لوگوں کی کس رگ کو دبایا جائے تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، اس لیے لنکا ڈھانے کا کام خوب اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔

''گڈ۔ میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر تجویز ہے۔ پریشانی اور تکلیف کا شکار اہلِ علاقہ جب فون کالز اور میسجز کے ذریعے دوسرے علاقوں میں مقیم اپنے عزیز و اقارب کو اپنے حال سے آگاہ کریں گے تو پورے شہر بلکہ ملک میں بھونچال سا آ جائے گا اور لوگ ایک بار پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حکومتی ادارے ہمارے لیے بالکل ناکارہ ہیں۔ پھر احتجاجاً پولیس اور دیگر متعلقہ اداروں کے خلاف پُرتشدد احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔'' وہ گویا تصور کی آنکھ سے یہ سب دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے میڈم! لیکن خیال رکھیے گا کہ اس ساری کارروائی پر بہت بڑی رقم خرچ ہوگی۔ کام کے بندے ہائر کرنے کے علاوہ معقول اسلحے اور گولہ بارود کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔''

''پہلے کب تمہیں رقم کے سلسلے میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے جو اب پریشان ہو رہے ہو؟ تم اپنا کام شروع کرو، رقم تمہیں مل جائے گی۔'' ریاض انور لالچی فطرت کا آدمی تھا جو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی رقم کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکا..... اور سنتھیا کو اس کا مطالبہ کرنا برا لگا تھا اس لیے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔

''کام تو میں چٹکی بجاتے میں کرا دوں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ کب اس کام کو کروانے کی خواہش مند ہیں؟'' اس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر ریاض انور نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

''صرف دو دن بعد۔ کر لو گے نا تم دو دن میں سارا انتظام؟'' سنتھیا نے اسے جانچتی نظروں سے



دیکھا۔

''بالکل ہو جائے گا میڈم!'' ریاض انور نے اعتماد سے جواب دیا۔

''کارروائی میں حصہ لینے والے بندے کام کے ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جدید اسلحہ تو فراہم کر دیں لیکن ان لوگوں کو اس کا استعمال ہی معلوم نہ ہو۔ اس آپریشن میں ہم ایسا اسلحہ استعمال کروانا چاہتے ہیں جو یہاں کی پولیس اور رینجرز نے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح پبلک کو یہ خاموش میسج جائے گا کہ ان کے تحفظ کے ذمے دار ادارے کتنے ناکام اور نااہل ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر ریاض انور کو ہدایت کی۔ اس آپریشن پر ''را'' کو جتنا خرچ کرنا پڑتا، اس حساب سے وہ نتائج حاصل کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔ آپس میں لڑتی ہوئی عوام اور بے بھروسہ حکومتی ادارے ان کے جذبہ نفرت کی تسکین کے لیے اہم تھے اس لیے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا جا رہا تھا۔ سنتھیا جو درحقیقت ''موساد'' کی ایجنٹ تھی اور ''را'' میں رہ کر بھی ''موساد'' سے وفاداری نبھاتی رہتی تھی۔ اس آپریشن کے لیے سو فیصد ''را'' سے مخلص و متفق تھی کیونکہ وفاداری چاہے کسی سے بھی نبھائی جاتی، مشن دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو کمزور سے کمزور تر کر کے اسے ایک ناکام ریاست ثابت کرنا۔

''اس بات کی آپ فکر ہی نہ کریں میڈم! میرے پاس ایسے ایسے کام کے بندے ہیں کہ عام ہتھیار تو کیا، ایٹم بم کو بھی آپریٹ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی پولیس اور رینجرز ان کے آگے کیا بیچتی ہے، اگر آرمی بھی مقابلے پر آ جائے تو منہ کی کھا کر جائے گی۔'' ریاض انور اپنی اہلیت ثابت کرنے کے احمقانہ حد تک پُرجوش ہو گیا۔ لیکن سنتھیا کو ان مقامی ایجنٹوں سے جو کہ دراصل اپنی زمین کے غدار ہوتے تھے، نمٹنے کا طویل تجربہ تھا۔ اس لیے ریاض انور کی شیخی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی اور پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کل ہمارا ایک اہم بندہ کراچی پہنچ رہا ہے۔ اس کی تربیت پر ہم نے بڑا روپیہ اور وقت خرچ کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جب وہ ہمارے لیے کام کرنا شروع کرے گا تو ہر طرف تہلکہ مچا کر رکھ دے گا۔ میں اس بندے کو تمہارے پاس بھجواؤں گی۔ تم اس کارروائی کے لیے اس سے بھی مشورہ کر لینا۔''

''ٹھیک ہے میڈم!..... جیسی آپ کی مرضی۔ اگر آپ مجھ پر مکمل اعتماد کرنے میں حرج سمجھتی ہیں تو میں آپ کے نمائندے کے مشوروں پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' کسی دوسرے آدمی کی آمد کا سن کر ریاض انور کا منہ لٹک گیا۔ وہ لالچی آدمی اس حد تک بدطینت تھا کہ مادرِ وطن کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے بھی ہیرا پھیری کرنے سے باز نہیں آتا تھا جن سے دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے جو مشن سونپا جا رہا ہے، اس پر کتنی بڑی لاگت آئے گی۔ اس لاگت کو مزید بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کے بعد وہ اچھی خاصی رقم مار سکتا تھا لیکن کسی دوسرے بندے کی موجودگی کے باعث یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ مایوس ہو گیا۔

''دل برداشتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دوسرے آدمی کی شمولیت کا فیصلہ تم پر عدم اعتماد کی وجہ سے نہیں بلکہ معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا ہے۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانچ لیں گے کہ وہ آدمی ہمارے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تم بہرحال یہ اطمینان رکھو کہ وہ تمہارے سر پر مسلط نہیں رہے گا بلکہ تمہارے انڈر میں کام کرے گا۔'' سنتھیا نے اسے اطمینان دلایا۔

''تھینک یُو میڈم!'' ریاض انور خوش ہو کر بولا۔ ''میں آپ کے اعتماد پر پورا اُترنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔'' غیر ملکی آقا کے تلوے چاٹتے ریاض انور کو کہیں دور تک بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ

ایک ملک دشمن کے اعتماد پر پورا اُترنے کا وعدہ کرتے ہوئے لاکھوں لوگوں کے اعتماد کا خون کر رہا ہے جو اسے کسی ہیرو کی طرح سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور اس کی بے تحاشا عزت کرتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''آپ کو اتنے سال بعد وطن واپس آ کر کیسا لگ رہا ہے؟'' شوخ رنگ کے لباس میں میک اَپ کے جملہ لوازمات سے لیس چلبلی سی رپورٹر نے اس سوال کے ساتھ مائیک کا رخ سلیم عرف سلّو کی طرف کیا تو اس نے پہلے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نروٹھے پن سے بولا۔

''ظاہر ہے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہاں میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار ہیں جن سے مل کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔''

''آپ کی خوشی میں ہمارا چینل بھی شریک ہے اور پورے پاکستان کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن دیکھئے نا، یہ پورا ملک بھی تو آپ کے لیے ایک فیملی کی طرح ہی ہے اس لیے ہم اپنے چینل کے ذریعے آپ کی اس فیملی کے افراد کی آپ سے ملاقات کروانا چاہتے ہیں۔''

زیرک رپورٹر نے فوراً ہی سلّو کی بے رخی کو بھانپ لیا اور چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت دینے لگی۔ اصل میں جب سے سلّو اور اس کے ساتھ بھارت سے آنے والے دوسرے پاکستانی قیدیوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، نیوز چینلز کے نمائندے کسی بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اور اب یہ رپورٹر اپنے کیمرہ مین کے ساتھ اس کی جھگی میں بھی چلی آئی تھی جس کی حالت گزرے برسوں میں اور بھی ابتر ہو گئی تھی اور غریب والدین اس جھگی سے بھی زیادہ خستہ حال نظر آتے تھے۔

بھارتیوں کی تربیت کے نتیجے میں اینگری ینگ مین بن جانے والا سلّو گھر اور ماں باپ کی حالت دیکھ کر مزید برانگیختہ ہو گیا تھا اور اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں سے نفرت مزید گہری ہو گئی تھی۔ اب یہ نیوز رپورٹر اسے بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ پاکستان کے سارے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں تو اس کے یقین کرنے کا سول ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کا مؤقف تھا کہ اگر کسی کو اس کا خیال ہوتا تو اس کی زندگی کے اتنے بہت سارے سال بھارت کی سرزمین پر نہ گزرتے اور اس کی رہائی کی کوشش کی جاتی یا پھر کم از کم اس کے ماں باپ کا ہی کوئی پرسانِ حال ہوتا جو غربت اور بیٹے کی جدائی کے غم میں وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس نے زبان سے اپنا یہ مؤقف ظاہر نہیں ہونے دیا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرے وطن کے لوگ میری رہائی پر خوش ہوں گے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے لیکن حکومت کا کام ہے کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہو جانے والے ماہی گیروں کی خبر گیری کرے اور انہیں اتنے سال بھارتی جیلوں میں سڑنے نہ دے۔ کیونکہ جب روزی کی تلاش میں جانے والا ماہی گیر گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے اس کے گھر والے بھوک سے مرنے لگتے ہیں۔'' سلّو کے لہجے میں کرب سا تھا۔

''یہ شخص اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا ہے۔ ہماری حکومت نے کبھی بھی اور کہیں بھی پھنسے ہوئے اپنے شہریوں کی مدد کے لیے کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کیا ہے۔ ایسے میں انسان کے دل میں شکایت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔'' ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے جاوید علی نے سلّو کا جواب سن کر تبصرہ کیا۔

''یہ صرف شکایت نہیں ہے جاوید! یہ اس نفرت کا بہت معمولی سا اظہار ہے جو بھارتیوں نے اس کے



دل و دماغ میں بھر دی ہے۔ تم اس شخص کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ان میں کتنی نفرت اور زہر بھرا ہوا ہے۔''

جاوید علی کے قریب ہی بیٹھے عادل خان نے جوابی تبصرہ کیا تو وہ قائل ہونے والے انداز میں خاموش ہو گیا اور توجہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر لی جہاں رپورٹر سلّو سے نیا سوال کر رہی تھی۔

''یہ بتائیں کہ بھارت میں آپ کا وقت کیسا گزرا؟ کیا انتہائی کم عمر ہونے کے باوجود وہاں کی جیل میں آپ پر سختی کی گئی؟''

نیوز رپورٹر وہ سوالات کر رہی تھی جو سلّو کی شخصیت کو کھول کر سامنے لانے میں مدد دے سکیں۔ یہ سوال نامہ اسے کہیں اور سے مرتب شدہ حالت میں ملا تھا۔ دراصل سلّو کے اس مختصر سے انٹرویو کے پیچھے سی ایف پی کا ہاتھ تھا۔ اس انٹرویو کا انتظام کثیر المقاصد نتائج کے حصول کے لیے کیا گیا تھا۔ پہلا مقصد تو سلّو کی ذہنی گرہوں کو سامنے لانا تھا، دوسرے میڈیا کے گھیرے میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر محدود رہنے پر مجبور تھا اور فوری طور پر اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسرے بھارت کی طرف سے جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ماہی گیروں کی رہائش کو ایک بڑی خبر بنا دینے کے نتیجے میں سلّو کا چہرہ ملک بھر کے عوام کے لیے ایک دم ہی شناسا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اگر وہ کہیں کسی تخریبی کارروائی میں ملوث پایا جاتا تو اس بات کا بہت امکان تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے شناخت کر لے گا۔ اگر وہ اپنی شناخت میں تبدیلی کر کے کسی کارروائی میں حصہ لینا چاہتا تو اس کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوتی۔ بہرحال، یہ سارے احتیاطی اقدامات تو صرف اس لیے کیے گئے تھے کہ اگر کبھی خدانخواستہ سلّو سی ایف پی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو اس پر گرفت کرنے کے لیے کوئی تو سبیل بنے ورنہ تو اسے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی خفیہ نگرانی میں لے لیا گیا تھا۔

''بھارت میں میرا وقت اس حساب سے بہت تکلیف میں گزرا کہ میں اپنے گھر والوں سے دور تھا اور ہر لمحہ مجھے ان کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ لیکن جہاں تک جیل میں مجھ پر سختی یا تشدد کی بات ہے تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ کم عمری کی وجہ سے مجھے بڑی رعایت دی جاتی تھی۔ کھیل اور تفریح کے مواقع بھی ملتے تھے۔ لیکن قید تو بہرحال قید ہوتی ہے، جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں خوش ہوں کہ بھارت نے خیر سگالی کے اظہار کے لیے مجھے اور میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی آزاد کر دیا ہے۔ ورنہ معلوم نہیں ہمیں اور کتنے سال وہاں رہنا پڑتا۔''

سلّو کے لب و لہجے سے بھارت کے لیے شکر گزاری ٹپک رہی تھی جو خاصی معنی خیز تھی ورنہ اس سے قبل جو بھی لوگ بھارتیوں کی قید سے آزاد ہو کر آئے تھے، وہ وہاں کی جیلوں میں خود پر روا رکھے گئے ظلم و ستم کا ہی ذکر کرتے تھے۔ بھارتی سورما بے ضرر و غریب ماہی گیروں پر بھی تفتیش کے نام پر ایسا ظلم و ستم کرتے تھے جیسے انہوں نے کسی بڑے دہشت گرد کو گرفتار کر رکھا ہو۔ غربت کے مارے یہ عام سے لوگ ان مظالم سے بے حد بری حالت کو پہنچ جاتے تھے اور اکثر کا تو ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا تھا۔

''یہ دیکھو، اسے کہتے ہیں برین واشنگ۔ مجھے یقین ہے کہ واقعی وہاں اس لڑکے کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہوگا۔ لیکن صرف اس لیے کہ بعد میں اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔'' عادل خان نے دانت بھینچتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اتنی زبردست طریقے سے برین واشنگ کی گئی ہے کہ یہ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے کے باوجود چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا۔'' جاوید علی نے اس سے اتفاق کیا۔

ادھر ٹی وی اسکرین پر اب سلّو کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی دکھایا جا رہا تھا اور رپورٹر ان سے

ان کے تاثرات معلوم کر رہی تھی۔

برسوں کے بعد بیٹے کی شکل دیکھنے والے والدین اسے سامنے پا کر اتنے خوش تھے کہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بار بار رونے لگتے تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے جاوید علی کو اپنے دل میں گہرا تاسف محسوس ہوا۔ سلیم عرف سلّو جس حالت میں اور جن ارادوں کے ساتھ پاکستان آیا تھا، اس کا انجام اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ اپنے انجام کو پہنچتا تو برسوں بعد خوشی کی شکل دیکھنے والے اس کے والدین پر کیا گزرتی۔ جاوید علی کو لگا کہ اگر اسے سلّو کے وجود میں گولیاں اُتارنے کا کام انجام دینا پڑا تو ایک بار تو ضرور ہی اس کا ہاتھ کانپ جائے گا۔ صرف اور صرف ان دو بوڑھوں کی وجہ سے جو آج خوش تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟' اپنی سوچوں میں گھرے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ٹی وی اسکرین پر چلنے والا منظر بدل چکا ہے اور سلّو کے انٹرویو پر مشتمل رپورٹ کے اختتام پر چینل کے نیوز روم سے دوسری خبریں نشر کی جانے لگی ہیں۔

''کچھ نہیں سر!..... بس اس شخص کا چہرہ اپنے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔'' اس نے عادل خان کے سامنے اپنے اصل احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے بصد اصرار خود عادل خان کے اس مشن میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ عادل خان اُس کی فٹنس کی وجہ سے تشویش کا شکار تھا اس لیے بہت مشکل سے راضی ہوا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ رہ کر حالات پر نظر رکھے۔ فیلڈ میں اُسے اُتارنے یا نہ اُتارنے کا فیصلہ وہ خود بعد میں اپنی صوابدید پر کرے گا۔ مشکل سے راضی ہونے والے عادل خان کے سامنے سلّو کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے نرم گوشے کا اظہار کر کے وہ خود کو اس مشن سے ڈراپ کر دیئے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں ابھی ہسپتال میں موجود شازمین کا زخم زخم وجود اور اس کا آخری خط بالکل تازہ تھا اور بھارتی سورماؤں سے وطنِ عزیز کی خاطر ٹکرانے کے جذبے کے ساتھ ذاتی انتقام کی تپش بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ تپش اتنی شدید تھی کہ وہ اب کبھی بھی نہ تو خود چین سے بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی بھارتیوں کو بیٹھنے دے سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''بیٹھو نوجوان! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ عام طور پر میں اتنی رات گئے کسی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن تم سے ملاقات ایسی جگہ سے طے کی گئی تھی کہ میرے لیے وقت کی کمی کے پیش نظر انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔''

قیمتی سگار منہ میں دبائے ریاض انور نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اسے بیٹھنے کی پیشکش تو ضرور کی لیکن یہ جتانا ضروری سمجھا کہ وہ بے وقت آیا ہے۔

''مجھے بھی شوق نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے سے ملتا پھروں۔ اوپر والوں کا آرڈر تھا، اس لیے ادھر آ گیا ہوں۔ ورنہ دن بھر الا بلا چینل والوں کو بھگتاتے بھگتاتے دماغ پچی ہو گیا ہے۔ اوپر سے آرڈر نہیں ہوتا تو اس وقت اپن بھی آرام سے اپنے گھر میں سو رہا ہوتا۔'' نوجوان نے اس کے رعب میں آئے بغیر کسی لاگ لپٹ کے بغیر جواب دیا۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔'' ریاض انور اس کا انداز دیکھ کر ذرا محتاط ہوا۔ ''گزرے چند برسوں میں اتنے چینلو کھلے ہیں کہ ان کے نام بھی یاد رکھنا پڑتا ہے۔ ذرا جو کسی کو نظر انداز کر دو تو وہ ناطقہ بند کر دیتا



ہے۔ ہم سیاست دان تو ان کا خصوصی ٹارگٹ ہیں لیکن وہ صرف ہمارے متعلق کتنی خبریں دیں گے؟ اس لیے جو بھی ایشو سامنے آ جائے، اسے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تم بھی اسی لیے گھیر لیے گئے۔'' اپنے تبصرے کے اختتام تک اس کا لہجہ بے حد دوستانہ ہو گیا۔ وہ موقع پرست آدمی تھا اس لیے ضرورت کے مطابق اپنا لب و لہجہ تیزی سے بدل لیا کرتا تھا۔ نوجوان کے تیور دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ دبنے یا رعب میں آنے والا بندہ نہیں ہے اس لیے اس سے دوستانہ رویہ رکھ کر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

''کام کی بات کرو۔ ٹائم بچے گا تو اپن تھوڑی دیر سو بھی لے گا۔'' نوجوان نے جو جواب دیا، اسے سن کر ریاض انور کو احساس ہوا کہ اس کا کسی وکھری ٹائپ بندے سے واسطہ پڑ گیا ہے اس لیے گلا کھنکھارتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تمہارے میرے درمیان دو طرح کے معاملات ڈسکس ہونے ہیں پہلا معاملہ سیدھا اور مختصر ہے۔ مجھے تمہیں کسی معقول جگہ ملازمت دلوانے کا کہا گیا ہے۔ یہ کام سمجھو کہ ہو گیا۔ کل میں میڈیا پر اس سلسلے میں اعلان کرنے کے ساتھ تمہارے لیے مالی امداد کا بھی اعلان کر دوں گا۔''

ریاض انور اسے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ اُس کے اس عمل کو کتنا سراہا جائے گا۔ لوگ تعریف کریں گے کہ برسوں بعد بھارتی جیل سے آزاد ہو کر آنے والے نوجوان کا کسی کو خیال آیا تو صرف ریاض انور کو ورنہ حکومت سے کسی کو کوئی اچھی اُمید تھی ہی نہیں۔

''ٹھیک ہے، دوسری بات بولو۔'' نوجوان جو کہ سلّو تھا، اس پر ریاض انور کی مہربانی کا مطلق اثر نہیں ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ملازمت یا مالی امداد کا اعلان کوئی بھی کرے، اصل ادائیگی تو اسے اس کے وہی آقا کریں گے جنہوں نے اس کے اندر نفرت اور لالچ بھر کر میدان میں اُتارا تھا۔

''دوسرے معاملے میں تمہیں میری مدد کرنی ہو گی۔'' ریاض انور نے لہجہ دھیما کر کے اسے جواب دیا اور پھر وہ نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا جس پر جا بجا سنتھیا نے سرخ دائرے بنا رکھے تھے۔ نقشے کی مدد سے وہ سلّو کو سمجھانے لگا کہ وہ وہاں کس قسم کی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس بار سلّو سنجیدہ ہو گیا اور پورے انہماک سے اس کی بات سننے لگا۔

''اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟'' تفصیل سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔ جواب میں ریاض انور اسے بتانے لگا کہ اس کے پاس کون کون سا اسلحہ کتنی تعداد میں موجود ہے۔

''اسلحے کی پوزیشن ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ ہی نائٹ ویژن گاگلز اور دھوئیں کے بموں کا انتظام بھی کر لینا تاکہ ہمارے آدمی اپنا کام صحیح طور پر مکمل کر لینے کے ساتھ ساتھ وہاں سے آسانی سے نکل بھی سکیں۔'' اس نے مشورہ دیا اور پھر مذکورہ علاقے کے ایک ایک چپے کے بارے میں اس طرح ہدایات دینے لگا کہ ریاض انور بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

سلّو کی گفتگو سن کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ نہایت کم عمری میں یہاں سے چلا جانے کے بعد ابھی واپس آیا ہے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان گلی کوچوں میں ہی کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ دراصل اُسے دورانِ تربیت پاکستان کے مختلف شہروں کے بارے میں بہت تفصیل سے معلومات ذہن نشین کروائی گئی تھیں۔ خصوصاً بڑے شہروں کا تو مکمل نقشہ اُسے ازبر تھا اس لیے اس وقت وہ ریاض انور سے بڑے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے نقشے میں مزید دو ایسے مقامات کو نشان زد کیا تھا، جنہیں سنتھیا نظر انداز کر گئی تھی۔ مقامات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ کن مقامات پر کس قسم کا اسلحہ اور کن صلاحیتوں

کے افراد کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ غرضیکہ وہ گفتگو کے اختتام تک ریاض انور کو بری طرح متاثر کر چکا تھا اور وہ قائل ہو گیا تھا کہ سنتھیا نے اسے یونہی سلّو سے ملاقات اور مشورے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''کل تین منی ٹرکس اس علاقے میں قائم چیریٹی اسکول کے لیے میری طرف سے فرنیچر، کتابیں اور اسٹیشنری وغیرہ لے کر جائیں گے۔ ان ٹرکوں میں ہی ہم ضروری اسلحہ بھی منتقل کر دیں گے۔ میری ساکھ ایسی ہے کہ کوئی بھی ان ٹرکس کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی بعد میں یہ شک کیا جائے گا کہ اس کام میں میرا ہاتھ تھا۔'' سلّو کے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تو اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور ایک دو مزید مشورے دینے کے بعد جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس آپریشن میں اس کی حیثیت فقط ایک مشیر کی سی تھی اور اس میں براہِ راست حصہ نہیں لے رہا تھا کیونکہ شروع کے چند دن اسے اس کے عزیز و اقارب کے ساتھ گزارنے کی اجازت دی گئی تھی۔ البتہ اس دوران اسے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہوئے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''ہیلو آفتاب!..... آج اتنی دیر سے جا رہے ہو؟'' وہ دو تین موٹی موٹی کتابیں سنبھالے لائبریری سے باہر آ رہا تھا کہ لارا سے ٹکراؤ ہو گیا جس نے اسے دیکھتے ہی خوش خلقی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

لارا تقریباً چوبیس پچیس سال کی ایک قبول صورت اور سنجیدہ مزاج لڑکی تھی جو اس لائبریری میں ہی ملازمت کرتی تھی اور یہیں مطالعے کی غرض سے مستقل آنے والے آفتاب کی اس سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ لارا کے سنجیدہ مزاج اور وسیع معلومات نے اس دوستی کو گہرا کرنے میں خاصی مدد دی تھی اور کبھی کبھار وہ دونوں فرصت ملنے پر ساتھ بیٹھ کر کافی یا موسم کی مناسبت سے کوئی دوسرا مشروب پی لیا کرتے تھے۔

''آج کام کچھ زیادہ تھا اور مجھے ہر حال میں اسے آج ہی نمٹانا تھا اس لیے میں زیادہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بس اب گھر ہی جا رہا تھا۔'' آفتاب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''تو پھر میرے ساتھ ہی چلو۔ میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔'' لارا نے اسے پیشکش کی۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب کے پاس اپنی ذاتی سواری موجود نہیں ہے اور حُسنِ اتفاق سے وہ آفتاب کے برابر والے اپارٹمنٹ میں ہی مقیم تھی۔ یہ حُسنِ اتفاق بھی دراصل ان کی دوستی کا ہی نتیجہ تھا۔ اپنے موجودہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے سے قبل آفتاب، کشور کے ساتھ جس اپارٹمنٹ میں مقیم تھا، اس کا کرایہ کافی زیادہ تھا جبکہ سہولیات قدرے کم۔ اس پر مستزاد اس کی لینڈ لیڈی خاصی نک چڑھی عورت تھی جو ہر ہفتے کرایہ وصول کرنے خود آتی تھی اور ساتھ ہی اپارٹمنٹ کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد کوئی نہ کوئی اعتراض کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

اُس کا یہ روّیہ آفتاب سے زیادہ کشور کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنتا تھا۔ ایک دن لارا کے ساتھ کافی پیتے ہوئے اُس نے اُس سے اپنی لینڈ لیڈی کے روّیے کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور معقول اپارٹمنٹ کی تلاش کا ذکر کیا تو لارا نے اسے اپنے پڑوس کا اپارٹمنٹ خالی ہونے کی اطلاع دی۔ یوں وہ اور لارا لائبریری کے دوست کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی بن گئے۔ کشور کو ان دونوں کی دوستی کا علم تھا لیکن لارا کے باوقار انداز نے اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے وہ اس دوستی پر معترض نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے خوش ہی تھی کہ اسے نیویارک جیسے شہر میں ایک معقول پڑوسن میسر آ گئی ہے۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ سچ پوچھو تو مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی کہ اتنا تھکا ہوا ہو کر طویل واک کر سکوں۔



اپنے کام کا کچھ حصہ مجھے آج ہی گھر جا کر بھی مکمل کرنا ہے۔''

آفتاب نے اسے جواب دیا اور خوش خوش اس کے ساتھ ہو لیا۔ گاڑی میں لائبریری میں ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا راستہ چند منٹوں کا ہی تھا۔ ان چند منٹوں میں ان دونوں کے درمیان کوئی قابل ذکر گفتگو نہیں ہوئی۔ بس لارا نے اس سے کشور اور اُمید کی خیریت دریافت کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ فرصت ملنے پر وہ لوگ کسی دِیک اینڈ پر ساتھ گھومنے چلیں گے۔ آفتاب نے بھی اُس کے اس پروگرام کی تائید کی۔ اتنی دیر میں وہ لوگ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ پارکنگ میں گاڑی روکنے کے بعد وہ دونوں لفٹ کی مدد سے چھٹی منزل پر پہنچے اور پھر لارا اسے ''بائے'' کہتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ میں گھس گئی۔ اس نے بھی اپنے اپارٹمنٹ کا رخ جہاں کشور نے اُمید کو گود میں تھامے اس کا استقبال کیا۔ آفتاب کو اپنی ساری تھکن سیکنڈ میں دُور ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں ایک ریک میں رکھ کر فوراً ہی اُمید کو گود میں لے لیا اور اسے خوب پیار کرنے لگا۔ وہ بھی باپ کی گود میں آ کر خوب قلقاریاں مارنے لگی۔

''آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔'' باپ بیٹی کو آپس میں لاڈ کرتے دیکھ کر کشور نے آہستہ سے شکوہ کیا۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ آج کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جائے گی۔ وہ تو شکر ہے کہ واپسی میں لارا مل گئی اور اس کی گاڑی میں آنے کی وجہ سے میرا تھوڑا سا وقت بچ گیا۔'' اس نے امید کے ساتھ لاڈ کو جاری رکھتے ہوئے کشور کو جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ میری فیلنگز کو سمجھ سکتے ہیں۔ جب سے مراد بھائی کے گھر پر ابا جی سے سامنا ہوا ہے، میں بے حد خوف زدہ ہو گئی ہوں اور ہر وقت یہی لگتا ہے کہ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ جائیں گے۔'' اس نے بے چارگی سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ اب بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ چودھری صاحب کتنے ہی غصے والے سہی، نیویارک کی حدود میں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ نتیجے میں وہ خود بھی برے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔'' آفتاب مطمئن تھا اور اسے بھی دلاسا دے رہا تھا۔

''میں ابا جی کو آپ سے بہتر جانتی ہوں آفتاب! وہ ہم دونوں کو قبر میں پہنچانے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔'' کشور اُس کی تسلی کے باوجود خوف زدہ تھی۔

''اور میرا ایمان ہے کہ طے شدہ وقت سے پہلے ہمیں کوئی بھی قبر میں نہیں پہنچا سکتا اس لیے میں آپ کو ایک بار پھر یہی مشورہ دوں گا کہ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور جلدی سے کھانا لگائیں۔ بھوک سے اس غریب کی جان نکلی جا رہی ہے۔'' اس نے کشور کی ناک دباتے ہوئے جان بوجھ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

''کھانا تیار ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں اتنی دیر میں ٹیبل پر کھانا لگاتی ہوں۔'' حسبِ توقع وہ پچھلا موضوع بھول کر اس کے کھانے کی فکر میں مبتلا ہو گئی اور آگے بڑھ کر امید کو بھی اس کی گود سے لے لیا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد آرام دہ شلوار قمیض پہن کر ٹیبل پر پہنچا تو کھانا لگ چکا تھا۔ اس نے نہایت رغبت سے کھانا شروع کر دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کشور کی کوکنگ کافی بہتر ہوتی جا رہی تھی اور وہ اچھا خاصا کھانا بنانے لگی تھی لیکن اس سے قبل جب وہ ڈھنگ کا کھانا نہیں بناتی تھی، تب بھی آفتاب اس کا پکایا ہوا کھانا اسی رغبت سے کھاتا تھا کہ کہیں کشور کی دل آزاری نہ ہو۔

وہ محلوں میں رہنے والی شہزادی جس نے کبھی تنکا بھی دہرا نہیں کیا تھا، جب اس کی خاطر اس کی محبت میں اپنا لائف اسٹائل بدل کر اتنی مشقت اُٹھا رہی تھی تو کیا وہ ذرا سا بد ذائقہ کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ اور اب تو

کشور کی یہ خامی بھی خاصی حد تک دُور ہوگئی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر اپنا کام لے کر بیٹھ گیا۔ کشور امید کو اس کے کھلونوں کے ساتھ مصروف کر کے کچن سمیٹنے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ اُمید کو لے کر بیڈ روم میں آئی اور اسے سلاتے سلاتے خود بھی نیند کی وادی میں اُتر گئی۔ اپارٹمنٹ میں چونکہ ایک ہی کمرہ تھا، اس لیے آفتاب کو بیڈ روم میں ہی اپنا کام کرنا پڑتا تھا۔ کشور اور امید کے سو جانے پر اس نے لائٹیں بند کر دیں اور خود ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرنے لگا۔ کام مکمل ہو گیا تو اس نے فوراً ہی انٹرنیٹ کی مدد سے اسے پاکستان میل کر دیا۔ یہ سارا کام کرتے ہوئے وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی معمولی سی آواز پیدا ہو کر کشور اور امید کی نیند میں خلل ڈالنے کا سبب نہ بنے۔

احتیاط کے پیشِ نظر اس نے اپنا موبائل بھی سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خود بھی سونے کے ارادے سے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی جس کی اسکرین روشن تھی اور کال آنے کا اشارہ مل رہا تھا۔ اس نے اتنی رات گئے کسی کے کال کرنے پر حیرت محسوس کرتے ہوئے موبائل اُٹھا لیا۔

اسکرین پر لارا کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ چونک گیا۔ لارا کبھی بھی اسے اتنی رات کو فون نہیں کرتی تھی اور فون کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہے۔

''ہیلو لارا! ..... خیریت تو ہے؟..... تم نے اتنی رات گئے کیوں کال کی ہے؟'' لارا کی طرف سے تشویش میں مبتلا اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کہاں تھے تم؟ ..... میں کتنی دیر سے کال کر رہی تھی۔ تم شدید خطرے میں ہو۔ دو افراد تمہارے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور معلوم نہیں کیا کر رہے ہیں۔'' لارا نے چیخنے والے لہجے میں اس سے کہا تو وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا۔

فوراً ہی اُس کی نظر ایک نیلگوں دھوئیں پر گئی جو کی ہول کے ذریعے آہستہ آہستہ اندر داخل ہو کر اپارٹمنٹ میں پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ دھواں کسی بے ہوش کر دینے والی دوا پر مشتمل تھا یا کسی زہریلی گیس کی مدد سے انہیں ہمیشہ کی نیند سلانے کا انتظام کیا جا رہا تھا، وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکاسی کا واحد راستہ وہی دروازہ ہے جس سے اندر دھواں پھینکا جا رہا تھا اور دوسری طرف یقیناً کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو کسی صورت انہیں باہر نہیں نکلنے دیتے۔ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ لیکن کوئی ترکیب سجھائی نہیں دی۔ اُلٹا پریشانی میں اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ موبائل فون اب تک اس کے کان سے لگا ہوا ہے اور دوسری طرف لارا ہنوز موجود ہے۔

موبائل کان سے لگائے وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں کی ہول سے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتی دھوئیں کی پتلی سی لکیر کو دیکھ رہا تھا جو یقینی طور پر انہیں ضرر پہنچانے کے لیے ہی تھی۔ اگر یہ دھواں فلیٹ میں بھر جاتا تو اندر موجود سب کی زندگی کے لالے پڑ جاتے۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس مہلک دھوئیں سے خود کو اور اپنی بیوی، بچی کو بچانے کے لیے وہ باہر کیسے نکلے۔ اپارٹمنٹ کے خارجی دروازے پر تو وہ لوگ موجود تھے جو اس دھوئیں کو اندر داخل کر رہے تھے اور اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کے باہر نکلنے کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔

''آفتاب! تم کیا کر رہے ہو؟..... جلدی کرو۔ اُمید اور کشور کو لے کر بالکنی میں پہنچو۔ وہاں سے تم لوگ



میری بالکنی میں آ سکتے ہو۔''

بے خیالی میں کان سے لگے فون پر اس نے لارا کی چیختی ہوئی تیز آواز سنی تو ہوش میں آیا اور تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

اُمید اور کشور ابھی تک حالات سے بے خبر گہری نیند میں تھے۔ اس نے کشور کا بازو تھام کر زور سے ہلایا تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

''کک..... کیا ہوا؟''

''جلدی سے بالکنی میں چلو۔ باہر خطرہ ہے۔'' اس نے سوئی ہوئی اُمید کو گود میں اٹھاتے ہوئے کشور سے کہا تو اس کے سارے حواس ایک دم بیدار ہو گئے۔ مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں چودھری سے ہونے والے ٹکراؤ کے بعد سے اس کے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ اس کا ضدی اور انا پرست باپ اسے یہاں بھی سکون سے نہیں رہنے دے گا اور اس کا یہ خدشہ مختصر مدت میں سچ بن کر سامنے آ گیا تھا۔

سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے آفتاب کے پیچھے بالکنی کا رخ کیا۔ لارا اور ان کے اپارٹمنٹ کی بالکونیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ درمیان میں دیوار موجود تھی۔ دیوار کے اُس طرف موجود لارا اپنی بالکنی پر جھکی اس طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آفتاب نے اُمید کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس طرف لٹکایا کہ لارا اُسے پکڑ سکے۔ لارا کو اُمید کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے میں ایک لمحہ ہی لگا ہوگا لیکن اُس ایک لمحے میں کشور کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ خدانخواستہ اگر لارا سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہو جاتی اور وہ اُمید کو پکڑنے میں ناکام رہتی تو وہ معصوم بچی کئی منزل نیچے پختہ سڑک پر جا گرتی اور اس صورت میں اس کا کیا حشر ہوتا۔ بہرحال خیر گزری اور بچی بخیر و عافیت دوسری طرف پہنچ گئی۔

اس کے بعد آفتاب اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے چند فٹ اونچی بالکنی کی دیوار پر چڑھنے میں مدد دینے لگا۔ دوسری طرف لارا اُس کی مدد کے لیے تیار تھی۔ اس نے اُمید کو نیچے فرش پر بٹھا دیا تھا جس کے زار و قطار رونے کی آواز کشور کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ نرم گرم بستر سے نکالے جانے اور اپنے اپارٹمنٹ سے دوسرے اپارٹمنٹ میں منتقلی کی کارروائی سے وہ بیدار ہو چکی تھی۔

آفتاب کے ہاتھ کا سہارا لیے بالکنی کی دیوار پر کھڑی کشور نے لارا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنے سے قبل یونہی ایک نظر نیچے کی طرف ڈالی اور ڈگمگا کر رہ گئی۔ اگر اس کا پاؤں پھسل جاتا تو آج اور ابھی قصہ تمام ہو جاتا۔

''کم آن کشور!..... ہری اپ۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ تاکہ میں تمہیں سہارا دے سکوں۔'' لارا نے اسے پکارا لیکن نیچے گر جانے کا خوف اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکی۔

''ہمت کرو کشور! دیکھو اُمید رو رہی ہے۔ اوھر جا کر اسے چپ کرواؤ۔'' آفتاب نے اُس کی کیفیت بھانپ لی تھی چنانچہ ایسی بات کہی کہ وہ اپنے خوف کو پیچھے چھوڑ کر لارا کی بالکنی میں چھلانگ لگانے کے لیے آمادہ ہو سکے۔ واقعی اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ کشور نے نیچے، بہت نیچے موجود زمین سے نظریں ہٹائیں اور لارا کی بالکنی کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں لارا ہاتھ آگے بڑھائے اس کی منتظر تھی جبکہ اُمید کی وہ صرف آواز سن سکتی تھی۔ بالکنی کے فرش پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یک دم ہی اس کی مامتا تڑپ اُٹھی کہ وہ اپنی روتی ہوئی بیٹی کو اپنی بانہوں میں بھر کر چپ کروا سکے۔

اس خواہش نے ہر خوف کو پیچھے چھوڑ دیا اور اس نے اپنی بالکنی سے لارا کی بالکنی کی طرف پیش قدمی کی۔ اتنی بلندی سے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کا فاصلہ طے کرنا آسان نہیں تھا، وہ بھی ایک گھریلو عورت کے لئے۔ آفتاب کے سہارے کے باوجود وہ اس کوشش میں ڈگمگا سی گئی اور یوں لگا کہ ابھی نیچے جا گرے گی لیکن دوسری طرف موجود لارا نے فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ادھر آفتاب بھی اسے سہارا دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار وہ سنبھل گئی اور کسی نہ کسی طرح لارا کی بالکنی میں اُترنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کوشش میں وہ موسم کی خنکی کے باوجود پوری کی پوری پسینے میں بھیگ گئی تھی لیکن فی الحال اسے اپنی حالت کی فکر بھی نہیں تھی۔ بالکنی میں اُترتے ہی وہ فرش پر بیٹھ کر روتی اُمید کی طرف بڑھی جو اس بے وقت کی بے آرامی کے باعث گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ اس کے پیچھے آفتاب بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

''اندر چل کر بیٹھو۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔'' تینوں کے بخیریت نکل آنے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے لارا نے کہا تو وہ لوگ بالکنی سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔ لارا اور ان کا اپارٹمنٹ ایک جیسا تھا۔ بالکنی سے وہ پہلے اس کے بیڈ روم میں پہنچے اور پھر وہاں سے گزر کر لاؤنج میں آ گئے۔ لاؤنج میں پہنچنے کے بعد باہر سے سنائی دیتی آوازوں سے انہیں اندازہ ہوا کہ جس دوران وہ لوگ اپنی زندگیاں بچانے کی کوشش کر رہے تھے، نیویارک کی تیز رفتار پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔ ان آوازوں کو سن کر آفتاب نے بیٹھنے کے بجائے دروازے کی طرف پیش قدمی کی اور ڈور آئی سے جھانک کر باہر کا منظر دیکھنا چاہا۔ عین اسی وقت ڈور بیل بج اُٹھی۔ آفتاب کو ڈور آئی سے دوسری طرف کھڑا پولیس مین صاف نظر آ رہا تھا اس لیے اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے دروازہ کھول دیا۔

''مس لارا کلائیو؟'' اسے دیکھتے ہی پولیس والے نے استفسار کیا۔

''میں لارا کلائیو ہوں سر!'' لارا تیزی سے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اس مختصر مدت میں آفتاب دیکھ چکا تھا کہ کئی پولیس والے دو تنومند سیاہ پوشوں کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوئے تھے اور لفٹ تیزی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

''آپ کی کال پر ہم نے ایکشن لے کر مجرمین کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ آپ کے برابر والے اپارٹمنٹ میں ہماری ٹیم ریسکیو آپریشن کر رہی ہے جبکہ میں آپ کا بیان لینے یہاں آیا ہوں۔'' پولیس آفیسر نے مہذب لہجے میں اس سے کہا۔

''شیور آفیسر! آپ اندر آ جائیں۔'' لارا نے قانون سے تعاون کرنے والے ایک اچھے شہری کی طرح خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے اسے اندر آنے کی پیشکش کی۔

''یہ میرے پڑوسی مسٹر آفتاب، ان کی مسز اور بیٹی ہیں۔ انہیں خطرے میں دیکھ کر میں نے ان تینوں کو بالکنی کے راستے اپنی بالکنی میں اُتروا لیا تھا۔'' لاؤنج میں پہنچ کر اس نے تعارف کروایا تو پولیس آفیسر کی نظروں میں اس کے لیے تحسین اُتر آئی۔

''گڈ!..... آپ ایک ذہین خاتون ہیں۔'' اس نے فوراً ہی اس کی تعریف کی۔ جواباً لارا صرف دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی جبکہ پولیس آفیسر واکی ٹاکی کی مدد سے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے لگا کہ جن لوگوں کو ریسکیو کی جانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ حفاظت سے برابر کے اپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ اس کال سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارے ماہرین آپ کے اپارٹمنٹ کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ تیار کریں گے۔ اس دوران آپ



تینوں مجھے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیں۔ سب سے پہلے میں مس لارا کلائیو کا بیان لوں گا کیونکہ انہوں نے ہی پولیس کو کال کیا تھا۔''

''میں رات دیر تک جاگ کر مطالعہ کرنے کی عادی ہوں اس لیے ابھی تک جاگ رہی تھی۔'' لارا نے فوراً ہی اپنا بیان ریکارڈ کروانا شروع کر دیا۔

''ہماری اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا کیئر ٹیکر انتھونی بھی مطالعے کا بہت شوقین ہے اور چونکہ میں ایک لائبریری میں ملازمت کرتی ہوں، اس لیے کتابوں کے حصول کے لیے انتھونی اکثر مجھ سے رابطہ کرتا ہے۔ آج رات جب میں سونے کی تیاری کرنے لگی تو مجھے یاد آیا کہ انتھونی کے پاس لائبریری کی ایک کتاب موجود ہے اسے کل واپس کرنا ضروری ہے۔ میں نے سوچا کہ انٹرکام پر انتھونی سے رابطہ کر کے کہہ دوں کہ صبح آف کر کے جانے سے پہلے کتاب مجھے واپس کر جائے۔ لیکن میرے نمبر ملانے پر اس نے انٹرکام نہیں اٹھایا اور یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ انتھونی کے ساتھ ڈیوٹی پر ایک دوسرا سکیورٹی گارڈ رابرٹ بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر انتھونی کسی ضرورت کے تحت اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا تو رابرٹ کو انٹرکام اٹھانا چاہئے تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ ایک بار خود جا کر جائزہ لے لوں کہ واقعی گڑبڑ ہے یا دونوں گارڈز غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس خیال کے تحت میں باہر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچی تو مجھے لگا کہ باہر کوئی موجود ہے۔ میں نے ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے دو نقاب پوش اپنے پڑوسی مسٹر آفتاب کے دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے ایک جھک کر کی ہول پر کچھ کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اندر جا کر پولیس کو کال کی اور پھر مسٹر آفتاب کو ان کے موبائل پر کال کر کے خطرے سے آگاہ کیا۔ میرے مشورے پر ہی یہ لوگ بالکنی کے ذریعے میرے اپارٹمنٹ میں آ گئے اور ہم سب آپ کے سامنے ہیں۔'' بات کے اختتام پر لارا نے اس طرح شانے اچکائے جیسے اب اس کے پاس مزید بتانے کے لیے کچھ نہ ہو۔

''ویل مسٹر آفتاب! آپ بتائیں کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے آپ کو آپ کی فیملی کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی؟..... آپ جانتے ہیں کہ اگر مس کلائیو ہمیں کال نہ کرتیں تو آپ لوگ سونے کے دوران اس زہریلی گیس کا شکار ہو جاتے جو ان دونوں نے کی ہول کے راستے اچھی خاصی مقدار میں آپ کے اپارٹمنٹ میں داخل کر دی تھی اور اب فرار کی تیاری میں تھے۔''

لارا کا بیان مکمل ہو جانے کے بعد پولیس آفیسر نے رُوئے سخن آفتاب کی طرف کر لیا اور اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں آفیسر! میں نے تو ان میں سے کسی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔'' آفتاب نے خود کو مکمل انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''وہ دونوں کون تھے، یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ وہ دونوں سگے بھائی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھاری معاوضے پر کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ لیکن دونوں اتنے چالاک ہیں کہ جرم کر کے کبھی بھی اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ اور ظاہر ہے پولیس صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر انہیں گرفتار نہیں کر سکتی۔ موجودہ سچویشن میں آپ اور پولیس دونوں اس اعتبار سے خوش قسمت رہے کہ آپ ان کا شکار ہونے سے بچ گئے اور پولیس کو پہلی بار انہیں ثبوتوں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑنے کا موقع مل گیا اور اس کا سارا کریڈٹ ان خاتون کو جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف بروقت پولیس کو انفارم کیا بلکہ آپ کو آپ کے اپارٹمنٹ

سے نکالنے میں بھی مدد دی۔'' پولیس آفیسر نے ایک بار پھر لارا کو سراہا۔ پھر یک دم بہت زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ بتائیں، آپ کی کس سے اتنی شدید دشمنی ہے کہ اس نے بھاری معاوضہ دے کر خطرناک کرائے کے قاتلوں کے ذریعے آپ کو قتل کروانے کی کوشش کی؟

آفتاب اس بار خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس کا ایک ہی جانی دشمن ہے لیکن وہ شخص اس کی عزیز بیوی کا باپ تھا اور وہ اس کے خلاف پولیس کو مطلع کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔

''ہمارا دشمن میرا سگا باپ ہے آفیسر!'' بالکل اچانک ہی خاموش بیٹھی کشور نے اپنے لب کھولے اور آفتاب کو مشکل سے نکال دیا۔ پولیس آفیسر فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مکمل تفصیلات حاصل کر چکا تھا، مع اس معلومات کے کہ کشور کا باپ چودھری افتخار عالم شاہ ان دنوں نیویارک میں ہی اپنے بیٹے مراد شاہ کے ساتھ مقیم ہے۔ ساری تفصیلات حاصل کرنے کے بعد پولیس آفیسر ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چند ہدایات دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''امید کو آرام سے کاؤچ پر لٹا دو۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔'' پولیس آفیسر کے جانے کے بعد لارا نے کشور سے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس ساری کارروائی کے دوران اُمید ماں کی بانہوں کی گرمی پا کر ایک بار پھر سو چکی تھی۔ اس معصوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا میں آنے سے قبل ہی وہ ایک ایسی دشمنی کے چکر میں پھنس گئی ہے جس کے باعث اس کی جان کو ہر دم خطرہ لگا رہتا ہے اور وہ ہر بار محض اپنی خوش قسمتی کی بنیاد پر بچ جاتی ہے۔

آپ نے پولیس آفیسر کے سامنے چودھری صاحب کا نام لے کر بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ وہ آپ کے والد ہیں، اگر وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو آپ کو یقیناً اچھا محسوس نہیں ہوگا۔''

تنہائی میسر آتے ہی آفتاب نے اس سے کہا۔ وہ جو اُمید کو کاؤچ پر لٹا کر خود اس کے قریب ہی بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی، ایک پل کے لیے ساکت ہو گئی پھر اسی زاویے پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ابا جی جیسے بھی ہیں، میرے دل میں ان کے لیے ایک فطری محبت موجود ہے۔ اگر معاملہ صرف میری زندگی کا ہوتا تو میں کبھی بھی پولیس آفیسر کے سامنے ان کا نام نہیں لیتی لیکن آپ کی اور اُمید کی زندگی کی قیمت پر میں کسی صورت میں ایک بیٹی کی حیثیت سے ان سے محبت نہیں نبھا سکتی۔ ان کے اتنے حملوں کے بعد اب انہیں بھی تھوڑی پریشانی میں مبتلا کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر وہ ایک باپ کی شفقت سے کام لیتے تو کبھی بھی اس حد تک نوبت نہیں آتی کہ مجھے انتخاب کی اس مشکل سے گزرنا پڑتا کہ اپنے انتہائی قریبی رشتوں میں سے کس کو بچانے کی کوشش کروں۔''

اس کی آواز دُکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے آفتاب افسردہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کشور کو اپنی بانہوں میں بھر لے لیکن لارا کی متوقع آمد کے باعث یہ بھی نہ کر سکا۔ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں رہنے کے باوجود وہ اپنی مشرقی روایات کی پاسداری کی کوشش کرتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ کشور کی شرم و حیا اس آزادی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اپنے اپارٹمنٹ کی تنہائی میسر آنے میں ابھی کچھ تاخیر تھی۔ کیونکہ پولیس آفیسر جاتے جاتے انہیں انفارم کر گیا تھا کہ ماہرین کو شواہد اکٹھا کرنے اور اپارٹمنٹ کو گیس کے اثرات سے پاک کرنے کے لیے کچھ مہلت درکار ہے۔ اس عرصے کے لیے لارا نے بخوشی انہیں اپنے پاس رُکنے کی پیشکش کر دی تھی اور ایک اچھے میزبان کی طرح خاطر مدارات کے لیے بھی کمربستہ ہو گئی تھی۔



''میں نے انتھونی کو کال کر کے اس کی خیریت معلوم کی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ حملہ آوروں نے بالکل اچانک ہی ان کے کیبن میں گھس کر اسے اور رابرٹ کو بے بس کر دینے کے ساتھ ساتھ کسی ایسی دوا کا اسپرے کر دیا تھا کہ وہ دونوں فوراً ہی بے ہوش ہو گئے۔ کیونکہ پولیس والوں نے انہیں ہسپتال منتقل کر دیا تھا۔ وہاں انہیں ہوش میں لایا گیا۔ انتھونی نے امید ظاہر کی ہے کہ صبح تک اسے اور رابرٹ کو چھٹی دے دی جائے گی اور اس عرصے میں دو سارجنٹ ان کی جگہ ڈیوٹی پر موجود رہیں گے۔''

لارا ٹرے میں کافی کے تین مگ اور تلی ہوئی مونگ پھلیاں لے کر واپس لاؤنج میں آئی تو اس کے پاس ان کے لیے کچھ اور خبریں بھی موجود تھیں ورنہ پولیس آفیسر نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ سکیورٹی گارڈز کی موجودگی کے باوجود وہ دونوں کرائے کے قاتل اندر کیسے گھسے تھے۔ کافی کے ساتھ مونگ پھلیاں ٹونگتے ہوئے وہ تینوں اس واقعے کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔

اس گفتگو کے دوران پہلی بار آفتاب نے اسے اپنی اور کشور کی شادی کا قصہ بھی سنایا جسے سن کر وہ حیران ہوتی رہی کہ دنیا میں ایسے پسماندہ ممالک بھی ہیں جہاں شادی جیسا اہم اور ذاتی رشتہ جوڑنے کے لیے بھی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اور اگر کوئی کسی طرح اپنی مرضی کر گزرے تو بارسوخ والدین اس حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں جس کا مظاہرہ اس نے کچھ دیر قبل دیکھا تھا۔ آفتاب اور کشور نے بہت کوشش کی کہ اُس کے اس تاثر کو کم کر سکیں لیکن جو کچھ وہ عملی طور پر دیکھ چکی تھی، اس کے بعد زبانی صفائیوں پر یقین کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔

⊛----✪----⊛

سلّو کے ساتھ ساتھ ریاض انور کی نگرانی کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن دونوں ہی کی طرف سے کوئی غیر معمولی اطلاع موصول نہیں ہو رہی تھی۔ ریاض انور اپنی معمول کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھا جس میں زیادہ تر فلاحی نوعیت کی تھیں۔ اس نے کراچی کے ایک پسماندہ علاقے میں قائم کردہ اسکولوں کے لیے بڑی تعداد میں ضروری اشیاء فراہم کی تھیں اور جس دوران اس کے ملازمین بھرے ہوئے ٹرکوں سے سامان اُتارتے رہے تھے، وہ ایک غیر رسمی اور غیر اعلانیہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے عوام کو یہ یقین دلاتا رہا تھا کہ اس کے سینے میں ان کے اور ان کے بچوں کے لیے کتنا درد ہے۔

مسجدوں سے کیے گئے اعلان کے نتیجے میں جمع کیے گئے علاقہ مکین کھلے میدان میں کھڑے دلجمعی سے اس کی یہ تقریر سن رہے تھے۔ تقریر کے دوران ریاض انور کے ایک گارڈ نے اس کے سر پر چھتری تان کر اسے دھوپ سے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر اس گارڈ کو چھتری سمیت پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر تم میرے سامنے کھڑے تمام افراد کو چھتریاں مہیا کر سکتے ہو تو تب تو ٹھیک ہے لیکن میں اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتا کہ میرے بھائی میرے سامنے دھوپ میں کھڑے ہوں اور میں اکیلا اپنے لیے سائے کا بندوبست کر لوں۔ لوگ اُس کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور دیر تک تالیاں پیٹ کر اسے سراہتے رہے تھے۔

دوسری طرف سلّو نے دوبارہ ریاض انور سے رابطہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ کسی سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بالکل کسی عام فرد کی طرح جو برسوں بعد اپنے خاندان سے ملتا ہے، ان لوگوں میں مگن ہو گیا تھا۔ اس کے والدین نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس کی چچا زاد سے جو کہ اُس کی بچپن کی منگ تھی، باقاعدہ اُس کی منگنی کریں گے۔ اس منگنی کے بہانے وہ سلّو کی واپسی کا جشن منانا چاہ رہے تھے۔ غریبوں کی

دنیا میں منائے جانے والے اس سادہ سے جشن میں ایک بار پھر اس رپورٹر کو پہنچا دیا گیا تھا جس سے سلّو کی آمد پر اس سے انٹرویو کیا تھا۔ اس رپورٹ میں سلّو کی کم عمر اور خوب صورت منگیتر کو بھی دکھایا گیا تھا۔ اپنے طبقے کی دُلہنوں کی طرح عام سی تیاری کے باوجود وہ نوخیز لڑکی بہت حسین لگ رہی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ خود سلّو بھی اس کے ساتھ خاصا جچ رہا تھا۔ نیوز چینل پر اس منگنی کے متعلق مختصر سی رپورٹ ختم ہوتے ہی ایک بریکنگ نیوز نشر کی جانے لگی۔

یہ خبر شہر کے اسی پسماندہ علاقے سے متعلق تھی جہاں دن میں ریاض انور نے اسکولوں کے لیے امدادی سامان پہنچانے کے علاوہ خود موقع پر پہنچ کر تقریر بھی کی تھی۔ خبر کے مطابق علاقے میں زبردست فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور حملہ آوروں نے اس راستے کو مکمل طور پر بلاک کر دیا تھا جس کے ذریعے علاقے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ شر پسندوں کے خلاف کارروائی کے لیے جانے والی پولیس ٹیم کی ایک جیپ کو راکٹ لانچر کی مدد سے اُڑا دیا گیا تھا جبکہ دوسری جیپ پر ہینڈ گرنیڈ سے حملہ ہوا تھا۔ ان دو مہلک اور جان لیوا حملوں کے بعد پولیس والے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے تھے اور دُور دُور سے ہی فائرنگ کرتے رہے تھے۔ ان کی فائرنگ سے حملہ آوروں کا کچھ بھی نہیں بگڑنے والا تھا۔ بلکہ وہ ہر برسٹ کا جواب دُگنی قوت سے دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے پاس اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے بے دریغ استعمال کرتے ہوئے انہیں اس کے ختم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

اس خبر نے شہریار کو بے پناہ مضطرب کر دیا تھا۔ سلّو کی آمد کے ساتھ ہی اس ہنگامے کا آغاز ہو گیا تھا جس کی توقع کی جا رہی تھی لیکن ظاہری طور پر سلّو اس سے بالکل الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ اس کارروائی سے اس کا جو واحد تعلق جوڑا جا سکتا تھا، وہ رات گئے ریاض انور سے کی جانے والی ملاقات تھی۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جس علاقے میں ریاض نے صبح تقریر کی تھی، اس وقت وہ گولیوں اور دستی بموں کی زوردار آوازوں سے گونج رہا تھا۔

''صبح ریاض انور نے اسکولوں کے لیے جو سامان بھجوایا تھا، یقیناً اسی سامان کی آڑ میں اسلحہ اور دہشت گرد علاقے میں داخل کیے گئے ہیں۔'' جاوید علی نے خبر سن کر فوری تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''یقیناً یہی بات ہے۔ بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس علاقے میں ریاض انور کا جتنا عمل دخل ہے، اس نے لازماً وہاں کوئی ایسا ٹھکانہ بنا رکھا ہوگا جہاں اسلحہ وغیرہ ذخیرہ کیا جا سکے۔ کیونکہ یہ جتنی شدت کی کارروائی ہے اس کے لیے صرف دو تین گاڑیوں میں دوسرے سامان کی آڑ میں چھپا کر لے جایا گیا اسلحہ کافی نہیں ہو سکتا۔'' جاوید علی کی بات سن کر اس نے اپنا اندازہ بھی بیان کیا۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ریاض انور اور سلّو دونوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے ان کے جسموں کو گولیوں سے چھید ڈالے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ خون کی ہولی شروع کروانے والے ان دونوں مجرموں کے خلاف ان کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ دوسری طرف نیوز چینل پر مسلسل اس واقعے کے بارے میں خبریں دی جا رہی تھیں۔ ان خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ علاقے میں بجلی کی سپلائی معطل ہو گئی ہے جبکہ فون کی لینڈ لائن بھی کام نہیں کر رہیں۔ کئی علاقہ مکینوں نے موبائل فونز کی مدد سے نیوز چینلز سے رابطہ کر کے بتایا تھا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔

چنگاریوں کی طرح اُڑتی گولیاں ان کے گھروں میں آ کر گر رہی تھیں اور لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو جانے کے باوجود ان گولیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ لیکن صورتِ حال ایسی تھی کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ ساتھ ایمبولینس اور امدادی ٹیموں کا بھی علاقے تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ علاقے



کو جانے والی سڑک پر جمع ہونے والے مختلف چینلز کے نمائندے بھی ایک خاص فاصلے تک محدود رہنے پر مجبور تھے اور لائیو کوریج میں صرف چلنے والی گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں سناتے ہوئے ہیجانی لہجوں میں عوام کو صورتِ حالات سے باخبر کر رہے تھے۔

''انہوں نے تو تباہی مچا کر رکھ دی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ دشمن ملک کی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔'' ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے جاوید علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کو سب کچھ نہیں سمجھو۔ اصل فساد تو اس کے بعد کھڑا ہوگا۔ جس علاقے میں یہ سب ہو رہا ہے، وہاں ایک مخصوص قوم کے افراد زیادہ تعداد میں آباد ہیں اور ان کی ایک دوسری قوم سے رنجش چل رہی ہے۔ اب وہ اس حملے کا الزام اس دوسری قوم پر لگائیں گے اور شہر بھر میں لسانی فسادات پھوٹ پڑیں گے۔'' شہریار کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔ وہ سلّو کو کنٹرول میں کرنے کے لیے میدان میں اُترا تھا لیکن پہلے ہی مرحلے میں اس نے اپنی برتری واضح کر دی تھی۔ وہ صحیح طور پر ان کی نظروں میں بھی نہیں آیا تھا اور اتنا بڑا اپ سیٹ کر ڈالا تھا۔

''اگر پولیس کو ہائی الرٹ کر دیا جائے تو صورتِ حال کو سنبھالا جا سکتا ہے۔'' جاوید علی نے امید ظاہر کی۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہماری پولیس اتنی اہل نہیں ہے کہ جرم کو پہلے سے روکنے کے لیے اقدامات کر سکے۔ ویسے بھی ہم انہیں یہ ذمے داری نہیں سونپ سکتے۔ ہماری حدود مقرر ہیں اور ہمیں ان حدود میں رہ کر ہی اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہتے شہریوں کا خون بہتا ہوا بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔'' جاوید علی جھنجلایا۔

''ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ برسوں بعد والدین کے پاس لوٹنے والے سلّو کو یک دم موت کے گھاٹ اُتار دینے میں مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے میرے دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر ہم کسی طرح اس عفریت کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے تو دشمن کا ہتھیار خود اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، ورنہ کسی کی کھوپڑی میں دو چھٹانک سیسہ اُتارنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ بھی اسی کے انداز میں سوچنے والا بندہ ہے۔ وہ خود بھی تو سلّو کے مارنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ صرف سلّو کے والدین کو دکھ سے بچانے کے لیے کتنی انسانی جانیں قربان کی جاتیں۔ اس کی لگائی گئی آگ میں جلنے والے بھی تو کسی نہ کسی گھر کے چشم و چراغ تھے جن کے والدین کا دکھ بھی ناقابلِ برداشت تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! واقعی سلّو کو مارنا کوئی مشکل بات نہیں ہے لیکن اسے کھلا چھوڑنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اسے یہاں ریاض انور جیسے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں سلّو سے زیادہ ریاض کا ہاتھ ہے، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سلّو یہاں آتے ہی اتنی بڑی کارروائی کر گزرتا۔ یہاں آ کر اپنا سیٹ اپ بنانے میں اسے کچھ وقت تو لگنا چاہئے تھا۔''

''سیٹ اپ بنانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے اداروں کی نااہلی کی وجہ سے یہاں ''را'' کا بنا بنایا سیٹ اپ موجود ہے۔ ریاض انور اور سلّو جیسے مہروں کو اس بنے بنائے سیٹ اپ میں استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے جاوید علی کی بات کا جواب دیا پھر

اپنے موبائل سیٹ پر مصروف ہوگیا۔

''بہت سختی اور ہوشیاری سے اس کی نگرانی کرو۔ چاہو تو اپنی نفری بڑھا لو۔ لیکن اسے کسی صورت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔'' جاوید علی جانتا تھا کہ وہ یہ ہدایات سلّو کی نگرانی کرنے والوں میں سے کسی کو دے رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی ہی کوئی ہدایت وہ ریاض انور کے سلسلے میں بھی دے گا لیکن خلافِ توقع اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

''اور ریاض انور.....؟'' آخر کار جاوید علی سے رہا نہیں گیا اور اس نے استفسار کیا۔

''ریاض انور اور سلّو کو ایک طرح سے ڈیل نہیں کیا جا سکتا۔ سلّو کو فیلڈ میں کام کرنے کے لیے ٹرینڈ کیا گیا ہے اس لیے اسے براہِ راست نگرانی کر کے پکڑا جا سکتا ہے۔ ریاض انور اس کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔ اس کے لیے مختلف حکمتِ عملی اختیار کرنی ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنا کوئی آدمی اس کی صفوں میں داخل کر دوں تاکہ وہ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف شواہد بھی جمع کر سکے۔'' اس نے جاوید علی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا جس سے اس نے بھی اتفاق کیا۔

پھر وہ دونوں ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے جہاں خدشات کے عین مطابق شہر کے مختلف حصوں میں بھڑک اُٹھنے والے ہنگاموں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف سیاست دانوں کی طرف سے بیانات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ قوم کے نام نہاد ہمدرد اپنے اپنے انداز میں حکومت سے حالات کنٹرول میں کرنے کی اپیلیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں ریاض انور بھی شامل تھا جس نے بڑے پُر درد لہجے میں اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ لسانی تفریق کی بنیاد پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا بند کر دیں اور صرف اور صرف پاکستانی بن کر سوچیں۔

⊛----✪----⊛

''آپ کا شک غلط نہیں تھا۔ پکڑے جانے والے ملزمان نے اعترافِ جرم کر لیا ہے۔ انہیں آپ کو آپ کی فیملی سمیت قتل کرنے کا کام آپ کے والد نے ہی سونپا تھا اور اس کے بدلے خطیر رقم ادا کی تھی۔ اگر اتفاق سے مس لارا کو سکیورٹی گارڈ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تو قاتل اپنا کام پورا کر ڈالتے۔ ہمارے ماہرین نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اس کے مطابق آلۂ قتل کے طور پر جس گیس کو استعمال کیا جا رہا تھا، وہ نہایت زہریلی ہے اور سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہونے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ آپ خوش قسمت تھے کہ اس مہلک گیس کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ میری طرف سے آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔''

وہ دونوں میاں بیوی اس وقت اپنے اپارٹمنٹ کے قریبی پولیس اسٹیشن میں موجود تھے جہاں انہیں فون کر کے بلایا گیا تھا اور اب وہ اسی آفیسر کے روبرو تھے، جس نے لارا کے اپارٹمنٹ میں ان تینوں کے بیانات لیے تھے۔ وہ اس کیس کا تفتیشی آفیسر تھا اور اپنی تفتیش کے بعد اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں انہیں قتل کرنے کی سازش کرنے والا کوئی اور نہیں، کشور کا سگا باپ چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔

''پھر آپ نے اس اصل مجرم کے خلاف کیا کارروائی کی؟'' کشور نے سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ آفیسر سے سوال کیا۔ نیویارک میں قیام کے دوران اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کو خاصا رواں کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ کافی ذہین لڑکی ہے جسے حویلی کی چار دیواری میں محدود رکھنے کے بجائے اگر حصولِ تعلیم



کے لیے باہر نکلنے کا موقع دیا جاتا تو وہ تعلیم کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتی۔

''افسوس کہ ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکے۔ وہ واردات سے کئی گھنٹے پہلے نیویارک سے نکل چکا تھا۔ ریکارڈ کے مطابق اس وقت وہ دبئی میں موجود ہے اور ظاہر ہے وہاں سے ہم اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔'' خوش اخلاقی سے پولیس آفیسر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے صاف گوئی سے جواب دیا۔ پولیس والا ہونے کے باوجود اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ پاکستان کے بجائے نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ کا حصہ تھا ورنہ ہماری پولیس کا جو طریقِ کار ہے، اس میں مجرم سے زیادہ مدعی کی درگت بن جاتی ہے اور وہ خود کو پولیس کے چکر میں پھنسانے کے بجائے انصاف کے حصول کے بغیر خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جانے کو اپنے حق میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

''لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے ہیں۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ آپ کے بھائی مراد شاہ کی نگرانی کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس طریقے سے اس کیس میں کوئی پیش رفت ہو سکے۔'' اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پولیس آفیسر نے انہیں بتایا۔

''میرے بھائی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔'' کشور نے فوراً مراد شاہ کی صفائی پیش کی۔

''ہم پولیس والوں کی تربیت میں شامل ہے کہ ہم ہر شخص پر شک کرتے ہیں۔ آپ نے جو حالات بیان کیے تھے، ان کے مطابق ایک خیال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ آپ کا بھائی بظاہر انجان بن کر آپ کے والد کی معاونت کر رہا ہو اور اسی نے پہلے جان بوجھ کر اپنے گھر میں آپ لوگوں کا سامنا کروایا ہو اور پھر آپ کا ایڈریس بھی آپ کے والد کو فراہم کر دیا ہو۔ اس طریقِ کار سے انہیں ایک فائدہ یہ حاصل رہے گا کہ ناکامی کی صورت میں اپنے بھائی سے رابطے میں ہونے کے باعث آپ لوگ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکیں گے اور انہیں دوبارہ حملہ کرنے میں آسانی رہے گی۔'' پولیس آفیسر نے ایک خوفناک خیال پیش کیا جسے سن کر کشور دہل گئی۔

''میں یقین نہیں کر سکتی کہ مراد بھائی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔'' وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑائی۔

''ہو سکتا ہے آپ کا یقین صحیح ہو لیکن ہم تو اپنے طریقِ کار کے مطابق ہی کام کریں گے۔ اس طرح کچھ نہیں تو اتنا فائدہ تو ہوگا کہ ہم آپ کے والد کی دوبارہ نیویارک میں آمد سے باخبر ہو سکیں گے۔'' پولیس آفیسر نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

''بہرحال فی الحال آپ لوگ محفوظ ہیں اور آرام سے اپنے اپارٹمنٹ میں رہ سکتے ہیں۔ کسی مسئلے کی صورت میں فوراً ہم سے رجوع کیجیے گا، ہم ہر ممکن طور پر آپ کی مدد کریں گے۔'' پولیس آفیسر کے یہ جملے اس بات کا اشارہ تھے کہ اس نے انہیں جس مقصد کے تحت بلایا تھا، وہ پورا ہو چکا ہے چنانچہ اب وہ وہاں سے جا سکتے ہیں۔

''تھینک یو آفیسر!'' آفتاب فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''آپ کا تعاون اور اچھا رویہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔''

پولیس آفیسر اُس کی بات کے جواب میں محض ذرا سا مسکرایا اور اس کا بڑھایا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''اگر شہری خود پولیس سے تعاون کریں تو پولیس زیادہ بہتر طریقے سے ان کی مدد اور حفاظت کر سکتی ہے۔ آپ ہوشیار رہیے گا۔ بے شک اصل شخص فرار ہو گیا ہے لیکن وہ دُور رہ کر بھی کرائے کے کسی قاتل کو

دوبارہ ہائر کرسکتا ہے۔'' پولیس آفیسر نے انہیں متنبہ کیا۔

''جو لوگ پکڑے گئے ہیں، ان کا کیا ہوا؟'' آفتاب کے ساتھ ہی کشور نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی اور اب وہ لوگ کھڑے کھڑے ہی پولیس آفیسر سے بات کر رہے تھے۔ پولیس آفیسر نے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''وہ ہماری کسٹڈی میں ہیں۔ ان سے قانون کے مطابق نمٹا جائے گا۔ ان پر صرف آپ کے اپارٹمنٹ پر حملہ کرنے کا الزام نہیں ہے بلکہ ہمیں ان سے ان کے تمام اگلے پچھلے کارنامے اُگلوانے ہیں۔ اس کے بعد ہی عدالت ان کے لیے کسی مناسب سزا کا فیصلہ سنا سکے گی۔''

پولیس آفیسر نے جواب دیا اور اپنے سامنے رکھی ایک فائل کھول کر اس میں مصروف ہو گیا۔ یعنی اب اس کے پاس کسی سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ کشور اور آفتاب وہاں سے باہر نکل آئے۔

''کیا واقعی مراد بھائی، اباجی سے ساز باز کر سکتے ہیں؟'' باہر آ کر کشور نے اُلجھے ہوئے انداز میں آفتاب سے استفسار کیا۔

''بظاہر تو وہ ایسے نہیں لگتے لیکن کسی بھی انسان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے بھی بعض لوگ زہر کے بجائے مٹھاس سے مارنے کے قائل ہوتے ہیں۔ کیا معلوم تمہارے بھائی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہو۔'' آفتاب نے محتاط الفاظ میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''لیکن مراد بھائی ایسے نہیں ہیں۔ مجھ سے تو وہ سب بہنوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ میرے خلاف اتنی بڑی سازش کریں۔'' کشور اب بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

''میں خود بھی اس سلسلے میں آپ پر زور نہیں دینا چاہتا۔ لیکن بعض معاملات ایسے ہیں جنہوں نے مراد بھائی کو مشکوک بنا دیا ہے۔ اگر ہم ان کے اپارٹمنٹ میں چودھری صاحب سے ہونے والے ٹکراؤ کو اتفاق تسلیم کر لیں، تب بھی یہ اُلجھن اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ چودھری صاحب کو ہمارے اس اپارٹمنٹ کا پتہ کس طرح چلا جہاں ہم رہ رہے ہیں۔ حقائق کیا ہیں، یہ تو وقت کے ساتھ سامنے آ جائیں گے لیکن فی الحال ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے نرمی سے کشور کو سمجھایا تو وہ قائل ہونے والے انداز میں سر ہلانے لگی پھر شکوہ کرنے والے انداز میں بولی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اباجی ہمیں دیکھ کر نچلے نہیں بیٹھیں گے اور وہی ہوا۔ جانے انہوں نے کیسے ہمارا پتہ حاصل کیا اور کرائے کے قاتلوں کو دوڑا دیا۔ خود وہ مزے سے دبئی جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن مجھے آفیسر کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہم پر دوبارہ حملہ ضرور کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ایک بار پھر اپنی موجودہ جگہ سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں اور مراد بھائی کو بھی اس جگہ سے آگاہ نہ کریں۔'' وہ دونوں کیب میں بیٹھ چکے تھے اور ڈرائیور کے نقش و نگار سے اس کی قومیت کا اندازہ لگانے کے بعد اطمینان سے اُردو میں بات چیت کر رہے تھے۔

''میرے دل میں بھی یہ خیال تھا لیکن صرف اس لیے زبان پر نہیں لایا کہ بار بار کی نقل مکانی آپ کے لیے ذہنی اُلجھن کا باعث بنتی ہے۔''

''کوئی بات انسان کو کتنی ہی ناگوار گزرے لیکن وہ اپنے نصیب سے تو نہیں بھاگ سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ہمارے نصیب میں یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی لکھ دی گئی ہے۔ آپ بتائیں، آپ کے ذہن میں نیویارک سے نکل کر کہاں جانے کا خیال ہے؟'' کشور نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔



''میں جب یہاں آ رہا تھا تو شہریار صاحب نے مجھ سے اپنے ایک دوست مصطفیٰ خان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا ایڈریس دیا تھا۔ مصطفیٰ خان آرلینڈو میں رہتا ہے۔ بڑی پُرسکون اور قدرتی نظاروں سے مالا مال جگہ ہے۔ لیکن میں نے صرف اس خیال سے رہائش کے لیے نیویارک کا انتخاب کیا تھا کہ گنجان آبادی والے بڑے شہروں میں خود کو گم کر لینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب قسمت ہی گرداب میں پھنسی ہو تو تدبیریں اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں۔'' موجودہ صورتِ حال نے اسے بھی تھوڑا سا اُداس کر دیا تھا۔ گزشتہ رات ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ساری بھاگ دوڑ بے کار گئی اور اتنی دور آنے کے بعد بھی وہ اور اس کی فیملی پاکستان ہی کی طرح غیر محفوظ ہیں۔

''اُداس نہ ہوں۔ قسمت گرداب میں پھنسی ضرور ہے لیکن ہم خوش قسمت بھی ہیں کہ ہر بار ہی بچ نکلتے ہیں۔'' اُسے اُداس ہوتا دیکھ کر کشور فوراً ہی دل جوئی کے لیے آگے بڑھی اور اس کے شانے پر اپنا گداز ہاتھ رکھتے ہوئے حالات کا روشن پہلو دکھایا۔

''میں اپنی ذات کے لیے اُداس یا پریشان نہیں ہوتا۔ لیکن تمہاری اور اُمید کی زندگی ڈسٹرب ہوتی ہے تو میں شدید تکلیف محسوس کرتا ہوں۔''

''ہمارے لیے سب سے اہم بات آپ کا ساتھ ہے۔ آپ کا ساتھ ہو تو ہم دنیا کے کسی بھی خطے میں خوشی سے رہ سکتے ہیں۔'' کشور نے اپنی گود میں موجود اُمید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ اُمید کو وہ گھر پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے اپنے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن لے کر گئے تھے۔ وہ خاصی پُرامن بچی تھی جو عموماً تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اُنہیں پریشان نہیں کیا تھا اور وہ نہایت سکون سے واپس آ گئے تھے۔ کیب کو فارغ کرنے کے بعد وہ لفٹ کی مدد سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچے تو اُمید کشور کے شانے سے لگ کر سو چکی تھی۔

آفتاب نے چابی کی مدد سے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ان کا بڑی چاہت اور ارمانوں سے سجایا گیا آشیانہ موجود تھا۔ ان دونوں ہی کے دل سے ایک ہوک سی اُٹھی۔ ہجرتی پرندوں کے مانند وہ ایک بار پھر اپنے اس چھوٹے سے آشیانے کو چھوڑ کر اُڑنے پر مجبور تھے۔

⊛----✪----⊛

''یہ کیا تماشا ہے چودھری! تمہارے ذاتی مسائل کسی دن ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دیں گے۔ تم نے کیا سوچ کر نیویارک میں اپنے داماد اور بیٹی کو قتل کروانے کا سوچا؟ نیویارک کوئی تمہارا گاؤں نہیں ہے جہاں تمہارے کارندے دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہوتا۔ مبارک ہو کہ تمہارے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتل نہ صرف ناکام ہو گئے ہیں بلکہ پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بعد انہوں نے ان کے سامنے تمہارا نام بھی لے دیا ہے۔''

اپنے خصوصی فون پر موصول ہونے والی الفا کی کال نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لِنڈا کی طرف سے ٹپ ملنے پر وہ ایک بار ہی ان دونوں قاتل بھائیوں سے ملا تھا اور مکمل پیشگی معاوضہ دے کر معاملات طے کر لیے تھے۔ ان دونوں کا ریکارڈ اس قسم کے معاملات میں بہت شاندار تھا اس لیے چودھری مطمئن تھا کہ اس بار تو اس کے انتقام کی آگ ضرور ہی کشور اور آفتاب کو جلا کر خاک کر دے گی۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے دونوں بھائیوں کے حرکت میں آنے سے کئی گھنٹے قبل نیویارک چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے دبئی روانہ ہو گیا تھا۔ دبئی پہنچ

کر اس نے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کیا تھا اور ساتھ ہی اپنی کامیابی کا جشن منانے کے لیے عمدہ قسم کی شراب کے ساتھ ایک طرح دار کال گرل کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔

مقررہ وقت پر وہ دونوں بھائیوں کی طرف سے دیے گئے ایک ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کرتا تو اس بات کی تصدیق کر دی جاتی کہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ لیکن مقررہ وقت پر تو کیا، بعد میں بھی کئی گھنٹوں تک کوشش کرنے کے باوجود کسی نے اس کی کال ریسیو نہیں کی اور وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں دوسری طرف بجتی گھنٹیوں کی آوازیں سنتا رہا۔

کال ریسیو نہ کیے جانے پر قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ ان دونوں کرائے کے قاتلوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور پیشگی ملنے والی خطیر رقم لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن اب الفا کے فون نے اُس کی یہ غلط فہمی دُور کر دی تھی۔ حقیقتاً اُس کے ساتھ ایڈوانس کی رقم ڈوب جانے سے بھی زیادہ برا ہوا تھا۔ رقم وہ دوبارہ کما سکتا تھا لیکن نیویارک پولیس کے ریکارڈ پر ایک بار اپنا نام آ جانے کے بعد جان چھڑانی مشکل تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے بعد اب اگر اس نے نیویارک جانے کی کوشش کی تو اس کے لیے یہ بات خطرناک ہو سکتی ہے۔

''سوری سر! میں نے اس کام کے لیے بہت تربیت یافتہ لوگوں کی مدد لی تھی اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں ناکام رہیں گے۔''

''ہر کام میں ناکامی کا امکان ہوتا ہے لیکن تم نے اس امکان کو اپنے ذہن میں ہی نہیں رکھا۔ یہ تو شکر کرو کہ لِنڈا نے تمہیں مشورہ دے دیا تھا کہ ایسی کسی کارروائی کے وقت شہر میں موجود رہنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ تو تم اب تک سلاخوں کے پیچھے ہوتے اور اگلا پچھلا سب کچھ اُگل ڈالتے۔''

الفا اُس کے ساتھ جس قسم کا رویہ رکھتا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بمشکل اسے برداشت کرتا ہے۔ وہ بھی اس مجبوری کی بنا پر کہ جنگل میں پوست کی کاشت چودھری کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ پیر آباد سے متصل جتنے بھی گاؤں دیہات تھے، ان میں چودھری ہی سب سے زیادہ طاقتور بندہ تھا جس کی سرپرستی میں وہ آرام سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ چودھری ہی کی وجہ سے انہیں افرادی قوت بھی میسر تھی۔ پوست کی کاشت اور حفاظت کا کام اسی کے آدمی انجام دیتے تھے۔ ان کی تنظیم نے صرف سرپرستی کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی یا پھر بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے حفاظتی انتظامات کو فول پروف بنانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی مہیا کر دی تھی۔ باقی ہیروئن سازی کے کارخانے یا اس کی سپلائی کا کام چودھری سے لینا ضروری نہیں تھا۔ ایک بار اس کے جوتوں کی فیکٹری میں زیرِ زمین قائم ہیروئن سازی کے کارخانے کی تباہی کے بعد شروع میں تو انہوں نے سوچا تھا کہ کسی اور مقام پر چودھری ہی کی نگرانی میں کام شروع کروا دیا جائے۔ لیکن پھر چودھری کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں آتے دیکھ کر انہوں نے اپنا یہ فیصلہ بدل دیا اور اب کوئی اور شخص ان کے لیے یہ خدمات انجام دے رہا تھا۔

''سوری مسٹر الفا! میں بے شک آپ لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں لیکن میرے بعض ذاتی مسائل ایسے ہیں جنہیں میں کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتا۔ چاہے بے شک آپ کو میرا عمل کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔'' وہ پہلے ہی اُلجھا ہوا تھا، الفا کے فون نے جہاں اسے ایک بار پھر اپنی ناکامی سے آگاہ کیا تھا، وہیں اس کا تلخ لہجہ بھی ناگوار گزرا۔ اس لیے ہمیشہ کی طرح دبنے کے بجائے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔



''تو پھر خوشخبری سن لو کہ اب تم ایک ایسے شخص ہو جو نیویارک پولیس کو مطلوب ہے اور جیسے ہی تم نے دوبارہ نیویارک میں قدم رکھا، پولیس کے ہاتھوں گرفتار کر لیے جاؤ گے۔'' الفا بھلا اُس کی صاف گوئی کو کہاں برداشت کر پاتا چنانچہ مزید تلخ ہو گیا۔

''میں نیویارک میں قدم رکھے بغیر بھی اپنے دشمنوں سے نمٹ سکتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد میں دوسری بار بھی ناکام ہی رہوں۔'' اس وقت چودھری اس سے دبنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''پھر بھاڑ میں جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے یہ سن لو کہ اب تمہارا ریکارڈ ایسا نہیں رہا ہے کہ ہم بڑے پیمانے پر تم سے کام لے سکیں۔ تم پاکستان اور نیویارک دونوں جگہوں پر قانون کی نظروں میں آ گئے ہو اس لیے ہمارے درمیان معاملات صرف پوست کی کاشت تک محدود رہیں گے اور اسی حساب سے تمہیں دیا جانے والا معاوضہ بھی گھٹا دیا جائے گا۔''

بالآخر الفا نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا جس سے چودھری کو جھٹکا سا لگا۔ دولت کی ہوس کو وہ کسی طور اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا اور بہت کچھ پاس ہونے کے باوجود مزید کا لالچ رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت بات انا کی آ گئی تھی اس لیے اس نے الفا پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کا فیصلہ اس کے لیے تکلیف دہ ہے اور لہجے کے کروفر کو قائم رکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، جو تم لوگ مناسب سمجھو۔ میں کوئی تمہارے ٹکڑوں پر نہیں پل رہا ہوں کہ ذرا سا معاوضہ کم کر دینے سے میرا جینا مشکل ہو جائے گا۔''

''جینے کے لیے صرف رقم کافی نہیں ہوتی چودھری! بڑے بڑے طاقتور ملکوں کے سربراہ صرف ایک گولی سے اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ اس بات کی تاریخ گواہ ہے۔ پھر تم جیسے ایک چھوٹے ملک کے عام سے جاگیردار کی کیا حیثیت ہے؟ آدمی زندہ رہے، تب ہی مال و دولت سے بھی لطف اٹھا سکتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کی دولت اس کے کسی کام کی نہیں رہتی۔'' الفا کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ اپنی بات کہہ کر اس نے چودھری کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

تلملائے ہوئے چودھری نے فوراً ہی لِنڈا کا نمبر ملا دیا۔ دو گھنٹیوں کے بعد اس کی مترنم آواز سنائی دی۔

''تم اپنے مسٹر الفا کو سمجھا لو لِنڈا! میں اتنی بکواس سننے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر میرا جاگیردار خون جوش میں آ گیا تو میں اپنا سارا نفع و نقصان بھول کر تم لوگوں سے الگ ہو جاؤں گا۔'' لِنڈا کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے غصے کا اظہار شروع کر دیا۔

''ریلیکس چودھری صاحب! پہلے یہ بتائیں کہ آپ کی مسٹر الفا سے کیا گفتگو ہوئی ہے؟'' لِنڈا نے نرم لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ جواب میں غصے میں بھرا چودھری اسے ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

''غلطی آپ کی ہی ہے چودھری صاحب! آپ کو الفا سے اس انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ کس لیول کا بندہ ہے، آپ کو علم نہیں ہے۔ میں اور ڈیوڈ بھی اس سے کسی معاملے میں باز پرس نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے کام ضرور کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے انڈر میں نہیں ہے۔ اگر وہ آپ کے خلاف بھڑک گیا تو ہم آپ سے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ محتاط رہیں۔'' لِنڈا کا جواب خاصا حوصلہ شکن تھا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ الفا کی ناراضگی کی صورت میں وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تم لوگوں سے الگ ہو جاتا ہوں۔'' لِنڈا کا جواب سن کر اس کا حوصلہ پست تو ہو گیا لیکن پھر بھی اس نے یہ بات کہہ کر خود کو مورل سپورٹ دینے کی کوشش کی۔

''یہ ممکن نہیں ہے چودھری صاحب! جو لوگ ایک بار ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں، وہ پھر جیتے جی الگ نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہے کہ آپ الفا کے ساتھ مفاہمت کر لیں اور اس کی مرضی کے مطابق کام کرتے رہیں۔ میں موقع دیکھ کر اس سے آپ کی سفارش کروں گی۔ امید ہے کہ اس کی ناراضگی دور ہو جائے گی۔''

نرم اور شیریں لہجے میں لِنڈا نے بھی اسے وہی دھمکی دی تھی جو الفا دے چکا تھا۔ لیکن لب و لہجہ مختلف ہونے کے باعث چودھری بھڑکا نہیں۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ! تم کہتی ہو تو میں خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ میں کسی کی دھمکیوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔'' چودھری کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی چنانچہ مصالحت کی راہ اختیار کرنی ہی پڑی۔ لِنڈا نے اس کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بے بس ہو جانے والے چودھری نے جھنجلاتے ہوئے موبائل سیٹ بیڈ پر پٹخ دیا۔ آج تک وہ لوگوں کو دھمکیاں دیتا اور ان کی زندگی کے فیصلے کرتا آیا تھا لیکن اب خود اسے کوئی سوا سیر ٹکرا گیا تھا جس کے چنگل سے نکلنے کے لیے اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔

❀----✪----❀

شہر کے حالات دو دن کے ہنگامے کے بعد آہستہ آہستہ قابو میں آنے لگے تھے۔ وہ علاقہ جو ان ہنگاموں کا مرکز تھا، پولیس کے مطابق انہوں نے بڑی جدوجہد کے بعد کلیئر کروا لیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جس طرح حملہ آوروں نے اچانک ہنگامہ شروع کیا تھا، اسی طرح خود ہی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ انہوں نے یہ پسپائی اس طرح اختیار کی تھی کہ علاقے کی پُر پیچ گلیوں اور راستوں میں گم ہو گئے تھے اور پولیس ان کی دھول کو بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ انہیں صرف تین لاشیں ملی تھیں جو پولیس کو انتہائی مطلوب ایسے افراد کی تھیں جو ہر قسم کے ہنگاموں میں مختلف گروپوں کے لیے فری لانسر کے طور پر کام کرتے تھے۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح شہر کا امن بحال ہونے لگا تھا۔ وزراء اور اعلیٰ عہدے داروں نے میڈیا پر بیانات دینا شروع کر دیئے تھے کہ دہشت گردوں کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے اور وہ کسی شخص کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ شہر کا امن و امان برباد کر دے۔ اس بیان بازی سے قطع نظر شہریار تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جس شخص کی آمد کے ساتھ ہی شہر کا امن تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا، وہ آگے چل کر جانے کیا گل کھلائے گا۔

سلّو کی مکمل نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے جدید آلات سے بھی مدد لی جا رہی تھی۔ نگرانی پر مامور لوگ اس کے گھر میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکتے تھے لیکن ابھی تک انہیں کوئی کلیو نہیں مل سکا تھا۔ ان دو دنوں میں سلّو مستقل گھر میں ہی رہا تھا اور گھر سے جو آوازیں سنائی دی تھیں، وہ بالکل عام نوعیت کی تھیں۔ اس نے اپنے پاس موبائل فون بھی نہیں رکھا تھا کہ اس سے کی جانے والی کالز ٹریس کر کے کسی طرح اس کے خلاف ثبوت حاصل کیے جا سکیں۔

اس کے طرزِ عمل سے بالکل ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ ایک عام سا شخص ہے جو برسوں بعد اپنوں سے ملنے پر بہت خوش ہے۔ ان دو دنوں میں وقتاً فوقتاً اس کے مختلف رشتے دار اس سے ملنے آتے رہے تھے۔ آنے والے اس کے لیے تحائف بھی ضرور لاتے تھے۔ سلّو کا سارا خاندان اس کے والدین ہی کی طرح غریب



لیکن غربت کے باوجود کسی نے برسوں بعد آنے والے سلّو کی رہائی کی خوشی میں شامل ہونے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ سی ایف پی کے نگراں یہ سب دیکھ کر مستقل شہریار کو جو کہ ان کے لیے عادل خان تھا، رپورٹ پہنچا رہے تھے۔ ان رپورٹس کو سن کر اسے ایسا لگتا تھا کہ حالات پر جمود طاری ہو گیا ہے لیکن آخر کار ایک ایسی خبر آئی جس نے کچھ ہلچل پیدا کر دی۔ رپورٹ دینے والے کے مطابق سلّو اپنی منگیتر کے لیے کوئی تحفہ خریدنے کے ارادے سے گھر سے باہر نکلا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم اسے فالو کرو اور مجھے رپورٹ دیتے رہو۔'' شہریار نے اسے حکم دیا۔ سلّو کی نگرانی کرنے والوں کی طرف سے اسے رپورٹ دی جاتی رہی۔ سلّو نے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے اپنی منگیتر کو تحفے میں دینے کے لیے بڑے سائز کا ایک خاصا مہنگا شولڈر بیگ خریدا تھا۔ بیگ خریدتے وقت اس نے سیلز مین سے طے کر لیا تھا کہ چونکہ وہ یہ بیگ اپنی منگیتر کے لیے خرید رہا ہے، اس لیے منگیتر کو پسند نہ آنے کی صورت میں اسے بیگ تبدیل کروانے کی رعایت حاصل ہو گی۔

سیلز مین نے اس سے تعاون کا وعدہ کیا تھا اور سلّو رقم ادا کر کے سیدھا گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس بیگ کے علاوہ اس نے پوری مارکیٹ میں سے کچھ اور خریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دیکھا جائے تو وہ جس حیثیت کا بندہ تھا، اس حساب سے وہ لیدر بیگ بھی خاصا مہنگا تھا۔ پھر سلّو ابھی تو پاکستان آیا تھا۔ اس کا کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں تھا کہ وہ اس قسم کی خریداری کر سکتا۔ بس یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے بھارتی آقاؤں کی عنایت کردہ رقم خرچ کر رہا ہے لیکن کافی محتاط انداز میں، ورنہ بیگ کے علاوہ منگیتر کے لیے دوسرے تحائف بھی خرید سکتا تھا۔

''سر! وہ ایک بار پھر باہر جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں وہی بیگ ہے جو اس نے کچھ دیر پہلے خریدا تھا۔'' ابھی سلّو کو واپس گھر پہنچے گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا کہ اس کے ماتحت نے اسے رپورٹ دی۔

''ممکن ہے وہ اپنی منگیتر سے ملنے جا رہا ہو تاکہ اسے وہ تحفہ دے سکے۔'' شہریار نے خیال ظاہر کیا۔

''مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے سر! گھر میں داخل ہونے کے بعد سلّو مستقل خاموش رہا ہے اور اب گھر سے دوبارہ باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنے والدین سے یہ کہا ہے کہ وہ اپنی منگیتر کے لیے جو تحفہ خرید کر لایا ہے، اس میں کچھ خرابی ہے اس لیے اسے تبدیل کروانے جا رہا ہے۔''

ماتحت نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ بیگ خریدتے وقت ہی سلّو نے یہ طے کر لیا تھا کہ منگیتر کو پسند نہ ہونے کی صورت میں وہ اس بیگ کو تبدیل کروا لے گا۔ بیگ منگیتر کو دکھانے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اس نے ایک گھنٹے کے اندر خاصے مہنگے خریدے گئے اس بیگ میں کوئی ایسی خامی ڈھونڈ لی تھی جس کے باعث اسے تبدیل کروانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہا ہو جس کے مطابق خریدے گئے بیگ کو واپس ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچانا ضروری ہو۔ اس بار خود شہریار کے لیے اپنے دماغ میں گھنٹی بج اٹھی۔

''تم اسے نظروں میں رکھو۔ میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے عجلت میں فیصلہ کیا اور جاوید علی کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود گاڑی میں جا بیٹھا۔ ابھی تک وہ اور جاوید علی کراچی یونٹ کے ایک ٹھکانے میں ہی بیٹھ کر اس کیس کو ہینڈل کرتے رہے تھے لیکن وہ ہر دم اس بات کے لیے تیار رہتے تھے کہ اگر ایمرجنسی میں باہر نکلنا پڑے تو فوراً روانہ ہو سکیں۔ اس وقت بھی وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ ان کے اسٹور تک پہنچنے تک سلّو بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس سلّو خاصا مہذب اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یا چال ڈھال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی، جس کی وجہ سے اسے دہشت گرد سمجھا جا سکتا۔ وہ بیگ لیے ہوئے اسی سیلز مین کے پاس گیا جس سے اس نے پیشگی بیگ تبدیل کروانے کا معاملہ طے کر لیا تھا۔ سیلز مین نے خوش دلی سے اسے اجازت دے دی۔

''سوری یار!..... میں اس قسم کا بندہ نہیں ہوں کہ چیزیں تبدیل کرواتا پھروں۔ لیکن تمہیں لڑکیوں کے نخروں کا تو معلوم ہوگا کہ انہیں مشکل سے ہی کوئی چیز پسند آتی ہے۔ اوپر سے میرے سسرالی ذرا قدامت پسند ہیں اس لیے میری منگیتر کو میرے ساتھ شاپنگ کے لیے آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

سلّو نے بے تکلفانہ انداز میں معذرت کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی تو سیلز مین مسکرا دیا پھر خود بھی قدرے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر اس بار بھی آپ کی منگیتر کو آپ کا لے جایا ہوا بیگ پسند نہیں آیا تو آپ کیا کریں گے؟''

''پھر میں کہوں گا کہ رکھنا ہے تو رکھو ورنہ مجھ سے گفٹ لینے کے لیے شادی کا انتظار کرو تاکہ خود ساتھ چل کر اپنی پسند کی چیز لے سکو۔''

سلّو نے بے ساختگی سے جواب دیا اور اپنے ہاتھ سے بیگ کو اس ریک میں واپس رکھ دیا جہاں اور بھی ڈھیر سارے بیگ رکھے ہوئے تھے۔ بیگ واپس رکھنے کے بعد اس نے وہاں سے ایک دوسرا بیگ اُٹھا لیا اور پھر بولا۔

''ویسے مجھے یقین ہے کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس بار میں اس کی پسند کے بارے میں آئیڈیا لے کر آیا ہوں۔''

اس گفتگو کے بعد اسے مشکل سے ڈیڑھ دو منٹ ہی اسٹور میں گزارنے پڑے ہوں گے۔ واپس کروائے ہوئے بیگ کی جگہ اس نے جو دوسرا بیگ لیا تھا، وہ مساوی قیمت کا ہی تھا اس لیے زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں پڑی۔

''تعاون کے لیے شکریہ۔'' اسٹور سے روانہ ہونے سے قبل اس نے سیلز مین کا شکریہ ادا کیا۔ اسٹور میں اس کی جگہ کئی اور سیلز مین بھی تھے اس لیے اس کے سلّو کے ساتھ مصروف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اس نوعیت کا اسٹور تھا جہاں اپنی مدد آپ کے تحت خریداری کی جاتی ہے اور گاہک آخر میں منتخب کردہ اشیاء سے بھری باسکٹیں سیلز مین کے سامنے رکھ کر بل بنوانے کے بعد قیمت ادا کر دیتے ہیں۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں سر! میں دعا کروں گا کہ اس بار آپ کی منگیتر کو آپ کا گفٹ پسند آ جائے گا۔'' سیلز مین نے خوش دلی سے جواب دیا تو سلّو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اس کا تعاقب جاری رکھو۔'' شہریار نے جو کہ ایک قریبی شیلف کی آڑ میں کھڑا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا، آپریٹس پر اپنے ماتحت کو حکم دیا اور خود تیزی سے اس بڑے سے شیلف کی طرف بڑھا جہاں مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے ڈھیر سارے لیڈیز بیگز رکھے ہوئے تھے۔ سلّو کا بیگ خرید کر ایک گھنٹے کی مختصر مدت میں تبدیل کروا لینا اُسے کھٹک رہا تھا۔ بیگ کی تبدیلی کے لیے اس نے سیلز مین کو جو کہانی سنائی تھی، وہ جھوٹ کا پلندا تھی۔ سلّو کی نگرانی کے نتیجے میں وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ سلّو وہ بیگ لے کر اپنے گھر ضرور گیا تھا لیکن اس نے وہ بیگ اپنی منگیتر کو نہیں دکھایا تھا کہ وہ اسے پسند یا ناپسند کرتی۔

اس کے علاوہ ایک دوسری بات یہ بھی تھی کہ اس نے جو دوسرا بیگ لیا تھا، اس کے انتخاب میں ذرا بھی



دلچسپی نہیں لگایا تھا حالانکہ رجیکشن کے ڈر سے دوسری بار تو اسے بہت دیکھ بھال کر اور احتیاط سے انتخاب کرنا چاہیے تھا۔

شیلف کے قریب کھڑے ہو کر اس نے پہلے نظروں ہی نظروں میں بیگ کا جائزہ لیا۔ وہ اندر سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فروخت کی غرض سے رکھے گئے سارے ہی بیگز کے اندر اخبار وغیرہ رکھے جاتے ہیں تاکہ پھول کر ان کی خوب صورتی واضح ہو جائے۔ لیکن اس طرح کی اشیاء اندر بھرنے سے وزن پر کچھ خاص فرق نہیں پڑتا اور بیگز ہلکے پھلکے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ جبکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ سلّو نے واپس کردہ بیگ کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے اس میں کافی وزن ہو۔ تشویش میں مبتلا شہریار نے بیگ کو اس کی جگہ سے ہلائے بغیر احتیاط کے ساتھ اس کی زِپ کھولی اور متحیر رہ گیا۔

''سر! یہ تو.....'' اس کے ساتھ موجود جاوید علی نے بھی بیگ کے اندر رکھی چیز دیکھ لی تھی۔

''شش..... کچھ نہیں کہنا۔ جاؤ کاؤنٹر پر، اس کی قیمت ادا کرو۔'' اس نے جاوید علی کو تنبیہہ کی اور بیگ کی زِپ دوبارہ احتیاط کے ساتھ بند کر کے اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

سلّو نے جس طرح اس بیگ کو لا کر وہاں رکھا تھا، اس سے یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ بیگ کے اندر رکھا بم صرف ہاتھ لگانے یا اِدھر سے اُدھر لے جانے پر نہیں پھٹے گا۔ وہ ایک ٹائم بم تھا جسے سیٹ کیے گئے ٹائم پر ہی پھٹنا تھا۔ موجودہ حالات میں اس کے پاس دو ہی آپشنز تھے۔ اوّل یہ کہ وہ بم ڈسپوزل اسکواڈ کو طلب کرے اور اسٹور خالی کروا لے۔ کیونکہ اس میں خطرات و خدشات زیادہ تھے۔ اسکواڈ کے پہنچنے میں دیر ہونے کی صورت میں بم پھٹ سکتا تھا۔ دوسرے اسکواڈ کو بلانے سے قبل انہیں ایمرجنسی میں اسٹور خالی کروانا پڑتا جس سے لوگوں میں بھگدڑ مچ جاتی اور خوف و ہراس پھیل جاتا۔ اس لیے اس نے سیکنڈ آپشن پر عمل کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا اور جاوید علی کے پے منٹ کر کے واپس لوٹنے سے قبل ہی عجلت میں بیگ سمیت باہر نکل گیا تھا۔

باہر اس کی گاڑی موجود تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اسے فل اسپیڈ میں دوڑا دیا۔ بم کے ساتھ موجود ٹائمر دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بم پھٹنے میں تقریباً آٹھ منٹ باقی تھے۔ ان آٹھ میں سے تین منٹ تو اسٹور میں ہی گزر چکے تھے اور گاڑی میں بیٹھنے کے بعد صرف پانچ منٹ باقی بچے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان پانچ منٹوں میں وہ اس میدان میں پہنچ جائے گا جسے یہاں آتے ہوئے اس نے راستے میں دیکھا تھا۔ وہ میدان تو تھا شاید بچوں کے کھیلنے کے لیے لیکن متعلقہ محکمے کی لاتعلقی اور اہلِ علاقہ کی بے حسی کی وجہ سے کچرا گھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہاں کچرے اور گندگی کا اتنا بڑا ڈھیر موجود تھا کہ بچوں کے وہاں کھیلنے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تین منٹ کے اندر وہ اس میدان تک پہنچ گیا اور احتیاط سے رکھا بیگ اٹھا کر کچرے کے ڈھیر کی طرف بھاگا۔ اصولاً اسے وہ بیگ دور ہی سے پھینک کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن تیزی سے گزرتے وقت کے باوجود اس نے رِسک لے لیا اور کچرے کے ڈھیر کے عین درمیان میں پہنچ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہٹا کر بیگ کو اندر دبانے کے بعد ہی واپس پلٹا۔ اس دوران اس کے اندر کا نفاست پسند اور نازک مزاج اور کریٹ جانے کہاں گیا تھا۔ زندہ تھا تو صرف ایک سپاہی جسے سب کچھ قربان کر کے اپنا فرض انجام دینے کے جذبے کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا۔ گندگی کے ڈھیر اور بدبو کے بھبکے اس کے جذبے کی راہ میں ذرا بھی مزاحم نہیں ہوئے تھے اور جب وہ اپنا کام نمٹا کر واپس پلٹ رہا تھا تو بم پھٹنے میں مشکل سے پچیس سیکنڈ باقی تھے۔

اس نے دوڑ کر میدان پار کیا اور اپنی گاڑی تک واپس پہنچا۔ وقت کی کمی کے پیشِ نظر اس نے گاڑی کا

انجن چلتا ہوا ہی چھوڑ دیا تھا پھر بھی جب اس نے ایکسیلریٹر پر دباؤ ڈال کر گاڑی کو آگے بڑھایا تو اسے ایک زوردار دھماکا سنائی دیا جس کے زور سے گاڑی ڈگمگا سی گئی لیکن اس نے بریکس نہیں لگائے۔ البتہ بیک ویو مرر میں دھماکے کے زور سے اوپر اُچھلتے کچرے کے ڈھیر کو ضرور دیکھا۔

اسے معلوم تھا کہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ اردگرد موجود گھروں کے در و دیوار لرز اُٹھے ہوں گے اور شاید چند گھروں کی کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے ہوں گے۔ لیکن قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ اس دھماکے سے کسی انسانی جان کے نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ جس راستے پر گاڑی چلا رہا تھا، وہ بھی کوئی مصروف شاہراہ نہیں تھی جہاں ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے کسی حادثے کا اندیشہ ہو۔ وہ لوگ تو محض شارٹ کٹ کے خیال سے یہاں سے گزر کر اسٹور تک پہنچے تھے اسی لیے وہ گراؤنڈ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

''سر! آپ کہاں ہیں؟'' دھماکے کے فوراً بعد ہی اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے جاوید علی کی تشویش میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ اس کی طرح وہ بھی دیکھ چکا تھا کہ بیگ میں ٹائم بم رکھا ہے۔ شہریار کا بیگ سمیت اسٹور سے بھاگ کھڑا ہونا اس کے لیے تشویش کا باعث بنا تھا اور پھر سنائی دینے والے دھماکے کی آواز نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا اس لیے اس نے گھبرا کر فون کیا تھا۔

''میں خیریت سے ہوں اور واپس جا رہا ہوں۔ تم بھی ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آ جاؤ۔'' اس نے جاوید علی کو حکم دیا۔ دھماکے کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے اسے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اہلِ علاقہ خود پولیس کو کال کر لیں گے اور پولیس معمول کی کارروائی کرنے کے بعد نامعلوم دہشت گردوں کے کھاتے میں اس واردات کو ڈال کر مطمئن ہو جائے گی۔

اس کے لیے اہمیت اس بات کی تھی کہ ایک بھی انسانی زندگی ضائع ہوئے بغیر یہ مصیبت ٹل گئی تھی اور وہ اس جرم کے ذمے دار کو جانتا تھا اور اب اسے اس کی بیخ کنی کے لیے کوئی نہ کوئی راست قدم اٹھانا تھا۔ انہی خطوط پر سوچتا ہوا وہ اپنے ٹھکانے پر واپس چلا گیا۔ راستے میں اس نے کنفرم کر لیا تھا کہ سلّو واپس اپنے گھر ہی گیا ہے۔ وہ واپس پہنچا تو اس کے تھوڑی دیر بعد جاوید علی بھی واپس آ گیا۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا سر! آپ نے بہت بڑا رِسک لیا تھا۔ آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی وہ خفگی کا اظہار کر پڑا۔

''سپاہی کو اپنے نقصان سے نہیں ڈرنا چاہئے، بس یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اپنے لوگوں کو کس طرح نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں مجھے جو بہتر لگا، وہ میں نے کیا۔ اب تم اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بحث نہیں کرنا۔ بس یہ بتاؤ کہ کیا معلومات حاصل کر کے آئے ہو؟'' اس نے جاوید علی کے پاس مزید بحث کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی چنانچہ وہ بھی ایک فرماں بردار ماتحت کی طرح حکم کے مطابق اسے رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''سلّو نے جس ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں دھماکا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خاصا بڑا ہے اور اسی حساب سے وہاں لوگ بڑی تعداد میں خریداری کرنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹور کی لوکیشن بھی ایسی ہے کہ اردگرد کئی دوسرے اسٹورز اور ریسٹورنٹس وغیرہ موجود ہیں۔ چنانچہ اگر وہاں دھماکا ہو جاتا تو کئی انسانی جانوں کے نقصان کے علاوہ شدید خوف و ہراس پھیل جاتا۔ اہم بات یہ ہے کہ اسٹور کے مالک نے سکیورٹی کے مناسب انتظامات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ وہاں جو سکیورٹی گارڈز موجود ہیں، ان کے پاس عام سا اسلحہ موجود ہے اور چیکنگ کے لیے موجود آلہ صرف داخلی دروازے پر موجود گارڈ کے پاس موجود ہوتا ہے جو ان



آلوں خراب ہے اور گزشتہ کئی دنوں سے استعمال نہیں کیا جا رہا۔ نگرانی کے لیے موجود کیمروں کی تعداد بھی قابلِ ذکر نہیں ہے۔ ایک کیمرہ داخلی دروازے پر موجود ہے جبکہ باقی دو ایسے مقامات پر لگائے گئے ہیں جہاں چھوٹے سائز کی یا قیمتی اشیاء رکھی گئی ہیں تاکہ کوئی کسٹمر ان اشیاء کو اپنی جیب یا پرس میں رکھ کر چلتا نہ بنے۔ میگزین، شوز اور کتابوں وغیرہ والے حصوں میں کیمرے موجود نہیں ہیں۔ میں نے سلّو کے دونوں بار اسٹور میں داخل ہونے کے اوقات کی ویڈیو دیکھی ہے۔ ایک بار اس نے بالوں کو سنوارنے کے بہانے چہرے کو ہاتھ کی آڑ میں چھپا لیا ہے اور دوسری بار وہ دونوں ہاتھ منہ کے آگے لا کر اس طرح چھینکتا ہوا اندر داخل ہوا ہے جیسے اسے شدید نزلہ زکام ہو رہا ہو۔ ویڈیو میں اس کے ہاتھ میں موجود رومال بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ کیمرہ اس زاویے سے لگا ہوا ہے کہ اسٹور میں آنے والے کی تو واضح تصویر لے سکتا ہے لیکن جانے والے کی پشت ہی ریکارڈ ہو پاتی ہے۔ اس طرح کیمرے کی آنکھ نے سلّو کی ایسی کوئی تصویر محفوظ نہیں کی، جس کی مدد سے اسے شناخت کیا جا سکے۔ اگر ہم لوگ اس کے پیچھے نہ ہوتے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔'' جاوید علی نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

''ہوں۔'' ساری بات سن کر اس نے ایک ہنکارا بھرا اور بولا۔ ''تفصیلات سے واضح ہے کہ سلّو نے ساری پلاننگ سے وہاں وہ بم رکھا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسٹور میں سکیورٹی کے کیا انتظامات ہیں اور کارروائی کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ ظاہر ہے اسے یہ معلومات کہیں نہ کہیں سے فراہم کی گئی ہوں گی۔ ورنہ وہ خود تو ابھی حال ہی میں پاکستان آیا ہے اور جب سے آیا ہے ہماری نظروں میں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''را'' یہاں کتنی زیادہ ایکٹیو ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں، کر گزرتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ سلّو کے پاس دھماکا خیز مواد کہاں سے آیا؟''

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اس مختصر مدت میں مسلسل سلّو کے رشتے دار اس سے ملاقات کے لیے آتے رہے ہیں۔ آنے والوں میں سے اکثر و بیشتر تحائف بھی لاتے تھے۔ لہٰذا دشمن کو ایک زبردست کور مل گیا۔ ان کا کوئی بھی بندہ رشتے دار کے روپ میں گفٹ پیک کی آڑ لے کر مطلوبہ معلومات اور ٹائم بم سلّو کو فراہم کر کے چلا گیا ہوگا۔ مجھے اصل افسوس اس بات کا ہے کہ ہم یہ سب جاننے کے باوجود ثبوتوں کی عدم دستیابی کی بنا پر اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ اس نے کہیں کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس نے اسٹور میں ٹائم بم رکھا تھا۔'' وہ کفِ افسوس ملنے لگا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے سر! ہم جانتے ہیں کہ وہ مجرم ہے اس لیے اسے اپنے ذرائع سے اغوا کروا لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی زبان کھلوانا ہمارے لیے کون سا مشکل ہوگا۔ بلکہ وہ زبان نہ بھی کھولے تو ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اس کی حقیقت جانتے ہیں اس لیے اسے اس کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔'' جاوید علی کے دل میں موجود سلّو کی ہمدردی اس وقت مکمل طور پر سوئی ہوئی تھی کیونکہ اس سفاک شخص نے مختصر مدت میں جس طرح اپنا خونیں کھیل شروع کر دیا تھا، اس کے بعد وہ کوئی گنجائش محسوس نہیں کر رہا تھا کہ اسے ڈھیل دی جائے۔

''اگر یہی کرنا تھا تو انتظار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم اس کی آمد کے ساتھ ہی کارروائی کر گزرتے۔ میں چاہتا ہوں کہ سلّو کے ذریعے باقی دوسرے لوگوں تک بھی پہنچ سکوں۔ ابھی تو صرف ایک ریاض انور ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس جیسے اور بھی ہوں گے جو یہاں اس کا ساتھ دے رہے ہوں گے اور ہمیں ان سب کی گردنیں ناپنی ہیں۔'' اس نے جاوید علی کی بات کا جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اپنے سینئر افسر کی

رائے سے اختلاف نہیں تھا البتہ وہ تشویش میں مبتلا تھا کہ آزادانہ پھرتا سلو کہیں کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا دے۔

⊛----✪----⊛

ایئرپورٹ سے نکل کر آبادی کی طرف جانے والے راستے پر سفر کرنا ان کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا تھا اور انہوں نے فوراً ہی محسوس کرلیا تھا کہ یہاں زندگی کے رنگ نیویارک سے بہت مختلف اور خوش نما ہیں۔ نیویارک میں فلک بوس عمارتوں، جھلملاتی روشنیوں اور ٹریفک کے اژدھام میں زندگی اتنی تیز رفتار تھی کہ اس کی تیزی کا ساتھ دینے کے چکر میں آدمی گھن چکر بن کر رہ جاتا تھا پھر وہاں کے مصنوعی پن میں بھی وہ کشش نہیں تھی جو ساری زندگی دیہات میں گزارنے والی کشور کو اپنی طرف متوجہ کرتی جبکہ یہاں تو آتے کے ساتھ ہی بڑا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ قلانچیں بھرتے ہرن کا جنگل کی وسعتوں میں گم ہو جانا، آسمان پر پرندوں کا ٹولیوں کی صورت میں اُڑنا اور ہوا میں سبزے کی مہک کو محسوس کرنا بہت پُرلطف تھا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی بہت اچھا لگا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے سڑک سے گزرتے ایک سانپ کو آرام سے گزر جانے کی مہلت دینے کے لیے گاڑی کو روک لیا تھا۔ اُس کی اس حرکت پر کشور کو بے ساختہ پیرآباد یاد آیا تھا۔ وہاں بھی یہ سب کچھ موجود تھا لیکن جانور تو دور کی بات، انسانی جانوں کی بھی اتنی قدر نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن انسان تو جانور سے بھی زیادہ بے وقعت تھا۔ پھر وہاں صفائی اور سہولتوں کا بھی شدید فقدان تھا۔ آرلینڈو کی چوڑی اور چکنی سڑکوں پر سفر کرتے اسے پیرآباد کے وہ کچے پکے راستے یاد آئے جن پر سفر کرتے ہوئے آرام دہ گاڑی کے باوجود بھی چند جھٹکے لگ ہی جاتے تھے۔

سبزہ، جنگلی حیات اور کھلی فضا جیسی خصوصیات مشترک ہونے کے باوجود آرلینڈو اور پیرآباد ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ پینٹنگ کے جملہ لوازمات ایک طرف کسی ماہر مصور کے ہاتھوں میں ہوں تو دوسری طرف کسی اناڑی کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح بننے والی تصویروں کا فرق جتنا واضح ہوسکتا تھا، اتنا ہی واضح فرق یہاں اور وہاں میں تھا۔ یہاں والوں کو اللہ نے جن نعمتوں سے نوازا تھا، انہوں نے نہ صرف ان سے استفادہ کیا تھا بلکہ انہیں خوب سنبھال سنوار کر رکھا تھا جبکہ پاکستان میں نعمتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے تو بہت تھے لیکن ان کی قدر اور دیکھ بھال کرنا کوئی نہیں جانتا تھا۔

خوش نما مناظر کو دیکھنے اور مختلف باتوں کو سوچنے میں ان کا ایئرپورٹ سے مصطفیٰ خان کے گھر تک کا سفر طے ہوتا چلا گیا۔ مصطفیٰ خان سے ان کا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا لیکن وہ صرف شہریار کے حوالے پر ان کی مدد کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے جب آفتاب نے اسے اپنی آمد کے وقت سے آگاہ کیا تھا تو اس نے انہیں ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن آفتاب نے اسے زحمت دینا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پاکستان نہیں ہے جہاں لوگ کسی مہمان کی آمد پر گاڑیاں بھر بھر کر اسے خوش آمدید کہنے ایئرپورٹ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں انسان کو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بندھ کر چلنا پڑتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی غیر ضروری تکلفات میں پڑ جائے تو خاصی زحمت اٹھاتا ہے۔ اس لیے اس نے مصطفیٰ کو انکار کردیا تھا۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا البتہ انہیں اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت ضرور دی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ انہیں اس گھر تک پہنچا دیتا جو اس نے آفتاب کی خواہش کے مطابق ان کے لیے کرائے پر لیا تھا۔ اس گھر میں ضرورت کا سارا ساز و سامان بھی موجود تھا جس کی وجہ سے انہیں اضافی کرایہ دینا پڑتا۔ لیکن نیویارک والے اپارٹمنٹ کا سامان بیچتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ خود چیزیں



خرید کر گھر کو سجانے سنوارنے کی زحمت نہیں کریں گے۔ اس طرح ان کے وقت اور پیسے کی بچت بھی ہوتی اور ایک ان سب چیزوں کو چھوڑنے کی صورت میں یہ دکھ بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے اتنے شوق سے اپنی گرہستی بنائی تھی، اسے ایمرجنسی میں چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ ایک طرح سے انہوں نے خانہ بدوشوں کی سی زندگی کو قبول کرلیا تھا اور اب اسی کے مطابق اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مصطفیٰ خان کے گھر کے دروازے پر گاڑی رُکی تو وہ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے نیچے اُتر آئے۔ گھر اچھا خاصا بڑا لگ رہا تھا اور احاطے کی دیوار زیادہ اونچی نہ ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ رہے تھے کہ جتنے حصے پر بنائی عمارت تعمیر کی گئی تھی، اس سے زیادہ ایریا لان کے لیے استعمال ہوا تھا۔

آفتاب نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ٹریک سوٹ میں جو شخص کھڑا تھا، وہ یقیناً مصطفیٰ خان ہی تھا جو شاید کچھ دیر قبل ہی جاگنگ وغیرہ سے فارغ ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی فراخ پیشانی پر اس وقت بھی پسینے کے ننھے ننھے قطرے دیکھے جاسکتے تھے۔

''مصطفیٰ خان اور آپ دونوں یقیناً مسٹر اینڈ مسز آفتاب ہیں۔'' اس نے خوش دلی سے اپنا مضبوط ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

''اندر تشریف لے آئیں۔ میں آپ لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' آفتاب کی تصدیقی مسکراہٹ کا اپنی مسکراہٹ سے جواب دیتے ہوئے اس نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی ان کے سامنے مصطفیٰ خان کے گھر کا خوب صورت لان آگیا لان کو دیکھتے ہی اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ اسے کسی صاحبِ ذوق نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے ترتیب دیا ہے۔ آنکھوں کو تراوٹ دیتی سبز گھاس، ایک خاص ترتیب سے لگائے گئے پھل دار اور پھول دار درخت و پودے، اسٹائلش سی لان چیئرز اور خوب صورت سے جھولے میں سے کوئی شے ایسی نہیں تھی جو اس منظر میں غیر ضروری یا غیر منظم محسوس ہوتی۔

''آپ کا لان بہت خوب صورت ہے۔'' کشور تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''شکریہ، یہ میری بیگم کا شوق ہے۔ وہ خاصی سگھڑ خاتون ہیں۔ ابھی آپ ان کے ہاتھ کا بنا ناشتہ تناول کریں گے تو خود میری اس رائے کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ البتہ میں اس اعتبار سے بڑا مظلوم آدمی ہوں کہ مجھے ان کے ہر شوق کی تکمیل کے لیے ان کے اسسٹنٹ کا کردار ادا کرنا پڑتا ہے اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ عموماً بے چارے اسسٹنٹ کو ہی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔''

مصطفیٰ خان نے ایسے لب و لہجے میں یہ سب کہا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن کشور کے چہرے کی مسکراہٹ بڑی تیزی سے حیرت کے رنگوں میں ڈوب گئی۔ اس حیرت کا سبب وہ لڑکی تھی جسے وہ گیٹ پر سے ہی دیکھتے ہوئے آرہے تھے۔ لڑکی ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ مصروف اُسے جھولا جھلا رہی تھی لیکن وہ کچھ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ انہیں اس کی پشت ہی نظر آرہی تھی۔ پشت پر لہراتی ناگن جیسی لمبی چوٹی والی لڑکی اور جھولا جھولتی بچی نے مصطفیٰ خان کے لان کی خوب صورتی کو مزید بڑھا دیا تھا اور انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ مصطفیٰ خان کی بیوی اور بیٹی ہیں لیکن یک دم ہی لڑکی پلٹی تو کشور کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ وہ اس کا شناسا چہرہ تھا اور وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ یہاں اس سے سامنا ہوسکتا ہے۔

''ماہ بانو.....!'' اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی۔

''یہ مہرین ہیں۔ یہ اور ان کے شوہر اسلم صاحب یہیں اس گھر کی انیکسی میں رہتے ہیں اور ان کی ہماری نٹ کھٹ سی بیٹی سے خوب دوستی ہے۔'' کشور کی حیرت سے بے خبر چند قدم کا درمیانی فاصلہ طے کرنے

کے بعد مصطفیٰ خان ان کا تعارف کروانے لگا۔ یہ تعارف دونوں طرف کے لوگوں کا کروایا گیا تھا لیکن کشور نے زیادہ غور نہیں کیا۔ وہ تو حیران تھی کہ ماہ بانو یہاں کیسے پہنچ گئی؟

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں چھوٹی بی بی؟ جیسے آپ حالات کے گرداب میں پھنس کر یہاں پہنچی ہیں، ویسے ہی میں بھی آ گئی ہوں۔'' اس کے تاثرات دیکھ کر ماہ بانو نے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ حالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن یہ طے تھا کہ جس شخص کے خوف سے وہ بھاگتی پھر رہی تھی، وہی شخص ماہ بانو کی دربدری کا بھی ذمے دار تھا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ ہم ایک سے حالات سے مفرور لوگ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔'' اس نے فوراً ہی ایک قدم آگے بڑھ کر نہ صرف ماہ بانو سے ہاتھ ملایا بلکہ اسے گلے بھی لگا لیا۔ اس ایک قدم نے پیر آباد کی حویلی کی چھوٹی بی بی اور وہاں ملازمہ جیسی حیثیت رکھنے والی ماہ بانو کے درمیان تفریق کو ختم کر دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

سنتھیا اضطراب کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ ''را'' والوں نے خصوصیت سے اسے کراچی کے حالات پر نظر رکھنے اور اُنہیں وقتاً فوقتاً بگاڑتے رہنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔

یہاں رہ کر اسے اپنی ٹیم سے زیادہ ریاض انور اور سلّو جیسے لوگوں سے کام لینا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے جو پہلا منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت کامیاب رہا تھا اور دو تین دن کے اندر ہی شہریوں کو اچھا خاصا جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن یہاں کے باسیوں کی خصوصیت تھی کہ حالات چاہے کتنے بھی خراب ہو جائیں، وہ زیادہ دنوں تک اپنے گھروں میں محصور ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور حالات میں ذرا سی بہتری آتے ہی یہاں کاروبارِ زندگی دوبارہ شروع ہو جاتا تھا۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن اس نے پہلے ہی منصوبہ تیار کر رکھا تھا کہ جیسے ہی شہر میں دوبارہ سے رونقیں جاگنا شروع ہوں گی۔ تخریب کاری کی ایک اور واردات کی مدد سے لوگوں کو ہراساں کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے شہر کے ایک بارونق کاروباری علاقے کا انتخاب کیا تھا اور کام کی ذمے داری سلّو کو سونپی گئی تھی۔ اسے یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ سلّو نے نہایت چابک دستی اور ہوشیاری سے مکمل کر لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کے کان وہ خبر نہیں سن سکے تھے جس کی وہ منتظر تھی۔

نیوز چینلز سے بم بلاسٹ کے حوالے سے خبر نشر تو ہوئی تھی لیکن اس خبر میں ان کے منتخب کردہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے بجائے کسی خالی میدان میں کچرے کے ڈھیر پر بم دھماکے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کارروائی پر مختلف تبصرے کیے جا رہے تھے۔ اسے ان تبصروں سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ اس بات پر ضرور برانگیختہ تھی کہ منصوبے کے مطابق وہ دھماکا شہر کے بارونق علاقے کے بجائے کسی خالی میدان میں کیسے ہو گیا؟

''یس، کم اِن۔'' ٹہلتے ٹہلتے اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی تو آنے والے کو اجازت دے کر خود کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کی اجازت ملتے ہی آہستگی سے دروازہ کھلا اور اس کا ماتحت موہن اندر داخل ہوا۔

''بیٹھو۔'' اُس نے مؤدب کھڑے موہن کو سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس کمرے میں وہ لوگ اس وقت موجود تھے، وہ دفتر کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ دراصل انہوں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کی آڑ میں اپنا یہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ ایجنسی ظاہری طور پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام ہی کرتی تھی لیکن یہاں کے مالکان



و با اختیار لوگ ''را'' سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ایجنسی میں اپنی ضرورت کے تحت آنے جانے والوں کے ساتھ کب کوئی خفیہ ایجنٹ شامل ہو جاتا تھا، کوئی اندازہ بھی نہیں کر پاتا تھا اور بڑے بڑے منصوبے یہیں بیٹھ کر طے کر لیے جاتے تھے۔ اس ایجنسی کے علاوہ بھی انہوں نے کچھ اور ایسے خفیہ ٹھکانے بنا رکھے تھے جہاں بظاہر تو کوئی اور کام ہوتا تھا لیکن جس کی آڑ میں ''را'' والے سرگرم رہتے تھے۔

''سلّو جب اسٹور میں بم رکھنے گیا تھا تو تم ہی اس کا تعاقب کر رہے تھے نا موہن؟'' لمحہ بھر میں موہن کا جائزہ لینے کے بعد اس نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یس میڈم! سلّو نے میرے سامنے ہی بم والا لیدر بیگ اس شیلف میں رکھا تھا جہاں اور بھی دوسرے بہت سارے بیگ سجے ہوئے تھے۔''

اُس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ سنتھیا یہاں ایجنسی کے مالک کی ایک ایسی کزن کی حیثیت سے موجود تھی جو بیرونِ ملک سے آئی تھی اور اپنا کوئی کاروبار شروع کرنے سے پہلے مختلف امکانات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایجنسی میں کام کرنے والے ایسے ملازمین جو خالصتاً جائیداد کی خرید و فروخت وغیرہ کے کام ہی انجام دیتے تھے اور انہیں حقائق کا کوئی علم نہیں تھا، اس حیثیت سے اسے بہت عزت و احترام دیتے تھے اور انہیں اس کی وہاں وقت بے وقت آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ وہ مالک کی کزن تھی اور صرف اس کاروبار کے اسرار و رموز سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے نہ تو دیگر ملازمین کی طرح اس پر کوئی پابندی عائد ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے احکامات سے رُوگردانی کی جا سکتی تھی۔ ویسے بھی اس عرصے میں سنتھیا نے جو کہ مسز سمانتا کے نام سے یہاں متعارف کروائی گئی تھی، کسی ملازم سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اس لیے لوگ اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔

''میں تمہاری رپورٹ کو درست مان لوں تو پھر اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ بم اسٹور کے بجائے کسی میدان میں جا کر کیسے پھٹا؟ ایسا تو صرف دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ سلّو نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور اچانک دل میں جاگ جانے والے جذبۂ حب الوطنی سے مجبور ہو کر پبلک میں بم بلاسٹ کرنا پسند نہ کیا ہو۔ لیکن جس طرح کی اس کی تربیت کی گئی تھی، اس کے بعد اس چیز کا امکان کم بلکہ بہت ہی کم ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہے ہوں اور انہوں نے اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نگرانی کرنے والوں میں سے کوئی بم والا بیگ اٹھا کر اسٹور سے لے گیا ہو اور اسے میدان میں پھینک دیا ہو لیکن پھر ذمے داری تم لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ تم اور تمہارے ساتھ سلّو کی نگرانی کرنے والے کو دھیان رکھنا چاہئے تھا کہ کہیں کوئی اور بھی تو اس کے اردگرد نہیں منڈلا رہا ہے۔''

حالات کا تجزیہ کرتی سنتھیا کا لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ موہن کو اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے سے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ وہ اور اس کے دو ساتھی آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹوں میں سلّو کی نگرانی کا کام کر رہے تھے لیکن اتفاق سے ان میں سے کسی نے بھی وہاں کسی دوسرے نگراں کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس کے بعد اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ کچھ اور لوگ بھی سلّو کی نگرانی کر رہے تھے۔

''اسٹور میں نصب کیمروں کی فلم نکلوا کر دیکھو کہ وہ کون لوگ تھے جو سلّو کے اردگرد منڈلا رہے تھے اور انہوں نے اس کے ایک اہم مشن کو ناکام بنا ڈالا۔'' موہن کی حالت سے بے نیاز سنتھیا نے اسے حکم دیا۔

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں میڈم! لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ داخلی دروازے پر نصب کیمرے کی فلم غائب ہے جبکہ باقی دو کیمرے تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایسی جگہ نصب ہیں کہ ان کی ریکارڈنگ سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔'' موہن نے ڈرتے ڈرتے رپورٹ پیش کی۔

''شٹ.....'' سنتھیا نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سلّو واقعی کسی خفیہ ادارے کی نظر میں آگیا ہے اور وہ لوگ کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہوسکتا ہے میڈم! لیکن ابھی تک کسی نے اسے چھیڑا نہیں ہے اور وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور واپس آنے کے بعد آرام سے اپنے گھر میں سویا پڑا ہے۔'' موہن نے اسے بتایا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے سلّو پر اتنا کثیر سرمایہ اور محنت اس لیے نہیں لگائی تھی کہ اس سے کوئی کام لیے بغیر اسے ضائع کر دیں۔ لیکن حالات کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنا یہ مہرہ بساط سے اٹھانا ہی پڑے گا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور موہن کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ جانے پر تیزی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سنتھیا نے ریاض انور سے رابطہ کیا۔

''آپ نے سلّو کی ملازمت کا کیا بندوبست کیا ہے ریاض انور صاحب؟'' کوشش سے اپنے لہجے کو معتدل بناتے ہوئے اس نے ریاض انور سے پوچھا۔

''میں آپ کو بتانے ہی والا تھا۔ میں نے اس کے لیے وزیر اعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں جگہ بنالی ہے۔ کل اس کا رسمی سا انٹرویو اور ٹرائل وغیرہ ہوگا۔ اس کے بعد وہ فوراً اپنی ڈیوٹی شروع کرسکتا ہے۔'' ریاض انور نے اسے بتایا تو وہ خوش ہوگئی اور اس کے شیطانی دماغ میں فوراً ہی ایک منصوبہ ترتیب پانے لگا۔

''میں تمہیں ایسے ہی ضائع نہیں ہونے دوں گی سلّو!..... تمہیں کچھ نہ کچھ تو ایسا کرنا ہوگا کہ اپنی تربیت کا حق ادا کرسکو۔''

ریاض انور سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ بڑبڑائی اور سامنے رکھے پیڈ پر بظاہر اُلٹی سیدھی لکیریں بنانے لگی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان اُلٹی سیدھی لکیروں کو بنانے کے دوران اس نے ایک بڑا مربوط منصوبہ بنا ڈالا تھا اور اب منتظر تھی کہ موقع ملے تو اس منصوبے پر عمل کرسکے۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان کے قدم بہت تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ بہت ایمرجنسی میں پیرآباد سے لاہور پہنچا تھا جہاں کے ایک ہسپتال میں کچھ عرصہ قبل ہی اس کی ماں کو اسلام آباد سے منتقل کیا گیا تھا۔ پیرآباد سے اسلام آباد آنے جانے میں اسے مشکل پیش آتی تھی اور بعض اوقات وہ ایسی مصروفیات میں گھر جاتا تھا کہ چاہنے کے باوجود ماں سے ملنے کے لیے نہیں جا پاتا تھا۔ بے شک وہ کومے میں تھی اور ایک اعتبار سے دنیا کے کاروبار سے بے نیاز ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اُسے ایسا لگتا تھا کہ ماں اس کا انتظار کرتی ہے اور اس سے ملنے نہیں جا پاتا تو اُداس ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے خود اسے اسلام آباد سے لاہور منتقل کروالیا تھا۔ پیرآباد سے لاہور تک کا فاصلہ نسبتاً کم تھا اور وہ جلدی جلدی ماں کے پاس چکر لگا لیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بہت ایمرجنسی میں اور خاصی جذباتی کیفیت میں ہسپتال پہنچا تھا۔

ہسپتال کی طرف سے اُسے اطلاع دی گئی تھی کہ اُس کی ماں کومے سے باہر آگئی ہے اور اس اطلاع کے بعد تو اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایک پل کے لیے بھی پیرآباد میں رک سکے۔ عمیر آفندی کو اطلاع دے



کر وہ فوراً ہی روانہ ہوگیا تھا اور اب چند قدم کا فاصلہ اُڑ کر پار کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن ماں کے کمرے کے دروازے پر اسے روک لیا گیا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں مسٹر خان! کہ آپ کی والدہ بے شک کومے سے باہر آگئی ہیں لیکن ان کی جسمانی حالت بہت خراب ہے۔ ان کے اعضاء مناسب طریقے سے اپنا کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زندگی بچانے کے لیے کچھ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مگر آپ ان سے ملتے وقت یہ بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس مہلت بہت کم ہے۔ آپ کتنے گھنٹوں یا دنوں کے لیے انہیں اس عالم میں دیکھ سکیں گے، یہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے لیکن ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وقت بہت کم ہے۔''

دروازے پر اسے روک لینے والے ڈاکٹر نے تلخ حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے اس ساری خوشی کو کافور کر دیا تھا جو وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

ڈاکٹر کے راستہ دینے پر اس نے ماں کے کمرے کی طرف پیش قدمی کی تو اس جوش وخروش کی جگہ جو وہ پیرآباد سے اپنے دل میں لے کر آیا تھا۔ ایک تھکن سی قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی بستر پر ماں کا ڈھانچا سا وجود نظر آگیا۔ جوانی میں خاصی صحت مند اور تندرست اس کی ماں پے در پے صدموں کو سہتے سہتے اپنا رنگ روپ، ہوش وحواس اور صحت سب کچھ کھو بیٹھی تھی لیکن یہ کمزور ونحیف وجود اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ تھی تو لگتا تھا کہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہے لیکن اب وہ چراغِ سحری کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے اپنی بوڑھی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ماں کی کھلی آنکھیں دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں جھلملا گئیں۔ وہ جو بڑے سے بڑے خطرے میں گھر کر کبھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا، ماں کے بچھڑ جانے کے ڈر سے رو پڑا۔

''مشابرم خان!'' ماں نے اپنی نحیف آواز میں اسے پکارا تو وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

''پہاڑوں کے بیٹے کی آنکھ میں آنسو اچھے نہیں لگتے بیٹا!'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور اس کا ہر لفظ سننے کے لیے مشابرم خان کو بھرپور توجہ دینی پڑ رہی تھی۔

اس نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اپنی مرتی ہوئی ماں کو اپنے آنسوؤں سے دُکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر کے بتائے حقائق ذہن میں ہونے کے باوجود لہجے میں بشاشت بھرتے ہوئے بولا

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں ماں! آج اتنے دنوں بعد تم نے مجھے دیکھا ہے ورنہ ہر بار تو میں ہی تمہیں دیکھ کر چلا جاتا تھا۔''

''میں بھی بس تجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے جاگی ہوں میرے بیٹے! ورنہ اس جسم میں اب جان نہیں ہے۔'' وہ سچ مچ چراغِ آخرِ شب تھی۔

''ایسا مت کہو ماں! تمہارے سوا میرا اس دنیا میں ہے ہی کون؟'' مشابرم خان نے اس کے گوشت سے محروم ہاتھ کو محبت سے چوما۔

''تو کسی اور کو اپنا بنالے نا۔'' اس نے فرمائش کی۔

''وہ کیسے؟'' مشابرم خان نے اُلجھن آمیز انداز میں استفسار کیا۔

''تو گل سے شادی کرلے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اسے اپنی بہو بناتی۔'' ماں کی خواہش نے اسے بھونچکا کر دیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی ماں اس سے اس کے بھائی کی محبت اور منگ کو اپنانے کی فرمائش کرے گی۔ اکرم خان مر چکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اکرم خان کو اپنی منگیتر سے کتنی محبت تھی اور وہ بھی

اسے چاہتی تھی۔ آخر وہ کیسے اسے اپنا سکتا تھا۔

''انکار نہ کرنا مشابرم خان! یہ میری آخری خواہش ہے۔'' ماں نے اس سے اعتراض کا ہر حق چھین لیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے بعد وہ کیا کہہ سکتا ہے۔ اپنے بھائی کی منگیتر کو اپنانا مشکل تھا تو مری ہوئی ماں کی خواہش کو رد کرنا مشکل ترین۔

''آپ اس سے ملتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ آپ کے پاس مہلت بہت کم ہے۔'' ڈاکٹر کے کہے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے تو انکار کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اگر وہ ناخوش رہ کر ماں کو خوش کر سکتا تھا تو یہ سودا زیادہ مہنگا نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے ماں!..... جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن پہلے تم جلدی سے صحت یاب تو ہو جاؤ تا کہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھ سکو۔'' اس نے ہامی بھرنے کے ساتھ ماں کو بہلانے کی کوشش کی۔

''اب اتنی مہلت نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے کہتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن لب بس ذرا سا کھنچ کر رہ گئے۔

''سوری سر! آپ کو پیشنٹ کے پاس کافی دیر ہو گئی ہے۔ زیادہ بولنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ باہر آ جائیں تا کہ یہ ریسٹ کر سکیں۔''

ایک نرس نے اندر آ کر ماں بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کی تو مشابرم خان کو نہ چاہتے ہوئے بھی باہر جانا پڑا۔ باہر نکل کر وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

زندگی آج اسے عجیب مقام پر لے آئی تھی۔ ایک طرف ماں سے جدائی کی گھڑی سامنے کھڑی تھی تو دوسری طرف اس کی خواہش کو پورا کرنے کی آزمائش سامنے تھی۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔ اسی پل کوئی اس کے برابر میں آ کر بیٹھا اور اس کی پیٹھ شفقت سے سہلانے لگا۔ اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔

''ماموں! آپ.....'' برابر میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہاں ہسپتال میں ماموں سے ملاقات ہو جائے گی۔

''میں اور گل کل رات کو ہی یہاں پہنچے تھے۔ گل نے خواب میں تمہاری ماں کو دیکھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی، بابا! بی جان سے ملنے چلتے ہیں۔ مجھے بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بی جان مجھے یاد کر رہی ہیں۔ بس پھر ہم باپ بیٹی یہاں پہنچ گئے اور خدا کی قدرت دیکھو کہ اچانک ہی تمہاری ماں کو ہوش آ گیا۔ مجھے اور گل کو سامنے دیکھ کر بہت خوش بھی ہوئی اور روئی بھی۔ گل کو شروع سے اس نے اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ اکرم خان زندہ ہوتا تو اب تک اس کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہوتی۔ لیکن اب..... اب تو سب تمہاری مرضی پر ہے۔ اس نے مجھ سے اپنی خواہش ظاہر کی تو میں انکار نہیں کر سکا۔ میں نے یہی کہا کہ اگر مشابرم خان راضی ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے۔ نہ ہی میری بیٹی میری بات ماننے سے انکار کرے گی۔ ہمارے ہاں بہنوں کو خالی ہاتھ لوٹانے کا رواج نہیں ہے اور یہ تو میری مرتی ہوئی بہن کی خواہش ہے۔'' مشابرم خان کا ماموں اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن مشابرم خان خود بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکا۔

''میں بھی ماں کی بات ماننا چاہتا ہوں۔ لیکن بار بار اکرم خان کا خیال آ جاتا ہے۔ گل مینا اس کی منگ تھی اس لیے میں نے ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن اور بھائی کی نظر سے دیکھا۔ اب اچانک اس رشتے کو بدلنا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔'' بالآخر اس نے ماموں کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار کر ہی دیا۔

''ہم سمجھتا ہے بچہ! ہمیں تمہارا دل کا بات معلوم ہے۔ لیکن کبھی کبھی حالات کے ساتھ ساتھ دل کو بھی



انا پڑتا ہے۔ تمہیں اپنا خالہ زاد بھائی یاد ہے نا۔ اس کو تو اپنے بھتیجا بھتیجی کو سہارا دینے کے لیے بھائی کی بیوہ ے نکاح پڑھانا پڑا تھا۔ عمر میں پورے دس سال بڑی تھی وہ عورت لیکن اس جوان کے بچے نے اپنے گھر کی ٹی کے لیے قربانی دی۔ اور آج دیکھ لو، دونوں میاں بیوی کتنے آرام سے رہ رہے ہیں۔ ان کی اور اولادیں ھی ہو گئی ہیں۔ جب بھائی کی بیوہ سے نکاح ہو سکتا ہے تو منگیتر کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ لیکن میں تم پر زور ہیں دیتا۔ جو تمہاری مرضی ہے کرو۔ میں نے جتنی بات کی، وہ بھی بہن کے خیال سے اور تمہارا ماموں ہونے ی وجہ سے ورنہ گل مینا کا باپ ہو کر تو میں ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میری بیٹی مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ اس ے لیے دو رشتے پہلے بھی آئے ہوئے ہیں۔ نہ بھی آتے تو میں اسے زندگی بھر اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔''

مشابرم خان کے ماموں کی رگوں میں دوڑتا پہاڑی خون بول اُٹھا۔ یقیناً اس نے بہن کی وجہ سے جتنی ماجزی دکھا دی تھی، وہ اس کے مزاج کے خلاف تھی اور اب فطری غیرت جاگ اُٹھی تھی۔

''ناراض نہیں ماموں! مجھے معلوم ہے کہ گل مینا جیسی اچھی لڑکی کے لیے کتنے لوگ خواہش رکھتے ہوں گے۔ میں تو بس آپ کو اپنے دل کی بات بتا رہا تھا ورنہ ماں کے دل کی خواہش تو میں رد نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ میرے بزرگ ہیں۔ ماں کی اس آخری خوشی کو پورا کرنے کے لیے میں آپ کو سارے اختیارات دیتا ہوں۔'' آخر کار مشابرم خان نے ہامی بھر ہی لی۔

اس کے بعد کے سارے مراحل بڑی تیزی سے طے ہوئے اور گل مینا جو اس کے بھائی کی محبت تھی، اس کی بنا دی گئی۔ بہت سادگی سے ہونے والے اس نکاح میں کسی قسم کا روایتی اہتمام نہیں تھا۔ نہ گل مینا کو چاندی کی جھانجھریں پہنائی گئی تھیں، نہ اس نے بلتی دولہاؤں کی طرح پھندنے والی سرخ ٹوپی لگائی تھی۔ یہاں تو دولہا دلہن کے لیے نئے جوڑوں کا بھی اہتمام نہیں ہو سکا تھا اور وہ بس چند بولوں کے بدلے ایک دوسرے کے نام لکھ دیئے گئے تھے۔

نکاح کے وقت اس نے گل مینا کو دیکھا تھا۔ سرخ انگارہ آنکھوں والی گل مینا بھی یقیناً اُس کی طرح اس بندھن کے لیے بادل ناخواستہ ہی تیار ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ دل میں پچھتا بھی رہی ہو کہ کیوں پھوپھی کی محبت میں ہوشے سے یہاں کھنچی چلی آئی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ بھی اس کی طرح صرف ماں کی خوشی کے لیے اس راستے میں بندھنے کے لیے راضی ہوئی ہو گی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کی رضامندی معلوم ہی نہ کی گئی ہو۔ ان کے ہاں لڑکیوں سے شادی کے وقت ان کی پسند ناپسند معلوم کرنے کا رواج ہی کہاں تھا؟

اُس نے ایسی ہی اُلٹی سیدھی باتیں سوچتے ہوئے ایجاب و قبول کے مراحل طے کیے لیکن پھر اس کے بعد اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چراغِ سحری کی طرح بھڑکتی اس کی ماں کی زندگی کی لو نکاح کے فوراً بعد ہی بری طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ ڈاکٹرز نے فوراً ہی تمام متعلقین کو باہر نکال دیا کہ مریضہ کو طبی امداد دی جا سکے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے اور انہوں نے آگاہ بھی کر دیا تھا کہ ان کا بچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی آخری سانس تک کوشش تو کرنی ہی تھی۔ ڈاکٹرز کے تمام تر خلوص کے باوجود یہ کوشش رنگ نہ لا سکی اور انہیں بے چینی سے باہر ٹہلتے مشابرم خان، اس کے ماموں اور گل مینا کو بری خبر سنانی پڑی۔

سب کچھ واضح ہونے کے باوجود مشابرم خان کو اپنے حواس جواب دیتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور یوں لگا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ اس خبر کو سننے کے بعد اسے آگے کیا کرنا تھا اور کیا نہیں، اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ بے چارے ماموں کے لیے بھی لاہور اجنبی شہر تھا۔ ہوشے جیسی چھوٹی جگہ سے آ کر وہ یہاں ویسے بھی گھبرایا ہوا تھا، اب جو سر پر یہ نئی افتاد پڑی تو اور بھی پریشان ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ

کسی طرح مشابرم خان کے حواس ہی قابو میں لا سکے۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں موجود گل بینا بھی کچھ کرنے سے قاصر تھی اور سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یہی کام پوری دلجمعی سے کر رہی تھی۔ حواس باختہ کر دینے والی اس صورتِ حال میں لیاقت رانا کی فون کال رحمت ثابت ہوئی۔

انہوں نے شہریار کی سونپی ہوئی دیگر ذمے داریوں کی طرح یہ ذمے داری بھی بہت احسن طریقے سے سنبھال رکھی تھی اور مسلسل مشابرم خان کی ماں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ ہسپتال انتظامیہ کو حکم تھا کہ کسی بھی غیر معمولی بات کی اطلاع انہیں ضرور دی جائے چنانچہ مشابرم خان کی ماں کی موت کی اطلاع بھی انہیں پہنچا دی گئی تھی۔ وہ فوراً ہی ایکٹیو ہو گئے اور مشابرم خان کو فون کر کے تدفین کے سلسلے میں اس کی رائے لینے لگے کہ آیا وہ ماں کی یہیں تدفین پسند کرے گا یا ان کی ڈیڈ باڈی بلتستان میں واقع اپنے گاؤں لے جانا پسند کرے گا۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے خود انتظامات کروانے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ ان کا فون سن کر مشابرم خان ذرا ہوش میں آیا اور سوچنے سمجھنے کے لائق ہو سکا۔

کاندے میں اب اس کا کچھ نہیں بچا تھا جس کے لیے وہ وہاں جانے کی خواہش کرتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اپنی زمین سے کتنا پیار تھا۔ اگر مرنے سے پہلے اس سے اس کی رائے پوچھی جاتی تو وہ یقیناً اسی زمین میں دفن ہونے کی خواہش کرتی۔ اس نے ماں کی اُن کہی خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور لیاقت رانا سے بلتستان جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ بلتستان جس کے پہاڑوں میں اس کے باپ اور بھائیوں کی قبریں تھیں اور اب وہ وہاں ایک اور قبر میں اضافے کے لیے جانے کو تیار تھا۔ تکلیف کے ان لمحات میں اس کے دل نے شہریار کو بڑی شدت سے یاد کیا اور ماں کے ساتھ ساتھ بھائیوں جیسے مہربان باس کے لیے بھی چند آنسو سے چھلک پڑے۔

وہ اتنا مہربان تھا کہ آج اس کے نہ ہونے کے باوجود بھی اس کا کیا ایک انتظام اس مشکل گھڑی میں اس کے لیے سہارا بن گیا تھا۔ ورنہ لیاقت رانا کو کیا پڑی تھی کہ ایک عام سے ڈرائیور کی فکر کرتے؟ وہ دل کی گہرائیوں سے دعا کرنے لگا کہ اللہ کوئی ایسا معجزہ دکھا دے کہ ایک بار پھر اسے شہریار کا ساتھ نصیب ہو جائے اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اگر اُسے ایک بار پھر یہ موقع ملتا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاں فشانی سے اس کی خدمت کرتا۔

❀----✪----❀

سلّو کو وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں شامل کر لیا گیا ہے۔''

یہ خبر سن کر شہریار انگشت بدنداں رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بھی وی آئی پی کا سکیورٹی اسٹاف ایسے ہی چلتے پھرتے نہیں رکھ لیا جاتا۔ اس مقصد کے لیے بہت دیکھ بھال کر قابلِ اعتماد لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں چار دن ہوئے وطن واپس آئے سلّو کو ملازمت دے دی گئی تھی۔ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ ملازمت ریاض انور کی خصوصی سفارش پر دی گئی ہے۔

ریاض انور اور وزیراعلیٰ صاحب میں خصوصی دوستانہ مراسم تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات رد نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ایک بار ریاض انور صرف اس وجہ سے عین وقت پر الیکشن میں بیٹھ گیا تھا کہ اس کا حریف موجودہ وزیراعلیٰ کی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی پارٹی کی خواہش پر انہوں نے ریاض انور سے فرمائش کی تھی کہ وہ ان کے امیدوار کے مقابل کھڑا نہ ہو۔



ریاض انور نے دوستی نبھانے کے لیے اتنی بڑی بات مان لی تھی لیکن یہ بھی کہا جاتا تھا کہ معاملہ صرف دوستی کا نہیں تھا، درونِ خانہ کوئی خاص ڈیل ہوئی تھی جس کے سبب ریاض انور کو لگ بھگ اتنا ہی فائدہ ہوا تھا جتنا کہ ایم پی اے بننے کی صورت میں ہوتا۔ ڈیل کا ایک ثبوت یوں بھی ملا کہ اگلے الیکشن میں وزیراعلیٰ کی پارٹی نے ریاض انور کے حلقے سے اپنا کوئی امیدوار کھڑا ہی نہیں کیا اور ریاض انور نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن جیتنے کے بعد وزیراعلیٰ کی پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ ماضی کے معاملات جو بھی تھے، بہرحال ابھی تو سلّو کے وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں شامل ہونے کا مسئلہ تھا۔

سلّو کی یہ ملازمت خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی اور یقیناً اس کے پیچھے کوئی گہری سازش تھی۔ سازش خدانخواستہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی، تب بھی ریاض انور پر براہِ راست کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ ظاہراً تو وہ سلّو کے لیے بس ایک سماجی لیڈر کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس نے اپنے تعلقات استعمال کر کے برسوں بعد وطن واپس آنے والے ایک نوجوان کے لیے روزگار کا بندوبست کیا تھا جس میں ظاہر ہے کوئی برائی نہیں تھی۔ بعد میں وہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا، خلوصِ نیت سے کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سلّو کی نیت میں کھوٹ ہے یا یہ کہ وہ دشمن کی قید سے دشمن کا ایجنٹ بن کر آیا ہے، اس بات کی کسے خبر تھی۔ ریاض انور کی اچھی شہرت کے باعث اس کا یہ عذر قبول کر لیا جاتا لیکن شہریار کی تو یہ خواہش تھی کہ سلّو کا وار چلنے ہی نہ دے اور کسی نقصان سے قبل ہی اسے قابو کر لے۔ چنانچہ وہ فوری طور پر سرگرم ہو گیا۔ یہ تو اسے ذرا سی تفتیش سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اگلے ہفتے وزیراعلیٰ کے بیٹے کا ولیمہ ہے اور ولیمے کی اس دعوت میں صدر اور وزیراعظم سمیت ملک بھر سے بہت سی سیاسی اور سماجی شخصیات شرکت کے لیے آئیں گی۔ اس حساب سے اس تقریب میں سکیورٹی کے سخت انتظامات کا بھی اندازہ تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سلّو کے لیے جگہ ہی سکیورٹی اسٹاف میں بنائی گئی تھی اور یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ جہاں محافظ سے ہی حملے کا ڈر ہو، وہاں کوئی بھی سکیورٹی پلان کامیاب ہونے کا امکان نہیں رہتا۔

''مجھے بھی اپنے ایک بندے کے لیے وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں جگہ چاہیے۔'' اس بات کا تعین کر لینے کے بعد کہ سلّو دہشت گردی کی جو بھی کارروائی کرے گا، اس کے لیے دعوتِ ولیمہ سب سے بہترین موقع ہو گا تو اس نے کرنل توحید سے مطالبہ کیا۔

''یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ سکیورٹی اسٹاف میں اتنی اچانک اور آسانی سے کسی کو شامل نہیں کیا جاتا۔'' اس کا مطالبہ سن کر انہوں نے اعتراض کیا۔

''کمال ہے۔ ریاض انور جیسا دوغلا اور ملک دشمن آدمی تو یہ کام لمحوں میں کر لیتا ہے لیکن آپ کے لیے یہ مشکل ہے؟'' اس نے جھنجلا کر انہیں آڑے ہاتھوں لینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔

''وہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے، یہ تم بھی جانتے ہو۔ سلّو کو وزیراعلیٰ نے خود اپنی ذمے داری پر اپائنٹ کیا ہے اور اس کے ہر عمل کے لیے وہ خود جواب دہ ہوں گے۔ کسی متعلقہ محکمے یا افسر پر اس کی ذمے داری عائد نہیں ہو گی..... جبکہ میں اس حساب سے مجبور ہوں کہ میرا وزیراعلیٰ سے براہِ راست ایسا کوئی تعلق نہیں بنتا کہ وہ ریاض انور کے سفارشی کی طرح میرے سفارشی کو بھی فٹافٹ اپنے سکیورٹی اسٹاف میں شامل کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کروں گا، تب بھی تھرو پراپر چینل ہی کام کرنا ہو گا اور ڈر ہے کہ میرا بھجوایا ہوا بندہ خود نظروں میں آ جائے۔ ہم سے تو سیاست دان ویسے ہی بدکتے ہیں۔ وزیراعلیٰ میرے بھیجے ہوئے بندے کو سکیورٹی گارڈ سے بڑھ کر آئی ایس آئی کا کوئی جاسوس سمجھیں گے۔'' کرنل توحید

نے بہت تحمل سے اس پر صورتِ حال واضح کی تو جھنجلاہٹ کی جگہ بے بسی نے لے لی۔

''ایسی صورت میں تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے سر!..... دشمن کو کھل کھیلنے کا موقع مل جائے گا۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہماری پہنچ ہی نہیں ہے، ہم کیا کر سکیں گے؟''

''تم اتنی ٹینشن مت لو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تھوڑی مہلت دو کہ میں وہاں تمہاری اور تمہارے کسی بندے کی موجودگی کو ممکن بنانے کے لیے جائزہ لے سکوں۔''

انہوں نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا تو اسے بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوا کہ کرنل توحید کتنے مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں جنہوں نے خراب حالات کا اندازہ ہونے کے باوجود کسی قسم کی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا..... جبکہ خود اس کا یہ حال تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح، کسی کو سلّو کے سر پر مسلط کر دے تاکہ اس کی بہترین نگرانی ہو سکے۔ ریاض انور سے وہ البتہ بعد میں ذرا اطمینان سے نمٹنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا کیونکہ جانتا تھا کہ سلّو کی طرح ریاض انور سے فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کرنل توحید نے اس سے دوبارہ تقریباً دس گھنٹے بعد رابطہ کیا۔

''سلّو کی نگرانی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں آئی ایس آئی کا ایک بندہ بھی شامل ہے۔ موجودہ حالات میں، میں نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے ذمے داری سونپ دی گئی ہے کہ وہ سلّو کی نگرانی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ روٹین سے ہٹ کر بھرتی کیا جانے والا یہ شخص کسی سازش میں تو ملوث نہیں ہے۔ اس لیے تم بے فکر رہو کہ سلّو کسی بڑی تخریبی کارروائی کا بندوبست کر لے گا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہو سکے گی۔''

''تھینک یو سر!..... میری بھی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح سلّو کو نظر میں رکھا جا سکے۔ اس طرح کسی بہت بڑی کارروائی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے اور صرف یہ خدشہ رہے گا کہ وہ دعوت میں موجود کسی خاص شخصیت کو نشانہ نہ بنا لے۔ سب سے زیادہ خطرہ صدر اور وزیرِ اعظم کے لیے ہے۔ سلّو کے جو کوائف ہمارے پاس موجود ہیں، اس کے مطابق وہ بہت ماہر اور شاندار نشانچی ہے۔۔ اور ظاہر ہے کہ سکیورٹی اسٹاف میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کے پاس گن تو لازماً موجود ہو گی۔ وہ بے شک وہاں کوئی بم بلاسٹ نہیں کر سکے گا لیکن اپنے پاس موجود گن سے دو چار گولیاں چلا کر پورے ملک میں تہلکہ مچا دے گا۔ آپ جانتے ہیں نا کہ یہاں کسی وی آئی پی کی موت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہمارے وی آئی پیز خود زمین کے اندر جاتے جاتے بھی بے گناہ عوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کھینچ لے جاتے ہیں۔'' وہ از حد فکر مند تھا۔

''اس خطرے سے نمٹنے کے لیے تمہیں ہی کچھ کرنا ہو گا۔'' کرنل توحید نے جواب دیا۔

''مگر کیسے؟..... میرے ہاتھ پیر تو بندھے ہوئے ہیں۔ میرے پاس اس تقریب میں شامل ہونے کا کوئی راستہ ہوتا تو میں سلّو سے نمٹ لیتا۔ لیکن اب تو بالکل مجبور ہوں۔ اگر مجھے حفاظت کے بجائے تخریب کاری کے لیے وہاں جانا ہوتا تو پھر بھی اتنی مشکل نہیں ہوتی اور میں زبردستی وہاں جا گھستا۔ لیکن اب کیا کروں؟ رہ رہ کر اسی بات پر پچھتا رہا ہے کہ آتے کے ساتھ ہی سلّو کو شوٹ کیوں نہ کر ڈالا۔ اسے اتنی چھوٹ کیوں دے دی؟'' اس نے یہ سوچے بغیر کہ کرنل توحید اس کی باتوں سے اسے نا اہل آدمی تصور کر سکتے ہیں، ان کے سامنے اپنے مسائل بیان کیے کیونکہ اس وقت مسئلہ اپنی ذاتی انا یا خودداری کی حفاظت کا نہیں، ملکی سلامتی کا تھا جس کے آگے کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

''اتنے جذباتی پن سے نہ سوچو۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک ہے۔ سلّو کو گولی مار دینا کوئی حل نہیں تھا۔



ب بھی تم حالات دیکھ کر اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے کہ تم اور تمہارا ایک ساتھی اس مت میں شریک ہو سکیں۔ تم ایک ٹی وی رپورٹر کے ساتھ کیمرہ مین کی حیثیت سے اس تقریب کی کوریج کے لیے جاؤ گے جبکہ تمہارے ساتھی کے لیے میں نے بیروں میں جگہ بنا لی ہے۔ تم بتا دو کہ کسے اپنے ساتھ رکھنا پسند کرو گے؟ تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی آئی ڈی کارڈ وغیرہ بنوایا جا سکے۔'' انہوں نے ایسی خوش خبری سنائی کہ اس کا دل جھوم اٹھا اور ساری ٹینشن دُور ہو گئی۔ اب کم از کم سلّو اندھیرے کا تیر بن کر کسی کو میں نہیں لے سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان نے اپنی ماں کی تدفین کاندے میں کی تھی۔ اسے اکرم خان کی قبر کے ساتھ ہی جگہ ملی تھی۔ شاید یوں ایک ماں کو دوبارہ اپنے اس بیٹے کا قرب مل گیا تھا، جس کے بچھڑ جانے کے غم نے اسے ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا۔

تدفین میں شرکت کے لیے ہوشے سے اس کے ماموں کے خاندان کے باقی افراد بھی کاندے آ گئے تھے۔ گل مینا، اس کی بھابی اور ماں نے مل کر مشابرم خان کے گھر کا نظام سنبھال لیا تھا کئی دنوں سے بند گھر کی صفائی پونچھ کر کے اسے دوبارہ رہنے کے قابل بنا لیا گیا تھا۔ غم بانٹنے کے لیے وہاں آنے والی گاؤں کی عورتوں کے لیے بھی وہی تینوں نمٹتی تھیں۔ رواج کے مطابق پہلے تو گاؤں کے مختلف گھروں سے کھانا بھیجا گیا پھر انہوں نے خود گھر کا چولہا جلا لیا۔ وہاں غربت و افلاس کے ڈیرے تھے اور کوئی بھی اتنا خوش حال نہیں تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو مسلسل تین وقت کا کھانا بھیجتا رہے۔ اس لیے مشابرم خان نے خود اس سلسلے کو روک دیا تھا۔ ماں کی تدفین ہو جانے کے باوجود وہ فوری طور پر وہاں سے روانہ نہیں ہوا تھا اور دو چار دن اپنے گھر اور گاؤں میں رہنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے ماموں کے خاندان نے البتہ تیسرے دن ہی واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

''اگر تم چاہو تو ان لوگوں کے ساتھ ہوشے جا سکتی ہو۔'' سب لوگ روانگی سے قبل بیٹھے قہوے کے گھونٹ بھر رہے تھے جب اس نے گل مینا سے یہ بات کہی۔

''یہ اب ہمارے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟ یہ یہیں رہ کر تمہاری خدمت کرے گی اور تم جہاں رہو گے ہمارے ساتھ جائے گی۔ ہمارے ہاں بیاہی بیٹیاں میکے میں نہیں رہتیں بلکہ خاوند کے ساتھ رہ کر اس کی خدمت کرتی ہیں۔''

گل مینا کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کا باپ بول اٹھا تو مشابرم خان کو خاموش ہونا پڑا۔ بے چاری گل مینا تو شروع سے ہی خاموش تھی اور نظریں جھکائے کسی چابی کی گڑیا کی طرح اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

اس وقت میں مشابرم خان کو اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ اس ٹینشن یا باپ کے ردِ عمل میں سے کس بات پر خوش اور کس پر ناخوش تھی۔ قہوہ پی کر سب لوگ رخصت ہوئے تو گل مینا نے خالی پیالیاں سمیٹیں اور انہیں دھونے کے لیے لے گئی۔ مشابرم خان اکیلا ہی گھر کے آنگن میں رہ گیا۔ اس طرح اکیلے بیٹھ کر اسے شدت سے تنہائی کا احساس ہوا اور وہ وحشت زدہ سا ہو کر ماں کی قبر پر جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

قبرستان میں بالکل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں وہ سکون سے ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہا۔ ساتھ ہی اکرم خان کی قبر بھی تھی لیکن وہ اس قبر سے ایسے نظریں چرا رہا تھا جیسے اکرم خان اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہو اور نظریں ملیں تو شکوہ کرنے لگے کہ بھائی! تم نے میری محبت اور منگیتر کو اپنے نام کیسے لکھوالیا؟ کافی دیر ماں کی قبر پر گزارنے کے بعد وہ واپس پلٹا تو یہاں سے روانگی کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''تیاری کرلو۔ کل صبح ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' گھر پہنچتے ہی اس نے گل مینا کو یہ حکم سنایا جس کے جواب میں وہ زبان سے کچھ نہیں بولی لیکن اس کی حرکات وسکنات سے اس نے اندازہ کرلیا کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں روانگی کی تیاری کر رہی ہے۔ اس تیاری میں اپنا اسباب سمیٹنے کے ساتھ ساتھ گھر میں موجود سامان کو محفوظ طریقے سے رکھنا بھی شامل تھا۔

وہ مشابرم خان کے معمول سے واقف تھی کہ جب وہ شہر جاتا ہے تو طویل مدت تک واپس پلٹ کر نہیں آتا اس لیے ضروری تھا کہ گھر میں موجود سامان کو اس طریقے سے رکھا جائے کہ لمبی مدت تک بحفاظت رہ سکے۔ اس کام کو نمٹانے کے ساتھ ساتھ اس نے رات کا کھانا بھی تیار کیا اور سلیقے سے لا کر مشابرم خان کے سامنے رکھ دیا۔ مسور کی دال اور سرخ موٹی موٹی روٹیوں پر مشتمل یہ کھانا اسے بس کاندے میں ہی ملتا تھا شہری بود و باش میں ایسے کھانے کا کوئی گزر نہیں تھا۔ وہاں وہ چھنے ہوئے سفید آٹے کی پتلی پتلی چپاتیاں کھاتا تھا لیکن اسے اپنے گاؤں میں اُگنے والی ناقص گندم کے آٹے کی روٹیاں اب بھی بھاتی تھیں۔

کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نکاح کے بعد یہ پہلی رات تھی جب وہ اور گل مینا ایک چھت کے نیچے تنہا تھے لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے جھجک رہے تھے۔ چنانچہ وہ پوری رات سوچتے جاگتے عجیب اضطراب کے عالم میں گزری۔ کل قبرستان سے واپس گھر آتے ہوئے وہ سواری کا انتظام کرتا ہوا آیا تھا اس لیے اس طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی، بس وقتِ مقررہ پر روانہ ہونا ضروری تھا۔

گل مینا نے صبح اُٹھ کر چابک دستی سے سب کام نمٹالیا۔ سامان تک وہ رات کو ہی سمیٹ کر رکھ چکی تھی ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے برتن دھو کر رکھے اور پھر وہ لوگ گھر کو اچھی طرح بند کر کے روانہ ہو گئے کاندے سے اسکردو تک کا سفر انہوں نے بذریعہ جیپ طے کیا۔ اس سفر میں ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ راستے بھر مشابرم خان کی ان لوگوں سے ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ البتہ گل مینا کا سفر خاموشی سے کٹا۔

اسکردو پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر گل مینا کو وہاں ٹھہرایا اور خود آگے کے سفر کے لیے ڈائیوو کے ٹکٹ لینے چلا گیا۔ ٹکٹ اسے مل گئے لیکن یہ اگلے دن کے تھے۔ آج کے دن یہاں سے لاہور جانے والی آخری ڈائیوو اس کے پہنچنے سے کچھ دیر قبل روانہ ہو چکی تھی۔

ٹکٹ حاصل کر کے وہ سیدھا ہوٹل کی طرف نہیں گیا۔ وہاں جانے کے لیے اس کا دل راضی ہی نہیں تھا۔ دل کی یہ کیفیت اس وجہ سے نہیں تھی کہ اسے گل مینا پسند نہیں تھی۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی اگر اس کی اکرم خان سے رشتے کی بات نہ چلی ہوتی تو وہ خود اس سے رشتہ جوڑنے میں خوشی محسوس کرتا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس نے گل مینا کے انداز میں بھی اپنے لیے جھجک محسوس کی تھی اور اسے یوں لگا تھا کہ وہ زبردستی اس نئے رشتے میں باندھ دی گئی ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ مزید کوئی جبر نہیں کرنا چاہتا تھا جان بوجھ کر اس سے دور رہ رہا تھا۔

اس وقت بھی ہوٹل جانے کے بجائے وہ خیالوں میں اُلجھا اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ بے خیالی ایسی تھی کہ اسے



ہی نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے قدم اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے وہ شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر ویرانے میں جا نکلا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کئی گڑھے بھی تھے۔

اس کے قدموں سے تھکن لپٹی تو وہ آرام کے لیے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اسے اس اندھیرے میں بیٹھ کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک سکون اور ٹھنڈک سی اُس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی ہو لیکن وہ زیادہ تر اس منظر پر اپنا ارتکاز قائم نہیں کر سکا۔ کوئی بہت دھیمی سی آواز تھی جو اسے اپنی پشت پر سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ یہاں اس ویرانے میں انسانی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ پوری توجہ سے اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہیلو..... زیرو زیرو ون..... دِس اِز زیرو زیرو ٹو کالنگ یو۔'' غور کرنے پر اسے الفاظ سمجھ آنے لگے تو اس کے سارے حواس جاگ اُٹھے۔ یہاں کوئی آدمی تھا جو چھپ کر ٹرانسمیٹر پر کہیں رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یقینی طور پر اس کے دوست ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ احتیاط سے کچھ اور اس سمت کھسک گیا جہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس بار اسے اندازہ ہو گیا کہ بات کرنے والا ایک گڑھے میں دبکا ہوا ہے اور بار بار کسی زیرو زیرو ون کو پکار رہا ہے۔ آخر کار اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں مر گئے تھے؟..... میں کب سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔ اوور۔'' کال ریسیو کرنے والے پر اس نے اپنا غصہ نکالا۔

''میں کھانا کھانے چلا گیا تھا۔ تم کہو، کیا خبر ہے؟ اوور۔'' دوسری طرف کی آواز قدرے مدھم ہونے کے باوجود مشابرم خان نے ہر لفظ واضح طور پر سنا۔

''تجھے ان حالات میں کھانے کی پڑی تھی۔ اگر باس کو پتہ لگ گیا نا تو تجھے اپنے پالتو کتوں اور بھیڑیوں کے آگے ڈال دے گا، اوور۔'' خود کو زیرو زیرو ٹو کہنے والے نے غصے کا اظہار کیا۔

''بھاشن چھوڑ اور یہ بتا کہ خبر کیا ہے؟ اوور۔'' دوسری طرف کوئی ڈھیٹ بندہ تھا جس نے ڈرے بغیر بیزاری سے پوچھا۔

''مچھلی دریا میں آ گئی ہے۔ تم لوگ اپنی جگہ پر کانٹا ڈال کر بیٹھ جاؤ، اوور۔'' اس نے جو جواب دیا، وہ کوڈ ورڈز میں تھا اس لیے مشابرم خان کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس سلسلے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

''ہم بالکل تیار ہیں۔ تم فکر نہ کرو اور آرام سے جا کر سو جاؤ۔ کل صبح کا اخبار تمہیں مچھلی کے شکار کی تفصیل سنائے گا۔ اوور اینڈ آل۔'' دوسری طرف موجود شخص کی آواز میں ایسی سفاکی در آئی تھی کہ مشابرم خان نے اپنے وجود میں پھریری سی دوڑتی محسوس کی اور کچھ نہ سمجھنے کے باوجود وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ ٹرانسمیٹر پر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے وہ دو لوگ کسی خطرناک گہری سازش میں شامل ہیں۔ دوسرے شخص تک تو اس کی رسائی نہیں تھی لیکن یہاں موجود شخص کو وہ اب بخشنے والا نہیں تھا۔ اس شخص کے گڑھے سے باہر نکلنے سے قبل وہ خاموشی سے حرکت میں آیا اور خود گڑھے کے کنارے پر جا پہنچا۔

''ہاتھ اٹھا کر شرافت سے باہر نکل آؤ ورنہ گولی مار دوں گا'' کنارے پر کھڑا ہونے کی وجہ سے اسے گڑھے میں موجود شخص نظر آ رہا تھا۔ اسے نشانے پر رکھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں حکم دیا تو وہ شخص جو اس ویرانے میں کسی کی موجودگی کا گمان نہیں رکھتا تھا، بری طرح اُچھل پڑا۔ لیکن اچانک لگنے والے جھٹکے کے باوجود اس کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ اس نے مشابرم خان کے حکم پر عمل کرنے کے بجائے بہت تیزی سے

حرکت کرتے ہوئے اس پر ایک فائر جھونک دیا تھا۔ مشابرم خان نے اس کے ریوالور سے نکلنے والا شعلہ دیکھ لیا تھا اس لیے پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا لیکن ہٹتے ہٹتے بھی اس نے ایک فائر جھونک دیا تھا۔

اب یہ اُس کی قسمت کی خوبی تھی یا گڑھے میں موجود شخص کی بدقسمتی کہ بغیر کسی نشانے کے چلائی گئی اندھی گولی سیدھی اس کے ہاتھ پر جا کر لگی جس میں اس نے ریوالور تھام رکھا تھا۔ اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔ مشابرم خان یہ تو نہیں جانتا تھا کہ اس کی چلائی گئی گولی نے کیا کمال دکھایا ہے لیکن چیخ سن کر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔

اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر خود بھی گڑھے میں چھلانگ لگا دی اور سیدھا اس شخص پر جا کر گرا۔ پہلے سے زخمی وہ شخص مشابرم خان کے مضبوط جسم کے نیچے دب کر بری طرح ڈکرایا لیکن پھر اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیئے اور دونوں گھٹنوں کو موڑ کر مشابرم خان کی ناف کے نیچے ضرب لگائی۔ اس ضرب کو کھا کر مشابرم خان بری طرح بلبلا اُٹھا اور غصے میں ایک زوردار تھپڑ اپنے مقابل کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اُس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اندھیرے کی وجہ سے مشابرم خان کو خون نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے ہاتھوں نے خون کی چپچپاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

جنونی کیفیت میں اُس نے اپنے مقابل کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑا اور گڑھے کی دیوار پر اس کا سر دے مارا۔ اس ضرب کو کھا کر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ڈھیلے پڑ جانے والے ہاتھ پیروں نے مشابرم خان کو ڈرا دیا کہ کہیں وہ جان سے ہی نہ چلا گیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اس کی نبض چیک کی تو اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہوا ہے۔ اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کی اندرونی جیب میں حفاظت سے رکھا ہوا موبائل باہر نکالا اور اس میں موجود ٹارچ کو روشن کیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اب وہ اس شخص کے نقش و نگار کا جائزہ لے سکتا تھا۔ گوری رنگت، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے چغلی کھائی کہ وہ کوئی مقامی آدمی ہی ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا گھیرا شلوار قمیض پہن رکھا تھا اور مقصد یقیناً خود کو اندھیرے میں گم کر لینا تھا۔ اگر مشابرم خان اتفاقاً اس طرف نہ نکلتا تو وہ بڑے آرام سے اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے نکل جاتا۔

ٹارچ کی روشنی میں مشابرم خان نے اس کے زخموں کا بھی جائزہ لیا۔ ہاتھ پر لگنے والی گولی نے اس کی کلائی کی ہڈی کو تھوڑا سا نقصان پہنچایا تھا لیکن گولی اندر نہیں تھی، جسم سے باہر نکل گئی تھی۔ زخم سے خون کا معمولی اخراج اب بھی جاری تھا۔ منہ پر بھی تھوڑا خون جما ہوا تھا۔ البتہ اس نے سر پر جو ضرب لگائی تھی، اس سے خون تو نہیں نکلا تھا لیکن ایک بڑا سا گومڑ ضرور بن گیا تھا۔

بے ہوش آدمی کے معائنے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اس کی جامہ تلاشی لی تو چمڑے کا ایک پرس برآمد ہوا۔ پرس میں اس کا شناختی کارڈ اور چند ہزار کی رقم موجود تھی۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام احمد یار خان لکھا تھا اور اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ وہ اسکردو گلگت کا رہنے والا ہے۔

مشابرم خان نے موبائل میں موجود ٹارچ کو گڑھے میں اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا تو اُسے اُس شخص کا ریوالور کے علاوہ ٹرانسمیٹر بھی مل گیا۔ ان سب چیزوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد اُس نے اس آدمی کی شلوار سے ازار بند کھینچ کر نکالا اور اس کی مدد سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے نتیجے میں وہ کراہتا ہوا ہوش میں آ گیا۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں اسے مشابرم خان کا چہرہ صحیح طرح نظر نہیں آ



تھا لیکن اسے دیکھتے ہی یہ یاد آ گیا تھا کہ بے ہوش ہونے سے قبل اس پر کیا گزری تھی۔

''کک..... کون ہو تم؟ اور مجھ سے تمہیں کیا دشمنی ہے؟'' دانتوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس سے صحیح طور پر بولا نہیں جا رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے یہ جملے ادا کر پایا تھا۔

''دشمنی اور دوستی کا تعین اس وقت ہو گا، جب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے۔'' مشابرم خان نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''میرا نام احمد یار ہے۔ میں یہیں کا رہنے والا ہوں اور پولیس میں ملازمت کرتا ہوں۔'' اس نے بغیر کسی جھجک کے اپنا تعارف کروا دیا۔ نام اور پتہ تو مشابرم خان نے اس کے شناختی کارڈ پر خود بھی دیکھ لیا تھا، پیشے کا سن کر چونک پڑا۔

''پولیس میں کس عہدے پر کام کرتے ہو؟''

''میں اے ایس آئی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس ٹرانسمیٹر کا کیا کام ہے؟ کسی اے ایس آئی کے پاس میں نے کبھی ٹرانسمیٹر نہیں دیکھا۔ اس کے محکمۂ پولیس سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ تھوڑی نرمی سے کام لے رہا تھا لیکن اس کے شکوک و شبہات بہرحال دور نہیں ہوئے تھے۔ ''جھوٹ بولنے سے پہلے خیال رکھنا کہ میری بہت اوپر تک پہنچ ہے اور میں تمہارے محکمے سے تصدیق کر سکتا ہوں۔'' اس نے احمد یار کو تنبیہہ کی۔

''یہ میرا ذاتی شوق ہے۔'' احمد یار نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''شوق..... شوق میں ٹرانسمیٹر کون اپنے پاس رکھتا ہے؟'' مشابرم خان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس ہم چند دوستوں نے ایسے ہی شوق شوق میں دو تین ٹرانسمیٹر خرید لیے تھے اور کبھی کبھار ایک دوسرے سے رابطے کے لیے انہیں استعمال کر لیتے ہیں۔'' وہ ایک ایسی بات کہہ رہا تھا جو کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔

''اور اس کے لیے تم ایسے ویرانوں کا استعمال کرتے ہو؟'' مشابرم خان نے طنز سے پوچھا۔

''ہاں۔ کیونکہ لوگوں کے درمیان استعمال کرنے سے مسئلہ ہو سکتا تھا۔ کوئی شکایت کر دیتا تو خوامخواہ ہماری کھنچائی ہو جاتی۔'' وہ پوری ڈھٹائی سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

''بکواس بند کرو اور سچ سچ بتاؤ کہ تم کس مچھلی کے شکار کی بات کر رہے تھے؟'' اس بار مشابرم خان نے اس سے سختی سے پوچھا۔

''میرے دوستوں نے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا تھا لیکن جا نہیں سکا۔ بس انہیں بتا رہا تھا کہ شکار کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا۔'' اس نے کوئی اثر لیے بغیر اسی اطمینان سے جواب دیا۔ اس بار مشابرم خان کا ہاتھ اُس پر اُٹھ گیا۔

''میں نے تیری بکواس بہت سن لی۔ اب سچ بولنا شروع کر دے ورنہ ساری ہوشیاری ناک کے راستے باہر نکال دوں گا۔'' وہ غرّایا۔

''میں نے سچ بتا دیا، یقین کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی ہے۔'' مشابرم خان کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ کھا کر بھی وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ اس بار مشابرم خان نے اس پر اپنا ہاتھ چھوڑا تو روکنا گوارا نہیں کیا۔ جگہ اور درد کی شدت کا تعین کیے بغیر وہ اسے بے تحاشا پیٹتا چلا گیا۔ غیر ملکی ساخت کے ٹرانسمیٹر نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ مقامی ہونے کے باوجود وہ ملک دشمنوں کا آلۂ کار ہے۔ پھر کچھ اس کی ذاتی فرسٹریشن بھی تھی جسے نکالنے کا

موقع مل گیا تھا اس لیے اس نے احمد یار کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ چیختا چلاتا اُس کی مار سہتا رہا لیکن ایک بار بھی یہ نہیں بولا کہ سچ بتانے کے لیے راضی ہے۔ اُس کی اس ڈھٹائی کو دیکھ کر مشابرم خان کو مزید تاؤ آ گیا اور اُس نے اُس کی زخمی کلائی پکڑ کر اُسے ایک جھٹکا دیا۔ گولی نے ویسے ہی اُس کی کلائی کا حشر بگاڑ دیا تھا۔ مشابرم خان نے جھٹکا دیا تو وہ بری طرح بلبلا اُٹھا۔

''ابھی یہ صرف ایک جھٹکا ہے۔ تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے اس زخم میں اُنگلی ڈال کر اتنی بری طرح کریدوں گا کہ تمہاری روح تک بلبلا اُٹھے گی۔''

مشابرم خان نے اُسے سفاکی سے دھمکی دی۔ ملک دشمنوں کے لیے ویسے بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ احمد یار نے اس کی دھمکی کو سمجھ کر زبان کھولنے میں ہی عافیت جانی۔

''بب..... بتاتا ہوں، رُک جاؤ۔'' آخر کار اُس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ زبان کھولنے پر راضی ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مشابرم خان کو اس کے چہرے پر بے پناہ اذیت کے آثار نظر آئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ شخص جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

''بولو..... لیکن صرف سچ۔ مجھے جھوٹ کا گمان بھی ہوا تو تمہارے پورے جسم میں آگ بھر دوں گا۔ میرے پستول میں ابھی بہت گولیاں ہیں۔ یہ گولیاں تمہارے جسم کے ایسے حصوں میں اُتاروں گا کہ تم تڑپ اُٹھو گے لیکن موت نہیں آئے گی۔'' گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دیتے ہوئے اس نے ایسی دھمکی دی کہ احمد یار کا اذیت سے مسخ ہوتا چہرہ خوف کی دُھند میں چھپ گیا۔

''میں سچ بول رہا ہوں۔ اصل میں ہم اپنے نظریات و خیالات میں بہت پکے ہیں۔ جو ہمارے خلاف بولتا ہے، اسے ہم زندہ نہیں رہنے دیتے۔ آج جو آخری بس یہاں سے روانہ ہوئی ہے، اس میں ہمارے مخالفین بھی سفر کر رہے ہیں۔ راستے میں اس بس کو میرے ساتھی روک کر اس میں سوار ہمارے خلاف بات کرنے والوں کو قتل کر دیں گے۔''

آخر کار اس نے بھیانک سچائی اُگل ہی دی جسے سن کر مشابرم خان کا خون کھول اُٹھا۔ وہ جنونی قاتل نہ جانے کس کے سدھائے ہوئے تھے لیکن یہ طے تھا کہ ان کے جنون کا نشانہ بننے والے بے گناہ معصوم افراد ہوتے اور پھر قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس واردات کے بعد شروع ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں مزید کئی لوگ مارے جاتے۔

''اپنے ساتھی سے رابطہ کرو اور اسے روکو۔ اس سے کہو کہ کسی وجہ سے یہ مشن روک دیا گیا ہے۔'' اس نے وحشت کے عالم میں احمد یار کا گلا دبوچ لیا۔

''اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے ساتھی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا تو مشابرم خان جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے احمد یار سے سچ اُگلوانے میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ سچائی کا جاننا اس کے لیے بیکار ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو گولی مار دے۔ عالمِ وحشت میں اس نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔ قریب تھا کہ وہ اسے گولی مار دیتا لیکن احمد یار کے سکون نے اسے روک دیا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر یوں پُرسکون ہو گیا تھا جیسے یہی اس کی خواہش اور راہِ نجات ہو۔

مشابرم خان کو یک دم ہی ہوش آ گیا۔ اگر وہ اس شخص کو مار دیتا تو اس کے باقی ساتھیوں اور اس بارے تک کیسے پہنچتا جس کا ذکر اس نے ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھی سے کیا تھا۔ اُس کی انگلی پستول کی لبلبی سے ہٹ گئی اور اس نے ریوالور کا دستہ اُس کے سر پر اتنی قوت سے مارا کہ وہ صرف بے ہوش ہو جائے۔ اس کام سے



فارغ ہو کر وہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس پر سگنل درست طریقے سے نہیں آ رہے تھے۔ مجبوراً اُسے اس گڑھے سے نکل کر واپس سڑک پر آنا پڑا۔ یہاں اس کے اتنے مضبوط روابط نہیں تھے جو وہ اس نازک معاملے کو اوپر تک لے جا پاتا۔ مجبوراً اسے مشورے اور مدد کے لیے یہاں سے بہت دُور لاہور میں بیٹھے ذیشان سے رابطہ کرنا پڑا۔

''تم وہیں رُکو۔ میں کسی سے بات کر کے تمہارا نمبر اسے دیتا ہوں تاکہ کوئی ذمے دار شخص خود تم سے رابطہ کر لے۔'' اس کی زبانی تفصیلات سن کر ذیشان نے اسے ہدایت دی۔ جواباً وہ صرف ''یس سر'' ہی کہہ سکا لیکن اس ویرانے میں تنہا کھڑے ہو کر انتظار میں وقت گزارنا آسان نہیں تھا۔

اتنے ہنگامے کے بعد وہ قنوطیت زدہ کیفیت بھی باقی نہیں رہی تھی جس میں تنہا بیٹھ کر تارے گننا اچھا لگتا ہے۔ اسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ہوٹل کے کمرے میں تنہا موجود گل مینا پریشان ہو رہی ہو گی۔ اسے معلوم تھا کہ ہوشے کی مختصر آبادی میں کھیل کُود کر بڑی ہونے والی گل مینا کی زندگی میں گنتی کے چند ہی ایسے مواقع آئے ہوں گے جب وہ اپنے گاؤں سے باہر نکلی ہو اور ان چند مواقع میں سے کوئی ایک بھی موقع ایسا نہیں ہو سکتا تھا جب اسے کسی ہوٹل میں تنہا رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ لیکن آج اس کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کے ارادے کا بہت زیادہ دخل نہیں تھا اور وہ صرف کچھ دیر باہر کھلی ہوا میں تنہا وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن پھر حالات ہی ایسے ہو گئے کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا اور اب بھی معلوم نہیں تھا کہ کتنی دیر میں خلاصی ہو۔ ذیشان کے کہیں رابطہ کرنے اور کسی ذمے دار شخص کے یہاں تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا۔

اُسے افسوس ہوا کہ ہوٹل سے نکلنے سے قبل اس نے وہاں کا فون نمبر کیوں نہیں لیا، ورنہ کم از کم فون پر ہی گل مینا کے لیے پیغام دے دیتا۔ پیغام ملنے کی صورت میں وہ زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتی لیکن اب تو جانے کیا کیا سوچ رہی ہو گی۔ شاید اسے یہ گمان ہوا ہو کہ مشابرم خان اسے ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر خود کہیں فرار ہو گیا ہے۔ عجیب لایعنی سی سوچیں تھیں جنہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

سوچوں کی اس یلغار سے بچنے کے لیے وہ ایک چکر اس گڑھے تک بھی لگا آیا جہاں احمد یار بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی نبض چیک کر کے اس نے اطمینان کر لیا کہ ابھی اسے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگے گا۔ ویسے اگر وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو بندھے ہوئے ہاتھ پیروں اور زخمی وجود کی وجہ سے وہاں سے فرار ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

احمد یار کی طرف سے اطمینان ہو جانے پر وہ ایک بار پھر سڑک پر واپس آ گیا کیونکہ وہاں سے ہٹ کر موبائل پر سگنل ہی نہیں آ رہے تھے اور ذیشان کے مطابق اس سے تعاون کے لیے آنے والوں میں سے کسی کو پہلے اس کے موبائل پر ہی رابطہ کرنا تھا۔ آخر کار یہ انتظار ختم ہوا اور اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔

''میں میجر اسفندیار بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ مسٹر مشابرم خان ہیں؟'' کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ہی اس کے بارے میں بھی تصدیق چاہی۔

''جی ہاں، میں مشابرم خان ہی ہوں۔ آپ کو میرا نمبر یقیناً میجر ذیشان سے ملا ہو گا۔'' اس نے اپنے بارے میں تصدیق کرتے ہوئے ذیشان کا حوالہ دینا مناسب سمجھا۔

''یس، مجھے اُن کا ریفرنس دیا گیا ہے۔ آپ سب سے پہلے مجھے اپنی لوکیشن سے آگاہ کریں تاکہ ہماری ٹیم آپ تک پہنچ سکے۔'' مزید باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔ مشابرم خان نے بھی

پھر کوئی غیر متعلق بات نہیں کی اور تفصیل سے اس جگہ کے بارے میں بتانے لگا جہاں اس وقت وہ موجود تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ ویٹ کریں، ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ پوائنٹ پر پہنچ کر میں اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس تین بار بجھا کر جلاؤں گا۔ تیسری بار لائٹ جلنے پر آپ روشنی میں آ جایئے گا۔'' لوکیشن کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد میجر اسفندیار نے اسے ہدایت کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

مشابرم خان ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ کر گھڑیاں گننے لگا۔ ویسے تو اس وقت یہاں کسی اور کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن کسی حادثاتی اتفاق سے بچنے کے لیے اس نے یہ احتیاط مناسب سمجھی تھی کہ خود کو چھپا کر رکھے۔ آخر کار اسے سڑک پر گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دے گئی۔ اس آواز کو سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے لیکن اس نے فوری طور پر سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی پتھر کی آڑ میں دبک کر سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔

آخر کار سڑک پر جیپ کی روشنیاں نمودار ہو گئیں۔ یہ متحرک روشنیاں اس سے کچھ فاصلے پر آ کر ساکت ہو گئیں تو وہ سمجھ گیا کہ آنے والے آ گئے ہیں۔ مزید تصدیق گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے تین بار جلنے بجھنے سے ہو گئی۔ تیسری بار بجھ کر لائٹ روشن ہوئی تو وہ سامنے آ گیا۔ فوراً ہی جیپ سے دو تین افراد کود کر اُترے۔

''میجر اسفندیار.....'' آنے والوں میں سے سب سے زیادہ دراز قد شخص نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''میں مشابرم خان ہوں۔ میری ہی اطلاع پر آپ کو زحمت دی گئی ہے۔'' جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں تنہا تھا اس لیے یہ بات قابلِ فہم تھی کہ وہی مشابرم خان ہو سکتا ہے۔

''ہمیں اس مشکوک آدمی تک گائیڈ کر دو۔'' اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر میجر اسفندیار نے اسے حکم دیا تو وہ چپ چاپ ان لوگوں کی راہنمائی کے لیے آگے بڑھ گیا۔ گڑھے میں احمد یار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

''یہ تو خاصا زخمی ہے۔ اسے فوری طبی امداد دینی پڑے گی۔'' وہ لوگ اپنے ساتھ طاقتور سرچ لائٹس لائے تھے جن کی روشنی میں انہوں نے احمد یار کی ابتر حالت کو فوراً ہی محسوس کر لیا۔ اب تک موبائل کی محدود روشنی پر گزارہ کرنے والے مشابرم خان کو بھی پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے احمد یار کے ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو اس کے زخموں کو صحیح ہونے میں خاصا وقت لگتا

''سوری مسٹر خان! آپ کو تکلیف ہو گی لیکن اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ اس شخص کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم یہاں مزید وقت ضائع کر سکیں۔ اگر یہ مر گیا تو ہمارے لیے راستہ بند ہو جائے گا اور ہم سولہ بے گناہ شہریوں کے اصل قاتلوں تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔''

میجر اسفندیار نے جتنے اعتماد سے مقتولین کی تعداد کا ذکر کیا، اس سے مشابرم خان نے سمجھ لیا کہ واقعی احمد یار نے صحیح کہا تھا کہ اب تک اس کے ساتھی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔ احمد یار سمیت جیپ واپسی کے راستے پر گامزن ہوئی تو اس نے میجر سے اس بارے میں تصدیق بھی کر لی۔ اس نے دھیمی آواز میں نہایت دکھ کے ساتھ تصدیق کی کہ واقعی وہ واقعہ پیش آ چکا ہے اور کئی بے گناہ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

میجر اسفندیار کی زبانی واقعے کی تفصیلات سن کر اس کا دل افسردہ ہو گیا پھر وہ سارے راستے کوئی بات



ں کر سکا۔ یہاں تک کہ زخمی کو دو فوجی اہلکاروں کی نگرانی میں ہسپتال پہنچا کر وہ لوگ آرمی کے ایک ٹھکانے لے گئے۔ یہاں مشابرم خان کا تفصیلی بیان ریکارڈ کیا گیا اور پھر اسے ہوٹل واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہار کا ریوالور اور ٹرانسمیٹر اُس نے راستے میں ہی میجر کے حوالے کر دیا تھا اور اس بھرپور تعاون کے بعد وہاں روکے جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ چنانچہ نہ صرف واپسی کی اجازت مل گئی بلکہ اسے پورے ت واحترام کے ساتھ آرمی کی جیپ میں ہوٹل تک پہنچایا گیا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ سیدھا اس کمرے کی طرف گیا جو اس نے اپنے اور گل مینا کے لیے بک کروایا تھا۔ کمرے دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔

''کون.....؟'' اندر سے گل مینا کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو گل! میں ہوں، مشابرم خان۔'' اس نے جواب دیا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اس نے دروازے سے ابھی پہلا قدم ہی اندر رکھا تھا کہ گل مینا اس سے بری طرح لپٹ گئی اور زور زور سے نے لگی۔ مشابرم خان اس افتاد پر بوکھلا گیا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ اس کے اتنی دیر تک غائب رہنے پر وہ گھبرا ی ہو گی لیکن اس درجے خوف زدہ ہو گی، یہ اندازہ نہیں تھا۔

''کیا ہو گیا ہے گل مینا! خود کو سنبھالو۔'' وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟..... یہ بھی نہیں سوچا کہ اکیلی گل مینا یہاں اس اجنبی جگہ پر کیا ے گی؟'' وہ اس سے بدستور لپٹی ہوئی روتے روتے شکوہ کرنے لگی۔

''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا، بس ایک کام میں پھنس گیا تھا۔ تم میری بیوی ہو، بھلا میں تمہیں وڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟'' وہ اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ کمرے کا دروازہ اس نے ہی دھکا دے کر بند کر دیا تا کہ یہ منظر اور گل مینا کی آواز کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔

''تم سچ کہہ رہے ہو..... تم مجھے چھوڑو گے تو نہیں؟'' بے یقینی سے کہتی ہوئی وہ اس سے الگ ہوئی اور ی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''کہہ دیا نا بابا! نہیں چھوڑوں گا۔ چھوڑنا ہوتا تو تمہیں وہیں گاؤں میں چھوڑ کر آ جاتا، یہاں تک لانے ا کیا ضرورت پڑی تھی؟'' اس نے کچھ جھلا کر اسے یقین دلایا لیکن یہ طے تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہونے ہ باوجود اس پر زیادہ غصہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی متورم آنکھیں اور چھوٹی سی سرخ ناک کو دیکھ کر اندازہ ہو تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔

''چھوڑ کر آئے نہیں، لیکن آنا تو چاہتے تھے۔ جب ہی تو مجھے بابا کے ساتھ ہوشے جانے کے لیے کہہ ے تھے۔'' اس نے کاندے والے گھر میں کہی گئی اس کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے شکوہ کیا۔

''وہ تو میں اس خیال سے کہہ رہا تھا کہ اگر تمہارا دل میرے ساتھ آنے کے لیے راضی نہ ہو تو تم اپنے اپ کے گھر چلی جاؤ۔'' مشابرم خان زندگی میں پہلی بار ایسی نازک صورتِ حال میں پھنسا تھا جس میں ہاتھ پیروں سے دشمن کے وار سے بچنے کے بجائے زبان سے ایک نازک اندام حسینہ کے سامنے اپنا ع کرنا پڑ رہا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے ہاں بیاہی ہوئی بیٹیوں کا ماں باپ کے گھر رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا؟'' ے یاقوتی لبوں پر شکوہ مچلا۔

وقت کے ان لمحات میں وہ کہیں سے بھی اکرم خان کی محبوبہ یا منگیتر نہیں لگ رہی تھی، وہ بس ایک بیوی

تھی۔ روایتی بیوی جسے اپنے شوہر کا گھر اور قرب ہی سب سے زیادہ بھاتا ہے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مشاہ
خان کے سارے واہمے اور شکوک بھی اُڑن چھو ہو گئے اور یاد رہا تو صرف اتنا کہ سامنے موجود دل رُبا سی لڑ
اس کی بیوی ہے جس پر اسے شرعی اور قانونی سارے حقوق حاصل ہیں۔ پہلی بار اس نے گل مینا کو صرف ا
صرف اپنے رشتے کے حوالے سے دیکھا تو غیر آباد دل میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔

''معاف کر دو۔ آئندہ کبھی میں تمہیں تمہارے باپ کے گھر بھیجنے کی بات نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ ا
گھر میں اور اپنے پاس رکھوں گا۔'' گل مینا اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑی تھی۔ اس لیے اسے اپنی بانہو
کے حصار میں قید کر لینے میں اسے ذرا مشکل پیش نہیں آئی۔ کچھ دیر قبل بے ساختگی میں اس سے ازخود لپ
جانے والی گل مینا اُس کی اس اچانک پیار بھری پیش قدمی پر سٹپٹا سی گئی لیکن کہیں جائے فرار نہیں تھی۔ وہ
سے دہری ہوتی کسی لچکیلی شاخ کی طرح مشابرم خان کی بانہوں میں لرزنے لگی۔ مشابرم خان نے اس لرز
کانپتی، شرماتی دوشیزہ کو بڑی نرمی اور احتیاط سے اپنے وجود میں سمو لیا۔ پہاڑوں کے سنگلاخ بیٹے نے زندگی
یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا اور بہت خوش تھا۔

⊛----✪----⊛

ولیمے کی تقریب کا اہتمام وزیراعلیٰ ہاؤس میں ہی کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں مہمانوں کی بڑی تعداد
مدعو کیا گیا تھا اور اس حساب سے سکیورٹی کا بھی سخت انتظام تھا۔ وزیراعلیٰ ہاؤس جانے والی سڑک اس روز
ٹریفک کے لیے بند کر دی گئی تھی اور مقررہ اوقات میں صرف وہی لوگ وہاں سے گزر سکتے تھے، جن
پاس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ موجود تھا۔ آنے والوں کو دعوت نامہ دکھانے کے لیے علاوہ اپنی شناخ
بھی ظاہر کرنی پڑتی تھی۔

شہریار جو عادل خان کی شخصیت اختیار کرنے کے بعد ویسے ہی بالکل بدل گیا تھا، اس موقع پر بھی ا
حلیے میں کچھ تبدیلیاں کر کے آیا تھا۔ ہفتے بھر میں اس نے اپنی شیو خاصی بڑھا لی تھی۔ گھنی مونچھوں، کاشک
لینس اور بدلے ہوئے ہیئر اسٹائل نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کافی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ اس
میں اس کے لیے نیوز چینل کے کیمرہ مین کی حیثیت سے کارڈ بھی بنوا دیا گیا تھا اور یوں اس کے دعوت
میں شرکت کا انتظام ہو گیا تھا۔

دوسری طرف جاوید علی پہلے ہی بیرے کی حیثیت سے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کام کے لیے اسے
تھوڑی سی تربیت بھی لینی پڑی تھی جبکہ شہریار کو کیمرہ مین کی جگہ لینے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا
طالب علمی کے زمانے میں اسے فوٹو گرافی کا شوق رہا تھا اور اس شوق میں وہ مختلف کیمروں کے ساتھ
ہینڈی کیم بھی استعمال کرتا رہا تھا۔ چنانچہ اب جو کیمرہ اسے استعمال کے لیے دیا گیا، اس کے بارے میں
بنیادی معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اسے استعمال کرنے کے لائق ہو گیا۔ یوں بھی اس بات سے
فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ تقریب کے مناظر فلما پاتا ہے یا نہیں۔ اس کی تقریب میں شرکت کا مقصد سلو
رکھنا اور اسے دہشت گردی کی کسی کارروائی سے روکنا تھا۔

پورے ہفتے کے دوران آئی ایس آئی کے اہلکار کی مدد سے سلو پر بھرپور نگاہ رکھی گئی تھی۔ اس اہلکار
مطابق اس عرصے میں سلو نے کوئی مشتبہ حرکت نہیں کی تھی بلکہ پوری دیانت داری سے اپنے فرائض انجام
رہا تھا۔ اس مرحلے میں باہر کے کسی فرد نے اس سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا، نہ ہی وہ خود کہیں گیا تھا۔ اس کی



رہائش گاہ میں اس کے کوارٹر کی تلاشی بھی لے لی گئی تھی لیکن اس کے سامان میں سے کوئی مشکوک شے برآمد نہیں
ہوئی تھی۔

ساری تفصیلات سن کر ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ سلو پر بے جا شک کر رہے ہیں لیکن شہریار جانتا تھا کہ سب
ٹھیک نظر آنے کے باوجود ٹھیک نہیں ہے کیونکہ سلو کا وہاں موجود ہونا ہی سب سے بڑی گڑبڑ کی نشانی تھی
ہر طرف سے کلیئرنس ملنے پر وہ اپنے اس خیال پر راسخ ہوتا جا رہا تھا کہ سلو اس تقریب میں بم بلاسٹ
جیسی کوئی کارروائی کرنے کے بجائے اپنے پاس موجود ہتھیار سے کام لے گا۔ اور زیادہ امکان یہی تھا
کہ وہ کسی اہم شخصیت کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔

صدر اور وزیراعظم دونوں کی تقریب میں شرکت کی اطلاع کی وجہ سے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ
ان میں سے کسی ایک یا دونوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ البتہ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اس
کارروائی کے بعد سلو نے اپنے انجام کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اتنی زیادہ سکیورٹی کے بعد یہ تو ممکن
نہیں تھا کہ وہ وہاں سے صحیح سلامت نکل پاتا۔ اس لیے خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے آقاؤں سے اپنی
جان کی قیمت وصول کر لی ہو۔ دنیا میں ایسے سرپھروں کی کمی نہیں تھی جو اپنی جان کے عوض اپنے پیاروں کے
لیے عیش و عشرت کی زندگی خرید لیتے ہیں۔ شاید سلو نے بھی ایسا ہی کوئی سودا کیا تھا لیکن مسلسل نگرانی کے
باوجود ان کی نظر میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

اس نے ملک بھر کے بینکوں کا ریکارڈ چیک کروا کر اس بات کی بھی تصدیق کر لی تھی کہ سلو، اس کے
والدین یا منگیتر میں سے کسی کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں کوئی بڑی رقم تو جمع نہیں کروائی گئی تھی.....
لیکن ایسا بھی کچھ نہیں تھا۔ سلو کے نام سے ایک اکاؤنٹ موجود ضرور تھا لیکن اس میں موجود ایک ڈیڑھ لاکھ کی
رقم ایسی نہیں تھی جسے اس کی جان کی قیمت سمجھا جا سکتا۔ یہ رقم پچھلی تاریخوں میں شاید اس کے انجام دیے گئے
ان دو کاموں کا معاوضہ تھی جو پہلے ہی ان کی نظر میں تھے۔ ویسے بھی اب تک ان کے سامنے سلو کی جو شخصیت
آئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قطعی خودکشی کا رجحان رکھنے والا آدمی نہیں ہے اور زندگی کو
انجوائے کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔

سلو کے بارے میں اس کے اندازے کتنے درست تھے اور کتنے غلط، اس بات کا اندازہ تو بعد میں ہی ہو
سکتا تھا۔ فی الحال تو اُسے اس پر نظر رکھنی تھی اور وہ یہ کام کیمرے کی آنکھ کی مدد سے بخوبی کر رہا تھا۔ اس کے
ساتھ موجود رپورٹر کو پہلے ہی اس کے بارے میں ہدایات دی جا چکی تھیں اس لیے وہ اس کے معاملات میں
دخل اندازی کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنا کام نمٹا رہی تھی بلکہ اس کے کہنے پر اس طرف کا رخ کرنے پر
بھی تیار ہو جاتی تھی جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ بظاہر تقریب کی کوریج کرتا ہوا وہ سلو پر پوری نظر رکھے ہوئے
تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جاوید علی بھی یہی کام کر رہا تھا۔ بیرے کی سفید براق یونیفارم میں اس نے بھی اپنا
حلیہ خاصا تبدیل کر رکھا تھا اور مشروبات کے گلاس ٹرے میں رکھ کر اِدھر اُدھر گھومتا بظاہر مہمانوں کی خاطر
تواضع کر رہا تھا لیکن حقیقتاً سلو ہی کی نگرانی کر رہا تھا۔

سلو کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے اور وہ کسی ماہر سکیورٹی گارڈ ہی کی طرح چاروں طرف نگاہ
رکھے ہوئے تھا۔ اس کی نگاہ میں کسی شکرے کی سی لپک تھی۔ ہر آنے والے نئے مہمان کو وہ بڑی جانچتی ہوئی
نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وزیراعلیٰ کی سخت سیاسی مخالف شخصیت کی آمد تقریباً وزیراعظم کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی
اور اس وقت شہریار نے نوٹ کیا کہ سلو کی آنکھوں کی شکاری چمک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے اور چہرے کے

نارمل نظر آنے والے تاثرات میں بھی کچھ تناؤ کی سی کیفیت آ گئی ہے۔ اس نے جاوید علی کو اشارہ کیا کہ ہوشیار رہے۔ اس کے خیال کے مطابق اب وہ وقت آ گیا تھا، جب سلّو حرکت میں آ سکتا تھا۔ وہ خود بھی پوری تندہی سے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

وزیراعظم کی آمد کے بعد تقریب کے شرکاء کی ساری توجہ اُنہی کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور دُولہا دُلہن کی حیثیت ثانوی سی رہ گئی تھی۔ وزیراعلیٰ خود ان کا ہاتھ تھام کر اُنہیں اسٹیج پر لے گئے تھے جہاں دُولہا دُلہن نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور پھر فوٹو سیشن شروع ہو گیا۔

لوگ دُولہا دُلہن سے زیادہ وزیراعظم کے ساتھ تصویر اُتروانے کے خواہش مند تھے۔ وزیراعظم کی حیثیت اس تقریب میں اس لیے بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی کہ صدر نے عین وقت پر ناسازیٔ طبع کی وجہ سے تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

سننے میں آ رہا تھا کہ ان کے ساتھ دل کا کوئی مسئلہ ہے اور عنقریب وہ چیک اپ کے لیے بیرونِ ملک روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کی عدم شرکت کی وجہ سے اس بات کا امکان بہت بڑھ گیا تھا کہ سلّو کا نشانہ وزیراعظم ہی ہوں گے۔ کیمرہ مین کی حیثیت سے شہریار کو موقع مل گیا تھا کہ وہ اسٹیج کے قریب رہ سکے۔

وہاں موجود رہتے ہوئے اس نے دیکھا کہ سلّو بھی غیر محسوس طریقے سے اسٹیج کی طرف کھسک آیا ہے اور عین اس وقت پر جبکہ وزیراعلیٰ کی مخالف سیاسی شخصیت تصویر بنوانے کے لیے اسٹیج پر چڑھ رہی تھی، اس نے سلّو کی گن کو سیدھا ہوتا ہوا دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ لرز گیا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ سلّو کا نشانہ وزیراعظم نہیں بلکہ اُن کی شخصیت ہے۔ اسے دشمن کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ اگر وزیراعلیٰ کے ہاں ہونے والی تقریب میں انہی کے ایک ایسے سکیورٹی گارڈ کی گولی سے جسے صرف ہفتہ بھر قبل انہوں نے خود بالکل غیر رسمی طریقے سے اپائنٹ کیا تھا، اگر ان کے مخالف سیاست دان کا قتل ہو جاتا تو ملک بھر میں ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ وزیراعلیٰ کے مخالفین اس قتل کو اُن کی سازش قرار دے کر ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کے بعد احتجاج، دھرنے، لانگ مارچ وغیرہ جیسے نہ جانے کون کون سے سلسلے شروع ہو جاتے جن میں نقصان صرف اور صرف عوام کی جان اور مال کا ہوتا اور یہاں لگی آگ پر دشمن اپنے ایوانوں میں جشن مناتے۔

یہ سارے خیالات لمحہ بھر میں ہی اس کے ذہن سے گزر گئے اور وہ پوری طرح سلّو سے نمٹنے کے لیے تیار اس کی طرف لپکا لیکن اس کا اور سلّو کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا اور اس کی انگلی گن کا ٹریگر دبانے ہی لگی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنا کیمرہ سلّو پر دے مارا۔ کیمرے کا دھکا لگنے سے سلّو کا نشانہ بہک گیا اور گن سے نکلنے والی گولی اسٹیج کی سیڑھیوں میں کہیں دھنس گئی۔

سلّو نے بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن شہریار اُڑتا ہوا اس پر جا گرا۔ جب تک وہاں موجود سکیورٹی اسٹاف کچھ سمجھتا، شہریار خود سلّو کو قابو کر چکا تھا۔ مضبوط ہاتھ پیروں والا سلّو اُسے خود پر سے ہٹا کر پھینکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن شہریار بھی عمر فاروق کا تربیت یافتہ تھا اس لیے سلّو کے لیے اس سے نجات حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ پھر وہ اس سے بچتا بھی تو کہاں جاتا؟ لاتعداد گنیں تھیں جنہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ مجبوراً اسے ہاتھ پیر ڈالنے پڑے۔ سکیورٹی والوں نے اسے پوری طرح گھیر لیا۔

شہریار اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا تو اس طرف نگاہ ڈالنے کی مہلت ملی جہاں سے وہ سلّو سے نمٹنے کے دوران آوازیں سنتا رہا تھا۔ وہاں جاوید علی ایک اور سکیورٹی گارڈ سے اُلجھا ہوا نظر آیا لیکن یہ جھگڑا بھی طول نہیں پکڑ



سکا اور مسلح افراد نے اُنہیں گھیرے میں لے لیا۔

ذرا دیر میں ہی شہریار، جاوید علی، سلّو اور وہ دوسرا سکیورٹی اہلکار مسلح افراد کے حصار میں وہاں سے باہر لے جائے جا رہے تھے۔ شہریار نے نکلتے نکلتے وزیراعلیٰ پر نظر ڈالی۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا تو یہ ایک فطری سی بات تھی۔ ان کے بیٹے کے ولیمے میں کھڑا ہونے والا یہ ہنگامہ ان کے لیے باعثِ رسوائی تھا لیکن ان کے پیچھے کھڑے ریاض انور کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں زیادہ معنی خیز تھیں۔ تقریب کے دیگر شرکاء کی طرح اگر وہ بھی تھوڑا بہت پریشان نظر آتا تو بات سمجھنے والی تھی لیکن وہ تو وزیراعلیٰ سے بھی زیادہ حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تو تم اپنے ٹیسٹ میں کامیاب ہو ہی گئے؟'' عمر فاروق نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''استاد اچھا ہو تو شاگرد کے ناکام ہونے کا کیا سوال؟'' وہ بھی جواباً مسکرایا۔

''نہیں، صرف استاد کا اچھا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اگر شاگرد ہونہار نہ ہو تو استاد کی ساری استادی دھری رہ جاتی ہے۔'' انہوں نے بڑی بے ساختگی سے کہا تو سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس وقت ان کی محفل میں ذیشان بھی موجود تھا۔ شہریار کی کراچی سے واپسی ہو گئی تھی۔ سلّو کی گرفتاری کے بعد اس کا کام وہاں مکمل ہو گیا تھا اس لیے اسے بہت پھرتی سے وہاں کے منظرنامے سے غائب کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ساتھ دینے والا جاوید علی بھی نہیں جان سکا کہ عادل خان نامی وہ اسپیشل ایجنٹ جس کے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی، اچانک گدھے کے سر سے سینگ کی طرح کیسے غائب ہو گیا تھا۔

''میں نے اکیلے کچھ نہیں کیا۔ یہ سارا ٹیم ورک تھا۔ اگر مجھے اپنے ساتھیوں خصوصاً جاوید علی کا ساتھ میسر نہیں ہوتا تو میں اتنی آسانی سے یہ کیس ہینڈل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا مخلص اور انرجیٹک لڑکا ہے۔ ہمیں اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس کے پاس ٹیلنٹ ہے۔ اگر تھوڑی سی توجہ ملے گی تو بہت کارآمد ثابت ہو گا۔'' اس نے کھلے دل سے جاوید علی کو سراہا۔

''وہ خود بھی تم سے بہت متاثر ہے۔ کراچی یونٹ کے انچارج سے تمہارے بارے میں بہت کچھ پوچھ رہا تھا لیکن ظاہر ہے وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے کیا بتاتا۔ بس یہ تنبیہہ کر دی کہ جس بات کا جاننا ضروری نہیں، اس کے لیے ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی کا ذکر آنے پر ذیشان نے اسے بتایا۔

''مجبوری نہ ہوتی تو میں خود اس سے مل کر شاباش دینا پسند کرتا۔ اُس نے اس شخص کو قابو کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا جو سلّو کو گولی مارنے کے چکر میں تھا۔ دشمن نے بڑی زبردست پلاننگ کی تھی۔ ایک طرف وہ سلّو سے اپنی مرضی کا بندہ قتل کروا کر بھرپور نتائج حاصل کرتے تو دوسری طرف اسے قتل کروا کر اس سے نجات حاصل کر لیتے۔ شاید انہیں کسی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ سلّو ہماری نظروں میں ہے اس لیے انہوں نے اسے اپنے لیے بیکار جانتے ہوئے اس سے چھٹکارا حاصل کرتے کرتے بھی فائدہ اٹھانے کی سوچی تھی۔ وہ مار دیا جاتا تو ہمارے پاس کیا ثبوت ہوتا کہ اسے کہاں تربیت دی گئی اور کس مقصد کے تحت پاکستان بھجوایا گیا۔ اس کے قاتل پر بھی کوئی الزام نہ آتا کہ ایک طرح سے اس نے اپنا فرض ہی انجام دیا ہوتا۔''

''مؤقف تو اس نے اب بھی یہی اختیار کیا تھا کہ سلّو کو گولی چلاتے دیکھ کر اُس نے اُس پر گولی چلانے

کی کوشش کی تھی ورنہ حقیقتاً وہ اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے آدمیوں کی ٹھیک ٹھاک تواضع کے بعد اس نے سچ اُگلا کہ اسے کسی انجان آدمی نے بھاری رقم کے عوض اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ پہلے وہ یہ آفر قبول کرتے ہوئے ہچکچایا لیکن پھر یہ سوچ کر مان گیا کہ ایک قاتل کو قتل کرنے پر اس سے کون باز پرس کرے گا بلکہ وہ تو ایک طرح سے ہیرو ہی بن جائے گا۔ لیکن بے چارے کی قسمت خراب تھی کہ تم اور جاوید علی وہاں پہنچ گئے اور ساری چالیں ہی اُلٹی پڑ گئیں ورنہ اس وقت ملک کے حالات بالکل مختلف ہوتے اور ہر طرف ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی۔'' ذیشان نے اس کی بات کو آگے بڑھایا تو اس کے لہجے میں واضح اطمینان تھا۔

''ہنگامہ تو اب بھی ہوا ہوگا۔ بہت سے لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ وہ دو افراد کون تھے جنہوں نے اتنی بڑی سازش کو ناکام بنایا اور پھر خود منظر سے غائب ہو گئے؟'' وہ چونکہ ہنگامی طور پر کراچی سے واپس آ گیا تھا، اس لیے بہت سی باتوں سے واقف نہیں تھا اور اب ذیشان ہی اسے حقائق سے باخبر کر سکتا تھا اس لیے اس سے استفسار کیا۔

''یقیناً ایسا ہوا تھا۔ لیکن کرنل صاحب نے معاملات سنبھال لئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ آئی ایس آئی کے پاس رپورٹ تھی کہ وزیر اعلیٰ کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ میں کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے اس لیے انہوں نے اپنے آدمی وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ کئی اعلیٰ عہدے داروں کے دباؤ کے باوجود انہوں نے تم دونوں کی شناخت ظاہر کرنے سے معذرت کر لی لیکن بدلے میں انہیں یہ سارا معاملہ آئی ایس آئی کے سپرد کرنا پڑا اور یوں ہم باوجود خواہش کے سلّو کو اپنی تحویل میں نہیں لے سکے۔ سی ایف پی کے وجود کو خفیہ رکھنے کے لیے یہ قربانی دینا ہماری مجبوری تھی۔ بہرحال، امید ہے کہ آئی ایس آئی بھی اسے بہتر طور پر ڈیل کر لے گی۔ ویسے بھی خبر ہے کہ یہ جاننے کے بعد کہ اس سے کام نکلوانے کے بعد خود اسے بھی ختم کرنے کا انتظام رکھا گیا تھا، سلّو ازخود تعاون پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ بھارت میں ''را'' والوں نے دورانِ قید اسے دہشت گردی کی تربیت دینے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف اس کے دل و دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ اسی لیے وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ یہاں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے اپنی جان کی پروا نہیں ہے۔ ولیمے کی تقریب میں قتل کی کارروائی بھی اُس نے اس یقین دہانی کے بعد کرنے کی ہامی بھری تھی کہ اسے وہاں سے بحفاظت نکال لیا جائے گا اور پھر طویل عرصے تک انڈر گراؤنڈ رکھ کر اس کے حلیے میں اتنی نمایاں تبدیلیاں کر دی جائیں گی کہ جب وہ دوبارہ منظر پر آئے گا تو کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔''

''اوہ..... آئی سی۔'' ذیشان کی بات سن کر اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی حیران تھا کہ وہ اس طرح اپنی جان گنوانے پر کیوں تُل گیا تھا..... تو اصل بات یہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح اسے ایک بار پھر بے وقوف بنایا گیا تھا۔''

''بالکل ایسا ہی تھا۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ زندگی گنوانے سے قبل اس نے یہ بات جان لی ہے اور ہمیں ''را'' والوں کے خلاف ایک مضبوط گواہ مل گیا ہے۔ سنا ہے کہ سلّو کی حقیقت کو منظر پر نہ لانے کے لیے آئی ایس آئی، ''را'' سے کوئی بڑی ڈیل کرنے والی ہے۔ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اسے کسی فرضی کہانی میں چھپا دیا جائے گا اور اس کے بدلے بھارت مشرقی بارڈر پر جمع کی گئی اپنی فورسز کو پیچھے ہٹا لے گا۔'' ذیشان نے اسے اندر کی خبر دی۔



''میں اگر پالیسی ساز ہوتا تو اس قسم کی ڈیل کرنے کے بجائے دنیا کے سامنے ''را'' کا اصل چہرہ لانا ا مناسب سمجھتا۔'' اس نے فوراً اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا۔

''دنیا ''را'' کے اصل چہرے سے پہلے ہی واقف ہے۔ اگر یہ کیس سامنے آ بھی جاتا تو دنیا کی معلومات ں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ہم وہ کرتے جو ملکی سلامتی کے لیے زیادہ بہتر ہے۔'' پہلی بار ذیشان نے اس سے اختلاف کیا تو اسے خاموش ہونا پڑا۔ ذیشان کی بات میں وزن تھا۔ کون جانتا ''را'' کے بارے میں خبر نہیں تھی بلکہ پاکستان کے دیگر دشمن بھی ''را'' کے کردار سے واقف ہونے کی سے پاکستان کے خلاف کوئی سازش کرتے ہوئے اکثر و بیشتر اس سے مدد لے لیا کرتے تھے۔

''اگر اس معاملے کو اس طرح نمٹایا جائے گا تو پھر سلّو کا کیا ہوگا؟'' اس نے سوال اٹھایا۔

''اسے زندگی بھر کے لیے کسی کال کوٹھڑی میں ڈال کر اس کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا۔ ے لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہے۔ کچھ عرصے بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ سلّو کون تھا اور اس نے کیا تھا؟'' ذیشان نے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

''اور ریاض انور..... اس کا کیا ہوگا؟'' سلّو نے اپنے اعترافی بیان میں اس کا نام بھی تو لیا ہوگا؟''

''اتفاق سے سلّو نے اپنے بیان میں اس کا نام نہیں لیا۔ اصل میں اُس نے اپنے بیان میں صرف ا ریگل اسٹور میں بم دھماکے کی کوشش کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس کی وہ کوشش ناکام ہو گئی تھی لیکن ریاض انور والے معاملے میں تو ٹھیک ٹھاک لوگ مارے گئے تھے اس لیے اُس نے اُس کا ذکر کر کے اپنی گردن مزید پھنسانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔'' اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے ذیشان نے قیاس آرائی کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ خبیث اب تک آزادی سے دندناتا پھر رہا ہے؟'' اس نے غصے سے دانت پیسے۔

''آزادی سے نہیں، اس کی نقل و حمل پر ہماری پوری نظر ہے۔ جاوید علی کو ابھی تک کراچی میں ہی روکے رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ریاض انور سے نمٹ سکے۔ اگر تمہارے سلسلے میں مجبوری نہ ہوتی تو شاید ہم یہ معاملہ بھی تمہارے سپرد کر دیتے۔ لیکن بہرحال جاوید علی اسے دیکھ لے گا۔ ہمیں اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔'' اس بار عمر فاروق نے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکا۔ ذیشان کی بات اور تھی۔ وہ اس کا ساتھی اور دوست تھا جس سے وہ بے تکلفانہ ہر طرح کی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ بحث و مباحثہ بھی کر لیتا تھا لیکن عمر فاروق کے ساتھ ادب و احترام کا رشتہ تھا۔ وہ اس کے استاد تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ سوال جواب کرنا خلافِ ادب تصور کرتا تھا۔

''میرے خیال میں اب تم سلّو والے معاملے میں اُلجھنا چھوڑ دو۔ یہ کیس ایک طرح سے ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس تمہارے لیے اس کے علاوہ بھی کچھ اور خبریں ہیں۔'' اُسے خاموش پا کر ذیشان نے بھی موقع کا فائدہ اٹھایا اور موضوعِ گفتگو بدل ڈالا۔

''خبریں اچھی ہیں یا بری.....؟'' اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے ذیشان سے پوچھا۔

''سو فیصد اچھی خبریں ہمارے پاس کم ہی ہوتی ہیں۔ ہم کچھ اچھا بھی اسی وقت کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں جب کہیں کچھ بہت برا ہو چکا تھا۔'' ذیشان کے لہجے میں واضح افسردگی تھی۔

''مطلب؟'' وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

''اسکردو سے روانہ ہونے والی ایک بس کے سولہ مسافروں کو قتل کر دیا گیا اور اس کی وجہ ان کے مخصوص نظریات تھے۔'' ذیشان نے اسے بتایا۔

''یہ تو بہت افسوس ناک خبر ہے اور اس کے سرے یقینی طور پر اسی سازش سے جا کر ملتے ہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بھڑکانے اور بہکانے کے لیے بہت منظم طریقے سے کی جا رہی ہے۔'' اس نے فوراً رائے دی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ نظریات کا اختلاف کوئی اتنی انوکھی بات نہیں ہے۔ لیکن دشمنوں نے بڑی ہوشیاری سے اس اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے ہاں انتہا پسندی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کیس میں بھی اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں، اس سے یہی لگتا ہے کہ اس کارروائی کے پیچھے غیر ملکی دشمنوں کی سازش کارفرما ہے۔''

وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا کہ کس طرح مشابرم خان نے اسے اسکردو سے فون کر کے اس وہاں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا اور اس کے بعد اس نے خان کی مدد کے لیے کیا کارروائی کی۔

''تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ کارروائی واقعی ملک دشمن عناصر کی کارستانی نظر آتی ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ دشمن نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ان برف پوش پہاڑوں میں اپنا خفیہ اڈا قائم کر رکھا تھا، جہاں وہ انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو تربیت دے رہے تھے۔ مشابرم خان کی جرأت مندی کی وجہ سے ہی ہم ان کا وہ ٹھکانا تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ وہاں اب پھر سازشیں جاری ہیں اور دشمن اپنوں کے ہاتھوں ہمارے لوگوں کو قتل کروانے کا مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس معاملے کو نظر انداز نہیں کرنا بلکہ ایسا کرو کہ اس کیس پر کام کرنے والے افسر کو ہدایت کر دو کہ وہ اس معاملے میں مشابرم خان سے کام لینے میں قطعی ہچکچاہٹ نہ دکھائے۔ مشابرم خان بہت کام کا بندہ ہے۔ اس کی ذمے داری سونپے جانے پر بہت کچھ کر گزرے گا۔''

حالات نے مشابرم خان کو اس سے الگ کر دیا تھا لیکن وہ آج بھی اس سے خصوصی اُنسیت رکھتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا دل سے معترف تھا۔

''میں یہ کام پہلے ہی کر چکا ہوں اور مشابرم خان کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ انکوائری افسر کی طرف سے اجازت ملنے تک وہیں ٹھہرے۔''

''یہ تم نے اچھا کیا لیکن یہ تو بتاؤ کہ مشابرم خان اچانک اسکردو کیسے پہنچ گیا؟ اسے تو پیر آباد میں ہی رہ کر عمیر آفندی کی معاونت کرنی تھی نا.....؟'' اسے خیال آیا تو اس نے ذیشان سے وضاحت چاہی۔

''وہ اپنی والدہ کی تدفین کے لیے اپنے گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسکردو میں ٹھہرا تو یہ واقعہ پیش آ گیا۔''

''اوہ.....تو اس بے چارے کی والدہ فوت ہو گئیں۔ وہ تو اس واقعے پر بہت دُکھی ہوا ہو گا۔ کاش میں اس کے اس غم میں شریک ہو سکتا۔'' ذیشان کی زبانی مشابرم خان کی والدہ کے انتقال کا سن کر وہ خود بھی افسردہ ہو گیا۔ مجبوری تھی کہ وہ ہر دم خود پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہنے والے مشابرم خان کی زندگی کے اس المیے پر اس سے تسلی کے دو حرف بھی نہیں بول سکتا تھا۔

''مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن تم نے اپنے لیے جو راہ چنی ہے، اس پر چلتے ہوئے یہ سب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ شہریار عادل سے عادل خان تک کے سفر میں جذبات کی یہ قربانی ہی سب سے



ہے۔ ویسے تم اطمینان رکھو کہ رانا صاحب نے اس موقع پر مشابرم خان کا بھرپور خیال رکھا۔ میت کو لاہور سے اس کے گاؤں پہنچانے اور تدفین تک کے سارے انتظامات انہی کی طرف سے کیے گئے تھے۔'' ذیشان نے تلخ حقیقت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تسلی بھی دی۔

''ذیشان ٹھیک کہہ رہا ہے شہریار! تمہاری زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کے بعد اس طرح کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اُلجھنے اور افسردہ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ تم نے اپنی شخصیت مٹا کر ایک بہت بڑی قربانی دی ہے اور یہ قربانی اس لیے ہے کہ تمہیں بہت بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ سلّو والا کیس تمہارے لیے صرف ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ اس ٹیسٹ میں کامیابی کے بعد تمہیں بڑا اور زیادہ اہم کام سونپا جائے گا اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں وہ کام سونپ دیا جائے۔''

عمر فاروق نے بالکل اچانک مداخلت کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر کار وہ گھڑی آ ہی گئی تھی جس کے لیے اسے تیار کیا جاتا رہا تھا۔

''بھارت؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔

''ہاں بھارت۔ تمہیں بھارت جانا ہو گا اور وہاں سے ڈاکٹر فرحان جمیل کو آزاد کروا کر وطن واپس لانا ہو گا۔ پاکستان میں ہر سُو دندناتے ''را'' والوں کو بھی تو پتہ چلنا چاہئے کہ ان کے منہ سے بھی شکار چھینا جا سکتا ہے۔'' عمر فاروق کے لہجے میں چنگاریاں سی تھیں۔

''لیکن یہ ڈاکٹر فرحان جمیل ہیں کون؟ کچھ ان کا حدود اربعہ تو پتہ چلے؟'' ایک شخص کو اگر بھارت جا کر چھڑانے کی ذمے داری اسے سونپی جا رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی بہت خاص آدمی تھا لیکن خود وہ فرحان جمیل نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں تھا۔

''ڈاکٹر فرحان جمیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہم فخریہ اپنے ملک کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں لیکن حقیقتاً ایک بڑے ریسرچر ہیں۔ دورانِ تعلیم انہوں نے انگلینڈ اور امریکہ کی بڑی لیبارٹریز میں بھی کام کیا تھا اور وہیں سے انہیں مائیکرو اور جینئرمز پر کام کرنے کا شوق ہوا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ریسرچ جاری رکھی۔ ان کا تعلق چونکہ ایک متمول خاندان سے ہے، اس لیے کافی عرصے تک وہ اپنے طور پر اپنی ذاتی لیبارٹری میں کام کرتے رہے پھر بعد میں انہوں نے حکومت سے رابطہ کر کے بتایا کہ انہوں نے تحقیق سے وہ طریقہ ڈھونڈ لیا ہے جس کے ذریعے وہ حیاتیاتی ہتھیار تیار کر سکتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ پاکستان کوئی جارحیت پسند ملک نہیں ہے لیکن ہمیں مسلسل دوسری طاقتوں سے خطرہ لاحق رہتا ہے اس لیے ہم اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع پر خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔ دفاعی نقطۂ نظر سے ہی ہم نے ایٹم بم بھی تیار کیا ہے اور اگر ڈاکٹر فرحان کی وجہ سے ہم ایک اور کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمارے دشمنوں کو یہ ایک اشارہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی طرف بری نظر ڈالنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لیں کہ پاکستان اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ وہ تر نوالہ سمجھ کر اسے نگل سکیں۔

حکومت کی طرف سے ڈاکٹر فرحان کو منظوری مل گئی کہ وہ اپنی ذاتی تحقیق کو آگے بڑھائیں اور اس کے لیے حکومتی وسائل کو استعمال کریں۔ لیکن اس سے قبل کہ ڈاکٹر فرحان کام شروع کرتے، بھارت میں مقیم ان کی اہل کا پیغام آ گیا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو ایک بار تو اسے کو دیکھ لیں۔ یہ ایک جذباتی معاملہ تھا۔ ڈاکٹر فرحان اپنی والدہ اور نانی کو مایوس نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے چند دن کی مہلت لی اور بھارت روانہ ہو گئے۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہاں جا

کر ان کا بھرپور استقبال ہوتا اور ان کے ماموں اور کزنز خوش ہوتے کہ برسوں بعد بہن اور اس کے بیٹے کی شکلیں دیکھنے کو ملیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر فرحان کی نانی نے انہیں اور ان کی والدہ کو بطور خاص اس لیے وہاں بلوایا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ بات ان کے ماموؤں کو منظور نہیں تھی کہ بہن جس کے دور ہونے کی وجہ سے وہ اس کے حصے کو اپنا ہی سمجھتے تھے اور برسوں سے اس کے حصے کی زمین پر کاشت کر کے لاکھوں کما رہے تھے، زمین کے بدلے کروڑوں روپے سمیٹ کر لے جائے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی اور ڈاکٹر صاحب کو ایک جاسوس کی حیثیت سے گرفتار کرلیا گیا۔

بدقسمتی سے بھارتی انٹیلی جنس کو کسی طرح اس بات کی بھنک بھی مل گئی کہ ڈاکٹر فرحان کسی قسم کی تحقیق کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا کیس پکا ہوگیا۔ ادھر ان کی والدہ کو بھائیوں نے باور کروایا کہ وہ جائیداد میں حصہ لینے کا خیال دل سے نکال دیں تو اس کی آمدنی سے ان کے بیٹے کی آزادی کے لیے کوشش کی جاسکے۔ ایک ماں کے لیے بیٹے سے بڑھ کر کیا ہوسکتا تھا۔ وہ راضی ہوگئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انڈین گورنمنٹ نے انہیں ناپسندیدہ قرار دے کر انہیں پاکستان واپس بھیج دیا۔ اب وہ بے چاری یہاں ہیں اور فون اور خطوں کے ذریعے اپنے بھائیوں سے درخواست کرتی رہتی ہیں کہ کسی طرح ان کے بیٹے کو آزاد کروا کر پاکستان بھجوایا جائے۔ بھائی کچھ کرتے نہیں لیکن بہن کو اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ فرحان کی آزادی کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں لیکن فرحان پر اتنے سخت الزامات ہیں کہ اس کی رہائی کی کوئی صورت نہیں بن پا رہی۔

ڈاکٹر فرحان کی والدہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں ہیں۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ اس لیے اچھے خاصے باحیثیت خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود ان کی رہائی کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کو آزاد کروانے کے لیے ایک کوشش کی تھی کہ قیدیوں کے تبادلے کے ذریعے ڈاکٹر فرحان کو یہاں واپس لایا جاسکے لیکن بھارتی حکومت نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ ایک مبینہ جاسوس کو کسی طور آزاد نہیں کر سکتے۔ اس جواب کے بعد ہمارے پاس مزید اصرار کی گنجائش نہیں تھی اور یوں پانچ سال سے ڈاکٹر فرحان وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ اب ہم تمہارے سپرد یہ کام کر رہے ہیں کہ تم کسی بھی طرح انہیں وہاں سے آزاد کروا کر لاؤ تاکہ وہ واپس آکر دوبارہ اپنا کام سرانجام دے سکیں۔ اس سلسلے میں تمہیں جو بھی وسائل درکار ہوں گے، وہ کسی نہ کسی طرح ہماری طرف سے مہیا کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن ہم کھل کر کہیں بھی تمہاری حمایت نہیں کریں گے۔'' عمر فاروق نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''سر بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شہریار! اس مشن پر جاتے ہوئے تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ایک جاسوس یا سیکرٹ ایجنٹ بلاشبہ کسی ملک کے لیے اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا ہے اور پوری قوم اُس کے اس احسان تلے دبی ہوتی ہے کہ اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر دفاعِ وطن کے لیے کام کیا لیکن مصلحتیں کبھی کھل کر اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتیں۔ کوئی سیکرٹ ایجنٹ جب دشمن کی سرزمین پر پکڑا یا مارا جاتا ہے تو اس کی حکومت کبھی اسے قبول نہیں کرتی۔ تم بھی یہاں سے بے شک پاکستان کی بہتری اور استحکام کی خاطر اپنی جان ہاتھ میں لے کر بھارت کی سرزمین پر پہنچو گے لیکن وہاں پہنچتے ہی تمہاری پاکستانی شناخت ختم ہو جائے گی، تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوگا کہ تم خود کو پاکستانی ثابت کر سکو۔''

ذیشان نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے تلخ حقائق سے آگاہ کیا۔ ان باتوں سے بظاہر ایسا لگ رہا



کہ اسے جان بوجھ کر جہنم میں جھونکا جا رہا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے جذبۂ حب الوطنی کو بہت ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی اسے سی ایف پی میں شامل کیا گیا تھا اور اس کے اوپر اتنا کثیر سرمایہ خرچ کر کے اس کی تربیت کے ساتھ ساتھ ظاہری تبدیلی کے عمل سے گزارا گیا تھا۔ ان سب باتوں کے پیچھے کسی قسم کی بدنیتی کارفرما نہیں تھی۔ نہ ہی اسے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا بلکہ اس کا انتخاب صرف اور صرف اس حقیقت کی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر وطن پر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتا تھا۔ آج اُس کے اس جذبے کی آزمائش تھی تو وہ کیسے پیچھے ہٹتا۔ سر اُٹھا کر متانت اور سنجیدگی سے بولا۔

''گرفتاری یا موت کا ڈر مجھے میرے دشمن سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ نہ ہی میں نے اپنے سینے پر تمغے سجانے کے لیے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے ساتھ وہاں کیا ہوگا۔ نہ ہی مجھے یہ لالچ ہے کہ مجھے گارڈ آف آنر پیش کرتے ہوئے قبر میں اُتارا جائے۔ اگر اپنے وطن کی خاطر کام کرتے ہوئے میں کسی گندے نالے یا جوہڑ میں گر کر بھی مر جاؤں گا تو میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہوگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی ضائع نہیں کی۔''

''مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم سے ہمیں ایسا ہی جواب سننے کو ملے گا۔'' عمر فاروق بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ بھی فوراً ہی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے اسے گلے لگایا اور جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کے ساتھ کمرے میں موجود ذیشان بھی سحر زدہ سا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس کے دل نے بے ساختہ یہ خواہش کی تھی کہ کاش شہریار کی جگہ وہ ہوتا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص کی اپنی ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے جہاں رہ کر اسے اپنے حصے کا کام انجام دینا پڑتا ہے اور اس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دیتا رہے۔

''ذیشان، ڈاکٹر فرحان کے کوائف پر مشتمل ایک فائل اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ تم اطمینان سے اس فائل کو پڑھ لینا۔ تمہیں ابھی فوری طور پر روانہ نہیں ہونا ہے۔ چند دن ملیں گے تاکہ تم آرام سے یہ کیس سمجھ سکو۔ مزید کچھ معلومات درکار ہوں گی تو وہ بھی ذیشان فراہم کر دے گا۔ اس عرصے میں تمہارے خدوخال کو ایک فائنل ٹچ دیا جائے گا تاکہ تم اس عادل خان سے مختلف نظر آؤ جو کراچی میں سلّو والے کیس پر کام کر رہا تھا۔ میں نے تمہارے سرجن کو کراچی جانے سے پہلے فائنل ٹچر سے اسی لیے روک دیا تھا کہ تمہارا چہرہ کسی کے لیے بھی آشنا نہ رہے۔ چاہے وہ سی ایف پی کے اہلکار ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اب تو یہ تبدیلی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تم بہت سوں کی نظروں میں آگئے ہو۔ اس لیے تمہیں مزید تبدیلی کے عمل سے گزارنا ہماری مجبوری ہے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں سر!'' عمر فاروق کی لمبی چوڑی وضاحت کا اس نے بہت اختصار سے جواب دیا البتہ نظریں اس فائل پر جما کر رکھیں جو سینٹرل ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔

''اس فائل میں ڈاکٹر فرحان جمیل کے کوائف موجود ہیں۔'' اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ذیشان نے فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے خاموشی سے فائل لینے کے بعد اسے کھول کر دیکھا۔ سامنے ہی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر لگی ہوئی تھی جس میں فراخ پیشانی، روشن آنکھوں اور تیکھے نقوش والا ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص مسکرا رہا تھا۔ اس کی ذہانت اور آسودہ حالی اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھی

''یہ بھارت جانے سے قبل کھینچی گئی ڈاکٹر فرحان کی آخری تصویر ہے۔ گرفتاری کے بعد کبھی انہیں منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ ابتدا میں عدالتی کارروائی کے لیے انہیں عدالت لایا جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی اس طرح کہ ان کا چہرہ موٹی چادر میں چھپا ہوا ہوتا تھا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت کے روبرو جس شخص کو پیش کیا جاتا رہا، وہ واقعی ڈاکٹر فرحان ہیں یا کوئی اور..... لیکن ہماری انٹیلی جنس رپورٹ بہرحال یہ بتاتی ہے کہ ڈاکٹر فرحان زندہ ہیں چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ ہم کسی طرح انہیں وطن واپس لا سکیں۔ ہمارے وطن میں گنتی کے چند ہی تو لوگ ہیں جن سے ہم وطن کی ترقی اور بہبود کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اور ان چند میں سے ایک سے بھی محروم ہو جانا ہمارے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ اس لیے تم سمجھ سکتے ہو کہ اس مشن کے لیے تمہارا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟''

اسے تصویر کا جائزہ لیتے دیکھ کر ذیشان نے اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن اس کا ذہن تو اس کے آخری جملے میں ہی اٹک گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے فائل کو بند کیا اور نہایت سنجیدگی سے ذیشان اور عمر فاروق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بار بار وضاحتیں دے کر آپ لوگ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے نہ تو آپ کی نیک نیتی پر کوئی شک ہے، نہ ہی میرا جذبہ اتنا کمزور کہ ذرا سی آزمائش سامنے آنے پر ایمان ڈولنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وضاحتیں دینے سے آپس کا باہمی اعتماد بڑھتا نہیں، کم ہوتا ہے اور اس کیس میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے برائے مہربانی اب آپ میں سے کوئی ایسی بات نہ کرے جس کو سن کر مجھے شرمندگی ہو یا میری دل آزاری ہو۔ میں آپ لوگوں کا حصہ ہوں اور آپ لوگوں جیسا ہی ہوں۔ ہاں اگر آپ کو میرے جذبے پر کوئی شک ہو تو الگ بات ہے۔''

''تم غلط سمجھ.....'' ذیشان نے تیزی سے وضاحت کرنی چاہی لیکن عمر فاروق نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''کوئی وضاحت نہیں ذیشان! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ہمیں سے ہے اور ہماری طرح ہی کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس لیے اسے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے ذیشان سے کہا اور پھر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''گڈ لک مائی سن! تم اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کرو۔ اس دوران تمہارے جانے کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔ اور وہاں تمہیں اجازت ہے کہ اس مشن میں اپنے ساتھ کسی مددگار کو لے جا سکتے ہو۔ وہ شخص کون ہوگا، اس کا انتخاب تم کرو گے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' اس پیشکش کے جواب میں کوئی مطالبہ کرنے کے لیے ابھی اس کا ذہن واضح نہیں تھا اس لیے اس نے مہلت لے لی۔

''اچھی طرح سوچ لو۔ تم مجھ سمیت جس کی طرف اشارہ کرو گے، وہ خوشی سے تمہارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو جائے گا۔'' انہوں نے جواب دیا اور اپنی جگہ سے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔

''تم ریسٹ کرو۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' انہوں نے ذیشان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانے کا عندیہ دیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کی فائل ہاتھ میں لیے گہری سوچ میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

⊛----✪----⊛



''بیٹھو!'' میجر اسفندیار نے اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ پروگرام کے مطابق گل مینا کے ساتھ واپسی کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ اپنے تئیں وہ احمد یار کو میجر اسفندیار کے لے کر کے اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ لیکن صبح ہی صبح ہوٹل میں اسے میجر اسفندیار کی طرف سے پیغام ملا کہ فی الحال وہ اپنا واپسی کا ارادہ ملتوی کر دے، انہیں اس سے کچھ کام ہے۔

اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے یہ بات مان لی۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ وہ جس ڈائیوو سے جانے والا تھا اس کی روانگی بھی ملتوی ہو گئی ہے۔ اصل میں گزشتہ روز جو واقعہ ہوا تھا، اس نے لوگوں پر دہشت سی طاری کر دی تھی۔ ایک ساتھ اتنے افراد قتل کیے جانے پر شہری سراپا احتجاج تھے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ احتجاج کرنے والوں میں تمام مکتبہ ہائے فکر کے لوگ شامل تھے جو اس قسم کے ہر واقعے کی مذمت کرتے ہیں۔

فی الحال شہر کے حالات کشیدہ تھے۔ شریف لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ اس کا ردِعمل انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ اس صورتِ حال پر مشابر خان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ ایسی دہشت گرد کارروائی میں حصہ لینے والے تمام مجرموں کو ایک قطار میں کھڑے کر کے گولیوں سے بھون ڈالے یا پھر کوئی اور بہت سخت سزا دے۔ یونہی بہت جلتے کڑھتے بہت سا وقت گزر گیا تو میجر اسفندیار کا ایک آدمی گاڑی لے کر اس کے ہوٹل آ پہنچا۔ اس آدمی کے ساتھ روانہ ہونے سے قبل اس نے گل مینا کو بہت سی تسلیوں کے ساتھ کمرے کو لاک کر کے وہیں تک محدود رہنے کی ہدایت کی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب وہ میجر اسفندیار کے سامنے تھا اور وہ دراز قد میجر بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر کار وہ اپنے اس کام سے فارغ ہوا تو لب کشائی کی۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نہایت کام کے بندے ہو اس لیے مجھے چاہئے کہ تمہیں اپنی معاونت کے لیے بلاؤں۔ اب تم بتاؤ کہ تم میرے لیے کیا کیا کام کر سکتے ہو؟''

''جو بھی آپ کہیں۔ بشرطیکہ وہ ملکی مفاد میں ہو۔'' مشابرم خان نے نہایت اعتماد سے اسے جواب دیا۔

''ظاہر ہے ایسا ہی ہوگا۔ میں نے اپنے جسم پر یہ یونیفارم ملکی مفاد کی حفاظت کے لیے ہی پہنی ہے۔'' اسفندیار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ شاید اسے باہر کے ایک بندے کو اپنے ساتھ شامل کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس لیے مجبور تھا کہ حکم اوپر سے آیا تھا۔ پھر وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ صرف مشابرم خان تھا جس کی وجہ سے وہ دہشت گردی کے واقعے کے ایک اہم مجرم کو بغیر ہاتھ پیر ہلائے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس سے بے حد اہم معلومات حاصل کر لی تھیں۔

''کل تمہاری مدد سے ہم نے احمد یار نامی جس آدمی کو گرفتار کیا تھا، اس سے ہمیں بہت اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔'' مشابرم خان کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر اس نے خود کو سنبھالا اور تفصیلات بتانا شروع کر لیں۔

''احمد یار سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں نہایت محنت اور نزاکت سے کام کرنا پڑا۔ اس شخص کے پاؤں جوتے کی ایڑی میں زہر کا ایک کیپسول چھپا رکھا تھا۔ اگر تم نے اسے اتنی تکنیک سے باندھ کر نہ ڈالا تو وہ ہوش میں آتے ہی وہ کیپسول کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ اسے یہی سبق دیا گیا ہے کہ جب تم یہ محسوس کرو کہ تمہارے ذریعے کچھ قیمتی راز ظاہر ہونے والے ہیں تو اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو اور ہمیشہ کی زندگی پا کر جنت میں چلے جاؤ۔ ہمارا طریقِ کار ہے کہ کسی مجرم کے اپنی تحویل میں آتے ہی لباس سمیت اسے اس کی

ہر شے سے محروم کر دیتے ہیں اور وہ ہمارے مہیا کیے گئے لباس میں ہماری تفتیش کا سامنا کرتا ہے۔ اس طر
اگر مجرم نے کوئی نقصان دہ شے یا ڈیوائس وغیرہ چھپا رکھی ہو تو وہ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ احمد یار
سامان کے تجزیے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ اس کے دائیں جوتے کی ایڑی گھوم سکتی ہے اور ایڑی کے گھوم
سامنے آ جانے والے حصے میں ایک ایسا خلا موجود ہے جس میں زہریلا کیسول رکھا گیا ہے۔ باقی اس
پاس سے ایسی کوئی قابلِ ذکر شے نہیں نکلی۔ ایک ٹرانسمیٹر ہے جو پہلے ہی سامنے آ گیا تھا۔'' میجر اسفندیار
ذرا رُک کر اپنے سامنے رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ احمد یار سے تفتیش کے دوران ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ ا
لوگ خودکشی کا رجحان رکھنے کے باعث کچھ بھی اُگلنے کے لیے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تفتیش کے لیے
اسے اس مقام پر لے گئے جہاں آدمی خود اپنے منہ سے موت کی تمنا کرتا ہے لیکن موت بھی اس کی مدد
لیے نہیں آتی۔ بالآخر تنگ آ کر اسے اپنی زبان کھولنی پڑی اور اس نے انکشاف کیا کہ وہ اور اس کے سا
یہاں کے ایک راہنما بشیر اکبر کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ بشیر وہی شخص ہے جو مارے جانے والوں
نظریات کا سخت مخالف ہے اور اپنی باتوں سے اس نے اپنے ساتھیوں کے دلوں میں ان لوگوں کے لیے
نفرت بھر دی ہے۔ چند قریبی لوگوں کے دلوں میں یہ نفرت انتہا کو پہنچا دی گئی ہے اور یہ قریبی لوگ اس
اشارے پر کسی بھی شخص کی جان لینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ احمد یار کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ
ہے کہ بشیر اکبر نے ان کے ذہنوں کو اس بری طرح ماؤف کر دیا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے
محروم ہو چکے ہیں اور کسی معمول کی طرح ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جس کا حکم اُنہیں بشیر
ہے۔ احمد یار کے خون کے نمونے کا تجزیہ کرنے پر یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ وہ نشے کا عادی ہے اور یقیناً
اس عادت میں اسی لیے مبتلا کیا گیا ہوگا کہ وہ بنا سوچے سمجھے بے دام غلام کی طرح احکامات کی پیروی
رہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہمارے لیے بشیر کا کردار بہت مشکوک ہو چلا ہے اور ہمیں کوشش کرنی
کہ اس بندے کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص تم سے اس لیے مدد چاہتا ہوں کہ
ماتحتوں میں بھی بشیر کے مداح شامل ہیں جو اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈریں گے۔ اس لیے ان حالات
تم ہی سب سے کارآمد آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔''

میجر اسفندیار جو تفصیلات بتا رہا تھا، انہیں سن کر مشابرم خان کے ذہن میں پیر آباد کے غلام علی اور
آباد کے شاہنواز کی صورتیں اُبھر رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی تو مذہبی راہنما کے بہروپ میں دشمن کے ا
ثابت ہوئے تھے جو معصوم ذہنوں میں زہر گھول کر انہیں دہشت گرد بنانے میں مصروفِ عمل تھے۔

''میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا
ہے؟'' اس نے ٹھوس لہجے میں نہایت عزم کے ساتھ میجر اسفندیار سے کہا تو وہ اس کے ساتھ اپنا پلان ڈ
کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

''یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ اتنی خوب صورت کہ میں عادی نہ ہونے کے باوجود ہر روز نیند
اُٹھ کر مارننگ واک پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں اور جب واپس آتا ہوں تو لگتا ہے آنکھوں میں
رنگ مناظر بھر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ آنکھوں میں بسے ان مناظر اور ہر سُو بکھری پرندوں کی چہچہاہٹو



مالک بیٹھ کر لکھنا کتنا خوشگوار تجربہ ہے، میں آپ کے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔''

مصطفیٰ خان کے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ جملے ادا کرنے والا شخص آفتاب تھا۔ آرلینڈو آمد کے بعد وہ
ری طور پر کشور کے ساتھ اپنے گھر منتقل ہو گیا تھا اور آج مصطفیٰ خان نے بطورِ خاص انہیں کھانے پر مدعو کیا تھا۔

اس دعوت میں اسلم اور ماہ بانو بھی شریک تھے۔ کشور اور ماہ بانو اس وقت کچن میں مصطفیٰ خان کی بیوی کی
مدد کروا رہی تھیں جبکہ اسلم اس محفل میں شامل تھا جس میں بیٹھ کر آفتاب آرلینڈو کی شان میں رطب اللسان
تھا۔ ذاتی طور پر اسلم کو بھی یہ شہر رہائش کے لیے پسند آیا تھا لیکن وہ آفتاب جتنا متاثر اس لیے نہیں تھا کہ اس
نے اپنی زندگی کے بے شمار شب و روز جنگل کے قدرتی ماحول میں گزارے تھے۔ اس کی قوتِ شامہ اس مہک
سے آشنا تھی جو صبح آنکھ کھلتے ہی مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے اور وہ ان پنکھ پکھیرو کو بھی خوب جانتا تھا جن کی
چہچہاہٹیں کسی محبوبۂ دلنواز کی طرح بڑی مٹھاس سے انسان کو نیند سے جگا ڈالتی ہیں اور وہ ڈسٹرب کیے جانے
کے باوجود بے مزہ نہیں ہوتا۔ آفتاب نے بھی اپنی زندگی کے کچھ ماہ و سال اسی جنگل سے متصل پیر آباد میں
گزارے تھے لیکن بدقسمتی سے پیر آباد اور آرلینڈو کو سنبھالنے والے ہاتھ مختلف تھے اس لیے وہاں کا ماحول اور
نقشہ بھی مختلف تھا اور آفتاب کا متاثر ہونا سمجھ آتا تھا لیکن اسلم بہرحال اس جتنا متاثر نہیں تھا۔

''آپ لکھنے لکھانے والے آدمی ہیں نا، اس لیے آپ کے لیے یہ جگہ بہترین ثابت ہوئی ہے لیکن ایک
انجینئر کی حیثیت سے آپ میری رائے لیں تو یہاں کام کرنا بہت مشکل ہے۔ قدم قدم پر آدمی کو جنگلی حیات
کے تحفظ کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اچھے بھلے چلتے کام کو صرف اس وجہ سے روک دینا پڑتا ہے کہ جس جگہ پر ہم
کام کر رہے ہیں وہاں کسی نایاب نسل کے جانور کا مسکن تو موجود نہیں ہے۔ اس وقت بڑی شدید جھنجلاہٹ
ہوتی ہے کہ اب کیا کریں اور دل میں خیال آتا ہے کہ کاش ہم پاکستان میں ہوتے جہاں اپنی من مانی کرتے
ہوئے کسی کو بھی نیست و نابود کر دیتے اور کوئی بھی ہمیں پوچھنے والا نہ ہوتا کہ یہاں جو نادر انواع پائی جاتی
تھیں، وہ معدوم ہو گئیں تو کیونکر۔''

مصطفیٰ خان کے لہجے میں جو طنز کی کاٹ سی تھی، اسے آفتاب اور اسلم بخوبی محسوس کر سکتے تھے کہ وہ بھی ایسے
احساس دلوں کے مالک تھے جو وطنِ عزیز میں ہر سُو راج کرتی بدنظمی پر کُڑھتے تھے اور کُڑھتے چلے جاتے تھے۔

''آپ کی مشکل اپنی جگہ لیکن میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں۔ یہاں آنے کے بعد میرے کام میں اتنی
روانی آ گئی ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک ناول لکھنا بھی شروع کر دوں بلکہ ناول کا خاکہ بھی میرے ذہن
میں ترتیب پا چکا ہے اور جلد میں اسے شروع کرنے والا ہوں۔ حقیقتاً میں یہاں آ کر بہت پچھتا رہا ہوں کہ
پہلے میں نے شہریار صاحب کا مشورہ قبول کیوں نہ کیا اور پاکستان سے سیدھا یہاں آنے کے بجائے نیویارک
میں کس لیے آباد ہو گیا؟''

مصطفیٰ خان کی تلخ بات کے تسلسل کو جاری رکھنے کے بجائے آفتاب نے آرلینڈو کی شان میں قصیدہ
خوانی کو زیادہ مناسب سمجھا اور مصنوعی سرد آہیں بھرتا اپنے پچھتاوے کا اظہار کرنے لگا۔

''شہریار کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے اکثر بعد میں اس طرح پچھتاتے نظر آتے ہیں۔ ویسے اچھا
ہوا کہ آپ نے پہلے نیویارک میں قیام کر کے دیکھ لیا تب ہی تو آپ آرلینڈو کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ سکے
ہیں۔'' مصطفیٰ خان نے بھی خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ ان کی تعداد تین ہونے کے باوجود
صرف وہ دونوں ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے اور اسلم محض خاموش سامع کا کردار نبھاتا ضرورت پڑنے پر
اخلاقاً مسکرا دیتا تھا۔ اس کی زندگی کے اتنے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بستے ان آزاد منش اور قدرے وحشی

لوگوں کے ساتھ گزرے تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی کسی محفل میں سرے سے شرکت ہی نہ کی تھی اور وہ ہر طرح کے ادب و آداب سے قطعی آزاد تھے..... تو ان بگڑے ہوئے لوگوں میں رہتے ہوئے وہ بھی ذرا بگڑ گیا تھا، اگرچہ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ خود کو وہاں بھی منفرد رکھ سکے لیکن آدمی کے لیے کسی ماحول میں رہتے ہوئے اس سے مکمل فرار ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ماحول کسی نہ کسی کمزور مقام سے نقب لگا کر اس کے اندر اُتر ہی جاتا ہے، سو اسلم بھی اس ماحول کو چھوڑ دینے کے باوجود مہذب دنیا میں رہتے ہوئے کبھی کبھار خود کو اس دنیا کے لیے اجنبی محسوس کرنے لگتا تھا اور یہ اجنبیت اس کے لبوں پر چپ کا تالا ڈالتی رہتی تھی جیسا کہ آج وہ اس محفل میں محض خاموش سامع تھا۔

''آپ صحیح کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شہریار صاحب کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے ضرور پچھتاتے ہوں گے کیونکہ ان کے مشورے میں پورا پورا خلوص شامل ہوتا تھا۔ ان جیسا مقام و مرتبہ رکھنے والوں میں ایسے مخلص لوگ مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مجھے تو جب ان کا خیال آتا ہے، یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور زندگی دے۔''

''آمین! مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لمبی زندگی پائے گا کیونکہ دنیا کو اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' آفتاب کو آنکھ سے خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے مصطفیٰ خان نے اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے دیا اور خود بولنا شروع کر دیا۔

''شہریار شروع سے بڑی حساس اور مہم جو طبیعت کا مالک ہے۔ دورانِ تعلیم ہم لوگ اکثر ہی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں کسی ایڈونچر کے لیے نکل جاتے تھے۔ ایک بار ہم میں سے کچھ لڑکے شرارت میں آ کر پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش کرنے لگے تو شہریار بڑا سخت ناراض ہوا کہ گاڑی میں انواع و اقسام کے ٹن پیک کھانے موجود ہونے کے باوجود وہ لوگ کیوں ان معصوم پرندوں کو زندگی کا نغمہ گانے سے روک دینا چاہتے ہیں جو اگر پکنے کے بعد پلیٹوں تک پہنچیں تو شاید کسی ایک شخص کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی کافی نہ ہوں لیکن زندہ رہ کر اپنے گیت الاپتے رہیں تو بہت سے لوگوں کو زندگی کی تازگی اور سرخوشی کا احساس دلاتے رہیں۔ اس بات پر ان لوگوں نے شہریار کا بہت مذاق اُڑایا تھا کہ اس مستقبل کے بیوروکریٹ کے اندر تو کسی شاعر کی روح حلول کر گئی ہے اور جا کر اس کے ماموں کو اطلاع دینی چاہئے کہ آپ کا ہونہار بھانجا ہرگز وہ بننے کے لائق نہیں رہا جو آپ اسے بنانا چاہتے ہیں۔ شہریار نے ان کے مذاق اُڑانے کی بالکل پروا نہیں کی اور اس بات پر اڑا رہا کہ ان پرندوں کو شکار نہیں کیا جائے گا۔ ممکن تھا کہ نوبت مار کٹائی تک جا پہنچتی کیونکہ وہ لڑکے مسلسل اسے زِچ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ہم باقی ساتھیوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اب اتفاق دیکھو کہ ہم آگے چلے تو ان شریر لڑکوں میں سے پھر کسی کے اندر شکار کی خواہش مچلی اور اس نے زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنی ایئر گن نکالی اور ایک درخت پر بیٹھے پرندوں پر استعمال بھی کر ڈالی۔ بدقسمتی سے وہ کسی پرندے کو تو شکار نہ کر پایا لیکن ایک کوّے کا گھونسلا نشانے پر آ گیا اور پھر مت پوچھو کہ کوّوں نے اس لڑکے کا کیا حال کیا؟ وہ جہاں جہاں جاتا تھا، کوّے اس کے پیچھے چلے آتے تھے اور اس کے سر پر ٹھونگیں برساتے تھے۔ بڑا برا حال ہو گیا تھا اس بے چارے کا۔ تنگ آ کر اس نے ٹرپ ہی ادھورا چھوڑ دیا اور واپس گھر چلا گیا۔ بعد میں گروپ کے سارے لڑکے شہریار کو چھیڑتے رہے کہ اس بے چارے کو تمہاری بد دعا لگی ہے۔ بس وہ ایسے ہی دن تھے۔ نوجوانی کی بے فکری میں ہم موج میلا کرتے پھرتے تھے اور اب اپنی ذمے داریوں میں گھرے لمبے عرصے تک ایک دوسرے سے فون پر رابطہ کرنے کا بھی



موقع نہیں ملتا۔'' مصطفیٰ خان بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

آفتاب حیران تھا کہ وہ شہریار کی حالت سے جان بوجھ کر تغافل کیوں برت رہا ہے اور کیوں نہیں چاہتا کہ اس محفل میں اس حوالے سے کوئی گفتگو ہو کہ شہریار پاکستان کے ایک ہسپتال میں نیم مُردہ حالت میں پڑا ہوا ہے اور اسے ان سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ صحافی ہونے کی حیثیت سے وہ پاکستان سے اتنی دور ہونے کے باوجود بھی وہاں کے حالات سے واقف رہتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ شہریار ایک قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹر حتمی طور پر کچھ نہیں کہتے کہ وہ کب ہوش میں آئے گا یا آ بھی سکے گا یا نہیں؟ بہرحال یہ تو طے تھا کہ مصطفیٰ خان ناواقف نہیں تھا، اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ مصطفیٰ خان نے خود گفتگو کا رُخ بدل دیا تھا اور پھر اسے وہ خفیف سا اشارہ بھی تو کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے اس موضوع کو چھیڑنے سے روک رہا ہو۔

اس اشارے کو سمجھ کر وہ چپ تو ہو گیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ اس اشارۂ زباں بندی کے پیچھے کوئی تو راز ہے جسے شہریار کا بچپن کا دوست مصطفیٰ خان جانتا ہو گا۔ مصطفیٰ خان بھی خوب ہی آدمی تھا۔ جدی پشتی رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص نے صرف دوستی نبھانے کی خاطر اپنے سے بہت ہی کم حیثیت لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک قابل انجینئر کی حیثیت سے یہاں کی ایک نامور تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کرنے کے علاوہ سٹی سینٹر میں ایک عدد اسٹور کا مالک بھی ہے جس کی آمدنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس آمدنی میں سے اسٹور پر کام کرنے والے درجن بھر ملازمین کو اتنی معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں کہ ان کے اپنے گھر بخوبی چلتے تھے۔ ماہ بانو اور اسلم بھی ان ملازمین میں شامل تھے جنہیں مصطفیٰ خان کے گھر میں قریبی دوستوں اور عزیزوں کی سی حیثیت حاصل تھی اور یہ سب اس لیے تھا کہ وہ شہریار کے بھجوائے ہوئے مہمان تھے اور شہریار جیسے باکمال آدمی کا دوست بھی باکمال تھا کہ دوستی کی خاطر پھر کسی فرق کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد ایک دور کافی کا بھی چلا پھر محفل برخاست کر دی گئی۔ مصطفیٰ خان نے اصرار کر کے آفتاب اور کشور کو ان کے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ آرلینڈو میں ایک آرام دہ گھر کرائے پر لے لینے کے بعد آفتاب کے مالی حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ گاڑی خریدنا بھی افورڈ کر سکے اس لیے وہ لوگ اس سہولت سے محروم تھے۔ مصطفیٰ خان کو تکلیف نہ دینے کا خیال دل میں ہونے کے باوجود اس کے اصرار کے باعث آفتاب کو اس کی لفٹ کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔

''آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ میں نے آپ کو ڈائننگ ٹیبل پر شہریار سے متعلق بات مکمل کیوں نہیں کرنے دی؟'' گاڑی آگے بڑھاتے ہی مصطفیٰ خان نے آفتاب سے ذکر چھیڑ دیا۔

''بالکل حیرانی تو ہوئی تھی لیکن خاموش اس لیے رہا کہ جانے اس کے پیچھے کیا مصلحت ہو؟'' اس نے اعتراف کیا۔

''اصل میں یہ خود شہریار کی خواہش تھی۔ مسلسل دشمنوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے شاید اسے اندازہ تھا کہ کسی روز وہ ان کا نشانہ بن سکتا ہے اس لیے اس نے جب میرے پاس ماہ بانو عرف مہرین اور اسلم کو بھجوایا تو مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ مجھے کچھ ہونے کی صورت میں ان دونوں میاں بیوی کو کوئی خبر نہ ہونے دینا۔ اس خواہش کے پیچھے کیا وجہ تھی، یہ میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کی خواہش کا خیال ضرور رکھا اسی لیے وہ دونوں میاں بیوی نہیں جانتے کہ ان کے پیچھے پاکستان میں شہریار پر کیا گزر چکی ہے۔ آپ سے بھی

میری یہی درخواست ہے کہ آئندہ آپ دونوں بھی اس سلسلے میں محتاط رہیے گا۔"

اپنی مختصر سی وضاحت میں اس نے آفتاب کی اُلجھن تو دُور کر دی لیکن اس بات سے بے خبر رہا کہ ایک اُلجھن نے اسلم کے ذہن میں بھی جگہ بنالی ہے جو بے شک ان کی محفل میں خاموش سامع کا کردار نبھا رہا تھا لیکن مصطفیٰ خان کا یک دم موضوع بدل دینا اور آنکھ سے اشارہ کرنا اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

⊛-----✪-----⊛

"آج میں تمہیں ایک بڑی حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی۔" شیخ زید روڈ پر دوڑتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان طرح دار حسینہ نے جو خود کو لائلہ کہلاتی تھی اور شاید حقیقت میں لیلیٰ تھی، اپنی سنہری زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا تو اس کے پہلو میں براجمان چودھری افتخار جو پہلے ہی اس پر ریشہ خطمی تھا، اس ادا پر مزید نثار ہونے لگا اور نثار ہونے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اُس نے اپنے ہاتھوں کا بے باکانہ استعمال شروع کر دیا۔

"نائی مین۔ میں گاڑی چلا رہی ہوں۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو ہم دونوں سیدھے اوپر جائیں گے۔" چودھری کی جسارت پر برا ماننے بغیر لائلہ نے اسے بڑے پیار سے ہنستے ہوئے بالکل ایسے تنبیہہ کی جیسے کوئی بے پروا مزاج کی ماں اپنے لاڈلے سپوت کو محض دنیا دکھاوے کے لیے تکلفاً ٹوکے۔ ورنہ حقیقتاً اسے ذرا پروا نہ ہو کہ اس کا بچہ اپنی شرارتوں کے نام پر کون کون سی تباہیاں مچاتا پھر رہا ہے۔ لائلہ نے چودھری کو اتنی چھوٹ دی تھی تو اس لیے کہ وہ اس کال گرل کو بے حد و حساب نواز رہا تھا۔

اپنے دبئی کے قیام کو رنگین بنانے کے لیے اس نے یہ بندوبست کیا تھا اور بہت خوش تھا کہ لمبے قد، سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی یہ حسینہ اس پر دل و جان سے فدا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سر سے پیر تک مصنوعی رنگوں میں رنگی اس حسینہ کا یوں فدا ہونا بھی مصنوعی ہے اور وہ اس طرح ہر اس شخص پر فدا ہو جاتی ہے جو اسے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق نوازنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

بہر حال اس حسینہ میں کوئی ایسا جادو ضرور تھا کہ چودھری نے پچھلے تین دن سے اسے ہی اپنا رفیق بنا رکھا تھا۔ اس میں لڑکی کے حُسن سے زیادہ ذہانت کا بھی دخل تھا اور صرف خلوت میں ہی نہیں، جلوت میں بھی چودھری کو خوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ دبئی میں گھومنے میں اسے خوب لطف آ رہا تھا اور حسبِ عادت لڑکی اور شراب کی بوتل کے ساتھ کمرے تک محدود رہنے کو ہی ترجیح نہیں دے رہا تھا۔

اپنی ذہانت کے اس کمال کی وجہ سے لائلہ نے ایک طرف تو خود کو حد سے زیادہ "استعمال" ہونے سے بچا رکھا تھا تو دوسری طرف وہ جی بھر کر چودھری کی جیبیں خالی کروا رہی تھی۔ کل وہ اسے اسی طرح "آج میں آپ کو ایک حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی" کہہ کر سونے کے بازار میں لے گئی تھی اور یہ بازار ایسا تھا کہ اس میں ہر طرف سونا بکھرا پڑا تھا۔ بے شمار جگمگاتی دکانیں تھیں جن کے اندر ہر طرح کے زیورات بھرے پڑے تھے۔ بھاری بھرکم زیورات، جنہیں تیل کی دولت سے مالا مال شیخ بخوشی اپنی بیگمات کی نذر کرتے تھے، دیکھنے والے کو متاثر کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔

چودھری صاحب کی فریفتگی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے لائلہ نے بھاری بھرکم زیورات کا ایک سیٹ معاوضے کے علاوہ بطور بونس حاصل کر لیا۔ اس قسم کے دوسرے کئی بونس وہ گزشتہ تین دنوں میں حاصل کر چکی تھی کہ دبئی میں گھومنے پھرنے کے لیے بھی عموماً شاپنگ مالز کا ہی رخ کرنے کا رواج تھا۔ اور اگر کسی شاپنگ



مال میں گھومتے ہوئے چودھری صاحب کی منظورِ نظر کو کوئی قیمتی سوٹ، پرس، جیولری یا شوپیس بھا جاتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ محض قیمت کی گرانی کی وجہ سے چودھری صاحب کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی من پسند چیز سے محروم ہو جاتی۔ چنانچہ خوب شاپنگ ہو رہی تھی جس سے چودھری کے خزانے میں کمی ہونے کا سوال اس لیے پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اس خزانے کو اپنے کمزور مزارعوں کی خون پسینے کی محنت سے بھرنے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ اب تو اس خزانے میں ہیروئن کی آمدنی سے ہونے والا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا چنانچہ چودھری تفریح کے نام پر خوب دولت اُڑا رہا تھا۔ اب بھی لائلہ نے اسے ایک حیرت انگیز جگہ لے چلنے کا ذکر کیا تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً راضی ہو گیا کہ اسے اس حسینہ پر لٹائے جانے والے درہموں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

لائلہ نے گاڑی "امارات" نامی مال کی وسیع پارکنگ میں پارک کی اور پھر وہ دونوں جگمگاتی روشنیوں میں گاڑی سے نکل کر یوں ساتھ چلے کہ اپنے شانے سے لگی لائلہ کے گرد چودھری نے ایک ہاتھ کا حلقہ اس طرح سے بنا رکھا تھا کہ اس کی انگلیاں لائلہ کی جینز اور ٹاپ کے درمیان موجود ایک خاصی بڑی خالی جگہ پر اس کی ناف پر تھرکتی تھیں۔ لائلہ کو اس جسارت پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ یہی سب برداشت کرنے کی تو لیس لیتی تھی۔ چنانچہ مگن سی اسے مختصر راستوں اور خودکار زینوں سے گزار کر ایک ایسی جگہ لے گئی جس نے چودھری کو سچ مچ مبہوت کر دیا۔ یہاں اس نے شیشے کی دیوار کے پار ایسا نظارہ دیکھا کہ لمحہ بھر کے لیے کنفیوز ہو گیا کہ دبئی میں ہے یا واپس نیویارک پہنچ گیا ہے۔ اور مراد شاہ کے اپارٹمنٹ کی فرنچ ونڈو میں کھڑا باہر کا نظارہ کر رہا ہے۔

"یہ "اسکی دبئی" ہے۔" اس کی کیفیت دیکھ کر لائلہ نے فخر سے بتایا۔

"کمال ہے بھئی۔ مجھے تو ایسا لگا کہ میں دبئی کے بجائے نیویارک میں ہوں۔ ایسی برف باری کا دبئی میں کہاں تصور کیا جا سکتا ہے؟"

چودھری متاثر تھا۔ حقیقتاً ساڑھے بائیس ہزار میٹر پر مشتمل یہ برفانی علاقہ تھا ہی متاثر کن کہ گرم لُو اُڑاتے صحرا میں اس کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن عربوں نے یہ کمال کر دکھایا تھا۔ بلندی سے گرتی برف، پھسلواں راستوں پر اسکیٹنگ بورڈ پر گرم لباسوں میں پھسلتے لوگ، پتوں پر برف کے ذرّات لیے کھڑے پائن کے درخت، برف پر پھسلنے والی گاڑیاں اور ایک دوسرے پر برف اُڑاتے سرخوشی سے کھیلتے بچوں کو دیکھ کر بھلا کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ یہ سب نقلی ہے۔ لیکن یہ تھا بہر حال نقل ہی جسے عربوں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر نقل بمطابق اصل حسبِ خواہش بنا کر دکھا ڈالا تھا۔

"جس کے پاس دھن دولت ہو، وہ ہر شے کا تصور کر سکتا ہے۔ ورنہ تو "اسکی دبئی" کی تعمیر تو کیا، لائلہ جیسی عورت کی قربت بھی خواب بن جاتی ہے۔" لائلہ نے ہنستے ہوئے چودھری کی بات کا جواب دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "آئیں چلیں، ذرا چل کر اس موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

اگرچہ چودھری کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا کہ زندگی میں اپنے وطن کے شمالی علاقہ جات کے علاوہ بہت سے سرد ممالک کا بغرض تفریح سفر کیا تھا، پھر بھی وہ لائلہ کو خوش کرنے کے لیے اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ کھلونوں اور گرم لباس کے حصول کے بعد وہ دونوں اس علاقے میں داخل ہوئے تو یکدم ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس جگہ پر درجۂ حرارت منفی ایک یا دو ہوتا تھا اور گرم علاقوں میں رہنے والوں کے، چاہے وہ چوبیس گھنٹے اے سی میں رہتے ہوں، مزاج پوچھنے کے لیے کافی تھا۔

اندر گھستے ہی لائلہ تو ہوا ہو گئی اور پیروں سے اسکیٹنگ بورڈ باندھے برف پر پھسلنے کا لطف اٹھانے لگی۔ البتہ چودھری کے لیے یہ تجربہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ شوق ہی شوق میں پھسل جاتا تو نہ تسلیم کیے جانے والے بڑھاپے کی ہڈیاں جو اگرچہ بہت سنبھال کر رکھی گئی تھیں، پھر بھی تھیں تو بوڑھی ہی، ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد مرمت میں خاصی مدت لیتیں اور اس عرصے کے لیے وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہو جاتا۔ اس لیے بہتر سمجھا کہ ایسے کسی خطرناک تجربے سے دور ہی رہے۔ لیکن جب یہاں تک آ گیا تھا تو کچھ تو کرنا ہی تھا، اس لیے برف پر پھسلنے والی گاڑی کا رخ کیا۔ اس گاڑی کو انسان دوڑاتے تھے۔ چنانچہ اس میں بیٹھ کر اس کی انا کو خاصی تقویت ملی۔ لیکن پھر وہ جلد ہی اس کھیل سے بھی اُکتا گیا اور اسکیٹنگ کا لطف اُٹھاتی لائلہ کو اشارے سے باہر نکلنے کا کہا۔ وہ فوراً آ گئی۔

''مزہ آ گیا۔ بہت دنوں بعد یہاں آئی ہوں۔ اگر آپ نہ بلاتے تو میں اپنا گھنٹہ پورا کیے بغیر باہر نکلنے والی نہیں تھی۔'' مال سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بچوں کی سی خوشی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا کروں گا کہ جب کبھی میرا دُبئی دوبارہ آنا ہوگا تو تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ نیویارک لے چلوں گا، تم وہاں برف باری کے سیزن میں چلنا اور خوب انجوائے کرنا۔''

یہ سوچے بغیر کہ اب شاید خود اس کا نیویارک میں داخلہ بھی مشکل ہو، اس نے لائلہ سے وعدہ کیا۔ ویسے بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ایک کال گرل سے کیے ہر وعدے کو نبھایا جائے۔ ایسے وعدے صرف اسے خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش کر سکے۔

ان کا اگلا پروگرام دُبئی کی ہوائی سیر کا تھا۔ اُس کی فرمائش بھی لائلہ نے ہی کی تھی اور چودھری کو اس لیے انکار نہیں تھا کہ خود اس نے بھی کبھی دُبئی کو اس انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ دُبئی کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر دیکھنا اس کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس سفر میں بھی اسے لائلہ کی قربت میسر تھی۔ بلند و بالا عمارتوں سے بھرے دُبئی کی فضائی سیر کرتا ہوا وہ نظروں سے عمارتوں کی بلندی کم ناپ رہا تھا، لائلہ کے جسمانی نشیب و فراز میں زیادہ اُلجھا ہوا تھا۔

''یہ برج دُبئی ہوٹل ہے۔ اسے برج العرب بھی کہتے ہیں۔'' ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے کی طرف پہنچ کر نیچی پرواز کرنے لگا تو لائلہ نے ایک کھلے ہوئے بادبانوں والی کشتی جیسی عمارت کی طرف چودھری کی توجہ مبذول کروائی۔

''یہ ہوٹل ہمارے دُبئی کی پہچان ہے۔ یہاں دنیا کی ہر سہولت میسر ہے۔ باغ، ریسٹورنٹ، کلب سمیت یہاں ہر وہ شے موجود ہے جس کے بارے میں کوئی انسان سوچ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک کمرے کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ عام آدمی یہاں قیام کا تصور نہیں کر سکتا۔'' لائلہ برج العرب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں کل ہی اس ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا ہوں۔ پھر جب تک میں یہاں ہوں، تم میرے ساتھ وہیں رہنا۔''

چودھری کو ایسا لگا کہ اس کے برج العرب کو چھوڑ کر کسی اور ہوٹل میں منتقل ہونے کی وجہ سے لائلہ اسے عام آدمی قرار دے رہی ہے اس لیے فوراً ہی اعلان کر دیا کہ وہ خود وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ اس خبر کو سن کر لائلہ بے حد خوش ہوئی۔

''اوہ..... سو سویٹ ڈارلنگ! تم نے تو میری دلی خواہش پوری کر دی۔'' اس نے پائلٹ کی پروا کیے بغیر چودھری کے چٹاچٹ کئی بوسے لے ڈالے۔



اس تفریحی پرواز سے سے فارغ ہو کر وہ کھانے کے لیے حجرہ ہوٹل پہنچے، تب بھی چودھری پر ان بوسوں کا سرور طاری تھا۔ یہ سحر اس وقت ٹوٹا جب اس کے خاص موبائل نے جیب میں پڑے پڑے وائبریشن کی۔ یہ موبائل اسے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے کی جانے والی کال ٹریس نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی ٹریس کرنے کی کوشش کرے تو کال ہی ڈس کنیکٹ ہو جاتی تھی۔ پہلے پہل جب دنیا کا یہ منفرد ترین موبائل اس کی ملکیت میں آیا تھا تو اسے بڑا احساسِ تفاخر ہوا تھا لیکن اب یہ بوجھ لگنے لگا تھا۔ کیونکہ دوسری طرف سے اس سے رابطہ کرنے والے عموماً احکامات ہی صادر کرتے تھے اور کسی کا حکم ماننا آج بھی اسے بڑا دُشوار لگتا تھا۔ اب بھی موبائل نے وائبریٹ کیا تو اس کا دل چاہا کہ کال ریسیو نہ کرے اور لائلہ کی قربت سے لطف اندوز ہوتا رہے لیکن خیال کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی اسے یاد آ گیا کہ الفا نیویارک میں کشور اور آفتاب کے اپارٹمنٹ پر کروائے جانے والے قاتلانہ حملے کے بعد پہلے ہی اس سے ناراض ہے اور کال ریسیو نہ کرنے کی صورت میں اس کی ناراضگی مزید بڑھ سکتی ہے، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کر ہی لی۔

''اُمید ہے کہ اب تک تمہارا تفریحی ٹور مکمل ہو گیا ہوگا۔ اس لیے مہربانی کر کے پاکستان واپس چلے جاؤ تاکہ وہاں تمہیں تمہارے حصے کی ڈیوٹی سونپی جا سکے۔''

الفا نے ایسے لہجے میں اس سے یہ جملے کہے جیسے وہ فون پر اس کی تصویریں دیکھ رہا ہو اور جانتا ہو کہ وہ ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کسی طرح دار حسینہ کی معیت میں زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔

''میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ مجھے وہاں کب دیکھنا چاہتے ہیں؟'' اس نے مینو کارڈ کا جائزہ لیتی لائلہ کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کل..... پہلی دستیاب فلائٹ سے۔'' الفا نے حکم جاری کر کے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا تو اس نے بے آواز سے جھنجلاتے ہوئے موبائل واپس جیب میں ڈال لیا۔

''خیریت ڈارلنگ! کس کا فون تھا؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو'' اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے لائلہ نے اس سے پوچھا۔

''پاکستان سے میرے پی اے کی کال تھی۔ کل ایک اہم بزنس پارٹی، میٹنگ کے لیے وہاں پہنچ رہی ہے اس لیے کل میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' اس نے اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا کہ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اس نے لائلہ سے کل رات برج العرب میں شفٹ ہونے کا وعدہ کیا تھا اور اب فوراً ہی اسے یہاں سے روانگی کا حکم نامہ مل گیا تھا۔

''اوہ نو..... یہ تو سارا پروگرام ہی خراب ہو گیا۔ کیا تم اس میٹنگ کو دو چار دن کے لیے ٹال نہیں سکتے؟ یا پھر کسی اور اعتماد کے بندے سے کہو کہ وہ یہ میٹنگ نمٹا لے۔'' وہ بڑی ادا سے ٹھنکی۔

''سوری ڈارلنگ! پارٹی بہت بڑی ہے اور میٹنگ بھی بہت اہم، اس لیے ہمیں ہی اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی ہوگی۔ تم اُداس نہ ہو، میں بہت جلد دوبارہ یہاں کا چکر لگاؤں گا اور آنے سے پہلے ہی برج العرب میں ڈبل بیڈ روم بک کروا لوں گا۔ پھر ہم دونوں بہت سارے دن وہاں ساتھ رہیں گے۔'' چودھری اس کی ادا سے متاثر تو ضرور ہوا تھا لیکن زیر اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جو زبردست تھا، اس کی جان کو آ جاتا۔ چنانچہ فی الحال اس کے حکم کی تعمیل میں ہی بھلائی تھی۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان بری طرح لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم تھے جن سے نکلتے خون نے اس کے لباس کو رنگ ڈالا تھا۔

جسم پر موجود یہ زخم اسے کسی لڑائی یا حادثے کے نتیجے میں نہیں لگے تھے بلکہ اس نے خود اپنے آپ کو لگائے تھے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ بشیر تک رسائی حاصل کر سکے۔

اس نے اور میجر اسفندیار نے بہت غور کیا تھا کہ اس شخص پر کس طرح ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے؟ لیکن کوئی بھی طریقہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اتنی مضبوط حیثیت کا مالک تھا کہ اگر فوج اس کے خلاف براہ راست ایکشن لینا چاہتی تو پورے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور اس کے ہزاروں پیروکار بپھر کر فوج کے خلاف ہی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ صرف احمد یار کے بیان کی بنیاد پر اسے گرفتار کرنے کے بارے میں سوچا جا سکے۔ خفیہ طور پر اغوا کرنا بھی اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جہاں رہتا تھا، وہاں ہر وقت مسلح افراد پہرہ دیتے تھے اور ان مسلح افراد سے بھڑے بغیر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

اپنی قیام گاہ سے وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب بھی نکلتا تھا، اس کے ساتھ اس کے ذاتی محافظوں کی فوج موجود ہوتی تھی۔ ان مسلح محافظوں کے نرغے میں گھس کر اس تک پہنچنے کے لیے بھی فوج ہی کی ضرورت پڑتی تھی۔ پھر اس کے بعد بھی نتائج بدترین ہی نکلنے تھے کہ سب سے بڑا مسئلہ اس کے حواریوں کا تھا۔ بشیر کچھ ہوتا تو وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سڑکوں پر نکل آتے اور انہیں سنبھالنا انتظامیہ کے لیے مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے تو یہی غور کرنا شروع کیا کہ بغیر کسی ہنگامے کے اس تک کس طرح پہنچا جائے۔

آخر کار مشابرم خان کو ہی ترکیب سوجھی۔ میجر اسفندیار اس ترکیب پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ اپنے کسی آدمی کو اس طرح سے زک پہنچانا کہ وہ شدید زخمی نظر آئے، بڑی عجیب سی بات تھی۔ پھر اسے یہ بھی فکر تھی کہ اپنے پروگرام کے مطابق اگر مشابرم خان بشیر کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اکیلا کیا کر سکے گا۔ لیکن مشابرم خان نے اسے راضی کر لیا۔ میجر اسفندیار کو بھی آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ مشابرم خان کو زخمی کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ زخم اس نوعیت کے تھے کہ بظاہر دیکھنے میں وہ خاصا زخمی نظر آئے لیکن اسے ایسا کوئی خطرناک زخم نہیں لگایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ پھوٹ جائے یا بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے وہ نقاہت محسوس کرنے لگے۔ احتیاطاً اسے پہلے سے طاقتور ادویات کے ساتھ ساتھ خون کے بہاؤ کو روکنے والی ادویات بھی استعمال کروا دی گئی تھیں اور پھر اس کا لیر لیر پیراہن خون میں تر بتر نظر آتا تھا، اس میں اس کا اپنا خون بہت کم موجود تھا اور بیشتر رنگینی اس چار بکرے کے خون کی تھی، جسے آج کھانے کے لیے ذبح کیا گیا تھا۔

حسب پروگرام لڑکھڑا کر چلتا مشابرم خان جب پتھروں سے بنی اس عمارت کے دروازے پر پہنچا، جو اس کے ایک حصے میں بشیر کی رہائش تھی۔ باقی حصہ محافل وغیرہ کے لیے مخصوص تھا، تو جان بوجھ کر گر گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر دروازے پر موجود محافظوں میں سے ایک لپک کر اس کے قریب آیا۔ مشابرم خان نے ایسا سادہ لیا جیسے وہ بے ہوش ہو۔ محافظ نے قریب آ کر اس کا جائزہ لیا اور پھر وہیں سے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔

"یہ تو بڑا زخمی ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی نے اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔"



جواب میں ایک اور محافظ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔

"واقعی..... اس بے چارے کی تو بہت بری حالت ہے۔ ایسا کرتے ہیں، اسے اندر پہنچا دیتے ہیں۔ اندر ڈاکٹر تو ہے ہی، وہ اس کی مرہم پٹی کر دے گا۔ بعد میں یہ ہوش میں آ کر خود ہی بتا دے گا کہ اس کی یہ درگت کس نے بنائی ہے۔" دوسرے محافظ نے بھی قریب آنے پر اس کی حالت دیکھی تو ہمدردی سے بولا۔ پھر فوراً ہی وہاں ایسی ہلچل مچ گئی جو کسی شدید زخمی کو ہسپتال منتقل کرنے کے وقت مچتی ہے۔

مشابرم خان نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور صرف آوازوں سے اردگرد کی صورت حال کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کسی کے کہنے پر اندر سے اسٹریچر منگوایا گیا اور دو تین آدمیوں نے مل کر اسے اس اسٹریچر پر منتقل کیا۔ پھر اسٹریچر حرکت کرتا ہوا اندر کی طرف جانے لگا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اپنے منصوبے کے پہلے حصے میں تو کامیاب ہو گیا تھا اور اندر تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ورنہ یہی مرحلہ سب سے مشکل تھا۔

وہ ایک دو بار بہانے سے یہاں آ کر امکانات کا جائزہ لے چکا تھا۔ عبادت کے اوقات میں وہاں موجود محافظ زیادہ محتاط رہتے تھے اور کسی بھی شخص کو بلا ضرورت وہاں رکنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں وہ بشیر کی رہائش گاہ تک رسائی کیسے حاصل کرتا؟ البتہ اس نے بشیر کو دیکھا ضرور تھا۔ چگی داڑھی والے اس شخص کی رنگت گوری تھی۔ قد کاٹھ اچھا تھا، لیکن آنکھوں میں جو سانپ جیسی چمک تھی، وہ مقابل کو زیادہ دیر اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں دیتی تھی۔ اس نے کچھ دیر بشیر کے پیچھے وہاں عبادت کی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک خوش الحان شخص تھا۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں وہ شخص اس کے دل کو بھایا نہیں تھا اور نہ ہی دل میں احترام کے وہ جذبات اُبھرتے تھے جو کسی نیک نام اور پرہیزگار شخص کو دیکھ کر اُبھرتے ہیں۔

مشابرم خان تو ایسا شخص تھا کہ کسی بھی قسم کے فرق کو خاطر میں لائے بغیر ہر عالم دین کا احترام کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا نظریہ تھا کہ معمولی اختلافات کے ساتھ ان میں سے ہر شخص دین کی خدمت کر رہا ہے اور اگر اس نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھی ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اس کے اسٹریچر کو احاطے میں ہی عبادت گاہ سے ہٹ کر بنائی گئی ایک نسبتاً چھوٹی عمارت میں لے جایا گیا۔ آنکھ کی جھری سے گردوپیش کا جائزہ لیتے مشابرم خان نے وہاں کے مخصوص ماحول سے اندازہ کر لیا کہ یہ وہی چھوٹا سا ہسپتال ہے جس کے بارے میں اسے علم ہوا تھا کہ یہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر اور نرسنگ اسٹاف ڈیوٹی پر رہتا ہے اور نہ صرف بشیر کے معمولی اشارے پر اس کی خدمت کے لیے پہنچ جاتا ہے بلکہ اس کے منظورِ نظر افراد کو بھی یہاں علاج کی سہولت میسر رہتی ہے۔

اس کا اسٹریچر اندر پہنچا تو ڈیوٹی پر موجود اسٹاف نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ فوراً ہی اس کے پھٹے ہوئے خستہ لباس کو اس کے جسم سے الگ کر کے اس کے زخموں کی صفائی اور مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس مرہم پٹی کے دوران وہ منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج کرتا رہا تاکہ ایک تو طبی امداد دینے والوں کو اس کی تکلیف کا یقین ہو جائے، دوسرے یہ بھی واضح ہو جائے کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔ بے ہوشی کا ڈرامہ کر کے وہ باہر موجود محافظوں کو تو بے وقوف بنا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے طبی عملہ جعلی بے ہوشی کے دھوکے میں نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ ان کے سامنے نیم غنودگی اور نقاہت کی اداکاری تو کی ہی جا سکتی تھی۔

"اسے چین کر دو۔" شاید اس کی مسلسل کراہوں سے تنگ آ کر ڈاکٹر نے یہ ہدایت دی تھی۔ فوراً ہی اس ہدایت پر عمل ہوا اور اس کا بازو پکڑ کر کسی نے اس میں سوئی چبھو دی۔ سوئی کی چبھن کے ساتھ اس نے اپنے جسم میں اترتی دوا کو محسوس کیا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد وہ احساسات سے عاری ہو گیا۔ اسے دیا گیا چین

کلر یقیناً نشہ آور تھا جس نے اسے سکون کی نیند سلا دیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے لیکن صاف ستھرے کمرے میں موجود تھا۔ کمرے میں سفید رنگ کا غالب استعمال ظاہر کر رہا تھا کہ یہ ہسپتال کا کمرہ ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں کینولا لگا تھا جس کی مدد سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ قریب ہی کرسی ڈالے ایک نوعمر و خوش شکل لڑکی بیٹھی اس کی صورت تک رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ لڑکی مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں مسٹر!'' قریب آ کر اس کی کلائی کو تھامتے ہوئے اس نے شیریں لہجے میں دریافت کیا۔

''میں کہاں ہوں؟'' نرس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے غائب دماغی سے سوال کیا۔

''آپ ہسپتال میں ہیں، آپ کو شدید زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ ہم نے آپ کی مرہم پٹی کر کے لباس تبدیل کروایا۔ آپ بتائیں کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' نرس نے نرم لہجے میں اس کی یادداشت بحال کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں ٹھیک ہوں..... لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہاں تک کیسے پہنچا؟'' اس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ اپنے ذہن پر زور دیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔'' اسے تسلی دے کر نرس کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر اپنے ذہن میں وہ کہانی دہرانے لگا جو یہاں والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اسے سنانی تھی۔ چند منٹوں میں ہی نرس، ڈاکٹر کے ساتھ واپس آ گئی۔ ڈاکٹر نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اس کا معائنہ کیا اور اپنے کام سے فارغ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے مسٹر؟''

''مشابرم خان۔'' اس نے سچ بتایا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان! اب تمہاری حالت کافی بہتر ہے۔ زخم بہت زیادہ ہیں لیکن کوئی بھی زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تمہیں یہ زخم کیسے آئے؟'' اپنے سپاٹ لہجے کے باوجود ڈاکٹر کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر زخموں کی نوعیت دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ زخم کسی حادثے کے نتیجے میں نہیں آئے ہیں بلکہ کسی تیز دھار ہتھیار سے لگائے گئے ہیں۔

''مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکٹر صاحب! میں بے چارہ غریب مسافر یہاں آ کر خوامخواہ پھنس گیا۔ میں اپنی ماں کی میت میں شریک ہونے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر پنجاب جا رہا تھا۔ وہاں میری ڈرائیور کی نوکری ہے۔ گاؤں سے ادھر آ کر گاڑی میں سیٹیں بھی بک کروالی تھیں۔ پھر پتہ چلا کہ حالات کی وجہ سے گاڑیاں آگے نہیں جا رہی ہیں۔ میں اور میری بیوی ادھر ہی پھنس گئے۔ بیوی نے کہا بھی کہ واپس گاؤں چلو لیکن میں اس انتظار میں رک گیا کہ گاڑیاں چلیں گی تو آگے چلے جائیں گے۔ واپس گاؤں جانے اور پھر آنے میں وقت بھی لگتا اور خرچہ بھی ہوتا۔ بیوی میری بات مان گئی۔ ہم یہیں ایک ہوٹل میں رہنے لگے۔ ہوٹل سے میں کبھی کبھی نماز پڑھنے ادھر بھی آ جاتا تھا۔ کل بھی مغرب کی نماز میں آیا تھا۔ نماز پڑھ کر نکلا تو ایسے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا اور گھومتے ہوئے ذرا سنسان جگہ پر پہنچ گیا۔ وہاں فوراً ہی دو آدمیوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے ساتھ مار پیٹ کرنے لگے۔ میں نے ان سے اپنا جرم پوچھا تو کہنے لگے تیرا جرم یہ ہے کہ تُو ان کا پیروکار



ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بھائی! میں ایک مسافر ہوں لیکن اُنہیں میری بات سمجھ نہیں آئی۔ وہ مجھ پر تشدد کرتے رہے اور کہنے لگے جن سترہ افراد کو بس سے اُتار کر ہلاک کیا گیا، وہ بھی غریب مسافر تھے۔ ان پر رحم نہیں کیا گیا تو ہم تم پر کیوں رحم کریں؟ ہم تو تم سے اور تمہارے جیسے دوسروں سے اپنے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لیں گے۔ ہم تمہیں تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ وہ مجھے زخمی کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ میں تکلیف اور خوف سے بے ہوش ہو گیا اور شاید وہ لوگ مجھے مُردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے بہت دیر میں ہوش آیا تو میں ہمت کر کے اس ویرانے سے نکل پڑا۔ اس وقت ایسا نہیں تھا کہ اُجالا ہوتا اور مجھے راستے سمجھ آتے، بس ایسے ہی چل پڑا۔ تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے ٹھیک طرح سے چلا جا رہا تھا اور نہ ہی راستے سمجھ آ رہے تھے۔ میں ہمت کر کے چلتا رہا۔ چلتے چلتے سورج نکل آیا اور میں نے دیکھا کہ میں ادھر آنے والی سڑک پر ہوں تو ہمت بڑھ گئی کہ تھوڑی اور کوشش کروں گا تو ٹھیک جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے آگے تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میں عبادت گاہ کے سامنے پہنچ کر گر گیا تھا، جہاں سے گیٹ پر موجود گارڈز مجھے لے کر یہاں آئے اور آپ لوگوں نے مہربانی کر کے میری مرہم پٹی کر دی۔'' اس نے نہایت روانی سے وہ کہانی سنا دی جو پہلے سے یاد رکھی تھی۔

''تم نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے تمہیں اس طرح زخمی کیا؟'' ڈاکٹر اُس کی سنائی داستان سے متاثر نظر آ رہا تھا چنانچہ ذرا نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ان لوگوں نے چہرے پر نقابیں لگا رکھی تھیں اور وہاں اندھیرا بھی بہت تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ان لوگوں کو پہچان سکتے تو بہت اچھا ہوتا۔ تمہارے مجرموں کو تمہارے سامنے سزا دی جاتی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہ تو سمجھ آ ہی گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اب بھی انہیں ایسے ہی چھوڑا نہیں جائے گا۔ ہم اسلحے کا جواب پتھر سے دینے والے لوگ ہیں اور ہم سے ٹکرانے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ خاصا سنگین تھا اور اس کے الفاظ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ یہاں صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی کام نہیں کر رہا بلکہ بشیر کا مقرب خاص ہے اسی لیے اس قسم کے عزائم کا اظہار کر رہا ہے۔

''آپ جو کریں آپ کی مرضی ہے ڈاکٹر صاحب! میں غریب آدمی ہوں اور کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ مجھ پر اتنی مہربانی کریں کہ ہوٹل میں میری بیوی کو اطلاع کروا دیں کہ میں یہاں ہوں۔ وہ بے چاری بڑی پریشان ہو گی کہ میں رات واپس کیوں نہیں آیا اور اب بھی دن چڑھے تک کہاں ہوں۔'' اس نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اسے کسی انتقام وغیرہ سے دلچسپی نہیں ہے، اپنی بیوی کے لیے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''تم نے دن چڑھے کے الفاظ غلط استعمال کیے ہیں۔ تم بے ہوش تھے، اس لیے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ دن چڑھنے کے بعد دوبارہ ڈھلنے کے لیے تیار ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اطلاع دی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ میری بیوی بے چاری نے تو رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی ہو گی۔'' وہ مضطرب نظر آنے لگا۔

''جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ تم ہمیں ہوٹل کا نام اور اپنا کمرہ نمبر وغیرہ بتاؤ۔ میں یہاں سے کسی کو بھیج کر تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔ اچھا ہے وہ ہو گی تو تمہاری دیکھ بھال بھی کر لے گی اور تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔ آج کی رات کم از کم تم کو یہیں گزارنی پڑے گی۔ پھر کل صبح تمہارا چیک اپ کرنے کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں چھٹی کب دی جائے۔'' ڈاکٹر اس سے کہہ کر باہر نکل گیا جبکہ نرس وہیں موجود رہی۔

"ڈاکٹر صاحب تو بہت مہربان آدمی لگتے ہیں۔" نرس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

"اپنے لوگوں کے لیے وہ بہت مہربان ہیں۔ ورنہ باہر والوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتے۔" نرس نے جواب دیا۔

مشابرم خان نے اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا، اپنے لوگوں سے اس کا کیا مطلب ہے۔

"بشیر صاحب یعنی بڑے صاحب کو آپ کے بارے میں بتایا جائے گا تو انہیں بھی بہت افسوس ہوگا۔ ہم میں سے کسی کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ میں نے ان کی طرح اپنے دیوانوں سے اتنی محبت کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ جب ہی تو ہم بھی ان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" وہ چھوٹی سی لڑکی بڑی عقیدت سے بتا رہی تھی اور مشابرم خان سوچ رہا تھا کہ بشیر کیسا جادوگر ہے جس نے سب کے دل اپنی مٹھی میں لے رکھے ہیں۔

"میری ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، بس آتے جاتے یہاں ٹھہرتا ہوں تو عبادت کے دوران ان سے دیدار بھی کر لیتا ہوں۔" اس نے ایسے لہجے میں بتایا جیسے اپنی اس محرومی پر بڑا افسردہ ہو۔

"ہم میں سے زیادہ تر کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی خوش ہونا پڑتا ہے۔ ان کے اتنے چاہنے والے ہیں وہ آخر کس کس سے ملیں گے؟ لیکن تم اُداس نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری داستان ان تک پہنچی تو وہ تمہیں ملاقات کے لیے اپنے پاس ضرور بلائیں گے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے اسے اُمید دلائی۔

"پھر تو میں اپنے اس طرح زخمی ہونے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔" اس نے بے ساختگی سے کہا تو نرس دھیمے سُروں میں ہنس دی۔ وہ بڑی نوخیز لڑکی تھی جو یوں ہنستے ہوئے اچھی لگ رہی تھی۔

"تم کب سے یہاں ملازمت کر رہی ہو؟ تمہاری تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی ہوگی۔" مشابرم خان نے اسے کھوجنا شروع کر دیا۔

"نہیں، میں یہاں دو مہینے پہلے ہی تو آئی ہوں۔ میری ڈیوٹی یہیں پر ہوتی ہے جبکہ ان کو ضرورت پڑے تو ڈاکٹر صاحب خود ان کے پاس چلے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ظاہر ہے کوئی سینئر نرس ہوتی ہے۔" اس نے بھولپن سے بتایا۔

"یہاں کتنے ڈاکٹرز اور نرسیں ہیں۔ کیا یہ کافی بڑا ہسپتال ہے؟" اس نے اپنی کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

"یہ زیادہ بڑا ہسپتال نہیں ہے، بس یوں سمجھ لو کہ یہاں صرف بڑے صاحب، ان کے ذاتی ملازمین اور عبادت گاہ کے اسٹاف کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار باہر سے تمہارے جیسا کوئی مریض آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں چوبیس گھنٹے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جونیئر ڈاکٹرز ہیں جن میں سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہیں جبکہ نرسیں مجھ سمیت چار ہیں۔ ہم دو دو کر کے دن رات کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ کبھی کسی چھٹی کی ضرورت پڑے تو ایک نرس سے بھی کام چل جاتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر ہسپتال میں کوئی مریض داخل نہیں ہوتا۔" وہ بھولپن سے اسے ساری معلومات فراہم کرتی چلی گئی۔

"کیا دونوں جونیئر ڈاکٹرز بھی شفٹوں میں کام کرتے ہیں؟" اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا، اس پر عمل کرنے کے لیے مکمل معلومات ہونا ضروری تھا۔

"نہیں، دونوں ڈاکٹرز دن کے اوقات میں چھ چھ گھنٹوں کی شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ رات میں صرف بڑے ڈاکٹر صاحب ہی ہوتے ہیں۔ البتہ دونوں جونیئر ڈاکٹرز اس بات کے پابند ہیں کہ اگر



ایمرجنسی میں رات کو یہاں بلوایا جائے گا تو وہ فوراً پہنچ جائیں گے۔" نرس نے بتایا۔

مشابرم خان اس سے اسی نوعیت کے مزید سوالات بھی کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ فطرتاً کچھ معصوم لڑکی تھی جو سادگی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ تقریباً پون گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر دوبارہ وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر تھے۔

مشابرم خان جانتا تھا کہ اس کے پاس اس کے لیے کیا خبر ہوگی پھر بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"میری بیوی تو ٹھیک ہے نا؟" مشابرم خان نے گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے لوگوں کی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ریسپشن پر موجود بندے نے بتایا ہے کہ کل رات گئے دو افراد وہاں آئے تھے اور تمہاری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے ساتھ جاتے ہوئے تمہاری بیوی نے کسی قسم کا ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اسے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے اسے وہی اطلاع دی جو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ میجر اسفندیار کے ساتھ اس کا یہ پروگرام پہلے طے پا چکا تھا کہ وہ لوگ گل مینا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس طرح ایک تو وہ گل مینا کے محفوظ مقام پر ہونے سے مطمئن بھی رہتا، دوسرے یہ ڈرامہ بھی کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کی خبر دیتے ہی پریشان ہونے کی اداکاری شروع کر دی۔

"وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی ڈاکٹر صاحب! یہاں ہمارا ایسا کوئی جاننے والا نہیں ہے جس کے ساتھ وہ اتنی رات کو جا سکے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے ڈرا دھمکا کر یا پھر دھوکے سے کہیں لے جایا گیا ہے۔" اس نے تقریباً رونے والی شکل بنا لی۔

"ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں تمہاری بیوی کے پاس پہنچے ہوں گے اور انہوں نے اسے اطلاع دی ہوگی کہ مشابرم خان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں داخل ہے اور تمہیں بلا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے وہ اس کے جال میں آ کر ان کے ساتھ چل پڑی ہوگی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والے لوگ کون تھے؟"

ڈاکٹرز نے خود ہی ایسا تجزیہ پیش کر دیا کہ مشابرم خان کو کہانی سنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ ایک سوال کے اٹھائے گئے سوال کا جواب اسے دینا تھا۔

"میرے خیال میں تو یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے مجھے تشدد کر کے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مار کھانے کے دوران میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں یہاں کون سے ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"اور ان کمینوں نے انتقام کے جوش میں ایک معصوم عورت کو اغوا کر ڈالا۔ جانے وہ ظالم اس بے چاری کے ساتھ کیا کریں گے۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ رات بھر میں اس کی عزت کسی طور محفوظ نہیں رہی ہو گی اور پتہ نہیں کتنے درندے اس کے جسم کو بھنبھوڑتے رہے ہوں گے۔ تم دیکھنا کہ جلد ہمیں کہیں سے اس کی بے جان لاش مل جائے گی۔"

مشابرم خان کی بات سن کر ڈاکٹر نے ایسے الفاظ میں ایک اَن دیکھے منظر کا نقشہ اس کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا کہ مشابرم خان حقائق سے واقف ہونے کے باوجود کانپ اٹھا۔

"اگر میری گل کو کچھ ہوا تو میں ان میں سے ایک ایک کی تکا بوٹی کر ڈالوں گا۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں عزم کا اظہار کیا۔

"تم خود کو تنہا مت سمجھو۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اس کا حساب لینے کے لیے ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے۔ میں خود بڑے صاحب سے تمہارے سلسلے میں بات کروں گا۔ فی الحال تم یہاں ریسٹ کرو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہاری بیوی کو تلاش کیا جا سکے۔"

ڈاکٹر اسے تسلی دے کر باہر نکل گیا تو اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ یہ اداکاری اس لیے ضروری تھی کہ کمرے میں مستقل موجود نرس کے ذریعے دوسروں کو بھی خبر ہو سکے کہ اس اپنی بیوی کے غیاب پر کتنا افسردہ ہے۔ حسبِ توقع نرس اُس کے قریب چلی آئی اور اُس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے تسلی دینے لگی۔

"اتنے پریشان مت ہو مسٹر! ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اندازے غلط ہوں اور تمہاری بیوی بالکل محفوظ ہو۔" وہ بہت معصومیت سے اُسے اُمید دلا رہی تھی۔ مشاہرم خان کو افسوس ہوا کہ اسے اتنی معصوم لڑکی کو دھوکا دینا پڑ رہا ہے اور یہ صرف اس لیے تھا کہ وہ لڑکی ان لوگوں کا حصہ تھی جن کے خلاف اسے کارروائی کرنی تھی۔ اس نے رونے کی اداکاری بند کر دی اور نرس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا تم رات میں بھی یہاں رہو گی؟" یہ سوال اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے رات کا وقت سب سے مناسب تھا لیکن ایک پہرہ دیتی نرس کی موجودگی میں کچھ کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ ازیں کہ اسے کسی طرح ناک آؤٹ کر دیا جاتا اور اس کا اس نرس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ہم یہاں بارہ بارہ گھنٹوں کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ میری جگہ سسٹر کشمالہ آ جائیں گی۔ لیکن آج ان کی ساتھی نرس چھٹی پر ہیں اس لیے میری طرح وہ فل ٹائم تمہارے کمرے میں نہیں رہ سکیں گی۔ ہمیں دوسرے کام بھی نمٹانے ہوں گے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، تم اب بہتر ہو اور تمہارے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں کہ رات بھر کسی کا تمہارے پاس رہنا ضروری ہو۔ پھر بھی اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اپنے بیڈ کے ساتھ موجود یہ گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ سسٹر کشمالہ فوراً تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔" وہ نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

"ٹھیک ہے، تم چلی جاؤ۔ صبح تو آ ہی جاؤ گی اور یہ زیادہ اچھی بات ہے۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔ اگر مجھے گل مینا کی طرف سے پریشانی نہیں ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ آرام سے لمبی تان کر سو جاتا۔" وہ ایک بار پھر افسردہ نظر آنے لگا۔

"تمہاری یہ پریشانی بھی اللہ دُور کر دے گا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گی کہ وہ بڑے صاحب سے تمہارے لیے دعا کرنے کو کہیں۔ ان کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی دعا سے تمہاری گل مینا بالکل صحیح سلامت مل جائے گی۔"

نرس کے لہجے میں بشیر کے لیے گہری عقیدت تھی۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اتنی معصوم اور ہمدرد لڑکی ایسے فریبی کے چاہنے والوں میں شامل ہے لیکن اصل المیہ بھی یہی تھا کہ معصوم اور بھولے بھالے لوگ ایسے چالبازوں کے جال میں زیادہ آسانی سے پھنس جاتے تھے جو انہیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہتے تھے۔

"اچھا اب تم آرام کرو۔ میں چلتی ہوں۔ مجھے گھر جانے سے پہلے اپنا یونیفارم بھی بدلنا ہے۔ تم اگر ان



پر زیادہ دباؤ محسوس کرو تو دواؤں میں یہ نیلے رنگ کی گولی ہے، اسے کھا لینا۔ اسے کھانے سے تمہیں ان سے نیند آ جائے گی۔"

وہ اسے ہدایات دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ بھی آنکھیں موند کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ ابھی ایکشن میں آنے کے لیے تھوڑا وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا اس لیے اتنی دیر آرام کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

سی ایف پی والوں نے ریاض انور کا پیچھا چھوڑا نہیں تھا۔ اس کی مسلسل نگرانی ہو رہی تھی اور اس نگرانی کے نتیجے میں اس کے معمولات جاوید علی کے علم میں آ گئے تھے جو کہ ریاض انور کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ہی کراچی میں رُکا ہوا تھا۔ یوں تو یہ کام کراچی یونٹ والے بھی کر سکتے تھے لیکن چونکہ لاہور یونٹ پہلے سے اس کیس پر کام کر رہا تھا، اس لیے کیس اُنہی کے پاس رہنے دیا گیا تھا۔ البتہ مدد کے لیے کراچی کے اہلکار ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اب بھی نگرانی کا کام وہی انجام دے رہے تھے۔ جاوید علی بس اپنی جگہ بیٹھے رپورٹیں وصول کرتا رہتا تھا۔ وہ ابھی جان بوجھ کر بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔

اگرچہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں سلّو کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اس نے اور عادل خان دونوں نے اپنے حلیے کافی تبدیل کر لیے تھے لیکن پھر بھی اوپر سے اسے احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ داڑھی مونچھیں مزید بڑھ جائیں تو وہ خود کو نئے روپ میں ڈھال کر باہر نکل سکے۔ اس دوران اس نے منصوبہ بندی البتہ کر لی تھی اور اب ایکشن کے لیے تیار تھا۔ اس مقصد کے لیے کراچی یونٹ کے انچارج نے اس سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا اور اس کے مطالبے پر گاڑیوں سمیت دیگر اشیاء کا انتظام کر دیا تھا۔ ان انتظامات کے ساتھ جاوید علی اور چند دوسرے اہلکار منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے۔

وہ دو الگ الگ گاڑیوں میں تھے جن میں سے ایک گاڑی ٹنٹڈ گلاسز والی تھی۔ اس گاڑی میں جاوید علی خود موجود تھا اور ان کا رخ اس پارک کی طرف تھا جہاں ان کی معلومات کے مطابق ہر روز علی الصباح ریاض انور جاگنگ کے لیے جاتا تھا۔ نگرانی کے باعث یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ طویل ٹریک پر جاگنگ کیے بغیر ریاض انور کا دن شروع نہیں ہوتا تھا اور یہی ایک معمول تھا جو بنا کسی تعطل کے جاری رہتا تھا ورنہ اس کے علاوہ تو پورا دن اس کا شیڈول ہر روز مختلف ہی رہتا تھا۔

جاوید علی نے جاگنگ کے اوقات سے ہی فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ آج کل ریاض انور کی شوگر بہت بڑھی ہوئی ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق یہ بے پناہ ذہنی دباؤ اور بڑھتے ہوئے وزن کا نتیجہ ہے۔ ذہنی دباؤ کم کرنا تو اس کے بس میں نہیں تھا البتہ جاگنگ کا دورانیہ بڑھا کر وزن کم کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

جاوید علی کی ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی کے ساتھ نکلنے والی دوسری گاڑی نے تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی لیکن ان میں سے کسی کو تشویش اس لیے نہیں تھی کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔

وہ مقررہ رفتار سے سفر کرتے ہوئے جب اطمینان سے اپنے مطلوبہ پارک تک پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہی انہیں دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی لوگوں کی پریشان چیخیں بھی تھیں

اور اندازہ ہو رہا تھا کہ پارک میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ چکی ہے۔

شہر میں آئے دن ہونے والے بم دھماکوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں کسی پبلک پلیس پر جانے میں ویسے ہی خوف سا پایا جاتا تھا اور وہ پٹاخوں کی آوازیں سن کر بھی ہراساں ہو جاتے تھے۔ یہاں تو پھر ٹھیک ٹھاک زوردار دھماکے ہو رہے تھے اور ہر طرف دھواں دھواں محسوس ہو رہا تھا۔

گاڑی سے اُترنے والے اہلکار دھوئیں یا بھگدڑ کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور ایک مختصر وقفے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے تو ان میں سے ایک کے شانے پر ایک بھاری بوری لدی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر اس بوری کو پچھلی سیٹوں کے پائیدان میں پٹخ دیا۔ پچھلی نشست پر براجمان جاوید علی نے اپنا پیر بوری پر رکھ کر آہستہ سے دبایا تو اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ بوری میں ایک انسانی جسم موجود ہے۔ اطمینان کے اظہار کے لیے جیب سے چیونگم نکال کر اسے چبانے لگا جبکہ اس اثنا میں نیچے اُترنے والے دو اہلکار سوار ہو چکے تھے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" اس نے بوری پر سے پیر اٹھائے بغیر اپنے ساتھ بیٹھے شخص سے دریافت کیا۔

"نو سر! ہم بہت آسانی سے اسے نکال کر لے آئے۔ دھماکوں اور دھوئیں کی وجہ سے ہر شخص پریشان تھا۔ اس کے ساتھ آئے باڈی گارڈز بھی گھبرا گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ حالات کے پیشِ نظر ریاض انور کو اپنے گھیرے میں لے کر وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے، ہم نے انہیں ناک آؤٹ کر دیا اور ریاض انور کو بھی کلوروفام سے بے ہوش کرنے کے بعد بوری میں ڈال کر لے آئے۔" اس نے رپورٹ دی۔

"اُس کے گارڈز کو تو نقصان نہیں پہنچا؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ ٹھیک ہیں سر! صرف بے ہوش کیا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں خود ہی ہوش میں آ جائیں گے۔ ورنہ کوئی لے آئے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"گڈ!" اس بار جاوید علی نے اختصار سے کام لیا۔ گاڑی نے واپسی کا سفر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے طے کیا۔ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ کر انہوں نے ریاض انور کو تفتیش کے لیے مخصوص کمرے میں منتقل کر دیا اور اس کے ہوش میں آنے تک فیصلہ کیا گیا کہ ناشتہ کر لیا جائے۔ وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ اس دوران ہی ٹی وی چینلز سے واقعے کی خبر نشر ہونا شروع ہو گئی۔ حسبِ معمول مختلف چینلز کے نمائندے ہیجان خیز لہجے میں اس واقعے کی رپورٹنگ کر رہے تھے اور سوال اٹھائے جا رہے تھے کہ ریاض انور جیسے نیک نام سیاست دان کو اغوا کرنے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں اور اس اغوا کا کیا مقصد ہے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے ریاض انور کے گارڈز، قریبی ساتھیوں اور اہلِ خانہ کے تاثرات معلوم کرنے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر اس واقعے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کر رہا تھا کہ ریاض انور کو فوری طور پر بازیافت کروا کر اس کے اغوا کاروں کو کڑی سزا دی جائے۔ ایک نیوز چینل والے پھرتی دکھاتے ہوئے ریاض انور کی بیوی اور بیٹی تک بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں فطری طور پر اس واقعے پر افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ خصوصاً ریاض انور کی جواں سالہ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بتا رہی تھی کہ اُس کا باپ کتنی محبت کرنے والا آدمی ہے اور ایک باپ کی حیثیت سے اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ وہ روتے ہوئے صدر، وزیراعظم سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اپیل کر رہی تھی کہ اسے اس کا باپ واپس لوٹایا جائے۔ یہ ایک بیٹی کے اپنے باپ کے لیے حقیقی جذبات تھے اور اس کے لیے دل میں صرف افسوس ہی محسوس کر سکتے تھے



البتہ ریاض انور جیسے کردار کے شخص کو جس کی وجہ سے بے شمار گھر اُجڑے تھے، رعایت دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جاوید علی اور اس کے مددگاروں نے اس خصوصی کمرے کا رخ کیا جہاں ریاض انور کو رکھا گیا تھا۔ وہ اس دوران ہوش میں آ چکا تھا اور خوف زدہ سا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ اس کمرے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ اندر داخل ہونے والے کو بھی فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک عقوبت خانہ ہے۔ دیواروں پر لٹکے تشدد کے کئی آلات، چھتوں میں فکس کنڈے جن سے رسیاں لٹکی ہوئی تھیں، خودکار ہتھکڑیوں والی کرسیاں جن میں سے ایک پر اس وقت ریاض انور براجمان تھا اور ایسی ہی بے شمار دوسری اشیاء سے کمرہ بھرا پڑا تھا جو گواہی دیتی تھیں کہ اس عقوبت خانے میں لائے جانے والے کی روح تک بلبلا اُٹھتی ہو گی۔

جاوید علی اور اس کے ساتھیوں نے چہروں پر ایسی نقابیں لگائی ہوئی تھیں جنہوں نے ان کی آنکھوں کے علاوہ پورے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ جاوید علی کمرے میں داخل ہو کر سیدھا ریاض انور کی طرف بڑھا اور اس کے مقابل کھڑے ہو کر اسے کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی نظروں میں ایسی شعلوں کی سی لپک تھی کہ ریاض انور نے ذرا دیر میں ہی گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"صرف نظریں جھکانے سے کام نہیں چلے گا ریاض انور! تجھ جیسے بے غیرت کو تو زندہ زمین میں دفن کر دینا چاہیے۔ تیرے جو کرتوت ہیں، وہ سات سمندروں کا پانی بہانے کے بعد بھی تجھے پوتر نہیں ہونے دیں گے۔" جاوید علی نے نفرت سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض انور کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ جاوید علی کے رویے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ اسے جسمانی اذیت میں مبتلا کرنے سے پہلے اتنے زیادہ نفسیاتی دباؤ میں لے لینا چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی ٹوٹ جائے اور حقائق جاننے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔

"تم کون لوگ ہو؟" آخر کار ریاض انور نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم جہنم کے داروغے ہیں اور تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دینے کے لیے پکڑ لائے ہیں۔" اس نے سفاک لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو، مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میرے اچھے کردار کی گواہی بے شمار لوگ دیتے ہیں۔" اس نے اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"لیکن ہمارا شمار ان بے شمار لوگوں میں نہیں ہوتا جو تمہارے پرستار ہیں۔ ہم ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں تمہاری حقیقت معلوم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم "را" کے پٹھو ہو اور شریف بن کر اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔"

جاوید علی نے آخر بلی کو تھیلے سے باہر نکال ہی لیا تاکہ ریاض انور اگر اپنے اغوا کے سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو وہ غلط فہمی دور ہو جائے۔

"یہ غلط ہے۔ میں اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں جب ہی تو میں نے یہاں کئی فلاحی ادارے قائم کر کے عوام کی فلاح و بہبود کی ذمے داری اُٹھا رکھی ہے۔" وہ حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اور اس فلاح و بہبود کے بہانے تم جب چاہتے ہو، امدادی سامان کے ساتھ ہتھیار اور بارود بھیج کر کسی

بھی علاقے میں آگ لگا دیتے ہو۔'' جاوید علی نے طنز کیا تو ریاض انور کے چہرے پر چھائی پریشانی میں
اور اضافہ ہو گیا اور پورے جسم پر پسینے کی دھاریں سی بہنے لگیں۔

''یہ..... یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر الزام ہے۔'' وہ ہذیانی لہجے میں تردید کرنے لگا۔

''اب تم اس بات سے بھی انکار کر دو گے کہ جس روز کراچی میں خون کی ہولی کھیلی گئی، اس سے
ایک دن پہلے تم سے رات گئے سلّو نامی دہشت گرد ملنے آیا تھا۔ یہ دہشت گرد انڈیا کا تربیت یافتہ ہے اور
نے وزیراعلیٰ کے بیٹے کے ولیمے کے موقع پر ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جو ان کا سیاسی مخالف
ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ وزیراعلیٰ نے صرف تمہاری سفارش پر سلّو کو قواعد وضوابط کے خلاف اپنے سکیورٹی
اسٹاف میں شامل کیا تھا۔''

وہ ریاض انور پر اپنی معلومات ظاہر کر کے اسے بتا رہا تھا کہ اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالا گیا بلکہ بہت
سمجھ کر یہاں لایا گیا ہے۔

''کیا تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟'' ریاض انور نے دہشت زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ہم جہنم کے داروغہ ہیں اور تم جیسے بداعمالوں کو ان کے اعمال کے سبب
کی سیر کرواتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔'' جاوید علی نے اسے اطلاع دی۔

''دیکھو، تم میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں
کیا۔ ہاں، سلّو کو وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں ملازمت ضرور دلوائی تھی۔ لیکن صرف اور صرف انسانی
ہمدردی کی بنیاد پر اور وہ بھی اس وجہ سے کہ سلّو نے مجھ سے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ چونکہ وہ اسلحہ
استعمال جانتا ہے، اس لیے اسے کسی خاص شخصیت کا باڈی گارڈ رکھوا دیا جائے۔ میرے وزیراعلیٰ سے اچھے
دوستانہ تعلقات ہیں اس لیے میں نے ان سے اس کی سفارش کر دی۔ بعد میں وہ کیا نکلا، کیا نہیں اس میں میرا
کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو نیک نیتی سے ایک بے سہارا لڑکے کی مدد کی تھی۔'' ریاض انور نے سنبھالا لینے کی
کوشش کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

''میرے خیال میں ہمیں انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی۔'' اس کی ڈھٹائی دیکھ کر جاوید علی نے کہا اور ہاتھ
سے جانے کیا اشارہ کیا کہ ریاض انور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بری طرح لرزتا ہوا ذبح کیے جانے والے
بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ دراصل وہ جس دھاتی کرسی پر بیٹھا تھا، اس میں کرنٹ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کرنٹ
کی شدت اتنی نہیں تھی کہ وہ جان سے چلا جاتا لیکن تکلیف تو بہرحال اُسے ہوئی تھی۔ وہ بھی اتنی شدید کہ وہ
سے پیر تک کانپ اُٹھا تھا۔ چند سیکنڈز کا یہ جھٹکا برداشت کرنے کے بعد جب اسے اس عذاب سے نجات ملی
وہ نڈھال سا بری طرح ہانپنے لگا۔

''یہ ابھی صرف ٹریلر ہے۔ اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہوگا۔''

''تم لوگ کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہو؟..... میں سچ کہتا ہوں کہ میرا ''را'' سے کوئی رابطہ نہیں
ہے۔'' وہ اپنے بیان پر قائم رہا جس کی پاداش میں اس کا جسم ایک بار پھر جھٹکوں کی زد میں آ گیا۔ اس بار
دورانیہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ریاض انور سہہ نہ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے بڑی بے دردی کے
ساتھ پھر ہوش میں لایا گیا۔ اس بار اس کا دم خم واضح طور پر غائب لگ رہا تھا۔ دراصل وہ کوئی تربیت یافتہ
سیکرٹ ایجنٹ یا جاسوس تو تھا نہیں کہ اس قسم کے تشدد کو حوصلے سے سہہ سکتا۔ آرام اور آسائش سے بھرپور
زندگی گزارنے والے جسم میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ زیادہ دیر ہمت کا مظاہرہ کر سکتا چنانچہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔



''تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بالآخر جب اس کا خشک ہو جانے والا حلق اور اکڑ جانے والی
ان اس قابل ہوئے کہ وہ کچھ بول سکے تو اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم ''را'' کے لیے کب سے اور کیا کام کر رہے ہو؟'' جاوید علی نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''دس سال ہو گئے مجھے ان کے چنگل میں پھنسے ہوئے۔ دس سال سے میں مجبور ہوں کہ ان کے ہر
مارے اور ہر حکم پر عمل کروں۔'' اس نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا تم اپنی مرضی سے ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ہو؟'' جاوید علی چونکا۔

''نہیں۔ بلکہ دس سال پہلے انہوں نے میرے لیے یہ جال تیار کیا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھے
الرات کے بہانے ایک جگہ بلایا اور پھر میری بیٹی کو اس کے اسکول سے اغوا بھی کر لیا۔ میں ان کے دیئے
ئے میں شاید نہ آتا لیکن بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے ان کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اب جو کچھ وہ کہتے ہیں،
ں اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ ورنہ میری بیٹی ان کے نشانے پر رہتی ہے اب تو وہ جوان ہو چکی ہے
ور مجھے دھمکایا جاتا ہے کہ اگر میں نے ان کا کوئی حکم ماننے سے انکار کیا تو وہ میری بیٹی کو اغوا کر کے پہلے تو اس
ی آبروریزی کریں گے پھر اس کی نچی ہوئی بے لباس لاش کسی مصروف چوراہے پر پھینک دیں گے۔ تم ہی
ناؤ ان حالات میں، میں کیسے ان کا حکم نہیں مانتا؟''

مظلومیت کی اداکاری کرتا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور خود کو مجبور ظاہر کرتے ہوئے ان مراعات اور
یاشیوں کا ذکر گول کر دیا جو اسے ''را'' کی خدمت کے عوض دستیاب تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے بلیک میل
رنے کے لیے اس کی لاڈلی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا لیکن ایسا صرف ایک بار ہوا تھا جبکہ بعد میں وہ لالچ میں ان
کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ ''را'' کے سوریاؤں نے اسے دولت، شراب اور شباب کی لت لگا دی تھی۔ فراوانی سے
ملنے ان تینوں چیزوں نے اس کے ضمیر کو مکمل طور پر سُلا دیا تھا اور اب وہ بے حد بے شرمی سے ان کے لیے کام
کر رہا تھا۔

''اگر یہ سچ بھی ہے تو مجھے تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ تم نے ایک اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اس
ملک کی ہزاروں بیٹیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ کیا تمہارے پاس کوئی حساب ہے کہ تمہاری وجہ سے کتنی عورتیں بیوہ اور
یتیم ہوئیں اور کتنوں کو آبروریزی کی اذیت سے گزرنا پڑا؟''

جاوید علی کے اس سوال کے جواب میں اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ جاوید علی کے پاس
ایسے کئی سوال تھے جن کے جواب وہ دے سکتا تھا۔ جاوید علی پے در پے اس سے وہ سوالات پوچھتا چلا گیا اور
ریاض انور نے جہاں اس کے جوابات دینے میں مزاحمت کی، وہاں اس کی مناسب تواضع بھی کر ڈالی۔

⊛----✪----⊛

''تم نے کیا سوچا ہے؟..... کسے اپنے ساتھ بھارت لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس کے بالمقابل
بیٹھے ذیشان نے اس سے پوچھا۔

''دیکھو کسے لے جاتا ہوں، ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ بس ایک نام ذہن میں ہے لیکن معلوم نہیں کہ
اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوگا بھی یا نہیں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''وہ کون؟..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم جاوید علی کو اپنے ساتھ لے جانا پسند کرو گے۔ وہ خاصا ایکٹیولڑکا
ہے اور تمہاری اس کے ساتھ خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔''

''نہیں، جاوید علی کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ فی الحال اسے یہیں رہ کر کام کرنے دو۔'' اس نے ذیشان کا سوال گول کر کے اس کی بات کے صرف ایک حصے کا جواب دیا۔

''میں بھی ذاتی طور پر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اگر تم خواہش کرتے تو تمہیں انکار بھی نہیں کیا جاتا۔ جاوید نے اس مختصر عرصے میں بڑی کارکردگی دکھائی ہے۔ پہلے نوازش علی کی کوٹھی میں نہایت خوبصورتی سے کام کیا، پھر وزیراعلیٰ ہاؤس میں تمہارے ساتھ مل کر بڑا کارنامہ انجام دیا اور اب ریاض انور کے مزاج پوچھ رہا ہے۔'' ذیشان کے لہجے میں اپنے ماتحت کے لیے تحسین تھی۔

''میں تم سے ریاض انور کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا۔ کیا رہا اس کا؟'' اس نے فوراً دریافت کیا۔

جواباً ذیشان نے اسے ریاض انور کے اغوا سے لے کر اس پر تشدد تک کی ساری کہانی سنا دی۔

''جاوید علی نے تو ریاض انور کی ناک میں رسّی ڈال کر اسے کسی سدھائے ہوئے فرمانبردار جانور کی طرح بنا ڈالا ہے۔ اگلا پچھلا سب اُگل ڈالا ہے اس نے کہ کب کب اور کیا کیا، کیا۔ بڑا مال کمایا ہے اس خبیث نے بھارتیوں کی خدمت کے عوض۔ اور اسی رقم میں سے تھوڑا بہت فلاحی کاموں میں لگا کر عوام کو اُلّو بناتا رہا ہے۔ سلّو کے سلسلے میں بھی وہ ''را'' کے اشارے پر ایک خوفناک منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ ''را'' والوں نے حکومت سے ڈیل ہو جانے کے باوجود سلّو کے وجود کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اسے راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کو عملی جامہ ریاض انور نے پہنچانا ہے۔ وہ اتنی پہنچی ہوئی چیز ہے کہ اتنی رازداری برتنے کے باوجود اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سلّو کو کس جیل میں رکھا گیا ہے اور اس نے پورا منصوبہ تیار کر لیا ہے کہ کس طرح جیل میں سلّو کو ہلاک کروانا ہے۔''

ذیشان اسے جاوید علی کی ریاض انور سے حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کرنے لگا جس میں سب سے قابلِ ذکر بات سلّو کی ہلاکت کے منصوبے سے متعلق تھی۔ بھارتی حکومت سے معاملات طے ہو جانے کے بعد سلّو کے معاملے کو بہت رازداری سے ہینڈل کیا جا رہا تھا اور اس کی تقدیر کا فیصلہ عدالت کے بند کمرے میں کیا جانا تھا۔ میڈیا والوں کو جس حد تک مناسب سمجھا جاتا، بعد میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے آگاہ کر دیا جاتا۔ البتہ فی الحال ہر ایک نے اپنے ہونٹ سی رکھے تھے اور اس کیس کی کھوج میں لگے صحافیوں کو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں معلومات کے حصول کے لیے کس شخص کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان حالات میں ریاض انور کی ''باخبری'' واقعی بڑی معنی خیز اور حیرت انگیز تھی۔

''منصوبہ کیا ہے؟'' شہریار نے اس معاملے میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جس جیل میں سلّو کو رکھا گیا ہے، وہاں ریاض انور کے کچھ گرگے پہلے ہی سے قید ہیں اور عرصے سے وہاں یہ سازش تیار کی جا رہی ہے کہ کس طرح جیل توڑ کر وہاں سے فرار ہوا جائے۔ ریاض انور کے بقول اب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے کچھ اور خطرناک گرگوں کو جیل میں داخل کروا چکا ہے۔ کسی دن اچانک لوگوں کو خبر ملے گی کہ سینٹرل جیل میں قیدیوں کے درمیان دنگا فساد ہوا اور معاملات اس حد تک آگے چلے گئے کہ جیل انتظامیہ کے لیے حالات پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ ان خراب حالات سے فائدہ اُٹھا کر ایک طرف تو وہ لوگ سلّو اور شاید اس کے ساتھ کسی ایک آدھ قیدی کو مزید ہلاک کر دیں گے، کچھ لوگ لازماً زخمی بھی ہوں گے اور دوسری طرف خطرناک مجرموں کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔''

''اس منصوبے پر اندر کے لوگوں کی شمولیت کے بغیر تو عمل نہیں ہو سکتا۔'' ذیشان سے تفصیلات سن کر اس



نے تبصرہ کیا۔

''بالکل، یہ اندر کے لوگ ہی تو ہوں گے جو ان دنگا کرنے والوں کو ہتھوڑی، پانے، ڈنڈے وغیرہ جیسی اشیاء فراہم کریں گے اور مؤقف یہ اختیار کیا جائے گا کہ قیدیوں نے یہ چیزیں جیل کی ورکشاپ سے چرائی ہیں۔ آتشیں ہتھیاروں کا مسئلہ یوں حل ہو گا کہ قیدی چند سپاہیوں سے ان کی رائفلیں چھین لیں گے جو اصل میں انہیں چھیننے سے زیادہ خود پیش کی جائیں گی۔''

ذیشان کے جوابات سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض انور کو کتنا بروقت اغوا کر لیا گیا ورنہ وہ موذی تو اپنا کام دکھا چکا تھا۔

''ایسا کرو کہ جو کچھ ہونے جا رہا ہے، اسے ہونے دو اور بس سلّو کو کسی طرح وہاں سے نکال لو۔'' ذیشان نے اتنی ساری تفصیلات سنا کر شاید اسے اتنا حیران نہ کیا ہو جتنا اس نے اپنے ایک جملے سے اسے حیران کر دیا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا ہوں۔ ہم کیسے ایسا کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی سازش کے بے نقاب ہو جانے کے باوجود اس پر عمل ہو جانے دیں؟'' وہ اپنی حیرت کو لبوں پر سوال بنا کر لے آیا۔

''تم نے کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ اپنے ساتھ بھارت لے جانے کے لیے میرے ذہن میں کس کا نام ہے تو سنو..... میں سلّو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے دھماکا کیا۔

''کیا؟'' ذیشان کا منہ کھل گیا۔

''سلّو کے کیس پر کام کرتے ہوئے میں نے مسلسل اس پہلو پر نظر رکھی ہے کہ کسی طرح بھارتیوں کو ان کا تیار کردہ سلّو نامی مہلک ہتھیار اس طرح واپس لوٹا دوں کہ اس ہتھیار سے اُگلتے شعلے اُنہیں ہی بھسم کر ڈالیں۔ حکومت نے اس سلسلے میں ہم پر بڑی مہربانی کی ہے اور سلّو پر واضح ہو گیا ہے کہ بھارت اس کا ہمدرد نہیں ہے اور وہ لوگ اسے صرف اور صرف اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ سلّو جیسا جذباتی لڑکا بھارتیوں کی اس حرکت پر بری طرح بھڑکا ہوا ہو گا اور اگر ہم ان شعلوں کو ذرا سی ہوا دیں گے تو وہ ان پر قہر بن کر ٹوٹنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو مہم درپیش ہے، اس میں سلّو جیسا نڈر اور بے جگر شخص ساتھ دینے کے لیے سب سے مناسب رہے گا۔'' اس نے اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

''پھر بھی، بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ تم سلّو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں جس مہم پر جانا ہے، اس میں کسی قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہو گی اور سلّو کو میں قابلِ بھروسہ نہیں سمجھتا۔'' ذیشان نے اعتراض اُٹھایا۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ میں اسے کس طرح ہینڈل کرتا ہوں اور کیسے اس سے کام لیتا ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام لیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اس مہم پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اس سے زیادہ مناسب کوئی نہیں لگا۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

''لیکن مشکل یہ ہے کہ ریاض انور کو اغوا کر لینے کے بعد جیل والی سازش پر عمل کیسے ہو گا؟ اس سازش کا ماسٹر مائنڈ تو وہی ہے جسے ظاہر ہے ہم کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی آزاد کر سکتے ہیں۔'' ذیشان کی اپنی ہی اُلجھنیں اور پریشانیاں تھیں۔

''ہمیں ریاض انور کو آزاد کرنا ہو گا لیکن ذرا سلیقے سے۔ ہم ریاض انور کے اغوا کو اغوا برائے تاوان کا

روپ دے سکتے ہیں۔ ریاض انور سے ڈسکس کر کے معلوم کر لو کہ اس کی فیملی جلد از جلد کتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکتی ہے۔ وہ رقم لے کر اسے چھوڑ دینا پھر وہ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہوگا اور ہمارا کام بن جائے گا۔'' اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اور تمہارے خیال میں ریاض انور اتنا بیبا بچہ ہے کہ ہماری بنائی گئی کہانی کو اپنے بھارتی آقاؤں سے چھپا لے گا۔'' ذیشان نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ خبیث آدمی ضرور اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے کی کوشش کرے گا لیکن اُسے اس حرکت سے روکنے کے لیے ہم اپنا کوئی آدمی اس کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں جو ہر وقت اس کے قریب رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔''

''ایسا آدمی تو خود مشکوک ہو جائے گا۔'' ذیشان نے اعتراض کیا۔

''نہیں ہوگا مشکوک۔ اگر ہم ذرا سلیقے سے منصوبہ بندی کریں گے تو سب ممکن ہو جائے گا۔ ویسے بھی ہم کوئی زندگی بھر کے لیے تو اس خبیث کا ٹھیکہ لینے والے نہیں ہیں۔ اُس سے اس منصوبے پر عمل کرواؤ اور پھر اس کا کام تمام کر کے اپنے آدمی واپس بلوا لو۔ یہ تو پہلے سے طے ہے نا کہ ریاض انور جیسے غدار کو اب زیادہ عرصے کے لیے اس دھرتی کا بوجھ بنا کر نہیں رکھنا ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنا ایک لڑکا ریاض انور کے ساتھ بھیج دیں اور ریاض انور اپنے منہ سے لوگوں کو یہ کہانی سنائے کہ اغوا کاروں نے رقم کی وصولی کے بعد اسے شدید زخمی اور بے ہوش حالت میں ایک ایسی ویران جگہ پر ڈال دیا تھا جہاں سے وہ اتفاقاً وہاں پہنچ جانے والے اس نوجوان کی مدد سے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ وہ تعریف کرے گا کہ نوجوان نے بڑی ہمدردی سے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور خود گھر تک چھوڑنے آیا۔ نوجوان کے اتنے احسانات کے بدلے میں اگر وہ اسے اپنے قریبی اسٹاف میں ملازمت دے دے گا یا یونہی اپنے ساتھ رکھے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا بلکہ لوگ اس کی احسان شناسی کو سراہیں گے۔ بس یوں ہمارا کام بن جائے گا۔'' اب ذیشان کا دماغ بھی چل پڑا تھا۔

''گڈ! اب تم اسی ٹریک پر سوچ رہے ہو جس پر میں سوچ رہا ہوں۔ میری مانو تو ایک کام اور کرنا۔ ریاض انور کو اس کی جوان بیٹی کے حوالے سے بھی تھوڑا ڈرا دینا تاکہ اگر اس کے ذہن میں ہم سے دھوکے کا خیال آئے بھی تو وہ اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔'' ذیشان کو شاباش دینے کے ساتھ اس نے ایک اہم مشورہ بھی دیا۔

''بس اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ اب میں تمہارا منصوبہ سمجھ چکا ہوں تو ہر کام بہترین طریقے سے انجام پا جائے گا۔ لیکن یاد رکھو کہ سلّو کے سلسلے میں تمہیں پہلے کرنل صاحب سے اجازت لینی ہوگی تب ہی ہم اس منصوبے پر عمل کر سکیں گے۔ ورنہ تو سب سے آسان حل یہ ہے کہ ریاض انور کو گولی مار کر اس کی لاش کسی کھڈ، کنڈی یا نالے میں پھینک دی جائے۔''

''اس کی تم فکر نہیں کرو۔ میں کرنل صاحب سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔'' اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ریسیور واپس کریڈل پر رکھ رہا تھا تو کرنل توحید کو راضی کر چکا تھا۔

''اوکے، یہ کام تو ہو گیا۔ میں جاوید علی سے بات کر کے اس منصوبے کی جزئیات کو ڈسکس کر لوں گا اور ہم اس پر عمل کر گزریں گے۔'' کرنل صاحب کی اجازت مل جانے پر ذیشان نے آگے کا پروگرام سیٹ کرنا



شروع کر دیا۔ یہ کیس کیونکہ جاوید علی کے پاس تھا اس لیے اس سے ڈسکس کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ ذیشان نے فوری طور پر اس سے رابطہ کیا اور ریاض انور کے حوالے سے جو کچھ ان کے درمیان طے ہوا، اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان تفصیلات میں یہ ذکر شامل نہیں تھا کہ سلّو کو جیل سے نکال کر شہریار کے ساتھ عمارت بھیجا جا رہا ہے۔ جاوید علی کو بس اتنا بتا دینا کافی تھا کہ منصوبے کے مطابق سلّو کو ہلاک کرنے سے بچا کر اسے اس طرح جیل سے فرار کروانا ہے کہ وہ سی ایف پی کی تحویل میں آ جائے۔ یہ حکم سن کر جاوید علی نے سوچا یہ گمان کیا ہوگا کہ اپنے ایک اہم مجرم کا ہاتھ سے نکل جانا سی ایف پی کو اچھا نہیں لگا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے دوبارہ اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں تاکہ اس سے مزید معلومات وغیرہ حاصل کی جا سکیں۔

''میں نے آپ کا سارا پلان سمجھ لیا ہے سر!..... اس پر انشاء اللہ کامیابی سے عمل بھی ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد ریاض انور کا کیا، کیا جائے گا؟..... کیا ہم اسے موذی کو ایسے ہی آزاد چھوڑ دیں گے؟'' اس نے نہایت غور سے ذیشان کی ساری بات سننے کے بعد سوال اُٹھایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... ہم اسے صرف وقتی طور پر ڈھیل دے رہے ہیں۔ بعد میں اس کا پتا بھی صاف کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں پلان تمہیں خود ہی تیار کرنا ہوگا۔ بس ٹائمنگ کا خیال رکھنا۔ جیل والی سازش پر عمل ہونے سے پہلے اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے اور وہ پوری طرح تمہاری نگرانی میں بھی رہنا چاہئے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اس کا ذہن صاف کیا۔

''اس طرف سے آپ بے فکر رہیں سر! میں ریاض انور کے ساتھ اپنا آدمی لگانے کے ساتھ ساتھ اُس کے جسم سے ایک ایسی ڈیوائس بھی اٹیچ کروا دوں گا کہ جن اوقات میں ہمارے بندے کا اس کے قریب رہنا ممکن نہیں ہوگا، اس وقت بھی ہم اُس کی سرگرمیوں سے آگاہ رہیں گے۔''

''گڈ۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے اس لیے میں نے اپنا مقصد تم پر واضح کر کے تمہیں فری ہینڈ دے دیا ہے۔ اپنی سہولت اور طریقِ کار کے مطابق کام کرو اور نتیجہ وہ دو جس کے ہم خواہش مند ہیں۔'' ذیشان نے کھلے دل سے اس کی تعریف کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''ایک اہم مرحلہ تو سمجھو طے ہو گیا۔ اب دوسرا کام یہ کرو کہ اپنا ایک بندہ اس جیل میں پہنچا دو جہاں سلّو موجود ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ سارا وقت سلّو کے قریب رہ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرے۔ خصوصاً اس وقت جب پلان کے مطابق اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت ہمارے آدمی کو نہ صرف سلّو کو شیلڈ کرنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ساتھ لے کر فرار بھی ہونا ہوگا تاکہ سلّو ہم تک پہنچ جائے۔''

ذیشان، جاوید علی کو اس کا کام سمجھا کر فارغ ہوا تو شہریار نے ایک اور اہم کام کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ ذیشان نے اس پوائنٹ کو نوٹ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ یہیں بیٹھے بیٹھے فوری طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے جیل کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنا پڑتا اور یہ کام بھی وہ براہِ راست کرنے کے بجائے کرنل توحید کے ذریعے ہی کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ کرنل توحید ہی تھے جو آئی ایس آئی اور سی ایف پی کے درمیان توازن قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ سی ایف پی کے وجود کو پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور اس جدوجہد میں ان جیسے چند اور بھی اعلیٰ فوجی عہدے دار شامل تھے۔

کرنل توحید جیل کی انتظامیہ میں سے کسی قابلِ اعتماد آدمی سے رابطہ کرتے تو ایک طرف ان کا کام آسان ہو جاتا اور دوسری طرف فرار کی سازش کرنے والے خطرناک مجرموں کے فرار کو بھی ناکام بنانے یا دوبارہ سرے سے گرفتار کرنے کے سلسلے میں کارروائی کی جا سکتی تھی۔ معاملہ بہت نازک تھا اور مقابل موجود دشمن

کے خطرناک سازشی اور مکار ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں سر جوڑے بہت دیر تک ایک ایک پوائنٹ کو ڈسکس کرتے رہے۔ ساتھ ہی جاوید علی کے لیے بھی ہدایات تیار ہوتی رہیں کہ سب سے اہم رول اسی کا تھا۔ اگر ریاض انور کی اغوا برائے تاوان والی کہانی میں کہیں جھول آ جاتا تو دشمن چوکنا ہو جاتا اس لیے پلے کا یہی ایکٹ سب سے زیادہ جان دار اور نیچرل ہونا ضروری تھا۔ بہرحال، بہت دیر کی دماغ پاشی کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو خاصے مطمئن تھے۔

⊛----✪----⊛

''تم کھانے سے فارغ ہو چکے ہو، اس لیے بہتر ہے کہ اپنی دوائیں لے کر تھوڑی دیر میں سو جاؤ۔ تم جو آرام کرو گے تمہارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس کشمالہ نے اس کے سامنے سے کھانے کی ٹیبل ہٹاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والی کم سن نرس کے مقابلے میں پختہ عمر کی خاصی ہوشیار عورت تھی جس کی حرکات وسکنات سے ہی ایک خاص قسم کی طراری جھلکتی تھی۔

''بڑے ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں نرس؟'' مشابرم خان نے اُس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس سے پوچھا۔

''کیوں؟..... تم انہیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی تکلیف ہے کیا؟..... مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ میں ہی تمہارا مسئلہ حل کر دوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ ایک تجربہ کار نرس بھی ڈاکٹر سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ میں تمہیں بہت اچھی دوا دے سکتی ہوں۔'' وہ ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ نہیں تھی۔

''مجھے جسمانی تکلیف کا مسئلہ نہیں ہے نرس! میں اپنی بیوی کی وجہ سے پریشانی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ وہ اسے تلاش کرنے میں میری مدد کریں گے لیکن ابھی تک کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے کسی پریشان حال شخص کی طرح تھکے تھکے لہجے میں اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اوہ آئی سی، مجھے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہاری بیوی کو کون لوگ لے گئے ہیں۔ بہرحال تم فکر مند نہ کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جلد تمہاری بیوی کو تلاش کر لیا جائے گا اور اسے اغوا کرنے والوں کو عبرتناک سزا بھی دی جائے گی۔'' کشمالہ نامی نرس اُسے تسلیاں دینے لگی۔

''آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں نرس! لیکن جب تک میری بیوی نہیں مل جاتی، مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' اس نے اُداسی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی کیفیت سمجھ رہی ہوں مسٹر مشابرم خان! آپ واقعی بہت پریشانی میں ہیں لیکن فی الحال صبر اور حوصلے سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ آپ ہمت کریں اور یقین رکھیں کہ ان مشکل حالات میں آپ تنہا نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر اس کی دل جوئی کرنے لگی۔ پھر پلٹ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوائیں نکال کر اس کے سامنے رکھیں۔

''آپ یہ دوائیں کھا لیں۔ انہیں کھانے سے آپ کے زخم بھی ٹھیک ہوں گے اور نیند بھی اچھی آ جائے گی۔'' مشابرم خان نے دیکھا کہ ان دواؤں میں نیند کی وہ گولی بھی شامل ہے جس کے بارے میں پچھلی شفٹ کی نرس نے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔ اس نے کشمالہ سے دوائیں لے کر اپنے منہ میں رکھے ہوئے پانی



سے وہ گولی نیچے گرا دی۔ باقی دواؤں کی تو بہرحال اسے ضرورت تھی اس لیے انہیں کھانا ضروری تھا۔

''بس اب آپ لیٹ جائیں۔ تھوڑی دیر میں آپ کو نیند آ جائے گی۔'' اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لے کر ٹیبل پر واپس رکھنے کے بعد کشمالہ نے اس کا تکیہ ٹھیک کیا اور اسے آرام سے لٹانے کے بعد اس کے اوپر اس کا کمبل پھیلا دیا۔ مشابرم خان نے بھی خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے آنکھیں بند کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کشمالہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان نے آنکھیں کھول کر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے آٹھ ہوئے تھے اور اسے جو کارروائی کرنی تھی، اس کے لیے آدھی رات کا وقت زیادہ مناسب رہتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت کا جاگ کر انتظار کرنے کے بجائے ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لے لینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ بہرطور وہ زخمی تو تھا اور اسے آرام کی ضرورت بھی تھی۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی کی وجہ سے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بغیر کسی الارم کے بھی مقررہ وقت پر ضرور جاگ جائے گا چنانچہ اطمینان سے سو گیا۔ ٹھیک ڈھائی گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ لیٹا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ یہاں اسے ان کے اوقات میں بھی زیادہ آوازیں اور چہل پہل محسوس نہیں ہوئی تھی اور اب تو بالکل ہی سناٹے کا راج تھا۔

اس سناٹے میں اس کے کانوں نے قدموں کی مدھم چاپ واضح طور پر سن لی۔ آنے والا اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے اندر جھانکا۔ اس نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کرتے ہوئے آنے والے کو دیکھا۔ وہ نرس کشمالہ تھی جس نے اس کے گہری نیند میں ہونے کا اندازہ لگایا اور پھر دروازہ دوبارہ احتیاط سے بند کر کے واپس پلٹ گئی۔ اس کے واپس جانے کے بعد وہ آہستگی سے بستر سے نیچے اُترا اور تکیے رکھ کر کمبل کو اس انداز میں بستر پر پھیلایا کہ دور سے دیکھنے والے کو یہی گمان گزرے کہ کمبل تلے کوئی سویا ہوا ہے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے میں موجود اکلوتی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ دن بھر میں وہ جائزہ لے کر پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اس کھڑکی کا استعمال کرے گا۔ کیونکہ دروازے سے نکلنے میں یہ خطرہ تھا کہ کوریڈور میں اسٹاف کے کسی شخص سے سامنا نہ ہو جائے۔ سلائیڈنگ ونڈو نے اس کا کام ویسے بھی آسان کر دیا تھا۔ اسے بس ایک شیشہ ہی کھسکانا تھا، اس کے بعد اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے نہایت احتیاط اور خاموشی سے یہ مرحلہ طے کیا اور باہر کود نے کے بعد کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا۔ باہر کا موسم اندر کے مقابلے میں قدرے سرد تھا اور لمحہ بھر کے لیے اسے جھرجھری سی آ گئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ سردی کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے ابھی اتنی ٹھنڈک نہیں تھی کہ گرم کپڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پریشانی ہو۔

کھڑکی سے کود کر نکلنے کے بعد بھی ابھی وہ ہسپتال کی چاردیواری سے باہر نہیں نکلا تھا اور ابھی اسے احاطے کی دیوار پھلانگنی تھی لیکن اس سے قبل وہ کسی ایسی شے کا متلاشی تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ وہ جس طریقے سے یہاں پہنچا تھا، اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لا سکے۔ اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرتا تو اس کا ہتھیار فوراً ہی ڈاکٹر وغیرہ کی نظر میں آ جاتا اور وہ مشکوک سمجھا جاتا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ تو اس کے پاس ہو۔ اس سلسلے میں اس کے ذہن نے ڈاکٹروں کے استعمال میں رہنے والے سرجیکل آلات کے حصول کی راہ دکھائی تھی۔

اُس کی جس کمرے میں مرہم پٹی کی گئی تھی، وہاں اُس نے اس قسم کی چیزیں دیکھی تھیں۔ بالکل خالی ہاتھ جانے کے بجائے اگر وہ ذرا سی کوشش سے کوئی آلہ بطور ہتھیار حاصل کر لیتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے اندازے سے اس کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کی جس میں اس کے خیال کے مطابق اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ احتیاط کی وجہ سے اس نے کھڑکی کو بہت معمولی سا کھسکایا تھا۔ اس معمولی سی درز میں سے فوراً ہی روشنی اور آوازوں نے باہر کی طرف رخ کیا۔ آوازیں سن کر اس نے شکر کیا کہ اس نے بے دھڑک کھڑکی کھولنے کے بجائے احتیاط سے کام لیا تھا۔ پیدا ہونے والی جھری سے آنکھ لگا کر اس نے اندر جھانکا۔ اندر ڈاکٹر، نرس کشمالہ اور ایک عورت موجود تھی۔ عورت بیڈ پر نیم دراز تھی اور ڈاکٹر اور نرس اس کے سر پر کھڑے تھے۔ ان تینوں کے درمیان کسی بات پر بڑے شد و مد سے بحث ہو رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے کسی کو کھڑکی کا پٹ کھسکائے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ میں کسی مستند لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کے بغیر اپنا ابارشن نہیں کرواؤں گی۔'' اس نے خوبصورت خدوخال والی عورت کو بلند لہجے میں کہتے ہوئے سنا۔

''ہم یہاں کسی لیڈی ڈاکٹر کو نہیں بلا سکتے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بڑے صاحب کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔'' ڈاکٹر نے انکار کیا۔

''لیکن میں بھی لیڈی ڈاکٹر کے بغیر اتنا بڑا رِسک نہیں لے سکتی۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بڑے صاحب اگر دل بھر کر مجھ سے کھیل لینے کے بعد میری طرف سے بے پروا ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی جان گنوا دوں۔ میرا شوہر ہے، بچے ہیں، گھر ہے۔ نذر محمد کے واپس آنے کے بعد میں دوبارہ اس کے ساتھ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہ سکتی ہوں۔ میرے بچوں کو میری ضرورت ہے۔ میں مر گئی تو کون اُن کو پالے گا؟''

بلند لہجے میں بولتی عورت کا لہجہ آخر میں آ کر یاس زدہ ہو گیا تھا جبکہ کھڑکی کے باہر کھڑا یہ سب سنتا مشابرم خان دم بخود تھا۔ عورت کے جملوں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ یقیناً عورت کا شوہر طویل عرصے سے علاقے سے باہر کہیں گیا ہوا تھا اور اس عرصے میں بشیر اکبر نے عورت کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔ اس عیاشی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہ نکل چکا تھا اور اب بشیر کے ہم راز ڈاکٹر اور نرس اس کوشش میں تھے کہ عورت کے خاوند کے واپس آنے سے پہلے پہلے اس کی کوکھ میں پلتے بشیر کے گناہ کی نشانی کو مٹا ڈالیں۔ لیکن عورت خوف زدہ تھی کہ تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی عدم موجودگی سے کہیں وہ اپنی جان ہی نہ کھو بیٹھے۔ اسی لیے ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی۔

ان تینوں کے درمیان اچھی خاصی گرما گرمی ہو رہی تھی۔ مشابرم خان اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا..... لہٰذا ان کو بحث میں اُلجھا دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کمرے کی کھڑکی سے ہٹ کر اس نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اور یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں اس کی مرہم پٹی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کی کھڑکی کھولنے پر اسے اپنا گوہرِ مقصود حاصل ہو گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کر بندر کی پھرتی سے کمرے کے اندر کودا اور اپنی مطلوبہ چیزیں سمیٹ کر ایک بار پھر کھڑکی کے راستے واپس باہر آ گیا۔

اب اس کا رخ ہسپتال کی چار دیواری کی طرف تھا۔ چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے پوری



طاقت سے جمپ لگائی تو ہاتھ دیوار کی منڈیر کو تھامنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ زور لگا کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور فوراً ہی دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ یہاں زمین نرم تھی اور ہسپتال کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے پودے لگائے گئے تھے جن کی وجہ سے دن کی روشنی میں منظر خاصا خوب صورت لگتا تھا لیکن اس وقت اندھیرے میں جس پودے پر جا کر گرا، اس کے کئی کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا۔ کانٹے چبھنے سے بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر اُس نے اس اذیت پر قابو پا لیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

اب اس کا رخ اس حصے کی طرف تھا جہاں بشیر اکبر کی رہائش گاہ تھی۔ مین گیٹ سے لے کر اس کی رہائش گاہ تک ایک پختہ سڑک بنی ہوئی تھی۔ یہ سڑک ہسپتال کے سامنے سے بھی گزر رہی تھی لیکن مشابرم خان نے سڑک پر چلنے کے بجائے کچی زمین پر ہی چلتا رہا۔ کیونکہ سڑک پر چلنے کی صورت میں وہ فوراً ہی نظر میں آ جاتا، اس لیے وہ احتیاطاً کچی زمین پر ہی چلتا رہا جہاں جابجا موجود پودے اور درخت بوقتِ ضرورت اسے چھپنے کے لیے آڑ فراہم کر سکتے تھے۔

خیریت گزری کہ وہ کسی بھی قسم کی دشواری میں پڑے بغیر بشیر کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ پہلی بار یہاں آنے کے باوجود وہ جدید سائنس کے کارنامے کے باعث اس عمارت کے پورے محلِ وقوع سے واقف تھا۔ میجر اسفند نے اسے کمپیوٹر کی اسکرین پر پوری عمارت دکھائی تھی۔ اس تصویر میں دو متحرک سائے بھی نظر آئے تھے جو یقینی طور پر وہاں پہرہ دے رہے تھے۔ رہائشی عمارت میں محض ان دو پہرے داروں کی موجودگی شاید اس لیے اکتفا کیا گیا تھا کہ پوری عمارت کے گرد حفاظت کا زبردست انتظام موجود تھا اور پہرے داروں کی بڑی تعداد کے علاوہ دیواروں پر برقی تار بھی بچھائے گئے تھے اور کسی فردِ واحد تو کیا، چھوٹی موٹی مسلح پلٹن کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اس دفاعی حصار کو توڑ سکے۔ اس لیے اندر مختلف یونٹ کی شکل میں بنی عمارتوں کی حفاظت کے لیے زیادہ تردد نہیں کیا گیا تھا۔

مشابرم خان جس ترکیب سے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا، اگر وہ ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی ہوتی تو وہ کبھی یہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

رہائش گاہ کے عقبی حصے میں پہنچ کر وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اندر کی آہٹ لیتا رہا۔ اندر خاموشی تھی لیکن اندازہ تھا کہ اندر کم از کم دو پہرے دار موجود تھے۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چار دیواری کا جائزہ لیا۔ اس چار دیواری کی بلندی ہسپتال کی دیواروں سے زیادہ تھی۔ اس نے پہلے کی طرح اُچھل کر اس پر چڑھنا چاہا لیکن انگلیاں محض منڈیر کو چھو کر ہی رہ گئیں اور وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اُس نے اپنے وجود کی تمام تر توانائیاں مجتمع کرتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹ کر دوڑ لگاتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب رہا اور انگلیاں منڈیر پر جم گئیں لیکن ساتھ ہی اسے شدید اذیت سے بھی گزرنا پڑا۔ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے لگائے گئے تھے جو اس کی انگلیوں میں کھب گئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنی چیخوں کو حلق سے خارج ہونے سے روکا اور بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے زخمی ہاتھوں پر زور دیتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ اس کوشش میں اسے جس اذیت سے گزرنا پڑا، وہ ناقابلِ بیان تھی لیکن پہاڑوں کے بیٹے کا عزم بھی پہاڑوں جیسا تھا۔ وہ اس تکلیف سے گزر کر بے حد مدھم آواز کے ساتھ نیچے کود گیا۔

اندر دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سے پودے اور چھوٹی قامت کے درخت لگائے گئے تھے۔ ان کم قامت درختوں کو لگانے کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ کوئی جوان درختوں کے سہارے عمارت کے اندر یا باہر آ جانہ

سکے۔ اس نے ایسے ہی ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ کر اپنی قمیض کا دامن پھاڑا اور دونوں زخمی ہاتھوں پر مٹی لیپ کر کے ہاتھوں پر بمشکل پٹیاں باندھ لیں۔ کانچ کے ٹکڑے اندر پیوست ہونے سے ہاتھوں میں بڑے گہرے زخم آئے تھے جن سے تیزی سے خون کا اخراج ہو رہا تھا۔ خون کے اس اخراج کو روکنے کے لیے وہ فی الحال یہی ترکیب استعمال کر سکتا تھا۔

اس کام کے دوران وہ اپنے اردگرد سے غافل نہیں ہوا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس دوران وہاں کوئی پہرے دار نمودار نہیں ہوا تھا جبکہ اصولاً مستقل گشت کرنے والے پہرے داروں میں سے کسی ایک کو تو اب تک وہاں سے گزرنا چاہئے تھا۔

اس نے چند لمحے مزید پہرے دار کے نمودار ہونے کا انتظار کیا پھر خود انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ باہر موجود ان دو پہرے داروں سے نمٹے بغیر وہ اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا ورنہ بعد میں یہ دونوں اس کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیتے۔

نہایت محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ بائیں طرف سے نکل کر عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد اسے دونوں پہرے دار گیٹ کے قریب بیٹھے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں جبکہ ایک سگریٹ بھی سلگا ہوا تھا جس سے دونوں باری باری کش لے رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں کسی کی دخل اندازی کے خطرے سے بالکل بے نیاز تھے اور نہایت بے پروائی سے اپنی معمول کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی بے پروائی سے ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ اگر مشابرم خان کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ بہت آسانی سے انہیں قابو کر سکتا تھا لیکن اس وقت دونوں کو ایک ساتھ قابو کرنے کی کوشش کرنا اس اعتبار سے خطرناک تھا کہ اگر وہ آڑ سے نکل کر ان کی طرف بڑھتا تو دونوں میں سے کسی کی بھی اس پر نظر پڑ سکتی تھی اور پھر ان کے لیے اپنی رائفلیں اٹھا کر اسے قابو کر لینا یا ٹھکانے لگا دینا ذرا مشکل نہ ہوتا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس پر عمل کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا۔

''اچھا بھائی! چائے کا شکریہ۔ تُو آرام سے بیٹھ۔ میں ذرا راؤنڈ مار کر آتا ہوں۔'' ابھی اسے کوئی تدبیر سوجھی بھی نہیں تھی کہ ہوا کے دوش پر لہراتی آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔ دونوں پہرے داروں میں سے ایک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور رائفل اٹھا کر شانے سے لٹکا لی تھی۔ اس نے قدموں کی حرکت دی تو مشابرم خان نے دیکھا کہ وہ اسی سمت آ رہا ہے جہاں وہ خود چھپا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے کچے میں پودوں کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں ہی راؤنڈ لگانے کے لیے آنے والا پہرے دار اس کی نظر میں آ گیا۔ وہ نہایت اطمینان سے چل رہا تھا اور اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سر پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس کی یہ بے خبری اور اطمینان، مشابرم خان کے لیے مفید ثابت ہوا اور جیسے ہی وہ اس کی کمین گاہ سے چند قدم آگے بڑھا، اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے جست لگا کر اسے پیچھے سے اس طرح جکڑا کہ اس کا ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ پر جما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کے بازو نے اس کی گردن کے گرد اس طرح حلقہ تنگ کر دیا تھا کہ وہ بے بس سا ہو گیا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ شانے سے لٹکی اپنی رائفل اُتارنے کے لیے ہی ہاتھ پیر چلا سکتا۔ مشابرم خان نے اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے کچی زمین پر گھسیٹ لیا اور اسے پشت کے بل زمین پر گرا کر خود اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ اور ناک کو ڈھانپے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے زور لگا کر وہ اس کا گلا



دبا رہا تھا۔

ذرا دیر کی محنت کے بعد ہی گارڈ نے ہاتھ پیر پٹخنا چھوڑ کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کا سر بھی ایک طرف ڈھلک گیا۔ مشابرم خان نے اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کر کے اسے چیک کیا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کا کافی دیر تک ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اس کے سینے سے اُتر گیا اور اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لیا۔ پہرے دار سے نمٹنے کی کوشش میں اس کے زخمی ہاتھوں سے ایک بار پھر خون رِسنا شروع ہو گیا تھا۔ تکلیف بھی شدید تھی لیکن اس وقت اس کے پاس اپنے زخموں پر دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ راؤنڈ پر نکلنے والا پہرے دار جب اپنے ساتھی کے پاس واپس نہیں پہنچے گا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو کر اسے دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہو گا۔

یہ عمارت اتنی وسیع و عریض نہیں تھی کہ اس کے گرد ایک چکر لگانے میں کسی کو چند منٹ سے زیادہ وقت درکار ہوتا۔ اس لیے ضروری نہیں تھا کہ اس سے قبل کہ دوسرا پہرے دار اپنے ساتھی کی تلاش میں نکلے، وہ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو۔ وہ ایک بار پھر اسی مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے جھانک کر اس نے گیٹ کے قریب بیٹھے پہرے داروں کو چائے اور سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسرا پہرے دار ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اور اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ ختم ہونے تک اس کا اطمینان باقی رہا، اس کے بعد وہ کچھ بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور وہ بے چین نظر آنے لگا۔ پھر شاید اس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ کسی خطرے کی بُو پا کر رائفل شانے سے اتار کر محتاط انداز میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا لیکن اپنے ساتھی کے برعکس اُس نے اس جانب سے عمارت کا راؤنڈ لگانے کے بجائے جہاں مشابرم خان موجود تھا، دوسری جانب کا رخ کیا تھا۔ چنانچہ مشابرم خان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے پہلے والے کی طرح دبوچ سکے۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے پہرے دار کے مڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ موڑ مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر وہ حرکت میں آیا۔ اب وہ خود فرنٹ کی طرف سے گزر کر پہرے دار کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ محتاط ہونے کے باوجود اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ ہاتھوں میں موجود رائفل نے اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس فکر میں مبتلا نہیں تھا کہ مسلح دشمن کے مقابلے میں خود نہتا ہے۔ ویسے وہ جو منصوبہ اپنے ذہن میں لے کر آیا تھا، اس میں آتشیں ہتھیار چلانے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ان ہتھیاروں کی دہشت ہی کم ہوتی ہے اور سامنے والا مقابلے پر ڈٹنے سے پہلے خود دس بار سوچتا ہے۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے تیزی سے عمارت کے سامنے کا حصہ پار کر لیا اور احتیاط سے اس سمت مڑا جہاں پہرے دار گیا تھا۔ مشابرم خان نے نظروں سے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کا اندازہ لگایا اور پنجوں کے بل بے آواز قدموں سے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ پہرے دار چونکہ کچھ دیر قبل ہی اس جگہ سے گزرا تھا اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ خطرہ اس کی پشت کی طرف سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی ساری توجہ آگے کی جانب مرکوز تھی۔ اپنی پشت پر مشابرم خان کی موجودگی کا اسے اسی وقت پتہ چلا جب مشابرم خان کے ہاتھوں میں موجود رائفل کی نال اس کی گردن سے جا لگی۔

''بغیر کوئی آواز نکالے اپنی رائفل پھینک دو ورنہ اپنے ساتھی کی طرح تم بھی جان سے چلے جاؤ گے۔'' اس نے سرد لہجے میں اس نے پہرے دار کو حکم دیا اور جان بوجھ کر اسے اس کے ساتھی کے مرنے کی غلط اطلاع دی تاکہ وہ اس دہشت میں مبتلا ہو جائے کہ جو شخص ایک آدمی کو قتل کر سکتا ہے، اس کے لیے دوسرا قتل کرنا کون

سا مشکل ہوگا۔

''تت.....تم کون ہو؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں جو بھی ہوں، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ ہاں اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے تعاون کرو۔'' وہ دھیمی آواز میں غرایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود غراہٹ میں ایسی دہشت تھی کہ پہرے دار نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس کی۔ اس کی کیفیت کا اندازہ لگا کر مشابرم خان اسے رائفل کے بل پر دھکیلتا ہوا عمارت کے عقب میں لے گیا۔

''تم دونوں کے علاوہ اس عمارت کی حفاظت کے لیے اور کتنے لوگ ہیں؟'' اس نے پہرے دار سے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔ ایک وقت میں بس دو ہی آدمی ڈیوٹی دیتے ہیں۔ صبح ہماری ڈیوٹی ختم ہوگی تو ہماری جگہ دوسرے دو آدمی آجائیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کے علاوہ یہاں حفاظت کا کیا انتظام ہے؟..... میرا مطلب ہے کہ کوئی الیکٹرانک الارم وغیرہ تو موجود نہیں ہے؟''

''نہیں۔ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بڑے صاحب کی حفاظت پر مامور ہر آدمی نے اپنی جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کرنے کا عہد کر رکھا ہے''

اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کی اب تک کی کیفیت کے باعث مشابرم خان کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ بہت تیزی سے پیچھے ہٹنے کے باوجود اس کے ہاتھ پر ایک ہلکا سا چرکا لگ ہی گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پہرے دار کے ایک ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر ہے جس سے وہ دوسرا وار کرنے کے لیے پَر تول رہا ہے۔ مشابرم خان اس لڑائی کو طول نہیں دے سکتا تھا کیونکہ شور شرابے کی صورت میں اندر موجود بشیر اکبر ہوشیار ہو سکتا تھا۔

اس نے پہرے دار کے دوسرا حملہ کرنے سے قبل تیزی سے حرکت کی اور ہاتھ میں موجود رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے بھرپور وار کیا۔ اس کا نشانہ پہرے دار کا سر تھا لیکن چونکہ پہرے دار خود حرکت میں تھا اس لیے اس کا نشانہ خطا گیا اور رائفل کا بٹ اس کے شانے پر لگا۔ شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور جھٹکا لگنے کے باعث اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور چھلانگ لگا کر خنجر تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اب مشابرم خان اسے مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر رائفل کو گھمایا اور اس بار اس کا نشانہ بالکل درست تھا۔ پہلی ہی ضرب سے پہرے دار کی کھوپڑی تڑخ گئی اور وہ لہراتا ہوا نیچے آگرا۔ مشابرم خان نے احتیاطاً اسے ایک ضرب اور لگا دی لیکن حقیقتاً اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلی ضرب پر ہی بغیر آواز نکالے جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

مشابرم خان اس کی رائفل کو پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا، اس اضافی وزن کو ایک طرف پھینک کر اس کا خنجر اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ عجیب وضع کا خنجر تھا جس کی شکل کچھ ہلال نما تھی اور وہ بے طرح جھلملا رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ خنجر کی دھار بہت تیز ہے اور وہ انسانی گوشت تو کیا ہڈیوں اور اور چیزوں کو بھی با آسانی کاٹ سکتا ہے۔ خنجر کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر مشابرم خان نے اسے اپنے ہاتھ ہی پکڑ لیا اور رائفل شانے سے لٹکا لی۔ اب اس کا رخ مرکزی عمارت کے دروازے کی طرف تھا جہاں اس کے یقین کے مطابق بشیر اکبر چین کی نیند سو رہا تھا اور اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے عیش کدے کے



ان سی قیامت آکھڑی ہوئی ہے۔

مرکزی دروازے پر آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس قسم کے لاک کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اسے اندر سے چابی لگائے صرف لٹو گھما کر کھولا جا سکتا ہے لیکن باہر سے کھولنے کے لیے ہر صورت چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی مشکلات سے نمٹنے اور ہتھیار کے طور پر ہسپتال سے کچھ سرجیکل آلات چرا لایا تھا۔ لیکن اتفاق سے اسے ان چیزوں کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یہاں آکر ہتھیاروں کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور دروازے کا لاک کھولنے کے لیے بھی ہاتھ میں موجود خنجر بہت موزوں تھا۔ اس نے خنجر کی نوک کو اپنے مقصد کے لیے آزمایا تو ذرا سی کوشش سے ہی لاک کھل گیا۔

لاک کھلنے کے بعد اسے اندر داخل ہونے سے کون روک سکتا تھا؟ وہ آرام سے اندر گھستا چلا گیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ کچن کے برابر والے کمرے میں اسے ایک ادھیڑ عمر عورت سوئی ہوئی نظر آئی۔ عورت صورت سے ہی ملازمہ لگ رہی تھی جو یقینی طور پر بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی جیسے کاموں کے لیے رکھی گئی تھی۔

مشابرم خان دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور عورت کی کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ ملازمہ کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے باہر نکل کر احتیاطاً اس کے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے کمروں کو چیک کرتا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، لیونگ روم سب ہی اعلیٰ درجے کی اشیا سے مزین تھے اور یہ سارا اہتمام صرف ایک شخص کے لیے تھا۔

خالی کمروں میں جھانکتا ہوا وہ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کے وجدان نے اسے بتایا، یہ کمرہ خالی نہیں ہے اور کمرہ خالی نہ ہونے کا مطلب تھا کہ وہاں بشیر موجود ہے۔ اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے اس نے دروازے پر کان لگا کر دوسری طرف سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل سکوت تھا لیکن اس سکوت سے اس کا یہ یقین متزلزل نہیں ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ وہ عمارت کے سارے کمرے دیکھ چکا تھا۔ وہاں اسے ایک بیڈ روم بھی ملا تھا لیکن اس کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ وہ مہمانوں کے لیے مختص ہے۔ شاید کبھی کبھار بشیر کا کوئی خاص مہمان آتا ہوگا تو اسے اس بیڈ روم میں ٹھہرانے کا اعزاز عطا کیا جاتا ہو گا۔ ورنہ یہاں اس رہائش گاہ سے ہٹ کر ایک عمارت ایسی بھی تھی جسے مہمان خانے کا نام دیا گیا تھا اور دور دراز علاقوں سے آنے والے مخصوص افراد کو وہاں ٹھہرایا جاتا تھا۔

اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ رات کے اس پہر بشیر کے سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے بھی کمرے میں داخلہ ممکن محسوس ہو سکتا ہے، دروازے کی ناب کو گھمایا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا اس لیے کھولا نہیں جا سکا۔ اب اس کے پاس خنجر کو ایک بار پھر آزمانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بار اس نے پہلے سے کئی گنا زیادہ احتیاط برتتے ہوئے کارروائی کی کہ اگر بشیر نیند کا کچا ہوا تو معمولی سے کھٹکے پر بھی جاگ سکتا ہے۔ ایک منٹ سے کم وقت میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور ناب گھما کر دروازے کو بس اتنا دھکا دیا کہ اس میں معمولی سی درز پیدا ہو جائے اور اندر داخل ہونے سے پہلے وہ کمرے کا باہر ہی سے جائزہ لے سکے۔ لیکن آنکھ لگانے سے قبل ہی اسے اندر سے بلند مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ یک دم ہی اُس پر منکشف ہوا کہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے جو پرائیویسی اور آرام کے تقاضے بھرپور طریقے سے ادا کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ ایسی بھی قسم کی بیرونی آواز اندر نہ جانے کی وجہ سے اندر موجود شخص کو بیرونی خطرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بشیر کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہوئی تھی۔

''نہیں مانتی سالی تو اسے ایک زہر کا انجکشن لگا دو لیکن بار بار فون کر کے مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا شوہر آئے تو بول دینا، سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اُس کی یا اُس کے خاندان میں سے کسی کی کیا مجال ہے کہ ہماری کہی بات کو جھٹلا سکے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، بے فکری سے کرو۔ آگے کے حالات میں خود سنبھال لوں گا۔ اور ہاں، کل تک میرے لیے کسی نوجوان ملازمہ کا بندوبست کر دو۔ وہ جو بڈھی گھوڑی تم نے بھیجی ہے، اس کی شکل دیکھ کر تو میرا کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس بڑھیا کی وجہ سے میرا موڈ اور رات دونوں برباد ہو کر رہ گئے۔''

بشیر کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ ریسیور کان سے لگائے مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو سن کر ہی مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر کو زرینہ نامی عورت کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔

''اور ہاں سنو۔ اب کی بار جس کسی کو بھی بھیجو اسے پہلے ہی ٹیکے شیکے لگا کر بھیجنا۔ میں بار بار ایسی مصیبتوں کو نہیں بھگت سکتا۔ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہی آج وہ عورت سر پر چڑھی چلی آ رہی ہے۔''

اُس کی نان اسٹاپ ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔ اب صورتِ حال اور بھی زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ بشیر اکبر بظاہر دین اور عوام کا خدمت گار بنا تجرد کی زندگی گزار رہا تھا اور اس نے ہر طرف یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ امور میں مصروف رہتا ہے کہ اس نے شادی سے بھی گریز کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ یہاں اپنے اس عیش کدے میں گھریلو ملازماؤں کو مقصد برآری کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ان عورتوں کی زبانیں عقیدت، خوف لالچ یا کسی بھی دوسری وجہ سے بند رہتی ہوں گی لیکن زرینہ ان کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ مشابرم خان نے اپنے کانوں سے اس ضدی عورت کی بحث سن کر آیا تھا اور اب بشیر اکبر کی زبان سے اس کی موت کے احکامات جاری ہوتے ہوئے بھی سن لیے تھے۔

''کم بخت اتنی بڑی بڑی رقمیں لیتے ہیں مجھ سے لیکن کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔'' بشیر نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور بڑبڑاتا ہوا ڈگمگاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ نے بتایا کہ وہ نشے میں ہے۔ شاید نشے ہی کی وجہ سے وہ اتنے خراب لہجے اور بلند آواز میں بات کر رہا تھا ورنہ عام حالات میں اس کی جو تقریریں وغیرہ مشابرم خان نے سنی تھیں، ان میں اس کا لہجہ نہایت دھیما اور نرم ہوتا تھا یا پھر یہ تھا کہ خلوت میں وہ اپنی اصلیت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا۔ اب مزید انتظار بے کار تھا اس لیے مشابرم خان نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور یک دم ہی پورا دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی وہ بجلی کے کوندے کی طرح اندر داخل ہوا اور پھر فوراً ہی اپنی پشت پر دروازے کو بند کر دیا۔ یہ صورتِ حال بشیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بری طرح ہڑبڑا کر کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں موجود جام چھوٹ گیا اور دبیز قالین پر بے آواز گرا۔ اس میں موجود ام الخبائث بہہ کر قالین میں جذب ہو گئی۔

''کک..... کون ہو تم؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں کیا جانے والا اپنا سوال مکمل کرتا، اس سے قبل مشابرم خان اس کے سر پر پہنچ کر خنجر کی دھار اس کے گلے پر رکھ چکا تھا۔

''کوئی آواز نکالے بغیر صرف اور صرف میری ہدایات پر عمل کرو ورنہ میں تمہاری شہ رگ کاٹ دوں گا۔'' مشابرم خان نے خوف ناک لہجے میں دھمکی دی۔

''یہ خنجر دور ہٹاؤ۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔'' بشیر کی نظریں خنجر پر گڑی ہوئی تھیں اور مشابرم خان کی موجودگی سے زیادہ اس کے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے خائف نظر آ رہا تھا۔



''میں نے یہ خنجر تمہارے ایک چاہنے والے سے چھینا ہے۔ وہ اس خنجر سے میری جان تو نہیں لے سکا لیکن میں تمہاری جان بہت آرام سے لے سکتا ہوں۔ اس لیے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔'' خنجر اس کی شہ رگ سے ہٹائے بغیر اس نے مزید دھمکی دی۔

''میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ تم یہ خنجر دور ہٹا لو اور بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس بار مشابرم خان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ خنجر سے بے پناہ خوف زدہ ہے۔

''تمہیں میرے ساتھ یہاں سے اس طرح چلنا ہو گا کہ کسی کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف زبردستی یہاں سے لے جایا جا رہا ہے۔'' اس نے خنجر ہٹانے کے بجائے اس کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا اور اب بس اتنی ہی کسر باقی تھی کہ خنجر کی دھار اس کی جلد میں اُتر جاتی۔

''میں راضی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن تم یہ خنجر دُور ہٹاؤ۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا تو مشابرم خان نے اس کا بے پناہ خوف دیکھتے ہوئے خنجر کا دباؤ ذرا کم کر دیا۔

''ہم ابھی اور اسی وقت چلیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ باہر جانے کے لیے تمہاری گاڑی کون ڈرائیو کرتا ہے؟''

''میرے پہرے داروں میں ہر ایک ڈرائیونگ جانتا ہے اور میں کہیں جاتے وقت ان میں سے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اس وقت ان دونوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہے کہ گاڑی چلا سکے۔ ویسے بھی تمہیں اکیلے ہی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ تو پہلے اپنے نائب کو یہ اطلاع دو کہ تمہیں ابھی اور اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے دنیا سے کٹ جانے کا حکم ملا ہے اس لیے تم یہاں سے جا رہے ہو۔''

بشیر کا جو ریکارڈ ان کے پاس موجود تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی کم از کم دو بار اس طریقے سے غائب ہو چکا ہے اسی لیے اُس نے اس وقت بھی اسے یہی بہانہ بنانے کا حکم دیا۔

''میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم اب ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے فون کرنے دو۔'' بشیر بہت آسانی سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مشابرم خان کو اس سے ایسے بودے پن کی اُمید نہیں تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے اپنی بات منوانے کے لیے اچھے خاصے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن یہاں تو بہت آسانی سے بات بن گئی اور وہ اس آسانی کو غیبی امداد سمجھ رہا تھا کیونکہ ظاہری طور پر بہت مضبوطی دکھانے کے باوجود وہ لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس کے خیال میں ایسا خون کے مستقل رساؤ کی وجہ سے تھا۔

''میں تمہیں ذرا بھی چھوٹ نہیں دے سکتا۔ میرا خنجر تمہاری شہ رگ پر ہی رکھا رہے گا۔ تم فون کرو۔ اگر تمہارا ابھی گڑبڑ محسوس ہوئی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔'' وہ بشیر کے ساتھ ذرا بھی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ اسے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس کا یہ متعاون رویہ کہیں کوئی چال ہی نہ ہو۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ یہ نہ ہو کہ خنجر انجانے میں میرے گلے میں گھس جائے۔'' اسے راضی نہ ہوتے دیکھ کر اس نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن ساتھ ہی ایک خوف زدہ سی التجا کرنا نہ بھولا۔

''میں بے احتیاطی صرف اسی صورت میں کروں گا جب تم احتیاط نہیں کرو گے۔'' مشابرم خان نے سادگی سے جواب دیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے فون کی طرف متوجہ کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM پاکستانی پوائنٹ PAKISTANIPOINT

بشیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے نائب کو جانے کی اطلاع دینے لگا۔ اس نے مشابرم خان کے اشارے پر بات کو زیادہ طول نہیں دیا تھا اور مختصراً بتا کر کال منقطع کر دی تھی۔

''اب یہ بتاؤ کہ گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟'' وہ فون کال سے فارغ ہوا تو مشابرم خان نے اس سے استفسار کیا۔

''چابیاں اس میز کی دراز میں ہیں۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔

''نکالو۔'' مشابرم خان اسے خنجر کی زد میں لیے ہوئے دراز تک گیا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے دراز کھولی۔ چابیوں کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ولایتی پسٹل بھی رکھا تھا۔ پسٹل دیکھ کر مشابرم خان کی گرفت خنجر پر کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ بشیر نے اس کے جسم میں پیدا ہونے والا واضح طور پر محسوس کیا اور پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کیے بغیر صرف چابیاں نکال لیں۔

وہ چابیاں نکال چکا تو مشابرم خان نے اسے پیچھے سے ٹھوکا دے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں بیڈروم سے لے کر پورٹیکو تک اس طرح آئے کہ بشیر کی گردن پر ہنوز خنجر رکھا ہوا تھا۔

''تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔'' مشابرم خان نے اسے حکم دیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا خنجر بشیر کی گردن سے دور ہٹا تھا۔ لیکن اس موقع پر بھی اس نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور بشیر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے تک خود بھی عقبی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ لمحہ بھر میں ہی اس کا خنجر ایک بار پھر بشیر کی گردن پر تھا۔

''گلوو کمپارٹمنٹ کھولو۔'' بشیر اگنیشن میں چابی لگا رہا تھا کہ اسے پیچھے سے یہ حکم ملا۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں کمپارٹمنٹ کھول دیا۔ اس میں جدید ساخت کا ایک چھوٹا سا پسٹل رکھا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے لپک کر پسٹل اپنے قبضے میں کر لیا۔

''میں ایک بار پھر تمہیں یاد دلا رہا ہوں کہ کوئی گڑبڑ نہیں کرنا۔ ورنہ میں تمہارے دیوانوں سے بھی زیادہ پاگل آدمی ہوں۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر میں تمہیں کسی صورت نہیں بخشوں گا۔ ہاں اگر تم مجھ سے تعاون کرتے رہے تو میری حد تک تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔''

اس نے پھنکارنے والے انداز میں بشیر کو یاد دہانی کروائی تو وہ بس اپنے خشک لبوں پر زبان ہی پھیر کر رہ گیا اور اس کی اجازت سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بے آواز انجن والی قیمتی گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھی۔

مشابرم خان نے خود کو عقبی نشست کے پائیدان میں اس طرح چھپا لیا کہ باہر سے ایک نظر دیکھنے پر کسی کو دکھائی نہ دے۔ گاڑی کی چیکنگ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر خود اکبر موجود تھا۔ البتہ اس موقع پر اسے اپنی ایک کوتاہی کا احساس ضرور ہوا۔ وہ بشیر کو اسی حلیے میں اٹھا کر لے آیا تھا جس میں وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھا شراب نوشی کر رہا تھا۔

عبادت گاہ کے محافظ جو ہمیشہ اسے نفیس نقش و نگار سے مزین ٹوپی اور چغے میں دیکھنے کے عادی تھے اسے اس رف حلیے میں دیکھ کر ضرور چونکتے لیکن اب اس کے پاس اپنی غلطی کو درست کرنے کا موقع نہ تھا۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بہت مشکل سے بار بار دماغ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی دھند کو جھٹک کر دور کر رہا تھا۔ آخر کار گاڑی عمارت کے مین گیٹ کو پار کر ہی گئی اور اس نے اپنے دل میں شدت سے اللہ کا شکر ادا کیا۔



''لیفٹ پر لے لو۔ اور پھر جہاں سڑک ختم ہو، وہاں گاڑی روک لینا۔'' اس نے ایک اور حکم صادر کیا اور دل سے سر کو جھٹکا۔ بس اب ذرا ہی دیر کا راستہ بچا تھا۔ اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق آرمی کی گاڑیاں ان کی منتظر ہوتیں۔ میجر اسفندیار سے یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ رات گیارہ سے صبح فجر تک آرمی کی دو گاڑیاں مسلسل مقررہ جگہ پر موجود رہیں گی اور اس کے بعد سارے معاملات وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔ اس نے بہت کوشش سے مقررہ جگہ پر پہنچنے تک اپنے حواس کو قائم رکھا۔ شکر کا ایک مقام یہ بھی تھا کہ شک میں مبتلا ہو کر بشیر کے محافظوں کی کوئی گاڑی تعاقب میں نہیں آئی تھی یا شاید ان میں سے کسی کی جرأت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت اس کی گاڑی کے پیچھے آ سکے۔ سچ جو بھی تھا، اس کے لیے یہ غنیمت سب سے بڑی تھی کہ اس نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا ہے۔ اس کے حسب ہدایت بشیر نے مقررہ جگہ پر گاڑی روکی تو اس نے گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں اور ایک بار پھر سر جھٹک کر دماغ کو گرفت میں لے لینے والی دھند سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار اسے اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور آنکھیں خود بخود ہی بند ہوتی چلی گئیں۔

''اسٹریچر لاؤ اور اسے ایمبولینس میں شفٹ کرو۔ ہری اپ۔'' بند آنکھوں سے اس نے جو آخری چند آوازیں سنیں، ان میں گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ کسی کی چیختی ہوئی آواز میں کہا جانے والا یہ جملہ بھی شامل تھا۔ پھر اس کے بعد وہاں کیا کچھ ہوا، اسے خبر نہ ہو سکی۔

⊛----✪----⊛

''اتنے چپ چپ کیوں رہتے ہو بادشاہو! کچھ گل شل کیا کرو۔ ایسے زبان سی کر بیٹھے رہو گے تو جیل میں وقت گزارنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔''

جیل میں اس وقت تفریح کا وقت تھا اور قیدی کھلے میدان میں مختلف کھیل، کھیل کر اپنا دل بہلا رہے تھے۔ سلو کا شمار خطرناک مجرموں میں ہوتا تھا، اس لیے اسے سب سے الگ تھلگ کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا اور ابتدائی ایام میں اسے اس کی کوٹھڑی سے بالکل بھی باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ اندھیری اور سیلن زدہ کال کوٹھڑی نے چند دنوں نے ہی اس کے دماغ کے بہت سے کیڑے جھڑا دیئے تھے اور وہ ایک نفرت میں ڈوبے ہوئے انسان کی حیثیت کے بجائے مختلف انداز میں سوچنے لگا تھا۔

سوچ کی اس تبدیلی کے بہت سے محرکات تھے جن میں سب سے پہلا محرک تو یہ سوال تھا کہ اسے وزیراعظم کے بیٹے کے ولیمے میں اس کے مخالف سیاسی لیڈر کے قتل کے لیے کیوں چنا گیا تھا؟..... اس بھری ہوئی محفل میں متعدد سکیورٹی اہلکاروں کی موجودگی میں وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد کیسے بچ کر نکل سکتا تھا؟ اور اگر یہ ممکن ہی تھا تو وہ بیک ڈور اور مددگار جنہیں اس واردات کے بعد اسے جائے وقوعہ سے فرار کروانا تھا، اس موقع پر کدھر غائب ہو گئے تھے؟ اور وہ آدمی کون تھا جو اس کی ناکامی کے بعد اسے شوٹ کر دینا چاہتا تھا؟

اس نے خود دیکھا تھا کہ وزیراعظم کے سکیورٹی انچارج نے اس کی ناکامی کے بعد اسے گولی مارنے کی کوشش کی تھی اور عین وقت پر ایک دوسرا آدمی اسے چھاپ نہ لیتا تو اس کی جان جانا یقینی تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے اس کی فردِ جرم سنانے والوں نے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا تھا کہ بھارت میں اس کی پرورش خاص مقاصد کے تحت کی گئی تھی۔ اس لیے وہ خود اپنے وطن ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس کی شخصیت کے نظروں میں آ جانے کے بعد اسے اپنا کہنے والوں نے

ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ ادھر وہ وزیرِاعلیٰ کے مخالف سیاسی لیڈر کو گولی مار کر ہلاک کرتا، ادھر چیف سکیورٹی آفیسر کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔ بھارتیوں کے اس سفاکانہ رویے نے اسے ذہنی طور پر بُری طرح اُلجھا دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسے صحیح سمجھے اور کسے غلط۔

اس نے انٹیلی جنس والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور مسلسل خاموش رہا تھا۔ اس خاموشی کے باوجود اسے جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کیونکہ جاننے والے جانتے تھے کہ اس نے کوئی اور جرم چاہے نہ کیا ہو لیکن بھارت کا ایجنٹ تو وہ بہرحال ہے۔ سیلن زدہ تاریک کوٹھڑی میں اس کے دن بہت تکلیف میں گزر رہے تھے اور ابتدائی دو چار دن تو وہ انسانی شکل کیا، آواز کے لیے بھی ترس کر رہ گیا تھا۔ بس کوئی شخص چپکے سے کوٹھڑی کے دروازے کے نیچے سے کھانا اندر سرکا دیتا تھا جسے وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کسی نہ کسی طور تھوڑا بہت کھا لیتا تھا۔

اسے اس اذیت سے جزوی طور پر کئی دن بعد نجات ملی اور اتنی اجازت دے دی گئی کہ وہ تفریح کے وقفے میں گھنٹہ بھر کے لیے اپنی کوٹھڑی سے باہر کھلے میدان میں آ سکتا ہے۔ گھنٹے بھر کی یہ چھوٹ اسے غنیمت معلوم ہوئی تھی لیکن اس ایک گھنٹے میں اس نے کبھی کسی کھیل میں حصہ لینے یا کسی دوسرے قیدی سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چند ایک قیدیوں نے خود اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی بھی لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن یہ ایک شخص تھا جو کسی جونک کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور ہر روز تفریح کے اس وقفے میں اس سے بات چیت اور چھیڑ چھاڑ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اپنی اُلجھی ہوئی سوچوں میں گم رہنے والے سلّو نے کبھی اس کی باتوں پر ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ باز نہیں آتا تھا۔

''سنا ہے تُو دہشت گردی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ لیکن تیری بھولی شکل دیکھ کر دل نہیں مانتا۔ سچ بتا، کچھ کیا بھی تھا یا ان سالے پولیس والوں نے تجھے ایسے ہی بھرتی کے لیے پکڑ لیا۔ یہ سالے بڑے ..... ہیں۔'' اس نے ایک بڑی سی گالی دی۔ ''اصل مجرموں کے تو قریب جاتے ہوئے ان کی پتلونیں گیلی ہو جاتی ہیں لیکن نوکری بچانے کے چکر میں بے گناہوں کو پکڑ کر گنتی پوری کر دیتے ہیں۔ ان..... کو اپنی کارکردگی بھی تو ظاہر کرنی ہوتی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ایک موٹی سی گالی جملہ پولیس اہلکاروں کو دی۔

سلّو نے اس کی کسی بات کی تردید یا تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور یونہی ٹھس بیٹھا رہا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس شخص کی باتیں نہ سن رہا ہو یا پھر اسے اس کی باتوں سے اُلجھن ہو رہی ہو لیکن پھر بھی وہ اس سے گریزاں تھا۔ اس لیے کہ اسے شک تھا کہ کہیں یہ شخص کسی خفیہ ادارے کے لیے جاسوسی نہ کر رہا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ جیلوں میں بعض قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیل انتظامیہ یا پھر کسی اور ادارے کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ قیدی اس اعتبار سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں کہ دوسرے قیدی انہیں اپنا ساتھی تصور کرتے ہوئے ان کے سامنے بہت سے راز اُگل ڈالتے ہیں اور بعد میں یہ چیز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ سلّو کا سینہ بہت سے رازوں سے بھرا ہوا تھا جنہیں کوئی نہیں اُگلوا سکا تھا اس لیے اسے بجا طور پر شک تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے کے باوجود اگر یہ شخص زبردستی اس کے گلے پڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے تو یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

''دیکھ بھائی! بات سن۔ تجھ پر جو الزام لگا ہے نا، وہ ایسا نہیں ہے کہ تُو دو چار سال کی جیل کاٹ کر آزاد ہو جائے۔ تیری تو ساری زندگی جیل میں سڑتے ہوئے گزر جائے گی یا اگر باہر نکلا بھی تو ایسی عمر میں نکلے گا کہ



میرے لیے اپنی روٹی کمانا بھی مشکل ہو جائے گا اور تُو سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہوا پھرے گا۔'' وہ غیر محسوس طور پر سلّو کے بالکل قریب کھسک آیا تھا اور دھیمی آواز میں بڑی ہمدردی سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

''تمہیں کیا غرض ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں؟'' سلّو نے پہلی بار اُس کی کسی بات کا جواب دیا لیکن لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

''مجھے تیری بھری جوانی پر رحم آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ بہت ہوا تو بیس اکیس کا ہو گا۔ سچ کہوں تو ابھی تیرے کھیلنے کودنے اور عیش کرنے کے دن تھے اور تُو آ کر بیٹھ گیا ہے اس جیل میں، وہ بھی دہشت گردی کے الزام میں۔ چچ چچ چچ..... بڑا دُکھ ہوتا ہے تجھے دیکھ کر۔ دل چاہتا ہے کہ تیرے لیے کچھ کروں۔'' اس کا لہجہ ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔

''تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟'' اس نے سوچ لیا کہ آج اس شخص سے بات کر کے اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کرنی چاہئے، چنانچہ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''کرنے کو تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور کرنا بھی چاہتا ہوں لیکن پتہ نہیں تم اعتماد کے لائق ہو بھی یا نہیں؟''

اس کا انداز سلّو کو بڑا معنی خیز محسوس ہوا لیکن یہ بات اپنے کسی انداز سے ظاہر نہ ہونے دی اور بے پروائی سے بولا۔

''یہ فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہو گا۔ میں بھلا تمہیں اپنے بارے میں کیا گارنٹی دے سکتا ہوں؟ میں تمہارے پاس مدد کی درخواست لے کر بھی نہیں آیا ہوں اس لیے تمہاری اپنی مرضی ہے کہ مجھ پر اعتماد کرو یا نہیں۔ میری طرف سے بہرحال کوئی اصرار نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اپنا دل بولتا ہے کہ تم پر اعتبار کر لوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس بار سلّو خاموش رہا۔ ''یہ دیکھو، میرے پاس کیا ہے؟'' اس نے سلّو کا ہاتھ پکڑ کر بڑی رازداری سے اپنی جیب پر لگایا۔ سلّو ہاتھ لگتے ہی بری طرح چونک گیا۔ اس کے تربیت یافتہ مشاق ہاتھوں نے فوراً ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کے ہاتھوں نے جس سخت چیز کو چھوا ہے، وہ کوئی ریوالور ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے اپنے ہمدرد کو دیکھنے لگا۔

''میں نے اور میرے کچھ ساتھیوں نے مل کر جیل سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں کھیل شروع ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو موقع کا فائدہ اٹھا کر ہمارے ساتھ بھاگ سکتے ہو۔'' اس کی پیشکش ایسی تھی کہ سلّو ہکا بکا رہ گیا۔ اسے قطعی اُمید نہیں تھی کہ صورت سے خطرناک لگنے والا یہ قیدی اسے ایسی پیشکش کرے گا۔

''تمہارے پاس زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں ہے۔ تمہیں ابھی فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہمارے ساتھ یہاں سے بھاگو گے یا ساری زندگی اس جیل میں سڑتے ہوئے برباد کرو گے؟..... وہ دیکھو، وہاں کھیل شروع ہو گیا ہے۔'' اس نے فٹ بال کھیلنے والے قیدیوں کی سمت اشارہ کیا۔

ان کے درمیان کھیلتے کھیلتے اچانک ہی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ آپس میں گتھم گتھا کئی قیدی لہولہان ہو گئے۔ کسی کا سر پھٹا تو کسی کا ہونٹ۔ کسی کی ناک سے خون بہہ نکلا تو کوئی اپنے ہاتھ پیر سہلانے لگا۔

پہرے پر موجود سپاہیوں نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی تو کچھ قیدیوں نے ان کی بندوقیں چھین لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ قیدی اِدھر سے

اُدھر بھاگنے لگے۔ سپاہیوں کی سیٹیاں اور چیختی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان سب آوازوں پر سب سے بھاری آواز اس ایمرجنسی الارم کی تھی جو جیل میں بجا دیا گیا تھا۔ سلّو دم بخود سا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ لمحوں میں جیسے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔ یہ یہاں سے بھاگنے کا سب سے سنہری موقع ہے۔'' اس کے ساتھ کھڑے قیدی نے اس کا ہاتھ تھام کر تیز سرگوشی کی اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔

انگشت بدنداں سلّو کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ذہن میں اس وقت ساتھی قیدی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس پر جو الزامات ہیں، ان کے باعث وہ جیتے جی جیل کی زندگی سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اگر اتفاق سے تیس چالیس سال بعد آزاد بھی گیا تو اس حال میں نہیں ہوگا کہ زندگی سے کوئی لطف کشید کر سکے۔

اس کی ان باتوں میں حقیقت تھی اور خود وہ بھی قید کے ان چند دنوں میں اس نہج پر سوچتا رہا تھا۔ اور اگر اب قسمت سے اسے زندگی کی طرف جانے کا ایک موقع مل رہا تھا تو وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے لالچ نے اس کے قدموں میں پھرتی پیدا کر دی اور وہ اپنے نجات دہندہ کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

ان کا رخ جیل کی اس دیوار کی طرف تھا جہاں ان سے پہلے ہی کئی قیدیوں نے پہنچ کر کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ان قیدیوں کے ہاتھوں میں بیلچے، پھاوڑے اور کدالیں وغیرہ موجود تھیں جن سے پے در پے ضربیں لگا کر وہ دیوار میں شگاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قیدیوں کے پاس اتنی بروقت ان چیزوں کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ منصوبہ بہت پہلے سے تیار تھا اور ابھی صرف موقع پیدا کیا گیا تھا۔ منصوبہ سازوں نے اتنی چالاکی سے کام لیا تھا کہ کئی سپاہیوں کی رائفلیں چھین کر انہیں بے بس کر دیا تھا اور وہ دھواں دھار فائرنگ کرتے ہوئے دیوار توڑنے والوں کو کور دے رہے تھے۔ انہیں کوئی پروا نہیں تھی کہ اس فائرنگ سے پولیس والوں کے ساتھ ان کے ساتھی قیدی بھی زد میں آ سکتے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا اور موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ بھی فرار کی کوشش میں تھے جو اس سازش میں شامل نہیں تھے۔

''ہم ادھر سے کمند ڈال کر باہر نکلیں گے ورنہ اگر اس دیوار تک جانے کی کوشش کی تو مارے بھی جا سکتے ہیں۔ دیوار مضبوط ہے۔ جانے ٹوٹ بھی سکے یا نہیں۔ اوپر سے وہ لوگ دھواں دھار فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہمیں کوئی گولی بھی لگ سکتی ہے۔'' بھاگتے بھاگتے سلّو کے ساتھی قیدی نے اس سے کہا اور پہلو کی دیوار کی طرف رخ موڑ لیا۔ سلّو کیا کہتا، وہ تو اس کے رحم و کرم پر تھا اور آزادی کے لیے صرف اور صرف ایک چانس لے رہا تھا ورنہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ منصوبہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ اسے تو بس اس شخص پر ہی انحصار کرنا تھا۔ دونوں بھاگتے ہوئے کئی دوسرے قیدیوں سے ٹکراتے پہلو کی دیوار کے قریب پہنچے تو اس شخص نے اپنی کمر سے اٹھا کر کمر سے بندھی ایک مضبوط رسّی پھرتی سے کھول کر ہاتھ میں پکڑی۔ رسّی کے سرے پر بڑا سا آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے رسّی گھما کر پوری قوت سے اس دیوار کی طرف اُچھالی تو آنکڑا دیوار میں پھنس گیا۔

''چلو پہلے تم اوپر چڑھو۔'' اس نے سلّو کو اشارہ کیا تو وہ پھرتی سے حرکت میں آ گیا۔ رسّی کی مدد سے بلند دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا اس کے لیے بہت معمولی سی بات تھی اور اتنی آسانی سے آزادی حاصل ہونے کے خیال نے اس کے اندر جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔ رسّی کا سرا تھام کر وہ بندر کی سی پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اسی وقت اسے رائفل چلنے کی زوردار آواز سنائی دی اور گولیوں کی آواز سے اس کے بہت قریب



گزری۔

اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دو قیدی ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موجود رائفل سے دھواں نکل رہا تھا۔ دوسرے کی پوری کوشش تھی کہ اس سے رائفل چھین لے۔ اس کشمکش کے دوران ہی وہ بلند آواز سے چیخا۔

''سلیم! واپس اُتر جاؤ۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

سلّو تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ چند فٹ کی دُوری پر آزاد فضا تھی لیکن نیچے سے کوئی اُسے پکار رہا تھا کہ اگر نیچے نہ اُترا تو مارا جائے گا۔

لمحہ بھر قبل ہی اس نے موت کو اپنے سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتے دیکھا تھا، اس لیے ٹھٹک گیا تھا۔ اُس کا یہ رکنا محض چند سیکنڈ کا ہی تھا۔ لیکن اس کی تیز نظروں نے فوراً ہی دیکھ لیا کہ اسے بھاگنے کی ترغیب دینے والے قیدی نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا ہے اور اس ریوالور کا رخ اسی کی طرف ہے۔ اب بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ نہ ہی وہ گولی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے باقی ماندہ فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہیں سے ریوالور بردار پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اسے چھلانگ لگاتا دیکھ چکا تھا، اس لیے فوراً ہی فائر داغ دیا۔ فائر کی بلند آواز کے ساتھ ہی فضا میں ایک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی اور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

⊛----✪----⊛

ہر طرف ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے باوجود سلّو نے ریوالور سے کیے گئے فائر کی آواز بہت اچھی طرح سن لی تھی۔ شاید اس لیے کہ ریوالور چلانے والے نے اس گولی پر اس کا نام لکھ کر چلایا تھا۔ مگر بالکل آخری لمحات میں ایک معجزہ سا رونما ہو گیا۔ اس کے اور گولی کے درمیان ایک انسانی جسم آتا ہوا آ کر حائل ہو گیا اور فضا اس کی دردناک چیخ سے گونج اُٹھی۔

سلّو کے قدم زمین پر ٹکے تو اُس نے اس انسانی جسم کو اپنے قدموں میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ بے حد تکلیف میں ہے اور شاید ہی بچ سکے۔

''ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ورنہ تمہارا انجام تمہارے ساتھی سے بھی زیادہ برا ہوگا۔'' یہ آواز اتی ہوئی آواز اس دوسرے قیدی کی تھی جو کچھ لمحوں قبل رائفل بردار قیدی سے برسرِ پیکار تھا مگر اب اس نے بازی کھیل ہی اُلٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہ صرف رائفل اپنے قبضے میں لے چکا تھا بلکہ اس کی طرف بڑھتی موت کی راہ میں اپنے مدِمقابل کو اُچھال کر حائل کر دیا تھا اور اب اس شخص کو رائفل کی زد میں لیے کھڑا تھا جو سلّو کے لیے اس کا ہمدرد اور نجات دہندہ بن کر ملا تھا۔ لیکن لمحہ بھر قبل ہی اس نجات دہندہ نے موت کے ہرکارے کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تم کون ہو؟'' ریوالور بردار نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ پریشان بھی نظر آ رہا تھا جیسے جو کچھ ہوا ہو، اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ کسی قسم کی مداخلت کی امید نہیں رکھتا تھا۔

''تمہارے لیے میں جہنم کا فرشتہ ہوں۔ اگر تم نے ریوالور پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو میں تمہیں تمہارے ساتھی کے پیچھے جہنم روانہ کر دوں گا۔''

اُس کے لہجے میں ایسا قطعی پن تھا کہ ریوالور بردار نے مزید پس و پیش سے کام نہیں لیا اور ریوا
پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔

اس کا پھینکا ہوا ریوالور اس کے ساتھی کے قریب جا کر گرا جس کا جسم اب تڑپنا چھوڑ کر ساکت ہو چکا
اور یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

سلّو سکتہ زدہ سا کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن فی الحال تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ سب
ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس اُلجھن نے تو اسے اس ساری افراتفری اور ہنگامے سے بھی بے نیاز کر دیا تھا
اس کے اردگرد جاری تھا۔

''اب واپس چلو۔'' رائفل بردار نے حکم جاری کیا تو ہاتھ اٹھائے شخص کو ناچار پلٹنا پڑا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے سلیم!'' دوسرا حکم سلّو کے نام جاری ہوا تو اُس نے دزدیدہ نظروں
مُردہ قیدی کے قریب پڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ جیل سے نکل کر آزاد فضاؤں میں جانے کے خیال سے
اندر عجیب سی توانائی محسوس کر رہا تھا اور اب وہ شخص اسے واپس انہی اندھیروں کی طرف لے جا رہا تھا
اس کا دم گھٹتا تھا۔

لیکن کمال یہ تھا کہ اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے نے یقینی طور پر دو مرتبہ اسے موت
منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ ایک بار اس وقت جب وہ رسّی سے لٹکا دیوار کی بلندی کو سر کرنے کی کوشش
تھا اور رائفل کی گولی اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔ اور دوسری بار بھی اس نے عین اس
اس کی جان بچائی تھی، جب وہ ریوالور کی گولی کا نشانہ بننے والا تھا۔ اسے لگا کہ یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ
اپنی جان بچانے والے شخص کے ساتھ کچھ برا کر سکے۔ لیکن یہ بھی تو آسان نہیں تھا کہ وہ آزادی کے
قریب آ کر ایک بار پھر زنداں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔

نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے کسی طرح رائفل بردار کو زیر کر لے اور
بار پھر اس رسّی سے لٹک کر اوپر چڑھ جائے جو اسے جیل کی چار دیواری کے دوسری طرف لے جا سکے
کے اندر چھڑی جنگ شاید اسے آزادی کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کرنے کی راہ دکھاتی۔
فیصلہ ہونے سے قبل ہی اس نے ایک ہاتھ کو آگے بڑھ کر ریوالور اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ ریوالور اُٹھانے
نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

''چلو یار!..... کیا سوچ رہے ہو؟''

سلّو کے پاس آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے
جھکائے آگے بڑھنے لگا۔ چار افراد پر مشتمل اس قافلے کا ہر شخص اردگرد پھیلی افراتفری سے مکمل بے نیاز
البتہ ان میں سے ہر ایک کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ جیل انتظامیہ اس وقت پوری طرح متحرک ہو چکی
مشکل ہی ہے کہ قیدیوں کے فرار کا منصوبہ کامیاب ہو سکے۔

قیدیوں ہی کے حلیے میں موجود ان دو افراد کے زیر ہدایت چلتے ہوئے وہ لوگ جیل کی عمارت کے
حصے میں پہنچے، وہ دفاتر پر مشتمل تھا اور وہ دونوں جس بے دھڑک انداز میں انہیں وہاں لائے تھے، اس
صاف ظاہر تھا کہ ان کے جسم پر لباس تو بے شک قیدیوں والا ہے لیکن وہ انتظامیہ سے بہت قریبی تعلق
ہیں۔ ایک باوردی اہلکار والے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہونے پر اس اندازے کی تصدیق



گئی۔ سامنے ہی کرسی پر جو شخص براجمان تھا، اس کے بیج پر ڈی آئی جی کے الفاظ کندہ تھے۔ جبکہ ایس پی اور
ای ایس پی بھی اسی کمرے میں پائے جاتے تھے اور ان کی نظریں اس اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جس پر
جیل کے مختلف حصوں کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں حضرات نے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا رکھے تھے
اور وقتاً فوقتاً احکامات جاری کر رہے تھے۔

''کامیاب واپسی مبارک ہو۔'' ڈی آئی جی نے مسکرا کر ان دونوں کا استقبال کیا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو سر!..... آپ کا مجرم آپ کے حوالے ہے اور ہم انعام میں اپنے ساتھ اسے لے
جا رہے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔'' رائفل بردار نے جواب دیا تو ڈی آئی جی ایک گہری سانس لے کر
رہ گیا اور کچھ افسوس سے بولا۔

''یہ شخص اصل مجرم کہاں ہے؟ اصل مجرم تو ریاض انور ہے جس نے اس جیسے غنڈے کو اپنی ضرورت کے
لیے پالا، اپنے کام نکلوائے اور اب اسے یہاں سے نکال لے جانے کے چکر میں تھا۔ اگر کرنل صاحب کی
طرف سے اس سازش کا انکشاف نہ کیا جاتا تو آج غضب ہی ہو جاتا۔ لیکن اب مجھے امید ہے کہ اس جیل
سے ایک بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اور ہم اپنی صفوں میں شامل کالی بھیڑوں تک پہنچنے
میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

ڈی آئی جی کی زبان سے ریاض انور کا نام سن کر خطرناک صورت قیدی اور سلّو دونوں ہی چونک
پڑے۔ دونوں ہی کے لیے یہ نام شناسا تھا اور فرق صرف اتنا تھا کہ سلّو کو علم نہیں تھا کہ اس سب کے پیچھے
ریاض انور موجود ہے جبکہ دوسرا جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، ریاض انور کی سرپرستی میں کر رہا تھا۔

''کیوں بھئی شہباز! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟..... تمہیں جیل سے فرار کروانے کا یہ منصوبہ تمہارے
اس ریاض انور نے ہی بنایا تھا نا اور اس نے ہی تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرتے ہوئے
ہوشیاری چالاکی کے ساتھ سلّو کو بھی ٹھکانے لگا دینا۔''

ڈی آئی جی نے بالکل اچانک ہی سلّو کے ساتھ موجود قیدی کی طرف رخ کرتے ہوئے اس سے کہا
تو وہ جواباً خاموش رہا۔ لیکن اس کی جھکی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا، وہ غلط
نہیں تھا۔

سلّو اس انکشاف کو سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ریاض انور لوگ ہے اور اس
کی ڈوریاں کن ہاتھوں میں ہیں۔ اگر ریاض انور نے اس کے قتل کے احکامات جاری کیے تھے تو اس کا مطلب
تھا کہ یہ حکم وہاں سے صادر ہوا ہے جنہوں نے برسوں اسے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے ہمدرد اور
بہی خواہ ہیں۔

''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتے شہباز!..... سچ بولو، یہ ریاض انور ہی کا کارنامہ ہے نا؟'' ڈی آئی جی،
سلّو کی کیفیت سے بے خبر فرار کی کوشش کرنے والے قیدی سے مخاطب تھا۔

''اب میں کیا بولوں سر! آپ کو تو لگتا ہے سب بات کی پکی انفارمیشن ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکل
جانے میں کامیاب ہو جاتے تو سیدھے ریاض صاحب کی خدمت میں پہنچتے۔ ان سے اچھا خدمت کا صلہ کوئی
نہیں دیتا۔ اور ابھی تو اگر بیچ میں یہ لوگ نہیں کُودتے تو ہم انعام کے بھی حق دار ہو جاتے۔ ریاض صاحب نے
سمجھایا تھا کہ اس سالے کو اپنے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار کرو اور جب یہ راضی ہو کر ساتھ چل پڑے تو عین
موقع پر اسے کسی پولیس والے کی رائفل سے اُڑا دینا تاکہ ہر طرف یہی خبر پھیلے کہ سلیم عرف سلّو جیل سے

بھاگنے کی کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔"

اس نے نہایت بے خوفی سے اعتراف کرتے ہوئے ایک ایسا انکشاف کیا جس نے سلو کو ہلا کر رکھ دیا اور مارے طیش کے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ممکن تھا کہ وہ طیش کے عالم میں شہباز پر ہی حملہ کر دیتا لیکن فوراً ہی ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی۔

"کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اس شخص نے جو کچھ کیا، اس کی سزا اسے مل جائے گی۔ البتہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ کہیں اور ہوگا۔" اس کے عقب میں کھڑا ہوا کریہہ سا کہنے والا وہ شخص تھا جس نے کچھ دیر قبل اس کے ریوالور ہتھیانے کے ارادے کو ناکام بنایا تھا۔ سلو دوسری بار اس کے اپنے ارادے کی راہ میں رکاوٹ حائل کرنے پر اندر سے جھنجلا کر رہ گیا لیکن فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا، اس لیے خاموشی ہی بہتر تھی۔

"اوکے سر! ہمارا کام مکمل ہوا، ہم چلتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ اپنے معاملات خود بہتر طور پر نمٹا لیں گے۔" رائفل بردار نے ڈی آئی جی سے اجازت چاہی۔

"شیور۔" ڈی آئی جی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ "کرنل صاحب! ایک بار پھر میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ آئی جی صاحب کی غیر موجودگی میں مجھے آنے والی یہ بلا ٹل گئی۔"

وہ بہت ممنون دکھائی دے رہا تھا اور اُسے ہونا بھی چاہیے تھا کہ آئی جی صاحب ہفتے بھر کے لیے مجھے لے کر اپنا چیک اپ کروانے بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں جو کچھ بھی ہوتا، اس کی ذمے داری اس کے شانوں پر ہی آ جاتی۔

ڈی آئی جی سے الوداعی کلمات ادا کر کے وہ دونوں سلو اور شہباز کو لے کر باہر نکلے تو باہر بہت سا پولیس والے ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر شہباز کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالیں اور پھر وہ تین چار افراد کے ٹھڈوں اور لاتوں کی برسات میں وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ ان تینوں کے ساتھ صرف دو پولیس والے باقی رہ گئے تھے۔

"اسے بھی ہتھکڑی لگانی ہے سر؟" ایک پولیس والے نے سلو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، اسے ہم اپنا مہمان بنا کر لے جا رہے ہیں۔ اور مہمانوں کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی۔" رائفل بردار نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر! جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کے لیے گاڑی تیار ہے۔" اُس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ پھر ان تینوں کو اپنی راہنمائی میں لے کر آگے بڑھا۔

سلو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو سے اس نے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ اب اس کا واسطہ فوج سے پڑنے والا ہے لیکن وہ لوگ اس پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے تھے؟ یہ اپنی جگہ ایک اُلجھن تھی۔

جدید ماڈل کی اس گاڑی کے شیشے بلٹ پروف اور ٹنٹڈ تھے چنانچہ باہر سے کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا کہ گاڑی میں تین ایسے افراد سوار ہیں جن کے جسموں پر قیدیوں والا لباس ہے۔

گاڑی انہیں لے کر وہاں سے روانہ ہوئی تو جیل میں بچی کھچی بھگدڑ میں خاطر خواہ کمی ہو چکی تھی اور لگتا تھا کہ جیل حکام حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔



سلو نے گیٹ سے باہر گاڑی نکلنے پر حیرت زدہ نظروں سے ان راستوں پر نظر دوڑائی جن پر لوگ آ جا چلتے پھرتے تھے لیکن وہ اس آزادی سے محروم تھا اور کچھ دیر قبل دو بار مرنے سے بچنے کے بعد ایک بند پراڈو گاڑی میں، انجان لوگوں کے ساتھ نہ جانے کس انجان منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

"نئی زندگی مبارک ہو۔" ہسپتال کے خنک اور اُجلے ماحول میں آنکھ کھلنے پر مشابرم خان نے میجر ابرار کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے چہرے پر بڑی جاندار اور پُرخلوص مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اپنائیت کا احساس تھا۔

"شکریہ میجر صاحب!" مشابرم خان جواب میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟" میجر اسفند کرسی سرکا کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بہت زیادہ نقاہت محسوس کر رہا تھا لیکن اظہار ضروری نہیں سمجھا۔

"تم قابلِ فخر ہو مشابرم خان! تم نے جس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر اس بھیڑیے کو ہم تک پہنچایا، اس کے لیے ہم سب تمہارے احسان مند ہیں۔" میجر کے لہجے میں عقیدت تھی۔

"میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے اور اگر فرض کی ادائیگی میں میری جان بھی چلی جاتی تو مجھے غم نہیں تھا۔ بے کار جینے سے کچھ کر کے مر جانا بہتر ہوتا ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں پہلا طویل جملہ بولا۔

"جان دینا اور لینا ہمارے ہاں اب کوئی بڑی بات نہیں رہی ہے۔ لوگ معمولی رقم سے لے کر مذہب، ملک، زبان، غیرت اور جانے کن کن بنیادوں پر اس مشکل مرحلے سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جنہیں اس بات کا ادراک ہو کہ وہ جان جیسی قیمتی شے کی بازی ناحق نہیں لگا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم اس حال کو کس وجہ سے پہنچے تھے؟ تمہیں اس خنجر سے زخم لگا تھا جس کی زد میں لے کر تم بشیر اکبر کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر ہم تک لائے تھے۔ وہ خنجر زہر آلود تھا اور اس کا زہر تمہارے پورے جسم میں پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو تمہاری جان بچانے کے لیے سر توڑ کوششیں کرنی پڑی ہیں، تب جا کر تم کو آنکھیں کھولی ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ خنجر زہر آلود ہے۔ اسے میں نے بشیر اکبر کے ملازم سے چھینا تھا اور اس سے آپ کے دوران ہی مجھے زخم آیا تھا۔"

اسے سمجھ آنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں وہ خنجر دیکھ کر بشیر اکبر اتنا خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا کہ بے چون و چرا اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا چلا گیا۔ خود اپنی کیفیت بھی اسے سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ جسم میں سرایت کرتے زہر کا اثر تھا کہ وہ نڈھال سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت تو اس نے اپنی کمزوری کے بارے میں یہی گمان کیا تھا کہ اس کا خون بہہ جانے کی وجہ سے ایسی کیفیت ہو رہی ہے لیکن اب حقیقت کھلی تو دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اس پر احسان کیا اور قوتِ ارادی کو اتنی مضبوطی بخشی کہ وہ حالات سے بخیر و خوبی نمٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

"ہم بھی خنجر کے بارے میں نہیں جانتے تھے لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے تمہیں دیکھتے ہی کیفیت سے اندازہ لگا لیا کہ تم پر زہر کا اثر ہوا ہے۔ بعد میں بشیر اکبر سے تفتیش کی تو اس نے خنجر کی حقیقت بتائی۔ اس قسم کے خنجر اس کے چند مخصوص محافظوں وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حلف اٹھا رکھا ہے

کہ بشیر اکبر کے حکم پر اور اس کی حفاظت کی خاطر وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے
لوگوں کو وہ اپنے خاص کاموں کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ ان لوگوں کی اُس نے اس طرح برین واش
رکھی تھی کہ اگر ان کے لیے اپنے مشن سے صحیح سلامت واپس لوٹنا ممکن نہ ہو اور پکڑے جانے کا خطرہ
جائے تو وہ بلا جھجک خودسوزی کر ڈالتے تھے۔ اسی لیے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ آج کل لوگوں کے لیے
لینا اور دینا دونوں ہی بڑی بات نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں اللہ کا شکرگزار ہوں کہ میرا شمار ان خوش قسمتوں میں ہوتا
کمزوری اور خون کی کمی سے زرد پڑتے مشابرم خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہوگئی
میجر اسفند کے ہونٹوں پر اُبھرنے والی مسکراہٹ بڑی جان دار اور بھرپور تھی۔

''تم خوش قسمت بھی ہو اور دلیر بھی۔ ورنہ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی کہ بشیر اکبر کو اس کی کچھار سے
نکال لایا جائے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔'' میجر نے ایک بار پھر کھل کر اسے سراہا۔

''لیکن بعد میں تو ہنگامہ کھڑا ہوا ہوگا۔ اس کے محافظوں کے انجام اور میرے فرار نے بہت سے
اٹھائے ہوں گے۔ کیا اس صورتِ حال پر اس کے عقیدت مند مشتعل نہیں ہوئے؟'' وہ جسمانی طور پر
تھا لیکن دماغ نے تیزی سے کام شروع کر دیا تھا اس لیے اس قابل تھا کہ سوالات اٹھا سکے۔

''اس سلسلے میں ہماری بشیر اکبر کے نائب سے ڈیل ہوگئی ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو یقین دلائے گا کہ
اپنی مرضی سے گیا ہے۔ بشیر کے بعد اسے وہاں اتنا اثر و رسوخ حاصل ہے کہ اگر کچھ لوگوں کو شک ہوا بھی
کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اگر کسی نے اس کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کا نام و نشان مٹا دے گا۔''

''لیکن وہ اس بات پر راضی کیسے ہوا؟'' مشابرم خان کو حیرت ہوئی۔

''اقتدار کے لالچ میں۔'' میجر مسکرایا۔ ''تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے
لوگوں نے اپنے خون کے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ ایسے میں اگر بشیر اکبر کے نائب نے ہمارے
ساز باز کر لی تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟''

''میں پھر بھی حیران ہوں کہ یہ ڈیل ہوئی کیسے؟'' مشابرم خان کی اُلجھن و حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔

''اس کے لیے مجھے تمہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ہوگا۔ تم نے جو عرصہ ہسپتال میں زندگی اور
کی جنگ کرتے ہوئے گزارا ہے، اس عرصے میں ہم نے بشیر کے سارے کس بل نکال کر اس سے نہ
بہت سی معلومات حاصل کی ہیں بلکہ معاملات کو بھی تیزی سے نمٹایا ہے۔ بشیر نے اعتراف کیا ہے کہ
یہودی ہے اور بچپن سے اسے ایسی تربیت دی گئی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہر بات
رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ نوعمری میں ہی اپنے بزرگوں اور مذہبی پیشوا کے
اس بات کا عہد کر چکا تھا کہ عظیم اسرائیل کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دے گا اور یہود کے سب سے
دشمن مسلمین کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہر وہ کام کرے گا جو اس کے لیے ممکن ہو۔ اپنی مخصوص تر
ارادوں کے ساتھ اس نے بہت نوعمری میں یہاں ڈیرا جما لیا اور اپنی چالاکی اور ذہانت سے کام لے کر
آہستہ ایسا مقام حاصل کر لیا کہ بے شمار لوگ اس کے سحر میں گرفتار ہو گئے۔

وہ ان سحر زدہ لوگوں کو اسلام کے نام پر ایسی تعلیمات دیتا رہا جن سے اسلام کا دور تک تعلق نہیں
اس نے اتنی ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیا کہ معصوم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ کوئی ان کو
واشنگ کر کے انہیں اسلام کی حقیقی روح سے دور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں سے مخالفت کی آواز اُٹھی بھی



اسے مشتعل قرار دے کر اس کے خلاف نام نہاد جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ غرضیکہ بشیر ایک بڑے طبقے کو
اسے پر لانے میں کامیاب ہو کر ایک طرف تو اسلام دشمنی نبھاتا رہا اور دوسری طرف اس نے پاکستان
کو کھوکھلی کرنے کے لیے ''را'' والوں سے بھی ساز باز کر لی اور نہایت کامیابی سے ڈبل ایجنٹ کے
ساتھ مذہبی راہنما کا رول بھی ادا کرتا رہا۔

یہاں گزرنے والے طویل عرصے میں اس نے پاکستان اور پاکستانیوں کا بڑا نقصان کیا۔ پہاڑوں میں
لڑکوں کی تربیت کے لیے جو کیمپ قائم کیا گیا تھا، اس کیمپ کے قیام میں بھی بشیر نے خاصی مدد کی
تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اس کیمپ کی تباہی کے براہِ راست ذمے دار ہونے کے باوجود کسی کی نظر
نہیں آئے تھے ورنہ شاید بلتستان میں قدم رکھتے ہی دھر لیے جاتے اور بشیر پر قابو پانا تو دور کی بات، خود اپنا
بھی نہ کر پاتے۔''

میجر اسفند کی بات نے اسے اپنا بلتستان کا پچھلا دورہ یاد دلایا۔ زندگی کا وہ حصہ اس کے دل پر ایسے زخم
لگا گیا جو شاید کبھی نہ بھر پاتے۔ اس نے پناہ کی تلاش میں بھٹکتی ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن قسمت
ماہ بانو وہاں بھی محفوظ نہ رہ سکی اور اسے اغوا ہونے سے بچانے کے لیے اس کے بھائی اکرم خان نے
جان قربان کر دی۔

جوان بیٹے کی موت نے ماں کو غم سے ایسا نڈھال کیا کہ وہ ہوش و حواس کھو کر کومے میں چلی گئی اور
اپنی جان کی بازی بھی ہار گئی۔ غصے اور غم میں مبتلا مشابرم خان نے اس وقت ایک عالمِ جنون میں
پہاڑوں میں واقع اس تربیتی کیمپ تک رسائی حاصل کی تھی اور اتفاقاً اور خوش قسمتی کے باعث تن تنہا
کیمپ کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ آج اُسے بتایا جا رہا تھا کہ اس کیمپ کو قائم کرنے میں مدد دینے والوں
میں ایک بشیر بھی تھا اور اسے خوشی تھی کہ اپنی جان کی بازی لگا کر وہ برسوں سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر
اگلنے اس شاطر سانپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''بشیر جو کچھ کر رہا تھا، وہ مکمل طور پر ون مین شو تھا۔ اس نے اپنے قرب و جوار میں موجود کسی شخص،
حتیٰ کہ اپنے نائب کو بھی اپنی حقیقت کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ یہاں جو لوگ اس کے معتمد تھے، وہ بھی
اس حد تک اسے جانتے تھے کہ بشیر اکبر ایک ایسا فراڈیا ہے جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا رہا
اور اپنے جھوٹے زہد و تقویٰ کا جال بچھا کر لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ دونوں
ہاتھوں سے دولت کما کر خوب عیاشی کر رہا تھا اور دوسری طرف اعلیٰ طبقے اور حکومتی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ
قائم کر رہا تھا اس کے کردار سے واقف ہونے کے باوجود اس کے معتمدین و مقربین کو اس پر اس لیے کوئی
شک نہیں تھا کہ وہ انہیں بھی خوب عیاشی کرواتا تھا اور دل کھول کر نوازتا تھا۔ اس بات کا تو کسی کو گمان بھی
نہیں تھا کہ وہ اسرائیلی و بھارتی ایجنٹ ہے۔

حقیقتاً وہ اتنا شاطر تھا کہ لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی اُنگلیوں کے اشاروں پر نچانے کے باوجود انہیں
اصل عزائم اور مقاصد کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے اتنے بہت سے سال اسرائیل
حکومت میں صرف کر کے اپنے آقاؤں کو بے تحاشا خوش کر رکھا تھا، چنانچہ ان کی طرف سے بھی اسے خوب
نوازا جاتا تھا۔ اسرائیل میں اس کے خاندان کو بھی خصوصی رعایات و مراعات حاصل تھیں۔ اس کے اہلِ خانہ
کو اصلی پاسپورٹ اور دستاویز کے ذریعے پاکستان آ کر اس سے ملاقات کر چکے تھے جبکہ وہ صرف دو بار
نکل گیا تھا۔ ایک بار اپنی شادی کے لیے اور دوسری بار اپنے باپ کی آخری رسومات میں شرکت کے

لئے۔ ظاہر ہے دونوں جانب سے ہونے والی یہ آمد و رفت براہِ راست اسرائیل اور پاکستان کے درمیان
تھی بلکہ وہ لوگ ہمیشہ کسی دوسرے ملک کے شہری کی حیثیت سے سفر کرتے تھے۔ بشیر کی بیوی نے اس
اہلِ خانہ میں سے سب سے زیادہ پاکستان کا سفر کیا اور ہمیشہ کسی نہ کسی مذہبی جماعت کے ساتھ باپردہ
مسلمان عورت کے روپ میں یہاں آئی۔

یہاں اس نے طویل وقفوں کے لیے قیام کیا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں تین اولادیں بھی
ہوئیں۔ ان بچوں کو بھی بشیر اکبر کی طرح ہی اسرائیل میں خصوصی تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے۔ بشیر کی
بھی اسی کی طرح کٹر یہودی ہے اور اسے شوہر کی بہت کم رفاقت میسر آنے کے باوجود اس بات پر فخر
اس کا شوہر اپنے مذہب اور وطن کی خاطر بے شمار قربانیاں دے رہا ہے۔ ہم نے نہ صرف یہ ساری معلو
بشیر سے اُگلوائیں بلکہ اس کی ویڈیو بھی تیار کی۔ اس ویڈیو نے ہمارا کام بہت آسان کر دیا اور ہم اس
نائب کو اپنا ہم نوا اور رازدار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ تم بے ہوش تھے ورنہ بہت سارے حالات
میرے بتائے بغیر بھی واقف ہو جاتے۔ بشیر کے غیاب پر بہت سی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ کسی
تھا کہ جیسے وہ ماضی میں پہلے بھی دو بار غائب ہو کر واپس آ گیا تھا، ویسا ہی اس بار بھی ہو گا۔ کچھ لوگ
کے حالات سے واقف تھے، اسے بشیر کا اغوا قرار دے رہے تھے اور اس اغوا کا ذمے دار تمہیں ہی ٹھہرا
تھا۔ کیونکہ تم پراسرار طور پر ہسپتال سے غائب تھے۔ البتہ اس کے نائب نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ اس
کو عوامی حلقوں تک نہیں جانے دیا اور کسی بڑے ہنگامے سے بچنے کے لیے خود ہی انتظامیہ سے مذاکرات
مصروف تھا۔

شروع میں اس نے بہت شور مچا رکھا تھا کہ کسی بھی طرح بشیر کو بازیاب کروایا جائے ورنہ وہ اپنے
کے ساتھ مل کر پورے علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہم نے محسوس کر لیا کہ وہ
کا اتنا وفادار نہیں جتنا ظاہر کر رہا ہے بلکہ ایک طرح سے اس کی خواہش ہے کہ بشیر غائب ہی رہے تو بہتر
کیونکہ اس طرح تمام اختیارات اسے حاصل ہو جاتے۔ ہم نے اس کے دل کے اس چور کا فائدہ اٹھا
ہوئے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے جب بشیر کی حقیقت کا علم ہوا تو سناٹے میں رہ گیا اور
اعتراف کیا کہ اس کے ساتھ مل کر عوام کو دھوکا دینے کے باوجود وہ قطعی واقف نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے
کا آلۂ کار بنا ہوا ہے جو بیک وقت اسرائیل اور بھارت کا ایجنٹ ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس معا
اتنی خوبی سے سنبھال لے گا کہ کسی کو شک بھی ہوا تو اظہار نہیں کر سکے گا۔ ہم نے کچھ شرائط اور ضوا
ساتھ اس سے معاملات طے کر لئے۔ اب وہ بشیر کی جگہ سنبھالے گا اور عبادت گاہ کے تمام معاملات اس
ہاتھ میں رہیں گے۔''

میجر اسفند نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ایک بار
تشویش کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''یہودی بڑی منصوبہ ساز قوم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے یہاں اپنا اتنا بڑا اسیٹ اپ قائم
اسے اس حال میں چھوڑ دیں کہ بشیر کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے۔ اصولاً تو یہاں اس کے بعد اس کی
سنبھالنے کے لیے کسی اور کو موجود ہونا چاہئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا نائب ہی اس کا جانشین ہو اور
سے معاہدہ کر کے اسرائیل سے وفاداری نبھا رہا ہے؟''

''تمہاری تشویش درست ہے۔ لیکن غلطی کی گنجائش ہر جگہ ہوتی ہے۔ بشیر کا نائب بھی تیار کیا جا



ان یہاں نہیں، تل ابیب میں۔ بشیر کی خواہش تھی کہ اس کے بعد اس کی جگہ اس کا بیٹا لے۔ اگلے سال وہ
بیٹے بلکہ پوری فیملی کو یہاں بلانے والا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسے فلسطینی خاندان کی صورت میں یہاں آ کر
ہوتے جس کا سربراہ اسرائیلی جارحیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس طرح بشیر کو اپنے خاندان سے قریب رہنے کا
بھی مل جاتا اور وہ اپنے بیٹے کو اپنی جگہ دینے کی راہ بھی ہموار کر لیتا۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی رہی کہ یہ
معاملہ آنے سے قبل ہی اس کی حقیقت ہمارے سامنے آ گئی اور اب وہ اپنے انجام تک پہنچنے کے لیے ہماری
تحویل میں ہے۔''

''اور اگر اسرائیل نے اس کے نائب کو لالچ اور دباؤ کے ذریعے اپنے دام میں پھنسا لیا تو؟'' اس کے
ایک اور اندیشہ تھا۔ میجر اسفند ہنس پڑا۔

''تم تو حد سے زیادہ محتاط اور دور اندیش آدمی ہو یار!..... لیکن فکر نہ کرو، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اب چونکہ یہ
معاملہ ہمارے سامنے آ گیا ہے اس لیے ہم کڑی نگاہ رکھیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ اب عبادت گاہ اور اس سے
متعلق ہر اہم شخص چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں رہے گا۔'' اس نے مشابرم خان کو تسلی دی۔ ''اب اگر تمہاری
کل ہو گئی ہو تو مجھے اجازت دو۔ کوئی اور بھی ہے جو میرے بعد تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔''

''بہت بہت شکریہ میجر صاحب! میں نے واقعی آپ کا بہت وقت لے لیا۔'' اس بار مشابرم خان جھینپ
گیا۔

''اٹس او کے مین! تم نے جو کچھ کیا، وہ اتنا قابلِ قدر ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں کسی
فوجی اعزاز سے نوازنے کی سفارش کرتا۔ لیکن یہ بھی ہماری قسمت کا کھیل ہے کہ قوم و وطن کی خاطر
بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کی ایک بڑی تعداد کو منظر پر نہیں لایا جا سکتا۔'' میجر اسفند نے ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر تھپکی دی اور باہر نکل گئے۔

ان کے باہر جانے کے لمحہ بھر بعد ہی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس کھلے دروازے سے گل مینا بہار کے
جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مشابرم خان کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ پھیل گئی جبکہ
گل مینا اس کے قریب آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''اِدھر آؤ میرے پاس۔ رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے محبت سے گل مینا کو پکارا تو وہ اس کے کچھ اور
قریب چلی آئی لیکن ساتھ ہی آنسوؤں کی روانی میں بھی مزید اضافہ ہو گیا۔ مشابرم خان نے نرمی سے اس کا
ہاتھ تھام لیا۔

''اس بار تو میں تمہیں بتا کر گیا تھا۔ پھر کیوں رو رہی ہو؟ کیا میرے بتا کر جانے کے باوجود تمہیں یہ ڈر
تھا کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں؟'' اس نے پوچھا تو گل مینا شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔'' اس کے تسلسل سے
آنسوؤں کو روکنے کے لیے اس نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا جو کارگر رہا اور گل مینا نے بڑی جدوجہد
اپنے جذبات کو قابو میں کر کے آنسوؤں کو مزید اُمڈنے سے روک لیا۔ آنسو پُر کے تو وہ زبان سے کچھ کہنے
لائق ہوئی۔

''آپ مجھے یہ تو بتا کر نہیں گئے تھے کہ اس حال میں واپس آئیں گے۔'' رُندھی ہوئی آواز میں اس کے
ہونٹوں پر شکوہ مچلا جسے سن کر مشابرم خان کے ہونٹوں سے ایک گہرا سانس خارج ہوا اور اسے سمجھ میں آنے لگا
گل مینا کیوں رو رہی ہے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ اور ہراساں ہو گئی تھی۔

''دیکھو گل! یہ سب میری زندگی کا حصہ ہے۔ میں لوگوں کو اس حال تک پہنچاتا بھی ہوں اور خود بھی اس حال کو پہنچ جاتا ہوں۔ تم یوں سمجھ لو کہ میں جس کھیل میں ملوث ہوں، اس میں انسان کو اپنی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے اور جان کی بازی لگانا ہمارے لیے کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کے کتنے مرد ہیں، دیامیر (نانگا پربت) سر کرنے والوں کے جنون کا ساتھ دینے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس جنون میں میرے باپ، بھائیوں سمیت ہمارے کتنے پیارے اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ ماں نے مجھے ان خطروں سے بچانے کے لیے ہی یہاں سے دور بھیج دیا تھا لیکن میری رگوں میں جو خون ہے، وہ کیسے مجھے سکون سے بیٹھنے دیتا۔ میں بے جان پہاڑوں سے گریز کر کے نکلا تو ایسے انسانوں سے ٹکرانے پر مجبور ہو گیا جو سینے میں دل کی جگہ پتھر لے کر گھومتے ہیں اور انسان ہونے کے باوجود انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں۔ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں اور میری کوئی حیثیت بھی نہیں، اس کے باوجود میرا خود سے یہ عہد ہے کہ زندگی میں جب جب ان انسان دشمنوں سے سامنا ہوگا، میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے کے بجائے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میں کچھ غلط نہیں کر رہا ہوں بلکہ جب میں مروں گا تو میرے پاس یہ فخر ہوگا کہ میں نے اپنے وطن اور انسانیت کی بہبود کے لیے اپنی جان دی ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم مجھ جیسے سرپھرے کا ساتھ دینا چاہتی ہو یا نہیں۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میرے ساتھ رہنے کی صورت میں تمہیں بار بار ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اور آج کے بعد میں یہ قطعی پسند نہیں کروں گا کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھوں۔ عورت کے آنسو مرد کو کمزور کر دیتے ہیں اور میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔''

اس نے گفتگو کا آغاز تو بہت نرمی سے کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا لہجہ خود بخود ہی سخت ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ہر لفظ کے ساتھ گل مینا اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ مشابرم خان خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں کی سطح بالکل خشک ہو چکی تھی اور گلے میں پھنسا آنسوؤں کا پھندا بھی کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت صاف اور واضح تھا۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گی خان! اور یہ میرا وعدہ ہے کہ آج کے بعد تم کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھو گے۔ کیونکہ میری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ وقت تم پر ثابت کر دے گا کہ صرف پہاڑوں کے بیٹوں کے حوصلے ہی بلند نہیں ہوتے بلکہ بیٹیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔'' وہ اپنے عزم اور حوصلے سے بول رہی تھی کہ مشابرم خان بھی چند لمحوں کے لیے اس کا منہ تکتا رہ گیا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ وطن عزیز کے خلاف سازش کرنے والے یہود و ہنود اگر اس کم عمر لیکن بلند ہمت عورت کو دیکھ لیں تو جان لیں گے کہ بشیر اکبر جیسے پٹھوؤں کے سہارے وہ سازشوں کے کتنے بھی جال بچھائیں، کامیاب بہرحال نہیں ہو سکیں گے کہ بشیر اکبر جیسے تو برسوں کی عیش و عشرت کی زندگی کے نتیجے میں اتنے کمزور اور بودے ہو چکے ہوتے ہیں کہ چار ہاتھ کھا کر اگلا پچھلا سب اُگل ڈالتے ہیں اور یہاں ایک عورت کا عزم بھی ایسی مضبوط چٹان کے مانند تھا کہ اس سے ٹکرانے والے لہولہو ہو جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

''مجھے تم پر فخر ہے گل مینا! اللہ کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے تم جیسی باہمت عورت کا ساتھ دیا۔ اپنے اس وعدے کو زندگی بھر یاد رکھنا۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی کسی دوسری عورت کو تمہاری جگہ نہیں دوں گا۔''

اس نے گل مینا کے ہاتھ کو زور سے دبا کر کھینچا لیکن پھر خود ہی کراہ اُٹھا کہ زخم زخم وجود کسی بے احتیاطی



کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر گل مینا کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی اور چہرے پر وہ سارے رنگ سمٹے ہوئے تھے جو سورج نکلتے سمے دیامیر کی چوٹیوں پر بکھرتے ہیں۔

⊛----✪----⊛

''تم کب تک میرے سر پر مسلط رہو گے؟'' ریاض انور نے اپنے ساتھ چلتے نوجوان سے برہم لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ چلنے والا یہ نوجوان سی ایف پی کا اہلکار تھا جو منصوبے کے مطابق ریاض انور کے ساتھ اس لانچ میں اس طرح نازل ہوا تھا کہ ریاض انور کو سب پر یہ ظاہر کرنا پڑا تھا کہ اسے ویران سڑک پر بے ہوش حالت میں پا کر اس نوجوان نے اس کی مدد کی اور وہیں مرنے کے لیے پڑا چھوڑنے کے بجائے ہوش میں لا کر یہاں تک لایا۔ راستے میں نوجوان سے گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوا کہ وہ پڑھا لکھا لیکن بے روزگار ہے تو اس کا احسان چکانے کے لیے فوراً اپنے مشیر کی حیثیت سے اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ جسے ظاہر ہے نوجوان نے قبول کر لیا اور اب وہ مشیر ہر وقت اس کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔

ریاض کی معلومات کے مطابق اس کا نام سہیل تھا اور وہ دل میں اُس سے ازحد چڑنے کے باوجود سب پر یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ اپنے کیے گئے احسان کے بدلے وہ نوجوان اسے دل و جان سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ سہیل مستقل اس کے قریب دیکھا جا رہا تھا۔ کسی شدید ضرورت کے تحت چند منٹوں کے لیے وہ اسے تنہا چھوڑتا بھی تھا تو ایسے وقت میں بھی وہ مکمل آزاد نہیں ہوتا تھا بلکہ جانتا تھا کہ ایک ڈیوائس کے ذریعے اس کی حرکات و سکنات کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے حالات کے بارے میں آگاہ کر پاتا۔

ایسے بھی سی ایف پی والوں نے اس کے ہاتھ پیر مکمل طور پر باندھ دیئے تھے۔ ایک طرف اسے اپنی گل مینا کی طرف سے خطرات لاحق تھے تو دوسری طرف اپنے اس اعترافی بیان کے سامنے آنے کا خدشہ تھا جو اس نے سی ایف پی کی تحویل میں رہ کر دیا تھا۔

یہ سب خطرات نہ بھی ہوتے تو وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا؟ اس کے خیال کے مطابق خفیہ ملکی ادارے اس علاقوں میں آنے کے بعد اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی۔ فی الحال وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لیے مجبور تھا کہ اس سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر بے چون و چرا عمل کرتا جائے۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آدمیوں کو جیل سے فرار اور سلو کے قتل کے احکامات جاری کر دیئے تھے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کرنے سے اس کے سر پر سوار لوگوں کو کیا حاصل ہوگا؟ اس کے لوگوں کی ہدایت پر اس نے اپنی ساری سرگرمیاں موقوف کر دی تھیں اور صرف ایک بار میڈیا کو اپنے اغوا اور تاوان کی کہانی سنانے کے بعد شدید اعصابی دباؤ میں ہونے کا بہانہ کر کے زیادہ تر وقت اپنی خواب گاہ میں گزار رہا تھا۔

سہیل اُس کا چہیتا بنا یہاں بھی اُس کے آس پاس موجود رہتا تھا۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والے ملاقاتیوں اور فون کالز کے سلسلے میں بھی وہ ہی فیصلہ کرتا تھا کہ کس کو ریاض انور تک رسائی حاصل کرنے دی جائے اور کس کو نہیں۔

اس جکڑ بندی نے ریاض انور کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی اپنے قریب نہیں رہنے دے

رہا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خواب گاہ میں آنے پر چند منٹوں میں ہی واپس بھیج دیتا تھا۔ ا
کی بیوی بے چاری کو عادت تھی کئی کئی راتیں شوہر کے بغیر گزارنے کی۔ وہ ایسا مصروف رہتا تھا کہ اسے مشکل
سے ہی اپنی خواب گاہ کا رخ کرنے کی مہلت ملتی تھی لیکن اس بار عجب تماشا ہوا تھا کہ وہ خود تو مستقل خواب
میں مقیم تھا لیکن بیوی کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وسیع و عریض کوٹھی میں کمروں کی کوئی کمی
تھی۔ بیوی کسی بھی دوسرے پُرتعیش کمرے میں مزے سے سو سکتی تھی لیکن اندر ہی اندر تلملائی ہوئی تھی کہ ا
طرح خواب گاہ سے باہر کیے جانے پر اس نے ملازمین کے سامنے سبکی محسوس کی تھی۔

ریاض انور کو اُس کے احساسات کی فی الحال کوئی فکر نہیں تھی بلکہ وہ تو اس چکر میں تھا کہ کسی طرح سر
مسلط مصیبت سے جان چھڑائی جائے۔ طبیعت بہت اُلجھی تو اُس نے سہیل سے لان میں چہل قدمی
فرمائش کر دی جسے اس نے قطعی رد نہیں کیا اور اب وہ دونوں کچھ اس طرح لان میں ٹہل رہے تھے
دونوں کے درمیان بڑی خوشگوار گفت و شنید ہو رہی ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریاض انور اُس پر اپنی جھلا
نکال رہا تھا۔

''آپ تو بڑے کمزور اعصاب کے نکلے ریاض صاحب! میرا خیال تھا کہ ''را'' والوں نے آپ
انتخاب کیا ہے تو کچھ دیکھ بھال کر ہی کیا ہوگا۔ لیکن آپ تو ذرا سی مشکل پڑنے پر ہی ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔'' ا
نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ ریاض انور کو جواب دیا۔

''بار بار مجھے ''را'' کا طعنہ مت دیا کرو۔ تم ان کا ذکر کیے بغیر بھی بات کر سکتے ہو۔'' وہ بگڑا۔

''عجیب آدمی ہو۔ دوستوں کا ذکر سن کر چڑتے ہو یا پھر اس لیے ناراض ہو کہ تمہارے بہ خیر و عا
واپس آنے پر ان میں سے کسی نے اب تک تمہیں ایک فون تک نہیں کیا۔'' اس نے مزید اسے سلگایا۔

''وہ میرے باپ کے سگے نہیں ہیں جو خیر خیریت پوچھنے کے لیے مجھے فون کریں۔ انہیں کام ہوتا
رابطہ کرتے ہیں۔'' ریاض نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

''تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہاری ''را'' والوں کے کسی ٹھکانے سے واقفیت نہیں ہے
میں تمہارے ذریعے ان تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''یہ بات میں پہلے ہی تمہارے بھائی بندوں کو سمجھا چکا ہوں۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو وہ دیگر باتوں
طرح یہ بات بھی مجھ سے اُگلوا لیتے۔''

اس نے منہ بنا کر جواب دیا جس پر سہیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اچھی طرح ریاض ا
کی وہ حالت یاد تھی جب وہ سی ایف پی کے جوانوں کے ہاتھوں بھیگی بلی بنا سب کچھ فرفر بتا رہا تھا۔ مگ
خیر وہ اب بھی تھا کہ اپنے گھر میں ہوتے ہوئے اپنی مرضی کرنے سے قاصر تھا لیکن یہاں پھر بھی شاید
امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لے گا اس لیے پہلے کے مقابلے میں کم دباؤ میں
ہو رہا تھا۔

''میں اپنی بیوی اور بیٹی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' کچھ دیر خاموشی سے
رہنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''کر دینا۔ کل تک رُک جاؤ۔'' خلافِ توقع سہیل نے کوئی اعتراض کرنے کے بجائے فوراً آمادگی
کر دی۔ ریاض کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ اتنی آسانی سے راضی ہو گیا، ساتھ ہی اسے خوشی بھی
بیوی اور بیٹی کو یہاں سے محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کے بعد اس کے لیے تنہا یہاں سے بھاگ نکلنا



آسان ہوتا۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر اپنی فیملی سمیت بیرونِ
ملک منتقل ہو جاتا۔ روپے پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو دنیا کے کسی بھی
حصے میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔

یہ بات تو اسے ویسے بھی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ پاکستان میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی
اور وہ یہاں رہ کر مزید لوٹ مار نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ آٹھ دس سال کے لیے منظر سے ہٹ جاتا
کسی مضبوط کہانی کے ساتھ واپس آتا تو اپنے خلاف موجود ثبوتوں کو رد کر کے دوبارہ سیاست کے میدان
میں اپنے قدم جما سکتا تھا۔

''میرے خیال میں پاکستان کو چھوڑ کر کہیں اور رہنے کے لیے کون سا ملک سب سے بہتر ہے؟''
سہیل نے اچانک یہ سوال کر کے اسے حواس باختہ کر دیا اور اسے یوں لگا کہ وہ اس کی حرکات و سکنات کے
ساتھ سوچوں پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔

''تم مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دنیا کے اتنے ملک دیکھ چکے ہو۔ اس لیے میں نے پوچھ لیا۔'' اس کی
بوکھلاہٹ سے بے نیاز سہیل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کا انداز واقعی ایسا تھا جیسے بنا کسی سبب
محض تذکرہ یہ سوال کر بیٹھا ہو۔

ریاض انور کچھ دیر تو اسے مشکوک نظروں سے گھورتا رہا، پھر سر جھٹک کر بولا۔

''اگر آدمی کے پاس دولت ہو تو پاکستان سمیت تمام پسماندہ ممالک کو چھوڑ کر دنیا میں کہیں بھی مزے
سے رہا جا سکتا ہے۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا تنفر تھا جسے سہیل نے شدت سے
محسوس کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں تو تم جیسے لوگ صرف دولت لوٹنے کے لیے رہتے ہیں۔'' اس نے بھی
ریاض انور کے لیے اپنے دل میں موجود نفرت کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر کلائی پلٹ کر رسٹ واچ پر ٹائم
دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اب تک کھیل شروع ہو چکا ہوگا۔ آؤ تمہارے بیڈ روم میں چل کر ٹی وی پر
دیکھتے ہیں کہ کیا خبریں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریاض انور کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے لان سے واپسی
کے لیے پلٹ گئے۔

''اپنے پی اے کو بتا دو کہ آدھ گھنٹے بعد میں اپنے گھر والوں سے ملنے جاؤں گا۔ میرے لیے ایک گاڑی
ارینج کی جائے۔'' اُس نے دُور کھڑے پی اے کو دیکھ کر آہستہ سے ریاض سے کہا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا،
اسے بے چارہ کچھ لاوارث سا نظر آنے لگا تھا۔ اسے پہلے کی طرح ریاض انور کے قریب رہنے کا موقع ہی
نہیں مل رہا تھا۔ وہ اسے بس چند لمحوں کے لیے بلاتا تھا اور ضروری احکامات دے کر فارغ کر دیتا تھا۔ چنانچہ
اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ریاض انور جہاں ہو، آس پاس ہی منڈلاتا رہے جیسا کہ اس وقت وہ لان کے
گیٹ میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کہہ رہا ہو..... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔

سہیل نے آدھ گھنٹے بعد یہاں سے اپنی روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو جہاں ریاض انور کو جھٹکا لگا اور اس نے
وجود میں خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی، وہیں پی اے بھی صاحب کی زبانی یہ سن کر کھِل اُٹھا کہ سہیل
گھر جا رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنے مالک کو یہ احساس دلا سکتا تھا کہ وہ ایک اجنبی نوجوان کو

جو بے شک اس کا محسن ہے، ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر اچھا نہیں کر رہا ہے۔ ایسا پچھلے وقتوں میں تھا کہ بادشاہ احسان کے بدلے میں محسن کو سر پر بٹھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بادشاہ نے نظام سقہ شخص کو ایک دن کی حکمرانی دینے جیسی حماقت بھی کر ڈالی تھی۔ لیکن آج کے دور میں اس قسم کی احسان شناسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں دشمن تو دشمن، دوست سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ریاض انور اور سہیل حکم جاری کرنے کے بعد اندر کی طرف بڑھ گئے اور پی اے آدھ گھنٹے بعد جانے والے لیکچر کے لیے نکات تلاش کرتا رہا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر سہیل نے خود ٹی وی کھول دیا۔ توقع مطابق نیوز چینلز سے سینٹرل جیل میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کی خبریں نشر کی جا رہی تھیں اور صاف بتایا تھا کہ چند قیدیوں کے جھگڑے سے شروع ہونے والا یہ ہنگامہ اصل میں جیل سے فرار کی ایک سوچی سازش ہے۔

ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آیا کوئی قیدی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔ انتظامیہ نے فی الحال اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صحافیوں نے البتہ کے باہر مورچے جما لیے تھے اور وقفے وقفے سے جاری فائرنگ کی خبریں دینے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور چہار دیواری کے مختلف اطراف کے مناظر بھی دکھا رہے تھے۔ ان مناظر میں ایک منظر جیل کے مرکزی دروازے سے برآمد ہونے والی تاریک شیشوں والی گاڑی کے تیزی سے وہاں سے نکل جانے کا بھی تھا دیکھ کر صحافیوں نے گھیرنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ اس گاڑی کو دیکھ کر سہیل نے اطمینان کا سا لیا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اس کے ساتھی سلو کو وہاں سے لے کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

''دو کپ چائے تو منگوا لیں ریاض صاحب!'' اس نے سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹی وی اسکرین طرف دیکھتے ریاض انور سے فرمائش کی۔

''تمہارے لیے منگوا دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت چائے سے زیادہ ڈرنک کی طلب ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ چائے منگوائیں، تب تک میں آپ کے لیے ڈرنک دیتا ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شیلف کی طرف بڑھ گیا جہاں انواع و اقسام کی شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ نے ریاض انور سے اس کی پسند دریافت کر کے ایک بوتل نکالی اور جام، سوڈے اور برف سمیت جملہ لوازمات کے ساتھ میز پر لا کر رکھ دی۔ ریاض انور اس دوران انٹرکام پر چائے کا آرڈر دے رہا تھا اس لیے یہ نہیں سکا کہ سہیل نے برف کے کیوبز پر سفید رنگ کا ایک سفوف سا چھڑک دیا ہے جو کہ برف کے ساتھ اس گھل مل گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔

وہ انٹرکام پر آرڈر دے کر فارغ ہوا تو سیدھا شراب نوشی کے لوازمات سے سجی میز کی طرف آیا سہیل کو اشارے سے جام تیار کرنے سے روک کر خود ہی ایک جام میں تھوڑی سی انڈیل کر میٹ پیلے سہیل ہونٹ بھینچے اسے دیکھنے لگا۔ عادی شرابی کو نیٹ پینے سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا، ماسوائے اس کہ آنکھوں کے گوشوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔

اُسے اُلجھن سی ہونے لگی۔ اُس یہاں سے روانہ ہونے سے قبل ریاض کا قصہ تمام کرنے کا حکم اس نے کوشش کی تھی کہ خاموشی سے یہ کام ہو جائے۔ لیکن اب لگتا تھا کہ تھوڑا طاقت کا استعمال کرنا پڑ اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچتا ہوا وہ ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے ملازم کے چائے لانے کا انتظا



اس کے چائے لانے کے بعد ہی وہ کچھ کر سکتا تھا۔

ملازم چائے لے آیا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ریاض انور نے پہلا جام نیٹ پینے کے بعد دوسرا اہتمام سے تیار کیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ ریاض کو شراب نوشی کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا شراب نے اس کے اعصاب کو سہارا دینا شروع کر دیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ اب اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ جو سفوف اس نے ریاض انور کے معدے میں پہنچانے کا اہتمام کیا تھا، اس کی یہ خاصیت تھی کہ وہ آدھ گھنٹے بعد اپنا اثر شروع کر کے استعمال کرنے والے کی حرکتِ قلب کو بند کر دیتا تھا اور پوسٹ مارٹم میں اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ اپنی پیالی خالی کرنے کے بعد اس نے ملازم کو انٹرکام پر برتن لے جانے کا حکم دیا۔

''آپ اتنی ٹینشن مت لیں سر! ٹینشن میں آپ حد سے زیادہ ڈرنک کریں گے تو یہ آپ کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔'' ملازم میز پر سے چائے کے برتن سمیٹ رہا تھا تو اس نے جان بوجھ کر ریاض انور یہ جملہ کہا تاکہ ملازم گواہ رہے کہ ریاض انور کسی وجہ سے پریشانی کا شکار تھا۔

''تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔ میری مرضی، میں جتنی چاہے پیوں۔'' لازم تھا کہ ریاض انور کو اُس کی مداخلت بری لگی اس لیے اس نے بگڑ کر جواب دیا۔

''میں تو آپ کی صحت کے خیال سے کہہ رہا تھا سر!'' اس نے ملازم کے سامنے جھینپ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے منمناتی آواز میں کہا۔ چند جملوں کی گفتگو کا گواہ ملازم اپنی تربیت کے مطابق بظاہر انجان بنا برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے ریاض صاحب! میں چلتا ہوں۔ آپ دل بھر کر پیتے رہیے۔ کیا پتہ پھر کبھی ملے یا نہیں۔'' اس نے وہی سلگتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ریاض سے کہا اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کی پروا کیے بغیر باہر نکل گیا۔

حسبِ ہدایت گاڑی تیار تھی۔ کوٹھی سے روانہ ہو کر وہ لوگ مین روڈ پر پہنچے تو اس نے ڈرائیور کو ایک ایسے علاقے کا پتہ بتایا جہاں گنجان آبادی تھی اور پتلی پتلی گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پتلی سی گلی کے سامنے گاڑی رُکوائی۔ یہ گلی اتنی تنگ تھی کہ اس میں گاڑی کا جانا ممکن نہیں تھا۔

''بس یار! یہیں روک دو۔ اندر مجھے پیدل ہی جانا ہو گا۔ تم ایسا کرو کہ اب واپس چلے جاؤ۔ مجھے جب واپس آنا ہو گا تو خود آ جاؤں گا یا فون کر کے تمہیں کہہ دوں گا۔'' اس نے ڈرائیور سے دوستانہ انداز میں کہا اور گاڑی سے نکل کر گلی میں داخل ہو گیا۔

ذرا ہی دیر میں وہ پُر پیچ گلیوں سے گزرتا ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جہاں راستہ ذرا کشادہ تھا اور رکشہ وغیرہ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ گیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ریاض انور کی موت کے بعد اس کے بارے میں بہت سے سوال اُٹھائے جائیں گے اور اس کی موت کو طبعی نظر آنے کے باوجود پُراسرار قرار دیا جائے گا۔ کچھ لوگ شاید ممکنہ قاتل کی حیثیت سے اس کی تلاش کا کام بھی شروع کر دیتے لیکن اسے ان سب باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ وہ اس کام کو کامیابی سے انجام دے کر آ رہا ہے جو اسے سونپا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ریاض انور جیسے ناسور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی تھی۔

⊛----●----⊛

اُس نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک سادہ سی نشست گاہ تھی جہاں وہ بالکل آزاد کے ساتھ مہمان کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے لیے یہ تبدیلی خاصی حیرت انگیز تھی۔

کراچی کی جیل سے فرار کی ناکام کوشش کے بعد وہ جن لوگوں کی حراست میں چلا آیا تھا، انہوں اگرچہ اس سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اور کھانے پینے سمیت آرام وغیرہ کا بھی پورا خیال رکھتے رہے تھے اس کے باوجود اسے اس بات کا بھرپور احساس رہا تھا کہ وہ ان کی قید میں ہے۔ اسے کراچی سے لاہور لا ہوئے بے شک اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئی تھیں لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کے اردگرد لوگ اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا ہیں اور جیسے ہی وہ ان کی مرضی سے ہٹ کر حرکت کرنے کی کو کرے گا، وہ حرکت میں آجائیں گے۔ ویسے وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا بھی نہیں تھا اور بلی کے تھیلے سے باہر آ تک خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اتنا اندازہ البتہ اس نے لگا لیا تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، ان کا تعلق پاکستان کے کسی نہ کسی خفیہ ادارے سے ہے۔ جب ہی تو وہ آسانی سے اسے جیل حکام کی رضامندی کے ساتھ وہاں سے نکال کر لے آئے تھے۔ اب وہ منتظر تھا کہ اُن اس مہربانی کا مقصد سامنے آجائے۔

اُسے کراچی سے سڑک کے راستے لاہور لایا گیا تھا اور یہ سفر ایک ایسے بند ٹرک میں طے ہوا تھا جس کے اندر کھانے پینے، آرام کرنے سے لے کر ہر طرح کی سہولت میسر تھی اور انہیں راستے میں کسی ہوٹل وغیرہ میں نہیں رُکنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ ٹرک کے بند کیبن میں باتھ روم کی سہولت بھی موجود تھی۔

اس سفر کے اختتام پر اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اب لاہور میں ہے۔ پھر اسے چند گھنٹے آرام کا موقع دے کے بعد اس جگہ پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ ایک نشست گاہ میں بیٹھا ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے پہلے سے طے شدہ کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے آیا ہے۔

''السلام علیکم دوست!..... اُمید ہے تمہیں میرے انتظار میں زیادہ دیر بور نہیں ہونا پڑا ہوگا۔'' نشست گاہ میں بیٹھے اُسے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اس سے بڑے دوستانہ لہجے میں بولتا ہوا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے آنے والے کا جائزہ لیا۔ وہ دراز قامت کا خوش شکل اور جوان آدمی تھا جس کے نقوش میں نرمی کا تاثر پایا جاتا تھا۔

''ایک قیدی کے لیے یہ بات قطعی غیر اہم ہوتی ہے کہ وہ بور ہو رہا ہے یا نہیں۔'' مختصر سے جائزے کے بعد اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''قیدی..... کس نے کہا کہ تم یہاں قیدی ہو؟'' نو وارد نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''یعنی میں یہاں سے باہر نکل کر کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں؟'' اس نے جانچتی ہوئی نظریں اپنے مقابل کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''شیور! تمہیں یہاں ایک معاملے پر بات چیت کے لیے بلایا گیا ہے۔ اگر تم نہ چاہو تو گفتگو کیے بغیر بھی یہاں سے جا سکتے ہو۔ اس کمرے سے لے کر باہر مین گیٹ تک کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔'' اس نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا جس پر وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اور وہ واقعی یہاں سے نکل کر باہر جانے کے لیے آزاد ہوگا۔ لیکن اس پر یہ واضح نہیں تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا؟ وہ بالکل خالی جیب تھا اور لاہور میں اُس کا ایسا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا جس



گھر وہ پناہ لے سکے۔ ہاں، اپنی تربیت کے بل بوتے پر اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کسی کی جیب کاٹ کر یا اور طاقت رقم حاصل کر لے اور آگے کے لیے بھی اپنی راہیں بناتا چلا جائے۔ لیکن فی الوقت اس کے لیے ایسا کرنا بھی دشوار تھا کہ وہ جن کے اشارے پر سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالنے کے لیے پاکستان آیا تھا، انہوں نے اس سے اپنا رابطہ ہی توڑ دیا تھا۔ دوسرے اُسے یہ تجسس بھی ہو چلا تھا کہ اتنی جدوجہد سے خود کو یہاں لانے والوں کا مقصد جان سکے۔ چنانچہ راستہ کھلا ملنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔

''مجھے کس معاملے پر بات کرنے کے لیے بلایا گیا ہے؟'' خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''میں تم سے جو بات کرنا چاہتا ہوں، اس سے پہلے یہ ویڈیو دیکھ لو تاکہ تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔'' اس نے ریموٹ کی مدد سے ایک طرف رکھا ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی اسکرین پر ریاض انور کا چہرہ نظر آنے لگا۔ چہرے کے پس منظر میں کمرے کا جو ماحول تھا، اسے دیکھ کر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی انٹروگیشن سیل ہے اور ریاض انور کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔

ابھی وہ مشاہدے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ ریاض انور کا اعترافی بیان شروع ہو گیا۔ یہ بیان حقیقتاً ان سوالوں کے جوابات پر مشتمل تھا جو کوئی ناپسندیدہ شخص اس سے کر رہا تھا اور وہ صرف اس کی آواز ہی سن رہا تھا۔

اس بیان میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ اُس کے ''را'' سے روابط ہیں اور وہ خطیر رقوم کے عوض ''را'' کی خواہش پر پاکستان کے مفادات کے خلاف کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے شہر میں ہونے والے حالیہ فسادات میں اپنے کردار کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ دہشت گردی کی اس کارروائی میں مہارت سے تربیت حاصل کر کے آئے ہوئے ایک نوجوان سلّو نے منصوبہ بازی میں اس کی خاطر خواہ مدد کی تھی۔ سوالات پوچھنے والے نے تاریخ اور وقت کا حوالہ دے کر تصدیق چاہی تو ریاض انور نے اس کا بھی اعتراف کر لیا۔

دم بخود سے بیٹھے سلّو پر اس اعتراف سے انکشاف ہوا کہ وہ پاکستان آمد کے فوراً بعد سے ہی نگرانی میں رہا ہے۔ بہرحال، وہ خاموشی سے ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ رہا۔ ویڈیو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض انور سے مختلف اوقات میں حاصل کی گئی معلومات کو ایک ساتھ یکجا کر لیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ ''را'' کی خواہش پر ہی اس نے سلّو کو وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں ملازمت دلوائی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ سلّو کے ہاتھوں وزیراعلیٰ کے مخالف سیاست دان کو قتل کروانے کے بعد اسے بھی موقع پر ہی ہلاک کر دیا جائے گا۔ البتہ سلّو کو یہ جھانسہ دیا گیا تھا کہ جب وہ اپنا کام مکمل کر لے گا تو اُسے محفوظ راستے سے فرار کروا دیا جائے گا۔ ''را'' کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تو سلّو سے جان چھڑانے کے لیے متبادل منصوبہ اس طرح تیار کیا گیا کہ ریاض انور اپنے جن غنڈوں کو جیل سے فرار کروانے کی کوشش کر رہا تھا، انہی کے ذمے سلّو کا قتل بھی لگا دیا گیا۔ لیکن یہ کام اس طرح ہونا تھا کہ سمجھا جاتا، سلّو فرار کی کوشش میں کسی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔

سلّو نے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ یہ سب سنا اور اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ویڈیو لگانے والے نے ''آف'' کا بٹن دبا کر اسکرین کو تاریک کر دیا اور اسے متوجہ کرنے کے لیے آہستہ سے کھنکھارا۔

''ریاض انور کی زبانی اس منصوبے کا علم ہونے پر ہم نے جیل حکام کو اعتماد میں لے کر خود ایک متبادل منصوبہ تیار کیا اور اپنے کچھ آدمی قیدیوں کی روپ میں تمہارے آس پاس پھیلا دیئے۔ ان آدمیوں کی وجہ سے ایک طرف ہم تمہاری جان بچانے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف جیل انتظامیہ نے بھی خطرناک مجرموں کے فرار کی سازش کو ناکام بنا دیا۔'' وہ متوجہ ہوا تو مقابل نے اسے آگاہ کیا۔

''بڑی مہربانی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم کون ہو؟ اور مجھ پر تمہاری مہربانی کا کیا مقصد ہے؟'' وہ شاک کی کیفیت سے نکلا تو اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مخصوص بے باک انداز میں سوال کیا۔

''میں تمہاری یہ اُلجھن دُور کر سکتا ہوں۔ میرا نام عادل خان ہے اور میں پاکستان کے ایک خفیہ ادارے کے لیے خدمات انجام دیتا ہوں۔ اپنے ادارے کی کوششوں کے ذریعے ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہوا تھا اور ہم نے پاکستان میں قدم رکھتے ہی تمہیں اپنی خفیہ نگرانی میں لے لیا تھا۔ میرے پاس تمہارے پاکستان میں گزرے ایک ایک دن کی تفصیل موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان آنے کے بعد تم کب ریاض انور سے ملے۔ کس طرح تم نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے بم بلاسٹ کی کوشش کی۔ کیسے وزیراعلیٰ کی سکیورٹی فورس میں شامل ہوئے اور کس طرح جیل سے فرار کی اسکیم کا حصہ بنائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی مجھے تمہارے بارے میں چھوٹی بڑی بہت سی تفصیلات کا علم ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ تمہارے پاکستان آنے سے قبل ہی تمہارا کیس مجھے سونپ دیا گیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ''را'' کے سورماؤں نے ایک معصوم پاکستانی بچے کی برین واشنگ کر کے اسے دہشت گرد میں تبدیل کر دیا ہے اور ہمارے شہری کو ہمارے ہی خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اس کیس کے انچارج کی حیثیت سے مجھے تمہارے سلسلے میں مکمل اختیار حاصل تھا۔ میں چاہتا تو تمہیں پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی شوٹ کر دیتا، ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بم رکھنے کے الزام میں گرفتار کر دیتا یا وزیراعلیٰ کے ہاں تقریب میں دہشت گردی کے الزام میں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیتا۔ کچھ نہیں ریاض انور کے منصوبے کے مطابق جیل سے فرار کے موقع پر تمہارا قتل ہو جانے دیتا۔ لیکن میں نے ہر جگہ ہر موقع پر نہ صرف تمہیں ڈھیل دی بلکہ پوری پوری کوشش کی کہ تمہاری زندگی کی حفاظت ہو سکے۔''

''لیکن کیوں.....؟'' اس نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے تسلسل سے بولتے عادل خان سے پوچھا

''میرے پاس اس کی بہت سیدھی اور صاف وجہ تھی۔ ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے میں قدرتی طور پر تمہارے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہوں۔ میرے لیے پل بھر میں تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دینا مشکل نہیں تھا لیکن میں ان والدین کی آنکھوں میں جلتے خوشی کے دیپ نہیں بجھانا چاہتا جو برسوں سے اپنے بیٹے کی جدائی کا غم سہتے وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چکے تھے اور اب اس بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر پھر سے جی اُٹھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میرے نزدیک اصل مجرم تم نہیں بلکہ وہ ہیں جنہوں نے ایک معصوم بچے کے کورے کاغذ جیسے ذہن پر نفرت کی تحریر نقش کی۔ تم تو خود مظلوم تھے کہ تم سے تمہارا اصل چھین کر تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیئے گئے تھے۔ میری خواہش تھی بلکہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ پر لکھی نفرت کی اس تحریر کو مٹا کر تمہیں تمہارا اصل لوٹا سکوں تاکہ آنے والے کل میں تمہیں دہشت گرد سلو کے بجائے محبِ وطن سلیم کے نام سے یاد رکھا جائے۔'' عادل خان جو دراصل شہریار تھا، بولتے بولتے تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔

''اور اگر آپ مجھے وہ نہ بنا سکے جو چاہتے ہیں، پھر؟'' سلو نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ



لے کر پوچھا۔

''پھر مجبوری ہو گی۔ ناسور بن جانے پر بعض اوقات انسان اپنے جسم کا ہی کوئی عضو کاٹ ڈالنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسے اس عضو سے بہت محبت بھی ہوتی ہے اور اس کی ضرورت بھی۔ لیکن باقی جسم کو بچانے کے لیے اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے باقی ساری زندگی ادھورے پن کا دُکھ دل میں کسک لگاتا رہے۔''

اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو سلو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اُس نے ایک بار پھر لب کھولے اور اعتراف کیا۔

''آپ نے اس ویڈیو میں جو کچھ دکھایا اور سنوایا، وہ میرے لیے زیادہ انوکھا نہیں ہے۔ مجھے وزیراعلیٰ ہاؤس میں پکڑے جانے پر ہی شک ہو گیا تھا کہ اگر ادھر میرا کوئی ہمدرد ہوتا تو میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ بعد میں جیل میں جو کچھ ہوا، اس پر بھی میں نے یہاں لائے جانے تک بہت سوچا اور یہی سمجھ میں آیا کہ ''را'' والوں نے مجھے چونا لگا دیا ہے۔ میرے دل میں ان کے لیے بڑا غصہ بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایک دم سے محبِ وطن پاکستانی بن جاؤں گا اور باقی کی زندگی پاکستان کی خدمت کرتے ہوئے گزاروں گا۔ سوری صاحب! چاہے آپ کو بُرا لگے، لیکن سچ یہ ہے کہ میرے دل میں بڑے شکوے ہیں۔ اگر وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ ہم غریب عوام کے لیے کچھ کرنے والے ہوتے تو مجھے اپنی زندگی کے اتنے سارے سال وہاں بھارت میں نہیں گزارنا پڑتے۔ اور پھر نہ وہ لوگ مجھے دہشت گردی کی ٹریننگ دیتے، نہ ادھر میرے ماں باپ رو رو کر خوار ہوتے۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں صاحب! کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق کبھی اچھا پاکستانی نہیں بن سکتا۔ اب یہ آگے آپ کی مرضی ہے کہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، کیا کریں۔ گولی مارنے کا ارادہ ہے تو ماریں۔ ایسی چیزوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور میں وہی بولتا ہوں جو سچ ہے۔''

اس نے اپنے مخصوص انداز میں شہریار سے بھی بڑھ کر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اُس کے اس انداز پر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی سلیم! میں انسانی نفسیات کو سمجھتا ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے مزاج میں اتنی آسانی سے ایک دم تبدیلی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس وقت تم مجھ سے سچ کہنے کے بجائے یہ کہتے کہ تمہارے دل میں اچانک اپنے وطن کی محبت جاگ گئی ہے اور تم وطن کی خاطر تبدیل ہونے کو تیار ہو تو میں کبھی یقین نہیں کرتا بلکہ یہی سوچتا کہ تم اپنی جان بچانے کی خاطر مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ نے میرے دل میں تمہاری قدر و قیمت کو مزید بڑھا دیا ہے۔''

''شکریہ! اب آگے بولیں میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بغیر مطلب آیا۔

''کیسی ڈیل؟'' سلو نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''مجھے بھارت میں ایک مشن پر جانا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس مشن میں تم میرے معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ چلو۔ مجھے اپنے مشن کے لیے بہادر اور جرأت مند شخص کے ساتھ کی ضرورت ہے جو کہ تم ہو۔ لیکن یہ تمہیں ساتھ لے جانے کی واحد وجہ نہیں ہے۔ بہادروں کی میرے اپنے ساتھیوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں تمہیں ان پر فوقیت صرف دو وجوہات کی بنا پر دے رہا ہوں۔ اوّل یہ کہ میں بھارتیوں کا تیار کیا ہوا مہرہ انہی پر استعمال کر کے انہیں سبق سکھانا چاہتا ہوں، دوسرے یہ کہ تم کئی برس بھارت میں رہنے کی وجہ

سے وہاں سے کافی حد تک واقف ہو اس لیے زیادہ بہتر معاون ثابت ہو گے۔'' وہاں گویا صاف گوئی کا مقا
ہو رہا تھا جس میں وہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گیا آپ کا فائدہ۔ پر مجھے کیا فائدہ ہو گا کہ میں آپ کا ساتھ دوں اور اپنی
مشکل میں ڈالوں؟'' ٹانگ پر ٹانگ جمائے ہوئے سلّو نے اس سے پوچھا۔

''جان تو تم اپنی مشکل میں ڈال ہی چکے ہو۔ یہاں سے باہر نکل کر دیکھو پھر تمہیں پتہ چل جائے گا
کتنے محفوظ ہو۔ تم ایک ایسے شخص ہو جو ریکارڈ کے مطابق جیل سے مفرور ہے اور جس کی قانون نافذ کر
والے اداروں کو شدت سے تلاش ہے۔ اگر تم ملکی پولیس اور ایجنسیوں سے بچ نکلے تو تمہارے نام نہاد
تمہیں نہیں بخشیں گے۔ وہ تو پہلے ہی تمہارے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں اور تمہارے منظر پر آتے
تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا دینے میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ تم ان کے لیے ایسا خطرہ ہو جو کبھی بھی
کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا ساتھ دینے میں تمہارا سب سے
فائدہ تو یہ ہے کہ تمہیں ایک پناہ گاہ میسر آ جائے گی جہاں تم قانون نافذ کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ''را''
گرگوں سے بھی محفوظ رہو گے۔ یہاں رہ کر تمہیں اپنے حلیے میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرنے کا موقع
جس کے بعد تمہارے لیے آزادانہ نقل و حمل آسان ہو جائے گی۔ ہم تمہاری مالی معاونت بھی کریں گے
اگر تم میرے ساتھ میرے مشن میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے تو تمہیں تمہارے کام کا باقاعدہ معاو
جائے گا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے، تمہارے لیے موجودہ حالات میں یہ پیشکش بہت مناسب ہے۔
تم جن عزائم کے ساتھ اور جن لوگوں کی پشت پناہی میں یہاں آئے تھے، وہ تو اب تمہارے لیے اپنی
کھو بیٹھے ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم پر یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ بھارتیوں نے تمہیں
اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ تو وہ تمہارے ہمدرد ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات
کوئی مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔'' وہ جو کچھ بولتا رہا، سلّو سر جھکائے اسے سنتا رہا کہ اس
کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''تمہارے لیے میرے پاس ایک اہم اطلاع یہ بھی ہے کہ تمہارے والدین کو ان کی جھگی سے
ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ وہ کسی اندھے انتقام کی بھینٹ نہ چڑھ سکیں اور نہ ہی کوئی
پہنچنے کے لیے انہیں استعمال کر سکے۔ تم جب چاہو گے، ان سے تمہاری ملاقات کا انتظام کر دیا جائے گا
کے علاوہ تم جب تک میرے ساتھ رہو گے، یہاں ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور کفالت ہوتی رہے گی
''تھینک یو سر! یہ آپ نے مجھ پر سچ مچ بڑا احسان کیا۔'' سلّو جواب تک کسی بات سے متاثر نظر
تھا، اس کی زبانی اپنے والدین کی بابت سن کر چونک گیا اور اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں تھینک یو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں پاکستانی شہری ہیں اور ان کا تحفظ
ذمے داری سمجھتے ہیں۔''

''کاش کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہونے والے غریب مچھیروں کو بھی آپ لوگ اپنی ذمے داری
میرے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا۔ اب میں چاہوں بھی تو نارمل لائف نہیں گزار سکتا۔'' اس کے لہجے
دکھ دونوں ہی تھے۔

''تم سمجھو گے نہیں لیکن یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کھلے سمندروں سے گرفتار ہونے والے ما
کے سلسلے میں ہم بالکل بے بس ہیں۔ ان ماہی گیروں کو ہمیشہ اس الزام کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے



سمندری حدود کی خلاف ورزی کی تھی۔ حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور وہ لوگ جان بوجھ کر بھی بے گناہ
ماہی گیروں کو کھلے سمندر سے گھیر کر لے جاتے ہیں۔ اب یہ ماہی گیروں کی قسمت پر منحصر ہوتا ہے کہ اردگرد
ہماری کوئی گشتی بوٹ وغیرہ موجود ہو تو اُنہیں مدد مل جاتی ہے ورنہ وہ بے چارے پھنس جاتے ہیں اور ہمارے
پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ اُنہیں بے گناہ ثابت کر سکیں۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی
ہوا۔ تمہارے کیس میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے تمہاری کم عمری کو دیکھتے ہوئے تمہیں اپنے مذموم
مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ تمہاری اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ تمہاری یہاں آمد سے قبل
ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہو گیا اور وہ لوگ تم پر بہت سا وقت اور پیسہ خرچ کرنے کے باوجود تم سے اپنا
کوئی ایک بھی کام نہیں نکلوا سکے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہے اور اگر
اس کی یہی مرضی ہے تو میں کون ہوتا ہوں منع کرنے والا۔ ٹھیک ہے، میں چلوں گا آپ کے ساتھ انڈیا اور اُن
لوگوں کو بتاؤں گا کہ سلّو کی زندگی چھیننا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ جوش میں آ گیا۔ پھر خیال آنے پر
پوچھنے لگا۔ ''آپ کس مشن پر اُدھر جا رہے ہیں؟..... تاج محل کو اُڑانا ہے یا ممبئی کی دو چار مارکیٹوں میں بم
دھماکے کرنا ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں یا میرے ساتھی کوئی دہشت گرد نہیں ہیں جو بلاوجہ کسی کی املاک کو نقصان
پہنچائیں یا بے گناہ انسانوں کا خون بہانے کا سوچیں۔ فی الحال میں تمہیں اپنے مشن کی تفصیلات سے آگاہ
نہیں کر سکتا۔ لیکن تم اتنا سمجھ لو کہ بھارتیوں نے ہماری ایک بہت ہی قیمتی شے پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے اس شے
کو واپس اپنے وطن لانا ہے۔'' اس نے بہت سبھاؤ سے سلّو کے سوال کا جواب دیا جس پر وہ دھیرے سے
سر ہلا دیا۔

''مجھ پر اعتماد نہیں ہے نا۔ اس لیے اصل بات گول کر دی آپ نے۔''

''اعتماد انسان اپنے رویے سے وقت کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔ ابھی تو تمہاری حیثیت ایک ایسے شخص
کی ہے جو اپنے مفادات کی خاطر اُجرت پر میرا ساتھ دے گا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تم پر مکمل
اعتماد کر سکوں۔ ویسے بھی ہماری فیلڈ میں بلا ضرورت معلومات کو منتقل نہیں کیا جاتا، چاہے وہ شخص کتنا ہی
وفادار اور مخلص کیوں نہ ہو۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔ آج سے میں آپ کا ملازم ہوں اور جو حکم آپ دیں گے، اس پر عمل
کروں گا۔'' سلّو نے بھی بحث نہیں کی اور فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

''ویری گڈ۔ تمہارا یہی رویہ رہا تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔
فی الحال تم آرام کرو اور ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرو جو تمہارا حلیہ وغیرہ تبدیل کرنے میں تمہاری مدد کریں
گے۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سلّو بھی خودکار انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مدِمقابل میں کوئی ایسی
بات تھی کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''میرے خیال میں تمہیں یہ بتانے کی تو قطعی ضرورت نہیں ہے کہ اس عمارت سے باہر تمہارے لیے
خطرہ ہے اس لیے بلا اجازت یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔'' اُس نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے
ہوئے بہت نرم لہجے میں سلّو سے یہ الفاظ کہے۔

لہجے کا نرم پن کے باوجود سلّو تک یہ پیغام پہنچ گیا کہ عملاً وہ ایک قیدی ہے جسے یہاں سے باہر جانے کی

آزادی نہیں ہے۔ ناگواری کے احساس سے اس کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔

''آپ تو مجھے میرے ماں باپ سے ملوانے والے تھے؟'' اس نے ذرا تلخی سے دریافت کیا۔

''مجھے اپنی ہر بات یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو، ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔'' اس نے جواب دیا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سلو جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اُسے روک سکتا یا کوئی اور سوال کر پاتا۔

⊛----✪----⊛

''بڑے دُکھ کی بات ہے لنڈا ڈارلنگ! میں نے تم سے اتنا چھوٹا سا کام کہا اور تم نے ابھی تک نہیں کیا۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے دُبئی سے اچانک واپس پاکستان پہنچنا پڑا ورنہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے خود ہی اپنا کام حل کر لیتا۔'' چودھری کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ناراض نہ ہوں چودھری صاحب! میری بھی خواہش تھی کہ آپ کے کام آتی۔ لیکن مجبوری نے میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔'' لنڈا نے اپنی لوچ دار آواز میں معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری کا رونا رویا۔

''تمہاری کیا مجبوری ہو سکتی ہے؟ تم نیویارک میں بیٹھی ہو اور تمہاری کتنی پہنچ ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ کشور اور آفتاب تو کیا، اگر میں تم سے امریکہ کے صدر کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی خواہش کرتا تو تم معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم ایسا کرنا چاہو۔''

وہ سچ مچ خفا تھا۔ نیویارک والے اپارٹمنٹ میں کشور اور آفتاب کی ہلاکت کا منصوبہ ناکام ہونے سے شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اس کے امریکہ میں داخلے کا راستہ بھی ایک طرح سے بند ہو گیا تھا۔ نیویارک پولیس کی مستعدی کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اگر اس نے مستقبل قریب میں نیویارک کا رُخ کیا تو دھر لیا جائے گا۔ الفا نے بھی فی الحال اُس کے اُدھر کا رخ کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ مقامی معاملات سنبھالنے پر زور دیا تھا اس لیے وہ بالکل بندھ کر رہ گیا تھا۔ البتہ لنڈا کے توسط سے اسے ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ آفتاب اور کشور اب نیویارک کے اس اپارٹمنٹ میں نہیں رہتے جہاں انہیں ہلاک کروانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُس کے دل میں بھڑکتی آتش انتقام اس اطلاع پر مزید بھڑک اٹھی تھی اور اس نے لنڈا سے درخواست کی تھی کہ وہ ان دونوں کا پتہ چلانے کے لیے کسی دوسرے گینگ سے معاملہ طے کروانے میں اس کی مدد کرے۔

لنڈا نے اس وقت تو اس کی بات خاموشی سے سن لی تھی لیکن کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اُس کا کام سامنے نہیں آیا تھا چنانچہ چودھری نے خود اس سے رابطہ کر کے شکوہ شروع کر دیا۔

''آپ نے تو مجھے بہت اونچی چیز بنا دیا چودھری صاحب! اب میری اتنی بھی زیادہ پہنچ نہیں ہے۔ اگر میں تھوڑی بہت کوئی حیثیت رکھتی بھی ہوں تو وہ اپنے ان بڑوں کی وجہ سے جنہوں نے سختی سے مجھے کے ذاتی معاملات سے الگ رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ میرے لیے حکم ہے کہ میں تنظیمی معاملات کے آپ سے کسی اور معاملے میں ڈیلنگ نہ کروں، ورنہ تنظیم میں میری اپنی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ اب ہی بتائیں کہ اتنے سخت احکامات کے بعد میں کیسے آپ کی خواہش پوری کر سکتی ہوں؟ اوپر والوں کی نظر معتوب ہونے کے بعد تو میرا کہیں کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہے گا۔'' چودھری کے شکوے کے جواب میں اس نے اپنی صفائیاں پیش کرنا شروع کر دیں جسے سن کر چودھری بل کھا کر رہ گیا۔



''تم بڑوں کا رونا کیوں رو رہی ہو؟ صاف کہو کہ الفا نے تمہیں منع کیا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں تو میری زبان سے کہلوانا کیا ضروری ہے؟''

''وہ شخص ضرورت سے زیادہ مجھے اپنے دباؤ میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھا دو۔ میں اتنا بھی بے اختیار اور مجبور نہیں ہوں کہ اس سے دبتا ہی چلا جاؤں۔ یہاں کے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ اگر میں چاہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''مثلاً.....؟'' اُس کی دھمکی کے جواب میں لنڈا نے سرد مہری سے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے علاقے میں کتنا با اختیار ہوں۔ اگر میں ضد میں آ گیا تو تم میں اور کسی کی جنگل میں موجود افیون کے کھیتوں تک رسائی نہیں رہے گی۔ میں خود ہر شے پر قبضہ کر لوں گا۔ اس کے بعد میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ میں اس افیون کو ڈائریکٹ کسی دوسری پارٹی کو بیچ دوں۔ تمہارے علاوہ بھی مارکیٹ میں دوسرے لوگ ہیں جو اس دھندے کو چلا رہے ہیں۔ جو مجھے تم سے مل رہا ہے، وہ میں ہر غلامی کے آزادی سے دوسروں سے حاصل کر لوں گا۔'' اپنے تئیں اس نے بہت زوردار دھمکی دی تھی جس کے اس کے خیال کے مطابق تنظیم کے کرتا دھرتا ہل کر رہ جاتے۔

''یہ آپ کی خام خیالی ہے چودھری صاحب! یہاں لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ کسی شخص کو اپنے اوپر اتنا حاوی ہونے کا موقع دے دیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے اور وہاں کی نگرانی کے فرائض انجام دینے والے بے شک آپ کے لوگ ہیں لیکن وہاں ٹیکنالوجی ہماری کام کر رہی ہے۔ ہم اگر چاہیں تو محض ایک بٹن دبا کر سب کچھ تباہ کر سکتے ہیں۔ اور اس تباہی کے نتیجے میں آپ کے کئی قیمتی کارندوں کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا جنگل بھی جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اس صورت میں آپ اپنے نقصان کا حساب لگا لیجئے گا۔ آپ ہماری طرف سے ملنے والے خطیر معاوضے کے علاوہ بھی بہت کچھ کھو بیٹھیں گے۔ جبکہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کہ ہم یہیں اور اپنا سیٹ اپ دوبارہ قائم کر لیں۔ دوسرے آپ کبھی خواب میں بھی یہ مت سوچئے گا کہ آپ ہم سے اعلیٰ ہماری افیون کا کسی دوسری پارٹی سے سودا کر سکتے ہیں۔ پہلے نمبر پر تو آپ شمالی علاقہ جات اور افغانستان کے بیوپاریوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے جو اپنے مقابل آنے والے کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ ہماری بات اور ہے، ہم اس بزنس پر چھائے ہوئے ہیں اور ہم نے طلب و رسد میں کبھی کمی نہیں آنے دی ہے۔ اس لیے ہم پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو کوئی نہیں چھوڑے گا۔ دوسرے جو افیون آپ کے ہاں کاشت کی جا رہی ہے، اس سے ہیروئن تیار کرنے کی ٹیکنالوجی بھی ہمارے پاس ہے۔ ہماری ٹیکنالوجی کے بغیر کوئی اور اس افیون سے اس کوالٹی کی ہیروئن تیار نہیں کر سکتا جس کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک بار سودا کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو اگلی بار کوئی آپ سے سودا نہیں کرے گا۔ یہ سب حقائق کو اپنے سامنے رکھ کر آپ ذرا عقل کے ساتھ فیصلہ کیجئے گا کہ آپ ہم سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں ہیں بھی یا نہیں۔''

چودھری کو سارا نفع نقصان بتاتے ہوئے لنڈا کے لہجے میں جو اجنبیت اور سرد مہری تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی اصل ہمدردیاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں۔ اور اگر وہ اس سے محبت اور لگاوٹ سے پیش آتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی تنظیم کے مفادات پر اسے کسی بھی طرح ترجیح یا چھوٹ دے سکتی ہے۔ اس کے لب و لہجے نے چودھری کے جوش کے غبارے میں سُوئی چبھو دی اور وہ گھبرا کر بولا۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو ڈارلنگ! میں تو بس غصے میں ایک بات کہہ گیا تھا۔ ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ

نہیں ہے۔ نہ ہی میں تنظیم سے بغاوت کا سوچ سکتا ہوں۔ لیکن تنظیم کے بڑوں کا بھی تو فرض ہے کہ وہ ا
لیے خدمات انجام دینے والوں کے مفادات کا خیال رکھیں۔ اگر ہم اپنے ذاتی مسائل کی طرف سے پُر سکو
ہوں گے تو تنظیم کے لیے زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکیں گے۔'' لِنڈا کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر اس نے ب
تیزی سے پینترا بدل لیا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تنظیم اپنے لیے کام کرنے والے ہر شخص کو اس کی خدمت کے بدلے میں نہا
معقول معاوضہ دیتی ہے جس کے بعد اس پر کسی طرح کی ذمے داری نہیں رہتی۔ دوسرے یہ کہ تنظیم کے
ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ اگر ہم ہر شخص کے ذاتی مسائل کے حل کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں اپنا و
ضائع کرتے رہیں تو تنظیمی کام کب اور کیسے انجام پائیں گے؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اس حقیقت کو سمجھ
کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کاروباری تعلق ہے اور یہ تعلق اسی صورت قائم رہ سکتا ہے کہ آپ ہمار
شرائط کے مطابق کام کرتے رہیں اور جواب میں اپنی شرائط پیش کرنے کی زحمت نہ کریں۔''

لِنڈا اس سے جس لب و لہجے میں بات کر رہی تھی، اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس نرم و گداز حسینہ کے بجا
ایوڈ یا الفا سے بات چیت کر رہا ہے۔ آج پہلا موقع تھا کہ لِنڈا سے بات کرتے ہوئے وہ رعبِ حُسن م
جائے دہشت سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

''کول ڈاؤن ہنی! میں نے مان لیا ہے نا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں غصے میں کچھ زیادہ ہی غلط
بول گیا ہوں۔ تم اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔'' وہ اب باقاعدہ گھگیا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ سے دوستی کے ناتے میں بات ختم کر دوں گی لیکن اب آئندہ کبھی آپ ایسا کچھ
کہیے گا جس سے بغاوت کی بُو آئے۔ آپ نے سنا ہے نا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور ہماری
جتنی طاقتور اور جدید ہے، کچھ بعید نہیں کہ ہماری لاعلمی میں ہی ہماری گفتگو کا ریکارڈ ان تک پہنچ جائے۔ آ
نئے ہیں، یہاں کے لوگوں کا مزاج نہیں سمجھتے۔ لیکن میں آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ آپ اپنی نادانی میں کسی
بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ آپ کا جوان بیٹا یہیں نیویارک میں رہتا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو آ
کیا کریں گے؟ سنا ہے آپ کے ہاں تو جاگیر کے وارث کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وارث نہ رہا تو آپ
بعد آپ کی جاگیر تو بے کار ہی چلی جائے گی۔''

وہ اُسے میٹھی چھری سے ذبح کر رہی تھی۔ ہمدرد اور دوست بن کر وہ سب کہتی جا رہی تھی جو کوئی دشمن ا
کہہ سکتا ہے۔

''میں نے کہا ہے نا کہ اس بات کو جانے دو۔ اب تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس
بہت زور دے کر لِنڈا کو یقین دلایا۔

''اوکے، ایز یُو وِش۔ اب مجھے اجازت دیں۔ پھر کبھی اچھے ماحول میں بات یا ملاقات ہوگی۔'' لِنڈا
لہجے کی نرمی اور لوچ واپس لوٹ آئے اور اس نے بڑے خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

فون بند ہونے کے بعد بھی چودھری بہت دیر تک ساکت سا بیٹھا رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے ٹکرا
خواہش میں اسے ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی تھی اور یہ تسلیم کرنا پڑا تھا کہ ان لوگوں کے اختیارات کے سامنے
کی کوئی حیثیت نہیں ہے پھر بھی جانے کیوں وہ اپنے خون کی تاثیر سے مجبور ہو کر ایسی غلطی کر بیٹھتا تھا۔ اور
دفعہ تو لِنڈا نے اسے بہت ہی زیادہ خطرناک دھمکی دی تھی۔ چودھری مراد عالم شاہ اُس کا وہ اکلوتا بیٹا تھا،
سے بہت خفا رہنے کے باوجود وہ بڑی محبت کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اولادوں میں واحد وہی ہے جو اس کے



ں جاگیر کا وارث قرار پا سکتا ہے۔ دوسرا بہزاد شاہ تو اپنی ذہنی پسماندگی کی وجہ سے کسی لائق ہی نہیں تھا۔
ملوں کو وارث بنانے کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ اس کے حوالے سے دھمکی ملی تو اس کا دل اتنا بے قرار
ا کہ اُسی اس کا نمبر ملا بیٹھا۔

دوسری طرف سے فون مراد ہی نے اٹھایا اور یہ جاننے کے بعد کہ دوسری طرف اس کا باپ موجود ہے،
ادب سے سلام کرنے کے بعد اس کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگا۔

''میں ٹھیک ہوں پُتر! بس تیری فکر ہو رہی تھی اس لیے تجھے فون لگا لیا۔''

''وہ کیوں ابا جی! میں یہاں اچھا بھلا ہوں۔ پھر آپ کو میری فکر کس لیے ہو رہی تھی؟'' یہ پہلا موقع تھا
اپ نے ایسی بات کہی تھی۔ اس لیے وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ اس کے پوچھنے پر چودھری کو اپنی غلطی کا
اس ہوا چنانچہ بات بنانے کے لیے بولا۔

''بس پُتر! تیری ماں کے بعد دل ایسا ہی کملا ہو گیا ہے۔ وہ تھی تو آپ ہی تجھے فون شون کرتی رہتی تھی
ھے بھی تیری خیریت بتاتی رہتی تھی۔ اب اتنے دنوں سے کسی نے مجھے تیرے بارے میں نہیں بتایا تو ویسے
ل پھر اول گھبرا گیا۔''

''اماں کی کمی تو مجھے بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ان جیسی رعب داب والی اور دبنگ
اں اتنی خاموشی سے دنیا چھوڑ گئی ہیں۔'' وہ بیٹا تھا، ماں کے ذکر پر قدرتی طور پر آزردہ ہو گیا۔

''بس پُتر! جیسی رب کی مرضی۔ ہمارے تمہارے پاس صبر کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔'' وہ فوراً بیٹے کو
ل دینے لگا۔ پھر بات بدلنے کے لیے بولا۔ ''تُو سنا تیری زنانی اور دِھی کا کیا حال ہے؟''

دل میں چور ہونے کی وجہ سے وہ وڈی چودھرائن کے موضوع پر بیٹے سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ یہ
ال کہ کہیں مراد شاہ کو اپنی ماں کی موت کی حقیقت کا علم نہ ہو جائے، اسے اندر ہی اندر سہمائے رکھتا تھا اور
ل کی ایک بڑی وجہ الفا بھی تھا جس نے واضح طور پر دھمکی دے رکھی تھی کہ اس کی سرکشی کا ایک نتیجہ مراد
افشائے راز کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔''

''وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ شاہدہ آپ کو سلام کہہ رہی ہے۔'' مراد نے جواب دیا۔

''اور کشور کی کیا اطلاع ہے؟''

''کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس سے میرا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں
''مراد شاہ کے لہجے میں خود بخود ہی سختی در آئی۔

''تُو جھوٹ بول رہا ہے مراد شاہ! تجھے سب معلوم ہے پر تُو جان بوجھ کر مجھے نہیں بتا رہا۔ پر تُو فکر نہ کر.....
ود اُس کی کھوج لگا لوں گا۔'' چودھری دھاڑا۔

''تاکہ اُس پر ایک اور قاتلانہ حملہ کروا سکیں؟..... آپ نے تو مجھے کشور سے نظر ملانے کے لائق نہیں
ا ابا جی! وہ سوچتی ہوگی کہ میں بھی آپ کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور ہمدردی کی آڑ میں اُس سے دشمنی کرتا رہا
اسی لیے تو اُس نے مجھ سے ہر رابطہ توڑ دیا۔ اور اب اگر اتفاق سے کہیں مل بھی گئی تو مجھے یقین ہے کہ مجھ
منہ پھیر کر چلی جائے گی۔ آپ نے تو بہن بھائی کے رشتے کا اعتبار ہی توڑ دیا ابا جی! بھائی تو بہنوں کی
الت کیا کرتے ہیں۔ اور میری بہن سمجھتی ہوگی کہ میں اس کے لیے خطرہ ہوں۔'' وہ بیک وقت تلخ اور
اس محسوس ہو رہا تھا۔

''اوئے رہنے دے یہ تقریریں۔ بھائی، بہنوں کے رکھوالے ہوتے ہیں، پر ایسی بہنوں کے جو گھر کی

چار دیواری میں بیٹھتی ہیں۔ کشور کی طرح چوری چھپے گھر کی دہلیز پار کرنے والیوں کے لیے غیرت مند کندھے پر بندوق ڈال کر گھومتے ہیں تاکہ موقع ملتے ہی عزت کا جنازہ نکالنے والی کا جنازہ نکال سکیں۔ یہ گل نہیں سمجھے گا مراد شاہ! تُو رہتا ہے امریکہ میں، ہو رخود بھی امریکی بن گیا ہے۔ تجھے کہاں یاد رہے عزت و غیرت کے اصول۔'' اس نے بیٹے کو لتاڑا۔

''اچھا ہی ہے کہ مجھے ایسے غیر انسانی اصول یاد نہیں ہیں جو صرف اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان اس کے بنیادی حقوق چھین کر اپنی حکمرانی کا نشہ پورا کیا جا سکے۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''تجھ سے گل کرنا تو اپنا منھ خراب کرنا ہے۔ تُو نہ میری گل سمجھا ہے نہ سمجھے گا۔ پر میری مجبوری ہے میرا اکلا وارث ہے۔ ہیر پھیر کر مجھے تجھے منہ لگانا ہی پڑتا ہے۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تُو میرے بعد کا انتظام کیسے چلائے گا؟ تجھے تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ تیرے دادا کا عرس کس تاریخ کو ہوتا ہے۔ پر میں تک زندہ ہوں مجھے تو سب دیکھنا ہے اور اپنے پرکھوں کی روایات کی حفاظت کرنی ہے۔ جا تُو اُدھر فرنگیوں ہی خوش رہ، میں پیر والا ہو کر بھی سب کلا ہی دیکھتا رہوں گا۔'' اُس نے مراد شاہ کو باتیں سنا کر فون بند اور بلند آواز میں منشی کو پکارا۔

''حاضر سرکار!'' منشی چراغ کے جن کی طرح فوراً خدمت میں آموجود ہوا۔

''عرس کی تیاریوں کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ دریافت کیا۔

''تیاریاں جاری ہیں سرکار! آپ دیکھیے گا کہ پچھلے سال سے زیادہ شاندار انتظامات ہوں گے اس میں نے درگاہ کی سجاوٹ اور حویلی کی تزئین کا کام شروع کروا دیا ہے۔ دعوت نامے بھی ایک دو دن میں کر آ جائیں گے۔ آپ دیکھیے گا محفل کے کیسے شاندار دعوت نامے تیار کروائے ہیں میں نے۔ باقی انتظام بھی بہت شاندار ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' منشی نے فوراً رپورٹ شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے تیرے انتظامات کو بھی۔ یہ بتا کہ اُدھر ڈاک بنگلے کی کیا خبر پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی اُدھر؟''

''نہیں چودھری صاحب! سب ٹھیک ہے۔ بہرام اور دوسروں کو میں نے آپ کے حکم پر ڈاک بنگلے ہٹا لیا تھا۔ اب وہاں صرف سرکاری چوکیدار ہے اور اسے کسی معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اے سی عمیر بھی اپنی جگہ موجود ہے اور ہمارے خدشات کے مطابق اس نے دوبارہ جنگل کا رخ کرنے کی کوشش کی۔'' اس حوالے سے بھی منشی کے پاس اس کے لیے تسلی بخش رپورٹ موجود تھی۔ اظفر اور اس کے ساتھی جنگل میں قتل کرنے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اظفر کے بارے میں انہیں شک تھا کہ کسی خفیہ ادارے کا آدمی ہے اس لیے اسے قتل کرنے کے بعد بھی یہ خیال رکھا تھا کہ اگر اس کے قتل کی تفتیش شروع ہو تو کوئی گرفت میں نہ آ سکے۔ کیونکہ اس سارے معاملے میں بہرام ہی سامنے تھا، اس لیے انہیں خدشہ تھا کہ تفتیش کرنے والے اسے ہی گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے اسے پوری ٹیم سمیت منظر سے ہٹا دیا تھا اور ڈاک بنگلے سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے جیسے وہاں ان کا عمل دخل ہی نہ رہا ہو۔ وہاں ابھی تک فاریسٹ آفیسر نہیں آیا تھا اس لیے فی الحال وہاں قبضہ رکھنا ضروری بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا خطرہ انہیں اس طرف سے تھا کہ وہ اظفر کا کزن ہونے کی وجہ سے اس معاملے میں دلچسپی لے سکتا ہے لیکن اس کی طرف



سے ابھی تک ذکر ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اس لیے انہیں اطمینان ہو چلا تھا۔

''اس نئے اے سی سے عرس سے پہلے میری ملاقات کا انتظام تو کروا دو۔ بلاؤ کسی دن اُسے کھانے پر۔ تم اس کی طرف سے سب اچھا کی رپورٹ دے رہے ہو۔ میں بھی مل کر دیکھوں کہ کیسا بندہ ہے۔''

''چنگا سرکار! میں آپ کا پیغام اے سی کو پہنچا دوں گا۔ دیکھیے گا، سر کے بل دوڑا چلا آئے گا۔ پہلے ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ چودھری صاحب امریکہ سے آ جائیں تو ان سے ملاقات کروں گا۔ ہمارے دیئے تحفے تحفے اس نے بہت خوش ہو کر لیے تھے۔''

''یہ چنگی گل ہے کہ وہ تحفے لے کر خوش ہونے والا آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو مٹھی میں لینا آسان ہوتا ہے۔ وہ تحفے لے کر خوش باش ایک طرف بیٹھا رہے گا، ہو رہم اپنے کام کرتے رہیں گے۔'' چودھری کو عمیر کے بارے میں جان کر خاصا اطمینان ہوا ورنہ جب تک شہریار یہاں تھا، اس نے ان لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اسمگلنگ اور کھالوں کی اسمگلنگ تو عرصہ ہوا بند ہو چکی تھی۔ دوسرے معاملات میں بھی اس کا عمل دخل تھا۔ اس وجہ سے حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ وہ ملک سے باہر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب شہریار تو نہیں تھا لیکن اس نے خفیہ اداروں کی جو تلوار اس کے سر پر لٹکا دی تھی، اس کی وجہ سے اسے بہت محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ عمیر کی طرف سے سہارا مل جاتا تو اسے اپنے کالے دھندوں میں آسانی ہو جاتی۔

''یہ کام تو آپ سمجھیں ہو گیا سرکار! اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو تو حکم فرمائیں۔'' منشی بلا کا چرب زبان اور عادی تھا۔ کام بھی خوب کرتا تھا اس لیے برسوں سے اس کی چودھری کے ساتھ اچھی نبھ رہی تھی۔ کبھی کبھار ناہی ہو بھی جاتی تو اس کی پچھلی خدمات کی وجہ سے چودھری زیادہ سختی سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے موڈ کی خرابی کا منشی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا اور اس کی خلاصی کر کے خود اٹھ کر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عرس کے سلسلے میں چھوٹی چودھرائن کو ضروری ہدایات دینا لازمی تھا۔ وڈی چودھرائن ایک تو میکے سے بھی خاصی تربیت لے کر آئی تھی، دوسرے برسوں سے حویلی کا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھوں میں تھا اس لیے خاص مواقع پر اسے سرسری ہدایت کرنا کافی ہوتا تھا، باقی وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتی تھی۔ لیکن چھوٹی چودھرائن کی طرف سے وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا کہ اتنے بڑے موقع پر اس کی کارکردگی اچھی ہو گی۔

''سلام چودھری صاحب!'' وہ جیسے ہی چھوٹی چودھرائن کی خواب گاہ میں داخل ہوا، وہ ہڑبڑا کر بستر سے اتری اور ادب سے اسے سلام کیا۔ چودھری نے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''بیٹھو۔'' اُس نے اجازت دی تو چودھرائن بھی مسہری پر ٹِک گئی لیکن انداز مؤدبانہ تھا اور چہرے پر تفکر سا رہا تھا کہ چودھری نے آخر یہاں کا رُخ کیسے کیا ہے؟ عام طور پر تو وہ اسے ملازماؤں کی زبانی ہی پیغام دیا کرتا تھا اور ملاقات کا شرف بخشنے کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی بہت ضروری کام ہے۔

وہ ایک ایسی ماں کی بیٹی تھی جس نے حویلی کی روایات سے بغاوت کر کے اپنے لیے زندگی کی خوشیاں کشید کرنے کی جسارت کی تھی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی کے اتنے برسوں میں کئی باغیوں کا انجام دیکھ چکی تھی۔ حویلی کی کرتا دھرتا وڈی چودھرائن کا انجام بھی اس کے سامنے تھا جس کی ساری خدمات اور حیثیت کو بھلا چودھری نے فوری طور پر اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرتی رہتی تھی کہ جانے کب اُسے کشور کے متعلق کوئی بری خبر سننے کو مل جائے گی۔

''حویلی کا سب انتظام سنبھال لیا ہے نا تُو نے؟..... کہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟'' اُس کے تفکر سے بے نیاز چودھری نے اس سے پوچھا۔

''کوئی پریشانی نہیں چودھری صاحب! ملازم سارے پرانے اور وفادار ہیں۔ سارے کام جیسے وڈی کی زندگی میں چلتے تھے، اب بھی ویسے ہی چل رہے ہیں۔ میں چنگی طرح سب کاموں کی دیکھ بھال ہوں۔'' اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

''تجھے ملوم ہے نا کہ سالانہ عرس ہونے والا ہے ہور اس موقع پر حویلی میں بھی وڈی مہمان داری ہے۔ اس کے لیے بھی تُو کوئی تیاری شیاری کر رہی ہے یا نہیں؟'' اس کی رپورٹ سے متاثر ہوئے چودھری نے سختی سے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں چودھری صاحب! منشی نے پہلے ہی مجھے پیغام بھجوا دیا تھا۔ رنگ و روغن ہور مرمت شر کے کام اس کے بندے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ساری صفائیاں ستھرائیاں اپنی نگرانی میں کروانی ہیں۔ نئے پردے اور چادریں وغیرہ بھی شہر سے منگوا کر رکھ لی ہیں۔ پنڈ کی عورتیں چاول ہور دو اناج کی صفائی کے لیے بھی روزانہ پابندی سے آ رہی ہیں۔ آپ ذرا فکر نہ کریں۔ عرس کے وقت سب رہے گا۔'' اس نے مؤدبانہ تسلی دی۔

''مجھے اطمینان تو دلا رہی ہے پر یہ گل کھوپڑی میں بٹھا لے کہ اگر مجھے کوئی شکایت ہوئی تو وڈی کی تیری بھی حویلی سے چھٹی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔'' چودھری نے ایسے سرد لہجے میں دھمکی دی کہ وہ کر رہ گئی اور بے ساختہ ہی اس کو مزید تسلیاں دینے لگی جنہیں سننے کے بعد چودھری نے اپنی طرف اسے خاصی ہدایات دیں۔ وہ اُس کی ہر بات کو گرہ میں باندھتی رہی۔

''سب چنگی طرح سمجھ گئی ہے یا نہیں؟'' آخر میں چودھری نے اس سے سوال کیا۔

''بالکل سمجھ گئی ہوں سرکار!'' اس نے فوراً جواب دیا۔ لیکن پھر بچے کے رونے کی آواز سن کر بری اُچھل گئی۔ آواز سن کر چودھری بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ ایک چھوٹا سا شیر خوار بچہ چودھرائن کے بستر کی جانب لیٹا رو رہا تھا۔ بچے نے بیڈ شیٹ کا ہم رنگ کمفرٹ اوڑھ رکھا تھا اس لیے کمرے میں موجود ہو باوجود وہ اس کی موجودگی کے بارے میں نہیں جان سکا تھا۔ اگر بچہ روتا نہیں تو وہ اب بھی بے خبری واپس لوٹ جاتا۔

''یہ کس کا بچہ ہے؟'' اس نے چونک کر چودھرائن سے سوال کیا۔

''اپنے بہزاد شاہ کا پُتر ہے۔ میرا اکیلے میں جی گھبراتا ہے تو کبھی کبھار اسے نیچے بلوا لیتی ہوں۔'' نے جواب ضرور دیا لیکن اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ چودھری کی اجازت کے بغیر خود روتے ہوئے بچے بڑھ کر اٹھا لے۔

''اس کو اوپر ہی رکھا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' بچے کے بارے میں جان کر اس کے احساسات عجیب ہو گئے اور یاد آیا کہ کچھ دیر قبل وہ مراد شاہ کو اپنا اکلوتا وارث قرار دے رہا تھا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی ایک وارث یہ بچہ بھی تھا جو بظاہر تو بہزاد شاہ کا بیٹا کہلاتا تھا لیکن وہ یہ حقیقت جانتا تھا کہ بہزاد شاہ کارنامہ انجام دینے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اور خود اُس نے اپنے سفلی جذبات کی تکمیل کے لیے باپ رشتے کی دھجیاں اُڑائی ہیں اور اپنے ذہنی معذور بیٹے کی منکوحہ سے شرم ناک تعلق قائم کر کے دنیا ترین حرکت کی ہے۔



بہزاد شاہ کی منکوحہ فریدہ کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ اس کے حریف وڈیرے کی بہن تھی اور قسمت کی ابلی سے اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک طرف تو ذہنی معذور بہزاد شاہ سے فریدہ کا نکاح پڑھوا کر اپنے ب کو نیچا دکھایا، دوسرے فریدہ کو پامال کر کے اپنی کامیابی کا جشن مناتا رہا۔ یہ بچہ اس کے اسی ظلم اور ت کی نشانی تھا جس سے صرف وہی واقف تھا۔

''میں ابھی اسے اوپر بھجوا دیتی ہوں۔'' اس کے احساسات سے بے خبر چھوٹی چودھرائن نے بوکھلا کر اب دیا۔

''اماں! بچہ کیوں اتنی بری طرح رو رہا ہے؟'' ابھی چودھرائن کے الفاظ اُس کے منہ میں ہی تھے کہ ا زوردار آواز سے کھلا اور فریدہ اندر داخل ہوئی۔ اندر آنے کے بعد وہ چودھری کو مکمل طور پر نظر انداز ی ہوئی بچے کی طرف بڑھ گئی اور اسے بانہوں میں اُٹھا لیا۔

چھوٹی چودھرائن اُس کی جرأت پر آنکھیں پھاڑے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر ملازماؤں فریدہ کو چودھری کی اندر موجودگی کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا اور اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں تھا کہ کوئی بنا اجازت اندر آ جاتا۔ لیکن فریدہ نہ صرف اندر آ گئی تھی بلکہ چودھری کی موجودگی کو نظر انداز کر بچے کو بھی گود میں اٹھا لیا تھا..... جبکہ چودھرائن خود اندر موجود ہوتے ہوئے یہ جرأت نہیں کر سکی تھی۔

''فریدہ! چودھری صاحب کو سلام کر۔'' اس نے فریدہ کو اس کی گستاخی کا احساس دلانا چاہا۔ بچے کو فریدہ نے نظر اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا۔

اس کی اس ایک نظر میں طنز، حقارت، نفرت..... کیا کیا نہیں تھا۔ بے حد و حساب بے ضمیر ہونے کے چودھری کو اس کی نظر نے اندر سے کپکپا کر رکھ دیا۔ ضمیر کی ملامت پر یا شاید دل بھر جانے پر اس نے سے اپنا گھناؤنا تعلق تو ختم کر لیا تھا لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ بات ختم ہو جاتی۔ کی نفرت بھری نگاہیں اس جیسے آدمی کو بھی اندر سے جھلسا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ وہاں کھڑا نہیں رہ فوراً ہی مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے چھوٹی چودھرائن، فریدہ کو اُس کی حرکت پر سرزنش کرتی رہی بے نیازی سے یوں سنتی رہی جیسے اس کے بجائے کسی اور کو یہ سب کہا جا رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

ایک گاہک کی فرمائش پر اسے مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی ٹائیاں نکال کر دکھا رہی تھی کہ اچانک ہی کے آگے دائرے سے ناچنے لگے اور اسٹور میں موجود ہر شے گھومنے لگی۔

اس نے کوشش کی کہ کاؤنٹر کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچا لے لیکن خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی اس کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ نیچے بیٹھ کر اُسے بہت زور کی اُبکائی آئی اور ایسا الٹیاں اُلٹ کر باہر آنے لگی ہوں۔

''آر یو اوکے مہرین؟'' اس کے برابر والے کاؤنٹر پر موجود لڑکی کی نظر اس پر پڑی تو وہ تشویش سے گئی لیکن اس میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ طبیعت اچانک ہی اتنی بری طرح بگڑی تھی کہ پسینے ہو گئے تھے اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

ساتھی لڑکی نے اُس کی حالت دیکھی تو لپک کر اس کے قریب آئی اور سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور گلاس میں پانی لے آئی۔ اس نے ایک گھونٹ پانی پیا تو طبیعت سنبھل گئی۔

اس اثنا میں لڑکی انٹرکام پر کیش کاؤنٹر پر بیٹھے اسلم کو اس کے بارے میں اطلاع دے چکی تھی اور
حیران پریشان کھڑے گاہک کو ٹائیاں دکھانے لگی۔ اتفاق سے یہ ایسا وقت تھا کہ اسٹور میں زیادہ رش نہیں
اس لیے لڑکی کو اپنی جگہ چھوڑنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

''کیا ہوا ماہ!..... طبیعت کیسے خراب ہوگئی؟'' افتاں و خیزاں اسلم اطلاع ملتے ہی کاؤنٹر چھوڑ کر دوڑا
آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''بس ایسے ہی ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''ذرا سا چکر آنے میں رنگت ایسی زرد ہو جاتی ہے کیا؟..... تم اُٹھو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے
چلتا ہوں۔ تمہیں خود تو ذرا اپنا خیال نہیں ہے۔ ڈھنگ سے کھاتی پیتی تک نہیں ہو، ایسے میں کمزوری تو ہونی
ہے۔'' اس کے تسلی دینے کے باوجود اسلم کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ یہاں سے آف کرنے کے بعد چلیں گے۔'' وہ اپنے لیے اس کی محبت سے وا
تھی، اس لیے زیادہ بحث نہیں کی۔

''آف ہونے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔ میں فون پر مصطفیٰ صاحب سے بات کر کے دو گھنٹے کی
لے لیتا ہوں۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور فوراً ہی مصطفیٰ خان سے موبائل پر رابطہ کر کے اجازت طلب کر
لگا۔ اس نے بلا تردّد اجازت دے دی۔ اجازت کا مسئلہ حل ہونے پر اس نے اپنی جگہ کسی اور کو ذمے
سونپی اور ماہ بانو کو لے کر روانہ ہوگیا۔

ہسپتال پہنچ کر اس نے لیڈی ڈاکٹر کو خود ماہ بانو کے بارے میں نہایت تشویش سے آگاہ کیا اور
ڈاکٹر اسے معائنے کے لیے کمرے میں لے گئی تو خود مضطرب سا باہر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے ا
دوبارہ بلایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جبکہ ماہ بانو کچھ جھینپی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو مبارک ہو مسٹر اسلم! آپ کی مسز کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس پر آپ پر
ہوں..... بلکہ آپ کے لیے خوشخبری ہے کہ آپ کے ہاں نئے مہمان کی آمد آمد ہے۔'' وہ ایک اد
کی ایشیائی نقش و نگار رکھنے والی عورت تھی جس نے بہت جوش سے اسے یہ خوشخبری سنائی تھی۔ خبر سن کر
کھِل اُٹھا۔

''تھینک یو سو مچ ڈاکٹر! آپ نے واقعی مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ اب آپ میری مسز
سمجھائیں کہ بچے کی خاطر انہیں اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ اور اب یہ مکمل طور پر آرام کریں گی۔''
نے ماہ بانو پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''صحت کا خیال رکھنے والی بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں انہیں مکمل ڈائٹ شیڈول بنا کر دے د
جس پر سختی سے عمل کروانا آپ کا کام ہے۔ اس کے علاوہ آپ انہیں پابندی سے چیک اپ کے لیے بھی
لاتے رہیے گا۔ لیکن مکمل آرام والی بات غلط ہے۔ پریگنینسی کوئی مرض نہیں ہے جو عورت کو مکمل بستر
جائے۔ کسی پیچیدگی کی صورت میں بیڈ ریسٹ کا مشورہ دینے کے علاوہ ہم ماں بننے والی عورتوں سے
ہیں کہ صحت مند زندگی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بالکل نارمل لائف گزاریں۔ کیونکہ ماں جتنی
رہتی ہے، اس کے اور بچے کی صحت کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ گھریلو کام کاج کے علاوہ اپنی
آسانی سے جاری رکھ سکتی ہیں۔ بس اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ زیادہ وزن نہ اُٹھائیں اور چلتے پھرتے
دھیان رکھیں کہ کہیں گرنے نہ پائیں۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اسے اچھی طرح سمجھایا پھر ڈائٹ پلان



ساتھ فولاد اور وٹامنز پر مشتمل دوائیں بھی تجویز کر کے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

''میں بہت خوش ہوں ماہ!..... سچ پوچھو تو میں خوشی سے ساتویں آسمان پر اُڑ رہا ہوں۔ میرے لیے یہ
بڑا خوشی کا مقام ہے کہ میری محبت کی نشانی تمہارے وجود میں سانس لے رہی ہے۔''

باہر نکل کر اس نے ماہ بانو کو اپنے ایک بازو کے حصار میں لے کر خود سے قریب کرتے ہوئے اپنی خوشی
اظہار کیا۔

جواب میں وہ کچھ نہیں بولی اور صرف خاموشی سے مسکراتی رہی۔ فی الحال وہ اسلم کی طرح خوش یا پُر جوش
ہونے کے بجائے عجیب سے احساسات کا شکار تھی اور قدرت کی کاریگری دیکھ رہی تھی جس نے عجیب طرح
پہلے اسے اسلم کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھا تھا اور اب اولاد کی زنجیر بھی پیروں میں پڑنے جا
تھی۔ اس زنجیر کے بعد کہاں ممکن تھا کہ وہ پلٹ کر ماضی کی کسی یاد کو آواز دے سکتی یا اس محبت کے بارے
سوچ سکتی جس نے بارش کی پہلی بوند کی طرح اس کے دل کی سرزمین کو مہکایا تھا۔

⊛----✪----⊛

اس قافلے میں کُل سات افراد شامل تھے جن میں سے دو شہریار اور سلّو تھے۔ یہ اسمگلروں کا قافلہ
جن کے لیے انڈیا اور پاکستان کی درمیانی سرحد عبور کرنا ایک معمول کی بات تھی۔

وہ دونوں اس قافلے کا حصہ اس لیے بنے تھے کہ بھارت میں رازدارانہ داخلے کا یہی سب سے مناسب
اور کسی حد تک محفوظ طریقہ تھا۔

قافلے میں ان کی شمولیت کا انتظام کسی کیپٹن اظہر نے کروایا تھا۔ لیکن وہ بھی اس طرح کہ درمیان
ایک دوسری پارٹی موجود تھی اور قافلے کو لیڈ کرنے والا اسمگلر قاسم یہی جانتا تھا کہ اسے جن دو لوگوں کو
ساتھ بھارت لے جانا ہے، وہ بھیرو دادا کے بندے ہیں۔ اس کام کے لیے بھیرو دادا نے اسے بھاری رقم
تھی اور ساتھ ہی یہ تنبیہہ کر دی تھی کہ اس کا کام صرف ان دونوں کو سرحد پار کروانا ہے۔ وہ کیوں اور کس
وہاں جا رہے ہیں؟ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قاسم نے اب تک اس بات کا خیال
تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی دورانِ سفر ان دونوں کے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھ رہے تھے۔
دونوں کی بھی پوری کوشش تھی کہ ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہ آئے کہ قافلے میں شامل دیگر افراد سے کسی قسم
کبیدگی پیدا ہو۔ لیکن وہ باقی لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے گریزاں تھے۔ اور ضرورت کے علاوہ بات
نہیں کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے پاس موجود سامان کے بیگز بھی کسی اور کو اٹھانے کی اجازت نہیں دی تھی اور خود
اٹھاتے تھے۔ ان کا ابتدائی سفر جیپ میں طے ہوا تھا اور اس کے بعد وہ پیدل چلنے لگے تھے۔ قاسم نے
بتایا تھا کہ پیدل صرف چند گھنٹوں کی مسافت ہے، اس کے بعد انہیں سواری کے لیے اونٹ مل جائیں گے
آبادی میں پہنچنے کے بعد یہ شہریار اور سلّو کی اپنی صوابدید پر تھا کہ کہاں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنی علیحدہ
اختیار کر لیتے۔ فی الحال تو ان کا سفر جاری تھا اور ابھی انہوں نے سرحد پار نہیں کی تھی۔

پیدل چلتے ہوئے ان کے بیگز ان کے شانوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ موجود اسمگلر
بھی اپنے شانوں سے بڑے بڑے تھیلے لٹکا رکھے تھے جن میں اسمگلنگ کا وہ عمومی سامان تھا جو بھارت
پاکستان کے درمیان اسمگل ہوتا رہتا تھا۔ لیکن بھیرو دادا کے توسط سے شہریار کو پتہ چلا تھا کہ اس سامان
ساتھ ساتھ قاسم کچھ نایاب ہیرے اور مورتیاں بھی خفیہ طور پر لے کر جا رہا ہے۔ عام حالات میں وہ قطعی
بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی پاکستان کی نادر و نایاب اشیا کو یوں بھارت اسمگل کر ڈالے۔ لیکن فی الحال
وہ جس اہم مشن پر تھا، اس کی خاطر ان اسمگلروں سے مفاہمت پر مجبور تھا۔

''فائق خان.....!'' قافلہ کچھ اس ترتیب سے چل رہا تھا کہ شہریار، سلّو اور ایک اسمگلر سب سے
تھے۔ پھر باقی چار افراد دو دو کی ٹولیوں میں اس طرح چل رہے تھے کہ قاسم سب سے پیچھے تھا اور اس



م نے ہی شہریار کو جو کہ فائق خان کے نام سے سفر کر رہا تھا، پکارا تھا۔ اس کی پکار پر وہ اور اس کے ساتھ
سلّو رک گیا۔ سلّو کا موجودہ نام پاشا تھا اور شہریار کی طرح اس کا حلیہ بھی کافی بدلا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے قاسم؟'' شہریار نے قاسم کے قریب آنے پر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''سرحد پار سے میرے ساتھیوں نے خبر پہنچائی ہے کہ آج رات سرحد پار کرنا خطرناک ہوگا اس لیے آج
ہمیں اسی طرف ہی کہیں پڑاؤ ڈال لینا چاہیے۔ آج رات سرحد پر انڈین آرمی کی معمول سے زیادہ نفری اور
نقل و حمل دیکھنے میں آ رہی ہے۔'' اُس نے پُرتشویش لہجے میں اطلاع دی جسے سن کر شہریار کے ماتھے پر تفکر کی
لکیریں اُبھر آئیں۔

''پریشان نہ ہو خان! یہ ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے اور ہم تھوڑا ٹھہر کر اپنا
دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔'' اسے پریشان پا کر قاسم اسے تسلی دینے لگا۔

''اوکے، تم ان معاملات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا ہوگا؟ رات تو اب ہو ہی
گئی ہے۔'' شہریار نے فوراً ہی مطمئن ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی ہمیں کچھ دیر اور چلنا ہوگا۔ پھر ہم محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔'' قاسم نے اسے بتایا اور ان کا
قافلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ اس بار قاسم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جبکہ سلّو اور اس کا ساتھی پیچھے ہو
گئے تھے۔

''لگتا ہے تم بھیرو دادا کے پاس نئے آئے ہو۔ میں نے پہلے کبھی اس کے آدمیوں میں تم دونوں کو نہیں
دیکھا۔'' ساتھ چلتے چلتے قاسم نے اس کے ساتھ گفتگو چھیڑ دی۔

''ہم اس کے آدمی نہیں ہیں۔ ہم اپنی کسی ضرورت کے تحت بھارت جا رہے ہیں جس کے لیے ہم نے
اس سے سرحد پار کروانے کی درخواست کی تھی۔ لیکن اس نے بتایا کہ اس کا قافلہ جانے میں ابھی ایک ہفتہ
لگے گا۔ ہمیں جلدی تھی اس لیے اس نے تمہارے ساتھ ہمارا معاملہ کروا دیا۔'' شہریار نے سنجیدگی سے
اس کی بات کا جواب دیا اور اندر ہی اندر ہوشیار ہو گیا کہ یہ شخص اپنی ابتدائی خاموشی کے بعد اب تجسس کے
ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم دونوں اس فیلڈ میں نئے ہو اور اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔
اگر تم چاہو تو اپنا مال مجھے دکھا کر مجھ سے یہیں سودا کر سکتے ہو۔ مال اچھا ہوا تو میں تمہیں اس کی بہت
اچھی قیمت دوں گا اور تم بے کار میں سرحد پار کرنے کے خطرے سے بچ جاؤ گے۔'' قاسم نے نہایت مکاری
سے اپنی دانست میں اسے خاصی پُرکشش پیشکش کی۔

''تمہارا شکریہ۔ لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا، اپنے طور پر خود کر لیں گے۔ تم سے
ہماری بس ڈیلنگ ہوئی ہے کہ ہمیں سرحد پار کروا دو۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم کسی دوسرے معاملے میں دلچسپی
لینے کے بجائے خود کو وہیں تک محدود رکھو جس کا تمہیں معاوضہ دیا گیا ہے۔'

شہریار نے اسے سخت لہجے میں تنبیہہ کی جس پر اس نے فوراً ہی اپنا رویہ بدل لیا اور اس کے شانے پر
ہاتھ رکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''برا کیوں مانتے ہو یار؟ میں نے تو ایسے ہی ایک آفر کی تھی۔ اگر تمہیں قبول نہیں تو کوئی بات نہیں۔''

اس کے بعد ان کا باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر وہ لوگ رک گئے۔ یہاں
مکمل اندھیرا تھا اور کسی ذی روح کی موجودگی کا گمان تک نہیں ہوتا تھا۔ قاسم کے ساتھیوں نے فٹافٹ سامان

میں موجود خیمے نصب کیے۔ خیمے چھوٹے تھے جن میں دو آدمی ہی سما سکتے تھے۔ شہریار اور سلّو کو ایک ہی ملا، باقی میں قاسم کے ساتھی کسی نہ کسی طرح فٹ ہو گئے۔

خیموں کی تنصیب کے بعد انہوں نے ڈبوں میں بند خوراک سے اپنی بھوک مٹائی۔ اس تاریک وہ میں آگ جلانا خطرناک ہوتا اس لیے انہوں نے ٹھنڈے کھانے پر ہی اکتفا کیا اور کھانے کے بعد چائے کا تکلف بھی نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ قاسم اور اس کے ساتھیوں نے شراب نوشی ضرور شروع کر دی تھی دونوں کو بھی انہوں نے اس شغل میں شامل کرنا چاہا تھا لیکن دونوں ہی نے انکار کر دیا تھا۔ جس کے سے مزید اصرار نہیں کیا گیا اور مائع دودھ کے بند ڈبے پینے کے لیے دے دیئے گئے۔

قاسم اور اس کے ساتھی شراب نوشی کے دوران خوب فحش گوئی کر رہے تھے۔ شہریار نے سلّو کو اشا اور وہ دونوں اپنے ہاتھ میں پکڑے دودھ کے ڈبے لے کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ آگے انہیں نہ جانے تکلیفیں اُٹھانی تھیں اور کتنے دن رات جاگ کر گزارنے تھے، اس لیے بہتر تھا کہ آرام کا جو موقع مل اس سے فائدہ اٹھالیں۔ جلد ہی وہ دونوں سو گئے۔

سوئے ہوئے انہیں مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ خیمے میں تھرکتی ٹارچ کی روشنی نے فوراً ہی اسے احساس دلایا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ دم سادھے پڑا رہا۔ وہ شخص سلّو کے بیگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ قاسم کا ساتھی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ قاسم کے لالچ نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ ان کی لاعلمی میں ان کے سامان کی کروائے۔ اُس نے اُسے سبق سکھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص پر جا شاید ان کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھا اس لیے پوری طرح گرفت میں آ گیا اور اس کے بعد شہریار اسے سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اتنی بری طرح مارتا چلا گیا کہ اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اس کی سن کر دوسرے لوگ دوڑے آئے۔ انہوں نے گاما کو اس کی گرفت سے چھڑوایا۔

''چھوڑو فائق خان!..... کیا اُس کی جان لو گے؟'' قاسم نے اسے جھنجوڑا۔

''میں اپنے سامان پر بُری نظر ڈالنے والے کی جان نکال لوں گا۔ یہ رات کی تاریکی میں یہاں کرنے آیا تھا۔'' شہریار نے جان بوجھ کر غصے سے کف اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اسے اس کی غلطی پر کڑی سزا دوں گا۔ فی الحال ہم سفر میں ہیں اس لیے تم جانے دو۔ میں پر اس کا فیصلہ کروں گا۔''

قاسم نے اسے سمجھایا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ قاسم اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا کے باہر نکلنے کے بعد شہریار نے بے خبر سوئے ہوئے سلّو کی طرف دیکھا۔ اتنے ہنگامے میں اس کا سو حیرت انگیز تھا۔ فوراً ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ سونے سے پہلے انہیں جو دودھ کے ڈبے دیئے گئے ان میں یقیناً نیند کی کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اتفاق سے اس نے وہ دودھ نہیں پیا تھا جبکہ سلّو پینے کی سے غفلت میں چلا گیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ جو ہوا، اس میں قاسم کا ہاتھ تھا، یہ معاملہ سامنے آنے پر تصدیق ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی کے سفر میں قاسم اور اس کے ساتھیوں سے خود بھی ہوشیار اور سلّو کو بھی ہوشیار رہنے کی ہدایت کرے گا۔

باقی رات آرام سے گزر گئی۔ شاید قاسم اور اس کے ساتھیوں نے سمجھ لیا تھا کہ اندر موجود شخص ٹیڑھی ہے، وہ اتنی آسانی سے اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔



صبح سلّو بھی جاگ گیا لیکن کسلمندی اور سستی کی شکایت کرتا رہا۔ قاسم اور اس کے ساتھی چور بنے ہوئے رہے۔ البتہ شہریار نے سب کے سامنے سفر کی تھکن اور بے آرامی کو الزام دیتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دن کی روشنی میں آگ جلانے میں حرج نہیں تھا اس لیے قاسم کے دو ساتھیوں نے مل کر تازہ ناشتہ تیار کیا۔ ناشتے کے بعد وہ لوگ اپنی اپنی مرضی کے شغل میں مصروف ہو گئے۔ سرحد پار کرنے کے لیے رات کا اندھیرا ضروری تھا اس لیے انہیں سفر کا آغاز ابھی نہیں کرنا تھا۔ ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شہریار نے سلّو کو قاسم کی حرکت سے آگاہ کر دیا۔ وہ بیک وقت شرمندگی اور غصے کا شکار ہو گیا۔ معمولی اسمگلرز کے ہاتھوں بے بس ہو جانا اس کے لیے باعثِ شرمندگی تھا اس لیے بس نہیں چل رہا تھا کہ قاسم کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے۔ شہریار نے اسے ٹھنڈا کیا اور سمجھایا کہ مصلحت یہی ہے کہ فی الحال خاموشی اختیار کر لی جائے اور غیر اہم لوگوں سے اُلجھ کر اپنی توانائی ضائع نہیں کی جائے۔ سلّو نے اس کی بات سمجھ لی۔

سرِ شام اُن کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد قاسم نے انہیں بتایا کہ وہ اہم زون میں داخل ہو گئے ہیں اور اب انہیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اُس کی ہدایت کے بعد ان لوگوں کے اعصاب خاصے تنے رہے لیکن خیر گزری اور وہ اس جگہ سے بھی گزر گئے۔

آگے ان لوگوں کا ٹھکانہ تھا جنہوں نے اُنہیں اونٹ مہیا کرنے تھے۔ وہاں انہوں نے کچھ دیر ٹھہر کر خود کو تازہ دم کیا اور پھر اونٹوں پر سوار ہو کر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

شہریار کے لیے یہ سفر کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اگر وہ اتنے دن عمر فاروق کی سخت تربیت میں نہ رہا ہوتا تو یہ سفر اُس کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا۔ سلّو البتہ اطمینان سے تھا۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی سختیاں دیکھی تھیں۔ پھر ''را'' والوں کی تربیت سے گزرا تھا اس لیے اسے کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ان کا سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ دُور بہت دُور معمولی سی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

''یہ سرحد سے قریب ترین آبادی ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں بھی ہمیں کم از کم ایک گھنٹہ اور لگے گا۔'' قاسم نے اس کے قریب ہی اونٹ کو دوڑاتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید پانچ منٹ گزر گئے۔

اچانک ہی وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور اچانک ہی سرچ لائٹیں جلا کر اُنہیں للکارنے لگے تھے۔

''بھاگو.....!''

شور وغل کے درمیان قاسم کی بلند دھاڑ سنائی دی اور پھر ہاں عجیب افراتفری مچ گئی۔ شہریار کا اونٹ بھی دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے اونٹ پر جم کر بیٹھے رہنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی اور ہر لمحے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی پل نیچے گر جائے گا۔ اُس کا یہ اندیشہ اس صورت پورا ہوا کہ ایک فائر کی آواز گونجی اور ایک انگارہ سا اُس کے بازو میں گھس گیا۔ پھر اُسے مزید بھی فائر سنائی دیئے اور اُس کا بھاگتا ہوا اونٹ بھیانک آواز میں چیخا۔ انسانوں کی ہوس نے اُس معصوم جانور کو بھی جنگ کا ایندھن بنا دیا تھا۔ زخمی اونٹ نے بلبلا کر اُسے نیچے پٹخ دیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

اُن کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی اور عجب خوف کا عالم تھا۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس مشن پر

نکلنے سے قبل ہی اُسے باور کروا دیا گیا تھا کہ قدم قدم پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے اگر وہ حو
نہ رکھتا ہو تو پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس نے بہت دلیری سے اس پیشکش کو ٹھکرا کر آگے بڑ
فیصلہ سنا دیا تھا۔ اپنے اس فیصلے پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا لیکن وہ ایسے مرحلے پر نہیں مرنا چاہتا تھا کہ اس
اپنے مشن کے سلسلے میں کچھ کیا ہی نہیں تھا اور ابھی صرف بھارت کی سرزمین پر قدم رکھنے کی کوشش کر رہا
اُسے ان زخموں کی بھی پروا نہیں تھی جو ایک بارودی گولی کے بازو کو چوم جانے اور اونٹ کے خود کو پٹخ
کے باعث لگے تھے۔ زخموں کو تو وہ ہر مجاہد کی طرح اپنے لیے حقیقی میڈل سمجھتا تھا لیکن اس وقت اس
نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہی تھا کہ کسی طرح اس ناگہانی صورتِ حال سے بچ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جا
تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر سکے۔

بچنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح وہ یہاں سے نکل کر دور دکھائی دینے والی آبادی تک
جائیں۔ سفر سے پہلے اس نے جو ضروری معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق نظر آنے والی قریب
آبادی ایک ایسا گاؤں تھا جس میں سکھوں اور ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی اور مسلمانوں کے چند ہی
پائے جاتے تھے۔ اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ لوگ اس آبادی میں پہنچ کر کسی مسلمان کے گھر میں داخل ہو
وہاں اُنہیں پناہ مل جائے گی۔ لیکن مسئلہ اُس آبادی تک پہنچنے کا ہی تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اسے
کے لیے مہیا کیا گیا اونٹ یہاں پٹخ گیا تھا۔

''سر! آپ میرے ساتھ آئیں۔'' اُسے گرے چند سیکنڈز ہی گزرے ہوں گے کہ اس نے اپنے
سلّو کی آواز سنی۔ وہ اپنے اونٹ پر سوار تھا اور اسے پکار رہا تھا۔ اس نے اونٹ کی طرف دیکھا اور بے بسی
سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ کوئی مشکی گھوڑا نہیں تھا کہ وہ جھپٹ کر اس پر سوار ہو جاتا۔ وہ اونٹ تھا جس پر اسی
سوار ہوا جا سکتا تھا کہ وہ نیچے بیٹھ جاتا۔

سلّو کو بھی یہ بات سمجھ آ گئی اور اس نے شدید خطرے میں ہونے کے باوجود اونٹ کو مہارت کے
نیچے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سلّو کو اونٹ کو بٹھاتے دیکھ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا تھا، اس لیے بنا وقت ضائع
سلّو کے پیچھے اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ سلّو نے فوراً ہی اونٹ کو کھڑا کر دیا۔ یہ عمل معمول کے مقابلے
دس گنا تیزی سے ہوا تھا اس لیے شہریار کو بہت زور کا جھٹکا لگا اور ابھی وہ اس پہلے جھٹکے سے سنبھلے نہیں
کہ اونٹ تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی رفتار حیرت انگیز تھی۔

''خود کو سنبھال کر بیٹھنا سر! اگر گر گئے تو میں دوبارہ آپ کو اٹھانے کے لیے نہیں رُکوں گا۔'' سلّو نے
مہارت سے اونٹ کو دوڑاتے ہوئے اسے وارننگ دی تو اس نے اپنے ہاتھوں کو مزید مضبوطی سے اونٹ
کوہان پر جما دیا اور کوشش کرنے لگا کہ خود کو ہر صورت اس صحرائی جہاز پر سوار رکھ سکے ورنہ یقیناً اسے
چانس ملنا مشکل تھا۔

''اپنا سر نیچے رکھنا سر! گولی اِدھر اُدھر لگے تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے اگر بھیجے میں گھسے تو پھر دوسری
کا ٹکٹ کٹ کر ہی رہتا ہے۔'' ان کے اردگرد فائرنگ کا سلسلہ اسی تواتر سے جاری تھا چنانچہ سلّو نے اونٹ
دوڑاتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ قافلے میں شامل افراد خود کو بچانے کی کوشش میں مصروف
تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کوشش میں کتنے کامیاب ہیں اور کتنے گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔ وہ تو
سلّو جیسے پائلٹ کے پیچھے بیٹھا صحرائی جہاز کہلانے والے جانور کی پشت پر خود کو قائم رکھنے کی کوشش



مصروف تھا۔

یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ بے شک فائرنگ اور میگافون پر دی جانے والی وارننگ کی آوازیں اب
سنائی دے رہی ہیں لیکن ان کی شدت پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب ان کے قریب
گولیاں شوں کر کے گزرنے والی گولیاں لاپتہ ہو چکی تھیں۔ جس کا ایک واضح مطلب یہ تھا کہ وہ خطرے کی
سے دور نکل آئے ہیں۔ اس احساس کی تصدیق کے لیے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

''خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے، پر اتنا موقع مل گیا ہے کہ ہم زندگی بچانے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔'' سلّو کی
بات بلا کی تیز تھیں۔ اس نے اپنا منہ آگے رکھنے کے باوجود اس کی حرکت کو محسوس کر لیا اور نہایت سنجیدگی
سے بولا۔ اس کی بات کی تائید کے لیے یہ امر کافی تھا کہ اس نے ابھی تک اونٹ کی رفتار کو کم نہیں کیا تھا۔ یہ
اس کی تیز رفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے بہت دور محسوس ہونے والی آبادی اب کافی قریب محسوس ہونے لگی
تھی۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ دس منٹ کے اندر اندر آبادی میں پہنچ جائیں گے لیکن اس کی توقع کے
برعکس دو چار منٹ مزید سفر کرنے کے بعد سلّو نے اونٹ کو روک دیا اور اسے نیچے بٹھانے لگا۔

''یہاں سے ہم پیدل چل کر گاؤں میں داخل ہوں گے۔ اونٹ پر گئے تو پہرے دار وغیرہ کی نظر میں آ
جائیں گے۔'' نیچے اُترنے سے قبل اس نے شہریار کو وضاحت دی جسے سن کر وہ سر ہلاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ نیچے
اترتے ہوئے اس کے زخموں نے شدید احتجاج کیا لیکن یہ وقت ایسی باتوں پر کان دھرنے کا نہیں تھا چنانچہ وہ
تکلیف کو نظر انداز کرتا ہوا سلّو کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

رات خاصی اندھیری تھی اور انہیں ایک دوسرے کے وجود بھی سایوں کی طرح ہی نظر آ رہے تھے۔
سلّو نے پہلے بیٹھے ہوئے اونٹ کو کھڑا کر کے ایک طرف ہنکایا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی پشت پر بندھا ہوا
بیگ اُتار لیا۔

''تم زخمی ہو اس لیے بوجھ میں اٹھا لیتا ہوں۔'' اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں کہا اور تیز تیز قدموں
سے چلنے لگا۔ شہریار بھی زخمی ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دینے کی پوری پوری کوشش کرنے لگا۔

''معاف کرنا، ساتھ کام کرنے میں آپ جناب کا تکلف کرنا مشکل لگتا ہے اس لیے میں نے تمہیں ''تم''
کہہ کر پکارا ہے۔'' تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے کہا تو انتہائی مخدوش حالات کے باوجود شہریار مسکرا دیا
اور بولا۔

''مجھے خود کو آپ جناب کہلوانے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے۔ اس لیے تم اپنی سہولت کے حساب سے جو
چاہے کہہ کر بلا سکتے ہو۔''

''تھینک یو۔'' اُس نے اپنے اکھڑ انداز میں شکریہ ادا کیا لیکن لہجے میں انکساری کا نام و نشان تک
نہیں تھا۔

باقی کا راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔ گاؤں کی حدود شروع ہوئیں تو وہ دونوں زیادہ محتاط ہو
گئے۔ کچھ دیر قبل زوردار فائرنگ ہوئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود رات کے سناٹے
میں آواز گاؤں میں بھی سنی گئی ہو۔ ایسی صورت میں گاؤں والوں کے جاگتے ہوئے ملنے کا امکان تھا۔ چنانچہ
ان کی کوشش تھی کہ وہ فوراً ہی اندر داخل نہ ہو جائیں بلکہ پہلے دُور سے حالات کا جائزہ لیں۔ اس مقصد کے
لیے انہوں نے باہر سے ہی گاؤں کے گرد چکر لگایا۔ یہ بہت زیادہ آبادی والا گاؤں نہیں تھا اور اندازے
کے مطابق یہاں مشکل سے پچاس سے ساٹھ گھر موجود تھے۔ ان گھروں میں زیادہ تر نیم پختہ اور

کچے تھے جیسا کہ عموماً گاؤں دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔

ابھی وہ اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ یہاں ایک آدھ گھر ایسا بھی ہوگا جو گھروں کے مقابلے میں مضبوط اور پکا ہوگا اور وہاں گاؤں کا سردار اور اہلِ خانہ مقیم ہوں گے۔ انہیں سے تو خیر کیا لینا دینا تھا، بس اپنے لیے ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی جہاں وہ محفوظ رہ پاتے۔

شہریار کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی مسلمان کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ انہیں زیادہ سے پناہ دے دے گا۔ لیکن باہر سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس گھر میں مسلمان مقیم ہیں، سکھ یا ہندو۔ دُور دُور سے لیے گئے جائزے کے دوران البتہ وہ یہ اندازہ ضرور لگا چکے تھے کہ فائرنگ کے نتیجے میں کوئی شخص بیدار نہیں ہوا ہے۔ یا اگر ہوا بھی ہے تو اس نے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید سرحد سے قریبی گاؤں ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح کی فائرنگ وغیرہ سننے کے عادی تھے۔

اطمینان کر لینے کے بعد وہ دونوں آبادی کے اندر داخل ہو گئے۔ اب مسئلہ اس انتخاب کا تھا کہ کس میں داخل ہوا جائے۔ عام گھروں کی چند فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو جانا تو کوئی بڑی بات نہ تھی اور شہریار جائزہ لے رہا تھا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔

''ہمیں ان دو تین پکے مکانوں میں سے کسی میں پناہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' اس کے خیال کے بالکل برعکس سلّو نے سرگوشی میں اپنی رائے دی۔

''یہ تو سرداروں وغیرہ کے مکان ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے مکان میں گھسنا اور مکینوں کو قابو کرنا تھوڑا مشکل ہوگا۔ ان گھروں میں افرادِ خانہ کے علاوہ ملازمین اور اسلحے کی موجودگی کا بھی پورا پورا امکان ہے۔'' اس نے سلّو کی رائے کے جواب میں درپیش خطرات کا اظہار کیا۔

''یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہم اندر گھس کر پوزیشن اپنے کنٹرول میں کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو آگے کی ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔ ان سرداروں کی بڑی پہنچ ہوتی ہے۔ اگر ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آیا تو سردار کے گھر کی تلاشی لینے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔'' سلّو نے نہایت اطمینان سے بیان کیا جس کے بعد اسے اس کی تجویز قبول کرنی ہی تھی۔ ویسے بھی اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سردار کے گھر میں اگر مسلح ملازمین موجود بھی ہوئے تو ان کے لیے انہیں سنبھالنا بڑی بات نہیں ہوگی۔ وہ جس تربیت کے بل بوتے پر ''را'' اور دیگر بھارتی ایجنسیوں سے نبرد آزما ہونے کا عزم دل میں لیے یہاں آیا تھا، اس کے سامنے بھلا کسی چھوٹے سے گاؤں کے سردار کے ملازمین اور اسلحہ کیا حیثیت رکھتے تھے۔

شہریار کھلے دل سے اس کی تجویز قبول کرتے ہوئے اس پختہ مکان کی طرف پیش قدمی کر گیا۔ پورے گاؤں میں سب سے بڑا اور شاندار تھا۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اندازہ یہی تھا کہ مکین اس پہر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پہل سلّو نے کی اور پلک جھپکتے میں احاطے کی پانچ فٹ اونچی دیوار پار کر کے اندر کود گیا۔ شہریار نے بھی اس کی پیروی کی۔ لیکن ابھی وہ دیوار پر پہنچ کر دوسری طرف نہیں تھا کہ اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر تاریکی میں اُس کا ہیولا نظر آنے لگا۔ وہ غرا رہا تھا اور جس دلیری سے سامنے آیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ مقابل کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے میں کمال رکھتا ہوگا۔ اگر اس وقت اس کے پاس سائلنسر لگا ہوا پسٹل موجود ہوتا تو وہ ایک فائر کر کے کتے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتا۔ لیکن اتفاق سے اس کا بیگ سلّو نے تھام رکھا تھا اور وہ فی الوقت غیر مسلح تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُس کے پاس پنڈلی سے بندھا ایک خطرناک خنجر بھی تو تھا۔



اس نے فوراً اس خنجر کو کھینچ کر پنڈلی پر سے اُتارا اور کتے کی طرف اچھال دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ خنجر ہدف تک پہنچتا، کتا بری طرح پھڑکا اور پھر بے آواز زمین پر گر گیا۔ کتے کے گرتے ہی اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔

سلّو اس دوران مُردہ کتے تک پہنچ چکا تھا اور اس کے بھیجے میں اُترا ہوا اپنا خنجر باہر نکال رہا تھا۔

''تم بھارتی کتوں سے نمٹنے کے لیے یہاں آئے ہو نا؟ تو سمجھو اس کام کا آغاز ہو گیا۔'' خون آلود خنجر کو کتے کے لمبے بالوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف دیکھے بغیر مسخرے پن سے کہا۔

شہریار اُس کے ریمارکس پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر آگے بڑھا اور زمین پر جھک کر اپنا خنجر تلاش کرنے لگا اور اسے واپس اس کی جگہ پر باندھ لیا۔ کتے کے بھونکنے کا کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا اس لیے انہوں نے مزید پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ بے چارے کتے کی لاش وہیں ایک ڈھیر کی شکل میں پڑی رہی۔

اب وہ گھوم پھر کر احاطے میں موجود مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ مکان صرف ایک منزلہ ہی تھا لیکن اس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بہت مضبوط تھے اور سب کے سب اندر سے بند بھی، اس لیے ان دونوں کے لیے سے وہ اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اب دوسرا طریقہ یہی رہ جاتا تھا کہ وہ مکان کی چھت پر پہنچ جائیں اور وہاں سے اندر داخل ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں۔

ایک منزلہ مکان کی چھت پر چڑھ جانا ان دونوں کے لیے ہی مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ لمحہ بھر میں وہ اوپر تھے۔ شہریار کو البتہ اپنے زخمی بازو کی وجہ سے ذرا تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد اس نے بازو کو ہلا جُلا کر اپنی تسلی کر لی تھی۔ بازو کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا اور گولی ذرا سا گوشت پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم سے خون کا رساؤ بہرحال جاری تھا جس نے اس کی آستین کو رنگ ڈالا تھا۔ یہ اور بات کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے فی الحال اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

''جی آیاں نوں۔ میں ادھر کھڑی تہاڈا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' ابھی وہ دونوں چھت پر پہنچے ہی تھے کہ نسوانی آواز سنائی دی۔

دونوں ہی نے بری طرح بھڑک کر آواز کی سمت دیکھا۔ اندھیرے کے باعث منظر زیادہ واضح نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑی عورت کا ہیولا دیکھ سکتے تھے۔ وہ جس طرح تن کر کھڑی تھی، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اچھے قد کاٹھ کی جوان العمر عورت ہے۔ آواز سے بھی وہ جوان ہی محسوس ہوئی تھی۔ سلّو نے پھرتی دکھاتے ہوئے اپنی گن نکال کر اس کا رخ عورت کی طرف کر دیا۔

''یہ بغیر آواز کے چلتی ہے۔ اگر تُو نے ذرا بھی شور مچایا تو تیرے بھیجے میں گولی اُتار دیں گے اور تُو کسی کو سلام ہونے سے پہلے اوپر پہنچ جائے گی۔'' اس نے دھیمی آواز میں غراتے ہوئے عورت کو دھمکی دی۔

''یہ تو کوئی گل نہ ہوئی جی۔ میں تہاڈا سواگت کر رہی ہوں اور تم مینوں مارنے دی دھمکی دے رہے ہو۔'' اس نے بڑے معصومانہ انداز میں شکوہ کیا اور پھر مزید بولی۔ ''اگر مینوں شور ہی کرنا تھا تو اس ویلے کرتی جب تم نے میرے کتے کو مارا تھا۔ کتنا سوہنا جناور (جانور) تھا۔ پر چھڈو، اساں تینوں معاف کیتا۔''

وہ عجیب و غریب کردار کی صورت میں اچانک ان کے سامنے آئی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس سے کس طرح نمٹا جائے۔ اگر وہ ان کے مقابلے پر کھڑی اُنہیں نقصان پہنچا رہی ہوتی تو اسے آرام سے زیر کر لیا جاتا۔ لیکن وہ تو ایسے باتیں بگھار رہی تھی جیسے ان کے استقبال کے لیے ہی وہاں کھڑی ہو۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں ہے اور وہ دونوں ہاتھ سامنے کیے بالکل نہتی کھڑی ہے۔ انداز

نڈر ہونے کے باوجود لہجہ دھیما تھا جیسے وہ خود بھی نہ چاہتی ہو کہ کوئی اس کی آواز سن سکے۔

''اب کیا کھڑے کھڑے میرا منہ ہی تکتے رہو گے؟ یہاں تک آئے ہو تو میرے ساتھ نیچے بھی چلو ذرا دھیان سے۔ نیچے گھر میں بہت لوگ ہیں۔ کوئی آواز سن کر جاگ بھی سکدا ہے۔'' وہ اس انداز سے جیسے پورا یقین ہو کہ وہ دونوں ضرور اس کے پیچھے آئیں گے۔

ہوا بھی یہی لیکن کچھ اس طرح کہ سلّو نے عورت کے عین پیچھے پوزیشن لے کر گن کی نال اس کی گ سے لگا دی اور دھمکی دی۔

''اگر تم نے ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے تم اپنی جان سے جاؤ گی۔'' ا اندیشہ تھا کہ عورت کے ذریعے انہیں ٹریپ کرنے کی کوشش نہ کی جا رہی ہو اور جب وہ نیچے پہنچیں تو مسلح ا ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں۔

''فکر نہ کرو بھائیاں جی! میں تہاڈے ساتھ کوئی چال نئیں چل رہی ہوں۔ میں تو بس تہاڈی مدد کر ہوں۔ تم بس بالکل چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

اب عورت کی آواز پہلے کے مقابلے میں مزید دبی ہوئی تھی اور وہ اتنی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی واقعی لگتا تھا کہ وہ شدت سے اس بات کی متمنی ہو کہ اہلِ خانہ میں سے کوئی آہٹ سن کر جاگنے نہ پائے۔

سیڑھیاں اُترنے کے بعد وہ اُنہیں لیے دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گئی۔ یہاں ایک قطار میں تین دروا نظر آ رہے تھے۔ تینوں ہی دروازے بند تھے۔ عورت پہلے دروازے پر رُکی اور اسے ہاتھ سے ہلکا سا دے کر کھولا۔ عورت کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ دونوں ذرا سا جھجکے کہ کہیں اس کمر صورت چوہے دان میں نہ پھنس جائیں۔ لیکن اہم بات یہ تھی کہ عورت ان سے پہلے کمرے میں داخل ہوئی ا اگر وہ کمرہ ان کے لیے چوہے دان ہوتا تو وہ خود بھی ان کے ساتھ اندر پھنس جاتی۔ جبکہ اس کے انداز ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ کسی ۔ کہے پر انہیں پھنسانے کی کوشش کر بھی رہی تھی تو ا یہ خوف تو ہونا چاہئے تھا کہ اس کی جان مشکل میں پھنس جائے گی۔ لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ نظر نہ رہا تھا۔

عورت کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر پلنگ پر سوئے ہوئے مرد پر پڑی۔ سلّو تو ہی عورت کو کور کیے ہوئے تھا، شہریار جھپٹ کر مرد کے قریب پہنچا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر باہر نکال لیا۔

''اس کی چنتا نہ کرو۔ یہ بہت گہری نیند سو رہا ہے، ہور اگر اس کے سر پر ڈھول بھی بجاؤ گے تو جاگے گا۔'' عوت نے نہایت اطمینان سے انہیں مطلع کیا۔ اب تک وہ اندھیرے میں اس کا ہیولا ہی رہے تھے لیکن کمرے میں جلتی لالٹین کی روشنی میں اسے واضح طور پر دیکھنے کا موقع ملا تو دم بخود رہ گئے۔ مشکل سے بیس سال کی انتہائی خوب صورت لڑکی تھی جس کے کٹیلے نین اور رس بھری جیسے ہونٹ سادگی بھی دیکھنے والوں کو متوجہ کرتے ہوں گے۔ لیکن اس وقت تو وہ سولہ سنگھار کیے غضب ڈھا رہی تھی۔ ریشمی کام دار کُرتہ، ہم رنگ دھوتی، چنا ہوا چمک دار دوپٹہ، ناک، کان، گلے اور ماتھے پر سجا زیور، آنکھوں پڑے کاجل کے بڑے بڑے ڈورے اور ہونٹوں پر لگی سرخی کے ساتھ بانہوں میں چھنکتی چوڑیاں..... سب کر اعلان کر رہی تھیں کہ وہ نئی نویلی دُلہن ہے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اتنی طرح دار عورت کا شوہر پلنگ پر مدہوشی کی نیند سو رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' سلّو نے جو اپنے پیچھے دروازے کو پہلے ہی بند کر چکا تھا، اپنے اندازے کی تصدیق



ا ارت سے پوچھا۔

''یہ میرا پتی سربجیت سنگھ ہے۔ میں امرت کور ہوں۔ ہمارا ابھی چار روز پہلے ہی ویاہ ہوا ہے۔'' اس نے اب دیا تو اس کی آنکھیں اندرونی تپش کے تحت دہک رہی تھیں اور لہجے میں شدید تلخی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم ہمیں کھل کر اپنے بارے میں کچھ بتا دو اور یہ بھی کہ تم ہمیں اپنے ساتھ یہاں کیوں ا ہو؟'' یہ احساس ہو جانے کے بعد کہ یہاں فی الحال ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہ دونوں ہی ذرا اس ہو گئے تھے اور ایک موڑھے پر ٹکتے ہوئے شہریار نے اس سے یہ سوال کیا۔

''اپنا نام تو میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے، باقی بھی بتا دیتی ہوں۔'' وہ پلنگ پر اپنے پتی کی پائینتی سے ا گئی اور کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں بتانے لگی۔

''میرے ماتا پتا کا میرے بچپن میں ہی دیہانت (انتقال) ہو گیا تھا اور میں یہیں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوں۔ یہ میرے تاؤ جگجیت سنگھ کا گھر ہے۔ میرے تاؤ کی دو وہٹیاں ہیں جن میں سے وڈی سے تین ہور چھوٹی چار اولادیں ہیں۔ وڈی تائی کی اولادیں عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں اس لیے میری ان سے زیادہ ا تائی کے بچوں سے بنتی تھی۔ خاص طور پر دلجیت سنگھ اور آشا کور میرے پکے سنگی تھے۔ بچپن ہنستے کھیلتے اور ے کب بیتا کچھ پتہ ہی نہیں لگا۔ تاؤ اور چھوٹی تائی کا سلوک میرے ساتھ چنگا تھا، پر وڈی تائی نک چڑھی ل اور آنے بہانے سب بچوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھی۔ میں نے تو کئی واری اپنی چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر اس ے ہاتھوں بری طرح مار بھی کھائی۔ تاؤ کو میرے پٹنے کا دکھ بھی ہوتا تھا پر وہ وڈی تائی کو زیادہ کچھ اس لیے ں کہہ سکتے تھے کہ اس کا میکہ وڈا مضبوط تھا، ہور اس کے پیو اور بھرا ذرا ذرا سی گل پر لڑنے مرنے کے لیے ا جاتے تھے۔ وڈی تائی جیسی تھی، ویسے ہی اس کے بچے بھی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ گھلتا ا نہیں تھا لیکن رعب سب جماتے تھے۔ خاص طور پر یہ سربجیت تو بہت ہی لڑاکو اور غصیلا تھا۔ بلاوجہ ہی کبھی ی چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا تو کبھی بانہہ مروڑ دیتا۔ میں تکلیف سے روتی تو یہ ہنسنے لگتا۔ دلجیت سے میرا رونا نہ ا جاتا ہور وہ میری خاطر اس سے لڑنے کھڑا ہو جاتا۔ لیکن وہ وچارہ عمر ہور قد کاٹھ میں سربجیت سے بہت م تھا اس لیے ہر واری بری طرح مار کھاتا اور ہار جاتا۔

میں نے یہ حال دیکھا تو دلجیت کو بچانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو چپ چاپ سہنا شروع کر دیا۔ ان اپنے من میں پلتے دو جذبوں کو بڑھنے سے نہ روک سکی۔ ان میں ایک جذبہ سربجیت سے سخت نفرت کا تھا ا دوسرا دلجیت سے گہری محبت کا۔ دلجیت بھی میری ہی طرح مجھ سے بڑا پریم کرتا تھا اور ہم سوچتے تھے کہ ب بڑوں کے بعد ہمارے ویاہ کی باری آئے گی تو ہم ایک ہو جائیں گے۔ آشا ہمارے پریم کی رازدار تھی اور ال ہوتی تھی کہ میں اُس کی بھابو بن کر ہمیشہ اسی گھر میں رہوں گی۔ وہ چپکے چپکے مجھ سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتی ال تھی۔ مجھے دلجیت کا پریم ہور آشا کی چھیڑ چھاڑ دونوں ہی سے بڑا سرور آتا تھا ہور میں دن گنتی رہتی تھی ر کب وہ دن آئے گا جب ہمارے سپنے سچ ہوں گے۔ لیکن قسمت کی مار کہ وہ دن کبھی نہیں آیا ہور مجھے ال اچانک یہ خبر سننے کو ملی کہ وڈی تائی نے سربجیت کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا ہے ہور اب میرا ویاہ اس ہو گا۔

میں بڑا روئی تڑپی۔ دلجیت ہور آشا بھی پریشان ہو گئے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آشا نے چھوٹی تائی ال اپنی ماتا سے گل کر کے انہیں یہ راز بتایا کہ میں ہور دلجیت ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں ہور میں ا کے سوا کسی کی استری (بیوی) بننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ سن کر وہ گھبرا گئی ہور ایک دن اکیلے میں مجھے

اپنے کمرے میں بلا کر اپنی چنری میرے قدموں میں ڈال کر بولی۔ دیکھ امرت! دلجیت میرا ایک ہی پتر ہے اور اپنی تین بہنوں کا اکیلا سہارا ہے۔ اگر یہ گل کسی کو ملوم ہو گئی کہ تُو ہور دلجیت ایک دوجے سے پریم کرتے ہیں تو سربجیت میرے پتر کی جان کے پیچھے پڑ جائے گا۔ تُو جانتی ہے کہ وہ مزاج کا کتنا ہٹیلا اور خودسر ہے اس سے ذرا برداشت نہیں ہو گا کہ تُو اس کا رشتہ ٹھکرا کر دلجیت کا نام لے۔ وہ تجھے ہور دلجیت دونوں کو زمین میں گاڑ دے گا۔ اب تُو خود سوچ کر فیصلہ کر لے کہ چپ چاپ سربجیت سے ویاہ کر کے اس طوفان کو ٹال دیتی ہے یا فیر اپنی ہور دلجیت کی جان گنواتی ہے؟

مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن دلجیت کو کانٹا بھی چبھے، یہ گوارا نہیں تھا اس لیے بچپن میں دلجیت کو بھانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی، ویسے میں اس بار بھی چپ ہو گئی۔ دلجیت نے بہت کوشش کی کہ مجھ سے گل کر سکے۔ آشا کی زبانی اس نے مجھے کوئی پیغام بھیجے لیکن میں نے جواب دیا کہ میں بڑوں کے فیصلے پر خوش ہوں۔ یوں میں نے پریمی کو بچانے کے لیے اپنے پریم کو بھلا چڑھا دیا اور سربجیت کی دھرم پتنی بننا منظور کر لیا۔ ویاہ کے ویلے میرے من میں یہی تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح من پر جبر کر کے یہ رشتہ نبھا لوں گی لیکن سربجیت نے پہلی ہی رات یہ واضح کر دیا کہ وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس سے وفا کی جا سکے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ چنگی طرح جانتا ہے کہ میں ہور دلجیت ایک دوجے سے پریم کرتے ہیں اسی لیے اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تاؤ نے دُوجا ویاہ کر کے اس کی ماں کو تکلیف دی تھی اس لیے اس نے مجھ سے ویاہ کر کے چھوٹی تائی ہور اس کی اولاد کو تکلیف دی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں چونکہ بچپن سے ہی چھوٹی تائی کے بچوں سے قریب تھی اور ہر وقت ان میں کھیلتی کودتی رہتی تھی اس لیے وہ ان لوگوں کی طرح مجھ سے بھی سخت نفرت کرتا تھا ہور اسی نفرت کے کارن اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی نفرت ثابت بھی کر دی ہور میرے سارے پنڈے بھنبھوڑ ڈالا۔ ایہہ دیکھو۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی دونوں آستینیں اوپر کیں تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے بھرے بھرے گورے بازوؤں پر جابجا زخم کے نشان ہیں۔ یہ نشان ایسے تھے جیسے کسی نے اسے دانتوں سے کاٹا اور نا ملنے سے نوچا ہو۔

''ایسے بہت سارے نشان میرے پورے پنڈے وِچ موجود ہیں ہور میں ان نشانوں کو ریشمی خوب صورت کپڑوں کے نیچے چھپا کر پھر رہی ہوں کہ کہیں دلجیت کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ سربجیت نے مینوں اس بری طرح مارا ہے تو فیر کسی گل دی پروا کیے بغیر اس سے اُلجھ جائے گا۔ ہور میں ایسا نہیں چاہتی۔ ایہہ سربجیت ہے نا، ایہہ موقع دی تلاش میں ہے۔ دلجیت اگر ذرا بھی اُلجھا تو ایہہ اس دی جان لے لے گا۔''

اس نے ایک نفرت بھری نظر پلنگ پر بے خبر سوئے اپنے پتی پر ڈالی اور سسکنے لگی۔ ان دونوں ہی کو امرت کور کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ وہ اتنی پیاری اور نرم و گداز سی دوشیزہ حقیقتاً اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس کے شوہر نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ وہ یقیناً نہایت جاہل اور وحشی آدمی تھا جس نے ایک معصوم لڑکی کو ایک ایسی بات کے لیے نفرت کا نشانہ بنا رکھا تھا جس میں اس کا سرے سے کوئی قصور نہیں تھا۔

جگجیت سنگھ کی دو شادیوں میں امرت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ تو گاؤں، دیہاتوں کا ایک عمومی رواج



صاحبِ حیثیت و صاحبِ اختیار لوگ ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے تھے۔ امرت کور کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ سربجیت کے ننھیال والے بڑے ڈاہڈے لوگ تھے اور بہن کی حمایت میں بہنوئی کے سامنے کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگاتے تھے لیکن انہوں نے بھی یقیناً اس رواج کو سمجھتے ہوئے بہنوئی کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں کھڑی کی تھی ورنہ جگجیت سنگھ جو گھریلو معاملات میں بیوی سے دبتا تھا، دوسرا بیاہ کیونکر کر پاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی دوسری شادی کچھ خاص حالات میں ہوئی ہو اس لیے بھی اس کے سسرالیوں کو بولنے کا موقع نہ ملا ہو۔ بہرحال وجہ جو بھی تھی، انہیں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ امرت کور نے اُنہیں اپنے کمرے میں کیوں پناہ دی ہے اور وہ یہ ساری کہانی سنا کر ان سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے؟

''ایہہ سربجیت ہے نا، ایہہ کتنا کمینہ ہے..... تساں اس گل دا اندازہ کر سکدے ہو کہ اس نے جان بوجھ کے ویاہ سے پہلے ایہہ کمرہ اپنے لیے لیا کہ اس دے برابر والا کمرہ دلجیت دا ہے ہور یہ چاہندا ہے کہ دلجیت نوں تصور نال راتاں تڑپ تڑپ کے گزارے کہ اس دی محبوبہ برابر والے کمرے وِچ کسی ہور دی بانہاں میں ہے۔ اس نے مینوں یہ بھی بتایا ہے کہ دو چار سال بعد مجھ پر سوت لے آئے گا تے فیر اس دا انتقام پورا ہو جائے گا۔'' اس نے ان پر مزید حقائق عیاں کیے۔

''ہمیں تمہارے حالات جان کر بہت افسوس ہوا بی بی! لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم یہ سب ہمیں کیوں بتا رہی ہو اور ہم سے کیا چاہتی ہو؟'' اس رات کی صبح بھی ہونی تھی اور یقیناً صبح ہونے کے بعد ان کی امرت کور کے کمرے میں موجودگی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے بارے میں سوچے بغیر ساری رات اس کی داستانِ غم سنتے ہوئے گزار دیں۔ اسی لیے شہریار نے اس کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم اسے قتل کر دو۔'' اس نے اپنے پتی پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اپنی اصل بیان کی۔ اس پل اُس کے خوب صورت نقوش والے معصوم چہرے پر بڑی سفاکی چھا گئی تھی۔ اس کی اصل جان کر شہریار تو بالکل بھونچکا ہی رہ گیا البتہ سلّو نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''اس کام کے بدلے ہمیں تم سے کیا فائدہ ہو گا؟''

''تہانوں پہلے ہی مجھ سے فیدہ ہو رہا ہے۔ جب تساں نے چار دیواری پھلانگی تھی ہور کتا بھونکا تھا تو تساں نے اپنی اکھاں نال سب دیکھیا سی پر شور نہ کیتا۔ ورنہ اس ویلے تم اتنے آرام نال نہ بیٹھے ہوتے۔ جس ویلے تم نے گولی ماری ہے نا، وہ میرا پالتو کتا تھا۔ مینوں اس نال بڑا پریم تھا۔ پر مینوں مجبوری ہے۔ اس آدمی توں پیچھا چھڑان لئی مینوں اِک موقع ملیا ہے، جسے میں ضائع نہیں کر سکدی۔ تسی دسّو..... سودا کرنا ہے؟ تسی اینوں ٹھکانے لگا دو، میں تہانوں گاؤں توں باہر نکال دوں گی۔'' اس نے بلی تھیلے سے باہر نکالی۔

''تم بتاؤ کہ یہ اتنی گہری نیند کیسے سو رہا ہے کہ ہم اس کے سر پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں پھر بھی اس کی آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔'' وہ لڑکی جو اب تک انہیں مظلوم لگ رہی تھی، اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کرتے دیکھ کر چالاک لگنے لگی اس لیے وہ ہرزاویے سے اس پر شک کرنے میں حق بجانب تھے۔

''اینوں شراب دی عادت ہے۔ تن راتاں سے ایہہ شراب پی کر مجھ پر ظلم کر رہا تھا۔ آج میں نے اس شراب نال افیم ملا کر پلا دی ہے اس لیے یہ مُردوں کی طرح پڑا سو رہا ہے۔ مینوں اس نال اتنی نفرت ہے کہ

میں اس دی جان بھی لے سکدی ہوں۔ پر فیدہ کی ہوگا؟ اس دے قتل دے الزام میں پھنس کر میری زندگی خراب ہو جائے گی۔ پر اگر تسی اس کو قتل کر دو تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ودھوا (بیوہ) ہونے کے بعد یا تو دلجیت سے ویاہ ہو جائے گا یا میں ساری حیاتی ایسے ہی ادھر پڑی رہوں گی۔ مینوں دونوں ہی گلاں منظور ہن پر اس دے سنگ رہنا وڈا مشکل ہے۔''

وہ سربجیت سے واقعی بڑی شدت سے نفرت کرتی تھی اس لیے اسے یہ بھی منظور تھا کہ چاہے وہ بعد اپنے محبوب کو نہ پا سکے لیکن کسی طرح اس آدمی سے جان چھوٹ جائے۔ اُس کی پُرکشش پیشکش کے باوجود شہریار تذبذب کا شکار تھا۔ سربجیت کتنا ہی ظالم اور کمینہ صفت سہی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی ان کے مقابل آیا تھا اس لیے ایک غیر متعلقہ آدمی کو قتل کر دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وطن دشمنوں کو انجام تک پہنچانا دوسری بات تھی لیکن اس کے پاس کسی کو باقاعدہ سازش کر کے قتل کر دینے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی ایسے شخص کو جو ان کے سامنے ہوش و حواس سے بے گانہ اور بے دست و پا پڑا تھا۔

''ہم تمہارا یہ کام کر دیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم ہمیں گاؤں سے باہر کیسے نکالو گی؟ کیا اس کام کے بعد دلجیت ہمارے ساتھ جائے گا؟'' شہریار کے برعکس سلّو مفادات کو ترجیح دینے والا تھا کیونکہ اس کی تربیت انہی خطوط پر ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی امرت کور کی پیشکش قبول کر لی اور اپنے اندازے کی بنیاد پر اس سے ایک اہم سوال کیا۔

''اونہوں۔'' امرت کور نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''دلجیت دا اس معاملے وچ کوئی تعلق نئیں ہے۔ میں خود تمہیں ادھر سے نکالوں گی۔ تم دونوں اس کو اٹھا کر اوپر چھت تے لے جاؤ ہور کتے کی طرح اس دے وچ بھی گولی مار دو۔ میں تیار ہو کر ابھی آتی ہوں۔'' اس نے اپنا پورا پروگرام بنایا۔

''تم نے ہمیں پاگل سمجھا ہوا ہے کہ ہم اس طرح تمہاری بات مان لیں گے؟ تم جیسی عورت کا بھروسہ ہے؟ جو عورت اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کر سکتی ہے وہ ہمارے ساتھ کیا رعایت کرے گی۔ چلا کہ ادھر ہم نے اوپر چھت پر تمہارے پتی کا کام تمام کیا اور ادھر تم نے شور مچا کر پورے گھر کو جگا ڈالا۔ اس طرح تم خود تو بچ جاؤ گی لیکن ہم پھنس جائیں گے۔''

''فیر تسی خود دسّو کہ کیا چاہتے ہو؟ ویسے میرا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نئیں ہے۔ تم چاہے کچھ سمجھو پر جو آگ میرے تن من کو لگی ہے، اسے میں ہی جاندی ہوں، ورنہ میں کوئی بری عورت نہیں ہوں۔'' سلّو کی سخت بات کا جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے لیکن وہ ذرا متاثر نہ ہوئی اور اسی لہجے میں بولا۔

''تمہارے پتی کو چھت پر لے جا کر ٹھکانے لگانے کا کام میں اکیلا کروں گا اور میرا ساتھی تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہے گا تاکہ اگر تم کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرو تو یہ تم سے نمٹ سکے۔''

''مینوں منظور ہے۔'' وہ فوراً راضی ہو گئی۔

اس کی رضامندی ملتے ہی سلّو نے لمبے چوڑے سربجیت کو پلنگ سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سربجیت کے قد و قامت کو دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ خاصا وزنی ہو رہا ہوگا جبکہ سلّو اس کے مقابلے میں ذرا کمتر نظر آتا تھا لیکن اس نے جتنے آرام سے سربجیت کو اٹھا رکھا تھا اسے دیکھتے ہوئے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ سے کہیں زیادہ وزنی بندے کو اٹھائے ہوئے ہے۔



''تسی زخمی ہو۔ لاؤ میں مرہم پٹی کر دیتی ہوں۔'' سلّو کے باہر نکلنے کے بعد وہ شہریار کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے زخمی بازو کو دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

شہریار کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن پھر بھی خاصا خون بہہ گیا تھا اس لیے بہتر تھا کہ اگر مرہم پٹی کا موقع مل رہا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لے۔ اُس نے امرت کور کی پیشکش قبول کر لی۔

اس کی طرف سے رضامندی ظاہر ہوتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گئی اور اس کی آستین ہٹا کر جگ میں سادے پانی میں کپڑا بھگو کر پہلے اس کے زخم اور اردگرد کے حصے سے خون صاف کیا۔

''ابھی میں پانی گرم کرنے رسوئی میں نئیں جا سکدی ہوں اس لیے اسی پانی سے کام چلانا ہوگا۔'' اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس نے شہریار سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ اتنا بھی کافی ہے۔'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

''چنگی گل یہ ہے کہ گولی اندر نہیں گھسی ہے۔ بس گوشت کو تھوڑا نقصان پہنچا کر نکل گئی ہے ورنہ وڈی مشکل ہو جاتی۔'' اب وہ اس کے زخم کو ڈیٹول سے صاف کرنے کے بعد اس پر کوئی مرہم لگا رہی تھی۔ شہریار کو حیرت ہوئی کہ اس نے زخم دیکھ کر کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ زخم گولی لگنے کا نتیجہ ہے ورنہ عموماً گھریلو عورتوں کو اس قسم کی شد بد نہیں ہوتی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ گولی کا زخم ہے؟'' اس نے اپنی حیرت کو سوال کا روپ دے ڈالا جس پر امرت کور بہت دھیمی آواز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ایک ردھم تھا اور بالکل یوں لگتا تھا کہ کہیں دُور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

''اس گھر دے جو مرد ہیں نا، ہتھیار ان کے لیے کھلونوں کی طرح ہیں ہور کھیل میں چوٹیں تو لگدی رہن۔ میں ایسی چوٹاں نوں دیکھ دیکھ کر ہی جوان ہوئی ہوں اس لیے چنگی طرح پہچانتی ہوں کہ یہ گولی کا ہی زخم ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی جاندی ہوں کہ تم سرحد پار سے آئے ہو، ہور سرحد پار کرتے ویلے ہی یہ زخم لگا ہے۔'' وہ اپنی یقین تھی کہ شہریار اسے جھٹلا نہیں سکا اور خاموش بیٹھا رہا۔

امرت کور نے بھی اسے نہیں چھیڑا اور خاموشی سے پٹی باندھنے کا کام مکمل کرنے لگی۔

''اب تسی منہ دوسری طرف پھیر لو۔ مینوں کپڑے وی بدلنے ہیں۔'' پٹی باندھنے کے کام سے فارغ ہو کر اس نے شہریار سے کہا تو اسے اس کی بات پر عمل کرنا پڑا۔ لیکن منہ دوسری طرف پھیر لینے کے باوجود وہ سب سے پوری طرح ہوشیار تھا کہ مبادا وہ اس پر پیچھے سے وار نہ کر دے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور صرف کپڑوں کی سرسراہٹیں سنائی دیتی رہیں۔

''میں نے کپڑے بدل لیے ہیں۔'' ایک آدھ منٹ میں ہی اس نے اطلاع دی تو شہریار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ریشمی سرخ جوڑا اتار کر اس کی جگہ مردانہ کپڑے پہن چکی تھی جو یقیناً اس کے پتی کے تھے۔ اچھے قد کاٹھ کی ہونے کے باوجود یہ کپڑے اس کے جسم پر ڈھیلے ہو رہے تھے۔ کپڑوں کے ساتھ اس نے اپنے سارے زیور، گہنے وغیرہ بھی اُتار دیئے تھے اور اب رگڑ رگڑ کر ہونٹوں پر موجود سرخی مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لمبے بالوں کی چوٹی کو بل دے کر جُوڑے کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے سلّو بھی واپس آ گیا۔ اس کی آمد سے بے نیاز امرت کور نے جُوڑا بنانے کا کام مکمل کیا اور پھر پھرتی سے اپنے سر پر پگڑی باندھنے لگی۔

حلیے کی اتنی تبدیلی سے وہ کچھ کچھ مرد لگنے لگی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی شخص اُسے دیکھتا
یہی سمجھتا کہ کوئی نوعمر لڑکا ہے۔ سلّو نے اس کا یہ حلیہ دیکھ کر سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے لیکن زبان
سے کچھ نہ بولا۔

''تم دونوں بھی اگر اس شہری لباس کی جگہ دھوتی باندھ لو تو چنگا ہوگا۔'' اس نے ایک اچھا مشورہ دیا۔
ان کی طرف سے رضامندی ملتے ہی انہیں بھی دھوتی کُرتے پر مشتمل ایک جوڑا فراہم کر دیا۔ سلّو اور شہریار
دونوں نے ہی اپنے کپڑے اُتارے بغیر اوپر سے دھوتی کُرتہ پہن لیا۔ اب وہ روانگی کے لیے تیار تھے۔ ان
اپنے پاس موجود بیگ شانوں پر لٹکا لیے تھے۔ اس موقع پر شہریار نے بھی اپنی گن اوپر نکال لی تھی کہ اگر
ضرورت پڑے تو فوری طور پر اسے استعمال کیا جا سکے۔

''تم چاہو تو اوپر چھت پر جا کر اپنے پتی کی لاش دیکھ سکتی ہو۔'' نکلنے سے قبل سلّو نے امرت کور
مایوسی کی۔

''اس دی لوڑ نئیں ہے۔ میں نے جو جوا کھیلنا تھا، کھیل چکی۔ اگے میری قسمت۔'' اس نے جواب دیا۔
انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بہت سنبھل کر چل رہی تھی اور اس کے
سے معمولی سی بھی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ یہ احتیاط وقت کا تقاضا تھی۔ ذرا بھی بداحتیاطی کی صورت میں
گھر کا کوئی فرد جاگ سکتا تھا۔ نتیجے میں ان دونوں کے ساتھ وہ بھی پھنس جاتی۔

دروازے کی کنڈی بے آواز کھول کر وہ تینوں باہر احاطے میں نکل آئے۔ امرت نے اپنے
دروازے کو آہستہ سے بھیڑ دیا اور آگے بڑھی۔ پھاٹک کے قریب تین چار گھوڑے کھڑے تھے اور امرت
رخ اُنہی کی طرف تھا۔ جب وہ دونوں دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے اور گھر کے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈ
رہے تھے تو انہوں نے بھی ان گھوڑوں کو دیکھا تھا لیکن زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت ان کے ذہنوں میں
یہاں سے فرار کے بجائے پناہ لینے کا خیال بسا ہوا تھا اس لیے گھوڑے ناقابل توجہ ٹھہرے تھے۔ ایک حقیقت
یہ بھی تھی کہ گھوڑے جیسے پالتو اور وفادار جانور پر اپنی مرضی سے سواری کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اڑیل گھوڑے
تو ماہر سے ماہر سوار کو بھی مرضی نہ ہونے کی صورت میں لمحہ بھر کے اندر اپنی پشت سے پٹخ ڈالتے ہیں۔ لیکن اس
صورتِ حال مختلف تھی۔ ان کے خدشات کے برخلاف سرحدی محافظوں نے گاؤں میں داخل ہو کر انہیں تلاش
کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ وہ ان کے فرار ہو کر اس طرف آنے سے باخبر نہیں ہوئے
تھے یا پھر جتنوں کو پکڑ لیا تھا، اُنہیں ہی کارکردگی دکھانے کے لیے کافی سمجھا تھا۔ آخر اتنے تواتر سے غیر قانونی
طور پر سرحد کے آر پار آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا تو کہیں تو کوئی سقم یا غفلت کا عنصر کارفرما تھا کہ دونوں
طرف کے اسمگلرز اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔

گھوڑوں کے قریب پہنچ کر امرت کور نے ان میں سے ایک مشکی گھوڑے کے جسم پر ہاتھ رکھ کر اسے
سہلایا تو وہ یوں ہنہنایا جیسے اسے پہچان لیا ہو۔

''رکھو! تجھے ان دونوں پرونہوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ لے جائے گا نا؟..... دیکھ کوئی شرارت نہ
کرنا ورنہ دلجیت تیرے سے ناراض ہو جائے گا۔'' وہ گھوڑے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں
اس سے سرگوشیاں بھی کر رہی تھی۔ اس کی سرگوشیوں کو سن کر گھوڑے نے یوں سر ہلایا جیسے اس کی ساری بات
سمجھ گیا ہو۔

''اب تسی اس دے اوپر سواری کر سکدے ہو۔ یہ دلجیت دا گھوڑا ہے۔ ہور میری ہر گل سنتا ہے۔''



اس عجیب سے فخر کے ساتھ بتایا۔ یقیناً محبوب کے گھوڑے کا اپنا وفادار ہونا اس کے لیے باعثِ خوشی تھا۔

ان دونوں نے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً گھوڑے پر سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ان
حالات میں پیدل بھٹکنے کے بجائے ایک سواری کا میسر آ جانا نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ پہلے امرت کور سوار ہوئی۔ اس
کے بعد وہ دونوں بھی گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑی اچھی نسل کا طاقتور گھوڑا تھا جس نے آسانی سے
ان تینوں کا وزن سہار لیا اور امرت کے اشارے پر سبک رفتاری سے آگے بڑھا۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے
قبل امرت نے احاطے کا پھاٹک کھول دیا تھا چنانچہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ گھوڑے کی
باگیں فی الحال امرت کے ہاتھوں میں ہی تھیں اور وہ بڑی مہارت اور تیزی سے اسے آگے بڑھا رہی تھی جس کا
مطلب تھا کہ گھوڑا اس سے یونہی مانوس نہیں ہے بلکہ وہ باقاعدگی سے اس کی پشت پر سواری کرتی رہی ہے۔

گھوڑے پر شہریار عین اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا چنانچہ اس کے گداز جسم کی گرمی اسے اچھی طرح محسوس
ہو رہی تھی۔ امرت کور بڑی بھرپور عورت تھی۔ اسے سربجیت کی عقل پر افسوس ہوا کہ اگر وہ زور زبردستی سے اس
کو اپنا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اسے اپنی نفرت کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ سوتیلی ماں اور بھائی
سے انتقام لینے کے لیے تو اتنا بھی کافی تھا کہ امرت کور ان کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی بن کر رہتی لیکن
اس عقل کا اندھا کم از کم اپنی اتنی حسین بیوی کے ساتھ تو انسان کا بچہ بن کر رہتا۔ اس نے بڑی حماقت کی کہ وہ
انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس بے قصور کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ پاؤں تلے دبائے جانے پر تو چیونٹی
بھی احتجاج کرتی ہے، امرت کور جیسی نڈر لڑکی کیسے یہ ظلم سہہ لیتی؟ اُس نے موقع دیکھتے ہی اپنی جان چھڑا
لینے کا جرأت مندانہ فیصلہ کر لیا اور یہ سربجیت کی بدقسمتی تھی کہ شادی کے صرف چار دن بعد ہی اسے یہ موقع مل
گیا تھا اور وہ دل بھر کر امرت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بھی نہیں بنا سکا تھا۔

''یہاں سے تسی سیدھے چلے جانا فیر موڑ آنے پر اُلٹے ہاتھ مڑ جانا فیر اس دے اگے.....'' اپنی سوچوں
میں گم اُسے پتہ بھی نہیں چلا اور امرت گھوڑے کو گاؤں سے باہر جانے والے راستے تک لے آئی۔ اس جگہ
گھوڑا روک کر وہ ان دونوں کو راستہ سمجھانے لگی۔

''اب مینوں ادھر سے واپس جانا ہوگا۔ تہاڈے سنگ زیادہ دور گئی تو پیدل واپس گھر جانے میں مشکل ہو
گی۔ بہت سمے بیت گیا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب لوگ جاگنا شروع ہو جائیں گے۔''

اپنی مجبوری بتاتے ہوئے وہ گھوڑے سے نیچے اُتر گئی۔ اس بار انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔
اس کا کہنا صحیح تھا کہ مزید اُن کے ساتھ آگے جانے کی صورت میں وہ مشکل میں پڑ سکتی تھی۔ اسے کسی کے
جاگنے سے پہلے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ صبح جب سب جاگ جاتے تو اسے ان کے سامنے ایک ایسی پریشان
بیوی کا کردار بھی ادا کرنا تھا جس کا شوہر آدھی رات کو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

جب گھر کی چھت پر سربجیت کی لاش دریافت ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے رو دھو کر سب کو یہ یقین دلا سکتی
تھی کہ سربجیت اپنی شراب نوشی کی لت پوری کرنے اوپر چھت پر گیا تھا اور پھر جانے کیسے اور کس کی گولی کا
نشانہ بن گیا۔ گھر کے کھلے دروازے اور مشکی گھوڑے کا غیاب یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوتا کہ کوئی نامعلوم
افراد چھت کے راستے گھر میں داخل ہوئے تھے اور سربجیت کو ٹھکانے لگا کر اپنی راہ پر ہو لئے۔ رات
سرحد پر ہونے والی فائرنگ اور گرفتاریوں کی خبریں اُنہیں یہ بھی سمجھا دیتیں کہ یہ ساری کارروائی کرنے والے
لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں امرت کور پر کسی کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد
میں اس گھرانے کے لوگ سربجیت کے قاتل سے انتقام لینے کے لیے کیا کر سکتے تھے اور کیا نہیں، یہ بالکل

الگ معاملہ تھا۔ لیکن یہ بات تو طے تھی کہ امرت نے نہایت کامیابی سے اپنے ظالم شوہر سے پیچھا چھڑا لیا اور بہت ممکن تھا کہ وہ اپنے محبوب کو پانے میں بھی کامیابی حاصل کر لیتی۔

''اب تسی جاؤ، واہ گرو خیر کرے گا۔'' گھوڑے سے اُتر کر اس نے پہلے اسے دو چار تسلی آمیز تھپکیاں دیں پھر ان دونوں سے کہتی ہوئی خود واپس پلٹ گئی۔

اس کے قدم تیز اور مضبوط تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر وہیں کھڑے اس نڈر عورت کو دیکھتے رہے۔ اندھیرے اور تنہائی سے بے نیاز بڑی بے خوفی سے واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔ اس کی مضبوطی کو دیکھتے ہوئے اس بات پر یقین کیا جا سکتا تھا کہ قسمت نے اگر اسے اپنے محبوب دلجیت کا ساتھ عطا نہیں کیا تو دعوے کے مطابق وہ تنہا بھی زندگی کا سفر طے کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

بہرحال، ان کے لیے تو وہ راستے میں ملنے والی ایک ایسی داستان تھی جسے وہ زیادہ عرصہ اپنی یادداشت میں محفوظ بھی نہ رکھ پاتے۔ چنانچہ اس کے لیے مزید ٹھہرنا بے کار تھا۔ شہریار نے اس کی نظروں سے اوجھل ہونے سے قبل ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کی ٹاپوں سے اُٹھنے والی دھول میں کہیں گم ہو جانے والی امرت کور کو فراموش کر کے وہ دونوں ہوا ہو گئے۔ کامیابی تک پہنچنے کے لیے ابھی انہیں بہت منزلیں طے کرنی تھیں۔

❀----✪----❀

''صورتِ حال بہت خراب ہے سنتھیا!''

''میں جانتی ہوں سر! ہمیں ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ ایک طرف ریاض انور جیسا اہم مہرہ ہاتھ سے نکل گیا ہے تو دوسری طرف سلّو کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ پولیس نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ اپنے گھر سے غائب ہیں اور ہم کسی طور یہ تصدیق نہیں کر سکتے کہ آیا واقعی سلّو کی لاش ان کے حوالے کی گئی تھی یا نہیں۔ البتہ اس کا غائب ہونے سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پولیس والے غلط کہہ رہے ہیں۔ سلّو مرا نہیں بلکہ اب بھی اُنہی کی تحویل میں ہے۔ اور شاید پولیس اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے والدین کو استعمال کر رہی ہو۔ دوسری طرف ریاض انور کی موت بھی مشکوک ہے۔ اُس کے جس ملازم نے اسے آخری بار زندہ دیکھا تھا اس کا بیان ہے کہ ریاض صاحب اسے بہت پریشان نظر آ رہے تھے اور اس پریشانی میں کثرت سے شراب پی رہے تھے۔ اُن کے نئے لیکن سب سے قریبی ملازم نے انہیں شراب نوشی سے پرہیز کرنے کی نصیحت بھی کی تھی لیکن انہوں نے اسے بری طرح جھڑک کر رکھ دیا تھا۔

ملازم کے اس بیان کو سامنے رکھا جائے تو بظاہر یہی لگتا ہے کہ ذہنی دباؤ اور کثرتِ شراب نوشی کا باعث اچانک اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ ریاض کے معدے میں کثیر مقدار میں شراب کی موجودگی کا بھی پتہ چلا ہے لیکن پھر بھی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ ہے اور ریاض کی بیوی اور بیٹی نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ وہ بہت مضبوط اعصاب کا آدمی تھا اور اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ کسی پریشانی کی وجہ سے وہ اس حد تک ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا ہو گا کہ اس کی حرکتِ قلب ہی بند ہو گئی۔ میں اس معاملے کو ابھی



مشکوک ہوں تو مجھے ریاض انور کی موت بڑی مشکوک اور پُراسرار لگتی ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اصل انور جب اپنے اغوا کے بعد واپس آیا تھا تو ایک نوجوان محسن کی حیثیت سے اس کے ساتھ چپک کر آیا تھا اور اُس وقت تک وہ اس کے ساتھ ایسے چپکا رہا تھا کہ ریاض نے ایک پل بھی اس کے بغیر نہیں گزارا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ نوجوان ریاض کی موت سے تھوڑی دیر قبل اپنے گھر والوں سے ملاقات کے بہانے وہاں سے چلا گیا تھا اور پھر نہ تو وہ واپس لوٹ کر آیا اور نہ ہی اس کا کوئی اتا پتہ ملا۔ جو ڈرائیور اسے چھوڑنے گیا تھا، اس کا کہنا ہے کہ وہ کئی گھنٹوں تک اس کی واپسی کے انتظار میں اس تنگ گلی کے کونے پر کھڑا رہا جس میں اس کی کار لے جانا ممکن نہیں تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور نوجوان واپس نہیں آیا تو ڈرائیور نے بیزار ہو کر سوچا کہ اس سے مل کر معلوم کر لے کہ اسے اور کتنی دیر لگے گی۔ نوجوان کس گھر میں گیا ہے، یہ تو وہ نہیں دیکھ سکا تھا البتہ اس کے نام اور حلیے کی بنیاد پر گلی میں آتے جاتے لوگوں سے پوچھتا رہا لیکن کسی نے بھی اس کے بتائے ہوئے نام اور حلیے کے شخص سے واقفیت کا اظہار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد ڈرائیور مایوس ہو کر واپس لوٹ گیا اور واپس کوٹھی پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ اس کا مالک اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

حالات و واقعات جس طرح ہمارے سامنے آئے ہیں، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نوجوان کسی خفیہ ادارے کا ایجنٹ تھا اور ریاض کے اغوا کے پیچھے بھی کسی خفیہ ادارے کا ہاتھ تھا جس نے اپنے ایجنٹ کو ریاض کے ساتھ نتھی کر کے اس کی رہائش گاہ پہنچا دیا۔ اس نوجوان نے اپنے قیام کے دوران کیا معلومات حاصل کیں، یہ تو کہنا مشکل ہے البتہ میں یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ریاض کی موت کا ذمے دار وہی ہے۔ میں جانتے ہیں کہ ایسے کیمیکلز اور ادویات کا وجود ہے جنہیں کسی مشروب یا غذا میں ملا دیا جائے تو انہیں استعمال کرنے والے کو علم ہی نہیں ہو پاتا اور وہ دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کیمیکلز میڈیکل سائنس کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں اور پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر کبھی یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ موت طبعی نہیں ہے۔ جیسا کہ اصل انور کے کیس میں ہوا ہے اور اس کی موت کی وجہ ہارٹ فیل بیان کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کی وجہ سے پولیس نے اس مشکوک نوجوان کی تلاش میں بھی زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی ہے اور ریاض انور کی موت کو طبعی قرار دے کر اس کی فائل بند کر دی گئی ہے۔'' سنتھیا تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ ایک جملے کے جواب میں بولنا شروع ہوئی تو بولتی چلی گئی۔

''اٹس اوکے ڈیئر! ریاض انور کی موت یا سلّو کا غیاب ہمارے مسائل نہیں ہیں۔ ان مہروں کو ''را'' والوں نے بساط پر کھڑا کیا تھا اس لیے ان کے پٹ جانے پر تشویش میں بھی انہی کو مبتلا ہونا چاہیے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ ان کی جگہ دوسرے افراد کو لے آئیں گے اور ہمارا کام چلتا رہے گا۔ تم ہمیشہ کی طرح بس اپنی اجتماعی سے اپنے حصے کا کام کرتی رہو۔ رہی حالات کی خرابی کی بات تو میں کچھ دوسرے معاملات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بلتستان میں ہمارا قائم کردہ سیٹ اپ تقریباً تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور بہت کم مدت میں ہم نے وہاں دوسرا بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ وہاں کے پہاڑوں میں موجود ہمارے خفیہ تربیتی کیمپ کی تباہی تو ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھی ہی لیکن اب ایک اور بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ گلگت میں ہمارا ایک بندہ بشیر اکبر کے نام سے برسوں سے اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مقاصد میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی اور لوگوں میں ایک بڑی تعداد کو اپنی مٹھی میں کر چکا تھا۔ اس کے بعض ساتھی تو اس پر یوں اپنی جان چھڑکتے تھے کہ اس کے حکم پر بلا تامل اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا سکتے تھے۔ لیکن اچانک ہی بشیر اکبر غائب ہو گیا اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ اب اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ پاکستان کی کسی خفیہ ایجنسی

کے ہاتھ لگ گیا ہے۔'' وہ سنتھیا کو تفصیل سے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

''ویری بیڈ۔ یہ تو واقعی بہت بڑا نقصان ہو گیا۔ لیکن اس میں تھوڑی غلطی ہمارے پلاننگ کرنے والوں کی بھی ہے۔ اتنا بڑا سیٹ اپ صرف ایک شخص کیوں چلا رہا تھا؟ اور اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص کے ہونے سے سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔'' سنتھیا کے لہجے میں افسوس کے ساتھ ساتھ ملامت بھی تھی۔

''ہمیں اس کمزوری کا احساس تھا لیکن ہم اس شخص کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا یہ ساری کامیابی اس نے تن تنہا حاصل کی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور تدابیر کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچا کہ اب سب کچھ اس کی مٹھی میں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ تنہا ایک سیٹ اَپ بنا سکتا ہے تو اسے بھی سکتا ہے اور واقعی وہ چلا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد کوئی اور نہیں بلکہ اس کا بیٹا اس کی جگہ لے۔ ہم اس کی ہر خواہش ماننے پر مجبور تھے کیونکہ اوّل تو اس کا خاندان بہت اثر و رسوخ والا ہے اور اس خاندان کی عظیم اسرائیل کے لیے بے پناہ قربانیاں اور خدمات ہیں۔ دوسرے وہ خود بھی اپنا آپ منوا چکا اور اس کی بات سے انحراف کرنا اس پر بداعتمادی تصور کی جاتی۔ لیکن اب ہم بہت بڑی مشکل میں ہیں کہ کس طرح اس کا کھوج لگائیں۔ کیونکہ اس کی تمام تر من مانیوں کے باوجود اس کے خاندان کا اصرار ہے کہ اس کے اس طرح غائب ہونے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔'' اس نے سنتھیا کو اپنا مسئلہ بتایا۔

''میرے خیال میں تو اس سلسلے میں اس کے نائب سے ہی کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہی تو ہے جو اس کے بعد سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے اور جس نے لوگوں کو باور کروایا ہے کہ بشیر اکبر اپنی مرضی سے ترکِ تعلق کر کے کہیں روپوش ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں کسی کی طرف سے شہ ملے بغیر اس نائب کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ بشیر کی جگہ لے سکتا۔ اسے کہیں نہ کہیں سے حوصلہ ضرور ملا ہے۔ شاید ان خفیہ اداروں کی طرف سے جنہوں نے کسی طرح بشیر اکبر تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنے میں کر رکھا ہے۔''

سنتھیا بہت تجربہ کار ایجنٹ تھی۔ اسرائیل کے مفادات کی خاطر اس نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس کی دی ہوئی قربانیوں میں ترکِ وطن، بھارتی شہری سے شادی، ''را'' میں شمولیت کے علاوہ اکلوتی بیٹی کلارا عرف ماریہ سے محرومی سرفہرست تھی۔ کلارا نے ڈاکٹر ماریہ کے روپ میں شہریار جیسے شخص کو عرصے تک خوب بے وقوف بنایا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سازش کے نتیجے میں اس کی بیوی تک بننے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن پھر شہریار کی خوش قسمتی سے اس کا راز فاش ہو گیا اور وہ کرنل توحید کو شیشے میں اتارنے کے چکر میں خود ماری گئی۔

سنتھیا کو اپنی اکلوتی بیٹی کے مرنے کا بہت دکھ تھا اور وہ تنظیم کے بڑوں کی طرف سے تل ابیب چلے جانے کی پُرکشش پیشکش کے باوجود صرف بیٹی کی موت کا انتقام لینے کے لیے یہاں رُکی ہوئی تھی۔ جیسی منجھی ہوئی ایجنٹ نے اگر حالات جان کر چند درست اندازے لگا لیے تھے تو یہ اتنے زیادہ تعجب کی نہیں تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم بھی انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ لیکن فی الحال اپنے کسی بندے کو اس کے پیچھے نہیں لگا سکتے۔ ہمیں شک بلکہ یقین ہے کہ اس بندے کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہوگی اس لیے ہم اپنے آدمی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔'' ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔



''اس کے لیے میری خدمات حاصل ہیں نا۔ جو زہر سے نہ مارا جا سکے، اُسے گُڑ سے مارنے کا انتظام میرے پاس ہوتا ہے۔ عورت..... خوب صورت عورت دنیا کا ایسا خطرناک ہتھیار ہے، جسے جہاں چاہو چلا لیں۔ میرے پاس چند بڑی اچھی تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کو میں اس باپ کے بچے کے پیچھے لگا دوں گی۔ پھر دیکھنا کمال کہ کیسے ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔'' اس نے بڑے یقین سے دعویٰ کیا۔

''تھینک یو سو مچ سنتھیا! اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو یہ بڑا کام ہوگا۔'' جذبات میں ڈیوڈ نے فون پر ہی اسے بوسہ دیا۔ وہ اس حرکت پر زور سے ہنسی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''یہاں حالات میں جو خرابی ہو رہی ہے، اس کے پیچھے کسی ایسی خفیہ ایجنسی کا ہاتھ لگتا ہے جس کے وجود سے ہم واقف نہیں ہیں۔ البتہ مجھے شک ہے کہ کرنل توحید کا اس ایجنسی سے گہرا تعلق ہے۔ پہلے تو میں انتقام کے چکر میں اس شخص کو بھسم کر دینا چاہتی تھی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اسے زندہ پکڑ کر اس سے اہم معلومات کا حصول ضروری ہے۔ تم کسی طرح یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ وہ کہاں ہے؟ پھر میں اس کا بھی کوئی علاج سوچتی ہوں۔''

''اوکے، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جب تک اپنی پلاننگ پر توجہ دو۔'' ڈیوڈ نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو اس نے بھی ریسیور واپس رکھ دیا لیکن کچھ ایسے انداز میں کہ اس کے ہاتھ بھینچے ہوئے تھے اور وہ چشمِ تصور سے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچتا دیکھ رہی تھی۔ ●

⊛----✪----⊛

''عرس کی تیاریاں کیسی چل رہی ہیں اللہ کھا؟'' اپنے پسندیدہ گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھے چودھری نے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے ہوئے منشی سے پوچھا۔

''سب کام تسلی بخش طریقے سے ہو رہے ہیں سرکار! مزار میں جو چند چھوٹے موٹے مرمت کے کام تھے، وہ ہو چکے ہیں۔ صفائی ستھرائی بھی خوب ہو رہی ہے اور سجاوٹ کا سارا سامان بھی آ گیا ہے۔ اس بار میں نے شہر سے خصوصی لائٹیں بھی منگوائی ہیں۔ ان لائٹوں کو مرکزی ہال میں لگایا جائے گا۔ آپ دیکھئے گا کہ ان لائٹوں کو لگانے سے ہال کا ماحول کتنا پُر اثر اور نورانی سا لگنے لگے گا۔ باقی عطر اور دیگر خوشبویات عرس سے ایک دن پہلے ہی سارے مزار پر چھڑکی جائیں گی تاکہ عرس والے دن ان کا اثر باقی رہے۔ میں نے اس بار ایک خصوصی انتظام یہ بھی کیا ہے کہ جس پانی سے پیر صاحب کی قبر مبارک کو غسل دیا جائے گا، اس میں بھی کچھ خوشبوئیں ملا دی جائیں گی تاکہ جب بعد میں عقیدت مندوں میں اس پانی کو تبرک کے طور پر بانٹا جائے تو ان کا دھاک بیٹھ سکے۔ قبر پر چڑھائی جانے والی چادر کے سلسلے میں تو پہلے ہی اللہ آباد کے چودھری سے معاملہ طے ہو گیا تھا۔ چڑھاوے کی چادر اس کی طرف طے آئے گی۔''

منشی نے فوراً اسے تفصیلی رپورٹ دی جس میں چودھری کے لیے سب سے اطمینان بخش اطلاع چڑھاوے کی چادر کے حوالے سے تھی۔ قبر پر ہر سال چڑھائی جانے والی یہ چادر بہت خاص ہوتی تھی۔ اس کے لیے سبز رنگ کا نہایت قیمتی کپڑا استعمال کیا جاتا تھا اور اس کپڑے پر سونے کے تاروں سے مختلف آیات اور کلمات لکھے جاتے تھے۔ جب سے عرس کا سلسلہ شروع ہوا تھا، یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ چڑھاوے کی یہ چادر مختلف علاقوں دیہاتوں سے بطور تحفہ لائی جاتی تھی۔ بعض جگہ سے اسے واقعی عقیدتاً لایا جاتا تھا اور بعض کو چودھری

ے اثر و رسوخ سے مجبور ہو کر لانا پڑتا تھا۔

بظاہر یہ چادر کسی بھی گاؤں کے چودھری یا سردار کی طرف سے تحفے میں آتی تھی لیکن ایک سچ یہ بھی کہ عموماً کوئی بھی چودھری یا سردار اسے اپنے ذاتی خرچ پر تیار نہیں کرواتا تھا بلکہ اس کے لیے اپنی رعایا پر ڈال کر ان سے زبردستی کے چندے وصول کرتا تھا۔ چودھری افتخار اس حقیقت سے آگاہ تھا لیکن اس کے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے بس چڑھاوے کی چادر سے غرض تھی، چاہے کوئی سردار اسے اپنے خرچ پر بنواتا یا اس کے لیے اپنے مزاروں اور کمیوں کا خون چوستا۔ ہر سال موصول ہونے والی اس چادر کی وجہ سے ایک طرف عرس کی شان بڑھ جاتی تو دوسری طرف بھاری مالی منفعت بھی ہوتی۔ عرس پر عقیدت مندوں کی طرف سے نذرانے کے طور پر دی جانے والی رقوم اور سونے چاندی کے زیورات کا چڑھاوا الگ تھا۔ عرس پر ہونے والے بھاری اخراجات نکال کر بھی ان چڑھاووں سے اسے ٹھیک ٹھاک مالی فائدہ ہوتا تھا۔

اس موقع پر مختلف علاقوں سے بلائے گئے اعلیٰ عہدے داروں کی بہ حیثیت مہمان موجودگی ایک اور فائدہ تھا۔ وہ لوگ جہاں چودھری کی شان دیکھ کر اس سے متاثر ہوتے تھے، وہیں چودھری کو اعلیٰ حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں مدد ملتی تھی۔ یعنی عرس ہر طرح سے اس کے لیے ایک اہم موقع ہوتا تھا اس لیے اپنی تمام تر اُلجھنوں اور مصروفیات کی باوجود اس پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ اور سب سے زیادہ شامت منشی کی آتی تھی جسے وقتاً فوقتاً اس طرح کی رپورٹس پیش کرنی پڑتی تھیں جیسی اس نے ابھی پیش کی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تُو جو مناسب سمجھ، کرتا رہ۔ میں نے تجھے سب سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے، پر کہیں کمی رہ گئی تو جان لے کہ میں کھال بھی تیری ہی کھینچوں گا۔'' منشی کے انتظامات کو سن کر خاصا اطمینان محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کو دھمکانا نہیں بھولا تھا۔

''کوئی کوتاہی ہوگی تو میں سزا پانے میں اُف بھی نہیں کروں گا۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔'' منشی نے فوراً ہاتھ جوڑ کر عاجزی و انکساری کا اظہار کیا۔ اس کا چودھری سے برسوں کا ساتھ تھا اس لیے وہ اس کے مزاج کو خوب جانتا تھا کہ اسے کس موقع پر کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔

''چل ٹھیک ہے، اب تُو ایسا کر کہ ڈرائیور سے کہہ جیپ تیار کر دے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آج میں جنگل کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ بہت دن ہوئے اُدھر کا چکر لگا کر کام کا جائزہ نہیں لیا۔'' اس نے ایک اور حکم جاری کیا اور دوبارہ کش لگانے لگا۔ دنیا کی بیش قیمت شرابیں، سگار اور پائپ وغیرہ استعمال کرنے کے باوجود اس کے لیے حقے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی تھی اور وہ جب بھی حویلی میں موجود ہوتا تھا، صبح نہار منہ حقے کے چند کش ضرور لیتا تھا۔

''جو حکم سرکار! میں ابھی جیپ اور بندے تیار کروا دیتا ہوں۔ پر اتنا یاد دلا دوں کہ آج آپ کے حکم پر میں نے نئے اے سی عمیر آفندی کو رات کے کھانے کی دعوت دے رکھی ہے۔'' تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے منشی نے دھیرے سے اسے یاد دلایا۔

''وہ ٹھیک ہے یار! میں نے کون سا باورچی خانے میں کھڑے ہو کر اپنی نگرانی میں اس کے لیے کھانا بنوانے ہیں۔ شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا تو فیر رات میں اس کے ساتھ کھانا بھی کھا لوں گا۔ بلکہ اگر شکار میں کوئی ہرن شرن ہاتھ لگ گیا تو وہ بھی اے سی کی دعوت میں اس کے سامنے رکھ دیں گے۔'' چودھری نے بے پروائی سے جواب دیا تو منشی اس کی تائید کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

چودھری ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب تیار ہو کر باہر نکلا تو حسب توقع جیپ تیار تھی۔ جیپ کے



ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح بندے مزید تیار تھے جو فی الحال اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دیتے۔ اگر اس کا شکار کا موڈ بن جاتا تو یہ دونوں اس میں بھی اس کا بھرپور ساتھ دے سکتے تھے۔

بہرحال، اس وقت وہ چونکہ باقاعدہ شکار کے لیے نہیں جا رہا تھا اس لیے اس کے ساتھ زیادہ ساز و سامان اور بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر بس افیون کے کھیتوں کا ایک جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ خود بھی ان سے باخبر رہے اور اگر اوپر والوں میں سے کوئی رپورٹ طلب کرے تو اسے بھی قابل اطمینان جواب دے سکے۔

ڈرائیور اس کی منزل سے واقف تھا۔ چنانچہ جنگل میں داخل ہونے کے بعد اسے چودھری سے سوال کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی وہ خود اِدھر اُدھر بھٹکا اور سیدھا جنگل کے اس حصے کی طرف جیپ بڑھاتا گیا جس طرف افیون کے کھیت تھے۔

یہ کھیت جنگل کے ایسے حصے میں بنائے گئے تھے جہاں جنگل بہت گھنا اور تاریک ہو جاتا تھا اور عام لوگ اس طرف کا رخ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ گھنے درختوں اور پودوں کے بیچ سے گزرنے کے بعد انہیں کیسی انہونی دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ افیون کے یہ کھیت اتنی ہوشیاری سے تیار کیے گئے تھے کہ فضائی جائزہ لینے پر بھی نظر نہیں آ سکتے تھے۔ یہاں کام کرنے والے لوگ بھی مخصوص تھے اور ان میں سے کسی کو بھی اب تک چھٹی نہیں دی گئی تھی۔ خود اپنی مرضی سے کسی کے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کڑی نگرانی کا انتظام تھا اور چھپ کر وہاں سے نکلنے کی خواہش کرنے والا دوسری دنیا تو جا سکتا تھا، اپنے گھر نہیں۔

''اپنی جیپ وہیں روک لو ورنہ اسے تباہ کر دیا جائے گا۔''

مخصوص راستے پر بڑی احتیاط سے چلتی جیپ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کسی نے بلند آواز میں اس تنبیہ کی۔

اس آواز کو سن کر وہ سب چونک گئے اور ڈرائیور نے غیر ارادی طور پر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ کے رکتے ہی چودھری کے دونوں مسلح نمک خوار اُچھل کر جیپ سے اُترے اور اپنی رائفلز سنبھال کر ایسے اردگرد کا جائزہ لینے لگے جیسے بولنے والے کے نظر میں آتے ہی اسے گولی سے اُڑا دیں گے۔ لیکن وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ وہ بس اِدھر اُدھر نظر گھما کر ہی رہ گئے۔

''تم لوگ اور تمہاری جیپ ہمارے نشانے پر ہے۔ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہیں کی تو نتائج کی ذمے داری تمہارے اپنے اوپر ہوگی۔'' وہی نامعلوم سمت سے سنائی دیتی آواز ایک بار پھر گونجی۔

چودھری اور اس کے نمک خوار حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ جنگل کے اس حصے میں وہ ہمیشہ آزادانہ آتے جاتے رہے تھے۔ یہاں درختوں میں چھپے ہوئے پہرے دار ضرور موجود تھے لیکن وہ سب چودھری کے آدمی تھے اور اس کی جیپ اور آدمیوں کو بخوبی پہچانتے تھے۔ پھر یہ کون پیدا ہو گیا تھا جو ان کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہا تھا؟

حیرانی اور غصے میں مبتلا چودھری کو یکایک یاد آیا کہ لنڈا نے اس سے جنگل کے اس حصے میں خصوصی سختی کے انتظامات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں کوئی جدید تکنیک استعمال کی گئی ہے اور یقیناً یہ اس سسٹم کی نگرانی کرنے والا بندہ تھا جو اسکرین پر ان لوگوں کو دیکھ کر احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس شخص کے لیے اجنبی، اس کی جیپ اور آدمی سب اجنبی ہی ہوں گے اسی لیے اس نے انہیں روکنے کی جسارت کی تھی۔

''اس کو بتاؤ کہ تم چودھری افتخار عالم شاہ کے کارندے ہو۔ ہور چودھری صاحب خود جیپ میں ہیں۔'' خیال ذہن میں آتے ہی چودھری نے ڈرائیور سے کہا تو وہ لپک کر جیپ سے اُترا اور بلند آواز چودھری کے الفاظ دہرائے۔

''اس کے باوجود میں تمہیں آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو نئے رولز بنائے گئے ہیں کے مطابق چودھری صاحب کو بھی یہاں آنے سے پہلے اوپر سے اجازت لینی ہوگی۔ اگر اوپر والے چودھری صاحب کے آنے کی اطلاع دیں گے تو میں انہیں آنے کی اجازت دوں گا، ورنہ انہیں مایوس پڑے گا۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں ڈرائیور کی بات کا جواب دیا تو چودھری کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور آواز میں اپنے آدمیوں سے بولا۔

''تم تینوں جیپ میں آ کر بیٹھو اور آگے چلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کون مائی کا لعل میرا راستہ روکتا ہے۔'' اس کا حکم ملتے ہی ڈرائیور سمیت اس کے دونوں کارندے جھپٹ کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ جیپ کا انجن غراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوا لیکن اس سے قبل کہ جیپ آگے بڑھتی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے اُٹھی۔ چند گولیاں جیپ کی باڈی پر بھی آ کر لگیں۔ چودھری کے کارندوں نے فوراً اپنی رائفلیں سیدھی کیں لیکن وہ فائر کرتے تو کس پر؟ وہاں نہ بولنے والا نظر آتا تھا اور نہ ہی فائر کرنے والا۔ جواباً بس وہ فائرنگ ہی کر سکے۔

''فضول میں اپنی گولیاں ضائع نہ کرو۔ تم ہواؤں میں فائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ جبکہ تم سے ہر ایک میرے نشانے پر ہے۔ میں چاہوں تو اپنی انگلی کی معمولی سی جنبش سے جیپ میں موجود ہر شخص کو پڑی اُڑا سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ چودھری صاحب میرے دشمن نہیں بلکہ ہمارے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک ساتھی کی حیثیت سے وہ تنظیم کے اصول و قواعد کی پابندی کریں گے۔ اسی طرح میں بھی تنظیم کا ایک رُکن ہوں اور جو ذمے داریاں مجھے سونپی گئی ہیں، ان پر عمل کرنے کا پابند بھی ہوں۔ آپ لوگ اجازت کے بغیر آئے ہیں اس لیے میں آپ کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔ اگلی بار اجازت لے کر آئیں تو دیکھئے گا، آپ کا یہاں کیسے استقبال ہوتا ہے۔ میں خود آپ سے اپنے آج کے رویے کے لیے معافی مانگوں گا۔ اُمید ہے کہ میری مجبوری آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی اور اب آپ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔''

فائرنگ کی آواز بند ہوئی تو فضا میں ایک بار پھر اس نادیدہ شخص کی آواز گونج اُٹھی۔ ابتدا میں اس کا لہجہ جارحانہ تھا لیکن پھر بتدریج اس کے انداز میں نرمی آتی چلی گئی۔ چودھری جو غصے سے کھول رہا تھا، اس کی بات سن کر سمجھ گیا کہ وہ کسی صورت اسے اپنی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا اور اگر اس نے اپنی ضد کی تو نتیجے میں ناکامی اور رُسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اندر ہی اندر شدید ذلت محسوس کرتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو جیپ واپس موڑ لینے کا حکم دیا۔ یہاں آنے سے قبل اس کا موڈ تھا کہ واپسی میں کچھ شکار میں بھی گزارے گا لیکن موجودہ صورتِ حال نے اس کے موڈ کا بیڑا غرق کر دیا تھا اس لیے وہ لوگ رُکے جنگل سے نکل گئے۔

واپسی کے سفر میں وہ بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ تعاون اختیار کرنے کے بعد اُسے بے تحاشا مالی فائدہ حاصل ہو رہا تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ شروع سے



اس کے ساتھ زور زبردستی سے کام لے رہے تھے۔ وہ جو منوانا چاہتے تھے، کسی نہ کسی طور منوا لیتے تھے اور چودھری کمنڈی کو اس کے بے اختیار ہونے کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، وہ اس گفتگو کا ردِعمل ہے جو اس نے فون پر کی تھی۔ لنڈا نے اسے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ اس کی غلط فہمی ہے کہ جنگل میں موجود افیون کھیتوں پر اس کے آدمیوں کے کام کرنے کی وجہ سے اُسے وہاں کُل اختیارات حاصل ہیں اور وہ جب چاہے تنظیم کو مال کی سپلائی روک سکتا ہے۔ آج اُسے اس کی بے اختیاری کا عملی تجربہ بھی کروا دیا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ سارے انتظامات اس عرصے میں کیے گئے ہیں جب وہ پیر آباد سے دُور نیویارک میں موجیں کرتا پھر رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ الفا کی ایما پر کیا گیا ہوگا کیونکہ اس کی الفا سے براہِ راست بھی ایک دو جھڑپیں ہو چکی تھیں۔

الفا تنظیم کا با اختیار عہدے دار تھا۔ اس نے یہ بھانپ لیا ہوگا کہ چودھری بغاوت پر اُتر آیا تو ان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہی کھڑی کرے گا کہ ان کے کثیر سرمائے سے تیار کردہ افیون کے کھیتوں تک ان کی رسائی نہ ہونے دے۔ چنانچہ اس نے ایسے انتظامات کر دیئے کہ کھیتوں میں کام اور پہرے داری بے شک اس کے کارندے کرتے رہیں کنٹرول اس کے اپنے بھروسے کے آدمیوں کا ہو۔ وہ جدید ٹیکنالوجی سے تنظیم کا کرتا دھرتا تھا چنانچہ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا ہوگا کہ نگرانی کے لیے آلات اور کمپیوٹرائزڈ سسٹم کھیتوں کے اردگرد کے علاقے میں نصب کر دے۔

اس کام کے لیے زیادہ افرادی قوت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بس دو آدمی کافی ہوتے جو وقت کی تقسیم کر کے باری باری ڈیوٹی دے سکتے تھے۔ ان آدمیوں کو کچھ خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی ہوگی۔ بس مانیٹر پر نظر رکھنی ہوگی۔ جنگل کے مختلف ویوز دیکھتے رہتے ہوں گے جیسا کہ آج اُنہیں دیکھ لیا گیا تھا اور پھر حساس علاقے کی حدود میں داخل ہونے سے قبل ہی رک جانے کی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی۔ ان پر جس گن سے گولیاں برسائی گئی تھیں، وہ یقیناً کسی مناسب مقام پر پوشیدہ تھی جسے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھتا شخص ایک آدھ بٹن دبا کر اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر قادر ہوگا۔ عملی مظاہرہ اس نے چودھری اور اس کے کارندوں کو کر کے دکھا دیا تھا۔

اسی سبکی کے بڑے شدید احساس کے ساتھ حویلی پہنچا اور پہنچتے ہی منشی اللہ رکھا کو طلب کر لیا۔

''تجھے معلوم ہے منشی! کہ جنگل میں ہمارے پہرے دار کارندوں کے علاوہ کوئی اور بھی سکیورٹی سسٹم کام کر رہا ہے؟'' اس کا لہجہ غضب ناک تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''معلوم ہے سرکار! آپ کے حکم سے میں نے ہی تو سسٹم لگانے والوں کی پوری پوری مدد کی تھی۔'' منشی اس کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا تاہم بے حد احتیاط اور احترام سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں نے کب تجھے ایسا کوئی حکم دیا تھا؟'' چودھری دھاڑا۔

''میرے پاس ثبوت ہے سرکار! جو لوگ کام کے لیے آئے تھے، اُنہوں نے مجھے آپ کا لکھا خط دیا تھا۔'' منشی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔

''میں نے تجھے ایسا کوئی خط نہیں لکھا۔ جا مجھے وہ خط لا کر دکھا۔'' اب چودھری خود بھی اُلجھ گیا تھا اس لیے اسے ذرا کم والیوم میں دھاڑ کر حکم دیا۔

منشی تعمیل حکم کے لیے فوراً دوڑا اور چند منٹوں میں ہی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ خط اسے لا تھمایا۔ چودھری نے لفافہ کھول کر اندر موجود تہ شدہ کاغذ نکالا اور لمحہ بھر کے لیے خود بھی حق دق رہ گیا۔ کاغذ پر جو تحریر

موجود تھی، وہ سو فیصد اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی اور آخر میں اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ ہینڈ رائٹنگ اور د
اتنی کامل نقل کی گئی تھی کہ کچھ دیر کے لیے اسے بھی یہی شک گزرا کہ شاید خود اسی نے منشی کو یہ خط لکھا
حیرت اور بے یقینی کے عالم میں وہ اس خط کو پڑھنے لگا۔ اس خط میں واقعی منشی کو یہ احکامات دیئے گئے
وہ آنے والی ٹیم سے بھرپور تعاون کرے اور انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دے۔ آخر میں اسے
تنبیہہ کی گئی تھی کہ اس سارے معاملے کو فون پر ڈسکس نہ کرے کیونکہ فون کال ٹریس ہونے کا خطرہ رہتا
اس خط کو پڑھنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ منشی بے چارہ واقعی بے قصور تھا اور اس نے جو کچھ کیا تھا،
کا حکم سمجھ کر کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تیرا معاملہ تو مجھے سمجھ آ گیا۔ پر یہ بتا کہ ضلعی انتظامیہ کیسے بے خبر رہی؟ سسٹم لگانے
لیے اچھے خاصے بندے اور آلات یہاں تک لائے گئے ہوں گے تو کیا کسی نے ان سے کچھ نہیں پوچھا؟''

''پوچھتے کیسے سرکار؟..... سارا مال اور بندے اس کنٹینر میں آئے تھے جو پھل لے کر لاہور گیا تھا۔
جانتے ہی ہیں کہ واپس آنے والے ٹرکوں اور کنٹینروں کی اس طرح چیکنگ نہیں ہوتی جیسی یہاں سے
وقت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اے سی شہریار کے حادثے کا شکار ہونے
بعد کئی دنوں تک ضلع کا کوئی پُرسانِ حال ہی نہیں تھا۔ شہریار کی سختی کی وجہ سے اس کا عملہ اور پولیس
چوکس رہتے تھے۔ وہ نہیں تھا تو سب کو چھوٹ ملی ہوئی تھی اس لیے بھی کام بہت آرام سے ہو گیا۔'' منشی
اسے جواب دیا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے سرکار؟..... آپ کے انداز سے
لگ رہا ہے کہ جیسے آپ اس سارے معاملے سے لاعلم ہوں۔''

''تم ٹھیک سمجھے منشی!'' منشی کے سامنے اس نے اعتراف کیا۔ ''یہ سارا گیم بہت اوپر سے کھیلا گیا
میں نے جن لوگوں کے ساتھ یہ نیا بزنس شروع کیا ہے، وہ بلا کے خطرناک اور چالاک لوگ ہیں۔ انہوں
کب میری تحریر کا نمونہ حاصل کیا اور کیسے میرے دستخط ان تک پہنچے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم
کی ہوشیاری کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ انہوں نے وقت سے بہت پہلے ہی اپنا سارا ہوم ورک مکمل کر
تھا اور جیسے ہی انہیں لگا کہ یہ کام کر گزرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا ہے، وہ اپنا کام دکھا گئے۔ شہریار
اپنی کرسی پر موجود ہونے کی صورت میں وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی شریکِ راز بنانا
نہیں کیا کہ کہیں علاقے کے حکمراں کی حیثیت سے میں ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا نہ شروع کر دوں
بہت بڑا دھوکا دیا ہے ان خبیثوں نے مجھے..... لیکن تم دیکھنا، ایک دن میں انہیں اس بات کا جواب دے
رہوں گا۔''

وہ غصے کا اظہار کر رہا تھا لیکن چہرے پر ایسی بے بسی تھی جو پہلے کبھی منشی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس
کیفیت دیکھتے ہوئے وہ یہ پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکا تھا کہ آخر ماجرا کیا پیش آیا تھا۔

''آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں سرکار! آپ کا ساتھ دینے کے لیے ہم موجود ہیں نا۔ وقت پڑنے پر آپ
سا اشارہ کر کے دیکھئے گا۔ آپ کے جاں نثار آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔'' جو کچھ پیش آیا، اس کی سن
وہ ان آدمیوں سے بھی لے سکتا تھا جو چودھری کے ساتھ جنگل گئے تھے۔ فی الحال اسے سمجھانا اور سنبھالنا
ضروری تھا۔

''مجھے میری بلڈ پریشر کی دوا دو۔ میں دوا کھا کر کچھ دیر آرام کروں گا۔''

چودھری نے مزید اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بجائے دھیمی آواز میں منشی کو حکم دیا جس کی اس نے



کی اور دوا کے ساتھ پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یاددہانی کروانے والے
میں بولا۔

''یہ بہت اچھا ہو گا کہ ابھی آپ آرام کر لیں۔ رات کے کھانے پر میں نے آپ کی طرف سے نئے
میر آفندی کو مدعو کر رکھا ہے۔ آپ آرام کر کے شام تک اس کے آنے سے پہلے تازہ دم ہو جائیں
'' چودھری نے اس کی بات سنی اور خاموشی سے گولی منہ میں رکھ کر پانی کی مدد سے نگل لی۔ منشی کا مشورہ
تھا۔ نئے اے سی سے ملاقات اہم تھی اس لیے اس کا دماغی طور پر فٹ ہونا ضروری تھا۔

دوا کھا کر وہ جو سویا تو پھر شام کی ہی خبر لایا۔ منشی اللہ رکھا اس دوران اس کے ساتھ جنگل جانے
والے ملازمین سے معلومات حاصل کر چکا تھا چنانچہ پوری احتیاط رکھی کہ اس کی نیند میں ذرا بھی خلل پیدا
ہو۔ اس کے بگڑے ہوئے مزاج کے پیشِ نظر وہ پورا دن ایک ٹانگ پر کھڑا رہا اور عرس کے انتظامات
ساتھ رات ہونے والی عمیر آفندی کی دعوت کے اہتمام پر بھی بذاتِ خود نظر رکھی کہ کہیں کوئی کمی
اس سے برہم چودھری کو مزید برافروختہ نہ کر دے۔ یہاں تک کہ اس نے اتنی احتیاط رکھی کہ جب عمیر
پہنچا تو اس پر بہت زیادہ اپنائیت جتاتے ہوئے چپکے سے اس کے کان میں بھی یہ بات پھونک دی کہ
چودھری صاحب کا مزاج کسی وجہ سے معمول پر نہیں ہے اس لیے ان سے گفتگو کرتے ہوئے ذرا احتیاط
جائے۔

عمیر اس مشورے کو سن کر اندر ہی اندر تلملایا ضرور لیکن تاثرات سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے یہ مشورہ
گزرا ہے۔ اصل میں تو اس کے لیے چودھری سے ملاقات ہی ایک ناخوشگوار عمل تھا لیکن وہ چونکہ شروع
اس حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا کہ بے شک چلے گا اپنی راہ پر لیکن چودھری اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے
نہ لے گا۔ جنگل میں اپنے کزن اظفر اور اس کے ساتھیوں کی مشکوک موت کے بعد اس کے لیے
اس بات پر عمل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے بہترین نتائج کے حصول کے لیے صبر کا
ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اُسے اس ضلع میں تعینات کروانے والوں کا بھی یہی مشورہ تھا کہ کوئی واضح بات
آنے سے پہلے جذبات میں آ کر کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرے۔

اظفر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہلاک ہونے والے فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ملازم خالقو نے اپنے
لمحات میں جو چند الفاظ ادا کیے تھے، ان میں چودھری اور افیون کے الفاظ بہت واضح تھے جس سے اس
اور اس کے ساتھ دوسروں نے یہ نتیجہ تو ضرور اخذ کر لیا تھا کہ اظفر اور اس کی ٹیم کی ہلاکت میں چودھری کی
سازش کا عمل دخل ہے اور شاید منشیات کے مکروہ دھندے میں ملوث چودھری نے جنگل میں افیون کی کوئی
گاہ وغیرہ بنا رکھی ہے کہ وہ پہلے بھی جنگل کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ لیکن
حال وہ کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکے تھے۔ کرنل توحید کے جس نمائندے سے اُس کی اس سلسلے میں بات
ہوئی تھی اس نے اسے بتایا تھا کہ آج کل وہ لوگ دیگر معاملات میں بہت زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں اس
طور پر اس معاملے پر توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اس معاملے کو فراموش کر
ہیں کیونکہ عمیر کی اظفر سے رشتے داری اپنی جگہ لیکن اظفر اور اس کے ساتھی انہیں اس سے کہیں بڑھ کر
تھے اور وہ اپنے ساتھیوں کا قتل کسی صورت معاف نہیں کر سکتے تھے۔ بے شک کچھ تاخیر ہو جائے لیکن
اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچانا تھا۔

اُس سے یہ سب کہنے والے کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ وہ اس کے بیان کو قطعی طور پر سیاسی بیان قرار

نہیں دے سکا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ اس سے جو کہا گیا ہے، اس پر عمل بھی کیا جائے گا۔ دوسرے مشابرم خان کے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے بھی بے دست و پا تھا۔ بطورِ اے سی تو اُسے اپنی ذمے داریاں نبھانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا کہ دفتری معاملات میں عبدالمنان جیسا مخلص اور تجربہ کار پی اے راہنمائی اور معاونت دونوں فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا لیکن وہ جو اپنی ملازمت کے ساتھ ایک سائیڈ مل دیکھ رہا تھا، اس کے لیے مشابرم خان کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ اسے علم تھا کہ شہریار کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے مشابرم خان بہت سے حالات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف ہے بلکہ مشکل حالات میں ساتھ دینے کے لیے ایک بہترین ساتھی بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے اسے اس کا شدت سے انتظار تھا لیکن وہ بھی آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں البتہ اسے اتنی اطلاع ضرور فراہم کر دی گئی تھی کہ ایک اہم معاملے میں اُلجھنے کی وجہ سے مشابرم خان مضروب ہے اور مکمل صحت یابی تک نامعلوم مدت کے لیے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہے گا۔

اتنے سارے اُلجھے ہوئے معاملات کے ساتھ اس نے چودھری کی دعوت بہت بے دلی سے اور صرف مصلحتاً قبول کی تھی اور یہاں آتے ہی اسے بتایا جا رہا تھا کہ قبلہ چودھری صاحب کا مزاج ذرا برہم ہے اس لیے گفتگو میں احتیاط برتی جائے۔ اس مشورے پر اسے غصہ تو بہت آیا لیکن پھر ضبط کر گیا۔

ادھر چودھری نے منشی کے اندازے کے برخلاف خود کو کافی سنبھال لیا تھا۔ بھرپور نیند لے کر اُٹھنے کے بعد اس نے سارے معاملے پر بہت ٹھنڈے دماغ سے غور کیا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ لِنڈا کو فون کر کے اپنی اس بے عزتی کے لیے اس سے شکوہ کرے لیکن پھر خود ہی ارادہ تبدیل کر لیا۔ حالات نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ لِنڈا اس سے محبت کے کتنے ہی دعوے کرے لیکن حقیقت میں وہ تنظیم کی وفادار تھی اور تنظیم کے مفادات کے برخلاف اسے کوئی فیور نہیں دے سکتی تھی اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس بے عزتی کو خاموشی سے پی لیا جائے اور ہوشیاری سے حالات پر نظر رکھی جائے۔

یہ صحیح تھا کہ وسیع اختیارات و وسائل رکھنے والی منشیات فروشوں کی اس تنظیم نے اسے وقتی طور پر زیر کیا تھا لیکن کوئی لمحہ ایسا بھی آ سکتا تھا جب اس کا داؤ چل جائے۔ خصوصاً الفا نامی بلا کو تو وہ موقع ملتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دینے کا ارادہ رکھتا تھا، البتہ اس موقع کی تلاش میں اسے ذرا صبر کرنا پڑتا۔ صبر اور انتظار کا دوانیہ اس حساب سے اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ مالی فوائد تو اسے اب بھی حاصل تھے اور کوئی خاص کام کیے بغیر اس کے فارن اکاؤنٹس میں کثیر سرمائے کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے دل و دماغ کو اس نکتے پر متفق کر لینے کے بعد اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا کہ وہ نئے اے سی عمیر آفندی سے خوشگوار موڈ میں ملاقات کرے چنانچہ حسبِ معمول کرّ و فر کی تیاری کے ساتھ اس نے عمیر سے بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔ عمیر بھی جواباً اس سے گرم جوشی سے ملا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''کیسے مزاج ہیں چودھری صاحب!..... منشی نے بتایا کہ آج آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اگر ایسا ہے تو آپ آج کا ڈنر کینسل کر سکتے تھے۔ ہم کسی اور دن اکٹھے ہو جاتے۔ ویسے بھی اب عرس کے موقع پر تو ہمیں یہاں آنا ہی تھا۔''

''ارے نہیں اے سی صاحب! ایسا بھلا کیسے ہوسکتا تھا کہ ہم خود دعوت دے کر اسے کینسل کر دیں۔ ویسے بھی میری طبیعت زیادہ خراب نہیں تھی، بس ذرا بی پی ہائی ہو گیا تھا۔ دوا کھا کر آرام کیا تو سیٹ ہو گیا۔ منشی نے آپ سے ایویں اس بات کا ذکر کیا۔ اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور کھلے دل سے آپ کو



ایلی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ رہی عرس کے موقع پر آنے کی گل تو وہ تو خیر نال آپ کو آنا ہی ہے۔ پر اُس دا اور اِس دعوت میں فرق ہے۔ عرس پر بہت مہمان آئیں گے لیکن آج کی دعوت تو خاص الخاص آپ کے لیے ہے۔''

مصافحے کے بعد عمیر کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے وہ بڑی اپنائیت سے اسے تھامے ہوئے حویلی کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرس میں شرکت کے لیے آنے والے عام لوگ ہوں گے۔'' عمیر کا خوامخواہ ہی دل چاہا کہ اس سے چھیڑ خانی کرے چنانچہ ایک ایسی بات کہہ دی کہ چودھری بوکھلا گیا۔

''نہ نہ اے سی صاحب! ایسی کوئی گل نہیں ہے۔ عرس میں جنہیں دعوت دے کر بلایا جاتا ہے، وہ سب میرے خاص دوست ہور عزیز ہی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی گل الگ ہے۔ آپ اس ضلع کے کرتا دھرتا ہو۔ ہور ہم اس کے خدمت گار۔ اس لیے ہمارا آپ کا واسطہ پڑتا رہے گا۔ یہی سوچ کر میں نے مناسب سمجھا کہ تنہائی میں آپ سے ایک ملاقات کر لی جائے تاکہ ہم ایک دوسرے کو چنگی طرح سمجھ سکیں۔ عرس پر رش اور مصروفیات میں کھل کر ملاقات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔''

''یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں چودھری صاحب! بس ایسے ہی ازراہِ مذاق ایک بات کہہ دی تھی۔'' اس کی باتیں سن کر عمیر نے اسے تسلی دی اور چودھری کو کھولنے کی خاطر بڑے دوستانہ انداز میں بولا۔

''آپ نے ہمارے اور اپنے تعلق کے حوالے سے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہمارا ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ بس اتنا یاد رکھیے گا کہ خدمت گار آپ نہیں، ہم ہیں۔ حکومت نے ہمیں آپ کی خدمت کے لیے ہی تو تعینات کیا ہے۔ اس لیے پلیز اگر آپ کو کہیں بھی کوئی مسئلہ ہو، مجھے ضرور بتایئے گا۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔'' چودھری کو بانس پر چڑھانے کے لیے وہ بھرپور انکساری اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کے روّیے کے باعث چودھری کی باچھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہمارے لیے کچھ کیا تو جواب میں آپ کو بھی ہماری طرف سے مایوسی نہیں ہو گی۔'' وہ اتنا پُرجوش ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر یقین دلانے لگا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ کے اس دعوے کو بھی آزما کر دیکھیں گے۔ لیکن فی الحال تو ایک ایسا سا مسئلہ ہے، آپ اس سلسلے میں کرم فرما دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں آپ کو اس سلسلے میں تکلیف تو نہیں دینا چاہتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے بھی اوپر والوں کو رپورٹ دینی ہوتی ہے۔''

''آپ مسئلہ بتائیں کہ کیا ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ چنگی بجاتے میں حل کر دوں گا۔'' اس کے روّیے کا چودھری پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اس سے ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار نظر آنے لگا۔

''مسئلہ گاؤں کے اسکول اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کا ہے۔ اسکول میں ٹیچرز نہیں ہیں اور وہاں خاک اُڑ رہی ہے اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کی صحت کے مسائل بڑی تعداد میں سامنے آ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ہی دو خواتین کو الیفائیڈ لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کے باعث ڈلیوری کے دوران موت کا شکار ہوئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی طرف سے کچھ رکاوٹیں ہیں اس لیے اسٹاف نہیں آ رہا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ میڈیا کا دور ہے۔ اب بھی اے اے منشا نامی جرنلسٹ نے ان دونوں ایشوز کو لے کر مجھ پر خاصی لعن طعن کی ہے کہ بطور اے سی میرا فرض بنتا ہے کہ ان دونوں مسائل کو فوری طور پر حل کر دوں۔''

وہ بڑی خوب صورتی سے چودھری کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر چودھری ظاہری پراشتعال میں آ گیا اور بولا۔

''یہ خوامخواہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ میں بھلا کیوں نہ چاہوں گا کہ میرے پنڈ میں تعلیم صحت کے مسائل حل ہوں؟ لیکن کوئی ڈھنگ سے کام کرنے والا تو ہو۔ آپ سے پہلے والے اے سی کہیں سے فنڈز حاصل کر کے اسکول اور مرکزِ صحت کے لیے عمارتیں تو بے شک بنوا دی تھیں لیکن افسوس کہ ڈھنگ کا اسٹاف نہیں رکھ سکا اسکول میں پڑھانے کے لیے وہ جانے کن اوباش لونڈے لپاڑوں کو لے آیا سننے میں آیا تھا کہ وہ لڑکے پڑھانے سے زیادہ گاؤں کی عورتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اپنی بہو، بیٹیوں پر نظر کون برداشت کرتا ہے بھلا؟ مجھے صحیح سے نہیں معلوم پر سننے میں آیا تھا کہ ان چھڑے چھانٹ ٹیچروں نے کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اس کے گھر والوں نے انتقاماً چپکے سے اس گھر میں آگ لگا دی جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ دونوں ہی جرائم چونکہ ثابت شدہ نہیں ہیں، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ البتہ پچھلے اے سی نے اس کیس میں خوامخواہ میری گردن پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی کوشش میں خیر وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور بعد میں اس نے مجھ سے مصالحت کر لی تھی۔ میں بھی چپ ہو گیا کہ چلو دو۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بعد میں اے سی صاحب کی اپنی ساس صاحبہ اسکول میں پڑھاتی رہیں اور ان کی بیگم مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر رہی۔ بعد میں جانے کیا ہوا کہ اے سی کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی یہاں سے غائب ہو گئیں۔ ان کے غائب ہونے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ عیسائی ماں بیٹی میرے پنڈ کی عورتوں اور بچوں کو خراب کر رہی تھیں۔ ماں استانی بن کر مسلمان بچوں کو نہ جانے کون کون سی تعلیمات دے رہی تھی اور بیٹی ڈاکٹرنی کے روپ میں عورتوں کو اُلٹے سیدھے مشورے دے کر انہیں بچے پیدا کرنے سے روک رہی تھی۔ میں اس گاؤں کا جاگیردار بھی ہوں اور روحانی پیشوا بھی۔ یہاں کچھ ہوتا ہے تو لوگ میرے پاس فریاد لے کر آتے ہیں۔ گاؤں کے مردوں نے یہ معاملات میرے سامنے رکھے تو میں نے ان کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کر دیا کہ اب اسکول اور مرکزِ صحت میں بغیر چھان پھٹک کیے اسٹاف نہیں رکھا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری طرف سے شدید مزاحمت ہو گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس میں غلط کیا ہے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو تعلیم کے نتیجے میں لامذہب ہوتے اور اپنی عورتوں کو مسلمانوں کی نسل کشی میں حصہ دار بنتے دیکھتے رہیں؟ اس گاؤں کا کوئی بھی فرد اس قیمت پر تعلیم اور صحت نہیں چاہتا اور میں صرف ان کی ترجمانی کرتا رہا ہوں۔''

وہ بولنے پر آیا تو جھوٹ کے انبار پر انبار لگاتے ہوئے اپنے حق میں کہانی بناتا چلا گیا جس سے وہ متاثر تو خیر کیا ہوتا لیکن مصلحت کے تحت نرمی سے بولا۔

''آپ کا مؤقف بالکل ٹھیک ہے چودھری صاحب! اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے علاقے کے لیے ٹیچنگ اسٹاف اور لیڈی ڈاکٹر کا تقرر کرتے ہوئے پوری احتیاط برتوں گا۔ بلکہ آپ چاہیں تو خود بھی ان لوگوں سے مل کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔ بس میری اتنی گزارش ہے کہ یہ دونوں کام ہو جانے چاہئیں۔ کیونکہ نہ ہونے کی صورت میں میرے کیریئر پر بہت برا اثر پڑے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں خوشامد کا عنصر بھی پیدا کر لیا جس نے چودھری کو خوش کر دیا۔

''ٹھیک ہے اے سی صاحب! ہم نے آپ کی یہ فرمائش پوری کی۔ اب ہم آپ کا کیریئر تو خراب نہیں کر سکتے نا۔ پر یاد رکھیے گا کہ ہماری طرح آپ کا بھی ضرورت کے وقت ہمارے کام آنے کا وعدہ ہے۔



اس پر منظوری دیتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی دے دی۔

''اپنی ٹائم چودھری صاحب! مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔'' عمیر نے خوش دلی سے جواب دیا۔

اس کے بعد ان کے درمیان دوسرے عمومی معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ اس دوران کھانا لگنے کی اطلاع دے دی گئی۔ پھر شاہ لوازمات سے سجی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ دوستانہ فضا مزید رنگ جمانے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ ان کی پہلی ملاقات نہیں۔ بلکہ وہ عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

''پرانے اے سی کے ساتھ اس کا ایک بہت چہیتا ڈرائیور ہوا کرتا تھا..... کیا نام تھا اُس کا.....؟'' گفتگو کے دوران چودھری نے اپنی مرضی کا ایک موضوع چھیڑا اور یوں بات کو ادھورا چھوڑ دیا جیسے کوشش کے باوجود یاد نہ آ رہا ہو۔

''مشابرم خان۔'' عمیر نے اس کی یادداشت کی بحالی کے لیے خود نام بتایا۔

''ہاں ہاں، بالکل یہی۔ مشابرم خان۔ کیا وہ اب بھی موجود ہے؟'' چودھری بہترین اداکاری کر رہا تھا۔

''جی ہاں، ظاہر ہے۔ پرانے اے سی کے نہ ہونے سے وہ اپنی گورنمنٹ جاب چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا۔ کام کر رہا ہے وہ محکمے میں۔ البتہ آج کل چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کی والدہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے اس سلسلے میں۔ آپ فرمائیں، آپ کو اُس کی یاد کیسے آ گئی؟''

بظاہر کھانے میں مگن بے نیازی سے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عمیر کن انکھیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بس بڑا ہی بدتمیز قسم کا آدمی تھا۔ شہریار عادل نے اسے ضرورت سے زیادہ سر چڑھا رکھا تھا، اس لیے وہ خود کو اے سی کے ڈرائیور کے بجائے اے سی سمجھنے لگا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے میرے ملازمین سے بھی الجھنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، میرا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بس آپ کو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ ایسے اوباش آدمی کو زیادہ سر نہ چڑھائیں۔ سننے میں آیا تھا کہ آپ نے بھی اسے اپنا ذاتی ڈرائیور برقرار رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں ہو گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے لیے کوئی دوسرا ڈرائیور منتخب کر کے اسے محکمے میں لگوا دیں اور کھپا دیں ورنہ کل کلاں کو وہ آپ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ آپ تو سمجھ ہی سکتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کو ایک بار اختیار کا نشہ ہو جائے تو پھر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ شہریار عادل کے دور میں وہ خاصا بااختیار ہو گیا تھا۔ اب بھی اس کا یہ رویہ برقرار رہ سکتا ہے۔''

وہ بڑے مناسب انداز میں عمیر کو مشابرم خان کی طرف سے بھڑکانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ عمیر نے بھی اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ میں نے بھی ایک دو مواقع پر محسوس کیا تھا کہ وہ کسی معاملے میں میری اجازت لینے سے قبل خود ہی عملی اقدامات اٹھا لیتا ہے لیکن میں نظرانداز کر گیا۔ اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو اس کی طرف سے ہوشیار رہوں گا اور جہاں کہیں اسے اس کی حدود سے تجاوز کرتے دیکھا، گوشمالی ضرور کروں گا۔''

عمیر نے اپنے جواب سے یہ عندیہ تو نہیں دیا تھا کہ وہ مشابرم خان کو اس کی جگہ سے ہٹا دے گا لیکن اس نے جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا، وہ بھی تسلی بخش تھے۔ چودھری نے فی الحال اس پر اکتفا کرنا ہی مناسب سمجھا اور عمیر سے دوستانہ تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے مزید گرم جوشی سے اس کی خاطر مدارات

کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی بہت اُداس تھا۔ پچھلے دنوں اس نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ اس کے کریڈٹ پر ایک نہیں کارنامے تھے۔ پہلا کارنامہ اس نے یہ انجام دیا تھا کہ خواجہ سراؤں کے دلدادہ اخلاقی کج روی کے شکار نواب نوازش علی کی کوٹھی میں پنجے گاڑے بیٹھے ''را'' کے کئی ایجنٹوں کو نہایت کامیابی سے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اُس اس کارنامے کی وجہ سے ''را'' والے اپنے کئی ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو گئے جہاں وہ بڑی مقدار میں اسلحہ ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ یہیں جاوید علی اپنی زندگی کے سب سے انوکھے خوبصورت جذبے سے بھی روشناس ہوا تھا۔ اس کے مشن کی انجام دہی میں مدد دینے والی نواب نوازش علی بیٹی شازمین اور وہ محبت کے رشتے میں بندھ گئے تھے اور مختصر مدت میں ہی اس جذبے نے انہیں بڑی شدت سے گرفت میں لے لیا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کہ اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کی مہلت نہیں اور اس سے قبل ہی جاوید علی کو تلاش کرتے ''را'' کے غنڈوں کے ہاتھ شازمین لگ گئی۔ انہوں نے اس جاوید علی کے بارے میں حقائق اُگلوانے کے لیے اتنا برا سلوک کیا کہ وہ نازک کلی سی لڑکی مسل کر رہ شازمین کی موت جاوید علی کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس صدمے کے زیر اثر وہ انتقاماً ''را'' کے ایک فرد کو کچل ڈالنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ شاید اس کے جذبے کی گہرائی تھی کہ اس کے کئی مواقع بھی میسر آ پہلے اُسے لاہور سے آنے والے اسپیشل ایجنٹ عادل خان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا اور انہوں بھارت کے تیار کردہ دہشت گرد سلیم عرف سلّو سے بڑی خوبی سے دو دو ہاتھ کیے۔ سلّو کا قصہ ختم ہونے بعد عادل خان تو واپس چلا گیا لیکن وہ ریاض انور کی راہ پر لگ گیا۔ نیک نام سمجھا جانے والا یہ سیاسی درحقیقت ''را'' کا نمک خوار تھا۔ جاوید علی نے اپنے تدبر اور حکمتِ عملی سے اسے بھی انجام تک پہنچا دیا کوشش کے باوجود وہ ریاض انور سے ''را'' کے مزید ایجنٹوں یا ٹھکانوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر تھا اور اس طرح آگے کوئی راہ نظر نہ آنے کی وجہ سے آج کل بے دست و پا بیٹھا تھا۔

یہ بے کاری اور بے عملی ہی تھی جس نے بیک وقت اسے جھنجلاہٹ اور اُداسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ تک وہ حرکت میں تھا، اُسے لگتا تھا، شازمین کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا رہا ہے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں تو اس کی جدائی کا غم اور اذیت ناک موت کا خیال زیادہ ستانے لگا تھا۔ اگرچہ اسے اس کے محکمے کی سے بہت سراہا گیا تھا اور کراچی سے لاہور واپس بلا کر کچھ دن کی چھٹیاں بھی دے دی گئی تھیں کہ وہ اپنا کے ساتھ کچھ وقت گزار لے۔

ماں سے وہ سنگل پیرنٹ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہی بہت قریب رہا تھا اور اگر عام حالات میں چھٹیاں ملی ہوتیں تو وہ انہیں ماں کے ساتھ بہت انجوائے کرتا لیکن اب تو دل و دماغ کی یہ حالت تھی کہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی ماں کو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں معلوم تھا۔ اس اُنہیں سب کچھ بتایا تھا اور بچوں کی طرح ان کے سینے سے لگ کر رویا بھی تھا۔ وہ خود جوانی میں تھیں، اس لیے اس دُکھ سے واقف تھیں جو اُن کا بیٹا جھیل رہا تھا۔

انہوں نے اس سے اس کے کسی رویّے کا شکوہ نہیں کیا تھا اور اپنے طور پر اس کا دل بہلانے اور بنانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ کیا کرتا کہ اس کے دل و دماغ ایسی کسی کوشش سے بہلتے ہی نہیں



شازمین کی موت کے بعد اگر کبھی سکون محسوس ہوا تھا تو صرف ان لمحوں میں جب وہ ملک دشمنوں کے برسرِ پیکار رہا تھا۔ اب بھی اسے احساس ہو گیا کہ اگر وہ آرام کے نام پر ملنے والی چھٹیوں میں اس گھر بیٹھا رہا تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گا۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے اس نے سامان پیک کیا اور ماں کو حافظ کہہ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جلد وہ لاہور میں قائم سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں ذیشان کے سامنے تھا۔

''اتنی جلدی کیوں آ گئے جوان!.....تم نے بہت کام کیا تھا اور ان چھٹیوں پر تمہارا حق تھا۔'' ذیشان اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے جتنا آرام کرنا تھا، میں نے کر لیا سر!.....میں نہیں سمجھتا کہ مجھے مزید آرام کی ضرورت ہے، اس میں واپس آ گیا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں ذیشان کی بات کا جواب دیا۔

''گڈ.....یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم کام سے دل چرانے والوں میں سے نہیں ہو۔ ٹھیک ہے، ڈیوٹی ان کر لو۔ پھر جہاں کام نکلا، تمہیں اس طرف لگا دیں گے۔''

ذیشان کو بھی اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات سے واقفیت تھی، اس لیے زیادہ بحث میں پڑے اسے جوائننگ کی اجازت دے دی۔

''کام میں خود سوچ کر آیا ہوں سر! بس آغاز کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' اس نے جھکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیسا کام؟'' ذیشان چونکا اور اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''پچھلے دنوں ایک ہندو دکاندار، رائے چند ہماری نظروں میں آیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ہسپتال شہریار عادل کے فنگر پرنٹس اور خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے اس شخص کی نگرانی بھی کروائی تھی لیکن یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ اس سے وہ نمونے کس نے حاصل کیے۔ اس وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ رائے چند کی نگرانی جاری رکھی جائے گی۔ میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ اس نگرانی کے کیا نتائج نکلے۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اس بندے پر مزید کام کر کے ''را'' کے مزید ایجنٹوں کا پتہ لگا سکتا ہوں۔'' اس نے ذیشان کے سامنے وہ بات رکھی جو گھر سے ہی سوچ کر یہاں آیا تھا۔

''رائے چند کی نگرانی اب بھی جاری ہے لیکن یہ کام ہمارا کوئی منجھا ہوا ساتھی نہیں کر رہا بلکہ سیکورٹی ایجنسی کے مختلف اہلکاروں کو یہ ڈیوٹی سونپی جاتی ہے۔ اصل میں ابتدائی نگرانی سے کوئی خاص نتائج حاصل نہیں ہوئے تھے، اس لیے بہتر یہی سمجھا گیا کہ کسی خاص بندے کو اس کام میں اُلجھانے کے بجائے عمومی نظر رکھی جائے جس کے لیے سیکورٹی گارڈز سے کام چلایا جا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ افرادی نہیں ہے اس لیے ہمیں کبھی کبھی ثانوی نوعیت کے معاملات میں اس طرح بھی کام چلانا پڑتا ہے۔ ہمارے سیکورٹی گارڈز بظاہر رائے چند کے اسٹور کے سامنے والے ریستوران پر فرائض انجام دے رہے ہیں ان انہیں ہدایت ہے کہ اگر رائے چند کی دکان پر کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو اطلاع دیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ فی الحال رائے چند کی اس حد تک نگرانی ہو رہی ہے کہ کہیں وہ منظر سے غائب تو نہیں ہو رہا۔ باقی فی الحال وہ آزاد ہی ہے۔''

ذیشان نے اسے تفصیل سے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اصل میں اب تک یہی سمجھا گیا تھا کہ رائے کوئی خاص ایجنٹ نہیں ہے بلکہ اسے چھوٹے موٹے کاموں میں درمیانی آدمی کے طور پر استعمال کیا جاتا

ہے اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے تو بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ فی الحال ہم بالکل اندھیرے میں ہیں اس لیے کہیں کہیں سے کام شروع کرنے کے لیے رائے چند بری چوائس نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کس حد تک نچوڑا جا سکتا ہے۔'' جاوید علی کا لہجہ حتمی تھا۔ ذیشان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اجازت دے دی۔

''اوکے ینگ مین! تم جو چاہو۔ لیکن خیال رکھنا کہ جوش میں ہوش نہ کھونے پائیں۔'' جاوید علی کے اندر جو لاوا اُبل رہا تھا، اسے بہنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ملنا ہی چاہئے تھا اس لیے اسے اجازت دینے میں ہی بہتری تھی۔ البتہ وہ ایک افسر کے طور پر اسے تنبیہہ کرنا نہیں بھولا تھا۔

''ڈونٹ یو وری سر! میں خیال رکھوں گا۔'' جاوید علی نے اسے یقین دلایا۔ البتہ اس کی آنکھیں اس شکاری کی طرح چمک رہی تھیں، جسے شکار کا پرمٹ مل گیا ہو۔

⊛----✪----⊛

امرت کور کے دیئے گھوڑے نے ان کے لیے سفر کو آسان بنا دیا تھا۔ گھوڑا صحت مند اور پھرتیلا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے بغیر رُکے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس سفر کے لیے امرت کور کے دیئے مشوروں پر صرف اس حد تک عمل کیا تھا کہ اس گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چلے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنی مرضی سے سفر کے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ راستے کی تفصیلات اور اردگرد کے نقشے کے بارے میں بہت سی باتیں ان کے اپنے ذہن میں بھی موجود تھیں۔ کیونکہ یہاں آنے سے قبل انہوں نے اس سلسلے میں اچھا خاصا ہوم ورک کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ اجنبی ملک میں اپنی لاعلمی کے باعث پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ چونکہ ایک اہم مشن پر آئے تھے اور امید تھی کہ اس مشن کی تکمیل کے دوران خاصی ہلچل ہے گی اس لیے کسی قانونی راستے سے بھارت میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس صورت میں وہ جہاں بھی جاتے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں رہتے اور وقت بے وقت کی پولیس انکوائری ان کا ناک میں دم کیے رہتی۔

اب بھی ان کے لیے خطرات تو تھے۔ اگر کہیں کوئی پولیس والا اُنہیں گھیر لیتا تو وہ اس کی پوچھ تاچھ کے جواب میں کسی قسم کے شناختی کاغذات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتے تو مشکل حل ہو جاتی۔ آگے جا کر انہیں ایک ایسا بندہ مل جاتا جو ان کے لیے ضروری کاغذات تیار کروا دیتا جن کی موجودگی میں ان کے لیے وقتی طور پر یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ وہ بھارتی شہری ہیں۔ لیکن یہ تو بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو خطرے میں ہی تھے۔ اس لیے کوشش کر رہے تھے کہ سورج نکلنے سے قبل زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں۔ امرت کور کے مشوروں پر بھی انہوں نے اسی احتیاط کے پیشِ نظر عمل نہیں کیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے پکڑی جائے اور ان کے بارے میں سب کچھ اُگل دے تو اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ان کا تعاقب نہ کیا جا سکے۔ ان کی یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی اور سورج نکلنے تک وہ ایک قصبے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

چھوٹے علاقوں کی روایات کے مطابق وہاں صبح سویرے ہی معمولاتِ زندگی کا آغاز ہو گیا تھا اور بازار، دُکانیں وغیرہ کھلی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے چائے خانے کے سامنے گھوڑا روک لیا۔



اس وضع قطع کے باوجود ان کے جسم پر چونکہ سربجیت کے قیمتی کپڑے تھے اس لیے دیکھنے والوں کو ان کے بارے میں یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی قریبی دیہات کے صاحبِ حیثیت جوان ہیں اور کسی خاص مقصد کے تحت اس قصبے تک آئے ہیں۔ انہوں نے جیسے ہی گھوڑا روک کر چائے خانے کی طرف قدم بڑھائے، ایک بوڑھا سا لڑکا فوراً الرٹ ہو گیا اور اپنے کندھے پر پڑے میلے سے کپڑے سے جلدی جلدی کرسیاں صاف کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

''اِدھر بیٹھیں صاحب جی!''

وہ دونوں خاموشی سے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''حکم صاحب!'' لڑکا سربستہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''پراٹھے، انڈے، ایک پلیٹ حلوہ اور دو دودھ پتی۔'' سلّو نے شہریار سے مشورہ کیے بغیر آرڈر دیا۔ چائے خانے کے سامنے ہی دو افراد بڑے بڑے توؤں پر یہ لوازمات تیار کر رہے تھے اور وہاں بیٹھ کر ناشتہ کرنے والوں کے علاوہ کئی لوگ لفافوں میں بھی یہ اشیا خرید کر لے جا رہے تھے۔ چائے خانے کے بالکل ساتھ اس طرح کا انتظام خوب تھا۔ اس طرح لوگوں کو چائے کے ساتھ ساتھ بھرپور ناشتے کی بھی سہولت حاصل ہو جاتی۔ لیکن شہریار، سلّو کے آرڈر پر کچھ گھبرا سا گیا۔ اُسے اس قسم کا بھاری بھرکم ناشتہ کرنے کی قطعی عادت نہیں تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے یہ سب کھانا اوّل تو مشکل ہو گا لیکن اگر کسی طرح کھا بھی لیا تو شاید ہضم نہ کر پائے۔

''ہم جس گیٹ اپ اور جیسے علاقے میں ہیں، اس کے مطابق یہی ناشتہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی شدید بھوک لگ رہی ہے۔ بھاگ دوڑ میں رات کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب موقع ملا ہے تو بہتر ہے جی بھر کر کھا لیں۔''

اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپتے ہوئے سلّو نے سرگوشی میں کہا۔ ناچار شہریار کو بھی قائل ہونا پڑا۔

اور جب ان کی میز پر گرما گرم ناشتہ چُنا گیا تو اس کی خوشبو ہی اتنی اشتہا انگیز تھی کہ دل میں اس قسم کے بھاری ناشتے کے لیے ناپسندیدگی محسوس کرنے والا شہریار اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور ایک بار ہاتھ بڑھا تو اس نے اس وقت تک سلّو کا ساتھ دیا، جب تک جملہ لوازمات ختم نہ ہو گئے۔ یہ شدید بھوک کے ساتھ ساتھ ناشتے کی لذت کا بھی کمال تھا کہ وہ برسوں سے کاربند اصولوں پر سے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اب وہ پہلے والا شہریار عادل کب رہا تھا؟ اس شہریار عادل کو تو اس نے خود اپنی مرضی سے ہزاروں نقابوں میں چھپا دیا تھا اور آنے والے وقت میں جانے کون کون سے اور کتنے ناموں سے اپنا تعارف کروانے والا تھا۔

''مزہ آ گیا نا ناشتہ کر کے؟'' سلّو نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''ہاں یار! زبردست ناشتہ تھا۔'' اس نے اعتراف کیا۔

ذرا دیر میں ہی سلّو کے اشارے پر ان کی میز پر سے خالی برتن ہٹا کر دودھ پتی کے بڑے بڑے پیالے رکھ دیئے گئے۔ ناشتے کے تجربے کے بعد شہریار کے پاس اب اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پیالہ تھام لیا۔

اسی وقت قریبی میز سے ایک جوان العمر شخص اُٹھ کر ان کی میز کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بعد ساتھ بیٹھنے کی اجازت چاہی جو انہیں دینی پڑی۔

''میرا نام جگدیش ہے۔ ادھر ہی کا رہنے والا ہوں۔ قصبے کے سارے لوگ مجھے ہور میں اُن کو جانتا ہوں۔ پر آپ لوگوں کی شکلیں میرے لیے نئی ہیں۔ کدھر سے آئے ہو آپ؟''

اس کا لہجہ اگرچہ مہذبانہ تھا لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کھوج تھی اور اس کھوجی تاثر کی وجہ سے وہ اچھی خاصی شکل وصورت کا مالک ہونے کے باوجود بڑا شاطر بندہ لگ رہا تھا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا بھرا!..... اسیں اِدھر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ تارانگر پنڈ سے آئے ہیں۔ میرا نام رمیش ہے ہور یہ میرا اِنگا بھرا رویندر ہے۔ ہے تو یہ میرے چاچے دا پُتر پر تم سگا ہی سمجھو۔ آنے والے مہینے میں اس کا ویاہ ہونے والا ہے۔ ہور اپنے نِکے بھرا کا ویاہ ہو ہور اس میں شوشا نہ ہو، ایہہ کیسے ہو سکدا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ چل تجھے لے کر شہر چلتا ہوں۔ اُدھر سے ساری خریداری کرواؤں گا۔ بہت لمبا سفر ہے ہمارے پنڈ سے شہر کا۔ ہم لوگ پوری رات ہی سفر کرتے رہے ہیں۔ یہاں رُکے تھے کہ بھوجن کر کے تھوڑی دیر کسی سرائے میں آرام کریں گے، فیر آگے جائیں گے۔''

جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی۔ سلّو اس سے عمر میں چھوٹا تھا، اس حساب سے یہ کہنا مناسب بھی لگ رہی تھی۔

''کدھر جاؤ گے خریداری کے لئے؟..... اگر ہریانہ جانا ہے تو بتاؤ۔ میرا ایک یار اپنی دُکان کے لیے سامان لینے اُدھر جانے والا ہے۔ میں تمہیں اُس کے ساتھ کر دوں گا۔'' جگدیش نامی جوان کی آنکھیں اس کی بات سن کر چمکنے لگیں اور اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''دھنّے واد بھرا!..... پر ہمیں ہریانہ نہیں جانا۔ ہم دلّی جا کر خریداری کریں گے۔ سنا ہے وہاں وڈا بڑا مال ملتا ہے۔''

شہریار نے اس کی پیشکش رد کر دی۔ اب تک وہی اس نووارد سے گفتگو کر رہا تھا اور سلّو سچ مچ ایسے کم دیہاتی نوجوان کی طرح خاموش اور شرمایا ہوا بیٹھا تھا جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہو اور وہ بڑے بھائی کی موجودگی میں اس موضوع پر گفتگو میں حصہ لینے سے ہچکچا رہا ہو۔

''کیا اس گھوڑے پر بیٹھ کر ہی دلّی جانے کا ارادہ ہے؟..... اگر ایسا خیال ہے تو سوچ لو کہ ویاہ کی مشکل سے ہی تم اپنے پنڈ واپس پہنچو گے۔'' جگدیش نے تمسخرانہ لہجے میں ان کے پاس موجود سواری کی بے بضاعتی کا احساس دلایا۔

''نہ بھرا جی! دلّی تک اس گھوڑے پر کیوں جائیں گے؟ ہم نے سوچا ہے کہ گھوڑا کسی بھلے آدمی کے ہاں یہیں رکھوا دیں گے ہور یہاں سے لاری میں دلّی کے لیے نکل جائیں گے۔ اُدھر سے خریداری کر کے واپس آئیں گے تو پہلے ادھر رُک کر اپنا گھوڑا لیں گے ہور فیر واپس اپنے پنڈ تارانگر پہنچ جائیں گے۔''

اُس کے تمسخرانہ انداز کو نظر انداز کر کے شہریار نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ جو شاطر محسوس ہونے والا شخص پوری طرح یقین کر لے کہ وہ واقعی بہت سادہ لوح دیہاتی ہیں جو پہلی بار اپنے گھر سے باہر نکلے ہیں اور انہیں زمانے کی چالبازی کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ جگدیش کی آنکھیں پہلے سے زیادہ چمکنے لگیں۔

''تم دونوں میں سے کوئی پہلے کبھی دلّی گیا ہے یا نہیں؟'' بظاہر اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''نہ۔'' شہریار نے جواب دینے کے ساتھ زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور مزید بولا۔ ''اسیں پہلی بار اُدھر جا رہے ہیں۔ اصل میں اپنے ویاہ میں تو ایسا کوئی ہوش نہیں تھا۔ جو کچھ بڑوں نے کیا، اس پر شکر کر لیا۔



اب اپنا اِنگا بھرا ہے نا۔ اس کے ویاہ میں دل کے سارے ارمان نکالنے ہیں۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ بے ڈھنگے پن سے کسی ایسے ناآسودہ آدمی کی طرح ہنسا جسے اپنی شادی پر بظاہر خواہ دھوم دھام ہونے کا قلق ہو لیکن ادب وآداب کے تکلفات اور بڑوں کے لحاظ نے اظہار کا موقع نہ دیا ہو۔

''یہ تو وڈی چنگی گل ہے۔ لگتا ہے تم اپنے اس بھرا سے سچ مچ بڑا پریم کرتے ہو۔ پر بھائیا جی! میں تم کو ایک گل صاف بتا دوں۔ اُدھر دلّی میں نئے آدمی کے لیے وڈی مشکل ہوتی ہے۔ دکان دار، آٹو رکشہ والے۔ سبھی والے۔ ہوٹل والے سب مل کر نئے آدمی کو خوب لوٹتے ہیں۔ ادھر ویسے بھی بڑی مہنگائی ہے۔ وہاں کے بازاروں میں خریداری کے لیے تھوڑی بہت رقم سے گزارہ نہیں ہوتا۔ ٹھیک ٹھاک رقم ہو بندے کے پاس تو ادھر کا رخ کرے۔ ورنہ جانا بے کار ہے۔''

''رقم وی کوئی گل نہیں ہے۔ یہ اپنا بھرا ہے نا، اس کے ویاہ پر میں اپنی ساری کمائی لٹانے کو تیار ہوں۔''

شہریار اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ چالاک آدمی اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے بے وقوف بنا کر فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ بے پروائی سے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ دلّی جاؤں گا۔ میرا اُدھر کئی واری جانا ہوا ہے۔ ہور میں مٹیا محل توں چاندنی چوک تک ہر جگہ کو چنگی طرح جاندا ہاں۔ پر جب تمہیں اپنے لٹنے کی فکر نہیں تو میں اپنا کام دھندا چھوڑ کر کیوں تمہارے ساتھ جاؤں؟ ہاں پر اگر تم چاہو تو اپنا گھوڑا میرے پاس چھڈ سکدے ہو۔ رام کی اِچھا سے چنگی حالت میں ہی پاؤ گے۔'' اس نے ایک اور جال پھینکا۔

''دھنّے واد بھرا! تم جیسے بھلے آدمی کے پاس گھوڑا چھوڑ کر ہم شانتی سے خریداری کے لیے دلّی جا سکتے ہیں۔'' اس نے جگدیش کے پاس اپنا گھوڑا چھوڑنے کا عندیہ دے کر اسے خوش کر دیا۔ البتہ دلّی ساتھ لے جانے کے لیے حامی نہ بھری کہ مبادا وہ شخص ان کے ساتھ چپک ہی نہ جائے اور انہیں اس سے جان چھڑانے میں اپنا وقت برباد کرنا پڑے۔ گھوڑے کی حد تک تو معاملہ اس لیے ٹھیک تھا کہ انہیں خود بھی اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور یہاں سے آگے جانے سے پہلے انہیں اس سے جان چھڑانی ہی تھی۔

''او نِکے! یہ کیا، تُو کُڑیوں کی طرح بیٹھا بس شرمائے جا رہا ہے۔ چل ذرا وڈے بھرا کے لیے ملائی مار کر ایک پیالہ دودھ پتی تو منگوا۔'' جگدیش کو اپنے جواب سے خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے سلّو کو بھی کسی بار کرنے والے بڑے بھائی کی طرح جھڑکنے کا فریضہ انجام دیا اور اس نے بھی پوری سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔

چائے پی کر وہ جگدیش کے ساتھ اس سرائے کی طرف روانہ ہو گئے جو اس کے مطابق اس علاقے کی واحد سرائے تھی۔

⊛----✪----⊛

وہ بہت حسین لڑکی تھی۔

اس کے متناسب جسم کے اوپر جو چہرہ سجا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ چودھویں کا چاند بھی شرما جائے گا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ گھور آنکھیں، ستواں ناک، رس بھرے سرخ ہونٹ، دودھ میں گلال گھلی رنگت والی بے داغ جلد اور سیاہ ناگن سی زلفیں جو دیکھنے والے کو خود میں اُلجھا ڈالیں، سو وہ اُلجھ ہی گیا تھا۔

اس کا نام منیر تھا اور کچھ دن قبل وہ بشیر اکبر کے نائب کے عہدے پر فائز تھا لیکن وہاں جو انقلاب آ
اس کے نتیجے میں وہ نائب سے آقا کے عہدے پر جا پہنچا۔ نئی نئی ملی اس سرداری نے اسے فی حال اتنا الجھا
ہوا تھا کہ کسی تفریح کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

بشیر اکبر کے اچانک غیاب کے حوالے سے اس نے شروع سے جو مؤقف اختیار کیا تھا، اگرچہ اب
اس پر سختی سے قائم تھا لیکن پھر بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے اسے وقتاً فوقتاً نمٹنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں
ہی وجہ سے وہ فی الحال بہت محتاط بھی تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی کو خود پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع نہ د
اس کوشش کے باعث وہ سب سے بڑی تفریح، عورت سے بھی دُور رہ رہا تھا ورنہ یہ وہ چیز تھی جو بشیر اکبر
دورِ اقتدار میں اسے کثرت سے میسر تھی۔ اس سلسلے میں بشیر اکبر نے اپنے کسی ساتھی پر کبھی پابندی عائد
کی تھی اور اس آزادی کا فائدہ منیر جیسے لوگ خوب اٹھاتے تھے کیونکہ وہ اپنی برسوں پرانی بیویوں سے ا
چکے تھے۔

منیر کی شادی کو پندرہ سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور اس سلسلے میں اس کی کبھی خوب صورت کہلا
والی بیوی چھ عدد بچوں کی پیدائش کے بعد پھول کر اتنی کپا ہو چکی تھی کہ اس موٹاپے میں اس کے نقش و نگار
جانے کے ساتھ ساتھ جلد کی رنگت اور تازگی کو بھی زوال آ گیا تھا۔

اس زوال شدہ حُسن والی عورت کو اپنے چھ عدد بچوں کی پرورش پر لگا کر منیر خود دل بھر کر عیاشی کرتا
تھا اور اس عیاشی کے لیے اسے ایسی آڑ مہیا تھی کہ کبھی پکڑ میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا عیار تھا کہ تنظیم
کرتا دھرتا بن جانے کے بعد خود تو بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گیا تھا لیکن بیوی بچوں کو پہلے والے گھر
ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ تنظیم کے سربراہ کی ذمے داری بہت بڑی ہے اور یکسوئی سے یہ ذمے
نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ گھریلو زندگی کے جھمیلوں سے دور رہے۔ مثال کے طور پر پیش کرنے
لیے بشیر اکبر کا طرزِ زندگی موجود تھا، جس نے اپنے مشن کی خاطر کبھی شادی نہیں کی تھی۔ منیر چونکہ پہلے
شادی شدہ تھا، اس لیے یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا۔ اس لیے اس
بندوبست کر دیا تھا کہ مستقل قیام تو بشیر اکبر والی رہائش گاہ پر رکھے گا لیکن وقتاً فوقتاً بشرطِ ضرورت بیوی
سے ملنے بھی جاتا رہے گا۔

بیوی جو عرصے سے اُس کی بے رُخی اور بے اعتنائی سہہ رہی تھی، اس بات کو مانتی نہ تو کیا کرتی۔ ا
بھی اب اس کی زندگی جس نہج پر آ گئی تھی، اس میں اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اسے اپنے اور بچوں کے
خرچہ پانی ملتا رہے۔ اور ظاہر ہے، منیر کے نائب سے سربراہ بننے کے بعد آمدنی میں اضافہ ہونا ہی ہوا
چنانچہ وہ صبر شکر کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور منیر صاحب کوچ کر کے بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے
اسے بیک وقت بہت سے مسائل سے نمٹنا پڑ رہا تھا اور وہ بخوشی نمٹ رہا تھا کہ ہر تکلیف کے بعد راحت
کی امید ہوتی ہے۔ اور اب سامنے جو لڑکی موجود تھی، اسے دیکھ کر اسے لگ رہا تھا کہ راحت مل ہی گئی
لڑکی کو ایک ایسا شخص اپنے ساتھ لے کر آیا تھا جو برسوں سے تحریک کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور اس
اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے باعث اتنی جگہ بنا رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا اسے بشیر اکبر سے ملاقات
اجازت مل جاتی تھی۔ چنانچہ منیر کو بھی یہ اجازت دینی پڑی اور جب وہ اس کے سامنے آیا تو وہ اس سے
مقصد پوچھنا بھول کر اس کے ساتھ موجود حُسنِ مجسم میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ حسینہ ایسی قیامت تھی کہ سنگھار
نام پر اُس کی آنکھوں میں موجود کاجل کی دھار اور ٹھوڑی پر قریب قریب لگائے گئے تین تِلوں کے علاوہ



ل موجود نہیں تھا۔

حقیقت میں اُس کا حُسن اتنا کامل تھا کہ اُسے کسی مصنوعی سنگھار کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ لڑکی کو ساتھ
لے کر آنے والے شخص نے منیر کی بے خودی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو کا
آغاز کیا۔

''یہ گل جاناں ہے سرکار!..... کشمیر کی رہنے والی ہے اور کل ہی میرے گھر پہنچی ہے۔ اس کا بھائی طالب
علمی کے زمانے میں میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ ہم ساتھ گریجویشن کر رہے تھے اور ہماری اتنی گہری دوستی ہو گئی
تھی کہ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کر رکھا تھا کہ زندگی میں کبھی بھی دونوں میں سے کسی کو مدد کی ضرورت
ہوئی تو دوسرا ہر حال میں دوستی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے اس کا ساتھ دے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میرا دوست
اپنے والد کی موت کی خبر سن کر تعلیم مکمل کیے بغیر ہی کشمیر واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے مجھ سے کوئی رابطہ
نہیں رکھا۔ میں بھی تعلیم مکمل کر کے واپس یہاں آ گیا اور اپنی زندگی میں مگن ہو گیا۔ لیکن کل جب گل جاناں
میرے خط کے ساتھ میرے گھر پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ میرا ایک دوست ہوا کرتا تھا جو زمانے کی گردشوں میں مجھ
سے بچھڑ گیا تھا۔ گل جاناں نے مجھے جو خط دیا، وہ میرے دوست نے میرے نام لکھا تھا لیکن اس وقت کے
بعد جب وہ زندہ نہ رہے۔ اس خط میں اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں دنیا میں تنہا رہ جانے والی
اس کی عزیز بہن کو سہارا دوں۔ خط میں موجود تحریر اور گل جاناں کی زبانی سنائے جانے والے حالات کے
نتیجے میں جو تفصیل میرے سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ میرا دوست کشمیر واپس جانے کے بعد حریت پسندوں کی ایک
تنظیم میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے ساتھ رہ کر جوشب و روز گزار رہا تھا، اس میں یہ لازمی تھا کہ اس کی زندگی
کا چراغ کسی لمحے گُل ہو جائے گا۔ اسے زندگی کی چاہ نہیں تھی۔ وہ بس اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا اور
اس آرزو مند تھا کہ اپنے باپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس خواہش نے اس سے تعلیم کے علاوہ ماں،
بہن اور بھائی سب کو چھڑوا دیا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ ان سے دور رہ کر ان کی محبت کو بھی فراموش کر گیا ہو۔ چاہے مہینوں ملاقات نہ ہو
سکی لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ دور رہ کر بھی ان کی خبر گیری کرتا رہے۔ گھر میں جوان بھائی کی موجودگی کے
باعث اسے تسلی تھی کہ ماں بہن کا خیال رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی اور موجود ہے۔ لیکن اس کا یہ اطمینان
اس ایک دن ختم ہو گیا اور اس کے بھائی کو ایک مجاہد کا بھائی ہونے کے جرم میں بے دردی سے ہلاک کر دیا
گیا۔ اس وقت اسے شدت سے احساس ہوا کہ ماں اور بہن کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ
اپنی دونوں بہنوں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، ایک اپنی ماں اور بہن کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر
گھر بیٹھ سکتا تھا؟ ویسے بھی عملاً اس کا اپنے گھر میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ جو اس
کے خون کے پیاسے تھے اور جنہوں نے اس سے دشمنی میں اس کے بھائی کو ہلاک کر ڈالا تھا، بھلا اسے گھر میں
چین سے کب رہنے دیتے؟ وہ دل پر پتھر رکھ کر تحریک کی ذمے داریوں میں مصروف ہو گیا لیکن شاید اسے
احساس تھا کہ جلد وہ بھی بہت سوں کی طرح جامِ شہادت نوش کر لے گا اس لیے اس نے ماں بہن کے تحفظ
کے لیے اتنا کیا کہ میرے نام ایک خط لکھ کر محفوظ کر دیا اور میرا پتہ اپنی بہن کو دے کر اسے سمجھایا کہ اگر کبھی
ایسا ہو کہ اب حالات اس کے لیے بہت سنگین ہو چکے ہیں تو وہ ماں کو لے کر اس خط سمیت میرے پاس
آ جائے۔ اسے یقین تھا کہ میں طالب علمی کے زمانے میں اس سے کیا گیا عہد اب بھی نہیں بھولا ہوں گا۔
اس لیے گل جاناں نے اس کی بات کو اپنے پلّو سے باندھ لیا اور جب بھائی کی شہادت کی اطلاع ملنے کے

ساتھ ہی اس کی ماں نے صدمے سے دم توڑ دیا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے، جب اسے اپنی
کے لیے کشمیر چھوڑنا ہوگا۔ یہ بھائی کی تحریک کے ایک ساتھی کے ساتھ مشکل سفر کر کے میرے گھر پہنچ گئی
مجھے اس کا خط دیا۔ مجھے اپنا دوست بھی یاد تھا اور اس سے کیا گیا وعدہ بھی۔ اس لیے میں اسے پناہ دینے
انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میری بیوی راضی نہیں ہوئی اور اس نے ایک رات میں ہی ہنگامہ کھڑا
کر دیا کہ اسے گھر سے نکالو۔''

''لیکن کیوں؟'' گل جاناں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ پوری توجہ سے پورا قصہ
منیر نے سوال کیا۔

''وجہ بالکل واضح ہے سرکار! آپ گل جاناں کو غور سے تو دیکھیں، یہ کتنی حسین لڑکی ہے۔'' اس
دعوتِ نظارہ دی۔ جبکہ منیر تو یہ کام پہلے ہی کر چکا تھا اور اسے اعتراف تھا کہ لڑکی کا حُسن اتنا خطرناک ہے
بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو بھی امتحان میں مبتلا کر دے۔ اس حُسنِ بے مثال کی وجہ بھی اب اس
سامنے آ گئی تھی کہ وہ اس خطے سے تعلق رکھتی تھی جسے جنت نظیر کہا جاتا تھا اور جنت میں تو حوریں ہی بستی ہیں
اور گل جاناں تو شاید ان حوروں میں بھی سب سے الگ ہی چمک دمک رکھتی تھی۔ اس کے جسم پر موجود کھلی
لباس بھی اس پر خوب سج رہا تھا۔ یہ اور بات کہ منیر نے پہلے لباس پر توجہ نہیں دی تھی اور اس کے پیچھے
خزانے کو ہی نظروں سے کھوجنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''اس کے حسن سے ڈر کر میری بیوی نے شور مچا دیا کہ میں ہرگز ہرگز ایسے فتنے کو اپنے گھر میں
رکھوں گی جس کی وجہ سے مجھے اپنے شوہر کے بھٹکنے کا ڈر ہو۔ اب آپ ہی سوچیں کہ میں کیا کر سکتا تھا؟ شادی
نہ ہوئی ہوتی تو خود اس کا ہاتھ تھام کر سہارا دے دیتا۔ لیکن اب تو بیوی ہی کی سنی ہے کہ وہ میرے بچوں کی
اور دکھ درد کی ساتھی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اتنے مان سے یہاں بھیجی گئی اپنی دوست
بہن کو بے آسرا چھوڑ دوں۔ اس لیے اس مشکل کے حل کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ میری
کریں۔'' اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

''اسے کشمیر سے یہاں لانے والا شخص کہاں ہے؟'' منیر نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تو کل ہی اسے چھوڑ کر دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ آپ ایسے لوگوں کو جانتے ہی
گے کہ اپنے وجود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کتنی رازداری سے کام لیتے ہیں۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف کروانا
میرے گھر کچھ دیر رُکنا بھی گوارا نہیں کیا اور اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ اس لیے میں مکمل مجبور ہوں کہ اس
لڑکی کی ذمے داری کو خود اُٹھاؤں اور حالات کی وجہ سے اُٹھا بھی نہیں پا رہا۔''

اُس کا انداز بڑا بے بس تھا۔ اُس کے ساتھ موجود گل جاناں نے دورانِ گفتگو ذرا بھی لب کشائی نہیں
تھی اور لبالب آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ یوں سر جھکا کر بیٹھی تھی کہ جیسے اپنی تقدیر کا فیصلہ
منتظر ہو۔

اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے اس نمکین پانی نے منیر کے دل کی دنیا کو مزید تہ و بالا کر ڈالا اور
شدت سے خواہش کرنے لگا کہ یہ لڑکی کسی طرح اسے مل جائے تو وہ اس کے سارے دکھ خود سمیٹ
لیکن وہ جس مقام پر تھا، وہاں زبان سے ایسی خواہش کا اظہار ممکن نہیں تھا چنانچہ صبر سے کام لیتے
نہایت مدبرانہ لہجے میں مدعی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم بتاؤ کہ تمہاری کیا خواہش ہے؟ اگر کہو تو علاقے میں اس کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا جائے



ویسے ہی کوئی مناسب لڑکا ملے، اس سے اس کی شادی کر دی جائے؟''

''یہ تو ذرا لمبا پروسس ہو جائے گا سرکار! شادی کے لیے مناسب لڑکا ملنے تک یہ تنہا کسی جگہ کیسے رہ سکے گی؟ نوجوان ہے اور اس پر سے بے حد خوب صورت بھی۔ لوگ تو اس کا جینا محال کر دیں گے۔'' اس نے فوراً اعتراض کیا۔

''پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' منیر نے اس سے پوچھا۔

''میری درخواست تو یہ تھی کہ آپ گھریلو کام کاج کے لیے اسے اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھ لیں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بشیر اکبر صاحب کے دور میں جو ملازمہ گھریلو کام کاج کرتی تھی، وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر چکی ہے اس لیے لازم ہے کہ آپ کو ایک ملازمہ کی ضرورت ہوگی۔ گل جاناں کو رکھنے سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ یہ محفوظ ٹھکانے پر ہے۔''

اس نے ایسی بات کہی جسے سن کر منیر کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ دل سے وہ خود آرزومند تھا کہ کسی طرح گل جاناں کو اپنے قریب رکھ سکے لیکن مروّتاً اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ اب بھی اگرچہ اس کی خوشی اس کے چہرے سے جھلکی پڑ رہی تھی لیکن وہ لہجے کو مدبرانہ رکھتے ہوئے بولا۔

''تم ہمارے بڑے اچھے دوست ہو اور ہمیں ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ اپنے لوگوں کی مشکلات اور پریشانیوں کو حل کر سکیں۔ اگر اس لڑکی کو ہمارے ہاں ملازمہ رکھنے سے تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے تو ہمیں تمہاری درخواست ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم پورے اطمینان سے اسے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہو۔''

بشیر اکبر کی گرفتاری کے بعد اس نے جو چھان بین کی تھی، اس کے نتیجے میں اس کے سامنے یہ بات بھی آئی تھی کہ اس رات عبادت گاہ کے وسیع احاطے میں قائم ہسپتال میں مشابرم خان نامی مشکوک مریض کے علاوہ بشیر اکبر کی گھریلو ملازمہ بھی موجود تھی۔ ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر اور ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس اس وقت اس عورت کو ابارشن کے لیے راضی کر رہے تھے تاکہ اس کی کوکھ میں پلتی ناجائز اولاد کو دنیا میں آنے سے روکا جا سکے۔ عورت کسی سند یافتہ اور تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں ابارشن کروانے کے لیے راضی نہیں تھی اور اس سے نمٹنے میں ڈاکٹر اور نرس کو اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ کب مشابرم خان ہسپتال سے نکل گیا۔ بعد میں انہوں نے عورت کو زبردستی کسی نہ کسی طرح ابارشن کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن عورت کے اندیشوں کے مطابق وہ اس معاملے کو سنبھال نہیں پائے اور وہ اپنی جان سے چلی گئی۔

ڈاکٹر نے مشہور کر دیا کہ بشیر اکبر کی یہ ملازمہ کل دن میں صفائی کرتے ہوئے ایک اونچے اسٹول سے گر گئی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور بہت زیادہ خون کے اخراج سے اس کی جان چلی گئی تھی۔ عورت کی ڈیڈ باڈی کو سر پر بندھی ایک خون آلود پٹی کے ساتھ تابوت میں بند کر کے ورثاء کے حوالے کر دینا ڈاکٹر کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

بیوی کی موت کی اطلاع سن کر دوسرے شہر سے دوڑ کر آنے والا اس کا شوہر تابوت کو دفنانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کے آنے تک بشیر اکبر کے غیاب اور اس کے محافظوں کی پراسرار ہلاکت کا غلغلہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ اگر وہ کسی قسم کے شک کی بنیاد پر دہائی دینے کی کوشش کرتا بھی تو اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ اس مرنے والی ملازمہ کا قصہ جو بھی تھا، منیر کی ساری دلچسپی اس بات میں تھی کہ وہ گل جاناں کو اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھنے کی صورت میں مزے سے دل کے سارے ارمان پورے کر سکتا ہے۔

''بہت بہت شکریہ سرکار! آپ نے میری درخواست قبول کر کے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔'' منیر اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مدعی نے عاجزی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے حال کے منظر میں واپس کھینچا۔

''بس اب تم جاؤ۔ ہمارا جو فرض تھا، ہم نے وہ ادا کیا۔ تمہیں اتنا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' گل جاناں جیسا دُرِّ نایاب گھر بیٹھے ہاتھ آ جانے سے منیر کا لہجہ خود بخود ہی شاہانہ ہو گیا تھا۔

''جیسا آپ کا حکم۔'' وہ شخص فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر براہِ راست گل جاناں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ہمارے سرکار ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ان کا حکم ہر حال میں پورا کرتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ان کے قریب رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ خیال رکھنا کہ انہیں تم سے کوئی شکایت نہ ہونے پائے اور یہ تمہیں جو بھی حکم دیں، تم بلا حیل و حجت بجا لاؤ۔''

گل جاناں نے اس کی ہدایت سن کر معصومانہ انداز میں زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ بغیر زبان ہلائے صرف سر کی جنبش سے رضامندی کا اشارہ دینے والی اس ادا نے منیر کا پہلے ہی لوٹ پوٹ دل اور بھی موہ لیا۔ اس نے بمشکل مدعی کے وہاں سے رخصت ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی تنہائی ملی، گل جاناں کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔

''جاناں! ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دو۔'' پانی کا جگ اور گلاس اس کے بالکل سامنے میز پر رکھے تھے۔ وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر خود بھی آرام سے پانی پی سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے گل جاناں سے فرمائش کی تھی چنانچہ وہ نہایت سعادت مندی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور گلاس میں پانی انڈیل کر بڑی نزاکت کے ساتھ اسے پیش کیا۔ پانی پیش کرتا اُس کا مخروطی اُنگلیوں والا گلابی ہاتھ اتنا دلکش تھا کہ اس کے سامنے نفیس شیشے کا قیمتی گلاس معمولی لگ رہا تھا۔ منیر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی انگلیوں کو اس کے ہاتھ سے مس کیا اور سارے وجود میں برق سی دوڑتی محسوس کی۔ اُدھر گل جاناں کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

باقی پورا دن بھی منیر اُسے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے پکارتا رہا اور بہانے بہانے سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو بھی چھوتا رہا گل جاناں نے ایک بار بھی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی عام لڑکیوں کی طرح گھبرائی اور پریشان نظر آئی۔ اس کے رویے سے یوں لگ رہا تھا کہ اس نے خود کو کی گئی اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا ہے اور واقعی منیر کی ہر طرح کی خدمت بجا لانے کو تیار ہے۔

منیر جو اسے یہاں رکھتے وقت سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بیڈ روم تک لانے کے لیے کچھ صبر کرنا پڑے گا اور شاید زور زبردستی سے بھی کام لینا پڑے گا، رات آنے تک اُس کے رویے سے یقین کر چکا تھا کہ وہ آسانی ہی اسے اپنی خواب گاہ کی زینت بنا سکتا ہے۔ اس کا یہ یقین غلط بھی نہیں نکلا اور جب اس نے گل جاناں کو اپنے لیے جام تیار کرنے کے بعد اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ یہ کامیابی بہت بڑی تھی۔ منیر کی باچھیں کھل گئیں۔

''تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم میرے ساتھ اس گھر میں بہت عیش و آرام سے رہو گی۔''

گل جاناں سے جام لینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مخمور لہجے میں وعدہ کرنے لگا۔ اس کے لہجے اور حرکات و سکنات سے جھلکتا سرور بتا رہا تھا کہ وہ پینے سے پہلے ہی بہک چکا ہے۔



اور یہ تھا بھی سچ۔ وہ شراب سے پہلے شباب کے نشے میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''میں خوش ہوں کہ میرے بھائی کے دوست کی بیوی مجھے اپنے گھر رکھنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس کے انکار کی وجہ سے ہی میں آپ تک پہنچی ہوں۔ آپ کا گھر مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ یہاں سہولت کی ہر چیز موجود ہے۔ فریج میں اتنے مزے مزے کی کھانے کی چیزیں رکھی ہیں۔ وہاں کشمیر میں تو ہم بڑی مشکل میں رہتے تھے۔ جب تک بابا زندہ تھے، پھر بھی حالات ٹھیک تھے۔ ان کے مرنے کے بعد تو ہم پر زندگی تنگ ہو گئی۔ کھانے سے رُوکھی سوکھی کھانے کو ملتی تھی اور کبھی کبھی تو فاقہ ہی کرنا پڑتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس زندگی سے۔ اللہ نے میری قسمت کھول دی کہ اتنی تکلیفوں کے بعد یہاں پہنچا دیا۔ آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپ مجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے راضی ہو گئے میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی اور آپ کی اتنی خدمت کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔''

پہلے سے سرور میں آئے منیر کو اس کے الفاظ نے اور بھی خوش کر دیا اور اس کے ہاتھ کو جوش سے دباتے ہوئے بولا۔

''بھول جاؤ اپنی پچھلی ساری تکلیفوں اور دُکھوں کو۔ میرے گھر میں تم رانی بن کر رہو گی۔ یاد رکھنا! کہ میں نے یہاں تمہیں صرف اپنی ذاتی خدمت کے لیے رکھا ہے۔ جھاڑو، برتن، کھانا پکانا، یہ سارے کام وہ عورت کرے گی جو پہلے سے یہاں یہ کام کر رہی ہے۔ تم بس میرے کمرے میں رہ کر اسے ترتیب میں رکھنا اور وقت پر کھانا، پانی، چائے، کافی وغیرہ دیتی رہنا۔ تم زیادہ سے زیادہ میرے سامنے رہو، میرے لیے یہی خدمت ہی کافی ہے۔ تم جیسی مکھن ملائی سی لڑکی کو گھر کے سخت کاموں میں جھونکنا تمہارے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی اور مجھ جیسا ہمدرد دل رکھنے والا آدمی یہ ظلم کبھی نہیں کر سکتا۔''

''ویری نائس۔ آپ تو بہت ہی قدردان نکلے۔'' اُس کی باتیں سن کر گل جاناں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور پھر جوش میں آ کر اس سے نہ صرف لپٹ گئی بلکہ چٹاخ سے اسے چوم بھی لیا۔

اس کی اس جسارت پر منیر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس خیال سے جوش میں آ گیا کہ لڑکی خود پکے ہوئے آم کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھانا اس کے خیال میں عقلمندی تھی۔ لیکن حقیقت میں اسے یاد نہیں رہا تھا کہ جوش میں اکثر انسان اپنا ہوش کھو دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''بڑا چالو بندہ تھا۔ میرا تو بڑا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ذرا دو دو ہاتھ کر لوں۔ پر آپ نے اسٹوری ہی ایسی بنا دی کہ شرمیلے دُولہا کا رول پلے کرتے ہوئے بیٹھنا پڑا۔ ورنہ اُس سالے کو پتہ چل جاتا کہ وہ سیر ہے ہم سوا سیر۔'' جگدیش سلّو اور شہریار کو سرائے میں چھوڑ کر رخصت ہوا تو تنہائی میسر آتے ہی سلّو کی زبان چل پڑی۔

''میں بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ دو نمبر آدمی ہے اور لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ٹھگنے کا کام خوب کرتا ہو گا۔ لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسے احساس نہ ہونے دوں کہ ہم اسے سمجھ گئے ہیں۔ ہم یہاں آئے ہیں اور ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ غیر متعلقہ لوگوں سے اُلجھے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں۔ اس قصبے میں ہم صرف اس لیے رُکے ہیں کہ پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ چند گھنٹے آرام کر کے تازہ دم

ہو جائیں۔ باقی ہمارا کسی سے لینا دینا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جگدیش ہم سے وہ گھوڑا ہتھیا سکتا ہے۔ ہمیں امرت کور نے دیا تھا تو وہ اسے لینے دو۔ ہم نے کون سا اسے خریدا تھا۔ ویسے بھی آگے سفر کے لیے ہمیں گھوڑے کو یہیں چھوڑنا ہوگا۔ تو کیا برا ہے کہ جگدیش اسے لے لے۔'' شہریار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''واہ واہ، ایسے ہی جگدیش کو گھوڑا ٹھگ کر کیوں لے جانے دیں؟ میں تو اس گھوڑے کی رقم کھرا کروں گا۔ تم دیکھنا کہ میں اسے کتنے اچھے داموں بیچتا ہوں۔ دیوی امرت کور کا گھوڑا کسی ٹھگ کے ہاتھ لگ جائے، یہ مجھے منظور نہیں۔'' اس کی نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر سلّو نے چمک کر اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے۔ جو جی چاہے کرنا۔ ویسے بھی تمہیں سودے بازی کرنا خوب آتی ہے۔ امرت کور سے تم نے اچھا سودا کیا تھا۔ کم از کم میں اکیلا ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔'' خشک لہجے میں بولتے شہریار کا اشارہ سربجیت کے قتل کی طرف تھا۔ امرت کور کی خواہش پر اسے قتل کر کے یہاں تک کے سفر کی سہولت حاصل کرنا سلّو کا کارنامہ تھا۔

''ہاہاہا.....'' سلّو اس کی بات سن کر زور سے ہنسا۔ ''سودے بازی کا نتیجہ تو سویرا ہونے پر امرت کور کے سامنے آیا ہوگا اور بے چاری بیٹھی ہمیں گالیاں اور کوسنے دے رہی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟'' قمیض اُتار کر اپنے بازو کے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے شہریار نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے پتی سربجیت کو قتل نہیں کیا تھا اور صرف چھت پر لٹا کر آیا تھا۔'' اس نے دیدے گھماتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔

''یہ تو وعدہ خلافی ہے۔'' شہریار اگرچہ سربجیت کے قتل پر دل سے راضی نہیں تھا لیکن سلّو کی زبانی یہ سن کر چونک گیا۔

''ایسے معاملات میں ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اُس سکھنی نے جو داستان سنائی تھی، اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بے چارہ سربجیت مظلوم ہو اور امرت کور اس سے کام لے کر اپنے عاشق کی خاطر اسے قتل کروانا چاہتی ہو۔ ہم بے کار میں اپنے سر قتل کا الزام لیتے اور مشکل میں پھنس جاتے۔ تم خود سوچو کہ سربجیت قتل ہو جاتا اور کسی وجہ سے امرت کور پکڑی جاتی تو اُس کا سارا سچ اُگل دینا تھا۔ پھر اُس کے سسرال والے اُس کے ساتھ تو جو سلوک کرتے سو کرتے لیکن انہوں نے ہمیں بھی نہیں چھوڑنا تھا۔ امرت کور سے ہمارے حلیے پوچھ کر وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور خوامخواہ مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ تم خود سوچو تو میں نے جو کچھ کیا، تمہیں ٹھیک لگے گا۔ سربجیت کی صبح آنکھ کھلی ہوگی تو وہ خود کو چھت پر پا کر تھوڑا حیران ہوا ہوگا۔ اور اگر نشے کا عادی تھا تو یہی سوچا ہوگا کہ ٹھرک میں چڑھ کر کب سو گیا، پتہ نہیں چلا۔ بہت سے بہت وہ بیوی پر چیخے چلائے گا کہ اُس نے اُس کا خیال نہیں کیا۔ رات بھر چھت پر ہی پڑا رہنے دیا۔ اس چال باز عورت کے پاس بولنے کے لیے کیا ہوگا؟ وہ دل میں ہمیں گالیاں ضرور دے گی لیکن ہمارے خلاف کچھ کر نہیں سکے گی۔ یوں راوی ہمارے لیے چین ہی چین لکھے گا۔'' وہ اپنی کارروائی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

''مجھے وہ لڑکی سچی لگی تھی۔'' شہریار نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور لیٹنے کے لیے تکیہ درست کرنے لگا۔ دونوں ہی بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے چند گھنٹوں کی نیند لینے کی اشد ضرورت تھی۔ سونے سے قبل انہوں نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا کیونکہ عادت نہ ہونے کی وجہ سے وہ سربجیت کے ریشمی دھوتی اور کرتے



الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''یہ مرد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اسے دنیا کی ہر خوب صورت لڑکی سچی لگتی ہے اور اس طرح وہ خود کو مصیبت میں پھنسا لیتا ہے۔'' سلّو نے اُس کی رائے پر فلسفیانہ لہجے میں تبصرہ کیا تو اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

شہریار نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا اور سینے تک جسم پر چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''بہتر ہے کہ تم اپنے شیطانی چرخے جیسے دماغ کو ضرورت سے زیادہ چلانے کے بجائے اب خاموشی سے سو جاؤ۔ ہمیں دہلی جانے والی بس پر آج ہی وقت پر سوار ہونا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹھیک الارم پر جاگ جائیں۔ میں نے سرائے کے مالک کو بتایا ہے کہ اسے ہمیں کب اُٹھانا ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ ہی اُٹھنا ہوگا۔ اس وقت شکایت مت کرنا کہ تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔''

''اوکے باس! نہیں کروں گا شکایت۔ لیکن ابھی میں سو نہیں سکتا۔ ابھی مجھے گھوڑے کا سودا بھی کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے سرائے کے مالک سے مدد لینی چاہیے۔''

سلّو فیصلہ کُن لہجے میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تو اس نے شانے اچکاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کرے گا اور شاید یہی کام کرنا باقی تھا جب ہی سلّو نے اس کی طرح دھوتی کرتے سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا تھا۔

سلّو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور اس کمرے کا رخ کیا، جہاں ان کی سرائے کے مالک سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی سرائے نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے بس دو تین ہی کمرے بنے ہوئے تھے اور عمارت کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بہت کم لوگ ہی ٹھہرتے ہوں گے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں زیادہ آتا ہی کون ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہوگا کہ دُور دیہاتوں سے کسی قسم کی خرید و فروخت کے لیے آنے والوں کو اگر رات ہو جاتی ہوگی تو وہ رات کے وقت سفر کرنے کے بجائے رات بھر کے لیے سرائے میں قیام کر کے صبح روانہ ہو جاتے ہوں گے۔

''کون.....؟'' وہ دفتر نما کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سرائے کے مالک نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ دراصل وہ دونوں پیر میز پر جمائے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور کھٹکا پیدا ہونے پر چونک گیا۔

''میں ہوں، رویندر۔ تمہاری سرائے کا پروہنا۔'' سلّو نے اس کے سامنے موجود کرسی پر ٹکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی حالت کافی خستہ تھی اور لگتا تھا کہ اگر زیادہ بوجھ پڑا تو زمین بوس ہونے میں دیر نہیں لگائے گی اس لیے وہ بہت احتیاط سے اس پر بیٹھا بلکہ ٹکا تھا۔

''او اچھا پُتر! کچھ کام تھا کیا؟'' بوڑھے نے میز پر سے ٹٹول کر اپنی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی تو اسے احساس ہوا کہ بوڑھے کی بینائی بہت کمزور ہے اور وہ عینک کے بغیر شاید ہی کچھ دیکھ پاتا ہو۔

''کام تو تھا چاچا! میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھوڑا کسی کو بیچ دیں۔ اگر تمہاری جان پہچان کے کسی بندے کو گھوڑا خریدنا ہو تو بتاؤ۔'' وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ چھوٹی عمر کے بڑے تجربے نے اسے بتایا تھا کہ بوڑھا ایماندار آدمی ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں۔

''ایہہ تو کوئی مسئلہ ہی نئیں پُتر!..... میرے وڈے پُتر کو ایک گھوڑے کی لوڑ ہے۔ میں اسے بلا کر گھوڑا

دکھا دیتا ہوں۔ اگر اسے پسند آیا تو وہ خرید لے گا۔'' اس کا مدعا سن کر بوڑھا جوش میں آ گیا اور فوراً باہر نکل کر کسی کو آواز دینے لگا۔

آواز سن کر آنے والے کو اس نے ہدایت کی کہ وہ بازار سے اس کے بڑے بیٹے کو بلا لائے اور خود واپس دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔

''بس ابھی آ جاتا ہے منڈا۔ میرا بلاوا سن کر فوراً دوڑا آئے گا۔ وڈی چنگی اولاد دی ہے بھگوان نے مجھے۔ ایک آواز پر میری گل سنتے ہیں سارے۔ بھگوان نے بھی ان پر وڈی کرپا کی ہے۔ کام دھندا چنگا چلتا ہے۔ یہ سرائے تو بس میں خود کو مصروف رکھنے کے لیے چلاتا ہوں ورنہ کوئی لوڑ نئیں ہے، اس بڈھے دے لیے کام دھندا کرنے کی۔''

بوڑھا واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھا تو خود ہی اسے بتانے لگا۔ اس کے دعوے کے مطابق اس کے بیٹے نے وہاں پہنچنے میں واقعی بالکل دیر نہیں لگائی اور فوراً ہی پہنچ گیا۔

''کی گل ہے پتا جی! منڈا بول رہا تھا تسی مینوں بلا رہے سی۔'' اس نے سلّو کو ایک نظر دیکھا اور باپ سے پوچھنے لگا۔

''آہو پتر! میں تینوں اس بندے نال ملانے واسطے بلا رہا تھا۔ ایہہ اپنا گھوڑا بیچنا چاہندا ہے تو میں نے کہا تُو دیکھ لے۔ تجھے اپنے کم کے لیے گھوڑے کی لوڑ تھی نا۔'' بوڑھے نے بیٹے کو بتایا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''گھوڑا میں نے دیکھا ہے۔ وہی ہے نا جو اُدھر دروازے کے پاس بندھا ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی اور اثبات میں جواب ملنے پر پوری طرح سلّو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد جلد ہی دونوں میں سودا طے پا گیا۔

''تسی تھوڑی دیر ادھر بیٹھو، میں ابھی روپے لاتا ہوں۔'' مناسب قیمت پر سودا ہو جانے پر اس نے سلّو سے کہا۔ اصل میں امرت کور کا عنایت کردہ گھوڑا واقعی اتنا زبردست تھا کہ جو پاتا، خوش ہی ہوتا۔

''ٹھیک ہے بھرا! پر خیال رکھنا کہ سودے کی گل باہر نہ نکلے۔ اُدھر قصبے کا ایک بندہ ہے جگدیش۔ اس کی بھی نظر تھی گھوڑے پر۔ پر اپنے کو وہ کچھ ٹھیک بندہ نہیں لگا اس لیے اس سے سودا نہیں کیا۔'' سرائے کے مالک کا بیٹا وہاں سے جانے لگا تو سلّو نے اسے ہدایت کی۔

''جگدیش..... وہ تو وڈا بدمعاش بندہ ہے۔ چنگا ہی ہوا کہ تسی اُس کی باتوں میں نئیں آئے ورنہ نقصان اُٹھاتے۔'' وہ فوراً ہی بولا تو سلّو اپنے اندازے کی تصدیق پر مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس کی جیب میں ایک معقول رقم پہنچ چکی تھی۔ رقم لے کر جیب تھپتھپاتا ہوا وہ کمرے میں آیا تو شہریار سو چکا تھا۔ وہ بھی کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کامیابی کی خوشی اور تھکن نے مل کر ایسا کام دکھایا کہ جب وہ بستر پر لیٹا تو ایسی ٹوٹ کر نیند آئی کہ کچھ ہوش نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اسے ان افراد کی آمد کی بھی خبر نہ ہو سکی جو دن کی روشنی میں بھی نیم تاریک پڑے کمرے میں کسی سائے کی طرح داخل ہوئے تھے۔

⊛----✪----⊛

سلّو اور شہریار دونوں ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

کمرے میں داخل ہونے والے دونوں سائے محتاط قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے اور طے شدہ



منصوبے کے مطابق ایک سلّو کی چارپائی کی طرف اور دوسرا شہریار کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں نے اپنے بیگ چارپائیوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے داخل ہونے والے دونوں افراد نے بالکل بیگوں کو کھینچ کر باہر نکالا اور کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔

اس ساری کارروائی کے دوران وہ بار بار سوئے ہوئے شہریار اور سلّو کا جائزہ لیتے جا رہے تھے کہ کہیں ان میں سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ آنکھ کھل جانے کی صورت میں وہ انہیں دو چار پٹخنیاں دے کر بے ہوش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن خیر گزری اور اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ خاموشی سے اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس جانے لگے۔

''تم دونوں جو بیگ لے جا رہے ہو، ان میں کچھ نہیں۔ رقم تو میرے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔'' اچانک انہیں اپنے عقب سے آواز سنائی دی تو وہ بھڑک کر واپس پلٹے۔ دونوں میں سے ایک چارپائی خالی کرنے اور بولنے والا ایک دیوار کے قریب کھڑا تھا۔

دراصل یہ شہریار تھا جس کی آنکھ کسی خودکار حفاظتی نظام کی طرح ان دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھل گئی تھی۔ لیکن اس نے فوری طور پر انہیں چھیڑنے کے بجائے انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا اور عین اس وقت پر انہیں مخاطب کیا تھا، جب وہ اپنے تئیں کامیاب واردات کر کے واپس جا رہے تھے۔

اس نے انہیں واپس جاتے دیکھ کر اتنی پھرتی اور خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ ان کے پیچھے کتنی بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ شہریار نے انہیں مخاطب کیا تو وہ تیزی سے پلٹے اور ان میں سے ایک نے پھرتی سے خنجر نکال کر شہریار پر پھینکا۔ وہ ہوشیار تھا چنانچہ تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خنجر دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

اس وار کو ناکام ہوتے دیکھ کر دونوں نے بیک وقت شہریار کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگانے والوں میں سے ایک تو درمیان میں ہی دھڑام سے گر گیا جبکہ دوسرے کو شہریار کی پڑنے والی لات نے واپس اچھال دیا۔ درمیان میں گرنے والے کو سلّو نے سنبھال لیا۔ درحقیقت وہ شخص گرا بھی اس کے ٹانگ اڑانے سے تھا۔ سلّو کی آنکھ اس کارروائی کا آغاز ہوتے ہی کھل گئی تھی اور اس نے مناسب وقت پر اپنا حصہ بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

کمرے کی محدود فضا میں ان کے درمیان ہونے والی یہ ہاتھا پائی زیادہ طول نہ کھینچ سکی۔ دراندازی کرنے والے وہ دونوں نامعقول افراد بے شک ہاتھ پیر چلانا تو جانتے تھے لیکن دو تربیت یافتہ لڑاکوں کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر وہاں ہنگامہ ہوا اور پھر جلد ہی دونوں زمین بوس ہو گئے۔ سلّو نے آگے بڑھ کر کمرے میں روشنی کر دی۔ روشنی میں جو چہرے ان کے سامنے آئے، ان میں سے ایک کو شناخت کرنا ان کے لیے دشوار نہیں تھا۔ وہ جگدیش تھا جو اس قصبے میں وارد ہوتے ہی ان سے چمٹ گیا تھا اور انہیں توقع تھی کہ یہ لالچی شخص کسی نہ کسی طرح انہیں ضرور تنگ کرے گا۔ اب جبکہ اس نے دن دہاڑے انہیں سوتا جان کر اُن کے کمرے میں گھس کر ان کے بیگ چرانے کی کوشش کی تھی تو اس کی نیت کھل کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔

''رام بھلی کرے۔ سب چنگا تو ہے بھایا جی؟''

اس سے قبل کہ وہ دونوں جگدیش سے بازپرس شروع کرتے، ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے ذرا سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''ہاں، سب چنگا ہے۔ اندر آ جاؤ۔''

شہریار نے جواب دے کر پوچھنے والے کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اُمید تھی کہ دستک دینے والا مقامی شخص ہوگا اور وہ اسے گواہ بنا کر جگدیش اور اس کے ساتھی کا فیصلہ کر ڈالیں گے۔ دروازہ کھلا تو ایک سادرمیانی عمر کا آدمی اندر داخل ہوا۔

''میں آپ کے سامنے والے کمرے میں رُکا ہوا ہوں۔ یہاں سے اُٹھا پٹخ ہور مار دھاڑ کی آوازیں دیں تو جانکاری کے لیے آ گیا۔''

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اس کے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بزدل مزاج کا آدمی ہے اور اس نے اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دینے کی جرأت کی ہے، جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ اندر صورتِ حال مکمل طور میں ہے۔

''تسی کدھر سے آ کر ایتھے ٹھہرے ہو؟'' سلّو نے اس سے پوچھا۔

''میں ہریانہ توں آیا سی۔ میں اوتھے دُکاناں تے مال سپلائی کرتا ہوں۔ سفر لمبا ہے، اس واسطے دیر آرام لئی ایتھے ٹھہر گیا ہوں۔'' اُس نے اپنے بارے میں بتایا تو سلّو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تسی اپنی ذاتی گڈی سے آئے ہو؟''

''آہو۔ میرے کول اِک سوزوکی ہے۔ اسی پر آیا ہوں۔'' اس نے بتایا تو وہ دونوں ہی خوش ہو گئے۔

''آؤ بھایا! آرام نال ایتھے بیٹھو۔ فیر میں تہانوں سارا الفرادسدا ہوں۔'' سلّو نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے جگدیش اور اس کے ساتھی کو زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''تسی وڈے بھایا جی کو بتاؤ پا جی! کہ سارا قصہ کی ہے۔'' سلّو نے ذرا شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے شہریار سے درخواست کی تو وہ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ٹھیٹھ دیہاتی انداز میں شروع ہو گیا۔

''قصہ ایہہ ہے پا جی! کہ یہ جو اپنا نندا ورا ہے، وریندر، اس کا ویاہ ہونے والا ہے۔ ہور اسیں اس کے ویاہ کی تیاری کے لیے دلّی خریداری لئی جا رہے ہیں۔ اس قصبے میں آرام لئی ٹھہرے تھے۔ ادھر ہوٹل میں بدمعاش جگدیش مل گیا ہور اسیں اپنی سادگی کی وجہ سے اینوں بتا دِتّا کہ روپے لے کر خریداری واسطے ایدھر آئے ہیں۔ ہُن کیا معلوم تھا کہ یہ بدمعاش آدمی ہے ہور موقع ملتے ہی سانوں لوٹنے واسطے ایدھر گھس جائے گا۔ تو رام کی کرپا نوں میری اکھ کھل گئی ہور اسیں انہاں نوں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بدمعاش ہمیں ڈرانے لئی خنجر بھی لے کر آئے تھے پر انہاں نوں ملوم نئیں تھا کہ اسیں بچپن توں اکھاڑے وِچ ورزشاں کر کے بیٹھکاں لگا کے جوان ہوئے ہیں۔ ایسی پھینٹی لگائی ہے اس ماں دے پُتر تے اس دے ساتھی دی کہ جیون یاد رکھیں گے۔'' شہریار نے نہایت پُر تفاخر انداز میں اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''ایہہ تے وڈی بُری گل ہے۔ اس سرائے کے مالک نوں بلا کر گل کرو کہ ایتھے کیہہ ہور رہیا ہے۔ ویلے ایہہ حال ہے تو راتاں نوں تو ایتھوں گزرنا شریف آدمی واسطے ممکن ای نئیں ہے۔''

نووارد نے مشورہ دیا تو سلّو فوراً ہی باہر نکل گیا۔ باہر برآمدے میں بھی کوئی خاص روشنی نہیں تھی۔ میں عمارت بنائی ہی کچھ اس انداز میں گئی تھی کہ دن کے وقت بھی اندھیرے اور گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔



سرائے کے مالک کے دفتر نما کمرے کے سامنے پہنچا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اس نے کنڈی کھول کر اندر جھانکا۔ بوڑھا کرسی پر مزے سے سو رہا تھا۔

سلّو نے اسے جھنجوڑ کر جگایا اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے تفصیلات سن کر سیدھا ان کے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے باہر کا رخ کیا اور ایک بچے کے ہاتھوں پیغام بھیج کر اپنے بیٹے اور قصبے کے معززین کو بلایا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک چھوٹا سا ہجوم جمع ہو گیا۔ جگدیش اور اس کے ساتھی اس دوران ہوش میں آ گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں قصبے کے معززین جمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے بے ہوش بن کر رہنے میں ہی عافیت جانی۔ سرائے کے مالک، اس کے بیٹے اور دیگر افراد نے پہلے شہریار اور سلّو سے حال مانگی کہ انہیں یہاں اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا پھر جگدیش اور اس کے ساتھی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے لگے۔

''اسیں ان دوناں نوں وڈی چھوٹ دے چکے ہیں۔ ہور ان کی بدمعاشیوں کو شما کرتے رہے ہیں کہ ویلے رج بندے توں ایسی غلطی ہو جاندی ہے، دونوں کسی ویلے سنبھل جائیں گے۔ پر اَج تو انہاں نے ساڈی ایہ ہی کٹوا دی ہے۔ اجنبی مسافروں نوں لوٹنے دی کوشش کرن والی حرکت ایسی نئیں ہے کہ شما کر دی جائے۔ اب پولیس کو ان کے بارے میں دسنا ہی ہوگا۔ دو چار مہینے حوالات میں رہ کر پھینٹی کھائیں گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔'' آخر کار سرائے کے بوڑھے مالک نے سب کی متفقہ رائے سے یہ فیصلہ سنا ڈالا۔

فیصلہ سن کر اب تک بے ہوش بنا پڑا جگدیش اور اس کا ساتھی اپنی جگہ سے اُٹھ گئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے کہ اس بار انہیں معاف کر دیا جائے، آئندہ وہ بھول کر بھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ لیکن ان دونوں کا فیصلہ حتمی تھا۔ شاید دو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے اپنے قصبے کے جوانوں کی حرکت نے انہیں بے پناہ شرمندہ کر دیا تھا اس لیے وہ کسی طور نرم پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جگدیش اور اس کے ساتھی کا قصہ نمٹا تو ان دونوں سے ایک بار پھر معذرت کر کے انہیں نہ صرف آرام کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا بلکہ سرائے کے مالک نے اپنی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

مناسب آرام اور پُر تکلف کھانے کے بعد وہ اس قصبے سے روانہ ہوئے تو کچھ اس طرح کہ سرائے میں آئے ہوئے تیسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار تھے جو انہیں کسی ایسے مقام پر چھوڑ دیتا، جہاں سے انہیں دہلی کے لیے براہِ راست سواری مل جاتی۔

⊛----✪----⊛

''سر! ایک مچھلی جال میں آئی ہے۔''

یہ اطلاع ملنے پر میجر اسفندیار آپریشن روم کی طرف دوڑا۔ یہاں تکنیکی عملہ وقت کی پروا کیے بغیر پوری مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے ایک خالی کرسی سنبھال کر ماتحت کا پیش کردہ ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیا۔ سماعتوں کے ذریعے اسے سمجھ آنے لگا کہ عبادت گاہ کے موجودہ کرتا دھرتا کی خواب گاہ میں گل جاناں نامی گلبری بلبل کون سے گل کھلا رہی ہے۔ اُس نے اپنی مطلب برآری کے لیے شراب اور شباب کے گویا دریا بہائے ہوئے تھے اور عقل کا کچا اور نفس کا غلام اس کے آگے پگھلتا جا رہا تھا۔

''یہ تو بڑی وکھری ٹائپ کی مچھلی ہے یار!..... تُو کہہ رہا تھا، مچھلی جال میں پھنسی ہے، پر مجھے تو لگتا ہے

کہ یہ خود کیل کانٹوں سے لیس ہو کر شکار کے لیے نکلی ہے۔'' اس نے سنائی دینے والی آوازوں پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خوش دلی سے اپنے ماتحت سے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے سر جی! کبھی کبھی شکاری خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔ آپ بس ذرا سا اشارہ کریں، یہ شکاری مچھلی آپ کی ٹیبل پر ہو گی۔'' ماتحت نے ترنت جواب دیا۔

''تو بس سمجھو ہو گیا اشارہ۔'' اس نے جواب دیا تو چہرے کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے اور وہاں اب کھلنڈرے پن کی جگہ مکمل سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ معاملہ تھا بھی اہم۔ انہیں ابتدا سے ہی یہ یقین رہا تھا کہ بشیر اکبر کے غیاب کے بعد نیا سیٹ اپ قائم ہو جانے کے باوجود اس کے پیچھے موجود لوگ حقائق کا کھوج لگانے کے لیے ضرور میدان میں اُتریں گے اور اصولی طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے اس شخص کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہی سب سے اہم تھا جس نے بشیر اکبر کی جگہ لی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ مسلسل اس آدمی کو اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں اس کی رہائش گاہ کو بھی ''بگڈ'' کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان دنوں میں ہی ان پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ وہ ایک عیاش طبع آدمی ہے۔ گل جاناں کی اس کے گھر آمد سے بھی وہ باخبر تھے اور یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ملازمہ کی حیثیت سے گھر میں داخل ہونے والی اس لڑکی کو وہ اپنی داشتہ بنانے میں دیر نہیں لگائے گا۔ البتہ فوری طور پر یہ شک نہیں کیا جا سکا تھا کہ پناہ کی غرض سے آنے والی لڑکی اپنے ساتھ کچھ خاص مقصد لے کر آئی ہے۔ یہ بات تو انہیں رات کے اس پہر پتہ چل رہی تھی جب وہ اپنے ٹارگٹ کو شباب اور شراب کے نشے میں ڈبو کر اس سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ بشیر اکبر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اس کے پیچھے کن لوگوں یا ادارے کا ہاتھ ہے۔ وہ کاٹھ کا اُلو بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر مل جانے پر سب کچھ اُگلتا جا رہا تھا۔

''ایک پارٹی عبادت گاہ جائے گی اور دوسری اس آدمی کے گھر جو اس فتنے کو لے کر آیا تھا۔ عبادت گاہ کے سامنے پہنچنے والی پارٹی کے لیے میں پہلے ہی اندر سے لائن کلیئر کروا دوں گا۔ تم لوگ پورے اطمینان سے جاؤ، مجھے رزلٹ میں بس کامیابی چاہیے۔''

اس نے بہت تیزی سے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے تھے اور ان پر عمل اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہو رہا تھا۔

گل جاناں کو لانے والے شخص کے گھر پر پہنچنے والی پارٹی پہلے اپنے ٹارگٹ پر پہنچی۔ وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت کی پروا کیے بغیر پڑوسی کے دروازے پر دستک دی اور اُس سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

''یہ لوگ تو شاید لاہور گئے ہوئے ہیں۔ میری گھر والی نے ذکر کیا تھا کہ پڑوسن اپنے میکے والوں سے ملنے جا رہی ہے۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ اس کا میکہ لاہور میں ہے۔'' وردی پوشوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ شخص تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور ایک ہی سانس میں خود کو حاصل معلومات منتقل کر دی تھیں۔

پارٹی کے لیڈر نے ذیشان کو اطلاع دی اور اس نے محلے کے دو معززین کی موجودگی میں تالا توڑ کر خانہ تلاشی کا حکم دے ڈالا تاکہ اگر کوئی مشکوک شے ملے تو اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ ہدایات ملتے ہی پارٹی نمبر ایک اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس دوران دوسری پارٹی بھی اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئی تھی۔ اسفندیار نے پہلے ہی یہ بندوبست کر لیا تھا کہ عبادت گاہ کی سکیورٹی پر متعین افراد میں اپنے آدمی بھی شامل ہوں اس لیے اس وقت انہیں کوئی دشواری پیش



نہیں آئی اور وہ سیدھے رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

گل جاناں اور موجودہ راہنما صاحب یقینی طور پر قابلِ اعتراض حالت میں ملے۔ راہنما صاحب کے تو ہوش اس اتنی بری طرح معطل تھے کہ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ گل جاناں نے تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن اسے بھی جوانوں نے قابو کر لیا۔ انہیں راہنما صاحب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور نہ ہی ساتھ لے جانے میں نقصِ امن کا بھی اندیشہ تھا اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ صرف گل جاناں کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل اس فتنے کو بستر کی بڑی سی چادر میں لپیٹ لیا گیا تھا۔

وہ لوگ تیزی سے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے۔ وہاں اسفندیار ان کا منتظر تھا۔ اس کے حکم پر چادر میں بالکل ساکت پڑی گل جاناں کا چہرہ کھولا گیا تو وہ سب چونک اُٹھے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اسفندیار نے قریب جا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری میں پڑا ہوا تعویذ دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تم لوگوں نے یہاں لانے سے پہلے اس کی تلاشی لے کر اس کی سب چیزوں کو اپنے قبضے میں کیوں نہیں لیا تھا؟'' اس نے سرد لہجے میں اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔

''سوری سر! یہ جس حالت میں تھی، ہم نے بس یہی مناسب سمجھا کہ اسے چادر میں لپیٹ کر یہاں لے آئیں۔ ویسے بھی وہاں زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں تھا۔'' پارٹی کو لیڈ کرنے والے شخص نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت پیش کی تو اسفندیار نے برا سا منہ بنایا اور دوبارہ قریب جا کر گل جاناں کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کا خوب صورت چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کی پُتلیاں ساکت تھیں۔

یقینی طور پر اس کے گلے کے تعویذ میں جو زہر موجود تھا، وہ بہت سریع الاثر تھا جس نے چند منٹوں کے اندر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اب وہ ان کے لیے بالکل بیکار تھی۔ ایک لاش سے بھلا وہ کیا اور کیسے کچھ معلوم کر سکتے تھے۔

''اسے چیک کرو۔'' اسفندیار نے اس کے بالوں میں لگا موتیوں سے بنا نفیس سا کلپ نکال کر ماتحت کو پکڑایا تو وہ فوراً کلپ لے کر باہر نکل گیا۔

''ضروری کارروائی مکمل کرو اور لاش کو ٹھکانے لگانے کا حکم دو۔'' اسفندیار حکم دے کر خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ کچھ دیر بعد دوسری پارٹی کا لیڈر بھی وہاں پہنچ گیا اور رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''گل جاناں کو منیر تک پہنچانے والے شخص کا نام قاسم تھا۔ وہ یہاں کا مقامی نہیں تھا بلکہ بشیر اکبر کی یہاں آمد کے لگ بھگ پانچ سال بعد یہاں آیا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن سے بشیر اکبر کے ذاتی مراسم تھے یا جنہیں وہ دوسروں کی نسبت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ہم نے اس کے گھر کی مکمل تلاشی لی ہے۔ فرنیچر، کپڑے اور گھریلو استعمال کا سارا سامان اپنی جگہ موجود ہے لیکن بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود ہمیں وہاں کسی قسم کے کاغذات، رقم یا زیورات وغیرہ جیسی چیزیں نہیں ملی ہیں۔ پورے گھر میں ایسا کوئی اہم یا فوٹو فریم موجود نہیں ہے جس سے ہم قاسم اور اس کے بیوی بچوں کی تصویریں حاصل کر سکیں۔ کوئی مشکوک چیز بھی نہیں ملی ہے۔ لیکن عام چیزوں کو چھوڑ کر گھر سے ہر اہم شے کا غائب ہونا اپنی جگہ خود مشکوک ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ قاسم پوری پلاننگ کے ساتھ یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔''

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ وہ بیوی کو میکے لے جانے کے بہانے یہاں سے نکل گیا ہے اور پیچھے ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی ہے کہ گل جاناں کے پکڑے جانے کی صورت میں اُسے تلاش کیا جا سکے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے گل جاناں کو قاسم کے ذریعے منیر تک پہنچایا تھا، انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ منیر کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ اور گل جاناں کے اپنی کارروائی کے دوران پکڑے جانے کا امکان ہے۔'' اپنے ماتحت کے اندازوں کی تصدیق کرتے ہوئے اس نے اپنا تجزیہ بھی پیش کیا۔

اسی لمحے دستک دے کر ایک جوان اندر چلا آیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے کچھ دیر قبل اس نے گل جاناں کا کلپ چیک کرنے کے لیے دیا تھا۔

''کلپ چیک کر لیا گیا ہے سر! اس میں ایک بہت طاقتور مائیکروفون نما آلہ چھپا ہوا تھا جس کی مدد سے بہت دور بیٹھ کر بھی اس آلے کی رینج میں آنے والی آوازوں کو واضح طور پر سننا ممکن ہے۔'' اس نے آتے ہی رپورٹ پیش کی۔

''میرا یہی اندازہ تھا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک ہے اور جدید آلات کے استعمال کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت سے کھیلنا بھی خوب جانتا ہے۔ گل جاناں کی حیثیت ایک معمولی مہرے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اس خوب صورت لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر نہایت کامیابی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ان کے ایجنٹ بشیر اکبر کے ساتھ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی اور وہ کیسے منظر سے غائب ہو گیا۔ ہم سے غلطی ہوئی کہ اس قسم کا خدشہ موجود ہونے کے باوجود کہ منیر کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے، وقت سے پہلے یہ بھانپنے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ گل جاناں کو کسی خاص مقصد کے تحت منیر تک پہنچایا گیا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی اور منیر شراب کے نشے میں گل جاناں کے سامنے سب کچھ اُگل چکا تھا جو کہ یقینی طور پر کہیں اور سنا گیا ہے۔ گل جاناں جو ظاہر ہے اس لڑکی کا حقیقی نام نہیں ہے، اپنے بڑوں کے سامنے پہلے ہی یہ عہد کر کے آئی ہو گی کہ اگر گرفتاری کی نوبت آئی تو اپنے بارے میں کچھ اُگلنے کا خطرہ مول لیے بغیر پہلے مرحلے پر ہی خودکشی کر لے گی اور اس کے لیے اس کے پاس معقول انتظام بھی تھا۔'' کلپ سے متعلق رپورٹ سن کر اسفندیار نے ایک بار پھر حالات کا بھرپور تجزیہ کیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں سر! مشابرم خان کے ذریعے پہلے بندے کو پکڑنے سے لے کر اب تک ہمارے سامنے جو صورتِ حال پیش آئی ہے، اس میں یہ بات بہت واضح ہے کہ یہ لوگ جن افراد کو اپنی ماتحتی میں لے کر کام نکالتے ہیں، ان کے ذہنوں کو اس بُری طرح جکڑ لیتے ہیں کہ وہ وقت پڑنے پر اپنی جان لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔'' اس کے ماتحت نے اس کی تائید کی۔

''مطلب برآری کے لیے ہر جگہ ایسے احمقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اپنی جان لینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کے دل و دماغ میں خوش کُن خواب بھر دیئے جائیں تو پھر وہ یہ احمقانہ جرأت بھی کر بیٹھتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ خدا کی مخلوق کو آزار دے کر بھلا وہ خدا کی جنت کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے؟'' اسفندیار نے تبصرہ کیا پھر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

''اپنی وے، جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے پاس واحد کلیو قاسم ہی ہے۔ دیکھو کہ اسے تلاش کرنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے یا نہیں۔ آس پاس والوں سے معلومات حاصل کر کے اس کا اسکیچ بنواؤ۔ جہاں وہ ملازمت کرتا ہے، وہاں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے وہاں سے اس کے کوئی ڈاکومنٹس وغیرہ مل جائیں۔ یہ بھی دیکھو کہ اس کے بچے کس عمر کے ہیں اور اسکول وغیرہ جاتے تھے یا نہیں۔ اگر وہ اسکول جاتے تھے تو وہاں سے بھی ہمیں ان کے فوٹو گرافس کی شکل میں کوئی کلیو مل سکتا ہے۔ تم لوگ یہ کام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ مشابرم خان کی سیفٹی کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کے لیے خطرات سب سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس سارے کیس میں وہ اپنے اصل نام کے ساتھ منظر پر آیا تھا اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ اس کے لیے پہلے کی طرح اپنی روٹین کی طرف پلٹنا مشکل ہو گا اور اس کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''اوکے سر!'' اس کا اشارہ پا کر دونوں ماتحت کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس مشن میں اس نے بہت ہی خاص اور اعتماد کے بندوں کو ساتھ رکھا تھا کہ اگر اس کے اردگرد کوئی بشیر اکبر کا چاہنے والا موجود ہو تو گڑبڑ نہ کر سکے ورنہ حالات اور بھی مشکل ہو جاتے۔ حقیقت میں وہ خود بھی اس معاملے میں بہت زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا اور صرف اس حد تک کام کر رہا تھا کہ کرنل توحید کو مطمئن کیا جا سکے۔ اب بھی وہ اس سارے معاملے پر باریک بینی سے غور کرتے ہوئے منتظر تھا کہ دن کا باقاعدہ آغاز ہو جائے تو کرنل توحید کو اب تک کے حالات کی رپورٹ پیش کر دے۔

⊛----✪----⊛

نیلی جینز پر سیاہ رنگ کے کھلے گلے کی ٹی شرٹ میں ملبوس جاوید علی متوسط طبقے کا کھلنڈرا سا نوجوان لگ رہا تھا۔

ایشان کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے رائے چند پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس وقت اپنی بائک پر سوار اسی کی دکان کی طرف جا رہا تھا۔

وہاں جانے کے لیے اس نے شام کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے خریداری کے بہانے رائے چند کی دکان کا ایک چکر لگائے گا، پھر سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر دکان بند ہونے تک اس پر نظر رکھے گا۔ دکان سے وہ اس کے پیچھے اس کے گھر تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوتا تو شاید وہ اس کے گھر میں گھس کر اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے قابو میں کرتا اور اس سے اس کی حقیقت اُگلوا لیتا۔ بہرحال، ابھی اس سلسلے میں اُس کا ذہن واضح نہیں تھا اور فی الحال تو وہ رائے چند کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا تھا۔

اپنے اس پروگرام کے مطابق اس نے بڑی بے پروائی سے رائے چند کی دکان کے عین سامنے اپنی بائک روکی اور اُنگلی میں کی چین گھماتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

رائے چند کی دکان جو کہ اچھی خاصی بڑی تھی، وہاں روزمرہ استعمال کے آئٹمز فروخت کیے جاتے تھے۔ دکان میں لمبائی کے رخ پر کافی بڑا انگریزی کے حرف ''L'' کی شکل کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا، جہاں شیشے کے شوکیس میں بے شمار اقسام کی ٹافیاں، چاکلیٹس، بسکٹس اور بچوں کی پسند کی الم غلم اشیا بھری پڑی تھیں۔ باہر رکھے ریکس میں چپس اور پاپڑ جیسے آئٹمز نظر آ رہے تھے جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے دیواروں میں لکڑی کے شیلفس میں دودھ کے ڈبے، دلیے کے پیکٹس، صابن اور سرف کی تھیلیوں سے لے کر گھریلو استعمال کی بے شمار اشیا کا ایک ڈھیر ترتیب سے سجا ہوا تھا۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں دکان میں داخل ہوا اور بلا ضرورت شیلفس میں سجی بہت سی اشیا خریدنا شروع کر دیں۔ بعض اشیا کی صرف قیمت اور کوالٹی کے بارے میں استفسار کرنے پر اکتفا کیا اور بعض کے بارے میں

تبصرہ کیا کہ قیمت کے مقابلے میں ان کی کوالٹی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح اسے وہاں کافی وقت گزارنے کا موقع مل گیا اور وہ بڑی ہوشیاری سے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ دکان پر دو تین سیلز مین تھے اور حقیقت میں وہ گاہکوں کو ڈیل کر رہے تھے۔

رائے چند کاؤنٹر پر بیٹھا صرف بل کے مطابق رقوم وصول کر رہا تھا۔ سفید کُرتے پاجامے میں کلین شیو وہ درمیانی سی عمر کا مرد دیکھنے میں خاصا شریف اور خوش اخلاق محسوس ہو رہا تھا۔ جاوید علی اپنی خریداری مکمل کر کے بل کی ادائیگی کے لیے اس کے سامنے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوا تو اس نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے اس سے رقم وصول کی اور اپنی دراز میں رکھ کر بقایا نکالتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔

''آپ اس علاقے میں نئے لگتے ہیں۔ میں پہلی بار آپ کو اپنی دکان پر دیکھ رہا ہوں۔''

''میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو آپ کی دکان دیکھ کر خیال آیا، والدہ نے گھریلو استعمال کی کچھ چیزیں لانے کا حکم دیا تھا۔ بس اس لیے یہاں چلا آیا۔ ویسے یہاں آ کر مجھے اچھا لگا۔ آپ کی دکان پر ہر شے بہت قرینے سے رکھی ہوئی ہے اور خریدنے والا نہایت سہولت سے خریداری کر سکتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھیے، میرے پاس سامان کی لسٹ نہیں تھی لیکن چیزوں پر نظر پڑتی گئی اور یاد آتا گیا کہ کیا خریدنا تھا۔'' جواباً اس نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنس کر بتایا۔

''پھر تو آپ میری دکان کو یاد رکھیے گا اور آئندہ بھی یہاں سے سودا خریدیے گا۔ آپ کو یہاں سہولت کے ساتھ ساتھ خصوصی ڈسکاؤنٹ بھی ملے گا۔'' رائے چند نے ترغیب دیتے ہوئے اسے بقایا رقم واپس کی اور اس نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ اس نے بننے والے بل کے مقابلے میں کم رقم کاٹی ہے۔

''آپ سے شاید حساب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے زیادہ روپے واپس کر دیے ہیں۔'' اس نے فوراً ٹوکا۔

''نہیں، کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے ابھی سے آپ کو ڈسکاؤنٹ دینا شروع کر دیا ہے۔'' اس کی ہنس کر جواب دیا تو جاوید علی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا اس انتظار میں ہے کہ وہ کاؤنٹر سے ہٹے تو وہ رائے چند سے بات کرے۔

یہ بات کچھ عجیب تھی۔ کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ لڑکے نے دکان سے کوئی خریداری نہیں کی تھی بلکہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف آیا تھا جبکہ دکان میں اچھا خاصا وقت گزار کر وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ رائے چند کا خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ گاہکوں سے صرف رقم کی لین دین کا کام کرتا ہے۔ ایسے میں اس لڑکے کا براہ راست وہاں آ کر کھڑا ہونا قابلِ غور تھا۔ وہ دکان سے باہر نکل گیا لیکن توجہ لڑکے کی طرف ہی رہی۔ باہر نکل کر سامان کا تھیلا بائیک پر باندھنے اور بائیک اسٹارٹ کرنے میں اس نے جان بوجھ کر خاصا وقت لگایا اور اس دوران بیک ویو مرر کی مدد سے دکان کے اندر کا جائزہ لیتا رہا۔

لڑکا سرگوشی میں رائے چند سے بات کر رہا تھا۔ جواب میں رائے چند کاؤنٹر سے اُٹھ کر دکان کے کسی اندرونی حصے کی طرف گیا اور ایک پیکٹ لا کر لڑکے کو تھما دیا جسے لڑکے نے فوراً ہی اپنی قمیض کے نیچے چھپایا اور تیزی سے دکان سے باہر نکل گیا۔ جاوید اس دوران بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔

لڑکے نے دکان سے نکل کر ایک قریبی گلی کا رخ کیا تو وہ اس سے پہلے بائیک اس گلی میں لے گیا۔ کونے پر لے جا کر ایسے زاویے سے روک لی کہ لڑکا نظر آتا رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکا اسی گلی کے کسی گھر میں جاتا ہے یا آگے نکل جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ کسی گھر میں داخل نہیں ہوا اور گلی سے نکل کر آگے بڑھ



گیا۔ اس کا رخ ایک چھوٹے سے پارک کے دروازے کی طرف تھا۔

یہ بالکل اُجاڑ پارک تھا جس میں اُگائی گئی گھاس جانے کب کی سوکھ کر مٹی کے ساتھ رُل مل گئی تھی اور امین پر بس پارک میں کھڑے چند ٹنڈ منڈ سے درختوں کے جھڑ جانے والے زرد اور سوکھے پتے ہی پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پارک بالکل ویران پڑا تھا اور وہاں کسی ذی نفس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لڑکا دروازے سے گزر کر پارک میں داخل ہوا تو جاوید علی کو اندازہ ہوا کہ اس کی منزل پارک نہیں ہے بلکہ وہ پارک کے دروازے سے داخل ہو کر وہاں بنی پختہ روش پر سے گزرنے کے بعد دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جاوید علی کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال آیا اور وہ بائیک کھڑی کر کے خود بھی تیزی سے لڑکے کے پیچھے لپکا۔

''اے لڑکے! بات سنو۔'' پارک میں داخل ہونے کے بعد اس نے لڑکے کو سخت اور بارُعب لہجے میں پکارا۔ اس کی پکار سن کر لڑکا رُک تو گیا لیکن اس کے چہرے پر واضح طور پر خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ جاوید علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چشم زدن میں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے سخت نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیا بات ہے بھائی صاحب! آپ نے مجھے کیوں پکارا ہے؟'' لڑکے نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا۔

''بھائی صاحب نہیں، مائی باپ بولو۔ ہم پولیس والے تم جیسے آوارہ چھوکروں کے مائی باپ ہوتے ہیں۔'' اس نے چہرے کے تاثرات میں مزید سختی سموتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

''پپ..... پو..... پولیس..... مگر آپ.....'' اس نے جاوید علی کے جینز اور ٹی شرٹ میں نمایاں ہوتے اسمارٹ ورزشی جسم پر ایک نظر ڈالی اور حیرت اور خوف سے ملے جلے لہجے میں چند آدھے ادھورے جملے ادا کیے۔

''کیوں..... کیا تجھے یقین نہیں آ رہا؟..... اپنا کارڈ دکھاؤں کیا تجھے؟'' جواباً جاوید علی غرایا۔

''نہیں سر جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟'' اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے استفسار کیا تو اس کا لہجہ کسی گڑبڑ کی چغلی کھا رہا تھا۔

''وجہ بھی بتاتا ہوں بچو! تم ذرا میرے ساتھ ادھر تو چلو۔'' وہ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر ایک سنگی بینچ کی طرف لے گیا۔ اس سے قبل اُس نے اپنی ٹی شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اُڑسی پسٹل کی جھلک دکھا دی تھی جس کی وجہ سے لڑکے کا خوف کچھ اور بھی بڑھ گیا اور وہ کسی بھی قسم کی پس و پیش کیے بغیر ڈھیلے قدموں کے ساتھ بینچ کی طرف گھسٹتا چلا گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' بینچ پر بیٹھنے کے بعد اس نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''حاذق۔'' اس نے مری مری آواز میں بتایا۔

''عمر؟''

''پندرہ سال۔''

''کس کلاس میں پڑھتے ہو؟'' وہ لڑکے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے لیے یونہی ضمنی سوالات کرتا جا رہا تھا۔

''نویں کا امتحان دیا ہے۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

''رہتے کہاں ہو؟''

''وہاں، اُس گلی کا چوتھا گھر میرا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے اُس گلی کی طرف اشارہ کیا جس سے گزر کر وہ یہاں تک آئے تھے۔

''وہاں گھر ہے تو پھر آگے کہاں جا رہے تھے؟'' جاوید نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''وہ جی..... دوست کے پاس جا رہا تھا۔''

''کیوں؟'' اُس کا لہجہ کچھ اور سخت ہوا۔

اس بار لڑکے نے جواب نہیں دیا اور بس ہکلا کر رہ گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر جاوید علی نے جواب پر اصرار کرنے کے بجائے ایک اور سوال داغ دیا۔

''رائے چند کی دُکان پر کیا لینے گئے تھے؟'' اس سوال کا لڑکے پر زبردست ردِعمل ہوا اور اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اس کے انداز سے ایسا لگا کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہو لیکن ہاتھ جاوید علی کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے مجبور ہو۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' جاوید علی غرّایا۔

''کک..... کچھ نہیں جی۔ میں تو بس ان سے گھی کے ڈبے کی قیمت پوچھنے گیا تھا۔'' اسے آخر کار کوئی بہانہ سوجھ ہی گیا۔

''بکواس کرتے ہو۔ ابھی تمہاری تلاشی لے کر وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو تم رائے چند سے لے کر آئے ہو۔'' اس نے لڑکے کو تقریباً جھنجوڑ ڈالا جس پر وہ باقاعدہ رو پڑا۔

''معاف کر دیں سر جی!..... آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی شروع کر دی۔

''پیکٹ نکال کر دکھاؤ مجھے۔'' اس نے لڑکے کو حکم دیا جس کی اُسے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔

جاوید علی نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا جائزہ لیا۔ پیکٹ کا سائز زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی وزن زیادہ تھا۔ اُس نے اس پر چڑھا کور پھاڑ کر اسے کھولا۔ اندر سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور سی ڈی نکل کر سامنے آئی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں چار پانچ ہی سگریٹ تھے۔

''یہ کسے دینے جا رہے تھے؟'' اس نے دونوں چیزوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد مہری سے دریافت کیا۔ وہ چاہتا تو اتنی لمبی گفتگو کرنے کے بجائے پہلے ہی مرحلے میں لڑکے کی تلاشی لے کر یہ پیکٹ نکال لیتا۔ لیکن صرف احتیاطاً ایسا نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بے شک وہ جس پارک میں موجود تھے، وہ ویران اور اُجاڑ ہی ہوا تھا لیکن اس کے آگے پیچھے گلیاں تھیں اور ان گلیوں میں رہنے والے یقینی طور پر اس پارک کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس لیے وہ یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا کہ کوئی اسے حاذق کے ساتھ زور زبردستی کرتا دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو اور اس معاملے میں مداخلت کرے۔ وہ دونوں جب سے یہاں بیٹھے تھے، وہاں سے صرف ایک شخص گزرا تھا اور یقیناً اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ حاذق نامی اس لڑکے سے کس نوعیت کی گفتگو کر رہا ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ تم یہ پیکٹ کسے دینے جا رہے تھے؟''

''کسی کو نہیں۔ میں اپنے دوست شہباز کے گھر اس کے ساتھ یہ فلم دیکھنے جا رہا تھا۔'' لڑکے نے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا جو کہ خاصا حیرت انگیز تھا۔ رائے چند کی دکان پر جنرل آئٹمز بکتے تھے، وہ کوئی ویڈیو



سٹور نہیں تھا، جہاں سے فلمیں لا کر دیکھی جاتیں۔

''تم اور تمہارا دوست سگریٹ بھی پیتے ہو؟'' اس نے ایک سگریٹ نکال کر اسے کھولتے ہوئے سوالات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''کبھی کبھی چھپ کر۔'' اس نے جھکی نظروں سے اعتراف کیا۔ اس دوران جاوید علی سگریٹ کو کھول چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس سگریٹ میں سفید زہر بھرا ہوا ہے۔

''اوئے، تم تو نشہ کرتے ہو۔'' اس نے یک دم لڑکے کی گدی پکڑ لی۔

''نہیں سر جی! قسم سے میں نشہ نہیں کرتا۔ یہ سگریٹ تو رائے انکل نے آج پہلی بار مجھے دیئے ہیں۔ کہہ رہے تھے پی کر دیکھو، اس کے ساتھ فلم دیکھنے کا مزہ ڈبل ہو جائے گا۔'' لڑکے نے خوف زدہ منمناہٹ کے ساتھ حقیقت کا انکشاف کیا۔

''یہ کون سی فلم ہے؟..... سی ڈی پر کوئی نام وغیرہ تو لکھا ہوا نہیں ہے۔'' ہیروئن بھرے سگریٹ دیکھ کر اسے اندازہ ہونے لگا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے اور شاید رائے چند ''را'' کے عمومی ایجنڈے کی پیروی کرتے ہوئے نوجوان نسل کی تباہی میں بھی کوئی کردار ادا کر رہا ہے۔

''یہ..... یہ وہ فلم ہے جی..... وہ..... جنہیں نیلی.....'' لڑکے نے اٹک اٹک کر بتانا شروع کیا تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ نوعمر لڑکا قابل اعتراض فلمیں دیکھتا تھا اور اسے ہیروئن کے نشے کی طرف بھی راغب کیا جا رہا تھا۔ ان دو چیزوں کے زندگی میں شامل ہونے کے بعد اس کی تباہی میں کیا شک کیا جا سکتا تھا۔

''تم دوست کے گھر میں بیٹھ کر یہ فلم دیکھتے اور سگریٹیں پیتے تو اس کے ماں باپ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟''

''اس کے امی ابو کسی شادی میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور رات کو دیر سے واپس آئیں گے۔ اسی لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا۔''

لڑکے نے بتایا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی صورت حال ہو گی۔ فی زمانہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بچے موقع ملتے ہی والدین کو چونا لگا دیتے تھے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات میں ماں باپ کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے صرف لڑکیوں کو ان کی حفاظت کے پیشِ نظر گھر میں تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا لیکن اب صورتِ حال تقریباً یکساں تھی۔ ترغیبات اور خدشات دونوں میں ہی زیادہ اضافہ ہو چکا تھا کہ دونوں ہی کی حفاظت ضروری ہو گئی تھی۔

موجودہ زمانے کے والدین کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اگر وہ اپنی اولاد اور اس کے مستقبل کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو نہایت احتیاط سے انہیں اپنی مستقل نگرانی میں رکھیں۔ احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ آج کل بچے شخصی آزادی کے نعرے کی وجہ سے اتنے حساس ہو چکے ہیں کہ اپنی زندگی میں والدین کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتے۔ ایسے میں ظاہر ہے والدین کے پاس یہی حل رہ جاتا ہے کہ غیر محسوس طور پر ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور ایسے مواقع میسر نہیں آنے دیں کہ وہ کسی شکاری کے جھانسے میں پھنسنے کے لیے آسان شکار نظر آئیں۔

''چلو تمہارے دوست کے گھر چلتے ہیں۔'' اس نے یک دم ہی ایک فیصلہ کیا اور حاذق کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

''کیا آپ اسے بھی گرفتار کر لیں گے؟'' اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''یہ فیصلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے میں اس سے ملاقات کرلوں۔'' جاوید علی نے سنجیدگی سے جواب دے کر اس کا ہاتھ ایک بار پھر گرفت میں لے لیا۔ مجبوراً اسے اس کے حکم کی تعمیل میں آگے بڑھنا پڑا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارک سے باہر نکلے تو حاذق اُسے ایک قریبی گلی میں لے گیا۔ اس گلی کے ایک مکان کے سامنے پہنچ کر حاذق نے کال بیل بجائی۔ فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی اور گیٹ کی کنڈی کھلنے لگی۔

''تو بھی بڑا سست ہے یار حاذق! اتنی دیر کردی آنے میں۔ معلوم نہیں ہے کیا کہ امی ابو کے آنے سے پہلے فلم واپس بھی.....''

بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو حاذق کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور باقی کے لفظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے حاذق کے سُتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں بچّو!..... پہلے تم اندر تو چلو۔'' اُس نے لڑکے کو دھکا دے کر پیچھے کیا اور خود حاذق کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے اندر گھس گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے بڑی پھرتی سے گیٹ دوبارہ بند کر دیا اور اپنا پسٹل نکال لیا۔ اس کی پھرتی کے سامنے وہ لڑکے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اتنا نڈر اور زیرک تھا کہ بڑے بڑے مجرموں کے لیے بھی اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں تھا، یہ دونو عمر لڑکے بھلا کیا اوقات رکھتے تھے۔ ان میں اگر کچھ دم خم تھا بھی تو پسٹل دیکھ کر نکل گیا۔

''اندر کمرے میں چلو۔'' اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے جاوید علی نے سرد لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی پسٹل سے اشارہ بھی کیا تو دونوں لڑکے گرتے پڑتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

اندر پہنچ کر اس نے ان دونوں کو ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا اور مزید چند سوالات کیے جن سے ایک طرف تو حاذق کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوگئی، دوسری طرف کچھ مزید معلومات بھی حاصل ہوئیں۔

لڑکوں کے بیان کے مطابق وہ تقریباً چھ ماہ سے رائے چند کی دکان سے اس طرح کی فلمیں لے کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں ان کے ایک ایسے دوست نے جو عمر میں ان سے چند سال بڑا تھا اور ساتھ کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے اُن کی اس سے دوستی تھی، اس راہ پر لگایا تھا۔ وہی انہیں رائے چند کی دکان پر لے گیا تھا اور اس کی سفارش پر رائے چند انہیں یہ فلمیں فراہم کرنے لگا تھا۔

حاذق کی طرح شہباز نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھار سگریٹ نوشی کر لیتے ہیں لیکن نشے کے استعمال سے اس نے بھی انکار کیا تھا۔ جاوید نے ان سے ان کے اس دوست لڑکے کا نام پتہ معلوم کر کے اپنے پاس نوٹ کرلیا۔ اب وہ آگے کی کارروائی کے لیے تیار تھا اور اس سلسلے میں اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل بھی بنا چکا تھا۔ لیکن اس سے قبل ان لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے غیر متحرک کرنا ضروری تھا چنانچہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً انہیں ایک رسّی سے باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہو چکا تھا کہ شہباز کے والدین کی رات گئے گھر آمد متوقع ہے اس لیے وہیں بیٹھ کر اطمینان سے اپنی کارروائی کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے اپنے منصوبے اور اس کی ضروریات کے مطابق سہولیات کی دستیابی کے بارے میں بتایا۔ وہاں سے منظوری ملنے پر وہ مزید مصروف ہوگیا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے فی الحال ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے مہروں کو حرکت دینا



تھا۔ وہ یہی کرتا رہا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اب کارروائی شروع ہوا ہی چاہتی ہوگی تو وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ روانگی سے قبل اس نے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا جہاں ان دونوں لڑکوں کو قید کیا تھا۔ دونوں لڑکے بے بسی سے فرش پر پڑے تھے۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا کہ جانے اب یہ شخص ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

''میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہوگی کہ جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں کسی کے سامنے زبان مت کھولنا۔ میں یہ ناخن تراش یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس میں ایک ننھا سا چاقو بھی لگا ہوا ہے۔ اب یہ تم دونوں کے اوپر ہے کہ کیسے اور کتنی دیر میں اس تک پہنچ کر ایک دوسرے کی رسیاں کاٹ کر اس قید سے نجات حاصل کرتے ہو۔ اگر ناکام رہے تو اپنے والدین کی آمد تک انتظار کر لینا۔ وہ خود تمہیں کھول لیں گے۔ میں اب جاتا ہوں۔ ٹاٹا۔ بائے بائے۔''

اس نے ناخن تراش لڑکوں سے کافی فاصلے پر موجود ایک میز پر رکھ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تو جانے سے پہلے اُنہیں کھول بھی سکتا تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ مکمل کارروائی کرنے سے قبل ان کا آزاد ہونا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے اچھا تھا کہ اس چھوٹی سی سزا کے ذریعے انہیں سبق مل جاتا اور وہ غلط حرکتیں چھوڑ کر سیدھی راہ پر آجاتے۔

وہاں سے نکل کر وہ سیدھا اس پارک کی طرف گیا جس کی دوسری جانب اس نے اپنی بائیک کھڑی کر رکھی تھی۔ پارک کے ایک دروازے سے دوسرے دروازے کے درمیان بنی پختہ روش پر سے گزرتے ہوئے اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ دو افراد اس کی بائیک کے قریب کھڑے ہیں اور بڑی عرق ریزی سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس نے قریب پہنچ کر جیب سے چابی نکالی تو وہ چونک گئے۔

''یہ بائیک تمہاری ہے جوان؟'' دونوں میں سے زیادہ عمر رسیدہ صاحب نے اسے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی میری ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟'' اس نے جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ لوگ اس سے زیادہ بحث کرنے کی کوشش نہ کریں اور بائیک پر سوار ہوگیا۔

''اعتراض تو چھوٹا لفظ ہے میاں! ہم تو پچھلے بیس پچیس منٹ سے اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جانے کس وقت موٹر سائیکل پر بم باندھ کر یہاں کھڑی کر گیا ہے۔ ہم تو پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دینا چاہتے تھے اس مشکوک موٹر سائیکل کے بارے میں لیکن وہ بادشاہ لوگ بھی شاید آج سرِ شام ہی لمبی تان کر سو گئے ہیں اس لیے کوئی فون ہی نہیں اٹھاتا۔'' بڑے میاں جانے کس بات پر زیادہ خفا تھے۔ تھانے والوں کے رویے پر یا اپنے تئیں ایک مشکوک موٹر سائیکل کے ہاتھ سے نکل جانے پر۔

''آپ نے ٹھیک ہی سمجھا جناب! اس تھیلے میں بم ہی رکھا ہے۔'' اس نے رائے چند کی دکان سے لائی گئی اشیا کے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بائیک کو کک لگائی تو وہ دونوں حضرات یوں پیچھے ہٹے جیسے موٹر سائیکل ان پر چڑھاتے ہوئے بم بلاسٹ کردے گا۔

''یہ بم آج رائے چند کے سر پر پھٹے گا۔'' گلی سے گزر کر واپس رائے چند کی دکان کی طرف جاتے ہوئے وہ زیرلب بڑبڑایا تو اس کے کان پولیس کی گاڑی کا سائرن سن رہے تھے۔

اس نے بائیک اُس ریستوران کے سامنے لے جا کر روک دی جو رائے چند کی دکان کے عین سامنے

موجود تھا۔ یہاں سے وہ پولیس والوں کی ساری کارروائی اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کارروائی کو دیکھتے ہوئے اس کی نظر میں اپنے آدمی بھی آ گئے۔ اس ڈرامے میں جہاں پولیس کا کردار ختم ہوتا، وہیں سے اس کے آدمیوں کا کام شروع ہو جاتا۔ اسے سکون محسوس ہوا کہ وہ صحیح وقت پر اپنے کردار کی ادائیگی کے لیے موجود ہیں۔ رائے چند کی دکان میں داخل ہونے کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس والے برآمد ہوئے ان کے چہرے فتح کی خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان کے ساتھ بوکھلایا ہوا رائے چند موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

دوسری طرف ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود تھیلے میں واضح طور پر کئی سی ڈیز نظر آ رہی تھیں۔ اردگرد کے دکاندار، ریستوران کا عملہ، گاہک اور راہ گیر اس کارروائی کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اپنی اپنی جگہ انگشت بدنداں تھے کہ ایک جنرل اسٹور پر سی ڈیز کا کیا کام تھا؟ ان میں سے چند یقیناً حقیقت بھی ہوں گے جن میں سے ایک گروہ ان افراد کا ہوگا جنہیں رائے چند کے کالے دھندے سے ہوگی اور وہ اس کے پکڑے جانے پر خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔ جبکہ دوسرے گروہ کے افراد کو پریشانی ہوگی کہ رائے چند کی گرفتاری کے بعد وہ اپنے مطلب کی سی ڈیز کہاں سے حاصل کریں گے۔ جاوید فی الحال دونوں ہی طرح کے لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ رائے چند کی گرفتاری کے بعد پولیس کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فی الحال تو رائے چند کو تھانے لے جایا جا رہا تھا لیکن اسے کہیں اور اس کے استقبال کے لیے پہنچنا تھا تاکہ اس سے دو دو ہاتھ کیے جا سکیں۔

⊛----✪----⊛

''لو بھائیا جی! اسیں ہریانہ وچ پہنچ گئے ہیں۔ ایہہ ہریانہ دا شہر پانی پت ہے۔ ایتھے ساڈا گھر ہے۔ میرے کول رُکو۔ نہا دھو کر روٹی شوٹی کھاؤ، فیر اگے چلے جانا۔ میں خود تہیں دلی جانے والی بس وچ بٹھا جاؤں گا۔'' وہ سرائے میں اپنے علاوہ ٹھہرے ہوئے دوسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار ہو کر اس کے شہر تک پہنچے تھے اور اب وہ اپنی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے خلوص سے اپنے ساتھ اپنے گھر چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

''بہت بہت دھنے واد بھا جی! پر اس دی لوڑ نئیں ہے۔ اسیں تہانوں پہلے ہی دس چکے ہیں کہ اسیں جلد سے جلد دلی وچ پہنچنا چاہندے ہیں تاکہ اپنے راج کمار دے ویاہ کی تیاری کر کے واپس لوٹ جائیں۔ اس دے ویاہ توں فارغ ہونے کے بعد فیر کبھی ادھر آنا ہوا تو تہاڈے کول ضرور آئیں گے۔'' شہزاد نے عاجزی اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا لیکن قبول کرنے سے بڑی خوبی سے انکار کر دیا۔

''تہاڈی مرضی جی۔ اگر بولو تو دلی کے لیے بس کے ٹکٹ کٹوا دیتا ہوں۔'' اس نے ان کے بہانے کی حقیقت سمجھتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کیا اور ایک اور پیشکش کی۔

''نہ نہ..... ایہہ چھوٹا سا کم اسیں خود بھی کر سکدے ہیں۔ تسی اپنے گھر جاؤ ہور آرام کرو۔ ہم تھوڑا سا میں گھوم پھر کر دیکھتے ہیں۔''

وہ اب اس شخص سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے اس لیے اس دوسری پیشکش کو بھی ٹھکرا کر رخصت کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے چار و ناچار ان دونوں سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کر لیا



اور انہیں اپنی گاڑی سے اُتار دیا۔ اُتارنے سے قبل البتہ وہ اُنہیں یہ بتانا نہیں بھولا تھا کہ دہلی کے لیے بسیں کہاں سے ملتی ہیں اور ٹکٹ کے حصول کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ اس کی فراہم کردہ ان معلومات کو ذہن نشین کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور بازار کی رونقوں میں خود کو گم کر لیا۔

تاریخی اہمیت کے حامل اس شہر کے بازار میں گھومتے ہوئے شہریار کو مغل تاج دار ظہیر الدین بابر یاد آیا۔ اس مغل بادشاہ کے متعلق جو معلومات فراہم کرتی تھی، ان کی روشنی میں اسے جرأت مند اور بہادر سپہ سالار تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پانی پت کے میدان میں ہی اس نے ابراہیم لودھی سے جنگیں لڑی تھیں۔ اس میدانِ جنگ کا تو کچھ پتہ نہیں تھا لیکن آج وہ اس کے بازار میں گھوم رہے تھے۔ بازار میں گھوم پھر کر انہوں نے ایک دکان سے اپنے ناپ کے کپڑے خریدے، پھر ناپ کے جوتے بھی لے لیے۔

خریداری کرتے ہوئے ان کا انداز اُن ٹھیٹھ دیہاتیوں جیسا تھا جو پہلی بار اپنے لیے شہری وضع قطع کے کپڑے اور جوتے خرید رہے ہوں۔ اُن کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دکان داروں نے اپنے انہیں خوب لوٹا۔ اپنے کردار کو تقویت دینے کے لیے وہ آرام سے لٹ گئے۔ رقم کے معاملے میں ویسے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت ہی انہیں راستے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے معقول انڈین کرنسی فراہم کر دی گئی تھی۔ امرت کور کے گھوڑے کو فروخت کرنے کے باعث اس رقم میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے آرام سے خریداری مکمل کی اور پھر ایک عوامی حمام میں جا کر لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شیو بھی بنا ڈالی۔

نیٹ شرٹ اور جوتوں کی تبدیلی کے ساتھ ان کے سنورے ہوئے حلیوں نے ان کی وضع قطع کو بالکل بدل کر کے رکھ دیا۔ کچھ دیر قبل جس شخص نے اُنہیں بازار کے قریب ڈراپ کیا تھا۔ اگر اس وقت وہ انہیں دیکھتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے شناخت کی یہ تبدیلی ضروری بھی تھی تاکہ اپنے پیچھے کوئی اتا پتہ چھوڑ کر نہ جائیں۔ فی الحال تو وہ خود کو انڈین معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ہوئے تھے۔ یہاں سے لباس کی خریداری کا بھی یہی مقصد تھا ورنہ جو کپڑے وہ پاکستان سے پہن کر نکلے تھے اس کے علاوہ بھی ایک ایک اضافی جوڑا اُن کے بیگ میں موجود تھا۔ پہنے ہوئے لباس تو راستے میں ہی خراب ہو گئے تھے چنانچہ سرائے سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے انہیں تلف کر دیا تھا اور امرت کور کے فراہم کردہ دھوتی کُرتے میں ہی یہاں تک آئے تھے۔ اب وہ ان دیہاتی کپڑوں سے بھی جان چھڑا چکے تھے اور نئے نئے شہر کے فیشن میں رنگے ہوئے جوان دکھائی دے رہے تھے۔ پاکستان سے ساتھ لائے ہوئے لباس کا استعمال بھی انہوں نے اس لیے مناسب نہ سمجھا تھا کہ چہرے مہرے اور بول چال کے علاوہ لباس بھی چغلی کر دیتا ہے کہ بندے کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ چہرے اور بول چال میں تو وہ اپنی ربیت اور لہجے بل بوتے پر خاصی تبدیلی لا چکے تھے، لباس بھی بھارتی تیار کردہ پہن لیا تو مقامی ہی لگنے لگے۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور دہلی تک براہِ راست جانے والی بس کے ٹکٹ لیے۔ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے وقت میں وہاں پہنچے تھے جب بس کی روانگی میں بس پندرہ منٹ ہی باقی رہ گئے تھے اور اس کے باوجود انہیں اس میں سیٹیں مل گئی تھیں۔

''تم یہاں سے کھانے پینے کے لیے کچھ خریدو، میں ابھی آتا ہوں۔'' دہلی تک جانے کا انتظام ہوا تو دوسرے اہم کام کا خیال آیا اور وہ سلّو کو ہدایت کر کے اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے ایک پبلک کال

آفس دیکھا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر بھارت پہنچے تھے، وہاں موبائل کے سگنلز نہیں آتے تھے اس
اپنے پاس موبائل رکھنا بے کار تھا۔ اس قسم کے سارے انتظامات انہیں یہیں رہ کر کرنے تھے اور وہ اسی
میں پی سی او تک جا رہا تھا۔

پاکستان سے روانگی سے قبل اُسے چند اہم فون نمبرز اور کوڈز ذہن نشین کروائے گئے تھے جہاں
انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں کچھ مدد مل سکتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے ہی ایک نمبر پر رابطہ کر رہا تھا
پر چونکہ سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اسے اس قسم کے رازوں میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ پی
سے اپنا مطلوبہ نمبر ملا کر وہ کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیئے ہیں۔'' اس نے طے شدہ کوڈ ورڈ ادا کیا۔

''جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔'' دوسری طرف سے جوابی کوڈ ورڈز ادا کیے گئے

''ہم پانی پت میں ہیں اور تھوڑی دیر بعد دہلی جانے والی بس میں سوار ہونے والے ہیں۔'' کو
سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ صحیح آدمی سے رابطہ ہوا ہے چنانچہ اپنے بارے میں اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس آپ سے ملوں گا۔'' اس نے جواب دیا
انہوں نے ملاقات کے لیے وقت، ایک دوسرے کے حلیے اور نئے کوڈ ورڈز طے کر لئے۔ اس ساری گفتگو
انہوں نے مشکل سے پانچ منٹ ہی صرف کیے تھے۔

پی سی او والے کو کال کا بل ادا کر کے وہ باہر نکل آیا۔ پی سی او میں یہ بات اچھی تھی کہ دو تین الگ
بوتھ بنے ہوئے تھے چنانچہ اسے تنہائی میں اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس پی سی او کی
خصوصیت اس نے پہلے ہی نوٹ کر لی تھی اسی لیے اس کا انتخاب بھی کیا تھا۔ کال سے فارغ ہو کر وہ اسٹاپ
واپس پہنچا تو سلّو ہاتھ میں ایک شاپر لیے اس کا منتظر تھا۔

''ابھی میں نے یہ کچوریاں خرید لی ہیں۔ صحیح کھانا دہلی پہنچ کر ہی کھائیں گے۔'' شہریار کو دیکھ کر
نے بتایا۔

''او کے، ایز یو وِش۔'' اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا، وہاں
طرح لگی بندھی روٹین پر چلنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی پہلے کی طرح وہ نخرے دکھائے جا سکتے تھے۔ اپنے لیے
نے جس زندگی کا انتخاب کیا تھا، اس میں کسی آوارہ گرد اور خانہ بدوش کا سا انداز اختیار کرنا لازم تھا۔
زندگی میں معمولات نہیں ہوتے، پسند ناپسند نہیں ہوتی اور معیارات قائم نہیں کیے جاتے۔ بس خود کو وقت
دھارے پر چھوڑ کر مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے ہاتھ پیر چلائے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہی کر رہا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' سلّو نے لفافے سے ایک کچوری نکال کر کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ایک کام سے گیا تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے بتانا نہیں چاہتے؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کیا.....؟'' اُس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور پوری طرح کچوریوں
مصروف ہو گیا۔

چند منٹ بعد بس چلنے کا اعلان ہوا تو وہ دونوں بھی اس میں سوار ہو گئے۔ بس آرام دہ تھی۔ سبک رفتاری
سے فاصلے طے کرتی ہوئی سونی پت اور کرنال سے گزر کر دہلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔



دہلی کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے راستے میں کئی فارم ہاؤسز دیکھے۔ ساتھی مسافروں کی
معلوم ہوا کہ ان فارم ہاؤسز کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بس نے انہیں
بس اسٹاپ پر اُتارا تو وہ دونوں سائیکل رکشے میں بیٹھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان دونوں کے پاس ایک ایک سفری بیگ کے سوا کوئی سامان نہیں تھا اس لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ
سے پہلے کسی ہوٹل میں جا کر وہاں کمرہ بک کرواتے اور پھر اپنا سامان رکھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ
۔ ویسے بھی ہوٹل میں قیام کے لیے شناختی دستاویز کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے ان کے پاس نہیں
اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس شخص سے مل لیتے جس سے انہیں دہلی میں اپنے لیے مدد ملنے کی اُمید تھی۔ سلّو کو
بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب اس نے سائیکل رکشے کو جامع مسجد چلنے کو کہا تو اس نے کسی قسم کا
اظہار نہیں کیا۔ وہ یوں مطمئن تھا جیسے بھارت کسی خطرناک مشن پر نہ آیا ہو بلکہ سیر کے لیے آیا ہو اور اس سیر
لیے سارے معاملات طے کرنا شہریار کی ذمے داری ہو۔

شہریار کے لیے اس کا یہ بے نیاز اور بے پروا انداز باعثِ تفکر نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسی لاابالی سلّو کے
وہ شخص چھپا ہوا ہے جو وقت پڑنے پر ایکشن میں آنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس کی یہ
بے نیازی تو اس کے نڈر اور دلیر ہونے کی دلیل تھی۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ہی اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آ گیا۔ درمیانی قامت کے گول مٹول سے
آدمی نے سفید دھاریوں والی نیلی قمیض کے ساتھ سر پر سفید ہیٹ لگا رکھا تھا جو اس کی گوری رنگت پر جچ رہا
فون پر اس شخص نے اپنا یہی حلیہ بتایا تھا چنانچہ شہریار اطمینان سے اس کی طرف بڑھ گیا اور اس کے عین
سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

''دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے، کہاں حاضری دوں کہاں نہیں؟''

''کہیں بھی جاؤ نہ جاؤ، درگاہ نظام الدین پر جانا مت بھولنا۔'' اس نے بھی جوابی کوڈ ورڈ دہرایا اور
مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''فی الحال تو ہمیں سب سے پہلے کسی رہائش گاہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اپنے لیے شناختی
دستاویزات، موبائل فونز اور ان کی سمز وغیرہ درکار ہوں گی۔'' اس نے فوراً اسے اپنی ضروریات سے بلا تکلف
آگاہ کیا۔ تکلف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے اس شخص سے رابطہ کرنے کے لیے کہا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ
ان کی ضروریات پوری کر سکے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ سب ہو جائے گا۔ مجھے چند منٹ کے لیے مسجد کے اندر جانا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو
میرے ساتھ چلیں۔ پھر ہم ایک جگہ چلیں گے۔'' اس نے خوش خلقی سے کہا۔

''آپ چلے جائیں۔ ہم یہیں آپ کا انتظار کرتے ہیں۔'' اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ یہیں سے دیکھ
سکتا تھا کہ مسجد کے دروازے پر سکیورٹی کا زبردست انتظام ہے اور ان کے پاس کچھ اسلحہ موجود تھا۔ دروازے
سے گزر کر وہ مسجد میں جانے کی صورت میں فوری طور پر پکڑے جاتے، چنانچہ یہیں انتظار کرنا مناسب تھا۔

انکار سن کر وہ شخص تنہا ہی چل پڑا۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھنے لگے۔
مغل بادشاہ کی سرخ پتھروں سے تعمیر کروائی گئی یہ جامع مسجد پُرشکوہ گنبدوں اور میناروں پر مشتمل تھی اور اس
وہ خصوصی طرزِ تعمیر جھلکتا تھا جو مغلوں سے منسوب ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مسجد کی سیڑھیوں کے

نیچے اور آس پاس صفائی کا شدید فقدان تھا۔ حالانکہ وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ حکومتِ ہند کو سیاحوں کی وجہ سے جو کثیر آمدنی ہوتی ہے، اس میں مسجد کا بھی اہم کردار ہے۔ بہرحال، اس وقت اس قسم کے معاملات پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ مسجد اور ہندوستان بھر میں موجود مسلمانوں کی تعمیر کردہ تاریخی اہمیت کی حامل عمارتوں سے ہر پاکستانی مسلمان کی طرح اس کی بھی جذباتی وابستگی تھی اور وہ بجا طور پر فخر کرتا تھا کہ مسلمانوں کے طویل عرصے ہندوستان پر حکمرانی کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو ان عمارتوں کی صورت انمول خزانے سے نوازا تھا۔

دنیا کے عجائبات میں سے ایک بے نظیر عجوبہ تاج محل، مسلمان مغل بادشاہ شاہجہاں کا کارنامہ ہونے کے باوجود ہندو نواز ہندوستان کے لیے کثیر زرِ مبادلہ کما کر دیتا تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کا ان پر ایک احسان تھا لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے کارہائے نمایاں ماضی کا حصہ بن چکے تھے اور پاکستان بننے کے بعد کوئی پاکستانی مسلمان اپنے آباء کی ان یادگاروں پر حقِ ملکیت نہیں جتا سکتا تھا اور حال کا قصہ یہ تھا کہ اسے اپنے وطن کے ایک مایہ ناز سائنس دان ڈاکٹر فرحان جمیل کو بھارتی بھیڑیوں کی قید سے نجات دلا کر واپس پاکستان لے جانا تھا۔

ماضی میں جو کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جو کچھ بھارتی غنڈوں نے لوٹ لیا تھا، اس سب کے لیے بے شک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اپنا حال اور مستقبل بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ڈٹ کر ان غنڈوں سے مقابلہ کریں۔ ایسے ہی ایک مقابلے کا عزم دل میں لے کر وہ جان ہتھیلی پر لیے ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تھا اور یہ طے تھا کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو یہاں سے واپس لے کر ہی جائے گا۔

''چلیے، اب چلتے ہیں۔'' اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ مسجد کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کتنے گہرے خیال میں ڈوب گیا تھا۔ نیلی قمیض والے نے آ کر دوبارہ مخاطب کیا تو حال کے منظر میں واپس آ گیا۔ نیلی قمیض والے سے اس نے اس کا نام دریافت نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی ان سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انہیں ناموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس انہیں معلوم تھا کہ وہ پاکستان کے لیے کام کر رہے ہیں اور اس سے آگے کسی قسم کے سوال و جواب کی گنجائش نہیں تھی۔

بھرے پُرے بازار سے گزرتے ہوئے وہ پیدل ہی جانے کن کن گلیوں سے گھماتا ہوا انہیں ایک مکان تک لے گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور باہر سے دیکھنے میں ہی لگتا تھا کہ مکینوں کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس آدمی نے دروازے پر دستک دی تو ایک جوان لڑکے نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی لیکن بظاہر وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں نیلی قمیض والے کے پیچھے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مکان کی حالت اندر سے بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسا باہر سے دیکھ کر اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

''پہلے تمہاری شناختی دستاویزات کی تیاری کے لیے کام شروع کرتے ہیں۔'' اس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی کام کی بات شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اس کے اور اس کے ساتھی کے رحم و کرم پر تھے۔ کمرے میں روشنی کا معقول انتظام کر کے ایک دیوار پر نیلی چادر تان دی گئی اور وہ دونوں ان کے چہروں پر اپنا ہنر آزماتے ہوئے دو تین مختلف حلیوں میں ان کی تصویریں لیتے چلے گئے۔ اُن کے سامنے آئینہ نہیں تھا لیکن ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ دونوں ہی افراد میک اپ کے فن میں ماہر ہیں۔



''میں نے تصویریں لے لی ہیں۔ کمپیوٹر پر ان پر مزید کام کر کے آپ دونوں کے لیے کئی شناختی دستاویزات تیار کروا دوں گا۔ اس کام کے لیے مجھے بس کل تک کی مہلت درکار ہو گی۔ اس کے بعد آپ آزاد ہوں گے کہ حلیہ بدل بدل کر ہندوستان بھر میں جہاں چاہے گھومتے پھریں۔ آپ کی شناخت کے سلسلے میں کوئی آپ پر شک نہیں کر سکے گا۔'' اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے اُنہیں آگاہ کیا جبکہ اُس کا ساتھی خاموشی سے سارا ساز و سامان سمیٹنے لگا۔

''تھینک یو..... یہ کام تو ہو گیا۔ باقی دوسرے معاملات.....؟'' شہریار نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''تین چار سیلولر فون کے سیٹ اور سیمیں میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔ رہائش کا مسئلہ ابھی میرا ساتھی آپ کے ساتھ جا کر حل کروا دے گا۔ صرف آج ہی آپ کو یہ پرابلم رہے گی، کل سے تو آپ کسی بھی ہوٹل میں آسانی سے قانونی طور پر قیام کر سکیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ اس دوران اس کا ساتھی سامان سمیٹ کر کمرے کے بعد واپس آ گیا۔

''یہ ایک اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کی مدد سے آپ پورے ہندوستان میں کہیں سے بھی رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کارڈ کا تعلق ایک ایسے شخص کے اکاؤنٹ سے ہے جسے مرے ہوئے بھی پانچ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن بینک کے پاس ریکارڈ نہیں ہے۔ اکاؤنٹ میں ہم مختلف ذرائع سے رقم جمع کرواتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے بینک کے پاس یہ ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں ہو گا۔ بشرطیکہ آپ ذہانت، ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیں۔'' اس نے ایک کارڈ شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا پھر اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ بالکل الرٹ کھڑا ہو گیا۔

''آیئے، میں آپ کو ہوٹل تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے انہیں ساتھ لیا اور گھر سے نکل گیا۔ اپنے ساتھی کی طرح وہ بھی اُنہیں پُر پیچ گلیوں سے گھماتا ہوا مٹیا محل بازار واپس لے آیا اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے کر داخل ہو گیا۔

''اور لالو بھائی! کیا حال ہے؟..... بھابی اور بچے سب ٹھیک ہیں نا؟'' کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ارے راہول! تم..... بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔ گھر پر بھی بہت دنوں سے نہیں آئے۔ تمہاری بھابی اور بچے تمہیں یاد کر رہے تھے۔'' لالو کے نام سے پکارے جانے والے شخص نے بھی جواباً گرم جوشی سے مصافحہ کیا جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ آنے والے جوان کے اس سے خاصے خوش گوار اور بے تکلفانہ تعلقات ہیں۔ کاؤنٹر والے شخص نے اسے راہول کہہ کر پکارا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا وہ راہول کا روپ دھار کر یہاں رہ رہا تھا۔

''تمہیں تو اپنی مصروفیت کا علم ہی ہے لالو بھائی!..... کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ایک جگہ ٹِک کر بیٹھیں تو میل جول میں بھی باقاعدگی آئے۔''

''ہاں، مجھے سب معلوم ہے، تم صحافی لوگ کتنے بدمعاش ہوتے ہو۔ یہ بتاؤ، آج کل کس ہیروئن بے چاری کے پیچھے لگ کر اسے بلیک میل کرنے کی تیاری کر رہے ہو؟'' لالو نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے کہاں لالو بھائی! تم یار لوگ بھی خوامخواہ بدنام کرتے ہو۔ میں ایسا بلیک میلر ہوتا تو شہر میں اپنا بھی کوئی بنگلہ اور کوٹھی ہوتی۔'' اس نے سنجیدہ شکل بنا کر تردید کی کوشش کی۔

''مجھے بے وقوف نہیں بناؤ۔ مجھے سب معلوم ہے تمہاری چار سو بیسی کا۔'' لالو نے اس کی بات کو ماننے کرنے سے انکار کر دیا۔

''اچھا مت مانو۔ لیکن اب مہمانوں کے سامنے انسلٹ تو نہ کرواؤ۔ یہ میرے چاچا کے بیٹے ہیں پانی پت سے گھومنے پھرنے کے لیے نکلے ہیں۔ کچھ دن دہلی میں ٹھہریں گے، پھر آگے نکل جائیں گے تم ہوٹل میں ان کے لیے دو بیڈز کا ایک کمرہ تو بک کر دو۔'' وہ بڑی خوب صورتی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''کیوں نہیں بھئی، تمہارے مہمان ہیں تو ہمارے بھی مہمان ہوئے۔'' اس نے اُٹھ کر شہریار اور سلو سے ہاتھ ملایا پھر دوبارہ راہول کی طرف متوجہ ہوا۔ ''دونوں کے نام بتاؤ۔''

اس نے نام بتا دیے جو کہ جگدیش اور ویندر ہی تھے اور پتے کے خانے میں کوئی پتہ بھی لکھوا دیا۔ اس کی وجہ سے لالو نے شناختی کاغذات دکھانے پر بھی اصرار نہیں کیا اور ایک کمرے کی چابی نکال کر ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ چابی کے ساتھ منسلک ٹیگ پر کمرہ نمبر تیرہ لکھا ہوا تھا۔

''اچھا بھئی، تمہارے لیے کمرے کا انتظام تو ہو گیا۔ تم آرام سے یہاں رہو اور جہاں چاہے گھومو پھرو میں اب چلتا ہوں، ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' کام ہوتے ہی اس نے ان دونوں سے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ارے یار! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کم سے کم چائے تو پیتے جاؤ؟'' لالو نے اسے روکا۔

''نہیں، ابھی مجھے سچ مچ جانا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو گھر آ کر بھابی کے ہاتھ کے بنے گوبھی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ ابھی تم میرے حصے کی چائے میرے مہمانوں کو پلا دو۔'' وہ ہاتھ ہلاتا ہوا عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے روانہ ہوتے ہی لالو نے ایک پورٹر کو بلا کر ان دونوں کو ان کا کمرہ دکھانے کا حکم دیا۔ کمرے میں پہنچ کر سلو نے بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گیا۔

''تمہارے دوست کتنے کنجوس ہیں۔ کھانا تو دُور کی بات، ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔'' ٹانگیں پھیلا کر بستر پر لیٹے لیٹے اس نے تبصرہ کیا۔

''ہم یہاں تفریحی دورے پر نہیں آئے ہوئے ہیں کہ لوگ ہماری خاطر مدارات کرتے پھریں۔ اگر ہمارے لیے جو کچھ کرنا چاہئے تھا، وہ انہوں نے کیا۔ تم کھانا کھانا چاہتے ہو تو ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں یہیں منگوا لیتے ہیں۔'' نیلی قمیض والے سے ملنے والے موبائلز میں سے ایک موبائل میں سم لگاتے ہوئے اس نے سلو کی بات کا جواب دیا۔

''نہیں، کہیں باہر چلتے ہیں۔ ذرا سیر بھی ہو جائے گی اور کھانا بھی کھا لیں گے۔'' وہ جو بستر پر لیٹا تھا کہ جیسے بھوک اور تھکن کے مارے برا حال ہو، یکدم ہی باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ شہریار نے مسکراتے ہوئے اس کے پروگرام کی تائید کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ سلیم عرف سلو نامی یہ بلا بڑی آفت ہے اور ذرا سا سفر یا بھوک اسے اتنی آسانی سے نڈھال نہیں کر سکتے۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی نے اپنے سامنے بیٹھے رائے چند کو غور سے دیکھا۔ وہی اُجلا سفید لباس اور نرم سے دینے والے نقوش تھے اس شخص کے جس سے اچھا بھلا بندہ دھوکا کھا جائے اور ذرا شک نہ ہو کہ کیسی شیطانی



رکھنے والا آدمی ہے۔ سی ایف پی والوں کی نظر میں تو وہ اس لیے آیا تھا کہ انہیں اس پر ''را'' کا مبینہ ہونے کا شک تھا لیکن اس کے علاوہ بھی وہ ایسے جرائم میں ملوث تھا کہ اس پر قانون کی گرفت ہونا ضروری تھی۔

وہ بدبخت اخلاق باختہ فلموں اور منشیات کی مدد سے بڑی چالاکی اور خاموشی کے ساتھ نوجوان نسل کو تباہ کرنے کے مشن پر جتا ہوا تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کا ساتھ دینے میں لالچ اور طمع میں مبتلا قانون کے رکھوالے برابر کے شریک تھے۔ وہ کتنا ہی شریف صورت سہی لیکن بہر طور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کے ان کارنامے اور غیر قانونی دھندوں کی سن گن پولیس کو نہ ملی ہو۔ وہ سب جانتے تھے لیکن پابندی سے پہنچنے والے نذرانے نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔ اب جو اوپر سے سخت احکامات ملے تو انہیں چار و ناچار اس کی دکان پر چھاپہ مار کر مال برآمد کرنا پڑا۔ چھاپہ مارنے والی ٹیم کا انچارج انسپکٹر یقیناً اس وقت بہت حیران ہوا ہو گا اب اسے اوپر سے ہی یہ احکامات ملے کہ معقول رشوت قبول کر کے رائے چند کو آزاد کر دیا جائے۔ انسپکٹر سمجھدار تھا۔ اس نے موقع کا خوب فائدہ اُٹھایا اور رائے چند سے مول تول کر کے خاصی بڑی رقم اینٹھنے میں کامیاب رہا۔

رائے چند کے لیے اصل اہمیت آزادی کی تھی سو اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر کے اپنے لیے آزادی خرید لی۔ چالاک بنیے نے شاید یہ سوچ رکھا ہو کہ یہ نقصان اپنے غیر قانونی دھندوں سے بعد میں پورا کر لوں گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ تھانے سے نکلنے کے بعد وہ اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ اس نے فون کر کے اپنے بیٹے سے رقم منگوائی اور پھر اسے واپس بھیج دیا کہ تم واپس جاؤ، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ تھانے میں اس نے خود کو گرفتار کرنے والے انسپکٹر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی کہ باقاعدگی سے پہنچنے والے نذرانے کے باوجود آخر اس نے اس پر ہاتھ کیوں ڈالا۔ اگر معمول کے نذرانے سے زائد رقم ہی درکار تھی تو وہ ویسے بھی بتا سکتا تھا۔ انسپکٹر بھی گھاگ آدمی تھا، سچ اور جھوٹ کو آپس میں ملاتے ہوئے اسے یہ کہانی سنائی کہ علاقہ مکینوں میں سے کسی نے اوپر شکایت کر دی تھی کہ رائے چند اس ایک دکان دار علاقے میں منشیات اور گندی فلموں کا کاروبار کر رہا ہے، اس کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ ایس پی صاحب نے تھانے فون کر کے ایکشن لینے کا حکم دیا تو مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ مہلت اتنی کم تھی کہ وہ پہلے سے اسے اطلاع بھی نہیں دے سکا کہ اپنی دکان سے ساری مشکوک چیزیں ہٹا لے۔ لیکن اب حق نمک ادا کرنے کے لیے اسے آزاد کرنے کو تیار ہے۔ اوپر والوں کو وہ یہ کہانی سنا سکتا تھا کہ چھاپے میں رائے چند کی دکان سے کچھ برآمد نہیں ہوا اور تفتیش کے نتیجے میں بھی پولیس کو اس سے ایسی کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں جن کی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیا جا سکتا چنانچہ معمولی تنبیہہ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مستقبل میں اس پر رائے چند پر سخت نظر رکھی جائے گی۔

یہ ساری کہانی سن کر رائے چند شاداں و فرحاں تھانے سے روانہ ہو گیا کہ اس کے دوست انسپکٹر نے بے شک ایک بڑی رقم لینے کے بعد اسے بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا اور مستقبل میں بھی اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ یہ نہ تو انسپکٹر کو معلوم تھا، نہ رائے چند کو کہ مستقبل اس کے لیے کتنا بھیانک ثابت ہونے والا ہے۔ تھانے سے نکل کر وہ کچھ دُور ہی پہنچا تھا کہ سی ایف پی کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور ہیڈ کوارٹر پہنچا کر جاوید علی کے حکم کے مطابق بغیر کسی قسم کے سوال جواب کے بڑے کلاسیکل انداز میں اس کی پھینٹی لگا دی۔ یہ انداز تھا جو پولیس والے بھی اختیار کرتے ہیں۔

رائے چند کو بھی خوب جی بھر کر مار پڑی۔ لیکن ایسے طریقے سے کہ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ آیا، ہڈی ٹوٹی پھوٹی۔ چہرہ تو بالکل بھی متاثر نہیں ہوا البتہ چیخیں مارتے مارتے اور یہ پوچھتے پوچھتے رائے چند کا حلق خشک ہوگیا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس سلوک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن اس پر تشدد کرنے والے تعمیلِ حکم میں گونگے بہرے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُسے اپنی کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تشدد کرنے والوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق خود ہی اپنے ہاتھ روک دیئے اور اسے اس کا وہی سفید اُجلا لباس دوبارہ پہنا دیا گیا جسے بغرضِ تشدد اُتار دیا گیا تھا۔ لباس پہنانے کے بعد ان لوگوں نے اسے جوس وغیرہ اور پھر اس کرسی پر لا بٹھایا۔

یہاں بیٹھنے کے بعد اس نے جاوید علی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ چند لمحے قبل دیکھا گیا جاوید علی کا چہرہ بھلا اس کی یادداشت سے کیسے نکل سکتا تھا؟ البتہ وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوا کہ اس کی دکان پر عام گاہک بن کر آنے والا یہ شخص حقیقت میں کوئی عام آدمی نہیں تھا اور اس پر آنے والی مصیبت ٹوٹی ہے، اس میں اس شخص کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

''تم حیران ہو رہے ہو گے رائے چند! کہ تمہیں یہاں لا کر کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر اتنی بری طرح کیوں مارا پیٹا گیا تو میں تمہاری یہ حیرت دُور کر دیتا ہوں۔ تم پڑنے والی اس مار کو اپنے گھناؤنے دھندے کی سزا کی پہلی قسط سمجھ لو اور عقل مند ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ جب پہلی قسط ہی ایسی ہے تو تعاون نہ کرنے کی صورت میں ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔'' نظروں ہی نظروں میں کچھ دیر ایک دوسرے کو تولنے کے بعد جاوید علی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور تمہارا تعلق کس محکمے سے ہے؟ میں مانتا ہوں کہ مجھ پر لگائے گئے الزامات درست ہیں لیکن میں کوئی واحد شخص تو نہیں ہوں جو اس شہر میں یہ دھندا کر رہا ہے۔ تم نے سب میں سے کسی کو کچھ نہیں کہا اور مجھے پکڑ کے لے آئے جبکہ میں ہمیشہ بہت پابندی سے پولیس کو اس کا حصہ دیتا رہا ہوں۔ اب بھی میں تھانے میں ایک خاصی بڑی رقم جمع کروانے کے بعد وہاں سے نکلا ہوں اور یقین ہوں کہ اتنی خدمت کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالے۔''

رائے چند نے ذرا ناراضگی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جسے سن کر جاوید علی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ شخص اس کے وطن کے مستقبل کو تباہ و برباد کر رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس جرم کے مداوے کے لیے چند ضمیروں کو کرارے نوٹوں سے نواز دینا کافی تھا۔ ادھر خود اس کا یہ حال تھا کہ جتنی دیر میں ساری کارروائی ہوئی اور سی ایف پی والوں نے رائے چند کو یہاں لا کر اس کی خاطر مدارات کی، وہ مسلسل مصروف رہا۔

حاذق اور شہباز نامی لڑکوں سے اس نے ان کے اور ان کے دوستوں کے جو ٹیلی فون نمبر دیئے تھے، ان پر فون کر کے ان لڑکوں کے والدین کو آگاہ کیا کہ ان کے بچے کیا کچھ کرتے پھر رہے ہیں۔ ان والدین سے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اپنے بچوں سے پوچھ گچھ کر کے ان سے مزید ایسے لڑکوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں جو ان کے بچوں ہی کی طرح ان قبیح عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں تاکہ بروقت اطلاع دے کر انہیں ان برائیوں سے نجات دلائی جا سکے۔ ساتھ ہی اس نے انہیں یہ بھی پیشکش کی کہ اگر اس سلسلے میں انہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وہ بلا جھجک اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے اس نے ان تمام والدین کو ایک پی او بکس نمبر دے دیا تھا، جہاں وہ اپنی گزارشات اسے بھیج سکتے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ اگر رائے چند کے علاوہ بھی کوئی شخص اس



کے علاقے میں اس قسم کا دھندا کر رہا ہے تو وہ اسے آگاہ کر سکتے ہیں۔ اطلاع دینے والے کے لیے بھی اپنی شناخت ظاہر کرنا ضروری نہیں ہوگا، البتہ اس کی دی گئی اطلاع پر قرار واقعی کارروائی کی جائے گی۔ لوگوں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور اپنے تعاون کی پوری پوری یقین دہانی بھی کروائی تھی۔

اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ واقعی ان منشیات فروشوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور سی ایف پی کا دائرۂ کار محدود ہونے کے باوجود اپنے بڑوں کو اس بات کے لیے راضی کرے گا کہ اپنے محدود وسائل اور نفری کے باوجود وہ اس مسئلے کے حل کے لیے پوری پوری کوشش کریں کیونکہ ان کا کام ہی وطن کی حفاظت تھا اور وطن کی حفاظت کے لیے سب سے ضروری یہی تھا کہ اس کے مستقبل یعنی نوجوان نسل کو بچایا جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو رائے چند! کہ اس شہر میں تمہارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں لیکن صرف تم ہماری گرفت میں آئے ہو۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ تم بدقسمت ہو اور دوئم یہ کہ ان میں سے کسی اور پر ''را'' کا مبینہ ایجنٹ ہونے کا الزام نہیں ہے۔'' جاوید علی کا جملہ مکمل ہوا تو رائے چند نامی رڈی حالت میں ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔

''یہ..... یہ..... تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔'' اس نے جاوید علی کو جھٹلانے کی کوشش کی۔

''یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ اور کتنی ٹھوس ہے، اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ پچھلے کئی مہینوں سے ہم تمہاری نگرانی کروا رہے ہیں۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ نگرانی کس تاریخ سے اور کیوں کروائی جا رہی ہے۔'' اس نے رائے چند کو بتانا شروع کیا کہ کس تاریخ کو اسے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اب تک کس طریقے سے اس کی نگرانی کی جاتی رہی ہے۔

''تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جس تاریخ کا تم ذکر کر رہے ہو، اُس دن میں ہسپتال گیا ضرور تھا لیکن اپنی بیوی کی رپورٹس لینے۔ اُس کے پتے میں پتھری ہے اور اس کا علاج اسی ہسپتال سے ہو رہا ہے۔'' رائے چند نے ایک بار پھر اسے جھٹلانے کی کوشش کی اور نہایت معصومیت سے بولا۔ ''میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ تم شہریار نامی جس شخص کا نام لے رہے ہو، وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟''

''اس مسئلے کو تم جانے دو۔ میرے آدمی بندے کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس لانے میں ایکسپرٹ ہیں۔ تمہیں سب یاد آ جائے گا کہ شہریار کون ہے اور تم نے اس کے نمونے کیوں حاصل کیے تھے۔ یہ کوئی کمرۂ عدالت نہیں ہے جو مجرم جھوٹے دلائل دے کر خود کو بچا لے۔ ہم دلائل نہیں صرف حقائق کو سننے والے لوگ ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی اور قوتِ برداشت پر منحصر ہے کہ تم کتنی دیر میں سچ اُگلنا شروع کرتے ہو۔ البتہ ایک بات کا میں تمہیں یقین دلا دوں کہ سچ اُگلے بغیر تمہیں موت کی آغوش میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔''

جاوید علی کا لہجہ سفاک ہوگیا۔ رائے چند کے لیے اس کے دل میں رحم کی کوئی رمق تھی بھی نہیں۔ ایک طرف وہ سب سے بڑے دشمن ''را'' کا ایجنٹ تھا تو دوسری طرف موت کا بیوپاری۔ ایسے شخص کو تو اگر اُسے اختیار دیا جاتا تو وہ سات بار اذیت ناک موت کی سزا دیتا۔ اس وقت بھی اس نے اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بُری طرح تھرّانے لگا۔ یہ تھرتھراہٹ اس برقی رو کا نتیجہ تھی جو یک لخت ہی اس کی کرسی میں دوڑا دی گئی تھی۔

دھاتی کرسی میں چند سیکنڈز کے لیے دوڑنے والی برقی رو نے رائے چند کے حلق سے چیخیں نکلوا دیں۔

''میرے آدمیوں کو بتاؤ کہ تم منشیات اور مخربِ اخلاق فلموں کا دھندا کرنے والے کن کن لوگوں سے واقف ہو اور ''را'' کے کن کن سورماؤں سے تمہارے روابط ہیں؟ میرے ان دو سوالوں کا جواب حاصل کرنے

کے لیے یہ لوگ تم پر اتنا ستم ڈھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ تمہاری روح بلبلا اُٹھے گی۔ لیکن یہ تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' رائے چند کے بجلی کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اسے دھمکایا۔ [illegible] کے ناول [illegible] گیا۔ [illegible] چند کی چیخیں اس کے تعاقب میں کمرے سے باہر تک آ رہی تھیں۔

''واہ بھئی..... کیا فنٹاسٹک کھانا ہے اِدھر کا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ دہلی میں رہوں اور تینوں وقت اسی ہوٹل میں آ کر کھانا کھاؤں۔''

لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے سلّو نے جھوم کر کھانے کی تعریف کی اور ساتھ ہی خواہش بھی بیان کی۔

''تم ایسا کرنا کہ جب شادی کرو تو ہنی مون منانے کے لیے اپنی بیگم کو یہیں لے آنا اور خوب دل بھر کر دہلی کے کھانے کھانا۔ فی الحال میں تو تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔'' شہریار نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

کل رات کھانے کے لیے وہ اسی ہوٹل میں آئے تھے اور سلّو کو یہاں کا کھانا اتنا پسند آیا تھا کہ وہ وہاں سے روانہ ہوتے وقت ناشتے کا مینیو معلوم کرتا ہوا نکلا تھا۔ شہریار کو سادہ ناشتہ کرنے کی عادت تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ سادہ ناشتہ اُنہیں اس ہوٹل کی انتظامیہ بھی فراہم کر سکتی تھی جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن سلّو کی ضد پر اسے ناشتے کے لیے ''نوادر'' نامی اس ہوٹل میں آنا ہی پڑا تھا اور بلاشبہ وہاں فراہم کیا جانے والا ناشتہ بے حد لذیذ تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں پیدل ہی اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔ بازاروں کی خاک چھاننے کے علاوہ انہوں نے مختلف بس سروسز کے دفتروں اور ریلوے اسٹیشن کا دورہ بھی کیا تھا۔ اس طرح انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دہلی سے باہر جانے کے لیے انہیں کن ذرائع سے اور کن اوقات میں سہولیات مل سکتی ہیں۔ اس آوارہ گردی میں ان کا اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا اور بھوک بھی خوب چمک گئی تھی۔ بھوک لگنے پر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا گیا تو سلّو کا انتخاب ایک بار پھر ''نوادر'' ہوٹل ہی تھا۔ شہریار کے نزدیک آپس میں بہتر تعلقات کے لیے ایسے چھوٹے موٹے لاڈ اُٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اب کھانا کھاتے ہوئے سلّو کھانے کی شان میں رطب اللسان تھا۔

''آئیڈیا برا نہیں ہے استاد!..... ویسے تو لگتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہیں ہے۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے شادی ہو گئی تو صرف یہاں کے کھانوں کی خاطر میں یہاں ہنی مون منانا پسند کروں گا۔ بلکہ ایسا کروں گا کہ اپنی بیوی کو شیف کی ٹریننگ دلوانے کے لیے کچھ عرصہ یہاں ملازمت دلوا دوں گا۔ بس یہ سمجھو ساری زندگی کے عیش ہیں۔''

سلّو بھی موڈ میں تھا اس لیے خوشگوار لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی گفتگو کا یہ حصہ مشروب پہنچانے کے لیے ان کی میز پر آنے والی ویٹریس نے بھی سنا اور مسکرا کر خوش دلی سے بولی۔

''ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہمارے کھانوں کو پسند کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جب بھی دوبارہ یہاں آئے، ہمارے کھانوں کا یہی معیار پائیں گے۔''

''جی ہاں۔ لیکن بس شرط اتنی ہے کہ کھانا آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں سے ہی سرو کیا جائے۔



کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کھانے کے اس سواد میں آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں کا بھی بڑا دخل ہے۔'' ویٹریس کی دخل اندازی کا برا مانے بغیر سلّو نے شوخی سے اسے جواب دیا۔

''ایسی بددُعا نہ دیں سر! میں نے مجبوری میں صرف کچھ عرصے کے لیے یہ ملازمت کی ہے، ورنہ میرے پاس ماسٹرز کی ڈگری ہے اور جیسے ہی میری پرابلم سولو (Solve) ہوئی، میں کسی اچھی نوکری پر لگ جاؤں گی۔'' اس نے انہیں بتایا، پھر یکدم موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد کر سکتے ہیں۔''

''نو تھینکس۔ جو کچھ ہے، وہی بہت ہے۔ آپ اپنے دوسرے کسٹمرز کو دیکھ سکتی ہیں۔'' اس بار سلّو کے بجائے شہریار نے اسے جواب دیا۔ وہ خود نپا تلا کھانا کھا کر اپنا ہاتھ روک چکا تھا اور ایک ویٹریس کے ساتھ اس کی اس غیر ضروری بے تکلفی کو پسند نہیں کیا تھا۔ کتنا ہی نرم دل اور غریب پرور سہی لیکن وہ تھا تو ایک بیوروکریٹ خاندان کا حصہ، چنانچہ اس کے اندر بیوروکریسی کے کچھ نہ کچھ جرثومے بہرحال موجود تھے اور اس کے نزدیک یہ نہایت غیر مہذبانہ حرکت تھی کہ ایک ویٹریس اس طرح گفتگو میں دخل دے اور جواباً اس کی حرکت کا برا ماننے کے بجائے اس سے بے تکلفی برتی جائے۔ ویٹریس نے بھی اس کا یہ موڈ بھانپ لیا اور خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

''تم بھی بڑے بدذوق ہو یار!..... اتنی خوب صورت لڑکی باتیں کر رہی تھی کہ لے کر اسے بھگا دیا۔'' سلّو نے ایک اور لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی حرکت پر تبصرہ کیا۔

''خوب صورت لڑکیاں خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ اگر تم خوب صورتی کو دیکھ کر طرح پھسلتے رہے تو ہم کسی نہ کسی مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔'' شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

''مشکلوں سے ڈرنے والے اے آسماں! ہم نہیں۔'' سلّو نے بے نیازی سے اسے جواب دیا اور شراب کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

اُس کے اس انداز پر شہریار اسے فقط گھور کر رہ گیا اور خود بھی مشروب پینے لگا۔ ابھی مشکل سے اس نے گھونٹ ہی لیے تھے کہ ڈائننگ ہال کے ایک حصے سے شور سا سنائی دیا۔ وہ دونوں ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ کونے والی ایک میز تھی جس پر دو تین آدمی موجود تھے اور کچھ دیر قبل انہیں کھانا پیش کرنے والی ویٹریس اس میز کے قریب نظر آ رہی تھی۔ میز کے گرد بیٹھے تین آدمیوں میں سے ایک نے ویٹریس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور وہ بلند آواز میں اسے اپنا ہاتھ چھوڑنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

''یہ ہاتھ تو اب نہیں چھوٹنے کا۔ تُو ہمارے من کو بھا گئی ہے۔ اور اس من کو شانتی اسی سے ملے گی، جب ہمارے بیڈروم میں ایک رات گزارے گی۔''

ویٹریس کے کہنے پر اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اس شخص نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ جواباً اس لڑکی نے اپنے دوسرے آزاد ہاتھ کا طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔ ڈائننگ ہال میں اس وقت کئی لوگ موجود تھے اور یہ قصہ شروع ہوتے ہی سب کھانا پینا بھول کر اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اتنی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ لڑکی نے اس شخص کے منہ پر تھپڑ مارا تو خاموشی کی وجہ سے تھپڑ کی گونج پورے ڈائننگ ہال میں سنائی دی۔

''بڑی تیکھی شے ہے۔'' سلّو نے زیرِ لب تبصرہ کرتے ہوئے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ

سکیڑے۔ ادھر لڑکی کے تھپڑ مارتے ہی جیسے ایک بھونچال آ گیا تھا۔ تھپڑ کھانے والے آدمی کے ساتھ ہی دونوں بندے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے شکاری جانوروں کی طرح لڑکی کو دبوچ لیا۔

''سالی! تیری اتنی ہمت کہ دادا پر ہاتھ اُٹھائے۔ تیری تو ہم بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔'' وہ بری طرح اس لڑکی پر پل پڑے تھے اور بلا دریغ جوتے مکے مار رہے تھے۔ شہریار اور سلّو اس منظر کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ ہال میں بیٹھے ہوئے ا۔ ۔وں میں سے کسی نے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ بلکہ کئی نے تو خاموشی سے وہاں سے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

''شما کر دیں سرکار! نادان ہے۔ نئی نئی نوکری پر لگی ہے۔ آپ کو جانتی نہیں ہے۔'' ہوٹل کے منیجر تک ہنگامے کی خبر پہنچی تو وہ دوڑا آیا اور تھپڑ کھانے والے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے عاجزانہ درخواست کرنے لگا۔

''کپڑے پھاڑ دو سالی کے اور گلے میں رسّی ڈال کر اڈّے تک لے جاؤ تاکہ ساری دلّی کو پتا چل جائے کہ نادر دادا سے پنگا لینے والے کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

منیجر کی درخواست کو قطعی نظر انداز کرتا ہوا وہ بری طرح غرّایا۔ اور اس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا ہی لڑکی کو زدوکوب کرتے ہوئے دونوں افراد نے اس کے لباس پر ہاتھ ڈال دیا۔ ایک نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ پھٹ گیا اور اندر سے اس کا گورا بدن جھانکنے لگا۔ وہ جو مار کھا کر چلّا یا رحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی، اس حرکت پر بری طرح رونے چلّانے لگی۔

سلّو اور شہریار کے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ اتنا بڑا ظلم اپنی نظروں کے سامنے ہوتا دیکھیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ وہ گویا کسی اندرونی ربط کے تحت اپنی جگہ سے بیک وقت کھڑے ہوئے اور پل بھر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اس لڑکی کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

''شرم نہیں آتی ایک کمزور عورت سے ایسا سلوک کرتے ہوئے؟'' سلّو نے ان میں سے ایک کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار گھونسا مارا جبکہ دوسرا شہریار کی لات کی زد میں آ گیا۔

''یہ کون مائی کے لال ہیں جو نادر دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کر رہے ہیں؟'' ہال میں موجود افراد میں سے کسی نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور پھر وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ہوٹل سے باہر نکلنے لگے۔ ادھر ان چاروں کے درمیان زبردست معرکہ جاری تھا۔

نادر دادا کے آدمی مضبوط ہاتھ پیر کے اور اچھی قد و قامت کے مالک تھے۔ لڑنے بھڑنے میں ماہر لگتے تھے لیکن ان میں وہ تیزی اور پھرتی نہیں تھی جو شہریار اور سلّو میں تھی۔ وہ پینترے بدل بدل کر ان پر حملے کرتے تھے اور یہ دونوں نہ صرف کامیابی سے ان کا حملہ روک دیتے تھے بلکہ پلٹ کر ایسا وار کرتے کہ وہ بلبلا اُٹھتے تھے۔

اس لڑائی کو دیکھنے والے اب بہت کم افراد وہاں رہ گئے تھے۔ ایک نادر دادا تھا جو اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا اور اطمینان سے کرسی پر براجمان اس طرح وہ فائٹنگ دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر ہو۔ دوسرا اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس تھی جو ان دونوں سے جان چھوٹ جانے پر کھسکتی ہوئی فاصلے پر موجود ستون تک چلی گئی تھی اور اس سے ٹیک لگا کر اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے



ہاں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے اور گھٹنے سمیٹ کر پیٹ سے لگا رکھے تھے۔ اس طرح شاید اس نے اپنی حفاظت کی کوشش کی تھی۔ وہ خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں اپنے لیے لڑتے ہوئے ان دو اجنبیوں کو دیکھ رہی تھی جن کے جسم میں خون کی جگہ شاید پارا بھرا ہوا تھا اور وہ یوں اُچھل اُچھل کر لڑ رہے تھے کہ ابھی پیر زمین پر پوری طرح ٹکتے نہیں تھے کہ وہ دوبارہ فضا میں بلند ہو جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے صحیح معنوں میں نادر دادا کے پٹھوؤں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔

اس منظر کا تیسرا ناظر ہوٹل کا منیجر تھا جس کے چہرے پر حیرانی سے زیادہ پریشانی تھی۔ وہ گردن کو دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے مسلسل حرکت دیتے ہوئے اس نقصان کا تخمینہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جو قیمتی شو پیس، کراکری اور فرنیچر وغیرہ کے ٹوٹنے پھوٹنے کے نتیجے میں ہوٹل کو اٹھانا پڑتا۔

ان تین ناظرین کے علاوہ چوتھی ناظر ہوٹل کی ریسپشنسٹ تھی جو ڈر کر کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گئی تھی اور وہاں سے کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتی تھی۔ ان چار افراد کے علاوہ وہاں موجود گاہک اور ہوٹل کا سارا عملہ اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے نکل چکا تھا۔ چند منٹ کے دورانیے پر مشتمل اس لڑائی میں واضح طور پر سلّو اور شہریار کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔

نادر دادا کے آدمیوں نے جب دیکھا کہ ہاتھ پاؤں کی لڑائی میں ان دونوں لڑکوں کو قابو کرنا آسان نہیں ہے تو ان میں سے ایک نے نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل کھینچ کر نکال لیا اور ہیجان زدہ لہجے میں چیخا۔

''بس بہت ہو گئی۔ اب تم دونوں سیدھے ہو کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے جسموں کو چھلنی کر ڈالوں گا۔'' اُس کی اس دھمکی نے لمحہ بھر کے لیے سارے منظر کو ساکت کر دیا۔

شہریار اور سلّو خوامخواہ کسی چکر میں پڑ جانے سے بچنے کے لیے اپنے ہوٹل سے نکلتے وقت اسلحہ ساتھ لے کر نہیں نکلے تھے۔ اپنے طور پر تو وہ بس صرف گھومنے اور دہلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ کسی قسم کی دستاویزات کی عدم موجودگی میں وہ اگر کسی ایسی جگہ چلے گئے جہاں اسلحے کا لائسنس والے آلات نصب ہوئے تو خوامخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ ایک کمزور مظلوم لڑکی کی عزت کا تھا اور وہ اپنے تحفظات کے بارے میں کچھ سوچے بغیر اس جھگڑے میں کُود پڑے تھے۔

''طمنچہ اندر رکھ بخشو! مرد بن کر اگر مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تجھ میں تو ہیجڑوں کی طرح بیٹھ کر تالیاں بجا۔ اسلحے کے زور پر بے ایمانی سے مقابلہ جیتنے کی کوشش نہ کر۔''

ساکت منظر کو نادر دادا کی گرج دار آواز نے ایک بار پھر متحرک کر دیا۔ حکم سنتے ہی بخشو نے تو چوروں کی طرح نظر چراتے ہوئے اپنا اٹھا ہوا بازو نیچے کر لیا البتہ دوسرے نے کچھ کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس کا رخ سلّو کی طرف تھا جس نے اپنی جگہ سے بس معمولی سی حرکت کی اور بڑے آرام سے حملہ آور ہونے والے کو اٹھا کر پیچھے کی طرف پٹخ دیا۔

''بس کرو تم لوگ یہ ڈرامے بازی۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔ میں ان کو موٹی رقمیں دیتا ہوں نا تم حرام خوروں کو، انہیں کھا کھا کر تمہارے جسموں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ دیکھنے میں ایسے ہو لیکن ایک چوہے تک سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تم میں۔ بس ہٹ جاؤ ایک طرف اور انجام کا انتظار کرو۔''

لگتا تو یوں تھا کہ مقابلے کا نیا راؤنڈ شروع ہونے جا رہا ہے لیکن نادر دادا کی پھٹکار سن کر اس کے دونوں

گر گے فوراً ہی ایک طرف ہٹ گئے اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

''نام کیا ہے تم دونوں کا؟'' اپنے آدمیوں کو کنارے لگانے کے بعد نادر دادا ان دونوں کے مقابل آ کر کھڑا ہوا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''میں جگدیش ہوں اور یہ میرا کزن رویندر۔ ہم یہاں دہلی میں گھومنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' شہریار نے عام سے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ویسے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ نادر دادا نامی یقینی طور پر کسی بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے یا پھر اسے کسی بڑے آدمی کی پشت پناہی حاصل ہے اس لیے لوگ اس سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ سرِ عام ایک لڑکی سے ایسی چھیڑ چھاڑ کرنے پر کسی نے اسے یا اس کے آدمیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور یہ صورتِ حال ایک طرح سے ان کے لیے مناسب نہیں تھی۔ وہ ایک خاص مشن پر آئے تھے اور آتے ہی کسی بڑے غنڈے سے بھڑ جانے کی وجہ سے بڑی مشکلات میں ہو سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے تدبر سے اس صورتِ حال سے نمٹنا تھا اس لیے نادر دادا سے گفتگو کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔

''یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اگر دہلی کے رہنے والے ہوتے تو میرے آدمیوں کے مقابلے پر آنے کی ہمت کبھی نہیں کرتے۔'' نادر دادا نے مسکرا کر اسے جواب دیا پھر ایک بار دوبارہ ان دونوں کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تمہاری جی داری من کو بہت بھائی ہے۔ اس جی داری کے صدقے ہی میں تمہاری جان بخشی کر رہا ہوں ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بندہ نادر دادا کے بندوں سے پنگا لے اور اسے اپنے ہاتھ پیر سلامت واپس جانا نصیب ہو۔ تم دونوں خوش قسمت ہو۔ پتہ نہیں تم میں کیا بات ہے کہ تمہیں معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔''

''تھینک یو سو مچ دادا! آپ کے برتاؤ سے پتہ لگ گیا ہے کہ آپ سچ مچ بہادر آدمی ہو۔ کیونکہ ایک بہادر ہی دوسرے بہادر کو ایسے سراہتا ہے۔''

کسی مشکل میں پڑے بغیر آسانی سے مسئلہ نمٹتا دیکھ کر شہریار نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس شخص کو کسی بات سے طیش دلانے کے بجائے مزید مکھن لگا دیا جائے ورنہ کچھ دیر قبل اس نے جس طرح ایک لڑکی پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ کسی طور ایک بہادر کا شیوہ نہیں ہوتا۔

''ہمارے ہاں بہادروں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ اگر تمہارا ہمارے ساتھ شامل ہونے کا من کرے تو کسی سے بھی پوچھ لینا کہ نادر دادا کا اڈا کہاں ہے؟ وہ سیدھا تمہیں ہمارے پاس پہنچا دے گا۔''

اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی جس کے جواب میں ظاہر ہے شہریار کو خاموشی ہی اختیار کرنی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر نادر دادا نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

منیجر بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا اور دروازے کے قریب اسے روک کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔

جواب میں نادر نے بھی کچھ کہا جس کے بعد منیجر کی اُتری ہوئی صورت پر ذرا رونق دوڑی اور اس نے خود آگے بڑھ کر نادر دادا اور اس کے آدمیوں کے لیے بڑے احترام سے دروازہ کھولا۔ ان تینوں کے باہر جانے کے بعد وہ پلٹ کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر حیرت نظر آ رہی تھی۔

''یہ تو چمتکار ہو گیا۔ دادا نے نہ صرف آپ دونوں کو شما کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ میرے ہوٹل کا ہوا نقصان خود بھرے گا۔'' ان دونوں کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بے یقینی سے بتایا۔



''چلو، یہ تو تمہارے لیے اچھا ہو گیا۔ اب ایسا ہے کہ ہم دونوں چلتے ہیں۔ تم اُس بے چاری ویٹریس کی ڈریسنگ وغیرہ کروا کر اسے اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرو۔'' منیجر کو جواب دینے کی ذمے داری بھی شہریار نے ہی سنبھالی۔ اصل میں وہ سلّو کے لاابالی پن اور بے باکی سے ذرا خائف رہتا تھا اس لیے عموماً ایسے مواقع پر گفت و شنید کی ذمے داری از خود سنبھال لیتا تھا۔

''سوری سر! میرے لوگوں میں سے کوئی یہ ہمت نہیں کر سکے گا کہ دادا کو ناخوش کرنے والی عورت کی مدد کر سکے۔ ہاں، آپ کی بات الگ ہے۔ آپ میں ہمت تھی تو ہی آپ نے دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دادا نے خود آپ کے لیے معافی کا اعلان کیا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اسے اس کے گھر تک پہنچانے کے لیے آپ سے بہتر کوئی نہیں ہو گا۔''

منیجر کا جواب سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔ یہاں ان کے ساتھ اُلٹی آنتیں پڑیں والا معاملہ ہو گیا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس ان کے سامنے تھی۔ اپنی نیم عریانی کو چھپانے کی کوشش کرتی وہ خوب صورت لڑکی زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت سخت ہراساں بھی تھی اور ضروری تھا کہ اس مشکل گھڑی میں کوئی اسے سہارا دے۔ ان دونوں سے ہی انکار نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی جب وہ اس کی خاطر غنڈوں سے بھڑ جانے کی خطرناک حرکت کر چکے تھے تو پھر اسے اس کے گھر تک پہنچا دینا تو نسبتاً کم خطرناک کام تھا۔

''اوکے، ہم یہ کام کر دیتے ہیں۔'' شہریار نے منیجر پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور سلّو کو اشارہ کیا تو وہ ایک میز پوش کھینچ کر اُتارتے ہوئے ستون کے ساتھ نڈھال بیٹھی ویٹریس کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کچھ روپے ہیں اس کی مرہم پٹی کروانے کے کام آئیں گے۔'' منیجر نے اپنا پرس نکال کر اس میں سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے شہریار کی طرف بڑھائے۔

''نو تھینکس۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے انکار کر دیا اور سلّو کی طرف بڑھ گیا جو میز پوش سے لڑکی کی ستر پوشی کرنے کے بعد اسے سہارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔ شہریار نے اسے دوسری طرف سے سہارا دیا اور پھر وہ دونوں اسے لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ہوٹل سے باہر نکل کر انہوں نے ایک آٹو رکشہ روکا اور لڑکی سے اپنے گھر کا پتہ بتانے کو کہا۔ لڑکی کے پتہ بتانے کے بعد آٹو والے سے کرائے کا معاملہ طے ہوا اور وہ اس طرح لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے کہ لڑکی درمیان میں بیٹھی تھی اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں تھے۔

راستے بھر ان میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ شہریار نے ایک بار راستے میں کسی کلینک یا ہسپتال پر رک جانے کے بارے میں ضرور استفسار کیا لیکن لڑکی نے خود انکار کر دیا۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ نادر اور اس کے غنڈوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کے نتیجے میں لڑکی کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ماتھے پر کافی بڑا سا گومڑا ابھر آیا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی نیل اور خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس پر مستزاد اس کا لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ اگر لوگ اسے لے کر کسی ہسپتال جاتے تو انہیں جواب دینا پڑتا کہ لڑکی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ پولیس کیس ہونے کی وجہ سے ہسپتال کی انتظامیہ پولیس کی آمد سے قبل اسے ٹریٹمنٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی اور پولیس سے سامنا کرنا ان کے اپنے حق میں مناسب نہ ہوتا، وہ بھی اس صورت میں کہ کسی دادا ٹائپ غنڈے سے ٹکر لے چکے تھے اور ان کے پاس شناختی دستاویزات تک نہیں تھیں۔

مطلوبہ پتے پر پہنچ کر لڑکی نے رکشہ رُکوایا اور وہ لوگ نیچے اُتر آئے۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کرنے تک لڑکی دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ وہ نچلے طبقے کا ایک محلّہ تھا جہاں چھوٹے چھوٹے بے رونق و بدنما گھر بنے ہوئے تھے۔ لڑکی نے دروازے پر کئی دستکیں دیں، تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا شخص عجیب و غریب تھا۔ اس نے چوخانے والی لنگی پر میلی سی بنیان پہن رکھی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر کے بال اور داڑھی بے حد اُلجھی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اسے نہائے ہوئے کئی مہینے پھر شاید مہینے گزر گئے تھے۔ وہ دروازے پر نمودار ہوا تو بدبو کا ایک بھبکا سا محسوس ہوا۔

''تُو کیوں بے وقت آ گئی میری نیند خراب کرنے؟'' اس نے نہ تو لڑکی کے ابتر حلیے کی طرف توجہ دی اور نہ ہی اس کے پیچھے کھڑے دو اجنبیوں کی طرف۔ بس اسے دیکھ کر بڑبڑایا اور جھومتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

''آپ دونوں اندر آ جائیں۔'' لڑکی نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر ان سے کہا۔

''میرے خیال میں پہلے میں آپ کے لیے کسی میڈیکل اسٹور سے کچھ میڈیسن اور بینڈیج وغیرہ کا سامان لے آؤں۔'' شہریار اندر جاتے ہوئے ذرا سا ہچکچایا۔

''میرے پاس فرسٹ ایڈ باکس موجود ہے اس لیے اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث ہونٹوں سے سسکی سی نکل گئی۔

''پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے گھر والے زخموں کی صفائی اور ڈریسنگ میں آپ کی مدد کر دیں گے۔ ساتھ میں آپ کوئی پین کلر لے لیجئے گا، درد سے آرام آ جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق تو آپ کو کوئی بھی بہت زیادہ گہری چوٹ نہیں لگی ہے۔ گھر پر ہی چند دن پابندی سے دوائیں لینے کے ساتھ آرام کریں گے رہیں گی تو طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔ البتہ اگر آپ محسوس کریں کہ کوئی اندرونی گھاؤ ہے تو ہسپتال چلی جائیں گا۔'' شہریار اب وہیں سے واپس پلٹنے کے موڈ میں تھا۔

''میرے کوئی گھر والے نہیں ہیں۔ صرف ایک گھر والا ہے جو اتنے ہوش میں نہیں ہوگا کہ میری مرہم پٹی کروانے میں مدد کرے یا مجھ سے ہمدردی کرے۔''

وہ بہت آہستہ سے ہی بولی تھی لیکن اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اور کچھ تلخی سی محسوس ہوئی تھی۔ البتہ وہ دونوں اس انکشاف پر چونک سے گئے تھے کہ اتنی کم عمر اور کامنی سی نظر آنے والی وہ لڑکی شادی شدہ تھی اور بیوی بھی اس عجیب الخلقت شخص کی تھی جسے ایک نظر دیکھنے پر ہی انہیں گھن سی محسوس ہوئی تھی۔ سلّو پر تو اس انکشاف کا زیادہ ہی اثر ہوا اور اس نے زیرلب ''اُوئی ماں! اتنا بڑا دھوکا۔'' کہتے ہوئے ہلکی سی سیٹی بجا ڈالی تھی۔ البتہ شہریار اس انکشاف سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا چنانچہ بردباری سے بولا۔

''اوکے، ہم اندر چل کر آپ کی ہیلپ کر دیتے ہیں۔''

''تھینک یو سو مچ۔'' اس نے شکریہ ادا کیا اور خود اندر داخل ہو کر انہیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا جس کے در و دیوار سے غربت ٹپک رہی تھی۔ لڑکی انہیں لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

''آپ لوگ یہاں بیٹھیں، میں کپڑے چینج کر لوں پھر فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتی ہوں۔'' انہیں وہاں بٹھا کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس نے ہمت کر کے خود کو اس حد تک سنبھال لیا تھا کہ کسی کے سہارے کے بغیر چل سکے۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں سستا سا مختصر فرنیچر رکھا تھا اور



بے حد استعمال شدہ دری بچھی ہوئی تھی۔ البتہ صفائی خوب تھی۔ دیوار پر ایک لکڑی کا ریک بھی لگا ہوا تھا جس میں بہت سی کتابیں سجی تھیں۔ ان کتابوں میں سے زیادہ تر انگریزی زبان میں تھیں اور مطالعے کا شوقین شہریار اور سے ان کے نام پڑھ کر ہی یہ بتا سکتا تھا کہ وہ خاصی مہنگی کتابیں ہیں۔ گھر کا عسرت زدہ ماحول اور اس کے شوہر کو دیکھ کر یہ کتابیں یہاں اجنبی سی لگتی تھیں لیکن اجنبی تو وہ لڑکی بھی لگی تھی اس ماحول میں۔

''سوری، آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ میں اپنے زخموں کو دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو سوچا چائے بھی بنا لوں۔'' کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہ صرف لباس بدل چکی تھی بلکہ چہرہ دھو کر اس پر مرہم وغیرہ بھی لگا لیا تھا۔

''آپ نے چائے کا تکلف کیوں کیا؟ ہم تو آپ کی مدد کے خیال سے اندر آ گئے تھے اور آپ اس تکلیف میں پڑ گئیں۔'' اسے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے دیکھ کر شہریار نے بے ساختہ ہی ٹوکا۔

''تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے میرے لیے خود کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالا تو کیا میں آپ کے لیے چائے بھی نہیں بنا سکتی تھی؟''

اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے چائے کی پیالیاں ان دونوں کی طرف بڑھائیں۔ پیالیاں نفیس اور مارک سٹری تھیں اور ان میں موجود چائے بھی خوش رنگ اور خوشبودار تھی۔ چکھنے پر ذائقہ بھی بہت اچھا لگا۔

''فنٹاسٹک..... میں نے کہا تھا نا کہ اصل کمال آپ کے ہاتھوں کا ہے۔ اب دیکھیں، یہ چائے ہوٹل نوادر کے کسی شیف نے تیار نہیں کی پھر بھی کتنے مزے کی لگ رہی ہے۔'' پہلا گھونٹ بھرتے ہی سلّو نے شوخی سے کہا جس پر وہ ہولے سے ہنسی پھر ہلکا سا کراہ کر چپ ہو گئی۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک بار پھر وہی گفتگو کا آغاز کیا۔

''کیا میں اپنے محسنوں کے نام جان سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ میں رویندر ہوں اور یہ میرے دوست جگدیش ہیں۔ ہم دہلی گھومنے کے لیے آئے ہیں۔'' سلّو نے فوراً اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خاصا سمجھ دار تھا اور یہ اندازہ لگا کر ہی منہ کھولتا تھا کہ کہاں کیا بولنے پر شہریار کو اعتراض نہیں ہوگا۔

''میرا نام عائشہ ہے لیکن یہاں زیادہ تر لوگ مجھے آشا کہتے ہیں۔'' اس نے بھی اپنا تعارف کروایا پھر وہ بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ گھومنے کے لیے نکلے ہیں اور میری ہمدردی میں خود اپنے لیے اتنی بڑی مصیبت مول لے بیٹھے ہیں۔''

''جانے دیں۔ وہ معاملہ تو اب ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ نادر دادا نے ہم سے کیا کہا تھا۔'' سلّو نے کان پر سے مکھی اُڑانے والے انداز میں اسے جواب دیا۔

''اس غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ میں نے اپنی ڈریسنگ کے بہانے آپ دونوں کو اندر ہی اس لیے بلایا تھا کہ آپ کو خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ وہ خطرناک اور عیار آدمی ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے آدمیوں کو آپ دونوں کے ہاتھوں زحمت اٹھانی پڑی ہے، یہ اس کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اب یہ بات نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیل گئی ہو گی اور مجھے نہیں لگتا کہ اس نے آپ لوگوں کی بہادری سے متاثر ہو جانے کا جو ڈراما کیا ہے، اس میں کوئی حقیقت بھی ہے۔ وہ صرف وہاں سے اپنی بچی کھچی عزت بچا لایا ہے اور گرنے کے باوجود اپنی ٹانگ اونچی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ڈرامے کا توڑ... پوری کوشش کرے گا کہ آپ لوگ یہاں سے بچ کر نہ نکلنے پائیں۔ وہ نہایت سفاکی سے آپ کو

عبرت کا نشان بنا کر پورے دہلی کو یہ خاموش پیغام دینے کی کوشش کرے گا کہ نادر دادا کے آدمیوں سے بھڑنے والوں کا انجام کسی طور پر اچھا نہیں ہوسکتا۔''

وہ جو کچھ اُنہیں بتا رہی تھی، وہ ان کے لیے تشویش ناک تھا۔ اگر وہ اس طرح کے مسائل میں الجھ جاتے تو اپنے اصل مشن پر کام کرنا مشکل ہو جاتا۔

''جب تمہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں تو کیا ضرورت تھی نادر دادا پر ہاتھ اٹھانے کی۔'' سلّو نے کچھ جھلا کر اس سے یہ سوال کیا۔ کیونکہ بہرحال معاملے کے اس حد تک جانے میں عائشہ کے تجسس کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

''میں بکاؤ مال نہیں ہوں جو اس جیسا غنڈہ موالی سرِ راہ میرا ہاتھ پکڑے اور کوئی بھی بے ہودہ حرکت کرے تو میں نظرانداز کر دوں۔ اس گندے آدمی کی بات ماننے سے یہ بہت بہتر تھا کہ میں اس کے آدمیوں کے ہاتھوں اپنی جان سے چلی جاتی۔ کم از کم لوگ اس بات کے تو گواہ رہتے کہ میں نے اپنی عزت بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی۔'' اس نے غصے سے سلّو کی بات کا جواب دیا۔

''اونہہ عزت..... تمہارے خیال میں وہ شخص اب تمہیں بخش دے گا؟..... تمہارے کہنے کے مطابق ہم دونوں کی جان کا دشمن بن چکا ہوگا تو کیا فساد کی اصل جڑ کو چھوڑ دے گا؟'' سلّو نے اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے بغیر دوبدو جواب دیا۔ شہریار البتہ خاموشی سے اس گفتگو کو سن رہا تھا اور سن کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مصیبت سے بچنے کی کیا صورت نکل سکتی ہے۔

''میں اس کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گی۔ یہ دیکھو..... یہ اب ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ اگر نادر دادا کے آدمی مجھ سے ٹکرائے تو صحیح سلامت بچ کر نہیں جاسکیں گے۔ اور بالفرض میں ان سے مقابلہ نہ کرسکی تو ایک گولی اپنے دل میں اتار کر اس جسم کو ٹھنڈا کر دوں گی۔''

اس نے اپنے لباس میں سے ایک چھوٹا سا لیڈیز پسٹل باہر نکالا اور اسے لہراتے ہوئے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ یہ اظہار کرتے ہوئے اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے، اس پر عمل کرنے کی بھی جرأت رکھتی ہے۔

ویسے بھی اُس کی جرأت مندی کا مظاہرہ وہ کچھ دیر قبل ہوٹل میں دیکھ ہی چکے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کے مقابل دہلی کا نامی گرامی غنڈہ ہے، اگر اس نے اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی تو اس کا مطلب کہ وہ واقعی فطرتاً دلیر لڑکی ہے اور اتنے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کی یہ بے باکی بڑی حیرت انگیز تھی۔ وہ تو تھی ہی پوری کی پوری حیرت انگیز چیز۔ اس کی بول چال اور نشست و برخاست کا انداز دیکھ کر یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس پسماندہ سے محلے میں رہتی ہوگی اور ایسے میلے کچیلے آدمی کی بیٹی ہوگی جسے انہوں نے کچھ دیر پہلے ہی دروازے پر دیکھا تھا۔

''آپ تو مجھے کوئی اونچی شے لگتی ہو میڈم! یہ اتنا مہنگا پسٹل آپ کے پاس کہاں سے آیا؟'' سلّو شناس تھا اس لیے اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کافی قیمتی ہے چنانچہ مشکوک لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔

''یہ مجھے میرے ایکس ہزبینڈ نے دلایا تھا۔ وہ ایک مل اونر تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں زیورات پہن کر اکیلی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوں تو میرے پاس اپنی سیفٹی کے لیے کچھ ہونا چاہئے۔''

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ لیکن وہ لوگ تو حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ



اس کا شوہر ایک مل اونر تھا اور اب وہ ایک ابتر حلیے والے آدمی کے ساتھ اس تنگ و تاریک مکان میں بسی ہوئی تھی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے انقلاب کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہی رہی ہوگی اور ان کے دلوں میں خوامخواہ وجہ جاننے کا تجسس جاگ اُٹھا تھا۔

''تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرا باپ بھی مل اونر تھا اور اس نے اپنے لیے مل اونر داماد کا ہی انتخاب کیا تھا۔'' اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا جو شاید اپنے حالات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے ان انکشافات سے البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ جو اس اُلجھن میں تھے کہ اس کی شخصیت اس ماحول سے لگا نہیں کھاتی، وہ دُور ہوگئی تھی لیکن ایک نئی اُلجھن پیدا ہوگئی تھی کہ آخر وہ عرش سے فرش پر کیسے اور کیونکر پہنچی؟ یہ اُلجھن سوال بن کر ہونٹوں پر چلی آئی جسے سن کر وہ پہلے تلخی سے مسکرائی اور پھر نہایت اُداسی سے بتانے لگی۔

''میری زندگی کی کہانی وہی عام سی ہے جو ہمیشہ سے ہمارے معاشرے میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ میں اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی تھی اور ساتھ ہی ذہین بھی۔ میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور اپنی چلبلی فطرت کی تسکین کے لیے ایک نیوز پیپر میں جاب کرنے لگی۔ وہیں ایک شخص وِجے بھی تھا۔ میری ہی طرح ایجوکیٹڈ اور خوب صورت۔ ہم دونوں کو پتہ بھی نہیں چلا اور ساتھ کام کرتے کرتے ہم ساری زندگی ساتھ بتانے کے خواب دیکھنے لگے محبت کے نشے نے ہمیں اتنا سرشار کیا کہ ہم بھول گئے کہ ہمارے درمیان مذہب اور کلاس کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ خیال آیا تو وِجے نے وعدہ کیا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔ اس کے اس وعدے کے سہارے میں نے پاپا سے اس کے بارے میں بات کرنے کی جرأت کر لی۔ وہ ہمیشہ میری ہر خواہش پوری کرتے رہے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس خواہش کو بھی رد نہیں کریں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا اور پاپا نے فیصلہ سنایا کہ مذہب تبدیل کر لینے کے باوجود وِجے جیسا ٹٹ پونجیا اُنہیں داماد کے طور پر قبول نہیں ہوگا۔

میں نے بہت کوشش کی، خودکشی کی دھمکی تک دے کر دیکھ لی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے زمانہ قدیم کے کسی بادشاہ کی طرح مجھے میرے کمرے میں نظربند کرنے کے بعد میرا رشتہ اپنے ایک دوست کے بیٹے سے طے کر دیا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔ جواب میں انہوں نے مجھے وہی فرسودہ دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ اسی وقت میری ماں کو طلاق دے دیں گے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں میری ماں سے بہت محبت تھی اور وہ ایک دن بھی ان کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا میں اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ میرے باپ ہونے کی وجہ سے وہ بھی میری رگ رگ کو پہچانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کی دھمکی کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا اس لیے انہوں نے مجھے پریشرائز کرنے کے لیے ایک ایسی حرکت کی جس کی مجھے ان سے بالکل بھی اُمید نہیں تھی۔ انہوں نے شادی سے صرف چار دن پہلے وِجے کی بہن کو اغوا کروا لیا۔ مایوں والے دن جب میری چھوٹی بہن کارڈلیس لے کر میرے کمرے میں آئی کہ وِجے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو میں حیران رہ گئی کہ میرے گھر کا کوئی فرد وِجے سے میری بات کیسے کروا سکتا ہے؟

اسی حیرت میں مبتلا جب میں نے بہن سے کارڈلیس لے کر ہیلو کہا تو وِجے میری آواز سن کر رو پڑا اور بولا۔ عائشہ! میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں کہ اپنے پاپا کی بات مان لو اور خاموشی سے یہ شادی کر لو۔'' اس بار میں حیران رہ گئی کہ وِجے یہ سب کیوں کہہ رہا ہے؟ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ

اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے اور باعزت رہائی کی شرط تمہاری شادی کے لیے ہاں رکھی گئی ہے۔ اس جواب سے صاف ظاہر تھا کہ اس کام کے پیچھے پاپا کا ہاتھ تھا۔ پاپا اتنے با اختیار آدمی تھے کہ وجے جیسا نوآموز صحافی جو ابھی اپنا کیریئر بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا، ان سے قطعی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ صحافی برادری میں سے بھی کوئی ان کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دیتا چنانچہ صرف وجے کی محبت میں، میں نے پاپا کے سامنے ہار مان لی اور ساجد کی بیوی بن کر اس کے گھر چلی گئی۔ لیکن اس عہد کے ساتھ کہ جس گھر سے میری ڈولی اُٹھی ہے، اب وہاں میرا جنازہ بھی نہیں جائے گا۔

شادی کے بعد میں ایک بار بھی پاپا سے ملنے نہیں گئی۔ یہاں تک کہ رسم کے مطابق میری ماں، بہن اور بھابی مجھے میکے لے جانے کے لیے آئیں تو میں نے انکار کر دیا۔ ساجد میری اس حرکت پر بہت حیران ہوا لیکن مجھے اپنے فیصلے میں اٹل دیکھ کر انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ شادی کے بعد میں نے خود کو ایک اچھی بیوی اور بہو ثابت کیا اور اپنے ساتھ کی گئی پاپا کی زیادتی کا بدلہ ساجد کی فیملی سے لینے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کو پورا سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی بھی دے دی۔ دیکھنے میں، میں خوش باش تھی اور ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن میرا اندر میری اس زندگی سے خوش نہیں تھا۔ میں مہنگے کپڑوں، اچھے کھانوں اور ہیرے جواہرات وغیرہ سے خوش ہونے والی لڑکی ہی نہیں تھی۔ مجھے زندگی میں تھرل اور ایڈونچر اچھا لگتا تھا اور یقین تھا کہ اگر پاپا، وجے سے میری شادی کر دیتے تو اس کے ساتھ رہ کر میں وہی زندگی گزارتی جو مجھے پسند تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی ضد پوری کرنے کے لیے مجھے اتنی بری طرح بلیک میل کیا تھا کہ میرا دل ان سے خراب ہو گیا تھا۔

پورے پانچ سال تک میں ساجد کے ساتھ ایک اَن چاہی زندگی گزارتی رہی اور خود کو خوش ظاہر کرنے کی اداکاری بھی کرتی رہی۔ لیکن پھر میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ کمال، ساجد کا چچازاد بھائی تھا اور نشے کی لت میں مبتلا تھا۔ والدین جب اس کا علاج کروا کروا کر ہار گئے تو انہوں نے میرے سسر سے مدد کی درخواست کی۔ میرے سسر اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئے اور یہاں اس کا علاج ہونے لگا۔ گھر کی بہو کی حیثیت سے مہمان کا خیال رکھنا یوں بھی میرا فرض تھا۔ پھر کمال کا کیس بھی ایسا تھا کہ مجھے لگا، میری بے مقصد زندگی کو کوئی مقصد مل گیا ہو۔ کھانے پینے، گھومنے پھرنے کے سوا بھی تو زندگی کچھ ہوتی ہے نا؟ بس میں نے ٹھان لی کہ کمال کو نشے کی لت سے نکالنا ہے۔ میری توجہ اور نصیحتوں کا اُس پر اچھا اثر ہوا اور وہ کسی حد تک اپنے علاج کے لیے تعاون کرنے لگا لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی نشے کو بھول چکا ہو۔ ایک دن میں نے اس پر غصہ کیا کہ وہ دن کے وقت تو نشے کو ہاتھ نہیں لگاتا لیکن رات کو جب میں اس کی نگرانی نہیں کر سکتی تو نشہ کرنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ اس کا حل یہ ہے کہ میں دن رات اس کے ساتھ رہنے لگوں۔ اس وقت تو میں نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا لیکن بعد میں وہ چلتے پھرتے یہی فرمائش کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے میرا ساتھ مل گیا تو وہ خود کو سدھار لے گا۔ میرا دماغ بھی ایک دن پھر گیا۔ میں نے سوچا کہ میں ساجد کے گھر رہ کر جو بے مقصد زندگی گزار رہی ہوں، اس میں میرے لیے کون سا سکون ہے۔ اگر میں کمال کی بات مان لیتی ہوں تو میرے کریڈٹ پر ایک کارنامہ تو ہوگا کہ میں نے ایک شخص کی زندگی کو بچا لیا۔ اس پھر سب کچھ بدل گیا اور میں یہاں پہنچ گئی۔''

وہ اپنی داستانِ زندگی سنا رہی تھی اور وہ سانس روکے سنتے جا رہے تھے۔

''یہ سب آسانی سے تو نہیں ہوا ہوگا..... تمہیں خاصی مشکل اُٹھانی پڑی ہوگی؟''



''وہ تو اُٹھانی پڑی تھی۔ جب میں نے ساجد سے طلاق مانگی تو ہر طرف بھونچال آ گیا۔ سب لوگ مجھے سمجھانے لگے کہ میں ایسی غلطی نہ کروں یہاں تک کہ پاپا، جن سے میری برسوں سے بات چیت بند تھی، وہ بھی دوڑے آئے لیکن میں اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹی۔ پاپا نے اپنے طور پر پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں میرا وجے سے دوبارہ رابطہ تو نہیں ہو گیا۔ لیکن ظاہر ہے اُنہیں ایسی کوئی سن گن نہیں ملی۔ ان گزرے ہوئے سالوں میں وجے نہ صرف شادی کر چکا تھا بلکہ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کا سفر بھی طے کر لیا تھا اور ایک چینل سے معاہدے کے تحت دبئی میں رہ کر ان کے لیے کام کر رہا تھا۔

میرے گھر والوں سمیت سب نے بہت کوشش کی کہ طلاق مانگنے کی وجہ جان سکیں لیکن اس بار میں نے کمال کا نام کسی کو بتانے کی غلطی نہیں کی ورنہ شاید پاپا مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ میں نے اپنی چار سال کی بیٹی کو ساتھ لیا اور سسرال کا گھر چھوڑ کر ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ اب سب نے دیکھ لیا کہ میں اپنی ضد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں تو میرے سسر نے ساجد کو سمجھایا کہ جو عورت تمہارے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہے، اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ یوں مجھے طلاق ہو گئی۔ عدت کا عرصہ میں نے کرائے کے مکان میں محدود رہ کر گزارا۔ میرے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ گزر بسر کے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی پھر میں اپنے ساتھ پاپا کی طرف سے ملا میں دیا گیا زیور بھی لے کر آئی تھی میرا ارادہ تھا کہ زیور بیچ کر کمال کا علاج کروا دوں گی اور بعد میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کہیں ملازمت کر لوں گی۔ کمال ٹھیک ہو جاتا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر عدت میں کمال سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ بعد میں وہ مجھ سے ملا تو پہلے سے بھی بری حالت میں تھا۔ میرے پیچھے کسی نے اس کے علاج پر توجہ نہیں دی اور وہ آزادی پا کر پہلے سے زیادہ شدت سے نشہ کرنے لگا۔

اُسے اس حالت میں دیکھ کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ بس ہمت کی اور اسے علاج کے لیے ہسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے بعد وہ کچھ سنبھلا تو اس نے شادی کے لیے رٹ لگا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہ پوری طرح سیٹل ہو جائے، پھر شادی کر لوں گی۔ میں خود بھی ان دنوں اپنی جاب میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کمال نے رٹ لگا لی کہ میں اس سے فوری طور پر شادی کروں ورنہ وہ ڈاکٹرز سے تعاون کرنا چھوڑ دے گا۔ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننی پڑی اور شادی ہوتے ہی نئے سرے سے پوری فیملی میں ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے فون پر تو کسی نے روبرو مجھے خوب باتیں سنائیں اور الزام لگایا کہ میں نے خود سے کم عمر شخص کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنا بسا بسایا گھر توڑ ڈالا۔ میں اس الزام پر چپ رہی کیونکہ لاکھ کہتی کہ میں نے کمال کی محبت میں نہیں بلکہ ہمدردی میں اور اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ لگنے والے اس الزام کے ساتھ مجھے پاپا اور ساجد کے مزید دو بڑے الزام سہنے پڑے۔ پاپا کا خیال تھا کہ میں نے اس بات کو کبھی نہیں بھلایا تھا کہ انہوں نے وجے سے میری شادی نہیں ہونے دی، اس لیے میں نے انتقاماً یہ حرکت کر کے ان کی عزت اچھالنے کا انتظام کیا۔ ادھر ساجد کو بھی کسی طرح وجے والے معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ ایک طرف میرے طلاق لے کر کمال سے شادی کرنے کا غم اور دوسری طرف یہ الزام کہ اس کی بیوی شادی سے پہلے کسی کی محبوبہ رہی تھی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا اور اس دیوانگی میں اس الزام لگایا کہ اس کے نکاح میں رہ کر میں نے جس بچی کو جنم دیا، وہ اس کی نہیں تھی بلکہ میں میکے سے اپنی

کوکھ میں ساتھ لے کر آئی تھی جب ہی تو شادی کے بعد اتنی جلدی بچی کی پیدائش ہوگئی تھی۔

میں نے پاپا کا الزام خاموشی سے سہہ لیا تھا لیکن ساجد کے الزام پر سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اسے چیلنج کیا کہ وہ ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر اپنے اس الزام کو سچ ثابت کر دے۔ سچ وہ بھی جانتا تھا اس لیے ٹیسٹ کے لیے راضی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے ٹیسٹ نہیں کروایا تو میڈیا پر اس سارے معاملے کو اُٹھاؤں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ سب کے سامنے اپنا یہ الزام واپس لے۔ میری دھمکی نے اثر کیا اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے صرف غصے میں یہ بات کہی تھی ورنہ اسے ایسا کوئی شک نہیں تھا۔ میں پھر بھی پیچھے نہیں ہٹی اور کہا کہ ٹیسٹ تو تمہیں ہر صورت کروانا ہوگا تاکہ دوسروں کے دلوں میں شک کا بیج پڑ گیا ہے، وہ جڑ سے اُکھڑ سکے۔ اُسے ٹیسٹ کروانا ہی پڑا۔ کیونکہ میں بغیر ٹیسٹ کروائے اس کی جان چھوڑنے والی بھی نہیں تھی۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ ایک عورت کے لیے یہ کتنی اہم بات ہوتی ہے کہ اس کے کردار پر اُنگلی اُٹھائی جائے اور یہاں تو معاملہ میری عزت سے بھی بڑھ کر تھا۔ آگے چل کر میری بچی کے لیے پرابلمز کھڑی ہو سکتی تھیں۔ شک باقی رہتا تو لوگ کہتے، کیا معلوم واقعی وہ سچ مچ حرام کی اولاد ہو۔ اسے کبھی اپنے خاندان اور معاشرے میں وہ مقام نہیں ملتا جو ایک نارمل بچے کا حق ہوتا ہے۔''

بڑی روانی سے اپنے کارنامے سناتی ہوئی وہ خاصی بلند حوصلہ عورت لگ رہی تھی جو دیکھنے میں تو بڑی نازک سی تھی اور اپنی اصل عمر سے کئی سال چھوٹی بھی نظر آتی تھی لیکن مضبوطی میں مردوں کو بھی مات دیتی تھی۔ ایسی عورت اگر انجام کی پروا کیے بغیر نادر دادا پر ہاتھ اُٹھا بیٹھی تھی تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

''ساجد کے الزام سے چھٹکارا ملا تو کمال کے والد میدان میں اُتر آئے۔ انہوں نے کمال کو اپنے ہمالی کے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے الزام میں جائیداد سے عاق کر ڈالا۔ میرے لیے اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی بلکہ میں شروع سے ہی اس کی توقع کر رہی تھی۔ لیکن کمال کو اپنے والد کے فیصلے سے دھچکا لگا۔ وہ ناز و نعم میں پلا تھا اور ہمیشہ ایسی ہی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور ظاہر ہے میں اپنی جاب کے ذریعے وہ معیار زندگی قائم نہیں رکھ سکتی تھی جو کسی مل اونر یا بڑے تاجر کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے بستر سے لے کر کپڑوں، جوتوں، کھانوں اور برتنوں تک ہر چیز پر اعتراض تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ یہ بات سمجھ لے لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور اس غم کو بھلانے کے لیے ایک بار پھر شدت سے نشے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاید تمہیں اندازہ ہو کہ یہ علاج اتنا سستا نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی اس کی خاطر اپنے زیورات کا ایک بڑا حصہ بیچ چکی تھی۔ جو بچا تھا، وہ میں نے بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے بیچ ڈالا۔ اس کا بورڈنگ اسکول میں ایڈمیشن کروایا تاکہ وہ گھر کے ماحول سے دور رہے اور کمال کی نفرت کا نشانہ بننے سے بچ سکے۔ بچ جانے والی رقم سے میں نئے سرے سے کمال کا علاج شروع کروانا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھ سے زیادہ تیزی دکھائی اور اپنی لت پوری کرنے کے لیے وہ رقم چوری کر ڈالی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ میں جہاں جاب کر رہی تھی، وہاں کے کرتا دھرتا سے میری اَن بن ہوگئی اور مجھے جاب سے نکال دیا گیا۔

جاب چھوٹنے پر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور سوچا کہ کہیں اور اپلائی کر دوں گی لیکن جب اس کام کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ میرے ڈاکومینٹس غائب ہیں۔ کمال سے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب میں نے اپنی بہت ساری کتابیں بھی غائب دیکھیں تو سمجھ گئی کہ اس نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے روپے حاصل کرنے کی خاطر وہ کتابیں بیچ ڈالی ہیں اور ان کے ساتھ ہی میرے ڈاکومینٹس



کسی طرح چلے گئے ہیں۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ ان کی ڈپلی کیٹس نکلواؤں لیکن اس کی بھی کچھ فیس ہوتی ہیں جو پوری کرنے میں میرے سامنے کچھ رکاوٹیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس چکر میں لمبا وقت لگ سکتا ہے اور گھر چلانے کے ساتھ ساتھ بچی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی مجھے رقم کی ضرورت ہوگی اس لیے سب سے پہلے تو کرائے کا وہ مکان چھوڑا جو یہاں کے مقابلے میں کافی بہتر علاقے میں تھا اور اس حساب سے اس کا کرایہ بھی زیادہ تھا۔ مکان چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے وہاں موجود تقریباً تمام قیمتی چیزیں بھی بیچ ڈالیں۔ اس طرح مجھے کافی بچت ہوگئی اور بچنے والی رقم میں نے گھر میں رکھنے کی غلطی کرنے کے بجائے ایڈوانس فیس کے طور پر بچی کے اسکول میں جمع کروا دی۔ اب اس کی طرف سے مجھے یہ اطمینان ہے کہ اگر چند مہینے تک مجھے معقول ملازمت نہیں ملتی ہے، تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ یہ گھر میں نے بہت کم کرائے ضروری سامان سمیت حاصل کیا ہے اور ظاہر ہے کمال جو پہلے ہی ناخوش تھا، یہاں آنے پر اور زیادہ ناراض ہے۔ میں اس کی ناراضگی کو غلط نہیں سمجھتی لیکن فی الحال خود بھی مجبور ہوں۔ ایک سہیلی کے توسط سے ''نوادر'' میں ویٹریس کی جاب حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گھر کا دال دلیہ چلتا رہے۔ ڈاکومینٹس کی ڈپلی کیٹس مل جانے پر جب مجھے کوئی اچھی جاب مل جاتی تو میں ایک بار پھر کمال کا علاج شروع کروا دیتی۔ لیکن اب دیکھو کہ وقت مزید زندگی کا کون سا رخ دکھاتا ہے۔ اپنے زندگی کے حالات اور واقعات سے تو میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میں جو ارادہ باندھوں اور جو خواب دیکھوں، حقیقت اس کے برخلاف ہی نکلتی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں یک دم ہی نمی اُمڈ آئی۔

''پلیز نہیں۔ آپ تو بہت حوصلہ مند اور مختلف عورت ہیں۔ اس طرح آنسو بہا کر خود کو عام عورتوں کی صف میں مت کھڑا کیجیے۔'' وہ بڑی عجیب شخصیت کی مالک تھی اور اس نے مروّجہ اصولوں سے ہٹ کر اپنی زندگی کے لیے بڑے انوکھے فیصلے کیے تھے۔ پھر بھی وہ قابلِ ستائش محسوس ہوتی تھی۔ ایسی بہادر عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا چنانچہ شہریار اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا۔

''آپ پہلے شخص ہیں جو مجھے اس طرح سراہ رہے ہیں ورنہ تو تقریباً ہر شخص مجھے ملامت ہی کرتا ہے کہ ایسی بے وقوف عورت ہو کہ عیش و آرام کو ٹھکرا کر اپنے لیے یہ ذلت اور عسرت بھری زندگی منتخب کر ڈالی۔'' اس نے نزاکت سے انگلی کی پور سے آنکھوں کے کناروں تک چلی آنے والی نمی کو صاف کیا اور بولی۔

''یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ عام لوگ کبھی بھی خاص لوگوں کو سمجھ نہیں پاتے اور آپ ایک خاص ہستی ہیں۔'' شہریار نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

''نوازش۔'' اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر خوش دلی سے کہا۔

''آپ کمال نامی اس مخلوق سے چھٹکارا کیوں حاصل نہیں کر لیتیں؟ یہ شخص آپ کی زندگی سے نکل گیا تو آپ کے لیے تھوڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔'' سلّو نے اسے مفت مشورہ دیا جسے سن کر اس نے شدت سے نفی میں سر کو دائیں بائیں جنبش دی اور بولی۔

''اگر میں آسانیوں کی ہی خواہش مند ہوتی تو وجے جیسے مڈل کلاسیے کے ساتھ محبت کر کے اس کے گھر بسنے کے خواب کیوں دیکھتی؟ اپنے باپ سے تعلقات کیوں توڑتی؟ اور ساجد کا گھر کیوں چھوڑتی؟..... زندگی میں جدوجہد کی قائل ہوں اور شاید میری زندگی میں یہ زیادہ لکھی گئی ہے۔ پھر کمال کا تو میرے سوا کوئی ہے ہی نہیں جو میرے چھوڑنے کے بعد اسے گلے لگا لے۔ مجھے ہی اسے سمیٹنا اور سنبھالنا پڑے گا اور یقین ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو میں یہ کام کر گزروں گی۔ وہ ایک دن ضرور نشہ چھوڑ کر خود کو معاشرے

کا کارآمد فرد ثابت کرے گا اور اس وقت اگر اس نے مجھے چھوڑنا چاہا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بس کر دیجئے نیک پروین صاحبہ! آپ کی اتنی انوکھی سوچ اب مجھ سے مزید ہضم نہیں ہو سکتی۔" [illegible] نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن اس کی آنکھوں میں عائشہ کے [illegible] ستائش تھی، اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس انوکھی عورت سے متاثر ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے، مجھے چھوڑ دیتے ہیں اور اب آپ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ میرا مشورہ [illegible] آپ دونوں فوری طور پر دہلی چھوڑ دیں تاکہ نادر دادا کے عتاب سے بچ سکیں۔"

"اور تم؟..... تمہارا کیا ہوگا؟" شہریار نے پوچھا۔

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" اس نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا لیکن اسے بدستور اپنی طرف [illegible] سے دیکھتے پا کر سنجیدگی اختیار کر لی اور بولی۔ "نوادر میں جو کچھ ہوا، اس کی خبر کسی نہ کسی ذریعے سے [illegible] پہنچ جائے گی۔ اگر نہ بھی پہنچی تو میں خود پہنچانے کا بندوبست کر دوں گی۔ ہمارے درمیان لاکھ اختلافات [illegible] مگر وہ یہ کسی صورت برداشت نہیں کریں گے کہ ان کی بیٹی کی عزت کوئی غنڈہ سرِ عام اُچھال سکے۔ ان [illegible] پاس دولت کی طاقت ہے اور کئی صاحبِ اختیار لوگ ان کے دوست ہیں۔ سب مل ملا کر نادر دادا کو [illegible] ہی دیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں اپنا ارادہ بتا ہی چکی ہوں۔ دو چار میرے ہاتھوں مارے جائیں [illegible] میں اپنی جان سے چلی جاؤں گی اور یہ کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ آخر کار تو ہر شخص کی زندگی [illegible] انجام ہونا ہے۔ ہاں، مجھے مرتے وقت یہ افسوس رہے گا کہ میں جس مقصد کے لیے ساجد کا گھر چھوڑ کر [illegible] وہ پورا نہیں ہو سکا۔"

اب شہریار کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ نہ ہی وہ اس کے لیے اس سے زیادہ [illegible] اظہار کر سکتا تھا کیونکہ وہ تو خود پُرخطر راہوں کے مسافر تھے اور کسی طور اس لڑکی کو پناہ نہیں دے [illegible] ویسے بھی وہ جس فطرت کی مالک تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کی [illegible] بھی تو وہ ہرگز قبول نہیں کرتی کیونکہ وہ کمال کو بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں ان مسائل سے نکالے اور تم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکو۔" اس [illegible] پورے خلوص کے ساتھ عائشہ کو دعا دی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے ماہ بانو کی یاد آ گئی تھی۔ حالانکہ [illegible] عائشہ کی طرح بے باک اور آزاد مزاج نہیں تھی، ہاں البتہ عزت کے معاملے میں بے حد حساس تھی اور [illegible] بچانے کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی بالآخر امریکہ پہنچ گئی تھی۔

ماہ بانو کا خیال ذہن میں آیا تو دل میں ایک کسک سی جاگی۔ وہ کتنا مجبور تھا کہ اپنے ہاتھوں اسے کسی [illegible] بنا ڈالا تھا۔ لیکن خوشی بھی تھی کہ وہ زندگی کے خارزاروں میں بھٹکنے سے بچ کر اسلم کے ساتھ ایک محفوظ [illegible] گزار رہی تھی۔ وہ اسلم کے بارے میں پُریقین تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کے [illegible] سے اس کے دل پر لگا ہر زخم مندمل کر سکتا ہے۔

"ایک بات کہوں، تم برا تو نہیں مانو گے؟" عائشہ کی آواز اُسے لمحۂ وجود میں واپس لائی۔

"کہو۔"

"تم دونوں نے مجھے اپنے غلط نام بتائے ہیں۔ تم نے خود کو ہندو ظاہر کیا ہے لیکن جن الفاظ [illegible] میں تم مجھ سے گفتگو کرتے رہے ہو، اسے دیکھتے ہوئے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم دونوں [illegible] ہو اور کسی خاص وجہ سے اپنی اصلیت چھپا رہے ہو۔"



وہ بولی تو وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سن پڑ گئے۔ عائشہ کی صاف ستھری اُردو سن کر، اس کے ساتھ گفتگو [illegible] کرتے ہوئے انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ہندوؤں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور انہیں اس کے ساتھ اسی لب [illegible] میں بات کرنی چاہیے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ہم دونوں نے اپنے شوق سے اُردو سیکھی ہے اور جب کبھی آپ جیسی اُردو دان [illegible] بات چیت کرنے کا موقع ملے تو اس کا فائدہ اٹھا کر خود بھی بولنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔" پہلے شہریار [illegible] طرف کو سنبھالا اور پھر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گی۔ اگر آپ خود کو جگدیش اور رویندر کہلوانے پر مُصر ہیں تو مجھے کوئی [illegible] نہیں پہنچتا کہ آپ کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔"

عائشہ نے جو جواب دیا، اس سے واضح تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی وضاحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں [illegible] شہریار نے بھی زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ ان کے حق میں اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے بارے میں [illegible] کھوج لگانے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔"

"یہاں بیٹھے سوچ بچار ہی کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟..... میں نے تم دونوں سے کہا ہے کہ [illegible] طور پر دہلی سے روانہ ہو جاؤ اور تم ابھی تک میرے گھر جیسی خطرناک جگہ پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

"اوہ ہاں..... واقعی ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے" شہریار نے اس کی تائید کی لیکن اپنی [illegible] وہ خود اُلجھن میں تھا کہ دہلی سے فوری طور پر کس طرح نکلے؟ ان کے مددگار نے انہیں شام کے بعد شناختی [illegible] دستاویزات مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا جن کے بغیر زیادہ سفر کرنا ان کے لیے یوں بھی خطرناک ہو سکتا تھا لیکن اب صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ یہاں ٹھہرنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میرے خیال میں تم دونوں کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرے ہوئے ہو گے اور وہاں یقینی طور پر تمہارا سامان [illegible] موجود ہوگا۔ اگر نادر دادا تم سے انتقام لینا چاہتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے آدمیوں نے اب تک مختلف [illegible] میں تم دونوں کی تلاش شروع کروا دی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اگر تمہارے سامان میں کوئی قیمتی شے [illegible] ہے تو اسے وہیں پڑا رہنے دو اور ہوٹل جانے کا خطرہ نہ مول لو۔"

عائشہ نے انہیں ایک اور مشورے سے نوازا لیکن اس کا یہ مشورہ اس لیے قابلِ قبول نہیں تھا کہ ان کے [illegible] میں اسلحے اور کرنسی کے علاوہ دیگر ضروری چیزیں بھی موجود تھیں۔

"ہم اپنا سامان ہوٹل میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اس میں ہماری بہت اہم چیزیں موجود ہیں۔"

عائشہ کے مشورے کا اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور بولا۔ "نادر یا اس کے آدمیوں کو ہمارے نام [illegible] معلوم نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی تصویر ہے، اس لیے صرف زبانی حلیہ بتا کر ایک ہوٹل میں جا کر ہمیں [illegible] تلاش کرنا ان کے لیے اتنا آسان نہیں ثابت ہوگا۔ اس سارے پروسس میں کافی وقت لگ سکتا ہے اس لیے [illegible] ہمارے پاس چانس ہے کہ ہم وہاں جا کر اپنا سامان لے آئیں۔"

"بالکل ٹھیک، چلو ہم ابھی چلتے ہیں۔" سلّو نے بھی اس کی تائید کی اور کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ رُکو۔ میرے خیال میں، میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔" عائشہ نے [illegible] انہیں روکا۔

"وہ کیسے؟"

"میری ایک عزیز سہیلی ہے شکنتلا! میری خاطر وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں اس کے ذریعے

تمہارا سامان منگوا دوں۔ اس دوران تم اس کے گھر پر بھی رک سکتے ہو۔ روکنے کو میں بھی روک لوں لیکن اس کا امکان ہے کہ وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے اور تم مارے جاؤ گے۔'' اس نے اپنی تجویز پیش کی۔

''شکریہ لیڈی۔ آپ نے ہمیں جو پیشکش کی اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن اس بات کو کسی طور مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ ہماری خاطر اپنی سہیلی کو خطرے میں ڈالیں۔ ہم مرد ہیں، کسی نہ کسی طرح خود کو بچا ہی لیں گے۔ اس لیے نہ تو آپ کوئی زحمت کریں اور نہ ہی کسی دوسرے کو زحمت میں ڈالیں۔ اب ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا۔'' شہریار نے غور سے اس کی تجویز سنی ضرور لیکن فوراً ہی رد کر دی اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں اللہ سے آپ دونوں کی سلامتی کے لیے دعا کروں گی۔'' وہ ان کے ہمراہ دروازے تک آئی اور بالکل ایسے لہجے میں کہا جیسے کسی محاذ پر جانے والے سپاہی کی بہن کہتی ہو گی۔

''ایک بار پھر شکریہ۔ ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے بھی دعاؤں کی ہی۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر وہ دونوں آگے پیچھے نکل گئے۔ گلی سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی سواری کو تلاش کرنے کے بجائے پیدل ہی چلنے کو ترجیح دی تھی۔

''بیٹھے بٹھائے ہم نے یہ سالی اچھی مصیبت گلے لگا لی۔ اب پتہ نہیں وہ خبیث دادا ہمیں کتنا خوار کروائے گا۔'' فرماں برداری سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے سلّو نے اپنے انداز سے صورتِ حال پر تبصرہ کیا جس کے جواب میں اس نے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔ اصل میں وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں کچھ دیر سکون سے بیٹھا جا سکے۔

چند منٹ چلنے کے بعد بالآخر ایک پبلک پارک کی صورت میں ایسی جگہ مل گئی۔ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ شکر تھا کہ اچھی خاصی مار دھاڑ اور اُچھل کود کے باوجود نہ تو موبائل اس کی جیب سے نکل کر کہیں گرا تھا اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچا تھا چنانچہ اس وقت وہ اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

''شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیئے ہیں۔'' ذہن نشین کیا ہوا مخصوص نمبر ملانے کے بعد رابطہ ہونے پر اس نے طے شدہ کوڈ ادا کیا۔

''جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔'' دوسری طرف سے جوابی کوڈ دہرایا گیا۔

''ہم مشکل میں ہیں۔ کچھ دیر پہلے ''نوادر'' ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہماری نادر دادا نامی غنڈے کے آدمیوں سے ہاتھا پائی ہو گئی تھی اور اب امید ہے کہ اس کے بندے ہمیں ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ کیا تم ہمارے ہوٹل سے ہمارا سامان نکالنے کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟'' صحیح آدمی سے رابطہ ہو جانے کا یقین ہونے پر اس نے فوری طور پر اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اوہ گاڈ!..... تو وہ تم دونوں تھے۔ اس واقعے کی بازگشت تو دور تک پھیل گئی ہے۔ بہرحال، تم کہاں ہو؟ مجھے اپنی لوکیشن بتاؤ۔ پھر میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا اور پھر فوراً ہی اس سے پوچھنے لگا۔ جواب میں اس نے عائشہ کی زبان سے سنا، علاقے کا نام بتانے کے ساتھ ساتھ اس پارک کے اطراف کی نشانیاں بھی بتا دیں جہاں وہ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو۔ میں خود تمہیں لینے آتا ہوں۔'' وہ فوراً ہی بولا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اب ان کا



ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ یہی کرتے رہے۔ تقریباً پچیس منٹ بعد انہیں اپنے مددگار کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔

''میں اپنے ساتھ گاڑی لایا ہوں۔ اس میں ایک ڈرائیور بھی موجود ہے۔ تم دونوں راستے بھر کوئی بات کرو اور بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔'' کسی قسم کے تکلف میں پڑے بغیر اس نے سنجیدگی سے انہیں ہدایت کی اور پلٹ کر چل پڑا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے تھے۔

وہ ان کے لیے جو گاڑی لایا تھا، وہ ایک ٹیکسی تھی۔ ٹیکسی میں ان کے بیٹھتے ہی سفر شروع ہو گیا بیس منٹ میں وہ ایک تنگ گلی کے کونے پر ٹیکسی سے اُتر رہے تھے۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی تو ان کا پیدل سفر شروع ہوا اور وہ انہیں مختلف گلیوں سے گزارتا ہوا اس گھر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں وہ پہلے بھی آ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس نے دروازے پر دستک دینے کے بجائے جیب سے چابی نکال کر دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر انہیں لیے اندر داخل ہو گیا۔

''یہ آپ نے بڑا غضب کیا کہ نادر دادا جیسے بندے سے اُلجھ بیٹھے۔ اس غلطی کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے۔'' اندر پہنچتے ہی وہ تشویش سے بولنا شروع ہو گیا۔

''ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ کیا بلا ہے۔ ہم نے تو بس ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوتی دیکھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔'' منہ پھلا کر جواب دینے کا فریضہ سلّو نے انجام دیا۔

''وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے بارے میں آپ لوگ اس بات سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں اتنا کچھ ہونے کے باوجود پولیس کا کوئی آدمی پھٹکا تک نہیں ہو گا کیونکہ یہ نادر کا حکم ہے کہ جہاں وہ اور اس کے بندے کسی لفڑے میں اُلجھے ہوں، وہاں پولیس کا نام و نشان بھی نظر نہ آئے۔'' اس نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اوہ، آئی سی۔ یعنی وہ اتنا بڑا غنڈہ ہے کہ پولیس بھی اس سے ڈرتی ہے؟''

''بالکل۔'' وہ زور سے گردن ہلا کر بولا۔

''تو پھر اب تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' شہریار نے استفسار کیا۔

''میں نے راہول کو فون کر دیا تھا۔ وہ کچھ بندوبست کر کے آتا ہو گا۔ اس کے آنے تک تم دونوں اپنے حلیوں میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو تاکہ کوئی فوری طور پر تمہیں شناخت نہ کر سکے۔''

اس نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ حلیوں کی تبدیلی میں ان کی مدد بھی کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے پر راہول بھی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ان دونوں کے بیگز لٹکے ہوئے تھے۔

''اوہ مائی گاڈ!..... بڑی مشکل سے لالو بھائی کو سمجھا بجھا کر یہ بیگز لے کر آیا ہوں۔ وہ بھی اس بات کا کام کرنے کے بعد کہ اس کی جان کسی مشکل میں نہ پھنس سکے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگز نیچے زمین پر رکھے تو سلّو نے آگے بڑھ کر ایک بیگ کھولا اور اندر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''اچھی طرح چیک کر لو، ہر چیز موجود ہے یا نہیں؟ میں نے تو بڑی جلدی میں سارا کام نمٹایا ہے۔ اپنے کمرے سے یہ بیگ نکالنے کے ساتھ اسی رنگ کے دو بیگ کپڑوں اور دیگر سفری سامان سمیت وہاں سے اٹھا کر آیا ہوں۔ اب اگر نادر دادا کا کوئی آدمی تمہارا پوچھتا ہوا لالو بھائی تک پہنچا تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ تم ٹھہرے ہوئے تو اس کے ہوٹل میں ہی ہیں لیکن صبح سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آئے۔ ثبوت میں وہ تمہارے زیر استعمال کمرہ اور سامان دکھا دے گا۔ بس پھر اللہ اللہ خیر سلّا۔ آگے تو دادا کی مرضی ہو گی کہ کیا ہوتا

ہے۔ لالو البتہ اس شرط پر زبان نہیں کھولے گا کہ ہونے والے کسی نقصان کو بھرنے کی ذمے داری ہم اٹھا گے۔'' اس نے اُنہیں تفصیلات سے آگاہ کیا اور بوتل منہ سے لگا کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں سے بس کے ذریعے بستی نظام الدین تک چلے جاؤ۔ وہاں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی آتے ہیں۔ تم اپنے موجودہ گیٹ اَپ کے ساتھ وہاں کے ماحول میں آسانی سے گھل مل جاؤ گے۔'' راہول خاموش ہوا تو پہلے والے شخص نے بولنا شروع کر دیا۔

''ہم دہلی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔'' شہریار نے مطالبہ کیا۔

''سوری، ابھی تم لوگوں کی شناختی دستاویزات تیار نہیں ہو سکی ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ کل تک کا وقت لگ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ جہاں میں کہہ رہا ہوں، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ رہو گے میں خود وہاں آ کر تمہیں کاغذات پہنچا دوں گا۔''

اس نے درپیش مسئلہ بتایا تو ان کو اس کی بات ماننی پڑی۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے بیگ شانوں سے لٹکائے بستی نظام الدین کے لیے جانے والی بس پر سوار ہو رہے تھے۔ انہیں وہاں جانے کا مشورہ دینے والے کے خیرخواہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ بس سے اُترنے کے بعد رکشہ کر کے درگاہ تک چلے جانا اور وہاں موجود سراؤں میں سے کسی میں قیام کر لینا۔

انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور ایک سرائے میں کمرہ بک کروانے کے بعد دیگر زائرین کی طرح خود بھی درگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں بے شمار لوگ تھے جو ہندو، مسلم اور سکھ کی تخصیص کے بغیر اپنی حاجتیں لے کر وہاں آئے ہوئے تھے۔ صحیح غلط کی بحث اپنی جگہ لیکن یہ امر حیرت ناک تھا کہ اس ہندوستان میں جہاں اصل میں ہندوؤں ہی کا راج تھا، ایک مسلمان بزرگِ دین کی ایسی عزت تھی کہ ان سے گزر جانے کے طویل عرصے بعد بھی ہر ایک کے دل پر راج کرتا تھا اور یہ حکمرانی ایسی تھی جسے کوئی مٹا نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی کچھ دیر تک زائرین کے ساتھ درگاہ کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے پھر وہاں پکنے والی دیگ کے لیے نذرانہ دے کر باہر نکل گئے۔ عقیدے کے مطابق اس دیگ کے لیے نذرانہ وہ لوگ دیتے تھے جو کوئی حاجت لے کر وہاں آتے تھے۔ انہیں حاجت کوئی نہیں تھی لیکن اس خیال سے نذرانہ دے دیا تھا کہ ہر روز سینکڑوں لوگوں کو مفت کھانا فراہم کرنے والی دیگ میں تھوڑا سا حصہ ان کا بھی پڑ جائے گا۔

سرائے واپس آ کر انہوں نے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آج صبح سے ہی وہ مستقل سفر میں تھے اور اب جا کر بستر کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی اس لیے لیٹتے ہی سو گئے۔ صبح دستک کی آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔

''شاید سرائے کا مالک ہو گا اور ناشتے کے بارے میں پوچھ رہا ہو گا۔'' شہریار نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے اندازہ لگایا۔

''جو بھی ہو، اُس کو ٹال دو۔ میں ابھی کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔'' سلّو نے کروٹ بدل کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجبوراً شہریار کو ہی بستر چھوڑنا پڑا۔ ویسے بھی آج وہ معمول کے خلاف بہت دیر تک سویا تھا۔ اس کے بستر سے اُتر کر دروازے پر جانے تک دستک ایک بار پھر دی گئی جو پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

''کون ہے بھائی! ذرا صبر کرو۔ آ رہا ہوں۔'' اس نے وہیں سے کہا اور دروازے کی طرف لپکا۔

''کون ہے؟'' دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے احتیاطاً دریافت کیا۔



''پولیس۔ دروازہ کھولو۔'' باہر سے جو جواب دیا گیا، اسے سن کر شہریار تو شہریار، بستر پر کروٹ بدل کر سونے والا سلّو بھی اُچھل پڑا۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پولیس کی موجودگی کا سن کر وہ دونوں ہی ساکت رہ گئے۔ دلّی کے نوادر میں عائشہ نامی ویٹریس سے ہمدردی کرتے ہوئے وہ نادر دادا نامی جس شخص سے بھڑ گئے تھے، اس کے بارے میں علم نہیں تھا کہ وہ کتنی پہنچ والا ہے۔ اندازہ ہوا تو تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ عائشہ سمیت ان کے دہلی میں موجود مددگاروں نے بتایا کہ نادر دادا سے دشمنی مول لے کر دہلی میں خیر و عافیت سے رہنا ممکن نہیں ہے۔ وہ فوری طور پر دہلی چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے کہ شناختی کاغذات کی عدم موجودگی قدم قدم پر مشکلات کھڑا کرتی۔ چنانچہ اپنے ہمدردوں کے مشورے اور مدد سے حلیہ بدل کر بستی نظام الدین پہنچ گئے تھے اور زائرین کی سرائے میں مقیم تھے۔ لیکن کیا ستم تھا کہ یہاں ابھی رات ہی گزری تھی کہ پولیس کے ہرکارے دروازے پر پہنچ گئے۔

غالب امکان یہی تھا کہ ان کے پیچھے نادر دادا کا ہی ہاتھ ہو گا۔ دہلی کے ایک بڑے غنڈے سے دشمنی مول لینے کے بعد پولیس والے اس کے اشارے پر ان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتے تھے، یہ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اور یہاں تو معاملہ اور بھی بڑھ کر تھا۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتے تو شناختی دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ثبوت اور گواہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو گرفتار کر لینے کی صورت میں پولیس کے ساتھ ایک تیر سے دو شکار کر لینے والا خوش نما اتفاق پیش آ جاتا۔ ایک طرف وہ نادر دادا کے ہرکاروں کو پکڑ کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دوسری طرف غیر ملکی جاسوسوں کو پکڑ لینے کا اعزاز حاصل ہو جاتا۔

موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے کسی طور یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھ آ جاتے۔ چنانچہ پکڑے جائے فرار تلاش کرنے کے لیے شہریار نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ دو سنگل بیڈز والا یہ کمرہ کچھ اتنا بڑا نہیں تھا۔ کمرے میں اٹیچڈ باتھ کی سہولت بھی نہیں تھی۔ دیواریں سپاٹ تھیں اور کسی کھڑکی کا نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ ایک روشن دان تھا جو زیادہ بلند بھی نہیں تھا لیکن اس کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے کسی انسانی وجود کے گزرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔

فرار کے سارے راستے مسدود پا کر اس نے سلّو کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بستر چھوڑ چکا تھا، اس کا اشارہ پا کر فوراً حرکت میں آیا اور ہتھیار تھام کر دروازے کی آڑ میں اس طرح آ کھڑا ہوا کہ ضرورت پڑنے پر فائر کر سکے۔

''دروازہ کھولتے ہو یا توڑ دیں؟'' دروازہ کھلنے میں تاخیر ہوئی تو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے دوبارہ دستک دی گئی اور ساتھ ہی سخت لہجے میں دھمکایا بھی گیا۔

''آ رہا ہوں سر جی! ذرا کپڑے پہن رہا تھا۔'' شہریار نے سادگی سے جواب دیا اور دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ لیکن اس سے قبل کہ پٹ کھولتا، باہر عجیب ہنگامہ شروع ہو گیا۔

''پکڑو، بھاگنے نہ پائیں سالے۔'' کوئی زور سے چیخا اور پھر بھاگنے دوڑنے کی آوازوں کے ساتھ دو فائر اور چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے شہریار نے احتیاط سے ایک پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ ان کے کمرے کے دروازے پر اب کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا اور وہ سب سرائے کے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس نے دو قدم باہر نکل کر دیکھا تو دروازے کے قریب دو افراد پڑے ہوئے نظر آئے جنہیں یقینی طور پر گولیاں لگی تھیں۔ ان گرے ہوئے افراد میں سے ایک نے شہریار کے دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ بلند کیا اور گولی داغ دی۔ گولی نے سب سے آگے بھاگ کر جاتے ہوئے پولیس والے کو نشانہ بنایا اور وہ بری طرح چیختا ہوا گر گیا۔ اس کے گرتے ہی اس کے باقی ساتھی یکدم ہی مشتعل ہو گئے اور انہوں نے بنا تکلف اپنی رائفلوں کا منہ کھول دیے۔ بیک وقت کئی گولیاں پولیس والے پر فائر کرنے والے شخص کی طرف لپکیں اور پل بھر میں اس کے جسم میں کئی سوراخ ہو گئے اور ان سوراخوں میں سے خون کے فوارے اُبل پڑے۔

وہ خاصا صحت مند اور جان دار شخص تھا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں کھانے کے باوجود فوری طور پر جان نہیں گیا بلکہ اذیت سے بری طرح اُچھلنے اور تڑپنے لگا۔ ایک انسانی وجود کا اس طرح کرب میں مبتلا ہونا اس طور پر کوئی خوش کن نظارہ نہیں تھا۔ شہریار کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی افسوس اور خوف کی ملی کیفیت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص تڑپ تڑپ کر ختم ہو گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پڑا اس کا ساتھی بھی ساکت ہو گیا حالانکہ وہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھنے والی گولیوں میں سے کسی ایک کا بھی نشانہ نہیں بنا تھا لیکن شاید اس کے مرنے کے منظر نے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وہ خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا یا بے ہوش بن جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ دونوں کو کسی قابل نہ پا کر پولیس والوں نے حرکت کی اور اپنی کارروائی مکمل کرنے لگے۔

''کیا فائدہ ایسے لالچ کا۔ دولت کی ہوس میں جان بھی چلی گئی۔'' اس منظر کو دیکھتے تماشائیوں میں سے کسی ایک نے تبصرہ کیا۔

''مجھے تو دکھ ہو رہا ہے۔ کیسا کڑیل جوان ہے۔ اس کی ماں، بہنیں اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش دیکھیں گی تو ان کے من پر کیا گزرے گی۔'' کہیں سے ایک اور تبصرہ آیا۔

'کیا بات ہے بھائی صاحب! یہ کیا قصہ ہے؟'' تبصروں نے اس کے دل میں تجسس جگایا تو اس نے قریب کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا۔

''ڈکیت تھے جناب! دہلی کے ایک بینک میں ڈکیتی مار کر یہاں آ کر چھپ گئے تھے۔ پولیس کو کسی طرح خبر ہو گئی اور انہوں نے صبح صبح یہاں ہلّا بول دیا۔ ان ڈاکوؤں کے چکر میں وہ سرائے کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ پکڑے جانے کا خدشہ ہے تو بھاگنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر اب جس حال میں پڑے ہیں، آپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

ادھیڑ عمر شخص نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا جہاں مرنے والے ڈاکو کی لاش کو سفید کپڑے سے ڈھانپا جا چکا تھا جبکہ اس کے زخمی ساتھی کو گرفتار کرنے کے بعد طبّی امداد کے لیے ہسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔

''واقعی بڑے افسوس اور عبرت کا مقام ہے۔'' اس نے بھی جوابی تبصرہ کیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سلّو بھی اس دوران باہر نکل چکا تھا اور اس سارے منظر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''خلاص۔'' شہریار کو سامنے پا کر اس نے صورتِ حال پر یک لفظی تبصرہ کیا اور اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''میں تو دوبارہ سونے کے لیے لیٹ رہا ہوں۔ تمہارا دل چاہے تو ناشتہ پانی کر لو۔'' کمرے میں داخل ہی اس نے اعلان کیا اور غڑاپ سے بستر پر جا گرا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے خراٹے کمرے میں



گونجنے لگے اور وہ یوں اطمینان سے سو گیا جیسے کچھ دیر قبل دیکھی جانے والی خون میں نہائی انسانی لاش اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ حالانکہ صورتِ حال ذرا سی مختلف ہوتی تو پولیس کا نشانہ بننے والے ان دونوں افراد کی جگہ وہ خود بھی ہو سکتے تھے۔

شہریار نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑا اور کمرے کی محدود جگہ میں ہی اپنی معمول کی ورزش کرنے لگا۔ سی ایف پی کو جوائن کرنے سے پہلے بھی صبح اُٹھ کر ورزش کرنا اس کا معمول رہا تھا۔ تربیت کے بعد اس معمول میں کچھ مزید سخت مشقوں کے ساتھ اور بھی زیادہ باقاعدگی آ گئی۔ اپنے موجودہ مشن کے دوران بھی وہ اس کام کے لیے موقع نکال ہی لیتا تھا۔ ورزش سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پسینہ خشک ہونے کا انتظار کیا اور پھر تولیہ اُٹھا کر نہانے چلا گیا۔ سرائے سے اس دوران مقتول ڈاکو کی لاش اُٹھائی جا چکی تھی اور پولیس اپنی کارروائی کر کے واپس چلی گئی تھی۔ اس نے لائن سے بنے غسل خانوں میں سے ایک غسل خانے کا رخ کیا اور بھرپور غسل لے کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو وہاں سلّو کے ساتھ راہول بھی موجود تھا اور ان کے درمیان ناشتے کے لوازمات سجے تھے۔

''آ جاؤ بھئی، ناشتہ کر لو۔ گرم اور مزیدار ہے۔'' اسے دیکھ کر سلّو نے دعوت دی تو وہ بلا تکلف ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وقت بھی خاصا ہو گیا تھا اور ورزش کے بعد غسل نے بھوک بھی خاصی چمکا دی تھی اس لیے ناشتہ واقعی بہت مزے کا لگا۔

''تم دونوں کے کاغذات تیار ہو گئے ہیں۔ ان کاغذات کے علاوہ بھی مزید کچھ کاغذات تیار کروا کر ان شہروں کے پی او بکس میں محفوظ کر دیئے جائیں گے جن کے بارے میں امکان ہے کہ تمہیں اپنے مشن کے سلسلے میں جانا پڑے گا۔''

ڈاکٹر فرحان کے بارے میں اُنہیں کنفرم نہیں پتہ تھا کہ وہ کس شہر میں ہیں بلکہ کچھ شہروں کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ شاید ان میں سے کسی جگہ وہ موجود ہو سکتے ہیں۔ اسی حوالے سے راہول نے انہیں اطلاع دی تھی۔ اطلاع دینے کے ساتھ اس نے شناختی کارڈز وغیرہ نکال کر اس کے حوالے کیے۔ شناختی کارڈز پر لگی تصویریں ان کے موجودہ حلیوں کے مطابق ہی تھیں۔ شہریار نے شکریے کے ساتھ انہیں وصول کر لیا۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث آج صبح وہ بڑی مشکل میں پھنسنے والے تھے۔

''نادر دادا والے معاملے کا کیا ہوا؟'' اس نے راہول سے ایک اہم سوال کیا۔

''اس کے آدمی تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس چکر میں وہ لالو بھائی کے ہوٹل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے دوستی کا پاس کرتے ہوئے وہی کہا جو میں نے اُنہیں سکھایا تھا۔ ہوٹل کے خالی کمرے سے وہ تم دونوں کے وہ بیگز لے کر چلے گئے جو میں نے تمہارے اصل بیگز کی جگہ رکھ دیئے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ نادر دادا کے لوگ اب بھی تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں جلد سے جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے شہر پہنچ جاؤ۔ میرے مطابق تمہارے لیے سب سے بہتر ممبئی جانا ہو گا۔ دہلی ریلوے اسٹیشن سے ممبئی کے لیے راجدھانی ٹرین چلتی ہے۔ میں تمہارے لیے اس کی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ یہ ٹکٹ لو اور فرسٹ کلاس کے مزے لوٹتے ہوئے ممبئی پہنچ جاؤ۔'' راہول نے ٹکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے تو شہریار کو ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔'' راہول نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً ہی وہاں سے روانہ گیا۔

''ٹھیک کہہ رہا تھا وہ۔ تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شکر یہ تو اسے ہمارا ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس کی خالی خولی میزبانی کے بدلے میں آج میں نے اسے اتنا زبردست ناشتہ کروایا ورنہ میں بھی اس کی طرح اسے سوکھے منہ ٹرخا سکتا تھا۔''

راہول کے جانے کے بعد سلّو نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اُسے اس بات کی بہت شکایت تھی کہ راہول والی رہائش گاہ پر اس نے اور اس کے ساتھی نے کام کی بات کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی اور یہاں تک کہ انہیں مہمان خیال کر کے چائے تک کا تکلف نہیں کیا تھا۔

''جانے دو یار!'' شہریار نے اس کی بات سن کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور سمجھانے لگا۔ ''وہ بے چارے پتہ نہیں کتنے مشکل حالات میں یہاں کام کر رہے ہیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کتنی مشکل اور مختلف ہوتی ہے۔ اپنی اصل شخصیت، وطن اور خاندان سمیت ہر شے کو بھول کر صرف مقصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہر گھڑی خطرے کی تلوار سر پر لٹکتی رہے اور دل میں یہ اندیشہ ہو کہ پتہ نہیں کب اور کیسے ہماری اصلیت کھل جائے۔''

''وہ بے چارے ہیں اور ہم تو جیسے پکنک پر نکلے ہیں۔'' اس کی بات سن کر سلّو بڑبڑایا۔

''ابھی تک تو سمجھو پکنک ہی منا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر روانگی کے لیے تیاری کرنے لگا۔ سلّو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے تو ٹرین کی روانگی میں تقریباً آدھ گھنٹہ باقی تھا اور اس بات کا اعلان پبلک سروس سسٹم سے کیا جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے گاڑی کا نام لے کر تکرار کے ساتھ روانگی کا وقت بتایا جانے لگا۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگنے تک وہ چائے نوشی کے ساتھ ساتھ اخبار بینی بھی کرتے رہے۔ یہ انگریزی اخبار تھا جس کے مطالعے میں ایک تو ان کا وقت اچھا گزرا، دوسرے چہروں کے سامنے ایک آڑ بھی رہی۔ بدلے ہوئے حلیوں میں ہونے کے باوجود انہوں نے اس احتیاط کو مناسب سمجھا تھا کہ اگر نادر دادا کے گُرگے وہاں منڈلا رہے ہوں تو انہیں غور سے ان کا جائزہ لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اخبار بینی کی مصروفیت سے کسی کے شک میں پڑنے کا گمان یوں نہیں تھا کہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھے حضرات میں سے اکثریت اسی مشغلے میں مصروف تھی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر لگ جانے کا اعلان سن کر انہوں نے اپنے اپنے اخبار رول کر کے بغل میں دبائے اور ٹرین کی طرف بڑھ گئے۔ فرسٹ کلاس میں ان کے لیے مخصوص کوپے شاندار تھا۔ ایک نرم کاؤچ پر ڈھیر ہوتے ہوئے سلّو نے بغل میں دبا ہوا اخبار ایک طرف ڈالا اور اپنی کنپٹیوں کو اُنگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''آج میں نے اتنی انگریزی پڑھ لی ہے کہ لگتا ہے بدہضمی ہو جائے گی۔ سالی یہ انگریزی ان لوگوں نے ہم کو ڈنڈے کے زور پر سکھائی تھی ورنہ بالکل شوق نہیں تھا فرنگیوں کی زبان سیکھنے کا۔''

''چلو، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کچھ تو اچھا کیا۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔ وہ خود بھی اس وقت ایک کاؤچ پر ہی براجمان تھا لیکن سلّو کے برعکس اخبار لپیٹ کر رکھنے کے بجائے ایک بار پھر کھول لیا تھا۔ اخبار پڑھتے ہوئے اُس کی نظر اس چھوٹی سی خبر پر بھی پڑ گئی جس میں نوادر ہوٹل میں پیش آنے والا واقعہ مختصراً بیان کیا گیا تھا۔ خبر میں نادر دادا کا نام نہیں تھا اور شاید اس طرح اس کی ساکھ بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہریار نے سلّو کو بھی وہ خبر پڑھ کر سنائی۔



''نام کیسے لکھتا سالا اخبار والا۔ نادر دادا اپنی اس بیہجتی (بے عزتی) کے لیے اس کی واٹ نہ لگا دیتا کیا۔'' اس نے تبصرہ کیا جس سے شہریار نے بھی اتفاق کیا اور آخر کار خود بھی اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد سلّو ہی کی طرح پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نادر دادا کیا تھا اور کیا نہیں، ان کے لیے تو اصل بات اس بات کی تھی کہ وہ اس سے بچ کر نہایت آسانی سے دہلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ممبئی کی طرف مزے سے رواں دواں تھے۔

⊛----✪----⊛

''ہم نے رائے چند کو اُدھیڑ ڈالا ہے سر! اس نے اپنے سارے غیر قانونی دھندوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی قبول کیا ہے کہ وہ ''را'' کے لیے کام کرتا رہا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور انہیں جب اس سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو وہ خود اس سے رابطہ کر لیتے ہیں۔''

رائے چند کو جاوید علی نے اپنے جن ماتحتوں کے حوالے کیا تھا، ان میں سے ایک نے رپورٹ دی۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

رائے چند کو تفتیشی مراحل سے گزارنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ انہیں اپنے کام میں خاصی مہارت حاصل تھی اس لیے یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا کہ رائے چند جیسا شخص اُنہیں غچا دینے میں کامیاب رہا ہوگا اور اتنی سختی سے گزرنے کے بعد بھی جھوٹ بول رہا ہوگا۔ اس کی نگرانی کے دوران بھی ایک طرح سے اُس کے اس بیان کی تصدیق ہوئی تھی۔ اسے گھر سے دُکان اور دُکان سے گھر جانے کے سوا آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ہسپتال سے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے لے کر گیا تھا، تب بھی کسی سے ملاقات کے لیے نہیں گیا تھا اور غالب گمان یہی تھا کہ ''را'' کا کوئی ایجنٹ گاہک کے روپ میں آ کر اتنے چپکے سے وہ نمونے لے گیا تھا کہ نگرانی کرنے والے کو بھی شک نہیں گزرا تھا۔

''اس نے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتایا جن سے وہ ہیروئن اور فلمز حاصل کرتا ہے؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''یس سر! اس کا کہنا ہے کہ یہ اشیا اسے ایک عورت سپلائی کرتی ہے۔ وہ عورت ایک ایسی سیلز ویمن کے روپ میں اس کے گھر آتی ہے جو بظاہر خواتین کے استعمال کی اشیا گھر گھر لے جا کر فروخت کرتی ہے۔ روایت کے مطابق اس کی آمد کے وقت رائے چند گھر پر موجود نہیں ہوتا اور دکان پر رہتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں عورت اس کی بیوی کو ایک پارسل دے کر چلی جاتی ہے اور بدلے میں اس کی بیوی طے شدہ رقم ادا کر دیتی ہے۔'' ماتحت نے جواب دیا۔

''یہ طریقہ کار بہت زیادہ عجیب نہیں ہے یار! مانا کہ عورت احتیاط کے پیشِ نظر اس کی دکان پر آنا مناسب نہیں سمجھتی ہوگی لیکن رائے چند پر گھر میں موجود نہ رہنے کی پابندی کیوں ہے؟ متوسط طبقے کی آبادیوں میں اس طرح سے گھروں پر ساز و سامان فروخت کرنے والی خواتین کی آمد ایک عام سی بات ہے۔ گھریلو خواتین بازاروں کے مقابلے میں اطمینان سے ان خواتین سے خریداری کرنا بہتر سمجھتی ہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے گھر کی آزاد فضا میں آسانی سے جانچ پڑتال کر کے خریداری کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔ بسا اوقات پر اگر گھر میں مرد حضرات موجود ہوں تو خود ہی ایک سائیڈ پر ہو جاتے ہیں چنانچہ اگر یہ سمجھا جائے کہ رائے چند کی موجودگی میں اس عورت کے اس کے گھر آنے سے کسی قسم کے شکوک و شبہات جنم لینے کا

خدشہ تھا، اس لیے اس نے یہ پابندی عائد کی تھی تو کچھ عجیب غیر منطقی سی بات ہو گی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اہتما
خاص اس لیے کیا گیا ہے کہ رائے چند اس عورت کو نہ دیکھ سکے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!..... مجھے بھی یہ معاملہ کچھ عجیب لگا ہے۔'' ماتحت نے اس کی تائید کی۔

''آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں، رائے چند کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' جاوید علی اپنی جگہ سے اُٹھ
اپنے ساتھی کے ساتھ چل پڑا۔

رائے چند تفتیش کے مخصوص کمرے میں ایک اسٹریچر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی اور
اس رائے چند سے قطعی مختلف لگ رہا تھا جسے جاوید علی نے اس کی دکان پر دیکھا تھا۔

''کیا حال ہے رائے چند!..... کیا خیال ہے، تمہاری اس حالت کی فلم بنا کر ان نوجوانوں میں تقسیم کر
جائے جنہیں تم اخلاق باختہ فلمیں دکھا کر تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر انہیں
نصیحت اور ان کے والدین کو سکون حاصل ہو گا کہ ابھی اس ملک میں وہ لوگ موجود ہیں جو اس کے مستقبل
برباد کرنے کی کوشش کرنے والوں کے ہاتھ توڑ دینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں
رائے چند کے لیے سخت نفرت تھی۔ جواب میں رائے چند نے اپنا منہ موڑ لیا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ اس کا سارا دم خم نکال دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے ابھی اس میں بہت جان باقی
اور جب جان باقی ہے تو لازمی ہے، سینے میں کچھ راز بھی باقی ہوں گے۔ اسے چھت سے اُلٹا لٹکا دو تا کہ
اپنے اندر کے راز اُگلنے میں زیادہ مشکل نہ ہو۔''

اس کی زبان سے حکم جاری ہوتے ہی بڑی سرعت سے اس پر عمل ہوا اور فوراً ہی رائے چند چھت پر
ایک آنکڑے کے ساتھ لٹکتی زنجیر میں اُلٹا لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک خاطر مدارت ہو
تھی، اُلٹا لٹکنے سے جہاں اس کا سارا خون چہرے کی طرف سمٹ آیا، وہیں خوف کے بادل بھی چھائے ہو
نظر آنے لگے۔

اُس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے جاوید علی نے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹو
پڑی اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ یہ کمال بجلی کے اس جھٹکے کا تھا جو اس کے پیر کے ساتھ بندھی زنجیر سے گزر
بس لمحے بھر کے لیے اس کے جسم سے گزرا تھا لیکن اُسے ایسے ہلا گیا تھا جیسے زلزلہ زمین کو لرزا کر رکھ دیتا ہے۔

''تم نے عیدِ قرباں پر بکروں کی قربانی ہوتے ہوئے تو دیکھی ہو گی۔ اُنہیں بھی اسی طرح اُلٹا لٹکا کر ا
کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ میرے آدمی کسی قصاب سے کم ماہر نہیں ہیں۔ یہ آرام سے کسی بکرے کی طر
تمہاری کھال اُتار سکتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہو گا کہ بکرے کی کھال اس کی جان نکلنے کے بعد اُتاری جا
ہے اور یہاں کھال اُترنے سے تمہاری جان نکلے گی۔''

اس کے نہایت سفاکی سے ادا کیے گئے جملے ابھی ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک آدمی ہاتھ میں تیز دھا
چھرا لیے رائے چند کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تت..... تم مجھ سے ایسا غیر انسانی سلوک نہیں کر سکتے۔''

رائے چند بجلی کے جھٹکے سے تو سنبھل گیا تھا لیکن زندہ حالت میں کھال اُترنے کے خیال سے دہشت
زدہ ہو کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''انسانوں والا سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، تجھ جیسے درندے کے ساتھ نہیں جس کے کا
کرتوت معصوم زندگیوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ تُو نے کبھی ان معصوموں کا سوچا ہے جو تیرے دیئے ہوئے



اپنی رگوں میں اُتار کر خود بھی لمحہ لمحہ مرتے ہیں اور اپنے محبت کرنے والوں کو بھی جیتے جی مار دیتے ہیں۔
میں مبتلا ایک جوان کی ماں کے دل کی تڑپ اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو تُو اپنی کھال اُتارے جانے
صورت میں محسوس کرے گا۔''

اُس کے لہجے کی سختی اور درشتی میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو اس نے ہاتھ
اٹھا کر رائے چند کے بازو کی جلد پر ایک ہلکا سا چرکا لگایا۔ رائے چند بُری طرح چیخنے لگا۔ اُس کی ان چیخوں
ہونے والی تکلیف سے زیادہ اس دہشت کا دخل تھا کہ اس کے پورے جسم کی کھال کو اسی طرح اُتارا
جانے والا ہے۔

''چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کمرے سے باہر تمہاری آواز نہیں جا سکتی۔ اور اس کمرے
موجود لوگ صرف وہی بات سنتے ہیں جو ان کے کام آ سکے۔'' جاوید علی نے نہایت سرد مہری سے اسے
مطلع فراہم کی۔ کچھ بھی پوچھنے سے قبل وہ اسے اتنا دہشت زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ جھوٹ یا انکار کی گنجائش ہی
نہ رہے۔

''تم مجھ سے پوچھو، میں وہ سب بتاؤں گا جو تم پوچھو گے۔'' حسبِ توقع رائے چند لائن پر آ گیا۔

''تمہیں مال سپلائی کرنے والی عورت کون ہے؟'' اس نے پہلا سوال کیا۔

''میں اُسے نہیں جانتا۔ مجھے اوپر سے حکم تھا کہ جب وہ عورت مال دینے میرے گھر آئے تو میں
موجود نہ رہوں۔ ویسے بھی وہ پہلے سے بتا کر مقررہ وقت پر نہیں آتی۔ میری غیر موجودگی میں اچانک ہی
کبھی آ جاتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''پھر تم اُسے مال کی پے منٹ کیسے دیتے ہو؟''

''میں طے شدہ رقم ہمیشہ اپنے گھر کے سیف میں محفوظ رکھتا ہوں۔ وہاں سے میری پتنی نکال کر اسے
دیتی ہے۔'' وہ شرافت سے جواب دے رہا تھا۔

''اس طریقے سے تمہیں مال کی سپلائی میں پریشانی نہیں ہوتی؟ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہو گا کہ عورت کے
مال لانے سے پہلے ہی تمہارا اسٹاک ختم ہو جائے، اس صورت میں تم کیا کرتے ہو؟''

''ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کبھی ایک دو دن کا فرق پڑ جائے تو پڑ جائے ورنہ زیادہ تر وہ میرا اسٹاک ختم
ہونے سے پہلے ہی نیا مال سپلائی کر دیتی ہے۔''

''تمہیں کبھی تجسس نہیں ہوا کہ اس عورت کو دیکھو؟'' جاوید علی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ
ابھی تک اُلٹا لٹکا ہوا تھا اور بے پناہ سرخ ہوتے اس کے چہرے سے تاثرات کا اندازہ لگانا ذرا مشکل تھا۔

''میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا تو اوپر والے میری کھال میں
بھسا بھروا دیتے۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔

''اوپر والے کون؟'' جاوید علی نے درشتی سے پوچھا۔ جواباً وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''میں نے پوچھا ہے، اوپر والے کون؟'' جاوید علی کی آواز کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کے
ساتھی کا چھرا ایک بار پھر رائے چند کے جسم کی طرف بڑھا۔

''وہی جنہوں نے میرے ذریعے ہسپتال سے اے سی شہریار کے خون اور بالوں کے نمونے منگوائے
تھے۔'' اس نے دہشت زدہ ہو کر جواب دیا لیکن اب بھی ''را'' کا لفظ زبان پر نہ لا سکا۔ البتہ مطلب واضح تھا
اس لیے جاوید علی کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسلحہ، منشیات، اخلاق باختہ فلمیں۔ دشمن ہر رُخ سے وار کر کے انہیں

تباہ کرنے پر تُلا ہوا تھا اور اسے یہ آسانی اس لیے تھی کہ اس ملک میں اس کا ساتھ دینے کے لیے رائے چند اور ریاض انور جیسے کئی غدار موجود تھے۔

''اگر تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا، تب بھی تمہیں تمہاری بیوی نے تو اس کے بارے میں کچھ بتایا ہو گا؟'' اس نے رائے چند کو کریدنے کی کوشش کی کیونکہ ''را'' والوں تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس اب صرف یہی اُمید تھی کہ کسی طرح اس عورت کا سراغ مل جائے۔

''نہیں، وہ عورت چہرے پر نقاب لگا کر آتی تھی اس لیے وہ بھی کچھ نہیں جانتی۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تم کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں بتا سکتے تو ہمارے سامنے صرف تم ہی ہو جس کے ذریعے ہم اپنے دل میں بھڑکتی آگ کو بجھا سکیں..... اُدھیڑ ڈالو اس کو۔ اس کی چیخیں مجھے سکون دیں گی۔''

وہ رائے چند سے بولتے بولتے اچانک اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا جس نے فوراً ہی اُلٹے لٹکتے رائے چند کے جسم پر چھرا چلا دیا۔ چند اِنچ کی کھال کا ٹکڑا کٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ساتھ ہی رائے چند نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن چھرے کو ایک بار پھر اپنے جسم پر محسوس کر کے چیخوں کو قابو کر لیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''رُک جاؤ۔ میں تمہیں ایک کام کی بات بتا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ۔'' جاوید علی کو پہلے ہی یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور چھپائے ہوئے ہے، اس لیے اطمینان سے بولا۔

''یہ سچ ہے کہ مال سپلائی کرنے کے لیے آنے والی عورت نقاب میں آتی تھی لیکن ایک دن اتفاق سے اس کے چہرے سے نقاب سرکنے کے کارن میری پتنی نے اس کی شکل دیکھ لی تھی۔ شکل اُسے یاد رہ گئی اور ایک روز وہ میرے ساتھ خریداری کے لیے باہر نکلی ہوئی تھی تو اُس نے اُس عورت کو دیکھ کر مجھے اُس کے بارے میں بتایا۔ اس وقت وہ عورت نقاب میں نہیں تھی اور بڑے ماڈرن کپڑے پہنے ایک مساج سینٹر میں جا رہی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہاں وہ کسی کام سے گئی تھی یا ملازمت کرتی ہے۔ میں نے تو اوپر والوں کے ایما سے کبھی دوبارہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کیا۔'' آخر اُس نے ایک اہم راز اُگل ہی دیا۔

''اسے نیچے اُتار دو۔'' جاوید علی نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی جس پر پہلے ہی کی طرح سرعت سے عمل کیا گیا۔

''عورت کا حلیہ بتاؤ۔'' رائے چند کو دوبارہ اسٹریچر پر لٹایا گیا تو وہ اس کے مقابل کھڑا ہوتا نرمی سے پوچھنے لگا۔

اس بار اُس نے بغیر کسی مزاحمت کے عورت کا حلیہ تفصیل سے بتا دیا۔

''اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دو۔'' حلیہ معلوم کرنے کے بعد اس نے مزید وہاں رُکنا بیکار سمجھا اور ہدایت کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

''مجھے گولی مار دو پلیز!'' پیچھے سے رائے چند نے اس سے درخواست کی۔ یقیناً وہ اذیتوں سے تنگ آ چکا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہاں سے زندہ رہائی ممکن نہیں اس لیے درد بھرے لہجے میں یہ التجا کر رہا تھا۔

''ابھی انتظار کرو۔ شاید میرے دل میں تمہارے لیے غصہ کچھ کم ہو جائے تو میں تمہیں ایسی آسان موت کا تحفہ دے سکوں۔''

اس نے مڑے بغیر سرد مہری سے جواب دیا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ اس وقت اسے رائے چند کے مستقبل کا



فیصلہ کرنے سے زیادہ اہم کام درپیش تھے اور وہ صرف انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔

⊛----✪----⊛

وہی جانا پہچانا منظر تھا۔

مزار کے احاطے میں کھچا کھچ لوگ بھرے ہوئے تھے اور بڑی عقیدت سے اپنی باری آنے پر نذرانے چڑھا رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی چودھری قیمتی پوشاک میں سب سے شاندار اور اُونچی کرسی پر براجمان تھا اور اس کے اردگرد رکھی دیگر کرسیوں پر اس کے خاص مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ عام لنگر کے علاوہ حویلی کے مہمان خانے میں خاص مہمانوں کے لیے خصوصی دعوت کا بھی اہتمام تھا۔

مریدوں کے ہاتھ جوڑنے اور قدموں سے لپٹ کر اپنی عقیدت کے اظہار کا وہ سلسلہ بھی جاری تھا جو چودھری کے گھمنڈ میں مزید اضافے کا سبب بنتا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود آج اُسے وہ تسکین حاصل نہیں ہو رہی تھی جو ہمیشہ اس موقع پر وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ اس بے چینی اور بے لذتی کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔

سب سے اہم سبب تو یہ تھا کہ اب دل سے اپنے مطلق العنان حاکم ہونے کا احساس مٹنے لگا تھا۔ وہ لاکھ خود کو بہلاتا کہ آج بھی پیر آباد اور گردونواح کے دیہاتوں پر اس کی حکمرانی ہے لیکن دل کو یہ خیال کچوکے لگاتا رہتا تھا کہ وہ خود کسی کے زیر اثر آ چکا ہے اور اپنے فیصلوں کے لیے کچھ اَن دیکھی قوتوں کا محتاج ہے۔ نشیات کے دھندے نے اسے بے تحاشا دولت سے تو ضرور نوازا تھا لیکن ساتھ ہی دوسروں کے زیر نگین ہونے کے ذلت آمیز احساس سے بھی آشنا کر دیا تھا۔

دوسرا ذلت آمیز احساس اپنی جوان بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے کا تھا۔ اگرچہ اب تک عوام کو اس معاملے کے بارے میں ڈھنگ سے کوئی خبر نہیں تھی اور مختلف بہانے بنا کر کشور کے غیاب پر پردے ڈالے جاتے رہے تھے لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات تو ضرور موجود ہوں گے اور کسی کو یقین نہیں آتا ہو گا کہ چودھری نے اپنی سات پردوں میں رہنے والی بیٹی کو امریکہ کے آزاد معاشرے میں رہنے والے اس کے بھائی کے پاس بھیج رکھا ہے۔

اس کے دل کو کچوکے لگانے والا تیسرا احساس مراد شاہ کے رویے کا تھا۔ وہ خاندانی روایات سے بالکل منحرف تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کشور کے سلسلے میں بھی عدم تعاون کی راہ اختیار کی تھی۔ چودھری کا خیال تھا کہ اگر وہ ساتھ دیتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کشور اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

مراد شاہ کے باغی پن کا یہ عالم تھا کہ چودھری نے اس کی تمام تر کوتاہیوں کو نظرانداز کر کے ازخود اسے فون کیا اور عرس کے موقع پر پاکستان آنے کی ہدایت کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ چودھری لاکھ اسے سمجھاتا رہا کہ وہ مستقبل کا گدی نشین ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ خاص مواقع پر یہاں موجود رہ کر تربیت حاصل کرے لیکن وہ نہیں مانا اور صاف کہہ دیا کہ اُسے ایسی جھوٹی عزت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک بھی کہہ ڈالا کہ اگر دادا جی سچ مچ روحانی صلاحیتیں رکھنے والے کوئی نیک بزرگ ہوتے تو وہ ان کے عرس کے موقع پر آنے کا سوچ بھی سکتا تھا لیکن یہ جاننے کی صورت میں کہ دادا جی آخری عمر تک بے راہ روی میں مبتلا رہے اور عیش ونشاط کی محفلیں سجاتے رہے، وہ ہرگز بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے

اس پروگرم میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُس کی ایسی صاف گوئی پر چودھری بڑا تلملایا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیٹا جوان اور خودمختار تھا۔ اور اس کی دولت کی پروا کیے بغیر امریکہ میں اچھی خاصی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے عاق کرنے کی دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر کب سے دانت نکالے بیٹھے اس کا داماد سب ہڑپ کرنے بیٹھ جاتے اور وہ بیٹے سے بھلے کتنا ہی ناراض ہوتا، کسی اور کو اس کی جگہ لیتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی گستاخی کے باوجود خاموش رہنے پر مجبور تھا۔

بظاہر حاکم ہوتے ہوئے مختلف معاملات میں اپنی بے بسی کے احساس نے اُسے بے کیفی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بے کیفی کے اس عالم میں اس نے مزار پر چادر چڑھانے کے ساتھ ساتھ دیگر رائج رسومات کی ادائیگی کی اور اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ حویلی پہنچ گیا۔

ان مہمانوں میں نیا اے سی عمیر آفندی بھی شامل تھا جس کی وہاں خوب آؤ بھگت کی جا رہی تھی اور وہ بظاہر اپنی اس پذیرائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد منشی نے کوشش کی کہ عمیر کو شب بسری کے لیے روک سکے لیکن وہ نجی مصروفیت کا بہانہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہمان البتہ آج رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے اور حسبِ روایت ان کے لیے شراب و شباب کے ساتھ شب بسری کا انتظام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے مختلف علاقوں سے چن چن کر پیشہ ور عورتوں کو جمع کیا گیا تھا ان عورتوں میں سے ایک چودھری کا بھی گرمانے بھی رات گئے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دی گئی۔

شوخ میک اَپ، زرتار لباس اور زیورات سے لدی پھندی وہ عورت بالکل مختلف تھی پھر بھی جانے کیوں عین عرس والی رات اُسے اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر اُسے ماہ بانو یاد آ گئی۔ سیاہ چادر کے ہالے میں میک اپ سے مبرّا، تھکن کا احساس لیے ماہ بانو کے معصوم سے چہرے اور اس پیشہ ور عورت کے مکار مسکراہٹ والے چہرے میں کوئی قدر مشترک نہ ہونے کے باوجود اسے ماہ بانو یاد آئی تو احساسِ شکست بھی جاگ اُٹھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ماہ بانو کی اپنی زندگی میں آمد کے اس پہلے روز وہ پہلی بار شکست کے احساس سے دوچار ہوا اور اس کے بعد پے در پے اسے کئی مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یعنی ماہ بانو وہ پہلی ہستی تھی جو شگون بن کر اس کی زندگی پر چھا گئی تھی۔ اس کا خیال دل میں آیا تو پھر وہ جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو گیا۔ شراب نے پہلے ہی حواس کو معطل کر رکھا تھا۔

اس عورت کو دیکھ کر ماہ بانو کیا یاد آئی، اسی پر ماہ بانو کا گمان ہونے لگا اور دل میں اسے توڑ پھوڑ کر دینے کی خواہش اس تیزی سے اُبھری کہ خود پر قابو نہ رہا۔ اوّل اوّل تو اس عورت نے اُس کی جارحیت برداشت کیا کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ایسے کئی گاہکوں سے نمٹ چکی تھی جو ذرا متشدد طبیعت کے مالک ہوتے تھے لیکن چودھری تو جیسے اس کا انجر پنجر ڈھیلا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ لاکھ بچاؤ کی کوشش کرتی رہی، چاہا کہ اپنی مہارت سے چودھری کے جنون کو قابو میں کر لے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی اور آخر کار خوف زدہ ہو کر چیخنے چلّانے لگی۔

اس کی چیخ و پکار کی آوازیں کمرے سے باہر تک سنی گئیں لیکن کس کی ہمت تھی کہ چودھری کی خواب گاہ میں داخل ہوتا۔ چیخ و پکار کی یہ آوازیں اتنی بڑھیں کہ حویلی کی اوپری منزل تک بھی جا پہنچیں۔ بچے کو سلانے کی کوشش میں فریدہ ان آوازوں کو سن کر چونکی اور انہونی کے احساس سے حقیقت جاننے کے لیے نیچے آئی۔ نیچے آ کر اُسے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ آوازیں چودھری کی خواب گاہ سے آ رہی ہیں۔



وہ چودھری کے ملازمین اور چھوٹی چودھرائن کی طرح اس سے ڈرنے اور دبنے والی نہیں تھی کہ کان لپیٹ کر خاموش کھڑی رہتی۔ وہ کسی شیرنی کی طرح غصے میں چلتی چودھری کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچی اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

نشے اور انتقام سے بدمست چودھری اس مداخلت پر ہوش میں آیا لیکن اس وقت تک خاصی دیر ہو چکی تھی اور زخموں سے لہولہان عورت بستر پر پڑی اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔

''اسے دیکھو اور فوراً کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' اُس نے غرّانے والے انداز میں اپنے پیچھے کھڑے منشی کو حکم دیا۔ اگرچہ وہ حویلی کے مکینوں میں شاید سب سے کم حیثیت اور اختیارات کی مالک تھی لیکن تھی تو بہرحال حویلی کی بہو۔ اور وہ بھی اس وقت ایسے کرّ و فر سے بات کر رہی تھی کہ اُس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فوراً ہی ایک گاڑی ڈاکٹر کو لانے کے لیے روانہ کی گئی اور عورت کو ایک چادر میں لپیٹ کر دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا۔ چودھری اس دوران بالکل خاموش کھڑا رہا۔

''آج تو تُو اپنے پیروں پر کھڑا ہے چودھری! لیکن اُس دن سے ڈر جب قدرت تجھ سے تیری سیاہ کاریوں کا انتقام لینے پر تُل جائے گی۔''

فریدہ نے اُسے دہکتی نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت سے کہا اور ایک جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل کر اوپری منزل کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں اس کا کردار ختم ہو چکا تھا اور اب یہ اس عورت کی قسمت پر منحصر تھا کہ وہ زندہ بچتی ہے یا نہیں۔

مرکزِ صحت سے ڈاکٹر داور، ڈرائیور کے ساتھ حویلی پہنچے تو زخمی طوائف آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی سی کوشش کی لیکن اس کی ٹوٹتی سانسوں کی ڈوری کو دوبارہ نہ جوڑ سکے۔

''یہ ختم ہو گئی ہے۔'' انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے منشی کو اطلاع دی اور واپسی کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے انہیں یہ سمجھنے میں قطعی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حویلی میں جنم لینے والی ایسی داستانیں حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی دفن کر دی جاتی ہیں اور انہیں قطعی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حویلی والوں کو اس کیس کو پولیس تک لے جانے کا مشورہ دے سکیں۔

ان کے واپس جاتے ہی باقی کے معاملات منشی نے سنبھال لئے۔ فوراً ہی حویلی کی ملازماؤں کی مدد سے عورت کو غسل دے کر اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ دیا گیا اور صبح ہونے سے قبل ہی اُس نائیکہ کو حویلی بلا لیا گیا جس کے کوٹھے سے وہ عورت منگوائی گئی تھی۔ اپنی ایک ساتھی کی موت کی خبر سن کر وہ بری طرح بپھر گئی۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا بائی جی! ہمیں معلوم ہے تمہارا بڑا نقصان ہوا ہے اور ہم اس نقصان کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم قیمت بولو۔ ہم بغیر کسی اعتراض کے ادا کر دیں گے۔'' منشی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے روکا اور دوٹوک لہجے میں پیشکش کی۔

نائیکہ تجربہ کار تھی اور ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانا جانتی تھی چنانچہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑے درد بھرے لہجے میں بولی۔

''انسان کا بھی کبھی کوئی مول ہوا ہے منشی جی! اور یہ تو میرے کوٹھے کا سب سے انمول ہیرا تھا جو آپ لوگوں نے برباد کر دیا۔''

''کہا ہے نا کہ اس ہیرے کی قیمت بتاؤ۔ تم جو مانگو گی، ادا کیا جائے گا۔''

منشی کو بھی ہر حال میں یہ معاملہ نمٹانا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں چودھری ایسے کسی اسکینڈل کو سہارنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

''صرف میری گل تو نہیں ہے نا منشی جی! اس کا ایک بھائی بھی ہے جو میرے کوٹھے پر ہی طبلہ بجاتا ہے۔ وہ بھلا کیسے اپنی بہن کی قیمت لینے پر راضی ہوگا؟'' نائیکہ نے فوراً مظلوم شکل بنالی۔

''کیسے راضی نہیں ہوگا؟ جو آدمی اپنی بہن کو ہر رات نئے آدمی کی سیج سجانے کی قیمت وصول کرسکتا ہے وہ اس کے مُردہ جسم کی قیمت کیسے وصول نہیں کرے گا؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ایسے خونی رشتوں کو۔ تمہارے ہاں ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر اس کا بھائی کوئی اعتراض کرے تو اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔ اس کے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ موقع کا فائدہ اُٹھا کر قیمت وصول کرلے ورنہ بعد میں رونے پیٹنے کے سوا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

منشی نے اسے عقل کی راہ دکھائی تو نائیکہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کرڈالا۔ اُس کا مطالبہ سن کر منشی کچھ کہے بغیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو منشی جی! میں نے زیادہ رقم نہیں بتائی۔ اپنا نقصان پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس رقم میں سے اس کے بھائی کو بھی تو حصہ دینا پڑے گا ورنہ وہ اپنا منہ کیسے بند رکھے گا؟'' وہ بھی جانتی تھی کہ رقم بہت بڑی ہے اس لیے منشی کی خاموشی پر اپنے حق میں دلیل دینے لگی۔

''میں اور تُو دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تُو نے جو مانگا ہے، وہ تیری اوقات سے بہت زیادہ ہے لیکن میں نے تجھے زبان دے دی ہے۔ اس لیے اطمینان رکھ کہ تیرا مطالبہ ضرور پورا ہوگا۔ اب یہاں سے اُٹھ اور لاش لے کر یہاں سے روانہ ہوجا۔''

منشی نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا تو وہ خوشی سے اپنی باچھوں کو پھیل جانے سے بمشکل روک سکی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو رقم وصول ہونے والی ہے، وہ اتنی زیادہ ہے جو وہ طوائف ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی اسے کما کر نہیں دے سکتی تھی۔ رہا اس کے بھائی کا حصہ تو کوٹھے پر بے دام غلام بن کر کام کرنے والا وہ سولہ سترہ سالہ لڑکا بھلا اُس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ وہ سیدھا سادہ جوان تو دو وقت کی روٹی کے لیے بھی اس کا محتاج تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لاش کے ساتھ حویلی سے خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ زرتار لباس میں سج سنور کر چوراہوں پر دل جیت لینے کی خواہش سینے میں لے کر آنے والی طوائف کو کہاں علم تھا کہ جب وہ اس حویلی سے لوٹے گی تو اپنی زندگی کی بازی ہار کر سفید کفن میں لپٹی واپس جارہی ہوگی۔ اور یہ تو دنیا میں آنے والے ہر نفس کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ واپسی میں اپنے ساتھ کیا لے کر لوٹے گا۔ وہ تو بس دنیا جیت لینے کی خواہش میں یہاں رائج اصولوں کی تال پر کسی طوائف کی طرح دیوانہ وار ناچتا رہتا ہے اور جب یہ رقص رُکتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں میں چبھے کانٹوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

⊛-----✪-----⊛

ممبئی ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر وہ دونوں باہر آئے تو فوراً ہی ایک ٹیکسی ان کے سامنے آرُکی۔

''شیواجی ہوٹل۔'' سلّو نے اُسے بتایا۔ ممبئی اُس کا دیکھا بھالا شہر تھا اور یہاں کے بارے میں وہ ہر معلومات رکھتا تھا۔ سفر کے دوران ہی اس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر ممبئی پہنچ کر شیواجی ہوٹل میں قیام کیا جائے



تو بہتر رہے گا۔ اس لیے سلّو نے چھوٹتے ہی ٹیکسی والے سے اس ہوٹل کا نام لیا اور معاملات طے ہونے پر دونوں ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔

سلّو نے ابھی بیٹھنے کے بعد اپنی طرف کا دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ ایک لڑکی کھلے دروازے سے آندھی طوفان کی طرح ٹیکسی میں گھس گئی اور تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ بند کرلیا۔

''او میڈم!.....کون ہو تم؟'' اُس کی جرأت پر سلّو نے غرّا کر پوچھا۔

''مجھے اندو کہتے ہیں۔ تم لوگ شیواجی جارہے ہو تو میں نے سوچا تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ اکیلی ہوں الگ ٹیکسی لے کر کیا کروں گی؟'' اُس کا اطمینان قابلِ دید تھا اور ایسے دوستانہ لہجے میں بتا رہی تھی جیسے برسوں سے برسوں کی آشنائی ہو۔

''پر ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے۔ تمہیں پھوکٹ (مفت) کی ٹیکسی چاہیے تو کوئی اور بندہ تلاش کرلو۔'' سلّو کو طیش آگیا۔

اس دوران ٹیکسی ڈرائیور اور شہریار دونوں خاموش رہے تھے۔ ڈرائیور شاید اس لیے کہ یہ اس کا معاملہ نہیں تھا اور شہریار اس لیے کہ وہ خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی متناسب جسامت کی مالک تھی اور اس نے چست جینز پر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے شانوں تک آتے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کے علاوہ اس نے کسی قسم کا سنگھار نہیں کر رکھا تھا۔ البتہ اپنے بے نقوش کی وجہ سے وہ اس عالم میں اچھی لگ رہی تھی لیکن پھر بھی اس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ مردوں کو لبھانے کے لیے گھر سے نکلنے والی کوئی پیشہ ور عورت نہیں تھی۔ اپنے بے باکانہ رویے کے باوجود وہ کچھ مختلف اور منفرد لگ رہی تھی۔

''تم تو بڑے اِل مینرڈ آدمی ہو۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے اپنے جسم کو یوں جنبش دی جیسے ٹیکسی سے اترنے لگی ہو لیکن پھر پلک جھپکتے میں اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا پسٹل نکال لیا۔

''چلو، اب شرافت سے چل پڑو۔'' اُس نے پسٹل سلّو کے پہلو سے لگا کر حکم دیا تو وہ کچھ اور بھی طیش میں نظر آنے لگا اور یوں محسوس ہوا کہ پسٹل کی پروا کیے بغیر اندو نامی اس لڑکی پر پل پڑے گا۔ اُس کی اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے شہریار نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے سے باز رہنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ وہ پہلے ہی انجن اسٹارٹ کرچکا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی بڑھا دی۔

''مجھے صرف تم سے لفٹ چاہیے تھی۔ اگر تم ویسے ہی مان جاتے تو مجھے یہ نہیں نکالنا پڑتا۔'' ٹیکسی ممبئی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی تو اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں وضاحتی جملہ ادا کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں لفٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کرائے کا پرابلم تو ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو مان نہیں سکتا کہ اتنا مہنگا پسٹل رکھنے والی کا پرس خالی ہوگا۔'' سلّو نے بھی اس دوران اپنے آپ کو کسی حد تک پُرسکون کرلیا تھا چنانچہ اپنے تجسس کو زبان دی۔

''لگتا ہے اسلحے کے بارے میں خاصی جانکاری رکھتے ہو۔ کس گروپ کے بندے ہو؟'' اس کے سوال میں سے اپنے مطلب کا نکتہ چن کر اس نے اُلٹا سلّو پر سوال داغا۔

اس سوال سے اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی خطرناک ہے اور اس سے زیادہ بات چیت کرنا مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے اس لیے بنا جواب دیئے چہرہ دوسری طرف موڑ کر اردگرد سے گزرتے ٹریفک کا جائزہ لینے لگا۔

اُس کی اس ادا پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی ضرور لیکن پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شیوا جی ہوٹل پہنچ کر ان کا سفر ختم ہوگیا۔

ٹیکسی رُکنے پر اس نے اُترنے سے پہلے اپنا پرس کھول کر اس میں سے چند نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اُچھالے اور پھر اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے سلّو سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے پیسوں کا کوئی پرابلم نہیں ہے پھر بھی تھینکس فار دی لفٹ۔'' وہ جیسے آندھی کی طرح ان کی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی، ویسے ہی اپنی بات کہہ کر آناً فاناً ٹیکسی سے اُتری اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''لڑکی تھی یا کوئی چھلاوا؟'' ٹیکسی ڈرائیور بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ان دونوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے شانے اُچکا کر خود بھی ٹیکسی سے اُتر گئے۔

اس وقت وہ دونوں ہی نفاست سے سلے قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں سفری بیگ کے بجائے اچھی کوالٹی کے بریف کیس تھام رکھے تھے۔ حلیے میں یہ تبدیلی انہوں نے سفر کے دوران کی تھی۔ اب کوئی اُنہیں دیکھتا تو یہی اندازہ لگاتا کہ وہ معزز کاروباری افراد ہیں۔

ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی خوش اخلاقی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی مرضی کے مطابق انہیں دو سنگل بیڈ والے کمرے فراہم کر دیئے۔

کمروں کے حصول کے لیے اُنہیں کوئی دشواری اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ اب ان کے پاس شناختی کاغذات موجود تھے جن کی موجودگی میں ہوٹل کی انتظامیہ کو انہیں کمرے فراہم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔

کمرے مل جانے پر انہوں نے سب سے پہلے فریش ہو کر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ انہیں کہاں سے باقاعدہ کام کا آغاز کرنا ہے، اس سلسلے میں ان کو معلومات دہلی میں ہی حاصل ہوگئی تھیں۔

ڈاکٹر فرحان جمیل کی تلاش کا آغاز انہوں نے اس انسپکٹر سے کرنے کا فیصلہ کیا جس نے ان پر الزام لگنے کے بعد انہیں گرفتار کیا تھا اور بعد میں کیس کا رخ موڑ کر انہیں پاکستانی جاسوس قرار دے دیا تھا۔ انہیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہ انسپکٹر اب نہ صرف ترقی پا چکا تھا بلکہ ایک چھوٹے علاقے سے ممبئی جیسے شہر ٹرانسفر کیا جا چکا تھا۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ معنی خیز تھیں۔ فرحان جمیل کے کیس پر کام کرنے کے بعد انسپکٹر پریم ناتھ کی جیبیں بھی نوٹوں سے بھر گئی تھیں تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں تو انعام زیادہ ہی ملا تھا۔ ایک طرف ترقی ہوئی تھی تو دوسری طرف وہ ممبئی جیسے شہر پہنچ گیا تھا جہاں یقیناً دن دُگنی رات چوگنی کمائی کھا رہا تھا۔

غسل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھالیا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اس لیے ہر کام اطمینان سے کر رہے تھے۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق پریم ناتھ عموماً رات گیارہ بجے کے بعد اپنے گھر سے نکل کر روزانہ ایک نائٹ کلب جایا کرتا تھا۔ یہ ایسا وقت ہوتا تھا جب اس کے ساتھ ایک سپاہی کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ انہیں یہ معلومات ممبئی میں مقیم اپنے ایک آدمی سے حاصل ہوئی تھیں۔ دہلی کی طرح یہاں وہ شخص ان کی مدد کے لیے موجود تھا۔ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر انہیں مطلوبہ اسلحہ اور محفوظ ٹھکانہ فراہم کرے۔



اپنے طور پر وہ کافی عرصے سے پریم ناتھ کی نگرانی بھی کر رہا تھا لیکن اُسے براہِ راست چھیڑنے کا مجاز نہیں تھا۔ اسے ممبئی میں رہ کر ایک عرصے تک اپنی مخصوص خدمات انجام دینی تھیں اس لیے اس کے نظروں میں آنے کا خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا تھا۔ ان کی پشت پر رہ کر وہ ان کی جتنی مدد کر سکتا تھا، کرتا لیکن اصل ایکشن انہیں ہی لینا تھا۔

کھانے کے دوران وہ اپنا لائحہ عمل طے کر چکے تھے۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد اُنہیں کہیں سے ایک گاڑی اور موٹر بائیک چرانی تھی۔ ان چوری شدہ سواریوں میں ہی وہ پریم ناتھ کے اغوا کی مہم پر نکلتے اور اسے لے کر اس ٹھکانے پر پہنچ جاتے جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے حاصل کیا جا چکا تھا۔ اپنے طور پر ان کی منصوبہ بندی مکمل تھی اور وہ اس مہم پر بس نکلنے ہی والے تھے کہ وہ ہوگیا جس کی اُنہیں قطعی توقع نہیں تھی۔

کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ روم سروس کے الفاظ سن کر دروازہ کھولنے کے لیے جانے والا سلّو گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں بیرے کے بجائے چند مسلح افراد سے سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے تو پورے اطمینان سے بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے صرف اس لیے دروازہ کھول دیا تھا کہ چند لمحے قبل خود اس نے انٹرکام پر روم سروس سے رابطہ کر کے برتن لے جانے کو کہا تھا۔ لیکن اب تین مسلح افراد اسے دھکیلتے ہوئے کمرے کے اندر گھسے چلے آئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟' دونوں ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا شہریار بھی اس افتاد پر بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنے پر معلوم ہوگا۔'' ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟.....ہم تمہارے ساتھ کیوں جائیں گے؟.....آخر ہمارا قصور کیا ہے؟'' بحث میں اُلجھا کر شہریار ایک طرف تو ان کا جائزہ لے رہا تھا اور دوسری طرف اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر کس زاویے سے ان پر حملہ کر کے اپنا بچاؤ کیا جا سکتا ہے۔

اپنے حلیوں اور بول چال سے وہ کوئی سرکاری آدمی نہیں لگتے تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی گینگ سے متعلق ہیں۔ گینگ کا خیال آنے پر فطری طور پر اس کا ذہن نادر دادا کی طرف چلا گیا۔

دہلی میں عائشہ نامی جس ویٹریس کو بچانے کے لیے وہ نادر دادا کے غنڈوں سے جھگڑ بیٹھے تھے، اُس نے انہیں یہی بتایا تھا کہ دو اجنبیوں کے ہاتھوں اپنے گُرگوں کی وہ شکست اس کے لیے سخت بے عزتی کا باعث بنی ہوگی اور وہ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان سے انتقام لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ غیر ضروری مسئلوں میں نہیں اُلجھنا چاہتے تھے اس لیے نادر دادا کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے فوری طور پر دہلی سے فرار ہو کر ممبئی پہنچ گئے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر ابھی اُنہیں یہاں پہنچے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ انہیں گھیر لیا گیا تھا۔

ان تینوں مسلح افراد کی مشاقی اُن کے کھڑے ہونے کے انداز، اسلحے پر گرفت اور نظروں کی تیزی سے بخوبی ظاہر ہو رہی تھی۔ انہوں نے اتنی مہارت سے ان دونوں کو کور کیا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سی حرکت کرتا تو نظر میں آئے بنا نہ رہ پاتا۔

''تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب بھائی جی کے سامنے پہنچ کر ملیں گے۔ ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ تمہیں یہاں سے اُن تک پہنچا دیا جائے۔ اب یہ تم پر ہے کہ سیدھے طریقے سے چلتے ہو یا ہم تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہیں اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لے جائیں۔''

اسی شخص نے اسے جواب دیا جواب تک گفتگو کر رہا تھا۔ شہریار نے ایک نظر سلّو کی طرف دیکھا۔ وہ ا
انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

اسے سلّو کی مہارت پر کوئی شبہ نہیں تھا اور جانتا تھا کہ بے شک اس وقت وہ بری طرح گھرے ہو
ہیں اور ان کا اسلحہ بھی بریف کیس میں بند ہے، اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ وہ دونوں مل کر ان تینوں کو ا
کر لیں۔ لیکن ابھی صورتِ حال مکمل طور پر ان پر واضح نہیں تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کمرے میں موجود
تین مسلح افراد کے علاوہ ان کے کتنے ساتھی ہیں جو باہر مدد کے لیے موجود ہیں۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ
اس وقت ایک اچھے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے کمروں میں پہنچنے والے مسلح افراد اتنی طاقت
رسائی والے تو ہو سکتے تھے کہ ان کے یوں دندناتے ہوئے ہوٹل میں گھس آنے اور دو مہمانوں کو بزور اسلحہ
کر کے لے جانے پر ہوٹل کی انتظامیہ خاموش رہتی۔ لیکن یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان غنڈوں کو ا
کر کے ہوٹل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے تو انتظامیہ پولیس کو آگاہ نہیں کرتی اور وہ پولیس کی نظروں
کسی صورت نہیں آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس نے سلّو کو ٹھنڈا رہنے اور کچھ نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ
کر وہ ریلیکس ہو گیا اور یوں شانے اچکائے جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو کہ یہاں سے نکال
کس جگہ لے جایا جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے سے
تمہیں اس بات کا احساس ہو گا کہ تم غلط آدمیوں کو لے گئے ہو۔''

اس نے اپنے ساتھ کھڑے مسلح افراد کو اپنے بنا مزاحمت کے ساتھ چلنے کا عندیہ دیا تو انہیں آگے
کا حکم دیا گیا۔ حکم دینے والوں نے ان کے ہاتھ اوپر نہیں اُٹھوائے تھے اور نہ ہی باندھنے وغیرہ کی کوشش کی
جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے سامنے کسی کی اتنی مجال
ہو سکتی کہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر سکے۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو شہریار کو اپنے فیصلے کی درستگی کا اندازہ ہوا کمرے سے نکلتے ہی
کوریڈور میں چوکس کھڑا ایک مسلح فرد نظر آ گیا۔ دو کو انہوں نے لفٹ سے نیچے جانے کے بعد ہال میں دیکھا
وہاں ہوٹل کا عملہ اور کچھ گاہک بھی موجود تھے اور خاصے سراسیمہ نظر آتے تھے۔

وہ باہر نکلے تو ایک تاریک شیشوں والی گاڑی اور دو تین موٹر سائیکلیں ان کی منتظر تھیں۔ انہیں گاڑی
سوار کروا کر دو افراد ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ تیسرا ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو
گاڑی میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا اور گاڑی اسٹارٹ بھی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے اسے
سے آگے بڑھا دیا۔ پیچھے موٹر سائیکلیں بھی غراتی ہوئی آگے بڑھیں۔

یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ وہ جس گاڑی میں سوار تھے، اس میں جدید اسلحے سے لیس تین
بالکل چوکس بیٹھے تھے۔ چوتھا فرد ڈرائیور تھا اور یقینی طور پر وہ بھی مسلح تھا۔ وہ کسی طور گاڑی میں موجود ان
پر قابو پا بھی لیتے تو ان موٹر سائیکل سواروں کا کیا کرتے جو گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اگر
گاڑی میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت محسوس کرتے تو ان کی گنوں کے دہانے شعلے اُگلنے لگتے۔ وہ یہ جانے
کس جرم کی پاداش میں پکڑے گئے تھے، اپنی جان سے چلے جاتے۔ ایسی موت مرنے سے یہی بہتر تھا کہ
کچھ انتظار کر لیتے کہ شاید تقدیر کوئی بہتر موقع عنایت کر دے۔ ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے
موجود ہتھیار ان بریف کیسوں میں بند تھے جو اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص کے قدموں میں پڑے تھے۔ انہیں



کمرے سے نکال کر لاتے ہوئے انہوں نے ان کے بریف کیس بھی ساتھ لے لیے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا
ہوٹل میں الگ الگ کمرے لینے کے باوجود وہ دونوں نہ صرف کھانے کی غرض سے ایک کمرے میں جمع
بلکہ انہوں نے اپنے بریف کیس بھی ساتھ رکھے تھے۔ بریف کیس مخصوص نمبروں سے کھلنے والے تھے اس
ری طور پر تو یہ خدشہ نہیں تھا کہ انہیں کھول لیے جانے کی صورت میں ان کی ذات کچھ اور مشکوک ٹھہرے
لیکن فی الحال وہ خود بھی استفادہ حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

موٹر سائیکلوں کی جلو میں گاڑی انہیں لیے نہ جانے کس سمت دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کچھ فاصلہ اور طے
تو اگلی سیٹ پر تن کے بیٹھے شخص نے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں فیکے! کیا پوزیشن ہے؟..... کوئی نظر تو نہیں آیا؟''

''ٹھیک ہے..... مجھے بھی کوئی دکھائی نہیں پڑا۔ تم لوگ نکلو ادھر سے۔ اپن انہیں بھائی جی کے پاس لے
پہنچتے ہیں۔''

اس نے یہ جملے کس سے کہے ہیں، انہیں اس کا اندازہ کچھ دیر میں اس وقت ہو گیا جب گاڑی کے پیچھے
ہوئے موٹر سائیکل سواروں کو ایک ایک کر کے غائب ہوتے دیکھا۔

''تم لوگ آخر ہمیں کیوں اور کس بھائی جی کے پاس لے جا رہے ہو؟..... ہم سیدھے سادے کاروباری
ل ہیں۔ ہمارا کسی جھگڑے پھڈے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہوتے ہی کچھ آس بندھی تو شہریار نے موقع کی تلاش میں گفتگو کا آغاز
یا۔ اتنی دیر میں وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ انہیں یوں ہوٹل کے کمرے سے اُٹھوا لینے میں انڈر ورلڈ کے کسی بندے
ا ہے۔ لیکن ظاہر ہے وہ ایسے کسی جھگڑے میں پھنسنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے اس کی کوشش تھی
کسی طرح ان لوگوں سے یہیں جان چھڑا لے۔ انہیں باتوں میں لگانے کی صورت میں ایسا کوئی موقع مل
تا تھا جب اسے اور سلّو کو ایکشن میں آنے کا موقع مل جاتا۔ موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہونے کے بعد
امید سی بندھ گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح گاڑی میں موجود لوگوں سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے تو یہاں سے
ر ہو جائیں گے۔

''بولا تھا نا کہ بھائی جی کے سامنے پہنچ کر سب پتہ چل جائے گا۔ پھر کیوں میرے کان کھا رہا ہے؟''
سیٹ پر سوار شخص نے اجڈ پن سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''دیکھو اگر تم پیسے وغیرہ کے چکر میں ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہو تو سمجھ لو کہ ہم کوئی بہت بڑے
ں مین نہیں ہیں۔ بس چھوٹا سا بیوپار ہے۔ تم نے ہمارے گھر والوں سے تاوان مانگا بھی تو وہ دو چار لاکھ
زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکیں گے۔''

اس شخص کے لہجے کی پروا کیے بغیر شہریار نے اس سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا جس پر وہ کچھ طیش میں آ
اور پلٹ کر غصے سے بولا۔

''سالے! تجھے بولا ہے نا چپ رہ۔ پھر کیوں بک بک کیے جا رہا ہے؟''

''بڑے بھائی سے گالی دے کر بات مت کرو۔ ورنہ میں تمہاری ان گنوں کی پروا کیے بغیر تمہارا گلا دبا
ں گا۔'' سلّو کا ذہن بہت تیز تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ شہریار کیا چاہ رہا ہے اس لیے اس کا ساتھ دینے پر
ربستہ ہو گیا اور ایسی بات کی کہ اس شخص کے اشتعال میں مزید اضافہ ہو جائے۔ یہ تو اب تک طے ہو چکا تھا
وہ لوگ انہیں کسی بھائی جی تک زندہ لے جانے کے پابند ہیں اس لیے مشتعل ہونے کی صورت میں بھی

زیادہ سے زیادہ انہیں زخمی یا بے ہوش کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن جان سے نہیں مارا جاتا.....اور جب ان کے پاس اپنی جان کی سلامتی کی ضمانت تھی تو تھوڑا رِسک لینے میں کیا حرج تھا؟

''گلا دبائے گا.....میرا گلا دبائے گا؟.....میں تیرے ہاتھ توڑ کر ہڈیوں کے اتنے ٹکڑے کر دوں گا کہ تیرے اس بھائی سے گنے بھی نہیں جائیں گے۔'' حسبِ توقع وہ سخت مشتعل ہو گیا اور پیچھے مڑ کر سلّو پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

ان دونوں کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے اس کے آدمیوں کو بھی سلّو کی جسارت یقیناً گراں گزری تھی اس لیے ان کے چہروں کے عضلات بھی تن گئے تھے اور توجہ پوری طرح ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ایسے میں جب ان کی چلتی گاڑی کے عین سامنے کچھ فاصلے پر دھماکا ہوا تو کوئی بھی خود کو سنبھال نہیں سکا اور سڑک کی روانی سے دوڑتی ہوئی گاڑی بری طرح لہرا گئی۔

دھماکے کی نوعیت کیا تھی اور کس نے اور کیوں یہ دھماکا کیا تھا، سلّو اور شہریار کے پاس ان سوالوں میں اُلجھنے کی فرصت نہیں تھی انہیں ایک موقع ملا تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کر سکتے تھے۔ آگے والا تو پہلے ہی اس وجہ سے مشکل میں پھنس گیا تھا کہ سلّو پر مڑ کر حملہ کرنے کی کوشش میں اس کا زاویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑا تو اسے زوردار جھٹکا لگا اور اس کا سر دروازے سے جا ٹکرایا۔ ڈرائیور لہراتی گاڑی کو سنبھالنے کی فکر میں ہلکان تھا اس لیے انہیں بس ان دو سے ہی نمٹنا تھا جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ اگرچہ گاڑی کو جھٹکا لگنے سے وہ دونوں خود بھی کسی قدر متاثر ہوئے تھے لیکن درمیان میں پھنس کر بیٹھے ہونے کی وجہ سے ان کا توازن زیادہ نہیں بگڑا تھا چنانچہ وہ خود کو سنبھال کر اپنی اپنی طرف موجود بندوں سے بھڑ گئے تھے۔

اس موقع پر انہیں ایک بار پھر غیبی مدد ملی اور گاڑی جس پر ڈرائیور کسی حد تک قابو پا چکا تھا، ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دوبارہ ڈگمگائی۔ اس کے ساتھ ہی فوراً ہی ایک اور دھماکا سنائی دیا اور گاڑی رک گئی۔ ان کے کان مؤخر الذکر دونوں دھماکوں کی نوعیت کو شناخت کر سکتے تھے۔ یہ گاڑی کے ٹائروں کے پھٹنے کے نتیجے میں گونجنے والے دھماکے تھے جن کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کہیں سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آ کر پھٹے ہیں۔

گاڑی رکتے ہی ڈرائیور اور اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود شخص نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ان کی کوشش تھی کہ خود کو دروازے کی اوٹ میں رکھیں۔ لیکن ان کی قسمت خراب تھی کہ ان کی توقع کے خلاف پیچھے سے دو برسٹ چلے اور ان دونوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اصل میں اب تک ہونے والی کارروائی کے نتیجے میں انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ حملہ آور سامنے کے رخ پر موجود ہیں لیکن وہ پیچھے بھی موجود تھے اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر بڑی آسانی سے لقمۂ اجل بنا دیا تھا۔ ادھر پیچھے والے افراد پر سلّو اور شہریار آفت بن کر ٹوٹے ہوئے تھے۔

سلّو نے اپنے مقابل کے چہرے پر تابڑ توڑ مکے برسا کر اُس کی ناک کی ہڈی توڑنے کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک آنکھ بھی مضروب نظر آ رہی تھی۔ جواب میں اس نے بھی ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی تھی اور پہلے گھونسے کے بعد ہی سلّو کے شانے پر اپنی گن سے ایک زوردار ضرب لگائی تھی لیکن اس کے بعد اسے کوئی موقع نہیں ملا۔ سلّو نے نہ صرف اسے گن سے محروم کر دیا تھا بلکہ اتنی ضربیں بھی لگا دی تھی کہ اگر اسے باہر گولیوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ خود اسے چھوڑ کر گاڑی سے نکل بھاگتا۔ بہرحال



اس کو تو مقابلے پر ڈٹے رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس مقابلے میں شہریار اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ اس کے حصے میں آنے والے آدمی کی گن جھٹکے کی وجہ سے پہلے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بلا خوف و خطر اس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ البتہ اس کا دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سخت جان تھا۔ شہریار نے موقع ملنے پر اس کے آگے کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر مارا تو ضرب کی شدت کی وجہ سے اس کا سر پیچھے سے کھل گیا لیکن وہ مقابلے پر ڈٹا رہا اور اپنی انگلیوں سے اس طرح شہریار کا گلا جکڑ لیا کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

مقابل کے اس داؤ سے خود کو نکالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر مارنے کی کوشش کی لیکن پہلے کی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ ادھر وہ تھا کہ اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا جس کی وجہ سے شہریار کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔

اس سے قبل کہ اس کے حواس جواب دے جاتے، اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے مقابل کے سر پر موجود مقام پر دونوں ہاتھوں سے ضربیں لگانی شروع کر دیں جہاں سے اس کا سر چوٹ کھا کر پھٹ گیا۔ زخمی جگہ پر لگائی جانے والی ان ضربوں پر وہ بلبلا اٹھا اور شہریار کے گلے پر اس کی گرفت قدرے کمزور پڑ گئی۔ اگر اس وقت وہ لوگ گاڑی کی محدود فضا کے بجائے کسی کھلی جگہ پر ہوتے تو ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیروں سے کام لینے کا بھی موقع مل جاتا لیکن فی الحال تو ہر ایک ہی کھل کر لڑنے سے قاصر تھا۔

''تم چاروں گاڑی سے باہر نکل آؤ اور یاد رکھنا کہ اگر کسی نے بھی اُلٹی سیدھی حرکت کی تو سیدھا اوپر پہنچا دیا جائے گا۔''

اس سے قبل کہ اندر جاری کشمکش کسی فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہوتی، دائیں بائیں سے دروازے کھولے گئے اور دو گن بردار اُن کے سروں پر آ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر سلّو کی عجیب مضحکہ خیز حالت ہو گئی۔ عین اس وقت جب دروازہ کھولا گیا، سلّو نے اسے ایک اور زوردار مُکا رسید کر دیا۔ مُکا کھا کر وہ پیچھے کی طرف اُلٹا اور دروازہ کھلنے کے نتیجے میں اس کا آدھا جسم گاڑی سے باہر لٹک گیا جبکہ ٹانگیں اندر ہی پھنسی رہیں۔ سلّو نے اُترنے کا راستہ بنانے کے لیے اسے ٹانگ سے ضرب لگاتے ہوئے نیچے دھکیلا اور پھر خود بھی اُتر گیا۔ اس دوران شہریار اور اس کا مقابل بھی دوسری طرف سے اُتر چکے تھے۔

سلّو اور شہریار کو معلوم نہیں تھا کہ اچانک حملہ کر کے مداخلت کرنے والے لوگ کون تھے؟ اور وہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آتے؟ فی الحال تو ان کی ہدایت پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں تھا چنانچہ انہوں نے فوری عمل کیا اور باہر نکلنے کے بعد جب اُنہیں اردگرد کا جائزہ لینے کی فرصت ملی تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہ کسی بارونق سڑک کے بجائے کسی رہائشی کالونی کی ذیلی سڑک پر ہیں۔ اس سڑک پر سے ظاہر ہے وہاں رہنے والوں کے علاوہ مشکل سے ہی کوئی گزرتا ہوگا اس لیے سڑک سنسان پڑی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اگر ان کی گاڑی کے آگے پیچھے بھی کوئی گاڑی موجود ہو تو ہنگامہ شروع ہونے کی صورت میں اس کا ڈرائیور وہیں سے اسے بھگا لے گیا ہو۔ کیونکہ پاکستان ہو یا انڈیا، دونوں جگہ یہ رویّہ تو عام تھا کہ لوگ کسی جھگڑے میں اُلجھنے یا اس کے گواہ بننے کے مقابلے میں موقع سے غائب ہو جانا سب سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اور اس کی وجہ مشترک تھی۔ عام آدمی کے ساتھ پولیس کا ناروا سلوک.....دونوں ہی ممالک میں مجرموں سے زیادہ بے قصور کو ستانے اور پھنسانے کا کام تھا اس لیے عام آدمی پولیس کے معاملے میں ملوث نہ ہونے ہی کو سب سے بہتر سمجھتا تھا۔

''تم دونوں اس گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ نیچے اُترے تو انہیں گھیرنے والوں میں سے ایک نے سلو اور شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ذرا فاصلے پر کھڑی ایک بڑی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل کروانے کے لیے ایک مسلح شخص ان کے سر پر سوار ہو گیا چنانچہ انہیں قدم اٹھانے پڑے۔ وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ فائرنگ کی زوردار آواز کے ساتھ انسانی چیخیں سنائی دیں۔ انہیں یہ سمجھنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ بچ جانے والے باقی دو افراد کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔

''جلدی چلو، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔'' ان پر گن تانے پیچھے آتے شخص نے غراتی آواز میں حکم دیا تو انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ معلوم نہیں یہ نئے حملہ آور کون تھے؟ وہ تو ابھی یہی نہیں سمجھ پائے تھے کہ بھائی جی کہلانے والے شخص کے غنڈوں نے انہیں ہوٹل سے کیوں اُٹھایا ہے کہ یہ نئی پارٹی میدان میں کود پڑی اور اب شاید وہ ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جا رہے تھے۔

''ہری اپ، اندر آ جاؤ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' اگرچہ وہ گن پوائنٹ پر گاڑی کی طرف بڑھنے پر مجبور تھے لیکن ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ موقع ملتے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیال پر عمل پیرا ہونے کی نوبت آنے سے پہلے ہی گاڑی میں سے ایک نسوانی چہرے نے جھانک کر انہیں پکارا تو وہ نہ صرف حیران ہوئے بلکہ کچھ بھی کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور اندر بیٹھ گئے۔

''چلو، اس سے پہلے کہ بھائی جی کے آدمی یہاں پہنچیں، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' ان کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور اسی لڑکی نے تیز لہجے میں کہا جو اُن کے شرافت سے گاڑی میں بیٹھنے کا سبب بنی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ممبئی ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زبردستی ان کی ٹیکسی میں سوار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا نام اندو بتایا تھا اور وہ اب بھی انہی کپڑوں میں ملبوس تھی جن میں انہوں نے اسے چند گھنٹے قبل پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اندو نامی اس لڑکی کے الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ پہلے سے اسٹارٹ گاڑی چل پڑی۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود دیگر اسلحہ بردار افراد بھی تیزی سے بھاگ کر ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ وہ دوسری گاڑی بھی چند سیکنڈز میں ان کی گاڑی کے پیچھے فراٹے بھرتی ہوئی آنے لگی۔

''وہاں اس گاڑی میں ہمارے بریف کیس بھی تھے۔'' شہریار کو اندو کا انداز کچھ دوستانہ لگا تھا اس لیے اُس کے سامنے اپنے بریف کیسوں کے لیے دُہائی دی۔

''فکر نہ کرو۔ میرے ساتھی بہت ہوشیار ہیں۔ وہ کام کی کوئی بھی چیز چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ تمہارے بریف کیس تمہیں واپس مل جائیں گے۔''

اندو نے اسے تسلی دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ زیادہ بات کرنے کی گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اندو سمیت گاڑی میں موجود ہر فرد کے چہرے اور جسم تنے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت سے ایسا لگتا تھا کہ راہِ فرار اختیار کرنے کے باوجود انہیں یہ خطرہ ہو کہ کسی طرف سے حملہ ہو جائے گا۔ چند لمحوں بعد فضا میں فائرنگ کی آوازیں گونجیں تو گویا ان کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

''وہ باسٹرڈ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔'' اندو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری پیچھے کی طرف مڑ گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

''ڈونٹ وری۔ پچھلی گاڑی میں روی اور شنکر موجود ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک ان کی گاڑی کو اپنے پیچھے



لگا نہیں دیں گے۔'' اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اسے تسلی دی۔ اور یہ تسلی اس وقت بالکل درست ثابت ہوئی جب پے در پے ہوتی فائرنگ کے دھماکے کے درمیان انہوں نے ایک ذرا مختلف دھماکا سنا اور ساتھ ہی اندو پُرمسرت انداز میں چیخی۔

''وہ مارا۔ اُن کی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا ہے اور وہ سڑک چھوڑ کر کچے میں اُتر گئی ہے۔''

''بس تو سمجھو اب ہم بنا کسی کٹھنائی کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ تم ریلیکس ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' اگلی سیٹ والے نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔ اس بار وہ واقعی ریلیکس ہو گئی اور سیدھی ہو کر بیٹھنے کے بعد ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''خوش ہو جاؤ، تم دونوں کی چمڑی اُدھڑنے سے بچ گئی۔''

''تھینکس فار یور ہیلپ۔ لیکن ہمیں یہ سارا چکر سمجھ نہیں آیا۔ یہ کون لوگ تھے جو اس طرح ہمیں ہوٹل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے؟'' موقع ملتے ہی شہریار نے اپنی اُلجھن دور کرنے کی کوشش کی۔

''انہوں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اندو نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''کسی بھائی جی کا ذکر کر رہے تھے، اس کے علاوہ کوئی بات نہیں بتائی۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''اور تم نہیں جانتے کہ یہ بھائی جی کون ہے؟'' اس نے بغور ان دونوں کے چہروں کو دیکھا۔

''نہیں۔'' اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

''کیا پہلی بار ممبئی آئے ہو؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''ہاں، پہلی بار یہاں کی ایک پارٹی سے بزنس کا موقع ملا ہے۔ اسی پارٹی سے میٹنگ کے لیے آئے تھے اور یہاں آتے ہی عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پہلے تم اسٹیشن پر ٹکرا گئیں، پھر وہ بھائی جی والے جان کو آ گئے۔ اور اب پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

شہریار نے کسی ایسے سیدھے سادے کاروباری شخص کے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا جو اس ساری صورتِ حال سے بہت زیادہ گھبرا گیا ہو۔ سلو بھی اگرچہ خاموش تھا لیکن اپنے چہرے کے پریشان تاثرات سے اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

''یہ ممبئی ہے ڈیئر! یہاں آدمی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہاں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر لینی چاہئے۔ بائی داوے، تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو اور کیا کاروبار کرتے ہو؟'' اندو نے مسکرا کر تبصرہ کیا اور ساتھ ہی دو نئے سوالات بھی داغ دیئے۔ وہ خاصی پُرکشش لڑکی تھی اور مسکراتے ہوئے اور بھی اچھی لگتی تھی۔

''ہم پانی پت سے آئے ہیں۔ ہمارا مصالحوں کا بزنس ہے۔ ''سواد'' کے نام سے ہمارے مصالحوں کے پیکٹ بکتے ہیں۔ شاید کبھی تمہارے سننے میں یہ نام آیا ہو۔''

اُس نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ کیونکہ اندازہ تھا کہ ممبئی سے اتنی دُور پانی پت کے علاقے سے نہ تو واقف ہو گی اور نہ ہی بے شمار کمپنیوں کے پکنے والے مصالحہ جات کے پیکٹس میں ایک نئے نام کا اضافہ چونکانے کا سبب بنے گا۔ نتیجہ حسبِ توقع نکلا اور اندو بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

''مجھے ایسا کوئی نام یاد نہیں۔ اصل میں میرا کوکنگ وغیرہ میں کوئی خاص انٹرسٹ نہیں ہے اس لیے اس قسم کی پروڈکٹس کے بارے میں ٹیلی ویژن پر چلنے والے کمرشلز بھی کبھی خاص دلچسپی سے نہیں دیکھے۔''

''ابھی ہمارا بزنس نیا بھی تو ہے۔ یہاں کی پارٹی سے ڈیل ہو جائے تو ہم اپنی پروڈکٹس کی پبلسٹی کے لیے نئے اور اچھے کمرشلز بنوا کر ٹیلی ویژن پر چلوائیں گے۔'' شہریار نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے اس خاتون کے اپنی پروڈکٹ سے ناواقف ہونے پر خاصی مایوسی ہوئی ہو۔

''آئی تھنک تمہیں اب ممبئی میں بزنس کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ کم از کم اب تم دونوں تو یہاں رہ کر اپنے بزنس کے معاملات نہیں دیکھ سکتے۔ بھائی جی تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا اور تمہیں ہرگز نہیں چھوڑے گا۔' اندو نے کچھ تاسف سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران ان کا سفر مسلسل جاری رہا تھا اور گاڑی مختلف سڑکوں سے تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی۔

''آخر وہ شخص بیٹھے بٹھائے ہمارا دشمن کیوں بن گیا ہے؟ ہم تو اسے جانتے بھی نہیں ہیں۔'' اس بار سلّو نے پہلی بار زبان کھولی اور غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔

''یہ میں تمہیں آرام سے بیٹھ کر بتاؤں گی۔ اب تو ہم منزل پر پہنچ ہی گئے ہیں۔'' گاڑی ایک بنگلے کے دروازے پر رُکی اور ڈرائیور نے ہارن بجایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اُس کی بات سنتے ہی اس لیے وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

ہارن کے جواب میں بنگلے کا گیٹ فوراً ہی کھل گیا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ ان کے پیچھے آنے والی گاڑی رہائشی علاقہ آنے سے پہلے ہی منظر سے غائب ہوگئی تھی چنانچہ یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے سواروں نے ان کے بحفاظت منزل پر پہنچ جانے کا یقین ہو جانے پر اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

گاڑی کے پورٹیکو میں رُکنے پر وہ دونوں بھی اندو اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئے پھر وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے کے رہائشی حصے میں داخل ہو گئے۔

''اس طرف آ جاؤ۔'' اندر داخل ہونے کے بعد اندو انہیں لیے ایک کمرے میں گھس گئی۔ یہ کمرہ ڈرائنگ روم کی طرز پر سیٹ تھا۔ اندو نے ان دونوں کو ایک بڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک دوسرے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر صوفے کے ساتھ رکھی تپائی پر موجود انٹرکام کا بٹن دبا کر بے تکلف لہجے میں بولی۔ ''تین کافی بھیجو۔''

''تم دونوں میں سے کوئی ڈرنک تو نہیں کرنا چاہتا؟'' حکم صادر کرتے ہی اسے خیال آیا تو وہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ دونوں ہی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آرام سے بیٹھو۔ اس بنگلے کے اندر تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' مسکرا کر اُن سے مخاطب ہوئی وہ خود بھی بہت ریلیکس لگ رہی تھی۔

''یہاں خطرہ نہیں ہے لیکن یہاں سے باہر تو خطرہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شہر میں کچھ غنڈے ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، ہم اپنا بزنس کیسے کریں گے؟'' شہریار کا انداز اب خالص کاروباری بندے کی طرح کا تھا جو فطرتاً بزدل بھی ہو لیکن بزنس کا اچھا موقع بھی گنوانے کے لیے تیار نہ ہو۔

''آئی ایم سوری، یہ ہماری وجہ سے ہوا ہے۔ میرا تمہاری ٹیکسی میں لفٹ لینا تمہارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔'' اس نے شرمساری کا اظہار کیا۔

''لیکن کیوں؟..... تم نے کہا تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کر سارا چکر بتاؤ گی تو اب بتاؤ۔'' سلّو نے اس سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر وہی جاندار اور پُرکشش مسکراہٹ دوڑ گئی۔



''کم بولتے ہو لیکن ہو ہینڈسم۔ فلموں میں کام کرو تو اینگری ینگ مین کا رول بہت اچھا کرو گے۔'' اس نے سگریٹ کا پیٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے چھیڑنے والے انداز میں تبصرہ کیا اور پھر پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ سلّو نے اسے گھورتے ہوئے ایک سگریٹ نکال لیا۔ البتہ شہریار نے موڈ نہ ہونے کا اظہار کر کے انکار کر دیا۔

''دیکھو یار! چکر یہ ہے کہ میں ایک جرنلسٹ ہوں اور لوگوں کے رازوں کا کھوج لگانا میرا پروفیشن ہی نہیں، ہابی بھی ہے۔ میرے جیسے جرنلسٹوں کی یہاں بڑی مانگ ہے اور میں بھی ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہوں جو میری سروسز کے اچھے چارجز دے سکیں۔ اشوک صاحب میرے اچھے کسٹمرز میں سے ایک ہیں اور آج کل میں ان کے کہنے پر بھائی جی کے گینگ کے راز حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس چکر میں، میں نے بھائی جی کے ایک خاص بندے کو بھی پھنسا لیا تھا اور اُسے اُلّو بنا کر بہت کچھ اُگلوانے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی۔ لیکن پھر اُسے مجھ پر شک ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے پوچھ تاچھ کرتا، میں منظر سے غائب ہوگئی۔ آج بہت دن بعد ممبئی ریلوے اسٹیشن کے باہر میرا کسی کام سے جانا ہوا تو میرا اس سے سامنا ہو گیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اس لیے ہوشیاری سے کام لے کر پہلے اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر کیا اور دوسری گاڑیوں کی آڑ لے کر بچتی بچاتی تمہاری ٹیکسی تک پہنچ گئی۔ اس وقت تم لوگ ٹیکسی ڈرائیور سے شیوا جی ہوٹل چلنے کی بات کر رہے تھے۔ میری اپنی گاڑی تو پارکنگ میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہارے ساتھ شیوا جی تک جاؤں گی۔ شیوا جی کے بالکل سامنے والی بلڈنگ میں اشوک صاحب کا ایک فلیٹ ہے، اس لیے مجھے وہاں چھپنے میں آسانی رہتی۔ لیکن بیڈ لک یہ ہوئی کہ شاید اس نے بھی تمہاری زبان سے شیوا جی ہوٹل کا نام سننے کے ساتھ مجھے تمہاری والی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے میں تو ہوٹل کے راستے ہی روانہ ہونے کی وجہ سے بچ گئی لیکن تم دونوں کو میرا ساتھی سمجھتے ہوئے اس نے اپنے بندوں کے ذریعے گھیر لیا تاکہ تمہارے ذریعے میرا ٹھکانہ معلوم کر سکے۔''

وہ بڑی عجیب کہانی سنا رہی تھی۔ لیکن اس کی ظاہری شخصیت دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس قسم کی عورت سمجھا جائے لیکن وہ جن حالات میں اور جن لوگوں کے ساتھ ملی تھی، اس کی بات نہ ماننے کا کوئی سوال نہیں تھا جبکہ وہ خود بھی اپنے بارے میں یہی اعتراف کر رہی تھی۔

''وہ تمہیں دُور سے گولی بھی تو مار سکتا تھا۔ اس نے اتنی آسانی سے تمہیں ہمارے ساتھ نکلنے کیوں دیا؟'' اس کی ساری کہانی سن کر شہریار نے نقطۂ اعتراض اُٹھایا۔

''جسے آپ چاہتے ہوں، اسے گولی مارنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ہماری منزل تو شام ہی ہے اس لیے وہاں ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ وہاں اکیلا تھا، فائرنگ کرنے کی صورت میں مشکل میں بھی پھنس سکتا تھا۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پہلے ہی میں پنکچر کر چکی تھی۔'' اس نے نہایت اطمینان سے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سمجھ میں آ گئی کہ بھائی جی کے غنڈوں نے تمہارے چکر میں ہمیں گھیر لیا تھا لیکن یہ بتاؤ کہ تم ہماری مدد کو کیسے پہنچیں؟'' شہریار نے دوسرا سوال اُٹھایا۔ جب وہ آسانی سے ہر بات بتاتی جا رہی تھی تو اپنی ہر اُلجھن دور کر لینا ہی مناسب تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں شیوا جی ہوٹل کے بالکل سامنے والی بلڈنگ میں تھی۔ وہیں کی ایک کھڑکی سے میں نے بھائی جی کے آدمیوں کو ہوٹل کے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ میری تلاش میں

ہیں اور ظاہر ہے، میں تو انہیں وہاں نہیں مل سکتی تھی لیکن میری وجہ سے تم دونوں مصیبت میں پھنسنے والے
میرے من کو یہ اچھا نہیں لگا کہ تم دونوں بیکار میں پھنس جاؤ۔ میں خود تو بلڈنگ کے پیچھے کے راستے سے
سے نکل گئی لیکن دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ دیکھتے رہیں، بھائی جی کے بندے کیا کرتے ہیں۔ انہوں
جب مجھے فون پر بتایا کہ وہ لوگ تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کر
اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہم نے جس سڑک پر ان کی گاڑی کو گھیرا
بھائی جی کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سڑک پر جو ہنگامہ ہوا تو اس کی آوازیں وہاں تک گئی ہوں
جب ہی تو ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور اس کا انجام بھی تم نے دیکھ لیا تھا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو
لوگوں کی جان بچانے کے لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو کتنے خطرے میں ڈال دیا
سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس نے کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ان کی گفتگو کے دوران
ایک ملازم نہایت خاموشی سے کافی سرو کر کے چلا گیا تھا۔

''خاک جان بچائی ہے تم نے ہماری۔ اس سے اچھا تو تم ہمیں ان لوگوں کے ساتھ جانے دیتیں
وہاں جا کر کیا ہوتا؟..... وہ ہم سے تمہارے بارے میں پوچھتے اور ہم بتا دیتے کہ تم زبردستی ہماری لیکسی میں
بیٹھی تھیں اور شیوا جی پہنچنے کے بعد اُتر کر کہیں چلی گئیں۔'' سلّو نے ایک بار پھر خاموشی توڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔

''اس گمان میں مت رہنا للّو!..... بھائی جی کے آدمی اتنی آسانی سے تمہاری بات ماننے والے
تھے۔ وہ سچائی جاننے کے لیے تمہاری چمڑی اُتار کر رکھ دیتے اور پھر کہیں جا کر مانتے کہ تم سچ کہہ رہے
میں تمہیں اس اذیت سے بچانا چاہتی تھی اس لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا۔'' اندو نے نخوت سے ہونٹ سکڑتے
ہوئے اپنا احسان جتلایا۔

''بچت تو ہماری اب بھی نہیں ہوئی۔ ہم یہاں بزنس میٹنگ کے لیے آئے تھے اور اب حال یہ ہے
یہاں سے باہر نکلے تو مارے جائیں گے۔'' وہ اب بھی اس کا احسان ماننے کو راضی نہیں تھا۔

''میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے اس طرح حملہ کر کے ہمیں چھڑا لانے پر تو ان لوگوں نے
گمان کیا ہوگا کہ ہم تمہارے خاص آدمی تھے اور اب ہمارے لیے خطرہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا
شہریار نے بھی سلّو کا ساتھ دیتے ہوئے اندو کو اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

''او کے، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب میں تمہارے لیے بس اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ تمہیں ممبئی سے حفاظت
کے ساتھ نکال دوں۔ اور اس کا انتظام جلدی ہو جائے گا۔ جب تک تم دونوں آرام کرو۔ کوئی ضرورت ہو
بھی بتا سکتے ہو۔ نوکر تمہاری ہر اچھا پوری کرے گا۔'' اسے یوں اپنی غلطی گنوانا پسند نہیں آیا تھا چنانچہ کچھ نا
سے کہتی ہوئی اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''ہمارے بریف کیس ابھی تک ہمیں نہیں ملے ہیں۔'' اسے جاتا دیکھ کر شہریار نے جلدی سے یقین دہانی
کروائی۔

''مجھے یاد ہے۔ یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں تمہارے بریف کیس مل جائیں گے۔'' اس نے
لہجے میں جواب دیا اور مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئی۔ ویسے بھی اس سے مزید کچھ کہنا بیکار
کیونکہ یہ تو وہ بھی جانتے تھے کہ بریف کیس دوسری گاڑی میں جانے والے بندے اپنے ساتھ لے گئے
اور وہ گاڑی اس کے ساتھ اس بنگلے میں نہیں آئی تھی۔ اسلحے کے علاوہ ان بریف کیسوں میں ان کی چند
اہم چیزیں بھی موجود تھیں اس لیے وہ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس صورت میں انتظار ہی سب سے



ایسے بھی فی الحال پریم ناتھ والے منصوبے پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے اُنہیں دوبارہ نئے
سے منصوبہ بندی کرنی پڑتی چنانچہ وہ انتظار کرتے رہے۔

ملازم نے ایک بار پھر خود ہی ان سے پوچھے بغیر چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ کی چیزیں پیش کر
دیں۔ وہاں ٹیلی ویژن سیٹ موجود تھا اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے خبریں دیکھتے رہے۔ خبروں میں دو
آدمیوں کے تصادم اور اس کے نتیجے میں بھائی جی کے گرگوں کے مارے جانے کے بارے میں بتایا جا رہا
تھا۔ خبریں دیکھتے ہوئے ہی انہوں نے ٹی وی کی اسکرین پر بھائی جی اور اشوک صاحب کی تصویریں بھی
دیکھیں۔ بھائی جی کی طرف سے الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے آدمیوں کے قتل کے پیچھے اشوک کا ہاتھ ہے لیکن
اشوک نے اس الزام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کھلی بدمعاشی کے مظاہرے ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہوئے ہی سہی، خاصا وقت گزر گیا اور اندو ایک بار
پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس بار اس کے دونوں ہاتھوں میں ان کے بریف کیس لٹکے ہوئے تھے۔

''یہ لو تمہارے بریف کیس اور فوراً یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ باہر گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم دونوں
یہاں سے سیدھے ریلوے اسٹیشن جاؤ گے اور وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر دہلی۔ فرسٹ کلاس میں دہلی تک کے
لیے کوپے بک کروا دیا گیا ہے۔ وہاں سے تم اپنے حساب سے پانی پت جانے کا انتظام کر لینا اور پھر دوبارہ
کبھی ممبئی کا رخ مت کرنا ورنہ آئندہ کے لیے میں تمہاری کوئی گارنٹی نہیں لے سکتی۔'' اس نے بریف کیس فرش
پر رکھے اور انہیں کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر اپنی کہہ کر کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے باہر نکل گئی۔ ان
لوگوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا لیکن کچھ کہہ اس لیے نہیں سکے کہ اندو کے باہر جاتے ہی وہ شخص اندر آ گیا
اور گاڑی میں اگلی نشست پر بیٹھا رہا تھا۔

''چلیں؟'' اُس نے اس لہجے میں یہ ایک لفظ ادا کیا جیسے سوال نہ کر رہا ہو، اُنہیں حکم دے رہا ہو۔ چار و
ناچار انہیں قدم آگے بڑھانے پڑے۔ کیونکہ اس وقت وہ عام کاروباری افراد کا کردار ادا کر رہے تھے اور ظاہر
ہے کوئی سیدھا سادہ کاروباری شخص غنڈوں سے اختلاف کی ہمت تو نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار انہیں جس گاڑی میں سفر کروایا گیا، وہ پہلی کے مقابلے میں چھوٹی تھی لیکن اس کے تاریک
شیشوں کے پیچھے وہ سب کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر بھی وہ شخص ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

''یہاں ہمارے کچھ آدمی ہر طرف نظر رکھے ہوئے ہیں پھر بھی میں تم لوگوں کو بالکل ٹائم پر لایا ہوں۔
اب جلدی جلدی چلو ورنہ ایک منٹ بعد ٹرین نکل جائے گی۔''

وہ دونوں اپنے طور پر یہ سوچ چکے تھے کہ اسٹیشن پہنچ کر کسی طرح وہاں سے نکلنے کی تدبیر کریں گے لیکن
یہاں تو ایسا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نہایت افراتفری میں انہیں تقریباً چلتی گاڑی میں سوار ہونا پڑا اور وہ ایک
کمرے کا منہ دیکھتے فرسٹ کلاس کے اس کوپے میں جا بیٹھے جو اُن کے لیے بک کروا دیا گیا تھا۔

قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی۔ وہ دہلی کے ایک دادا سے بچتے بچاتے ممبئی پہنچے تھے اور ممبئی کے دو
غنڈوں کی مہربانی کی وجہ سے دوبارہ دہلی کی طرف جا رہے تھے۔

⊛-----✪-----⊛

''میرے خیال میں اب تمہیں جاب چھوڑ دینی چاہئے۔'' وہ حسبِ معمول ناشتے کے لیے اسٹور جانے
کے لیے تیار ہو رہی تھی جب اسلم نے اس سے یہ بات کہی۔

''وہ کیوں جناب؟'' اس نے دوپٹے کو دونوں شانوں پر اچھی طرح پھیلاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم گھر میں رہ کر زیادہ سے زیادہ آرام کرو، تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' اسلم نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اچھی تو وہ ہمیشہ سے لگتی تھی لیکن جب سے ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی، چہرے پر ایک الگ ہی نور آ گیا تھا اور اسلم کا دل پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی طرف کھنچتا تھا۔

''میں کوئی دنیا کی انوکھی عورت تھوڑی ہوں جو ماں بننے جا رہی ہے۔ آپ نے اپنے ہاں کے گاؤں دیہاتوں میں نہیں دیکھا کہ کیسے عورتیں آخری وقت تک کھیتوں میں سخت محنت کرتی رہتی ہیں بلکہ بعض دفعہ وہیں ڈیلیوری کی نوبت آ جاتی ہے میری جاب تو اتنی سخت بھی نہیں ہے جو آپ اتنے گھبرا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر اسلم کی تشفی کروانے کی کوشش کی۔

''تم اپنا ان عورتوں سے مقابلہ نہیں کرو۔ ان کے شوہروں کو ان کا خیال نہیں ہوتا ہوگا لیکن میری تو تم جان ہو۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں تمہیں کیسے پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھوں۔'' اس نے عقب سے ماہ بانو کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسلم کی اس حرکت پر بالوں پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور گھنے بال ایک آبشار کی صورت اسلم کے چہرے اور شانوں پر آ گرے۔

''کیا کر رہے ہیں؟ اتنی مشکل سے بال سمیٹے تھے، سب بکھرا دیئے۔ اب دوبارہ باندھنے میں دیر لگے گی۔ مجھ پر الزام مت رکھیے گا کہ لیٹ کروا دیا۔'' اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''میں تو چاہتا ہوں کہ تم جاؤ ہی نہیں۔ بس آرام سے گھر پر بیٹھو اور آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاری کرو۔''

اس نے کچھ اور بھی قریب ہوتے ہوئے اس کے بالوں کی مہک اپنے سانسوں میں اُتاری۔ اُس کی اس وارفتگی پر ماہ بانو کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ اسلم کی یہ وارفتگی اور والہانہ پن اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، وہ اوّل روز سے ہی اسے اسی طرح چاہ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اُس کی اتنی بے تحاشا محبت پر کچھ گھبرا جاتی تھی اور اندر ہی اندر ایک احساسِ جرم ستانا شروع کر دیتا تھا۔ اپنے دل و دماغ پر لاکھ پہرے بٹھانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بہت دھیمے سُروں میں بجنے والا ساز شہریار کی محبت کا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اسے بھلا نہ پائی تھی، بس خود کو پابند کر لیا تھا کہ ہونٹوں پر شہریار کا نام تک نہ آئے۔ شہریار نے بھی اسے یہاں بھیجتے ہوئے اسے پابند کیا تھا کہ وہ کسی صورت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے گی۔ چنانچہ اسے پاکستان میں ہونے والے واقعات کی کوئی خبر نہیں تھی اور واحد خبر رساں دل تھا جو اسے اطلاع دیتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے، سلامت ہے۔ اس دیوانے دل کو اس کی وحشتوں سے بچانے اور پابندیوں میں جکڑے رکھنے کے لیے وہ اپنا ہر دم مصروف رہنا ضروری سمجھتی تھی لیکن اب اسلم فرمائش کر رہا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ گھر بیٹھ کر اسے آرام نہیں ملے گا بلکہ بے لگام سوچیں پاگل کرنے چلی آئیں گی۔

''کن خیالوں میں ڈوب گئیں؟ کیا آنے والے مہمان کے بارے میں سوچ رہی ہو کہ وہ بیٹی ہوگی یا بیٹا؟..... کچھ بھی ہو بھئی، مجھے تو جی جان سے پیارا ہوگا۔ کیونکہ وہ میری جان کے وجود کا حصہ جو ہوگا۔'' اسلم اس وقت خاصے رومانی موڈ میں تھا۔ ماہ بانو نے کسمسا کر اس کی بانہوں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی لیکن



کامیاب نہ ہو سکی۔

''یہ آپ کو بے وقت کی شوخیاں کیوں سوجھ رہی ہیں؟ مجھے تیار ہونے دیں نا۔'' ناکامی کی صورت میں اس نے بے بس سے انداز میں ذرا جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن اسلم کہاں قابو میں تھا۔ پے در پے اس کے کئی گرم بوسوں نے ماہ بانو کی گردن کی پشت کو دہکا ڈالا تھا۔

''اسلم! میں کہہ رہی ہوں نا کہ مجھے تیار ہونے دیں۔ ہمیں وقت پر اسٹور پہنچنا ہے۔'' اس بار اس نے ناراضگی سے اسلم کو پیچھے دھکیلا۔

''اور میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی جاب چھوڑ دو تو اس پر تم ذرا توجہ نہیں دے رہیں۔'' اس بار وہ کچھ ذرا سا خفا ہوا۔

''میں اس لیے توجہ نہیں دے رہی ہوں کہ میں آپ کی طرح جذبات سے نہیں بلکہ حقیقت پسندی سے سوچ رہی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کی بات اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ماں جتنی متحرک ہوگی، بچے کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ مکمل آرام کا مشورہ صرف ان عورتوں کو دیا جاتا ہے جن کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہو۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ گھر میں فارغ بیٹھنا میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔ میرے پیچھے میرا ایک دردناک ماضی ہے۔ میں بہت مصیبتوں سے گزری ہوں اور اپنے بہت قریبی رشتوں کو کھویا ہے۔ مجھے اب بھی یہ خیال بے چین رکھتا ہے کہ وہاں پیر آباد میں میرے سگے ماں باپ کیسی تنہا اور بے یار و مددگار زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ سوچیں کہ اگر میں فارغ بیٹھ گئی تو اذیت ناک سوچیں مجھے چین سے کہاں جینے دیں گی؟ گھر سے باہر نکلتی ہوں اور مصروف رہتی ہوں تو دل بہلا رہتا ہے۔ دل و ذہن کو مصروف رکھنے والی سرگرمیاں ختم ہو گئیں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی اب ہمیں آنے والے بچے کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ مصطفیٰ بھائی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمیں یہ سہولت ہمیشہ حاصل رہے۔ حالات میں کبھی بھی کوئی ایسی تبدیلی آ سکتی ہے کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے۔ اس صورت میں کرائے کے کسی گھر میں رہنا اور اس کے اخراجات برداشت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وقت اور سہولت سے فائدہ اٹھا کر ہم جتنی بچت کر سکتے ہیں، کر لیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہم دونوں مل کر محنت کریں۔ یہ کوئی پاکستان نہیں ہے نہیں کہ ایک شخص کما کر لائے تو پورا گھر کھا لے۔ یہاں تو سب کو جینے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔'' وہ جوش میں آئی تو بولتی چلی گئی جبکہ اسلم کو یک دم ہی چپ لگ گئی۔

''تم تیار ہو کر باہر آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ اس کو کسی قدر سنبھال کر پلٹا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کے انداز سے ماہ بانو کو لگا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ زیادتی کر گئی ہے اور جو آپ کو اتنا چاہیں، ان کا دل دُکھانا تو کسی صورت اچھا نہیں ہوتا۔ احساس ہونے پر وہ فوراً ہی اسلم کے پیچھے لپکی اور اس کا بازو تھام کر اسے باہر جانے سے روکا۔

''آئی ایم ویری سوری اسلم! میری باتیں شاید آپ کو بری لگی ہیں۔''

''نہیں، برا ماننے کی کیا بات ہے؟ تم نے کچھ بھی غلط تو نہیں کہا۔ میں ہی ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔'' اس نے دھیرے سے ماہ بانو کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا۔

''آپ میرے ساتھ اس طرح نہیں کریں اسلم! ایک آپ کی محبت ہی تو ہے جو مجھے اس دنیا میں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ آپ بھی مجھ سے رُوٹھ گئے تو میں کیا کروں گی؟'' وہ روہانسی ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی

اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ عورت کے آنسو تو وہ ہتھیار ہیں جو بڑے بڑے سورماؤں کو فتح کر لیتے ہیں۔ اسلم جیسا محبت کرنے والا کہاں ان کا وار سہہ پاتا، فوراً ہی گھبرا گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماہ بانو! میں واقعی تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اور میں پورے دل سے تمہیں جاب پر چلنے کی اجازت دے رہا ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے رخسار پر سے آنسو صاف کیے۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ رونے سے اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے سے پڑ گئے تھے جو اسے کچھ اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اسلم نے بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں کو ایک ایک کر کے چوم لیا۔

''میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ اب تم پانچ منٹ کے اندر تیار ہو کر آ جاؤ ورنہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کبھی بھی مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' ماہ بانو کھلکھلا کر ہنسی۔ اسے دھوپ میں بارش کا منظر یاد آ گیا اور اس نے مسکرا کر اپنے دل میں اُس کے اس یقین کی تائید کی کہ وہ کبھی اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ کم از کم اپنی مرضی سے تو ہرگز نہیں۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی نے مساج سینٹر میں قدم رکھا۔

یہ خاصی جدید اور خوب صورت عمارت تھی اور شہر کے پوش علاقے میں واقع تھی۔ جاوید علی نے اس سینٹر کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق یہاں طبقۂ امراء کے افراد کا آنا جانا تھا اور مرد و زن دونوں ہی وہاں مساج کروانے کی غرض سے آتے تھے۔

سینٹر کو ایک سابق ایس پی کی بیگم چلا رہی تھی جو کہ خود بھی خاصی ماڈرن عورت تھی اور سننے میں آیا تھا کہ جوانی میں آدھے شہر کے مردوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اب بھی وہ خاصی پہنچ والی تھی، اسی لیے اس کے مساج سینٹر کے بارے میں خاصی افواہوں کے باوجود اب تک پولیس نے ایک بار بھی چھان بین کی زحمت نہیں کی تھی۔

جاوید علی کو اپنی ٹیم کی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوا تھا کہ یہ مساج سنٹر محض ایک آڑ ہے ورنہ اصل میں یہاں کوئی اور ہی دھندا کیا جا رہا ہے۔ اس دھندے میں عیاشی کا سامان فراہم کرنے سے لے کر بڑی پارٹیوں کو بلیک میل کرنے تک سب کچھ شامل تھا اور ظاہر ہے اس مقصد کے لیے مساج سینٹر میں جہاں خوب صورت لڑکیاں اور ہینڈسم لڑکے ملازمت کرتے تھے، وہیں خفیہ گارڈز اور خفیہ کیمرے بھی موجود تھے۔ خفیہ کیمروں کی موجودگی کا سب سے بڑا سبب ان فلموں کی تیاری تھی جو چنیدہ گاہکوں کی قابل اعتراض حالت میں بنائی جاتی تھیں اور پھر انہیں بلیک میل کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ مساج سینٹر کی اس بدنام شہرت کے باوجود وہاں آنے والے گاہکوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی تھی اور لوگ باقاعدگی سے وہاں آتے رہتے تھے۔ بہرحال، وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا براہِ راست ان کے ادارے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس قسم کے جرائم ان کے دائرۂ کار میں آتے تھے۔ انہیں تو بس اس عورت کی تلاش تھی جو رائے چند کو غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی تھی۔



رائے چند نے انہیں اس عورت کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ اس اعتبار سے خاصا منفرد تھا کہ رائے چند کے مطابق وہ لمبے قد کی لیکن جاپانیوں کے سے نقش و نگار رکھنے والی عورت تھی۔ جاوید علی نے باری باری اپنے دو ماتحتوں کو گاہکوں کے روپ میں مساج سینٹر بھیجا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی خدمت انجام دینے والی لڑکیوں کے علاوہ اور بھی کئی خواتین کو دیکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی رائے چند کے بتائے ہوئے حلیے پر پوری نہیں اُترتی تھی۔

سی ایف پی کے دو جوان مستقل مساج سینٹر کی نگرانی کر رہے تھے لیکن انہوں نے بھی وہاں اس حلیے کی کسی عورت کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا جس سے انہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ شاید رائے چند نے ان سے بیانی کی ہے۔ لیکن آج اچانک ہی نگرانی کرنے والے جوانوں نے اطلاع دی کہ اس حلیے کی ایک عورت مساج سینٹر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ پیچھے اس کے آدمی اور پولیس کی ایک چھاپہ مار ٹیم تیار تھی جو اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی سینٹر پر ریڈ کر دیتی۔

''ہیلو سر!..... دیبا مساج سینٹر میں خوش آمدید۔'' وہ گلاس ڈور کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، استقبالیہ پر موجود لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ خاصی طرح دار لڑکی تھی اور اس نے ٹاپ لیس بلاؤز کے نیچے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ اُسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بہت ہی پُرکشش انداز میں مسکرائی اور پھر اپنی مترنم آواز میں اسے خوش آمدید کہا۔

وہ اس اعتبار سے بڑی زبردست لڑکی تھی کہ اسے قدرت نے خوب صورت چہرے اور پُرکشش جسم کے ساتھ دلکش آواز سے بھی نوازا تھا۔ ورنہ عموماً اتنا زبردست تناسب کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید وہ اسی تناسب کی وجہ سے استقبالیہ پر بٹھائی گئی تھی کہ آنے والا پہلے مرحلے میں ہی متاثر ہو جائے اور یقین کر لے کہ یہاں اسے جو بھی ملے گا، وہ زبردست ہی ہوگا۔

''یو آر سو بیوٹی فل۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تم سے زیادہ خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

جاوید علی نے کسی دل پھینک عاشق کی طرح چھوٹتے ہی اس کی تعریف کر دی جس پر وہ بڑی ادا سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور نہایت لگاوٹ سے بولی۔

''اِٹس آ کمپلیمنٹ فار می۔''

''بھئی جو سچ تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' جاوید علی نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا۔

''ایسا شاید اس لیے ہے کہ آپ اس سے پہلے کبھی ہمارے مساج سینٹر نہیں آئے۔ یہاں آپ کو مجھ سے زیادہ خوب صورت چہرے اور جسم دیکھنے کو ملیں گے۔'' اب اس کا انداز خالص کاروباری تھا۔

''اوہ، تم نے تو مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ میں بے چین ہو کہ ایک ہی دن میں اپنی زندگی کی دوسری خوب صورت لڑکی کو دیکھ سکوں۔'' وہ بھی برسرِ مطلب آ گیا۔

''اپنے کوائف نوٹ کروا دیں۔'' وہ فوراً ہی اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

''نام؟''

''کیپٹن انس شیر علی۔'' اس نے پورے اعتماد سے بتایا۔

''اوہ..... تو آپ آرمی سے ہیں۔'' وہ ذرا سا چونکی۔

''کیوں، یہاں آرمی والوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے کیا؟'' جواب میں اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آرمی والے خود ہی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ شاید اپنی ٹف رائلز اور ریگولر ایکسرسائز کی عادت کی وجہ سے انہیں فرصت اور ضرورت دونوں ہی نہیں ہوتیں۔'' اس نے وضاحت کی تو وہ بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں بھی پچھلے کئی دن سے چھٹیوں پر لاہور آیا ہوا ہوں اور چھٹیوں کی وجہ سے روٹین میں تھوڑا فرق آ گیا ہے اس لیے سوچا ذرا جسم کو فٹ کروایا جائے اور سستی نکالی جائے تاکہ واپس جانے پر ایڈجسٹ کرنے میں آسانی رہے۔''

''ڈونٹ وری سر! یہاں سے آپ ایسے فٹ فاٹ ہو کر جائیں گے کہ پھر دوبارہ بار بار ہمارے پاس آنے کا دل چاہے گا۔'' اس نے اعتماد سے دعویٰ کیا اور مزید کوائف حاصل کرنے لگی۔

جاوید علی کو اپنے دو ساتھیوں کے تجربے کی بنیاد پر ان سوالات کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا اس لیے اپنے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہا جن کی بنیاد پر وہ اسے کوئی امیر کبیر شخص سمجھ کر خصوصی اہمیت کا حامل سمجھے۔ امارت کے ساتھ آرمی کے بیک گراؤنڈ کے ٹچ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا اور وہ لڑکی بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔

کمپیوٹر پر اس کے کوائف منتقل کرنے کے بعد وہ اس کی طرف رخ کر کے دل آویز انداز میں مسکرائی، عین اسی وقت اس کے سامنے رکھے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

''یس میم!'' اس نے انٹرکام اُٹھا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا اور دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ چند ثانیے کی مختصر بات سن کر اس نے اسی مؤدبانہ لہجے میں ''اوکے میم!'' کہا اور ریسیور رکھتے رکھتے ہی دوسرے ہاتھ سے گھنٹی کا بٹن دبا دیا تھا۔ فوراً ہی ایک بیس بائیس سالہ اسمارٹ سی لڑکی مختصر لباس میں وہاں نمودار ہو گئی۔

''سر کو روم نمبر ففٹین میں لے جاؤ۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے اسے حکم دیا۔

''اوکے مس!'' وہ کہہ کر جاوید علی کی طرف پلٹی۔ ''آیئے سر!''

جاوید علی اس کی راہنمائی میں چل پڑا۔ عمارت باہر سے جتنی خوب صورت نظر آتی تھی، اندر سے بھی اتنی ہی خوب صورت اور جدید تھی۔ وہاں صفائی کا بھی خوب خیال رکھا گیا تھا۔ فرش کی سطح اتنی چمکیلی اور شفاف تھی کہ چلتے ہوئے اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔

اس کی راہنما لڑکی لچکیلی چال چلتی، اسے سیڑھیوں سے اوپر لے گئی۔ اوپری منزل میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے اور ہر کمرے کے دروازے سے اوپر کمرہ نمبر بھی درج تھا۔ ان میں سے کچھ نمبر روشن تھے اور کچھ نہیں۔ روشن نمبروں کا مطلب وہ جانتا تھا۔ جن کمروں کے نمبر روشن تھے، وہاں گاہک موجود تھے۔ کمرہ نمبر پندرہ کے سامنے پہنچ کر لڑکی نے سائیڈ میں لگا چھوٹا سا بٹن دبایا تو ردِعمل میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل گاؤن پہنے دراز قامت لڑکی جس کے چہرے کے نقوش جاپانیوں کے سے تھے، ان کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔

اس کا چہرہ دیکھ کر جاوید علی کا دل بلّیوں اُچھل پڑا۔ آج سینٹر میں اس کی موجودگی کا سن کر اگرچہ وہ خاصا پُرامید تھا لیکن گمان نہیں تھا کہ براہِ راست اسی سے واسطہ پڑ جائے گا۔

''ہیلو سر!..... پلیز اندر تشریف لائیں۔''

جاوید علی کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور حلاوت آمیز لہجے میں اسے دعوت دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جاوید علی کو بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھانا پڑا جسے اس نے بہت جوش سے تھاما اور پھر چھوڑنے کے



بجائے ہلکے سے دباتے ہوئے اندر کھینچ لیا۔

اندر وہی ماحول تھا جو کسی مساج سینٹر کے کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔ درمیان میں پڑا خصوصی طرز کا بیڈ، ریکس میں رکھی مختلف بوتلیں اور اسٹینڈز پر ٹنگے تولیے وغیرہ۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک روم ریفریجریٹر بھی موجود تھا جس کا مقصد اسے اس وقت فوراً ہی سمجھ آ گیا جب اس نے لڑکی کو اس میں سے بیئر کے ٹن نکال کر لاتے دیکھا۔

''میں نے سوچا کہ پہلے آپ کی تھوڑی سی تواضع کر دوں۔'' ایک ٹن اُسے تھما کر وہ خود بیڈ سے کچھ فاصلے پر موجود کرسی پر جا بیٹھی۔ جاوید علی کو پہلے ہی اس نے بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ ٹن ہاتھ میں لیے وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ کرسی پر وہ ایسے انداز اور زاویے سے بیٹھی تھی کہ اس کا طویل گاؤن سامنے سے کھل گیا تھا اور اس سے اس کی لمبی خوب صورت ٹانگیں عریاں حالت میں گھٹنوں کے اوپر تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''فی الحال میں اس کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہا لیکن تم جیسی خوب صورت میزبان کو انکار بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے تھوڑی سی چکھ لیتا ہوں۔''

اس نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو گیا ہے اور ٹن کھول کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ صرف پینے کی اداکاری کر رہا تھا، پی نہیں رہا تھا۔

''سننے میں تو آیا ہے کہ آرمی والے بڑے شوق سے یہ شغل کرتے ہیں اور آپ معمولی سی بیئر کے لیے تکلف سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ مخمور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آرمی والے شوق ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کا اپنا ایک ڈسپلن ہوتا ہے اور چاہیں بھی تو اسے توڑنے میں خاصی مشکل محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اس وقت پینے کا عادی نہیں ہوں، صرف تمہارا دل رکھنے کے لیے چکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آرمی میں ہوں؟..... ابھی تو ہمارا آپس میں انٹروڈکشن بھی نہیں ہوا؟'' اسے جواب دیتے ہوئے اس نے سوال بھی داغ دیا۔

''سمجھیں جادو سے۔'' وہ کھلکھلائی اور ٹن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس طرح شاید وہ مزید کچھ کہنے سے بچنا چاہتی تھی۔

جاوید علی نے بھی جواب پر اصرار نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے استقبالیہ کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن لی ہو۔ اسے عین وقت پر بجنے والا انٹرکام بھی یاد آیا۔ امکان یہی تھا کہ اس کے کوائف جان کر اسے جاوید علی میں خصوصی دلچسپی محسوس ہوئی ہو اور اس نے خود اسے وہاں بلوایا ہو۔

''تمہیں تو جادو سے پتہ چل گیا لیکن مجھے ایسا کوئی جادو نہیں آتا اس لیے تمہیں اپنا انٹروڈکشن خود کروانا پڑے گا۔''

''میں عالیہ ہوں۔ اس مساج سینٹر میں میرا میڈم دیبا کے ساتھ ففٹی پرسنٹ کا شیئر ہے اور عام طور پر میں صرف یہاں کے انتظامات کی نگرانی کرتی ہوں یا اگر کوئی گاہک پسند آ جائے تو خود اسے سروسز فراہم کرنے میں حرج نہیں سمجھتی۔'' اس نے اپنے بارے میں بتایا۔

''یعنی میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں یہ موقع ملا ہے؟'' جاوید علی نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ ہنس دی۔

''ویسے تمہارا نام سن کر مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی ہے۔ تمہارے نقوش سے میں تمہیں جاپانی سمجھا تھا۔''

وہ بھی گفتگو کو طول دے کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اس کے آدمی اشارہ ملنے کے بعد یہاں پہنچ کر پوزیشن سنبھال لیں۔

''نقوش سے جاپانی سمجھے تھے اور قد دیکھ کر کیا سوچا تھا؟'' اس نے شوخی سے پوچھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ڈسٹ بن تک گئی جس میں اس نے بیئر کا خالی ٹن ڈال دیا۔

''ہاں، قد کے معاملے میں حساب کتاب کچھ گڑبڑ ہے۔'' جاوید علی نے اُلجھن کے اظہار کے لیے ایک ہاتھ بالوں تک لے جا کر آہستہ سے کھجایا۔ ''عام طور پر جاپانی لڑکیوں کا قد لمبا نہیں ہوتا اور تم خاصی لمبی ہو۔ لیکن یار! کچھ ایکسپشنل کیسز بھی تو ہوتے ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ تم ان میں سے ایک ہو۔''

''میں تمہاری اُلجھن دُور کر دیتی ہوں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری ماں جاپانی اور باپ پاکستانی ہے۔ اور میں دونوں کا مکسچر۔''

اپنی بات کہہ کر وہ کھلکھلائی تو جاوید علی نے بھی اس کا ساتھ دیا اور سائیڈ پر ذرا سا جھک کر اپنے ہاتھ میں تھاما بیئر کا ٹن وہاں موجود تپائی پر رکھ دیا۔

ٹن رکھ کر وہ سیدھا ہوا تو نظروں کے سامنے گویا بجلی سی کوند گئی۔ اس کے لمحے بھر کی حرکت میں ہی عالیہ نے اپنا طویل گاؤن اُتار پھینکا تھا اور اب ایک مختصر سی بکنی میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''میرے خیال میں اب کام شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ لہراتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی اور اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اتار کر ایک قریبی اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔

''آدمی بڑے اسمارٹ ہو۔'' قمیض ٹانگ کر وہ دوبارہ اس کے نزدیک آئی اور اس کے کسرتی جسم پر اپنی لمبی اُنگلیاں پھیرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

''سب فوج کی زندگی کا کمال ہے۔'' اسے عالیہ کا قرب ناگوار گزر رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اس کے بغیر اپنے مقصد کو نہیں پا سکے گا اس لیے لہجے اور تاثرات کو خوشگوار ہی رکھا تھا۔

''یہ تو ہے۔ تم فوجی ہوتے ہی کمال کے ہو۔ میرا تم سے پہلے بھی ایک فوجی سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ تمہاری طرح ینگ نہیں تھا پھر بھی بڑی زبردست چیز تھا۔ افسوس کہ ایک بار کے بعد دوبارہ واپس ہی نہیں آیا۔'' وہ آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اب بے تکلفی کے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اور اسے بہت نرمی سے بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کرنل توحید نام بتایا تھا اس نے مجھے۔ بہت ہینڈسم اور زور آور آدمی تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہو گا؟ دل میں بڑی شدید خواہش ہے کہ کبھی دوبارہ اس سے مل سکوں۔ تم تو خود آرمی میں ہو۔ کبھی سامنا ہو تو پیغام دینا کہ دیبا مساج سینٹر والی عالیہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔''

''میں کیسے انہیں یہ پیغام دے سکتا ہوں؟ ایک کرنل سے کیپٹن رینک کے کسی بندے کو ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔'' عالیہ کی زبان سے کرنل توحید کا ذکر سن کر وہ چونک گیا تھا۔ اس بات پر یقین کرنا تو خیر مشکل تھا کہ کرنل توحید کبھی اس مساج سینٹر پر عالیہ نام کی اس عورت سے ملے ہوں گے، البتہ عالیہ کی ذات کچھ اور بھی مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے کوائف نوٹ کرواتے ہوئے اپنے آپ کو قابلِ توجہ بنانے کے لیے یہ بتایا تھا کہ اس کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر جنرل تھے اور شاید اصل میں یہی بات عالیہ کے لیے قابلِ توجہ ٹھہری تھی ایک بریگیڈیئر جنرل کی فیملی سے کسی کرنل کے مراسم ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا اور اس امکان کی بنیاد پر عالیہ اس کی مدد سے کرنل توحید کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔



اسے کرنل توحید پر ہونے والا وہ خودکش حملہ نہیں بھولا تھا جس میں وہ سی ایف پی کے جوانوں کی پھرتی کے باعث بال بال بچے تھے۔ ان پر وہ حملہ شہریار کی سابقہ بیوی ڈاکٹر ماریہ کے قتل کے بعد انتقامی کارروائی کے طور پر کیا گیا تھا اور ڈاکٹر ماریہ مبینہ طور پر ''را'' اور ''موساد'' کی ڈبل ایجنٹ تھی۔ اور اب عالیہ اس کے حوالے سے چھان بین کر رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا بھی ان دونوں تنظیموں یا کم از کم کسی ایک سے ضرور تعلق ہے۔

''کسی عام کیپٹن کی نہیں ہو سکتی لیکن ایسا کیپٹن جو خود بریگیڈیئر جنرل کا بیٹا ہو، ایسی جرأت کر سکتا ہے۔'' عالیہ نے وہی بات کہی جو اس کے اپنے دھیان میں تھی۔

''تم کرنل صاحب کو ٹھیک سے جانتی نہیں ہو اس لیے ایسی بات کہہ رہی ہو۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہیں اور نجی محفلوں میں بھی ڈسپلن کو توڑنا پسند نہیں کرتے۔'' اس نے عالیہ کو تاثر دیا کہ وہ کرنل توحید سے بخوبی واقف ہے۔ ردِعمل میں اس نے عالیہ کے چہرے پر دوڑتی خوشی کی لہر کو بخوبی محسوس کیا۔

''ٹھیک ہے، تم میں ہمت نہیں ہے تو مجھے اُن کا ایڈریس دے دینا۔ میں تمہیں دکھاؤں گی کہ تمہارے وہ ہارڈ اینڈ ٹف کرنل صاحب، عالیہ کے سامنے کیسے موم بنتے ہیں۔''

اس نے ابھی تک اُس کا باقاعدہ مساج شروع نہیں کیا تھا اور یونہی اِدھر سے اُدھر اُنگلیوں کو گردش دے رہی تھی۔ شاید وہ سمجھی تھی کہ ایک بے وقوف کیپٹن ہاتھ آ گیا ہے اور اس سے وہ آسانی سے کرنل کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گی۔

''اے، ذرا احتیاط سے۔ میرا تعویذ خراب نہیں ہونا چاہیے۔'' عالیہ کی گردش کرتی لمبی انگلیاں بے دھیانی میں اس کے گلے میں موجود تعویذ سے جا ٹکرائی تھیں۔ اس نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کا یہ موقع مناسب سمجھا اور اسے ٹوکا۔

''اوہ سوری۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا ماڈرن آرمی آفیسر بھی یہ تعویذ وغیرہ جیسی چیزیں پہنتا ہے۔'' اس نے فوراً ہی معذرت کرنے کے ساتھ حیرت کا بھی اظہار کیا۔

''میری ماں دیہاتی بیک گراؤنڈ کی ذرا پرانے خیالات کی عورت ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک میں یہ تعویذ اپنے گلے میں پہنے رہوں گا، ہر بلا اور مصیبت سے بچا رہوں گا۔'' اس نے بتایا۔

''چلو پھر دیکھتے ہیں کہ تمہاری ماں کا یہ تعویذ آج تمہیں مجھ جیسی خوب صورت بلا سے کیسے بچاتا ہے؟'' اس نے شوخی سے کہتے ہوئے جھک کر اس پر چھا جانے کی کوشش کی۔

اسی پل ایک ساتھ دو باتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ایک جاوید علی کی گردن کے قریب پیدا ہونے والا ارتعاش اور دوسرے کمرے میں موجود کسی خفیہ اسپیکر سے اُبھرنے والی آواز۔ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ نہ تو یہاں کی آوازیں باہر جا سکتی تھیں اور نہ ہی باہر کی آوازیں اندر آ سکتی تھیں، شاید اسی لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔

''پولیس نے سینٹر پر ریڈ کر دیا ہے۔ پلیز آپ سب الرٹ ہو جائیں۔'' اسپیکر سے اُبھرنے والی گھبرائی ہوئی آواز کو اس نے شناخت کر لیا۔ وہ وہی مترنم آواز والی ریسپشنسٹ تھی جس سے وہ استقبالیہ کمرے میں مل چکا تھا۔

اس کی آواز سن کر اس نے بڑی خوبصورتی سے فطری ردِعمل کا اظہار کیا اور عالیہ کو دھکیل کر اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے اس اسٹینڈ کی طرف دوڑا جہاں اس کی شرٹ موجود تھی۔ شرٹ اسٹینڈ سے اُتار کر اس نے نہایت پھرتی سے پہن لی اور بٹن لگاتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں عالیہ سے پوچھنے لگا۔

''یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تو بتاؤ؟''

''اتنے پریشان مت ہو کیپٹن! ہم سچویشن کو ہینڈل کر لیں گے۔ یہ پولیس والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' عالیہ نے بھی اس دوران اپنا گاؤن پہن لیا تھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے دلاسا دے رہی تھی۔

''تم میرا پرابلم نہیں سمجھو گی۔ آج کل پولیس والے میڈیا کی ٹیم ساتھ لے کر ریڈ کرتے ہیں۔ تم تو شاید بعد میں مک مکا کر کے اپنا دھندا چلاتی رہو گی لیکن میری یہاں موجودگی ظاہر ہو گئی تو میرے خاندان کی ساکھ پھر کبھی نہیں لوٹ سکے گی۔ مجھے کسی کی بھی نظروں میں آئے بغیر فوراً یہاں سے نکلنا ہے اور تم مجھے باہر نکالو گی۔'' وہ طیش کا مظاہرہ کرتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا۔

''اوکے، میں کچھ کرتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔'' وہ اسے لے کر کمرے سے باہر نکلی تو معاملے کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہوا۔ وہاں خاصا شور تھا اور دیگر کمروں میں موجود افراد بھی باہر نکل آئے تھے۔ نیچے سے پولیس والوں کی وارننگ کے ساتھ ساتھ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''اس طرف چلو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کوریڈور کے آخری سرے کی طرف بھاگی۔ اس سرے پر بھی سیڑھیاں موجود تھیں۔ وہ اسے لے کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔

نیچے پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا رخ کیا اور دفتر کے انداز سے سجے اس کمرے میں ٹھہرنے کے بجائے وہاں موجود دوسرے دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ اب وہ عمارت کے بغلی حصے میں تھے۔

''ہمیں یہ دیوار پھاند کر باہر نکلنا ہو گا۔'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اسے بتایا۔

''ہم اس دیوار کو پھلانگ کر کہاں نکلیں گے؟'' جاوید علی نے اس سے دریافت کیا۔

''گلی میں۔ یہ ایک پتلی سی گلی ہے جس کے دوسری طرف ایک پرائیویٹ اسکول کی باؤنڈری وال ہے۔ اس وقت اسکول بند ہو گا۔ ہم اس کی باؤنڈری وال کراس کر کے اندر اس وقت تک چھپ سکتے ہیں جب تک پولیس یہاں سے چلی نہیں جاتی۔ وہاں بیٹھ کر میں اوپر کسی کو نمبر ملاؤں گی تو پولیس والوں کا دماغ خود ہی ٹھکانے آ جائے گا۔''

وہ پتہ نہیں کیسے اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی لیکن بہت زیادہ پریشان بہرحال نہیں لگ رہی تھی اور پوری طرح پُریقین تھی کہ سچویشن اس کی منشا کے مطابق کنٹرول میں آ جائے گی۔

''تمہیں جو کچھ کرنا ہے، بعد میں کرتی رہنا۔ فی الحال تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' جاوید علی ہر صورت اسے وہاں سے باہر نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے سوچنے کا موقع نہ ملے۔ اس کے ٹوکنے پر وہ حرکت میں آئی اور اس کا سہارا لے کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس کے دیوار پر چڑھنے کے انداز میں خاصی مشاقی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔

وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کود گیا۔ درمیانی گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ وہ دونوں اسے پار کر کے اسکول کے احاطے کی طرف بڑھے اور ابھی وہ اسے سہارا دے کر دیوار پر چڑھا ہی رہا تھا کہ گلی روشنیوں سے بھر گئی۔

''خبردار!..... بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' روشنی کے ساتھ ہی ایک للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ دونوں ہی گویا ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر عالیہ نے تیزی سے اپنے گاؤن میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا



لیکن جاوید علی نے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے اس کی کلائی کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو ایڈیٹ!..... مجھے فون کرنا ہے۔'' وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے غرائی لیکن ظاہر ہے وہ اس کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ اسی پل بھاگتے ہوئے قدم ان کے عین سامنے آ کر رک گئے اور ایک گن کی نال عالیہ کی کنپٹی سے جا لگی۔

''اسے گاڑی میں ڈالو۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' جاوید علی نے گن بردار اور اس کے دوسرے ساتھی کو حکم دیا۔

''یُو.....'' عالیہ کچھ سمجھتی ہوئی اس کی طرف غصے سے مڑی۔

''حرکت مت کرو۔ ورنہ یہیں ماری جاؤ گی۔'' گن بردار نے سختی سے اسے حکم دیا پھر یک دم ہی گن کا دستہ نپے تلے انداز میں اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ لہراتی ہوئی نیچے گرنے لگی تو اس کے دوسرے ساتھی نے اسے سنبھال لیا اور کندھے پر ڈال کر گلی کے دوسرے سرے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ یہ گلی خاصی پتلی تھی اس لیے وہ لوگ اپنی گاڑی اندر نہیں لا سکے تھے اور مجبوراً عالیہ کو اپنے کندھے پر اٹھا کر گاڑی تک لے جانا پڑا تھا۔

کارروائی کرنے والے، جاوید علی سمیت گاڑی میں بیٹھ گئے تو گاڑی آگے بڑھ گئی۔ جاوید علی یہاں جلدی میں آیا تھا اس لیے اسے اپنے پیچھے گاڑی یہاں کھڑی رہ جانے کی ٹینشن نہیں تھی۔ سی ایف پی اور پولیس کا کوئی ایڈونچر ہونے کے باوجود انہوں نے احتیاط رکھی تھی کہ پولیس کو بھی ان کا کوئی اتا پتہ نہ ملے۔ وہ پولیس کے محکمے میں بھری ہوئی کالی بھیڑوں کی وجہ سے ان پر کبھی بھی پورا اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اس کارروائی کے لیے بھی پولیس والوں کو اوپر سے بس اتنے احکامات دیئے گئے تھے کہ خفیہ ایجنسی کے دو افراد انہیں اپنے ساتھ جس جگہ لے جائیں، وہاں بغیر کسی جھجک کے ریڈ کر دیں اور ریڈ کی جگہ پر سے یہ دونوں افراد جو کچھ اپنی تحویل میں لینا چاہیں، لینے دیں۔ پولیس کا کام صرف اتنا ہو گا کہ عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر کے عمارت اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد آگے کی کارروائی کے لیے انہیں مزید ہدایات جاری کی جائیں گی۔

مقامی تھانے کا انچارج اور دیگر افسران اگرچہ ان احکامات پر جز بز تو ہوئے تھے، خاص طور پر انہیں یہ بات بری طرح کھلی تھی کہ انہیں استعمال تو کیا جا رہا ہے لیکن اعتماد نہیں کیا جا رہا تھا لیکن حکم کی تعمیل مجبوری تھی کہ احکامات آئے ہی اوپر سے اور سختی کے ساتھ تھے کہ ان کے پاس چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی۔

''ہاں، کیا رہا؟'' گاڑی نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ جاوید علی کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی اور سنجیدگی سے بولا۔

''پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دی ہیں۔ تھانہ انچارج کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ اس کارروائی پر بالکل بھی خوش نہیں ہے اور مجبوری میں ہی سب کچھ کر رہا ہے۔ اوپر کے احکامات کے علاوہ تھوڑا دباؤ میڈیا کا بھی ہے۔ ہم جس نیوز رپورٹر کو اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ وہ اپنے ہینڈی کیم سمیت مسلسل پولیس والوں کے سر پر سوار ہے۔ میڈم دیبا نے بھی خاصا شور مچا رکھا تھا اور پولیس والوں کو مسلسل دھمکیاں اور گالیاں دے رہی تھی کہ پابندی سے ملنے والے ماہانہ بھتے کے باوجود انہوں نے اس کے سینٹر میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی۔ وہ تو تھانہ انچارج نے ہی میڈیا کے بندے کی موجودگی کا احساس دلا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ورنہ پبلک کو اور بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو مل جاتا۔'' دوسری طرف موجود شخص پُرجوش انداز میں اسے تفصیلات

سے آگاہ کرنے لگا۔

''یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، تم لوگوں کے کام کا کیا رہا؟'' اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''ہم نے کافی کچھ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ مختلف مقامات خصوصاً کمروں میں نصب کیمروں سے تیار کی جانے والی ویڈیوز ہمارے قبضے میں ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹرز سے ہارڈ ڈسکس بھی نکال لی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ یہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ ہم دو افراد محدود وقت میں سب کچھ نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں اس عمارت کو اپنی کسٹڈی میں لینا ہوگا۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''ٹھیک ہے۔ پولیس والوں کو بتا دو کہ فی الحال وہ عمارت سے ملازمین کے علاوہ کوئی بھی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے اور وقتی طور پر عمارت کا کنٹرول بھی انہیں تمہارے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ بعد میں ضروری کارروائی کر کے عمارت ان کے حوالے کر دی جائے گی۔'' اس نے ہدایت جاری کی۔

''او کے باس!.....اور کچھ؟''

''اور یہ کہ اس نیوز رپورٹر سے ہوشیار رہنا۔ اسٹوری بنانے کے چکر میں یہ لوگ اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ اس ریڈ میں سی ایف پی یا کسی دوسرے خفیہ ادارے کی شمولیت کا قطعی ذکر نہیں آنا چاہئے۔''

اس نیوز رپورٹر کو انہوں نے ایک بڑی اسٹوری کا لالچ دے کر خود اس کارروائی میں ساتھ رکھنے کا انتظام کیا تھا لیکن اس پر چند شرائط بھی لاگو کی گئی تھیں جن میں ایک کسی خفیہ ادارے کی موجودگی کو راز میں رکھنا بھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بس وہی کچھ ریکارڈ کر سکتا تھا جس کی اسے اجازت دی جاتی۔ رازداری کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی کیمرہ ٹیم اور ٹیکنیکل اسٹاف کو ساتھ لانے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی اور وہ تنہا ہی اپنے ہینڈی کیم کی مدد سے اس موقع کی کوریج کر رہا تھا۔

''ڈونٹ وری۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ یہاں سے جانے سے پہلے اسے اپنے کیمرے میں محفوظ ویڈیوز سمیت ہر چیز کی مکمل تلاشی دینی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر تم اطمینان سے اپنا کام کرو۔ تم دونوں جب تک وہاں موجود ہو، تمہیں کور دینے کے لیے ہمارے ساتھی آس پاس موجود رہیں گے۔''

وہ موبائل آف کر کے واپس جیب میں رکھنے لگا تو ہاتھ خود بخود ہی اپنے گلے میں موجود تعویذ سے ٹکرایا۔ اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس تعویذ کو اپنے گلے سے اتار کر محفوظ کرنے کے لیے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔

آج کے اس مشن میں اس تعویذ نے بڑی کرامات دکھائی تھیں۔ بظاہر وہ سیاہ ڈوری میں پرویا ہوا عام سا چوکور تعویذ تھا لیکن حقیقت میں اس میں ایک نہایت طاقتور اور جدید ساخت کی ننھی سی ڈیوائس رکھی گئی تھی۔ اس ڈیوائس کی مدد سے اس کے ساتھی دُور گاڑی میں بیٹھے مساج سینٹر میں اس کی کسی بھی فرد سے ہونے والی گفتگو اچھی طرح سنتے رہے تھے۔

اس کے علاوہ اس میں ایک دوسرے کو کاشن دینے کی سہولت بھی موجود تھی۔ مساج سینٹر میں عالیہ سے سامنا ہوتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو کاشن دے دیا تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی طرح اسے کاشن دے کر اپنے ایکشن کے لیے ریڈی ہونے کا عندیہ دیتے رہے تھے۔ تعویذ کے ساتھ رابطے میں موجود جلد کی سطح پر یہ کاشن ایک تھرتھراہٹ کی صورت میں محسوس ہوتا تھا اور کسی دوسرے کو اس



کی خبر نہیں ہو پاتی تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ عالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اپنی دانست میں تو وہ اصل تو حید تک پہنچنے کے لیے کسی کھلنڈرے سے کیپٹن کو قابو میں کرنے جا رہی تھی لیکن کھیل ہی کھیل میں بازی پلٹ گئی تھی اور اب وہی صورت سے بھولا نظر آنے والا کیپٹن چہرے پر سخت تاثرات سجائے اسے بے خبری کے عالم میں اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔

بے ہوشی کی حالت میں پچھلی نشست پر بیٹھی عالیہ کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ شکل و صورت سے بھولا بھالا نظر آنے والا یہ کیپٹن اس کے ''را'' اور ''موسا'' سے ملتے تانے بانوں کی وجہ سے اس کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ''را'' والوں کی وجہ سے اپنی پہلی محبت کو کھویا تھا۔ اسے کبھی بھی، کسی بھی حال میں شازمین کا چہرہ بھولتا نہیں تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کی یادداشت میں ہر دم تازہ رہنے والا شازمین کا چہرہ اپنے خوب صورت خدوخال کے ساتھ نہیں بلکہ اس اذیت اور خوف کے ساتھ منجمد تھا جس سے وہ ''را'' کے ایجنٹوں کی تحویل میں گزری تھی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ''را'' کے کسی ایجنٹ کے ہاتھ آ جانے کے بعد وہ اس کے ساتھ کسی رُو رعایت یا نرمی سے کام لیتا۔ اس طرح عالیہ کا بُرا وقت اس کے بہت قریب آ گیا تھا لیکن وہ اس سے بے خبر پچھلی نشست پر بے ہوش پڑی کبھی دائیں والے تو کبھی بائیں والے کے کندھے پر گری جا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''مجھے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا سر؟'' ذیشان نے اپنے فون پر عمیر آفندی کی کال ریسیو کی تو خود کو خاصی مشکل میں محسوس کیا۔

عمیر آفندی کو شہریار کی جگہ دلوانے میں سی ایف پی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اس نے اب تک یہ ثابت کیا تھا کہ اس کا انتخاب درست ہے۔ وہ دیانت داری اور سمجھ داری کے ساتھ اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دے رہا تھا لیکن اس دوران اسے ایک بڑے صدمے سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کا کزن اظفر جو درحقیقت سی ایف پی کا جوان تھا، جنگل کا راز جاننے کی کوشش میں اپنے ساتھیوں سمیت اپنی جان گنوا چکا تھا۔ عمیر ہی تھا جس نے اس بات کا کھوج لگایا تھا کہ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی موت کے پیچھے کوئی حادثہ نہیں بلکہ باقاعدہ قاتلانہ منصوبہ موجود تھا اور اسی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد تحقیقات کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ وہاں جنگل میں ایسا کیا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑ رہی ہیں۔

''مجھے تمہارے جذبات کا پوری طرح احساس ہے عمیر! شاید تم یقین نہیں کرو لیکن اظفر کو کھونے کا ہم سب کو بھی اتنا ہی دُکھ ہے جتنا تمہیں۔ بلکہ ہمارا دُکھ تو اس حوالے سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اظفر کے ساتھ ہم نے اپنے چار ساتھی مزید گنوائے ہیں اور ہم مزید کوئی کارروائی کرنے میں تذبذب کا شکار بھی اسی لیے ہیں کہ کہیں کسی بھرپور پلاننگ کے نہ ہونے کی صورت میں ہمیں مزید نقصان نہ اٹھانا پڑے۔'' آخر خود کو سنبھال کر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یوں کہیں کہ آپ لوگ ڈر رہے ہیں اور آپ کے پاس اظفر جیسا کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے جو بے خوف اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔'' وہ ذرا تلخ ہوا۔

''تم غلط ہی نہیں سمجھ رہے، ہمارے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی بھی کر رہے ہو۔ ہم میں سے ہر ایک ہر وقت وطن کی خاطر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اندھا دھند

اپنے آدمیوں کو آگ میں جھونک دیں۔ ہمارا ہر ایک ساتھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے اور اظفر جیسے خوبیوں والے جوانوں کو کھونے کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کی صورتِ حال کتنی خراب ہے۔ ہم اس کو بھولے نہیں ہیں کہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی کارروائی کرنی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ افرادی قوت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے تھوڑا انتظار کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے لوگ کئی دوسرے محاذوں پر مصروف ہیں اور فی الحال ہم اس طرف توجہ دینے پر مجبور ہیں۔ جنگل میں آپریشن کرنا ہماری آئندہ کی پلاننگ میں شامل ہے لیکن اب یہ آپریشن پولیس کے ذریعے نہیں کرنا چاہتے۔ پولیس میں موجود کالی بھیڑوں اور رازداری کے فقدان کی وجہ سے ایسی کوئی کوشش وقت اور پیسے کے زیاں کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوگی۔ چنانچہ چاہے تمہیں کتنا ہی ناگوار گزرے، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمہیں بھی ہماری طرح موزوں وقت تک کے لیے صبر کرنا ہوگا۔'' اس نے عمیر کے تلخ جملے کے جواب میں ذرا طوالت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ لوگ مشابرم خان کو بھی واپس ڈیوٹی پر نہیں بھجوا رہے ہیں۔ وہ میرے پاس آ جائے تو کم از کم دونوں ہی مل کر کچھ کر ڈالیں گے۔ وہ جی دار بندہ ہے، میرا ساتھ ضرور دے گا۔'' عمیر کی سُوئی ابھی تک اٹکی ہوئی تھی۔

مشابرم خان کے معاملے میں ہم مجبور ہیں۔ وہ کچھ ایسے معاملات میں ملوث ہو گیا ہے کہ اب اس کا منظرِ عام پر آنا خود اس کی جان کی سلامتی کے لیے خطرناک ہوگا۔ کم از کم اب وہ اپنی پہلی والی جگہ پر تو ہرگز کام نہیں کر سکے گا۔ اس کے لیے ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں۔'' ذیشان نے اسے دوٹوک جواب دیا۔

''اس طرح تو میں یہاں کچھ نہیں کر سکوں گا اور چودھری اور اس کے گرگے اپنی من مانی کرتے رہیں گے۔'' وہ جھنجلایا۔

''ایک بات یاد رکھو عمیر! ہم قصائی نہیں ہیں۔ ہم اپنے لوگوں کی وطن کے لیے محبت اور جذبات کو روندتے ہوئے اُنہیں کسی مذبح خانے میں ایسے ہی نہیں دھکیل دیتے۔ اگرچہ ہم ہیں ہی خطروں کے کھلاڑی پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ایک ایک فرد کی حفاظت کا خیال رکھیں۔''

ذیشان بھی اب بے حد سنجیدہ موڈ میں آ چکا تھا لیکن عمیر کی ذہنی رو شاید کچھ بہکی ہوئی تھی چنانچہ اس نے جھنجلاہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ذرا غصے سے بولا۔

''آپ احتیاطیں ہی کرتے رہیں گے اور یہاں چودھری اور اس کے گرگے خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہاں ایسا کوئی فرد نہیں جو ان کے ہاتھ پکڑ سکے۔ وہ خود کو قانون کی گرفت سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔''

''وہاں کون سا نیا واقعہ ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں جان سکوں کہ تم اتنے ڈسٹرب کیوں ہو؟'' ذیشان کا لہجہ یک دم ہی نرم پڑ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو عمیر جیسے کھرے شخص کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی ہے۔

چودھری کے گاؤں میں ہونے والے سالانہ عرس کے بارے میں تو آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ اپنی اسی پالیسی کے مطابق کہ چودھری سے اُلجھے بغیر اپنے کام کیے جاتے رہیں۔ میں اس عرس میں شریک ہوا تھا لیکن صرف کھانے کے وقت تک۔ میرے پی اے عبدالمنان نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چودھری کے اصرار پر وہاں رات بسر کرنے والے عیاشی اور فحاشی کی ہر حد پھلانگ جاتے ہیں اور ظاہر ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عرس کی رات وہاں بڑا ہنگامہ ہوا اور چودھری نے تشدد کے ذریعے وہاں آئی



طوائف کو قتل کر ڈالا۔ اصولاً اس پر قتل کا مقدمہ چلنا چاہئے تھا لیکن چودھری نے نائیکہ کا منہ نوٹوں سے بھر بند کر دیا اور اس کے اپنے ذاتی ملازمین میں سے تو کسی کے منہ کھولنے کا ویسے ہی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا تو بے چاری طوائف کے قتل کا مقدمہ کون درج کرواتا؟ اب آپ بتائیں کہ وہ عورت بے شک طوائف تھی اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک انسان کا یہ حق ہے کہ اگر کسی نے اس پر زیادتی کی ہے تو ذمے دار افراد اس کی دادرسی کریں۔ وہ مظلوم طوائف اپنی جان سے جانے کے بعد قبر کے اندھیروں میں منتظر ہوگی کہ کسی طرح تو نظامِ انصاف کام کرے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ سرے سے کوئی مدعی اور گواہ ہی نہیں ہے۔''

عمیر اپنے ڈپریشن کی وجہ آہستہ آہستہ بتاتا چلا گیا۔ حادثے کا علم اسے ان خبروں کے ذریعے ہوا تھا جن پر چھپانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے، مگر وہ سرگوشیوں کی صورت اردگرد گردش کرتی رہتی ہیں۔

''یہ واقعی بہت افسوس ناک واقعہ ہے لیکن اس واقعے پر بیٹھ کر صرف افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کوشش کرو کہ کسی طرح اس معاملے میں چودھری پر گرفت کی جا سکے۔'' ذیشان نے خود بھی افسوس کرتے ہوئے اس کو مشورہ دیا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ جبکہ کہیں قتل کا کوئی مقدمہ ہی درج نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کوئی عینی شاہد موجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق موت کی وجہ سیڑھیوں سے گرنا قرار دی گئی ہے۔'' وہ کچھ مایوس سا تھا۔

''تم یہ کر سکتے ہو کہ اس کیس کی تحقیقات کرواؤ۔ وہاں پولیس میں ڈی ایس پی منظور نامی ایک آدمی کافی اچھا کام کا ہے۔ تم پیچھے رہتے ہوئے اس سے اس سلسلے میں کام لے سکتے ہو۔ مرنے والی کی قبر کشائی کروا کر اس کا پوسٹ مارٹم کرواؤ۔ لیکن اس سے پہلے اس کا کوئی ایسا والی وارث یا قریبی سہیلی وغیرہ ڈھونڈو جو اس واقعے پر دل سے افسردہ ہو اور اس بات پر راضی ہو جائے کہ چودھری کے نام نہ سہی، کسی نامعلوم فرد کے خلاف ایف آئی آر درج کروا دے۔ نائیکہ نے رقم لے کر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے سب نے بھی اس صورتِ حال کو قبول کر لیا ہو۔ لوگ کسی کی طاقت سے خوف زدہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ سارے کے سارے لوگ ہی بے حس ہوں۔ وہاں اس کوٹھے پر کوئی تو ہوگا جسے اس صورتِ حال نے توڑا ہوگا۔ تمہارا کام ہے کہ کسی بھی طریقے سے اس شخص کا کھوج لگاؤ۔ باقی رہی گواہ کی بات تو وہ تمہیں پولیس کے اندر بھی مل سکتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق چودھری کے چھوٹے بیٹے بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ اپنے سسر سے سخت نفرت کرتی ہے اور اگر ہم کسی طرح اس تک رسائی حاصل کر لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ گواہی کے لیے تیار ہو جائے گی۔'' وہ ایک کے بعد ایک مشورے دیتا چلا گیا جو عمیر آفندی کے دل کو لگے۔

''آپ نے مجھے بہت اچھی لائن آف ایکشن دے دی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چودھری کی گردن گرفت میں لے سکوں۔'' حسبِ توقع وہ کوئی راہ نظر آتے ہی پُرجوش ہو گیا۔

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔'' ذیشان جانتا تھا کہ چودھری جیسے بندوں کے لیے اس نظام میں اس قسم کے الزامات سے بچنے کے لیے کتنی گنجائش اور سہولتیں موجود ہیں پھر بھی اس کی ہمت بندھائی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قتل کے اس کیس میں بے شک چودھری کو کوئی سزا نہ ملے اور الزام ثابت نہ ہو، پھر بھی اتنا ہوگا کہ اس کے دامن پر لگنے والے داغوں میں ایک داغ کا اضافہ ہو جائے گا۔

''میں اس کیس کو حل کرنے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔'' عمیر نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''ہم بھی اظفر کے قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اور انہیں ایک دن ان کے انجام تک ضرور

پہنچائیں گے۔'' جواباً ذیشان نے اسے یقین دہانی کروائی اور دوسری طرف کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

اگرچہ اس نے بہت سبھاؤ سے عمیر کو اس وقت نمٹایا تھا لیکن خود اس کے اپنے اعصاب جھنجھنا اُٹھے تھے اور وہ کسی بھی کام کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ عجیب اعصاب زدہ حالت میں اپنی نشست چھوڑ دی اور ایک ایسی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں بے شمار کیسوں کی فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک فائل اظفر والے کیس کی بھی تھی۔ اس فائل کو الماری سے نکال کر وہ اپنی میز تک آیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

فائل میں اظفر اور اس کے ساتھیوں کی پیر آباد روانگی سے لے کر ان کے قتل تک کی تمام ممکنہ معلومات موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک نقشہ بھی موجود تھا۔ یہ نقشہ انہیں اظفر کے سامان سے ملا تھا۔

فائل پڑھتے ہوئے اس نے وہ نقشہ بھی کھول ڈالا۔ جنگل کے بارے میں اس معلوماتی نقشے پر اظفر نے بہت سے نشان لگائے تھے لیکن ان نشانوں میں ایک نشان بہت نمایاں تھا۔ اظفر نے اپنی نوٹ بک میں زندہ مقام تک پہنچنے کے لیے عین اسی دن کی تاریخ لکھی تھی جس دن اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا گیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان سب کی لاشیں اس مقام سے بہت دور بالکل مختلف سمت میں ملی تھیں جبکہ اگر لوگ کسی حادثے کا شکار ہوئے بھی تھے تو اصولاً ان کی لاشیں اس مقام کے اطراف میں یا اس کی طرف جانے والے راستے پر ملنی چاہئے تھیں۔ یہ نکتہ شروع ہی سے اس کے ذہن میں کھٹکتا رہا تھا۔ اب ایک بار پھر فائل دیکھنے پر وہ کھٹک بیدار ہو گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی اس سمت میں دوبارہ کام شروع کیا گیا اس نکتے کو سب سے زیادہ اہمیت دینے پر زور دے گا۔

⊛----✪----⊛



ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔

یہ ممبئی سے دہلی جانے والی نان اسٹاپ ٹرین تھی اور وہ دونوں فرسٹ کلاس کے کوپے میں بیٹھے اس عجیب و غریب صورتِ حال پر حیرت زدہ تھے۔ آج ہی تو وہ دہلی سے اپنی جان بچا کر ممبئی پہنچے تھے لیکن ممبئی کے اسٹیشن پر اُترتے ہی ان کے ساتھ عجیب و غریب واقعات کا آغاز ہو گیا تھا اور واقعات کے اس تسلسل کے نتیجے میں وہ ایک بار پھر دہلی کی طرف جا..... بلکہ بھیجے جا رہے تھے۔

ان کے حساب کتاب کے مطابق اس وقت ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ انسپکٹر پریم ناتھ پر گھات لگا کر اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جاتے اور اس کا دماغ ٹھکانے پر لانے کی تدبیریں کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس نے اچانک یہ ترقی کی راہیں کس طرح طے کیں اور اس میں ڈاکٹر فرحان جمیل والے کیس کا کتنا دخل ہے؟ پریم ناتھ کی ترقی اور فرحان جمیل کے کیس کا آپس میں ربط مل جانے کی صورت میں ان کے لیے انہیں تلاش کرنے میں کچھ آسانی ہو جاتی۔ وہ کوشش کرتے تو شاید یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ فرحان جمیل کو اس کے ننھیالی گاؤں سے اغوا کر کے کس جگہ رکھا گیا ہے۔ کم از کم کوئی کلیو تو مل ہی جاتا۔ لیکن یہاں الٹی ہی کہانی شروع ہو گئی۔ وہ اس عجیب سی رپورٹر لڑکی اندو کی مہربانی سے ممبئی سے واپس دہلی جانے والی ٹرین میں بیٹھے ہوئے تھے اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔

دہلی تک جا کر واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا اور یہ اندیشہ بھی رہتا کہ وہاں پہنچنے کی صورت میں کہیں نادر دادا یا اس کے آدمیوں سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ ناگزیر حالات کے علاوہ وہ کسی بھی شخص سے براہِ راست تصادم کے حق میں نہیں تھے اور اب اس وبال سے نکلنے کی مشترکہ کوشش کر رہے تھے۔

''انہیں ہمارے بریف کیس کھولنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' کوئی موضوعِ گفتگو نہ پا کر سلو نے ایک بار پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔

وہ بہت ایمرجنسی میں بالکل ٹرین کے چلنے کے وقت پر وہاں پہنچے تھے، اس کے باوجود سلو نے کوپے میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنے بریف کیسوں کو چیک کیا تھا اور چیک کرنے کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ بریف کیسوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کوشش کرنے والوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

بریف کیس ان کے لیے بہت اہم تھے۔ ایک طرف وہ اگر انہیں کاروباری نظر آنے والے معززین شمار کرواتے تھے تو دوسری طرف ان میں ان کا بہت سا اہم سامان موجود تھا۔

''اسے تجسس کے علاوہ کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ اندو صحافی ہے جو کہ فطرتاً ہوتے ہی کھوجی ہیں۔ اور اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ جرائم پیشہ افراد کی آلۂ کار بھی بنی ہوئی ہے۔ ہمارے متعلق جاننے کے شوق نے اس سے

یہ قدم اُٹھوایا ہوگا لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔'' شہریار نے اپنا خیال پیش کیا۔ اس تیز رفتار ٹرین میں بیٹھ کر وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

''ایک طرح سے یہ اطمینان کی بات ہے بھی اور نہیں بھی۔ اطمینان اس بات کا کہ وہ لوگ بریف کیس میں موجود اشیا کے بارے میں نہیں جان سکے لیکن اگر اندو کی شخصیت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی اس بات پر خاصی بے چین ہوگئی ہوگی کہ عام سے کاروباری افراد کے پاس اس طرح کے بریف کیس کیونکر موجود ہیں جو ایک گینگ کے ماہر غنڈوں سے بھی نہیں کھل پائے۔''

سلّو نے جو تجزیہ پیش کیا، وہ قابلِ غور تھا۔ جرائم کی دنیا سے وابستہ افراد کی حس کسی گڑبڑ کو محسوس کرنے کے معاملے میں دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے اس لیے بہت ممکن تھا کہ اندو نے ان کی اس بارے میں بتائی گئی تفصیلات میں سے کسی پر بھی یقین نہ کیا ہو۔ لیکن اس صورت میں سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس کا اگلا اقدام کیا ہوگا۔ ظاہری طور پر تو اس نے اخلاقی تقاضے پورے کرتے ہوئے ان دونوں کو بھائی کے گرگوں کے چنگل سے چھڑا کر ممبئی سے بحفاظت نکال دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی تھی کہ دہلی سے سیدھے اپنے شہر پانی پت چلے جاؤ۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرے رخ سے دیکھا جاتا تو سمجھ آتی کہ اندو کے نزدیک وہ دونوں مشکوک افراد ہیں چنانچہ اس نے کوئی نہ کوئی ایسا انتظام کیا ہوگا کہ ان کے بارے میں حقیقت جان سکے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ دہلی ریلوے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد انہیں ایسے افراد کا سامنا کرنا پڑے جو ان کے بارے میں کھوج لگانے پر مامور ہوں۔ دہلی سے پہلے کوئی ایسا امکان اس لیے نہیں تھا کہ یہ ٹرین نان اسٹاپ دہلی جا رہی تھی۔

''ہمیں اس لڑکی سے اپنا پیچھا چھڑانا ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم دہلی پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی کہیں غائب ہو جائیں اور ٹرین کے بجائے کسی اور ذریعے سے واپس ممبئی پہنچیں۔'' وہ جیسے جیسے غور کر رہا تھا، ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اندو نامی وہ لڑکی اتنی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی دوبارہ اتنا لمبا سفر طے کر کے دہلی واپس جا پہنچنے کی تو کوئی تک ہی نہیں تھی۔ اندو کے بارے میں اپنی سوچ کو وہ واہمہ بھی قرار دے دیتے، تب بھی ان کے لیے مناسب تو یہی تھا کہ وہ دہلی نہ جائیں اور راستے میں ہی کہیں ڈراپ ہو جائیں۔ مگر کیسے؟..... یہ ایک سوال تھا جو ان کے ذہنوں میں گونج رہا تھا۔ آخر وہ سوچ سمجھ کر ایک منظم منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

شہریار نے گھنٹی کا بٹن دبا کر فرسٹ کلاس میں سروس فراہم کرنے والے بیرے کو اپنے کوپے میں بلوایا۔ جس وقت بیرا کوپے میں آیا، سلّو اوپر کی برتھ پر سینے تک چادر اوڑھے لیٹا تھا اور بہت دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔

''میرے لیے ایک کپ کافی لا دو۔ اگر ہو سکے تو میرے ساتھی کے لیے کوئی پین کلر بھی لے آنا۔ میں گردوں کا مریض ہے اور بدقسمتی سے اس نے اپنی دوائیں ساتھ نہیں رکھی تھیں۔ اب اسے درد شروع ہو گیا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ دہلی تک کس طرح پہنچے گا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جاگ کر اس کے سرہانے ڈیوٹی دینی پڑے گی اسی لیے میں کافی کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''

اس نے بیرے کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا جس پر اس کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن



اسے دلاسا دینے کے لیے وہ مسکرایا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

''ڈونٹ وری سر! میں ابھی دونوں چیزیں پہنچاتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ ان کی حالت سنبھل جائے گی۔''

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کی پیالی اور پین کلر سمیت واپس آ گیا۔ اس بار سلّو کی کراہیں کچھ زیادہ بلند ہو گئیں۔ بیرے نے اسے پانی کے ساتھ ہمدردی سے وہ گولی کھلائی اور سہارا دے کر دوبارہ تکیے پر لٹا دیا۔

''اور کوئی کام سر؟'' سلّو کو لٹانے کے بعد وہ شہریار کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔

''نہیں تم جاؤ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو بتا دیں گے۔''

اس نے جواب دیا تو بیرا باہر نکل گیا۔ لیکن پندرہ منٹ بعد ہی شہریار نے اسے دوبارہ کال کر لیا۔ اس بار سلّو کی کراہیں باقاعدہ چیخوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

''میرے خیال میں میرا ساتھی دہلی تک سفر نہیں کر سکے گا۔ ہمیں راستے میں کہیں اُترنا ہوگا۔'' چہرے پر پناہ پریشانی کے تاثرات سجائے شہریار نے اس سے کہا لیکن خود سلّو کو سنبھالنے میں لگا رہا جو بہترین اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درد سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

''میں اوپر والوں کو انفارم کرتا ہوں۔'' چہرے پر تشویش سجائے بیرا وہاں سے واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دو افراد ان کے کوپے میں موجود تھے۔

''ٹرین رُکوا کر ہمیں کسی نزدیکی شہر میں اُتارا جائے۔'' شہریار نے ان کے سامنے بھی مطالبہ کیا جس پر ان میں سے ایک نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔

''یہ نان اسٹاپ ٹرین ہے۔ اسے درمیان میں روکنا بہت مشکل ہوگا۔''

''ہم کوشش کرتے ہیں کہ مسافروں میں سے کوئی ڈاکٹر مل جائے تو ان کی تکلیف کم کرنے کا بندوبست کیا جا سکے۔'' دوسرے شخص نے تحمل سے کہا لیکن شہریار اس پر چڑھ دوڑا اور بہت سی باتیں سنائیں جن کا لبِ لباب تھا کہ ٹرین کا عملہ غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ساتھی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ٹرین میں کسی ڈاکٹر کو تلاش کرنے کے بجائے انہیں قریبی اسٹیشن پر اُتار دیا جائے جہاں سے وہ کسی ہسپتال جا کر علاج کروا سکیں۔

کافی لیت و لعل کے بعد اُن کا یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ کراہتا، نڈھال ہوتا سلّو، شہریار کے سہارے ٹرین سے نیچے اُترا۔ دہلی جانے والی ٹرین کچھ ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد آگے بڑھ گئی جبکہ انہیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سلّو کی اداکاری کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا۔

''ابھی ایمبولینس آتی ہی ہوگی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے اسے تسلی دینے کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ سلّو بمشکل کرسی پر بیٹھا اور دہرا ہو گیا۔

اسٹیشن کا بوڑھا ماسٹر سلّو کی حالت دیکھ کر خائف ہوا جا رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جلد ہی ایمبولینس پہنچنے کی اطلاع پہنچ گئی۔ شہریار، سلّو کو سہارا دے کر کمرے سے باہر لے گیا اور ایمبولینس میں موجود اسٹریچر پر لٹا دیا۔ ساتھ ہی سائیڈ پر لگی پتلی سی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور اسٹیشن سے باہر نکل کر مختلف راستوں پر دوڑنے لگی۔

''بس دوست! گاڑی روک دو۔ اس سے آگے کا سفر ہم خود کریں گے۔'' گاڑی نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شہریار نے پسٹل نکال کر ڈرائیور کے سر پر رکھ دیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر! پیشنٹ کو ہسپتال پہنچانا ہے۔'' ڈرائیور اس ناگہانی پر بوکھلا گیا لیکن فوراً ہی

اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ مریض کی کراہیں سنائی نہیں دے رہیں اور وہ آرام سے اسٹریچر پر بیٹھا ہوا رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ گاڑی روکو اور جیسا ہم کہتے ہیں، کرو۔'' سلّو نے اسے دھمکایا۔

''گاڑی رُکنی نہیں چاہئے ڈرائیور!..... یہ کون ہیں، ان سے یہ ہم خود معلوم کر لیں گے۔'' اچانک ہی کوئی چھلاوا سا سلّو کے اسٹریچر کے نیچے سے برآمد ہوا اور اپنی خوف ناک گن سے بیک وقت ان دونوں کو نشانے پر لیتا ہوا بولا۔

اس کی شکل دیکھ کر وہ دونوں دنگ رہ گئے۔ یہ تو وہی بیرا تھا جو بڑی انکساری سے ٹرین میں ان کی خدمات انجام دیتا رہا تھا۔

''کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کا خیال من میں ہے تو اسے نکال دو۔ اگر تم دونوں نے کسی طرح بھی قابو کر بھی لیا تو ان لوگوں سے نہیں بچ سکو گے جو ساتھ والی گاڑی میں تمہارے لیے ہی موجود ہیں۔'' وہ فوری حیرت کے جھٹکے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس نے انہیں مطلع کیا۔

بے ساختہ ہی ان کی نظریں ایمبولینس کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر گئیں۔ وہاں واقعی ایک ہائی روف نما گاڑی موجود تھی اور اس میں سوار مسلح افراد کے ہتھیاروں کی نالیں یقینی طور پر انہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''دیکھ بھائی! ادھر ہمارا کسی سے کوئی لڑا نہیں ہے۔ ہم اپنے کام سے جا رہے ہیں۔ تُو اپنا راستہ لے۔'' وہ دونوں ہی اسلحہ دیکھ کر ڈر جانے والے نہیں تھے لیکن غیر متوقع مصیبت سر پر ٹوٹ پڑنے پر تھوڑے سے سٹپٹا گئے۔

''مجھے کیا کرنا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔'' ٹرین میں انہیں بڑے ادب سے اپنی خدمات پیش کرنے والا بیرا اس وقت یکسر بدل چکا تھا اور خوفناک تیور پیش آ رہا تھا۔

''اگر تجھے پتہ ہے کہ تجھے کیا کرنا ہے تو ہم کو بھی تو پتہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ تیرے ساتھ جا کر اپنا ٹائم کیوں خراب کریں گے؟''

سلّو پر اس کے خوفناک انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اسے طیش دلا کر ایسا کوئی موقع تلاش کرنا چاہتا تھا جب اس پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔

لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ایمبولینس میں اس بیرے پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ایمبولینس کے ساتھ ساتھ دوڑتی گاڑی میں سوار مسلح افراد کیا کرتے جن کی گنز کے رُخ اُنہی کی طرف تھے۔

ہائی روف میں سوار ان بندوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ ایمبولینس کے ساتھ یہی واحد گاڑی نہیں دوڑ رہی بلکہ پیچھے ایک پولیس جیپ بھی موجود ہے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی اور وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ان سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے جو گاندھی نگر میں اُترتے ہی انہیں پولیس نے گھیر لیا ہے۔ البتہ یہ طے تھا کہ جو بھی گڑبڑ تھی، اس کا آغاز ممبئی سے ہی ہو گیا تھا۔ اور ان کے کوپے میں خدمات فراہم کرنے والے بیرے کو بطورِ خاص ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ بیرا نہیں بلکہ



بیرے کا سوانگ بھر کر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے آتی پولیس جیپ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ کسی وجہ سے وہ قانون کی نظر میں آ گئے ہیں۔

ایمبولینس کے ساتھ چلتی ہائی روف میں سوار مسلح افراد اگرچہ سادہ پوش تھے پھر بھی ان کی وضع قطع دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پولیس کے محکمے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اُنہیں اندو نے ممبئی سے دہلی جانے والی ٹرین کے پہلے سے بُک کوپے میں سوار کروایا تھا اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ بیرا اسی کا آدمی تھا اور ان کے ٹرین سے اترتے ہی خود بھی پیچھے اُتر گیا تھا۔

اگر وہ تنہا ان کے مقابل آتا، تب بھی شہریار اتنی بری طرح نہ چونکتا۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ تھی کہ ایمبولینس کے اسٹیشن پہنچنے کے مختصر عرصے میں نہ صرف اس نے پولیس کی مدد حاصل کر لی تھی بلکہ خود بھی ذاتی طور پر انہی کی ایمبولینس میں گھس بیٹھا تھا۔ اتنی تیزی سے یہ سب کر لینا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اندو نے اپنا تعلق کسی اشوک صاحب کے گینگ سے بتایا تھا لیکن اسے نہیں لگتا تھا کہ ممبئی کے ایک لڑکے کی اتنی پہنچ ہو گی کہ وہ وہاں سے اتنی دور گاندھی نگر میں اتنا بہترین انتظام کر سکے۔ اور پھر کسی گینگ سے تعلق رکھنے والے فرد کو اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ایسے گینگ جو بھی قدم اُٹھاتے ہیں، اپنے مفادات کی خاطر اُٹھاتے ہیں اور ظاہر ہے سلّو اور شہریار دونوں کا ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال کسی کوڑیالے سانپ کی طرح سنسنا رہا تھا کہ اندو وہ نہیں جو اس نے خود کو ان کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ وہ شاید کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے آدمیوں کی مدد سے بہت آسانی سے انہیں گھیر لائی تھی۔

''تیری ایسی کی تیسی.....'' وہ ایمبولینس کے ساتھ اور پیچھے دوڑتی گاڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ سلّو نے ایمبولینس کے اندر کارروائی ڈال دی اور جانے کس ترتیب سے اپنے ہر پر سوار بیرے سے اس کی گن چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ خود شہریار تو بس لمحہ بھر کی ہلچل کو محسوس کرنے کے ساتھ بیرے کے منہ سے نکلنے والی گالی ہی سن سکا اور اب حالات یہ تھے کہ بیرے کی اپنی گن کی نال اس کے سر سے لگی ہوئی تھی۔ سلّو کی اس پھرتی پر جہاں وہ ششدر رہ گیا، وہیں ساتھ دوڑتی ہائی روف میں سوار افراد کے تیور بھی بگڑ گئے۔

''اسے چھوڑ دے۔ ورنہ کتے کی موت مارا جائے گا۔'' ان میں سے ایک نے چیخ کر دھمکی دی۔

''اپنی گاڑیاں یہاں سے دُور لے جاؤ۔ ورنہ میں اس کا بھیجا اُڑا دوں گا۔'' دھمکی سے خائف ہونے کے بجائے سلّو نے جوابی دھمکی دی اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بیرے کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گن کا دباؤ بڑھایا۔ اُس کے اس انداز پر نہ صرف بیرے کا چہرہ متغیر ہوا بلکہ ہائی روف سواروں کے چہروں پر بھی تذبذب کی کیفیت نظر آنے لگی اور یوں محسوس ہوا کہ وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب اُنہیں کیا کرنا چاہئے۔

''یہ تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اگر تم نے مجھے مار بھی دیا تو اس شہر سے باہر نہیں نکل پاؤ گے۔ اس ہر ایگزٹ پر ناکا لگا دے گی۔'' بیرے نے سلّو کو دھمکی آمیز انداز میں سمجھایا۔

شہریار خود بھی کسی حد تک اس سے متفق تھا لیکن اب جبکہ سلّو قدم اٹھا چکا تھا تو اس کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یوں بھی وہ جس صورتِ حال میں گھرے ہوئے تھے ان کے آگے کھائی اور پیچھے کنواں والا

معاملہ تھا۔ اگر ابھی گرفتار ہو کر پولیس کے کسی ٹھکانے پر پہنچ جاتے تو بھی پولیس نے ان کے ساتھ کوئی مہمانوں والا برتاؤ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے شکنجے سے نکلنے کے لیے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنا پسٹل تو پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھا جسے وہ کچھ دیر قبل ایمبولینس کے ڈرائیور کو دھمکانے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اب دوبارہ اس نے اس سے یہی کام لینا شروع کر دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہیں گاڑی کسی صورت نہیں روکنی ہے۔ اسے چلاتے رہو اور شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف چلو۔

''ٹھیک ہے جناب!'' ڈرائیور گھگھیایا۔ اُدھر سلّو ایمبولینس سے جونک کی طرح چمٹے پولیس اہلکاروں سے نمٹ رہا تھا۔

''دس تک گننے تک اگر تم لوگوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تو میں انجام کا سوچے بغیر اس کا بھیجہ اُڑا دوں گا۔'' دھمکی دینے کے ساتھ ہی وہ بلند آواز میں گنتی گننے لگا۔ ہائی روف، ایمبولینس سے اتنی قریب چل رہی تھی کہ یقیناً اس میں سوار لوگ سلّو کی گنتی کو سن سکتے تھے۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' کنپٹی سے لگی گن کے بڑھتے دباؤ کے ساتھ وہ صرف چھ تک گنتی برداشت کر سکا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

اُس کی چیخ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہائی روف کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس جیپ نے بھی اپنی رفتار گھٹا دی۔ چند منٹوں میں ایمبولینس اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ دونوں گاڑیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس طرف سے تھوڑا اطمینان ہوا تو شہریار پیچھے سے کُود کر اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ ڈرائیور جو پہلے ہی خوف زدہ تھا، اس نے اسے اپنے برابر میں بیٹھا دیکھا تو خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''میں غریب ڈرائیور ہوں صاحب! میرا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ آپ کو جہاں جانا ہے جائیے، مجھے یہیں اتار دو۔''

اس نے تقریباً روتے ہوئے شہریار سے التجا کی تو اُسے اُس پر رحم آ گیا۔ وہ غیر متعلقہ اور بے قصور آدمی تھا اور خوامخواہ اس مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ انہوں نے وقتی طور پر تو بے شک پولیس والوں سے پیچھا چھڑا لیا تھا لیکن کچھ بھروسہ نہیں تھا کہ شہر سے نکلنے کی کوشش میں وہ کسی ناکے پر دھر لیے جاتے۔ نکلتے بھی تو خاصی مار دھاڑ کے بعد اور اس چکر میں اگر وہ بے چارہ ڈرائیور زد میں آ جاتا تو جانے پیچھے اس کے گھر والوں پر کیا گزرتی۔ وطن اور مذہب کی تفریق سے قطع نظر وہ ایک انسان تھا۔ وہ بھی بے قصور و بے ضرر انسان جو جانے کتنے افراد کے کنبے کی کفالت کا ذمے دار تھا۔ اُسے اس شخص کو اس جھگڑے سے الگ کر دینا ہی مناسب معلوم ہوا اور وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گاڑی روکو۔''

ڈرائیور نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

''نیچے اُتر جاؤ۔'' اس نے دوسرا حکم صادر کیا جس کی ڈرائیور نے پہلے سے بھی زیادہ پھرتی سے تعمیل کی۔ اس کے اُتر کر دروازہ بند کرنے تک شہریار اُس کی جگہ سنبھال چکا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ ایمبولینس ہونے کی وجہ سے اسے بہت اچھے حال میں رکھا گیا تھا اور زیادہ رفتار پر بھی وہ بڑی سبک روی سے چل رہی تھی۔



''تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ہم تمہیں صرف معمول کی پوچھ گچھ کے لیے لے جا رہے تھے لیکن تم نے اپنی حرکتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ تم خطرناک مجرم ہو اور اب میرے ساتھی تم سے سختی کے ساتھ پیش آئیں گے۔'' سلّو کی گن تلے سانس لیتے بیرے نے انہیں دھمکی دی۔

''ہمارے ساتھ جو بھی ہو لیکن اس سے پہلے ہم تجھے نرک (جہنم) میں پہنچا کر چھوڑیں گے۔'' اس کی دھمکی سے خوف زدہ ہوئے بغیر سلّو نے اسے اس کے انجام سے باخبر کیا۔

''ویسے تم جھوٹ خوب بولتے ہو نقلی بیرے صاحب! معمول کی پوچھ گچھ کے لیے اتنا کھٹ راگ کون اپناتا ہے؟ اور تم تو ممبئی سے ہماری نگرانی کر رہے ہو۔ تم تو بس یہ بتاؤ کہ اس جرنلسٹ لڑکی اندو نے ٹپ دے کر تمہیں ہمارے پیچھے لگایا ہے یا وہ خود بھی تمہاری ساتھی یا باس ہے؟'' اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شہریار نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

''سنا نہیں بڑے بھائی نے تجھ سے کیا پوچھا ہے؟'' سلّو نے اُس کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم اتنی آسانی سے مجھ سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں مشکل کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔'' سلّو نے اسے ایک اور ہاتھ دے مارا۔

''ذرا شانتی سے کام لے یار! ابھی اس کی ضرورت ہے۔'' شہریار نے اسے ٹوکا۔ اس بندے کو ساتھ لے کر وہ بس حفاظت سے یہاں سے نکل جانے کا خواہش مند تھا۔ خوامخواہ کی مار دھاڑ اور خون خرابہ بیکار تھا اور وہ اپنی توجہ اصل مقصد، یعنی ڈاکٹر فرحان جمیل کی بازیابی پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ سیدھی سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔ ابھی تک کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ شہر کے نقشے سے ناواقف تھے لیکن ڈرائیور کو اتارنے سے قبل فرمائش کر چکے تھے کہ شہر سے باہر جانے والے راستے پر چلے۔ ڈرائیور کو اُتارنے کے بعد بھی وہ اسی سمت میں گاڑی دوڑا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے یہ ایک ایسی سڑک تھی جو بالکل سیدھی سیدھی چلتی جا رہی تھی اور ابھی تک اس پر ایسا کوئی مقام نہیں آیا تھا کہ اسے تذبذب کا شکار ہونا پڑتا۔ سڑک کے اطراف میں آبادی بھی نہیں تھی، بس کہیں کہیں کھیت یا باغ نظر آ جاتے تھے ورنہ زیادہ تر زمین ویران پڑی تھی۔ اس ویرانے میں سفر کرتے ہوئے ایک ہی ایمبولینس کو ایک زوردار دھچکا لگا اور فضا کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے گونج اٹھی۔ پہلے دھماکے کے بعد اگلے سیکنڈ میں ہی دوسرا دھماکا بھی سنائی دے گیا اور ایمبولینس بری طرح لہرانے لگی۔ سلّو کی گن بیرے کی کنپٹی سے ہٹ گئی۔ اس نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور نال پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ گن سلّو کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس دھینگا مشتی کے نتیجے میں ایک فائر بھی ہوا لیکن کسی کو بھی نقصان پہنچائے بغیر گولی ایمبولینس کی باڈی میں ہی کہیں پیوست ہو گئی۔ بیرے نے قابل ستائش پھرتی سے کام لیتے ہوئے گن کو سیدھا کیا اور نال سلّو کے پہلو سے لگا دی۔

''بس..... اب تمہارا کھیل ختم۔'' نال کو اُس کے پہلو میں چبھوتے ہوئے وہ بری طرح غرایا۔ اس موقع پر شہریار، سلّو کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے تو وہ پے در پے پھٹنے والے دو ٹائروں کی وجہ سے ڈگمگاتی ایمبولینس کو سنبھالنے میں اُلجھ گیا اور جب اسے روکنے میں کامیاب ہوا تو دس بارہ کے قریب افراد کہیں سے نکل کر اس پر اُمڈ آئے۔ وہ سارے کے سارے مسلح تھے اور انہوں نے پل بھر میں ایمبولینس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''تم دونوں اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر نیچے اُتر آؤ۔ اگر اب کسی بدمعاشی کی کوشش کی سر سے لے کر پیر تک پورے جسم میں چھید کر دیں گے۔'' مسلح افراد میں سے ایک نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ احکامات جاری کیے۔۔ان کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔خصوصاً اس لیے بھی کہ سلّو کے پہلو سے پہلے ہی ایک گن کی نال لگی ہوئی تھی۔شہریار نے گاڑی سے اُترنے میں پہل کی۔پچھلے حصے میں موجود سلّو اور دا بھی حرکت میں آئے۔ مسلح افراد میں سے ایک نے پہلے ہی پیچھے سے ایمبولینس کا ڈھکن نما دروازہ کھول دیا۔ سلّو جیسے ہی اس کے کنارے پر پہنچا، پیچھے سے بیرے نے اسے ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ اُڑتا ہوا سڑک کے بل سڑک پر جا گرا لیکن کوشش کر کے چہرہ سڑک سے ٹکرانے سے روک لیا۔ پھر بھی اسے کافی چوٹیں برداشت کرنی پڑیں۔ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر سڑک سے لگنے والی رگڑ کے علاوہ بائیں ہتھیلی میں چبھ جانے والی کیل کی نوک نے اسے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ بہرحال وہ سخت جان تھا اس لیے منہ سے کوئی کراہ یا سسکی نہ نکلنے دی اور ضبط سے وہ تکلیف سہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسے چبھنے والی کیل کے علاوہ بھی سڑک پر جابجا بہت سی کیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور یقینی طور پر ایمبولینس کے ٹائروں کو پھاڑنے کا سبب بنی تھیں۔ یہ تو واضح ہی تھا کہ ان کیلوں کو سڑک پر انہی مسلح افراد نے پھیلایا تھا جو اُنہیں گھیرے کھڑے تھے۔ان مسلح افراد میں سے کئی کے جسموں پر پولیس کی یونیفارم موجود تھی اور قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے انہوں نے کچھ دیر پہلے جان چھڑائی تھی۔علاقہ شناس ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت آسانی سے کسی دوسرے راستے سے سامنے آ کر اُنہیں گھیر لیا تھا۔ وہ بھی ایسی کامیابی سے کہ ان دونوں کو ہاتھ پیر ہلانے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' ان دونوں کو حکم دیا گیا اور چند فٹ کا فاصلہ پیدل چلا گیا۔ آگے پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا کہ آگے ایک ذیلی سڑک آ کر اس سڑک سے مل رہی ہے۔ پولیس والوں نے وہیں سے آ کر انہیں سامنے سے گھیرا تھا۔ مقامی ہونے کا اتنا ایڈوانٹیج تو اُنہیں حاصل ہی تھا اور وہ انجان ہونے کی وجہ سے بری طرح پھنس گئے تھے۔ ذیلی سڑک پر پولیس والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اُنہیں ایک گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا اور بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر ایک پھوار سی پڑی۔ وہ کیا شے تھی، اُنہیں سوچنے کی فرصت نہیں ملی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش وحواس سے بیگانے اُن کے جسموں کو کس انجانی جگہ پر منتقل کیا جا رہا تھا، یہ تو شاید اُنہیں آنکھ کھلنے کے بعد بھی مشکل ہی سے پتہ چلتا۔

⊛----✪----⊛

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟.....کون ہو تم اور اس طرح مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟'' عالیہ کو ہوش آیا اور اس نے اپنے سامنے بیٹھے جاوید علی کو گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کروا چکا ہوں۔ یہاں لانے کا مقصد یہ سمجھ لو کہ ہم تمہیں کرنل توحید کے نزدیک لے آئے ہیں۔تم بہت بے چین تھیں نا اُن کے لئے.....تو مجھے تمہاری اس بے قراری پر رحم آ گیا۔'' جاوید علی نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بکواس مت کرو۔ مجھے تمہاری نیت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟'' وہ جاوید علی کی مسکراہٹ سے نروس ضرور ہوئی لیکن کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پا لیا اور ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔



''نیت کی خرابی سے اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے بکاؤ جسم کے چکر میں ہوں تو اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو۔ تمہارے بے شمار بار استعمال شدہ جسم میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اُس نے عالیہ پر صورتِ حال واضح کی۔

''تم پولیس والے بھی نہیں لگتے..... پھر کون ہو؟'' وہ جس کاروبار میں ملوث تھی، اُس میں پولیس سے مستقل واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے اُس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔اس کے بعد ذہن میں ایک ہی خیال رہ جاتا تھا۔ کوئی خفیہ ادارہ.....اور ظاہر ہے، یہ ایک اندوہناک خیال تھا اس لیے وہ اچھی خاصی گھاگ ہونے کے باوجود لرزیدہ تھی۔

''میں جہنم کا داروغہ ہوں اور اس وقت تمہارا اعمال نامہ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا ہوں۔ مساج سینٹر کے نام پر جاری شرم ناک کاروبار کے ساتھ تم جتنی مکاری سے میری قوم کے جوانوں کی رگوں میں زہر اُتار رہی تھیں، وہ قطعی قابلِ معافی نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اپنے لیے ذرا نرم سزا کا انتخاب کرنا چاہتی ہو تو مجھے اپنے کاروبار کی ساری تفصیل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سیدھی طرح یہ بتا دو کہ تمہاری ڈوریاں کس کے ہاتھ میں ہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی کی آلۂ کار نہیں ہوں۔ مساج سینٹر میڈم دیبا کا ہے اور وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتی ہیں۔ میں صرف ایک ملازمہ ہوں اور کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوں۔'' اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں کو زبان پھیر کر تر کرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن تم نے تو خود میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ تم میڈم دیبا کی پارٹنر ہو۔'' جاوید علی نے اسے گھیرا۔

''وہ تو میں نے بس ایسے ہی تمہارے سامنے شو مارنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ پھر بھولی بنی۔

''میرا خیال ہے عالیہ بیگم! کہ تم پر صورتِ حال کو اچھی طرح واضح کر دوں تا کہ تم بے کار جھوٹ بول کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہیں کرو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم پورے آٹھ گھنٹے بعد ہوش میں لائی گئی ہو اور ظاہر ہے ان آٹھ گھنٹوں میں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے تمہارے پورے سینٹر کو ادھیڑ ڈالنے کے ساتھ ساتھ میڈم دیبا کی زبان بھی کھلوا لی ہے۔ سینٹر میں موجود خفیہ کیمرے، مخرب اخلاق فلموں اور نشہ آور ادویات سمیت سب کچھ ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ میڈم دیبا نے ہمارے سامنے اعتراف کیا ہے کہ مساج کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص تیل تم ہی اُنہیں فراہم کرتی تھیں اور اس تیل کے لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ایک ایسا جز شامل تھا جو مساموں سے جسم میں سرایت کر کے جسم کو سرور کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے تمہارے مساج سینٹر آنے والے گاہک بار بار پلٹ کر تمہاری طرف آتے تھے حالانکہ ان میں سے کئی کو تم لوگ باقاعدہ بلیک میل کر رہے تھے۔ ہماری تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم منشیات کے جس دھندے میں ملوث ہو، میڈم دیبا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسمگلنگ اور بلیک میلنگ کے کاروبار میں تو تمہاری پارٹنر تھی لیکن اس دوسرے دھندے میں تم نے اسے شریک نہیں کیا تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہمیں وہاں سے ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیا کا جو اسٹاک ملا ہے، وہ تمہارے آفس کے خفیہ لاکر میں رکھا ہوا تھا جس کی چابی صرف اور صرف تمہارے ہی پاس ہوتی ہے۔ اب بتاؤ کہ ان حقائق کی موجودگی میں تم انجان یا معصوم بننے کی اداکاری کرنے کی جرأت کرو گی یا سچ بولو گی؟'' عالیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے ہر لفظ کے ساتھ اس کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔

''اگر تمہارے ذہن میں اب بھی کوئی خوش فہمی ہے کہ تم کوئی جھوٹ بول کر اپنے ان تمام جرائم سے ا
کر سکو گی تو میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ رائے چند جسے تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن فراہم کر
تھیں، یہیں موجود ہے اور تمہاری تمام تر احتیاط کے باوجود تمہاری صورت سے نا آشنا نہیں۔ وہ تمہار
سامنے آ کر تمہارے سارے جرائم گنوا سکتا ہے۔''

اس نے عالیہ کو یہ اطلاع فراہم کر کے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ رائے چند کی
موجودگی کا سن کر وہ بالکل ڈھے گئی اور یک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاوید علی اس صورتِ حال
سٹپٹا گیا۔ اُس کے نزدیک وہ ایک تربیت یافتہ مجرم تھی اور وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس سے حقائق اُگلوانے
اسے خاصی محنت کرنی پڑے گی اور تشدد کا سہارا بھی لینا پڑے گا لیکن اس نے تو کسی عام عورت کی طرح
دھونا شروع کر دیا تھا۔

''او میڈم!..... میرے پاس یہ ٹسوے دیکھنے کا ٹائم نہیں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور میں جو پو
ہوں وہ فٹافٹ بتاؤ۔'' چند لمحے اُس کا رونا برداشت کرنے کے بعد اس نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''میں اپنی بدقسمتی پر رو رہی ہوں۔ یہ میری کالی قسمت ہی ہے جو مجھے جرم کی دنیا تک لے آئی ہے
میرا باپ بہت عزت دار خاندان کا فرد تھا اور میں آج تک اس کے خاندان کی نیک نامی کو قائم رکھنے کے
اپنی عزت کو پامال کر رہی ہوں۔''

جاوید علی کی ڈانٹ سن کر اس نے ہچکیوں پر تو کسی طرح قابو پا لیا لیکن بولی تو آواز بہر حال رُندھی
تھی اور اس رُندھی ہوئی آواز میں اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ بہت مبہم تھا۔

''اگر تم کھل کر سب کچھ بتاؤ تو میں تمہاری بات سمجھ سکتا ہوں ورنہ تو میرا صرف ایک سوال ہے۔ تم
اپنی ڈوریاں ہلانے والے آقاؤں کے نام پتے سے آگاہ کرو۔''

اُس کے الفاظ سے کوئی نتیجہ نہ اخذ کر سکنے کی وجہ سے جاوید علی نے سخت لہجے میں وضاحت چاہی۔ اُ
ایک شک یہ بھی تھا کہ عالیہ کوئی اُلٹی سیدھی کہانی کر اُس کا ذہن بھٹکانا چاہتی ہے، اس لیے عورت
سب سے بڑے ہتھیار کے سامنے بھی نرم نہیں پڑا تھا۔

''میں تمہارے اس سوال کا جواب بہتر طور پر دینے کے لیے اپنی داستان سنانا ضروری سمجھتی ہوں تا کہ
میری پوزیشن کا درست اندازہ لگا سکو۔'' عالیہ نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بولنا شروع کرو۔ میں خود اندازہ لگا لوں گا کہ تمہاری داستان میں کتنی حقیقت ہے اور
افسانہ۔'' آخر کار جاوید علی سننے کے لیے تیار ہو گیا اور ریلیکس موڈ میں بالکل ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ عالیہ کو ہا
پیر باندھ کر اس کے سامنے بٹھایا گیا تھا اس لیے اسے یہ اندیشہ قطعی نہیں تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ کر کے یہاں
نکلنے کی کوشش کر سکے گی۔ یوں بھی اس عمارت سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ یہاں خطرناک مجرموں کو لا
ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے تو سکیورٹی کے انتظامات بھی اسی حساب سے کر رکھے تھے۔

''میری بربادی کی اس داستان کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔
سمجھ لو کہ میں نے اپنے والد کے ایک غلط فیصلے کی سزا بھگتی ہے۔ اور وہ غلط فیصلہ تھا، میری ماں سے شا
کرنا۔ میرے والد ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کسی ڈپلومہ کے لیے جاپان گئے تھے۔ وہاں
کی، میری ماں سے دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اس حد تک بڑھی کہ دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شادی
کے میری ماں کو اپنے ساتھ پاکستان لائے تو خاندان کے بزرگوں نے اُنہیں بطور بہو قبول نہیں کیا اور



صاحب کو جائیداد میں حصہ دینے کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیا۔ دولت اور محبت دونوں پاس تھیں اس لیے
انہوں نے اس مقاطع کی پروا نہیں کی اور اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ میری ماں جاپان میں کسی بہت خوش
حال خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی چنانچہ دولت اور آسائشات کی فراوانی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئی اور ہر
اس بری عادت کو اپنا لیا جسے ایک مہذب خاندان میں کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ نشے کی کثرت،
ہر مردوں سے آزادانہ میل جول، جوا..... بس یہی سب کچھ تھا جو اس کے دل کو بھاتا تھا اور وہ مجھ سمیت پاپا
ابھی فراموش کر چکی تھی۔

پاپا کو اپنی مصروفیات میں اُن کی اس روش کی ذرا دیر سے خبر ہوئی اور جب بعد میں انہوں نے ممی کو
روکنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب جانے یہ محبت کی زیادتی تھی یا پاپا کی بزدلی کہ وہ اس
بگڑی ہوئی عورت کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکے اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے خود کو نشے میں غرق کر لیا۔ ان
حالات میں میری ذات ہی سب سے زیادہ متاثر ہوئی اور میں ماں باپ دونوں ہی کی توجہ سے محروم ہو گئی۔
اگر معاملات صرف یہیں تک رہتے تو بھی شاید اتنی خرابی نہ ہوتی لیکن ہوا یوں کہ آوارہ تتلی کی طرح محفلوں
میں گھومنے والی میری ماں چند ایسے لوگوں کی نظر میں آ گئی جنہوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے
انہیں ایک بہترین ذریعہ سمجھا۔ وہ جانے کن کن دھمکیوں اور سازشوں کے نتیجے میں میری ماں کو اپنے ڈھب
لانے میں کامیاب ہو گئے اور اُنہیں وطن دشمن سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنے لگے۔ ممی کی فطرت میں
ایک عجیب سا چلبلا پن تھا۔ پھر پاکستان اُن کا آبائی وطن بھی نہیں تھا چنانچہ وہ آسانی سے ان لوگوں کے جال
میں پھنس گئیں اور ان کے مفادات کے لیے کام کرنے لگیں۔

ممی ہی کی وجہ سے میں بھی ان کی نظروں میں آ گئی اور انہوں نے صرف سولہ سال کی عمر میں میری
عزت کو پامال کر کے مجھے اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں انکار کرتی تو وہ میری شرم ناک تصویریں
ہیروئن پورے شہر میں پھیلا دینے کی دھمکی دیتے اور میں ایسا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ
پاپا پہلے ہی ممی کی وجہ سے بہت دُکھی ہیں اور اگر میرے حوالے سے ایسی کوئی بات سامنے آئی تو ان کے لیے
یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہو گا۔ بس یوں میں عزت بچانے کے لیے بے عزت ہوتی رہی۔ ممی کی ذہنی حالت
ایسی تھی کہ اُنہیں کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ پاپا کو میں نے خود پتہ نہیں چلنے دیا اور چپ چاپ اذیت سے
گزرتی رہی۔

جب میری عمر بیس سال تھی تو ممی نشے کی زیادہ مقدار لینے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔
ان کے چند دن بعد پاپا کے روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جانے سے ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی بے وفا بیوی سے
سچی محبت کرتے تھے۔ بہر حال، ان دونوں کی زندگی کا قصہ تو ختم ہو گیا لیکن میں جس دلدل میں پھنس چکی
تھی، اس سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دی۔ مدد مانگتی بھی تو کس سے؟ ماں باپ اپنی اپنی زندگیاں گزار کر
اس سے جا چکے تھے اور جو خاندان تھا، وہاں جانے کی ہمت میں کر نہیں سکتی تھی کہ میرے صیاد مجھ سے پہلے
میری ذلت کی داستان ان لوگوں تک پہنچا دیتے۔ تم خود ہی سوچو کہ وہ خاندان جس نے ایک غیر ملک اور
اجنبی کی عورت کو قبول نہیں کیا تھا، اس عورت کی داغ دار بیٹی کو کیسے قبول کرتا؟ بس یوں میں ان لوگوں کے
ہاتھوں پر ناچتی چلی گئی۔

دیبا مساج سینٹر میں میری شراکت بھی انہی لوگوں کا فیصلہ تھا۔ میڈم دیبا لالچی عورت ہے۔ اپنے مساج
سینٹر سے وہ پہلے ہی فحاشی کے اڈے کا کام لے رہی تھی، میری شمولیت سے یہ کام ذرا جدید انداز پر ہونے

لگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلیک میلنگ کے دھندے کے علاوہ وہ بہت سے حقائق سے واقف نہیں تھی۔ میرے ذریعے مختلف پارٹیوں کو ہیروئن کی سپلائی کا تو اسے قطعی علم نہیں تھا لیکن بہرحال وہ کوئی شریف عورت نہیں اور اس کی وجہ سے کئی لڑکیاں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ تم مجھے میرے جرائم کی جو بھی سزا دو، مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی میں تم سے یہ بھی کہوں گی کہ میڈم دیبا کو بھی کسی صورت معاف نہیں ملنی چاہیے۔''

وہ سب کہہ چکی تو خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے ان لوگوں کے نام پتے لکھواؤ جنہوں نے تمہیں اس دھندے میں پھنسایا۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں بھی بتاؤ جنہیں تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی رہی ہو؟'' اُس کی داستانِ حیات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر جاوید علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جواب میں اُس نے ایک طویل فہرست لکھوا ڈالی۔ فہرست میں کئی نام ایسے تھے جو معززینِ شہر میں شمار ہوتے تھے اور جن کے بارے میں گمان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوں گے۔

''تم نے مجھ سے کرنل توحید کے بارے میں جاننے کی کوشش کیوں کی تھی؟'' فہرست مکمل ہو گئی تو جاوید علی نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔

''مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ اگر کوئی ایسا گاہک ملے جو میرے اندازے کے مطابق آرمی میں مضبوط روابط رکھتا ہو تو میں اس کے ذریعے کرنل توحید کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔''

''یہ تو بڑے مبہم امکان پر کام کرنے والی بات ہے۔ میرے حساب سے تو اس بات کا ایک فیصد سے بھی کم امکان تھا کہ تمہیں ایسا کوئی کسٹمر ٹکرا جاتا۔'' اس کا جواب سن کر وہ حیران ہوا۔

''یہ ہدایات حاصل کرنے والی میں کوئی واحد لڑکی نہیں ہوں گی۔ بلکہ اس شہر بلکہ پورے ملک میں بے شمار ایسی لڑکیاں ہیں جنہیں انہوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور ان کی مدد سے ایسے کام لیتے رہتے ہیں۔ خود مجھے حکم ہے کہ اپنے مساج سینٹر پر آنے والے گاہکوں پر گہری نظر رکھوں اور جو بھی کام کا بندہ نظر آئے، اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اوپر والوں کو آگاہ کروں۔''

''یعنی تم ان کے لیے مخبر کا کام کرتی رہیں۔ یقینی طور پر تمہارے گاہکوں میں کئی ایسے سرکاری افسران شامل رہے ہوں گے جن سے تم کئی اہم ملکی راز حاصل کر کے ملک دشمنوں کو فراہم کرتی رہی ہو گی؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مجھے جان سے مار دو، میں اُف تک نہیں کروں گی۔ بس میرا نام پبلک کے سامنے نہیں آنے دینا ورنہ میرے مرے ہوئے باپ کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔ اپنے بھیانک جرائم کے باوجود تم نے اس تعاون کی وجہ سے اپنے لیے کچھ آسانی پیدا کر لی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری خواہش کا خیال رکھا جا سکے۔'' جاوید علی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر تم ایسا کر سکے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔ باقی تو میرے لیے کسی چیز کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی ہے۔ میں اپنی اس زندگی سے اوب چکی ہوں۔ خودکشی کی ہمت نہیں تھی ورنہ اب تک خود ہی چھٹکارا حاصل کر چکی ہوتی۔ شاید تم یہ بات سمجھ نہ سکو لیکن حقیقتاً میرے لیے یہ احساس بڑا کرب ناک ہے کہ میں خالی تھالی میں کھاتی ہوں، اسی میں چھید کرتی رہی ہوں۔'' اپنے الفاظ سے اس نے جاوید علی کے دل میں کچھ ہلچل



پیدا کی۔

حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر دلدل میں جا پھنسنے والی اس لڑکی کو کم از کم اتنا تو احساس تھا کہ ارضِ وطن کو نقصان پہنچا کر وہ کوئی جرم کر رہی ہے۔ ورنہ یہاں تو بڑے بڑے نام نہاد سیاست دان، بیوروکریٹس اور ملکی کارکن دن رات جانوروں کی طرح اس وطن کو بھنبھوڑ رہے تھے اور نام کو بھی شرمندہ نہیں تھے بلکہ بڑی ڈھٹائی سے اپنی حُبّ الوطنی کے راگ الاپتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پہلے رائے چند غائب ہوا اور اب عالیہ..... اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں ہی پولیس کی کارروائی کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں۔ اتنے سالوں سے وہاں کامیابی کے ساتھ اپنا سیٹ اپ چلا رہے تھے۔ پولیس کے ساتھ بھی اچھی سیٹنگ تھی پھر اچانک کیا ہوا کہ پولیس ان کی دشمن بن گئی اور آگے پیچھے دونوں کو نشانہ بنا لیا؟'' سنتھیا کراچی سے لاہور آئی ہوئی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی حالات کی اس نئی کروٹ پر جلبلا رہی تھی۔

''میں خود پریشان ہوں۔ دونوں پولیس کے ریڈ کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں لیکن دونوں ہی کا کسی پولیس اسٹیشن سے کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ رائے چند کے بارے میں تو پھر بھی اتنا پتہ چلا ہے کہ گرفتاری کے چند گھنٹوں میں ہی اس نے تھانے دار سے مُک مُکا کر کے وہاں سے اپنی جان چھڑا لی تھی لیکن پھر اس کے بعد وہ اپنے گھر پہنچا، نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر ملی۔ جبکہ عالیہ کی گرفتاری کا تو سرے سے کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ مساج سینٹر سے میڈم دیبا سمیت کئی ورکرز کو گرفتار کیا گیا ہے لیکن گرفتار ہونے والوں میں عالیہ کا نام شامل نہیں ہے۔ میں نے کئی ذرائع سے پولیس والوں کو کھنگالا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی عالیہ کے بارے میں نہیں جانتا اور ایسا لگتا ہے کہ ریڈ کے وقت وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ لیکن میری معلومات کے مطابق اس روز عالیہ وہیں تھی اور شاید ریڈ کے وقت کسی طرح وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔''

''ایسی صورت میں اسے کسی سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ تو اپنے اپارٹمنٹ بھی نہیں پہنچی۔'' سنتھیا نے تیز لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''شاید وہ موقع پا کر بھاگ نکلی ہے۔'' پانڈے نے کہا تو سنتھیا نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

''نہیں پانڈے! مجھے یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔ کوئی تھرڈ پارٹی ہے جو یہ سارا چکر چلا رہی ہے اور اس نے پولیس کو کور کے طور پر فرنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ تم اور میں ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کبھی بھی اوپر سے دباؤ پڑے بغیر کسی ایسی جگہ ریڈ نہیں کر سکتے جہاں سے انہیں پابندی سے بھتا ملتا ہو۔ تم رائے چند اور عالیہ دونوں کے غائب ہونے پر غور کرو۔ دونوں معاملات میں کتنی خوب صورتی سے پولیس کو الگ کر دیا گیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں لازماً کسی خفیہ ایجنسی کی تحویل میں ہیں اور یہ بات ہمارے لیے خاصی خطرناک ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے خود بھی اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا اسی لیے پہلے ہی ان سارے لوگوں کو انڈر گراؤنڈ ہونے کا حکم دے چکا ہوں جن کے بارے میں عالیہ جانتی ہے۔ رائے چند سے تو خیر ایسا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ وہ ڈائریکٹ کسی سے رابطے میں نہیں رہتا تھا اس لیے کسی کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ عالیہ اسی کی وجہ سے پھنسی ہے۔'' سنتھیا زیرِ لب بڑبڑائی۔ عہدے میں پانڈے سے نیچے ہونے کے باوجود اس کا ذہن زیادہ تیز تھا اور وہ حالات کا درست تجزیہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی تھی اور ایسا اس لیے تھا کہ وہ ''را'' کے علاوہ ''موساد'' کی بھی تربیت یافتہ تھی جب ہی تو اتنے برسوں کامیابی سے اپنا کردار ادا کر رہی تھی اور کسی کو اس کے ڈبل ایجنٹ ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ پانڈے اس کا سینئر بنا بیٹھا تھا، بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کی ناک کے عین نیچے سنتھیا منشیات کا دھندا بھی چلا رہی اور عالیہ کو فحاشی اور جاسوسی کے علاوہ اس مقصد کے لیے بھی استعمال کرتی رہی ہے۔

''کیا کہا؟..... میں نے سنا نہیں۔'' پانڈے نے اس کی بڑبڑاہٹ کو سمجھ نہ سکنے پر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ پے در پے خود کو پہنچنے والے نقصانات کا جواب کیسے دوں؟'' پانڈے کو یہ جواب دیتے ہوئے اس کے ذہن میں بلتستان میں مرنے والی اپنی ایجنٹ کا خیال بھی موجود تھا۔ اس ایجنٹ کے پاس موجود خفیہ آلات کی وجہ سے وہ وہاں کی صورتِ حال سے تو بے شک پوری طرح واقف ہو گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ مرنے والی وہ ایجنٹ ''را'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی لیکن ''موساد'' کا سرمایہ تھی اس لیے اس کی جان جانے کا اسے زیادہ قلق تھا۔

''جواب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے خودکش حملہ آوروں کی جو فوج تیار کی ہے، اسے اس موقع پر کام میں لاؤ اور کراچی اور لاہور میں قیامت برپا کر دو۔ یہ ہنگامہ کھڑا ہو گا تو ایجنسیاں اس چکر میں پھنس جائیں گی اور ہم اپنے مہروں کو بچانے کی مہلت حاصل کر لیں گے۔''

پانڈے نے مکاری سے مشورہ دیا جو سنتھیا کو بھی مناسب لگا۔ اُس نے ''را'' کے ساتھ مل کر معصوم ذہنوں کی برین واشنگ کی اس سازش کے لیے برسوں محنت کی تھی اور نتیجے میں ان کے پاس ایسے نوجوانوں اور بچوں کی ایک بڑی کھیپ موجود تھی، جسے وہ آسانی سے اس آگ میں جھونک سکتے تھے۔ ان کے پتھر دلوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی بربریت کا نشانہ بن جانے والے ان معصوموں کی مائیں ہر پل اپنے لختِ جگر کی واپسی کی آس لگائے رو رو کر اپنی آنکھوں کی روشنی گنوا رہی ہیں۔ ان کے نزدیک تو اپنے وطن اور قوم کی خاطر سب کچھ کرنا جائز بلکہ باعثِ فخر تھا اور اس فخر کو قائم رکھنے کے لیے وہ ہر سنگدلانہ فیصلہ بڑی آسانی سے کر ڈالتے تھے۔ اس بار بھی کراچی اور لاہور کی تقدیر کا فیصلہ بنا کسی حیل وحجت کے کر دیا گیا۔ نتیجے میں اگلے چند دن تک دونوں شہروں خصوصاً کراچی میں کھیلے جانے والے آگ اور خون کے کھیل نے انسانیت کو خون کے آنسو رُلا ڈالا۔

⊛----✪----⊛

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ کتنی دیر بے ہوش رہے اور کتنا سفر کر کے کہاں پہنچا دیئے گئے۔ بس آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو ایسی تاریک جگہ پر پایا جہاں پر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور ایسی خاموشی تھی، گویا انہیں دنیا سے کاٹ کر زندہ ہی کسی تاریک قبر میں اتار دیا گیا ہو۔

انہیں یہاں ڈالنے والوں نے بس اتنی مہربانی کی تھی کہ اس قبر میں ان کے ہاتھ پیر آزاد رہنے دیئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کافی دیر تک اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت میں لانے کے لیے ہلاتے جلاتے رہے جو شاید بے ہوشی کی کسی دوا کی وجہ سے یا بہت دیر تک بے حس وحرکت پڑے رہنے کے باعث سُن ہو گئے تھے۔



''میں نے کہا بھائی جی! ہم زندہ تو ہیں نا؟ یا سالوں نے ایک ہی قبر میں گاڑ دیا ہے؟'' جسم کو حرکت میں لانے کی کوشش میں وہ دونوں ہی اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ اس تاریک جگہ پر انہیں اکٹھا رکھا گیا ہے۔ پھر سلّو نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''ایہہ تو مینوں نہیں ملوم پر یاد رکھ کہ تیرے سالوں کی اس بدتمیزی پر میں انہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اِبھی گیا ہوں تو بھوت بن کر بدلہ لوں گا۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے شہریار نے اسی انداز میں جواب دیا۔ ایک طرح سے یہ سلّو کے لیے اشارہ تھا کہ کچھ بھی بولتے وقت محتاط رہے۔ انہیں اس انداز سے گاندھی نگر میں گھیرا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے کسی غنڈہ گروپ کا نہیں بلکہ حکومتی ادارے کا تعلق ہے اور ایسی صورت میں انہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ بلکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہیں یہاں قید کرنے والوں نے ان کی گفتگو سننے کا کوئی خفیہ انتظام کر رکھا ہو۔

''ایسی بڑھکیں نہ مارو بھائی جی! اگر میری گھر والی نے سن لیا تو مینوں چھڈے گی نہیں۔ بوہت مارے گی۔ تیرے بھرا نے ایسی گل کی کیسے؟ ہور تُو نے سنی کیوں؟'' سلّو اس کا اشارہ سمجھ گیا اور یونہی ہانکنے لگا۔

''تُو تو بڑا زن مرید نکلا۔ زنانی سے اتنا ڈرا تو جیے گا کیسے؟'' ہاتھ پیروں کو حرکت کے قابل پا کر کھڑے ہوتے ہوئے شہریار نے اس کی فضول گوئی میں اس کا ساتھ دیا۔

''ویسے ہی جیسے تسی جیتے ہو۔ تسی بھی تو بھابو سے وڈا ڈرتے ہونا۔'' سلّو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی کھڑا ہوا اور شریر لہجے میں جواب دیا۔

''چل اوئے بکواس نہ کر۔ چپکا پڑا رہ۔'' شہریار نے اسے ڈپٹا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے حرکت کرنے لگا۔ یہ شاید کسی دوا کا ہی اثر تھا کہ اب بھی چلتے ہوئے اسے اپنے پیروں میں بھاری پن کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سلّو کی بھی تھی لیکن وہ بھی اسی کی طرح ہر طرح کے حالات میں جدوجہد کرنے کی سعی رکھتا تھا چنانچہ حرکت میں آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دس بارہ فٹ کے اس کمرے کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے اچھی طرح ٹٹول چکے تھے جس کے نتیجے میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ کمرے کی دیواریں بالکل ٹھوس ہیں اور ان میں کہیں بھی کوئی کھڑکی یا دروازہ موجود نہیں ہے۔ اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ انہیں کسی تہ خانے میں رکھا گیا ہے جس کا داخلی راستہ یقینی طور پر چھت پر رکھا گیا تھا اور چھت اتنی اُونچی تھی کہ سلّو نے شہریار کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے اس تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کی، تب بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس صورتِ حال میں وہ دم بخود رہ گئے۔ قید کرنے والوں نے انہیں ایسی جگہ قید کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر نکلنے کی جدوجہد بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب صرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ اپنے صیاد کا انتظار کریں۔ تہ خانے کے ننگے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے انہوں نے یہ انتظار شروع کر دیا۔ انہیں بہت دیر اس حالت سے نہیں گزرنا پڑا پھر بھی خاصی کوفت محسوس ہوئی۔ آپس میں اُلٹی سیدھی ہانکنے کا موڈ بھی صورتِ حال کی اس سنگینی نے ختم کر دیا تھا۔ کوئی سنجیدہ بات اس ڈر سے نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں کسی خفیہ مائیک کے ذریعے ان کی یہاں کی ہوئی بات چیت سنی نہ جا رہی ہو۔

انتظار کی یہ کوفت بھری گھڑیاں بہت عجیب انداز میں ختم ہوئیں۔ بیٹھے بیٹھے انہیں یہ محسوس ہوا کہ اوپر چھت کی طرف ہلچل سی ہوئی ہے لیکن بس صرف حرکت کا احساس تھا۔ روشنی بالکل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کچھ

دیکھ پاتے۔

اور جب روشنی ہوئی تو اتنی تیز کہ کافی عرصے سے اندھیرے میں ڈوبی ان کی بصارت چندھیا سی گئی۔ کچھ پل بعد وہ دیکھنے کے لائق ہوئے تو تہ خانے کا منظر سامنے تھا۔ وہ ایک سپاٹ دیواروں والا کمرہ تھا جو اس وقت پوری طرح روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ان روشنیوں کا منبع چھت پر نصب طاقتور لائٹس تھیں لیکن اس وقت ان کی توجہ کا اصل مرکز وہ شیشے کی کیپسول نما لفٹ تھی جس سے کئی مسلح نفوس نکل کر ان کے آس پاس پھیل گئے تھے۔ اور ظاہر ہے، ان کے ہاتھوں میں موجود ہتھیاروں کا رخ ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

مسلح افراد کے درمیان اندو کو دیکھ کر انہیں بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جن حالات سے گزر رہے تھے، پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کے پیچھے اندو ہی کا ہاتھ ہے۔ چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس اندو نے فوری طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ لفٹ کی طرف کر کے کوئی بٹن دبایا تو لفٹ واپس جانے لگی۔ یہ عجیب طریقے سے کام کرنے والی لفٹ تھی اور بالکل اس انداز میں کام کر رہی تھی جیسے کسی ٹوکری کو رسی سے لٹکا کر اوپر عمارت سے پھینکا اور واپس کھینچا جاتا ہے۔ لفٹ واپس چلی گئی تو چھت میں بننے والا گول خلا بھی بند ہو گیا۔

''ہاں تو مسٹر جگدیش اور مسٹر رویندر!..... آپ کی سواد مصالحہ کمپنی کا کام کیسا چل رہا ہے؟ گاندھی نگر میں آپ کو کچھ نیا بزنس ملا یا نہیں؟''

لفٹ واپس جانے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دیوار سے پشت لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے بہت طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں یہاں لانے کا کارن بتاؤ؟'' شہریار نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کارن تو تم بتاؤ گے کہ تم ممبئی سے دہلی جاتے ہوئے جھوٹا بہانہ کر کے گاندھی نگر میں کیوں اُترے تھے؟''

''ہم دہلی واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ہمیں ممبئی میں امپورٹنٹ بزنس ڈیل کرنی تھی لیکن تم نے ہمارا ایک نہ سنی اور زور زبردستی سے دہلی جانے والی ٹرین میں بٹھا دیا۔ ایسے میں ہمیں جو سوجھا، ہم کر گزرے۔'' شہریار نے محتاط انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بکواس مت کرو اور جھوٹ بولتے سے یاد رکھو کہ میرا ایک آدمی ٹرین میں تمہاری نگرانی کرتا رہا ہے۔ ویسے بھی میں یہ بات پہلے سے جانتی ہوں کہ تم کوئی بزنس مین نہیں ہو۔ کسی بزنس مین کے پاس ایسے برانڈڈ کیس نہیں ہوتے جنہیں کھولنا ماہر قفل سازوں کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔ ہم نے تمہارے بریف کیسوں کو ایکسرے مشین سے گزار کر دیکھا تھا جس سے یہ بات بھی سامنے آ گئی تھی کہ ان میں خطرناک گنیں موجود ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کسی بزنس مین کو ایسی گنیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ انہیں تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''گنیں ہم نے اپنی سیفٹی کے لیے رکھی تھیں ہم ممبئی میں ہونے والی لوٹ مار سے خوف زدہ تھے اس لیے اپنی اور اپنی چیزوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے چلے تھے۔''

''اوکے، ایسا ہے تو مجھے ان دونوں بریف کیسوں کو کھولنے کا کوڈ بتاؤ۔ میں انہیں کھول کر اپنی تسلی کر لوں گی کہ ان میں کوئی ایسی چیز تو موجود نہیں جو تمہیں بزنس مین کے بجائے کچھ اور ثابت کر دے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں شہریار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی مسلح افراد میں سے ایک نے دونوں بریف کیس لا کر اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔



''کیوں، کیا تم پولیس والی ہو جو تمہاری تسلی کروانا ضروری ہے؟..... جاؤ نہیں بتاتا میں تمہیں کوڈ۔'' شہریار نے اڑیل پن کا مظاہرہ کیا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف موقع تلاش کر رہا تھا کہ کسی طرح صورتِ حال اپنے حق میں کر سکے لیکن انہیں اپنی زد میں لیے کھڑے مسلح افراد اتنے چوکس تھے کہ کسی بھی غیر معمولی حرکت پر انہیں گولیوں سے بھون کر رکھ سکتے تھے۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی زندگی بچا کر ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔

''تم مجھے پولیس والی ہی سمجھ لو لیکن یاد رکھو کہ میری بات مانے بغیر تم تو کیا، تمہاری آتما بھی اس جگہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔'' اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

''لاک نہیں کھل رہا تو اسے توڑ دو یا بریف کیس کو کاٹ کر اس کے اندر کا راز جان لو۔ میں بہر حال تمہیں کوڈ نہیں بتاؤں گا۔'' شہریار نے تمسخرانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''ہم ان ترکیبوں پر عمل کر سکتے تھے اگر یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں کھولنے والا مواد ہوا کے سے نہیں اُڑ جائے گا۔'' اندو کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ہاہاہا..... تم کیا ہمیں کسی جاسوسی فلم کا کردار سمجھ رہی ہو جو ایسی خوفناک باتیں سوچ رہی ہو؟'' شہریار نے اس کا مذاق اُڑایا۔

''میں تمہیں جاسوسی فلم کا کردار نہیں بلکہ سچ مچ کا جاسوس سمجھ رہی ہوں اور ایک بار پھر وشواس دلاتی ہوں کہ تم اپنی اصلیت اُگلے بغیر مجھ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے۔'' وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''اوہ..... تو اندو جی جو ایک جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اشوک صاحب کے گینگ کی ہمدرد ہونے کی اداکارہ تھیں، اب اچانک دیش بھگت بن بیٹھی ہیں۔'' شہریار نے اس پر طنز کیا۔

''میں کیا ہوں اور کیا نہیں، اس کو جانے دو۔ لیکن اب تمہیں بتانا ہو گا کہ تم کون ہو؟'' وہ خوفناک لہجے میں بولی اور ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ چھت کی طرف کر کے کوئی بٹن دبا ڈالا۔ اچانک ہی چھت سے شیشے کا ایک کیس سا نمودار ہوا اور ان دونوں پر آ گرا۔ اب وہ دونوں اس باکس میں قید تھے اور صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ان پر افتاد آ پڑی تھی۔ باکس میں قید ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی انہیں اندازہ ہونے لگا کہ انہیں سانس لینے میں زبردست دشواری ہو رہی ہے۔

''یہ باکس آکسیجن سے بالکل خالی ہے اور اس میں امونیا گیس بھری ہوئی ہے۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو یہی باکس تمہاری قبر بن جائے گا۔'' اندو کی آواز نے انہیں اپنے گھٹتے ہوئے سانس اور تیز ہوتی ہوئی بُو کے راز سے آگاہ کیا۔ یہ واقعی بڑا زبردست ٹارچر تھا۔ کہنے کو اس نے انہیں انگلی بھی نہیں لگائی تھی لیکن شدید عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

''میں تمہیں کوڈ بتاؤں گا اور اپنی حقیقت بھی۔'' چند لمحے اور گزرے تو سلّو نے حوصلہ ہار دیا اور زور سے چلایا۔ اُس کی اس حرکت پر شہریار چونک گیا۔ سلّو نے اس مشن میں اس کے ساتھ شریک ہوتے وقت ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ جذبۂ حُبّ الوطنی کے باعث نہیں بلکہ ذاتی انتقام کی آگ بجھانے اور پُرکشش معاوضے کی خاطر اس کے ساتھ شریک ہو رہا ہے اور ظاہر ہے، انتقام اور پیسے میں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی جان دینے پر راضی ہو جاتا۔

وہ سلّو کو اس حرکت پر باز رکھنے کے لیے اس کی طرف لپکا لیکن اس سے قبل ہی شیشے کا وہ باکس ان پر سے ہٹ چکا تھا اور ابھی اس کا ہاتھ سلّو کے کالر تک ہی پہنچا تھا کہ تین مسلح افراد بیک وقت اس پر پل پڑے۔

شہریار کے لیے اس وقت سلّو کو روکنا زندگی اور موت کے مسئلے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج اگر دونوں جان سے بھی چلے گئے تو کل ان کے مشن کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور میدان میں اُتر جائے گا اگر ان کا مشن سامنے آ گیا تو ڈاکٹر فرحان جمیل کو تلاش کر کے وطن پہنچانا پہلے سے بھی زیادہ دشوار ہو جائے گا اُنہیں قیدی بنا کر رکھنے والے مزید محتاط ہو جائیں گے اور ان پر اتنے پہرے لگا دیں گے کہ ان تک رسائی ناممکن ہو جائے گی۔

اپنی اس سوچ کے تحت اس نے خود پر حملہ آور ہونے والوں کے پاس موجود اسلحے کا بھی خیال نہیں کیا بیک وقت ایک کو گھونسا اور دوسرے کو لات رسید کی۔

جواب میں اُسے بھی اُن کی گنز کی آہنی ضربات برداشت کرنی پڑیں۔ اُس نے ان ضربات کی پروا نہیں کی اور ان میں سے ایک کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر دو پر دے مارا۔

اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ کمرے میں موجود چوتھا مسلح شخص اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہتا۔ شہریار کو سے دھمکانا تو اس لیے بے کار تھا کہ وہ اپنے مقابلے پر آنے والے تینوں افراد میں سے ایک کو دوبارہ گرفت میں لے چکا تھا اور اس پر گولی چلانے میں یہ احتمال تھا کہ گولی شہریار کے بجائے اس کے ساتھی کو لگ جائے گی۔ وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کی مدد کو لپکا لیکن درمیان میں ہی سلّو کی ٹانگ چل اور وہ اپنی گن سمیت زمین بوس ہو گیا۔

اس اثنا میں گرنے والے دونوں افراد سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں سیدھی کیں اور سلّو کی طرف رخ کر کے فائر کر دیا۔ سلّو کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا چنانچہ اس نے چھلاوے کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دی اور اُچھل کر اس جانب پہنچ گیا جہاں اندو ریموٹ ہاتھ میں لیے انگشت بدنداں کھڑی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کوئی اتنا بے خوف بھی ہو سکتا ہے کہ چار عدد خطرناک گنز کی موجودگی میں مقابلہ کرنے کی احمقانہ جرأت کر سکے۔ لیکن وہ دونوں یہ کر چکے تھے اور لمحوں میں نہ صرف پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا کوئین یعنی وہ خود ان کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ سلّو فائرنگ سے بچنے کے بعد اس تک پہنچا تھا تو اس کوشش کی تھی کہ اسے جوڈو کا کوئی کمال دکھا سکے لیکن وہ اس سے زیادہ باکمال نکلا اور اس کا وار روکنے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تھام کر بازو کو اتنی بری طرح پیچھے کی طرف موڑا کہ وہ کراہ کر رہ گئی۔

''اگر کسی نے اب کوئی حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' اندو کی نازک سی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ کر اس نے اس کے ساتھیوں کو دھمکی دی۔ ان چاروں میں سے ایک تو پہلے ہی شہریار کی گرفت میں تھا، باقی تین بھی اس کی دھمکی سن کر ٹھٹک گئے۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ اپنی ہاں جکڑے ہونے کی وجہ سے عملاً کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

''اپنی گنز پھینک کر ہاتھ سر پر رکھ لو۔'' سلّو نے دوسرا حکم جاری کیا۔

''تم بہت بھیانک غلطی کر رہے ہو۔ ہمیں قابو میں کرنے کے بعد بھی تم اس عمارت سے نہیں نکل سکو گے۔'' گلے پر دباؤ کے باعث اندو نے پھنسی پھنسی آواز میں اسے خبردار کیا۔

''وہ ہمارا پرابلم ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو سمجھاؤ کہ گنز پھینک دیں ورنہ تمہاری یہ نازک سی گردن ٹوٹ جائے گی۔'' سلّو غرایا اور اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا جس کے نتیجے میں اس کے حلق سے خرخراہٹ سی برآمد ہوئی۔ خرخراہٹ کی اس آواز کو سن کر اب تک تذبذب کی کیفیت میں کھڑے اس کے ساتھیوں نے گنز دُور پھینک دیں اور ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ شہریار جو چند لمحے قبل سلّو کی طرف سے بدگمان ہو چکا



اس کے کارنامے پر کھل اُٹھا اور اپنے بازو میں جکڑے شخص کو کھڑی ہتھیلی کے ایک وار سے انٹاغفیل کرنے کے بعد لپک کر دور پڑی گنز کی طرف لپکا۔

''اب تم تینوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے ہوش و حواس میں موجود ان تینوں افراد کو حکم دیا۔

اُنہیں ناچار اس حکم کی پیروی کرنا پڑی کہ اسلحے سے محرومی اور باس کی خطرے میں پڑی زندگی ان کی مجبوری بن چکی تھی۔

شہریار دونوں ہاتھوں میں گنز سنبھالے محتاط قدموں سے ان کے عقب میں پہنچا اور بائیں ہاتھ میں تھامی گن کو نال سے تھام کر اس کا دستہ ایک کے سر پر بجا ڈالا۔ وہ فوراً ہی تیورا کر گر پڑا۔ دوسرے شخص کے سر پر لگنے والی ضرب بھی جچی تلی اور کارآمد تھی لیکن اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے مختصر سے دورانیے میں تیسرے کو یکدم ہی جوش آ گیا اور وہ تیزی سے پلٹ کر شہریار پر حملہ آور ہوا۔ اس بار شہریار نے کسی قسم کی رعایت میں وقت ضائع کرنے کی زحمت نہیں کی اور دائیں ہاتھ میں موجود گن کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں برآمد ہوئیں۔ اتفاق سے اس شخص کا چہرہ زد میں تھا۔ گولیوں نے اس کا ہر نقش اُڑا ڈالا اور اعضاء کے چیتھڑوں کے ساتھ خون کے چھینٹے دور تک پھیل گئے۔

''تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ اب سب کو مار کر بھی تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔'' اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اندو کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے فق ہوا اور اس نے ایک بار پھر اپنی دھمکی دہرائی۔

''ہم تمہارے جیسے تھرڈ کلاس لوگ نہیں ہیں جو سستی حرکتیں کرتے پھریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ہر حرکت بہت مہنگی ہے۔ تم بار بار یاد دلا کر اپنا ٹائم برباد مت کرو۔''

سلّو نے اسے تلخی سے جواب دیا اور بلا تکلف منہ پر ایک تھپڑ دے مارا۔ اُس کے مارے گئے تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ نہ صرف اندو کے رخسار پر اُنگلیوں کے نشان چھپ گئے بلکہ گال اندر سے پھٹ جانے کے باعث باچھوں سے خون بہہ نکلا۔

''یُو سن آف بچ۔ تم اپنے بارے میں نہ بھی بتاؤ تو میں پہچان چکی ہوں کہ تم بلڈی ایڈیٹس پاکستانی ایجنٹ ہو اور یہاں کسی خاص مشن پر آئے ہو۔'' تھپڑ کھا کر اندو پھٹ پڑی اور نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

''اور تم ہو ''را'' کی نمک خوار جو شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر یُو سونگھتی پھرتی ہو۔'' شہریار جو اس کے ریموٹ کنٹرول کو اپنے قابو میں لے چکا تھا، اس سے بھی زیادہ نفرت سے بولا۔

''مجھے گرو (فخر) ہے کہ میں اپنے دیش کی خاطر تم جیسے آتنک وادیوں کو ان کے انت (انجام) تک پہنچاتی ہوں۔ اب بھی چاہے تم میری جان لے لو لیکن یہاں سے بچ نہ سکو گے۔''

اس نے اپنی وہی دھمکی دہرائی جس نے انہیں سوچ میں ڈال دیا کہ یقیناً وہ کسی ایسی عمارت میں ہیں جہاں سکیورٹی کا زبردست انتظام رکھا گیا ہو گا اور اس تہ خانے میں موجود افراد کے علاوہ بھی اوپر کئی افراد موجود ہوں گے۔ وہاں تک کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ تہ خانہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔

''تمہیں ہم پر شک کیسے ہوا؟'' اپنے اندیشوں اور سوچوں کو فی الحال ذہن سے جھٹکتے ہوئے شہریار نے اس سے پوچھا۔

''تمہاری شامت تمہیں مجھ تک لے آئی۔'' وہ تمسخر سے مسکرائی۔ تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کے باعث

اس نے خود کو بہت تیزی سے اپنے ساتھی کی کراہت آمیز موت کے جھٹکے سے سنبھال لیا تھا۔

''بکواس نہیں۔ سیدھی طرح جواب دو۔'' اُس کا جواب سن کر سلّو غرّایا اور اس کے کان کو پکڑ کر اس طرح موڑا کہ وہ چیخ اُٹھی۔

اُس کے چیخنے کے باوجود سلّو نے اس کے کان پر سے اپنی گرفت ہلکی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی شدت سے زور لگایا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ذرا پروا نہیں تھی کہ وہ ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں شہریار کے لیے شاید ایسا کرنا مشکل ہوتا۔

''اے جانور کی اولاد!..... مجھے چھوڑ دے۔'' دردناک چیخوں کے درمیان اس نے بلبلاتے ہوئے سلّو سے کہا اور کوشش کی کہ اپنی ٹانگ سے اُس پر وار کر سکے۔

سلّو پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کی ٹانگ کے خود سے ٹکرانے سے پہلے اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور اتنی زوردار ضرب لگائی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''تم خوامخواہ کی زور آزمائی کر رہی ہو۔ یہ شخص تمہیں ذرا رعایت نہیں دے گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے ہمارے سوالوں کے جواب دیتی چلی جاؤ۔'' ریموٹ کے فنکشنز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

''میں نے کہا نا کہ تمہیں تمہاری شامت مجھ تک لے آئی تھی ورنہ میں تو سچ مچ صرف بھائی جی کے آدمی سے بچنے کے لیے تمہاری ٹیکسی میں بیٹھی تھی اور بعد میں بھی صرف انسانیت کے ناتے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعد میں تمہارے بریف کیسوں کی وجہ سے تمہاری طرف سے شک میں پڑ گئی اور بیرے کے روپ میں اپنا ایک آدمی تمہارے پیچھے لگا دیا۔ وہ تم دونوں کی باتیں سنتا رہا اس لیے جب تم نے سیدھے دلی جانے کے بجائے گاندھی نگر پر اُترنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مجھے انفارم کر دیا اور ہم نے وہاں کی لوکل پولیس کے ساتھ مل کر تمہیں اریسٹ کرنے کا پورا انتظام کر لیا۔ میں نے سنا تھا کہ اریسٹ ہونے سے پہلے بھی تم دونوں نے خاصی مارا ماری کی تھی لیکن پھر بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ یہاں اس جگہ تم اتنی آسانی سے میرے آدمیوں کو زیر کر لو گے۔'' انہیں پہلی بار اندو کی آواز میں مایوسی محسوس ہوئی۔ شاید اسی مایوسی کی وجہ سے اس نے سچ اُگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

''اوپر کتنے آدمی موجود ہیں؟'' اس کے بیان پر کوئی تبصرہ کیے بغیر شہریار نے اس سے اگلا سوال کیا۔

''مجھے ان کی گنتی یاد نہیں لیکن وہ کئی ہیں اور پوری طرح ہتھیار بند ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لفٹ کو نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''گرین بٹن۔'' اس کا جواب بے حد مختصر تھا جسے سن کر شہریار نے سلّو کو اشارہ کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں چل پڑے۔

''سچ بول کُتیا! ورنہ تیرے سگوں کو یہاں سے تیری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔'' وہ اسے اتنی بری طرح مار رہا تھا کہ فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود شہریار کو اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹنے کا یقین ہو گیا۔

''بلیو بٹن دباؤ..... بلیو بٹن۔ لفٹ نیچے آ جائے گی۔'' اس نے مار کھاتے کھاتے گویا ہار مان لی اور ہانپتی ہوئی آواز میں چیخی۔

''یہ کسی لومڑی کی طرح مکار ہے۔ میں اس کی کسی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔ کوئی اور کوشش کرنا ہوگی۔''



شہریار نے اس کا جواب سن کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا تو اندو کی آنکھوں میں مایوسی اُتر آئی جس نے واضح کر دیا کہ مشکل میں ہونے کے باوجود وہ مسلسل اُنہیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ جب یہ ہمارے کام کی نہیں تو میں اسے ٹپکا دیتا ہوں۔'' سلّو نے سفاکی سے کہا اور اس کی گردن پر دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالنے لگا۔ اندو ایک بار پھر بری طرح تڑپنے لگی۔

''ریڈ بٹن..... ریڈ بٹن پش کرنے سے لفٹ نیچے آ جائے گی۔''

اپنی بچت کے لیے اس نے ایک اور آپشن پیش کیا لیکن اُس کی ہر بات ناقابلِ یقین ہو چکی تھی چنانچہ سلّو نے ڈراپ سین کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

''ان میں سے کسی کو ہوش میں لاؤ۔'' اندو سے فارغ ہونے والے سلّو کو شہریار نے حکم دیا تو وہ کسی ڈھول کی طرح حرکت میں آ گیا اور بے ہوش افراد میں سے ایک کے پہلو میں دو تین زوردار ٹھوکریں جمائیں۔ تکلیف کے باعث وہ کراہتا ہوا ہوش میں آ گیا۔

''لفٹ نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' اسے سوچنے کی مہلت دیئے بغیر شہریار نے گن کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''ریڈ بٹن۔'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ اس بے ساختگی میں سچائی تھی اور شاید اس لیے تھی کہ وہ ابھی پوری طرح حواسوں میں نہیں لوٹا تھا۔

اس کا جواب سن کر شہریار نے اللہ کا نام لیتے ہوئے سرخ بٹن دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہیں اس قبرنما تہ خانے سے بہرصورت نکلنا تھا اس لیے رِسک لینا ناگزیر تھا۔ خیر گزری کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں بہتر ثابت ہوا اور وہی کیپسول نما لفٹ نیچے آ گئی۔

اس بندے کو سلّو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس نے آگے بڑھ کر لفٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں ایک سوئچ پینل موجود تھا جس پر اسے آپریٹ کرنے کے لیے واضح اشارے موجود تھے ورنہ جو ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا، اس میں مختلف رنگ کے بٹنوں کے علاوہ کوئی اشارہ ہی نہیں دیا ہوا تھا اور وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر اندو کی بات مان کر وہ اس کی مرضی سے کوئی بٹن دبا دیتا تو لفٹ نیچے آنے کے بجائے چھت سے کوئی زہریلا مادہ برسنا شروع ہو جاتا یا اوپر کی عمارت میں خطرے کا کوئی الارم بجنے لگتا اور ان کے فرار کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جاتیں۔

''اسے آف کرو اور بریف کیس لے کر لفٹ میں آ جاؤ۔'' لفٹ آپریٹ کرنے کا سسٹم اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس نے سلّو سے کہا تو اس نے خاموشی سے ہوش میں آنے والے شخص کی تقدیر کا فیصلہ کیا اور بریف کیس سمیٹ کر اس کے ساتھ لفٹ میں آ کھڑا ہوا۔

''آج تم نے ثابت کر دیا کہ اس مشن پر تمہیں اپنے ساتھ لانے کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔'' لفٹ کا دروازہ بند کر کے اوپر جانے کے لیے بٹن دبانے سے پہلے شہریار نے اس سے کہا۔

''کچھ دیر پہلے شاید تمہاری رائے کچھ اور تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں تم مجھے جان سے مار دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' سلّو نے ناراض لہجے میں اسے جواب دیا تو اس کے چہرے پر حقیقی شرمندگی کے تاثرات ابھر آئے۔

''آئی ایم ویری سوری یار! اس وقت میں سچ مچ سمجھا تھا کہ تم اپنی جان بچانے کے لیے اندو کو کوڈ بتانے لگے ہو۔'' اس نے زبان سے اعتراف اور معذرت کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا۔

''کون سا کوڈ؟..... میں صرف اپنے بریف کیس کو کھولنے کا کوڈ جانتا ہوں اور اس میں ایک گن کے علاوہ کوئی کام کی چیز موجود نہیں ہے۔'' سلّو نے نروٹھے پن سے جواب دیا تو وہ پہلے مسکرایا پھر اپنے بریف کیس کو کوڈ کی مدد سے کھول کر اس میں رکھے سامان کو آگے پیچھے کرنے کے بعد اس میں سے ایک لفافہ برآمد کر کے اسے تھماتے ہوئے بولا۔

''یہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں اس وقت دکھاؤں گا جب تم پر اعتماد کرنے لگوں گا۔''

''شکریہ اتنی جلدی اعتماد کرنے کا۔'' سلّو نے طنز سے کہتے ہوئے لفافہ کھول کر اس میں موجود شے نکالی۔ وہ ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر تھی۔

''یہ کیا.....؟'' تصویر دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''ہم اس شخص کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ رازداری کے خیال سے میں نے تمہیں کچھ باتوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ فی الحال تم اس تصویر کو اپنے ذہن میں نقش کر لو۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہیں اس کی تفصیلات سے بھی آگاہ کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ لی تصویر۔ آگے کیا کرنا ہے؟'' سلّو کے لہجے میں بظاہر بے نیازی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے کسی ایکسرے مشین کی طرح تصویر کا جائزہ لیا تھا۔

''اسے پھاڑ دو۔ اب بس یہ ہمارے ذہنوں میں ہی رہے گی۔ میں مزید اس تصویر کو اپنے پاس رکھ کر خطرہ نہیں مول لے سکتا۔ ورنہ کسی نہ کسی اسٹیج پر ہماری یہاں آمد کا مقصد سامنے آ جائے گا۔''

شہریار نے اسے ہدایت دیتے ہوئے پینل پر موجود ایک بٹن دبا دیا۔ اس دوران سلّو نے اس کی ہدایت سمجھتے ہوئے تصویر کے اتنے پُرزے کر دیئے تھے کہ کوئی اُنہیں جوڑنا بھی چاہتا تو نہیں جوڑ سکتا تھا۔

''اپنے بریف کیس کو یہیں چھوڑ دو۔ اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا بیکار ہوگا۔'' وہ بریف کیس میں موجود اپنی اپنی گنز پہلے ہی نکال چکے تھے۔ شہریار نے پلاسٹک کا ایک لفافہ اپنے ٹراؤزر کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے سلّو کو ہدایت کی لیکن خود اپنا بریف کیس ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سلّو نے بنا حیل و حجت اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور وہ لفٹ سے باہر آ گئے۔

لفٹ نے اُنہیں جس کمرے میں پہنچایا تھا، وہ بڑا عجیب و غریب تھا اور پورے فرش پر مختلف قسم کی مشینیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ یہاں انہوں نے شیشے کا وہ باکس بھی دیکھا جس میں کچھ دیر رہ کر انہوں نے آکسیجن کی محرومی اور امونیا کی موجودگی کی چبھن کو محسوس کیا تھا۔ انہیں سمجھ آ گیا کہ نیچے موجود سپاٹ تہ خانے میں ہونے والی ساری کارروائیوں کا حقیقی انتظام اس کمرے میں ہے اور اس تہ خانے میں اس ریموٹ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا جو انہوں نے اندو سے حاصل کیا تھا۔

اس کمرے کو دیکھ کر انہیں اور بھی زیادہ شدت سے احساس ہوا کہ یہاں بہت احتیاط اور حاضر دماغی سے کام لینا پڑے گا کیونکہ جس عمارت میں اتنے انتظامات تھے، وہ کوئی عام جگہ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اندو ایک طرح سے یہ اعتراف کر چکی تھی کہ اس کا تعلق ''را'' سے ہے اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ وہ ''را'' کے کسی ٹھکانے پر موجود ہیں۔

''میں آگے چلوں گا، تم مجھے کور دینا۔'' کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سرگوشی میں سلّو سے کہا اور پھر دروازے کو بے آواز کھول کر پھرتی سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک لمبا کوریڈور تھا جو



وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ کوریڈور میں اور بھی کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔

سلّو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور پہلے پڑنے والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر جھکتے ہوئے کی ہول سے کمرے کے اندر جھانکا۔ اس کی نظروں نے فوراً ہی کمرے میں نصب کمپیوٹرز، دفتری سامان اور ایک دُبلی پتلی سی لڑکی کا احاطہ کر لیا۔ لڑکی کی عمر پچیس کے آس پاس تھی اور شکل کے اعتبار سے وہ قبول صورت کہلائی جا سکتی تھی۔ البتہ اس کے اسمارٹ جسم پر جینز اور ٹی شرٹ جچ رہے تھے۔ وہ ریوالونگ چیئر پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور دیوار کے ساتھ نصب کمپیوٹرز کی اسکرینز پشت پر چلی گئی تھیں۔ شہریار کی ہول سے کان لگا کر اندر کی سُن گُن لینے لگا جبکہ سلّو چوکس کھڑا گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

''میری مجبوری کو سمجھو شیکھر! میں ابھی تم سے ملنے نہیں آ سکتی۔ میں نے اس ٹائم چھٹی مانگی تو میری جاب ختم ہو جائے گی۔'' وہ بڑے میٹھے لہجے میں اپنے کان سے لگے موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''جاب تم سے بڑھ کر نہیں ہے۔ لیکن اس پر ہمارا فیوچر بنتا ہے۔ اچھی اِنکم کے بنا ہم ایک اچھی لائف کیسے گزار سکیں گے؟'' دوسری طرف سے شاید اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا جواب اس نے قدرے جھنجلاہٹ آمیز دلیل کے ساتھ دیا تھا۔

''ہم نیکسٹ ویک کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ساتھ لنچ کر لیں گے۔ بلکہ میں ایسا کروں گی کہ آفس سے چھٹی لے لوں گی پھر ہم پورا دن ساتھ گزاریں گے۔'' اُس کی گفتگو سے دوسری طرف موجود شخص سے اس کے تعلق کی نوعیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ موبائل فون پر شیکھر نامی جس شخص سے بات کر رہی تھی، وہ یقینی طور پر اس کا محبوب یا منگیتر رہا ہوگا جو دفتری اوقات میں اسے ڈسٹرب کر کے پیشہ ورانہ فرائض میں کوتاہی کا سبب بن رہا تھا۔

''ابھی میں فون بند کر رہی ہوں۔ تمہاری ناراضگی جب میں ملنے آؤں گی، تب دُور کر دوں گی۔''

اگلا بندہ شاید کسی طرح قائل نہیں ہو رہا تھا چنانچہ اس نے یکدم ہی فون بند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کال منقطع کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اس طرح سر تھام کر بیٹھ گئی کہ اس کا موبائل فون سر اور ہاتھ کے درمیان میں دبا ہوا تھا۔

شہریار کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے ہینڈل دبا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور برق رفتاری سے اندر داخل ہو گیا۔

سلّو نے بھی اس کی تقلید کی۔ کیونکہ کوریڈور میں اس طرح منہ اٹھائے کھڑے رہنا خطرناک تھا۔ اچانک ہی کوئی بھی کسی کمرے سے باہر نکل کر اسے وہاں کھڑا دیکھ سکتا تھا۔

''کک..... کون ہو تم؟'' ان دونوں کے اس طرح اچانک کمرے میں داخل ہونے پر لڑکی بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور پھر یکدم ہی اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے جیسے اس نے اپنے سامنے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

''تم لوگ تہ خانے سے باہر کیسے نکلے؟'' لمحہ بھر میں پہچان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

یقینی طور پر وہ تہ خانے میں ان دونوں کی موجودگی سے باخبر تھی اور اس کے حساب سے یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ کوئی اپنی مرضی سے تہ خانے سے باہر نکل سکے۔

''ہم لفٹ سے اوپر آئے ہیں۔'' شہریار نے نہایت سادگی سے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں عمارت کے بیرونی حصے، مختلف زاویوں سے دکھائی دے رہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عمارت ایک ایسے علاقے میں موجود ہے جہاں بہت کم عمارتیں موجود ہیں اور اردگرد کا زیادہ تر علاقہ خالی پڑا ہوا ہے۔

عمارت کے دروازے پر دو سکیورٹی گارڈز چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے جبکہ چار دیواری خاصی بلند ہونے کے ساتھ اس پر خاردار تار بھی بچھے ہوئے تھے۔ شہریار کو یقین تھا کہ ان تاروں میں برقی رو دوڑانے کا انتظام بھی موجود ہوگا۔

''اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں؟'' اس کا جواب سن کر لڑکی نے ایک اور سوال داغا اور آہستہ سے اپنا بایاں ہاتھ پشت کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ موبائل فون اس کے دائیں ہاتھ میں موجود تھا اور وہ اس نے بالکل سامنے رکھا ہوا تھا۔

''اپنا ہاتھ سامنے کرو ورنہ اس گن سے نکلنے والی گولیاں تمہارے کلیجے میں گھس جائیں گی اور تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں۔'' شہریار نے سخت لہجے میں اسے دھمکایا تو اس نے بے بسی کے عالم میں اپنا ہاتھ سامنے کر لیا۔

اسی وقت سلو آگے بڑھا اور اسے اتنی زور سے جھٹکا دے کر واپس کرسی پر بٹھایا کہ اس کا موبائل اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ فرش پر نرم و ملائم کارپٹ بچھا تھا جس کی وجہ سے موبائل نیچے گرنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

''چھوڑو مجھے..... کیا کر رہے ہو؟'' لڑکی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اچانک پڑنے والی اس افتاد پر اچھی خاصی خوف زدہ ہو گئی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔

شاید وہ فیلڈ میں رہ کر کام کرنے کے بجائے دفتر تک محدود رہ کر کام کرنے کی عادی تھی اور اسے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر ضرورت سے زیادہ گھبرا گئی ہو کہ جو لوگ اندو اور اس کے مسلح ساتھیوں کو زیر کر کے تہ خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ خاصے خطرناک ہوں گے۔

''آواز نکالے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہو ورنہ گردن کی ہڈی توڑ کر ایسے جان نکالوں گا کہ تمہارے فرشتوں کو بھی تمہارے مرنے کی خبر نہیں ہوگی۔''

سلو نے غرا کر اسے دھمکی دی لیکن اس کی آواز بس اتنی تھی کہ کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کمرے کے علاوہ بھی وہاں بہت سے کمرے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کس کس کمرے میں کتنے افراد موجود ہیں جو آواز سن کر اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ تم بس اس کا منہ بند رکھو۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' شہریار اُس کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ فوراً ہی اس کی نظر میں کی پیڈ سے ہٹ کر لگا ایک بٹن آ گیا۔ لڑکی نے شاید ہاتھ پیچھے لے جا کر اسی بٹن کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بٹن کسی الارم وغیرہ سے منسلک ہے۔

اس بٹن سے صرفِ نظر کرتا ہوا وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ذرا ہی دیر میں اسے اپنی کوشش میں کامیابی



حاصل ہوئی اور اسکرین پر موجود مناظر تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ اب وہ بیرونی مناظر کے بجائے عمارت کے اندرونی حصے کے مناظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

عمارت میں تقریباً بارہ کے قریب کمرے موجود تھے جن میں تہ خانے کے اوپر والے کمرے کے علاوہ وہ کمرہ بھی شامل تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھے۔ باقی کے دس کمروں میں سے دو گیسٹ روم کے انداز میں سجے ہوئے تھے جبکہ ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر سیٹ تھا۔ ان تینوں کمروں میں کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ایک طویل ہال نما کمرے میں چھ افراد ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان افراد کے علاوہ عمارت کے دیگر کمروں میں مزید پانچ افراد اور بھی موجود تھے جن میں سے تین تو ایک جگہ بیٹھے آپس میں کوئی گفتگو کر رہے تھے جبکہ دو دفتری نوعیت کا کوئی کام کر رہے تھے۔

شہریار نے مزید بٹن دبائے تو اسکرین پر تہ خانے کا منظر بھی نظر آنے لگا۔ وہاں اندو اور اس کے ساتھی فرش پر بے دست و پا پڑے بہ زبانِ خاموشی اپنی شکست اور ریزہ ریزہ غرور کی داستان سنا رہے تھے۔ شہریار نے سلو کو اشارہ کیا تو اس نے لڑکی کی کرسی کو گھما کر اس کا رخ اسکرین کی طرف کر دیا۔ وہاں موجود منظر کو دیکھ کر اس کا چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔

''پلیز! مجھے کچھ مت کہنا۔ میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ میں نے اور شیکھر نے ایک ساتھ جیون بتانے کے اتنے سپنے دیکھے ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو شیکھر صدمے سے پاگل ہو جائے گا۔'' اس نے عجیب معصومانہ لہجے میں شہریار سے التجا کی اور یک دم ہی بری طرح سسکنے لگی۔

''اس انجام کے لیے تو تمہیں اسی وقت سے تیار رہنا چاہئے تھا جب تم نے ''را'' کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا۔'' شہریار نے سپاٹ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں مجبور تھی۔ میرے پاس یہ چوائس نہیں تھی کہ میں اُنہیں انکار کر سکوں۔'' اس نے اسی طرح سسکتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا ''را'' جیسے اداروں میں بھی جبری بھرتیاں ہوتی ہیں؟'' شہریار حیران ہوا۔

''دوسروں کا مجھے نہیں پتہ لیکن میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ میری بیڈ لک تھی کہ میں نے ایم سی ایس کے ایگزامز میں ٹاپ کیا اور یک دم ہی بہت سے لوگوں کی نظروں میں آ گئی۔ ان دنوں میں اپنی اس مشہوری کے لیے بہت خوش تھی۔ میں نے اور میرے ٹیچرز نے نیوز رپورٹرز کو بڑھ چڑھ کر بتایا کہ کمپیوٹر کی دنیا میں، میں کتنی جانکاری رکھتی ہوں اور کیسے کیسے کارنامے انجام دے سکتی ہوں۔ مجھے فوراً ہی کئی جگہ سے جاب کی آفرز آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنے پیرنٹس اور شیکھر سے رائے لے کر گورنمنٹ سیکٹر کی طرف سے ملنے والے سب سے اٹریکٹو آفر کو ایکسیپٹ کر لیا۔ وہاں تین مہینے تک مجھے پرکھا گیا اور پھر یہاں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ تمہیں معلوم ہے، یہ لوگ مجھ سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کمپیوٹر ایکسپرٹ سے زیادہ ایک ہیکر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میں ان کے لیے اپنی ہی گورنمنٹ کے کئی آفیسرز اور نیتاؤں کے راز چوری کرتی ہوں۔ میں نے ان کے لیے کئی دولت مندوں کے اکاؤنٹس صاف کیے ہیں اور آگے بھی جانے یہ مجھ سے کیا کیا کام لینے والے ہیں۔ میں یہ جاب چھوڑ دینا چاہتی ہوں لیکن نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے منگیتر شیکھر سے ملنے کی پرمیشن بھی بہت مشکل سے ملتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک آدمی سارا ٹائم ہماری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ میرے موبائل سے ہونے والی ہر کال کا ریکارڈ یہ لوگ چیک کرتے ہیں اور میں کسی سے اپنے من کی بات نہیں کر سکتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن یہ لوگ میرے پیرنٹس کی طرح شیکھر کی بھی جان نہ لے لیں۔ اس لیے میں

خود بھی جان کر اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ میری سنتا ہی نہیں ہے۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں انہیں ایک عجیب سی داستان سناتی چلی گئی۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ تمہارے پیرنٹس کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے؟'' شہریار کا لہجہ خود بخود ہی اس کے لیے نرم پڑ گیا۔

''مجھ سے اپنے مطلب کے کام لینے سے پہلے مجھ پر زور دیا جا رہا تھا کہ میں چوبیس گھنٹے یہیں رہا کروں اور صرف وِیک اینڈ پر اپنے پیرنٹس سے ملنے کے لیے جایا کروں۔ میں اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہوں اس لیے انہیں اور مجھے دونوں کو ہی یہ بات منظور نہیں تھی۔ میرے انکار پر پہلے تو مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا لیکن جب میں نے جاب چھوڑنے کی دھمکی دی تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر ٹھیک ایک مہینے بعد میرے پیرنٹس ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کے مرنے کے بعد شیکھر فوری طور پر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے دفتر کی طرف سے بتایا گیا کہ ایگریمنٹ کے مطابق میں پانچ سال تک نہ تو جاب چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی شادی کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ یہ شرطیں کب اور کیسے ایگریمنٹ میں شامل کی گئیں لیکن چونکہ اس پر میرے دستخط موجود تھے، اس لیے میں اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے پانچ سال جیل میں کاٹنے پڑتے۔ میں مجبور ہو کر چوبیس گھنٹے کے لیے یہاں رہنے پر راضی ہو گئی اور اب ان کے اشاروں پر ناچ رہی ہوں۔ یہ آفس میرا نہیں ہے۔ میں صرف کھانے کے وقفے میں یہاں بیٹھتی ہوں ورنہ میرے کام کا کمرہ دوسرا ہے جہاں میں ان کی مرضی کے کام کرتی ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں میرا یہ سوچنا غلط تو نہیں ہے کہ انہی لوگوں نے میرے پیرنٹس کو جان بوجھ کر حادثے کا نشانہ بنایا تھا۔'' اس کا لہجہ نفرت اور دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

شہریار کو اس کی داستان سن کر دلی دکھ ہوا۔ آج تک تو وہ اپنے ہی ملک میں ''را'' کی ریشہ دوانیوں سے خار کھاتا تھا لیکن یہاں تو انہوں نے اپنوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ بہرحال، اس وقت اُسے اس لڑکی کے حالات پر کُڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ لوگ خود مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے اور انہیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا چنانچہ اپنی توجہ اسی طرف مبذول رکھی اور سلّو سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میرے خیال میں تم بنا ہتھیار کے خاموشی سے ان دو افراد کو تو آرام سے آف کر سکتے ہو۔''

''بالکل۔'' سلّو نے جواب دیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہریار اُسے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ پہلے نزدیک ترین کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے نہایت آہستگی سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اگر موجود شخص کو فوری طور پر اس کی آمد کا احساس نہیں ہوا اور جب ہوا تو مصیبت اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھنے اور دراز کھول کر شاید کوئی ہتھیار نکالنے کی بیک وقت کوشش کی لیکن دونوں ہی مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور سلّو نے اسے چھاپ لیا۔

معلوم نہیں وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی تھا یا نہیں لیکن حقیقتاً اس پر اتنی اچانک یہ افتاد ٹوٹی تھی کہ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے باعث چند لمحوں میں ہی اپنی زندگی سے محروم ہو گیا۔

اس شخص کو اپنے انجام تک پہنچانے کے بعد سلّو نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ وہ چونکہ اسکرین پر دیکھ کر عمارت کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس لیے حرکت کرنے میں کوئی دُشواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ادھر شہریار نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنے ساتھ موجود اس کمپیوٹر ایکسپرٹ لڑکی کی کرسی کا رخ اسکرین کی طرف سے



ہٹا دیا تھا تاکہ وہ یہ سب نہ دیکھ سکے۔

''را'' کے ٹھکانے پر موجود ہونے کے باوجود اسے وہ لڑکی خاصی ڈرپوک لگی تھی اس لیے یہ احتیاط برتی تھی کہ کہیں وہ کوئی اندوہناک منظر دیکھ کر اضطراری طور پر چیخ ہی نہ پڑے۔ لڑکی کی گردن سے گن کی نال لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے وہ اسکرین پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے کمرے میں داخل ہونے والے سلّو کو اس دفعہ کچھ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہاں موجود شخص نے اسے دیکھ لیا اور پھرتی سے اپنا پسٹل نکال لیا۔

اس موقع پر سلّو نے عجیب جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود گن اس کے پسٹل والے ہاتھ پر دے ماری۔ اس کا نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا اور گن سمیت فاصلے پر جا گرا۔

سلّو نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی پینٹ میں اڑسی ہوئی دوسری گن نکال کر اس کا رخ آدمی کی طرف کر دیا تو شہریار کو اس کے آرام سے گن دے مارنے کی وجہ سمجھ آئی۔ اس کے پاس اپنی ذاتی گن کے علاوہ اندو کے ساتھی سے چھینی گئی گن بھی موجود تھی جس کی وجہ سے اس نے نہایت ذہانت اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے حق میں کر لیا تھا۔

شہریار اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا لیکن دیکھنے سے اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اس نے اس درمیانی عمر کے گنجے آدمی کو ہاتھ اوپر اٹھا کر میز کے پیچھے سے نکلنے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم پر وہ آدمی کچھ بولا ضرور لیکن سلّو کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے اسے انکار کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ میز کے پیچھے سے نکل کر دیوار کی طرف بڑھ گیا اور اپنا رخ اس طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔

سلّو محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھا اور اپنا گن والا ہاتھ اوپر اٹھا کر پشت پر سے اسے ضرب لگانی چاہی لیکن وہ شخص اس کی توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور یک دم ہی پلٹ کر اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اچانک ہونے والے جھٹکے کی وجہ سے سلّو کے ہاتھ سے گن نکل کر دُور جا گری۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے گن کے گرنے کی آواز پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں دوسرے دو کمروں میں موجود افراد شاید اب تک اس طرف متوجہ ہو چکے ہوتے۔

گن ہاتھ سے نکل جانے پر سلّو نے جھنجلا کر اپنی لات چلائی جو مقابل کے پہلو میں لگی اور جواباً اس نے بھی سلّو کے منہ پر ایک گھونسہ دے مارا۔ اس گھونسے کے جواب میں سلّو نے ایک بار پھر اپنی ٹانگ کا استعمال کیا اور دونوں رانوں کے بیچ میں نازک جگہ کو نشانہ بنایا۔ وہ شخص بلبلا اُٹھا۔ لیکن آدمی جی دار تھا اس لیے منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر مقابلے پر ڈٹا رہا اور سلّو کی گردن کو کھڑی ہتھیلی کے وار کا نشانہ بنانا چاہا۔ سلّو نے ایک دم جھکائی دے کر نہ صرف خود کو اس کے وار سے بچایا بلکہ اس کے پیٹ میں اپنے سر سے زوردار ٹکر دے ماری۔ یقیناً یہ ایک زوردار ضرب تھی لیکن وہ شخص اسے جھیل گیا اور سلّو کے بالوں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ دونوں قالین پر گرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔

شہریار کے لیے یہ بڑے نازک اور صبر آزما لمحات تھے۔ اُس نے ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیا کہ اگر سلّو اس آدمی پر قابو حاصل نہیں کر پایا تو اسے خود ایکشن میں آنا ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرے افراد کا بھی الرٹ ہو جانا لازمی تھا اس لیے اس کے لیے صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہو جاتی۔ فی الحال تو قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ گفتگو اور کھانے میں مصروف آدمیوں کے دونوں ہی گروہوں کو اپنے اردگرد کی بھنک نہیں

پڑ سکی تھی اور وہ ہنوز اپنی مصروفیت میں مشغول تھے۔

سلّو اور اُس کا مقابل آپس میں بدستور اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مقابل کو لڑنے کے ہنر میں ماہر ہے۔ البتہ سلّو کو اس پر یہ برتری حاصل تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں جوان اور زیادہ توانا جسم کا مالک تھا۔ آخر کار اُس کی اس برتری نے مقابلے کا فیصلہ کر دیا۔ سلّو نے اچانک ہی اپنے مقابل کے دونوں کانوں کو مضبوطی سے گرفت میں لیا اور اس کا سر پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ اس کے مقابل کی بالوں سے محروم کھوپڑی چیخ کر رہ گئی اور وہ کسی مُردہ چھپکلی کی طرح نیچے گرا۔ ایسی حالت میں قالین پر لمبا لیٹا نظر آنے لگا کہ اُس کے سر سے نکلنے والا خون تیزی سے قالین کو بھگو رہا تھا۔ اُس کی حالت سے بے نیاز سلّو اطمینان سے اُسے چھوڑ کر کمرے کے ان حصوں کی طرف متوجہ ہوا جہاں اس کی دونوں گنز گری تھیں۔ گنز اپنے قبضے میں کرنے کے بعد وہ متوازن چال چلتا ہوا شہریار کے پاس واپس آ گیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اندر گھستے ہی اس نے شہریار سے پوچھا اور یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اس کے لباس پر نظر آنے والے خون کے چھینٹوں نے لڑکی کے خوف زدہ چہرے کی زردی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ خون اس گنجے کا تھا جس کا سر اُس نے دیوار سے ٹکرا کر اس کی زندگی کا قصہ تمام کیا تھا۔

''اب ہمیں ان تینوں گروپس سے نمٹنا ہوگا۔'' اس کا اشارہ ڈائننگ ہال اور لیونگ روم کے علاوہ گیٹ پر موجود گارڈز کی طرف تھا۔ وہ کُل ملا کر گیارہ افراد تھے جن سے ان دونوں کو بیک وقت نمٹنا تھا۔ کرنے کو تو یہ بھی کر سکتے تھے کہ اپنے ساتھ موجود لڑکی کو بے ہوش کرتے اور گیٹ چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔ لیکن شہریار کے نزدیک وہ اس کے وطن کے بدترین دشمن تھے چنانچہ وہ انہیں ان کے انجام تک پہنچائے بغیر وہاں سے فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''اتنے افراد سے اکٹھا نمٹنے کے لیے ہمیں لازماً گنز کا استعمال کرنا پڑے گا اور ہم صرف دو ہیں۔ یعنی بیک وقت حملہ کرنے کی صورت میں ہمیں کسی نہ کسی ایک گروپ کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے اس گروپ کے افراد فائرنگ کی آواز سن کر ہمارے مقابلے پر آ جائیں گے۔'' سلّو نے سنجیدگی سے صورتِ حال کا احاطہ کیا جس پر لڑکی نے ایک بار پھر سسکنا شروع کر دیا۔

''پہلے اس کا منہ تو بند کراؤ۔ پھر کچھ کرتے ہیں۔'' سلّو بیزاری سے بولا جس پر شہریار نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سر پر ایک جچی تلی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ بے شک وہ مظلوم تھی لیکن تھی تو دشمن کے کیمپ کا حصہ اس لیے وہ اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔

''میں ڈائننگ ہال میں جاتا ہوں، تم لیونگ روم میں جاؤ۔ یہ لوگ اپنی مصروفیت میں مگن ہیں۔ ہم بیک وقت فائرنگ کریں گے تو کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ جب تک گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر اندر رخ کریں گے، ہمارا کام ختم ہو چکا ہوگا اور ہم اُنہیں سنبھال لیں گے۔

لڑکی کو بے ہوش کر کے شہریار نے فوری طور پر اسے اگلے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ڈائننگ ہال میں موجود افراد کھانے کے اختتامی مراحل میں ہیں اس لیے ان پر فوری ایکشن میں آنا ضروری تھا۔ اگر دیر ہو جاتی تو وہ چھ افراد تتر بتر ہو جاتے اور ایسی صورت میں ان پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔

سلّو بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اپنے ٹارگٹ



کی پہنچے اور پھرتی سے دروازہ کھول کر دونوں ہاتھوں میں موجود گنز سے ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ گنز کے دہانوں سے نکلتی گولیوں نے انسانی جسموں کو بے دردی سے چھیدنا شروع کر دیا۔ سلّو کے سامنے پانچ افراد تھے۔ وہ تینوں ہی لمحوں میں گولیاں کھا کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

البتہ ڈائننگ ہال میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ دو گنز سے بیک وقت فائر کرنے کے باوجود شہریار کے چھ کے چھ افراد کو ایک ساتھ نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور ان میں سے دو افراد نے نیچے بیٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کو الٹ کر خود کو اس کے پیچھے چھپا لیا۔ ڈائننگ ٹیبل کے اُلٹنے کے نتیجے میں اس پر موجود برتن اور خورد و نوش کی اشیا نیچے گر کر بکھر گئیں اور گولیاں کھا کر فرش پر گرنے والے اسی کھانے میں لوٹ پوٹ ہونے لگے جسے کچھ دیر پہلے مزے سے کھا رہے تھے۔

یہ ساری سیکنڈوں کی کہانی تھی اور اگر شہریار نے خود کو یک دم ہی نیچے نہ گرا لیا ہوتا تو اس گولی کا نشانہ بن جاتا جو ڈائننگ ٹیبل کی آڑ میں چھپنے والوں میں سے ایک نے چلائی تھی۔ گولی ریوالور سے چلائی گئی تھی اور کھلے دروازے سے گزر کر کوریڈور میں سامنے والے کمرے کی دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔

شہریار نے نیچے گرتے ہی ڈائننگ ٹیبل پر ایک برسٹ مارا۔ وہ مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی ٹیبل تھی پھر بھی گولیوں نے اس میں کئی چھید کر ڈالے۔ ساتھ ہی ایک زوردار سسکاری بھی سنائی دی جو یقیناً ان دو میں سے کسی ایک کے زخمی ہونے کی نشانی تھی۔

برسٹ مارنے کے بعد شہریار ایک لمحہ بھی اپنی جگہ پر نہیں ٹھہرا اور فوراً ہی پوزیشن بدل لی۔ یہ چیز اس کے لیے سود مند ثابت ہوئی اور وہ ایک بار پھر اس فائر سے بچ گیا جو ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے سے ریوالور ہی سے کیا گیا تھا۔ اس فائر نے اسے دو اہم حقائق سے آگاہ کیا۔ اوّل یہ کہ ان دونوں میں سے صرف ایک شخص مسلح تھا۔ دوسرے اُس کے پاس بھی محض ریوالور ہی تھا۔ ظاہر ہے اپنے تئیں وہ لوگ اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر بیٹھے پُرتکلف کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس لیے اسلحہ ساتھ رکھنا غیر ضروری سمجھا ہوگا اور کسی ایک شخص کے پاس یہ ریوالور بھی بس اتفاقاً ہی موجود ہوگا۔

اسلحے کے معاملے میں اپنی برتری کو محسوس کر کے اس نے فرش پر پڑے پڑے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں خطرناک گنز کے دہانوں سے نکلنے والی دہکتے انگاروں جیسی گولیوں نے سیکنڈوں میں فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنی فتح کو محسوس کر کے کھڑی ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے جھانکا تو اسے دو نفوس اپنے ہی خون میں لت پت آخری سانسیں گنتے دکھائی دیئے۔

ایک نظر میں ان چھ کے چھ کی موت کا یقین کر لینے کے بعد وہ باہر کی طرف لپکا تو اسے سلّو کوریڈور کے آخری سرے پر موجود سیڑھیوں سے نیچے اُترتا دکھائی دیا۔

اپنے شکاروں سے نمٹتے ہوئے اس نے باہر سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں چنانچہ جب سلّو کے تلخ مندی سے چمکتے چہرے کو دیکھا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے شکاروں سے نمٹنے کے بعد چھت پر چلا گیا ہوگا۔ مین گیٹ سے مرکزی عمارت ذرا فاصلے پر تھی چنانچہ جب گارڈز نے فائرنگ کی آواز سن کر اندر کا رخ کیا ہوگا تو انہیں کچھ وقت لگا ہوگا۔ اتنی ہمت چیتے کی سی پھرتی رکھنے والے سلّو کے لیے کافی تھی۔ اس نے چھت پر سے ہی ان دونوں کو نشانہ بنا کر ان کا کام تمام کر دیا ہوگا۔

''اب یہاں سے نکلنا چاہئے۔ ورنہ فائرنگ کی آوازیں سن کر کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر دے دے گا۔'' اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سلّو نے کہا۔

''ہاں چلتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ اس بے ہوش لڑکی کو لے کر کسی ایک گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے سلّو کو ہدایت دی تو وہ منہ بناتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں صاف ستھرے طریقے سے مرنے والے شخص کی لاش پڑی تھی۔ اپنی خون آلود قمیض کی جگہ اس کی قمیض پہن کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ اسے کندھے پر ڈال کر وہ واپس آیا تو شہریار دکھائی نہیں دیا۔ اس کی فکر میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر تین عدد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے سیاہ شیشوں والی سرخ گاڑی کا انتخاب کیا اور لڑکی کو اس کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کی کاریگری نے چند لمحوں کے اندر بغیر چابی کے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ وہ اسے چلاتا ہوا عمارت کے مین گیٹ تک پہنچا۔ بڑے سے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا جو یقیناً باہر موجود گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر بوکھلاہٹ میں کھلا چھوڑ آئے تھے۔

اس نے انجن کو اسٹارٹ چھوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ سے اُتر کر گیٹ کو چوپٹ کھول دیا۔ اسی وقت شہریار اندر سے دوڑ کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پہنچنے سے قبل وہ ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ شہریار نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ابھی دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ سلّو گاڑی کو گولی کی طرح نکال کر باہر لے گیا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر بھی اسے عقب نما آئینے میں عمارت سے بلند ہوتے شعلے نظر آ گئے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''شارٹ سرکٹ۔'' شہریار نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''را'' والوں سے اس کی نفرت کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔ انہوں نے اسے نجی اور قومی دونوں اعتبار سے شدید نقصان پہنچایا تھا۔ وہ نہ تو معصوم شینا کی دردناک موت بھول سکا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں جیسے بھائی سجاد رانا کا قتل۔ وطن کے خلاف کی جانے والی سازشیں اور ناقابلِ معافی جرائم اپنی جگہ تھے اسی لیے موقع ملنے پر ان کی ایک بڑی افرادی قوت کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ اس نے انہیں زبردست مالی نقصان پہنچانے کا موقع بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اس عمارت میں موجود بہترین انتظامات دیکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ''را'' کا کوئی اہم ٹھکانہ تھی اور اب وہ لوگ اس ٹھکانے سے محروم ہو گئے تھے۔

''ہم اس گاڑی میں زیادہ دیر تک سفر نہیں کر سکتے۔ یہ گاڑی فوراً ٹریس ہو جائے گی۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سلّو نے کوئی غیر ضروری بات کرنے کے بجائے خود بھی بے حد سنجیدگی سے ایک اہم نکتے کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''ہوں..... ٹھیک ہے۔ ابھی تو چلتے رہو۔ ہم آگے چل کر یہ گاڑی چھوڑ دیں گے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا اور برابر میں بے ہوش پڑی لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے وہ پچھلی نشست پر بیٹھا ہی اس لیے تھا کہ لڑکی کا کوئی بندوبست کر سکے۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' ہوش میں آنے پر خود کو گاڑی میں دیکھ کر اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم تمہیں کہیں نہیں لے جا رہے۔ بس یوں سمجھو کہ تمہاری مظلومیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے تمہاری جان بخشی کر دی ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ جب تم سے تفتیش کی جائے تو کہہ دینا آج تم



کہاں پر تھیں اس لیے کچھ نہیں جانتیں۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں لڑکی کے سوال کا جواب دیا اور پھر سلّو سے بولا۔ ''گاڑی یہیں روک دو۔''

سلّو نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور مصروف سڑک پر نظر آنے والے بس اسٹاپ کے قریب گاڑی روک دی۔

''اُترو اور اپنے گھر جا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔'' شہریار نے لڑکی سے کہا تو وہ یوں تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اُتری کہ ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو گئی تو وہ لوگ اپنا فیصلہ بدل لیں گے۔

اُس کی بے یقینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے نیچے اُترنے کے بعد اپنے پیچھے گاڑی کا دروازہ تک بند کرنے کی زحمت نہیں کی اور بجائے بس اسٹاپ پر رُکنے کے سڑک پار کر کے تیزی سے دوسری طرف جانے لگی۔

شہریار نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور سلّو ایک بار پھر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ لیکن ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ وہاں ایک عجیب سا شور سنائی دیا۔ شہریار نے بے ساختہ ہی گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ان کے پیچھے ٹریفک رکنے لگا تھا اور لوگ دوڑ کر سڑک پر ایک جانب جا رہے تھے۔

''وہ مر گئی۔ ہیوی ٹرک نے اسے روند ڈالا۔'' سلّو بیک ویو مرر میں پہلے ہی لڑکی کو دیکھ رہا تھا اس لیے اور سے بولتے ہوئے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اس انکشاف کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ ابھی چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے جب اس نے لڑکی کو اس کی جان بخشی کا مژدہ سنایا تھا لیکن وہ جو کاتبِ تقدیر تھا، اس نے اس کے فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر کر انسان کی بے بسی اور بے اختیاری کو ثابت کر دیا تھا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ مر گئی ہے؟ ہو سکتا ہے معمولی سا حادثہ ہوا ہو؟'' وہ جیسے یقین کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''میں نے خود اُسے ٹرک کے نیچے آتے دیکھا ہے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی معجزہ نہ ہوا ہو تو وہ فوراً ہی اپنی جان سے چلی گئی ہوگی یا کم سے کم بھی اتنی شدید زخمی ہوئی ہوگی کہ عمر بھر کے لیے معذور تو ضرور ہو گئی ہوگی۔''

سلّو نے بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ وہ اتنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا کہ وہ لمحوں میں ہی جائے حادثہ سے کافی دور نکل گئے تھے اور اب اس کی کوشش تھی کہ مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر کم ٹریفک والے راستوں کا رخ کرے کیونکہ ابھی انہیں اس گاڑی سے بھی نجات حاصل کرنی تھی۔

''بہت بدنصیب نکلی بے چاری۔ میں نے تو اس کی مظلومیت سے متاثر ہو کر اسے زندہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن جو اللہ کو منظور۔'' شہریار ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اللہ نے ہمارے اور اس کے حق میں بہت بہتر فیصلہ کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر وہ تفتیش کے دوران وہ کہتی جو تم نے اس سے کہا تھا تو کیا وہ لوگ یقین کر لیتے؟ وہ حقیقت جاننے کے لیے اسے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اور ظاہر ہے، یہ ہمارے اور اس کے دونوں کے لیے بُرا ہوتا۔ اس لیے سمجھو کہ جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو یوں بھی اسے زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تم باس ہو، اس لیے اعتراض نہیں کیا۔''

سلّو بولنے پر آیا تو تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا۔ اُس کے لہجے کی تلخی کے باوجود شہریار نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ کمزور لڑکی ''را'' کے بھیڑیوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی اور نتیجے میں وہ ان کے حلیوں سمیت اس سے ہر ممکنہ معلومات اُگلوا لیتے۔

''میں گاڑی اس شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں روک دیتا ہوں۔ وہاں سے پھر ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔'' جائے حادثہ سے دور نکلنے کے بعد سلّو نے گاڑی کی رفتار نارمل کر لی تھی اور مستقل اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک مصروف شاپنگ سینٹر نظر آنے پر اس نے شہریار سے کہا تھا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے منظوری دے دی۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد انہوں نے گلوک اپنے لباس میں چھپایا اور اس طرح باہر نکلے جیسے دو دوست خوش گوار موڈ میں خریداری کے لیے وہاں آئے ہوں لیکن پارکنگ سے نکل کر انہوں نے شاپنگ سینٹر کی عمارت کی طرف رخ کرنے کی زحمت نہیں کی اور ٹہلتے ہوئے دوبارہ سڑک پر آ گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد اُنہیں ایک آٹو رکشہ مل گیا۔ رکشے والے کو ایک قریبی علاقے کا پتہ بتا کر وہ اس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے وہ کوئی دوسری پھر آگے تیسری سواری کر لیتے، تب کہیں جا کر کسی محفوظ ٹھکانے تک محفوظ طریقے سے پہنچنے میں کامیاب ہو پاتے۔

⊛----✪----⊛

وہ چاروں میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان آئندہ کی منصوبہ بندی سے متعلق ایک اہم میٹنگ اپنے اختتامی مراحل میں تھی اور دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کی پیش کردہ تجاویز میں سے چند کو باہمی اتفاق سے منظور کر لیا تھا۔

ان دو گروپوں میں سے ایک ''موساد'' کے اسپیشل ایجنٹس لِنڈا اور ڈیوڈ پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے گروپ میں الفا اور بیٹا کہلانے والے ہیروئن کے وہ بین الاقوامی بیوپاری شامل تھے جو ''موساد'' کے تحت اسرائیل کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔

''خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ اتحاد بہت سودمند ثابت ہوا ہے اور ہم چند مشکلات کے باوجود اپنے کام کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی ہم اپنے منصوبوں پر کامیابی سے عمل کرتے رہیں گے۔''

بیٹا نے میز پر رکھی پرانی اور نادر شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو باقی افراد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس میٹنگ میں ڈیوڈ اور لِنڈا کی حیثیت مہمانوں کی تھی اور بیٹا میزبان ہونے کا حق ادا کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے جام تیار کر رہا تھا۔

لِنڈا اور ڈیوڈ کے ''موساد'' سے متعلق ہونے کی وجہ سے میٹنگ کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ وہاں کسی خدمت گار کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی اور شراب کے علاوہ کسی اور تکلف کی بھی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

''میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں مسٹر بیٹا! اور مجھے یہاں طے ہونے والی ہر بات سے مکمل اتفاق ہے۔ لیکن اس وقت میں ایک ایسی بات بھی آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں جو ہماری میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس پر آج ہی بات کر لی جائے۔'' لِنڈا نے اس کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے اپنی اسی مسکراہٹ سے نوازا جس کے سامنے بڑے بڑے ڈھے جاتے تھے اور اس سے اختلاف کی ہمت کھو دیتے تھے۔

''کیوں نہیں مس لِنڈا! تم اگر ایسا سمجھتی ہو تو ضرور بات کرو۔'' بیٹا نے فراخ دلی سے اسے اجازت دی۔ اس دوران وہ باقی دونوں افراد کو بھی تیار شدہ جام تھما چکا تھا اور اب اپنے لیے جام تیار کر رہا تھا۔



''مسئلہ ہے پاکستان سے تعلق رکھنے والے چودھری افتخار عالم شاہ کا۔ ہم نے اُس بندے کو ٹریپ کر کے آپ کے حوالے کیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے آپ پاکستان میں کس قدر اہم کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگوں کی طرف سے اس بندے کو مناسب طریقے سے ٹریٹ نہیں کیا جا رہا۔'' اس نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

''تم یہ نہیں کہہ سکتیں مس لِنڈا! وہ فیوڈل لارڈ کتے کی دُم ہے جسے میں بالکل صحیح طریقے سے ٹریٹ کر رہا ہوں۔ اگر تمہارے کہنے پر میں نے اسے ڈھیل دی تو وہ ہمارے سر چڑھ جائے گا۔'' بیٹا کے بجائے الفا نے تلخی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''میں آپ کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتی مسٹر الفا! لیکن آپ مشرق کے فیوڈل لارڈز کی نفسیات کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ وہ وقتی طور پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے آپ کے پریشر میں آ گیا ہے لیکن کسی بھی دن اس کی کچلی ہوئی انا اچانک ہی پوری طاقت سے بیدار ہو جائے گی اور نتیجہ ہماری بربادی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ اس نے افیون کے کھیتوں کے علاوہ وہاں کتنے کام سنبھال رکھے تھے۔ اب اگر وہ کچھ نہ کرے اور صرف ان کھیتوں کے متعلق ہی اپنی گورنمنٹ کو بتا دے تو ہماری کتنی محنت اور سرمایہ ضائع چلا جائے گا۔'' لِنڈا نے لہجے کو مہذبانہ رکھا لیکن الفا سے دبے بغیر اپنی بات کہتی چلی گئی۔

''وہ لالچی بڈھا مر کر بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔'' الفا نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کے پاس ایسی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اپنی کچلی ہوئی انا کو بحال کرنے کے لیے وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' لِنڈا نے بیٹا جھجک اس سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا ڈیوڈ البتہ بالکل خاموش تھا۔ یہاں آنے سے قبل ہی ان کے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ لِنڈا اس معاملے کو میٹنگ کے اختتام پر اٹھائے گی لیکن وہ اس بحث میں حصہ نہیں لے گا۔

''تمہاری ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اُس ڈرٹی مین کو اپنے سر پر بٹھا لوں؟'' یہ بات پوچھتے ہوئے الفا کے لہجے میں چودھری کے لیے بے پناہ حقارت تھی۔

''میں نے یہ نہیں کہا۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ اسے بہتر طور پر ٹریٹ کیا جائے۔''

''تم اپنی بات کی ذرا وضاحت کرو۔'' اس بار بیٹا نے مداخلت کرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ وقتاً فوقتاً چودھری سے ایسے کام لیے جاتے رہیں جن کی وجہ سے اُسے یہ احساس ہو کہ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو اسے دی جانے والی رقم میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔ ہمارے لیے کام کرنے میں اس کے لیے سب سے بڑی کشش ہی یہ تھی کہ ہم اسے ایک کافی بڑی رقم دے رہے تھے۔ لالچی آدمی کو دولت سے دُور کر دو تو وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کام کرنے کا اہل نہیں رہتا۔'' الفا کے بُرے بُرے منہ بنانے کے باوجود اس نے اپنی بات مکمل کی اور کہیں بھی اپنے لہجے میں تلخی یا تندی نہ آنے دی۔

منشیات کے اسمگلرز بے شک موساد کے تحت کام کرتے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے لوگوں کے بے شمار روابط ہوتے ہیں اور موساد سے بگڑنے کی صورت میں وہ کہیں اور کا بھی رُخ کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تو ان کا گاڈ فادر امریکہ ہی تھا جس سے تمام تر مراعات حاصل کرنے کے باوجود وہ بہت چالاکی سے امریکیوں کو نشے کی لت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

''مس لِنڈا کی بات معقول ہے۔ واقعی وہ شخص ہمارے لیے اہم ہے۔ کوشش کرو کہ اس سے بگاڑ پیدا نہ

ہو۔ معاوضے کی ادائیگی کے لیے تو میں ابھی منظوری دے دیتا ہوں، باقی تم سوچ لو کہ اس کے لیے کیا کرنا ہو؟'' بیٹا نے اپنے ساتھ بیٹھے الفا سے کہا تو وہ اپنی جگہ پر پہلو بدلنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔ عہدے کے اعتبار سے برابر ہونے کے باوجود بیٹا کو اس کے مقابلے میں تنظیم سے پرانی وابستگی کی وجہ سے ذرا زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے وہ اس سے اختلاف کو غیر مناسب سمجھتا تھا۔

''ایسا کرو، اسے انڈیا بھیج دو۔ ممبئی میں ایک گینگسٹر اشوک سے ہمیں کاروباری معاملات طے کرنے ہیں۔ وہ معاملات چودھری کے ذریعے طے ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کیوں لنڈا! تمہارے خیال میں چودھری اس بات سے خوش ہوگا یا نہیں؟'' الفا کو مشورہ دیتے ہوئے بیٹا نے اچانک ہی لنڈا کو مخاطب کیا۔

''بالکل خوش ہوگا۔ اگر اسے رقم کے علاوہ ممبئی فلم انڈسٹری کی چند پریوں کا جلوہ بھی دکھا دیا جائے تو...'' لنڈا نے اپنی بات کے اختتام پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس نے خود اپنے حسن کے زور پر ہی اب تک چودھری کو قابو میں رکھا ہوا تھا اس لیے یہ بات وثوق سے کہنے میں حق بجانب تھی کہ چودھری کو حسین چہروں اور جسموں کے ذریعے خوش کیا جا سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کا بندوبست تو اشوک آرام سے کر دے گا۔'' بیٹا نے یقین دلایا تو الفا کے دل میں موجود تکدر کے باوجود اُن کی یہ میٹنگ خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوگئی۔

لنڈا، ڈیوڈ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے لیے چودھری اہم نہیں تھا لیکن الفا جیسے لوگوں کو کبھی کبھی یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وہ کتنے ہی اہم سہی، اُنہیں موساد کی برتری کو تسلیم کرنا ہوگا۔ آگے الفا، چودھری سے کس طرح کام لیتا، یہ اس کا مسئلہ تھا۔ خود اس کے لیے تو بس اپنی اتنی ہی کامیابی کافی تھی۔

⊛----✪----⊛

عمیر نے سرسری نظروں سے اپنے ملاقاتی کا جائزہ لیا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کا ذرا درشت چہرے والا آدمی تھا لیکن اس کے سامنے مؤدب بیٹھا رہا تھا۔

''تو تم میرے لیے کیا کچھ کر سکتے ہو مسٹر جگو؟''

''جو آپ حکم کریں سر! میں اپنے گھر والوں سے ملنے پنڈ آیا ہوا تھا۔ ذیشان صاحب سے میری بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہاں ہوں تو آپ سے مل لوں۔ آپ کو کسی معاملے میں میرے جیسے آدمی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کو شہریار صاحب کی جگہ ہی سمجھوں اس لیے اب آپ مجھے اپنا خادم سمجھ لیں۔ شہریار صاحب نے ایک واری میرے اکلوتے پتر کی حیاتی بچائی تھی۔ میں نے اس احسان کے بدلے اپنی پوری حیاتی ان کے نام لکھ دی۔ ہور جب کبھی بھی انہوں نے مجھے کسی کام سے پکارا، فوراً خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اللہ انہیں صحت تندرستی دے۔ سچ پوچھیں تو ان کی حالت کا سوچ کر بڑا دل کڑھتا ہے۔'' اس کے مختصر سوال کا طویل جواب دیتے ہوئے جگو آخر میں آزردہ ہوگیا۔

اس نے اپنی ساری زندگی ایک با اثر سیاست دان کے لیے غنڈہ گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن شہریار کو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا اس لیے اس سے خصوصی محبت رکھتا تھا۔ ساری دنیا کی طرح اسے بھی یہی معلوم تھا کہ ایک حادثے کا شکار ہونے کے بعد شہریار ہسپتال میں کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ شہریار کی مستقبل کے لیے کی گئی پیش بندی تھی کہ اس نے پہلے ہی جگو کو ذیشان سے متعارف کروا کر اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ



بوقتِ ضرورت ذیشان کی مدد کرے۔ اب تک ایسی نوبت نہیں آئی تھی لیکن چودھری کے ہاتھوں ہونے والے طوائف کے قتل کی تفتیش کرتے ہوئے عمیر کو کسی مددگار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

مشابرم خان ہوتا تو کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں تھی لیکن موجودہ حالات میں اسے فی الحال انڈر گراؤنڈ ہی رکھا جا رہا تھا۔ شہریار کی ٹیم میں شامل دوسرا مخلص بندہ عبدالمنان تھا لیکن وہ دفتری امور کی حد تک ہی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ لڑنے بھڑنے والے معاملات میں مدد کرنا اس شریف آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک تیسرا شخص جو ماضی میں شہریار کا ساتھ دیتا رہا تھا، وہ ڈی ایس پی منظور تھا لیکن اس کے تعاون کے پیچھے ترقی کا جذبہ زیادہ کارفرما رہا تھا اس لیے اب بھی اس پر بس ایک حد تک ہی اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اب جگو یہاں تھا اور اسے عمیر کی مدد کرنا تھی۔

''شہریار صاحب جیسے مخلص آدمی کی حالت پر تو مجھے بھی دلی افسوس ہے لیکن جب میں ان کے تم جیسے چاہنے والے دیکھتا ہوں تو یقین ہونے لگتا ہے کہ انشاء اللہ وہ ایک دن ضرور کومے سے باہر آ جائیں گے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک نہیں، بے شمار دعائیں ہیں۔'' اس نے جگو کی تائید میں خود بھی چند جملے ادا کیے پھر کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کام کی بات چھیڑی۔

''میجر ذیشان کا کہنا ہے کہ شہریار صاحب نے جس جنگ میں خود کو ملوث کر رکھا تھا، تم بھی اس کا ایک حصہ تھے اس لیے اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ جن لوگوں سے یہ جنگ لڑی جا رہی تھی، اس میں ایک فرد چودھری افتخار عالم شاہ بھی ہے۔''

''بالکل سر! بلکہ شہریار صاحب کے کہنے پر میں نے کئی بار چودھری کو اچھا خاصا سبق بھی سکھایا تھا۔'' جگو فوراً بول پڑا۔

''چودھری بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ چھوٹے موٹے سبق اس پر اثر نہیں کرتے۔ دولت اور طاقت کے نشے میں وہ دوسروں کو انسان سمجھنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے۔ اب بھی اس نے ایک طوائف پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ وہ بے چاری جوان عورت تھی اور چودھری نے بلاوجہ ہی اسے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ عین اس روز پیش آیا جب پیر آباد میں عرس منایا گیا تھا اور حویلی کی روایات کے مطابق چودھری نے اپنی اور اپنے خاص مہمانوں کی دل بستگی کے لیے جو اس رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے، طوائفوں کے ایک گروپ کو وہاں بلا رکھا تھا۔ موت کا شکار ہونے والی لڑکی کو چودھری کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور حتمی طور پر وہ اسی کے تشدد کا شکار ہو کر اپنی جان سے گئی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ چودھری نے نائیکہ کے ساتھ ساز باز کر لی اور قتل کے کیس کو دبا دیا گیا۔ میں نے کافی کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا ہے کہ مرنے والی طوائف کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو کوٹھے پر مختلف خدمات انجام دیتا ہے۔ اگر کسی طرح اس لڑکے کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کے خلاف رپورٹ درج کروائے اور اس کی قبر کشائی کر کے پوسٹ مارٹم کی درخواست کرے تو ہمارے لیے چودھری پر دباؤ ڈالنا آسان ہو جائے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں خود اس معاملے میں سامنے نہیں آنا چاہتا اور خود چودھری سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہوں اس لیے اس لڑکے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی مدد درکار ہے جسے میرے حوالے سے شناخت نہ کیا جا سکے۔ اور وہ اتنا جی دار ہو کہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود کوٹھے پر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ میجر ذیشان کے مطابق تم اس کام کے لیے ایک موزوں آدمی ہو۔ وہ لڑکا ہم تک پہنچ گیا تو تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور ہم ایک این جی او کی مدد سے باقی کا سارا کام کروائیں گے۔'' عمیر نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''اگر ایسا ہے تو میں سیدھا سیدھا اس لڑکے کو اغوا کروا لیتا ہوں۔ میں کہوں گا تو میرے آدمی اُسے اٹھا دہاڑے بھی کوٹھے سے اٹھا کر لے آئیں گے۔'' جگو نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ نائیکہ شور مچا دے گی اور کیس بھی بے جان ہو جائے گا، کیونکہ وہ لوگ یہی کہیں گے کہ لڑکے کو زبردستی یہ سب کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ وہ لڑکا راضی خوشی تمہارے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کے لیے تمہیں اس شہر جانا پڑے گا جہاں اس طوائف کا کوٹھا ہے۔ تم کوٹھے پر دو تین بار جا کر محفلوں میں شرکت کرو اور کوشش کرو کہ لڑکا تمہاری صورت سے آشنا ہو جائے۔ اس کے بعد کوٹھے کی نگرانی کروانا اور لڑکے کے کسی کام سے باہر نکلنے کی صورت میں اس سے اچانک کہیں مل بیٹھنا۔ یہی وہ مناسب وقت ہوگا جب تم اسے ٹٹول بھی سکو گے اور اپنے ساتھ راضی خوشی چلنے پر آمادہ کر لو گے۔'' جگو کی تجویز کو رد کرتے ہوئے اُس نے اُسے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ مجھے کوٹھے کا پتہ اور لڑکے کا نام وغیرہ بتا دیں۔ باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔'' جگو فوراً اس کی بات سمجھ گیا تو وہ اسے ان تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا جو اس کام کے لیے اسے درکار تھیں۔ جگو کی توجہ اور انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یہ کام بخوبی انجام دے ڈالے گا۔

⊛----✪----⊛

وہ تینوں جاگنگ سوٹس میں ملبوس تھے اور جاگنگ ٹریک سے ہٹ کر گھاس کے ایک قطعے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے جاگنگ کر کے تھک چکے ہوں اور کچھ دیر یونہی بیٹھ کر سستاتے ہوئے گپ شپ لگا رہے ہوں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی۔ اس وقت وہ تینوں ایک نہایت اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے یکجا ہوئے تھے اور میٹنگ کے لیے پارک کے اس سنسان گوشے کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ کسی ہوٹل کے بند کمرے میں ہونے والی گفتگو کے لیک آؤٹ ہو جانے کا نسبتاً زیادہ امکان ہوتا ہے۔

ان تین افراد میں سے دو تو شہریار اور سلّو تھے جبکہ تیسرا مقامی ایجنٹ کلام تھا۔ شہریار اور سلّو کے حلیے گزشتہ روز کے مقابلے میں خاصے مختلف تھے اور اس تبدیلی کے لیے اُنہیں کسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے سے پہلے خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے شہر کی تین مختلف بار برشاپس سے کام نکالا تھا۔ ان کے حلیوں میں بالوں کی رنگت اور اسٹائل کی تبدیلی کے علاوہ بڑھے ہوئے شیو کو فرنچ کٹ میں تبدیل کر دینے سے خاصا فرق پڑا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک جگہ سے کانٹیکٹ لینز خرید کر وہ بھی آنکھوں میں لگا لیے تھے اور ذرا مشکل تھا کہ کوئی پہلی نظر میں انہیں اس حیثیت سے شناخت کر پاتا کہ وہ وہی ہیں جو ''را'' کے ایک ٹھکانے پر قید تھے۔

حلیوں کی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے ایک پی او بکس میں رکھے ہوئے نئے شناختی کاغذات بھی حاصل کر لیے تھے اور اپنے لیے نئے لباس اور جوتے بھی۔ اس سلسلے میں دہلی میں ملنے والے ان کے مددگاروں کے فراہم کردہ کریڈٹ کارڈ نے بہت مدد دی تھی اور وہ آرام سے خرچ کرتے چلے گئے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا تھا اور وہاں رات آرام سے گزارنے کے علاوہ اس بات کا بھی بندوبست کر لیا تھا کہ کلام سے ایک ملاقات ہو جائے۔



''آپ لوگ کہاں غائب تھے؟ میں انتظار کرتا رہا کہ آپ لوگ مجھ سے رابطہ کریں گے لیکن آپ کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ آپ نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ لوگ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں اس لیے میں اپنے طور پر بھی آپ کی کوئی خیر خبر نہیں لے سکا اور آج انتہائی خراب حالات کے باوجود آپ سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔'' گفتگو کا آغاز کلام نے کیا۔

''ہم ایک ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے تھے دوست!..... لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے حالات کی خرابی کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہم صبح ہوٹل سے اخبار دیکھ کر نکلے تھے اور اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شہر کے حالات خراب ہیں۔'' اسے جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی جبکہ سلّو مزید بے فکرے پن کا مظاہرہ کرنے کے لیے گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔

''حالات عام لوگوں کے لیے ٹھیک ہیں لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے تشویش ناک۔ آپ نے اخبار میں ساؤتھ کے علاقے میں ایک سرکاری عمارت کے جلنے کی خبر تو ضرور پڑھی ہوگی؟''

''ہاں پڑھی تھی۔ خبر کے مطابق آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی جس کے نتیجے میں دفتر کا سارا عملہ اور سامان جل کر راکھ ہو گیا۔'' کلام کی بات نے اسے تھوڑا سا چونکایا ضرور تھا لیکن اس نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''یہ صرف میڈیا کو دی جانے والی بریفنگ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عمارت کسی عام سرکاری دفتر کی نہیں بلکہ ''را'' کی ملکیت تھی اور کل وہاں سے فائرنگ کی خاصی آوازیں سنی گئی تھیں۔ وہاں جتنی ہلاکتیں ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی آگ میں جلنے کی وجہ سے نہیں ہوئی وہ سارے کے سارے پہلے ہی کسی نہ کسی طور ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ بعد میں ان کی لاشیں جل کر خاک ہو گئیں۔ مجھے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق اس وقت عمارت میں موجود افراد میں سے صرف ایک میناکشی نامی لڑکی وہاں نہیں مری بلکہ کچھ دیر بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماری گئی۔ اس حادثے کے عینی شاہدین کے مطابق میناکشی کو حادثے سے کچھ دیر پہلے ایک سرخ گاڑی سے بس اسٹاپ پر اُترتے دیکھا گیا تھا اور اہم بات یہ ہے کہ وہ سرخ گاڑی ''را'' ہی کی ملکیت تھی جسے فائرنگ کے بعد آگ پھیلنے سے کوئی لمحہ بھر قبل اس عمارت سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ کار کے شیشے سیاہ تھے اس لیے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان میں کون اور کتنے لوگ سوار ہیں۔ وہ گاڑی بھی بعد میں ایک شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں کھڑی مل گئی تھی لیکن وہاں نصب کیمروں نے صرف اتنا دکھایا کہ اس میں دو افراد سوار تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان افراد کی واضح تصویر نہیں آ سکی۔ البتہ مجھ تک اُڑتے اُڑتے اتنی خبر ضرور پہنچی ہے کہ جلنے والے ''را'' کے اس ٹھکانے پر کچھ قیدی لائے گئے تھے اور یہ سارا اُنہی کا کیا دھرا ہے۔ اب آپ لوگ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ''را'' والے اس وقت کتنی بری طرح بلبلائے ہوں گے۔ ایک طرف ان کے قیدی نکل بھاگے اور دوسری طرف وہ اپنی بڑی افرادی قوت کے ساتھ ساتھ ایک اہم ٹھکانے سے بھی محروم ہو گئے۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ''را'' کے گُرگے سارے شہر میں ان دونوں افراد کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کو بھی ٹٹولا جا رہا ہوگا جو ان کے خیال میں ان کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ میری ذات آج تک بظاہر شک و شبہے سے پاک رہی ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں کب ان کی نظروں میں آ جاؤں۔ اسی لیے حالات کے پیشِ نظر آج محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن آپ سے ملاقات سے انکار ممکن نہیں تھا، چنانچہ آگے پیچھے تھوڑا دیکھ بھال کر یہاں چلا آیا۔'' اس نے پوری صورتِ حال ان کے گوش گزار کی جو خود اس صورتِ حال کے ذمے دار تھے۔

''ویری گڈ کلام! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم اتنے ایکٹیو ہو کہ اتنے مختصر وقت میں اتنی ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' صورتِ حال پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے شہریار نے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''ہم یہاں ہیں ہی اس لئے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو شہریار مسکرا دیا پھر سرسری لہجے میں بولا۔

''تمہارے خیال میں ان حالات میں پریم ناتھ کو اغوا کرنا کیسا رہے گا؟''

''میرے حساب سے تو یہ وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔ دو چار دن بعد کارروائی کریں گے تو بہتر رہے گا۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''کیسا تضاد ہے؟ ادھر ہمارے ملک میں یہ لوگ دن رات خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ یہاں کا میڈیا بھی مسلسل خبریں دیتا رہتا ہے کہ کراچی اور لاہور میں کس دن کتنے بم بلاسٹ ہوئے لیکن خود اپنے گھر میں جب اس آگ کی ذرا سی تپش پہنچی ہے تو یہ بلبلا اُٹھے ہیں۔'' شہریار نے افسوس کا اظہار کیا۔

''یہ تضاد ہمارے اپنوں کی کرم فرمائیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمارے لوگوں میں آدھے لوگ کرپٹ اور آدھے نااہل ہیں۔ مخلص لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔ ایسی صورت میں ملک کا یہ حال تو ہونا ہی تھا۔'' اس نے بھی تاسف بھرے لہجے میں شہریار کے دکھ میں ساتھ دیا۔ اس کا یہ افسوس اور دکھ لاعلاج نہیں تھا۔ وطن سے دُور، اپنوں کی جدائی برداشت کر کے وطن کی خدمت کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر سرگرداں رہنے والے شخص کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان حالات پر جلے کڑھے۔

''نااہلوں اور بے ایمانوں کو جانے دو کلام! مجھے یقین ہے کہ ہم چند مخلص لوگ مل کر بھی وطن دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہیں گے اور اُنہیں ایسی ہی ضربیں لگاتے رہیں گے جو کل انہوں نے سہی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ''را'' کے اُس ٹھکانے کو کس نے تباہ کیا ہے؟'' اس کی تسلی کو سن کر کلام بری طرح چونکا۔

''ہاں، وہ ہمارا ہی کارنامہ تھا۔'' اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''او مائی گاڈ.....!'' کلام نے اپنا سر تھام لیا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دونوں اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد یوں آزادانہ گھومتے پھر رہے ہیں۔''

''تمہارے پاس اس واقعے کے بارے میں اتنی معلومات ہیں تو یقیناً ان دو افراد کے حلیے بھی تمہارے علم میں آئے ہوں گے جنہیں اس کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہمیں دیکھو، ہم دونوں میں سے کوئی اس حلیے پر پورا اُترتا نظر آ رہا ہے کیا؟''

''نہیں۔ واقعی آپ کو دیکھ کر میرا دھیان بالکل بھی آپ کی طرف نہیں گیا تھا لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج میں آپ دونوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اگر پہلے سے دیکھ رکھا ہوتا تو شاید اندازہ ہو جاتا۔ بہرحال، میرا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ دونوں کو سخت احتیاط کرنی چاہئے۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی اس نے مشورے سے بھی نوازا۔

''ہم بھی خوامخواہ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے لیکن ایک حد تک ہی محتاط رہتے ہیں۔ ہمارے جیسے کام کرنے والے لوگوں کو اپنا دل مضبوط کرنا ہی پڑتا ہے۔'' شہریار نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر سلو پر ڈالی۔ نیم دراز تو وہ پہلے ہی تھا، اب آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اور ظاہری طور پر اردگرد سے بالکل بے نیاز محسوس ہو رہا تھا۔



''آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے کلام نے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا۔ جواب میں اس نے اسے اسٹیشن پر پہلی بار اندو سے واسطہ پڑنے سے لے کر اپنی گرفتاری اور پھر فرار تک کی ساری داستان سنا ڈالی۔

''امیزنگ..... آپ دونوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ صرف دو افراد کا اتنے سارے مسلح افراد سے نمٹنا اور سیکیورٹی کے سارے انتظامات توڑ کر بھاگ نکلنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ''را'' والے تو حقیقتاً بھنا کر رہ گئے ہیں۔'' اس نے پُرستائش لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''انہیں تو ابھی ہم سے اور بھی بہت چوٹیں کھانی ہیں۔ لیکن مجھے اصل سکون اس وقت ملے گا جب ہم ڈاکٹر فرحان جمیل کو ان کے قبضے سے نکال کر لے جائیں گے۔''

''یہ بھی اِن شاء اللہ ہو جائے گا۔ بس ذرا پریم ناتھ ہاتھ آ جائے تو اس سے ایسی معلومات حاصل ہو جائیں گی جو ڈاکٹر صاحب تک پہنچنے کے لیے ہمیں درکار ہیں۔'' کلام نے اسے تسلی دی۔

''تم یہ بتاؤ کہ یہ بھائی جی اور اشوک صاحب کا کیا چکر ہے؟ وہ ''را'' کی ایجنٹ لڑکی اندو ایک طرف تو اشوک کے گینگ کا حصہ بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف بھائی جی کے بارے میں جاسوسی کرتی پھر رہی تھی۔''

''یہ دونوں ممبئی کے دو بڑے غنڈے ہیں۔ اشوک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو انتہا پسند ہے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہاں تک کہ یہاں کی ہندو انتہا پسند مذہبی جماعتیں نازک مواقع پر اس کی خدمات حاصل کرتی ہیں اور اس کے گینگ کے لوگ چند گھنٹوں میں ہی مسلمانوں کو ہلا دیتے ہیں۔ منشیات، اسلحہ، جسم فروشی، نائٹ کلبز، جوئے کے اڈے، سارے دھندے کرتا ہے وہ اور اس کے ''را'' کے افسران سے مراسم کی بھی سن گن ملی ہے۔ اس کے مقابلے میں بھائی جی مسلمان ہونے کے ناتے یہاں کی مسلمان آبادی سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان پر کوئی برا وقت پڑنے کی صورت میں اس کے آدمی مسلمانوں کی مدد کے لیے میدان میں اُتر آتے ہیں۔ دو تین بار اشوک اور بھائی جی کے آدمیوں کے درمیان اچھا خاصا تصادم ہو چکا ہے لیکن پھر اسٹیبلشمنٹ ہی ہر بار دونوں کے درمیان صلح صفائی کروا دیتی ہے۔

دھندے وہ بھی سارے اشوک والے کرتا ہے لیکن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تو ہیروئن کے دھندے میں نہیں پڑتا، دوسرے اس کے لیے کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کسی کو بھی جبراً اس دھندے میں نہیں لایا جاتا۔ میری اس سے کبھی براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی لیکن میرے ایک ساتھی کے اس سے مراسم ہیں جس کی وجہ میں یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود وہ پاکستانیوں کے لیے اپنے دل میں خاصا نرم گوشہ رکھتا ہے۔ شاید اس کی اسی ادا کی وجہ سے اندو نامی ''را'' کی ایجنٹ اس کے بارے میں سن گن لیتی پھر رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اشوک کے گینگ میں شمولیت اس لیے اختیار کی ہوگی کہ اگر بھائی جی کے خاص آدمی سے مراسم بڑھا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں کبھی اس کی ذات شک کی زد میں آ بھی جائے تو وہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسے اشوک گروپ کی جاسوس سمجھیں اور اس کی اصلیت چھپ جائے۔'' کلام کا تجزیہ پُردلیل تھا اس لیے اُسے اُس سے اتفاق کرنا پڑا۔

''واقعی وہ بڑی عیار تھی اور بہت خوبی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔''

''لیکن آپ کے سامنے تو اس کی ساری عیاری دھری رہ گئی اور دنیا سے جاتے جاتے وہ اپنے کئی ساتھیوں کی جانیں بھی ساتھ لے گئی۔'' کلام نے برجستگی سے تبصرہ کیا تو وہ فقط مسکرا کر رہ گیا۔

''اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ معمول کے مطابق میں پریم ناتھ پر نظر رکھوں گا اور اس کے اغوا کی کارروائی اسی طرح کی جائے گی جیسے ہم پہلے طے کر چکے ہیں۔ بس نئی تاریخ کا تعین ہم حالات کو دیکھنے کے بعد کریں گے۔'' اُس نے ان لوگوں سے رخصت چاہی۔

''ذرا ایک نظر اُس مچھر پر بھی ڈال لینا جو تمہارے ہاتھ لگ کر یہاں تک آیا ہے۔'' پوری گفتگو کے دوران مداخلت نہ کرنے والے سلّو نے اچانک آنکھیں کھول کر کہا تو کلام بری طرح اُچھل پڑا۔

''کون..... کون میرے پیچھے آیا ہے؟''

''وہ جو ادھر بینچ پر بیٹھا بظاہر اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہا ہے لیکن اصل میں ہماری نگرانی کر رہا ہے۔'' سلّو نے اسی طرح لیٹے لیٹے انگوٹھے سے خفیف سا اشارہ کیا تو کلام نے چور نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اسے وہ چہرہ کچھ شناسا محسوس ہوا اور پھر فوراً ہی یاد آ گیا کہ آج صبح ہی اس نے اس شخص کو اس بیکری میں دیکھا تھا جہاں سے وہ اپنے لیے ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن وغیرہ خریدتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ البتہ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''میں نے اسے تمہارے پیچھے ہی پارک میں آتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تمہیں فالو کر رہا ہے لیکن اب کافی دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے کئی بار اسے جیب سے موبائل نکال کر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھا لیکن کسی وجہ سے اس کی بات نہیں ہو سکی ہے۔ ایک بار یہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا بھی ہوا تھا اور مجھے لگا تھا کہ باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔''

سلّو کی باتیں سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی گفتگو کے دوران بظاہر آنکھیں موند کر پڑا سلّو کیسے اہم کام میں مصروف تھا۔

''مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ شخص میری نگرانی کر رہا ہے۔ میں جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتا ہوں، یہ بھی شاید اسی میں رہتا ہے لیکن میری اس سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی بلکہ سامنا بھی ایک آدھ بار ہوا ہوگا۔ آج صبح یہ مجھے بلڈنگ کے سامنے موجود بیکری میں نظر آیا تھا۔'' کلام نے ایسے لہجے میں یہ سب کہا جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔

''اِٹس اوکے۔ ہم اس سے ابھی نمٹ لیں گے۔'' شہریار نے اس کے شانے کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

''تم بالکل اس طرح یہاں سے جاؤ جیسے تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کیسے ہو؟''

''میرے پاس کار ہے۔'' اس نے بتایا۔

''دیٹس گڈ۔ بس تم آگے چلو۔ ہم بھی پیچھے آ رہے ہیں۔'' شہریار نے اس سے کہا اور پھر ان تینوں نے آپس میں اس انداز میں مصافحہ کیا جیسے ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہوں۔ بینچ پر بیٹھا مونچھوں والا آدمی بھی پرندوں میں اپنے انہماک کو بھول کر کھڑا ہو گیا اور ان سے پہلے ہی پارک سے باہر نکل گیا۔ ان تینوں میں سے کلام پہلے نکلا اور چند لمحوں کے وقفے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہ اس پارک سے نزدیک تھا۔ اس لیے انہوں نے کسی سواری استعمال کرنے کے بجائے یہاں تک پیدل آنا پسند کیا تھا۔ پارک سے باہر نکلتے ہی انہوں نے اس حصے کا جا



جہاں لوگوں نے اپنی گاڑیاں پارک کر رکھی تھیں۔ فوراً ہی کلام اور وہ مونچھوں والا ان کی نظروں میں آ گئے۔

کلام اپنی گاڑی کا لاک کھول کر اس میں بیٹھ رہا تھا جبکہ مونچھل بائیک پر بیٹھا اس طرح کِک لگا رہا تھا اس کی کوشش کے باوجود بائیک اسٹارٹ ہو کر نہ دے رہی ہو۔ ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا اور اس کی طرف بڑھ گئے۔

''کیا بات ہے بھائی! بائیک خراب ہو گئی ہے کیا؟'' شہریار نے آگے بڑھ کر بڑے دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... بس کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔'' ایک تو وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے، اس پر سے براہِ راست مخاطب بھی تھے اس لیے وہ کچھ گھبرا گیا۔

''تو ایسا کریں، اسے یہیں چھوڑ دیں۔ ہم آپ کو اپنی گاڑی میں لفٹ دے دیتے ہیں۔'' شہریار کی یہ پیشکش اس کے لیے مزید بوکھلاہٹ کا سبب بنی۔

''نہیں جناب! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔''

''لیکن ہمیں تو تمہاری ضرورت ہے نا، اس لیے اب تم وہیں جاؤ گے جہاں ہم تمہیں لے جائیں گے۔'' اس بار سلّو اُس سے مخاطب ہوا۔ اُس کے لہجے کی کاٹ کے ساتھ مونچھل نے اپنے پہلو میں لوہے کی چبھن بھی محسوس کی اور سخت سراسیمہ ہو گیا۔

''یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔''

''جان پہچان بھی ہو جائے گی۔ ہم، تم سے اچھی طرح اپنا تعارف کروائیں گے۔ تم بس ہمارے ساتھ چلو۔'' سلّو نے ایسے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالا جیسے وہ اس کا کوئی دیرینہ دوست ہو اور اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' وہ بری طرح بدکا۔

''اگر ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے تو پھر اوپر جاؤ گے۔'' اس کے پہلو پر نال کا دباؤ کچھ اور بڑھاتے ہوئے اس نے بڑے فلسفیانہ لہجے میں اعلان کیا جسے سن کر مونچھل کا چہرہ بالکل ہی تاریک پڑ گیا۔

''اب اور دیر مت کرو۔ میرا یہ ساتھی کریک ہے اور گولی چلانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا۔'' اس بار شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

لحہ بہ لحہ زرد پڑتی رنگت کے ساتھ وہ شخص بائیک سے نیچے اُتر آیا اور اس کے اشارے پر اس طرح کلام کی گاڑی کی طرف بڑھا جیسے اسے ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ کلام گاڑی اسٹارٹ کیے ان کا منتظر تھا۔ اس شخص کو ان کے ساتھ آتا دیکھ کر اس نے پھرتی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیئے۔ وہ دونوں اس کے درمیان میں رکھتے ہوئے پچھلی نشست پر سوار ہو گئے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میں ایک شریف اور غریب آدمی ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی میرے بدلے میں کوئی تمہیں بھاری تاوان دے سکتا ہے۔'' گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے اپنی مدافعت میں صفائی دینے کی کوشش کی۔

''اس کا منہ بند کرو یار! میں سارے راستے یہ بکواس نہیں سن سکتا۔'' شہریار نے ناگواری سے کہا تو سلّو نے اس کے سر پر آہنی دستہ جما کر اسے بے ہوش کرنے میں لحہ بھر بھی نہیں لگایا۔

''اسے کہاں لے کر چلنا ہے سر؟'' کلام نے گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پر ڈال دی تھی اور اب شہریار

سے پوچھ رہا تھا۔ اُس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس ساری صورتِ حال پر تھوڑا سا نروس ہے۔

''کسی ایسی جگہ جہاں ہم اس سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کر سکیں۔ اور ظاہر ہے ایسی جگہ تم ہی ہمیں پہنچا سکتے ہو۔'' شہریار نے کچھ سرد مہری سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ گردن سیدھی کر کے پورے انہماک سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد گاڑی ممبئی کے ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جہاں غربت اور غلاظت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تنگ و تاریک گلیوں میں اُڑتا کچرا، گندے پانی کی نالیاں اور ننگ دھڑنگ بچے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ بھارت کے معاشی دارالخلافہ ممبئی کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کی گاڑی وہاں داخل ہوئی تو کئی بچے اس طرف متوجہ ہوئے لیکن کوئی قریب نہیں آیا۔

''یہ جگہ تو کچھ نامناسب لگتی ہے۔ یہاں تو ہم کئی لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔'' شہریار کو وہاں کا ماحول دیکھ کر تشویش ہوئی۔

''اس بندے کو ہوش میں لے آئیں۔ یہ اپنے پیروں پر چل کر مکان میں داخل ہو گا تو کوئی توجہ نہیں دے گا۔ ویسے آپ کے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دوں کہ اس علاقے میں رہنے والے بیشتر افراد کسی نہ کسی طور غیر قانونی کام میں ملوث رہتے ہیں۔ جیب کترے، منشیات فروش، چور، نوسر باز سب آپ کو اس علاقے میں ملیں گے۔ لیکن یہ سب چھوٹے مجرم ہیں، اس لیے اپنی غربت سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی تھوڑا بہت زیادہ کما بھی لیتا ہے تو اس روپے کو شراب اور بازاری عورتوں کے چکر میں گنوا دیتا ہے۔ اس قسم کی آبادی ہونے کی وجہ سے یہاں مکان حاصل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مالک مکان کو کرائے کے علاوہ کسی بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں نے بھی یہاں فرضی نام سے ایک مکان حاصل کر رکھا ہے جو زیادہ تر بند ہی پڑا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کسی کو یہاں ہم پر کوئی شک گزرا، تب بھی وہ پولیس کو اطلاع دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ خود مجرم ہیں اس لیے پولیس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالفرض اگر کسی نے بعد میں کچھ بتا بھی دیا تو ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ یہاں کسی کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میری اس گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی ہے اس لیے پولیس کے لیے مجھے ٹریس کرنا آسان نہیں ہو گا۔''

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا چنانچہ پورے اعتماد سے بولا اور گاڑی ایک چھوٹے سے بوسیدہ گھر کے سامنے روک دی۔ اس دوران سلّو بے ہوش آدمی کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کر چکا تھا کہ وہ ہوش میں آ گیا تھا اور اب آنکھیں پھاڑے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بنا آواز نکالے گاڑی سے باہر نکلو۔'' سلّو نے اس کے پہلو میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں حکم دیا تو اس کو تعمیل کرنی پڑی۔ کلام پہلے ہی گاڑی سے اُتر چکا تھا اور مکان پر لگا تالا کھول دیا تھا۔ وہ اپنے قیدی سمیت تیزی سے مکان میں داخل ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ باہر گلی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی اس دوران ان کا اتنی اچھی طرح جائزہ نہیں لے سکا ہو گا کہ پوچھنے پر تفصیلی حلیہ بیان کر سکے۔

''تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں پھر میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟'' مکان نیم تاریک سا تھا اور وہاں عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ ان کے قیدی نے اندر پہنچتے ہی سراسیمہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی جس پر ظاہر ہے، ان میں سے کسی نے کان نہیں دھرے۔



''نام کیا ہے تمہارا؟'' تفتیش کا آغاز شہریار نے کیا جبکہ کلام انہیں وہاں چھوڑ کر خود دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''ونود۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔

''کہاں رہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کیا جس کے جواب میں اس نے اس بلڈنگ کا نام بتا دیا جہاں کلام کی رہائش تھی۔

''کلام کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' شہریار نے اُس سے تیسرا سوال کیا جس پر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے گھبراہٹ کا تاثر اُبھرا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''اگر یہ غلط فہمی ہے تو تم اپنی رہائش گاہ سے اتنی دور اس پارک میں کیا کر رہے تھے؟'' شہریار نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''وہ تو میں بس ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔'' اس کا لہجہ ہی گواہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ شہریار نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔

''جھوٹ بولو گے تو اپنے لیے مشکلات کھڑی کر لو گے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر تم نے مجھ پر تشدد کی کوشش کی تو میں چیخ چیخ کر لوگوں کو یہاں جمع کر لوں گا۔'' اپنا گال سہلاتے ہوئے اس نے دھمکی دی۔

''تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہمارے پاس اس کا معقول انتظام ہے۔'' کلام اسی وقت کمرے میں داخل ہوا اور اس کی دھمکی کے جواب میں بولتے ہوئے ہاتھ میں موجود سامان زمین پر رکھ کر خود ایک جانب بڑھ گیا۔ وہاں ایک اسٹیریو رکھا ہوا تھا جس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے نتیجے میں کمرہ تیز موسیقی کی آواز سے گونج اُٹھا۔ معلوم نہیں کلام اس مکان کو کن مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ طے تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہو گا، وہ اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو گا اسی لیے معمولی فرنیچر والے دُھول مٹی سے اٹے اس گھر میں یہ اسٹیریو موجود تھا۔ بلند موسیقی کی آوازیں اندر ہونے والی گفتگو کو باہر جانے سے روکنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ تھیں۔

موسیقی کی آواز بلند ہوتے ہی سلّو اور کلام نے مل کر ونود کو رسیوں میں جکڑ دیا اور ساتھ ہی اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی بولتی بھی بند کر دی۔

''اب تم مجھے شرافت سے میرے ہر سوال کا صحیح جواب دو گے ورنہ یہ دونوں تمہاری دُرگت بنا کر رکھ دیں گے۔ اور یہ تو اب تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا، نہ ہی تم کسی کو بلا سکو گے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو مارتے ہیں اور بندے کو رونے بھی نہیں دیتے۔ تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا اب اسی وقت باہر آئے گا جب تم سچ اُگلنے کے لیے تیار ہو گے۔''

ونود کے تمام تر احتجاج کے باوجود نہ صرف اسے رسّی سے باندھ دیا گیا تھا بلکہ منہ میں کپڑا ٹھونس کر احتجاج سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

اس بندمنہ کے ساتھ اس پر کتنا ہی تشدد کر لیا جاتا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس حکمتِ عملی کا نتیجہ سامنے آ گیا اور ونود نے ہار مان کر اشارے سے سچ بتانے کا عندیہ دے دیا۔ فوراً ہی اس کے منہ کو آزاد کر دیا گیا اور خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کے لیے پانی پلایا گیا۔

اپنے اعترافی بیان میں اس نے جو کچھ بتایا، اس کے مطابق وہ ایک چھوٹا موٹا جرائم پیشہ تھا جس کے پولیس سے معاندانہ کے بجائے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ وقتِ ضرورت پولیس کے لیے مخبر کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ اس کام کو انجام دیتے ہوئے اسے اردگرد پر کڑی نظر رکھنے کی عادت ہوگئی تھی اور وہ لوگ جو اس کے رہتے تھے، اس کی توجہ کا خصوصی مرکز ہوتے تھے۔ کلام پر بھی وہ اسی حوالے سے کڑی نظر رکھتا تھا لیکن اسے مشکوک سمجھنے کے باوجود اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جس کی بنیاد پر پولیس میں اس کی مخبری ہو سکے۔ بس ایک اُمید کے سہارے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھا بہت غیر محسوس انداز میں۔ احتیاط کے سبب اس نے کلام سے راہ و رسم بڑھانے یا اس کے سامنے زیادہ آنے سے بھی گریز کیا تھا اسی لیے کلام اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔

اُس نے آج پہلے کلام کو بیکری پر دیکھا تھا لیکن یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ جب وہ اسے جاگنگ سوٹ میں پارکنگ کی طرف جاتا نظر آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے عرصے سے اس پر نظر رکھنے کے باعث اسے معلوم تھا کہ کلام جاگنگ کرنے کا عادی نہیں ہے۔ چنانچہ اس تبدیلی کی وجہ جاننے کے لیے اس نے کلام کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس پارک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جہاں وہ سلّو اور شہریار سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔

اسے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر اسے لگا کہ ہو نہ ہو، دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرتا تھا لیکن اتفاق سے اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ کلام کے ملاقاتیوں کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔

کلام پارک سے نکلا تو وہ خود بھی اس خیال سے باہر نکل گیا کہ اس کے ساتھی بھی کسی نہ کسی سواری پر وہاں آئے ہوں گے اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر ان کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن قسمت کی خرابی سے وہ خود ان لوگوں کی نظروں میں آ گیا اور وہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

''تم نے کبھی کسی پولیس والے کے سامنے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تم کلام کو مشکوک شخص سمجھتے ہو؟'' اس سے ساری معلومات اُگلوانے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''خاص طور پر نہیں لیکن میں نے اپنی بلڈنگ میں اکیلے رہنے والے جن افراد کی لسٹ پولیس کو دی تھی اس میں کلام کا نام بھی شامل تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اوکے۔ اس کا منہ دوبارہ بند کر دو۔ پھر سوچتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔'' شہریار نے سلّو کو اشارہ کیا۔

''بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کے سامنے بھی تم لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ تم کہو گے تو شہر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن تم مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ایک مخبر تھا اس لیے حالات کی سنگینی کو بھانپ سکتا تھا اسے اپنا انجام اچھا نظر نہیں آ رہا تھا، سو منتوں پر اُتر آیا تھا۔

شہریار نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سلّو نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی۔ یہ سب چیزیں اُنہیں اسی گھر سے کلام نے مہیا کی تھیں۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' شہریار اشارے سے کلام کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس سے مشورہ چاہا۔



''ہمارے لیے اتنا خطرناک آدمی نہیں ہے لیکن خطرناک ضرور ہو گیا ہے۔ اگر ہم اسے یہاں سے زندہ جانے دیتے ہیں تو یہ ہمارے، خصوصاً میرے لیے بڑی مشکلیں کھڑی کر دے گا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں خود کو بچانے کے لیے اسے آف کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ سوچو کہ طریقِ کار کیا ہوگا؟ اگر یہ کوئی عام جگہ ہوتی تو ہم اسے قتل کر کے یہیں چھوڑ جاتے لیکن یہ تمہارا ایک ٹھکانہ ہے اس سے محروم ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر ہم اسے گولی مار کر لاش اپنے ساتھ گاڑی میں لے جاتے ہیں، تب بھی پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ کہیں کسی ناکے پر پولیس والوں نے روک کر چیکنگ کر لی تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔'' اس سے اتفاق کرنے کے ساتھ شہریار نے آگے کے حالات کا بھی تجزیہ کیا۔

''لاش کو ٹھکانے لگانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں سے سمندر نزدیک ہے اور سمندر کی طرف جاتے ہوئے کئی ایسے سنسان مقامات آتے ہیں جہاں ہم لاش پھینک سکتے ہیں۔ میں ایسے راستوں سے واقف ہوں جہاں ہمارا پولیس سے واسطہ نہیں پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔'' شہریار نے اس سے اتفاق کر لیا۔

''لیکن یہاں میرے پاس ایسا انتظام نہیں ہے کہ لاش کو چھپا کر لے جا سکوں۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے کوئی بڑا سوٹ کیس وغیرہ خرید کر لانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سوٹ کیس لے آؤ۔ ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔'' شہریار نے اس کو اجازت دی اور طے پایا کہ ونود کو سائلنسر لگے ریوالور سے قتل کرنے کا کام سلّو انجام دے گا۔ سائلنسر لگا ریوالور کلام نے فراہم کر دیا اور خود فوراً سوٹ کیس کی خریداری کے لیے روانہ ہو گیا۔

''ایسی موت جانے کب ہمارا مقدر بن جائے کچھ معلوم نہیں ہے۔'' ونود کو عین دل کے مقام پر گولی مار کر ہمیشہ کی نیند سلانے کے بعد سلّو نے تبصرہ کیا تو شہریار اس سے اختلاف نہیں کر سکا۔

''خیر میں ان باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ان سالے بھارتیوں نے اپنی ٹریننگ ہی ایسی کی ہے کہ مرنا اور مارنا دونوں مشکل نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ رہ کر وطن پرستی وغیرہ کا بھی تھوڑا سا سبق پڑھ لیا ہے۔ اور یہ بھی اطمینان ہے کہ ادھر میں مروں گا تو اُدھر تم لوگ میرے ماں باپ کا خیال رکھو گے۔ بس وہ میری بے چاری منگیتر خوار ہو جائے گی۔ بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے لیکن پیار کا کیا ہے؟ کوئی اور مجھ سے اچھا مل گیا تو اس سے بھی کرنے لگے گی۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہا تھا لیکن شہریار سمجھ گیا کہ ایک انسانی جان لینے کا ڈپریشن اس کے حواسوں پر چھا رہا ہے۔ گزشتہ روز ''را'' کے ایک ٹھکانے پر بھی انہوں نے کئی لوگوں کو موت کی نیند سلایا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچا کر بھاگنے کے چکر میں تھے اس لیے وہ قتل و غارت گری لازمی تھی۔ اس وقت اس شخص کو ہلاک کیا تھا، وہ ایک چھوٹا مجرم تھا۔ شاید اسی لیے اسے مار کر وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

''اتنی ٹینشن مت لو۔ اگر ہم اس شخص کو چھوڑ دیتے تو کل یہ ہمارے لیے موت کا پروانہ بن جاتا۔ یہ کلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ظاہر ہے کلام کے ذریعے ہمارا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے ختم کرنا ہماری مجبوری تھی۔'' شہریار نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

''میں ٹینشن وینشن لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ بس ایسے ہی ایک بات بول دی تھی۔'' وہ فوراً ہی طرح دے گیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے کلام بھیا کی چوائس بھی ایویں ہے۔ اتنے بور گانے لگا کر گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، کوئی اچھے گانے والوں کا کلیکشن بھی ہے یا نہیں اس کے پاس۔'' وہ

دیوار گیر ریک میں رکھا کلیکشن چیک کرنے لگا۔ پھر شاید اپنے مطلب کا کوئی ریکارڈ مل گیا تو اسٹیریو آف کر کے اسے تبدیل کرنے لگا۔

خاموشی کے اس قلیل سے وقفے میں انہوں نے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنے۔ دونوں ہی بری طرح چونک گئے۔ آوازیں زیادہ دُور سے نہیں آ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ گاڑیوں کا رخ اسی طرف ہے۔ دم سادھے ان آوازوں کو سننے لگے جو چند لمحوں میں ہی اتنی قریب آ گئی تھیں کہ انہیں اپنے کان سنسناتے محسوس ہو رہے تھے۔

ان دونوں ہی نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر کئی سوال تھے۔ کیا کسی کو ان کے بارے میں کوئی سُن گُن مل گئی تھی؟..... کیا کسی نے ونود کا قتل ہوتے دیکھ لیا تھا؟ کیا ونود نے ان سے غلط بیانی کی تھی اور ان کی گرفت میں آنے سے قبل وہ کسی کو ان کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا؟..... کلام جو سوٹ کیس خریدنے گیا تھا، اب تک واپس کیوں نہیں پہنچا تھا؟

فی الحال ان کے ذہنوں میں موجود ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور پولیس موبائلوں کے سائرن تھے کہ چیخے چلے جا رہے تھے۔ اب تو وہ یقین سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ گاڑیاں اسی گلی میں یا اس کے کارنر پر موجود ہیں۔ شہریار نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اس کے پٹ کو بس اتنا کھولا کہ ذرا سی جھری بن جائے۔ اس جھری سے اس نے جو پہلا چہرہ دیکھا، وہ ایک مسلح پولیس اہلکار کا تھا۔ اس کے بعد اسے مزید کئی پولیس والے وہاں دکھائی دے گئے۔

''دونوں قاتلوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر مکان سے باہر آ جاؤ ورنہ پولیس مکان کا دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گی۔''

گلی کے کونے پر کھڑی پولیس وین سے میگا فون کے ذریعے اعلان کیا گیا تو ان دونوں کا خون رگوں میں اُچھل پڑا۔ اور بے ساختہ ہی ان کی نظریں ونود کی لاش کی طرف گئیں۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کے حلق سے اپنی زندگی کی آخری چیخ بھی برآمد نہیں ہو سکی تھی لیکن موت کی دہشت اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی خوف زدہ بے نور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ ''مجھے قتل کر کے تم خود کیسے بچ سکو گے؟''

وہ بڑی نازک صورتِ حال میں پھنسے ہوئے تھے۔

باہر پولیس کی خاصی بڑی نفری موجود تھی اور وقفے وقفے سے قاتلوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ باہر نکل کر گرفتاری دینا ان کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ باہر نہ نکلے تو پولیس ان کو انہیں گرفتار کرنے کے لیے اندر گھس آئے گی اور ایک عدد لاش کی موجودگی کے باعث وہ کسی صورت صحت مند سے انکار نہیں کر سکیں گے۔

لاش بھی کسی ایسے ویسے بندے کی نہیں تھی۔ ونود پولیس مخبر تھا اور جب وہ گرفتار کر لیے جاتے تو لازماً پولیس کھوج لگاتے ہوئے کلام تک پہنچ جاتی۔ ایک دفعہ ان کے ہاتھ سرا آ جاتا تو پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ جان لیتے کہ ان سب کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے ساتھ سلّو بھی تھا جسے کئی برس تک ''را'' والوں نے تربیت دی تھی۔ فی الحال تو وہ اپنے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن جب انہیں گرفتار کیا جاتا تو جلد یا بدیر یہ راز بھی کھل جاتا کہ پاکستان کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کے لیے تیار کیا جانے والا سلّو اب انڈیا کے خلاف کام کر رہا ہے۔



''را'' والے تھے بھی بہت مکار اور چالباز۔ وہ یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کرتے کہ سلّو کو انہوں نے دہشت گردی کی تربیت دی ہے لیکن اُلٹا یہ الزام لگا دیتے کہ سلّو پاکستان کا ایجنٹ ہے جو برسوں پہلے بھی دہشت گردی کے لیے بھارت میں داخل ہوا تھا لیکن گرفتار ہو جانے کے باعث کچھ نہیں کر سکا اور اب پاکستان نے دوبارہ اسے دہشت گردی پھیلانے کے لیے بھارت بھیج دیا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے شور مچاتے کہ دیکھو ہم تو اتنے اچھے ہیں کہ جس پر جاسوسی کا شک تھا، اسے خیر سگالی کے طور پر رہا کر دیا لیکن پاکستان ایسا دہشت معاش ہے کہ ہمارے اس جذبے کی قدر نہیں کی اور ایک بار پھر ایسے خطرناک بندے کو ہمارے ملک میں بھیج دیا۔ اپنے مشن کی ناکامی کے ساتھ وطن کی بدنامی شہریار کو کسی صورت منظور نہیں تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی صورت بھی گرفتار نہیں ہونا ہے۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے تیز سرگوشی میں سلّو سے کہا اور مکان کے مختصر صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود نہیں تھیں لیکن چھت اتنی بلند بھی نہیں تھی کہ اس تک رسائی ممکن نہ ہو۔ اس نے ایک کمرے کی سلاخ دار کھڑکی پر پاؤں جمائے اور لمحوں میں کھڑکی پر بنے چھجے پر پیر رکھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ سلّو نے بھی اس کی پیروی کی۔

چھت پر پہنچ کر وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ یہ مکان گلی کے تقریباً وسط میں تھا اس لیے اس کے دائیں بائیں مکانات موجود تھے۔ اتفاق سے دونوں اطراف بنے مکانات اس مکان کے مقابلے میں خاصے اونچے تھے اور وہ دونوں میں سے کسی تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ کوئی ساز و سامان بھی نہیں تھا ورنہ کمند ڈال کر کسی ایک مکان تک پہنچ جانا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

''پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔'' سلّو نے سرگوشی میں کہا اور رینگتا ہوا چھت کی پچھلی طرف چلا گیا۔ دائیں بائیں بلند مکانات کی وجہ سے دیوار اُٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی لیکن آگے اور پیچھے کی طرف ڈھائی تین فٹ اونچی دیواریں موجود تھیں۔ انہوں نے پیچھے والی دیوار تک پہنچ کر احتیاط سے جھانکا۔ وہ ایک تنگ سی گندی گلی تھی جس میں اتنا کیچڑ پڑا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں چھلانگ لگا دیتے تو چوٹ لگنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن وہ چھلانگ لگا ہی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے ایک ہی منظر میں گندی گلی کے دونوں سروں پر چوکس کھڑے مسلح پولیس اہلکاروں کو دیکھ لیا تھا۔ لگتا تھا پولیس والے پوری طرح منصوبہ بندی کر کے یہاں پہنچے تھے کہ کسی صورت اپنے شکار کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

''ادھر سے نکلنا تو مشکل ہے۔'' پولیس والوں کے چہرے دیکھ کر سلّو نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''مشکل ہے، ناممکن تو نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دونوں اطراف میں کُل پانچ چھ افراد ہی موجود ہوں گے۔ ہم احتیاط اور پھرتی سے کام لے کر ان افراد سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ ہتھیار تو ہیں نا ہمارے پاس۔'' یہ شہریار بھی سمجھتا تھا کہ وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا لیکن ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔

''او کے باس! جیسا تم کہو۔'' شیر دل سلّو نے انکار نہیں کیا۔

''باہر کودتے ہی تم رائٹ والوں کو سنبھالنا، میں لیفٹ والوں کو دیکھ لوں گا۔ چاہے اندھا دھند فائرنگ کرنی پڑے لیکن ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کسی کو یرغمال بنا سکے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔'' وہ جانتا تھا کہ اس ایکشن کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن رِسک لیے بغیر بھی گزارہ نہیں تھا۔ ان کے درمیان طے ہوا کہ وہ تین تک گنتی گنے گا اور تین کہتے ہی وہ دونوں بیک وقت نیچے کود جائیں گے۔

''ایک..... دو.....'' اس نے گنتی گننی شروع کی۔

ابھی دو منہ میں ہی تھا کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور پھر تو گویا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند ایک گولیاں ان کے قریب سے بھی گزریں۔ دونوں فوراً لیٹ گئے۔ فائرنگ کی آوازوں اور سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے فوراً جان لیا کہ یہ گولیاں ان پر نہیں برسائی جا رہیں۔ نہ ہی یہ یکطرفہ فائرنگ ہے۔ یہ دو گروپ تھے جو آپس میں متصادم تھے۔ ایک کے بارے میں تو انہیں پتہ تھا کہ وہ پولیس والے ہیں لیکن دوسرے کے بارے میں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہاں ان کے کسی ہمدرد کے آنے کا تو امکان نہیں تھا۔ ہمدرد کا خیال آنے پر ذہن خود بخود کلام کی طرف چلا گیا۔ وہ کافی دیر پہلے سوٹ کیس خریدنے کے لیے وہاں سے نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

ایک دفعہ تو یہ بات ذہن میں آتی تھی کہ شاید پولیس سے مقابلہ کرنے والے وہ اور اس کے آدمی ہوں لیکن یہ زیادہ قرین از قیاس نہیں لگتا تھا۔ کلام اور اس کے دیگر ساتھی جس حیثیت اور مقصد کے تحت یہاں مقیم تھے، اس میں پولیس سے اس قسم کے مسلح تصادم کی گنجائش مشکل سے ہی نکلتی تھی۔ عقل نے فوراً ہی انکار کیا۔ نہیں..... یہ کلام نہیں ہو سکتا تھا۔

''نیچے چلتے ہیں۔ یہاں خوامخواہ ہی کسی گولی کی زد میں آ جائیں گے۔'' سلّو نے مشورہ دیا تو اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ نیچے چلے جائیں۔

اِردگرد برستی گولیوں کی وجہ سے کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں سینے کے بل رینگتے ہوئے چھت کے اس حصے تک پہنچے جہاں سے صحن میں اُترا جا سکتا تھا۔ صحن میں اُترنے کے بعد وہ سیدھے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں ونود کی لاش ہنوز اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

''یہ کلام پتہ نہیں کہاں ہے؟'' شہریار نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے موبائل فون نکالا لیکن اس پر سگنل نہیں آ رہے تھے۔

''شٹ..... یہ تو کام ہی نہیں کر رہا۔'' وہ جھنجلایا۔

''پولیس نے ریڈ کرنے سے پہلے موبائل سروس جام کر دی ہو گی۔''

سلّو نے خیال ظاہر کیا تو اسے اتفاق کرنا پڑا۔ باہر فائرنگ، بھاگ دوڑ اور لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں ہنوز اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔

''لگتا ہے پولیس کسی اور چکر میں یہاں آئی ہے۔'' سلّو نے اپنی پہلی والی جگہ سنبھالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ اس علاقے میں جرائم پیشہ افراد کی اکثریت ہے۔ پولیس نے یقیناً کسی کی اطلاع پر یہاں کارروائی کی ہے اور وہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کر رہے ہیں۔ اگر پولیس کا نشانہ ہم ہوتے تو ان کے لیے اس گھر کے دروازے کو توڑ کر اندر گھس آنا بالکل مشکل نہیں تھا۔'' ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ حالات کا درست تجزیہ کر سکیں۔

''ہمیں اس لاش کو کہیں چھپا دینا چاہئے۔ اگر پولیس ان لوگوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ اردگرد کے گھروں کی تلاشی بھی لے۔ اس صورت میں یہ لاش ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔'' سلّو کی بات دل کو لگنے والی تھی۔

انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ لاش کو فی الحال کسی ترکیب سے انڈر گراؤنڈ ٹینک میں اس طرح اُتار دیا جائے کہ پہلی نظر میں کسی کو دکھائی نہ دے لیکن وہ خود اسے آسانی سے وہاں سے نکال سکیں۔ ترکیب پہلے سلّو کو سجھائی دی اور وہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری سامان کے ساتھ ٹینک کا ڈھکن کھول کر



اندر اُتر گیا۔

ٹینک کا نصف حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی یقیناً کئی دنوں سے ٹینک میں مستقل موجود تھا اس لیے اس سے ہلکی سی ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔ سلّو کو وہاں جو کام انجام دینا تھا، اس کے لیے پانی میں اُترنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ٹینک میں اُترنے کے لیے بنائی گئی سیڑھیوں میں سے پہلی سیڑھی پر ہی رُک گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔

مشکل سے دو منٹ کے وقت میں اس نے کام مکمل کر لیا اور اس طرح ٹینک سے باہر آیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں رسّی دبی ہوئی تھی اور رسّی کے دونوں سرے ٹینک کے اندر تھے۔ اصل میں وہ ٹینک کے اندر گیا ہی اس لیے تھا کہ رسّی کے دونوں سروں کو ٹینک کی چھت پر اندر کی طرف سے ٹھونک سکے۔ ٹھونکا پیٹی کی آواز باہر جاری فائرنگ کی آوازوں میں دب گئی تھی اور وہ دونوں مطمئن تھے کہ باہر کسی کو اس مکان میں جاری غیر معمولی سرگرمیوں کا علم نہیں ہو سکا ہو گا۔

سلّو کے ٹینک سے باہر آنے کے بعد وہ دونوں کمرے میں گئے اور ونود کی لاش کو وہاں سے اُٹھا کر صحن میں لے آئے۔ ونود یوں تو زیادہ بھاری بدن کا نہیں تھا لیکن لاش میں تبدیل ہونے کے باعث خاصا بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے اس کی لاش ٹینک کے ڈھکن کے قریب رکھی اور پھر رسّی کا پھندا سا بنا کر اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ونود کی لاش کو احتیاط کے ساتھ ٹینک میں اتار دیا۔ یہ کام ذرا مشکل اور محنت طلب ثابت ہوا کیونکہ کسی زندہ شخص کے مقابلے میں لاش کو ٹینک میں اُتارنا بڑا ٹیکنیکل کام تھا۔ لیکن بہرحال انہوں نے اسے انجام دے ڈالا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ لاش رسّی سے بندھی تاریک ٹینک کی تہ میں اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ کوئی ٹینک کا ڈھکن ہٹا کر جھانکتا تو اسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن وہ جب چاہتے رسّی کھینچ کر لاش کو باہر نکال سکتے تھے۔ سلّو نے رسّی لٹکائی بھی ڈھکن سے کافی اندر کی طرف تھی اس لیے ڈھکن کھول کر ایک نظر میں اس کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

خود کو کافی مطمئن محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ٹینک کے ڈھکن کو ایک بار پھر اس کی جگہ پر لگا دیا۔ ڈھکن لگا کر ابھی وہ پلٹے بھی نہیں تھے کہ انہیں اپنے پیچھے ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہی بیک وقت چونک کر پھرتی سے آواز کی سمت پلٹے۔ ان کے سامنے ایک دُبلا پتلا، لمبا سا آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موجود خطرناک گن کا رخ انہی کی طرف تھا جبکہ وہ خود ونود کو محفوظ جگہ پر چھپانے کے چکر میں اپنے ہتھیار ایک طرف رکھ چکے تھے۔ ہتھیاروں کے بارے میں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر پولیس نے اس گھر کا رخ کیا تو دونوں میں سے ایک پولیس والوں کو دروازے پر کچھ دیر روکنے کی کوشش کرے گا جبکہ دوسرا ہتھیاروں کو بھی ٹینک کی تہ میں پہنچا دے گا۔ یہاں انہیں کوئی پوزیشن نہیں مل سکی تھی چنانچہ ہنگامی حالت میں ہی کھلے ہتھیاروں کو ٹینک میں پھینک کر ان کے ناکارہ ہونے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ بہرحال ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے مقابل ایک مسلح شخص آن کھڑا ہوا تھا۔

''اپن کی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے پر اپن چاہتا ہے کہ تم اپن کے ساتھ کوآپریٹ کرو۔'' ان دونوں میں سے کسی کے کچھ بولنے سے قبل گن بردار شخص نے لب کشائی کی۔

''گن تو تم نے دشمنوں کی طرح ہی اُٹھا رکھی ہے۔'' شہریار نے محسوس کر لیا تھا کہ اس شخص کا لہجہ نرم ہے

اس لیے کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

''یہ اپن کی مجبوری ہے۔ اگر اپن کے ہاتھ میں یہ گن نہیں ہوتی تو تم بات سننے کے بجائے ابھی ہم پر چڑھ دوڑتے۔'' وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے ہاتھ میں موجود ہلاکت خیز گن ہی تھی جس نے ان دونوں کے قدموں کو باندھ دیا تھا اور وہ بنا سوچے سمجھے اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ کوآپریٹ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی بات سن لینا ہی مناسب سمجھا۔

''یہ تم نے عقل کی بات کی ہے۔ چلو کمرے کے اندر چلتے ہیں پھر بات ہوگی۔'' اس نے تجویز پیش کی جو معقول ہی تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو فی الحال وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

''یہ جو فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہو، اس کی وجہ جانتے ہو؟'' کمرے میں پہنچ کر اس نے سوال کیا۔ جواب میں بے ساختہ ان دونوں کے سر نفی میں ہل گئے۔

''یہ سالا سارا ارجن اور لکھن کا پھیلایا ہوا لفڑا ہے۔ اشوک صاحب کے بندوں سے ان دونوں بھائیوں کا کوئی لفڑا چل رہا تھا۔ سالوں نے باہر معاملہ نمٹانے کے بجائے دو بندوں کو اغوا کیا اور ادھر اپنے ٹھکانے پر لا کر ان سے پوچھ تاچھ کرنے کے لیے اتنا مارا کوٹا کہ وہ جان سے چلے گئے۔ اب اپن کا اندازہ یہ ہے کہ ادھر ان کے بندوں میں اشوک صاحب کا بھی کوئی آدمی تھا جس نے اپنے ساتھیوں کے مرنے کی مخبری کر دی۔ حرام کا جنا اشوک بڑا چالاک بندہ ہے۔ اس نے خود سامنے آنے کے بجائے پولیس کو اس طرف دوڑا دیا۔ ممبئی کی پولیس میں ایسے کئی حرام کے جنے ہیں جو اشوک کے تلوے چاٹتے ہیں۔ اپنے مالک کے حکم پر وہ ادھر چڑھ دوڑے۔ اب یہ اپن کی قسمت تھی کہ اپن بھائی جی کے حکم پر ارجن سے دھندے کی بات کرنے ادھر آیا ہوا تھا اس لیے فائرنگ شروع ہوئی تو پھنس گیا۔ ارجن اور لکھن اپنے بندوں کے ساتھ مل کر پولیس کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن اپن جانتا ہے کہ وہ چوہے دان میں پھنس گئے ہیں اور اپن ان کے ساتھ پھنسنا نہیں چاہتا اس لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں سے نکل پڑا۔ یہاں سے چوتھا مکان ہے ارجن کا اور اپن گولیوں کی برسات میں چھتیں پھلانگتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ گولی مولی لگ کر مر جاتا تو خیر تھی لیکن زندہ گرفتار ہو کر بھائی جی کو تو مشکل میں ڈالنے کا تو نہیں تھا نا۔''

وہ جو کہانی اُنہیں سنا رہا تھا، اس میں اشوک صاحب اور بھائی جی کے نام ان کے لیے جانے پہچانے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو ممبئی میں داخل ہوتے ہی انہیں اندو نامی لڑکی کی وجہ سے ان دو ناموں سے واقفیت حاصل ہوئی تھی اور اب پھر یہ دونوں نام سامنے آ گئے تھے۔ باہر جاری فائرنگ میں ممبئی کے ان دونوں غنڈوں کا نام سننا زیادہ عجیب بھی نہیں لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اتنی کہانی تو ہمیں سمجھ میں آ گئی لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ ہم تم سے کیا کوآپریٹ کر سکتے ہیں؟ باہر جو ہنگامہ جاری ہے اس میں تو ہم خود بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے اس لیے تمہاری مدد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ہمیشہ کی طرح گفتگو کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی تھی اور سلو اس معاملے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا لیکن شہریار جانتا تھا کہ حقیقت میں وہ پوری طرح چوکنا ہے اور ضرورت پڑنے پر فوری طور پر ایکشن میں بھی آ سکتا ہے۔

''نکلنے کا راستہ ہوتا تو اپن خود نکل جاتا۔ ابھی تو اپن یہاں چھپنے کی جگہ مانگتا ہے۔ فائرنگ کی آواز کو غور



سے سنو تو سمجھ جاؤ گے کہ بس اب کھیل ختم ہی ہونے والا ہے۔ پولیس والے اس لفڑے میں جیتیں گے اور ارجن کے گھر کے ساتھ ساتھ آس پاس کے مکانوں کی بھی تلاشی لیں گے۔ اس ٹیم (وقت) تمہیں اپن کو چھپانا ہوگا۔'' اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''لیکن ہم تمہیں چھپائیں گے کہاں؟ اس گھر میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔'' شہریار نے پہلو بچانا چاہا۔

''اُدھر ہی چھپانا جدھر تم نے وہ لاش چھپایا ہے۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو شہریار بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ یقیناً جب وہ شخص چھت پر تھا تو اس نے ونود کی لاش کو ٹینک میں اتارے جانے کا منظر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

''وہاں تم کیسے چھپو گے؟ ٹینک میں پانی بھرا ہوا ہے۔''

''کتنا پانی ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''تقریباً آدھا ٹینک۔''

''پھر کوئی پرابلم نہیں۔ اپن سیڑھی پر کھڑا ہو جائے گا۔ پولیس والا سالا ڈھکن اُٹھانے لگے تو تم اشارہ کر دینا۔ اپن پانی میں کُود جائے گا۔ پانی کے اندر تین منٹ کے لیے سانس روک لینا اپن کے لیے کوئی مشکل نہیں۔'' اس نے خود ہی سارا منصوبہ ترتیب دے دیا۔

اُن کے لیے اس منصوبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے تعاون نہیں کرتے اور وہ گرفتار ہو جاتا تو لازماً ٹینک میں چھپی لاش کی نشاندہی کر دیتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اسے بھی ونود کے پاس پہنچا دیتے۔ لیکن بے وجہ انسانی خون سے ہاتھ رنگنے کی بھی کوئی تک نہیں بنتی تھی البتہ یہ ممکن تھا کہ اس تعاون کے بدلے وہ اس شخص کی ہمدردی حاصل کر لیتے اور وہ کبھی نہ کبھی ان کے کام آ جاتا۔ ویسے بھی بھائی جی کے بارے میں اُنہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ مسلمانوں اور پاکستانیوں کا ہمدرد تھا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟'' شہریار نے اس سے دریافت کیا۔ اس گفت و شنید کے دوران وہ فائرنگ کی آوازوں پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ فائرنگ کی شدت میں کمی آ گئی تھی اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایک گروپ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

''عبدالرحمٰن..... پر ادھر سارا لوگ اپن کو عبدل بھائی بولتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''ٹھیک ہے عبدالرحمٰن!..... ہم تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر پولیس نے گھر گھر تلاشی لینا شروع کی اور اس مکان تک پہنچی تو تم وہی کرنا جو سوچ رکھا ہے۔ آگے قسمت کی بات ہوگی کہ تم اور ہم بچ پاتے ہیں یا نہیں۔'' آخر کار شہریار نے اسے تعاون کی یقین دہانی کروا ہی دی۔

''قسمت کی تم فکر نہ کرو۔ قسمت کا اپن دھنی ہے۔ پہلے بھی کئی بار موت کے منہ میں سے نکلا ہے۔ اب بھی انشاء اللہ نکل جائے گا۔'' اس نے یقین سے کہا اور پھر یکدم ہی موضوع گفتگو بدل ڈالا۔

''سالا تم لوگ تو بتاؤ کہ تم کون ہے؟ اپن کو تو اس بستی کا رہنے والا نہیں لگتا۔'' اس کی چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں بہت غور سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ہم جو بھی ہیں تمہارے لیے جاننا ضروری نہیں۔ ابھی ہم اپنی مجبوری کی وجہ سے ایک دوسرے سے کوآپریٹ کرنے پر مجبور ہیں لیکن ایک دوسرے سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپس میں اپنے بارے میں گفتگو کریں۔ ہاں تم اپنی سہولت کے لیے ہمیں نوشاد اور قمرو کہہ سکتے ہو۔'' شہریار نے اسے ذرا بے مروّتی سے

جواب دیا اور خود اُٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جہاں سے باہر گلی میں جھانکا جا سکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے ہی کی طرح بے حد احتیاط سے کھڑکی کے پٹ میں جھری بنائی اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ فائرنگ کا سلسلہ اب تقریباً رک چکا تھا اور گلی میں کئی پولیس والے دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''میرے خیال میں اب تمہیں ٹینک میں چھپ جانا چاہئے۔ پولیس نے اپنی ابتدائی کارروائی مکمل کر لی ہے اور اب یقیناً وہ لوگ کسی بھی وقت اردگرد کے گھروں کی تلاشی لینا شروع کر سکتے ہیں۔'' کچھ دیر باہر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے عبدالرحمٰن عرف عبدل کی طرف پلٹتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن ٹینک کا ڈھکن اس وقت تک کھلا رکھنا جب تک پولیس والے دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔ اس دوران میں پوری طرح ہوشیار رہوں گا۔'' اس نے اپنی گن کو اس طرح تھپتھپایا جیسے انہیں دھمکی دے رہا ہو۔ وہ خاصا ہوشیار آدمی تھا اور اس مکان میں وارد ہونے کے بعد ایک بار بھی اس نے ان دونوں کو اپنی گن کی زد سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اب بھی وہ پوری طرح محتاط نظر آ رہا تھا۔

''جیسا چاہتے ہو کرو۔ بہرحال ہمارا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' شہریار نے لاپروا انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر عبدل نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت پھرتی سے ان کے ہتھیاروں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ہتھیار وہ خود ونود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کمرے میں ایک جانب ڈال کر چلے گئے تھے۔ عبدل کی تمام تر ہوشیاری کے باوجود ان کے پاس گنجائش تھی کہ وہ ان ہتھیاروں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع نکال لیں۔ لیکن ان دونوں ہی کے نزدیک موجودہ صورتِ حال میں ہتھیار بے کار تھے اس لیے ان کے حصول کے لیے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ عبدل کا معاملہ البتہ الگ تھا۔ وہ غول سے بچھڑے ہوئے کسی جانور کی طرح وحشت زدہ تھا اور ہر ممکنہ احتیاط کر رہا تھا۔ اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے خود اس صحن میں موجود واٹر ٹینک کا ڈھکن ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔

شہریار اور سلّو نے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی جگہ پر موجود رہ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ونود کو عین دل کے مقام پر گولی ماری گئی تھی اور فوری موت واقع ہو جانے کی وجہ سے بہت زیادہ خون نہیں بہا تھا۔ جو خون نکلا تھا، اس کو بھی انہوں نے اس کے سینے پر موٹا کپڑا رکھ کر اِدھر اُدھر بہنے سے روک دیا تھا چنانچہ کمرہ تقریباً صاف تھا۔ بس چند ایک ہی خون کے قطرے پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان قطروں کو شہریار نے خود آگے بڑھ کر صاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گئے۔ پولیس تلاشی کے لیے اس مکان تک آتی یا نہ آتی، وہ بہرحال ابھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر نکلتے تو فوراً پولیس والوں کی نظر میں آ جاتے۔

شہریار نے انتظار کے جاں گسل لمحات کو گزارتے ہوئے ایک بار پھر اپنا موبائل نکال کر چیک کیا۔ اس پر ابھی تک سگنل نہیں آ رہے تھے چنانچہ وہ کلام سمیت کہیں کسی شخص سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً کلام کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ سوٹ کیس خریدنے کے بعد واپس پلٹا ہوگا تو علاقے میں پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر دُور ہی رُک گیا ہوگا اور موبائل سگنلز بند ہونے کی وجہ سے ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکا ہوگا۔

اللہ اللہ کر کے انتظار کے لمحات ختم ہوئے اور دروازے پر پولیس والوں کی مخصوص زوردار دستک سنائی دی۔ دستک کی آواز سن کر سلّو نے خود کار انداز میں صحن کا رخ کیا جبکہ شہریار دروازہ کھولنے کے لیے آگے



بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں اتنا وقت لگایا کہ سلّو ٹینک کا ڈھکن لگا کر خود وہاں سے ہٹ جائے۔ معمولی سی تاخیر بھی پولیس والوں پر گراں گزری اور انہوں نے بری طرح دروازے کو پیٹ ڈالا۔

''اتنی دیر کیوں لگائی دروازہ کھولنے میں سالے! ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں جو باہر انتظار میں کھڑے رہیں؟'' جونہی اس نے دروازہ کھولا، دو پولیس والے اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بدزبانی کرنے لگے۔ حالات کی وجہ سے شہریار نے اُن کی اس بدزبانی کو خاموشی سے برداشت کر لیا اور خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''سوری سر! ہم باہر کی سچویشن کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اس لیے تھوڑا ٹائم لگایا۔'' پولیس کا معمولی سپاہی اپنے لیے ''سر'' کا لفظ سن کر پھول کر کپا ہو گیا اور مزید نخوت سے بولا۔

''بکواس نہ کراوئے۔ اور یہ بتا کہ یہاں کوئی فراری بندہ تو نہیں آیا؟''

''یہاں ہم دونوں بھائیوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔'' اس کی بدتمیزی کے باوجود شہریار نے اسے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو ہم لیں گے ہی۔ پر تُو بتا کہ تُو کون ہے؟'' اُس کی اکڑ کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''میں جگدیش ہوں اور یہ میرا چھوٹا بھائی رویندر ہے۔ یہ گھر ہمارے دوست متر کا ہے۔ وہ ہمیں جاگنگ کے بعد پارک سے اپنے گھر میں لے آیا تھا اور ہمارے لیے باہر سے ناشتہ لینے گیا تھا کہ آپ لوگوں نے یہاں آپریشن شروع کر دیا۔ ہم لوگ یہاں پھنس گئے اور متر ابھی واپس نہیں آ سکا۔'' اس نے پولیس والے کو پہلے سے سوچی ہوئی کہانی سنا دی جو ان کے جسم پر موجود جاگنگ کے لباس کی وجہ سے حقیقت کے قریب معلوم ہوتی تھی۔

''زیادہ بھولا نہ بن اوئے۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ ادھر اس علاقے میں کوئی شریف بندہ نہیں رہتا۔ پر اس سے ہمیں کسی اور سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم بس ارجن کے ساتھیوں کو تلاش کر رہے ہیں۔'' وہ پولیس والا تھا اس لیے اس کے انداز سے دھوکا کھانے کو تیار نہیں ہوا اور بُری طرح لتاڑ کر رکھ دیا۔

''چلو بھئی، تلاشی شروع کرو۔'' اس بار اس کا مخاطب اس کا اپنا ساتھی تھا جو فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ چھوٹے سے تقریباً خالی پڑے مکان کی تلاشی لینا کیا مشکل تھا۔ دونوں نے لمحوں میں کام نمٹا لیا۔ شہریار کے خدشات کے برعکس اُنہیں انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں جھانکنے کا خیال بھی نہیں آیا اور وہ اپنا کام بھگتا کر روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے البتہ انہوں نے ان دونوں کو یہ ضرور جتایا تھا کہ وہ دونوں انہیں شکل سے چار سو بیس لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت چونکہ وہ محدود آپریشن کر رہے ہیں اس لیے ان جیسے کئی بدمعاشوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہیں۔

آسانی سے جان چھوٹ جانے پر انہوں نے پولیس والوں کی اس بکواس کو میٹھے شربت کے گھونٹ کی طرح پی لیا اور دروازے کو ایک بار پھر اندر سے بند کرنے کے بعد سلّو نے جا کر ٹینک کا ڈھکن ہٹا دیا۔ عبدل پلک جھپکتے میں باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنی گن سمیت ان دونوں کے ہتھیار بھی موجود تھے۔ وہ جرم کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے ہتھیار کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے یقیناً پہلے سے ہتھیاروں کو پانی میں پھینکنا دانش مندی نہیں سمجھی ہوگی اور یہ طے کیا ہوگا کہ ناگزیر حالات میں ہی ان کارآمد چیزوں کا نقصان برداشت کرے گا۔ خوش قسمتی سے اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور اس نے اپنے ساتھ ان دونوں کے ہتھیار بھی ضائع ہونے سے بچا لیے تھے۔

وہ ٹینک سے باہر نکلا تو وہ لوگ دوبارہ اسی کمرے میں جا بیٹھے۔ یہاں آ کر شہریار نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا۔ ابھی تک اس پر سگنلز موصول نہیں ہو رہے تھے۔ یقیناً پولیس اپنی کارروائی مکمل ہونے سے قبل موبائل سروس بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات میں انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ونود کی لاش کو انہوں نے جان بوجھ کر ابھی ٹینک سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اب وہ یہ کام کلام کے واپس آنے کے بعد ہی کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کا ہتھیاروں سے لیس عبدالرحمٰن کو بھی چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ان کا حریف نہیں تھا، بس اپنی جان کی حفاظت کے لیے احتیاطاً ہتھیار سنبھال کر بیٹھا ہوا تھا اور باہر کے حالات موافق ہوتے ہی یہاں سے نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایسے میں اس سے خوامخواہ بھڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر کیا جانے والا انتظار ایک گھنٹے کی مدت پر جا کر ختم ہوا اور باہر کی سُن گُن لینے پر اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ پولیس اب اس علاقے سے نکل رہی ہے۔ ساتھ ہی موبائل فونز کے سگنل بھی جاگ گئے۔ شہریار کی طرح عبدالرحمٰن بھی بار بار اپنا موبائل چیک کر رہا تھا۔ سگنلز کھلے تو اس نے فوراً کوئی نمبر ملا کر موبائل کان سے لگا لیا۔ اس کی کال فوراً ریسیو کی گئی۔

''ہاں چھوٹے، اپن ٹھیک ہے۔ تُو فکر نہ کر..... بس اب تھوڑی دیر میں نکلتا ہے۔'' وہ اُن پر نظریں رکھے ہوئے کسی سے بات کرنے لگا۔

''ابھی فون پر ہی ساری تفصیل کر لے گا کیا؟..... اپن کو ادھر سے نکلنے دے، پھر آرام سے سب سن لینا۔'' دوسری طرف موجود شخص نے یقیناً کوئی استفسار کیا تھا جس پر اس نے بھڑکنے والے انداز میں جواب دیا پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

''یہ تو تُو نے بہت اچھا کیا اوئے۔ بس وہیں رُکا رہ۔ اپن پیدل ہی ادھر تک آ جائے گا۔ اپن کی گاڑی کا حال احوال بعد میں معلوم کرنا۔ ادھر ارجن کے اڈے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ فائرنگ میں اس کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہو گا۔ کیا پتہ پولیس والے ساتھ اُٹھوا کر لے گئے ہوں۔'' اس کا آدمی یقیناً قرب و جوار میں ہی کہیں موجود تھا چنانچہ اس نے خود وہاں تک پہنچنے کا عندیہ دیا اور کال ختم کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''او کے یارو!..... اپن چلتا ہے۔ تمہاری آج کی مدد اپن کو ساری زندگی یاد رہے گی۔ اپنا تجربہ بتاتا ہے کہ سالا تم دونوں بھی مار دھاڑ کرنے والا آدمی ہے۔ پر اپن سے نہیں بھڑا تو اچھا کیا۔ اکھا (سارا) ممبئی عبدالرحمٰن کو جانتا ہے۔ اپن بھائی جی کا خاص آدمی ہے۔ اگر تم کو کبھی مدد کی ضرورت پڑے تو سیدھے اپن کے پاس آ جانا۔ اپن تمہارا آج کا احسان ضرور اُتارے گا۔''

اس نے شاہانہ انداز میں کہا اور ان کے ہتھیار ذرا فاصلے سے دیوار کے ساتھ ڈال کر آگے بڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سیدھا باہر نکل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور باہر نکلنے سے قبل اس نے شہریار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

شہریار نے خاموشی سے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عبدالرحمٰن نے خاصی طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو جکڑ کر مصافحہ کیا۔ شہریار کی جگہ کوئی عام شخص ہوتا تو اس کی گرفت کی سختی پر تڑپ جاتا لیکن وہ نارمل رہا اور جوابی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ کی گرفت نرم ہی رکھی۔ عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سلّو سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ بھی اس نے شہریار والی حرکت ہی کی۔ جواباً سلّو نے شہریار جیسے رویّے کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اتنی ہی قوت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ عبدالرحمٰن



بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

''جان دار آدمی ہو، پر اس جیسے عقلمند نہیں۔'' شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا اور پھر جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز پر سلّو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بلا ضرورت طاقت کا مظاہرہ کرنا عقلمندی نہیں ہوتی۔'' شہریار نے اسے سمجھایا۔

''وہ خود ایسا نہیں کر رہا تھا کیا؟'' سلّو نے چڑ کر کہا۔

''نہیں، اس کا عمل بلا ضرورت نہیں تھا۔ وہ ہمیں جانچ رہا تھا۔'' شہریار نے رسان سے جواب دیا اور اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس پر کوئی کال آ رہی تھی۔

''تھینک گاڈ، آپ لوگ ٹھیک ہیں۔ میں بہت دیر سے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب بس میں وہاں پہنچ ہی رہا ہوں۔'' اس کی آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کلام بولتا ہی چلا گیا اور کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کلام آ رہا ہے، چلو ہم ٹینک سے ونود کی لاش باہر نکال لیتے ہیں۔ زیادہ دیر پانی میں پڑی رہنے سے اس کا پھول جائے گی اور کلام کو اسے یہاں سے ہٹانا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔'' فون بند ہوتے ہی اس نے سلّو سے کہا جو ہمیشہ کی طرح فوراً عمل کے لیے تیار ہو گیا۔

لاش کو ٹینک سے باہر نکالنا اندر ڈالنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ثابت ہوا۔ انہوں نے کپڑوں سمیت لاش کو اندر لا ڈالا تھا اور اب اس کے کپڑے پانی سے شرابور ہو گئے تھے۔ دونوں نے مل کر بہ مشکل اسے باہر نکال کر صحن کے فرش پر رکھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''میں دیکھتا ہوں۔ کلام ہو گا۔'' سلّو ٹینک کے اندر تھا اس لیے اس کا حال زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شہریار کے کپڑے زیادہ نہیں بھیگے تھے چنانچہ وہ ہی دروازہ کھولنے گیا۔ حسبِ توقع وہاں کلام ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوٹ کیس تھام رکھا تھا۔

''سوری، آپ لوگوں کو یقیناً پریشانی اُٹھانی پڑی ہو گی۔ میں خریداری کر کے واپس آ رہا تھا تو پتہ چلا کہ اس علاقے میں پولیس کا آپریشن جاری ہے۔ موبائل پر بھی رابطہ نہیں ہوا لیکن میرے پاس پریشان ہونے اور انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' وہ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر کھولتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

''اِٹس او کے۔ مجھے تمہاری پوزیشن کا اندازہ ہے۔'' شہریار نے اسے اطمینان دلایا۔

''میں نے اندازے سے آپ دونوں کے لیے کپڑے بھی خرید لیے ہیں۔ جاگنگ سوٹ کے بجائے آپ ان کپڑوں میں یہاں سے نکلیں تو بہتر رہے گا۔'' سوٹ کیس میں سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ بولا۔ خود اس کے اپنے جسم پر بھی اب جاگنگ سوٹ کے بجائے عام پینٹ شرٹ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے کپڑے خریدنے کے بعد شاپنگ سینٹر میں ہی بدل ڈالے تھے۔ شہریار کی تیز نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوٹ کیس میں ایک بڑے سائز کا پولی تھین بیگ رکھا ہوا ہے۔ وہ اس کا مصرف اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

''کپڑے لا کر تم نے اچھا کیا۔ ونود کی لاش کو چھپانے کے چکر میں ہمارے کپڑے خاصے خراب ہو گئے تھے۔'' اس نے شاپنگ بیگ میں سے کپڑے نکال کر ان کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ اس کے اور سلّو کے لیے مناسب رہتے۔

''لاش کہاں چھپائی آپ لوگوں نے؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ پیچھے والے کمرے میں پڑا ہو گا۔'' کلام جو

سوٹ کیس سے پولی تھین نکال کر کھڑا ہو رہا تھا، بری طرح چونکا۔

''تمہارے پیچھے یہاں بہت کچھ ہوا ہے۔ نہایت سنگین حالات میں اگر ہم تمہیں یہاں صحیح سلامت نظر آ رہے ہیں تو اسے خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' وہ مختصراً اسے اس عرصے میں گزرنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ مائی گاڈ!..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے پیچھے آپ کا عبدل بھائی سے واسطہ پڑا ہوگا۔ آپ واقعی خوش قسمت ہیں کہ وہ یہاں سے خوش ہو کر گیا ہے اور اس نے وقت پڑنے پر آپ کے کام آنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اب آپ زندگی میں کبھی بھی اُسے اُس کا یہ وعدہ یاد دلائیں گے تو وہ مکرے گا نہیں اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی آپ کا ساتھ دے گا۔''

''لگتا ہے تمہاری بڑی اچھی جان پہچان ہے عبدل بھائی سے۔'' سلّو جو کمرے میں آ چکا تھا، اس کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں کیا، اس کے بارے میں ممبئی کے وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے کبھی اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت پھرتیلا، لڑنے بڑھنے کا ماہر اور ہتھیار شناس آدمی ہے۔ اپنے دشمنوں کے لیے سفاک تو دوستوں کے لیے جان لٹا دینے والا ہے۔ بھائی جی کے سر چڑھے لوگوں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔'' سلّو کے طنزیہ لہجے کو نوٹ کیے بغیر وہ سادگی سے دیگر تفصیلات بتانے لگا۔

''چلو ٹھیک ہے، کبھی ضرورت پڑی تو اسے آزما دیکھیں گے۔ ابھی تو ونود کی لاش کا بندوبست کرو تاکہ ہمیں یہاں سے خلاصی ملے۔'' شہریار نے درمیان میں دخل اندازی کر کے موضوعِ گفتگو ختم کیا تو وہ تینوں صحن میں پڑی ونود کی لاش کے پاس پہنچے اور اسے بڑی صفائی سے پولی تھین بیگ میں لپیٹ کر سوٹ کیس میں منتقل کر دیا۔

''اُس مردود کی وجہ سے اب مجھے ٹینک کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔'' سوٹ کیس بند کرتے ہوئے کلام بڑبڑایا۔

''وہ تمہیں ویسے بھی کرنی چاہیے۔ سڑے ہوئے گٹر کے پانی جیسی بدبو آ رہی ہے اس میں سے۔'' سلّو نے ناک چڑھا کر کہا۔ دونوں دفعہ ٹینک میں اُترنے کا فریضہ اسی نے انجام دیا تھا اس لیے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھا۔

''اصل میں میرا یہاں بہت دنوں بعد آنا ہوتا ہے اس لیے یہ نوبت آ جاتی ہے۔''

کلام نے کھسیائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی جس پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر وہ دونوں کپڑے تبدیل کرنے چلے گئے۔ ان کا یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔ کلام سوٹ کیس میں بند لاش کو کس طرح ٹھکانے لگاتا، یہ اس کی دردسری نہیں تھی۔

⊛----✪----⊛

جگو نے چمچماتی ہوئی کار عین اپنی مطلوبہ عمارت کے نیچے روکی اور کار ہی کی طرح چمچماتے نئے کپڑوں میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

یہ وہ محلّہ تھا جہاں ہر سمت سے سُر سنگیت اور گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دیتی تھی اور آنے والے



مہمانوں کا رات کے پُراسرار ماحول میں استقبال ہوتا تھا۔ یہاں آنے کے لیے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ گاڑی سے لے کر پیر میں موجود جوتوں تک ہر شے کا انتخاب لاجواب تھا۔

اپنے اس محتاط انتخاب کی وجہ سے وہ کسی غنڈے کے بجائے رئیس ابن رئیس لگ رہا تھا اور یہاں ایسا لگنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے کا رواج تھا۔ اس کا بھی چندا بائی کے کوٹھے پر پُرجوش استقبال ہوا۔ ڈیوڑھی میں موجود بوڑھے لیکن گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ملازم نے خوشامدانہ لہجے میں اسے سلام کیا اور بڑی عزت سے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے گیا۔

کئی جگہ سے ٹوٹ جانے والی تنگ و تاریک سیڑھیوں سے گزر کر جگو اوپر پہنچا تو وہاں آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی پھیلی تھی۔ بڑے سے ہال میں پھیلی اس روشنی میں کچھ دخل تو جھالردار فانوس اور فینسی لائٹوں کا تھا لیکن اصل کمال حُسن کی ان دیویوں کا تھا جو برق کی طرح کوند کر جملہ حاضرین کے حواسوں پر گر رہی تھیں۔ سُر اور سنگیت کی لے پر ناچتی یہ پریاں جگو کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ جس سیاست دان کے لیے خدمات انجام دیتا تھا وہ کئی بار رات کی تاریکی میں ایسی محفلوں میں شرکت کے لیے بطور باڈی گارڈ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اپنے آقا کے ساتھ ہونے کے باعث وہ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تماش بین نہیں کہلاتا تھا اور ایک طرف چوکس کھڑا خود کو ہر شے سے بے نیاز ظاہر کرتا تھا۔ لیکن آج وہ خود تماش بین بن کر آیا تھا اور ہونے والی آؤ بھگت سے لطف اندوز ہوتا ہوا ان تھرکتی بلاؤں کو داد دے رہا تھا۔

اس شغل کے دوران اس نے اپنی یہاں آمد کے اصل مقصود کو فراموش نہیں کیا تھا اور نگاہیں مسلسل گوہرِ مقصود کی متلاشی تھیں۔ آخر کار اس کی یہ تلاش ختم ہوئی۔ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کی بجی سنوری گڑیا سی لڑکی تھی۔ قدرے جھجکتے ہوئے محفل میں وارد ہوئی تھی۔ جھجکتے ہوئے قدموں، جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ حرکت میں آئی تو محفل کا رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی پیش رووں کی طرح نہ تو بازار کی جملہ اداؤں کی مالک تھی، نہ تماش بینوں کو لبھانے کے لیے تیکھے چتون سے کام لے رہی تھی۔ پھر بھی ہر ایک اس پر مرمٹنے کو تیار نظر آ رہا تھا۔ کئی نے یہ بھی کوشش کی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے آغوش میں لے لیں لیکن وہ چکنی مچھلی کی طرح ہر ایک کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

بے تاب دلوں نے اس کے قدموں میں نوٹوں کے ڈھیر لگا دیئے اور وہ جو خود بکاؤ تھی، کاغذ کے ان ٹکڑوں کو بے نیازی سے اپنے نرم و نازک تلوؤں تلے روندتی رہی۔ بالآخر محفل ختم ہوئی اور منچلے سحر زدہ سے وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ رخصت ہونے والوں میں جگو شامل نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنی جگہ جم کر بیٹھا تھا۔

''کیا خدمت انجام دوں سرکار کی؟'' ادھیڑ عمر نائیکہ چندا بائی نے جو اسے اپنی جگہ جمے دیکھا تو کوٹھے کے آداب کے مطابق مہذبانہ دریافت کیا۔

''آں..... کیا کہا تم نے؟'' جگو نے ایسی اداکاری کی جیسے کسی گہرے خیال سے واپس پلٹا ہو۔

''میں نے کہا سرکار! محفل تو کب کی ختم ہو گئی اگر آپ کو مجھ سے کوئی اور خدمت درکار ہو تو ارشاد فرمایئے؟'' بائی نے بہت نرمی سے اسے ابھی تک وہاں بیٹھے رہنے کا احساس دلایا تو اس نے اپنے لبوں سے ایک گہری سرد سانس خارج کی اور کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''محفل کب ختم ہوئی، مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میری نظروں کے سامنے تو وہ اب بھی رقص کرتی ہر سُو روشنی بکھیر رہی ہے۔''

''یہ آپ کس کو عزت بخش رہے ہیں سرکار! کچھ اُس کا حال حلیہ تو بتائیے؟'' بائی نے اس کی
پوشاک سے لے کر ہاتھوں میں پہنی نایاب پتھروں والی انگوٹھیوں تک کا ایک ہی نظر میں جائزہ لے
خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہی جو سب سے آخر میں سفید لباس پہنے آئی تھی اور سب کچھ ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں ڈبو دیا تھا۔''
گو کہ دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھتا تھا لیکن شہر میں قیام اور فلموں کے چسکے کی وجہ سے ان محفلوں میں
کے طریقے سے خوب واقف تھا۔

''بہت خوب سرکار! نام تو آپ نے خود بتا دیا اس کا۔ وہ واقعی چاندنی ہے۔ میرے کوٹھے کا سب
خوب صورت اور نایاب موتی۔''

چندا بائی کوٹھے کی پیداوار تھی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچنے سے لے کر نائیکہ کی گدی سنبھالنے تک
نے اس کاروبار کے بہت سے اسرار و رموز سیکھے تھے چنانچہ چاندنی میں اس کی دلچسپی محسوس کر کے پہلے ہی
کے بھاؤ بڑھانے کی تدبیر کرنے لگی۔

''میں اس موتی کو ایک رات کے لیے اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' جگو نے بے تابی سے
خواہش بیان کی۔

''پہلے اپنا کچھ تعارف تو کروائیے۔ پہلی بار آپ کو اپنے کوٹھے پر دیکھا ہے۔ ذرا معلوم تو ہو کہ میری
چاندنی کو مانگنے والا اس کی صحیح قدر دانی بھی کر سکے گا یا نہیں؟''

وہ گھاگ کاروباری عورت تھی، سو یہ ممکن نہیں تھا کہ اگلے کی مالی حیثیت کا درست تخمینہ لگائے بغیر
سے معاملات طے کر لیتی۔

''میرا نام ملک ممتاز ہے۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہماری فرم ممتاز ٹریڈرز کے نام سے مختلف کاروبار
کرتی ہے جن میں مصالحہ جات کی امپورٹ ایکسپورٹ کے علاوہ ووڈ گڈز اور کیمیکلز وغیرہ کے کاروبار بھی
شامل ہیں۔ آپ کے شہر میں بھی میں کاروبار کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ سُر سنگیت کا شوقین ہوں اس لیے جہاں
بھی جاؤں، اپنے مطلب کی جگہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ چندا بائی کے کوٹھے سے بہتر محفل
کہیں اور نہیں سجائی جاتی اس لیے سیدھا یہیں چلا آیا اور اب اعتراف ہے کہ بتانے والے نے ٹھیک بتایا تھا
آپ تو بڑے انمول موتی اپنے دامن میں جمع کیے بیٹھی ہیں اور میں ان سے ایک موتی کے لیے بس چند گھنٹوں
کے واسطے درخواست گزار ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے جو کہ ظاہر ہے سراسر جھوٹ پر مبنی تھا
ایک بار پھر اپنی خواہش دہرائی۔

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ اصل میں بے بی کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے اور وہ محفل میں حاضری
دینے پر بھی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔'' اپنے گھٹنوں پر ہاتھ جما کر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاؤ بڑھانے
کے لیے بائی نے ایک اور کاروباری حربہ استعمال کیا۔

''میں آپ کو اسے رضامند کرنے کے لیے منہ مانگا نذرانہ دوں گا۔ بس آج کی رات کے چند گھنٹے
میرے نام کر دے۔ میں اتنا اصرار اس لیے کر رہا ہوں کہ میں آج رات ہی یہاں ہوں۔ کل شام تک مجھے
حال میں لاہور واپس جانا ہوگا ورنہ بہت بڑا مالی نقصان ہو جائے گا۔''

بائی کے حربوں کو سمجھنے کے باوجود اس نے عاجزی سے اس سے اصرار کیا۔ رقم کی اسے اس لیے
نہیں تھی کہ عمیر آفندی نے اسے فری ہینڈ دے دیا تھا۔ اتنا عقلمند تو وہ بھی تھا کہ سمجھ سکے کہ جب کوٹھے والیوں



سے معاملات طے کرنے ہوں تو رقم سب سے پہلے تیار رکھنا پڑتی ہے۔

''آپ کے کاروبار کا معاملہ ہے تو میں ابھی بے بی کو سمجھا بجھا کر راضی کرتی ہوں۔ آپ کا نقصان تو ہم
کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے۔''

اس ادھیڑ عمر نائیکہ سے وقت نے حُسن کی دولت کو یکسر چھین لیا تھا لیکن اداؤں سے کام لینا وہ اب بھی
نہیں بھولی تھی۔ کھڑے ہونے کے بعد اس نے زور دار تالی بجائی اور اس کا ردِعمل سامنے نہ آنے پر بُری
طرح دھاڑی۔

''شاہدے!..... او شاہدے!..... کدھر مر گیا ہے تُو؟'' اُس کی دھاڑ پر سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا یوں
سمت قدموں سے اندر داخل ہوا جیسے بادلِ ناخواستہ آنا پڑا ہو۔

''صاحب کو اوپر کمرے میں پہنچا دو۔ اور ہاں، ان سے نذرانہ لینا مت بھولنا۔'' بائی نے سخت لہجے میں
لڑکے کو احکامات دیئے اور خود ہال سے نکل گئی۔

''آیئے صاحب!'' لڑکے کے الفاظ مہذبانہ لیکن لہجہ کاٹ دار تھا۔ جگو نے اس کے لہجے کی پروا نہیں کی
اور دزدیدہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ دُبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھوں اور سانولی رنگت والا وہ لڑکا سولہ سترہ سال
کا تھا اور اُسے لگ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی تلاش میں اس کوٹھے تک آیا ہے۔ اسے براہِ راست لڑکے
کو چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اسی طریقِ کار پر عمل کرے گا جو پہلے سے سوچ کر آیا
ہے۔ تیکھے چتونوں والی، منجھی ہوئی اداؤں سے بھرپور رقاصاؤں کے مقابلے میں اس نے شب بسری کے لیے
چاندنی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ اس ماحول میں نوآموز اور کچھ ان فٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کے
خیال کے مطابق منجھی ہوئی طوائفوں کے مقابلے میں وہ اس کم سن لڑکی سے زیادہ آسانی سے اپنی مطلوبہ
معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

''لائیے، نذرانہ عطا فرمائیے۔'' اسے خواب گاہ کے انداز میں سجائے گئے ایک کمرے میں پہنچا کر لڑکے
نے چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے ہوئے مطالبہ کیا۔

جواب میں جگو نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی تھما دی۔ یہ اچھی خاصی
بھاری رقم تھی۔ چندا بائی نے اس سے چاندنی کی کوئی قیمت طے نہیں کی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ
اس کے مطلب کی رقم ادا نہیں کرے گا، وہ چاندنی کو اس کمرے تک ہرگز نہیں پہنچائے گی اس لیے عقل مندی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی اتنی رقم دے دی کہ اس کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس سے
نوٹوں کی موٹی گڈی وصول کرنے کے بعد لڑکے نے اسے لمحہ بھر کے لیے کینہ توز نظروں سے گھورا اور پھر ایک
جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔

اب جگو کمرے میں تنہا تھا اور اسے چاندنی کا انتظار کرنا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور
گھنگھروؤں کی چھن چھن کے ساتھ وہ اسی سفید لباس میں نمودار ہوئی جس میں اس نے محفل میں جلوہ دکھایا
تھا۔ تھم تھم کر آگے بڑھتے اُس کے قدموں نے جگو کو احساس دلایا کہ اس کے انداز میں جو جھجک اور ہچکچاہٹ
اس نے محفل میں محسوس کی تھی، وہ اب بھی برقرار ہے۔

''آداب۔'' اُس کے تجزیوں سے بے خبر چاندنی نے دھیمے لہجے میں ماتھے تک ہاتھ لے جاتے
ہوئے کہا۔

''تشریف لائیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ میری خواہش

کے احترام میں یہاں تک چلی آئیں۔'' جگو نے بڑی تہذیب سے اس کا استقبال کیا۔ اس لب و لہجے اور انداز کو برقرار رکھنے کے لیے اسے بڑی محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا کیونکہ جو زندگی وہ گزار رہا تھا، اس میں تو الگ ہی زبان میں گفتگو ہوتی تھی۔

''شکریے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی جیب میں اتنی طاقت تھی کہ میں بسترِ مرگ پر بھی ہوتی تو آپ کے سامنے حاضر ہو جاتی۔'' اس کی دھیمی اور سریلی آواز میں حالات کی تلخی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''آپ تو ناراض معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اطمینان رکھیے آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' اس کی تلخی کو محسوس کرنے کے باوجود جگو نے نرمی سے کہا۔ جواب میں اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ جگو اسے مزید کسی قسم کی یقین دہانی کرواتا، دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ وہ سہج سہج کر چلتی دروازے تک پہنچی اور دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا۔ اس کے باوجود جگو باہر اس لڑکے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جسے چندا بائی نے ''شاہدے'' کہہ کر پکارا تھا۔

''تُو یہاں کیوں آیا ہے؟'' چاندنی نے دبی آواز میں اس سے پوچھا۔

''بائی جی نے یہ تیرے کمرے میں پہنچانے کو کہا تھا۔'' جگو کے تیز کانوں نے شاہدے کی دھیمی لیکن تلخ آواز سنی۔

''وہ کمینی جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ لا، یہ مجھے دے اور خود کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جا۔ ورنہ وہ تجھے ایسے ہی تنگ کرتی رہے گی۔''

چاندنی نے بڑبڑاتے ہوئے غصے سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شاہدے کی لائی ہوئی سوغات وصول کر لی۔ جگو نے دیکھا کہ وہ امپورٹڈ شراب کی بوتل ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ چاندنی کی ایک رات کے بدلے اس نے چندا بائی کو جو موٹی رقم بھجوائی تھی، اس کے بعد وہ اس خاطر مدارات کا حق دار تھا۔

''معافی چاہتی ہوں، ہمارے یہاں آئے ہوئے مہمانوں کو اس طرح ڈسٹرب کرنے کا رواج تو نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیوں بائی جی اکثر میرے ساتھ ایسی بھول کر جاتی ہیں۔'' وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹی اور ایک تپائی پر جہاں پہلے ہی بلوریں جام رکھے ہوئے تھے، بوتل دھرتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے برا نہیں لگا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اور بائی جی کے درمیان کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔'' جگو نے ہوشیاری سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''ہمارا جھگڑا تو ہمیشہ چلتا ہے۔ میں گھر سے سوچ کر نکلی تھی کہ فلمی ہیروئن بنوں گی لیکن پھنس گئی اس بائی کے چکر میں۔ اس نے عزت دار گھرانے کی لڑکی کو طوائف بنا ڈالا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی بے بسی کے ساتھ اس سے نفرت بھی نہ کروں تو کیا کروں؟''

اُس کی مختصر سی وضاحت میں اُس کی پوری کہانی سامنے آ گئی تھی۔ وہی لڑکیوں کا اسکرین پر ناچتی تھرکتی پریوں کو دیکھ کر ان جیسا بن جانے کی خواہش میں ماں باپ کے گھر کی محفوظ و مامون چار دیواری کو چھوڑ کر آدمی نظر آنے والے درندوں کے چنگل میں پھنس جانا اور اندھی خواہش کی تکمیل کے بجائے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھنا۔ چاندنی کی کہانی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو وہ اس سے تفصیلات جاننے کی خواہش کرتا۔ اگر کچھ محسوس ہوا تو اس کا اور شاہدے کا تعلق۔ اس نے شاہدے کی نظروں میں اپنے لیے نفرت بھی دیکھی تھی اور کچھ دیر قبل دروازے پر ہونے والی ان دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے۔



''تمہاری کہانی جان کر افسوس ہوا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ماں باپ کی عزت کی پروا کیے بغیر گھر کی دہلیز پار کر جانے والیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم تو پھر بھی خوش قسمت ہو کہ یہاں اس ماحول میں تمہیں شاہدے جیسا ہمدرد ملا ہوا ہے جو تمہارے لیے کچھ نہ بھی کر سکے لیکن تمہارے ساتھ تمہارا غم تو بانٹتا ہی ہے۔''

اپنے قائم کیے ہوئے اندازے کی بنیاد پر کہی جانے والی بات کا ردِعمل اس نے چاندنی پر پوری طرح محسوس کیا۔ وہ جو جام تیار کرنے کے لیے روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی اور آئس کیوبز نکال رہی تھی، چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہاں شاہد میرا ہمدرد ہے؟''

''یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کی نظروں میں اپنے لیے نفرت بھی تھی اور ظاہر ہے وہ اس لیے تھی کہ میں تمہارا کسٹمر ہوں۔'' اس نے بغیر لاگ لپٹ کے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' وہ ریفریجریٹر کے پاس سے ہٹ کر تپائی تک آ گئی اور مہارت سے جام تیار کرنے لگی۔ کوٹھے پر ملنے والی تربیت میں یقیناً اسے یہ کام بھی سکھایا گیا تھا۔

''میری طرح شاہد بھی اس کوٹھے کی پیداوار نہیں ہے۔ اسے اور اس کی بڑی بہن کو چند غنڈوں نے بچپن میں اغوا کر کے بائی جی کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ بائی نے اس کی بہن کو طوائف بنا ڈالا اور اسے کوٹھے کا خدمت گار۔ یہ طبلہ وغیرہ اچھا بجا لیتا ہے لیکن ہے تھوڑا اڑیل۔ کبھی بجانے پر راضی نہ ہو تو بائی جی بھی اس کو رام نہیں کر پاتی۔ جب سے اس کی بہن مری ہے، اس نے طبلے کو ہاتھ لگانا بالکل چھوڑ دیا ہے اور بس اوپر کے کام کر دیتا ہے۔''

اسے جام پیش کر کے وہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی جسے سن کر جگو کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس لڑکی کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے لیے اس حد تک کارآمد ثابت ہو گی۔ بس ایک اندازہ تھا کہ وہ اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور کہیں باہر سے لائی گئی ہے اس لیے اس سے کچھ اُگلوانا آسان ثابت ہو گا۔

''اس کی بہن وہی ہے نا جو پیر آباد کے چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں مری تھی؟'' اس نے اچانک ناسوال داغا جس پر چاندنی نے بے اختیار ہی اثبات میں سر ہلا دیا پھر گھبرا کر خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے تم ایک ہمدرد سمجھ لو۔ میں جانتا ہوں کہ چودھری کی حویلی میں شاہد کی بہن حادثاتی موت نہیں مری بلکہ اُسے قتل کیا گیا تھا۔ قتل کرنے والا با اختیار اور دولت مند تھا اس لیے اُس نے چندا بائی کا منہ نوٹوں سے بھر کر اسے خاموش کروا دیا۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا شاہد بھی اس قتل پر خاموش رہے گا؟..... کیا اس کے دل میں خواہش نہیں ہے کہ اپنی بہن کے قاتل کو اس کے کیے کی سزا دلوائے؟''

''وہ اپنی بہن کی موت پر بہت دُکھی ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ قاتل انجام کو پہنچے لیکن ایک طاقتور اور اختیار و ڈیرے کے مقابلے میں اُس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ اس کوٹھے پر پلا بڑھا ہے اور یہاں سے باہر کی دنیا کو بہت کم جانتا ہے۔ تھانے کچہری تک اس بے چارے کی پہنچ ہی کہاں ہے جو انصاف حاصل کرنے کے لیے کچھ کر سکے۔ اگر فرض کریں کہ وہ وہاں تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے گواہی کون دے گا؟ یہاں سب بائی سے ڈرتے ہیں اور اس کے ڈر سے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔'' چاندنی نے اسے ان

PAKISTANIPOINT

حقائق سے آگاہ کیا جن سے وہ بہ خوبی واقف تھا۔

''کیا تم بھی شاہد کی خاطر گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہو گی؟ وہ تمہیں اتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ تمہارے لیے آنے والے گاہکوں سے نفرت محسوس کرتا ہے۔ جواب میں تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی کیا؟'' جگو نے اس سے ذرا کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

''میں ایسا کر کے خود کہاں جاؤں گی؟ میرے پاس بھی تو اس کوٹھے کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

''اور اگر ہم تمہیں وہ ٹھکانا فراہم کر دیں پھر؟''

''ہم..... یعنی کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں؟'' وہ اس کی بات سن کر چونکی۔

''ہاں۔ بلکہ سمجھو کہ اس کے پیچھے اصل لوگ کوئی اور ہیں۔ میں تو صرف ان کے لیے کام کر رہا ہوں۔'' جگو نے اعتراف کرنے میں حرج نہ سمجھا۔

''کیا وہ چودھری کے مخالف وڈیرے ہیں؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''نہیں۔ وہ قانون کے محافظ ہیں اور تمہیں اور شاہد کو تحفظ دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔''

''اُف میرے اللہ! آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ قانون کب چودھری جیسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے؟'' وہ بے یقینی کا شکار ہوئی۔

''ہر جگہ کچھ اچھے اور ایمان دار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ میں تمہیں اور شاہد کو ایسے ہی لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' جگو نے اسے سمجھایا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس کیس میں تمہاری مدد حاصل کرنے کے علاوہ وہ لوگ دونوں کے مستقبل کے لیے بھی کوئی اچھا انتظام کر دیں گے۔ کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ تم دونوں اس گند سے دُور کسی پُرسکون گھر میں ساتھ رہو؟''

''آپ تو حسین خواب دکھا رہے ہیں۔ مجھ سے زیادہ شاہد ان باتوں کو سن کر خوش ہو گا۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہاں سے نکل سکے۔ مینا کے مرنے کے بعد تو وہ مجھ سے مسلسل اسی خواہش کا اظہار کرتا رہا ہے۔ کہتا ہے بہن کے بعد تمہیں نہیں کھونا چاہتا لیکن یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا نا۔ ابھی وہ خاصا کم عمر ہے۔ آپ کو معلوم ہے، وہ عمر میں مجھ سے ایک دو سال چھوٹا ہی ہے لیکن بس یہ اندھی محبت ہے، اس فرق کو نہیں دیکھتی۔ یہاں کوٹھے پر سب جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اسی لیے کمبخت چنداول اُسے اذیت دینے کے لیے خاص طور پر میرے کسٹمرز کی خدمت سونپ دیتی ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اسے بتاتی چلی گئی۔

''بس تو تھوڑی سی ہمت کرو اور کل دوپہر میں تم دونوں کسی بہانے سے یہاں سے نکل کر محلے کے پہلے پڑنے والے پہلے چوک تک پہنچ جاؤ۔ میں گاڑی لے کر وہاں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔'' لوہا گرم دیکھ کر جگو نے فوراً چوٹ لگائی۔

''نہیں، چوک پر نہیں۔ وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں محلے کا کوئی بھی فرد ہمیں آپ کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ میں ایسا کروں گی کہ کل شاہد کے ساتھ خریداری کے بہانے مارکیٹ آ جاؤں گی۔ آپ ٹھیک چار بجے بوچاٹ والے کے اسٹال پر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ اور ہاں، مجھے اپنا موبائل نمبر بھی دے دیں اگر کسی وجہ سے کل ہم وہاں نہ پہنچ سکے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں گی۔'' چاندنی نے کہا تو جگو نے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے اپنا موبائل نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ خوش تھا کہ عمیر آفندی نے اسے جو کام



سونپا تھا، اسے خوش اسلوبی سے انجام دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

⊛----✪----⊛

''تم نے جن لوگوں کے نام پتے مجھے لکھوائے تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی منظر پر موجود نہیں ہے۔ کوئی دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا ہوا ہے، کوئی بیرونِ ملک طبّی معائنے کے لیے اور کوئی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے۔ کسی کی گاؤں میں بیٹھی ماں بیمار ہو گئی ہے تو کسی کی بیوہ بہن کو بھائی کی اشد ضرورت ہے۔ کچھ کے گھر والوں نے مکمل لاعلمی ظاہر کی ہے کہ وہ نہیں جانتے ہمارا مطلوبہ شخص کہاں ہے۔ جن کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان حالات میں تمہاری مہیا کردہ فہرست تو بالکل بیکار ہو گئی ہے۔'' جاوید علی، عالیہ کے روبرو بیٹھا اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کر رہا تھا۔

''لیکن اس سے یہ تو تصدیق ہو جاتی ہے نا کہ میں نے تمہیں جو نام، پتے دیے تھے، وہ کتنے اہم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے کی وجہ سے اُن لوگوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہو گا اس لیے کہ اُنہیں ڈر ہو گا کہ میں کسی کے ہتھے لگ چکی ہوں اور ذرا سے تشدد سے اور زور زبردستی کے نتیجے میں سب اُگل سکتی ہوں۔'' عالیہ نے بڑا مدلل جواب دیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں دوبارہ ان کے منظر پر آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں فوری طور پر ان ملک دشمنوں کو نیست و نابود کر دوں۔''

اسے معلوم تھا کہ کسی کے لیے بھی ساری زندگی انڈر گراؤنڈ ہو کر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بس موقع بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر دوبارہ منظر پر آ جاتے ہیں۔ عالیہ کی فراہم کردہ فہرست میں تو کئی نام ایسے تھے جن کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ بھلا کب تک چھپ کر بیٹھتے۔ انہیں ایک دن سامنے تو آنا ہی تھا لیکن اس کے بھڑکتے جذبات اس انتظار کے متحمل نہیں تھے۔

''اس سلسلے میں میرے پاس ایک کلیو ہے۔ معلوم نہیں کام آتا بھی ہے یا نہیں لیکن پھر بھی ایک شخص اشفاق رانا کے بارے میں مجھے اندازہ ہے کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کا وہ ٹھکانہ اتفاق سے میری نظروں میں آ گیا تھا۔ میری ایک دوست صبا ہے جو میری ہی طرح تنہا ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں پرسنل سیکرٹری کی جاب کرتی ہے اور شام ڈھلے ہی وہاں سے واپس آتی ہے۔ کبھی کبھی نہیں بھی آ پاتی۔ میری مصروفیت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی اس لیے ہم کم کم ہی ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے اکٹھے ہو پاتے تھے۔ ایک دن صبا فارغ تھی تو اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں انوائٹ کر لیا اور یہ اتفاق تھا کہ میں نے اس کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں اشفاق رانا کو ایک خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ صبا سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک ایئر ہوسٹس ہے اور وہاں تنہا رہتی ہے لیکن اشفاق رانا کا وہاں کثرت سے آنا جانا ہے۔ اکثر رات کے اوقات میں بھی وہ وہاں ٹھہرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے ایئر ہوسٹس سے خفیہ شادی کر رکھی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ شہر سے باہر نہیں نکلا ہے تو پھر اسی ایئر ہوسٹس کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرا ہو گا کیونکہ اس کی دانست میں اُس کے اس ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں ہے۔''

''یہ تو تم نے بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ اشفاق رانا اگر وہاں نہیں چھپا ہوا، تب بھی اس کی چہیتی کو معلوم ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم اُس سے اُگلوا لیں گے۔''

عالیہ کی فراہم کردہ معلومات پر وہ کھل اُٹھا اور اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھانے کے لیے اس سے سوالات کر کے مزید معلومات حاصل کرنے لگا۔

کام کی تمام باتیں معلوم کر لینے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر لائحہ عمل طے کیا اور ذیشان سے اجازت طلب کرنے کے بعد وہ لوگ ضروری تیاریوں کے بعد اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس جس کا نام عالیہ نے شاہین بتایا تھا، اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے کے لیے انہوں نے سوئی گیس کمپنی کے نمائندوں کا بھیس اپنایا تھا۔ بلڈنگ کے چوکیدار کو انہوں نے یہی بتایا کہ فلیٹ C-30 سے ان کی کمپنی کو کمپلین موصول ہوئی ہے کہ اپارٹمنٹ میں کسی مقام سے گیس لیک ہو رہی ہے اس لیے وہ کمپنی کی طرف سے چیک کرنے آئے ہیں کہ لیکج کس جگہ سے ہو رہی ہے۔ اس وضاحت کے بعد چوکیدار نے ان کے اندر جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

C-30 سیکنڈ فلور پر تھا۔ جاوید علی اور اس کا ساتھی لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہ اپارٹمنٹ پروجیکٹ اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ ہر بلاک کے ایک فلور پر صرف دو ہی اپارٹمنٹ تھے۔ ان کے مطلوبہ اپارٹمنٹ C-30 کے مقابل موجود C-29 عالیہ کی دوست صبا کا تھا جو مبینہ طور پر اس وقت اپنی جاب پر گئی ہوئی تھی اس لیے انہیں اپنی کارروائی انجام دینے میں کسی ڈر اور جھجک کا سامنا نہیں تھا۔

C-30 کے سامنے پہنچ کر جاوید علی کے ساتھی نے ڈور بیل بجائی جس کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور مجبوراً اسے دوسری دفعہ بیل بجانی پڑی۔ اس بار قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز نے غنودہ سی آواز میں دریافت کیا کہ دروازے پر کون ہے۔

وہ لوگ صبح سویرے نہیں پہنچے تھے لیکن آواز سے ظاہر تھا کہ اسے گہری نیند سے جگایا گیا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ فلائٹ سے واپس آ کر اپنی نیند پوری کر رہی تھی یا پھر گزری شب کسی اور وجہ سے جاگنے کے باعث اس وقت سو رہی تھی۔

''میں نے ایسی کوئی کمپلین نہیں کروائی۔ میرے اپارٹمنٹ میں گیس کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' ان کی طرف سے آمد کی وجہ بتائے جانے پر اس نے جواب دیا۔

''آپ معلوم کر لیں میڈم! ہو سکتا ہے گھر کے کسی اور فرد نے کمپلین لکھوائی ہو۔'' جاوید علی نے مہذبانہ لہجے میں اس سے درخواست کی۔

''یہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ اس لیے کسی اور کے کمپلین کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ان پیپرز پر سائن کر دیں تاکہ ہمارے پاس ریکارڈ رہے کہ ہم کمپلین پر یہاں آئے تھے۔'' جاوید علی نے کسی ایسے ملازم کے لہجے میں ہی اس سے التجا کی جسے واپس جا کر اوپر والوں کو رپورٹ دینی ہو۔

''اوکے، میں کر دیتی ہوں۔'' اس نے بیزار سے لہجے میں کہا اور ان کے تیز کانوں نے لاک ہٹائے جانے کی آواز سنی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چوکنے ہو گئے۔

''عجیب ملک ہے۔ جب کمپلین کرواؤ تو کوئی آتا نہیں اور اب بغیر کمپلین کے ہی سر پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔'' اس نے بڑبڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا۔ لیکن اگلے لمحے ہکا بکا رہ گئی جب وہ اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اس سے قبل کہ وہ چیخنے کے لیے منہ کھولتی، جاوید علی نے اس کا منہ آہنی ہاتھ میں جکڑ کر بند کر



دیا۔ دوسری طرف اس کے ساتھی نے اس دوران دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب اگر باہر سے کوئی گزرتا بھی تو اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی محسوس ہوتا۔

''اندر چیک کرو۔'' جاوید علی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چوڑا ٹیپ نکال کر مہارت سے شاہین کے ہونٹوں پر چپکاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ جبکہ جاوید علی نے اس جگہ کھڑے کھڑے بری طرح مچلتی شاہین کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس کی کلائیوں کو آپس میں ملا کر ان پر ٹیپ لپیٹ دیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔

اچھے خاصے کشادہ لاؤنج میں کھلنے والے پہلے دروازے سے ہی اسے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی جسے سن کر اس کا دل اُچھل پڑا۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود ہے ایسے وہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کیے بغیر سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ شاہین سمیت اس کمرے میں داخل ہو کر جب اس نے بدن پر صرف ایک جانگیا پہنے کھڑے شخص کو دیکھا تو کھل اٹھا۔

اشفاق رانا ایک نامور وکیل تھا جو حقوقِ نسواں کے لیے کام کرنے والی ایک این جی او کے ساتھ منسلک تھا۔ جاوید علی نے ٹی وی اور اخبارات میں اس کے بیانات سنے اور پڑھے تھے۔ اس کی باتوں کو سن کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ عورتوں کی حمایت میں اس قدر بولنے والا شخص حقیقت میں کیا تھا۔ حقیقت تو وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ عورتوں کا حمایتی ایک خوب صورت لڑکی کی خواب گاہ میں نیم برہنہ حالت میں کھڑا تھا اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس کی خفیہ بیوی ہی تھی یا کوئی داشتہ۔ بہرحال وہ اس وقت تو اس بات پر خوش تھا کہ عالیہ کا دیا کلیو بیکار نہیں گیا تھا اور وہ لوگ اشفاق رانا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟..... اگر روپیہ اور زیور چاہتے ہو تو سب لے جاؤ لیکن ہم لوگوں کو کچھ مت کہنا۔'' اپنی محبوبہ کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ویسے گھبرا تو وہ پہلے ہی گیا تھا کہ ایک خوف ناک پسٹل کی نال اس کی طرف اُٹھی تھی اور اس نے یہی گمان کیا تھا کہ دن دہاڑے وہاں ڈاکو گھس آئے ہیں۔

''بکواس بند کرو۔ ہمیں یہاں سے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ اپنی حرام کی دولت تم اپنی داشتاؤں کو خوش رکھنے کے لیے سنبھال کر رکھو۔ ہمیں اپنی خون پسینے کی کمائی کافی ہے۔''

جاوید علی نے غرا کر کہا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ آنے والے ڈاکو ہوتے تو وہ دھن دولت دے کر بچ جاتا لیکن یہاں تو تیور بتا رہے تھے کہ یہ وہی ہیں جن سے بچ کر چھپنے کی تاکید کی گئی تھی اور اپنے تئیں وہ سب سے خفیہ ٹھکانے پر آ گیا تھا جہاں وہ اپنی روپوشی کے ایام رنگینی سے گزار سکتا تھا لیکن معاملہ بہت جلد رنگین سے سنگین ہو گیا تھا۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں ایک معزز آدمی ہوں اور اس شہر میں میری بہت عزت ہے۔''

''عزت دار آدمی اس طرح منہ چھپا کر عورتوں کی آغوش میں نہیں آ بیٹھتے جیسے تُو آ بیٹھا ہے۔'' جاوید علی نے نفرت سے کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

''تمہیں میرے ساتھ یہ سلوک بہت مہنگا پڑے گا۔ میرا اس شہر میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ میری ایک پکار پر ساری وکیل برادری تمہارے خلاف اُٹھ کھڑی ہو گی۔'' وہ تھپڑ کے زور سے ہل کر رہ گیا تھا۔ اس نے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اسے دھمکی دی۔

''ہم تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نکلنے دیں گے تب نا۔ تمہاری وکیل برادری کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا

کہ وہ جو عزت مآب اشفاق رانا صاحب ہوا کرتے تھے، انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔'' وہ بھلا کہاں اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا تھا۔ نہایت طنز سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر نہایت آسانی سے بڑی بڑی باتیں بنانے والے طرم خان کو قابو کر کے اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔

محترمہ شاہین تو پہلے ہی اپنی پرواز بھول کر ایک طرف سہمی کھڑی تھیں۔ جاوید کے ساتھی فیصل نے اشفاق رانا کو مناسب طریقے سے بٹھانے میں اس کی مدد کی۔ اب اشفاق رانا کے صرف منہ پر ٹیپ نہیں چپکا ہوا تھا بلکہ ہاتھ پاؤں بھی اسی ٹیپ میں لپٹ کر بے بس ہو گئے تھے۔ وہ صرف ایک عدد جانگیے میں فرش پر اکڑوں بیٹھا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

''ایسا کرو کہ ان خاتون کے بھی پاؤں باندھ کر انہیں دوسرے کمرے میں پہنچا دو کیونکہ اب اس کمرے میں جو کچھ ہوگا، یہ شاید اسے برداشت نہ کر سکیں۔'' اس نے سرد لہجے میں فیصل کو حکم دیا جس نے فوراً ہی خوف سے پھٹ جانے والی آنکھوں کے ساتھ مہین سے شب خوابی کے لباس میں صاف دِکھتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بنی شاہین کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔

اس کام کو انجام دیتے ہوئے اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ وہ کسی طور اس قابل نہ رہے کہ باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلا سکے۔ باہر سے کسی سُن گُن لینے کا اس لیے سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ فلور پر موجود واحد فلیٹ میں کوئی موجود نہیں تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے جن کی وجہ سے کسی کے دُور سے بھی کچھ دیکھ لینے کا امکان نہیں تھا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ واپس خواب گاہ میں آیا تو جاوید علی اپنی کارروائی شروع کر چکا تھا۔ اس کی جارحیت کے باعث تڑپتا، لوٹ پوٹ ہوتا اشفاق رانا بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں لیکن منہ پر ٹیپ لگا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلا نہیں سکتا تھا۔

''بتاؤ وہ کون لوگ ہیں جنہیں تم معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر پیش کرتے ہو اور وہ لڑکیاں ساری زندگی کے لیے اپنی اصل شخصیت کو کھو کر ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں؟''

اس کے قہرناک لہجے میں کیے گئے سوال کے جواب میں اشفاق رانا نے سر کو دائیں بائیں اس طرح جنبش دی جیسے خود پر لگائے جانے والی فردِ جرم سے انکار کر رہا ہو۔

''تمہارے پاس جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے رانا! تمہیں صرف سچ بولنا ہے۔ کیونکہ دیبا مساج سینٹر میں کام کرنے والی تمہاری آلۂ کار عالیہ ہمارے قبضے میں ہے اور ہم اس سے بہت کچھ اُگلوا چکے ہیں۔''

اُس نے اس انداز میں اشفاق رانا کو یہ حقیقت بتائی جیسے عالیہ سے حقائق معلوم کرنے کے لیے اُنہیں اُس پر خاصا تشدد کرنا پڑا ہو۔ اپنے الفاظ کا ردِعمل اس نے اشفاق رانا کے چہرے پر دیکھا جو زرد پڑ گیا تھا۔

''اچھی طرح سوچ لو رانا! ہم نے عالیہ کو عورت ہونے کی رعایت نہیں دی تو تم جیسے سانڈ کو کیسے معاف کر سکتے ہیں؟''

اشفاق رانا کو دباؤ میں آتا محسوس کر کے اس نے مزید سنگین لہجے میں اسے دھمکایا۔ جواب میں اس نے سر کو یوں جنبش دی جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو

جاوید نے فیصل کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے منہ پر سے ٹیپ ہٹا دے۔

''تم نے عالیہ کے ساتھ کیا، کیا؟'' ٹیپ ہٹتے ہی اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اُسے پار لگا دیا۔'' جاوید علی نے سفاک انداز میں جواب دیا۔



''لیکن کیوں؟..... جب اس نے تمہیں ساری معلومات فراہم کر دی تھیں تو پھر تم نے اسے کیوں مارا؟ ہمارے ساتھ بھی تم ایسا ہی کرو گے؟'' اس کے لہجے میں احتجاج، خوف اور شک سب تھا۔

''اس نے بتانے میں بہت دیر لگائی تھی۔ اس دوران اس کے جسم پر اتنے زخم لگ چکے تھے کہ وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مر گئی۔'' اس نے بے نیازی سے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر لہجے کو مزید خوفناک بناتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے بھی دیر کی تو تمہاری جان بھی اسی طرح جا سکتی ہے۔''

''نہیں پلیز۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اشفاق رانا کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی ہو چکی تھی، عالیہ کا انجام سن کر وہ مزید ڈھیلا پڑ گیا۔ اپنی کیٹگری سے تعلق رکھنے والے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی فطرتاً بزدل تھا اس لیے ایک حد تک ہی دباؤ برداشت کر سکا اور فرفر بولنا شروع ہو گیا۔

''مجھے اس کام کے لیے پامیلا نامی ایک عورت نے راضی کیا تھا۔ لگ بھگ پندرہ سال قبل وہ مجھے ایک پارٹی میں ملی تھی۔ اس پارٹی میں وہ کسی سرکاری افسر کے ساتھ بطور پرسنل سیکرٹری شریک ہوئی تھی۔ ہاں سب اسے مس پامیلا کہہ کر پکار رہے تھے لیکن بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی کنواری لڑکی نہیں بلکہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ بہرحال پارٹی میں تو ہماری بس ایک خوشگوار ملاقات ہی ہوئی تھی اور ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ فون نمبرز کے تبادلے کر لیے تھے۔ کچھ دن بعد پامیلا نے خود مجھ سے رابطہ کر کے کہیں ملاقات کرنے کی فرمائش کی۔ اس ملاقات میں وہ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے میری سماجی خدمات کو سراہا اور پھر نہایت خوب صورتی سے گفتگو کو اس ڈھب پر لے آئی کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے سب معلوم تھا کہ میری این جی او کو کہاں سے فنڈز ملتے ہیں اور میں کس کے کہنے پر زیادہ تر ایسے کیسز پر کام کرتا ہوں جن کی مدد سے پاکستان کا نام بدنام کیا جا سکے۔

میں اس کام میں ماہر تھا کہ کیسے عورت کے ساتھ ہونے والی چھوٹی سی زیادتی کو بہت بڑا ایشو بنا کر دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میرے میڈیا میں بھی گہرے روابط تھے جن کی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ کہیں سے کوئی چٹ پٹی خبر مل جائے جس کی بنیاد پر وہ اپنے ناظرین کو متوجہ کر سکیں۔ پامیلا نے مجھ سے کہا کہ اپنا یہ دھندا جاری رکھوں اُسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ایک بڑی رقم کے عوض مجھ سے ایسی لڑکیاں فراہم کرنے کی فرمائش بھی کی جن کا آگے پیچھے کوئی پوچھنے والا نہ ہو اور وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکے۔ بس اس دن کے بعد سے میں اس کا بزنس پارٹنر بن گیا۔ وہ میرے اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقوم ٹرانسفر کرتی رہی اور میں اس کی فرمائش کے مطابق لڑکیاں فراہم کرتا رہا۔ عالیہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔'' وہ سر جھکا کر ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

جاوید علی کا دل چاہا کہ کسی دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر توڑ دے لیکن خود پر ضبط کر گیا کہ ابھی اسے اس سے مزید معلومات حاصل کرنا تھیں۔

''پامیلا ہمیں کہاں مل سکتی ہے؟'' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب تک وہ جوان تھی، ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے لیکن پھر میرے لیے اس کی کشش ختم ہو گئی۔ اصل میں جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، تب بھی وہ کوئی ایسی جوان نہیں تھی۔ پینتیس سے تو اوپر ہی کی ہو گی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لیکن ظاہر ہے، عمر کب تک چھپتی ہے۔ پتہ چلنے لگا کہ وہ کوئی جوان لڑکی نہیں بلکہ ڈھلتی عمر کی عورت ہے۔ اس نے خود بھی پارٹیز میں شرکت کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت محسوس

ہوئی تھی اس لیے میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔''

''جھوٹ بولتا ہے اُلّو کی دُم۔'' اُس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتا اور پرکھتا جاوید علی آخری جملوں سن کر طیش میں آیا اور اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کا گال اندر سے پھٹ گیا اور ساتھ ہی ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے بے ساختہ ایک زوردار چیخ مارنی چاہی لیکن قریب ہی کھڑے فیصل نے اس کا منہ زور سے دبوچ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

''اگر تجھے اُس کا پتہ ٹھکانہ معلوم نہیں ہے تو پھر تُو لڑکیاں پھانسنے کے بعد اُنہیں سپلائی کیسے کرتا ہے؟'' جاوید علی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک تھپڑ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنا بھاری بوٹ والا پیر اس کے بندھے ہوئے پیروں کے یکجا پنجوں پر اس طرح رکھ دیا کہ پورا وزن ڈال دیا اور اس کے کھڑے پنجے بری طرح مڑ گئے اور وہ یوں تڑپ اُٹھا جیسے کوئی ہڈی چیخ گئی ہو لیکن اس بار بھی اس کی چیخ کو منہ سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں دیا گیا۔

''یاد رکھ رانا!..... تُو نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دیا تو اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔'' اس نے وحشت بھرے انداز میں اس طرح دھمکی دی کہ رانا کی رہی سہی ہمت ختم ہوگئی اور وہ سر کو یوں حرکت دینے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

جاوید علی نے ایک لمحے کو اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پیلے پڑ جانے والے رخساروں کو تکلیف کی شدت سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں نے تر کر دیا تھا۔ وہ کہیں سے وہ شخص نہیں لگ رہا تھا جسے سونڈ بونڈ ٹی وی اسکرین پر بولتے دیکھ کر لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔ اس نے فیصل کو اس کے منہ سے ہاتھ ہٹانے کا اشارہ کیا۔

''پپ..... پانی..... مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔'' اس نے بھیک مانگنے والوں کی طرح عاجزی سے درخواست کی۔

اُس کی درخواست پر جاوید علی خود آگے بڑھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیل کر اس کے قریب آیا۔ یہ صرف ایک گھونٹ پانی تھا جسے پی کر رانا کسی کتے کی طرح ہانپنے لگا اور نہایت لجاجت سے مزید پانی پلانے کی درخواست کی۔

''مزید پانی تمہیں اس وقت ملے گا، جب تم مجھے پامیلا کے بارے میں معلومات فراہم کرو گے۔'' جاوید علی نے اٹل لہجے میں شرط عائد کی۔

''اُس کا پتہ واقعی مجھے نہیں معلوم ہے۔ لیکن ایک فون نمبر ہے جس پر میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ رابطہ ہونے پر وہ لڑکی کے بارے میں جو ہدایات دیتی ہے، میں ان پر عمل کرتا ہوں۔''

''فون نمبر بتاؤ۔'' جاوید علی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہ میرے موبائل میں پامیلا کے نام سے فیڈ ہے۔'' اس نے شرافت سے بتایا تو جاوید علی نے فیصل کو اشارہ کیا۔ رانا اور شاہین دونوں کے ہی موبائل فون اس کے قبضے میں تھے۔ فیصل نے فوراً رانا کا موبائل چیک کرنا شروع کر دیا۔

''اس میں پامیلا کے نام سے ون اور ٹو کر کے دو نمبر فیڈ ہیں۔'' فون کا بک لاگ چیک کر کے فیصل نے فوراً ہی بتایا۔

''پامیلا ٹو والا نمبر اس کے استعمال میں ہے۔ پامیلا ون ایک پی ٹی سی ایل نمبر ہے جو کبھی اس میرے بیورو میں ہوتا تھا جس کی آڑ میں وہ اپنی لڑکیوں سے دھندا کرواتی تھی۔ بعد میں وہ میرج بیورو بند کر کے منظر



سے بالکل غائب ہوگئی تھی۔''

''میرج بیورو کا پتہ اور پامیلا کا حلیہ دونوں بتاؤ۔ اور یہ بھی کہ اُسے میرج بیورو بند کیے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' جاوید علی نے دریافت کیا۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے، پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔''

''نہیں، پہلے میرے سوالوں کے جواب دو۔'' اس نے قطعی جواب دیا اور کرید کرید کر مزید تفصیلات معلوم کرنے لگا۔

رانا کو مجبوراً اس کے سوالوں کے جوابات دینے پڑے۔ جب جاوید علی کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں رہا ہے تو اس نے سوالات کا سلسلہ روک دیا اور گلاس بھر کر پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بے تابی سے پورا پانی پی گیا۔

''اُمید ہے تمہاری پیاس بجھ گئی ہوگی۔ ہم اتنے بے رحم بھی نہیں کہ مرنے والے کی آخری خواہش بھی پوری نہ کریں۔''

سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کمرے کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ رانا کے کچھ سمجھنے سے قبل فیصل نے اس کے ہونٹوں پر دوبارہ ٹیپ چپکا دیا اور اپنی جیب سے بے آواز پسٹل نکال کر اس کی کھوپڑی میں دو گولیاں اُتار دیں۔

شیطانی دماغ رکھنے والا جو بہت بڑی بڑی باتیں کرتا تھا، نہایت خاموشی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

جاوید علی کو معلوم تھا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہوگا اس لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ رانا جیسے غدار اور بدکردار لوگ اس کے لیے اتنے قابلِ نفرت تھے کہ وہ بلا ضرورت ان جیسوں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

''ہم تمہارے پیر کھول کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے جو کر سکتی ہو، کر لینا۔'' اس کے حکم پر فیصل نے برابر والے کمرے میں بند شاہین کے پیروں کو آزاد کیا اور دروازہ بند کر کے جاوید علی کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔

لفٹ میں پہنچ کر ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود باریک دستانے اُتار کر واپس جیبوں میں ٹھونسے اور گراؤنڈ فلور پر لفٹ پہنچنے پر اطمینان سے باہر نکل کر چوکیدار کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس گاڑی میں جا بیٹھے جس پر گیس کمپنی کا لوگو بڑا واضح بنا ہوا تھا۔

ان کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ ساتھ ہی وہ تینوں اپنے حلیے میں تبدیلی لانے کے لیے استعمال کی جانے والی چیزیں ایک ایک کر کے خود سے الگ کرتے چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ پیر آزاد ہونے کے باوجود شاہین کو اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے اور کسی کو متوجہ کرنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا اور جب وہ اور بلڈنگ کا چوکیدار وہاں آنے والے افراد کے حلیے پولیس کو بتائیں گے تو انہیں ان حلیوں کے افراد پورے شہر میں کہیں نہیں ملیں گے۔

⊛----✪----⊛

''کیا بوریت ہے باس!..... ایسے پڑے پڑے تو ہم کو زنگ لگ جائے گا۔'' سلّو نے شہریار سے شکوہ کیا۔ شہر میں سکیورٹی ہائی الرٹ ہونے کی وجہ سے کلام نے فی الحال کوئی بھی کارروائی کرنے سے منع کیا تھا اس

لیے وہ تقریباً ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ کوئی مصروفیت تھی تو بس یہ کہ صبح جاگنگ کے لیے قریبی پارک میں چلے جاتے یا دن میں کسی وقت شہر کی تفریح گاہوں کا رخ کرتے۔ کیونکہ مستقل ہوٹل کے کمرے میں ٹھہرے رہنا بھی انہیں انتظامیہ کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا تھا۔

جاگنگ کرتے ہوئے دو بار کلام بھی ان سے آملا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ونود کی تلاش کو کامیابی سے ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور بلڈنگ میں ابھی تک کسی کو اس کے غیاب پر تشویش نہیں ہے۔ اس کی وجہ اُس کا طرزِ زندگی تھا۔ ایک تو وہ اکیلا رہتا تھا، دوسرے بنا کسی سے ذکر کیے اس طرح کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جانا اس کا معمول تھا اس لیے کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ دوسری طرف کلام، پریم ناتھ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے مطابق آج کل پریم ناتھ خود گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ''را'' نے اس کے محکمے والوں کا جینا مشکل کیا ہوا تھا اور وہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہی ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ اس کے گھر جانے کے اوقات مخصوص نہیں رہے تھے۔ ان حالات میں نائٹ کلبز اور ڈسکو میں جا کر تفریح کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اپنی یہ جھنجلاہٹ وہ اس طرح نکال رہا تھا کہ بے قصور شہریوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے نام پر اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان بے قصور افراد کو چھوڑنے کے لیے ان کے گھر والوں سے بڑی رقوم بھی وصول کی جا رہی تھیں۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ پولیس والوں کے سائے سے بھی بھڑکنے لگے تھے۔ کلام کی فراہم کردہ ان معلومات کی تصدیق نیوز چینلز بھی کر رہے تھے اور اب حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ شہری پولیس کے رویے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میڈیا اُن کا ساتھ دے رہا تھا اور مبصرین صاف لفظوں میں اس اندھیر پر مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ حکام کو آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ شہریار بہت غور سے اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا اس لیے سلّو کا شکوہ سن کر مسکرایا اور بولا۔

''ذرا صبر کرو شہزادے! اب جلد ہی یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا اور ہم ہاتھ پیر چلانے کے لیے آزاد ہوں گے۔''

اُس کی یہ بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ دو دن بعد ہی کلام نے اُنہیں اطلاع دی کہ حالات سازگار ہیں اور پریم ناتھ اپنے سابقہ معمول پر واپس لوٹ چکا ہے۔ انہوں نے پہلے ہی خاصا انتظار کر لیا تھا اس لیے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی رات کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔

کلام کا آدمی ہنوز پریم ناتھ کی نگرانی کر رہا تھا اس لیے انہیں سادہ سی پلاننگ پر عمل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ کارروائی کے لیے انہوں نے ایک ایسی سڑک کا انتخاب کیا جہاں کلام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دن کے وقت بھی بہت کم گاڑیاں گزرتی تھیں اور رات میں تو مشکل سے ہی اِکا دُکا گاڑیوں کا گزر ہوتا تھا۔

اصل میں اس سڑک پر کچھ عرصہ قبل راہزنوں نے بڑی لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ وہ اچانک ہی اطراف کی جھاڑیوں سے نکل کر کسی گاڑی کو روک لیتے تھے اور گاڑی والوں کا سارا مال ہتھیا لیتے تھے۔ ایک آدھ بار وہ جوان عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور بعد میں ان عورتوں کی لاشیں ہی ملی تھیں۔ چنانچہ لوگوں نے ڈر کے مارے اس راستے پر سے گزرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راہزنوں کے اس چالاک گروہ نے بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر کہیں اور کا رُخ کر لیا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں موجود خوف ہنوز باقی تھا۔ چنانچہ رات کے وقت تو خصوصاً اس سڑک پر سفر کرنے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ پریم ناتھ چونکہ پولیس والا تھا اور اپنے ساتھ ایک گن



بھی رکھتا تھا اس لیے بلا خوف و خطر اس سڑک کا استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس سڑک کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کرنے کی صورت میں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔

انہوں نے پریم ناتھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اسی سڑک کا انتخاب کیا اور جب اس کے تعاقب میں آتے کلام نے انہیں اطلاع دی کہ وہ لوگ اس سڑک پر پہنچنے والے ہیں تو اپنا کام شروع کر دیا۔ ان دونوں کے پاس چوری کی دو عدد گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کو انہوں نے اس انداز میں سڑک پر کھڑا کر دیا کہ یہ دونوں گاڑیاں کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہوں۔ پھر خود آستینیں چڑھا کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے۔

ظاہر ہے، پریم ناتھ کی گاڑی وہاں پہنچی تو اس نے دور سے ہی یہ سارا منظر دیکھ لیا۔ پولیس والا ہونے کی وجہ سے اس کے لیے اس منظر کو نظر انداز کر کے گزر جانا ممکن نہیں تھا اور بالفرض وہ گزرنا بھی چاہتا تو دونوں گاڑیاں سڑک پر اس انداز میں کھڑی کی گئی تھیں کہ اس گاڑی کے لیے گزرنے کا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس کی گاڑی عین ان دونوں کے سامنے آ کر رک گئی۔

''اوئے، یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے؟'' پریم ناتھ کا گن مین اپنی گن لہراتا ہوا گاڑی سے برآمد ہوا اور رعب سے انہیں ڈپٹتے ہوئے بولا۔ پریم ناتھ نے البتہ گاڑی سے نیچے اُتر کر صورتِ حال کا جائزہ لینا اپنی افسرانہ شان کے خلاف سمجھا تھا۔

''دیکھیں سر! اس نے میری گاڑی کو سائیڈ ماری ہے۔ میں اس سے نقصان بھرنے کو کہہ رہا ہوں تو یہ اُلٹا مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

گن مین کی للکار سن کر پہلے تو وہ دونوں اس طرح چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہوئے جیسے اب تک انہیں سڑک پر کسی دوسری گاڑی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ پھر شہریار نے لہجے میں مظلومیت بھرتے ہوئے اس سے شکایت کی۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ سالا نشے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جھونک میں میری گاڑی کو سائیڈ مار بیٹھا۔ آپ قریب آ کر دیکھیں، اس کے منہ سے شراب کی کتنی گندی بُو آ رہی ہے۔ سالے ٹھرکی نے میری گاڑی کی ایسی تیسی کر دی۔ یہ دیکھیں کیا حشر ہو گیا ہے گاڑی کا۔''

شہریار کے عاجزانہ لہجے کے مقابلے میں سلّو کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا اور وہ بہت غصے سے گن مین کو گویا اصل صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

دونوں کے بیانات سن کر تذبذب میں پڑ جانے والے گن مین نے خود گاڑیوں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور چند قدم آگے بڑھ کر ذرا جھک کر دیکھنا چاہا کہ کون سی گاڑی کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔

سلّو اور شہریار کو ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ سلّو قیامت بن کر اس کے سر پر ٹوٹ پڑا جبکہ شہریار نے اپنی گن کا رخ گاڑی میں بیٹھے پریم ناتھ کی طرف کر دیا۔

اس سارے منظر کو کسی تماشے کی طرح دیکھتے پریم ناتھ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال اس طرح پلٹ جائے گی۔ اس نے بے ساختہ ہی ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ایک گن کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی۔ یہ کلام تھا جو اس کی گاڑی کا تعاقب کرتا رہا اور کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر پیدل نہایت خاموشی سے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔'' اس نے غرّا کر پریم ناتھ کو دھمکایا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

''جلد جان جاؤ گے۔ ابھی تو گاڑی سے نیچے اُترو۔'' کلام نے سابقہ لہجے میں اسے جواب دیا جس پر وہ کسی مزاحمت کے بغیر گاڑی سے اُتر آیا۔ مزاحمت کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اسے سامنے ہی اپنی گن مین سڑک پر چت لیٹا نظر آ رہا تھا اور وہ خود خالی ہاتھ تین مسلح افراد کے نرغے میں تھا۔

''اگر تم کوئی لٹیرے ہو تو تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور مجھے نقصان پہنچا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔''

شاید اسے اچانک ہی وہ راہزن یاد آ گئے تھے جن کی اس سڑک پر لوٹ مار کرنے کی کہانیاں عام تھیں اس لیے ذرا سا سنبھالا لے کر انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔

''اپنا منہ بند رکھو۔ ہم نے تمہارا سب آگا پیچھا معلوم کر کے ہی تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' شہریار جو اس دوران ان کے نزدیک آ چکا تھا، سخت لہجے میں بولا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔

پریم ناتھ کے لیے یہ صورتِ حال بڑی گمبھیر تھی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح اُسے گھیرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ وہ کوئی اچھا ریکارڈ رکھنے والا پولیس افسر نہیں تھا۔ جہاں بھی رہا تھا، لوگوں پر ظلم و ستم ہی ڈھائے تھے جس کی حالیہ مثال بے گناہوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کی رہائی کے بدلے ان کے اعزا سے خطیر رقوم وصول کرنا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' اُسے گم صم کھڑا دیکھ کر شہریار نے گن سے ٹہوکا دیا۔ اس کا رخ کچھ فاصلے پر کھڑی کلام کی گاڑی کی طرف تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر شہریار نے اپنی جیب سے کلوروفام میں ڈوبا رومال نکالا اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر پریم ناتھ کی ناک پر رکھ دیا۔

اس اچانک حملے پر وہ ذرا سا مچلا لیکن پھر ہاتھ پیر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی شہریار نے اسے سنبھال لیا۔ اس دوران کلام تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کی ڈکی کھول چکا تھا۔ ڈکی میں وہی ایک سوٹ کیس رکھا تھا جو چند دن قبل اس نے دنود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ڈکی میں رکھے ہی اس نے سوٹ کیس کو کھولا اور تینوں نے مل کر پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کو اس میں منتقل کر دیا۔ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ مناسب مقدار میں آکسیجن اندر جاتی رہے۔

ڈکی بند کرنے کے بعد ان تینوں نے گاڑی میں اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کلام بیٹھا تھا جس نے گاڑی ریورس کر کے سڑک پر واپس موڑ لی۔ آگے ان کی دو گاڑیوں اور پریم ناتھ کی گاڑی نے مل کر سڑک بلاک کر دی تھی اس لیے اس سڑک پر آگے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاڑیاں چوری کی ہونے کی وجہ سے انہیں ان کی کوئی فکر نہیں تھی۔

ساری کارروائی کے دوران انہوں نے اپنے ہاتھوں پر ربڑ کے پتلے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے پریشانی بھی نہیں تھی کہ پولیس کو ان کے فنگر پرنٹس مل جائیں گے۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر بہت کامیابی سے پریم ناتھ کو اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ ان کی منزل کلام کا وہ فلیٹ تھا جو اس نے اسی قسم کی کارروائی کے لیے ایک نئے پروجیکٹ میں لے رکھا تھا۔

پروجیکٹ نیا ہونے کی وجہ سے ابھی وہاں بہت کم فلیٹ آباد ہوئے تھے اور کلام کا فلیٹ تو تھا بھی ٹاپ



فلور پر جہاں اس کے سوا ابھی تک کوئی دوسری فیملی نہیں آئی تھی۔ وہ خود بھی وہاں کبھی کبھی ہی جاتا تھا اور بلڈنگ کے چوکیدار کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص وہاں اس کا چہرہ شناس تھا۔

اب بھی وہ گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو چوکیدار نے اسے پہچان کر گاڑی کو کھلے دروازے سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ کلام نے گاڑی پارکنگ میں لے جا کر روکی اور پھر اس نے اور سلّو نے مل کر سوٹ کیس ڈکی سے باہر نکالا۔ سوٹ کیس پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس میں وِیل لگے ہوئے تھے اس لیے اسے ڈکی سے نکالنے کے بعد انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور اکیلا سلّو ہی اسے دھکیلتا ہوا کلام کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ شہریار بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

وہاں اوپر جانے کے لیے لفٹ موجود تھی۔ وہ تینوں سوٹ کیس سمیت لفٹ میں سوار ہوئے اور ایک بٹن دباتے ہی لفٹ نے انہیں چند لمحوں میں ٹاپ فلور پر پہنچا دیا۔ یوں پریم ناتھ بغیر کسی ہنگامے اور شور شرابے کے کلام کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

یہ لگژری فلیٹ تھا جو بناوٹ کے اعتبار سے تقریباً ساؤنڈ پروف تھا اور انہیں مزید سہولت یہ حاصل تھی کہ اس پڑوس میں کوئی آباد بھی نہیں تھا اس لیے وہ اپنی ساری کارروائی اطمینان سے انجام دے سکتے تھے۔ فلیٹ میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے سوٹ کیس کھولا۔ اور پریم ناتھ پسینے میں شرابور بڑا اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہا تھا۔ سوٹ کیس کو ڈکی سے نکال کر اوپر لانے کے لیے انہیں اس کا ڈھکن صحیح طور پر بند کرنا پڑا تھا اس لیے اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ سوٹ کیس کھلنے کے نتیجے میں اُسے وافر آکسیجن ملی تو وہ گہرے گہرے سانس لے کر کمی پوری کرنے لگا۔

''اسے ہوش آنے والا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے باہر نکال کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔'' اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اپنا خیال ظاہر کیا تو کلام اور سلّو فوراً ہی حرکت میں آ گئے۔ دونوں کے کام مکمل ہونے تک پریم ناتھ کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ غائب دماغی کی کیفیت میں ایک سمت تکے جا رہا تھا۔ شہریار کمرے کے ساتھ منسلک باتھ روم سے ایک مگ میں پانی بھر لایا اور اس کے منہ پر اُنڈیل دیا۔ چہرے پر پانی پڑنے پر اس نے جھرجھری سی لی اور پھر اس کی آنکھوں کا رنگ بدلتا نظر آیا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ غائب دماغی کی کیفیت سے باہر نکل رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اس کے منہ سے نکلنے والے سوال نے ثابت کر دیا کہ وہ حواسوں میں لوٹ چکا ہے۔

''ہم حرام کے اس مال میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جو تم نے بے گناہ شہریوں کو گرفتار کر کے ان کی رہائی کے بدلے میں رشوت کے طور پر وصول کیا ہے۔'' شہریار نے نہایت سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تو تم نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے؟'' پریم ناتھ کے چہرے پر ذرا سا اطمینان اُترا۔

''ہاں۔ تاوان تو تمہیں ادا کرنا ہو گا۔'' اُسے یہ جواب دیتے ہوئے شہریار کی نظروں میں ڈاکٹر فرحان اسمبل کی خوب صورت تصویر تھی۔ ایسے شاندار شخص کو پھنسانے میں کلیدی کردار ادا کرنے والے شخص کو وہ سچ مچ بھاری تاوان کی ادائیگی کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ تاوان کے طور پر اسے شاید اپنی جان ہی گنوانی پڑتی۔

''دیکھو، میں تمہیں جھٹلاؤں گا نہیں۔ رشوت میں نے سچ مچ لی ہے۔ لیکن میرا وشواس کرو کہ وہ سارے پیسے اکیلے میری جیب میں نہیں گئے۔ اوپر نیچے والوں کو حصہ دینے کے بعد میرے حصے میں بہت تھوڑی رقم آئی ہے۔ تم اسی حساب سے مجھ سے مانگو گے تو میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن میری حیثیت سے بڑھ کر ڈیمانڈ

کرو گے تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' ان کی طرف سے کوئی مطالبہ سامنے آنے سے پہلے اس نے بارگیننگ شروع کر دی۔

''حیثیت تو تمہاری بڑی اونچی ہے پریم ناتھ!..... اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک چھوٹے سے گاؤں سے اُٹھ کر ممبئی جیسے شہر میں نہ آ گئے ہوتے۔ بتاؤ کیا قیمت لی تھی تم نے ڈاکٹر فرحان جمیل کو ''را'' کے ہاتھوں میں پہنچانے کی؟..... تمہیں تو دو طرف سے حصہ ملا ہوگا۔ ایک طرف سے فرحان جمیل کے دشمن خاندان والوں نے نوازا ہوگا تو دوسری طرف سے ''را'' نے اتنا اہم شخص پکڑوانے پر تم پر نوازشات کی بارش کر دی ہوگی۔ تمہارے یہ ٹھاٹھ باٹھ ایسے ہی تو نہیں ہیں۔ سیدھے طریقے سے کام کرتے تو تم مرتے دم تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے جس کے مزے آج لوٹ رہے ہو۔''

اس کے ہر لفظ کے ساتھ پریم ناتھ کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا اور اب وہ کسی اور نظر سے اپنے سامنے موجود افراد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پولیس کی نوکری میں ایک عرصہ گزارا تھا اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ ''را'' کی گرفت میں موجود ایک پاکستانی سائنس دان کی تلاش میں اس طرح پہنچنے والوں کا تعلق بھارت کی سرزمین سے تو ہو نہیں سکتا۔ وہ یقیناً ڈاکٹر فرحان کے ہم وطن تھے جو اپنے ملک کے ایک قیمتی سرمائے کو واپس لینے یہاں تک آ پہنچے تھے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا ''را'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک چھوٹا افسر ہوں اور ''را'' والے مجھ جیسوں کو منہ نہیں لگاتے۔'' آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

''را'' سے تیرا تعلق ہے یا نہیں، یہ تو ہم بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تُو یہ قبول کر کہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے ڈاکٹر فرحان جمیل کو تُو نے گرفتار کیا تھا یا نہیں؟''

''میں نے اپنی سروس کے دوران درجنوں افراد کو گرفتار کیا ہے۔ اب مجھے ان سب کے نام تو یاد ہونے سے رہے۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جس پر شہریار کا پارا چڑھ گیا اور اس نے بے دریغ اسے لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ مارتے ہوئے اُس نے اس بات کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا کہ اس کے پیر پریم ناتھ کے جسم کے کس حصے پر پڑ رہے ہیں۔ دو تین لاتیں تو اس [illegible] اس کے منہ پر بھی دے ماریں جس کے نتیجے میں اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور دائیں جبڑے کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ چوٹیں کھا کر وہ بری طرح چیخنے لگا جس پر کلام نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آوازوں کا گلا گھونٹ ڈالا۔

''تم تو بڑے بودے نکلے پریم ناتھ!..... صرف ٹریلر پر ہی تمہارا یہ حال ہو گیا۔ ابھی تو ہم تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کریں گے۔ تمہیں تو اچھا خاصا تجربہ ہوگا کہ کیسے تشدد پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تم تو اپنے علاقے میں بڑے سفاک پولیس والے مشہور تھے۔ سنا ہے تم نے ڈاکٹر فرحان پر بھی بے تحاشا تشدد کیا تھا اور ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہیں۔ ہم تمہارے سامنے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔ اب بتا کہ تُو ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

اس نے فرش پر پڑے پریم ناتھ پر جھک کر اس کے چہرے کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ پریم ناتھ کو اس کی انگلیاں اندر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اذیت اور نفرت سے اس کے جسم کے خدوخال بگڑ گئے لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلّا کر اظہار نہ کر سکا۔

''پلاس سے اس کے سارے ناخن ایک ایک کر کے اُکھاڑ ڈالو اور خبردار..... اس وقت تک اپنا ہاتھ مت روکنا جب تک یہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے رضامندی نہ ظاہر کر دے۔''



حکم جاری کر کے وہ خود ایک کرسی پر جا بیٹھا اور سلّو حکم کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

''میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔'' سلّو نے ابھی پریم ناتھ کی پہلی انگلی کو ہی اپنی گرفت میں لیا تھا کہ کلام کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی پریم ناتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن اُکھڑ کر پلاس کی گرفت میں نظر آنے لگا۔ ناخن اُکھیڑے جانے کی اذیت سے پریم ناتھ کا جسم بری طرح سے پھڑکا اور بننے والے زخم سے تیزی سے خون بہنے لگا۔

سلّو نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا ہاتھ روکا نہیں اور پریم ناتھ کی شدید مزاحمت کے باوجود اس کی دوسری انگلی کا ناخن بھی اُکھاڑ ڈالا۔ اس بار وہ اذیت برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

''جانے دو۔ تھوڑی دیر کے لیے چائے کا وقفہ کر لیتے ہیں، پھر اس سے نمٹیں گے۔'' پریم ناتھ کے بے ہوش ہونے پر سلّو نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بے نیازی سے کہا۔

اسی وقت کلام ٹرے میں چائے کے کپ رکھے واپس آ گیا۔ ٹرے میں چائے کے کپ کے علاوہ ایک چھوٹی پلیٹ میں چاکلیٹ کوکیز بھی رکھے ہوئے تھے۔

''یہاں میرا کبھی کبھار ہی آنا ہوتا ہے اس لیے خورونوش کی اشیاء میں چائے، کافی کے علاوہ بس بسکٹ ہی مل سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ بغیر فریج کے بھی لمبے عرصے کے لیے محفوظ رہ سکتے ہیں۔'' اُس نے کسی ایسے میزبان کی طرح، جو آنے والے مہمانوں کی خاطر خواہ مدارت نہ کر پا رہا ہو، شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی۔

''یہ بھی بہت ہے۔ ہم یہاں دعوت میں نہیں آئے ہیں جو خاطریں کرواتے پھریں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرے میں سے چائے کا کپ اُٹھا لیا۔ سلّو نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور بلا ضرورت کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔

''اس کی کھال مجھے کافی موٹی لگتی ہے۔ یہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا۔'' چائے پیتے ہوئے فرش پر بے ہوش پڑے پریم ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کلام نے تبصرہ کیا۔

''مجھے ہر حال میں اُس سے سچ اُگلوانا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اس کا پورا جسم ہی کیوں نہ چھیدنا پڑ جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ذرا سے لالچ کے پیچھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ وہ بے چارے نہ جانے اتنے عرصے میں کتنی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں اور کس حال میں ہیں؟ اس شخص کے لیے میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔''

یہ وہی شہریار تھا جو اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود نچلے طبقے کے مظلوم و مجبور افراد کی پریشانیاں بہت ہمدردی سے سنتا تھا لیکن ایک ملک دشمن کے لیے اس کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ کلام بھی اندر سے لرز اُٹھا۔ سلّو البتہ نارمل تھا۔ جس نہج پر اس کی تربیت ہوئی تھی، اس میں کسی پر تشدد کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دوسرے اتنے دنوں کے ساتھ میں اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ملک دشمنوں کے حق میں شہریار کتنا سخت اور بے لچک آدمی ہے۔

''تم شاید اپنا موبائل کچن میں چھوڑ آئے ہو۔ وہاں سے اس کی ٹون سنائی دے رہی ہے۔'' کچن کی طرف سے آتی بہت دھیمی سی آواز پر شہریار کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے کلام کو آگاہ کیا۔

''اوہ.....'' کلام تیزی سے کچن کی طرف گیا اور جب فون کان سے لگائے واپس آیا تو چہرے کے تاثرات لحہ بہ لحہ رنگ بدل رہے تھے۔

''ہمیں یہاں سے فوری طور پر روانہ ہونا ہوگا۔ میرے ایک آدمی کی کال آئی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ اسے اطلاع ملی ہے کہ جس بلڈنگ میں ہم موجود ہیں، اس پر ریڈ کرنے کے لیے ایک پولیس پارٹی روانہ ہو چکی ہے۔ ابتدائی معلومات کے مطابق پولیس کو یہاں کچھ جرائم پیشہ افراد کی موجودگی کی خبر ملی ہے اس لیے ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

جلدی جلدی انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوا کلام افراتفری کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس وقت پولیس کے ایک مغوی افسر کے ساتھ یہاں موجود تھے اور پکڑے جانے کی صورت میں بہت برے انجام سے دوچار ہو سکتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے حالات سخت مخدوش تھے۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے اسے دوبارہ سوٹ کیس میں پیک کرو پھر نکلتے ہیں۔'' چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ کر شہریار نے فیصلہ سنایا اور فوری طور پر حرکت میں آ گیا۔

کلام کے تاثرات سے ایسا لگا کہ وہ اس کام میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور فوری طور پر نکلنے کا خواہش مند ہے لیکن شہریار کا اٹل انداز دیکھتے ہوئے اسے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور خود بھی ان دونوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

اب ایک بار پھر بے ہوش پریم ناتھ سوٹ کیس میں منتقل ہو چکا تھا اور وہ لوگ لفٹ کے ذریعے اسے نیچے لے جا رہے تھے۔

سوٹ کیس کو ڈکی میں ڈال کر خود گاڑی میں بیٹھنے تک انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ پروجیکٹ نیا ہونے کی وجہ سے زیادہ آباد نہیں تھا اور یہ ماحول ان جیسے افراد کے علاوہ جرائم پیشہ لوگوں کے لیے بھی سازگار تھا کیونکہ یہاں ان کی حرکات وسکنات کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہیں ہوتا تھا۔

کلام نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی ہی تھی کہ اُنہیں پولیس کی ایک جیپ دکھائی دی۔ خلافِ معمول پولیس والے ہوٹرز بجاتے ہوئے آنے کے بجائے خاموشی سے وہاں آئے تھے۔ ان کی گاڑی کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر انہیں دور سے ہی رکنے کا اشارہ کیا گیا لیکن ظاہر ہے ان کے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ کلام نے ایکسلریٹر پر دباؤ کچھ اور بھی بڑھا دیا اور اس کی گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ لازمی ردِعمل کے طور پر پولیس کی گاڑی بھی ان کے پیچھے آئی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کلام کی کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے تعاقب میں آنے والی پولیس جیپ سے پیچھا چھڑا لے۔ لیکن پولیس والے بھی ان کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''گاڑی کی اسپیڈ تھوڑی کم کرو۔ میں انہیں روکنے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' سلّو نے کلام سے کہا اور خود اپنی گن سنبھال کر بیٹھ گیا۔

اُس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کلام نے آہستہ آہستہ رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ ان کی گاڑی کی رفتار کم ہوتی دیکھ کر پولیس جیپ کا ڈرائیور جوش میں آ گیا اور جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

اُس کی اس حرکت نے گاڑی اور جیپ کا درمیانی فاصلہ مزید کم کر دیا اور سلّو کے لیے جیپ کے اگلے ٹائر کو نشانہ بنانا اور بھی آسان ہو گیا۔ اگلے ٹائر میں گولی لگتے ہی فضا میں زوردار آواز گونجی اور تیز رفتار پولیس جیپ اس بری طرح لہرائی کہ ڈرائیور کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ کلام نے فوراً ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

اس وقت وہ ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جس کے دونوں اطراف درختوں کے گھنے جھنڈ موجود



ے۔ عرصے سے ممبئی میں رہنے والا کلام یہاں کے راستوں اور جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھا لیکن یہ الیت کسی ناگہانی کو تو نہیں ٹال سکتی تھی۔ جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے تعاقب میں وہی واحد جیپ ہیں آ رہی تھی جس کے ٹائر کو نشانہ بنا کر سلّو نے اسے ناکارہ کر دیا تھا۔ وہاں کچھ اور بھی ہیڈ لائٹس تھیں جو ہری سے دوڑتی چلی آ رہی تھیں۔

''ہمارے سامنے سے بھی کچھ گاڑیاں آ رہی ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے وائرلیس پر رابطہ کر کے اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا ہے۔'' اچانک ہی کلام نے متوحش لہجے میں انہیں مطلع کیا۔ یہ ون وے روڈ تھا اس پر سامنے سے گاڑیاں آنے کا مطلب تھا کہ انہیں دونوں جانب سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

''بچاؤ کا کیا راستہ ہے؟'' شہریار نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''ہمیں گاڑی چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ میں گھسنا ہوگا۔''

یہ جواب سن کر شہریار نے ہونٹ بھینچ لئے۔ گاڑی چھوڑنے کا مطلب تھا کہ انہیں پریم ناتھ کو بھی چھوڑنا پڑتا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ پریم ناتھ سمیت پکڑے جاتے تو خلاصی کی کوئی صورت نہیں نکلتی البتہ بچ نکلنے کی صورت میں دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

''اوکے۔''

''ہم رائٹ سائیڈ پر جائیں گے۔'' اس کی ایک لفظی رضامندی سن کر کلام نے بتایا۔ اس صورتِ حال میں سب سے زیادہ اسے ہی نقصان پہنچنے والا تھا۔ اس کی گاڑی سے پریم ناتھ کے ملنے کا مطلب تھا کہ وہ پوری طرح ایکسپوز ہو جائے گا اور اسے اپنا برسوں کا بنا بنایا سیٹ اپ ختم کر کے نئے سرے سے قدم جمانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے یہاں سے باہر نکل جانا پڑتا۔ کیونکہ ایک سرا ہاتھ میں آنے کے بعد یہاں کی ایجنسیاں اسے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ وہ تو کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھتی پھرتیں۔

فکروں اور پریشانیوں کے باوجود اس نے بہت مہارت سے گاڑی روکی اور وہ تینوں پھرتی سے باہر نکل کر دائیں طرف کے جھنڈ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے بھی انہیں جھنڈ میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہو اور خود بھی ان کے تعاقب میں وہاں چلے آئیں۔ پولیس والوں کی عددی برتری اس صورت میں ان کے لیے مسئلہ بن سکتی تھی لیکن اس کے سوا فی الحال ان کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''ہمیں یہاں سے شمال کی طرف بھاگنا ہے۔ وہاں سے ایک ریلوے لائن گزرتی ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم وہاں سے گزرنے والی کسی گاڑی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

بھاگتے بھاگتے کلام نے انہیں آگاہ کیا تو انہیں سمجھ آیا کہ اس نے خصوصیت سے دائیں طرف کے جھنڈ میں گھسنے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ وہ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اس لیے سارے حواس کسی وحشی جانور کی طرح چوکنے تھے۔ ان چوکنے حواسوں کے ساتھ انہوں نے پہلے گاڑیوں کے بریک لگنے کی آوازیں سنیں اور پھر ان آوازوں پر ٹرین کی تیز وِسل حاوی ہوتی چلی گئی۔

''جلدی کریں، کوئی گاڑی جنکشن کو چھوڑ کر اس طرف آنے والی ہے۔ اس وقت اس کی رفتار تیز نہیں ہو گی اس لیے ہم اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' کلام نے چیخ کر انہیں آگاہ کیا اور اپنی رفتار کو کچھ اور بڑھا دیا۔

ان دونوں نے بھی یہی کیا اور عین اس وقت تک ریلوے لائن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ گاڑی

دھیمی رفتار میں وہاں سے گزر رہی تھی۔

ان کے اندازوں کے برعکس وہ کوئی مسافر ریل گاڑی نہیں تھی بلکہ مال گاڑی تھی۔ یہاں وہ ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور اپنی اپنی مہارت اور پھرتی سے کام لے کر اپنے طور پر اس مال گاڑی پر چڑھنا تھا۔

تینوں نے اللہ کا نام لیا اور چھلانگ لگا دی۔ تینوں ہی تربیت یافتہ تھے اس لیے ذرا سی مشکل سے سہی، اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

مال گاڑی پر چڑھنے کے لیے انہوں نے دو ڈبوں کے درمیان چھوڑی جانے والی وسیع جگہ کا انتخاب کیا تھا اس لیے فوراً ہی فرش سے چپک کر لیٹ گئے۔ بیٹھنے یا کھڑے رہنے کی صورت میں دُور سے انہیں دیکھ لیے جانے کا امکان تھا۔ ان تینوں کے اضافے سے بے نیاز مال گاڑی اپنے سفر پر گامزن رہی۔ اپنی جگہ لیٹے لیٹے بھی وہ دیکھ سکتے تھے کہ جھنڈ میں کئی ٹارچوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ یہ جگنو انہیں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو لحہ بہ لحہ رفتار پکڑتی مال گاڑی کے ساتھ ان کی پہنچ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ پناہ گاہ عارضی ہے اور اب نہ جانے انہیں کب تک اور کتنا بھاگنا ہے۔

⊛----✪----⊛

''میں نے تمہاری فراہم کردہ معلومات کے متعلق اچھی طرح چھان بین کروائی ہے۔ اشفاق رانا نے تمہیں پامیلا نامی جس عورت کے بارے میں بتایا تھا، کچھ حوالوں کے باعث ہم اس کی اصلیت تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ سب سے اہم حوالہ میرج بیورو کا تھا۔ کچھ عرصہ قبل شہر میں ہونے والے بم دھماکوں کا سراغ لگاتے ہوئے پولیس اس میرج بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن انہیں وہاں تک پہنچنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی اور یہ عورت وہاں سے اپنا سیٹ اپ ختم کر کے فرار ہونے میں کامیاب رہی تھی۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ کچھ عرصہ شہریار عادل کی بیوی بن کر رہنے والی ڈاکٹر ماریہ نے اپنے آخری بیان میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اور اس کی ماں ''را'' اور ''موساد'' کی ڈبل ایجنٹ ہیں اور پامیلا بن کر امراء کے طبقے میں گردش کرنے والی عورت دراصل ڈاکٹر ماریہ کی ماں سنتھیا جوزف ہی تھی۔ بیٹی کی موت کے بعد وہ مسلسل منظر سے غائب ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی لاش وصول کرنے کے لیے بھی کسی قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کچھ اس قسم کے ثبوت بھی ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنتھیا کے ریاض انور سے بھی تعلقات تھے لیکن ظاہر ہے اب ریاض انور مر چکا ہے اس لیے ہم اس سے کچھ بھی نہیں معلوم کر سکتے۔''

ذیشان نے اپنی طرف آس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جاوید علی کو سنجیدگی سے ان تفصیلات سے آگاہ کیا جو اس نے اشفاق رانا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں جمع کی تھیں۔

''میں نے آپ کو رانا سے حاصل ہونے والا ایک نمبر بھی تو دیا تھا، اس سے کوئی سراغ نہیں ملا؟'' جاوید علی کے پاس ابھی ایک اُمید باقی تھی۔

''تم نے شاید اس نمبر پر غور نہیں کیا۔ وہ بڑا عجیب نمبر ہے اور ہمارے ملک میں استعمال ہونے والی کسی بھی موبائل سروس سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے اس نمبر پر کال کر کے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن بیل جانے کے باوجود کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ رانا کے موبائل سے کال کر کے دیکھتے۔ ہوسکتا ہے وہ اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہ کرتا ہو۔'' اس نے تیزی سے مشورہ دیا۔



''پہلے میں نے رانا کا نمبر استعمال کیا تھا لیکن اس کے باوجود کال ریسیو نہیں کی گئی اور اب تو اس کی موت کی خبر منظر عام پر آ گئی ہے۔ اس ایئر ہوسٹس شاہین نے پولیس اور میڈیا والوں کو سب بتا دیا ہے کہ کس طرح دو افراد نے زبردستی اس کے فلیٹ میں گھس کر اسے اور رانا کو بے بس کیا اور پھر اسے علیحدہ کمرے میں بند کر کے رانا سے تنہائی میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ ان حالات میں اب ہمارے لیے کسی طور رانا کا نمبر استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارا دشمن جتنی جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہے، کچھ بعید نہیں کہ اسے ٹریس کرنے کے چکر میں ہم خود پھنس جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ سنتھیا کے موبائل پر یہ سہولت بھی موجود ہو کہ وہ کال کرنے والے کی لوکیشن سے آگاہ ہو سکے۔'' اس نے جاوید علی کو صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی۔

''اشفاق رانا کا موبائل ریکارڈ..... اس سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوا کیا؟''

''نہیں۔'' ذیشان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''وہ جس موبائل کمپنی کی سروسز استعمال کر رہا ہے اس نے ہمیں اس کا پورا ڈیٹا فراہم کر دیا ہے لیکن اس مخصوص نمبر سے آنے یا اس پر کی جانے والی کالز کے متعلق اس کے پاس کسی قسم کا ڈیٹا نہیں ہے۔''

''یعنی ہم ایک بار پھر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔'' پُرجوش سے جاوید علی کو مایوسی نے آ گھیرا۔

''بی بریو جوان! ہمارے پروفیشن میں بہت بار ایسا مقام آتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے لیکن ہم اپنی ہمت ٹوٹنے نہیں دیتے اور اس اندھیرے میں ہی اپنے لیے روشنی کی کوئی کرن ڈھونڈ نکالتے ہیں۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی۔ جسے اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا اور اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی فی الحال تو اسے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری محنت اکارت چلی گئی ہو۔ اس گم سم سی کیفیت میں وہ اس کمرے میں جا پہنچا جہاں آج کل عالیہ کا قیام تھا۔ ابتدا میں عالیہ کے بارے میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ اسے وہ لوگ اس طرح استعمال کریں جیسے دوسرے ملکوں کی سیکرٹ سروسز عورتوں کو استعمال کرتی ہیں۔ عورت نامی نرم و نازک ہتھیار کے ذریعے وہ بڑے بڑے سورماؤں کو زیر کر لینے کے ہنر سے واقف تھے۔

عالیہ جیسی تجربہ کار عورت یہ کام بہت خوبی سے انجام دے سکتی تھی لیکن ذیشان سمیت کسی نے بھی اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ ایک تو وہ عورت کے اس استعمال سے ہی متفق نہیں تھے، دوسرے مجبوری میں گناہوں کی دلدل میں پھنس جانے والی عالیہ کو اگر وہ بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرنے لگتے تو یہ اس کے ساتھ سخت زیادتی ہوتی۔ چنانچہ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ ہونے تک فی الحال اسے یہیں رکھا گیا تھا۔ ویسے بھی ابھی اس کا باہر نکلنا اس کے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔

''کیا بات ہے..... بڑے اُداس لگ رہے ہو؟'' اسے اپنے سامنے پا کر عالیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں دریافت کیا۔

''ناکامی، اُداسی ہی لاتی ہے۔ تم سے ملنے والا اشفاق رانا کا کلیو بھی ہمارے کسی کام نہیں آ سکا۔ اس سے سب کچھ اُگلوانے کے باوجود ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے تھے۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اسے خود بخود ہی ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔

چند روز قبل قابلِ نفرت ٹھہرنے والی عالیہ سے اس عرصے میں اسے کچھ اُنسیت ہو چلی تھی اور اب وہ پہلے جتنی بری نہیں لگتی تھی بلکہ وہ اس کی مجبوریوں کو سمجھنے لگا تھا۔ بنیادی طور پر وہ بری لڑکی نہیں تھی، بس حالات

نے اسے برا بنا دیا تھا اور اب موقع ملا تھا تو واقعی شریف زادیوں کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یہاں اتنی بڑی تعداد میں موجود مردوں میں سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی لیکن اب تک ایسی کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔

''ہوں.....تو یہ بات ہے۔ غلطی تم میں سے کسی کی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں ہر کام کا ایک طریقہ مقرر ہے۔ ہوسکتا ہے رانا سے تمہیں جو نمبر ملا ہے، اس پر رابطے کے لیے بھی کوئی طریقِ کار مقرر ہوتا کہ کوئی غیر متعلق شخص مداخلت نہ کر سکے۔ یہ طریقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کال سے پہلے کوئی مخصوص کوڈ ایس ایم ایس کرنا یا مقررہ تعداد میں مس کال دینا وغیرہ۔ اور ظاہر ہے، یہ بات وہی شخص جانتا ہوگا جسے یہ نمبر فراہم کیا گیا ہے۔''

''تمہارے پاس بھی تو ایمرجنسی میں رابطے کے لیے کوئی صورت ہوگی۔'' جاوید علی کے دل میں اُمید کی کرن جاگی۔

''میرے پاس صرف ایک صورت ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر کبھی مجھے روپوش ہونے کی ضرورت پیش آئے تو میں انگریزی کے اخبارات کے کلاسیفائیڈ پیج پر ایک مخصوص اشتہار مسلسل تین دن تک چھپواؤں اور اس اشتہار کے ساتھ اپنا رابطہ نمبر بھی دوں۔ اس طرح وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ خود مجھ تک پہنچ کر میری مدد کی کوشش کریں گے۔'' اس کے سوال پر عالیہ نے اسے آگاہ کیا۔

''یہ تو بہت عجیب طریقِ کار ہے۔ اس طریقے سے تو کبھی تمہاری فوری مدد نہیں ہوسکتی۔'' اس کی بات سن کر جاوید علی نے اعتراض کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ میں اور مجھ جیسی دوسری لڑکیاں ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے فکرمند ہوں۔ میں اگر اپنی جان سے بھی چلی جاؤں گی تو کیا ہوگا؟ وہ میری جگہ کوئی دوسری لے آئیں گے۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تلخ حقیقت بیان کی۔

''یعنی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اشتہار کے جواب میں ان کی طرف سے کوئی رسپانس نہ آئے۔'' جاوید علی پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''ہوتو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں ہوگا نہیں۔ اُنہیں تجسّس ہوگا کہ میرے اتنے دن کے غیاب کے بارے میں جان سکیں۔ اگر وہ یہ سمجھ بھی گئے کہ میں نے یہ اشتہار اُن کے مخالفین کی مدد کے لیے دیا ہے تو بھی وہ میرے ذریعے آپ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ میری حیثیت تو دونوں طرف کے لوگوں کے لیے چارے کی سی ہے جس کے ذریعے اپنا اپنا شکار کھیلنے کی کوشش کی جائے گی۔'' وہ یک دم ہی اُداس ہوگئی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو عالیہ! کم از کم ہمارے لوگ اتنے خودغرض نہیں ہیں کہ تمہارے تحفظ کا خیال رکھے بغیر تمہیں استعمال کریں۔ اشتہار دینے یا نہ دینے کے سلسلے میں تم مکمل آزاد ہو۔ ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرے گا۔ البتہ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اشتہار میں تمہارا جو رابطہ نمبر دیا جائے گا، وہ کسی ایسی جگہ کا ہوگا جہاں تم موجود نہیں ہوگی۔ تم یہیں بیٹھے بیٹھے اس نمبر پر آنے والی کالز ریسیو کرو گی اور اتنی سمجھ دار تو تم ہو کہ یہ سمجھ سکو کہ ہم اپنے اتنے اہم ٹھکانے کا پتہ کسی دشمن کی نظر میں نہیں آنے دے سکتے۔'' جاوید علی کو اس کی بات نے صدمہ پہنچایا تھا اس لیے وہ ذرا جذباتی لہجے میں اسے وضاحت دینے لگا۔

''سوری جاوید! میں نے تمہارا دل دُکھایا۔ لیکن تم بھی میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب تک کی



زندگی میں میرا جن لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، وہ سب ایسے تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے میرا انسانوں کے خلوص پر سے اعتماد ختم ہوگیا ہے۔ اس اعتماد کو بحال ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔'' عالیہ زمانہ شناس لڑکی تھی اس لیے اس کی کیفیت کو فوراً بھانپ گئی۔

''ہمارے ساتھ رہو گی تو انشاء اللہ جلد یہ اعتماد بحال ہو جائے گا۔'' جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا تو عالیہ اس کے سادہ سے چہرے پر پھیلی شفاف مسکراہٹ کو دیکھتی رہ گئی۔ اتنا تجربہ تو وہ رکھتی تھی کہ جان سکے کہ ایسی شفاف مسکراہٹ انہی چہروں پر بکھرتی ہے جو بے ریا دل رکھتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''آپ کمال کے میزبان ہیں اشوک صاحب! آپ نے تو دو راتوں میں ہی میرا دل خوش کر دیا ہے۔ آپ کی یہ میزبانی مجھے ساری عمر یاد رہے گی۔ میری طرف سے آپ کو دعوت ہے کہ آپ بھی پاکستان آئیں۔ ہم نے بھی آپ کی میزبانی کا حق نہ ادا کر دیا تو بولیے گا۔''

چودھری کی پچھلی رات بالی وڈ کی ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ گزری تھی اس لیے وہ بہت ہی ترنگ میں تھا۔ بھارت کا یہ دورہ اس کے لیے ہر اعتبار سے خوش کن ثابت ہوا تھا۔

پہلی خوشی تو اسے اس وقت حاصل ہوئی تھی جب لِنڈا نے اسے اطلاع دی تھی کہ تنظیم اسے اہم میٹنگ کے سلسلے میں بھارت کے دورے پر بھیج رہی ہے۔ اس اطلاع نے اس کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کو بحال کر دیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ تنظیم نے بالآخر اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

بھارت پہنچنے پر اشوک کی طرف سے اُس کا پُرجوش استقبال ہوا تھا اور ان دو دنوں میں اس نے دل کھول کر اس کی خاطر مدارات کی تھی۔ اس وقت بھی وہ لوازمات سے بھری ناشتے کی ٹیبل پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے اور خوشی چودھری کے بشرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''دھنّے واد چودھری صاحب! کبھی یہاں کے دھندوں سے مہلت ملی تو آپ کے نیوتے کو ضرور یاد رکھوں گا۔ ابھی تو آپ ہماری میزبانی کا مزہ لیجئے اور جو من چاہے بس اس چیز کی طرف اشارہ کر دیجئے۔ بالی وڈ کی کوئی ہیروئن ایسی نہیں جسے ہماری طرف سے سندیش ملے اور وہ آنے سے انکار کر دے۔ ہمارے حکم پر تو سالی کسبیاں شوٹنگ چھوڑ کر بھی آنے پر مجبور ہیں۔''

اشوک نے شاہانہ انداز میں اسے پیشکش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ چودھری کو اپنے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن جن لوگوں کی طرف سے اسے بھیجا گیا تھا، ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھا۔ چودھری کی بڑھ چڑھ کر کی جانے والی مہمان نوازی میں بھی جہاں ایک طرف اوپر والوں کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا، وہیں وہ چودھری کو خود سے متاثر کر کے مرعوب کرنا چاہتا تھا اور چودھری کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہے۔

اس کی شخصیت بھی اپنی جگہ بارعب اور متاثر کُن تھی۔ وہ لگ بھگ پینتالیس سال کا مضبوط جسم رکھنے والا مرد تھا جو ہمیشہ قیمتی ٹو پیس سوٹ زیبِ تن کرتا تھا۔ اس کے گلے میں کافی بھاری سونے کی زنجیر رہتی تھی اور بائیں ہاتھ کی کلائی میں ننھے ننھے ہیرے جڑا موٹا سا سونے کا کڑا موجود تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے جو کہ ایک اسٹائل سے پائپ پیتے ہوئے اور بھی نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ پائپ میں جو تمباکو استعمال کرتا تھا، اس کی مہک خود اس کے امپورٹڈ ہونے کا اعلان کرتی تھی۔

وہ شہر کے کی ہوٹلوں اور سپر مارکیٹس کا مالک تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا بزنس دبئی تک پھیلا ہوا ہے اور فلم انڈسٹری میں بھی اس کا کثیر سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ٹاپ ہیرو ہیروئن سے لے کر پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز اور ڈسٹری بیوٹرز تک سب جھک کر اسے نمسکار کہتے تھے اور وہ مزے سے سب پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ اس کے اصل دھندوں کو بھی سب جانتے تھے لیکن کوئی نہیں تھا جو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکے۔ پولیس اہلکاروں سے لے کر بڑے بڑے عہدے داروں اور وزراء سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ وہ سب کو خوش رکھتا تھا اور سب اس سے صرف نظر کرتے تھے۔

''کاروباری معاملات تو ہمارے درمیان تقریباً طے ہی ہو گئے ہیں۔ اب آپ حکم فرمائیے کہ آج کے دن آپ نے میرے لیے کیا پروگرام طے کیا ہے؟'' جوس کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے چودھری نے خوشگوار موڈ میں بے تکلفی سے دریافت کیا۔

دوپہر کے بعد میں آپ کو اس جگہ لے چلوں گا جہاں آپ کا مال پیکنگ کے لیے تیار ہے۔ آپ مال کو ایک نظر دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیجئے گا پھر میں اس کی پیکنگ شروع کروا دوں گا۔ دوپہر تک آپ فارغ ہوں گے۔ چاہیں تو یہیں ٹھہر کر آرام کریں یا اگر کچھ اور خواہش ہو تو اس آدمی کو بتا دیں جسے میں نے آپ کی خدمت کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔ میں البتہ اس دوران یہاں موجود نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پولیس آفیسر کو دیکھنے ہسپتال بھی جانا ہے۔ کل رات اس بے چارے کو اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی نکلی کہ اتفاقاً ایک پولیس پارٹی کے ہاتھ لگ گیا۔ سنا ہے سالا خاصا زخمی ہوا ہے اس لیے اسے دیکھنے جانا ضروری ہے۔'' اشوک نے اس کے سامنے اپنا پورا پروگرام رکھ دیا۔

''ایسا کرتا ہوں کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہسپتال چلتا ہوں۔ اس کے بعد وہیں سے کہیں گھومنے پھرنے نکل جاؤں گا۔ آپ آگے اپنے کام نمٹا لیجئے گا۔ دوپہر کے کھانے پر ہم دوبارہ یہاں اکٹھے ہو جائیں گے۔'' چودھری نے اپنا پروگرام بتایا جس سے اشوک نے اتفاق کیا۔

دس منٹ بعد وہ اشوک کے محل نما مکان سے روانہ ہوئے تو جس بڑی سی گاڑی میں وہ دونوں سوار تھے، اس کے علاوہ بھی دو گاڑیاں ان کے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں اشوک کے ذاتی محافظ سوار تھے جبکہ دوسری گاڑی باوردی ڈرائیور اور گارڈ سمیت چودھری کے لیے مخصوص تھی تاکہ وہ ہسپتال سے جہاں جانا چاہے، جا سکے۔

ہسپتال میں انہیں جس کمرے میں جانا تھا، اس کے دروازے پر باوردی پولیس اہلکار تعینات تھے لیکن انہوں نے اشوک سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے ادب سے نمسکار کرنے کے ساتھ ہی پھرتی سے اس کے لیے دروازہ بھی کھول دیا۔

اشوک اپنے محافظوں کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے چودھری سمیت کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک خوب صورت سی نرس ڈیوٹی پر موجود تھی جو اشوک کو دیکھ کر یوں اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''باہر جاؤ بے بی! جب تک ہم ادھر ہیں، تمہاری چھٹی ہے۔'' اشوک نے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''نمسکار اشوک صاحب! آپ نے مجھے بڑا مان دیا کہ میری خاطر یہاں تک چلے آئے۔'' بستر پر دراز



مریض بھی اس دوران اُٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے کہنے لگا۔

''ہم اپنے دوستوں کا پورا خیال رکھتے ہیں پریم ناتھ! تم ہماری اتنی سیوا کرتے ہو، ہم کیسے تمہیں دیکھنے یہاں نہ آتے؟'' اشوک نے باوقار لہجے میں جواب دیا۔

جواب دینے سے قبل وہ چودھری کو لے کر اس نرم و گداز صوفے پر بیٹھ چکا تھا جو ہسپتال کے اس وی آئی پی روم میں آنے والے خاص مہمانوں کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔'' پریم ناتھ نے اس خوشامدی کتے کی طرح کہا جو ہڈیوں اور چھیچھڑوں کے لیے اپنے مالک کے تلوے چاٹتا ہے۔

''یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حال کس نے کیا؟ کہیں یہ بھائی جی کے غنڈے تو نہیں تھے جنہوں نے ہمارے ایک وفادار پر ہاتھ ڈال کر ہمیں چھیڑنے کی کوشش کی ہو؟'' اشوک نے گمبھیر لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''نہیں اشوک صاحب! یہ دوسرا قصہ ہے۔'' پریم ناتھ نے اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اس کے ساتھ بیٹھے چودھری کی طرف دیکھا۔

''اوہ..... ہم ان سے تمہارا تعارف تو کروانا بھول ہی گئے۔ یہ ہمارے ایک پاکستانی دوست چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔ انہیں پتہ چلا کہ ہم اپنے ایک زخمی دوست کو دیکھنے ہسپتال جا رہے ہیں تو یہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ گئے۔''

اشوک نے اس کی نظروں کا زاویہ دیکھتے ہوئے چودھری کا تعارف کروایا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر چودھری کو نمستے کہا اور پھر عاجزی سے بولا۔

''بہت بہت دھنے واد چودھری صاحب! کہ آپ نے میری اتنی پروا کی۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اشوک صاحب کے دوست ہیں تو پھر میرے بھی دوست ہی ہوئے۔'' چودھری نے بڑے تدبر سے اسے جواب دیا۔

''ہاں تو پریم ناتھ! تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا اور کس نے تمہاری یہ حالت بنائی؟'' اشوک نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار پریم ناتھ نے ذرا تذبذب کے عالم میں چودھری کی طرف دیکھا۔

''ان سے کوئی پردے داری نہیں ہے پریم ناتھ!..... یہ ہمارے دوست ہیں۔'' اشوک نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی تو اسے چار و ناچار زبان کھولنی پڑی۔ کیونکہ اشوک کی حکم عدولی کرنا بھی اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

''یہ قصہ میرے ممبئی آنے سے پہلے شروع ہوا تھا۔ میں نے ایک زمیندار کے کہنے پر اس کے پاکستان سے آئے ہوئے بھانجے کو ایک کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ مار پیٹ کے دوران اُس نے یہ اُگل دیا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جو حیاتیاتی ہتھیاروں پر ریسرچ کر رہا ہے۔ مجھے وہ کام کا بندہ لگا اور میں نے فوراً ''را'' والوں سے سودے بازی کر کے اسے ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس کا کیا، کیا؟ اس کی تو مجھے جانکاری نہیں لیکن مجھے یہاں ممبئی میں میری مرضی کی پوسٹنگ مل گئی۔ کل رات جب میں اپنے گھر سے نکل کر کلب جا رہا تھا تو راستے میں کچھ لوگوں نے میری گاڑی کو گھیر کر میرے گارڈ کو زخمی کر دیا اور مجھے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں اور ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنایا لیکن اتفاق سے اسی وقت اس

اپارٹمنٹ بلڈنگ پر پولیس نے بھائی جی کے چند ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر ریڈ کر دیا۔ وہ لوگ مجھ سمیت افراتفری میں بھاگے لیکن پولیس ان کے پیچھے لگ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ گاڑی میں فرار مشکل ہے تو ایک جگہ گاڑی روک کر درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے اور وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس نے ان کی چھوڑی ہوئی گاڑی کی تلاشی لی تو ڈکی میں سے ایک سوٹ کیس میں، میں بند زخمی حالت میں مل گیا اور انہوں نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔ اسی لیے میں اس سے آپ کے سامنے زندہ بیٹھا ہوں۔ ورنہ یا تو دم گھٹنے سے مر جاتا یا ابھی تک ان کا ٹارچر سہہ رہا ہوتا۔'' پریم ناتھ نے اختصار کے ساتھ پوری کہانی سنا ڈالی۔

''ہوں..... تو یہ چکر تھا۔ ورنہ کل رات تو بھائی جی کا وہ پٹھا عبدل پکڑا ہی جاتا۔ میرے آدمیوں نے ہی پولیس کو خبر دی تھی کہ عبدل اس بلڈنگ میں موجود ہے جو ایک پارٹی کے ساتھ اسلحے کی بڑی ڈیلنگ کر رہا ہے۔'' اس کی کہانی سن کر اشوک نے گویا کوئی گتھی سلجھائی۔

''چکر تو یہی ہے اشوک صاحب! لیکن میں بڑے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ وہ تینوں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور دوبارہ کبھی بھی مجھ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' پریم ناتھ کچھ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

''فکر نہ کرو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے اپنے کچھ بندے بھیج دوں گا۔ پھر تمہارا پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی تو ہے نا۔ کیا انہوں نے اتنی دیر میں کڈنیپرز کا اتا پتہ معلوم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا؟''

''پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ جس گاڑی سے مجھے نکالا گیا تھا، اس کے مالک کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس کا نام کلام تھا اور وہ ایک فلیٹ میں اکیلا کرائے پر رہتا ہے۔ مجھے جہاں لے جایا گیا تھا، وہ اپارٹمنٹ بھی اسی کی ملکیت ہے لیکن وہ کل سے غائب ہے۔ میرے محکمے کے لوگ اس کے بارے میں مزید انفارمیشن اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں اس بات کا وشواس ہو گیا ہے کہ وہ کوئی پاکستانی جاسوس تھا جو یہاں رہ رہا تھا۔'' اس نے اشوک کی بات کا جواب دیا۔

''اوکے، یہ تم لوگوں کا پرابلم ہے کہ ان مجرموں کی گرفتاری کے لیے تمہارا ڈیپارٹمنٹ کیا کرتا ہے۔ مجھے تو بس اسی بات کا دکھ ہے کہ بھائی جی کی ناک کا بال عبدل پھر بچ نکلا۔ لگانے کو تو میرے آدمی بھی اسے ٹھکانے لگا دیں لیکن پولیس کے ہاتھ لگ کر اس کی جو رُسوائی ہو گی، اس کا مزہ ہی الگ ہے۔ خیر..... ابھی نہیں تو پھر کبھی وہ سالا چھری تلے آئے گا تو ضرور پھر ہم گن گن کر اپنے بدلے لیں گے۔''

وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تو چودھری نے بھی اس کی پیروی کی۔ پریم ناتھ بھی اپنے زخموں کو بھول کر بستر سے نیچے اُتر آیا۔

''ہم جا رہے ہیں۔ تم آرام کرو۔'' اشوک نے پریم ناتھ سے کہا اور شاہانہ انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری بھی اس کے ساتھ تھا۔ اشوک کے ان ٹھاٹھ باٹھ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے اپنے سامنے بھی جھکنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی لیکن اشوک کی بات ہی الگ تھی۔ نہ اس کی دولت کا شمار تھا اور نہ اختیارات کی حد۔ وہ یہاں رہ کر اشوک کی ایک ایک حرکت اور انداز کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ طے کرتا جا رہا تھا کہ واپس جا کر خود اسے کیا کیا اقدامات اُٹھانے ہوں گے جن سے اس کا اسٹیٹس اور بھی بلند ہو سکے۔

⊛----✪----⊛

حسبِ پروگرام جگو بازار میں بوچاٹ والے کے اسٹال پر چاندنی اور شاہد سے ملا اور انہیں اپنی کار میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔



اس موقع پر چاندنی کچھ سہمی ہوئی تھی جبکہ شاہد بے یقینی کا شکار نظر آتا تھا۔ اس نے راستے میں جگو سے کئی ایسے سوال کیے جن سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگو کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہے۔ جواب میں جگو نے صرف اتنا کہا کہ وہ انہیں جہاں لے جا رہا ہے، وہاں پہنچ کر ان پر اس کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر یوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا ہو۔

جگو نے راستے میں عمیر کو اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کیا اور اس کی ہدایت پر انہیں دفتر کے بجائے اس کے بنگلے پر لے گیا۔ یہ بنگلہ اب بھی اسی طرح سجا ہوا تھا جیسے شہریار کے دور میں تھا۔ اگرچہ شہریار نے اپنے ذاتی خرچے پر بنگلے کو آراستہ کیا تھا لیکن لیاقت رانا نے وہاں سے کسی بھی شے کو ہٹانا پسند نہیں کیا تھا۔ عمیر یہاں آیا تو اسے نفاست اور سادگی سے کی ہوئی یہ سیٹنگ بہت پسند آئی لہٰذا اس نے یہاں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عمیر نے بنگلے کے لاؤنج میں ان تینوں کا استقبال کیا۔

''آپ لوگوں کو سفر میں کوئی پریشانی تو پیش نہیں آئی؟'' شاہد سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے با اخلاق لہجے میں دریافت کیا۔

''نو سر! ہم بہت آرام سے یہاں پہنچے ہیں۔'' شاہد نے مرعوبیت سے جواب دیا۔ اتنا پڑھا لکھا تو وہ بہر حال تھا کہ بنگلے کے باہر لگی تختی پڑھ کر یہ جان سکے کہ لانے والے نے ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا ہے۔

''گڈ۔ اب آپ لوگ چاہیں تو فریش ہو جائیں۔ بیس منٹ بعد کھانا لگ جائے گا۔ کھانے کے بعد ہم آپس میں بات چیت کریں گے۔'' نرمی سے نپے تلے لہجے میں بولتا ہوا وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

دوبارہ ان کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تو عمیر نے دیکھا کہ اگرچہ انہوں نے منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لیے تھے لیکن جسم پر کپڑے وہی تھے جو پہن کر وہ یہاں آئے تھے۔ یکدم ہی اسے اپنی غفلت کا احساس ہوا۔ وہ دونوں یہاں خالی ہاتھ آئے تھے۔ انہیں جس انداز میں فرار ہو کر یہاں آنا پڑا تھا، اس میں کپڑے ساتھ لانے کی گنجائش کہاں تھی؟ ہاں، یہ ممکن تھا کہ لڑکی اپنے پرس میں تھوڑی بہت نقدی یا زیورات لے آئی ہو۔ بہر حال اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''اس وقت تو یہاں کا بازار بند ہو چکا ہو گا، کل ڈرائیور کے ساتھ جا کر تم دونوں اپنے کپڑوں اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی خریداری کر لینا۔'' کھانے کے دوران اس نے ان سے یہ مختصر بات کی جس میں آپ جناب کا تکلف ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس سے اتنے چھوٹے تھے کہ اس تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''ہم اپنا سامان اس لیے ساتھ نہیں لائے کہ پھر بائی جی کو ہم پر شک ہو جائے گا لیکن رقم ہے ہمارے پاس۔ ہم اپنی ضرورت کا سامان خود خرید لیں گے۔'' چاندنی نے اپنی بے سروسامانی کی وضاحت پیش کرتے ہوئے خودداری کا علم بلند رکھنا چاہا۔

''اپنے پاس موجود رقم تم سنبھال کر رکھو۔ بعد میں کام آئے گی۔ تم دونوں مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔ اور یہ طے ہے کہ جب تک تم دونوں یہاں ہو، تمہارے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔'' عمیر نے نہایت رسان سے لیکن فیصلہ کن لہجے میں اپنا حکم سنایا جس کے بعد ان دونوں کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی اور وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

کھانے کے بعد عمیر انہیں اپنے ساتھ اسٹڈی میں لے گیا۔ کسی اہم گفتگو کے لیے وہ جگہ خاصی مناسب

تھی۔ جگو ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اسے لاہور واپس جانے کی جلدی تھی اس لیے اس نے کھانے میں شرکت سے معذرت ظاہر کر کے اجازت لے لی تھی چنانچہ اس وقت اسٹڈی میں بس وہ تین افراد ہی تھے۔

''چودھری افتخار عالم شاہ بارسوخ آدمی ہے اور دوسرے بارسوخ افراد کی طرح قانون شکنی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ ہم کافی عرصے سے کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے گرد دائرہ تنگ کر سکیں لیکن ہر بار ہی وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلتا ہے۔ مینا کا کیس سامنے آنے کے بعد ہم نے اس کے ورثا کو اس لیے تلاش کیا ہے کہ ان کی مدعیت میں چودھری کے خلاف کیس درج کیا جا سکے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں شاہد کی صورت میں ایک وارث کے علاوہ گواہ کی حیثیت سے تم بھی مل گئی ہو اور یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ جان لو کہ یہ کیس اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا سا رُکا اور ان دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

''تم دونوں بس آج رات ہی میرے مہمان رہو گے۔ کل صبح تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے بعد تم دونوں کو ایک دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کسی قسم کا تعلق ظاہر نہ ہو۔ آج کے بعد تم دونوں سے بس ایک وکیل ہی رابطہ رکھے گا۔ اس وکیل کی فیس وغیرہ میرے ذمے ہو گی اور تم لوگوں کے ضروری اخراجات بھی۔ کسی انتہائی ضرورت کے تحت ہی تم دونوں میں سے کوئی مجھ سے رابطہ کرنے کا حق دار ہو گا، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مجھ سے براہِ راست رابطہ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کے سامنے میرا ذکر کرنا۔'' عمیر نے بولتے بولتے پہلو بدلا اور ذرا سا توقف کے بعد گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

''میرا جو آدمی تم دونوں کو لے کر یہاں آیا ہے، اس نے مجھے تمہارے بارے میں پہلے ہی سے معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تم دونوں نے کوٹھے پر پرورش ضرور پائی ہے لیکن ابھی بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہو اس لیے میں تمہیں اس کیس کی بعض نزاکتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہیں دو طرح کے دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک چندا بائی کے کوٹھے سے بھاگ کر تم نے اسے ویسے ہی نقصان سے دوچار کیا ہے، اوپر سے جب یہ کیس کھلے گا تو اس پر بھی لالچ کے باعث قتل کو چھپانے کا الزام عائد ہو گا۔ دوسری طرف چودھری کی بھی کوشش ہو گی کہ مدعی اور گواہ دونوں پر دباؤ ڈال سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ دھمکیوں سے لے کر قاتلانہ حملے تک کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے۔ دشمنوں کی طرف سے ایک اوچھا ہتھکنڈا یہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُلٹا تم دونوں کو حدود کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کریں۔ اس وار سے بچنے کا سیدھا سادھا اور پیشگی حل یہ ہے کہ فوری طور پر تم دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ رضامند نہ ہونے کی صورت میں، میں تم دونوں کے لیے الگ الگ قیام گاہوں کے بندوبست کی کوشش کروں گا۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تمہارا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ مل جل کر ایک دوسرے کی حفاظت کر سکو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس بار اس کا رُوئے سخن شاہد کی طرف تھا۔

''میں آپ کی ساری باتوں سے متفق ہوں سر!..... اگر چاندنی کو اعتراض نہ ہو تو میں پہلی فرصت میں اس سے نکاح کے لیے راضی ہوں۔'' شاہد نے پہلی بار اس کے سامنے لب کشائی کی۔

''میں راضی ہوں سر!'' چاندنی کی طرف سے دھیمی آواز میں فوراً جواب آیا۔ عمر میں شاہد سے ایک ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے باوجود اس وقت وہ کسی عام گھریلو لڑکی کی طرح شرمائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔



''ٹھیک ہے، یہ کام تو کل تمہارے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے انجام پا جائے گا لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کہیں کسی دباؤ سے گھبرا کر تم لوگ اس کیس سے بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟'' عمیر نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر! کئی دن کانٹوں پر گزارنے کے بعد مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اپنی بہن کے قاتل کو انجام تک پہنچانے کے لیے کچھ کر سکوں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں خود کو اس کیس سے علیحدہ کر سکوں۔'' شاہد نے بڑے عزم سے جواب دیا۔

''مجھے ہر قدم پر آپ شاہد کے ساتھ ہی کھڑا پائیں گے۔'' عمیر کی سوالیہ نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے چاندنی نے بھی یقین دہانی کروائی۔

''گڈ..... یہی اسپرٹ باقی رہی تو چودھری اپنے انجام تک ضرور پہنچے گا لیکن فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ چودھری پاکستان میں موجود نہیں ہے اور سیر و سیاحت کے ویزے پر بھارت گیا ہوا ہے۔ ہم کارروائی تو کل ہی سے شروع کر دیں گے لیکن ظاہر ہے اصل میں اس کیس میں گرما گرمی اس وقت آئے گی جب چودھری واپس پاکستان پہنچے گا۔ میری کوشش ہو گی کہ یہ بات لیک آؤٹ نہ ہونے پائے کہ یہاں اس پر مینا کے قتل کا کیس چلانے کی تیاری ہو چکی ہے۔ میرے کچھ روابط ایسے ہیں جن کے ذریعے ہمیں چودھری کی بھارت سے روانگی کی خبر مل سکتی ہے۔ خبر مل گئی تو ہم اسے ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کروا دیں گے۔ پھر انشاء اللہ! چودھری کو قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر اس کیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چودھری کی واپسی تک تم لوگ تقریباً فارغ ہی رہو گے، سو اس عرصے میں اطمینان سے ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے کرنا۔''

اس نے جان بوجھ کر آخر میں ایک شوخ جملہ بول کر ماحول پر چھائے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی شرمیلی سی مسکراہٹ نے بتایا کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام نہیں رہا ہے۔ دل ہی دل میں اُس کی اس مسکراہٹ کے قائم رہنے کی دعا کرتے ہوئے وہ محفل برخاست ہونے کا اعلان کر کے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

⊛----✪----⊛

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ تم اکیلی چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاؤ لیکن مجبوری یہ ہے کہ آج میرا اسٹور پر رہنا ضروری ہے۔ مصطفیٰ بھائی آج کل سائٹ پر ہیں ورنہ وہ ہوتے تو مجھے چھٹی کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

ناشتہ کرتے ہوئے اسلم نے کوئی دسویں بار اپنی پریشانی اور مجبوری کا اظہار کیا تو ماہ بانو اُس کی اتنی فکرمندی پر مسکرا دی۔ اس لیے اُس کی محبت میں اسے کبھی کوئی شک وشبہ نہیں ہو رہا تھا لیکن آج کل تو وہ اس کا اتنا خیال رکھ رہا تھا کہ اسے خود پر کانچ کی گڑیا کا گمان ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ دنیا کی چند خوش قسمت عورتوں میں سے ہے جس کا شوہر اس حالت میں اس کا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔ ورنہ وہ جس ماحول میں پروان چڑھی تھی، وہاں اس بات کو اتنی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور مرد کہتے تھے کہ اگر کوئی عورت بچہ پیدا کر رہی ہے تو یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔ دنیا کی ساری عورتیں ہی یہ کام کرتی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک عورت بچے پیدا کرنے والی مشین تھی جسے ہر حال میں اپنا کام کرنا تھا۔

''آپ اتنی فکر کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے روٹین کے چیک اپ کے لیے ہی تو جانا ہے اس کے لیے میں آرام سے بلقیس باجی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ بلکہ اگر آپ کہیں تو میں کلینک سے اسٹور آ جاتی ہوں، آپ کا

ہاتھ بٹادوں گی۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دیتے ہوئے پیشکش کی۔

''بالکل نہیں، آج تمہاری چھٹی ہے اور کلینک سے فارغ ہونے کے بعد تم گھر آ کر مکمل آرام کرو گی۔'' اسلم نے فوراً انکار کر دیا۔

''تو ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ آپ بھی میری بات مانیں اور بالکل پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ کوئی پریشانی کی بات ہے ہی نہیں۔'' اس کے سامنے گرم چائے کا کپ رکھتے ہوئے ماہ بانو نے شرما عائد کی۔

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولا تو وہ ہنس پڑی پھر ذرا چھیڑنے کے لیے بولی۔

''یہ اتنی فکرمندی میرے لیے ہے یا اپنے ہونے والے بچے کے لئے؟''

''دونوں کے لئے۔ تم مجھے عزیز ہو اور تمہارے بطن میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ بھی مجھے پیارا ہے۔ میں دونوں میں سے کسی کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر تم مجھے ہر حال میں زندہ سلامت اور صحت مند چاہئے ہو۔'' اس نے جذباتی ہو کر ماہ بانو کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں جانتی ہوں، بس ایسے ہی آپ کو چھیڑ رہی تھی۔'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''میرے جذبات کی گہرائی کو جانتے ہوئے تمہیں یہ زیادتی نہیں کرنی چاہئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تمہاری ذات میں میرے لیے دنیا کے سارے رشتے سمٹ کر آ گئے ہیں۔ میرا پیار کہیں بٹا ہوا نہیں ہے، میرے لیے بس تم، تم اور تم ہی ہو۔ تم سے جدائی کا تصور بھی کروں تو میری سانسیں اُکھڑنے لگتی ہیں۔'' وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

''اچھا بابا! معاف کر دیں۔ میں اپنے کان پکڑتی ہوں، میری توبہ جو آئندہ ایسی گستاخی کی ہو۔'' اس نے سچ مچ اپنے دونوں کان پکڑ لیے تو اسلم ہنس پڑا پھر جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے اسٹور جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ کام کی وجہ سے آج وہ معمول سے کچھ پہلے ہی وہاں جا رہا تھا۔

''پتہ نہیں کیوں آج تمہیں چھوڑ کر جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔'' دروازے سے نکلتے نکلتے بھی وہ اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

''وہ تو جناب کا کبھی بھی نہیں چاہتا۔ لیکن بس اب جائیے۔ آپ کو دیر ہو جائے گی اور میرے کام بھی نہیں سمٹ سکیں گے۔'' ماہ بانو نے اسے باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''کیا کرتے ہیں، کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ محجوب ہوئی۔

''یہاں دیکھنے کے لیے اُڑتے پرندوں اور پھول پودوں کے سوا ہے ہی کون؟'' اس نے بولتے ہوئے ایک اور گستاخی کی اور اس سے قبل کہ وہ اسے دھکا دے دیتی، اپنی گرفت سے آزاد کر کے ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ماہ بانو اندر آ گئی اور گھر کے مختلف کام نمٹانے لگی۔ ان کاموں کو نمٹانے کے ساتھ ساتھ وہ کھانا بنانے کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ ابھی اُس کے پاس ہسپتال کے لیے روانہ ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج کے کھانے میں وہ اسپیشلی اسلم کی پسندیدہ ڈش بریانی بنانا چاہتی تھی۔ روزانہ تو وہ خود بھی اسلم کے ساتھ اسٹور جاتی تھی اس لیے اتنی فرصت سے کچھ پکانے کا موقع نہیں ملتا تھا اور وہ سادہ سا کھانا کھانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ چھٹی والے دن بھی اسلم اسے زیادہ دیر کچن میں کھڑا رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس لیے آج وہ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا



رہی تھی۔

اس کا ارادہ یہ تھا کہ بریانی کے لیے یخنی تیار کر کے رکھ دے گی اور شام میں اسلم کے واپس آنے کے وقت چاول اُبال کر تہ لگا دے گی۔ ایک چولہے پر بریانی کے لیے یخنی تیار کرتے ہوئے اس نے دوسرے پر کسٹرڈ بھی بنانا شروع کر دیا۔ جلدی سے تیار ہونے والی اس سویٹ ڈش کو ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھنے کے بعد وہ اس کی سجاوٹ بعد میں کر سکتی تھی۔ تیزی سے ان کاموں کو نمٹاتے ہوئے اس نے اپنی جانے کی تیاری بھی کر ڈالی۔ چنانچہ جب مصطفیٰ خان کی بیوی بلقیس اپنی چلبلی سی بیٹی طوبیٰ کا ہاتھ تھامے وہاں آئی تو وہ پوری طرح تیار تھی۔

''اوہو، بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ صبح صبح کیا پکا ڈالا؟'' بلقیس نے ناک سکیڑ کر خوشبو کو اندر اُتارتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں استفسار کیا۔

''شام میں بریانی پکانے کا ارادہ ہے۔ اسی کے لیے یخنی تیار کی ہے۔'' اس نے پرس اٹھا کر شانے سے لٹکاتے ہوئے بتایا تو طوبیٰ مچل گئی۔

''آنٹی! میں بھی بریانی کھاؤں گی۔''

''کیوں نہیں بیٹا! آپ کی اور آپ کی ممی کی بھی بریانی کی دعوت ہے۔'' اس نے طوبیٰ کے رخسار کو تھپتھپایا۔

''بری بات ہے طوبیٰ!.....ایسے زبردستی کسی سے دعوت نہیں لیتے۔'' بلقیس نے بیٹی کو گھرکا۔

''زبردستی کیسی۔ طوبیٰ نہ بھی کہتی تو میں خود آپ کو انوائٹ کرتی۔ مصطفیٰ بھائی تو ویسے بھی آج نہیں آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اکیلے ڈنر کرنے کے بجائے ہمیں جوائن کر لیں۔'' ماہ بانو نے لگاوٹ سے کہا تو بلقیس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''ٹھیک ہے بھئی، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن بس اب فوراً نکل پڑو۔ تمہیں کلینک چھوڑ کر ہم ماں بیٹی شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے اور واپسی میں دوبارہ پک کر لیں گے۔'' بلقیس نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم آرام سے اندر جا کر چیک اپ کرواؤ۔ ہم آدھ پون گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔'' کلینک کے سامنے اسے اتار کر بلقیس نے محبت سے کہا اور خود اپنی چھوٹی سی کار دوڑاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اسے جس شاپنگ سینٹر سے خریداری کرنی تھی، وہ یہاں سے دس بارہ منٹ کی ڈرائیو پر ہی تھا۔ پھر بھی وہ راستے میں ماہ بانو کو ہدایت دے چکی تھی کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو اسے کال کر کے جلدی بھی بلا سکتی ہے۔

پارکنگ ایریا میں پہنچ کر اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور طوبیٰ کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی۔ اندر جا کر اس نے اپنی ضرورت کی اشیا اُٹھا اُٹھا کر ٹرالی میں رکھنا شروع کر دیں۔ ان اشیا کو وہ لسٹ دے کر اسلم سے بھی منگوا سکتی تھی۔ لیکن خواتین کے ازلی شاپنگ کے شوق سے مجبور ہو کر خود ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اپنی اس مصروفیت میں وہ اتنی مگن تھی کہ چالیس منٹ کا وقت گزرنے پر بھی کوئی احساس نہیں ہوا۔ چونکی تو اس وقت جب اس کے پیچھے پیچھے چلتی طوبیٰ نے شاید اپنی شمولیت کے لیے ایک ریک میں ایک دوسرے کے اوپر رکھے خشک دودھ کے ڈبوں میں سے ایک نکال کر ٹرالی میں ڈالنا چاہا لیکن نتیجے میں سارے ڈبے نیچے آ گرے۔ ان ڈبوں میں سے ایک اس کے سر سے ٹکرایا جبکہ دوسرا پیر کے انگوٹھے پر آ گرا۔ انگوٹھے پر گرنے والے ڈبے نے زیادہ کام دکھایا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔

طوبیٰ نے دہشت زدہ چیخیں ماریں اور بلقیس سمیت کئی افراد اس کی طرف بھاگے۔ بلقیس کے کئی منٹ انتظامیہ سے معذرت کرنے اور طوبیٰ کی مرہم پٹی کروانے میں گزر گئے۔ ان لوگوں کا کوئی نقصان نہ ہوا تھا اس لیے فراخ دلی سے نہ صرف معذرت قبول کر لی بلکہ بچی کی مرہم پٹی بھی خود کروائی۔

اپنی کی ہوئی شاپنگ کا بل ادا کرنے کے بعد بلقیس، طوبیٰ سمیت پارکنگ میں پہنچی تو اسے گھڑی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ کافی لیٹ ہو چکی ہے۔ دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا تا کہ ماہ بانو کو اپنے دیر سے آنے کی اطلاع دے سکے۔

اس کا نمبر ٹرائی کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا موبائل آف ہے۔ بلقیس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ کلینک پہنچ کر ہی ماہ بانو کو اپنی تاخیر کا سبب بتا سکتی تھی۔ دس منٹ میں کلینک تک کا سفر طے کر کے گاڑی باہر روکنے کے بعد وہ اندر پہنچی تو اسے ماہ بانو انتظار گاہ میں دکھائی نہ دی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسپشنسٹ سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ تو تقریباً بیس منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہیں۔'' اس نے بتایا تو بلقیس کچھ اور شرمندہ ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی تاخیر سے گھبرا کر ماہ بانو خود ہی گھر واپس چلی گئی ہے۔ اس نے فوراً گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلے اپنی خریدی ہوئی اشیا اور طوبیٰ کو اندر پہنچایا۔

''آرام سے اپنے بیڈ پر لیٹی رہو۔ یہاں سے ہلیں تو میں سخت خفا ہو جاؤں گی۔'' طوبیٰ کو اس کے کمرے میں پہنچا کر اس نے سختی سے ہدایت کی اور خود سیدھی انیکسی کی طرف چلی گئی۔ وہاں کا دروازہ بند تھا اور اندر کسی کی موجودگی کا گمان نہیں ہو رہا تھا پھر بھی اس نے دستک دے کر دیکھا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں سی اُبھر آئیں۔

ماہ بانو کو اس سے پہلے ہی یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ اس نے چند منٹ اور انتظار کا فیصلہ کیا وہیں انیکسی کے سامنے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران اُس نے ایک دو بار پھر اس سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر ہنوز بند جا رہا تھا۔ دل میں کچھ گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک موہوم سی اُمید کے سہارے اسلم کا نمبر ملایا۔

''جی باجی! کہیے، کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' اسلم نے فوراً ہی کال ریسیو کی اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اُس کے انداز نے بلقیس کو بتا دیا کہ اس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا ہے۔ ماہ بانو وہاں بھی نہیں پہنچی ہے۔

''ہیلو بلقیس باجی!..... کیا ہوا آپ کو؟..... کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟'' اُدھر سے اسلم پریشان سا پوچھ رہا تھا۔

''میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں فون کیا تھا کہ ماہ بانو وہاں تو نہیں آئی ہے؟'' بلقیس نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہاں.....؟'' اسلم کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''وہ تو آپ کے ساتھ کلینک گئی تھی اور وہاں سے اسے آپ کے ساتھ ہی گھر واپس جانا تھا۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی پریشانی تھی۔

''ہاں لیکن وہ مجھے کلینک پر نہیں ملی۔ میں قریبی شاپنگ سینٹر سے خریداری کر کے کلینک پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ گھر آ گئی ہو گی لیکن وہ یہاں بھی نہیں ہے۔''

بلقیس نے گھٹے گھٹے لہجے میں اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے اور اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ اسے اس کا سب سے قیمتی اثاثہ گم ہونے کی اطلاع دی جا رہی



تھی۔ ایسے میں وہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا بھی تو کیسے.....؟

اسلم کو اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ماہ بانو غائب ہے..... یہ جان کر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ اُسے اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا اور اس کے بغیر خود کو ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بغیر روح کے مٹی کا بے جان جسم ہو۔

''آپ نے کلینک میں اچھی طرح دیکھا تھا باجی! ہو سکتا ہے وہ وہیں ہو اور واش روم وغیرہ چلی گئی ہو۔ اکیلی وہ وہاں سے کیسے کہیں جا سکتی ہے؟'' مبہم سی امید کے سہارے اس نے اپنی رُکتی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے ریسپشن پر معلوم کیا تھا اور ان لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ مسز مہرین اسلم، ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے بعد روانہ ہو چکی ہیں۔''

بلقیس جو اپنی جگہ خود بہت پریشان اور شرمندہ تھی، آہستہ سے بولی۔ مہرین، ماہ بانو کا وہ نام تھا جو اس کی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے شہریار نے اسے دیا تھا اور وہ اسی نام سے امریکہ آئی تھی۔

''میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ وہاں سے کہیں جا ہی نہیں سکتی۔'' اسلم بڑبڑانے کے انداز میں بولا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

بلقیس نے پریشانی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر ذرا ہمت سے کام لے کر مصطفیٰ کا سیل نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں مصروف تھا جو اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔

اس طرف سے ناکام ہو کر اس نے کشور کا نمبر ملایا۔ اس گھر کے علاوہ پورے آرلینڈو میں واحد وہی جگہ تھی جہاں ماہ بانو ہسپتال سے نکل کر جا سکتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کشور نے اپنے شائستہ لہجے میں کال کا جواب دیا اور ذرا چہک کر بولی۔

''بلقیس بھابی! کیسی ہی آپ؟ میں آپ لوگوں کو یاد ہی کر رہی تھی۔''

''کن کن لوگوں کو.....؟'' بلقیس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا جس پر وہ ہنسی اور پھر بولی۔

''آپ کی اور ماہ بانو کی فیملی کو۔ کیسی ہے وہ؟ ایسی حالت میں جاب کرنے سے پریشانی تو محسوس نہیں کر رہی؟'' کشور کی باتوں سے ہی ظاہر تھا کہ ماہ بانو اس کے ہاں نہیں پہنچی پھر بھی بلقیس نے اس سے پوچھ لیا۔

''ماہ بانو تمہارے گھر تو نہیں آئی کشور؟''

''نہیں تو..... کیا اُسے آنا تھا؟..... کب نکلی تھی وہ گھر سے؟'' کشور کو حساس ہوا کہ بلقیس کے لہجے کی شگفتگی غائب ہے اور وہ کچھ پریشان لگ رہی ہے۔

جواب میں بلقیس نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ اطلاع سن کر کشور لمحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ ماضی میں بھی کئی بار ماہ بانو غائب ہو چکی تھی اور غیاب میں اکثر اس کے اپنے والد بزرگوار چودھری افتخار عالم شاہ کا ہوتا تھا۔ وہ نیویارک میں چودھری کے وسیع اختیارات کا ایک مظاہرہ بذاتِ خود بھگت چکی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ شک کرنے میں حق بجانب تھی کہ یہاں بھی اس کے والد نے ہی کوئی ہاتھ دکھایا ہے اور اگر وہ آرلینڈو تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو یہ سوچنا غلط نہیں تھا کہ وہ اور آفتاب بھی بچی سمیت خطرے میں ہیں۔

''ہیلو کشور!..... تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر بلقیس نے اسے پکارا تو وہ ہوش

میں آئی۔

''میں نے آپ کی بات سن لی ہے اور سوچ رہی ہوں کہ وہ کہاں جاسکتی ہے۔ اصولاً تو اسے کلینک پر ہی آپ کا انتظار کرنا چاہئے تھا اور اگر دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی روانہ ہوگئی تھی تو اب تک گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ بہرحال تھوڑی دیر اور انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں پھر میں آفتاب کے ساتھ آپ کے گھر آجاؤں گی۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا تو بلقیس کو تھوڑا حوصلہ محسوس ہوا۔

''پلیز کشور! تم لوگ ذرا جلدی آجاؤ۔ باہر بارش شروع ہو چکی ہے اور یہاں کے موسم کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کیا رُخ اختیار کر لے۔ میں طوبیٰ کے ساتھ گھر میں اکیلی ہوں۔ مصطفیٰ اپنے کسی کام سے گئے ہوئے ہیں اور آج واپس بھی نہیں آئیں گے۔ میں کوشش کر رہی ہوں لیکن میرا اُن سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

گھر میں تنہا رہنا بلقیس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ ہی وہ بہت کمزور اعصاب کی مالک عورت تھی لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ماہ بانو کی گمشدگی کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی۔

''آپ گھبرائیں نہیں بھابی! ہم کوشش کرتے ہیں کہ جلد آپ کے پاس پہنچ جائیں۔'' اُس کی کیفیت محسوس کر کے کشور فی الحال اپنی تشویش کو بھول گئی اور اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

بلقیس ایک بار پھر مصطفیٰ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس بار میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مصطفیٰ کے گھر سے دور رہنے کی صورت میں اس سے رابطہ نہ ہوسکنا بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا کہ اپنے کام میں کھو کر بیوی اور بچی کو بھلا بیٹھتا تھا لیکن آج اُسے مصطفیٰ کی یہ عادت ہمیشہ سے زیادہ بری طرح کھلی اور اس نے طے کر لیا کہ واپس آنے کے بعد اُسے اُس کی حرکت پر خوب باتیں سنائے گی۔

⊛----✪----⊛

اسلم کو اس وقت ماہ بانو کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بھول گئی تھی۔ وہ اسٹور، دیگر ملازمین پر چھوڑ کر باہر سے نکل کھڑا ہوا تھا اور دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے فرض شناسی دکھانے کی خاطر ماہ بانو کو اکیلا چھوڑ دیا۔

جو معاملہ اس کے علم میں آیا تھا، اس کے مطابق وہ بلقیس کو بھی زیادہ قصوروار نہیں قرار دے سکتا تھا۔ قصور تو اسے بس اپنا ہی لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی سب سے قیمتی شے کی ذمے داری کسی اور کو سونپی ہی کیوں جبکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کچھ ایسے دشمن ہیں جو اسے ہر حال میں اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

پریشانی اور پچھتاوے کی ملی جلی کیفیت میں وہ ایک کیب میں اس کلینک کے لیے روانہ ہوا جہاں ماہ بانو اپنا چیک اپ کرواتی تھی۔ کلینک پہنچ کر اس نے استقبالیہ سے معلومات حاصل کیں تو اسے بھی وہی جواب ملا جو بلقیس کو دیا گیا۔

''آپ لوگ اچھی طرح چیک کریں۔ ہوسکتا ہے وہ یہیں ہو اور آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔'' اس نے خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے استقبالیہ پر موجود شخص سے کہا۔

''غلط فہمی کی بات ہی نہیں ہے سر! ہم نے پوری ذمے داری سے آپ کو یہ اطلاع دی ہے۔'' اس شخص نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔ میری بیوی یہاں آئی تھی اور یہاں سے وہ اکیلی کہیں نہیں جاسکتی۔'' اس شخص کی



بے نیازی پر لحہ بھر میں ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہو۔ تم گھر جا کر انتظار کرو، ایک آدھ دن میں واپس.....'' اُس کے طیش میں آنے پر وہ شخص بھی بدگوئی پر اُتر آیا لیکن اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور اسلم کے ایک زوردار گھونسے نے اس کے ہونٹوں کو پھاڑنے کے ساتھ دو دانت بھی توڑ دیے۔

''الزام لگاتا ہے۔ میری پاکباز بیوی پر اُنگلی اُٹھاتا ہے۔'' اس نے صرف مُکا مارنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گردن سے پکڑ کر اس شخص کو کاؤنٹر کے پیچھے سے کھینچ کر نکال لیا۔ فوراً ہی وہاں افراتفری مچ گئی۔ ریسپشن پر اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے چیخ کر گارڈ کو پکارا۔ گارڈ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی وہاں آگئے۔ پھر بھی اُنہیں بپھرے ہوئے اسلم کو قابو میں کرنے میں وقت لگا کہ وہ ماہ بانو کی شان میں گستاخی کرنے والے کو چار چھ ہاتھ مزید جڑ چکا تھا۔

''چھوڑو مجھے۔ میں اس شخص کو بتاؤں گا کہ کسی عزت دار عورت پر الزام لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

کئی افراد نے مل کر اسے جکڑ رکھا تھا پھر بھی وہ فرطِ جوش سے چلّا رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہاں پولیس پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے آتے ہی سب سے پہلے تو اسے ہتھکڑی لگائی پھر دیگر لوگوں سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ مضروب شخص کو پہلے ہی طبی امداد کے لیے وہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔

مضروب شخص کی ساتھی لڑکی نے سب سے پہلے اپنا بیان دیا۔ پولیس کو کال کرنے والی بھی وہی تھی۔ اپنے بیان میں اس نے کبھی بھی کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لینے کے بجائے واضح الفاظ میں اسلم کی پریشانی اور اپنے ساتھی کے روّیے سے پولیس والوں کو آگاہ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک پاکستانی کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے پولیس والوں کے انداز میں تھوڑی نرمی آگئی۔

''ہم تمہارا مسئلہ سمجھ گئے ہیں مسٹر! لیکن تمہیں چاہئے تھا کہ تشدد سے کام لینے کے بجائے پولیس کو انفارم کرتے۔ ان حالات میں ہم سے زیادہ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ بہرحال، تم یہاں آرام سے بیٹھو اور چاہو تو اپنے وکیل یا کسی دوسرے مددگار کو بلا لو۔ مجھے یقین ہے کہ زخمی ہونے والا شخص تمہارے خلاف قانونی کارروائی ضرور کرے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری بیوی کی بازیابی کے لیے کیا، کیا جاسکتا ہے۔''

سارجنٹ نے اسے سپاٹ لہجے میں حالات سے باخبر کیا اور خود اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ اسلم بھی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اپنے دماغ پر قابو پا سکے تاکہ اس صورتِ حال سے نمٹ سکے۔

اُس کی خواہش پر اُسے ایک گلاس پانی پلایا گیا۔ ابھی وہ پانی پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔ پولیس والوں کی طرف سے اسے کال ریسیو کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ کال کرنے والا آفتاب تھا جو اس سے ماہ بانو کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

اس نے مختصر الفاظ میں اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا جس پر آفتاب تشویش میں مبتلا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں پہنچنے کا عندیہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس دوران پولیس والوں نے ماہ بانو کے بارے میں جو تحقیقات کیں، ان کے مطابق یہ حقائق سامنے آئے کہ مسز مہرین اسلم نے لگ بھگ تین گھنٹے قبل ڈاکٹر سے اپنا روٹین کا چیک اپ کروایا تھا اور کسی سے کچھ بھی کہے بغیر فوراً ہی کلینک سے باہر چلی گئی تھیں۔ کلینک پہنچنے کے بعد ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

اسلم نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ چیک اپ کے بعد اسے وہیں ٹھہر کر مسز مصطفیٰ خان کا انتظار کرنا تھا جو کہ اسے پک کرنے کے لیے وہاں آنے والی تھیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ ماہ بانو اپنی

مرضی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔

کلینک میں نصب ویڈیو کیمروں نے بھی عملے کے اس بیان کی تصدیق کی تھی جس پر اسلم بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے ایسی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی جسے ماہ بانو کے ازخود کہیں چلے جانے کا سبب قرار دے سکے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ پا رہا تھا کہ ماہ بانو کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے لیے کلینک سے باہر نکلی ہو گی لیکن کسی ناگہانی آفت نے اسے واپس نہیں آنے دیا۔ اس نے سارجنٹ پر بھی اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا۔

''اوکے، ہم چیک کر لیتے ہیں لیکن ہمارے ریکارڈ کے مطابق شہر میں ٹریفک کا ایسا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا ہے جس میں کسی خاتون کے متاثر ہونے کی اطلاع ملی ہو۔ اغوا وغیرہ کی بھی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال، تم اپنی مسز کا سیل نمبر مجھے دے دو۔ وہ اپنی مرضی سے یا زبردستی جہاں بھی گئی ہے، ہم اس کا پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔'' سارجنٹ نے غیر جذباتی انداز میں اس سے کہا تو اس نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر اسے ماہ بانو کا سیل نمبر دے دیا۔ اسی اثنا میں آفتاب وہاں پہنچ گیا۔

''تم نے رپورٹ میں چودھری صاحب پر شک ظاہر کیا ہے یا نہیں؟'' اس نے پہلے وہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کیں، پھر اسلم سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چودھری صاحب بھلا یہاں کہاں؟'' اس نے نڈھال سی حالت میں جواب دیا۔

''تم انہیں کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ حضرت اپنی سگی بیٹی اور مجھے کرائے کے غنڈوں سے ہلاک کروانے کی کوشش کر چکے ہیں۔'' آفتاب نے اسے جواب دیا اور پھر مڑ کر سارجنٹ سے اس بارے میں بات کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے، ہم چیک کر لیتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں سے دھواں دھار برستی بارش صاف نظر آ رہی تھی۔ آفتاب نے اسلم کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں تھپکی دی اور خود اس شخص کی خیریت معلوم کرنے چلا گیا جو اسلم کے ہاتھوں مجروح ہوا تھا۔

اس شخص سے مل کر اس کا اشتعال دور کرنے اور اسلم کے لیے ہمدردی کے جذبات جگانے میں اسے کچھ وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکا کہ اسلم کو اپنے ساتھ گھر لے جا سکے۔ اس دوران بارش نے مزید زور پکڑ لیا تھا اور طوفانی جھکڑ چلنے لگے تھے۔

آفتاب یہاں بلقیس کی گاڑی میں آیا تھا۔ موسم کی شدت کے باعث اسے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھنی پڑ رہی تھی۔ برابر والی سیٹ پر کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے اسلم نے بھی کوئی بات نہیں کی اور بس ونڈ اسکرین کو دیکھتا رہا، جہاں تیزی سے چلتے وائپرز شیشے سے پانی کی چادر کو ہٹانے کی پوری کوشش کر رہے تھے لیکن لمحہ بھی نہیں گزرتا تھا اور یہ چادر دوبارہ تن جاتی تھی۔

دُھندلائے ہوئے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں دُھندلا گئیں اور دل میں ہوک سی اُٹھی کہ جانے اس خطرناک موسم میں ماہ بانو کہاں ہو گی اور کن مشکلات میں گھری ہوئی ہو گی۔ آسمان پر گاہے بگاہے کڑکتی بجلی اس کے اعصاب کو بھی جھٹکے لگا رہی تھی۔ اس شدید موسم میں تو ماہ بانو اور ان کے ہونے والے بچے کو اس کے مضبوط بازوؤں کی پناہ کی ضرورت تھی لیکن نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔

راستے بھر انہی سوچوں میں گھرا جب وہ آفتاب کے ساتھ مصطفیٰ خان کے گھر پہنچا تو گاڑی سے اُترکر



سیدھا انیکسی کا رخ کیا۔ آفتاب نے چاہا کہ اسے پکارے اور زبردستی سب کے درمیان لے جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسے جو جھٹکا لگا تھا، اس سے سنبھلنے کے لیے تنہائی درکار تھی۔

ادھر اسلم ہر چیز سے بے نیاز انیکسی میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف ماہ بانو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بلامقصد ہی اِدھر سے اُدھر گھومنے لگا۔ ان کی چھوٹی سی اس جنت میں ہر شے قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھی اور کہیں گرد و غبار کا معمولی سا بھی نشان نہیں تھا۔ خواب گاہ میں موجود بیڈ کی بے شکن چادر میں اسے ماہ بانو کے ریشمی جسم کی سرسراہٹیں محسوس ہوئیں تو وہ گھبرا کر وہاں سے نکل آیا اور کچن میں پہنچ گیا۔

جگمگ کرتے صاف ستھرے کچن میں چولہے پر دھری دیگچی کا ڈھکن کھول کر دیکھا تو اس میں بریانی کے لیے تیار کی گئی یخنی نظر آئی۔ اپنے ٹوٹتے ہوئے اعصاب کے باوجود وہ سمجھ سکتا تھا کہ آج رات کے کھانے میں ماہ بانو اس کے لیے بریانی بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے دیگچی فریج میں رکھنے کے ارادے سے اُٹھا لی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کلینک پہنچنے سے قبل بنائی گئی یخنی گرم ہونے کی وجہ سے وہ فریج میں رکھنے کے بجائے باہر ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس کی بنائی گئی یخنی کو محفوظ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ واپس آ کر اس سے بریانی تیار کر سکے۔

فریج کا دروازہ کھول کر یخنی اندر رکھتے ہوئے اس کی نظر کسٹرڈ کے پیالے پر پڑی۔ اس کے گلے میں یک دم ہی کوئی گولا سا پھنس گیا۔ کہنے والوں نے کتنی آسانی سے کہہ ڈالا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے لیکن یہاں سارے آثار تو یہ بتاتے تھے کہ اسے لوٹ کر واپس یہیں آنا تھا اور اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنا تھا۔

وہ سخت آزردہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ استری اسٹینڈ پر انگوری رنگ کا لباس رکھا ہوا تھا۔ یہ لباس ماہ بانو پر خوب سجتا تھا اور اسلم کا من پسند تھا شاید اسی لیے اس نے نکال کر استری کرنے کے لیے رکھا تھا تاکہ جب شام ڈھلے وہ واپس آئے تو اس کے من پسند لباس میں اس کا استقبال کر سکے۔ وہ شام ڈھلنے سے بہت پہلے واپس آ گیا تھا لیکن استقبال کرنے والی کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔

بڑے بڑے سورماؤں سے بے جگری سے ٹکرا جانے والے اسلم کا یہ سب دیکھ کر جگر پاش پاش ہونے لگا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر کسی ننھے بچے کی طرح دھواں دھار رونے لگا۔ آسمان سے برستے پانی نے اس کا دکھ بانٹنے کے لیے کچھ اور شدت سے برسنا شروع کر دیا اور نشریاتی اداروں سے خبر نشر کی جانے لگی کہ آرلینڈو میں ایک اور ہری کین آنے کو ہے۔

⊛----✪----⊛

مال گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی تھی اور وہ اندھیری رات میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں اتنی ایمرجنسی میں وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کہ وہ اپنی منزل کا بھی تعین نہیں کر سکے تھے۔ بس خوش قسمتی یہ تھی کہ پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئے تھے اور فی الحال محفوظ تھے۔ لیکن یہ سلامتی بھی انہیں پریم ناتھ جیسے قیمتی آدمی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بدلے میں حاصل ہوئی تھی۔

''یہاں سے نکلنے کے بعد تمہارے پاس کوئی دوسرا ٹھکانہ ہے؟'' شہریار نے سرگوشی میں کلام سے دریافت کیا۔

''میرا ذاتی تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے لیکن ایک آدھ جگہ رابطہ کرنے پر انتظام ہو جائے گا۔'' کلام نے بھی

دھیمے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ البتہ سلّو ان سے بے نیاز اندھیرے میں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے کسی نادیدہ شے کو تلاش کر رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔ پھر تم جہاں مناسب سمجھو، وہاں اُتر کر اپنے اس محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جانا۔ تمہارا موبائل تو تمہارے پاس ہی ہے نا؟ بھاگ دوڑ میں کہیں گرا تو نہیں؟''

موبائل محفوظ ہے۔'' کلام نے مختصر جواب دیا۔

''بس تو پھر تم اپنے لیے بندوبست شروع کر دو۔ پریم ناتھ کے تمہارے گاڑی سے بازیاب ہونے کے بعد وہ لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ نمبر بھی معلوم کر لیں اور اس کی مدد سے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔'' شہریار نے مشورہ دیا۔

''یہ نمبر میرے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہے اور صرف وہی لوگ اس نمبر سے واقف ہیں جو میری اصلیت سے بھی واقف ہیں۔ میری جان پہچان کے عام لوگوں کے پاس میرے فلیٹ میں موجود لینڈ لائن کا نمبر ہی ہوتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے اسے بتایا پھر بولا۔ ''آپ مجھے اُترنے کا مشورہ دے رہے ہیں یعنی خود میرے ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے؟''

''تم ٹھیک سمجھے۔ ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے اور پھر تم سے رابطہ کریں گے۔ حالات خراب ہونے کی صورت میں بھی تمہارے محفوظ رہنے سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ پیچھے والوں کو ہمارے انجام کی خبر ہو جائے گی اور وہ کسی دوسری ٹیم کو اس مشن کی تکمیل کے لیے بھیج سکیں گے۔'' اس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا تو کلام خاموش ہو گیا۔ ان کے پیشے میں جذبات کو پس پشت ڈالنا پڑتا تھا۔ اس وقت شہریار جو کہہ رہا تھا، وہی مناسب تھا۔

جس پل ان کی یہ گفتگو اختتام پذیر ہوئی، اسی پل سلّو یوں بھڑک کر کھڑا ہوا جیسے کسی جنگل میں خطرے کی بُو سونگھ کر غزال وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ان پر ایک جال آ پڑا اور وہ اس میں اُلجھ کر رہ گئے۔

''اپنے ہتھیار پھینک کر اُلٹے لیٹ جاؤ۔ ورنہ گولیوں سے بھونے جاؤ گے۔'' سخت لہجے میں دھمکانے والے نے اپنی طاقت کا عملی ثبوت دیا اور ان کے کانوں نے مشین گن چلنے کی آواز سنی۔

شہریار نے ہل جل کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن جانے جال کس انداز میں پھینکا گیا تھا کہ وہ اس میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ سلّو اور کلام نے بھی شاید اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھی تھی لیکن انہیں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''اگر تم لوگوں نے میرے تین تک گننے تک اپنے ہتھیار نہیں پھینکے تو تمہارے جسموں کو چھید دیا جائے گا۔'' اس دھمکی کے ساتھ ہی فضا ایک بار پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ لیکن اس بار مشین گن مخالف سمت سے چلائی گئی تھی۔

اُنہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کے مقابل آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر موجود ہیں جبکہ وہ درمیانی خلا پر ہونے کی وجہ سے کسی طور محفوظ نہیں تھے۔ ان پر جال نہ بھی پھینکا جاتا تو اس پوزیشن میں وہ کسی صورت اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' شہریار نے سرگوشی میں ان دونوں سے کہا اور خود سب سے پہلے عمل کیا۔

کلام اور سلّو کے پاس بھی ان کی پیروی کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ ہتھیار پھینکنے کے بعد وہ



حسبِ ہدایت مال گاڑی کے آہنی فرش پر اُلٹے لیٹ گئے۔ فوراً ہی آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر سے چند افراد دھنا دھن نیچے کُودے اور ان کے ہتھیاروں کو قبضے میں لے لیا۔ پھر ایک شخص عین ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ چست لباس میں چھپا ہوا تھا جس کی محض آنکھوں اور ناک کی جگہ پر سوراخ تھے۔

''اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے حکم صادر کیا تو ان تینوں نے فوراً ہی عمل کیا۔ فرش پر اُلٹے لیٹے رہنے کے مقابلے میں بیٹھنا زیادہ بہتر تھا۔ کم از کم اس طرح وہ اپنے مقابل کو دیکھ تو سکتے تھے۔

بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر طاقتور ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی جس نے ان کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔

''کس کے آدمی ہو؟'' اس نے چہروں سے انہیں شناخت کرنے میں ناکام ہو کر سرد لہجے میں پوچھا۔

''کسی کے نہیں۔'' حسبِ روایت جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی اور ٹارچ بند ہو جانے کے بعد مخاطب کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں وہ اپنے سیاہ چست لبادے کی وجہ سے محض ایک سائے کی طرح ہی نظر آ رہا تھا جسے وہ کسی طور شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ پولیس والا نہیں ہوسکتا۔ وہ لوگ محض اتفاقاً ہنگامی بنیادوں پر اس مال گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور یہ کسی طور ممکن نہیں تھا کہ پولیس والے ان کے انتظار میں پہلے سے وہاں چھپے بیٹھے ہوں۔

''چلتی مال گاڑی پر کیوں سوار ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور سوال داغا۔ یوں تو وہ تنہا ہی ان سے گفتگو کر رہا تھا لیکن وہ اس جیسے مزید سایوں کو اپنے اردگرد محسوس کر سکتے تھے۔ تیز حسیات والا سلّو انہی سایوں کی موجودگی کو بھانپ کر اپنی جگہ سے حرکت میں آیا تھا لیکن اسے تاخیر ہو گئی تھی۔

''اپنی جان بچانے کے لئے۔'' شہریار نے اختصار سے کام لیا۔ وہ خود کو گھیرنے والوں کی اصل حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا اس لیے بہت احتیاط سے گفتگو کر رہا تھا۔

''کس سے جان بچا کر بھاگے تھے؟'' اس کی طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔

''پولیس۔'' وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں ہے اس لیے یہ جواب دینے میں قباحت محسوس نہیں کی۔

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''ایک پولیس والے کی ٹھکائی کر دی تھی۔''

''کس لئے؟''

''سالا رشوت مانگتا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ڈیٹیل میں سب بتاؤ۔'' وہ آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جواب میں شہریار چپ رہا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟'' وہ غرّایا۔

''تم اتنا سب پوچھ کر کیا کرو گے؟ میں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے۔ مال گاڑی رُکے گی تو اُتر کر اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔'' شہریار نے لہجے میں بیزاری محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ تجھے اُگلنا ہوگا کہ تُو کس کا آدمی ہے اور اس مال گاڑی پر کیوں چڑھا جس میں بھائی جی کا مال جا رہا ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولا اور ایک لات شہریار کے شانے پر رسید کر دی۔

ضرب شدید تھی لیکن اس کی توجہ اپنی تکلیف سے زیادہ اس کے الفاظ پر تھی۔ بھائی جی سے اس کا غائبانہ تعارف پہلے بھی تھا۔ ممبئی میں دخل ہونے کے بعد وہ لوگ تواتر سے یہ نام سن رہے تھے۔ بار بار بھائی جی کے

آدمیوں سے ان کا ٹاکرا ہو جاتا تھا۔ ایک بار پھر وہ لوگ ان کے سامنے تھے اور یقیناً انہیں اشوک کا ساتھی سمجھ رہے تھے۔

''منہ بند کیے ٹکر ٹکر کیا دیکھے جا رہا ہے؟..... میری بات کا جواب دے۔'' اس سے شہریار کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی اور اسے ایک اور لات دے ماری۔

''ہم کون ہیں، اس سوال کا جواب میں عبدالرحمٰن کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔'' اس بار شہریار نے ذرا تیز لہجے میں جواب دیا۔ یہ تعین ہو جانے کے بعد کہ وہ بھائی جی کے آدمی ہیں، اس کے لیے اس شخص سے گفتگو کرنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔

''کس عبدالرحمٰن کی بات کرتا ہے..... اپنے عبدل بھائی کی؟'' اس نے ذرا استعجاب اور بے یقینی سے استفسار کیا۔

''ہاں اسی کی۔ اب مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر ہاتھ اُٹھانے کی غلطی مت کرنا ورنہ خود تمہارا انجام برا ہو سکتا ہے۔'' اس نے اپنے لہجے کو مزید سخت اور سرد کر لیا۔ اُس کے اس رویّے نے مقابل کو متذبذب کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہو لیکن یقین نہ کر کے کسی بدسلوکی کی ہمت بھی نہ کر پا رہا ہو۔

چند لمحے اسی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد بالآخر وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا اور فضا میں مخصوص انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ایک آدمی فوراً حرکت میں آیا۔ شہریار اور اس کے ساتھی صبر سے نتیجے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جال میں قید، کئی مسلح افراد کے نرغے میں ان کے پاس ہاتھ پیر چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

انتظار کے چند پل بیتے تو انہوں نے سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس اس آدمی کے پیچھے موجود ڈبے کی دیوار میں لمبائی کے رخ روشنی کا ایک مستطیل دیکھا۔ یہ ڈبے میں کھلنے والا دروازہ تھا جس کے اندر روشن مدھم بلب کی روشنی اندھیرے میں بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں جال سے آزاد کیا جا رہا ہے لیکن یاد رکھنا کہ کسی بھی قسم کی چالاکی بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم تمہیں جو رعایت دے رہے ہیں، وہ عبدل بھائی کے نام کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنا آدمی مان لیا تو ہم پلکوں پر بٹھائیں گے ورنہ تو تم خود اپنا انجام سمجھ سکتے ہو۔''

اب تک ان سے گفتگو کے فرائض انجام دینے والے شخص نے جال سے آزادی کی نوید سناتے ہوئے دھمکی دینا بھی ضروری سمجھا۔ ان کا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیزی سے چلتی مال گاڑی سے چھلانگ لگانے کی صورت میں اگر کسی طرح ان کی ہڈیاں سلامت رہ بھی جاتیں تو وہ گولیوں کی اس برسات سے کس طرح بچتے جو فائرنگ کے لیے تیار کھڑے افراد کی طرف سے کی جاتی۔ ان کے حق میں یہی سب سے بہتر تھا کہ وہ لوگوں سے تعاون کرتے اور عبدالرحمٰن تک پہنچ جاتے۔

پولیس کے مخبر نود کو قتل کرنے کے بعد کلام کے ایک ٹھکانے پر وہ لاش کو کسی محفوظ جگہ پر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے تب عبدالرحمٰن وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بلڈنگ سے فرار ہوا تھا جہاں پولیس نے ریڈ مارا تھا اور وہاں سے پولیس کے ساتھ مقابلہ کرنے والے آہستہ آہستہ پسپا ہوتے جا رہے تھے۔

انہوں نے اس موقع پر عبدالرحمٰن کو پناہ دینا قبول کر لیا تھا اور عبدالرحمٰن نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ انہیں کبھی ضرورت پڑے تو وہ ممبئی شہر میں کسی سے بھی عبدل کا ٹھکانہ پوچھ لیں۔ ٹھکانہ



معلوم کرنے کی تو نوبت نہیں آئی تھی لیکن وہ بھائی جی کے ساتھیوں سے آ ٹکرائے تھے۔ اسی بھائی جی کے ساتھیوں سے جس کا عبدالرحمٰن دایاں ہاتھ مانا جاتا تھا۔ اسلحے کی چھاؤں میں انہیں دروازے سے گزار کر ڈبے میں پہنچا دیا گیا۔

ڈبے کا بیشتر حصہ فرش سے چھت تک ترتیب وار رکھے لکڑی کے مضبوط ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور درمیان میں بس اتنی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی کہ چند افراد سما سکیں۔

ان تینوں کو وہاں بچھی دری پر بٹھا یا گیا۔ اسلحہ بردار اب بھی ان کے سروں پر سوار تھے حالانکہ اس ڈبے میں داخل ہونے سے قبل وہ ان کی جامہ تلاشی لے کر یہ چیک کر چکے تھے کہ پھینکے ہوئے اسلحے کے سوا ان کے پاس کوئی اور ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔

''اپنے نام بتاؤ۔ میں ابھی عبدل بھائی سے تمہارے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔'' وہ شخص جو شاید یہاں کا انچارج تھا، شہریار کی طرف منہ کر کے بولا۔ اب تک ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہے وہ یہ اخذ کر چکا تھا کہ جیسے اپنے ساتھیوں میں سے گفتگو کرنے کے اختیارات اس کے پاس ہیں اسی طرح ان تینوں میں سے شہریار ہی اس کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

''میں نوشاد ہوں اور یہ قمرو..... اس تیسرے کو تمہارا عبدل بھائی نہیں جانتا۔ ہمیں بھی پہچاننے سے انکار کرے تو یاد دلا دینا کہ ہم وہی ہیں جن کی موجودگی میں اس نے ایک گھر کے ٹینک میں چھپ کر پولیس سے اپنی جان بچائی تھی۔'' شہریار نے اسے وہی نام بتائے جو کلام کے ٹھکانے پر بتا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے، اپن بھائی سے بات کرتا ہے۔ جب تک تم ادھر آرام سے بیٹھو۔ کسی گڑبڑ کا سوچنا بھی نہیں۔ اس ڈبے میں گولی چلی تو سمجھو قیامت آ جائے گی۔'' دھمکیاں دینا شاید اس کی عادت تھی۔

''ہم کسی گڑبڑ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ رہی گولی چلنے کی بات تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے آدمی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ انہیں خود بھی معلوم ہو گا کہ بارود کے اس ڈھیر میں کوئی چنگاری پیدا کرنے کا کیا انجام ہو گا۔'' شہریار کو یک دم ہی اسے چھیڑنے کی سوجھی تو سلگانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان سے بولا۔

''کیا مطلب؟..... تمہیں کیسے معلوم کہ یہ بارود کی پیٹیاں ہیں؟'' وہ ٹھٹک گیا۔

''بھائی جی کا مال ہے تو ان پیٹیوں میں آم اور جامن تو ہونے سے رہے۔ سفید پاؤڈر وہ بیچتا نہیں ہے تو پھر ان پیٹیوں میں اسلحہ اور بارود ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تو کامن سینس کی بات ہے۔'' اس نے نہایت سکون سے جواب دیا جس پر وہ اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔

''عبدل بھائی بولتے ہیں کہ وہ تم لوگوں کو جانتے ہیں پر یہ مال گاڑی احمد آباد سے پہلے نہیں رُکنے والی اس لیے تمہیں ہمارے ساتھ وہاں تک چلنا پڑے گا۔ بھائی خود بھی وہاں آنے والے ہیں۔ وہ وہیں تم سے ملیں گے۔ جب تک تم آرام سے ہمارے ساتھ رہو۔ کھاؤ پیو اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بولو۔'' اس بار اس کا لہجہ واضح طور پر نرم تھا۔

''شکریہ۔ ہم بس تھوڑا سا پانی پینا چاہتے ہیں۔'' اس نے اپنی خواہش بیان کی جو فوراً پوری کر دی گئی۔ پانی پینے کے بعد وہ تینوں پیٹیوں سے ٹیک لگا کر اور ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ بھاگ دوڑ اور اعصابی کشیدگی کے بعد ملنے والا یہ تھوڑا سا آرام بھی بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن دل میں ایک ملال بھی تھا۔ پریم ناتھ جسے انہوں نے بڑی آسانی سے اغوا کر لیا تھا، اس سے بھی زیادہ آسانی سے ہاتھوں سے نکل گیا تھا اور یہ بات

صاف ظاہر تھی کہ اب وہ اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنے والا ہے۔ دوسری طرف ایک بار پھر ممبئی سے باہر جانے پر مجبور تھے۔ نہ جانے یہ شہر انہیں نکلنے کیوں نہیں دے رہا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ پہلے بھی وہ یہاں سے نکل کر گجرات کے شہر گاندھی نگر پہنچے تھے اور اب بھی گجرات کے ہی ایک دوسرے شہر احمد آباد لے جائے جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

''کوئی رسپانس؟'' جاوید علی دستک دے کر اس کمرے میں داخل ہوا جس میں آج کل عالیہ ٹھہری ہوئی تھی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''نو رسپانس۔'' عالیہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اشتہار چھپتے ہوئے تین دن تو ہو گئے ہیں۔ انہیں اب تک تمہیں کال کر لینی چاہئے تھی۔'' جاوید علی نے فکرمندی سے کہا تو وہ کمرے میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی۔ یہ سیٹ خاص طور پر یہاں اس لیے رکھوایا گیا تھا کہ عالیہ کے بڑوں میں سے اگر کوئی رابطہ کرے تو وہ دن رات کے کسی بھی حصے میں اس کال کو ریسیو کرنے سے محروم نہ رہ سکے۔

''شاید انہیں شک ہو گیا ہے اور وہ جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں۔'' اس نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ابھی دن کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ہو سکتا ہے اس عرصے میں وہ رابطہ کر لیں۔'' جاوید علی نے اُمید سے جڑے رہنے کو ترجیح دی اور بتانے لگا۔ ''یہ فون نمبر جس فلیٹ کا پتہ شو کرتا ہے، اس کے ساتھ والا فلیٹ بھی ہمارے ایک ساتھی کا ہے۔ وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ بلڈنگ کا چوکیدار بھی ہمارا ہی بندہ ہے اس لیے ہم نے ہر طرف نظر رکھی ہوئی ہے۔ شک ہونے کی صورت میں بھی وہ لوگ تمہارے ذریعے ہم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے لیکن کسی نے وہاں سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب دوسری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ دور دور سے عمارت کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اس کا توڑ ہم نے یہ نکالا ہے کہ مذکورہ فلیٹ میں میرے ساتھی کی بیوی دن میں تین چار چکر لگا لیتی ہے۔ اس کا ناک نقشہ تم سے مختلف ہے لیکن قد کاٹھ اور بالوں کی رنگت ملتی جلتی ہے۔ ہماری ہدایت کے مطابق وہ کھڑکیوں کے پردے کھولتی بند کرتی رہتی ہے اور کچھ وقت وہاں گزارتی ہے لیکن اپنا زاویہ ایسا رکھتی ہے کہ اگر کوئی دور سے بھی دیکھ رہا ہو تو اسے چہرہ نظر نہ آئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عورت کے قد کاٹھ سے دھوکا کھا کر وہ تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔''

''دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کس کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔'' عالیہ نے شانے اچکا کر بولتے ہوئے اپنی بے نیازی کا اظہار کرنا چاہا۔ لیکن ٹیلی فون کی بجنے والی گھنٹی نے اس کی بے نیازی کو قائم نہ رہنے دیا اور وہ یوں آنکھیں پھاڑے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملا کر دھیمی آواز میں بات کرنے لگا۔

''ہیلو۔'' اعصاب زدہ عالیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر دھیمی آواز میں کہا۔

''عالیہ.....؟'' دوسری طرف سے سوالیہ انداز میں اس کا نام پکارا گیا۔ کال کرنے والا کوئی مرد تھا۔

''یس۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے بہت محتاط ہو۔

''اپنا کوڈ نمبر بتاؤ۔'' دوسری طرف سے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ عالیہ نے اپنا کوڈ دہرا دیا۔



''اوکے۔ اب اس فلیٹ کا پتہ بتاؤ جہاں تم ٹھہری ہوئی ہو۔'' جاوید علی اسے پہلے ہی ایسے ممکنہ سوالوں کے جوابات ذہن نشین کروا چکا تھا اس لیے اس نے روانی سے پتہ بتا دیا۔

''ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا پیش آیا اور تم وہاں تک کیسے پہنچیں؟'' اس بار اس سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

''مساج سینٹر پر ریڈ ہوا تو میں گرفتاری کے ڈر سے سینٹر کی دیوار پھاند کر سائیڈ کی گلی میں کود گئی تھی اور وہاں سے ساتھ والے اسکول کی باؤنڈری کراس کر کے اسکول میں چھپ گئی تھی۔ بھاگ دوڑ میں میرا موبائل بھی کہیں گر گیا تھا اس لیے میں فوری طور پر کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں کئی گھنٹے تک وہیں چھپی رہی اور جب یہ محسوس ہوا کہ اب پولیس وہاں سے جا چکی ہے تو وہاں سے نکل کر ایک راہ گیر سے گزارش کر کے اس کے موبائل فون سے ایک دوست کو کال کی۔ میرا وہ دوست فوراً مدد کے لیے راضی ہو گیا اور میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر مجھے پک کر لیا۔ پولیس کے ڈر سے میں اپنے اپارٹمنٹ واپس نہیں جا سکتی تھی اس لیے دوست سے ہی کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی گزارش کی۔ اس نے کہا میری بیوی میکے رہنے گئی ہوئی ہے، تم میرے ساتھ ہی میرے گھر چلو۔ دو دن تک میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں رہی اور وہ مجھ سے پورا فائدہ اٹھاتا رہا۔ لیکن میں اس کے ذریعے اخبار میں اشتہار نہیں چھپوا سکتی تھی۔ وہ مجھ سے وجہ پوچھتا تو میں اسے کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ تیسرے دن اس کی بیوی کو واپس آنا تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ایک ایسے فلیٹ میں منتقل کر دیا جو کرائے پر چلتا ہے اور آج کل خالی پڑا ہوا ہے۔ فلیٹ پر آنے سے پہلے میں اخبارات میں اشتہار چھپنے کے لیے دے کر آئی تھی۔ اپنے دوست کے گھر سے اس کے فلیٹ تک آنے کے لیے مجھے چہرہ نقاب میں چھپانا پڑا تھا کہ کہیں راستے میں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اب بھی میں جانتی ہوں کہ میں کس حال میں یہاں رہ رہی ہوں۔ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے، اس ڈر سے باہر نکلنا تو دور کی بات، کھڑکیوں تک جانے سے بھی ڈرتی ہوں۔ یہاں اس خالی فلیٹ میں ضرورت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ مجھے فرش پر سونا پڑتا ہے۔ نل کا سادہ پانی پیتی ہوں اور کھانے کے لیے ڈبل روٹی، جیم اور بسکٹوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ چیزیں بھی یہاں آنے سے پہلے میرے دوست نے دلا دی تھیں۔ کل اس کا فون آیا تھا کہ میں دو تین دن میں اس کا فلیٹ خالی کر دوں کیونکہ یہاں نئے کرائے دار آنے والے ہیں اور اسے پینٹ وغیرہ کروانا ہے۔ آپ لوگوں کی طرف سے کانٹیکٹ نہ کیے جانے پر میں سخت پریشان تھی کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔ باہر کے حالات کی بھی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی۔ سارے کام کے نمبر میرے موبائل میں ہی فیڈ تھے۔''

اس نے آواز کے زبردست اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک مربوط کہانی سنا ڈالی۔ ابتدا میں کال ریسیو کرنے سے پہلے اس پر اپنے آقاؤں کی جو دہشت طاری تھی، اس پر بھی اس نے بتدریج قابو پا لیا تھا۔

''اشفاق رانا کے قتل کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس کی ساری داستان سن کر اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے دوسری طرف سے بالکل اچانک پوچھا گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا رانا قتل ہو گیا ہے؟'' عالیہ نے بے ساختہ حیرت کی بڑی خوب صورت اداکاری کی۔

''تمہیں نہیں معلوم؟..... یہ خبر تو سارے نیوز چینلز اور اخبارات میں آئی ہے۔'' دوسری طرف موجود شخص نے سرد لہجے میں استفسار کیا۔

جواب میں عالیہ نے ایک سرد آہ بھری اور بے چارگی سے بولی۔

''اس بے سروسامانی کے عالم میں اخبارات اور نیوز چینلز کہاں دستیاب ہیں؟ میں تو بس اس چار دیواری کی قیدی ہو کر رہ گئی ہوں۔ پہننے کے لیے کوئی دوسرا جوڑا تک نہیں ہے۔ جسم پر موجود کپڑے سخت گندے ہو چکے ہیں۔ آپ لوگ کب تک میری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں؟''

عالیہ نے بڑے کام کا سوال پوچھا۔ اس کے قریب بیٹھا جاوید علی بھی یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے کان کے ساتھ ایک آلہ لگا ہوا تھا اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ عالیہ کی کارکردگی سے مطمئن ہے۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تمہارے پاس دو دن ہیں ابھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو دنوں میں تمہارے لیے کیا، کیا جا سکتا ہے۔ تم انتظار کرو۔ ہم کسی بھی وقت تم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''چالاک لوگ ہیں۔ جس نمبر سے کال کر رہے تھے، اس کی سم رجسٹرڈ نہیں ہے۔ لوکیشن بھی معلوم نہیں ہو سکی کیونکہ کال کرنے والا مستقل حرکت میں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔'' کال ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد جاوید علی نے اپنے کان سے لگا آلہ الگ کرتے ہوئے عالیہ کو بتایا۔

''ان سے تم حماقت کی توقع بھی نہیں کرنا۔ ان پر تم صرف اسی صورت فتح حاصل کر سکتے ہو کہ خود ان سے زیادہ چالاکی کا مظاہرہ کرو۔'' عالیہ نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

''میں یہ بات سمجھتا ہوں اسی لیے کال آتے ہی اپنے ساتھی کو فون کر کے ہدایت دے دی تھی کہ اب اپنی بیوی کو اس فلیٹ پر مت جانے دینا۔'' جاوید علی نے بتایا۔

''بہت اچھے..... میں دعا کروں گی کہ اس جنگ میں تم ہی کامیاب رہو۔''

''آمین۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''یہ معاملہ نمٹ جائے تو میں تمہیں یہاں سے بہت اچھی جگہ شفٹ کر دوں گا۔ تم وہاں جب تک چاہو سکون سے رہنا اور اطمینان سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا۔ ہم میں سے ہر ایک تمہارے فیصلے کا احترام کرے گا۔''

عالیہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ بہت اچھی جگہ کون سی ہے لیکن وہ وہاں ٹھہرا ہی نہیں اور وہ اس کے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''کیا میں اس کے لیے رونے کے سوا کچھ نہیں کروں گا؟'' جب وہ کافی دیر رو چکا تو یہ خیال چابک کی طرح اس کے دماغ پر آ کر لگا۔ وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری ماہ بانو اس طوفانی موسم میں کہیں باہر بھٹک رہی ہو اور میں ایک محفوظ چھت کے نیچے بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کی تلاش میں باہر نکلنا ہو گا۔''

وہ بلند آواز سے بڑبڑایا اور برساتی نکال کر اسے پہننے لگا۔ اسی پل ایک زوردار دھماکا ہوا اور اسے در و دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن اس کے اپنے پائے استقامت میں ذرا لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ یہ دھماکا آسمانی بجلی گرنے سے ہوا تھا۔

آرلینڈو کے رنگ بدلتے موسم میں آسمانی بجلی کا گرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگرچہ انہیں یہاں آئے ہوئے بہت طویل عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن چند ماہ میں ہی بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ باقی معلومات بلقیس نے بہم پہنچائی تھیں۔ یہاں دھوپ اتنی شدید نکلتی تھی کہ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگتا تھا۔ اور پھر اچانک ہی



گھرے بادل اُمڈ آتے تھے جو گرج چمک کے ساتھ بارش برساتے تھے۔ یہاں ہری کین، آندھیاں، طوفانِ بادوباراں اور ہوا کے تیز جھکڑ آتے رہتے تھے اس لیے گھروں کی تعمیر بھی ایک خاص طرز پر کی جاتی تھی۔ ہر گھر میں کنڈکٹر نصب ہوتے تھے جو گھر پر بجلی گرنے کی صورت میں اسے زمین میں لے جاتے تھے۔ یوں گھر جل کر خاکستر ہونے سے محفوظ رہتا تھا۔ مکینوں کو کچھ سہنا پڑتا تھا تو محض ایک زوردار دھماکا اور بس۔ اس نے بھی دھماکے کی آواز کو سنا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا تو پیچھے کسی کو اپنی خبر پہنچانے کی بھی فکر نہیں تھی۔ بس فکر تھی تو اس کی جو دنیا میں اس کا واحد رشتہ تھی اور جسے وہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ لوگوں کی رائے کا تو اس نے پہلے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ گھر پہنچ کر اسے مزید ثبوت مل گئے تھے کہ وہ یہاں واپس لوٹنے کے لیے ہی گھر سے باہر نکلی تھی اور واپس نہیں پہنچ سکی تھی تو اس کے نزدیک اس بات کا ایک ہی مطلب تھا..... وہ کسی حادثے یا مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے ہر حال میں باہر جانا تھا اور اپنی ماہ بانو کو تلاش کر کے واپس یہاں لانا تھا۔

وہ عجیب عالمِ دیوانگی میں وہاں سے نکلا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی پانی کے تھپیڑے سے اس کے منہ پر پڑے اور لمحہ بھر کے لیے قدم ڈگمگا سے گئے۔ لیکن اس نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھال لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ بارش اتنی شدت سے برس رہی تھی کہ آنکھوں کے آگے پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔ یہاں تک کہ چند گز کے فاصلے پر موجود مین گیٹ بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے خطرناک موسم میں اس جیسا کوئی دیوانہ ہی باہر جانے کا سوچ سکتا تھا چنانچہ وہ جا رہا تھا۔

گیٹ سے اس کا فاصلہ چند فٹ رہ گیا تھا، تب ایک بار پھر بجلی زور سے کڑک کر چمکی اور لمحہ بھر کے لیے اردگرد ماحول روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں اسے مین گیٹ صاف نظر آیا اور قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ کئی ماہ کے مسلسل آنے جانے میں وہ اس وسیع و عریض گھر کے زیرِ استعمال حصوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اندھیرے میں بھی مین گیٹ کا لاک کھولنے والی ناب کو پکڑ کر آسانی سے گھما سکتا تھا لیکن اس بار عجیب ہی تجربہ ہوا۔ ناب گھومی ضرور لیکن لاک نہ کھلا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن نتیجہ وہی پہلے والا تھا۔ جھلا کر اس نے کچھ اور زور لگایا لیکن ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی پل اسے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پانی کی دُھندلی سی چادر میں سے اس شخص کو گھور کر دیکھا۔ جواب میں اس نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''یہاں وقت برباد کرنا بے کار ہیں۔ مسز مصطفیٰ نے گیٹ کو ڈبل لاک لگا رکھا ہے اور دوسرا لاک جس چابی سے کھل سکتا ہے، وہ ان کے پاس ہے۔''

اسلم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حرکت بالخصوص اسے باہر جانے سے روکنے کے لیے کی گئی ہے۔ ورنہ اتنے عرصے میں کبھی ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ کبھی گیٹ کو ڈبل لاک لگایا گیا ہو۔ مصطفیٰ خان کی رات میں غیر موجودگی کی صورت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔

''میں ابھی ان سے چابی لاتا ہوں۔'' وہ بلند آہنگ میں بولا۔ ویسے بھی ہوا اور بارش کا شور اتنا زیادہ تھا کہ دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بلند آواز میں بولنا ضروری تھا۔

''اوکے۔'' آفتاب نے اس سے بالکل بھی بحث نہیں کی اور دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں مصطفیٰ خان کی فیملی آباد تھی۔

مصطفیٰ خان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ رئیس ابنِ رئیس تھا اور اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ان کی لمبی چوڑی جائیداد کا اکلوتا حق دار اور وارث بھی۔ کہنے کو اس نے اپنی انجینئرنگ کا استعمال کرتے ہوئے ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کر رکھی تھی لیکن اس کے ٹھاٹھ باٹھ کا اس کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے ہر ماہ ٹھیک ٹھاک منافع دینے والا سپر اسٹور بھی اپنے باپ کی جائیداد کے بل بوتے پر خریدا تھا اور یہ وسیع و عریض گھر بھی۔ جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ بلقیس چاہتی بھی تو اس کی صفائی ستھرائی کا کام خود نہیں سنبھال سکتی تھی۔ ایک جز وقتی ملازم آ کر یہ کام انجام دیتا تھا۔ وہی ملازم لان کی حالت بھی ٹھیک رکھتا تھا۔ البتہ گھر کا کچن مکمل طور پر بلقیس خود سنبھالتی تھی اور لانڈری بھی خود ہی نمٹا لیتی تھی۔ باغبانی کا اسے خود بہت شوق تھا اس لیے گاہے بگاہے اس طرف بھی نظرِ کرم رہتی تھی۔

مین گیٹ سے رہائشی حصے تک کا طویل فاصلہ طے کر کے وہ دونوں اندر پہنچے تو بلقیس اور کشور منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''اتنے خراب موسم میں کہاں جا رہے تھے اسلم؟'' بلقیس نے فوراً ہی استفسار کیا۔

''ماہی کو ڈھونڈنے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ، اسلم! مجھے میری ایک ذرا سی لغزش کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرے دل پر موجود بوجھ میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ ابھی میں تم سے نظریں نہیں ملا پا رہی۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو بعد میں ماہ بانو سے سامنا ہونے پر اس کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں گی۔'' وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئی۔

''میں نے آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔'' اسلم اس سے نظر چراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''صرف زبان سے الزام نہیں لگایا ورنہ تمہاری آنکھیں، چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات مجھے یہی کہتی محسوس ہو رہی ہیں کہ میں تمہاری مجرم ہوں۔''

''پلیز بلقیس باجی! ایسی باتیں مت کریں۔ آپ تو ہمارے محسنوں میں سے ہیں۔ میں آپ کو کوئی دُکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن ابھی میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ ماہ بانو غائب ہے اور میں بس اسے تلاش کرنے جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لاک کھول دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی ورنہ مجھے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔'' اس کی سُوئی ایک ہی جگہ اٹکی تھی۔

''پلیز اسلم! ماہ بانو کی تلاش کا کام تم پولیس پر چھوڑ دو۔ اپنے وسائل کے ساتھ وہ لوگ یہ کام زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔'' اس بار آفتاب نے گفتگو میں مداخلت کی اور اسے سمجھانے لگا۔

''وسائل کتنے ہی ہوں، وہ مجھ جیسی لگن تو نہیں رکھتے ہوں گے نا۔'' اس نے دلیل دی۔

''جذباتی مت بنو اسلم! اگر یہ واقعہ پاکستان میں پیش آیا ہوتا تو تم تشویش میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ جانے پولیس صحیح طور پر کام کرے بھی یا نہیں۔ لیکن یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کتنے ہی بُرے سہی لیکن اپنے فرائض پوری تندہی سے انجام دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تم اس برفانی موسم میں باہر نکل کر کیا کر سکو گے؟ تمہیں تو یہاں کے سارے راستے بھی ڈھنگ سے یاد نہیں ہوں گے۔'' آفتاب عقلی دلائل دے رہا تھا لیکن اس کا معاملہ جذبات کا تھا۔ اس کے اندر کی بے کلی اسے چین سے بیٹھنے کہاں دیتی۔

''میں آپ سب سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت میں کسی کی کوئی بات ماننے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے ہر صورت میں جانا ہی ہو گا۔'' اپنا فیصلہ سنا کر اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے ابھی اس کا ہاتھ دروازے کی ناب پر ہی تھا کہ پیچھے سے اسے بلقیس کی آواز سنائی دی۔



''تمہیں ماہ بانو کی قسم ہے اسلم! اتنے خراب موسم میں تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے اور ماہ بانو کے معاملے میں پولیس کی رپورٹ کا انتظار کرو گے۔''

یہ الفاظ سن کر وہ ٹھٹک گیا اور قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ لیکن پھر لمحہ بھر میں ہی اس کے ساکت قدم حرکت میں آ گئے اور وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اپنے اس جذباتی وار کو ضائع جاتے دیکھ کر بلقیس گرنے والے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ آفتاب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شیشے کے شفاف دروازے سے عام حالات میں مین گیٹ فاصلے کے باوجود صاف نظر آتا تھا لیکن آج درمیان میں آسمان سے برستے پانی کی چادر تن گئی تھی۔ اس اضدلی چادر میں سے اسلم اپنے گہرے رنگ کے لباس کی وجہ سے ایک ہیولے کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک دم ہی بجلی چمکی اور لمحہ بھر کے لیے روشن ہو جانے والے منظر کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ جذباتی سا اسلم ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کو رد نہیں کر سکا تھا اور یک دم اپنے قدموں کا رخ واپس انیکسی کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اب اسلم کی نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کی زنجیر میں بندھ گیا تھا۔

''پلیز بھابی! ریلیکس ہو جائیے۔ اسلم کہیں نہیں گیا۔ انیکسی میں ہی ہے۔'' اس نے نڈھال سی بیٹھی بلقیس کو تسلی دی اور پھر کشور سے مخاطب ہوا۔

''آپ بھابی کو کوئی جوس وغیرہ پلائیے اور پھر طوبیٰ کو دیکھیے۔ بچی کتنی دیر سے اپنے کمرے میں اکیلی سو رہی ہے۔ اس سے کھانے پینے کو پوچھیے۔''

''جی اچھا۔'' کشور نے یوں مستعدی سے اس کے احکامات بجا لانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑی جیسے ساری زندگی کی مشق ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی اونچی حویلی میں تو کبھی اس نے تنکا بھی دُہرا نہ کیا تھا۔ لیکن محبت کی طاقت نے مختصر عرصے میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ وہاں سے چلی گئی تو آفتاب ننھی اُمید کو بلانے لگا جو ماں کے پیچھے جانے کے لیے مچل رہی تھی۔ بچی کو بہلاتے ہوئے بھی اس کا ذہن ماہ بانو کے عذاب میں اُلجھا ہوا تھا اور پیشانی پر پھیلنے والا شکنوں کا جال بتا رہا تھا کہ اسلم چاہے اس خلوص کو سمجھ نہ سکے لیکن اس صورتِ حال پر وہ سب ہی بری طرح پریشان ہیں۔

⊛----✪----⊛

''ہم کب تک اِدھر پڑے رہیں گے؟ یہ ہمیں عبدالرحمٰن کا مہمان کہتے ہیں لیکن حقیقت میں قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ ہوتی ہے نا جیلوں میں بڑے لوگوں کے لیے اے کلاس۔ اس میں رہ رہے ہیں ہم۔ کھانے پینے سے لے کر ہر طرح کی سہولت ہے یہاں لیکن ہم اس چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتے اور مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔''

وہ لوگ مال گاڑی میں بھائی جی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد آباد پہنچ گئے تھے۔ یہاں انہیں ایک صاف ستھرے گھر میں رکھا گیا تھا اور ہر طرح کی آسائش بھی دستیاب تھی لیکن لانے والوں نے واضح کر دیا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن سے ملاقات ہونے تک کہیں نہیں جا سکیں گے اور ان کے بارے میں حتمی فیصلہ وہی کرے گا۔ یہ انہیں اس کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا اور یہ انتظار سلّو کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس کے چہرے پر چھائی بیزاری کو دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' سلّو نے فو
جواب دیا۔

''اس کے لیے کوئی پلان ہے تمہارے پاس؟'' شہریار کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''ممبئی واپس پہنچ کر کوئی پلان بھی بنالیں گے۔ کم سے کم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو بہتر ہوگا
بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''تم غلط نہیں سوچ رہے ہو لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہارے بقول عبدالرحمٰن نے ہمیں یہاں قید
رکھا ہے تو لازمی ہے کہ اس کے آدمی ہماری نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ا
سے بھی اُلجھنا پڑے گا جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے کسی کا بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ فرض کرو ہم بلا
نقصان کے ممبئی پہنچ جاتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں پہلے کی طرح سازگار حالات نہیں ملیں گے۔ حلیے میں تبدیلی
کے اپنی تلاش میں پھرنے والے پولیس والوں سے تو شاید بچ جائیں لیکن پریم ناتھ تک رسائی اتنی آسان نہیں
ہوگی۔ وہ اپنی سکیورٹی کی طرف سے ہوشیار ہوگیا ہوگا اور ساتھ ہی ''را'' والے بھی الرٹ ہوں گے کہ اگر کوئی
پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے اپنی گرفت میں لے سکیں۔ یہ مت بھولو کہ ہم پریم ناتھ کے سامنے ا
پاکستانی ہونے اور بھارت میں موجودگی کی وجہ کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں بے حد شدومد
ڈھونڈا جا رہا ہوگا۔ ایسے حالات میں، میں عبدالرحمٰن کی دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔ اس کی طرف سے ایک
اعتبار سے دوستانہ رویّے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مارا ماری کی صورت میں یہ رویّہ تبدیل بھی ہوسکتا ہے ا
ہمارے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں۔' اس نے بہت رسان سے سلّو
سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

''عادل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بھائی جی اور عبدالرحمٰن دونوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ
مسلمانوں کے ہمدرد ہیں چنانچہ ہمیں عبدالرحمٰن سے ایک ملاقات ضرور کر لینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے ہم اس
کوئی فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہیں۔''

کلام نے بھی گفتگو میں مداخلت کرتے ہو
ایک امکان پیش کیا۔ اس وقت وہ لوگ گھر کے کشا
لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اس لیے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ ان کی آپس میں کی جانے والی گفتگ
سنی یا ریکارڈ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اطمینان سے گفتگو جاری تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ دونوں کی یہی رائے ہے تو میں بھی اس پر راضی ہو جاتا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ
میرے لیے اس طرح فارغ بیٹھ کر وقت گزارنا بڑا مشکل ہے۔ خیر..... اس مسئلے کا حل بھی نکالا جا سکتا ہے
آپ دونوں بیٹھ کر چائے پئیں، میں ذرا ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھ کر دل بہلاتا ہوں۔'' وہ اپنا چائے
کپ ہاتھ میں لیے اُٹھ گیا اور اندر کا رخ کیا۔

''بہت مختلف مزاج کا بندہ ہے۔ میں حیران ہو کہ اس مہم کے لیے آپ جیسے شخص نے اس کا انتخاب کیا
کیا؟'' اس کے جانے کے بعد کلام نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ بہت کام کا بندہ ہے اس لیے اسے فراغت بالکل اچھی نہیں لگتی
شہریار نے مسکراتے ہوئے سلّو کی طرف داری کی۔

اسی وقت گیٹ کے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ چوکیدار نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔
ہی ایک لینڈ کروزر دندناتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے رُکتے ہی اگلے دونوں دروازے کھٹا کھٹ کھلے اور



طرف سے ڈرائیور اور دوسری طرف سے گن مین برآمد ہوا۔

ڈرائیور نے کمال مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے جو
دُبلا پتلا اور لمبا سا شخص برآمد ہوا، اسے پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ عبدالرحمٰن تھا جس سے
وہ اس سے قبل کلام کے ٹھکانے پر پہلے بھی اتفاقاً مل چکے تھے۔ عبدالرحمٰن نے بھی انہیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ لیا
تھا چنانچہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔

''معاف کرنا، اپن کو آنے میں ذرا زیادہ ٹائم لگ گیا اور تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اپنے
آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کا اچھی طرح خیال رکھیں۔ تمہیں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی نا؟''
قریب پہنچ کر تینوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

''بالکل نہیں، تمہارے آدمیوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا کہ ہمیں اپنی نظروں کے سامنے سے بھی نہیں ہٹنے
دیا۔ وہ دیکھو، ایک پٹھا ابھی بھی گن لیے چھت پر ٹہل رہا ہے کہ کہیں ہم یہاں سے بھاگ نہ جائیں۔'' اس کا
مخاطب شہریار تھا لیکن جواب سلّو نے جلے کٹے لہجے میں دے ڈالا جس پر عبدالرحمٰن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا
پھر مدبرانہ لہجے میں بولا۔

''یہ بے چارے اپنی ڈیوٹی کر رہے تھے۔ اگر تم لوگ مجھ سے ملے بغیر یہاں سے چلے جاتے تو ان کی
شامت آجاتی۔'' اس دوران اس نے ایک کرسی سنبھال لی تھی اور وہ لوگ بھی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔

''آخر تمہیں ہم سے ملنے کی اتنی خواہش کیوں تھی؟ ہم سے تو تمہاری بڑی سرسری آشنائی ہے بلکہ آشنائی
بھی کیا بس ایک اتفاقی ملاقات تھی جس کے بعد تم اپنے راستے اور ہم اپنے راستے چلے گئے تھے۔'' شہریار نے
بے حد سنجیدگی سے اس سے سوال کیا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ ہم اپنے اپنے راستے پر چل رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد بھی تم مجھ سے
ٹکرائے ہو اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے ذرا بات چیت کر کے معلوم تو کریں کہ یہ چکر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے
اپن تمہارے کسی کام آسکے۔'' وہ بھی فوراً سنجیدہ ہوگیا اور شہریار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے
جواب دیا۔

''کیسا ٹکراؤ؟..... اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے اسی مال گاڑی پر چڑھ گئے جس پر
بھائی جی کا مال جا رہا تھا لیکن وہ صرف ایک اتفاق تھا، ورنہ ہمارا تم لوگوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر شہریار ذرا سا چونکا لیکن نگاہیں عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے نہیں ہٹائیں اور بالکل اسی
کے انداز میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا رہا۔

''غلط..... بالکل غلط۔ تم مال گاڑی پر چڑھنے سے پہلے بھی ہم سے ٹکرائے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ
تمہیں خود معلوم نہیں ہوا کہ تم کیا کر بیٹھے ہو۔'' عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کی تردید کی تو وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب؟''

''کیا تم پولیس کے ریڈ کے ڈر سے سپنا اپارٹمنٹس سے فرار نہیں ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور چونکا
دینے والا سوال کیا لیکن شہریار نے خود کو سنبھال کر رکھا اور بڑے ہموار لہجے میں بولا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان معاملات سے
تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق.....؟'' عبدالرحمٰن استہزائیہ انداز میں ہنسا اور پھر بولا۔ ''وہ سارا اسٹیج میں نے سجایا تھا۔ اس روز

اگر تم لوگ وہاں موجود نہیں ہوتے تو منظر بالکل مختلف ہوتا۔

''میں اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔'' شہریار نے ان کے الفاظ اور بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے طور پر کچھ اندازے قائم کر لیے تھے لیکن اس کی زبانی حقائق کو جاننا بہتر سمجھا۔

''تمہیں اپنی اور میری پہلی ملاقات تو یاد ہو گی۔ اس روز میں پولیس کے گھیرے سے نکل کر اس مکان میں پہنچا تھا جہاں تم اور تمہارے یہ ساتھی موجود تھے۔'' اس نے سلّو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس روز میں ایک پارٹی کے ٹھکانے پر موجود تھا اور اتفاق سے میری موجودگی میں ہی وہاں دو آدمیوں کو غداری کے جرم میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ وہاں شاید ان کا کوئی تیسرا ساتھی بھی موجود تھا جس نے پولیس کو خبر کر دی اور پولیس نے آناً فاناً ریڈ کر دیا۔ لیکن بعد میں مجھے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ قاتلوں کو گرفتار کرنا تو بہانہ تھا، پولیس اصل میں میری بُو سونگھتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ وہ جو بھائی جی کا دشمن ہے اشوک، وہ پولیس کے کتوں کو ہڈی ڈالتا رہتا ہے اور وہ لوگ اسے خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج کل اشوک کو بھوت چڑھا ہوا ہے کہ کسی طرح مجھے مروا کر بھائی جی کی کمر توڑ دے۔ اس لیے اُس نے اپنے کتوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ پولیس والوں کو ایک بار سبق سکھا دیا جائے۔ کیونکہ بھتا تو ہماری طرف سے بھی انہیں برابر ملتا ہے لیکن کچھ حرام کے پلّے ایسے ہیں جو سب کھا پی کر بھی ساتھ اپنے ہم مذہبوں کا ہی دیتے ہیں۔ ادھر اپنی طرف مسلمانوں کا رش ذرا زیادہ ہے اس لیے ان کی ہمدردیاں ہمارے بجائے اشوک ''صاحب'' سے ہیں۔'' اس نے اشوک کا نام لیتے ہوئے صاحب پر خصوصی زور دیا۔

''سپنا اپارٹمنٹس میں، میں نے خود جان بوجھ کر اپنی موجودگی کی خبر پولیس تک پہنچائی تھی اور پوری تیاری کے ساتھ ان کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی ایک کو بھی زندہ سلامت نہیں جانے دوں گا لیکن عین وقت پر تم لوگوں کی وجہ سے گڑبڑ ہو گئی۔ تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے اس لیے پولیس سے بچ کر بھاگ نکلنے کے چکر میں اسے اپنے پیچھے لگا بیٹھے اور ہماری ساری تیاری بے کار گئی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ تمہارا ہمارا تعلق بنتا ہے یا نہیں؟''

شہریار نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کھوجنے والی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ کہ ''تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے'' اس کے لیے خاصے معنی خیز تھے۔ ان الفاظ سے اس نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی ڈکی سے پریم ناتھ کو زندہ نکال لیا گیا ہوگا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا ہوگا کہ اسے اغوا کرنے والے پاکستانی ایجنٹ تھے اور اس سے ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن ممبئی کے ایک بڑے گینگ میں خاص اہمیت کا بندہ تھا چنانچہ اس تک بھی یہ خبریں ضرور پہنچی ہوں گی۔ ادھر اتفاق سے وہ خود اس کے بندوں سے آنکرائے تھے اس لیے اس نے ان سے خود ملاقات کرنا بہتر سمجھا اور ساری معلومات جمع کر کے یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ شہریار پر تھا کہ وہ اس ملاقات کا مقصد کھوج کر خود کو اور اپنے ساتھیوں کو کس پوزیشن پر رکھتا ہے۔ ویسے جہاں تک وہ اندازہ لگا پایا تھا، عبدالرحمٰن کا انداز اس کے ساتھ دوستانہ تھا چنانچہ اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے براہِ راست بات کرنا مناسب سمجھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہو لیکن سوال اب بھی یہی ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟''



اس سوال کو سن کر عبدالرحمٰن کھل کر ہنسا اور پھر بولا۔ ''اپن تم سے کیا چاہے گا؟ اپن تو خود تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے۔ ہاں، اس چکر میں اگر تھوڑا بہت فائدہ ہمیں بھی پہنچ گیا تو وہ برا نہیں ہوگا۔''

''تم اتنی بڑی پیشکش اپنی ذمے داری پر تو نہیں کر سکتے؟'' شہریار نے اسے کھوجا۔

''تم ٹھیک سمجھے۔ اپن نے بھائی جی سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی تمہیں یہ آفر کی ہے۔'' اس نے نہایت سادگی سے اعتراف کیا۔

''لیکن کیوں؟..... بے شک تم لوگ مسلمان ہو لیکن ہو تو بھارتی شہری اور میں ایسے کئی مسلمانوں کو جانتا ہوں جو بھارت کو اپنا وطن ہونے کی حیثیت سے پاکستان سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہے کہ تم لوگ صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری مدد کرنا چاہتے ہو، وہ بھی ایک ایسے معاملے میں جو دو ملکوں کے درمیان سلامتی اور طاقت کے توازن جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے؟''

وہ عبدالرحمٰن سے بحث کر کے اپنے سارے شکوک و شبہات دور کرنا چاہتا تھا۔ سلّو اور کلام نے اس دوران گفتگو میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے کا ایک ایک لفظ بغور سن رہے تھے۔

''تمہارے سوال اصولی طور پر درست سہی لیکن تم اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہو کہ یہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو بھارت میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے محبت کرتا ہے اور کھیلوں سے لے کر جنگ تک کے میدان میں ہمیشہ پاکستان کی سبقت پر خوش اور شکست پر اُداس ہوتا رہا ہے۔ بھائی جی، میں اور ہم جیسے کئی اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ بھائی جی کی پاکستان سے محبت کی چند اہم وجوہات بھی ہیں۔ پہلی وجہ دورانِ تعلیم پیش آنے والا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ بھائی جی ایک لائق اسٹوڈنٹ تھے اس لیے انہیں بڑی آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ کچھ ہندو انتہا پسند لڑکے ان کی ذہانت کو دیکھ کر نہلس ہونے لگے۔ اوپر سے بھائی جی تھے بھی بہت بے باک۔ انہوں نے کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور کسی بھی موقع پر بحث چھڑ جانے پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اسلام ہی اصل میں دینِ حق ہے۔ اس صاف گوئی اور بے باکی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہی نکلا اور ایک روز معاملہ زبانی بحث سے نکل کر ہاتھا پائی تک پہنچ گیا۔

بھائی جی بہادر اور جی دار تھے لیکن اکیلے اتنے سارے لڑکوں کا مقابلہ کہاں تک کرتے۔ نتیجے میں بری طرح زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔ اس پر سے کالج انتظامیہ نے ان سے ہمدردی کرنے کے بجائے واقعے کی ذمے داری ان پر ڈال کر انہیں کالج سے ٹرمینیٹ کر دیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے سیکولر ہونے کا کتنا بڑا دعویٰ کیا جائے، یہ اصل میں ہندوؤں کی سرزمین ہے۔ بھائی جی کو کالج سے نکالے جانے کا بہت غم ہوا۔ وہ بیمار رہنے لگے۔ ماں باپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو دل بہلانے کے لیے انہیں ساتھ لے کر پاکستان چلے گئے جہاں ان کے بہت سے رشتے دار ہجرت کر کے جا چکے تھے۔

پاکستان جا کر بھائی جی کو بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر اپنے ماموں کے گھر ان کا بہت دل لگا۔ دل لگنے کی وجہ ان کی ماموں زاد تھی۔ سلیقہ شعار، ذہین، مہذب اور خوب صورت لڑکی سے محبت نہ ہوتی تو عجیب ہوتا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ بھی ان سے محبت کرتی ہے چنانچہ اظہارِ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ شادی کی خواہش بھی کر ڈالی۔ جواب میں ان کی ماموں زاد نے جو کچھ کہا، وہ انہیں کبھی نہیں بھول سکا۔ اس نے کہا۔

''بے شک میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں لیکن آپ سے بڑھ کر اس وطن سے محبت کرتی ہوں۔ میرے بزرگوں نے بے شمار قربانیاں دے کر پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں ان کے بچے سکون سے آباد ہو سکیں۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ میں صرف ایک شخص کی محبت میں لاکھوں قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان جا کر کیسے بس سکتی ہوں؟''

ادھر بھائی جی کی مجبوری تھی کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس صورت میں انہیں اپنے والدین سے جدا ہونا پڑتا اور وہ اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ محبت کی بہت سی داستانوں کی طرح ان کی داستان بھی ادھوری رہ گئی لیکن وہ خود بخود ہی اس وطن سے محبت کرنے لگے جس کی خاطر ان کی محبوبہ نے انہیں چھوڑنا منظور کر لیا تھا۔ انہیں ساری زندگی اپنے والدین سے بس ایک ہی شکوہ رہا کہ وہ بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح پاکستان ہجرت کر کے کیوں نہیں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا بھارت میں کبھی دل نہیں لگ سکا۔ پھر حالات بھی موافق نہیں رہے اور قدم قدم پر ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ناانصافیوں نے انہیں انڈر ورلڈ کا حصہ بنا دیا جہاں وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے مقام بناتے ہوئے ممبئی کے بادشاہ بن گئے۔ لیکن ان کی یہ بادشاہت ہندو انتہا پسندوں کو اچھی نہیں لگتی اور وہ اشوک جیسوں کو مقابلے پر لا کر بھائی جی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن الحمدللہ بھائی جی کے ساتھ ان بے شمار مسلمانوں کی دعائیں ہیں جن کے گھر کا چولہا بھائی جی کی مہربانی سے جلتا ہے اس لیے دشمنوں کا منہ ہمیشہ کالا ہوا ہے۔''

اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نے جو کہانی سنائی، وہ اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اے سی کی جاب سے شروع ہو کر وطن کے محافظ کے روپ میں ڈھل جانے والی عملی زندگی کے مختصر دورانیے میں اسے ایسی کتنی ہی عجیب و غریب کہانیاں سننے کو مل چکی تھیں جنہوں نے زندگی کے حقائق سے جنم لیا تھا لیکن خود غیر حقیقی لگتی تھیں۔

''ٹھیک ہے، میں نے مان لیا کہ بھائی جی پاکستان اور مسلمانوں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں لیکن میں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک بھائی جی سے براہِ راست ملاقات نہ کر لوں۔'' اس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنی شرط بیان کی کیونکہ ہر یقین دہانی کے باوجود یہ خدشہ باقی تھا کہ انڈر ورلڈ کا بادشاہ اس کی مدد کے بہانے یقیناً اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

''اس ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔ تم لوگ کل صبح تیار رہنا۔ صبح ہم ممبئی واپس چلیں گے۔'' عبدالرحمٰن نے کوئی بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ قبول کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''فلیٹ کی نگرانی کرنے والا ایک بندہ میری نظر میں آ گیا ہے۔ وہ سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر موجود ہے اور ٹیلی اسکوپ کی مدد سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے آج بھی دو بار اپنی بیوی کو وہاں بھیجا تھا اور وہ نہایت احتیاط سے بس ذرا دیر کے لیے پردہ سرکا کر اوٹ میں رہتے ہوئے باہر جھانکنے کے بعد کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ اس وقت میں خود ٹیلی اسکوپ سنبھالے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا اور جانتے ہو مجھ پر کیا خوفناک انکشاف ہوا؟'' جاوید علی کا ساتھی اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا اور اس کے لہجے میں خاصا ہیجان تھا۔



''کیا انکشاف ہوا؟'' اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے رسان سے پوچھا۔

''اس آدمی کے پاس دور مار رائفل تھی اور وہ اسی کے ساتھ منسلک ٹیلی اسکوپ سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ میری بیوی اگر چند سیکنڈ اور اپنی جگہ پر کھڑی رہتی تو مجھے یقین ہے کہ اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔''

''اوہ نو.....'' اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ عالیہ کی جگہ اپنے ساتھی کی بیوی کو اس فلیٹ پر چلنے پھرنے کی ہدایت دینے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ دشمن کو وہاں عالیہ کی موجودگی کا یقین آ جائے لیکن وہ لوگ تو تصور سے زیادہ عیار اور گھٹیا نکلے تھے۔ انہوں نے خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا تھا کہ عالیہ ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ تو اس کے ساتھی کی بیوی خوش قسمت نکلی کہ گولی چلنے سے پہلے وہاں سے ہٹ گئی ورنہ خود جاوید علی کے حصے میں بے حد شرمندگی اور پچھتاوا آ جاتا۔

''اب تم بالکل بھی اپنی بیوی کو وہاں مت بھیجنا بلکہ اپنے فلیٹ میں بھی احتیاط سے رہنا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی مستقل بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔'' سراسیمگی کی کیفیت میں اس نے اپنے ساتھی کو ہدایات دیں۔

''آف کورس یار! میں یہی کروں گا۔ میری اکلوتی بیوی ہے اور خاصی عزیز بھی۔ میرا کہیں کسی دوسری عورت سے چکر بھی نہیں چل رہا کہ اپنی بیوی سے جان چھڑانے کے لیے اسے موت کے منہ میں بھیج دوں۔'' اس کے ساتھی نے تیزی سے اپنے ہیجان پر قابو پا لیا تھا اور اب ہلکے پھلکے لہجے میں بولتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سوری یار! مجھے اس چکر میں بھابی کو انوالو ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ انہیں ذرا بھی نقصان پہنچتا تو مجھے شدید دکھ اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔'' جاوید علی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''اِٹس او کے۔ غلطی صرف تمہاری نہیں، میری بھی ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسی سچویشن کا خیال نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے بچت کر دی۔ اب ہمیں گزری ہوئی باتوں پر پچھتانے کے بجائے آگے کی بہتر پلاننگ کرنی چاہئے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آگے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ وہ فون نمبر تو ٹریس نہیں ہو سکا جس سے اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کی گئی تھی۔'' اپنے ساتھی سے اتفاق سے کرتے ہوئے اس نے اسی سے مشورہ مانگا۔

اسٹیٹ ایجنٹ کو آنے والی کال کا قصہ یہ تھا کہ کسی نامعلوم آدمی نے فلیٹس کے بیرونی حصے میں نکلی ہوئی دکانوں میں قائم ایک اسٹیٹ ایجنسی پر کال کر کے یہ بات کہی تھی کہ اس نے سنا ہے فلاں نمبر کا فلیٹ کرائے کے لیے خالی ہے اور وہ اس فلیٹ کو کرائے پر لینا چاہتا ہے۔ ایجنٹ نے اسے جواب دیا کہ وہ مالک سے بات کر کے ہی کچھ کہہ سکے گا کیونکہ فلیٹ بے شک کرائے پر تو چلتا ہے لیکن مالک خود براہِ راست کرائے داروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے جاوید علی کے ساتھی سلمان سے رابطہ کیا تھا کیونکہ اس کے علم میں یہی تھا کہ اس فلیٹ کا مالک پڑوس میں رہنے والا سلمان ہے۔ یہ اور بات کہ سلمان کے کرائے دار عموماً سی ایف پی سے ہی تعلق رکھنے والے ایسے افراد ہوتے تھے جنہیں چند ماہ کسی ضرورت کے تحت وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ سلمان نے اسٹیٹ ایجنٹ سے سی ایل آئی پر آنے والا نمبر لے لیا کہ وہ خود اس شخص سے بات کر لے گا۔ ایجنٹ نے نمبر اس شرط پر دیا کہ اسے متوقع کمیشن ادا کیا جائے۔ سلمان نے کمیشن کی رقم ادا کرنے کے ساتھ زبان بندی کی شرط عائد کر دی لیکن رقم دے کر حاصل کیا جانے والا وہ نمبر کسی کام نہیں آیا تھا اور وہ اس کے

ذریعے کسی تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔

''ابھی تو ہمارے سامنے وہ رائفل والا ہی ہے جو سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے چھاپ لیں تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔'' سلمان نے مشورہ دیا۔

''مجھے شک ہے کہ وہ کرائے کا کوئی قاتل نکلے گا لیکن ٹھیک ہے، اسی کو دیکھ لیتے ہیں۔ کچھ نہ کرنے سے تو یہی بہتر رہے گا۔''

جاوید علی نے مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اس شخص کے خلاف کارروائی کے لیے کیا طریقہ کار بہتر رہے گا۔ کیونکہ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ عالیہ کے سابق آقاؤں نے اردگرد اپنے مزید ہرکاروں کو گھات میں بٹھا رکھا ہو اور وہ جیسے ہی رائفل مین پر ہاتھ ڈالیں، چھپے ہوئے دشمن میدان میں اُتر آئیں۔ مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اس سے اصل مقصد کا حصول ضرور دشوار ہو جاتا۔ وہ نیچے کے دو چار یا آٹھ دس بندوں کو گرانے میں بے شک کامیاب ہو جاتے لیکن اصل چہروں تک نہ پہنچ پاتے۔

تھوڑے سے غور و خوض کے بعد وہ حکمتِ عملی وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق سلمان کو اپنی جگہ پر ہی رہتے ہوئے بدستور نگرانی کا کام انجام دیتے رہنا تھا جبکہ جاوید علی اس ٹیم کو لیڈ کرتا جو رائفل بردار کی گرفتاری کے لیے حرکت میں آتی۔

فون بند کرنے کے بعد جاوید علی اس سلسلے میں انتظامات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے نوٹس پر اس نے سٹی گورنمنٹ کے تحت کام کرنے والے ایک محکمے سے تین گاڑیاں عملے سمیت حاصل کر لیں۔ یہ وہ محکمہ تھا جو شہر میں صحت و صفائی کا ذمے دار تھا اور اس سلسلے میں طے شدہ شیڈول کے مطابق مختلف کیڑے مار ادویات کا اسپرے کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن محکمے کی طرف سے یہ فریضہ کم ہی انجام دیا جاتا تھا اور کرتا دھرتا شہریوں کی صحت و زندگی کا سودا کر کے رقم اپنی جیبوں میں بھر لیتے تھے۔ ایسے سست اور بے پروا محکمے کے ملازم ایک گھنٹے میں مکمل تیاری کے ساتھ حاضر ہو گئے تو اس میں کمال اوپر سے ملنے والے احکامات کا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جاوید علی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ محکمے کی ایک گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ایک ایمبولینس کو بھی الرٹ کر دیا گیا جبکہ سی ایف پی کے چند نوجوان ایک علیحدہ گاڑی میں کسی ممکنہ تصادم سے نمٹنے کے لیے علیحدہ سے پیچھے ہو لئے۔ ان نوجوانوں کو ہر ممکن طور پر خود کو کسی کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ رکھنا تھا۔

جاوید علی تین گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچا تو لوگوں نے دلچسپی سے ان گاڑیوں کو دیکھا اور یہ جان کر خوش ہوئے کہ شہری انتظامیہ کو بھی اس بات کا خیال آ گیا ہے کہ مختلف علاقوں میں مچھر مار اور دیگر ادویات کا اسپرے کروایا جائے۔ اس علاقے میں بڑی تعداد میں رہائشی پلازا موجود تھے۔ جاوید علی نے دو گاڑیاں تو عملے سمیت غیر متعلقہ عمارتوں میں اسپرے کے لیے بھیج دیں جبکہ خود اس گاڑی میں اپنے ساتھیوں سمیت موجود رہا، جسے اس پلازا میں اسپرے کا کام انجام دینا تھا جس کی چھت پر رائفل بردار موجود تھا۔

''وہ آپ کی گاڑی کو دیکھ رہا ہے لیکن اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش نہیں کی۔'' پلازا کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایئر پیس میں سلمان کی سرگوشی سنی۔



''اچھا ہے، ہم آسانی سے اپنا کام کر لیں گے۔'' اس نے قدم روکے بغیر جواب دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی عملے کے دیگر افراد جیسا لباس پہنے ہوئے تھے لیکن دیگر افراد کو سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کے کسی کام میں مداخلت نہ کریں اور وہ جو کرتے ہیں، کرنے دیں۔ اس ہدایت کے ملنے پر وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ موجود افراد خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کسی نے ان سے فری ہونے یا مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

پلازا پرانا تعمیر شدہ تھا اور یہاں لفٹ کا انتظام نہیں تھا اس لیے انہیں چار منزلیں طے کر کے چھت تک جانے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ چھت پر جانے والی ان سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا مضبوط جالی دار دروازہ موجود تھا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ پلازا کے مکینوں کو کھلے عام چھت پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ کنڈی کے ساتھ لٹکے تالے نے اس خیال کو مزید تقویت بخشی۔ تالا کھلا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی چابی منسلک نہیں تھی اور زیادہ تر یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ تالے کو نقب زنی کے کسی حربے سے کھولا گیا ہوگا۔ ایک مبینہ کرائے کے قاتل کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا تھا۔

جاوید علی اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے کھلی چھت پر پہنچ گئے اور پہلی نظر میں ہی انہوں نے اس شخص کو دیکھ لیا جو وسیع و عریض چھت پر پانی کی ٹینکی کے قریب زمین سے چپکا لیٹا تھا اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھا کہ چھت سورج کی گرمی سے تپ چکی ہے۔ اس کی توجہ اب بھی یقیناً سامنے والی بلڈنگ کی اس کھڑکی کی طرف مبذول تھی جہاں اس کے خیال میں عالیہ کو نمودار ہونا تھا۔ اسپرے کرنے والی گاڑیوں کا شاید اس نے اس لیے نوٹس نہیں لیا تھا کہ سمجھ رہا ہوگا وہ لوگ نیچے فلیٹس تک اسپرے کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ان لوگوں کے چھت پر آنے اور اسے دیکھ لینے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والوں نے یہ سارا کھڑاگ پھیلایا ہی اس تک پہنچنے کے لیے تھا۔ جب تک اسے چھت پر کسی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا، صورتِ حال اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور وہ بیک وقت تین افراد کے نشانے پر تھا۔ اسے ہاتھ اٹھاتے ہی بن پڑی۔

ایک خطرناک رائفل کے ساتھ پکڑے جانے کے باعث وہ یہ پوچھنے کا تو اہل ہی نہیں تھا کہ اسے کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے خود کو گھیرنے والوں کی حیثیت کے بارے میں بھی کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھی اس ادارے کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے جس کا باقی عملہ اپارٹمنٹس میں کیڑے مار ادویات کا اسپرے کر رہا تھا لیکن یقینی طور پر ایک گھاگ مجرم یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ صرف بہروپ ہے جو اس تک پہنچنے کے لیے بھرا گیا ہے۔

''ہاتھ سر پر رکھ لو۔ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کی غلطی مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔'' جاوید علی نے غراتے ہوئے اسے دھمکی دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں فوراً حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ اٹھائے شخص کے عقب میں پہنچا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس شخص کی جامہ تلاشی لینا چاہتا ہو لیکن عقب میں پہنچ کر اس نے بالکل اچانک ہی اپنی گن کا دستہ اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ یہ ایک جچا تلا وار تھا جس نے اس شخص کو فوراً ہی تیورا کر زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ دھپ کی زوردار آواز سے منہ کے بل گرا اور گرنے کے باعث اسے خاصی چوٹیں بھی آئیں جن میں پیشانی پر اُبھرنے والا گومڑ اور پھٹ جانے والے ہونٹ سب سے نمایاں تھے۔

وہ حالتِ بے ہوشی میں تھا۔ اسے بے ہوش کرنے والے نے پھرتی سے اس کی جامہ تلاشی لینا شروع کر

دی۔ جاوید علی مطمئن سا فون پر مصروف ہو گیا۔

''ہاں سلمان! کیا رپورٹ ہے؟''

''کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ٹیلی اسکوپ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے بلڈنگ کی چھت پر کی جانے والی ان کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

''ٹھیک ہے، ایمبولینس بھجوا دو اور ریزرو پارٹی سے کہو کہ چوکنا رہیں۔ اگر کوئی ہمارا پیچھا کرتا ہے تو انہیں اسے سنبھالنا ہوگا۔''

اس نے سلمان کو ہدایات دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران نہ صرف تلاشی لینے والے نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا بلکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی جدید طرز کی ٹیلی اسکوپک رائفل کے پارٹس کو کھول کر اسے تین حصوں میں منقسم کرنے کے بعد قریب ہی پڑے ایک چھوٹے سے بیگ میں منتقل کر چکا تھا۔ گھسا پٹا سا یہ بیگ بالکل اس طرز کا تھا جو پلمبر یا الیکٹریشن وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس بیگ میں تین حصوں میں منقسم ہو جانے والی رائفل رکھے جب وہ شخص پلازا میں داخل ہوا ہوگا تو کسی کو اس پر شک بھی نہیں گزرا ہوگا اور یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کسی فلیٹ کے مکین نے اپنی ضرورت کے تحت اس شخص کو کال کر کے بلوایا ہے۔

''اب چلنا چاہئے۔'' دور سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر جاوید علی نے کہا اور پھر وہ تینوں اس بے ہوش آدمی کو اٹھا کر نیچے لے جانے لگے۔

''یہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔'' نیچے پہنچ کر جب کسی نے استفسار کیا تو بغیر رکے یہ مختصر جواب دے کر وہ آگے بڑھتے گئے۔

وہ نوجوان جو شاید اس پلازا کے ہی رہائشی تھے، مدد کے لیے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی ایمبولینس وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ اوپر سے اس کے ہوٹر کی آواز سنتے ہوئے آئے تھے۔ زخمی کو تیزی سے ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور دونوں نوجوانوں کو روک کر وہ تینوں بھی اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کو منزل کا علم تھا اس لیے اس نے فوراً ہی پوری رفتار سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پیچھے ان کے ساتھ آنے والا شہری حکومت کا عملہ حسبِ ہدایت اپنا کام کرتا رہا۔

جاوید علی اور اس کے ساتھی بالکل چوکنا بیٹھے اپنے گرد و نواح خصوصاً عقب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب تک انہیں ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی جس پر یہ شک گزرتا کہ وہ ان کے تعاقب میں ہے۔ کافی فاصلے سے آتی اپنے ساتھیوں کی گاڑی البتہ انہوں نے پہچان لی تھی۔ وہ ایک ایسی سڑک پر سفر کر رہے تھے جو بہت دور تک سیدھی چلتی جا رہی تھی اور کافی آگے جا کر دو حصوں میں منقسم ہوتی تھی۔ اس دوراہے پر پہنچ کر ڈرائیور نے ایمبولینس کو دائیں طرف کی سڑک پر موڑ دیا۔ دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باعث اس سڑک پر ٹریفک کا اژدھام کم ہو گیا تھا۔

''سر! ٹرننگ سے دو گاڑیاں ایمبولینس کے پیچھے آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کے تعاقب میں ہیں۔'' پیچھے موجود گاڑی میں سے جاوید علی کو اس کے ایک ماتحت نے اطلاع دی تو اس نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ اسے فوراً ہی ساتھ ساتھ چلتی ایک پراڈو اور شیراڈ نظر آ گئیں۔

''ٹھیک ہے، میں نے ان دونوں گاڑیوں کو دیکھ لیا ہے۔ تم لوگ بھی الرٹ رہنا۔'' اپنے پیچھے والوں کو یہ ہدایت دینے کے بعد وہ پوری توجہ سے ان مشکوک گاڑیوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو مبینہ طور پر ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی گفتگو سن لی تھی اس لیے وہ بغیر کسی ہدایت کے ہی اپنی جگہ



الرٹ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی گنز ان کے گھٹنوں کے درمیان رکھی ہوئی تھیں اور وہ کسی بھی لمحہ ضرورت پڑنے پر فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان کی طرف سے پہل اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ پہلے وہ آنے والوں کے ارادے جاننا چاہتے تھے جو ان پر اگلے چند سیکنڈوں میں ہی واضح ہو گئے۔

شیراڈ کے ساتھ ساتھ چلتی پراڈو کی رفتار میں یک لخت اضافہ ہوا اور وہ ایمبولینس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جس لمحے پراڈو، ایمبولینس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، جاوید علی کی نظریں اس میں سوار افراد سے چار ہوئیں۔ ڈرائیور کے علاوہ تقریباً سب ہی لوگ ایمبولینس کی طرف متوجہ تھے۔ نظریں ملنے پر ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھا اور پھر پراڈو آگے نکل گئی۔

''خیال رکھنا، ہمیں ان میں سے کم از کم ایک آدمی زندہ حالت میں گرفتار کرنا ہے۔'' جاوید علی نے اپنے ساتھ ایمبولینس میں سوار افراد کے پیچھے گاڑی میں موجود اپنے ساتھیوں کو بھی یہ حکم دیا۔

ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور ایمبولینس بری طرح لہرائی۔ شیراڈ سے اس کے پچھلے پہیے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ردِعمل میں فوراً ہی ایک دوسرا دھماکا گونجا اور شیراڈ لہرائی۔ یہ فائر جاوید علی کے پیچھے آنے والے ساتھیوں میں سے کسی نے کیا تھا۔

پے در پے ہونے والے فائروں نے اس سڑک پر چلنے والی دوسری گاڑیوں کے ڈرائیورز کو ہراساں کر دیا تھا جو ان کے قریب تھے۔ وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گئے جبکہ پیچھے والوں نے مزید آگے آنے کی جرأت نہیں کی۔ کچھ وہیں گاڑیاں روک کر کھڑے ہو گئے اور کچھ واپس موڑنے لگے۔ ادھر ایمبولینس اور شیراڈ دونوں ہی کے ڈرائیوروں نے مہارت سے اپنی اپنی گاڑیوں کو قابو کر کے سڑک پر روک لیا تھا۔ پراڈو بھی اپنے اور ایمبولینس کے درمیان ٹریفک چھٹنے کے بعد سڑک پر ترچھی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یوں آگے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔

پراڈو والوں نے رکتے ہی ایمبولینس پر ایک برسٹ مارا۔ نشانہ اس بار بھی پہیے ہی تھے۔ پے در پے ہونے والے دو دھماکوں نے ایمبولینس کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہونے کا اعلان کیا۔ ایمبولینس جس کا راستہ پہلے ہی مسدود تھا، بالکل ناکارہ ہو گئی لیکن اس میں سوار کسی فرد کے چہرے پر پریشانی کی معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ پُرعزم ہو گئے تھے۔

''شیراڈ والوں کو بھون ڈالو۔'' جاوید علی مسلسل پیچھے والوں سے بھی رابطے میں تھا۔ اس کی طرف سے حکم صادر ہوتے ہی دونوں طرف سے شیراڈ پر گولیاں برسنے لگیں۔ جاوید علی کے ساتھ ایمبولینس میں سوار اس کے دو ساتھی پیچھے شیراڈ پر فائرنگ کر رہے تھے جبکہ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ مل کر پراڈو کی سمت فائر کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح پراڈو کے ٹائر ناکارہ کر دے تاکہ وہ لوگ فرار نہ ہو سکیں لیکن اس کا زاویہ نہیں بن پا رہا تھا۔ بیک وقت چلتے کئی ہتھیاروں سے برستی گولیوں نے فضا کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سڑک پر اپنی گاڑی لا سکتا۔ پہلے سے موجود گاڑیاں بھی کسی نہ کسی طرح نکل جانے کی کوشش میں تھیں۔

فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جاوید علی نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے وہاں بھی صورتِ حال کی خبر دے دی۔ اس دوران ایمبولینس کا ڈرائیور پراڈو کے ایک ٹائر کو ناکارہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بے تحاشا ہوتی فائرنگ میں سب کے سب نشستوں کے درمیان دبک کر محتاط پوزیشن میں فائر کرنے پر مجبور تھے لیکن نہیں اندازہ تھا کہ ان کا دشمن بھی ان سے بہتر پوزیشن میں نہیں ہے۔ وہ تقریباً برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے۔

''تم مجھے کوّر دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح نیچے اُتر جاؤں۔'' جاوید علی کوشش کر کے ایمبولینس کے اگلے حصے میں پہنچ گیا اور ڈرائیور سے جو اُن ہی کا آدمی تھا، کہا۔

''اس میں خطرہ ہوگا سر!'' وہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔

''ہم جان کی بازی لگانے کا عہد کر کے میدان میں اُترتے ہیں پھر کسی خطرے سے کیا ڈرنا۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔'' جاوید علی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا جس کے بعد ڈرائیور مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

برستی گولیوں میں گاڑی سے اُتر کر اس کے نیچے سرک جانا یقیناً ایک مشکل کام تھا لیکن جاوید علی نے کامیابی سے یہ کارنامہ سرانجام دے لیا لیکن اس کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی۔ کسی طرف سے آنے والی ایک گولی اس کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن یہ زخم اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ یہ وہ جاوید علی تھا جس سے نواب نوازش علی کی کوٹھی میں راج کرتی خواجہ سراؤں کی مسلح افواج کو تن تنہا قابو کیا تھا۔ وہیں وہ محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہوا تھا اور نواب کی بیٹی شازمین کو دل دے بیٹھا تھا۔ شازمین بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ لیکن دشمن کی سازشوں کے نتیجے میں ایک ایسے وقت جب وہ ہسپتال کے بستر پر زخموں سے چُور چُور پڑا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس نے رگوں کو کاٹ دینے والا شازمین کا جدائی کا غم بہت حوصلے سے سہا تھا اور دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لے گا۔ اس کے سامنے شازمین کے قاتلوں کی صورت میں کوئی ایک چہرہ نہیں تھا بلکہ وہ ہر وطن دشمن میں اس کے قاتل کو ڈھونڈتا تھا اور انہیں نیست و نابود کر کے سکون پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے مقابل کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ ''را'' کے سورما ہیں اس لیے اس کے جذبے کے ماند پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایمبولینس کے نیچے لیٹ کر اس نے اپنی گن سیدھی کی اور پراڈو کی طرف فائر کر دیا۔ اس بار اسے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور پراڈو کا اگلا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ پراڈو والوں نے بھی بلا تکلف جوابی فائر کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ان پر ایمبولینس کے نیچے سے فائر کیا گیا ہے اس لیے اسی طرف رخ کر کے برسٹ مارا تھا۔ جاوید علی نیچے ہونے کی وجہ سے گولیوں سے تو محفوظ رہا لیکن گولیوں سے اُکھڑنے والی سڑک کا ایک ٹکڑا اُڑ کر اس کے ماتھے پر آ لگا۔ زخم آنکھ سے بس ذرا ہی اوپر لگا تھا۔ فوراً ہی خون بہنے لگا جو اس کی آنکھ تک بھی پہنچ گیا۔ اس نے خون کی وجہ سے دُھندلا جانے والی اپنی بصارت کو آستین کی مدد سے صاف کر کے واضح کرنے کی کوشش کی اور دوسرے ہاتھ سے زخم کو زور سے دبا کر پکڑ لیا تاکہ خون کے بہاؤ کو روک سکے۔

''آپ ٹھیک ہیں نا سر؟'' اپنے کان سے لگے ریسیور پر اسے اپنے ایک ساتھی کی پُرتشویش آواز سنائی دی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ اپنا دھیان پوری طرح دشمن پر رکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ پراڈو والے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

اس نے گن اپنے ہاتھ سے رکھ دی تھی لیکن اپنی تمام حسیات کو دشمن پر ہی مرکوز کر رکھا تھا اس لیے وہاں ہونے والی غیر معمولی سرگرمی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ لوگ وقفے وقفے سے فائر کرتے ہوئے پراڈو چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پراڈو جیسی گاڑی کی وجہ سے انہیں ایک اچھی ڈھال بھی مل گئی تھی جس کی آڑ میں وہ اپنے فرار کی کوشش جاری رکھے



ہوئے تھے۔

یک دم ہی ان کی مخالف سمت سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور یوں لگا کہ پراڈو والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ فائرنگ کے شور کے باوجود جاوید علی نے واضح طور پر انسانی چیخیں سنیں۔

''ہم پہنچ گئے ہیں۔'' یک دم ہی اس کے کان کے ساتھ لگے آلے میں ذیشان کی جاں فزا آواز گونجی تو وہ مسکرا کر وہیں لیٹ گیا۔ سر اور بازو میں لگنے والے زخم صرف تکلیف ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ ان سے جاری خون نے اسے خاصی حد تک کمزور بھی کر دیا تھا۔ لیکن وہ لیڈر ہونے کی حیثیت سے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ذیشان اور اس کے ساتھیوں کی وہاں موجودگی نے اسے اطمینان بخشا اور اس نے نہایت ہموار لہجے میں جواب دیا۔

''میں زخمی حالت میں ایمبولینس کے نیچے پڑا ہوں سر! اب اس مشن کی کمان آپ کو سنبھالنی ہوگی۔'' اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آنے والے اپنا کام بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

⊛----✪----⊛

بڑھی ہوئی شیو، اُلجھے بال، ملگجا لباس اور چہرے پر کھنڈی زردی..... یہ اسلم تھا جسے ماہ بانو کی جدائی نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔

ایکسی کے دروازے پر کھڑے آفتاب نے نہایت تاسف سے اسے دیکھا۔ وہ خود محبت کے جذبے سے آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ محبوب سے جدا ہو جانے والا یہ شخص اذیت کی کس انتہا سے گزر رہا ہوگا۔ ماہ بانو کی قسم دیئے جانے پر وہ طوفان میں باہر جانے سے تو رک گیا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ اپنے آپ سے بھی جدا ہو گیا ہو۔ خوراک کے نام پر بلقیس اور کشور بڑی مشکلوں سے اب تک اسے فقط آدھا گلاس دودھ، ایک کپ کافی اور دو بسکٹ کھلانے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ دو دن میں لی جانے والی یہ غذا ایک جوان مرد کے لیے تو کیا کسی شیر خوار بچے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ لیکن اسلم کو اس سے زیادہ مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے اندر کی تمام تر وحشتوں کے ساتھ اس نے اگر ان سے اتنا تعاون بھی کیا تھا تو خود پر خاصا جبر کر کے ہی کیا ہوگا۔

''اسلم.....!'' آفتاب نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے آہستہ سے پکارا۔ جواباً اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر محض آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

''پولیس آفیسر تم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔'' آفتاب نے اسے اطلاع دی تو وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس سے کچھ بھی کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پولیس آفیسر کو مصطفیٰ خان کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ اسلم، آفتاب کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔

''کچھ معلوم ہوا آفیسر؟'' اسلم نے بے تابی سے اس سے سوال کیا۔

''ہاں۔ لیکن شاید وہ تمہارے لیے ناپسندیدہ ہو۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا جس پر اسلم کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور آہستہ سے بولا۔

''میں سننا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری وائف کو کلینک کے قریب واقع ایک اسٹور پر سے کسی شخص کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پھر وہ اسی آدمی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بھی نظر آئی تھی جہاں ان دونوں نے کافی پی اور

پھر تمہاری بیوی اور وہ آدمی ایک گاڑی میں ساتھ بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ عینی شاہدین کے مطابق وہ اپنی مرضی سے اس آدمی کے ساتھ گئی تھی اور ذرا بھی خوف زدہ یا ہراساں نہیں لگتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہو۔ بدقسمتی سے وہاں موجود کسی شخص کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ورنہ ہم تمہیں اس جگہ تک بھی پہنچا دیتے جہاں وہ اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہو گی۔''

پولیس آفیسر کے الفاظ نے اسلم کے چہرے پر سرخی پھیلا دی لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں اس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''سوری مسٹر! فی الحال ہم طوفان کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے اس کیس پر ابھی کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی صورتِ حال واضح ہے اور ہم کسی عاقل و بالغ شخص کے اپنی مرضی سے کہیں جانے پر پابندی عائد نہیں کر سکتے۔ اگر وہ تم سے بیزار ہو کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔''

اس نے نہایت بے رحمی سے اپنے معاشرے کی اقدار کے مطابق اسلم کو جواب دیا۔ اس بار اسلم خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر دہاڑا۔

''بکواس بند کرو۔ میں تمہیں اپنی پاکباز بیوی کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' ممکن تھا کہ وہ پولیس افسر پر حملہ بھی کر دیتا لیکن آفتاب نے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے اسے پہلے ہی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔

''جو سچ تھا، وہ میں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے تم تک پہنچا دیا۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اس سچ کو مان لو یا خود کو دھوکا دے کر بہلاتے رہو۔''

افسر نے طنزیہ انداز میں کہا اور اپنی کیپ سر پر جماتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی بلقیس اور کشور بھی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر گہری افسردگی تھی۔

''آپ دونوں میری ماہی کو جانتی ہیں نا۔ اس کی پاکبازی کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے اور وہ پولیس والا اس پر اتنا بڑا الزام لگا کر چلا گیا۔ بے وفا عورت ایسی ہوتی ہے کیا جو گھر سے نکلتے وقت گھر کو چمکا کر نکلے اور عجلت میں بھی شوہر کے پسندیدہ کھانے کی تیاری کر کے جائے۔ اس کی پاکبازی کا مجھ سے بڑھ کر کون گواہ ہو سکتا ہے؟..... میں نے اسے پرکھا اور برتا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے، میں مر کر بھی ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتا جس سے اس کی عزت پر حرف آتا ہو۔ اسے اپنی آبرو اتنی عزیز نہیں ہوتی تو اتنے امتحانوں سے کیونکر گزرتی؟ چاند میں بھی داغ ہے لیکن میری ماہ بانو بالکل بے داغ ہے اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔''

رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ بولتے ہوئے اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا تو کشور خاموش نہیں رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کے طویل امتحان کے سفر کا آغاز اس کے باپ کی بدنیتی سے ہی ہوا تھا۔ چنانچہ دل میں گہرا احساسِ ندامت تھا۔ بولی تو آواز اس احساس سے بوجھل تھی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اسلم صاحب! واقعی ماہ بانو ایک مثالی لڑکی ہے اور اس پر لگائے گئے الزام کو کسی صورت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقیناً کسی مشکل کا شکار ہو گئی ہے اور ہم سب کی دعا ہے کہ وہ اس مشکل سے جلد از جلد نجات پا لے۔''

''بالکل ٹھیک۔ میری بھی اس کے بارے میں یہی رائے ہے اور میرا اور مصطفیٰ کا فیصلہ ہے کہ ہم اسے



تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ میری آج صبح سویرے ہی مصطفیٰ سے بات ہوئی ہے۔ انہیں اس حادثے کا سن کر شدید شاک لگا ہے اور انہوں نے فوری طور پر واپس آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے آنے تک آپ تم تھوڑا سا صبر کر لو۔ ان کے خاصے سورسز ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھوج لگا لیں گے۔'' بلقیس نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''پلیز بلقیس باجی! اب آپ مجھے کسی طرح مجبور مت کیجئے گا۔ پہلے ہی آپ نے ماہ بانو کی قسم دے کر میرے ہاتھ پیر باندھ دیئے تھے لیکن آپ نہیں جانتیں کہ میں کس کرب اور اذیت سے گزرا ہوں۔ شاید اتنی اذیت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوتی جب طوفان میں باہر نکلنے کی صورت میں، میں کسی حادثے کا شکار ہو جاتا۔ لیکن خیر، آپ نے جو کیا، میرے بھلے کے لیے کیا۔ اس لیے مجھے آپ سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اب آپ مجھے نہیں روکیں گی۔ میں باہر نکل کر خود اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس فکر سے بالکل آزاد ہو جائیں کہ میں دیوانگی میں خود کو کوئی نقصان پہنچا لوں گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ کیونکہ ماہ بانو کی زندگی محفوظ ہونے کا یقین کیے بغیر میں خود بھی نہیں مرنا چاہتا۔ میرے اندر اس کی خاطر زندہ رہنے کی آرزو ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی میری اس خواہش کو رد نہیں کرے گا۔''

ماہ بانو کے غیاب کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنے مربوط اور مضبوط انداز میں کوئی بات کر رہا تھا اور لہجے میں دیوانگی کے بجائے ایک عزم تھا۔ بلقیس سمیت کسی کی بھی ہمت نہیں ہو سکی کہ اس کی خواہش کو رد کر سکے چنانچہ اجازت دیتے ہی بن پڑی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ اور جو معلوم کر سکتے ہو کرو۔ لیکن رات تک لوٹ کر واپس آ جانا۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک مصطفیٰ بھی کسی اچھی خبر کے ساتھ یہاں موجود ہو۔'' بلقیس نے بڑی بہنوں کے سے خلوص کے ساتھ آہستہ سے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' آفتاب نے اسے پیشکش کی۔

''نہیں آفتاب صاحب! آپ مجھے اکیلے جانے دیں۔ آپ پاسبانِ عقل کی طرح ہیں اور فی الحال میرا جنوں آزادی چاہتا ہے۔ میں آپ کو اپنے ساتھ بھٹکانا نہیں چاہتا۔''

اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اتنی قطعیت کے ساتھ جواب دیا کہ آفتاب مزید اصرار نہیں کر سکا اور وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

سب سے پہلے اس نے انیکسی میں جا کر اپنا لباس تبدیل کیا اور بال سنوار کر گھر سے روانہ ہو گیا۔ شیو اس نے نہیں بنائی تھی کہ مزید وقت ضائع ہو گا۔ لباس کی تبدیلی اور بال سنوارنے کا عمل بھی بس ضرورتاً ہی تھا کہ ذرا مہذب حلیے میں موجود بندے کی بات لوگ نسبتاً زیادہ توجہ سے سنتے ہیں۔ گھر سے نکل کر اس نے اس علاقے کا رخ کیا جہاں وہ کلینک واقع تھا جس میں ماہ بانو اپنے روٹین کے چیک اپ کے لیے گئی تھی۔ کلینک کے اندر جا کر کچھ معلوم کرنا بے سود تھا کیونکہ یہ کوشش وہ اسی دن کر چکا تھا جس دن ماہ بانو غائب ہوئی تھی۔

اس روز اس نے غصے اور جذبات میں کلینک کے ایک ملازم کو بھی اس کی بدزبانی کا ٹھیک ٹھاک سبق سکھا ڈالا تھا۔ اس لیے اب اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اس سے تعاون کرتا۔ اس نے کلینک کے قرب و جوار میں واقع شاپس اور ریسٹورنٹس سے معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

پولیس مین نے اسے یہ تو بتایا تھا کہ ماہ بانو کو ایک اسٹور اور ریسٹورنٹ میں کسی آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سا ریسٹورنٹ یا اسٹور تھا۔ اس علاقے میں صرف دو ریسٹورنٹس تھے جبکہ

شاپس بہت ساری تھیں۔ اس نے پہلے ریسٹورنٹس سے کام کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ ماہ بانو کی تصویر اس کے پس میں موجود رہا کرتی تھی۔ یہی تصویر دکھا کر اس نے پہلے پڑنے والے ریسٹورنٹ کے عملے سے ماہ بانو کے بارے میں جاننا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا البتہ ایک ویٹریس نے اتنا ضرور بتایا کہ اس سے قبل ایک پولیس سارجنٹ بھی اس لڑکی کی تصویر لیے اسے ڈھونڈنے وہاں آ چکا ہے۔

اسلم سمجھ گیا کہ سارجنٹ نے تصویر ہسپتال کے ریکارڈ سے حاصل کی ہو گی۔ ویٹریس کے بیان سے اس کی بھی تصدیق ہو گئی کہ پولیس افسر نے یونہی آ کر انہیں کوئی داستان نہیں سنا ڈالی تھی بلکہ واقعی وہ ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ سے مایوس ہو کر وہ دوسرے میں چلا گیا۔ یہاں اس نے ریسیپشن سے کام کا آغاز کیا۔

''بہتر ہے آپ یہاں کے منیجر سے مل لیں۔ وہ اس سلسلے میں زیادہ بہتر طور پر آپ کی مدد کر سکیں گے۔'' ریسیپشن پر موجود لڑکی نے تصویر دیکھتے ہی اس سے کہا اور انٹرکام پر منیجر سے بات کرنے لگی۔

''آپ سیدھے ہاتھ چلے جائیں۔ وہیں آپ کی منیجر سے ان کے دفتر میں ملاقات ہو جائے گی۔'' ریسیور واپس رکھنے کے بعد اس نے کاؤنٹر سے دائیں جانب جانے والی گیلری کی طرف اشارہ کیا۔

اسلم دل میں ایک اُمید سی لیے اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ گیلری میں پہلے کمرے کے دروازے پر ہی منیجر کی تختی لگی تھی۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ ایک فربہی مائل تقریباً پینتالیس سالہ خوش لباس شخص نے اس کا استقبال کیا۔

''مجھے ریسپشنسٹ نے بتایا ہے کہ آپ وہ بدقسمت آدمی ہیں جن کی بیوی دو دن قبل کہیں غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اور میرے عملے نے اس سلسلے میں سارجنٹ مورس سے مکمل تعاون کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ کو بھی معلومات فراہم کر دی ہوں گی اس لیے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے؟''

اس سے ہاتھ ملانے کے بعد منیجر نے خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس کا لہجہ مہذبانہ لیکن الفاظ حوصلہ شکن تھے۔ وہ گویا دبے لفظوں میں اسے یہ جتا رہا تھا کہ ایک ایسی عورت کے لیے جو اسے چھوڑ کر بھاگ چکی ہے، وہ کیوں خوار ہوتا پھر رہا ہے۔

''ہاں، اس نے مجھے بتا دیا تھا لیکن مجھے اس کی فراہم کردہ معلومات پر یقین نہیں آیا اس لیے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اسلم نے خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے اسے جواب دیا کیونکہ وہ ہر ایک سے لڑ جھگڑ کر یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اُس ویٹریس کو بلا دیتا ہوں جس نے اُس جوڑے کو سرو کیا تھا۔ آپ خود ہی اس سے بات کر لیں۔''

منیجر اس سے کہہ کر خود انٹرکام پر مصروف ہو گیا جبکہ اسلم کے سینے میں ایک آگ سی دہکنے لگی۔ ''جوڑے'' کے لفظ نے اسے شدید تکلیف پہنچائی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو تو بہت کھلے دل سے تسلیم کر لیا تھا کہ اس سے پہلے ہی ماہ بانو کے دل پر کسی کا قبضہ تھا لیکن وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے نکاح میں ہوتے ہوئے ماہ بانو کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ اس نے بالکل سرخ چہرے کے ساتھ منیجر کو انٹرکام پر بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ کسی روزی نامی ویٹریس کو اپنے کمرے میں بھجوانے کا حکم دے رہا تھا۔



''روزی آ رہی ہے، اس سے مل کر جس طرح چاہے آپ تسلی کر لیجئے گا۔'' ریسیور رکھنے کے بعد منیجر نے اسے اطلاع دی تو وہ فقط سر ہی ہلا سکا۔

دو منٹ سے بھی کم وقت گزرا ہو گا جب کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور ملائم نسوانی آواز نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ منیجر کے ''یس'' کہنے پر اپنی آواز ہی کی طرح لوچ دار اور ملائم نظر آنے والی تقریباً اٹھارہ اُنیس سالہ لڑکی نے اندر قدم رکھا۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی تھی جس کی لمبی ٹانگیں اس منی اسکرٹ میں اور بھی نمایاں ہو رہی تھیں جو وہاں کام کرنے والی لڑکیاں یونیفارم کے طور پر پہنتی تھیں۔

''روزی! یہ ان خاتون کے شوہر ہیں جن کے بارے میں سارجنٹ مورس نے تم سے معلومات حاصل کی تھیں۔ چونکہ تم نے ہی ان خاتون اور ان کے ساتھی کو سرو کیا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں ان سے ملوا دوں۔''

منیجر نے ایک طرح سے تعاون کی رسم ادا کی تو روزی نامی وہ ویٹریس اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر؟'' اس نے نہایت شائستگی سے اسلم سے دریافت کیا۔

''پہلے تم یہ تصویر دیکھ لو اور مجھے بتاؤ کہ کیا یہ وہی خاتون ہیں جن کے بارے میں تم نے سارجنٹ مورس کو بتایا تھا؟''

اسلم کے دل میں یک دم ہی خیال آیا تھا کہ ہو سکتا ہے ہسپتال کے ریکارڈ میں موجود پاسپورٹ سائز تصویر نے ویٹریس کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو، اس لیے اس نے اپنے پرس میں موجود تصویر اس کے سامنے کر دی۔

روزی نے چند سیکنڈ تک تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے لب کھولے۔

''یس سر!..... یہ وہی خاتون ہیں۔'' اُس کی تصدیق نے اسلم کے دل میں اُبھرنے والی اُمید کی کرن کو بجھا دیا۔

''کیا تم نے ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی گفتگو سنی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے؟''

اسلم نے اذیت کے صحرا سے گزرتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا۔ اسے یہ سوال کرنا بھی ماہ بانو کی توہین کے مترادف لگا تھا لیکن اسے تلاش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

''وہ دونوں شاید پرانے شناسا تھے کیونکہ مرد ماضی کے کسی عمل کے لیے ان خاتون سے معذرت کر رہا تھا اور پھر شاید ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا تھا کیونکہ بعد میں، میں نے انہیں مسکراتے ہوئے ایک ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا۔'' روزی نے جھکی نظروں سے جواب دیتے ہوئے اس کے اندر کی دنیا کو تہ و بالا کیا۔

''آپ کے ہاں نصب کیمروں نے ان کی فوٹیج تو ضرور تیار کی ہو گی۔ کیا آپ مجھے وہ فوٹیج دکھا سکتے ہیں تاکہ میں اپنی بیوی کے ساتھ موجود شخص کو شناخت کر سکوں؟''

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اتنے ضبط سے کام لے رہا تھا ورنہ وہ تو وہ اسلم تھا جس نے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر ان پر بھی اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ جس کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے تھے اور جو اسلحے کے بغیر بھی مقابل کے چھکے چھڑا سکتا تھا۔ یہ تو ماہ بانو ہی تھی جس نے اسے جنگل کی زندگی چھوڑ کر مہذب انسانوں کی دنیا میں آنے پر مجبور کیا تھا اور جس کی خاطر وہ اپنے دیس سے اتنی دور آ بسنے پر راضی ہوا تھا۔ ماہ بانو کی یک ہی نظر اس کے دل کو موم کر دیا کرتی تھی اور اب وہ اس کی جدائی میں خاک ہو رہا تھا۔

''روزی! تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔'' منیجر نے پہلے ویٹریس کو وہاں سے روانہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس سلسلے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ فوٹیج پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ آپ چاہیں تو پولیس سے رابطہ کریں۔''

منیجر نے اس انداز میں اسے جواب دیا جس سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اسے مزید اپنے آفس میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اسے یقیناً پولیس سے ہی رابطہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ ایک بار فوٹیج دیکھ لیتا تو کم از کم یہ تو اندازہ ہو جاتا کہ ماہ بانو کے غیاب کا سبب بننے والا شخص کون تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس کا کوئی دشمن ہی رہا ہو اور وہ صرف اپنی نرم دلی کے سبب اس کے جال میں پھنس گئی ہو۔ یہ تو وہ بہرحال مان ہی نہیں سکتا تھا کہ اس نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ ماہ بانو کے نام نہ بتانے کے باوجود اس نے یہ بات پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ وہ جس شخص کی محبت میں مبتلا ہے، وہ شہریار عادل ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ان دونوں کی آنکھوں میں حیا بھی دیکھی تھی۔ وہ دونوں ہی ایسے نہیں تھے کہ اخلاقی و شرعی حدود کو توڑنے کی کوشش کرتے چنانچہ اسے یقین تھا کہ یہ معاملہ ایسا نہیں جیسا دکھ رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، آپ کے تعاون اور مشورے دونوں کے لیے ہی بہت بہت شکریہ۔'' اسلم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس بار دونوں میں سے کسی نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

اسلم کمرے سے باہر نکل کر گیلری میں پہنچا تو یک دم ہی اس ویٹریس سے ٹکراؤ ہو گیا جس سے کچھ دیر قبل اس نے منیجر کے کمرے میں بات کی تھی۔

ویٹریس نے اس سے کچھ کہے بغیر کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ششدر سا اسلم اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہاں مزید رُکنا مناسب نہیں ہے۔ کاغذ کا پرزہ اپنی مٹھی میں دبائے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے اپنی مٹھی کھولی، اس میں دبے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

''رات دس بجے مجھ سے اس پتے پر ملو۔''

مختصر سے اس پیغام کے نیچے ایک پتہ درج تھا لیکن نام نہیں لکھا تھا۔ اسلم کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی اور لگا کہ ماہ بانو کی تلاش میں کوئی بہت اہم پیش رفت ہونے والی ہے۔

لیکن ابھی دس بجنے میں بہت دیر تھی۔ درمیان کے کئی گھنٹے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں گزار سکتا تھا چنانچہ اردگرد کی شاپس سے ماہ بانو کی تصویر دکھا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔

ایک اسٹور کے مالک نے تصویر کو شناخت کر لیا۔ اس کے مطابق ماہ بانو نے وہاں سے جیلی، فریش کریم اور آئسنگ شوگر جیسے آئٹمز خریدے تھے اور پھر اپنے ساتھی مرد کے ساتھ اس حالت میں وہاں سے روانہ ہوئی تھی کہ اس نے ماہ بانو کی کمر میں اپنا دایاں بازو حمائل کر رکھا تھا۔ اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے۔

اسلم اسٹور کے آخری ریمارکس پر توجہ دینے کے بجائے ماہ بانو کی خریدی ہوئی اشیاء کے بارے میں سوچنے لگا۔ فریج میں تیار کر کے رکھا ہوا کسٹرڈ وہ ماہ بانو کے غیاب کے دن ہی دیکھ چکا تھا اور جو چیزیں اس نے اسٹور سے خریدی تھیں، وہ سب ایسی تھیں جو کسٹرڈ کی سجاوٹ کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یعنی یہ طے تھا



کہ اسے لوٹ کر گھر ہی آنا تھا۔ لیکن جانے وہ کون تھا کہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور وہ ایسے غائب ہو گئی جیسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔

اسٹور سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد اسے شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ وہ اس شخص کو دیکھ سکے جسے ماہ بانو کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ریسٹورنٹ کی طرح اسٹور میں نصب کیمرے کی فوٹیج بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ چنانچہ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ پولیس اسٹیشن جائے اور وہاں سارجنٹ مورس سے مل کر اسے فوٹیج دکھانے پر آمادہ کرے۔ اس نے فوراً ہی اس بات پر عمل کیا اور پندرہ منٹ میں وہاں جا پہنچا۔ راستے میں وہ یہ بات نوٹ کرتا ہوا گیا تھا کہ طوفان کے بعد بحالی کا کام بہت تیزی سے ہوا تھا اور زندگی دوبارہ پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی تھی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کی خواہش پر جب اسے سارجنٹ مورس کے پاس پہنچایا گیا تو مورس نے اسے اپنے سامنے موجود کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''میں وہ فوٹیج دیکھنا چاہتا ہوں جس میں میری بیوی اور وہ آدمی ایک ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ فوٹیج تمہاری تحویل میں ہیں۔'' اس نے فوراً اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیوں؟'' سارجنٹ نے اس سے یک لفظی سوال کیا۔

''اُس آدمی کو شناخت کرنے کے لئے۔ اس سے مجھے اپنی بیوی کو تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔'' اس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ حقیقتاً اسے سارجنٹ کا رویہ بری طرح چبھ رہا تھا جو شاید اسے تیسرے درجے کا شہری سمجھتے ہوئے اس طرح اس کے کیس میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی اسے لینی چاہئے تھی۔

''تمہاری بیوی کو تلاش کرنا ہماری ذمے داری ہے اس لیے تمہیں چاہئے کہ آرام سے گھر بیٹھ کر انتظار کرو۔ ہمیں جیسے ہی مزید کوئی خبر ملے گی، ہم تم تک پہنچا دیں گے۔'' وہ واقعی تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ تمہارا کام ہے۔ پھر بھی تمہیں مجھے وہ فوٹیج دکھانی چاہئے۔ ممکن ہے کہ میں اس شخص کو شناخت کر سکوں اور پولیس کو اس تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔'' اس نے نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے اس سے اصرار کیا۔

''میں وہ فوٹیج جان بوجھ کر تمہیں نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تم مشرقی مردوں کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے اگر اس شخص کو پہچان لیا تو سیدھے اس کے ٹھکانے پر پہنچو گے اور غیرت کے نام پر قتل و غارت گری مچا کر رکھ دو گے۔ جسے ظاہر ہے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم مجھ سے یہ اُمید نہ رکھو کہ میں تمہیں وہ فوٹیج دکھانے کی غلطی کروں گا۔''

اس نے ذرا تلخ لہجے میں اسلم کو یہ جواب دیا اور بے نیازی سے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسلم کو اس کا یہ انداز سخت گراں گزرا لہٰذا ذرا تند لہجے میں بولا۔

''مجھے اپنی بیوی کے کردار پر کوئی شک نہیں ہے آفیسر! مجھے یقین ہے کہ وہ کسی دشمن کے ہاتھوں میں پھنس گئی ہے اور میں اسے ہر حال میں وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''شواہد تو کچھ اور کہتے ہیں۔'' وہ ذرا طنز سے مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال، ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ تمہاری بیوی مل گئی تو تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم میرا مزید وقت برباد

مت کرو۔'' اس نے اُکھڑے ہوئے انداز میں اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دے دیا۔

اسلم کا دل چاہا کہ اس کے دو چار دانت تو ضرور ہی توڑ دے لیکن پھر اس پیغام کا خیال آ گیا جو روزی نامی ویٹرلیس نے اس تک پہنچایا تھا۔ ممکن تھا کہ دس بجے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنے کی صورت میں اسے ماہ بانو کا کوئی کلیو مل جاتا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اگر وہ اس بداخلاق پولیس والے سے اُلجھنے کی غلطی کر بیٹھتا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ اس کی عقل نے بہت بروقت اس کے جنون کو قابو کیا اور وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر اسے اپنے اس روّیے پر آفتاب یاد آ گیا جسے وہ اس لیے ساتھ لانے پر راضی نہیں ہوا تھا کہ کہیں وہ اس کے جنون کے راستے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ لیکن اب کسی پاسبانِ عقل کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود خود بھی مصلحت پسندی سے کام لے رہا تھا۔

اپنی اس روش پر اس کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے اُداس سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ یونہی پیدل چلتے ہوئے اپنا تجزیہ کرنے لگا۔ دو دن جو اس نے گھر میں ہاتھ پیر ہلائے بغیر گزارے تھے، اس کے لیے بڑے قیامت خیز ثابت ہوئے تھے۔ ان دو دنوں میں اس کے اندر سے زندگی کا احساس ختم ہو گیا تھا اور بس یہی دل چاہتا تھا کہ سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ لیکن اب جبکہ وہ ماہ بانو کو عملی طور پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو لمحہ بہ لمحہ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے نہایت سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ کوئی حماقت کرتا تو نتیجے میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتا اور کچھ بھی کرنے سے قاصر ہو جاتا۔

اسے اگر ماہ بانو کو تلاش کرنا تھا تو خود بھی آزاد اور زندہ سلامت رہنا تھا۔ دل میں زندہ رہنے کی تمنا جاگی تو یہ بھی احساس ہوا کہ دو دن سے اس نے ڈھنگ سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے جس کے باعث اس کے جسم میں ہلکا ہلکا کمزوری کا احساس جاگ رہا ہے۔ جسم کی مشین کو چلاتے رہنے کے لیے غذا کے ایندھن کی ضرورت تھی تاکہ یہ مشین اپنی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔

وہ خود کو بمشکل آمادہ کر کے ایک کافی شاپ میں جا پہنچا اور کافی کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ جلد ہی وہ دونوں چیزیں اس کی میز پر پہنچ گئیں۔

اس نے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اپنے منہ میں ڈالا۔ اسی پل دل میں یہ خیال آیا کہ نہ جانے ان دو دنوں میں ماہ بانو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ سینڈوچ کا وہ ٹکڑا اس کے حلق میں پھنس سا گیا جسے نیچے اُتارنے کے لیے اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا۔ کافی کی گرمی نے اس کی زبان اور حلق کو جلا ڈالا اور بے ساختہ ہی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔ یہ نمی کافی کی جلن کے باعث نہیں تھی بلکہ اس دکھ کے سبب تھی جو مسلسل اس کے سینے کو جلا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

لمبا قد، بے پناہ گوری رنگت، نیلگوں سبز آنکھیں، سیاہی پر غالب ہوتے چاندی جیسے سفید بال اور مضبوط و توانا جسم پر بے پناہ جچتا سفید براق کُرتہ پاجامہ..... یہ حلیہ تھا کبیر خان عرف بھائی جی کا جو بچپن سے بھی تجاوز کرتی عمر کے باوجود بلا جھجک وجیہہ اور ہینڈسم قرار دیا جا سکتا تھا۔

عبدالرحمٰن عرف عبدل کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے جانے والے وہ تینوں پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔



''تشریف رکھیے۔'' اس کا لہجہ نہایت نستعلیق تھا جس کی ممبئی کے کسی بدمعاش سے اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ظاہری شخصیت کی طرح اس کے لہجے نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

''یہ ملاقات شاید بہت پہلے ہو جاتی اگر آپ کے آدمی ہمیں شیواجی ہوٹل سے یہاں لانے میں ناکام نہ ہو جاتے۔'' شہریار نے مسکاتے ہوئے اس واقعے کا حوالہ دیا جب انہیں مخالف گروپ سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی اندو کی وجہ سے بھائی جی کے گرگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اچھا ہی ہوا کہ وہ لوگ ناکام ہو گئے ورنہ ہماری ملاقات بہت مختلف ماحول میں ہوتی۔'' بھائی جی نے نہایت نرم لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا لیکن کچھ تھا جس نے شہریار کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی اور وہ ایک بار پھر بھائی جی کی شخصیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ نہایت نفیس دکھائی دینے والے اس شخص کی اصل شخصیت کئی پرتوں میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ اس کے سادہ ہونے کا سوال پیدا بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی سادہ آدمی ممبئی کی جرم نگری پر حکومت کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔ اس صورت میں ہم دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے روبرو ہوتے۔'' شہریار نے بظاہر اس سے اتفاق کیا لیکن بین السطور یہ جتایا کہ ملاقات کے ان لمحات میں دونوں طرف کے لوگ ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں اور کسی کو کسی پر برتری نہیں۔

بھائی جی کے چونک کر اپنی طرف دیکھنے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا پیغام پوری طرح ان تک پہنچ گیا ہے۔ بھائی جی چند ثانیوں کے لیے اسے غور سے دیکھنے کے بعد دھیرے سے مسکرا دیا۔

''نوجوان! تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ تم میں وہ ہمت اور جرأت ہے جو آدمی کو اس کی منزل تک لے جاتی ہے۔ تم بھی اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گے اور مجھے خوشی ہوگی کہ میں اس کام میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

''لیکن کیوں؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''عبدل نے تمہیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ پھر یہ سوال کس لئے؟''

''میرے نزدیک ہمدردی کے لیے یہ وجہ ناکافی ہے کہ ہم ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آپ کی محبوبہ رہتی ہے۔'' اس نے بلا جھجک کہہ ڈالا لیکن بھائی جی کے چہرے پر اُبھرتے درد کے احساس نے تھوڑا سا شرمندہ کر دیا۔

''میرے نزدیک تو یہ ایک وجہ بھی بہت اہم ہے لیکن ساتھ ہی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ ہم بھارتی مسلمان جو اکثر و بیشتر ہندوؤں کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، نفسیاتی طور پر پاکستان کے استحکام میں ہی اپنی سلامتی محسوس کرتے ہیں۔ میرے جیسے طاقتور یہاں بہت کم ہیں، اکثریت کمزوروں کی ہے اور ان کمزوروں کو یہ آسرا رہتا ہے کہ اگر ان کے ساتھ ظلم ہوگا تو مذہب کے علاوہ بھی بہت سے رشتوں سے جڑے ہونے کے باعث پاکستانی عوام اور حکومت دنیا کے سامنے ان کے حق میں آواز اُٹھائے گی۔ میں اس سوچ کا حامی ہوں اور اپنی طاقتور پوزیشن کے باوجود جانتا ہوں کہ کسی بین الاقوامی فورم پر مجھ جیسے غنڈے کی نہیں، ایک مستحکم حکومت کی بات سنی جائے گی اس لیے پاکستان کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اللہ آپ کی یہ خواہش پوری کرے۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے بے ساختہ دعا کی اور مزید بولا۔ ''فی الحال تو ہمارا ملک دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث بہت مشکل حالات سے گزر رہا ہے اور ہم سمیت بس چند گنے چنے لوگ ہی ہیں جو ان سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں۔ آپ

جیسی شخصیت کا ساتھ مل گیا تو ہمارا کام ذرا آسان ہو جائے گا۔ پیچھے ہٹنے والے تو بہر حال ہم نہیں ہیں۔''

''میں اب تک تمہارا ساتھ ہی دیتا رہا ہوں ورنہ بہت ممکن تھا کہ اب تک تم پولیس کی تحویل میں ہوتے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم لوگ ممبئی میں سب سے زیادہ مطلوب افراد ہو اور پولیس دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تمہارے اس ساتھی کی رہائش گاہ کو انہوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور اس سے معمولی واقفیت رکھنے والے لوگ بھی اس وقت سخت مشکل میں ہیں۔'' بھائی جی کا اشارہ کلام کی طرف تھا۔

''جس کنٹینر میں چھپ کر تم لوگ احمد آباد سے یہاں پہنچے ہو، اس کا تعلق اگر مجھ سے نہیں ہوتا تو تمہارا اتنی آسانی سے دوبارہ ممبئی میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھرنے والے خفیہ اداروں کے آدمی اب تک تمہیں چھاپ لیتے۔ بہر حال، یہ سب بتانے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تم پر کوئی احسان جتاؤں۔ میں صرف اپنے خلوص کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ساتھ ہی تمہیں ان مشکلات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں درپیش ہیں۔ پریم ناتھ نے اپنا جو بیان ریکارڈ کروایا ہے، اس کے بعد تمہارے لیے کوئی آسانی باقی نہیں رہی ہے۔ اور ان حالات میں تمہارے لیے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا بہت ہی دشوار ہوگا۔''

''اس کے باوجود ہم اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' شہریار نے مضبوط لہجے میں اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھیوں کے تاثرات نے اُس کے اس عزم میں شامل ہونے کا اظہار کیا۔

''اور اس کام کے آغاز کے لیے تمہارے سامنے پریم ناتھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' بھائی جی نے پورے وثوق سے کہا تو ان میں سے کوئی تردید نہیں کر سکا۔

''میری مان تو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ ایک ایسا درمیانی بندہ ہے جسے خفیہ ادارے تمہیں پھانسنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کریں گے۔ پھر اسے پکڑ کر تمہیں حاصل بھی کیا ہو گا؟ وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں کسی ایسے فرد کا نام بتا دے گا جس کا ''را'' سے تعلق ہو اور جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو خفیہ اداروں کی تحویل میں دینے میں کامیاب ہوا ہو۔''

''پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ اس کے سوا ہمارے سامنے ایسا کوئی فرد نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مقصد تک پہنچ سکیں۔'' شہریار نے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا۔

''ایسا فرد میں تمہیں تلاش کر کے دوں گا۔ میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ یہ چھوٹا سا کام آسانی سے ہو جائے گا۔'' بھائی جی نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا اور پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

''اس کام کے بدلے تمہیں بھی میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' شہریار نے چونک کر استفسار کیا۔

''تمہیں میرے مخالف اشوک کو قتل کرنا ہوگا۔'' اس کی فرمائش نے ان تینوں کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ کبیر خان عرف بھائی جی خود اتنے وسائل کا مالک تھا کہ اس کے آدمی اُس کی اس خواہش کو پورا کر سکتے تھے پھر اسے ان سے یہ کام لینے کا کیوں خیال آیا تھا؟ تینوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی اس اُلجھن کو شہریار نے سوال کی صورت اس کے سامنے رکھ دیا۔

''قتل کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ میں اشوک کو اور اشوک مجھے موقع ملنے پر ہلاک کر سکتے ہیں لیکن صرف اس لیے نہیں کرتے کہ اس صورت میں فسادات کی ایک آگ بھڑک اُٹھے گی اور دونوں طرف کے لوگ انتقام کے چکر میں ایک دوسرے کو کھیت ڈالیں گے۔ لیکن یہ کام اگر تم کر دو تو مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے



گی بلکہ میں اعلان کر دوں گا کہ ایک ہندوستانی کو قتل کرنے والوں سے انتقام لیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس صورت میں اشوک کے بندے جوق در جوق میری طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اور اس کے بعد پورے ممبئی میں ایسا کوئی طاقتور گروہ باقی نہیں رہے گا جو میرے مقابلے پر آنے کی جرأت کر سکے۔''

بالآخر بلی تھیلے سے برآمد ہو گئی اور ان پر واضح ہو گیا کہ اس سے پہلے بھائی جی ان کی مدد کے لیے جو جذباتی وجوہات پیش کرتا رہا تھا، وہ محض لفاظی تھی اور اس کا حقیقی مقصد وہی تھا جو اس نے اب بیان کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تمہیں زخمی دیکھ کر افسوس ہوا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ تم نے نہایت کامیابی سے دشمن کی چال کو ناکام بنا دیا۔'' زخموں کی مرہم پٹی کروا کر جاوید علی ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو وہاں سب سے پہلے عالیہ سے سامنا ہو۔

''تمہارے جذبات کے لیے شکریہ۔ لیکن یاد رہنا کہ زخموں سے سپاہی کبھی نہیں گھبراتا۔ کیونکہ زخم ہی اس کے اصل میڈل ہوتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ کی بات کا جواب دیا تو وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اچھا خاصا خون بہہ جانے کے باعث اس کی رنگت میں ہلکی سی زردی در آئی تھی لیکن اس کے باوجود آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اس کی ذہانت اور جرأت کی گواہی دیتی تھی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں خاتون؟'' جاوید علی نے اسے ٹوکا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ جو لوگ اپنی زندگی کا درست نصب العین متعین کر لیتے ہیں، کتنے بہادر اور کھرے نظر آتے ہیں۔'' اس نے بے خودی کے عالم میں جواب دیا۔

''اس تعریف نے میرا کئی لیٹر خون بڑھا دیا ہے اور امید ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے آئرن اور طاقت کی جو دوسری ادویات دی ہیں، اب ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس نے مذاق میں بات اُڑانے کی کوشش کی جس پر عالیہ کھل کر ہنس دی۔

جاوید علی نے محسوس کیا کہ یہ ہنسی اس سے بہت مختلف ہے جو مساج سینٹر میں وہ گاہکوں کو لبھانے کے لیے بکھیرتی تھی۔ یہ وہ خالص ہنسی تھی جو کسی بھی عام سی لڑکی کے ہونٹوں پر بکھرتی ہے۔

''تم اپنی تیاری کر لو۔ آج میں تمہیں اس جگہ لے چلوں گا، جہاں کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔'' گفتگو کے سلسلے کو مزید آگے بڑھائے بغیر وہ اسے ہدایت دے کر خود آگے بڑھ گیا۔

ہسپتال میں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے علاوہ خون اور گلوکوز کی ایک ایک بوتل بھی لگائی گئی تھی، اس کے باوجود وہ خفیف سی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کمزوری کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا اور ڈاکٹروں کے اصرار کے باوجود چند گھنٹوں سے زیادہ ہسپتال میں رکنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔

اسے بے چینی تھی کہ آپریشن میں اپنے حصے میں آنے والی کامیابی کا جائزہ لے سکے۔ ویسے تو اسے وہاں اپنے ساتھ موجود ساتھی کے ذریعے یہ اطلاعات مل گئی تھیں کہ حملہ آوروں میں سے کسی کو بھی زندہ بچ نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں کُل ملا کر آٹھ افراد سوار تھے جن میں سے پانچ تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے، تین کو زخمی حالت میں وہاں سے گرفتار کر کے لے جایا گیا تھا۔ ان میں سے بھی ایک راستے میں دم توڑ گیا جبکہ دو زخمی حالت میں ان کی تحویل میں تھے اور ان سے تفتیش کی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جہاں عموماً مجرموں سے تفتیش کی جاتی تھی۔

''آپ کو میجر صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس سے قبل کہ وہ اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچتا، اسے راستے میں ایک آدمی نے یہ پیغام دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میجر صاحب سے اس کی مراد ذیشان ہے جو وہاں نصب جدید آلات کی وجہ سے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بھی ماتحتوں کی آمدورفت سے باخبر رہتا تھا۔ حکم کی تعمیل میں وہ فوری طور پر اس طرف روانہ ہوگیا۔

''السلام علیکم سر!'' اجازت ملنے پر اندر داخل ہو کر اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام..... آؤ بیٹھو۔'' ذیشان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب کیسا فیل کر رہے ہو؟''

''مچ بیٹر سر!'' وہ مسکرایا۔

''لیکن ڈاکٹروں کا تو کہنا ہے کہ ابھی تمہیں ہسپتال میں رہ کر آرام کی ضرورت تھی؟'' ذیشان نے سرزنش کرنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''میں ڈاکٹر کی رائے سے متفق نہیں تھا کیونکہ اپنی باڈی کے بارے میں، میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نوجوان نے سی ایف پی میں اپنے انتخاب کو ہر لمحے درست ثابت کیا تھا۔ وہ اتنا باصلاحیت تھا، تب ہی تو جب شہریار، سلو والے کیس پر کام کرنے کراچی گیا تھا، اس نے کراچی یونٹ میں موجود ہر شخص کو چھوڑ کر اپنے ساتھ کے لیے جاوید علی کو منتخب کیا تھا جس نے شازمین کی جدائی کے تازہ زخم کے باوجود بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس کیس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چینی ہے جس پر تم کام کر رہے ہو۔ اطمینان رکھو۔ تم نے جو چند گھنٹے ہسپتال میں گزارے ہیں، انہیں ہم نے ضائع نہیں ہونے دیا اور دونوں گرفتار زخمیوں سے ٹھیک ٹھاک معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ان دونوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ''را'' کے لیے کام کرتے ہیں لیکن وہ فائٹنگ ونگ کے بندے ہیں اور صرف ملنے والی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ پلاننگ کے شعبے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پلازا کی چھت پر جس رائفل بردار آدمی کو عالیہ کو قتل کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا، وہ ایک کرائے کا قاتل ہے جو بڑے معاوضے پر ایسے کام نہایت صفائی سے انجام دیتا ہے۔ تمہارا راستہ روکنے والوں کو اس شخص اور گرد و پیش کی نگرانی پر متعین کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ عالیہ کے قتل کی صورت میں کہیں نہ کہیں سے ردِعمل ظاہر ہوگا اور وہ ایسے افراد کو گھیرنے کی کوشش کریں گے جو زیادہ سرگرم نظر آئیں۔ رائفل بردار اپنے مقصد میں تو کامیاب نہیں ہو سکا لیکن تم لوگوں کو اسے ایمبولینس میں ڈال کر لے جاتے دیکھ کر نگرانی کرنے والوں نے سمجھ لیا کہ تم ہی ان کے مطلوبہ افراد ہو۔ چنانچہ انہوں نے تمہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ نہیں جان سکے کہ پیچھے ایک گاڑی میں تمہارے مزید ساتھی بھی موجود ہیں اس لیے خود پھنس گئے۔ دوسرے انہیں تم لوگوں کو زندہ پکڑ کر لانے کی ہدایت کی گئی تھی اس لیے انہوں نے بہت سخت ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ پراڈو والوں کے پاس تو آٹومیٹک اسلحے کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ تک موجود تھے۔'' ذیشان نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''ہمیں اغوا کر کے وہ کہاں لے جاتے؟'' جاوید علی کا جوش اب بھی قائم تھا۔

''گلبرگ کی ایک کوٹھی کا پتہ بتایا تھا انہوں نے لیکن وہاں ریڈ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں موجود افراد ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سامان اور اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ وہاں سے کوئی ثبوت بھی نہیں ملا۔ اسلحہ روسی ساختہ تھا لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ بس اسلحے اور وہاں موجود ورزش کے آلات دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کچھ لڑنے بھڑنے والے افراد کا ٹھکانہ تھا۔ اس جگہ کو پولیس کی کسٹڈی میں دے دیا گیا



ہے۔ اس کے علاوہ کرائے کے قاتل کو بھی پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس سے تفتیش کر کے پولیس خود ہی معلوم کر لے گی کہ اس نے کہاں کہاں اور کتنے افراد کو قتل کیا ہے۔ اس کیس سے نمٹنے کے لیے پولیس ہی بہتر ہے۔'' ذیشان نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا کیونکہ وہ جاوید علی کی اس معاملے میں دلچسپی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ہم اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے؟'' وہ جسم پر زخم کھا کر اتنا نڈھال نہیں ہوا تھا جتنا ان خبروں سے خود کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔

''فی الحال..... لیکن ہمیں مکمل طور پر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی ہمارے پاس وہ دونوں آدمی موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم ان سے مزید معلومات اُگلوا سکتے ہیں۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی تو وہ دوبارہ پُرجوش ہوگیا۔

''میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں سر!''

''ٹھیک ہے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اسے اجازت دے دی کہ اس کے اندر جلتے الاؤ پر پانی ڈالنے کے لیے ایسے ٹاسک بہت ضروری تھے۔

اجازت ملتے ہی وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ان دونوں میں سے ایک کی موجودگی کی اطلاع دی۔ وہ شخص ایک کرسی پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کرسی میں نصب ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے حاصل شدہ معلومات کے مطابق یہ گولی کا زخم تھا۔ گولی نے اس کی ہڈی کو توڑ دیا تھا لیکن انہوں نے اسے ہسپتال لے جانے کی زحمت نہیں کی تھی اور سی ایف پی کے ایک ایسے اہلکار نے جو فوج میں میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہا تھا، اس کے پیر سے گولی نکال کر زخم پر بینڈیج باندھ دی تھی۔ یہ کوئی علاج نہیں تھا۔ اس شخص کو باقاعدہ آپریشن کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ اس کے لیے ایسے چونچلے نہیں اٹھا سکتے تھے اس لیے بس اتنے پر اکتفا کیا تھا کہ وہ فوری طور پر مرنے سے بچ جائے۔ اس کے سوجن زدہ چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ معلومات کے حصول کے لیے سی ایف پی کے جوانوں نے بھی اس کی خاطر خواہ مدارت کی تھی۔

اس وقت وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا جو شاید کسی پین کلر کی مہربانی تھی۔ جاوید علی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا تو وہ ایک کراہ کے ساتھ بیدار ہوگیا۔ اپنے سامنے جاوید علی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی اُتر آئیں۔

''موہن..... یہی نام ہے نا تمہارا؟'' سپاٹ لہجے میں کیے گئے اس سوال کا جواب اس نے سر کی اثباتی جنبش سے دیا۔

''تم مجھے ایسا کیا بتا سکتے ہو موہن! جو اب تک تم نے میرے ساتھیوں کو نہیں بتایا؟'' اس نے اسی سرد لہجے میں پوچھا جو مقابل کے وجود میں خوف کی لہر دوڑا دیتا تھا۔

''مم..... میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میرے پاس بتانے کے لیے اب کچھ نہیں ہے۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ پھر میرے پاس تم سے کرنے کے لیے ایسا سلوک ہے جو اب تک میرے ساتھیوں میں سے کسی نے تمہارے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ سرد لہجے میں بولا اور رُوئے سخن پہلے سے وہاں موجود سلمان کی طرف کر لیا۔

''اس کی بینڈیج کھول دو سلمان!''

سلمان نے فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بینڈیج کھلتے ہی موہن کے چہرے پر چھائے خوف اور تکلیف کے تاثرات پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اور منہ سے بے ساختہ ہی سسکاریاں نکلنے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو یقیناً بینڈیج نے کچھ سہارا دیا ہوا تھا، وہ بالکل آزاد ہوگئی تو درد بھی اس کی برداشت سے کھیلنے کے لیے آزاد ہوگیا اور زخم سے ایک بار پھر خون رِسنے لگا۔

''ہم اپنے اپنے وطن کے سپاہی ہیں اس لیے زخم تو ہم دونوں ہی کے حصے میں آئے ہیں لیکن فرق ہماری حیثیت کا ہے۔ تم غاصب اور بدنیت ہو اور اپنی سازشوں سے میرے وطن کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہو جبکہ میں تم جیسوں کے ساتھ اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہا ہوں اس لیے تم سے کوئی بھی سخت ترین روّیہ اپنانے میں حق بجانب ہوں۔ ہمارے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ اس وقت میں مختار اور تم قیدی ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم مجھ سے بدترین روّیہ اختیار کرتے اس لیے میں بھی بے شمار انسانوں کے قتل میں ملوث شخص سے کوئی بھی سلوک کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔''

وہ عملی قدم اٹھانے سے پہلے اسے نفسیاتی حربوں سے زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور موہن کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے۔

''الیکٹرک راڈ لاؤ سلمان! اور اس کے زخم میں اس جگہ گھسا دو جہاں گولی نے سوراخ کیا ہے۔ اگر اس پر اس کا بھی اثر نہ ہوا تو پھر زخم میں نمک اور مرچیں بھر دینا۔''

یہ احکامات دیتے ہوئے اس کے چہرے سے نرمی کے تاثرات بالکل ختم ہو گئے تھے اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو کچھ دیر قبل عالیہ سے بہت اچھے موڈ میں بات کر رہا تھا۔

سلمان نے اس کے احکامات پر خاموشی سے عمل کیا اور جب وہ سرخ دہکتی ہوئی راڈ لے کر موہن کے قریب پہنچا تو موہن کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ سلمان نے راڈ کو اس کے زخم سے جیسے ہی چھوا، وہ فلک شگاف آواز میں چیخا۔ یہ چیخ ایسی تھی کہ سننے والے کو اندازہ ہو جائے کہ اب اس میں مزید دم خم نہیں ہے۔ سلمان نے مشکل سے تین سیکنڈ کے لیے ہی راڈ اس کے زخم پر رکھی ہوگی لیکن یہ تین سیکنڈ بھی اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ وہ سر سے پیر تک پسینے سے بری طرح نہا گیا تھا۔

''کیا خیال ہے..... اس بار تین کے بجائے تیس سیکنڈ کے لیے راڈ تمہارے زخم پر رکھی جائے گی بلکہ پوری طرح اندر داخل کر دیں گے تو زیادہ ہی مناسب ہوگا۔''

جاوید علی نے بڑے پُرسکون انداز میں اس کی رائے طلب کی جس پر اس کی آنکھوں میں نفرت لہرائی تھی لیکن وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ اپنی نفرت کا اظہار کر سکے اس لیے صلح جُو انداز میں بولا۔

''میں پہلے ہی تمہارے ساتھیوں کو بہت کچھ بتا چکا ہوں اب مزید.....''

''میں نے کہا نا کہ مجھے وہ سننا ہے جو تم نے نہیں بتایا۔ اس لیے تمہارے لیے بہتر ہے کہ مجھے وہ بتاؤ جو میں سننا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرے پاس زبان کھلوانے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک طریقے موجود ہیں۔ تم اگر انہیں خود پر آزمانے کا شوق رکھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' جاوید علی نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی اور سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی حرکت میں آیا۔

ابھی راڈ موہن کے زخم سے انچ بھر دور تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ چیخا۔

''بھگوان کے لیے اسے مجھ سے دور رکھو۔ میں تمہیں ایک بہت کام کی بات بتاتا ہوں۔''



سلمان نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

''بولتے رہو۔ رُکے تو ہم شروع ہو جائیں گے۔'' اس کی آمادگی کے باوجود اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس دھمکی نے خاصا اثر کیا اور وہ بغیر رُکے بولنا شروع ہو گیا۔

''میں ''را'' کے فائٹنگ وِنگ میں شامل ہوں۔ میں اور میرے ساتھی آرڈر ملنے پر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہر مشن کا پلان ہمیں اپنے انچارج سے مل جاتا ہے اور ہمارا اوپر والوں سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رہتا اس لیے ہم کسی کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ کلبرگ کی جس کوٹھی کا پتہ تم لوگوں کو بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی ٹھکانے کا آفیشلی ہمیں علم بھی نہیں ہے لیکن میں اتفاق سے ایک ایسی جگہ کو جانتا ہوں جس کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہاں ہمارے کچھ بڑے رہتے ہیں کیونکہ اس بنگلے میں، میں نے اپنے انچارج کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ باقی کنفرم کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔''

اس نے ایک ایسی بات بتائی تھی جس سے انہیں فائدہ ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ بہرحال، اس کلیو پر انہیں کام تو کرنا ہی تھا کہ ان کی فیلڈ میں امکانات پر ہی کام کیا جاتا ہے۔ موہن سے اس بنگلے کا پتہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسے مزید بھی ٹٹولتا رہا لیکن اس کے علاوہ کوئی خاطر خواہ بات معلوم نہ ہو سکی۔

''اس بنگلے کی نگرانی پر آدمی لگا دو۔ اس بار ہم ڈائریکٹ ریڈ کرنے کے بجائے موقع دیکھ کر کارروائی کریں گے۔'' وہ سلمان کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تو اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہو جائے گا۔ لیکن تم اپنا خیال رکھو۔ ابھی تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے اور تم ہسپتال سے اٹھ کر یہاں آ گئے ہو۔'' سلمان نے اسے ٹوکا۔

''میں ٹھیک ہوں یار!..... لیکن تم لوگ اتنا اصرار کر رہے ہو تو ریسٹ بھی کر لوں گا۔ یہاں سے میرا سیدھے گھر جانے کا ہی پروگرام ہے۔ امی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ بس تم مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔''

''بے فکر رہو۔ میں تمہیں اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔'' سلمان نے اسے تسلی دی تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ اپنا مختصر سامان پیک کر چکی تھی۔

''ریڈی ہو..... چلیں؟'' اس نے پوچھا تو عالیہ نے محض سر کی جنبش سے اسے اثبات میں جواب دیا اور ایک چادر اٹھا کر اسے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹنے کے بعد اس کے ایک پلّو سے نقاب کی طرح اپنے چہرے کو چھپا لیا جس پر جاوید علی کے چہرے پر ایک پسندیدہ تاثر اُبھرا لیکن زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی میں سوار وہاں سے جا رہے تھے۔

''تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد عالیہ نے اس سے دریافت کیا۔

''جا تو رہے ہیں..... پہنچ کر تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔''

''بڑے پکے ہو بھئی۔ کچھ اُگلتے ہی نہیں۔''

''اتنی آسانی سے اُگلنے والا ہوتا تو وطن کے محافظوں میں کیونکر شامل ہوتا؟'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا تو عالیہ بھی مسکرا دی۔ اس کے بعد کا سفر انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں گزار دیا۔ آخر کار وہ ایک چھوٹے سے خوش نما مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ دونوں اپنی اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔ جاوید علی نے پہلے عالیہ کا بیگ پچھلی سیٹ سے اٹھایا، پھر گاڑی لاک کر کے مکان کی گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی دروازہ

کھل گیا اور سر پر دوپٹہ اوڑھے ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا۔

''اسلام علیکم امی!'' وہ فوراً ہی ان سے لپٹ گیا۔

وہ بھی سلام کا جواب دے کر اس کی بلائیں لینے لگیں۔ بازو کا زخم تو قمیض کی فل آستینوں میں چھپا ہوا تھا لیکن ماتھے کی چوٹ فوراً ان کی نظر میں آ گئی۔

''جب آتا ہے، کوئی نہ کوئی چوٹ سجا کر لاتا ہے۔''

''یہ تو تمغے ہیں امی! اور ایک سپاہی کی ماں کو انہیں دیکھ کر خوش رہنا چاہئے۔'' وہ انہیں ایک بازو کے حصار میں لے کر اندر کی طرف بڑھا، ساتھ ہی عالیہ کی طرف بھی توجہ دلائی۔

''دیکھیں تو سہی میرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔''

''یہ عالیہ ہے نا'' انہوں نے خود ہی فوراً اندازہ لگا لیا اور پھر براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ''معاف کرنا بیٹی! یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اتنے اتنے دنوں بعد اپنی شکل دکھاتا ہے وہ مجھے اس کے سوا کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔''

''اِٹس اوکے آنٹی! میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔'' عالیہ نے فوراً ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس وقت وہ خود خاصی جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جاوید علی اسے اتنی عزت دے گا کہ اپنے گھر لے آئے گا۔

''جیتی رہو۔ مجھے جاوید نے فون پر بتا دیا تھا کہ کسی دن تمہیں لے کر یہاں آئے گا۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تمہارے آنے سے مجھے بیٹی بھی مل جائے گی اور میری تنہائی بھی بٹ جائے گی۔ تم جب تک چاہو، یہاں رہو۔ آج سے یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

انہوں نے اسے محبت سے گلے لگایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برسوں کی آبلہ پائی کے بعد آج اس کے قدموں نے ایک ایسے گھر کی زمین کو چھوا تھا جہاں کے مکینوں نے اسے خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر کو اس کا گھر قرار دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''اندر آ جاؤ۔''

ٹھیک رات دس بجے اس نے روزی کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اسے اندر آنے کا کہہ کر روزی دروازے سے ہٹ گئی۔ اسلم اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

ریسٹورنٹ میں منی اسکرٹ پہن کر گاہکوں کے آرڈر سرو کرتی روزی کے مقابلے میں نہا دھو کر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنی روزی اور زیادہ معصوم اور دلکش لگ رہی تھی لیکن اسلم کو اس کی خوب صورتی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی ماہ بانو کی تلاش میں اس تک آیا تھا۔

''تم کچھ پیو گے؟'' اسے اپارٹمنٹ کے مختصر لاؤنج میں ایک صوفے پر بٹھا کر روزی نے اس سے دریافت کیا۔

''پلیز، میں کسی قسم کی فارمیلیٹیز میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے میری بیوی کے بارے میں جو بتا سکتی ہو، بتا دو۔'' اسلم نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا تو اس نے اپنی نشیلی آنکھوں سے اسے غور سے دیکھا۔



''بہت چاہتے ہو اپنی بیوی کو؟''

''اپنی جان سے بھی زیادہ۔''

''خوش قسمت ہے وہ۔ میں نے اس کے لیے تمہاری محبت دیکھ کر ہی تمہیں حقائق بتانے کا فیصلہ کیا ہے ورنہ کسی کے علم میں یہ بات آ گئی تو شاید میری اپنی زندگی کے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

اس کے الفاظ نے اسلم کے جسم میں تناؤ پیدا کر دیا اور وہ پوری جان سے ہمہ تن گوش ہو گیا کہ روزی اسے کیا بتاتی ہے۔

''تمہاری بیوی کو میں نے جس شخص کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اس کا کوئی پرانا شناسا تو محسوس ہوتا تھا لیکن اچھا دوست یا رشتے دار نہیں۔ ان کے درمیان کچھ تلخی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات وہ ہے جو ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے معلوم ہوئی۔ میرے گرینڈ پا، گالف کورس کے ساتھ بنے مکانات میں سے ایک مکان میں رہتے ہیں اور میں بھی کبھار ان سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ اس روز بھی میں اپنی جانب سے سیدھی وہیں گئی تھی اور باتوں باتوں میں گرینڈ پا نے مجھے بتایا تھا کہ آج انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ان کے مطابق وہ عادت کے مطابق ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے کہ انہیں سرخ رنگ کی کار میں ایک انڈین جوڑا نظر آیا۔ گاڑی مرد ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ ایک دلدل کے قریب پہنچنے پر مرد نے گاڑی روکی اور ڈیش بورڈ پر سے کچھ اٹھا کر باہر نکلا۔ گرینڈ پا کا اندازہ ہے کہ وہ چیز موبائل فون تھا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مرد موبائل فون کو دلدل میں پھینکنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت تو میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن جب تمہاری بیوی کی تلاش کے سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی تو مجھے اس واقعے کا خیال آیا۔ میں نے پولیس کو کچھ بتانے سے پہلے گرینڈ پا سے اس جوڑے کا حلیہ معلوم کر لینا زیادہ بہتر سمجھا لیکن بہت جلد پولیس کا ایسا رویہ سامنے آیا کہ جیسے وہ اس کیس کو دبانا چاہتی ہے۔ ہم لوگوں کو ہدایت دے دی گئی کہ اس سلسلے میں کسی سے اس کے سوا کوئی بات نہ کی جائے جو پولیس کے ریکارڈ کا حصہ ہے۔ میں قانون پسند شہری ہوں لیکن تمہاری حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تمہاری بیوی کے بارے میں ضرور بتاؤں گی کیونکہ گرینڈ پا سے بات کر کے اس بات کی تو میں تصدیق کر چکی تھی کہ ان کے دیکھے ہوئے جوڑے کا حلیہ وہی تھا جو ہمارے ریسٹورنٹ میں آنے والے جوڑے کا تھا۔''

روزی تو شاید تیار ہی بیٹھی تھی کہ اس سے ملاقات ہوتے ہی سب کچھ اس کے گوش گزار کر دے، چنانچہ بولتی ہی چلی گئی۔

''مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔'' اسلم نے ساری بات سن کر اس سے کہا۔

جواب میں اس نے تفصیل سے اسے پورا حلیہ بتا دیا جسے سن کر اسلم نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں، میں اس حلیے کے کسی فرد کو نہیں جانتا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تمہاری جتنی مدد کر سکتی تھی، کر دی۔ حالانکہ مجھ پر سارجنٹ اور منیجر کی طرف سے خاصا دباؤ تھا۔'' اس نے امریکیوں کے مخصوص انداز میں شانے اچکائے اور اس سے یکسر بے نیاز نظر آنے لگی۔

''تھینک یو مس روزی! تم نے میری جو ہیلپ کی، اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' وہ بھی فوراً وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ پہلا کلیو تھا جو ماہ بانو کے بارے میں ملا تھا لیکن جس نے پریشانی کو

مزید بڑھا دیا تھا۔

''گرینڈ پا کا خیال ہے کہ وہ گاڑی جنگل کی طرف گئی تھی۔'' وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے سے روزی کی آواز سنائی دی۔

روزی کے اپارٹمنٹ سے نکل کر اس نے مصطفیٰ خان کے گھر کی طرف رخ کیا۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ ذرا سکون سے بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا۔

گھر پہنچا تو اچھا خاصا سناٹا چھا چکا تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود چابی سے گیٹ کھولا اور سیدھا انیکسی کی طرف جانے کے بجائے مصطفیٰ خان کے رہائشی حصے کی طرف رخ کیا تاکہ اگر بلقیس جاگ رہی ہو تو اس سے معلوم کر سکے کہ آیا مصطفیٰ خان واپس آ گیا ہے یا نہیں۔ اور اس نے ماہ بانو کے بارے میں کیا معلومات حاصل کی ہیں۔

گلاس ڈور تک پہنچ کر دستک دینے سے پہلے ہی اسے طوبیٰ نظر آ گئی۔ اس نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اسلم اندر داخل ہو گیا۔

''آپ ابھی تک سوئی نہیں ہو؟'' اس نے طوبیٰ کے گال کو آہستہ سے تھپتھپا کر اس سے پوچھا۔

''نہیں لیکن آپ ممی کو مت بتائیے گا۔ وہ مجھے ڈانٹیں گی۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''نہیں بتاؤں گا۔ لیکن آپ جا کر انہیں بتا دو کہ اسلم انکل آئے ہیں۔''

''نو، میں نہیں بتا سکتی۔ آپ خود جا کر ان سے مل لیں۔ وہ اسٹڈی میں پاپا کے ساتھ کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہی ہیں۔'' وہ تمام شرارتی بچوں کی طرح بہت ذہین تھی اس لیے یہ غلطی نہیں کی کہ اسلم کے آنے کی اطلاع دینے ماں باپ کے پاس چلی جائے۔

اسلم نے اسٹڈی میں مصطفیٰ خان کی موجودگی کا سن کر خود وہاں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ لیکن اسٹڈی کے دروازے پر پہنچ کر ابھی اس نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ بلقیس کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

''اسلم تو پاگل ہو جائے گا۔ ماہ بانو میں اس کی جان اٹکی رہتی ہے اور آپ جو حالات بتا رہے ہیں، ان کے مطابق تو اسے بازیاب کروانا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے سامنے جو معلومات آئی ہیں، ان کے مطابق یہ بہت اوپر کے درجے کا معاملہ ہے۔ اور سارجنٹ مورس کو اس کیس پر کام کرنے سے باقاعدہ روک دیا گیا ہے۔ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے ایک تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنگلات میں زیر زمین ایک تجربہ گاہ قائم کی گئی ہے اور وہاں کسی بہت خفیہ پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ ماہ بانو سے پہلے بھی چند دوسری حاملہ خواتین کے غائب ہونے کی اطلاعات ہمارے پاس موجود ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان تمام خواتین کو جنگل کے آس پاس ہی آخری بار دیکھا گیا ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہاں قائم تجربہ گاہ میں حاملہ خواتین پر کوئی تجربہ کیا جا رہا ہے اور ماہ بانو بھی وہیں ہے، تب بھی تلاش کا کام آسان نہیں ہو گا۔ البتہ میں نے اپنے اندازے سے جنگل کے کچھ حصوں کا انتخاب کیا ہے جہاں میرے خیال کے مطابق کوئی تجربہ گاہ قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو۔''

اندر وہ کمپیوٹر کی اسکرین پر جنگل کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے بلقیس کو ان کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔



اسلم وہیں کھڑا سب کچھ سنتا رہا اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ انیکسی میں پہنچ کر اس نے ایک بار پھر مصطفیٰ خان کی زبان سے سنی ہوئی باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا اور خود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے اپنے آپ کو کمپوز کر لیا تھا اور بہت سکون سے کام کر رہا تھا۔

اپنے طور پر ساری معلومات اکٹھی کرنے کے بعد وہ روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی رہی اور آخر کار صبح کی پہلی پو پھٹتے ہی وہ اپنی تیاری مکمل کر کے گھر سے نکل پڑا۔

آرلینڈو میں ابھی صبح پوری طرح نہیں جاگی تھی۔ نہ کوئی گاڑی نظر آ رہی تھی، نہ انسان۔ البتہ فطرت کے دوسرے لوازم آہستہ آہستہ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوا میں وہی تازگی اور خوشبو تھی جو صبح کے علاوہ دن کے کسی اور حصے میں محسوس نہیں کی جا سکتی۔ پیڑ پودے ہوا کے ساتھ آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں پرندے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اسلم کے سارے حواس بس ان چہچہاہٹوں کی طرف متوجہ تھے جو جنگل کی طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ پرندوں کے ان نغموں میں اپنی ماہ بانو کی نغمگی کی آواز سن رہا تھا جو اسے پکار رہی تھی، اپنی طرف بلا رہی تھی اور وہ دیوانہ وار اس پکار پر لپکا چلا جا رہا تھا۔

آبادی کو چھوڑ کر اس نے جنگل میں قدم رکھا تو اس کے پیچھے کا سارا منظر سورج کی روشنی سے سنہرا ہو چکا تھا لیکن اب وہ خود تاریکی میں تھا۔ بے تحاشا گھنے جنگل میں سورج کی روشنی کا بھی گزر نہیں تھا۔ تاریکی میں قدم اُٹھاتا وہ اپنی زندگی کی روشنی کی تلاش میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن یکدم ہی زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین میں دھنستے جا رہے ہوں۔

اس نے کوشش کی کہ کھینچ کر اپنے پیروں کو باہر نکال سکے لیکن وہ کچھ اور بھی اندر دھنستے چلے گئے۔ گھنے تاریک جنگل میں، جہاں وہ کسی کو مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا، ایک دلدل اسے نگلنے کے لیے تیار تھی۔

اس کی زندگی کے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بیتے تھے۔ اسے جنگل سے کبھی خوف نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو ایک طرح سے اس کا دوست تھا جس نے زندگی کے بدترین دور میں اسے پناہ دی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر جنگل کی زندگی نے ہی اسے ماہ بانو جیسی نعمت عطا کی تھی۔

لیکن آرلینڈو کا یہ جنگل ذرا مختلف تھا۔ سورج کی روشنی تک کو رسائی نہ دینے والی یہ زمین کسی انسان کے قدموں کو اپنے اوپر کیونکر برداشت کر سکتی تھی؟ وہ اسلم کو اُس کی اس جرأت کی سزا دینے پر تُل گئی تھی اور اس کے وجود کو نگل لینا چاہتی تھی۔ وہ جوں جوں اپنے پاؤں اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مزید دھنستا جا رہا تھا لیکن وہ اس بات کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھا کہ اس کا وجود اس دلدلی زمین میں گم ہو جائے اور اس کی ماہ بانو بے یار و مددگار کسی ظالم تجربے کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اسے اپنی ماہ بانو کو بچانا تھا تو زندہ رہنا تھا اور آخری لمحے تک زندگی کے لیے جدوجہد کرنی تھی۔

آدمی میں جدوجہد کا حوصلہ ہو تو عمل کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ بھی اُمید کا ایک سرا آ گیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، گھنے درخت کی بے حد جھکی ہوئی شاخ تھی جو عین اس کے سر پر لہرا رہی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے اس نازک سی شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی چنچل دوشیزہ کی طرح کنی کاٹ گئی اور اس کے ہاتھ آئے بغیر ہوا کے جھونکے سے دُور ہٹ گئی۔

وہ اتنے نازک لمحات سے گزر رہا تھا کہ اُس کی اس ادا پر جھنجلا گیا لیکن اپنی نظر اس شاخ پر سے ہٹنے نہیں دی۔ شاخ بھی گویا اس سے اٹکھیلیاں کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لہراتی ہوئی قریب آتی اور پھر ایک جھٹکے سے دُور ہٹ جاتی۔

آخر کئی بار کی کوشش کے بعد اسلم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور اس کے سہارے آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دلدل کی گرفت سے آزاد کروا کر اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے جوتوں میں مقید پیر آزاد ہو کر ہوا میں لہرانے لگے۔ اسی لمحے اسے شاخ کے تڑخنے کا احساس ہوا۔ اس نے خود کار ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نزدیکی شاخ کو پکڑ لیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے والی شاخ ٹوٹ کر دلدل میں جا گری۔

اسلم کانپ کر رہ گیا اور دل کی گہرائی سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بروقت اس شاخ کو چھوڑ چکا تھا ورنہ خود بھی اس کے ساتھ اسی دلدل میں جا گرتا۔

خوف اور شکر گزاری کے ان لمحات سے گزرنے کے بعد اس نے آگے کے سفر کا آغاز کیا اور ہاتھ میں تھمی شاخ کے سہارے اوپر اٹھنے لگا۔ لہراتی ہوئی اس شاخ کو پکڑ کر آگے کھسکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ بہت عجیب و غریب شاخ ہے جس میں نہ تو پھول پتے ہیں اور نہ ہی مزید ذیلی شاخیں۔ بس ایک گول اور کسی قدر پھسلواں ٹہنی ہے جس کے سہارے اوپر کھسکنے میں اسے خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ ٹہنی کی نرماہٹ بھی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

جنگل میں ایک عمر گزارنے کے باوجود اس نے کوئی ایسا درخت نہیں دیکھا تھا جس کی ساخت اتنی عجیب ہو۔ بس وہ یہی سوچ سکا کہ آرلینڈو کے اس جنگل کے درخت، اس کے وطن کے درختوں سے مختلف ہیں اس لیے عجیب محسوس ہو رہا ہے۔

دن کا وقت ہونے کے باوجود وہاں روشنی اتنی کم تھی کہ اس کے لیے اس شاخ کا ڈھنگ سے جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ یہاں کے درختوں پر ریسرچ کرنے تو آیا نہیں تھا جو زیادہ غور و خوض کرتا۔ بس جان بچا کر شاخ کے ذریعے موٹے تنے تک پہنچ گیا اور سکون کا سانس لیتے ہوئے ذرا دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔

اسی پل اسے اپنے نزدیک سرسراہٹ محسوس ہوئی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جس شاخ کو پکڑ کر وہ تنے تک پہنچا تھا وہ سرسراتی ہوئی اوپر کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یکدم ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ جسے شاخ سمجھ کر بڑے اطمینان سے اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا، وہ درحقیقت کوئی شاخ نہیں بلکہ جیتا جاگتا، صحت مند اور طویل اژدھا تھا جو اپنی لمبی دُم لٹکائے اس درخت پر محوِ استراحت تھا۔ اللہ کے اس کرشمے نے اسے گنگ کر دیا۔ اژدھا جس کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ عام انسان اس کے قریب جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، اس وقت اس کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس یقین کے ساتھ دوبارہ ماہ بانو کی تلاش کے لیے کمربستہ ہو گیا کہ اللہ اس کام میں اس کی مدد کر رہا ہے ورنہ خطرناک دلدل اور موذی جانور سے وہ کیونکر اتنی آسانی سے بچ نکلتا۔

⊛----✪----⊛

''کیا آپ نے اشوک کو قتل کرنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا ہے؟''

کلام کے اس سوال پر کمپیوٹر پر مصروف شہریار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بھائی جی کے ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے جہاں انہیں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا اور عملاً وہ وہاں فارغ بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔



''سچ پوچھو تو نہیں۔ میرے لیے انسانی جان کو ختم کرنا کبھی بھی آسان کام نہیں رہا ہے۔ وطن دشمنوں سے نمٹنا اور انہیں ان کے انجام تک پہنچانا الگ بات ہے لیکن جس طرح بھائی جی نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے، مجھے خود پر کسی کرائے کے قاتل کا گمان ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر خاموشی سے کلام کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم عملاً مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھائی جی کو ناراض کر کے اس ٹھکانے سے نہیں نکل سکتے ہیں اور نکل گئے تو پولیس اور خفیہ ایجنسیاں ہمیں نہیں چھوڑیں گی۔'' کلام نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''جب تم لوگ جانتے ہو کہ ہمارے پاس بھائی جی کی شرط ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس بحث کی کیا تک ہے؟ اشوک کون سا نیک اور عوام دوست آدمی ہے جو اس کی جان لینے پر آدمی شرمندگی محسوس کرے۔ وہ مرے گا تو اللہ کی مخلوق کو تھوڑا سکھ ہی محسوس ہوگا کہ زمین پر سے ایک شیطان کا وجود کم ہوا۔ تم دونوں کچھ مت کرنا، میں اُس کا کام تمام کر دوں گا۔ چھٹانک بھر کی گولی دل میں اُتار کر آدمی کی سانسیں بند کرنے میں محنت ہی کیا لگتی ہے؟ خاص طور پر اشوک جیسے بدذات کو تو میں بڑے شوق سے اوپر پہنچاؤں گا۔''

ان دونوں سے ذرا فاصلے پر نرم و دبیز قالین پر تکیوں کے سہارے نیم دراز سلّو نے اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیلتے ہوئے اچانک ہی ان کی گفتگو میں مداخلت کی اور مسئلہ ہی ختم کر دیا۔

اُس کے اس انداز پر شہریار اور کلام اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اب وہ ان سے بے نیاز ایک بار پھر پورے انہماک سے گیم کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اُس کے اس انداز پر بے ساختہ ہی شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بظاہر لاابالی نظر آنے والا یہ نوجوان ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بڑھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اتنے دنوں کے ساتھ نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اتنا بے نیاز نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقتاً وہ ایک ذہین، چابک دست اور حساس شخص تھا جس نے اپنے آپ پر بے نیازی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ اس خول کے نیچے سے جھانکتی اس کی نرم اور حساس فطرت شہریار کو بہت پیاری لگتی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ ان بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد جب وہ وطن واپس جائیں گے تو وہ اس کے لیے اچھی زندگی کے انتظام کے لیے بھرپور کوشش کرے گا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سی ایف پی میں اس کی شمولیت کے لیے سفارش کر دیتا۔ بہرحال، ابھی وہ وقت دور تھا اور انہیں حال کے مسائل سے نمٹنا تھا۔

''کھانا تیار ہے جناب! آپ لوگ ڈائننگ روم میں آ جائیں۔ وہاں عبدل بھائی کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ جانے کتنی دیر تک سلّو کے بارے میں سوچتا رہا کہ ملازم کی مداخلت نے اسے واپس کمرے کے ماحول میں کھینچ لیا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو ہم آ رہے ہیں۔'' اس نے ملازم کو جواب دیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سلّو اور کلام نے بھی اس کی تقلید کی۔ کچھ دیر میں ہی وہ تینوں ڈائننگ روم میں موجود تھے جہاں عبدالرحمٰن ان کا منتظر تھا۔

''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، پھر کام کی بات کریں گے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد عبدالرحمٰن نے ان سے کہا تو وہ لوگ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کھانا بڑے طریقے کا تھا۔ چکن کڑاہی، آلو مٹر کی بھجیا، ارہر کی دال، بگھارے چاول اور گرما گرم روٹیوں کے علاوہ سلاد، اچار اور رائتے کا بھی اہتمام تھا۔ ایسے متنوع دسترخوان سے ہر مزاج کا بندہ اپنا پیٹ

بھر سکتا تھا۔

ان تینوں نے بھی اپنی اپنی پسند کے مطابق پلیٹوں میں کھانا نکالا اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ نمکین کے بعد میٹھے کا دور چلا اور پھر عبدالرحمٰن، ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دیتا ہوا ان تینوں کو لے کر واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں وہ کھانے سے قبل بیٹھے ہوئے تھے۔

''بڑے کام کی خبر لایا ہوں تم لوگوں کے لئے۔ دل خوش ہو جائے گا تمہارا۔'' کمرے میں داخل ہو کر اس نے بڑے شوق سے انہیں بتایا۔

''کام کی خبر ہے تو بتانے میں دیر کیسی؟.....فوراً سنا ڈالو۔'' اس کی بات کا شہریار نے جواب دیا۔

''سنانے سے زیادہ دکھانے کی خبر ہے۔'' وہ کمپیوٹر کے ساتھ جا بیٹھا اور اپنے بائیں ہاتھ میں موجود چمڑے کے بڑے سے پرس سے ایک سی ڈی باہر نکال کر لگانے لگا۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چند لمحوں بعد مانیٹر کی اسکرین پر متحرک تصویریں نظر آنے لگیں۔ ان تصویروں میں اشوک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا لیکن ایک چہرے کے گرد بنے سرکل نے انہیں بتا دیا کہ عبدالرحمٰن انہیں کس کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ تیزی سے بدلتے مناظر میں ہر بار اسی چہرے کے گرد موجود سرکل نے مزید تصدیق کر دی کہ اصل اہمیت اسی کی ہے۔

یہ مختلف مواقع پر تیار کی گئی ویڈیوز تھیں جنہیں خاص طور پر اسی مقصد کے لیے یکجا کر دیا گیا تھا۔ یہ ویڈیو صرف متحرک تصویروں پر مشتمل تھی۔ اس میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور مانیٹر کی اسکرین پر متحرک مناظر میں وہ اس آدمی کو مختلف مواقع پر اشوک کے ساتھ دیکھ سکتے تھے۔ کہیں وہ اشوک سے ہاتھ ملا رہا تھا، کہیں اس کے ساتھ کسی دفتر نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ کسی جگہ اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں شراب نوشی سے لطف اٹھا رہے تھے۔ دو تین جگہ انہوں نے پریم ناتھ کو بھی اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس ویڈیو میں اس کا اندازِ نشست و برخاست بالکل ویسا ہی محسوس ہوا جیسا کسی بادشاہ کے دربار میں خوشامد سے اپنا کام نکالنے والے مصاحب کا ہوتا ہے۔

''یہ ارجن اگروال ہے۔ ''را'' کا ایک سینئر [illegible]۔ لیکن ظاہر میں دنیا اس کو ایک بڑے بزنس مین کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات سے واقف ہیں کہ بزنس تو محض ایک آڑ ہے ورنہ یہ بندہ ''را'' کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتا ہے۔ آئے دن اس کی سیکرٹریز بدلتی رہتی ہیں اور ہر ایک، دوسری سے بڑھ کر خوب صورت اور طرح دار ہوتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حسین عورتوں کی مدد سے ارجن بڑے بڑے بزنس مینوں اور سرکاری افسران کی جاسوسی کا کام لیتا ہے اور کئی افراد کو حاصل ہونے والی معلومات کے بل پر ''را'' کی طرف سے بلیک میل کیا جاتا ہے۔''

وہ تینوں غور سے ویڈیو دیکھ رہے تھے اور عبدالرحمٰن انہیں بتاتا جا رہا تھا۔

''ارجن کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات موجود ہیں، ان کے مطابق یہ بے حد سوشل آدمی ہے جس کے کاروباری حلقے سے لے کر سیاست دانوں، سرکاری افسران، فلم نگری کے ستاروں اور یہاں تک کہ جرم کی دنیا میں بھی گہرے روابط ہیں۔ ثبوت تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی رہے ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ ہم نے یہ ساری معلومات پریم ناتھ کی زندگی کو کھنگالتے ہوئے حاصل کی ہیں ورنہ ہم براہِ راست اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ پریم ناتھ اور ارجن اگروال دونوں کا تعلق ایک ہی جگہ سے ہے۔ دونوں نے ہی ابتدائی تعلیم ایک ہی اسکول سے حاصل کی ہے۔ لیکن ارجن، پریم ناتھ کے مقابلے میں بے حد ذہین اور ہوشیار



طالب علم تھا۔ قسمت کی مہربانی سے اس کا پتا بہتر روزگار کے چکر میں اپنے گاؤں سے ممبئی پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے اپنی ذہانت اور چالاکی کو استعمال کرنے کا خوب موقع ملا۔ بہت سے مراحل طے کر کے یہ نہ صرف ''را'' میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ ممبئی کے ایک بڑے بزنس مین کی اکلوتی بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس سے شادی بھی رچا ڈالی۔ بیاہ کے وقت چاہے لڑکی کا باپ خوش نہ ہو لیکن بعد میں جوائی نے ایسی ہوشیاری سے ایک اور ایک گیارہ بنائے کہ سسر بھی دنگ رہ گیا اور تسلیم کر لیا کہ ارجن ہی اس کا اکلوتا جوائی بننے کا صحیح حق دار تھا۔ اب سسر تو زندہ نہیں ہے لیکن یہ اُس کی دولت پر راج کرتا پھر رہا ہے۔ جن دنوں پاکستان سے ڈاکٹر فرحان جمیل آیا اور اپنے رشتے داروں کی سازش کی وجہ سے پریم ناتھ کے ہتھے چڑھا، ان ہی دنوں ارجن بھی اپنی اکلوتی ماسی کے کریا کرم میں شریک ہونے اپنے آبائی گاؤں پہنچا ہوا تھا۔ پرانی دوستی اور تعلق کی بنیاد پر پریم ناتھ نے بھی اس سے ملاقات کی۔

اس ملاقات کے بعد ہم اندازے ہی لگا سکتے ہیں کہ پریم ناتھ نے پرانی دوستی کی وجہ سے یا پھر ارجن کی اونچی حیثیت دیکھ کر اپنے آپ کو بھی اونچا ظاہر کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کا معاملہ اس کے سامنے بیان کر دیا اور اس کے بعد سارے معاملات پریم ناتھ کے ہاتھ سے نکل کر اس کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر فرحان کو ''را'' کی کسٹڈی میں پہنچانے کے ساتھ ہی اس نے پرانے دوست پر بھی مہربانی کی اور ترقی دلوا کر ایک چھوٹے سے گاؤں سے ممبئی میں لا بٹھایا۔ پریم ناتھ کے اشوک سے تعلقات دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ارجن نے دوست پر جو احسان کیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے نئے لیکن ہم پلّہ دوست اشوک کو پولیس کی بھرپور مدد مل جائے اور حالات بتاتے ہیں کہ واقعی پریم ناتھ، اشوک کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔''

عبدالرحمٰن نے اپنی بات ختم کی تو وہ تینوں جان چکے تھے کہ وہ پریم ناتھ کو اغوا کر کے اس کے ذریعے ''را'' کے جس افسر تک پہنچنا چاہتے تھے، اس تک بھائی جی نے اپنے وعدے کے مطابق بیٹھے بیٹھے ہی اُنہیں پہنچا دیا تھا۔

''کیا تمہارے لیے اس خبر کی اہمیت نہیں ہے؟'' اپنی بات ختم کر کے عبدالرحمٰن نے کچھ دیر شہریار کے تبصرے کا انتظار کیا لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی پا کر آخر کار خود ہی پوچھ بیٹھا۔

''اہمیت کیوں نہیں ہے؟ تم نے ہمارا ایک بہت بڑا کام کر ڈالا ہے۔ لیکن اب یہ بتاؤ کہ اس تک رسائی کیسے ممکن ہو گی؟ ہم ارجن تک پہنچیں گے، تب ہی تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کوئی سن گن ملے گی۔'' وہ جیسے کسی گہرے خیال سے باہر نکل کر بولا۔

''اس کی سکیورٹی بہت سخت ہے۔ اس نے نجی گارڈز بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں۔ تمہیں ارجن تک پہنچنے کے لیے بڑی نفری کے ساتھ پہلے اس کے گارڈز سے نمٹنا ہو گا۔ میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایسے افراد کی لسٹ بنا لی ہے جو ہمارے گروپ سے تعلق رکھنے کی شہرت نہیں رکھتے۔ تم جب بھی ارجن سے نمٹنے جاؤ گے، ہمارے آدمی تمہاری مدد کے لیے جدید سلحے کے ساتھ تیار ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں نکلے گا جو تمہیں چھوڑ کر بھاگنے کا سوچ سکے۔'' ان کے پاس آنے سے پہلے وہ اپنا سارا ہوم ورک کر کے آیا تھا۔

''تھینک یو عبدالرحمٰن!.....ہمیں صرف اسلحے اور سواری کی ضرورت ہے، میں اپنے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑ لے جا کر دشمن کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں جو چاہئے اس کی لسٹ بنا دو۔ تمہیں وقت پر سب مل جائے گا۔ آدمی بھی اسٹینڈ بائی رہیں گے۔ اگر تم چاہو تو ان میں سے کسی کا اپنی مدد کے لیے انتخاب کر سکتے ہو۔'' اس نے اپنی پیش کش پر زیادہ اصرار نہیں کیا اور جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اسے پہچانتے ہو عبدالرحمٰن؟..... ذرا اس کے بارے میں معلوم کرو کہ یہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آ رہا ہے؟'' اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے شہریار نے ختم ہو جانے والی سی ڈی کو پھر پلے کیا اور اشوک کے ساتھ اس کے دائیں جانب کھڑے ایک صحت مند اور ادھیڑ عمر آدمی کو پوائنٹ آؤٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اپن کو یہ کوئی باہر کا آدمی معلوم پڑتا ہے لیکن آپ کہتے ہو تو اس کا پورا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیتے ہیں۔'' عبدل نے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر ساتھ ہی پیشکش بھی کر ڈالی۔

''تم صرف یہ معلوم کرو کہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آ رہا ہے؟'' شہریار نے مانیٹر کی اسکرین پر نظر جماتے ہوئے اسے جواب دیا۔ اس کے ساتھ موجود سلو اور کلام نے بھی اس تصویر کو غور سے دیکھا تھا لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس شخص کو پہچان نہیں سکے تھے۔

⊛----✪----⊛

''چائے۔''

جاوید علی اپنے بستر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور اس کی طرف سے اجازت ملنے پر عالیہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جن میں ایک اس نے جاوید علی کو پیش کیا اور خود اپنا کپ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تھینک یو..... میرا اس وقت چائے پینے کا بہت دل چاہ رہا تھا لیکن خود اٹھ کر بنانے کا موڈ نہیں تھا اور امی کو بے آرام کرنا مناسب نہیں لگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ سے کہا اور کپ لبوں سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''زبردست۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی چائے بنا لیتی ہو گی۔'' پہلے گھونٹ پر اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

''شاید اسی خطرے کی وجہ سے تم نے مجھ سے چائے کی فرمائش نہیں کی تھی ورنہ یہ چھوٹا سا کام تو میں بھی کر سکتی تھی۔'' عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

جاوید علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیض اور گلابی اور آسمانی رنگ کے امتزاج کا دوپٹہ اوڑھے وہ پہلے کے مقابلے میں بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی اور کھوجنے پر بھی اس کے چہرے پر وہ تیزی اور مکاری نظر نہیں آتی تھی جو دیبا مساج سینٹر میں اس سے پہلی ملاقات کے موقع پر نظر آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ سی ایف بی کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہی تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن یہاں آ کر تو اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جاوید علی نے کل اسے امی کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ دن بھر وہ زیادہ تر ان کے ساتھ ہی لگی رہتی تھی اور اسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر بہت خوش ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' عالیہ نے اسے ٹوکا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''کچھ نہیں، بس غور کر رہا تھا کہ تم نے اتنی معمولی سی بات کو کس انداز میں لے لیا۔ میں نے تو صرف



اس لیے تمہیں چائے کے لیے نہیں کہا تھا کہ تم دن بھر امی کے ساتھ لگی رہی تھیں، کہیں تھک نہ گئی ہو۔ ویسے بھی میں خود اتنی بری چائے بناتا ہوں کہ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ جو جاوید کے ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے، وہ دنیا میں کسی کے بھی ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے۔'' اپنے عمل کی وضاحت دیتے ہوئے وہ آخر میں نیم مزاحیہ لہجے میں بولا تو وہ ہنس دی اور سادگی سے استفسار کیا۔

''کیا سچ مچ تم اتنی بری چائے بناتے ہو؟''

''کہو تو کسی دن تمہیں بنا کر پلا دوں گا۔'' اس نے یوں جواب دیا جیسے چائے پلانے کی پیشکش نہ کر رہا ہو، کوئی دھمکی دے رہا ہو۔

''نہ بابا!..... میں ایسا خطرہ مول لینے کے بجائے ہر بار خود ہی چائے بنانا پسند کروں گی۔'' وہ خوش گوار موڈ میں تھی چنانچہ ہنس کر جواب دیا۔

ہنستے ہوئے اس کے دائیں رخسار پر ڈمپل پڑتا تھا جس نے جاوید علی کو شازمین کی یاد دلا دی تھی۔ حالانکہ اس ڈمپل کے علاوہ عالیہ میں کوئی ایک بات بھی شازمین والی نہیں تھی۔ شازمین تو کسی نوخیز کلی کی طرح اتنی حسین تھی کہ نظر اس پر پڑ کر ہٹنا بھول جائے۔ جبکہ عالیہ اس کے مقابلے میں پختہ عمر کی ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا ورنہ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھا اور خود کو یہاں ایسے ایڈجسٹ کر لیا جیسے ہمیشہ سے ہی یہاں رہتی آئی ہو۔'' اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خیال کو جھٹکتا ہوا وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ تم دیکھنا کہ بہت جلد میں آنٹی سے سب کچھ سیکھ لوں گی اور جب کبھی تم فرصت ملنے پر یہاں آؤ گے تو میں تمہیں بریانی، نرگسی کوفتے، نہاری سب پکا کر کھلاؤں گی۔'' اس نے جاوید علی کی پسندیدہ ڈشز کے نام گنواتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''ضرور، یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اچھی لڑکیوں کی طرح امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرو لیکن میرا تمہیں مشورہ ہے کہ صرف ان کاموں میں ہی کھپ کر نہ رہ جاؤ۔ تم ذہین اور باصلاحیت ہو۔ کوشش کرو کہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکو۔ مزید تعلیم سے لے کر کسی بھی قسم کے کورسز تک میں ہر معاملے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بس ایک بار تم میرے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا۔'' جاوید علی نے خلوصِ دل سے اسے پیشکش کی۔

''تھینک یو۔ میں تمہاری اس آفر کو یاد رکھوں گی لیکن فی الحال میں کچھ عرصہ ایسے ہی گزارنا چاہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک عام عورت کی طرح وقت گزارنے کا موقع ملا ہے اور یقین کرو مجھے بہت مزہ آ رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر واقعی خوشی کے رنگ تھے۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' جاوید علی نے بحث نہیں کی اور خالی کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر تعریف کی۔ ''چائے سچ مچ بہت مزے کی تھی اور میں امید کر سکتا ہوں کہ جب تم کھانا پکانا سیکھ لو گی تو وہ بھی ایسا ہی مزے دار ہو گا۔''

''اِنشاء اللہ۔'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے بے ساختہ کہا اور پھر خالی کپوں کو ٹرے میں رکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے جاتا دیکھ کر جاوید علی نے ایک بار پھر زیرِ مطالعہ کتاب ہاتھ میں لے لی جس پر عالیہ نے اسے ٹوکا۔

''تمہیں آرام کے لیے چھٹیاں دی گئی ہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آرام بالکل نہیں کر رہے۔ رات

کو بھی دیر تک تمہارے کمرے کی لائٹ آن رہتی ہے۔''

''میں بالکل فٹ ہوں یار! اور اب مجھے مزید آرام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سلمان کی طرف سے اشارہ ملتے ہی واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے معلوم ہے کہ کوئی کچھ بھی کہے، تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔'' کچھ خفگی سے کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو جاوید علی مسکرانے لگا اور پھر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اسے ایک طرف رکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

اُس کی ذہنی رو یکدم ہی بدل گئی تھی اور اب وہ سلمان سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال جاننے کا خواہش مند تھا۔ ''را'' کے فائٹنگ ونگ سے تعلق رکھنے والے موہن نے جس بنگلے کی نشاندہی کی تھی، اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی جس کے نتیجے میں وہ لوگ اس بات پر پُریقین ہو چکے تھے کہ اس بنگلے میں واقعی کچھ مشکوک افراد رہائش پذیر ہیں تاہم ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ لوگ کارروائی نہیں کرنا چاہ رہے تھے [illegible] مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔

''ہاں جاوید! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' سلمان کا نمبر ملانے پر اس کی طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی اور اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں بالکل فرسٹ کلاس فٹ ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ آج کی کیا خبریں ہیں؟ آج پورا دن تم نے مجھے کال ہی نہیں کی۔'' اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے ساتھ اس نے شکوہ بھی کیا۔

''سوری یار! آج مصروفیت ذرا زیادہ ہی رہی۔ میں نے سوچا کہ پہلے سارے کام نمٹا لوں، پھر تمہیں فون کر کے کوئی اچھی خبر سناؤں گا۔'' سلمان کے انداز میں دبا دبا جوش تھا جس نے جاوید علی کو چونکا دیا۔

''کیا مطلب..... کوئی خاص بات؟''

''ہاں یار! بہت خاص بات ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم اس بنگلے کی بیرونی نگرانی کے ساتھ ساتھ اندر کے حالات جاننے کے لیے بھی کوششوں میں لگے ہوئے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے کیونکہ ٹیلی فون پر وہ لوگ کھل کر کوئی بات کرتے ہی نہیں تھے اور ہم انہیں نگرانی کا احساس نہ ہونے دینے کے لیے بہت محتاط تھے۔ یہاں تک کہ نگرانی کرنے والے بھی بنگلے سے بہت دُور رہ کر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے نگرانی کر رہے ہیں۔ ایسے میں کسی ایسی ڈیوائس کو جس کے ذریعے اندر کے حالات معلوم ہو سکیں، بنگلے کے اندر پہنچانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پھر شفیع کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس کے پاس چھوٹی نسل کا ایک بہت خوب صورت کتا ہے جو خاصا ذہین بھی ہے۔ ہم نے اس کتے کے گلے میں پڑے پٹے میں ایک چھوٹی سی ڈیوائس انچ کر کے اسے بنگلے کی طرف بھیج دیا۔ وہ کتا اتنا خوب صورت ہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اسے نقصان پہنچانے کا سوچے۔

بنگلے کے گارڈز نے بھی اسے اندر جانے سے نہیں روکا اور ہماری خوش قسمتی کہ وہاں موجود افراد کو وہ کتا اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے اس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کرنے کے بجائے وہیں روک لیا۔ اب وہ وہاں بنگلے میں موجود ہے اور ہمیں اندر کے حالات کی سُن گُن مل رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آج رات اس بنگلے میں کوئی اہم میٹنگ ہونے والی ہے اور اس میٹنگ میں بڑے اہم لوگ شرکت کریں گے۔'' سلمان نے تفصیل کے ساتھ اسے ساری بات بتائی تو وہ بھی جوش میں بھر گیا۔

''یہ تو ہمیں بڑا گولڈن چانس ملا ہے۔ اگر آج رات ہم وہاں بھرپور کارروائی کریں تو بڑی کامیابی



حاصل کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں پھر ساتھ بیٹھ کر کارروائی کے لیے پلاننگ کرتے ہیں۔ اس دوران تم اپنے طور پر جو انتظامات کرنا چاہو، کرتے رہو۔''

''لیکن یار! تم زخمی ہو۔ تمہیں چاہئے کہ آرام کرو۔ ہم لوگ انشاء اللہ سب سنبھال لیں گے۔'' سلمان نے اسے روکنا چاہا۔

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ زخم بھر چکے ہیں اور میں کسی بھی کارروائی کے لیے خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے جیسا ضدی آدمی میرے روکنے سے رُکے گا تھوڑی۔'' اس کا جواب سن کر سلمان نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا تو وہ سلسلہ منقطع کر کے روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ گھر سے روانہ ہو چکا تھا۔ اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے اس نے ایک کاغذ پر پیغام لکھ کر ٹیبل کلاک کے نیچے رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کبھی ایمرجنسی میں روانہ ہونا پڑتا، ماں کے آرام میں خلل نہیں ڈالتا اور اسی طرح خاموشی سے پیغام لکھ کر روانہ ہو جاتا۔ بعد میں فون پر ان سے رابطہ کر کے انہیں تسلی بھی دے دیتا کہ بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ اُس کے اس طرزِ عمل پر ناراض ہوتی تھیں لیکن اب انہوں نے صبر کر لیا تھا اور سمجھ گئی تھیں کہ بیٹے کی رگوں میں دوڑتا شہید باپ کا لہو اسے وطن کی محبت سے زیادہ کسی محبت میں مبتلا نہیں ہونے دے گا اور جب وطن کو اس کی ضرورت ہو گی، وہ یونہی سب کچھ بھلا کر دوڑا جائے گا۔

⊛----✪----⊛

''پتہ نہیں بے چاری ماہ بانو کہاں ہو گی؟ پولیس تو اس معاملے میں انٹرسٹ نہیں لے رہی اور وہ سارجنٹ مورس اُلٹا یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہے۔ کم از کم میرے لیے تو یہ ایک بالکل ناقابلِ یقین بات ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہی نہیں اور اب تو ماں بھی بننے والی ہے۔ دنیا کی ہر ماں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی اولاد کے بارے میں سوچتی ہے تو ماہ بانو جیسی لڑکی کیسے نہیں سوچے گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے نہیں گئی اور کسی مشکل کا شکار ہے۔''

چچے کی مدد سے اُمید کو دلیہ کھلاتی کشور نے افسردہ سے لہجے میں آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی مصطفیٰ خان کی واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹ آئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے روزانہ کے معمولات کا آغاز کر دیا تھا لیکن دل و دماغ پیش آنے والے حادثے کے اثر سے متاثر تھے۔

''اس بات پر تو ہم سب متفق ہیں کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کے عدمِ تعاون کے بعد ہم کس سے مدد کی توقع رکھیں۔ میں اس معاملے پر کافی سوچ بچار کرتا رہا ہوں اور میرے ذہن میں تو بس یہی ایک ترکیب آئی ہے کہ میں نیویارک کے جس اخبار کے لیے کالم لکھ رہا ہوں، وہاں کی انتظامیہ سے بات کروں۔ جب الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے پولیس پر تنقید کی جائے گی اور ان کی کارکردگی پر سوالات اُٹھائے جائیں گے تو پولیس کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری امید مجھے مصطفیٰ خان سے ہے۔ وہ ایک باحیثیت آدمی ہے جس کے تعلقات بھی خاصے وسیع ہیں۔ وہ اگر بھرپور طریقے سے کوشش کرے تو کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔''

''کوشش تو وہ ضرور کریں گے۔ اس سلسلے میں تو ان پر بلقیس بھابی کا بھی خاصا دباؤ رہے گا۔ وہ ماہ بانو کے غائب ہونے پر بہت شرمندہ ہیں اور ہر وقت اس بات پر پچھتاتی رہتی ہیں کہ اس روز وہ اسے کلینک پر چھوڑ کر شاپنگ کے لیے گئی ہی کیوں؟'' اس نے امید کے منہ میں دلیے کا ایک اور چمچہ ڈالا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ان کا پچھتاوا اپنی جگہ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر اسلم کی ہے۔ اس کی ذہنی حالت بالکل بھی نارمل نہیں ہے اور جوش میں وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' کشور نے اس سے اتفاق کیا۔ ''وہ جنون کی حد تک ماہ بانو سے محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ میرے دل میں تو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں جنون میں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ اس طرح کے حالات میں تو بہت زیادہ حساس لوگ ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتے ہیں اور جان لینے اور دینے پر تل جاتے ہیں۔''

''نہیں خیر، وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ اسے اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔'' آفتاب نے اس سے اختلاف کیا اور ہاتھ بڑھا کر پھرتی سے دلیے کا پیالہ اُمید کی پہنچ سے دور کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اُمید ہاتھ مار کر پیالے کو اُلٹ دیتی۔ اب وہ ایسی ہی چھوٹی موٹی شرارتیں کرنے لگی تھی جن کے باعث کشور کے کام میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ کشور ماتھے پر شکن لائے بغیر خندہ پیشانی سے تمام گھریلو امور انجام دیا کرتی تھی پھر بھی اسے اس بات کا احساس رہتا تھا کہ ناز و نعم میں پلی اس کی بیوی کو اس کے ساتھ رہ کر بڑی سخت زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔

''بلی بہت شریر ہوتی جا رہی ہے۔ کھانے پینے میں بھی تنگ کرنے لگی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا کہ زبردستی دلیہ کھلانے کی کوشش میں میڈم کا منہ کتنا گندا ہو گیا ہے۔''

بچی کے گال پر پیار سے ہلکی سی چٹکی نوچتے ہوئے کشور نے آفتاب کو بتایا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کے درمیان موضوعِ گفتگو خود ہی تبدیل ہو گیا اور وہ اسلم اور ماہ بانو کو چھوڑ کر اپنی بچی کی چھوٹی موٹی باتیں اور شرارتیں آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔

اس دوران کشور نے اسے دلیہ کھلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شیشے کے چھوٹے سے باؤل میں موجود دلیہ ختم ہو گیا تو وہ اسے اٹھا کر منہ دُھلانے لے گئی۔ منہ دُھلانے کے بعد وہ تولیے سے بچی کا منہ خشک کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا تو آفتاب لکھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ عام لکھنے والوں کی طرح نازک مزاج نہیں تھا اور لکھنے کے دوران پیدا ہونے والے کسی خلل کی وجہ سے ناراضی کا اظہار نہیں کرتا تھا، اس کے باوجود کشور کی کوشش ہوتی تھی کہ کام کے دوران وہ ڈسٹرب نہ ہو۔ کیونکہ بہرحال اسے اپنے کام کے لیے ذہنی یکسوئی درکار تھی اور ڈسٹرب ہونے کی صورت میں کام کی رفتار میں فرق پڑتا تھا۔ اس وقت بھی وہ آفتاب کا خیال کرتی ہوئی جلدی سے تولیہ واپس اسٹینڈ پر لگا کر بچی کو گود میں لیے ہوئے فون کی طرف لپکی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''کیسی ہو کشور؟'' اپنی ''ہیلو'' کے جواب میں سنائی دینے والی آواز نے اس کے پورے جسم کو سُن کر دیا اور وہ اس قابل بھی نہیں رہی کہ زبان ہلا کر کیے جانے والے سوال کا جواب دے سکے۔

''کیا بات ہے گڑیا؟ تم نے اپنے بھائی کی آواز پہچانی نہیں یا گھبرا گئی ہو؟'' وہ سو فیصد مراد شاہ تھا اور



اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی تصدیق یا ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے فون پر اس کی آواز سن کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔

نیویارک سے آرلینڈو منتقل ہوتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر مراد شاہ کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ خوف زدہ تھی۔ اسے نیویارک کے فلیٹ میں بیتی اپنی زندگی کی وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اس کے سگے باپ کے بھیجے کرائے کے قاتلوں نے ان کے فلیٹ میں زہریلی گیس چھوڑ دی تھی۔ اس رات اگر ان کی پڑوسن لارا اُنہیں اس خطرے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مدد نہیں کرتی تو وہ دونوں میاں بیوی، بچی سمیت اگلے دن کا سورج دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔

اس واقعے کے بعد جہاں انہوں نے آرلینڈو منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہیں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے نئے ٹھکانے سے کسی کو آگاہ نہیں کریں گے۔ لیکن ان کی اس احتیاط کے باوجود مراد شاہ نے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جو ایک تشویش ناک بات تھی۔

''کیا بات ہے کشور!..... تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ کیا میری آواز سن کر تمہیں برا لگا ہے؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر مراد شاہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

اس بار کشور نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جذبات سے بھرپور تلخ لہجے میں بولی۔

''آپ میری کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں لالہ! میں بہت مشکلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھے اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ سکون سے جینے دیا جائے۔ مجھے نہ تو خاندانی نام و نسب سے کچھ لینا دینا ہے اور نہ ہی باپ کی بے تحاشا جائیداد میں سے اپنا حصہ چاہتی ہوں تو پھر آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہیں؟ بھول جائیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں کبھی کسی کشور نامی لڑکی نے جنم لیا تھا۔ مُردہ تصور کر لیں مجھے اور میرے خیال تک کو کسی قبرستان میں دفن کر دیں۔''

''تم جذباتی ہو رہی ہو کشور! اور اپنے جذبات میں یہ تک نہیں سمجھ پا رہیں کہ تمہارا رویہ میرے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اباجی نے بہت زیادتی کی ہے لیکن یقین کرو کہ میرا اُن کے کسی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم مجھے بنا بتائے نیویارک سے غائب ہو گئیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں ہر طرف تمہیں ڈھونڈتا رہا کہ کسی طرح تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہی یقین دلا سکوں کہ میں بے قصور ہوں۔ کتنی مشکل سے میں نے ایک اخبار کے دفتر سے تم لوگوں کا فون نمبر حاصل کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور ایسا میں نے اس لیے نہیں کیا کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس محبت کی وجہ سے تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں جو ایک بھائی کی حیثیت سے میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔ تاجور اور صنوبر یہاں سے دور پاکستان میں ہیں لیکن فون اور نیٹ کے ذریعے میرا مستقل ان سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ اپنے دُکھ سُکھ کہتی ہیں۔ میں ان کو اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہوں لیکن تم..... تم یہاں رہ کر بھی مجھ سے دُور ہو۔'' مراد شاہ کی آواز میں دکھ تھا۔

''میں مجبور ہوں لالہ! عورت باپ اور بھائی کے رشتوں سے جو تحفظ اور اطمینان محسوس کرتی ہے، میرا دل اس سے خالی ہے اور میں ہر وقت اس خوف سے لرزتی رہتی ہوں کہ کہیں یہ رشتے مجھ سے میری چھوٹی سی جنت نہ چھین لیں۔''

وہ فون پر ہی سسک پڑی۔ اسے اس طرح روتے دیکھ کر اس کی گود میں موجود اُمید نے بے چینی

محسوس کی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے رخسار پر پھسلتے آنسوؤں کو چھونے لگی۔ وہ ننھی سی بچی ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں پہنچی تھی کہ آنسوؤں کی زبان سمجھ سکتی اور انہیں چُننے کی کوشش کرتی لیکن اس کی معصومیت میں کی جانے والی حرکات نے کشور کے دل کو عجیب سی ڈھارس دی تھی اور اسے لگا تھا کہ اس کا درد کم ہونے لگا ہے۔

''تم ابھی میری بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ میں پھر کبھی تم سے رابطہ کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل سے میرے لیے کدورت ایک نہ ایک دن نکل ہی جائے گی۔ بس تم اتنا یاد رکھنا کہ چودھری افتخار عالم شاہ اور مراد شاہ میں بہت فرق ہے۔ ابا جی کے لیے دولت سب سے زیادہ اہم ہے اور میں اسے بہت کم اہمیت دیتا ہوں۔ میرے لیے میرے اپنوں کی محبت اور سلامتی ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ میں اگر ابا جی کے مزاج کا آدمی ہوتا تو پیر آباد میں رہ کر خوشی سے ابا جی کی گدی سنبھال رہا ہوتا۔ لیکن میں ان سب چیزوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو ابا جی کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے میں ان سے کوئی گستاخی نہیں کر سکتا اس لیے یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ خود کو ان کے طرزِ زندگی سے دور رکھوں۔'' اس نے اپنی صفائی میں تھوڑی سی وضاحت دی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ''اللہ حافظ'' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کشور نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور خود ایک قریبی کاؤچ پر بیٹھ کر اُمید کو برابر میں بٹھانے کے بعد اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

خون کی کشش اس کے دل کو بھائی کی طرف کھینچ رہی تھی تو اپنے حالات کی سختی دور رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟.....کون تھا فون پر جس سے بات کر کے آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے؟'' اسے علم بھی نہیں ہوا کہ کب آفتاب اس کے برابر میں آ بیٹھا ہے۔ اُس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دریافت کیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر یکدم ہی اس کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رونے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلاتا ہوا اسے حوصلہ دیتا رہا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد وہ کسی قدر خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی۔ آفتاب نے اسے پانی پلایا اور ایک بار پھر اس سے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں اس نے آزردہ لہجے میں اسے مراد شاہ کی کال کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر دیا جنہیں سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی سے سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

''حقیقت یہ ہے کشور! کہ میں نے کبھی مراد بھائی کو غلط نہیں سمجھا لیکن ہمارے حالات ہی ایسے ہیں کہ ہم کسی شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اب بھی اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک طرح سے اپنے قابلِ بھروسہ ہونے کا ثبوت دیا ہے ورنہ وہ چاہتے تو ہم سے رابطہ کرنے کے بجائے ڈائریکٹ کوئی کارروائی کر سکتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو آپ اطمینان رکھیں کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔''

''دل تو میرا ابھی نہیں مانتا کہ لالہ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن حالات نے ڈرا دیا ہے۔ زندگی میں چند دن سکون کے ملتے ہیں پھر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑتا ہے۔ جب ہم کسی کو کچھ نہیں کہتے تو دوسرے بھی ہمیں ہمارے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ ہم سب کے بغیر بس آپ کے اور اپنی بچی کے ساتھ خوش ہوں۔ کوئی آ کر میری اس جنت میں دخل اندازی کیوں کرتا ہے؟'' وہ اب تک پوری طرح نہیں سنبھلی تھی اور بولتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔



''مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے ساتھ بہت خوش ہیں لیکن خونی رشتوں کی کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جن دنوں نیویارک میں ہماری مراد بھائی سے ملاقات ہوئی تھی، آپ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ اندرونی خوشی نے آپ کو اتنا خوب صورت بنا دیا تھا کہ میری نظریں آپ کے چہرے پر نہیں ٹکتی تھیں۔ اس لیے میرا آپ کو مشورہ ہے کہ اگر مراد بھائی آپ سے رابطہ کرتے ہیں تو آپ ان سے بات کر لیا کریں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ باقی آپ کی اپنی مرضی ہے۔ میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

اس کے بے حد رسان سے سمجھانے پر کشور کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔

اسی وقت ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس بار آفتاب نے خود فون اٹھایا جبکہ کشور، اُمید کی طرف متوجہ ہو گئی جو نیند آنے پر خود ہی کاؤچ پر سو گئی تھی لیکن ذرا بے آرام سی تھی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھایا اور اندر بیڈ روم میں لے جا کر بستر پر سلا دیا اور اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کر کے باہر نکل آئی۔ آفتاب ابھی تک فون پر مصروف تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر محسوس ہو رہے تھے۔

''آپ حوصلہ رکھیں بھابی! میں اور کشور شام میں آپ کی طرف چکر لگائیں گے۔'' اس کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے کشور کو یہ تو بتا دیا کہ وہ بلقیس سے بات کر رہا تھا لیکن مزید تفصیلات جاننے کے لیے اسے آفتاب کے فون بند کرنے کا انتظار کرنا پڑا۔

''بلقیس بھابی تھیں۔ اسلم گھر سے غائب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رات کو کسی وقت وہ واپس آیا تھا جس کا اندازہ اُنہیں انیکسی کی لائٹ جلتے دیکھ کر ہو گیا تھا پھر یہ سوچ کر اسے نہیں چھیڑا کہ ابھی آرام کر لے پھر صبح ناشتے پر اس سے ملاقات کر لی جائے گی۔ صبح وہ ناشتے کے لیے اسے بلانے گئیں تو وہ وہاں نہیں تھا۔ مصطفیٰ خان نے اپنے طور پر چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ بہت صبح سویرے اسے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ لوگ سیل فون پر بھی اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔''

''یا اللہ! کہیں اسلم کا دماغ تو نہیں اُلٹ گیا؟.....جنگل میں وہ کیا لینے گیا ہے؟'' آفتاب کی زبانی حالات جان کر کشور نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

وہ بے وجہ اس طرف نہیں گیا ہے۔ مسز مصطفیٰ نے اشارے کنائے میں بتایا ہے کہ مصطفیٰ خان کو بھی چند ایسے آثار ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں لے جائے جانے کا امکان ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اسلم کا اس طرح اُٹھ کر جنگل کی طرف چل پڑنا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی خیریت کی طرف سے سخت تشویش کا شکار تھیں۔'' آفتاب کی باتوں نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ دونوں بے چارے اچھی بھلی زندگی گزار رہے تھے اور اب تو ان کے ہاں ننھا مہمان بھی آنے والا تھا۔ ایسی حالت میں معلوم نہیں بے چاری ماہ بانو جانے کہاں پھنسی ہوئی ہے اور کس حال میں ہے اور ساتھ ہی اسلم نے بھی خود کو خطرے میں ڈال لیا ہے۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے کہ جانے دونوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اللہ ان دونوں کی حفاظت کرے۔'' اپنی تشویش کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خلوصِ دل سے دعا بھی کی۔

''آمین۔'' آفتاب نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ''بس اسی طرح دعا کرتی رہیں۔ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ باقی ہم دیکھیں گے کہ عملی طور پر کیا، کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بلقیس بھابی سے کہہ دیا ہے کہ شام کو ہم ان کی طرف آئیں گے۔ میں مصطفیٰ خان کے ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کروں گا کہ اسلم کی مدد کے لیے ہم کیا عملی

اقدامات اٹھا سکتے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس طرح کی گفتگو قطعی مناسب نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے۔ اس دوران میں گھر کے ضروری کام نمٹا لیتی ہوں۔ اُمید سو رہی ہے، آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے اپنا کام کر لیں۔''

وہ مراد شاہ کا فون آنے کے بعد خود پر طاری ہونے والی کیفیت فراموش کر چکی تھی اور اب ماہ بانو اور اسلم کے لیے فکرمند بس ان کی سلامتی کے لیے دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔

⊛----✪----⊛

سبز گھاس پر اُچھلتا کودتا چھوٹا سا لمبے لمبے نرم و ملائم سفید بالوں والا کتا بہت ہی خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ اتنا مہذب تھا کہ اس نے لان میں موجود پھول پودوں کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کھیلتے کھیلتے کسی پھول دار پودے کے قریب پہنچ بھی جاتا تو ایک ادا سے پھولوں کو سونگھنے کے بعد واپس پلٹ آتا اور اپنی اگلی ٹانگوں سے باری باری اس بڑی سی رنگین بال کو کِک لگانے لگتا جو کسی نے شاید اس کی اداؤں سے متاثر ہو کر ازراہِ محبت اسے عطا کر دی تھی۔

''کتا تو واقعی بڑا پیارا ہے۔ بنگلے والوں نے اسے بھگانے کے بجائے مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے تو یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا تعلق جس خبیث قوم سے ہے، اسے یوں بھی ہماری ہر اچھی چیز کو ہتھیا لینے کی فکر رہتی ہے۔''

دُوربین کی مدد سے بنگلے کے لان کا منظر دیکھتے جاوید علی نے تبصرہ کیا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی یہاں پہنچا تھا۔ اس سے قبل اس نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اپنی واپسی کی رپورٹ کی تھی اور سلمان کے ساتھ حالات کے مطابق منصوبہ بندی بھی کر ڈالی تھی۔ اب وہ اور سلمان بنگلے سے کافی فاصلے پر موجود ایک بلند عمارت کی پانچویں منزل پر موجود تھے۔

پانچویں منزل کے جس کمرے میں انہوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا وہ ایک تجارتی ادارے کے دفتر کا حصہ تھا۔ اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہی تھے اور ان میں سے بیشتر شام پانچ سے چھ کے درمیان بند ہو جاتے تھے۔ سلمان کے ساتھ علاقے کا دورہ کرنے کے بعد جاوید علی نے اس دفتر کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دُور دُور سے نگرانی اپنی جگہ لیکن کوئی ایسا انتظام بھی ہونا چاہئے کہ وہ اس عمارت کا بصری جائزہ لے سکیں۔ چنانچہ اب وہ یہاں تھے۔

دفتر کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں داخل ہو جانا ان کے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا اور وہ باری باری آرام سے دُوربین کی مدد سے جائزہ لے لیتے تھے۔ بنگلے کی مرکزی عمارت میں کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں، اُنہیں علم نہیں تھا اور وہ صرف مین گیٹ پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ لان میں جھانک لینے تک محدود تھے یا پھر اس ڈیوائس کے ذریعے کوئی بات کانوں میں پڑ جاتی تھی جو کتے کے گلے میں پڑے پٹے کے ساتھ منسلک تھی۔

''اُس کی ناز برداری کر اور اپنی ڈیوٹی پر جا۔ تجھے معلوم نہیں ہے کیا کہ آج کتنی خاص میٹنگ ہے۔ سکیورٹی میں ذرا بھی کمی نہیں رہنی چاہئے ورنہ کسی کی بھی خیر نہیں ہو گی۔'' ٹیلی اسکوپ نے انہیں لان میں موجود دو افراد کی شکلیں دکھائیں اور کتے کے پٹے کے ساتھ منسلک ڈیوائس نے یہ ڈائیلاگ سنا تو وہ گویا اس منظر کا حصہ بن گئے۔



''تجھے پتہ تو ہے یار! کہ مجھے کتے کتنے پسند ہیں۔ ہمارے ساتھ سکیورٹی میں مدد دینے والا ٹیری پچھلے مہینے مرا تو میں کتنا اُداس ہو گیا تھا۔ آج اس کتے کو دیکھ کر بڑے دنوں بعد میرا من خوش ہوا ہے تو تجھ کو پریشانی ہو رہی ہے۔''

ان دو میں سے ایک جو پہلے سے ہی لان میں موجود تھا اور کتے کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اپنے ساتھی کے اعتراض پر منہ بنا کر بولا اور کتے کو اٹھا کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''من تو تیرا استاد خوش کرے گا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میٹنگ روم کی سکیورٹی کے بارے میں انوپم نے ابھی تک رپورٹ کیوں نہیں دی ہے؟''

''ارے باپ رے۔ میں تو سچ مچ بھول گیا تھا۔'' اپنے ساتھی کے تلخی سے کہنے پر انوپم کے نام سے پکارے جانے والا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا اور کتے کو گود میں لیے ہوئے تیزی سے عمارت کی طرف مڑ گیا جبکہ اس کا ساتھی بھی وہاں سے چل پڑا۔ اب ان کے سامنے بس خالی لان تھا جبکہ آواز کوئی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے کان کے ساتھ لگا آلہ ایک بار پھر جاگ اُٹھا اور اس پر آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''میٹنگ روم کی چیکنگ کر لی انوپم؟'' کسی کا سخت لہجے میں کیا گیا استفسار سنائی دیا۔

''یس سر! سب اوکے ہے۔'' انوپم نے رپورٹ دی۔

''ایک بار پھر چیک کر لو۔ آج کی میٹنگ میں میڈم بھی ہوں گی اور ان کی سخت انسٹرکشن ہے کہ کہیں کوئی غفلت نہیں ہونی چاہئے۔'' اسی سخت لہجے والے نے ہدایت دی۔

''اوکے سر! میں ری چیک کر لیتا ہوں۔'' انوپم نے فوراً ہامی بھر لی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ انوپم وہاں سے ہٹ گیا ہو، انہیں اُس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''چلو یار ٹیری جونیئر!..... ایک بار پھر چیکنگ کر لیتے ہیں۔ آرڈر تو آرڈر ہوتا ہے نا۔'' کچھ دیر اُنہیں معمولی آہٹیں سنائی دیتی رہیں پھر دوبارہ انوپم کی بڑبڑاہٹ شروع ہو گئی۔

''اے سی اے ون، کھڑکیوں کی جالیاں بالکل فٹ، یہ بٹن آن کرو تو کھڑکی کے دروازے سب میں کرنٹ دوڑنے لگے گا۔ ادھر سے کوئی آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی زبردستی اندر گھس سکتا ہے۔ گھسے گا تو خود مرے گا۔ یعنی میٹنگ بالکل سیف طریقے سے ہو سکتی ہے اس لیے مجھے ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' پتہ نہیں وہ خود کلامی کر رہا تھا یا کتے سے مخاطب تھا لیکن انہیں بڑی اہم معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

''او یار ٹیری جونیئر! تم بھی عجیب ہی کتے ہو۔ میں اتنی دیر سے تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم یہاں ٹیبل کے نیچے گھس کر سو گئے ہو۔ چلو سوتے رہو۔ میں بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔'' انوپم کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سچ مچ کتوں سے بہت پیار کرتا تھا۔

''سب کو بتا دو کہ بہت محتاط رہنا ہے اور ابھی کسی قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی ہے۔ دُور رہ کر بس یہ نظر میں رکھیں کہ میٹنگ میں شرکت کے لیے کتنے افراد آتے ہیں اور ان کی شناخت کیا ہے۔ ہمیں جو بھی کارروائی کرنی ہو گی، ان لوگوں کی واپسی کے موقع پر کریں گے۔''

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی خفیف سی آوازوں کے بعد جب کوئی دوسری آواز نہیں اُبھری تو یہ واضح ہو گیا کہ واقعی انوپم کتے کو میٹنگ روم میں سوتا چھوڑ کر خود باہر نکل گیا ہے۔ جاوید علی نے دو تین منٹ کے وقفے

کے بعد سلمان کو یہ ہدایت دی اور خود دُور بین سے تاک جھانک میں مصروف رہا۔ لان بدستور خالی تھا لیکن مختلف پوائنٹس پر پہرے دار نظر آ رہے تھے۔

''اگر یہ کتا میٹنگ کے دوران اندر ہی موجود رہے تو کتنا اچھا ہوگا۔ ہمیں وہاں ہونے والی ساری گفتگو سننے کا موقع مل جائے گا۔''

ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایات دینے کے بعد سلمان نے بڑی اُمید سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''ہوں..... لیکن ایسا ہونا ذرا مشکل ہی ہے۔ میٹنگ کے وقت کتا اندر رہ گیا تو انوپم کی شامت آ جائے گی۔ جو لوگ اپنی سکیورٹی کے معاملے میں اتنے حساس ہوں کہ محفوظ ترین کمرے میں میٹنگ کا انعقاد کریں، وہ کمرے میں کتے کی موجودگی کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟''

جاوید علی نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا تو سلمان کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔ اگلے ایک گھنٹے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی، بس سست روی سے گزرتے وقت کے ساتھ رات نے اپنا کچھ اور سفر طے کر لیا۔ رات کا وقت ہونے کے باوجود انہیں بنگلے پر نظر رکھنے میں دشواری نہیں پیش آ رہی تھی۔ طاقتور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی نے سارا منظر واضح کر رکھا تھا۔ پھر اس بنگلے کے علاوہ اس کے اردگرد کے دوسرے بنگلوں میں سے بھی تھوڑی بہت روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود ان کے پاس نائٹ ویژن گاگلز موجود تھے جو کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات میں ان کے کام آ سکتے تھے۔

گھنٹے سے دو تین منٹ ہی اوپر ہوئے تھے کہ انہوں نے انوپم اور اس کے ایک ساتھی کو مرکزی عمارت سے باہر نکلتے دیکھا۔ انوپم کچھ پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ باہر آنے والا شخص تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

مشکل سے اسی نوے سیکنڈ کی گفتگو کے بعد انوپم نے وہاں سے حرکت کی اور پھر انہوں نے ایک بائیک پر سوار اسے بنگلے سے روانہ ہوتے دیکھا۔ سلمان نے فوراً ہی اپنے ایک آدمی کو اس کے تعاقب کے احکامات دے ڈالے۔ اس واقعے کے بعد آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا۔ انوپم کے تعاقب میں جانے والے سلمان کے ساتھی نے اس دوران انہیں رپورٹ پیش کر دی تھی۔

''انوپم یہاں سے سیدھا ہاسپٹل گیا ہے۔ وہاں اس کی ماتا جی ایڈمٹ ہیں اور ان کی حالت خاصی خراب بتائی جا رہی ہے۔ ایک طرح سے ڈاکٹر نے انہیں جواب دے دیا ہے۔'' ساتھی کی رپورٹ نے انہیں انوپم کی اچانک روانگی کی وجہ سے آگاہ کر دیا۔

''پتہ نہیں کتا اب بھی میٹنگ روم میں ہے یا نہیں؟'' بوریت کے شکار سلمان نے سوال اُٹھایا۔

''میرے خیال میں تو وہ اب بھی اندر ہی موجود ہے۔ دوسری صورت میں ہمیں کوئی آواز ضرور سنائی دیتی۔'' جاوید علی نے جواباً اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''سارا دن کھیل کُود کرتا رہا ہے شاید اس لیے لمبی نیند سو گیا ہے۔ ویسے بھی عابد کا کہنا ہے کہ اس کا کتا رات بھر لمبی تان کر سوتا ہے اور مشکل سے ایک دو بار جاگتا ہے۔ اگر آج بھی یہ طویل نیند سوتا رہا تو ہمارا بھلا ہو جائے گا۔ کیونکہ میرے خیال میں انوپم جتنی ایمرجنسی میں یہاں سے گیا ہے، اسے بالکل بھی یاد نہیں رہا وہ گا کہ کسی کے ذمے کتے کو میٹنگ روم سے باہر نکالنے کا کام لگا دے۔''

سلمان کے لہجے میں ایک اُمید سی تھی۔ اسی وقت انہوں نے ایک گاڑی بنگلے کی طرف آتے دیکھی۔ یہ



بالکل نئے ماڈل کی کلٹس تھی۔

چوکیدار نے گاڑی دیکھتے ہی تیزی سے بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ بنگلے میں موجود افراد میں سے ایک نے اس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔

کتے کے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے محروم رہے۔

کلٹس کے بعد چند منٹوں کے وقفے سے تین گاڑیاں مزید بنگلے میں پہنچیں اور آسانی سے اس کے وسیع پورچ میں سما گئیں۔ وہ دونوں جس زاویے سے بیٹھے نگرانی کر رہے تھے، اس سے یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ گاڑیاں چلانے والے کون ہیں۔ وہ بس اسی وقت ان کی صورت دیکھتے تھے جب گاڑی سے اُترنے کے بعد بنگلے میں ان کا استقبال کیا جاتا تھا۔

آخری گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں پہنچی۔ جاوید علی کو اس کا چہرہ کچھ شناسا لگا لیکن وہ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا اور وہ چند سیکنڈ ہی باہر رکنے کے بعد اندر چلی گئی۔

اس کے اندر جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے وہ بالکل تاریکی میں چلے گئے کیونکہ اب نہ تو کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی سنائی لیکن پھر کان سے لگے آلے میں پہلی آواز سنائی دی تو وہ دونوں خوش ہو گئے۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کتا ہنوز میٹنگ روم میں سویا پڑا ہے اور وہ وہاں ہونے والی گفتگو سن سکتے ہیں۔ وہ دم سادھے میٹنگ کے باقاعدہ آغاز کا انتظار کرنے لگے جس کے لیے انہیں زیادہ زحمت نہیں اُٹھانی پڑی اور رسمی ہیلو ہائے کے بعد کسی نے گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ یہ میٹنگ کیوں ارینج کی گئی ہے۔ ہم برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں اور ان برسوں میں کئی بار ہمیں اُتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن کچھ عرصے سے تو حالات ہمارے لیے بہت ہی خراب ہو گئے ہیں اور ہمیں کئی بڑے نقصان اٹھانا پڑے ہیں۔ بلتستان میں ہمارا ٹریننگ کیمپ تباہ ہوا، نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تباہی سے خواجہ سراؤں کی مدد سے بنائے گئے سیٹ اپ کو خاصا نقصان پہنچا، مساج سینٹروں میں بھی کافی گڑبڑ ہو چکی ہے اور حد یہ ہے کہ ہمارے لیے کام کرنے والی ایک لڑکی عالیہ کی وجہ سے ہمیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ خبر نہیں کیسے وہ دشمنوں کے کیمپ سے جا ملی ہے اور اس کے دھوکے کی وجہ سے ہمیں اپنے فائٹنگ وِنگ کے اہم ورکرز سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری جانی پہچانی حکومتی ایجنسیوں کے علاوہ بھی کوئی خفیہ ایجنسی ایسی ہے جو ہمارے خلاف کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارے سامنے جو اہم ترین نام ہے، وہ کرنل توحید کا ہے۔ ہم اپنے سورسز سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ آج کل کرنل توحید پنڈی میں ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ کرنل کو وہاں سے اغوا کر لیا جائے اور اسی سے ساری انفارمیشن حاصل کی جائے۔ اغوا کے لیے منصوبہ مس سنتھیا نے تیار کر لیا ہے۔ یہ اپنا منصوبہ آپ لوگوں کے سامنے رکھیں گی تاکہ اگر اس میں کوئی خامی ہو تو دُور کر لی جائے..... پلیز سنتھیا! اپنا منصوبہ سب کے سامنے بیان کرو۔''

گمبھیر مردانہ آواز بلند ہوئی تو انہیں ایک زنانہ آواز سنائی دینے لگی۔ بولنے والی کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سخت طبیعت کی مالک ہے۔ اس کے لہجے کی ہی طرح اس کا منصوبہ بھی سخت خطرناک تھا۔ جاوید علی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ شناسا محسوس ہونے والی عورت، ڈاکٹر ماریہ کی ماں سنتھیا جوزف ہے۔

یہ عورت بہت سی وجوہات کی بنا پر اُنہیں پہلے ہی مطلوب تھی چنانچہ اس کی یہاں موجودگی کا جان کر وہ خاصا پُر جوش ہو گیا تھا۔ ان کے ریکارڈ کے مطابق یہ عورت ڈبل ایجنٹ تھی اور ''را'' کے ساتھ ساتھ ''موساد'' کے لیے بھی کام کرتی تھی بلکہ اس کی حقیقی وفاداری تو ''موساد'' کے ساتھ ہی تھی لیکن وہ ''را'' کے ساتھ بھی بخوبی اس لیے چل رہی تھی کہ مقصد تو دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو نقصان پہنچانا اور یہاں کے حالات کو اس نہج پر لے جانا جہاں پہنچ کر پاکستان کا نام ونشان مٹانا آسان ہو جائے۔

''ہم کرنل توحید کی روٹین کو مسلسل واچ کر رہے ہیں اور میں نے سوچ لیا ہے کہ کرنل کو جس روز کڈنیپ کیا جائے گا، اس روز آدھے گھنٹے پہلے مینارِ پاکستان کو بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں بھی سارا ہوم ورک کر لیا گیا ہے۔ البتہ منصوبے کو ہر طرح کی خامی سے پاک رکھنے کے لیے اسے بھی میں آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں۔ آپ میں سے جو بھی چاہے، اپنی رائے دے سکتا ہے۔''

وہ لوگ اپنے ناپاک منصوبے کو آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔ ان کی یہ باتیں سن کر جاوید علی اور سلمان دونوں ہی کے چہرے طیش سے سرخ ہو رہے تھے۔

دشمن اُن کے وطن کو بے شمار نقصانات پہنچانے کے بعد اب ان سے ایک ایسی یادگار بھی چھین لینا چاہتا تھا جس کے بارے میں پاک سرزمین کے ہر بچے کو نہایت فخر سے یہ بتایا جاتا تھا کہ یہ مینارِ عین اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی۔ دشمن نے نہایت خباثت سے بڑی گہری چال سوچی تھی۔ ایک طرف وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتے تھے تو دوسری طرف قوم کو ایک ایسے صدمے سے دوچار کرنے والے تھے جو انہیں سکتے میں مبتلا کر دے۔ ان حالات میں ان کے لیے کرنل توحید کے اغوا کی مذموم سازش پر عمل کرنا آسان ہو جاتا۔

''میری ایک تجویز ہے میڈم! ہمیں چاہئے کہ مینارِ پاکستان کے علاوہ بھی دوسری جگہوں پر بلاسٹ کریں۔ ضروری نہیں کہ وہ جگہیں مینارِ پاکستان کی طرح ہی اہم ہوں لیکن ہونی پبلک پلیس ہی چاہئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہلاکتیں ہوں اور پورا ملک لرز اُٹھے۔''

ایک قدرے باریک آواز والے نے نہایت سفاکی سے تجویز پیش کی جو سنتھیا کو بہت پسند آئی اور اس نے اس پر عمل کی منظوری دیتے ہوئے تجویز دینے والے کو فری ہینڈ دے دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں جیسے چاہے یہ کام انجام تک پہنچا دے۔

سازشیوں کے اس ٹولے کی میٹنگ ایسی ہی چند باتوں کے بعد اختتامی مرحلے میں داخل ہو گئی۔ جاوید علی اور سلمان نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ماتحتوں کو ہدایت دینے لگے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ میٹنگ کے لیے آنے والے چاروں اہم افراد کو بنگلے سے دور جا کر گھیرنا چاہتے تھے کیونکہ بنگلے میں جو حفاظتی انتظامات تھے، وہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ کافی بڑی فورس کے ساتھ ہی بنگلے پر چڑھائی کر کے کامیابی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس میں بھی یہی خدشہ تھا کہ مقابلے کے دوران سرکردہ افراد میں سے کسی کی جان نہ چلی جائے۔ ان کے لیے ان افراد کی ہلاکت سے زیادہ انہیں زندہ گرفتار کرنا سودمند ہوتا۔ باقی چھوٹی مچھلیوں سے تو بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔

''میں سنتھیا کے پیچھے جاؤں گا۔ تم کلفٹس والے سے نمٹ لینا۔ اس کے علاوہ راشد اور خیری سے کہہ دو کہ وہ دو دو کے گروپ میں باقی دونوں سے نمٹ لیں۔'' وہ جس عمارت کے ایک دفتر سے بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے، اب اس کی پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ پارکنگ میں پہنچ کر اس نے سلمان سے کہا اور لپک کر اپنی



بائیک پر سوار ہو گیا۔

یوں تو وہ زیادہ تر گاڑی کا استعمال کرتا تھا لیکن یہاں آتے ہوئے گاڑی ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ کر بطورِ خاص بائیک پر آیا تھا۔ دو پہیوں والی یہ سواری یوں تو تھوڑی خطرناک تھی لیکن اپنی رفتار اور ٹریفک کے رش میں آسانی سے جگہ بنا کر نکل جانے کے باعث خاصی باسہولت بھی لگتی تھی۔

''بنگلے سے ان لوگوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے کلفٹس والا نکلا ہے اور اس کا رخ علاقے سے باہر کی طرف ہی ہے۔''

وہ دونوں اپنی اپنی سواریوں کو اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر نکل رہے تھے جب نگرانی کرنے والوں میں سے کسی نے اطلاع دی۔ ان دونوں ہی نے اپنے اپنے آپریٹس پر یہ اطلاع سنی۔

''جانے دو، کسی کو بالکل بھی چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی نے سختی سے حکم دیا جس پر پوری طرح عمل کیا گیا اور ایک ایک کر کے انہیں چاروں ہی کی روانگی کی اطلاع مل گئی۔

ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ بنگلے کے گیٹ سے ہی تعاقب شروع کر دیں کیونکہ اس پوش علاقے سے مین روڈ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ جاوید علی نے بھی سنتھیا کی گرے سوک کو جلد ہی پا لیا لیکن اس سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر مخصوص فاصلے سے ٹریفک کے اژدھام میں اسی طرح اپنی بائیک چلاتا رہا جیسے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی ایک غیر متعلقہ شخص ہو۔ راستے میں ہی اس نے ہیڈ کوارٹر رابطہ کر کے اب تک کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ مزید نفری کی درخواست کر دی کیونکہ بنگلے کو کلیئر کرنے کے لیے ان کو زیادہ افراد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسے اس سلسلے میں تسلی دے دی گئی۔

''میرا شکار یہاں سے دور نہیں گیا ہے اور علاقے کے ہی ایک دوسرے بنگلے میں پہنچ گیا ہے۔'' سنتھیا کا تعاقب کرتے ہوئے اسے اپنے آپریٹس پر خیری کی آواز سنائی دی۔ یہاں آتے ہوئے وہ اس بات کا بندوبست کر کے آئے تھے کہ ایک دوسرے سے مستقل رابطے میں رہیں۔

''ٹھیک ہے، فی الحال اسے مت چھیڑو اور باہر ہی رہ کر نگرانی کرو۔ اس کا بعد میں بندوبست کر لیں گے۔'' اس نے خیری کو ہدایت دی اور بہت سی دوسری گاڑیوں کے ساتھ اس روڈ پر مڑ گیا جس کا سنتھیا نے رخ کیا تھا۔

روڈ آگے جا کر کئی شاخوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ سنتھیا نے اپنی گاڑی دائیں بائیں جانے والے راستوں میں سے کسی طرف موڑنے کے بجائے بالکل سیدھ میں موجود پُل پر چڑھا دی۔ ٹریفک کے حصوں میں منقسم ہو جانے کے باعث پُل پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ جاوید علی کو بھی ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش تھی۔ اس نے یک دم ہی اپنی بائیک کی رفتار تیز کی اور سنتھیا کی سوک کے قریب سے اس طرح تیزی سے لے گیا جیسے عموماً مردوں کی طرح خاتون ڈرائیور کو ڈرانا مقصود ہو۔

آگے جا کر اس نے ایک تماشا کیا اور بگڑے ہوئے، تھرل کے متلاشی لڑکوں کی طرح دونوں ہینڈلز پر سے ہاتھ اٹھا کر گاڑی چلانے لگا۔

اُس کی ان حرکتوں کے باعث ممکن ہی نہیں تھا کہ سنتھیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔ وہ زور زور سے اپنی گاڑی کا ہارن بجانے لگی کہ کسی طرح اس ایڈونچر کے چکر میں پڑے لڑکے سے اپنے لیے راستہ صاف کروا سکے لیکن وہ کسی طرح اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا تھا۔

اُس کی یہ بے نیازی سنتھیا کے لیے اشتعال کا سبب بنی اور اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا کر سائیڈ

سے نکلنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں شاید اس کی گاڑی کا کوئی حصہ بائیک کو ذرا سا چھو گیا۔ دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ بائیک کا توازن بگڑا اور اس کا سوار ہوا میں اُڑتا ہوا گرے سوک کے بونٹ پر جا گرا۔

سنتھیا نے گھبرا کر اپنی گاڑی کو بریکس لگائے۔ جاوید علی بچنے کی کوشش کرتا ہوا جھٹکے سے نیچے گرا۔ لیکن وہ اس زاویے سے گرا تھا کہ گاڑی کے سامنے نہیں آیا تھا ورنہ گاڑی رُکتے رُکتے بھی اسے کچل ڈالتی۔

گاڑی رُکنے کے بعد غصے میں بھری سنتھیا باہر نکلی۔ رواں ٹریفک میں سے بھی ایک دو افراد نے اپنی گاڑیاں روک لی تھیں اور نیچے گرے ہوئے جاوید علی کا جائزہ لے رہے تھے۔

''اس ایکسیڈنٹ میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ غلطی اس کی ہی تھی۔ یہ چلتی سڑک پر کرتب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

غصے اور پریشانی میں مبتلا سنتھیا نے چیخ کر اپنی صفائی پیش کی جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ اس جوان کے لیے بھی تشویش میں مبتلا تھے جو زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میڈم! آپ کی غلطی نہیں ہے۔ لیکن اسے ہسپتال تو لے جانا ہی پڑے گا۔'' ایک شخص نے انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے اہم نکتہ پیش کیا۔

''میں اسے ہسپتال لے کر جاؤں گی تو پولیس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ویسے بھی ایک ایسی عورت جس کے اشارے پر سینکڑوں بے گناہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے، کسی انسان کی زندگی بچانے میں کیا دلچسپی رکھ سکتی تھی۔ وہ تو بس اضطراری عمل کے طور پر وہاں رک گئی تھی اور اب لوگوں کی وجہ سے پھنسی ہوئی تھی۔

''آپ مجھے ہسپتال لے چلیں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بیان نہیں دوں گا۔'' زخمی جاوید علی نے کراہ کر اس سے استدعا کی تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

''اچھی بلا گلے پڑ گئی ہے۔'' لوگوں کے جاوید علی کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے تک وہ بڑبڑاتی رہی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی گاڑی کے ٹائر کچل کر وہاں سے روانہ ہو جائے۔

''آپ اتنی ناراض نہ ہوں۔ ہسپتال کا بل میں خود ادا کروں گا۔'' جاوید نے کچھ چڑانے والے انداز میں اسے تسلی دی۔

ایک زخمی شخص کا یہ انداز دیکھ کر وہ کچھ چونک گئی۔ لیکن اب تو گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا ہی چکی تھی چنانچہ لب بھینچے خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔

''میری بائیک پُل پر پڑی ہوئی ہے۔ حالت خاصی خراب ہے، اسے وہاں سے اُٹھوا لینا۔'' اپنے ماتھے سے بہتے وائے خون پر رومال رکھتے ہوئے اس نے کسی کو یہ ہدایت کی تو ڈرائیونگ کرتی سنتھیا چونک گئی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ لب ولہجہ کسی عام شخص کا نہیں ہو سکتا۔

''کون ہو تم؟'' سوال کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تیزی سے ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔

''اونہہ..... ایسی کوئی غلطی مت کرنا مسز سنتھیا جوزف! ورنہ تمہارا یہ طرح طرح کی ڈائیز سے رنگے بالوں والا سر سلامت نہیں رہے گا۔'' جاوید علی نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا پسٹل اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔

''تو تم جان بوجھ کر میری گاڑی کے آگے آئے تھے..... وہ بھی اس وقت، جب ہم ایک فلائی اوور پر سفر کر رہے تھے؟'' وہ سخت متعجب تھی البتہ لہجے میں خوف کا کوئی عنصر نہیں تھا۔



''ہاں بس اچانک ہی اس پاگل پن کے لیے دل مچلا اور دیکھو کتنی سہولت ہو گئی۔ میں اپنی کھٹارا بائیک سے تمہاری اس آرام دہ گاڑی میں شفٹ ہو گیا۔'' وہاں بھی قابلِ دید اطمینان تھا۔ ورنہ سچ یہ تھا کہ اپنی اس عجیب وغریب حرکت کے نتیجے میں اسے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود خاصی چوٹیں لگی تھیں۔

''مجھے کچھ شک سا تو ہوا تھا لیکن پھر یہی سوچا کہ کوئی شخص ایسی حماقت کیوں کرے گا۔ بہرحال اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور خود تمہارا تعلق کس ادارے سے ہے؟'' وہ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ابھی تک اس کے انداز میں کوئی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پہلے جتنی اسپیڈ کے ساتھ ہی پورے سکون سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

''فی الحال تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے دونوں سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔''

وہ سنتھیا سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پہلی بار ڈیش بورڈ کے خانے سے پسٹل نکالنے کی کوشش کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

''اور بدلے میں تم مجھ سے اپنے بہت سے سوالوں کے جواب چاہو گے۔'' اس کا لہجہ مستفسرانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ابھی تک جاوید علی نے اسے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی چنانچہ وہ اپنی مرضی سے سیدھی گاڑی دوڑائے جا رہی تھی۔

''یہاں سے لیفٹ لے لو۔'' ایک چوراہے پر پہلی بار جاوید علی نے اسے کوئی ہدایت دی لیکن اس نے اَن سنی کر دی۔

''تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا؟'' جاوید علی اس کی کھوپڑی پر پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے غرّایا۔

''میں صرف اپنی مرضی کرنے کی عادی ہوں۔'' اس نے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا تو جاوید علی کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے بڑی مشکل شے کو ہینڈل کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔

''سر پر رکھی پسٹل کی نال کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی کرنے کی کوشش کرے تو اس کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایسا شخص خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' وہ ذرا جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

''وہ تو کوئی تمہاری حرکت کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن دیکھو تم صحیح سلامت بیٹھے ہو۔'' وہ اس طرح مسکرا کر بولی جیسے اس کا مقابل کوئی ننھا بچہ ہو اور وہ اس کی کیفیت سے پوری طرح لطف اٹھا رہی ہو۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اب جو موڑ آئے گا، وہاں سے یوٹرن لے لینا۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔''

سنتھیا کی مسکراہٹ نے اسے مزید تپا دیا اور وہ پہلے سے زیادہ جھنجلا کر اسے دھمکی دینے لگا۔

''اچھا سلوک تو تم میرے ساتھ کسی صورت نہیں کر سکتے بلکہ اگر میں تمہاری بات مان کر شرافت سے تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی تو میرے ساتھ یقینی طور پر بہت برا سلوک ہو گا اور عمر کے اس حصے میں، میں زیادہ تشدد برداشت کرنے کی اہل نہیں ہو سکتی اس لیے بہتر ہے کہ میں وہی کروں جو میں خود مناسب سمجھتی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا اور گاڑی ایک اور فلائی اوور پر چڑھا دی۔

جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ اس کے سامنے بے بس ہے۔ جو شخص مرنے سے نہ ڈرتا ہو، اسے پھر کس چیز سے دھمکایا جا سکتا ہے۔

''او کے بوائے! پھر ہم دونوں ہی ایک ساتھ اوپر چلتے ہیں۔ اپنے اس آخری سفر کو تم عالمِ بالا میں بھی یاد

رکھو گے۔"

بھرپور اطمینان کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے یکدم ہی اسٹیئرنگ موڑ دیا۔ گاڑی زوردار دھماکے سے فلائی اوور پر لگے حفاظتی جنگلے سے ٹکرائی اور اسے توڑتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔

یہ جاوید علی کی زندگی کا خوفناک لیکن شاید سب سے خوش قسمت لمحہ تھا۔ گاڑی نیچے جا کر گرنے کے بجائے جنگلے میں ہی اٹک گئی۔

سنتھیا نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھ رکھی تھی چنانچہ ونڈ سکرین کو توڑتی ہوئی نیچے رواں ٹریفک کے درمیان جا گری۔ جاوید علی نے اگر ڈرائیونگ سیٹ کی پشت گاہ کو نہ تھام لیا ہوتا تو شاید اس کا بھی یہی انجام ہوتا۔ اب بھی وہ خاصے خطرے میں تھا۔ جنگلے سے جھولتی گاڑی کسی بھی لمحے نیچے گر سکتی تھی اس لیے سنتھیا کی فکر چھوڑ کر وہ سب سے پہلے اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے گاڑی کے دروازوں پر قسمت آزمائی کی لیکن دروازے لاک ہو چکے تھے۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ شیشے توڑ دے لیکن اس کے لیے بھی اسے اپنے ہاتھوں سے ہی کام لینا پڑتا۔ پسٹل تو پہلے ہی جھٹکا لگنے سے اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی اور دائیں ہاتھ کا زوردار گھونسہ مار کر ایک جانب کا شیشہ توڑ دیا۔

اسی وقت اسے اوپر سے جھانکتے دو چہرے نظر آئے۔ یہ یقیناً وہ چشم دید گواہ تھے جنہوں نے حادثہ ہوتے دیکھا تھا اور اب بدقسمت گاڑی کے سواروں کا حال جاننے کے لیے نیچے جھانک رہے تھے۔ رات ہو رہی تھی اس کے باوجود ابھی اتنا وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک بڑے شہر میں ٹریفک کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ پُل کے اوپر اور نیچے سے مسلسل گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

"میرا ہاتھ پکڑو بھائی صاحب!" جاوید علی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ان میں سے ایک نے اسے پکارا۔ جاوید علی نے فوراً اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے اوپر اٹھنے میں مدد دینے لگا جبکہ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ خود وزن کی وجہ سے اُلٹ کر نیچے نہ جا گرے۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد جاوید علی موت کے منہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"شاید آپ کا ساتھی....." اسے گاڑی سے نکلنے میں مدد دینے والے شخص نے نیچے رک جانے والی ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔ یقینی طور پر وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔

اس کے اشارے پر جاوید علی نے پُل سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ اتنی بلندی سے گر کر کسی کا بچنا ویسے بھی محال تھا اور وہ تو لازماً کئی گاڑیوں کے نیچے بھی کچلی گئی ہو گی جبھی گوشت کے لوتھڑے کی صورت اس زمین پر پڑی تھی جسے اس نے ساری زندگی برباد ہی کرنے کی کوشش کی تھی پھر بھلا اسے اس زمین پر امان کیوں ملتی؟

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے

ایسے مزید واقعات کے لیے جلد ششم کا مطالعہ کیجئے۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....

جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

# گرداب

ششم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اراوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے



رات تقریباً ڈھل چکی تھی اور سپیدۂ سحر پھوٹنے کو تھا۔

ذیشان کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی جبکہ جاوید علی اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چھوٹے بڑے زخم موجود تھے تاہم کوئی بھی زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا اور وہ معمولی ڈریسنگ کے بعد ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔

حادثے کے بعد پہنچنے والی پولیس سے جان چھڑا کر نکلنے کے لیے اسے اپنے ادارے کے مراسم کو استعمال کرنا پڑا تھا اور وہ ذیشان کی طرف سے ملنے والے حکم کی وجہ سے سیدھا ہیڈ کوارٹر پہنچا تھا۔

''تم سے اس طرح کی حرکت کی اُمید نہیں تھی۔ جرأت مندی اور حماقت میں فرق ہوتا ہے۔ بے شک ہم اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ہر وقت جان کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن ہماری تربیت میں خودکشی کی ترغیب تو کہیں بھی شامل نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ تم پر فخر کیا ہے لیکن اس بار تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے جاوید!'' ذیشان کے لہجے میں دبا دبا غصہ اور افسوس تھا۔

''سوری سر! میں خود شرمندہ ہوں کہ میں سنتھیا کو زندہ یہاں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔''

''میں اس وجہ سے تم سے ناراض نہیں ہوں۔'' ذیشان نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ''مجھے تمہارے طریقِ کار سے اختلاف ہے۔ تم نے کس احمقانہ انداز میں اس تک رسائی کی کوشش کی تھی۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے تم خود موت کے منہ میں جا سکتے تھے۔''

''بس سر! اس وقت پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں یہی ترکیب آئی تھی۔'' اس نے بنا تامل اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

''آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔'' ذیشان نے اسے تنبیہ کی۔

''او کے سر!'' اس نے فوراً ہامی بھر لینے میں ہی بچت محسوس کی۔

''جاؤ جا کر ریسٹ کر لو۔ دوسرے لوگ باقی معاملات نمٹا لیں گے۔'' خلافِ توقع ذیشان نے آسانی سے اس کی جان چھوڑ دی۔

وہ فوراً ہی وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ زخموں اور تھکن سے چُور اس کا جسم آرام کا خواہش مند تھا لیکن وہ صورتِ حال جانے بغیر کسی طرح سکون سے نہیں سو سکتا تھا۔ ویسے ہی سنتھیا جیسی اہم مجرمہ کے ہاتھ نہ آنے کا غم اسے بے چین کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ یہ بھی اعتراف کر رہا تھا کہ اس ادھیڑ عمر عورت نے اپنے ایجنٹ ہونے کا حق ادا کر دیا تھا اور اپنے وطن سے اس طرح وفاداری نبھائی تھی کہ جان دے دی تھی لیکن ایسا موقع نہیں آنے دیا تھا کہ کوئی اس سے زبردستی کچھ اُگلوا سکے۔ وہ بہروپ بدل بدل کر برسوں پاکستان میں رہی تھی

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
PAKISTANIPOINT

اور خود کو ایک ایسی موت کے حوالے کر دیا تھا جس نے اس کی لاش تک کو ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے یار! یہاں کیوں آ گئے؟ ریسٹ کر لیتے۔'' وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سلمان نے اسے دیکھ کر کہا۔

''طبیعت تو میجر صاحب نے بالکل صاف کر دی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا رہا؟'' اس نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور فوراً ہی اپنے مطلب پر بھی آ گیا۔

''بنگلے کو کلیئر کروا لیا گیا ہے۔ وہاں بھاری اسلحہ اور دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ آدمیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ سی ایف پی نے خود وہاں کارروائی کرنے کے بجائے رینجرز کے ذریعے آپریشن کیا ہے۔ آپریشن میں وہاں موجود زیادہ تر افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ جو تھوڑے بہت بچے ہیں، وہ رینجرز کی کسٹڈی میں ہیں اور وہ لوگ خود ان سے نمٹ لیں گے۔''

''ان تینوں کا کیا ہوا جن کا تم، راشد اور خیری پیچھا کر رہے تھے۔ میں تو اپنی جان کی بازی لگانے کے باوجود سنتھیا کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔'' اس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

''ہم بھی کوئی بڑا تیر نہیں مار سکے۔ میں جس آدمی کا پیچھا کر رہا تھا، اسے تعاقب کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ مجھے ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا خیری بھی اس وجہ سے ناکام رہا کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا شکار اس بنگلے پر موجود ہے جہاں وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ اور اس کا ساتھی اس بنگلے کی نگرانی کرتے رہ گئے اور جب اس شخص کی گرفتاری کے لیے بنگلے پر ریڈ کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ وہ بنگلہ اندر سے ساتھ والے بنگلے سے ملا ہوا تھا اور خیری کا شکار وہاں سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم چاروں میں صرف راشد اپنے حصے میں آنے والے بندے کو یہاں تک لانے میں کامیاب ہو سکا ہے لیکن بدقسمتی سے اس شخص کو جھڑپ میں سر پر ایسی چوٹ آئی ہے کہ وہ مسلسل بے ہوش ہے۔ اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بس اس امید پر بیٹھے ہیں کہ وہ ہوش میں آ جائے تو اس سے کچھ معلوم کیا جا سکے۔'' سلمان کی فراہم کردہ معلومات اس کے لیے خاصی مایوس کن تھیں۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی یوں لگ رہا تھا کہ کچھ ہاتھ نہ آیا ہو۔ سلمان کے سامنے اس نے اپنی اس مایوسی کا اظہار کر دیا۔

''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اپنے دو اہم افراد ہاتھ سے نکل جانے کے باعث دشمن کو خاصا نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے ایک اہم ٹھکانے سے محروم ہو گئے ہیں۔ اسلحے اور بارودی مواد کے علاوہ ان کے لیے کام کرنے والے کئی خونخوار فائٹرز نے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی میٹنگ میں جو خطرناک سازشیں تیار کی تھیں، ہم ان سے واقف ہو گئے ہیں۔ اب ان کے لیے ممکن نہیں ہو گا کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو سکیں۔ ہم کرنل صاحب کی سکیورٹی کے ساتھ ساتھ مینارِ پاکستان سمیت دیگر اہم مقامات کی سکیورٹی میں اضافہ کر کے سازشیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنے پر مجبور کر دیں گے۔ تم جو اتنے مایوس ہو رہے ہو، یہ سوچ کر ہی خود کو مطمئن کر لو کہ ہم نے اپنی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں قوم کو ایک عظیم صدمے سے دوچار ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر خدانخواستہ مینارِ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو شاید کبھی بھی خود کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ سازش سامنے آنے کے نتیجے میں ہم کم از کم حفاظتی انتظامات مزید مضبوط کرنے کے قابل تو ہو گئے ہیں نا۔ بس یہ کامیابی بھی بہت ہے۔ انسان کے حصے میں ہر بار سو فیصد کامیابی نہیں آتی۔ کیونکہ اگلی پارٹی جس سے ہم لڑ رہے ہیں کوئی معمولی طاقت تو نہیں رکھتی۔ وہ بھی ہماری طرح تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں جو ظاہر ہے، ہاتھ باندھے تو ہمارے سامنے حاضر نہیں ہو جائیں گے۔ انہیں



تو آخر اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پیر چلانے ہی ہیں تو تم وہ انہیں چلانے دو۔ اِنشاء اللہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم ان کے ہاتھ پیر توڑ کر انہیں ان کے ملک اس حالت میں واپس پہنچائیں گے کہ ان کے دوسرے ساتھی پاکستان کا رخ کرتے ہوئے سو بار سوچیں گے۔''

جاوید علی کی کیفیت کے پیشِ نظر سلمان اسے تسلیاں دیتا رہا جنہوں نے خاطر خواہ اثر کیا اور اس نے بھی سوچا کہ دشمن موجود ہے تو ہمارا حوصلہ بھی تو مُردہ نہیں ہوا۔ ابھی بہت بار ایسے مواقع میسر آئیں گے جب دشمن کو خاک چاٹنے پر مجبور کیا جا سکے گا۔

⊛----✪----⊛

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان تینوں نے اپنے سامنے موجود وسیع و عریض عمارت کا جائزہ لیا۔ اس عمارت کا نام ارجن وِلاز تھا اور یہاں وہ اس شخص سے نمٹنے آئے تھے جو مبینہ طور پر انہیں ڈاکٹر فرحان جمیل کا پتہ بتا سکتا تھا۔

''را'' کے اس ایجنٹ کے پاس سسر سے ملنے والی دولت کے باعث بے پناہ سہولیات موجود تھیں۔ وہ جس محل میں رہتا تھا، اس میں جہاں خدمت کے لیے ڈھیروں ملازمین تھے وہیں حفاظت کے انتظامات بھی خوب کیے گئے تھے۔ ان انتظامات میں انسان اور جدید تکنیک دونوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو یہ معلومات عبدالرحمٰن نے فراہم کی تھیں اور ان معلومات کی روشنی میں وہ غور و خوض کرتے رہے تھے کہ ارجن تک رسائی کیسے ہو۔

بھائی جی طرف سے آدمیوں کی فراہمی کی پیشکش کے باوجود ان کے لیے ارجن کی رہائش گاہ پر چڑھائی کر دینا ممکن نہیں تھا کہ جب دو مسلح گروہ آپس میں ٹکراتے تو ہنگامہ ہوتا اور ارجن کی حیثیت کے پیشِ نظر پولیس فوراً اس کے گھر کی طرف دوڑی آتی۔ ایسے میں وہ ارجن سے خاک کچھ حاصل کر سکتے تھے؟ اس لیے اس آئیڈیے کو تو فوری طور پر مسترد کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی کئی آئیڈیاز زیرِ بحث آئے لیکن سب میں یہی قباحت تھی کہ کام خاموشی سے نہیں ہو رہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی کے علم میں آئے بغیر بات بن جائے۔

مسلح سکیورٹی گارڈز کو جُل دے کر اندر گھسنے کی ترکیب سوچتے سوچتے خود شہریار کو ہی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ اپنے ذہن میں آنے والے خیال پر عمل کرنے کے لیے اسے عبدالرحمٰن کی مدد کی ضرورت پڑی اور عبدالرحمٰن نے اس کے منصوبے کو سراہتے ہوئے فوراً ہی مدد کی ہامی بھر لی۔

شہریار کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن سے ایسی نشہ آور دوا منگوانے کو کہا جو کسی کو مشروب میں ملا کر دی جائے تو آدمی فوری طور پر متاثر نہ ہو بلکہ آہستہ آہستہ دوا اس کے اعصاب کو متاثر کرے۔

عبدالرحمٰن نے اس کی فرمائش پر نہ صرف یہ دوا منگوا دی بلکہ اپنے آدمیوں کے ذریعے ارجن وِلاز کے پینے کے پانی اور دودھ میں شامل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔

یہ کام اس طرح انجام پایا کہ ہر روز وِلاز میں فراہم کیے جانے والے منرل واٹر کی بڑی کین نما بوتلوں میں دوا انجیکٹ کر دی گئی۔ وِلا میں اندر باہر تین مختلف مقامات پر ڈسپنسر لگائے گئے تھے جن کا پانی مالکان و ملازمین سب پیتے تھے اور ڈسپنسر نصب کرنے والی کمپنی صبح و شام پانی فراہم کرنے کی پابند تھی۔

پانی کے علاوہ دودھ میں دوا ملانے کا کام محض احتیاطاً کیا گیا تاکہ کام پکا ہو۔ وِلا میں مختلف ضروریات کے لیے ٹیٹرا پیک دودھ استعمال ہوتا تھا اور دودھ کے یہ ڈبے روزانہ کی گروسری کے لیے مامور ملازم ہی خرید کر لاتا تھا۔ اس ملازم کو جُل دے کر عبدل کے آدمیوں نے بڑی ہوشیاری سے دودھ کے ڈبوں میں دوا

انجیکٹ کر دی۔ پانی اور دودھ میں دوا کی ملاوٹ کا یہ کام ایک ہی دن میں کیا گیا اور اب وہ تینوں رات کے اندھیرے میں ارجن وِلاز کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ وِلا اور ارجن کی مسلسل نگرانی کرتے رہنے والے بھائی جی کے آدمیوں نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ ارجن، وِلا میں ہی موجود ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ کارروائی کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔

اس کارروائی کے لیے عبدل کی کھلی پیشکش کے باوجود انہوں نے بھائی جی کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے آنا منظور نہیں کیا تھا اور صرف ایک ڈرائیور کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تھے۔

اُنہیں اُمید تھی کہ اندر اُنہیں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ امکان یہی تھا کہ دودھ اور پانی جیسی اہم چیزوں میں دوا کی ملاوٹ کی وجہ سے تقریباً ہر شخص کے معدے میں دوا پہنچ گئی ہوگی اور اپنا کام شروع کر دیا ہوگا۔ مضبوط اعصاب کے لوگ اس دوا سے اگر بے ہوش نہ بھی ہوتے تو کم از کم اس لائق نہیں رہ سکتے تھے کہ ان کا بھرپور مقابلہ کر پائیں۔ چنانچہ وہ نہایت پُر امید حالت میں پوری تیاری کے ساتھ ارجن وِلا کے باہر موجود تھے۔ ان کے ساتھ آنے والے ڈرائیور کو باہر ہی رہ کر ان کا انتظار کرنا تھا۔ البتہ وہ تینوں اس سے مکمل رابطے میں رہتے اور وہ پوری طرح تیار رہتا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں انہیں وہاں سے فوری طور پر فرار کروا کر محفوظ مقام تک پہنچا دے۔ بہ صورتِ دیگر وہ ان کی واپسی کے لیے معاون ہوتا۔

ڈرائیور سے رخصت ہو کر انہوں نے چند منٹ پر مشتمل ارجن وِلاز تک کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ وہ سامنے کی طرف سے نہیں گئے تھے بلکہ ایک بغلی گلی کا انتخاب کیا تھا۔ وِلا کی وسیع عمارت اس طرح بنائی گئی تھی کہ چاروں طرف سے اس کی کوئی بھی دیوار کسی دوسری عمارت سے نہیں ملی ہوئی تھی اور تن تنہا کھڑا وِلا بڑا مغرور لگتا تھا۔

پروگرام کے مطابق انہوں نے وِلا کے اطراف میں چکر لگانا شروع کیا اور دائیں سائیڈ سے گھومتے ہوئے عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ عقبی طرف دیوار بہت زیادہ بلند اور سپاٹ تھی اس لیے وہاں سے اندر داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف یہ دیکھنے آئے تھے کہ اس طرف کوئی پہرے دار تو موجود نہیں ہے۔ ان کا وہاں کسی سے سامنا نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے چلتے ہوئے بائیں سائیڈ پر گھوم گئے۔ سائیڈوں پر دیوار کی بلندی کم تھی اور کوئی ترکیب لڑا کر ان پر چڑھا جا سکتا تھا لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان دیواروں پر ایسے خاردار تار لگے ہیں جن میں کرنٹ دوڑتا ہے اور بے خبری میں ان پر چڑھنے کی کوشش کرنے والا اپنی جان سے ہاتھ دھونے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔

انہی حاصل شدہ معلومات کے مطابق دائیں اور بائیں طرف بڑے خوب صورت پودوں پر مشتمل باغات بنائے گئے تھے اور ان باغات کے درمیان ہی مختلف مقامات پر مسلح افراد پہرہ دیتے رہتے تھے کہ بالفرض اگر کوئی برقی تار سے بچ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جائے تو زندہ واپس نہ جا سکے۔

ان تینوں نے دیوار پھلانگ کر اندر جانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور چلتے چلے گئے۔ حالانکہ ان کی پشت پر لدے بیگز میں ایسا سامان موجود تھا جو ان حفاظتی انتظامات کا توڑ ہو سکتا تھا۔ لیکن مکمل جائزہ لینے سے پہلے وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے گریزاں تھے۔

ان تینوں میں اس وقت شہریار سب سے آگے تھا۔ اس سے قبل کہ دیوار ختم ہونے پر وہ عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچتے، دو افراد کے بولنے کی آواز نے شہریار کو ٹھٹک کر رُک جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے پیچھے آتے سلّو اور کلام بھی خودکار انداز میں رُک گئے۔



''آج سالی نیند بہت آ رہی ہے۔ ڈیوٹی پوری کرنا کٹھن ہو رہا ہے۔'' دیوار سے چپک کر سانس روکے کھڑے ان تینوں کو کسی کی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

''آج پھر تُو نے اپنی اوقات سے زیادہ چڑھا لی ہوگی، جب ہی یہ حال ہے۔'' جواب میں دوسرا مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''نہیں یار! دیکھ لے، پوّا ابھی تک جیب میں آدھے سے زیادہ پڑا ہے۔ میں نے دو تین چسکیاں ہی لگائی ہیں لیکن حال ایسا ہو رہا ہے جیسے شراب کا ڈرم پی گیا ہوں۔'' پہلے والے کے انداز میں بے بسی تھی اور نظر نہ آنے کے باوجود ان تینوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ہے۔

''من تو تیرا ڈرم بھر کر شراب پینے کو ہی چاہتا ہے لیکن جورو سے ڈر کر کم پیتا ہے۔'' اس کے ساتھی نے ایک بار پھر اس کا مذاق اُڑایا۔

''ہاں تُو تو جیسے اپنی جورو سے ڈرتا ہی نہیں ہے۔ سچ بتا آج چھٹی کا دن کیسے اُس کی سیوا کرتے ہوئے بتایا؟ اُس نے ہفتے بھر کے کاموں کا ڈھیر تیری چھٹی کے دن کے لیے جمع کر کے رکھا ہوا تھا نا؟'' بوجھل آواز والے کی آواز کا بوجھ پن کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا لیکن وہ تھا خاصا تیز جو اس عالم میں بھی اپنے ساتھی کی جوابی کھنچائی پر تُل گیا تھا۔

''میری پتنی مجھ سے بڑا پریم کرتی ہے یار!..... اور اس کے پریم کے بدلے اگر میں اس کا اور گھر کا خیال رکھتا ہوں تو اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔'' مذاق اُڑانے والے کا لہجہ اب کچھ دفاعی ہو گیا۔

''یہ اچھا پریم ہے کہ وہ تجھے ایک بچہ پیدا کر کے دینے کو تیار نہیں اور ہفتے بعد گھر جانے پر بھی ترساتی رہتی ہے۔'' بوجھل آواز والا اب اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔

''بچہ بھی ہو جائے گا۔ سچ پوچھ تو ابھی وہ خود بچی سی لگتی ہے اور اس کی جان دیکھ کر میرا من نہیں کرتا اس پر بوجھ ڈالنے کو۔'' اس نے پست سے لہجے میں صفائی پیش کی۔

''چل اوئے..... مجھے بے وقوف سمجھا ہے تُو نے؟'' پہلے والا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''تُو اس بات کو جانے دے۔ چل، چل کر سریتا سے بولتے ہیں کہ دو چار کپ چائے بنا کر بھجوائے تاکہ تیری سستی دور ہو جائے۔'' اس نے موضوعِ گفتگو ہی بدل ڈالا۔

''وہ سالی شاید گدھے گھوڑے بیچ کر سو گئی ہے۔ اتنی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن انٹرکام ہی نہیں اٹھاتی۔'' بوجھل آواز والے نے جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''ایک بار اور ٹرائی کر لیتے ہیں، ہو سکتا ہے اس ٹائم وہ باتھ روم میں گئی ہو۔''

''چل ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے سالے انگا کو بھی جگانا ہے۔ دو گھڑی کمر ٹکانے کا بول کر کیبن میں گیا تھا، دو گھنٹے ہونے کو آئے ہیں، ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ گئے تو شہریار اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

''یہ دوسرا آدمی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ چھٹی پر ہونے کی وجہ سے یہ دوا سے بچ گیا ہے۔''

''پروا نہیں۔ بس اس کے نشانے پر آنے کی دیر ہے۔'' سلّو نے اپنی سائیلنسر لگی پسٹل کو چوما۔ بڑے ہتھیاروں کے ساتھ یہ پسٹلز وہ تینوں خصوصی طور پر اپنے ساتھ رکھ کر لائے تھے کیونکہ ان کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ کسی بھی قسم کے شور شرابے اور ہنگامے سے بچ کر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔

''صورتِ حال کافی نازک ہے۔ یہاں سب لوگ دوا سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ان

میں سے کسی کو یہ احساس ہو گیا کہ ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو وہ پولیس کو بھی انفارم کر سکتا ہے۔'' وہ خاصی تشویش کا شکار تھا۔

''اب تو جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ لڑنے والوں کو مرنے سے کبھی ڈرنا نہیں چاہئے۔'' سلّو نے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا۔'' شہریار نے خشک لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''انسان کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں ہر شخص یہ سوچ کر قیامت تک جینا چاہتا ہے کہ ابھی فلاں کام کرنا اور فلاں خواہش باقی ہے۔ لیکن جب موت کا فرشتہ آ جاتا ہے تو پھر کسی کی کوئی پیش نہیں چلتی۔'' سلّو فلسفیانہ موڈ میں تھا۔

''اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھو۔ ابھی ہمیں پوری توجہ اپنے ٹارگٹ پر رکھنی ہوگی۔'' بحث کے طول پکڑنے سے پہلے کلام نے دخل اندازی کی تو شہریار سنجیدگی سے انہیں ہدایات دینے لگا۔ ویسے خود اس کا بھی اس موقع پر مزید بحث جاری رکھنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

''میں مین گیٹ پر نظر رکھتا ہوں، تم کلام کے ساتھ دیوار پھلانگنے کے کام میں حصہ لو۔'' اس کی ہدایات سننے کے بعد سلّو نے اپنا فیصلہ سنایا۔

عام حالات میں شاید شہریار خود مین گیٹ والوں سے نمٹنے کا فیصلہ کرتا لیکن سلّو سے ہونے والی تازہ بحث کی روشنی میں اس نے اس کے فیصلے سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رِسک زیادہ ہونے کے باوجود بہرحال اسے یہ اطمینان تو تھا کہ سلّو بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔

فیصلہ ہو چکنے کے بعد سلّو اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ کلام دیوار پر کمند ڈالنے لگا۔ لوہے کا آنکڑا کرنٹ دوڑتے خاردار تار سے ٹکرایا تو چنگاری سی پیدا ہوئی لیکن ان دونوں نے توجہ نہیں دی اور کلام لپک کر رسّی کی مدد سے کسی بندر کی سی پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔

جب وہ اس حد تک اوپر پہنچ گیا کہ خاردار تاروں تک پہنچ جائے تو رُک گیا اور رُک کر اپنے بیگ سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ مخصوص ساخت کا ایک کٹر تھا جس نے اگلے چند سیکنڈوں میں برقی تار کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس نے احتیاط سے تار کو ہٹا کر گزرنے کے لیے راستہ بنایا اور مزید اوپر چڑھ کر دیوار پر بیٹھ گیا۔

اسی وقت اندر سے ایک فائر ہوا اور یہ کلام کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت وہ نیچے جھک کر شہریار کو اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا اس لیے اس کی کھوپڑی اُڑنے سے بچ گئی۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے فوراً ہی اندر چھلانگ لگا دی اور ایک ایسی جگہ جا کر گرا جہاں موتیے کے بہت سارے پودے ایک ساتھ لگے ہونے کی وجہ سے ایک باڑ سی بن گئی تھی۔ اس نے خود کو فوراً ہی اس باڑ میں چھپا لیا۔ ایک فائر اس طرف بھی آیا لیکن گولی کلام کو چھوئے بغیر دیوار میں گھس گئی۔

اگلا فائر سائیلنسر لگے پسٹل سے ہوا اور کلام نے کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ اس سے پہلے کہ وہ جھاڑ میں سے جھانک کر دیکھتا، کوئی دھپ سے اس کے قریب کُودا۔

''یہ میں ہوں۔ ذرا خیال رکھنا۔'' اسے شہریار کی تیز سرگوشی سنائی دی جو یقیناً اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ کہیں آواز سن کر کلام اس پر فائر نہ کر دے۔

اس کی آواز سن کر کلام آڑ سے نکل آیا۔ چمپا کے پیڑ کے پاس اسے ایک آدمی گرا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا



بھیجہ اُڑ گیا تھا۔ اس آدمی کو شہریار نے دیوار پر سے اس وقت نشانہ بنایا تھا جب وہ کلام پر تیسرا فائر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اگر اندر مزید لوگ ہوش میں ہوئے تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' شہریار نے تشویش کا اظہار کیا۔

''میرا خیال ہے کہ کوئی ہوش میں نہیں ہے۔ ورنہ تین فائرز کے بعد کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا۔'' کلام نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

اسی وقت انہیں مین گیٹ کے ذیلی دروازے سے سلّو اندر آتا دکھائی دیا۔

''کیا رہا؟'' اس کے قریب آنے پر کلام نے بے قراری سے پوچھا۔

''ایک تو میرے پہنچنے سے پہلے خود ٹن ہو کر گر گیا تھا، دوسرا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے عین دل کے مقام پر گولی مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ کیبن میں بھی ایک بندہ سویا ہوا تھا۔ اس کی بھی کنپٹی بجا کر اس کے لمبے سونے کا انتظام کر آیا ہوں۔'' اس نے بہت پیار سے اپنے پسٹل کا دستہ سہلایا۔

''ویری ویل ڈن۔ چلو اب اندر کی خبر لیتے ہیں۔'' شہریار نے اس کی کارکردگی کو سراہا۔ ارجن وِلا کی مرکزی عمارت کے مقابلے میں احاطہ بہت بڑا تھا۔ مین گیٹ سے مرکزی عمارت تک سرخ بجری کی طویل روش تھی جس کے دونوں اطراف میں گاڑیاں پارک کرنے کے لیے خاصی بڑی جگہ موجود تھی اور بیک وقت وہاں چار بڑی اور قیمتی گاڑیاں کھڑی ہونے کے باوجود خاصی گنجائش نظر آ رہی تھی۔

مرکزی عمارت کے دونوں جانب لگائے گئے باغ خاصے وسیع تھے اور یقیناً خوب صورت بھی۔ لیکن رات کے وقت ناکافی روشنی کی وجہ سے وہ پوری طرح سے اس کی خوب صورتی کو دیکھنے سے محروم تھے۔ لان میں بڑی بڑی فینسی لائٹس موجود ہونے کے باوجود انہیں روشن نہیں کیا گیا تھا اور بہت معمولی سی روشنی موجود تھی۔ شاید ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ اگر رات کے وقت کوئی چوری چھپے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو مسلح افراد کے ذریعے اسے پکڑ کر اس جرأت کا مزہ چکھایا جا سکے۔ بہرحال ان کی راہ میں تو اس ایک کے سوا کوئی نہیں آیا تھا۔

وہ باغ میں گھوم پھر کے اس کا جائزہ لینے لگے کہ مبادا کوئی چھپا ہوا دشمن بعد میں ان کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔ تلسی کے پودے کے پاس انہیں دو افراد گہری بے ہوشی کی حالت میں پڑے نظر آئے۔ ان میں سے ایک کی انگلیوں کے درمیان بجھا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا بھی دبا ہوا تھا۔ شہریار نے وہ ٹکڑا نکال کر اسے سونگھا تو انکشاف ہوا کہ وہ ہیروئن سے بھرا ہوا سگریٹ تھا۔

ان کی طرف سے ملائی گئی دوا والا پانی پی کر وہ دونوں یقیناً پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے، اس پر سے ہیروئن بھرا سگریٹ بھی پینے بیٹھ گئے۔ دو آتشہ نشے نے ان کی برداشت کی حد ختم کر دی اور وہ وہیں گر گئے۔ اور امکان یہی تھا کہ کئی گھنٹوں سے پہلے ہرگز بھی ہوش میں نہیں آ سکیں گے۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور آدمی تنہا گھاس پر لیٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی نشہ آور دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہا تھا۔ انہوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی اور اندر جانے کی تدبیر کرنے لگے۔

لکڑی کا مضبوط دروازہ تو یقیناً لاک تھا اور اندر ہی سے کھولا جا سکتا تھا۔ انہوں نے متبادل راستے کے طور پر کھڑکیوں کو استعمال کرنے کا سوچا۔ کھڑکیاں شیشے کی تھیں لیکن ان میں اندر سے لوہے کی مضبوط جالی

لگائی گئی تھی۔ جائزہ لیتے ہوئے وہ ایک ایسی کھڑکی تک پہنچے جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا البتہ لوہے کی جالی اپنی جگہ تھی۔ کلام اور سلّو آگے بڑھ گئے جبکہ شہریار وہیں رک کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا جس کی سیٹنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کمرہ صنفِ نازک کے استعمال میں ہے۔ غور سے دیکھنے پر اسے اندر جلتے نائٹ بلب کی روشنی میں بستر پر سر سے پیر تک چادر اوڑھے کسی وجود کی موجودگی کا بھی احساس ہو گیا۔ سونے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت گہری نیند میں ہے۔

شہریار نے فیصلہ کر لیا کہ اسی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونا بہتر ہے۔ اس نے اپنی پشت پر ٹنگے بیگ سے جدید ساخت کی چھوٹے سائز پر مشتمل لوہا کاٹنے والی آری نکالی اور کام شروع کر دیا۔ آری بہت بہترین تھی۔ اس نے تیزی سے گرل کو کاٹ کر رکھ دیا اور اندر جانے کے لیے راستہ بن گیا۔ اس دوران کلام اور سلّو عمارت کے گرد چکر لگانے کے بعد لوٹ کر واپس آ چکے تھے۔

''تم یہیں رُکو، ہم دونوں اندر جاتے ہیں۔'' شہریار نے کلام کو ہدایت کی۔ اس کے ذہن میں یہ خدشہ موجود تھا کہ یہاں حفاظت کے جدید انتظامات موجود تھے۔ اس کے باوجود اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فائرنگ نے بھی کسی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا تو یہ ایک غیر فطری سی بات تھی۔ وہ خود کو یہ تسلی دے کر بھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کہ اندر موجود تمام افراد بے ہوش پڑے ہوں گے۔ جیسے باہر موجود سکیورٹی گارڈز میں سے ہر ایک پر بے ہوشی کی دوا یکساں طور پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی، اسی طرح اندر بھی کچھ افراد کو اثر ضرور ہوش میں ہونا چاہئے تھا۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے گرل کاٹ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کے نتیجے میں عمارت کے کسی حصے میں الارم ضرور بجا ہوگا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ کوئی ٹریپ بھی تو ہو سکتا تھا کہ محض اُنگلی کی جنبش سے وہاں میدانِ جنگ سجا ڈالتے۔ عمارت میں کئی مقامات پر ایسی خودکار گنز نصب کی گئی تھیں جنہیں یہاں بیٹھے باآسانی آپریٹ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے ہوئے ہونے کے باعث ایسا کچھ نہیں ہو سکا تھا۔

اندر داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے بستر کی طرف رُخ کیا تھا اور تھوڑی سی چادر ہٹا کر خوابیدہ وجود کا جائزہ لیا۔ ارجن کا اپنی حفاظت کے لیے کیا گیا یہ انتظام اب ان کے کام آ رہا تھا۔ وہ سولہ سترہ سال کی کم سن لڑکی تھی جو بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ دوا کے اثر میں شہریار نے انگلیوں کی معمولی جنبش سے پوری عمارت کو کھنگال ڈالا۔ انہیں ملنے والے لڑکے، لڑکی کے علاوہ انہیں ایک بیڈروم میں سوئے ہوئے ارجن اور اس کی بیوی دکھائی دیئے۔ دیگر مقامات پر موجود لوگ بھی سوئے ہوئے تھے۔ اپنی وضع قطع سے وہ لوگ ارجن کے ملازمین محسوس ہو رہے تھے۔ انہیں حاصل دیا گیا تھا کہ حالات بگڑنے کی صورت میں وہ کچھ کر سکے۔

سلّو نے بنا رعایت ان دونوں کو ناکارہ بنایا جبکہ شہریار ''کی پیڈ'' سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے مانیٹر پر جائزہ لیا۔ وہ سولہ سترہ سال کی کم سن لڑکی تھی جو بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ دوا کے زیر اثر ہے پھر بھی اس نے احتیاطاً اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کوئی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ دونوں پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے کمرے سے باہر نکلے۔ ان کے لدھ معلومات کے مطابق بھی وہاں ارجن کے بیوی بچوں کے علاوہ صرف ملازمین ہی موجود ہوتے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر ایسے زاویے سے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے کہ اگر کوئی اُنہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کرے تو بیک وقت دونوں کو نہ پھانس سکے۔ لیکن ان کے خدشات کے برعکس ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کوریڈور میں موجود بیشتر کمرے خالی تھے۔ صرف ایک کمرے میں انہیں بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا سوتا ہوا ملا جو یقیناً ارجن کا بیٹا تھا۔ انہوں نے اس لڑکے کے ساتھ لڑکی والا ہی سلوک کیا اور مزید آگے بڑھے۔ اس طویل کوریڈور میں انہیں مزید کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا اور وہ گھومتے ہوئے عمارت کے دوسرے حصے میں داخل ہو گئے۔

اس عمارت میں گھومتے ہوئے شہریار کو اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی وسعت کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ بھائی جی کے گرگوں کو بھی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان پر سو فیصد بھروسہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ادھر بھارت میں پہلے سے کام کرتے کلام کے ساتھیوں کو کال کرنا بھی اس لیے مناسب نہیں تھا کہ کہیں وہ لوگ بھی کسی کی نظر میں آ جائیں۔ چنانچہ اُنہیں رسک لینا پڑا تھا۔



راؤنڈ لیتے ہوئے وہ جدید سہولیات سے آراستہ بڑے سے کچن میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک عورت ساڑھی میں ملبوس کچن ٹیبل پر سر ٹکائے دنیا جہاں سے بے خبر سو رہی تھی۔ عورت کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور اس کی مانگ میں سیندور لگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کچن کی انچارج سریتا تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پیر باندھنے کی زحمت نہیں کی بلکہ ریوالور کے دستے سے کنپٹی پر لگائی گئی ایک جچی تلی ضرب نے یہ اطمینان دلا دیا کہ وہ اب کئی گھنٹے جاگنے کے لائق نہیں رہی ہے۔

کچن سے نکل کر وہ ایک ایسے کمرے میں جا پہنچے جس نے انہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عمارت کا کنٹرول روم تھا اور وہاں نصب اسکرینز پر عمارت کے اندرونی و بیرونی بہت سے حصوں کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ وہ خود کھڑکی کے قریب کھڑے کلام کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ اتنے زبردست انتظام کے بعد کسی کو بے خبری میں نشانہ بنا لینا کیا مشکل تھا۔ لیکن ان کی خوش قسمتی رہی تھی کہ کنٹرول روم میں موجود دونوں افراد بھی دوا کے زیر اثر تھے۔ ان میں سے ایک کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سو رہا تھا تو دوسرے نے کمپیوٹر ٹیبل پر ماتھا ٹکا رکھا تھا۔

دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے وہ اس کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کنٹرول پینل کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں اندازہ ہوا کہ یہاں سے محض نگرانی کا کام نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ دونوں افراد جدید آلات کی بدولت حصے میں الارم ضرور بجا ہوگا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ کوئی ٹریپ بھی تو ہو سکتا تھا کہ محض اُنگلی کی جنبش سے وہاں میدانِ جنگ سجا ڈالتے۔ عمارت میں کئی مقامات پر ایسی خودکار گنز نصب کی گئی تھیں جنہیں یہاں بیٹھے باآسانی آپریٹ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے ہوئے ہونے کے باعث ایسا کچھ نہیں ہو سکا تھا۔

سلّو نے بنا رعایت ان دونوں کو ناکارہ بنایا جبکہ شہریار ''کی پیڈ'' سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے مانیٹر پر اپنی انگلی کی جنبش سے اسکرین پر تیزی سے بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھتا شہریار ایک کمرے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہاں بستر پر کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک مخنی سا آدمی پانی میں شرابور سٹپٹایا ہوا بیٹھا تھا جبکہ بستر کے قریب ایک موٹی تازی سی عورت دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کی بالٹی پکڑے کھڑی مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مرد کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نیند سے جاگنے کے بعد بدحواس ہے اور کوشش کے باوجود عورت کی بات نہیں سمجھ پا رہا ہے جس کی وجہ سے عورت کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور مہین سی نائٹی میں مشکل سے سمائے بھاری جسم کی بوٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

''تم ارجن اور اس کی بیوی کا بندوبست کر کے آؤ، میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔'' سلّو کو ہدایت دیتا ہوا وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ جس کمرے میں اس نے اس مرد و عورت کو دیکھا تھا، وہ دوسری منزل پر واقع

تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچنے کے بعد وہ وہیں رک کر اندر کی سُن گُن لینے لگا۔

''تُو کیا کہہ رہی ہے بھاگوان! میری بُدھی میں کچھ نہیں آ رہا۔'' اندر سے مرد کی آواز سنائی دی جو اس کے وجود کی طرح ہی مخنی سی تھی۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے فائرنگ کی آواز سنی ہے۔'' عورت کی پاٹ دار آواز میں جھنجلاہٹ کا عنصر بھی موجود تھا۔ شاید وہ یہ بات کئی بار شوہر کے گوش گزار کر چکی تھی لیکن اس کا نیند میں ڈوبا ہوا ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔

''ڈاکو آ گئے ہیں تو تمہیں اور مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے بھائی کے اس محل میں سارا بندوبست ہے۔ ڈاکو بے چارے آ کر خود ہی پھنس جائیں گے۔'' مرد نے جواب دیا اور ساتھ ہی زوردار جمائی بھی لی۔

''تم تو نے احمق ہی رہنا۔ میں کہتی ہوں، اس گولڈن چانس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ بھابی اپنے گہنے کہاں رکھتی ہیں۔ میں وہ گہنے نکال کر اپنے سامان میں چھپا لیتی ہوں۔ بعد میں سب یہی سمجھیں گے کہ گہنے ڈاکو لے گئے ہیں۔'' وہ ارجن کی بہن تھی، سو اس کی طرح چالباز کیوں نہ ہوتی۔ موقع ملتے ہی اپنی سگی بھابی کو بھی لوٹنے کا منصوبہ بنانے لگی تھی۔

''کیا بولتی ہے بھاگوان؟..... ادھر تو سانس بھی لو تو تیرے بھائی کو خبر ہو جاتی ہے اور تُو چلی ہے اپنی بھاوج کے گہنے چرانے۔'' مرد کا لہجہ سہما ہوا تھا۔ اسے ارجن جیسے سالے سے ڈرنا ہی چاہئے تھا۔

''میری بات سنو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ میں گولیوں کی آواز سن کر جاگی ہوں اور حیران ہوں کہ ابھی تک کسی نے کچھ کیا کیوں نہیں۔ سارے نوکروں چاکروں اور گارڈز کے علاوہ بھیا اور بھابی بھی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ خود تمہیں میں نے بڑی مشکل سے جگایا ہے۔ بالکل ایسا لگتا ہے کسی نے سارے کے ساروں کو نیند کی دوا کھلا کر سلا دیا ہے اور اب یہاں کوئی بڑی گھٹنا ہونے والی ہے۔'' موٹی واقعی بہت ہوشیار تھی اور حالات کا ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر رہی تھی۔

''نیند تو مجھے بھی بہت آ رہی ہے۔ لیکن تُو بتا کہ تُو کیوں باقی سب کی طرح سوئی نہیں اور میرا دماغ کھا رہی ہے۔ جا تجھے جو کرنا ہے، آپ کر لے اور مجھے سونے دے۔'' مرد اتنا بھی دبو نہیں تھا، جتنا مانیٹر اسکرین دیکھ کر اپنی صحت اور حلیے کے باعث اسے محسوس ہوا تھا۔

''تم تو سدا ڈرتے ہی رہنا۔ تمہاری یہ کاہلی اور بزدلی ہی ہے جس کے کارن ہم آج تک وہیں کے وہیں ہیں اور ترقی نہیں کر سکے۔'' میاں کا فیصلہ سننے کے بعد عورت اپنی پاٹ دار آواز میں بڑبڑائی اور آواز دور سے یوں محسوس ہوا کہ وہ باہر آنے کو ہی ہے۔ شہریار نے اب مزید وہیں رکے رہنا مناسب نہیں سمجھا اور تیزی سے حرکت کرتا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

عورت نے جو اسلحہ تھامے ایک نقاب پوش کو اپنے سامنے دیکھا تو چیخنے کے لیے پورا منہ کھول دیا لیکن اس کے حلق سے چیخ برآمد ہونے سے قبل ہی شہریار نے پسٹل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی۔

''آواز نکالی تو جان سے جاؤ گی۔'' ساتھ ہی وہ دھیمی آواز میں غرایا۔ لیکن بہرحال اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ جانے والا مرد اُٹھ بیٹھا اور خوف زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو میں پوچھوں، شرافت سے



بتاتے جاؤ۔'' اُس کے سختی سے کہنے پر عورت نے جلدی سے یوں سر کو جنبش دی جیسے اپنے تعاون کا یقین دلانا چاہتی ہو۔ شہریار نے پسٹل کی نال اس کے منہ سے نکالی اور وہ ہانپتی ہوئی بستر پر گر گئی۔

''اسے پانی پلاؤ۔'' سرہانے رکھے جگ گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے اس کے شوہر کو حکم دیا۔ کیونکہ عورت کی جیسی حالت ہو رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''آ گیا (اجازت) دو تو میں ریفریجریٹر سے کولڈ ڈرنک نکال لیتا ہوں۔ یہ یہاں آ کر پانی پینا پسند نہیں کرتی اور اس کی جگہ صرف کولڈ ڈرنک اور جوس پیتی ہے۔''

مرد نے عاجزی سے درخواست کی تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ عورت کیوں جاگ رہی تھی۔ اس نے کمرے سے وہ پانی پیا ہی نہیں تھا جس میں انہوں نے خواب آور دوا ملائی تھی۔

''تم دونوں کون ہو اور یہاں کب آئے ہو؟'' مرد کو ریفریجریٹر سے کولڈ ڈرنک نکالنے کی اجازت دیتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''میں پرکاش ہوں..... ارجن کا جیجا (بہنوئی) اور یہ اس کی دیدی سیتا ہے۔ ہم آج رات ہی سورت سے یہاں پہنچے ہیں اور ہمارا یہاں ایک ہفتہ ٹھہرنے کا پروگرام ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کس لیے آئے ہو؟''

''بس یونہی، سیتا کا جب عیش کرنے کو من کرتا ہے تو وہ مجھے یہاں گھسیٹ لاتی ہے۔ میرے پاس اس کے بھائی جتنی دولت جو نہیں ہے۔'' وہ کچھ اُداس سا بتانے لگا۔

''او کے، تم دونوں بستر سے اُٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' اسے ان دونوں سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور سخت لہجے میں حکم سنایا۔

''تم ہمیں گولی تو نہیں مارو گے نا؟'' کچھ دیر قبل مکارانہ منصوبہ بندی کرتی سیتا نے بھیگی بلی جیسے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا اور پسٹل لہراتے ہوئے اشارہ کیا کہ فوری اس کے حکم کی تعمیل کی جائے۔

دونوں میاں بیوی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اپنی جگہ سے حرکت کر کے دیوار تک پہنچ گئے اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

شہریار نے ان کی پشت پر جا کر پہلے مرد کے سر پر دستے سے ضرب لگائی۔ وہ فوراً ہی تیورا کر گرا۔ سیتا اپنے پتی کو گرتے دیکھ کر بے ساختہ پلٹی۔ اس وقت شہریار اسے ضرب لگانے کے لیے ہاتھ کو حرکت میں لا چکا تھا۔ چنانچہ سر کے بجائے چہرے پر ضرب لگی اور اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تکلیف کے باعث اس نے زوردار چیخ ماری۔ لیکن اس دوران شہریار کا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آ چکا تھا۔ اس بار ضرب کنپٹی پر پڑی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی۔

''تم کہاں ہو؟'' اُس نے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سلّو کو پکارا۔ مشن کے دوران ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کے لیے وہ ایک جدید قسم کا آلہ استعمال کر رہے تھے۔ باقی سامان کی طرح یہ بھی انہیں بھائی جی کی طرف سے ہی فراہم کیا گیا تھا۔

''کنٹرول روم میں۔ میں نے ارجن اور اس کی بیوی کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں اور باقی عمارت بھی

چیک کر لی ہے۔ اب یہاں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' سلو نے فوراً جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم وہیں رہو اور ہر طرف نظر رکھو۔ میں یہاں ارجن سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ کلام! تم میرے پاس آ جاؤ۔ اور ہاں، آتے ہوئے ارجن کی بیٹی کو بھی لے آنا۔'' اس نے بیک وقت اپنے دونوں ساتھیوں کو ہدایات دیں اور خود ارجن کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

خواب گاہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی کسی دولت میں کھیلتے ہوئے آدمی کی ہونی چاہئے۔ وسیع و عریض بیڈ پر اس کے پہلو میں سوئی ہوئی بیوی بھی بے حد خوب صورت تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ قسمت کی دیوی ارجن پر مہربان رہی تھی کہ اس امیر زادی کا دل اس پر آ گیا تھا جس نے اس کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ لیکن اس کی قسمت ایک اور کھیل کھیلنے والی تھی جس میں ارجن کے حصے میں کامیابی آنے کا امکان بہت کم تھا۔

وہ آگے بڑھا تو فوراً ہی اس کی نظر میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی خواب آور گولیوں کی شیشی آ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی ایسی غفلت بھری نیند کی کہ وہ اپنے ہاتھ پیر باندھنے کے عمل کے دوران بھی نہیں جاگ سکا تھا، کیا وجہ تھی۔ اس بے چارے نے تو انجانے میں ڈبل ڈوز لے لی تھی۔ ایک طرف وہ دن بھر ایسا پانی پی رہا تھا جس میں خواب آور دوا ملی ہوئی تھی اور دوسری طرف اس نے اپنے ہاتھوں سے سلیپنگ پلز لے لی تھیں۔ شاید وہ ان کا عادی تھا اور روزانہ سونے سے پہلے یہ گولیاں ضرور کھاتا تھا۔ اس کا ثبوت آدھی سے زیادہ خالی ہو جانے والی شیشی تھی۔ ارجن کے تکیے کے نیچے سے جھانکتا ہوا پسٹل بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود اپنے تکیے کے نیچے پسٹل رکھ کر سونے کی عادت اس کے سیکرٹ ایجنٹ ہونے کا ثبوت تھی۔

شہریار کے اندازے کے باوجود وہ ایک ایسا آدمی ہوگا جو اپنے سائے سے بھی بھڑک جاتا ہوگا۔ اب لوگ سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل بھی ہوتے ہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی ارجن کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن پہلے تو اسے ہوش میں لانا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر باہر نکالا اور ارجن کے رخسار پر ایک چرکا لگا دیا۔ نتیجے میں اس نے ایک سسکاری لی اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے شہریار نے اس کے دوسرے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ عین اسی وقت کلام، ارجن کی بیٹی کو کندھے پر ڈالے کمرے میں داخل ہوا۔

''کک..... کون ہو تم؟'' ارجن نے آنکھیں کھول کر اپنے بیڈ روم کا منظر دیکھا اور لکنت زدہ آواز میں پوچھنے لگا۔

''موت کے فرشتے۔'' شہریار نے اتنے سرد لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا کہ کلام کو اس کا ساتھی ہونے کے باوجود اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' اب ارجن نے خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا اور نظریں گھما کر اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نظر بیٹی پر پڑی تو بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔

''سویٹی کو یہاں کیوں لائے ہو؟'' تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرتے ہوئے اس نے بہ مشکل پوچھا۔

''تاکہ سویٹی کے سویٹ سے ڈیڈی کو ہمارے سوال کا جواب دینے کے لیے زیادہ سوچنا نہ پڑے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا پھر ہاتھ میں پکڑا خنجر کلام کی طرف اُچھال کر اس سے بولا۔

''یہ پکڑو، میرے سوال پوچھنے کے بعد اگر ارجن نے فوری جواب نہیں دیا تو ہر پانچ سیکنڈ بعد اس



کی ایک انگلی کاٹ دینا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔''

''اوکے باس!'' کلام کے لیے ایک بے گناہ لڑکی پر ایسا تشدد کرنا بہت مشکل تھا لیکن شہریار جس موڈ میں نظر آ رہا تھا، اسے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ادھر ارجن بھی بلبلا اٹھا۔

''تم اس نردوش (بے گناہ) بچی پر ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔'' بندھا ہوا ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

''ظلم ہم نہیں، تم کرو گے۔ ہمارے پوچھے گئے سوال کا جواب نہ دے کر۔'' شہریار نے اسی سرد مہری سے جواب دیا۔

''پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟ لیکن اسے کچھ مت کہنا۔''

''ڈاکٹر فرحان جمیل کو کہاں رکھا گیا ہے؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ چونک گیا۔

''اوہ..... تو تم وہ پاکستانی ایجنٹ ہو جو اس چکر میں پریم ناتھ کو بھی ٹارچر کا نشانہ بنا چکے ہو۔''

''پانچ سیکنڈ بہت جلدی گزر جاتے ہیں ارجن!'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

''خبردار! تم میری بیٹی کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔'' وہ نفرت زدہ لہجے میں چلایا۔

''پانچ سیکنڈ پورے ہو گئے ہیں۔'' اس کے چیخنے پر دھیان دیئے بغیر وہ سپاٹ لہجے میں بولا اور کلام کو اشارہ کیا۔ جس نے قدرے جھجکتے ہوئے لڑکی کی بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی پر خنجر چلا دیا۔ زخم لگنے سے اس کا جسم بری طرح پھڑکا۔ اس کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آئی، بس نیند میں ہی کراہتی رہی۔ کلام کی بیوی بھی ابھی تک نیند میں ہی تھی لیکن اس کی پلکوں کی جنبش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے میں جاری کارروائی اسے ڈسٹرب کر رہی ہے اور اب وہ کسی بھی لمحے آنکھیں کھول سکتی ہے۔

''یہ کیا کر رہے ہو ایڈیٹ!..... تمہیں مجھ سے اپنے سوالوں کے جواب چاہئیں تو مجھے ٹارچر کرو۔ اس معصوم کو کیوں نشانہ بنا رہے ہو؟'' بیٹی کی انگلی کٹتے دیکھ کر وہ چلانے لگا۔

''کیوں کا جواب بہت واضح ہے ارجن! تم نے پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کو بم بلاسٹ اور ٹارگٹ کلنگ کے احکامات دیتے ہوئے کبھی سوچا ہے کہ تمہارے اس ظالمانہ اقدام سے کتنی معصوم جانیں ضائع ہو جائیں گی، کتنے لوگ اپنے اعضاء سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور کس کس گھر کا چولہا بجھ جائے گا۔'' اس نے جذباتی انداز میں اسے جواب دیا اور کلام کی طرف مڑ کر اسے ایک اور اُنگلی اُڑا دینے کا اشارہ کیا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس بار لڑکی کا جسم پہلے سے زیادہ بری طرح پھڑکا لیکن ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی۔ اس کے برعکس اس کی ماں نے آنکھیں کھول دیں۔

''تم بچ کر نہیں جا سکو گے۔ ہماری دھرتی پر قدم رکھ کر تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ یہاں سے تمہاری لاشیں بھی واپس پاکستان نہیں جائیں گی۔'' ارجن کسی پنجرے میں بند درندے کی طرح دھاڑنے لگا۔

''پانچ سیکنڈ پورے ہو گئے ہیں تمہاری اس بکواس میں۔'' اس کی دھمکیوں کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے سابقہ انداز میں اسے مطلع کیا جس پر اس کے چہرے کا خون بالکل ہی نچڑ گیا۔

''پلیز..... پلیز میری بچی پر یہ ظلم نہیں کرو۔ یہ تو پہلے ہی مُردوں سے بدتر حالت میں جی رہی ہے۔ تم

اور مار کر کیا کرو گے؟''

ہوش میں آ کر ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوئی ارجن کی بیوی نے اچانک ہی دخل اندازی کرتے ہوئے لجاجت سے درخواست کی۔

''کیا مطلب؟'' اس کے جملوں نے شہریار کو چونکا دیا اور وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھا۔

''یہ کوکین کا نشہ کرتی ہے اور اس نشے نے اسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا علاج ہو جائے لیکن یہ ہمارے ساتھ کوآپریٹ ہی نہیں کرتی۔ آج بھی اس نے پیپر ویٹ مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے اسے کوکین نہیں دی تو اپنی گردن میں شیشہ مار کر اپنی جان لے لے گی۔ مجبوری میں ہمیں اپنے ہاتھ سے اسے یہ زہر دینا پڑا۔'' تفصیل بتا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہریار اس انکشاف پر اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ لوگوں میں موت بانٹتے پھرنے والے ارجن کے اپنے گھر میں موت نے اس طرح پنجے گاڑ دیئے تھے کہ اس کی اکلوتی بیٹی کے جسم سے قطرہ قطرہ کر کے زندگی نچوڑ رہی تھی اور وہ بے بس تھا۔ شاید اپنی اسی بے بسی کی وجہ سے اسے سونے کے لیے نیند کی گولیوں کی مدد لینی پڑتی تھی۔

''فرسٹ ایڈ باکس کہاں ہے؟'' وہ انسان تھا۔ خود پر کتنی ہی درندگی طاری کرنے کی کوشش کرتا، اپنے اندر کی انسانیت کو نہیں پچھاڑ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اسے سیکنڈوں کی گنتی بھول گئی تھی۔

''وہ اس الماری میں۔ سب سے نیچے والے خانے میں۔'' مسز ارجن نے سسکتے ہوئے بتایا۔

''اس کی بینڈیج کر دو۔'' اس نے کلام کو حکم دیا۔ وہ تو جیسے منتظر ہی تھا۔ فوراً فرسٹ ایڈ باکس نکال کر بے ہوش لڑکی کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

بے ہوشی کی دوا کے علاوہ یہ اس کی رگوں میں دوڑتے کوکین کے نشے کا زہر بھی تھا جو وہ ایک بے پناہ اذیت ناک تجربے سے گزرنے کے باوجود ہوش میں نہیں آ سکی تھی۔

''اب تم کیا بولتے ہو؟ تمہارے کسی لائق نہ ہونے کے باوجود ہم نے تمہیں رعایت اور مہلت دونوں دے دی ہیں۔ لیکن اب بھی اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو ہمارا اگلا نشانہ تمہارا بیٹا ہوگا اور اس بار میں اُنگلیاں کٹوانے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ سیدھے سیدھے ہر پانچ سیکنڈ بعد اس کا ایک ایک عضو کٹ جائے گا۔'' کلام اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو وہ دم بخود پڑے ارجن سے مخاطب ہوا۔

''یہ تم سے کیا پوچھ رہے ہیں ارجن!..... انہیں بتا دو۔ میں اپنی نظروں کے سامنے اس طرح اپنے بچوں کو کٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔'' اس کی بیوی روتے ہوئے زور سے چیخ کر بولی۔

''یہ مجھ سے دیش کا ایک اہم راز جاننا چاہتے ہیں۔'' ارجن نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔

''تو بتا دو۔ تم کون سے دیش بھگت ہو۔ لاکھوں کا ٹیکس کھا جاتے ہو، لوگوں کو بے وقوف بناتے ہوا موقع ملنے پر بلیک میلنگ سے لے کر منی لانڈرنگ تک سب کچھ کر گزرتے ہو تو پھر ایک راز بتانے میں مسئلہ ہے؟''

اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ارجن کی دیوانگی تھی اور اپنی دیوانی محبت میں اس نے اس کی حیثیت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے باپ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سے کئی گنا نیچے خاندان سے تعلق رکھنے والے ارجن کو اپنے اکلوتے داماد کے طور پر قبول کر لے۔

بیاہ کے بعد بھی اس نے اپنا تن من دھن پتی پر نچھاور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور سب سیا



سفید کا مالک اسے بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت معاملہ اس کی اولاد کا تھا چنانچہ وہ ایک وفادار پتنی سے زیادہ ماں دکھائی دے رہی تھی جس کی دیوانگی اپنی اولاد کی بقا کے سوا کچھ نہیں چاہتی تھی۔

''لڑکے کو یہاں لے آؤ۔'' بیوی کی باتیں سن کر ارجن کے چہرے کی رنگت یوں بھی تیزی سے بدل رہی تھی۔ شہریار نے کلام کی طرف رخ کر کے یہ حکم صادر کیا تو اس کا چہرہ بالکل ہی زرد پڑ گیا۔

''ٹھہرو، میں بتاتا ہوں۔'' کلام ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے بے بس انداز میں اسے پکارا۔

''اسے گاندھی نگر کے ایک ہسپتال میں رکھا گیا ہے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے اس لیے اس کا ہسپتال میں رہنا ضروری ہے۔'' ارجن کے بتانے پر اس کا دماغ چکرا سا گیا۔ قدرت کتنی بار انہیں گاندھی نگر لے جا چکی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ ان کا گوہر مقصود وہاں موجود ہے۔ ڈاکٹر فرحان ہمیل کی تلاش میں بھٹکتے اگر آج وہ ارجن تک نہیں پہنچتے تو کبھی خیال بھی نہیں آ پاتا کہ ہر بار گھوم پھر کر گاندھی نگر ہی کیوں جا پہنچتے ہیں۔ ان لمحات میں جہاں اسے ڈاکٹر فرحان کا پتہ مل جانے کی خوشی ہو رہی تھی، وہیں ان کی حالت ٹھیک نہ ہونے کا سن کر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ بھارتیوں کی تحویل میں انہیں اتنی شدید ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئی ہوں گی کہ ان کا حلیہ ہی بدل کر رہ گیا ہوگا۔ اس نے تصویر میں ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تھا اور بلاشبہ وہ اچھی شخصیت کے مالک ایک ایسے انسان تھے جن کے چہرے سے ہی ان کی ذہانت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ایسے شاندار شخص کی بری حالت کا سن کر اس کا دل و دماغ غصے سے بھر گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو اس حال تک پہنچانے میں جن لوگوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا، ان میں سے ایک ارجن اگروال بھی تھا اور اس کے لیے وہ اپنے دل میں جان بخشی کی کوئی گنجائش نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ کچھ سوچتا ہوا مسز ارجن کی طرف پلٹا اور بولا۔

''مسز ارجن! آپ کی جیولری کہاں ہے؟ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

اُس کے اس مطالبے پر وہ بنا کسی احتجاج کے خودکار انداز میں اُٹھی اور ایک دیوار پر لگی پینٹنگ کی طرف قدم بڑھائے۔ پینٹنگ میں جنگل کے ماحول میں ایک شیر کو ہرن پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مسز ارجن نے پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر شیر اور ہرن پر ایک ایک ہاتھ جمایا اور ہاتھوں کو یوں حرکت دی جیسے ہرن کو شیر کی گرفت سے چھڑا رہی ہو۔ دفعتہً ایک کھٹکا سا ہوا اور فریم اس طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا کہ شیر ایک طرف اور ہرن دوسری طرف۔

درمیان میں پیدا ہونے والے خلا میں نمبروں والی ایک تجوری نظر آ رہی تھی۔ مسز ارجن اگروال نے نمبر ملا کر وہ تجوری کھولی تو ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ تجوری زیورات اور نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ یعنی کچھ دیر قبل مسز اگروال نے اپنے شوہر پر منی لانڈرنگ کا جو الزام لگایا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔

''یہ سب ایک بیگ میں ڈال کر ہمارے حوالے کر دو۔''

فوری فیصلہ کرتے ہوئے شہریار نے اسے حکم دیا۔ یہ مال ارجن نے محنت سے زیادہ چار سو بیسی کے بل بوتے پر کمایا تھا چنانچہ اگر وہ اسے ''را'' کی چار سو بیسی کا جواب دینے کے لیے خرچ کر ڈالتے تو کوئی حرج بھی نہیں ہوتا۔

ارجن کی پتنی نے اس حکم کی بھی تعمیل کی جبکہ وہ خود بستر پر پڑا بے بسی سے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کی

بیوی کو تو ان لوگوں نے اپنے مقصد کے لیے بندشوں سے آزاد کر دیا تھا جبکہ وہ اب تک بندھا پڑا تھا۔ دواؤں کے اثر کے باعث جسم ویسے ہی سست پڑا ہوا تھا ورنہ شاید وہ ان بندشوں سے آزاد ہونے کی کوئی ترکیب لڑا بھی لیتا۔ ابھی تو کھلی آنکھوں سے تماشا دیکھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

''پولیس کو اس واردات کی رپورٹ لکھواتے ہوئے تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تمہارے گھر میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے جنہوں نے تمہارا سارا زیور اور پیسہ لوٹ لیا۔ زیور کے لیے افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اسے ساتھ نہ لے جاتے تو تمہاری سگی نند نے اسے چرا لینا تھا۔ اور ہاں..... پولیس کو بھی یہ بتانا کہ مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں نے تمہارے شوہر مسٹر ارجن اگروال کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔'' یہ کہتے ہی اس نے پسٹل کا رخ ارجن کی طرف کر کے اسے گولی مار دی۔ گولی اس کے سینے میں بائیں جانب گھسی اور اس کے جسم نے ایک زوردار جھٹکا لیا۔ اس کی بیوی یہ منظر دیکھ کر اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ چیخنا بھول گئی۔

''سوری مسز اگروال! یہ شخص میرے وطن کا دشمن تھا اس لیے میں اسے کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ میرا بتایا ہوا بیان دے کر خود کو اور اپنے بچوں کو پریشانی سے بچا لیتی ہیں یا سچ بول کر اپنے لیے مزید مصیبتیں کھڑی کرتی ہیں۔''

پسٹل جیب میں رکھ کر وہ ارجن کی طرف بڑھا اور اسے بندشوں سے آزاد کرنے لگا۔ اب وہ شخص انہیں یا کسی دوسرے کو ضرر پہنچانے کے لائق نہیں تھا۔

کلام کے ساتھ کمرے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اسے مسز ارجن کی پہلی سسکی سنائی دی جسے سن کر اسے دکھ بھی محسوس ہوا لیکن اس نے اس کیفیت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ لوگوں میں موت بانٹنے والے ارجن کی وجہ سے کتنی سہاگنوں کو بیوہ ہو کر ماتم کرنا پڑا تھا چنانچہ اگر آج اس کی بیوی اس کی لاش پر بیٹھی بین کر رہی تھی تو اسے مکافاتِ عمل کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''میں نے یہاں کی لینڈ لائن کاٹ دی ہے۔ ارجن اور اس کی بیوی کے موبائل پہلے ہی میرے قبضے میں ہیں اس لیے اس کی بیوی کے لیے فوری طور پر پولیس سے رابطہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔''

وہ کنٹرول روم کے سامنے سے گزرے تو سلّو بھی ان سے آملا اور اپنا کارنامہ سنایا جس پر شہریار کی سمجھ میں آیا کہ اسے ارجن اور اس کی بیوی کے پاس موبائل فون کیوں نظر نہیں آئے تھے ورنہ عموماً لوگ اپنے سیل فون کو سوتے وقت اپنے قریب ہی رکھ کر سونا پسند کرتے ہیں۔

''آپ لوگ جلدی سے باہر آ جائیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ گاڑیاں خاموشی سے ارجن ولا کو گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

ابھی وہ پوری طرح اطمینان کا سانس بھی نہیں لے سکے تھے کہ بھائی جی کی طرف سے مہیا کیے گئے ڈرائیور نے اطلاع دی۔ اسے وہ اپنے فرار کے لیے باہر ہی چھوڑ کر آئے تھے۔

''اوکے، ہم آ رہے ہیں۔ تم ریڈی رہو۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔ ساتھ ہی ان تینوں کے قدم تیز ہو گئے۔ واپسی کے لیے انہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا، جس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ ارجن کی بیٹی کے کمرے کی کھڑکی کا ٹوٹا شیشہ یقیناً اُس کی اس دیوانگی کی نشانی تھا جو کوکین نہ ملنے کی صورت میں اس پر طاری ہو جاتی ہوگی۔ اس پہلے سے ٹوٹے ہوئے شیشے کی وجہ سے ہی یقیناً وہاں کا سکیورٹی الارم بھی کام نہیں کر رہا تھا اور ان کا کام مزید آسان ہو گیا تھا۔ لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے جو اچانک ہی وہاں نمودار ہو گئے تھے اور ظاہر ہے ان کے فرار کی راہ بھی روکنے والے تھے۔



شاید یہ اس فائرنگ کا ردِعمل تھا جو اندر گھستے وقت انہیں کرنا پڑی تھی۔ لیکن یہ کچھ لیٹ ردِعمل تھا جس کی یہی توجیہہ ہو سکتی تھی کہ پاکستان کی طرح بھارتی پولیس بھی شکایت کے ردِعمل میں متحرک ہونے میں خاصا وقت لیتی تھی۔

''اس طرف کوئی نظر نہیں آ رہا۔'' وہ جس طرف سے خاردار برقی تار کاٹ کر اندر داخل ہوئے تھے، اسی جانب دیوار پر چڑھ کر سلّو نے جائزہ لیا اور سرگوشی میں اطلاع دی۔

''تمہیں مشکوک گاڑیاں کس طرف نظر آ رہی ہیں اختر؟'' اس نے ڈرائیور کو آہستہ سے مخاطب کر کے سوال کیا۔

''وہ لوگ فرنٹ اور بیک پر ہیں۔ آپ لوگ اگر سائیڈ سے آ جائیں تو بچ سکتے ہیں۔ میں گاڑی کچھ فاصلے پر لے گیا ہوں تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکوں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''اوکے، ہم آ رہے ہیں۔'' اس نے ڈرائیور کو جواب دیا اور اشارے سے سلّو کو نیچے اُترنے کو کہا۔ وہ جس طرف سے یہاں داخل ہوئے تھے، وہ دیوار اس جگہ کے مخالف سمت میں تھی جہاں ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ چنانچہ سلّو کے نیچے اُترنے کے بعد انہوں نے دوسری دیوار کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں موجود خاردار تاروں کو کاٹ کر دوسری طرف کودنے کے عمل میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی جس کی سزا انہیں کلام کے دائیں پیر میں اُترنے والی گولی کی صورت میں بھگتنی پڑی۔ گولی کی وجہ سے کلام کے لیے خود بھاگ کر فاصلہ طے کرنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ اسے اور سلّو کو کلام کو سہارا دینا پڑا۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ ان کے لیے حملہ آوروں کی نظر میں آئے بغیر بھاگ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ گولیوں کی ایک پوری باڑ ان کے تعاقب میں آئی اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چند انچ کے فاصلے سے بچ گئے تھے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سے نکل گئی تھیں۔

''لیٹ جاؤ۔'' شہریار زور سے چیخا اور وہ دونوں کلام کو ساتھ لیتے ہوئے نیچے لیٹ گئے۔ ایک بار پھر ان کی قسمت نے یاوری کی اور گولیاں ان کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔

''تم کلام کو لے کر آگے نکلو۔ میں ان سے نمٹتا ہوں۔'' حملہ آوروں کو روکے بغیر فرار ممکن نہیں ہے، اس بات کو سمجھ لینے کے بعد شہریار نے سلّو کو حکم دیا اور خود وہیں رک کر اپنی پشت پر بندھے بیگ سے اپنے مطلب کی چیز نکالنے لگا۔ اس دوران خود کو مسلح ظاہر کرنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ سے گولیاں چلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولیاں دشمن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔ لیکن کچھ تو کرنا ہی تھا۔

ابھی اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ بیگ میں موجود جدید ساخت کی رائفل کے ٹکڑوں کو نکال کر جوڑتا اور دوسرے کو منہ توڑ جواب دے پاتا اس لیے بیگ میں موجود اسموک بم نکالا اور اس طرح اچھال دیا کہ دشمن اور اس کے درمیان دھوئیں کی ایک چادر سی تن گئی۔

اس نے فوری طور پر اپنی پوزیشن تبدیل کی اور رائفل کے ٹکڑے نکال کر اسے جوڑنے کے بعد اندازے سے ایک برسٹ مارا۔ جدید رائفل کا یہ برسٹ اس بات کا اعلان تھا کہ مقابل انہیں خود سے کمتر نہ سمجھے۔ برسٹ مارنے کے بعد وہ رُکے بغیر آگے کی طرف بھاگا۔ فوراً ہی اُس سلّو اور کلام نظر آ گئے۔ کلام کی زخمی ٹانگ کی وجہ سے ان کے بھاگنے کی رفتار بہت کم تھی۔

''میں اسے سہارا دیتا ہوں۔ تم اپنی رائفل نکال لو۔'' اس نے قریب پہنچ کر سلّو کو حکم دیا تو وہ فوراً عمل پیرا ہو گیا۔ ایسے موقعوں پر اس کی پھرتی دیکھنے والی ہوتی تھی اور وہ یوں چاق و چوبند نظر آنے لگتا تھا جیسے موت

سے لڑنے نہیں، کرکٹ میچ کھیلنے گراؤنڈ میں اُتر رہا ہو۔

ادھر شہریار کچھ تشویش کا شکار تھا۔ اپنے ذاتی بیگ کے علاوہ اس نے وہ زیورات اور نوٹوں سے بھرا بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ پھر کلام کو سہارا بھی دینا تھا۔

''میری رائفل بھی نکال دیں۔ بھاگ نہ سکا تو کم سے کم دو چار کو تو مار سکوں گا۔'' اس موقع پر کلام نے اس سے فرمائش کی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑا اور پھر اس کی فرمائش مان لی۔ اُس کے کان ان گاڑیوں کی غراہٹیں سن رہے تھے جو دھوئیں کی چادر سے گزر کر ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان گاڑیوں سے مسلسل فائرنگ بھی کی جا رہی تھی جس کا جواب سلّو اپنی رائفل سے دے رہا تھا۔ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ نقصان دونوں طرف سے کسی کا نہیں ہو رہا تھا۔

''میں نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا ہے۔ اگر آپ دس قدم اور آگے بڑھ آئیں تو میں آپ تک گاڑی لے آؤں گا۔'' نہایت مخدوش حالت میں ڈرائیور کی آواز ان کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا گئی۔

وہ دیوانہ وار بھاگے۔ اس بار سلّو انہیں کور دے رہا تھا اور اس مہارت سے فائرنگ کر رہا تھا کہ ایک اکیلا ہی دس کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ اگر بھارتی جان لیتے کہ یہ وہی سلّو ہے جسے انہوں نے پاکستان کی تباہی کے لیے بڑی محنت سے تیار کیا تھا تو اپنا سر پیٹ لیتے۔

رائفل کو بے تحاشا استعمال کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہینڈ گرینیڈ نکال کر دانتوں سے اس کی پن کھینچے کے بعد اس سمت اچھال دیا جہاں سے دشمن کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دھوئیں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

ہینڈ گرینیڈ گرا تو گویا وہاں قیامت ہی قیامت برپا ہو گئی۔ سب سے آگے آنے والی گاڑی براہِ راست اس کی زد میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا گولہ بن گئی۔ اس کے پیچھے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور بروقت بریک لگانے میں ناکام رہا اور وہ گاڑی بھی جلتی ہوئی گاڑی میں گھس گئی۔

افراتفری کے اس عالم میں کس کو ہوش رہتا کہ ان کا پیچھا کرے۔ وہ لوگ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔

سلّو کے لیے یہ موقع مناسب تھا۔ وہ تیزی سے شہریار اور کلام کے پیچھے بھاگا اور فوراً ہی ان سے جا ملا۔ بھائی جی کا ڈرائیور اپنے کہے کے مطابق وہاں ان کا منتظر تھا۔

کلام کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے کے بعد وہ دونوں بھی تیزی سے سوار ہو گئے اور ڈرائیور نے برق رفتاری سے گاڑی دوڑا دی۔ سیدھا مین روڈ پر جانے کے بجائے وہ ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا انتخاب کر رہا تھا اور ان کے اندازے کے مطابق جائے حادثہ سے دور نکلتا چلا گیا۔

پوش علاقہ ہونے کی وجہ سے وہاں گلیاں اور راستے کشادہ تھے اس لیے ڈرائیور کو کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے ان چوہے کے سے کمزور دل رکھنے والوں میں سے کسی کے اندر حوصلہ نہیں تھا کہ باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لے۔ ان لوگوں سے زیادہ سے زیادہ یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلیٰ عہدے داران کی نیندیں فون کر کر کے حرام کر دیں اور ان سے پوچھیں کہ ایسے پوش علاقے میں کوئی ہنگامہ برپا ہوا تو کیونکر.....؟

ادھر شہریار اور سلّو چلتی گاڑی میں کلام کی ٹانگ کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ گولی اُس کی پنڈلی



کا گوشت پھاڑتی ہوئی ہڈی میں گھس گئی تھی اور وہ شدید تکلیف کے علاوہ مستقل خون بہتے رہنے کے باعث کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی میں جلتے بلب کی محدود روشنی میں وہ اس کا زرد پڑتا ہوا چہرہ دیکھ سکتے تھے لیکن حقیقی طبی امداد دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ آلاتِ جراحی اور مستند ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو کسی ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد ہی میسر آ سکتا تھا۔ فی الحال انہوں نے صرف اتنا کیا کہ اس کے زخم سے خون کا بہاؤ کم سے کم کرنے کے لیے اس کے اوپر مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔

''اسے یہ جوس پلائیں۔ کمزوری کم ہو گی۔'' ڈرائیور نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جوس کا ایک ڈبہ ان کی طرف بڑھایا جسے شہریار نے تھام لیا۔ یہ سرخ انگوروں کا جوس تھا۔ شہریار نے اس میں اسٹرا ڈال کر کلام کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بے چارہ زخمی ٹانگ کے ساتھ کافی بھاگ دوڑ کر چکا تھا اور اب اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

''آنکھیں کھولو کلام!..... یہ جوس پیو۔'' شہریار نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میری ہمت نہیں۔'' اس نے ٹوٹتے لہجے میں بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''بی بریو کلام! ہم مشکل سے نکل آئے ہیں، بس جیسے ہی کسی ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تمہارا علاج شروع ہو جائے گا لیکن اس وقت تک تمہیں خود کو سنبھالنا ہو گا۔ لو یہ جوس پیو تاکہ تمہاری توانائی بحال ہوتی رہے۔'' شہریار نے اسے سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر زبردستی اسٹرا اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

اس بار اس نے ایک گھونٹ بھر لیا۔ باقی کا راستہ بھی شہریار نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ سلّو البتہ خاموش بیٹھا تھا اور گاہے بگاہے شہریار کے چہرے پر ایک نظر ڈال لیتا تھا جو نہ جانے کیوں اس کی طرف سے بالکل بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن تو جانے کب کے پیچھے رہ گئے تھے اور ڈرائیور بھی گلیاں چھوڑ کر گاڑی مین روڈ پر لا چکا تھا۔ ہر بڑے شہر کی طرح رات گئے بھی جاگتے رہنے والے ممبئی کی سڑکوں پر کون تھا جو خاص ان کی گاڑی کی طرف توجہ دے پاتا۔ چنانچہ وہ بہ خیریت اپنے ٹھکانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں عبدالرحمٰن ان کا منتظر تھا۔ اسے کلام کو گولی لگنے کی خبر ڈرائیور راستے میں دے چکا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ لوگ وہاں پہنچے، وہ آدمی اسٹریچر لیے گاڑی کی طرف لپکے اور کلام کو تیزی سے گاڑی سے اسٹریچر پر منتقل کیا گیا۔

''تمہارا بلڈ گروپ کیا ہے؟'' سفید کوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے کلام سے سوال کیا۔

''بی پازیٹو۔'' اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''گڈ..... اس گروپ کا بلڈ ہمارے کلیکشن میں موجود ہے۔'' ادھیڑ عمر شخص نے مسرت کا اظہار کیا لیکن وہ باقاعدہ کسی سے مخاطب نہیں تھا اور اس کی توجہ پوری طرح کلام پر ہی تھی۔ شہریار اور سلّو بھی خودکار انداز میں اس کے اسٹریچر کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے۔

''آپ لوگ یہیں رُکیں۔ ڈاکٹر صاحب کام کے دوران کسی کی موجودگی کو پسند نہیں کرتے۔'' اسٹریچر والوں کے ایک ایسے حصے میں پہنچا جہاں اس سے قبل کبھی ان کا جانا نہیں ہوا تھا تو اسٹریچر اٹھانے والوں میں سے ایک نے سختی سے کہتے ہوئے انہیں روک دیا۔

اس کی بات سن کر ان دونوں نے ہی اپنے قدم روک لئے۔ یہ کوئی غیر اصولی بات نہیں تھی کہ ڈاکٹر تسلی

اور اطمینان سے کام کرنے کے لیے غیر متعلقہ لوگوں کے داخلے کو ناپسند کرتا تھا۔ اتنا نازک کام کرنے والوں کو یکسوئی کے لیے اس کی ضرورت بھی تھی۔ روک دیئے جانے کے بعد وہ دونوں پلٹ کر اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں اب تک ان کا زیادہ اُٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ عبدالرحمٰن پہلے سے وہاں موجود تھا اور اس نے ٹی وی آن کر رکھا تھا۔

''آؤ بھئی، تم لوگ تو بڑا کمال دکھا کر آئے ہو۔ ممبئی کی پولیس ہل کر رہ گئی ہے۔ ایک تو ارجن اگروال کے گھر ڈکیتی اور قتل و غارت ہوئی ہے، دوسری طرف پورے نو پولیس والے مارے گئے ہیں۔ زخمی بھی بہت ہوئے ہیں۔ پولیس نے پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور مشکوک افراد کی گرفتاری کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کمال دیکھو کہ تم لوگ شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے بعد کتنی آسانی سے صحیح سلامت یہاں پہنچ گئے ہو۔'' اس نے کھلے دل سے ان کی کارکردگی کو سراہا۔

''ہمارا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا ہے۔'' نہایت سنجیدگی سے کہتے ہوئے شہریار نے گویا اسے یاد دلایا۔

''اس کی فکر مت کرو دوست! وہ دو چار دن میں چنگا بھلا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر دیپک اپنے کام میں بڑا ماہر ہے۔ یہ آس پاس گھومتے اپنے پلّے دیکھ رہے ہو نا۔ ان میں سے ہر ایک کئی کئی بار زخمی ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ یہ سالے آئے دن کسی نہ کسی لفڑے میں پڑ کر یہاں پہنچتے ہیں اور ڈاکٹر دیپک ان کا علاج کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ جسم کے ہر حصے سے گولی نکالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس واسطے تمہیں اپنے ساتھی کے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسے ریپیئر کروا کر ہی تمہارے حوالے کریں گے۔'' عبدالرحمٰن کا انداز اگرچہ غیر سنجیدہ تھا لیکن اس نے معلومات ایسی فراہم کی تھیں کہ انہیں تسلی ہو گئی تھی۔

''یہ بولو کہ مشن میں کامیاب لوٹے ہو یا نہیں؟..... خبروں میں تو بتا رہے ہیں کہ ارجن کے سینے میں گولی ماری گئی ہے اور اس کی حالت بہت نازک ہے۔'' گفتگو جاری رکھتے ہوئے عبدل نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

''اوہ..... وہ گندگی کی پوٹ ابھی تک زندہ ہے۔'' ارجن کے زندہ ہونے کا سن کر اسے افسوس ہوا۔

''زندہ ہے لیکن ہوش میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں دلا رہے ہیں۔'' میڈیا کی تیز رفتاری کی وجہ سے بغیر کسی کوشش کے بھی اہم خبریں ان تک پہنچ رہی تھیں۔

اسی وقت ٹیلی ویژن پر ارجن کی بیوی کا بیان دکھایا جانے لگا۔ صدمے سے اس کی بری حالت تھی اور وہ اٹک اٹک کر بتا رہی تھی کہ ان کے گھر میں چند ڈاکو زبردستی گھس آئے تھے جنہوں نے اس کی بیٹی کو تشدد کا نشانہ بنا کر ان سے سارے زیورات اور روپیہ لوٹ لیا اور مزاحمت پر ارجن کو گولی مار دی۔

اُس کے اس مختصر بیان کے ساتھ ہی اس کی بیٹی کا زخمی ہاتھ اور ارجن کو ہسپتال منتقل کیے جانے کے مناظر بھی دکھائے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی نیوز اینکر کا رواں تبصرہ بھی جاری تھا جو اس سفاکانہ عمل کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کر رہا تھا کہ ڈکیتی کی اس واردات کے پیچھے اصل کہانی کچھ اور ہے۔ کیونکہ عام ڈاکوؤں کے لیے کسی طور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ارجن وِلا کے حفاظتی سسٹم کو شکست دے کر اندر تک رسائی حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی کیمروں کا ریکارڈ بھی غائب کر دیں۔ سلّو کے انجام دیئے گئے کارنامے کے سبب وہاں ایک کام اور ہوا تھا۔ پولیس والوں کے زبردستی وہاں گھسنے کی کوشش میں مختلف مقامات پر نصب خودکار گنیں برس پڑی تھیں اور کئی پولیس اہلکار گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔

اینکر کے مطابق کسی عام ڈاکو میں اتنی ذہانت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس پیچیدہ سسٹم کو سمجھ کر آپریٹ کر سکے



اور سرے ڈاکوؤں کو ضرورت بھی نہیں تھی کہ پولیس اہلکاروں کو نشانہ بناتے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی تخریب کار یا دہشت گرد ہی کر سکتے تھے۔ اپنے اس نقطہ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اینکر پرسن نے ہینڈ گرینیڈ سے پولیس کی گاڑیوں کو تباہ کرنے کے واقعے کی بھی مثال پیش کی تھی۔

اُس کے مطابق کسی پڑوسی کی طرف سے ارجن وِلا میں فائرنگ کی آواز سنے جانے کی شکایت پر وہاں پہنچنے والی پولیس کی گاڑیوں کو فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں نے ہینڈ گرینیڈ سے نشانہ بنایا تھا۔ یعنی آنے والے اتنی تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ کسی صورت انہیں روکا جانا ممکن نہیں تھا۔

اینکر پرسن نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا کوئی عام ڈاکو اس طرح دستی بموں کا استعمال کر سکتا ہے؟ اینکر پرسن کی عادت و تربیت کے مطابق اس کی طرف سے مسلسل بولنے اور سوالات و قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ شہریار نے ایک نظر سلّو کی طرف دیکھا اور اس ایک نظر میں وہ سمجھ گیا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ ہینڈ گرینیڈ کے استعمال نے ہر ایک کو چونکا دیا تھا حالانکہ ان کے درمیان یہ بات پہلے سے طے ہو گئی تھی کہ انتہائی ناگزیر حالات کے علاوہ اس کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

''تم لوگوں نے تو خاصی تھرتھری مچا کر رکھ دی ہے۔ ایک تو ارجن اگروال کے گھر پر حملہ کیا، اوپر سے اتنے پولیس والوں کو لمبا لٹا دیا۔ اوپر سے نیچے تک سب ہل کر رہ گئے ہوں گے۔'' عبدالرحمٰن نے لطف لینے والے انداز میں انہیں داد دی پھر خیال آنے پر پوچھنے لگا۔

''ارجن کے گھر سے کتنا مال ہاتھ لگا؟ خبروں میں تو بتا رہے تھے کہ ڈاکو لاکھوں کا زیور اور نقدی ساتھ لے گئے ہیں۔''

''خبروں میں غلط بتا رہے ہیں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا تم نے وہاں سے کچھ نہیں لوٹا؟''

''لوٹا ہے۔ لیکن اس کی مالیت لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ہو گی۔'' اس نے بھرا ہوا بیگ عبدل کے سامنے اُلٹ دیا جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ طلائی زیورات میں سے بیشتر زیورات ایسے تھے جن میں مختلف اقسام کے قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سونا چھوڑ کر صرف اس ہیروں کو ہی بیچا جاتا تو بہت بڑی رقم حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ رقم بھی انڈین کرنسی میں نہیں، ڈالرز کی شکل میں تھی جنہیں دیکھ کر عبدالرحمٰن کی آنکھیں پھٹنا بجا تھا۔

شہریار نے یہ سب کچھ اس نیت سے حاصل کیا تھا کہ ارجن کی حرام کی کمائی بھارتی چال بازوں کی چالوں کا جواب دینے کے لیے استعمال کرے گا لیکن وہ یہ سب کچھ عبدالرحمٰن سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ان کے پاس ایک زائد بیگ موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس سونے اور ہیروں کو اپنے طور پر مارکیٹ میں بیچ کر رقم حاصل کر سکتے۔ ایسی کسی کوشش میں وہ مشکل میں بھی پڑ سکتے تھے۔ اس لیے بہتر تھا کہ ان لوگوں پر ہی بھروسا کر لیا جائے۔ لوٹ کا یہ مال ان سے لٹ بھی جاتا تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ جو چیز جیسے آتی ہے، ویسے چلی بھی جاتی ہے۔ خود کو بے نیاز ظاہر کرتا وہ خاموشی سے عبدالرحمٰن کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسی وقت کمرے میں موجود انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ عبدالرحمٰن نے فوراً ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سنجیدگی سے سننے لگا۔ بات سن کر اس نے خاموشی سے ریسیور واپس رکھ دیا اور رُوئے سخن ان دونوں کی طرف کیا۔

''ڈاکٹر دیپک بات کر رہا تھا۔ اس کے مطابق تمہارے ساتھی کی ٹانگ سے گولی نکال لی گئی ہے۔ لیکن

گولی نے اس کی ہڈی کو اتنی بری طرح متاثر کیا ہے کہ وہ اب چلا بھی تو لنگڑا کر چلے گا۔ اس کی ٹانگ پہلے کی طرح نہیں ہو سکے گی۔"

یہ خبر شہریار کے لیے گہرا صدمہ ثابت ہوئی اور بے ساختہ اس کی نظر دولت کے اس ڈھیر پر پڑی جسے لٹا کر بھی وہ کلام کو اس کی اصل صحت مند ٹانگ واپس نہیں دلا سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اتنی گہری نیند کہ دیکھنے والے کو یہی گمان گزرے کہ اب صبح ہی کی خبر لائے گی۔ لیکن یکدم ہی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کی نیند ٹوٹنے کا سبب ایک پکار تھی۔

"ماہ بانو.....!"

کسی نے بہت زور سے اسے پکارا تھا۔ اور وہ اس پکار کا جواب دینے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔ لیکن اِدھر اُدھر دیکھتی جب نیند کے خمار سے نکلی تو احساس ہوا کہ ان مضبوط دیواروں کو پار کر کے نہ تو کوئی آواز اس تک آ سکتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی آواز کو کسی تک پہنچا سکتی ہے۔ اس نے جو سنا اور جو دیکھا، سب ایک خواب تھا۔ نیند میں اسے پکارنے والا اسلم تھا جو جنگل کی وسعت اور پیچیدگیوں سے بے نیاز اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا اور دیوانہ وار اسے پکار رہا تھا۔ وہ بھی اس کی پکار کا جواب دینا چاہتی تھی لیکن حلق سے آواز برآمد ہونے سے قبل ہی حقیقت کے خارزاروں میں کھینچ لی گئی جہاں اسلم کے خود تک پہنچنے کا گمان بھی نہیں تھا۔

حقیقتاً وہ خود بھی ڈھنگ سے نہیں جانتی تھی کہ کہاں اور کیوں ہے۔ اسے یہاں پہنچانے کا ذمے دار شخص بھی دوبارہ اس سے نہیں ملا تھا اور وہ اجنبیوں کے سامنے سر پٹختی رہتی تھی کہ اسے یہاں سے جانے دیا جائے۔ لیکن وہ تو گویا گونگے بہرے تھے جو نہ تو اس کی کوئی بات سنتے تھے اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتے تھے۔

یہاں اس کی زندگی اس چھوٹے سے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کمرے میں زندگی کی تمام بنیادی سہولتیں موجود تھیں اور بظاہر اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا لیکن اس کے لیے یہی اذیت بہت تھی کہ اسے اس کے گھر اور شوہر سے دور اس تنہائی میں لا پھینکا گیا ہے جہاں وہ کسی اپنے سے بات کرنے اور اس کی صورت دیکھنے کے لیے بھی ترستی ہے۔

یہاں رہ کر اسے اپنے ہونے والے بچے کی بھی فکر لگی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ لوگ اس کا بھرپور خیال رکھ رہے تھے اور ڈاکٹر کی طرف سے تجویز کردہ دواؤں کے ساتھ ساتھ شیڈول کے مطابق بہترین خوراک بھی مہیا کی جاتی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل انجانے خدشوں سے لرزتا رہتا تھا۔

یہاں لائے جانے کے بعد اس کے مختلف قسم کے ٹیسٹ بھی لیے گئے تھے اور الٹرا ساؤنڈ بھی ہوا تھا لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ کون خدائی فوجدار ہیں جو اسے ایک نارمل زندگی سے نکال کر یہاں لے آئے ہیں اور خود اس کی صحت اور دیکھ بھال کے ٹھیکیدار بن بیٹھے ہیں۔ یہاں جن چہروں سے اس کا سامنا ہو رہا تھا، وہ سب کے سب اس کے لیے نا آشنا تھے۔ البتہ اسے یہاں تک پہنچانے کا ذمے دار شخص اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس شخص کا نام تھا ڈاکٹر طارق۔

ڈاکٹر طارق وہ شخص تھا جس سے اس کی کراچی میں قیام کے دوران ملاقات ہوئی تھی۔ شہریار نے اسے مہرین کے نام سے کراچی کے جس کالج میں داخلہ دلوایا تھا، وہاں اس کی راحیلہ نامی ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی تھی اور وہ راحیلہ کے اصرار پر کبھی کبھار اس کے گھر بھی جانے لگی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات اس کے بھائی



ڈاکٹر طارق سے ہوئی تھی۔ وہ پڑھائی کے سلسلے میں ان دونوں کی مدد کر دیا کرتا تھا اور ماہ بانو کے نزدیک ایک اچھا انسان تھا۔ لیکن اس اچھے انسان نے اپنی اصلیت اس وقت دکھائی جب اسے ایک اتفاق کی وجہ سے اس بات کا علم ہوا کہ ماہ بانو پنجاب کے ایک وڈیرے سے اپنی جان اور عزت بچاتی پھر رہی ہے۔ اس موقع پر اس نے نہایت کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے چودھری کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی اور وہ کالج کے ہاسٹل سے سوتے میں اٹھا لی گئی۔

اس واقعے کے بعد اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا اور اسے ایک بار پھر تعلیم حاصل کر کے کسی اچھے مقام تک پہنچنے کے خواب سے دستبردار ہونا پڑا۔ اللہ کی مہربانی سے اسے اسلم جیسے چاہنے والے شخص کا ساتھ مل گیا اور وہ لوگ شہریار کے تعاون سے آرلینڈ وشفٹ ہو کر ایک خاصی مطمئن زندگی گزارنے لگے۔ لیکن یہاں بھی بدقسمتی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اس روز جب معائنے کے لیے اسے کلینک پر چھوڑ کر بلقیس خود شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی، وہ جلد فارغ ہونے کے سبب کسٹرڈ کی ڈریسنگ اور سلاد میں شامل کیے جانے والے کچھ سامان خریدنے کی نیت سے قریبی اسٹور تک چلی گئی۔ اتفاق سے اسے وہاں چکر آ گیا اور اس سے قبل کہ وہ چکرا کر گرتی، کسی نے اسے تھام لیا۔ حالت سنبھلنے پر اس نے اپنے محسن کو دیکھا تو ڈاکٹر طارق کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس نے خود بھی اسے پہچان لیا اور اس سے قبل کہ وہ اس سے منہ موڑ کر چل پڑتی، بڑی لجاجت سے اپنی صفائی بیان کرنے کا ایک موقع دینے کی درخواست کر کے قریبی ریسٹورنٹ تک چلنے کی فرمائش کی۔

وہ شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ کرتی لیکن وہ اتنی عاجزی اور لجاجت سے بول رہا تھا کہ اس کا دل پسیج گیا اور وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ تک جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ وہاں انہوں نے کافی پی اور طارق اس سے معافی مانگتا رہا کہ اس نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ اس کے بقول اسے امریکہ آ کر اسپیشلائزیشن کرنے کا جنون تھا لیکن وسائل کی کمی کے باعث وہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا ایسے میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ چودھری کو ماہ بانو کا پتہ بتانے کی صورت میں اسے بھاری رقم مل سکتی ہے تو اس کا ایمان ڈگمگا گیا۔ ماہ بانو نے اسے خوب باتیں سنائیں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ ایک بے یار و مددگار لڑکی کی زندگی سے کھیلنے سے بھی نہیں کترایا تو آگے کیا خاک دُکھی انسانیت کی خدمت کرے گا۔

طارق نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کی ہر بات سنی اور شرمندگی کا اظہار کرتا رہا کہ وقتی طور پر اس پر شیطان غالب آ گیا تھا لیکن اب وہ اپنے اس عمل پر بہت پچھتاتا ہے اور کفارے کے طور پر تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس جا کر غریب ہم وطنوں کی خدمت کرنے کا عزم رکھتا ہے۔

مروّت اور خلوص سے گندھی ماہ بانو نے اس کی معذرت کو قبول کر لیا اور اسی سبب ایک بار پھر اس پر اعتماد کرنے کی غلطی کر بیٹھی۔ چنانچہ ڈاکٹر طارق کی کلینک تک ڈراپ کرنے کی آفر ردّ نہ کر سکی۔ ریسٹورنٹ سے کلینک دُور بھی کہاں تھا۔ وہ پیدل بھی آرام سے جا سکتی تھی لیکن کچھ اس ڈر سے بھی اس کی پیشکش قبول کر لی کہ کہیں راستے میں ایک بار پھر چکر نہ آ جائیں۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر کلینک تک کا مختصر راستہ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی اور جب وہ دوبارہ جاگی تو اس کمرے میں موجود تھی۔ اس نے بہت شور مچایا، روئی پیٹی، چیخی چلائی کہ اسے یہاں سے جانے دیا جائے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہاں تک کہ اس کی طارق سے ملاقات کی خواہش تک پوری نہیں کی گئی۔

تھک ہار کر اس نے رونا دھونا چھوڑ دیا اور کھانا اور دوائیں باقاعدگی سے لینے لگی کیونکہ دوسری صورت میں اس کے بچے کے لیے خطرات پیدا ہو جاتے۔

اس موقع پر جانے کیوں اُسے بلتستان کے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ میں ملنے والا لڑکا عمران بہت یاد آیا۔ اس لڑکے نے ہی اسے یہ سبق سکھایا تھا کہ کبھی بھی زندگی کی مشکلوں سے ہارنا نہیں ہے اور ہر لمحے جیتے رہنے کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ زندگی کی جنگ جیتنے والا قدرت کی طرف سے کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ عمران خود تو ایک ایوالانچ کی زد میں آ کر اپنی جان کھو بیٹھا تھا لیکن اس کے دیئے ہوئے حوصلے کے سہارے وہ ان برف زاروں سے صحیح سلامت نکل آنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس نئی مصیبت سے بھی بچ نکلے گی۔ لیکن فی الحال کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کمرے کی قیدی تھی اور قید کرنے والے کبھی اس کے قفس کا دروازہ باہر سے بند کرنا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ اس نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن آزادی کی خواہش تو دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ یہی خواہش شاید خواب بن کر اس کی آنکھوں میں آ سمائی تھی اور اب وہ یہ ادراک ہو جانے کے بعد کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا محض خواب تھا، نڈھال سی بستر پر لیٹی تھی۔

''اسلم!..... کہاں ہو تم؟ دیکھو میں اور تمہارا بچہ کس مشکل میں پھنسے ہیں۔ تم آ کر ہمیں اس مشکل سے نکالتے کیوں نہیں ہو؟'' تکیے پر سر رکھے وہ آنکھیں موند کر لیٹی تو خود بہ خود ہی ہونٹوں سے شکوہ اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ روتے روتے اس کی آنکھوں میں ایک شبیہہ اور لہرائی۔

''اور آپ..... آپ تو مجھے یہاں بھیج کر بالکل بے فکر ہو گئے ہیں۔ کبھی پلٹ کر حال تک نہیں پوچھا کہ ماہ بانو جیتی بھی ہے یا نہیں۔'' شہریار کی شبیہہ سے لڑتے ہوئے اس کے آنسو کچھ اور بھی شدت سے رواں ہو گئے تھے اور وہ اردگرد سے اس حد تک غافل ہو گئی تھی کہ یہ بھی نہ جان سکی کہ کوئی آہستہ سے دروازہ کھول کر دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا ہے اور بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا ہے۔

آنے والے نے دھیرے دھیرے اس کے جسم کو سہلانا شروع کر دیا اور ہاتھ کو حرکت دیتا ہوا اس کے رخسار تک لایا تو وہ بے خودی کی کیفیت سے نکلی اور بدک کر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

وہ جب سے یہاں لائی گئی تھی، کسی نے اس کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ مختلف ضروریات کے لیے اس کے کمرے میں آنے والے مردوں میں سے کسی نے اسے بے باک نظروں یا بے ہودہ گفتگو تک کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ وہ سب نہایت مشینی انداز میں کام کرتے تھے اور کسی روبوٹ کی طرح اسے وقت پر کھانا، پھل، مشروبات اور ادویات پہنچا کر خاموشی سے پلٹ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی ٹیسٹ کے لیے اپنا بلڈ لینے والے شخص کے لمس کو بھی اس نے سرد پایا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے جسم پر متحرک لمس بے جان نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جھٹکے سے اُٹھتے ہوئے اس نے کوئی گٹھڑی سی بستر سے لڑھک کر نیچے گرتی ہوئی محسوس کی اور فوراً ہی دھب کی آواز بھی سنائی دے گئی۔ کمرے کے فرش پر قالین نہیں بچھا ہوا تھا اس لیے ''دھب'' کی یہ آواز کافی زوردار تھی۔

اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور سوئچ بورڈ کے قریب پہنچ کر لائٹ کا بٹن دبایا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں نیم تاریک محسوس ہونے والا کمرہ یک دم روشن ہو گیا لیکن وہ کسی کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

بستر کے دوسری طرف گرنے والی گٹھڑی نما شے ابھی تک اسی جگہ پڑی ہوئی تھی اور وہ اسے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی تھی جب تک کہ خود گھوم کر اس طرف نہیں جاتی۔



زندگی میں پل پل بدلتے حالات نے اسے فیصل آباد میں بے بے اور ابا کے ساتھ رہنے والی کمزور اور بے بس ماہ بانو نہیں رہنے دیا تھا۔ ماضی کے مقابلے میں وہ بہت مضبوط اور جرأت مند ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی گھوم کر بستر کے دوسری طرف گئی۔

وہاں ایک حیرت انگیز منظر اس کا منتظر تھا۔ نیلی نیکر اور سفید ٹی شرٹ میں وہ کوئی سات آٹھ سال کا بچہ تھا جو اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کا بیشتر حصہ بھی گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا اور وہ بس اس کی سہمی ہوئی نیلی چمک دار آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی۔

سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے اس بچے نے حقیقتاً اسے ششدر کر دیا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی جو اپنے تجربے اور قدرتی حِس کے تحت جسم پر محسوس ہونے والے لمس کی زبان سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لیکن ایک تقریباً پانچ سالہ بچے کو سامنے دیکھ کر اپنا احساس خود اس کے لیے ایک سوال بن گیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' آخر اس نے بچے سے بات چیت کر کے اس معمے کو حل کرنے کا فیصلہ کیا اور قدرے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ایڈی۔'' اُس کی طرف سے نہایت مختصر جواب آیا۔ لیکن ماہ بانو ایک بار پھر چونک گئی۔ دیکھنے میں وہ چار پانچ سال کے محسوس ہونے والے بچے کی آواز بالکل کسی سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کی طرح قدرے بھاری اور بوجھل تھی۔

''یہاں کیسے آئے ہو؟'' اسے خود ہی اپنی حیرت دور کرنے کا انتظام کرنا تھا اس لیے سوال جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

''میں یہیں رہتا ہوں، بیرک نمبر تین میں۔'' اس بار اس کی زبان سے ادا ہونے والے مکمل جملے نے اس کی آواز کو بہت وضاحت کے ساتھ ماہ بانو کے کانوں تک پہنچایا۔

''یہاں میرے کمرے میں کیوں آئے ہو؟'' لاشعوری طور پر اس کا لہجہ کچھ اور بھی سخت ہو گیا جس پر اس نے ایڈی کی آنکھوں کو کچھ اور سہما ہوا محسوس کیا۔

''تم جس دن یہاں آئی تھیں، اس دن میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تم وہیل چیئر پر تھیں اور سو رہی تھیں پھر بھی مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا، میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ آج گارک میرے بیرک کو لاک کرنا بھول گیا تو مجھے موقع مل گیا اور میں تمہارے پاس آ گیا۔''

اس نے جوانوں والی آواز میں بچگانہ معصومیت سے بتایا تو ماہ بانو عجیب اُلجھن میں مبتلا ہو گئی۔ ایڈی کی صورت میں اس کے سامنے بہت عجیب و غریب کردار آ گیا تھا جس کے متعلق اپنے احساسات کو وہ کوئی واضح نام نہیں دے پا رہی تھی۔ نیم تاریکی میں اپنے جسم پر محسوس ہونے والا لمس، ایڈی کی بھاری آواز، سہمی ہوئی آنکھیں اور معصومانہ اندازِ گفتگو اسے کسی ایک حتمی نتیجے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

''سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'' یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ اس کا مقابل جسمانی طور پر اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے، وہ خوف زدہ نہیں رہی تھی۔ بس حیرت ہی حیرت تھی جسے دور کرنے کا انتظام کر رہی تھی۔ ایڈی کو رعب دار آواز میں دیا جانے والا حکم بھی اسی مقصد سے تھا۔

اس کی طرف سے حکم ملنے پر وہ ذرا سا جھجکا تو ضرور لیکن حکم عدولی نہیں کی اور گھٹنوں کے بل لپٹے بازو کھول کر آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ اب ماہ بانو اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھی اور دیکھ کر حیرت سے ساکت تھی۔

تقریباً تین فٹ قد رکھنے والے ایڈی کی ٹھوڑی پر سنہری بالوں والی چھوٹی سی داڑھی لہرا رہی تھی اور

ہونٹوں کے اوپر بھی سنہری رُواں تھا۔ اتنی دیر سے وہ اپنا چہرہ کچھ اس انداز میں گھٹنوں میں چھپا کر بیٹھا ہوا
کہ وہ اس کی صرف آنکھیں ہی دیکھ پا رہی تھی اور وہ آنکھیں سو فیصدی ایک بچے کی آنکھیں تھیں لیکن کسی پا
سال کے بچے کی داڑھی مونچھیں تو نہیں ہو سکتی تھیں۔ کیا وہ کوئی ایسا بالغ نوجوان تھا جس کی جسمانی نشو
رُک گئی تھی؟..... اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا لیکن وہ خود کو اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دے سکی۔
چلتے اور ٹیلی ویژن پر اسے ایسے کئی پستہ قامت افراد کو دیکھنے کا موقع ملا تھا جن کی عمر کے ساتھ ساتھ جسما
نشو ونما نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن ان افراد کو غور سے دیکھنے پر ان کے چہروں سے ان کی اصل عمر کا اندازہ بہر حا
ہو جاتا تھا۔

یہاں ایڈی کا یہ حال تھا کہ اس کے معصوم چہرے کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ایک پانچ سالہ بچے نے ک
ڈرامے میں بڑے کا کردار نبھانے کے لیے اپنے چہرے پر داڑھی اور ہلکی سی مونچھیں چپکا لی ہیں۔

''اپنی داڑھی پکڑ کر کھینچو۔'' دل میں اُبھرنے والا شک دُور کرنے کے لیے اس نے ایڈی کو حکم دیا جس
تعمیل میں اس نے داڑھی کے سنہری بال اپنی ننھی ننھی اُنگلیوں میں جکڑ کر زور سے کھینچ ڈالے۔ لیکن پھر
داڑھی اپنی جگہ پر موجود رہی۔

ماہ بانو نے داڑھی کھینچنے کے نتیجے میں اس کے چہرے پر پھیلنے والی تکلیف کی کیفیت کو بغور دیکھا تھا، ا
لیے داڑھی کے اصلی ہونے میں کسی شک و شبے میں مبتلا نہیں رہی تھی۔ لیکن اس حیرت کا کیا کرتی جو لحہ بہ
بڑھتی جا رہی تھی۔

''اب میں جاؤں؟'' اُس کے احکامات کی کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح تعمیل کرتے ہوئے ایڈی
معصومیت سے پوچھ کر اسے چونکا دیا۔

''نہیں، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے انگلی سے بیڈ کی طرف
اشارہ کیا تو ایڈی اچک کر وہاں بیٹھ گیا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ ماہ بانو کی دروازے کی طرف پشت تھی لیکن اس نے دروازے کا ک
اور ایڈی کے چہرے پر خوف کا چھا جانا محسوس کر لیا تھا۔

''مارک!'' وہ دھیمی آواز میں سہمے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

''ایڈی!..... شریر لڑکے!..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' آنے والے نے نہایت سخت لہجے میں ایڈ
سے دریافت کیا۔ اس دوران ماہ بانو بھی دروازے کی طرف گھوم چکی تھی لیکن وہ اس کے بجائے مکمل طور
ایڈی کی طرف متوجہ تھا۔

''سوری مارک! مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے میں ٹائم پاس کرنے یہاں آ گیا۔'' معصومیت
معذرت کرتا ہوا ایڈی واضح طور پر سہما ہوا تھا۔

''جھوٹ مت بولو بدمعاش!..... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تم
انتظار میں تھے کہ میں کس روز تمہارے بیرک کو لاک کرنا بھول جاتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو! اس بار تمہاری حرکت
کو ماسٹر معاف نہیں کرے گا اور تمہیں سزا بھگتنی ہوگی۔''

مارک، ماہ بانو کے قریب سے گزر کر بولتا ہوا ایڈی تک پہنچا اور اس کا دایاں کان پکڑ کر اسے بستر
نیچے اُتار دیا۔ اس کے لہجے اور گرفت کی سختی، ایڈی کا چہرہ خوف سے سفید کیے دے رہی تھی۔

''سوری میڈم! اس بدمعاش کی وجہ سے آپ کے آرام میں خلل پڑا۔ خوب صورت خواتین کو دیکھ کر



ی ہی حرکتیں کرتا ہے۔ لیکن آپ فکر مت کریں، آئندہ یہ آپ کو تنگ نہیں کر سکے گا۔ اب آپ اطمینان سے
ہ جائیے۔''

ایڈی کا کان پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے مارک نے ماہ بانو کے قریب رک کر اس سے
لہا اور پھر ایڈی کو لیے باہر نکل گیا۔

اس صورتِ حال پر حیران پریشان ماہ بانو گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن بری طرح
ھا ہوا تھا اور مارک کے الفاظ نے اسے مزید اُلجھا دیا تھا۔ ایڈی کے متعلق اس کے ریمارکس خاصے معنی خیز
ھے اور اس کا اپنا تجربہ بھی بڑا عجیب تھا۔ لیکن کون تھا جو اس کے سامنے اس معمے کا حل پیش کرتا؟

⊛----✪----⊛

''تم نے جس آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا، اپن نے حاصل کر لی ہے۔ وہ
تان سے آیا ہے۔ اس کا نام چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ بہت بڑا جاگیردار ہے اور اپنے علاقے میں پیر
ہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اشوک صاحب سے یہ اس کی پہلی ملاقات ہے اور جہاں تک اپن کو جانکاری حاصل
ی ہے، یہ بندہ کسی خاص سودے کے لیے بھارت آیا ہوا ہے۔ اپن کو سن گن ملی ہے کہ شاید یہ بندہ اشوک
اسلحہ لے کر پاکستان جانے والا ہے لیکن ابھی اس کی واپسی کی کوئی ڈیٹ پتہ نہیں چلی ہے۔ ابھی تو سالا
ی فلم نگری کی پریوں میں گھرا ہوا ہے اور اشوک کی میزبانی کے مزے اُڑا رہا ہے۔ مال کب اور کیسے جانے
ا ہے، اس کے بارے میں اپن کو کوئی جانکاری نہیں ملی ہے۔'' ارجن والے مشن سے واپسی کے بعد
ارالرحمٰن نے ایک بار پھر ناشتے پر ان سے ملاقات کی تھی اور اپنے ساتھ یہ معلومات لے کر آیا تھا۔

شہریار نے ارجن کی شناخت کے لیے دکھائی جانے والی ایک ویڈیو میں چودھری کو اشوک کے ساتھ
ھا تھا اور اسی وقت عبدالرحمٰن سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی فرمائش کی تھی۔ کیونکہ اتنا تو
جھتا تھا کہ مشکوک سرگرمیوں میں ملوث چودھری کا اشوک جیسے بدنام گینگسٹر کے ساتھ نظر آنا خالی از علت
ں ہو سکتا۔ وہ بھارت آیا تھا اور اشوک کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

چودھری کے ہیروئن کے کاروبار سے جڑے ہونے کے کچھ شواہد پہلے بھی ملے تھے لیکن چودھری نے
ہوشیاری سے خود کو اس معاملے سے الگ کر لیا تھا اور ان کے پاس اسے گرفتار کرنے کا کوئی قانونی جواز
ں رہا تھا۔ اس کے وہ سارے بندے بھی منظر سے غائب تھے جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ اُس کے
گھناؤنے کاروبار میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے وہ لوگ اس پر ہاتھ ڈالنے سے معذور رہے
۔ ڈاکٹر فرحان کی رہائی والا مشن سونپے جانے کے بعد اس کی توجہ چودھری کی طرف سے بالکل ہٹ گئی تھی
وہ یہاں بھارت میں مصروف ہو گیا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ چودھری خود بھارت پہنچ گیا تھا اور ایک بار
ں کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوئی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غدارِ وطن ہے۔ اور ظاہر
یسا شخص اس کے نزدیک ناقابلِ معافی تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ ڈاکٹر فرحان والا معاملہ بھی ایسے اسٹیج پر تھا
ن کے لیے تیزی سے اقدامات کرنا ضروری تھے ورنہ ڈاکٹر فرحان ان کے ہاتھوں سے نکل سکتا تھا۔

''ارجن کے بارے میں کیا خبر ہے؟..... وہ ہوش میں آ گیا ہے یا نہیں؟'' چودھری سے متعلق خبروں پر
تبصرہ کیے بغیر اس نے عبدالرحمٰن سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے گولی نکال لی ہے لیکن ابھی تک وہ ارجن کی زندگی کے بارے میں
آس نہیں دلا رہے ہیں۔''

''اور اس کی فیملی؟'' شہریار نے استفسار کیا۔

''اس کی بیٹی کو بھی علاج کے لیے ہسپتال میں رکھا گیا ہے۔ ماں زیادہ تر بیٹی کے ساتھ ہسپتال میں رہتی ہے اور کبھی کبھی گھر جاتی ہے جہاں اس کا بیٹا آج کل اپنے گاؤں سے آئی ہوئی بوا اور انکل کے ساتھ رہا ہے۔''

''ارجن کی بیوی کا کوئی نیا بیان تو سامنے نہیں آیا ہے؟'' اسے اس طرف سے تشویش تھی کہ کہیں ارجن کی بیوی یہ راز نہ اُگل دے کہ ان کے گھر رات کے اندھیرے میں گھسنے والے ڈاکو نہیں تھے اور ارجن سے کسی خاص بات کو جاننا چاہتے تھے۔ اس نے ارجن سے سوال جواب تو اس کی بیوی کی بے ہوشی کے دوران کیے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ اس سے ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن ارجن کے جواب بہرحال اس نے سنا تھا۔ اگر وہ ''را'' کے کسی اہلکار کے سامنے گاندھی نگر کا نام لے لیتی تو ان کے لیے جاننا ذرا مشکل نہیں رہتا کہ ڈاکوؤں کے روپ میں ارجن ولا میں گھسنے والے کون تھے اور ان کا کیا مقصد تھا۔

''نہیں، ابھی تک وہ اپنے بیان پر قائم ہے اور اس نے یہی بتایا ہے کہ آنے والے نقاب پوش ڈاکو جو بہت سا زیور اور نقد رقم لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ اس نے پولیس کے سامنے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کی بیٹی نشے کی عادی ہے اور اتفاق سے اس نے اسی روز نشے کی طلب سے پاگل ہو کر اپنے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ایک بھاری شوپیس مار کر توڑ دیا تھا جس کی وجہ سے ولا کا سکیورٹی الارم آف کرنا پڑا تھا۔ ورنہ ڈاکوؤں کے لیے اندر داخل ہونا آسان نہیں ہوتا۔''

عبدالرحمٰن نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا جو اپنی جگہ تسلی بخش تھیں لیکن وہ سمجھتا تھا کہ دماغ سے کام لینے والوں نے چاہے ارجن کی بیوی کے بیان کو غلط نہ سمجھا ہو لیکن یہ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ ڈکیتی کی رات میں کچھ اور ہوا ہے اور انہیں شدت سے اس بات کا انتظار ہو گا کہ ارجن ہوش میں آ جائے تو اس سے حقیقت معلوم ہو۔ اس دوران ممکن تھا کہ وہ اس کی بیوی کو دباؤ میں لے کر اصل بات جاننے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کر لیں۔

''ارجن کو ہوش آئے، اس سے پہلے ہی ہم اپنا کام مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تم ہمیں ہمارا اسلحہ اور دو چار اضافی ہینڈ گرینیڈ دے دو۔'' آخر کار حتمی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اس نے عبدالرحمٰن سے مطالبہ کیا۔

''اور بھائی جی کے کام کا کیا ہو گا؟''

''وہ کام ہم ڈاکٹر صاحب کی رہائی کے بعد کریں گے۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں عبدالرحمٰن کے سوال کا جواب دیا۔

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم اپنا کام نکل جانے کے بعد بھاگ نہ نکلو گے؟'' عبدالرحمٰن اپنا ناشتہ کر چکا تھا اور اب سامنے پڑے سگریٹ کے پیکٹ میں سے اپنے لیے سگریٹ منتخب کر رہا تھا۔

''ہمارا بندہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔'' اس کا اشارہ کلام کی طرف تھا جس کی ٹانگ کا آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی تھی لیکن ظاہر ہے ابھی اسے لمبے عرصے تک آرام کی ضرورت تھی۔

''وہ بندہ اب ناکارہ ہو چکا ہے۔ تم اس کی خاطر واپس پلٹ کر کیوں آؤ گے؟'' عبدالرحمٰن گویا اس کی دی ہوئی گارنٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تمہاری دنیا میں اپنے معذور ہو جانے والے ساتھیوں کو ناکارہ سمجھا جاتا ہو گا۔ ہمارے لیے وہ



لائق عزت و احترام ہیرو ہے جسے ہم کسی طور غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہمیں ہر صورت اسے کسی پُرسکون ٹھکانے تک پہنچانے کے لیے لوٹ کر واپس آنا ہو گا۔'' بولتے ہوئے شہریار کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ پڑ گیا تھا۔

''تمہیں اپن کی بات بری لگی اس کے لیے سوری بولتا ہے لیکن تم یہ بات خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے انسان شیوریٹی چاہتا ہے۔ تم نے جو گارنٹی دی ہے، وہ اپن کے دل کو لگی ہے۔ تم بتاؤ کدھر جانا ہے؟ اپن ابھی بندوبست کر دیتا ہے۔'' عبدالرحمٰن نے اس کے جذبات کی سچائی کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ بُرا مانے بغیر بولا۔

''نہیں، تم صرف اسلحے کا انتظام کر دو۔ جہاں جانا ہے، ہم خود چلے جائیں گے۔''

''کیوں؟..... کیا اپن پر بھروسہ نہیں رہا ہے؟'' شہریار کے انکار پر وہ مستفسر ہوا۔

''بات بھروسے کی نہیں، احتیاط کی ہے۔ ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ کوئی بھی معاملہ جتنے کم افراد کے علم میں ہو، اتنا ہی بہتر رہتا ہے۔ تمہارے کسی ذریعے سے سفر کرنا ہمارے لیے یوں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے ہم پکڑے گئے تو ممبئی میں اپنے واحد ہمدرد سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ پولیس یا ''را'' میں سے کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم ہماری مدد کر رہے ہو ورنہ وہ لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے گروہ کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اس طرح نہ تم ہماری مدد کر سکو گے، نہ ہی ہم تمہارا کام کر سکیں گے۔'' اس نے بہت سبھاؤ سے اپنے فیصلے کی وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے..... جیسا تمہیں ٹھیک لگتا ہے کرو۔ پر اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ تم لوگوں کے خاکے اور تمہارے ساتھی کی تصویریں ہر نیوز چینل پر دکھائی گئی ہیں اور ہر اخبار میں چھپی ہیں۔ باہر نکل کر تم کسی لفڑے میں نہ پڑ جانا۔'' اس کے لہجے میں ان لوگوں کے لیے تشویش تھی۔

''لفڑے میں تو ہم پڑے ہوئے ہی ہیں۔ البتہ تم تصویروں اور خاکوں کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ ہمارا ساتھی تو خیر باہر ہی نہیں نکلے گا۔ اور رہی خاکوں کی بات تو وہ کون سا ہمارے اصل حلیے کے مطابق ہیں اور ہم کون سا اسی حلیے میں باہر نکلنے والے ہیں جو کوئی ہمیں پہچان لے گا۔ تم اس سلسلے میں فکر نہ کرو اور بس یہ دعا کرو کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس لوٹیں۔''

شہریار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اب وہ سب ہی ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بس گفتگو کر رہے تھے۔

''انشاء اللہ تم ضرور کامیاب ہو گے۔ کیونکہ تمہاری لگن سچی ہے۔'' وہ ایک غنڈہ تھا لیکن ہم مذہب ہونے کے باعث ان کے درمیان ایک عجیب سی یگانگت قائم ہو گئی تھی چنانچہ نہایت خلوص سے انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔

''ہماری غیر موجودگی میں تم ہمارے ساتھی کا خیال رکھنا۔ اگر ہو سکے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کے خدوخال میں تھوڑی سی تبدیلی لانے کی کوشش کرنا تاکہ ہمیں اسے یہاں سے نکال کر لے جانے میں آسانی رہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ یہاں وہ بہت آرام سے رہے گا۔ پلاسٹک سرجری بھی کوشش کریں گے کہ ہو جائے۔ تم بس اپنے کام پر دھیان رکھنا۔ ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو فون کھڑکا دینا۔ پورے انڈیا میں اپنے بھائی جی کے تعلقات ہیں۔ کسی نہ کسی طرح تمہیں مدد پہنچ ہی جائے گی۔''

اس نے شہریار کی درخواست کے جواب میں اسے نہ صرف بھرپور تسلی دی بلکہ ایک بار پھر مختلف زاویوں سے مدد کی پیشکش بھی دہرائی۔

''بہت بہت شکریہ۔ ہم تمہارا یہ سلوک ہمیشہ یاد رکھیں گے اور اس کے بدلے میں اپنا وعدہ بھی پورا کریں گے۔ تم اس دوران بس اتنا کرنا کہ اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے مہمان پر بھی نظر رکھنا۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی رہائی کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہوتا تو یقین کرو کہ میں خود بھی پہلے ان لوگوں سے نمٹنا پسند کرتا۔'' اس نے عبدالرحمٰن کی پیشکش کے جواب میں بہت نرمی سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک اور اہم معاملے کے سلسلے میں ہدایات دیں۔

''بے فکر رہو۔ وہ دونوں مستقل اپنے آدمیوں کی نظروں میں ہیں۔'' اس نے تسلی دی۔

''بس تو پھر ہمیں اجازت دو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ نکلنے سے پہلے اپنی تیاری کے علاوہ ہم اپنے ساتھی سے ملاقات بھی کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تو اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھے سلّو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ شہریار کو اس مشن کے لیے اس کے انتخاب پر ہمیشہ خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کسی معاملے میں غیر ضروری مداخلت نہیں کرتا تھا لیکن عمل کے لیے ہر دم تیار اور چاق و چوبند ملتا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھ کر وہ سیدھے کلام سے ملاقات کے لیے گئے۔ وہ ہوش میں تھا اور اس بات کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ دونوں اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن خود ہی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''ہمت سے کام لو یار!..... کچھ عرصے کی بات ہے، اس کے بعد انشاء اللہ تم اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے ہو سکو گے۔''

شہریار لپک کر اس کے قریب پہنچا اور اس کا بایاں ہاتھ تھام کر اسے تسلی دی۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ چند گھنٹوں میں ہی بہت نحیف محسوس ہو رہا تھا اور چہرے کی رنگت میں زردی سی گھل گئی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی جس سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ پیروں سے لے کر سینے تک تنی ہوئی چادر کی وجہ سے وہ اس کی آپریشن شدہ ٹانگ کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن پھر بھی انہیں احساس تھا کہ ان کا ساتھی ایک بڑی تکلیف سے گزر رہا ہے۔

''میں اپنے زخمی ہونے پر افسردہ نہیں ہوں بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ اب میں اس مشن میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔'' کلام نے اپنے دکھ کی وجہ بیان کی۔

''کوئی بات نہیں۔ تم جہاں تک ہمارا ساتھ دے سکتے تھے، تم نے دیا اور بہت اچھی طرح دیا تھا۔ اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ تمہاری اس خدمت کے بدلے میں تمہاری حفاظت کا انتظام کریں اور تمہیں یہاں سے محفوظ راستے سے پاکستان واپس پہنچا دیں۔ ڈاکٹر صاحب والا معاملہ نمٹ جائے تو انشاء اللہ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ فی الحال تو تم خود بھی سفر کرنے کے لائق نہیں ہو اس لیے بہتر ہے کہ یہاں رہ کر آرام کرو۔'' شہریار نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ ان حالات میں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

''تم یہاں موجود اپنے سیٹ اپ میں سے کسی ذمے دار آدمی کا رابطہ نمبر اور کوڈ مجھے بتا دو تاکہ جب ڈاکٹر صاحب کو رہا کروانے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں یہاں سے نکالنے کا کام ہو سکے۔ یہ کام ظاہر



ان سے رابطے کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔''

کلام کی خیریت معلوم کرنے کے علاوہ وقتِ رخصت اس سے ملاقات کے لیے آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں موجود اپنے مددگاروں سے رابطے کا طریقہ معلوم کر سکے کیونکہ بہرحال انہیں جو بھی کرنا تھا، اس کے لیے ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ ان لوگوں کا یہاں پورا ایک سیٹ اپ تھا اور وہی ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے محفوظ طور پر نکال سکتے تھے۔ کلام جب تک ٹھیک تھا، کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اب اس کی جگہ دوسرے بندے سے رابطہ بہت ضروری تھا۔ کلام نے اسے طریقِ کار بتا دیا۔

''تھینک یو۔ اب تم آرام کرو۔ ہم تھوڑی دیر میں روانہ ہونے والے ہیں۔ اس کے لیے کچھ تیاریاں کرنی ہیں۔''

وہ دونوں کلام سے مصافحہ کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔ لباس اور حلیوں کی تبدیلی کا عمل مکمل ہونے تک عبدالرحمٰن نے انہیں ان کے مطلوبہ ہتھیار بھجوا دیئے تھے۔ یہ چھوٹے سائز کے لیکن زبردست مار کی گرگی والے ہتھیار تھے جنہیں وہ آسانی سے اپنے لباس میں چھپا سکتے تھے۔ ہینڈ گرینیڈز بھی انہوں نے مساوی تعداد میں تقسیم کر لیے۔ اب وہ اپنے چھوٹے سائز کے سفری بیگز کے ساتھ روانگی کے لیے بالکل تیار تھے۔ اپنے بیگز ہاتھ میں لیے وہ باہر نکلے تو ہمہ وقت وہاں موجود رہنے والا عبدالرحمٰن کا ایک خاص آدمی ان کے سامنے آ گیا۔

''عبدل بھائی نے کہا ہے کہ آپ لوگ جہاں جانا چاہیں آپ کو وہاں ڈراپ کروا دوں گا۔ ڈرائیور گاڑی کے ساتھ تیار ہے۔ آپ بولو کدھر جانا ہے؟'' اس نے مؤدب لہجے میں پیغام رسانی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ریلوے اسٹیشن۔'' شہریار نے اسے مختصر سا جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں ہی وہ ایک آرام دہ گاڑی میں بیٹھے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے اس لیے باہر سے انہیں دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو بالکل ڈھلے ہوئے حلیوں میں چلتی گاڑی میں شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیشن تک کا طویل فاصلہ نہایت سبک رفتاری سے طے ہو گیا۔ ڈرائیور نے نیچے اُتر کر پچھلی طرف کے دونوں دروازے کھولے اور مزید کسی حکم کے انتظار میں پیچھے ہٹ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

''تم جا کر آگرہ جانے والی ٹرین میں فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لے آؤ۔ ہم یہیں گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔'' شہریار نے ایک بڑا نوٹ نکال کر ڈرائیور کے حوالے کیا تو وہ فوراً روانہ ہو گیا۔

وہ دونوں گاڑی کے دروازے ایک بار پھر بند کر کے پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئے۔ سلّو کو اس کے عمل کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، اس کے باوجود اس نے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ جب ان کا مطلوبہ بندہ آدمی نگر میں ہے تو وہ آگرہ کا ٹکٹ کیوں منگوا رہا ہے؟ اپنی قدرتی صلاحیتوں اور تربیت کے باعث وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے کام میں کبھی بھی کسی کو اصل حقائق سے واقف نہیں ہونے دیا جاتا۔ چنانچہ شہریار کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ڈرائیور کو اپنی منزل کا پتہ چلنے دیتا۔ ٹکٹ کے پیسے ضائع ہونے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان یہاں بھیجنے والوں نے اس بات کا بندوبست کر رکھا تھا کہ انہیں وقتِ ضرورت رقم ملتی رہے۔ ایک خاص اکاؤنٹ کا اے ٹی ایم کارڈ اس وقت بھی شہریار کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ارجن کے گھر سے لوٹی ہوئی کثیر رقم اور قیمتی زیورات الگ تھے۔

فی الحال شہریار نے یہ سب چیزیں عبدل کے پاس بطور امانت رکھوا دی تھیں۔ کچھ نقد رقم جو اچھی خاصی

ہی تھی، اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس رقم میں سے اچھا خاصا حصہ سلّو کے پاس بھی تھا کہ اگر کسی گمبھیر صورتِ
میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو دونوں ہی اپنے اپنے طور پر اپنے لیے کچھ کر سکیں۔

ڈرائیور ٹکٹ اور بقایا رقم کے ساتھ کچھ دیر میں واپس لوٹ آیا۔ شہریار نے اس سے صرف ٹکٹ وص
کیے اور بچ جانے والی رقم اسے سونپ دی۔ ٹکٹ جیب میں آ جانے کے بعد وہ دونوں نیچے اُتر آئے اور ڈرا
کو واپس جانے کا حکم دے دیا۔ وہ گاڑی لے کر اسٹیشن کی حدود سے دُور نکل گیا تو شہریار نے سلّو کے سا
ایک ٹیکسی کی طرف پیش قدمی کی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس شہر کی طرف جا رہے تھے لیکن اس بار انہوں
زیادہ طویل سفر نہیں کیا اور درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔

ہوٹل میں انہوں نے صرف ایک دن کے لیے کمرہ حاصل کیا اور اپنے سفری بیگ وہیں رکھ کر خود
نکل گئے۔ بازار میں دکانیں کھل چکی تھیں۔ ایک چھوٹی سی دکان سے انہوں نے اپنے اپنے سائز کے ملبوسا
خریدے اور ہوٹل واپس آ گئے۔

ہوٹل پہنچ کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ایک بار پھر وہ حلیوں کی تبدیلی کے عمل سے گزرے۔ ا
انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو عبدالرحمٰن کی کوٹھی سے نکلے تھے۔ لباس کی تبد
کے علاوہ انہوں نے جوتے اور سفری بیگ بھی تبدیل کر لیے تھے اور ظاہر ہے یہ ساری خریداری ن اسی با
سے ہوئی تھی جہاں سے انہوں نے کپڑے خریدے تھے۔

استقبالیہ کلرک کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ ایک ساتھ باہر نکلنے کے بجائے الگ الگ ہوٹل سے
آئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر ا
بیرونِ شہر جانے والی بسوں کے اڈے پر پہنچانے کو کہا۔ خریداری اور حلیوں کی تبدیلی کے دوران موقع
شہریار نے سلّو کو بتا دیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر حفاظتی انتظامات زیادہ سخت ہوتے ہیں اور وہاں سے ا
سمیت نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے شروع ہی سے اس کی سفر کے لیے پہلی ترجیح بس تھی لیکن عبدالرحمٰن
ڈرائیور کو دھوکا دینے کے لیے اس نے اسٹیشن جا کر آگرہ جانے والی ٹرین کے ٹکٹ منگوائے تھے۔ وہ صور
حال ہی ایسی تھی کہ وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے پر مجبور تھے۔ عبدالرحمٰن کی کوٹھی سے قیمتی لباس ہی ر
ہونے والوں کو اب یکسر مختلف حلیے اور عام سے لباس میں دیکھ کر وہ ڈرائیور بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا
نے انہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچایا تھا۔

ٹیکسی سے بس اڈے پر اُترنے کے بعد شہریار نے سلّو کو ٹکٹ خریدنے کے لیے روانہ کیا اور خود ا
چھوٹے سے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ وہاں بیٹھ کر دو افراد کے لیے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اس نے اپنی دا
آنکھ کو مخصوص وقفوں سے شہادت کی انگلی سے تین بار مسلا اور اردگرد سے بے نیاز اخبار سامنے پھیلا کر ا
مطالعہ کرنے لگا۔ یہ ہندی اخبار اس نے ہوٹل میں آنے سے پہلے ایک اسٹال سے خریدا تھا۔ اسے ہندی
کچھ خاص شُد بُد نہیں تھی لیکن خود کو مقامی ظاہر کرنے کے لیے جان بوجھ کر یہ اخبار خرید لایا تھا اور اب پور
انہماک سے اس میں یوں مصروف تھا جیسے واقعی مطالعہ کر رہا ہو۔ ویٹر نے چائے کی ٹرے لا کر سامنے رکھ
بھی اس نے اپنا سر اوپر نہیں اُٹھایا۔

''آپ کا مطلوبہ سامان لاکر نمبر چھ میں موجود ہے۔'' ویٹر نے دھیمی آواز میں اسے یوں پیغام دیا
اس سے چائے کے علاوہ کسی اور شے کو پیش کرنے کے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

''ابھی صرف چائے کافی ہے۔ میرا ساتھی بھی آ جائے تو میں تمہیں کھانے پینے کے بارے میں بتا



گا۔'' شہریار نے اخبار سے سر اٹھا کر اسے قدرے بلند آواز میں جواب دیا۔

ویٹر فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا اور دوسری میزوں کے آرڈر پورے کرنے لگا۔ یہاں آنے سے قبل وہ
اس ہوٹل میں حلیوں کی تبدیلی کے لیے رُکے تھے، وہاں سے باتھ روم جانے کے بہانے اس نے کلام سے
حاصل کیے گئے نمبر پر گفتگو کی تھی۔ اس مختصر سی گفتگو کا نتیجہ طے شدہ پروگرام کے مطابق بس اڈے پر قائم اس
ہوٹل میں ویٹر کی زبانی ملنے والے پیغام اور چائے کی ٹرے میں رکھی سلور چمکتی ہوئی بغیر کی رِنگ کی چابی کی
صورت میں سامنے آ گیا تھا۔

اس نے نہایت خاموشی سے چابی اپنی مٹھی میں دبا لی۔ اسی وقت سلّو ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ
میں بس کے دو ٹکٹ تھے۔ وہ سیدھا شہریار کی ٹیبل پر آ بیٹھا جس نے اس کے انتظار میں ابھی تک چائے کو
ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چائے کپوں میں نکالنے لگا اور بولا۔

''کچھ کھانے کا موڈ ہو تو منگوا لو۔''

''وہ تو میں ضرور منگواؤں گا۔ بھاگ دوڑ میں صبح کا ناشتہ تو کب کا ہضم ہو گیا ہے۔ اب پیٹ میں چوہے
دوڑ رہے ہیں۔''

اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے بلایا اور اسے پیٹیز اور سموسے لانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے پھرتی سے یہ آرڈر
ہرا کر دیا۔ اس دوران شہریار خاموشی سے چائے پیتا رہا تھا۔ سلّو نے پیٹیز ہاتھ میں لے کر منہ کی طرف بڑھایا
تو وہ اپنی چائے ختم کر کے کپ واپس میز پر رکھ چکا تھا۔

''تم آرام سے کھاؤ پیو۔ اتنی دیر میں، میں سامان بس میں رکھواتا ہوں۔'' وہ سلّو کے جواب کا انتظار
کیے بغیر اپنے ساتھ ساتھ اس کا بیگ بھی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اُس کے اس انداز پر سلّو نے معنی خیز نظروں سے
اس کی طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور اسی اطمینان سے بیٹھا کھاتا رہا۔

ادھر شہریار کا رخ لاکر رُوم کی طرف تھا۔ ویٹر سے ملنے والی چابی سے اس نے اس کے بتائے ہوئے لاکر
کو کھولا۔ وہاں ایک بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ باہر نکال کر اس کی زِپ تھوڑی سی کھول کر اندر جھانکا۔
بھوری رنگ کی جھلک نے اسے بتایا کہ کام اسی انداز میں ہوا تھا جیسے اس نے کہا تھا۔

مطمئن ہونے کے بعد اس نے زِپ دوبارہ بند کی اور بیگ کندھے پر لٹکا کر لاکر روم سے باہر آ گیا۔
باہر وہ بس کھڑی تھی جس میں انہیں گاندھی نگر تک جانا تھا۔ بس کا کنڈیکٹر چیخ چیخ کر دو منٹ بعد گاڑی کے
روانہ ہو جانے کا اعلان کرتے ہوئے مسافروں کو جلد سے جلد سوار ہو جانے کی ہدایت کر رہا تھا۔

اس کی پکار پر سیدھے بس کی طرف جانے کے بجائے اس نے ایک کیبن کی طرف رخ کیا جہاں مختلف
انواع اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ ان اشیا میں کھانے پینے کے آئٹمز سے لے کر ناخن تراش، کاغذ، قلم وغیرہ
جیسی چیزیں بھی شامل تھیں۔ کیبن پر اس کے علاوہ دو تین آدمی اور خریداری کے لیے کھڑے تھے۔ اس نے
خریداروں کی اس قطار میں شامل ہو کر جوس کے ڈبے اور ایک چھوٹا تالا خریدا۔ تالا بیگ کی زِپ اور اسٹریپ
کے کنڈے میں پھنسا کر بند کرنے کے بعد اس نے چابی اپنی جیب میں رکھ لی اور بس میں سوار ہو گیا اور سلّو
اور اپنے بیگز بس کے سامنے والے حصے میں رکھوا دیے۔

ٹکٹ کے مطابق اپنی سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے لاکر سے نکالا گیا اضافی بیگ پیروں کے قریب
رکھا اور خود سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا۔ اسی وقت اسے سلّو بس کے دروازے سے اندر داخل ہوتا نظر آیا۔
اندر آنے کے بعد اس نے شہریار کی جانب رخ کرنے کے بجائے دائیں طرف کی رو میں اس سے کچھ آگے

سیٹ سنبھال لی۔ یہ ان کے درمیان پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ایک ساتھ سفر نہیں کریں گے تا کہ کوئی مس
ہو تو ایک دوسرے کی مدد کرنے میں آسانی رہے۔

اسی احتیاط کے باعث اس نے سلّو کی طرف زیادہ دیر دیکھنے سے بھی اجتناب کیا اور دروازے سے
داخل ہوتے دوسرے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ مسافروں کی اکثریت نے عین وقت پر بس میں سوار ہونے
ترجیح دی تھی چنانچہ ایک کے بعد ایک قدرے عجلت میں اندر داخل ہوتے نظر آ رہے تھے اور بس کی نشستیں
تیزی سے پُر ہوتی جا رہی تھیں۔

شہریار کے برابر میں ایک تیس پینتیس سالہ قبول صورت اور متناسب جسم کی عورت براجمان ہو گئی۔ اس
نے نیلی جینز کے ساتھ ایک تنگ سی گلابی رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر سامنے کی طرف مشہور گلوکارہ
میڈونا کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ایک نظر میں ہی عورت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر دروازے کی
طرف متوجہ ہوا۔ اب وہاں سے پولیس کی یونیفارم میں ملبوس دو افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔

''اوہو، اب یہ ایڈیٹس دس پندرہ منٹ ضائع کر دیں گے۔ پہلے ہی گاڑی دس منٹ لیٹ ہو چکی ہے۔''
پولیس والوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے برابر میں بیٹھی عورت کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ مخاطب شاید اسے ہی
گیا تھا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوا اور ہنوز پولیس والوں پر نظریں جمائے رہا جو اندر داخل ہونے کے بعد طائرانہ
نظروں سے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ جائزہ لینے کے بعد انہوں نے شاید اپنے طور پر چند مسافر منتخب
کر لیے اور دونوں ایک ایک رو میں منقسم ہو کر اپنی کارروائی کرنے لگے۔ اس کارروائی میں مسافروں سے
سوال جواب کے علاوہ ان کے سامان کی تلاشی لینا بھی شامل تھا۔

دائیں طرف کی رو والے نے سلّو سے بھی چند ایک سوالات کیے۔ فاصلے کی وجہ سے وہ سلّو کے دھیمے
آواز میں دیئے گئے جوابات نہیں سن سکا لیکن پولیس والے کے اس سے دُور ہٹ جانے پر اتنا اندازہ ہو گیا
کہ سلّو اسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اسی اثنا میں اس کی طرف کی رو میں مصروف پولیس والا اس
کے سر پر پہنچ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟'' اس نے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ بس گاندھی نگر جا رہی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ سب مسافر بھی وہیں جا رہے ہوں گے۔'' اس سے
قبل کہ وہ جواب دے پاتا، عورت نے تیزی سے کہا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

''اپنی وائف کی زبان کنٹرول کرو ورنہ کبھی اس کی وجہ سے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔'' عورت کے بالکل
منطقی جواب نے پولیس والے کا موڈ خراب کر دیا اور وہ سختی کے ساتھ شہریار سے مخاطب ہوا۔ اس کے
اندازے کی اس بدترین غلطی نے اسے بدمزہ کر دیا اور وہ رُوکھے لہجے میں بولا۔

''یہ میری وائف نہیں ہے بلکہ میں اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ یہ صرف میرے ساتھ یہ سیٹ شیئر کر
رہی ہے۔''

''اوکے، اب تم یہ بتاؤ کہ تم گاندھی نگر کیوں جا رہے ہو؟ اور وہاں کس جگہ رُکو گے؟'' اس کے جواب
سن کر خجل ہونے کے باوجود پولیس والے نے اپنی سابقہ ٹون میں نیا سوال کیا۔

''وہاں میرا گھر ہے اور ظاہر ہے میں گھر میں ہی رہوں گا۔'' اسے بھی پولیس والے کو چڑانے میں مزہ
آنے لگا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھی عورت پولیس مین کی درگت بننے پر مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

''اپنا ایڈریس نوٹ کرواؤ۔'' وہ بھی کسی صورت بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ شہریار نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سکا



اے کے ایک مکان کا پتہ لکھوا دیا۔ ارجن اگروال سے یہ جاننے کے بعد کہ ڈاکٹر فرحان کو گاندھی نگر میں
کھا گیا ہے، اس نے نیٹ پر رات ہی کو اس علاقے کا سارا حدود اربع معلوم کر لیا تھا اس لیے جواب دینے
ں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''سیکٹر فائیو اے میں کہاں؟..... شیواجی کے مندر کے پاس؟'' پولیس والا بھی بڑا کائیاں تھا اور گھما پھرا
اس سے سوالات کر رہا تھا۔

''نہیں، شیواجی کا مندر سیکٹر بی میں ہے۔ میں ہنومان جی کے مندر کے پاس رہتا ہوں۔'' وہ بھی کسی
ع پکڑے جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس بار پولیس والے نے بھی اس کا جواب قبول کر لیا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ممبئی کیوں گئے تھے؟''

''بزنس کے لئے۔ میں آرٹیفیشل جیولری کا بزنس کرتا ہوں، ممبئی سے وہی خریدنے گیا تھا۔'' اس نے بھی
لہجے میں عاجزی سمو لی کہ پولیس والے کو اشتعال دلانا کسی صورت مناسب نہیں تھا۔

''بیگ کھول کر دکھاؤ۔'' اس نے تصدیق کے لیے اس کے قدموں میں پڑے بیگ کو کھولنے کا حکم دیا۔

شہریار نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول کر زِپ بھی کھول دی۔ اندر سے سنہری جھلملاتے ہوئے
رات اپنی جھلک دکھا کر نظروں کو خیرہ کرنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر پولیس والے کو اس کی طرف سے اطمینان ہو ہی گیا اور وہ اس کی سیٹ کے پاس
ہٹ کر آگے بڑھ گیا۔

شہریار نے بیگ کی زِپ بند کر کے ایک بار پھر احتیاط سے تالا لگایا اور چابی واپس جیب میں رکھ لی۔
ں والوں نے بھی بس میں چند منٹ مزید گزارے اور پھر اسے کلیئر قرار دیتے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ یوں
ی روانگی عمل میں آئی۔

''میرا نام اوشا ہے۔ ممبئی کی رہنے والی ہوں اور اپنے انکل سے ملنے گاندھی نگر جا رہی ہوں۔'' بس چل
ی تو عورت نے اس سے اپنا تعارف کروایا۔

''مجھے پٹیل کہتے ہیں۔'' اس نے بھی ذرا تکلف سے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''آپ مجھے اپنی شاپ کا ایڈریس دینا پسند کریں گے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا اور
ضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ایکچوئیلی میں کچھ جیولری خریدنا چاہتی ہوں۔''

''آپ تو خود ممبئی کی رہنے والی ہیں۔ یہاں سے ممبئی کی جیولری خرید کر کیا کریں گی؟'' شہریار نے تعجب کا
ہار کیا۔

''اصل میں، میں اپنے انکل کی بیٹیوں کے لیے ممبئی سے کوئی گفٹ نہیں لا سکی ہوں اس لیے سوچ رہی
ں کہ آپ سے جیولری خرید کر انہیں گفٹ کر دوں۔'' اس نے شہریار کی حیرت دور کی۔

''اوکے، میں آپ کا پرابلم سمجھ گیا ہوں۔ آپ ایسا کیجئے گا کہ مین مارکیٹ میں آ کر کسی سے بھی پوچھ
ے گا کہ ممبئی جیولرز شاپ کہاں ہے۔ آپ کو میری شاپ تک پہنچا دیا جائے گا۔'' اس نے مہذبانہ انداز میں
ا سے کہا اور پھر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایکسکیوزمی!..... میں
ت تھکا ہوا ہوں اور راستے میں کچھ نیند لینا چاہتا ہوں۔''

''شیور۔'' عورت نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا اور باہر سے گزرتے مناظر کو

دیکھنے لگی۔ شہریار نے نوٹ کیا تھا کہ اس عورت کی مسکراہٹ بہت پُرکشش لیکن بھید بھری ہے۔ وہ اسے کچھ عجیب سی لگی تھی اس لیے وہ دانستہ اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ طویل راستے میں گفت وشنید سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ سوتا ہوا بن جاتا۔ چنانچہ اسی طریقے پر عمل کیا۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ سونے کی اداکاری کرتے کرتے اس کے تھکے ہوئے اعصاب خود بخود ہی ڈھیلے پڑ گئے اور سچ مچ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کی نیند کا دورانیہ کتنا ہے لیکن گہری نیند میں بھی اس نے اپنی جیب کے پاس حرکت کو محسوس کرلیا اور خودکار انداز میں بند آنکھوں سے ہی اس حرکت کرتی ہوئی شے کو دبوچ لیا۔ فوراً ہی اسے ایک سسکی سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر آواز کے ماخذ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہمسفر کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا اور وہ چہرے پر ذرا تکلیف کے آثار لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میرا ہاتھ چھوڑیے..... کیا توڑ ہی ڈالیں گے؟'' اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا کوئی تاثر نہیں تھا اور وہ بس ذرا سی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے ایک ادا سے اس سے مخاطب تھی۔

''میری پاکٹ میں ہاتھ کیوں ڈال رہی تھیں؟'' اس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر شہریار نے سخت لہجے میں لیکن دھیمی آواز سے دریافت کیا۔ وہ جن حالات سے دوچار تھا وہ احتیاط کے متقاضی تھے۔ کچھ بھروسہ نہیں تھا کہ وہ بلند آواز میں عورت پر جیب میں ہاتھ ڈالنے کا الزام لگاتا تو کئی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور عورت اپنی جان بچانے کے لیے اُلٹا اسی پر دست درازی کا الزام لگا دیتی۔ وہ پاک و ہند کے لوگوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہاں لوگ ویسے چاہے عورت کو اپنی جوتی تلے رکھنے کو پسند کرتے ہوں لیکن اس قسم کے معاملات میں ان کی ساری ہمدردیاں عورت کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔

''میں تمہاری پاکٹ میں ہاتھ نہیں ڈال رہی تھی بلکہ اس کیڑے کو اُڑا رہی تھی جو تمہاری پاکٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔'' اوشا نے بھی دھیمی اور درد بھری آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک شہریار کی مضبوط گرفت میں تھا اور یقیناً وہ تکلیف محسوس کر رہی تھی۔

اس کے جواب کو سن کر شہریار نے بے ساختہ ہی بس کے اندر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ ایئرکنڈیشنڈ بس کے تمام دروازے کھڑکیاں بند تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ باہر سے کوئی کیڑا اُڑ کر اندر آنے کے بعد اس کی جیب پر آ بیٹھا ہو جسے اُڑانے کے لیے اوشا کو تردّد کرنا پڑا ہو۔ پھر بھی اُس نے اُس کی توجیح قبول کرلی اور بااخلاق لہجے میں بولا۔

''سوری، میں نیند میں ہونے کی وجہ سے کچھ اور سمجھا تھا۔''

ساتھ ہی اس نے اوشا کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

''بہت سخت پکڑ ہے آپ کے ہاتھ کی۔'' ہاتھ کو سہلاتے ہوئے اس نے کچھ ناز سے شکوہ کیا۔

''مردوں کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ آپ کو شاید ایکسپیرینس نہیں ہے۔'' اس بار شہریار نے بھی مسکرا کر معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ اس طرح وہ اس عورت کی ٹائپ کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کوئی خفیہ ایجنٹ، کال گرل، نوسرباز کچھ بھی ہوسکتی تھی اور اس بات کا تعین کرنے کے بعد ہی وہ اس سے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرسکتا تھا۔

''ایسی بھی بات نہیں ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اتنی مضبوط پکڑ کسی مرد ہی کی ہوتی ہے اور آپ تو کام بھی بڑے نازک کرتے ہیں۔''



''کام کتنا ہی نازک ہو، مرد مضبوط ہی اچھا لگتا ہے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔

''یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے بھی مضبوط مرد اچھے لگتے ہیں۔ میں کسی روز ضرور آپ کی شاپ پر آؤں گی اور اگر آپ نے پسند کیا تو ہم ساتھ میں کچھ وقت گزاریں گے۔'' اس کے لہجے میں جو ترغیب تھی، اس کے مطابق شہریار اس کے کال گرل ہونے کا ہی اندازہ قائم کرسکا تھا لیکن یہ کوئی حتمی اندازہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انڈین ایجنسیوں میں بھی عورتوں کو اس طریقے سے استعمال کر کے اپنا کام نکالنے کا چلن عام ہے اس کے لیے خود کو اوشا سے بچا کر رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ وہ نہایت ہوشیاری سے یہ کوشش کر رہا تھا۔

''آپ کے ساتھ وقت گزارنا کسے اچھا نہ لگے گا۔ آپ ضرور میری شاپ پر آئیے گا۔ میں کل سے ہی آپ کا انتظار شروع کردوں گا۔'' اس نے دل پھینک انداز میں اسے دعوت دی۔ اس دعوت کے ذریعے وہ یہ تاثر مضبوط کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی گاندھی نگر کا مقامی ہے اور وہ اس سے اس کی شاپ پر باآسانی مل سکتی ہے۔

''آج سے کیوں نہیں؟'' اس کا جواب سن کر اوشا نے بے ساختہ ہی پوچھا۔

''آج گھر والی نہیں چھوڑے گی۔'' اس نے بھی اسی بے ساختگی سے جواب دیا۔

''اوہ..... تو آپ میرڈ ہیں۔'' وہ گویا تھوڑی سی مایوس ہوئی۔

''ہاں ہوں تو سہی۔ پر میری پتنی زیادہ تیز عورت نہیں ہے۔ اس کا سارا ٹائم گھر کے کاموں میں گزر جاتا ہے اور وہ مجھ سے میری روٹین کے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کرتی۔ لیکن آج کی بات الگ ہے۔ ایک تو میں سفر سے واپس لوٹ رہا ہوں، دوسرے آج ہی کے دن ہمارے بیاہ کو ایک سال کمپلیٹ ہو رہا ہے اس لیے میرا اس کے پاس ہونا ضروری ہے۔'' وہ بڑی مہارت سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

''اوہ..... پھر تو آج سچ مچ تمہارا اپنی پتنی کے پاس موجود ہونا ضروری ہے۔'' اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا اور پھر ذرا معنی خیزی سے بولی۔ ''آج تو وہ بڑی شدت سے تمہارا ویٹ کر رہی ہوگی۔''

''وہ تو ہے۔ کیا تمہیں خاص موقعوں پر اپنے پتی کا انتظار نہیں رہتا؟'' اوشا نے بے تکلفی دکھاتے ہوئے ''تم'' کہہ کر پکارا تو وہ بھی فوراً یہ مرحلہ طے کر گیا۔

''ہمارے ہاتھ کی ریکھا میں پتی کہاں لکھا ہے؟ ہم جیسیاں تو بس بغیر پھیروں کے مردوں کی سیج سجایا کرتی ہیں۔'' نہایت اُداسی سے بولتی وہ اپنی حقیقت عیاں کر گئی جس پر سو فیصد یقین نہ ہونے کے باوجود وہ ہار سا گیا۔ اس روپ میں عورت اس کے لیے سدا ناقابلِ قبول رہی تھی، چاہے اس کے پیچھے مجبوری کی کتنی ہی داستان رہی ہو۔

''چپ کیوں ہوگئے؟..... کیا میں دوستی کے لائق نہیں ہوں؟'' اوشا نے سرگوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بس میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔'' اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور پھر وہ گاندھی نگر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔

شہریار کی کوشش تھی کہ یونہی عمومی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہے جبکہ اوشا اس کی ذات میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور وہ اس کے اس قسم کے سوالات کو بھی بڑی خوبی سے نمٹا رہا تھا۔ لیکن بہرحال گاندھی نگر پہنچنے سے پہلے ہو چکا تھا کہ اوشا ایک نہایت گھاگ عورت ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

وہ اپنے بارے میں جو انکشاف کر چکی تھی، اس کے بعد اس کے گھاگ ہونے پر تعجب بھی نہیں کیا جاسکتا

تھا۔لیکن جانے کیوں اُس کی چھٹی حس بار بار یہ اشارہ دے رہی تھی کہ وہ اس کے سوا بھی کچھ ہے جو اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔

گاندھی نگر پہنچنے کے بعد اس نے بہت خوش اخلاقی سے اوشا کو گڈ بائے کہا اور آنے والی شام اپنی شام پر آنے کی دعوت دے کر آگے بڑھ گیا۔ وہ جو بھی تھی، اس مصیبت سے یہیں پیچھا چھڑا لینا مناسب تھا۔ اس لیے سواری کا انتظام کر کے اس نے ڈرائیور کو ایس پی ہوٹل چلنے کا حکم دیا۔ یہ ہوٹل گاندھی نگر کے سیکٹر 7 میں تھا جبکہ جس ہسپتال میں ارجن نے انہیں ڈاکٹر فرحان کی موجودگی کے بارے میں بتایا تھا، وہ سیکٹر فائیو ڈی اور فائیو اے کے درمیان کہیں واقع تھا۔

سلّو کو بھی الگ سواری میں اس کے پیچھے ایس پی ہوٹل ہی پہنچنا تھا۔ وہ دونوں وہاں یکجا ہوتے اور مزید آگے کی کارروائی کرتے۔

ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے وہ پوری طرح ہوشیار رہا کہ اس کا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ لیکن سارے راستے اسے ایسی کوئی مشکوک گاڑی نظر نہیں آئی اور کسی حد تک اس کا اوشا پر شک دُور ہو گیا اور اس نے سوچا کہ ممکن ہے وہ وہی ہو جو اس نے خود کو ظاہر کیا تھا۔ ورنہ کوئی سیکرٹ ایجنٹ تو اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنے لیے ایک ڈبل بیڈ کا کمرہ بک کروایا اور کاؤنٹر پر اطلاع دے دی کہ کچھ دیر بعد اس کا ایک دوست بھی وہاں پہنچنے والا ہے۔ اسے فوری طور پر کمرے میں پہنچانے کی ہدایت کر کے ہوا وہ سامان اٹھا کر کھڑے عمر رسیدہ ویٹر کے پیچھے اپنے کمرے تک جا پہنچا۔

اس کے اندازے کے مطابق سلّو کو بھی پانچ دس منٹ کے وقفے سے وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور بیس منٹ بعد جبکہ وہ کچھ تشویش میں مبتلا ہونے لگا، اس کے کمرے کے دروازے پر دستک اُبھری۔ وہ اس دستک کو پہچانتا تھا۔ یہ سلّو کی دستک تھی۔ اُس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''بہت دیر لگا دی آنے میں؟'' سلّو کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے استفسار کیا۔

''بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔ کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے ڈاج دینے میں ذرا وقت لگ گیا۔'' اُس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بتایا اور تپائی پر رکھا پانی کا جگ اُٹھا کر گلاس میں پانی اُنڈیلنے لگا۔

''تعاقب.....؟ لیکن کوئی تمہارا تعاقب کیوں کر رہا تھا؟'' اس کا تشویش میں مبتلا ہونا لازمی تھا۔

''ظاہر ہے کوئی تو وجہ رہی ہو گی لیکن میں اپنے طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ سفر کے دوران میرا ایسے کسی شخص سے واسطہ نہیں پڑا جس کے بارے میں کہہ سکوں کہ وہ مشکوک تھا۔'' اُس نے ایک سانس میں پانی کا گلاس خالی کیا اور شانے اچکاتے ہوئے اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں جواب دیا۔

''اوکے، یہ اچھا ہے کہ تم اس سے اپنی جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ آؤ آخری بار بیٹھ کر اپنے منصوبے کا جائزہ لے لیتے ہیں تاکہ کوئی خامی ہو تو اس کا حل نکالا جا سکے۔''

سلّو کا تعاقب اگرچہ اس کے لیے خاصی تشویش ناک بات تھی لیکن اس وجہ سے وہ اپنے اصل کام کو کم طور پر پسِ پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ تمام تر خطرات و خدشات کے باوجود انہیں اپنے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ دونوں مل کر پوری عرق ریزی سے اپنے منصوبے کا جائزہ لینے لگے۔ اس دوران شہریار سے چند ایک بار فون پر بھی مختصر گفتگو کی اور بالآخر جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو دلوں میں اس بات کا یقین تھا کہ آج ڈاکٹر فرحان جمیل کی قید کا آخری دن ہو گا۔

⊛----✪----⊛



''کیسے ہو خان؟'' ذیشان نے اپنے سامنے بیٹھے مشابرم خان کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''اللہ کا کرم ہے صاحب!.....وہ جس حال میں رکھے، ہم اس میں خوش رہنے والا بندہ ہے۔ لیکن آج کل بیکاری سے تھوڑا پریشان ہے۔ ایسے بیکار بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کا عادت نہیں ہے ہمیں۔'' مشابرم خان نے اس کے سوال کا ذرا تفصیلی جواب دیا۔

حقیقتاً وہ فراغت سے تنگ آ گیا تھا۔ بلتستان میں یہودی لابی کے سیٹ اپ کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس نے پاک آرمی کے ساتھ مل کر بڑا اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس کارروائی کے دوران اس کی شناخت بھی منظرِ عام پر آ گئی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا تھا کہ فی الحال اسے انڈر گراؤنڈ ہی رکھا جائے اور کسی دوسرے مشن میں شامل کر کے اس کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ ویسے بھی اس مشن کے دوران وہ اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا اور ریکوری کے لیے اس کا کچھ عرصہ آرام کرنا بہت ضروری تھا۔

''بس تو پھر خوش ہو جاؤ۔ تمہارے لیے کام نکل آیا ہے اور جلد تم ایک بار پھر ایکشن میں ہو گے۔'' اُس کا جواب سن کر ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن مشابرم خان نے نوٹ کیا کہ یہ مسکراہٹ لبوں سے آگے نہیں جاتی ہے اور ذیشان کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہے۔

''کیا ہمیں عمیر صاحب کو دوبارہ جوائن کرنا ہے؟'' دل ہی دل میں ذیشان کی پریشانی کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''نہیں، اس طرف تو فی الحال تمہیں بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر کوئی تمہیں تلاش کر رہا ہو گا تو اس طرف ضرور نظر رکھے ہوئے ہو گا۔ یوں بھی عمیر کی طرف صورتِ حال ابھی اتنی خراب نہیں ہے کہ وہ اکیلا ہینڈل نہ کر سکے۔ میں نے اس کا جگو سے بھی رابطہ کروا دیا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی ٹھیک ٹھاک مدد کر سکتا ہے۔ ابھی بھی اس نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ریڈ لائٹ ایریا سے ایک ایسی لڑکی اور لڑکے کو لانے میں کامیاب ہو گیا ہے جن کی مدد سے چودھری پر طوائف کے قتل کا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لڑکا مرنے والی کا بھائی ہے جبکہ لڑکی اس کی محبوبہ ہے۔ عمیر نے اس کی کورٹ میرج کروا دی ہے اور دونوں وہاں بیوی کی مدعیت میں چودھری پر کیس بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن آج کل چودھری بھارت میں ہے اس لیے کارروائی کچھ خاص آگے نہیں بڑھی ہے۔ رہی جنگل میں آپریشن کی بات تو ہم اس معاملے کو چھیڑنے سے فی الحال قاصر ہیں۔ ہمارے وسائل ہمیں اس کام کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔''

ذیشان سنجیدگی سے اسے بتاتا چلا گیا جس پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، آپ جو مناسب سمجھتے ہیں، مجھے وہ کام دے دیں۔ ہم تو ہاتھ پیر کھولنے کے لیے کب سے ترس رہے ہیں۔''

''کیوں، عمر فاروق صاحب کے ساتھ رہ کر تمہیں ہاتھ پیر کھولنے کا موقع نہیں مل رہا ہے کیا؟ وہ تو ماہرِ سخت گیر انسٹرکٹر ہیں جو بندے کا تیل نکل جانے تک اس سے مشقت کرواتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، عمر صاحب نے واقعی ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ جنگل کا شیر قفس میں خوش نہیں رہتا۔ اسی لیے میں بھی چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملے۔''

''تو بھئی مل رہا ہے نا موقع.....اپنا بوریا بستر سمیٹو اور یہاں سے امریکہ جانے کی تیاری کرو۔ تمہارا اگلا مشن وہیں ہو گا۔ اس دوران تمہاری بیوی ہماری مہمان ہو گی اور ہم اس کا ہر ممکن خیال رکھیں گے۔'' ذیشان کے جواب نے مشابرم خان کے چہرے پر حیرت دوڑا دی۔

''امریکہ.....لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟'' حیرت نے الفاظ کا روپ بھی اختیار کر لیا۔

''تمہیں ماہ بانو نامی وہ لڑکی یاد ہوگی، جسے شہریار صاحب نے چودھری کے پنجوں سے بچائے رکھا تھا۔ اس لڑکی کی بعد میں انہوں نے اسلم نامی ایک شخص سے شادی کروا کر ان دونوں میاں بیوی کو امریکہ میں ایک جگہ آرلینڈ وشفٹ کر دیا تھا جہاں وہ دونوں بہت سکون سے رہ رہے تھے۔ لیکن اب اچانک ہی ماہ بانو پُراسرار طور پر وہاں سے غائب ہوگئی ہے اور اسلم بھی اس کی تلاش میں نکلنے کے بعد لاپتہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں جا کر ماہ بانو کو تلاش کرو۔ کیونکہ شہریار صاحب کے پیچھے اس مسئلے کو حل کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔'' ذیشان بولتا جا رہا تھا اور مشابرم خان کے دل و دماغ گویا آندھیوں کی زد میں آ گئے تھے۔

شہریار کے ساتھ کافی عرصے سے کام کرنے کی وجہ سے وہ ماہ بانو سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ماہ بانو ہی تھی جسے پناہ دینے کی پاداش میں اسے اپنے جوان بھائی اور ماں کی قربانی دینی پڑی تھی۔ شہریار کے زبان سے اظہار نہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ ماہ بانو کی شہریار کے دل میں بہت خاص جگہ ہے اور چاہے وہ اس لڑکی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے یا نہ بنائے، اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتا ہے۔ اس دل سے جو ایک عرصے سے مشینوں کے سہارے زندہ تھا اور مشابرم خان جیسے چند مخلص ہر صبح اس امید کے ساتھ اپنے بستر سے اُٹھتے تھے کہ آج کا سورج دیکھنے کے لیے تو شہریار ضرور ہی اپنی آنکھیں کھولے گا۔ لیکن وہ تو سب سے بے خبر طویل نیند سو رہا تھا۔ سی ایف پی کے شہریار کے کوما میں چلے جانے والے ڈرامے کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف تھے اور مشابرم خان سمیت ہر ایک یہی پوچھتا تھا کہ شہریار کوما کی حالت میں ہسپتال کے بستر پر پڑا موت اور زندگی کے درمیان اٹکا ہوا ہے۔

''آپ فکر نہ کریں سر جی! اور بس امریکہ پہنچنے کا بندوبست کر دیں۔ ہم اپنی جان دے کر بھی ماہ بانو بی بی کو ڈھونڈ نکالے گا۔'' وہ اس وقت خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ شہریار کی اس کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی اور وہ عقیدت کی حد تک اس سے محبت کرتا تھا چنانچہ اس لڑکی کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا جو اس کے یقین کے مطابق شہریار کی محبت تھی۔

''تمہارے اس خلوص کی وجہ سے ہی میں نے اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ لیکن تمہارے اوپر کوئی زور زبردستی بھی نہیں ہے۔ اگر نہ جانا چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہاں پہنچنے کے بعد تم اتنی آسانی سے واپس نہیں آ سکو گے۔ وہاں بہت سے معاملات کافی اُلجھے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے جب ہم یہاں سے ایک بندہ وہاں بھیجیں گے تو اس کو وہ سب بھی دیکھنا پڑے گا۔ تمہاری کچھ عرصہ پہلے شادی ہوئی ہے کہیں تمہیں اپنی بیوی کو چھوڑ کر جانا ناگوار تو نہیں گزرے گا؟''

''بالکل بھی نہیں۔ ہماری بیوی بھی ہماری طرح پہاڑوں کی اولاد ہے اور پہاڑ جیسا مضبوط دل رکھتی ہے۔ ہم بولے گا تو وہ خوشی سے ہمیں رخصت کرے گی۔'' مشابرم خان نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر جانے کی تیاری کرو۔ تمہیں یہاں سے پہلے دُبئی بھیجا جائے گا اور پھر وہاں سے تم آگے جاؤ گے۔ سفر سے متعلق دیگر ہدایات تمہیں عمر فاروق صاحب کے ذریعے پہنچتی رہیں گی۔'' یہ جملے مشابرم خان کے لیے اشارہ تھے کہ ملاقات ختم ہو چکی ہے۔

وہ انکساری سے ذیشان کو سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا جبکہ ذیشان اپنی جگہ بیٹھا گہری سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سوچ کا مرکز شہریار عادل تھا جو اپنے بجائے دوسروں کے لیے جینے کو ترجیح دیتا تھا اور اس وقت بھی وطن کے مفاد میں گمنام حیثیت سے جدوجہد میں مصروف تھا اور جدوجہد بھی ایسی تھی کہ جس میں ناکامی کی صورت میں کوئی اس کی لاش کو اون (Own) کرنے والا بھی نہ ہوتا۔ نہ ہی کامیابی پر کسی تمغے یا



[illegible] سے نوازا جاتا۔ حقیقی مجاہد ایسا ہی ہوتا ہے۔ انجام کی پروا کیے بغیر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے جدوجہد [illegible] نے والا۔

⊛----✪----⊛

''میرے ساتھی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کیا آپ ہسپتال جانے کے لیے کسی گاڑی کا [illegible] بندوبست کر سکتے ہیں؟'' اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل پیرا شہریار نے انٹرکام پر ہوٹل کے کلرک سے [illegible] لیا اور نہایت پریشان لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''شیور سر! میں ابھی ایمبولینس کے لیے کال کرتا ہوں۔'' جواب میں کلرک نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے [illegible] اسے یقین دہانی کرائی اور واقعی چند منٹ کے وقفے کے بعد ایمبولینس حاضر تھی۔ پیٹ پکڑ کر بری طرح [illegible] ہوئے سلّو کو تیزی سے اس میں منتقل کیا گیا۔ شہریار ایک بیگ تھامے اس کے ساتھ تھا اور راستے بھر پسینے [illegible] شرابور، درد سے دہرے ہوتے سلّو کو دلاسا دیتا رہا تھا۔

ایمبولینس کے ڈرائیور نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے بہت تیزی سے انہیں ہسپتال [illegible] ایمرجنسی میں پہنچا دیا جہاں سلّو کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرز مختلف [illegible] سوالات بھی کرتے چلے گئے تاکہ کیس کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔

سلّو تو تکلیف سے اتنا بے حال تھا کہ اس پر نیم غشی طاری ہو رہی تھی اور ڈاکٹرز کے سوالات کے جواب [illegible] کا فریضہ انجام دیتا شہریار اس کی بھرپور اداکاری پر دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا۔ یہاں آنے [illegible] پہلے اس نے سلّو کو ایسی دوا استعمال کروائی تھی جس کی وجہ سے جسم سے پسینے کا اخراج بہت زیادہ بڑھ جاتا [illegible]۔ اس طرح ڈاکٹرز کو یہ یقین کرنا آسان رہتا کہ واقعی وہ بہت تکلیف میں ہے۔ ہسپتال پہنچنے کے لیے [illegible] کے درد کا بہانہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اس جھوٹ کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا اور ڈاکٹرز مختلف امکانات [illegible] سامنے رکھتے ہوئے اصل مرض تک پہنچنے کے لیے اُلجھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ترکیب اُنہیں ہسپتال میں قیام [illegible] ایک اچھا بہانہ فراہم کر سکتی تھی چنانچہ ڈاکٹرز کی ہدایات پر نرس کے لگائے جانے والے پین کلر کو بھی سلّو [illegible] مسترد کر دیا اور بتایا کہ ہنوز درد اتنی ہی شدت سے ہو رہا ہے۔

''میرا خیال ہے ہمیں انہیں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔ ایڈمٹ کر کے ہم ان کا الٹراساؤنڈ اور دوسرے [illegible] کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اچانک اُٹھنے والے اتنے شدید درد کی کیا وجہ ہے۔'' بالآخر ڈاکٹر کے منہ [illegible] الفاظ ادا ہوئے جنہیں سننے کے لیے ان دونوں کے کان منتظر تھے۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو جو کرنا ہے، کرو۔ پر میرے بھرا کو ٹھیک کر دو۔ مجھ سے اس کی اتنی [illegible] دیکھی نہیں جا رہی ہے۔'' شہریار نے ایک محبت کرنے والے پریشان حال بڑے بھائی کی طرح ڈاکٹر [illegible] التجا کی۔

''ڈونٹ وری۔ بھگوان نے چاہا تو یہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے اسے پیشہ ورانہ انداز میں [illegible] سے لہجے میں تسلی دی اور اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ایک بار پھر سلّو کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ [illegible] کی ہدایت پر سلّو کا ٹریٹمنٹ کیا جانے لگا اور بالآخر جب اُسے مزید ایک اور انجکشن کے علاوہ ڈرپ بھی لگا [illegible] گئی تب اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ اس کے درد میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اس دوران شہریار [illegible] ہسپتال میں داخلے کی کارروائی نمٹاتا رہا۔

کارروائی مکمل ہوتے ہی سلّو کو دوسری منزل پر واقع کمرہ نمبر 88 میں منتقل کر دیا گیا۔ [illegible] اگروال

سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ڈاکٹر فرحان کو ہسپتال کی تیسری منزل پر رکھا گیا تھا جہاں عموماً ذہنی امراض میں مبتلا افراد کو رکھا جاتا تھا۔

''یہ مرحلہ تو طے ہو گیا۔ اب ہم اطمینان سے یہاں رہ کر جائزہ لے سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو کس طریقے سے یہاں سے نکالا جائے۔'' سلّو کو یہاں منتقل کرنے والے ماتحت عملے کے علاوہ جب قدرے مطمئن ڈاکٹر اور نرس بھی کمرے سے باہر نکل گئے تو شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''تمہاری اس ترکیب نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کم بختوں نے سوئیاں گھونپ گھونپ کر میرا ہاتھ چھید ڈالا ہے۔'' سلّو نے قدرے غصے سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کی مدد سے چپکائی گئی، درید میں گھسی سوئی کو کھینچ کر باہر نکالا۔ سوئی نکلتے ہی خون بہنے لگا جسے اس نے ایک رُوئی کے پھاہے کی مدد سے دبا کر روکا۔

''مجبوری تھی برخوردار!..... ورنہ مجھے بھی شوق نہیں تھا کہ تم جیسے ہٹے کٹے آدمی کو ہسپتال میں داخل کر کے اس کے ناز نخرے اُٹھاؤں۔'' شہریار نے اسے ترنت جواب دیا اور بیگ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اندر جدید ساخت کی ایک گن تین حصوں میں منقسم صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ چند چھوٹے ہتھیار اور دستی بم بھی موجود تھے۔

یہ اشیا کپڑوں کی تہ کے درمیان رکھی تھیں اور سلّو نہیں جانتا تھا کہ شہریار نے ان کا بندوبست کب اور کیسے کیا؟ وہ بہت اشتیاق سے گن کو دیکھ رہا تھا اور انداز کچھ ایسا تھا جیسے اپنے من پسند کھلونے کو ہاتھ میں لینے کے لیے بے چین ہو۔

''اس کے پارٹس جوڑ کر اپنے بستر کے نیچے چھپا لو۔ کھیل شروع ہونے پر اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے تو ہم کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر کو خاموشی سے یہاں سے نکال کر لے جائیں لیکن ظاہر ہے دوسری پارٹی کی طرف سے شدید مزاحمت کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے میں یہ بہت کام آئے گی۔''

کمرے میں کسی کے موجود نہ ہونے کے باوجود اس نے نہایت دھیمی آواز میں سلّو سے کہا اور خود بیگ میں ہی موجود ایک چھوٹے چرمی بیگ میں دو دستی بم رکھ کر اسے بیلٹ کی مدد سے اپنے پیٹ پر باندھنے لگا۔ اندر اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اور ایسی ہی ایک جیکٹ سلّو کے لیے بیگ میں رکھی تھی۔ اسے چونکہ مریض کا کردار ادا کرنا تھا، اس لیے وہ ہوٹل سے ہی یہ جیکٹ پہن کر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ سارا سامان اسی بیگ سے نکلا تھا جو بظاہر آرٹیفیشل جیولری سے بھرا ان کے ساتھ ممبئی سے یہاں تک آیا تھا۔

سلّو نے اس بیگ کے بارے میں ازخود بہت کچھ سمجھ لیا تھا اور شہریار سے کسی قسم کا استفسار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا اور اس وقت بھی پوری توجہ سے گن کے مختلف حصے جوڑنے میں مصروف تھا۔ یہ ہتھیار اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ ''را'' سے تربیت حاصل کرنے کے دوران اُس نے اس خطرناک گن کو بھی استعمال کرنا سیکھا تھا۔

گن روسی ساختہ تھی، شاید اسی لیے شہریار نے یہ جانے بغیر کہ وہ اسے استعمال کر بھی سکتا ہے یا نہیں اس کے حوالے کر دی تھی۔ بھارتی اسلحہ شناس اپنے دوست روس کے تیار کردہ اسلحے کو بھی بہت اچھی طرح استعمال کرنا جانتے تھے چنانچہ سلّو کا اس سے ناآشنا ہونا مشکل ہی تھا۔

ایک منٹ دس سیکنڈ کے اندر گن کے تینوں حصوں کو جوڑ کر ورکنگ پوزیشن میں لاتے ہوئے سلّو نے اپنی واقفیت کو ثابت بھی کر دیا۔ گن اس کے بستر کے نیچے منتقل ہوئی تو شہریار بھی پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔



اس کے جسم پر موجود ڈھیلی ڈھالی شرٹ کچھ اس طرح کی تھی کہ کسی کے لیے اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ اندر بلٹ پروف جیکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔

''میرے جانے کے بعد اگر کوئی یہاں آئے تو تم اسے سوتے ہوئے نظر آنے چاہئے ہو۔ اس صورت میں کوئی تمہیں مخاطب نہیں کرے گا۔ بالفرض کسی نے تم سے میرے بارے میں دریافت کر لیا تو تم اسے بتاؤ گے کہ میں اپنی اور تمہاری ضروریات کا سامان لینے گیا ہوا ہوں۔ باقی الٹرا ساؤنڈ یا دوسرے ٹیسٹوں کے لیے تو اب وہ صبح ہی کہیں گے اس لیے تمہیں اب یہاں لیٹ کر میری طرف سے اشارہ ملنے کے سوا کچھ نہیں کرنا۔''

کمرے سے نکلنے سے قبل اس نے سلّو کو ہدایات دیں اور خود چٹخنی کھول کر باہر قدم رکھا۔ یہ چٹخنی اس نے ڈاکٹر اور دیگر عملے کے کمرے سے باہر جانے پر خود لگائی تھی تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ سکے۔

کمرے کے باہر رات کا وقت ہونے کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا تاہم طاقتور لائٹس کی وجہ سے ماحول پوری طرح روشن تھا۔ وہ پُراعتماد قدموں سے چلتا ہوا تیسری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ یہاں بھی نیچے کی طرح تقریباً سناٹا ہی تھا۔ بس ایک آدمی اس کمرے کے سامنے جہاں ڈاکٹر فرحان کو رکھا گیا تھا، کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہر فلور کی طرح یہاں بھی طبی عملے کے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ عملے کے تمام افراد اس کمرے میں بیٹھے تھے اور اس بات کا انتظام تھا کہ جہاں بھی کسی مریض کو ضرورت پیش آئے، وہ اپنے بیڈ کے ساتھ لگا بٹن دبا دے۔ عملے کو فوراً پتہ چل جاتا کہ انہیں کس کمرے سے کال کیا گیا ہے۔ مریضوں سے ملاقات کے لیے آنے والے وزیٹرز کو بھی اگر کسی قسم کی معلومات درکار ہوتیں تو وہ بھی اسی عملے سے رابطہ کر سکتے تھے لیکن اس کی ضرورت بہت کم ہی پیش آتی کیونکہ سیڑھیوں اور لفٹ کے عین مقابل موجود دیوار پر ایک اسابورڈ آویزاں تھا جہاں ہر کمرہ نمبر کے ساتھ اس میں داخل مریض کا نام جلی حروف میں درج تھا۔

شہریار نے بورڈ اور کرسی پر براجمان شخص پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور بغیر رُکے سیدھا چلتا ہوا ڈاکٹر فرحان کے کمرے کے سامنے سے گزر کر اس کے دائیں جانب موجود کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے قطعی علم نہیں تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا یا نہیں۔ اس نے بس ایک چانس لیا تھا اور خوش قسمتی سے اس کے ہینڈل دبانے پر دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

اس نے پورے اعتماد سے دروازے سے قدم اندر رکھا اور پھر پھرتی سے اسے بند بھی کر دیا۔ باہر کرسی پر جھکا کر بیٹھا شخص اس کے انداز کو دیکھ کر یہی اندازہ لگا سکا ہو گا کہ وہ اس کمرے میں داخل مریض کا کوئی رشتے دار ہے جو اس کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ باہر بورڈ پر نظر ڈالنے پر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں سنگیتا نامی کوئی عورت داخل ہے، اب باقی تفصیل بھی معلوم ہو گئی۔ بستر پر ہاتھوں کے ساتھ دراز عورت پچاس کے پیٹے میں تھی اور سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر وحشت ناک اثرات نظر آ رہے تھے جو اس کے ذہنی مریض ہونے کا ثبوت تھے۔ عورت کے ساتھ اٹینڈنٹ کے طور پر بیس بائیس سالہ ایک لڑکی موجود تھی جو بیڈ کے قریب رکھے کاؤچ پر نیم دراز تھی۔ اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کا ارادہ ہی نیند سے مغلوب ہو کر اچانک سو گئی ہے۔ بالوں کی کئی لٹیں اس کی چٹیا سے نکل کر چہرے پر پھیل گئی تھیں اور مناسب نقوش والے گندمی چہرے کو دلکشی عطا کر رہی تھی۔ اس کا سویا ہوا ہونا شہریار کے لیے باعث اطمینان ثابت ہوا ورنہ دوسری صورت میں اسے پھرتی سے کام لے کر پہلے اس لڑکی کو قابو میں کرنا تھا۔ اب بھی وہ اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ میں تھامی ہوئی چھوٹی سی بوتل کا رخ اس کے چہرے کی طرف کر

کے اس پر بے ہوشی کی دوا اسپرے کی۔

دوا کی پھوار سی پڑنے پر لڑکی ذرا کسمسائی لیکن آنکھیں کھول کر جائزہ لینے سے قبل ہی اس پر دوا کا اثر غالب آ گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بے ڈھنگے انداز میں کاؤچ پر گر گئی۔ شہریار نے اسے سنبھال کر طریقے سے لٹایا اور پائینتی پڑی پر چادر کھول کر سینے تک اسے اوڑھا دی۔ دیکھنے والے کو یہی لگتا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ لڑکی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ مریض عورت کی طرف بڑھا۔ وہ گہری نیند رہی تھی اور امکان یہی تھا کہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر ہو۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً اس کے چہرے پر بھی دوا کا اسپرے کر دیا لیکن ذرا کم مقدار میں۔ ورنہ پہلے سے ہی ذہنی مرض میں مبتلا عورت کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا اور بہر حال وہ اس لڑائی میں کسی بے قصور اور غیر متعلق شخص کو نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔

دونوں خواتین سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر تقریباً آٹھ انچ کا برمے نما شے نکالی۔ اس آلے کے ساتھ بجلی کا ایک تار بھی تھیلے کی صورت منسلک تھا۔ اُس نے تار کے ساتھ منسلک پلگ کو دیوار میں نصب الیکٹرک بورڈ کے ساکٹ میں لگایا اور آلے کی تیز نوک دیوار پر رکھ کر بٹن پکڑ کر دیا۔ ننھے سے آلے نے مضبوط دیوار کو اس طرح کاٹنا شروع کر دیا جیسے وہ محض ہارڈ بورڈ کی بنی ہو۔ آواز کے اعتبار سے اس برمے نما آلے کی آواز تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اور اُسے اُمید تھی کہ کمرے میں پورے رفتار سے چلتے پنکھے کی آواز میں ہی گم ہو جائے گی۔ یہ خاص آلہ بھی اس نے ممبئی میں موجود اپنے ہمدرد سے ہی منگوایا تھا۔ حقیقتاً اس نے ساری منصوبہ بندی عبدالرحمٰن کے فراہم کردہ بنگلے میں ہی مکمل کر لی تھی۔ ایسا، نیٹ سے حاصل کیے گئے ہسپتال کے نقشے کو دیکھنے پر ممکن ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ تیزی سے دیوار کو ہوا ٹیکنالوجی کی جدت پر عش عش کر رہا تھا۔

اس نے چند منٹوں میں دیوار کو اس طرح کاٹ لیا کہ وہ احتیاط سے کٹے ہوئے حصے کو نکالتا تو اتنا بڑا پیدا ہو جاتا جس میں سے ایک عام جسامت کا آدمی گزر سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر فرحان جمیل کی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ وہ خاصے اسمارٹ آدمی تھے اور اُمید کی جا سکتی تھی کہ اس خلا میں سے آسانی سے گزر جائیں گے۔ ''را'' کی قید میں رہ کر ان کی صحت کے اچھا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئے ہوں۔

برمے کو واپس اپنی جیب میں رکھ کر اس نے احتیاط سے دیوار کے کٹے ہوئے حصے کو نکالنا شروع کر دیا۔ اس دوران اس نے ایک بار پلٹ کر بے ہوش عورت اور لڑکی کو بھی دیکھا۔ دونوں بدستور غافل تھیں۔ اس نے دیوار کا کٹنے والا چوکھٹا ٹکڑا نکال کر دیوار کی جڑ کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ بننے والا خلا روشن تھا اور اس خلا سے گزر کر اس کمرے تک بھی آ رہی تھی جس میں وہ خود موجود تھا۔

اس نے خلا میں سے جھانک کر ڈاکٹر فرحان کے کمرے میں دیکھا اور ایک خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔ نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ ایک صاف ستھری چادر کو چار تہ میں کر کے کمرے کے فرش پر بچھائے بڑے خشوع و خضوع سے محوِ عبادت تھے۔

شہریار نے بہت غور سے ان کا جائزہ لیا۔ وہی کشادہ پیشانی اور روشن آنکھیں تھیں جنہیں اس نے تصویر میں دیکھ کر ان کے ذہین ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔ البتہ صحت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اب وہ باریش ہو گئے تھے اور یہ ریش کھچڑی بالوں پر مشتمل کچھ اُلجھی اُلجھی سی تھی۔



کے سر کے بال بھی چھدرے اور خاصی حد تک سفید ہو چکے تھے اور ظاہر ہے یہ ''را'' کی قید میں ملنے والے تحفے تھے۔ اُسے اُن کے بائیں رخسار پر زخم کا مندمل ہو جانے والا ایک تین انچ کا نشان بھی نظر آیا تھا جو یقیناً اس تشدد کی نشانی تھا جو انہوں نے ''را'' کی قید میں سہا ہوگا۔

''میں ٹارگٹ پر پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں سلّو کو اطلاع دی۔ اس سرگوشی کو حساس آلے کی مدد سے سن کر بستر پر لیٹے ہوئے سلّو کو کیا کرنا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ لوگ کسی ہنگامے کے لیے تیاری کر کے آئے تھے لیکن اب تک جتنی سہولت سے ہر کام ہو رہا تھا، امید بندھ چلی تھی کہ بغیر کسی مارا ماری کے وہ نہایت صفائی سے ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہیں ان کے کمرے سے اس کمرے میں لا کر اگر وہ ان کے حلیے میں معمولی سا ردّ و بدل کر دیتا اور وہ دونوں خود اعتمادی سے چلتے ہوئے لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور اور پھر وہاں سے پارکنگ میں پہنچ جاتے تو کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ یہاں سے ''را'' کے کسی قیدی کو آزاد کروا کر لے جایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فرحان کے کمرے کے دروازے پر پہرے داری پر مامور شخص بھی اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہ جاتا۔

اتنا سکون کچھ غیر فطری بھی تھا۔ انسپکٹر پریم ناتھ سے ہونے والے ٹاکرے کے نتیجے میں ''را'' کے کانوں تک یہ بھنک پہنچ گئی تھی کہ کچھ لوگ ڈاکٹر فرحان جمیل کو رہا کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد انہیں ویسے ہی الرٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے بعد ارجن اگروال کے دِلا پر کی گئی ان کی کارروائی بھی خاصی قابل غور تھی۔ ارجن اگر واقعی اب بھی اتنا سیریس تھا کہ کوئی بیان نہ دے سکا ہو اور اس کی بیوی نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی تھی، تب بھی ''را'' جیسی گھاگ ایجنسی کے کرتا دھرتاؤں کو ٹھٹک جانا چاہئے تھا اور نتیجے میں ڈاکٹر فرحان کو یا تو یہاں سے شفٹ کر دینا چاہئے تھا یا پھر ان کی سکیورٹی اتنی سخت ہونی چاہئے تھی کہ چڑیا کا بچہ بھی پَر نہ مار سکے۔ لیکن وہ تو بس کرسی پر ایک اونگھتے ہوئے اہلکار کو کمرے کے باہر بٹھا کر مطمئن ہو گئے تھے۔ کم از کم نظر یہی آ رہا تھا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ کچھ نادیدہ وجود یا آلات اتنی خاموشی سے نگرانی پر مامور ہوں کہ دیکھنے والی نظریں دھوکا کھا جائیں۔ شہریار کی آنکھیں بھی یہ دھوکا کھا رہی تھیں۔ دھوکا نہ بھی کھاتیں تو اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اسے ڈاکٹر فرحان کو ہر صورت یہاں سے نکال کر لے جانا تھا۔ اور اس کام کے لیے وہ ہر طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اوکھلی میں سر دے کر موسلوں سے ڈرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر کے کمرے میں جانے کی جلدی دکھانے کے بجائے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا جائزہ مکمل کیا۔ ہسپتال کے مخصوص ماحول والے کمرے میں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کی مدد سے ڈاکٹر خود کو یا کسی دوسرے کو کوئی نقصان پہنچا پاتا۔ یہاں تک کہ بستر کے سرہانے رکھی تپائی اور اس پر رکھا جگ گلاس تک ہلکی پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے جن سے ڈاکٹر قطعی تشدد کے کسی آلے کا کام نہیں لے سکتا تھا۔ کسی قسم کے آرائشی سامان کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملحقہ غسل خانے میں بھی استعمال کا سامان یقیناً ایسا ہوگا کہ بس ضرورت پوری کی جا سکے، کوئی فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے۔

غسل خانے کا دروازہ بند تھا اس لیے وہ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر بننے لکھنے والا ایک بے ضرر سا آدمی تھا جس سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے واقف ہوگا۔ وہ بے چارہ تو بس اپنی ایک تحقیق کی جس سے وطن کو کوئی فائدہ پہنچ سکے، سزا جھیل رہا تھا اور اس کمرے میں اب تک صرف اس لیے زندہ تھا کہ اس نے تمام تر حربوں کے باوجود زبان نہیں کھولی تھی۔

ڈاکٹر نے سلام پھیرا تو وہ چوکور خلا پار کر کے اس کے کمرے میں جا پہنچا اور عین اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ڈاکٹر واضح طور پر ٹھٹکا۔

''تعارف کے لیے وقت بہت کم ہے ڈاکٹر صاحب! بس اتنا جان لیجئے کہ میں آپ کو پاکستان واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔''

اُنہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے ان کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے آگاہ کیا۔ جواب میں انہوں نے گردن کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دی اور شہادت کی انگلی سے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

شہریار دیکھ چکا تھا کہ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سے کسی ایک میں بھی ناخن موجود نہیں ہیں لیکن اس وقت اس بات پر غور کرنے کے بجائے انگلی کے اشارے کو سمجھنا ضروری تھا۔

وہ برق رفتاری سے باتھ روم کے دروازے کی طرف پلٹا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ چست جینز اور جیکٹ میں ملبوس خطرناک گن ہاتھ میں تھامے ایک شناسا سی شکل اس کے سامنے تھی۔ وہ اوشا تھی جو ممبئی سے یہاں آتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھ کر سفر کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔

''مجھے سامنے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟'' اس نے گویا شہریار کی حالت سے حظ اٹھایا اور مذاق اُڑانے والے انداز میں بولی۔ ''تم نے کیا سوچا تھا کہ تم اتنی آسانی سے ''را'' کے پنجوں سے شکار چھین کر لے جاؤ گے اور کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہوگا۔ یہ تمہاری غلط فہمی تھی مسٹر! ہم نے ڈاکٹر کو پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہاں رکھا ہوا ہے۔ اس فلور کے کوریڈور اور ڈاکٹر کے کمرے میں نگرانی کے لیے کیمرے لگے ہوئے ہیں اور باہر بیٹھ کر پہرہ دیتا احمق محض تم جیسوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہے۔ تمہاری آمد کی اطلاع ہمیں اسی وقت ہو گئی تھی جب تم سیڑھیوں سے اوپر پہنچے تھے۔ تم نے اپنا حلیہ اس حلیے کے مقابلے میں خاصا تبدیل کر لیا ہے جس میں سفر کر رہے تھے لیکن پھر بھی میری نگاہیں بالکل اسی طرح تمہیں پہچان سکتی ہیں جیسے میں نے بس میں تمہارے برابر میں بیٹھ کر یہ جانچ لیا تھا کہ تم میک اپ میں ہو۔ اتفاق سے میں اس ہوٹل میں موجود تھی جس میں بیٹھ کر تم نے اپنے ساتھی کے ساتھ چائے پی تھی اور بس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس بات پر کھٹک گئی تھی کہ تمہارے برابر کی سیٹ خالی ہونے کے باوجود تم اور تمہارا ساتھی الگ الگ سفر کر رہے تھے۔ میں ''را'' کی اسپیشل ایجنٹ ہوں اور ارجن اگروال پر حملے کے بعد خاص طور پر یہاں بھجوائی گئی ہوں۔ چاہتی تو ہیلی کاپٹر سے بھی یہاں آ سکتی تھی لیکن بس میں آنے کا فیصلہ صرف یہ سوچ کر کیا کہ تم جیسے لوگ کس ذریعے کو سب سے محفوظ سمجھ کر اس سے سفر کر سکتے ہیں۔ اور دیکھ لو کہ میں نے پہلے ہی مرحلے پر تمہیں پہچان لیا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ تم بہت اسمارٹ ہو اور پیچھا ہونے پر فوراً سمجھ جاؤ گے اس لیے میں نے اپنے ایک آدمی کو تمہارے ساتھی کے پیچھے لگا دیا لیکن وہ احمق کامیاب نہ رہا۔ اب ہمارے پاس ایک راستہ تھا کہ شہر کے ہوٹلوں وغیرہ میں تمہیں تلاش کریں۔ لیکن میں نے اس طرف اپنی انرجی ویسٹ کرنے کے بجائے یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنا بہتر سمجھا کیونکہ تمہیں ہر حال میں آنا تو یہیں تھا۔ اور دیکھو تم کتنی آسانی سے چوہے دان میں آ پھنسے ہو۔ اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟''

وہ شاید بہت زیادہ بولنے کی عادی تھی اس لیے ایک ہی سانس میں اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی لیکن اس دوران بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھی اور شہریار اس کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ہتھیار نہیں نکال سکتا تھا۔ نہ ہی براہ راست اس پر حملہ کر کے اس کی گن چھین سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں وہ گولی چلا دیتی اور اسے خود سے زیادہ ڈاکٹر فرحان کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا جو اس کے بالکل قریب ہی بیٹھے بس خاموشی سے اس ساری صورتحال کو دیکھ رہے تھے۔



''اوکے، میں مانتا ہوں کہ ''را'' کی اسپیشل ایجنٹ اوشا دیوی مجھ سے زیادہ انٹیلی جنٹ ثابت ہوئی اور اس نے بہت آسانی سے مجھے گھیر لیا ہے۔ اب آگے بولو کہ کیا کرنا ہے؟'' وہ سمجھتا تھا کہ صورتِ حال کتنی گمبھیر ہے۔ اوشا اور باہر پہرے پر موجود شخص کے علاوہ بھی کئی افراد ہوں گے جو ہسپتال کے اندر اور باہر پھیلے ہوں گے اور اوشا کے ایک اشارے پر حرکت میں آ جائیں گے۔

وہ ان ساری باتوں سے ڈرنے والا نہیں تھا لیکن مناسب موقع کا انتظار بھی کرنا ضروری تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس فلور پر آنے کے بعد ٹریس ہوا تھا اور وہ لوگ سلّو کی موجودگی کے مقام سے ناواقف تھے۔ سلّو جو ظاہر ہے اپنے آپریٹس پر یہاں ہونے والی ساری گفتگو سن رہا تھا، صورتِ حال کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کر سکتا تھا۔ اوشا خوش تھی کہ اسے چوہے دان میں پھنسا چکی ہے جبکہ وہ اپنی جگہ پُرامید تھا کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے اور جب تک بدن میں سانسیں باقی ہیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔

''آگے جو کچھ ہوگا، وہ خود ہی تمہارے سامنے آتا جائے گا۔ ابھی تم اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اُٹھاؤ اور یہاں سے باہر نکلو۔'' وہ مستقل مضحکہ اُڑانے والے لب و لہجے میں اس سے گفتگو کر رہی تھی اور شاید خوش تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر اس پر اپنی برتری ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

ایک ایسا شخص جو مبینہ طور پر ''را'' کے ایک اہم ٹھکانے کو کُل اسٹاف سمیت نیست و نابود کر دینے کا ذمے دار تھا، جس نے پریم ناتھ جیسے پولیس افسر کو اغوا کر کے برے حال تک پہنچا دیا تھا اور جو ارجن اگروال جیسے حفاظتی حصار میں رہنے والے ایجنٹ کے سینے میں گولی اتار کر اسے انتہائی سیریس حالت میں ہسپتال پہنچا چکا تھا، اگر اتنی آسانی سے اس کے قابو میں آ گیا تھا تو اس کے لیے یہ خوشی ہی کی بات تھی اور اس خوشی میں ابھی اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کسی بھی قسم کی مزاحمت نہ کرنے والے مقابل کو ان ہتھیاروں سے نہتا کر دے جو بظاہر نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی عقل مند آدمی سمجھ سکتا تھا کہ اتنے اہم مشن پر آنے والا شخص خالی ہاتھ تو ہرگز بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ خوشی اور جوش میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

''معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! میں یہاں تک آ کر بھی آپ کی مدد نہیں کر سکا۔'' اس نے اوشا کے احکامات پر فوری طور پر عمل کرنے کے بجائے ڈاکٹر کی طرف رخ کیا اور نہایت افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ بولتے ہوئے اس نے آنکھوں سے ڈاکٹر کو ایک اشارہ بھی کیا جسے ذہین ڈاکٹر نے فوراً سمجھ لیا۔ چنانچہ جب شہریار اس سے اپنی بات کہہ کر اس انداز میں اوشا کی طرف مڑا کہ اس کا دایاں پہلو ڈاکٹر کی طرف تھا، ڈاکٹر کی انگلیوں نے اپنا کام کر دکھایا۔

''ڈاکٹر صاحب کی چنتا مت کرو۔ یہ بڑے سیانے دیوانے ہیں۔ تمہارے بعد کسی اور کے آنے کی ارتھنا کرنے کے لیے دوبارہ اپنے خدا کے سامنے جم جائیں گے۔''

اوشا نے ڈاکٹر کا مضحکہ اُڑایا اور اسے گن سے اشارہ کیا کہ دروازے کی طرف بڑھے۔ اس وقت وہ اپنی کامیابی کے نشے میں اس قدر خود اعتمادی میں مبتلا تھی کہ باہر موجود اپنے آدمی تک کو اندر بلانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر شہریار بڑے اطمینان سے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اوشا گن لیے عین اس کے پیچھے تھی۔

''رکھو! دروازہ کھولو۔'' اس نے بھی یقیناً کسی آپریٹس پر موجود اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ جواباً فوراً ہی دروازہ

کھل گیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر فرحان نے شہریار کی توقع سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اوشا کے عین عقب میں پہنچ کر اس برمے نما آلے کی نوک اس کی گردن کی پشت میں اُتار دی جو انہوں نے شہریار کے اشارے پر اس کی جیب سے نکالا تھا۔

اوشا کے ہونٹوں سے وار کھا کر ایک تیز چیخ نکلی اور اس سے قبل کہ اس کا دروازہ کھولنے والا ساتھی کچھ کر پاتا، شہریار بجلی کی طرح تڑپ کر اوشا پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اوشا کی گن پر ہاتھ ڈالا تھا اور اب وہ گھائل حالت میں خود اس کے نشانے پر تھی۔

''میڈم کو چھوڑ دو۔ تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے درجنوں کمانڈوز نے ہسپتال کی پوری بلڈنگ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔'' رگھو کے نام سے پکارا جانے والا وہ بندہ خلاف توقع منظر دیکھ کر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا پھر اسے دھمکی دینے لگا۔

''ان درجنوں میں سے ایک تو ابھی کم ہو گیا۔'' شہریار نے اس کی دھمکی کے جواب میں سرد لہجے میں کہا اور بلا تکلف گن کا رخ اس کے ماتھے کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ گولی کھا کر وہ کسی مُردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا۔

''آپ ہتھیار چلا سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' رگھو کی لاش پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بغیر اس نے پشت پر موجود ڈاکٹر فرحان سے دریافت کیا جس کا جواب ان کی طرف سے اثبات میں ملا۔

اس نے فوراً اپنے ہاتھ میں موجود گن انہیں تھما دی اور خود اپنی قمیض کے نیچے سے ایک اور جدید وضع کی گن نکال کر اوشا کو آگے کی طرف دھکیلا۔ ڈاکٹر فرحان کی طرف سے گردن کی پشت پر کیا گیا وار شاید کسی نازک پوائنٹ پر لگا تھا جس نے اوشا کے جسم کو خاصا ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ مکمل طور پر ہوش میں نہیں تھی۔ شہریار نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ رگھو کی لاش اپنے پیروں میں روندتی ہوئی آگے بڑھی۔ شہریار اور ڈاکٹر فرحان البتہ اس لاش کو پھلانگ کر باہر نکلے تھے۔

جیسے ہی وہ باہر نکلے، لفٹ کا دروازہ کھلا اور چار کمانڈوز دندناتے ہوئے باہر نکلے۔ اس بار ڈاکٹر فرحان نے فائر کرنے میں شہریار سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی گن ریٹ ریٹ کی آوازیں نکالتی ہوئی اندھا دھند چلی اور ایک کمانڈو کی زندگی کا چراغ فوراً ہی گل ہو گیا جبکہ دوسرا ٹانگ پر گولی کھا کر نیچے گرا۔ باقی دو کو شہریار نے گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا۔

عین اسی وقت سیڑھیوں کی طرف سے ان پر فائر کیا گیا لیکن ان لوگوں کی مجبوری یہ تھی کہ شہریار نے اوشا کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا اور ڈاکٹر فرحان کو اس طرح اپنے پیچھے رکھا تھا کہ وہ براہِ راست کسی گولی کی زد میں نہ آ سکیں۔ چنانچہ سیڑھیوں کی طرف سے آنے والی گولیاں بے اثر ہی گئیں اور ان کے قریب سے گزرتی ہوئی دیواروں میں پیوست ہو گئیں۔

''گراؤنڈ فلور پر میں کور دینے کے لیے موجود ہوں۔'' اس نے سیڑھیوں کی طرف سے آنے والے فائر کا جواب دیتے ہوئے اپنے کانوں میں سلّو کی آواز سنی اور ایک گونا گوں اطمینان محسوس کرتے ہوئے پیٹ پر بندھے چرمی بیگ سے ایک دستی بم برآمد کیا۔

یہ خاص نوعیت کا دستی بم تھا۔ جس میں دھماکا خیز مواد تو بہت کم تھا البتہ دھواں ڈھیر سارا نکلتا تھا۔ ہسپتال جیسی جگہ جہاں بہت سے بے قصور افراد بھی موجود تھے، اس قسم کے بم بہت کارگر تھے کیونکہ یہ بہت محدود پیمانے پر تباہی مچاتے اور انہیں بچ نکلنے کے مواقع فراہم کر دیتے۔ بم کی پن کھینچ کر اس نے سیڑھیوں کی



طرف پھینکا تو ہلکا سا دھماکا سنائی دیا اور تیزی سے دبیز دھواں پھیلنا شروع ہو گیا۔

''آیئے سر!'' وہ تیز لہجے میں ڈاکٹر فرحان سے بولتا ہوا اوشا سمیت لفٹ کے کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی سلّو سے بھی رابطہ کیا۔ ''ہم لفٹ سے نیچے آ رہے ہیں۔''

''میں نے ریسیپشن کاؤنٹر کے پیچھے دو ڈاکٹرز اور ایک نرس کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہاں تقریباً چھ کمانڈوز موجود ہیں۔ دو دو لیفٹ اور رائٹ پر اور دو مین ڈور کے پاس۔ لفٹ کھلتے ہی وہ تمہیں چھاپنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے پہلے ہی تم دونوں طرف بم پھینک دینا۔ میں عین اسی وقت دروازے کے پاس والوں کو نشانہ بناؤں گا۔'' سلّو نے اس کے سامنے پلان رکھا جس کی اس نے محض ''اوکے'' سے منظوری دے دی اور فوراً ہی عملدرآمد ہو گیا۔

بازو کے سہارے سے جھولتی اوشا دیوی ڈھال سے زیادہ راہِ عمل میں رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اس لیے اس سے پہلے ایک گولی اس کے سر میں اتار کر اس نے اس بوجھ سے نجات حاصل کی اور پھر دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بم تھام لیا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے پاس موجود گن ڈاکٹر فرحان کو تھمانی پڑی۔

تیز رفتار لفٹ تیزی سے انہیں گراؤنڈ فلور پر لے گئی۔ لفٹ رُکتے ہی وہ ڈاکٹر فرحان کو اشارہ کرتا ہوا لابی سے نیچے بیٹھ گیا۔ لفٹ کا خودکار دروازہ کھلتے ہی اس کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آئے اور دائیں بائیں دونوں بم بیک وقت اچھال دیئے۔ اس عمل میں اس کی ٹائمنگ بہت شاندار تھی۔ دو بموں کی پن کھول کر بیک وقت انہیں دو مختلف سمتوں میں اُچھال دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ دوسرا کارنامہ ڈاکٹر فرحان نے انجام دیا اور اس کے شانوں سے اوپر سیدھے فائر مارنا شروع کر دیئے۔

ان حالات میں اس کے لیے یہی بات سب سے خوشگوار تھی کہ ڈاکٹر فرحان کسی بھی مرحلے پر اس کے لیے بوجھ نہیں بنے تھے اور ٹھیک ٹھاک قسم کی معاونت کر رہے تھے۔ حالانکہ ان سے متعلق جو رپورٹ اس کے پاس تھی، اس کے مطابق تو وہ نہایت ابتر حالت میں ہونے چاہئے تھے۔ وہ ان کے جسم پر تشدد کے نشان بھی دیکھ چکا تھا لیکن تمام تر حقائق کے باوجود وہ انہیں بہت ایکٹیو دیکھ رہا تھا۔ گولیاں ان پر بھی چلائی گئی تھیں اور اگر وہ کھڑے رہنے کی غلطی کرتے تو یقیناً نشانہ بن جاتے۔

''جھک کر زِگ زیگ۔'' اس نے لفٹ سے قدم باہر رکھنے سے پہلے ڈاکٹر کو ہدایت دی اور ان سے اپنی گن واپس لے کر فائر کرتا ہوا خود بھی اسی انداز میں بھاگنے لگا۔ لیکن بھاگتے ہوئے بھی اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ ڈاکٹر فرحان اس کے آس پاس ہی موجود ہوں۔ جن کے لیے جان کی بازی لگائی تھی، انہیں پیچھے چھوڑ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سلّو بھی ان لمحات میں پوری طرح متحرک تھا۔ اپنے کہنے کے مطابق اس نے شہریار کے بالکل ساتھ والے مین ڈور کی طرف بم اُچھال دیا تھا اور اب ہسپتال کے وسیع استقبالیہ حصے میں ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اندھا دھند برسائی جانے والی گولیوں کا بھی شور تھا۔ ان بہت سے ہتھیاروں میں وہ سلّو کے پاس موجود روسی ساختہ خطرناک گن کے چلنے کی آواز الگ شناخت کر سکتا تھا اور یہ آواز بتا رہی تھی کہ سلّو اس وقت مرکزی دروازے کے قریب ہی موجود ہے۔

''آ جائیں، یہاں راستہ کلیئر ہے۔'' اپنے کان میں سنائی دینے والی سلّو کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کی مہر ثابت کر دی۔ وہ ڈاکٹر فرحان کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اس طرف لپکا۔ وہاں دھواں ہی دھواں تھا جو بصارت کو ناکارہ بنا رہا تھا۔ لیکن یہی دھواں ان کی آڑ بھی بنا ہوا تھا۔

وہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھتے چلے گئے۔ کیونکہ اب ان کے لیے راستہ بنانے کی ذمے دا
''را'' کے تخلیق کردہ اس عفریت نے سنبھال لی تھی جو ان سے منحرف ہو کر شہریار کا دست و بازو بنا تھا تو
قدم پر انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اسے ان کے سارے حربے اور ان کے توڑ اچھی طرح
تھے۔ اب بھی اس نے تن تنہا باہر تباہی مچا کر رکھ دی تھی اور گن کے ساتھ بموں کا بھی بے دریغ استعمال کر
تھا۔ اس طرح اس نے ہسپتال کے پارکنگ ایریا تک بہت آسانی سے ان کے لیے راستہ بنا دیا تھا۔

یہ پہلے سے طے تھا کہ وہ یہیں سے کوئی گاڑی لے کر فرار ہوں گے۔ سلّو کی ذہانت کہ اس نے ا
بڑی اور مضبوط ساخت کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے بغیر چابی کے اسٹا
کرنے میں اسے چند سیکنڈز سے زیادہ نہیں لگے۔ اس دوران ڈاکٹر فرحان اور شہریار بھی تیزی سے سوا
گئے تھے۔ شہریار نے سلّو کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی تھی جبکہ ڈاکٹر فرحان پچھلی نشست پر تھے اور شہریا
ہدایت کے مطابق اپنا سر نیچے کی طرف جھکا رکھا تھا۔

سلّو نے غراتے انجن والی گاڑی کو آگے بڑھایا تو انہوں نے ہسپتال کے مین گیٹ کو بند پایا۔ اس
گیٹ کے پار کوئی نصف درجن کمانڈوز کی جھلک وہ یہیں سے دیکھ سکتے تھے لیکن رُکنے کو قطعی تیار نہیں
چنانچہ جیسے ہی گاڑی اتنے فاصلے پر پہنچی کہ سلاخ دار گیٹ کو دستی بم کے نشانے پر لیا جا سکتا، شہریار نے گا
کی کھڑکی سے نصف دھڑ باہر نکال کر ایک بار پھر جان کی بازی لگائی اور قوس کی صورت حرکت کرتے اس
بائیں ہاتھ میں دبا بم ٹھیک گیٹ سے جا کر ٹکرایا۔

گاڑی کو گولیوں کی زد میں لینے کی کوشش کرتے کمانڈوز جرأت مندی کے اس مظاہرے پر ڈھنگ
حیرت زدہ بھی نہیں ہو سکے اور اُلٹ کر پیچھے گرے۔ بم نے پہلے ہی کام دکھا دیا تھا۔ قوی ہیکل گاڑی
قوت سے آگے بڑھی تو لوہے کا مضبوط سلاخوں والا دروازہ خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گیا اور وہ نہا
کامیابی سے ہسپتال کی حدود سے نکلتے چلے گئے۔ ردِعمل میں انہیں بھی کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ فائرنگ اور
کے بعد ٹکراؤ سے بکھر جانے والے ونڈ اسکرین کے کئی شیشے فرنٹ پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے اُڑ کر ان کے
کے بعض حصوں میں گڑ گئے تھے اور ان کے پاس فرصت نہیں تھی کہ اپنے ان زخموں پر توجہ دے سکیں۔

گیٹ سے ٹکراؤ کے باوجود سلّو نے گاڑی کی رفتار کم نہیں ہونے دی تھی جس کے نتیجے میں ا
زبردست جھٹکے برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ لیکن رفتار کم کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

ہسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی دو گاڑیوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور ان گاڑیوں
مسلسل ان پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ لگتا تھا، تعاقب کرنے والے ان کی گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنا
رہے ہوں۔ لیکن سلّو کی مجنونانہ ڈرائیونگ انہیں موقع نہیں دے رہی تھی۔

اس نے گاڑی کی اندرونی اور بیرونی تمام لائٹیں بجھا رکھی تھیں چنانچہ گہرے رنگ کی گاڑی کو رات
تاریکی بھی پناہ دے رہی تھی۔ تعاقب میں آنے والے اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے نشانہ لینے
کوشش بھی کرتے تو اِدھر سے اُدھر لہرا کر آگے بڑھتی گاڑی ان کی زد پر نہ آ پاتی۔ لیکن تعاقب بہر حال ا
نے جاری رکھا ہوا تھا۔

ان تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانا ضروری تھا ورنہ ان کے لیے یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جا
گاندھی نگر میں سوائے اللہ کی ذات کے کوئی ان کا مددگار بھی نہیں تھا۔ بھارت میں پاکستان کے مفاد کے
کام کرنے والے ان کے ساتھیوں نے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو احمد آباد میں ریس



ہیں اور ان کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ وہ احمد آباد ماؤنٹ ابو اسٹیٹ ہائی وے پر ان کے منتظر رہیں
یہ ہائی وے، نیشنل ہائی وے نمبر 8 سے متصل تھی جو کہ ممبئی سے سیدھی دہلی تک جاتی تھی۔ دہلی سے آگے
لوگ ڈاکٹر صاحب کو سرحد پار کروانے کا انتظام کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس راستے سے پاکستان اور ہندوستان
درمیان اسمگلرز کا کثرت سے آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ سرحدی محافظوں سے ساز باز کر کے یا چوری چھپے
دوسرے کے علاقوں میں جاتے رہتے تھے۔

لیکن یہ مرحلہ ابھی بہت دور تھا۔ ابھی تو وہ گاندھی نگر میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ گاندھی نگر جو کہ مہاتما
گاندھی کا مقامِ پیدائش تھا اور مغربی بھارت کی ریاست گجرات کا دارالخلافہ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا۔

ہندوستانیوں نے اپنے لیڈر کی اس جنم بھومی کو خوب سنوار کر رکھا تھا اور پورا شہر بڑی اچھی منصوبہ بندی
ساتھ بسایا گیا تھا۔ کل تیس سیکٹرز پر مشتمل اس شہر کو تعمیر کرتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ
کے لوگوں کے لیے تعلیم، علاج، خریداری اور سواری جیسی زندگی کی بنیادی سہولیات میسر ہوں۔ شہر کو سرسبز،
آلودگی سے پاک اور Cosmopolitan بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ اپنی ان کوششوں میں وہ خاصے
کامیاب بھی تھے لیکن یہ وقت ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کو سراہنے کا نہیں تھا۔ ابھی تو انہیں اپنے تعاقب میں
آنے والوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔

''اسپیڈ کم کرو۔ میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔'' ان کی گاڑی کرکٹ گراؤنڈ کے قریب سے گزر رہی تھی
شہریار نے ٹھہرے ہوئے فیصلہ کُن لہجے میں سلّو سے کہا اور سلّو کے پیروں کے پاس پڑی وہ گن تھام لی
اب تک سلّو ہی استعمال کرتا رہا تھا۔

اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سلّو نے بتدریج گاڑی کی رفتار ہلکی کرنی شروع کر دی لیکن اسے زِگ زیگ
انداز میں لہرانا بند نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس صورت میں فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے پیچھا کرنے
والوں کے لیے ان کی گاڑی کو نشانہ بنانا آسان ہو جائے گا۔ اس ساری صورتِ حال میں انہیں اگر کوئی
فائدہ حاصل تھا تو یہ کہ گہری رنگت اور بجھی ہوئی بتیوں کے باعث ان کی گاڑی رات کی تاریکی میں نمایاں
نہیں تھی جبکہ تعاقب میں آنے والی گاڑیاں اپنی جلتی روشنیوں کی وجہ سے نمایاں تھیں۔ سلّو کے رفتار ہلکی
کرنے کے ساتھ ہی شہریار سیٹ پھلانگ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا۔ اس حصے میں ڈاکٹر فرحان
بھی برستی گولیوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پائیدان میں دبکے ہوئے تھے۔ ان کے جسم میں بھی شیشے کے
ٹکڑے پیوست نظر آ رہے تھے جو یقیناً گولیوں کے باعث ٹوٹنے والے پچھلے شیشے کے تھے۔

فی الحال ان پر توجہ دینے کے بجائے اس نے شیشے کے ٹوٹے ہوئے حصے پر گن کی نال جمائی اور خود کو
حد خطرے میں ڈال کر پیچھے آنے والوں پر فائر کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی گن اس
بار سے بہت شاندار تھی کہ سنگل اور برسٹ دونوں صورتوں میں فائر کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ
بہت وسیع رینج رکھتی تھی اور وہ اُمید رکھ سکتا تھا کہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا
تھا۔ البتہ گاڑی کے لہرا کر چلنے کی وجہ سے خود اسے بھی نشانہ لینے میں بہت زیادہ دشواری پیش آ رہی تھی۔

بالآخر چند سیکنڈ کی کوشش کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ باقاعدہ نشانہ لینا ممکن نہیں ہے اور اس کوشش
میں وہ خود بھی ان گولیوں کا نشانہ بن سکتا ہے جو رفتار کم ہونے کے نتیجے میں گھٹنے والے فاصلے کی وجہ سے کچھ
اور ہی شدت سے آ رہی تھیں۔

دل ہی دل میں اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے اس نے محض قسمت کے بھروسے پر اندھا دُھند

برسٹ دے مارا اور اگلے ہی لمحے اس کا دل یہ دیکھ کر خوشی سے ناچ اُٹھا کہ تعاقب میں آتی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی بری طرح بے قابو ہوئی اور ڈگمگاتی ہوئی ساتھ ساتھ دوڑتی دوسری گاڑی سے جا ٹکرائی۔

بے حد رفتار سے دوڑتی گاڑیوں کا یہ تصادم ہولناک ثابت ہوا اور دونوں ہی سڑک سے لڑھکتی گئیں۔ کیا ہوا تھا، یہ شہریار خود بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ اس کے مارے ہوئے برسٹ نے پہلی گاڑی کے ڈرائیور کو نشانہ بنایا تھا چنانچہ گاڑی بے قابو ہوگئی اور ساتھ ہی دوسری گاڑی کو لے ڈوبی۔

جو بھی ہوا تھا، بہرحال اس کے لیے اچھا ہی ہوا تھا اور فی الحال وہ تعاقب سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ شہر سے باہر بھی نکل سکیں گے؟ تو بالکل سامنے کی بات تھی کہ اب تک شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کا حکم صادر کیا جا چکا ہوگا اور وہ ٹھیک ٹھاک قسم کی جنگ لڑے بغیر وہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔

وہ اور سلّو اس جنگ و جدل کو برداشت کر سکتے تھے لیکن پائیدان میں دبکے زخمی ڈاکٹر کے لیے شاید مناسب نہیں ہوتا۔ اس طرح نکلنے میں سب سے بڑا رسک تو جان جانے کا ہی تھا۔ اپنی جان کی انہیں پروا نہیں تھی کہ اسے تو وہ خود لٹانے آئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی زندگی بہت قیمتی تھی اور کسی صورت ان کی جان کے لیے مزید خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا تھا۔ پہلے ہی وہ اچھی خاصی مشکل سے گزر چکے تھے۔ ''را'' والے پہلے ان کے استقبال کے لیے ہسپتال میں موجود نہیں ہوتے تو وہ لوگ خاموشی سے ڈاکٹر کو نکال کر لے جاتے اپنے مددگاروں کے حوالے کر دیتے۔ لیکن اب تو حالات یکسر مختلف تھے۔

شہریار محسوس کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کو جنگ و جدل سے گزار کر ان کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر تھا کہ زندہ گرفتاری کا رسک لے لیا جائے۔ کیونکہ زندگی بچ جانے کی صورت میں مزید جدوجہد کی گنجائش رہتی ہے۔ اپنی اسی سوچ کے تحت اس نے یکدم ہی سلّو کو گاڑی روک دینے کا حکم سنایا۔ بیک ویو مرر میں پچھلی گاڑیوں کے تباہ ہونے کا منظر دیکھ چکا تھا چنانچہ رفتار زیادہ رکھنے کے باوجود ذرا سکون سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی طرف سے حکم ملنے پر اس نے خاموشی سے گاڑی سائیڈ پر کر کے روک لی اور یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اگلے حکم کا منتظر ہو۔

''ہمیں گاڑی یہیں چھوڑنی ہوگی۔'' اس نے سلّو کو بتایا اور خود ڈاکٹر فرحان کو نیچے اُترنے میں مدد دینے لگا۔ ان کے بازوؤں پر پیٹھ پر شیشے کے ٹکڑے چبھے تھے اور زخموں سے خون رس کر کپڑوں کو بھگو رہا تھا۔ اس نے پچھلی نشست پر پڑا ہوا ایک بڑا تولیہ اٹھا کر ان کے بازوؤں کے گرد لپیٹ لیا۔ اس طرح ایک تو ان کا خون آلود لباس چھپ گیا تھا، دوسرے خون ٹپک کر زمین پر گرنے کا خدشہ نہیں رہا تھا۔

تولیہ ظاہر ہے اسی گاڑی والے کا تھا جس کی گاڑی وہ لے اُڑے تھے۔ اپنے پاس موجود گن اس نے سلّو کے حوالے کر دی اور خود ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے ارادوں کو نہ جاننے کے باوجود بھی قدم قدم پر مستعدی سے اس کا ساتھ دینے والا سلّو گن کے علاوہ گاڑی سے وہ بیگ بھی نکال لایا تھا جسے ہسپتال سے شہریار کے اپنے حوالے کرنے کے بعد اس نے ایک بار بھی اسے نہیں چھوڑا تھا۔

اب وہ تینوں ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ تعاقب کرنے والوں سے انہوں نے پیچھا چھڑا لیا تھا اور رات کا آخری پہر ہونے کی وجہ سے راستے سنسان پڑے تھے اس لیے کسی کے دھر لینے کا خطرہ بہت ہی کم تھا۔



''ہمیں کہیں پناہ لینی ہوگی۔ جہاں رہ کر زخموں کی مرہم پٹی کی جا سکے اور ڈاکٹر سمیت ہم اپنے حلیوں میں مناسب تبدیلی کر سکیں۔''

چلتے ہوئے اس نے سلّو کو مختصراً اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ تب سلّو سمجھ گیا کہ ان کی منزل قریب ہی نظر آنے والی ہاؤسنگ اسکیم کا کوئی مکان ہے جس کا انتخاب انہیں اپنے اندازوں کی بنا پر کرنا ہوگا۔

یہ ہاؤسنگ اسکیم ایک وسیع احاطے میں قائم تھی اور اگر وہ وہاں کسی مکان میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جاتے تو واقعی اپنے لیے بچت کی کوئی راہ نکالنے کا موقع مل جاتا۔ ہاؤسنگ اسکیم تک رسائی ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی۔ احاطے میں آمد و رفت کے لیے استعمال ہونے والا بڑا سا گیٹ بند تھا اور گیٹ کے سامنے بوڑھا چوکیدار کرسی ڈالے بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے لیے شاید اتنا اطمینان ہی کافی تھا کہ گیٹ بند ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس گیٹ سے آر پار نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے بوڑھے چوکیدار کو اس خوش فہمی میں مبتلا محوِ خواب رہنے دیا اور سلّو کی کاریگری کے سہارے بند گیٹ کا قفل کھلا بھی اور بند بھی ہوگیا۔ اب وہ تینوں احاطے کے اندر تھے اور چابک دستی سے اپنے لیے مناسب مکان کا انتخاب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں موجود تمام مکانات ایک جتنے رقبے پر قائم تھے اور عموماً سنگل اسٹوری تھے۔ البتہ سب کی بناوٹ ایک دوسرے سے مختلف تھی۔

احاطے میں روشن بلب کی وجہ سے وہ وہاں موجود مکانات کا اچھی طرح جائزہ لے سکتے تھے۔ بعض مکانات بہت سادہ تھے جبکہ بعض کے فرنٹ ویو کو خوبصورت بنانے کے لیے خاصا پیسہ صرف کیا گیا تھا۔ لیکن زیادہ تعداد درمیانے کے مکانات کی تھی۔

انہوں نے ان میں سے ہی ایک مکان کا انتخاب کیا۔ انتخاب کے بعد مکان کے اندر تک رسائی حاصل کر لینا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ مین گیٹ پر لگے آٹومیٹک لاک کو سلّو کی ہنرمند اُنگلیوں نے کھولا اور وہ اگلے فرحان سمیت اندر داخل ہوگئے۔

مکان نیم تاریک تھا اور صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ سلّو نے تیزی سے گھر کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا جبکہ شہریار روشن کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ مکمل طور پر بند نہیں تھا اور وہ نیم وا دروازے سے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ یہ کمرہ خواب گاہ کے انداز میں سجا ہوا تھا اور کمرے کے وسط میں موجود ڈبل بیڈ پر کوئی شخص سر سے پیر تک چادر تانے سو رہا تھا، جو کہ اپنی جگہ ایک حیرت کی بات تھی۔ کیونکہ موسم خاصا گرم تھا اور اس گرمی میں اوڑھ لپیٹ کر سونا تو دُور کی بات، لوگ کوشش کرتے تھے کہ کھلی جگہوں پر یا پھر ایئر کنڈیشنڈ رُوم میں رہیں۔ ویسے بھی گاندھی نگر کا شمار موسم کے اعتبار سے ان علاقوں میں ہوتا تھا جہاں سال کے بیشتر حصوں میں موسم گرم اور خشک رہتا ہے۔

سوئے ہوئے شخص کے برابر میں ہی ایک عورت تکیے کے سہارے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے گھٹنوں پر ایک ہارڈ بورڈ پر کلپ کیا ہوا رائٹنگ پیڈ رکھا ہوا تھا اور ہاتھ میں پکڑا قلم بائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لکھتے ہوئے کچھ سوچنے کے دوران نیند سے مغلوب ہو کر سو گئی ہے۔ اسی وجہ سے رات کے اس پہر بھی کمرے کی بتی روشن تھی۔

شہریار اس عورت کے چہرے پر پہلی نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض میں دوپٹے سے بے نیاز، بیٹھے بیٹھے ہی سوئی ہوئی اس عورت کا چہرہ اس کے لیے شناسا تھا اور اسے کوئی شک نہیں تھا کہ یہ عورت وہی عائشہ ہے جس سے ان کی دہلی میں ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات بھی بڑی عجیب و غریب صورتِ

حال میں ہوئی تھی۔ عائشہ کو انہوں نے دہلی کے ایک ہوٹل میں ویٹریس کے روپ میں دیکھا تھا۔ لیکن عائشہ کی یہاں موجودگی بتا رہی تھی کہ خود اس کے لیے بھی دہلی میں رہنا ممکن نہیں ہو سکا تھا اور وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے گاندھی نگر آنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ البتہ جس مکان میں موجود تھی، وہ اس سے کئی گنا بہتر ہے جس میں انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اس بات سے شہریار نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عائشہ اپنے لیے بہتر ملازمت کے حصول میں کامیاب ہو گئی ہے۔

''یہ تو وہی دہلی والی ہے۔'' ابھی وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ سلّو بھی وہیں چلا آیا اور عائشہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے ساختگی سے بولا جس کے جواب میں شہریار کے لبوں سے بس ایک ''ہوں'' ہی نکلی اور وہ پُرسوچ انداز میں اس سے پوچھنے لگا

''ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟''

''انہیں میں نے لاؤنج میں صوفے پر لٹا دیا ہے۔ انہیں خاصے زخم آئے ہیں اور اب مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔'' سلّو نے بھی دھیمی آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... تم اُنہیں دیکھو، میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے سلّو سے کہا تو وہ وہاں سے پلٹ گیا اور خود شہریار کمرے کے اندر داخل ہوا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے سوئی ہوئی عائشہ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی شہادت کی انگلی کی مدد سے اس کے گھٹنوں پر رکھے رائٹنگ پیڈ کو آہستہ سے بجایا۔

یہ ہلکی سی دستک ہی عائشہ کے لیے کافی ثابت ہوئی اور وہ چونک کر نیند سے بیدار ہو گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھا تو بری طرح چونک گئی۔

''کوئی آواز مت نکالنا۔ اُٹھ کر میرے ساتھ خاموشی سے کمرے سے باہر آ جاؤ۔'' اس نے عائشہ کو پستول کی جھلک دکھاتے ہوئے دھیمی لیکن سخت آواز میں حکم دیا تو وہ کچھ سراسیمہ نظر آنے لگی لیکن اس کے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی اور رائٹنگ پیڈ ایک جانب رکھ کر خود بستر سے نیچے اُتر آئی۔

اس ساری کارروائی کے دوران چادر تان کر سوئے شخص کے وجود میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی اور وہ ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا۔

''یہ.....؟'' شہریار نے اس کی طرف اشارہ کر کے عائشہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ میرے شوہر ہیں۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے یہ ہرگز نہیں جاگیں گے۔'' جواب دیتے ہوئے عائشہ کے لہجے میں جو کرب تھا، اسے شہریار سمجھ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عائشہ کے اس نام نہاد شوہر کو نشے کی عادت ہے اور اب بھی یقیناً وہ اپنا نشہ پورا کر کے سو رہا تھا اس لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔

''ٹھیک ہے، تم باہر آ جاؤ۔'' شہریار نے اس بار نرمی سے اسے مخاطب کیا اور وہ بے چون و چرا کمرے سے باہر آ گئی۔

شہریار نے خود ہی احتیاطاً کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی اور اسے ساتھ لیے ہوئے لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں سلّو اور ڈاکٹر فرحان موجود تھے۔ سلّو نے اس دوران ڈاکٹر کے زخموں کو خاصی حد تک صاف کر دیا تھا لیکن ان کے پاس مرہم پٹی کا سامان نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ شیشے نکالنے کے بعد خون روکنے کا کوئی معقول انتظام نہیں کر سکا تھا اور اب ڈاکٹر فرحان خاصے نڈھال نظر آ رہے تھے۔ زخمی تو وہ دونوں خود بھی تھے لیکن ان کے زخم معمولی نوعیت کے تھے۔ ٹوٹنے والے شیشوں کی کرچیاں اُنہیں اس حد تک نقصان



پہنچا سکی تھیں جتنا ڈاکٹر فرحان زد میں آ گئے تھے۔

''او مائی گاڈ! انہیں تو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔ میں ابھی میڈیکل کٹ لے کر آتی ہوں۔'' ڈاکٹر فرحان پر نظر پڑتے ہی عائشہ بے ساختہ بولی اور تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے اسے نہیں روکا۔ تاہم شہریار وہیں سے اسے اوپن کچن میں حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے ذرا سے پنجے اچکا کر سب سے اوپری کیبنٹ کا پٹ کھولا اور اس میں سے مستطیل شکل کا فرسٹ ایڈ باکس کھینچ کر باہر نکالا اور تیز قدموں سے چلتی واپس لاؤنج میں آئی۔

''میں میڈیکل کے شعبے سے تو تعلق نہیں رکھتی لیکن تم میں سے کوئی میری مدد کرے تو ان کی تھوڑی بہت مرہم پٹی کر سکتی ہوں۔''

اس نے اپنے ابتدائی خوف پر بہت جلد قابو پا لیا تھا اور اب بہت نارمل لہجے میں ان سے مخاطب تھی۔ اس کا یہ رویہ ان کے لیے زیادہ حیرت ناک نہیں تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ شادی سے قبل اس نے کچھ سال ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کی تھی اور ایک صحافی کی حیثیت سے ناگہانی حالات میں خود کو سنبھالے رکھنے کا ہنر جانتی تھی۔ اپنی شخصیت کی اس مضبوطی کی وجہ سے ہی تو اس نے اپنی زندگی کے انوکھے فیصلے کیے تھے جن میں سب سے بڑا فیصلہ دولت مند شوہر کو چھوڑ کر اپنے ایک ایسے کزن کو اپنانے کا تھا جو نشے کی علت میں مبتلا ہونے کے بعد ان کے گھر علاج کی خاطر لایا گیا تھا۔

''کہیں کہیں کانچ کے ذرّے اب بھی گوشت کے اندر ہی موجود ہیں۔'' قریب بیٹھ کر زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا اور فرسٹ ایڈ باکس سے ایک باریک چمٹی نکال کر کانچ کے ٹکڑوں کو صاف کرنے لگی۔ سلّو مسلسل اس کی مدد کر رہا تھا۔ اسی نے یہ بندوبست بھی کیا تھا کہ لاؤنج کے دروازے کھڑکیوں پر بھاری پردوں کو اچھی طرح پھیلا دیا تھا تاکہ اندر جلتی تیز روشنی باہر کسی کو متوجہ نہیں کر سکے۔

وہ جس گاڑی میں فرار ہوئے تھے، وہ اس ہاؤسنگ اسکیم سے بہت زیادہ دور نہیں کھڑی تھی اور ڈھونڈنے والے اس گاڑی تک پہنچ جاتے تو ممکن تھا اردگرد کی آبادیوں کی طرف بھی ان کا دھیان جاتا اور وہ اس ہاؤسنگ اسکیم کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے۔ چنانچہ یہی بہت تھا کہ ہر ممکن احتیاط کی جاتی۔

''تمہارے شوہر کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟'' شہریار جو خاموشی سے ایک طرف بیٹھا ان دونوں کو مرہم پٹی کرتا دیکھ رہا تھا، اچانک ہی عائشہ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔

''وہ ہیروئن کا نشہ کرتا ہے۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''اور تم..... تم کیا کرتی ہو؟'' وہ عائشہ کی گاندھی نگر میں موجودگی کے سلسلے میں متجسس تھا۔

''میں یہاں ایک نیوز پیپر میں جاب کرتی ہوں۔''

''کتنے عرصے سے؟''

''کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے دہلی میں تھی۔ وہاں حالات میرے لیے مناسب نہیں تھے اس لیے جب ایک فرینڈ نے یہاں جاب کا بتایا تو میں یہاں شفٹ ہو گئی۔ یہ گھر بھی میری فرینڈ کے ایک عزیز کا ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ دُبئی شفٹ ہو گئے ہیں اور انہوں نے مجھے یہ پرمیشن دی ہوئی ہے کہ جب تک وہ مکان کو سیل نہیں کرتے، میں یہاں رہ سکتی ہوں۔'' اس بار اس نے ذرا تفصیل سے شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

''گڈ..... اس طرح تمہیں اپنے شوہر کے علاج میں مدد ملے گی۔ ایسے مریضوں کے علاج کے لیے اچھا

اور پُرسکون ماحول بھی بہت مدد دیتا ہے۔"

بے ساختہ ہی ان خیالات کا اظہار کرتا ہوا شہریار سچ مچ خوش تھا کہ عائشہ، کمال کو اُس عسرت زدہ ماح
سے نکال کر لانے میں کامیاب ہوگئی ہے جو یقیناً اس کے اعصاب کے لیے سب سے بڑا بوجھ تھا۔ منہ
سوچنے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والے شخص کے لیے غربت بھری زندگی کے تھپیڑے سہنا کسی عذاب سے
نہیں تھا۔ اسے تو چار دن میں بھول گیا تھا کہ عائشہ وہ عورت تھی جس کے عشق میں وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا
جس نے صرف اس کے علاج کی خاطر اپنا بسا بسایا گھر توڑ کر اس کی زندگی میں شامل ہونا قبول کرلیا
اسے عائشہ کی اپنی خاطر دی جانے والی قربانیاں بھی بھول گئی تھیں۔ اس بے چاری نے نہ صرف دنیا
بدنامی مول لی تھی بلکہ عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر میدانِ عمل میں بھی کودنا پڑا تھا۔ کمال کے رویے کی
سے وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو ہاسٹل میں رکھنے پر مجبور ہوگئی تھی اور خود معاشی مسائل کے حل اور کمال کے علاج
لیے سرگرداں تھی۔

"ان صاحب کی ڈریسنگ تو ہوگئی۔ میرے خیال میں آپ لوگوں کو بھی تھوڑی مرہم پٹی کی ضرو
ہے۔" ڈاکٹر فرحان کے جسم کے مختلف حصوں میں آنے والے زخموں کی مناسب دیکھ بھال کے بعد وہ
طرح ان دونوں خصوصاً شہریار کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب وہ پوری طرح سے پُرسکون تھی اور اس کا رویہ
کے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ اس کے گھر مہمان آئے ہوں۔

"ہم اپنے زخموں کو دیکھ لیں گے۔ تم اس دوران ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کردو۔" شہ
نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

صبح بس ہونے ہی والی تھی اور ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں سے کس طریقے سے نکلیں گے
عبدالرحمٰن نے پیشکش کی تھی کہ اگر انہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے تو وہ ان سے رابطہ کر سکتے ہیں
ابھی تک وہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس پیشکش کو قبول بھی کرے یا نہیں۔ اپنے طور پر یہاں سے نکل کر
بھی کم خطرناک نہیں تھا کیونکہ یہ یقینی تھا کہ اب تک شہر میں آمدورفت کے تمام ذرائع پر سخت پہرہ لگا دیا گیا
گا اور ان کے لیے ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے نکال کر لے جانا آسان ثابت نہیں ہوگا۔

"اوکے، میں بریک فاسٹ تیار کرتی ہوں۔ وہ کونے میں واش رُوم ہے۔ تم لوگ چاہو تو یوز کر
ہو۔" وہ اطمینان سے چلتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تو شہریار نے بھی اس کے مشورے کو قبول کرتے ہو
واش روم کا رخ کرلیا۔

وہ فرسٹ ایڈ باکس اپنے ساتھ لے گیا تھا تاکہ حلیے کی درستگی کے ساتھ ساتھ اپنے زخموں کی صفائی
ان پر مرہم لگانے کا کام بھی کر ڈالا۔

وہ فارغ ہو کر نکلا تو سلّو واش روم میں چلا گیا۔ وہ لاؤنج میں ڈاکٹر فرحان کے نزدیک بیٹھ کر کچن
کام کرتی عائشہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی طرف سے یہ خطرہ تو بہت کم تھا کہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچائے گی پھر
اپنے طور پر احتیاط ضروری تھی۔ کامنی سی عائشہ بہت پھرتی سے کام کر رہی تھی اور کچن سے آملیٹ تلنے جا
کی سوندھی سی خوشبو یہاں تک پہنچ کر معدوں میں ہلچل پیدا کر رہی تھی۔

ممکنہ بھاگ دوڑ کے خیال سے اس نے اور سلّو نے رات کا کھانا بہت ہلکا کھایا تھا جو کہ ظاہر ہے
تک ہضم بھی ہو چکا تھا۔ ہنگامی حالات ہوتے تو شاید انہیں اپنی بھوک کا خیال بھی نہیں آتا۔ لیکن یہاں
پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر آملیٹ اور توس کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کو سونگھتے ہوئے بھوک کا احساس دوچند ہو



بھی عجیب نہیں تھا۔ عارضی ہی سہی لیکن فی الحال وہ ایک پناہ گاہ میں تھے۔

"یہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مس بی ہیومت کرنا۔" صوفے پر نیم دراز ڈاکٹر فرحان کو نہ
جانے کس خدشے نے ستایا کہ انہوں نے دھیمی آواز میں اس سے استدعا کی۔

اُن کی بات سن کر وہ چونکا، پھر مسکرا کر بولا۔

"ڈونٹ وری ڈاکٹر! ہم محسن کُش نہیں ہیں اور عورت، خصوصاً مسلمان عورت کا تو بہت ہی احترام
رتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ یہ مسلمان ہے؟"

"یہ لیں بھئی۔ ناشتہ تیار ہے۔ جو کچھ میں بنا سکتی تھی، بنا لیا۔ پراٹھے وغیرہ بنانا ذرا مشکل کام ہے اس
لیے آپ لوگوں کو ان چیزوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔"

وہ ڈاکٹر فرحان کے سوال کا جواب نہیں دے پایا تھا کہ عائشہ ہاتھ میں ٹرے لیے وہاں چلی آئی۔ اس
نے ٹرے ٹیبل پر رکھی تو شہریار نے اس میں رکھے ہوئے لوازمات کا جائزہ لیا۔ آملیٹ، توس، مکھن اور جیم کے
علاوہ ایک چھوٹی سی ٹوکری میں پھل کاٹنے والی چھری سمیت سیب بھی رکھے ہوئے تھے۔

"آپ لوگ کھانا شروع کریں۔ چائے دم پر ہے۔ میں بس ابھی دو منٹ میں نکال کر لے آتی ہوں۔"
وہ ایک ایسے خوش اخلاق میزبان کا کردار ادا کرنے لگی تھی جو بن بلائے اور بے وقت آنے والے مہمان کے
لیے بھی دل کشادہ رکھتا۔

"تھینک یو سو مچ..... آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتے میں شریک ہو جائیں۔"

شہریار نے اسے دعوت دی تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اگر آپ کو یہ ڈر ہے کہ میں نے اس ناشتے میں کچھ ملا دیا ہے تو میں ضرور آپ کے ساتھ شریک ہو
جاتی ہوں۔"

"نہیں، مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔ ایک گھریلو عورت اس کھانے میں ملا بھی کیا سکتی ہے؟ آپ کے
اس ملانے کے لیے چوہے مار یا کیڑے مار دواؤں کے علاوہ اور کیا چیز ہوگی؟ اور ہم تینوں میں سے کوئی بھی
ایسا بے وقوف نہیں ہے جو کھانے میں اس قسم کی کسی چیز کی موجودگی کو محسوس کیے بغیر اسے حلق سے نیچے اُتار
لے۔" شہریار نے نہایت سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور خود کچھ لینے سے پہلے ڈاکٹر فرحان کو پلیٹ
میں کی۔ وہ اُس کے ملک کا سرمایہ تھے اور وہ دل و جان سے ان کی عزت کرتا تھا۔

"میں چائے لاتی ہوں۔" عائشہ اُس کا پُر دلیل جواب سن کر جھینپ گئی تھی جبکہ مزید کچھ کہے بغیر کچن کی
طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خوشبودار چائے کے ساتھ ان کے درمیان موجود تھی۔

اس دوران سلّو بھی واش روم سے نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا اور بڑی رغبت سے ناشتہ کر رہا
تھا۔ شہریار کو بھی ناشتہ پسند آیا تھا اور اس نے دل میں اعتراف کیا تھا کہ عائشہ ایک سلیقہ مند عورت ہے۔ ورنہ
جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی، وہاں تو عورتیں کم ہی کچن میں قدم رکھتی ہیں اور کاروبارِ خانہ گھریلو ملازمین کے
ہاتھوں میں ہی رہتا ہے۔

عائشہ نے بھی کمال کے ساتھ گزارے مختصر عرصے میں یہ سب سیکھا تھا تو بڑا کمال کیا تھا۔ ان دونوں کے
ناشتے میں ڈاکٹر فرحان نے بہت کم کھایا تھا، البتہ چائے رغبت سے پی تھی اور ایک کے بعد دوسرا کپ بھی
پی کرلیا تھا۔

"اگر تم لوگ کہو تو ٹیلی ویژن آن کر دوں؟" عائشہ ان کے ساتھ ناشتے میں باقاعدہ تو شامل نہیں ہوئی تھی لیکن ایک سیب تراش کر اس کے ساتھ شغل کر رہی تھی۔ سیب کی ایک قاش کو نزاکت سے کھاتے ہوئے اس نے یہ سوال کیا تھا۔

"کر دو لیکن والیوم کم رکھنا۔" بریکنگ نیوز کے اس زمانے میں حالات سے باخبر ہونے کے لیے ان کے پاس بھی سب سے مؤثر ذریعہ ٹیلی ویژن ہی تھا چنانچہ شہریار نے اجازت دے دی۔ موبائل فون کے استعمال سے وہ خود اجتناب کر رہا تھا کہ اگر کال ٹریس ہو گئی تو مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔

عائشہ نے اس کی طرف سے اجازت پا کر ٹیلی ویژن کھول دیا۔ حسبِ توقع نیوز چینلز رات پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر مختلف فوٹیجز کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرحان سمیت دونوں کی تصاویر بھی بار بار دکھائی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان کی تصویر تو بہت واضح تھی کہ وہ یقیناً ان کے ریکارڈ میں بھی موجود ہو گی لیکن سلو اور شہریار کسی بھی فوٹیج میں بہت زیادہ نمایاں نہیں تھے لیکن پھر بھی اتنا تو تھا کہ وہاں بیٹھی عائشہ ان دونوں کو شناخت کر سکتی تھی۔

خبروں میں یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ اس گاڑی کو تلاش کر لیا گیا ہے جو مفرور ملزمان ہسپتال سے لے اُڑے تھے۔ لیکن اس سے آگے متعلقہ اداروں کے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں کہ وہ تینوں کیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے تھے۔

چلنے والی نیوز رپورٹ میں ڈاکٹر فرحان کو نہایت خطرناک مجرم قرار دیا جا رہا تھا اور بتایا جا رہا تھا کہ اس پاکستانی سائنسدان کو پانچ سال قبل اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے بہانے خطرناک عزائم کے ساتھ بھارت میں داخل ہوا تھا۔ ایسے مجرم کا فرار ہو جانا بھارتی سالمیت کے لیے سخت خطرناک قرار دیا جا رہا تھا اور پاکستان کے خلاف زہر افشانی کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھارتی حساس اداروں پر بھی تنقید کی جا رہی تھی جنہوں نے ایسے خطرناک ملزم کی حفاظت کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ پہلے سے اطلاع ہونے کے باوجود کہ ڈاکٹر فرحان کو آزاد کروانے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے، انہیں ہسپتال سے کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کیا تھا۔ "را" والے میڈیا کے سامنے یہ اعتراف کیسے کرتے کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحان کو چارے کے طور پر استعمال کر کے ان کے ہمدردوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن صرف دو افراد ان کے حفاظتی حصار کو توڑ کر نہ صرف ڈاکٹر فرحان سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ "را" کے سورماؤں کو بھی موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

اُن کی طرف سے جو بیان جاری کیا گیا تھا، اس میں فقط اتنا کہا گیا تھا کہ مجرموں کو کسی صورت چھوڑا نہیں دی جائے گی اور ہر صورت قانون کے شکنجے میں جکڑ لیا جائے گا۔ شہر کے داخلی اور خارجی راستوں پر سخت نگرانی کی بھی اطلاع دی گئی تھی۔ ان ساری خبروں کو ان تینوں کے ساتھ ساتھ عائشہ نے بھی غور سے سنا اور دیکھا تھا اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس سے ان کی حقیقت پوشیدہ رہتی۔ بس اس سوال اس کے ردِعمل کا تھا۔ وہ بے شک مسلمان تھی لیکن بھارتی شہری تھی جس کی وفاداریاں اس سرزمین کے ساتھ ہونا لازم تھا جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ اس کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر بھی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے سخت ہیجان اور اضطراب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ شہریار نے ہاتھ بڑھا کر اس سے ریموٹ لیا اور ٹیلی ویژن بند کر دیا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟" ٹیلی ویژن بند کر کے شہریار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔



"میں..... میں سوچ رہی ہوں کہ اس وقت میری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ اس عورت کے ساتھ جسے ہم اپنی ماں کہتے ہیں یا اپنے ان محسنوں کے ساتھ جن کی وجہ سے میری عزت اور جان بچی اور آج میں ایک پُرسکون جگہ پر بیٹھی ہوں۔" اس نے سخت تذبذب کے عالم میں جواب دیا تو شہریار چونک گیا۔

"محسن..... تم ہمیں اپنا محسن کیوں کہہ رہی ہو؟"

"میں نے تم دونوں کو پہچان لیا ہے۔ بے شک تمہارے حلیے بالکل بدلے ہوئے ہیں اور میں صرف شکل و ہلیاد پر تمہیں شناخت نہیں کر سکتی تھی، اس کے باوجود میں تم دونوں کو پہچان چکی ہوں اور میں نے تم لوگوں کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے شناسائی دیکھی ہے۔ تم نے اب تک مجھ سے میرے متعلق جو سوالات کیے، ان میں بھی اس بات کی جھلک تھی کہ تم پہلے سے مجھے جانتے ہو۔ خاص طور پر تمہارا اپنے ساتھی کے سامنے مجھے مسلمان کہنا خاصا معنی خیز تھا۔ اگر تم پہلی بار مجھے ملے ہوتے تو یہ کیسے جان سکتے تھے کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر تم نے یہ بھی نوٹ کیا کہ تم مجھ پر اعتماد کر رہے ہو۔ حالانکہ جن حالات میں تم گھرے ہوئے ہو، تمہیں اپنے سائے سے بھی بھڑکنا چاہئے۔ اتنی آسانی سے بندہ جب ہی اعتماد کرتا ہے جب دوسرے سے کچھ نہ کچھ واقف ہو۔" وہ ذہین تھی اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتی تھی چنانچہ اس کے لیے اندازے لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

"پھر..... تم نے کیا سوچا ہے؟ تم ہمارا ساتھ دو گی؟" شہریار نے ایک طرح سے اعتراف کر لیا کہ اس کا ان کے بارے میں اندازہ درست ہے۔

"میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ میرے لیے تم دونوں مہربان دوستوں کی طرح ہو جنہوں نے ایک نہایت کڑے وقت میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی۔ لیکن دوسری طرف تم پر دہشت گرد اور پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ تم دونوں کئی افراد کی جانیں لینے کے ذمے دار ہو اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں قاتلوں کا ساتھ کیسے دوں؟..... تمہارے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر محسن کُش بھی نہیں کہلانا چاہتی۔ بس سمجھ لو کہ میں بُری طرح کنفیوز ہوں۔" اس نے اپنی دونوں کنپٹیاں ہتھیلی کی مدد سے دباتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے اوپر ہمارے احسان کا بوجھ مت لو۔ کیونکہ وہ کوئی احسان تھا ہی نہیں۔ ایک عورت کی عزت کو خطرے میں دیکھ کر ہم خود کو روک نہیں سکے تھے۔ وہ عورت تمہارے بجائے کوئی اور بھی ہو سکتی تھی۔ بس اس کا مظلوم ہونا شرط تھا۔ کیونکہ ہم قوم، نسل اور مذہب سے بھی پہلے انسانیت پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔"

"تو پھر اتنے سارے لوگوں کو کیوں مار ڈالا؟" شہریار کی بات سن کر وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھی۔

"یہ معاملہ مختلف ہے۔ اگر ہم وہ سب نہیں کرتے تو خود مارے جاتے اور ظاہر ہے ہم اپنی جانیں تو نہیں گنوا سکتے تھے۔ ہمیں اپنے ان قابلِ احترام ہیرو کو ہر حال میں وطن واپس لے کر جانا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں اور ہمارے لیے یہ کسی طور قابلِ قبول نہیں کہ ہم انہیں دشمن کی قید میں مسلسل اذیتوں سے گزرتا برداشت کر سکیں۔ تم ان کا حال دیکھ رہی ہو نا۔ ان کی کسی انگلی میں ناخن موجود نہیں ہیں۔ اور ایک ایسے آدمی کو علم و تحقیق کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو، ایسے تشدد کا نشانہ بنانے کی کیا تک بنتی ہے؟ یہ کوئی جاسوس نہیں ہیں، نہ کسی ایجنسی یا دوسری تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بس ایک ریسرچر ہیں جن کا ہر جگہ احترام کیا جانا چاہئے۔"

شہریار کا انداز جذباتی تھا۔

''لیکن ان پر تو دہشت گردی کا الزام ہے؟'' وہ اب بھی کنفیوز ہی تھی۔

''الزام..... صرف الزام ہی ہے۔ لیکن اس الزام میں سچائی نام کو بھی نہیں ہے۔ یہ بے چارے بھارت صرف اپنے رشتے داروں سے ملنے آئے تھے اور پھر سازشوں کا شکار ہو کر کہیں سے کہیں پہنچا دیے گئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں بھارت میں دہشت گردی کرنی بھی ہے تو ایسے کام کے لیے ہم کو تربیت یافتہ بندے کو بھیجیں گے یا ایک ایسے شخص کی زندگی خطرے میں ڈال دیں گے جو تحقیق کے میدان میں ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ سچ صرف یہ ہے کہ تمہارے بھارتی ناخداؤں نے پاکستان کو زِک پہنچانے کے لیے اپنے کے ایک قابل فرزند کو ناکارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اب جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف اور صرف ردِعمل ہے۔ لیکن اس ردِعمل میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ کسی مظلوم کو نقصان نہ پہنچے اور صرف وہ لوگ نشانہ بنیں جو ہماری راہ میں آ رہے ہیں۔''

وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ البتہ عائشہ سر گھٹنوں میں چھپا کر اس انداز میں بیٹھ گئی کہ جیسے دل و دماغ پر بہت بوجھ آ گرا ہو اور وہ خود کو کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر پا رہی ہو۔

''تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ تمہارے اوپر ہمارا ساتھ دینے کے لیے کوئی دباؤ تو نہیں ہے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ ہم پناہ کے لیے جس گھر میں داخل ہوئے، وہ تمہارا ثابت ہوا۔ ورنہ ہم یہاں کچھ اجنبیوں سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں بھی ہم کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ہمارا واحد مطالبہ پناہ ہوتی اور اس کے لیے ہمیں گھر کے افراد کو یرغمال بنانا پڑتا۔ تمہارے ساتھ بھی ہم ایسا کر سکتے تھے۔ تمہارے شوہر کے ساتھ ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیتے ہیں اور خود موقع دیکھ کر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی کو بعد میں کوئی نہ کوئی آزاد کروا ہی لے گا۔''

اُس نے کھل کر عائشہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر فرحان اور سلّو نے اس دوران خاموشی سادھ رکھی تھی اور صرف سامع کا کردار ادا کر رہے تھے۔ سلّو کے بے نیاز انداز کو دیکھ کر تو یہ لگتا تھا کہ شاید اس گفتگو کو سننے کی بھی زحمت نہیں کر رہا ہے۔ ناشتے کے تمام لوازمات سے انصاف کرنے کے بعد اب آرام سے بیٹھا ایک سیب ہاتھ میں لیے اس پر دانت مار رہا تھا۔

''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو۔'' عائشہ نے مطالبہ کیا۔

''ٹھیک ہے، تم سوچ لو۔ لیکن یاد رکھو کہ ہمارے پاس وقت کی کمی ہے اس لیے تمہیں جلد ہی کسی فیصلے پر پہنچنا ہوگا۔'' یہ شہریار کا جواب تھا جسے سن کر عائشہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموشی سے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

⊛----✪----⊛

وہ پاگلوں کی طرح جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا لیکن اب تک ماہ بانو تک رسائی کی کوئی اُمید نہیں بن رہی تھی۔ اُس کا دل دیوانہ وار اپنی ماہی کو پکارتا تھا لیکن اُس کی ہر صدا جنگل کی وسعتوں میں ہی کہیں کھو جاتی تھی۔ وہ مصطفیٰ خان کی گفتگو سن کر گھر سے نکلا تھا اور کسی حد تک اس کا اندازہ تھا کہ جنگل کے کس حصے میں ماہ بانو کے ملنے کا امکان ہے۔ لیکن جنگل اتنا گھنا تھا کہ معمولی تیاری کے ساتھ تنہا وہاں آ کر وہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اب کس جانب جانا چاہیے۔ بس یونہی چلتا رہتا تھا اور اسے پکارتا رہتا تھا۔

کھانے پینے کے لیے اس کے پاس کوئی خاص سامان موجود نہیں تھا۔ وہ گھر سے اپنے ساتھ تھوڑے سے چنے لے کر نکلا تھا اور شدت سے بھوک محسوس ہونے پر ایک مٹھی پھانک لیتا تھا۔ چند ایک بار جنگلی پھل



بھی استعمال کیا تھا لیکن اس معاملے میں سخت احتیاط کی ضرورت تھی۔ اکثر جنگلی پھل خوش نما اور خوش ذائقہ ہوتے ہوئے بھی انسان کے لیے ضرر رساں ہوتے ہیں۔

اس نے کھانے کے لیے پھلوں کا انتخاب کرتے ہوئے یہ دھیان رکھنا تھا کہ جنگل میں رہنے والے جانور ان پھلوں کو کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ جانوروں کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے اور عموماً وہ زہریلی غذا کو کھانے کی غلطی نہیں کرتے۔

پینے کے لیے پانی بھی اسے جنگل میں ہی کہیں نہ کہیں مل جاتا تھا۔ اس سرسبز و شاداب ریاست میں یوں پانی کے ذخائر کی کوئی کمی نہیں تھی تو پھر جنگل میں کیسے یہ کمی ہوتی۔ وہ اپنے پاس موجود بوتل کو کسی بھی نالے یا چشمے سے بھر لیتا اور پورا دن آرام سے گزر جاتا۔

یوں بھی وہ جن حالات سے دوچار تھا، اسے کھانے پینے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بس جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے اس ایندھن کی ضرورت تھی۔ یہ احساس کہ ماہ بانو کسی مشکل میں ہے اور اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے اسے ہی عملی اقدامات کرنے ہوں گے، اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ ورنہ اپنی ماہی کو دیکھے بغیر تو اسے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔

سوتا بھی وہ اس وقت تھا، جب فطرت اسے ہار مان لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اور یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے کہ انسان کتنے ہی بڑے جذباتی حادثے سے کیوں نہ گزرے، فطری احتیاجات بس ایک عرصے تک ہی دبی رہتی ہیں اور آخر کار انسان ان سے مغلوب ہو ہی جاتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں سانس سے ناتا توڑ لینے کی ہوتی ہے۔ جو جذباتی بحرانوں سے گزرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، وہ موت کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ لیکن وہ تو مرنے کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ابھی ماہ بانو کے زندہ ہونے کی آس باقی تھی اور اس آس کے سہارے وہ اپنی سانسوں کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

''مصطفیٰ خان نے جنگل کے اس حصے کا ذکر کیا تھا۔ اگر مجھے یہاں پہنچنا ہے تو پہلے مشرق کی طرف اور پھر شمال کی طرف جانا ہوگا۔''

کمپیوٹر سے نکالے گئے جنگل کے نقشے کا پرنٹ سامنے پھیلائے وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ عرصے میں اس نے یہ نقشہ اتنی بار دیکھا تھا کہ بار بار کے استعمال سے اس کا کاغذ خراب ہونے لگا تھا۔ راستے کے تعین کے لیے وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈبیا جتنا کمپاس (قطب نما) بھی لے کر آیا تھا لیکن اس کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ وہ صحیح طور پر کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ اور اس بات کا اندازہ اسے اپنے بار بار بھٹکنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ چنانچہ اب وہ اس کا سہارا لینے کے بجائے اپنی صوابدید پر سفر کر رہا تھا۔ سمتوں کے تعین کے لیے سورج سے مدد لینے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس گھنے جنگل میں سورج کا دیدار بھی آسانی سے نہیں ہو پاتا تھا اور بعض اوقات تو دن کے وقت بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اچانک ہونے والی بارشوں کی آفت الگ بار بار ٹوٹ پڑتی تھی۔ بارش کا تو یہاں پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ابھی تو سورج نکلا ہوا ہے اور پھر منٹوں سیکنڈوں میں موسم اپنے تیور بدل کر ہر طرف جل تھل مچا دیتا تھا۔ گھنے درختوں کے سائے اسے کسی حد تک اس بارش سے پناہ تو دے دیتے تھے لیکن دلدلی زمین پر چلنا پھرنا مزید دشوار ہو جاتا تھا۔

جنگل میں چلتے ہوئے اسے مستقل اپنے ہاتھ میں ایک اسٹک رکھنی پڑ رہی تھی جسے قدم آگے بڑھانے سے پہلے زمین پر ٹکا کر وہ اس بات کا اطمینان کر لیتا تھا کہ اُٹھنے والا قدم اسے کسی دلدل میں نہیں پہنچا دے

گا۔ ماہ بانو اس کی زندگی تھی اور اپنی زندگی کی تلاش میں اسے قدم قدم پر حادثات اور موت سے جنگ لڑ
رہی تھی۔

یہاں موذی جانور بھی تھے، خطرناک دلدلیں بھی اور کہیں کسی پناہ گاہ میں چھپے وہ دشمن بھی جنہوں
اس کی ماہ بانو کو اس سے جدا کر دیا تھا۔ اس دشمن سے وہ خود بھی سامنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک کسی سے
نہیں ہوا تھا۔ ٹکراؤ ہوتا تو وہ اس سے ماہ بانو کا اتا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس بات کا بھ
اسے احساس تھا کہ یہاں چھپا وہ دشمن اس سے کہیں بہتر پوزیشن میں ہے اور ذرا سی چوک یا غفلت اُ
زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔

زندگی اسے اتنی پیاری نہیں تھی لیکن ماہ بانو کے کام آئے بغیر ضائع ہو جاتی تو مر کر بھی چین نہیں آ
بانو کے خیال کے ساتھ ساتھ اسے اس ننھی سی کونپل کا بھی خیال آتا تھا جس نے ابھی ماں کے بطن میں
موجودگی کا اعلان کیا تھا اور وہ بہت شوق سے منتظر تھا کہ وہ ننھی جان دنیا میں آئے تو وہ اپنی محبت کی اس
کو دیکھے جسے اس نے بہت چاہت سے اپنی جانِ جاناں کے وجود کا حصہ بنایا تھا۔ محبت کے طاقتور جذ
ہی اسے اتنی ہمت اور طاقت دی تھی کہ وہ دنیا کی اتنی بڑی سپر پاور سے ٹکر لینے چلا تھا۔

مصطفیٰ خان کی گفتگو سن لینے کے بعد اس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کو کسی عام امریکی شہری
نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پیچھے حکومتی سرپرستی موجود ہے۔ دنیا پر راج کرنے کا خواب دیکھنے والی یہ
ایک ایسے جنون میں مبتلا تھی کہ انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔

اسلم کا خون یہ سوچ سوچ کر کھولتا تھا کہ ان جلادوں نے ماہ بانو کو اپنے کسی تجربے کے لیے بالکل
پکڑ لیا تھا جیسے وہ کوئی چوہا، بلی یا گنی پگ ہو۔ امریکی حکومت اور اہم اداروں کے اکابرین خالصتاً
شہریوں کے علاوہ باقی دنیا کے انسانوں کو سمجھتے بھی جانور ہی تھے۔ بلکہ شاید اس سے بھی کم تر۔ کیونکہ جا
کی زندگی کی حفاظت کے لیے تو یہاں بڑے سخت قوانین تھے اور سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کوئی اُنکی
پہنچانے کا سوچ بھی سکے۔ غلطی سے بھی کسی سے اگر جرم ہو جاتا تو اس کا اسے شدید خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

ذہن میں بہت سے اُلجھے ہوئے خیالات لیے اس نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ گھنے درختو
درمیان جاری یہ سفر کتنے گھنٹوں پر محیط تھا، اس نے گننے کی زحمت نہیں کی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا،
حساب کتاب کرنا بھول گیا تھا اور اس وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا تھا جم
ٹانگیں چلنے سے انکاری ہو کر اسے کہیں ڈھے جانے پر مجبور نہیں کر دیتی تھیں۔ فطرت ہی اسے مجبور کر
بھی دیتی تھی لیکن بس وہ اتنی ہی دیر سوتا تھا کہ جتنی دیر اپنے جسم پر قابو نہیں رہتا تھا۔ ذرا توانائی آتی تو
تلاش کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔ سفر بھی وہ جو گھنے جنگل میں دشوار گزار راستوں پر تھا اور اُس کی
میں اپنی نشانیاں ثبت کرتا جا رہا تھا۔ چل چل کر اس کے پیروں میں سوجن آ گئی تھی اور بعض اوقات جوتا
تنگ ہو جانے پر اسے پیروں کو جوتے کی قید سے آزاد کر کے ننگے پیر بھی چلنا پڑتا تھا۔

ننگے پیر چلنے کی وجہ سے اسے کئی بار کانٹے بھی چبھے تھے اور ٹھوکریں بھی لگی تھیں۔ اس کے بائیں
چھوٹی انگلی کا ناخن تو تقریباً اُکھڑ ہی گیا تھا لیکن اُسے پروا نہیں تھی۔ بعض اوقات اسے خاردار جھاڑیو
درمیان سے بھی گزرنا پڑتا تھا اور چونکہ اپنی دیوانگی میں اسے احتیاط برتنے کا خیال کم ہی آتا تھا، اس
باران کانٹوں سے اپنا دامن اُلجھا کر جسم کے مختلف حصوں پر خراشیں لگوا بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے کئی
پھٹ گئے تھے اور اُلجھے بالوں اور بے ترتیب داڑھی مونچھ کے ساتھ وہ حقیقتاً ایسا مجنوں لگ رہا تھا جو



ک بچے اپنی لیلیٰ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہو۔ لیلیٰ لیلیٰ پکارتا وہ دیوانہ اپنے حال سے یکسر بیگانہ تھا۔ ہوش تھا
ں اتنا کہ کسی طرح اپنی لیلیٰ تک پہنچنا ہے۔

اندازے سے سمت کا تعین کیے اس نے کتنا سفر طے کر لیا تھا، کچھ نہیں جانتا تھا۔ چونکا اس وقت جب
اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک بچے کی جھلک سی دکھائی دی۔ اس جھلک کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔
اتنے عرصے میں یہ پہلی بار تھا کہ اسے اپنے سوا کسی دوسرے انسان کی جھلک دکھائی دی اور وہ انسان تھا
ایک چھوٹا بچہ۔

بے ساختہ ہی اس نے خود کو چوڑے تنوں والے دو ایسے درختوں کے پیچھے چھپا لیا جو اپنی وسعت کی
تقریباً ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے اور دونوں کے تنوں کے درمیان بس ایک معمولی سی جھری ہی
رہ گئی تھی۔ اس جھری میں سے وہ گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا چنانچہ خاموشی سے سانسیں روکے اس
دیکھ رہا تھا جہاں اسے اب بھی بھاگتے ہوئے بچے کی پشت نظر آ رہی تھی۔ بچے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ
اپنے گرد و پیش سے بھی پوری طرح چوکنا تھا کیونکہ یہ تو لازم تھا کہ کوئی بچہ تنہا اس جنگل میں موجود نہیں ہو
تھا۔

بچے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا اور اسے کسی دوسرے فرد یا افراد کے
میں اسے تعین کرنا تھا کہ وہ اس کے دشمن ثابت ہوں گے یا غیر متعلقہ افراد۔ دوستوں کی تو یہاں اسے
سے کوئی اُمید ہی نہیں تھی۔

"ایڈی!..... رُک جاؤ بدمعاش! ورنہ میں تمہارا حشر خراب کر دوں گا۔" چند سیکنڈ کا وقفہ نہیں گزرا تھا کہ
ہوا کے دوش پر لہراتی ایک کرخت آواز سنائی دی اور پھر فوراً ہی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک توانا آدمی
کے سامنے سے گزر کر اس سمت دوڑ گیا جس سمت وہ بچہ بھاگ رہا تھا۔ بچے کا تعاقب کرتے اس آدمی
ہاتھ میں ہتھیار بھی موجود تھا جس کو لہراتے ہوئے وہ بار بار گولی چلانے کی دھمکی بھی دے رہا تھا لیکن اس
کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور بچہ مسلسل بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اسلم اس وقت اسے ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں سے اسے بہت دُور تک دکھائی
رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اسلحہ بردار نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا اور زوردار آواز سے ہونے
والے فائر کے ساتھ ہی جنگل میں ایک انسانی چیخ گونجی۔

اسلم نے خود سے کافی فاصلے پر ایڈی کے نام سے پکارے جانے والے بچے کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔
بے ساختہ ہی وہ اپنی کمین گاہ سے نکل پڑا۔ لیکن یک دم ہی ہوش آ گیا کہ جو شخص کو ایک بچے کو اتنی آسانی سے
گولی مار سکتا ہے، وہ اس کے لیے تو اچھا خاصا خطرناک ثابت ہو گا۔

وہ فوراً ہی محتاط ہو گیا اور درختوں کی آڑ لے کر دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں وہ بچہ گرا ہوا تھا
اب اسلحہ بردار شخص بھی اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ آخر کار اسلم بھی ان سے اتنے فاصلے پر پہنچنے میں کامیاب
ہا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکے۔

"مارک! تم نے مجھے گولی ماری ہے۔ ماسٹر تمہیں اس کی سزا دے گا۔"

زمین پر گرا بچہ زور زور سے روتے ہوئے اس شخص سے مخاطب تھا جو اب اپنی گن ایک جانب رکھے
کی زخمی ٹانگ پر پٹی باندھ کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بچے کے بالائی
پر موجود ٹی شرٹ اُتار لی تھی۔

اسلم کو پہلی حیرت بچے کی آواز سن کر ہوئی تھی کیونکہ وہ آواز ہرگز بھی کسی چار پانچ سالہ بچے کی نہیں تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکا بات کر رہا ہو۔ قریب سے دیکھنے پر اسے کچھ اور بھی چیزیں آئیں۔ تقریباً تین فٹ کے اس بچے کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی اور ہلکی ہلکی مونچھیں موجود تھیں جبکہ بھی کسی جوان مرد کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ غلط فہمی کا شکار رہا ہے جسے بچہ سمجھتا رہا ہے، وہ بچہ نہیں بلکہ پستہ قامت کا نوجوان ہے۔ لیکن کسی نوجوان کا گولی کھا کر اس طرح کی طرح رونا بھی عجیب ہی تھا۔

''ماسٹر کو میں خود سمجھا لوں گا۔ تم اس بات پر بہت اِتراتے ہو نا کہ ماسٹر کے لاڈلے ہو۔ لیکن یاد رکھو ماسٹر تم سے کتنی ہی محبت کرتا ہو، اس بات کو بالکل برداشت نہیں کرے گا کہ تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو۔'' مارک نامی آدمی نے پٹی باندھنے کا کام مکمل کرتے ہوئے ایڈی کی دھمکی کا جواب دیا۔

''تم نے خود مجھے بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔ تم مجھے کھانے پینے کو نہیں دے رہے تھے اس لیے مجھے وہاں سے نکلنا پڑا۔ کیا میں بھوکا مرنے کے لیے وہاں پڑا رہتا؟'' ایڈی زور سے چیخ کر بولا۔

''تمہارا کھانا پینا بھی مجھے تمہاری حرکتوں کی وجہ سے بند کرنا پڑا تھا۔ تمہارے اس پانچ سال کے ا میں چوبیس سال کی جوانی پھڑ پھڑاتی رہتی ہے، اسے لگام ڈالنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ عورت، ماسٹر کے لیے کتنی اہم ہے۔ اگر تمہاری بدتمیزی سے اسے کوئی نقصان ہو جاتا تو ماسٹر ہاتھ سے تمہیں گولی مار دیتا۔''

مارک کے ایڈی کو دیئے جواب نے اسلم کے کان کھڑے کر دیئے۔

''اتنی خوب صورت عورت کی خاطر میری جان بھی چلی جاتی تو کوئی دکھ نہیں ہوتا۔'' ٹھیٹ عاشقوں لہجے میں یہ جواب دیتے ہوئے ایڈی کو شاید اپنی زخمی ٹانگ بالکل بھول چکی تھی۔

''او عاشق کی اولاد!..... اپنا منہ بند کر۔ اس عورت کی کوکھ میں پلتے بچے کو ماسٹر ایسے روپ میں ڈھا والا ہے کہ تُو اس کے سامنے پانی بھرتا رہ جائے گا۔ تجھے اس بات پر غرور ہے نا کہ تُو ماسٹر کا سب سے شاہکار ہے تو سن لے، وہ عورت ایک ایسے بچے کو جنم دینے والی ہے جو تجھ سے کئی گنا بڑھ کر ذہین خوبصورت ہوگا۔ پھر ماسٹر تجھے بھول جائے گا اور تُو میرے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس وقت میں تجھ سے ان سالوں کا گن گن کر بدلہ لوں گا جن میں تُو نے مجھے خوب ستایا ہے۔''

مارک نے ہلکے پھلکے ایڈی کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا تھا اور بولتا ہوا اسی راستے پر واپس چل پڑا تھا راستے سے وہ اور ایڈی یہاں آئے تھے۔ آڑ میں چھپ کر کھڑے اسلم کا دل گفتگو کے اس حصے کو سن کر کسی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا تھا۔

سننے کو اس نے مارک کی زبان سے کئی عجیب و غریب انکشافات سن لیے تھے لیکن خوب صورت عورت کا ذکر سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ عورت ماہ بانو ہی ہے۔ اس نے مصطفیٰ خان کی اس کی بیوی بلا سے کی جانے والی جو گفتگو سنی تھی، اس سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ جنگل میں کوئی ایسی خفیہ تجربہ گاہ قائم ہے جہاں حاملہ خواتین پر تجربے کیے جا رہے ہیں۔ یقینی طور پر وہ تجربے ایسے تھے جن کی انسانی حقوق تنظیموں کی طرف سے شدید مذمت کی جاتی۔ چنانچہ حکومتی سرپرستی حاصل ہونے کے باوجود یہ تجربات خفیہ مجرمانہ طریقوں پر کیے جا رہے تھے۔

اسلم کا دل یہ سن کر بُری طرح تڑپنے لگا تھا کہ یہ بے رحم لوگ ایک ننھی جان کو دنیا میں آنے سے قبل



اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ ان تجربات کا نتیجہ کچھ بھی نکلتا لیکن یہ تو سامنے کی بات تھی کہ ایسا بچہ عام بچوں سے مختلف ہوتا اور معاشرے میں عام فرد کی سی زندگی گزارنے کا اہل نہ ہوتا۔

اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایڈی نامی وہ نوجوان بچہ بھی کسی تجربے کا ہی نتیجہ تھا۔ ظالموں نے جانے س مقصد کے لیے اس پر کون کون سے تجربات کیے تھے کہ وہ پانچ سال کی عمر میں ہی اپنے بچپن سے محروم تھا اور اب اس کا ہونے والا بچہ بھی شدید خطرے میں تھا۔

ماہ بانو اور بچے کی زندگی کے خطرے میں ہونے کا سوچ کر اس کے وجود میں طیش کی شدید لہریں اُٹھ رہی تھیں اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی پیچھے سے جا کر مارک کی گردن دبوچ لے۔ اپنی اس خواہش پر اس نے بڑی مشکل سے قابو پایا اور غصے کو دباتے ہوئے احتیاط سے مارک کا پیچھا کرنے لگا۔

مارک اور ایڈی کے درمیان اب بھی مسلسل مکالمہ جاری تھا اور اس گفتگو کا زیادہ تر حصہ ایک دوسرے کو دی جانے والی دھمکیوں پر مشتمل تھا۔ مارک نے ایڈی کو دھمکی دی تھی کہ اگر آئندہ ایڈی نے اسے ستایا تو وہ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کرے گا اور اس کے ہاتھ پیر کاٹ کر ڈال دے گا۔ جواب میں ایڈی نے اسے دنیا جہاں کی گالیاں دے ڈالی تھیں۔

''او کے، تم انسانیت سے ماننے والے نہیں ہو۔ تمہیں سبق سکھانا ضروری ہے اور اس کے لیے میں نے پورا پلان سوچ لیا ہے۔ میں تمہیں اسی حالت میں لے جا کر تمہارے بیرک میں پھینک دوں گا۔ گولی ابھی تک ٹانگ کے اندر ہی ہے۔ دو چار دن بغیر علاج کے ایسے ہی پڑے رہو گے تو زخم سڑ جائے گا اور پھر ماسٹر خود تمہاری ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ سنانے پر مجبور ہو جائے گا۔'' وہ بہت سفاکانہ فطرت کا آدمی لگ رہا تھا۔

''تت..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس بار ایڈی واضح طور پر خوف زدہ ہو گیا۔

''تم جانتے ہو کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے نا کہ پچھلے سال میں نے تمہیں ایک کوبرا کے ساتھ باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ اگر اس روز تم مجھ سے سوری نہیں کرتے تو وہ کوبرا تمہیں تمہارے انجام تک پہنچا دیتا۔''

مارک کی باتوں سے اس کی سفاکانہ فطرت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ محتاط فاصلے سے ان کے تعاقب میں چلتا اسلم بھی اس گفتگو کا بیشتر حصہ سن رہا تھا۔ اس گفتگو کو سن کر جہاں اس کے دل میں ایڈی کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے، وہاں وہ یہ سوچ سوچ کر لرز رہا تھا کہ ایسی سفاک فطرت رکھنے والے آدمی کی قید میں ماہ بانو نہ جانے کس حال میں ہوگی۔

اپنی گفتگو سے مارک اذیت پسند آدمی لگ رہا تھا اور یہ طے تھا کہ اگر اس نے ماہ بانو کو کوئی نقصان پہنچایا ہوگا تو اسلم کے ہاتھوں اس کی سخت سزا بھی بھگتے گا۔ ویسے اس کا امکان ذرا کم ہی تھا کیونکہ مارک اپنی زبان سے کہہ چکا تھا کہ وہ عورت ان کے ماسٹر کے لیے بہت قیمتی ہے اور ماسٹر اسے کوئی نقصان پہنچنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اس تسلی نے بھی کسی حد تک اس کے اندر اُبھرتے اشتعال کو قابو میں کیے رکھا اور پھر ابھی تو حتمی طور پر یہ طے ہونا بھی باقی تھا کہ وہ عورت ماہ بانو ہے بھی یا نہیں۔ ویسے اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ ماہ بانو ہی ہوگی اسی لیے بڑے صبر و ضبط سے تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا۔

ایڈی کو کاندھے پر ڈالے دوسرے ہاتھ میں اپنی گن تھامے مسلسل چلتے مارک کا اسٹیمنا قابلِ تعریف تھا۔ جس مقام سے اس نے ایڈی کو اٹھایا تھا، وہاں سے اب تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا اور ذرا بھی نہیں ہانپ رہا تھا۔ آخر کار چلتے چلتے وہ جنگل کے ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں بہت سے درخت جھنڈ کی شکل میں موجود

تھے۔ مارک ایڈی کو لیے ہوئے اس جھنڈ میں داخل ہو گیا۔

اسلم ان کے پیچھے تھا۔ جھنڈ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک درخت کی آڑ میں رک کر جھانکا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ جھنڈ ایک خاص ترتیب میں تھا اور درخت اس انداز میں کھڑے تھے کہ درمیان میں ایک دائرے کی صورت اچھی خاصی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی اور بس چند جھاڑیاں وغیرہ ہی نظر آ رہی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں سے ہی ایک جھاڑی کے پاس پہنچ کر مارک نے ایڈی کو نیچے لٹایا اور خود جھاڑی کو کسی لیور کی طرح پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب حرکت دی۔

اس حرکت کے نتیجے میں جھاڑی اپنے نیچے موجود زمین سمیت بائیں جانب کھسک گئی اور ایک اچھا خاصا بڑا چوکور خلا نظر آنے لگا۔ مارک نے زمین پر لیٹے ایڈی کو ایک بار پھر اپنے کندھے پر ڈالا اور اس چوکور خلا میں اُتر گیا۔ اسلم اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہاں سیڑھیاں موجود ہوں گی جن کی مدد سے وہ نیچے اُتر رہا تھا۔ مارک اور ایڈی کے وجود اس خلا میں نظر آنے بند ہو گئے تو وہ خلا بھی بند ہو گیا اور ایک بار پھر لہلہاتی جھاڑی کے ساتھ زمین بالکل ایسی نظر آنے لگی جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

اسلم نے ڈراموں، فلموں میں اس طرح کے خفیہ ٹھکانے اور ان کے کھولنے بند کرنے کے عجیب و غریب طریقے بہت دیکھے تھے لیکن اس وقت اپنی آنکھوں سے حقیقت میں یہ سب دیکھنا بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ دل میں اُبھرتی اس خواہش پر کہ فوری طور پر خود بھی اس خفیہ ٹھکانے میں گھس جائے، قابو پاتے ہوئے وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے بالکل خشک ہو جانے والے حلق کو اپنے پاس موجود بوتل کے پانی سے تر کرنے کے بعد خود بھی اس جھاڑی کا رخ کیا۔

کئی منٹ گزر جانے کے باعث اسے یقین تھا کہ جب وہ یہ خفیہ راستہ کھول کر اندر داخل ہو گا تو کسی سے فوری طور پر مڈبھیڑ نہیں ہو گی اور مارک بھی زخمی ایڈی کو طبی امداد پہنچانے میں مصروف ہو گیا۔

خفیہ راستہ کھولنے کا طریقہ وہ دیکھ ہی چکا تھا۔ چنانچہ ہاتھ جھاڑی کی طرف بڑھایا اور یونہی اس کا ایک پتا پکڑ کر توڑ لیا۔ پتا توڑنے پر اسے احساس ہوا کہ یہ جھاڑی مصنوعی ہے کیونکہ پتا توڑنے پر بھی وہ نمی محسوس نہیں ہوئی تھی جو قدرتی طور پر ہر پودے میں موجود ہوتی ہے، حالانکہ دیکھنے اور چھونے میں وہ جھاڑی بالکل اصلی لگتی تھی۔ اُس نے اُنگلیوں کے بیچ دبا پتا ایک طرف پھینکا اور مارک کی طرح جھاڑی کو پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب حرکت دی۔ نتیجے میں ایک بار پھر وہ خلا نمودار ہو گیا جو کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا تھا۔

اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے خلا میں جھانک کر دیکھا۔ لوہے کا مضبوط زینہ نیچے جا رہا تھا اور اندر جلتی مدھم سی روشنی میں وہاں کسی ذی نفس کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ دو اسٹیپ نیچے اُترتے ہی اسے دیوار میں لگا ایک لیور نظر آ گیا۔ اس لیور کو حرکت دینے پر پیدا ہونے والا خلا بند ہو گیا لیکن اندر حبس یا اندھیرے کا نام و نشان نہیں تھا۔

مدھم سی نیلگوں روشنی میں محسوس کی جانے والی فضا کی تازگی بتا رہی تھی کہ وہاں وینٹی لیشن کا بڑا زبردست اور باقاعدہ نظام ہے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ساری سیڑھیاں اُتر گیا۔ نیچے اُترنے سے پہلے ہی اس نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا لیکن فی الحال کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا تو ریوالور کے استعمال کی کیا ضرورت پڑتی۔

سیڑھیاں اُترنے کے بعد وہ دائیں طرف جاتے گلی نما راستے کی طرف مڑ گیا۔ پتلے سے اس راستے کے دونوں جانب سپاٹ دیواریں تھیں اور ابھی اسے کوئی کھڑکی، دروازہ نظر نہیں آیا تھا۔ آخر کار وہ چلتا ہوا درمیان



میں پہنچ گیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ زیر زمین عمارت وہاں سے دائیں اور بائیں دو حصوں میں منقسم ہو رہی ہے اور دونوں طرف کوریڈورز ہیں جن میں مختلف کمروں کے دروازے موجود تھے اور فی الحال یہ سارے کے سارے دروازے بند نظر آ رہے تھے۔

اتنی بڑی جگہ پر جو لوگ بھی موجود تھے وہ یقیناً ان بند دروازوں کے پیچھے ہی تھے۔ ان لوگوں میں سے ایک اس کی ماہ بانو بھی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس دروازے کے پیچھے موجود ہو گی۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے اسے کہیں سے تو آغاز کرنا تھا چنانچہ دائیں طرف کے کوریڈور میں مڑ گیا اور پڑنے والے پہلے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک تھا چنانچہ ہینڈل پر دباؤ ڈالنے پر بھی نہیں کھلا۔

اس نے کمرے کے اندر کا معائنہ کرنے کے لیے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اسی لمحے اسے اپنے پیچھے حرکت کا سا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے سیدھا ہو کر پیچھے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس سے قبل ہی اس کی گردن میں ایک سوئی سی پیوست ہوئی اور اس نے بہت تیزی سے اپنے جسم کو سُن ہوتا ہوا محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں اور اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی کوشش میں ناکام ہو کر زمین پر آ رہا۔ نیچے گر کر ساکت ہو جانے والی اس کی آنکھ کی پتلیوں پر جو عکس بنا وہ مارک کے مسکراتے ہوئے خبیث چہرے کا تھا۔

❀----✪----❀

''میں کچھ دیر کے لیے اپنے دفتر جانا چاہتی ہوں۔'' عائشہ کے اس مطالبے کو سن کر وہ بری طرح چونک گئے۔

''کیا کہا تم نے؟'' شہریار نے کچھ حیرانی سے جو سنا، اس کی تصدیق چاہی۔

''مجھے آفس جانا ہے۔'' اس نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم تمہیں کیسے اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں؟'' شہریار نے نفی میں سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ بہت ضروری ہے۔ میری نئی جاب ہے اور موجودہ حالات میں ہرگز بھی یہ پسند نہیں کیا جائے گا کہ میں چھٹی کروں۔ اس کوتاہی پر مجھے جاب سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میں کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ میرے لیے یہ نقصان برداشت کرنا بہت مشکل ہو گا۔'' اپنے مطالبے پر قائم رہتے ہوئے عائشہ نے اس کے حق میں دلائل دیئے۔

''وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن تم خود سوچو کہ کیا ہمارے حالات اتنا بڑا خطرہ مول لینے کی اجازت دیتے ہیں؟ تم باہر جا کر ہمارے لیے کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتی ہو۔'' شہریار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''اس سلسلے میں، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ابھی میں نے یہ فیصلہ تو نہیں کیا ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں گی یا نہیں لیکن اتنی یقین دہانی ضرور کروا سکتی ہوں کہ جب تک تم اس چار دیواری میں ہو، میری زبان کسی کے سامنے نہیں کھلے گی۔ میرے خیال میں تم مجھ پر اتنا اعتماد تو کر سکتے ہو۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''بھروسے کی بات تو الگ ہے لیکن ہمارے ساتھ وقت کا بھی مسئلہ ہے۔ تم دفتر میں اپنی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی پوری کر کے آؤ گی تو کیا تب تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تمہارے انتظار میں بیٹھے رہیں گے؟ ابھی تمہارا

شوہر سو رہا ہے لیکن ظاہر ہے، اس کا نشہ اُترے گا تو وہ جاگ جائے گا اور اس شخص سے تو ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔ اپنے گھر میں اجنبی افراد کو دیکھ کر وہ شور بھی مچا سکتا ہے اور یہ ہمارے لیے نقصان دہ ہوگا۔'' شہریار نے اس سے بحث کی۔

عائشہ کی جگہ اگر کوئی دوسرا فرد سامنے ہوتا تو اس قسم کے مذاکرات کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وہ سارے فیصلے خود کرتا۔ لیکن عائشہ پر نہ جانے کیوں بھروسہ کرنے کا دل چاہتا تھا۔

''میں پورے دن کے لیے دفتر نہیں جاؤں گی۔ بس ایک دو گھنٹے لگیں گے۔ دفتر میں میرے باس کو معلوم ہے کہ کمال کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ میں چند ضروری کام نمٹانے کے بعد کمال کی طبیعت کا بہانہ کر کے اس سے چھٹی لے لوں گی۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ تم دن کی روشنی میں کچھ نہیں کر سکتے۔ دن کے وقت یہاں سے نکلو گے تو لوگوں کی نظروں میں آ جاؤ گے۔ تمہیں ہر حال میں رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ رہی بات کمال کے جاگنے کی تو اس کا میرے پاس حل موجود ہے۔ تم لوگ اس سامنے والے کمرے تک خود کو محدود کر لینا۔ کمرے میں اٹیچڈ باتھ موجود ہے۔ پینے کا پانی اور کھانے کے لیے کچھ میں تمہیں فراہم کر دوں گی۔ تم اندر سے دروازہ لاک کر لینا۔ عام طور پر کمال بیڈ روم اور لاؤنج کے علاوہ کسی دوسرے کمرے میں نہیں جاتا۔ لیکن بالفرض اس نے چاہا بھی تو وہ دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکے گا اور یہی سمجھے گا کہ دروازہ میں نے لاک کیا ہے۔ اس کے پاس مین گیٹ کے علاوہ گھر کی چابیاں نہیں ہوتیں اس لیے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بس تم لوگ یہ کوشش کرنا کہ کمرے سے کوئی آواز باہر نہ آنے پائے ورنہ شک ہونے پر کمال ہنگامہ کر سکتا ہے۔''

''اوکے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں اور بدلے میں یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔''

آخر کار شہریار نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ چند گھنٹے مزید عائشہ کے گھر میں گزارنے سے ڈاکٹر فرحان کو تھوڑا سا ریسٹ مل جائے گا۔ بے شک اب تک وہ ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے رہے تھے لیکن حقیقتاً ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور اب زخموں نے بھی خاصا نڈھال کر دیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ انہیں آرام کا موقع مل جاتا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچاؤں۔'' عائشہ نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے بعد وہ اپنے اخبار کے دفتر جانے کے لیے تیار کرنے لگی۔

بلیو جینز اور ڈھیلی ڈھالی پنک ٹی شرٹ پہن کر تیار ہونے کے بعد وہ ان کے سامنے آئی تو اس کی شخصیت کا وہ تاثر برقرار تھا جو انہوں نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ تیار ہونے سے قبل اس نے کچن سمیٹ کر صاف کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے شوہر کے لیے ناشتہ بھی تیار کر کے رکھا تھا۔ ان لوگوں کے لیے اس نے ایک تھرماس میں کافی تیار کر دی تھی۔ کافی کے ساتھ کچھ ہلکے پھلکے اسنیکس بھی تھے جو کسی وجہ سے اس کے لیٹ ہو جانے کی صورت میں ان کے کام آ سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر میں چلتی ہوں۔ میری طرف سے بالکل بے فکر رہنا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو تمہاری یہاں موجودگی کا احساس نہ ہو سکے ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گی۔'' گھر سے نکلنے سے قبل اس نے ان لوگوں کو اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہدایت کی۔



[illegible] اری سمجھا۔

وہ چلی گئی تو وہ تینوں بھی اس کمرے میں منتقل ہو گئے جس کا اس نے بتایا تھا۔ لاؤنج میں سے اپنی [illegible] گی کے تمام آثار وہ پہلے ہی مٹا چکے تھے اور ان کا کل سامان اسلحے سمیت اسی کمرے میں تھا جو عائشہ نے [illegible] کے لیے مختص کیا تھا۔

ڈاکٹر فرحان کو انہوں نے کمرے میں موجود سنگل بیڈ پر آرام کے لیے لٹا دیا تھا۔ عائشہ نے اپنے پاس [illegible] انہیں چند پین کلرز بھی دی تھیں جنہیں کھانے سے وہ خاصا افاقہ محسوس کر رہے تھے۔

''تم ڈاکٹر صاحب کے پاس رُکو۔ میں ذرا گھر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' عائشہ کو روانہ ہوئے چند منٹ [illegible] گزرے تھے کہ شہریار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بے شک عائشہ نے انہیں اس کمرے تک محدود رہنے کی [illegible] کی تھی اور وہ خود بھی اس ہدایت کی خلاف ورزی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ وہ [illegible] اردگرد سے بالکل بے خبر نہ رہیں۔ کم از کم انہیں اپنی پناہ گاہ کے بارے میں تو مکمل معلومات ہونی [illegible] تھیں۔

کمرے سے باہر نکل کر وہ احتیاط سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے پہلے اس نے بیڈ روم میں جھانک [illegible] کمال کو دیکھا۔ وہ ابھی تک لمبی تانے سو رہا تھا۔

اس کی طرف سے تسلی ہونے پر اس نے باقی گھر کا جائزہ لیا۔ سامان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سب کچھ [illegible] کمینوں کا ہی ہے۔ حالانکہ عائشہ کا پرانا گھر وہ دیکھ چکے تھے۔ وہاں سارا سامان بہت پرانا اور خستہ حال [illegible] اور انہوں نے گھر میں گنتی کی ہی چند چیزیں اچھی حالت میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تر عائشہ کی [illegible] تھیں اور دوسرے چائے کے برتن۔ ناشتے کے وقت انہوں نے چائے انہی نفیس پیالیوں میں پی تھی جو [illegible] دیکھ چکے تھے۔ کتابیں بھی ایک کمرے میں نظر آ گئیں لیکن ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں کم ہو [illegible] تھی اور یقیناً اس کے پیچھے کمال کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ پہلے بھی عائشہ کی قیمتی کتابیں بیچ چکا تھا اور ان کتابوں کے [illegible] ہی عائشہ کی تعلیمی اسناد بھی چلی گئی تھیں جس کی وجہ سے اس بے چاری کو ڈپلیکیٹ نکلنے تک ہوٹل میں [illegible] کی ملازمت کرنی پڑی تھی۔ وہ ملازمت ہی ان کی ملاقات کا سبب بنی تھی۔ لیکن دہلی چھوڑتے وقت [illegible] اندازہ نہیں تھا کہ کبھی دوبارہ بھی ایک دوسرے سے سامنا ہوگا۔ پہلے ہی کی طرح ایک اور اتفاق نے ان [illegible] ملاقات دوبارہ کروا دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت عائشہ مشکل میں تھی اور آج وہ اس کے گھر میں [illegible] گزین تھے۔

پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد وہ سب سے آخر میں اسٹور میں آیا۔ اسٹور گرد آلود تھا۔ شاید ملازمت [illegible] مصروفیت کی وجہ سے عائشہ ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دے سکی تھی۔ ویسے بھی یہاں زیادہ تر کاٹھ کباڑ [illegible] ہوا تھا۔ اسے اپنے کام کی صرف ایک چیز نظر آئی تھی اور وہ تھا ایک ہوا دان۔

اُس نے ایک جستی صندوق پر چڑھ کر ہوا دان سے باہر جھانکا۔ یہاں سے ہاؤسنگ اسکیم کا مین گیٹ [illegible] نظر آ رہا تھا۔ گیٹ پر اب بھی وہی رات والا بوڑھا چوکیدار موجود تھا لیکن اس کے ساتھ موجود دو پولیس [illegible] کی موجودگی ذرا تشویش ناک تھی۔ وہ دونوں چوکیدار سے کچھ پوچھ رہے تھے جس کا وہ زور زور سے سر [illegible] بڑی شد و مد سے جواب دے رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو [illegible] سن سکتا تھا لیکن قیاس یہی تھا کہ شاید انہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس گفتگو کے کسی انجام تک [illegible] سے قبل ہی اسے گھر میں کھٹ پٹ کا احساس ہوا۔

وہ جلدی سے نیچے اُتر کر اسٹور کے دروازے تک آیا اور وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ یہ کمال تھا
کھلتے ہی سیدھا کچن میں پہنچ گیا تھا اور ہاتھ منہ دھو کر فریش ہونے کی زحمت کیے بغیر کچن میں کھڑے
ہی ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

وہ ایسے رخ پر کھڑا تھا کہ اگر شہریار اسٹور سے نکل کر کمرے میں جانے کی کوشش کرتا تو ضرور
نظروں میں آ جاتا، چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہیں اسٹور میں دبکا رہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر کمال اِدھر اُدھر ہوتا تو وہ واپس کمرے میں چلا جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ ناشتے
کے بعد کمال نے چائے کا کپ ہاتھ میں تھاما اور لاؤنج میں آ بیٹھا۔ اب تو شہریار کا راستہ بالکل ہی مسد
چکا تھا۔

کمال نے ٹی وی کھول لیا تھا اور نیوز چینل لگائے خبریں دیکھ رہا تھا۔ آواز بلند ہونے کی وجہ سے
تک بھی صاف پہنچ رہی تھی۔ زیادہ تر خبریں وہی تھیں جو وہ صبح سویرے ہی سن چکے تھے۔ ان خبروں کو
کے ساتھ ساتھ نیوز اینکرز اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک خطرناک مجرم کو چھڑا
جانے والے دہشت گرد جو پہلے ہی نصف درجن سے زائد افراد کی ہلاکت کے ذمے دار ہیں، ابھی تک
گھوم رہے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت شہر میں ہی موجود ہیں یا یہاں سے نکل کر کسی اور شہر
کر چکے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں پر کڑی تنقید کی جا رہی تھی کہ ان کی ناقص منصوبہ بندی نے
افراد کی جان داؤ پر لگا رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شہریوں کو بھی تاکید کی جا رہی تھی کہ وہ جیسے ہی کسی
شخص کو دیکھیں، فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔ لوگوں کو اپنے گھروں اور ملازمت کی جگہوں پر بھی محتاط رہنے
جا رہا تھا۔

ان خبروں کو سن کر شہریار کو لگ رہا تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، ان کے فرار کی راہیں
مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن مسئلہ وہی تھا کہ دن کی روشنی میں تو ان کا یہاں سے نکلنا بھی آسان نہ
حلیہ بدل کر بھی نکلتے تو گیٹ پر موجود چوکیدار تین اجنبیوں کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔ کیونکہ اس طرح کی
آبادی میں چوکیدار ہر ایک مکین کا صورت آشنا ہوتا ہے۔ یہاں تو چوکیدار کے ساتھ پولیس والے بھی
نظر آ رہے تھے جو ذرا سا شک محسوس ہونے پر ہی مصیبت کھڑی کر دیتے۔

اپنی اس مجبوری کو تسلیم کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر کمال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے چائے
تھی اور اب کچھ بے چین سا اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ جب جیبوں سے کچھ برآمد نہیں ہوا تو کمرے
اُدھر تلاشی لینے لگا۔ تلاشی کے اس عمل میں اس پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

''سالی پتہ نہیں کہاں چھپا کر چلی گئی ہے۔ میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اس کے آنے تک کیا
ہی بیٹھا رہوں گا؟''

تلاش کے عمل کے ساتھ ساتھ جاری اس کی بڑبڑاہٹ سے ظاہر تھا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔
اُلٹ پلٹ دینے کے باوجود جب کچھ نہ نکلا تو وہ پیر پٹختا ہوا بیڈ روم میں جا گھسا۔ اب وہاں جا کر
اسے یہی کارروائی کرنی تھی۔ چنانچہ شہریار کے لیے اچھا موقع تھا کہ وہ واپس اپنی کمین گاہ میں پہنچ جا
اس نے تیزی سے حرکت کی۔ اس سے قبل کہ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر اس پر مخصوص دستک
دروازہ کھل گیا۔ یقیناً سلّو، کی ہول سے آنکھ لگائے بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا اس لیے اس کے لیے



دروازہ کھول دیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر چند منٹ سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک بار پھر کمال کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
اب وہ پہلے سے بہت زیادہ بلند آہنگ میں بول رہا تھا اور نشے کی بڑھتی ہوئی طلب کے ساتھ بڑھتی جھنجلاہٹ
کے باعث عائشہ کو بے تکان گالیاں دے رہا تھا۔

وہ اور سلّو باری باری کی ہول سے جھانک کر مسلسل اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ بیڈ روم کے
بعد کچن کا بھی حشر خراب ہو چکا تھا۔

کچن سے نکل کر وہ سیدھا اس کمرے کی طرف آیا جہاں وہ لوگ موجود تھے لیکن ظاہر ہے دروازہ لاک
ہونے کی وجہ سے وہ اسے کھولنے میں ناکام رہا۔

''یہیں ہو گی میری پڑیا۔ اسی لیے سالی اس کمرے کو لاک کر کے گئی ہے۔'' دروازہ نہ کھلا تو اس نے خود
ہی اندازہ قائم کر لیا۔

اپنی طلب پوری نہ ہو سکنے کے غصے میں وہ کئی بار بیوی کو سالی کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کچھ بنا چکا تھا۔
شہریار نے دل ہی دل میں عائشہ کے حوصلے کو سراہا جو ایک لگژری لائف کو چھوڑ کر ایسے آدمی کے ساتھ سر پھوڑ
رہی تھی اور نامساعد حالات کے باوجود مایوس نہیں تھی۔

''سالا یہ دروازہ ہی توڑ دیتا ہوں۔'' دروازہ کھولنے میں ناکامی ہوئی تو اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور فوراً
ہی اس پر عمل پیرا بھی ہو گیا۔

کی ہول سے آنکھ لگائے باہر کا منظر دیکھتے شہریار نے دیکھا کہ وہ دروازے سے ذرا دور جا کر کھڑا ہوا
اور پھر دوڑ کر آ کر اسے کندھے کی ایک ضرب لگائی۔ اب وہ کوئی فلمی ہیرو تو تھا نہیں کہ اس کی ایک ضرب سے
دروازہ اُکھڑ کر دُور جا گرتا۔

لکڑی کے مضبوط دروازے کے لیے اس کے نشے سے لاغر جسم کی ضرب قطعی بے اثر تھی۔ البتہ ردِعمل
میں خود کمال کے شانے پر جو ضرب لگی، اس نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ چیخ کے بعد اس کے منہ سے عائشہ
اور دروازے دونوں کے لیے مغلظات کا ایک طوفان برآمد ہوا لیکن پھر دوبارہ اس نے کوشش نہیں کی اور وہاں
سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے چلے جانے پر شہریار نے ذرا سکون محسوس کیا۔ کیونکہ اب اسے ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں
اس شور شرابے کو سن کر کوئی اس طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کا یہ سکون غارت ہو گیا
کیونکہ کمال کمرے سے ہاتھ میں کرسی کا ایک ٹوٹا ہوا دستہ لے کر برآمد ہوا تھا۔ اس نے یہ دستہ لا کر دروازے
کے لاک والے حصے پر ضرب لگائی۔ دستے کی ضرب لاک کا تو کیا بگاڑتی لیکن شور ضرور پیدا کیا۔

ناکامی پر ہار ماننے کے بجائے کمال پر جنون سا طاری ہو گیا۔ کیونکہ لاکڈ دروازے نے اس کے اندر یہ
یقین پختہ کر دیا تھا کہ اس کی مطلوبہ شے اسی کمرے میں ہے۔ شہریار کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے روکنے کے لیے
کیا کرے۔ لاک پر ضربیں لگائے جانے کی وجہ سے اسے اپنی آنکھ بھی کی ہول سے ہٹانی پڑی تھی۔

پریشانی کے عالم میں دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ایک تو کال بیل زور سے چیخی، دوسرے سلّو نے اس
کے شانے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا۔ اس نے مڑ کر سلّو کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پڑیا تھی
جس میں سفید رنگ کا سفوف نظر آ رہا تھا۔

ادھر کال بیل بجنے کے بعد کمال نے ضربیں لگانے کا عمل روک دیا تھا۔ شہریار نے جھک کر کی ہول سے

باہر جھانکا۔ وہ بکتا جھکتا باہر کی طرف جا رہا تھا۔

فوری طور پر ایک فیصلہ کرتے ہوئے اس نے سلّو کے ہاتھ سے پڑیا جھپٹی اور دروازہ کھول کر وہیں کھڑے کھڑے اس انداز میں اچھالی کہ وہ سیدھی سینٹرل ٹیبل کے پاس جا کر گری۔

پڑیا باہر پھینکنے کے بعد اس نے ایک بار پھر پھرتی سے دروازہ لاک کر لیا۔ کمال کی حرکتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے یہ تو محسوس کیا تھا کہ سلّو کمرے میں کچھ تلاش کرتا پھر رہا ہے اور پڑیا مل جانے پر سمجھ بھی گیا تھا کہ وہ کیا تلاش کر رہا تھا۔ لیکن افسوس یہ تھا کہ اس پڑیا کے انہیں ملنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی ورنہ پہلے ہی وہ اس ہنگامے کو روکنے کا بندوبست کر لیتے۔ اب تو گویا سُولی پر لٹکے ہوئے تھے۔

کمرے کے باہر انہیں کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شہریار نے ایک بار پھر کی ہول پر آنکھ ٹکا دی۔ باہر لاؤنج میں اسے کمال کے ساتھ چوکیدار اور ایک پولیس والا کھڑے نظر آئے۔

''تمہارے گھر میں اتنا شور کیوں ہو رہا تھا؟ تمہارے پڑوسیوں نے کمپلین کی ہے کہ شاید گھر میں چور وغیرہ گھس آئے ہیں اور دروازے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' پولیس والا سخت لہجے میں کمال سے مخاطب تھا۔

''میں نے بتایا ہے نا کہ میرے سوا کوئی گھر میں نہیں ہے۔ ایک کمرے کا دروازہ لاک ہو گیا ہے اور میں اسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' پولیس والے کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر کمال نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں اسے جواب دیا جس پر پولیس والے کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے اور وہ پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں بولا۔

''تمیز سے بات کرو مسٹر! میں تمہیں پڑوسیوں کو ڈسٹرب کرنے کے جرم میں اریسٹ بھی کر سکتا ہوں۔''

''ہا ہا.....'' اس کی دھمکی سن کر کمال زور سے ہنسا پھر بولا۔ ''تم بھول رہے ہو آفیسر! کہ تم لندن امریکہ کی پولیس میں نہیں بلکہ انڈین پولیس میں جاب کرتے ہو اور یہاں ایسا کوئی لاء نہیں چلتا کہ تم پڑوسیوں کو ڈسٹرب کرنے پر مجھے اریسٹ کر لو۔ ویسے بھی میں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اپنے گھر میں کر رہا ہوں۔''

اُس کے اس صاف گوئی سے دیئے جواب نے پولیس والے کو مزید مشتعل کر دیا اور اس نے گھما کر ایک تھپڑ کمال کے منہ پر دے مارا۔

''میرے ساتھ تھانے چل سالے! میں تجھے اچھی طرح سکھا دوں گا کہ یہاں کون سا لاء چلتا ہے اور کون سا نہیں۔'' رات ہونے والے واقعے کے بعد یقیناً پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں اور لازماً وہ سب ہی بے حد دباؤ میں تھے۔ ایسے میں کمال کے رویّے نے جلتی پر آگ کا کام کر دیا تھا۔

اندر وہ تینوں دم سادھے اس صورتِ حال کے انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ عملی طور پر اس وقت وہ ایک چوہے دان میں پھنسے ہوئے تھے جہاں سے وقتِ ضرورت بھاگ نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔

''جانے دیں سر جی! سالا نشئی ہے۔ اور نشے میں اُلٹا سیدھا بول گیا ہے۔ اسے اپنا ہوش ہوتا تو ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہی کیوں؟'' ایک تھپڑ کے بعد پولیس والے کا ہاتھ رُکا نہیں تھا اور وہ مسلسل کمال پر ہاتھ پیروں کا استعمال کر رہا تھا۔ نشے کے لیے ٹوٹتا کمال کا جسم ایسی مار کھانے کا اہل نہیں تھا چنانچہ چند ضربوں کے بعد ہی وہ نیچے گر گیا تھا اور چوکیدار شاید اس کی حالت پر رحم کھا کر ہی پولیس والے سے اس کی جان بخشی کی درخواست کر رہا تھا۔



''اس کا نشہ تو میں اُتارتا ہوں۔ حرام زادے کو کچھ خبر نہیں ہے کہ شہر میں کتنی ٹینشن ہے۔ پتا بھی کھڑکے تو ہماری دوڑیں لگ رہی ہیں۔ اور یہ ہے کہ اس نے یہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔'' پولیس والے نے بلا تکلف کمال کی پشت پر ایک اور لات رسید کی۔

''نشہ ملا ہی نہیں تو تم اُتارو گے کیسے آفیسر؟..... اگر ہمیں جادو کی پڑیا مل گئی ہوتی تو کاہے کو یہ سارا ہنگامہ کرتے؟''

زمین پر پڑے پڑے کمال نے لہک کر پولیس والے سے کہا جس پر وہ ''تیری تو.....'' بولتا ہوا ایک بار پھر اس کی طرف لپکا۔ لیکن اس بار چوکیدار نے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر کھینچ لیا۔

''کیا کرتے ہیں سر جی! اس کی پتنی جرنلسٹ ہے۔ اسے خبر ہو گئی کہ کسی پولیس والے نے گھر میں گھس کر اس کے پتی کو مارا پیٹا ہے تو ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ آپ کو تو خبر ہے کہ آج کل یہ جرنلسٹ کتنے سر پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہی مشکل میں پڑ جاؤ۔''

اتفاق سے چوکیدار، پولیس والے کو کمال کے پاس سے گھسیٹ کر اس کمرے کے دروازے کے قریب لے آیا تھا جس میں وہ تینوں موجود تھے اس لیے اس کی دھیمی آواز میں پولیس والے کو سمجھانے کی آوازیں ان تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

جرنلسٹ بیوی کا ذکر سن کر پولیس والے کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی البتہ اپنی افسرانہ شان دکھانے کے لیے وہاں سے جاتے جاتے بھی وہ کمال کو دھمکی دینا نہیں بھولا۔

''ابھی تجھے چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن پھر کمپلین آئی تو سیدھا تھانے لے جا کر اُلٹا لٹکا دوں گا۔''

''لٹکا دینا۔ شاید اسی طرح دنیا سیدھی نظر آنے لگے۔ ابھی تو سب کچھ اُلٹا دکھائی دے رہا ہے۔ تم بھی اُلٹے نظر آ رہے ہو آفیسر! تمہاری یہ جو ٹانگیں ہیں نا، یہ مجھے اوپر نظر آ رہی ہیں۔''

خراب حالت ہونے کے باوجود کمال بولنے سے باز نہیں رہا اور اپنی بات کہہ کر خود ہی زور زور سے ہنسنے بھی لگا۔

اُس کے اس انداز نے پولیس والے کو طیش تو دلایا ہو گا لیکن چوکیدار نے جو کہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اسے وہاں رکنے نہیں دیا اور اپنے ساتھ لے کر گھر سے نکلتا چلا گیا۔

''سالے نے حلیہ ٹائٹ کر دیا۔ پر کوئی بات نہیں..... بس ذرا اپنی جادو کی پڑیا مل جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ان کے جانے کے بعد کمال خود کلامی کے انداز میں بولتا ہوا اٹھا اور لہراتا ہوا صوفے کی طرف بڑھا۔ صوفے پر گرنے سے قبل ہی اس کی نظر میز کے قریب گری پڑیا پر پڑ گئی۔ پڑیا دیکھ کر وہ ساری چوٹیں بھول کر کھل اُٹھا۔

''او میری نیلم پری! تُو ادھر پڑی ہے اور میں تجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' خوشی سے لہک کر کہتے ہوئے اس نے لپک کر نیچے پڑی پڑیا اُٹھا لی۔ اس کے بعد یقیناً اسے مصروف ہو جانا تھا۔

شہریار ایک گہرا سانس لیتا ہوا دروازے کے پاس سے ہٹ گیا۔ سامنے سلّو اور ڈاکٹر فرحان کے چہرے تھے۔ سلّو حسبِ معمول حالات سے بے نیاز نظر آ رہا تھا جبکہ ڈاکٹر فرحان بستر پر ہی دیوار سے ٹیک لگائے پریشان بیٹھے تھے۔ اتنے برسوں بعد قید سے رہائی ملنے کے بعد دوبارہ پکڑے جانے کا خیال یقیناً ان کے لیے سب سے زیادہ دہشت ناک تھا۔ شہریار بے اختیار ہی ان کے قریب جا بیٹھا اور تسلی دینے والے

انداز میں ان کا شانہ تھپکنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں سر! چاہے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنی پڑیں، ہم آپ کو پاکستان ضرور پہنچا گے۔" تسلی کے یہ الفاظ ڈاکٹر پر نہ جانے کس طرح اثر انداز ہوئے کہ ان کے چہرے پر تلاطم سا نظر آیا اور کچھ کہنے کی کوشش میں صرف ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

"آپ کچھ نہ کہیں سر! ہمیں آپ کی ہر صعوبت کا اچھی طرح اندازہ ہے اور ہم اپنے ہیرو کو اب اس جہنم میں نہیں جانے دیں گے۔ یہ ایک مجاہد کا وعدہ ہے جسے میں اپنی آخری سانس تک نبھاؤں گا۔"

شہریار نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے جس پر ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے۔ یہ آنسو شاید اس شکر کے تھے کہ ان کی برسوں پر محیط تکلیف بے ثمر نہیں تھی اور وہ ایسے لوگوں کے اذیتیں سہتے رہے تھے جن کے دل میں ان کی قدر و عزت تھی۔

⊛----✪----⊛

"میں کہتا ہوں مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

اسلم بہت دیر ہوئی اس دوا کے اثر سے باہر آ گیا تھا جس کی مدد سے مارک نے اسے بالکل مفلوج کر دیا تھا۔

دوا کے زیر اثر وہ کئی گھنٹے تک بالکل ساکت پڑا رہا تھا اور ہاتھ پیر ہلانا تو دور کی بات، زبان ہلانے بھی معذور رہا تھا۔

بے بسی کا کئی گھنٹوں پر مشتمل یہ عرصہ اس نے ایک ہال نما کمرے کے بیرک میں گزارا تھا۔ وہاں سائز کے تقریباً آٹھ بیرک موجود تھے۔ ان بیرکوں کی دیواریں لوہے کی چادروں پر مشتمل تھیں جبکہ مضبوط سلاخوں سے بنایا گیا تھا۔

جس بیرک میں اسلم موجود تھا، اس کے علاوہ صرف دو بیرک آباد تھے اور وہاں اسے جنگل میں دینے والے ایڈی ہی کی طرح کے دو وجود دکھائی دیئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایڈی دیکھنے میں مفلوج باسی لگتا تھا جبکہ یہ دونوں اپنے نقوش اور رنگت سے ایشیائی محسوس ہو رہے تھے۔

چھوٹی قامت کے ان مرد نما بچوں یا بچے نما مردوں کو دیکھ کر اس کے اندر اشتعال کی لہریں اٹھنی ہو گئی تھیں۔ وہ ان کی ہیئت دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ یہ جس حال میں بھی نظر آ رہے ہیں، اس حال میں لانے ذمے داری قدرت کے بجائے ان انسانی ہاتھوں کی ہے جنہوں نے اللہ کے کاموں میں دخل اندازی کی اس کی چشم تصور اسے دکھا رہی تھی کہ اس کا ہونے والا بچہ بھی کل کو اسی حال میں پیدا ہو گا اور ماں کی آغوش کے بجائے ایسے ہی کسی بیرک میں پلے گا جہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح رکھا گیا تھا۔

دوا کا اثر معدوم ہونے پر جب اس کے ہاتھ پیر حرکت کرنے لگے تو اس نے دروازے کی سلاخیں توڑنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن مضبوط سلاخیں اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھیں۔

اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ بیرک کے محدود رقبے میں کسی زخمی درندے کی طرح ٹہلنے اور دھاڑنے لگا۔ لیکن اُس کی اس حرکت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اگر کوئی ردِ عمل ظاہر ہوا تھا تو بس اتنا کہ آباد بیرکوں سے ایک میں موجود بچہ اپنی بیرک کے سلاخ دار دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا اور اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے نے اتنی بھی زحمت نہیں کی تھی اور بالکل ایسے اپنے بستر پر پڑا رہا تھا جیسے کچھ دیکھ رہا ہو۔



اسلم نے ایک چیز نوٹ کی تھی کہ سوائے اس کی بیرک کے تمام بیرکوں میں کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا۔ ان سامان میں بستر، دیوار میں نصب پانی کا کولر، چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور لکھنے پڑھنے کا سامان نمایاں تھا۔ بیرک میں منتقل کرنے سے پہلے شاید بیرک سے یہ سارا سامان ہٹا دیا گیا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے ایک نارمل انسان اس پستہ قامت مخلوق کی طرح اس سارے سامان کے ساتھ اتنی مختصر بیرک میں نہیں سما سکتا تھا۔

کافی دیر ہنگامہ کرنے کے بعد جب کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تو آخر کار اسے تھک ہار کر ایک طرف بیٹھنا پڑا اور وہ خود کو سمجھانے لگا کہ اس طرح جذباتی ہو کر ہنگامہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جن لوگوں نے یرغمالی بنایا ہے، وہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اس لیے ان کے چنگل سے نکلنے کے لیے عقل اور صبر سے کام لینا ہو گا۔

پُرسکون بیٹھنے کا یہ دورانیہ چند منٹوں پر ہی مشتمل تھا۔ یکدم ہی ہال کا دروازہ کھلا اور اس نے مارک کو ایک ایڈی کو دھکیلتے اندر آتے دیکھا۔ اسٹریچر پر سنہری بالوں والا ایڈی لیٹا ہوا تھا۔ اسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخ دار دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

ایڈی، جسے اس نے جنگل میں کسی خرگوش کی طرح پھرتی سے اُچھلتے کُودتے دیکھا تھا، اسٹریچر پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت زرد تھی۔ اس کا جسم سینے سے لے کر پیروں تک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسلم کو یاد تھا کہ مارک نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری تھی اور پھر شانے پر لاد کر اپنے اس زیر زمین ٹھکانے تک لایا تھا۔ مارک نے اسے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اس کے زخم کا علاج کرنے کے بجائے یونہی اس کی بیرک میں لے جا کر پھینک دے گا تاکہ زخم سڑ جانے پر اس کی ٹانگ کاٹ سکے۔

اس وقت ایڈی کو اسٹریچر پر دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مارک نے اپنی دھمکی پر عمل نہیں کیا تھا اور اس کی ٹانگ سے گولی نکالے جانے کے بعد ہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ گولی نکالنے کا کام مارک نے کیا تھا یا کسی اور نے، اس کی اسلم کو خبر نہیں تھی لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ مارک تنہا ہی ایڈی کا اسٹریچر دھکیلتے ہوئے یہاں تک لایا تھا اور ایک بیرک کا دروازہ کھولنے کے بعد نہایت آسانی سے تنہا ہی ہلکے پھلکے ایڈی کو اس بیرک میں منتقل کر دیا تھا۔

"مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

مارک، ایڈی کی بیرک کا دروازہ لاک کر کے واپس جانے لگا تو اسلم نے اس سے مطالبہ کیا۔ اتنی دیر سے ایڈی کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ کچھ بولنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مارک پلٹ کر واپس جانے لگا تو وہ چونکا اور اس سے مطالبہ کیا۔

اس کا مطالبہ سن کر مارک ٹھٹک کر رکا اور اس کی بیرک کے دروازے کے عین سامنے کھڑا ہو کر اسے دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

"ان کمزوروں کو زیر کر کے تم خود کو بہت شہ زور سمجھتے ہو۔ اگر ایسے ہی شہ زور ہو تو مجھے یہاں سے نکال کر دکھاؤ اور مقابلہ کرو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دھوکے سے میرے جسم میں مفلوج کر دینے والی دوا داخل کر کے لڑنے کے مقابلے میں، ہاتھ پیروں کی طاقت آزمانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

اسلم نے جواباً شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے چیلنج کیا جس پر وہ زور سے ہنس دیا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔

"یہ کوئی ریسلنگ رنگ نہیں ہے مسٹر! جہاں ریسلرز ایک دوسرے کو چیلنج دے سکیں۔ میں تمہاری اس قسم

کی گفتگو سن کر جذباتی ہونے والا نہیں ہوں۔ تمہاری حیثیت یہاں ایک ایسے قیدی کی ہے جس نے ہمارا
حدود میں داخل ہونے کا سنگین جرم کیا ہے اور اس جرم کی سزا دینے میں صرف اس لیے تاخیر ہو رہی ہے کہ
فی الحال ماسٹر یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ آئے گا تو تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ جب تک تم یہاں سکون
رہو۔ چیخنے چلانے اور شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں کا انچارج میں ہوں اور میں ایسی حرکتوں
کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ تمہارا ہنگامہ میری برداشت کی حد سے بڑھ جائے تو
دوبارہ تم پر مفلوج کر دینے والی دوا استعمال کرنی پڑے۔"

وہ اسلم کو دھمکی دینے کے بعد ہال سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز پر اسلم نے شدید سبکی اور جھنجلاہٹ
محسوس کی لیکن فوراً ہی خود پر قابو بھی پالیا۔ کیونکہ اتنی دیر میں اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ جھنجلاہٹ کا اظہار
کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس کی چیخ و پکار پر یہاں کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اپنے
بازوؤں کی طاقت سے لوہے کا یہ مضبوط دروازہ توڑ کر باہر نکل سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ صبر سے اپنے
بہتر موقع کا انتظار کرے۔

مارک اسے یہ خوش خبری تو سنا ہی گیا تھا کہ ماسٹر کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ
کیا جائے گا، چنانچہ ابھی اس کے پاس مہلت تھی۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مہلت کتنی مدت کے لیے
کیونکہ مارک نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ماسٹر کب واپس آئے گا۔

وہ مجبور و بے بس سا بیرک کی ایک دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی وہ بیرک تھی
ایڈی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگا جسے پانچ سال کی عمر میں ہی اس کے بچپن سے محروم
گیا تھا اور وہ جوان اور بچے کا عجیب سا کمبی نیشن بن کر رہ گیا تھا۔

اس بے چارے کے ماں باپ کون تھے اور کہاں تھے جن سے الگ کر کے اسے یہاں ایک ایسی
زندگی گزارنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

ایڈی پر افسوس کرتے کرتے اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آ گیا۔ اگر ماہ بانو یہاں موجود
یقینی طور پر ان کا بچہ سخت خطرے میں تھا۔ جنگل میں اس نے ایڈی اور مارک کے مابین جو گفتگو سنی تھی
سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اسے بھی کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ ایک ناقابل
برداشت بات تھی۔ اسے اپنے بچے اور ماہ بانو کو بچانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا لیکن اس کے لیے ایک موقع
شرط تھا اور اس موقع کے انتظار میں ہر گزرنے والا پل اسے کانٹوں پر گزارنا تھا۔

⊛----✪----⊛

ماہ بانو کے سامنے فروٹ باسکٹ رکھی ہوئی تھی جس میں وہ انگور کے دانے چن چن کر کھا رہی تھی
بے حد میٹھے اور رسیلے تھے اور اسے ان کے لیے اتنی رغبت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے ٹوکری میں موجود
دوسرے پھل کی طرف نظر ہی نہیں ڈالی۔

ابتدائی چند دنوں کے بعد اس نے اپنی اس تعیش بھری قید سے مفاہمت کر لی تھی۔ شروع میں وہ
پریشان اور ہراساں رہی جس کی وجہ سے کھانے پینے پر بھی اثر پڑا تھا۔ لیکن پھر اس نے یہ بات سمجھ لی
کھانا پینا ترک کرنے سے فائدہ ہونا تو مشکل ہے، اُلٹا اس کی اور بچے کی صحت خراب ہو جائے گی۔

اس نے بلتستان کے برفانی پہاڑوں میں قید کے جو دن گزارے تھے، انہی میں یہ بات سیکھ لی
دشمن کی قید میں رہ کر کھانا پینا چھوڑنے کا مطلب ہے کہ خود کو دشمن کے مقابلے میں مزید کمزور کرنا۔ چنانچہ



غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔

اسے یاد تھا کہ وہاں اس نے اس سبق پر عمل کیا تھا جب ہی عمران نامی نوجوان کے ساتھ وہاں سے فرار
ہونے پر اس قابل رہی تھی کہ ان برف زاروں میں زندگی کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اب پھر اسے ایسا ہی
امتحان درپیش تھا اور توانائی کی زیادہ ضرورت اس لیے تھی کہ اس کے ساتھ اس کے بچے کی صحت اور زندگی بھی
جڑی تھی۔

بلتستان کے پہاڑی قید خانے کے مقابلے میں یہاں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ وہاں جو غذا ملتی تھی، وہ بس
ایسی ہوتی تھی کہ انسان اپنا پیٹ بھر لے۔ جبکہ یہاں اسے ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ ہر روز انواع و اقسام
کے کھانوں کے ساتھ ساتھ تازہ پھل اور مشروبات بھی پابندی سے فراہم کیے جاتے تھے۔ وہ یہ سب چیزیں
اعتدال سے استعمال کرتی تھی۔ کیونکہ اسے یاد تھا کہ اس کی ڈاکٹر نے اسے اچھی غذا اعتدال کے ساتھ استعمال
کرنے کی ہدایت کی تھی اور سمجھایا تھا کہ بعض حاملہ خواتین، بچے کی اچھی صحت کے نام پر کھانے پینے کو ہی اپنا
مقصدِ زندگی بنا لیتی ہیں جو کسی طور مناسب نہیں ہے۔ اس عمل سے بے بی پر اچھا اثر پڑے یا نہ پڑے، ماں خود
بے ڈھب اور بے ڈول ہو جاتی ہے۔

ماہ بانو ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی غذائی ضرورت پوری کر رہی تھی۔ کیونکہ اس نے
ماہ بانو کو سمجھایا تھا کہ اگر وہ چست و توانا رہنا چاہتی ہے تو اپنے کھانے پینے، سونے جاگنے اور کام و آرام کے
درمیان توازن قائم رکھنا ہوگا۔

ڈاکٹر نے اسے چند ایسی مخصوص ورزشیں بھی بتائی تھیں جو حاملہ خواتین کی صحت کے لیے مناسب ہوتی
ہیں۔ اس کے مطابق ماں جتنی متحرک اور چست ہو، ڈیلیوری کا عمل اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اپنے موجودہ
ماحول کو قبول کرنے کے بعد اسے ڈاکٹر کی ہدایات یاد آنے لگی تھیں اور وہ ان پر عمل پیرا بھی تھی۔

روزانہ اس کے چیک اَپ کے لیے وہاں آنے والے ڈاکٹر نے بھی اس کے معمولات کو سراہا تھا اور تسلی
دی تھی کہ اس کا بے بی بالکل ٹھیک ہے اور ایک صحت مند بچے کی طرح نشوونما پا رہا ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت
کے مطابق مارک وقت پر اسے دوائیں بھی فراہم کرتا تھا اور اس وقت تک اس کے سر پر کھڑا رہتا تھا جب تک
وہ دوا منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس حلق سے نیچے نہیں اُتار لیتی تھی۔

دو تین دن تک اس نے فراہم کی جانے والی دوائیں بغیر مزاحمت کے کھائی تھیں لیکن پھر اسے خیال آیا
کہ یہ لوگ جو اسے اغوا کر کے یہاں لانے کے بعد ہر طرح کا عیش و آرام فراہم کر رہے ہیں، ان کا کوئی
مقصد تو ضرور ہوگا۔ اسے خود کو دی جانے والی دوائیں اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگیں۔ خاص طور پر اس وجہ
سے بھی کہ وہ دوائیں کسی پیکنگ میں نہیں ہوتی تھیں جس سے انہیں ان کے نام یا فارمولے کا پتہ چل سکے۔
چنانچہ اس نے یہ ترکیب استعمال کی کہ جب مارک اسے کوئی گولی کھانے کو دیتا تو وہ اسے زبان کے نیچے چھپا
کر اوپر سے پانی کا گلاس پی لیتی اور مارک کے جانے کے بعد اس دوا کو واش روم میں پھینک کر پانی سے بہا
دیتی۔ لیکن اس کے پاس ان انجکشنز سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں تھی جو ہر تین دن بعد اسے باقاعدگی سے
لگائے جا رہے تھے۔

اس نے ان سے بچنے کے لیے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ مارک جیسے
طاقتور آدمی کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔ اس نے سیکنڈوں میں اسے بے بس کر کے ڈاکٹر کے حضور
پیش کر دیا تھا کہ وہ اسے انجکشن لگا دے۔

مارک طاقتور اور چست تھا جبکہ وہ اس کے مقابلے میں کمزور ہونے کے علاوہ ایسی حالت میں تھی جو احتیاط کی متقاضی تھی۔ ضرورت سے زیادہ مزاحمت کی کوشش میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ہونے والا نقصان ناقابلِ تلافی بھی ہو سکتا تھا، اس لیے اسے ہار ماننی پڑی۔

ویسے بھی بظاہر کوئی ایسی علامت نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ لگے کہ اسے یا ہونے والے بچے کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی ہو گئی ہے اور بچے کی Movements سے بھی ظاہر تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایسے میں حالات سے سمجھوتا کر لینا ہی مناسب تھا۔ ایک ماں کی حیثیت سے اسے بس اپنے ہونے والے بچے کی زندگی اور صحت کی فکر تھی۔

اس وقت بھی وہ انگور کھاتے ہوئے بس اسی بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز بہت بلند نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہت دور سے یا کسی بند جگہ سے آ رہی ہو۔ یہاں تک کہ وہ بولنے والے کے الفاظ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی پھر بھی بری طرح مضطرب ہو گئی تھی۔

اسے لگا تھا کہ یہ آواز اسلم کی ہے۔ اسلم کے اپنے آس پاس ہونے کا احساس اتنا خوش کن تھا کہ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ ہینڈل گھمانے پر جب دروازہ نہ کھلا تو اسے یاد آیا کہ سارے عیش و آرام کے باوجود وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتی ہے اور اپنی مرضی سے اس کمرے کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتی۔

آواز بدستور آ رہی تھی اور اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ اسلم ہی ہے جو غصے کے عالم میں چیخ چلا رہا ہے اور کسی وجہ سے وہ اس کی آواز واضح طور پر نہیں سن پا رہی ہے۔ شدید جذباتی کیفیت میں اس نے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا جس کا فوری ردِعمل ظاہر ہوا اور دروازہ کھول کر مارک اندر داخل ہوا۔

''اپنی پرابلم میڈم؟'' اندر داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے پیچھے دروازے کو دوبارہ بند کر دیا تھا لیکن دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے مختصر وقفے میں ماہ بانو نے کچھ اور وضاحت سے وہ آواز سنی تھی اور اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ اسلم ہی ہے۔

''یہ آواز کس کی ہے؟'' مارک کے لہجے کی درشتگی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے پوچھا۔

''تمہیں اس سے کیا غرض؟ یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔'' مارک نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ میرا اس سے تعلق ہے۔ کیونکہ وہ میرا شوہر ہے اور یقیناً مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہے۔ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟..... یاد رکھو کہ اگر تم نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی تو میں کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر تمہارے ساتھ تعاون کرنا چھوڑ دوں گی۔'' مارک کے جواب پر اسے غصہ آ گیا اور اس نے طیش سے دھمکی دی۔

''اس طرح تم اپنا ہی نقصان کرو گی اور اپنے ساتھ اپنے بچے کی زندگی خطرے میں ڈالو گی۔'' مارک پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اُلٹا وہ اسے ہی تنبیہہ کرنے لگا۔ اُس کی دھمکی سن کر ایک پل کے لیے وہ سہم گئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دل کڑا کر کے بولی۔

''مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔ میں اپنی اور اپنے بچے کی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں سمجھتی۔ ہم ایک فیملی ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔''

''اوہ..... یہ تو رومیو جولیٹ والا کیس لگتا ہے۔ وہاں وہ بے چین ہے اور یہاں تمہیں سکون نہیں۔ بے بی! تمہیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ دنیا کی ہر لوّ اسٹوری میں کوئی نہ کوئی ولن ضرور ہوتا ہے۔ اور تمہاری



کہانی میں وہ ولن میں ہوں اور میری مرضی کے بغیر تم دونوں ایک جگہ موجود ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے۔ سو پلیز کام ڈاؤن..... اور ہاں، اب شور مچانے اور دروازہ پیٹنے کی حماقت مت کرنا۔ اس کمرے پر ان حرکتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ دیکھو تمہارا رومیو بھی چیخ چلا کر بالآخر تھک گیا ہے اور اب بالکل خاموش ہے۔''

استہزائیہ انداز میں اس سے گفتگو کرتے ہوئے مارک نے اس کی توجہ دلائی تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اسلم کی آواز نہیں آ رہی ہے۔

''تم لوگوں نے اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے؟'' وہ یکدم ہی متوحش ہو گئی۔

''تم اتنے عرصے سے یہاں ہو، ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو تمہارے نر کو کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسے نقصان پہنچانا ہوتا تو میں اسی وقت اس کا کام تمام کر دیتا جب اس نے یہاں داخل ہونے کی حماقت کی تھی۔ شاید اس احمق کو اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کے داخلی و خارجی راستے کی خودکار کیمروں سے ہر وقت نگرانی کی جاتی ہے اور ہماری نظروں میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ تک یہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے جیسے ہی یہاں آنے کا راستہ کھولنے کی کوشش کی تھی، نظر میں آ گیا تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ تمہارا شوہر ہے اس لیے ماسٹر کے سامنے پیش کرنے کے لیے سنبھال کر رکھ دیا۔ اب تم دعا کرو کہ ماسٹر اسے اپنے لیے کارآمد پائے تاکہ اس کی زندگی کے دنوں میں اضافہ ہو جائے ورنہ ہمارے پاس بیکار چیزوں کو رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

وہ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے انسانوں کے بجائے زیرِ تجربہ جانوروں کا ذکر کر رہا ہو۔ اس کے جواب نے جہاں ماہ بانو کو یہ تسلی دی کہ فوری طور پر اسلم کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہیں وہ مزید اُلجھن میں بھی گرفتار ہو گئی کہ جانے اسے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے۔ اور اب وہ لوگ یہاں پہنچ جانے والے اسلم کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔

''اوکے، میں چلتا ہوں۔'' اس کی دگرگوں ہوتی حالت پر ایک طنزیہ سی نظر ڈال کر مارک نے دروازے کا رخ کیا۔ ماہ بانو میں اتنی تاب نہیں تھی کہ اسے روک پاتی۔ وہ وہیں فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بری طرح رو دی۔

''کیوں اتنی شدت سے چاہتے ہو مجھے کہ میرے سامنے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے؟..... کیا تمہاری تھا کہ تم میری تلاش میں یہاں تک پہنچتے اور اپنی جان مصیبت میں پھنساتے۔ تمہاری اتنی محبت کا قرض میں کیسے اتاروں گی؟ میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ جواب میں تم سے اتنی ہی محبت کر سکوں جتنی محبت مجھ سے کرتے ہو۔''

روتے ہوئے وہ غائبانہ اسلم سے مخاطب تھی جس کی محبت نے واقعی اسے بہت قرض دار کر دیا تھا۔ اسے کچھ نہیں آتی تھی کہ ایسی بے لوث محبت کا جواب کیونکر دے سکے گی۔ اس کے پاس اسے دینے کے لیے بس دعائیں ہی تھیں جن سے وہ اسے دل کی گہرائیوں کے ساتھ نوازتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا دل پوری شدت سے اس کی سلامتی کے لیے دعا گو تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس ملعون ڈاکٹر طارق کے لیے بددعائیں بھی دے رہی تھیں جس نے دوسری بار اسے دھوکا دیا تھا اور اچھی بھلی پُرسکون زندگی سے الگ کر کے اس جنجال میں ڈال دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''نام کیا ہیں تم لوگوں کے؟''

جاوید علی کے مخاطب وہ عورت اور دونوں بچے تھے جو اس کے عین سامنے بیٹھے تھے اور ان کے چہروں
خوف رقم تھا۔

خوف کی ایک وجہ تو وہ گن تھی جو ایک آدمی ان کے دائیں طرف لیے کھڑا تھا اور اس کا رخ ان تینوں
طرف تھا۔ دوسری وجہ وہ طریقِ کار تھا جس کے تحت اُنہیں یہاں لایا گیا تھا۔

سی ایف بی والوں نے انہیں عین اس وقت اسلحے کے زور پر قابو کر کے یہاں منتقل کر دیا تھا
عورت، بچوں کو اسکول چھوڑنے کے لیے جا رہی تھی۔ یہ عورت گووندا نامی اس آدمی کی بیوی تھی جسے ''را''
خلاف آپریشن میں وہ لوگ زخمی حالت میں گرفتار کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ گووندا کے سر پر چوٹ
تھی جس کی وجہ سے وہ کئی گھنٹوں تک ہسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹرز نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور سر کے زخم کے علاوہ اسے مکمل فٹ
دیا تھا۔ لیکن گووندا کا روّیہ عجیب و غریب تھا۔ وہ کسی بھی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر رہا تھا اور بظاہر
لگ رہا تھا کہ سر کی چوٹ نے اس کے دماغ کو متاثر کیا ہے۔

ڈاکٹرز اس حوالے سے اس کا بھرپور ٹریٹمنٹ کر رہے تھے لیکن وہ کسی طور تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔
کے روّیے کی وجہ سے ایک سینئر ڈاکٹر نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح کا روّیہ
کیے ہوئے ہے اور اس کا دماغ متاثر نہیں ہوا ہے۔

گووندا کے اس ڈھول کا پول کھولنے کی ترکیب سلمان کو سوجھی تھی۔ اس کیس کی مختلف جزئیات پر
کرتے ہوئے وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ گووندا کا گھر کہاں ہے؟ گھر معلوم ہونے کے بعد
معلومات حاصل کرنا کیا مشکل تھا۔ نتیجتاً اب اس کی خوب صورت بیوی اور دونوں بیٹے یہاں موجود
بیٹوں کی عمریں بالترتیب نو اور بارہ سال تھیں اور دونوں ہی ماں کی طرح خوب صورت تھے۔

''دیکھو، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم زیادہ روپے پیسے والے لوگ نہیں ہیں۔ میرے پتی کا چھوٹا
بزنس ہے جس سے ہمیں بس اتنا پرافٹ ہوتا ہے کہ ہم اپنے لائف اسٹائل کو مین ٹین رکھتے ہوئے بچوں
اچھے اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی خاص بینک بیلنس نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس
قیمتی زیور اور گہنے ہیں۔ اس لیے تم میرے پتی سے ہماری رہائی کے بدلے کوئی بڑا تعاون حاصل نہیں
سکتے۔'' عورت نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود ہی یہ اندازہ لگا کر کہ وہ اغوا برائے تاوان
واردات کا شکار ہوئی ہے، بولنا شروع کر دیا۔

''میں نے تم لوگوں کے نام پوچھے ہیں۔'' جواب میں جاوید علی نے غرا کر اپنا سوال دہرایا۔

''میرا نام راگنی ہے اور یہ میرے بیٹے امیش اور مہیش ہیں۔'' اس پر جاوید علی کا لہجہ اتنا اثر انداز ہوا
اس نے ایک ہی سانس میں جواب دے ڈالا۔

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' یہ بڑے تعجب کی بات تھی کہ گووندا اس کی حراست میں تھا لیکن اس کی بیوی
اس کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ روزانہ اپنے معمول کے مطابق بن ٹھن کر بچوں کو اسکول چھوڑنے اور
جاتی رہی تھی۔ اس کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں تھا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر نہ آنے پر تشویش کا شکار ہو
لیے جاوید علی نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

''وہ بزنس کے سلسلے میں سیالکوٹ گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔



''اس کی واپسی کب ہو گی؟''

''دو تین دن تک واپس آ جائیں گے۔'' راگنی کے جواب سے واضح ہو گیا کہ وہ کیوں تشویش یا پریشانی
اس حالت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے حساب سے تو اُس کا شوہر کاروباری دورے پر تھا۔

''گووندا کب سے ''را'' کے لیے کام کر رہا ہے؟'' بالکل اچانک یہ سوال کرتے ہوئے جاوید علی نے
اس کی آنکھیں پوری طرح راگنی کے چہرے پر مرکوز رکھیں۔

سوال سن کر وہ سخت حیرت میں نظر آئی۔

''میں آپ کا سوال سمجھی نہیں؟..... میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرے پتی بزنس مین ہیں اور آپ مجھ
سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کب سے ''را'' کے لیے کام کر رہا ہے۔'' اس کے تاثرات بالکل حقیقی تھے۔

''حیرت ہے کہ بیوی ہو کر تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔ حالانکہ ایک سیکرٹ ایجنٹ کے
معمولات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی بیوی کو ضرور چونکنا چاہیے۔'' اس کی لاعلمی پر جاوید علی نے طنز آمیز حیرت
کا اظہار کیا۔

''بھگوان کی سوگند مجھے بالکل نہیں پتہ۔ ان کی روٹین پر میں کئی بار چونکی ضرور لیکن پھر اس وجہ سے چپ
گئی کہ میں نے ان کی کئی ایسی ٹیلی فون کالز پکڑیں جو عورتوں کی تھیں اور مجھے لگا کہ ان کا ان عورتوں سے
معاملہ ہے۔ گووندا پر شک ہونے کے باوجود میں نے کبھی ان پر اپنا شک ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ابھی جو ناتا
ان کا ہے، میرے زبان کھولنے کے بعد کہیں کھل کر سامنے نہ آ جائے۔ میری ماں کہتی تھی کہ جب تک مرد کی
چوری پکڑی نہ جائے، اس کی آنکھ میں کچھ لاج رہتی ہے۔ پکڑے جانے پر وہ شرمندہ نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا سینہ
زوری پر اُتر آتا ہے۔ اس لیے ایک سمجھ دار پتنی کو چاہیے کہ اسے چھیڑے بغیر ہوشیاری سے اپنی طرف پلٹانے
کی کوشش کرے۔'' اس نے ذرا تفصیل سے اپنے لاعلم ہونے کی وضاحت کی۔

''اوکے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پاکستان میں رہ کر بھارت کے
لیے کام کرنے والے ایجنٹ کی بیوی ہونے کا کچھ نہ کچھ خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔'' وہ صاف گوئی سے بولتا
انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بھیج دو۔'' دو الفاظ پر مشتمل مختصر حکم دے کر اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

''ہم ہندو ضرور ہیں لیکن ہمارا جنم اسی دھرتی پر ہوا ہے اور ہم یہیں کھیل کُود کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس
یہ دھرتی ہمیں ماں سمان لگتی ہے۔ ہم اسے نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے
کے معاملے میں تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''پلیز چپ ہو جاؤ۔'' جاوید علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔ ''اس وقت تم کسی ٹی وی چینل کی
کے سامنے نہیں بیٹھی ہو کہ تمہاری اس طرح کی باتیں سن کر کوئی واہ، واہ کرے۔ ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا
کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے مجھے تمہاری اس قسم کی باتیں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

اس کے الفاظ نے راگنی کا راگ بند کر دیا اور وہ چہرے پر پریشانی لیے بے چینی سے ہاتھوں کی اُنگلیاں
نے لگی۔ بچے صورتِ حال کا مکمل ادراک نہیں رکھتے تھے لیکن پھر بھی خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور وہیل چیئر پر بیٹھے گووندا کو اندر لایا گیا۔

''پاپا.....!'' اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں بچے بیک وقت چلّائے اور اُٹھ کر اس کی طرف
گئے۔ گووندا نے بے ساختہ ہی اپنے بازو وا کر دیئے۔ دونوں بچے اس کے کھلے ہوئے بازوؤں میں سما

گئے۔ راگنی بھی مضطرب سی ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی لیکن قدم آگے نہ بڑھائے۔ گووندا کی اس پر نظر
تو گویا حقیقت کا ادراک ہوا اور بچوں پر سے بازوؤں کی گرفت خود بخود ہی ڈھیلی پڑ گئی۔

''پاپا! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟..... کیا آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟'' بچے باپ کو سامنے پا کر
بھول گئے تھے اور پوری طرح اس میں محو اس سے پوچھ رہے تھے۔

لیکن گووندا کی زبان کو تو تالا لگ چکا تھا اور وہ خود کو ایسے بے نیاز ظاہر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش
رہا تھا کہ اس کا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ لیکن اُس کے پہلے ردِعمل کے بعد اس اداکاری کی کوئی حیثیت
نہیں رہ گئی تھی، چنانچہ جاوید علی نے اشارہ کیا اور کمرے میں پہلے سے موجود مسلح شخص نے دونوں بچوں کو گو
سے دُور لے جانے کی کوشش کی۔ اس دوران وہیل چیئر کو دھکا دے کر لانے والا پوری طرح چوکس کھڑا
چوکس تو جاوید علی بھی تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں کسی قسم کا اسلحہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''پاپا!..... پاپا!..... ہمیں پاپا کے پاس جانے دو۔''

باپ سے دُور لے جائے جانے پر بچے احتجاج کرنے لگے۔ البتہ گووندا نے اپنے ہاتھ پیروں
کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن اس کی آنکھوں سے چھلکتی کرب ناک کیفیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے تکلی
ہو رہی ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم اپنا ڈرامہ بند کر دو۔ کیونکہ جو کچھ چند لمحوں میں ہم نے دیکھ لیا ہے، اس
بعد اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ تمہارا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ ہاں
تم یہ ڈرامہ جاری رکھنے پر مُصر ہو تو ایسا کر کے بھی دیکھ لو۔ تمہاری اس ہٹ دھرمی کا خمیازہ تمہارے بچوں
بیوی کو بھگتنا پڑے گا۔ میرا نہیں خیال کہ جب ہم ان تینوں کو چھت سے اُلٹا لٹکا کر ان کے نازک جسموں پ
برسائیں گے تو تم یہ منظر آسانی سے دیکھ سکو گے۔''

جاوید علی نے اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اتنی سفا کی سے
جملے ادا کیے کہ گووندا کو جھرجھری سی آ گئی اور بالآخر اسے اپنی زبان پر پڑے خاموشی کے قفل کو توڑنا ہی پڑا۔

''اپنے مطلب کے لیے معصوم بچوں اور کمزور عورت کو استعمال کرنا بزدلی ہے۔''

''تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مینارِ پاکستان سمیت شہر بھر کے مختلف مقامات پر دھماکے کرنے
منصوبہ بنایا تھا، وہ تو بہت دلیرانہ تھا نا۔ میں تمہاری آواز اچھی طرح پہچان سکتا ہوں۔ یہ تم ہی تھے جس
سنتھیا جوزف کو مشورہ دیا تھا کہ مینارِ پاکستان کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی بلاسٹ کیے جائیں۔ یہ سفا
مشورہ دیتے ہوئے تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ اس کے نتیجے میں کتنے بے گناہ لوگ اپنی جان سے ہاتھ
بیٹھیں گے؟ کتنوں کو ہمیشہ کے لیے معذوری کا عذاب سہنا پڑے گا؟ کتنی ماؤں کی گودیں اُجڑ جائیں گی
کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے اور کتنی کمزور عورتیں بیوگی کا عذاب کاٹیں گی؟''

گووندا کے اعتراض کا اس نے کاٹ دار لہجے میں جو جواب دیا، اسے سن کر جہاں وہ دم بخود رہ
وہیں راگنی نے بھی منہ پر ہاتھ رکھ کر زوردار سسکی لی۔

''مجھے وشواس نہیں ہوتا کہ تم اتنے بڑے راکھشس ہو۔ دھرم اور دھرتی سے پہلے اگر تم انسانیت
بارے میں سوچ لیتے تو ہرگز ایسے گھناؤنے کام میں نہیں پڑتے۔ تم نے تو ایک پل میں میرے من سے
لیے پریم مٹا ڈالا ہے۔ میں کیسے ایسے شخص کو اپنا پتی مان سکتی ہوں جو سرے سے انسان ہی نہیں ہے۔''

''تم چپ رہو راگنی! تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آ سکتی۔'' اس نے سر اٹھا کر رو رو کر بولتی بیوی کو



''میرے کیا، کسی بھی انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔ جو انسانیت پر یقین رکھتے ہیں، وہ کسی بھی
ان بے گناہوں کا خون نہیں بہاتے۔''

چپ ہونے کے بجائے اس نے دوبدو جواب دیا جس پر گووندا نے بری سی شکل بناتے ہوئے منہ پھیر
اس کے منہ پھیرتے ہی جاوید علی نے اس کے پیچھے کھڑے شخص کو اشارہ کیا تو وہ اس کی وہیل چیئر کو
دیتا ہوا کمرے سے باہر لے جانے لگا۔ بچے جو خاموش ہو گئے تھے، باپ کو واپس جاتا دیکھ کر ایک بار
شور مچانے لگے۔

''جانے دو بیٹا! یہ تمہارا باپ نہیں، ایک درندہ ہے جو نردوش (بے گناہ) انسانوں کا خون پی جاتا ہے۔''
نے باپ کی طرف لپکتے بچوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ واقعی گووندا کے بارے میں ہونے والے
انکشافات کو سن کر بہت دُکھی نظر آ رہی تھی۔ جاوید علی نے اس انسانیت پسند عورت پر ایک افسردہ سی نظر ڈالی
خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

''مناسب وقت دیکھ کر ان ماں بچوں کو آزاد کر دینا۔'' باہر نکل کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو ہدایت کی
خود اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں گووندا کو لے جایا گیا تھا۔ اس سفاک قاتل کے لیے اس کے دل
رحم یا ہمدردی کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے یہ طے تھا کہ چاہے اسے اس شخص کا ریشہ ریشہ ہی کیوں
الگ کرنا پڑے، وہ اس کی زبان کھلوا کر ہی دم لے گا۔

⊛----✪----⊛

''را'' کی قید میں گزرنے والے پانچ سال میرے لیے پانچ صدیوں کے برابر تھے۔ ان پانچ سالوں
وہ کون سا ذہنی اور جسمانی تشدد تھا جو اُن سفاک قصائیوں نے مجھ پر نہیں کیا۔ میرے ہاتھ پیر کے ناخنوں
حال تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو۔ ایک ایک ناخن نکلنے کی اذیت ایسی تھی جو مجھے آج تک نہیں بھولتی۔ الیکٹرک
سے لے کر برف کی سلوں پر لٹانے تک انہوں نے مجھ پر ہر حربہ آزما ڈالا لیکن میں نے انہیں اپنی
اور اس کے مقاصد کے متعلق کچھ بتا کر نہیں دیا۔ اپنی پوری زندگی میں، میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا
میں کبھی ایسے تشدد سے گزروں گا اور اسے سہہ بھی لوں گا۔ عام حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن میں
اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اسے ممکن کر دکھایا۔ بس یوں سمجھ لو کہ مجھ پر ایک ضد سوار ہو گئی تھی کہ
میری جان چلی جائے، میں ایک ایسے دشمن کے سامنے اپنی زبان ہرگز نہیں کھولوں گا جو بار بار میرے
پر جنگ مسلط کرتا ہے۔ اتنا زیادہ تشدد سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور مجھے علاج کی
سے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔

''ہسپتال میں گزرنے والے ایک ڈیڑھ سال کے بارے میں تو مجھے خبر نہیں کہ یہ مرحلہ کیسے گزرا اور میں
حال میں رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ میری ذہنی حالت بہتر ہونے لگی۔ ڈاکٹرز نے میری بحال ہوتی ذہنی
کے تسلسل کو اس بات سے مشروط کر دیا کہ میرے ذہن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ مجبوراً ''را'' والوں کو
سے دُور رہنا پڑا اور اس چیز کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ میری ذہنی حالت اس حد تک سنبھل گئی کہ
خود اپنے حالات کا احساس ہو گیا اور اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان لوگوں پر اپنی مکمل صحت یابی کو
نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ تشدد سے بچنے کا میرے پاس یہی واحد راستہ تھا۔

''انہی دنوں میں میرا خود بخود اللہ سے رابطہ قائم ہو گیا اور خود کو ہر طرف سے بے یار و مددگار پا کر اس
لو لگائی کہ وہی سب سے بڑا کارساز ہے۔ جب اس کی مدد مل جائے تو سارے راستے خود بخود ہی کھلتے

چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے مالک ومختار ہونے کا سبق شاید ہر مسلمان کو ہی رٹوایا جاتا ہے لیکن کم ہی ہوتے جو اس سبق کو اپنی عملی زندگی میں اپلائی کرتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ عیدین اور جمعے کی نمازیں پڑ سمجھتا تھا کہ اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کر رہا ہوں۔ نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کبھی خیال ہی آتا تھا کہ دل کی گہرائی سے اس ہستی کا شکر ادا کیا جائے جس نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ قید اور ٹارچر مجھے احساس دلایا کہ سابقہ زندگی میں، میں کن کن نعمتوں کو شکر گزاری کے احساس کے بغیر برتتا چلا جاتا بس پھر اس احساس کے بعد دل کی دنیا بدل گئی۔ باہر کی دنیا میں ہوتا تو اپنے ہر ہر عمل سے اپنے بدلے ہو احساسات کا اظہار کرتا۔ قید و بند میں بس اتنا کر سکا کہ زیادہ سے زیادہ اللہ کے سامنے حاضر رہنے لگا۔ حاضری نے دل کو سکون اور تقویت دونوں نعمتیں بخشیں۔

''چنانچہ جب ''را'' والوں کو شک ہوا کہ میں ٹھیک ہو گیا ہوں اور ردِعمل میں انہوں نے دوبارہ تشد سلسلہ شروع کیا تو میرے لیے تکلیف کو سہنا پہلے کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا۔ میں ہر درد کو بس یقین کے ساتھ سہتا رہا کہ وہ جو کارساز ہے، ایک نہ ایک دن مجھے ان حالات سے نجات ضرور دلائے گا میں واپس جا کر اس پاک سرزمین کی خدمت کر سکوں گا جو آباد ہی اللہ کے نام پر کی گئی ہے اور جسے اسلا قلعہ کہا جاتا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے جو علم دیا ہے، اس کی مدد سے میں اس قلعے کی فصیلوں کو بلند اور مض کرنے میں اپنا جو کردار ادا کر سکتا ہوں، وہ ضرور کروں گا۔ اور دیکھو، اللہ نے تمہیں میرا مددگار بنا کر بھیج دیا اللہ کی طرف سے میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہو اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ چاہے کتنے ہی نام حالات سے گزرنا پڑے، ایک دن انشاء اللہ میں اس دھرتی پر قدم ضرور رکھوں گا جس کا قرض اتارنے لیے میں نے اپنی زندگی اور رہائی کی بہت دعائیں مانگی ہیں۔''

کمال ہیروئن کی پڑیا ملنے کے بعد بالکل شانت ہو گیا تھا اور اب انہیں باہر سے اس کی ذرا بھی آ سنائی نہیں دے رہی تھی اس لیے کافی دیر دم سادھے بیٹھے رہنے کے بعد انہیں یہ موقع مل گیا تھا کہ آپس گفتگو کر سکیں۔

ڈاکٹر فرحان کو ہسپتال سے لے کر فرار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان سے ان کے بارے کچھ سن رہے تھے اور سن کر متاثر ہو رہے تھے کہ بعض لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ٹھوکر گرانے لیے نہیں بلکہ سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ قابلیت ان کے پاس پہلے بھی تھی لیکن قدو صعوبتوں نے انہیں بھٹی میں پک کر کندن بن جانے والے سونے کی طرح مکمل کر دیا تھا۔

''آپ کا یقین غلط نہیں ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ ارضِ وطن پر ہوں گے۔'' شہریار نے ان کے دو ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے یقین دہانی کروائی تو وہ مسکرا دیے۔

اسی وقت انہیں باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ سلّو جلدی سے لپک کر دروازے کے قر گیا اور کی ہول سے باہر جھانکا اسے عائشہ نظر آئی جو لاؤنج کے وسط میں کھڑی پریشان نظروں سے وہاں ابتر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہیں کھڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے بیڈروم کا رخ کر لیا۔

''عائشہ واپس آ گئی ہے۔'' سلّو نے سرگوشی میں ان لوگوں کو اطلاع دی اور خود بدستور کی ہول سے لگائے رہا۔

بیڈروم سے نکل کر عائشہ اب اس طرف ہی آ رہی تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ عائشہ کی ہول میں چابی ڈال کر گھمائی لیکن فوراً ہی دروازہ کھولنے کے بجائے آہستہ سے دستک دی۔



''کم اِن۔'' شہریار نے دستک کا جواب دیا۔ عائشہ کے اطوار ایسے تھے کہ وہ اس کے لیے پسندیدگی ں کرتا تھا۔ غیر معمولی حالات میں بھی وہ خود پر کنٹرول رکھنے کا ہنر جانتی تھی اور اپنی کیٹس بھی نبھاتی تھی ں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی بھی مالک ہے۔ ورنہ عام لوگ ا ما لیر معمولی حالات میں سب سیکھا پڑھا بھول جاتے ہیں۔

''سوری، مجھے اندازے سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا۔ تم لوگ بتاؤ میرے پیچھے کوئی پریشانی تو نہیں ی؟'' دروازہ کھول کر اندر آنے کے بعد اس نے فوراً معذرت کی اور ساتھ ہی ان کا احوال بھی دریافت کیا۔

''کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ بس تمہارے شوہر نے تھوڑی سی گڑبڑ کی تھی جس کے بعد ہم بال بال گئے۔''

شہریار نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تفصیل سے آگاہ کیا کہ کیسے کمال ہیروئن کی طلب میں ں کمرے کا دروازہ توڑنے پر تُل گیا تھا اور نتیجے میں پولیس اس طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''باہر چوکیدار نے بھی مجھے اس بارے میں بتایا تھا'' سارا قصہ سننے کے بعد عائشہ نے بولنا شروع کیا اور ک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''کمال اتنی بری طرح نشے کی لت میں مبتلا ہو چکا ہے کہ اسے یکدم اس سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ آہستہ آہستہ اس کی یہ عادت چھڑاؤں۔ اس لیے اس ں پڑیاں چھپا کر رکھتی ہوں۔ لیکن بعض اوقات زیادہ طلب ہونے پر وہ خود اس زہر کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ میں اسے دیکھ کر آ رہی ہوں، بالکل بے سدھ پڑا ہوا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ اب رات سے پہلے جاگے گا۔ یہ اس کے لیے اچھی نہیں ہے۔ ریکور کرتے کرتے اچانک وہ دوبارہ پیچھے کی طرف چلا جاتا ہے۔'' اس کی ں میں ہلکی سی تھکن تھی۔

''نشے میں مبتلا مریضوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو بھرپور علاج اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تم جاب کرتی ہو۔ پیچھے کمال گھر پر اکیلا رہ جاتا ہے اور کوئی اس کی گرانی کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم اس کا مکمل علاج ہونے تک اسے کسی ایسے ادارے میں ل کروا دو جہاں ایسے افراد کے رہنے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس طرح تم بھی بے فکر ہو جاؤ گی اور وہ بھی جلد ت یاب ہو جائے گا۔'' اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے شہریار نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ایسے ادارے بہت بھاری فیس لیتے ں اور اپنی اس نئی جاب سے مجھے اتنی انکم نہیں ہوتی کہ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ یہ خرچہ ی اٹھا سکوں۔ بہرحال چھوڑو..... میرا یہ مسئلہ کبھی نہ کبھی حل ہو ہی جائے گا۔ تم لوگ بتاؤ کہ اپنے لیے کیا ا ہے؟'' نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بیان کرنے کے بعد اس نے فوراً ہی موضوعِ گفتگو بدل دیا۔

''ہم تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ہمارا ساتھ دینے یا نہ دینے کے حوالے ے کیا فیصلہ کیا ہے؟ تمہارے فیصلے کی بنیاد پر ہی ہم اپنے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔'' شہریار ے اسے جواب دیا تو وہ جو اس دوران کرسی پر ٹک چکی تھی، سوچ میں پڑ گئی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔

''میں دفتر اسی مقصد کے لیے گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور تم لوگوں کے بارے میں ہر طرف وہی خبریں گردش کر رہی ہیں جو تم نے خود بھی ٹیلی ویژن پر دیکھ لی تھیں۔ لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ اس قسم کی خبریں اس اصول کی بنیاد پر بنائی جاتی ہیں کہ جھوٹ اس حد تک بولو کہ سچ محسوس ہونے لگے۔ ں لیے میں نے خبروں پر مکمل یقین کرنے کے بجائے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔ میرا ایک فرینڈ ہے

بھٹناگر..... وہ بہت اونچے درجے کا جرنلسٹ ہے اور اس کی پہنچ حکومتی دیوانوں سے لے کر آرمی ہیڈ کوارٹر تک ہر جگہ ہے۔ تمہارے معاملے کی سچائی جاننے کے لیے میں نے اس سے رابطہ کیا اور بہانہ بنایا کہ مجھے ایک موضوع پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا ہے، اب تم بتاؤ کہ اس قصے میں کتنے پرسنٹ سچائی ہے تاکہ میں فیصلہ کرسکوں کہ مجھے یہ فیچر لکھنا بھی چاہئے یا نہیں۔ بھٹناگر میرے اس دور کا فرینڈ ہے، جب میں اپنے باپ کی محل جیسی کوٹھی میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی اور مجھے جاب کرتے ہوئے یا روزگار ہونے کی بالکل بھی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جاب سے نکالے جانے کی پروا کیے بغیر صرف وہ لکھتی تھی جو مجھے سچ لگتا تھا۔ میری اس عادت سے واقف بھٹناگر نے مجھے ایک رازدار دوست کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتا دیا جس سے تمہارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ پریم ناتھ اور ارجن اگروال نے صرف اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو پھنسا کر ''را'' کے چنگل میں دے دیا کہ یہ ایک پاکستانی سائنس دان ہیں اور اپنی بدنیتی کی وجہ سے ''را'' والے چاہتے ہیں کہ جو کچھ یہ پاکستان کے لیے کر رہے ہیں، وہ بھارت کے لیے کریں یا کم از کم پاکستان کے لیے کچھ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اب بھی انہیں تم لوگوں سمیت پکڑنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ شہر کے داخلی اور خارجی راستوں پر سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ تم لوگ ان سمیت یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوسکو۔''

''اللہ نے چاہا تو راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ سچائی جاننے کے بعد تو تم ہماری مدد کے لیے تیار ہو نا؟''

''ہاں۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکوں گی؟ اور کیا اس کے بعد خود میں اور میرا خاندان محفوظ رہے گا؟ مسلمانوں سے ویسے ہی یہاں امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ تو میرا خاندان مالی طور پر بہت مضبوط ہے، اس لیے ہمیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن کمال سے شادی کے بعد میں اس خاندان کا حصہ بھی نہیں رہی ہوں اس لیے کمال، مجھے اور میری بچی کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ معاملہ اگر صرف میری ذات کا ہوتا تو میں پروا نہیں کرتی۔ لیکن میں کمال اور اپنی معصوم بچی کو کسی تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔''

اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود بہرحال وہ ایک عورت تھی اور اپنے قریبی لوگوں کے لیے فکرمند ہونا بھی فطری بات تھی۔

''اس سلسلے میں تم فکر مت کرو۔ ہم تم سے بس اس حد تک مدد لیں گے جو تمہارے لیے پریشانی کا سبب نہ بنے۔ یوں سمجھ لو کہ اس سلسلے میں تم کہیں منظرِ عام پر نہیں آؤ گی۔''

اس کے محسوسات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے اسے تسلی دی، پھر بولا۔

''اور ہاں، تم ہمارے خلاف فیچر ضرور لکھنا۔ کیونکہ تم نہیں بھی لکھو گی تو اور بہت سارے لوگ لکھیں گے البتہ لکھنے کی صورت میں یہ ہوگا کہ تمہاری پوزیشن اور بھی مضبوط ہو جائے گی اور تمہاری حب الوطنی پر بھروسا کیا جانے لگے گا۔''

''مشورے کا شکریہ۔ لیکن شاید میں اس پر عمل نہ کرسکوں کیونکہ تھوڑے سے فائدے کے لیے مجھے اپنے قلم کی سچائی کا سودا نہیں ہوسکے گا۔''

وہ بولتی ہوئی کھڑی ہوئی تو شہریار مسکرا دیا۔ عائشہ کو اب تک اس نے جتنا جانا تھا، اس کے بعد اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔



''لنچ تو میرے لیٹ ہونے کی وجہ سے گول ہو گیا ہے۔ اب میں ایسا کرتی ہوں کہ جلدی سے ڈنر تیار کر لیتی ہوں تاکہ تم لوگ جلدی کھا پی سکو۔ ویسے کہو تو ابھی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا بنا دیتی ہوں، ڈنر تیار ہونے تک سہارا ہو جائے گا۔'' کمرے سے باہر نکلنے سے قبل اس نے مہمان داری میں ناکام رہ جانے والی میزبان کی سی شرمندگی سے کہا۔

''کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہاری تیار کی ہوئی کافی اور اسنیکس سے ہمارا اچھا گزارہ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی ہم کوئی پکنک پر نہیں نکلے ہوئے کہ کھانے پینے کی فکر میں پڑے رہیں۔ تم جا کر آرام سے فریش ہو جاؤ اور چاہو تو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو۔ ڈنر کے لیے دال چاول یا کھچڑی جیسی کوئی بھی ہلکی پھلکی آسان سی ڈش تیار کر لینا۔ اس طرح ہمارے معدوں پر زیادہ بوجھ پڑے گا، نہ ہی تمہیں کوکنگ میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا۔''

شہریار نے کھلے دل سے اسے جواب دیا تو وہ ہنس دی پھر بولی۔

''اب میں اتنی بھی بُری میزبان نہیں ہوں کہ مہمان کو دن بھر بھوکا رکھنے کے بعد جو واحد کھانا کھلاؤں، وہ بھی دال چاول یا کھچڑی کی شکل میں ہو۔''

''ہم مہمان ہیں بھی کب؟ ہم تو بلائے جان بن کر زبردستی تمہارے گھر میں آ گھسے ہیں۔'' شہریار نے شائستگی سے اسے جواب دیا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''پلیز مجھے شرمندہ مت کرو۔ پہلے ہی میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہی ہوں کہ انہیں میرے ملک میں اتنے ظلم کا نشانہ بنایا گیا اور میں ایک صحافی ہونے کے باوجود کھل کر اس ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرسکتی۔ کیونکہ ایسا کرتے ہی میری ملک کے ساتھ وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔ حالانکہ سچ پوچھو تو مسلمان ہونے کے باوجود میرا اور میرے گھر والوں کا رویہ کبھی ان بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کی طرح نہیں رہا جو ہندوستان میں رہ کر پاکستانی ٹیم کی جیت پر خوش ہوتے ہیں اور جنہیں پاکستان کے ساتھ اپنا ایک روحانی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے بچپن سے یہی سیکھا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سے مذاہب اور رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہم بے شک مسلمان ہیں لیکن ہماری وفاداریاں اس سرزمین سے ہونی چاہئیں جہاں ہم رہتے بستے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں یہی ملک ہماری شناخت ہے۔''

اس کے لب و لہجے میں کھلی اُداسی بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر فرحان والے واقعے کی سچائی نے اس کے احساسات پر گہری ضرب لگائی ہے۔

''اوکے میڈم! تمہارا جو دل چاہے بناؤ، پکاؤ اور کھلاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کے طفیل ہم بھی عیش کر لیں گے۔'' ذرا شوخ لہجے میں بولتے ہوئے شہریار نے دانستہ ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو عائشہ اور اچھے لوگ یونہی حساس ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یقین کرو کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے لیے میں نے کسی مسلمان تو کیا، بھارت کے ہندو شہری کو بھی قصوروار نہیں سمجھا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم جیسے تیسری دنیا کے شہری، حکومتی پالیسیوں پر اپنا کوئی اثر رکھتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے فیصلے کہیں اور، کوئی دوسرا کرتا ہے۔ ہمارے ادارے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی من مانیاں کرتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ایک عام شہری کا کوئی کردار رہتا ہی کہاں ہے جو اسے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بالکل ریلیکس ہو جاؤ اور کم از کم میرے سامنے کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہ کرو بلکہ اگر میرے ساتھی بُرا نہ مانیں تو میں یہاں تک کہوں گا کہ اگر تم تلافی کے طور پر ہماری مدد کرنے کے لیے تیار

ہوئی ہو تو نہ کرو مدد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں یہ مدد تمہارے جذبۂ حُب الوطنی کے لیے بوجھ بن جائے۔ ہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ ہمیں کسی اور طریقے سے مدد پہنچا دے گا۔ کیونکہ اس کے کارساز ہونے پر ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر فرحان نے بہت اچانک اس گفتگو میں دخل دیا تھا اور بولنے پر آئے تھے تو بولتے چلے گئے تھے۔

عائشہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اُن کی اس گفتگو سے متاثر ہو رہی ہے چنانچہ ان کے خاموش ہونے کے بعد بولی تو اس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔

''آپ کے اللہ پر اعتماد نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ڈاکٹر صاحب! اور اب میں اپنے اس ارادے میں اور بھی پختہ ہو گئی ہوں کہ مجھے اپنی استطاعت کے مطابق آپ لوگوں کی مدد ضرور کرنی ہے۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ جو آپ کی مدد کرے گا، وہ اللہ کا منتخب کردہ بندہ ہوگا۔ تو پھر میں اللہ کا انتخاب ہونے کی سعادت کیوں حاصل نہ کروں؟..... ویسے بھی میں نے کسی تلافی کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے ناتے آپ لوگوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور الحمدللہ اس فیصلے پر قائم ہوں۔''

وہ اپنی آنکھوں سے بے اختیار چھلک پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے پلٹ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''چائے والی آفر کو بھول مت جانا میڈم! اتنی اموشنل سچویشن کے بعد تو مجھے پہلے سے زیادہ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' سلّو کے ہانک لگانے پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رُکے۔

''ڈونٹ وری، ابھی تھوڑی دیر میں بہت زبردست چائے مل جائے گی۔'' مڑے بغیر جواب دے کر وہ باہر نکل گئی تو شہریار نے بیڈ کے نیچے رکھا اپنا بیگ کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں سے بڑے نوٹوں پر مشتمل ایک گڈی نکال کر دیوار گیر مقفل الماری کی طرف بڑھ گیا۔

الماری کا قفل کھولنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود نوٹوں کی گڈی الماری میں منتقل ہو کر الماری دوبارہ مقفل بھی ہو گئی اور وہ یوں اطمینان سے اپنی جگہ آ بیٹھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دیے گئے وہ یہ رقم کمال کے علاج کے لیے عائشہ کے ہاتھ میں بھی دے سکتا تھا لیکن شاید اس خوددار لڑکی کے لیے یہ قابلِ قبول نہیں ہوتا اور وہ ہر صورت عائشہ کو یہ رقم دینا چاہتا تھا تاکہ اس عجیب و غریب، انوکھی سوچ رکھنے والی لڑکی کی زندگی میں تھوڑا سا اطمینان و سکون آ جائے۔ ورنہ کمال سے کی جانے والی ہمدردی کی سزا وہ سارا زندگی بھگتتی رہتی اور وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

⊛----✪----⊛

''ماہ بانو کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پتہ نہیں بے چاری کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟'' اُمید کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اس نے ٹی وی کی طرف متوجہ آفتاب سے کہا۔

تشویش تو مجھے بھی ہے۔ اس کے پیچھے اسلم بھی غائب ہو گیا ہے اور اب تک کہیں سے رابطہ کر کے کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروا دی جائے لیکن مصطفیٰ خان نے روک دیا۔''

آفتاب ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی بات کا جواب دینے لگا اور پھر یکدم ہی اُمید کی طرف متوجہ ہو گیا جو مسلسل اس کی جانب لپک رہی تھی۔ اُس کی اس حرکت کی وجہ سے کشور کے لیے اس کے فراک کے بٹن بند کرنا مشکل ہو رہا تھا۔



''ہا..... با.....!'' باپ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ زبان سے بھی اسے پکارنے لگی۔ ساتھ ہی اس کی لال لپکنے کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

''آرام سے بیٹھو اُمید!..... گر جاؤ گی۔ بابا کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں۔ چلی جانا ان کے پاس۔ پہلے کپڑے چینج کر لو۔'' کشور نے اسے پیار بھری ڈانٹ پلائی جس پر وہ منہ بسورنے لگی۔

''آ جاؤ میری جان!'' بیٹی کو رونے کے لیے تیار دیکھ کر آفتاب فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ فوراً لپک کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

''بہت چلبلی ہو رہی ہے۔ آپ کی تو دیوانی ہے۔ فارغ دیکھتے ہی چاہتی ہے کہ آپ فوراً اسے گود میں لے لیں۔'' کشور نے ممتا بھری نظروں سے آفتاب کی گود میں جا کر قلقاریاں مارتی بچی کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''بچی آپ سے زیادہ سمجھ دار ہے جو محبت کو پہچانتی اور جانتی ہے کہ باپ اسے اپنی بانہوں میں لے کر نہال ہوتا ہے۔ ایک آپ ہیں کہ دور دور رہ کر تڑپاتی رہتی ہیں اور خیال ہی نہیں آتا کہ بے چارہ شوہر کب سے پیار کے لیے ترس رہا ہے۔'' بچی کے رخسار کو چومتے ہوئے اس نے کشور کو چھیڑا۔

''زیادہ باتیں نہ بنائیں جناب! خود تو دن رات لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں اور الزام میرے سر لگایا جا رہا ہے۔''

کشور نے فوراً ہی اسے دوبدو جواب دیا لیکن آنکھوں کی چمک اور رخساروں کی لالی بتا رہی تھی کہ روزِ اول کی طرح آفتاب کی توجہ نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور وہ اس کے جذبوں کو پہچان کر شرما گئی ہے۔

''کتابیں پڑھنا تو مجبوری ہے۔ جب آپ کا کتابی چہرہ پڑھنے کو نہیں ملتا تو ہم کاغذی کتابوں سے ہی دل بہلا لیتے ہیں۔''

ٹھیٹ عاشقوں کے لہجے میں جواب دے کر اس نے زور سے بچی کو اُچھال کر واپس اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ بچی اس حرکت پر خوش ہو کر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''آپ بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ میں اتنے سیریس ایشو پر بات کر رہی تھی اور درمیان میں آپ کوئی اور قصہ چھیڑ بیٹھے۔'' کشور نے خفگی کا اظہار کیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ کیونکہ ماہ بانو کا مسئلہ ہی ایسا تھا جس پر ان سب کو ہی تشویش تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس معاملے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اصولی طور پر تو گمشدہ افراد کی بازیابی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پولیس میں رپورٹ درج کروائی جائے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں پولیس کا رویہ اتنا غیر ذمے دارانہ ہے کہ وہ رپورٹ لکھوانے کے باوجود اس معاملے کو سنجیدگی سے لینے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ بلکہ واضح طور پر ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ اوپر سے مصطفیٰ خان نے اسلم کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اب ہم ان دونوں کو ڈھونڈیں تو کیسے؟''

''وہ تو خیر انہوں نے صحیح کیا ہے۔ پولیس نے ماہ بانو کے معاملے میں کون سا کچھ کیا ہے جو اس سے اسلم کے سلسلے میں مدد لی جائے۔'' کشور نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''وہ بات اپنی جگہ ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مصطفیٰ خان جان بوجھ کر پولیس کو اس معاملے میں شامل کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کا انداز کچھ مشکوک سا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' کشور اس کی بات سن کر حیران ہوئی۔

"میں اپنے اس شک کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ بس میری چھٹی حس ہے جو بتا رہی ہے کہ مصطفیٰ خان کا کردار پُراسرار ہے اور وہ جو نظر آتا ہے، اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔" آفتاب کا انداز اُلجھا ہوا تھا۔

"کیا آپ کو لگتا ہے کہ ماہ بانو اور اسلم کے غائب ہونے میں مصطفیٰ بھائی کا کوئی کردار ہے؟" کشور نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ارے نہیں، ایسا کوئی شک میرے ذہن میں نہیں ہے۔ وہ اور اس کی بیگم بالکل ویسے ہی ان دونوں کے لیے پریشان ہیں جیسے ہم۔ بس مجھے یہ لگتا ہے کہ مصطفیٰ خان کو ان دونوں کی گمشدگی کے پیچھے چھپے بھید کی خبر ہے اور اسی وجہ سے وہ اسلم کی گمشدگی کو دانستہ چھپا رہا ہے۔ شاید اسے یہ ڈر ہے کہ پولیس اگر اسلم تک پہنچ گئی تو ماہ بانو کی بازیابی مشکل ہو جائے گی۔ وہ پولیس تک یہ خبر جانے سے روک کر اسلم کو آزادی سے کام کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔" اس نے اس بار کسی قدر وضاحت سے مصطفیٰ خان کے سلسلے میں اپنے شک کی وضاحت کی۔

"یہ تو واقعی ذرا عجیب سی بات ہے۔ بہرحال، اچھی بات یہ ہے کہ مصطفیٰ بھائی کا کردار نگیٹو نہیں ہے ورنہ آپ کی پہلی بات سن کر تو میں ڈر ہی گئی تھی۔"

اس کی وضاحت پر کشور نے سکون کا سانس لیا اور آفتاب کی گود میں موجود اُمید کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے بولی۔

"سونے کی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بابا کے ساتھ کھیلو، میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔"

اُمید نے جو واقعی ان کے درمیان جاری گفتگو کے دوران اونگھنے لگی تھی، ماں کی بات پر یوں منہ بسورا جیسے خود کو ڈسٹرب کیا جانا پسند نہ آیا ہو۔

اُس کی اس ادا پر مسکراتے ہوئے آفتاب اُسے بہلانے لگا تو کشور مطمئن سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی واپسی تک آفتاب بچی کو بہلا کر اس موڈ میں لے آئے گا کہ وہ سونا بھول کر کھیل میں لگ جائے گی اور وہ اطمینان سے اسے اس کا کھانا کھلا سکے گی۔

لیکن ابھی وہ کچن سے دو قدم کے فاصلے پر ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ٹیلی فون جس جگہ رکھا تھا وہاں سے وہ زیادہ قریب تھی اس لیے کال ریسیو کر لی۔

"کیسی ہو کشور میں تمہارا لالہ، مراد شاہ بات کر رہا ہوں۔" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے کہا گیا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ حالات ہی اتنے عجیب تھے کہ کسی اپنے سے بات کرنے کی خوشی اندیشے غالب آ جاتے تھے۔

"السلام علیکم لالہ!..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں کہ بھابی اور بچی کیسے ہیں؟" خود کو سنبھال کر اس نے اخلاق سے بھائی کی بات کا جواب دیا۔

"وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ شاہدہ تمہیں یاد کر رہی تھی۔ کبھی وقت ملے تو اس سے بات کر لینا۔ برسوں سے یہاں رہنے کے باوجود ہم مکمل طور پر یہاں ایڈجسٹ نہیں ہیں کیونکہ یہاں سب کچھ ہوتے ہوئے اپنوں کی کمی ہے۔ تمہیں نیویارک میں دیکھ کر ہم سب ہی بہت خوش ہوئے تھے اور لگا تھا کہ ایک خونی رشتے کی موجودگی بہت سی محرومیوں کو دُور کر دے گی۔ لیکن تم تو ہم سے دُور ہی بھاگ گئیں۔" بولتے بولتے مراد شاہ کا لہجہ تھوڑا اُداس ہو گیا۔



کشور نے پوری شدت سے اس اُداسی کو محسوس کیا کیونکہ وہ خود بھی تو زندگی میں بہت کچھ مل جانے کے باوجود ان رشتوں کے لیے تڑپتی تھی جنہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

"آپ میرے حالات سے واقف ہیں۔ میں اس ڈر سے اپنوں سے دُور رہنے پر مجبور ہوں کہ اپنے ماں محنت اور قربانی سے بنائے گئے چھوٹے سے آشیانے کو بکھرنے سے بچانا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کی تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں لوٹ کر گھر جا سکتے ہیں۔ آپ کا تو وہاں کھلے دل سے استقبال ہو گا۔ ہر طرح آپ کوئی حویلی والوں کے مجرم تھوڑی ہیں۔ آپ تو وہاں کے والی وارث ہیں جس کا سب کو انتظار ہے۔" دُکھ اور بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔

"مجبوری کی نوعیت مختلف ہے۔ ورنہ مجبور میں بھی ہوں۔ میرا بھی بہت دل چاہتا ہے کہ اپنوں کے درمیان رہوں اور جو علم حاصل کیا ہے، اس سے اپنے وطن کو فائدہ پہنچاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ابا جی کے سامنے میری ذرا نہیں نبھے گی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں، وہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں، اس کی وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے دُور رہیں اور کسی قسم کی کشمکش کی نوبت نہ آئے۔"

مراد شاہ کا جواب حقائق پر مبنی تھا چنانچہ کشور کچھ نہ کہہ سکی۔ خود اسی نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

"میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ میری کمپنی ایک کام کے سلسلے میں مجھے آرلینڈو بھیج رہی ہے۔ میں چند دن وہاں رہوں گا۔ رہائش کا انتظام بھی کمپنی کی طرف سے ہی ہو گا۔ بس میری اتنی خواہش ہے کہ میں آؤں تو تم سے ملاقات کر سکوں۔ کیا تم مجھے اپنے گھر ملاقات کے لیے آنے کی اجازت دو گی؟"

مراد شاہ کے بڑی اُمید سے پوچھے گئے سوال پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ عمر افتخار عالم شاہ کی وسیع جائیداد کا اکلوتا وارث، جسے خاندانی اصولوں کے مطابق خاندان کے ہر فرد پر اختیار حاصل تھا۔ کیونکہ جب وہ گدی نشین ہوتا تو سارے سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا اور خاندان کے ہر فرد کو اس کے اپنے سے متعلق کیے گئے فیصلوں کو قبول کرنا پڑتا۔ لیکن اس وقت اس کا بھائی اس سے اتنی سی بات کی اجازت کا طلب گار تھا کہ وہ اس سے ملنے اس کے گھر آ جائے۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی لالہ!" بڑی مشکل سے یہ جواب دے کر اس نے ریسیور کریڈل پر واپس رکھا اور کچن میں گھس گئی اور وہاں وہ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خونی رشتوں سے دُوری کا غم ہی ایسا تھا کہ زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل درد کے احساس سے نجات نہیں پاتا تھا۔

"کشور! جلدی آ جاؤ بھئی۔ اُمید کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ بھوک سے رونے لگی ہے۔" آفتاب جو فون پر مصروف دیکھ کر اُمید سمیت بیڈروم میں چلا گیا تھا، پکارنے لگا۔

اس کی پکار پر کشور نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور بچی کے لیے ایک باؤل میں پہلے سے تیار کر رکھا گیا کسٹرڈ نکالنے لگی۔

کسٹرڈ کا باؤل ہاتھ میں لے کر باہر نکلنے سے قبل اُس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا کوئی قطرہ نظر نہ آنے پائے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے آنسو آفتاب کے لیے تکلیف کا سبب بنتے اور جنہیں چاہا جائے، انہیں تکلیف سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی پڑتی ہے۔

❀----✪----❀

''زندگی کتنی اچھی لگنے لگی ہے نا۔''

کھلے صحن میں پڑی چارپائی پر شاہد کے برابر بیٹھ کر اس کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے چاندنی نے مسکراتے لبوں سے اپنے جذبات کی تائید چاہی تو شاہد نے اس کے وجود پر ایک گہری نظر ڈالی۔

اس نے کھلتے ہوئے سبز رنگ کا سوتی جوڑا پہن رکھا تھا اور چہرہ میک اپ سے بالکل عاری تھا۔ زیور کے نام پر بھی بس اس کی ناک میں ایک کوکا اور کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے باوجود وہ اس چاندنی سے کئی گنا زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی جسے وہ کوٹھے پر ننگ سٹک سے تیار بیش قیمت لباس اور زیورات میں موسیقی کی تال پر پیروں میں گھنگھرو باندھے تماش بینوں کے سامنے رقص کرتا دیکھتا تھا اور تماش بین اُس کی ایک ایک ادا پر دل کھول کر داد دیتے ہوئے اس کے قدموں میں ڈھیروں نوٹ لٹا دیتے تھے۔ بائی اس کی بلائیں لیتے ہوئے ان نوٹوں کو سمیٹتی رہتی تھی۔

شاہد نے کوٹھے پر برسوں گزارے تھے اور اپنی سگی بہن کو بھی ایسے ہی لوگوں کے سامنے ناچتے دیکھا۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسے اس سارے عمل سے کوئی ناگواری محسوس نہ ہوتی۔ لیکن شاید رگوں میں دوڑتے شریف ماں باپ کا خون تھا جو شعور کی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی کوٹھے کی زندگی کا حصہ بن جانے کے باوجود وہ اس سب کو ناپسند کرتا تھا۔ ہاں، اس ناپسندیدگی کے اظہار کی جرأت نہیں تھی کہ بائی جی کے پالے ہوئے خطرناک غنڈے ذرا سے اشارے پر آدمی کو رُوئی کی طرح دُھنک کر رکھ دینے میں ماہر تھے۔

کم سنی سے دل میں بیٹھا ان غنڈوں کا خوف اُسے دل پر جبر کر کے اس ماحول میں رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ وہ تو حالات کچھ ایسے بن گئے تھے کہ اُس کے اندر اس جہنم سے نکل بھاگنے کی ہمت پیدا ہوگئی۔ بہن کے چودھری کی حویلی میں قتل ہونے کا صدمہ ویسے ہی اس کے دل سے لگا ہوا تھا، چنانچہ جب چاندنی نے بتایا کہ کوئی ہے جو اس جگہ سے نکلنے میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اس کی بہن کے قاتل کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم رکھتا ہے تو اس نے ہر ڈر خوف کو جھٹک ڈالا اور چاندنی کے ساتھ وہاں سے کھڑا ہوا۔

انہیں وہاں سے نکال کر لانے والا جگو خود تو منظر سے ہٹ گیا لیکن وہ دونوں عمیر آفندی جیسے اہم سرپرستی میں آ گئے۔ لیکن یہ سرپرستی خفیہ تھی۔ ان دونوں کی کورٹ میرج، رہائش اور چودھری کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے جیسے تمام کاموں کا سارا بندوبست کروانے کے باوجود عمیر خود کہیں بھی منظر پر نہیں آیا بلکہ بظاہر ایک این جی او نے یہ ساری ذمے داری سنبھال لی تھی اور اب وہ دونوں اس بات کے منتظر تھے کہ چودھری بھارت سے واپس آئے تو اس کے خلاف کوئی کارروائی ہو سکے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس کے مسلسل کئی منٹ تک اپنی طرف تکتے رہنے پر چاندنی نے شرماتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تُو نے یہ اتنا سارا حُسن کہاں چھپا رکھا تھا؟ کوٹھے پر تو تُو اتنی خوب صورت نہیں لگتی تھی۔'' اپنے اُلجھے ہوئے خیالات سے نکل کر اس نے بات بنائی۔

''وہاں میں گندگی میں لتھڑی ہوئی تھی نا، اس لیے تجھے خوب صورت نہیں لگتی تھی۔ ہاں، وہ جو غلیظ اور نظریں رکھتے تھے، انہیں میرا وہ روپ بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن تُو تو مجھ سے سچی محبت کرتا ہے نا..... اس لیے ظاہری چمک دمک سے زیادہ تجھے میرا یہ اصل روپ اچھا لگتا ہے۔'' ذرا اُداس لہجے میں چاندنی نے فلسفیانہ انداز میں توجیہہ پیش کی تو وہ مسکرا دیا۔



''تُو نے میری بات کا جواب نہیں دیا شاہد!..... سچ بول، کیا تجھے میری طرح یہ زندگی اچھی نہیں لگ رہی؟'' جانے ذہن میں کیا وسوسہ آیا کہ اس نے ذرا تشویش سے اپنے سوال کو دہرایا۔

''جھلی نہ ہو تو..... بھلا مجھے یہ زندگی کیسے اچھی نہیں لگے گی جس میں ہم دونوں دن رات ایک دُوجے کے سنگ ہیں اور بیچ میں کوئی ظالم سماج بھی نہیں۔''

اس نے رخسار پر جھولتی چاندنی کے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کو پکڑ کر شرارت سے کھینچا تو اس کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکل گئی اور وہ خفگی بھری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔ لیکن شاہد نے اس کے گرد اپنے بازو کا حلقہ بناتے ہوئے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

''چھوڑو، مجھے روٹی بنانی ہے۔'' وہ یوں اس کے بازو میں کسمسائی کہ صاف ظاہر تھا اس قید سے آزادی کی کوئی تمنا نہیں ہے۔''

''رہنے دے، روٹی میں تندور سے لے آؤں گا۔ ابھی تو تُو نئی نویلی دُلہن ہے۔ میرے بجائے کسی اور سے پُرے خاندان کے مرد سے بیاہی جاتی تو سسرال والے دنوں منجی سے پیر نیچے نہ دھرنے دیتے اور تجھے ڈھیروں ناز اُٹھاتے۔''

اُس کے لہجے میں ایک حسرت سی تھی۔ شاید اپنے اس خاندان کا خیال آ گیا تھا جس کے ہونے کا احساس تو تھا لیکن ذہن میں کوئی شبیہہ، کوئی نشانی نہیں تھی کہ جس کی بنیاد پر وہ اپنے اصل کو کھوج سکتا۔

''ناز تو میں نے اتنے سال بہت اُٹھوائے ہیں۔ بائی جی کے کوٹھے پر کہاں ایسا کوئی کام کرنے دیا جاتا جس سے حُسن میں ذرا بھی فرق پڑے۔ وہ تو ہم لڑکیوں کو کبھی پھل بھی خود سے کاٹ کر نہیں کھانے دیتی تھی کہ کہیں غلطی سے اُنگلی پر کٹ لگ جائے اور اُنگلی بدنما نظر آنے لگے۔ لیکن سچ کہوں تو مجھے اُس عیش و آرام کی زندگی کے بجائے زندگی کا یہ روپ بہت خوب صورت لگتا ہے جس میں سبزی ترکاری کاٹتے ہوئے میری انگلیاں بھی زخمی ہوئی ہیں اور کلائیوں پر گرم توے اور پتیلے سے چرکے بھی لگے ہیں۔ میں ان چھوٹے چھوٹے زخموں کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے ان سے سج کر ایک مکمل عورت بن گئی ہوں جس سے بڑھ کر اس رُوئے زمین پر کوئی خوب صورت ہے اور نہ ہی خوش قسمت۔''

نہایت جذب سے بولتی وہ اپنے بیان میں بالکل سچی لگ رہی تھی۔ شاہد نے بے ساختہ ہی اس کے ان ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور واقعی سے جلنے اور کٹنے کے ان نشانوں کو چومنے لگا جو گھریلو کاموں کا عادی نہ ہونے کے باعث اس کے حسین ہاتھوں پر وجود میں آئے تھے۔

''ایسا نہ کرو شاہد!..... یہ زخم میرا فخر اور اعزاز ہیں اور انہیں دیکھ کر میں خوش ہوتی ہوں کہ میں بھی ایک وفادار عورت ہوں جو صرف اور صرف اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر روپ اپناتی ہے۔''

آنکھوں میں نمی لیے چاندنی نے اسے ٹوکا تو وہ جذباتی کیفیت سے باہر آیا۔ لیکن آنکھوں میں اس نمی کی تاب بھی موجود تھی جو چاندنی کے زخم دیکھ کر بے ساختہ ہی اُمڈ آئی تھی۔

''اچھا بس، اب زیادہ باتیں مت بنا۔ میں تندور سے روٹی لے کر آتا ہوں۔ تُو اتنی دیر میں سالن گرم کر اور دسترخوان لگا۔''

وہ اسے ہدایت کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔ چاندنی نے بھی کمرے کا دروازہ بند کر کے باورچی خانے کا رخ کیا۔ مختصر اسباب کے ساتھ صاف ستھرا باورچی خانہ دیکھ کر اس کے دل میں پھر خوشی کی لہر اُٹھی۔

رہائش کے ساتھ ساتھ بنیادی ضرورت کی اشیا بھی انہیں عمیر کی طرف سے فراہم کی گئی تھیں اور اس
گنتی کی ان چند اشیا کو بھی نہایت قرینے وسلیقے سے رکھا تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا معمولی گھر اُس کی
توجہ کے باعث ہر دم چمکتا رہتا تھا اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔

اس وقت بھی خوشی کے احساس سے لبریز اس نے بڑے مگن سے انداز میں سالن کی پتیلی چولہے پر
کر اس کے نیچے ہلکی آگ جلائی اور دسترخوان لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دسترخوان پر پلیٹیں، گلاس
پانی کا جگ رکھنے تک سالن گرم ہو چکا تھا۔ اُس نے اسے کٹورے میں نکالا۔ شاہد کی پسند پر آج اس
بھنڈی گوشت پکایا تھا لیکن کنفیوز تھی کہ جانے اچھا بنا ہے یا نہیں۔ البتہ یہ ضرور جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو، شاہد
کا پکایا ہوا کھانا ذوق وشوق سے ہی کھائے گا۔

اپنے اس یقین کے ساتھ سالن کا کٹورا ہاتھ میں لیے وہ کمرے میں پہنچی تو اتنی بُری طرح لرزی کہ
ہوا کٹورا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ ہاتھ میں چھرا لیے، دیوار سے ٹیک لگائے جو شخص اس کے سامنے
تھا، وہ اس کے لیے قطعی اجنبی نہیں تھا۔

''دلبر خان!.....تت.....تم..... یہاں؟'' خوف سے شل ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس نے استفسار کیا۔

''ہاں چاندنی بے بی!.....یہ میں ہی ہوں، دلبر خان۔ لیکن تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟
کیا جانتی نہیں ہو کہ دلبر خان، بائی جی کے کوٹھے سے اُڑی ہوئی کسی بھی چڑیا کو زیادہ دن آزادی سے
ہواؤں میں اُڑنے نہیں دیتا، اُس کے پَر کتر کر واپس پنجرے میں پہنچا دیتا ہے۔''

نہایت سفاک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دلبر خان نے طنزیہ لہجے میں اس سے کہا تو وہ اندر
کانپ کر رہ گئی۔ دلبر خان کی سفاکی سے اس سمیت کوٹھے پر موجود ہر لڑکی ہی واقف تھی۔

''میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے عزم کا اظہار کر دیا۔

''تمہارے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ جب دلبر خان تجھے لے جانے آیا ہے تو ساتھ لے کر ہی جائے
ویسے بھی تُو نے کوئی ایک جرم تو کیا نہیں ہے۔ صرف بھاگنے کی سزا تو پھر بھی ہلکی ہوتی ہے لیکن تُو نے بائی
اور چودھری صاحب کے خلاف پرچہ کٹوا ڈالا۔ بائی جی کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہونے والا وہ تیرا
سمجھتا ہے کہ اس جیسا کل کا لونڈا مقابلہ کر سکتا ہے؟..... بائی جی نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھی
پولیس والوں کے اپنی چوکھٹ چڑھنے سے پہلے ہی اپنی ضمانت کا بندوبست کر لیا تھا اس نے۔ منہ لٹکا کر
ہاتھ جانا پڑا اُن سالے وردی والوں کو۔''

دلبر خان کے لہجے میں سخت تحقیر تھی۔ چاندنی کو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ پولیس بائی جی کو گرفتار کر
میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ مقدمے کا اصل ملزم چودھری افتخار تو پہلے ہی منظر سے غائب تھا۔ بے بسی
شدید احساس کے ساتھ اس نے غیر اختیاری طور پر بیرونی راستے کی طرف نظر ڈالی۔ شاہد تندور سے
لینے گیا تھا اور اب تک اسے آ جانا چاہیے تھا لیکن اس کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

''شاہد کی راہ دیکھ رہی ہے تُو؟..... بے فکر رہ۔ اسے بھی میرے آدمی وہیں پہنچا دیں گے جہاں
جانا ہے۔ وہاں بلکہ قبر میں بھی دونوں لیلیٰ مجنوں ساتھ ہی رہنا۔''

سفاکی سے بولتے ہوئے اس نے چاندنی کی طرف قدم بڑھائے تو بے شک اندر سے اس کی حا
ابتر ہو گئی لیکن اس نے دلبر خان پر یہ کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''تم زبردستی مجھے یہاں سے کہیں نہیں لے جا سکتے۔ میں شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لوں گی۔''



''تو مچا شور۔ میں بھی دیکھتا ہوں، تیرے اندر کتنا دم ہے۔'' دلبر خان نے اسے جواب دیا۔

اس سے قبل کہ اس کے منہ سے کوئی آواز برآمد ہوتی، دلبر خان نے اس کے سر پر پہنچ کر اسے اپنی گرفت
لے لیا اور چھرے کی نوک چاندنی کی گردن سے لگا دی۔

''شور مچانے کی دھمکی دے رہی تھی نا.....اب مچا شور۔ نرخرہ ہی کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' اُس نے غرا کر
کہا۔

''چل اب آ گے..... باہر تجھے لے جانے کے لیے گاڑی کھڑی ہے۔''

بولنے کے ساتھ اس نے چاندنی کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی۔ گلے پر جمے تیز
چھرے کی موجودگی میں انکار کی تاب ہی کہاں رہ گئی تھی؟ پھر شاہد بھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ اگر وہ ان لوگوں
میں چلا گیا تھا تو وہ آزاد رہ کر کیا کرتی؟ اسے بھی اس کے پاس جانا تھا وہ کسی جواری کی طرح بے جان
سے باہر نکلی۔

دونوں جیسے ہی کمرے کے دروازے سے باہر نکلے، کوئی بہت زور سے دلبر خان سے ٹکرایا اور اسے اپنے
لڑکھڑاتا ہوا فرش پر جا گرا۔

دھکا چاندنی کو بھی لگا تھا اور وہ لڑکھڑا سی گئی تھی لیکن اس نے خود کو گرنے سے بچا لیا اور اس جانب دیکھنے
لگی جہاں دلبر خان اور نووارد آپس میں گتھم گتھا تھے۔

دلبر خان کا چھرا اس سے کافی فاصلے پر جا گرا تھا۔ وہ اپنے مقابل سے نمٹنے کی کوشش کرنے کے ساتھ
چھرے تک پہنچنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

چاندنی نے جھپٹ کر چھرا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خود ایک بار پھر محوِ تماشا ہو گئی۔

نووارد اُس کے لیے اجنبی تھا اور اسے اس کی چستی و پھرتی قابلِ داد محسوس ہو رہی تھی۔ سب سے بڑی
بات یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں کوئی خوف محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسی لیے بجائے موقع کا فائدہ اٹھا کر بھاگ
جانے کے، ان دونوں کے درمیان جاری مقابلہ دیکھ رہی تھی۔

نووارد بتدریج دلبر خان پر غالب آتا جا رہا تھا۔ اس وقت تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا جب دلبر خان کے
گھونسے کے جواب میں نووارد نے اس کے منہ کو اپنے تابڑ توڑ گھونسوں کی زد پر رکھ لیا اور نتیجے میں دلبر خان
منہ سے خون کے ساتھ ساتھ کئی دانت بھی باہر آ گئے۔

یہ وار اتنا زوردار تھا کہ دلبر خان چکرا کر رہ گیا اور نووارد نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اس کے دونوں بازو
کی طرف موڑ کر اس کی دونوں ہتھیلیاں ملا کر اس میں ہتھکڑی لگا دی۔

''اسے لے جا کر گاڑی میں ڈالو۔'' ہتھکڑی لگانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ مٹی جھاڑنے کے
انداز میں جھٹکے اور تحکمانہ انداز میں بولا تو چاندنی نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر اس کے مخاطب کو دیکھا۔ وہ پولیس
یونیفارم میں ملبوس دو افراد تھے جو نہ جانے کب اس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے اور اسے اندازہ نہیں ہو
سکا تھا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو بی بی!.....تمہارا شوہر تھانے میں ہے۔ اس پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا لیکن
اسے ایک ساتھی کی مداخلت پر وہ بال بال بچ گیا ہے۔ تم اس سے وہیں مل سکو گی۔''

یونیفارم میں ملبوس پولیس والے، دلبر خان کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے تو وہ شخص، جس کے بارے میں
چاندنی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی پولیس والا ہے، اس سے مخاطب ہوا۔

شاہد پر قاتلانہ حملے کا سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''شاہد ٹھیک تو ہے نا؟..... اسے کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے بی بی! تم ہمارے ساتھ تھانے چلو گی تو خود دیکھ لینا۔'' اس نے اکھڑ سے انداز میں جواب دیا تو ناچار چاندنی کو بھی باہر کی طرف قدم بڑھانے پڑے۔

باہر ایک پولیس وین موجود تھی، وہ اس میں سوار ہوگئی۔ وین میں سوار ہوتے ہوئے اس نے دیکھا اردگرد کے گھروں سے کئی افراد باہر جھانک رہے تھے۔

رات کے وقت ہونے والے ہنگامے نے کئی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور یقیناً انہیں تجسس تھا کہ چند روز قبل ہی اس گھر میں آ کر بسنے والی عورت کو پولیس وین میں کیوں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن پولیس کے ڈر کی وجہ سے وہ لوگ دُور رہنے پر مجبور تھے۔

چاندنی نے اس منظر کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ عزت کی زندگی چند دن سے زیادہ نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کوٹھے پر مجبوری اسے تماش بینوں کے سامنے نچاتی تھی اور یہاں بھی وہ لوگوں کی نظروں میں تماشا بنی تھی۔ کھوجتی نظروں سے نگاہیں چرا کر اس نے اپنا دھیان پولیس وین کے اندر کی طرف موڑ لیا۔ وہاں فرنٹ پر دلبر خان بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر وہ آج اس کے گھر میں قدم نہیں رکھتا تو یہ تماشا نہیں ہوتا۔

''تُو کیا سمجھتی ہے، ان پولیس والوں کے سہارے بچ نکلے گی اور میں حوالات میں پڑا رہ جاؤں گا؟.. تُو بائی جی کی پہنچ کو جانتی نہیں ہے۔ وہ یوں چٹکی بجاتے مجھے مکھن میں سے بال کی طرح نکلوا لے گی اور تُو ہر بار پھر اسی کوٹھے پر ہوگی جہاں بائی جی اپنے ہاتھوں سے تیری کھال اُدھیڑے گی۔'' دلبر خان کی اس سے نظر تو دھمکیاں دینے لگا۔

''چپ کر کے بیٹھ اوئے حرام کے تخم!..... حوالات چل کر ہم تجھے بتا دیں گے کہ تُو کتنا تیس مار خاں ہے۔ تجھ جیسے سینکڑوں کی بدمعاشی ہم نے دو منٹ میں نکال کر ناک میں رسّی ڈال دی ہے۔ تُو بھی پالتو کتوں کی طرح ہمارے تلوے چاٹے گا۔''

اپنے سامنے چاندنی کو دھمکیاں دینا پولیس والوں کو پسند نہیں آیا تھا اس لیے ان میں سے ایک نے دلبر خان کو زوردار لات رسید کرتے ہوئے جوابی دھمکی دی۔

اس لات اور دھمکی کے جواب میں دلبر خان زبان سے کچھ نہ بولا، بس کینہ توز نظروں سے گھور کر رہ گیا۔ منہ سے نکلنے والے خون نے اسے پہلے ہی خاصا بھیانک بنا دیا تھا۔ آنکھوں کی سرخی اور نفرت نے اس کا بھیانک پن میں اضافہ کر دیا تھا۔ چاندنی کا دل اسے دیکھ کر متلا سا گیا چنانچہ وہ نگاہوں کا رخ پھیر کر باہر کی جانب دیکھنے لگی۔

پولیس وین مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی تھانے جا پہنچی۔ تھانے پہنچ کر دلبر خان کو تو پولیس والے کہیں کر جانے کس سمت لے گئے جبکہ اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کمرے میں ایک میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں اور ان میں سے ایک کرسی پر شاہد بیٹھا ہوا تھا۔ شاہد کو اپنے سامنے پا کر وہ جذباتی ہوگئی۔ ممکن تھا کہ اپنی اس جذباتیت میں وہ شاہد کے گلے ہی لگ جاتی



مگر اپنے سامنے موجود پولیس والے کی وجہ سے خود پر قابو کیے رہی اور اندرونی کیفیت کا اظہار فقط ان دو الفاظ سے ہوا جو بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں سے رخساروں پر لڑھک گئے تھے۔ شاہد نے کھڑے ہو کر حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

''تم دونوں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔ صاحب بعد میں خود تم سے بات کریں گے۔'' چاندنی کے ساتھ وہاں آنے والے سپاہی نے قدرے نرم لہجے میں کہا اور خود پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے وہ دروازے کو باہر سے بند کر گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا شاہد؟''

سپاہی کے جانے کے بعد چاندنی اس سے مخاطب ہوئی اور یوں اس کا جائزہ لینے لگی جیسے کسی نادیدہ زخم کو ڈھونڈ نکالے گی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں..... تُو میری فکر نہ کر اور یہاں آ کر آرام سے بیٹھ۔'' شاہد اس کا ہاتھ تھام کر اسے کرسی تک لے گیا اور دونوں بازو تھام کر اسے ایک کرسی پر بٹھانے کے بعد خود بھی اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے پتہ چلا کہ تجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے تو میں ڈر گئی تھی۔'' اس نے نہایت معصومیت سے شاہد کو بتایا۔

''ہاں، کم بخت پتہ نہیں کب سے تاک میں کھڑا تھا۔ میں گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ تک ہی پہنچا ہوں گا کہ مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔ دُور سے ایک آدمی چیخ کر ہوشیار نہیں کر دیتا تو میں مارا گیا تھا۔ اس کے چیخنے سے حملہ کرنے والا بھی ذرا گھبرا گیا اور اس کا نشانہ چُوک گیا۔ بعد میں اسی آدمی نے اس خبیث کو قابو میں کیا۔ پھر اس نے پولیس کی گاڑی منگوا کر اسے اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا۔ میں تیرے لیے فکرمند تھا اور گھر واپس آنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے تسلی دی کہ میری حفاظت کا بھی پورا بندوبست ہے۔ اس کے بعد سے میں یہاں بیٹھا تیری راہ تک رہا تھا اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ اللہ کے فضل سے تُو بالکل ٹھیک ہے۔''

شاہد نے اسے خود پر گزرنے والی بپتا سنائی اور اس بات پر شکرگزاری کا اظہار کیا کہ وہ صحیح سلامت ہے۔ جواباً چاندنی نے اسے وہ سب کچھ کہہ سنایا جو اس پر گزری تھی۔

''عجیب بات ہے۔ آخر اچانک پولیس والے ہماری مدد کے لیے کیسے پہنچ گئے؟ ورنہ ان لوگوں کے بارے میں تو یہی مشہور ہے کہ یہ واردات کے بھی کئی گھنٹوں بعد جائے وقوعہ پر پہنچتے ہیں اور ہم نے تو انہیں اپنی مدد کے لیے بلایا بھی نہیں تھا۔''

چاندنی کی زبانی سب کچھ جان کر شاہد نے حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن ظاہر ہے چاندنی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں بیٹھے اپنے اپنے اندازے لگاتے رہے اور پھر اس کام سے بھی بور ہو گئے۔

چائے فراہم کرنے کے لیے آنے والے ایک سپاہی سے انہوں نے اپنے گھر واپس جانے کی بابت سوال بھی کیا لیکن اس نے کوئی واضح جواب دیے بغیر انہیں انتظار کرنے کا مشورہ دیا اور خود باہر نکل گیا۔

دونوں نے اب تک رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن جن حالات سے وہ دوچار ہوئے تھے، اس میں بھوک مر گئی تھی۔ مگر اب چائے کے ساتھ بسکٹ دیکھ کر دوبارہ چمک اُٹھی۔ ایک ایک کر کے دونوں نے سارے بسکٹ چٹ کر ڈالے۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد بھی انہیں کوئی ایک گھنٹہ انتظار کی سُولی پر لٹکنا پڑا پھر کہیں جا کر کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کھلے دروازے سے عمیر آفندی کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ دونوں ہی اپنی جگہ سے اُٹھ

کھڑے ہوئے۔ اپنا یہ محسن ان کے لیے بے حد لائقِ احترام تھا۔ کھڑے ہو کر استقبال کرنے کے ساتھ دونوں نے یک زبان اسے سلام بھی کیا۔

''وعلیکم السلام!..... بیٹھو۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے انہیں واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو اتنی دیر یہاں انتظار کرنا پڑا لیکن میں تم دونوں سے ضروری سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے اپنے پہنچنے تک تمہیں یہاں رُکوائے رکھا۔'' بیٹھنے کے بعد اس نے شاہد سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کوئی بات نہیں سر!..... ہمیں کون سا واپس جا کر کوئی پہاڑ کھودنے تھے۔ ٹائم تو آپ کا قیمتی ہے اور آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ہم سے ملنے یہاں آئے ہیں۔'' یہ جان کر کہ انہیں اب تک عمیر کے انتظار میں رکنا گیا تھا، ساری کوفت دور ہو گئی تھی اس لیے شاہد نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

''میں اس لیے تم سے ملنے آیا ہوں کہ تم دونوں کو تسلی دے سکوں۔ خود پر ہونے والے حملے کے بعد یقیناً تم دونوں گھبرائے ہوئے ہو گے۔ لیکن اطمینان رکھو..... میرے آدمی مسلسل تمہارے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں اور کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہو گا کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کو آٹا کی طرح منہ کی کھانی پڑے گی۔''

''اوہ..... تو آپ کے آدمی ہماری نگرانی کر رہے تھے؟''

''ہاں، مجھے پہلے سے ہی اس بات کا خطرہ تھا کہ تم دونوں کو اغوا یا قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی اس لیے میں نے اپنے آدمیوں کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ انہی لوگوں نے گڑبڑ ہوتی دیکھ کر خود ہاتھ پاؤں چلانے کے ساتھ بعد میں پولیس کو بھی بلا لیا تھا اور اس وقت دلبر خان اور اس کے ساتھیوں کی پولیس والوں کے ہاتھوں ٹھیک ٹھاک دُھلائی ہو چکی ہے۔ خاص طور پر دلبر خان کی تو ساری اکڑ نکال کر رکھ دی ہے پولیس والوں نے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ ہائی جی نے چودھری کے منشی اللہ رکھا سے ساز باز کرنے کے بعد یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہد کو قتل کر دیا جائے اور چاندنی کو اغوا کر کے واپس کوٹھے پر پہنچا دیا جائے۔ اس طرح سارا معاملہ ہی دب جاتا۔ تمہارے بعد کون ہوتا جو تمہاری بہن کے قتل کے مقدمے کی پیروی کرتا اور بے بس چاندنی کیسے گواہی دینے عدالت پہنچتی۔ یوں سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ ویسے بھی بائی جی نے اور چالیں بھی چل رکھی ہیں۔ اس نے تمہارے خلاف چاندنی کے اغوا کی ایف آئی آر کٹوانے کے ساتھ ساتھ یہ رپورٹ بھی لکھوائی ہے کہ تم کوٹھے سے لاکھوں کی مالیت کے زیورات بھی چوری کر کے فرار ہوئے ہو۔ ممکن تھا کہ اس جرم میں تمہیں اب تک گرفتار بھی کیا جا چکا ہوتا لیکن میں نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر کے فی الحال اس چال کا توڑ کر لیا ہے۔ اب منتظر ہوں کہ چودھری کے پاکستان واپس آنے کے بعد حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔''

عمیر نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جنہیں سن کر دونوں کے چہرے لحہ بہ لحہ رنگ بدلتے رہے۔

''بائی جی جھوٹی مکار ہے۔ ہم نے وہاں سے کچھ چوری نہیں کیا ہے۔ اگر کچھ لے بھی آتے تو چوری کیسی تھی؟ لاکھوں کمائے ہیں بائی جی نے میرے ذریعے..... اس میں سے اگر میں اپنا حصہ لینا چاہتی تو لے سکتی تھی لیکن میں لعنت بھیجتی ہوں اس حرام کے مال پر۔ میں اپنے شاہد کے ساتھ عزت کی رُوکھی روٹی کھا کر بھی خوش ہوں۔'' چاندنی نے جذباتی انداز میں لب کشائی کی۔



''میں اس حقیقت کو سمجھتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں کو دباؤ میں لے کر ایف آئی آر واپس لینے پر مجبور کرنے کے لیے وہ لوگ ہر چال چل سکتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ ان چالوں کے مقابلے میں ٹھہر پاؤ گے یا نہیں۔ لیکن میں یہ بتا دوں کہ اس کیس میں جان تب تک ہی رہے گی، جب تک تم دونوں اکٹھے رہو گے۔ تم پیچھے ہٹ گئے تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میرے ہاتھ پیر ویسے ہی اپنی سیٹ کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں اور میں کھل کر تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اب بھی میرے اشارے پر پولیس نے دلبر خان پر تشدد کر کے یہ اُگلوا تو لیا ہے کہ تم دونوں پر حملہ کرنے میں چودھری کے منشی کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ عدالت کے سامنے اپنے اس بیان سے مُکر جائے گا اور ہم اصل مجرم پر گرفت نہیں کر سکیں گے۔ ان حالات میں چاندنی کی گواہی کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی کیونکہ ہمارے پاس یہ واحد گواہ ہے۔'' عمیر نے کھل کر ان پر صورتِ حال واضح کی۔

''آپ فکر نہ کریں سر! ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ اگر ہم کمزور ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چودھری اور بائی جی جیسے لوگ ہمیں کچل کر ہی رکھ دیں۔ ہم انہیں بتائیں گے کہ چیونٹی میں بھی ہاتھی کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔''

چاندنی نے پُرعزم لہجے میں کہا جس کا شاہد سر کی اثباتی جنبش سے ساتھ دے رہا تھا۔ عمیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے دل کو یہ یقین ہونے لگا کہ دیر سے سہی، چودھری جیسا درندہ بالآخر پنجرے میں آ ہی جائے گا۔

⊛----✪----⊛

''مجھے بہت افسوس ہے عائشہ! میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہم کمال کے ساتھ یہ زیادتی کرنے پر مجبور ہیں۔'' شہریار نے سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے سامنے کھڑی عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

عائشہ نے گردن ہلاتے ہوئے اس بات کا اشارہ دیا کہ واقعی وہ اس کی مجبوری سمجھتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے ایک بیوی کی حیثیت سے وہ کمال کے لیے پریشان اور دُکھی تھی۔ اس کے لیے یہ بات تکلیف دہ تھی کہ وہ نشے میں دُھت اپنی ذات اور حالات سے بے خبر کمال کو یوں بستر پر چھوڑ کر ان کے ساتھ باہر چلی جائے کہ کمال کے ہاتھ پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوں اور منہ میں اس طرح کپڑا ٹھنسا ہو کہ وہ کچھ بول بھی نہ سکے۔

شہریار نے اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کے وقت ایمبولینس میں یہاں سے نکلیں گے۔ اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے یہاں سے نکلنے کے لیے عبدالرحمٰن سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا اور اس فون نمبر پر رابطہ کر لیا تھا جو عبدالرحمٰن نے اسے دیا تھا۔

جس ایمبولینس میں انہیں یہاں سے نکلنا تھا، وہ عبدالرحمٰن کا آدمی ہی مقررہ وقت پر ان کے لیے لے کر آتا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ عائشہ چوکیدار کو یہ بتائے گی کہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے کمال کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اس لیے وہ اسے ایمبولینس میں ہسپتال لے کر جا رہی ہے۔ وہ تین تھے اور ایک ہی ایمبولینس میں ان کے نکلنے کی راہ یہی تھی کہ ان میں سے ایک مریض کا روپ دھارے۔ اس روپ کے لیے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس طرح وہ آرام سے سفر بھی کر سکتے تھے۔ سلّو کو ان کے اسٹریچر کے نیچے چھپ کر سفر کرنا تھا جبکہ شہریار ڈرائیور کا مددگار بن جاتا۔ عائشہ کو وہ محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد صبح واپس بھجوا دیتے۔ لیکن یہ

سب کرنے کے لیے انہیں کمال کو بے بس کرنا پڑا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ اسے اعتماد میں لے کر اتنا قدم اٹھایا جا سکتا اور اس کا منظر پر نہ ہونا بھی ضروری تھا۔ وہ لوگ اگر اسے یونہی گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔

رات کے وقت بیوی کو گھر میں نہ پا کر وہ ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا اور ایسی صورت میں ظاہر ہے چوکیدار پولیس کو مطلع کرتا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کمال کو بے بس کر کے جاتے تاکہ کسی وجہ جاگ جانے کے باوجود بھی وہ کچھ نہ کر سکتا۔ بعد میں عائشہ خود اپنی ذہانت سے اسے سنبھال لیتی۔ بالفرض کسی کے سامنے کہتا بھی کہ اسے اس کی بیوی نے رسیوں سے باندھ کر گھر میں اکیلا چھوڑ دیا تھا تو کون اس کی بات کا یقین کرتا۔ ایک نشے باز کے لیے تو آسانی سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ نشے میں مست ہو کر اول فول بک رہا ہے۔

''میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ تم لوگ کھانا کھا لو پھر تمہارا آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔'' کمال سے نظریں کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے عائشہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں واقعی بہت شرمندہ ہوں عائشہ! اور آپ کو اتنی تکلیف دینے پر دل کی گہرائیوں سے معذرت بھی۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارا ساتھ دینے سے انکار بھی کر سکتی ہیں۔ اللہ ہمارے لیے کوئی اور راہ نکال دے گا۔'' اس کا موڈ دیکھ کر شہریار نے نہایت رسان سے اس سے کہا۔

''اب ان ساری باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگرچہ میں نہیں جانتی تھی کہ تم لوگ اپنے مسئلے کا حل نکالو گے لیکن میں نے وعدہ کیا ہے اس لیے میں اب عین موقع پر پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دیا جائے۔ کیونکہ موجودہ پلان پر عمل کرنے سے انکار کا مطلب ہوگا کہ میں مزید لوگوں کو اپنے گھر میں ٹھہراؤں اور یہ زیادہ مشکل ہوگا۔ کمال اور اردگرد والے آخر کب تک بے خبر رہیں گے کہ میرے گھر میں تین عدد مفرور افراد رہ رہے ہیں۔ بعد کی مشکل اور تکلیف سے بہتر ہے کہ میں موجودہ تکلیف سہہ لوں۔'' نہایت صاف گوئی سے کہتی ہوئی عائشہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہریار کو بھی اس کی پیروی کرنا پڑی۔

کھانا ڈائننگ ٹیبل کے بجائے اسی کمرے میں فرش پر دسترخوان بچھا کر لگایا گیا تھا جس میں وہ تینوں رہائش پذیر تھے۔

یہ پہلے ہی سے طے تھا کہ وہ تینوں اپنی جملہ ضروریات اسی کمرے میں محدود رہ کر پوری کریں گے تاکہ یہاں سے روانگی کے وقت اپنی یہاں موجودگی کی نشانیاں مٹانا دشوار نہ ہو۔

''تم لوگ جلدی سے کھانا کھا لو۔ میں اپنے دوسرے کام نمٹاتی ہوں۔'' عائشہ بولتی ہوئی واپس پلٹ کر کچن کی طرف جانے لگی۔

''آپ بھی کھانا کھا لیتیں۔ ہم جہاں ہوں گے، وہاں معلوم نہیں آپ کی کوئی خاطر کر بھی سکیں گے نہیں۔'' شہریار نے اسے ٹوکا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ مختصر جواب دے کر وہاں سے ہٹ گئی۔ شہریار بھی دل پر بوجھ سا لیے کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر فرحان اور سلّو اس کے منتظر ہی تھے۔ اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔

عائشہ نے وقت کی کمی کے باوجود کھانے میں اہتمام تھا گیا۔ فرمائشی دال چاول کے علاوہ اس نے



گوشت بھی بنایا تھا۔ ساتھ ہی سلاد اور ہری مرچوں کی چٹنی بھی تھی۔ کھانا خوشبودار، خوش رنگ اور خوش ذائقہ تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر فرحان اور شہریار رغبت سے نہ کھا سکے۔

شہریار کے دل پر عائشہ کی طرف سے بوجھ تھا تو ڈاکٹر فرحان اپنی داڑھی کے لیے غم زدہ تھے جسے حلیے کی تبدیلی کے لیے منڈوانا پڑا تھا۔ حلیے ان تینوں کے ہی تبدیل ہو چکے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باتھ روم میں موجود میک اپ کے سامان کے ساتھ ساتھ عائشہ کے پاس موجود اس کے ذاتی میک اپ کا بھی استعمال کیا تھا اور خود کو اس حد تک بدلنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ دور سے دیکھ کر کوئی انہیں شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ وقت کی قلت نہ ہوتی تو میک اپ کا معیار اور بھی اچھا ہو سکتا تھا کہ شہریار اور سلّو نے اس فن کی تربیت حاصل کی تھی۔

بہرحال، اب بھی میک اپ ایسا تو تھا کہ کسی عام شخص کے لیے اسے پکڑنا آسان ثابت نہیں ہوتا۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ بے دلی سے کھانا ختم کیا گیا۔ ڈاکٹر فرحان اور اس نے تو بہت ہی کم کھایا تھا۔ سلّو نے پھر بھی کھانے کے ساتھ کچھ انصاف کیا، پر بہت زیادہ اس نے بھی نہیں کھایا کہ بھرا ہوا معدہ تیز حرکت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب تو ایک طرف بیٹھ گئے لیکن ان دونوں کو باقی ماندہ کام نمٹانے پڑے۔ سلّو نے دسترخوان سمیٹ کر خالی برتن اور بچا ہوا کھانا باورچی خانے میں پہنچانے کی ذمے داری سنبھالی اور تیزی سے کمرے میں موجود اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

سامان سمیٹنے کے بعد اس نے باریک بینی سے کمرے کا جائزہ بھی لیا کہ کہیں ان کی کوئی نشانی یہاں نہ رہ جائے۔ برتن رکھ کر آنے کے بعد شہریار بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ انہوں نے ممکنہ طور پر ہر اس جگہ فنگر پرنٹس صاف کیے جہاں ان کے خیال کے مطابق ان تینوں کے ہاتھ زیادہ لگے تھے۔

وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو عائشہ ان کے لیے چائے لے آئی۔ اس کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی تھی۔ البتہ اس نے چائے ان کے ساتھ ہی پی اور فوراً ہی برتن لے جا کر دھو ڈالے۔ اس سلسلے میں شہریار نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ کوئی بھی استعمال شدہ برتن اَن دُھلا نہیں رہنا چاہیے۔

ان سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد انہیں ایمبولینس کے آنے کا انتظار تھا۔ آخر کار اس طرف سے اشارہ مل گیا۔

عائشہ نے انٹرکام کی مدد سے چوکیدار کو مطلع کر دیا کہ کمال کی طبیعت خراب ہے اور اس کی کال پر وہاں ایمبولینس آ رہی ہے۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں یہ سہولت تھی کہ ہر مکین انٹرکام پر چوکیدار سے رابطہ کر سکتا تھا۔

ایمبولینس آئی تو چوکیدار نے بغیر کسی رکاوٹ کے اسے عائشہ کے گھر تک آنے دیا۔ اس موقع پر عائشہ کا اصل کام یہ تھا کہ وہ چوکیدار کو اس طرح مصروف کر دے کہ اس کی توجہ ایمبولینس کی طرف نہ رہے۔ اس نے یہ کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ وہ چوکیدار کو اپنے ساتھ لے کر گھر کی بغلی جانب چلی گئی اور اسے وہاں ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دکھا کر بتایا کہ نشے کی حالت میں کمال نے یہ شیشہ توڑ دیا ہے۔ اندر گرل لگے کے باوجود اس نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے ہسپتال میں قیام کے دوران کوئی اس ٹوٹے ہوئے شیشے کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

''آپ چنتا نہیں کرو بی بی صاحب! اس اسکیم کے کسی گھر میں کبھی چوری چکاری نہیں ہوئی۔'' چوکیدار نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی، تم خیال رکھنا۔ چوری چکاری ہونا ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھار بچے شرارت میں گھر
کوئی اُلٹی سیدھی چیز بھی پھینک دیتے ہیں۔'' عائشہ نے اسے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا۔ لیکن ابھی تو تم اپنے پتی کو لے کر ہسپتال جاؤ۔'' چوکیدار نے
قدرے بیزاری سے جواب دیا تو عائشہ نے واپسی کے لیے قدم موڑ لئے۔ اسے اندازہ تھا کہ اس دوران
تینوں ایمبولینس میں سوار ہو چکے ہوں گے۔''

''عجیب عورت ہے، اپنے پتی کی چنتا کرنے کے بجائے گھر کی چنتا میں پڑی ہے۔'' مڑتے ہوئے
نے پیچھے سے چوکیدار کی بڑبڑاہٹ سنی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے سامنے پہنچ گئی۔

اس ہاؤسنگ اسکیم میں رہنے والے افراد زیادہ تر اپنے گھروں تک محدود رہنے کے عادی تھے اور
بھی رات کا وقت اس لیے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

چوکیدار کے پہنچنے تک وہ ایمبولینس میں سوار ہو چکی تھی۔ بدلے ہوئے حلیے میں شہریار ڈرائیور
والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ان تینوں نے اپنے حلیے کے ساتھ لباس بھی تبدیل کر لیے تھے اور یہ لباس ظاہر
کے تھے۔ خود ان کے کپڑوں کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی چنانچہ انہیں جلا کر ان کی راکھ فلیش میں
گئی تھی۔ ایمبولینس کی آمد کے وقت چوکیدار نے مین گیٹ کھولا تھا تو دوبارہ بند نہیں کیا تھا چنانچہ
سے ایمبولینس آندھی طوفان کی طرح باہر نکل گئی اور چوکیدار کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ ایمبولینس
کتنے لوگ سوار ہیں۔

یہاں سے کامیابی سے نکلنے کے بعد ایک مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا تو باہر کی فکر لگ گئی۔ آج کل
ہائی الرٹ تھا اور پولیس مختلف مقامات پر گشت کرتی پھر رہی تھی مگر ایمبولینس کا ہوٹر سن کر کسی نے انہیں
روکا۔ لیکن کوئی سر پھرا روک بھی سکتا تھا اس لیے ڈرائیور نے کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد سڑک
آبادی کا رُخ کر لیا۔

آبادی کے درمیان سے ایمبولینس نکالتے ہوئے اس نے ہوٹر بند کر دیا تھا۔ وہ اس شہر کا رہائشی
شہر کی صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کا گشت سڑکوں تک ہی محدود ہے
زیادہ توجہ شہر سے نکاسی کے راستوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ گلیوں محلوں سے گزرتی ہوئی ایمبولینس
سکون سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔

یہ وسیع رقبے پر واقع ایک سنگل اسٹوری عمارت تھی جس میں کھلا حصہ بہت زیادہ تھا اور ایک
مصنوعات بنانے والی کمپنی کے لوگو والی چار پانچ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

احاطے میں موجود عمارت کے دروازے کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ دروازہ
تھا۔ ایمبولینس کو رُکتے دیکھ کر دو افراد لپک کر قریب آئے۔ ان میں سے ایک نے پچھلا حصہ کھول کر اسٹریچر
لیٹے ڈاکٹر صاحب کو سہارا دے کر باہر نکلنے میں مدد دی۔ ان کے پیچھے عائشہ بھی اُتر آئی اور پھر سلّو بھی
کو ہٹا کر اُس کے نیچے سے نکل آیا۔

دوسرا آدمی شہریار کی طرف متوجہ تھا جو اپنے قدموں میں رکھا وہ بیگ لے کر نیچے اُترا تھا جس میں
کے ضروری سامان کے علاوہ اسلحہ بھی موجود تھا۔ راستے میں اگر کہیں پولیس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو
اسلحے کا بے دریغ استعمال کرنے سے ہرگز بھی گریز نہیں کرتا کہ اب تو مار دو یا مر جاؤ والی صورتِ حال
تصادم سے بچنے کی اپنی سی کوشش ضرور کر رہے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر مقابلہ کرنے کے لیے بھی



تیار تھے۔

''ہمارے ساتھ موجود خاتون کو کسی آرام دہ جگہ ٹھہرا دو اور صبح ہونے کے بعد انہیں ان کی مرضی کی جگہ پر
دینا۔ یہ خاتون ہماری ساتھی نہیں ہیں بس انسانیت کے ناتے ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی ہیں۔ اس
پورا خیال رکھنا کہ انہیں کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔''

اس شخص کے مصافحے کے لیے بڑھے ہاتھ کو تھام کر اس نے سب سے پہلے عائشہ کے سلسلے میں ہدایت
اس شخص پر وہ فوراً ہی کسی کو آواز دینے لگا۔

''جی سوریا بھائی!''

پکارا جانے والا فوراً خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''دیدی کو اندر لے جا کر عزت سے ٹھہراؤ۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر ان لوگوں کی طرف
متوجہ ہو گیا۔

''عبدل بھائی نے دو دن پہلے ہی اپنے کو فون کر کے بولا تھا کہ اگر آپ لوگ رابطہ کرو تو آپ سے پورا
تعاون کرنا ہے۔ آپ نے جو بولا، وہ ہم نے کر دیا۔ اب آگے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟''

ان لوگوں کو اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے جاتے ہوئے سوریا نے بے تکلفی سے بتاتے ہوئے فوراً ہی
آگے کا پروگرام بھی پوچھ ڈالا۔

''ہمیں اس شہر سے باہر نکلنا ہے۔'' شہریار نے بتایا۔

''تو نکل جاؤ..... کیا پرابلم ہے؟''

''پرابلم یہ ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کے لیے پورے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں
ہے کہ پولیس ہمیں یہاں سے آسانی سے نکلنے دے۔''

اب وہ لوگ ایک کمرے میں پہنچ چکے تھے جو ایک معمولی دفتر کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ اپنے میزبان
کے ساتھ ان تینوں نے بھی وہاں پڑی لکڑی کی کرسیاں سنبھال لیں۔ شہریار جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کا پایہ ذرا
ہل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ پوری طرح متوازن نہیں تھی۔

''بہت زبردست۔'' اس کے انکشاف پر سوریا نے پہلے غور سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر داد دینے
لگا۔ ''تم لوگوں نے تو خوب بھیس بدلا ہے۔ میں اتنی پاس سے بھی نہیں پہچان سکا کہ تم وہی لوگ ہو۔ ایسے
ہر دیوں کے لیے نکلنا کیا مشکل ہے؟ تم تو مزے سے بس یا ٹرین میں بھی بیٹھ کر نکل سکتے ہو۔''

''نہیں، یہ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں تلاش کرنے والے لوگ بھی کم شاطر نہیں ہیں۔ حلیے کی تبدیلی
کے باوجود بھی ان ذرائع سے سفر کرنے پر ہمارے پکڑ لیے جانے کے چانسز ہیں۔ کیونکہ ان کا اندازہ بھی یہی
ہو گا کہ ہم ایسے کسی ذریعے سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے انہوں نے بس اڈوں اور ریلوے اسٹیشنز
پر بھی کروں آدمی لگائے ہوئے ہوں گے اور یہ وہ آدمی ہوں گے جن کی تیز نگاہیں دور سے بھی اصل اور میک
اپ زدہ چہرے میں فرق کرنے کی اہل ہوں گی۔''

''اوہو، یہ تو بڑا گڑبڑ گھوٹالا پرابلم ہے۔ آپ لوگوں کے ذہن میں چھپ کر نکلنے کی کوئی ترکیب موجود
ہے کیا؟'' تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اُلٹا انہی سے تدبیر پوچھی۔

''میں نے سنا ہے کہ بھائی جی کا مختلف سامان، مختلف ذرائع سے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ اگر تم اس
سامان کے ساتھ ہی ہمارے یہاں سے نکلنے کا انتظام کر دو تو یہ بہت اچھا رہے گا۔'' اس نے اپنے ذہن میں

موجود تجویز پیش کی۔

''سامان تو واقعی آتا جاتا ہے۔ یہ ڈیری فارم بھی بھائی جی کی ہی ملکیت ہے اور اتفاق سے آج ایک لڑکا مال لے کر یہاں سے ممبئی جانے والا بھی ہے۔ لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس سے جانے پر تم پکڑے نہیں جاؤ گے؟ عام حالات میں تو خیر کسی کی ہمت نہیں ہے کہ ہماری گاڑیوں کی تلاشی لے سکے لیکن انٹیلی جنس والوں کی موجودگی میں پولیس والے بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور انہیں وہی کرنا پڑتا ہے جو اوپر سے حکم ملتا ہے۔ تم پکڑے گئے تو تمہارے ساتھ جو برا ہوگا سو ہوگا، بھائی جی کی بھی بدنامی ہوگی۔'' وہ ذرا جھجک کا شکار تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہو؟'' شہریار نے تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔ اس کے ساتھ خاموش بیٹھے سلّو اور ڈاکٹر صاحب کے چہروں پر بھی تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

''نہ نہ، میں نے ایسا نہیں کہا۔ لیکن ایک بار اپن کو عبدل بھائی سے بات کرنی پڑے گی۔ تم لوگ یہاں بیٹھو۔ اپن بات کر کے آتا ہے۔''

وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے نکلتے ہی ایک ملازم مشروبات سے بھری ہوئی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔ ٹرالی میں انواع و اقسام کی شرابوں کے ساتھ ان کے جملہ لوازمات بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ سوفٹ ڈرنکس بھی تھے لیکن ان میں سے کسی کو کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ سوریا کے رویے سے لگنے لگا تھا کہ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کرنے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر بند گلی میں آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی۔

اس اعصابی تناؤ کے ساتھ لذتِ کام و دہن میں مصروف ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ تو عائشہ کا بہت اصرار سے تیار کردہ ڈنر بھی رغبت سے نہیں کھا سکے تھے، ان ریڈی میڈ مشروبات میں کیا دلچسپی لیتے؟..... ان کا ذہن یہ فیصلہ کرنے میں ضرور مصروف تھا کہ یہاں سے انکار کے بعد ان کے لیے کون سا راستہ باقی رہ جاتا تھا۔ چند منٹوں کا انتظار ہی ان پر بہت بھاری گزرا اور جب سوریا واپس لوٹ کر آیا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔

''مبارک ہو، عبدل بھائی نے ہر حال میں تمہارا ساتھ دینے کا آرڈر دیا ہے۔'' سوریا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حکم کو سن کر خوش نہیں ہے لیکن اوپر سے ملنے والے حکم کو ٹالنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تو تم مجھے وہ ٹرک دکھا دو جسے مال لے کر ممبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میں اسے دیکھ کر فیصلہ کرلوں گا کہ اس میں ہماری گنجائش کیسے بن سکتی ہے۔''

اس کے تاثرات کی پروا کیے بغیر وہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ سلّو نے بھی اس کی پیروی کی۔

''ہم دونوں باہر جا کر معاملات نمٹاتے ہیں، آپ یہیں آرام کریں۔'' اس نے ڈاکٹر فرحان سے کہا اور خود سلّو کو ساتھ لے کر سوریا کی راہنمائی میں باہر نکل گیا۔

احاطے میں روشنی تھی اور کچھ افراد دودھ کے پیکٹوں کے کارٹن اندر سے اٹھا کر باہر لا کر رکھتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کارٹنز کو یقیناً ان ٹرکوں میں لوڈ کیا جانا تھا جن پر ایک مشہور کمپنی کا لوگو نظر آ رہا تھا۔

''اس کمپنی کے مالک بھائی جی ہیں اور یہاں سے دودھ، مکھن اور گھی ممبئی اور دہلی سمیت دیش کے بڑے شہر میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ ڈیری پروڈکٹس بنانے والی کوئی دوسری لوکل کمپنی اپنے بھائی جی کی کمپنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک دم اے ون کوالٹی کا مال بنتا ہے ادھر۔''

سوریا نے نہایت فخر سے اسے بتایا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی جی کس طرح کے جرائم پیشہ لوگ اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے سائیڈ میں ہر طرح کے کاروبار بھی کرتے



ہیں اور بڑی ایمانداری سے کرتے ہیں کہ اصل کمائی تو انہیں کہیں اور سے ہو جاتی ہے اور ایسے کاروبار سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے بے ایمانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

''یہ ٹرک مال لے کر ممبئی جائے گا۔'' ایک بڑے ٹرک کے قریب پہنچ کر سوریا نے اسے آگاہ کیا۔ اس میں لوڈنگ کا کام ابھی شروع ہی ہوا تھا اور مزدور پیک شدہ کارٹنز ایک ترتیب سے رکھتے جا رہے تھے۔ اس کا پچھلا حصہ بالکل بند تھا اور اس میں کولنگ سسٹم بھی موجود تھا۔ شہریار کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک خیال تھا۔ اس نے فوری طور پر سوریا سے بات کی تو اس نے لوڈنگ کرتے مزدوروں کو روک دیا۔

''یہ عام مزدور ہیں۔ آپ جو چاہ رہے ہیں، اس کے لیے مجھے اپنے خاص آدمیوں سے کام کروانا پڑے گا۔ اس کے لیے مناسب وقت وہ ہوگا جب باقی ٹرکوں میں لوڈنگ کا کام مکمل ہو جائے۔ اس دوران آپ کام جو بھی چاہے کر سکتے ہیں۔''

مزدوروں کے ہٹنے کے بعد اس نے بتایا تو شہریار نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ واپس عمارت کی طرف جاتے ہوئے وہ سوریا کو مزید تفصیل سے بتاتا رہا کہ وہ لوگ کیا اور کس انداز میں کرنا چاہتے ہیں۔ سوریا بغیر سوال جواب کے غور سے اس کی بات سنتا رہا۔

شہریار نے اپنے حلیوں میں تبدیلی کے لیے بھی لباس سمیت چند دوسری چیزوں کا مطالبہ کیا جن کے بارے میں سوریا نے اسے یقین دلایا کہ تھوڑی دیر میں مہیا کر دی جائیں گی۔ شہریار نے اس سے چند دواؤں کی فرمائش کی جن کے بارے میں سوریا نے بتایا کہ پہلے سے ہی موجود ہیں۔

گفتگو کرتے ہوئے وہ واپس اسی دفتر نما کمرے میں آ گئے جہاں ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ سوریا نے ان کو فراہم کیں تو اس نے سلّو کے ذمے ان کی ڈریسنگ کا کام لگا دیا۔ زخم ان دونوں کو بھی آئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کے زخم ان کی نسبت ذرا شدید نوعیت کے تھے اور انہیں زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ ان کی مرہم پٹی کے ساتھ انہیں کھانے کے لیے پین کلر اور زخم سکھانے والی ادویات بھی دی گئیں۔

شہریار کے اندازے کے مطابق اس جگہ کو صرف ڈیری مصنوعات کے کاروبار کے لیے ہی استعمال نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ بھائی جی کے لوگ بھی کور کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ان پروڈکٹس کی آڑ میں ممنوعہ اشیا جیسے اسلحہ اور شراب وغیرہ کی سپلائی بھی کی جاتی ہو۔ ہیروئن کے لیے تو بھائی جی کا کہنا کیا تھا کہ وہ اس کاروبار میں ملوث نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ڈریسنگ مکمل ہونے تک سوریا نے انہیں لباس اور دوسری اشیا بھی فراہم کر دی تھیں۔ انہوں نے باری باری ملحقہ باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیے۔ یہ لباس دھوتی اور کرتوں پر مشتمل تھے جو اس علاقے میں اس کاروبار سے وابستہ لوگوں میں عموماً مستعمل تھا۔

لباس کی تبدیلی کے بعد ایک بار پھر میک اپ کا مرحلہ پیش آیا۔ میک اپ کے سامان میں خاص طور پر جعلی ناخنوں کا سیٹ منگوایا گیا تھا۔ ان ناخنوں کو ایک سلوشن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی انگلیوں پر چسپاں کرنے کے بعد اتنی خوب صورتی کے ساتھ تراشا گیا کہ وہ اصلی ہی معلوم ہونے لگے۔

''معذرت چاہتا ہوں سر! داڑھی سے محرومی کے بعد آپ کو کچھ عرصے کے لیے ان مصنوعی ناخنوں کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان ناخنوں کی وجہ سے آپ وضو نہیں کر پائیں گے لیکن ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں اللہ سے معافی کی امید کی جا سکتی ہے۔'' شہریار نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں ان باتوں کو سمجھتا ہوں اور فی الحال تو مجھے کوئی پریشانی بھی نہیں ہے۔ وضو کیا ہوا ہے۔ انشاء اللہ فجر کی نماز تو اسی وضو سے ادا ہو جائے گی۔ آگے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کوئی دے گا۔" انہوں نے نہایت رسان سے اسے جواب دیا۔

"آپ کو ایک زحمت اور بھی اُٹھانی پڑے گی۔ دورانِ سفر ہم آپ کو منظر پر رکھنے کی غلطی نہیں کر لیے میں نے یہ بندوبست کر دیا ہے کہ ٹرک میں کارٹنز کے درمیان کچھ خالی جگہ رکھی جائے جہاں آپ سفر کر سکیں۔ گاڑی میں ایئر کنڈیشنر موجود ہے اس لیے آپ کو حبس وغیرہ کا مسئلہ تو نہیں ہو گا لیکن برداشت کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔"

"میرے لیے اتنے فکرمند مت ہو یار!..... میں خاصا سخت جان ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو اتنے والوں کی قید میں رہ کر سلامت کیسے رہتا؟ جس رب نے اتنے عرصے ہمت دی، وہ اب بھی حوصلہ چند گھنٹوں کا یہ سفر بھی گزر ہی جائے گا۔"

اس کی تشویش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی تو وہ مسکرا دیا اور تیاری مکمل کرنے لگا۔ دھوتی اور کُرتے کے ساتھ ان دونوں نے اپنے سروں پر پگڑی بھی باندھی تھی حلیے میں اتنے مختلف لگ رہے تھے کہ کسی قریبی شخص کے لیے بھی انہیں شناخت کرنا آسان نہیں ہو سکتا

"میں نے ٹرک میں کارٹنز لوڈ کروا دیئے ہیں۔ آپ چاہیں تو خود دیکھ لیں۔" سوریا نے آ کر ا تو شہریار اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ٹرک میں کارٹنز اس کے حکم کے مطابق ہی لوڈ کیے گئے تھے۔ ان کارٹنز کی ترتیب یوں تھی کہ میں ایک دوسرے کے اوپر جما کر رکھے گئے تھے کارٹنز کی دو دیواریں سی بنا کر ان کے درمیان خلا سا تھا اور پھر آخر تک کارٹنز جما کر بیچ میں وہاں تک پہنچنے کا راستہ چھوڑا گیا تھا۔

"ٹرک کے ساتھ ہمارے دو آدمی جاتے ہیں۔ ایک ڈرائیور اور دوسرا اس کا ساتھی۔ اس لیے سے دو کو اسی جگہ چھپ کر سفر کرنا پڑے گا۔"

اسے ٹرک کا معائنہ کروانے کے بعد سوریا نے کہا تو وہ ذرا تذبذب کا شکار ہو گیا۔ کسی بھی خراب صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے وہ سلّو کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اسے بھی ڈاکٹر ساتھ اس جگہ ٹھہرا دیا جاتا تو کسی ناگہانی کی صورت میں وہ اس بند جگہ سے اس کی کوئی مدد نہیں کر درمیانی خلا تک پہنچنے کے لیے جو جگہ چھوڑ دی گئی تھی، وہ بھی سفر کے آغاز سے پہلے کارٹنز رکھ کر جاتی۔ ایسے میں سلّو اگر چاہتا بھی تو کسی صورت باہر نہیں نکل سکتا تھا، علاوہ یہ کہ باہر سے کوئی کارٹ کے باہر نکلنے کے لیے راستہ بناتا۔

"کیا ڈرائیور کے ساتھ ایک کے بجائے دو افراد سفر نہیں کر سکتے؟"

"کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری روٹین کے بالکل خلاف ہو گا۔ اور آپ لوگ سے دوچار ہیں، اس میں پوری احتیاط کرنی ضروری ہے۔" اس کے سوال کا سوریا نے نہایت صاف جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، ایسا ہے تو ایسا ہی صحیح۔" وہ تذبذب کی کیفیت سے فوراً ہی نکل کر آہنی لہجے میں

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر فرحان اور سلّو کو ٹرک کے اس حصے میں پہنچا دیا گیا۔ سلّو کو اس طرح نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شہریار کے ساتھ رہے یا پھر اسے ہی اکیلے ڈرائیور



اجازت دے دی جائے۔ لیکن شہریار کے حکم کے سامنے اسے زیادہ بحث کرنے کی عادت نہیں تھی چاہتے ہوئے بھی اس تنگ جگہ پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔

اس موقع پر وہاں سوریا اور شہریار کے علاوہ کوئی بھی موجود نہیں تھا اور ایسا شہریار کی خواہش پر ہی کیا گیا چاہتا تھا کہ کم سے کم لوگوں کو ہی اس بات کا علم ہو کہ اس ٹرک میں کچھ افراد چھپ کر سفر کر رہے ہیں لوگوں کے باعلم ہونے کی صورت میں خطرات و خدشات بڑھ جاتے ہیں۔

اکٹر صاحب اور سلّو سوار ہو چکے تو اس نے اور سوریا نے مل کر ہی باقی کی جگہ پر کارٹنز ترتیب سے پچھلا حصہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب کوئی تالا کھول کر اندر جھانکتا بھی تو اسے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بھرے ٹرک میں دو افراد چھپے ہوئے ہیں۔

کام مکمل ہونے کے بعد سوریا نے ڈرائیور کو بھی وہاں بلا لیا۔ رازداری کے خیال سے اسے بھی ٹرک میں اکٹر صاحب کی موجودگی سے لاعلم رکھا گیا تھا اور شہریار کے بارے میں بھی صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ بھائی جی کا خاص بندہ ہے جسے ممبئی تک پہنچانا ہے اور راستے میں کسی ایمرجنسی کی صورت میں اس کی ہدایات کرنا ہے۔

شہریار نے ایک دفعہ کو یہ سوچا تھا کہ وہ خود ڈرائیور کی جگہ لے لے اور سلّو کو اپنی والی جگہ دے دے۔ مناسب نہیں تھا۔ اتنے لمبے سفر میں، وہ بھی جو ٹرک کے ذریعے کیا جا رہا تھا، تجربہ کار ڈرائیور ہی تھا۔ کیونکہ ایسا ڈرائیور نہ صرف راستوں سے باخبر ہوتا ہے بلکہ راستے میں پڑنے والی چوکیوں اور سے نمٹنے کا بھی تجربہ رکھتا ہے۔ اور یہ تو پھر تھا بھی بھائی جی کا بندہ جس نے لازماً پیسے اور طاقت کے بل تعلقات بنا رکھے ہوں گے اور کوئی اسے روکنے کی کوشش نہ کرتا ہو گا۔ موجودہ حالات میں یہ ڈرائیور آسانی سے چیکنگ وغیرہ سے بچا کر نکال سکتا تھا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھال لی تو وہ بھی سوریا سے ہاتھ ملا کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔ فوراً ہی ٹرک چل پڑا سے گیٹ سے گزر کر باہر پہنچ گئے۔ ابھی صبح کا اُجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا لیکن زندگی جاگنا ہو گئی تھی اور ایسے لوگ جو اخبار یا ڈیری کے کاموں سے وابستہ تھے، اپنے گھروں سے نکلنا شروع ہو شہر کی صفائی پر مامور میونسپل کا عملہ بھی اپنی بھاری جھاڑوؤں اور کچرا جمع کرنے کی ٹرالیوں کے ساتھ آغاز کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ڈرائیور نے اس سے دریافت کیا۔

"سلّو بندر۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"زحمت ماننا یار! سوریا صاحب نے زیادہ بات چیت سے منع کیا تھا لیکن میں نے اس لیے نام پوچھ لیا ضرورت پڑی تو تمہیں کیا کہہ کر پکاروں گا۔" ڈرائیور نے وضاحت دی اور پھر خاموشی سے اپنے کام ہو گیا۔

فی الحال وہ شہر کی سڑکوں ہی سے گزر رہے تھے۔ یہاں کسی کسی جگہ انہیں پولیس والے نظر آئے لیکن انہیں روکا نہیں گیا اور بالآخر وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو شہر سے باہر جاتی تھی۔ یہاں انہیں دور سے نظر آ گیا۔ ناکے پر سے ملنے والے اشارے پر ڈرائیور کو ٹرک روکنا پڑا۔

رُکتے ہی شہریار کو اپنے اعصاب میں تناؤ سا محسوس ہوا اور ہاتھ بے ساختہ ہی کُرتے کی اس جیب چلا گیا جس میں ایک ریوالور رکھا تھا۔

فی الحال ہتھیار کے نام پر اس کے پاس یہی واحد ریوالور موجود تھا۔ اپنی کارآمد گن، ہینڈ گرینیڈ
کا اسلحہ تو اس نے بیگ میں رکھ کر وہ بیگ سلّو کے پاس ہی رکھوا دیا تھا کیونکہ راستے میں کہیں چیکنگ ہو
یہ چیزیں سامنے آتیں تو وہ بُری طرح دھر لیے جاتے۔ کیونکہ یہی چیزیں تھیں جو انہوں نے ڈاکٹر صا
ہسپتال سے فرار کرواتے ہوئے استعمال کی تھیں اور ان کی موجودگی میں کسی دوسرے ثبوت کی ضرور
پیش نہیں آتی۔

''نیچے آؤ۔'' جیسے ہی ٹرک رُکا، دونوں جانب سے دو سپاہی آ کھڑے ہوئے اور حکم دیا۔

''کیا بات ہے بادشاہو!..... کیا اس دفعہ تم لوگوں کا حصہ نہیں پہنچا ہے جو اتنے خراب موڈ میں نظر
ہو؟'' حکم دینے والے کے لہجے کی سختی کے برخلاف ڈرائیور کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا۔

''تمہیں کہا ہے نیچے آؤ۔'' ایک بار پھر حکم کو دہرایا گیا۔

''ٹھیک ہے آ جاتے ہیں نیچے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور شہریار کو بھی نیچے اُترنے کا اشارہ کیا
کے اشارے پر وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔

''ہمیں ٹرک کی تلاشی لینی ہے۔ پیچھے کی چابی دو۔'' ان دونوں کے نیچے اُترتے ہی سپاہی نے حکم
''کیوں بھائی! کیا پیچھے کی تلاشی لے کر تم دودھ کے ڈبوں کے بیچ میں سے گائے دریافت کرلو
شہریار کے مقابلے میں ڈرائیور بہت ریلیکس تھا اور کسی طور سنجیدگی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اُس
کرنے کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں سے خاصا بے تکلف ہے اور اس کا ان سے وا
رہتا ہے۔

''بکواس نہ کرو اور چابی دو۔'' سپاہی نے کڑک دار آواز میں ڈرائیور کو پھٹکارا تو اس بار اس
نکال کر سپاہی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''تم کہو تو میں خود وکرم صاحب سے بات کرلوں۔'' چابی دینے کے بعد اس نے سپاہی سے پو
کے لیے یہ ایک خلافِ معمول بات تھی کہ اسے یوں روک کر اس کے ٹرک کی تلاشی لی جائے۔ لیکن
اسے تامل یوں نہ تھا کہ وہ بے خبر تھا کہ ٹرک میں دودھ کے پیکٹوں کے کارٹنز کے علاوہ بھی کچھ اور موجو

''وکرم صاحب کے پاس بڑے افسر آئے بیٹھے ہیں اور ان کا حکم ہے یہاں سے کوئی گاڑی
کے نہ گزرنے پائے۔'' سپاہی نے آخر وہ وجہ گوش گزار کر دی جس کے باعث خلافِ معمول تلاشی
کوشش کی جا رہی تھی۔

''اچھا اچھا، اوپر کا معاملہ ہے۔ تو پھر تم خوشی سے تلاشی لے لو۔ ورنہ میں تو یوں ڈر رہا تھا کہ
صاحب کسی وجہ سے ہم سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔ آدمی اچھے ہیں لیکن نذرانہ پہنچنے میں دیر ہو جا
خراب کر لیتے ہیں۔'' ڈرائیور کی فراخ دلانہ اجازت پر شہریار کے دل پر کیا گزر رہی تھی، یہ وہی جانتا
''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟..... نئی شکل لگ رہی ہے۔ پہلے کبھی اسے دیکھا نہیں؟'' چابی لے
کی طرف جاتے ہوئے سپاہی کی نظر شہریار پر پڑی تو ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''ہاں نیا بندہ ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی نوکری پر چڑھا ہے اور آج پہلی بار ہی میرے سا
ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا تو سپاہی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور خود پچھلے حصے میں چلا گیا۔ وہاں اس
کھول کر دروازہ کھولا اور لبالب کارٹنز سے بھرے ٹرک کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

''انوپ، اجے، آکاش..... یہاں آؤ اور میرے ساتھ ان کارٹنز کو اُتارنے میں مدد کرو۔'' اُس



ظاہر تھا کہ اسے بھی یہ مشقت گراں گزر رہی ہے لیکن حکم حاکم مرگِ مفاجات کے تحت عمل کرنے پر مجبور
اس کے آواز دینے پر اس کے ساتھی اس کے پاس پہنچ گئے۔

''تم لوگ بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اس طرح کام جلدی نمٹ جائے گا اور تم یہاں سے جلد روانہ ہو سکو
''اب تک ساری گفتگو کرنے والے سپاہی نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تو ڈرائیور کے ساتھ شہریار
مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس جانب بڑھ گیا۔

سپاہیوں نے کارٹنز نکال کر باہر رکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ شہریار نے ان کے ساتھ شامل ہونے سے
موجود سلّو کو خطرے کا کاشن دیا۔ اس کاشن کے ملنے کے بعد سلّو الرٹ ہو جاتا اور ہتھیار تیار کر کے
میں آ جاتا کہ خود کو کوئی نقصان پہنچنے سے پہلے دوسرے پر قیامت بن کر ٹوٹ سکے۔

ڈرائیور اور اس کے شامل ہو جانے سے کام کی رفتار مزید بڑھ گئی تھی اور ٹرک کے باہر تیزی سے کارٹنز کا
جا رہا تھا۔ اپنے طور پر وہ تو سستی سے ہی کام لے رہا تھا لیکن باقی سب لوگوں کو تو جلدی تھی۔ کچھ
کو کھول کر بھی دیکھا گیا تھا لیکن ظاہر ہے ان میں سے دودھ کے ڈبوں کے سوا کیا نکلنا تھا۔

ٹرک سے سامان اُتارنے کا عمل جاری تھا کہ وہاں دو اور مزید گاڑیاں پہنچ گئیں اور ان گاڑیوں کو بھی ان
روک لیا گیا۔

ان گاڑیوں کے سواروں سے گفتگو کے لیے دو سپاہی اور ان کے ساتھ وہی تیسرا سپاہی جس نے ان کے
گفتگو کی تھی، وہاں سے ہٹ گئے۔ اس طرح کارٹنز اُتارنے کا عمل کچھ سست ہو گیا۔ لیکن اب زیادہ
کی جب وہ ان کارٹنز کو ہٹاتے ہوئے اس حصے تک پہنچ جاتے جہاں ڈاکٹر صاحب اور سلّو موجود تھے۔
تشویش میں مبتلا شہریار نے کام کی رفتار کو مزید سست کرنے کے لیے اپنے ہاتھ روک لیے اور اپنے پیچھے آ
والی گاڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔

ان میں سے ایک منی ٹرک تھا جس پر بوریاں سی لدی تھیں جبکہ دوسری ہائی ایس نما گاڑی تھی جس میں
مرد اور بچے سب سوار نظر آ رہے تھے۔ اتنی سویرے یوں گاڑی بھر کر نکلنے والے وہ لوگ معلوم نہیں
جا رہے تھے۔ ان کی منزل دریا کے کنارے کوئی پکنک پوائنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ
کے علاقے میں کسی شادی میں شرکت کے لیے جا رہے ہوں جہاں وقت پر پہنچنے کے لیے انہیں اتنے
نکلنا پڑا ہو۔

سپاہیوں نے چونکہ گاڑی کے سواروں کو نیچے اُتروا لیا تھا، اس لیے وہ واضح طور پر ان لوگوں کو دیکھ سکتا
عورتوں نے زیادہ تر گہرے رنگوں کے خوش نما لباس پہن رکھے تھے اور آپس میں باتوں میں مصروف
بچے کھلے میں آنے کے بعد ذرا بے قابو ہوئے جا رہے تھے اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ان کی
کو ڈانٹ پھٹکار سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ مرد حضرات سپاہیوں سے مذاکرات میں مصروف تھے اور شاید یہ
رکھتے تھے کہ انہیں تلاشی کی زحمت سے گزرے بغیر ہی یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔
صورتِ حال پر مرد و زن سب ہی کوفت زدہ نظر آ رہے تھے۔

''جلدی ہاتھ چلاتا اوئے..... یہ کیا تُو عورتوں پر آنکھیں سینکنے میں لگا ہوا ہے۔'' کام کی زیادتی سے
سپاہی نے اسے فارغ کھڑا دیکھا تو جھنجلا کر ٹوکا۔

''فضول باتیں نہ کرو۔ میں کیوں عورتوں پر آنکھیں سینکنے لگا۔ تھک گیا تھا اس لیے رُک گیا۔'' شہریار
لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور کارٹن اُٹھانے کے لیے جھکا۔

''یہ کیا اوئے.....تُو جیب میں اسلحہ لے کر گھوم رہا ہے۔'' سپاہی کی نظر یک دم اُس کے کُرتے کی جیب میں پڑے ریوالور پر پڑی تو وہ زور سے چیخا اور اس کی گدی پکڑ لی۔

''ارے سنتری جی! یہ کیا کر رہے ہو؟..... بے چارے نے پستول رکھا ہے۔ کوئی کسی پر گولی تو نہیں چلائی۔ اب بھائی جی کے آدمی اپنی جیب میں پستول نہیں رکھیں گے تو کیا رام جی کی مورتی رکھ کے گھومیں گے؟..... تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ اپنے سو سجن تو سو دشمن ہیں۔ دشمنوں سے بچاؤ کے لیے اپنے کو یہ انتظام رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن تم کاہے کو چنتا کر رہے ہو؟..... تم تو اپنے سجن ہو نا۔'' ڈرائیور نے فوراً ہی مداخلت کرتے ہوئے بیچ بچاؤ کروایا۔

اس دوران شہریار نے بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے ہاتھ پیروں کو قابو میں رکھا ورنہ وہاں بڑا جھگڑا کھڑا ہو سکتا تھا اور وہ قبل از وقت کوئی جھگڑا شروع کرنے سے بچنا چاہتا تھا۔ ورنہ امکان تو یہی تھا کہ جب کارٹنز کی آخری قطار بھی ہٹ جائے گی اور ڈاکٹر فرحان اور سلو منظرِ عام پر آ جائیں گے تو وہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ لیکن بس وہ آخری حد آنے تک تصادم سے بچنا چاہتا تھا اور یہ تصادم بس ہونے کو تھا۔ آٹھ دس کارٹنز ہی مزید ہٹنے کی دیر تھی۔

''حالات بہت نازک ہیں یار!..... تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ اگر اتنے خراب حالات نہ ہوتے تو لوگ کاہے کو اتنی محنت میں لگتے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ممبئی سے ایک بڑے افسر، صاحب کے پاس پہنچے اور صاحب کو سختی سے حکم دیا ہے کہ کوئی کتنے ہی بھروسے کا آدمی کیوں نہ ہو، تلاشی کے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اپنی کیسی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ سارا دن لوڈروں کی طرح گاڑیوں سے سامان اُتارتے اور چڑھاتے رہتے ہیں۔ دو دن سے ڈھنگ سے کھانا بھی کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ایسے میں طبیعت چڑچڑی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟''

موجودہ صورتِ حال میں ڈرائیور کے پولیس والوں سے دوستانہ تعلقات کام آئے اور سپاہی بات کو آگے بڑھانے کے بجائے اپنی پریشانی کا رونا رونے لگا۔

اس پل شہریار کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ کر باہر کی جانب ہوگئی۔ ناکے پر موجود ٹینٹ نما کمرے سے برآمد ہونے والے دو افراد میں سے ایک کے جسم پر پولیس کی وردی تھی جبکہ دوسرا سادہ لباس میں تھا اور سادہ پوش کو دیکھ کر وہ بُری طرح چونک گیا تھا۔ اس بات میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ پولیس یونیفارم میں ملبوس شخص سے گفتگو کرتا یہ سادہ پوش انسپکٹر پریم ناتھ ہے۔

اس کی نگاہوں کے ارتکاز نے شاید پریم ناتھ کو بھی دیکھے جانے کا احساس دلایا اور اس نے رخ موڑ کر شہریار کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور شہریار کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نگاہوں کے اس تصادم نے اسے یہ بھی فراموش کروا دیا تھا کہ اس کے پیچھے رکے ہوئے میں سے اب کچھ ہی کارٹنز ہٹنے کی دیر تھی۔ پھر یہ سارا کھیل ختم ہو جاتا اور انہیں ایک دوسرا خونیں کھیل کھیلنا کرنا پڑتا۔

پریم ناتھ وہ شخص تھا جس نے ڈاکٹر فرحان کے لالچی رشتے داروں سے رشوت وصول کر کے ان چاروں کو جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا تھا اور پھر ''را'' کے چنگل میں پھنسا کر برسوں اسیری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس شخص نے اپنے اس کارنامے کے صلے میں ترقی اور دولت دونوں ہی چیزیں پائی تھیں۔ شہریار



کلام کی مدد سے اسے اغوا کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے لیکن اپنی خوش قسمتی سے وہ ان کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور عزم رکھتا تھا کہ خود کو اغوا کرنے والوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ شاید اسی لیے وہ ان کی سن گن ملنے پر ممبئی سے خود یہاں چلا آیا تھا اور ان کے گرد دائرہ تنگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اس شخص کے لیے شہریار کے دل میں بہت نفرت تھی اور یہ نفرت آنکھوں سے چھلک بھی سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے دھیرے سے اپنی نظریں پریم ناتھ پر سے ہٹا لیں۔ یوں بھی یہ بات پریم ناتھ جیسے افسر کی شان کے خلاف ہوتی کہ ایک عام سا کلینر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی گستاخی کرے۔ یہ گستاخی کر کے وہ اس کی افسرانہ شان کو للکارنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ صورتِ حال بہت ہی نازک تھی۔

خوش قسمتی سے پریم ناتھ نے بھی اسے قابلِ توجہ نہ گردانا اور خود بھی نظروں کا رخ پھیر کر اپنے ساتھ کھڑے پولیس افسر سے ہاتھ ملانے کے بعد اس پولیس کار میں سوار ہو گیا جس کا دروازہ ایک باادب ڈرائیور نے اس کے انتظار میں کھول رکھا تھا۔ اس کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور خود گھوم کر پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اسی وقت شہریار کو اپنے پیچھے کا ہوش آیا اور وہ یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سنتری کے ہاتھ اب ایک ایسے کار کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل جاتی کہ بظاہر دودھ کے کارٹنز سے لبالب بھرے ٹرک میں کارٹنز کے درمیان ہی ایک ایسا خلا رکھا گیا ہے جہاں دو افراد چھپ کر سفر کر رہے ہیں۔ اس سے پیشتر ساختہ ہی سنتری کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کارٹن ہٹانے سے روکا۔ جواب میں سنتری نے اسے خشمگین نظروں سے دیکھا۔

''تمہارے افسر صاحب چلے گئے ہیں۔ اب چھوڑو یہ بیکار کی محنت اور ہمارا اور اپنا وقت ضائع ہونے سے بچاؤ۔''

اس نے بڑے پُرخلوص لہجے میں سپاہی کو مشورہ دیا۔ مشقت سے بیزار سپاہی نے ایک نظر دُور ہوتی کار کی طرف دیکھا اور پھر شانے جھٹک کر ٹرک کے خارجی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تمہیں اوکے کر دیتا ہوں۔ تم اپنا سامان دوبارہ لوڈ کرنا شروع کر دو۔''

اس جواب کو سن کر شہریار نے سکون کا سانس لیا اور سنتری کے اُترتے ہی اپنے ساتھی ڈرائیور کے ساتھ دوبارہ کارٹنز لوڈ کرنے لگا۔

یہ ایک خاصا مشقت اور وقت طلب کام تھا لیکن وہ اس وقت جتنی بڑی مصیبت سے بچے تھے، اس کے مقابلے میں یہ مشقت کچھ نہیں تھی۔

اس نے کارٹنز اُتارنے میں جتنی سستی سے کام لیا تھا، دوبارہ لوڈ کرنے میں اس سے دہری پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ جلد از جلد اس مقام سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے اس کام کو پوری دلجمعی سے انجام دینے کی ضرورت یاد نہیں تھا کہ وہ، وہ شہریار عادل تھا جو افسر شاہی کا ایک پُرزہ تھا اور جس نے دنیا میں آنکھ کھولنے سے لے کر جوانی تک اپنے آگے پیچھے ملازمین کی فوج دیکھی تھی۔ اس وقت تو وہ بس محض وطن کا ایک سپاہی تھا جسے اپنے ''لوڈر'' کی حیثیت سے کام کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

''شش.....اُٹھو.....'' اسلم سونا نہیں چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے لیٹنے سے گریز کرتے ہوئے محض دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے پر اکتفا کیا تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ نیند تو سُولی پر بھی آ جاتی ہے، سو اسلم بھی بلا ارادہ ہی اونگھ آ گئی تھی اور اب کسی کے شانے پکڑ کر دھیمے سے پکارنے پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے ایڈی کو پایا۔ سنہری بالوں اور داڑھی والا وہ مردنما بچہ جانے کیسے اس تک پہنچا تھا۔ اس نے آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ایڈی اور اپنے قفس کے دروازے کھلے نظر آئے۔

''اب اُٹھ بھی جاؤ۔ اگر کوئی یہاں آ گیا تو پھر پکڑے جاؤ گے۔'' اسے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے پا کر ایڈی نے جھنجلا کر کہا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟.....لاک کیسے کھولا تم نے؟'' اسلم نے اس سے پوچھا۔

''مارک مجھے میڈیسن کھلانے کے لیے آیا تھا، میں نے اس کی جیب سے چابی اُڑا لی۔'' ایڈی مسکراتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا پھر ذرا ڈپٹنے والے انداز میں بولا۔

''اب یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟.....تمہیں اندازہ نہیں ہے تمہاری بیوی کس مشکل میں ہے۔ اگر ابھی تم کچھ نہیں کر سکتے تو یاد رکھنا کہ میرے ساتھ تمہارا بچہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہی کہیں بند ہوگا اور دیکھنے والی نظریں اُسے اسی حیرت اور تحقیر سے دیکھیں گی جن سے اور میرے ساتھ یہاں موجود ساتھیوں کو دیکھا جاتا ہے۔''

ایڈی کے لہجے میں کرب تھا۔ اسلم اس سے اس کے مکمل حالات جاننا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں تھا حالات کا تقاضا تھا کہ وہ سب سے پہلے یہاں سے نجات کی کوشش کرتا چنانچہ ایڈی کے شانے کو تھپکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''یہاں سے دوسرا کمرہ مارک کا ہے۔ اس کے کمرے میں ہی وہ کمپیوٹر نصب ہے جس کی مدد سے اور اس کے داخلی راستے کی نگرانی کی جاتی ہے۔ داخلی راستہ کھلنے اور بند ہونے پر مارک کے کمرے میں بجتی ہے اس لیے وہ جاگ رہا ہو یا سو رہا ہو، دونوں صورتوں میں خبردار ہو جاتا ہے۔ البتہ باقی عمارت کی نگرانی صرف اسی وقت کر سکتا ہے جب جاگ رہا ہو اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ اس جگہ کو اپنے بالکل محفوظ سمجھتے ہیں اور یہاں وہی لوگ رہتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق ان کے لیے بے ضرر ہیں اس لیے اندرونی نگرانی کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ میں اپنی پیدائش سے یہیں ہوں اس لیے اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مارک کے سونے کا وقت ہے اور اگر تم کچھ کر سکو تو اس وقت کر سکتے ہو۔ یہاں عملہ بہت کم ہے اس لیے اگر تم ہوشیاری سے کام لو تو حالات کو اپنے قابو میں کر سکتے ہو۔ تمہاری بیوی اسی کوریڈور میں مارک کے کمرے سے آگے والے کمرے میں موجود ہے۔ وہ بہت پیاری خاتون ہے اور میری خواہش ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔'' ایڈی کسی جوان و مدبّر آدمی کی طرح اسے مشورے دے رہا تھا۔

''تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' اسلم وہاں سے نکلنے لگا تھا کہ خیال آنے پر بولا۔

''نہیں، میں نہیں آ سکتا۔ میری ٹانگ زخمی ہے اور میں اس زخمی ٹانگ کے ساتھ زیادہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔''

ایڈی نے یاسیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ انکار کیا تو اسلم کو یاد آ گیا کہ یہاں سے فرار کی کوشش میں ایڈی کو مارک کی چلائی ہوئی گولی نے زخمی کر دیا تھا۔ وہ تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا لیکن صرف چند گھنٹوں بعد ہی نہ صرف وہ پوری طرح ہوش میں تھا بلکہ مارک کی جیب سے چابی اُڑا کر اسلم تک بھی آ پہنچا تھا۔ زخمی حالت میں یہ سب کر گزرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی مختصر قد و قامت کے باوجود یہ کارنامہ انجام دے کر ثابت کر چکا تھا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔



''بس اب دیر مت کرو اور فوراً یہاں سے جاؤ۔'' ایڈی نے خود ہی اسے ٹوکا تو وہ تیزی سے باہر نکلا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں تھا اور اسے صرف اپنے زورِ بازو پر ہی مارک پر قابو پانا تھا۔ اس کے لیے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن میں ماہر تھا اور زندگی میں کئی بار خالی ہاتھوں بھی اپنے مقابل کو پچھاڑ چکا تھا۔ یہاں تو مارک کے بارے میں شنید تھی کہ وہ سویا ہوا ملے گا۔ اس کے باوجود باہر نکل کر دوسرے کمرے کے دروازے کا ہینڈل دباتے ہوئے اس نے پوری احتیاط برتی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

خاصے کشادہ اس کمرے میں سب سے پہلے متوجہ کرنے والی چیز مانیٹر اسکرین ہی تھی جس پر ٹکڑوں میں مناظر نظر آ رہے تھے۔ وہ ایڈی کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اس کی بیرک کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال بیٹھا تھا۔

وہ اسکرین پر سے نظر ہٹانے ہی لگا تھا کہ ماہ بانو کے چہرے پر نظر پڑ گئی۔ وہ ایک نیم روشن کمرے میں ایک چادر تانے سوئی ہوئی تھی لیکن سوتے میں بھی سُوجے ہوئے نظر آنے والے اس کے پپوٹے گواہی دے رہے تھے کہ وہ سونے سے قبل روتی رہی ہے۔

ماہ بانو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل پر گھونسہ سا پڑا اور وہ یہ بھول کر کہ خود اس وقت مارک کے کمرے میں ہے، اسے پکار بیٹھا۔

''ماہی.....!''

یہ آواز ماہ بانو تک تو ظاہر ہے نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن آرام دہ وسیع بیڈ پر سویا ہوا مارک ضرور بیدار ہو گیا اور اس نے اسلم کو اپنے کمرے میں دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے لپک کر بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ یہی وہ وقت تھا جب اسلم کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر اپنا رخ بدلا۔ رخ بدلتے ہی مارک اس کی نظر میں آ گیا اور اس نے بلا تاخیر اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس چھلانگ کے نتیجے میں مارک اور وہ دونوں اس طرح بستر پر گرے کہ مارک اس کے نیچے تھا۔

مارک نے بھی جواباً پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دونوں گھٹنے سمیٹ کر اس کے پیٹ پر مارے اس کے نیچے دبے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ پوری شدت سے ضرب نہیں لگا سکا۔ اسلم نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے چہرے پر اپنے سر کی ضرب ماری۔ اس ضرب نے مارک کی ناک کو زخمی کیا اور اس سے خون جاری ہو گیا۔

اس نے بلبلا کر اسلم کو مُکا رسید کیا جو اس کے کان پر جا کر لگا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا کان سُن ہو گیا ہو۔ حقیقتاً یہ مُکا اس کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوا تھا اور وہ مارک پر پہلے جیسی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہا۔

مارک نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے اوپر سے دھکیل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ دھکیلے جانے پر اس کا توازن بگڑا ضرور لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور خود کو فرش پر گرنے سے بچا کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دوران مارک بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے حملے میں پہل کی لیکن اسلم نے نہایت پھرتی سے ایک

طرف ہو کر خود کو بچا لیا۔ مارک اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا۔ پیچھے سے اسلم نے اس کی پیٹھ پر زوردار لات رسید کی جس سے وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اسلم نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پیچھے سے اس کی گردن کے دائیں بائیں بیک وقت دونوں ہتھیلیوں کی کھڑی ضرب لگائی۔ اس ضرب نے مارک کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے اور وہ لہراتا ہوا فرش پر گرا۔

اسلم نے پیر سے اس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگائی اور اسلم نے کراہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسلم نے تصدیق سے پہلے اس کی کنپٹی پر ایک ٹھوکر اور لگائی۔ اس بار وہ کراہا بھی نہیں۔ اسلم نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا ملحقہ باتھ روم میں لے گیا۔ اسے باتھ روم میں منتقل کر کے اس سے دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مانیٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ماہ بانو ہنوز گہری نیند سو رہی تھی۔ ایڈی بھی پہلے کی طرح دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا اور اس کے چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔

اسلم جلدی جلدی چیک کرنے لگا کہ اس زیر زمین تجربہ گاہ میں مزید کتنے افراد موجود ہیں اور اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ وہاں زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ اس نے ایک کمرے میں دو افراد کو سوئے ہوئے دیکھا جبکہ ایک آدمی بستر پر نیم دراز کسی کتاب کا مطالعہ کرتا دکھائی دیا۔ ایک شخص کو اس نے تجربہ گاہ کے انداز میں سجے کمرے میں مصروف پایا۔ وہ چند ٹیسٹ ٹیوبز میں سرخ رنگ کا محلول لیے معلوم نہیں کس تحقیق میں مصروف تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ سرخ رنگ کا یہ محلول دراصل انسانی خون ہے جس کے مختلف ٹیسٹ کرتے ہوئے رپورٹ مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ اس شخص کے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر رحم مادر میں پرورش پاتے بچے کی تصویر متحرک تھی اور وہ رپورٹ لکھتے ہوئے گاہے بگاہے اسکرین پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔

اسلم نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا چکا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خلاف انسانیت ہے۔ دنیا میں کسی بھی جگہ انسانوں پر مہلک تجربے کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شاید اسی لیے امریکہ میں انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ اس گھنے جنگل میں زیر زمین چھپ کر یہ تجربے کروا رہا تھا۔ بات تو بالکل ہی واضح تھی کہ یہ تجربات حاملہ خواتین اور نومولود بچوں پر کیے جا رہے تھے اور ان کے نتیجے میں مخلوق پیدا ہو رہی تھی جسے اس نے ایڈی اور اس کے ساتھی کی صورت میں جانوروں کی طرح سلاخوں کے پیچھے رہتا دیکھا ہے۔

اچھی طرح چیک کر لینے کے باوجود اسے مارک اور ان چار کے علاوہ ان کا کوئی ساتھی وہاں نظر نہیں آیا۔ شاید اس جگہ کو خفیہ رکھنے کے لیے ملازم کم سے کم افراد کو ہی رکھا گیا تھا۔ جو سہولیات وہاں دکھائی دے رہی تھیں، ان کے ہوتے ہوئے روزمرہ کے امور کے لیے بھی زیادہ افراد کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک سے دو افراد نہایت آسانی سے وہاں کا انتظام و انصرام سنبھال سکتے تھے۔

مائیکرو ویو، ویکیوم کلینر، برتن اور کپڑے دھونے کی جدید مشینوں سمیت وہاں وہ سب کچھ موجود تھا جو زندگی کو برق رفتار اور آسان بنا دیتا۔

وہاں موجود افراد کی تعداد جان لینے کے بعد اسے بس یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان افراد کا انجام کیا ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں تو یہ سب مجرم تھے جو ایک غیر انسانی و غیر اخلاقی عمل میں ملوث تھے اور اس حساب سے انہیں سزا بھی ملنی چاہیے تھی۔

اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر ان میں سے کسی کو اس نے سلامت چھوڑ دیا تو وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال



لے جانے کے عمل میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔

اپنے ان اندیشوں کے ساتھ اس نے مارک کے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ بیڈ کے ساتھ رکھی پہلی میز کی دراز سے اسے ایک پسٹل مل گیا۔ یہ پسٹل مارک نے ہنگامی حالات کے لیے اپنے قریب رکھا ہو گا لیکن استعمال کا موقع نہ مل سکا۔ ایک الماری سے اسے اپنا بیگ اور کچھ دوسرا اسلحہ بھی مل گیا۔ وہیں چند ایکسٹرا اسٹکس بھی رکھی تھیں۔ اس نے اپنے بیگ کے علاوہ جدید ساخت کی ایک گن اٹھانے پر اکتفا کیا اور دل کی خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے ماہ بانو کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس نے دو افراد کو سوتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ دونوں اب بھی بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے سنگل بیڈز ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر بچھے تھے۔ ہماری دار نائٹ سوٹ میں سوئے ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وہاں سہولیات فراہم کرنے والے خدمت گار ہیں یا اس تجربہ گاہ میں جاری شیطانی تحقیق میں حصہ لینے والے سائنس دان۔ اس کے لیے تو دونوں ہی برابر تھے۔

چنانچہ ہونٹ بھینچے ہوئے پہلے دائیں جانب کے بستر پر سوئے ہوئے شخص کی طرف بڑھا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اتنی زور سے گن کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی کہ واضح طور پر کھوپڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ شخص منہ سے کراہ بھی نہیں نکال سکا۔ دوسرے بیڈ پر سویا ہوا شخص اس لمحے ذرا سا کسمسایا لیکن کروٹ بدل کر دوبارہ سو گیا۔

اسلم دبے قدموں اس کے سر پر پہنچا اور پہلے والی ترکیب استعمال کرتے ہوئے اس کے منہ پر بھی ہاتھ رکھا لیکن وہ دوسرے آدمی کی طرح بے خبر سوتا نہیں رہا اور چونک کر آنکھ کھول دی۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے اسلم کو اپنے سر پر سوار دیکھا تو اضطراری ردِعمل کے طور پر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اسلم نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور گن سے ایک زوردار ضرب اس کے سر پر لگانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش اس لیے کامیاب نہیں رہی کہ اس شخص نے عین موقع پر اپنا سر ہٹا لیا۔

گن کا وار اس کے شانے پر لگا اور اس نے بلبلا کر چیخنا چاہا لیکن اسلم کے مضبوطی سے منہ پر جمے ہوئے ہاتھ کی وجہ سے بس ذرا سی گھٹی گھٹی آواز ہی نکل سکی۔ اسلم نے فوراً ہی دوسرا وار بھی کر دیا۔ اس نے اس بار بھی کھوپڑی کی کوشش کی لیکن صرف جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکا اور کھوپڑی کے ایک جانب اسے یہ وار برداشت کرنا پڑا۔

اسلم نے جو اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا تھا اور اسے اُٹھنے کا موقع نہیں دے رہا تھا، تیسرا اور فیصلہ کن وار کیا۔ اس بار وار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ کر اندر گھس گئی اور اسلم کو اپنے چہرے پر خون کے چھینٹے برداشت کرنے پڑے۔

وہ آستین سے خون صاف کرتا ہوا اس کی چھاتی سے اُٹھ گیا۔ احتیاط کے پیشِ نظر وہ اپنے ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں گولی چلنے کی آواز دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ہوشیار نہ کر دے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو گیا کہ گن کی دہشت اپنی جگہ لیکن ان حالات میں خنجر زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ گن رکھ کر اس نے اپنے بیگ سے خنجر نکال لیا۔

خنجر لے کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس نے ایک آدمی کو مطالعے میں مصروف دیکھا تھا۔ اس کمرے میں بیڈ دروازے کے عین مقابل تھا اور وہ شخص بیڈ پر نیم دراز ہو کر مطالعے میں مصروف تھا۔ چنانچہ

دروازہ کھلتے ہی متوجہ ہوگیا اور اپنے سامنے ایک اجنبی کو پا کر اس کی آنکھوں میں حیرت اُتر آئی۔

اسلم نے اُسے حیرت کے بعد کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ تاک کر خنجر پھینکا کہ وہ سیدھا اس شخص کے دل میں جا اُترا۔

یہ عمل اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ اس شخص کو اپنے بچاؤ کے لیے ہلنے کا بھی موقع نہیں ملا اور وہ آنکھوں میں حیرت و دہشت کے رنگ لیے دنیا سے سدھار گیا۔ خنجر دل میں کھب جانے کی وجہ سے اسے تڑپنے اور چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ بہت خاموشی سے اپنی جان دے بیٹھا تھا۔

اسلم نے قریب جا کر اس کی موت کی تصدیق کی اور اس کے سینے میں کھبا ہوا خنجر کھینچ کر باہر نکالا۔ باہر نکلتے ہی تیزی سے خون کا اخراج ہونے لگا جس کی پروا کیے بغیر وہ مقتول کے کپڑوں سے ہی خنجر کو صاف کرنے لگا۔ خنجر سے خون صاف کرتے ہوئے اس کی نظر اس کتاب پر پڑی جو مرنے والا اپنی موت سے قبل پڑھ رہا تھا۔ وہ طب سے متعلق کوئی تحقیقاتی کتاب تھی۔ اسلم سمجھ گیا کہ یہ شخص ڈاکٹر ہے اور اسی نے ایڈی کی ٹانگ کا آپریشن کر کے اس میں سے گولی نکالی ہوگی۔ لیکن اب وہ دنیا کے سب سے بھیانک مرض موت کا شکار ہو کر خود لاعلاج ہوگیا تھا۔

اس شخص کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد اب اس کے سامنے صرف ایک فرد رہ گیا تھا اور وہ تجربہ گاہ میں مصروفِ عمل آدمی۔ اسکرین پر اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس کے لیے اس جگہ کا نقشہ بالکل بھی مشکل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہ سیدھا لیب تک پہنچ گیا۔ لیکن لیب کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجبوراً اسے دستک دینی پڑی۔

''کون؟'' اندر سے جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مارک۔'' اس نے کوشش کی کہ مارک جیسی آواز نکال سکے۔

''کیوں آئے ہو؟..... جانتے ہو میں مصروف ہوں اور ڈسٹرب ہونا پسند نہیں کرتا۔'' اس کی جھنجلاہٹ میں تلخی شامل ہوگئی۔

''سوری سر! لیکن میں مجبور ہوں۔ اُس لیڈی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' وہ کوشش کر رہا تھا کہ مارک کا لب و لہجہ برقرار رکھ سکے لیکن اسے دشواری پیش آ رہی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے۔ لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اندر موجود شخص نے اس کی آواز یا لب و لہجے سے زیادہ اس اطلاع کو اہمیت دی جو اس نے سنائی تھی۔ چنانچہ دروازہ اتنی تیزی سے کھلا کہ اسلم خود بھی ہڑبڑا گیا۔

دروازہ کھولنے والا اپنے ہاتھ میں شیشے کا ایک کونیکل فلاسک اٹھائے دروازے تک آیا تھا۔ اس نے مارک کی جگہ کسی اور کو اپنے سامنے پایا تو اضطراری ردِعمل کے طور پر اسے وہ فلاسک ہی کھینچ مارا۔

شیشے کا فلاسک عین اسلم کی پیشانی سے جا کر ٹکرایا اور کرچیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے اس کے ماتھے کو زخمی کر ڈالا۔ زخم سے جاری ہونے والے خون سے قبل فلاسک میں موجود محلول نے اسلم کے چہرے کو بھگو دیا۔ محلول بدبودار تھا۔ اسلم کو ابکائی سی آ گئی۔

دوسری طرف اس کے مقابل نے موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر دروازہ بند کر دیا۔ اسلم نے بازو کر آستین سے چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی اور بلا تکلف گن نکال لی۔ اس کے حساب سے یہ یہاں موجود افراد میں سے آخری فرد تھا چنانچہ اب کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ گن نکال کر اس نے لاک والے ہینڈل



کو گھمایا اور فائر کر دیا۔

فائر کی آواز بہت زور سے گونجی، ساتھ ہی لاک بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس پر تجربہ گاہ میں استعمال ہونے والی شیشے کی مختلف اشیا کی بوچھاڑ سی ہوگئی جس کی وجہ سے اسے آنکھیں تو آنکھیں لیکن یہ اطمینان ہوگیا کہ اندر موجود شخص کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے ورنہ وہ اس کا استعمال کرتا۔ اس اطمینان کے بعد وہ دندناتا ہوا اندر داخل ہوگیا اور گن اس پر تان کر غرایا۔

''بس اب سکون سے کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح جان سے جاؤ گے۔''

''کک..... کک..... کیا؟..... تم نے سب کو مار ڈالا؟'' وہ شخص جو پہلے ہی خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اب دہشت زدہ ہوگیا۔

''ہاں۔ میں ایسے کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو میرے لیے مشکل پیدا کرے۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ مزید خوف ناک کر لیا۔

''میں ایسا نہیں ہوں میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ تم جو بھی ہو، مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی کروں گا۔'' جلدی جلدی بولتے ہوئے اس نے اسلم کو اپنی رہائی کروائی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اسلم نے اس پر گن تانے تانے سوال کیا۔

''ولسن۔'' اس کی طرف سے فوراً جواب آیا۔

''تم یہاں کیا کرتے ہو؟''

''میں ڈاکٹر اسمتھ کو اسسٹ کرتا ہوں۔'' اس بار بھی اس نے بلا تاخیر جواب دیا۔

''ڈاکٹر اسمتھ کہاں ہے؟''

''وہ کسی کام سے نیویارک گیا ہوا ہے اور امکان ہے کہ صبح سے پہلے کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔'' اس نے بلا ارادہ وضاحت سے جواب دیا۔

''یہ خفیہ تجربہ گاہ کس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے؟ اور ڈاکٹر اسمتھ یہاں کیا تجربہ کر رہا ہے؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکتے ہوئے یہ سوال کیا تو وہ نظریں چرا گیا اور باقی سوالوں کی طرح اس سوال کا فوری جواب نہیں دیا۔

''اوکے، اگر تم نہیں بتانا چاہتے ہو تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' اس نے گن سے عین ولسن کی پیشانی کا جائزہ لیا اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔

''رُکو..... میں بتاتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے گولی نہیں مارو گے اور زندہ چھوڑ دو گے۔'' ولسن کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا اور مدافعانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ آگے کرتے ہوئے اس نے سچ بتانے کی مشروط رضامندی دے دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں گولی نہیں ماروں گا اور زندہ چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن ایسا اسی صورت میں ہوگا کہ تم میرے ہر سوال کا بالکل ٹھیک جواب دو گے۔ اگر میں نے محسوس کر لیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو تمہاری ہڈی پسلی سلامت رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔'' اسلم نے اپنے لہجے کی تختی کو برقرار رکھا۔

''ڈاکٹر اسمتھ ماہرِ جینیات ہے اور یہاں وہ ایک اہم ریسرچ کر رہا ہے۔ میں اس کا سب سے خاص اور ذہین شاگرد ہوں اس لیے اس نے اپنے اسسٹنٹ کے طور پر میرا انتخاب کیا ہے۔ یہاں آنے سے قبل اس

نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ امریکی حکومت کی خواہش اور تعاون پر اسے ایک خفیہ تجربہ گاہ میں خاص قسم کی تحقیق کرنی ہے اور اس ریسرچ میں اس نے مجھے اس کے معاون کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میرے لیے یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ میں ڈاکٹر اسمتھ جیسے قابل آدمی کے ساتھ حکومتی سرپرستی میں کسی اہم ریسرچ میں حصہ لوں اس لیے تفصیلات جانے بغیر میں نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔ لیکن جب یہاں آ کر کام شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ جو کام ہو رہا ہے، وہ کسی طور بھی انسانی اخلاقیات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

میں نے ڈاکٹر اسمتھ کے سامنے اس سلسلے میں احتجاج کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اب میرے پاس اس کا ساتھ دینے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے۔ میں یا تو یہاں رہ کر اس کی مدد کر سکتا ہوں یا مارک کے ہاتھوں اپنی جان گنوا کر کسی گم نام قبر میں اُتر سکتا ہوں۔ ساتھ دینے کی صورت میں ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں اچھی بڑی رقم منتقل کر دی جاتی۔ یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ میرے بیوی بچوں کے اخراجات پورے ہونے کے بعد بھی اتنا بچ جاتا کہ جب میں یہاں سے فارغ کیا جاتا تو خاصا عرصہ آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ مجھے یہ پیشکش کی گئی تھی کہ اس خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مجھے میری خواہش اور مزید اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے جانے کے علاوہ کسی تحقیقی ادارے میں پُرکشش ملازمت بھی مہیا کی جائے گی۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان حالات میں میرے پاس ہامی بھر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اپنی اس رضامندی کے بعد میں پورے بارہ سال سے یہاں ہوں اور مجھے سورج کی روشنی تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ بیوی بچوں سے ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فون یا انٹرنیٹ پر بھی مجھے کسی سے رابطے کی اجازت نہیں ہے اور میں صرف خطوط کے ذریعے انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ جواب میں وہ بھی مجھے خط لکھتے ہیں اور خطوط کا یہ سلسلہ اس طرح جاری ہے کہ مجھے یا میری بیوی کو ایک دوسرے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے کہ ہم کہاں موجود ہیں۔ ان لوگوں نے میری بیوی اور بچوں کو سابقہ رہائش سے کہیں اور منتقل کر کے مجھ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر میں کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں تعاون جاری رکھوں اور اجازت ملنے پر ہی یہاں سے باعزت طریقے سے روانہ ہوں۔ لیکن واپسی کا دن، مہینہ اور سال طے نہیں ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں کھلی فضا میں سانس لیے بغیر کسی دن یہیں مر جاؤں گا اور میرے گھر والوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہاں کس قسم کی ریسرچ ہو رہی ہے؟" اسلم نے اپنے لہجے سے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ اسے اس کے آنسوؤں نے متاثر کیا ہے اور وہ ان سے متاثر ہو کر اس کے لیے کسی نرم سلوک کا سوچ رہا ہے۔

"ڈاکٹر اسمتھ نومولود بچوں پر تجربہ کر کے انہیں ایک ایسی مخلوق میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو جسمانی عمر تو کم نظر آئے لیکن ذہنی طور پر وہ کسی بالغ شخص سے بھی زیادہ سمجھ دار اور ذہین ہو۔ اس مقصد کے لیے پہلے تو مختلف اداروں سے وہ بچے حاصل کیے گئے جن کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ان کے فالتو ہونے پر انتظامیہ کو کسی قسم کی جواب دہی نہیں کرنی پڑتی۔ یہاں لائے جانے والے ان بچوں کی عمر دو چار سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور ڈاکٹر ان پر مختلف ادویات کے تجربے کرتا رہتا تھا لیکن بدقسمتی سے اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور زیر تجربہ بچے مرتے رہے۔ اس ناکامی کے بعد ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ بچوں پر ان کی پیدائش سے قبل شکم مادر میں ہی تجربے کا آغاز کرے گا۔ نومولود بچوں کے مقابلے میں حاملہ خاتون کا حصول



مشکل تھا لیکن ڈاکٹر کسی نہ کسی طرح اس مقصد میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس کا تجربہ جزوی طور پر کامیاب ہو سکا اور جو بچے پیدا ہوئے، وہ بے شک ذہین تو تھے لیکن ان میں یہ کمی تھی کہ وہ مکمل طور پر نارمل نہیں آتے تھے۔ ہارمونز کی گڑبڑ سے ان کی وقت سے پہلے داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں اور وہ جنسی طور پر بالغ مرد جیسے جذبات رکھتے تھے۔ کچھ کی قامت بھی اپنی اصل عمر کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے کوئی بھی تین چار سال سے زیادہ نہیں جی سکا اور ڈاکٹر کی دیوانگی کا سلسلہ جاری رہا۔ اب بھی یہاں تین ایسے بچے موجود ہیں۔ ان میں ایڈی سب سے بہتر ہے اور اسی لیے ڈاکٹر کا چہیتا بھی ہے۔ اس میں سیکھنے اور عمل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب سے بھی معصوم نظر آتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کی داڑھی مونچھیں بہت تیزی سے بڑھتی ہیں اور جنسی طور پر بھی سب سے زیادہ بے چین ہے۔ یہاں لائی جانے والی کسی بھی عورت کو دیکھ کر وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور اس کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ بہت تفصیل سے اس کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔

"یہاں جو عورت موجود ہے، کیا اسے بھی اسی مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟" اسلم نے پھنکارنے کے انداز میں پوچھا تو ولسن کانپ سا گیا اور زبان کے بجائے محض سر کی اثباتی جنبش میں ہی جواب دے سکا۔

"بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی ماؤں کا کیا، کیا جاتا ہے؟" خود پر بے حد ضبط کرتے ہوئے اس نے اس سے سوال کیا تو اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا جس سے اندازہ ہو گیا کہ معاملات بہت خراب ہیں۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔" اسلم غرایا۔

"ان میں سے کچھ تو زچگی کے مرحلے سے گزر کر خود ہی جان سے چلی گئیں اور کچھ کو مارک لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لیکن شک ہے کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں لوٹ سکی ہوں گی۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

اور تم.... تم محض اپنی جان بچانے کے لیے اس گھناؤنے کام میں پوری طرح شامل رہے؟" اسلم کے ذہن کی اسکرین پر دیکھا ہوا وہ منظر زندہ تھا جب اس نے ولسن کو تجربہ گاہ میں پوری دلجمعی سے مصروف پایا تھا۔

"میں مجبور تھا۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"اپنی جان بچانے کے لیے بے گناہوں کے قتل میں شامل رہنا کسی طور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔" اسلم کا لہجہ سنا تو ولسن کے چہرے پر خوف کی زردی چھا گئی۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" عالم خوف میں اس نے اسلم کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہیں ہرگز بھی گولی نہیں ماروں گا اور یہاں زندہ چھوڑ کر جاؤں گا۔" اس کی کانپتے ہوئے اسلم نے ایک بار پھر اپنے وعدے کی توثیق کی تو وہ ذرا مطمئن ہو گیا۔

"اس قسم کے بچے تیار کرنے کا کیا مقصد ہے؟" اس نے وہ سب سے اہم سوال کیا جو اس سارے معاملے کی اس وجہ کو کھول دیتا۔

"ایک تو ڈاکٹر کی اپنی ذاتی ذہنی تسکین کہ وہ، وہ کر رہا ہے جو دوسروں نے ابھی تک نہیں کیا، دوسرے روس اور اسرائیل کا مشترکہ مفاد۔ یہاں تجربے کے لیے زیادہ تر ایسی عورتوں اور ان کے بچوں کو استعمال کیا جاتا ہے جن کا تعلق مشرقی ممالک یا ایسے ممالک سے ہو جو امریکہ اور اسرائیل کے حریف ہیں۔ ان بچوں کی

برین واشنگ کر کے اُنہیں انہی کے وطن کی جاسوسی کے لیے استعمال کرنے کا پروگرام ہے۔ ملازمین، پالک یا کسی بھی شکل میں ان بچوں کو اہم عہدوں پر فائز افراد تک پہنچا کر ان کی مدد سے اہم ملکی راز حاصل جا سکتے ہیں اور امید کی جا رہی ہے کہ یہ جاسوسی کے جدید آلات اور دوسرے ذرائع کے مقابلے میں کہیں مفید ثابت ہوں گے۔"

ولسن نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ امریکہ اور اُس کے طفیلیئے اسرائیل کا شوقِ حکمرانی انہیں انسانیت کے درجے سے بہت نیچے لے گیا تھا اور کہنے کو تو وہ سپر پاور تھے لیکن حقیقت خنزیر سے بھی زیادہ بدفطرت اور کم تر کہ جس کی اخلاقیات اتنی پست ہوں، اسے تمام تر مادی ترقی کے کسی طور بھی مہذب اور ترقی یافتہ نہیں گردانا جا سکتا۔

"میں نے تمہیں ہر بات سچ بتا دی ہے۔ اب تو تم مجھے کچھ نہیں کہو گے نا؟" ولسن بھی اسی قوم کا تھا جسے اپنے ذاتی مفاد کے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ اسلم سے اپنی زندگی کی مانگنے میں مصروف تھا اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنے گھناؤنے جرم میں شریکِ کار انسانوں کو چوہوں اور حشرات الارض کی طرح تجربوں کی بھینٹ چڑھانے کے باوجود وہ اپنے لیے زندگی خواہاں تھا۔

"میں تمہیں یہاں باندھ کر چھوڑ جاؤں گا۔ آگے تمہاری قسمت کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔" اسلم نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے اسے وہاں موجود باریک تار سے باندھ کر گیا۔ اب اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جس میں ماہ بانو محوِ خواب تھی۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے اسی پوزیشن میں سوتا ہوا پایا جس میں اسکرین پر دیکھا تھا۔ تشویش ناک بات تھی کم از کم یہاں ہونے والی فائرنگ کے ردِعمل میں تو اسے اُٹھ جانا چاہئے تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اس کی طرف بڑھا اور اس کی وائٹل سائنز چیک کیں جس کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ زندہ ہے لیکن بے حد گہری نیند سو رہی ہے۔ ایسی گہری نیند جو قدرتی سے زیادہ کسی دوا کا اثر لگتی تھی۔ اپنے تصدیق کے لیے اس نے اسے آوازیں دیتے ہوئے دھیرے سے ہلایا لیکن وہ ذرا سا کسمسا کر دوبارہ سو گئی۔ اب اُس کے پاس اُسے زبردستی جگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ روم ریفریجریٹر تک گیا اور اس سے یخ بستہ پانی کی بوتل نکال کر اس پر انڈیل دی۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ بالآخر اسے جھرجھری لے کر اٹھنا پڑا۔

چند سیکنڈوں تک تو وہ بے تاثر آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھتی رہی لیکن پھر اس کے ذہن نے پہلے مراحل طے کر لیے اور وہ "اسلم!" پکارتی ہوئی تیزی سے اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر دلاسا دیتا رہا کیونکہ اسے یوں اچانک سامنے پا کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پائی اور مسلسل ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"ہمت سے کام لو ماہ بانو! یہ جذبات سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔ میں نے فی الحال یہاں موجود افراد کو قابو میں کر لیا ہے لیکن معلوم ہوا ہے کہ ان کے مزید یہاں آنے والے ہیں۔ اُن کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ تم خود کو سنبھال کر یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔ میں ذرا اس شیطانی تجربہ گاہ کو تباہ کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

ماہ بانو کا تھوڑا سا غبار نکل گیا تو اُس نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ دار اور بہادر لڑکی تھی



اور اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے اور ہر طرح کے حالات سے نمٹنے سے بھی رہی تھی۔ چنانچہ اس بار بھی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ اتنی زیادہ جذباتیت کی بھی شاید یہ وجہ تھی کہ ایک ماں کی حیثیت سے وہ اتنے دنوں تک شدید خوف کے حصار میں رہی تھی۔ اُسے یہ سوچیں کھائی جاتی تھیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے اس کے ہونے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ بچے کے باپ کو پایا تو یہ ساری ٹینشن اور غبار آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو جو کرنا ہے، کریں۔ اتنی دیر میں، میں اپنے یہ کپڑے تبدیل کر کے تیار ہوتی ہوں۔" سنبھلنے کے بعد وہ مضبوط لہجے میں اسلم سے بولی اور فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اسلم کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ تیزی سے اپنا لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس کی یہ تبدیلی اس کے لیے ضروری تھی کہ اسلم کی ٹھنڈا پانی ڈال کر جگانے کی کوشش نے اس کے لباس کو گیلا کر دیا تھا اور وہ رات کے اس آخری پہر گیلے لباس کے ساتھ جنگل میں نکل کر خود کو بیمار کرنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔

اس نے سوٹ تبدیل کر کے اس نے جو لباس پہنا، وہ ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ اس کے ملبوسات اُسے انہی لوگوں نے فراہم کیے تھے اور وہ عادی نہ ہونے کے باوجود پہننے پر مجبور تھی۔ ہاں، سر پر بھی وہ اپنا وہ واحد دوپٹہ ضرور اوڑھتی تھی جو یہاں آتے وقت اس کے جسم سے لپٹا تھا۔ اس وقت اس نے وہی بڑا سا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹا اور اپنی سمجھ کے حساب سے چند ایسی چھوٹی موٹی چیزیں ایک بیگ میں جمع کرنے لگی جو اس کے حساب سے سفر کے دوران کارآمد ہو سکتی تھیں اور جن کا بوجھ وہ اٹھا سکتی تھی۔

ادھر اسلم، مارک کے کمرے میں مصروف تھا۔ اس نے اس کی الماری میں رکھی ڈائنا مائٹ اسٹکس نکال لیں اور اب بھرپور توجہ کے ساتھ اُنہیں نصب کرنے کے طریقِ کار پر غور کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ گزارے ہوئے اپنی زندگی کے کئی سالوں میں اس نے بے پناہ تجربات حاصل کیے تھے۔ اسلحہ اس کے لیے کھلونا بن گیا تھا اور تباہی کے مناظر ٹی وی اسکرین پر چلتے کسی فلمی سین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ دو واقعات میں ایسا بھی ہوا تھا کہ انہوں نے کسی اونچی دیواروں والی مضبوط حویلی کے اندر گھسنے کے لیے ڈائنا مائٹ کا استعمال کر کے اپنے لیے راستہ بنایا تھا۔ ایک ضدی سیٹھ کی نمبروں والی تجوری کا نمبر اس سے نہ ملانے کی صورت میں بھی تجوری کا دروازہ اُڑانے کے لیے ڈائنا مائٹ ہی کام آیا تھا چنانچہ وہ اس کے استعمال سے واقف تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ اسے اس وقت استعمال کیے گئے ڈائنا مائٹ کے مقابلے میں یہ موجودہ اسٹکس زیادہ جدید اور طاقتور محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کو تجربہ گاہ کے ہر حصے میں پھیلاتا ہوا وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں ایڈی اور اس کے دو ساتھی جانوروں کی طرح پنجرے نما بیرکوں میں موجود تھے۔ وہ اس سارے قصے میں سب سے مظلوم کردار تھے اور وہ ہرگز بھی انہیں کچھ دیر بعد ہونے والی تباہی کا حصہ نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے انہیں ہونے والی کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے ان کے بیرکوں کے لاک کھول دیئے اور یہ بتایا کہ آج سے وہ آزاد ہیں اور جہاں چاہے جا سکتے ہیں۔ باقی دو نے تو یہ خبر بہت خوش ہو کر سنی لیکن ایڈی کے چہرے پر محض ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہی آ سکی۔

"کیا بات ہے لیڈی!..... کیا تم یہاں سے نہیں جانا چاہتے؟" اسلم نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

''جانا چاہتا ہوں لیکن کیسے جا سکتا ہوں؟'' اس نے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا تو اسلم کو اس کا
یاد آیا۔ مارک نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری تھی۔ بعد میں گولی تو آپریشن کر کے نکال لی گئی تھی لیکن
ایڈی اس لائق نہیں تھا کہ اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ بھاگ دوڑ کر سکے۔ اس نے تو اسے آزاد کروانے کے
اپنی بیرک سے اس کی بیرک تک کا فاصلہ بھی نہ جانے کتنی دقتوں سے طے کیا تھا اُس کی اس مشکل کا
اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دوبارہ اس جگہ سے ہلا نہیں تھا اور نڈھال سا اب تک وہیں ایک دیوار
پشت لگائے بیٹھا تھا۔

دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں وہی اسلم کا سب سے بڑا محسن تھا۔ اُس کی یہاں سے بھاگ
کوشش نے اسلم کو زیرِ زمین تجربہ گاہ کی موجودگی سے باخبر کیا تھا اور وہی تھا جس نے مارک کی جیب
چابیاں پار کر کے اس کی رہائی کا انتظام کیا تھا۔ اپنے اس محسن کو وہ بھلا کیسے نظر انداز کر سکتا تھا؟ چنانچہ
بولے اسے اپنے کندے پر اُٹھایا اور اُس کمرے تک چھوڑ آیا تھا جہاں ماہ بانو موجود تھی۔ باقی دو تو
اُچھلتے کودتے باہر نکل چکے تھے۔

''تم دونوں تھوڑی دیر میرا انتظار کرو۔ میں اپنا کام مکمل کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔'' انہیں ہدایت
کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو جو اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی تیاری کر چکی تھی، ایڈی کو دیکھ
اس کا تر و تازہ نظر آنے والا چہرہ خاصا خون بہہ جانے کے باعث کچھ زرد پڑ گیا تھا لیکن بہرحال وہ
معصوم اور پُرکشش لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے پر پایا تھا۔

ایڈی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آنے پر اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں اور یاد آ گیا کہ ایڈی
لمس نے اس کے اندر کیا احساس جگایا تھا۔ وہ اپنے عجیب و غریب حلیے کے ساتھ مردنما بچہ یا بچہ نما مرد
سے ایک عورت کی حیثیت سے وہ کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ مسلسل نظریں جھکا کر بیٹھے ایڈی نے شاید
یہ کیفیت بھانپ لی چنانچہ نظریں اٹھائے بغیر ہی دھیرے سے بولنے لگا۔

''آئی ایم سوسوری میڈم! میری وجہ سے اُس رات آپ کو یقیناً کافی کوفت اُٹھانی پڑی تھی۔ لیکن
کریں کہ میں بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری مجبوری
ہوئے مجھے معاف کر دیں گی۔ کیونکہ میری ماں بھی بالکل آپ ہی کی طرح ایک مجبور عورت تھی جو ان لوگوں
قید میں رہ کر مجھ جیسے غیر معمولی بچے کو جنم دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں جو ہوں، جیسا ہوں، اس میں
سے زیادہ ان انسانی ہاتھوں کی چھیڑ چھاڑ کا قصور ہے جو اپنے نہ جانے کن مقاصد کے حصول کے لیے
تجربات کر رہے ہیں۔''

ایڈی جوں جوں بولتا جا رہا تھا، ماہ بانو کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات کے ساتھ
بے پناہ خوف کی کیفیت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ خوف اپنے ہونے والے بچے کے لیے تھا اور وہ سوچنے
ہو گئی تھی کہ کیا اس کا بچہ بھی ایک ایب نارمل بچہ ہو گا؟

''چلو بھئی، اب رُکنے کا وقت نہیں ہے۔ اس جگہ کو تباہ ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا
سے قبل کہ وہ مزید کچھ سوچتی، اسلم عجلت بھرے انداز میں وہاں آ کر بولا اور ایڈی کو اپنے شانے پر اٹھا
بانو دیکھ رہی تھی کہ اسلم خود بھی زخمی ہے۔ خصوصاً اس کے چہرے پر کئی چھوٹے چھوٹے زخم تھے جو
تجربہ گاہ کا سامان پھینک پھینک کر مارنے سے آئے تھے۔

ان زخموں میں پیشانی کا زخم ذرا زیادہ گہرا تھا جس سے خون نکل کر جم گیا تھا لیکن ان کے پاس



کہ وہ مرہم پٹی کے جھنجٹ میں پڑ سکتے۔ ناچار ماہ بانو کو اپنے دل پر جبر کرنا پڑا اور وہ اسلم کے پیچھے اس
سے باہر کی دنیا کی طرف جانے لگی جہاں اسے ڈاکٹر طارق کے دھوکے نے پہنچا دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

گاندھی نگر سے ممبئی تک کا سفر پُل صراط کا سفر تھا جو شہریار نے بظاہر پُرسکون رہتے ہوئے اندیشوں سے
طرح دھڑکتے دل کے ساتھ طے کیا تھا۔

فراخ میں اس کا ارادہ تھا کہ ٹرک کو احمد آباد لے جائے گا جہاں کلام کے ساتھی حسبِ وعدہ مدد کے لیے
ہی تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر ڈاکٹر فرحان کو احمد آباد تک لے آیا جائے تو وہ وہاں سے ان کے
جانے کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے شہریار کو یہ مناسب نہیں لگا۔ احمد آباد اور
گر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ گاندھی نگر سے نکلنے والے سب سے پہلے
کا رخ کریں گے۔ اس لیے خدشہ تھا کہ ''را'' کے کتے وہاں ان لوگوں کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ بھارتی ایجنسیاں اُنہیں گاندھی نگر میں نہ پا کر خاموش نہیں بیٹھیں گی۔ وہ
گر سے لے کر مشرقی پنجاب کے ہر اس گاؤں تک اپنے جاسوسوں کا جال بچھا دیں گے جس کی سرحد
سے ملتی ہو گی۔ کیونکہ اس حقیقت سے وہ بھی واقف تھے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان انسانوں
لے کر ہر جنس کی اسمگلنگ کے لیے سب سے زیادہ یہی بارڈر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان علاقوں میں
اور بھارتی دونوں ایجنسیوں کے روابط تھے اور جس کا داؤ چل جائے، وہ وہاں کامیابی حاصل کر سکتا
موجودہ حالات میں بہرحال بھارتی ایجنسیوں کو برتری حاصل تھی۔

اگر فرحان کو ان کی سرحدی حدود سے نکال کر لے جانے کی کوشش کی جاتی تو وہ اپنے اختیارات کا پورا
استعمال کر سکتے تھے جبکہ پاکستان والوں کو بہرحال سب کچھ چھپ چھپا کر کرنا تھا۔

اسے ایک ڈر یہ بھی تھا کہ گاندھی نگر سے ممبئی کے لیے نکلنے والا ڈیری کمپنی کا ٹرک اگر احمد آباد میں رُکتا تو
کے کان کھڑے ہو جاتے اور فوری طور پر ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس
تھا کہ ٹرک جس رُوٹ پر نکلا ہے، اسی پر سفر کرنے دیا جائے تاکہ شک کے مواقع پیدا نہ ہوں۔

اگر فرحان کو ایک بار بہ حفاظت ممبئی پہنچانے کے بعد وہ ان کی بھارت سے واپسی کا کچھ نہ کچھ
کر ہی لیتے۔ فی الحال تو موجودہ حالات سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا یہ سفر بخیر و
انجام کو پہنچا۔ راستے میں کچھ مقامات پر معمول کی چیکنگ ضرور ہوئی لیکن ٹرک کی اس انداز میں تلاشی
کوشش نہیں کی گئی کہ جگہ جگہ پورے ٹرک کے کارٹنز اُتروائے اور رکھوائے جاتے۔

طویل سفر طے کر کے وہ ممبئی کی حدود میں داخل ہوئے تو شہریار کو تھوڑا سکون محسوس ہوا اور اس نے
سے رابطہ کر کے اسے اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔

''ٹرک جس جگہ لے جایا جا رہا ہے، وہیں جانے دو۔ اپن ابھی وہاں سے تمہارے اور دوسروں کے نکلنے
کا بندوبست کرتا ہے۔'' اطلاع سن کر عبدالرحمٰن نے اپنے مخصوص انداز میں تسلی دی۔ چنانچہ وہ اطمینان سے
گئے جہاں ٹرک کو اَن لوڈ کیا جانا تھا۔

اس کام کے لیے اس نے ایک حد تک تو وہاں موجود لوڈز کی مدد لی لیکن جب سلّو اور ڈاکٹر صاحب کے
ہونے کی حد آئی تو وہاں موجود دونوں لوڈرز کو بہانے سے ہٹا دیا۔

''شکر ہے اس قید سے نجات تو ملی۔ ٹانگیں اکڑ گئی تھیں ایک پوزیشن میں پڑے پڑے۔'' کارٹنز ہٹتے ہی

نمودار ہونے والے سلّو نے کلمۂ شکر ادا کیا۔ حقیقتاً ٹرک کے ایئر کنڈیشنڈ ہونے کے باوجود بھی اس تنگ سی میں بیٹھ کر سفر کرنا ان دونوں کے لیے خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ زادِ راہ کے طور پر رکھی گئی پانی کی سے انہوں نے پانی بھی بے حد قلیل مقدار میں پیا تھا کہ زیادہ پانی پینے کی صورت میں اس کے اخراج مسئلہ پیش آ جاتا۔ اُٹھائی جانے والی اس صعوبت نے سلّو سے زیادہ ڈاکٹر فرحان پر اثر ڈالا تھا۔ وہ سلّو نسبت عمر میں کافی زیادہ تھے اور سب سے بڑھ کر انہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال ''را'' جیسے درندوں تحویل میں گزارے تھے جنہوں نے ان کے جسم سے تمام تر توانائیاں نچوڑنے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی پانچ سال کے اس عرصے میں ان کی جسمانی صحت اپنی طبعی عمر سے تین گنا زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ، وہ آدمی نہیں رہے تھے جو ملک وقوم کے مفاد کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کام کرنے کی خواہش تھا۔ ان کا تو وہ حال کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ کام کے لائق ہونے کے لیے انہیں ایک عرصہ چاہئے تھا۔

شہریار نے بڑی محبت اور احترام سے سہارا دے کر انہیں نیچے اُتارا اور اس کمرے کی طرف جہاں اس عمارت کے منیجر کی تختی لگی ہوئی تھی اور عبدالرحمٰن کی ہدایت کے مطابق اس کی طرف اشارہ ملنے تک انہیں اسی کمرے میں رہ کر انتظار کرنا تھا۔ اس کمرے تک خود کو منیجر کہنے والے شخص ان کی راہنمائی کی تھی اور شہریار کو یقینِ واثق تھا کہ یہ شخص عام سا کاروباری منیجر نہیں ہوگا بلکہ ان سا دھندوں میں بھی حصہ لیتا ہوگا جو بھائی جی کا حقیقی ''کاروبار'' تھے۔

منیجر کے کمرے میں اٹیچڈ باتھ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ان تینوں نے باری باری اس سہولت فائدہ اٹھایا۔ ان کے فریش ہو کر واپس آ بیٹھنے تک منیجر ان کے لیے ناشتے کا بندوبست کر چکا تھا۔ وہ آدمی تھا جو ان کے ہر ممکن آرام کا تو خیال رکھ رہا تھا لیکن کسی قسم کے سوال جواب کی زحمت میں نہیں تھا۔ ابھی وہ لوگ ناشتے کے آخری مراحل میں ہی تھے کہ اطلاع ملی، ان کے لیے گاڑی پہنچ چکی ہے۔

ان تینوں نے بہ عجلت ناشتہ ختم کیا اور منیجر کی راہنمائی میں ہی سیاہ شیشوں والی اس گاڑی تک ایک گن مین اور ڈرائیور کے ساتھ انہیں لے جا کے لیے آئی تھی۔ منیجر سے مصافحہ کر کے وہ تینوں کی پچھلی آرام دہ نشست پر براجمان ہو گئے۔ نئے ماڈل کی قیمتی گاڑی سبک رفتاری سے سڑکوں پر دواں ہو گئی۔ ممبئی جیسے اہم اور بڑے شہر میں جہاں پولیس کی ایک بڑی نفری سڑکوں اور شاہراہوں پر دیتی ہے، وہ تین نہایت مطلوب افراد صرف اس لیے مزے سے سفر کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گئے جس گاڑی میں سفر کر رہے تھے، وہ ممبئی کے ایک ایسے غنڈے کی ملکیت تھی جس کا راج انڈر ورلڈ میں جاتا تھا۔

''واہ میرے شیر جوانو!..... تمہیں دیکھ کر اپن کو بڑی خوشی ہوئی۔ اپن پہلے ہی جانتا تھا کہ تم مکمل کر کے ہی واپس لوٹے گا۔'' کوٹھی کے پورٹیکو میں عبدل نے کھلی بانہوں سے اس طرح ان کا کیا جیسے وہ اس کے دیرینہ ساتھی ہوں۔ یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جہاں اب تک انہیں رکھا گیا تھا۔ یہ دوسری

''کلام کا کیا حال ہے؟'' اس سے معانقہ کرنے کے بعد شہریار نے سب سے پہلا سوال اس کے بارے میں کیا۔ ٹانگ میں لگنے والی گولی کے باعث وہ اسے یہاں چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو لیکن اس کا دھیان بہرحال رہا تھا۔

''وہ ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ ابھی اندر چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔'' عبدالرحمٰن نے شانے پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا اور اپنے ساتھ ہی لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔



''پہلے ڈاکٹر صاحب کے آرام کا انتظام کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔'' عبدالرحمٰن ان لوگوں کو لے کر لاؤنج میں آیا تو شہریار نے مطالبہ کیا پھر سلّو سے بولا۔ ''اگر تم چاہو تو تم بھی آرام کر سکتے ہو۔''

''نہیں، میں سیٹ ہوں۔'' اس نے پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ جو تھکن ہوئی تھی، وہ مختصر سمٹ کر بیٹھے رہنے کے باعث ہوئی تھی۔ بعد میں چلنے پھرنے اور ہاتھ پیر کھولنے کا موقع ملا تو وہ خود کو محسوس کرنے لگا۔ شہریار بھی اس کی فطرت سے واقف تھا چنانچہ انکار سننے کے بعد دوبارہ آرام کے لیے نہیں کیا البتہ ڈاکٹر فرحان کو ایک ملازم کے ساتھ خواب گاہ میں بھیج دیا گیا۔

''تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔'' ڈاکٹر فرحان کے وہاں سے جانے کے بعد عبدالرحمٰن نے سنجیدہ کے ساتھ انہیں اطلاع دی۔ شہریار منہ سے کوئی سوال کیے بغیر اس بُری خبر کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''تم لوگ جس لڑکی عائشہ کے مکان میں پناہ لیے ہوئے تھے، وہاں ایک حادثہ پیش آ گیا۔ یہ نہیں پتہ سکا کہ حادثہ کیسے ہوا۔ بس چوکیدار نے مکان سے آگ کے شعلے اُٹھتے دیکھے تو شور مچایا اور ہاؤسنگ اسکیم کو جمع کر لیا۔ لوگوں نے اپنے طور پر بھی کوشش کی اور فائر بریگیڈ کو بھی بلوایا لیکن آگ بجھانے میں ہو گئی کہ وہاں موجود عائشہ کا پتی زندہ نہ بچ سکا۔ لوگوں نے کوشش کی کہ عائشہ کو فون کر کے حادثے کی دیں لیکن اس کا موبائل آف تھا۔ حالات نے عائشہ کا کردار خود ہی مشکوک کر دیا۔ وہ چوکیدار کے اپنے پتی کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال لے گئی تھی لیکن اس کے گھر سے اس کے پتی کی جلی ہوئی لاش پولیس نے ہسپتالوں سے پوچھ گچھ کی تو کہیں کسی ہسپتال سے عائشہ کا پتہ نہیں ملا۔ گاندھی نگر میں تم لوگوں سے جو حالات پیدا ہو گئے تھے، اس کے بعد یہ ایک چونکا دینے والا واقعہ تھا۔ چنانچہ پولیس پوری شدو عائشہ کو تلاش کرنے لگی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ عائشہ کے ڈیری فارم سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ سے پہلے ہی حادثے کی خبر ٹیلی ویژن پر آ گئی اور میرے آدمیوں نے صورتِ حال واضح ہونے سے اسے جانے سے روک دیا۔ حالات پتہ چلنے کے بعد تو اسے جانے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اب تک وہ وہیں ہے اور بہت پریشان ہے۔ وہ اپنے پتی کے جنازے میں شرکت کے لیے جانا ہے لیکن ہم اسے روکنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ گئی تو لازمی اریسٹ کر لی جائے گی اور اس کے بعد پولیس لیے یہ جاننا بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا کہ تم لوگوں کو گاندھی نگر سے نکالنے میں ہم لوگوں کا ہاتھ ہے۔ بھائی بہت طاقتور ڈان ہیں لیکن کبھی اس طرح کے معاملات میں ان کا پولیس اور ایجنسیوں سے کوئی لفڑا نہیں ہوا اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کا نام کسی طور سامنے نہ آئے۔ اپنے پاس اس مسئلے کا ایک سادہ سا حل تو یہ تھا لڑکی کو مار کر اس کی لاش کہیں پھینک دیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ لیکن اپن نے ایسا کوئی صرف اس لیے نہیں دیا کہ تم کو شاید اچھا نہ لگے۔''

''تم نے اچھا کیا کہ ایسا نہیں کیا۔ عائشہ ہماری محسن ہے اور ہم اپنی محسن کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی سکتے۔ تم بس اتنا کرو کہ جب تک ممکن ہو، اسے پولیس کی پہنچ سے دور رکھو۔ مجھے امید ہے کہ تھوڑے میں اس کیس کی دُھول بیٹھ جائے گی تو ہم عائشہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ابھی تو ریم ناتھ بھی وہیں ہے اور اس نے بہت ہنگامہ ڈال رکھا ہوگا۔ وہ واپس آ جائے تو عائشہ کو وہاں سے نکالنے کی سوچنا۔''

اس نے عبدالرحمٰن کی پوری بات نہایت اطمینان سے سنی اور مشوروں سے نوازا۔ حقیقتاً اسے عبدالرحمٰن عائشہ کو قتل کروا دینے کی تدبیر سن کر بہت غصہ آیا تھا لیکن وہ محض اس لیے ضبط کر گیا تھا کہ ایک تو جانتا تھا جرائم کی دنیا کے قواعد وضوابط کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں لوگوں سے کام نکال لینے کے بعد انہیں تصور کیا جاتا ہے۔ اور عائشہ تو ایک ایسا کردار تھا جس کی وجہ سے خود انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال تھا اس اگر عبدل نے اس کے قتل کی بات سوچ لی تھی تو کچھ انوکھا نہیں کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم لوگ چاہو۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس لڑکی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ لیکن تم کہ تم نے بھائی جی کے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟ ان کا دشمن اشوک روز بروز ترقی کر رہا ہے اور بھائی چاہتے ہیں کہ اب اس کا سر کچل دیا جائے۔ ورنہ آگے چل کر وہ ان کے لیے بڑی پریشانی کھڑی کر سکتا

''اب ہمیں اسی مسئلے پر توجہ دینی ہوگی۔ ہمیں اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن تم خود سوچو کہ تک ڈاکٹر صاحب کے بھارت سے نکلنے کا انتظام نہیں ہو جاتا، ہم خود کو کسی دوسرے مسئلے میں کیسے پھنسا ہیں؟ اس طرح تو ان کے لیے حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے حالات دیکھتے ہوئے ہی ہم نے انہیں مشرقی پنجاب کے راستے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اور ممبئی جیسے بھرے شہر میں لے کر آ گئے ہیں۔''

''وہ بندوبست بھی میں کر دوں گا۔ لیکن یہ ہمارے ایگریمنٹ میں شامل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ کام کا تمہیں بھائی جی کو معاوضہ دینا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ارجن اگروال کے لاکر سے ہم جو کچھ لے کر آئے تھے، وہ تم لوگ رکھ لینا۔'' وہ مہمل بات کا مطلب فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ ''را'' کے اہم ایجنٹ ارجن اگروال کے گھر کارروائی کرتے ہوئے وہ اس کی تجوری سے بہت بڑی رقم اور ہیرے جواہرات بھی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ سارا مال عبدل اور بھائی کے پاس ہی بطور امانت رکھا ہوا تھا اور ظاہر ہے اتنی دولت دیکھ کر ان لوگوں کی نیت خراب ہو رہی تھی اس موقع پاتے ہی دولت کو اپنے قبضے میں کرنے کی تدبیر بھی سوچ لی گئی تھی۔

شہریار کے لیے لوٹ کے اس مال کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے فوراً ہی اس سے دستبردار ہونے ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک تو سب سے قیمتی اثاثہ بس ڈاکٹر فرحان تھے جنہیں وہ ہر حال میں یہاں سے سلامت لے جانا چاہتا تھا۔

''میں بھائی جی کو تمہاری اس آفر کے بارے میں بتاؤں گا۔ انہیں دولت کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن لوگوں کے ذریعے یہ کام کروایا جائے گا، انہیں بہت بھاری رقم دینی پڑے گی تب ہی وہ کام پر راضی گے۔'' عبدل کو اس کے جواب نے خوش کر دیا تھا لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے ایسی وضاحت دے رہا تھا۔ شہریار کو اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا چنانچہ کسی بھی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر ایک بار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

اس بار عبدل نے اپنے ایک آدمی کو بلا کر انہیں کلام تک پہنچانے کی ہدایت کی اور خود واپسی کی اجازت لینے لگا۔

''ایک اور اہم خبر دینا تو اپن بھول ہی گیا۔'' ہاتھ ملا کر رخصت ہوتے ہوئے اسے اچانک کچھ یاد سر پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کی طرف پلٹا۔

''کیسی خبر؟'' شہریار کے ہونٹ سرسرائے۔



''اشوک صاحب کے پاس سے اسلحے کا کنٹینر پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ سنا ہے اس کا مہمان بھی دو چار دن بعد واپس جانے والا ہے۔''

اس نے واقعی بہت اہم اطلاع دی تھی۔ شہریار فوراً ہی اس سے دیگر تفصیلات پوچھنے لگا کہ اسلحہ کس سے لے جایا جا رہا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہیں۔

مہدل اس سلسلے میں اسے چند ادھوری معلومات ہی فراہم کر سکا۔ لیکن یہ بھی بہرحال اس کے لیے اہم جن کی بنیاد پر وہ آئندہ کوئی نہ کوئی لائحہ عمل طے کر ہی لیتا۔ البتہ یہ طے تھا کہ اس سلسلے میں وہ خود اپنے نہیں چلا سکے گا اور پاکستان میں بیٹھے اس کے ساتھیوں کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

''آپ کو کامیاب و کامران اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' عبدل کو رخصت کر کے وہ کلام سے ملنے پہنچے تو اس نے کھلی بانہوں اور جگمگاتی آنکھوں سے ان کا استقبال کیا۔

''خوشی تو تمہیں دیکھ کر بھی ہو رہی ہے۔ تم پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو۔'' شہریار نے فوراً ہی محبت اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ کلام پہلے کی نسبت واقعی بہت بہتر ہو گیا تھا اور اس کے سے وہ زردی غائب ہو گئی تھی جو خون کے بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ اتنی جلدی کے اندر در آنے والی تبدیلی کا مطلب تھا کہ اس کا یہاں بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ خود کلام نے اس کی تصدیق کر دی کہ یہاں اسے بہترین سہولیات فراہم کی جا رہی تھیں۔

''یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم ذہنی طور پر بھی خود کو تیار کر لو۔ اب تمہیں جلد ہمارے ساتھ یہاں سے نکلنا ہے۔ یہاں کے چند معاملات ہیں، وہ نمٹ جائیں تو میں عبدالرحمٰن اور بھائی جی سے جلد از جلد یہاں سے اس کا مطالبہ کروں گا۔'' اس نے کلام کو تسلی دی۔

''یہ لالچی لوگ ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے جو کچھ آپ انہیں دے چکے ہیں، اس کے علاوہ بھی منہ کھولیں گے۔'' اب تک خاموشی سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے سلّو نے لب کشائی کرتے ہوئے اپنا ظاہر کیا۔

''انہیں منہ کھولنے دو۔ ضرورت پڑنے پر کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔'' شہریار نے اُسے تسلی لیکن حقیقتاً ان جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں میں کھیلنا خود اسے بھی کھل رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

ایڈی کا وزن زیادہ نہیں تھا لیکن اسلم نے اس کے ساتھ ہی اپنا بیگ بھی اٹھایا ہوا تھا۔ پھر بہت دنوں کی آرامی اور آوارہ گردی بھی تھی جس نے جسم کے ہر حصے میں تھکن بھر دی تھی۔ چنانچہ اس کے جسم کو ایڈی کا اچھا خاصا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اسے نیچے نہیں اُتار سکتا تھا۔ ایڈی اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے چلنے کے نہیں تھا اور ان کے سامنے طویل و دشوار مسافت تھی۔

یہ ایڈی ہی تھا جس کی وجہ سے وہ ماہ بانو سمیت زیرِ زمین تجربہ گاہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے اس ایڈی کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے ماہ بانو کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی۔ وہ جس حالت میں تھی، اس کے لیے یہ مشقت بہت کڑی تھی۔ جنگل کا یہ سفر کسی سیدھی سادی شاہراہ پر چلنے جیسا نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر رکاوٹیں اور دشواریاں تھیں۔ کہیں راستہ ناہموار تھا تو کہیں زمین اس حد تک نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔ زمین پر بچھی جنگلی بیلیں اژدہے کی طرح پیروں سے لپٹ کر قدموں کو جکڑ لیتی تھیں تو پتوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ہی قریب سے کسی

خطرناک سانپ یا جانور کے گزر جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود ماہ بانو بہت ہمت اور بلند حوصلے سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ہی بری طرح لڑکھڑا کر گری۔

اس سے دو قدم پیچھے چلتے اسلم نے فوراً ایڈی کو نیچے اُتارا اور ماہ بانو کی طرف لپکا۔ وہ زمین پر گری ہوئی سے کراہ رہی تھی۔ اسلم نے دیکھا کہ اس کا دایاں پاؤں ایک بیل میں اُلجھ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ گر گئی تھی۔ اس نے اپنا خنجر نکال کر بیل کو کاٹا اور پھر ماہ بانو کے اس گھٹنے کی طرف دیکھا جسے وہ پکڑ کر بیٹھی تھی۔ گرنے کی وجہ سے اس کا گھٹنا چھل گیا تھا اور گھٹنے پر سے پھٹ جانے والے ٹراؤزر میں سے خون سرخی نظر آ رہی تھی۔

اس کا خون بہتے دیکھ کر اسلم کے دل کو دھچکا لگا۔ ماہ بانو وہ عورت تھی جسے وہ ہمیشہ پھولوں کی سیج پر بٹھا رکھنا چاہتا تھا جس نے اس کے اندر دوبارہ زندگی جینے کی چاہت پیدا کی تھی اور جس کی خاطر وہ اپنی نفرتیں اور دشمنیاں فراموش کر بیٹھا تھا لیکن عجیب بے بسی تھی کہ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود وہ اسے زندگی دینے سے قاصر تھا جس میں سکون اور شانتی ہو۔

یہ ان دونوں میں سے جانے کس کی قسمت کا اُلٹ پھیر تھا کہ زندگی چند دن سے زیادہ سیدھی شاہراہ سے گزرتی تھی اور پھر پٹڑی سے نیچے اُتر آتی تھی۔ پٹڑی سے اُتری ہوئی زندگی کو چلانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ قدم قدم پر اپنی بے بسی کا احساس ہوتا تھا اور پھر حوصلوں کو یکجا کر کے چلنے کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

''کیا ہوا؟..... بہت درد ہو رہا ہے کیا؟'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں اُترتی نمی کو دیکھ کر استفسار اور اسے سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس اچانک ہی پیر اُلجھ گیا تھا، اس لیے خود کو سنبھال نہ سکی۔'' اس کے سہارے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی اعلیٰ ہمتی کا مظاہرہ کیا۔

''تم چل تو سکو گی نا؟'' اسلم کی تشویش اپنی جگہ برقرار تھی۔

''آپ فکر مت کریں، مجھے بس معمولی سی چوٹ لگی ہے۔'' ماہ بانو نے مسکرا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ حالانکہ سچ یہ تھا کہ وہ اچھی خاصی تکلیف محسوس کر رہی تھی لیکن اس پر صرف اس لیے ظاہر نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس کی وجہ سے کسی امتحان میں نہ پڑ جائے۔

ایڈی کی حالت اس کے بھی سامنے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اسلم نے اسے نہ اٹھایا تو وہ اس جنگل میں اپنے بل بوتے پر زیادہ سفر نہیں کر سکے گا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ ہم جتنا فاصلہ طے کر سکیں، اُتنا ہی بہتر ہے۔''

مطمئن اسلم بھی نہیں تھا لیکن حالات نے اسے ماہ بانو کی بات پر یقین کر لینے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ ایک بار پھر ایڈی کو اپنے شانے پر لاد کر چل پڑا۔

ماہ بانو اب اس کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس نے سہارے کے لیے اسلم کا بایاں بازو تھام رکھا تھا۔ ایڈی کے ساتھ ہی اسلم نے اسی جیسے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی آزادی دلائی تھی۔ وہ دونوں فاصلے تک انہیں اپنے آس پاس دکھائی بھی دیئے تھے لیکن پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ان کے ان دونوں کے لیے غور و فکر کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اسلم تجربہ گاہ میں جو ڈائنامائٹ لگا کر آیا تھا، اس بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ وہ آدھے گھنٹے بعد پھٹنا شروع ہو جائیں گے۔ ڈائنامائٹ کے پھٹنے کے بعد



[illegible] کا بندوبست اس نے خود ہی کیا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ دھماکوں سے پہلے وہ لوگ محفوظ فاصلے پر پہنچ [illegible]۔ اسے ان دھماکوں کے دیگر نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ دھماکے ہوتے تو آگ بھی بھڑکتی اور جنگل میں [illegible] والی آگ کیسی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے، یہ کوئی عام فرد بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے تو خیر اپنی زندگی کا [illegible] حصہ جنگل میں گزارا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ہر ممکن پھرتی کے ساتھ جلد از جلد خطرے کی حد سے باہر [illegible] جائیں۔

[illegible] کے ادراک کی وجہ سے ہی وہ ماہ بانو کو بھی مشقت میں ڈالے اپنے ساتھ جلدی جلدی چلنے پر [illegible] رہا تھا۔

اس اعصاب شکن صورتِ حال میں اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید اس نے تجربہ گاہ کی تباہی [illegible] کر کے کوئی غلطی کر دی ہے۔ اگر وہ یہ انتظام نہ کرتا تو کم از کم فوری خطرہ ان کے سروں پر نہ منڈلا رہا [illegible] لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود ہی اپنے فیصلے کو درست قرار دے دیا۔ اس تجربہ گاہ میں جو شیطانی [illegible] کیے جا رہے ہیں، ان سے دیگر انسانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے تجربہ گاہ کی تباہی ٹھیک تھی۔ اسے اندازہ [illegible] ایسی تجربہ گاہیں بنانے کے لیے بہت کثیر سرمایہ اور وقت صرف ہوتا ہے اور ان کا دوبارہ قیام اتنی آسانی [illegible] نہیں ہوتا۔ اس لیے دیکھا جائے تو تجربہ گاہ کی تباہی انسانیت دشمن امریکیوں اور اسرائیلیوں کے منہ پر [illegible] طمانچہ ثابت ہوتی۔

اگر وہ تجربہ گاہ کی تباہی کا بندوبست کر کے نہ آتا تو بعد میں وہ لوگ محض تھوڑے سے افرادی نقصان کے [illegible] دوبارہ اپنی سرگرمیاں شروع کر دیتے۔ لیکن اب یہ سب آسان ثابت نہیں ہوتا۔ تجربہ گاہ کے ساتھ وہاں [illegible] مواد اور قیمتی آلات و کیمیکلز وغیرہ بھی ضائع ہو جاتا۔

اس شیطانی تحقیق میں ڈاکٹر اسمتھ کے دستِ راست ولسن کو بھی ان دھماکوں میں ختم ہو جانا تھا۔ اسلم نے [illegible] وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے گولی نہیں مارے گا اور وہاں زندہ چھوڑ کر جائے گا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا تھا [illegible] اس کو وہاں زندہ حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بعد میں وہ دھماکوں کے نتیجے مارا جاتا تو اس میں اس کا کوئی [illegible] نہیں ہوتا۔

اگرچہ ولسن نے خود کو مجبور اور بے بس ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اسلم اس کے مؤقف سے [illegible] نہیں ہو سکا تھا۔ صرف اپنے اور اپنے خاندان کی زندگی بچانے کے لیے بہت سوں کی زندگیاں تباہ اور ختم [illegible] کے عمل میں شریک ہو جانے کا اخلاقی جواز نہیں بنتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آپ اپنی ان [illegible] خدمات کے عوض خطیر معاوضہ وصول کر رہے ہوں اور آپ کا خاندان بھرپور عیش و عشرت کی زندگی [illegible] میں مصروف ہو۔

''اب اور کتنا چلنا ہے؟'' ماہ بانو شاید تھکنے لگی تھی جو اس نے ہانپتے ہوئے اسلم سے دریافت کیا۔ اسلم [illegible] کی کیفیت کو محسوس کیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''بس تھوڑی ہمت اور کرو۔ پھر ہم اس راستے تک پہنچ جائیں گے جو سیدھا جنگل سے باہر جاتا ہے۔''

[illegible] میں ایسا کوئی راستہ فی الحال ان کے سامنے تھا ہی نہیں۔ وہ خود اس جنگل کی وسعتوں میں کئی دن [illegible] کے بعد تجربہ گاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ واپسی میں کتنا وقت لگ جائے [illegible] اس کے بیگ میں میپ اور کمپاس موجود تھا لیکن ان سے مدد بھی وہ محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد لینا چاہتا [illegible] تو بس یہی فکر دامن گیر تھی کہ دھماکوں سے قبل جتنا فاصلہ طے کیا جا سکتا ہے، کر لے۔ پھر آگے کی بعد

میں دیکھی جاتی۔

اُس کی یہ خواہش خاصی حد تک پوری ہوئی۔ اور جب پہلے دھماکے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اتنی مدھم تھی کہ ماہ بانو اور ایڈی بھی نہیں سمجھ سکے کہ کیا ہوا ہے۔

''لیٹ جاؤ.....زمین پر لیٹ جاؤ۔'' اس نے چیخ کر ماہ بانو سے کہا اور خود بھی ایڈی سمیت لیٹ گیا۔ ان کے لیٹتے ہی پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور زمین لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''یا اللہ!.....یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اسلم کی کارروائی سے ناواقف ماہ بانو نے لرزتی آواز میں کہا۔

''تجربہ گاہ کی تباہی۔'' اسلم نے اسے مختصراً آگاہ کیا۔ جواب میں اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا چپ چاپ نیچے پڑی رہی۔

شوخ مزاج ایڈی بھی اس وقت خاموش تھا۔ اس کی ٹانگ کا زخم تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے اس تکلیف کو ظاہر کرنے سے گریزاں تھا۔

آخر کار مسلسل جاری دھماکوں کا سلسلہ تھما تو وہ لوگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیٹھے اور پہلی بار پانی کے گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتارے۔

پانی پینے کے بعد اسلم نے اپنی بیگ سے نقشہ اور کمپاس نکالا اور راستے کا تعین کرنے لگا۔ ایڈی اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اپنی عمر سے قطع نظر ذہنی پر وہ بہت پختہ تھا اور کسی بالغ فرد کی طرح مفید مشورہ دینے کا اہل بھی۔ اس لیے اسلم کو اس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

اُن کی اس مصروفیت کے دوران ماہ بانو کچھ دیر تو بیٹھی رہی پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ کھڑے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر دُور بہت دُور ایک سرخ بگولے جیسی شے پر پڑی۔

''یا میرے اللہ!.....وہ کیا ہے؟'' وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بہت زور سے بولی تو اسلم اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں وہ ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔

''جنگل میں دھماکوں کی وجہ سے آگ لگ گئی ہے۔'' بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے اسے آگاہ کیا تو وہ سراسیمہ ہو گئی۔

''آگ.....جنگل میں آگ۔'' لفظ سرسراتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے نکلے۔

''ہاں، جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ لیکن یہ ابھی بہت دُور ہے.....اگر ہم نے ہمت اور مستقل مزاجی سے کام لیا تو انشاء اللہ کسی مصیبت میں پڑے بغیر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

اس نے بڑے یقین سے ماہ بانو کو حوصلہ دیا لیکن اپنی طرف لپکتی آگ کے شعلوں کو سامنے دیکھ کر پکڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اور زیرِ لب بڑبڑائی۔

''اے میرے اللہ! اور کتنے امتحان باقی ہیں میری زندگی کے؟..... میں کبھی مصیبتوں کے اس گھیرے سے نکل بھی پاؤں گی یا نہیں؟''

⊛----✪----⊛

''آؤ جاوید! کہو تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟''

''سوسو سر!.....گووندا سے ہم نے بہت کچھ اُگلوا لیا تھا اور ان معلومات کی روشنی میں خاصی سرگرمی دکھائی لیکن آپ جانتے ہیں کہ چند چھوٹی مچھلیوں اور اسلحے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔''

جاوید علی سمجھ رہا تھا کہ ذیشان نے اسے خاص طور پر بلوا کر جو قصہ چھیڑا ہے، وہ اصل بات کے ساتھ



ہے۔ ورنہ انچارج کی حیثیت سے ذیشان کو ہر بات کی اچھی طرح خبر ہے۔

''یہ بھی کم نہیں۔ غیر قانونی اسلحے اور اس کے ان چھوٹے چھوٹے ڈیلروں نے حقیقت میں بڑی تباہی مچا رکھی ہے۔ اسلحہ اتنا عام ہونے کی وجہ سے آج حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ لوگ پچاس کے ایک نوٹ کے لیے دریغ ایک دوسرے پر گولیاں چلا دیتے ہیں۔''

ایشان نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ اس سے اختلاف نہیں کر سکا۔ یہ تو واقعی وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ کم عمر کے بچوں کے پاس بھی ہتھیار نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان ہتھیاروں کی تباہی کو سمجھے بغیر خود کو ہیرو محسوس کرتے ہوئے ہیرو سمجھتے تھے۔ ان بچوں کے ہاتھوں میں کتاب اور قلم کی جگہ ہتھیاروں کا ہونا اتنا المیہ تھا کہ پوری قوم کو اس پر ماتم کی ضرورت تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت کی بے چینی کو چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے سکون نہیں ملتا اس لیے خود تمہارے لیے ایسے ٹاسک تلاش کرتا رہتا ہوں جن سے تمہاری افتادِ طبع کی تسکین ہو سکے۔'' ذیشان نے ارشاد کیا تو جاوید علی الرٹ ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی بات غور سے سننے لگا۔ کیونکہ اس بات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے لیے کوئی کام نکل آیا ہے۔

''کچھ دیر پہلے ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ بھارت سے جدید اسلحے سے بھرا ایک کنٹینر پاکستان لایا جا رہا ہے۔ یہ اسلحہ اتنا جدید اور ہلاکت خیز ہے کہ اس کا منڈی میں پہنچنا ان دہشت گرد گروہوں کی چاندی کر دے گا جن کا مقصد ہی پاکستان میں تباہی و بربادی پھیلانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس اسلحے کو پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیلنے سے قبل ہی سرحد پر روک لو۔''

''میں حاضر ہوں سر!'' ذیشان کی بات سن کر اس نے کسی فوجی کی سی مستعدی و فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''ہارڈر پر اس سلسلے میں اطلاعات بھجوا دی گئی ہیں اور وہ لوگ اپنے طور پر ہوشیار بھی رہیں گے۔ لیکن یہ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی اسمگلنگ کرنے والے ایسے درجنوں چور راستوں سے واقف ہوتے ہیں جن پر قانون اور فوج کی نظر نہیں ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ اسلحے سے بھرا وہ کنٹینر بھی ایسے ہی کسی راستے سے پاکستان لایا جائے گا اور تمہیں ہر حال میں اسے پکڑنا ہوگا۔'' ذیشان نے اس پر زور دیا۔

''آئی وِل ٹرائی مائی بیسٹ سر!'' جواب میں جاوید علی نے اسے یقین دہانی کروائی اور اس معاملے میں اپنی ساری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی کلیو ہے سر؟''

''کچھ خاص نہیں۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسلحہ جس کنٹینر سے لایا جا رہا ہے، وہ بھارت کے ایک ایسے ایک فارم کا ہے جس کا مالک ممبئی کا ایک بہت بڑا غنڈہ اشوک بتایا جاتا ہے۔ اس کنٹینر میں بظاہر فروٹ ہی ہوں گے لیکن خفیہ خانوں میں اسلحہ چھپایا گیا ہوگا۔ اس اسلحے کے لیے بھارت جا کر چودھری افتخار عالم نے ایک سے ڈیل کی ہے۔ وہ خود تو فی الحال ممبئی میں ہی ہے لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس کے آدمیوں میں سے کوئی اس معاملے کو دیکھے گا۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے ایک بڑے ہیلی کاپٹر کا انتظام کر لیا ہے جو تمہیں لے کر کسی قریبی سرحدی گاؤں تک پہنچا دے گا۔ اس کام کے لیے تم اپنی ٹیم کا انتخاب خود کر لو اور اس کے علاوہ بھی جس چیز کی ضرورت ہو، بتا سکتے ہو۔'' ذیشان نے سنجیدگی کے ساتھ اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''تھینک یو سر! باقی سب کچھ تو میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ لیکن ہو سکے تو آپ میرے لیے ایک ایسے

ندے کا انتظام کر دیں جو بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والی اسمگلنگ سے منسلک ہو۔ کیونکہ
بال ہے کہ چور راستوں تک رسائی کے لیے ایک اسمگلر سے بڑھ کر کوئی راہنمائی نہیں کر سکے گا۔'' اس
اپنی خواہش بیان کی تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ویری نائس..... تم نے بالکل ٹھیک سوچا۔ ایسے آدمی کا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے
''نہیں اسی وقت ملے گا جب تم سرحد کے قریب پہنچو گے۔ کیونکہ وہ وہیں کا کوئی مقامی بندہ ہوگا۔'' جاوید
سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

''میں براہِ راست کسی سرحدی گاؤں تک ہیلی کاپٹر سے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اچانک گاؤں میں
کاپٹر اُترنے سے لوگ چوکنے ہو جائیں گے اور ہماری کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہماری آمد زیادہ
زیادہ خفیہ رہے۔''

''اس کے لیے تم فکر نہ کرو۔ تم لوگ سامان بردار ہیلی کاپٹر میں جاؤ گے۔ پاک فوج کا ایک ہیلی
اکثر سپاہیوں کی ضرورت کا سامان لے کر وہاں جاتا رہتا ہے اس لیے کسی کو شک بھی نہیں ہوگا کہ ہیلی کاپٹر
کون لوگ سوار ہیں۔'' سینئر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ خود ہر پہلو سے معاملے کا جائزہ لے چکا تھا
اسے تسلی دی اور بولا۔ ''اور کوئی سوال؟''

''نو سر!'' جاوید علی نے جواب دیا۔

''بس تو پھر تیاری کر لو۔ آدھ گھنٹے بعد تمہاری روانگی ہے۔'' اس نے گویا جاوید علی کو ملاقات کے اختتام
اشارہ دیا۔

جاوید علی اٹھا اور اسے سلیوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنی ٹیم میں وہ تین افراد کو شامل کر سکتا تھا۔ ان
کے علاوہ اگر اسے مزید افرادی قوت کی ضرورت پڑتی تو وہ سرحد پر تعینات فوج کے جوانوں میں سے کسی
رابطہ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا انتہائی صورت میں ہی کیا جاتا۔ کیونکہ سی ایف پی ایک انتہائی خفیہ ادارہ تھا
کے بارے میں وفاقی حکومت تک کو معلوم نہیں تھا اور بس فوج کے ہی چند خاص ذمے داران کو اس کے بارے
میں آگاہی تھی۔

سی ایف پی کے نوجوانوں کو خاص مواقع کے لیے ایک کارڈ ضرور جاری کیا گیا تھا جس پر لگی
مہروں اور دستخطوں سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ملک کے ایک ایسے ادارے سے منسلک ہیں جو ملک کے
کے لیے بہت سے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کے حق دار ہیں۔ لیکن اس کارڈ کا استعمال انتہائی حالات
میں ہی کرنے کی اجازت تھی اور سی ایف پی کا کوئی نوجوان اسے محض رعب و دبدبہ دکھانے کے لیے استعمال
نہیں کر سکتا تھا۔

ٹیم کا انتخاب کرنے میں جاوید علی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان میں سے ایک تو سلمان ہی تھا۔ باقی
بھی وہ تھے جو بہت پھرتیلے اور پُر جوش سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ضرورت کا اسلحہ اور دیگر سامان پہلے ہی
کے حکم کے مطابق تیار کروا دیا گیا تھا۔ جاوید علی نے بس ایک نظر اس سارے سامان کو دیکھا اور اوکے کر دیا
اس میں ان کی ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ منزل تک پہنچنے تک ان چاروں نے بھی اپنا
وقت ان نقشوں کو دیکھنے اور ان پر بحث کرتے ہوئے گزارا جو پاکستان اور بھارت کی سرحدی پٹی کو
کرتے تھے۔ ان نقشوں کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان صرف چار افراد کے لیے یہ مشن بہت



ہوتا۔ وہ چار آخر کہاں کہاں نظر رکھ سکتے تھے؟ لیکن بہر حال ان کے پاس پیچھے ہٹنے کی بھی گنجائش نہیں
انہیں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کا سی ایف پی کے لیے
انتخاب بلا وجہ نہیں تھا بلکہ وہ اس کے حق دار تھے۔ چنانچہ جب وہ سامان بردار ہیلی کاپٹر سے ایک سرحدی چوکی
اترے تو یہ بھول چکے تھے کہ ان کا کام کتنا مشکل تھا۔ بس ان کے دل میں یہ عزم تھا کہ
ہر حال میں اپنا مشن مکمل کرنا ہے۔

چوکی پر تعینات پاک فوج کے ذمے دار نے پُر وقار انداز میں ان کا استقبال کیا۔

''کوئی اہم خبر؟'' جاوید علی نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''ابھی تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی ہے۔ ہاں، روٹین کے مطابق اشوک فروٹ فارم کا ایک کنٹینر
آیا ہے لیکن میرے آدمیوں کو اس کی بھرپور تلاشی لینے کے باوجود کچھ نہیں ملا ہے۔ میں نے پھر بھی
کنٹینر کو روک رکھا ہے کیونکہ مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ لوگ یہاں آنے والے ہیں۔ میں نے
سمجھا کہ ایک بار آپ کو بھی اس کی تلاشی لینے کا موقع دے دیا جائے تو ممکن ہے کہ وفاقی ایجنسی کے
وہ ڈھونڈ نکالیں جو ہمیں دکھائی نہیں دے سکا ہے۔''

اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ بارڈر سے اسمگلنگ کے معاملے
دیکھنے کے لیے مرکز سے لوگ بھیجے گئے تھے۔ یہ ایک طرح سے انہیں نااہل سمجھے جانے کے مترادف تھا۔

''ٹھیک ہے، ہم اسے چیک کر لیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ ہمارا مطلوبہ آدمی یہاں پہنچ گیا ہے یا نہیں؟''
اسد کا بیج سینے پر لگائے چوکی کے انچارج کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''جی ہاں، وہ موجود ہے..... نذر محمد! ملک کو لے کر آؤ۔'' میجر اسد نے اسے جواب دینے کے ساتھ ہی
ماتحت کو حکم دیا۔

فوراً ہی ان کے سامنے تقریباً چالیس سال کا ایک لمبا تڑنگا اور گورا چٹا آدمی پیش کر دیا گیا۔ یہ ملک سبحان
اپنی گھنی مونچھوں اور داڑھی کے باوجود خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے شانوں تک آتے
کالے بال بھی اس پر برے نہیں لگ رہے تھے۔ اس نے کلف لگے سفید شلوار قمیض پر سرمئی رنگ کی
خاص انداز سے اوڑھ رکھی تھی اور پیروں میں چمڑے کے قیمتی سینڈل تھے۔ اس کی انگلیوں میں موجود
میں جڑے نگینے بھی خاصے بیش قیمت معلوم ہوتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ شاندار شخصیت کا مالک تھا
اسمگلر سے زیادہ زمیندار یا سردار محسوس ہوتا تھا۔

''السلام علیکم!..... فرمائیے کیسے خادم کو یاد کیا؟'' میجر اسد کے تعارف کروانے پر اس نے جاوید علی سے
انداز میں مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہم تم سے ان راستوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے
استعمال میں رہتے ہیں۔'' وہ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا جسے سن کر ملک سبحان ہنس پڑا۔

''بڑی عجیب بات ہے، قانون کے رکھوالے ایک مجرم سے اپنے مقصد کے لیے مدد مانگ رہے ہیں۔''

''صرف یہ سوچ کر کہ ملک سبحان بے شک ایک اسمگلر ہے لیکن ہے تو پاکستانی جو پاکستان کو مالی نقصان
پہنچا سکتا ہے لیکن اسے تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔''

اس نے ملک سبحان کے طنز کے جواب میں ایک جذباتی وار کیا جس کا اثر اس کی آنکھوں کے بدلتے
تاثرات کی صورت محسوس ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ ملک سبحان اپنے وطن کی حفاظت کے لیے تمہاری مدد کرے گا۔ اب بتاؤ کہ آپ کیا اپنے راستوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟''

اس نے گویا اپنے تعاون کا عندیہ دے دیا۔ اس وقت وہ دونوں ایک خیمے میں قائم دفتر میں تنہا موجود تھے۔ سلمان اور اپنے باقی دونوں ساتھیوں کو اس نے میجر اسد کے ساتھ اس کنٹینر کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ کچھ دیر قبل اشوک فروٹ فارم کے پھل لے کر آیا ہے۔ ملک کی آمد کی اطلاع اُس نے اُسے وجہ سے آگاہ کر دیا۔

''نہیں..... یہ ممکن نہیں۔'' اس کی بات سن کر ملک نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں ممکن نہیں؟..... ہمارے پاس پکی خبر ہے۔'' اس کے انکار پر جاوید علی نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''دیکھو سر جی!..... میں اسی علاقے میں پیدا ہوا ہوں اور یہاں کے ہر راستے کو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں سے دونوں طرف کی فوجوں کی نظر میں آئے بغیر سرحد پار کی جا سکتی ہے لیکن یہ کوئی باقاعدہ راستے نہیں ہیں۔ ان راستوں پر سفر کرنا بھی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ بڑی مہارت اور جی داری کی ضرورت ہوتی ہے اور ذرا سی غفلت سے بندہ اپنی جان سے جاتا ہے۔ یہ راستے ایسے نہیں ہیں کہ ان سے کوئی کنٹینر یا بڑی گاڑی آرام سے گزر جائے اور کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔ ہم اور ہمارے جو لوگ ان راستوں پر سے گزرتے ہیں، وہ زیادہ تر گھوڑے اور خچر استعمال کرتے ہیں یا پھر کبھی کبھی سیٹنگ ہو جانے پر جیپ استعمال ہو جاتی ہے لیکن کسی کنٹینر کا آنا ممکن ہی نہیں۔''

ملک سبحان نے اپنی بات کی وضاحت کی تو جاوید علی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ شخص ایسا دعویٰ کر رہا تھا تو حقیقت کیا تھی؟ کیا انہیں ملنے والی اطلاع غلط تھی؟..... لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔ کسی اطلاع پر میجر ذیشان ہرگز اسے اور اس کے ساتھیوں کو اتنی دور نہیں دوڑا سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس معاملے میں صرف سرحدی محافظوں پر تکیہ کرنے کے بجائے انہیں کیوں بھیجا گیا تھا۔ اسلحے کی اس ڈیل میں چودھری بھی ملوث تھا اور اگر وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو چودھری جیسے ملک دشمن کے خلاف اہم ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

''میری بات کا یقین کریں سر! اگر مال کسی کنٹینر میں آ رہا ہے تو پھر وہ یہیں سے گزرے گا۔'' اسے خاموش دیکھ کر ملک سبحان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیسے؟..... یہاں یہ اتنی بڑی حفاظتی چوکی قائم ہے۔ یہاں اتنا بڑا اسلحے سے بھرا کنٹینر پہنچ کیا پکڑا نہیں جائے گا؟'' اسے یقین کرنے میں تامل تھا۔

''کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے سر جی!'' ملک سبحان نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا تو وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب صاف ہے۔ اتنی بڑی ڈیل میں کوئی چھوٹی موٹی رقم تو نہیں لگی ہو گی۔ اور جو لوگ بڑی خرچ کرتے ہیں، وہ ان کو بچانے کا پورا بندوبست بھی رکھتے ہیں۔ کروڑوں کا مال بچانے کے لیے اگر لاکھ اوپر سے خرچ کرنے پڑ جائیں تو یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کہلائے گا نا۔'' اس کی معنی خیز باتیں جاوید کو پل پل چونکا رہی تھیں۔



''تمہارا مطلب ہے کہ اس ڈیل میں سرحدی چوکی کے محافظ بھی.....'' وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''میرا یہی مطلب ہے۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی ہیں تو انسان ہی نا۔ ان کے ساتھ بھی خاندان اور خاندان والوں کی ضرورتیں لگی ہوتی ہیں۔ کبھی کسی ضرورت کے بدلے میں فرض کا سودا ہو جائے، یہ ناممکن نہیں ہے۔'' ملک کی بات ایسی تھی جس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی وقت سلمان وہاں آ گیا۔

''کیا رہا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کنٹینر میں کچھ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ فروٹس کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے وہی اطلاع دی جس کی امید تھی۔ کیونکہ میجر اسد پہلے ہی بتا چکا تھا کہ کنٹینر کلیئر ہے لیکن اسے سلمان کے تاثرات سے محسوس ہوا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔

''تم یہاں بیٹھو ملک!..... میں دوبارہ آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔'' وہ سمجھ گیا کہ سلمان کے پاس جو بھی خبر ہے، وہ اسے ملک کے سامنے ظاہر کرنے سے گریزاں ہے۔ اس لیے ملک کو وہیں چھوڑ کر خود سلمان کے ساتھ باہر نکل گیا اور دونوں چلتے ہوئے ایک نسبتاً الگ گوشے میں پہنچ گئے۔

''ہاں اب کہو، کیا بات ہے؟''

''کنٹینر کی تلاشی کے دوران تین ایسی باتیں میرے علم میں آئی ہیں جو میرے نزدیک مشکوک ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''پہلی بات یہ کہ کنٹینر میں کئی خفیہ خانے بنائے گئے ہیں جو فی الحال خالی ہیں۔ ان خانوں کے بارے میں ڈرائیور کا مؤقف ہے کہ بعض اوقات اشوک صاحب کسی پارٹی سے قیمتی ساز و سامان جیسے زیورات وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کنٹریکٹ کر لیتے ہیں تو اس وقت یہ خفیہ خانے کام آتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں ہو پاتا کہ پھلوں سے بھرے کنٹینر میں اور بھی کچھ جا رہا ہے۔ اس طرح مال بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔''

''اپنی اس بات سے وہ خبیث اپنے اسمگلر ہونے کا اعتراف کر رہا ہے۔ اسے اسی الزام میں گرفتار کر لو اور پھر پیٹی لگاؤ کہ باقی کا سچ بھی اُگل دے۔'' سلمان کی بات سن کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے جوش سے کہا۔

''نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور زبانی بات سے وہ آرام سے مکر سکتا ہے۔ اگر ان کو گرفتار کرنا اتنا آسان ہوتا تو ملک سبحان جو اتنا نامی گرامی اسمگلر ہے، اتنے آرام سے ہم سے مذاکرات کرنے آ کر بیٹھا ہوتا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ وہ اسمگلر ہے لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر ہاتھ ڈالا نہیں۔'' سلمان نے حقیقت کی تیز چٹکی لے کر اس کے جوش کے غبارے میں سے ہوا نکال دی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مزید آگے بتاؤ۔'' وہ ڈھیلا پڑ گیا۔

''تمہیں معلوم ہو گا کہ مشہور فروٹ فارمز سے نکلنے والے فروٹس پر باقاعدہ اس فارم کے نام کے اسٹیکر لگائے جاتے ہیں۔ اس کنٹینر میں جو فروٹس لائے گئے ہیں، ان میں سے بھی بہت سوں پر اشوک فروٹ فارم کے اسٹیکر چسپاں ہیں لیکن تقریباً اتنے ہی پھل ایسے بھی ہیں جن پر کوئی اسٹیکر نہیں لگا ہوا۔ اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ بڑے فارمز اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ میں اناس کے ڈبوں میں سے ایسا اناس تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جس پر اشوک کے بجائے آنند فروٹ

فارم کا اسٹیکر چپکا ہوا ہے۔"

سلمان کا یہ انکشاف خاصا سنسنی خیز تھا۔ ساتھ ہی اس نے تیسری مشکوک بات بھی بتا دی۔

"تم جانتے ہو کہ میری سونگھنے کی حِس کتنی تیز ہے۔ اس کنٹینر میں جہاں ہر طرف پھل ہی پھل بھرے ہوئے ہیں اور ان کی خوشبو کے سوا کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے، میں نے بارود کی معمولی سی بُو محسوس کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس کنٹینر میں پہلے پھلوں کے ساتھ ساتھ اسلحہ اور گولہ بارود بھی موجود تھا لیکن کس طرح مخبری ہو گئی کہ اس ڈیل کی خبر پاکستان پہنچ چکی ہے اور یہاں داخل ہوتے ہی کنٹینر پکڑا جائے گا اس لیے ایمرجنسی میں کنٹینر سے اسلحہ اُتار کر اس کی جگہ کسی دوسرے فروٹ فارم سے پھل لوڈ کروا دیئے گئے۔ اب اسلحہ کسی اور ذریعے سے یہاں پہنچ رہا ہوگا؟"

ان دو اہم اطلاعات کو سن کر اس نے تیزی سے نتیجہ اخذ کر لیا۔

"بالکل.....ایسا بالکل ممکن ہے۔" سلمان نے اس کی تائید کی۔

"میرے خیال میں اس سلسلے میں ملک ہماری مدد کر سکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ سلمان کو ساتھ لیے ہوئے واپس اس خیمے کی طرف چلا گیا جہاں ملک سبحان اس کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ملک! یہ بتاؤ کہ تم بارڈر کے اس طرف کسی آنند فروٹ فارم کے بارے میں جانتے ہو؟" اس نے خیمے کے اندر جاتے ہی ملک سے سوال کیا۔

"بالکل جناب! یہ ادھر اس طرف ہی تو ہے۔ سرحد سے سب سے قریب آنند فروٹ فارم ہی پڑتا ہے۔" ملک نے ان کے خیال کی تصدیق کر دی اور یہ واضح ہو گیا کہ کسی نہ کسی طور مخبری ہو جانے کی وجہ سے آنند فروٹ فارم پر کنٹینر روک کر اس میں سے اسلحہ اُتارا گیا اور اس کی جگہ پھل لوڈ کیے گئے۔

"اچھا، یہ بتاؤ کہ اگر آنند فروٹ فارم پر اسلحہ اُتار لیا گیا ہو تو وہاں سے اسے کسی اور ذریعے سے ممکن ہو سکے گا؟"

"کیوں نہیں؟ وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ ہے ہی کتنا جو کوئی مشکل ہو۔ یہاں کسی کے ملوث ہونے کی صورت میں ذرا ٹھہر کر کسی دوسری بڑی گاڑی میں بھی سپلائی کی جا سکتی ہے۔ ورنہ عام روایتی طریقہ تو وہی ہے ہی۔ خچر، گدھے، گھوڑے سب اس کام کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ آنند فروٹ فارم سے یہاں کا فاصلہ بوجھ کے ساتھ طے کر لینا ان جانوروں کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔" ملک کے جوابات اس کے خیال کی تصدیق کرتے جا رہے تھے اور انہیں آگے بھی بہت کچھ سوچنے کا موقع مل رہا تھا۔

"یہاں اس علاقے میں کون ہو سکتا ہے جو آنے والی سپلائی کو وصول کر لے؟ ظاہر ہے یہاں تک آنے کے بعد سیدھا تو شہروں میں نہیں پھیل جائے گا۔ یہاں آنے کے بعد مال کی سپلائی کے لیے کسی بندے کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔" وہ بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے تھے۔

"یہاں صرف دو بندے ہیں جو اسلحے وغیرہ کی اسمگلنگ میں انوالو ہیں اور چاہے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے آگے مال کی سپلائی کے لیے ان دو میں سے کسی ایک سے معاملہ طے کیا گیا ہوگا۔" ملک سبحان نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"ان دونوں بندوں کے نام پتے بتاؤ۔" جاوید علی نے فوراً مطالبہ کیا۔

"ان میں سے ایک تو افراسیاب خان ہے جو یہ ساتھ والے گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ دوسرا ملک اسحاق ہے لیکن اس کا گاؤں یہاں سے ذرا دور پڑتا ہے۔ لیکن ہے سرحدی پٹی کے ساتھ ہی۔" وہ ان لوگوں سے



بیان کر رہا تھا۔

"ایک اور اہم سوال۔ جو فروٹ بھارت سے آیا ہے، اس کی سپلائی یہاں کس نے منگوائی ہے؟ ظاہر ہے اسمگلر خود تو ڈائریکٹ پھل وغیرہ منگوانے سے رہے۔ اس قسم کی چیزوں کے بیوپار کے لیے الگ سہولت اور سہولیات کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے کوئی اسلحے کا ڈیلر تو فراہم کرنے سے رہا۔ لازماً کوئی زمیندار کاری و باغبانی سے متعلق بندہ ہی یہ کام کر سکتا ہے۔"

جاوید علی نے خاصا مدلل سوال کیا۔ اب تک ان کا سارا زور اسمگل ہو کر آنے والے اسلحے کی بازیابی پر ہی تھا اور وہ اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں کر رہے تھے کہ اتنی بڑی مقدار میں آنے والے پھل یہاں کون وصول کرے گا؟

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس طرح کے کام یہاں بہت لوگ کرتے ہیں۔ کپڑا، زیور، ڈیکوریشن پیسز سے لے کر فریش فروٹ، سبزیاں اور ڈرائی فروٹ تک جس چیز پر بھی پرافٹ ملنے کی امید ہو اس کی اسمگلنگ دونوں طرف سے ہی ہوتی رہتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کی اسٹوریج اور انہیں لانے کا طریقے سے آگے پہنچانے کے لیے یہاں دو چار بندے ایسے ہیں جن کے پاس سارا انتظام ہے۔ یہ لوگ خود بھی ڈائریکٹ اس بیوپار میں حصہ لیتے ہیں اور دوسرے بیوپاریوں کو بھی معاوضہ لے کر یہ سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ تم اپنے مطلب کے بندے کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو سیدھے سیدھے کنٹینر کے ڈرائیور سے پوچھو کہ وہ فروٹ کی یہ سپلائی لے کر کس کے پاس پہنچے گا؟" ملک سبحان نے ذرا تفصیل سے اس سوال کا جواب دیا۔

"وہ میں معلوم کر چکا ہوں۔ اس کا نام اسحاق علی ہے۔" سلمان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے بتایا تو ملک سبحان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"اسحاق علی تو اچھا خاصا بڑا زمیندار ہے اور ہم میں سے کئی کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ میرے خود بھی اس سے اچھے تعلقات ہیں لیکن یہ تعلقات کاروباری نہیں ہیں۔ میں کسی کی سرپرستی کے بجائے آزادانہ کر اپنے بازو پر کام کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ البتہ تمہیں یہ بتاتا چلوں کہ اسحاق علی کے افراسیاب اور توقیر دونوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور ان میں سے کسی دو یا تینوں ہی کی ملی بھگت سے یہ کھیپ آ رہی ہوگی۔"

ملک سبحان ان کے لیے خاصا کام کا بندہ ثابت ہوا تھا اور اس نے انہیں ان کی تمام مطلوبہ معلومات بغیر کسی لیت و لعل کے فراہم کر دی تھیں۔ اتنی مدد تو شاید میجر اسد بھی (جس کا اپنا کردار فی الحال مشکوک ہو چکا تھا) نہیں کر سکتا تھا۔

"تھینک یو ملک!.....تم نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ ہمیں آگے بھی تمہارے تعاون کی ضرورت رہے گی۔ تم فی الحال ایک کام کرو۔ اپنے کام کرنے والے بندوں کے ذمے لگا دو کہ وہ ان راستوں کی نگرانی کریں جہاں سے باربردار جانوروں کے ذریعے مال آتا ہے۔ ان سے جیسے ہی کوئی اطلاع ملے، تم مجھے بتا دینا۔ پھر باقی معاملات میں اور میرے ساتھی دیکھ لیں گے۔"

جاوید علی نے فوراً ہی حکمتِ عملی ترتیب دے دی۔ اس کے اور ملک کے درمیان رابطے کا طریقِ کار طے ہوا اور ملک مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اسے رخصت کرتے ہوئے جاوید علی نے دو اور اہم باتیں طے کی تھیں۔ اوّل یہ کہ یہاں طے پانے والے معاملات کی میجر اسد سمیت کسی بھی دوسرے شخص کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔ اور دوم یہ کہ ملک سبحان اور

WWW.PAKISTANIPOINT.COM پاکستانی پوائنٹ PAKISTANIPOINT

اس کے ساتھیوں کو ان خدمات کے بدلے معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ طے کرنا ضروری تھا۔ اسلحہ جیسے خطرناک ذریعے سے دولت کمانے والوں کے لیے روپے پیسے کی کتنی اہمیت ہوتی ہے، یہ ان کے عمل سے ہی ظاہر تھا۔ اس لیے ان سے بلا معاوضہ صرف ملک وقوم کے نام پر کام لینا مشکل تھا۔ دوسرے معاوضہ طے کے بعد وہ پوری طرح پابند ہو جاتے کہ اپنی ذمے داری بھرپور طریقے سے انجام دیں۔ وہ قانون کی نظر میں مجرم سہی لیکن ان کا اپنا یہ قانون ضرور ہوتا ہے کہ جس کام کا وعدہ کر لیں اسے ہر صورت انجام تک ضرور پہنچاتے ہیں۔

ملک کو رخصت کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر میجر اسد سے ملا۔ اس کا موڈ کچھ خراب لگ رہا تھا اور اسے خراب موڈ کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

''کنٹینر آگے چلا گیا یا نہیں؟'' اس نے میجر سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ کے ساتھیوں نے اسے کلیئر قرار دے دیا تھا اس لیے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ پھل ہم اسے کافی زیادہ وقت کے لیے روک چکے تھے۔ اس میں پائن ایپل جیسے نازک پھل بھی موجود تھے جو وقت گزرنے کی صورت میں خراب ہو جاتے تو منگوانے والے کو خاصا نقصان اٹھانا پڑتا اور اپنے لوگوں کا نقصان کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔'' اس نے ایک طرح سے جتایا کہ وہ کتنا محبِ الوطن ہے اور اسے ہم وطنوں کا کتنا خیال ہے۔

''مجبوری تھی۔ اگر ہم اسے نہ روکتے تو پھلوں کی آڑ میں اسلحہ نکل جانے کا ڈر تھا۔''

''کیسا اسلحہ.....؟'' میجر کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔ ''اس طرح کسی پر سے اسلحہ نکال کر لے جانا ایک ناممکن سی بات ہے۔ ہمارے جوان ایسے کاموں کی روک تھام کے لیے وقت چوکس رہتے ہیں۔''

''ہمارے پاس بہت پکی خبر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم خود بھی اس طرح دوڑے ہوئے یہاں نہ آتے۔ ابھی تو پورا دن پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے پھلوں سے لدا کنٹینر صرف پہلے یہ چیک کرنے کے لیے بھیجا گیا کہ یہاں کیا صورتِ حال ہے اور اصل مال بعد میں بھیجا جائے۔''

اس کی نظر میں میجر اسد مشکوک ہو چکا تھا لیکن وہ بدستور اس سے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا تاکہ اس کے شک کا اندازہ نہ ہو۔

''آپ کو اتنا یقین ہے تو انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ فیڈرل ایجنسی کے ایک اسمگلر کی مدد سے جو کہ خود بھی مجرم ہے کیسے اس جرم کا سراغ لگاتے ہیں۔'' میجر اسد نے موقع پا کر طنز کا تیر چلایا۔

''لیکن آپ کے طریقِ کار میں تھوڑا فرق ہے۔ اس لیے آپ اُلجھن محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو آپ خود قائل ہو جائیں گے کہ ہمارا کام کرنے کا طریقہ مختلف ہونے کے باوجود مؤثر ہے۔''

وہ مستقل اسے ڈھیل دے رہا تھا۔ منہ توڑ جواب دینے یا شک ظاہر کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ کام بچانے کے لیے وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر گزرے اور بہرحال وہ اس غدارِ وطن کو ہاتھ سے نہیں جانے چاہتا تھا۔

''چلیں، یہ بھی آزما لیں گے۔ فی الحال یہ بتائیں کہ میں آپ لوگوں کی کیا خاطر تواضع کروں؟



علاوہ یہ بھی بتا دیں کہ اس معاملے میں آپ کو مجھ سے کیا خدمات درکار ہیں؟'' اس کی طرف سے مسلسل لیے لگائے جانے پر وہ بھی ڈھیلا پڑ گیا اور قدرے بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔

''خاطر تواضع کا کوئی موقع نہیں ہے اور خدمت آپ کو صرف یہ انجام دینی ہے کہ یہاں رہ کر ہر طرف ہر معاملے پر گہری نظر رکھیں۔ اور ہاں اگر ہمارے لیے کسی سواری کا بندوبست ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہو ہم ذرا اپنی نظروں سے بھی اس علاقے کو دیکھ لیں گے۔''

اس نے حلم کے ساتھ جواب دیا تو میجر اسد پانچ منٹ میں گاڑی تیار کروانے کا کہتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے کہے پانچ منٹ سچ مچ صرف پانچ منٹ ہی ثابت ہوئے اور انہیں ایک جیپ ڈرائیور سمیت فوراً ریڈی مل گئی۔

''ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے چلا سکتا ہے۔'' اس نے فوراً ہی ڈرائیور کو غیر ضروری قرار دے دیا۔

''آپ اسے ساتھ لے جاتے تو آپ کو سہولت رہتی۔ یہ یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہے اور آپ کو کسی خطرے میں ڈالے بغیر آسانی سے ہر جگہ لے جا سکتا ہے۔'' میجر اسد نے اس سے ڈرائیور کو ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔

''راستوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس نقشہ موجود ہے۔ ہم اس کی مدد سے آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔'' جاوید علی نے اس کی پیشکش قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ذرا دیر میں وہ چاروں جیپ میں سوار ہو کر جا رہے تھے۔

اسٹیئرنگ سلمان کے ہاتھ میں تھا جبکہ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ذیشان کو سارے حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔ میجر اسد کے بارے میں اس کا شبہ سن کر وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دُور دراز سرحدی علاقے میں اس نے فوج کے جوانوں کی مدد کے آسرے پر ہی صرف چار رکنی ٹیم کو اس مشن پر بھیج دیا تھا لیکن اگر وہ لوگ گڑبڑ کرتے تو چاروں واقعی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔

''تم میں سے ایک سائے کی طرح میجر کے ساتھ رہے اور جب دیکھے کہ وہ کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے تو نظر سے غائب کر دے۔ اس کے بعد جوانوں کو ہر حال میں تمہارا ہی حکم ماننا ہوگا۔''

آخر تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اس نے مشورہ دیا جو جاوید علی کے دل کو لگا اور اس نے جلد کوئی اچھی خبر ملنے کی امید ظاہر کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس عرصے میں وہ چوکی سے کافی آگے نکل آئے تھے اس لیے کسی کو میجر اسد کی نگرانی کے لیے چھوڑنے کا فوری طور پر پلٹنا مناسب نہیں ہوا اور سفر جاری رکھتے ہوئے اس نے ملک سبحان سے رابطہ کر لیا۔ اس کو خبر سنائی کہ وہ فوری طور پر اپنے آدمیوں کو روانہ کر چکا ہے۔

جاوید علی نے اس کی کارکردگی کو سراہا اور پھر اس سے اسحاق علی کے اس کولڈ اسٹوریج کے بارے میں پوچھا جہاں آنے والے پھلوں کو محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کافی دور ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ کنٹینر کو سیدھے راستے سے لے جانے والا ڈرائیور اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔

''کیا تم ہمیں ایک تیز رفتار سواری اور ایسا کوئی آدمی مہیا کر سکتے ہو جو کسی شارٹ کٹ سے ہمیں کنٹینر سے پہلے ہی وہاں پہنچا دے؟''

''کیوں نہیں۔ معقول معاوضہ ملے تو ملک سبحان ہر کام کر سکتا ہے۔'' یہ ملک کا جواب تھا۔

''معاوضے کی تم فکر نہ کرو۔ بس فوری طور پر گاڑی اور بندہ پہنچاؤ۔'' اس نے ملک کو آگاہ کیا کہ وہ لوگ اس کے آدمی کو کس جگہ ملیں گے۔

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟'' سلمان جو مستقل اس کی باتیں سن رہا تھا، ذرا تعجب سے پوچھنے لگا۔

''ہم کنٹینر کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں ڈرائیور اور کلینر کو اغوا کر لیں گے اور پھر ان سے اُگلوائیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔'' اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

''یہ کام تو انہیں چوکی پر روک کر بھی کیا جا سکتا تھا۔ انہیں جانے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت تھی؟'' سلمان اس سے بحث کر رہا تھا لیکن اس نے جیپ کا رخ اس طرف کر لیا تھا جہاں جاوید علی نے ملک کے آدمی کو گاڑی سمیت بلوایا تھا۔

وہ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے، وہاں ابھی تک انہیں آبادی نظر نہیں آئی تھی البتہ کافی فاصلے پر گاؤں کے آثار تھے جن کے بارے میں ان کے پاس موجود معلومات کے مطابق یہاں آبادی تین سو بھی کم تھی۔

''چوکی پر روکتے تو ان کی گرفتاری قانونی ہوتی جس کے لیے ظاہر ہے ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اب ہم غیر رسمی کارروائی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں اور کسی کو ان بندوں کے سلسلے میں جواب دینے کے لیے پابند بھی نہیں۔'' اس نے اپنے فیصلے کی وجہ بتائی اور مزید وضاحت دیتے ہوئے بولا ''ویسے بھی یہ خیال میرے ذہن میں بعد میں ہی آیا ہے۔ ملک کے ذمے خفیہ راستوں کی نگرانی کا کام لگنے کے بعد میں تھوڑی فرصت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خفیہ راستے سے اسلحہ آنے میں ابھی وقت لگے گا۔ آنند فروٹ فارم پر ہنگامی طور پر کنٹینر کو اسلحے سے خالی کرنے کے بعد اس میں فروٹ رکھوانے میں لوگوں کا خاصا وقت صرف ہوا ہوگا اور آگے کے انتظام کے لیے بھی انہیں تھوڑی مہلت چاہئے ہوگی اس لیے وہ اتنی جلدی سپلائی نہیں کر سکیں گے۔ اس دوران فارغ بیٹھنے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ کارروائی دکھا دیں۔''

''ٹھیک ہے باس!..... جیسا تم بولو۔'' سلمان نے اس کی تائید کر دی۔ پیچھے بیٹھے سعید اور خیری تو کبھی بھی زیادہ مداخلت کرنے والے بندے نہیں تھے۔ انہیں جو حکم ملے، اسے پوری توجہ سے بجا لانے کے سوا کسی بات سے غرض نہیں ہوتی تھی۔

''تم دونوں یہ جیپ لے کر واپس چوکی پر چلے جانا۔ سعید میجر پر نظر رکھے گا اور خیری! تم وہاں موجود دوسرے لوگوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرنا کہ ان کی میجر اسد کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اور ان میں سے کون ایسے ہو سکتے ہیں جو اس کے ساتھی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر سعید بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے لیکن اسے اپنی توجہ میجر کی طرف ہی رکھنی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حالت بگڑتے دیکھ کر میجر فرار کی کوشش کرے۔ اس صورت بھی بھاگنے نہیں دینا ہے۔''

سلمان کو مطمئن کرنے کے بعد وہ پیچھے بیٹھے اپنے دونوں ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اس دوران لوگ اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں انہیں ملک کے بندے سے ملاقات کرنی تھی۔ یہ قریب قریب دو ایسے ٹیلے تھے جن کے درمیان ایک تنگ سی راہ گزر موجود تھی۔

ٹیلے تقریباً خشک اور بنجر ہی تھے اور ان پر نباتات کے نام پر چند ایک کانٹے دار جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ حالانکہ اردگرد کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب تھا اور وہ راستے میں دیکھتے ہوئے آئے تھے کہ کھیتوں میں موجود فصلیں بڑی شان سے لہلہا رہی ہیں۔



ٹیلے کے پاس پہنچ کر وہ اور سلمان نیچے اُتر گئے جبکہ سعید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر جیپ کو واپسی کے لیے موڑ لیا۔

وہ دونوں خود کو کسی کی نظر میں آنے سے بچانے کے لیے دونوں ٹیلوں کی درمیانی گزرگاہ تک چلے گئے اور وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

انتظار کے ان لمحات میں بھی بیکار بیٹھنے کے بجائے جاوید علی اپنے پاس موجود اس علاقے کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ معلومات انہیں ذیشان کی طرف سے ہی فراہم کی گئی تھیں اور راستے بھر بھی وہ نقشوں اور معلومات پر ہی غور و فکر کرتے ہوئے آئے تھے اور اس کے نتیجے میں پہلی بار یہاں آنے کے باوجود اس علاقے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ البتہ ان ٹیلوں کا علم انہیں اپنے مطالعے کے بجائے تجربے کے باعث ہوا تھا اور انہیں، انہوں نے ہیلی کاپٹر کی نیچی پرواز کے دوران دیکھا تھا۔

انتظار کے لمحات زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے اور ایک اٹھارہ اُنیس سال کا لڑکا طاقتور انجن والی سیاہ موٹر سائیکل سوار ان تک آ پہنچا۔

لڑکا کم عمر تھا لیکن جب اس نے ناہموار، تنگ اور اونچے نیچے راستوں پر بنا رفتار کم کیے ایک جیسی مہارت سے گاڑی دوڑائی تو انہیں قائل ہونا پڑا کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہے۔

وہ ایسے ایسے راستوں سے گزر رہا تھا اور اتنی تیزی سے موڑ کاٹ رہا تھا کہ چاہنے کے باوجود وہ دونوں اس پر اطمینان نشین کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ خود لڑکے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے اپنی ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے پناہ توجہ دینی پڑ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور اس نے ان کے پاس پہنچ کر اپنے ملک سبحان کے آدمی ہونے کی حیثیت سے تعارف کروانے کے سوا دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ ایک کچی پکی سڑک تک پہنچ گئے اور لڑکے نے گاڑی ایک سائیڈ پر کر کے روک لی۔

"ابا نے کہا تھا کہ آپ لوگوں کو یہاں تک پہنچا دوں۔ یہاں پر رک کر آپ آنے والے کنٹینر کا آرام سے انتظار کر سکتے ہیں۔'' گاڑی روکنے کے بعد لڑکے نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اپنے لب وا کیے تو ملک نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

"تم ملک سبحان کے بیٹے ہو؟'' بابا کا لفظ ایسا تھا کہ وہ چونک گئے تھے اور لڑکے کے چہرے پر انہیں سبحان کی مشابہت بھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ خوب صورت تھا لیکن بہرحال اس میں ملک جیسا کرّ و فر اور رعب نہیں آ رہا تھا۔ اس کی ملک کی طرح لمبی زلفیں اور داڑھی بھی نہیں تھی۔

"جی ہاں میں ان کا بیٹا ملک عرفان ہوں۔ مجھے آپ کو یہاں لانے اور واپس لے جانے کی ذمے داری ملی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کرنا ہوا، آپ لوگ خود کریں گے۔ میں گاڑی سمیت ادھر آپ کا انتظار کروں گا۔'' اس نے انگلی کے اشارے سے جگہ کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک طرح سے انہیں گاڑی سے اترنے کی تاکید کی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کنٹینر ہمارے آنے سے پہلے ہی یہاں سے گزر چکا ہو اور ہم خوامخواہ یہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں۔'' سلمان نے اندیشہ ظاہر کیا جس کے جواب میں وہ یوں مسکرایا جیسے بڑے کسی بچے کی نادانی کی بات سن کر مسکراتے ہیں۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بابا نے مجھے یہاں پہنچنے کے لیے پینتیس سے چالیس منٹ کا وقت دا
میں نے صرف تیس منٹ میں تمہیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ اس لیے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم لیٹ ہو گ
کنٹینر کو سڑک کے لمبے راستے سے گزر کر یہاں پہنچنا ہے اور میری پراڈو نے جانے کہاں کہاں
آپ کو گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کروا دیا ہے۔''

وہ تینوں گاڑی سے نیچے اُتر آئے تھے اور وہ اپنی سیاہ پراڈو پر یوں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہو
بول رہا تھا جیسے وہ گاڑی نہیں، اس کی محبوبہ ہو۔

''اوکے پھر ٹھیک ہے۔ تم انتظار کرو۔ ہم اپنا کام کرتے ہیں۔'' جاوید علی نے مسکرا کر اس
دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے واپس پیچھے اسی کچے راستے کی طرف
جہاں سے وہ سڑک پر چڑھے تھے۔ اس سڑک کی حالت بہت اچھی نہیں تھی لیکن ظاہر تھا کہ اس پر گا
رہتی ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف میں فاصلے فاصلے سے خاصے درخت بھی موجود تھے۔

وہ دونوں ایک چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تا کہ اگر کوئی گاڑی سڑک
گزرے تو وہ فوری طور پر نظروں میں نہ آسکیں۔ بس اب انہیں یہ طے کرنا تھا کہ عنقریب وہاں
کنٹینر کو رُکوانے کے لیے انہیں کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی ہے۔

گاڑی تو ان کے پاس تھی نہیں کہ اسے سڑک پر کھڑا کر کے کنٹینر کا راستہ روک دیتے۔ مجھ
عرفان کے رویے سے بھی یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ اپنی گاڑی یا خود کو سامنے لانے کے لیے راضی
گا۔ ظاہر ہے اسے اور اس کے باپ کو یہیں رہ کر اپنا ''کاروبار'' کرنا تھا اور وہ ایک با اثر زمیندار
سے براہِ راست دشمنی کا خطرہ نہیں مول لے سکتے تھے چنانچہ انہیں جو کچھ کرنا تھا، اپنے بل بوتے پر ہی
اپنا لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے وہ دونوں ہی تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ وہ
کے کنارے موجود تھے، اس کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی اور سڑک کی حالت کی وجہ سے یہ بات یقینی تھی
سے گاڑیاں زیادہ رفتار سے نہیں گزر سکتی ہوں گی۔

''یہ درخت دیکھ رہے ہو جاوید؟'' اچانک ہی سلمان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سڑک
میں لگے مختلف درختوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاصا پرانا اور گھنا درخت تھا جس کا
زیادہ تھا کہ شاخیں سڑک تک چلی گئی تھیں۔ بلندی کے اعتبار سے بھی وہ وہاں موجود دوسرے
مقابلے میں زیادہ بلند تھا۔

''اگر ہم اس درخت پر چڑھ جائیں تو کنٹینر کے اس کے نیچے سے گزرتے ہوئے آسانی
اوپر چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ڈرائیور اور کلینر کو قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔'' یہ مشورہ
سلمان خاصا پُر جوش تھا۔

جاوید علی کو اس کی ترکیب مناسب لگی لیکن ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ لوگ کام
سکیں اور ٹائمنگ کی ذرا سی گڑبڑ انہیں ناکام کر دے۔

''درخت پر میں جاتا ہوں۔ تم وہاں آگے جا کر چھپ جاؤ۔ اگر میں کامیاب نہ ہو سکوں تو تم
انہیں روکنے کی کوشش کرنا۔''

بہت تیزی سے غور کرنے کے بعد اس نے سلمان کو مشورہ دیا جو اس نے فوراً قبول کر لیا اور
سمیت دوڑتا ہوا وہاں سے خاصا آگے چلا گیا۔



جاوید علی اس دوران درخت پر چڑھ چکا تھا اور اس نے اپنے لیے اس شاخ کا بھی انتخاب کر لیا تھا جس
سڑک پر سے گزرتے کنٹینر پر چھلانگ لگا سکتا تھا۔

اس کام کے لیے اس نے جان بوجھ کر اپنا انتخاب کیا تھا۔ کسی چلتی گاڑی پر چھلانگ لگانا خاصا رسکی عمل
اور کچھ بھروسہ نہیں ہوتا کہ بندہ کامیاب ہونے کے بجائے پھسل کر نیچے ہی جا گرے اور گاڑی کے
کے نیچے آ کر کچلا جائے۔ یہاں تو معاملہ بھی کنٹینر کا تھا۔ ایسی دیوہیکل وہیکل کے سامنے تو انسانی جان
اوقات ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نے سلمان کے بجائے خود کو اس ذمے داری کے لیے منتخب کر لیا
اسے اللہ کی ذات اور اپنی عمدہ تربیت پر بھروسہ تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے گا۔ بلندی پر
کی وجہ سے وہ سڑک کا دور تک جائزہ لینے کی پوزیشن میں تھا اور اس کی نظریں مسلسل اس راستے پر ہی
تھیں جہاں سے کنٹینر کو آنا تھا۔

ملک عرفان کی ماہرانہ اور تیز رفتار ڈرائیونگ نے انہیں وقت سے پہلے وہاں پہنچا کر اتنی مہلت دے دی
وہ اپنا لائحۂ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کے لائق بھی ہو گئے تھے۔

آخر کار چند منٹ کے انتظار کے بعد اسے کنٹینر آتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے اعصاب ایک دم تن گئے اور
دماغ خود کار طریقے پر تیزی سے حساب کتاب کرنے لگا کہ اسے کس لمحے چھلانگ لگانی ہے۔ ٹائمنگ
ذرا سی گڑبڑ سے شدید نقصان ہو سکتا تھا۔ اسے اپنی جان کی فکر نہیں تھی لیکن یہ سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کی
ملک و قوم کے مفاد کے لیے کتنی ضروری ہے۔

آخر کار کنٹینر سبک خرامی سے چلتا عین اس درخت کے نیچے آ گیا جس پر وہ موجود تھا۔ اس نے اللہ کا
اور چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے اس کے قدم کنٹینر کی چھت سے ٹکرائے لیکن پھر وہ بری طرح ڈگمگا
کسی چلتی ہوئی گاڑی پر اس طرح اچانک کود کر اپنے جسم کو توازن میں رکھنا آسان نہیں تھا لیکن بہر حال
کی جانے والی تسخیر کی صلاحیت اور خواہش دنیا میں عجیب عجیب منظر دکھاتی ہی رہتی ہے۔ یہ تو پھر اس
مطالبے میں ایک معمولی عمل تھا۔ جاوید علی نے بھی بالآخر اپنے ڈگمگاتے قدموں کو سنبھال لیا۔

اس دوران نیچے بھی ہلچل مچ چکی تھی۔ ڈرائیور اور کلینر یہ تو نہیں دیکھ سکتے تھے کہ چھلانگ لگانے والا کون
اس کے کودنے سے پیدا ہونے والی ''دھپ'' کی آواز تو انہوں نے بھی سن لی تھی۔

''اوپر کون ہے اوئے؟'' ڈرائیور بلند آواز میں چیخا لیکن بہر حال اس نے کنٹینر روکا نہیں۔

''میں دیکھتا ہوں استاد!'' کلینر نے تیزی سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چلتے ہوئے کنٹینر کی
پر جانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس دوران جاوید علی خود کو سنبھال کر ڈرائیور والی طرف سے نیچے اُترنے لگ تھا۔ کنٹینر کی سست رفتار اس
کام کو تھوڑا آسان بنا رہی تھی۔ بالآخر وہ اس پوزیشن میں آ گیا کہ ڈرائیور کو دیکھ سکے۔ بائیں ہاتھ سے
سنبھال کر اس نے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑا اور اس کی نال ڈرائیور کے سر سے لگا دی۔

''کنٹینر روک دو۔ ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔''

پناہ سرد آواز میں دی گئی اس دھمکی کے ردِ عمل میں ڈرائیور نے کنٹینر کو روکنے کے بجائے اسٹیئرنگ پر
بائیاں ہاتھ اٹھا کر اسے گھونسہ مارنے کی کوشش کی۔ جاوید علی نے فوری طور پر اپنا چہرہ پیچھے کر لیا پھر بھی
ناک پر ہلکی سی چوٹ لگ ہی گئی۔

اس نے جھنجلا کر ہاتھ میں موجود پسٹل زور سے ڈرائیور کو مارا جو اس کے بچنے کی کوشش کے نتیجے میں

سیدھا اس کے منہ پر جا کر لگا اور یقینی طور پر سامنے کے کئی دانت ٹوٹنے کے علاوہ دہانہ بھی شدید زخمی ہو
اس ذرا سے دورانیے میں کنٹینر اس جگہ تک پہنچ چکا تھا جہاں سلمان چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی
سب کچھ دیکھ لیا تھا اور اب خود دوڑ کر سامنے آ گیا تھا۔

ادھر کلینر کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اوپر جانا لاحاصل ہے۔ کھیل تو نیچے ہی شروع ہو چکا ہے۔ اس
آدھے راستے سے ہی واپس اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلمان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بے آواز ریوالور سے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔
حلق سے ایک کرب ناک چیخ نکلی اور وہ بے قابو ہو کر نیچے جا گرا۔ فوراً ہی پچھلے پہیوں نے اس
والے جسم کو اپنی زد میں لے کر کچل ڈالا اور فضا اس کی کرب ناک چیخوں سے گونج اُٹھی۔

جاوید سے مقابلے کی کوشش میں زخمی ہو جانے والے ڈرائیور نے یہ چیخیں سنیں تو بدحواس
خود بخود ہی بریک لگا بیٹھا۔ اس کے بعد سلمان اور جاوید علی کو روکنے والا کون تھا؟

انہوں نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکالنے کے بعد اسے لیے تیزی
سے ہٹتے چلے گئے۔ کلینر کی فکر کرنا غیر ضروری تھا۔ وہ بس آخری سانسیں لے رہا تھا اور ان کے لیے
تھا کہ اسے بھاری پہیوں کے نیچے سے کھینچ کر نکال سکیں۔

ڈرائیور جسے وہ دونوں ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے لے جا رہے تھے، مسلسل چیخ رہا تھا اور ان سے
کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کون ہیں۔

لیکن ان کے پاس اس کے سوالوں کا جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے
جانا چاہتے تھے تاکہ اگر کوئی جائے حادثہ پر پہنچ بھی جائے تو ان تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ ملک
انہیں ایک آدمی کو اس طرح لاتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

''ٹائم نہیں ہے۔ جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے واپس چلو۔'' جاوید علی نے تیز
اسے حکم دیا تو وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ ان دونوں نے ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر پٹخا اور دونوں طرف
اسے دبوچ کر خود بھی سوار ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے پراڈو واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔

''تم نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی ورنہ بابا نے مجھے اس قسم کے کسی معاملے کے
میں کوئی ہدایت نہیں کی تھی۔'' اس نے دبکے ہوئے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکایتی
یقینی طور پر وہ پریشان تھا کہ کہیں اس چکر میں اس پر کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ وہ جرائم کی دنیا
تھے اس لیے خود کو بہت بچا کر چلتے تھے۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہارے بابا تم سے ناراض نہیں ہوں گے اور نہ ہی تم کسی پریشانی میں
جاوید علی نے مختصر الفاظ میں اسے تسلی دی اور خود ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا جو زخمی چہرے کی وجہ
ناک لگنے کے ساتھ ساتھ خاصا وحشت زدہ بھی لگ رہا تھا۔ شاید کچھ کچھ صورتِ حال اس کی سمجھ میں
تھی۔ کیونکہ بار بار وہ سلمان کا چہرہ دیکھتا تھا اور ظاہر ہے کہ اسے پہچان بھی رہا تھا۔ کوئی بہت زیادہ
نہیں گزرا تھا جب سلمان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چوکی پر کنٹینر کی تلاشی لی تھی۔ اس وقت کنٹینر
دے کر جانے کی اجازت دینے والے نے اگر اسے دوبارہ گھیر لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ بہت
ہے۔ اور اس گڑبڑ میں اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔

ان دونوں نے اس سے تفتیش کا آغاز کیا تو اس کے بدترین اندیشوں کی تصدیق بھی ہو گئی۔



کہ اپنی زبان بند رکھے لیکن سی ایف پی کے تربیت یافتہ یہ جوان جو کسی صورت اسے رعایت دینے کے موڈ
نہیں تھے، اس بری طرح اس پر ٹوٹے کہ وہ خود ٹوٹ گیا اور ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''اسد صاحب سے اوپر والوں کے معاملات طے تھے اور انہوں نے یقین دلایا تھا کہ معمولی سی چیکنگ
کے بعد وہ ہمیں یہاں سے گزر جانے دیں گے لیکن عین موقع پر انہوں نے اطلاع دی کہ کسی طرح پاکستان کی
ایجنسیوں تک یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ پھلوں کی آڑ میں سرحد پار سے اسلحہ لایا جا رہا ہے اور حکومت کے خصوصی
نمائندے خود اس معاملے کا جائزہ لینے وہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم وہیں رک جائیں۔
اس لیے میں ہمارے کنٹینر کو آنند فروٹ فارم پر روک کر اس سے اسلحہ اُتارا گیا اور اس کی جگہ فروٹس لوڈ کیے
گئے۔ اب سارا اسلحہ وہیں پڑا ہے اور مناسب وقت دیکھ کر کسی بھی طریقے سے اسے یہاں اسمگل کر دیا
جائے گا۔''

''یہاں کون..... کیا اسحاق علی اسلحے کو وصول کرے گا؟'' جاوید علی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں، ہمیں مال وہیں ڈیلیور کرنا تھا لیکن اسحاق علی اصل آدمی نہیں ہے۔ وہ کسی اور پارٹی کے لیے کام
کر رہا ہے اور اس کا کام یہاں سے مال اس پارٹی تک پہنچانا ہے۔ وہ دوسری پارٹی کون ہے، یہ میں نہیں
جانتا۔'' ڈرائیور نے انہیں بتایا۔

اس کے بعد بھی وہ اپنے ذہن میں آنے والے بہت سے سوالات اس سے کرتے رہے جس کے نتیجے
میں انہیں بہت سی اہم معلومات حاصل ہو گئیں۔ جب انہیں لگا کہ اب ڈرائیور کے پاس انہیں بتانے کے لیے
کچھ باقی نہیں بچا ہے تو انہوں نے ملک عرفان سے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور کو گاڑی سے اُتار کر درختوں کے
جھنڈ میں لے گئے۔ واپسی میں ڈرائیور ان کے ساتھ نہ تھا۔ نوجوان ملک عرفان نے زبان سے تو کچھ نہیں
کہا لیکن اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''ہم نے سوچا تمہاری گاڑی اتنی اچھی ہے، اسے ایک وطن دشمن کے ناپاک خون سے گندا نہ ہونے
دیں۔'' جاوید علی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیا۔

اس کی بات کی سنگینی کو محسوس کر کے وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ مزید سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ وہ
جرائم کی دنیا کا بندہ ضرور تھا لیکن ان کے دھندے میں جان لینے کی نوبت ذرا کم ہی آتی تھی۔ وہ اسمگلرز تھے
زیادہ تر خود اپنی جان داؤ پر لگا کر کام کرتے تھے۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا
وہ کچھ مختلف ہیں۔ ان کے لیے جان دینا اور لینا دونوں ہی مشکل کام نہیں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات
کہ وہ یہ سب کچھ کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہے بلکہ اس کے پیچھے جذبۂ حب الوطنی ہے۔ ان کے انداز
سے ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر ملک دشمن کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہوں۔

ایک پل کے لیے اسے ان سے بھی خوف محسوس ہوا۔ کیونکہ وہ اور اس کا باپ بھی کوئی قانونی کام تو
کرتے نہیں تھے۔

واپسی کا باقی راستہ اس نے مکمل خاموشی کے ساتھ طے کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق انہیں انہی ٹیلوں
کے پاس جہاں سے اس نے انہیں پک کیا تھا، اُتارنے کے بعد خود اُڑنچھو ہو گیا۔

جاوید علی اور سلمان کو اس کے احساسات کی اتنی پروا نہیں تھی۔ خصوصاً جاوید علی بہت گہری سوچ میں تھا۔
اس نے وہیں رک کر پہلے ذیشان سے رابطہ کیا اور اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کیا۔ میجر اسد کے اس
معاملے میں ملوث ہونے کا سن کر اسے شاک لگا اور اس نے یقین دہانی کروائی کہ اسد کا جلد از جلد بندوبست

کر دیا جائے گا۔ ان کی ٹیم کے لیے بھی تاحکم ثانی وہیں رُکے رہنے اور حالات پر نظر رکھنے کی تاکید
جاوید علی نے اپنے طور پر اسے تسلی دی کہ وہ یہاں کے معاملات بہتر طریقے سے سنبھال لے گا۔ اس کے
ان کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا لیکن وہ خود اس کیفیت سے نہیں نکل سکا جو ڈرائیور کے بعد سے اس پر طاری تھی
''کیا سوچ رہے ہو؟'' سلمان نے اسے مستقل ایک ہی کیفیت میں دیکھا تو پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔
''میں سوچ رہا ہوں.....'' اس نے اپنے ذہن میں موجود خیال اس کے سامنے رکھ دیا۔''
''یہ بہت خطرناک ہوگا۔ شاید اوپر سے بھی ہمیں اس کی اجازت نہ ملے۔'' اس کا خیال سن کر سلمان
نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔
''خطروں سے میں نہیں ڈرتا اور فی الحال یہاں میں باس ہوں اس لیے اپنی صوابدید پر بھی بہت
فیصلے کر سکتا ہوں۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے سلمان کے اعتراض کا جواب دیا۔
''میں نہیں سمجھتا کہ اس فیصلے کو کوئی پسند کرے گا۔ یاد ہے نا کہ سنتھیا کی موت والی رات بھی
صاحب تمہارے جذباتی فیصلے پر کتنا ناراض ہوئے تھے۔'' سلمان نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے
دلانے کی کوشش کی۔
''یہ بالکل مختلف معاملہ ہے۔ میں دشمن کو سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ یہاں سب اسد جیسے ہی نہیں ہیں
بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔'' اس نے اپنی سابقہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔
''لیکن پھر بھی یار! یہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔'' سلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''تم اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں نے جو سوچ لیا ہے، اس
ہرگز پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔'' اس کا ارادہ غیر متزلزل تھا، یہ بات سلمان نے سمجھ لی۔
''پاگل ہوئے ہو کیا؟ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا، یہ تم سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟'' اس کی ناراضگی
ہی اس کی رضامندی بھی چھپی ہوئی تھی جسے محسوس کر کے جاوید علی کھِل اُٹھا۔
''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' اس نے بے ساختہ ہی سلمان کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ پھر بہت دیر تک
دونوں وہیں بیٹھ کر اپنا آگے کا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔
سب طے کرنے کے بعد اس نے چوکی پر موجود اپنے دونوں ساتھیوں سے رابطہ کر کے ان کو آگے کے
لیے مزید ہدایات دیں اور پھر ملک سبحان سے رابطہ کر کے اس سے فوری ملاقات کی فرمائش کر دی۔
ملک نے فوراً ہی گاڑی بھجوانے کا وعدہ کر لیا۔ گاڑی انہیں لینے آئی تو اسے ملک عرفان کے بجائے
اور چلا رہا تھا۔
''آپ لوگوں نے تو میرے بیٹے کو خوف زدہ کر دیا۔ کہہ رہا تھا، بابا! یہ لوگ ہمیں بھی نقصان پہنچا
ہیں۔'' ان کا استقبال کرتے ہوئے ملک نے ہنس کر انہیں یہ بات بتائی۔
''اس سے کہنا کہ ہمارے پاس اِن معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ہے ورنہ اس کا
درست بھی ہو سکتا تھا۔'' جاوید علی نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ملک کے چہرے کے تاثرات گمبھیر ہو گئے۔
''میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے ملک سبحان! ہم لوگ بہت بڑے مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اُلجھے
رہتے ہیں۔ اس لیے تمہارے لیول کے لوگوں کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ تم ہمارا ساتھ دے کر
لیے مزید رعایت بھی حاصل کر سکتے ہو۔''
سلمان نے فوری طور پر بات سنبھال لی۔ کیونکہ اس مرحلے پر وہ ملک سبحان سے نہیں بگاڑ سکتے



ملک کے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس کے لیے ملک کا تعاون بہت ضروری تھا۔
''میں اپنی اوقات کے مطابق آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ فرمائیے کیا حکم ہے میرے لئے؟''
ملک کی بات نے کسی حد تک تو اثر کیا لیکن ملک کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ پوری طرح اپنی سابقہ کیفیت
نہیں نکل سکا ہے۔ اس کی کیفیت کی پروا کیے بغیر جاوید علی نے اس کے سامنے اپنا مقصد بیان کر دیا جسے سن
وہ حیران رہ گیا۔
''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اس کی حیرت لفظوں میں بھی ڈھل گئی۔
''وہی جو تم نے سنا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟'' جاوید علی نے اسی سنجیدگی سے اس
سوال کیا اور ملک یوں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا جیسے اس کا انسان کے بجائے کسی غیر زمینی مخلوق
واسطہ پڑ گیا ہو یا پھر یہ کہ وہ اسے کوئی صحیح الدماغ آدمی تصور نہ کر رہا ہو۔ کیونکہ عام انسانوں کو تو اس نے
ایسی احمقانہ بہادری سے کام لیتے نہیں دیکھا تھا۔

⊛----✪----⊛

سلو ایک کثیر المنزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر ایک ایسے دفتر میں موجود تھا جہاں کام کے اوقات ٹھیک چھ
ختم ہو جاتے تھے اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ سے پونے سات کے درمیان دفتر لازماً خالی ہو جاتا تھا۔
وقت گھڑی کی سُوئیاں آٹھ کے ہندسے کو بھی کراس کر چکی تھیں اس لیے دفتر یقینی طور پر خالی تھا اور وہاں
اس کے سوا کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہیں تھا۔
البتہ وہ جانتا تھا کہ اس عمارت میں کئی ایسے دفاتر بھی موجود ہیں جہاں رات آٹھ اور نو بجے تک بھی کام
جاری رہتا ہے اور بعض میں تو گیارہ بجے رات تک بھی۔ اس لیے یہ عمارت اس وقت بھی سنسان نہیں تھی اور
اس پاس سے اُبھرنے والی مدھم آوازیں سن سکتا تھا۔ لیکن اس کا دھیان ان آوازوں پر نہیں تھا اور وہ ایک
تاریک کمرے کی کھڑکی کے سامنے اسنائپر گن سمیت جما بھرپور ارتکاز سے سڑک پار نظر آنے والے اس
ایک پلازا کی طرف متوجہ تھا جس کی تعمیر میں شیشے کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا اور نہایت مہارت سے
لگے برقی قمقموں نے ان شیشوں کی چمک کے ساتھ مل کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے میں
کسر نہیں چھوڑی تھی۔
حقیقتاً اسے خود بھی کئی بار اپنی آنکھیں چندھیائی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن بہرحال، وہ ایک مضبوط قوتِ
اور اعصاب کا مالک شخص تھا جو ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے ٹارگٹ پر مرکوز کرنے میں کامیاب ہو گیا
یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ اس جگہ پر توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں اسے مطلوبہ شخص
کا انتظار کرنا تھا۔
مطلوبہ شخص بھائی جی کا حریف اشوک تھا اور سامنے موجود شاپنگ پلازا کی نئی نویلی عمارت اس کے
کی ایمپائر کا ایک حصہ۔ شاپنگ پلازا کی یہ عمارت حال ہی میں مکمل ہوئی تھی اور آج اس کا باقاعدہ افتتاح
والا تھا۔ افتتاح کا وقت رات نو بجے کا طے کیا گیا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ اس کام کے لیے اشوک نے
کسی منسٹر دوست کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کر رکھا تھا۔ اس حساب سے وہاں سکیورٹی کے بھی سخت انتظامات
اور کسی غیر متعلقہ شخص کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پلازا کی حدود میں داخل ہو سکے۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا، اس
لیے وہاں داخل ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سارا منصوبہ عبدالرحمٰن نے تیار کر کے دیا تھا اور منصوبے
کے لیے درکار اشیا بھی اسی کی فراہم کردہ تھیں۔ لیکن یہ طے تھا کہ ان میں سے کوئی بھی شے اپنے بھائی

جی سے تعلق کو ظاہر نہیں کرتی تھی۔

جس گاڑی میں وہ دونوں یہاں تک آئے تھے، وہ چوری کی تھی۔ اور چور بازار سے خریدی گئی اسنائپر گن بھی کسی تھرڈ پارٹی کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔ وہ اپنا کام مکمل کر لیتے تو کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اشوک کی موت میں بھائی جی کا ہاتھ ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ سلّو کو یہاں سے جاتے جاتے یہ پتا چھوڑ کر جانا تھا کہ انسپکٹر پریم ناتھ کے لیے اشوک کی ڈیڈ باڈی کا تحفہ۔

یہ پیغام معاملات کو اُلجھا دیتا اور قدرتی طور پر اس کیس پر کام کرنے والے، اس کا تعلق ڈاکٹر فرحان کے معاملے سے جوڑتے۔ کیونکہ یہ پریم ناتھ ہی تھا جس کے ہاتھوں ڈاکٹر فرحان کی تباہی کا سفر شروع ہوا اور سوچا جا سکتا تھا کہ پریم ناتھ کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

اس طریقِ کار میں ایک خوبی یہ تھی کہ بھارتی ایجنسیاں ایک نظریہ قائم کر لینے کے باوجود براہِ راست پاکستان پر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتی تھیں۔ الزام عائد بھی کیا جاتا تو اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے شہریار نے اس طریقِ کار کو قبول کر لیا تھا۔ وہ خود بھی سلّو کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس وقت عمارت کے عقبی دروازے سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھا سلّو کی واپسی کا منتظر تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت اس کا کام سلّو کو سونپا گیا ہے، اس میں وہ زیادہ خطرے میں ہے اور وہ اس کی نسبت محفوظ پوزیشن میں ہے۔ سلّو کا انتخاب میرٹ پر کیا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلّو اپنی برسوں کی تربیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے مقابلے میں کہیں بہتر نشانچی ہے اس لیے اسے یہ ذمے داری سونپی تھی جو خود سلّو نے بھی بنا کسی ہچکچاہٹ کے فوراً قبول کر لی تھی۔ اُس کی اپنی فطرت میں تھرلنگ تھی اور وہ خطرناک صورتِ حال میں کام کرتے ہوئے ہچکچانے کے بجائے ایکسائٹمنٹ محسوس کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ دفتر کے تاریک کمرے میں پورے سکون سے کھڑا ہوا تھا اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ غلط طریقے سے دفتر کا دروازہ کھول کر یہاں داخل ہوا ہے اور ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کی موت کے نتیجے میں پورا ممبئی شہر ہل کر رہ جائے گا اور یہاں ہنگاموں کی آگ بھڑک اُٹھے گی۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گولی چلانے کے بعد اسے یہاں سے فرار ہونے کے لیے زیادہ مہلت نہیں ملے گی اور فوراً اندازہ لگا لیا جائے گا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ البتہ اس بات کا تعین کرنے میں تھوڑا وقت لگ سکتا تھا کہ گولی کس دفتر کی کھڑکی سے چلائی گئی ہے۔ وہ پہلے سے تحریر کردہ پیغام اپنی جیب میں لیے کھڑکی کے قریب بالکل ساکت کھڑا تھا۔ ٹارگٹ سامنے آنے پر اسے گولی چلانی تھی اور پیغام والا کاغذ، میز پر رکھ کر فوراً وہاں سے نکل جانا تھا۔ اس پر اسنائپر گن واپس اپنے ساتھ لانے کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ ایک بڑے بریف کیس میں ٹکڑوں کی شکل میں لائی گئی گن کے حصوں کو اس نے اسی دفتر میں بیٹھ کر آپس میں جوڑا تھا۔ وہ دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس کے ہاتھوں پر ربڑ کے باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے اپنے فنگر پرنٹس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ البتہ اس کے انتظار میں موجود شہریار کو خوشی ہو رہی تھی کہ وہ بھارتیوں کے تیار کردہ عفریت کو ان کے اپنے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور حقیقت میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ورنہ اگر کوئی دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اسنائپر گن کے ساتھ کھڑکی کے قریب کھڑا سلّو کتنا باوقار لگ رہا ہے۔ اس کا جسم بالکل ساکت تھا۔ سانس اتنی ہموار کہ اس کے نتیجے میں بھی جسم میں کسی قسم کا تحرک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

بھورے رنگ میں ڈائی کیے گئے اپنے سر کے بالوں کو اس نے جیل کی مدد سے سیٹ کر رکھا تھا اس



[illegible] سے اندر آتی ہوا کے باوجود اس کے بال بے ترتیب نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی ٹو پیس [illegible] جو اس کام کے لیے مناسب تو نہیں تھا لیکن اسے تحفظ ضرور دے رہا تھا۔ کیونکہ اس حلیے میں دیکھ کر [illegible] تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ٹارگٹ کلر ہے۔ وہ دیکھنے میں کوئی بزنس مین یا کم سے کم بھی کسی تجارتی [illegible] لگ رہا تھا۔ اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے اپنی آنکھوں پر زیرو نمبر کے شیشوں والی [illegible] عینک لگا رکھی تھی اور چہرے پر بھورے رنگ کی ہی فرنچ کٹ داڑھی بھی تھی۔

وہ حالتِ انتظار میں تھا اور مسلسل اسنائپر گن کے ساتھ منسلک دُوربین سے شاپنگ پلازا کا جائزہ لینے [illegible] تھا۔ وہاں سکیورٹی کے لیے باوردی پولیس والوں کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگ بھی نظر آ رہے [illegible] میں سے اکثریت یقیناً اشوک کے گُرگوں کی تھی۔

گاڑی کی سُوئیوں نے نو کے ہندسے کی طرف اپنا سفر مکمل کیا ہی تھا کہ اسے وہاں ہلچل سی محسوس ہوئی [illegible] وجہ بھی سمجھ آ گئی۔

وہ گاڑیوں کا پورا ایک قافلہ ہی تھا جو شاپنگ پلازا کے سامنے آ کر رُکا تھا۔ گاڑیاں رُکیں تو پہلے سے [illegible] کھڑے افراد میں سے کچھ اس طرف لپکے۔ بہت سے محافظ کھٹا کھٹ کھلے گاڑیوں کے دروازوں سے [illegible] اور پھر جب انہوں نے ''اوکے'' کا سگنل دیا تو ان دو خاص گاڑیوں کے دروازے کھلے جن سے [illegible] اور منسٹر برآمد ہوئے۔

اشوک نے باہر نکل کر گرم جوشی سے منسٹر کو گلے لگایا اور پھر دوستانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر اس طرف [illegible] جہاں افتتاحی تقریب کے لیے پلازا کے مرکزی دروازے کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا اور سرخ ربن، [illegible] صاحب کے ہاتھوں کاٹے جانے کی منتظر تھی۔ اس موقع پر وہاں میڈیا کے کئی نمائندے بھی موجود تھے اور [illegible] کی کوریج کر رہے تھے۔

اشوک اور منسٹر، سرخ ربن کے عین سامنے جا کر رُکے تو ایک سجی ہوئی طشتری میں چھوٹی سی قینچی لائی گئی۔ [illegible] پر اشوک نے جو منسٹر کی دائیں جانب کھڑا ہوا تھا، اس کا اب تک تھاما ہوا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکرا کر کچھ [illegible] منسٹر بھی مسکرا کر کچھ بولا اور قینچی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اب سلّو کے لیے مزید انتظار بے کار تھا۔ اس نے اپنی سانس روکی اور دیر سے لبلبی پر ساکت ٹکی ہوئی [illegible] حرکت میں آ گئی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ گن سے نکلی ہوئی گولی اشوک کے سر کو پاش پاش کر کے رکھ [illegible]

لیکن عین اس لمحے وہ ہوا جس کی اسے ذرا بھی امید نہیں تھی۔ وہ ایک ٹی وی چینل کا کیمرہ مین تھا جو [illegible] بہترین عکس بندی کے لیے جوش میں آ کر اچانک ہی کیمرے سمیت اپنے معاون کے شانے پر سوار ہو [illegible] اور اس کا جسم اچانک ہی اشوک اور گولی کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ظاہر ہے صورتِ [illegible] بدل گئی۔ کیمرہ مین گولی کھا کر ایک جھٹکے سے نیچے گرا اور اشوک اور منسٹر کے محافظوں نے خودکار [illegible] سے کام لیتے ہوئے اتنی تیزی سے ان دونوں کو اپنے حصار میں لیا کہ سلّو کے لیے دوسری گولی [illegible] کی گنجائش باقی نہیں رہی اور وہ اپنی ناکامی کا بوجھ شانے پر اٹھائے وہاں سے فرار کی راہ اختیار کرنے پر [illegible] ہو گیا۔

پچھلے دروازے پر شہریار گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا۔ وہ ناکامی کی تحریر چہرے پر رقم کیے اس تک پہنچا تو [illegible] نے کوئی بھی سوال کیے بغیر گاڑی چلا دی۔ اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ یہ عبدل کے اس

ساتھی کی کال تھی جو بظاہر اشوک کے گینگ کے لیے کام کرتا تھا لیکن اس کی حقیقی وفاداریاں بھائی جی کے ساتھ تھیں۔

''وہ بچ گیا ہے۔ تمہارے آدمی نے ایک کیمرہ مین کو مار ڈالا۔'' کال ریسیو کرنے پر اس نے اس کی ہیجانی آواز سنی۔

''کوئی بات نہیں۔ کام پھر بھی مکمل ہو جائے گا۔'' اس نے مختصر جواب دے کر موبائل آف کر دیا۔

''میں نے اشوک کا ہی نشانہ لیا تھا۔ لیکن وہ کیمرہ مین بالکل اچانک درمیان میں آ گیا۔'' سلّو نے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہیں ہوتا تو اس کام کے لیے تمہارا انتخاب نہیں کرتا۔'' شہریار نے اسے تسلی دینے والے لہجے میں جواب دیا اور وہ ایک موڑ کاٹ کر گاڑی کو اس سڑک پر لے آیا جہاں شاپنگ پلازا موجود تھا۔ اس سے قبل وہ عقبی جانب ایک غیر مصروف راستے پر سفر کر رہے تھے۔

''اب تمہارے ذہن میں کیا ہے؟..... کیا کرنا چاہتے ہو؟'' گاڑی کو پلازا والے روڈ پر آتے دیکھ کر اس نے اس سے دریافت کیا۔ شہریار کے ایک ہی جملے نے اسے ناکامی کے صدمے سے نکال دیا تھا۔ ویسے بھی کسی بات کو بہت دیر تک اپنے اعصاب پر سوار رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔

''ہمیں اپنا کام ابھی مکمل کرنا ہوگا۔ ورنہ بعد میں یہ کام اور بھی مشکل ہو جائے گا اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کو لے کر جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور قریب سے گزرنے والی ایک پولیس جیپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہاتھوں کے اشارے سے اس نے ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''وہاں میں نے ایک آدمی کو گن لے کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔'' پولیس والے متوجہ ہوئے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمت بتاتے ہوئے انہیں ہیجانی لہجے میں آگاہ کیا۔

یہ خبر سن کر وہ فوراً چونک گئے اور اپنی جیپ کا رخ اس کی بتائی ہوئی سمت میں موڑ کر اس بغلی گلی میں مڑ گئے جو شاپنگ پلازا کے عقبی حصے کی طرف جا رہی تھی۔

اس وقت اس جگہ پر عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن گونج رہے تھے۔ لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے اور سڑک پر سے گاڑی لے کر گزرنے والے چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جائیں۔

کوئی بھی خود کو اس ہنگامے میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا جو صرف اور صرف ایک گولی چلنے کے نتیجے میں وہاں بپا ہوا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ گولی سے مرا تو بے شک ایک بے چارہ کیمرہ مین تھا لیکن گولی اگر اشوک یا اس کے دوست منسٹر پر گئی تھی چنانچہ صورتِ حال بے حد گمبھیر تھی۔ پولیس جیپ کے پیچھے ہی اس نے اپنی گاڑی بھی موڑ لی تھی اور اب دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی عقبی حصے میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ جگہ بالکل سنسان پڑی تھی اور کسی گن بردار آدمی کا وجود ظاہر ہے نظر نہیں آ رہا تھا۔

''کہاں دیکھا تھا تم نے اسے؟'' پولیس والوں میں سے ایک نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ اس وقت اگر وہ دونوں قیمتی ملبوسات اور مہنگی ترین گاڑی کی وجہ سے بے حد امیر نظر نہ آ رہے ہوتے تو شاید پولیس والوں کا رویہ بہت خراب ہوتا۔ لیکن انہیں بھی خبر تھی کہ پیسے والوں کا اثر و رسوخ بہت اوپر تک ہوتا



ہے اس لیے اپنے روایتی طریقے پر بات کرنے سے بساط بھر گریز کر رہے تھے۔

''میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ گن لے کر اس عمارت میں گھس رہا تھا۔'' شہریار نے ایک اور کمرشل بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا جو پانچ منزلہ بلند تھی۔ اس پوری سڑک پر دونوں اطراف میں زیادہ تر کمرشل بلڈنگز تھیں اور چند ہی ایسی عمارتیں تھیں جو رہائشی فلیٹس کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ ان میں بھی گراؤنڈ فلور پر چھوٹے بڑے کاروباری مراکز ہی قائم تھے۔

''ہمیں فورس کو کال کر کے اس بلڈنگ کو گھیرے میں لینا چاہیے۔'' ایک پولیس والے نے ان سے گفتگو کرکے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا جو یقیناً اسے پسند آیا اور اس نے وائرلیس نکال لیا۔

ان لوگوں کے لیے مزید انتظار بیکار تھا۔ شہریار جس نے پہلے ہی اپنی جیب میں بڑے سائلنسر لگے پسٹل کو گرفت میں لے رکھا تھا، حرکت میں آ گیا۔ ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ اس کے پسٹل نے لگاتار چار گولیاں اُگلیں اور وہ چاروں ہی پولیس والے ڈھیر ہو گئے۔ گرنے سے پہلے ان میں سے دو کو تو آواز تک نکالنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ شہریار نے کوشش کی تھی کہ ان کے سروں کو نشانہ بنائے۔ اس کی یہ کوشش اس حد تک کامیاب رہی تھی کہ ایک کی پیشانی پر گولی نے سوراخ کیا تھا، دوسرے کی دائیں آنکھ سے گولی اندر گھس کر کان کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی تھی اور تیسرے کی گردن میں چھید ہو گیا تھا۔ چوتھا البتہ محفوظ رہا تھا اور گولی اس کی کان کی لو کو اُڑاتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس نے سب سے بلند چیخ ماری تھی اور تیزی سے زمین پر گر گیا تھا۔

سلّو نے اس کے مکر کو محسوس کر لیا اور لپک کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس سے قبل کہ پولیس والا کوئی حرکت کر پاتا، اس نے اس کے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑا اور پختہ سڑک پر زور سے دے مارا۔ پولیس والے کا سر کسی تربوز کی طرح پھٹ گیا اور اس سے سرخ سرخ خون بہنے لگا۔

''جلدی کرو، ان کی قمیصیں اُتار کر پہن لو۔'' شہریار جو خود بھی حرکت میں آ چکا تھا، زور سے بولا اور پھر اس نے ہی تیزی سے ان دو کو منتخب کرتے ہوئے ان کی شرٹیں اُتارنا شروع کر دیں جو خون آلود نہیں ہوئی تھیں۔ شہریار کے حصے میں مکمل صاف ستھری قمیض آئی البتہ سلّو نے جو قمیض پہنی، اس کے دائیں کندھے پر سوراخ موجود تھا۔

قمیصیں پہننے کے لیے انہیں اپنے کوٹ اُتارنے پڑے تھے لیکن انہوں نے کوٹ وہیں پھینکنے کے بجائے ساتھ لے لیے تھے اور لمحوں میں اپنے ضروری سامان سمیت پولیس جیپ میں منتقل ہو چکے تھے۔ گاڑی پرانی کی تھی اس لیے اس کی انہیں پروا نہیں تھی۔ سروں پر کیپ جمانے کے بعد وہ مکمل پولیس والے ہی لگ رہے تھے۔ البتہ پینٹیں بدلنے کی مہلت نہیں تھی۔ لیکن انہیں امید تھی کہ پینٹ کسی کی نظر میں نہیں آئے گی۔ شہریار نے جو پینٹ پہن رکھی تھی، وہ کسی حد تک پولیس یونیفارم سے میچ بھی کر رہی تھی اس لیے وہ زیادہ پُراعتماد تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ بھی اس نے سنبھال لی تھی اور فوری طور پر موبائل پر بھی مصروف ہو گیا تھا۔

''اشوک کہاں ہے مُنّا؟'' رابطہ ہوتے ہی اس نے اشوک کے آدمیوں میں شامل بھائی جی کے مخبر سے دریافت کیا۔

''وہ منسٹر صاحب کو رخصت کرنے کے بعد اب خود بھی یہاں سے نکل رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے باڈی گارڈ کے علاوہ پولیس والوں کی بھی اچھی خاصی نفری جانے والی ہے۔'' مُنّا نے اُسے آگاہ کیا۔

''گڈ!..... یہ تو اچھی خبر ہے۔'' ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور سلو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم تیار ہو نا؟''

''یس باس۔'' سلو جو اس کے پروگرام کو سمجھ چکا تھا، اعتماد سے بولا۔

اسی وقت سست رفتاری سے چلتی ہوئی جیپ کو لے کر شہریار مین روڈ پر آ گیا اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ وہاں کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ جیپ کے سوار بدل چکے ہیں اور جو اصل پولیس والے ہیں، وہ اس وقت لاشوں کی صورت میں عقبی سڑک پر ایک نیم تاریک گوشے میں پڑے ہوئے ہیں۔ پولیس جیپ نے ان کا کام بے حد آسان کر دیا تھا۔

وہ آرام سے سفر کرتے ہوئے شاپنگ پلازا کے سامنے پہنچ گئے تھے جہاں سے اشوک کی گاڑی بہت سی دوسری گاڑیوں کے حصار میں روانہ ہو رہی تھی۔ شہریار نے اپنی جیپ بھی ان گاڑیوں میں شامل کر لی۔ چھ گاڑیوں پر مشتمل وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا، تب بھی فضا پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سے گونج رہی تھی۔ شہریار نہایت سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

گاڑیاں اب اس سڑک سے ہٹ کر دوسری سڑک پر پہنچ چکی تھیں۔ شہریار بہت مہارت اور ہوشیاری سے اپنی جیپ کو اس طرف آگے بڑھا رہا تھا کہ اس کی اور اشوک کی گاڑی کا درمیانی فاصلہ گھٹ جائے۔ سلو اپنی جگہ بیٹھا خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

''یہ بلٹ پروف بلکہ شاید بم پروف گاڑی ہے۔ ہم اس پر حملہ کر کے اندر بیٹھے اشوک کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' سلو جو عمل کے لیے تیار تھا، قریب سے گاڑی کا جائزہ لینے پر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ شہریار بھی چونک گیا۔

اس نے سوچا تھا چلتی گاڑی پر ہینڈ گرینیڈ برسا کر اسے تباہ کر دیں گے تو اشوک کا پتا خود بخود صاف ہو جائے گا۔ لیکن موجودہ صورت میں تو یہ امکان ہی ختم ہو گیا تھا۔

اشوک کی گاڑی کے بارے میں اسے یہ اندازہ تو تھا کہ وہ بلٹ پروف ہو گی لیکن بم پروف ہونے کی بات اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔

''کوئی بات نہیں، ہم پھر بھی اپنا کام مکمل کر کے ہی رہیں گے۔ اشوک کو اس کے گھر پہنچنے دو۔'' ہمت ہارنے کے بجائے اس نے فوراً ہی اپنا اگلا لائحہ عمل طے کر لیا اور سرگوشیوں میں سلو کو بتانے لگا کہ آگے کے لیے اس کا کیا پروگرام ہے۔

اللہ اللہ کر کے وہ سفر ختم ہوا اور ممبئی کے نہایت پوش علاقے میں پہنچ کر گاڑیاں ایک ایسے محل نما بنگلے کے سامنے جا رکیں جو یقینی طور پر اس علاقے کا سب سے شاندار بنگلہ تھا۔

''یہ اپنی گاڑی اندر لے جائے گا اور باقی گاڑیوں کو پھاٹک کے قریب ہی روک دیا جائے گا۔'' سلو نے تشویش بھرے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جو درست ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔ عین اس وقت گویا ان کے لیے غیبی امداد آئی۔ وہ میڈیا والے تھے جو گاڑیوں کے وہاں پہنچتے ہی ٹوٹ پڑے تھے اور اشوک کے ڈرائیور کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جائے۔

اشوک کو ممبئی میں گینگسٹر کے علاوہ سوشل ورکر کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا تھا اس لیے اس پر ہونے والے حملے کے بعد اب میڈیا کا یہ حق بنتا تھا کہ وہ اشوک سے تھوڑی سی بات چیت کر کے اس بارے میں اس کی رائے سے عوام کو آگاہ کریں۔



اشوک اب اپنی محل نما رہائش گاہ کے عین سامنے تھا اس لیے فوری طور پر اس کا خوف بھی خاصا دور ہو چکا تھا اس لیے اس نے گاڑی رُکوا لی اور ایک شیشہ کھول کر اپنا چہرہ باہر نکالا۔ باہر بہرحال وہ پھر بھی نہیں نکلا تھا اور اس مختصر مہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔

''شوٹ.....'' شہریار نے سرسراتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ اشوک کے گرد میڈیا والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس نے ہینڈ گرینیڈ کے استعمال کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ سلو اس کے پیغام کو سمجھ گیا اور فوراً ہی گن نکال کر فائر کر دیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پولیس کی گاڑی میں اشوک کے خون کے پیاسے موجود ہیں۔ گولی چلی اور سنسناتی ہوئی دور پورٹرز کے سروں کے درمیان سے گزر کر عین اشوک کی پیشانی میں جا گھسی۔

سلو نے شاید یہ اپنی زندگی کا سب سے سچا نشانہ لیا تھا اور کچھ دیر قبل اُٹھائی جانے والی ناکامی کے داغ کو دھو دیا تھا۔

پھر کو تو شاید کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے لیکن پھر چیخ و پکار مچ گئی۔ شہریار نے اپنی جیپ کا انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا تھا چنانچہ سلو کے گولی چلاتے ہی اس نے بہت خطرناک طریقے سے جیپ کو موڑ لیا اور جیپ اپنے پیچھے موجود گاڑی کو دھکا مارتی ہوئی خاصی دُور تک چلی گئی۔ وہاں موجود دوسرے لوگ اب صورتِ حال کو سمجھ چکے تھے۔ تابڑ توڑ کئی گولیاں جیپ پر برسیں اور ان کے سروں سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ اگر انہوں نے اپنے سروں کو نیچے نہ جھکا لیا ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی بھیجے میں گھس چکی ہوتی۔

اس وقت شہریار کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ گاڑی کا رخ موڑ سکے۔ وہ اسے ریورس میں ہی تیز رفتار سے چلا رہا تھا۔ ادھر سلو سر جھکائے جھکائے ہی تعاقب میں آنے والی گاڑیوں کا راستہ روکنے کے لیے مسلسل فائرنگ کر رہا تھا لیکن گاڑیاں بھی رُکنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''ہینڈ گرینیڈ۔'' آخر کار شہریار کو فیصلہ کرنا پڑا۔ ویسے بھی اب صحافی بہت دُور اور پیچھے رہ گئے تھے اور اب میں آنے والے پولیس یا اشوک کے آدمی تھے۔

سلو نے اس کی ہدایت پر فوراً ہی ایک ہینڈ گرینیڈ نکالا اور اس کی پن کھینچ کر آگے کو لپکتی گاڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ کان پھاڑ دھماکا ہوا جس نے ان کی جیپ کو بھی لرزا کر رکھ دیا لیکن شہریار اس پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ سلو کے دوسرا گرینیڈ اُچھالنے تک وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ جیپ کو موڑ کر اسے دوڑا چلا سکے۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی تیز ترین ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل کر اس جیپ سے نجات حاصل کر لے۔ لیکن سامنے سے آتی تیز رفتار پولیس موبائل نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس نے ایک نظر سلو کی طرف دیکھا اور ایکسیلریٹر پر دباؤ کچھ اور بڑھا کر جیپ کو اس کی انتہائی رفتار پر لے آیا۔ پولیس موبائل کا ڈرائیور اس دیوانگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اس لیے بری طرح گھبرایا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ تصادم سے بچنے کے لیے کیا کرے۔

آخری لمحات میں اسے صرف ایک بات سوجھی اور وہ یہ کہ وہ خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ پھر جو ان گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں تو ڈرائیور کو بند ہونے والی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن اس خطرناک تصادم میں صرف ڈرائیور ہی تو متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دو دیوانوں کو بھی تو کوئی نتیجہ بھگتنا تھا جنہوں نے یہ خطرناک فیصلہ کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

آرلینڈو کے خوب صورت ایئرپورٹ پر نظر آنے والا وہ مسافر شخصیت کے اعتبار سے بہت شاندار لگ رہا تھا۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسامت کا مالک تھا اور اس کی گوری رنگت پر نیوی بلیو کلر کا ٹو پیس خوب جچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نیلگوں پتلیاں نیوی بلیو کلر کے انعکاس کی وجہ سے کچھ اور بھی نیلی لگ رہی تھیں۔ ایک مشرقی ملک کا باشندہ ہونے کے باوجود وہ کسی طور یہاں موجود امریکیوں سے زیادہ مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ یہ شخص مشابرم خان تھا جسے اس وقت دیکھ کر گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک عام سا شخص ہے۔ ماضی میں ڈرائیور کی معمولی ملازمت کرتا رہا ہے۔

اس کی واجبی سی تعلیم بھی یہاں کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں رکاوٹ نہیں بن پا رہی تھی کہ ایک ایسے خاندان کا حصہ تھا جو نسلوں سے باہر کی دنیا سے پہاڑوں پر آنے والوں کی مہمان داری اور راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے اور جہاں کے بچے بچے کو انگریزی بولنے میں زبردست مہارت حاصل تھی کیونکہ یہ زبان انہوں نے براہِ راست غیر ملکیوں سے سیکھی تھی اس لیے لب و لہجے پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔

یہاں آنے سے پہلے وہ دُبئی سے ہوتا ہوا آیا تھا اور شخصیت کی گرومنگ کے سارے مراحل بھی طے پائے تھے۔ اس وقت اسے دیکھ کر کسی بزنس ایگزیکٹو کا خیال آتا تھا۔

اپنے مختصر سامان سمیت باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو اس ہوٹل کا پتہ بتایا جو اس کے لیے پہلے سے کمرہ بک تھا۔

ہوٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے سب سے پہلے گلے میں موجود ٹائی کو یوں کھینچا جیسے نکالا گویا پھانسی کا پھندا ہو اور اب تک وہ طوعاً و کرہاً اسے برداشت کرتا رہا ہو۔

ٹائی سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے ذہن نشین کیا ہوا نمبر ڈائل کیا اور ''ہیلو'' کے جواب میں صرف ایک مختصر جملہ بولا۔

''آئی ایم ہیئر۔''

''اوکے.....آدھے گھنٹے بعد۔''

دوسری طرف سے بھی اتنا ہی مختصر جواب دیا گیا جسے سن کر اس نے مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی اور انٹرکام اٹھا کر پہلے روم سروس کو دس منٹ بعد اپنے کمرے میں کھانا پہنچانے کا حکم دیا اور پھر خود غسل خانے کا رخ کر لیا۔ پھر تی سے غسل کرنے کے بعد وہ ایک آرام دہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر باہر نکلا تو خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ سوٹ میں اسے اپنا جسم رسیوں میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

آزادی اور سکون کے اس احساس کے ساتھ ابھی وہ بستر پر ٹکا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی ''روم سروس'' کی مہذبانہ صدا بھی سنائی دی۔

اس نے ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دے دی اور خود بے نیازی سے ایک تپائی پر رکھا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ویٹر نے بھی اس کی بے نیازی دیکھ کر خاموشی سے ایک جانب رکھی میز پر کھانا لگایا اور واپس جانے سے قبل مہذب لہجے میں پوچھا۔

''اور کوئی خدمت سر؟''

''نو تھینکس۔'' اس نے اخبار کے پیچھے سے ہی جواب دیا اور جب یہ محسوس ہوا کہ ویٹر واپس جا چکا ہے تو اخبار واپس تپائی پر ڈال کر خود کھانے کی میز کے سامنے پہنچ گیا۔

کھانے میں اس نے اپنے لیے ویجی ٹیبل نوڈلز اور سی فوڈ پر مشتمل ایک ڈش منگوائی تھی۔ فلائٹ میں



ایک چیز سینڈوچ اور کافی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھا پی سکا تھا۔ وہ بھوک کی شدت کے باعث اس پھیکے ذائقہ محسوس ہونے والے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اس جیسے آدمی کے لیے زندگی میں آنے والی یہ تبدیلیاں بہت بڑی تھیں اب تک وہ دوسروں کا خدمت گار رہا تھا اس لیے کسی سے خدمت لینا بہت دُشوار لگ رہا تھا۔

بیرونِ ملک سفر اور اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام کے مواقع بھی اسے زندگی میں پہلی بار ہی میسر آئے تھے۔ پہلے اور اب یہاں آ کر وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے مسلسل عالمِ خواب میں ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے اس طویل سفر کا مقصد ایک پل کے لیے فراموش نہیں ہوا تھا اور وہ ان تعیشات کو اوپری دل سے برتتے ہوئے اس بات کے لیے بے چین تھا کہ کسی طرح موقع ملے اور وہ اس مشن پر کام شروع کر دے جس کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ جب ہی تو اس نے ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور آدھے گھنٹے کے انتظار کو بیکاری میں نہ گزارنے کے باوجود پوری شدت سے اپنے ملاقاتی کا منتظر تھا۔

کھانا کھانے کا کام بھی اس نے دس منٹ میں نمٹا لیا تھا اور چائے یا کافی کے پروگرام کو اپنے مہمان کی آمد تک مؤخر کر دیا تھا۔

ویٹر کے برتن سمیٹ کر لے جانے کے بعد بچ جانے والے چند منٹ اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے گزارے اور بالآخر ٹھیک تیسویں منٹ پر اُبھرنے والی دستک کی آواز کو سن کر لپک کر دروازے تک پہنچا۔

''مجھے مصطفیٰ خان کہتے ہیں۔'' دروازہ کھولنے پر ایک مہذب اور خوش شکل شخص نے اپنا تعارف کروایا تو مشابرم خان پوری گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔

''بڑا اشتیاق تھا مجھے کہ شہریار صاحب کے اتنے قریبی دوست سے مل سکوں۔'' مصطفیٰ خان کا ہاتھ تھامے ہی اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو اس کے لہجے میں واضح اُداسی گھلی ہوئی تھی۔

مصطفیٰ خان فوراً ہی اس کی کیفیت سمجھ گیا۔ مشابرم خان کو اس تک بھیجنے سے پہلے ذیشان نے اسے اس کے پروفائل فراہم کیے تھے، ان میں اس بات کا بھی تذکرہ تھا کہ خان، شہریار کا بے حد وفادار اور چاہنے والا ملازم ہے اور اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب مشابرم خان سے مل کر اس خود یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ ذیشان نے غلط نہیں کہا تھا۔

اس نے خاموش تسلی کے طور پر آہستہ سے مشابرم خان کا شانہ تھپتھپایا اور پھر اس کے روبرو بیٹھ کر باقاعدہ گفتگو کا آغاز کر دیا۔ کسی تکلیف دہ موضوع پر گفتگو کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اصل موضوع پر گفتگو کرے۔

''یہ تو تم پہلے سے ہی جانتے ہو کہ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد ماہ بانو کی تلاش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں، میں تمہیں تمام ممکنہ سہولیات اور معلومات فراہم کروں گا۔ تمہیں میرے ایک آدمی کا تعاون بھی حاصل رہے گا لیکن میں خود براہِ راست تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ کیونکہ اس معاملے میں انوالو ہو کر میں خود کو منظر پر نہیں لا سکتا۔ میں اور میرے چند ساتھی یہاں دوسرے کئی اہم کام انجام دے رہے ہیں اور اس معاملے میں براہِ راست مداخلت سے گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ پہلے ہی مجھے شک ہے کہ ماہ بانو کے اغوا والے واقعے کے بعد خفیہ نگرانی کی جا رہی ہے۔ شاید وہ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں اس کے لیے کیا کرتا ہوں اسی لیے میں نے بہتر سمجھا کہ خود براہِ راست ملوث ہونے کے بجائے کسی انجان آدمی کو، جس سے میرا تعلق ثابت نہ ہو، یہ کام سونپ دیا جائے۔ اسی احتیاط کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنے گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرایا

ہے اور یہاں سیدھا اپنی گاڑی میں آنے کے بجائے گاڑی ایک شاپنگ مال کی پارکنگ میں چھوڑ کر
سے تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طریقے سے میں نے نگرانی کرنے والوں کو ناکام کر دیا
اب یہ چاہتا ہوں کہ جلد از جلد تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر کے خود واپس لوٹ جاؤں۔''
سنجیدگی سے گفتگو کرتا ہوا مصطفیٰ خان اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ شہریار کا
دوست تھا۔

ابتدائی تمہیدی گفتگو کے بعد مصطفیٰ خان اسے دیگر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے نقشوں کی
سے مشابرم خان کو آگاہ کیا کہ جنگل میں داخل ہونے کے راستے کون کون سے ہیں اور اسے کس مقام پر
کی موجودگی کا شک ہے۔

مشابرم خان نہایت توجہ اور سنجیدگی سے ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔ آخر میں مصطفیٰ خان
اسے اپنے ایک ساتھی سے رابطے کے بارے میں بتایا جو اس کا اس مشن میں ساتھ دیتا۔

''میرا وہ معاون اس مشن کے لیے تمہیں اسلحے سمیت دیگر ضرورت کی اشیا بھی فراہم کر دے گا۔
قیمتی شے درکار ہو، اسے بتاتے ہوئے جھجکنا مت۔ اور یہ یاد رکھنا کہ تمہیں ہر قیمت پر ماہ بانو اور اسلم کو
کرنا ہے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ گزرتا وقت کہیں نقصانات کو بڑھا نہ دے۔''

مصطفیٰ خان خاصا مضطرب محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی اپنی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ خود اس کام کے
کھڑا ہوتا لیکن جانتا تھا کہ جو کچھ وہ یہاں رہ کر کر رہا ہے، وہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے اس لیے
کیے رہا تھا۔

''آپ تسلی رکھیں سر!..... میں اپنی طاقت و بساط کے مطابق جو کچھ کر سکا، ضرور کروں گا۔ اس کا
اگر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔''

مشابرم خان نے نہایت عزم و خلوص سے یقین دہانی کروائی تو مصطفیٰ خان خوش دلی سے واپسی کے
روانہ ہو گیا۔

⊛----✪---⊛

''تم صرف دو آدمی وہاں جا کر کیا کر سکو گے؟'' جاوید علی کے مطالبے پر ملک سبحان نے
گھورتے ہوئے سوال کیا جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں یا وہ کوئی بالکل ناقابلِ فہم بات کر رہا
''یہ ہمارا مسئلہ ہے ملک! ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں، یہ تو وقت بتائے گا۔ تم صرف اتنا کرو
خفیہ طریقے سے سرحد کے اس پار آنند فروٹ فارم تک پہنچا دو۔ ہم اس کام کا تمہیں معقول معاوضہ
اور جو رِسک ہوگا، وہ صرف ہمارے لیے ہوگا۔ تمہارا کام صرف ہمیں وہاں لے جانا اور واپس لانا ہے
کے لیے بھی حالات خراب ہونے کی صورت میں تم پابند نہیں ہو گے اور تمہیں آزادی ہوگی کہ
خطرے میں دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس آ جاؤ۔ ہم زندگی کی پروا کرنے والے لوگ نہیں
مشن مکمل ہو گیا تو ہمارے لیے یہی بہت ہوگا۔ موت کا کیا ہے، وہ تو ایک دن آنی ہی ہے۔ اگر شہا
صورت میں آ جائے تو یہ ہمارے لیے خوش نصیبی ہوگی۔''

اس نے ملک سبحان کے حیرت بھرے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا، اس کی تائید اس کے
کھڑے سلمان کے چہرے کے تاثرات سے بھی ہو رہی تھی۔ یہ عزم اور حوصلہ دیکھ کر ملک سبحان کے
بحث کرنا ممکن نہیں رہا



''ٹھیک ہے، مجھے آدھا گھنٹہ دو۔ میں تیاری کر کے تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔'' اس نے اپنی رضامندی
کر دی تو وہ دونوں بھی آگے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

وہ جانتے تھے کہ جس کام کے لیے جا رہے ہیں، وہ کسی بھی لمحے خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔
انہیں اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ وطن کی عزت و آن کا تھا۔ اگر وہ بھارتی سرزمین پر کوئی کارروائی کرتے
پکڑے جاتے تو یہ پاکستان کے لیے بہت برا ہوتا۔

بھارتیوں کا مزاج پہلے ہی ایسا تھا کہ وہ پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر بدنام کرنے کے لیے آئے دن کوئی
ڈرامہ کرتے رہتے اور ان ڈراموں کو سچ ثابت کرنے کے لیے اُلٹے سیدھے احمقانہ ثبوت بھی فراہم
کرتے رہتے تھے۔

ان حالات میں اگر وہ دونوں ان کے ہاتھ لگ جاتے تو انہیں تو بہت بڑا جیتا جاگتا ثبوت مل جاتا اور وہ
یہ سب نہیں چاہتے تھے۔ اپنی تیاریاں کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے
کوئی ایسی شے موجود نہ ہو جو ان کے پاکستانی ہونے کا ثبوت بن سکے۔

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اتنی احتیاط برتی کہ سلمان نے اپنی شرٹ کے کالر کے
چسپاں وہ ٹیگ بھی نکال پھینکا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شرٹ کس کمپنی کی برانڈ ہے۔ اسلحہ ان کے
پہلے ہی اتفاق سے روسی ساختہ تھا اور روس کے پاکستان کے مقابلے میں بھارت سے زیادہ قریبی
تھے۔ اپنے پاس موجود ٹرانسمیٹر انہوں نے یہیں چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ کوئی
مواصلاتی آلہ نہیں لے کر جا رہے تھے۔ انہیں وہاں جا کر کسی سے کوئی رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔
وہاں جو کچھ کرتے، اللہ کی مدد اور اپنے زورِ بازو پر کرتے۔ زندہ یا مُردہ واپس آنا ان کی قسمت پر منحصر تھا۔
صلے یا ستائش کی بہرحال انہیں چاہ نہیں تھی۔

ملک سبحان کے دیئے گئے آدھے گھنٹے میں انہوں نے نہ صرف اپنی تیاری مکمل کی بلکہ اپنے ساتھیوں
رابطہ کر کے چوکی کی صورتِ حال سے بھی آگاہی حاصل کی۔ وہاں خاموشی تھی اور کوئی غیر معمولی
نظر نہیں آ رہی تھی۔ میجر اسد کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ مستقل اپنے دفتر میں ہے اور ایک
وہاں سے نہیں نکلا۔

جاوید علی نے اپنے ساتھیوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیے بغیر محض اتنا بتایا کہ ممکن ہے، اگلے چند گھنٹوں
وہ ان سے رابطے میں نہ رہیں اس لیے ایسی صورت میں انہیں خود حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر
کرنے ہوں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو نمٹاتے ہوئے آدھا گھنٹہ بڑی سرعت سے گزر گیا۔ ملک
آدھے گھنٹے بعد حسبِ وعدہ ان کے سامنے حاضر ہو گیا۔

''سفر کی تیاری ہو گئی ہے۔ آپ لوگ تیار ہیں؟'' اس وقت وہ بہت بدلا ہوا آدمی محسوس ہو رہا تھا۔
اس کی پہلے ہی شاندار تھی، اب ایک عجیب سا وقار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''ہم تیار ہیں۔'' اس کے بدلاؤ کو محسوس کرتے ہوئے جاوید علی نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ وہ لوگ
ملک سبحان کے ہی ایک ٹھکانے پر موجود تھے۔

''تو ٹھیک ہے۔ پھر آپ میرے ساتھ آ جائیں۔'' وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر باہر نکل گیا۔ باہر اس کا
سال بیٹا ملک عرفان دو ہیوی بائیکس کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک بائیک پرانے ماڈل کی لیکن
حالت میں تھی۔ جبکہ دوسری بالکل نئی نویلی تھی۔

''ان میں سے ایک بائیک میری اور دوسری میرے بیٹے کی ہے۔ میرا بیٹا عادتوں میں مجھ پر گیا ہے اس لیے اس کے شوق بھی میری طرح کے ہیں اور یہ میری ہر بات فوراً سمجھ بھی جاتا ہے۔ آپ کا کام جلدی کا ہے اس لیے ہم نے ان بائیکس پر سفر کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم اس مشن میں شروع سے آخر تک آپ کے ساتھ رہیں گے۔ کیونکہ یہ صرف آپ کے نہیں، ہمارے وطن کا بھی معاملہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ساری زندگی اس وطن میں عیش کرنے کے بعد کم از کم ایک بار تو اس کا حق ادا کر دوں۔ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے کہ میرے اندر یہ خواہش آپ لوگوں کے عزم کو دیکھ کر اُبھری ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اس پیسے کی خاطر اتنی بار جان داؤ پر لگائی جا سکتی ہے تو ایک بار کسی بڑے مقصد کے لیے بھی سہی۔''

بائیکس کے پاس رک کر ملک سبحان نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو وہ دونوں اللہ کی کرشمہ سازی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ وہ مالک و مختار کیسے کیسے کمال دکھاتا ہے کہ ایک اسمگلر پل بھر میں مجاہد کا کردار ادا کرنے کو تیار ہو گیا اور ساتھ ہی اپنے اس بیٹے کو بھی لگا لیا جسے شاید مستقبل میں اس کے دھندے کی باگ ڈور سنبھالنی تھی اور وہ اس مقصد کے لیے تربیت کے مراحل سے بھی گزر رہا تھا۔

''آپ کا جذبہ قابلِ ستائش ہے لیکن ہمیں بہت سی احتیاطیں بھی برتنی ہوں گی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو بطور پاکستانی شناخت نہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے شناختی کاغذات سمیت ہر موجود لباس اور جوتوں تک کا دھیان رکھنا ہوگا۔ اور ہاں، ان بائیکس کے استعمال کے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔'' اس کے جذبے کو سراہتے ہوئے جاوید علی نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

''فکر مت کرو۔ میں ان ساری باریکیوں کو سمجھتا ہوں اس لیے ہر بات کا دھیان رکھا ہے..... اور یہ بائیکس تو یہ خود اسمگلنگ کا ہی مال ہے جس کی رجسٹریشن کسی بھی شخص کے نام نہیں ہے۔'' ملک سبحان نے تسلی کروائی۔ اس کا بیٹا اس دوران خاموشی سے کھڑا رہا تھا اور اس کی توجہ بھی اپنی بائیک پر ہی مبذول تھی ویسے بھی انہوں نے اسے اس کے باپ کی نسبت کم آمیز ہی پایا تھا۔

''تو ٹھیک ہے۔ پھر اللہ کا نام لے کر سفر شروع کرتے ہیں۔'' جاوید علی نے بالآخر سفر کے آغاز کی منظوری دے دی۔

پرانی بائیک پر ملک سبحان کے ساتھ وہ خود بیٹھا جبکہ نئی پر عرفان کے ساتھ سلمان۔ دونوں باپ بیٹے بیک وقت بائیکس اسٹارٹ کیں اور جب سفر شروع ہوا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ دونوں میں سے ایک دوسرے سے کم نہیں ہے۔ ملک سبحان کی ڈھلتی جوانی میں کسی طور بھی جوان بیٹے سے کم جوش نہیں تھا اور وہ بیٹا اپنے تجربہ کار باپ سے مات کھا رہا تھا۔

جاوید علی نے دل ہی دل میں دونوں کو داد دیتے ہوئے ملک کے بائیکس پر سفر کے فیصلے کو سراہا۔ دونوں نے اتنی عقل مندی کی تھی کہ پٹرول کے بھرے ہوئے کین بھی اپنی اپنی بائیک کے ساتھ لٹکا لیے تھے۔ اس لیے کسی مرحلے پر پٹرول ختم ہونے پر پھنس نہیں سکتے تھے۔

ان کے سفر کا بیشتر حصہ تنگ، ویران اور غیر ہموار راستوں پر مشتمل تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ورنہ ملک سبحان کے مطابق کبھی کبھار ان راستوں پر بھی انہیں سرحدی گشتی پارٹی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ وہ لوگ اپنے طور پر ایسی کسی پارٹی سے نمٹنے کے لیے ہر لمحہ پورے تیار تھے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور پورا سفر بخیر و عافیت طے ہو گیا۔

''اب ہم آنند فروٹ فارم سے بمشکل دس منٹ کے فاصلے پر ہیں۔'' ویران اور بنجر راستوں پر



سفر کرتے کرتے دھیرے دھیرے ہریالی میں بدلنا شروع ہوا تو ملک سبحان نے اسے آگاہ کیا۔ ویسے ہریالی کا اندازہ انہوں نے بس ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نظر آنے والے سایوں کو دیکھ کر ہی لگایا تھا ورنہ اب رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

''اس تو پھر فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر رک جانا۔ بائیکس کسی جگہ چھپا کر باقی کا فاصلہ پیدل طے کریں گے۔''

اس نے فوراً ہی ملک سبحان کو ہدایت کی جس کے جواب میں اس نے محض سر کو اثبات میں جنبش دی۔ دو منٹ بعد اس نے بائیک کو ایسی جگہ روک لیا جہاں بہت سی خودرو جھاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے بیٹے نے اس کی تقلید کی۔

''ہم بائیکس ان جھاڑیوں میں چھپا کر آگے جا سکتے ہیں۔ اچھا ہے کہ ہماری کارروائی کے دوران ان کو بھی ٹھنڈا ہونے کا موقع مل جائے گا۔'' ملک سبحان نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ یہ کام کرو۔'' جاوید علی نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اندھیرے کی وجہ سے منظر واضح نہیں تھا، صرف ڈھلتے چاند اور چمکتے ستاروں کی مدھم روشنی میں بصارت سے کام لے کر ہی تھوڑا بہت دیکھا جا سکتا تھا اور اس تھوڑے بہت سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گرد و پیش میں آبادی نہیں ہے۔ آبادی ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے روشنی کی کوئی جھلک ضرور دکھائی دے جاتی۔ اس نے ملک سبحان سے اس بابت دریافت کیا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ یہ علاقہ غیر آباد ہے۔ البتہ فارم ہاؤس کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس سے کچھ لوگ فارم پر کام کاج کے لیے جاتے ہیں لیکن وہ گاؤں بھی وہاں سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف ملک نے اسے جواب دیا۔ وہ اس علاقے سے اس حد تک واقف تھا کہ اندھیرے کے باوجود کہیں کسی جگہ رک کر سمت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور وہ یہاں تک آ گئے تھے۔

''تم دونوں چاہو تو یہاں رک کر ہمارا انتظار کر سکتے ہو۔ ہم نے صرف راہنمائی کے لیے تمہاری خدمات لی ہیں، اس سے آگے کے ماحول میں تم ہمارا ساتھ دو، یہ ضروری نہیں ہے۔ آگے جان کا خطرہ ہے اور کہا جا سکتا کہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔'' فارم ہاؤس کے لیے پیدل سفر پر روانہ ہونے سے قبل اس نے ملک سبحان سے کہا۔

''نہیں۔ میں سب آگا پیچھا سوچ کر ہی آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہوا ہوں اور اپنے بیٹے کے ساتھ میں نے زبردستی نہیں کی ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میرے ساتھ آنے کے لیے راضی ہوا ہے۔'' اس نے گمبھیر آواز میں جواب دیا تو اس کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی اور انہوں نے خاموشی سے سفر کا آغاز کر دیا۔ علاقہ سنسان تھا، اس کے باوجود وہ احتیاط سے پیش قدمی کر رہے تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ ایک ایسی چار دیواری تک پہنچ گئے جس کے اندر کہیں جلتی لائٹوں کی ہلکی سی روشنی یہاں سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

''یہی دیوار پھاند کر اندر جانا ہوگا۔'' جاوید علی نے سرگوشی میں کہا۔

''ہاں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی الارم سسٹم نصب ہو اور ہمارے کوشش کرتے ہی اندر والے ہوشیار

ہو جائیں۔'' سلمان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا؟..... ویسے مجھے اُمید ہے کہ یہاں کوئی الارم ہوگا۔ یہ ایک فارم ہاؤس ہے جہاں پھلوں کی کاشت کی جاتی ہے اور پھل بہر حال اتنی قیمتی شے نہیں ان کی حفاظت کا اتنا خیال رکھا جائے۔ یوں بھی یہ فارم ہاؤس آبادی سے کافی فاصلے پر ہے اس چوری چکاری کا خطرہ نہیں ہے۔ باقی رہیں یہاں جاری مجرمانہ سرگرمیاں تو اس کا تو یہاں آس پاس اندازہ بھی نہیں لگا پاتے ہوں گے..... یا اگر کسی کو علم بھی ہوگا تو وہ ان لوگوں سے ڈر کر مزید دُور رہ دیتا ہوگا۔'' اس نے سلمان کے اندیشوں کی مخالفت کرتے ہوئے دلائل دیئے۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اندر چلتے ہیں۔''

''وہ تو جانا ہی ہے لیکن پہلے میری کچھ باتیں غور سے سن لو۔ ہمارے پاس بڑے ہتھیار موجود ہمیں آخری حد تک ان کے استعمال سے بچنا ہوگا۔ کسی بھی شخص سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں الامکان خاموشی سے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنا۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ چھوٹے ہتھیاروں کا استعمال تاکہ آواز زیادہ دور تک نہ جا سکے۔ یہاں سے سرحد بہت زیادہ دُور نہیں ہے اس لیے خدشہ ہے کہ سرحد پر ڈیوٹی دیتے سپاہیوں تک پہنچ جائیں گی اور وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اس طرف آنے کریں گے۔ اور ظاہر ہے یہ ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔''

اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کسی منجھے ہوئے سپہ سالار کی طرح اپنے ساتھیوں کو بریفنگ تھا۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو بتایا کہ وہ چار دیواری کے کس حصے سے فارم ہاؤس میں داخل وہاں موجود مرکزی عمارت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ان کے درمیان اندھیرے میں ایک دوسرے کی شناخت کے لیے اُلّو کی آواز کا کوڈ بھی بھی طے کیا گیا کہ ہر ایک اپنے اپنے حصے کا کام مکمل کر کے نکلنے سے قبل دوسرے ساتھیوں کو کس دے گا۔ واپسی میں انہیں اکٹھے ہو کر یہاں سے نکلنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر روانہ ہونا تھا تک پہنچنا تھا جہاں انہوں نے بائیکس چھپائی تھیں۔

ان کے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ اس جگہ رک کر دس منٹ سے زیادہ پیچھے رہ جانے کے انتظار کا خطرہ نہیں مول لیں گے۔ خصوصاً ملک سبحان اور عرفان کو جلد از جلد ہر حال میں وہاں جانے کا حکم تھا۔ کیونکہ وہ دو ایسے افراد تھے جن کے شناختی کاغذات موجود ہونے سے کوئی فرق پڑ تھا اور انڈین حدود میں کئی ایسے افراد موجود تھے جو صرف صورت دیکھ کر انہیں پہچان سکتے تھے۔

یہ ساری ہدایات جاری کرتے ہوئے جاوید علی اس حد تک سنجیدہ تھا کہ کسی میں اس سے جرأت نہیں ہو سکی اور اس نے ون ٹو تھری اسٹارٹ کہہ کر انہیں حرکت میں آنے کا اشارہ دے دیا ہی اپنے اپنے طور پر کارروائی کے لیے تیار تھے اور ان کے ضروری سامان سے بھرے بیگ ان لدے ہوئے تھے۔

فارم ہاؤس کی چار دیواری قد آدم اونچی تھی اور ان کے لیے اس کے پار پہنچ جانا زیادہ مشکل لیکن جب جاوید علی نے اس کی کگر پر اپنے ہاتھ جمانے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ اس پر کانچ لگائے گئے ہیں جو بے احتیاطی پر انہیں زخمی کر سکتے ہیں۔

اپنے ہاتھوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا اپر اُتارا اور اس کی دہری تہ



کے بعد دوسری طرف اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے ساتھیوں نے بھی یہی استعمال کیا ہوگا۔

اپر کو دیوار پر چھوڑنے کے بجائے اس نے دوبارہ پہن لیا اور دبے قدموں مرکزی عمارت کی طرف پیش کی۔ وہاں خاموشی کا راج تھا اور اردگرد کسی ذی نفس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن انہیں تو طور پر احتیاط کرنی ہی تھی۔ محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ مختلف درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔

فارم ہاؤس کے مرکز میں قائم عمارت کے اندر جلتی مدھم روشنیاں اسے سمت کے تعین میں مدد فراہم کر میں اور قوتِ شامہ بتا رہی تھی کہ اس وقت وہ کن پھل دار درختوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔

یہ درخت ترتیب سے قطار در قطار لگائے گئے تھے اس لیے اندھیرے کے باوجود اس کے کہیں ٹکرانے کا امکان نہیں تھا۔ مرکز میں تعمیر شدہ عمارت اور اطراف میں موجود درختوں کے درمیان اچھی خاصی زمین خالی اور کہیں کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جو یہ درمیانی حصہ عبور کرتے ہوئے تحفظ فراہم کر سکے۔ واحد رات کا اندھیرا ہی تھا جو کچھ آڑ فراہم کر رہا تھا لیکن اندر موجود افراد میں سے اگر کوئی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا اندھیرے میں متحرک جسم کو محسوس کر سکتا تھا۔

جاوید علی نے اللہ کا نام لیا اور درختوں کی آڑ سے نکلتے ہی زمین پر لیٹ گیا۔ اب وہ کرالنگ کرتا ہوا عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ملک سبحان دائیں پہلو اور اس کا بیٹا عرفان ایک پہلو سے آئے گا جبکہ سلمان کو عقب سے آنا تھا۔ یہ طے شدہ پروگرام تھا جس پر ہر ایک لازماً عمل کرتا۔

اس نے احتیاط کے باوجود بہت تیزی سے حرکت کی تھی، اس لیے امید تھی کہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پہلے وہی وہاں پہنچا ہوگا۔ عمارت کا دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور اندر سے بند تھا۔ اس نے نپے تلے انداز میں دروازے کو دھکا دے کر اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ قوت کے بل پر اس دروازے کو کھولنا ممکن نہیں ہوگا اس لیے ایسی کوئی کوشش فضول ہوگی۔

سامنے کی دیوار میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی جس پر وہ زور آزمائی کر کے اندر تک رسائی حاصل کر پاتا۔ دروازے سے اوپر ایک روشن دان ضرور بنایا گیا تھا لیکن اس کا قطر اتنا نہیں تھا کہ وہ اس سے گزر کر اندر سکتا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پہلو کی کسی دیوار تک جا کر کوشش کرے لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس قسم کے مشن میں ترتیب و تنظیم ضروری ہوتی ہے اور ہنگامی حالات کے علاوہ کسی کا اپنے طے شدہ کردار سے ہٹ کر کام کرنا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ صبر سے اپنی جگہ جما رہا البتہ اتنی تبدیلی ضرور کی کہ دروازے کی کسی جھری میں سے اندر جھانک سکے لیکن ایسی کوئی جھری نہ مل سکی۔ اس کے اندر کی بے چینی اسے یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑے رہنے کی بھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

اندر سے ہلکی ہلکی آوازیں اُبھرنا شروع ہوئیں تو یہ بے چینی کچھ اور سوا ہو گئی۔ اس نے اپنے بیگ کی میں ہاتھ ڈال کر وہ لمبی رسّی برآمد کی جس کے ایک سرے پر بڑا سا ہُک بندھا تھا۔ ہُک کو گھما کر پھینکنے پر ہی کوشش میں روشن دان میں پھنسانے میں کامیاب ہو گیا۔ رسّی کے سہارے پھر روشن دان تک رسائی کرنا بھلا کیا مشکل تھا۔ اسے تو اس سے کہیں بلند مقامات پر اس طرح چڑھنے کی تربیت دی گئی تھی اور تو دروازے کی وجہ سے ایک اضافی فائدہ یہ مل گیا تھا کہ اسے ہوا میں جھولتے رہنے کے بجائے دروازے کی کنڈی پر پیر ٹکانے کی جگہ مل گئی تھی اور یہ سہارا بڑا کارآمد ثابت ہوا۔

اس نے روشن دان سے جھانکا تو اندر کا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ وہ یقینی طور پر ملک سبحان تھا جسے ایک

رائفل بردار نے اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ ملک شاید اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور کسی کھڑکی وغیرہ کے ذریعے اندر تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ملک سے کوئی بے احتیاطی ہوئی یا اندر والے ویسے ہی ہوشیار تھے کہ اندر گھستے ہی وہ پکڑا گیا۔ اس پر رائفل تان کر کھڑا شخص تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک آدمی اور نظر آ رہا تھا۔

''چھیتی بول! کون ہے تُو؟..... تیرے نال ہور کون کون ہے؟'' رائفل کی نال ملک سبحان کی کنپٹی سے لگائے کھڑا آدمی اس سے غضب ناک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''میں موت کا فرشتہ ہوں اور میرے ساتھ تیری موت ہے۔'' ملک سبحان نے بے خوف لہجے میں جواب دیا جس پر اس نے استہزائیہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

''بندوق کی نال تیری ٹھڈی وِچ لگی ہے ہور تُوں مینوں مارن دی دھمکیاں دے رہا ہے..... اوئے چھیتی چھت پر جا ہور دیکھ کہ آس پاس اس کا کوئی سنگی ساتھی تو نہیں چھپا ہوا۔ اور ہاں، پہلے اس جیرے کو اُٹھا دے..... کمبخت پوری بوتل چڑھا کر سو رہا ہے، اس لیے ابھی تک آنکھ نہیں کھلی ہے۔''

پہلے مذاق اُڑانے والے کو شاید بروقت ملک سبحان کی خود اعتمادی کھٹک گئی تھی، چنانچہ فوراً ہی یہ ہدایات جاری کرنے لگا۔

اب جاوید کے پاس مزید انتظار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس گفتگو کے دوران وہ اپنا بریٹا تو نکال ہی چکا تھا چنانچہ ملک سبحان کو کور کیے کھڑے شخص کا نشانہ باندھا اور قریب تھا کہ گولی چلا دیتا کہ وہ شخص ایک زوردار ہائے کے ساتھ رائفل سمیت فرش پر گر گیا۔

جاوید علی نے دیکھا کہ اس کے بائیں پہلو میں ایک لمبے پھل کا چاقو دستے تک دھنسا ہوا ہے۔ وہ پھینکنے والا کون تھا، یہ تو وہ نہیں دیکھ سکا لیکن سمت کا اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہ بائیں جانب سے آیا ہے اور اس طرف سے ملک عرفان کو آنا تھا۔ یعنی بیٹے نے پھرتی اور ہوشیاری سے کام لے کر باپ کو مشکل میں ڈالنے والے کو نہایت خاموشی سے زیر کر لیا تھا۔

باقی کے واقعات اس سے بھی زیادہ تیزی سے پیش آئے تھے۔ رائفل کی نال خود پر سے ہٹتے ہی ملک سبحان کسی چیتے کی پھرتی سے حرکت میں آیا تھا اور زخمی ہو کر نیچے گر جانے والے شخص کو پیروں تلے روندتا ہوا اس کے ساتھی پر جھپٹ پڑا جو ابھی تک شاید اسی تذبذب میں کھڑا تھا کہ اسے حکم دینے والا کس کے کارنامے کی بدولت یوں خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

ملک سبحان کے تیز رفتار حملے نے اس بے چارے کو اس مسئلے پر زیادہ غور کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ لمبا چوڑا ملک اس پر چھا گیا۔ دو چار پٹخنیوں میں ہی اس نے اس بے چارے کے ہاتھ پیر چلانے کی معمولی کوشش کو بھی ناکام بنا دیا اور وہ بھی اپنے ساتھی کے قریب ہی چت پڑا نظر آنے لگا۔

''ملک! میرے لیے دروازہ کھولو۔'' صورتِ حال قابو میں دیکھ کر جاوید علی نے اسے حکم دیا اور خود چھلانگ لگا دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ جاوید تیزی سے اندر داخل ہوا۔ پہلو میں چاقو کا وار کھانے والا تو اب آخری سانسیں گن رہا تھا البتہ اس کا ساتھی بے ہوش تھا۔

''عرفان! تم باہر ہی ٹھہر کر نظر رکھو۔ ہم اندر دیکھتے ہیں۔'' اندر جلتی روشنیوں میں اسے بائیں طرف کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے ملک عرفان کی جھلک نظر آ گئی تھی اس لیے بلند آواز میں اسے حکم دیا اور خود تیزی سے نظر آنے والے ایک دروازے کی طرف بڑھا۔



اسے یاد تھا کہ قریب المرگ شخص نے کسی جیرے کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے جاگنے سے پہلے اسے قابو میں کرنا ضروری تھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک گولی کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزر کر اس کے پیچھے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ وہ خودکار ردِعمل کے طور پر فوراً ہی نیچے گر گیا، نظریں البتہ اس کی دروازے کی جانب ہی تھیں جہاں اس نے سانولی رنگت کے جوان العمر آدمی کو شارٹ گن کے ساتھ کھڑا دیکھ لیا تھا۔ فائر کرنے کے بعد اس نے تیزی سے خود کو آڑ میں کرنے کی کوشش کی لیکن قدموں کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ تیزی سے حرکت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ یقیناً شراب کی اس بوتل کا کمال تھا جو اس نے رات سونے سے پہلے چڑھا لی تھی۔ بہرحال، وہ اپنی شراب نوشی کے باوجود اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ ملک سبحان کی، جواب میں چلائی گئی گولی اسے اپنے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہونے سے قبل ہی آڑ میں چھپنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس بار اس نے صرف گن کی نال باہر نکال کر فائر کیا تھا۔ ایک بار پھر وہی کان پھاڑ آواز گونجی اور گولی کسی نامعلوم سمت میں غائب ہو گئی۔

ظاہر ہے، یہ اندھا دھند فائر تھا جو محض اتفاقاً ہی کسی کو نشانہ بنا سکتا تھا اور اس شخص کو تو اپنا نشانہ لے کر کیے گئے پہلے فائر میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس بار بھی ملک سبحان نے جوابی فائر کیا جو پہلے والے کی طرح بے نتیجہ ہی رہا۔ جاوید علی نے اس دوران اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ وہ موجودہ صورتِ حال پر تشویش کا شکار تھا۔ اس کی خواہش کے برخلاف وہاں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ملک سبحان کے پسٹل سے ہونے والے فائروں کی تو پھر بھی خیر تھی کہ اس کی آواز زیادہ بلند نہیں ہوتی لیکن شارٹ گن کی دھماکے دار آواز تو ویرانے میں خاصی دور تک جانے کا امکان تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ اس تنہا شخص پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن کسی کے متوجہ ہو کر اس طرف نکل آنے کی صورت میں بڑی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ انہیں ابھی اپنا اصل کام مکمل کرنا تھا اور پھر سرحد پار بھی جانا تھا۔

''بس اب گن چھوڑ کر اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو اور کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کیے بغیر سیدھے ادھر چلو۔'' خاموشی کا ایک معمولی سا وقفہ آیا تھا جس میں انہوں نے سلمان کی غراتی ہوئی آواز سنی اور پھر وہ شرابی جیرے کو اپنی بریٹا کی زد میں لیے دروازے پر نمودار ہوا۔

اسے عقبی سمت سے یہاں داخل ہونا تھا اور اس سمت جانے کے لیے اسے دوسروں کے مقابلے میں کافی لمبا چکر کاٹنا پڑا ہو گا اس لیے وہ دیر سے وہاں پہنچا تھا لیکن اس پر دیر آید درست آید والی بات صادق آئی تھی۔ اس کے باعث ہی وہ مصیبت بننے والے جیرے کو پیچھے سے آ کر آسانی سے قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''اس سے پوچھو کہ اشوک کا مال کہاں رکھا ہے؟ اور ہاں، اگر یہ بتانے میں ایک پل کی بھی دیر لگائے تو اسے گولی مار دینا۔ ہم خود مال تلاش کر لیں گے۔''

جاوید علی نے سفاک لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی ملک سبحان کو بھی اشارہ کیا کہ وہ اوپر جا کر اردگرد پر نظر رکھے تاکہ فائر کی آواز سن کر اگر کوئی اس طرف آ نکلے تو بروقت پتہ چل جائے۔

''اپن کو مت مارنا صاحب!..... ہم تو یہاں خالی نوکر ہے۔'' سلمان کی بریٹا کا دباؤ جیرے کی کھوپڑی پر پڑا تو وہ گڑگڑانے لگا۔

''جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔'' اس کی فریاد پر کان دھرے بغیر جاوید علی نے اسے حکم دیا۔ ویسے یہ اندازہ خود بھی لگا چکا تھا کہ یہاں موجود تینوں افراد لڑائی بھڑائی کے فن اور اسلحہ شناسی میں کچھ تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں لیکن انہیں مہارت نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ چھوٹے بدمعاش تھے جنہیں آنند نے فارم ہاؤس کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔

ان میں سے کسی کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ اشوک کے اسلحے کی بھاری تعداد میں یہاں موجودگی کی کسی کو خبر ہوگی اور سرحد پار سے کوئی جان ہتھیلی پر رکھ کر کارروائی کے لیے بھی دوڑا آئے گا اس لیے مزید پہرے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور سب کچھ معمول کے مطابق دکھانے کے لیے ان تین گھامڑوں پر ہی اکتفا کر لیا گیا تھا جو یقیناً اپنا دفاع بھی ڈھنگ سے کرنے کے اہل نہیں تھے۔

''مال نیچے تہ خانے میں رکھا ہے۔ تہ خانے کا راستہ ادھر کمرے میں ہے۔'' جیرے نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب اُگل دیا تو اس نے سلمان کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ فوراً ہی سلمان کا ہاتھ حرکت میں آیا اور جیرے کی آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔

وہ دونوں تیزی سے حرکت میں آئے اور جیرے کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں تہ خانے کا راستہ تلاش کر کے نیچے اُتر گئے۔ وہاں اندھیرا تھا اس لیے انہیں اپنے بیگ سے ٹارچیں نکال کر روشن کرنی پڑی تھیں۔

ٹارچ کی روشنی میں وہ وہاں موجود پیٹیوں کو صاف دیکھ سکتے تھے۔ پیٹیوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے پھلوں کی پیٹیاں ہوتی ہیں۔ لیکن پہلی پیٹی کو کھول کر دیکھنے کی کوشش میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف ظاہری طور پر ہی پھلوں کی پیٹیوں سے مشابہ ہیں ورنہ خاصی مضبوط ہیں۔

اتفاق سے انہوں نے جو پہلی پیٹی کھولی، اس میں سے ایک مشین گن اور اس کے راؤنڈز مل گئے۔ کچھ سوچ کر جاوید علی نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس کام میں جت گیا جس کے لیے لوگ اتنا خطرہ مول لے کر یہاں آئے تھے۔

چند منٹوں کا یہ کام کتنا نازک اور محنت طلب تھا، یہ اس کے پسینہ پسینہ ہوتے وجود سے ظاہر تھا۔ اس کام کے دوران سلمان نے ذرا بھی مداخلت نہیں کی تھی اور دونوں ٹارچیں اپنے ہاتھ میں سنبھالے اسے روشنی فراہم کرتا رہا تھا۔

''الحمدللہ۔''

آخر کار جاوید علی کے لبوں سے نکلا تو سلمان نے بھی سکون کا سانس لیا۔ بظاہر تو اس ساری کارروائی کے دوران اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن حقیقتاً اعصاب اس کے بھی تنے ہوئے تھے۔

''اب یہاں سے نکل چلو۔ میں نے صرف دس منٹ کا وقت رکھا ہے۔'' جاوید علی نے آہستہ سے کہا تو وہ دونوں ہی تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ اوپر ان تینوں میں سے ایک مُردہ جبکہ دو بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ انہیں وہاں سے نکال پاتے۔ البتہ جاوید نے ان کے پہلو میں ایک ایک زوردار لات رسید کر کے ایک کوشش ضرور کی تھی کہ وہ ہوش میں آ جائیں۔ اس میں کامیاب رہی یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے رُکنے کا ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

باہر نکل کر سلمان نے حلق سے اُلّو کے مانند بلند آواز نکالی۔ یہ ملک سبحان اور عرفان کے لیے واپسی کا سگنل تھا۔ سگنل دینے کے بعد وہ دونوں ٹھہرے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق اب انہیں اسی جگہ ایک دوسرے سے ملنا تھا جہاں انہوں نے موٹر سائیکلیں چھپائی ہوئی تھیں۔



ابھی ہنوز اندھیرے کا راج تھا لیکن ان کی آنکھیں اس اندھیرے سے شناسا ہو گئی تھیں چنانچہ انہوں نے جھاڑیوں کی مدھم روشنی میں بھی واپسی کا سفر بخیر و خوبی طے کر لیا اور اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں بائیکس چھپائی ہوئی تھیں۔

انہوں نے بائیکس جھاڑیوں سے باہر نکالیں اور اندھیرے میں ان دونوں باپ بیٹے کو دیکھنے کی سعی کرنے لگے جن کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا اور یہ ذرا پریشانی کی بات تھی۔ وہ دونوں چست و توانا اور ان راہوں سے واقف تھے اس لیے ان کا اب تک یہاں نہ پہنچنا ناقابلِ فہم تھا۔ انہیں تو ان سے بھی پہلے یا کم از کم ساتھ ساتھ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اور اب تو وقت بھی زیادہ نہیں رہا تھا۔ دو تین منٹ اور گزرتے تو وہاں سے فروع ہو جاتے۔ اور جتنی بڑی مقدار میں وہاں اسلحہ و بارود موجود تھا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے کتنی شدید نوعیت کے ہوں گے۔ فارم ہاؤس کی حدود میں تو کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان حالات میں اگر ملک سبحان اور عرفان وہیں موجود تھے تو یہ ایک انتہائی تشویش ناک بات تھی۔

''اب ہم مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔'' وقت کے ایک ایک سیکنڈ کی گنتی کرتے سلمان نے مضطرب لہجے میں کہا تو جاوید علی کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔

''ہاں، ہمیں چلنا ہوگا۔ لیکن ان دونوں کا کیا ہوگا؟ ہم ان کے لیے بائیک بھی نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ بے شک اسٹارٹ شدہ ہیں لیکن کھوج لگانے والے کھوج لگا لیں گے کہ یہ کس کے استعمال میں رہی ہیں۔ لے جانے کی صورت میں وہ دونوں بعد میں آئے تو انہیں پریشانی ہوگی۔''

اس کے پیشِ نظر وہاں سے روانگی کے فیصلے کے علاوہ اور بھی مسائل تھے۔

''ایسا کرتے ہیں کہ ہم فی الحال یہاں سے نکل جاتے ہیں اور پھر آگے کہیں جا کر ان کا انتظار کر لیں گے۔ وہ تجربہ کار اسمگلرز ہیں اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔''

سلمان نے تجویز پیش کی جو حالات کے حساب سے مناسب ہی تھی۔ بوجھل دلوں کے ساتھ دونوں نے ایک بائیک سنبھالی۔ دل میں یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ دونوں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ان کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟ زیادہ امکان تو اسی بات کا تھا کہ جب وہ تہ خانے میں تھے، اسی وقت کچھ پیش آیا تھا۔ لیکن کیا؟ ... یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ کیونکہ انہیں کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جن لوگوں نے ان دونوں باپ بیٹے کے لیے مسئلہ پیدا کیا، انہیں بعد میں ان دونوں کی راہ بھی تو روکنی چاہئے تھی لیکن وہ تو بہت آرام سے نکل گئے تھے اور واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

مختلف سوچوں میں گھرے ان کا سفر جاری تھا کہ پہلا کان پھاڑ دھماکا سنائی دیا اور زمین اس بری طرح لرزی کہ ان کی بائیکس لہرا کر رہ گئیں۔ اگر عام بائیکس ہوتیں تو شاید بے قابو ہو کر لڑھک ہی جاتیں لیکن لرزش کہ ذرا سی لرزش کے سوا ان کا کچھ نہیں بگڑا۔

لیکن دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر پھیلتا ہی چلا گیا اور بالکل ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی جنگی میدان میں ہیں جہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پہلے دھماکے نے انہیں ہوشیار نہ کر دیا ہوتا تو ان کے لیے اپنی بائیکس کو کنٹرول میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

وہ اصل مقام سے بہت دور نکل آئے تھے اور براہِ راست کسی نقصان کی زد میں نہیں آ سکتے تھے سائیڈ ایفیکٹس کا نشانہ بن سکتے تھے۔ مجبور ہو کر انہیں رکنے کا فیصلہ کرنا پڑا ورنہ حادثے سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ اپنی جگہ رکے رکے انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں دُور بہت دُور آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ان شعلوں کی شدت بتا رہی تھی کہ آنند فارم ہاؤس، جہاں پاکستان کو سازش کا نشانہ بنانے کے لیے جمع کیا گیا اشوک کا اسلحہ رکھا تھا، اب خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔

اپنی اس کامیابی کے لیے اللہ کا احسان محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کچھ اور ایسی آوازیں سنیں دھماکوں کی آوازوں سے ہٹ کر تھیں۔ انہیں اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ سرحدی محافظ حرکت میں آ گئے ہیں۔ اب ان کا یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اب دھماکوں کی شدت کم ہو جانے کے باعث زمین کی لرزش بھی کم ہو گئی تھی اور وہ ملک سبحان اور عرفان کے انتظار کی آخری کوشش کر چکے تھے۔ بائیکس اسٹارٹ کیں اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

جس راستے پر وہ سفر کر رہے تھے، یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا اور زمین کچی پکی ناہموار تھی۔ ان کے ذہنوں میں ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک نہ جائیں کیونکہ اپنے طور پر انہوں نے پوری کی تھی کہ راستہ ذہن نشین کر لیں لیکن اندھیرے میں اور وہ بھی کسی باقاعدہ راستے پر سفر نہ کرنے کے باعث اس کوشش کے سو فیصد کامیاب ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ بھٹک جاتے تو سرحدی محافظوں کی بھی چڑھ سکتے تھے۔ انہی اندیشوں کے تحت سفر کرتے بالکل اچانک ہی ان کی آنکھوں پر تیز روشنی پڑی روشنی پڑتے ہی وہ کسی خودکار ردِعمل کے تحت دائیں بائیں مڑ گئے۔

جواب میں فوراً ہی پیچھے سے فائر آیا اور گولیاں ان کے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں جاوید علی دائیں طرف مڑا تھا اور یہاں زمین کچھ زیادہ ہی ناہموار تھی اور اس کی بائیک بری طرح اچھلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے ہیڈ لائٹ بند کر دی تھی اس لیے زیادہ امکان یہی تھا کہ فائرنگ کرنے والے اسے دیکھ نہیں پا رہے ہوں گے لیکن وہ بائیک کی آواز سے بھی سمت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ دوسرے ان کے پاس یقیناً بڑی تعداد میں اسلحہ موجود تھا جب ہی وہ بنا رُکے اندھا دھند فائرنگ کیے جا رہے تھے۔ شدت کی فائرنگ میں کوئی بھی گولی اسے چاٹ سکتی تھی یا بائیک کی پٹرول ٹنکی یا ٹائر کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بات پیش آتی تو نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا۔ چنانچہ اس نے بائیک روک دی اور یہ خوش قسمتی تھی کہ جہاں اس نے بائیک روکی وہاں بڑے بڑے چٹانی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ بائیک کو پرلٹا کر وہ ان پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گیا۔

دوسری طرف سلمان بھی یقیناً اسی جیسی مشکل کا شکار تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ ابھی تک ان کے کانوں نے کوئی انسانی چیخ نہیں سنی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کی طرح سلمان بھی ابھی تک محفوظ ہے۔ اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے اپنا لائحہ عمل طے کرنا شروع کر دیا۔ یہ طے تھا کہ بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ ابھی تک بھارت کی سرزمین پر موجود تھے اور بھارتی تعداد میں زیادہ کے علاوہ بھی بہت سی وجوہات کی بنا پر ان پر سبقت رکھتے تھے۔ بھاگنے کی صورت میں وہ بہرطور مارے جاتے اور زندہ ان درندوں کے ہاتھ آنا کسی طرح ان کے اور ملک کے مفاد میں اچھا نہیں ہوتا۔

چنانچہ اس نے مارو یا مر جاؤ کے اصول پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اسلحہ اور پشت پر لٹکا بیگ ہاتھ تھا۔ اپنی دُور مار رائفل کو تھپکتے ہوئے وہ حرکت میں آ گیا اور سانپ کی تیزی سے رینگتا ہوا واپس



مڑنے لگا جہاں سے ایک بڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر ان لوگوں نے اپنی سمت بدلی تھی۔

وہاں سے اب بھی مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی لیکن بدلے ہوئے انداز سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اب گاڑی تک محدود نہیں ہیں اور اردگرد پھیل کر فائرنگ کر رہے ہیں۔ روشنی اب ان کی طرف نہیں تھی جو ظاہر ہے انہوں نے اس خدشے کے تحت بجھا دی تھی کہ روشنی میں خود ان کو ہی نشانہ بنا لیا جائے گا۔

رینگتے رینگتے جاوید علی اتنے فاصلے پر پہنچ گیا کہ اسے تاروں کی روشنی میں وہاں کھڑی جیپ اور اس کے ڈرائیور کا ہیولا نظر آنے لگا۔

اس نے سینے کے بل زمین پر پڑے پڑے فاصلے کا تعین کیا۔ اس کی دُور مار رائفل یہاں سے جیپ کے ڈرائیور اور فیول ٹینک دونوں کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ اسے بس انتخاب کرنا تھا۔ اس نے ڈرائیور کا انتخاب کیا۔ کیونکہ فیول ٹینک میں لگنے والی گولی کے بعد وہ ایک دھماکے سے پھٹتا اور پھر آگ جیپ کو لپیٹ میں لے کر سارے ماحول کو روشن کر دیتی۔ موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے اندھیرا ہی محفوظ پناہ گاہ تھا۔

رائفل کی لبلبی دبانے پر گولی جیٹ کی سی رفتار سے ڈرائیور کی طرف بڑھی اور اس نے پھرتی سے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی۔ ڈرائیور کی چیخ ضرور نکلی ہوگی لیکن فائرنگ کے شور میں سنائی نہیں دی۔ دوسرا فائر کرتے ہوئے اس کے دل میں ایک بار پھر خدشات جاگ اُٹھے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ ڈرائیور کی طرح ہی سلمان کی بھی فائرنگ کی آواز میں دب گئی ہو۔

اسی وقت اس کے کانوں نے مشین گن کی آواز کو الگ شناخت کیا اور ڈھیروں ڈھیر سکون دل میں اُتر آیا۔ فارم ہاؤس سے اُٹھائی گئی مشین گن سلمان کے پاس تھی اور اس کی آواز گونجنے کا مطلب تھا کہ سلمان بخیر و عافیت تھا اور حرکت میں آ چکا تھا۔ وہ خود پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے جگہ بدل بدل کر فائر کرنے لگا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ فائرنگ کی شدت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ فائر ان کی طرف نہیں آ رہے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے دشمن مشکل میں پڑ گئے ہوں۔

اس نے صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اور پیش رفت کی اور پہلے سے زیادہ بہتر پوزیشن میں آ کر فائر کرنے لگا۔ اسی وقت فضا میں اُلّو کی کریہہ آواز بلند ہوئی اور اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کے مددگار بن کر بھارتیوں کے مقابلے میں اُترنے والے ملک سبحان اور عرفان ہیں۔ تین سمتوں سے فائر آنے کی وجہ سے بھارتیوں کا ناطقہ بند ہو گیا تھا اور وہ کچھ بوکھلائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد میں بھی خاصی کمی ہو گئی تھی کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح شدت سے فائرنگ نہیں کر رہے تھے۔

صورتِ حال کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے جاوید علی نے جیپ کے فیول ٹینک کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ فیول ٹینک میں گولی لگی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ وہ فائر کرتے ہی تیزی سے پلٹ گیا تھا اور اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں بائیک چھوڑی تھی۔

بائیک لے کر وہ واپس وہیں پہنچا تو فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا۔ جلتی ہوئی جیپ کی وجہ سے ماحول کافی روشن تھا اور اس روشنی میں وہ ملک سبحان کو دیکھ سکتا تھا۔ ملک نے بھی اسے دیکھ لیا اور لپک کر اس کے قریب آ گیا۔

''عرفان اور سلمان کہاں ہیں؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''عرفان، سلمان کو لینے اس طرف گیا ہے۔ سلمان کے پاؤں میں گولی لگی ہے اس لیے وہ خود بائیک چلا کر لانے کے لائق نہیں ہے۔'' ملک سبحان نے اسے آہستہ سے بتایا اور اس سمت دیکھنے گا جہاں ان دونوں کی آمد متوقع تھی۔

''تم دونوں یہاں تک کیسے پہنچے؟'' ملک کی تقلید میں خود بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''فارم ہاؤس کی وین میں۔ مجھے چھت پر جانے پر وہ وین گیٹ کے پاس کھڑی نظر آ گئی تھی اور مجھے کہ اگر ہم اس وین کو لے کر آگے نکل جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ شکر ہے میری چھٹی حس کا یہ اشارہ کام گیا اور بروقت ہم آپ لوگوں کی مدد کرنے میں کامیاب رہے۔''

''ہاں۔ لیکن ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ یہاں اتنی شدت سے فائرنگ ہوئی جسے سن کر بی ایس ایف والے ادھر کا رخ ضرور کریں گے۔ اتنی تاخیر بھی شاید اس لیے ہوگئی ہے کہ انہیں فارم ہاؤس میں ہونے والے دھماکوں نے پہلے ہی اُلجھا رکھا ہوگا۔''

''آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکلنا ہوگا۔ آپ بائیک مجھے چلانے دیں کیونکہ میں آپ سے زیادہ ان راستوں سے واقف ہوں۔''

دوسری طرف سے آتے عرفان اور سلمان کو دیکھتے ہوئے ملک سبحان نے مضطرب لہجے میں اس کے خیال کی تائید کی تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ جلتی جیپ کی روشنی میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ ملک عرفان کے پیچھے بیٹھے سلمان کی دائیں ٹانگ زخمی ہے جسے کسی کپڑے سے باندھ کر خون روکنے کی عارضی کوشش کی گئی ہے۔ اسے سلمان کی بہادری پر فخر محسوس ہوا کہ وہ زخمی ہونے کے باوجود مسلسل مشین گن جیسے ہتھیار کو استعمال کر رہا تھا۔

''فارم ہاؤس کی وین آگے کھڑی ہے لیکن میں اسے اس لیے استعمال نہیں کر رہا کہ اس کی رفتار بائیکس کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔''

ملک سبحان نے بائیک کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے اسے بتایا تو اس نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان باپ بیٹے کی رائیڈنگ کی مہارت کے تو وہ یہاں آتے ہی قائل ہو گئے تھے لیکن واپسی کے سفر میں وہ جس رفتار سے بائیکس کو دوڑا رہے تھے، اس نے ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مہارت سے بھی آگے کمال کو پہنچی رائیڈنگ تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ مکھن میں سے بال کی طرح یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن کچھ دیر میں یہ غلط فہمی دھری رہ گئی۔

بہت تیز رفتاری سے عقب میں آتے وہ لوگ جو مسلسل انہیں رک جانے کا حکم دے رہے تھے، بی ایس ایف سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ابھی ان کا درمیانی فاصلہ کافی زیادہ تھا اور وہ عقب سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن بہرحال یہ اندازہ تھا کہ بھارتیوں کے مقابلے میں ان کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ ایک تو وہ بھارتی سرزمین پر تھے، دوسرے بائیک جیسی کھلی سواری پر بھی جو کسی قسم کا تحفظ دینے میں قطعی ناکام رہتی۔ بھارتیوں کے مقابلے میں انہیں واحد ایڈوانٹیج یہ حاصل تھا کہ اب آگے بہت سا راستہ شروع ہو رہا تھا جس پر سے بائیک تو آسانی سے گزر سکتی تھی لیکن کسی بڑی گاڑی کا گزرنا مشکل تھا۔ اگر وہ لوگ کسی دور مار ہتھیار کا استعمال کرتے تو ان کی بائیکس نشانہ بھی بن سکتی تھیں۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی تدبیر آئی۔

''اسپیڈ تھوڑی سی کم کر لو۔'' اس نے ملک سبحان کو حکم دیا۔



اس حکم پر ممکن ہے ملک سبحان کو حیرت ہوئی ہوگی لیکن اس نے عمل ضرور کیا۔ اس دوران جاوید علی اپنی پشت پر بندھے بیگ سے ایک ہینڈ گرینیڈ نکال چکا تھا۔ گرینیڈ نکال کر اس نے جسم کو ذرا ترچھا کر کے اپنے پیچھے میں دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی اتنی دُور تھی کہ اسے ہینڈ گرینیڈ کا نشانہ بنانا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اسے تو بس تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔

''میں گرینیڈ پھینکنے لگا ہوں۔'' دانت سے پن کھینچنے سے قبل اس نے ملک سبحان کو آگاہ کیا تاکہ وہ نتیجے میں پیدا ہونے والی لرزش کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے اور بائیک پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

ملک عرفان اور سلمان والی بائیک ان سے بہت آگے سفر کر رہی تھی اور ان کی رفتار کم ہونے کی وجہ سے درمیانی فاصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ سلمان کی زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہ خود دل سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ لوگ جلد از جلد یہاں سے نکل کر پاکستان کی سرزمین پر پہنچ جائیں تاکہ سلمان کو طبی امداد مل سکے۔ گولی لگی ٹانگ کے ساتھ وہ بے چارہ نہ جانے کس اذیت سے بائیک جیسی سواری پر سفر کر رہا تھا۔

اس نے ہینڈ گرینیڈ پھینکا تو کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ ہی زمین بھی بری طرح لرزی اور ملک سبحان کو اسی طور پر تیار ہونے کے باوجود بائیک بری طرح لہرا گئی لیکن خیر گزری کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

''بائیک روکو۔'' اسے امید تھی کہ ہینڈ گرینیڈ نے پیچھے آنے والوں کی بصارت کو دھوکے میں ڈالنے کا کچھ انتظام ضرور کیا ہوگا چنانچہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل پیرا ہوا۔ ملک سبحان نے اس بار بھی بنا حیل و حجت کے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ بائیک رُکتے ہی وہ فوراً نیچے اُتر گیا۔

''اب تم جاؤ۔'' اُترتے اُترتے ہی اس نے ملک کو حکم دیا لیکن اس بار اس نے ذرا تذبذب کا مظاہرہ کیا۔

''میں نے کہا ہے، جاؤ۔'' اس نے کچھ ایسے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا کہ ملک سبحان نہ چاہنے کے باوجود اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے روانہ ہونے سے قبل ہی وہ حرکت میں آ چکا تھا اور راستے سے ذرا ہٹ کر پیچھے کی طرف جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ اس مقام سے بھی گزر گیا جہاں ہینڈ گرینیڈ کے گرنے سے زمین میں اچھا خاصا گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ اس دوران تعاقب کرنے والی گاڑی نے بھی اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ ایک جانب اوندھا اس طرح لیٹ گیا کہ صرف اس کا سر زمین سے تھوڑا اُٹھا ہوا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک اور ہینڈ گرینیڈ موجود تھا۔ گہرے رنگ کے لباس اور رات کے اندھیرے نے اسے چھپا کر رکھنے میں بے حد معاونت کی۔

تعاقب میں آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دھماکے کے بعد بند ہو گئی تھیں لیکن فائرنگ کی شدت میں کمی ہو گیا تھا۔ ٹارگٹ واضح نہ ہونے کے باعث وہ ہیجانی کیفیت میں بس اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ اس کے پاس ایسا کوئی موقع نہیں تھا۔ اسے ایک ہی وار کرنا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر، جچا تُلا۔

وہ گاڑی کی آواز سے اس کے اور اپنے مابین کم ہونے والے فاصلے کا پورا پورا حساب رکھ رہا تھا۔ بالآخر درختوں کی چھاؤں میں اسے گاڑی کا ہیولا نظر آ گیا اور دل ہی دل میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ آر یا پار کے لیے تیار ہو گیا۔

گاڑی اور اس کے درمیان شاید چند گز کا فاصلہ ہوگا، جب اس نے اپنی پوری توجہ مرکوز رکھتے ہوئے دستی

بم کی پن کھینچی اور اسے پوری قوت سے گاڑی پر اُچھال دیا۔ دستی بم کے اپنے ہاتھ سے نکل کر گاڑی سے مختصر پل اس نے گویا پل صراط پر کھڑے شخص کی سی وحشت سے گزارا اور اگلے ہی پل سنائی دینے والے پھاڑ دھماکے کے ساتھ دونوں بازوؤں میں اپنا سر اور چہرہ چھپاتا ہوا زمین سے بالکل چپک گیا۔

زمین اپنے سینے پر اُترنے والی اس آفت پر بری طرح تڑپی و مچلی اور ایک پل کے لیے اسے لگا کہ اب اس کا وجود زمین کے سینے پر نہیں ٹھہر سکے گا۔ لیکن دہشت کا یہ پل فوراً ہی گزر گیا اور اسے احساس ہوا چند سنگریزوں کے وجود سے ٹکرانے اور جسم کے تھوڑا اچھل پتھل ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوا ہے۔ البتہ ماحول بہت کچھ بگڑ گیا ہے اور وہ خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گئے ہیں۔ وہ دل میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوا اٹھا اور پوری قوت سے آگے کی طرف دوڑ پڑا۔

ملک سبحان کو چلے جانے کا حکم دینے کے بعد اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ خود یہ درمیانی فاصلہ طے کرے گا۔ لیکن اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر اپنے ساتھیوں کو وہاں نکلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب پیچھے بہت دُور تک ان کا راستہ بالکل صاف تھا اور کسی گاڑی کے آنے نہیں آ رہے تھے۔ لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ ہونے والی ہنگامہ آرائی جلد دوسروں کو بھی اس راہ پر لگا دے اس وقت کے آنے سے پہلے وہ جتنی دُور نکل سکتا تھا، نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی اس نے دوڑتے ہوئے ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ملک سبحان اپنی بائیک سمیت آ ٹکرایا۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' اس نے بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے ذرا خفگی کا اظہار کیا۔

''مجھے لگا کہ مجھے آپ کے لیے رُکنا چاہئے۔''

ملک نے انکساری سے جواب دیا اور بائیک بھگا دی۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح تیز رفتاری سے رہے تھے۔ اس بار جاوید علی نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اگر ملک دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اس وقت اس کے بڑی نرم اور خوب صورت سی مسکراہٹ ہے جو حقیقتاً قریب آتی وطن کی مٹی کی سوندھی خوشبو کو فضا میں کے دل کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔

⊛----✪----⊛

شہریار نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔

سامنے سے آتی موبائل میں موجود پولیس والوں سے نمٹنے کا واحد طریقہ اسے یہ سوجھا تھا کہ جیپ کی رفتار مزید بڑھا کر اسے پولیس موبائل سے ٹکرا دے اور تصادم سے قبل وہ اور سلّو جیپ سے لگا دیں۔

لیکن اتنی تیز رفتاری سے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا بھی کوئی مذاق نہیں تھا۔ سب سے زیادہ کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور حرکت کے طے شدہ قوانین کا سامنا کرنے کے ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ نتیجہ اپنے گوشت پوست کے جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ سلّو کو بھی یہ سب معلوم تھا لیکن پل بھر میں ہونے والے فیصلے پر عمل کرنے میں دونوں ہی نے مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اعتماد کے پیچھے اس بھرپور تربیت کا بھی ہاتھ تھا جو شہریار نے عمر فاروق اور سلّو سے حاصل کی تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ یقین کارفرما تھا کہ وہ حق کے لیے کام کر رہے ہیں اور میں چاہے جتنی بھی مشکلات آئیں، بہرحال حق چھا جانے کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

وہ دونوں اپنی اپنی جانب سے سڑک کے دائیں بائیں کودے تو حقیقت میں معلوم نہیں تھا کہ



سہنا پڑے گا لیکن دونوں ہی اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ شہریار جس جانب کودا، وہاں چھوٹے پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ اس کا حرکت کرتا ہوا بدن ان پودوں پر گرا۔ اسے زوردار ضرور لگا لیکن وہ کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا۔ البتہ پھولوں کے ساتھ موجود کانٹوں نے ضرور اشیں ڈال دی تھیں۔

دوسری طرف سلّو ایسی زمین پر گرا تھا جو نئے پودے کاشت کرنے کے لیے گوڈی کر کے نرم کی گئی تھی۔ زمین پر گرنے سے اسے کوئی ظاہری چوٹ تو بالکل ہی نہیں آئی لیکن گرنے سے لگنے والے جھٹکے نے اور دائیں شانے کو ضرور متاثر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی بند چوٹ فوری طور پر تو تنگ نہیں کرتی میں آدمی کو خاصی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کے لیے ساری اہمیت ابھی کی تھی۔ فی والوں کے لیے سب سے زیادہ خوش کُن بات یہ تھی کہ جیپ اور پولیس موبائل کے تصادم کا خاطر خواہ تھا۔ دونوں گاڑیوں کی رفتار بے حد تیز ہونے کی وجہ سے تصادم بھی بے حد شدید ہوا تھا اور گاڑیاں گویا سرے میں گھسنے کے بعد اُلٹ گئی تھیں۔

منظر پر ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ سوار افراد کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر حادثے ایک آدھ فرد زندہ بھی بچ گیا تھا تو وہ یقینی طور پر شدید زخمی ہی ہوگا اور اس وقت تک باہر نکلنے کے ہوگا جب تک کوئی باہر سے اس کی مدد نہ کرے۔

ان دونوں کے لیے یہ مختصر مہلت غنیمت تھی اس لیے وہ خود کو سنبھال کر تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ معلوم تھا کہ اشوک کے گھر سے بھی کچھ لوگ ان کے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ وہ افراد شہریار کی رائیونگ کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث پیچھے ضرور رہ گئے تھے لیکن چند منٹوں کے فرق سے ہی سہی، پہنچ تو جانا ہی تھا اس لیے بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس جگہ سے غائب ہو جائیں۔

شہریار نے اشارے سے سلّو کو اپنی جانب بلایا اور پھر وہ دونوں دائیں طرف دوڑتے چلے گئے۔ دائیں کا یہ حصہ کچھ اس طرح تھا کہ چند فٹ تک زمین کو پودوں اور چھوٹی قامت کے درختوں سے بھر کر ملک کی سی شکل دے دی گئی تھی اور اس سے آگے نسبتاً کم کشادہ سروس روڈ کے پار اپارٹمنٹس کا سلسلہ تھا۔

دونوں سروس روڈ پر پہنچے تو ایک بلڈنگ سے موٹر سائیکل سوار برآمد ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ جوان العمر اور موبائل فون کان سے لگائے پورے انہماک سے کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ شاید اپنی اسی مصروفیت کی اس نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بھی دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ان دونوں نے آنکھوں آنکھوں کیا اور یکدم ہی اس کے سامنے جا پہنچے۔

یکدم اپنے سامنے دو مسلح افراد کو پا کر بھونچکا رہ گیا اور موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شاید لمحہ اس نے اس بات پر غور بھی کیا کہ ان کے اشارے پر رکنے کے بجائے موٹر سائیکل بھگا لے پھر اندازہ لگا لیا کہ موٹر سائیکل کی رفتار گولی کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتی چنانچہ عقل مندی کا ہوئے موٹر سائیکل روک لی۔

اترو۔'' سلّو نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے غراتی آواز میں حکم دیا جس کی اس بے چارے پر بجا آوری کی۔

موٹر سائیکل چھوڑتے ہی سلّو نے اس کی جگہ سنبھال لی اور شہریار پھرتی سے اس کے پیچھے بیٹھ

گیا۔ موٹر سائیکل فوراً ہی ہوا ہوگئی اور اس کا مالک بے چارہ صدمے کی سی کیفیت میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

عام حالات میں وہ دونوں یا کم از کم شہریار تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کسی سڑک پر غنڈے کی طرح وہ کسی عام شہری سے چھین جھپٹ کرے گا لیکن مجبوری نے یہ بھی کروا دیا تھا اور وہ دونوں کوشش میں تھے کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائیں۔

انہوں نے اپنے جسموں پر موجود پولیس والوں کی قمیضیں بھی راستے میں ہی اُتار پھینکی تھیں چنانچہ جیپ سے زمین پر چھلانگ لگانے کے نتیجے میں لگنے والی دھول مٹی بھی کسی حد تک دُور ہوگئی تھی اور انہیں ان کی اُجلی قمیضیں نکل آئی تھیں۔ البتہ پینٹوں پر کچھ داغ دھبے نظر آ رہے تھے اور ہاتھ بھی بالکل صاف تھے۔ خاص طور پر شہریار کی ہتھیلیوں وغیرہ پر آ جانے والی خراشوں سے نکل کر جم جانے والا خون نمایاں تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ لوگ اسی حلیے میں شہر بھر میں گھومنے پھرنے کے بجائے اپنے حلیے کو مزید بنانے کی کوشش کریں۔ وہ تو شکر ہوا کہ کوئی ان کے تعاقب میں نہیں لگا تھا۔

یقیناً پیچھے آنے والے سڑک پر متصادم کھڑی گاڑیوں کو دیکھ کر ان میں اُلجھ گئے ہوں گے اور پہلی تو انہوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ دونوں گاڑیوں کے سوار ہی کام سے گئے۔ یہ تو انہیں قریب جا کر جائزہ اندازہ ہوا ہوگا کہ جیپ خالی ہے اور پرندے اُڑ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے، وہ اس شخص تک بھی پہنچ گئے ہوں کی موٹر سائیکل انہوں نے چھینی تھی۔ اس شخص سے انہیں موٹر سائیکل کا نمبر بھی پتہ چل گیا ہوگا اور یہ اندازہ کیا جا رہا ہوگا کہ جگہ جگہ ناکے لگا کر موٹر سائیکل کا نمبر ہر ایک تک پہنچا دیا جائے۔ ان حالات میں اب تک اس موٹر سائیکل کو استعمال کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ چنانچہ مناسب فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جگہ موٹر سائیکل چھوڑ دی جہاں سے انہیں کوئی دوسری سواری آسانی سے مل جائے۔ موٹر سائیکل چھوڑ کر سواری تلاش کرنے کے مختصر عرصے میں شہریار نے عبدالرحمٰن سے رابطہ کیا۔

''ارے ہیرو!..... کدھر ہو تم لوگ؟'' دوسری طرف سے عبدالرحمٰن نے فوراً ہی چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ یقیناً اشوک کے قتل کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اسی لیے وہ اتنا خوش تھا۔ شہریار نے مختصراً اسے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ فی الحال وہ کس جگہ موجود ہیں۔

''پھر تو کوئی فکر والی بات نہیں ہے۔ تم آٹو رکشہ یا ٹیکسی پکڑو اور مون ہوٹل پہنچ کر اس کے منیجر سے میں اسے تم دونوں کے بارے میں بتا دوں گا۔ آگے وہ خود سب سنبھال لے گا۔'' عبدالرحمٰن نے گفتگو بجاتے میں مسئلہ حل کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ذرا پھرتی سے کام لو استاد! اتنا بڑا ہے ابھی پورے شہر میں آگ بھڑک اُٹھے گی اور کسی کے لیے کہیں آنا جانا ممکن نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہریار نے اس کے مشورے کے جواب میں مختصراً کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اسی پل اسے احساس ہوا کہ شہر کی فضا بدل رہی ہے اور لوگ بدحواس سے نظر آ رہے ہیں۔ تیزی سے ہوتی دکانیں، سڑکوں سے غائب ہوتی گاڑیاں اور عجلت میں پیدل ہی کسی نہ کسی سمت بھاگتے افراد۔ یہ رہے تھے کہ اشوک کے قتل کی خبر نیوز چینلز سے نشر کی جا چکی ہے اور لوگ اس خبر کے ردِعمل سے خوف زدہ اپنی جانوں اور املاک کو محفوظ کرنے کی فکر میں ہیں۔

وہ ایک آٹو رکشہ کو تقریباً زبردستی روک کر اس میں سوار ہوئے تو وہاں پہلی گولی چلنے کی آواز آئی جس پر مزید بھگدڑ مچ گئی۔

''کدھر جانا مانگتا ہے صاحب! ابھی اپن کوئی سواری نہیں پہنچائے گا۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں



اپنی دھندا بند کر کے ابھی اپنے گھر جائے گا۔''

رکشے والے نے ان کے اس طرح اپنے رکشے میں آ گھسنے کا سخت برا مانا اور بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ بولتا چلا گیا۔

اس کی بات ختم ہونے تک باقاعدہ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مچنے والی لوگوں کی چیخ و پکار اور گاڑیوں کے بجتے ہارنز نے فضا کو مزید سنگین بنا دیا تھا۔ یہ سنگینی یقینی طور پر رکشے والے پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی اور وہ کمانے دھمانے کی فکر چھوڑ کر اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا اسی لیے اسے یہ زبردستی کے سوار ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔

''مون ہوٹل چلو۔'' رکشہ ڈرائیور کے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سلّو نے سرد لہجے میں اسے حکم دیا اور ساتھ ہی پسٹل نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ سرد مہر لہجے کو تو شاید رکشہ ڈرائیور نظر انداز بھی کر دیتا لیکن گردن سے لگے سرد لوہے کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ اس سرد لوہے کی اُگلی گئی چھٹانک بھر کی گولی آدمی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرد کر دیتی ہے۔ اس کی گھگھی سی بندھ گئی۔

''جلدی چلو۔'' سلّو ایک بار پھر غرایا تو وہ بے چون و چرا رکشے کو حرکت میں لے آیا۔ لیکن لوگوں پر طاری عجلت اور دہشت نے ٹریفک کو عجیب بے ڈھب کر دیا تھا اور جلد از جلد نکلنے کے چکر میں گاڑیاں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے آگے کہیں جلاؤ گھیراؤ بھی شروع ہوگیا تھا۔

''روڈ جام ہے صاحب! ادھر سے آگے جانے کا راستہ نہیں ملے گا۔'' رکشے والے نے فریادی لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔ سلّو اسے پسٹل کی پہلی جھلک دکھانے کے بعد پسٹل واپس اندر رکھ چکا تھا لیکن اس کا رعب تو اپنی جگہ قائم تھا۔

''دیکھو، سڑک سے ہٹ کر کہیں اندر کی گلیوں وغیرہ سے راستہ جاتا ہو تو وہاں سے نکال لو۔'' اس بار شہریار نے اسے نرم لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا کوشش میں مصروف ہوگیا۔

بے ترتیب ہو جانے والے ٹریفک میں سے رکشے کو نکالنے کے لیے راستہ بنانا کچھ آسان نہیں تھا۔ بے چارہ ڈرائیور خاصی دیر کی کوشش کے بعد اس میں کامیاب ہو سکا اور رکشے کو ایک چوڑی گلی میں لے گیا۔

گلی کا رخ کرنے والے وہ لوگ تنہا نہیں تھے۔ سڑک کی صورتِ حال سے مایوس ہو کر بہت سے لوگوں نے اس طرف کا رخ کیا تھا لیکن بہرحال وہاں سڑک جیسی خراب صورتِ حال نہیں تھی۔ خصوصاً اس اعتبار سے بھی کہ وہاں جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں نے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ ان کا باقی راستہ آرام سے کٹ گیا۔

''صاحب! آپ بولو تو ادھر ہی اُتار دوں؟ ادھر اُتر کر آپ اس سائیڈ والی گلی میں جاؤ گے تو مون ہوٹل کا پچھلا دروازہ مل جائے گا۔ سڑک پر لے جانے میں خطرہ ہے۔ سامنے سے گولیاں چلنے کی آواز آ رہی ہے۔'' رکشے والے نے رکشہ روکا اور ایک بغلی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم یہیں اُتر جاتے ہیں۔'' شہریار نے کہا اور اپنی قمیض کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ایک ساتھ اتنے سارے نوٹ دیکھ کر رکشے والے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''رکھ لو۔ یہ تمہاری خدمت کا انعام ہے۔ تم نے اتنے خراب حالات میں بھی ہمیں ہماری منزل تک پہنچایا، اس کے لیے تم ایسے ہی انعام کے حق دار ہو۔''

شہریار نے نرمی سے کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر ذرا تنبیہہ کرنے والے

لہجے میں بولا۔

''یاد رکھنا کہ آج کے دن کی کوئی بات تمہیں بھول کر بھی یاد نہیں کرنی ہے اور نہ ہی کسی کو ایک لفظ بھی بتانا ہے۔ ورنہ تمہارے ساتھ کچھ برا ہوا تو اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔''

''جو حکم مائی باپ۔'' رکشے والے نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس دوران سلو لاتعلق سا بیٹھا رہا۔

''گڈ۔'' شہریار نے اس کا شانہ دھیرے سے تھپتھپایا اور پھر وہ اور سلو رکشے سے اُتر گئے۔ رکشے والے نے پھرتی سے اپنا رکشہ اسٹارٹ کر کے موڑ لیا اور وہ دونوں اس گلی میں داخل ہو گئے جس میں ہوٹل مون کا عقبی دروازہ تھا۔

عقبی دروازہ بند تھا جس کے ساتھ ہی ایک کال بیل لگی ہوئی تھی۔ کال بیل کا بٹن دبانے پر فوراً ہی ایک گارڈ نمودار ہوا۔

''منیجر سے ملنا ہے۔ ہمیں عبدل نے بھیجا ہے۔'' گارڈ کی سوالیہ نظروں کے جواب میں شہریار نے بارعب لہجے میں بتایا تو وہ کچھ مرعوب نظر آنے لگا۔ ویسے بھی یہاں عبدالرحمٰن کو سب عبدل بھائی پکارتے تھے اور اگر کوئی صرف عبدل کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔

''آپ لوگ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں منیجر صاحب کو خبر کرتا ہوں۔'' مرعوبیت کے باوجود گارڈ نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا اور عقبی دروازے میں کھلنے والا وہ جالی دار چوکھٹا خلا بند کر دیا جس سے جھانک کر وہ ان سے گفتگو کر رہا تھا۔

انہیں مشکل سے ایک منٹ ہی وہاں انتظار میں کھڑا رہنا پڑا ہوگا کہ دروازہ ان کے لیے کھل گیا۔

''اندر تشریف لائیے۔ منیجر صاحب آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس بار گارڈ کا لہجہ بے حد مؤدب تھا۔

وہ دونوں دروازے سے گزر کر اندر داخل ہونے لگے تو بیپ ہوئی جو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ دروازے میں میٹل ڈیٹیکٹر نصب ہے جس نے ان کے پاس موجود اسلحے کی موجودگی کا اعلان کر دیا ہے۔ لیکن گارڈ نے اس بیپ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اسی عزت و احترام سے لے کر آگے بڑھ گیا جس کا اس نے دروازہ کھولتے وقت مظاہرہ کیا تھا۔

مختلف راہداریوں سے گزر کر منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ یہ ہوٹل خاصا بڑا ہے اور یقینی طور پر شہر کے بہترین ہوٹلوں میں شمار کیا جاتا ہوگا۔

''آپ اندر چلے جائیں۔ منیجر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ایک کمرے کے سامنے رک کر اس کے دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے ہوئے گارڈ نے ان سے کہا اور خود ہی دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

ان کے اندازے کے برخلاف وہ کمرہ کسی دفتر کے بجائے سٹنگ روم کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ بیش قیمت سنگل صوفے پر براجمان منیجر نے فوراً ہی کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ خوب صورتی سے سجے اس کمرے سے منیجر کی شاندار پرسنالٹی خوب میچ کر رہی تھی۔ اس نے بیش قیمت ٹو پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے فریم لیس گلاسز سے لے کر پیروں میں موجود جوتوں تک ہر شے اتنی نفیس تھی کہ وہ خود کو ملی ہوئی پوسٹ کے لیے بالکل صحیح انتخاب محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بھائی جی سے ملاقات کر چکے تھے۔ ممبئی کا نامی گرامی غنڈہ ہونے کے باوجود وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے



نواب محسوس ہوتا تھا، ایسے شخص نے اگر اپنے ایک شاندار ہوٹل کے منیجر کے طور پر سامنے موجود شخص کا انتخاب کیا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ گرم جوشی سے اپنا استقبال کرنے والے منیجر سے مصافحہ کر کے نشست سنبھالنے تک وہ دونوں بہت کچھ سوچ چکے تھے۔ مزید سوچنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ کمرے کی دیوار پر نصب بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسکرین پر سفید کُرتے پاجامے میں باوقار شخصیت رکھنے والے بھائی جی کو دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی جی کے اردگرد جو منظر تھا، اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی تقریب میں شریک ہے۔

''مجھے اشوک صاحب کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ بے شک ہم کاروباری حریف تھے لیکن انسانیت کے ناطے ان کا قتل میرے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ثابت ہوا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اس دہشت گردی کا خاتمہ کرے اور جلد از جلد اشوک صاحب کے قاتلوں کو تلاش کر کے انہیں ان کے انجام تک پہنچائے۔ کیونکہ اگر یہ قاتل گرفتار نہ ہوئے تو ان کے حوصلے اور بھی بلند ہو جائیں گے اور وہ کھلے عام قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیں گے۔ عام آدمی کو تو یہاں پہلے ہی کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے، قاتلوں کا حوصلہ بڑھا تو وہ حکومتی ایوانوں میں بیٹھے خواص تک بھی جا پہنچیں گے۔''

بھائی جی اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بڑا پُرجوش بیان دے رہا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ ہی ہوٹل مون کا منیجر دلچسپی سے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے سر!..... اشوک صاحب کے قتل میں کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟'' ایک شوخ و شنگ نظر آنے والی رپورٹر نے بھائی جی سے سوال کیا جسے سن کر بھائی جی کے چہرے کے تاثرات مزید گمبھیر ہو گئے اور وہ بولا تو اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ سنجیدگی تھی۔

''ایک بزنس مین اپنے لیے کتنے دوست اور دشمن بناتا ہے، اس سے تو خود وہ یا اس کے قریبی لوگ ہی واقف ہو سکتے ہیں۔ اشوک صاحب سے میرا تعلق اس نوعیت کا نہیں تھا کہ میں ان کے اس قسم کے رازوں سے واقف ہو سکوں۔ اس لیے آپ کو چاہئے کہ میرے بجائے ان کے قریبی ساتھیوں سے یہ سوال کریں۔ میں اس صورتِ حال میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اخلاقی تقاضے پورے کروں اور وہ میں کر رہا ہوں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ میں نے اس سانحے کی اطلاع ملتے ہی اپنی سجائی ہوئی محفل کا اختتام کر دیا ہے اور میں اس کوشش میں ہوں کہ اپنے معزز مہمانوں کو باحفاظت ان کے گھروں تک پہنچانے کا انتظام کر سکوں۔ بگڑے ہوئے حالات میں یہ کام آسان نہیں ہوگا اور یقیناً مجھے کئی افراد کو یہاں مون ہوٹل میں ٹھہرا کر ان کی مہمانی کرنی ہوگی۔'' بھائی جی کے الفاظ نے انہیں چونکا دیا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ اسکرین پر جو مناظر دیکھ رہے ہیں، وہ مون ہوٹل ہی کے ہیں اور بھائی جی بھی وہاں موجود ہے۔ عبدل کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھائی جی کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا۔

''کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اشوک صاحب کی موت کا آپ کو سب سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ بلکہ اس شہر میں آپ کے سب سے بڑے حریف وہی تھے؟'' ایک رپورٹر نے ذرا تلخ لہجے میں یہ سوال کیا تو اسکرین پر بھائی جی کے ماتھے پر ناگواری کی لکیر سی نظر آئی لیکن جب اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو معمول لہجہ دھیما ہی تھا۔

''میں کچھ بھی کہنے والوں کی زبان نہیں پکڑ سکتا لیکن اس بات کا مطالبہ ضرور کرتا ہوں کہ حکومت اس

معاملے کی تحقیق و تفتیش کروائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ فی الحال میں اپنی صفائی صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایک فرد کے چلے جانے سے کچھ نہیں بدلتا۔ آج اگر اشوک صاحب نہیں رہے ان کا کوئی قریبی ساتھی ان کی جگہ لے لے گا اور ظاہر ہے وہ بھی میرا حریف ہی ہوگا۔ اس لیے یہ کہنا کہ اشوک کے جانے سے میرا کوئی فائدہ ہے۔ حریف کی صورت اور نام بدل جانے سے میری پوزیشن بھلا کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہم کل بھی ایک دوسرے کے مخالف تھے، آج بھی ہیں اور آنے والے کل میں رہیں گے۔''

اس آخری وضاحت کو پیش کرنے کے بعد بھائی جی میڈیا والوں کے سوالات کا سامنا کرنے کے مزید وہاں نہیں رُکا اور ''ایکسکیوزمی'' کہتا ہوا منظر سے ہٹ گیا۔

اس کے منظر سے ہٹتے ہی اسکرین پر ایک بریکنگ نیوز دکھائی جانے لگی۔ یہ بریکنگ نیوز ان کے بھائی جی کے بیان سے بھی زیادہ تہلکہ خیز تھی۔ کیونکہ اس میں جو سی سی ٹی وی فوٹیج دکھائی جا رہی تھی، اس ان دونوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ فوٹیج بہت زیادہ صاف نہیں تھیں پھر بھی یہ امکان تھا کہ جن جن افراد نے موجودہ حلیوں میں دیکھا تھا وہ انہیں شناخت کر سکتے تھے۔

فوٹیج دکھاتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ یہ فوٹیج اس عمارت کے عقبی حصے میں نصب خفیہ کیمرے کا حاصل کی گئی ہے جس سے پہلی بار اشوک صاحب پر گولی چلائی گئی تھی اور وہ خوش قسمتی سے بچ گئے تھے۔ سے گفتگو نے مستقل مزاجی سے ان کا پیچھا کیا اور پولیس والوں کے بہروپ میں اپنا کام کر گزرے۔

انہیں سکرین پر بار بار اشوک کے گھر کے سامنے کے مناظر دکھائے جا رہے تھے اور ایک ایک سیکنڈ ''اندر تشریف'' ساتھ بتایا جا رہا تھا کہ قاتلوں نے کب اور کیسے اشوک کو نشانہ بنایا جس کے نتیجے مؤدب تھا۔

بلکہ آگے جا کر فرار کی کوشش میں دہشت گردوں نے کئی اور افراد کی زندگیوں کو

وہ دونوں دروازے

دروازے میں میٹل ڈیٹیکٹر موجود وہ تینوں نفوس اتنے انہماک سے یہ سب دیکھ رہے تھے کہ نیوز اینکر کی آواز گارڈ نے اس بیپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس سکوت کو انٹرکام کی گھنٹی نے توڑا۔ منیجر نے لپک کر نے دروازہ کھولتے ہوئے سے لہجے میں دوسری طرف کی بات سننے کے بعد صرف ''او کے سر!'' کہہ کر ریسیور واپس مختلف راہداری

بڑا ہے اور یقیناً آپ دونوں کے لیے عبدل بھائی کا پیغام ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ دونوں نہا دھو کر فریش ہو جائیں اور کچھ کھا پی لیں۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جی خود آپ سے ملاقات کریں گے۔''

ریسیور رکھنے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا اور احترام کے ساتھ پیغام پہنچایا۔ وہ اتنا بندہ تھا کہ سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنے کے بعد کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس طرح کا تھا جو انہیں کرائے کے قاتل سمجھنے کی صورت میں اصولاً اسے روا رکھنا چاہئے تھا۔ وہ مستقل انہیں معزز کی طرح ہی ٹریٹ کر رہا تھا۔

''ہمارے ہوٹل کا یہ وی آئی پی سوئٹ آپ دونوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں آپ کو اپنی ہر شے مل جائے گی۔ اگر کوئی کمی محسوس ہو تو مجھے انفارم کر دیجئے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے دور کر دوں۔'' وہ بڑی ذمے داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر! ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' شہریار نے پہلی بار لب کُشائی کی۔



''میرا نام اختر حسین ہے۔ یہاں زیادہ تر لوگ مجھے حسین کہتے ہیں۔'' اس نے فوراً ہی اپنا تعارف کرایا۔ اصولاً تعارف کا یہ مرحلہ ملاقات کی ابتدا میں طے ہوتا ہے لیکن وہ لوگ آتے ہی خبروں میں مصروف ہو گئے تھے اس لیے کسی کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر حسین! فی الحال آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں۔ ہمیں کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ سے رابطہ کر لیں گے۔''

شہریار نے اسے مہذبانہ انداز میں وہاں سے رخصت کیا۔ جاتے جاتے وہ بتا گیا تھا کہ انٹرکام پر ڈیل پریس کرنے پر براہِ راست اس سے رابطہ ہو جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد انہوں نے پورے سوئٹ کا جائزہ لیا۔ لیونگ روم کے علاوہ وہاں دو بیڈ رومز تھے اور ہر بیڈ روم کے ساتھ چمکتے دمکتے جدید سہولیات سے آراستہ باتھ رومز بھی موجود تھے۔ یہ باتھ اتنے بڑے تھے کہ انہیں حریری پردوں سے دو حصوں میں منقسم کر کے ایک حصے کو چھوٹے سے ڈریسنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی جہاں موجود الماری میں ہر طرح کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ جوتوں کے جوڑے، بیگس اور مردانہ ضروریات کی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔

لباس اور جوتے دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ انہی کے سائز کے مطابق ہیں جس کا مطلب تھا کہ ان یہاں رہائش کا پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا اور اسی اعتبار سے انتظامات بھی کر دیئے گئے تھے۔

ان دونوں نے ہی غسل خانوں کا رخ کیا اور طویل باتھ لے کر باہر نکلے تو نہ صرف تازہ دم ہو چکے تھے بلکہ اس حلیے سے بھی نجات حاصل کر چکے تھے جو انہوں نے اشوک کو قتل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔

غسل سے فارغ ہوتے ہی انہیں انٹرکام پر اطلاع دی گئی کہ کھانا تیار ہے اور سٹنگ روم میں لگایا جا رہا ہے۔

وہ دونوں سٹنگ روم میں پہنچ گئے جس کے ایک حصے میں چار افراد کی گنجائش والی ڈائننگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا لیکن ڈائننگ ٹیبل پر کھانا قرینے سے چُنا نظر آ رہا تھا۔ یہ کئی ڈشز تھیں جن کی سجاوٹ ہوٹلوں کے رواج کے مطابق اتنی عمدگی سے کی گئی تھی کہ آدمی خود بخود اشتہا محسوس کرنے لگتا۔

ان دونوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا شروع کیا۔ حیرت انگیز طور پر یہاں اونچی دکان اور پھیکا پکوان والا معاملہ نہیں تھا بلکہ ہر شے بہت مزیدار تھی۔

ان دونوں نے خوب ڈٹ کر کھانے سے انصاف کیا کیونکہ فی الحال انہیں کوئی مشن درپیش نہیں تھا جس میں وہ اپنے معدوں پر بوجھ ڈالنے سے گریز کرتے۔ شہریار نے البتہ سلو کی نسبت ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھا تھا کہ اپنی مقررہ خوراک سے زیادہ تجاوز نہ کرے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر نیوز دیکھنے لگے۔ وہاں وہی خبریں مختلف انداز میں بار بار دکھائی جا رہی تھیں لیکن وہ بھائی جی کی آمد تک فقط وقت گزاری کے لیے انہیں ہی دیکھے جا رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر ان کو کوئی بیرا کھانے کی میز سمیٹنے کے لیے بھی وہاں نہیں آیا تھا۔ شاید کوشش کی جا رہی تھی کہ ان کا زیادہ سامنا نہ ہو اسی لیے کھانا بھی اس وقت لگوایا گیا تھا جب وہ غسل میں مصروف تھے۔

بالآخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ بھائی جی اندر

داخل ہوا۔ اس کے پیچھے عبدالرحمٰن بھی موجود تھا۔

شہریار اور سلّو نے کھڑے ہو کر ان دونوں کا استقبال کیا۔ آپس میں مصافحے کے بعد چاروں نے سنبھال لیں اور سب سے پہلے بھائی جی نے مسکراتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''بہت خوب، بہت ہی عمدہ۔ تم دونوں کی بہادری نے ثابت کر دیا کہ میں نے تم سے ڈیل کرنے غلطی نہیں کی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنا کام انجام نہ دینے کے باوجود بعد میں تم لوگوں نے پھرتی اور بہادری کا مظاہرہ کیا، اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ سچ پوچھو تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا اور میں اس غم میں مبتلا تھا کہ اتنی اچھی منصوبہ بندی کے باوجود صرف ایک اتفاق کی وجہ سے بچ گیا۔ میں نے جب سنا تھا کہ اشوک کے بجائے ایک کیمرہ مین نشانہ بن گیا ہے تو مجھے لگا تھا کہ تمہیں دیوی اشوک کے ساتھ ہے لیکن تم نے ثابت کر دیا کہ آدمی باہمت اور باعزم ہو تو سامنے والے کی اچھی تدبیر بھی دھوکا دے جاتی ہے۔'' وہ بہت خوش تھا اور خوب کھل کر ان دونوں کی تعریف کر رہا تھا۔

''آپ کو مبارک ہو کہ آپ اپنے دشمن سے نجات پانے میں کامیاب ہو گئے اور وہ بھی اس خوبی سے آپ کے اور آپ کے تمام اہم آدمیوں کے پاس جائے واردات سے دُور کہیں اور موجود ہونے کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج رات دی جانے والی پارٹی خاص اسی مقصد کے لیے رکھی گئی ہوگی۔'' شہریار نے اس کی بات کے جواب میں بولنا شروع کیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ معمول سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ لیکن پولیس اور پبلک دونوں کے لیے یہ کوئی چونکانے والا نکتہ ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ میرا اور اشوک کا یہ معمول رہا ہے کہ ہم اپنے بہت سے اہم پروگرام اور پارٹیز ایک ہی دن رکھتے ہیں تاکہ پریس اور میڈیا ہمیں بیک وقت توجہ دینے پر مجبور ہو جائے اور خبروں میں کسی ایک کا نام دوسرے سے نمایاں نہ رہنے پائے۔'' بھائی جی نے اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''لیکن آج تو آپ اشوک سے اس معاملے میں شکست کھا گئے۔ آج تو ہر طرف وہی چھایا ہوا ہے۔'' سلّو نے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے ساختگی سے تبصرہ کیا۔ اسکرین پر اس وقت اشوک کی لاش کے کلوز اَپ دکھائے جا رہے تھے البتہ آواز بند ہونے کی وجہ سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ آخری موقع ہے جو اشوک کو یوں اہمیت مل رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں لوگ اس کا نام بھی بھول جائیں گے اور پورے ممبئی میں بس بھائی جی کا نام چلے گا۔''

عبدالرحمٰن نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً سلّو کی بات کا جواب دیا۔ خوش وہ ویسے ہی نظر آ رہا تھا۔

''لیکن تم لوگوں کی طرف سے تو یہ بیان دیا گیا ہے کہ اشوک کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہی کوئی اور اس کی جگہ لے لے گا۔'' سلّو نے اعتراض کیا۔

''ایسا وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے کہا گیا ہے لیکن آنے والے وقت میں پورا ممبئی دیکھے گا کہ اشوک کا گینگ ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اس کے آدمی کتے کی موت مارے جاتے ہیں۔ پناہ بس صرف اُنہیں ملے گی جو بھائی جی کے تابعدار ہو جائیں گے، باقی کو ممبئی میں جگہ ملی بھی تو زمین کے اندر ملے گی۔ زمین کے اوپر تو بس وہی رہ سکے گا جو بھائی جی کے نام کی مالا جپے گا۔''

عبدالرحمٰن نے آگے کا پروگرام بتایا۔ بھائی جی کے ہونٹوں پر پھیلی دھیمی سی مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ



اس خاص چیلے کے ایک ایک لفظ سے متفق ہے۔

''اوہ..... پھر تو تم اپنی ممبئی پر حکمرانی کی پیشگی مبارکباد قبول کر لو۔ جانے جب یہ نوبت آئے، تب ہم نہیں ہوں۔'' سلّو نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہریار اس وقت گفتگو میں خاص دلچسپی نہیں لے رہا ہے اس لیے خلافِ معمول خود بولنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے برخوردار! تم کچھ چپ چپ سے ہو۔ کوئی اُلجھن یا پریشانی ہے تو ہمیں بتاؤ۔ ہمیں بالکل ایسا لگ رہا کہ ہمارے جس دوست نے ہمارا اتنا بڑا کام کیا، وہ خود اس طرح اُلجھا ہوا بیٹھا رہے۔'' بھائی جی جیسا زیرک آدمی اس کی خاموشی کو محسوس نہ کرے، یہ کیسے ممکن تھا چنانچہ بڑی محبت سے پوچھنے لگا۔ یہ اور بات کہ شہریار اس محبت بھرے لہجے سے دھوکا کھانے والا نہیں تھا اور جانتا تھا کہ بھائی جی اس دنیا کا آدمی ہے جہاں محبت سے زیادہ مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے چنانچہ بغیر لاگ لپیٹ کے اپنے دل میں موجود شکوہ اُگل دیا۔

''ہمیں یہ اطلاع فراہم کی گئی تھی کہ جس عمارت سے میرا ساتھی اشوک پر گولی چلائے گا، اس کے عقبی حصے پر کوئی کیمرہ نصب نہیں ہے لیکن اب جو حقائق سامنے آ رہے ہیں، ان سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ اطلاع غلط تھی اور ظاہر ہے یہ بات ہمارے مفاد میں ٹھیک نہیں ہے۔ ٹی وی چینلز پر تصویریں دکھائی جا رہی ہیں۔ تصویروں کی مدد سے کسی نے شناخت کر کے اگر ہماری نشاندہی کر دی تو ہم کتنی مشکل میں پڑ جائیں گے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اب اس اسٹیج پر جبکہ کامیابی بس دو قدم کے فاصلے پر ہی ہے، میں کوئی رِسک نہیں لینا چاہتا۔''

''تم بیکار میں فکرمند ہو رہے ہو میرے دوست! ذرا ٹیلی ویژن پر چلنے والی تصویریں دیکھو اور پھر آئینہ دیکھو۔ تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے سارے خدشات بے بنیاد ہیں۔'' بھائی جی نے مسکراتے ہوئے اس کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن آپ سیکرٹ ایجنٹس کو نہیں جانتے۔ ان میں ایسے ایسے ماہر موجود ہوتے ہیں جو چہرے کے پیچھے موجود آدمی کا اصل چہرہ بھی کھنگال ڈالتے ہیں اور ہمیں تو نہ جانے کتنے لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ ان دیکھنے والوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے ہمیں اس ہوٹل تک بھی آتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ اور کچھ نہیں تو ہوٹل کے عملے میں سے ہی چند افراد اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم یہاں مقیم ہیں۔ ان میں سے کوئی بے شک مخبری نہ کرے لیکن باتوں باتوں میں اپنے کسی عزیز یا رشتے دار یا دوست کے سامنے تذکرہ تو کر سکتا ہے کہ اشوک کی موت کے ذمے دار افراد ہوٹل مون میں ٹھہرے ہوئے ہیں..... اور یہ بات ہر عقل والا آدمی جانتا ہے کہ کوئی راز اگر ایک بار لیک ہو جائے تو پھر راز نہیں رہتا..... سفر کرتا ہوا ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنے سے اسے روکنا ہوتا ہے۔'' شہریار اس کی تسلی سے مطمئن نہیں ہوا۔

''تم نے میرے بارے میں درست اندازہ نہیں لگایا ہے برخوردار! یہاں دُور دُور تک کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میرے خلاف مخبری کر سکے۔ پورا ممبئی جانتا ہے کہ ہوٹل مون، بھائی جی کی ملکیت ہے اور اگر کسی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا بھی ہوگا تو وہ اپنی زبان کھولنے کی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ اس غلطی کا انجام وہ خود اچھی طرح جانتا ہوگا۔ رہی ہوٹل کے عملے کی بات تو ان کی طرف سے تو میں تمہیں دو سو فیصد یقین دے سکتا ہوں۔ جن لوگوں نے تمہیں یہاں دیکھا ہے، وہ میرے اتنے اعتماد کے بندے ہیں کہ میری اجازت کے بغیر کہیں زبان کھولنا تو دُور کی بات ہے، وہ مجھ سے پوچھے بغیر سانس بھی نہیں لے

سکتے۔ اور بالفرض کسی طرح پولیس یا خفیہ اداروں تک یہ بات پہنچ بھی جاتی ہے کہ تم لوگ ہوٹل مون میں ہوئے ہو تو کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ تمہیں بازیاب کروانے کے لیے یہاں ریڈ کر اس لیے تم اپنی سکیورٹی کی طرف سے پورا اطمینان رکھو۔''

بھائی جی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں یقین دہانی کروائی اور بے پروائی سے سگار کے کش لیے اس کے زیر استعمال یہ سگار سو فیصد امپورٹڈ تھا اور اس کی خوشبو اتنی شاندار تھی کہ اردگرد موجود افراد میں ناگواری محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

''بھائی جی نے جو کچھ بولا، سو فیصد کھرا ہے۔ پھر بھی اگر تم لوگوں کا من نہیں مانتا تو اپن اس بندوبست کر دیتا ہے کہ تم کو ادھر سے کہیں اور شفٹ کر دے تا کہ تمہاری ٹینشن ہی ختم ہو جائے۔' عبدال نے بہت دیر بعد اس گفتگو میں حصہ لیا اور ایک تجویز پیش کی۔

اُس کی یہ تجویز سن کر بھائی جی کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے اور وہ پہلے ہی کی اطمینان سے سگار سے شغل کرتا رہا جس کا مطلب تھا کہ اس کے دستِ راست عبدل نے جو تجویز پیش کی اس سے اسے کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شہریار نے چند سیکنڈ کے لیے اس تجویز پر غور کیا اور پھر فیصلہ سنا دیا کہ وہ لوگ یہاں سے شفٹ ہو کریں گے۔ یہ فیصلہ اس نے کسی عقلی دلیل کی بنیاد پر نہیں کیا تھا، بس اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ رُکنا مناسب نہیں ہے اور اس نے اپنی چھٹی حس پر بھروسہ کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ دس منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔'' اس کا فیصلہ عبدالرحمٰن نے کہا اور پھر وہ اور بھائی جی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس موقع پر بھائی جی نے مکمل خا اختیار کیے رکھی تھی اور ایک دم سے لاتعلق ہو گیا تھا۔

''یہ لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں عمارت کے راستے پر کیمرے کی موجودگی کے بارے میں معلوم تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر ہم سے یہ بات کیونکہ ان کا مفاد اسی میں تھا کہ ہماری تصویریں منظر پر آ جائیں اور لوگوں پر یہ ثابت ہو جائے کہ اشوک میں ملوث افراد کا بھائی جی کے گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ان دونوں کی روانگی کے بعد سلّو نے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں لیکن جان بوجھ کر جتایا نہیں۔ ابھی ہمیں ان لوگوں کے تعاون کی ضر ہے اس لیے ضروری ہے کہ اختلافات کو بڑھنے نہ دیں۔'' شہریار نے رسان سے اسے جواب دیا اور دونوں وہاں سے اپنی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

فنگر پرنٹس کے سلسلے میں انہوں نے پہلے ہی حتی الامکان احتیاط کی تھی۔ اشوک کو انجام تک پہنچا لیے استعمال ہونے والے لباس البتہ ابھی ویسے ہی پڑے تھے چنانچہ ان دونوں ملبوسات اور ان کے حلیے کی تبدیلی کے لیے استعمال ہونے والی دیگر اشیا کو ایک باتھ روم میں یکجا کر کے انہیں نذرِ آتش کیا راکھ فلیش میں بہا دی۔ لگنے والی معمولی چوٹوں کی صفائی اور ان پر جراثیم کش ادویات کا استعمال کے ساتھ ہی کر چکے تھے۔ اس وقت دو دو پین کلرز پانی کے ساتھ نگلیں اور حلیوں میں ممکنہ تبدیلیاں ڈالیں لیکن یہ بہت معمولی تھیں۔ کیونکہ یہاں ان کے پاس میک اپ کا سامان موجود نہیں تھا اور نہ مہلت تھی کہ وہ کسی سے فرمائش کر سکتے۔



چھوٹے چھوٹے چند کاموں کو نمٹانے میں ہی دس منٹ کا وقت تیزی سے گزر گیا اور انہوں نے بیڈ روم سے میں دستک کی آواز سنی۔ آنے والا ہوٹل کا منیجر تھا۔

''آپ لوگوں کے لیے گاڑی تیار ہے۔'' اس نے انہیں اطلاع دی تو وہ لیونگ روم میں آ گئے۔ وہاں کی طرح ان کی لاعلمی میں ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے کا کام کیا جا چکا تھا۔

''گاڑی ہوٹل کے مین گیٹ کے ساتھ ہی لگائی گئی ہے۔ آپ کے حلیے پہلے کے مقابلے میں اتنے ہیں کہ کسی کے لیے آپ لوگوں کو پہچاننا ممکن نہیں ہو گا۔ آپ پورے اطمینان سے عام افراد کی طرح اور گاڑی میں بیٹھ جائیں۔'' لیونگ روم میں پہنچ کر منیجر نے انہیں کچھ اور ہدایات دیں اور پھر مسکراتے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں آپ دونوں کو سی آف کرنے کے لیے آپ کے ساتھ باہر تک جانے میں خوشی محسوس کرتا لیکن میرا آپ کے لیے مناسب نہیں ہو گا اور اس خصوصی سلوک کی وجہ سے اردگرد بُو سونگھتے پھرتے افراد آپ کی متوجہ ہو جائیں گے۔''

مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وضاحت کر دی کہ وہ انہیں یہیں سے رخصت کر رہا ہے اور ساتھ ہی وجہ بیان کر دی۔

''اٹس اوکے۔ ہم لوگوں کی زندگیوں میں ان فارمیلٹیز کی گنجائش ہوتی بھی نہیں ہے۔'' شہریار نے سے اس کی بات کا جواب دیا اور قدم آگے بڑھائے۔

''تعاون کے لیے شکریہ۔ موجودہ حالات میں ہم لوگ خود بھی بہت ٹینس ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہے کہ ویسٹ میں بھائی جی کے ایک ریسٹورنٹ کو آگ لگا دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اشوک کے کا کام ہو گا۔ وہ لوگ دوسری جگہوں پر بھی ایسی کارروائیاں کر سکتے ہیں اس لیے مجھے اپنے اس ہوٹل سکیورٹی کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہو گا۔'' وہ مہذب آدمی تھا اور یقیناً اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس پر کام بھی کر رہا تھا۔

شہریار نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ اس کی مجبوری کو سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں کسی شکوہ نہیں ہے۔

وہ اور سلّو باہر آ گئے۔ وہاں بڑے ہوٹلوں کی سی مخصوص خاموشی اور سکون طاری تھا لیکن سروس بوائے سے لے کر ریسپشنسٹ تک ہر ایک کے چہرے کے گمبھیر تاثرات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ سب اپنی اپنی جگہ اعصاب زدہ ہیں اور ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار بھی کہ اشوک کی موت کا ردِعمل مون ہوٹل پر حملے کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔

یقینی طور پر اس ممکنہ حملے کے خطرے کے پیشِ نظر وہاں سکیورٹی کے معقول انتظامات بھی کیے گئے ہوں لیکن اس حقیقت سے بھی نظریں نہیں چرائی جا سکتی تھیں کہ جب ایسا کوئی تصادم ہوتا ہے تو نقصان دونوں طرف کے لوگوں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ ہاں کم یا زیادہ کا فرق البتہ ہو سکتا ہے۔

وہ دونوں آپس میں کوئی بات کیے بغیر سنجیدگی سے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔

لابی کی سجاوٹ بہت خوب صورت تھی اور وہاں بڑے بڑے آرام دہ اور بیش قیمت صوفے لگائے گئے دیوار پر ایک بڑا ایل ای ڈی بھی موجود تھا جس پر خبریں ہی چل رہی تھیں اور خبروں کا موضوع یقینی طور اشوک کے واقعات ہی تھے۔ لیکن وہاں ان خبروں کو دیکھنے کے لیے زیادہ افراد موجود نہیں تھے۔ پوری لابی میں

سکتے۔ اور بالفرض کسی طرح پولیس یا خفیہ اداروں تک یہ بات پہنچ بھی جاتی ہے کہ تم لوگ ہوٹل مون میں
ہوئے ہو تو کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ تمہیں بازیاب کروانے کے لیے یہاں ریڈ کر
اس لیے تم اپنی سکیورٹی کی طرف سے پورا اطمینان رکھو۔''

بھائی جی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں یقین دہانی کروائی اور بے پروائی سے سگار کے کش لیے
اس کے زیر استعمال یہ سگار سو فیصد امپورٹڈ تھا اور اس کی خوشبو اتنی شاندار تھی کہ اردگرد موجود افراد میں
ناگواری محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

''بھائی جی نے جو کچھ بولا، سو فیصد کھرا ہے۔ پھر بھی اگر تم لوگوں کا من نہیں مانتا تو اپن اس
بندوبست کر دیتا ہے کہ تم کو ادھر سے کہیں اور شفٹ کر دے تا کہ تمہاری ٹینشن ہی ختم ہو جائے۔'' عبد
نے بہت دیر بعد اس گفتگو میں حصہ لیا اور ایک تجویز پیش کی۔

اُس کی یہ تجویز سن کر بھائی جی کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے اور وہ پہلے ہی کی
اطمینان سے سگار سے شغل کرتا رہا جس کا مطلب تھا کہ اس کے دستِ راست عبدل نے جو تجویز پیش کی
اس سے اسے کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شہریار نے چند سیکنڈ کے لیے اس تجویز پر غور کیا اور پھر فیصلہ سنا دیا کہ وہ لوگ یہاں سے شفٹ
کریں گے۔ یہ فیصلہ اس نے کسی عقلی دلیل کی بنیاد پر نہیں کیا تھا، بس اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ
رُکنا مناسب نہیں ہے اور اس نے اپنی چھٹی حس پر بھروسہ کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ دس منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔'' اس کا فیصلہ
عبدالرحمٰن نے کہا اور پھر وہ اور بھائی جی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس موقع پر بھائی جی نے مکمل
اختیار کیے رکھی تھی اور ایک دم سے لاتعلق ہو گیا تھا۔

''یہ لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں عمارت
راستے پر کیمرے کی موجودگی کے بارے میں معلوم تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر ہم سے یہ بات
کیونکہ ان کا مفاد اسی میں تھا کہ ہماری تصویریں منظر پر آ جائیں اور لوگوں پر یہ ثابت ہو جائے کہ اشوک
میں ملوث افراد کا بھائی جی کے گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ان دونوں کی روانگی کے بعد سلّو نے
سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں لیکن جان بوجھ کر جتایا نہیں۔ ابھی ہمیں ان لوگوں کے تعاون کی
ہے اس لیے ضروری ہے کہ اختلافات کو بڑھنے نہ دیں۔'' شہریار نے رسان سے اسے جواب دیا اور
دونوں وہاں سے اپنی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

فنگر پرنٹس کے سلسلے میں انہوں نے پہلے ہی حتی الامکان احتیاط کی تھی۔ اشوک کو انجام تک پہنچا
لیے استعمال ہونے والے لباس البتہ ابھی ویسے ہی پڑے تھے چنانچہ ان دونوں ملبوسات اور ان کے
حلیے کی تبدیلی کے لیے استعمال ہونے والی دیگر اشیا کو ایک باتھ روم میں یکجا کر کے انہیں نذرِ آتش کیا
راکھ فلیش میں بہا دی۔ لگنے والی معمولی چوٹوں کی صفائی اور ان پر جراثیم کش ادویات کا استعمال
کے ساتھ ہی کر چکے تھے۔ اس وقت دو دو پین کلرز پانی کے ساتھ نگلیں اور حلیوں میں ممکنہ تبدیلیاں
ڈالیں لیکن یہ بہت معمولی تھیں۔ کیونکہ یہاں ان کے پاس میک اپ کا سامان موجود نہیں تھا اور نہ
مہلت تھی کہ وہ کسی سے فرمائش کر سکتے۔



چھوٹے چند کاموں کو نمٹانے میں ہی دس منٹ کا وقت تیزی سے گزر گیا اور انہوں نے بیڈ روم
دروازے میں دستک کی آواز سنی۔ آنے والا ہوٹل کا منیجر تھا۔

''آپ لوگوں کے لیے گاڑی تیار ہے۔'' اس نے انہیں اطلاع دی تو وہ لیونگ روم میں آ گئے۔ وہاں
کی طرح ان کی لاعلمی میں ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے کا کام کیا جا چکا تھا۔

''گاڑی ہوٹل کے مین گیٹ کے ساتھ ہی لگائی گئی ہے۔ آپ کے حلیے پہلے کے مقابلے میں اتنے
ہیں کہ کسی کے لیے آپ لوگوں کو پہچاننا ممکن نہیں ہو گا۔ آپ پورے اطمینان سے عام افراد کی طرح
اور گاڑی میں بیٹھ جائیں۔'' لیونگ روم میں پہنچ کر منیجر نے انہیں کچھ اور ہدایات دیں اور پھر مسکراتے
مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں آپ دونوں کو سی آف کرنے کے لیے آپ کے ساتھ باہر تک جانے میں خوشی محسوس کرتا لیکن میرا
آپ کے لیے مناسب نہیں ہو گا اور اس خصوصی سلوک کی وجہ سے اردگرد بُو سونگھتے پھرتے افراد آپ کی
متوجہ ہو جائیں گے۔''

مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وضاحت کر دی کہ وہ انہیں یہیں سے رخصت کر رہا ہے اور ساتھ ہی وجہ
بیان کر دی۔

''اٹس او کے۔ ہم لوگوں کی زندگیوں میں ان فارمیلٹیز کی گنجائش ہوتی بھی نہیں ہے۔'' شہریار نے
سے اس کی بات کا جواب دیا اور قدم آگے بڑھائے۔

''تعاون کے لیے شکریہ۔ موجودہ حالات میں ہم لوگ خود بھی بہت ٹینس ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے
آئی ہے کہ ویسٹ میں بھائی جی کے ایک ریسٹورنٹ کو آگ لگا دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اشوک کے
کا کام ہو گا۔ وہ لوگ دوسری جگہوں پر بھی ایسی کارروائیاں کر سکتے ہیں اس لیے مجھے اپنے اس ہوٹل
سکیورٹی کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہو گا۔'' وہ مہذب آدمی تھا اور یقیناً اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس
پر کام بھی کر رہا تھا۔

شہریار نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ اس کی مجبوری کو سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں کسی
شکوہ نہیں ہے۔

وہ اور سلّو باہر آ گئے۔ وہاں بڑے ہوٹلوں کی سی مخصوص خاموشی اور سکون طاری تھا لیکن سروس بوائے
سے لے کر ریسپشنسٹ تک ہر ایک کے چہرے کے گمبھیر تاثرات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ سب اپنی اپنی جگہ
اعصاب زدہ ہیں اور ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار بھی کہ اشوک کی موت کا ردِعمل مون ہوٹل پر حملے کی
صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔

یقینی طور پر اس ممکنہ حملے کے خطرے کے پیشِ نظر وہاں سکیورٹی کے معقول انتظامات بھی کیے گئے ہوں
ان اس حقیقت سے بھی نظریں نہیں چرائی جا سکتی تھیں کہ جب ایسا کوئی تصادم ہوتا ہے تو نقصان دونوں
کے لوگوں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ ہاں کم یا زیادہ کا فرق البتہ ہو سکتا ہے۔

وہ دونوں آپس میں کوئی بات کیے بغیر سنجیدگی سے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔

لابی کی سجاوٹ بہت خوب صورت تھی اور وہاں بڑے بڑے آرام دہ اور بیش قیمت صوفے لگائے گئے
دیوار پر ایک بڑا ایل ای ڈی بھی موجود تھا جس پر خبریں ہی چل رہی تھیں اور خبروں کا موضوع یقینی طور
کے واقعات ہی تھے۔ لیکن وہاں ان خبروں کو دیکھنے کے لیے زیادہ افراد موجود نہیں تھے۔ پوری لابی میں

کُل تین افراد صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک لیپ ٹاپ کھولے کچھ کام کر رہا تھا، دوسرے سامنے اخبار کا فلمی خبروں والا صفحہ کھلا ہوا تھا اور تیسرا اونگھنے کے انداز میں نیم وا آنکھوں سے خبریں دیکھ رہا وہ لابی سے گزرے تو ان تینوں میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے

باہر حسبِ اطلاع ان کے لیے ڈرائیور سمیت ایک گاڑی موجود تھی۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ اس لمحے پہلی بار شہریار نے محسوس کیا کہ سلّو پُرسکون نہیں ہے اور بار بار عقب نما آئینے دیکھنے کے علاوہ پیچھے گردن موڑ کر ایسے دیکھ رہا ہے جیسے اسے اپنے تعاقب کا اندیشہ ہو۔

''اپنی پرابلم؟'' آخر کار شہریار کو اس سے پوچھنا ہی پڑا۔

''بھٹنا گر..... وہاں ہوٹل کی لابی میں، میں نے بھٹنا گر کو دیکھا تھا۔'' اس نے بے چین سے لہجے میں بتایا تو شہریار کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی حد تک خوف زدہ بھی ہے۔

''کون ہے یہ بھٹنا گر؟'' اس کے شانے پر دلاسا دینے کے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا البتہ آواز اتنی دھیمی تھی کہ ڈرائیور کے لیے اس کی بات سمجھنا دشوار ہوتا۔

''را'' کا ایک اہم بندہ۔ مجھے ٹریننگ اسی نے دی تھی۔'' سلّو نے بتایا تو شہریار کے حلق سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی۔ سلّو جیسی آفت کو تربیت دینے والا شخص کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہو سکتا تھا۔

''کیا اس نے تمہیں دیکھ لیا تھا؟'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

''بظاہر تو اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن اس جیسے آدمی کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں بند بھی ہوتیں تو مجھے یہی شک ہوتا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔''

''ان تینوں میں سے کون بھٹنا گر تھا؟'' اس کا جواب سن کر شہریار کی تشویش کچھ اور بھی بڑھ گئی اور اس نے دریافت کیا۔ اب اس کی نظریں بھی عقب نما آئینے اور گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

چند گھنٹے والا ماحول بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہاں اب نہ تو گاڑیوں کا ہجوم تھا اور نہ ہی بھاگتے دوڑتے لوگ۔ ہر قسم کی دکانیں، ریسٹورنٹس اور دیگر رات گئے تک چلنے والے کاروباری مراکز بند ہو چکے تھے اور ہُو کا سا عالم تھا۔ ایک آدھ جگہ انہیں جلے ہوئے ٹائرز اور گاڑیوں کے ڈھانچے بھی نظر آئے۔ ان کی گاڑی کے علاوہ سڑک پر سے بس اِکا دُکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ ایسے میں اگر کوئی ان کے تعاقب میں ہوتا تو اس کی نظر میں آنا لازم تھا۔ اور ابھی تک اس کی نظر میں کوئی مشکوک گاڑی نہیں آ سکی تھی۔

''وہ جو اونگھتے ہوئے خبریں دیکھ رہا تھا، وہی بھٹنا گر تھا۔'' سلّو نے آہستہ سے بتایا تو وہ یونہی تفہیمی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ سلّو کے اندیشے کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بھٹنا گر کی اس پر نظر پڑی تھی تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اس نے سلّو کو شناخت کر لیا ہو۔ کیونکہ ہوٹل سے نکلتے وقت ان دونوں نے بہت معمولی سا میک اپ کر رکھا تھا اور کسی اسپیشل سیکرٹ ایجنٹ کے لیے اتنے معمولی میک اپ کے پیچھے اصل چہرے تک پہنچنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بھٹنا گر تو سلّو کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا ہوگا اور یقینی طور پر اس تک رسائی کے لیے سرگرم بھی ہو گیا ہوگا۔

''را'' والوں نے تو اپنی طرف سے برسوں کی محنت اور سرمایہ کاری کے بعد سلّو کی شکل میں پاکستان کے خلاف ایک چلتا پھرتا بم تیار کیا تھا جس کے ذریعے وہ نہ جانے کتنی تباہی مچانے کی آرزو رکھتے تھے لیکن قسمتی سے پہلے ہی مرحلے میں سلو، سی ایف پی کی نظر میں آ گیا اور ان لوگوں نے اسے ناکام بنانے کے ساتھ ساتھ یہ باور کروانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی کہ مچھیروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے نوعمر سلّو کو



کسی جرم کے کھلے سمندر سے گرفتار کر کے برسوں اس کی برین واشنگ کی ہی اس لیے گئی تھی کہ وہ اپنے ہی ملک کے خلاف کارروائیاں کر سکے۔ بعد میں حالات نے بھی سلّو پر یہ بات ثابت کر دی اور اب وہ پورے خلوص کے ساتھ شہریار کا ساتھ دے رہا تھا۔

''را'' والے بھی یقینی طور پر اس مہلک ہتھیار کے کھو جانے کے بعد تشویش میں گرفتار رہے ہوں گے اور انہوں نے جستجو رہی ہوگی کہ کسی طرح سلّو تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ان حالات میں اگر بھٹنا گر نے اسے ہوٹل کی لابی میں دیکھ لیا تھا تو یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اسے اپنے ہاتھوں سے نکلنے دیتا۔ وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کر رہا ہوگا۔ لیکن کیا؟..... یہ ابھی تک سامنے نہیں آ سکا تھا۔ بظاہر تو کوئی ان کا تعاقب بھی نہیں کر رہا تھا۔

''سامنے ایک پولیس جیپ کھڑی ہے اور اس سے ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا جا رہا ہے۔'' اچانک ہی ڈرائیور نے بلند آواز میں آگاہ کیا تو وہ دونوں ہی چونک گئے۔

''کیا حکم ہے صاحب!..... بولو رُکنا ہے کہ نہیں؟'' ڈرائیور نے اطلاع دینے کے ساتھ ہی فوراً دریافت کیا۔

اسی وقت شہریار نے دیکھا کہ ایک گاڑی انہیں اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی ہے اور اسے بھی رکنے کا اشارہ کیا جا رہا ہے۔

''گاڑی روک لو۔ اگر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو پھر نکل پڑنا۔'' اسے خیال آیا کہ شاید حالات کی وجہ سے شہر میں مختلف جگہ ناکہ بندی کر کے پولیس اپنی ڈیوٹی پوری کر رہی ہے۔ ایسے میں اگر وہ تھوڑی بہت بات چیت کر کے وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو اچھا تھا ورنہ پھر مقابلے کا آپشن تو ہر صورت ہی ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔

ڈرائیور جس نے رفتار قدرے دھیمی کر لی تھی، اجازت پاتے ہی پولیس جیپ کے قریب جا رکا۔ جیپ کے باہر کئی پولیس اہلکار موجود تھے جن میں سے دو پہلے رُکنے والی گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ موجود تھے جبکہ وہاں کے قریب چلے آئے تھے۔

''کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟'' ایک نے ٹارچ کی روشنی اندر مارتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ مہتا صاحب کے مہمان ہیں سر! اور میں ان کے حکم پر ہی ایک جگہ پہنچانے جا رہا ہوں۔'' ڈرائیور کے الفاظ بے شک مہذبانہ تھے لیکن لہجے میں وہ کرّ و فر تھا جو کسی بڑے خاص آدمی کے خاص ملازم کے لہجے میں خود بخود ہی آ جاتا ہے اور وہ اپنے صاحب کی حیثیت کے زعم میں خود کو چھوٹے افسروں سے اعلیٰ اور برتر سمجھنے لگتا ہے۔

''اوہو..... مہتا صاحب کے مہمان ہیں یہ۔ ذرا خیال سے لے کر جانا۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ آج شہر کے حالات کتنے خراب ہیں۔ کہیں کوئی ان کے ساتھ شرارت نہ کر جائے۔'' مہتا کے نام میں کوئی ایسا جادو تھا کہ پولیس والے کا لہجہ خود بخود ہی مؤدبانہ ہو گیا۔

''چنتا مت کرو۔ ایسے شرارت کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔'' ڈرائیور نے لاپروائی سے جواب دیا اور پولیس والے کے پیچھے ہٹنے پر گاڑی آگے بڑھا لی۔ پیچھے کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار بیٹھے سلّو اور شہریار کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ خلافِ توقع پولیس والوں نے ان میں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا تھا اور محض ڈرائیور سے بات چیت کر کے ہی آگے جانے کی اجازت دے

دی تھی۔

''یہ مہتا کون ہے جس کا نام سن کر پولیس والوں کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی تھی؟'' گاڑی آگے بڑھی تو شہریار نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''فیڈرل لاء منسٹر ہیں۔ یہ گاڑی بھی اُنہی کی ہے۔ اپنے بھائی جی کے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ رہتے تو دہلی میں ہیں لیکن ادھر ممبئی میں بھی ان کی ایک کوٹھی ہے۔ عبدل بھائی نے آپ لوگوں کے لیے ان کی کوٹھی سے گاڑی منگوائی تھی۔''

ڈرائیور نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تو شہریار اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ یہ ڈرائیور کے بیان سے زیادہ مہتا کی گاڑی کا اثر ہوگا جو پولیس والوں نے بغیر چیکنگ اور تفتیش کے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ پولیس والے ان معاملات میں بہت ہوشیار اور باخبر ہوتے ہیں اور بڑے آدمیوں کی گاڑیوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں عبدل کی دُور اندیشی کو بھی سراہا جس نے شہر کے مخدوش حالات میں ان کے لیے ایسا عمدہ انتظام کیا تھا۔

ان کا باقی سفر اطمینان سے گزرا۔ تعاقب کی طرف سے سو فیصد یقین ہو گیا کہ کوئی پیچھے نہیں ہے۔ سنسان سڑکوں پر نظروں میں ضرور آ جاتا۔

''صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم تھوڑی سی نیند لے لیں تاکہ آئندہ کی کارروائی کے لیے فریش ہو سکیں۔ اب تک تو تمہیں یہ اطمینان بھی ہو گیا ہوگا کہ بھٹناگر نے ہوٹل کی لابی میں تمہیں کس دیکھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو اس کے آدمی ضرور ہمارا تعاقب کرتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم بھی اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو اور ریلیکس ہو جاؤ۔''

ڈرائیور انہیں ایک چھوٹے بنگلے میں پہنچا کر چلا گیا تو شہریار، سلّو سے مخاطب ہوا۔ سلّو کو بہت زیادہ بولنے کی عادت تو یوں بھی نہیں تھی لیکن اس وقت اس پر جو گمبھیر سنجیدگی طاری تھی، وہ شہریار کو بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی اس لیے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

اس کی بات سن کر سلّو کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تاہم اس نے اختلاف نہیں کیا اور فوراً ہی اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کی بطور خواب گاہ بنگلے پر موجود واحد ملازم نے نشاندہی کی تھی۔ شہریار بھی سر جھٹک کر اپنے لیے مخصوص خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

⊛----✪----⊛

وہ تینوں ممکنہ تیز رفتاری سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

زخمی ایڈی، اسلم کے شانے پر لدا ہوا تھا اور ماہ بانو اپنے پیر کی موچ کے باوجود اسلم کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔

دیکھا جائے تو ان تینوں میں سے کوئی بھی اتنی مشقت کا اہل نہیں تھا۔ لیکن جنگل میں پھیلنے والی آگ کا خوف ان کے قدموں کو رُکنے نہیں دے رہا تھا۔ آگ ابھی ان سے بہت دُور تھی لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس عفریت کو انہیں آ دبوچنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ اذیت ناک موت سے دوچار ہونے کا خطرہ انہیں نہایت تکلیف میں بھی قدم آگے بڑھاتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''مجھے یہیں چھوڑ دو دوست! میرا بوجھ تمہاری رفتار کو کم کر رہا ہے۔ تم کیوں میرے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہو؟'' اسلم کے شانے پر لدے ایڈی نے کراہتے ہوئے ایک بار پھر اس سے استدعا کی۔



''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جانتے بوجھتے کسی بے گناہ انسان کو اس آگ کا شکار ہونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہارے دونوں ساتھی خود ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ ورنہ میں تو انہیں بھی اپنے ساتھ ہی رکھتا۔ سمجھ لو کہ ہمارا مرنا ساتھ ہے۔ اگر ہم اس مصیبت سے نکل سکے تو ساتھ نکلیں گے ورنہ ایک ساتھ ہی موت ہمارا مقدر ہوگی۔ اب تم دوبارہ مجھ سے ایسا مطالبہ مت کرنا۔'' اسلم نے بالکل قطعی لہجے میں اسے جواب دیا اور آگے کا سفر جاری رکھا۔

''اب اور کتنا چلنا ہوگا؟'' اس کا ہاتھ تھام کر چلتی ماہ بانو نے نقاہت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ایک تو اس کی حالت ایسی تھی، اس پر سے پاؤں کی موچ نے بھی نڈھال کر دیا تھا۔ سو بے حد صابر ہونے کے باوجود اسے اپنا حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''ہمت کرو۔ بس کچھ دیر اور لگے گی پھر ہم انشاء اللہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' اسلم نے اسے تسلی دی لیکن حقیقتاً وہ اندر سے خاصا پریشان تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نقشے اور کمپاس کی موجودگی کے باوجود وہ کہیں غلطی کر بیٹھے ہیں اور جنگل سے باہر نکلنے والے راستے تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہے۔

''شش..... ذرا ایک منٹ رُکو۔'' اچانک ہی ایڈی نے اس کے شانے کو دبوچتے ہوئے سرگوشی میں کہا اور رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے ایک آواز آ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ ایک سے زیادہ بائیکس کی آوازیں ہیں۔'' لمحہ بھر کے لیے اپنی توجہ کسی خاص سمت میں مرکوز رکھنے کے بعد ایڈی نے سرگوشی میں ہی بتایا تو اسلم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے یاد آ گیا کہ ایڈی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق زیر زمین خفیہ لیبارٹری تک پہنچنے کے لیے ہنری اور طارق بائیکس کا استعمال کرتے تھے۔ وہ خود بھی اپنی سماعت پر زور دینے لگا اور اس بار اس نے جنگل کے شور میں مشینی آوازوں کو الگ سے شناخت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر یہ واقعی ہنری اور طارق ہیں تو ہم کوشش کر کے نہ صرف انہیں ان کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ ان سے بائیکس حاصل کر کے خود نسبتاً آسانی سے یہاں سے باہر بھی نکل سکتے ہیں۔'' اسلم جوش ہو گیا اور آواز کی سمت قدم بڑھا دیے۔ اس بار ماہ بانو بھی ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے شانہ بشانہ تھی۔

''ایسا کرو کہ تم مجھے یہیں اتار دو تاکہ تیزی سے وہاں تک پہنچ سکو۔ بعد میں تم مجھے یہاں سے لے جا سکتے ہو۔'' ایڈی نے تجویز پیش کی جو موجودہ حالات میں اسلم کو مناسب معلوم ہوئی۔ زخمی ایڈی کی وجہ سے اس کی رفتار میں واقعی کمی ہو رہی تھی۔ اگر وہ وقت پر ہنری اور طارق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو یہ نقصان بہت بڑا ہوتا۔ ویسے بھی فی الحال وہ جنگل کے جس حصے میں تھا، وہ آگ کی زد سے بہت دور تھا۔ اگر اسے کامیابی حاصل ہو جاتی تو وہ ایڈی کو یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم دونوں یہاں ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے کیا ہو پاتا ہے۔'' اس نے ایڈی کو نیچے اتار دیا اور بیک وقت اس سے اور ماہ بانو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' ماہ بانو نے وہاں رکنے سے صاف انکار کر دیا۔

''میں نے کہا نا کہ تم دونوں یہیں رُکو۔ تمہارے پیر میں موچ ہے۔ تم زیادہ رفتار سے میرے ساتھ نہیں چل سکو گی۔'' اسلم نے سختی سے انکار کر دیا اور مزید کچھ سنے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی رائفل اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی جبکہ پسٹل ماہ بانو کے پاس ہی تھا۔

''وہ میرا شوہر ہے ایڈی! اور میں اس موقع پر اس کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔'' دُور ہوتے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے یاسیت بھرے لہجے میں اپنی خواہش بیان کی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ تم میں ہمت ہے تو اس کے پیچھے چلی جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔ میں بہت سخت جان ہوں۔ مشکل وقت پڑا تو اس سے نمٹ ہی لوں گا۔''

ایڈی نے نہایت بردباری سے اسے جواب دیا تو ماہ بانو نے شفقت آمیز انداز میں اس کے سنہری بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس موجود ایک چھری اسے تھما کر آگے بڑھ گئی۔ یہ پھل کاٹنے والی چھری تھی جو اس نے روانہ ہوتے وقت اپنے پاس چھپالی تھی۔

اسلم اس سے کافی آگے نکل چکا تھا اور اب نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ محض اندازے سے اُس کے نقش قدم پر آگے بڑھتی رہی۔

چند منٹ بعد ہی اس نے گولی چلنے کی آواز سنی اور اس آواز نے اس کے لیے سمت کا تعین کرنا آسان کر دیا۔ اپنے پاؤں کے درد کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

ایک مقام پر پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ یہاں سے اسلم اور پروفیسر ہنری صاف نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر کی خاص بناوٹ کی بائیک ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور وہ دونوں گتھم گتھا تھے۔ پروفیسر عمر میں اسلم سے خاصا بڑا تھا لیکن اس کی فٹنس کمال کی تھی۔ اسلم بھی کسی سے کم نہیں تھا لیکن گزشتہ کئی روز کی مشقت نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ پھر لیبارٹری سے نکلنے کی جدوجہد میں بھی اسے بہت کچھ سہنا پڑا تھا اس لیے وہ پروفیسر سے زیر نہیں ہو رہا تھا تو اس پر حاوی بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس کی رائفل جس سے اس نے پروفیسر کی بائیک کو نشانہ بنا کر اسے رُکنے پر مجبور کیا تھا، ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور لگتا تھا کہ اس میں گولی نہیں ہے اس وجہ سے اسے ناکارہ پا کر اسلم نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ ماہ بانو کے پاس پسٹل موجود تھا لیکن ایک تو اس کی رینج زیادہ نہیں تھی، دوسرے پروفیسر اور اسلم جس طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، وہ کوئی رِسک لینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ وہ گولی چلاتی اور وہ ہدف کے بجائے اسلم کو لگ جاتی تو پھر کیا ہوتا؟ فی الحال وہ خاموش تماشائی بنے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اور وہ دونوں تھے کہ وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے اس سے مزید دُور ہوتے جا رہے تھے۔

ان دونوں کی یہ لڑائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ نظریں گھما گھما کر اردگرد کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ایڈی نے دو بائیکس کی آوازیں سنائی دینے کی بات کی تھی لیکن یہاں صرف ہنری اور اس کی بائیک موجود تھی۔ حالانکہ اصولاً ڈاکٹر طارق کو بھی اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ اطراف میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ گولی چلتے ہی خود کو کہیں چھپا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا، تب بھی اسے ہنری کی مدد کے لیے تو آنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور ماہ بانو اسی ڈر سے اپنی کمین گاہ سے نہیں نکل رہی تھی کہ کہیں طارق اندھیرے کا تیر بن کر اسے نشانہ بنا بیٹھے۔

وہ جس جگہ چھپی ہوئی تھی، وہاں سے آگے جنگل زیادہ گھنا بھی نہیں تھا اور ہنری اور اسلم تقریباً ایک کھلے حصے میں لڑ رہے تھے۔ یہ شاید جنگل میں آمدورفت کے لیے بنایا گیا راستہ تھا جو یہاں پیڑ پودے کم تھے۔ اسی راستے کی دوسری طرف پھر گھنا جنگل تھا۔

اسلم اور ہنری ایک دوسرے پر وحشیانہ حملے کرتے اور ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے کھلے حصے سے جنگل کے گھنے حصے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ماہ بانو کا اضطراب بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ اسلم کی کم عدولی کر کے محض اس کی مدد کے خیال سے یہاں آئی تھی لیکن کچھ کر نہیں پا رہی تھی۔ اسے اپنا یہ خاموش تماشائی والا کردار اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ طارق کے ڈر کو ذہن سے جھٹک کر خود میدان میں اُترنے کا فیصلہ کرتی، آپس میں پیکار اسلم اور ہنری نے بیک وقت فلائنگ کک لگائی اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر دُور جا گرے۔ اور پھر ماہ بانو کی آنکھوں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ وہ دونوں گرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنے میں کامیاب ہونے کے بجائے زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔

''دلدل۔''

اُس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال اُبھرا اور وہ ہر خوف اور اندیشے کو بھول کر دیوانہ وار اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس سمت بھاگی۔ لیکن ابھی وہ اس دلدل سے کافی فاصلے پر تھی کہ اس کے سر پر کوئی شے بہت زور سے آ ٹکرائی اور زمین و آسمان اس کی آنکھوں کے آگے گھوم کر رہ گئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے جو آخری منظر دیکھا، وہ اسلم کے وجود کے دلدل میں گم ہونے کا تھا.....!

⊛----✪----⊛

جاوید علی سمیت کسی کو اُمید نہیں تھی کہ وہ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھیں گے تو وہاں ان کا استقبال کرنے کے لیے سعید اور خیری کے ساتھ ساتھ میجر ذیشان خود موجود ہوگا۔

وہ چاروں اتنی جدوجہد کے بعد کئی مشکل و جان لیوا مراحل سے گزر کر واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ ان کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔

ذیشان نے انہیں فوری سوال جواب کے مرحلے سے گزارنے کے بجائے اپنے حلیے بہتر کرنے کی مہلت دی اور پھر وہ ایک خیمے میں گرما گرم چائے کی پیالیوں کے ساتھ اکٹھے ہوئے تو سپیدۂ سحر ظاہر ہونے کو تھا۔

اس ملاقات میں ملک اور اس کے بیٹے کی شمولیت کو ضروری نہ سمجھتے ہوئے اُنہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی جب کہ عثمان اور جاوید علی، ذیشان کے روبرو تھے۔ ذیشان کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے اور وہ اس حد تک سنجیدہ نظر آ رہا تھا کہ جاوید علی ایک بڑا کارنامہ انجام دینے کے باوجود اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

''تم دونوں مجھے یہاں دیکھ کر حیران تو ہوئے ہو گے؟'' آخر کار ذیشان نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

''یس سر!'' دونوں ہی دھیمی آواز میں جواباً صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

''میری یہاں موجودگی کی وجہ نہیں جاننا چاہو گے؟'' اس نے تلخی سے دریافت کیا۔

''آپ مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔'' جاوید علی نے ہمت کر کے جواب دیا۔ اتنا اندازہ تو بہرحال اسے ہو گیا کہ ذیشان کا مزاج برہم ہے۔

''میں خیری کی کال ملنے پر ایمرجنسی میں ہیلی کاپٹر سے یہاں پہنچا ہوں اور وہ مجھے کال کرنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ اس کا تم دونوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ جس مشن پر یہاں آئے تھے، اس کے لیے انہیں لیڈ کرنے والا شخص ہی غیر موجود تھا اور وہ اپنے طور پر کسی پیچیدہ صورتِ حال سے نہیں نمٹ سکتے تھے۔'' ذیشان کے الفاظ سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی اہم واقعہ پیش آ گیا ہے۔

''آئی ایم ویری سوری سر! ہم اپنے مشن کی تکمیل میں ہی مصروف تھے اس لیے اپنے ساتھیوں سے رابطہ

نہیں رکھ سکے۔ لیکن مجھے ان کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ یہاں سے حالات پر اچھی طرح نظر رکھ
ہیں۔'' جاوید علی لیڈر تھا اس لیے جواب دہی کا فریضہ بھی اسے ہی انجام دینا تھا۔

''لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ میجر اسد کی خودکشی کی صورت میں انہیں کیا لائحہ عمل اختیار
چاہئے۔'' ذیشان نے گویا ان کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

''کیا..... میجر اسد نے خودکشی کر لی؟'' جاوید علی نے حیرت سے یقین نہ کرنے والے انداز میں پو
''ہاں، یہ لو۔ اس کا سوسائیڈ نوٹ پڑھو۔'' ذیشان نے تہ کیا ہوا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو وہ
جلدی چند سطروں پر مشتمل اس نوٹ کو پڑھنے لگا۔

اپنی اس آخری تحریر میں میجر اسد نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے بڑی رقم کے عوض بھارت سے
والے اسلحے کے کنٹینر کو وہاں سے خاموشی سے گزار دینے کا سودا کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بچ
اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجنا چاہتا تھا۔ سی ایف پی کی ٹیم کی یہاں آمد کے بعد اسے اندازہ ہو
زیادہ دیر یہ بات راز میں نہیں رہے گی کہ اس نے اپنے وطن اور وردی سے غداری کی ہے اس لیے اس
ذلت کا سامنا کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ خودکشی کر لے اور سارے جھنجٹوں سے
حاصل کر لے۔

''تمہارے حکم پر خیری مستقل میجر اسد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے خیمے کے نزدیک ہی موجود
لیے میجر کے سائلنسر لگے ریوالور سے خودکشی کرنے کے باوجود اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس
جا کر خیمے میں چیک کیا اور میجر اسد کی خودکشی کا علم ہونے پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی کی
میں اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے خود یہاں آنے کا فیصلہ کر کے اردگرد سے تم لوگوں کے
میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ چوکی پر موجود کسی مناسب شخص کو
میں لے کر فی الحال میجر کی خودکشی کی خبر کو چھپایا جائے۔ صد شکر کہ سعید اور خیری نے یہ کام بخیر و خوبی
دے ڈالا۔ خیری یہاں رک کر یہاں کے معاملات کو سنبھالتا رہا جبکہ سعید نے تم دونوں کے بارے
معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت تو نہیں مل سکا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا
لوگوں کو آخری بار ملک سبحان کے ساتھ دیکھا گیا ہے اور ملک سبحان اپنے بیٹے کے ساتھ غائب ہے۔ اس
علاوہ اسے سڑک پر کھڑے کنٹینر اور کلینر کی لاش دیکھ کر بھی بہت سے اندازے لگانے میں کامیابی ہوئی۔

''میری یہاں آمد پر اس نے مجھے صورتِ حال سے باخبر کیا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ تم کیا کر
کھڑے ہوئے ہو۔ میں بے بس تھا اور تمہاری سلامتی کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں
معاملات البتہ میں نے سنبھال لیے۔ کرنل توحید کی مدد سے فوجی حکام کو میجر اسد کی خودکشی کا معاملہ خفیہ
ہینڈل کر لینے پر رضامند کر لیا تھا۔ اس وقت میجر کی لاش یہاں سے روانگی کے لیے تیار ہے۔ اس
سوسائیڈ نوٹ صرف اس کی فیملی کو پڑھوایا جائے گا اور ان سے وہ رقم واپس لی جائے گی جو میجر نے
سے وصول کی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا کیس تھا جس کی بنیاد پر ہم بھارت کو عالمی عدالت میں
سکتے تھے لیکن دو وجوہات نے ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اوّل میجر اسد کی خودکشی۔ اپنے خود
اس نے کسی بھارتی ایجنسی یا خاص فرد کا نام ظاہر نہیں کیا ہے اس لیے ہم بطورِ خاص کسی پر الزام عائد
سکتے۔ اگر میجر زندہ ہوتا تو اس کے اقبالی بیان کے ساتھ ساتھ ہم اس سے بہت سی دوسری معلومات بھی
کر سکتے تھے۔ دوسرے تم لوگوں کی سرحد پار موجودگی نے بھی ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں۔ تمہارے



ازی کے بعد ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ہم اس معاملے کو کسی فورم پر اُٹھا سکیں۔

''تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہاں بیٹھ کر سرحد کے اس طرف ہونے والے دھماکوں اور گولیوں کی
یں سننا کیسا تجربہ تھا۔ ہم صرف اندازے لگا سکتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور ان اندازوں کی بنیاد پر ہی
اپنے فیصلے بھی کرنے پڑے۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ کہیں تم لوگ وہاں پھنس نہ جاؤ، کہیں تم میں
ی کی جان نہ چلی جائے۔ چنانچہ میں یہاں بیٹھ کر جو کر سکتا تھا، وہ کیا۔ میں نے میجر کے بعد اس چوکی
ہارج کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس طرف فائر کروائے۔ اس طرح بھارتی
ں کی توجہ بٹ جاتی اور مجھے لگتا ہے کہ میری یہ حکمتِ عملی تم لوگوں کی وہاں سے کامیاب واپسی میں ضرور
ابت ہوئی ہو گی اور بھارتی اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہارا تعاقب نہیں کر سکے ہوں گے۔''

بے حد خراب موڈ کے ساتھ ذیشان نے اپنی بات مکمل کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی جاوید علی کے ہونٹوں
ی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بمشکل اس مسکراہٹ کو چھپایا اور لہجے کو بدستور دھیما رکھتے ہوئے عاجزی
لا۔

''تھینک یو سو مچ سر! آپ کی اس فہم و فراست نے واقعی ہماری بہت مدد کی ورنہ ایک مرحلے پر مجھے ایسا
تھا کہ اب ہم زندہ واپس نہیں پہنچ سکیں گے اور شاید یہی وہ وقت تھا جب آپ نے یہاں سے فائرنگ
م کروا کر بھارتیوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ ہمارا پوری قوت سے تعاقب کر سکیں۔''

''میں تمہاری وہاں کارروائی کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔'' اس کے چھپانے کے باوجود ذیشان اس
ونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے چمکنے والی مسکراہٹ کو دیکھ چکا تھا لیکن جان بوجھ کر نظرانداز کر گیا تھا اور بارعب
ں اپنی خواہش ظاہر کی۔

جاوید علی نے سلمان کی مدد سے پورا قصہ گوش گزار کر دیا جسے سنتے ہوئے کہیں کہیں ذیشان کے چہرے
ے تاثرات اُبھرے جیسے وہ ان کے اس کارنامے سے متاثر ہوا ہو لیکن زبان سے اس نے اس کا اظہار
کیا اور پوری بات ختم ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

''تم نے ایک بار پھر احمقانہ بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو کچھ تم کر گزرے ہو، اس کا نتیجہ اُلٹ بھی نکل
تا اور اس کے بعد حالات کیا ہوتے، یہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں ہے۔ میں اس سب کے
یں ذمے دار سمجھتا ہوں جاوید! یہ ٹھیک ہے کہ سی ایف پی میں فوج جیسی پابندیاں نہیں ہیں اور نہ ہی ہم
پنے ورکرز کے لیے کوئی مخصوص ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے آزاد ہوتا
کہ حالات کے مطابق اپنی صوابدید پر اقدامات کرے۔ لیکن تم یہ اقدامات کرتے ہوئے حد سے آگے نکل
ے ہو۔ جان دینے کی ہمت رکھنا اچھی بات ہے لیکن یوں ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے بھی نہ پھرا کرو۔ میں
ی بتا چکا ہوں اور اب ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ تمہاری جان ہمارے لیے کتنی قیمتی ہے۔''

آخری الفاظ آنے تک ذیشان کا لہجہ نرم ہو چکا تھا۔ جاوید علی کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اب تک وہ اس پر
ل کا اظہار کرتا رہا ہے، اصل میں اس کے پیچھے اس کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دیر ان کی سلامتی کی
ے پریشان رہا تھا اس لیے ردِعمل میں ایسے رویّے کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں آپ کے احساسات و جذبات کی قدر کرتا ہوں سر! اور مجھے تسلیم ہے کہ میری جان آپ کے
ق ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قیمتی صرف وہی آدمی ہوتا ہے جو کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا
ور نہ بے عمل آدمی کی حیثیت تو راستے کے پتھر سے بھی کم تر ہی ہوتی ہے اور لوگ اسے ٹھوکر مارنے میں

نہیں رکھ سکے۔ لیکن مجھے ان کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ یہاں سے حالات پر اچھی طرح نظر رکھ
ہیں۔'' جاوید علی لیڈر تھا اس لیے جواب دہی کا فریضہ بھی اسے ہی انجام دینا تھا۔

''لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ میجر اسد کی خودکشی کی صورت میں انہیں کیا لائحہ عمل اختیار
چاہئے۔'' ذیشان نے گویا ان کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

''کیا..... میجر اسد نے خودکشی کر لی؟'' جاوید علی نے حیرت سے یقین نہ کرنے والے انداز میں پو
''ہاں، یہ لو۔ اس کا سوسائیڈ نوٹ پڑھو۔'' ذیشان نے تہ کیا ہوا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو وہ
جلدی چند سطروں پر مشتمل اس نوٹ کو پڑھنے لگا۔

اپنی اس آخری تحریر میں میجر اسد نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے بڑی رقم کے عوض بھارت سے
والے اسلحے کے کنٹینر کو وہاں سے خاموشی سے گزار دینے کا سودا کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے
اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجنا چاہتا تھا۔ سی ایف پی کی ٹیم کی یہاں آمد کے بعد اسے اندازہ ہو
زیادہ دیر یہ بات راز میں نہیں رہے گی کہ اس نے اپنے وطن اور وردی سے غداری کی ہے اس لیے اس
ذلت کا سامنا کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ خودکشی کر لے اور سارے جھنجٹوں سے
حاصل کر لے۔

''تمہارے حکم پر خیری مستقل میجر اسد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے خیمے کے نزدیک ہی موجود تھا
لیے میجر کے سائلنسر لگے ریوالور سے خودکشی کرنے کے باوجود اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس
جا کر خیمے میں چیک کیا اور میجر اسد کی خودکشی کا علم ہونے پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی کی
میں اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے خود یہاں آنے کا فیصلہ کر کے اردگرد سے تم لوگوں کے
میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ چوکی پر موجود کسی مناسب شخص کو
میں لے کر فی الحال میجر کی خودکشی کی خبر کو چھپایا جائے۔ صد شکر کہ سعید اور خیری نے یہ کام بخیر و خوبی
دے ڈالا۔ خیری یہاں رک کر یہاں کے معاملات کو سنبھالتا رہا جبکہ سعید نے تم دونوں کے بارے
معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت تو نہیں مل سکا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا
لوگوں کو آخری بار ملک سبحان کے ساتھ دیکھا گیا ہے اور ملک سبحان اپنے بیٹے کے ساتھ غائب ہے۔ اس
علاوہ اسے سڑک پر کھڑے کنٹینر اور کلینر کی لاش دیکھ کر بھی بہت سے اندازے لگانے میں کامیابی ہوئی۔

''میری یہاں آمد پر اس نے مجھے صورتِ حال سے باخبر کیا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ تم کیا کر
کھڑے ہوئے ہو۔ میں بے بس تھا اور تمہاری سلامتی کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں
معاملات البتہ میں نے سنبھال لیے۔ کرنل توحید کی مدد سے فوجی حکام کو میجر اسد کی خودکشی کا معاملہ خفیہ
ہینڈل کر لینے پر رضامند کر لیا تھا۔ اس وقت میجر کی لاش یہاں سے روانگی کے لیے تیار ہے۔ اس
سوسائیڈ نوٹ صرف اس کی فیملی کو پڑھوایا جائے گا اور ان سے وہ رقم واپس لی جائے گی جو میجر نے بھار
سے وصول کی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا کیس تھا جس کی بنیاد پر ہم بھارت کو عالمی عدالت میں
سکتے تھے لیکن دو وجوہات نے ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اوّل میجر اسد کی خودکشی۔ اپنے خودکشی نو
اس نے کسی بھارتی ایجنسی یا خاص فرد کا نام ظاہر نہیں کیا ہے اس لیے ہم بطورِ خاص کسی پر الزام عائد
سکتے۔ اگر میجر زندہ ہوتا تو اس کے اقبالی بیان کے ساتھ ساتھ ہم اس سے بہت سی دوسری معلومات بھی
کر سکتے تھے۔ دوسرے تم لوگوں کی سرحد پار موجودگی نے بھی ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں۔ تمہاری



اندازی کے بعد ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ہم اس معاملے کو کسی فورم پر اُٹھا سکیں۔

''تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہاں بیٹھ کر سرحد کے اس طرف ہونے والے دھماکوں اور گولیوں کی
ازیں سننا کیسا تجربہ تھا۔ ہم صرف اندازے لگا سکتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور ان اندازوں کی بنیاد پر ہی
اپنے فیصلے بھی کرنے پڑے۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ کہیں تم لوگ وہاں پھنس نہ جاؤ، کہیں تم میں
کسی کی جان نہ چلی جائے۔ چنانچہ میں یہاں بیٹھ کر جو کر سکتا تھا، وہ کیا۔ میں نے میجر کے بعد اس چوکی
انچارج کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس طرف فائر کروائے۔ اس طرح بھارتی
ں کی توجہ بٹ جاتی اور مجھے لگتا ہے کہ میری یہ حکمتِ عملی تم لوگوں کی وہاں سے کامیاب واپسی میں ضرور
ارثابت ہوئی ہو گی اور بھارتی اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہارا تعاقب نہیں کر سکے ہوں گے۔''

بے حد خراب موڈ کے ساتھ ذیشان نے اپنی بات مکمل کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی جاوید علی کے ہونٹوں
ی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بمشکل اس مسکراہٹ کو چھپایا اور لہجے کو بدستور دھیما رکھتے ہوئے عاجزی
بولا۔

''تھینک یو سو مچ سر! آپ کی اس فہم و فراست نے واقعی ہماری بہت مدد کی ورنہ ایک مرحلے پر مجھے ایسا
تھا کہ اب ہم زندہ واپس نہیں پہنچ سکیں گے اور شاید یہی وہ وقت تھا جب آپ نے یہاں سے فائرنگ
ع کروا کر بھارتیوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ ہمارا پوری قوت سے تعاقب کر سکیں۔''

''میں تمہاری وہاں کارروائی کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔'' اس کے چھپانے کے باوجود ذیشان اس
ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے چمکنے والی مسکراہٹ کو دیکھ چکا تھا لیکن جان بوجھ کر نظرانداز کر گیا تھا اور بارعب
میں اپنی خواہش ظاہر کی۔

جاوید علی نے سلمان کی مدد سے پورا قصہ گوش گزار کر دیا جسے سنتے ہوئے کہیں کہیں ذیشان کے چہرے
پر تاثرات اُبھرے جیسے وہ ان کے اس کارنامے سے متاثر ہوا ہو لیکن زبان سے اس نے اس کا اظہار
کیا اور پوری بات ختم ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

''تم نے ایک بار پھر احمقانہ بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو کچھ تم کر گزرے ہو، اس کا نتیجہ اُلٹ بھی نکل
تھا اور اس کے بعد حالات کیا ہوتے، یہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں ہے۔ میں اس سب کے
لیے تمہیں ذمے دار سمجھتا ہوں جاوید! یہ ٹھیک ہے کہ سی ایف پی میں فوج جیسی پابندیاں نہیں ہیں اور نہ ہی ہم
اپنے ورکرز کے لیے کوئی مخصوص ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے آزاد ہوتا
ہے کہ حالات کے مطابق اپنی صوابدید پر اقدامات کرے۔ لیکن تم یہ اقدامات کرتے ہوئے حد سے آگے نکل
گئے ہو۔ جان دینے کی ہمت رکھنا اچھی بات ہے لیکن یوں ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے بھی نہ پھرا کرو۔ میں
یہ بھی بتا چکا ہوں اور اب ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ تمہاری جان ہمارے لیے کتنی قیمتی ہے۔''

آخری الفاظ آنے تک ذیشان کا لہجہ نرم ہو چکا تھا۔ جاوید علی کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اب تک وہ اس پر
ناراضگی کا اظہار کرتا رہا ہے، اصل میں اس کے پیچھے اس کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دیر ان کی سلامتی کی
فکر سے پریشان رہا تھا اس لیے ردِعمل میں ایسے رویّے کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں آپ کے احساسات و جذبات کی قدر کرتا ہوں سر! اور مجھے تسلیم ہے کہ میری جان آپ کے
لیے قیمتی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قیمتی صرف وہی آدمی ہوتا ہے جو کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا
ہو ورنہ بے عمل آدمی کی حیثیت تو راستے کے پتھر سے بھی کم تر ہی ہوتی ہے اور لوگ اسے ٹھوکر مارنے میں

ہی اپنے وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔'' بہت مضبوط لہجے میں اپنے عمل کے حق میں دلیل دیتا وہ ذیشان کو بھا
اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے جوان! تم نے ایک طرح سے فیصلہ سنا دیا ہے کہ تم اپنی روش پر قائم رہو گے۔ سو ہم بھی دعا
ے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔'' پوری گفتگو کے دوران ذیشان پہلی بار مسکرایا۔

''تھینک یو سر!.....دعا سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' جاوید علی کے لہجے میں چہکار تھی

''اور وہ میں تم سمیت اپنی ٹیم کے ہر ممبر کے لیے کرتا ہوں۔ کیونکہ ہمارا ہر ساتھی ہمارے لیے بہت
ہے۔'' جاوید علی سے یہ جملہ کہتے ہوئے ذیشان کے ذہن میں شہریار کا خیال تھا جس سے فی الحال ان کا رابطہ
ٹوٹا ہوا تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ دشمنوں کی سرزمین پر کیا کرتا پھر رہا ہے۔ بس کچھ اندازے ہی تھے
ل بنیاد پر وہ اس کی کامیابی کے لیے دعا مانگتے رہتے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ کل بھارت سے نکلنے والے ہر اخبار کی شہ سرخیوں سے خون اور آگ کی برسات
رہی ہو گی اور یہ رات جو گزری ہے، بھارت پر خاصی بھاری ثابت ہوئی ہو گی۔''

ان کی گفتگو اتنی طویل ثابت ہوئی تھی کہ سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ ذیشان نے
والے اس سورج کی روشنی کو محسوس کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں تبصرہ کیا تو جاوید علی اور سلمان دونوں
چونک گئے۔

''کیا مطلب؟'' دونوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''کل گزری رات کو ممبئی کا ایک بڑا غنڈہ اشوک قتل ہوا ہے۔ وہی اشوک جو اسلحے کی اس کھیپ کو ہا
اسمگل کرنے میں ملوث تھا۔ اُس خبیث کے اپنے انجام تک پہنچنے کے نتیجے میں ممبئی سمیت بھارت کے
شہروں میں ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے اور اندازہ ہے کہ بھاری جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' ا
نے بتایا تو ان دونوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ ایک طرف سرحدی گاؤں میں ہونے والی ہنگامہ آرائی تو دوسری
طرف شہر میں پھیلی بدامنی، بھارتی سرکار کو واقعی دہری چوٹ لگی تھی۔

''افسوس کہ اس ہنگامہ پرور اور پُرجوش رات کی صبح تمہیں چائے کی یہ ٹھنڈی ٹھار پیالیاں ہی مل سکیں
ذیشان نے اچانک ہی موضوعِ گفتگو تبدیل کر کے ان کی توجہ چائے کی ان پیالیوں کی طرف مبذول کرا
جن میں انہیں پیش تو گرما گرم چائے کی گئی تھی لیکن گفتگو کی گرما گرمی میں کوئی بھی اس چائے سے لطف ا
نہیں ہو سکا تھا اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی گرمی اور تازگی کھو بیٹھی تھی لیکن ان میں سے کسی کے دل میں
کے لیے ملال تھا نہ پروا۔ اس کا اندازہ اس قہقہے سے ہوا جو ان تینوں نے بیک وقت لگایا تھا۔

⊛----✪----⊛

''اب آپ تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں تو یہ آپ کی صحت کے لیے اچھا ہو گا چودھری صاحب! میرا کہا
میں کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں۔ یہیں آپ کے پاس ہوں اور بعد میں بھی آپ جب چاہیں مجھے کال
سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اگر آپ نے خود کو نہیں سنبھالا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ میرے ساتھ آنے والی
سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔''

وہ ممبئی فلم نگری سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ آج کی سب سے
ہیروئن کی ہم شکل سمجھی جاتی تھی۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ اس کی شکل ستر سے اسی فیصد اسی ہیروئن سے
ہے۔ لیکن جسمانی خوبصورتی کے معاملے میں وہ بیس فیصد نمبر بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اور یہاں یہ حال



ین طبقے کا ایک بڑا حصہ اس ہیروئن کی شکل سے زیادہ جسمانی خوب صورتی پر مرتا تھا۔ اس کی پتلی کمر
دیکھنے والوں کے دل رُک رُک جاتے تھے اور سینے کا زیر و بم سانسوں کو تھام لیتا تھا۔

چودھری کے پہلو میں الکا نامی ہیروئن کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی جسامت کو تمام تر کوششوں کے باوجود
معیار کے مطابق نہیں بنا سکی تھی۔ اصل میں وہ پیدا ہی کچھ ایسی بدوضع کاٹھ لے کر ہوئی تھی کہ ہزار
کوششوں کے بعد بھی خود کو بس کسی حد تک قابلِ قبول بنا سکی تھی اور اس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے اندر
اداکاری کی صلاحیت بھی بس برائے نام ہی تھی۔ اپنی اتنی بڑی بڑی خامیوں کے ساتھ اگر وہ ممبئی کی فلم نگری
موجود تھی تو اس کی پہلی وجہ تو یہی تھی کہ مشہور ہیروئن کی شکل سے مماثلت نے اس کے دل میں فلمی ہیروئن
کا شوق بلکہ جنون پیدا کر دیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا باپ اشوک کے گینگ میں تھا۔ بیٹی کے
نے اسے مجبور کیا کہ اشوک کی سفارش سے بیٹی کو ممبئی فلم نگری میں پہنچا دے۔ اور یوں الکا فلمی دنیا میں
تو ہو گئی لیکن فلم بینوں کے دل میں اپنی کوئی جگہ نہیں بنا سکی۔ اس کی اب تک کُل دو فلمیں ریلیز ہوئی تھیں
دونوں کی دونوں ہی بری طرح فلاپ ہو گئی تھیں۔ اس ناکامی کے بارے میں الکا کا خیال تھا کہ اُس کے کو
کا انتخاب درست نہیں کیا گیا تھا۔

آج کل وہ اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح اشوک کی سفارش پر اسے مشہور ہیرو یا کم سے کم بھی اجے
یا اکشے کمار کے ساتھ کوئی فلم مل جائے تو اس کی قسمت کا بند تالا کھل جائے گا۔

اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ اشوک کی خوشنودی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی اور
کے ساتھ اس خلوت گاہ میں موجود ہونا بھی اسی کوشش کا ایک حصہ تھا۔ اس جیسے اونچے خیالات رکھنے
کی کے لیے چودھری جیسے ٹھرکی بڈھے کو جھیلنا بہت مشکل کام تھا لیکن روشن مستقبل کے خوابوں نے اسے
جبر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ چودھری نے بھارت میں اپنے قیام کے آخری ایام میں اشوک سے اس
ہیروئن کی رفاقت کی فرمائش کی تھی اور اشوک نے اسے بتایا تھا کہ اس کی پسندیدہ ہیروئن اپنی فلم کی
کے سلسلے میں کم از کم بھی پندرہ روز تک ملک سے باہر رہے گی لیکن اسے اس سلسلے میں مایوس نہیں ہونا
۔ کیونکہ الکا کی صورت میں اس کے پاس چودھری کی پسندیدہ ہیروئن کا نعم البدل موجود ہے۔ یوں الکا،
کے ساتھ تھی اور بمشکل اسے جھیل رہی تھی۔

آخر کار جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو وہ چند تلخ جملے کہہ کر اس سے فاصلے پر چلی گئی اور اپنے
نام لباس کو درست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے سویٹ ہارٹ! نہ تو میں اتنا عمر رسیدہ ہوں جتنا دیکھنے
رہا ہوں اور نہ ہی اتنا کمزور ہوں کہ جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ میرے ساتھ تم اپنی
کے ان تجربات سے گزرو گی، جن سے کوئی نوجوان اور توانا آدمی بھی تمہیں آشنا نہیں کروا سکتا۔''

چودھری کو الکا کے یوں پہلو سے اُٹھ جانے پر اُلجھن بھی ہوئی تھی اور اس کی تلخ باتوں پر خجالت بھی
بلند و بانگ دعوے کرنے لگا۔

''ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اب میں تھک گئی ہوں اور تھوڑی دیر ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔''
بیزاری سے اسے جواب دیا اور اپنے لیے ایک جام تیار کرنے کے بعد اس انداز سے ہونٹوں سے لگایا
کا جسم آرام دہ کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بکھرا ہوا تھا اور عریاں ٹانگیں میز پر ٹکی چودھری کو دعوتِ

نظارہ دے رہی تھیں۔ قدرے بدوضع ہی سہی، وہ ایک عورت تھی جو رات کی اس تنہائی میں نشے
چودھری کو خوب ہی اپنی طرف لبھا رہی تھی۔

الکا کی بیزاری اور تلخی کا اسے خیال ہی نہ رہا اور مسہری سے اُتر کر ڈگمگاتا ہوا اس کی طرف بڑھا
وقت میز پر پڑا الکا کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں فون اُٹھایا اور اسکرین پر کال کر
والے کا نام دیکھ کر ذرا چونکتے ہوئے ''یس'' کا بٹن دبایا۔

''اوہ نو.....'' دوسری طرف سے جانے اسے کیا اطلاع دی گئی کہ وہ یک دم سے بیٹھے سے کھڑی ہو
دو قدم کے فاصلے پر موجود چودھری کو بھی اُس کے تاثرات دیکھ کر اپنے قدم روکنے پڑے۔

''آئی کانٹ بلیو اِٹ پاپا!'' اُس نے جو اگلا جملہ ادا کیا، اسے سن کر چودھری کو یہ تو اندازہ ہو گیا
کرنے والا الکا کا باپ ہے جو اسے کوئی غیر متوقع اطلاع دے رہا ہے۔ لیکن اصل بات کا اس کے فرشتوں
بھی گمان نہ گزرا۔ وہ تو جب الکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر ٹیلی ویژن آن کیا اور اسکرین پر دکھائے
والے مناظر کے ساتھ ساتھ کمرے میں نیوز ریڈر کی آواز پھیلی تو اس پر یہ تلخ حقیقت کھلی کہ ممبئی میں اس
میزبان اشوک اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

اس خبر کو سن کر وہ حواس باختہ ہو گیا۔ الکا کا اس سے بھی زیادہ برا حال تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ
سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اب جانے یہ اشوک کے مرنے کا غم تھا یا اپنی فلمی دنیا میں جگہ بنانے کے
کے چکنا چور ہو جانے کا خیال جو اسے یوں بری طرح رُلا رہا تھا۔ حواس باختہ چودھری اسے یوں بلک بلک
روتا دیکھ کر آگے بڑھا اور ہمدردی سے اسے گلے لگانا چاہا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' اس نے زور سے چودھری کو دھکا دیا اور خود اس سے بھی زیادہ زور سے چیخی
کے بعد وہ ہکا بکا چودھری کو مزید کچھ کہنے سننے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے حرکت میں آئی اور کرسی پر
گاؤن اُٹھا کر پہننے کے بعد میز پر رکھا اپنا پاؤچ اٹھا کر کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ظاہر ہے وہ جس اشوک کی خوشنودی کے لیے چودھری کی ناگوار قربت کو برداشت کر رہی تھی، جب
نہیں رہا تھا تو اسے یہ مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ اس جیسا ہی کچھ حال چودھری کا بھی تھا
وہی اسکرین پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا کہ جب اس کا میزبان ہی دنیا سے اُٹھ گیا تھا تو ممبئی میں مزید
ڈالے رکھنے کا کیا جواز رہ گیا تھا۔ بس اب اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کہاں کا رخ کرے۔ کیونکہ پاکستان
ملنے والی اطلاعات کے مطابق تو وہاں بھی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے اور اس کے پیچھے طوائف
قتل کا مقدمہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس قسم کے معاملات سے نمٹنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اتنے پُرلطف شب و روز گزا
کے بعد ایسی تلخیوں کا سامنا کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے میں یہی مناسب تھا کہ وہ دبئی کا رخ
جہاں بہت سی ماہ رخوں سے ملاقات کے لیے اس کا دل مچلتا رہتا تھا اور کچھ سے تو وعدے وعید بھی کر
تھا کہ جلد ایک بار پھر دبئی کا رخ کرے گا اور ان ساری خواہشات کو پورا کرے گا جو اپنی اچانک
واپسی کی وجہ سے تشنہ چھوڑے جا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

شہریار سونے کے ارادے سے خواب گاہ میں آیا تھا لیکن فوری طور پر سو نہ سکا اور کچھ سوچ کر ٹیلی
کھول لیا۔ وہاں گرما گرم خبروں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا اور سب سے زیادہ ترجیح اشوک کے قتل



بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کو دی جا رہی تھی۔

محتاط اندازے کے مطابق اس خبر کے پھیلنے کے بعد بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ اشوک
سیاسی اور حلیف گروپوں کے افراد اس خبر کو سن کر آپس میں بھڑ گئے تھے اور متعدد مقامات پر ہونے والے
جھگڑوں میں بہت سے افراد کے زخمی ہونے کے علاوہ کئی کی جانیں بھی گئی تھیں۔

آج رات شہر میں زخمی اور قتل ہونے والے کئی افراد ایسے بھی تھے جو کسی بھی گروپ سے منسلک نہیں تھے
اشوک کے قتل کے بعد بھڑکنے والی فسادات کی آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شہریار کو ان افراد کے لیے
دکھ تھا لیکن یہ وہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہمیشہ کا دستور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور کوئی اسے
نہیں بچا سکتا۔ خبروں سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر کے حالات اتنے مخدوش ہیں کہ انتظامیہ کو
حالات پر قابو پانے کے لیے دو سے تین دن لازماً درکار ہوں گے۔

خبروں سے اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ فسادات کی یہ آگ صرف ممبئی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ دوسرے
شہر بھی لپیٹ میں آئے تھے لیکن سب سے زیادہ زور ممبئی میں ہی تھا۔ اسکرین پر چلنے والے کلپ میں
اشوک کے گھر کا بیرونی منظر دکھاتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ نامعلوم دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے
والے اشوک کی آخری رسومات کے لیے فی الحال کسی وقت اور جگہ کا اعلان نہیں کیا گیا ہے اور اشوک کے رفقا
کی میں صلاح مشورے کے بعد ہی شہر کے حالات دیکھتے ہوئے کوئی حتمی اعلان کریں گے۔

میڈیا والوں کے رویے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ شہر کو ایک بڑے غنڈے سے نجات ملی ہے۔ وہ لوگ
اشوک کی شخصیت کو بطور ایک بزنس مین اور سماجی کارکن پیش کر رہے تھے۔

خبروں کے اس تسلسل میں ایک خبر یہ بھی نشر کی گئی کہ پولیس نے کسی کی مخبری پر ہوٹل مون پر ریڈ کیا
پولیس کے مطابق ایک عینی شاہد نے انہیں اطلاع دی تھی کہ اس نے دو مشکوک افراد کو رکشے سے اتر
ہوٹل مون کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس اطلاع پر پولیس نے فوری ایکشن لیا اور مون ہوٹل پر
ریڈ کر دیا۔

عام حالات میں شاید بھائی جی کی طرف سے اس کی اجازت نہ دی جاتی اور سخت مزاحمت کا مظاہرہ
کیا جاتا لیکن اس وقت خود کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے پولیس کو تلاشی کی اجازت دے دی گئی۔

اس وقت اسکرین پر جو مناظر دکھائے جا رہے تھے، وہ ہوٹل مون کی تلاشی کے بعد پولیس والوں کی
ناکامی اور مایوس شکلوں کے تھے اور پیش منظر میں مون ہوٹل کا منیجر اپنے مخصوص انداز میں میڈیا کو بیان دے رہا
تھا کہ اگرچہ پولیس کی طرف سے ان پر بہت گھناؤنا الزام عائد کیا گیا تھا اور اس طرح پولیس کو تلاشی کی
اجازت دینا نہ صرف بھائی جی بلکہ ان معززین کی شان کے خلاف تھا جو مون ہوٹل میں قیام پذیر تھے اور
جنہیں اس بے وقت کے ریڈ کے نتیجے میں بے آرام ہونا پڑا تھا۔ پھر بھی ان کی طرف سے کوئی مزاحمت
نہیں اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھائی جی کی طرف سے پولیس کے ساتھ
بھرپور تعاون کی ہدایت کی گئی تھی اور انہوں نے ایک قانون پسند اور محبِ وطن بھارتی ہونے کا ثبوت دے
دیا۔

منیجر نے دھیمے لہجے میں اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے آئندہ چند روز میں بھائی جی کی اجازت
سے ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے پولیس ڈیپارٹمنٹ پر ہتکِ عزت کا کیس دائر کیا جائے کیونکہ جس طرح
انہیں یہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ لوگ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے

بس شک کی بنیاد پر ہوٹل میں گھس آئے تھے اور شرفا کا آرام وسکون برباد کیا تھا۔

اس خبر کو سن کر شہریار نے شکر کیا کہ اس نے اپنی چھٹی جس کی پکار کو نظر انداز نہیں کیا اور ہوٹل میں رات گزارنے کے بجائے وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ورنہ وہ کسی بڑی پریشانی کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔ اس خبر کے بعد دوبارہ پھر وہی پہلے والی خبریں دہرائی جانے لگیں تو اس کی دلچسپی ختم ہو گئی اور اس نے ٹی وی بند کرنے کے خیال سے ریموٹ ہاتھ میں اٹھایا۔ لیکن بٹن دباتا، اس سے قبل ہی کسی بریکنگ نیوز کا اعلان ہونے لگا۔ وہ بریکنگ نیوز سننے کے لیے رک گیا۔ اگلے ہی لمحے نیوز اینکر پنجاب کے ایک سرحدی گاؤں کے واقع آنند فروٹ فارم پر رات گئے سنائی دینے والے زبردست دھماکوں کی خبر دے رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا وہاں موجود ان کے نمائندے کے مطابق دھماکے اتنے شدید تھے کہ محسوس ہو رہا تھا جیسے فروٹ فارم پر بہت بڑا ذخیرہ موجود ہو یا پھر وہاں کئی طاقتور ٹائم بم نصب کر دیئے گئے ہوں۔

اطلاع کے مطابق دھماکوں کے نتیجے میں بھڑکنے والی شدید آگ پر تا حال قابو نہیں پایا جا سکا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سرحدی گاؤں میں فائر بریگیڈ اور ریسکیو کے دوسرے ایسے اداروں کا کوئی باقاعدہ انتظام ہی نہیں تھا۔

ٹی وی چینل کے نمائندے نے ساتھ ہی یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا تھا کہ دھماکوں کے بعد بہت دیر سے سرحد کے دونوں طرف فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا اور دو طرفہ افتاد کی وجہ سے بھارتی فوج کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نیوز اینکر کے سوالوں کے جواب میں چینل کے نمائندے نے اپنا یہ ذاتی خیال پیش کیا کہ شاید سرحد کی دوسری طرف سے کوئی شرارت کی گئی تھی اور آنند فروٹ فارم پر ہونے والے دھماکے اسی شرارت کا نتیجہ تھے۔

چینل کا نمائندہ یہ رائے نہ دیتا تو شہریار کو حیرت ہوتی۔ کیونکہ بھارتیوں کا تو وطیرہ ہی یہ تھا کہ انہیں ہر قسم کے ہر واقعے کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ نظر آتا تھا۔

چینل کے نمائندے سے رابطہ ختم ہوا تو اینکر رات گئے دستیاب اپنے نام نہاد دفاعی تجزیہ کاروں سے ٹیلی فون پر ان کی رائے لینے لگی۔ شہریار ان تجزیہ کاروں کے زرّیں خیالات سے پہلے ہی واقف تھا اس لیے ٹی وی بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

لیٹنے کے بعد اسے یاد آیا کہ خبر میں جس سرحدی گاؤں کا نام لیا گیا تھا، یہ وہی تھا جہاں سے گزر کر اس اور چودھری کے درمیان طے پانے والی اسلحے کی ڈیل پاکستان سپلائی ہونی تھی اور صبح وہ اس بارے میں ایف پی کو مطلع بھی کر چکا تھا۔ تو کیا واقعی یہ اسی کاری ایکشن تھا اور سی ایف پی کے جیالوں نے بھارتی پاکستان پہنچنے سے قبل ہی بھارتی حدود میں ہی تباہ کر دیا تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو یہ بہت بڑی کامیابی تھی بھارتیوں کے لیے ایک سبق تھا کہ پاکستان اتنا بھی تر نوالہ نہیں ہے جتنا وہ سمجھتے ہیں۔

اپنے ذہن میں اُبھرنے والی اس سوچ نے اسے دل ہی دل میں ''وہ مارا'' کا نعرہ لگانے پر مجبور کیا اس نے خوشی اور طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔ آج کی رات اگر بھارتی سورما کے لیے بھاری تھی تو اس نے بھی بڑی جدوجہد کی تھی اور اب اس کا حق بنتا تھا کہ صبح کے قریب ہی سہی، دیر کے لیے پُرسکون نیند لے لے۔ تھکن اور طمانیت نے مل کر اسے کچھ زیادہ ہی گہری نیند سلا دیا۔ لیکن صبح سے آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا اور ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی تھی جسے محسوس کر



پہلے ہی کی طرح مکمل خاموشی اور سکوت کا راج تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کروٹ بدل کر ایک بار پھر نیند کی میں اُتر جائے۔ لیکن کچھ ایسا تھا جس نے اسے اپنے ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا اور وہ تھکن اور نیند احساس کو ذہن سے جھٹکتا ہوا بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

سونے سے قبل اس نے پسٹل اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ ہاتھ ڈال کر پسٹل برآمد کیا اور چیمبر میں گولیوں کی موجودگی کی یقین دہانی کرنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اندر سے اُبھرنے والی تنبیہہ کی بنیاد پر وہ کوئی خطرہ نہ آنے کے باوجود بے حد محتاط تھا۔

سلّو کی خواب گاہ اس کے لیے مخصوص خواب گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ قدرتی طور پر اس نے سب سے پہلے اسے ہی چیک کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ساتھی کی حیثیت سے اسے سب سے زیادہ اسی کی پروا تھی۔ ہینڈل پر دباؤ ڈالنے پر اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک نہیں کیا گیا ہے۔ بہت آہستہ سے دروازہ کھول کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں کوئی سر سے پیر تک چادر تانے بستر پر محوِ خواب نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ سلّو ہی ہونا چاہئے تھا اور اسے اس کی نیند خراب کرنے کے بجائے خاموشی سے پلٹ جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے اس کے برخلاف کیا اور تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اتنے دنوں سے سلّو کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ اس کی عادات واطوار سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ بہت بار انہیں ایک ساتھ ایک کمرے میں سونے کا اتفاق بھی ہوا تھا لیکن ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے سلّو کو یوں سر سے پیر تک چادر لپیٹ کر سوتے ہوئے دیکھا ہو۔ وہ اپنا چہرہ ہمیشہ کھلا رکھ کر سوتا تھا اور بستر پر جو وجود موجود تھا، اس کا کوئی عضو نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور چادر کھینچ کر ہٹا دی۔ فوراً ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہاں سلّو تو کیا کوئی دوسرا ذی نفس بھی موجود نہیں تھا اور تکیوں کو اس انداز میں بستر پر رکھ کر چادر اوڑھا دی گئی تھی کہ کسی سوئے ہوئے آدمی کا گمان ہو۔

اس نے پھرتی سے بستر اور اس کے ساتھ رکھی چھوٹی سی میز کا جائزہ لیا۔ وہاں اسلحے سمیت سلّو کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جوتے بھی غائب تھے۔ اور ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ سلّو کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوئی ہے اور وہ جہاں بھی گیا ہے، اپنی مرضی سے گیا ہے۔ لیکن کیوں اور کہاں؟..... ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب صرف سلّو ہی دے سکتا تھا اور وہ غائب تھا۔

شدید اُلجھن اور پریشانی کے عالم میں وہ سلّو کی خواب گاہ سے نکلا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں بنگلے پر موجود ملازم نے اپنے موجود رہنے کے بارے میں بتایا تھا۔ کچن کے بالکل ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں عام انٹرکام پر ملنے والے احکامات وصول کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ کمرہ یقیناً اس لیے مخصوص کیا گیا تھا کہ وہ یہاں میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی کھانے پینے سے متعلق وقت بے وقت کی فرمائشوں کو پورا کر سکے۔ شہریار کو اس بات کی امید کم تھی کہ ملازم سلّو کے بارے میں کوئی علم رکھتا ہو لیکن پھر بھی اسے کسی طور تو اسے شروع کرنے کا آغاز کرنا تھا۔

وہ آہستہ سے ملازم کے کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا لیکن پھر کچھ غیر معمولی پن محسوس کر کے پلٹ کر پلٹنے کی کوشش کی لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ دروازے کے پیچھے چھپے ایک شخص نے جھٹکے سے

اس کا پسٹل جھپٹ کر اپنے قبضے میں لے لیا اور دوسرے نے اس کی کھوپڑی پر کسی ہتھیار کی نال ٹکا دی۔

''اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' اسے اپنے ہتھیار کی زد میں لیے کھڑے شخص نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ شہریار محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی پشت پر دو افراد موجود ہیں مگر وہ دونوں افراد اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ البتہ وہ سامنے بستر سے نیچے بے سدھ پڑے بنگلے کے ملازم کو دیکھ سکتا تھا جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا جان کی بازی ہار چکا ہے۔ اُس کے اس لمحاتی جائزے کے دوران اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے تھے اور اب پیروں میں کلپ ڈالا جا رہا تھا۔ کھوپڑی سے لگی نال نے اسے کسی مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا اور وہ بے بسی سے خود کو مزید بے بس ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اسے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے آ گیا جبکہ دوسرا بدستور اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنائے پشت پر کھڑا رہا۔ سامنے آنے والا بھی سر تا پا سیاہ لباس میں چھپا ہوا تھا۔ چہرے پر موجود نقاب سے صرف اس کی آنکھیں جھلک رہی تھیں۔

''ملازم کو آف کر دیا ہے اور ایک ٹارگٹ ہمارے قابو میں ہے..... دوسرے کو تلاش کیا جا رہا ہے۔'' سامنے آنے کے بعد بھی وہ شہریار سے مخاطب نہیں ہوا اور آپریٹس پر کسی کو اطلاع دینے لگا۔ دوسری طرف سے جانے اسے کیا جواب دیا گیا کہ اس نے ''یس سر'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور اس کی پشت پر کھڑے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اسے لے چلو۔ سر خود اس سے بات کریں گے۔''

اگلے ہی لمحے شہریار ان کی نگرانی میں ملازم کے کمرے سے نکل کر کوریڈور میں چل رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں میں ڈالے گئے کڑے آپس میں ایک مختصر زنجیر سے منسلک تھے اور اس زنجیر کے اختصار کی وجہ سے وہ بہت چھوٹے سے قدموں سے تقریباً گھسٹتا ہوا ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔ بھاگنے یا باقاعدہ چلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سست رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی نیند بلاوجہ نہیں ٹوٹی تھی۔ ان لوگوں کے بنگلے میں داخل ہونے کے دوران یقیناً کوئی آواز پیدا ہوئی تھی جس نے اس کے شعور تک رسائی حاصل نہیں کی تھی لیکن آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ان لوگوں کے اپنے کمرے تک پہنچنے سے قبل ہی باہر نکل آیا تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اسے چھیڑنے کے بجائے دور سے نظر رکھنے پر اکتفا کیا تھا اور غالباً جس وقت وہ سلّو کے کمرے میں موجود تھا، اسی دوران ملازم سے خاموشی سے نمٹ لیا گیا تھا۔ انہیں اندازہ ہوا ہو گا کہ سلّو کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ اسی طرف کا رخ کرے گا۔ اس لیے اسے وہیں گھیر کر بے بس کرنے کا انتظام کر لیا گیا۔ سلّو کی غیر موجودگی شاید پہلے ہی ان کے علم میں آ چکی تھی اس لیے انہوں نے اس کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔

اپنی حرکات و سکنات سے ہی وہ کمانڈوز محسوس ہونے والے سیاہ پوش اسے اپنی نگرانی میں لیے بنگلے کے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئے تو اسے وہاں ایک آشنا صورت کو دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے مون ہوٹل کی لابی میں دیکھا تھا اور سلّو نے اسے بھٹناگر قرار دیا تھا۔ یعنی سلّو کا اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا اور اس کی تمام تر ہوشیاری کے باوجود بھٹناگر نے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

''سلّو کہاں ہے؟'' اسے بھٹناگر کے روبرو پیش کیا گیا تو اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔



''کون سلّو؟..... میں کسی سلّو کو نہیں جانتا۔'' شہریار نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مے بی تم اس شخص کو کسی اور نام سے جانتے ہو لیکن میں تم سے اس لڑکے کے بارے میں جانکاری چاہوں جو ہوٹل مون سے مہتا صاحب کی گاڑی میں سوار ہو کر تمہارے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے۔'' بھٹناگر اندر تک پیوست ہو جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ جواب میں شہریار یوں خاموش رہا جیسے اس کی بات سمجھنے سے قاصر ہو۔

''تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ میں نے خود اسے تمہارے ساتھ دیکھا تھا اور میرے علم پر راستے میں تم دونوں کو چھیڑنے کے بجائے صرف تمہاری گاڑی سے ایک ٹریننگ ڈیوائس اٹیچ کر کے اسے اس ٹھکانے کا پتہ چلایا گیا تھا۔ اس بنگلے میں تمہارے پہنچنے کے صرف بیس منٹ بعد میرے آدمیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس وقت سے اب تک بنگلہ مسلسل ہماری نگرانی میں ہے۔ ہم چاہتے تو فوری طور پر بھی اندر داخل ہو سکتے تھے لیکن تمہارے کمرے کی کھڑکی سے ٹیلی ویژن آن ہونے کا اشارہ ملتا رہا اور اسے مناسب سمجھا کہ سب کے سو جانے کا انتظار کر لیں۔ لیکن یہاں ہمیں وہ نہیں مل سکا جس کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں۔ ملازم سے ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ یہاں دو افراد ہی آ کر ٹھہرے تھے اور دوسرے کمرے میں موجود سیٹ اپ سے بھی یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ سلیم عرف سلّو سب کو دھوکا دے کر نکل گیا۔ اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے اور ہم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

بھٹناگر کی باتوں نے کئی پوائنٹس پر اس کا ذہن کلیئر کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بظاہر ان کا تعاقب نہ کیے جانے کے باوجود ان لوگوں نے یہاں تک رسائی کیسے حاصل کی؟ پولیس والوں کا راستے میں انہیں روکنا اور بغیر کسی مزاحمت کے آگے جانے کی اجازت دے دینا صرف اس لیے تھا کہ انہیں صرف ڈیوائس گاڑی سے چلنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ شاید راستے میں کھلی جگہ پر سلّو کو پکڑنے کی کوشش اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ کھلے جنگل میں شیر کا شکار کرنے کے مقابلے میں اسے دھوکے سے کسی جگہ گھیر کر شکار کرنا زیادہ آسان ہو۔ وہ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ یہاں آئیں گے اور سوتے میں آسانی سے اس پر قابو پا لیں گے۔ لیکن جب ان کے پہنچنے سے پہلے ہی پنجرے سے اُڑ چکا تھا۔ کہاں؟ یہ تو شہریار بھی نہیں جانتا تھا لیکن یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ سلّو نے اس موقع پر اسے اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟

⊛----✪----⊛

ماہ بانو، ایڈی کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر خود اسلم کے پیچھے گئی تھی۔ لیکن ایڈی کو لگا کہ وہاں رکنے کے بجائے دونوں کے پیچھے جانا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس طرح ایک تو وہ حالات سے باخبر رہتا، دوسرے ضرورت پڑنے پر ان کے کام بھی آ سکتا تھا۔

اسے وہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے تھے۔ خصوصاً اسلم جس بے غرضی سے اسے اپنے شانے پر لاد کر لے جا رہا تھا، اس چیز نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اٹھا کر چلنے کی وجہ سے ان کے سفر کی رفتار کم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے اسے وہاں بے یار و مددگار چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

اسے یاد تھا کہ وہ ایک رات ماہ بانو کے کمرے میں بُرے ارادے سے گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن بہرحال اس کی نیت تو واضح تھی۔ اس کے باوجود ماہ بانو نے بھی اپنے سے اسے وہاں چھوڑ جانے کو نہیں کہا تھا۔ ان لوگوں کی اس اعلیٰ ظرفی نے اس کے دل کو اسیر کر لیا تھا اور وہ ایک معصوم بچے کی ہی طرح ان سے اُنسیت و محبت کر رہا تھا۔

اس کے سات سالہ وجود میں تخلیق کیا گیا جوان آدمی کا دماغ بھی اسے یہ راہ دکھا رہا تھا کہ اسے اب لوگوں کا ہی وفادار رہنا ہے جو بُرے وقت میں اس کا سہارا بنے ہیں۔

اپنی اس سوچ کی وجہ سے اس نے ہمت کی اور زخمی ہونے کے باوجود سست روی سے آگے بڑھا اس طرح حرکت کرنے سے اس کی زخمی ٹانگ میں بہت تکلیف ہو رہی تھی، اس کے باوجود وہ ہونٹ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ماہ بانو کی طرح اس نے بھی اسلم کی جانب سے فائر کی آواز سنی تو تشویش میں گیا۔ وہ اسی سمت میں سفر کر رہا تھا جہاں اسلم اور ماہ بانو گئے تھے لیکن اس کے سفر کی رفتار بہت سست اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا صورتِ حال ہے۔

کچھ اور وقت گزرا تو اس نے ماہ بانو کی بلند چیخ سنی اور مزید مضطرب ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس رفتار میں اضافہ ہو جائے۔ اس کوشش میں اس کی ٹانگ کے زخم سے خون رِسنے لگا اور تکلیف میں بھی اضا ہو گیا۔ لیکن اس نے آگے بڑھنا بند نہیں کیا۔

آخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے صورتِ حال کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے سامنے جو منظر تھا میں صرف ماہ بانو اور ڈاکٹر طارق نظر آ رہے تھے۔ ہنری یا اسلم کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا ماہ بانو بے ہوش ہے اور طارق اس کے بے ہوش وجود کو اٹھا کر اپنی بائیک پر لادنے کی کوشش کر رہا ہے۔

یہ منظر ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ بازی ماہ بانو اور اسلم کے بجائے ان کے مخالفین کے ہاتھ میں تھی۔ البتہ ہنری کا غیاب اُس کے لیے اُلجھن کا باعث تھا۔ اگر وہ لوگ حاوی رہے تھے تو اس وقت بھی طارق کے ساتھ ہی نظر آنا چاہئے تھا لیکن وہاں اُس کی پنکچر ہو کر گری ہوئی بائیک کے سوا کچھ نظر رہا تھا۔

اپنی اس اُلجھن کو فی الحال اُس نے پسِ پشت ڈالا اور ماہ بانو کو بچانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ اس کے نام پر اس کے پاس صرف ایک پھل کاٹنے والی چھری تھی جس سے وہ اتنی دُور سے طارق کا بگاڑ سکتا تھا۔

بے شک وہ ذہین اور پھرتیلا تھا لیکن اپنے مختصر اور زخمی وجود کی وجہ سے وہ طارق جیسے بھرپور جوان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس خبیث کو ماہ بانو کو لے جاتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یہی سب سوچتے ہوئے اس کی نظر چند فٹ کے فاصلے پر پڑے ماہ بانو کے پسٹل پر پڑی۔ یہ پسٹل کے ہاتھ سے چھوٹ کے گرا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے ایڈی اس تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

اس نے ایک نظر طارق پر ڈالی۔ وہ اپنے اطراف سے مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کی حرکات وسکنات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے کسی طرف سے خود پر حملے کا خدشہ یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا اور اس کی ساری توجہ صرف اس بات کی طرف تھی کہ کسی طرح بے ہوش ماہ بانو کو اپنے ساتھ بائیک پر بٹھا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ رسّی کا استعمال کر تھا۔ رسّی سے باندھنے کی صورت میں ماہ بانو کے چلتی بائیک سے گرنے کا اندیشہ کم ہو جاتا۔

ایڈی نے اُس کی مصروفیت کو دیکھا اور احتیاط سے پسٹل کی طرف بڑھا۔ اُس کے حرکت کرنے کی سے زمین پر پڑے سوکھے پتے ذرا سے چرمرائے لیکن خوش قسمتی سے ایک ہرن عین اسی وقت دوڑتا ہوا سا سے گزرا اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ چرمراہٹ کی آواز پر ذرا سا چونکنے والا طارق مطمئن کہ اس کی وجہ ہرن تھا۔ یوں ایڈی نے نہایت آسانی سے پسٹل تک رسائی حاصل کر لی اور بہت خاموشی



طارق کی طرف بڑھا۔

اس جگہ چونکہ زمین صاف تھی اس لیے آوازیں پیدا نہیں ہو رہی تھیں۔ طارق اس زاویے سے کھڑا تھا کہ اس کی ایڈی کی طرف پشت تھی۔ ایڈی اس کی پشت پر پہنچا تو عین اسی وقت وہ بائیک پر سوار ہو کر اسے کک لگانے لگا۔ ایڈی بھی اچک کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ طارق نے اس کا بیٹھنا محسوس کر لیا اور بری طرح بدک کر پیچھے دیکھا۔ ایڈی کو پسٹل اٹھائے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لیکن پھر اس نے تیزی سے خود پر قابو پا لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''ہیلو ایڈی! مجھے اُمید تھی کہ یہاں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

''پروفیسر اور اس لڑکی کا شوہر کہاں ہیں؟'' طارق کی خوش اخلاقی کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے سرد میں پوچھا۔

''وہ دونوں لڑتے لڑتے اس دلدل میں جا گرے ہیں۔'' طارق نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایڈی توجہ ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی توقع کے برعکس ایڈی نے نہ تو اس پر سے نظریں ہٹائیں اور نہ ہی اس کی پسٹل پر گرفت کمزور ہوئی۔

طارق مایوس سا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر کمزور نظر آنے والا ایڈی ذہانت کے اعتبار سے بہت آگے اور اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جس وقت گولی چلی تھی، میں اپنی بائیک سمیت ان درختوں میں گھس گیا تھا۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے درختوں کے بارے میں بتایا۔

ایڈی نے اس بار بھی اس کے اشارے پر نگاہِ غلط نہ ڈالی۔

''مجھے شک تھا کہ فائر کرنے والے کا کوئی ساتھی بھی ضرور آس پاس موجود ہو گا، اس لیے خاموشی سے انتظار کرتا رہا اور ان دونوں کے جھگڑے میں ٹانگ نہیں اڑائی۔ جب وہ دونوں لڑتے ہوئے دلدل میں گرے تو بھاگتی ہوئی چیخ کر باہر نکلی اور میں نے اسے بے ہوش کر دیا۔ اسے میں اپنے ساتھ لے کر شہر جانا چاہتا تھا لیکن تم درمیان میں آ گئے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟ اصولاً تو تم ہمارے کیمپ کا حصہ ہو اس لیے تمہیں میرا ساتھ دینا چاہئے۔'' اپنی بات ختم کر کے طارق نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، شہر چلو۔'' ایڈی نے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جس سے دشمنی اور دوستی سے کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا تاہم مسلسل خود پر تنے ہوئے پسٹل نے طارق کو اس بات کا ضرور دلا دیا تھا کہ فی الحال اسے اس کے حکم کی تعمیل کرنی ہو گی۔ یوں بھی جنگل میں جس تیزی سے پھیل رہی تھی، وہ مزید وہاں نہیں رُک سکتے تھے۔

آگ پر تو شاید محکمۂ جنگلات کسی طرح قابو پا لیتا لیکن وہ کسی کا سامنا کر کے اس کے سوالات کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے کوشش کرنی تھی کہ شہر پہنچ کر کسی ایسے فرد سے رابطہ کر سکے جو اس معاملے کو ہینڈل کر لے۔ اپنے چہرے کا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے اس نے بائیک اسٹارٹ کر دی اور شہر کی طرف سفر شروع ہو گیا۔

وہ تینوں بائیک پر اس ترتیب میں تھے کہ سب سے آگے طارق خود تھا۔ اس کے پیچھے رسّی سے بندھی ماہ بانو کا وجود بائیک کے دونوں طرف جھول رہا تھا اور سب سے پیچھے ایڈی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مختصر الوجود تھا اس لیے پیچھے بچنے والی تنگ جگہ میں بھی سما گیا۔ طارق کی پشت سے لگی اس کی پسٹل کی نال مسلسل اس بات کا

اعلان کر رہی تھی کہ وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ طارق نے بھی دل میں سوچا کہ پہلے یہاں سے نکل جائے، اس کے بعد اس چھوٹی سی بلا سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

وہ تیزی سے جنگل سے باہر جانے والے راستے پر سفر کرتا رہا۔ آخر کار جنگل کے نیم تاریک ماحول سے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں درخت اور جھاڑیاں بہت محدود تعداد میں رہ گئے تھے اور اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ جنگل کی حدود ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔

''ہم شہر پہنچنے والے ہیں۔'' طارق کے اعلان نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ درحقیقت اس وقت اس کی توجہ طارق سے زیادہ ماہ بانو کی طرف تھی جو ہولے ہولے کراہ رہی تھی اور اس کا کراہنا اس بات کی نشاندہی تھی کہ وہ ہوش میں آ رہی ہے۔

''بائیک روک دو۔'' آخر کار اس نے طارق کو حکم دیا اور اس کے عمل کرنے کے بعد خود بائیک سے اتر کر اتنے فاصلے پر جا کھڑا ہوا کہ طارق اس کے نشانے کی زد پر تو رہے لیکن پلٹ کر اس پر حملہ نہ کر سکے۔

''اسے نیچے اُتارو اور اس کی رسیاں کھول دو۔'' دوسرا حکم صادر کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ طارق کیا کر سکتا ہے۔ اس نے ماہ بانو کو بانہوں میں تھام کر بائیک سے اُتارا اور یکدم ہی اس کے وجود کو ایک ڈھال بناتا ہوا بولا۔

''پسٹل پھینک دو۔ ورنہ میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔''

اس صورتِ حال پر ایڈی لمحہ بھر کے لیے گھبرایا لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر منہ بناتا ہوا بولا۔

''بے شک توڑ دو۔ یہ میری محبوبہ نہیں ہے جو میں اس کی جان کی فکر میں ہلکان ہوں۔''

اُس کے اس جواب نے طارق کو مایوس کر دیا۔ اس کا ریوالور بغلی ہولسٹر میں تھا جس پر ایڈی نے ہاتھ چلتے ہی قبضہ کر لیا تھا اور اس لیے فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ننھی سی مخلوق کے ہاتھوں اپنے اس طرح بے بس ہو جانے پر اس نے دانت کچکچائے اور اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

رسّی کی بندشیں کھلیں تو ماہ بانو کے وجود میں کچھ جان آئی۔ ہوش اسے پہلے ہی آ گیا تھا لیکن جس حالت میں وہ سفر کر رہی تھی، سوائے کراہنے کے کوئی آواز نہیں نکال پا رہی تھی۔

''ہم تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کر کے یہاں سے آگے بڑھو گی تو سڑک پر کسی نہ کسی سے لفٹ مل جائے گی۔'' ایڈی نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا تو وہ سسک پڑی۔

''اسلم..... اسلم کہاں ہے؟''

''بہتر ہے کہ فی الحال تم صرف اپنی فکر کرو۔'' ایڈی نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا اور طارق کو ایک بار پھر بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے طارق نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ماہ بانو کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ دونوں شہر جانے والے ہیں۔

''یہ پانی کی بوتل رکھ لو۔'' ایڈی خود بھی اچک کر طارق کے پیچھے بیٹھ گیا اور بائیک سے لٹکتی پانی کی بوتل نکال کر ماہ بانو کی طرف اُچھالی۔ چھوٹے سے وجود میں بڑا دماغ رکھنے والا وہ لڑکا اپنے دماغ کی وجہ سے بھرپور قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ اس کی جسمانی حالت جتنی دگرگوں تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ زخم سے مسلسل رِسنے والے خون نے اسے بے حد کمزوری میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے بار بار اپنی بصارت کے دُھندلا جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس سے وہ بار بار سر جھٹک کر نجات حاصل کر رہا تھا کیونکہ اپنے کام کی تکمیل سے پہلے اپنے حواس کا ساتھ چھوڑ دینا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔



''واپس جنگل کی طرف چلو۔'' طارق نے بائیک اسٹارٹ کی تو اس کے حکم کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا۔

''اگر ایسا نہیں کرو گے تو میں یہیں تمہارا دی اینڈ کر دوں گا۔'' ایڈی نے پسٹل کی نال کو پوری قوت سے اس کی پشت سے چبھوتے ہوئے دھمکی دی تو اسے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

''یہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔'' تعمیلِ حکم کے باوجود طارق نے اسے احساس دلانا ضروری سمجھا۔

''میں کیا کر رہا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' ایڈی نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''اپنے اس عمل پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔'' طارق کی گیدڑ بھبکی کا جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بڑی مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

طارق یہ مسکراہٹ نہ دیکھ سکا بلکہ پھر اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچا کہ ایڈی کے پسٹل کی نال نے بڑی پھرتی سے اس کی پشت سے سر تک کا سفر طے کیا اور انگلی کی جنبش نے طارق کا کاسۂ سر توڑ کر اس کے انسانی دماغ کو ہمیشہ کے لیے تاریکی میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیا۔

گولی چلنے کی آواز سے جنگل میں پرندوں نے کہرام سا مچا دیا۔ بائیک کا کنٹرول سنبھالے طارق کا دماغ سے رشتہ منقطع ہوا تو بائیک بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی اور پیچھے بیٹھا ایڈی بائیک کے ایک درخت سے ٹکرانے سے قبل ہی اُڑتا ہوا دُور جا گرا۔

گرنے کے نتیجے میں کتنی ہڈیاں ٹوٹیں اور کہاں کہاں درد نے اپنے پنجے گاڑے، یہ حساب لگانے کے لیے اسے مہلت نہیں ملی اور طمانیت کے گہرے احساس کے تحت اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس جنگل کی زمین کے نیچے حالتِ قید میں برسوں پرورش پاتا اس کا وجود اگرچہ یہیں اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا لیکن یہ اطمینان تو تھا کہ وہ قیدی کے بجائے آزاد انسان ہے اور بے شک اس کی دنیا میں آمد اس کی مرضی سے نہیں تھی لیکن وہ یہاں سے جا تو اپنی مرضی سے رہا تھا..... اور یہاں سے جانے کا فیصلہ اُس نے اس لیے کیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ عام انسانوں کی دنیا میں اس کا وجود بالکل مس فٹ ہے۔ مس فٹ کی حیثیت سے جیتے رہنے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ خود کو فنا کر لیتا..... سو اُس نے کر لیا تھا۔

⊛----✪----⊛

شاہد کے بازو پر سر رکھ کر سوئی ہوئی چاندنی کی آنکھ بالکل اچانک کھلی لیکن کمرے میں چھائے گھپ اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی۔

یکبارگی اُسے شدید خوف کا احساس ہوا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہو چکے ہیں۔ نیند کے خمار سے نکلتے ہی اسے دو باتوں کا ادراک ہوا۔ اوّل یہ کہ اس کی آنکھ کسی کھٹکے کے سبب کھلی تھی۔ دوم کمرے میں جلتا زیرو کا بلب خود بخود بند نہیں ہوا بلکہ کسی نے بند کیا تھا۔

خوف کے اس عالم میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو برابر میں سوئے ہوئے شاہد کو جگانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل کر پاتی، ایک آہنی ہاتھ نے اس کے منہ کو دبوچ لیا۔ اس نے بدحواسی طور پر خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن پھر فوراً ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ حملہ آور نے بے ہوشی کی کوئی دوا سنگھائی تھی۔ بالکل یہی عمل شاہد کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔

دوبارہ ان دونوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو کاٹھ کباڑ سے بھرے ایک سیلن زدہ کمرے میں کرسی پر بندشوں میں جکڑا ہوا پایا۔

''یہ ہم کہاں ہیں شاہدے؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اپنے بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اب آنکھ کھلی ہے تو یہاں ہوں۔'' شاہد اس سے زیادہ اُلجھا ہوا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں چودھری یا بائی جی کے غنڈوں میں سے کسی نے اغوا کیا ہے۔'' چاندنی نے سہمے ہوئے انداز میں قیاس آرائی کی۔

''تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے گُڑیے!'' اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لحیم شحیم آدمی بولتا ہوا داخل ہوا۔

اس آدمی کی شکل ان کے لیے اجنبی تھی لیکن تیور دیکھ کر وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ کوٹھے پر گزرے ماہ و سال نے اُنہیں اتنا تجربہ تو ضرور عطا کیا تھا کہ وہ جان سکیں کہ اس قسم کے غنڈے کسی پیسے والے کے پالتو ہوتے ہیں اور اپنے مالک کے حکم پر دوسرے لوگوں کی ہڈی پسلی توڑنے سے لے کر جان لینے تک ہر کام کر گزرتے ہیں۔

''تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' آخر کار چاندنی نے ہی ہمت کر کے اس سے دریافت کیا۔

''میں نہیں، میرے آقا چاہتے ہیں کہ تم ان کی راہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم سیدھی طرح سے اس کے لیے راضی نہیں ہوتے تو میں دو منٹ میں تمہیں ان کی راہ سے ہٹا سکتا ہوں۔''

بولتے بولتے اس کے تیور جارحانہ ہو گئے۔ چاندنی اور شاہد میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہہ سکتے۔

''پچھلی واری تو ہمارے سنگی انجانے میں چوٹ کھا گئے تھے لیکن تم نے دیکھ لیا نا کہ ہم کتنے آرام سے تمہیں تمہارے ٹھکانے سے اُٹھا لائے ہیں۔ تمہارا وہ مچھر پہرے دار اُدھر ہی پڑا سردی کھا رہا ہوگا۔ وہ ہوش آ گیا تو دیکھ لے گا کہ ہم کیسے اس دی ناک دے تھلّے (نیچے) سے تم دونوں کو اُٹھا لائے ہیں۔''

اس نے اپنی بات سے واضح کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ ان کی نگرانی کی جا رہی ہے بلکہ نگرانی کرنے والے کو ناک آؤٹ کر کے انہوں نے اپنی برتری بھی ثابت کر دی تھی۔

''اب تسی دسّو کہ اگر میں تم دونوں کو مار کر تمہاری لاشیں ادھر ہی گاڑ دوں تو کون تمہاری مدد واسطے آئے گا۔ تمہارے پچھلوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ راتوں رات تسی کتھے غائب ہو گئے ہو۔'' وہ اچھی طرح انہیں خوف زدہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

''آخر تم ہم سے چاہتے کیا ہو؟ اگر مارنا ہے تو مار ڈالو۔ اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس کار شاہد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن الفاظ کے برعکس اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ موت کے خیال سے اس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے ہیں اور وہ زیادہ دباؤ برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتا۔

''نہ سوہنیو نہ۔ اتنی سوہنی جوڑی ہے تہاڈی۔ میرا جی نہیں مانتا کہ بھری جوانی میں تمہیں موت دے دوں۔ تمہیں تو ابھی بہت لمبی حیاتی جینا چاہیے۔''

ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا کیونکہ اس کے سخت تاثرات اور



یہ نرم باتیں کسی طور لگا نہیں کھا رہی تھیں۔

''اگر ہمارے بچنے کی کوئی راہ ہے تو بتاؤ۔'' ذہین چاندنی نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں اس طرح اغوا کر کے یہاں لانے اور پھر مذاکرات کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ انہیں قتل کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کا اصل مدعا جاننے کی کوشش کی۔

''یہ کی ہے نا تُو نے عقل مندوں والی گل..... تو سن، زندہ رہنے کے لیے تجھے بس اتنا کرنا ہوگا کہ چودھری صاحب اور بائی جی کے خلاف جو پرچہ کٹوایا ہے اسے واپس لے لو اور عدالت سے معافی مانگ لو کہ تم کی چڑھائی میں آ کر تم نے بیکار میں قنون (قانون) کا وقت برباد کیا۔'' وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا اور سن کر شاہد کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں اپنی معصوم بہن کی اذیت ناک موت کا شکار بنانے والوں کو معاف کر دوں؟''

''تو اس کے سوا تیرے پاس چارہ کیا ہے؟ نہیں مانتا میری گل تو نہ مان۔ میں ابھی تم دونوں کا کام تمام کر دیتا ہوں۔ آگے سارا قصہ آپوں آپ ہی ختم ہو جائے گا۔'' وہ فوراً تیور بدل کر درشتگی سے بولا تو چاندنی نے شاہد سے درمیان میں مداخلت کی۔

''تم ہمیں تھوڑی دیر کی مہلت دے دو بھائی! میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آدھا گھنٹہ دے رہا ہوں، دونوں چھیتی کوئی فیصلہ کر لو۔'' وہ شاہد کو قہر بار نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کیا تم اپنی جان بچانے کے لیے میری بہن کا خون معاف کر دینا چاہتی ہو چاندنی؟'' شاہد نے درد ناک لہجے میں اپنی جیون ساتھی سے دریافت کیا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے شاہد! اگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی تو اپنی جان دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تمہاری بہن کے قاتل پھر بھی آزاد گھومتے رہیں گے۔''

''لیکن اس صورت میں میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی بہن کے خون کا سودا نہیں کیا۔'' اس کی دلیل کے جواب میں وہ جذباتیت سے بولا۔

''جذباتی مت بنو شاہد! ایسے ڈائیلاگ فلموں اور ڈراموں میں تو اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں بیکار ہوتے ہیں۔ اتنے سال کوٹھے پر گزارنے کے بعد بھی اگر تم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہ سمجھ سکے تو اور کب سمجھو گے؟'' چاندنی کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

''آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟'' اس نے بے بسی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ بہت لمبی زندگی جینا چاہتی ہوں۔'' اس نے فوراً لہجے میں نرمی سمو لی اور شاہد کا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھ میں لے لیا۔ بندھے ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہی موجود تھے اس لیے اس عمل میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن اپنی بہن کی دردناک موت کا خیال میرے دل سے نہیں نکل سکتا۔'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم اس بات کو اپنے دل سے نکال دو۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی زندگیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔ چند سال بعد جب یہ قصہ پرانا ہو جائے گا اور سب لوگوں سے شاہد اور چاندنی کا خیال نکل جائے گا، تب تم کسی تدبیر سے اپنی بہن کے قاتلوں سے بدلہ لے

لینا۔'' وہ بہت لگاوٹ سے اسے جو سمجھا رہی تھی، موجودہ صورتِ حال میں سمجھانا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔

''دیکھو شاہد! کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ ہم یہاں سے کہیں دُور ایک دوسرے کے سنگ اچھی پُرسکون زندگی گزاریں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو جس کے آنگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کھیلیں ہم انہیں زندگی کی وہ ساری خوشیاں دیں جن سے ہم اپنے بچپن میں محروم رہے۔'' مصلحتوں کے بعد خوابوں کے سلسلے نے زبردست کام کیا اور نیم دلی سے دشمن کی بات مان لینے پر غور کرنے والا شاہد کھلی آنکھوں دیکھے جانے والے خوابوں کے سنگ چلنے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

دل میں بہن کے لیے جو ایک کسک تھی، اسے بھی یہ سوچ کر دبا دیا کہ وقت آنے پر میں اس کا بدلہ لوں گا۔ ادھر اس کے فیصلے پر شاداں و فرحاں چاندنی کو یقین تھا کہ ایسا کوئی وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب اپنے خوابوں کی دنیا بسا چکے ہوں گے تو شاہد کبھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پائے گا کہ صرف ایک انتقام کی خاطر ان نعمتوں کو ٹھوکر مار کر جا سکے۔ یوں اس رات عدل و انصاف کے لیے کی جانے والی ہر کوشش اس سیلن زدہ کمرے میں فقط اس لیے دم توڑ گئی کہ غریب کی بزدلی اور خودغرضی میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ اپنے حق کے لیے ڈٹ سکے۔ اور جہاں حوصلہ نہ ہو، وہاں نظامِ انصاف قائم ہونا بھی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے۔

⊛----✪----⊛

شہریار اس حالت میں چھت سے اُلٹا لٹکا ہوا تھا کہ ایک انڈرویئر کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا اور اس کی نظروں کے عین سامنے بھٹناگر ایک کرسی پر پاؤں پر پاؤں رکھے بظاہر بہت پُرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ سلّو کے بارے میں بتا دو تو تمہاری مشکل خاصی آسان ہو سکتی ہے۔'' اس نے بہت دھیمے لہجے میں اپنا مطالبہ دہرایا جو اس سے قبل بھی کئی بار کر چکا تھا۔

بھائی جی والے بنگلے سے اسے گرفتار کرنے سے لے کر اپنے اس ٹھکانے پر لانے تک وہ اسی طرح دھیمے لہجے میں یہ مطالبہ کرتا رہا تھا لیکن اب جو صورتِ حال تھی، اس سے شہریار کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی طرف سے مطلوبہ جواب نہ پا کر وہ اور اس کے ساتھی اسے تختۂ مشق بنا کر خوب ستم ڈھائیں گے۔ وہ اسی طور پر خود کو اس کے لیے اچھی طرح تیار کر چکا تھا چنانچہ بھٹناگر ہی کی طرح پُرسکون لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس لیے اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی میرے ساتھی کی بات تو اس کے بارے میں، میں خود کچھ نہیں جانتا تو تمہیں کیسے کچھ بتاؤں؟''

''ٹھیک ہے۔ تم اگر خود اپنے آپ سے ہمدردی نہیں رکھتے ہو تو پھر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' بھٹناگر نے شانے اچکا کر یوں کہا جیسے اسے اس کی بے وقوفی پر افسوس ہو۔ ''او کے، تو پھر میں چلتا ہوں کیا میرا یہاں رُکنا بیکار ہی ہے۔'' وہ کرسی سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہریار انتظار کرنے لگا کہ دیکھو اب کیا ظہور میں آتا ہے۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ بھٹناگر اپنے روّیے سے اس کے اعصاب کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو گرفتار کرنے سے لے کر اب تک کسی نے اس کے ساتھ روایتی مار پیٹ نہیں کی تھی لیکن اس طرح چھت سے اُلٹا لٹکا کر واضح کر دیا تھا کہ شرافت اور تعاون نہ کرنے کے نتیجے میں اس کا کیا حشر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اس حشر کے لیے تیار تھا لیکن ان کا مطالبہ نہ مان سکتا تھا۔

بھٹناگر کے باہر جانے کے تقریباً دو منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا پہلوان نما آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کا



بدن ایک انڈرویئر کے علاوہ کوئی لباس نہیں پہن رکھا تھا اس لیے اس کے مضبوط مسلز کی خوب نمائش ہو رہی تھی۔ ریلسرز کی طرح اس نے اپنے پورے جسم پر تیل نما کوئی شے لگا رکھی تھی کہ روشنی میں اس کا جسم خوب چمک رہا تھا۔ اس کا سر بھی بالوں سے محروم تھا اور جسم کی طرح ہی چمک رہا تھا۔ چہرے پر داڑھی مونچھ نام کی کوئی شے نہیں تھی، البتہ بھنویں خوب گھنی اور چوڑی چوڑی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ ہر آدمی اسے دیکھ کر خوامخواہ ہی رعب میں آ جائے اور اپنے دل میں فیصلہ کر لے کہ اس پہلوان سے کسی طور پنگا نہ لینا ہے۔ لیکن شہریار اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ میں موجود خاردار کوڑے کو دیکھ کر بھی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور یونہی آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔

پہلوان نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا اور اسے ایسی تولنے والی نگاہوں سے دیکھتا رہا جیسے قصائی ذبح کے لیے پیش کیے جانے والے جانور کو دیکھتا ہے۔

چند سیکنڈ تک اچھی طرح شہریار کا جائزہ لینے کے بعد اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ ابھری اور وہ دھیرے سے بولا۔

''مزغا جان دار ہے۔ مزہ آئے گا۔'' بولنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے کوڑے والے ہاتھ کو تیزی سے جنبش دی اور خاردار کوڑا بجلی کی تیزی سے لپکتا ہوا شہریار کے جسم پر آ کر لگا۔ کوڑے کی ایک ضرب ہی ایسی تھی کہ شہریار کے جسم میں مرچیں سی بھر گئیں اور وہ جان گیا کہ خاردار دھاتی کوڑے نے اس کے پہلو کی کھال اُدھیڑ ڈالی ہے۔ اپنی چیخ پر قابو پانے کے لیے اسے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچنا پڑا۔

اس کے بعد تو گویا اس پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ تابڑ توڑ جسم پر پڑنے والے کوڑوں نے بازو، پیر، پیٹھ، پیٹ، سینہ..... جسم کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا اور لمحوں میں اس کا پورا جسم دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گیا۔ شدید تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے اسے خود پر خاصا جبر کرنا پڑا تھا۔ چیخوں پر قابو رکھنے کے لیے اس نے ہونٹوں کو اتنی بری طرح بھینچا تھا کہ نچلا ہونٹ اپنے ہی دانتوں کی زد میں آ کر زخمی ہو گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔ خون تو جسم کے باقی حصوں سے بھی رِس رہا تھا کہ خاردار کوڑے نے اس کے پورے جسم کو بری طرح اُدھیڑ ڈالا تھا۔

''بہت جان ہے تجھ میں۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ کتنے پانی میں ہے۔'' پہلوان نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر زور سے جھٹکا دیا اور نفرت بھرے لہجے میں بولتا ہوا ایک شیلف پر پڑا ڈبہ اُٹھانے لگا۔ شہریار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے جہاں تک کام کیا، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کمرہ بطورِ خاص عقوبت گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہو گا۔ وہاں دیواروں پر ایسے کئی خوفناک ہتھیار لٹکے ہوئے تھے جو موجودہ زمانے میں تو متروک ہو چکے ہیں، البتہ ماضی میں کئی ظالم و جابر بادشاہوں اور راجاؤں کے ہاں ان کے استعمال کی مثالیں ملتی تھیں۔

وہاں دیوار گیر الماریاں بھی تھیں اور جانے کون کون سے آلاتِ ستم بھرے ہوئے تھے۔ فی الحال تو وہ پہلوان کو درمیانے سائز کا وہ ڈبہ کھولتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ڈبے کا ڈھکن ہٹا کر وہ اس کے قریب آیا اور ہاتھ اندر ڈال کر ڈبے میں موجود شے باہر نکالی۔ اگلے ہی لمحے شہریار کے زخموں میں آگ سی لگ چکی تھی۔ پہلوان نے ڈبے میں سے سرخ پسی ہوئی مرچوں اور نمک کا سفوف نکال کر اس کے زخموں پر ملنا شروع کر دیا تھا۔ ضبط کے باوجود شہریار کے لبوں سے ایک سسکاری نکل گئی جس پر پہلوان قہقہہ لگا کر ہنسا اور مٹھیاں بھر بھر کر سفوف اس کے جسم پر ملنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''صاحب کو روسٹ کیا ہوا بکرا بہت پسند ہے۔ پہلے تجھے اچھی طرح مرچ مسالا لگا دوں پھر روسٹ کر دوں گا۔'' اپنی اس بات پر اُس نے اس طرح عمل کیا کہ نمک مرچ کا مکسچر اچھی طرح اس کے جسم پر کے بعد ایک الماری کھول کر اس میں سے انگیٹھی نکالی۔ انگیٹھی ربڑ کے پائپ کے ساتھ ایک گیس سلنڈر منسلک تھی۔ بے حد برداشت رکھنے کے باوجود شہریار ایک لمحے کو تھرّا سا گیا۔ پہلوان سچ مچ اسے روسٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کمال یہ تھا کہ تشدد کے اس عمل کے دوران اس نے ایک بار بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ جاننے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہے کہ ہاتھ آئے شکار کو کس طرح زیادہ سے زیادہ اذیت دے سکتا ہے۔

شہریار جس تکلیف سے گزر رہا تھا، اس کی شدت کو خود ہی جانتا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک مسام اذیت دے رہا تھا اور وہ کسی کے سامنے فریاد نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ فریاد کرنے کا مطلب تھا، اپنی ہار تسلیم کر لینا اور سب بتانے پر رضامندی ظاہر کرنا جو بہرحال وہ اپنی جان کی قیمت پر بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

زندگی کے اس پہلے بدترین تشدد سے گزرتے ہوئے اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ پسینے کی رفتار میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب پہلوان نے انگیٹھی جلا کر عین اس کے سر کے نیچے رکھ دی۔ انگیٹھی اور اس کے سر کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اگر آنچ تیز ہوتی تو اس کے بالوں کو آگ گرفت میں لے سکتی تھی لیکن فی الحال پہلوان نے آنچ دھیمی رکھی تھی اور وہ اپنے سر پر اس کی حدت محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا چہرہ اور سر کے بال حدت کی وجہ سے پسینے سے تر ہو گئے اور پسینے کے قطرے چھن چھن کرتے آگ پر جا کر گرنے لگے۔

''صاحب کو دھیمی آنچ پر تیار کیا روسٹ بہت پسند ہے۔'' پہلوان نے ایک اور بھیانک قہقہہ لگا کر اسے یوں اطلاع دی جیسے واقعی وہ اس کے صاحب کی پسند و ناپسند جاننے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ حالانکہ وہ تو اس اذیت کو برداشت کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا جو اس کی بصارت کو بار بار دُھندلائے جا رہی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اذیت ایسی ہے جو اسے بے ہوش بھی نہیں ہونے دے گی اور اسے شاید اپنی آخری سانس تک رگ رگ میں اُتر جانے والی اس تکلیف کو سہنا ہوگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو یار؟'' اُس کی کھوپڑی کے اندر دماغ گویا اُبلنے لگا تھا جب اس نے کسی کی حیرت زدہ آواز سنی اور آواز کی سمت میں دیکھنا چاہا لیکن بے تحاشا تکلیف اور مسلسل آنکھوں پر بہہ کر آتے پسینے کی وجہ سے دُھندلا جانے والی بصارت کے باعث ایک ہیولے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ یہ شخص کب اندر آیا ہے۔

''صاحب کے لیے روسٹ تیار کر رہا ہوں۔'' پہلوان نے نہایت سنجیدگی سے نووارد کو جواب دیا۔

''تُو بھی نا موٹی بُدھی کا ہے پہلوان! لنچ ٹائم ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ ابھی سے روسٹ بنا کر رکھ دے گا تو ٹھنڈا ہو جائے گا نا۔''

''اچھا تو پھر تھوڑے سمے کے لیے رُک جاتا ہوں۔'' پہلوان گویا اپنے ساتھی کی دلیل سے قائل ہوا اور انگیٹھی شہریار کے سر کے نیچے سے ہٹا کر بجھا دی۔

''چل بھئی، تُو تھوڑی دیر اور جی لے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آ کر پھر اپنا کام کرتا ہوں۔ صاحب کو پرگرما گرم تازہ روسٹ ملے، یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ میرا ہی روسٹ بنا کر رکھ دیں گے۔'' انگیٹھی کو سلنڈر ایک طرف ہٹا کر رکھتے ہوئے پہلوان نے اس سے کہا اور پھر اپنے ساتھی سمیت باہر نکل گیا۔



کیفیت سے اُلٹے لٹکے شہریار نے بے اختیار سکون کی ایک سانس لی۔ تکلیف جسم کے ہر مسام میں سے ہو رہی تھی لیکن عین سر کے نیچے جلتی آگ کے ہٹنے سے اذیت میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ اس آگ نے تو اس کے جسم کا سارا پانی پسینے کی صورت میں بہا ڈالا تھا اور وہ شدید پیاس محسوس کر رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہاں کسی سے ایک گھونٹ پانی کا سوال اس کے مظالم کو اور بڑھا دے گا۔

وہ فی الحال اسے جان سے نہیں مار سکتے تھے کہ اس کی زبان سے بہت کچھ سننے کے خواہش مند تھے لیکن وہ اس سے اس کے اعصاب کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ اعصاب کی اس جنگ میں وہ کب تک ان کے سامنے ٹھہر سکتا تھا، اسے خود بھی نہیں معلوم تھا لیکن پہلے مرحلے سے کامیابی سے گزر جانے پر دل میں اللہ کا شکر ضرور ہوا تھا۔ شکر گزار وہ اس بات پر بھی تھا کہ درپیش مہم کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی اہم چیزیں اپنے پاس نہیں رکھی تھیں اور اشوک کے قتل کے لیے نکلنے سے قبل سب کچھ امانتاً ڈاکٹر فرحان کے پاس رکھا تھا اور ڈاکٹر فرحان فی الحال بھائی جی کی پناہ میں حفاظت سے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جو کچھ اس پر گزر رہا ہے، آگے اس سے بھی کڑے مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ان مراحل کے لیے اللہ سے ہمت اور استقامت مانگتے ہوئے وہ کب مدہوش ہوا، اسے خبر نہیں ہو سکی۔ جتنی تکلیف سے وہ گزرا تھا، اصولاً تو اسے بہت پہلے بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن مضبوط قوتِ ارادی نے یہ عیاشی بھی مشکل سے عطا کی تھی۔ اس ایک صورتِ حال میں بے ہوش ہو جانا بھی عیاشی ہی کے زمرے میں آتا تھا۔

⊛-----✪-----⊛

''تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر پانڈے!'' ڈیوڈ نے بہت تپاک سے اپنے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے سے ہاتھ ملایا۔

''مجھے بھی۔'' پانڈے نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود اُلجھن اور بے کلی کو ڈیوڈ بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

''را'' کے اس مقامی سربراہ کے لیے یقیناً یہ پیغام حیران کن رہا ہوگا کہ ''موساد'' کا کوئی اہم ذمے دار اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال اس نے ملاقات پر رضامندی ظاہر کر کے ملاقات کی جگہ کا تعین کر دیا۔ اس ملاقات میں پانڈے کی حیثیت میزبان کی تھی، چنانچہ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس شاندار سوئٹ میں وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا اور ڈیوڈ کا سوئٹ کے دروازے پر استقبال کیا تھا۔ یہ ون ٹو ون ملاقات تھی اس لیے سوئٹ میں پانڈے کے ہمراہ اس کا کوئی ساتھی موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے یہاں پہنچنے سے قبل وہ ماہرین نے سوئٹ کا ہر طرح سے جائزہ لینے کے بعد اسے سکیورٹی کے اعتبار سے کلیئر قرار دینے کے ساتھ اس بات کی بھی یقین دہانی کروا دی تھی کہ وہاں ہونے والی گفتگو کے لیک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب بھی اس کے نصف درجن کے قریب ماتحت سوئٹ کے آس پاس اور ہوٹل کے داخلی و خارجی راستوں پر موجود تھے اور ہر شے پر بھرپور نظر رکھے ہوئے تھے۔

ظاہر ڈیوڈ وہاں اکیلا آیا تھا لیکن قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی وہاں کچھ آدمی خفیہ موجود ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پاکستان کو نہایت حقیر سمجھنے کے باوجود وہ اس کی خفیہ ایجنسیوں سے خوف زدہ تھے اور اس خوف کے سبب ہی انہوں نے اس موقع پر اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر رکھا تھا۔

''آپ کی میزبانی کا آنر پا کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے میں نے

اس بہت پرانی اور قیمتی وائن کا انتظام کیا ہے۔'' مصافحے کے بعد پانڈے اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ دونوں دبیز اور بیش قیمت صوفوں پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ چکے تو پانڈے نے کرسٹل کے نازک جام اس کے لیے وائن نکالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا۔

اسے معلوم تھا کہ ''موساد'' جیسی تنظیم کی طرف سے ملنے والا ملاقات کا پیغام خالی از علت نہیں ہے ملاقات کے لیے آنے والے نمائندے کو زیادہ سے زیادہ خوش کر کے شیشے میں اتار لینا چاہتا تھا۔ یوں بھی دونوں حالات ان کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں تھے۔ پچھلے کافی عرصے سے ''را'' پاکستان میں اپنے کسی اہم مشن میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور اُلٹا انہیں اپنے ہی کئی اہم ساتھیوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ان سا میں ورما، سنتھیا اور ڈاکٹر ماریہ قابلِ ذکر تھے۔ اور سنتھیا کی موت کے بعد سے تو وہ خود کو زیادہ ہی تنہا کرنے لگا تھا۔ کیونکہ اب ساری ذمے داری اس کے شانوں پر آ گئی تھی اور حالات اتنے خراب اپنے اہم ساتھیوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم ٹھکانوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ خواجہ سراؤں والا بگڑ گیا تھا اور ان مشکل حالات میں انہیں یہاں اپنی کارروائیاں جاری رکھنے میں دشواری کا سامنا تھا۔

''لاجواب۔'' ڈیوڈ نے اس کی پیش کردہ وائن کا پہلا گھونٹ لیا اور بے ساختہ انداز میں تعریف کی۔ تعریف پر پانڈے کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''ٹائم کم ہے اس لیے کام کی بات بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔'' ڈیوڈ بہت تیزی سے مطلب بات پر آ گیا۔

''شیور۔'' پانڈے کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

''میں اور میری تنظیم کا ہر فرد جانتا ہے کہ آج کل ''را'' کو پاکستان میں کن مشکلات کا سامنا ہے عرصے میں تم لوگوں کو قریب قریب ہر مشن میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا چاہتا اس لیے صرف ایک حالیہ ناکامی کا ذکر کروں گا۔ بھارت کے اشوک اور یہاں کے چودھری ذریعے اسلحے اور بارود کی ایک اہم ڈیل کی گئی تھی اور ڈیلیوری ہونے ہی والی تھی کہ پاکستان کی خفیہ اس معاملے میں کود پڑیں۔ نتیجے میں بھارت کو یہ زوردار طمانچہ کھانا پڑا کہ وہ اسلحہ و بارود بھارت کی ہی تباہ کر دیا گیا اور بھارتی حکام ایسا کوئی ٹھوس ثبوت بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے کہ الزام پاکستان سر رکھ سکیں۔''

ڈیوڈ کی معلومات پانڈے کو حیران کر رہی تھیں کیونکہ جس واقعے کا اس نے حوالہ دیا تھا، اس کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور خود ان کی اپنی تحقیقات بھی ادھوری تھیں۔ اسے کیا معلوم ''موساد'' ہمیشہ سے ڈبل گیم کھیل رہی تھی اور بظاہر جس ڈیل کا تعلق ان سے تھا، اس کی اصل ''موساد'' کے ہاتھ میں ہی تھیں۔ اشوک اور چودھری دونوں ہی ''موساد'' ہی کے تو مُہرے تھے۔ لیکن کے ذریعے ''را'' کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا تھا کہ اس نے عیاشی کی غرض سے بھارت آئے ہوئے وڈیرے کو اپنے جال میں پھانس کر اس ڈیل کے لیے رضامند کر لیا ہے۔

''میرا مقصد تمہیں بے عزت کرنا نہیں ہے۔ اصل میں ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور پچھلے عرصے ہمیں بھی یہاں کچھ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔'' یہ اعتراف کرتے ہوئے ڈیوڈ کے دل میں مارا کی موت کا کرب تھا۔ بظاہر ''را'' کے ساتھ کام کرنے والی یہ دونوں ماں بیٹیاں اصل میں تو ان کی ساتھی تھیں۔



''اوہ.....'' پانڈے نے اس کے اعتراف پر تبصرہ کرنے کے بجائے ہونٹ سکیڑ کر محض اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

''یہ سچ ہے۔ اور اسی لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اپنی اپنی ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہم اکٹھے ہو کر پاکستان کو ایسا بھرپور جواب دیں کہ اس کے حکمران اور عوام برسوں بلبلاتے رہیں۔'' ڈیوڈ کی آنکھوں میں یہ عزم ظاہر کرتے ہوئے بلا کی سفاکی اور نفرت تھی۔

''کیا میں آپ کے پلان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟'' پانڈے الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔

''بالکل..... کیونکہ ہم نے جو پلان تیار کیا ہے، اس میں ایک خاص سبب سے تمہارے ادارے کا ہی کمال ہو گا۔''

''اچھا، وہ کیسے؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر اس نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

''ہماری انفارمیشن کے مطابق ایک نواحی گاؤں جمال پورہ میں تمہارا ایک مدرسہ کام کر رہا ہے اور اس مدرسے کی انتظامیہ کا جمال پورہ کے علاوہ اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں بھی اتنا اثر و رسوخ ہے کہ مدرسے کے منتظم کی طرف سے کیے جانے والے کسی اعلان یا کارروائی پر کوئی شخص ذرا بھی اعتراض نہیں کرتا اور مدرسے کے عملے کے ساتھ وہاں آنے والے مہمانوں کو بھی لائقِ احترام سمجھا جاتا ہے۔''

ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر پانڈے کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ یہ ایسی معلومات نہیں تھیں جو اس وناکس کے علم میں ہوتیں۔ مرکز کے علاوہ یہاں کام کرنے والے ''را'' کے مقامی عہدے داروں میں بس گنتی کے چند بڑوں کو ہی اس راز کا علم تھا اور ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ موساد'' نے ان کی تنظیم میں بہت اوپر تک جگہ بنا رکھی ہے۔ ''موساد'' کے اس کردار پر تشویش اور ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور کچھ خفت زدہ سا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہمیں معلوم ہے کہ جمال پورہ کے علاوہ بھی بہت سے گاؤں دیہاتوں میں چھوٹے بڑے پیمانے پر تمہارے مدارس اور مدرس موجود ہیں۔ لیکن جمال پورہ میں ہماری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس گاؤں سے پاکستان کا ایک اہم ایئربیس بہت قریب ہے اور ہم وہاں کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔''

ڈیوڈ کا ارادہ جان کر پہلے تو پانڈے کا منہ حیرت سے کھلا لیکن اگلے ہی پل آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایئربیس پر ڈیوڈ کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ واقعی پاکستان کو ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو جاتے۔

''اس مشن میں ہمارے اور تمہارے منتخب کمانڈوز حصہ لیں گے۔ ساری معلومات اور مشن میں کام آنے والے ساز و سامان ہماری طرف سے مہیا کیا جائے گا اور تمہارا اصل کام یہ ہو گا کہ ہمیں مدرسے کے ذریعے کور فراہم کرتے رہو۔ اس کے لیے سب سے پہلا قدم تو یہ اُٹھانا ہو گا کہ مدرسے کا منتظم اعلان کرے کہ کچھ مخیر حضرات کے تعاون سے مدرسے کی توسیع کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس توسیعی منصوبے کے فوری آغاز کے لیے مع ساز و سامان کے جمال پورہ آ رہی ہیں۔ اس طرح ہم اپنے مطلب کے بندے اور سامان آسانی سے وہاں پہنچا دیں گے۔'' ڈیوڈ نے اپنا منصوبہ واضح کیا تو پانڈے کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی اور وقتی طور پر وہ یہ تک فراموش کر بیٹھا کہ ڈیوڈ کی اس بارے میں معلومات نے اسے کتنا کبیدہ خاطر کیا تھا۔

''اس منصوبے پر کب عمل کیا جائے گا؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"فائنل ڈیٹ میں فی الحال نہیں دے سکتا۔ تم ہفتہ آٹھ دن کا عرصہ سمجھ لو لیکن اپنی تیاری ایسے کرو چار دن بعد ہی ایکشن لینا ہو۔ ہمارا ہوم ورک مکمل ہے اور میرے کمانڈوز چند گھنٹے کے نوٹس پر بھی ایکشن سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے جب تک پلان کا وہ حصہ مکمل نہیں ہو جاتا جس کا تعلق تم لوگوں سے ہے، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔" ڈیوڈ نے اس پر صورتِ حال واضح کی۔

"یہ ایک اچھا منصوبہ ہے لیکن ظاہر ہے، میں اوپر والوں سے ڈسکس کیے بغیر آپ کو کوئی فائنل جواب نہیں دے سکتا۔" پانڈے جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں یہ پکا پکایا منصوبہ ان کے لیے کتنا خوش کن ہے اس موڑ پر آ کر جہاں اُسے اس منصوبے میں "را" کی کلیدی حیثیت کا احساس ہو گیا تھا، وہ ایک دم پینترا بدل گیا اور فوری رضامندی کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔

"میرے خیال میں مسٹر پانڈے! تم اس معاملے کو صحیح طور پر سمجھے نہیں ہو۔ میں تم سے ملاقات کے لیے آیا ہوں تو صرف اس لیے کہ تم مقامی انچارج ہونے کی حیثیت سے یہاں کے معاملات میں بھی کوآپریٹ کر سکتے ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اصل منظوری تو ہم تمہارے بڑوں کے ساتھ ڈسکس کر کے حاصل کر چکے ہیں۔" ڈیوڈ نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ایک منٹ میں اسے اس کی اوقات یاد دلا دی اور پانڈے کو اچھی طرح یاد آ گیا کہ اوپر سے اسے "موساد" کے نمائندے سے بھرپور تعاون کی ہدایت کی گئی تھی۔

"اوکے، میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" وہ بالکل سیدھا ہو گیا۔

"ابھی اپنے کمانڈوز کو تیار کرو۔ باقی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً تمہیں ملتی رہیں گی اور ساتھ ساتھ ہمارے درمیان منصوبے کی جزئیات بھی طے ہوتی رہیں گی۔ میں ضرورت پڑنے پر خود تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔" ڈیوڈ یکدم ہی وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پانڈے نے بھی ہڑبڑا کر اس کی تقلید کی۔

"اوکے، سی یو۔" نپے تلے انداز میں یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے پانڈے سے الوداعی مصافحہ کیا۔ انداز میں واضح احساسِ برتری تھا۔ پانڈے کو اندازہ ہو گیا کہ اس معاملے میں بہت اچھی پوزیشن پر ہونے کے باوجود وہ اسے اپنے زیرِ اثر لانے میں ناکام رہا ہے اور اس ناکامی پر فی الحال وہ مٹھیاں بھینچے اسے جاتا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

ماہ بانو کی حالت بہت خراب تھی۔ اُس کے لیے قدم اُٹھانا دُشوار ہو رہا تھا پھر بھی وہ اپنے وجود میں سانسیں لیتی ننھی جان کے لیے ہمت کر رہی تھی۔

ذہنی، قلبی اور جسمانی تینوں اعتبار سے اسے شدید تکلیف سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے اغوا سے لے کر لیبارٹری کے پُرتعیش کمرے میں قیام اور پھر وہاں سے فرار کے مراحل میں وہ جس اعصابی دباؤ کا شکار رہی تھی، اس سے خود ہی واقف تھی۔ اسلم کے ہنری سمیت دلدل میں گرنے کا منظر رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور دل میں تکلیف کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

اُسے یاد آ رہا تھا کہ اسلم اُس کے ماں بننے کی خبر سن کر کتنا خوش ہوا تھا اور بالکل چھوئی موئی کی طرح اس کی حفاظت کرتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی کہ ماہ بانو کو ذرا بھی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ لیکن اُس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ دُکھ اور جسمانی تکلیف دونوں سے لڑتی ماہ بانو اس وقت بالکل تن تنہا زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

اُسے یہ زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ اسلم کی محبت کی نشانی بچانے کے لیے درکار تھی اور اسی لگن میں وہ اب



آبلے کی طرح دُکھتے جسم کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہی تھی۔ پاؤں کی موچ کی وجہ سے یہ عمل اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا پھر بھی اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔

جنگل میں سفر کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پیروں اور چہرے پر کئی خراشیں آئی تھیں اور کہیں کہیں سے کپڑا بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور بالوں میں خاک اُڑ رہی تھی۔ رہی سہی کسر ان آنسوؤں نے پوری کر دی تھی جن کے مسلسل بہنے پر اس کا کوئی زور نہیں تھا۔ بس وہ اتنا کرتی تھی کہ جب ان آنسوؤں کے سبب آنکھیں بالکل دُھندلا جاتی تھیں اور سامنے کا منظر نظر آنا بند ہو جاتا تو وہ ہاتھوں کی پشت سے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالتی تھی۔

وہ اب جنگل کے قریب سے گزرتی سڑک تک پہنچ چکی تھی اور دل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی مدد مل جائے گی۔ لیکن بہرحال اسے ان آنسوؤں پر اب بھی کوئی قابو نہیں تھا جو اس کی بصارت کو دھندلائے دے رہے تھے۔ دُھند کی اس چادر کو اپنے سامنے سے ہٹانے کے لیے اس نے ایک بار پھر ہتھیلی کی پشت سے رگڑا تو اسے سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی نظر آ گئی۔ وہ گاڑی اس سے خاصے فاصلے پر تھی جتنا سفر وہ طے کر چکی تھی، اس کے مقابلے میں یہ راستہ کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ میکانکی انداز میں اس طرف بڑھنے لگی۔ چند قدم مزید آگے چلنے پر اسے وہ آدمی نظر آ گیا جو کار سے کچھ فاصلے پر اپنی آنکھوں سے کیمرہ لگائے کھٹا کھٹ تصویریں کھینچ رہا تھا۔

آرلینڈو کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ یہاں پائے جانے والے قدرتی مناظر نئے آنے والوں کے قدم باندھ لیتے تھے۔ وہ بھی یقیناً کوئی نووارد تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تصویر کشی میں مصروف تھا۔

ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھے ایسے پنچھی کی تصویر لینے کی کوشش کر رہا ہے جو اپنے پروں میں موجود تاج اور قوسِ قزح کے رنگوں جیسے پروں کے باعث کسی ریاست کے شہزادے جیسی حکمت رکھتا ہے۔ اس پرندے کی تصویر لینے کے لیے صحیح زاویہ بنانے کی خاطر اس نے دو چار قدم پیچھے ہٹ کر پنجوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک ناگہانی سے دوچار ہو گیا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کا چمکتا ہوا سانپ تھا جو مزے سے سڑک پر محوِ استراحت تھا۔ آدمی کے پیچھے ہٹنے پر اس کا پیر سانپ کی دُم پر جا پڑا اور ردِعمل میں سانپ نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔

آدمی بری طرح بدکا اور سانپ کو تیزی سے جھاڑیوں میں گم ہوتا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ پورا واقعہ تیزی سے پیش آیا تھا اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے ماہ بانو بھی پل بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے اندر کی وہ ماہ بانو جاگ اُٹھی جو سارے جہاں کا درد اپنے دل میں لیے حتی المقدور دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان لمحات میں اسے اپنے سارے دُکھ اور تکلیفیں بھول گئی تھیں اور وہ اس شخص کی مدد کرنے کی خواہاں تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تکلیف اور جسم میں اُٹھتی ٹیسوں کو نظرانداز کر کے تیزی سے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس شخص کے قریب جا پہنچی جس نے اس دوران فوری شاک سے سنبھل کر اپنے متاثرہ پاؤں کا جوتا اُتار لیا تھا اور پتلون کے پائینچے چڑھائے پنڈلی پر موجود سانپ کے دانتوں کا نشان دیکھ رہا تھا۔

"جلدی سے اپنی ٹائی کھولیے۔" ماہ بانو نے چیخ کر اسے ہدایت دی تو پہلی بار وہ اس کی وہاں موجودگی سے واقف ہوا تاہم ابھی سب سے زیادہ اہم اس صورتِ حال سے نمٹنا تھا جس سے وہ دوچار ہو چکا تھا۔ ماہ بانو کی ہدایت کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور زخم سے تھوڑا اوپر مضبوطی سے باندھ دی۔

اسی اثنا میں ماہ بانو اپنی انگلی میں موجود بھدی سی انگوٹھی اُتار چکی تھی۔ انگوٹھی اس نے عین اس جگہ رکھ دی جہاں سانپ نے کاٹا تھا۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اجنبی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ زہر مہرہ پتھر کی بنی انگوٹھی ہے اور اس پتھر کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ زہر کو چوس لیتا ہے۔'' اس نے اجنبی کو وہ معلومات فراہم کیں جن سے اسے مشابرم خان کی کزن گل مینا نے انگوٹھی تحفے میں دیتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔ وہ سجنے سنورنے کی بہت زیادہ شوقین نہیں تھی اور پھر حالات بھی ایسے رہے تھے کہ ایسے کسی شوق کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بلتستان کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی پُرخلوص گل مینا کی محبت سے دیئے گئے اس تحفے کو خود سے جدا نہیں کر سکی تھی۔ اس عرصے میں اس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی تھیں لیکن انگوٹھی کبھی اس کی انگلی سے جدا نہیں ہوئی تھی اور آج ایک اجنبی کی زندگی بچانے کے کام آ رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں بہتر ہوں۔ لیکن مجھے آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ہم کسی ہسپتال چلتے ہیں وہاں مجھے اور آپ کو بہتر ٹریٹمنٹ مل سکتا ہے۔''

اجنبی جو اس دوران اُس کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لے چکا تھا، نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ لیکن اُس کی اس پیشکش نے ماہ بانو کو متوحش کر دیا۔ جو حالات اس کے سامنے آئے تھے، ان سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قسم کی تجربہ گاہ حکومت کی سرپرستی کے بغیر قائم ہونا مشکل تھا اور اگر وہ کسی ہسپتال جاتی تو تجربہ گاہ کی تباہی اور جنگل کی آگ کے سلسلے میں تحقیقات کرنے والے باآسانی اس تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ چنانچہ خود کو طبی امداد کی شدید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود وہ ہسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

''کیا بات ہے، آپ اتنی خوف زدہ کیوں نظر آ رہی ہیں؟'' اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کر کے اجنبی نے پوچھا۔

''میں کچھ وجوہات کی بنا پر ہسپتال نہیں جا سکتی۔ البتہ اگر آپ مجھے میرے دوستوں تک پہنچا دیں اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں تو آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔'' اس نے نہایت لجاجت سے اس سے درخواست کی تو وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جس حالت میں نظر آ رہی تھی، یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے لیکن وہ ہسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

اس نے غور سے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا۔ عموماً کسی جرم میں ملوث افراد ہسپتال جانے سے گریز کرتے ہیں کہ پولیس کے گھیرے میں نہ آ جائیں۔ لیکن ماہ بانو کے چہرے کی ملاحت اور معصومیت اسے کسی طرح مجرم ظاہر نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی ابتر حالت اور چہرے پر موجود مسلسل گریہ کے آثار سے تو وہ اسے کوئی مصیبت زدہ معلوم ہوتی تھی۔

''اوکے، جہاں آپ چاہیں میں آپ کو وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے یکدم ہی ماہ بانو کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھا دیا۔ کیونکہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرنے والی خود کہیں زیادہ تکلیف میں ہے۔

گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد ماہ بانو نے اسے آفتاب اور کشور کے گھر کا پتہ بتایا۔ مصطفیٰ خان کے گھر جانے کا فیصلہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس کی تلاش کا سلسلہ شروع ہوا تو تلاش کرنے والے سب سے پہلے وہیں کا رخ کریں گے۔

مصطفیٰ خان کے بعد پورے آرلینڈو میں آفتاب اور کشور ہی تھے جن سے وہ مدد کی توقع رکھ سکتی تھی۔



اس کے گھر کا پتہ بتانے کے بعد اس نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی اور اپنے وجود میں لہریں لیتے بے چینی کو برداشت کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اپنی اس کیفیت میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے بتائے ہوئے پتے کو سن کر اجنبی کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر حیرت اُتر آئی تھی۔

اپنے جسمانی و قلبی کرب سے لڑتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ فاصلہ کس طرح طے ہوا۔ ذہنی طور پر تو وہ جنگل میں ہی تھی جہاں اس نے اسلم کو ایک دلدل میں گرتا ہوا دیکھا تھا لیکن دل کو یقین دلانا مشکل تھا کہ اسے بے تحاشا چاہنے والا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا ہے۔

دل کا یہ درد آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا اور چہرے کے ساتھ اس کا گریبان بھی تر ہو گیا تھا۔ وہ بغیر آہوں اور سسکیوں کے بہت خاموشی سے اس شخص کے لیے رو رہی تھی جس کے چلے جانے سے دنیا میں اپنا آپ بالکل تنہا محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ کی منزل آ گئی۔'' درد کی داستان سناتے اس کے خاموش آنسوؤں سے راستے بھر بے چین رہے اجنبی نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک کر دھیرے سے اسے اطلاع دی اور پھر خود نیچے اُتر کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحے کے بعد گیٹ کھل گیا اور کشور کا چہرہ نظر آیا۔

''السلام علیکم لالہ!'' وہ جو ڈور آئی سے پہلے ہی بھائی کو دیکھ چکی تھی، دروازہ کھولتے ہی بولی۔ مراد شاہ نے پہلے ہی ٹیلی فون پر اسے کسی روز اپنی آرلینڈو آمد کی اطلاع دے چکا تھا اس لیے اس کا اس وقت اپنے دروازے پر موجود ہونا کشور کے لیے زیادہ حیرت کا سبب نہیں بنا۔

''گیٹ پورا کھول دو۔ میں گاڑی اندر لاؤں گا۔'' اشارے سے بہن کے سلام کا جواب دے کر اس نے عجلت حکم دیا تو اسی وقت کشور کی نظر پسنجر سیٹ پر موجود ماہ بانو پر جا پڑی۔

''ارے، یہ تو ماہ بانو ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملی اور اسے کیا ہوا ہے؟'' حیرت کے باعث اس کی زبان سے ایک ساتھ بہت سے سوال آ گئے لیکن مراد شاہ کسی ایک کا بھی جواب دیے بغیر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔ کشور نے جلدی سے پورا گیٹ وا کیا۔ مراد شاہ گاڑی کو گیٹ سے گزار کر گھر کے مختصر پورچ میں لے آیا۔ کشور گیٹ بند کر کے تیزی سے گاڑی کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر اُترتی ماہ بانو کو سہارا دیا۔

اس کا سہارا پا کر ماہ بانو جو اب تک خود کو نہ جانے کس طرح سنبھالے ہوئے تھی، ڈھے سی گئی۔ تنہا کشور کے لیے اس کے وجود کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ مراد شاہ جو خود بھی گاڑی سے باہر آ چکا تھا، اس بات کو محسوس کر کے لپک کر ان دونوں کے قریب پہنچا اور ماہ بانو کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

وہ دونوں اسے لے کر اندر داخل ہوئے تو آفتاب بھی اپنے کام کو چھوڑ کر لاؤنج میں آ چکا تھا۔ کال بیل کی آواز اس نے بھی سنی تھی اور جانتا تھا کہ کشور خود ہی دیکھ لے گی لیکن جب اس نے کسی گاڑی کے اپنے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی تو معاملہ جاننے کے لیے اُٹھ گیا۔ ان کی اپنی زندگی اتنے غیر یقینی حالات میں گزر رہی تھی کہ ذرا بھی غیر معمولی پن چونکا دیتا تھا۔

''انہیں اندر بیڈ روم میں لے چلو۔'' یہ ایک دوسرے سے سلام دعا یا حال احوال معلوم کرنے کا موقع نہیں تھا چنانچہ آفتاب کو دیکھ لینے کے باوجود کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر کشور سے بولا۔

چند لمحوں میں وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ مراد شاہ نے مختصراً بتایا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی اور وہ کیوں اسے ان کے گھر تک لایا ہے۔ اپنے سانپ سے ڈسے جانے کا قصہ البتہ وہ گول کر گیا تھا۔

''میں مصطفیٰ خان کو اطلاع دیتا ہوں۔ اس دوران آپ لوگ اسے تھوڑی بہت فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش

کیجئے۔'' اس کی زبانی سب جان کر آفتاب نے کہا اور خود تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر کا ٹیلی فون استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا کسی پبلک بوتھ سے مصطفیٰ خان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماہ بانو کی حالت خراب ہے کہ اسے گھر پر مکمل طبی امداد نہیں دی جا سکتی۔ اور ان حالات میں مصطفیٰ خان جیسا اثر و رسوخ بندہ ہی زیادہ بہتر مدد کر سکتا تھا۔

ادھر کشور اور مراد شاہ اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پورے جسم پر موجود زخموں میں کوئی بھی بہت زیادہ گہرا یا تشویش ناک نہیں تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ حاملہ تھی اور نہ جانے کن صعوبتوں سے گزر کر آ رہی تھی کہ آخر میں ہمت ہار کر بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔

مراد شاہ کی مدد سے اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے کے ساتھ ساتھ کشور اسے ہوش میں لانے کی کوشش بھی کرتی رہی تھی۔ اس کے لیے اس وقت سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اُمید سو رہی تھی اور ڈسٹرب کرنے والا نہیں تھا۔

''میں باہر جاتا ہوں۔ تم کوشش کر کے اس کا لباس تبدیل کروا دو۔'' مراد شاہ نے کشور سے کہا اور باہر نکل گیا۔ کشور نے اپنی وارڈ روب میں سے شلوار قمیض کا ایک ڈھیلا ڈھالا جوڑا نکالا اور سخت جدوجہد کے بعد اسے تبدیل کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ لباس کی تبدیلی کے دوران ماہ بانو کو قدرے ہوش آ گیا اور وہ بڑے درد بھرے لہجے میں اسلم کو پکارنے لگی۔

اُس کی اس پکار نے کشور کا دل تڑپا دیا۔ اسے اسلم کے حالات سے واقفیت نہیں تھی اور اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ اور اب ادھر ماہ بانو اسے پکار رہی تھی۔ یعنی دونوں ہی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے شدید تڑپ تھی۔ محبت سے آشنا کشور نے اس تڑپ کو بھی شدت سے محسوس کیا اور دل میں ان دو دیوانوں کے مل جانے کی دعا مانگتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ گلاس میں گرم دودھ لے کر وہ واپس کمرے میں آئی تو ماہ بانو کی آنکھیں بدستور بند تھیں لیکن وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''ماہ بانو!..... آنکھیں کھولو ماہ بانو!'' اس کے رخساروں کو آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کشور نے اسے مسلسل آوازیں دیں تو اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔

''آنکھیں کھولو۔ اُٹھو شاباش، تھوڑی سی ہمت کرو۔'' کشور نے بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر تکیے کی مدد سے نیم درازی کی حالت میں بٹھایا اور دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

''پلیز، تھوڑا سا دودھ پی لو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔'' اس کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر کشور نے اسے سمجھایا تو اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''تھوڑا سا اور.....'' کشور نے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے پچکارا۔ یہ کشور کی محبت کا اثر تھا کہ ماہ بانو کی ذہنی پختگی کہ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا سا دودھ اور پی لیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ زوردار لہر سے تڑپ اُٹھی۔

کشور نے اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی ماہ بانو کے دن پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ زچگی سے گزر رہی ہے۔

اسی وقت اسے آفتاب کی واپسی کے آثار محسوس ہوئے۔ وہ بہ عجلت کمرے سے باہر نکلی۔



''میری مصطفیٰ خان سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ دیر میں یہاں ایمبولینس پہنچ جائے گی۔'' آفتاب نے ایک اچھی خبر سنائی۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے بے ساختہ اطمینان کا اظہار کیا اور بولی۔ ''ماہ بانو کی حالت بہت خراب ہے میرا اندازہ ہے کہ اسے لیبر پین شروع ہو گئے ہیں اس لیے اس کا جلد از جلد کسی ہسپتال تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''ہم انتظار اور دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ آپ جائیں اور اس کا خیال رکھیں۔'' آفتاب نے اس سے کہا تو وہ پلٹ کر دوبارہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ جبکہ آفتاب صوفے پر خاموش بیٹھے مراد شاہ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں مراد بھائی؟'' قریب بیٹھنے پر اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو ذرا تشویش سے پوچھنے لگا۔

''ہوں۔'' مراد شاہ نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ اسی وقت آفتاب کی نظر اس کی پتلون کے پائنچے اور پنڈلی سے ذرا اُوپر بندھی ٹائی پر پڑی۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے سانپ نے ڈسا ہے۔'' مراد شاہ نے آہستہ سے اعتراف کیا اور پھر تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سانپ نے اسے ڈسا اور ماہ بانو نے اس کی مدد کی

''زہر مہرہ پتھر کی اس تاثیر کے بارے میں، میں نے بھی سنا ہے..... لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے جسم سے سانپ کا زہر نکل چکا ہے؟'' اس کی پنڈلی پر موجود سانپ کے ڈسنے کے نشان اور اردگرد کی ہلکی سی سوجن کو دیکھتے ہوئے اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس پتھر کی وجہ سے خاصا فائدہ ہوا ہے۔ ورنہ اتنے عرصے میں تو زہر میرے پورے جسم میں پھیل کر اپنا اثر دکھانا شروع کر چکا ہوتا۔ لیکن میں خود کو بہت معمولی سا متاثر محسوس کر رہا ہوں۔'' مراد شاہ نے جواب دیا۔

''پھر بھی آپ کو فوری ٹریٹمنٹ ملنا چاہئے۔ اتنا وقت یہاں ضائع کرنے کے بجائے آپ کو سیدھے ہسپتال چلے جانا چاہئے تھا۔'' وہ بدستور تشویش میں مبتلا تھا۔

''میں اس لڑکی کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ مجھے لگا کہ میرے ہسپتال جانے کی صورت میں وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس جائے گی۔'' بیڈ روم کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے وجہ بتائی۔

''پھر بھی مراد بھائی! کم از کم اب تو آپ ہسپتال چلے جائیں۔ چلیں اُٹھیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' آفتاب نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں آفتاب! یہ مناسب نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ کشور کو خاتون کے ساتھ ہسپتال جانا پڑے گا۔ میں تمہارا گھر پر بچی کے پاس رُکنا ضروری ہے۔'' مراد شاہ نے اسے سمجھایا۔

''لیکن آپ.....'' آفتاب ذہنی طور پر اس کے یونہی بیٹھے رہنے کے لیے راضی نہیں تھا۔

''ابھی ایمبولینس آئے گی تو میں بھی ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ یو ڈونٹ وری۔ ذرا سی تاخیر سے میرا کچھ بگڑے گا۔'' مراد شاہ نے اسے تسلی دی تو آفتاب اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

وہ اپنے باپ سے کتنا زیادہ مختلف تھا۔ اس کا باپ وہ شخص تھا جس کی بدنیتی کی وجہ سے ماہ بانو کی بدقسمتی

کی داستان کا آغاز ہوا تھا اور وہ ایک گرداب میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ جبکہ وہ اپنے باپ کے برعکس ماہ بانو کے اپنے لیے اجنبی ہونے کے باوجود اس کے مفادات کے لیے فکرمند تھا۔ شاید وہ شیطان کے گھر پیدا ہونے والی ولی تھا۔ زندگی کے اس لمحے میں پہلی بار آفتاب کو مکمل طور پر اس بات پر اعتبار آیا کہ مراد شاہ اس سے اور اس سے مخلص ہے اور وہ اب تک جن تکلیفوں سے گزرے ہیں، ان میں مراد شاہ کا ذرا بھی دخل نہیں رہا ہے کیونکہ جو شخص ایک اجنبی لڑکی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا سکتا تھا، بھلا وہ اپنی بہن کی زندگی اور خوشیوں کا دشمن کیسے ہوسکتا تھا؟

⊛----✪----⊛

دُبئی ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی چودھری نے یوں سکون کی سانس لی جیسے اب تک کوئی اس کے پیچھے ہوا تھا اور اب جا کر اسے یہ اطمینان ہوا تھا کہ پیچھا کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

بھارت سے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ وہ پہلے ہی کر چکا تھا اور جب یہ اطلاع ملی کہ اسلحے کی وہ کھیپ جس کی اُس نے اشوک سے ڈِیل کی تھی اور جسے پاکستان میں اس کے آدمیوں کو وصول کرنا تھا، بھارتی سرحد میں ہی تباہ کر دی گئی ہے تو وہ دُم دبا کر دُبئی کی طرف بھاگا کہ پاکستان میں قدم رکھنے کی فی الحال اس میں ہمت نہیں تھی۔ البتہ بھارت سے روانگی سے قبل منشی نے اسے ایک اچھی خبر سنا دی تھی کہ چاندنی اور شاہد کو کہیں واپس لینے پر مجبور کیا جا چکا ہے اور واپسی کی صورت میں اسے کم از کم اس معاملے میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔

منشی سے اسے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اسلحے والے معاملے میں اس کے خلاف کوئی انکوائری ہو رہی ہے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا اور دُبئی کے مزے لوٹنے چلا گیا تھا۔ دُبئی کی شان کا اندازہ اس کے ایئرپورٹ سے ہی ہو جاتا تھا۔ چکا چوند روشنیوں سے رات کو بھی دن کا سماں لیے یہ ایئرپورٹ دنیا کے چند بڑے اور جدید ترین ایئرپورٹس میں شمار ہوتا تھا۔

چودھری اپنے سوٹ کیس کے ساتھ باہر نکلا تو یہی خیال تھا کہ پرائیویٹ کار یا ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل کا رخ کرے گا لیکن باہر نکلتے ہی ایک حیرت اس کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

''لِنڈا!.....تم یہاں؟'' وفورِ جذبات سے اس کے لیے بولنا مشکل ہوگیا۔

اس نے کافی وقفے کے بعد لِنڈا کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس درمیانی عرصے میں پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو چکی ہے اور اپنے حُسن کی جولانی سے اس پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ اس بار اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ 'ہر چند کہیں کہ ہے مگر نہیں ہے' کی تفسیر بنا ہوا تھا۔

سلیولیس بلاؤز کا گریبان اتنا کشادہ تھا کہ دیکھنے والی نگاہوں کو دُور دُور تک کا جائزہ لینے کے لیے کسی خاص جدوجہد کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاؤز اور منی اسکرٹ کے درمیانی سے جھانکتی پتلی کمر کا نظارہ بھی کم دلکش رُبا نہیں تھا۔ اور پھر گھٹنوں سے بہت اوپر ختم ہو جانے والے منی اسکرٹ سے جھانکتی دلکش و سڈول ٹانگیں کہ جن سے نظر اُلجھتی تو پھر پلٹنا مشکل ہو جاتا۔

''اتنے حیران کیوں ہو چودھری!.....کیا میرا دُبئی آنا منع ہے؟'' اس کی حیرت کو دیکھ کر لِنڈا نے اس کا دل کو قتل کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔

''نہیں، میں تو بس اپنی خوش نصیبی پر حیران ہو رہا ہوں کہ یہاں تم میرے استقبال کے لیے موجود ہو۔'' چودھری نے گرم جوشی سے معانقہ کرتے ہوئے اپنی حیرانی کی وضاحت کی۔



''میں کسی کام سے یہاں آئی ہوئی تھی۔ تم نے فون پر بتایا کہ انڈیا سے دُبئی آ رہے ہو تو میں نے سوچا تم سے مل کر پچھلے دنوں کی یاد ہی تازہ کرلوں۔''

اُس کا سوٹ کیس ڈکی میں رکھنے کے بعد وہ اسے لے کر کار میں بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا کہ اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔

لِنڈا کی سحر انگیز قربت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے فراموش کر سکتا۔ اس پر ان دنوں کو یاد کر کے ہی نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ چنانچہ لپک کر بولا۔

''اوہ لِنڈا مائی ڈارلنگ!.....تم نے تو میرا دل ہی خوش کر دیا۔ پلیز، اپنی گاڑی ڈاؤن ٹاؤن کی طرف موڑ لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوٹل جمیرہ میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کہیں لے جانا چاہتی ہوں۔'' لِنڈا مردوں کے خود پر اس طرح نثار ہونے کی عادی تھی۔ اسے اپنی زبردست قوتِ تسخیر کا اچھی طرح علم تھا اس لیے چودھری کی حالت دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کہیں اور کہاں.....؟'' اس کی بات سن کر چودھری کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ چوکنے پن سے سوچنے لگا۔ ویسے بھی اس کا تجربہ اسے بتاتا تھا کہ عقل کو خبط کر دینے والی لِنڈا جب بھی اس سے ملاقات کرتی تھی اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص وجہ موجود ہوتی تھی۔

''یہ سرپرائز ہے۔'' لِنڈا نے اسے خوب صورتی سے ٹال دیا اور بے حد اصرار پر بھی کچھ نہیں بتایا۔ اس طرح گفتگو ہی اس طرح بدل ڈالا کہ چودھری کو احساس بھی نہ ہوسکا اور حسبِ معمول وہ لِنڈا کی عقل کو خبط کر دینے والی قوتِ تسخیر کے تابع ہو کر وہاں جا پہنچا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔

یہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی ساتویں منزل پر موجود لگژری اپارٹمنٹ تھا جس کے ایک کمرے میں چودھری کی ناپسندیدہ ہستی پہلے ہی ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی مسٹر الفا!'' اس نے دانتوں کو چباتے ہوئے الفا سے مصافحہ کیا۔

''لیکن ظاہر ہے مجھے نہیں ہوئی۔ کیونکہ تم میری ہی فرمائش پر یہاں موجود ہو۔'' صوفے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے الفا نے دل جلانے والے انداز میں کہا تو چودھری اپنی جگہ بل کھا کر رہ گیا لیکن اظہار نہ کر سکا۔

''خیریت.....تم مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟'' اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ نارمل ہی رہے۔ کیونکہ اسے تجربہ تھا کہ اس کی طرف سے سخت ردِعمل پر الفا کا مزاج بگڑ جاتا تھا اور وہ چونکہ اس سے بہتر پوزیشن میں تھا اس لیے آسانی سے اسے نقصان بھی پہنچا دیتا تھا۔

چودھری اُس کے مزاج کی برہمی کو ملنے والے کثیر معاوضے میں کمی کی صورت ایک بار بھگت چکا تھا اور اب ایسا کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے علاقے میں وہ کتنا ہی جابر و ظالم اور مطلق العنان حاکم تھا لیکن ایک بین الاقوامی طرز کی جرائم پیشہ تنظیم کے آگے اس کے ذاتی اثر و رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس سے طاقتور لوگ تھے کہ جب چاہتے اسے چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ سکتے تھے۔

''تم سے کچھ کاروباری معاملات طے کرنے تھے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے ہم ایک ایک ڈرنک لے لیں۔ طرح سے آئے ہو، تھکے ہوئے ہو گے۔ ڈرنک لینے سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔'' خلافِ معمول الفا کا لب و لہجہ بھی۔ ایک اچھے میزبان کی طرح اسے ڈرنک کی پیشکش کرنے کے بعد وہ لِنڈا سے مخاطب ہوا۔

''ہنی! کیا تم ہم لوگوں کے لیے ڈرنک تیار کر دو گی؟''

"کیوں نہیں؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور صوفے سے اُٹھ کر بل کھاتی ہوئی اس کیبنٹ تک جہاں بہت سی بوتلیں سجی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہاں سے ایک بوتل منتخب کرنے کے بعد وہ جملہ لوازمات کے ساتھ چودھری کے پہلو میں آ بیٹھی۔ تین جام تیار کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلا جام چودھری کو دوسرا الفا کو اور تیسرا اپنے ہاتھ میں تھام کر چودھری سے مزید قریب ہو بیٹھی۔

چودھری دہرے نشے میں مبتلا ہونے لگا۔ ہاتھ میں موجود بلوریں جام اگر آتشیں سیال کو معدے میں انڈیل کر اندر آگ لگا رہا تھا تو بھری بوتل جیسا خمار آلود وجود رکھنے والی لِنڈا اپنے لمس سے اس کے تن من میں دہکا رہی تھی اور اس کو خود پر قابو پائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ الفا کے نزدیک شاید یہی گفتگو کا سب سے مناسب وقت تھا چنانچہ وہ کھنکھارتے ہوئے بولنا شروع ہوا۔

"تم جانتے ہو کہ تنظیم تمہیں تمہاری شمولیت اور تعاون کے بدلے میں شروع ہی سے بہت بڑا معاوضہ ادا کرتی چلی آ رہی ہے..... کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اپنے علاقے کے ایک بارسوخ جاگیردار کی حیثیت سے تم ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو گے....."

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟ میں نے ہر لمحے تم لوگوں کا پورا پورا ساتھ دیا اور مجھے جو بھی ذمے داری سونپی گئی اسے اچھی طرح ادا کرنے کی کوشش کی۔" چودھری نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر اپنی خدمات شروع کر دیں۔

"کوشش اور کامیاب کوشش میں فرق ہوتا ہے مسٹر چودھری! تمہاری کامیابی کا تناسب بہت کم رہا ہے۔ تم نہ تو وہ کارخانہ بچا سکے جہاں ہم نے اپنے مال کی تیاری کے لیے کثیر سرمایہ کاری کی تھی اور نہ ہی منڈی میں مال کے پھیلاؤ کے لیے کچھ خاص کارکردگی دکھائی۔ اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے لیے تمہاری افادیت ہمارے اندازے سے بہت کم رہی ہے۔" الفا نے بغیر لاگ لپیٹ کے اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

"چلو یونہی سہی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ جیسے ناکارہ آدمی کو ملاقات کے لیے کیوں بلایا ہے؟" اس کی بات سن کر چودھری کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔

لِنڈا نے فوراً اس کا بازو اپنے نازک ہاتھ سے یوں دبایا جیسے اس کے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی اور غصے کی شدت سے بے قابو ہوتی چودھری کی سانس قابو میں آنے لگیں۔

"مسٹر الفا کا مقصد آپ کو بے عزت کرنا نہیں ہے چودھری صاحب! آپ ذرا تحمل سے ان کی بات سنیں۔ ظاہر ہے یہ آپ کو ماہانہ اتنی خطیر رقم ادا کر رہے ہیں تو جواب میں آپ سے بھی تو کچھ نہ کچھ چاہیں گے نا۔" چودھری کا بازو سہلاتے ہوئے وہ اسے بڑے رسان سے سمجھانے لگی تو چودھری کو اثبات میں سر ہلانا پڑی کہ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ واقعی وہ اکثر مقامات پر ناکام ہی رہا تھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم پاکستان کے خفیہ اداروں کی نظر میں آ چکے ہو اور تمہاری فیکٹریوں سمیت کاروباری مراکز کی نگرانی بھی کی جا رہی ہو گی اس لیے ہم اب ان جگہوں سے کہیں بھی اپنا ہیروئن والا کام انجام نہیں دے سکتے اور موجودہ حالات میں ہمیں ایسی کسی جگہ کی اشد ضرورت ہے جہاں ہیروئن تیار کرنے کے بعد ہم آسانی سے منتقل کر سکیں۔ ایسی جگہ دستیاب ہونے سے ہمارے وقت اور لاگت کی بچت ہو گی اور ہمیں فی الحال تم سے ایسی ہی جگہ درکار ہے۔" چودھری کو لائن پر آتا دیکھ کر الفا نے اپنا



مدعا کا آغاز کیا۔

"تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ میری ذات مشکوک ہے۔ پھر میں تمہیں ایسی کوئی جگہ کیسے مہیا کر سکتا ہوں؟" چودھری نے بہت سادگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"ایک ایسی جگہ تمہارے پاس ہے جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم وہاں کوئی غیر قانونی کام دے سکتے ہو۔" الفا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو چودھری اُلجھ گیا۔

"ایسی کون سی جگہ ہے میرے پاس؟"

"تمہاری حویلی۔" الفا کے جواب نے چودھری کو اُچھلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ اُس کی کیفیت سے بے نیاز ہی بولتا چلا گیا۔ "سنا ہے تمہاری حویلی میں ایک بہت بڑا تہ خانہ ہے۔ اس تہ خانے میں ہم اپنا ہیروئن والا کا سیٹ اپ لگا سکتے ہیں۔ ماہرین ہمارے اپنے بندے ہوں گے۔ باقی کاموں کے لیے تم آدمی فراہم کر دو گے۔" وہ جیسے سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں حویلی کو ایسے کسی کام کے لیے استعمال کرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔" چودھری نے بلند ہوتی آواز میں انکار کیا۔

"اسی پوائنٹ نے تو ہمیں حویلی کے انتخاب پر مجبور کیا ہے۔ مخالفین کی بھی یہی سوچ ہو گی کہ تم حویلی کو کسی کام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔" الفا کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔" اس بار چودھری نے ذرا بلند آواز میں انکار کیا جس پر لِنڈا نے اس کا بازو زور سے دباتے ہوئے اسے ریلیکس رہنے کی خاموش درخواست کی۔

"ہماری دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ ہم اپنے لیے کام کرنے والوں کو آرڈر دینے اور جواب میں "یس" سننے کے عادی ہیں۔ "نو" کا آپشن ہمارے کسی ورکر کے پاس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ استعمال کر کے وہ اپنے لیے موت کا انتخاب کر رہا ہے۔" الفا نے سرد مہری سے اسے اس کی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" چودھری کا جاگیردارانہ لہو یکدم ہی جوش مارنے لگا۔

"یہ دھمکی نہیں، ہمارا اصول ہے جس سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اس وقت تم جوش سے کام لے رہے ہو۔ بہتر ہے کہ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو پھر مجھے جواب دینا۔" اسی سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے الفا نے اس جگہ اچانک ہی چھوڑ دی اور لِنڈا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اس خبطی آدمی کو سمجھاؤ لِنڈا! ہمارے ساتھ ضد کر کے یہ اپنا نقصان کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں مسٹر الفا! چودھری صاحب میری بات ضرور سمجھ جائیں گے۔" لِنڈا نے اپنی لوچ دار آواز میں الفا کو یقین دہانی کروائی اور اس سے رخصت ہونے کے بعد چودھری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈارلنگ!..... کیوں سوچے سمجھے بغیر اس آدمی سے بھڑ رہے تھے؟ وہ تمہارے لیے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

"میں اس کا مطالبہ نہیں مان سکتا۔ وہ ہمارے پُرکھوں کی حویلی ہے اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی عزت پر کوئی آنچ آئے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی کہ حویلی کی

طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ الفا بہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی حویلی کا انتخاب
ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ حویلی کا کوئی راز وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہاں کے سارے ملازم
تمہارے وفادار ہیں۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم یہ کریں گے کہ کام کو اس طرح انجام دیں کہ کسی کو کانوں
خبر ہی نہ ہو سکے۔ مشینری اور ماہرین کو تہ خانے تک پہنچانے کے لیے باہر سے سرنگ لگائی جاسکتی ہے۔
کے پیچھے جو تمہارا خاندانی قبرستان ہے، وہاں سے تہ خانے تک سرنگ بننا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ جس
میں یہ کام ہو، تم لوگوں پر یہ ظاہر کر سکتے ہو کہ تم اپنے بزرگوں کی قبروں کی مرمت وغیرہ کروا رہے ہو۔''

اسے اپنی قربت سے نوازتی وہ بڑے سبھاؤ سے مشورے اور تجاویز پیش کر رہی تھی اور ظاہر ہے
سیمیں بدن کے غنچہ دہن سے نکلی باتیں چودھری کی عقل کو خبط کر کے اسے انکار سے نیم رضامندی کی
لے جا رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے، یہ سب ہو جائے گا۔ لیکن بعد میں جب مال لایا، لے جائے گا تو کسی کی نظر پڑ سکتی ہے
اس نے اپنے دل میں موجود ایک اور اندیشہ بیان کیا۔

''کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ میں گاؤں کی زندگی کے معمولات سے واقف ہوں۔ وہاں لوگ رات
بہت جلدی سو جاتے ہیں اس لیے کام کرنے والے بندوں کے سوا کسی کو کچھ نہیں پتہ چلے گا۔ مزید احتیاط
طور پر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جس رات مال سپلائی ہونا ہو، اطراف میں پہرہ لگا کر اس بات کو یقینی بنا لیں کہ
غیر متعلقہ شخص قبرستان کے قریب نہ آسکے۔'' اب اس نے اپنا سر چودھری کے سینے پر رکھ دیا تھا اور
مہارت سے اس کے خدشات دور کر رہی تھی۔

''اور مال کو علاقے سے باہر کیسے نکالو گے؟ تمہیں معلوم ہوگا کہ پولیس باہر جانے والی گاڑیوں کی
میں تلاشی لیتی ہے۔''

''اوہو چودھری صاحب! آپ تو بہت ہی زیادہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ جو پھلا
سی شہریار عادل تھا، اس کا خوف ابھی تک آپ کے دل سے نہیں نکلا۔ اس نے آپ کو بہت زیادہ
ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' لنڈا کے طعنے پر وہ کھسیا گیا۔

''ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کو ایسی باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں۔ آخر ہم وہاں سے جنگل میں کاشت
جانے والی افیون بھی تو نکال ہی رہے ہیں نا۔ تو تیار شدہ ہیروئن نکالنے میں کیا مسئلہ ہوگا؟ آپ کے
پھل اور سبزیاں لے کر جاتے ہیں، ان میں سے دو چار پیٹیوں میں ہیروئن چھپا کر نکال دی جائے گی تو
خبر ہوگی؟ یہ کوئی لکڑی اور جانوروں کی کھال کی اسمگلنگ کا معاملہ تو ہے نہیں کہ ذرا سی تلاشی پر مال
جائے۔ ذہانت اور احتیاط سے کام لیا جائے گا تو معمول کی چیکنگ کرنے والوں کے فرشتوں کو بھی
ملے گی۔ ویسے بھی اب شہریار عادل کے دور جیسی چیکنگ نہیں ہوتی۔''

وہ اپنی نرم و نازک اُنگلیوں کا جادو چودھری کے بدن میں منتقل کرتی مستقل اُس کی برین واش
کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر چودھری کو اس کی اداؤں اور دلائل کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور وہ قائل
کہ موجودہ حالات میں ہیروئن سازی کی تیاری کے لیے حویلی سے زیادہ مناسب مقام کوئی نہیں ہے۔ اپنی
شکست کے بدلے اس نے ایک پوری رات کے لیے لنڈا کو جیت لیا اور اس کے نزدیک یہ سودا برا نہیں

⊛----✪----⊛



شہریار کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا۔ بس وہ تکلیف کا احساس تھا جو اسے ہوش میں لایا
اسے یوں لگا تھا کہ اس کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔

لاشعوری طور پر اس نے ان سوئیوں کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی خواہش میں بازو میں ایک جگہ محسوس
چبھن کے مقام سے سوئی نکال کر پھینکنے کی کوشش کی تو اس کی انگلیوں نے کسی نرم اور لجلجی سی شے کا لمس
محسوس کیا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر ملگجی سی روشنی میں اس شے کو دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر ایک
جھرجھری لے کر رہ گیا کہ وہ ایک جونک ہے جس کا لجلجا جسم اس کے خون سے بھر چکا ہے۔

اس نے ہاتھ میں موجود جونک کو دُور اُٹھا کر پھینکا اور پھر دیوانوں کی طرح اپنے جسم کے مختلف مقامات
سے خون چوستی جونکوں کو نوچ نوچ کر دور پھینکنے لگا۔

ان جونکوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی جنہیں اپنے جسم پر موجود پا کر اُسے گھن سی محسوس ہو رہی
تھی۔ ان جونکوں کو خود سے الگ کرنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ کمرے میں روشنی پھیل
گئی۔

اچانک ہونے والی اس روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ جب وہ اس تیز روشنی میں دیکھنے کے
قابل ہوا تو اس نے بھٹنا گر کو اپنے سامنے پایا۔

''کیا خیال ہے مسٹر! تم اپنے اور سلّو کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار ہو یا نہیں؟'' بھٹنا گر نے اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ جواب میں وہ خاموش رہا۔

''یہ خاموشی تمہیں مشکل میں ڈال دے گی۔ جو کچھ تم نے سہا ہے، وہ صرف ٹریلر تھا۔ آگے ہمارے پاس
تمہیں دکھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

شہریار ایک بار پھر خاموش رہا۔

''اس طرح خاموش بیٹھ کر اگر تم خود کو گونگا بہرہ ثابت کرنا چاہ رہے ہو تو یہ کوشش بیکار ہوگی۔ کیونکہ اس
کے آگے تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔'' بھٹنا گر کی دھمکی کا
اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''کچھ نہیں تو یہی بتا دو کہ سلّو اس بنگلے سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟'' ظاہر ہے بھٹنا گر اُس کے انکار پر
سوال کرنا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''تم یقین نہیں کرو گے لیکن میں سچ سچ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔'' اس سوال کا جواب سچائی سے
دینے میں کوئی عار نہیں تھا چنانچہ اس نے دے دیا۔

''گندی نالی کے کیڑے!..... کی اولاد..... تُو اپنی زبان سے نہیں اُگلے گا تو میں..... سے سب اُگلوا
لوں گا۔ تیرے جیسے پاکستانی گُتے کی دُم سیدھی کرنے کے لیے میرے پاس بہت طریقے ہیں۔''

بھٹنا گر نے اچانک ہی اسے مغلظات بکنا شروع کر دیں اور اس پر پل پڑا۔ وہ بیک وقت ہاتھوں اور
پاؤں کا استعمال کر رہا تھا۔

شہریار نے چار چھ ضربیں تو اپنے جسم پر کھا لیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بندھا ہوا نہیں ہے اور
بھٹنا گر کو اُس کی اس جسارت کا جواب دے سکتا ہے۔ چنانچہ خود بھی اس پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی کھڑی
ہتھیلی کا وار بھٹنا گر کے شانے پر پڑا تو وہ بلبلا اُٹھا لیکن فوراً ہی جواب میں اس کی ناف کے پاس اپنا گھٹنا دے

مارا۔ بھوک، تشدد اور خون کے اخراج کی وجہ سے کمزور پڑ جانے والے شہریار کے لیے یہ وار بہت زوردار تھا لیکن اپنے انسٹرکٹر عمر فاروق کی تربیت نے اس کے اندر اتنی قوتِ برداشت پیدا کر دی تھی کہ وہ نہ صرف اس وار کو سہہ گیا بلکہ پلٹ کر بھٹناگر کے سینے پر اپنے سر کی زوردار ٹکر مار دی۔ بھٹناگر ٹکر کھا کر ذرا پیچھے ہٹا اور لات گھما کر اس کے پہلو میں رسید کی۔ اس کے بعد فوراً ہی اس نے ایک مُکا شہریار کے جبڑے پر جڑ دیا۔

شہریار نے بھی ہمت نہیں ہاری اور جواب میں اس کی پیٹھ پر ایک لات رسید کی۔ حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس مقابلے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر وہ بھٹناگر کو شکست دینے میں کامیاب بھی رہا تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا کیونکہ کمرے کے ہر کونے میں جدید اسلحے سے لیس بھٹناگر کے ساتھی آ کھڑے ہوئے تھے۔ البتہ انہوں نے اس لڑائی میں دخل اس لیے نہیں دیا تھا کہ بھٹناگر نے انہیں خود دخل اندازی سے روک دیا تھا۔

"تُو یہاں سسک سسک کر پاگل کُتے کی موت مرے گا۔ اور مرنے سے پہلے میں تیرے اندر سے سب کچھ نکال لوں گا۔" ہاتھ پیروں کے ساتھ بھٹناگر کی زبان کو بھی سکون نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ اپنے آپ سے اسے مستقل مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں جیسی بھی موت مروں لیکن آج تُو اپنے آدمیوں کے سامنے میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر رہے گا۔" شہریار نے اسے جواب دیا اور یکدم ہی دونوں ہاتھوں سے اس دیوار کی طرف اُچھال دیا جہاں اُس کا گن بردار ساتھی کھڑا ہوا تھا۔

بھٹناگر کو اُس پر اُچھالنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر دھکا کھانے سے اس کے آدمی کے ہاتھوں سے گن نکل گئی اور وہ اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تو بازی پلٹ سکتی ہے۔ چنانچہ بھٹناگر کو اُچھالتے ہی خود بھی اس طرف چھلانگ لگائی۔ اس کی حسبِ توقع گن مین دھکا لگنے سے گر گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دُور جا گری تھی لیکن اس موقع پر بھٹناگر نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا اور لیٹے لیٹے ہی اس کی راہ میں اس طرح ٹانگ اڑائی کہ وہ گن تک پہنچنے سے قبل ہی گر گیا۔ یہ بات محسوس کر کے کہ وہ گن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مختلف کونوں میں کھڑے دوسرے گن مین بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے سنبھل کر اُٹھنے سے قبل ہی اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"فرار کا سپنا من سے نکال دو مسٹر! یہاں صرف وہ آتے ہیں جنہیں ہم لائیں اور واپس کوئی نہیں جاتا۔" اس دوران خود کو سنبھال کر کھڑے ہو جانے والے بھٹناگر نے اُس کے پہلو میں ایک زوردار لات رسید کی اور نفرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ہتھیاروں کے زور پر مجھے زیر کر کے خود پر اترانے کے بجائے ہمت ہے تو اپنے زورِ بازو پر مجھے جیت کر دکھاؤ۔" شہریار نے اپنی سمت اُٹھی گنوں کو دیکھتے ہوئے اسے چیلنج کیا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ان جدید گنوں کی موجودگی میں حرکت کرنا جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

"یہ کوئی فائٹنگ وِنگ نہیں ہے جو میں اس طرح کے چیلنجز قبول کرنے کی حماقت کروں۔ نہ ہی مجھے تمہاری کو سورما ثابت کرنے کا شوق ہے۔ تم میرے دیش کے دشمن ہو اور میں دشمن کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کو جائز سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے دشمنوں سے بہادری کا سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ اپنے سوالوں کے جواب چاہیے ہوتے ہیں۔"

اس کے چیلنج کے جواب میں بھٹناگر سرد مہری سے بولا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو ان میں سے ایک



نے زوردار ٹھوکر لگائی اور سخت لہجے میں بولا۔ "چل اُٹھ۔"

شہریار اپنے دُکھتے ہوئے جسم کو سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تاخیر کی صورت میں مزید مار کھانا پڑے گی۔ ویسے ان لوگوں کے پاس اس کے لیے اذیت رسانی کے سوا کچھ تھا بھی نہیں۔ اسے ان کی قید میں کئی دن گزر گئے تھے اور کچھ کھلانا تو دُور کی بات، انہوں نے اسے پانی تک نہیں پلایا تھا۔

اب وہ جتنی اذیت سے گزر چکا تھا، اس کے باعث خاصی کمزوری محسوس کر رہا تھا اور اپنی زائل ہوتی توانائی کو بحال کرنے کے لیے اسے کم از کم ایک گلاس پانی پینے کی شدید خواہش تھی لیکن اپنی اس خواہش کو پورا کر کے وہ انہیں اپنی کمزوری کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی، وہ اس کی باریکیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دشمنوں کی گرفت میں آ جانے والے سیکرٹ ایجنٹ کے لیے میں اذیتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان اذیتوں سے یا تو موت نجات دلاتی ہے یا پھر حُبّ الوطنی اور ضمیر کے سودے سے تھوڑی آسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آزادی اور رہائی کسی ایک آدھ خوش نصیب کے حصے میں آتی ہے اور اسے اپنے بارے میں علم نہیں تھا کہ ایسے خوش نصیبوں میں اس کا شمار ہے یا نہیں۔ فی الحال تو وہ قوتِ برداشت کا امتحان دینے اور دیتے رہنے کے لیے تیار تھا، یہاں تک کہ اس قید خانے یا زندگی سے نصیب ہو جائے۔ سودے بازی بہرحال اُسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔

"یہ چکر دیکھ رہے ہو نا؟..... جب یہ چلنا شروع ہوگا تو پہلے تم اپنے شریر کو کسی تنے ہوئے تار کی طرح محسوس کرو گے اور دھیرے دھیرے یہ تناؤ اتنا بڑھے گا کہ تمہارے شریر کا جوڑ جوڑ کھلنے لگے گا۔ تمہاری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور ماس ریشہ ریشہ ہو جائے گا۔"

گن مین اُسے دھکیل کر لکڑی کی ایک میز تک لے گئے تھے اور اسے میز پر لٹانے کے بعد اس کے ہاتھ پیروں کو ایسے آہنی شکنجوں میں کس دیا گیا تھا جن کے ساتھ لوہے کی زنجیریں منسلک تھیں اور ان کے سرے چرخیوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ "را" والوں نے اپنے دشمنوں سے راز اُگلوانے کے لیے خاک قسم کا عقوبت خانہ بنا رکھا تھا جہاں اذیت رسانی کے جدید و قدیم ہر طرح کے آلات موجود تھے۔ اس وقت اسے ایک قدیم طرز کے اذیت رسانی کے طریقے سے گزارا جانے والا تھا۔ چرخیاں دیکھ کر وہ کافی کچھ سمجھ گیا تھا باقی وضاحت بھٹناگر نے کر دی۔ شاید وہ جسمانی اذیت دینے سے قبل اسے اعصابی طور پر توڑ دینا چاہتا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مدِمقابل کو ایمان کی حرارت اور "را" کے دہشت گردوں کے لیے سخت نفرت نے اتنا سخت جان بنا دیا تھا کہ وہ اس کے جسم کو تو توڑ پھوڑ سکتے تھے لیکن اس کے ایمان پر حاوی ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"اسٹارٹ۔" بھٹناگر نے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کا کوئی تاثر نہیں دیکھا تو دانت کچکچاتے ہوئے اپنے ماتحت کو حکم دے دیا۔

فوراً ہی دونوں جانب نصب چرخیاں حرکت کرنے لگیں۔ ان کی حرکت بہت دھیمی تھی۔ شاید اس لیے کہ پریشانی کا شکار ہونے والا ہمت ہار کر زبان کھولنے کی ہامی بھر لے تو فوراً ہی اس سلسلے کو روک کر اسے مہلت دے دی جائے۔ ورنہ چرخیوں کے تیز چلنے کی صورت میں تو بہت تیزی سے بندہ اپنے حواس کھو سکتا تھا۔

"ٹیلو۔" ابھی زنجیروں کے کھینچنے کی وجہ سے شہریار کے جسم میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہی ہوا تھا کہ بھٹناگر کے موبائل پر کسی کی کال ریسیو کی۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اس نے بنگلے سے بھاگنے کے بعد بھائی جی سے کانٹیکٹ نہیں کیا۔ کوئی نئی انفارمیشن دے۔" دوسری طرف موجود شخص کی بات سننے کے بعد اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر بولا۔

"دیکھ ہیرا!..... تجھے نہیں پتہ کہ وہ کیسی بلا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر ہم اس کو پکڑنے میں ناکام رہے تو وہ ہمیں کتنی مشکل میں ڈال دے گا۔ پر اپنے آدمی پھیلا کر انہیں اس کی تلاش میں لگا دو۔ ہمارے ریکارڈ میں اس کے بہت سارے فوٹو ہیں۔ ان کے اور پرنٹس نکلواؤ اور سب میں بانٹ دو..... اور کچھ چاہئے تو وہ بھی بولو لیکن اُسے پکڑو۔ زندہ یا مُردہ ہر حال میں اپنے پاس چاہئے۔"

چیخ چیخ کر بولتا وہ خود کتنی اعصابی کشیدگی کا شکار ہے، یہ اس کے انداز سے ظاہر تھا۔ شہریار نے گفتگو کا ہر لفظ سنا اور سمجھ گیا کہ ہنوز وہ لوگ سلو کی تلاش میں ناکام ہیں۔

"میرے آدمی اسے نہیں ڈھونڈ سکے تو تُو سالا اُگلے گا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔" فون سے فارغ بھٹناگر اُس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے تنے ہوئے جسم پر ایک لات رسید کر دی۔ اب معلوم نہیں نے قوت زیادہ لگائی تھی یا زخم زخم وجود کے ساتھ تنی ہوئی حالت میں شہریار کو اس کی شدت زیادہ محسوس اور اسے اپنی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں بھینچ کر اپنا منہ بند رکھنا پڑا۔

بھٹناگر نے دوسری لات اس کے بجائے اسٹریچر نما لکڑی کی اس میز پر ماری جس پر وہ لیٹا پایوں میں نصب پہیوں کی وجہ سے میز فوراً ہی حرکت کرتی ہوئی اس کے نیچے سے نکل گئی اور اس کا جسم معلق ہو گیا۔ لمحہ لمحہ بڑھتے تناؤ کے ساتھ معلق حالت میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے کے آثار نمودار ہونے لگے اور مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

چرخی دھیمی رفتار سے مسلسل چلتی رہی اور جسم میں تناؤ کی کیفیت میں بھی اسی حساب سے اضافہ یہاں تک کہ اُسے محسوس ہوا کہ اس دوطرفہ کھنچاؤ کی وجہ سے یا تو اس کے جسم کے سارے جوڑ کھل جائیں یا وہ دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا۔

اذیت اس انتہا کی تھی کہ اس کی قوتِ ارادی جواب دے گئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں ہی مضبوط اعصاب کا مالک سہی لیکن بہرحال وہ تھا تو گوشت پوست کا بنا انسان جس کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔

اس کی چیخیں نکلتی دیکھ کر بھٹناگر کے تنے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا روکنے کا اشارہ کیا۔

اذیت کا یہ سلسلہ رُکا تو نڈھال سا شہریار ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا تو اس نے شہریار کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔ شہریار نے ان قطروں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اُتارا۔

"تو پھر تم میرے سوالوں کے جواب دینے کو تیار ہو؟" بھٹناگر نے اس کے قریب آ کر بڑے پوچھا۔ گویا اب اس کی طرف سے انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"تم میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر سکتے ہو۔ جسم سے میری روح نکال سکتے ہو لیکن چند اس زبان سے وہ نہیں نکلوا سکتے جو تم سننا چاہتے ہو۔"



شہریار نے نہایت نفرت سے اس کی بات کا جواب دیا تو ذلت کے احساس سے بھٹناگر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ چیخ کر بولا۔

"چکر چلاؤ اور اب اس وقت تک نہیں روکنا جب تک اس کی آتما اس کے شریر کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔"

اس کا حکم صادر ہوتے ہی شہریار پر قیامت ٹوٹ پڑی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ خود بھی اپنی بھیانک چیخیں سننے سے محروم ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

"چودھری افتخار بھارت سے دُبئی پہنچ گیا ہے۔"

"بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر کار اسے لوٹ کر یہاں آنا ہی ہے۔" ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر جاوید علی نے دانت کچکچا کر تبصرہ کیا۔

"واپس تو خیر وہ ضرور آئے گا۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کون سے ٹھوس ثبوت ہیں جو وہ ڈر کر یہاں رخ نہ کرے۔" ذیشان نے حقیقت بیان کی تو جاوید سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا۔

"طوائف کے قتل والے کیس کا کیا ہوا؟ اس میں تو چودھری، چندا بائی کے ساتھ نامزد مجرم تھا نا؟"

"میری عمیر سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ اس کیس کے دونوں اہم گواہ اور مدعی چاندنی اور اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے چودھری اور چندا بائی کے خلاف کیس واپس لینے کی درخواست دائر کر دی ہے۔"

"اوہ نو....." ذیشان کی دی ہوئی اطلاع نے اسے صدمہ پہنچایا۔ "عمیر نے اس سلسلے میں معلومات تو کی ہوں گی۔ کیا ان دونوں کو ڈرا دھمکا کر کیس واپس لینے پر مجبور کیا گیا ہے؟"

"امکان تو یہی ہے۔ لیکن وہ دونوں اس سلسلے میں زبان نہیں کھول رہے ہیں۔ عمیر نے جگو کے ذریعے صورت حال جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بس دونوں میاں بیوی کی ایک ہی رٹ ہے کہ اب یہ کیس نہیں لڑنا چاہتے۔" ذیشان نے اسے بتایا تو وہ افسردہ ہو گیا۔

"یہ بہت برا ہوا۔ قتل کے کیس سے چودھری نے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑا لی۔"

"اس جیسے جاگیرداروں کے لیے ایسے کیسز کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ ان سے اپنی جان چھڑانے کے طریقے اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے تو مزے سے انسانی جانوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک طوائف کی کیا حیثیت ہے۔ چودھری کے اعمال نامے میں تو نہ جانے کتنے معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خونِ ناحق لکھا ہوا ہے لیکن ہر بار وہ ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے بچ نکلتا ہے۔ شہریار کے دور میں اس نے اساتذہ کے رہائشی مکان میں آگ لگوا دی تھی جس کے نتیجے میں ایک نوجوان استاد غیب جل کر مر گیا تھا لیکن چودھری کا بال بھی نہیں بگڑا۔ گاؤں والوں میں سے کسی نے چودھری یا اس کے کارندوں کے خلاف گواہی دینے کی زحمت نہیں کی۔" ذیشان حقائق بیان کرتے ہوئے خود بھی خاصا تلخ ہو گیا۔

"ہمارا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ ہم ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے اور اپنی بزدلی سے ظالم کو مزید ظالم بناتے جاتے ہیں۔" جاوید علی نے تبصرہ کیا اور خیال آنے پر پوچھا۔ "آپ چودھری کی حویلی فون کالز بھی تو ٹیپ کروانے والے تھے، اس کام کا کیا ہوا؟"

"کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔" ذیشان نے شانے اُچکائے۔ "حویلی کی لینڈ لائن سمیت چودھری اور اس کے خاص ملازمین کے موبائل فونز تک کی کالز چیک کی جا رہی ہیں لیکن کہیں سے کوئی کلیو نہیں مل رہا۔ ہمارے پاس

کالز کی جو ریکارڈنگ پہنچ رہی ہے، ان میں چودھری کی کسی غیر قانونی سرگرمی کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ پوری طرح چوکنا ہے اور اسے اندازہ ہے کہ فون پر کی جانے والی گفتگو اس کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی ہے اس لیے وہ احتیاط کر رہا ہے۔" ذیشان کا جواب سن کر اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ایسا ہی لگتا ہے لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ پھر چودھری اپنے یہاں کے کام کیسے چلا رہا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے آدمیوں کو ہدایات تو دینی پڑتی ہوں گی۔ ملازمین بھی اسے یہاں کی اطلاعات دیتے ہوں گے۔ لیکن جو ریکارڈنگز ہمارے پاس آتی ہیں ان میں کوئی سن گن نہیں ہے۔ تم شاہد اور چاندنی والے معاملے کو ہی لے لو۔ اگر چودھری کے کارندوں نے اپنے طور پر بھی ان کے خلاف کارروائی کی تھی تو اس کارنامے کو چودھری کے سامنے بیان تو کرنا چاہئے تھا لیکن بالکل خاموشی ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ پیر آباد سے دُور ہونے کے باوجود چودھری یہاں کے معاملات سے بے خبر ہو سکتا ہے؟" ذیشان نے ایک اہم سوال اُٹھایا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چودھری کے لیے پیر آباد کی اہمیت مسلّم ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی آوارہ گردی کرتا پھرے لیکن لوٹ کر اسے ہر حال میں پیر آباد ہی آنا ہے۔ اس کا اصل راج پاٹ تو وہیں ہے۔" جاوید علی نے بڑی بے ساختگی سے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

"بس مجھے یہی تشویش ہے کہ وہ رابطے کا کون سا ذریعہ استعمال کر رہا ہے؟" اس کی تائید ملتے ہی ذیشان پُر جوش ہو گیا۔ "ہم نیٹ سے لے کر فیکس اور ٹیلی گرام تک رابطے کے کسی بھی ذریعے سے غافل نہیں ہیں پھر بھی اندھیرے میں ہیں تو اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔ بس وہ وجہ ہی معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ البتہ چودھری کا منشی اللہ رکھا جس موبائل کمپنی کی سِم استعمال کرتا ہے، اس نے یہ عجیب وغریب بات بتائی ہے کہ بعض اوقات منشی کے موبائل فون کی گھنٹی بجتی ہے لیکن جیسے ہی ریکارڈنگ مشین کام کرنا شروع کرے، کال کٹ جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسی کسی کال کا کھوج بھی نہیں ملتا کہ یہ کس نمبر اور علاقے سے کی جا رہی تھی۔"

"یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے سر!" ذیشان کی بات سن کر وہ بے چین ہو گیا۔ "یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور چودھری جن لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے چودھری کو کوئی ایسی ڈیوائس دے رکھی ہو جس کی وجہ سے ہم اس کی کال تک نہیں پہنچ پا رہے۔" جاوید علی بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا۔ لیکن ان کی مجبوری تھی کہ ان کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دشمنوں کو اپنی چالیں چلنے دو۔ ایک نہ ایک دن تو ہم انہیں انجام تک پہنچا کر رہیں گے۔" ذیشان نے اپنے عزم کا اظہار کیا تو جاوید علی فوراً "انشاء اللہ" کہہ اُٹھا۔

"تمہیں معلوم ہے جاوید! تم میرے سب سے قابل ماتحت ہو اسی لیے میں تم سے بہت کچھ شیئر کرتا ہوں۔ آج کل مجھے بھارت میں کام کرنے والے اپنے اسپیشل ایجنٹ عادل خان کی بہت فکر ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے اور ڈر رہا ہوں کہ وہ کہیں پھنس نہ گیا ہو۔" یہ ان کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن ذیشان دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے سامنے اپنی پریشانی بیان کر بیٹھا۔

"یہ عادل خان وہی تو نہیں ہیں سر! جنہوں نے کراچی میں میرے ساتھ کام کیا تھا؟..... وہ بہت دلیر



بہادر آدمی ہیں اور میری خواہش ہے کہ مجھے پھر کبھی دوبارہ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل سکے۔"

"ہاں، میں اسی عادل خان کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر مجھے یقین ہے کہ بھارتی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ اگر ان کی گرفت میں آ بھی گئے تو وہ دن قابو میں نہیں رہیں گے۔ ان جیسے بہادروں کو زیر کرنا بھارتی چوہوں کے بس کی بات نہیں ہے۔" اس نے بڑے یقین سے ذیشان کو اُمید دلائی۔

"اللہ کرے تمہارا یہ گمان سچ ثابت ہو۔ میں بھی اس کے لیے کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں۔" جاوید علی کو یہ مختصر جواب دے کر وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن ذہن بہت سی فکروں میں اُلجھا ہوا تھا۔

ان فکروں میں شہریار کی سلامتی کے علاوہ ماہ بانو کی فکر بھی شامل تھی۔ اسے مشابرم خان کے آرلینڈو پہنچنے کی اطلاع مل گئی تھی لیکن اس کے بعد ابھی تک خاموشی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ مشابرم خان وہاں مصطفیٰ خان کی ہدایت سے کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ تو اس دن سے بھی خوف زدہ تھا جب شہریار سے سامنا ہوتا اور وہ اسے ماہ بانو سے متعلق کوئی اچھی خبر دینے سے معذور ہوتا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان جنگل میں تھا۔

اس کا ساتھ دینے کے لیے مصطفیٰ خان نے ایک آدمی کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ وہ دونوں تمام ضروری سامان سے لیس تھے اس لیے انہیں جنگل میں سفر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی اور وہ تیزی سے منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ مصطفیٰ خان نے انہیں لیب کی لوکیشن سے کافی حد تک آگاہ کر دیا تھا اس لیے ان کا سفر ایک مخصوص سمت میں جاری تھا۔

"جنگل میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔" مشابرم خان کے ساتھی نے بہت دُور اُٹھتے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر اسے بلند آواز میں آگاہ کیا۔

"واقعی..... لیکن یہ آگ لگی کیسے؟" مشابرم خان نے بھی اس جانب دیکھا اور حیرت کا اظہار کیا۔

"یہاں جنگلوں میں آگ لگنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مختلف قدرتی عوامل کی وجہ سے ایسا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ یہ آگ لگ بھگ اسی جگہ پر لگی ہوئی ہے جہاں لیب کی موجودگی کا گمان ہے۔" اس نے بتایا تو مشابرم خان کے چہرے پر پریشانی دوڑ گئی۔

"اب ہم کیا کریں فہد!..... ہمیں تو جانا ہی لیب کی طرف تھا؟"

"ہمارے پاس آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جنگل میں آگ بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ آگے بڑھنا موت کے مترادف ہو گا۔ ہمارے پاس واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" فہد نے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

"لیکن ہم اس طرح ناکام کیسے واپس لوٹ سکتے ہیں؟ مصطفیٰ صاحب کو پورا یقین تھا کہ ماہ بانو کو اس میں رکھا گیا ہے۔ اگر لیب جل رہی ہے تو ماہ بانو کی زندگی کو بھی تو خطرہ ہو گا۔ ہمیں اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہئے۔" مشابرم خان بے چین ہو گیا۔

"تمہارا خدشہ غلط نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر اس لڑکی کو بچا لینے کا امکان ہوتا تو میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر وہ اس وقت لیب میں موجود ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ ہم بھی اس کی زندگی کے لیے کسی معجزے کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا۔ مشابرم خان کو بھی قائل ہونا پڑا۔ کیونکہ بہت زیادہ فاصلہ ہو
کے باوجود اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ کی شدت بہت زیادہ ہے اور کسی ذی روح کے بچنے کا امکان نہیں لیکن
بھی اس کا دل وہاں سے واپسی کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ شہریار کی ایسی محبت تھی جس کا اس نے کبھی زبان سے اعتراف یا اظہار
نہیں کیا تھا لیکن اس کے ہر ہر عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دنیا کا ہر سکھ اور خوشی دینے کا خواہش مند
ہے۔ شہریار جب حادثے کا شکار ہوا اور نامعلوم مدت کے لیے کومے کی حالت میں ہسپتال کے بستر پر لیٹ
گیا تو اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے ہر وقت یہ دُکھ کھائے جاتا تھا کہ اگر میں اے سی صاحب کے
ساتھ ہوتا تو اپنی جان وار کر بھی انہیں بچا لیتا۔ لیکن قسمت نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ اب اسے موقع ملا
کہ شہریار نہ سہی، اس کی محبت کو بچا لے تو ساری راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو یار؟..... واپس چلو۔ یہاں آگ بجھانے کی کوششیں شروع ہوئیں تو ہم کسی کی
نظروں میں آ جائیں گے اور جواب دہی کرنی پڑے گی کہ ہم بغیر پرمٹ کے جنگل میں کیا کر رہے ہیں۔'' اس
سوچوں میں گھرا دیکھ کر فہد نے اسے ٹوکا۔

''تم واپس چلے جاؤ فہد!..... میں ماہ بانو کو لیے بغیر واپس نہیں جا سکتا۔'' آخر کار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ اس وقت تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ واپس چلو۔ ہم
واپس جا کر سر سے حالات کے مطابق نئی ہدایات لینی ہوں گی۔'' فہد نے جھنجلاتے ہوئے اسے سمجھانے کی
کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

فہد نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر وہ دونوں ہی چونک
گئے۔ بلاشبہ وہ فائر کی ہی آواز تھی جو انہیں سنائی دی تھی۔ وہ دونوں ہی اسلحہ شناس تھے اس لیے آواز سن کر
اندازہ لگا سکتے تھے کہ فائر رائفل یا شارٹ گن کے بجائے پسٹل سے کیا گیا ہے اور ظاہر ہے شکاری حضرات
پسٹل کا استعمال نہیں کرتے۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' مشابرم خان فوراً ہی آواز کی سمت دوڑا۔ فہد نے بھی اس کی پیروی کی۔ ایک
کے بعد انہیں کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بس وہ اندازے سے ہی ایک سمت بڑھتے جا رہے تھے۔

بھاگتے ہوئے انہیں اس بات کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا کہ ان کے قدموں تلے سوکھے پتے آ کر
چرمرائیں۔ کیونکہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے کی کیا صورتِ حال ہے اور انہیں دوست دشمن یا غیر جانب دار
میں سے کس کا سامنا کرنا ہے۔

''وہ دیکھو، وہ کیا ہے؟'' اچانک ہی فہد نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مشابرم خان نے
اس طرف نظر ڈالی۔

وہ ایک موٹر سائیکل تھی جو بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا
ہے۔ موٹر سائیکل سے کچھ فاصلے پر انہیں آڑی ترچھی حالت میں پڑی ایک آدمی کی لاش بھی دکھائی دے گئی۔
لاش کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی تھی جس سے بھیجہ باہر آ گیا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی اندازہ قائم کر لیا کہ گولی کا شکار بننے والا شخص یہی ہے۔ لیکن گولی چلانے والے کا
اتہ پتہ نہیں تھا اسی لیے وہ سامنے آتے ہوئے بھی احتیاط کر رہے تھے کہ کہیں وہ چھپا ہوا آدمی انہیں ہی نشانہ
بنا لے۔ درختوں کی آڑ سے چپکے چپکے جائزہ لیتے ہوئے مشابرم خان کی نظر ایڈی پر پڑی۔



''وہ دیکھو، وہاں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ وہ شدید زخمی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس
میں حرکت کر رہا ہے۔'' زخمی ایڈی کو دیکھ کر وہ پُر جوش ہو گیا۔

''میں جا کر اُسے دیکھتا ہوں۔ تم یہیں رُک کر مجھے کور دو اور اردگرد پر نظر رکھو۔'' اب اس کے لیے اپنی
جگہ پر رکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایک سات آٹھ سالہ بچے کو جنگل میں زخمی حالت میں بے یار و مددگار پڑا دیکھتے
کسی بھی انسان دوست کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ فہد کی طرف سے کوئی جواب ملنے سے قبل ہی وہ درخت
سے نکل کر بچے کی طرف بڑھ چکا تھا۔

اس کے قریب پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس کی نبض چیک کی۔ نبض بہت آہستہ چل رہی تھی اور
وہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر اسے فوری طبی امداد نہیں ملی تو وہ زندہ نہیں بچ پائے گا۔ لیکن اس جنگل سے ہسپتال
پہنچنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ پیدل تھے اور انہیں جنگل کے قریب ڈراپ کر کے جانے والا ان کا
ڈرائیور واپس لوٹ چکا تھا۔

ایڈی کا سر ذرا سا اوپر اٹھا کر اس نے پہلے اپنے پاس موجود پانی کی بوتل سے اس کے چہرے پر چھینٹے
مارے۔ بوتل اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

بہت تھوڑا سا پانی اس کے منہ کے اندر گیا اور زیادہ تر باچھوں سے بہہ گیا۔ پھر بھی مشابرم خان نے اپنی
کوشش ترک نہیں کی اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے سہلا کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا رہا۔ اس عمل کے
دوران اسے احساس ہوا کہ بچہ اس کے اندازے سے زیادہ زخمی ہے۔ اس کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور
یہ بعید نہ تھا کہ اندرونی اعضا کو بھی نقصان پہنچا ہو۔ پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقتاً اسے
سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کس طرح فرسٹ ایڈ دے۔ اس کا جسم بری طرح لہولہان ہو رہا تھا اور لباس کی
وجہ سے خون کی سرخی غالب آ گئی تھی۔ اس حالت میں یہ سمجھنا ہی مشکل تھا کہ اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی
ہیں۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کا سر خاصی حد تک محفوظ تھا اور سر اور چہرے پر چند معمولی سی خراشوں
کے علاوہ کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

''آہ..... آہ.....'' آخر کار اس کی کوششیں رنگ لائیں اور بچے کے منہ سے کراہیں نکلیں لیکن اس کی
آنکھیں اب بھی بند تھیں اور پپوٹے یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ انہیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اے بچے! اُٹھو..... آنکھیں کھولو اور بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مشابرم خان نے اس کے گال
تھپتھپائے تو وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ان آنکھوں میں شدید نقاہت تھی۔

حقیقتاً اُس کا اتنا زیادہ خون بہہ چکا تھا کہ آنکھیں کھول لینا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ وہ صرف حالیہ حادثے
میں زخمی نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے قبل اسے ٹانگ میں گولی بھی لگ چکی تھی۔ گولی کا وہ زخم بھی اس حالیہ
دوڑ میں کھل گیا تھا اور خون کا بہاؤ دوگنا ہو گیا تھا۔

''بیٹا! تم کون ہو؟ اور یہاں اس جنگل میں کیسے پہنچے؟'' مشابرم خان نے محبت اور ہمدردی سے اسے
پوچھتے ہوئے سوال کیا۔ ایک گائیڈ اور پھر افسران کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنے کی وجہ سے اس کی
قوتِ گویائی کی استعداد اچھی تھی اس لیے وہ اس معاملے میں کسی دشواری کا شکار نہیں تھا۔

''میں تو پیدا ہی اس جنگل میں ہوا ہوں۔'' مشابرم خان کے سوال کے جواب میں یہ جملہ کہہ کر ایڈی نے
مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث بس ہونٹ کھنچ کر رہ گئے۔

''کیا مطلب؟'' مشابرم خان حیران ہوا۔

"تم پتہ نہیں کون ہو لیکن میری زندگی ختم ہونے والی ہے، اس لیے میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں اُمید پر کہ شاید تمہارے ذریعے یہ داستان باہر کی دنیا تک پہنچ جائے۔"

اُس کا اندازِ گفتگو مشابرم خان کو حیران کر رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بچے کو اس انداز میں ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تو ایڈی تھا۔ پروفیسر ہنری کی تحقیق اور تجربات کا نتیجہ جو اپنے آٹھ سالہ وجود جوان آدمی کا دماغ اور جذبات رکھتا تھا۔

"اس جنگل میں زیرِ زمین ایک تجربہ گاہ ہے جہاں نوزائیدہ بچوں اور حاملہ خواتین کو تجربات جاتا ہے۔ اس لیب کا انچارج پروفیسر ہنری تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا بچہ "ایجاد" کر سکے جو میں تو بچہ ہی ہو لیکن اس کی کھوپڑی میں بڑے آدمی کا دماغ ہو۔ اُس کی اس خواہش کے پیچھے کیا مقصد تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس چکر میں اس نے بڑا ظلم کیا اور انسان کے بچوں کو گنی پگ کی اپنے تجربات کی نذر کر دیا۔ اس کے ظلم و ستم کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کب تک جاری رہتا لیکن خدا کی قدرت وہ ماہ بانو نامی ایک ایسی عورت کو اپنی تجربہ گاہ میں لانے کی غلطی کر بیٹھا جس کا شوہر اس سے دیوانہ وار کرتا تھا۔"

ماہ بانو کا نام سن کر مشابرم خان بری طرح چونکا لیکن ایڈی کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور تسلی سے اس اختصار سے بیان کیے واقعات سنتا رہا۔

ایڈی نے اسے بتا دیا کہ کیسے اسلم ان لوگوں کو لے کر لیب سے نکلا اور پھر پروفیسر سے ٹکراؤ کے میں اس کے ساتھ ہی ایک دلدل میں جا گرا۔ اس نے ماہ بانو کو یہاں سے نکالنے اور پھر طارق کو گولی مار تک کے سارے ضروری واقعات بیان کر دیے۔ لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مشابرم خان کو باقاعدہ کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک لے جانا پڑا تھا۔

ایڈی کی زبانی اسلم کی موت اور ماہ بانو کے زندہ بچ نکلنے کی اطلاع نے اسے بیک وقت افسوس اور کے جذبات سے ہمکنار کر دیا تھا اور وہ پہاڑوں کا بیٹا ہونے کے باوجود آنکھوں سے آنسو بہا رہا تھا۔ ان سے بہت سے آنسو ایڈی سے اظہارِ عقیدت کے لیے بھی تھے جس نے اپنے نحیف و نزار وجود کے ساتھ کو طارق جیسے شیطان کے چنگل سے نکال دیا تھا۔

"ہم تمہیں ہسپتال لے جاتے ہیں۔ وہاں تمہیں بہتر ٹریٹمنٹ ملے گا تو تم بچ جاؤ گے۔" اسے احساس رہا تھا کہ ایڈی کی نبض پہلے کے مقابلے میں مزید سست ہو چکی ہے پھر بھی اسے امید دلانے لگا۔

"نہیں، مجھے مزید گنی پگ بن کر رہنا منظور نہیں۔ ویسے بھی اب میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ تم ہمت تو یہ داستان دنیا کے سامنے لے آنا۔"

ایڈی نے اپنی آنکھوں کی بجھتی روشنی میں اُمید کا دیا جلاتے ہوئے اس سے کہا تو اسے یقین دلانے لیے مشابرم خان نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دوست! کہ ایک دن یہ راز دنیا کے سامنے لا کر دنیا کی سب سے مہذب ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی اخلاقی پستی اور مجرمانہ ذہنیت کو ضرور عریاں کروں گا کیونکہ تم میرے محسن تم نے جس لڑکی کی جان بچائی ہے، وہ مجھے اپنی سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔" ایڈی سے وعدہ کرتے مشابرم خان جذباتی ہو گیا۔

"اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ لیکن یاد رکھنا کہ سب سے پہلے اپنی بہن کی حفاظت کا انتظام کرنا ہے



اس جنگل سے نکل جانے کے باوجود پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ لوگ اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" اس نے کسی سمجھ دار آدمی کی طرح مشابرم خان کو نصیحت کی پھر اس سے تھوڑا سا پانی پلانے کی درخواست کر بیٹھا۔

مشابرم خان نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے ہونٹوں سے لگائی۔ ایڈی نے ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور پھر ایک زوردار ہچکی لے کر آنکھیں موند لیں۔ باقی کا پانی اُس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ مشابرم خان اسے ہلا رکھ کر اسے دیوانہ وار ٹٹولنے لگا لیکن اس کے چھوٹے سے وجود میں کہیں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں تھی۔

"ہمیں یہاں سے چلنا ہو گا خان!" فہد جو نہ جانے کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ ہوش میں آیا اور ایڈی کا سر آہستگی سے واپس زمین پر رکھ دیا۔ اس معصوم و مظلوم وجود کو یہاں چھوڑ کر جانا اس پر گراں گزر رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ ایڈی کی وصیت پر عمل کرنے اور ماہ بانو کی سلامتی کا انتظام کرنے کے لیے ان کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ ورنہ تاخیر کی صورت میں وہ خود بھی پھنس سکتے تھے۔ وہ فہد کے ساتھ واپسی کی راہ پر گامزن ہوا تو دل بری طرح بوجھل تھا۔

⊛----✪----⊛

"کیا خبر ہے ڈاکٹر؟" کلینک کی انتظار گاہ میں بیٹھی کشور نے ڈاکٹر کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا تو ڈاکٹر تسلی آمیز انداز میں دھیرے سے مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ کے دونوں مریض خطرے سے باہر ہیں۔ خاتون سے ملاقات میں تو فی الحال کچھ وقت لگے گا اگر آپ چاہیں تو مسٹر شاہ سے مل سکتی ہیں۔"

"مسٹر شاہ....." کشور جو مراد شاہ کے سانپ سے ڈسے جانے کے واقعے سے لاعلم تھی، حیران ہوئی۔ "انہیں کیا ہوا ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟..... اُنہیں نہایت خطرناک سانپ نے ڈسا تھا لیکن یہاں آنے سے پہلے اچھی خاصی ایڈرنل گئی تھی اس لیے زہر زیادہ پھیل نہیں سکا۔"

ڈاکٹر کے انکشاف پر کشور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہاں آتے وقت اس کی پوری توجہ ماہ بانو کو سنبھالنے مرکوز رہی تھی اس لیے اسے مراد شاہ کی حالت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور اسے ایمبولینس میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ ان کے تنہا ہونے کے خیال سے ساتھ جا رہا ہے۔ کیونکہ آفتاب تو اُمید کی وجہ سے گھر رہنے پر مجبور تھا لیکن اب اسے یاد آ رہا تھا کہ ان کے ایمبولینس میں سوار ہوتے وقت آفتاب نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے کچھ گفتگو کی تھی جو یقیناً مراد شاہ کے متعلق ہی ہو گی۔

"میں مسٹر شاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر سے فرمائش کی۔

"کیوں نہیں۔ وہ رُوم نمبر تین میں موجود ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے بتایا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر کلینک کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں مریضوں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔

یہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا جسے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والا ایک ڈاکٹر اپنے معاونین کی مدد سے چلا رہا تھا۔ مصطفیٰ کے اس ڈاکٹر سے گہرے مراسم کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی تھی کہ مذہبی طور پر ڈاکٹر بھی مسلمان ہی تھا اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس ایک ظاہری وجہ کے علاوہ بھی کوئی ایسی وجہ ہو گی کہ مصطفیٰ خان نے ان میں اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ماہ بانو کو یہاں بھجوایا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی لالہ؟..... آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ آپ کو سانپ نے ڈسا ہے؟" بیڈ

پر نیم دراز مراد شاہ کو دیکھتے ہی اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی زبانی سنی خبر اس کے لیے تو ایک صدمہ ہی ثابت ہوئی تھی ورنہ تو اسے یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کلینک پہنچ کر مراد شاہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

''ریلیکس بہنا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اسی لیے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا کہ خوامخواہ تمہاری پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا۔'' مراد شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

''لیکن یہ ہوا کیسے؟ یہاں ایسے واقعات اتنے عام تو نہیں ہیں۔'' وہ ساری تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ جواب میں مراد شاہ نے اپنے سانپ سے ڈسے جانے اور ماہ بانو کی مدد سے لے کر ان کے گھر پہنچنے تک کی ساری کتھا سنا ڈالی جسے سن کر کشور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اگر آج ابا جی میرے سامنے ہوتے تو انہیں ضرور احساس دلاتی کہ وہ لڑکی جس کی زندگی برباد کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، آج آپ کے بیٹے کی زندگی بچانے کا وسیلہ بن گئی۔

''کیا مطلب؟'' اس بار حیران ہونے کی باری مراد شاہ کی تھی۔

''یہ ابا جی کے ظلم کی بڑی شرم ناک داستان ہے جسے آپ کے سامنے بیان کرتے ہوئے مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔''

''پھر بھی، کچھ تو بتاؤ۔'' کشور کے گریز نے مراد شاہ کے تجسس میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے اصرار پر کشور نے مختصراً مناسب الفاظ میں ماہ بانو کی داستانِ حیات سنا ڈالی۔

''یہ تو واقعی بہت ظلم کیا ابا جی نے۔ کتنی پاک اور شفاف لڑکی ہے وہ۔ اسے تو ایک نظر دیکھ کر اس کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے اور ابا جی نہ جانے کیسے تین تین بیٹیوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی اتنی معصوم اور کم سن لڑکی کے لیے ناپاک عزائم رکھتے تھے۔'' اپنے باپ کے کردار سے آگاہ ہونے کے باوجود اسے دلی رنج ہوا۔

''لا الہ!..... اللہ کے بعد آپ پر ماہ بانو کا احسان ہے کہ اس وقت آپ صحیح سلامت بیٹھے ہوئے ہیں اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اس کے لیے ضرور کچھ کیجیے گا۔ ابا جی کی اولاد میں سے واحد آپ ہی ہیں جو ان کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں اور وارث کی حیثیت سے آپ کا فرض بھی بنتا ہے کہ ان کے کیے کی تلافی کریں۔'' کشور نے اس سے درخواست کی۔

''بالکل۔ مجھ سے جو ہو سکا، اس کے لیے ضرور کروں گا۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس کا ابھی کیا حال ہے؟'' مراد شاہ نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے ماہ بانو کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔'' مراد شاہ کو جواب دیتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی معلومات ادھوری ہیں۔ دراصل بھائی کے بارے میں خبر سن کر فطری طور پر وہ اس کے لیے اتنی فکر مند ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر سے ماہ بانو کے بارے میں تفصیلات جاننے کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور اسے اپنے اس رویے پر شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ اور اس کی خیر خبر لو۔'' مراد شاہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے رسماً سے کہا تو وہ کمرے سے نکل گئی اور انکوائری سے ماہ بانو کا کمرہ معلوم کر کے وہاں پہنچ گئی۔

ماہ بانو تکیے پر سر رکھے گہری نیند سو رہی تھی اور ایک نرس اس کی دیکھ بھال کے لیے مستعد بیٹھی ہوئی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟'' اس نے نرس سے ہی دریافت کیا۔



''پہلے سے بہت بہتر ہیں لیکن ابھی بہت دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ کیس خاصا مشکل تھا اور ان کی حالت نے مزید مشکل بنا دیا تھا۔ میرے خدا!..... میں نے اپنے آٹھ سال کے کیریئر میں کسی حاملہ خاتون کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔ حقیقتاً ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے ان کے زخموں کی مرہم پٹی کریں یا بے بی کو باہر کروائیں۔ بس سمجھیں کہ اوپر والے کی مہربانی سے ماں اور بچے کی زندگی بچ گئی ورنہ ہمیں تو دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔'' نرس نے گویا کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

''ان کے ہاں کیا ہوا ہے؟..... بیٹا یا بیٹی؟'' کشور نے تجسس سے پوچھا۔

''بیٹا ہے۔ لیکن ابھی اسے ہم نے انڈر آبزرویشن رکھا ہوا ہے۔'' نرس نے اسے اطلاع دی۔

''اس کی جان کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا؟ اصل میں، میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پری میچور بچے عام طور پر بہت کمزور ہوتے ہیں اور ان کا سروائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' سوال کرنے کے ساتھ ہی اس نے وضاحت بھی پیش کی۔ ماہ بانو ان کی گفتگو سے بے نیاز بے خبر سوئی ہوئی اور یقیناً ایسا مسکّن دواؤں کے استعمال کی وجہ سے تھا۔

''ارے نہیں، صحت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عمومی پری میچور بچوں کے مقابلے میں اس کی صحت بہت اچھی ہے۔ وزن کے اعتبار سے وہ بالکل نارمل بچوں جیسا ہے۔ لیکن اس کا بایاں ہاتھ نارمل سائز کا نہیں ہے اور امکان ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے اس ہاتھ کو استعمال کرنے سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر جائزہ لے رہے ہیں کہ اس میں کوئی اور کمی یا پیچیدگی تو نہیں ہے۔''

نرس نے پروفیشنل انداز میں آگاہ کیا تو کشور افسردہ ہو گئی اور اسے دُکھ ہونے لگا کہ اتنی تکلیفوں کے بعد ماہ بانو کے حصے والی یہ خوشی بھی ادھوری سی ہے۔ اسی وقت دروازہ ناک کر کے بلقیس اندر داخل ہوئیں۔

''کیسی ہے مہرین؟'' انہوں نے ماہ بانو کا وہ نام لے کر پوچھا جو اس کے پاسپورٹ پر درج تھا۔ چونکہ مخاطب کشور تھی، اس لیے اس نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ مائی گاڈ! میرے پاس بھی اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' انہوں نے افسوس سے کہا اور بتایا۔ ''مصطفیٰ کو اطلاع ملی ہے کہ اسلم کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ وہ ایک دلدل میں گر گیا تھا جہاں سے اسے نکال نہیں جا سکا۔'' ان کی دی اس اطلاع نے کشور کو لرزا کر رکھ دیا۔

''میرے اللہ!..... یہ لڑکی آخر اتنے صدمے ایک ساتھ کیسے برداشت کرے گی؟'' وہ سخت متفکر تھی۔

''ہمیں اُسے حوصلہ دینا ہو گا۔ یوں بھی یہ بہت باہمت لڑکی ہے۔ جلد یا بدیر اللہ کی رضا میں راضی ہو جائے گی۔ وہ مالک اپنے بندوں کو آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے لیکن ان پر ظلم نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس ساری لڑکی کے لیے اُن دُکھوں کے بعد کوئی بہت اچھا صلہ رکھا ہو گا اس نے۔''

مسز بلقیس زیادہ بردبار خاتون تھیں اس لیے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مثبت انداز میں سوچنے لگیں۔ ان سے کشور کو بھی ڈھارس ملی اور ساتھ ہی یہ تسلی بھی ہو گئی کہ وہ بلقیس کے ساتھ مل کر اس صورتِ حال کو زیادہ اچھی طرح نمٹ سکے گی۔ کسی کو حوصلہ دینے کے لیے انسان کے اپنے پاس بھی حوصلہ ہونا ضروری ہے اور اس وقت بلقیس اس کا حوصلہ بن گئی تھیں۔

⊛----✪----⊛

وہ بے لباسی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوا تھا اور جوڑ جوڑ دُکھتے جسم میں فرش کی ٹھنڈک اُتر کر اس کے احساس کو مزید سُوا کر رہی تھی۔

بھوک، پیاس اور تشدد نے جسم کو اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ کروٹ بدلنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا اور
میں ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو حلقوں میں حرکت کر رہی تھیں
ان کے سامنے بھی دُھند سی چھائی ہوئی تھی اور کوئی منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ یکدم ہی اُسے دُھند کے ا
حرکت کا احساس ہوا۔ کوئی تھا جو دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

وہ بصارت پر زور دے کر آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی نظروں نے سب
سیاہ رنگ کی اس چادر کو فوکس کیا جس پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ وہ
گیا۔ اس قید خانے میں بھلا عورت کا کیا کام تھا؟ حیرت زدہ سا وہ چادر میں لپٹے اس ہیولے کو اپنی
بڑھتا دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار واضح نہیں تھے لیکن یہ چادر اس کے لیے ضرور آشنا تھی۔ اُس نے اس
کہاں دیکھا ہے؟ اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا اور پھر یکایک ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ چادر تو اس
بلتستان کے سفر کے دوران بشام ہوٹل میں قیام کرنے پر ایک ویٹر سے خرید کر ماہ بانو کو دی تھی۔ وہ ویٹر
کی عورتوں کے ہاتھوں تیار کردہ دستکاری کے نمونے گاہکوں کو فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل کر
اسے یہ چادر ماہ بانو کے لیے اتنی پسند آئی کہ فوراً ہی خرید لی اور واقعی چادر ماہ بانو پر سج گئی تھی۔

لیکن یہاں کون تھا جو وہ چادر پہنے اس کے سامنے چلا آیا تھا؟..... وہ اپنی پوری جان آنکھوں
کر دُھند سے اُبھرتی اس شبیہہ کو دیکھنے لگا۔ اور جب اس کے نقش و نگار واضح ہوئے تو گویا شادیٔ مرگ
مبتلا ہو گیا۔

''ماہ بانو!..... تم..... تم یہاں کیسے؟'' اس نے استعجاب و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''میں آپ کے لیے آئی ہوں۔ آپ اتنی تکلیف میں تھے کہ میں آپ سے دُور رہ ہی نہیں سکی اور
چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس چلی آئی۔'' وہ اُس کے قریب دو زانو بیٹھتی ہوئی اپنی شیریں آواز میں بولی
خوش ہو گیا۔ کسی کے لیے آپ اتنے اہم ہوں کہ وہ آپ کے لیے سب چھوڑ دے، یہ احساس ہوتا ہی
خوش کن ہے۔ لیکن اس کی خوشی پل بھر کی تھی کیونکہ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا ماہ بانو! تم اب اسلم کی ہو۔ تم پر بس اُس کا حق ہے۔'' دل پر جبر کر
اس نے ماہ بانو کو ٹوکا۔

''نہیں، مجھ پر سب سے پہلے آپ کا حق ہے۔ کیونکہ میرا آپ سے دل کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ
رشتوں پر بھاری ہوتا ہے۔'' وہ جو اس کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کر دیا کرتی تھی، ضدی لہجے میں بولی۔

''دنیا ان باتوں کو نہیں مانتی۔'' اس نے کمزور سے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور میں دنیا کو نہیں مانتی۔'' وہ مزید ضدی ہوئی۔

''اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ حلق بالکل خشک ہو رہا ہے۔'' اس نے بحث
کے لیے فرمائش کی۔ یوں بھی اسے بہت شدید پیاس لگ رہی تھی۔ اس کے فرمائش کرتے ہی ماہ بانو
کا بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے بہت بے چینی سے گلاس سے گھونٹ بھرنے کی کوشش
لیکن جانے کیا ہوا کہ گلاس ماہ بانو کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور سارا پانی بہہ گیا۔

''نہیں.....'' وہ زور سے چیخا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے عقوبت خانے
کے منظر میں ماہ بانو تھی اور نہ ہی زندگی کو رواں رکھنے والا پانی۔

وہ محض ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسا خواب جو اس کے دل کے چور خانوں میں چھپی تصویر کو سامنے



عام حالات میں اسے اپنے اعصاب پر اتنا قابو رہتا تھا کہ وہ کبھی ماہ بانو کے خیال کو خود پر حاوی نہیں
دیتا تھا۔ اس کے لیے زندگی کو سہل بنانے کی کوششیں اپنی جگہ لیکن اس کی پاکیزہ محبت کو یہ گوارا نہیں تھا
اسلم کی منکوحہ کو اپنے تصور میں لانے کی جسارت کر سکے۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان انتہائی خوشی اور
میں اسے یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہو۔ سو وہ بھی لاشعوری طور پر ماہ
اپنے تصور میں دیکھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ لیکن یہ تصور بھی ذرا دیر کا تھا اور حقیقت کی دنیا میں وہ اس حال
تھا کہ جوڑ جوڑ دُکھتے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت دینے کا بھی اہل نہیں تھا۔

اسے اس حال کو پہنچا دینے والے سورماؤں کو اس کی اتنی خراب حالت کے باوجود ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی
حرکت نہ کر ڈالے۔ چنانچہ انہوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر ڈالا ہوا تھا۔ ہر بار غیر انسانی تشدد سے
لے کے بعد وہ اسے یونہی تھوڑا سا وقفہ دیا کرتے تھے کہ شاید وہ اپنی شکست تسلیم کر لے لیکن وہ اپنی
ت کے باوجود ذہنی طور پر ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہاں، جان وہ ضرور لے سکتے
اس کے جانے کا اسے غم نہ ہوتا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر ہی گھر سے نکلا تھا۔

مکمل ہوش میں آنے کے بعد اپنے عزائم کو دل میں دہراتا وہ یونہی وقت کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ کمرے
دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر فوراً ہی اس کے نتھنوں سے ایک اشتہا انگیز خوشبو ٹکرائی۔ اس خوشبو کو سونگھ کر
دے میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور اس نے فوراً دروازے کی سمت دیکھا۔ ایک آدمی کھانے کی
اندر آ رہا تھا۔ ٹرالی اندر لا کر اس نے اس کرسی کے سامنے رکھ دی جس پر بیٹھ کر بھٹناگر اس سے
کرتا تھا۔ ٹرالی لائے جانے کے چند لمحوں کے بعد بھٹناگر خود بھی اندر آ گیا اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

''واہ..... کیا شاندار مہک ہے۔ سواد بھی لازمی اچھا ہو گا۔'' ٹرالی کے قریب چہرہ کر کے اس نے ایک
سانس کے ساتھ کھانے کی خوشبو اپنے اندر اُتاری اور جھوم کر بولا۔

شہریار سمجھ گیا کہ وہ اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے چنانچہ
طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

''چکن تکے سے اسٹارٹ کرتا ہوں۔ ایسا سنہری اور خستہ چکن تکہ میں نے اپنے جیون میں پہلے نہیں
اس کے بے نیازی برتنے کے باوجود وہ باز نہ آیا اور بلند آواز میں بول کر کھانا شروع کر دیا۔

اس کے کھانے کی آوازیں شہریار کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کتا
چھوڑ رہا ہو۔

''ارے بھئی، ہمارے مہمان کو تو کچھ دو۔ کہتے ہیں مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے اور بھگوان کی سیوا کرنا تو
ہے نا..... چلو پھر شروع ہو جاؤ۔''

اس کا یہ خطاب یقیناً کھانے کی ٹرالی لانے والے ماتحت سے تھا جس کے فوراً حرکت میں آ جانے کا
شہریار کو قدموں کی چاپ سے ہوا۔ کھٹر پٹر کی آوازوں کے بعد قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر
اور وہ اس کے بال سختی سے مٹھی میں پکڑ کر چلایا۔

''اوئے مہمان کے بچے! تیری خوراک کا سمے ہو گیا ہے۔'' اس نے زنجیروں میں جکڑے شہریار
زبردستی ایک آہنی خود پہنا دیا۔

شہریار جو آنکھیں کھول چکا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ آہنی خود کے ساتھ بجلی کے تار جڑے ہیں اور اسے
والا تاروں کے ساتھ موجود پلگ لے کر سوئچ پینل میں موجود ساکٹ میں لگا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی

سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے۔

''اپنے سارے حربے آزما کر دیکھ لو بھٹنا گر! لیکن تمہیں حاصل کچھ نہیں ہونے والا۔'' اس نے [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کیا۔

''تم کچھ بھی کہو۔ ہمیں تو اپنی پرم پرا (روایت) پوری کرنی ہے۔ ہم تمہاری پوری خاطر کریں [illegible] مرتے سمے یہ شکایت نہ کرو کہ ہم سے تمہاری سیوا میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا اور [illegible] سے کھانے میں مصروف ہوگیا۔

ادھر شہریار پر قیامت ٹوٹ گئی۔ بجلی کے وہ جھٹکے کتنی دیر تک اسے دیئے گئے، وہ صحیح حساب تو نہیں [illegible] لیکن حقیقتاً اس پر سے ایک قیامت گزر گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اوّل اوّل اُس نے ضبط سے کام لیے [illegible] کی اور چیخوں کو حلق میں ہی گھونٹتا رہا لیکن پھر اس کی یہ کوشش ناکام ہوگئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہو [illegible] فوراً ہی برقی رو منقطع کر دی گئی اور وہ ہانپتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند سیکنڈ [illegible] اندر اس کی حالت بری ہوگئی تھی اور اب پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

''اپنی ہار مان کر سب کچھ بتانے کا وعدہ کرو تو میرے ساتھ اس کھانے میں شریک ہو سکتے [illegible] ہمیں تمہاری کچھ نہ کچھ خاطر تو کرنی ہی ہے۔'' بھٹنا گر جو اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے اس کی [illegible] بغور جائزہ لے رہا تھا، بیک وقت ترغیب اور دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

''تجھ جیسے حرام کے پلّے کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے مقابلے میں مجھے اپنی جان [illegible] منظور ہے۔'' شہریار نے نفرت سے جواب دیا جسے سن کر بھٹنا گر کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ [illegible]

''اس کے دماغ کا علاج کرو۔'' اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا اور ایک بار پھر شہریار کو اس قیامت [illegible] گزرنا پڑا۔ اس بار دورانیہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ درمیان میں وقفہ دے کر اس سے زبان [illegible] کے بارے میں پوچھا گیا اور انکار پر دوبارہ اس اذیت سے گزارا گیا۔

نامعلوم کتنی بار وہ اس اذیت ناک مرحلے سے گزرا اور آخر کار بے ہوشی کی بانہوں میں جا کر [illegible] پائی۔ بے ہوشی کا یہ دورانیہ کتنی مدت پر محیط تھا، یہ اندازہ لگانے کے لیے اس کے پاس کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ [illegible] جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں ہر وقت نیم تاریکی رہتی تھی اور روشنی صرف اس وقت کی جاتی تھی جب وہ [illegible] پر کوئی ستم ڈھانے کے لیے اس عقوبت خانے میں قدم رکھتے تھے لیکن ابھی تک اسے توڑنے میں کامیاب [illegible] ہو سکے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا پھر فوراً ہی اس کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ وہ [illegible] خود نہیں آیا تھا بلکہ لایا گیا تھا اور اس کا ثبوت اس کا تر چہرہ تھا۔

''اُٹھ جاؤ یار! اتنی دیر لگائی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' ابھی اس نے اپنی زنجیریں کھولتے [illegible] دیکھا ہی تھا کہ اس کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ سو فیصدی سلّو کی آواز تھی لیکن وہ پھر بھی بے یقینی کا شکار [illegible] لگا اور ایسا محسوس ہوا کہ ماہ بانو کی طرح وہ سلّو کو بھی حالتِ خواب میں دیکھ رہا ہے۔

''ہری اپ.....! ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔'' سلّو نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تو اسے یقین [illegible] وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش پر اس [illegible] ہڈی نے بھرپور احتجاج کیا۔ تشدد اور مستقل بندھے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم فوری طور پر حرکت کر [illegible] قابل نہیں تھا۔ سلّو نے بھی یہ بات سمجھ لی اور ہمدردی سے بولا۔

''تم اپنے ہاتھ پیروں کو ہلا جُلا کر حرکت میں لانے کی کوشش کرو، میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ بغیر [illegible]



[illegible]ل گیا۔ شہریار اس کی ہدایت کے مطابق اپنے ہاتھ پیروں کو ہلانے جُلانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ [illegible] قابل ہوگیا کہ کھڑا ہو سکے۔ کھڑے ہونے کے بعد بھی اس نے حرکت جاری رکھی اور پنجوں کے بل اُچھلنے [illegible] علاوہ بازوؤں کو بھی حرکت دیتا رہا۔ ان کوششوں کے دوران اسے اندازہ ہوگیا کہ اگرچہ تشدد نے اس کے [illegible] کا کباڑا نکال دیا ہے لیکن وہ اتنا گیا گزرا نہیں کہ بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ سلّو کی [illegible] تک وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

''یہ لو، یہ کپڑے پہن لو۔'' وہ پینٹ شرٹ پر مشتمل ایک جوڑا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شہریار نے [illegible]گزاری کے گہرے احساس کے تحت جوڑا تھاما اور جلدی جلدی پہننے لگا۔ پینٹ لمبائی میں معمولی سی کم تھی [illegible] گزارہ ہو سکتا تھا۔ کم سے کم بے لباسی کے مقابلے میں تو سب کچھ قابلِ قبول تھا۔

''تم یہاں کیسے پہنچے؟'' اپنا بنیادی مسئلہ حل ہوتے ہی اُس نے سلّو سے پوچھا۔

''لمبی کہانی ہے۔ پہلے یہاں سے نکل جائیں، پھر بتاؤں گا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس [illegible] ہم ''را'' کے ایک ٹھکانے پر ہیں اور یہاں ہمیں کسی بھی وقت مشکل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

سلّو نے اُسے جواب دیا اور ساتھ ہی ایک پسٹل بھی تھما دیا۔ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ایک شارٹ گن [illegible] تھی۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو وہ مون ہوٹل سے اپنے ساتھ لے کر چلے تھے لیکن شہریار پھنس جانے کی وجہ سے [illegible] سے محروم ہوگیا تھا جبکہ سلّو پہلے ہی فرار ہو جانے کی وجہ سے اپنے پاس موجود اسلحہ بھی ساتھ لے جانے [illegible] کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ فرار ہو کر کہاں گیا تھا اور پھر یہاں کیسے پہنچا تھا؟ فی الحال یہ سب معلوم کرنے کا [illegible] نہیں تھا اور وہ قدم سے قدم ملائے سلّو کے ساتھ اس عقوبت خانے سے باہر جا رہا تھا۔ عقوبت خانہ زیر [illegible] قائم کیا گیا تھا اس لیے وہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔

وہ سلّو کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو تہ خانے کے آہنی دروازے کے قریب ایک آدمی عریاں [illegible] میں پڑا نظر آیا۔ اُس کی کھوپڑی چٹخی ہوئی تھی جو یقیناً شارٹ گن کے دستے سے لگائی گئی چوٹ کا نتیجہ [illegible]۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے جسم پر موجود لباس بھی اسی شخص کا ہے۔

''یہاں کتنے لوگ ہیں، مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے۔ میں سیدھا تم تک آیا تھا تاکہ دونوں مل کر [illegible] سے نکلنے کی تدبیر کر سکیں۔''

سلّو نے سرگوشی میں اسے بتایا اور وہ دونوں دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے کے بعد انہوں نے [illegible] دروازہ بند کر دیا۔ عریاں پہرے دار کی لاش بھی بند دروازے کے پیچھے ہی چھپ گئی۔

اب وہ ایک کوریڈر میں تھے جو فی الحال سنسان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک بالکل سیدھا اور سپاٹ دیواروں والا [illegible]ریڈور تھا جہاں نہ تو کسی کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا اور نہ ہی چھپنے کی کوئی جگہ تھی۔ چنانچہ وہ دونوں محتاط لیکن [illegible] قدموں سے وہاں سے گزر رہے تھے۔

ابھی انہوں نے آدھا کوریڈور پار کیا تھا کہ آخری سرے پر موجود دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل [illegible]۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جبکہ اس کی گن [illegible] کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی۔ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ پہرے دار کا ساتھی تھا جو چائے لینے گیا ہوا تھا اور [illegible] کی غیر موجودگی میں یہاں بازی پلٹ گئی تھی۔ پورے اطمینان سے واپس آتے ہوئے وہ اس منظر کا گمان [illegible] نہیں کر سکتا تھا جو اس کے سامنے تھا۔ چنانچہ پہلے ردِعمل کے طور پر اس نے یوں منہ کھولا جیسے اپنے سامنے [illegible]ات دیکھ لیا ہو۔ پھر چائے کی ٹرے ہاتھ سے چھوڑ کر گن سنبھالنی ہی چاہی لیکن اس سے قبل ہی سلّو حرکت

میں آ چکا تھا۔ اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی سے جست لگائی اور آنے والے کے گن سنبھالنے سے پہلے اس
جا پڑا۔

اگلے لمحے وہ اس کے نیچے تھا اور سلّو ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبوچے دوسرے سے اسے تابڑ توڑ کے
رہا تھا۔ اس دوران شہریار بھی حرکت میں آیا اور دروازے کے قریب جا کر باہر جھانکا۔ کہیں کسی کے کوئی آ
نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور پلٹ کر سلّو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے شکار کی اچھی خاص
درگت بنا چکا تھا اور اس طرح اس پر چھا گیا تھا کہ اسے جوابی ردِعمل ظاہر کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

''عمارت میں کتنے لوگ ہیں؟'' اسے سیکنڈوں میں اچھا خاصا ادھ موا کر دینے کے بعد اس نے سوال
جس کے جواب میں اس آدمی نے زور سے نفی میں گردن ہلائی جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے سوال کا جواب
دینے کے لیے راضی نہیں ہے۔

''اس سے سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے آف کر دو۔ ہم باہر نکل کر خود ہی
سے نمٹ لیں گے۔'' شہریار کا اندازہ تھا کہ ''را'' کے کسی گرگے سے معلومات اُگلوانا اتنا آسان نہیں ہوگا اس
لیے اس نے سلّو کو مشورہ دیا۔

''تم ابھی دیکھنا کہ یہ کیسے طوطے کی طرح فرفر بولے گا۔'' سلّو یکدم ہی کھڑا ہو گیا اور اپنا ایک
آدمی کے سینے پر رکھنے کے بعد دوسرے کو کچھ اس انداز میں اس کی گردن پر رکھا کہ اس کا چہرہ بائیں رخ
اور جسم نے ایک زور کا جھٹکا کھایا لیکن منہ آزاد ہونے کے باوجود اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ کے
کوئی آواز برآمد نہیں ہو سکی۔

''اب بولو کہ یہاں کتنے آدمی موجود ہیں؟'' سلّو کے لہجے میں درندے کی سی غراہٹ تھی۔ سوال کر
کے بعد اس نے اس شخص کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ تھوڑا کم کیا۔ وہ فوراً ہی کسی کتے کی طرح ہانپ
کر سانس لینے لگا۔

''میرے سوال کا جواب دو۔'' سلّو نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

''بتاتا ہوں.....'' وہ رحم طلب لہجے میں بولا اور پھر فرفر بتانا شروع کر دیا۔

اُس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عمارت میں کُل سات افراد موجود تھے جن میں سے دو
یہاں ڈھیر کر ہی چکے تھے جبکہ باقی پانچ میں سے دو آپریشن روم میں ڈیوٹی دے رہے تھے اور تین
ریٹائرنگ روم میں تاش کی محفل جمائی ہوئی تھی جس کے ساتھ شراب کا دور بھی جاری تھا۔ بھٹناگر کے
بارے میں معلوم ہوا کہ فی الحال وہ وہاں موجود نہیں ہے اور کسی کام سے نکلا ہوا ہے۔

عمارت کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہاں سے نکلنے کے لیے مین گیٹ کے
سوا کوئی راستہ نہیں تھا اور مین گیٹ کو صرف آپریشن روم سے ہی کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار
موجود نہیں تھا۔ ان معلومات کے حصول کے دوران سلّو کو بار بار اس کی گردن پر دباؤ بڑھانا پڑتا تھا، تب
رواں ہوتا تھا۔ ورنہ بار بار اٹک جاتا تھا۔

سلّو کو جب اندازہ ہو گیا کہ اب اس کے پاس کچھ بتانے کو باقی نہیں بچا ہے تو اُس نے اُس کی گردن
پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا۔ دباؤ پڑنے پر وہ شخص بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

''ہمارے سامنے دو ٹارگٹ ہیں۔ ایک آپریشن روم اور دوسرا ریٹائرنگ روم۔ دونوں جگہ ایک
افراد ہیں اس لیے ہم وہاں گوریلا ایکشن کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن پر مجبور ہوں گے اور اس کے



ہے کہ دونوں جگہ بیک وقت ایکشن لیا جائے۔ لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری کیا پوزیشن ہے؟ میرے اندازے
تم پر جتنا ٹارچر ہوا ہے، تمہارے لیے فی الوقت تیزی سے حرکت کرنا بھی مشکل ہوگا۔'' اس آدمی کو
انجام تک پہنچانے کے بعد وہ شہریار سے مخاطب ہوا۔

وہ لوگ جس جگہ موجود تھے، وہ اس اعتبار سے بڑی اچھی تھی کہ یہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا
نے اطمینان سے ساری کارروائی نمٹائی تھی۔ شاید اس حصے کو وہ صرف بطور ٹارچر سیل استعمال کرتے
لیے وہاں دو محافظوں کے علاوہ کسی کی مستقل آمد و رفت نہیں تھی اور دوسرے افراد صرف اسی وقت
رخ کرتے تھے جب کسی قیدی سے پوچھ گچھ کرنا مقصود ہو۔

''میں مینیج کر لوں گا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کی حالت اگرچہ واقعی خاصی خراب تھی لیکن خود پر
تھا کہ ہاتھ پیر بے شک زیادہ نہ چلا پائے لیکن اسلحے کے زور پر کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ اسی خیال کے
نے محافظ کی گن بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور پسٹل جیب میں ڈال لیا تھا۔

''اوکے..... پھر تم آپریشن رُوم کی طرف جاؤ۔ میں ریٹائرنگ رُوم والوں سے نمٹتا ہوں۔''

سلّو نے فیصلہ کرتے ہوئے یقیناً اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ شہریار کے حصے میں کم افراد آئیں۔ کیونکہ
میں پڑے محافظ کی اطلاع کے مطابق آپریشن روم میں صرف دو افراد تھے۔ دونوں کمروں کی
معلوم کر چکے تھے اس لیے وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اطراف کا دھیان رکھتے ہوئے وہ دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ شہریار کے پاؤں میں جوتے بھی
کیونکہ جس محافظ کا لباس اس نے پہنا تھا، اس کے جوتے اس کے پاؤں میں نہیں آ سکے تھے اور
کے جوتے چیک کرنے کا اس خیال نہیں آیا تھا۔

''اب تمہاری طرف سے فائر کی آواز آئے گی، تب میں ایکشن لوں گا۔'' انگریزی حرف ایل (L) کی
برآمدے میں ریٹائرنگ روم پہلے پڑتا تھا جبکہ آپریشن روم برآمدے کے مڑنے کے بعد دوسرے
تھا اس لیے اسے سرگوشی میں آگاہ کر کے سلّو وہیں رُک گیا جبکہ وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر آگے بڑھتا
پھر آپریشن روم کے سامنے جا کر ہی رُکا۔ کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے ابھی اس نے ہینڈل پر
تھا کہ اندر سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ وہ بے ساختہ ہی رُک گیا۔

''یس سر!'' کال ریسیو کرنے والے کے مؤدبانہ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اہم آدمی سے بات کر

سہاش صاحب اور باقی لوگ ابھی ڈنر سے فارغ ہوئے ہیں۔ میں اُنہیں آپ کا میسج پہنچا دیتا
شہریار کو دوسری طرف کی بات سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ آ رہا تھا کہ کوئی ایسا پیغام دیا
ریٹائرنگ رُوم میں موجود افراد تک پہنچایا جانا ہے۔

کے اعصاب اپنی جگہ تن گئے کیونکہ امکان یہی تھا کہ وہ شخص پیغام پہنچانے کے لیے کمرے سے باہر
اس کی مجبوری یہ تھی کہ جب تک وہ فون پر مصروف تھا، ایکشن لینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس
فون کے ذریعے کسی بھی گڑبڑ کی خبر باہر پہنچ جاتی۔ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس نے انتظام کر
سمجھا حالانکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی طرف سے کارروائی کے آغاز میں تاخیر سلّو کو تشویش میں
ہوگی۔

بھٹناگر صاحب کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے انہیں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا۔

ایک طرف وہ اس سلّو کی تلاش میں دیوانے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف اس قیدی کے لیے فکرمند ہیں۔ کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ اتنی موٹی موٹی زنجیریں توڑ کر قید خانے سے نکل بھاگے گا۔ آنند اور ونود کی ڈیوٹی کے باہر ڈیوٹی لگا کر بھی انہیں چین نہیں مل رہا تھا۔ ابھی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کسی نے جا کر قیدی کو دیکھا یا نہیں؟ میرا جواب سن کر بگڑنے لگے کہ اتنے خطرناک قیدی کی چنتا کرنے کے بجائے یہاں لوگ ڈرتے پھر رہے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ وہ بھوکا پیاسا بندہ جس کا جوڑ جوڑ انہوں نے ہلا ڈالا ہے، آخر کرے گا کیا کرے گا؟'' فون کال ریسیو کرنے والے نے کال ختم ہونے کے بعد اپنے ساتھی کے سامنے اظہار شروع کر دیا۔

''تو ان ساری پنچایتوں میں کیوں پڑ رہا ہے یار! تجھے بھٹناگر صاحب نے جتنا کہا ہے، اُتنا کر۔ وہ بیکار میں پریشان ہونے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ خاص بات ہے جبھی تو وہ اتنی چنتا کر رہے ہیں۔ تو نے بندے کا پکا پن نہیں دیکھا کیا؟ اتنے ٹارچر کے بعد سب ''چیں'' بول دیتے ہیں لیکن اس نے ابھی تک بات بھی نہیں اُگلی ہے۔ میرے حساب سے تو بھٹناگر صاحب کی پریشانی ٹھیک ہے۔''

دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بھٹناگر کے حق میں دلائل دیے۔ شہریار کو وہ موقع بالکل مناسب لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر والوں کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ ردِعمل میں فوراً ہی ایک چیخ سنائی دی۔ لیکن دوسرا شخص خاصا پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے ایک بڑی میز کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے فوراً ہی اس کی طرف ایک فائر داغا۔ شہریار کو بائیں بازو میں سے ذرا اوپر شدید جلن کا احساس ہوا۔ گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔

وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کی آڑ میں رہتے ہوئے اندر برسٹ مارا۔ جواب میں اندر سے فائرنگ کی گئی۔ حقیقتاً وہ دونوں اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بھی دوسرے کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور کامیابی کا امکان بس اسی صورت میں تھا کہ کوئی ایک اتفاقیہ طور پر زد میں آ جائے۔

دوسری طرف سلّو نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ وہ برآمدے کے دوسرے حصے میں ہونے والی فائرنگ کی آواز خوب اچھی طرح سن رہا تھا۔

''تمہارے لیے بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو۔ کیونکہ ہم سب کو مار کر بھی تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔'' فائرنگ کے دوران ذرا سا وقفہ آیا تو اندر والے نے چیخ کر اسے متنبہ کیا۔

شہریار نے زبان سے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دو فائر داغ دیئے۔

''میری بات نہ مان کر تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میرا وشواس کرو۔ یہ بلڈنگ تمہارے لیے قبرستان ثابت ہو گی۔ تم اس کی دیواروں سے سر پٹختے رہ جاؤ گے لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکو گے۔''

''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تمہیں اتنی ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہریار نے سختی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسی وقت اس نے برآمدے کے موڑ سے سلّو کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ تیز لیکن بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' قریب آ کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ایک مارا جا چکا ہے جبکہ دوسرے نے مقابلے کے لیے مورچہ سنبھالا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم برسٹ مارو، اندر میں دیکھتا ہوں۔'' سلّو نے کہا تو وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا رُخ بدل کر برسٹ مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ادھر اس نے سلّو کو فرش پر اوندھا لیٹ کر دروازے کی طرف



ہوئے دیکھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ عین اسی وقت اندر سے بھی جوابی برسٹ مارا گیا اور سلّو دروازے کے عین سامنے ہونے کی وجہ سے نشانہ بن سکتا تھا لیکن خوش قسمتی نے اس کا ساتھ دیا اور اندر سے آنے والی گولیاں اس کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ اصل میں اندر موجود بندے کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے مقابل کی مدد کے لیے کوئی اور آ چکا ہے اس لیے اس نے پہلے ہی کی طرح دیوار کی آڑ میں چھپے شہریار کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ رینگ کر عین دروازے کے بیچ میں پہنچ جانے والے سلّو کی طرف تو اس کی توجہ ہی نہیں گئی تھی اور اسی چیز کا سلّو نے فائدہ اٹھایا تھا۔ میز کے پیچھے چھپا وہ بندہ فائر کرنے کے لیے آڑ سے ذرا باہر نکلا تھا اور اس سے قبل کہ واپس پناہ گزین ہوتا، سلّو کی شارٹ گن نے ایک قہقہہ اُگلا اور اس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ اب ان کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ پہلے شہریار کا شکار ہونے والے کی گردن میں گولی لگی تھی اور وہ زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ وہ بدقسمت، شہریار اور اس کے مقابل کے درمیان ہونے والی فائرنگ کے تبادلے کی زد میں بھی آیا تھا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں میں گولیاں لگی ہوئی نظر آ رہی تھیں لیکن یہ اس کی بدنصیبی ہی تھی کہ کوئی بھی گولی ایسے مقام پر نہیں لگی تھی کہ زندگی کا چراغ فوراً ہی گل ہو جاتا، سو اُسے سسک سسک کر اپنی جان دینی پڑ رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی شہریار نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اسے خاردار کوڑے سے پیٹنے کے بعد زخموں پر نمک ملا تھا اور پھر سر کے نیچے آگ دہکا دی تھی۔ اب وہ اذیت پسند شخص خود شدید اذیت برداشت کرتے ہوئے موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ اسے اس کے انجام تک پہنچنے کے لیے چھوڑ کر وہ خود کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سلّو نے جس شخص پر تشدد کر کے معلومات حاصل کی تھیں اس نے یہی بتایا تھا کہ بیرونی گیٹ کو صرف آپریشن روم سے ہی کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے اور اب وہ کی بورڈ پر مختلف بٹن دباتا بیرونی گیٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے کمپیوٹر اور کنٹرول پینل کمرے میں ایسے رُخ پر رکھے ہوئے تھے کہ فائرنگ کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے اور اس وقت وہ اس قابل تھا کہ مین گیٹ کھولنے کی کوشش کر سکے۔ اُس کی اس کوشش کا نتیجہ فوراً سامنے آ گیا۔ مین گیٹ کھولنے کے لیے کمپیوٹر اس سے کوڈ مانگ رہا تھا اور ظاہر ہے اسے کوڈ معلوم نہیں تھا۔

''کیا ہوا..... کام بنا؟'' مختلف دروازوں کو پھرتی سے کھول کر ان کی تلاشی لینے میں مصروف سلّو نے اسے خاموش کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، گیٹ کھولنے کے لیے کمپیوٹر کوڈ مانگ رہا ہے۔'' اس نے پریشانی سے بتایا تو سلّو بھی پریشان ہو گیا اور بے ساختہ ہی اس شخص کی طرف دیکھا جو اب تک جان کنی کے عالم میں تھا۔ اس کے دیکھتے ہی اس شخص نے آخری جھٹکا لیا اور جان کنی کی تکلیف سے نجات پا گیا۔

''شِٹ..... یہ تو بہت برا ہوا۔ تم کوشش کرو کہ کسی طرح کوڈ ٹوٹ جائے۔'' جھنجلائے ہوئے سلّو نے اس سے فرمائش کی تو وہ دوبارہ کوشش میں مصروف ہو گیا لیکن جسم کی بچی کھچی توانائی بھی اس ہنگامے میں خرچ کر لینے کے بعد اس کے دماغ پر کمزوری کی وجہ سے دُھند سی چھانے لگی تھی اور وہ بھرپور کوشش نہیں کر پا رہا تھا۔

سلّو نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی اور دودھ کے ٹیٹرا پیک تھے۔

''یہ لو، جلدی سے یہ کھا لو تاکہ کچھ کرنے کے لیے توانائی بحال ہو سکے۔'' اس نے ڈبل روٹی کے سلائس

ے ساتھ ٹیٹرا پیک اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بلا تکلف دونوں چیزیں تھام لیں۔ شکستہ جسم کو اس وقت توانائی کی اتنی شدید ضرورت تھی کہ وہ فی الحال دشمن کے اس ٹھکانے سے نکلنے کی فکر بھی بھول گیا تھا۔

سلّو دونوں چیزیں یقیناً فریج سے نکال کر لایا تھا اس لیے بے حد ٹھنڈی ہو رہی تھیں، اس کے باوجود وہ جلدی جلدی سلائس کو چباتا دودھ کی مدد سے حلق سے نیچے اُتارتا چلا گیا۔ دوسری میز پر چڑھ کر بیٹھا سلّو بھی اسی عمل میں مصروف تھا اور اس کے انداز سے بھی ظاہر تھا کہ اسے بھی کافی طویل وقفے کے بعد کچھ کھانے کو ملا ہے۔ ڈبل روٹی اور دودھ کے پیکٹوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس دیئے۔

''چلو چل کر یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ تلاش کرتے ہیں۔'' یہ تجویز سلّو نے پیش کی جس سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

اگلے چند منٹوں میں انہوں نے پوری عمارت میں گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ عجیب قلعہ نما عمارت تھی جس سے باہر نکلنے کا مین گیٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی اتنی مضبوط سلاخیں لگی تھیں کہ انہیں توڑنے یا کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان دونوں نے پھر بھی اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھ لی لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ عمارت کی بناوٹ کچھ ایسے طرز کی تھی کہ چھت پر جانے تک کا راستہ نہیں رکھا گیا تھا ورنہ وہ وہاں سے ہی نکلنے کی کوشش کرتے۔ دیواریں توڑ کر نکلنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ اوّل تو دیواریں بہت مضبوط تھیں دوسرے ان کے پاس ایسا ساز و سامان بھی نہیں تھا جس کی مدد سے ایسی کوئی کوشش کی جا سکتی۔

شہریار کو اپنے مقابل کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''میرا وشواس کرو، یہ بلڈنگ تمہارے لیے چوہے دان ثابت ہو گی۔ تم اس کی دیواروں سے سر پٹختے رہ جاؤ گے لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکو گے۔''

اس کا دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی وہ دیواروں سے سر پٹختے پھر رہے تھے لیکن باہر نکلنے کا راستہ تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ عمارت ان کے لیے چوہے دان بن کر رہ گئی تھی جہاں وہ پھنس گئے تھے۔ باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا، مین گیٹ اور وہ اس راستے کو کھولنے والے جادوئی منتر ''کھل جا سم سم'' سے آگاہ نہیں تھے۔

ہر طرف سر پھوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر سیاہ رنگ کے گیٹ کے سامنے جا پہنچے لیکن وہ قسمت کے بند تالے کی طرح کھلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کچھ دیر اسے کھولنے کی لاحاصل سعی کرنے کے بعد وہ پلٹنے ہی لگے تھے کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے ہی آ کر رُکی تھی لیکن دروازے میں کوئی درز نہ ہونے کے سبب وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ شہریار کچھ سوچ کر سرپٹ آپریشن روم کی طرف بھاگا کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً مستقل کوشش کرتا رہا تھا اس لیے کمپیوٹر کی اسکرین پر اس وقت بھی مین گیٹ کا منظر ہی آ رہا تھا۔ اس نے کچھ بٹنوں کو پش کیا تو منظر وسیع ہو گیا اور گیٹ کے باہر موجود گاڑی نظر آنے لگی۔ جس وقت اس نے گاڑی کو دیکھا، وہ ریورس ہو رہی تھی پھر بھی اسے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود بھٹنا گر کا چہرہ نظر آ گیا جس پر اس وقت شدید اُلجھن اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی اسکرین سے غائب ہو گئی اور سامنے سپاٹ زمین نظر آنے لگی۔

''کیا ہوا؟..... کون تھا باہر؟'' اس کے پیچھے آپریشن روم میں آنے والے سلّو نے پوچھا تو وہ آہستہ



سے اس کی طرف پلٹا۔

''بھٹنا گر۔'' اس یک لفظی جواب میں سب کچھ تھا۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ بھٹنا گر کا یہاں تک آ کر واپس پلٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ گیٹ نہ کھلنے پر وہ سمجھ گیا ہو گا کہ اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے اور ظاہر ہے یہ اس کی جگہ تھی اس لیے یہاں ہونے والی گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے وہ مؤثر اقدامات کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ جبکہ وہ دونوں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ بالکل عالمِ برزخ میں ٹھہرائی گئی روحوں کا سا انتظار تھا کہ دیکھیں پردۂ غیب سے ان کے لیے جنت کے در کھلنے کا اعلان ہوتا ہے یا وہ جہنم میں دھکیلے جانے والے ہیں۔

بھٹنا گر سے بچنے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کرنا چاہئے، یہ سوال پوری شدت سے ان دونوں کے ذہنوں میں چکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ خود بھٹنا گر ان تک پہنچنے کے لیے کیا طریقِ کار استعمال کرے گا۔

بظاہر عمارت میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا چنانچہ وہ اس راستے کے سامنے مورچہ بند ہو سکتے تھے لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ یہاں داخلے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہو سکتا ہے جہاں سے بھٹنا گر خود اکیلا یا اپنے ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوتا اور چپکے سے ان پر قابو پا لیتا۔ یہ خفیہ راستہ کہاں ہو گا، وہ نہیں جانتے تھے۔ پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کے بجائے عمارت میں کوئی زہریلی گیس وغیرہ چھوڑ کر وہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن اس امکان کی اُمید ذرا کم ہی تھی۔ ایک تو اتنی بڑی جگہ گیس کی مدد سے کسی کو ختم کرنا آسان نہیں تھا، دوسرے ''را'' والے خواہش مند تھے کہ ان پر قابو پا کر ان سے معلومات حاصل کی جائیں۔ ابھی تک بھٹنا گر نے اس سے پوچھا نہیں تھا لیکن شہریار کو اندازہ تھا کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کے متعلق بھی ان سے جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

''ذرا کمپیوٹر پر توجہ دو۔ اگر عمارت کے اندر بھی کیمرے لگے ہیں تو کمپیوٹر کی مدد سے ہر حصے پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔'' سلّو نے سوچ بچار کے بعد مضطرب لہجے میں شہریار سے فرمائش کی۔ وہ جلدی جلدی کی پیڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔

سلّو کا اندازہ درست تھا۔ مین گیٹ کی طرح عمارت کے مختلف حصوں کا بھی یہاں بیٹھے بیٹھے جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ انہیں وہ برآمدہ بھی نظر آیا جہاں سلّو نے ایک محافظ پر قابو پا کر اس سے معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ آپریشن روم میں ڈیوٹی پر موجود افراد نے تساہل سے کام لیا اور نگرانی کا فریضہ ڈھنگ سے انجام نہیں دیا ورنہ وہ بہت پہلے ہی پھنس چکے ہوتے۔

''یہاں صرف کوریڈورز نظر آ رہے ہیں۔ کمروں کے اندر کیا صورتِ حال ہے، معلوم نہیں ہو سکتی۔''

''اتنا بھی بہت ہے۔ وہ عمارت کے کسی بھی حصے سے اندر داخل ہو ہم تک پہنچنے کے لیے کوریڈور سے تو گزرنا ہی پڑے گا۔'' سلّو نے اس کی بات کا جواب دیا ہی تھا کہ اسکرین پر سے اس کوریڈور کا منظر غائب ہو گیا جہاں محافظ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''وہ آ گیا ہے اور اس نے کیمرے کو ناکارہ بنا دیا ہے۔'' سلّو سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ بھٹنا گر کو ان پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ وہ اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ آپریشن روم میں عمارت کے مختلف مناظر دکھانے والے کیمروں کو کہاں کہاں نصب کیا گیا ہے اس لیے اس نے اندر داخل ہوتے ہی ایک کیمرے کو ناکارہ بنا دیا تھا اور وہ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''اسے اندازہ ہوگا کہ ہم یہاں ہیں اس لیے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔'' دوسرا کیمرہ بھی ناکارہ بنا دیا گیا تو سلّو نے فیصلہ کرلیا اور اس فیصلے پر تیزی سے عمل درآمد بھی کیا گیا۔ البتہ اس سے قبل پوری عمارت کی روشنیاں بجھانا وہ نہیں بھولے تھے۔ ہتھیار انہوں نے مرنے والوں سے پہلے ہی ہتھیا لیے تھے اور اب گھپ اندھیرے میں چوہے بلّی کا کھیل جاری تھا۔

دونوں طرف کے لوگ ہی اتنے ہوشیار تھے کہ کہیں کسی کے حرکت کرنے سے کوئی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ شہریار اور سلّو دونوں نے ہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتے ہوئے اس جگہ پوزیشن سنبھال لی تھی جہاں کوریڈور ''ایل'' کی شکل میں مڑ رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بھٹنا گر ان کی تلاش میں آپریشن روم کا رخ ضرور کرے گا اس لیے وہیں رہنا ضروری سمجھا۔ جب آپریشن روم کے کھلے دروازے سے کوئی چیز اندر اچھال کر دروازہ تیزی سے بند کیا گیا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ بھٹنا گر وہاں پہنچ چکا ہے۔

وہ ان کے قریب سے اتنی خاموشی سے گزرا تھا کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوسکی تھی۔ یقیناً خود اس نے بھی ان کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا اور اس کی آپریشن روم کے پاس موجودگی کو صرف اس وجہ سے جان پائے تھے کہ اندر اُچھالی جانے والی شے نے کسی چیز سے ٹکرا کر ہلکی سی آواز پیدا کی تھی اور دروازے کو تیزی سے بند کرنے کی وجہ بھی خفیف سی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

سلّو نے اس آہٹ پر پھرتی سے برسٹ دے مارا۔ فوراً ہی جوابی فائرنگ ہوئی اور گولیاں عین اس دیوار سے آکر ٹکرائیں جس سے سلّو چپکا کھڑا تھا۔ اگر اس نے فائر کرکے وہاں سے ہٹنے میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کا انجام برا ہوتا۔ بھٹنا گر نے فائر کی آواز پر نہایت سُچّا نشانہ لیا تھا۔ سلّو نے بھی اسی جیسی مہارت کا مظاہرہ کیا اور اپنی پوزیشن تبدیل کرتے ہی فائر کی آواز پر نشانہ لیا لیکن کوئی چیخ یا کراہ سنائی نہیں دی جس کا مطلب تھا کہ بھٹنا گر بھی محفوظ رہا ہے۔

PAKISTANIPOINT

اس بار اُس نے فائر کرنے کے بجائے ان کی سمت گیس بم اُچھالا۔ اندھیرے میں وہ بم کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن قوتِ شامہ نے کام دکھایا اور بُو محسوس کرتے ہی دونوں نے فوری طور پر اپنی سانس روک لی۔ سانس روک کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹے تاکہ گیس کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس دوران وہ یہ اندازہ کر چکے تھے کہ بھٹنا گر کے پاس اگرچہ اسلحہ اور مقابلے کے لیے دوسری اشیا موجود ہیں لیکن وہ تنہا ہی ہے۔ شاید اسے خود پر بہت زیادہ اعتماد تھا جو عمارت میں گڑبڑ محسوس کرکے کسی اور کو اپنی مدد کے لیے بلانے کے بجائے خفیہ راستے سے یہاں پہنچ گیا تھا اور اب صورتِ حال یہ تھی کہ کوئی بھی کسی پر برتری حاصل نہیں کرسکا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک دوسرے کے ساتھ چوہے بلّی کا کھیل کھیلتے پھر رہے تھے۔

اچانک ہی بھٹنا گر نے ایک نہایت غیر متوقع حرکت کی۔ وہ آپریشن روم میں گھسا اور اس نے عمارت کی لائٹیں روشن کردیں۔ اندھیرا جو انہیں پناہ فراہم کررہا تھا، یک دم ہی غائب ہوگیا اور وہ پوری طرح عیاں ہو گئے۔ یہ ایک بوکھلا دینے والی صورتِ حال تھی لیکن دونوں ہی نے تیزی سے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور قریبی کمرے کے دروازے سے اندر پہنچ گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سلّو نے بھٹنا گر کے ساتھیوں کو جہنم رسید کیا تھا اور وہ لاشوں کی صورت فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ کمرے کے اندر آجانے کے بعد انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ نگرانی کرنے والے کیمروں سے محفوظ ہوگئے ہیں کیونکہ آپریشن روم میں رہ کر انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ کیمرے صرف برآمدوں کا منظر دکھاتے تھے اور ان میں سے بیشتر کیمرے خود بھٹنا گر نے ناکارہ بنا دیے تھے۔ البتہ اس برآمدے والے کیمرے کے بارے میں انہیں علم نہیں تھا کہ کام کررہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ بھٹنا گر



یہاں تک پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے مین سوئچ آف کردیا تھا۔

''میں فرنٹ سے جاتا ہوں، تم پیچھے سے پہنچنے کی کوشش کرو۔'' سلّو نے تیزی سے آگے کی حکمتِ عملی بتائی اور ایک نسبتاً کم وزن شخص کی لاش اُٹھا کر یوں اپنے سامنے کرلی کہ ڈھال کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ دوسری طرف شہریار کمرے کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اب اسے عمارت کے نقشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس روم تک پہنچنا تھا جہاں بھٹنا گر مورچہ زن ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف کودتے ہی سب سے پہلے اس نے وہاں روشن طاقتور بلب کو نشانہ بنایا۔ اب کیمرے کے کام کرنے کی صورت میں بھی کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ادھر سلّو نے بھی تقریباً یہی حکمتِ عملی استعمال کی اور لاش کو اپنے سینے سے لگائے آگے بڑھتا رہا۔

یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک لاش کو اس انداز میں حرکت دینے کے لیے اسے خاصی طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی پھر بھی وہ کسی نہ کسی طور اسے ساتھ لیے آگے بڑھتا رہا۔ وہ خود تو دبے قدموں ہی آگے بڑھ رہا تھا لیکن لاش کے گھسٹنے کی وجہ سے ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی جو بے پناہ خاموشی کی وجہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ البتہ لائٹوں کو نشانہ بنا لینے کی وجہ سے ایک بار پھر اندھیرے کی پناہ ضرور مل گئی تھی۔

آپریشن روم میں موجود بھٹنا گر کو اس کے سوا کچھ نہیں سوجھا کہ آہٹ پر نشانہ لے۔ اس نے خود بھی آپریشن روم کی لائٹیں بجھا دی تھیں۔ چنانچہ دروازہ کھول کر آرام سے فائر کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں اس کے اپنے آدمی کی لاش میں پیوست ہوئیں اور ظاہر ہے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ لیکن اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے لاش کو دھکا دے کر خود سے دُور پھینکا اور اپنا جسم دیوار کے ساتھ سمیٹ لیا۔ لاش کے دُور جا گرنے سے خاصی آواز پیدا ہوئی اور اس آواز پر بھٹنا گر فائر نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا؟ فائر کرنے کے لیے اُسے آڑ سے نکلنا پڑا اور سلّو کے لیے سنہری موقع تھا۔ اس نے گن کی نال سے نکلنے والے شعلے پر نشانہ لیا اور گولی سیدھی بھٹنا گر کے جسم میں پیوست ہوگئی۔ لیکن وہ ہوشیار آدمی تھا۔ فوراً فائر کرتے ہی محفوظ کرنے کے لیے حرکت میں آگیا تھا، اس لیے جان بچ گئی اور اسے محض اپنے بازو میں گولی کو جگہ دینا پڑی۔ گولی کھا کر وہ نیچے گرا اور لات مار کر دروازہ بند کردیا۔ اب وہ آپریشن روم میں خود کو محفوظ کرچکا تھا۔ شہریار جو پیچھے سے گھوم کر عقبی کھڑکی تک پہنچا تھا، یہ دیکھ کر مایوس ہوگیا کہ اس کمرے کی کھڑکیاں بلٹ پروف ہیں اور وہ وہاں سے بھٹنا گر کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔

''تم بیکار کوششیں کررہے ہو۔ اس بلڈنگ سے تم میری مرضی کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے۔'' ابھی تک شہریار نے اس کے کسی فائر کے جواب میں فائر نہیں کیا تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہاں اس کے مقابل ایک کے بجائے دو افراد ہیں۔

''ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں تم بھی یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ میں نے اس کمرے کے دروازے کے ساتھ بم فٹ کردیا ہے۔ تم دروازہ کھولو گے تو بم بلاسٹ ہوجائے گا اور تمہارے جسم کے ساتھ پوری عمارت بھی ٹکڑوں میں تبدیل ہوجائے گی۔''

سلّو جو اس دوران بھی بہت خاموشی سے دروازے تک پہنچ چکا تھا، دروازے کی کنڈی باہر سے بند کرکے بلند آواز میں بولا۔

اس کی آواز سن کر بھٹنا گر اُچھل پڑا۔

''سلّو! تم..... تم یہاں ہو؟'' وہ جیسے ہیجان میں مبتلا ہوگیا۔

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا تھا؟'' سلّو نے ہنس کر پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ مجھ سے اس انداز میں مقابلہ کرنے صرف تم ہی ہو سکتے ہو۔" بھٹناگر نے تسلیم کیا۔

"اور اب تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ جیسے میں یہاں آ سکتا ہوں، ویسے ہی واپس بھی ہوں۔" سلّو نے اس کا مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا تو وہ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا اور تڑخ کر بولا

"ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں کر رہی ہے۔"

"شکر کرو کہ میں تمہیں یہاں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" سلّو نے جواب دیا۔ حقیقتاً جس طرح آپریشن رُوم سے باہر نکل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، وہ بھی اندر جا کر اس کا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی بات کہہ کر شہریار کو اشارہ دیا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ عمارت کے اس حصے کی رہے تھے جہاں سے انہوں نے بھٹناگر کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

یہ شہریار کے قید خانے والا حصہ تھا۔ اس حصے کے کیمرے خود بھٹناگر نے ناکارہ بنائے تھے اس انہیں نگرانی کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اب وہ صرف اس خفیہ راستے کی تلاش میں تھے جہاں سے بھٹناگر عمارت داخل ہوا تھا۔ یہ راستہ تلاش کرنے میں اُنہیں اس لیے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی کہ راستہ کھولنے بھٹناگر نے اُسے عجلت میں بند نہیں کیا تھا۔ یہ راستہ اس عقوبت خانے کی ایک الماری کے پیچھے تھا جس بہت سے تشدد کے آلات بھرے ہوئے تھے۔ الماری کے کسی سلائیڈنگ ڈور کی طرح ایک جانب کھسک جانے کے باعث راستہ واضح ہو گیا تھا۔

یہ تنگ سرنگ نما راستہ تھا جہاں سے دو افراد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بیک وقت نہیں گزر سکتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہاں بھی سلّو ہی آگے رہا۔ اصل میں شہریار جسمانی حالت کی وجہ سے اس نے اب تک زیادہ تر بوجھ خود ہی اُٹھایا تھا۔ اب بھی آگے رہ کر کسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا لیکن اس بار وہ کسی مشکل سے دوچار نہیں ہوئے۔ خفیہ راستہ عمارت قریب ہی ایک خشک نالے میں جا کر کھلا۔

نالے سے باہر بھٹناگر کی گاڑی کھڑی تھی لیکن انہوں نے اس کا رُخ نہیں کیا اور پیدل چلتے ہوئے سے دُور نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑے ہتھیار انہیں نظروں میں لا سکتے تھے اس لیے وہ انہوں نے میں ہی پھینک دیئے۔ اب ان کے پاس صرف ریوالور تھے جو آسانی سے لباس میں چھپائے جا سکتے تھے۔

وہ نالے کے اندر ہی سفر کرتے ہوئے خاصے آگے نکل گئے۔ پھر ایک ایسی جگہ سے باہر نکلے قریب ہی خاصا بڑا پبلک پارک موجود تھا۔ وہ جنگلا پھلانگ کر پارک میں داخل ہو گئے۔ اس وقت انہوں دو گاڑیوں کو آندھی طوفان کی طرح اس رُخ پر جاتے دیکھا جہاں سے وہ ابھی آئے تھے۔ یقیناً بھٹناگر اپنے ساتھیوں کو کال کر کے بلایا تھا۔

ان دونوں کے پاس اچھی خاصی تعداد میں موجود ان مسلح افراد سے بھڑنے کی نہ تو گنجائش تھی، نہ ایسی کوئی ضرورت محسوس کر رہے تھے اس لیے اُنہیں نظر انداز کر دیا اور پارک کے مین گیٹ سے باہر نکل کر کھڑی ٹیکسیوں میں سے ایک کا رُخ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھے کسی قریبی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

ہوائی جہاز میں محوِ سفر ماہ بانو کے ذہن میں بیک وقت کئی خیالات گردش کر رہے تھے۔ کبھی وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی جب فیصل آباد میں بے بے اور ابا کے ساتھ سُکھ چین سے رہتی تھی۔ کبھی



پیش آنے والے واقعات یاد آتے پھر شہریار کا اپنی مدد کرنا اور خود اس کی محبت میں مبتلا ہو جانا یاد آ جاتا۔ وہ اسلم کے بارے میں سوچتی جو بالکل اچانک اس کی زندگی میں آنے والا وہ کردار تھا جس نے اسے تماشا محبت دی تھی۔ حقیقتاً وہ اس پر جان چھڑکتا تھا اور اپنی جان وار کر اسے ایک بڑی مصیبت سے نجات دی تھی۔ اسلم کی نشانی کو سینے سے لگائے وہ اس کی محبتوں اور وارفتگیوں کو بغیر کسی ارادے کے سوچ جا رہی تھی۔ اسلم وہ شخص تھا جس نے بغیر صلے کی خواہش کے اس سے اتنی شدید محبت کی تھی کہ وہ اپنا دامن اس کی محبت سے بچا نہیں پائی تھی اور دل میں خود بخود ہی اس کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

یہ ایک سچ تھا کہ شہریار کی محبت کی جڑیں اپنے بہت اندر تک اُتری ہونے کے باوجود اس وقت وہ اسلم کی جدائی پر ملول و مغموم تھی۔ اس کے آنسو چپکے چپکے اس کے دل پر گر رہے تھے۔ ستم یہ تھا کہ ان حالات میں اسے کہیں سکون سے بیٹھ کر اپنا غم منانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ مصطفیٰ خان کا کہنا تھا کہ اس کا جلد از جلد لینڈو سے نکل جانا مناسب تھا۔ کیونکہ ابھی جنگل میں لگی آگ کو بجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ آگ کے بعد جب زمین ٹھنڈی ہو جاتی تو یقیناً لیبارٹری والے حصے میں خصوصی کارروائی کی جاتی اور بے شک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا ہو گا لیکن جدید سائنسی ایجادات سے لیس امریکی ماہرین اس حقیقت کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتے کہ وہاں جل کر مرنے والوں میں ماہ بانو کی لاش موجود نہیں ہے۔ اور یہ جاننے کے بعد یقیناً وہ اس کی تلاش شروع کر دیتے۔

ان کے لیے اس ہسپتال تک پہنچنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا جہاں ماہ بانو کا علاج اور بچے کی پیدائی ہوئی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ اسے فوری طور پر وہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ مصطفیٰ خان کی خواہش پر ڈاکٹر نے مختصر عرصے میں اسے ایسی ادویات استعمال کروا دی تھیں کہ وہ نیویارک تک کے سفر کے قابل ہو گئی تھی۔ زخموں کو چھپانے کے لیے اسے گاؤن نما ایک سادہ سا لبادہ پہنایا گیا تھا اور چہرے کے کچھ حصے کو چھوڑ کر اس نے اسکارف اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ بیشتر زخم چھپ گئے تھے۔ ناک کے قریب ایک ہلکی سی خراش نظر آ رہی تھی لیکن وہ ایسی نہیں تھی کہ کسی کو چونکانے کا سبب بن جائے۔ اتفاق سے اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی اس لیے اسے کسی ہمسفر کے سوال جواب کا سامنا کرنے کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ یوں بھی کچھ ذرا لیے دیئے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ بلاوجہ کسی سے غیر ضروری گفتگو کر کے اسے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

یوں وہ بڑے سکون سے سفر کر رہی تھی اور جو بے سکونی تھی، بس اُس کے اندر ہی تھی۔ اپنے بچے کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت سے تفکرات تھے۔ ایک ہاتھ ناکارہ ہونے کا تو پہلے ہی علم ہو گیا تھا، مزید ڈاکٹر نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے بچہ ذہنی طور پر مکمل تندرست نہ ہو۔ ایسے بچے کے لیے تو ہر ماں پریشان ہوتی ہے اور اس کی پریشانی اس لیے دُوگنی تھی کہ اس کی اپنی زندگی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ حالات میں وہ اپنے بچے کی سکون سے اچھے طور پر پرورش کیسے کر پاتی؟ خدشات اور اندیشوں کے باوجود اس نے امید اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور زندگی کے اس امتحان سے بھی پوری ہمت سے گزر گئی۔ یہاں تک کہ اس نے دورانِ پرواز ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں بھی مقررہ وقت پر لے کر ایک گلاس پانی لے لیا تھا۔ وہ آگے کی جدوجہد کے لیے اپنی توانائی بحال رکھنے کی اہمیت سے خوب واقف تھی۔

اسے بلتستان کے برف زار میں ایوالانچ کا شکار ہو جانے والے عمران کی باتیں کبھی نہیں بھولتی تھیں اور اس یہ یقین موجود رہتا تھا کہ اللہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے اُسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اب بھی زندگی کی

ایک راہ نکل ہی آئی تھی۔ اس کی زندگی کو طوفانوں کی زد میں لانے والے چودھری کے بیٹے مراد شاہ نے اسے اپنے تعاون کی پیشکش کی تھی۔ وہ خود اس کے ساتھ نہیں آیا تھا لیکن اسے اپنے اپارٹمنٹ کا پتہ دے کر یہ یقین دہانی کروا دی تھی کہ وہاں اس کی بیوی شاہدہ اس کے استقبال کے لیے موجود ہوگی اور واقعی اس کا یہ دعویٰ غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ جب بچے اور اپنے چھوٹے سے سفری بیگ کے ساتھ مراد شاہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو شاہدہ نے اتنے خلوص سے اس کا استقبال کیا کہ اسے یقین آ گیا کہ وہ زندگی کے کچھ دن یہاں سستا کر سکون سے آگے کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ ویسے بھی وہ اتنی خوش نصیب تو بہر حال تھی کہ بدترین حالات میں بھی تنہائی کا عذاب جھیلنے سے بچ جاتی اور اسے خود بخود ہی قدرت کی طرف سے بہت سے سہارے مل جاتے تھے۔ اب بھی مصطفیٰ خان، بلقیس، کشور، آفتاب اور مراد شاہ سمیت کتنے ہاتھ تھے جنہوں نے اسے تھام رکھا تھا اور وہ اللہ سے شکوہ نہیں کر سکتی تھی۔

⊛----✪----⊛

''میں بھٹنا گر پر نظر پڑتے ہی سمجھ گیا تھا کہ ہمارا مشکل وقت شروع ہو گیا ہے۔ کوئی آثار نہ ملنے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور ہمارے تعاقب میں ہوگا اور اس خیال نے مجھے اتنا وحشت زدہ کیا کہ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹ ہی نہیں سکا اور میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خاموشی سے نگرانی کرنی چاہئے۔ میں نے بستر پر تکیے جما کر اوپر چادر اوڑھائی اور خود چھت کے راستے پڑوس کے بنگلے میں کود گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر بھٹنا گر میری تلاش میں وہاں تک پہنچا تو مجھے غائب پا کر اُس کا ذہن پڑوس میں ضرور جائے گا اسی لیے میں وہاں بھی نہیں رُکا اور سامنے والے بنگلے میں جا گھسا۔ بس مجھے اتنی ہی مہلت ملی۔ اس کے بعد میں نے وہاں دو گاڑیوں کو آ کر رُکتا دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرے خدشات کے مطابق بھٹنا گر وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ لوگ بہت دیر تک بنگلے کی نگرانی کرتے رہے اور میں سامنے والے بنگلے سے سب دیکھتا رہا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مختلف سمتوں میں پھیلے ہونے کی وجہ سے میں اکیلا ان سب سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اپنی جگہ پر رہا۔ پھر جب وہ لوگ بنگلے میں داخل ہوئے تو میرے پاس موقع تھا کہ وہاں سے فرار ہو جاؤں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ تمہیں گرفت میں لے لیں گے اور میں تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانے کی خود غرضی نہیں دکھا سکتا۔ چنانچہ موقع دیکھ کر ایک گاڑی کی ڈکی میں گھس گیا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بھٹنا گر کو اس کے ٹھکانے پر ہی انجام سے دوچار کروں گا۔ تمہیں جس گاڑی میں لے جایا گیا، میں اسی کی ڈکی میں بند ساتھ پہنچ گیا لیکن عمارت میں چہل پہل ہونے کی وجہ سے مجھے فوری طور پر ڈکی سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ کئی گھنٹوں تک میں مختصر سی جگہ پر پسینے میں شرابور پڑا رہا۔ موقع دیکھ کر باہر نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ ''را'' کا ٹھکانہ ہے تو یہاں کیمروں سے نگرانی کا انتظام بھی ہوگا، چنانچہ بہت احتیاط سے ایک کمرے تک رسائی حاصل کی۔ وہ کمرہ اپنی ترتیب کے اعتبار سے گیسٹ روم لگ رہا تھا۔ میں وہاں اٹیچڈ باتھ میں چھپ گیا کہ موقع دیکھ کر باہر نکلوں گا لیکن کسی نے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا اور میں وہاں پھنسا رہ گیا۔ کافی غور و خوض کے بعد مجھے وہاں سے باہر نکلنے کی راہ دکھائی دی۔ باتھ روم میں ایک ہوادان موجود تھا اور میں اس کا شیشہ نکال دیتا تو باہر نکل سکتا تھا لیکن ظاہر ہے میں شیشہ توڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے احتیاط کرنی تھی اور اسے فریم سمیت اس طرح نکالنا تھا کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میرے پاس اوزار بھی نہیں تھے۔ میں نے کمرے اور باتھ روم کی تلاشی لی تو اپنے مطلب کی کچھ چیزیں مل گئیں۔ ان کی مدد سے میں نے بڑی جدوجہد سے فریم سمیت ہوادان کو کھولنے بند کرنے والا



اور بالٹی پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکا تو انکشاف ہوا کہ اس طرف بھی باتھ روم ہی ہے۔ میں نے وقت جھانکا، وہاں ایک آدمی نہا رہا تھا۔ میں نے اس کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کوئی ساتھی دوسری طرف کمرے میں موجود ہوا تو میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔ ''را'' کے کسی ٹھکانے پر میں اندھا دُھند کارروائی کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس شخص کے غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلنے کے بعد بھی بہت دیر سُن کھڑا رہا پھر جب مجھے لگا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تو دوسری طرف اُتر گیا۔

''باتھ روم سے کمرے میں جھانکا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں جا کر چابی کے سوراخ سے باہر کا جائزہ لینے لگا تب مجھے تمہاری چیخیں سنائی دیں اور سمجھ گیا کہ حسبِ دستور وہ معلومات اُگلوانے کے لیے تشدد کا عمل لے رہے ہیں۔ چیخوں کی آواز سے مجھے سمت کا بھی اندازہ ہو گیا کہ تم کہاں ہو لیکن اس سے قبل کہ باہر نکل کر کچھ کرنے کا سوچتا، تمہاری چیخیں بند ہو گئیں اور میں نے بھٹنا گر کو ایک آدمی کے ساتھ اسی کمرے کی طرف آتا دیکھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں فوری طور پر باتھ روم کے درمیان موجود چوکھٹے سے پہلے والے باتھ روم میں چلا گیا لیکن کان اس طرف ہی لگائے رکھے۔ بھٹنا گر اور اس کا ساتھی کمرے میں آئے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تم پر بے پناہ تشدد کرنے کے باوجود اب تک کچھ اُگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دوسرے بھٹنا گر میری تلاش میں پاگل ہو رہا تھا اور کسی طرح مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے اسے کئی جگہ فون کر کے ہدایتیں دیتے ہوئے سنا۔ وہ اپنے ساتھی ماتحت کو وہاں سے روانہ ہونے کی اطلاع دے کر چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی سے مجھے اعتماد محسوس ہوا اور پھر ایک مناسب وقفے سے میں نے کارروائی شروع کر دی۔ آگے کے سارے واقعات سے تو تم خود واقف ہو۔''

ایک بہت عام سے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے کے بعد وہ سکون سے بیٹھے تو سلّو نے اسے ساری کہانی سنائی۔ اس ساری تفصیل کو سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ خوش قسمتی قدم قدم پر سلّو کی ہم رکاب رہی ہے۔ اتفاق ہی تھا کہ سلّو وہاں تمام عرصہ گاڑی کی ڈکی اور پھر کمروں میں چھپا رہا، جہاں نگرانی کرنے والے کمرے نصب نہیں تھے۔ دوسرے ''را'' والے خود اپنے ٹھکانے کے محفوظ ہونے کے یقین کی وجہ سے اپنے معاملے میں بے پروائی برت رہے تھے اور مستقل طور پر یہ کام نہیں ہو رہا تھا ورنہ حالات مختلف بھی ہو سکتے تھے۔

''ہم بھٹنا گر کو بے بس کر کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، اس بات پر وہ سخت مشتعل ہوگا اور اپنے شہر میں ہر طرف اپنے آدمیوں کا جال بچھا دیا ہوگا اس لیے ہم اس ہوٹل میں بھی خود کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا ہوگا۔''

وہ ہوٹل پہنچنے سے قبل کچھ دوائیں میڈیکل اسٹور سے خریدتے ہوئے لائے تھے جن میں سے زیادہ تر درد اور اینٹی بائیوٹک تھیں اور زخم صاف کرنے کا کچھ سامان بھی تھا۔ راہ چلتے انہوں نے ٹھیلے پر پرانے کپڑے بیچنے والے سے پینٹ شرٹ کا ایک ایک جوڑا بھی خرید لیا تھا۔ پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ سلّو کے پاس کا پرس محفوظ تھا لیکن کسی بڑی دکان کا انہوں نے جان بوجھ کر رخ نہیں کیا تھا کہ ایسی جگہوں پر نگرانی کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد سب سے پہلے شہریار نے گرم پانی سے غسل کیا پھر سلّو نے اس کے زخموں کی صفائی کر کے ان پر مرہم لگایا۔ اچھی بات یہ تھی کہ شہریار کے سارے زخم جسم کے ایسے حصوں میں تھے جو کپڑوں میں چھپ گئے تھے ورنہ زخمی نظر آنے کی صورت میں تو وہ لوگ فوراً ہی مشکوک سمجھ لیے جاتے۔

انہوں نے کمرے میں ہی سادہ مگر پُرغذائیت کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد شہریار نے دوائیں
لیں۔ اس دوران وہ اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی سوچتے رہے تھے۔

''ہمیں عبدالرحمٰن سے رابطہ کرنا ہوگا۔ فی الحال وہی لوگ ہمیں محفوظ ٹھکانہ فراہم کر سکتے ہیں اور
اپنے آدمیوں کے لیے تو ہمیں ویسے بھی ان کے پاس جانا ہی ہے۔'' اس کا اشارہ ڈاکٹر فرحان اور
طرف تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ فی الحال ہمارے لیے یہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔ میں محسوس کر
کہ شہر کی فضا اب بھی معمول پر نہیں ہے۔ اشوک کے قتل کے اثرات اب تک محسوس ہو رہے ہیں اور
بازار کھل گئے ہیں لیکن ان میں پہلے جیسی گہما گہمی نہیں ہے۔ لوگ زیادہ بلند آواز سے بات تک نہیں کر
ہیں۔''

سلّو نے اس کی تائید کرتے ہوئے حالات کی گمبھیرتا کا ذکر کیا۔ یہ سچ تھا کہ انڈر ورلڈ کے
ڈان کے قتل کے بعد ممبئی جیسا بڑا شہر بھی فوراً معمول پر نہیں آ سکا تھا اور فضا کچھ ڈری سہمی سی تھی۔

''میں عبدالرحمٰن سے بات کرتا ہوں۔ اس کا نمبر مجھے یاد ہے۔'' آخر کار شہریار فیصلہ کر کے کمرے
باہر نکل گیا۔ اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس ہوٹل میں گاہکوں کو کمرے کے اندر فون کی سہولت
گئی تھی۔ بس انٹرکام موجود تھے جن سے روم سروس سے رابطہ کیا جا سکتا تھا اس لیے اسے کال کرنے
استقبالیہ کاؤنٹر تک جانا پڑا۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اس نے احتیاطاً تھیلے ہی سے خریدی گئی سیکلہ
کیپ کو اس طرح جھکا کر لگا رکھا تھا کہ چہرے کا کافی حصہ چھپ گیا تھا۔ استقبالیہ کلرک نے اس کی
فوراً ہی ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے یادداشت میں محفوظ عبدالرحمٰن کا نمبر ڈائل کیا۔
بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''میں بات کر رہا ہوں۔'' عبدالرحمٰن کی آواز سن کر وہ احتیاط سے بولا۔ اسے امید تھی کہ بغیر نام
بھی عبدالرحمٰن اسے صرف آواز سے پہچان جائے گا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

''وہیں رُکو، میرے آدمی خود تمہیں لینے آ رہے ہیں۔'' جواب میں اسے عبدالرحمٰن کی نہایت
سنائی دی۔ اس نے اس سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کہاں سے بات کر رہا ہے اور اپنی بات کہہ کر فوراً
بند کر دیا۔ شہریار اُلجھا ہوا کمرے میں واپس پہنچا اور سلّو کو ساری بات بتائی۔

''ہوسکتا ہے عبدالرحمٰن اس ہوٹل کا فون نمبر پہچانتا ہو اس لیے اسے تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت
نہیں ہوئی ہو۔'' سلّو نے اندازہ لگایا۔

''شاید..... لیکن مجھے عبدالرحمٰن کا انداز کچھ غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔'' وہ ابھی تک تذبذب میں
چھٹی حس کسی گڑبڑ کا الارم بجا رہی تھی۔

''حالات ہیں ہی غیر معمولی۔ اشوک کے قتل کی انویسٹی گیشن کرنے والے بھائی جی سمیت
گینگ کے ہر اہم آدمی کے موبائل فونز انڈر آبزرویشن ہوں گے اس لیے عبدالرحمٰن محتاط ہوگا۔''

سلّو کی بات میں وزن تھا اس لیے اُسے قائل ہونا پڑا اور وہ اس خیال سے بستر پر لیٹ گیا کہ
عبدالرحمٰن کے بھیجے بندے نہیں پہنچتے، تھوڑی دیر ستا لے۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے مشکل سے دو منٹ
گزرے تھے کہ فائر کی آواز سنائی دی اور پھر تو گویا بھونچال ہی آ گیا۔ تابڑ توڑ ہوتی اس فائرنگ میں
کا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ دو گروہ آپس میں متصادم ہو گئے ہوں۔



میں لوگوں کی چیخ و پکار، بھاگ دوڑ اور دکانوں کے شٹر گرنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

''یہ تو لگتا ہے کہ اسی ہوٹل کے باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔'' سلّو بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور آوازوں
اندازہ لگا کر بولا۔

''شاید عبدالرحمٰن کے آدمی پہنچ گئے ہیں اور اُنہی کا کسی سے مقابلہ ہو رہا ہے۔'' شہریار کی یہ قیاس آرائی
کے تناظر میں بالکل درست تھی۔ جب سے اشوک کا قتل ہوا تھا، بھائی جی اور اس کے گروہ کے افراد
طرح ٹھنی ہوئی تھی اور وہ جگہ جگہ ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ اب بھی ایسا ہی لگتا تھا کہ قرب و
موجود اشوک کے گینگ کے افراد نے بھائی جی کے آدمیوں کو پہچان لیا تھا اور دونوں گروہوں میں
ہو گیا تھا۔

''باہر نکل کر جائزہ لیتے ہیں۔'' آخر کار اُنہیں کمرے سے نکلنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ فائرنگ اتنی شدت سے
کہ بارود کی بُو اُن کے کمرے تک در آئی۔ اتنی شدید فائرنگ میں وہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے والے
تھے ورنہ باقی افراد تو دروازے بند کر کے اندر دبک گئے تھے۔ استقبالیہ کاؤنٹر تک خالی پڑا تھا اور یقیناً
جان بچانے کے لیے کہیں چھپ گیا تھا۔ پتلونوں کی جیبوں میں رکھے اپنے اپنے ریوالور کے
گرفت مضبوط کیے وہ ابھی ہال میں پہنچے ہی تھے کہ دو افراد بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں
کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی جبکہ دوسرا ہلکی مشین گن سنبھالے ہوئے تھا۔ ان دونوں کو وہ عبدالرحمٰن
پہلے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے فوراً ہی شناخت کر لیا۔ وہ دونوں بھی اُنہیں پہچان گئے۔

''تم دونوں کو کور دیں گے۔ تم گیٹ سے رائٹ سائیڈ پر موجود بلیک پجیرو تک پہنچنے کی کوشش کرو۔
عبدل بھائی کا فون آیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ تمہیں جلدی یہاں سے نکالیں ورنہ اور نفری پہنچ جائے
میں سے ایک نے جلدی جلدی ان پر صورتِ حال ظاہر کی تو وہ تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ باہر
ارش کی طرح برس رہی تھیں اور انہیں ان برستی گولیوں سے بچ کر گاڑی تک رسائی حاصل کرنی تھی۔
باہر جھانکتے ہی اُنہیں باہر گرم میدانِ کارزار کا اندازہ ہو گیا۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی گاڑیوں
مختلف جگہوں پر مورچہ زن تھے۔ وہ گیٹ پر پہنچے تو سامنے موجود بیوٹی سیلون کی چھت سے ان پر
گئی۔ وہ فوراً سائیڈوں میں دبک گئے۔

''تم دونوں پوری شدت سے سامنے اور لیفٹ پر فائرنگ کریں گے۔ باہر والے بھی ہماری مدد کریں
دونوں کو بس اتنا کرنا ہے کہ چند سیکنڈ کی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر گاڑی تک پہنچ جاؤ۔ گاڑی بلٹ
تمہیں لے کر آسانی سے نکل جائے گی۔''

والے نے ہی ذرا بلند آواز میں بولتے ہوئے پلان ان کے سامنے رکھا جو تھا تو خطرناک لیکن
صورتِ حال میں اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

یار نے سر کی جنبش سے اپنی رضامندی ظاہر کی اور جیسے ہی ان کے ہمدردوں نے تین تک گنتی کر کے
آغاز کیا، وہ حرکت میں آ گئے۔ گیٹ سے بمشکل دو ڈھائی گز دُور کھڑی گاڑی تک پہنچنا اس وقت
سے گزرنے کے مترادف تھا۔ ان کے اطراف میں مختلف اقسام کی گنز کے دہانے یوں گولیاں
تھے کہ ان کے شور میں کان پڑی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ البتہ عبدالرحمٰن کے آدمیوں کی
اس حساب سے کامیاب رہی کہ پوری قوت سے مقابل پر فائر کھول دیئے جانے کے سبب وہ اپنے
دبک جانے پر مجبور ہو گئے اور کوئی یہ جرأت نہیں کر سکا کہ سر باہر نکال کر نشانہ لیتا۔ چنانچہ

انہوں نے گولیوں کی دہشت زدہ کر دینے والی آوازوں میں پجیرو تک کا فاصلہ جھکے جھکے تیزی سے طے کیا۔ ان کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ پجیرو کو حرکت میں آتا دیکھ کر مخالفین نے اس کی طرف فائر کیے لیکن گاڑی کے بلٹ پروف ہونے کی وجہ سے ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور وہ تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔

ابھی وہ موڑ تک ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک پولیس جیپ نمودار ہوئی۔ پولیس والوں نے اشارہ کیا کہ گاڑی جائے ہنگامہ سے فرار ہو رہی ہے چنانچہ اسے رُکنے کا اشارہ دیا لیکن ظاہر ہے قانون کے رکھوالوں کے اشارے پر ناچنے والا وہاں تھا ہی کون؟ ڈرائیور بے نیازی سے پجیرو کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ پولیس والوں نے مشتعل ہو کر کئی فائر کیے، ان کا نشانہ درست بھی رہا ہو گا تو پجیرو کا کیا بگڑنے والا تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ ادھر پولیس والے بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے جیپ ان کے پیچھے لگا دی۔

''انہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔'' ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے عقب نما آئینے میں تعاقب میں آتی جیپ کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی سائیڈ کا شیشہ نیچے کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دُور مار رائفل ہے۔ رائفل کی نال کو کھڑکی سے باہر نکال کر اس نے اپنا زاویہ ذرا سا تبدیل کیا اور سکون سے نشانہ لینے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے فائر کی آواز کے ساتھ ٹائر پھٹنے کا دھماکا سنا اور پوری رفتار سے تعاقب میں آتی جیپ بری طرح اُلٹ گئی۔ فائر کرنے والے نے رائفل کی نال اندر کی اور دوبارہ شیشہ چڑھا کر اپنی سیٹ سے بیٹھ گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے مین روڈ چھوڑ دی اور پجیرو کو ایک بغلی سڑک پر موڑ دیا۔ اس کے بعد اسے اتنے موڑوں سے گھما کر ایک چوڑی گلی میں لے گیا کہ کسی نئے بندے کے لیے راستے کا تعین ممکن نہیں تھا۔ گلی میں پہنچ کر اس نے ایک گیٹ کے سامنے ہارن دیا۔ فوراً ہی گیٹ کھل گیا اور پجیرو اس کے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں پورچ میں ایک گاڑی پہلے سے ہی کھڑی تھی جس کی ظاہری حالت اتنی خراب تھی کہ مالک اس سے سوتیلی اولاد والا سلوک کرتا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر شک گزرتا تھا کہ وہ سڑک پر چلے بھی نہیں ہو گی اور دل سے اُتری ہوئی بیوی کی طرح یونہی ایک طرف پڑی رہتی ہو گی۔ پجیرو کے سامنے بالکل ہی کھچاڑا محسوس ہو رہی تھی۔

''یہاں سے آگے تم لوگوں کو اس گاڑی میں جانا ہو گا۔'' گاڑی کی حالتِ زار دیکھ کر فرنٹ سیٹ والے شخص سے یہ جملہ سننا اُنہیں بہت عجیب لگا تھا۔

''عبدل کہاں ہے؟'' شہریار نے اس سے پوچھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد اب وہ پہلی بار ایک ساتھی سے بات کر رہے تھے۔

''یہ گاڑی تم لوگوں کو جہاں پہنچائے گی، عبدل بھائی وہاں تم سے خود کانٹیکٹ کر لے گا۔'' اس نے بتایا۔ گفتگو کے اس چھوٹے سے سلسلے کے دوران پجیرو کا ڈرائیور اُتر کر اس کھچاڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور ان سے گفتگو کرتے شخص نے اپنی جگہ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ انہیں صرف گاڑی کی تبدیلی کے لیے لایا گیا ہے۔ یہ آدمی پجیرو کو لے کر کسی طرف نکل جاتا اور انہیں گاڑی میں کسی اور سمت نکل جاتے۔

اس بار انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے نیچے اُتر گئے۔ پجیرو کا انجن فوراً بیدار ہوا اور ان کے گاڑی میں بیٹھنے تک وہ کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ وہ جس کھچاڑا گاڑی میں سوار ہوئے تھے اس



کی فوراً ایک غراہٹ کے ساتھ بیدار ہوا اور پجیرو کے پیچھے ہی وہ بھی باہر نکلی۔ گاڑی کے نکلتے ہی گیٹ تیزی سے بند ہو گیا۔ گاڑی اپنی ظاہری حالت کے مقابلے میں چلنے میں بہت شاندار تھی اور بہت روانی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ نوٹ کر رہے تھے کہ ڈرائیور مرکزی شاہراہوں سے گزرنے سے حتی الامکان گریز کر رہا تھا۔ یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔ بڑی شاہراہوں پر چیکنگ کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ گاڑی کے سفر کی سمت سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ساحلی علاقے کی طرف لے جائے جا رہے ہیں۔ فضا میں آنے والی تبدیلی نے بھی اس اندازے کی تصدیق کر دی۔ ساحلی ہواؤں کا لمس اور خوشبو ایسی جداگانہ ہوتی ہے کہ آدمی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی لے جایا جائے تو وہ بتا سکتا ہے کہ سمندر کے قریب ہے۔

بھائی جی کا گروہ جتنا پھیلا ہوا تھا اور جس قدر وسائل رکھتا تھا، اس کا ایک ٹھکانہ ساحلی علاقے میں ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن انہیں حیرت ہوئی تھی جب ڈرائیور رہائشی بنگلوں کے قریب سے کنی کترا کر گزر گیا اور وہ اس سے بہت آگے ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں زیادہ تر کچے مکان بلکہ جھونپڑیاں موجود تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور بچے آدھے ادھورے لباس میں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ فضا میں مچھلی اور جھینگوں کی بساند بھری ہوئی تھی اور اس تازگی اور فرحت کا دُور دُور تک احساس نہیں تھا جسے سمندری ہوا سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ان کی گاڑی ایک کچے مکان کے سامنے رُکی تو مکان کا زنگ آلود دروازہ یوں کھل گیا جیسے کوئی دروازے پر لگا اُن کی آمد کا منتظر ہو۔

''آپ لوگوں کو یہاں رہنا ہو گا۔ عبدل بھائی بعد میں خود آپ سے رابطہ کر لیں گے۔'' ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو اطلاع دی اور پھر مکان سے نکلنے والے اس ادھیڑ عمر آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا جس نے لنگی کے ساتھ فقط ایک بنیان پہن رکھی تھی۔

''صاحب لوگوں کا خیال رکھنا ماچھو! یہ عبدل بھائی کے خاص مہمان ہیں۔''

''تم بے فکر رہو۔ ماچھو ان پر اپنی جان وار دے گا۔'' اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر اس نے شاید مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز اتنی کرخت تھی کہ دوستانہ پن کا تاثر نہیں اُبھرتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی اس لیے خاموشی سے گاڑی سے اُتر کر ماچھو کی معیت میں مکان میں داخل ہو گئے۔ ماچھو اُنہیں جس کمرے میں لے گیا، اس کی حالت مکان کی بیرونی حالت کے مقابلے میں بہت اچھی تھی۔ دیواروں کا رنگ و روغن تو بے شک اُڑا ہوا تھا لیکن فرش پر قالین ڈال کر اس پر ایک صاف ستھری چادر بچھائی گئی تھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ انہوں نے ان گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ڈاکٹر فرحان اور کلام کو دیکھا تو بھونچکے رہ گئے۔

''آپ دونوں یہاں کب پہنچے؟'' شہریار نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی عبدالرحمٰن کے آدمی ہمیں یہاں پہنچا کر گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تم لوگ بھی یہاں پہنچنے والے ہو۔'' ڈاکٹر فرحان نے جواب دیا تو ان کے لہجے میں بھی تفکر تھا۔ وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ حالات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ جب سے ان کا بھائی جی اور عبدل سے رابطہ ہوا تھا ان کے ٹھکانے بے شک بدلتے رہے تھے لیکن ہمیشہ اُنہیں بہترین رہائش گاہوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک انتہائی پسماندہ بستی کے ایک کچے مکان میں موجود تھے۔

''کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے جو ہمیں یہاں بھیج دیا گیا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ

بظاہر گمبھیروں سے آباد اس بستی میں اکثریت جرائم پیشہ افراد کی ہے۔'' سلّو نے اپنے خیال کا اظہار کرنے کے ساتھ دعویٰ کیا۔

''میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا۔ کیونکہ بڑے گینگز ہر طبقے میں اپنی رسائی رکھتے ہیں اور ان کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوتی ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں کیوں پہنچایا گیا ہے؟''

''فرار کروانے کے لیے۔ وہ ہمیں سمندری راستے سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اب تک خاموش بیٹھے کلام نے اس سوال کا جواب دیا تو وہ سب چونک گئے۔ واقعی ان چاروں کو اکٹھا اس جگہ پہنچانے کا یہی مقصد ہوسکتا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو اس بارے میں آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور بہت تیزی سے عمل شروع ہوگیا تھا۔ شاید بھائی جی جرائم کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ بننے سے قبل ان لوگوں کو وہاں سے نکال دینا چاہتا تھا جنہوں نے اشوک کا کانٹا نکالا تھا۔

''چائے صاحب!'' وہ چاروں سوچ بچار میں مصروف تھے کہ ماچھو ایک ٹرے میں چائے کے چار کپ لیے چلا آیا۔ بھدّے نظر آنے والے وہ کپ صاف ستھرے تھے اس لیے انہیں ان میں موجود دودھ پتی کو پینے میں تامل نہیں ہوا۔

''عبدل بھائی کا فون آیا تھا، بولے جب تک میں نہیں آ جاتا، مہمانوں کو ٹی وی دکھاؤ اور خاطر واطر کرو۔ اپن آپ لوگوں کے لیے مرغی ذبح کر کے پکوائے گا۔ آپ کا من کچھ اور کھانے پینے کو بولتا ہے تو بتاؤ، ادھر دیسی سے لے کر ولایتی تک سب ملتا ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا تھا۔

''کچھ نہیں چاہیے۔ تم ٹی وی کھول دو۔'' اس کی پیشکش کا شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ بھی مزید کچھ کہے بغیر حرکت میں آ گیا اور ایک میز پر کروشیے کے نمونے سے ڈھکے ٹی وی کی نقاب کشائی کر کے اس کا بٹن آن کر دیا۔ ساتھ ہی ریموٹ بڑے احترام سے لا کر شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ٹی وی کھلتے ہی ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ موت کی تکلیف ثبت ہو جانے والا وہ چہرہ بھائی جی کا ہے، اسے پہچان لینے کے باوجود یقین کرنا مشکل تھا۔ وہ چاروں ہی پوری توجہ سے ٹی وی دیکھنے لگے۔

جو تفصیلات سامنے آئیں، اُن کے مطابق بھائی جی نے پنکھے سے پھندا لگا کر خودکشی کی تھی۔ لاش سب سے پہلے اس کے ذاتی ملازم نے دیکھی تھی جو یہ معلوم کرنے اس کے کمرے میں گیا تھا کہ سونے کے اوقات نہ ہونے کے باوجود بھائی جی پچھلے دو گھنٹے سے کوئی کال کیوں اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ پولیس نے جو ابتدائی تفتیش کی تھی، اس کے مطابق کمرے کی ہر چیز ترتیب سے موجود تھی اور ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے جن سے گمان کیا جا سکے کہ اس خودکشی میں کسی دوسرے فرد کا ہاتھ ہے۔ البتہ اتنا ضرور بتایا گیا تھا کہ بھائی جی نے خودکشی سے قبل بڑی مقدار میں شراب نوشی کی تھی۔

حزن و ملال کی تصویر بنا عبدالرحمٰن خبروں میں نمایاں تھا جس نے نم آنکھوں کے ساتھ بتایا تھا کہ وہ صرف تین گھنٹے قبل بھائی جی کے ساتھ تھا اور اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ خودکشی کر سکتے ہیں۔ ہر نیوز چینل پر بھائی جی کی موت کی خبر تواتر سے نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف طرح کے تبصرے کیے جا رہے تھے۔ انڈرورلڈ کے دو بڑے مخالفین کی اتنے کم وقفے سے اموات نے بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ سوالات اُٹھائے جا رہے تھے کہ یہ اموات کسی سازش کا نتیجہ ہیں یا محض اتفاق؟ ان حالات میں جبکہ بھائی جی ممبئی کا بے تاج بادشاہ بننے جا رہا تھا، ایسے کیا اسباب بنے کہ وہ خودکشی پر مجبور ہوگیا؟

بھائی جی کی خودکشی کے عوامل پر غور و خوض کرنے کے ساتھ ساتھ دبی زبان میں یہ قیاس آرائیاں بھی کی



جا رہی تھیں کہ یہ خودکشی کے بجائے قتل بھی ہوسکتا ہے اور اس قتل کے محرکات میں اشوک کی موت کے بدلے کو لے کر کسے بھائی جی کی موت سے زیادہ فائدہ پہنچے گا؟ ان ساری باتوں کا دبی زبان سے ہی سہی، جائزہ لیا جا رہا تھا۔ ان چاروں کے لیے ہی یہ صورتِ حال نہایت گمبھیر اور عجیب تھی اور وہ بھی مختلف طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

ان کی سوچوں اور تفکرات سے بے نیاز ماچھو اُن کی مہمان داری کے انتظام میں مصروف تھا۔ آوازوں سے انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ ماچھو کے ساتھ اس کی بیوی بھی اس مکان میں موجود ہے جس نے مرغی ذبح کرنے کے دوران شوہر کو بے شمار ہدایتیں دی تھیں۔ کمال یہ تھا کہ اس کی آواز بھی ماچھو کی طرح ہی کرخت اور کاٹ دار تھی اور چھوٹے سے گھر میں گونجتی پھر رہی تھی۔ وہ باقاعدہ ان کے سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس نے باقاعدہ پردہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ چاروں منہ ہاتھ دھونے اور دوسری ضروریات کے لیے ماچھو کی راہنمائی میں باتھ روم تک گئے تھے تو اس عورت سے بھی سامنا ہوا تھا۔ وہ ماچھو کے مقابلے میں خاصی کم عمر لیکن مضبوط ہڈیوں کی دبنگ عورت معلوم ہوتی تھی۔ مرغی اس نے دیسی انداز میں مگر مزیدار بنائی تھی۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج نہ ہوتے تو اس سے صحیح طور پر انصاف کر سکتے تھے لیکن ابھی تو صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھا سکے تھے۔

''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں صاحب؟'' کھانے کے بعد ماچھو ایک بار پھر ان کے لیے چائے لایا تو عاجزی سے دریافت کیا۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے وہ شہریار کی دوائیں ساتھ نہیں لے سکے تھے۔ سلّو نے ماچھو سے ان کے بارے میں معلوم کیا کہ کیا وہ کسی میڈیکل اسٹور سے مل سکتی ہیں۔

''میڈیکل اسٹور (اسٹور) جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ نام لکھ کر دے دو۔ ادھر بستی میں سے سب مل جائے گا۔ ادھر کا ڈاکٹر بھی سارا حساب کتاب جانتا ہے۔ آپ بولو تو اسے یہاں لے کر آ جاتا ہوں۔ اپنا ہی آدمی ہے۔''

جواب میں ماچھو نے پیشکش کی لیکن انہوں نے صرف دواؤں کے نام لکھ کر دینے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ انہیں لے کر باہر نکل گیا اور ان کی توقع کے خلاف صرف دس منٹ بعد ہی دواؤں کے ساتھ واپس آ گیا۔ انہوں نے پانی کے ساتھ دوائیں کھا لیں۔ زخموں کی مرہم پٹی دوبارہ کرنا فی الحال ضروری نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے ڈاکٹر فرحان اور کلام کو زبردستی سونے کے لیے لٹا دیا۔ بستر کا انتظام ماچھو کر گیا تھا۔ سلّو اور کلام بھی بستر پر نیم دراز ہو گئے۔ یہاں وقت گزاری کے لیے ان کے پاس ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ اچانک ہی وہاں ایک بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ اس نیوز کے مطابق بھائی جی کے دیرینہ ساتھی عبدالرحمٰن نے اس کی خودکشی کی وجہ تلاش کر لی تھی۔ وجہ پاکستان سے آنے والی ایک ای میل تھی جس کے مطابق پاکستان میں مقیم بھائی جی کی محبوبہ اگلی دنیا سدھار گئی تھی۔

اتنے دبنگ آدمی کی موت کی ایسی وجہ سامنے آنے پر بڑے بڑے مبصروں کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ خود بھی بھائی جی کی داستانِ عشق سے واقف تھے، اس لیے وجہ سامنے آنے پر گہری سانس لے کر رہ گئے۔ بھائی جی نے اُنہیں یہاں سے نکالنے کے جو وعدے وعید کیے تھے، ان کے لیے بس وہ عبدالرحمٰن سے کہہ سکتے تھے کہ وہ ان وعدوں کو ایفا کرے گا۔ آثار بھی ایسے ہی محسوس ہوتے تھے۔

آنے والی اس نئی خبر پر کچھ دیر تبصرہ کرنے کے بعد بالآخر وہ دونوں بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کلام اور سلّو کو تو نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد سونا نصیب ہوا تھا چنانچہ وہ بہت گہری نیند سوئے۔ رات کے آخری

پہر آہٹوں پر ان کی آنکھیں کھلیں۔ وہ عبدالرحمٰن تھا جو ان سے ملنے آیا تھا۔

''تم لوگوں کی نیند ڈسٹرب کی اس لیے سوری۔ پر اپن سالا بھی کیا کرتا۔ میڈیا والے ایسے ہ
ما فک چٹ گئے تھے کہ جان چھڑانا مشکل ہوگئی۔ فرصت ملتے ہی سب سے پہلے اِدھر آیا ہوں۔ معلوم
لوگ بھی اس سچویشن پر بڑا پریشان ہوگا۔'' ان کے قریب ہی بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے اس نے بولنا شروع
کر دیا۔

''ہاں، ہم پریشان تو تھے لیکن تمہاری مصروفیت کا بھی اندازہ تھا۔ بھائی جی کی اچانک موت کا
افسوس ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس سانحے پر بہت ڈسٹرب ہوگے۔ بھائی جی کے بعد تو ساری ذمے
تمہارے سر پر ہی آ گئی ہوگی نا۔ اس موقع پر پبلک کو سنبھالنا، گینگ کو منظم رکھنا اور میڈیا سے نمٹنا واقعی آسان
نہیں ہے۔'' شہریار نے ہمدردانہ لہجے میں بولتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ وہ تھکا ہوا ضرور تھا لیکن غم زدہ
نہیں آ رہا تھا جو کہ بھائی جی کے قریب ترین ساتھی کی حیثیت سے اسے نظر آنا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے
محسوس ہوا تھا کہ اس کی بات سنتے ہوئے عبدل کے ہونٹوں پر مبہم سی پُراسرار مسکراہٹ بھی چمکی تھی۔

''اپن اس سارے لفڑے سے نمٹ لے گا۔ ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا۔ تم لکی ہو کہ ٹائم پر
ورنہ تمہارے لیے ادھر سے نکلنے کے راستے اور بھی تنگ ہو جاتے۔'' عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ انکشاف کا
رکھتے تھے لیکن بہت کچھ وضاحت طلب تھا جو اس نے ان کے سوالوں پر واضح کیا۔

''اپن کے دھندے کا رُول ہے کہ کوئی کام بھی پکڑے پھر سامنے والی پارٹی سے چیٹنگ نہیں کرنا
اپن تم لوگوں کا احسان مند تھا کہ ایک موقع پر تم نے ہمارا مدد کیا تھا۔ بعد میں تمہارا بھائی جی سے بھی
گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر تم اشوک کا کانٹا نکال دیتا ہے تو وہ تم کو تمہارے ساتھیوں سمیت ادھر سے
دے گا۔ لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ اپن کو بتائے بغیر ''را'' والوں سے کانٹیکٹ کیا اور اُس
بھٹناگر سے ڈیلنگ کر لیا کہ اگر ''را'' اُس کو اشوک کے کیس سے الگ کر دیتی ہے تو وہ دو پاکستانی
گردوں کو گرفتار کرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ اس نے سارا سیٹنگ ایسے بنایا کہ تم کو شک ہی نہ ہو
کام میں اُس کا ہاتھ ہے۔ بعد میں جب اپن کو پتہ چلا کہ ایسا لفڑا ہو گیا ہے تو اپن بہت گرم ہوا اور بھائی
اپنے دھندے کے اصول یاد دلائے لیکن وہ سالا اپن کی بات کو ایسے ٹال دیا جیسے اپن کوئی سڑک چھاپ
ہو۔ بولنے لگا، عبدل! تُو ملازم ہے، ملازم رہ۔ مجھے ڈکٹیشن مت دے۔ اپن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ
دے گا کہ عبدل کے بغیر وہ کچھ نہیں ہے۔ اُس کے پاس باس کی کرسی ضرور تھی لیکن اُسے اس کرسی پر
رکھنے والا تو عبدل تھا نا؟ گینگ میں چند کو چھوڑ کر کون ہوگا عبدل کی بات پر بھائی جی کی بات کو اہمیت
سب سالا لوگ جانتا ہے کہ جو عبدل بھائی بولے، وہی کرنے کا ہے۔ پر بھائی جی کو یہ بات سمجھ نہیں آئی۔
حلالی کے واسطے اپن نے بہت سر پھوڑا، پر وہ نہ مانا۔ تم دونوں بھٹناگر کی قید سے نکل کر جس ہوٹل میں
تھے، وہاں بھائی جی کے بندے نے تمہیں دیکھ کر اطلاع دے دی تھی۔ جب تم نے اپن کو وہاں سے
اپن تمہیں وہاں سے نکالنے کی ترکیب ہی کر رہا تھا، پر بھائی جی پہلے ہی پارٹی تیار کر کے تمہیں پکڑنے
تھا۔ آگے تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ میرے آدمیوں نے کتنی مشکل سے تمہیں وہاں سے
یہاں پہنچا دیا۔''

وہ آنکھیں پھاڑے یہ ساری داستان سن رہے تھے۔ ممبئی کے ایک ڈان کا نمبر ٹو ان کی خاطر
کے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ عجیب ہی انہونی ہوئی تھی لیکن جرائم کی دنیا کا طریقِ کار دیکھا جائے



بات بھی نہیں تھی۔ یہاں پر نمبر ٹو کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نمبر ون کی جگہ لے لے۔ اس کے لیے وہ
خانہ کوشش بھی کرتا رہتا ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بھی یقیناً کرتا رہا تھا اور بھائی جی کے وفاداروں کو اپنا
بنا رکھا تھا۔ نمبر ون کی جگہ لینے کے لیے ہر طرح سے تیار عبدالرحمٰن کو بہانہ بھائی جی نے خود فراہم کر
اس نے اپنے باس ہونے کے زعم میں عبدالرحمٰن کی انا کو ٹھیس پہنچائی اور پیمانہ چھلک پڑا۔ اگر بھائی جی
موقع پر نرمی اور مصلحت سے کام لیتا تو ممکن تھا گاڑی کچھ برس اور بھی چل جاتی لیکن اب تو وقت اپنی چال
چکا تھا۔

''ان حالات میں کیا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بھائی جی کی موت خودکشی کے بجائے قتل تھی؟'' عبدالرحمٰن کی
میں براہِ راست دیکھتے ہوئے شہریار نے اس سے پوچھا۔

''میں نے کہا نا کہ تم لوگ لکی ہو۔ تمہاری لک نے اپن کا کام آسان کر دیا۔ بھائی جی کی داستانِ عشق
پتہ ہی ہے۔ وہ سچ مچ اپنی محبوبہ پر بہت مرتا تھا اور اتفاق دیکھو کہ یہ سارا چکر شروع ہوا تو اس کے
کی خبر آ گئی۔ خبر سن کر وہ بہت اُداس ہوا اور غم غلط کرنے کو شراب پر شراب چڑھانے بیٹھ گیا۔ اپن کو اس
برداشت نہیں ہوا اور اُسے مکتی دلا دی۔ محبوبہ کے ساتھ ساتھ ویزا لگنے پر وہ تو خوش ہی ہوا ہوگا نا؟ اوپر
کی روحوں کا ملن ہو گیا ہوگا اور اس سے بڑھ کر اپن اُس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟'' بھولی صورت کے
یہ سوال کرتا ہوا عبدالرحمٰن اُنہیں اپنا ایک اور روپ دکھا گیا تھا ورنہ اب تک تو وہ اسے بھائی جی کے
کے طور پر ہی دیکھتے آئے تھے۔

''تم نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہمیں تمہارے ان معاملات سے کچھ لینا دینا بھی نہیں ہے۔
تم سے بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ہم سے کیا وعدہ پورا کرو گے یا ہمیں اپنے طور پر کچھ برداشت کرنا ہو
مقامی حالات سے اُن کا کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے شہریار نے براہِ راست اپنے اور اپنے ساتھیوں
والے سے سوال کیا۔

''اگر کچھ کرنے کا نہیں ہوتا تو تم لوگوں کو یوں مارا ماری کر کے یہاں تک لاتے ہی کیوں؟ اپنے پورے
کام آ گئے ہیں تمہیں وہاں سے نکال کر لانے میں۔ آگے بھی بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔ پر تم پھکر
مت کرو۔ ادھر تم ایک دم محفوظ ہے۔ اس بستی کا بچہ بچہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ کسی مائی کے لال میں
نہیں ہے کہ عبدل کی اجازت کے بغیر اس بستی میں قدم رکھ سکے۔ اگر کوئی غلطی سے آ بھی گیا تو ادھر وہ
نہیں ہے جو تمہارے بارے میں ایک شبد (لفظ) بھی اُگل سکے۔'' اس نے سینہ ٹھونک کر دعویٰ کیا۔

''تم ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے کیا انتظام کر رہے ہو؟ کیا ہمیں سمندر کے راستے سے بھیجنے والے
شہریار کے لیے مطمئن ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔

''ایک دم ٹھیک سمجھا تم نے۔ ابھی تفصیل میں جانے کا ٹیم (ٹائم) نہیں ہے۔ اپن کو واپس بھی جانا ہے۔
کا سارا انتظام اپن کو ہی کرنا ہوگا۔ پر تم پھکر نہ کرو..... تمہارا کام بھی چالو ہے۔ بیس بائیس گھنٹے سے
نہیں ادھر نہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ اپن ایک بار پھر تم سے کہتا ہے کہ بے پھکر ہو کر رہو۔ کھاؤ پیو اور خوب دل
آرام کرو تا کہ آگے سفر کے لیے فریش ہو جاؤ۔'' وہ بلا کا پُراعتماد تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا کہ واقعی
اس کے کنٹرول میں ہے۔

''تم کہتے ہو تو ہم بے فکر ہو جاتے ہیں۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ہمارے لیے یہ زندگی اور موت سے بھی
معاملہ ہے۔ ہماری جانیں چاہے چلی جائیں لیکن ہمیں ڈاکٹر صاحب کو یہاں سے بحفاظت نکالنا

ہے۔'' شہریار نے اُسے احساس دلایا تو وہ جواب میں اس کا شانہ تھپک کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پھر یاد آنے پر پلٹا۔

''وہ جو گاندھی نگر میں عائشہ نام کی لڑکی تم نے ڈیری فارم پر چھوڑی تھی، وہ بھی ادھر ممبئی آ گئی ہے۔ اشوک کی موت کے بعد جو ہنگامہ ہوا تھا، اس کا فائدہ اُٹھا کر میرے بندوں نے اُسے گاندھی نگر سے نکال لیا۔ وہ تم لوگوں سے ملنا چاہتی تھی اس لیے وہ اُسے ممبئی لے آئے۔ لیکن میں نے اُسے روک رکھا ہے۔ اگر تم کہو تو تمہاری اس سے بات کروادی جائے گی۔''

اس موقع پر عائشہ کے بارے میں خبر سن کر وہ اپنی جگہ ہل کر رہ گیا۔ یہاں کے ہنگاموں میں عائشہ اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ ان کی مدد کے جرم میں اس بے چاری نے بڑا نقصان اُٹھایا تھا۔ اُس کی تو زندگی ہی اُلٹ کر رہ گئی تھی۔ اُس کا شوہر کمال، جس کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، جان سے گیا تھا اور وہ ہاسٹل میں مقیم اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی محروم ہو گئی تھی کہ اس سے رابطہ کرنے کی صورت میں خود نظر میں آ جاتی اور پاکستانی دہشت گردوں کی مدد کرنے کے جرم میں ذلت و رُسوائی کے ساتھ شدید سزا بھی پڑتی۔ اس عائشہ کو وہ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے؟

''اس سے میری بات کروا دینا۔'' فیصلہ پل میں ہی ہو گیا۔ عائشہ اس سے جو بھی مطالبہ کرتی، اسے پورا کرنا تھا کہ اس کا قرض اُتارنے کی یہی ایک صورت تھی۔

⊛----✪----⊛

پاکستان کے ایک اہم ایئربیس پر دہشت گردوں کے حملے کی خبر بہت حیرت اور دُکھ کے ساتھ سنی گئی۔ حملہ کرنے والے دہشت گرد بے حد تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس تھے اور انہوں نے اتنی منصوبہ بندی اور ہوشیاری سے یہ کام کیا تھا کہ لگتا تھا وہ وہاں کے چپے چپے سے پوری طرح واقف ہوں۔

انہیں اس کمزور پوائنٹ کے بارے میں بھرپور آگہی تھی جہاں سے وہ ایئربیس پر داخل ہو سکتے تھے۔ نہ صرف نہایت آسانی سے اس ممنوعہ حدود میں گھس گئے تھے بلکہ اپنے لیے کئی مضبوط مورچے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

حملے کے پہلے ہی گھنٹے میں انہوں نے وہاں کھڑے جنگی جہازوں میں سے ایک کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جبکہ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا تھا۔ وہاں موجود سپاہی اور افسران ان دہشت گردوں سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں شدید مزاحمت کا سامنا تھا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنے تین جوانوں کی شہادت کے ساتھ کئی کے زخمی ہونے کا صدمہ اُٹھا چکے تھے۔

تمام حساس اداروں کو فوری طور پر اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ کرنل توحید تک بھی جو اطلاع سے لاہور میں ہی سی ایف پی کے ہیڈکوارٹر میں موجود تھے، یہ خبر پہنچائی گئی۔ فوراً ہی وہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی اور نقشوں کی مدد سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ حملہ کس طرف سے ہوا ہو گا۔

عمر فاروق بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ انہوں نے تمام جزئیات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس وقت ہمارے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ فی الحال ہم ایئربیس کو دشمن کے آدمیوں سے خالی کروائیں اور اپنی سالمیت پر پڑنے والی اس کاری ضرب کا بھرپور جواب دیں۔ ہمیں حالات پر کنٹرول پانے میں جتنی دیر لگے گی، اتنا ہی ہمارا امیج خراب ہو گا۔ ایک طرف دہشت گردوں کے حوصلے بلند ہوں گے تو دوسری طرف عوام کا مورال گرے گا اور وہ سوچیں گے کہ جو فورسز اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں



وہ قوم کے لیے کیا کریں گی۔''

عمر فاروق کی بات دلیل سے پُر تھی، چنانچہ کرنل صاحب بھی غصہ چھوڑ کر عملی اقدامات میں مصروف ہو گئے۔ ان سے درپردہ تعاون کرنے والے بہت لوگ تھے۔ انہوں نے سی ایف پی جیسے خفیہ ادارے کی بنیاد یونہی نہیں رکھی تھی چنانچہ جب انہوں نے کام شروع کیا تو تمام مطلوبہ معلومات و تفصیلات منٹوں میں ان تک پہنچ گئیں۔ ہیڈکوارٹر میں موجود ہر فرد اس وقت بے حد مصروف تھا۔ فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دھڑا دھڑ فیکس اور ای میلز موصول ہو رہی تھیں۔ اس سارے عمل کی کرنل صاحب خود نگرانی کر رہے تھے۔ ذیشان، عمر فاروق اور اس کے دیگر ساتھی بھرپور معاونت کر رہے تھے۔

کرنل صاحب نے اپنے تعلقات کی بنیاد پر ہی یہ منظوری حاصل کر لی تھی کہ اس معاملے کو سی ایف پی ہینڈل کرنے میں مدد کرے گی۔ آپریشن کے لیے درکار تمام اسباب و وسائل کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ وہ جگہ سے دو ٹیموں کی شکل میں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے روانہ ہوئے تو ان میں سے ایک ٹیم کو وزیرآباد نامی گاؤں میں جبکہ دوسری کو جمال پورہ میں اُترنا تھا کیونکہ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی گاؤں سے ہی ایئربیس تک رسائی حاصل کی گئی ہو گی۔

رات کے اندھیرے میں ہیلی کاپٹرز کی یہ پرواز خطرناک تھی لیکن ماہر پائلٹس نے کامیاب لینڈنگ کی۔ ایئربیس پر جاری فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں اِردگرد کے دیہاتوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ عورتیں گھروں کے اندر اپنے بچوں کو گودوں میں چھپائے بیٹھی تھیں تو مرد ہراساں سے باہر ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے اور اس نہ سمجھ آنے والی صورتِ حال پر مختلف تبصرے کر رہے تھے۔ سی ایف پی کے افراد کے علاوہ بھی وہاں فورسز کے دوسرے افراد موجود تھے جن کے گھیرے کی وجہ سے دیہاتی حد سے آگے بڑھ کر ایئربیس کی طرف نہیں جا سکتے تھے۔

جمال پورہ میں اُترنے والی ٹیم میں جاوید علی اور سلمان بھی شامل تھے۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ دہشت گردوں کی طرف سے پاکستان کی مختلف جیلوں میں بند پانچ ایسے دہشت گردوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے جنہیں پچھلے چھ ماہ میں گرفتار کیا گیا تھا اور ان پر جاسوسی، بم دھماکوں اور اغوا جیسے سنگین جرائم کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ اپنا مطالبہ پورا نہ کیے جانے کی صورت میں انہوں نے ایئربیس پر موجود دیگر طیاروں کو بھی تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔

''یہ بڑی عجیب سی سچویشن سامنے آئی ہے۔ اتنا بڑا اور منظم حملہ صرف پانچ دہشت گردوں کو رہا کروانے کے لیے کرنا میرے نزدیک تو حماقت ہے۔ اس کے مقابلے میں تو یہ کہیں آسان ہوتا کہ یہ لوگ کسی عوامی علاقے پر قبضہ کر کے وہاں کے لوگوں کو یرغمال بنا لیتے یا پھر جیل توڑ کر اپنے آدمی آزاد کروانا بھی آسان تھا۔ آخر ان لوگوں نے یہ راہ ہی کیوں اختیار کی؟'' جاوید علی کے قریب موجود سلمان نے ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔ جس انداز سے حملہ ہوا ہے، وہ کسی مقامی تنظیم کے بس کی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں بڑی طاقتیں انوالو ہوں گی اور ظاہری مقصد سے زیادہ اصل مقصد دنیا کو یہ باور کروانا ہو گا کہ پاکستان میں سکیورٹی کی صورتِ حال کتنی ناقص ہے۔ پھر بعد میں یہ ایشو اُٹھایا جائے گا کہ اتنی نااہل فورسز رکھنے والے ملک کو ایٹم بم جیسا خطرناک ہتھیار رکھنے کی اجازت دینا دنیا کے امن کے لیے نقصان دہ ہے۔ دہشت گرد کبھی بھی اسی انداز میں کہوٹہ تک بھی رسائی حاصل کر لیں گے اور پھر دنیا میں

قیامت برپا ہو جائے گی۔''

وہ دونوں طے شدہ پروگرام کے تحت محتاط روی سے اس برساتی نالے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے ساتھ ساتھ قائم ایئر بیس کی باؤنڈری وال میں نقب لگا کر دہشت گردوں نے وہاں تک رسائی حاصل کی تھی۔ پشت پر بندھے تھیلوں کے ساتھ کیے جانے والے اس پیدل سفر میں انہوں نے گفتگو کا سلسلہ بھی رکھا ہوا تھا۔ جاوید علی کی پشت پر اس کے تھیلے کے علاوہ سرفنگ بورڈ بھی نظر آ رہا تھا جو اس نے خود فرمائش کے اپنے لیے منگوایا تھا۔ سلمان کے علاوہ اس کے دوسرے ساتھی مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر اپنا طے شدہ کام ادا کرنے مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے تھے۔

وہ برساتی نالے کے قریب پہنچے تو اس کی پُرشور آواز پوری طرح سنائی دینے لگی۔ پچھلے دنوں بہت بارشیں ہوئی تھیں اس لیے نالے میں خاصی طغیانی تھی۔ قریب پہنچ کر جاوید علی نے پیروں سے بورڈ باندھنے کا کام شروع کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ایک اور خطرناک تجربہ کرنے جا رہا تھا۔

آخر کار جاوید علی نے اپنا کام مکمل کیا اور نالے میں چھلانگ لگا دی۔ آسمان پر موجود چاند کی مدھم روشنی میں سلمان نے اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ متلاطم نالے کے پانی پر اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نالے کے چوڑے پاٹ کو عبور کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

وہ تقریباً وسط میں پہنچا ہو گا کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی وہ جس طرح سلمان کو لگا کہ وہ گولی کی زد میں آ گیا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ایک شاندار قلابازی لگائی اور سابقہ پوزیشن میں کافی دور چلا گیا۔ اس دوران سلمان اندازہ لگا چکا تھا کہ فائر کس طرف سے کیا جا رہا ہے وہ عقبی دیوار کے قریب موجود واچ ٹاور تھا جہاں سے کسی فرد نے فائرنگ کی تھی اور اب بھی مسلسل کر رہا تھا مستقل ایک ہی ہتھیار کے استعمال کی وجہ سے سلمان سمجھ گیا کہ وہ شخص تنہا ہے۔ ظاہر ہے انہیں اس طرف سے کسی کی آمد کی اُمید کم ہی ہو گی اس لیے ایک آدمی بھی کافی سمجھا گیا ہو گا۔ پھر وہ آدمی تھا بھی اپنی پوزیشن پر۔ وہ وہاں سے دُور دُور تک نظر رکھ کر آنے والوں کو روک سکتا تھا۔

فاصلہ بہت زیادہ ہونے کے باوجود سلمان اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اپنی رائفل سے فائرنگ کا شروع کر دیا۔ اس کی یہ ترکیب کسی حد تک کارگر رہی اور اس آدمی نے آوازوں سے اس کی موجودگی کی اندازہ لگا کر جوابی فائر مارا۔ اس دوران جاوید علی کو کچھ اور آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔

''عقبی واچ ٹاور پر ایک آدمی موجود ہے اور ہماری طرف فائرنگ کر رہا ہے۔'' سلمان نے اپنے آدمی پر یہ خبر آگے بڑھائی۔

''اس کی توجہ اپنی طرف کیے رکھو۔ ہم اُسے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اسے یہ جواب دینے والے عمر فاروق تھے جو ان کی ٹیم کے ساتھ جمال پورہ آئے تھے۔ وہی اس ٹیم کو کمانڈ کر رہے تھے۔ سلمان پہلے ہی فائرنگ کے ذریعے واچ ٹاور پر موجود بندے کو ڈسٹرب کر رہا تھا، ان کی ہدایت پر مزید شدت سے فائرنگ کرنے لگا۔ ادھر جاوید علی کا بھی پانی پر سفر جاری تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو گا، واچ ٹاور والے کے لیے اسے نشانہ بنانا آسان ہوتا جائے گا لیکن اس ڈر سے وہ اپنا سفر نہیں روک سکتا تھا بلکہ ڈر تو شاید سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہاں تو پھر اس جنون نے پنجے گاڑ لیے تھے کہ وطن کے دشمنوں کو ان کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ اس جنون نے وہ اس گولی کو بھی خاطر میں نہیں لایا جو اس کے کان کی لو کو تقریباً چھو کر گئی تھی اور جس کی گرماہٹ اس نے



اچھی طرح محسوس کی تھی۔ اگر صرف ایک انچ کا فرق پڑ جاتا تو گولی اس کی کنپٹی میں اُتر سکتی تھی۔ اس نے قلابازی لگا کر اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کا توازن بگڑا اور وہ خود کو رو سے بہتے پانی پر جمائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

عین اسی وقت اس نے فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے ساتھ فاروق موجود ہیں چنانچہ فوراً اُن سے مخاطب ہوا۔

''اسے ہٹ مت کیجیے گا سر! بس میرے پہنچنے تک اُلجھائے رکھیں۔''

''او کے۔'' عمر فاروق نے اسے جواب دیا۔ ساتھ ہی ہیلی کاپٹر فضا میں بلند نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر واچ ٹاور والے کے اوسان یقینی طور پر خطا ہوئے اور وہ جاوید علی کو بھول کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ہیلی کاپٹر کو مار گرائے لیکن ماہر پائلٹ نے اسے محفوظ فاصلے پر رکھا ہوا تھا اور مہارت سے بار بار اس کا رخ بدل لیتا تھا۔

پائلٹ کے ساتھ موجود عمر فاروق کی گن شعلے اُگل اُگل کر واچ ٹاور والے کو ڈرا رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت نشانہ بن سکتا ہے لیکن حقیقتاً انہوں نے ایک بھی ایسا فائر نہیں کیا تھا جو اسے نشانہ بنا سکے بلکہ فاصلے کی وجہ سے وہ اسے نشانہ بنا ہی نہیں سکتے تھے۔ ہاں، اپنے لائحۂ عمل سے انہوں نے اسے گھن چکر ضرور بنا کر رکھ دیا تھا۔ چند منٹوں کے اس کھیل میں جاوید علی بہت تیزی سے نالہ عبور کر کے باؤنڈری وال کے اس حصے تک پہنچ گیا تھا جہاں سے دہشت گردوں نے نقب لگائی تھی

باؤنڈری وال سے واچ ٹاور تک کا فاصلہ طے کرنا بھی اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ اوپر پہنچا تو سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس نقاب پوش ہیلی کاپٹر سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپریٹس پر مسلسل کسی کو ہدایات دے رہا تھا لیکن دوسری طرف سے اسے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔

''بس اب ہتھیار پھینک دو۔ یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔'' اس نے اپنی گن کی نال نقاب پوش کی کھوپڑی سے لگاتے ہوئے کہا۔ یہ گن اس نے باؤنڈری وال سے اندر داخل ہونے سے قبل اپنے بیگ سے نکالی تھی جبکہ سرفنگ بورڈ کو وہ نالے کے قریب ہی اتار کر پھینک آیا تھا۔

نقاب پوش نے سر سے لگی گن کے باوجود اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور بھڑک کر اس کی طرف پلٹا لیکن جاوید علی اسے اتنی مہلت دینے والا نہیں تھا کہ وہ اس پر فائر کر سکے۔ اس نے اپنی گن کو پوری قوت سے اس کے ہاتھ پر مارا۔ نتیجتاً ہاتھ کے زخمی ہونے کے ساتھ ہی وہ نہتا بھی ہو گیا۔ پھر بھی اس نے کمال جرأت سے کام لیا اور خالی ہاتھ ہی اس سے بھڑ گیا۔ جاوید علی اسے گولی مار سکتا تھا لیکن مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ شخص درکار تھا چنانچہ خود بھی گن ایک طرف اُچھال کر اس کے حملے کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

نقاب پوش اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے اسے واچ ٹاور سے نیچے دھکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصا توانا آدمی تھا اور جاوید کا وزن اس کے مقابلے میں کہیں کم تھا لیکن اس موقع پر اس نے ہوشیاری سے کام لیا اور نقاب پوش کے پیٹ میں تابڑ توڑ کئی ایسے مکے مارے کہ اس کی قوت کم ہو گئی اور وہ اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ اس موقع پر جاوید علی نے اپنے سر سے اس کی ناک کو نشانہ بنایا۔ وار کاری تھا چنانچہ اس کی ناک سے خون بہہ کر نقاب کو تر کرنے لگا۔

جاوید علی کے بازو اس کی گرفت سے آزاد ہو گئے اور پل بھر کے لیے اسے یوں لگا کہ وہ شخص چکرا کر گرنے والا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ اس نے گرتے گرتے بڑی ہوشیاری سے ٹانگ کے ساتھ

بندھا خنجر کھینچ نکالا تھا۔ جاوید علی کو لمحے بھر کے لیے خنجر کی چمک دکھائی دی اور پھر اس کے بازو میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ اگر وہ خودکار ردِعمل کے طور پر دائیں جانب جھک نہ گیا ہوتا تو خنجر سیدھا اس کے دل میں ہی اترتا۔ اس جان لیوا حملے سے بچنے پر وہ ایسے شیر کی طرح بھڑک اٹھا جس پر کسی نا اہل شکاری نے گولی چلا کر اسے زخمی کر دیا ہو۔ اپنے ان بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ وہ نقاب پوش پر جھپٹا تو پھر وہ اسے سہار نہ سکا۔ جاوید علی کے حملوں میں اتنی تیزی تھی کہ وہ دفاع کی کوشش میں نڈھال ہو گیا۔ لیکن نہ تو دوبارہ اس پر حملہ کر سکا اور نہ ہی اپنے دفاع میں کامیاب ہو سکا۔ جلد ہی اس نے ہاتھ پیر ڈال دیئے۔

''میں نے اسے قابو کر لیا ہے سر!'' اس نے غیر متوازن سانسوں کے ساتھ عمر فاروق کو اطلاع دی۔

''ہم دیکھ چکے ہیں جوان! تم وہیں ٹھہرو۔ ہم تمہاری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر پہلی بار اپنے بازو کے زخم کی طرف متوجہ ہوا۔ خنجر گوشت میں اچھا خاصا اتر گیا تھا اور زخم سے متواتر خون بہہ رہا تھا۔ خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ انتظار کرنے لگا۔

ایئر بیس کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں لیکن ہر فرد کا دائرۂ کار بٹ گیا تھا اور وہ یہاں سے ہٹ کر کہیں اور دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں رکھتا تھا۔ ویسے بھی بے ہوش کو عمر فاروق کے حوالے کرنے سے پہلے اس کا یہاں سے ہٹنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ جلد ہی وہ اس کو لے گئے۔

''آرمی نے ایئر بیس کو تقریباً کلیئر کروا لیا ہے۔ اس بندے کو ہم اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ اس سے ہمیں بہت سی اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ لیکن خیال رہے کہ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے۔ دہشت گردوں کے لیے یہ شخص ہمارے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اپنے راز کی حفاظت کے لیے وہ اسے اغوا کر لینے یا اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔''

بے ہوش حالت میں گرفتار شخص کو پوری چابک دستی سے ہیلی کاپٹر میں منتقل کرنے کے دوران عمر فاروق نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی جس پر سب نے بیک زبان ''یس سر'' کہا۔

''جاوید! تم زخمی ہو، اس لیے ہیلی کاپٹر میں قیدی کے ساتھ واپس جاؤ گے۔ میں اور باقی ٹیم یہاں کے معاملات نمٹا کر بعد میں واپس آئیں گے۔'' ان کا دوسرا حکم نامہ جاوید علی کے لیے تھا جس پر عمل کرنے میں اسے اس لیے اعتراض نہیں تھا کہ وہ اپنے حصے کا کارنامہ انجام دے چکا تھا اور اطلاعات مل رہی تھیں کہ حالات اب انڈر کنٹرول ہیں، جلد ہی سب کلیئر کر لیا جائے گا۔

⊛----✪----⊛

ماہ بانو نیویارک میں مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں سکون سے رہ رہی تھی۔

وہ یہاں پہنچی تھی تو بہت دُکھی اور شکستہ حال تھی۔ شاہدہ نے پورے خلوص سے اس کی دل جوئی اور دلداری کی۔ ننھی علینہ بھی اس کا دل بہلانے کا ایک سبب بنی۔ اپنی پیاری پیاری باتوں سے وہ گھنٹوں اس کا دھیان بٹائے رکھتی اور اکثر کوئی نہ کوئی ایسا معصومانہ جملہ بول دیتی کہ ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آتی۔ ماہ بانو کا اپنا بیٹا بھی تھا جس کا جسمانی عیب اسے دُکھی کرتا تو دوسری طرف وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اس نامساعد حالات میں بھی اس مالک نے اس کے بچے کی زندگی محفوظ رکھ کر اسے جینے کا جواز مہیا کر دیا تھا۔

وہ یہاں آئی تھی تو بالکل گم صم تھی، یہاں تک کہ بچے کا نام بھی نہیں رکھ پائی تھی۔ شاہدہ نے اس طرف اس کا دھیان دلایا اور ساتھ ہی اصرار بھی کیا تو اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام مجاہد رکھا۔ وہ بچہ دنیا میں



آنے سے قبل ہی اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا رہا تھا اور نہ جانے ماں کے شکم میں جاری اس جہدِ مسلسل کے دوران کن کن مراحل سے گزرا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ ناکارہ ہو گیا تھا۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ آگے بھی اسے اپنی زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی ہو گی۔ اس کے کچھ نادیدہ دشمن تھے جو شاید اسے ماں کی گود کی گرمی سے محروم کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ ان دشمنوں سے بچ جاتا تو بھی اسے نارمل لوگوں میں اپنے وجود کو تسلیم کروانے کے لیے سخت محنت و جدوجہد کرنا پڑتی اس لیے اس کا نام مجاہد بالکل ٹھیک تھا۔

اس کے نیویارک آنے کے چار دن بعد مراد شاہ بھی واپس آ گیا۔ اس سے انہیں وہ خبریں ملیں جو ٹی وی نہیں کر سکتا تھا۔ خبروں سے انہیں یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگل میں لگی آگ پر قابو پا لیا گیا ہے اور آگ لگنے کی وجوہات کا کھوج لگایا جا رہا ہے۔ جنگل میں زیرِ زمین کسی خفیہ لیبارٹری کے وجود کو تو ظاہر ہے وہ تسلیم نہیں کرنے والے تھے اس لیے ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہاں ہونے والے دھماکوں کی خبر میڈیا کو دیتے۔ ان حالات میں زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ آگ لگنے کی وجہ قدرتی عوامل کو قرار دیا جائے گا۔ البتہ ایڈن خانہ جو کارروائیاں چل رہی تھیں، ان کی خبریں مراد شاہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ آگ بجھنے اور اس کی شدت کم ہونے کے انتظار میں امریکی تحقیقی اداروں کو کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔

اگرچہ انہوں نے ایڈی اور ڈاکٹر طارق کی لاشوں کے علاوہ بائیکس تک ابتدا میں ہی رسائی حاصل کر لی تھی لیکن یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ لیبارٹری میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایڈی کے علاوہ انہیں باقی تجرباتی بچوں کی جلی ہوئی لاشیں بھی مل گئی تھیں۔ انہوں نے لیبارٹری کے تباہ ہو جانے اور پھر جل کر خاکستر ہو جانے کے بعد بہت سے نتائج اخذ کر لیے تھے۔

اپنی تحقیقات سے وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ جس وقت لیبارٹری تباہ ہوئی، پروفیسر ہنری وہاں موجود نہیں تھے لیکن وہ پروفیسر اور اسلم کی دلدل میں دھنس جانے والی لاشیں دریافت نہیں کر سکے تھے۔ اس بارے میں جو لوگ آگاہ تھے، ظاہر ہے وہ انہیں حقائق سے آگاہ کرنے والے نہیں تھے اور کوئی اتفاق ہی آنے والے وقت میں ان لاشوں کو منظر پر لا سکتا تھا۔ بہرحال، وہ یہ جان چکے تھے کہ اس حادثے سے پہلے ماہ بانو وہاں سے نکل چکی تھی کیونکہ وہاں انہیں اس کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملے تھے۔ اس انکشاف پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ سارا فساد ماہ بانو کو وہاں سے نکالنے کا تھا۔ چنانچہ اس کی تلاش میں انہوں نے سب سے پہلے مصطفیٰ خان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ظاہر ہے اس نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ اسلم اور ماہ بانو کو اس نے ہم وطن ہونے کے ناتے اپنے پاس ملازمت اور پے انگ گیسٹ کی سہولیات ضرور دے رکھی تھیں لیکن وہ ان کی نجی زندگی سے قطعی ناواقف تھا۔ ماہ بانو کے غیاب پر اس نے اخلاقی طور پر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلم کی مدد بھی کی تھی لیکن اس سے آگے کے حالات سے وہ ناواقف تھا کہ ماہ بانو کا دیوانہ شوہر اسلم اپنی بیوی کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور اس نے کیا کچھ کیا۔

مصطفیٰ خان کے پاس اپنی کاروباری اور ملازماتی مصروفیات کی ایک طویل تفصیل تھی جس کی روشنی میں اس نے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ اتنی مصروفیات کے بعد اس کے پاس کسی اور سرگرمی میں حصہ لینے کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ مصطفیٰ خان ایک معزز آدمی تھا جو ایک اچھے عہدے پر ملازمت کے علاوہ نمایاں کاروباری شخصیت بھی تھا۔ اس اعتبار سے اس کے اونچے طبقے میں اچھے تعلقات بھی تھے اس لیے تحقیقاتی اداروں نے اس سے زبانی کلامی تو بہت سختی سے تفتیش کی لیکن دباؤ میں لینے میں ناکام رہے۔ البتہ اس کی خفیہ نگرانی کی جا رہی تھی جس سے مصطفیٰ خان ناواقف نہیں رہا تھا۔

پولیس والوں کا دوسرا نشانہ آفتاب اور کشور تھے جن کے دونوں ہی خاندانوں سے دوستانہ مراسم تھے، ان دونوں میاں بیوی نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا کہ وہ بے شک ماہ بانو کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان تھے لیکن پولیس سے مدد کی توقع رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسلم کے بارے میں ان کا بھی یہی بیان تھا کہ ماہ بانو کو تلاش کرنے کے جنون میں وہ کہاں گیا؟ انہیں اس کا علم نہیں۔

آفتاب معاشی طور پر کوئی بہت مضبوط آدمی نہیں تھا لیکن ایک صحافی تھا جس نے امریکہ کے مقامی اخبارات میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ ایک صحافی کو وہ غیر ضروری طور پر تنگ کرتے تو انہیں بھی عوام کو اس سوال کا جواب دینا پڑتا کہ جنگل کی آگ اور ماہ بانو اور اسلم کے غیاب کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس لیے فی الحال ان کی طرف سے کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا گیا تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے تھے کہ یہ صرف وقتی خاموشی ہے اور وہ لوگ اتنی آسانی سے چپ ہو کر بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ اپنی کھوج کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لیے وہ ہر امکان پر کام کرتے جیسا کہ انہوں نے اسٹور پر ماہ بانو اور اسلم کے کولیگز کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا اور ان سب باتوں سے ہٹ کر یہ جاننے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے کہ جنگل والے حادثے کے فوراً بعد ماہ بانو نے آرلینڈو سے نیویارک تک کا سفر کیا لیکن اس کے بعد وہ تاریکی میں تھے اور انہیں اس بات کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ نیویارک میں ماہ بانو کہاں گئی۔

''وہ بہت اسمارٹ ہیں۔ تمہارے کیس میں چند اتفاقات نے انہیں حقائق تک پہنچنے میں تاخیر کا شکار کر دیا ہے لیکن وہ جس انداز سے کام کرتے ہیں، ہمیں ان سے یہ اُمید رکھنی چاہئے کہ وہ کسی بھی وقت یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ ابھی انہیں نہیں معلوم لیکن جلد وہ جان لیں گے کہ جن تاریخوں میں یہ سب کچھ ہوا، لگ بھگ انہی تاریخوں میں کشور کا بھائی مراد شاہ نیویارک سے آرلینڈو گیا تھا۔ میرے پاس وہاں جانے کا جواز موجود ہے اور میں یہ بھی ثابت کر سکتا ہوں کہ تمام عرصے میں، میں اپنی کمپنی کی طرف سے مہیا کیے گئے ہوٹل کے کمرے میں ہی مقیم رہا اور میں تمہیں جانتا تک نہیں۔ بلکہ میرا تو خاندانی ناچاقی کی وجہ سے اپنے بہن بہنوئی سے بھی میل جول نہیں ہے۔ لیکن وہ اتنی آسانی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان پر اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہیں یہاں سے کہیں اور شفٹ کر دوں۔'' اسے حالات سے آگاہ کرنے کے بعد مراد شاہ نے اپنی رائے پیش کی تو وہ تھوڑی سی متوحش ہو گئی۔

''کہاں؟..... اتنے چھوٹے بچے کے ساتھ میں اکیلی کہاں رہوں گی؟'' اس کا اندرونی اضطراب اس کے لہجے میں در آیا۔

''مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن تمہاری اور بچے کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں جس جگہ منتقل کروں گا، وہاں تمام ممکنہ سہولیات بھی فراہم کر دوں گا تاکہ تمہیں کسی بھی وجہ سے پریشان ہونا اور باہر نکلنا نہ پڑے۔'' مراد شاہ نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی وہ یہاں میرے اتنے دن قیام کا سراغ تو لگا سکتے ہیں؟'' اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''اس کے لیے بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ میں نے چیک کر لیا ہے کہ داخلی گیٹ پر نصب کیمرے نے تمہاری جو تصویر لی ہے، وہ واضح نہیں ہے اور کوئی بھی چادر اوڑھے مشرقی عورت ویسی ہی دکھائی دے سکتی ہے جیسی تم اس تصویر میں نظر آ رہی ہو۔ تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ شاہدہ کی ایک پاکستانی دوست نے حال ہی میں ماں بنی ہے اور ہم نے اسے اس بات کے لیے راضی کر لیا ہے کہ وہ کسی پوچھ گچھ کے جواب میں یہ کہہ دے کہ ان تاریخوں میں وہ یہاں آئی تھی اور شاہدہ کی مہمان رہی تھی۔''



مراد شاہ کا ہوم ورک مکمل تھا۔ دراصل اسے کچھ مشورے مصطفیٰ خان نے بھی دیئے تھے جن کی روشنی میں اس نے ترتیب دے ڈالا تھا ورنہ بنیادی طور پر تو وہ سیدھے سیدھے راستے پر چلنے والا صاف ستھرے کردار کا آدمی تھا جس کا چالبازیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ اپنے چالباز و شاطر باپ سے وراثت میں کچھ نہیں لے سکا تھا۔

''میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں مراد شاہ صاحب! مجھے اُمید نہیں تھی کہ ان حالات میں آپ میری اس حد تک مدد کریں گے کہ خود کو مشکل میں ڈال لیں گے۔'' ماہ بانو نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس سب کے بدلے مراد شاہ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''تمہیں میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے ماہ بانو! میں تو خود تمہارا مقروض ہوں اور بس اس قرض کا کچھ حصہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' یاسیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ماہ بانو کے سامنے اعتراف کیا۔ اس وقت صرف وہ دونوں ہی لاؤنج میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ شاہدہ کچن میں مصروف تھی جبکہ ننھی علینہ، مجاہد کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ چند دن کے بچے سے دنیا جہان کی باتیں کرنا ان دنوں اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔

''آپ شاید سانپ کے ڈسنے والے واقعے کا ذکر کر رہے ہیں۔ لیکن وہ تو بہت معمولی سی مدد تھی جو انسانیت کے ناتے مجھے کسی بھی شخص کی کرنی ہی چاہئے تھی۔'' اپنی انگلی میں موجود زہر مہرہ انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ یہ انگوٹھی اسے ہمیشہ گل مینا کی یاد دلاتی تھی۔

''اس مدد کے حوالے سے بھی میں تمہارا مقروض ہوں۔ لیکن اصل قرض تو مجھ پر ابا جی نے چڑھایا ہے۔ کشور مجھے بتا چکی ہے کہ تمہاری زندگی کو یہاں تک لانے میں انہوں نے کتنا بھیانک کردار ادا کیا ہے۔ ان کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے میں خود کو تمہارا مجرم و مقروض تصور کرتا ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان حالات سے نکلنے میں تمہاری مدد کروں۔ اس کے لیے اگر مجھے کچھ مشکل اٹھانی پڑتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ احساسِ ندامت کے مقابلے میں یہ بوجھ ذرا کم ہی ہوگا۔''

اس کی پورے خلوص سے کہی بات نے ماہ بانو کو دنگ کر دیا۔ یہ تو شیطان کے پیٹ میں ولی والی مثل تھی۔ ابا جی جیسے سفاک آدمی کا بیٹا اتنا حساس ہو سکتا ہے، یہ تو کبھی اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

''آپ کی صورت میں، میں پیر آباد کا مستقبل روشن دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے بہت برجستگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''فی الحال تو میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اُس ماحول میں خود کو بالکل مس فٹ محسوس کرتا ہوں۔'' مراد شاہ نے شانے اچکا کر جواب دیا۔

''نہیں، آپ کو اس انداز سے نہیں سوچنا چاہئے۔ سسٹم کو بدلنے کے لیے وہاں آپ جیسے شخص کی بہت ضرورت ہے۔'' اپنی عادت کے مطابق وہ اسے سمجھانے لگی۔

''مستقبل میں کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنے بارے میں تمہارے ان کمنٹس کو یاد رکھوں گا۔'' مراد شاہ نے کہا اور مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ حالات کی سختی نے اسے خاصا کمزور کر دیا تھا اور حزن و ملال سے گھرا چہرہ زرد زرد نظر آتا تھا لیکن وہ جو اس کی قدرتی ملاحت اور کشش تھی، وہ اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ مراد شاہ بھی اس سے متاثر ہوا تھا اور ایک مرد کی حیثیت سے اس کے لیے اپنے دل میں کشش کو محسوس کی تھی لیکن اپنے باپ کی طرح بے لگام جذبات سے زیر ہونے والا نہیں تھا۔ خاندانی روایات کے

تحت ہی سہی، اس نے شاہدہ کے ساتھ زندگی نباہنے کا عہد کیا تھا اور پوری دیانت داری سے یہ عہد پورا کر
رہنا چاہتا تھا چنانچہ فوراً ہی اپنی نظروں کا رخ موڑ لیا۔

''آپ نے یاد رکھا تو یہ میری عزت افزائی ہوگی۔'' ماہ بانو جو اس کی نظروں کا خود پر ٹھہرنا اور پھر
محسوس کر چکی تھی، پورے اعتماد سے بولی۔ حالات نے اسے اتنی صلاحیت تو عطا کر دی تھی کہ وہ نگاہوں کی
زبان سمجھ سکے۔ مراد شاہ کی نگاہوں میں اس کے لیے کوئی ناپاک جذبہ نہیں تھا۔

''ارے ہاں، میں تمہیں ایک اہم خبر تو دینا بھول ہی گیا۔ پاکستان میں تمہارا ایک شناسا، مشابرم خان
کرتا تھا۔ وہ بھی آج کل یہاں امریکہ میں ہے۔ مصطفیٰ خان نے مجھے تمہارے لیے یہ پیغام دیا تھا کہ
مشابرم خان تمہارے پاس ہوگا اور اس کی موجودگی میں تم خود کو کافی محفوظ تصور کرو گی۔'' مراد شاہ کو یاد آیا
اسے پیغام دیا۔ مشابرم خان کا نام سن کر وہ سچ مچ خوش ہوگئی۔

''واقعی خان یہاں موجود ہے؟ وہ تو بہت بہادر اور نیک دل آدمی ہے۔ آپ کی اس سے ملاقات
ہے؟''

''نہیں۔'' اس کے اشتیاق سے پوچھے گئے سوال کا اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں اس سے ملا
ہوں، بس مصطفیٰ خان نے مجھے اس کے بارے میں تمہیں بتانے کو کہا تھا۔''

اس جواب کو سن کر ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب وہ کسی مشکل میں ہوتی ہے
شہریار سے وابستہ کوئی نہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ مصطفیٰ خان نے بھی تو اب
شہریار کے حوالے سے ہی اس کی اتنی مدد کی تھی اور اب مشابرم خان اس کا محافظ بن کر آنے والا تھا۔ یعنی
جس نے اس سے رابطہ نہ رکھنے کا عہد لیا تھا، خود اس کے حال سے بے خبر نہیں رہتا تھا اور کسی نہ کسی طور
موجودگی کا احساس دلا جاتا تھا۔

''تم کہاں کھو گئی ہو؟ دیکھو بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اسے کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟ شاہدہ
کھانے کے لیے آواز دے رہی ہے۔ بچے کو دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جاؤ۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔
میں تمہاری دوسری رہائش کا بندوبست کرنے نکل جاؤں گا۔''

مراد شاہ کی آواز اسے اس کی سوچ سے باہر نکال کر لائی تو وہ ''جی!'' کہتی ہوئی تیزی سے وہاں سے
کر باہر نکل گئی۔ شہریار عادل کو اس کی فکر تھی یا نہیں، اس بات سے زیادہ اب اسے اس بات کی فکر کرنی تھی
وہ اسلم کے بیٹے مجاہد کی ماں ہے جس کی اسے ہر دم حفاظت کرنی ہے۔

⊛----✪----⊛

''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں عائشہ! ہماری وجہ سے آپ بہت مشکل میں پڑ گئی ہیں۔''

''مجھے آپ کے شرمندہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ آپ کی شرمندگی میری زندگی کی مشکلات
کو دُور نہیں کر سکتی۔ میں اپنے ملک میں اجنبی ہوگئی ہوں اور خود کو بچانے کے لیے چوروں کی طرح چھپتی
رہی ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میری کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں اپنے دامن پر ملک دشمن کا داغ لے
اب اس ملک میں کیسے رہ سکتی ہوں؟ یہ لوگ تو مجھے نشانِ عبرت بنا دیں گے اور میں اپنے عزت دار باپ
لیے کلنک کا ٹیکا بن جاؤں گی۔ میری بیٹی ابھی چھوٹی ہے لیکن وہ اس طعنے کو سنتے ہوئے بڑی ہوگی کہ اس کی
ماں ملک دشمن تھی تو وہ بھی مجھ سے نفرت کرے گی۔'' وہ جو بہت ضبط والی تھی، اس کی آواز سنتے ہی
پڑی۔



شہریار اس کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ ان کی مدد کر کے وہ اپنا سب کچھ گنوا چکی تھی اور اتنے
سے ایک ڈیری فارم پر عدم تحفظ کے احساس کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ پہلے اس کی زندگی کا ایک مقصد
وہ کمال کا علاج کروا کر اسے نشے کی لت سے آزاد کروانا چاہتی تھی پھر اس کی بیٹی تھی جس کے لیے یقیناً
کے دل میں بہت اونچے اونچے خواب تھے لیکن یک دم سب کچھ ختم ہوگیا تھا اور وہ وطن کی غدار ٹھہرائی جا
تھی۔ ایسے حالات میں جبکہ خود اس کے لیے یہاں کی زمین تنگ پڑ چکی تھی، وہ کسی اور کے لیے کیا کر سکتی
۔ اس کا پریشان ہونا بالکل فطری تھا۔

''کیا آپ ہمارے ساتھ یہاں سے چلیں گی عائشہ؟'' وہ بے اختیار ہی اس سے یہ سوال کر بیٹھا۔

''جی.....!'' وہ بے حد حیران ہو کر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''میں پوری سنجیدگی سے آپ کو یہ پیشکش کر رہا ہوں۔ ہم لوگ عنقریب یہاں سے نکلنے والے ہیں اور
آپ چاہیں تو آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے گا کہ یہ سفر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا
ہم اپنی زندگیوں کے رِسک پر یہاں سے نکلیں گے۔'' اس نے سنجیدگی سے اپنی پیشکش کو دہراتے ہوئے
صورتِ حال بھی واضح کر دی۔

''زندگی کا رِسک تو مجھے یہاں بھی ہے۔ میں قانون کے ہاتھ آ گئی تو وہ لوگ کوئی مجھے پھولوں کے ہار تو
پہنائیں گے۔ ذلت بھری موت یا موت سے بدتر قید ہی میرا نصیب ہوگی۔'' اس نے یاسیت زدہ لہجے
حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ کامیابی سے منزل پر پہنچ جانے کی صورت میں کم از کم آپ
سرے سے عزت دار زندگی کے آغاز کا موقع تو ملے گا۔''

''لیکن میری بیٹی..... اس ملک سے نکل جانے کی صورت میں مجھے ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہونا
گا۔ اور اس کی جدائی مجھے جیتے جی مار دے گی۔'' وہ بلک اُٹھی۔ بیٹی سے جدائی کا خیال ہی اُسے تڑپا
کے لیے کافی تھا۔

''ابھی آپ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کریں۔ انسان زندہ رہے تو بہت سے امکانات کے در کھلے
ہیں۔ فی الحال تو آپ کے لیے یہ اطمینان کافی ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی خیریت سے ہے اور ایک اچھے
میں پڑھ رہی ہے۔ اس کے والد بھی یقیناً اس کی خبر گیری کرتے رہیں گے۔ پھر بعد میں جیسے ہی موقع
ملا، اسے آپ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے جو اپنے زندہ نہ رہنے کی
میں بھی پورا کرنے کے لیے میں اپنے لوگوں کو پابند کر جاؤں گا۔ میری ذات سے آپ کو جو نقصان
ہے، اس کی تلافی کی میرے پاس یہی ایک صورت ہے۔'' بہت مضبوط لہجے میں کہے گئے ان الفاظ نے
کو تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں ڈال دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں راضی ہوں۔'' آخر کار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''اوکے، اب آپ عبدل یا اس کا جو بھی ساتھی آپ کے قریب ہے، اس سے میری بات کروائیں۔''
کا فیصلہ سن کر اس نے اس سے کہا۔ اگلے ہی لمحے عبدالرحمٰن کا ساتھی حسین لائن پر تھا۔

''عبدل سے کہنا کہ یہ عورت بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔ اس لیے اسے بھی ہمارے پاس ہی پہنچا دیا
۔ اور ہاں، اس کے علاوہ مجھے ایک لیپ ٹاپ، یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس کے ساتھ چاہیے۔ کیا اس کا
ہو جائے گا؟'' اس نے حسین سے براہِ راست اپنے مطلب کی بات کی۔

''بالکل سر! میں عبدل بھائی سے بات کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ایک گھنٹے کے بعد دونوں آپ کے پاس ہوں گے۔'' اس کا اشارہ عائشہ اور لیپ ٹاپ کی طرف تھا۔

شہریار نے اوکے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل ماچھو کے حوالے کر دیا۔ یہ ماچھو کا ہی سیٹ تھا اس نے عائشہ کی کال آنے پر اسے لا کر دیا تھا۔ ماچھو نے جب اسے سیٹ تھمایا تھا تو وہ پل بھر کے لیے حیران رہ گیا تھا کیونکہ وہ بلیک بیری تھا۔ لیکن پھر اسے سمجھ آ گئی تھی کہ ماچھو کے ساتھ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ'' والا معاملہ تھا۔ اس بظاہر غربت زدہ نظر آنے والی بستی میں بے حد غریب نظر آنے والا وہ مچھیرا عبدل کا خاص آدمی تھا جو شاید ان کے گینگ کی اسمگلنگ کے بہت سے معاملات سنبھالتا تھا اس لیے وہ قانون کی پکڑ سے بچنے کے لیے بلیک بیری جیسا محفوظ سیٹ استعمال کر سکتا تھا۔ ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ عبدل محض ان کی وجہ سے ماچھو کو وہ سیٹ دے کر گیا ہو۔ جرم کی دنیا کا بہت تجربہ کار بندہ ہونے کی وجہ سے وہ قانون اور تحقیقاتی اداروں کے طریقِ کار سے بھی خوب واقف تھا اس لیے اس نے اگر انہیں یہاں چھپایا تھا تو چھپائے رکھنے کے لیے معقول انتظامات بھی لازمی کیے ہوں گے۔

''عائشہ کو ساتھ لے جا کر کہیں ہم مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ بے شک وہ جرأت مند عورت ہے لیکن اس طرح سمندر کے راستے خفیہ طور پر نکلنے میں کوئی بھی بدترین واقعہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایسے حالات کو کیسے کنٹرول کرے گی؟'' وہ کال سے فارغ ہوا تو سلّو نے اس کے فیصلے پر اعتراض کیا۔

''اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں رہ کر بھی وہ ماری جائے گی۔'' سلّو کو کسی معاملے میں بے جا دخل اندازی کرنے کی عادت نہیں تھی اور شہریار جانتا تھا کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا ہے اس لیے نرمی سے اسے جواب دیا۔

''یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے میاں! ہم اس بچی کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اس نے بہت کڑے وقت میں ہماری مدد کی تھی، اب ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ اس کی مدد کریں۔'' ڈاکٹر فرحان نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے شہریار کی حمایت کی تو سلّو نے شانے اچکا کر ''جیسی آپ کی مرضی'' کہا اور بے نیازی سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس محدود جگہ پر ان کا یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہ مسلسل ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ صبح کی خبروں میں بھی سب سے زیادہ فوقیت بھائی جی کی خودکشی کے واقعے کو ہی دی گئی تھی۔ ان خبروں کے درمیان اچانک ہی بریکنگ نیوز چلنے لگی اور اسکرین پر تین خاکے دکھائے جانے لگے۔ یہ خاکے سلّو، شہریار اور ڈاکٹر فرحان کے تھے اور بہت واضح تھے۔ خاکے دکھاتے ہوئے یہ بتایا جا رہا تھا کہ یہ تینوں خطرناک دہشت گرد ہیں جنہوں نے بھارت بھر میں دہشت گردی کی خطرناک وارداتیں کی ہیں اور اب یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے تمام خواص و عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ اپنے اطراف پر گہری نظر رکھیں اور جہاں کہیں بھی یہ افراد نظر آئیں، فوراً اطلاع دیں۔ اطلاع دینے کے لیے کئی ٹیلی فون نمبرز بھی بتائے گئے۔ پھر معمول کی نشریات اور خبروں کے دوران ان کے خاکوں کے ساتھ یہ اپیل بار بار دہرائی جاتی رہی۔

ان کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا اس لیے زیادہ پریشان نہیں ہوئے۔ البتہ ڈاکٹر فرحان کے چہرے پر ضرور کچھ اضطراب نظر آنے لگا۔ شہریار نے ان کا ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے انہیں خاموش تسلی دی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جب تک وہ یہاں سے نکل نہ جاتے۔ ان کے لیے حالات بہرحال بے یقینی ہی تھے۔



ایک گھنٹے سے کچھ منٹ اوپر گزرے تھے کہ ماچھو نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی تھی جس سے عائشہ اُتر کر اندر آئی اس کے پیچھے ہی ایک نوجوان شہریار کا مطلوبہ سامان لے کر اندر داخل ہوا۔ کمرے میں اس نے پورا سسٹم سیٹ کر دیا۔ لیپ ٹاپ کی بیٹری پوری طرح چارج تھی اور اسے فوری طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود شہریار نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ عائشہ کے ساتھ آنے والا اپنا کام نمٹا کر فوراً روانہ ہو گیا لیکن جانے سے قبل یہ بتا گیا کہ کسی بھی ضرورت کے تحت اسے کال کیا جا سکتا ہے، وہ فوراً حاضر ہو جائے گا۔ وہ دیکھنے میں بہت اسمارٹ تھا اور کسی گینگ کا بندہ نہیں لگتا تھا لیکن جس طرح اس نے ان لوگوں سے مکمل بے نیازی برتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھا تھا، اس سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ گینگ میں پڑھے لکھے اور ہنر مند نوجوانوں کو بھی اس قسم کی ضروریات کے لیے رکھا گیا ہے جو شاید مار دھاڑ تو نہیں کر پاتے ہوں گے لیکن اپنی مجبوریوں کی اچھی قیمت وصول کرنے کے بعد گینگ سے اپنی وفاداری نبھاتے ہوں گے۔

نوجوان چلا گیا تو وہ عائشہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئی تھی اور اس کے رنگ و روپ میں بھی فرق پڑا تھا لیکن بہرحال اب بھی اپنی عمر سے کہیں کم اور نوعمر سی لڑکی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ دوبارہ وہی گفتگو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہوئی جو وہ پہلے ہی فون پر بھی کر چکے تھے۔ پھر اسے ماچھو کی بیوی کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ وہ مردوں سے ہٹ کر ذرا اطمینان سے آرام کر لے۔ درپیش خطرے کے خیال سے وہ سب ہی آرام اور جسمانی توانائی بحال کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ سلّو کو چھوڑ کر ان سب نے طاقت کی ادویات بھی لی تھیں ساتھ ہی ہاتھ پیر کھولنے کے لیے صبح ناشتے سے قبل ہلکی پھلکی ورزش بھی کر ڈالی تھی۔ وہ خود کو سفر کے لیے ممکنہ طور پر فٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شہریار نے ایک دن میں ہی اچھا خاصا سنبھالا لے لیا تھا اور اس کے زخم بھرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر فرحان اور غلام پر بھی بھائی جی کی اتنے دن کی میزبانی نے اچھا اثر ڈالا تھا اور امید کی جا سکتی تھی کہ وہ سفر کی تکالیف کو برداشت کر جائیں گے۔ سلّو تو خیر تھا ہی بالکل فٹ کیونکہ وہ خود کو فٹ رکھنے کا ہنر جانتا تھا اور کسی بھی مشن کے دوران ہونے والی چھوٹی موٹی انجری سے خود ہی نمٹ لیتا تھا۔

ظہر کے وقت ٹی وی پر بھائی جی کی نمازِ جنازہ اور تدفین کی خبریں دکھائی گئیں۔ جنازے میں لوگوں کی بے تعداد نے شرکت کی تھی اور کئی افراد پھوٹ پھوٹ کر روتے نظر آئے تھے۔ خود عبدالرحمٰن بڑا دل گرفتہ نظر آ رہا تھا اور تعزیت کرنے والوں سے عاجزی سے مل رہا تھا۔

دو بجے ماچھو نے دسترخوان لگا دیا۔ اس بار عائشہ کے ساتھ ماچھو کی بیوی بھی دسترخوان پر بیٹھی اور اپنی بلند آواز میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی رہی۔ کھانے کے بعد انہیں ان کی فرمائش پر سبز قہوہ پیش کیا گیا اور پھر وہ لوگ قیلولے کے اعلان کے ساتھ تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

اس وقت شہریار نے لیپ ٹاپ کھولا اور اپنا خاص اکاؤنٹ کھول کر پاکستان میں رابطہ کرنے لگا۔ اس اکاؤنٹ سے کی جانے والی کال پکڑنا آسان نہیں تھا اگر کہیں ان کی گفتگو سن بھی لی جاتی تو لوکیشن کا تعین اس لیے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اس کے باوجود بھارت آنے کے بعد اس نے مشکل سے ایک آدھ بار ہی اس سہولت سے استعمال کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر جگہ بڑے بڑے ماہر بیٹھے ہیں اس لیے احتیاط کرتا رہا تھا۔ پہلی ہی کوشش میں اس کا پاکستان میں رابطہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق کال ریسیو کرنے والا ذیشان ہی تھا۔

''کیسے ہو یار!..... کیا حال ہے تمہارا؟ تم نے تو کئی دنوں سے اپنی کوئی خیر خبر ہی نہیں دی۔'' اس کی آواز سن کر وہ جذباتی ہو گیا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور انشاء اللہ ہم کامیابی کے ساتھ جلد واپس آ رہے ہیں۔'' اس نے ذیشان کو خوشخبری سنائی۔

''شاندار..... یہ تو تم نے واقعی بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ پھر بتاؤ ہم کب تمہارا استقبال کریں؟'' اس کی آواز سے ہی بے حد خوش محسوس ہو رہا تھا۔

''ابھی فائنل پروگرام میرے سامنے نہیں ہے لیکن امکان یہی ہے کہ ہم آج رات ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ جو پارٹی ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے رہی ہے، اس نے دُبئی تک پہنچانے کی آفر کی ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''یعنی تم لوگ سمندر کے راستے نکلنے والے ہو؟'' ذیشان نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے تصدیق کی۔

''بندوبست پکا ہے نا؟..... یہ نہ ہو کہ تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ۔'' ذیشان متفکر ہو گیا۔

''پارٹی اسٹرونگ ہے، باقی اس طرح کے کاموں میں رسک تو ہوتا ہی ہے۔'' اس نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

''تم فائنل پروگرام طے کر کے مجھے بتاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتا دوں گا لیکن پلیز یار! تم اتنے پریشان مت ہو۔ انشاء اللہ ہم صحیح سلامت پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' اس نے ذیشان کو تسلی دی۔

''انشاء اللہ۔'' اس نے جواباً صرف اتنا ہی کہا۔

''تم سناؤ، تمہاری طرف کیا خبریں ہیں؟'' وہ موضوع بدل گیا۔

''خبریں تو خاصی گرما گرم ہیں۔ تمہارے پیچھے یہاں بھی بہت کچھ ہوتا رہا ہے لیکن ابھی تفصیل بتانا موقع نہیں ہے۔ تم لوگ واپس آ جاؤ تو پھر آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔'' وہ اسے ٹال گیا۔

''یہاں خبروں میں ایئربیس پر حملے کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ کیا چکر ہے؟'' بھائی جی کی موت کی خبر کے ساتھ جو چند خبریں میڈیا پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکی تھیں، ان میں سے ایک خبر پاکستان کے ایک ایئربیس پر دہشت گردوں کے قبضے کی خبر بھی تھی جسے سن کر وہ لوگ بے حد مضطرب ہوئے تھے اور اب وہ ذیشان سے اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''وہ.....'' ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ہمارے انہی کرم فرماؤں کی مہربانی تھی جن سے مستقل برسرِ پیکار ہیں۔ شکر ہے ہم اس سچویشن سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے اور دہشت گرد اپنے انجام کو پہنچ گئے۔'' ذیشان کی کوشش تھی کہ اس معاملے کو بہت ہلکے انداز میں لے تاکہ اس کی ٹینشن میں اضافہ نہ ہو۔

''ہاں، یہ اچھی بات ہے۔ لیکن جو ہوا، وہ بہت غلط تھا۔ اس سے دنیا کو ہمارے بارے میں بہت برا پیغام چلا گیا ہے۔'' وہ افسردہ تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اغیار کی سازشوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی غداری کے ہاتھوں بھی نقصان اٹھاتے رہے ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔''

ذیشان نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔ اپنے ہی ایک بھائی بند کی غداری نے اس کے شانے جھکا دیے تھے اور وہ حقیقتاً بہت افسردہ تھا۔

''جانے دو یار! جب تک ہماری دھرتی کے وفادار زندہ ہیں، غداروں کو ان کے انجام تک پہنچاتے رہیں گے۔''



اس نے فوراً ذیشان کی دلجوئی کی تو پھر ایک بار پھر موضوع بدل گیا۔

''باقی دوسرے معاملات تو ٹھیک چل رہے ہیں نا؟ مجھے فرصت نہیں مل سکی کہ سام انکل کی طرف والوں کی خیریت لے سکوں۔'' اس کا اشارہ امریکہ میں مقیم اپنے دوستوں کی طرف تھا۔

''ہاں، وہاں بھی خیریت ہے۔'' ذیشان اسے ماہ بانو کی موجودہ مشکلات سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مختصر جواب دیا۔ اس نے بھی مزید تفصیل نہیں پوچھی اور ضروری تفصیلات معلوم ہو جانے کے بعد دوبارہ کال کرنے کا کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

کمرے میں موجود اس کے ساتھیوں نے بھی یہ گفتگو سنی تھی لیکن کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ پر خاموش پڑے رہے۔

یونہی اونگھتے ہوئے شام ہو گئی۔ ماچھو کی بیوی نے انہیں شام کی چائے پیش کی۔ چائے پی کر وہ سب خود کو اپنے اپنے طور پر فریش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماچھو کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صحن تو بالکل ہی برائے نام تھا اس لیے وہ اس بڑے کمرے تک ہی محدود رہنے پر مجبور تھے جہاں انہیں ٹھہرایا گیا اور جگہ کے مطابق ہی ہلکی پھلکی ورزش کر رہے تھے۔

''عبدل بھائی نے بولا ہے آج رات روانگی ہے۔ بارہ بجے کے بعد کسی بھی ٹائم ریڈی رہنا۔ گاڑی آپ لوگوں کو لینے آ جائے گی۔ سمندر میں لانچیں تیار کھڑی ہیں۔ آپ لوگوں کے سوار ہوتے ہی چل پڑیں گی۔'' اس کے بعد ماچھو نے انہیں پیغام دیا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ پُل صراط جیسے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں جس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات کے تناسب کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

''ایک بات تو بتاؤ ماچھو! کل سے ہم لوگ یہاں ہیں، تمہارے گھر پر مسلسل گاڑیاں آ جا رہی ہیں لوگ آتے ہوتے ہوں گے۔ حکومت کا کوئی مخبر بھی ہماری موجودگی کی خبر لیک آؤٹ کر سکتا ہے۔ خفیہ ادارے تو تم کی بستیوں پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔'' وہ کل سے اس بارے میں سوچ رہا تھا، اس وقت ماچھو سے پوچھ لیا۔

''کسی..... میں جرأت نہیں ہے کہ یہاں قدم رکھ سکے۔'' اس نے ایک بڑی گالی کے ساتھ دعویٰ کیا۔ ''یہاں کا ہر آدمی اپن کا آدمی ہے اور کوئی اجنبی سالا ادھر پھٹک بھی نہیں سکتا۔ کوئی غلطی سے بھی اِدھر آ جائے گا تو اپن کا سب اگلا پچھلا اُگلوا کر ہی اس کی زندگی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اپن نے پہلے بھی تم سے کہا تھا، ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ بالکل بے فکر ہو کر ادھر رہو۔ لانچ تک پہنچانے تک اپن تمہاری فل گارنٹی لیتا ہے۔ اس سے آگے وہ لوگ معاملہ سنبھال لے گا جن کا عبدل بھائی نے ڈیوٹی لگایا ہوگا۔''

اسے اپنے انتظام کی مضبوطی پر پورا بھروسہ تھا اور شاید غلط بھی نہیں تھا۔ ایک ایسی بستی میں جہاں سب کے حالات ایک دوسرے سے وابستہ ہوں اور سب ایک گینگ سے ہی تعلق رکھتے ہوں، کسی اجنبی کے لیے داخلہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ماچھو سے پھر کوئی سوال نہیں کر سکا۔ البتہ ذیشان سے رابطہ کر کے اسے اپنے کام سے آگاہ کر دیا۔

''میری کرنل صاحب سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے۔ انہوں نے آگے کہیں ڈوریاں ہلائی ہیں اور معاملہ تک پہنچ گئی ہے۔ چین کا ایک بحری بیڑا اس وقت انڈین سی میں موجود ہے اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ لوگ دُبئی کا رخ کرنے کے بجائے ان تک پہنچ جاؤ۔ وہ تم لوگوں کو ریسیو کر کے محفوظ ٹھکانوں تک

پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔"

ذیشان نے اسے ایک بالکل ہی حیران کُن خبر سنائی۔ چین کی پاکستان سے دوستی میں کوئی شبہ نہیں تھا
چین کی طرف سے انہیں ایسا فیور ملے گا، اس کی وہ ایک فیصد بھی امید نہیں رکھتا تھا۔

"میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آخر یہ معاملہ چائنہ تک پہنچا کیسے؟ اور وہ ہماری اس طرح کی مدد کے
کیوں تیار ہے؟" اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے۔" ذیشان نے جواب دیا اور پھر ذرا تفصیل سے بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب
حیاتیاتی ہتھیاروں کی تیاری پر کام کر رہے تھے، وہ اصل میں ہمیں نہیں، چین کو درکار ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ
نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات ہماری حکومت سے مستعار مانگ رکھی تھیں۔ خود ہمارے لیے تو اس طرح
تجربات شاید بیکار ہی ثابت ہوتے کیونکہ خطے میں ہمارا سب سے بڑا حریف بھارت ہے اور تقریباً ایک
ماحول کی وجہ سے ہم اس کے خلاف یہ ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے۔"

"اوہ..... آئی سی۔" اسے اس معاملے میں چائنہ کی دلچسپی کی وجہ سمجھ آ گئی۔ یقینی طور پر پاکستان
حکومت اس تعاون کے بدلے چین سے بھی بہت کچھ حاصل کر رہی ہوگی اور اس صورت میں ڈاکٹر
صحیح سلامت بھارت سے انخلا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یہ قومی سلامتی اور اپنے سب سے ہمدرد ملک
ساتھ دوستی کا معاملہ تھا۔

"تم روانگی کے بعد بھی مجھ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کرنا تاکہ میں تم لوگوں کی لوکیشن سے
رہوں۔ ساتھ ہی میں تمہیں ایک فریکوئنسی بھی نوٹ کروا دیتا ہوں۔ لانچ کے کھلے سمندر میں پہنچنے کے
اس فریکوئنسی پر براہِ راست چائنہ والوں سے بھی رابطہ کر سکتے ہو۔"

ذیشان نے اسے فریکوئنسی کے ساتھ کوڈ ورڈز وغیرہ بھی نوٹ کروائے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے
کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

نو بجے انہیں رات کا کھانا کھلا دیا گیا۔ اب ان کے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ٹی وی کھولا
خبریں دیکھنا بھی بیکار لگ رہا تھا کیونکہ اب مقامی خبروں میں ان کی دلچسپی کا کوئی عنصر باقی نہیں رہا
بوریت اور اعصاب زدگی کی اس کیفیت میں وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ ان پانچوں میں صرف
فرحان تھے جنہوں نے وقت کا بہتر مصرف تلاش کر لیا تھا۔ نماز وہ پانچوں وقت ہی پابندی سے پڑھتے
آج عشاء کی نماز ہمیشہ سے زیادہ طویل ادا کی اور ساتھ ہی خصوصی نوافل بھی ادا کیے۔ نوافل کے بعد
رقت سے طویل دعا مانگنے کے بعد بھی وہ مسلسل تسبیحات اور ورد میں مصروف رہے۔ عائشہ بھی زرد
شاید زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی لیکن ان پر واضح نہیں تھا۔

ماچھو نے ان پانچوں کو سفر کے لیے لباس بھی فراہم کر دیے تھے جن کی رنگت سیاہ تھی اور وہ چست
اور سیاہ جیکٹوں پر مشتمل تھے۔ عائشہ بھی ایسے ہی لباس میں ملبوس تھی اور مزید اسمارٹ اور ینگ لگ رہی تھی

سوا بارہ بجے کے قریب یہ اعصاب زدہ کر دینے والا انتظار ختم ہوا اور انہوں نے دروازے پر کسی
کے رُکنے کی آواز سنی۔ ماچھو نے پھرتی کے ساتھ جا کر دروازہ کھولا اور پھر اندر آ کر انہیں بتایا کہ ان کی
کا وقت ہو گیا ہے۔

وہ لوگ ایک ایک کر کے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ سیاہ رنگ کی لینڈ کروزر تھی جو رات کی تاریکی کا
بن کر نہایت خاموشی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ گاڑی میں انہیں بریف کرنے کے لیے حسین



ی مون ہوٹل کا نستعلیق سا منیجر جس کے بارے میں عبدالرحمٰن کے رائٹ ہینڈ ہونے کا انکشاف بھی ان
دونوں میں ہی ہوا تھا۔ اس وقت اس نے بھی سوٹ بوٹ کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"بھٹناگر پاگلوں کی طرح آپ لوگوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن زخمی
کے باوجود اس نے آرام سے بیٹھنا قبول نہیں کیا ہے۔ صبح عبدل بھائی کے پاس بھی آیا تھا۔ ان سے
کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی بھی دی کہ اگر ہماری طرف سے آپ لوگوں کی
ی تو گینگ کا انجام برا ہوگا۔ وہ اس حوالے سے خاص طور پر تفتیش کرتا رہا کہ کل ایک ہوٹل کے سامنے
ہی گینگ کے دو گروہوں کا آپس میں تصادم کیوں ہوا؟ عبدل بھائی نے اسے ٹال دیا کہ وہ آپس کی
وجہ سے ہوا تھا۔ گینگ کے دو لڑکوں میں کسی لڑکی کی وجہ سے رقابت تھی۔ ان میں سے ایک کل لڑکی
ہوٹل کے کمرے میں تھا کہ دوسرے کو اطلاع مل گئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل پر چڑھ
پہلے والے نے بھی اپنے حمایتیوں کو بلا لیا۔ اور یوں ذرا سی بات پر بڑا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں کو اس
میں پہلے ہی بریف کر دیا گیا تھا اس لیے بھٹناگر کے آدمیوں نے ان سے پوچھ تاچھ کی تو انہوں نے بھی
ی سنائی۔ اس وقت سب سمجھ رہے ہیں کہ اب سب کچھ عبدل بھائی ہی ہیں اس لیے ہر ایک وہی کہے گا
ہیں گے۔ عبدل بھائی نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ اشوک کی جگہ اس کا گینگ سنبھالنے والے کی طرف
ی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے اور اسے پیغام دیا ہے کہ آپس میں جھگڑے بغیر اگر ہم اپنا کام کرتے رہیں تو
ی فائدے میں رہیں گے۔ اس کی طرف سے بھی پوزیٹیو جواب آیا ہے۔"

استے میں حسین انہیں تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ انہیں مقامی حالات سے دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ
ہے تھے کہ اگر بھٹناگر کو عبدالرحمٰن پر شک ہے تو وہ اتنی آسانی سے ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور ان تک
ی کوئی راہ ضرور ڈھونڈ رکھی ہوگی۔ اس خدشے کا اظہار حسین کے سامنے بھی کر دیا گیا۔

"ہم اس امکان کو رد نہیں کر سکتے۔" حسین نے اعتراف کیا۔ "بستی کی حد تک تو ہر ایک سمجھتا ہے کہ
ی اجنبی کی گنجائش نہیں لیکن یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ آپ لوگ سمندر کے راستے فرار ہونے کی کوشش
گے، بھٹناگر وہاں ضرور کوئی کارروائی کرے گا۔ اس خدشے کو سامنے رکھتے ہوئے عبدل بھائی نے
ر دیا ہے کہ انڈیا کی سمندری حدود تک ان کے آدمی لانچوں میں آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے موجود
گے۔ اس کے بعد کھلے سمندر میں خطرہ اتنا زیادہ نہیں رہے گا۔"

پنے طور پر وہ انہیں تسلی دے رہا تھا لیکن وہ لوگ پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ بھٹناگر چاہتا تو کھلے
یں بھارتی نیوی سے مدد لے کر ان کو گرفتار کروا سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن بھی نیوی سے ٹکرانا مناسب نہیں سمجھتا
ں لیے اس نے آگے کی ذمے داری قبول نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی ذمے داری تھی بھی
اس نے ان کو بھارتی حدود سے نکال دینے کا وعدہ کیا تھا جو وہ پوری ذمے داری سے پورا کرنے جا رہا
ی تو انہیں اپنی تقدیر پر اور زورِ بازو پر ہی سب کچھ کرنا تھا۔

"آپ لوگوں کو جن لوگوں کے ساتھ روانہ کیا جا رہا ہے، وہ ماہی گیروں کا ایسا قبیلہ ہے جن کی زندگی کا
ہ سمندر کے سینے پر سفر کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور
م، موت و زندگی سب سمندر میں ہی منانا پسند کرتے ہیں۔ سمندر سے شکار کے علاوہ اسمگلنگ پر بھی ان
اوقات کا دارومدار ہے۔ یہ ہر طرح کی اجناس کے ساتھ ساتھ انسانی اسمگلنگ میں بھی حصہ لیتے ہیں۔
پ لوگ ان کے قیدی نہیں ہوں گے۔ آپ کو ہتھیار فراہم کیے جائیں گے اور یہ اختیار ہوگا کہ کسی بھی

نازک موقع پر خود فیصلہ کریں۔ وہ لوگ آپ کو آپ کی خواہش پر مشورے اور تجاویز ضرور دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے معاملات طے ہو چکے ہیں۔ اگر انہیں کوئی نقصان اٹھانا پڑا تو اس کی ادائیگی عبدل بھائی کریں گے۔ اسباب سے لے کر افراد تک ہر شے کی قیمت کا تعین پہلے سے کیا جا چکا ہے۔"

حسین اُنہیں جو تفصیلات بتا رہا تھا، انہیں سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ عبدالرحمٰن نے مختصر وقت میں بڑا کام دکھایا ہے حالانکہ وہ خود ذاتی طور پر بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف سے بھائی جی کی آخری رسومات کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف اس کی موت کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے نمٹنے کا مرحلہ تھا۔ پھر پولیس اور ایجنسیوں کا دباؤ الگ تھا۔

شہریار نے راستے میں ہی ذیشان کو ای میل کر کے اپنی پوزیشن اور چائنہ والوں کی مدد قبول کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ انہیں بھارتی حدود کے بجائے کھلے سمندر میں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کال کرنے سے گریز یوں کیا تھا کہ وہ حسین کے علم میں بھی یہ بات نہیں لانا چاہتا تھا کہ آگے اس کی مدد کے لیے کوئی اور موجود ہوگا۔

گھاٹ پر پہنچ کر حسین نے گاڑی روک لی۔ وہاں کچھ اور لوگ ان کے منتظر تھے جو پوری طرح مسلح تھے۔ انہیں بھی ان کی پسند کے مطابق ہلکا اور بھاری ہر طرح کا اسلحہ فراخ دلی سے فراہم کر دیا گیا۔ عائشہ کی زندگی میں یقیناً یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی بھاری مقدار میں اسلحہ دیکھ رہی تھی چنانچہ اس کے چہرے کے تاثرات میں خوف کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ تاہم اس نے بھی ایک پسٹل لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

گھاٹ سے حسین ان سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا اور انہیں لانچ میں سوار کروا دیا گیا۔ یہ ایک لانچ تھی جس میں پہلے ہی سے ایک خاندان موجود تھا۔ ان کے چہروں کی جھلسی ہوئی رنگت اور ہاتھ پیروں کی سختی گواہی دے رہی تھی کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ سمندر میں سخت جدوجہد کرتے ہوئے گزارا ہے۔ ان کی لانچ کے ساتھ ہی دوسری لانچ بھی کھڑی تھی جس میں عبدالرحمٰن کے آدمی سوار ہوئے تھے۔ انہوں نے الگ الگ لانچوں میں تقسیم ہونے کے بجائے ایک ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

دونوں لانچوں نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ بے انتہا بوڑھے نظر آنے والے ایک آدمی نے انہیں پاس آ کر بطور سردار اپنا تعارف کروایا اور پھر مختصر الفاظ میں یہ بات سمجھائی کہ ان کے ساتھ سفر کرنے کے لیے ان لوگوں کا ان جیسا نظر آنا ضروری ہے۔ وہ لوگ بوڑھے کی بات سے فوراً متفق ہو گئے اور تھوڑی دیر میں ان کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے جو بوڑھے نے اُنہیں فراہم کیے تھے۔ یہ کپڑے انہوں نے اپنے والے لباس کے اوپر ہی پہن لیے تھے۔ ہاتھ پیروں اور چہرے کی رنگت کی تبدیلی کے لیے انہوں نے استعمال کیا جو بوڑھے کے حکم پر ایک نوجوان نے ان کے سامنے ہی تیار کیا تھا۔ اس نے ایک بڑے میں تیل ڈال کر اس میں راکھ جیسی کوئی شے ملائی تھی۔ انہوں نے یہ محلول اپنے جسموں پر ملا تو رنگت شک تبدیل ہو گئی لیکن تیل کی بُو نے طبیعت مکدّر کر دی۔ وہ شاید مچھلی کا تیل تھا جس سے تیز بُو آ رہی تھی۔

بہرحال، انہیں اسے برداشت کرنا پڑا۔ عائشہ کو البتہ بہت دیر تک اُبکائیاں آتی رہیں۔ وہ ناز و پلی بڑھی ایک بڑے گھرانے کی لڑکی تھی جس نے شاید کبھی گمان بھی نہیں کیا ہوگا کہ اس کی زندگی ایسے سے بھی گزرے گی۔

ان کا سفر تیزی سے جاری رہا۔ آگے جا کر ان کے ساتھ مزید دو لانچیں شامل ہو گئیں جن کے میں بوڑھے نے بتایا کہ ان کا تعلق بھی اس کے خاندان سے ہے۔ لانچوں کو طاقتور انجن چلا رہے



فاصلہ تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ سمندر بھی خوش قسمتی سے پُرسکون تھا اور اس سے زیادہ اضطراب وہ اپنے اندر محسوس کر رہے تھے۔

یہ اضطرابی کیفیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اچانک ایک بڑی لانچ سامنے سے نمودار ہوئی اور انہیں رکنے کا اشارہ کیا جانے لگا۔ ان کے ہاتھ خود بخود ہی اپنے ہتھیاروں کی طرف بڑھ گئے۔

"نہیں، کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ پہلے مجھے آنے والوں سے بات کرنے دو۔" بوڑھے نے تحکمانہ لہجے میں کہا پھر لانچ کی رفتار کم کرنے کو کہا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ دبکے صورتِ حال کا اندازہ لگانے لگے۔

بوڑھا اب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور بڑی مہارت سے اپنا توازن قائم رکھے ہوئے تھا۔ دوسری لانچ قریب پہنچی تو اس نے ان سے گفت و شنید شروع کر دی۔ وہ کوسٹ گارڈز والے تھے جنہوں نے بوڑھے کو شناخت کر لیا تھا۔

"رنگھاوا! یہ تم ہو؟" پہچاننے والے نے اُسے اُس کے نام سے پکارا۔

"ہاں، میں اپنے پریوار کے ساتھ سفر پر جا رہا ہوں۔" بوڑھے نے باوقار انداز میں جواب دیا۔ وہ کہیں سے گھبرایا ہوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"اس بار تم نے جلدی سفر کا آغاز نہیں کر دیا؟ تم تو ہفتہ بھر کے لیے ٹھہرنے والے تھے نا؟" دوسری لانچ سے پوچھا گیا۔

"اس بار ہمارا سارا مال وقت سے پہلے اچھے داموں بک گیا ہے اس لیے ہم نے مزید رُکنا غیر ضروری سمجھا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم انگا قبیلے والے سمندر سے زیادہ دُور رہنا پسند نہیں کرتے۔ خشکی پر ہم اپنی زمینوں کی وجہ سے آتے ہیں اور اس بار مجبوری جلدی ختم ہو گئی تھی۔" بوڑھے نے اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ ہم تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔" وہاں سے انہیں اجازت مل گئی اور ایک بار پھر پوری رفتار سے شروع ہو گیا۔

"عام طور پر ہم لانچ کے انجن کھلے سمندر میں پہنچنے تک ہی چلاتے ہیں یا پھر اس وقت جب شدید ضرورت ہو۔ ہمیں ہفتوں اور مہینوں سمندر میں گزارنا ہوتے ہیں اس لیے ڈیزل کا خرچہ نہیں ہوتا۔ اس بار ہم لوگوں کے لیے ہم پورا سفر انجن چلا کر طے کریں گے اور صرف اتنی دیر کے لیے انجن بند ہوں گے کہ تھوڑا آرام مل سکے۔" کوسٹ گارڈ والوں سے نمٹ کر سفر کا آغاز ہوا تو بوڑھے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہم غریب لوگ ہیں اور اپنی غربت میں خوش بھی رہتے ہیں۔ لیکن ان..... کو رشوت دینے کے لیے غیر قانونی کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔" اس نے دُور ہوتی کوسٹ گارڈ کی لانچ کی طرف اشارہ کر کے گالی سی گالی دیتے ہوئے بتایا۔

"ہمارا عشق سمندر ہے۔ سمندر میں رہنے سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ان نوٹوں سے بند نہ کریں تو یہ ہمارا جینا مشکل کر دیں۔" بوڑھا اب انہیں اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کی وجہ آگاہ کر رہا تھا۔ اس کے پاس انہیں سنانے کے لیے بہت سی داستانیں تھیں جنہیں سنتے ہوئے انہیں سفر آسان لگنے لگا تھا۔ ورنہ ہر طرف پھیلے سمندر کی تاریکیوں میں ان کے لیے ہولناکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

ڈیوڈ نے تیسری دفعہ ویڈیو ریورس کر کے اسکرین پر نظر آنے والے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ ایئربیس والے واقعے میں ہلاک ہونے والے دہشت گردوں اور فوجی شہداء کی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کو ایک بار پھر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ان تصویروں میں تمام ہلاک شدگان کی تصویریں موجود ہیں؟'' اس نے پانڈے سے سنجیدگی سے ساتھ بیٹھے پانڈے سے دریافت کیا۔

''بالکل جناب! میں نے پاک فوج کی میڈیا کے لیے جاری کردہ تصاویر کے علاوہ بھی اپنے ذریعے سے یہ تصاویر حاصل کی ہیں اور ان میں کسی ہلاک شخص کی تصویر مس نہیں ہوئی۔'' پانڈے نے پورے یقین سے جواب دیا۔

''تو پھر سمجھ لو کہ بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے بتایا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' پانڈے جسے اب تک ڈیوڈ کے اضطراب کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی، حیرت سے پوچھا۔

اس آپریشن میں اس کا حصہ صرف اتنا تھا کہ وہ ڈیوڈ کو کمانڈوز کی مطلوبہ تعداد مہیا کر دے اور جمال پور میں قائم اپنے سیٹ اپ کو یہ ہدایت کر دے کہ ان لوگوں کو ڈیوڈ کی طرف سے ملنے والے احکامات کی پابندی کرنی ہے۔ ڈیوڈ طے شدہ کوڈ کے ذریعے ان لوگوں سے ایک فرضی نام سے بات چیت کرتا رہا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق مدرسے میں موجود بھارتی ایجنٹ کارروائی کے آغاز سے قبل ہی منظر سے غائب ہو گئے تھے اور صرف وہ لوگ باقی بچے تھے جو انجانے میں آلۂ کاربن کر اپنے تئیں دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

''ان تصاویر میں میرے ایک کمانڈو کی تصویر شامل نہیں ہے۔'' ڈیوڈ نے انکشاف کیا تو پانڈے اُچھل پڑا۔

''لیکن کیوں؟..... پاک فوج کے ترجمان کی طرف سے تو اعلان کیا گیا ہے کہ تمام حملہ آور ہلاک ہو گئے ہیں۔ پھر آپ کا کمانڈو کہاں چلا گیا؟ کیا وہ وہاں سے فرار ہو گیا تھا؟ لیکن ایسی صورت میں اسے آپ سے رابطہ کرنا چاہئے تھا۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔'' ڈیوڈ نے نہایت تشویش کے عالم میں اپنا خدشہ بیان کیا۔

''لیکن کسی شخص کے زندہ گرفتار ہونے کا تو بالکل بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ میرے اپنے ذرائع نے بھی اس کی کوئی اطلاع نہیں دی۔'' پانڈے نے غیر یقینی اعتراض کیا۔

''یہ ان کی ہوشیاری ہے۔ گرفتار ہونے والے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اس کی گرفتاری کو خفیہ رکھا ہے۔'' اس جیسے شاطر کے لیے درست اندازے قائم کرنا کیا مشکل تھا۔

''میں ایک بار پھر اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایسی بات ہے تو میرے ذرائع اسے کھوج نکالیں گے۔'' پانڈے نے دعویٰ کیا جس پر ڈیوڈ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ پانڈے کی تصدیق کے بغیر بھی وہ اپنے خیال پر راسخ ہو چکا تھا۔

''اگر کوئی زندہ گرفتار ہوا ہے تو یہ ہمارے لیے برا شگون ہے۔ پہلے ہی ہم اس آپریشن میں مطلوبہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔'' وہ جو اپنے تئیں شاید ایئربیس کو کھنڈر بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا، صورتِ حال پر افسوس سے تبصرہ کرنے لگا۔ اس کی یہ مایوسی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ ڈیوڈ نے اس کے سامنے جو پلان رکھا تھا، اس کے مطابق تو ان کے کمانڈوز کو ایئربیس پر ٹھیک ٹھاک تباہی پھیلانے کے بعد وہاں سے زندہ سلامت نکل جانا چاہئے تھا۔ اس سلسلے میں اندر موجود بڑوں میں سے ایک غدار سے یہ معاملات طے ہو گئے تھے لیکن انہیں



حیرت ہوئی تھی کہ اس غدار کی تصویر بھی مرنے والوں میں شامل تھی۔ پتہ نہیں کیسے وہ زد میں آ گیا تھا ان کا سارا پلان اُلٹ کر رہ گیا تھا اور وہ اپنے قیمتی کمانڈوز سے محروم ہو گئے تھے۔

''خیر..... ہم سو فیصد بھی ناکام نہیں رہے۔ تم آنے والے دنوں میں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے تبصرے مجھے یقین ہے کہ سب متحد ہو کر ایک ہی بات کہیں گے کہ پاکستان دہشت گردوں کا مرکز ہے اور اس ملک کے پاس ایٹم بم کی موجودگی عالمی امن کے لیے سخت خطرناک امر ہے۔''

ڈیوڈ کے بارہ بجاتے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ دوڑی۔ پانڈے نے بھی اس کے خیال کی تائید کی لیکن پاکستان دشمنی میں شدت کی وجہ سے وہ اتنے پر قناعت نہیں کر سکتا تھا اور اب تو اس پر اپنے کمانڈوز کی موت کا بدلہ لینے کی دُھن بھی سوار تھی چنانچہ ڈیوڈ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ انہیں کوئی اور کارروائی بھی کرنی چاہئے۔

''میں ایک کام پہلے سے سوچ کر آیا تھا۔ اپنے خاص ایجنٹس سے مجھے جو رپورٹس ملی تھیں، ان میں کرنل توحید نامی ایک شخص کا خصوصیت سے ذکر ہوتا تھا اور ہم یہ اندازہ لگا سکے تھے کہ ہمارے سامنے موجود خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ جو ایک نامعلوم خفیہ ادارہ کام کر رہا ہے، اس کا کرنل توحید سے گہرا تعلق ہے۔ ہمیں کسی طرح اس شخص تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔'' ڈیوڈ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے اپنے اگلے قدم سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھا۔ کرنل توحید کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

''آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے جناب! یہ شخص تو پہلے ہی ہماری لسٹ پر موجود ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا ایک ذہین ایجنٹ ڈاکٹر ماریہ ماری گئی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کی ماں سنتھیا ہماری سینئر ایجنٹ تھی اور اس نے اس سے بدلہ لینے کے لیے اسے بم بلاسٹ میں مروانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کرنل اپنے خفیہ گارڈز کی موجودگی کی وجہ سے بچ نکلا۔ بعد میں ہم اس تک رسائی کا موقع نہیں تلاش کر سکے اور اتفاق سے ہماری قابل سنتھیا جو اس سلسلے میں سب سے زیادہ ایکٹیو تھی، ایک مشن کے دوران ہلاک ہو گئی۔ ہمارے کئی مقامی ایجنٹس بھی لاپتہ یا ہلاک ہو گئے اس لیے ہم آج کل یہاں کچھ مشکلات کا شکار تھے۔ آپ جس آفر کے ساتھ آئے تھے، اس نے ہمیں بہت اُمیدیں دلائی تھیں لیکن جو تھوڑی بہت کامیابی ہمارے حصے میں آئی ہے، اس میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔''

پانڈے اسے جتانا نہیں بھولا تھا کہ اس کے منصوبے پر عمل کرنے سے انہیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا ہے۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ ڈاکٹر ماریہ اور سنتھیا حقیقت میں ''موساد'' کی ایجنٹس تھیں جو طویل عرصے تک ''را'' میں رہ کر ڈبل ایجنٹ کا کردار نہایت خوبی سے ادا کرتی رہی تھیں اور وہ ان خاص ایجنٹس کی وجہ سے بھی کرنل توحید تک پہنچنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر ہم اپنے اپنے ذرائع سے کرنل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب دونوں کے پاس قابلِ ذکر معلومات جمع ہو جائیں گی تو ایک میز پر بیٹھ کر پلان ڈسکس کریں گے اور اس بار تم برابری کی بنیاد پر پوری پلاننگ میں حصہ لو گے تاکہ کسی ناکامی کی صورت میں کسی ایک کو ذمے دار نہ قرار دیا جا سکے۔''

ڈیوڈ نے منٹوں میں سارا پروگرام طے کر کے پانڈے کو جتا دیا کہ وہ سارا ملبہ خود پر ڈالنے کی کوشش کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پانڈے کے پاس جواب میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ جب ڈیوڈ وہاں سے روانگی کا قصد کیا تو وہ اس سے مصافحہ کر کے الوداع کہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ البتہ ڈیوڈ کے

پاس سوچنے اور کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ کرنل کو اغوا کروانے میں اس لیے دلچسپی رکھتا تھا کہ اپنے ان دشمنوں تک رسائی حاصل کر سکے جو یہاں ان کی کامیابی میں مسلسل روڑے اٹکا رہے تھے۔ اور وہ یہاں بہت کچھ کرنے کے باوجود حالات کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کرنے میں ناکام تھے۔

مخالفین اس کے کمانڈو کو خاموشی سے گرفتار کر کے جتنا جان سکتے تھے، کرنل کے ہاتھ آ جانے کی صورت میں نہ صرف اس کا مداوا ہو جاتا بلکہ بونس میں کئی گنا زیادہ معلومات حاصل ہونے کا امکان تھا۔ بس کرنل ان کے ہاتھ آ جاتا۔ اس کے بعد تو وہ ''را'' والوں کو بھی گھاس ڈالنے والا نہیں تھا۔ ''را'' کا ساتھ تو بس اس نے اپنے مفادات کی خاطر قبول کیا تھا کہ اس خطے میں پاکستان سے اتنی نفرت رکھنے والا دوسرا کوئی کارآمد حلیف ملنا ذرا مشکل تھا۔

⊛----✪----⊛

تحقیقات کے نتیجے میں صورتِ حال کافی واضح ہو گئی تھی۔ ایئر بیس پر حملے کی کارروائی میں جمال پورہ میں برسوں سے قائم مدرسے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ بیس پر حملہ کرنے والے کمانڈوز مدرسے کی اس مہمان جماعت اور تعمیراتی عملے کے بہروپ میں آئے تھے جو مدرسے کے توسیعی منصوبے کا جائزہ لینے کے بہانے سے وہاں پہنچی تھی۔ ان کا ساز و سامان بھی تعمیراتی سامان کی آڑ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ ایئر بیس کا قریب ترین گاؤں ہونے کی وجہ سے جمال پورہ کے راستے میں ایک چوکی قائم کر دی گئی تھی لیکن چوکی پر موجود عملے نے مدرسے کے حوالے پر کچھ نرمی اور غفلت سے کام لیا اور پیک شدہ سامان کو کھول کر دیکھے بغیر یونہی سرسری جائزہ لے کر گزر جانے دیا۔

مدرسے کے منتظم اور اس کے خاص نائبین کی جمال پورہ سمیت اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں بھی اچھی شہرت تھی اور لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ حملے سے قبل وہ لوگ سرِشام ہی کسی بہانے جمال پورہ سے نکل گئے تھے اور پیچھے جو بچے تھے، ان کی جان خوامخواہ مصیبت میں آ گئی تھی۔ تحقیقاتی ادارے ان سے تفتیش کر رہے تھے لیکن وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر رہے تھے۔

وہ دو افراد جو منتظم اور اس کے نائبین کی غیر موجودگی میں مہمان جماعت کی میزبانی پر مامور تھے، صرف اتنا بتا سکے تھے کہ رات کے کھانے کے بعد جماعت کے ایک فرد نے اصرار کر کے خود چائے بنائی تھی۔ وہ چائے ان دونوں کو بھی پیش کی گئی تھی جسے پینے کے بعد وہ ساری رات بے حد گہری نیند سوتے رہے اور انہیں خبر نہیں ہو سکی کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس بات کے گواہ خود وہ سپاہی تھے جنہوں نے ان دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ گہری نیند میں سوئے ہوئے ان دونوں افراد کو سپاہی بہت مشکل سے اٹھا کر لائے تھے۔ ان کے طبی معائنے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ انہیں کوئی شدید نشہ آور دوا استعمال کروائی گئی ہے۔

''بدبخت دشمن نے بہت نازک مقام پر اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔ اب تک ہم ایسے کتنے مدرسے درباں چکے ہیں جہاں کا انتظام ملک اور مذہب دشمنوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ اتنا نازک معاملہ ہے کہ ہم کوئی کارروائی کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ کچھ کرتے ہیں تو ہمارے اپنے ہی لوگ احتجاج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔'' رپورٹس کا جائزہ لیتے کرنل توحید نے تبصرہ کیا۔

''احتجاج کرنے والے بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہیں سر! بے شمار مدرسے ایسے ہیں جہاں لوگ پورے خلوص سے دین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن جب اس طرح کے بیانات سامنے آتے ہیں جن سے یہ تاثر ابھرے کہ مدرسوں میں دہشت گرد تیار کیے جا رہے ہیں تو ظاہر ہے ان کے خلوص کی توہین ہوتی ہے۔'' ذیشان



نے نقطۂ نظر پیش کیا۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری پوزیشن بڑی نازک ہے۔ ایک طرف دنیا شور مچاتی ہے کہ پاکستانی مدرسوں میں انتہا پسند اور دہشت گرد تیار کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف اپنوں کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے ہم اپنی صفوں میں چھپے دشمنوں سے نجات حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔'' انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں سر! یہ تو حکمرانوں اور سیاست دانوں کی ذمے داری ہے کہ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کریں۔ ہم تو صرف ڈائریکٹ ایکشن لینے والے لوگ ہیں۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ جو بندہ پکڑا گیا ہے، اس نے کچھ اُگلا یا نہیں؟ اس کے حوالے سے مجھ پر بڑی ذمے داری ہے۔ میں نے دوسری ایجنسیوں کو اس بات کی ہوا نہیں لگنے دی ہے کہ ہم کسی دشمن کو زندہ گرفتار کرلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں مجھ سمیت گنتی کے بس چند افراد ہی اس حقیقت سے باخبر ہیں اور یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ تم اس شخص سے کیا معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہو۔'' انہوں نے ذرا سی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے دریافت کیا۔ ان کا زیادہ تک وقت سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر ہی میں گزر رہا تھا۔ کسی ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہوتی تو وہاں سے جاتے ورنہ یہیں موجود رہتے۔ اس عرصے میں انہوں نے آرام بھی بہت کم کیا تھا۔ ذیشان سمیت باقی عملے کا بھی یہی حال تھا۔

''ابھی ہم نے اس سے ابتدائی تحقیقات ہی کی ہیں لیکن بہرحال یہ اُگلوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ''موساد'' اور ''را'' کا مشترکہ منصوبہ تھا اور دونوں طرف کے کمانڈوز نے ہی اس کارروائی میں حصہ لیا تھا۔ پکڑے جانے والے شخص کا تعلق ''موساد'' سے ہے اور اس نے بتایا ہے کہ ان کے فرار کے انتظامات مکمل تھے لیکن عین وقت پر ان کا اس شخص سے رابطہ نہیں ہو سکا جس سے ان کا معاملہ ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اور اس کے ساتھی وہاں پھنس گئے۔'' ذیشان نے انہیں اب تک کی حاصل شدہ معلومات فراہم کیں۔

''اس بدبخت غدار کے بارے میں، میں جانتا ہوں جس نے دولت کی خاطر مادرِ وطن کا سودا کر ڈالا۔ وہ خبیث اپنے اردلی کے ہاتھوں ہی انجام کو پہنچا۔ اس اتنے بڑے عہدے دار کے مقابلے میں ایک اردلی اردلی نے اپنی حب الوطنی کو ثابت کر دکھایا۔ آپریشن کے بعد جن زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا، ان میں وہ زخمی اردلی بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس نے اپنے صاحب کی کسی سے کی جانے والی گفتگو سن لی تھی۔ وہ کسی سے وعدہ کر رہا تھا کہ اس کے آدمیوں کو وہاں سے بحفاظت نکالنے کا انتظام ہو جائے گا اور اس کام کو یقینی بنانے کے لیے وہ خود یرغمالی بن کر ان کے ساتھ جائے گا۔ محبِ وطن اردلی سے افسر کی یہ گفتگو برداشت نہیں ہوئی اور وہ سینہ تان کر اپنی حیثیت کا خیال کیے بغیر اس سے سوال جواب کرنے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ افسر نے پہلے تو اسے بھی لالچ کے جال میں پھنسانا چاہا لیکن جب کامیاب نہیں ہوا تو دھمکیوں پر اُتر آیا اور اردلی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اردلی اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور اس شخص کو جہنم رسید کر دیا۔ لیکن اس اثنا میں وہاں کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اردلی بھی دفاع کے لیے آنے والوں میں شامل ہو گیا اور گولیوں کا نشانہ بنا۔ اس کی جان شاید اسی لیے اٹکی ہوئی تھی کہ یہ حقیقت بیان کر سکے۔ وہ ہسپتال میں جامِ شہادت نوش کر کے وطن کا بیٹا ہونے کا حق ادا کر گیا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ایک توپوں کی سلامی دیتا اور اس کی قبر پر کتبہ لگاتا کہ یہاں وطن کا قابلِ فخر بیٹا سو رہا ہے لیکن میری آنکھوں نے دیکھو کہ میں غدارِ وطن کے تابوت کو بھی سبز پرچم میں لپیٹ کر دفن ہوتے دیکھوں گا اور دنیا کو یہ حقیقت بتا سکوں گا کہ یہ شخص وطن دشمن ہے اور ہرگز بھی اس لائق نہیں کہ اس کے ناپاک وجود کو میرے ملک کے

پاک پرچم میں لپیٹ کر اس کی مقدس زمین میں دفن کیا جائے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس شخص کی لاش کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھانے کے لیے دیتا۔ لیکن افسوس میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا کہ مجھے اس غاصب وردی کی عزت بھی بچانی ہے۔ میں ایک غدار کے کرتوت سامنے لا کر عوام کا تمام فورسز پر سے اعتماد ختم نہیں کر سکتا اسی لیے یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور ہوں۔'' کرنل توحید اس کے سامنے یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے شدید جذباتی ہو گئے تھے۔

''یہ ہمارا مقدر ہے سر! ہم ہمیشہ سے اس معاملے میں بدقسمت ثابت ہوئے ہیں کہ ہر بار اپنوں ہی کی غداریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے درمیان غدار نہ ہوتے تو اغیار کی سازشیں کیا بگاڑ سکتی تھیں؟ ہم وہ بدنصیب ہیں کہ اپنا آدھا وطن گنوا کر بھی کوئی سبق حاصل نہیں کر سکے اور آج ان حالات سے گزر رہے ہیں کہ ہر شخص آنے والے وقت سے خوف زدہ ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس وطن کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ جب میں بہت سے ایسے پُرخلوص لوگوں کو دیکھتا ہوں جو اس وطن کے لیے جان بھی نچھاور کرنے سے نہیں گھبراتے تو مجھے اندھیرے میں اُمید کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ جاوید علی، سلمان شہریار..... کتنی لمبی فہرست ہے میرے پاس ان افراد کی جو سب کچھ بھول کر اس وطن کے لیے جینا اور اس پر مرمٹنا چاہتے ہیں۔ پھر کیوں میں اپنے وطن کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوں؟'' ذیشان کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔'' کرنل توحید نے اس کی تائید کی اور کافی کے ایک کپ کی طرف متوجہ ہو گئے جو ذیشان نے اس گفتگو کے دوران الیکٹرک کیٹل میں تیار کرنے کے لیے ان کے سامنے رکھا تھا۔

''میں شہریار کی واپسی کا شدت سے منتظر ہوں۔ اس کے یہاں آنے پر ہم مل کر کچھ اہم معاملات نمٹائیں گے۔ اس عرصے میں ہم چودھری والے معاملے میں خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے ہیں اور دوسرے معاملات میں اُلجھے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چودھری سے بھی نمٹ ہی لینا چاہیے۔ ایک شخص کا کردار سامنے ہوتے ہوئے اسے اتنی چھوٹ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ صرف ایک عام ظالم اور جاگیر ہوتا تب بھی گوارا تھا۔ لیکن منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ سے اس کی وابستگی نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے۔'' کافی پیتے ہوئے وہ کرنل صاحب کے ساتھ اپنا مستقبل پروگرام ڈسکس کرنے لگا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ لیکن ابھی شاید شہریار کو واپس آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ پہلے تو وہ لوگ لندن پہنچیں گے پھر وہاں سے ان کی پاکستان واپسی ہو گی۔''

''جہاں اتنا انتظار کیا ہے، تھوڑا اور سہی۔ فی الحال تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ دانیال فرحان اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی۔ تو اللہ میرے یار کو سلامت رکھے۔ وہ صحیح سلامت واپس پہنچ گیا تو انشاء اللہ مستقبل میں ہم مل کر بہت اچھے گزریں گے۔'' ذیشان نے بہت خلوص سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''انشاء اللہ..... وہ ضرور واپس آئے گا۔ اللہ بھی جانتا ہے کہ اس وطن کو تمہارے اور اس جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔'' کرنل صاحب نے بھی خلوصِ نیت سے اس کی تائید کرتے ہوئے امید کا اظہار کیا۔ امیدیں اور دعائیں ہی تھیں جو بہت دور سمندر کا سینہ چیر کر آگے بڑھنے والے مسافروں کے لیے زادِ راہ



تھیں۔

⊛----✪----⊛

''آہ.....'' عالیہ نے اس کے بازو پر بندھی پٹی کھولی تو وہ آہستہ سے کراہا۔ پٹی زخم سے چپک گئی تھی اس لیے اسے الگ کرتے ہوئے تھوڑی تکلیف ہوئی تھی۔

''اتنے بڑے بڑے زخم تو شوق سے کھا لیتے ہو اور اب بچوں کی طرح آوازیں نکال رہے ہو۔'' عالیہ نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''زخم میں شوقیہ نہیں لگواتا ہوں۔ بس یہ تو وہ تمغے ہیں جو میرے حبِ وطن کا ثبوت بن کر دشمن کے ہاتھوں خود ہی میرے جسم پر سج جاتے ہیں۔''

''اس حساب سے تو ہمیں دشمنوں ہی کو دعائیں دینی چاہئیں۔ تم زخمی ہوتے ہو، تب ہی تو گھر کا رخ کرتے ہو۔ میں تو بے چاری آنٹی کے حوصلے کی داد دیتی ہوں کہ وہ کیسے اتنے اتنے عرصے تک تنہا رہ جاتی ہیں۔'' وہ اس کے زخم کی صفائی کرتے ہوئے خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''وہ ایک شہید کی بیوہ ہیں اور جانتی ہیں کہ ان کا بیٹا وطن کا ایک سپاہی ہے جس کی ان سے بھی زیادہ اس کو ضرورت ہے۔ وہ اپنی ممتا کی قربانی دیتی ہیں تو کئی ماؤں کی ممتا پُرسکون رہتی ہے۔'' اس نے نہایت سادگی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی تمہیں ان کے احساسات کا خیال کرنا چاہیے۔ وطن کی محبت میں وہ تم سے جدائی کا عذاب سہہ تو لیتی ہیں لیکن آخر ہیں تو ایک ماں ہی نا۔ جن کی زندگی میں تمہارے سوا کچھ نہیں ہے اور تمہارے حوالے سے ان کے دل میں بہت سے خواب بھی بسے ہیں۔ تم اپنی مصروفیات میں انہیں ان خوابوں سے محروم کرنے کی زیادتی نہیں کر سکتے۔ ان کا بھی تم پر کوئی حق ہے۔'' زخم پر جیل نما کوئی کریم لگاتے ہوئے وہ اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

''کیا امی نے تم سے اس سلسلے میں کوئی شکایت کی ہے؟'' جاوید علی نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔'' عالیہ نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ''وہ شکوے شکایات کرنے والی خاتون نہیں ہیں۔ میں نے یہ بات محسوس کی ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہاری باتیں کرتی ہیں۔ تمہاری پیدائش سے لے کر اب تک کا ایک لمحہ انہیں ایسے ازبر ہے جیسے یہ سب ابھی ابھی ان کی نظروں کے سامنے ہوا ہو۔ تم کیا چیز شوق سے کھاتے ہو، تمہیں کون سا رنگ پسند ہے، تم کتنی خوش الحانی سے قرأت کرتے ہو، ان کی زبان پر ہر وقت یہی باتیں ہوتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنی شدت سے تمہیں مِس کرتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ میں یہاں ہوں تو انہیں مجھ سے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں چلی گئی تو وہ پھر سے تنہا ہو جائیں گی اور تم وہی کبھی کبھار بھولے بھٹکے گھر آیا کرو گے۔'' اس کی ڈریسنگ کرتے ہوئے وہ دُکھی سے لہجے میں کہتی جا رہی تھی۔

''تو تم یہاں سے جانے کا کیوں سوچتی ہو؟..... ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ نا۔'' جاوید علی نے بہت شائستگی سے اس سے فرمائش کی جس پر اس کے کچھ جاپانی لگنے والے نقوش میں حیرت جاگی۔

''میں ہمیشہ یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ تم نے مجھے مشکل حالات میں سہارا دیا اس کے لیے میں دل سے تمہاری شکر گزار ہوں لیکن مجھے ساری زندگی تم پر بوجھ بن کر رہنا گوارا نہیں۔'' اپنی حیرت پر قابو پا کر اس نے جاوید علی کو جواب دیا۔

''کچھ بوجھ انسان خوشی سے اٹھاتا ہے۔ تم میری زندگی کی ساتھی بن جاؤ گی تو تمہارے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا جواز بھی پیدا ہو جائے گا اور امی کو پوتا پوتی کی شکل میں میرا بہترین نعم البدل ملے گا تو ان کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی۔'' اس نے گویا چٹکیوں میں سارا مسئلہ حل کر دیا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں کسی بھی طرح تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تم میرے مقابلے میں کم عمر اور خوش شکل ہو..... اور فرض کرو ان دونوں باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو میرا ماضی ایسا نہیں ہے کہ میں تم جیسے شخص کا ساتھ ڈیزرو کروں۔'' وہ ڈریسنگ مکمل کر چکی تھی چنانچہ سامان سمیٹتے ہوئے ذرا خفا سے لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''پہلے دو فرق تو تم نے خود بھی تسلیم کر لیے ہیں کہ نظر انداز کیے جا سکتے ہیں اور تیسری بات کی میرے لیے اہمیت نہیں ہے۔ گناہ سے سچے دل سے تائب ہو جانے والا اللہ کے ہاں کسی نومولود بچے کی طرح پاک ہو جاتا ہے تو پھر میں کون ہوتا ہوں تمہارے ماضی کے حوالے کو یاد رکھنے والا؟ میں تو بس اس لڑکی کو جانتا ہوں جو میرے گھر میں ویسے ہی رہتی ہے جیسے کسی شریف انسان کو رہنا چاہیے۔ جسے میرے گھر کو سجانا سنوارنا اچھا لگتا ہے۔ جو میری ماں سے میری پسند کے کھانے بنانا سیکھتی ہے۔ جس نے میری ماں کی تنہائیاں بانٹ لی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ جو کبھی انہیں تنہا چھوڑ کر میکے نہیں جائے گی اور میں جب بھی واپس گھر آؤں گا، مجھے اپنی منتظر ملے گی۔'' بہت سنجیدگی سے بولتے بولتے وہ آخر میں ذرا نیم مزاحیہ لہجے میں بولا تو عالیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ابھی سے بیویوں جیسی ظالمانہ نظروں سے تو مت گھورو یار!..... ابھی تو میں نے تمہیں صرف پرپوز کیا ہے۔'' وہ ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے مسخرے پن سے بولا تو عالیہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی جسے اس نے تیزی سے چھپا لیا۔ لیکن یہ مسکراہٹ تو جاوید علی کے دل پر نقش تھی۔ شازمین جو بہت طویل عرصے کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی، ایسے ہی تو مسکراتی تھی۔ نازک اندام، حُسن و رعنائی کا پیکر کم عمری شازمین اور کچھ کچھ جاپانی نقوش رکھنے والی پختہ عمر عالیہ میں یہی واحد قدرِ مشترک تھی جو جاوید علی کا دل اس کی طرف کھینچتی تھی۔ عالیہ کی مسکراہٹ اسے شازمین کی مسکراہٹ یاد دلا دیتی تھی۔ شازمین کو وقت کے جبر نے اس سے چھین لیا تھا لیکن وہ عالیہ کو اپنا کر اسے تو ایک نئی زندگی دے سکتا تھا۔ یہ لڑکی جو گناہوں کی دلدل سے نکل آئی تھی، اگر اس کا ساتھ پا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون ہو جاتی تو یہ سودا کوئی برا تو نہیں تھا۔ اس کے گھر کو عالیہ جیسی خیال رکھنے والی لڑکی کی ضرورت تھی۔

''تو پھر میں امی سے بات کروں؟'' اس نے عالیہ کی نیم رضامندی کو محسوس کرتے ہوئے اسے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہو سکتا ہے انہیں اعتراض ہو۔ وہ ماں ہیں، انہوں نے تمہارے حوالے سے کچھ اور خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔'' وہ کسی بچی کی طرح مضطرب اور خوف زدہ نظر آئی۔

''تو چلو ابھی یہ بات کلیئر کر لیتے ہیں۔'' وہ اتنی تیزی سے بستر سے اتر کر اس کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر لے گیا کہ عالیہ ''ارے ارے، رُکو تو سہی'' بولتی ہی رہ گئی اور وہ اس کمرے میں جا پہنچا جہاں جاوید علی کی والدہ بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ جاوید علی، عالیہ کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا تو وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا امی! کہ کیا آپ کو عالیہ کو اپنی بہو بنانے میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟''



کے جز بز ہونے کی پروا کیے بغیر اس نے شوخی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' ان کے جواب نے جہاں اس کی شوخی ہوا کی، وہیں عالیہ کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا۔

''مجھے یہ اعتراض ہے کہ میرا نالائق بیٹا جو ماں کو اتنے اتنے دنوں بعد اپنی شکل دکھاتا ہے، میری بہو کو بھی ایسے ہی ستائے گا اور اس بے چاری کی زندگی بھی میری طرح تمہاری راہ دیکھتے ہوئے ہی گزر جائے گی۔ اگر یہ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بعد میں مجھ سے کوئی گلہ نہ کرے کہ مجھے خبردار نہیں کیا۔'' ان کی نہایت سنجیدگی سے کہی بات کا اختتام ایک زیرِ لب مسکراہٹ پر ہوا اور ان دونوں کی رُکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

''پکا وعدہ..... میں کبھی آپ سے شکایت نہیں کروں گی۔'' عالیہ بے ساختہ جا کر ان سے لپٹ گئی۔

''یا ہو..... لڑکی نے ہاں کر دی۔'' جاوید علی نے خوشی کا مظاہرہ کرنے کے لیے دونوں بازو ہوا میں لہرانے کی کوشش کی لیکن زخم کو لگنے والے جھٹکے نے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''بس تیار ہو جاؤ۔ تمہیں اپنے میاں ایسی ہی زخمی اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں دستیاب ہوا کریں گے۔'' جاوید علی کی والدہ نے عالیہ کو ہوشیار کیا۔

''مجھے قبول ہے۔'' عالیہ کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ چمکی جو جاوید علی کے دل کو بھاتی تھی اور دل کے اندر تک یہ اطمینان اُتر گیا کہ بے شک وہ شازمین کو تو نہیں پا سکا لیکن اس کی مسکراہٹ ہمیشہ عالیہ کی صورت میں اس کے پاس رہے گی اور اس کی ہمراہی میں وہ سکون سے ان دشمنوں سے نمٹتا رہے گا جنہوں نے شازمین سے اس کی زندگی چھینی تھی۔

⊛----✪----⊛

بھارت کی سمندری حدود پار کرتے ہی وہ لانچ واپس چلی گئی تھی جس پر عبدالرحمٰن کے آدمی ان کی حفاظت کے لیے سوار تھے۔

اب تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے وہ لوگ بھی خاصی حد تک پُرسکون ہو گئے تھے اور سکون کے احساس نے ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار اُتار دیا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ سب ہی سوتے چلے گئے۔ پھر دوبارہ آنکھ ایک زبردست جھٹکے سے کھلی۔ ہر ایک ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ صبح نمودار ہونے لگی تھی اور رات کی تاریکی میں سیاہ لگنے والے سمندر نے بھی ہلکے سرمئی رنگ کی چادر اوڑھ لی تھی۔ دُور اُفق پر پھوٹتی سورج کی کرنوں سے چاندی میں نہائے پرندے حصولِ رزق کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

''وہ اُدھر..... اُدھر ایک لانچ ہے۔ اس پر سے لانچر فائر ہوا ہے۔ ہم لانچ بال بال بچا ہے۔'' بوڑھے رنگھاوا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ایک لانچ کی طرف اشارہ کیا۔ لانچ خاصے فاصلے پر تھی لیکن اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس پر ان کے دشمن ہی سوار ہیں۔

ان سب نے تیزی سے ہتھیار سنبھال لیے۔ رنگھاوا اپنے خاندان کے مردوں کو بھی ہدایات دینے لگا۔ ہزار نے ٹیلی اسکوپ رائفل ہاتھ میں سنبھال کر پوزیشن لی اور اس لانچ کی طرف دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ ماہی گیری کے لیے استعمال ہونے والی ایک عام لانچ تھی لیکن اسے اس پر موجود مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ ایک دل پر اُسے بھٹناگر کا شبہ ہوا تھا لیکن اتنی دُور سے نقوش واضح نہیں تھے۔ ان کی لانچ چلانے والے نے لانچ کا رخ ذرا سا بدل کر اس کی رفتار بڑھا دی تھی، اس وجہ سے فاصلے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے انہوں نے بھی جواب میں اپنی لانچ کی رفتار میں اضافہ کر لیا۔

اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں روکنے کے لیے فائر کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گولیوں نے پیچھے آنے والی لانچ کا کچھ بگاڑا یا نہیں لیکن ان کی طرف سے دوبارہ ایک اور لانچر فائر کیا گیا۔ اس بار لانچر اس لانچ کے قریب آ کر گرا جس پر رنگھاوا کے قبیلے کی عورتیں اور بچے بڑی تعداد میں سوار تھے۔ لانچر گرنے کی وجہ سے سمندر میں پیدا ہونے والے تلاطم نے لانچ کو بری طرح ڈولنے پر مجبور کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کے منہ سے بے ساختہ ہی چیخیں بلند ہوئیں اور یکایک انہوں نے ایک بچے کو لانچ سے سمندر میں گرتے دیکھا۔ اس منظر کو دیکھ کر کئی مردوں کے منہ سے بھی چیخیں نکل گئیں۔ بچہ ڈھائی تین سال سے زیادہ کا نہیں تھا اور سمندر میں بری طرح ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

یکایک سلّو نے اپنے ہاتھ میں موجود گن پھینکی اور سمندر میں کود گیا۔ وہ اچھا تیراک رہا ہوگا جب ہی اس نے یہ جرأت کی تھی۔ لیکن سمندر بپھرا ہوا تھا اور لانچر پھٹنے کی وجہ سے اس میں مزید دائرے بن رہے تھے جو تیراک کو نیچے کی طرف بھی کھینچ سکتے تھے۔

''اب ان کو جواب دینا ضروری ہو گیا ہے۔'' رنگھاوا غصے سے بڑبڑایا اور پھر بلند آواز میں کچھ ہدایات دینے لگا۔ زبان ان کے لیے اجنبی تھی اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھ سکے۔ ویسے بھی اس وقت ان کی توجہ سلّو کی طرف زیادہ تھی جو سمندر کی موجوں کا مقابلہ کرتا ڈوبتے اُبھرتے بچے تک پہنچنے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسری لانچ پر موجود جوان اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ مدد کے لیے بھی تیار نظر آ رہے تھے۔

سلّو نے ڈوبتے بچے کے قریب پہنچ کر اس کے لمبے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور اسے لانچ کی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت ایک تیز لہر آئی اور اس کا لانچ سے فاصلہ بڑھ گیا۔ بچے کو بہرحال اس نے اپنی گرفت سے نہیں نکلنے دیا۔ اس کی مدد کے لیے کوشاں نوجوانوں میں سے ایک نے لمبی سی رسّی کا پھندا بنا کر اس کی طرف پھینکا۔ پہلی کوشش ناکام رہی اور ہوا نے پھندے کو سلّو تک پہنچنے نہیں دیا۔ نوجوان نے ہمت نہیں ہاری اور آخر تیسری کوشش میں وہ کامیاب رہا۔

سلّو نے تیزی سے رسّی کو تھام کر اپنی کمر کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ سے یہ کام آسان نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے بچے کو تھاما ہوا تھا۔ آخر کافی جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ لانچ پر موجود نوجوان اس کی مدد کرنے لگے۔

اس دوران بوڑھے کی ہدایت پر عمل شروع ہو گیا تھا اور ان کی طرف سے پے در پے تین لانچر متعاقب لانچ پر فائر کیے گئے تھے۔ دو لانچر تو لانچ کے دائیں بائیں جا کر گرے جبکہ تیسرے نے لانچ کے اگلے حصے کو نشانہ بنایا۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا اور پیچھے آنے والی لانچ اُلٹ گئی۔

''بس اب نکل چلو۔'' رنگھاوا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ لانچیں مزید رفتار سے حرکت میں آ گئیں۔ سلّو اور سمندر میں گرنے والے بچے کو اس اثنا میں لانچ پر سوار کروایا جا چکا تھا اور ایک نوجوان، بچے کے پیٹ سے پانی نکال کر اسے طبی امداد دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان چند منٹوں میں ہی سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکلے تھے۔

''تمہارے پاس یہ انتظام بھی ہوگا، مجھے اُمید نہیں تھی۔'' شہریار لانچ میں سیدھے کھڑے رنگھاوا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ ماتھے پر ہتھیلی کا چھجا سا بنائے دُور ڈوبتی لانچ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اپنی بقا کے لیے رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس بار تو عبدل بھائی کی بھی مہربانی تھی۔ انہوں نے پیغام بھیجا تھا کہ یہ میرے خاص مہمان ہیں، ان کی حفاظت کے لیے جو چاہتا ہے ماگو



لیکن کام پورا کرنا۔'' رنگھاوا نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''شکر ہے وہ بچہ بچ گیا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔'' پچھلی لانچ کی طرف دیکھتے ہوئے شہریار نے تبصرہ کیا۔

''وہ سمندر کا بیٹا ہے میرا پوتا..... ہم سب سمندر میں رہنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ سمندر ہمارا دوست ہے۔ یہ ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ میرے بعد میرا بیٹا اور پھر پوتا سردار ہوگا۔ آج وہ سمندر میں ڈوبنے سے بچا ہے، کل اس کی لہروں پر کھیلتا پھرے گا۔ تمہارے ساتھی کی مدد کا شکریہ لیکن اگر وہ جلدی نہ کرتا دیکھتے کہ ہمارا اپنا کوئی جوان اسے بچانے کے لیے سمندر میں کُود جاتا۔ تم اسے احسان فراموشی مت کہنا۔ میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' بوڑھا بہت تجربہ کار اور سمجھ دار تھا۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ شہریار کو وہ اچھا لگا تھا۔ عام آدمیوں سے ذرا مختلف اور قدرے پُراسرار سا۔

''آؤ چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔'' پیچھے سے کسی عورت کی آواز سنائی دی تو شہریار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر

ناشتے میں انہیں کسی خاص انداز سے پکی مچھلی، خشک ڈبل روٹی اور چائے پیش کی گئی۔ یہ ناشتہ ان کے ماحول سے بہت مختلف تھا لیکن برا نہیں لگا۔

''مجھے بتایا گیا تھا کہ مجھے اس سفر میں فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔'' ناشتے کے بعد شہریار نے بوڑھے سے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ہم دُبئی نہیں جانا چاہتے اس لیے تمہیں اپنے سفر کی سمت تبدیل کرنی ہوگی۔'' شہریار نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''کس طرف جانا ہے؟'' بوڑھے نے بغیر کسی بحث کے اس سے دریافت کیا۔

''یہ میں تمہیں تھوڑی دیر میں بتاؤں گا۔ اس سے پہلے تم مجھے ریڈیو تک لے چلو۔''

''ٹھیک ہے، آؤ۔'' اس نے اس بار بھی اعتراض نہیں کیا اور اسے اپنے ساتھ ریڈیو روم تک لے گیا۔

شہریار نے ذیشان کی بتائی ہوئی فریکوئنسی ملا کر اس پر رابطہ کیا اور دوسری طرف سے ضروری معاملات طے کرتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بوڑھے کو اپنے سفر کی سمت بتائی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تم ضروری سمجھتے ہو کہ میرے قبیلے کی دوسری لانچیں بھی ہمارے ساتھ ہوں؟'' بوڑھے نے اس سے دریافت کیا۔

''نہیں، وہ اپنے معمول کے راستے پر جا سکتے ہیں۔'' شہریار نے اسے اجازت دی۔ اسے ویسے بھی اس بات سے وحشت ہو رہی تھی کہ معصوم بچے اور عورتیں ان کے ساتھ نشانہ بن جائیں۔ بچے کے لانچ سے گرنے کا منظر اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔

''اس لانچ میں موجود عورتوں اور بچوں کو بھی دوسری لانچوں میں بھیج دو۔'' اس نے بوڑھے سے مطالبہ کیا۔ اس نے اس کو اس نے منظور کر لیا۔

منتقلی کے اس عمل میں کچھ دیر کے لیے ان کا سفر رکا اور پھر لانچیں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کو نظر آتے رہے، پھر دُھندلاہٹ غالب آ گئی۔

اب ان کے پاس حدِ نگاہ تک پھیلے سمندر کو دیکھنے یا ایک دوسرے سے لایعنی باتیں کرنے کے سوا

کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اب بھی اندر سے ڈرے ہوئے تھے کہ پھر گھیرے جائیں گے۔ لیکن فی الحال کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر یکایک موسم میں تبدیلی ہونے لگی۔ آسمان جس پر پہلے چند ایک ہی بادل کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے یکایک سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا اور سورج کی کرنیں ان تک پہنچنے میں ناکام ہونے لگیں۔

''شاید بارش ہونے والی ہے۔'' شہریار نے اندازہ لگایا۔

''نہیں۔'' بوڑھے نے اس کی تردید کی۔ ''طوفان آنے والا ہے۔'' اس کے پُراسرار لہجے میں کہے گئے اس اعلان نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیئے ان میں سے کوئی بھی سمندر میں سفر کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اور کہاں ایک لانچ میں کھلے طوفان کا سامنا کرنا۔

اسی وقت ایک دوسری اُفتاد ٹوٹی جب کنٹرول روم میں ڈیوٹی دیتے شخص نے بوڑھے کو آ کر بتایا۔

''ہماری لانچ کو گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تین بڑی لانچیں ہیں۔''

اس خبر کو سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ ابھی تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا گیا ہے۔

تاریکی بے تحاشا تھی۔ آسمان پوری طرح بادلوں سے گھر چکا تھا اور یہ بادل اتنے دبیز تھے کہ سورج کی کرنوں کو ان سے گزر کر نیچے آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ دن میں ہی رات اور وہ بھی گہری سیاہ رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا اور ساتھ ہی یہ ہولناک خبر بھی ان تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی لانچ کو تین اطراف سے گھیرا جا رہا ہے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ساکت منتظر تھے کہ اندھیرے سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

لانچ کے کنٹرول روم سے شہریار، ذیشان کی بتائی ہوئی فریکوئنسی پر چینی جہاز کو مدد کا پیغام دے چکا تھا لیکن ظاہر ہے وہاں سے مدد آنے میں کچھ وقت لگتا اور اس عرصے میں انہیں اپنا دفاع خود کرنا ہوتا۔ ابھی تو صحیح طور پر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ انہیں گھیرنے والے کون ہیں؟ بھارتی سمندری حدود سے نکلنے کے بعد زیادہ امکان تو یہی تھا کہ یہ بھارتی ہی ہوں گے جو اُن کی بُو سونگھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہوں گے۔

چند منٹوں کے اعصاب شکن انتظار کے بعد آخر کار اس امر کی تصدیق ہو گئی۔ گھیرنے والوں کی طرف سے اعلان کیا جانے لگا تھا۔

''تمہاری لانچ کو گھیر لیا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی غلط حرکت کیے بغیر ہتھیار ڈال دو اور گرفتاری دے دو۔'' یہ اعلان تین بار دہرایا گیا لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ وہ سب ہتھیار سنبھالے خاموشی سے اپنی اپنی پوزیشن پر دبکے رہے۔ ان کی لانچ پر موجود افراد میں سے عائشہ اور ڈاکٹر فرحان لڑنے بھڑنے والے لوگ نہیں تھے لیکن انہوں نے بھی ہلکے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ عائشہ اور ڈاکٹر فرحان دونوں ہی شہریار کی پشت پر تھے۔

''آپ دونوں کو تیرنا آتا ہے؟'' کسی خیال کے تحت شہریار نے سرگوشی میں ان دونوں سے دریافت کیا۔

''سوئمنگ پول کی حد تک تجربہ ہے، سمندر میں تیرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔'' عائشہ نے جواب دیا۔

''مجھے تیراکی آتی ہے البتہ اپنے اسٹیمنا کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ڈاکٹر فرحان کا جواب بھی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ ظاہر ہے اتنے برس ''را'' کی قید میں گزارنے کے بعد وہ جو اپنی اصل عمر سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ لگتے تھے، اپنے اسٹیمنا کے بارے میں کیسے یقین سے کچھ کہہ سکتے تھے۔

''چلیں کوئی بات نہیں، اللہ مدد کرے گا۔ میں نے ایسے ہی احتیاطاً آپ سے پوچھ لیا تھا۔'' شہریار نے انہیں تسلی دی اور اگلے اعلان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اعلان کرنے والا لانچ کے مالک سے مخاطب تھا۔



''رنگھاوا!..... ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اپنی لانچ پر موجود ہمارے دشمنوں کو ہمارے حوالے کر دو، ہم تمہیں اور تمہارے قبیلے والوں کو جانے دیں گے۔''

اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ ''را'' والے تھے جو ایک بار چوٹ کھانے کے بعد دوبارہ پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ ان کے پیچھے آئے تھے۔

شہریار نے خود سے ذرا آگے کھڑے رنگھاوا کی طرف دیکھا۔ تاریکی میں بوڑھا اسے بس ایک سائے کی طرح ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسا سایہ جو بالکل سیدھا اور ساکت کھڑا تھا۔ لانچ والوں کی طرف سے اعلان ہونے پر بھی سائے میں چند سیکنڈ تک کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی زبان میں زور سے کچھ بولا۔ ردِعمل میں اس کے قبیلے کے دونو جوانوں نے اعلان کرنے والی لانچ کی طرف بیک وقت دو راکٹ لانچر فائر کیے۔ اندھیرے کے باوجود انہوں نے صرف آواز سے سمت کا تعین کر کے حیرت انگیز نشانہ لیا تھا۔ پل بھر میں ہی وہ آگ کا گولا بن گئی۔ جلتی ہوئی لانچ کی روشنی نے ان پر منظر کو کسی قدر واضح کر دیا اور انہیں تباہ ہونے والی کے علاوہ دونوں لانچیں بھی دکھائی دے گئیں جن میں سے ایک دائیں پہلو پر اور دوسری عقب میں تھی۔ دونوں لانچوں پر موجود افراد اپنی لانچ کو نشانہ بنتے دیکھ کر طیش میں آ گئے اور ان کی لانچ کی سمت بے تحاشا فائرنگ کی جانے لگی۔ جواب میں انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

دونوں طرف سے بھاری ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا تھا۔ گولیاں سائیں سائیں کی آوازوں کے ساتھ ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کس کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ سمندر کی سرکش لہروں نے جلتی ہوئی لانچ کی باقیات کو بہت تیزی سے تتر بتر کر دیا تھا اس لیے روشنی غائب ہو چکی تھی۔ ''را'' والوں کو ان پر ایک فوقیت حاصل تھی کہ وہ جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی لانچوں پر سوار تھے جبکہ وہ اسلحے سمیت دیگر بہت سی اہم اشیاء سے لیس ہونے کے باوجود ایک عام لانچ پر سوار تھے۔

شہریار اور اس کے ساتھیوں کے پاس تو بلٹ پروف جیکٹس بھی تھیں جو انہوں نے لانچ پر سوار ہونے سے قبل ہی حسین کی کھلی پیشکش کے نتیجے میں اسلحے کے ساتھ حاصل کر لی تھیں۔

''لانچ میں کئی سوراخ ہو گئے ہیں اور پانی اندر آ رہا ہے۔'' رنگھاوا کے آدمیوں میں سے کسی نے یہ اطلاع سنائی۔ لانچ میں پانی آنے کا مطلب تھا کہ لانچ کچھ دیر میں ڈوب جاتی اور ساتھ ہی انہیں بھی لے ڈوبتی۔

''تم اور تمہارے ساتھی لائف جیکٹس پہن لو۔ لانچ پر پانچ چھ لائف جیکٹس موجود ہیں۔'' خبر سن کر حیران ہونے کے بجائے بوڑھے رنگھاوا نے پُرسکون لہجے میں شہریار کے قریب آ کر اس سے کہا۔

''تمہارے ساتھیوں کا کیا ہوگا؟'' صرف پانچ چھ لائف جیکٹس کی موجودگی کی اطلاع سن کر شہریار نے بے اختیار ہی پوچھا۔ ان کی اس گفتگو کے دوران بھی فائرنگ کا تبادلہ جاری تھا اس لیے انہیں قدرے بلند آواز میں گفتگو کرنی پڑ رہی تھی۔

''ہم سمندر کی لہروں پر کھیل کُود کر پلے ہیں۔ ہمیں سمندر کچھ نہیں کہتا۔ یہ چند لائف جیکٹس بھی بس اس لیے لائی ہیں کہ مشکل وقت میں کمزور عورتوں یا بچوں کے کام آ سکیں۔'' رنگھاوا نے بے نیازی سے جواب دیا اور اپنے کسی آدمی کو لائف جیکٹس لانے کا حکم دینے کے بعد ایک بار پھر شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارے پاس ایک لانچر بچا ہے۔ لانچ ڈوب گئی تو بیکار ہو جائے گا۔ کہو تو اسے بھی فائر کر کے ایک اور

لانچ کا کام تمام کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟'' شہریار اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دے سکتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ زندہ سلامت اس مصیبت سے نکل سکے گا یا نہیں۔ لیکن بھارتی جتنی بڑی تعداد میں جہنم رسید ہوتے، اسے اتنی ہی خوشی ہوتی۔ ویسے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بھارتیوں کی طرف سے کوئی لانچر یا میزائل فائر نہیں کیا گیا تھا حالانکہ ان کے لیے یہ زیادہ آسان تھا۔ ان کے ایسا نہ کرنے کا ایک ہی سبب سمجھ آتا تھا کہ وہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کے خواہش مند تھے۔

رنگھاوا اُس کی رضامندی پا کر اپنے ایک نوجوان کو لانچر فائر کرنے کے لیے ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس دوران لانچ کے اسٹور روم سے لائف جیکٹس لا کر ان پانچوں کے حوالے کر دی گئی تھیں جو انہوں نے پہن لی تھیں۔ سلّو لائف جیکٹ پہننے کے بعد رنگھاوا کے برابر میں آ کھڑا ہوا اور واحد بچ جانے والے لانچر کو استعمال کرنے کے سلسلے میں اس کی رائے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی شامل کرتا گیا۔ رنگھاوا سمندر کا شہزادہ تھا۔ اس کی ہواؤں کو سونگھ کر بہت کچھ بتا سکتا تھا جبکہ سلّو کو قدرت نے بہترین حسیات سے نوازا تھا اس لیے وہ اس بات کا اہل تھا کہ رنگھاوا کو مشورہ دے سکے۔ اس مشاورت کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی تھی کہ مختلف سمتوں سے آنے والے فائرز اور چند مخصوص آوازوں کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ ان کی مقابل لانچیں مسلسل حرکت میں ہیں اور سمت بدل بدل کر ان پر فائر کیے جا رہے ہیں۔ خود وہ بھی ایک جگہ نہیں ٹکے ہوئے تھے لیکن اب لانچ میں بھرتے پانی کی وجہ سے اسے حرکت میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ روشنیاں دونوں طرف کی لانچوں کی گل تھیں اس لیے سمندر کے سینے پر وہ اندھا کھیل جاری تھا۔

بہر حال سلّو اور رنگھاوا کی مشاورت اختتام کو پہنچی اور رنگھاوا کے آدمی کی جگہ لانچر چلانے کی ذمے داری خود سلّو نے سنبھال لی۔ لانچر فائر کرنے سے پہلے اس نے زیر لب کچھ پڑھا اور فائر کر دیا۔ یہ دیکھ کر ان سب نے ایک فلک شگاف نعرہ مارا کہ سلّو اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہا ہے اور ایک لانچ مزید نشانہ بن چکی ہے۔

''اب ہمیں سمندر میں چھلانگ لگا دینی چاہئے۔ لانچ ڈوبنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اور جب یہ ڈوبے گی تو اطراف کی بہت سی چیزوں کو اپنے ساتھ لے کر ڈوبے گی اس لیے اچھا ہے کہ ہم پہلے ہی اس سے دُور ہٹ جائیں۔''

رنگھاوا نے انہیں اطلاع دی تو وہ سب تیزی سے حرکت میں آ گئے اور ایک ایک کر کے سمندر میں چھلانگ لگانے لگے۔ کلام تیرا کی جانتا تھا لیکن پچھلے دنوں ٹانگ میں لگنے والی گولی نے اسے جو نقصان پہنچایا تھا، علاج ہو جانے کے باوجود اس کا مکمل ازالہ نہیں ہو سکا تھا اور خدشہ تھا کہ اسے تیرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ لہٰذا لائف جیکٹ کی موجودگی کے باوجود رنگھاوا کے ایک آدمی کو اس کے آس پاس رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ ڈاکٹر فرحان کے ساتھ خود شہریار تھا جبکہ سلّو کو عائشہ کے آس پاس رہنا تھا۔ کھلے سمندر میں چھلانگ لگاتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی۔ سلّو نے اس کا ہاتھ تھاما اور زبردستی اپنے ساتھ لے کر کُود گیا۔

بھارتی خود اپنی لانچ کی تباہی کی وجہ سے افراتفری کا شکار تھے۔ لانچر کا نشانہ بننے والی لانچ پوری طرح تباہ نہیں ہوئی تھی اور اس سے لائف بوٹس سمندر میں اتاری جا رہی تھیں۔ تیسری لانچ چکر لگاتے ہوئے کافی فاصلے پر چلی گئی تھی اور اسے پلٹ کر ان تک واپس آنے میں کچھ وقت لگنا تھا اس لیے اس مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تیزی سے سمندر میں چھلانگ لگا رہے تھے۔ چھلانگ لگانے کے بعد بھی ان کے حالات غیر یقینی ہی تھے۔ کھلے سمندر میں وہ فرار ہو کر کہاں جا سکتے تھے؟ بس ایک اُمید تھی کہ چینی ان کی مدد کے لیے پہنچ جائیں گے۔ لیکن ان کی آمد کے بھی فی الحال آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔



آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ بچ جانے والی بھارتیوں کی لانچ پلٹ کر واپس آ گئی اور لائف بوٹس کے ان کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ کھلے سمندر میں لانچ سے محروم ہونے کے بعد ان کی پوزیشن ویسے بھی کمزور تھی، اوپر سے وہ اسلحے کے استعمال سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ کوئی اپنا اسلحہ لے کر کُودا بھی تھا تو پانی میں بھیگنے کے بعد وہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ بھارتیوں نے ان کی پوزیشن بھانپ لی تھی اور اب لانچ سے ان پر سرچ لائٹوں کی روشنی پھینکی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے بالکل تاریکی میں ڈوبا ماحول روشن ہو گیا تھا۔ ان کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

''تم سب ہمارے نشانے کی زد پر ہو اور تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے گرفتاری دے دو۔'' آنے والی لانچ سے ہونے والا یہ اعلان خود بھٹناگر کر رہا تھا۔ وہ اسے پہچان چکے تھے۔

''اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میں ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔'' اعلان کے بعد چند سیکنڈ کا بھی انتظار کیے بھٹناگر نے سفاک لہجے میں کہا اور اس کے الفاظ ختم ہونے تک لانچ پر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کا نشانہ رنگھاوا کے دو ساتھیوں کو بنایا گیا۔ دونوں نوجوانوں کی بھیانک چیخیں فضا میں گونجیں تو سب کے اوسان جھنجھنا اُٹھے۔ کھلے سمندر میں دشمن کی گولیوں کے آگے نہتے وہ سوائے مرنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شہریار کو وہ فیصلہ کرنا پڑا جو مصلحت کا تقاضا تھا۔ زندگی بچ جاتی تو بچاؤ کے دوسرے راستے تلاش کیے جا سکتے تھے۔

''ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار ہیں۔ تمہاری طرف سے اب کوئی گولی نہیں چلنی چاہئے۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، لانچ کی طرف آ جاؤ۔ کسی نے گڑبڑ کی تو اپنی موت کا خود ذمے دار ہو گا۔'' بھٹناگر نے سفاک لہجے میں حکم دیا۔ وہ سب اس کے حکم کی تعمیل میں لانچ کی طرف بڑھنے لگے۔ لانچ کے علاوہ لائف بوٹس سے بھی ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں انہیں لانچ پر چڑھانے کا کام مکمل کر لیا گیا۔

''رنگھاوا!..... تُو اپنے آدمیوں کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو جا۔'' بوڑھے رنگھاوا کو حقارت بھرے انداز میں حکم دیا گیا جس کی اس نے خاموشی سے تعمیل کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اور چال کی تمکنت سے ظاہر تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے رتی برابر بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کے اپنے ساتھیوں سمیت ایک طرف ہو جانے کے باعث شہریار اور اس کے ساتھی خود بہ خود ہی ایک طرف ہو گئے۔

دونوں گروہوں کی اس تقسیم کے بعد بھٹناگر لانچ کے کیبن سے برآمد ہوا۔ اس کے ماتھے پر بینڈیج تھی۔ زیادہ پرانی نہیں لگتی تھی۔ ظاہر تھا کہ بھٹناگر کو ان کے تعاقب میں ہی کوئی نئی چوٹ لگی ہے۔ شاید یہ چوٹ اس وقت لگی تھی جب پہلی بار سمندر میں ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا اور رنگھاوا کی طرف سے چلائے گئے لانچر نے بھارتی لانچ کو اُلٹ دیا تھا۔ اس وقت شہریار کو اس لانچ پر بھٹناگر کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔

''تو آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی نکالا۔'' بھٹناگر قدم قدم چلتا سلّو کے مقابل آ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے بولا۔

''عموماً آدمی اپنی موت کے تعاقب میں خود ہی جاتا ہے۔'' سلّو نے اسی کے لہجے میں دوبدو جواب دیا۔

''ہماری بلّی ہم ہی کو میاؤں۔'' اس کے جواب پر بھٹناگر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

''تم بھول رہے ہو، تم مجھے اپنا شیر کہا کرتے تھے۔'' سلّو نے اسے یقین دہانی کروائی۔

''چلو یونہی سہی۔ لیکن تمہیں بھی یاد ہو گا کہ شیر کو سارے گُر سکھانے والی بلّی کو اس کی خالہ کا درجہ حاصل

ہے۔'' بھٹناگر جیسے اس سے گفتگو کا لطف اٹھا رہا تھا۔

''تم کچھ بھی کہو، شیر کی حکمرانی مسلّم ہے اور شیر ہی بادشاہ ہوتا ہے۔'' سلّو کیوں پیچھے رہتا۔

''مزہ آ گیا۔ تُو تو سچ مچ آج بھی میرا وہی جی دار ہیرو ہے جس کو میں اپنی سب سے شاندار تخلیق کہتا ہوں پر جانے تُو راہ کیسے بھٹک گیا اور ان لوگوں کے ساتھ جا ملا جنہوں نے کبھی تیری پروا نہیں کی۔'' بھٹناگر ہلکے پھلکے لہجے میں سلّو سے گفتگو کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جانچ لینے والی گہرائی تھی۔

''تخلیق میں تیری نہیں، اپنے رب کی ہوں جسے تُو نے بھٹکانے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود تُو میری جڑوں کو اُکھاڑنے میں ناکام رہا اور آج پھر میں اسی مٹی کا وفادار ہوں جس مٹی سے میرا خمیر اُٹھا ہے۔''

سلّو کا لہجہ بادلوں کی گھن گرج لیے ہوئے تھا اور برستے بادل کے شور کے باوجود اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔

''تیری تو بڑی زبردست برین واشنگ ہوئی ہے ہیرو!..... پر کوئی بات نہیں، اب تُو میرے پاس آ گیا ہے نا تو میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ تیرا علاج ہے میرے پاس۔'' بھٹناگر بھی کمال ضبط سے کام لے رہا تھا۔ ابھی تک اس کے لہجے میں غصہ نہیں جھلکا تھا۔

''تُو نے جو غلاظت میرے ذہن میں بھر دی تھی، اس کا واش ہو جانا ہی بہتر تھا۔ اور یاد رکھ کہ اب پہلے کی طرح مجھے میرے لوگوں کے خلاف بھڑکا نہیں سکتا۔ کیا ہوا جو انہوں نے میری پروا نہیں کی لیکن تم لوگوں کی طرح مجھے اپنا آلۂ کار بھی تو نہیں بنایا۔ یہ تو تم تھے جو میرے ہاتھوں میرے اپنوں ہی کو مروانا چاہتے تھے اور جب تمہیں لگا کہ میں تمہارے کام کا نہیں رہا تو میری زندگی بھی چھیننے کی کوشش کی۔''

سلّو کے پاس اُس کی ہر بات کا جواب تھا۔ اس بار بھٹناگر نے اسے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ان سب کو باندھ کر نیچے ڈال دو..... اور ہاں، ڈاکٹر صاحب کا خاص خیال رکھنا۔ یہ بڑے بے ایمان ہیں۔ ہم نے اتنے برسوں ان کی خاطر کی اور یہ اپنوں کی شکل دیکھتے ہی فوراً بھاگ نکلے۔ اب بھاگنے کی کوشش کریں تو بے شک گولی مار دینا۔'' اس نے احکامات جاری کیے اور پھر رنگھاوا اور اس کے ساتھیوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''تجھے میں نے جاں بخشی کی آفر کی تھی رنگھاوا! لیکن تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب تُو اس کا نتیجہ بھگت۔ تجھے بڑا مان ہے نا کہ تُو سمندر کا بیٹا ہے تو چل میں تیری اور تیرے ان سب ساتھیوں کی سمندر میں ہی تدفین کر دیتا ہوں۔'' اس نے یکدم ہی اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ان لوگوں کی طرف تان لیا۔

''نہیں، تم ان لوگوں کو گولی نہیں مار سکتے۔'' شہریار نے اتنی تیزی سے حرکت کی اور بھٹناگر کے ریوالور کے سامنے سینہ تان کر جا کھڑا ہوا کہ انہیں ہتھیاروں کے حصار میں لیے کھڑے سپاہیوں کو اسے روکنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ اسی وقت ایک اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ ان کی لانچ کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر چکر کاٹنے لگا اور دُور کہیں سے اعلان کیا جانے لگا کہ لانچ والے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ انہیں گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔

''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' بھٹناگر، شہریار اور رنگھاوا دونوں کو ہی بھول کر بڑبڑایا اور تیزی سے کنٹرول روم کی طرف بڑھا۔ اس کے سپاہی جو اُن سب کو اپنے نشانے پر لیے کھڑے تھے، اور بھی زیادہ چوکس ہونے آنے لگے۔



''تم لوگ کون ہو؟ اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' چند سیکنڈوں بعد ہی انہوں نے بھٹناگر کی آواز سنی۔

''ہم تم سے ان پاکستانی قیدیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جو اس وقت تمہاری لانچ میں موجود ہیں۔ ہماری بات نہ ماننے کی صورت میں تمہاری لانچ کو تباہ کر دیا جائے گا۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اور لانچ میں موجود ہر شخص سن اور سمجھ رہا تھا۔

''اس صورت میں وہ پاکستانی قیدی بھی مارے جائیں گے جن کا تم ہم سے مطالبہ کر رہے ہو۔ میں تمہیں مہلت دیتا ہوں کہ ہم سے دُور رہو ورنہ ایک ایک کر کے قیدیوں کو ہلاک کر کے ان کی لاشیں سمندر میں فروع کریں گے۔'' بھٹناگر نے جواباً سفاک لہجے میں دھمکی دی جس کے جواب میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اس گفتگو کے دوران اس کے سپاہی عائشہ، کلام اور ڈاکٹر فرحان کو بیڑیاں پہنا چکے تھے اور سلّو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہونے والے مکالمے نے ان لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ قدرے تاخیر سے سہی عائشہ کی مدد آ چکی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پوزیشن اب بھی بھٹناگر ہی کی مضبوط تھی۔ اس مضبوط پوزیشن کو افسروں کی جی داری ہی کم کر سکتی تھی جن میں سے ایک کو بیڑیوں میں جکڑنے کے لیے بھارتی سپاہی بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ان میں سے ایک نے سلّو کی طرف ہاتھ بڑھائے، وہ تڑپ کر نیچے گرا اور اپنی کمر کے ساتھ بندھا خنجر کھینچ کر اس سپاہی کے سینے پر دے مارا جو فائرنگ کے لیے پَر تول رہا تھا۔ بس پھر اس کے بعد تو وہاں بھونچال ہی آ گیا۔ شہریار، رنگھاوا اور اس کے ساتھی سب حرکت میں آ گئے۔

بھارتی اس اچانک بدلتی صورتِ حال پر بوکھلا گئے اور اندھا دُھند فائرنگ کرنے لگے۔ ان گولیوں نے کئی اپنے ساتھیوں کو بھی نشانہ بنایا اور شہریار کی ٹیم بھی متاثر ہوئی لیکن زخم کھانے کے باوجود وہ مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ زندگی بچانے کا یہ آخری موقع ہے اس لیے اپنی پوری جان سے جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے کئی بھارتیوں سے ان کے ہتھیار چھین لیے تھے اور اب انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔

اس صورتِ حال میں انہیں چینیوں کی طرف سے بھی مدد ملنا شروع ہو گئی۔ وہ اسٹیمر میں نمودار ہوئے تھے اور مار رائفلوں کی مدد سے تاک تاک کر بھارتیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

اس کام میں انہیں اس لیے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی کہ بھارتیوں نے نیوی کی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی اور شہریار اور اس کے ساتھی سادہ لباس میں تھے۔ اس لانچ پر بھٹناگر سمیت دو تین افراد ہی ایسے تھے جنہوں نے یونیفارم نہیں پہن رکھی تھی اور یقیناً ان کا تعلق ''را'' سے تھا۔ ''را'' نے اپنے وسیع اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انڈین نیوی سے مدد لی تھی اور اب نیوی والے دونوں طرف سے مار کھا رہے تھے۔

کنٹرول روم میں موجود بھٹناگر نے صورتِ حال کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور خود بھی ہتھیار بدست باہر آ گیا تھا۔

سلّو کی اس پر نظر پڑی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی جانب لپکا۔ عین اس وقت جب وہ بھٹناگر کے سامنے آ چکا تھا، بھٹناگر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ہتھیار کی نال کا رُخ سلّو کی طرف کیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے مدِمقابل ایک دوسرے پر ہتھیار تانے کھڑے تھے۔ دونوں نے ہی کچھ لمحوں تک آنکھوں میں ایک دوسرے کو جانچا اور پھر بیک وقت ہتھیار دُور اُچھال دیئے۔

اب وہ اپنی اپنی طاقت اور ہنر آزمانے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ پہلا حملہ بھٹناگر نے کیا۔ وہ تقریباً اُڑتا ہوا سلّو کی طرف آیا اور ایسا تاثر دیا کہ اس کے دائیں پہلو پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ سلّو کو معلوم

تھا کہ یہ ڈاج ہے، وہ دائیں کے بجائے اس کے بائیں پہلو پر حملہ کرے گا اسی لیے اسی حساب سے بچاؤ کی دی۔ لیکن بھٹنا گر واقعی اُس کا استاد تھا۔ وہ اُس کے ردِعمل کو جانتا تھا۔ چنانچہ بہت آسانی سے اس کے دائیں پہلو کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلی زوردار ضرب کھا کر سلّو کو احساس ہو گیا کہ اپنے استاد کو اس کی حربوں اور طریقوں سے زیر نہیں کر سکے گا جو اس سے سیکھ رکھے ہیں۔ کیونکہ استاد ہونے کی حیثیت سے بہر حال اُس کے ردِعمل اور نفسیات سب کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے پہلی کے بعد دوسری ضرب بھی تیزی سے لگائی۔ اس کے بعد سلّو ہوشیار ہو گیا اور نہ صرف اس کے حملوں کو کامیابی سے روکنے لگا بلکہ کئی کامیاب وار کیے لیکن بہر حال اس لڑائی میں ابھی تک کسی کا پلّہ بھاری نہیں تھا۔ سلّو کے زوردار بھٹنا گر کا جبڑا ہلا ڈالا تھا تو بھٹنا گر کا ایک مُکا اُس کے دائیں کان کو اچھا خاصا مضروب کر چکا تھا۔

وہ دونوں دو وحشی جانوروں کی طرح ایک دوسرے پر غرّا غرّا کر حملے کر رہے تھے اور اس بات سے بے نیاز ہو چکے تھے کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی اندھی گولی ان کی زندگی کا چراغ گُل کر سکتی ہے۔ بھٹنا گر کی ایک زوردار کِک نے سلّو کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر دُور پھینکا یہی بات اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی عین اس جگہ سے گزری جہاں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ لیکن اسے اس اتفاق کا احساس بھی نہیں ہوا اور اس نے خود کو سنبھال کر بھٹنا گر کو جوابی کِک دی۔ بھٹنا گر اس کی کِک سے تو خود کو نہیں بچا سکا لیکن تیزی سے گھوم کر سلّو کے پیٹ میں اتنی زور سے ٹکر ماری کہ وہ ڈکراتا ہوا پیچھے جا گرا۔ لیکن پیٹ میں اُٹھتی درد کی لہروں کو کمال ہمت سے ضبط کر کے اُٹھا اور بھٹنا گر پر حملہ آور ہوا۔ اس بار بھٹنا گر دھوکا کھا گیا۔ اس کی توقع کے بالکل برخلاف سلّو اس کے قریب جا کر جھکا اور اس کے اچھے خاصے ڈیل ڈول والے وجود کو دونوں ٹانگوں سے اُٹھا کر دُور پھینک دیا بھٹنا گر اُڑتا ہوا جا کر لانچ کی ریلنگ سے ٹکرایا۔ اور اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا، سلّو اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے بھٹنا گر کے بال جکڑ کر اس کا سر کئی بار ریلنگ سے ٹکرایا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور بہنے والا خون اس کے چہرے کو خوفناک بنانے لگا۔ لیکن اس حال میں بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور سلّو کے پیروں کو اپنی ٹانگوں کی قینچی میں جکڑ لیا۔ یہ داؤ ایسا تھا جس سے سلّو خود کو نکال نہیں پا رہا تھا لیکن اس نے بھی بھٹنا گر کو معاف کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اس لیے کسی جونک کی طرح اس کی جان سے چمٹا ہوا تھا اور اپنے آزاد ہاتھوں کا استعمال کرتے ہوئے مسلسل اسے نشانہ بنا رہا تھا۔

بھٹنا گر نے دونوں ہاتھوں سے ریلنگ تھام کر خود کو سہارا دیا تھا اس لیے وہ ہاتھوں کا استعمال نہیں کر رہا تھا۔ سلّو نے پے در پے اس کی کلائیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کھڑی ہتھیلیوں کے وار ایسے تھے کہ بھٹنا گر کی کلائیوں کی ہڈیاں چٹخ جاتیں لیکن وہ بھی کوئی کم نہیں تھا۔ اپنی ٹانگوں کی قینچی میں سلّو کے پیروں کو اس طرح جکڑتا جا رہا تھا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔

بے پناہ اذیت سہتے ہوئے سلّو نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر بھٹنا گر کی ناک پر رسید کی۔ کلائیاں مجروح ہونے کی وجہ سے ریلنگ پر اس کی گرفت ویسے ہی ختم ہو گئی تھی۔ ناک پر اس جان لیوا ضرب نے اس کا خود پر سے کنٹرول مزید ختم کر دیا اور وہ اُلٹ کر سمندر میں جا گرا۔ اس کی ٹانگوں کی قینچی میں جکڑا سلّو اس کے ساتھ ساتھ ہی سمندر میں پہنچا۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ پانی میں گرنے کے باوجود بھٹنا گر کے پیروں کی گرفت اس پر کمزور ہوئی تھی۔ البتہ سلّو نے اتنا محسوس کر لیا کہ سمندر میں گر کر ذرا ہاتھ پیر مارنے کے بعد بھٹنا گر کی جدوجہد



ہوئی تھی اور خود اس کا یہ حال تھا کہ ٹانگیں جکڑی ہونے کے باعث وہ خود بھی پوری طرح جدوجہد کرنے سے قاصر تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ بھٹنا گر بے ہوش ہے یا ہلاک ہو گیا ہے لیکن اتنا جانتا تھا کہ دونوں صورتوں کے باوجود وہ اس کے داؤ سے خود کو آزاد نہیں کروا سکتا تا آنکہ کوئی دوسرا فرد اس کی مدد کرے۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ بھٹنا گر سے بھرپور مقابلہ کر کے اسے تقریباً پچھاڑ دینے کے باوجود وہ اس کی گرفت میں تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ بھٹنا گر اپنے بھاری وجود کے ساتھ اسے لے کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈبو دیتا۔ وہ اپنے جسم کو پوری طرح استعمال کرنے کے قابل نہ ہونے کے باعث آخر کب تک سمندر کی موجوں سے لڑ سکتا تھا۔ اور یہاں تو یہ حال تھا کہ اسے اپنے ساتھ ساتھ بھٹنا گر کے جسم کا بوجھ بھی اُٹھانا تھا۔

پامردی سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنی زندگی کی جنگ لڑتا رہا۔ لانچ پر لگتا تھا کہ صورتِ حال قابو میں آ گئی ہے اور چینی غالب آ چکے ہیں۔ کیونکہ فائرنگ کا سلسلہ اب تقریباً رُک چکا تھا اور اوپر سے لوگوں کے بولنے اور چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''ہیلپ۔'' غلبے کا یقین ہونے پر اس نے بلند آواز میں مدد کے لیے پکارا۔ موجوں کے شور میں اس کی آواز کہاں تک پہنچی، اسے یہ اندازہ لگانے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اچانک ہی اُٹھنے والی ایک موج نے بھٹنا گر سمیت اس کے وجود کو دُور لے جا کر پٹخ دیا۔

اس اچانک اُفتاد پر وہ ذرا سا بوکھلا گیا۔ لیکن یہ حواس کھونے کا وقت نہیں تھا اس لیے تیزی سے خود کو سنبھال کر موجوں سے لڑنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ لانچ سے اپنا فاصلہ کسی طرح کم کر سکے۔ اس جدوجہد کے دوران اس نے روشنی کی تیز شعاعیں سی اپنی طرف اُٹھتے دیکھیں۔ اس نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ایک لائف بوٹ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں لائف بوٹ نزدیک آتی گئی، اس میں سوار افراد بھی واضح ہوتے گئے۔ لائف بوٹ پر دو افراد سوار تھے جن میں سے ایک کو اس نے شہریار کے طور پر شناخت کر لیا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور سرچ لائٹ تھی اور وہ اسے مختلف سمتوں میں گھماتا وقفے وقفے سے اسے آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک تڑپ سی تھی۔

''میں یہاں ہوں۔'' سلّو نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے اسے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔ اس کی آواز شہریار تک پہنچی یا نہیں، بہر حال وہ خود روشنی کے دائرے میں آ گیا۔ وہ لوگ لائف بوٹ کو اس کے قریب ایک لے آئے اور پھر اسے بوٹ میں سوار کروانے کی کوشش کی جانے لگی۔ عام حالات میں سلّو کے لیے یہ مشکل نہ ہوتا کہ وہ بغیر کسی سہارے کے خود سے اوپر چڑھ جاتا لیکن کسی عفریت کی طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹی بھٹنا گر کی لاش نے اسے مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ شہریار اور اس کے ساتھ موجود چینی سپاہی نے اسے بوٹ پر چڑھایا تو اس کی ہیئت کذائی پر حیران رہ گئے۔

''یہ کیا ہے؟'' شہریار نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

''یہ وہ کمبل ہے جسے میں تو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے نہیں چھوڑتا۔'' سلّو نے جواب دیا۔ وہ عجیب سی الجھن میں لانچ کی طرف بڑھتی لائف بوٹ پر پڑا ہوا تھا۔

''یہ خود تو مر چکا ہے پھر تم اس کی ٹانگوں سے اپنی ٹانگیں آزاد کیوں نہیں کروا پا رہے؟''

''شاید بھٹنا گر، سلّو کی لگائی گئی ضرب کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر سمندر میں چہرہ زخمی ہو جانے کے باعث زندگی کی بازی ہار بیٹھا تھا لیکن بہر حال اس صورت میں بھی اس نے سلّو کو گرفت

میں لے رکھا تھا۔

''اس نے جس داؤ میں مجھے پھنسایا ہے، اس سے میں تنہا خود کو آزاد نہیں کروا سکوں گا۔ تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔'' سلّو نے ذرا پست آواز میں اسے آگاہ کیا۔ حقیقتاً بھٹناگر سے مقابلہ کرنے میں اسے دانوں تلے پسینہ آ گیا تھا اور پھر سمندر میں گزارے ہوئے وقت نے جسم کی رہی سہی توانائی بھی سلب کر لی تھی۔ اب تک حالات غیر یقینی تھے، وہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا لیکن اب محفوظ ہونے کے اطمینان نے اسے کچھ ڈھیلا کر دیا تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' شہریار اُس کی اور بھٹناگر کی اُلجھی ہوئی ٹانگوں کو پکڑ کر الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجے میں سلّو کے منہ سے ایک زوردار سسکاری نکلی۔ اسی وقت چینی سپاہی نے چیخ کر انگریزی میں کچھ کہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ شہریار اس لاک کو توڑنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کے ساتھی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مجبوراً سلّو کو اسی حالت میں اسٹیمر پر سوار کروا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے شہریار اور سپاہی دونوں کو اس کی مدد کرنی پڑی۔ اس کے سوار ہوتے ہی اسٹیمر حرکت میں آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب آسمان پر چھائے بادلوں نے چھٹنا شروع کر دیا تھا اور تاریکی کی دبیز تہ ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔

اسٹیمر سے وہ بحری جہاز میں منتقل کیے گئے۔ اس وقت تک روشنی کافی بہتر ہو چکی تھی اس لیے سلّو نے دیکھ لیا کہ کلام زندہ حالت میں جہاز پر منتقل نہیں کیا جا رہا۔

''یہ کلام.....؟'' اس نے ادھورا سا سوال کیا۔

''ہاں، کلام فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ اس کی گردن میں گولی لگی تھی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔'' شہریار نے جواب دیا تو اس کے لہجے میں سخت کرب تھا۔ برسوں اپنے خاندان سے کٹ کر بھارت میں اپنے دشمن کے لیے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے کلام کے دل میں یقیناً یہ خوش کُن خیال تھا کہ ان سب مصائب سے نمٹ کر ایک دن وہ اپنے گھر پہنچے گا اور گھر والوں کے درمیان رہ کر زندگی کی خوشیاں کشید کرے گا لیکن وہ ساری حسرتیں دل میں ہی لیے اس دنیا سے ناتا توڑ گیا تھا۔

''عائشہ کے بھی بازو میں گولی لگی ہے اور وہ خاصی خوف زدہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اللہ کی مہربانی سے محفوظ رہے اور ہمارے لیے خوشی کا مقام ہے کہ ہم نقصان اُٹھانے کے باوجود مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹ رہے ہیں۔'' خاموشی کے چھوٹے سے وقفے کے بعد شہریار نے اسے باقی صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا۔ سلّو نے بلاتبصرہ اس کی ساری بات سنی۔ اصل میں وہ کلام کی موت کے صدمے کے زیرِ اثر تھا۔ مختصر عرصے کے ساتھ کے باوجود اسے اپنے اس ساتھی کی موت پر جھٹکا سا لگا تھا۔

''آری کی مدد سے بھٹناگر کی ٹانگوں کو کاٹ کر تمہاری ٹانگوں سے الگ کیا جائے گا۔ یہاں موجود ایکسپرٹ کے مطابق اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ موجود نہیں ہے۔'' ان کی جہاز میں منتقلی کے بعد کلام کی لاش سرد خانے میں پہنچا دی گئی۔ ڈاکٹر فرحان کو ایک اعلیٰ افسر اپنے ساتھ ایک کیبن میں لے گیا۔ شہریار کو ذمے دار سے گفتگو کرنے لگا اور سلّو اور عائشہ کو اس بڑے سے ہال میں منتقل کر دیا گیا جو جدید طبی سہولیات سے لیس چھوٹے موٹے ہسپتال کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ وہاں عائشہ کو تو فوری طبی امداد دی گئی اور اس کے بازو سے گولی نکالنے کا انتظام کیا جانے لگا۔ البتہ سلّو کا کیس مختلف تھا اس لیے اسے ایسے ہی ایک بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ یہ ایک بیڈ بھی دراصل دو بیڈز کو ملا کر بنایا گیا تھا تاکہ بھٹناگر کو بھی فٹ کیا جا سکے۔ شہریار نے اسی اثنا میں ہسپتال میں سلّو کو فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔



ذرا دیر میں ایک ڈاکٹر برقی آری کے ساتھ وہاں آ پہنچا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ سلّو کی ٹانگوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے اسے بہت احتیاط سے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ تقریباً پینتیس منٹ میں اس نے اپنا کام مکمل کیا تو بھٹناگر کی دونوں ٹانگیں کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی تھیں۔ ٹانگوں کے ان ٹکڑوں اور بھٹناگر کے اوپری دھڑ کو سمندر برد کیے جانے کا منظر سلّو اور شہریار نے خود اپنی آنکھوں سے عرشے پر جا کر دیکھا۔

یہ وہ وقت تھا جب بادل مکمل طور پر چھٹ چکے تھے اور آسمان ایک بار پھر روشن اور صاف تھا۔ اس روشنی میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو چہرے سمیت جسم کے کئی حصوں میں چھوٹے بڑے زخم نظر آئے۔ کچھ زخم اُن کے دلوں پر بھی لگے تھے لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور یہ وقت کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ وہ زخموں کو بھرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

⊛----✪----⊛

''میں نے تمہیں ایک خاص کام کے لیے بلایا ہے جگو!..... کام ایسا ہے جس میں تم جیسے جی دار بندے کا ساتھ ہی مناسب رہے گا لیکن میری طرف سے تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ تم انکار کرنے کا پورا پورا حق رکھتے ہو، میں بالکل بھی برا نہیں مانوں گا اور اگر راضی ہو جاتے ہو تو تمہیں اس کام کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔'' عمیر آفندی نے اپنے سامنے مؤدب بیٹھے جگو سے یہ جملے کہے تو اس کے چہرے کی رنگت بتدریج متغیر ہوتی چلی گئی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ عمیر کی بات کے درمیان مداخلت کی خواہش رکھتا ہے لیکن حدِ ادب کی وجہ سے اس کے بات مکمل کر لینے تک خاموش رہنے پر مجبور ہے۔

''شہریار صاحب، مشابرم خان کی صورت میرے پاس ایک اچھا ساتھی چھوڑ کر گئے تھے لیکن حالات نے اسے مجھ سے دُور کر دیا ہے۔ میرا پی اے عبدالمنان بھی بہت مخلص آدمی ہے لیکن وہ انتظامی مسائل میں تو میری مدد کر سکتا ہے لیکن غیر معمولی حالات میں اس سے مدد مانگنا اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ ان حالات میں ایک ہی رہ جاتے ہو جس سے میں ساتھ دینے کی اُمید رکھ سکتا ہوں۔ تم پہلے بھی مجھ پر اپنی اہلیت ثابت کر چکے ہو لیکن اب جس معاملے میں تمہاری مدد درکار ہے، اس کی نوعیت ایسی ہے کہ میں تمہاری مکمل رضامندی کے بغیر فرض مروّت میں تمہیں اس میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔''

''آپ کام تو بتائیں سر جی! میری طرف سے انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شیر کا دل ہے جگو کے سینے میں۔ جان لینا اور دینا دونوں بہت چنگی طرح جانتا ہوں میں۔ آپ بس مجھے حکم دیں۔ مجھے نہ اپنی جان کی پروا ہے نہ پیسے کی۔ شہریار صاحب نے میرے پُتر کی جان بچا کر مجھے اپنا بے دام غلام بنا لیا تھا اور آپ اُنہی کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھیں تو آپ لوگوں کے ساتھ کام کر کے مجھے جو سچی خوشی ملتی ہے، وہ کسی اور کام میں نہیں ہے۔ شہریار صاحب کا احسان اپنی جگہ لیکن جب میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو لگتا ہے جگو کی زندگی بھی کسی کام کی ہے۔ اپنے آقا کے حکم پر حق ناحق کچھ بھی دیکھے بغیر جان ہتھیلی پر رکھنے والے کو جب اس دھرتی ماں کی بھلائی کے لیے کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے تو سچ پوچھیے دل اتنا خوش ہوتا ہے کہ باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ لوگوں کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے جڑ جانے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔''

وہ ایک با اثر سیاست دان کے مفادات کی حفاظت کرنے والا غنڈہ تھا لیکن اس وقت اس نے جس طرح اپنا دل کھول کر عمیر کے سامنے رکھ دیا تھا، اس سے عمیر بہت متاثر ہوا تھا۔ سچ یہ تھا کہ اب سے پہلے اس نے جگو کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کے اندر بھی کہیں نیکی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ تو بس اسے ایک پیشہ ور غنڈہ سمجھتا تھا جو شہریار کا احسان اُتارنے کے چکر میں کچھ کرنے کے لیے راضی ہو جاتا تھا۔

"مجھے تمہاری خواہش جان کر خوشی ہوئی ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا، اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش بھی کروں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سیدھی راہ کی طرف آنا چاہے تو اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ اس کی مدد کی جائے اور بہترین مواقع فراہم کیے جائیں۔

"بہت شکریہ سر جی! آپ نے میری بات سمجھی، اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ کیونکہ اگر پوچھیں تو اب پہلے والی زندگی سے دل بھر گیا ہے۔ پُتر بڑا ہو رہا ہے، وہ سمجھ دار ہو گیا تو میرے لیے اس کے سامنے کھڑا ہونا مشکل ہو جائے گا۔"

"فکر مت کرو جگو! تم نے نیت کر لی ہے تو سمجھو اللہ خود بخود ہی سب ٹھیک کر دے گا۔" عمیر نے اسے تسلی دی۔ پھر کچھ خیال آنے پر پوچھا۔ "جگو تمہارا اصل نام تو نہیں ہو گا۔"

"جی سر! ماں پیو نے تو جہاں داد نام رکھا تھا، پتہ نہیں کیسے بگڑ کر جگو ہو گیا۔" اس نے بتایا پھر بولا "میری چھوڑیے سر جی! آپ بتائیں کہ آپ نے کیسے یاد فرمایا؟"

"میں جنگل میں جانا چاہتا ہوں۔ چاندنی اور شاہد کے بیان بدل دینے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ میں اس کیس میں چودھری کو گھیر کر اس سے دوسرے حقائق بھی اُگلوانا چاہتا تھا لیکن یہ اُمید اب دم توڑ گئی ہے اور میرے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا ممکن نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ جنگل میں میرا کزن اظفر اپنے ساتھیوں سمیت پُراسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ میرا سب سے عزیز دوست بھی تھا اور جان سے پیارا بھائی بھی۔ اس کی موت کا غم مجھے ایک پل سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا اور میں جانتا ہوں کہ جب تک اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاؤں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔ حالات کے تجزیے سے مجھ پر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ اس کی موت کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جو جنگل میں ہی چھپا ہوا ہے اور کچھ لوگ ہیں جو اس راز کی حفاظت کے لیے انسانی جانوں کی بھینٹ لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں سے پہلے بھی کئی لوگ جنگل میں پُراسرار طور پر مُردہ پائے گئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت کی بھی وہی وجہ تھی جو اظفر اور اس کے ساتھیوں کی زندگی ختم کرنے کا سبب بنی۔ مجھے وہ وجہ تلاش کرنی ہے اور اس کام کے لیے میں تمہارے ساتھ جنگل میں جا کر اپنے طور پر چھان بین کرنا چاہتا ہوں۔" عمیر نے اسے قدرے تفصیل سے اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ آپ جنگل کے راز اور چودھری کو آپس میں کیوں جوڑ رہے ہیں؟" جگو جو اس کی بات غور سے سن رہا تھا، یہ سوال اُٹھایا۔

"اس کے پیچھے دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جنگل کے ساتھ جو گاؤں دیہات متصل ہیں، ان میں چودھری افتخار ہی سب سے بارسوخ وڈیرا ہے اور جنگل میں کوئی بھی کارروائی کرنے والوں کے لیے اس کا آشیرباد لینا ضروری ہے۔ دوسری اس سے بھی بڑی اور اہم وجہ چودھری کے اس ملازم کے آخری الفاظ ہیں جو اظفر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہی ہلاک ہوا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے کچھ ایسے الفاظ ادا کیے تھے جن سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ جنگل میں جو کچھ پیش آیا تھا، اس میں چودھری کا ہاتھ تھا یا کم سے کم بھی اس کا نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ اسی لیے پہلے میری کوشش تھی کہ کسی طرح چودھری کو گھیرے میں لیا جائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ فی الحال وہ منظر سے بھی غائب ہے اس لیے میں اس کا مزید انتظار کرنے کے بجائے جنگل کا ایک چکر لگا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ساتھ لے جانے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ



واضح کر رہا ہوں کہ اس کام میں جان کا خطرہ ہے۔" عمیر نے بہت وضاحت سے اسے جواب دیا۔

"تو بس ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ کب چلنا ہے؟" جگو نے اُسے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

"ہم کل صبح چلیں گے۔ روانگی کے سلسلے میں کچھ تیاریاں رہتی ہیں، وہ میں انشاء اللہ رات تک مکمل کر لوں گا۔ تم اس دوران جا کر گھر والوں سے ملاقات کر کے آ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لاہور سے سیدھے یہیں آئے ہو اور ابھی اپنے گھر بھی نہیں گئے۔"

عمیر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس جیسے آدمی کو یہ عزت اس آفس میں ہی ملتی تھی۔ پہلے شہریار تھا اور اب عمیر۔ بلاتے دونوں اپنے کام سے ہی تھے لیکن عزت دے کر۔ جبکہ جس سیاست دان کی وہ ملازمت کرتا تھا، وہ اس کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے کام کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔"

⊛----✪----⊛

"میں پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔ وہاں سے میں اور اسلم، شہریار صاحب کے کہنے پر صرف اس لیے یہاں آئے تھے کہ یہاں سکون کی زندگی گزار سکیں لیکن حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ جس کے نصیب میں سُکھ نہ ہو، وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں چلا جائے، پریشان ہی رہتا ہے۔ وہاں میں چودھری اور اس کے گرگوں سے بھاگتی پھرتی تھی اور اسلم کو قانون کا خوف تھا۔ اسلم تو رہا ہی نہیں لیکن میرے نصیب کی بھاگ دوڑ جاری ہے۔ یہاں جو لوگ میرے پیچھے لگے ہیں، وہ چودھری سے زیادہ چالاک اور با اختیار ہیں اور مجھے ہر لمحے یہ ڈر رہتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کے خوف سے میں سکون سے سو بھی نہیں سکتی۔"

مشابرم خان کے روبرو ان خیالات کا اظہار کرتی ماہ بانو کی آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے حلقے اس کی بات کی تصدیق کر رہے تھے۔

مشابرم خان نے تاسف سے اس کم عمر لڑکی کو دیکھا جس نے اپنی عمر کے دو عشرے مکمل ہونے سے قبل ہی دنیا کے جانے کون کون سے رنگ دیکھ لیے تھے اور کن کن مصائب سے گزر گئی تھی اور اب بھی مشکل میں پھنسی ہوئی تھی۔

وہ کل رات ہی نیویارک پہنچا تھا اور سیدھا اس اپارٹمنٹ آ گیا تھا جہاں ماہ بانو کو مراد شاہ نے منتقل کیا تھا۔ متوحش اور بے چین ماہ بانو کو مشابرم خان کی یہاں موجودگی سے خاصی تقویت ملی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ دار سر پر لٹکی ہوئی ہے اس لیے اپنی تشویش اور خواہش دونوں کا اس کے سامنے اظہار کر رہی تھی۔

"ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ پاکستان منتقل کر دیا جائے۔ مصطفیٰ صاحب سے اس سلسلے میں میری خاصی طویل گفتگو ہوئی ہے اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا یہاں کے مقابلے میں پاکستان میں رہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے پاکستان منتقل کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں کے خفیہ ادارے کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں اور وہ لوگ بھی یہ بات کو سمجھتے ہیں کہ تمہاری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ کسی طرح امریکہ سے نکل جاؤ اس لیے یہاں سے نکلنے کے راستوں پر ان کی پوری توجہ ہو گی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے مصطفیٰ صاحب امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ کس طرح تمہیں یہاں سے نکالا جائے۔ جب تک انہیں کوئی محفوظ راستہ نہیں مل جاتا، تمہارا یہاں

رہنا مجبوری ہے۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں نا تمہارا بھائی۔ میں تمہاری حفاظت اور مدد کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا۔''

اس پر حالات کو واضح کرنے کے بعد مشابرم خان نے اسے تسلی بھی دی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ امریکہ کے خفیہ اداروں کی طاقت کے مقابلے میں مشابرم خان اپنی تمام تر بہادری کے باوجود کچھ بھی نہیں کر سکتا اس لیے اس کی تسلی پر ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجانے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

''مایوس مت ہو میری بہن! جو اللہ ہمیشہ سے مشکل حالات میں تمہاری مدد کرتا رہا ہے، وہ اب بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔''

اس کا انداز سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے اسے سمجھایا تو اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور پھر موضوع گفتگو بدلنے کے لیے اس سے اس کے بارے میں سوال جواب کرنے لگی۔

ان سوال جواب کے نتیجے میں اسے علم ہوا کہ گل مینا کی شادی مشابرم خان سے ہوگئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اسے خوب صورت اور سادہ مزاج گل مینا بہت اچھی لگتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اپنے منگیتر اکرم خان کی موت نے اس پیاری سی لڑکی کو بہت دُکھی کر دیا ہوگا۔ لیکن مشابرم خان سے اس کی شادی کا سن کر اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ گل مینا کے دُکھوں کا بہترین مداوا ہوگیا ہے۔ مشابرم خان بہت صاف دل اور کھرا آدمی تھا۔ گل مینا جیسی لڑکی اس صاف دل شخص کے ساتھ بہت جلد ایڈجسٹ ہو کر زندگی کی خوشیاں پا سکتی تھی اور مشابرم خان کے لہجے کا سکون بتا رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر چکے ہیں۔

''یہ تو تم نے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ سن کر میرا دل گل مینا سے ملنے کے لیے بے چین ہوگیا ہے۔ میں پاکستان جا کر پہلی فرصت میں اس سے ملاقات کروں گی۔''

''ضرور۔'' مشابرم خان اُس کی بے چینی محسوس کر کے مسکرایا۔

''ایک بات پوچھوں خان؟''

''بالکل پوچھو۔'' مشابرم خان کا خیال تھا کہ وہ اس سے گل مینا کی بابت کچھ پوچھنے جا رہی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں بہت اطمینان سے بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ مجاہد کو ماہ بانو نے کچھ دیر قبل ہی فیڈ کروا کر سلا دیا تھا اس لیے اس کی بھی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

''تمہیں شہریار صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟'' وہ بہت جھجکتے ہوئے اپنا سوال لبوں پر لائی۔ اسلم سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے لبوں پر شہریار کا نام آیا تھا اور اس نے اس کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش کی تھی۔ اس کا سوال سن کر مشابرم خان کا چہرہ بجھ سا گیا اور وہ فوری طور پر کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔

''کیا بات ہے خان!..... تم اچانک اتنے اُداس کیوں ہو گئے؟'' اس کے تاثرات دیکھ کر ماہ بانو مضطرب ہوئی۔

''تم نے سوال ہی ایسا کر دیا۔'' مشابرم خان کے لبوں سے ایک آہ سی نکلی۔

''کیا مطلب؟ میں نے تو بس اتنا ہی پوچھا ہے کہ کیا تمہیں شہریار صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کاش میں تمہارے اس سوال کا جواب ہاں میں دے سکتا لیکن سچ یہ ہے کہ میں شہریار صاحب کی طرف سے ہی تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔'' مشابرم خان کے لہجے کی اُداسی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے خان! تم اتنی اُلجھی اُلجھی باتیں کیوں کر رہے ہو؟'' اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔



''تمہاری بات سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم حالات سے واقف نہیں ہو اور میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں آگاہ کر کے تمہارے دُکھوں میں مزید اضافہ کیسے کروں؟'' وہ بالکل بے بس لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے خان! مجھے بتاؤ؟ میرے دُکھی ہونے کی پروا مت کرو۔ مجھے تو اب دُکھ سہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''کئی ماہ پہلے شہریار صاحب کی گاڑی ایک زبردست حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔ اس حادثے میں شہریار صاحب کو اتنی زبردست چوٹیں لگیں کہ.....'' مشابرم خان اپنا جملہ مکمل کیے بغیر رُک گیا اور ماہ بانو کو ایسا لگا کہ اس کی سانسیں رُکنے لگی ہوں۔ وہ مضطرب سی ہو کر کھڑی ہوگئی۔

''اُنہیں کیا ہوا خان؟'' اسے علم نہیں تھا کہ وحشت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی ہے۔

''اُن کی زندگی تو بچ گئی لیکن ایسے کہ نہ وہ زندوں میں ہیں، نہ مُردوں میں۔ وہ کوما میں چلے گئے ہیں اور کئی ماہ سے ہسپتال کے بستر پر مشینوں کے سہارے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سب دن رات بس یہ دعا کرتے ہیں کہ کسی روز معجزہ ہو اور وہ بستر سے اُٹھ کھڑے ہوں۔ ورنہ ڈاکٹر تو کوئی اُمید نہیں دلاتے ہیں۔'' مشابرم خان نے بھرّائی ہوئی آواز میں بتایا تو وہ گرنے کے سے انداز میں دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہریار اتنی بڑی مشکل سے دوچار ہے اور اس کے دل کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ لیکن مشابرم خان بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ثبت دکھ ہی اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

''حوصلہ کرو ماہ بانو! اس طرح دل چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کرو۔ انہیں ہم سب کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے اسے سمجھایا لیکن وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اسی حالت میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ یوں بیٹھے بیٹھے جانے اسے کتنی دیر گزر گئی۔ دوبارہ وہ مجاہد کے بے تحاشا رونے پر حواس میں واپس لوٹی۔

مشابرم خان بچے کو گود میں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بچے کو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے میکانکی انداز میں بچے کو تھام لیا اور اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن کچھ دیر میں اس کی ہر تدبیر ناکام ہوگئی۔ نہ تو بچہ فیڈ کر رہا تھا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے بہل رہا تھا۔ وہ پریشان سی اس کے ننھے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر چیک کرنے لگی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ پیدائش سے لے کر اب تک وہ کبھی اتنی بری طرح نہیں رویا تھا اس لیے اسے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ کوئی درست نتیجہ بھی نہیں اخذ کر پا رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟..... یہ بچہ چپ کیوں نہیں ہو رہا؟'' مشابرم خان جو اسے بچہ تھما کر خود واش روم میں چلا گیا تھا، واپس آنے پر بھی بچے کو اسی شدت سے روتا دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگا۔

''پتہ نہیں کیوں چپ نہیں ہو رہا ہے۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔'' بچے کے قدرے سخت اور اُبھرے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماہ بانو نے اپنا اندازہ بیان کرتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

''اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔ تم تیاری کرو۔ جب تک میں کیب کا بندوبست کرتا ہوں۔'' مشابرم خان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ماہ بانو نے جلدی جلدی بچے کو تیار کیا اور ایک بیگ میں ضرورت کی چند چیزیں رکھنے کے بعد ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ انٹرکام پر مشابرم خان نے اسے کیب آ جانے کی اطلاع دی۔ وہ لفٹ کے ذریعے تیزی سے نیچے پہنچی۔ مشابرم خان کیب میں ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے لیے پچھلا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی کیب حرکت میں آ گئی۔ وہ لوگ کچھ دُور ہی نکلے ہوں گے کہ مشابرم خان نے بیک ا
مرر میں ایک پولیس وین کو اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رُکتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے
تاثرات چھا گئے۔ عام حالات میں شاید وہ پروا بھی نہیں کرتا لیکن ابھی تو انہیں پھونک پھونک کر ہر قدم اٹھا
تھا۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے ماہ بانو کو تو بچے سمیت ایمرجنسی میں بھیج دیا اور خود ایک پبلک بوتھ سے مراد شاہ
رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اس نے مختصراً اسے اپنی تشویش سے آگاہ کرنے کے بعد صحیح صورتِ حال
معلوم کرنے کی فرمائش کی۔ مراد شاہ نے اس سے آدھے گھنٹے بعد فون کرنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
مشابرم خان دوبارہ ماہ بانو کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں ایک لیڈی ڈاکٹر بچے کا معائنہ کر رہی تھی۔

''زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بچے کے پیٹ میں گیس ہو رہی ہے جس کی وجہ سے اسے پیٹ میں
درد ہو رہا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

ینگ سی ڈاکٹر نے نرم لہجے میں صورتِ حال سے آگاہ کر کے تسلی دی۔ اس کے بعد بچے کو ٹریٹمنٹ دی
جانے لگی۔

آدھے گھنٹے بعد مشابرم خان کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ حسبِ توقع دوسری
طرف مراد شاہ تھا جو اسے فون بوتھ سے کال کر رہا تھا۔ یہ طریقِ کار انہوں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ
ایک دوسرے سے رابطے کی ضرورت پڑی تو اپنے ذاتی نمبرز استعمال کرنے کے بجائے پبلک بوتھ کا سہارا
لیں گے۔

''تمہارا اندازہ درست تھا۔ پولیس ماہ بانو کی تلاش میں ہی وہاں پہنچی تھی۔ انہوں نے کسی طرح ا
ٹریس کر لیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ تم بتاؤ کہ وہاں تم دونوں کی کوئی ایسی چیز تو
نہیں ہے نا جس سے بعد میں مشکل کھڑی ہو جائے؟'' مراد شاہ نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کرتے
ہوئے پریشانی سے دریافت کیا۔

''نہیں، مصطفیٰ صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم اپنے کاغذات ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں
اپارٹمنٹ میں فنگر پرنٹس چھوڑنے کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہدایت کے مطابق ربڑ کے ہاتھ
دستانوں کا استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔'' مراد شاہ کے مقابلے میں اس کا لہجہ کہیں زیادہ پُرسکون تھا کیونکہ
مخدوش حالات سے نمٹتے رہنے کی عادت تھی۔

''تھینک گاڈ۔ اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟'' مراد شاہ کی تشویش کا سلسلہ ابھی
نہیں ہوا تھا۔

''اس کے لیے آپ فکرمند نہ ہوں۔ ہم کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے۔'' مشابرم خان نے اسے
جواب دینے سے گریز کیا اور ایک بار پھر ماہ بانو کے پاس جا پہنچا۔ مراد شاہ کی کال سننے کے لیے وہ کمرے
باہر نکل گیا تھا۔

''کیا ہوا؟..... کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' بچہ بیڈ پر پُرسکون نیند سو رہا تھا۔ ماہ بانو نے مشابرم خان کو
سوال کیا۔

''ہاں۔ تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اپارٹمنٹ پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ ہم واپس وہاں نہیں جا سکتے۔
زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مصطفیٰ خان نے اپنی ایک رہائش گاہ کی چابیاں مجھے دے رکھی ہیں۔ ہم



شفٹ ہو جائیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن ہمارے پاس ضرورت کا سامان نہیں ہے، خاص طور پر بچے کے لیے بہت سی چیزیں چاہئے ہوں
گی۔'' ماہ بانو نے اسے بتایا۔ اس نے حالات کے اتنے سرد و گرم سہے تھے کہ اب عادی ہو گئی تھی اور گھبرانے
کے بجائے فوری طور پر مسائل کی طرف دھیان دیتی تھی۔

''سامان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم بازار سے خریداری کر لیں گے۔ ویسے بھی ہمیں وہاں کھانے پینے کا
سامان ساتھ لے کر جانا ہوگا۔ مصطفیٰ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ جگہ شہر سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن کوئی بھی ٹیکسی
آرام سے پہنچا دے گا۔'' مشابرم خان نے اسے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہسپتال سے روانہ ہو رہے تھے۔ بچے کی حالت تسلی بخش تھی اور اسے ہسپتال میں
رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر نے ضروری ہدایات کے ساتھ کچھ دوائیں لکھ کر دے
دی تھیں۔ بچے کو سینے سے لگائے مشابرم خان کے پیچھے چلتی ماہ بانو سوچ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہی اس کے
بچے کے نصیب میں بھی دربدری کا عذاب آیا ہے۔ اس معصوم کو دنیا میں آئے ابھی چند روز ہی تو ہوئے تھے
ان چند دنوں میں اس کو ماں کے ساتھ ساتھ زندگی کی بقا کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگنا پھرنا پڑ رہا تھا۔
گرداب میں گھری ماں کے بچے کے نصیب میں گرداب کے سوا اور آ بھی کیا سکتا تھا؟

⊛----✪----⊛

''کامیابی کے ساتھ اپنی سرزمین پر واپسی مبارک ہو۔'' ذیشان نے گرم جوشی کے ساتھ شہریار کو گلے لگایا
اور پھر پورے جوش کے ساتھ اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ دشمن کی سرزمین پر گزارے دنوں نے اپنوں کی محبت
میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''کامیابی کے اس سفر میں سلیم میرا برابری سے شریک رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو بعض اوقات صرف اس کی
کردماغی اور پھرتی ہی کی وجہ سے ہم بال بال بچ گئے۔'' ذیشان سے الگ ہونے کے بعد اُس نے اپنے
موجود سلّو کی کھلے دل سے تعریف کی۔

''پھر تو میں مسٹر سلیم کا دل سے شکرگزار ہوں۔ دوست کا محسن ہمارا بھی محسن ہے۔'' ذیشان نے سلّو سے
گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ دونوں ابھی ابھی چین سے یہاں پہنچے تھے۔ دو طرفہ انڈر اسٹینڈنگ کی وجہ
ان کا یہ سفر بہت آسان ثابت ہوا تھا اور وطن کی فضاؤں میں سانس لیتے ہی نظر نے پُرخلوص دوست کو
سامنے پایا تو دل مزید خوش ہو گیا۔

''یہ مسٹر عادل کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کی نظرِ کرم ہی
ہے۔ آج میں ایک مجرم کے بجائے دوست کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔'' سلّو نے عاجزی کا
مظاہرہ کیا۔

''میرا کردار تو صرف اتنا ہے کہ میں نے ہیرے کو ہیرا سمجھا اور نا تراشیدہ حالت میں بھی اسے پہچان لیا
تھا، اس طرح ہم فائدے میں ہی رہے۔'' شہریار نے محبت سے سلّو کا شانہ تھپتھپایا۔ تھوڑے دنوں کے
عرصے نے اس کے دل میں سلّو کے لیے حقیقی محبت پیدا کر دی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ اس مختصر عرصے میں سلّو کے
غیر محسوس انداز میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں اور اس کے اندر کا وہ وحشت زدہ سا روپ کہیں غائب
تھا جس میں ''را'' والوں نے اسے ڈھال کر پاکستان کی تباہی کے لیے بھیجا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ باقی باتیں بھی ہوتی رہیں گی، پہلے یہاں سے چلتے ہیں۔'' ذیشان نے زبردستی

شہریار کے ہاتھ سے اس کا سفری بیگ لے لیا۔ اس چھوٹے سے بیگ کا وزن بہت ہی کم تھا۔ اصل میں تو اس کے پاس کوئی سامان تھا ہی نہیں۔ اس بیگ کا اہتمام بھی سفر کے لوازمات پورے کرنے کے لیے کیا گیا تھا جس میں ایک جوڑے اور استعمال کی معمولی چیزوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ذیشان کے ساتھ چلتے ہوئے وہ پارکنگ میں آئے اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شہریار نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھالی جبکہ سلو پیچھے بیٹھ گیا۔

''میرا تو یہ سوچ سوچ کر دل خوش ہو رہا ہے کہ بھارتیوں کو کیسی گہری چوٹ لگی ہے۔ خبیث سارا وقت پاکستان کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے ہیں۔ اب اُنہیں تھوڑا سا سبق ضرور ملا ہوگا کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی کوئی کلائیوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔'' اسٹیئرنگ سنبھالے ذیشان بہت خوش تھا۔

''چوٹ تو ان کو ضرور لگی ہے لیکن یہ بھول جاؤ کہ انہوں نے کوئی سبق سیکھا ہوگا۔ وہ اپنے اندر بھرے کینے اور بغض سے مجبور ہیں، لاکھوں چوٹیں کھائیں لیکن سازشیں کرنے سے پھر بھی باز نہیں آئیں گے۔'' شہریار نے حقیقت بیان کی۔

''کرنے دو اُنہیں سازشیں۔ اپنی ہر سازش کا اُنہیں منہ توڑ جواب بھی ملے گا۔ ہمارے پاس ہمت اور حوصلہ دکھانے اور قربانیاں دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔'' اتنے دنوں بعد اسے اپنے سامنے پا کر ذیشان بہت ترنگ میں تھا۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ ہمارے لوگوں میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن جب وطن کی سلامتی کی بات آتی ہے تو سب قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بھارت میں ہمارے ایجنٹ کلام نے جیسے ہر طرح کے حالات میں ہمارا ساتھ دیا، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ پاکستان آئے اور اپنوں کے ساتھ زندگی انجوائے کرے لیکن اس کی زندگی ہی نے وفا نہیں کی۔''

کلام کو یاد کرتے ہوئے وہ اُداس ہو گیا۔ اُس کی لاش فی الحال پاکستان نہیں پہنچی تھی اور گراؤنڈ بنایا جا رہا تھا کہ ایسے طریقے سے اسے پاکستان پہنچایا جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ وہ اتنے عرصے سے بھارت میں تھا اور بھارت سے فرار ہوتے ہوئے موت کا شکار ہوا۔ فی الحال یہ کہانی زیرِ غور تھی کہ کلام ایک جینی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جہاں وہ حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کے سامان کی تلاشی لینے پر اس کا پاکستان کا ایڈریس ملا جس پر اُس کے عزیزوں سے رابطہ کر کے اس کی لاش پاکستان بھجوانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ کہانی اس لیے چل جاتی کہ کلام بھارت جاتے ہوئے کسی کو آگاہ کر کے نہیں گیا تھا۔ اپنے عزیز و اقارب کے لیے ایک معمہ بنا ہوا تھا کہ اچانک ہی وہ کہاں غائب ہو گیا۔ یہ کہانی سامنے آتی تو معمہ حل ہو جاتا لیکن بہرحال یہ حتمی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ ہر پہلو کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

''وہ تو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہے یار! اس کے حصے میں تو ہمیشہ کی زندگی آ گئی۔ اس کی ذات پر افسوس نہیں، قابلِ رشک ہے۔'' ذیشان نے گویا اسے تسلی دی۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ شہادت کی تمنا تو ہم میں سے ہر ایک کے دل میں مچل رہی ہے۔'' شہریار نے اس سے اتفاق کیا پھر موضوعِ گفتگو بدلنے کو بولا۔

''اور سناؤ، یہاں میرے پیچھے کیا ہوتا رہا؟ ٹی وی کے ذریعے تھوڑی بہت سن گن تو ملتی رہی لیکن مکمل حالات تو تم ہی بتا سکو گے۔''



''یہاں بہت کچھ ہوا ہے اور شکر ہے کہ ہم بڑی بڑی مشکلوں سے نمٹنے میں کامیاب رہے۔'' اس نے اسمگلنگ کی ناکام کوشش سے لے کر بھارت کی حدود میں اس اسلحے کی تباہی اور ایئربیس پر حملے تک کی کہانی مختصر الفاظ میں کہہ سنائی۔ سنتھیا کی موت کا قصہ بھی زیرِ گفتگو آیا۔

''جاوید علی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس کی خصوصی تربیت کرواؤ۔ آگے چل کر وہ کوہِ نور ہیرا ثابت ہوگا۔'' ساری بات سن کر شہریار نے کمنٹس دیئے۔ کیونکہ ان میں سے ہر واقعے میں جاوید علی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

''یہ تو ہم میں سے ہر ایک محسوس کر رہا ہے۔ بہت اسپرٹ ہے اس لڑکے میں۔ بس اس کے جنون کو ذرا کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے بھی ہم پُر امید ہیں کہ انشاء اللہ اب وہ سنبھل جائے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''جنون تو اس کا صحیح ہے۔ انسان جب اپنے کسی پیارے کو دوسرے کے ظلم کی وجہ سے کھوتا ہے تو اس کا اللہ دہلا دہک جاتا ہے۔'' شہریار نے قدرے اُداسی سے کہا۔ اسے علم تھا کہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر راجہ سراؤں کے گینگ سے نمٹنے والا جاوید علی، نواب کی بیٹی شازمین کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ محبت اس بے چاری لڑکی کی زندگی چھن جانے کا سبب بن گئی۔

جاوید علی نے اس حادثے کا گہرا اثر لیا تھا۔ شہریار اُس کی اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس نے اپنے بھائیوں جیسے کزن سجاد اور اس کی بیٹی شینا کی موت کا زخم سہا تھا اور ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار پہنچانے کے لیے میدان میں اُتر آیا تھا۔ یہ تو اُس کی خوش قسمتی رہی کہ ذاتی جنگ بہت جلد وطن کی جنگ میں بدل گئی اور زندگی کو ایک بہتر مقصد مل گیا۔ جاوید علی کے ساتھ بھی بعینہٖ ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ اتفاق سے ان کے ذاتی دشمن ہی قومی دشمن بھی تھے۔

''قدرت بڑی منصف مزاج ہے یار!..... انسان دُکھ سہتا ہے تو سُکھ بھی اس کا حصہ ہوتا ہے۔ جاوید کو سائرہ کی شکل میں زندگی کی ایک اچھی ساتھی مل گئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ جلد وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔'' ذیشان نے اسے اطلاع دی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ زندگی میں حوصلہ بڑھانے والے موجود ہوں تو انسان کی کارکردگی مزید نکھر جاتی ہے۔'' اس کے یہ جملہ ادا کرتے ہی سفر تمام ہو گیا۔ ذیشان اُنہیں اس کوٹھی میں لایا جہاں وہ ایک عرصے سے عمر فاروق کے زیرِ تربیت رہا تھا۔ کوٹھی میں عمر فاروق نے بھی اس کا کھلی بانہوں سے استقبال کیا۔ سلو کو محبتوں میں حصے دار تھا۔

''تم چاہو تو تھوڑا آرام کر کے فریش ہو جاؤ۔ یہاں گاڑی اور ڈرائیور دونوں تیار ہیں۔ جب تم چاہو تمہارے والدین سے ملاقات کے لیے لے جایا جا سکتا ہے۔'' آپس میں مل لینے کے بعد میجر عمر نے سلو کو اطلاع دی۔

''میں فوری طور پر ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے لیے بہت اُداس ہوں گے۔'' سلو نے اپنا فیصلہ سنایا جو بالکل درست تھا۔ ایسے والدین جنہیں برسوں بعد اپنا بیٹا ملا تھا، ایک بار پھر اس کے غیاب پر کتنے پریشان ہوں گے، یہ کوئی بھی صاحبِ دل اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ سلو کو اس کی خواہش کا نذرانہ کر دیا گیا۔

''تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یہ تمہارا ہی حوصلہ تھا جو ہم چائنہ جیسے دوست کو اس کا من چاہا تحفہ دینے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر فرحان جیسے باصلاحیت انسان کی خدمات پا کر چائنہ ہم سے بہت خوش ہوگا

اور دوستی کے رشتے کو مزید تقویت ملے گی۔'' شہریار نے آرام کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے انہوں
لیونگ روم میں محفل سجالی تھی۔ یہیں عمر فاروق نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ تبصرہ کیا تھا۔

''میرے لیے بھی یہ بڑے اطمینان کی بات ہے۔ بھارت کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے ہمیں
جیسے دوست کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ اور ابھی تو انہیں بونس میں عائشہ جیسی ذہین عورت بھی مل گئی
ڈاکٹر صاحب نے خود چینی حکام سے مطالبہ کیا تھا کہ عائشہ کی چین میں رہائش کا بندوبست کیا جائے اور اس
بیٹی کو بھی جلد از جلد اس تک لایا جائے۔ ان کا یہ مطالبہ قبول کر لیا گیا۔ میرے خیال میں یہ بہت اچھا
یہاں کے مقابلے میں عائشہ وہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔ اس طرح میرے دل سے یہ بوجھ بھی اُتر جائے گا
میری وجہ سے اس بے چاری کی اچھی خاصی زندگی خراب ہو گئی۔''

اس نے ان لوگوں کو عائشہ کے کردار کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا اور بھارت میں پیش آنے
چیدہ چیدہ واقعات سناتا رہا۔ اس دوران چائے اور ہلکے پھلکے اسنیکس کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ذیشان اور
دلچسپی سے سارے واقعات سنتے رہے۔

''تمہاری اس مہم میں بھائی جی کا کردار بہت زبردست رہا۔ اس کی شخصیت کے منفی پہلو اپنی جگہ لیکن
کے ساتھ نے تمہارے کام کو خاصا آسان بنا دیا۔'' کہانی میں بھائی جی کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے
فاروق نے کہا۔

''ہاں، عجیب متضاد سی شخصیت کا مالک تھا وہ۔ ایک طرف بڑا نستعلیق اور محبت کے پیچھے زندگی
دینے والا اور دوسری طرف لالچی اور موقع پرست۔ اگر اس کے رائٹ ہینڈ عبدالرحمٰن نے آخری لمحات
ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہمارے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔'' ان کی تائید کرتے ہوئے شہریار نے
تبصرہ کیا۔

''جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے لیے تو سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ تم اپنے دامن میں کامیابی
کر صحیح سلامت ہمارے درمیان واپس آ گئے۔'' ذیشان نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''تم لوگوں کی دعائیں ساتھ تھیں یار! ورنہ میری کیا اوقات ہے۔'' اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا
بولا۔ ''میرے پیچھے تم لوگوں نے بھی کم کارنامے انجام نہیں دیئے۔ خاص طور پر سنتھیا کے انجام اور
سے ایک حملہ آور کی زندہ گرفتاری نے میرا دل بہت خوش کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس گرفتار ہونے والے
نے کچھ اُگلا یا نہیں؟''

''خاصا سخت جان بندہ تھا۔ لیکن ہمارے دیسی طریقوں کے آگے ٹھہر نہیں سکا۔ اس نے اُگل دیا
اس مہم کے پیچھے ''موساد'' اور ''را'' کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ وہ لوگ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے ساتھ
عالمی برادری میں نالائق بھی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے اس بندے سے یہاں ان کے ٹھکانوں
بارے میں بھی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی فراہم کردہ معلومات اس اعتبار سے بیکار ثابت ہوئیں
ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی پنچھی گھونسلوں سے اُڑ چکے تھے۔ بعد میں وہ بندہ بھی خودکشی کرنے میں کامیاب
گیا۔ اس نے باتھ روم کا بلب اُتار کر ہولڈر سے تار کھینچ کر خود کو الیکٹرک شاک لگایا تھا۔ گیلے فرش اور
وجہ سے سیکنڈوں میں ہی اس کا قصہ تمام ہو گیا ورنہ ہم ارادہ کر رہے تھے کہ اسے عدالت اور میڈیا کے
پیش کر کے دنیا کو بھارت اور اسرائیل دونوں کے کردار سے آگاہ کیا جائے۔'' ذیشان نے بتایا۔

''دنیا ان کے کردار سے پہلے ہی آگاہ ہے لیکن بدقسمتی سے ہم تعصب کے باعث عالمی برادری



بہت کم دوست رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک یکجا ہو کر سازشوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن یہ اس سے بھی زیادہ
اہم حقیقت ہے کہ ہمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ اپنے اسلامی تشخص کو بھول کر کچھ
ممالک امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کہیں کے حکمراں اقتدار
سے آگے کسی شے کی خواہش نہیں رکھتے اور کہیں اندرونی حالات اتنے خراب ہیں کہ ان سے نمٹنے میں ہی
ساری توانائیاں خرچ ہو جاتی ہیں۔''

اس کے حقیقت پر مبنی اس تبصرے نے سب کے دلوں کو ہی افسردگی میں مبتلا کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو
مسلمانوں کو دنیا میں سربلند دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے لیکن اپنے محدود اختیارات کے باعث کچھ بدلنے سے قاصر
تھے اور بس اتنا ہی کر سکتے تھے کہ اپنے دائرۂ کار میں ہی اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے رہیں۔

''اتنے اُداس مت ہو برخوردار! اللہ کبھی نہ کبھی ہماری قوم کو بھی عروج دے گا۔ بس تم جیسے جوانوں کا
حوصلہ بلند رہنا چاہیے۔'' آخر عمر فاروق نے ہی انہیں اس یاسیت سے نکالا۔

''انشاء اللہ!'' دونوں نے بیک وقت مسکرا کر کہا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''او کے، تم دونوں گپ شپ لگاؤ۔ مجھے کچھ کام ہے۔ اب رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہو گی۔''
انہوں نے ان کی محفل سے رخصت لی۔

''چودھری کی کیا خبر ہے یار؟'' شہریار کو اپنے سب سے خاص دشمن کی یاد نے ستایا۔

''ابھی تک موصوف پاکستان نہیں آئے ہیں۔ بھارت سے سیدھے دبئی پہنچ گئے ہیں۔'' ذیشان نے
اسے آگاہ کیا اور ساتھ ہی طوائف کے قتل والے کیس سے لے کر ان کے ٹیلی فون نمبرز کی نگرانی کے بارے
میں بھی بتا ڈالا۔

''مستقل نگرانی کے باوجود ہمیں شک ہے کہ ہم چودھری کی طرف سے آنے والی خاص کالز کو ریکارڈ
کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے حقائق ہمارے علم میں نہیں آ رہے۔''
ساری تفصیلات بتاتے ہوئے ذیشان نے اس سے اپنی اُلجھن کا ذکر کیا۔

''چودھری جن لوگوں کے ساتھ وابستہ ہے، وہ ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت آگے ہیں اس
لیے اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ انہوں نے چودھری کو رابطے کا کوئی محفوظ ذریعہ فراہم کر رکھا ہو جس
کے باعث ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' اس نے فوراً اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' ذیشان نے اس کی تائید کی۔

''ٹھیک ہے، اب میں واپس آ گیا ہوں تو چودھری سے بھی دو دو ہاتھ کر ہی لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرحان والا
معاملہ پوری توجہ کا طالب نہ ہوتا تو میں پہلے ہی اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔'' اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''اس وقت بھی ہمیں ایک اور توجہ طلب مسئلہ درپیش ہے۔'' ذیشان نے دھیمی آواز میں اسے آگاہ کیا۔

''کیسا مسئلہ؟'' وہ چونکا اور ذیشان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ذیشان فوری طور پر کوئی جواب
نہیں دے سکا۔

''کیا آرلینڈو میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟'' شہریار کو یکدم ہی ادراک ہوا کہ مسئلے کا تعلق ماہ بانو سے ہے
لیکن براہِ راست اس کا نام لینے کے بجائے ذرا گھما کر سوال کیا۔

''ہاں ہاں، خاصی گڑبڑ ہو چکی ہے اور ماہ بانو خاصی مشکل میں ہے۔'' وہ اسے دھیرے دھیرے حالات
سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ اسلم کی موت اور ماہ بانو کے ہاں معذور بچے کی پیدائش کا سن کر وہ تڑپ اُٹھا۔ اس سے

بھی بڑھ کر پریشانی کی بات یہ تھی کہ اتنا سب کچھ سہہ لینے کے باوجود ماہ بانو محفوظ نہیں تھی اور اسے اپنی اور اپنے بچے کی جان بچانے کی تگ و دو کرنی پڑ رہی تھی۔

''میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ میں ماہ بانو کو ان حالات سے لڑنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔'' آخر کار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ذیشان کو بھی اس سے اسی فیصلے کی امید تھی۔

''تمہارے جانے کے انتظامات ہو جائیں گے۔ لیکن تم زیادہ ٹینس مت ہو۔ مشابرم خان، ماہ بانو کے ساتھ ہے۔ مصطفیٰ خان بھی ان لوگوں کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ جو تمہیں عزیز ہو، ہم اس کی پروا نہ کریں، یہ کیسے ممکن ہے؟''

ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا لیکن اس کے سینے میں دھڑکتا دل اس وقت تک قرار نہیں پا سکتا تھا جب تک اسے ماہ بانو کے محفوظ ہونے کا مکمل یقین نہ ہو جاتا۔ ابھی تو وہ یہ سوچ سوچ کر ہی بے چین ہوا جا رہا تھا کہ ماہ بانو نے اسلم جیسے مخلص اور محبت کرنے والے ساتھی کی جدائی کا غم کیونکر سہا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسلم، ماہ بانو کی پہلی محبت نہیں ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسلم کی محبت میں اتنی گہرائی تھی کہ اس نے ماہ بانو کے دل میں اپنی جگہ ضرور بنائی ہوگی۔ ایک بے امان اور تنہا لڑکی ایسی سچی محبت کی ناقدری کر ہی نہیں سکتی تھی۔ خود اسے اگر اسلم کی محبت پر بھروسہ نہ ہوتا تو وہ ماہ بانو کو اس کے حوالے کیسے کرتا؟ اس نے تو بس یہی سوچا تھا کہ وہ دونوں یہاں سے دور رہ کر اپنی الگ دنیا بسا لیں گے اور سارے مسئلے مسائل سے نمٹ کر ایک دوجے کے ساتھ خوش رہیں گے۔ لیکن قسمت اتنی دور جا کر اپنا وار کرنے سے نہیں چوکی تھی اور اس بار ماہ بانو ایک بار پھر گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے ہر حال میں ماہ بانو کو اس گرداب سے نکالنا تھا، یہ سوچے بغیر کہ اس بار اس کے مقابل چودھری نہیں امریکہ جیسی بڑی طاقت کھڑی ہے۔

⊛----✪----⊛

بہت صبح کا وقت تھا بلکہ سورج طلوع ہونے میں ابھی بہت وقت باقی تھا جب عمیر اور جگو نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔

جگو، عمیر کی ہدایت پر گھر والوں سے مل کر اس کے پاس واپس آ گیا تھا چنانچہ ان کی اتنی صبح روانگی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں جن راستوں پر سفر کرنا تھا، اس کے لیے جیپ ہی سب سے بہترین انتخاب تھی چنانچہ اس وقت عمیر نے جیپ کا ہی اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔

''میں جنگل میں داخل ہونے کے معاملے پر ایک عرصے سے غور کر رہا ہوں اس لیے بہت سے نتائج اخذ کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ جنگل کے ساتھ جو گاؤں دیہات لگتے ہیں، ان میں پیر آباد ہی ایسا گاؤں ہے جہاں سے جنگل تک پہنچنے کا راستہ سب سے آسان ہے۔ ایک راستہ اللہ آباد سے بھی جاتا ہے لیکن خود اللہ آباد پہنچنے کا راستہ بہت خراب ہے اس لیے لوگ اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ دوسری طرف ٹاہلی والا اور دوسرے چند گاؤں ہیں لیکن وہ جنگل کے سرسبز حصے کے بجائے خشک پہاڑی حصے سے ملے ہوئے ہیں اس لیے وہاں سے بھی آمد و رفت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے لیکن بہرحال راستہ موجود ہے۔'' اس نے لمحے بھر کو توقف کیا۔

''اب ہم معاملے کو اس زاویے سے دیکھیں گے کہ کچھ لوگ جنگل میں کوئی غیر قانونی کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کے کام میں مداخلت کریں تو غور کرنا پڑے گا کہ انہوں نے مداخلت کاروں سے بچنے اور آگاہ رہنے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کیا ہوگا؟

''سب سے پہلے تو انہوں نے مروّجہ راستوں پر نگرانی کا انتظام کیا ہوگا تاکہ جیسے ہی کوئی جنگل میں



داخل ہو، انہیں معلوم ہو جائے۔ چنانچہ نقشے کی مدد سے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک ایسے راستے کا انتخاب کیا ہے جو دشوار تو ضرور ہے مگر وہاں نگرانی کا امکان نہیں ہے۔ اس وقت ہم اسی راستے کی طرف جا رہے ہیں۔ اب معاملے کا دوسرا پہلو سامنے رکھتے ہیں۔ جنگل میں مختلف وجوہات کی بنا پر مختلف افراد کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ سارے افراد وہاں حادثے کا شکار نہیں ہو جاتے۔ خاصی اموات کے باوجود جنگل میں جانے اور سلامت واپس آنے والوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ موت صرف انہی کے حصے میں آتی ہوگی جو کسی خاص راز سے واقف ہو جاتے ہوں گے۔ ہمیں یہاں یہ بات مدِنظر رکھنی ہوگی کہ کسی مجرمانہ سرگرمی کے لیے جنگل میں ٹھکانہ بنانے والے جنگل کے کسی خاص حصے پر ہی قابض ہوں گے لیکن ظاہر ہے اتنے بڑے جنگل میں ہم کسی خاص مقام کا تعین آسانی سے نہیں کر سکتے، البتہ میں نے کچھ اندازے ضرور لگائے ہیں۔

''اظفر اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں ہمیں جہاں سے ملیں، وہ حصہ اچھی طرح چیک کیا گیا تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ حصہ بالکل صاف ہے۔ یعنی ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں مشکوک جگہ سے دُور لا کر قتل کیا گیا تھا۔ بظاہر موت کی وجہ جنگلی جانوروں کا حملہ بنی لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جنگلی جانوروں کے حملے سے قبل وہ سب کے سب بے ہوش تھے۔

''مجھے اظفر کے سامان سے ایک نقشہ ملا تھا جس میں اس نے ایک خاص مقام کو مارک کر رکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنگل کے اس حصے تک جانا چاہتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر ہمیں جو لاشیں ملیں، وہ اس کے بالکل مخالف سمت میں تھیں اور ایسا یقیناً حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا گیا ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جنگل میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی حصے کو چیک کریں گے لیکن پوری احتیاط سے اور ذرا فاصلے پر رہ کر۔ کام پورا ہونے میں چاہے دیر لگ جائے لیکن بے احتیاطی سے مجرموں کو کوئی فائدہ نہیں ہونا چاہیے۔'' جیپ کو طے شدہ راستے پر چلاتے ہوئے عمیر، جگو کو بریفنگ دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کی کل چنگی طرح سمجھ گیا۔ آپ جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔'' اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں جگو نے صرف ایک جملہ کہا جو اسے بہت پسند آیا۔ کیونکہ وہ جگو سے یہی چاہتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی معاملے کو بہت زیادہ بگاڑ بھی سکتی تھی۔

''گڈ۔ اب تم ایسا کرو کہ پیچھے رکھے بیگز میں سے ٹیلی اسکوپ اور اپنی پسند کا اسلحہ نکال کر پہلے ہی سنبھال لو۔ نیلا بیگ تمہارا اور ہرا میرا ہے۔ یہ بیگ ہمیں اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جانے ہوں گے۔ جیپ میں جنگل سے باہر ہی ایک محفوظ جگہ پر چھپا دوں گا کیونکہ اس کو لے جانے کی صورت میں ہم فوراً ہی نظر میں آ جائیں گے۔ ویسے بھی میں نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، وہاں سے جیپ کا گزرنا ممکن نہیں ہوگا۔'' عمیر نے اس سے کہا تو اس نے جھک کر پچھلی نشست پر رکھا نیلا بیگ اٹھا لیا اور اس میں سے حسبِ ہدایت اشیاء نکالنے لگا۔ اس کے بعد کا سفر جو کہ زیادہ طویل نہیں تھا، خاموشی سے گزرا۔

عمیر نے منزل پر پہنچ کر جیپ روک لی اور پھر ان دونوں نے مل کر اسے ایک ایسی جگہ چھپا دیا جہاں بڑے اور پرانے درختوں کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ تھوڑی بہت کمی شاخیں اور پتے توڑ کر جیپ پر پھیلانے کے بعد پوری ہو گئی۔

جیپ سے اُترنے سے قبل انہوں نے ایک ایک واکنگ اسٹک بھی تھام لی تھی۔ ان کے سروں پر ایسی ٹوپیاں تھیں جن کے سامنے کے حصے پر ٹارچیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالکل ایسی ٹوپیاں تھیں جو کان کنوں کے

زیر استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن فی الحال انہوں نے ان ٹارچوں کو روشن نہیں رکھا تھا۔

''اس حصے میں زمین بہت نرم اور قدرے دلدلی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں ندی ہوتی تھی۔ لیکن ندی سوکھ گئی اور زمین اب تک دلدلی ہے۔ لوگ زمین کی ساخت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس حصے کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ لیکن مجھے میرے اسٹاف میں شامل ایک لڑکے نے بتایا تھا کہ ایک پتلی سی راہ گزر ایسی ہے جس پر چل کر جنگل کے اندر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں اُس سے وہ راستہ اچھی طرح سمجھ چکا ہوں پھر بھی احتیاطاً اسٹکس لے لی ہیں کہ راستہ چیک کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ راستے پر میں آگے رہوں گا، تم مجھے فالو کرنا۔'' قدم بڑھانے سے قبل عمیر نے جگو کو مزید بریفنگ دی۔

''ٹھیک ہے سر جی!..... لیکن آگے مجھے چلنے دیں۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ میں بزدل ہوں اور سارے خطروں کا آپ اکیلے سامنا کر رہے ہیں۔'' جگو نے سر ہلایا اور ساتھ ہی ایک فرمائش بھی کر دی۔

''نہیں یار! یہ بزدلی اور بہادری کا چکر نہیں ہے۔ یہاں تمہاری بہادری ثابت شدہ ہے۔ میں آگے صرف اس لیے رہنا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے مقابلے میں راستہ زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔'' عمیر نے اسے ہنس کر اسے سمجھایا تو وہ راضی ہو گیا۔

طلوع ہوتے سورج کی بہت ہلکی روشنی میں سفر کا نازک مرحلہ شروع ہوا۔ یہ راستہ واقعی دشوار تھا۔ واکنگ اسٹکس نے اس راستے پر چلنے میں ان کی بہت مدد کی۔ جہاں بھی زمین ایک حد سے زیادہ نرم تھی، اسٹک کے دھنساؤ نے قبل از وقت آگاہ کر دیا لیکن پھر بھی ایک جگہ عمیر پھسل گیا۔ خوش قسمتی سے وہ صرف کیچڑ تھی جس نے دلدل کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ جگو کے سہارے وہ دوبارہ اُٹھ کر چلنے کے قابل ہو گیا۔

آخر کار انہوں نے نہایت سست روی سے جنگل کے اندر رسائی کا یہ مشکل راستہ طے کر لیا۔ اب سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس کی شعاعیں جنگل کے اندر بھرپور رسائی حاصل کرنے میں ناکام تھیں۔

عمیر نے ایک درخت کے نیچے رک کر نقشہ نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کمپاس کی مدد سے اپنی سمت کا تعین کیا۔ جگو پڑھا لکھا بندہ نہیں تھا اس لیے اس قسم کے معاملات میں مدد کرنے سے قاصر صرف ہدایات ملنے کا انتظار کرتا تھا۔ اب بھی عمیر نے سمت کا تعین کرنے کے لیے آگے بڑھنے کی ہدایت کی تو وہ چل پڑا۔ ان کی ٹارچیں ایک بار پھر بند تھیں کیونکہ وہ ان کی روشنی کے باعث کسی کی نظروں میں آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آگے بڑھنے کے لیے درختوں کے پتوں سے چھن کر آنے والی معمولی روشنی بھی کافی تھی۔

دن کا آغاز ہوتے ہی جنگل میں زندگی بھی جاگ اُٹھی تھی۔ وہ مختلف چرند پرند کی آوازوں کے ساتھ ان کی چہل پہل کو بھی اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے۔ صبح ہوتے ہی رزق کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود انہیں فطرت کے اس حُسن نے متاثر کیا۔

یک دم ہی منظر میں ہرنوں کا ایک جوڑا داخل ہوا۔ شاخ در شاخ سینگوں والے وہ ہرن بہت خوبصورت تھے اور آپس میں اٹکھیلیاں کرتے بہت پیارے لگتے تھے۔ ان دونوں کی توجہ خود بخود ہی ان پر مرکوز ہو گئی اور وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ چپکے انہیں دیکھتے رہے۔ شوخ جوڑا چند لمحوں میں ہی قلانچیں بھرتا ہوا آگے کی طرف بڑھ گیا تو انہوں نے بھی قدم آگے بڑھائے۔ فاصلے کے باوجود انہیں ہرنوں کے متحرک جسم اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ اتفاق سے ہرن بھی اسی سمت بھاگ رہے تھے جس سمت انہیں جانا تھا۔ چنانچہ وہ تقریباً



ان کے پیچھے ہی تھے۔

یکایک ان کی نظروں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ جوڑے میں سے آگے بھاگتا ہوا ہرن یک دم ہی اسے پیچھے کی طرف اُچھلا اور زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ یہ منظر بالکل ایسا تھا جیسے بال دیوار سے ٹکرا کر واپس ہو۔ لیکن ہرن کی راہ میں کوئی دیوار نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کس نادیدہ شے سے ٹکرا کر اس بری طرح اچھلا تھا کہ اس کا ساتھی ہرن بھی دم بخود تھا۔

''درخت پر چڑھ جاؤ۔'' عمیر نے سرگوشی میں جگو کو ہدایت کی اور خود بھی ایک قریبی درخت کے تنے پر چڑھنے لگا۔

وہ درخت پر چڑھ رہے تھے، تب ہی انہوں نے کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے دم بخود کھڑا ہرن چوکنا ہوا اور مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں جب تک درختوں کی بلند شاخوں پر پہنچ کر ان پر براجمان ہوئے، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آ چکی تھیں۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ چار پانچ کتوں کا ایک غول تھا جو ہرن کی لاش کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منظر کو زیادہ واضح دیکھنے کے لیے انہوں نے اپنی دُوربینیں آنکھوں سے لگا لیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں کتوں نے مل کر ہرن کی لاش کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

جنگل کی زندگی میں یہ منظر انوکھا نہیں تھا لیکن انہیں جو بات قابلِ غور محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ پانچوں کتوں کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے تھے اور کسی طور جنگلی کتے نہیں لگ رہے تھے۔ جنگلی کتوں کے گلے میں پٹے کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتے یقیناً بہت بھوکے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایک اچھے خاصے صحت مند ہرن کو چٹ کر ڈالا اور ہڈیاں تک چبا گئے۔

اسی وقت جنگل کی فضا میں ایک تیز سیٹی کی آواز گونجی اور کتوں کے جسم ایسے ساکت ہو گئے جیسے ان کے حواس کو کوئی نادیدہ چابک پڑی ہو۔ انہوں نے اپنے منہ میں دبی ہڈیوں کو بھنبھوڑنا چھوڑا اور بالکل میکانکی انداز میں پلٹ کر واپس اس سمت بھاگے جہاں سے نمودار ہوئے تھے۔

اب شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ تربیت یافتہ سدھائے ہوئے کتے ہیں۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی موت بھی یقیناً انہی کتوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس منظر نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ جنگل کے اس حساس حصے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو پُراسرار سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

''اب ہمیں بہت احتیاط کرنی ہو گی جگو! ہم ڈینجر زون کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ذرا سی بھی غلطی ہمارے لیے موت کا پیغام بن سکتی ہے۔'' اس نے اپنے آپریٹس پر جگو کو مخاطب کیا۔

''جی سر! میں سمجھ گیا ہوں۔'' جگو نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد عمیر اسے بتانے لگا کہ وہ آگے کے لیے کیا ارادہ رکھتا ہے۔

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ ہمیں کتنے فاصلے پر رہ کر اپنا کام کرنا ہو گا۔ میں آگے بڑھوں گا اور حقائق جاننے کی کوشش کروں گا۔ تم اپنی جگہ پر رُک کر مجھے کور دیتے رہو گے۔ بلاوجہ ہم میں سے کوئی بھی اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالے گا..... ٹھیک ہے نا؟'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے جگو سے سوال کیا۔

''ٹھیک ہے سر! جیسا آپ کا حکم۔'' وہ اس کی مکمل فرمانبرداری کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ درخت سے اُترا اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا اس سمت بڑھا جہاں اس نے ہرن کو کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر اُچھلتے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ سائنس کا کوئی کرشمہ تھا اور جنگل کے ایک مخصوص حصے کو کسی

بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا حصار بنایا گیا تھا کہ جیسے ہی کوئی ذی روح اس حصے میں داخل ہونے کی کوشش کرے، اسے الیکٹرک شاک جیسی کسی چیز کا سامنا کرنا پڑے۔ شاک لگنے کے بعد جان دار مُردہ یا نیم مُردہ ہو جاتا تو اسے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے اس پر کتوں کو چھوڑ دیا جاتا، یوں قصہ تمام ہو جاتا۔ عمیر نے اپنی نظروں سے اس مقام کا تعین کر لیا تھا جہاں ہرن کو جھٹکا لگا تھا چنانچہ یہ طے تھا کہ اسے اس جگہ کے قریب بھی نہیں جانا تھا۔ وہ بس اس کے آس پاس کسی ایسے درخت کی تلاش میں تھا جو بہت بلند ہو اور اس پر چڑھ کر وہ دُور تک جائزہ لے سکے۔ آخر کار اسے ایک ایسا درخت نظر آ گیا۔ اس نے احتیاط سے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ درخت بلند ہونے کے ساتھ اس کا تنا بھی خاصا سیدھا تھا اس لیے اس پر چڑھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ کئی بار وہ پھسلتے پھسلتے بچا لیکن بالآخر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

ایک بلند شاخ پر پہنچ کر اس نے پہلے اپنی ناہموار سانسوں پر قابو پایا اور بیگ میں سے پانی کی بوتل نکال کر دو گھونٹ بھرے۔ پھر گردن سے لٹکی دُوربین کو آنکھوں سے لگا کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی اس کی نظریں اس منظر کو پا گئیں جس نے اس پر جنگل کا راز کھول دیا۔ وہاں کچھ ہٹ نما گھر بنے تھے جن کے ساتھ ہی کھیت بھی نظر آ رہے تھے۔ جنگل میں کھیت بڑی عجیب سی بات تھی۔ اُس نے لینز کو زوم کیا تا کہ اندازہ لگا سکے کہ یہ کس چیز کے کھیت ہیں لیکن درست اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ دیہاتوں میں اسے جن فصلوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، نظر آنے والے پودے ان میں سے کسی سے بھی مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ یوں بھی کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ چاول، گندم یا کپاس جیسی کسی فصل کو جنگل میں اتنی رازداری سے کاشت کرتا۔ فصل کے جائزے کے دوران اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اُسے اظفر کے ساتھ مرنے والے چودھری کے ملازم بہرام کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اس نے مرتے وقت جو چند الفاظ ادا کیے تھے، ان میں سے ایک لفظ تھا ''افیون'' تھا۔

''او مائی گاڈ!..... یہ لوگ یہاں افیون کاشت کر رہے ہیں۔'' زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے وہ شدید حیرت میں مبتلا تھا کیونکہ تمام لوگوں کی طرح وہ بھی یہی جانتا تھا کہ افیون کے پودے ٹھنڈے ماحول میں پہاڑی علاقوں میں لگائے جاتے ہیں۔ ملک کا شمالی حصہ اور افغانستان کا نام اس سلسلے میں تواتر سے سننے میں آتا تھا لیکن یہاں تو کچھ انوکھی ہی صورتِ حال تھی۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ دوربین سے جہاں تک کا منظر اسے دکھائی دے رہا تھا، اس میں اسے چند ہی انسانی وجود نظر آئے تھے۔ یہ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان تھے۔

''یہ تو بہت خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ واپس جا کر میجر ذیشان سے رابطہ کرتا ہوں۔ اس سیٹ اپ کو تباہ کرنے کے لیے تو بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کی ضرورت پڑے گی۔''

دل میں سوچتا ہوا وہ واپسی کے ارادے سے درخت سے اُترنے ہی لگا تھا کہ اسے چند افراد نظر آئے جنہوں نے اپنے سروں پر لکڑی کی پیٹیاں اُٹھائی ہوئی تھیں اور انہیں ایک خالی جگہ پر ایک کے اوپر ایک ترتیب سے رکھتے جا رہے تھے۔ ان پیٹیوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ یہاں سے عنقریب مال لے جانے والا ہے۔ اسے جو کچھ جاننا اور سمجھنا تھا، سمجھ چکا تھا چنانچہ کسی قسم کی مداخلت کا احمقانہ خیال دل میں نہیں لایا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کے سیٹ اپ سے نمٹنے کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کرنا ضروری ہے۔ کوئی تنہا شخص یا چھوٹا موٹا گروپ ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بہت قیمتی معلومات آسانی سے حاصل ہو



جانے کی خوشی اور جوش دل میں لیے وہ درخت سے نیچے اُترا لیکن زمین پر قدم رکھنے کے بعد ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا تھا کہ ایک رائفل کی نال اس کی گردن سے آ لگی۔

''ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔'' حکم دینے والے کا لہجہ رائفل کی نال سے بھی زیادہ سرد تھا۔ عمیر کو اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

''کون ہو تم؟..... کیا ڈاکو ہو؟..... اگر ڈاکو ہو تو یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی مال و دولت نہیں ہے۔ میں ایک شکاری ہوں اور میرے پاس بس شکار کا ہی سامان ہے۔'' اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اس شخص کو ڈاکو قرار دیا حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے۔ نگرانی کے لیے جدید آلات استعمال کرنے والوں نے اصل میں اپنے آلات پر بھی سو فیصد بھروسہ نہیں کیا تھا اور ان کے پہریدار وقتاً فوقتاً اطراف کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ درخت سے اُترتے ہوئے وہ ایسے ہی ایک پہریدار کی نظر میں آ گیا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ شکاری تمہاری طرح کے نہیں ہوتے۔ ویسے بھی ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگل میں کب اور کون سا شکاری کس حصے میں آئے گا۔ تم چھپ کر آئے ہو، اس کا مطلب ہے کہ کسی اور چکر میں ہو۔''

اس شخص نے غرّا کر جواب دیا جس سے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنی حفاظت کا کتنا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ لوگ مروّجہ راستوں سے جنگل میں آئے ہوتے تو ابتدا میں دھر لیے جاتے۔ پھنس تو وہ اب بھی گیا تھا لیکن امید تھی کہ جگو کے نظر میں نہ آنے کی وجہ سے بچت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ اُس کی یہ امید رائیگاں نہیں گئی۔ جگو نے واقعی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا ہے۔ وہ بہت خاموشی سے اس درخت سے نیچے اُترا جس پر چھپا ہوا تھا اور احتیاط سے گھومتا ہوا عمیر کو نشانہ بنائے شخص کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس آدمی کو بہت تاخیر سے اندازہ ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اور جب تک بھڑک کر پلٹا، جگو حملہ کر چکا تھا۔ اس کے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس شخص کے سر پر پڑا اور وہ چیخ مارتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کی یہ حرکت ان لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ فوراً ہی بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آوازوں سے ظاہر ہوا کہ وہ کم سے کم بھی دو ہیں۔

''بھاگو..... نکلو یہاں سے۔'' عمیر نے جگو سے کہا اور خود بھی اپنی نیچے پڑی رائفل اُٹھا کر بگٹٹ بھاگا۔ بھاگتے ہوئے بھی اس نے دھیان رکھا تھا کہ وہ درست سمت میں سفر کریں تا کہ واپسی کے محفوظ راستے تک پہنچ سکیں۔ لیکن ان کا تعاقب کرنے والے ان سے بھی تیز دوڑ رہے تھے اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جلد وہ ان تک آ لیں گے۔

پھر اچانک ہی ان لوگوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں ان کے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ مجبوراً انہیں بھی رک کر جوابی فائر کرنا پڑے۔ ان فائروں نے خاطر خواہ اثر کیا۔ پیچھے آنے والے ذرا محتاط ہو گئے کہ اس طرح اندھا دھند تعاقب کرنا ان کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ احتیاط نے ان کی رفتار سست کر دی جس نے عمیر اور جگو کو تیزی سے بھاگنے کا موقع فراہم کیا۔ سرپٹ بھاگتے ہوئے ایک لمحے ایسا آیا کہ انہیں لگا کہ ان کے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پیچھے آنے والوں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

انہوں نے ذرا رُک کر اپنا سانس بحال کیا۔ اب واپسی کا وہ خطرناک راستہ سامنے تھا جس پر سے سنبھل

کر گزرنا ضروری تھا۔

دونوں نے اپنے بیگز سے ہک کی مدد سے لٹکائی گئی فولڈنگ واکنگ اسٹکس نکال کر کھولیں اور قدم آگے بڑھائے۔ اسی پل ایک غراہٹ سنائی دی اور ایک جسیم کتے نے جگو پر حملہ کیا۔ جگو کے سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ اسے ساتھ لے کر زمین پر گر گیا۔ عمیر نے تیزی سے اپنی رائفل سیدھی کی لیکن کتا جگو سے اس بری طرح چمٹا ہوا تھا کہ اس پر فائر کرنا خود جگو کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اب یہی صورت تھی کہ وہ رائفل کا بٹ مار کر کتے کو قابو کرنے کی کوشش کرے۔

اس ارادے سے اس نے ابھی حرکت کی ہی تھی کہ ایک اور کتا اس پر حملہ آور ہوا۔ تعاقب کرنے والوں نے چالاکی کی تھی اور خود ناکام ہونے پر ان کتوں کو پیچھے لگا دیا تھا۔ تربیت یافتہ کتوں نے اتنی ہوشیاری سے ان کا تعاقب کیا تھا کہ انہیں بھنک بھی نہیں پڑ سکی تھی اور کتے موقع پاتے ہی ان پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ عمیر کی البتہ یہ خوش قسمتی رہی کہ کتا پہلے ہی حملے میں جگو کی طرح اسے زمین پر نہ گرا سکا۔ اصل میں اس نے کتے کو اس پر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا چنانچہ رائفل کو لاٹھی کی طرح چلایا اور کتے کی کمر پر ایک ضرور دار ضرب لگائی۔ کتا دُور جا کر گرا لیکن اسی اثنا میں ایک اور کتا میدان میں اُتر چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو ضرب کھا کر گرتا دیکھ کر وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ عمیر پر حملہ آور ہوا۔

عمیر نے رائفل کا بٹ آگے کر کے کچھ ایسے انداز میں اس کے حملے کا جواب دیا کہ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ کتا غصے اور اذیت سے بہت زور سے چیخا اور دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس بار گر جانے والے کتے نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دونوں نے ایک ساتھ دو مختلف سمتوں سے اس پر چھلانگ لگائی۔ عمیر کو اور کچھ نہ سوجھا تو ایک درخت کی لٹکی ہوئی شاخ تھام کر اس سے جھول گیا۔ دونوں کتے پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور گر گئے لیکن خود عمیر کو بھی یہ نقصان ہوا کہ وہ لٹکنے کے چکر میں اپنی رائفل گنوا بیٹھا۔ اب وہ اسی درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا تھا اور نیچے دونوں کتے کھڑے وحشیانہ انداز میں بھونک رہے تھے۔ ادھر جگو بھی خود پر حملہ آور کتے سے نبرد آزما تھا۔ وہ گاؤں کا پروردہ تھا اور اسے طاقت اور تکنیک کے بل بوتے پر خالی ہاتھ بھی اس قسم کے جانوروں سے نمٹنے کی مشق تھی اس لیے اس نے کسی طرح خود سے چمٹنے والے کتے سے اپنے جسم کو آزاد کروا لیا تھا اور اب اس کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

اس کتے سے نمٹنے میں اسے زیادہ دُشواری اس لیے پیش آ رہی تھی کہ وہ کوئی عام آوارہ یا جنگلی کتا نہیں تھا بلکہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھا اور یقینی طور پر انسانوں پر حملہ کرنے کے لیے ہی تربیب دیا گیا تھا اس لیے اس کی خطرناک لڑاکے کی طرح حملے کر رہا تھا لیکن آخر کار جگو نے اس پر اپنی برتری ثابت کر دی۔ کتے نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ عین وقت پر نیچے بیٹھ گیا اور کتا اپنے ہی زور میں آگے جا کر گرا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر جگو نے پتلے پھل والا تیز دھار چاقو نکال لیا اور جب کتا سنبھل کر دوبارہ اس پر حملہ آور ہوا تو یہ چاقو اس کی پسلیوں کو چیرتا ہوا سیدھا دل میں پیوست ہو گیا۔ جسیم اور طاقتور کتا دھپ سے زمین پر آ رہا۔

اس دوران درخت کی شاخ سے لٹکے عمیر نے کسی نہ کسی طرح اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنا وزن سنبھالتے ہوئے اس نے دوسرے سے فائر کیا۔ گولی اس کتے کو لگی جس کا جبڑا مجروح تھا۔ دوسرا کتا اس کی اور چالاکی کا مظاہرہ کرتا ہوا ایک جست لگا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

اپنے مقابل کتے سے نمٹ لینے والے جگو نے آگے بڑھ کر عمیر کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور جھاڑیوں کی سمت پے در پے کئی فائر کیے جو شاید بے نتیجہ ہی ثابت ہوئے۔



''جلدی جلدی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ آوازوں نے تعاقب کرنے والوں کو ہماری موجودگی کے سمت مقام سے آگاہ کر دیا ہو گا۔'' عمیر نے نیچے چھلانگ لگائی اور تیزی سے بولا۔ اور ایک بار پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس سارے ہنگامے میں جگو اپنے پسٹل اور دونوں ہی اپنی واکنگ اسٹکس سے محروم ہو گئے تھے۔ البتہ رائفلیں محفوظ تھیں اور دونوں نے اس بار رائفلیں تھام لی تھیں۔ جیسے ہی انہوں نے کیچڑ زدہ دلدلی زمین والے راستے پر قدم رکھے، عقب سے گولی چلائی گئی اور یہ صرف اور صرف عمیر کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کے کان کی لو اُڑاتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے زخمی کان سے بہنے والے خون کی چپچپاہٹ اپنی گردن پر محسوس کی لیکن حالات پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے اُنہوں نے جوابی فائرنگ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس وقت وہ صرف اندازے اور قسمت کے بھروسے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ دیکھ بھال کر راستہ طے کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

''تم تھوڑا آگے نکل کر ان پر فائرنگ کرو۔ میں یہاں رُک کر انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' عمیر نے ایک درخت کی آڑ میں رُکتے ہوئے جگو کو ہدایت کی۔ درخت کا تنا زیادہ موٹا نہیں تھا اور اس کے چھپنے کی صورت میں وہ دکھائی بھی دے سکتا تھا لیکن یہ بحث و مباحثے کا وقت نہیں تھا اس لیے جگو نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ویسے ان کے جسموں پر جو گہرے رنگ کے دھاری دار لباس تھے، وہ انہیں جنگل کے ماحول میں کیموفلاج کر رہے تھے۔ عمیر جنگل میں آتے ہوئے کیچڑ میں پھسل گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا لباس جنگل کے ماحول میں چھپنے کے لیے اور بھی مناسب ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ درخت کے پتلے تنے سے لپٹ کر کھڑا ہوا تو مکمل طور پر چھپ گیا۔ پیچھے آنے والے دونوں افراد ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ عمیر کی ہدایت پر آگے جا کر فائرنگ کرنے والے جگو کی رائفل گرجی تو دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور بھی جوابی فائرنگ کرنے لگے۔

اس جوابی فائرنگ نے عمیر کو اس کی موجودگی کے مقام سے آگاہ کر دیا اور اس نے بہت دیکھ بھال کر اور اندازہ گھات لگا کے اس وقت فائر کیا جب ان میں سے ایک اپنا سر درخت کی آڑ سے نکال کر فائر کر رہا تھا۔ عمیر کے کیے ہوئے فائر نے اس کی کھوپڑی اُڑا دی۔ دوسرے نے آواز سے سمت کا تعین کر کے اس کی طرف فائر کیا لیکن وہ فوری طور پر نیچے گر گیا تھا اس لیے بچت ہو گئی۔ ایک بار نیچے گرنے کے بعد اس نے دوبارہ کھڑے ہونے کی غلطی نہیں کی اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھتا جگو اسے بھرپور کور فراہم کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہی اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ وہ جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں، اُن کے حق میں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ پیچھے سے مزید کمک آ جاتی تو وہ بری طرح گھر جاتے۔ اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ اصل میں قسمت حد سے زیادہ مہربان ہے۔ چودھری کی حویلی کے تہ خانے کو ہیروئن سازی کی فیکٹری میں تبدیل کرنے کا کام کا آغاز ہو گیا تھا اور اس کام کی نگرانی کے لیے یہاں موجود چند خاص بندوں کو وہاں بھجوا دیا گیا تھا جہاں کے حساب سے تو وہ جنگل میں ایک محفوظ پناہ گاہ میں موجود تھے جہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں لیکن دوسرے پھروں نے انجانے میں ہی اس موقع سے فائدہ اُٹھا لیا تھا اور اب یہاں سے فرار ہونے ہی کو ان بہرحال اُنہیں مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ عمیر کی راہ میں ایک اور مشکل بچ جانے والے کتے کی صورت میں سامنے آ گئی۔ اپنے مالکوں سے وفاداری نبھاتا ہوا وہ وحشی جانور جو انسانی جسم کی مہک پر لپکتا تھا،

دھوکا کھائے بغیر اس پر حملہ آور ہوا تو اس نے کروٹ بدل کر اپنے جسم کو اس کے نیچے آنے سے بچایا اور ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر پوری قوت سے اسے ایک زوردار لات رسید کی۔ کتا اُڑتا ہوا کچھ فاصلے پر گرا اور پھر اسے دوبارہ اُٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جس جگہ گرا تھا، وہاں زمین بہت زیادہ نرم اور دلدلی تھی۔ خود کو وہاں سے نکالنے کی کوشش میں وہ بے چارہ جانور مزید دھنستا اور پھنستا چلا گیا لیکن اس سے پہلے کے چکر میں عمیر ایک بار پھر منظر پر آ گیا تھا۔

جگو کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ کرتے شخص نے فوراً ہی اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی اور اس حد تک کامیاب رہا کہ اس کی چلائی گولی نے عمیر کے دائیں شانے کو نشانہ بنا لیا۔ وہ جھٹکا کھا کر گرا۔ تکلیف شدید اور شانے میں انگارے سے بھر گئے تھے لیکن یہ رُکنے یا ہمت ہار دینے کا وقت نہیں تھا اس لیے وہ تکلیف کے عالم میں بھی آگے بڑھتا رہا۔ جگو کی رائفل اسے کور فراہم کرتی رہی۔

آخر کار وہ دونوں ہانپتے کانپتے، زخموں سے چُور وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ جگو کو گولی کوئی زخم نہیں آیا تھا لیکن اس نے جس کتے سے مقابلہ کیا تھا، اس نے اسے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔

''آپ کا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے سر جی!'' جنگل سے نکل کر جگو نے عمیر کے لباس پر تیزی سے پھیلتی ہوئی سرخی کو دیکھا تو گھبرا گیا۔

''آپ ذرا رُکیں تو میں آپ کی مرہم پٹی کر کے خون روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' پریشانی میں اس نے عمیر سے درخواست کی۔

''نہیں، پہلے ہمارا یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ میری زندگی سے زیادہ اس راز کی اہمیت ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے۔'' عمیر نے رُکے بغیر جواب دیا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں انہوں نے اپنی گاڑی چھپائی تھی۔ اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر جگو بیٹھا جبکہ عمیر اپنا موبائل نکال کر اس پر سگنل چیک کرنے لگا۔ سگنل موجود تھے۔ اس نے سب سے پہلے عبدالمنان سے رابطہ کیا۔

''میری بات غور سے سنو عبدالمنان! اور کوئی بھی سوال کیے بغیر ایک ایمبولینس ڈاکٹر سمیت لے کر پیر آباد کی طرف آنے والی روڈ پر لے آؤ۔ میں تمہیں اسی روڈ پر کہیں ملوں گا۔''

اس حکم کو جاری کرنے کے بعد اس نے میجر ذیشان کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے رابطہ ہوتے ہی وہ سب بتانے لگا جو اس نے جنگل میں دیکھا تھا۔ ذیشان اس کی بتائی ہوئی ایک ایک بات غور سے سن کر نوٹ کرتا رہا لیکن پھر اسے احساس ہو گیا کہ عمیر کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔

''تم ٹھیک تو ہو نا عمیر؟..... یہ بار بار تمہاری آواز ڈوب کیوں رہی ہے؟'' اس نے پریشانی دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ شاید سگنلز کے پرابلم کی وجہ سے میری آواز صحیح طرح نہیں پہنچ رہی ہے۔ لیکن آپ وقت ضائع کیے بغیر میری بات غور سے سنیں۔''

درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تفصیلات نوٹ کروانی شروع کر دیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جگو نے اسے عقیدت سے دیکھا اور ایک عرصے سے خون خرابا دیکھنے اور کروانے والے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے دو قطرے لڑھک گئے۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ وہ جذبہ جو انسان کو جان کی فکر سے بھی آزاد کر دے، کتنا طاقتور اور محترم ہوتا ہے۔ اس نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔ اس کے پہلو میں بیٹھے ایک بڑا کارنامہ انجام دینے والے شخص کے لیے فی الحال وہ اتنا ہی کر سکتا تھا۔



عبدالمنان ایمبولینس کے ساتھ جس وقت سڑک پر نمودار ہوا، وہ پیر آباد تک آنے والے راستے کو تقریباً طے کر چکا تھا۔ ایمبولینس کو رُکوا کر اس نے نڈھال سے عمیر کو اس میں منتقل کروایا تو پریشان عبدالمنان نے اس سے پہلا سوال کر ڈالے۔

''ابھی سوال جواب کا وقت نہیں ہے صاحب! پہلے آپ اے سی صاحب کی جان بچانے کی فکر کریں۔'' اس نے اسے صرف اتنا جواب دیا جو عبدالمنان کے دل کو بھی لگا۔

''زخمی تو تم بھی خاصے لگ رہے ہو؟'' ایمبولینس میں واپس بیٹھتے ہوئے اس نے جگو کے زخموں کو تشویش سے دیکھا۔

''یہ زیادہ خطرناک زخم نہیں ہیں لیکن اے سی صاحب کا بہت خون بہہ گیا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر صورت حال کی نزاکت باور کروائی تو عبدالمنان بھی مزید بحث میں نہیں پڑا اور ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کر دیا۔ ہوٹر بجاتی ایمبولینس تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جگو بھی دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے کے ساتھ ہی اس نے اپنا موبائل نکال لیا۔ وہ بھی ذیشان کا ہی نمبر ڈائل کر رہا تھا تاکہ اسے ان باتوں سے آگاہ کر سکے جو عمیر نے جان بوجھ کر چھپائی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ذیشان کو عمیر کی طرف سے آگاہ ہونا چاہئے تاکہ وہ اس کے لیے بہترین انتظامات کر سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ضلع شہریار کا اللہ خوش قسمتی سے ملنے والے اس دوسرے اے سی سے محروم نہ ہو۔

⊛----✪----⊛

''بھاگتے بھاگتے اب تو میں تھکنے سی لگی ہوں۔ زندگی نے عجیب تکلیف دہ شکل اختیار کر لی ہے کہ کہیں ٹھہر کر رہنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس بھاگ دوڑ میں، میں اپنے کتنے ہی پیاروں کو کھو چکی ہوں لیکن مشکلات کا سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔'' چائے کے ساتھ تیار شدہ سینڈوچز مشابرم خان کے سامنے رکھتے ہوئے وہ دل شکستہ نظر آ رہی تھی۔

''مایوس مت ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگوں کے حصے میں آزمائشیں ذرا زیادہ ہی آ جاتی ہیں لیکن یہ طے ہے کہ اللہ جنہیں تکلیف دیتا ہے، انہیں حوصلہ بھی دیتا ہے کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ کسی ذی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو آزمائشوں کو سہتے ہیں، وہ تو اللہ کے بہت منتخب کردہ لوگ ہوتے ہیں اور آزمائش کی بھٹی میں کندن بنانے کے لیے جھونکا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی کا یہ دور جو بہت تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے، تمہاری شخصیت سازی کر رہا ہے اور آگے چل کر تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔'' اس کا بیٹا خود زندگی سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا، تب ہی تو ایسے الفاظ میں اسے تسلی دینے کے لائق بنا تھا۔

''پتہ نہیں میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا کروں گی۔ ابھی تو میرے جسم کا رُواں رُواں شہریار صاحب کے لیے دعا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کو ان جیسے مخلص لوگوں کی ضرورت ہے اس لیے میں دعا کرتی ہوں کہ چاہے اور میرا بچہ باقی نہ رہیں لیکن وہ ٹھیک ہو جائیں۔ وہ ایسے آدمی ہیں جن سے بہت سے دوسروں کو زندہ رہنے کا آسرا ملتا ہے۔'' وہ اس شخص کو کیسے فراموش کر سکتی تھی جو اس کا اوّلین محبوب ہی نہیں، محسن بھی تھا۔

''ان کے لیے تو ان سے وابستہ ہر شخص دعا کرتا ہے۔ انہوں نے کتنوں کی زندگی بہترین ڈھب پر لگا کر کارنامہ انجام دیا ہے اور کتنے ہی ہیں جو اب بھی ان کے کیے اقدامات سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ ان میں لیاقت رانا اس عمر میں بھی ان کے شروع کیے گئے پروجیکٹس کی نگرانی کر رہے ہیں اور خوش قسمتی سے ان کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، وہ بھی ایسا جوان ہے جو ان کے ہی نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔''

مشابرم خان نے ابھی تک سینڈوچز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا حالانکہ وہ دونوں ہی بہت بھوکے تھے۔ صبح ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد انہوں نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور کئی گھنٹے بھاگ دوڑ میں گزر گئے تھے۔ [illegible] سے نکلنے کے بعد انہوں نے گھر اور بچے کی ضروریات کے مطابق تھوڑی سی شاپنگ کی تھی اور پھر اچھا خاصا طویل فاصلہ طے کر کے اس گھر تک پہنچے تھے۔ گھر یقیناً بہت زیادہ عرصے سے بند پڑا ہوا تھا اس لیے [illegible] قابلِ استعمال بنانے کے لیے بھی انہیں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ درمیان میں کئی بار ماہ بانو کو بچے کو بھی [illegible] پڑا تھا اور اب کہیں جا کر فریش ہونے کے بعد انہیں یہ موقع ملا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر کچھ کھا پی سکیں۔ [illegible] کھانا تیار کرنے میں وقت لگتا اس لیے ماہ بانو نے سینڈوچز تیار کر لیے تھے۔

''مصطفیٰ بھائی، شہریار صاحب کے گہرے دوست ہیں لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر [illegible] کیا کہ شہریار صاحب کو کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔'' اس نے مشابرم خان سے اپنی اُلجھن بیان کی۔

''انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہوگا۔ کیونکہ گہرے دوست کی حیثیت سے وہ جانتے ہوں گے [illegible] صاحب تمہیں تکلیف دہ باتوں سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔''

مشابرم خان کے جواب پر ماہ بانو کا دل زور سے دھڑکا۔ شہریار کے بہت قریب رہنے والے ایک [illegible] کے منہ سے اس جملے کو سننا اسے اپنی اہمیت و وقعت باور کروا گیا تھا۔ دُکھوں اور پریشانیوں سے انہیں ہی [illegible] جاتا ہے جو بہت عزیز ہوں لیکن عجب ستم ظریفی تھی کہ ایک دوسرے کو عزیز رکھنے والے یہ دو لوگ ہمیشہ [illegible] دُوجے سے دُور ہی رہے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی آپس میں حالِ دل بھی نہیں کہہ سکے تھے۔ دُکھ کے [illegible] سے اُس کا دل پگھلنے لگا اور وہ آنکھوں میں اُمڈتی آنسوؤں کی چمک کو مشابرم خان سے چھپانے کے لیے [illegible] پلیٹ پر جھک گئی۔ مشابرم خان نے بھی جان بوجھ کر اس سے نگاہیں چرائیں اور ایک سینڈوچ اٹھا کر [illegible] سے کترنے لگا۔

اسی پل ڈور بیل کی آواز گونجی۔ وہ دونوں ہی چونک گئے۔ عرصے سے خالی پڑے اس مکان کی [illegible] بجانے کی زحمت آخر کس نے کی تھی؟

مشابرم خان تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور [illegible] قدموں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ ڈور آئی [illegible] لگا کر اس نے باہر جھانکا۔ سادہ سے پینٹ شرٹ میں دو افراد سامنے کھڑے تھے جن میں سے ایک کا [illegible] ہاتھ پشت کی طرف تھا جبکہ دوسرے کی قمیض پر موجود اُبھار کسی اسلحے کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اس [illegible] پلٹ کر اشارے سے ماہ بانو کو خطرے سے آگاہ کیا اور خود آنے والوں سے مخاطب ہوا۔

''کون ہے؟''

''ہم میونسپل کے آفس سے آئے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ عرصے سے خالی پڑے اس مکان میں [illegible] لوگ موجود ہیں؟'' وہ شخص جس نے اپنا ہاتھ پشت پر رکھا ہوا تھا، جواب میں بولا۔

مشابرم خان کو اندیشہ تھا کہ اُس کے اس ہاتھ میں کوئی ہتھیار موجود ہوگا۔ جبکہ خود اس کے [illegible] ہتھیار موجود نہیں تھا۔

''اس مکان کا مالک ہمارا دوست ہے اور اس نے خود کچھ عرصہ قیام کے لیے ہمیں اپنے مکان کی [illegible] دی ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم تالا توڑ کر یہاں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لیے پلیز ہمیں تنگ مت [illegible]

مشابرم خان نے قدرے رُوکھے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر بھی ہم ایک بار چیک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری ذمے داری ہے۔'' مشابرم خان [illegible]



لگتا تھا کہ نرم لہجے کے باوجود اس شخص کے چہرے کے عضلات میں سختی در آئی ہے۔

''بہتر ہے کہ تم مالک سے رابطہ کر کے ہمارے بارے میں تصدیق کر لو۔ اس طرح ہم اور تم دونوں زحمت سے بچ جائیں گے۔'' مشابرم خان نے اسے مشورہ دیا جس پر اس کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

''ہمیں مشورہ دینے سے بہتر ہے کہ تم سامنے آ کر ہم سے بات کرو۔ ہمیں کیا کرنا ہے، ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔'' اس بار اُس کے لہجے میں بھی سختی تھی۔

''تم تو اس انداز سے بات کر رہے ہو جیسے ہم مجرم اور تم پولیس والے ہو۔ میونسپل کمیٹی کے کسی ملازم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عزت دار شہریوں سے اس طرح کا سلوک کرے۔''

اُنہیں گفتگو میں اُلجھائے مشابرم خان نے دیکھ لیا تھا کہ ماہ بانو نے بچے اور اس کی ضروری چیزوں کا [illegible] سنبھال لیا ہے۔ اس نے ماہ بانو کو مکان کے پچھلے حصے میں موجود کھڑکی سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ذرا [illegible] سے تذبذب کے بعد وہ حرکت میں آ گئی۔

''ہم ایف بی آئی سے ہیں اور اگر اب تم دروازہ کھول کر سامنے نہیں آئے تو ہم فائرنگ کر کے اس کا [illegible] لاک توڑ دیں گے اور تمہیں قانون سے تعاون نہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا۔''

بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ اس وقت تک ماہ بانو کھڑکی پھلانگ کر پچھلی طرف اُتر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ لیکن بعد میں تمہیں اپنے اس سلوک کی وضاحت کرنی ہوگی۔''

مشابرم خان نے اپنے لہجے میں بے نیازی سموتے ہوئے جواب دیا اور اچانک ہی دروازے کو اَن لاک کر [illegible]۔ وہ دونوں دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ایک نے مشابرم خان کو اپنی پسٹل کی زد میں لیا جبکہ دوسرا [illegible] کی تلاشی لینے لگا۔

''لڑکی نکل گئی ہے۔'' تلاشی لینے والے نے ذرا ہی دیر میں اعلان کر دیا پھر وہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

''وہ کھڑکی سے نکل کر بھاگی ہے۔'' اس نے فوراً ہی صورتِ حال کو سمجھ لیا۔ باہر سے انہیں مکان کے عقبی حصے میں کھڑکی کی موجودگی کا اس لیے علم نہیں ہوا تھا کہ پوری عقبی دیوار کھڑکی سمیت اس بیل سے ڈھکی ہوئی تھی جو [illegible] شک لگائی تو کسی انسان نے ہی ہوگی لیکن اتنے عرصے دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود بھی قدرتی طور پر ہی [illegible] پھولتی اور بڑھتی رہی تھی۔

''لڑکی کہاں گئی ہے؟'' مشابرم خان پر ہتھیار تانے کھڑے شخص نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے [illegible] ہوئے پوچھا جبکہ دوسرا کھڑکی سے دوسری طرف کُود کر ماہ بانو کے پیچھے جا چکا تھا۔

بچے کو سینے سے لگا کر بھاگتی ماہ بانو نے اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ لیا تھا۔ اس کی صحت اس لائق نہیں تھی کہ [illegible] ایک جوان اور تنومند آدمی کو بھاگنے میں شکست دے سکتی۔ چنانچہ کچھ نہ سوجھا تو ایک مکان کے نیم وا گیٹ [illegible] اندر گھس کر اسے بند کر دیا۔ اس کے پیچھے آنے والا اسے مکان میں داخل ہوتا دیکھ چکا تھا۔

وہ مختصر لان سے گزر کر اندرونی عمارت کی طرف بھاگی۔ اندر سے موسیقی کا بے تحاشا شور آ رہا تھا اور [illegible] آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت سارے لوگ اندر موجود ہیں۔ شاید وہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ مکان [illegible] کے باہر اس نے کئی بائیکس اور دو کاریں کھڑی دیکھی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تو موسیقی کی لے پر [illegible] اپنے افراد کی نظر اس پر پڑی۔ موسیقی تو جاری رہی لیکن ناچتے افراد ساکت ہو گئے۔ اس نے دیکھا ان افراد [illegible] زیادہ تر تعداد سیاہ فام مرد و زن کی ہے البتہ دو چار گوری چمڑی والے بھی نظر آ رہے تھے۔

''ہے بے بی! کون ہو تم؟'' آخر کار چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد والے ایک مضبوط جسم کے سیاہ فام نے

اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ اپنی گہری سیاہ رنگت کے باوجود وہ پُرکشش نقوش کا مالک تھا۔

''پلیز میری مدد کرو۔ کچھ لوگ مجھے اور میرے بچے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔'' ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اس سے التجا کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ درخواست کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے ہیں۔

''کم آن ڈارلنگ! یہاں آؤ اور ذرا آرام سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟'' ایک بے حد نازک اور دلکش سفید فام لڑکی اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولی۔ اس دوران کسی نے میوزک بند کر دیا تھا اور اب وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

''وہ میرے پیچھے ہے۔ وہ ہمیں مار دے گا۔'' ماہ بانو ریلیکس ہونے کے بجائے ہذیانی انداز میں چیخی اور یکدم ہی مرد کے مضبوط جسم کے پیچھے چھپ گئی۔ اصل میں اس نے اپنے پیچھے آنے والے شخص کی جھلک دروازے میں دیکھ لی تھی۔

''پولیس..... یہ پولیس کا معاملہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم میں سے کوئی دخل نہ دے۔'' پسٹل سمیت دروازے میں کھڑے شخص نے اپنا بیج لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

''اس لڑکی اور اس کے معصوم بچے نے کیا جرم کیا ہے آفیسر؟'' سیاہ فام جس نے سب سے پہلے ماہ بانو کو مخاطب کیا تھا اور جس کے پیچھے وہ چھپی ہوئی تھی، آفیسر سے پوچھنے لگا۔

''تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ قانون سے تعاون کرو۔'' سفید فام آفیسر کچھ کنفیوز تھا۔ شاید کالوں کی اس دہشت کے باعث جس کا مقابلہ وہ صرف ایک پسٹل سے نہیں کر سکتا تھا۔

''سوری آفیسر! ہم اس لڑکی کو پناہ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔'' سیاہ فام نے اعلان کیا جس پر پولیس آفیسر کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے اور وہ دھمکی دینے والے انداز میں بولا۔

''تمہیں اس حماقت کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔''

''ہمیں تم سے نمٹنا آتا ہے۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔'' سیاہ فام نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

آفیسر نے چند لمحے اسے کینہ توز نظروں سے گھورا اور پھر پیچھے ہٹنے لگا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتا اس لیے اپنے مددگاروں کو بلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہوا اور لوہے کا ایک گولا سا آ کر اس کے سر سے ٹکرایا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چکرا کر نیچے گر گیا۔

''تھینک یو کارلوس!'' پُرکشش سیاہ فام نے ایک شخص کی طرف رُخ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ماہ بانو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''او کے بے بی! اب تم بتاؤ کہ تم کیا جرم کر کے بھاگی ہو؟''

''کوئی نہیں۔ اصل میں تو یہ لوگ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھے میرے بچے سمیت نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں ہر بات تفصیل سے بتا دوں گی لیکن پہلے تم میرے ساتھی کی مدد کرو۔ وہ یہاں سے کچھ دُور اس کے ساتھی کے ساتھ ایک مکان میں موجود ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ مشکل میں ہو گا۔'' اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ جان بچانے کا ایک موقع ملا تھا جس سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔

''او کے، تم مکان کا نمبر بتاؤ۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مصطفیٰ خان کے اس مکان کی طرف جا رہے تھے جہاں مشابرم خان موجود تھا۔ ان لوگوں نے تیزی سے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کر لیا اور جلد مشابرم خان سمیت



ان آ گئے۔ دونوں آفیسرز کو بے ہوشی کی حالت میں وہ اسی مکان کے اندر بند کر آئے تھے۔

''اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو۔ وہ آفیسر ذرا زیادہ سخت جان تھا اس لیے میں اس سے جان چھڑا فوری طور پر تمہاری مدد کے لیے نہیں نکل سکا تھا۔'' ماہ بانو کو خیریت سے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

''بہتر ہو گا دوست! کہ پہلے تم ہمیں حالات سے آگاہ کر دو۔ کیونکہ بے شک ہم کسی سے ڈرتے نہیں لیکن بے وجہ قانون شکنی کر کے خود کو مصیبت میں ڈالنے کو بھی عقل مندی نہیں سمجھتے۔'' سیاہ فام نے مشابرم خان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''جان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا نام جوڈی ہے اور یہ میرا مکان ہے۔ ہم یہاں جان کی برتھ ڈے کا فنکشن کر رہے تھے۔ آگے چل کر تفتیش ہو گی تو مجھے بھی پولیس کے بہت سے سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔'' نازک اندام سفید فام لڑکی کے چہرے پر تفکر تھا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔ آپ چاہیں تو ہمیں گرفتار کروا سکتے ہیں لیکن یہ گرفتاری میڈیا اور چند ذمے دار افراد کے سامنے ہونی چاہیے تاکہ ہمارے ساتھ ماورائے قانون سلوک نہ کیا جا سکے۔'' ماہ بانو نے اب خود پر مکمل قابو پا لیا تھا اور مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

''دلچسپ..... ہم تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کا بندوبست کر سکتے ہیں لیکن پہلے تم ہمیں اپنے حالات سے آگاہ کرو۔'' سیاہ فام جس کا پورا نام جان میلکم تھا، پُراسرار لہجے میں بولا تو اُس نے اُسے حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مختصراً اپنے اغوا، تجربے سے گزارنے کی کوشش اور پھر فرار کی داستان سنا ڈالی۔ اس کے علاوہ باقی ماضی بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''باسٹرڈز..... ان کی فطرت ہے انسانوں کو گنی پگ کی طرح استعمال کرنے کی۔ کیونکہ یہ اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتے ہی نہیں ہیں۔''

سارا قصہ سن کر جان نے نفرت زدہ لہجے میں تبصرہ کیا۔ وہ نفرت کے اس اظہار میں حق بجانب تھا کیونکہ اس کی قوم نے ان سفید فاموں کی صدیوں کی غلامی بھگتائی تھی اور اب بھی امتیازی سلوک کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ انسان دوست راہنماؤں کی جدوجہد کے نتیجے میں اگرچہ معاشرے کی سوچ میں کافی تبدیلی آئی تھی لیکن پھر بھی سو فیصد لوگوں کی سوچ نہیں بدلی تھی۔ ردِعمل میں سیاہ فام بھی اُنہیں حقیر ثابت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کارروائی کرتے رہتے تھے جس کے نتیجے میں اُنہیں اُجڈ، جاہل، گنوار اور بدمعاش جیسے القابات سے نوازا جاتا تھا۔ تاہم انہیں پروا نہیں تھی۔ صدیوں کی غلامی جھیلنے کے بعد وہ آزادی کا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔

''تم لوگ ہمارے ساتھ ہارلم چلو۔ وہ ہمارا علاقہ ہے اور وہاں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' بالآخر جان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ دونوں راضی ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک گاڑی میں سوار وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ دوسری گاڑی اور موٹر سائیکلوں پر پارٹی کے دوسرے شرکاء سوار تھے۔ سڑکوں پر بلا گلا کرتے اس چھوٹے سے قافلے کو گزرتے دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ منچلے اپنے ساتھ ان افراد کو لے کر جا رہے ہیں جو امریکہ کے چہیتے اسرائیل کو بڑی شدت سے مطلوب ہیں۔

ماہ بانو اور مشابرم خان کو جس گاڑی میں بٹھایا گیا تھا، اس کی ڈرائیونگ سیٹ جوڈی نے سنبھال رکھی تھی جہاں موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ جوڈی نے روانگی کا فیصلہ ہو جانے پر اپنے مکان کو تالا لگا کر ان کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

''جان اور میں کلاس فیلو رہے ہیں۔ مالی مشکلات کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا لیکن ہماری دوستی آج تک برقرار ہے۔ اصل میں ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن میرے والدین ایک کالے کو اپنا داماد بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے میں نے ان کا گھر چھوڑ دیا اور اب اس کرائے کے مکان میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر رہی ہوں۔ تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے لیے مجھے پارٹ ٹائم جاب کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ جان بھی میری مدد کرتا ہے۔ شادی ہم، میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد کریں گے۔''

راستے میں جوڈی نے انہیں بتایا تو وہ لوگ حیران رہ گئے۔ نازک سی جوڈی اور لحیم شحیم جان کا بظاہر ان میں کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن ان دونوں نے انسانوں سے بھرے اس جہان میں ایک دوسرے کو منتخب کیا تھا تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ویسے بھی دو انسانوں کے آپس میں ملاپ کے لیے اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ دل کی قبولیت کے بعد باقی ساری باتیں ثانوی ہو جاتی ہیں۔

''جان بہت اچھا انسان ہے۔ دوسرے انسانوں کی پروا کرتا ہے۔ اس کی آواز بہت پیاری ہے۔ ٹرمیٹ تو بالکل لوئی آمسٹرانگ کی طرح بجاتا ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔''

چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ لیے وہ انہیں جان کی خوبیوں سے آگاہ کر رہی تھی۔ محبوب کا ذکر کرنا ہر دل میں، دنیا کے ہر فرد کے لیے شاید اپنی زندگی کا سب سے خوش کُن فعل رہا ہے اس لیے جوڈی بھی بہت دیر تک انہیں جان کی خوبیوں سے آگاہ کرتی رہی۔ ساتھ ہی وہ ماہ بانو کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر افسوس کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ہمدرد فطرت رکھنے والی سادہ مزاج لڑکی ہے۔ اس کی باتوں کے دوران انہوں نے طویل فاصلہ تیزی سے طے کر لیا۔ کم از کم محسوس یہی ہوا اور جب وہ براڈوے اسٹریٹ کے اختتام پر میلکم ایکس بلیوارڈ پر پہنچے تو جوڈی نے کھنکھناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ویلکم ٹو ہیونلی ہارلم۔''

اُس کے اس جملے کے بعد انہوں نے اطراف کا جائزہ لیا تو یوں لگا کہ نیویارک سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ علاقہ بقیہ شہر سے بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ انہوں نے یہاں بے شمار سیاہ مرد و زن کو مختلف اقسام کے شوخ رنگ لبادوں میں گھومتے دیکھا۔ عورتیں حجاب سے لے کر ماڈرن، عریاں اور عریاں ہر حالت میں تھیں۔ یہی حال مردوں کا بھی تھا۔ کوئی اپنے حلیے سے پادری لگتا تھا تو کسی مُلّا کا گمان ہوتا تھا۔ دکانوں اور فٹ پاتھوں پر ہر طرح کا مہنگا، سستا، ممنوعہ و غیر ممنوعہ سامان کھلے عام بک رہا تھا۔ مکانات زیادہ تر خستہ حال اور پرانی طرز کے تھے لیکن کچھ جدید طرز کی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان نیرنگی کو دیکھ کر ماہ بانو حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکی جس پر جوڈی مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں، یہ بالکل مختلف دنیا ہے۔ اصل میں اپنی برسوں کی غلامی کے بعد انہوں نے آزادی کی اتنی قدر کی ہے کہ ہر معاملے میں خود کو اور دوسروں کو بالکل آزاد تصور کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کی مرضی سے جینے کا حق دیتے ہیں۔''

جوڈی نے ان کی اتنی متنوع طرزِ حیات کی توجیہہ پیش کی جس کا سو فیصد درست ہونا ضروری نہیں تھا یہ اس کے ساجن کی گلیاں تھیں جن کا اسے عزیز ہونا لازمی تھا۔ خود وہ بھی ان سیاہ فاموں سے ایک خاص قسم کی اُنسیت محسوس کر رہے تھے کہ گوروں کے دیس میں اُنہیں ان کالوں کے درمیان ہی پناہ ملی تھی۔

⊛----✪----⊛

''آخر کون تھے وہ لوگ جو جنگل میں ایک ایسے راستے سے داخل ہوئے جن پر نگرانی کی ضرورت نہیں



نہیں سمجھی گئی تھی؟..... اُن کے اس طرح چوری چھپے جنگل میں داخل ہونے کا آخر کیا مقصد تھا؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے آدمیوں کی نظروں میں آنے کے باوجود بچ کر نکلنے میں کامیاب کیسے ہوئے؟''

جنگل کے سکیورٹی انچارج کو ڈیوڈ کے سامنے جواب دہی کا مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اس بات کا پابند تھا کہ ہر غیر معمولی واقعے کی رپورٹ ڈیوڈ کو ضرور کرے۔ اُن کے پاس رابطے کو ایسا محفوظ ذریعہ موجود تھا کہ رپورٹ منظرِ عام پر آئے بغیر دنیا کے کسی بھی خطے میں ڈیوڈ تک پہنچ جاتی تھی جبکہ سکیورٹی انچارج نہیں جانتا تھا کہ ڈیوڈ کہاں موجود ہے۔

''وہ لوگ جس راستے سے داخل ہوئے، اس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی وہاں سے بھی جنگل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے جنگل کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے افراد نے اس راستے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں کے اس طرح چوری چھپے یہاں آنے کا کیا مقصد تھا؟ یہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ ریڈ زون میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اگر ہوتے تو مارے جاتے۔ اس لیے آپ بھی اطمینان رکھیے کہ اگر کوئی آ کر واپس جانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہے تو ہمارا سیٹ اپ بالکل محفوظ ہے۔'' وہ ڈیوڈ کو تسلی دینے لگا۔

''تم نے بتایا کہ آنے والے دونوں افراد کو کتوں کے ذریعے بھی قابو کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کتے انہیں زخمی کرنے کے باوجود ہلاک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔''

''یس سر!..... اس واقعے میں ہمیں اپنے تین قیمتی کتوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔'' انچارج نے اعتراف کیا۔

''کتوں کے حملے سے زخمی ہونے والوں کو لازمی طور پر کسی ہسپتال کا رخ کرنا پڑے گا۔ اس ضلع میں ایک ہی بڑا ہسپتال ہے، تم ہسپتال میں ایسے مریضوں کے بارے میں معلوم کرو جو کتے کے کاٹے کا علاج کروانے آئے ہوں۔ اس طرح ہمیں ان افراد کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔'' کتوں کے مرنے کی اطلاع پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر ڈیوڈ نے اسے مشورہ دیا۔

''او کے سر! میں یہ کام کرواتا ہوں۔'' انچارج نے مستعدی سے جواب دیا۔

''یہ کام فوراً اور بہت ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔'' ڈیوڈ نے اسے تنبیہہ کی۔

''یس سر! کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ جو ہوا، اس پر بھی میں شرمندہ ہوں۔ اگر میرے پاس نفری ہوتی تو وہ لوگ اتنی آسانی سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔'' شرمندگی کا اظہار کرتے کرتے بھی وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے باز نہیں آیا۔

''سکیورٹی کے ساتھ دوسرے معاملات بھی اہم ہیں۔ آج رات لازماً مال چودھری کی حویلی میں پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں مشینوں کی تنصیب کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ دو ماہرین بھی چودھری اور لِنڈا کے ساتھ آج رات کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں اس لیے خیال رکھنا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ اس پروجیکٹ پر ہمارا بہت کثیر سرمایہ لگا ہوا ہے، اسے ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔'' ڈیوڈ کا لہجہ بہت زیادہ سنجیدہ تھا البتہ آواز بلند نہیں تھی۔ وہ خراب حالات میں بھی اپنے اعصاب پُرسکون رکھتا تھا۔

''مجھے پورا احساس ہے سر!..... عظیم اسرائیل کی سربلندی کے لیے جان بھی دینی پڑی تو آپ مجھے پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں پائیں گے۔ اپنی مقدس سرزمین کا مفاد مجھ سمیت ہر اسرائیلی کو دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔''

یہ وہی لہجہ تھا جس میں دنیا کا ہر وہ یہودی بات کرتا تھا جو بیت المقدس کو اپنی موروثی جاگیر اور یہودیوں کو خدا کی سب سے پیاری قوم تصور کرتے ہوئے دنیا بھر پر اپنی اجارہ داری کے خواب دیکھتا تھا۔ چاہے اس خواب کی تکمیل کے لیے اسے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔

''گڈ۔'' ڈیوڈ نے اسے سراہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ ابھی اسے دوسرے اہم کام بھی سرانجام دینے تھے۔ ہر طرف سے پریشان کن خبریں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ مسلسل نقصانات اُٹھا رہے تھے۔ ایئر بیس پر حملے کے نتیجے میں بھی جزوی فوائد ہی حاصل ہوئے تھے اور کئی قیمتی کمانڈوز کی جانوں کے نقصان کے علاوہ ایک کمانڈو کی زندہ گرفتاری کا بھی یقین تھا۔ اس گرفتاری کی وجہ سے انہیں اپنے ٹھکانے بھی بدلنے پڑے تھے اور اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ ان ساری ناکامیوں اور پریشانیوں کے پیچھے وہی گروپ کارفرما ہے جس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طور کرنل توحید سے مل رہے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس خفیہ ایجنسی یا گروپ جو بھی تھا، اس تک رسائی کے لیے کرنل پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے آدمیوں نے کرنل کی خفیہ نگرانی کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ اس کی مکمل نقل و حرکت سے تو واقف نہیں ہو سکے تھے لیکن اتنا علم ضرور ہو گیا تھا کہ کل کرنل اسلحے کی نمائش میں شرکت کے لیے کراچی پہنچ رہا ہے۔ ان کے لیے کرنل کو گھیرنے کا یہ بہترین موقع تھا اور وہ اس حوالے سے منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔

⊛----✪----⊛

''کیا بات ہے، تم لوگ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' شہریار اپنے ماموں لیاقت رانا کی فیملی سے ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ ماہ بانو کی مدد کے لیے نیویارک روانگی کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے کچھ وقت خاندان والوں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا۔ وہ لوگ اس کی جدائی سہنے کے بعد شدت سے اس کے منتظر تھے۔ خصوصاً اس کی ممانی آفرین کا تو اس میں دم ہی اٹکا رہتا تھا۔ انہوں نے سگی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی تھی اور اپنے بیٹے سجاد رانا اور پوتی شینا کی موت کے بعد شہریار ہی ان کی محبتوں کا واحد محور و مرکز رہ گیا تھا۔ احتیاط کے تمام تر تقاضوں کے باوجود شہریار کو ان محبتوں کا حق ادا کرنے کے لیے جانا پڑا تھا لیکن دل کو بھی تو قرار نہیں تھا چنانچہ موقع ملتے ہی سی ایف پی کے دفتر پہنچ گیا تھا جہاں ذیشان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے غیر معمولی صورتِ حال کا ادراک ہوا۔

''عمیر کا فون آیا تھا۔'' اس نے بلا کم و کاست اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔

''پھر کیا ایکشن لے رہے ہو؟'' ساری بات غور سے سننے کے بعد اس نے سنجیدگی سے ذیشان سے سوال کیا۔

''میری کرنل صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ جلد از جلد آپریشن کرنا ہے، اس سے تو وہ بھی متفق ہیں فوری طور پر کارروائی شروع کرنے کی بھی یقین دہانی کروائی ہے لیکن ظاہر ہے سب کچھ کھڑے کھڑے نہیں ہو جائے گا۔ بڑے پیمانے پر آپریشن کرنا پڑے گا جس میں اس بات کا بھی دھیان رکھنا ہو گا کہ ہمیں انسانی طاقت کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ کرنل صاحب اسلحے کی نمائش میں شرکت کے لیے کراچی جا رہے ہیں، اس کے بعد ہی وہ ہمیں کوئی حتمی منصوبہ دیں گے۔'' ذیشان نے اسے فیصلے سے آگاہ کیا۔

وہ جذباتی تھا لیکن خود بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ اس قسم کے آپریشن کے لیے وہ فوری طور پر اُٹھ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اجازت اور انتظامات میں تھوڑا وقت ضرور لگنا تھا۔



''ایک کام کرو ذیشان!..... عمیر کو فوری طور پر وہاں سے نکالو۔ وہاں اسے زیادہ اچھی طبی امداد بھی نہیں ملے گی اور ہر وقت سر پر یہ تلوار بھی لٹکتی رہے گی کہ دشمن اس کی بُو سونگھتے ہوئے ہسپتال تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بہت دیانت دار اور پُرجوش لڑکا ہے۔ اس جیسے قیمتی لوگوں کا بچاؤ کرنا بہت ضروری ہے۔'' تھوڑا سا سوچنے کے بعد اس نے ذیشان کو مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے، میں یہ انتظامات کروا دیتا ہوں۔'' ذیشان فوراً حرکت میں آ گیا۔ عمیر کی نورکوٹ سے لاہور منتقلی کے فوری انتظامات کرنے کے بعد اس نے جگو سے رابطہ کیا۔

''کہاں ہو اور تمہارا کیا حال ہے؟'' اس نے جگو سے سوال کیا۔

''اپنے گھر پر ہوں اور بالکل ٹھیک ہوں۔ دیسی نسخوں سے اچھا علاج ہو رہا ہے۔'' جگو نے جواب دیا لیکن اس کے لہجے سے کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''فضول تجربات میں وقت ضائع مت کرو اور فوری طور پر نورکوٹ کے ہسپتال پہنچو۔ وہاں سے عمیر کو لاہور شفٹ کیا جا رہا ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ ہی یہاں آؤ گے۔'' ذیشان نے تحکمانہ لہجے میں کہہ کر بغیر جگو کی بات سنے رابطہ منقطع کر دیا۔ جگو باقاعدہ سی ایف پی کا حصہ نہیں تھا لیکن اس کی خدمات ایسی تھیں کہ وہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

''یہ کام اچھا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ لاہور پہنچ جائیں تو ان کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔ تم بتاؤ کہ مصطفیٰ یا مشابرم خان کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟'' اس نے وہ سوال کیا جو دل میں لیے یہاں تک آیا تھا۔

''مصطفیٰ سے بات ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مشابرم خان سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کی طرف سے جو اطلاعات ملی ہیں، وہ بھی پریشان کن ہیں۔ ماہ بانو اور مشابرم خان کو اب تک دو رہائش گاہیں تبدیل کرنی پڑی ہیں کیونکہ پولیس ان کے مسلسل پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ لوگ مصطفیٰ اور مراد شاہ کی بھی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں اس لیے ان کے لیے معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ماہ بانو اور مشابرم کہاں موجود ہیں۔ مصطفیٰ کے ایک مکان پر تو انہوں نے ایف بی آئی کے ایجنٹ کی حیثیت سے باقاعدہ ان دونوں کو گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے وہ دونوں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور اب ہارلم میں ہیں۔ وہاں ایک نوجوان جان میلکم نے انہیں پناہ دے رکھی ہے۔ وہ ایک شریف نوجوان ہے لیکن اس کے بچپن کا ایک دوست اچھا خاصا ڈان ہے اور وہ ضرورت پڑنے پر اس دوستی کا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ نیویارک کی پولیس کو اندازہ ہے کہ اگر اس نے ہارلم کے علاقے میں جا کر کارروائی کرنے کی کوشش کی تو حالات خاصے بگڑ جائیں گے۔ اس لیے وہ لوگ صبر کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن ظاہر ہے، بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان کی کوئی فول پروف پلاننگ چل رہی ہو گی اور ہمیں اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہو گا۔'' ذیشان نے حالات اس کے سامنے رکھے جو یقینی طور پر خاصے مخدوش تھے۔

''کیا ہمارے پاس کوئی پلان موجود ہے؟'' شہریار نے دھیرے سے دریافت کیا۔

''مصطفیٰ نے ایک تجویز پیش کی ہے۔'' ذیشان اسے اس تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔

''آئی ایس آئی کے تعاون کے بغیر اس تجویز پر عمل مشکل ہو گا۔'' پوری بات سن کر اس نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

''اس سلسلے میں میری کرنل صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے تعاون کی یقین دہانی کروائی ہے۔ تو تم بھی سمجھتے ہو کہ سی ایف پی فوج کا ہی ایک ذیلی ادارہ ہے جسے بس سیاسی حکمرانوں کی نظر سے پوشیدہ رکھ

کر پوری طرح خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور کاغذات میں کہیں اس کا اندراج نہیں ہے لیکن ن
سرکردہ افسران اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم کہیں بھی کچھ بھی کرنے کا اختیار نہیں
تھے۔ اس کیس میں بھی لازماً آئی ایس آئی کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔''

ذیشان نے اُسے یقین دلایا۔

''اس کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں کہ ہم کامیابی سے یہ ڈیل کرسکیں گے۔ ہمارا دشمن عیار بھی
طاقت کے زعم میں ہمیں گھاس ڈالنے کو تیار بھی نہیں ہوتا۔'' اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''رِسک تو واقعی ہے لیکن ہمیں کوئی نہ کوئی اسٹیپ تو لینا ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن اس سارے معاملے کو مانیٹر کرنے میں خود نیویارک جاؤں گا۔ وہاں میرے
انتظام ہونے سے پہلے گیم شروع مت کرنا۔ میں ماہ بانو کو اپنی نگرانی میں واپس لاؤں گا۔'' اس نے فیصلہ
''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔'' ذیشان اُس کی کیفیت کو سمجھتا تھا اس لیے اختلاف نہیں کیا۔

''مصطفیٰ کو تو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے؟ اس معاملے کی وجہ سے کہیں اس کا برسوں کا بنا سیٹ اپ
نہ ہو جائے۔'' مصطفیٰ خان کسی زمانے میں اس کا کلاس فیلو ضرور رہا تھا لیکن اس سے دوبارہ رابطہ
کے توسط سے ہی ہوا تھا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا تھا کہ کسی زمانے میں اپنی کلاس کے دیگر جوانوں کی
بے حد لاابالی نظر آنے والا مصطفیٰ ایک عرصے سے امریکہ میں رہ کر آئی ایس آئی کے لیے کام کر رہا ہے
نے وہاں بہت زیادہ تعلقات بنا رکھے ہیں۔ وہ بہت ہوشیاری سے ہاتھ پیر بچا کر کام کرتا تھا اس لیے
تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دوست ممالک کے لوگ بھی شامل تھے اور یہ سب
آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہتے تھے۔

''تھوڑی بہت پریشانی کا اسے سامنا تو ہے۔ ماہ بانو اور مشابرم خان سیاہ فام امریکیوں کی مدد
پولیس کے دو افسران کو اس کے مکان میں ہی بند چھوڑ کر بھاگے تھے اس لیے اسے پولیس کی تفتیش کا
کرنا پڑا۔ لیکن اس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اس کا مکان ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ
لوگوں نے اس کی لاعلمی میں مکان استعمال کیا۔ پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس مکان میں ماہ
اور مشابرم خان ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے وہ مکان استعمال کرنے والوں کا مصطفیٰ سے تعلق نہیں
تھے۔ اگر تعلق تلاش بھی کرلیں تو ان کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں اتنی شدومد سے
کے متلاشی ہیں کیونکہ اس پر کوئی فردِ جرم تو عائد ہی نہیں ہوتی۔

''مراد شاہ کو بھی انہوں نے تھوڑا پریشان کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے عقل مندی کا ثبوت
پہلے ہی اپنے لیے ایک وکیل کا انتظام کرلیا۔ اب امریکی پولیس اپنے امریکی وکیل کو ہی یہ جواب دے
قاصر ہے کہ انہیں کس جرم میں ماہ بانو درکار ہے؟ اور کسی شخص سے اگر ماہ بانو نے ملاقات کی ہے یا اس
توسط سے کہیں رہائش اختیار کی ہے تو وہ شخص کس طرح قصوروار ثابت ہوتا ہے؟'' ذیشان اسے تفصیلات
آگاہ کرتا جا رہا تھا۔

''بالکل ٹھیک جا رہے ہیں یہ لوگ۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ زیادہ عرصے ان کی پیش نہیں چلے گی۔ امریکی
اپنے لبرل اور قانون پسند ہونے کا جتنا بھی ڈھونگ کریں لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ان سے بڑھ کر
بدمعاش اور قانون شکن نہیں ہے۔ یہ جو انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کا
شروع کیا ہوا ہے، یہ کس قانون کے تحت ہے؟ قانون تو کمزوروں کے لیے ہوتا ہے اور تم جانتے ہو کہ امریکی



نہیں ہے۔''

''اتنی ٹینشن مت لو یار! کوئی کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اللہ کی طاقت کے سامنے تو بے حیثیت ہی ہے
اپنی بھرپور کوشش کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینے والے لوگ ہیں۔ کیا تمہیں اللہ پر یقین نہیں ہے؟''

''اس کی ذات سے بڑھ کر کس پر یقین ہوسکتا ہے؟ وہی تو ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہمیشہ سہارا
رہا ہے۔'' ذیشان نے اس سے ایسی بات کہہ دی تھی جس کے سامنے سارے خدشات، دلائل اور حقائق
تھے، سو اُس نے بھی اسے تسلیم کیا اور جیسے ہلکا پھلکا ہوگیا۔ کیا ہوا جو راہ میں بہت سی مشکلات تھیں۔
ات سے نکالنے والی ہستی کا ساتھ بھی تو میسر تھا۔

⊛----✪----⊛

''آج ہسپتال میں کتے کے کاٹے کے کتنے کیسز آئے ہیں؟'' سرگوشی میں کیا گیا یہ سوال بالکل اتفاقاً ہی
المنان کے کانوں میں پڑا تھا۔

وہ ایمبولینس میں عمیر کے ساتھ ہی ہسپتال پہنچا تھا اور مستقل یہیں موجود تھا۔ اس کی انتظامی حیثیت کی
سے اسے ہر جگہ بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہاں بھی اسے ایم آر او کے کمرے میں بٹھایا گیا تھا اور چائے
سے خاطر مدارات کے ساتھ ساتھ عمیر کی حالت سے مستقل باخبر رکھا جا رہا تھا۔ عمیر کو لگنے والی گولی نکالی
تھی۔ دیگر زخموں کی مرہم پٹی بھی ہوگئی تھی۔ لیکن خون کے بہت زیادہ اخراج کی وجہ سے اس کی حالت
زیادہ تسلی بخش نہیں تھی۔ اسے ذیشان کی کال موصول ہو چکی تھی جس نے اسے عمیر اور جگو کو لاہور منتقل
کے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

عبدالمنان نے ہسپتال انتظامیہ کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ جیسے اب تک عمیر
یہاں موجودگی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے، اسی طرح اس کی یہاں سے منتقلی کا عمل بھی مکمل رازداری کے
انجام پانا چاہئے۔ وہ وسیع تجربہ رکھنے والا شخص تھا جس نے شہریار کے غیر معمولی اقدامات کا بھی پوری
ساتھ دیا تھا اور جانتا تھا کہ عمیر بھی شہریار ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اس لیے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا
کسی غیر متعلقہ شخص کو عمیر کے بارے میں خبر نہ ہو۔

اس کی یہ احتیاط پسندی اس وقت کام آ گئی تھی۔ بہت دیر سے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اُکتانے کے بعد اس
ارادہ ہاتھ پاؤں کھولنے کے خیال سے ہسپتال کے باہر تک کا چکر لگانے کا فیصلہ کیا تھا اور استقبالیہ کے
سے گزرتے ہوئے یہ سرگوشی سن لی تھی۔

سرگوشی سن کر اس نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا۔ کاؤنٹر پر جھک کر بات کرتے ہوئے اس شخص
بے شک دیہاتی طرز کا لباس پہن رکھا تھا لیکن چہرے مہرے اور کھڑے ہونے کے انداز سے وہ دیہاتی
لگتا تھا۔ عبدالمنان نے اس کے ہاتھ میں دبے وہ نوٹ بھی دیکھ لیے تھے جو اس نے استقبالیہ کلرک کو
ات اُگلوانے کے لیے بطور رشوت پیش کیے تھے۔ تاہم وہ صورتِ حال کو مزید جاننے کے لیے وہاں
ٹھیر آگے بڑھ گیا۔ اُسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کلرک اس آدمی کو کیا جواب دیتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو
یہاں موجودگی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا، دوم وہ کتے کے کاٹے کے بجائے گولی لگنے کے کیس میں
آیا تھا۔ جگو کا بھی ہسپتال کا رخ نہ کرنا اس وقت کام آ گیا تھا چنانچہ مشکوک آدمی جس حوالے سے تحقیق
تھا، اس سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

باہر آ کر اس نے اپنے دفتر کی گاڑی کی طرف رخ کیا۔ یہ گاڑی اس نے ہسپتال پہنچنے کے بعد کسی فوری

ضرورت کے پیشِ نظر منگوالی تھی۔ اس میں بیٹھا ڈرائیور جوان اور قابلِ اعتماد تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر اس کا الرٹ ہو گیا۔

''کہاں چلنا ہے سر؟''

''کہیں نہیں جانا۔ ابھی ایک آدمی باہر نکلے گا۔ میں وہاں برگد کے درخت کے پاس کھڑا ہو کر اشارے سے اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ تم ہوشیاری سے اس کی نگرانی کرنا اور اس کے بارے میں معلوم کر سکو، معلوم کر کے مجھے بتانا۔''

عبدالمنان اُسے ہدایات دے کر دُور ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں استقبالیہ پر رشوت کی مدد سے معلومات حاصل کرنے والا شخص باہر آتا نظر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو اشارے سے اس آدمی کے بارے میں آگاہ کیا اور خود منظر سے ہٹ گیا۔ وہ آدمی ایک جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہوا تو ڈرائیور بھی اس کے پیچھے گاڑی لے کر روانہ ہو پڑا۔ عبدالمنان واپس اندر چلا گیا۔ اس نے استقبالیہ کلرک کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ کچھ دیر بعد جگو بھی وہاں پہنچ گیا اور اس کے پیچھے وہ لوگ بھی چلے آئے جنہوں نے عمیر اور جگو کو لاہور منتقل کرنا تھا۔ مریض کی حالت کے پیشِ نظر طبی سہولتوں کے ساتھ سفر کے بھرپور انتظامات کیے گئے تھے اور ایک قابل ڈاکٹر بھی ساتھ جا رہا تھا۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے تو عبدالمنان نے بھی اپنے دفتر کا رُخ کیا۔

دفتر کے عملے کو اس حادثے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور عبدالمنان نے انہیں مطلع کر دیا تھا۔ اے سی صاحب اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے آج چھٹی پر ہیں۔ پریشانی کے باوجود اس نے دفتر پہنچ کر معمول کے کام انجام دینا شروع کر دیئے۔

کام میں مصروف ہوئے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک مرد کی آمد کی خبر دی گئی جو کسی اہم کام کے سلسلے میں صرف اور صرف اے سی صاحب سے ملنے کا متمنی تھا اور اس اطلاع پر کہ آج اے سی صاحب چھٹی پر ہیں، بہت پریشان ہو کر یہی کہتا رہا تھا کہ اس کا فوری طور پر اے سی صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اب عبدالمنان سے پوچھا جا رہا تھا کہ کیا وہ اس شخص سے ملاقات کرنا چاہے گا؟

عبدالمنان نے کچھ سوچتے ہوئے اس آدمی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور جب وہ اندر آیا تو اسے اپنے اندازے کی درستگی پر خوشی ہوئی۔ یہ اس عورت کا شوہر تھا جو کبھی کبھی چودھری کی حویلی کے کسی اہم معاملے میں ان کے لیے مخبری کا فریضہ انجام دے دیتی تھی۔

''آؤ اللہ بخش! کہو کیسے آنا ہوا؟'' اس نے آنے والے شخص سے پوچھا۔

''اے سی صاحب سے ملنا تھا جناب!'' اللہ بخش نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے درخواست کی۔

''کوئی خاص اطلاع لائے ہو؟'' عبدالمنان نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

جواب میں وہ خاموش رہا۔

''تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو اللہ بخش! کیونکہ اے سی صاحب بھی مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور تمہاری بیوی کے ذریعے حویلی سے ملنے والی ہر خبر میرے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔'' اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے، اس لیے اصرار کرنے لگا۔

''وہ تو ٹھیک ہے جناب! لیکن اگر اے سی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا۔ مجھے ان سے ملنے کا حکم ملا تھا۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''مجبوری ہے دوست! آج تو کیا، آئندہ کئی روز تک تمہاری ان سے ملاقات کا امکان نہیں ہے۔ وہ



سے باہر ہیں اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب واپس آئیں گے۔'' عبدالمنان نے اسے آگاہ کیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ یہ ان تک پہنچا دیجیے گا۔'' اللہ بخش نے بہت ہچکچاتے ہوئے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''بی بی کا حکم تھا کہ یہ خبر جلد سے جلد اے سی صاحب تک پہنچنی چاہیے۔ اب آپ دیکھ لیں کہ کیا کرنا ہے۔''

اس نے گویا لفافہ جلد از جلد عمیر تک پہنچانے کی تاکید کی اور پھر اجازت لے کر سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

عام حالات میں عبدالمنان یہ لفافہ جوں کا توں عمیر تک پہنچا دیتا لیکن اس وقت مجبوری تھی اس لیے اس نے بہت احتیاط سے بند کیے گئے لفافے کو پیپر نائف کی مدد سے چاک کر کے اس میں موجود تہ شدہ کاغذ باہر نکالا۔ حسب توقع یہ چودھری کے ایب نارمل بیٹے بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اس نے کاغذ پر موجود تحریر پڑھی اور مضطرب ہو گیا۔ فوری طور پر اس کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے وہ ایشان کا نمبر ملا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

کرنل توحید ایگزیبیشن ہال سے باہر نکلے تو ان کے ساتھ کچھ غیر ملکی مہمان بھی موجود تھے۔ اسلحے کی یہ نمائش عام لوگوں کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف فوجی افسران، حکومت کے اعلیٰ عہدے دار اور غیر ملکی مندوبین و سفراء کے علاوہ کچھ خاص لوگ ہی اس میں شرکت کر سکتے تھے۔ نمائش کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں شرکت کے لیے اُنہیں یہاں آنا پڑا تھا ورنہ ان کا ذہن ان بہت سے اہم کاموں اور معاملات میں اُلجھا ہوا تھا جن پر وہ خود نظر رکھنا چاہتے تھے۔

عمارت کی پارکنگ میں پہنچ کر انہوں نے تمکنت کے ساتھ مہمانوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور ان کے لیے مخصوص پروٹوکول آفیسر کی نگرانی میں انہیں رخصت کرنے کے بعد اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔

یہ بہت حساس قسم کی نمائش تھی اس لیے حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا ذاتی گارڈ اور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی حرکت میں آ گئی۔ انہیں دائیں ہاتھ پر نیپا چورنگی کی طرف جانے والے راستے پر سفر کرنا تھا۔ یونیورسٹی روڈ پر آگے بڑھتے ہوئے ایک شارٹ کٹ سے کینٹ کے علاقے میں جانا تھا جہاں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ نمائش تین دن جاری رہنی تھی لیکن ہنگامی حالات کی وجہ سے انہوں نے اپنی شرکت کو صرف ایک دن تک محدود کر دیا تھا۔ یہاں سے وہ کینٹ جاتے اور پھر دو گھنٹے کے آرام کے بعد انہیں ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہونا تھا جہاں ان کے لیے لاہور کی ایک فلائٹ میں سیٹ بک تھی۔

نپے تلے انداز میں وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھ کر زندگی گزارنے والے کرنل کو اندازہ نہیں تھا کہ آج کی تاریخ ان کے سارے حساب کتاب کو گڑبڑ کرنے والی ہے۔ نیپا چورنگی تک جانے والا راستہ بالکل ہموار تھا۔ اس پورے روڈ پر نیپا سے لے کر حسن اسکوائر تک ٹریفک کی روانی اور وی آئی پیز کی آمدورفت کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ ٹریفک پولیس کے علاوہ رینجرز کے بھی کئی اہلکار روڈ کے دونوں طرف چوکس کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان نظر آنے والے اہلکاروں کے علاوہ کچھ سادہ پوش خفیہ ایجنسی کے اہلکار بھی تھے جنہوں نے ایک ایک شے پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

کرنل توحید کی گاڑی نیپا چورنگی کا پُل کراس کرتی ہوئی یونیورسٹی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن

ہوگئی۔ پُل سے نیچے نیپا چورنگی پر ہی راشد منہاس روڈ سے آنے والے ٹریفک کے لیے بائیں ہاتھ پر یونیورسٹی روڈ پر مڑنے کے لیے راستہ تھا۔ جیسے ہی کرنل کی گاڑی نے پُل کراس کیا، راشد منہاس روڈ سے ایک گاڑی یونیورسٹی روڈ کی طرف مڑی اور کرنل کی گاڑی کے پیچھے چلنے لگی۔

کرنل توحید بھیڑ بھاڑ کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے اپنی سکیورٹی کے لیے ایک گارڈ کے سوا کسی کو ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ورنہ یہاں تو عام پولیس افسران سے لے کر سیاست دان اور بڑے صحافیوں تک کے پیچھے سکیورٹی اسکواڈ کے نام پر آگے پیچھے چلنے والی گاڑیوں کا پورا قافلہ لے کر چلنے کا رواج تھا۔

کرنل کی گاڑی سبک رفتاری سے چلتی ہوئی ابھی گلشن کالج کے قریب ہی پہنچی تھی کہ کالج کی جانب سے ایک بچہ اسپورٹس سائیکل پر سوار یک دم ہی سڑک پر آ گیا۔ بچے کو بچانے کے لیے کرنل کے ڈرائیور نے زوردار بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی۔ فوراً ہی پیچھے آنے والی گاڑی بھی رُک گئی اور اس سے ۱۱ افراد اُتر کر کرنل کی گاڑی کی طرف لپکے۔ ایسے میں دائیں اور بائیں جانب سے بھی کچھ لوگ اس جانب لپکے۔ یہ بھی مختلف گاڑیوں سے اُترے تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔ کرنل کی گاڑی رُکتے ہی دو طرف سے فائرنگ کر کے اس کے ٹائروں کو ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ گاڑی کے شیشے البتہ بلٹ پروف تھے اس لیے ان کی گولیاں بے اثر تھیں۔

آنے والے ہلاک کرنے کی نیت سے آئے بھی نہیں تھے۔ اُنہیں کرنل کو زندہ لے کر یہاں سے جانا تھا اس لیے سارا زور ڈرائیور اور گاڑی کی جانب تھا۔ ٹائروں کے ناکارہ ہو جانے کے باعث ڈرائیور گاڑی آگے نہیں لے جا سکتا تھا اور مسلح افراد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔

ایسے حالات میں گارڈ نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور دروازہ کھول کر گن باہر نکالتے ہوئے ان کی بے تحاشا فائرنگ کا جواب دینے لگا۔ پورا علاقہ فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھا۔ اردگرد سے گزرتی گاڑیوں میں سوار لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ اندھی گولیوں نے بھٹک کر کئی راہ گیروں کو بھی نشانہ بنا لیا لیکن حملہ آوروں کو پروا نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے گارڈ اُن کا نشانہ بنا اور پھر کھلے دروازے سے گزر کر ایک گولی ڈرائیور کو بھی چاٹ گئی۔

حملہ آوروں کا خیال تھا کہ اس بے تحاشا فائرنگ میں کرنل توحید اپنی بلٹ پروف گاڑی سے نکلنے کی حماقت نہیں کریں گے اور وہ انہیں گھیر کر لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی توقع کے بالکل برخلاف کرنل نے اپنی جانب کا شیشہ اُتارا اور فائرنگ شروع کر دی۔ انہوں نے بہت تاک کر نشانہ لیا اور دائیں طرف موجود ان دو مسلح افراد کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے جو گارڈ اور ڈرائیور کی موت کے باوجود بھی مسلسل ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ہر ایک کو وہاں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں افراد گولیاں کھا کر گرے تو ان کے تیسرے ساتھی نے بدحواسی میں یہ سوچے بغیر کہ فائر کرنے والے کرنل تو نہیں ہیں، ان کی جانب اپنی کلاشنکوف کا رخ کر دیا۔ برسٹ چلا اور ایک ساتھ کئی اندھی گولیاں لپکتی ہوئی کرنل کی جانب بڑھتی چلی گئیں۔

⊛----✪----⊛

یہ کیا ہو گیا تھا اور کیونکر ہو گیا تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ صدمہ بہت بڑا تھا اور ایسے وقت میں ان پر ٹوٹا تھا جبکہ وہ بیک وقت بہت سے محاذوں پر مشکل میں گھرے ہوئے تھے۔

''کرنل توحید شہید کر دیئے گئے۔'' یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے سن لی جاتی۔ سننے والوں کے حواس



منجمد ہو گئے تھے۔ اتنا گہرا صدمہ تھا کہ خواص و عوام سب نے اس کا اثر اپنے دلوں پر محسوس کیا تھا۔ سی ایف پی ایسے یتیم ہو گئی تھی۔

''کرنل..... کرنل توحید نہیں رہے۔'' اس بات کو سن کر قبول کرنا کوئی آسان تو نہیں تھا۔

''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟'' شہریار نے سرخ آنکھوں سے ساکت بیٹھے ذیشان سے پوچھا۔

''جو فوٹیج ملی ہے، اس کے مطابق کرنل صاحب ایکسپو سینٹر سے کینٹ جانے کے لیے نکلے تھے کہ گلشن کالج کے قریب ان کی گاڑی کو روک لیا گیا۔ مجرموں نے ایک ریموٹ کنٹرولڈ اسپورٹس سائیکل پر پانچ چھ سالہ بچے کی ڈمی کو بٹھا کر عین کرنل کی گاڑی کے گزرنے کے وقت اسے سڑک پر دوڑا دیا۔ فطری طور پر ایک بچے کو گاڑی کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے ڈرائیور نے بریک لگا دیئے اور بس پھر وہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ کرنل کے ڈرائیور اور گارڈ کے علاوہ بھی کئی بے گناہ راہ گیر زد میں آئے ہیں۔''

ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ وہ کرنل کی شہادت کی خبر ٹی وی پر سننے اور دیکھنے کے بعد سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر دوڑا ہوا آیا تھا اور اب ذیشان سے حقائق جاننے کا خواہش مند تھا۔ ذیشان کی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی اور وہ دکھ کی اس انتہا پر پہنچا ہوا تھا جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

''فوٹیج تم تک پہنچ گئی ہے؟'' شہریار نے اس سے پوچھا

''ہاں، تم بھی دیکھ لو۔'' ذیشان نے اپنا لیپ ٹاپ اس کی طرف کھسکایا۔ کسی اپنے کے مرنے کی خبر سننا قیامت ہوا کرتا ہے، اس کے مرنے کا منظر دیکھا تو پھر رستم در رستم تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ ان کا شعبہ ہی ایسا تھا کہ اسے خود پر جبر کر کے دیکھنا پڑا۔ ہونٹ بھینچے وہ فوٹیج دیکھتا رہا۔

''اس فوٹیج کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ حملہ آوروں کا مقصد کرنل کو ہلاک کرنا نہیں تھا، بس اتفاق سے یا بدحواسی میں انہوں نے کرنل کو نشانہ بنا دیا۔'' فوٹیج دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا۔

اس کا یہ تجزیہ کئی اعتبار سے درست تھا۔ اگر ہلاک کرنا مقصد تھا تو اس کا سب سے آسان طریقہ تو یہی تھا کہ جس ریموٹ کنٹرولڈ سائیکل کے ذریعے کرنل کا راستہ روکا گیا، اس میں بارودی مواد نصب کر دیا جاتا اور ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہی اسے اُڑا دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا تھا بلکہ مختلف سمتوں سے کرنل کو گھیرنے کی کوشش کی گئی تھی اور پہلے ان کے گارڈ اور ڈرائیور کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

کرنل والی سائیڈ پر تو اس وقت کوئی براہِ راست فائر بھی نہیں کیا گیا تھا جب تک کہ کرنل نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے خود فائرنگ شروع نہیں کی۔

فوٹیج میں دو افراد کرنل کی چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آ کر گرتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان پر گولیاں چلانے والے کا بھی سائیڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ گولیاں کرنل کے سر اور گردن میں لگی تھیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

ایک اور فوٹیج میں دو نقاب پوش نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے کرنل کی گاڑی کی طرف آ رہے تھے لیکن جب انہوں نے کرنل کو گولیاں کھا کر سیٹ پر گرتے دیکھا تو رُک گئے۔ ایک نے ہاتھ کو اس انداز میں حرکت دی جیسے بُری طرح جھنجلایا ہو۔ اور پھر وہ سب وہاں سے فرار ہونے لگے۔ سارا قصہ سیکنڈوں میں نمٹ گیا تھا۔ لیکن یہاں تو قیامت آ گئی تھی۔ شاید قیامت آتی بھی ایسے ہی ہے۔

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اس کی تائید کی۔

''کرنل کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی شناخت ہوگئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، وہ دونوں ایک کالعدم تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور تنظیم نے اس حملے کی ذمے داری قبول بھی ا
لی ہے۔'' ذیشان نے بتایا۔

''شٹ..... یہاں یہی ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن ہمیں ہمارے اپنوں کے ہاتھوں مروا دیتے ہیں ا
نقصان ہرصورت ہمارا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ دو جو کرنل کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں، ان کی موت کا بھی
ہماری دھرتی کی مائیں ہی کریں گی۔'' میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اس نے لہورنگ لہجے میں کہا۔

''کیا کریں کہ ہماری غفلتوں نے ہمیں یہ فصل کاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دشمن ہماری جڑوں میں گھس ا
بیٹھ گیا ہے۔ وہ صرف ڈوریں ہلاتا ہے۔ کٹھ پتلیوں کی طرح اشاروں پر ناچنے والے وہ ہیں جن سے ہمارا کوئی
نہ کوئی ناتا جڑا ہوا ہے۔ تم نے تو خود ایسے اداروں کو ڈسکور کیا ہے جہاں تعلیم کے نام پر ہمارے بچوں کے
معصوم ذہنوں کو بھٹکایا جا رہا ہے۔'' ذیشان کے لہجے میں بھی دُکھ بول رہا تھا۔

''ہاں۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ زہر کتنی شدت سے پھیلایا جا رہا ہے۔ میں تو آج تک ان نوجوانوں کو
بھی نہیں بھولا ہوں جنہیں پانڈے اللہ آباد سے جاتے جاتے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان نوجوانوں کے
والدین کتنے دنوں تک ہمارے پاس آتے رہے تھے کہ بے سی صاحب! ہمارے بچوں کا کچھ معلوم کرائیں
میں کچھ نہیں کر سکا۔ میں جانتا ہوں کہ ان نوجوانوں کو ایسے کسی تربیتی کیمپ لے جایا گیا ہوگا جہاں تعلیم کے نام
پر ان کی نس نس میں زہر بھرنے کے بعد انہیں دہشت گردی کے طریقے سکھائے گئے ہوں گے اور پھر لیبیا میں
بھیج دیا گیا ہوگا۔ کیا معلوم کہ اب تک وہ کسی حملے، کسی کارروائی میں کام بھی آ چکے ہوں۔ لیکن ان کی مائیں
ماؤں کی آنکھیں تو ان کی راہ دیکھتی ہوں گی نا اور راہ دیکھنے والی وہ مائیں کون ہیں؟ ان کا شمار میرے اہل
میں ہی تو ہوتا ہے۔'' کرنل کی جدائی کے دکھ سے نڈھال جانے وہ کن کن دکھوں کو رو رہے تھے کہ یہ رونا
نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کرنل مر گیا، یہ اچھا نہیں ہوا۔ تم اُسے زندہ لے کر آتے تو وہ ہمارے بہت کام آتا۔ بہت کچھ جانتا
مجھے اُس سے۔''

ڈیوڈ نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے آدمی سے کہا۔ وہ شخص اتنا شرمندہ تھا کہ اس کا
اوپر نہ اُٹھتا تھا اور آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا بھی تو اسے اپنے سامنے بیٹھے ایوا
اصل شکل دیکھنے کو نہ ملتی۔ دنیا کی کئی زبانوں پر عبور رکھنے والا وہ عیار شخص حلیہ بدلنے میں بھی کمال رکھتا تھا
اس وقت وہ ایک قبائلی سردار کے بہروپ میں بیٹھا اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب!..... بس میرے ایک آدمی کی غلطی نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ کرنل
گولیاں چلانے پر اس نے خود بھی گھبرا کر اس پر گولیاں چلا دیں۔ اسے اس کی اس غلطی کی سزا دی جا
ہے۔'' شرمسار کھڑے شخص نے صفائی پیش کی۔

''غلطی اس سے زیادہ تمہاری ہے۔ اتنی اہم مہم کے لیے تم نے آدمیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہوشیاری
سے کام کیوں نہیں لیا؟ اور ایک ایسے آدمی کو اپنے ساتھ کیسے شامل کر لیا جو ذرا سی فائرنگ سے گھبرا گیا؟'' ایوا
نے اس کی گوشمالی کی۔ اس بار وہ خاموش رہا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔

''مداوا خان! مداوا..... تمہیں اپنی اس غلطی کا مداوا کرنا ہوگا۔'' ڈیوڈ نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہو



سے گھورا۔

''میں تیار ہوں سردار!'' وہ جو بہت خونخوار تھا اور ایک سیکنڈ میں لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے کر ڈالتا تھا،
ڈ کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا کہ ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی زبردست تو ہوتا ہی ہے۔

''معلوم کرو کہ کرنل کی لاش کب اس کے آبائی گاؤں بھیجی جا رہی ہے اور کوئی ایسا چلتا پُرزہ رپورٹر ہائر
رو جو ہر ہر لمحے کی رپورٹ ہم تک پہنچاتا رہے۔ اس رپورٹر کے ذمے لگاؤ کہ وہ پوسٹ مارٹم سے لے کر
لن تک آس پاس نظر آنے والے لوگوں پر نظر رکھے۔ کرنل کے خاص آدمی اس موقع پر اس سے دُور نہیں
ں گے۔ تمہارے ہائر کیے ہوئے رپورٹر کو ان افراد کی فہرست فراہم کرنی ہے۔ فہرست سامنے آ جائے تو
ی باری ان افراد کو اُٹھانا اور ان سے وہ جاننے کی کوشش کرنا جو ہم کرنل سے جاننا چاہتے تھے۔'' ڈیوڈ نے حکم
ی کیا۔

''بے فکر رہیں سردار! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا۔''

''مجھے کوئی فکر نہیں خان! فکر تم کرو اپنی۔ اس بار کوئی گڑبڑ ہوئی تو انجام تمہارا برا ہوگا۔'' ڈیوڈ کی دھمکی پر
ں کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ یہ سردار کبھی کبھی ہی اس سے ملاقات کرتا تھا۔ عام طور پر اس کے احکامات ہی ملتے
لیکن وہ جانتا تھا کہ دل کھول کر دولت لٹانے والا یہ سردار کتنا سفاک ہے۔ وہ خود کئی بار اس کے حکم پر کئی
ں کو ان کی کوتاہیوں کی سزا دے چکا تھا اور یہ سزائیں اتنی ہولناک ہوتی تھیں کہ سہنے والا تو سہنے والا، دیکھنے
الا بھی لرز جاتا تھا۔

''اب میں دوبارہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ میرا آدمی تم سے رابطہ کرے گا۔ اسے پابندی سے
ٹ دیتے رہنا۔''

اسے اچھی طرح خوف زدہ کر دینے کے بعد ڈیوڈ وہاں سے روانگی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے علاقے
دہشت کی علامت بن کر رہنے والا خان کسی وفادار کتے کی طرح اسے اس کی گاڑی تک رخصت کرنے
ا۔ جس کوٹھی میں ان کی ملاقات ہوئی تھی، وہ خان کی ہی ملکیت تھی لیکن ڈیوڈ نے اسے فون کر کے یوں
بلوایا تھا جیسے وہ خود کوٹھی کا مالک رہا ہو۔ ایک طرح سے وہ تھا بھی۔ کیونکہ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے
جیسے کئی مہرے اس دولت سے ہی تو یہ جائیدادیں بناتے تھے جو وہ انہیں ان کی خدمات کے عوض عطا کرتا
، وہ دنیا کی خطرناک ترین سیکرٹ سروس ''موساد'' کا نمائندہ تھا جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے
ں سے دولت لٹانے کی طاقت رکھتی تھی اور جس کی پٹاری میں بے شمار عیاریوں بھرے حربے موجود تھے۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد اس نے لنڈا سے رابطہ کیا۔

''کیا ہو رہا ہے ڈارلنگ؟''

''چودھری کی میزبانی کا لطف اُٹھا رہی ہوں۔'' اس نے کھلکھلا کر بتایا۔

''کام وام بھی دکھایا یا اُس بڈھے کے پہلو سے ہی لگی بیٹھی ہو؟'' کرنل والی ناکامی کی وجہ سے اس کا
قدرے خراب تھا، اس لیے لنڈا کی کھلکھلاہٹ پسند نہیں آئی۔

''کام ہمیشہ میری پہلی ترجیح رہی ہے اور تم جانتے ہو کہ بڈھے کے پہلو سے لگ کر بیٹھنا بھی میرے کام
ی حصہ ہے۔'' اس نے ڈیوڈ کے الفاظ و انداز کا برا منایا۔

''سوری، میں ذرا ٹینشن میں تھا۔ یہاں میرے دوسرے مشن کو بھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔
ے ہائر کیے آدمی کرنل توحید کو صحیح وقت پر گھیرنے میں تو کامیاب ہو گئے تھے لیکن وہ اسے اغوا کر کے نہیں لا

سکے اور کرنل اپنی جی داری کی وجہ سے موقع پر ہی مارا گیا۔'' گاڑی چلاتے ہوئے اس نے اطمینان سے ا
کو ساری بات بتائی۔

وہ اور لِنڈا خصوصی موبائل سیٹس پر بات کر رہے تھے اس لیے اُنہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ ان کی یہ گفتگو کہیں
سن لی جائے گی۔ خود کو عظیم اسرائیل کا خادم کہنے والے ان خطرناک ایجنٹوں کو اپنی چالاکیوں کے علاوہ ا
اس لیے بھی برتری حاصل ہوتی تھی کہ وہ جدید سائنسی ایجادات سے لیس ہوتے تھے۔ وہ اس قوم کے افر
تھے جنہوں نے برسوں کی ذلت کے بعد زبردستی اسرائیل کو پایا تھا اور اب اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ اپنے
فادر امریکہ تک کو نہ صرف آنکھیں دکھاتے تھے بلکہ ان کے خلاف سازشیں بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ا
محسنوں کو بھی کبھی نہیں بخشا تھا۔ ان کے علم میں لائے بغیر ان کی جاسوسی بھی کرتے تھے اور بلیک میلنگ بھی
امریکہ میں ہیروئن کا پھیلاؤ بھی ان کا ایک منصوبہ تھا جس کے لیے وہ پاکستان کی سرزمین اور افراد کو بھی
چالاکی سے استعمال کر رہے تھے۔ امریکہ ردِعمل میں کچھ کرتا تو پاکستان کے خلاف۔ ان کا بھلا کیا بگڑتا۔

''یہاں سب کچھ بالکل ٹھیک چل رہا ہے۔ مشینری فکس ہو گئی ہے، مال پہنچ چکا ہے اور کام کرنے والے
بندے بھی موجود ہیں۔ نگرانی کا انتظام بھی اچھا ہے۔ بس چودھری تھوڑا سا ٹینس ہے کہ کہیں وہ پھنس
جائے۔ تو اُسے ریلیکس کرنے کے لیے ہی تو میں یہاں اس کے ساتھ آئی ہوں۔ تم بھی بے فکر رہو، اس طر
صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے قابو میں ہے۔'' لِنڈا نے اسے بتایا۔

''خوشی کی بات ہے۔ پھر بھی تم ہوشیار رہنا۔ کیونکہ ابھی حال ہی میں جنگل میں خاصی گڑبڑ ہوئی ہے
ڈیوڈ اسے پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ..... کچھ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کون لوگ تھے؟'' لِنڈا سن کر تشویش میں مبتلا ہوئی۔

''نہیں، کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ہمارے اپنے تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے
لیے مقامی افراد پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور یہ سارے مقامی بلڈی فول ہیں۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے
ڈیوڈ کو ایک بار پھر کرنل کے اغوا میں ناکامی یاد آ گئی تھی حالانکہ یاد رکھنے کی بات تو یہ بھی تھی کہ ''را''
''موساد'' کے تربیت یافتہ کمانڈوز بھی ایئربیس پر حملہ کر کے منہ کی کھا چکے تھے۔ بے شک ان کمانڈوز
وہاں خاصی تباہی پھیلا دی تھی لیکن آخر کار خود بھی مارے گئے تھے بلکہ ایک تو زندہ وطن کے رکھوالوں کے ہا
لگ گیا تھا اور اس کی گرفتاری کی وجہ سے ڈیوڈ کو اپنے کئی اہم ٹھکانوں کی تبدیلی کا حکم دینا پڑا تھا۔

''ریلیکس رہو ڈارلنگ! میں ہوں نا یہاں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔'' لِنڈا نے ڈیوڈ کے موڈ کی
دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ صرف کام کے حوالے سے بہترین ساتھی نہیں تھے بلکہ ان کے درمیان تعلق
بھی تھا۔ لیکن ڈیوڈ کا شمار ان مردوں میں نہیں ہوتا تھا جو اپنی محبوبہ کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل
اور اس کا کسی کے ساتھ نام تک لیے جانے پر تکلیف محسوس کرتے ہوں۔ وہ اپنے تئیں عظیم اسرائیل کے
میں سب کچھ قربان کر رہا تھا اور مفادات کے حصول کے لیے لِنڈا کے بے مثال حُسن کو ریوڑیوں کی
بانٹنے پر قطعی معترض نہیں تھا۔ دوسری طرف لِنڈا ابھی خود کو کوئی آبرو باختہ عورت نہیں بلکہ اسرائیل کی عظیم
سمجھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے اجداد نے اسرائیل کے قیام کے لیے وہ سب کچھ داؤ پر لگایا تھا جو ان
پاس تھا اور وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ وہ اپنے حُسن کی دولت کو ڈیوڈ سے پہلے اسرائیل کی
تسلیم کرتی تھی چنانچہ اسرائیلی مفادات کے لیے بے دریغ اس کا استعمال کرتی تھی۔ بھارت، پاکستان،
اور افغانستان میں کتنے تھے جو اُس کے حُسن کے جال میں پھنس کر اس کی وہ خواہشات پوری کر



جن سے اسرائیل کا مفاد وابستہ تھا۔ سو ایک طرح سے وہ اپنے عمل کے لیے خود کو حق بجانب سمجھنے میں درست
بھی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کب تک پاکستان میں ہو؟'' لِنڈا نے یک دم ہی گفتگو کا رخ بدلا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرے یہاں آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس فورس کا کھوج لگاؤں جو اب تک
ہمیں کئی ضربات لگا چکی ہے لیکن ابھی تک اس مقصد میں کامیابی نہیں ملی ہے۔ ماریہ اور سنتھیا کے ذریعے ہمیں
کرنل توحید کا ایک کلیو ہاتھ آیا تھا لیکن ہم اس تک رسائی میں بھی ناکام رہے۔ اب میں ایک دوسرے ذریعے
سے کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس طرح کامیابی مل جائے گی۔ یہ کامیابی مل جائے اور میں اس فورس کو
منتشر کرنے کا کام انجام دے ڈالوں تو پھر پاکستان سے روانگی بھی ہو جائے گی۔'' ڈیوڈ نے اپنا پروگرام بتایا۔

''پھر تو تمہارا یہاں قیام کافی لمبا ہو سکتا ہے۔ میں تو بس زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے لیے یہاں
ہوں۔'' لِنڈا نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''بہتر ہے کہ تم اور بھی پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ چودھری کی حویلی میں تمہاری موجودگی ان لوگوں کے
کان کھڑے کر دے گی جو چودھری کو مشکوک سمجھ کر پہلے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اسے
مشورہ دیا۔ لِنڈا کا دبئی سے پاکستان آنا اسے زیادہ پسند نہیں آیا تھا لیکن یہ الفا کی خواہش تھی اس لیے وہ منع بھی
نہیں کر سکا تھا۔ الفا اور اس کے ساتھی مل کر وہ بین الاقوامی تنظیم چلا رہے تھے جو دنیا بھر میں ہیروئن اور دیگر
منشیات اور اشیاء کے پھیلاؤ کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس تنظیم کی غیر اعلانیہ حکومتی سرپرستی کرنے والا اسرائیل اس
سے دو بنیادی فوائد حاصل کر رہا تھا۔ اوّل اپنے حریفوں اور حلیفوں کے مستقبل کو نشے میں ڈبو کر تاریک کرنا،
دوسرے بے تحاشا دولت کا حصول۔ ''موساد'' اس تنظیم سے تعاون کرنے کی پابند تھی کیونکہ اس کا صرف ایک
ایجنڈا تھا..... ''اسرائیل کا مفاد'' اب یہ مفاد دشمنوں کو کچل کر حاصل ہوتا یا دوستوں کی گردنوں پر پاؤں رکھ
کر..... انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''ڈونٹ وری ڈیوڈ! تم صرف اپنے کام پر توجہ رکھو اور میرے لیے بالکل بھی پریشان مت ہو۔ تم جانتے
ہو کہ میں مشکل حالات سے نکلنے کا گُر جانتی ہوں۔ اگر یہاں کسی نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی بھی تو چکنی مچھلی
کی طرح پھسل کر نکل جاؤں گی۔''

لِنڈا نے تسلی دینے والے انداز میں کہا اور اپنی بات کے اختتام پر کھلکھلا کر ہنسی۔ ڈیوڈ نے بھی اس کی ہنسی
ساتھ دیا لیکن اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے پوری طرح غائب نہیں ہوئے تھے۔ ٹریفک کے بہاؤ
میں بہتے ہوئے وہ اپنے ذہن سے وہ سارے اندیشے جھٹکنے میں ناکام رہا تھا جو حالات کو دیکھتے ہوئے پیدا
ہوئے تھے۔

⊛----✪----⊛

''ہماری خاطر تم نے خود کو بڑی مشکل میں پھنسا لیا ہے۔'' ماہ بانو نے نازک اندام جوڈی کی طرف
دیکھتے ہوئے تفکر سے کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ ہم بچنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔ تمہیں پناہ دینے کا فیصلہ جان کا تھا اور میں
اس کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کرتی ہوں۔'' جوڈی نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''جان خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسی فرماں بردار بیوی ملنے والی ہے۔'' ماہ بانو نے بھی مسکراتے ہوئے
کہا۔

''فرماں بردار بیوی۔'' جوڈی اس کے الفاظ دُہراتے ہوئے ہنسی پھر بولی۔ ''میں نے سنا ہے تمہارے ہاں بیویاں اپنے شوہروں کی بہت فرماں بردار ہوتی ہیں۔''

''حالات پر منحصر ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض عورتیں اپنے شوہروں کی بالکل نہیں سنتیں لیکن اکثریت ان کے فیصلوں کا احترام کرتی ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں مرد کو خاندان کا سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ سربراہ کی فرماں برداری نہ کی جائے تو نظام بگڑ جاتا ہے۔''

''میں جان کی بات صرف اس لیے مانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ ہے بھی سمجھ دار آدمی۔ بے اصولی فیصلے نہیں کرتا اس لیے مجھے بھی اس کی بات ماننے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ اب تم اپنے ہی معاملے کو دیکھ لو۔ تمہارے ساتھ یہاں ظلم کیا گیا تھا اور انسانیت کے ناتے ہمارا فرض تھا کہ ہم اس ناانصافی کے خلاف تمہارا ساتھ دیں۔ تمہیں مظلوم جاننے کے باوجود اگر ہم تمہیں ان درندوں کے حوالے کر دیتے تو ساری زندگی خود کو کیا جواب دیتے اور آنے والے وقتوں میں اپنے بچوں کو انسانیت کا درس کیسے دیتے؟'' وہ اپنے عمل پر بالکل مطمئن تھی۔ ماہ بانو کو اس پر رشک محسوس ہوا۔ جو اخلاقی اقدار مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں، وہ ان لوگوں میں موجود تھیں جن پر بے حیائی اور کفر کے فتوے دائر کرتے ہم ہر طرح کی بداعمالیوں میں مبتلا خود کو جنت کا وارث سمجھتے ہیں۔

''جان کا دوست کارلوس اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔ وہ ہمارے لیے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔ تم اس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے کر لو کہ ابھی تک کسی نے یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی حالانکہ میرے گھر پر جان اور اس کے دوستوں کی موجودگی کے باعث وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس کا تعلق ہارلم سے ہے۔ ان کی انویسٹی گیشن نے یہ بھی واضح کر دیا ہوگا کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آئے ہیں لیکن وہ یہاں ایسے ہی منہ اٹھا کر چڑھائی نہیں کر سکتے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ یہاں آئے تو پورا ہارلم ان کے مقابل سینہ تان کر کھڑا ہو جائے گا اور چاہے وہ انہیں کتنا ہی حقیر سمجھیں، بہرحال ان سے اُس وقت جیسا سلوک نہیں کر سکتے جب یہ لوگ گوروں کے غلام ہوتے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ صدیوں کی جدوجہد کے بعد ان سیاہ فاموں نے اپنے حقوق تسلیم کروائے ہیں اور آج اتنے کمزور نہیں رہے ہیں کہ ان کے ساتھ من مانا سلوک کیا جا سکے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ اجداد سے سیاہ فاموں کے لیے نفرت نئی نسل میں بھی منتقل ہوئی ہے لیکن اس کی شدت یا تناسب پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جو نفرت رکھتے ہیں، وہ بھی سیاہ فاموں کی طاقت سے خائف رہتے ہیں۔'' جوڈی اسے حقائق سے آگاہ کر رہی تھی۔ جان کے ساتھ مشابرم خان وہاں آ گیا۔

''میری مصطفیٰ خان سے بات ہوئی ہے۔ اس نے تمہارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔''

''کیسا پیغام؟'' وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہاری اور مجاہد کی ایک ویڈیو تیار کی جائے گی۔ اس ویڈیو میں تم اپنے اغوا سے لے کر جنگل میں خفیہ لیبارٹری، پروفیسر ہنری اور اس کے ساتھی ڈاکٹروں کے تجربات سمیت وہ سب کچھ بتاؤ گی جو اس کے تمہارے ساتھ پیش آیا یا تم نے وہاں دیکھا۔ تم بتا سکتی ہو کہ اسلم نے خود اس لیبارٹری کو تباہ کیا تھا جہاں انسانوں پر غیر انسانی تجربات کیے جا رہے تھے۔ تم بتانا کہ کس طرح تم وہاں سے فرار ہوئیں اور اس کوشش میں تمہارے شوہر کی جان گئی۔ اس ویڈیو میں تم اپنی اور اپنے بچے کی جان کو لاحق خطرے کے بارے میں بھی بتاؤ گی۔'' مشابرم خان نے اسے مصطفیٰ کے پیغام کے بارے میں بتایا۔



''لیکن کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہم اس ویڈیو کو سب سے پہلے پولیس اور ایف بی آئی تک پہنچائیں گے، اس پیغام کے ساتھ کہ اگر ان لوگوں نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا تو یہ ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دی جائے گی اور دنیا بھر میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں سے اپیل کی جائے گی کہ ایک بے سہارا لڑکی اور اس کے بچے کی جان بچانے کی کوشش کی جائے۔'' اس بار جان نے اس کو وضاحت دی۔

''شاید اس سے کوئی فرق نہ پڑے۔ تمہارے حکام کہہ دیں گے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور آرلینڈو کے حالات میں آگ لگنے کے واقعے کو بنیاد بنا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''ایسی صورت میں تمہارے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ثبوت موجود ہیں۔'' مشابرم خان اطمینان سے بولا۔

''کیسے ثبوت؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اسلم اور پروفیسر ہنری کی لاشیں دریافت نہیں ہو سکی ہیں اور یہ صرف تم جانتی ہو کہ وہ لاشیں کہاں ہیں۔ اس کے علاوہ جس ہسپتال میں مجاہد کی پیدائش ہوئی، وہاں تمہارے اور مجاہد کے خون کے نمونوں سے حاصل کردہ ایسی رپورٹس موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورانِ حمل تمہیں کچھ خاص قسم کی ادویات اور دوائیں استعمال کروائی جاتی رہی تھیں جس کی وجہ سے بچہ نارمل انسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کے موبائل میں ایڈی کی وہ ویڈیو بھی محفوظ ہے جو اس نے اس وقت بنائی تھی جب ایڈی مجھے ہارٹری اور تمہارے متعلق بتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس ویڈیو میں ایڈی کی آواز واضح نہ ہو لیکن اس کی تصویریں تو واضح ہیں نا۔ اگر امریکی حکام اس کی اصلیت قبول کرنے سے انکار بھی کریں تو انہیں یہ جواب دینا ہوگا کہ جنگل سے برآمد ہونے والی لاشوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ مزید برآں ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ثابت کر دے گی کہ ہلاک ہونے والوں کی موت کا سبب آگ نہیں تھی بلکہ وہ مختلف حادثات کا شکار ہوئے۔ مصطفیٰ خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں اور امریکی حکام اتنی آسانی سے اس سارے معاملے کو کور اَپ نہیں کر سکیں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی فردِ جرم نہیں ہے۔ تم معمولی سے معمولی جرم میں بھی قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کو مطلوب نہیں ہو تو پھر امریکی حکام یوں تمہارے پیچھے لگے رہنے کا کیا جواز پیش کر سکتے ہیں؟''

مشابرم خان نے اسے جو تفصیلات سنائیں، ان سے واضح ہو گیا کہ اس کے یہاں موجود مددگار و ہمدرد ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ اس کے یہاں سے نکلنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔ میں ویڈیو بنوانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر اس طرح نجات کی کوئی راہ نکل آئی تو مجھے خوشی ہوگی ورنہ جتنے یہ لوگ چالاک ہیں، مجھے یقین ہے کہ اس کا بھی کوئی نہ کوئی توڑ تلاش کر ہی لیں گے۔'' وہ بہت زیادہ پُرامید نہیں تھی۔ نااُمیدی کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی یاسیت زدہ عورت تھی، بس حقیقت اتنی تھی کہ اسے ان کی طاقت کا اندازہ تھا کہ وہ کیسے اپنے مدمقابل کو مسل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

''ہو سکتا ہے وہ کوئی توڑ تلاش کر لیں لیکن اس ڈر سے ہم کوشش تو ترک نہیں کر سکتے۔ تمہارے سامنے ہماری قوم کی مثال ہے۔ ہم ان کے ہاتھوں کتنی بری طرح پسے ہوئے تھے لیکن صرف اور صرف کوشش سے ہی نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، سو تم بھی کوشش کرو۔ ویسے بھی تمہارے معاملے کا تعلق امریکہ کے

لاڈلے اسرائیل سے ہے۔ امریکی حکام نہیں چاہیں گے کہ ان کی اسرائیل کو دی گئی اس سہولت کا ذکر لوگوں کے سامنے آئے۔ جھٹلانے کو وہ جھٹلا دیں گے لیکن دنیا بھی جانتی ہے کہ جہاں آگ ہو، وہیں سے ہی دھواں اُٹھتا ہے۔ باقی دنیا رہی ایک طرف، خود امریکہ کے مہذب شہری اس امر پر احتجاج کریں گے کہ امریکی حکام نے غیر انسانی و غیر اخلاقی تجربات کے لیے ایک اسرائیلی سائنس دان کو اپنی سرزمین اور اس پر بسنے والے لوگ استعمال کرنے کی اجازت کیسے دی؟ بات نکلے گی تو پھر حالیہ برسوں میں غائب ہونے والی حاملہ خواتین کے غیر حل شدہ کیسز پر بھی بات ہوگی اور ان کے لواحقین کی طرف سے بھی احتجاج سامنے آئے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے حکام اتنا پریشر برداشت کرنے کے بجائے تم سے کوئی خاموش معاہدہ کرنا زیادہ پسند کریں گے۔''

جان نے دلائل کے ساتھ اس کی ہمت بندھائی تو اسے بھی منظر کچھ روشن نظر آنے لگا اور وہ اپنے سینے سے لگائے ویڈیو ریکارڈ کروانے کے لیے تیار ہوگئی۔

⊛----✪----⊛

ذیشان نے اپنے موبائل پر موصول ہونے والی اطلاع سنی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے شہریار کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہاں ذیشان! کہو، کیا بات ہے؟'' کرنل توحید کی شہادت کے بعد وہ سب بہت بکھرے ہوئے تھے اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ جانے اب کیا سننے کو مل جائے چنانچہ اس وقت بھی شہریار نے قدرے اضطراب کے عالم میں اس کی کال ریسیو کی تھی۔

''ہسپتال میں اشیش کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' ذیشان نے اسے اطلاع دی۔

یہ اشیش وہی تھا جو پہلے پیرآباد کے مدرسے میں امام کا بہروپ بن کر رہ رہا تھا، ساتھ ہی قومِ لوط کا ایک پیروکار تھا۔ ماہ بانو کا اکلوتا اور معصوم بھائی اسی کی ہوس کا نشانہ بن کر اپنی جان سے گیا تھا۔ لیکن اس موقع پر اشیش کا کردار بھی سامنے آگیا۔ وہ پیرآباد سے فرار ہوا اور ایک دوسرے گاؤں میں جا کر وہی سب کچھ کرنے لگا جو پیرآباد میں کرتا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ چودھری کے عتاب سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکتے آفتاب اور کشور بھی اسی گاؤں میں رہائش پذیر ہوگئے۔ وہاں آفتاب نے اشیش کو دیکھ کر شناخت کرلیا اور شہریار کو اطلاع دے دی۔ اشیش گرفتار کرلیا گیا لیکن بعد میں اسے کوما کی حالت میں ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب شہریار افسرشاہی کے منصب کو ٹھکرا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سی ایف پی کو جوائن کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی اصل شناخت کو بھی قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ ''را'' اور ''موساد'' کے ایجنٹس پہلے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ سجاد رانا اور شینا کی اموات کے انتقام کے علاوہ حُبّ الوطنی سے سرشار کچھ نہ کچھ کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ دشمنوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ بم بلاسٹ میں شدید زخمی ہونے کے بعد وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ ایک جیسا قد کاٹھ رکھنے کی وجہ سے اشیش کو ہی شہریار قرار دے دیا گیا اور دشمنوں کو خود ایسے ثبوت فراہم کیے گئے کہ وہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئے کہ ہسپتال میں بے بس ولاچار پڑا بندہ شہریار عادل ہی ہے۔

اشیش کے اس نیم مُردہ وجود کے اخراجات وہ صرف اس لیے اٹھا رہے تھے کہ مستقبل میں شہریار کو اس بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے کہ آیا وہ ہمیشہ کے لیے عادل خان ہی بن کر رہنا چاہتا ہے یا اسے اپنی شہریار عادل والی حیثیت واپس چاہیے۔

اشیش کی موت نے فیصلے کی گھڑی اس کے سر پر لا کھڑی کی۔ اب اسے یہ مشکل فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اب



لیے کیا چاہتا ہے۔ اس فیصلے پر ہی اس کی آئندہ پوری زندگی کا انحصار تھا۔ اور قسمت نے عجیب چال چلی تھی کہ فیصلے کا یہ مرحلہ اس وقت اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا جبکہ کرنل توحید کی شہادت سے ان میں سے ہر ایک اپنے دماغ کو ماؤف ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ کرنل ان لوگوں کے لیے کیا تھے اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا لیکن فی الحال تو ان سب کو ایسا لگتا تھا کہ کسی لق و دق صحرا میں بالکل خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ نہ ان کو اس صحرا سے نکلنے کا راستہ معلوم ہے اور نہ ہی وہ وسائل پاس ہیں کہ جن کی موجودگی صحرا سے نکلنے کی کوشش کا آسرا بن سکے۔

''کرنل کو کب ان کے آبائی گاؤں روانہ کیا جا رہا ہے؟'' بہت دیر بعد ذیشان کی دی اطلاع پر تبصرہ کرنے کے بجائے شہریار نے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔ ذیشان کرنل کی شہادت کی اطلاع ملنے کے بعد فوری دستیاب فلائٹ سے کراچی چلا گیا تھا اور اس ہسپتال میں موجود تھا جہاں کرنل کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔ اشیش کے مرنے کی اطلاع شہریار سے پہلے اس تک اس لیے پہنچی تھی کہ ہسپتال انتظامیہ کو اس بارے میں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس مریض کے بارے میں کوئی بھی اطلاع اس کے عزیزوں سے پہلے انہیں دینے کے پابند ہوں گے۔ سی ایف پی کو کور دینے کے لیے بنائی گئی سکیورٹی ایجنسی کا ایک گارڈ ہمہ وقت ہسپتال میں ہی رہتا تھا اس لیے سب سے پہلے اطلاع ذیشان تک پہنچی تھی۔

''پوسٹ مارٹم ہوگیا ہے۔ جنازے کو خصوصی طیارے سے پہلے پنڈی بھجوایا جائے گا اور پھر وہاں سے ان کے آبائی گاؤں پہنچانے کا بندوبست ہوگا۔ میں اس خصوصی طیارے میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جس میں کرنل کو پنڈی لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں سے پھر میں ان کے گاؤں جاؤں گا۔''

ذیشان نے اسے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس وقت وہ انسان سے زیادہ ایک روبوٹ کی طرح کام کر رہا تھا۔ صدمے نے اسے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ اسے لگتا تھا کہ اس کے سارے حواس مکمل طور پر اپنا کام انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اس وقت وہ بس زیادہ سے زیادہ وقت کرنل کے قریب گزارنے کا خواہش مند تھا۔ وہ ایک بے روح جسم میں تبدیل ہوگئے تھے پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس وقت تک ان کے قریب رہے جب تک ان کا وجود زمین پر موجود ہے۔ قبر میں تو انسان کے اعمال کے سوا اس کے ساتھ کسی کو جانے کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ جذباتیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ سی ایف پی کا مقامی ہیڈ کوارٹر یہاں تھا پھر سب سے بڑھ کر فوج کے اپنے لوگ سارے معاملات کو دیکھنے کے لیے موجود تھے لیکن ذیشان پھر بھی خود کو نہیں روک سکا تھا۔ وہ کیسے خود کو روک سکتا تھا؟ کرنل توحید وہ انسان تھے جنہوں نے اس وقت اس کی اپنی نظروں میں کھوئی ہوئی عزت کو بحال کرنے میں مدد دی تھی جب وہ ایملی پارکر جیسی حسینہ کے جال میں پھنس کر اپنی ہی فورس سے غداری کا مرتکب ہوگیا تھا۔ یہ غداری شعوری نہیں تھی۔ ایملی نے اپنے حُسن اور شراب کے نشے میں ڈبو کر اس سے چند قیمتی راز حاصل کرلیے تھے اور پھر اُڑن چھو ہوگئی تھی۔ ذیشان کو ہوش آیا تو چڑیا کھیت چگ کر جا چکی تھی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے سزا پالے اور ہمیشہ کے احساسِ جرم سے نکل آئے۔ اس نے یہ اعتراف کرنل کے سامنے ہی کیا تھا لیکن کرنل نے اسے سزا نہیں دی اور انسانی جبلت کی کمزوری کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنی کوتاہی کے ازالے کا ایک بہترین موقع دیا۔ وہ سی ایف پی کے لاہور میں قائم کردہ ہیڈ کوارٹر میں لا بٹھایا گیا اور یہاں اس نے اتنی جی جان سے وطن کی خدمات سرانجام دیں کہ ماضی میں دامن پر لگا داغ مٹنے لگا۔ اُس کی اپنی نظر میں اس کی کھوئی ہوئی عزت بحال ہونے لگی۔

کرنل کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کبھی اسے اس کی ماضی کی وہ غلطی یاد نہ دلائی اور ہمیشہ کامیابیوں پر اس کا شانہ تھپکتے رہے۔ وہ نفیس اور محبِ وطن انسان آج شہادت کا درجہ حاصل کر کے اپنی ہمیشہ کی آرام گاہ جانے کا منتظر تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ذیشان کا کندھا اسے کندھا دینے والوں میں شامل نہ ہوتا۔ کرنل کے احسان کے بوجھ سے جھکے اس کے شانے شہید کے جنازے کو اٹھانے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے اور دل غم سے نڈھال ہوا جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم پنڈی پہنچو، میں بھی پہنچ رہا ہوں۔ وہاں سے ساتھ ہی کرنل کے گاؤں چلیں گے۔'' شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا اور ذرا سے توقف کے بعد بولا۔ ''میں ماموں جان سے بات کرلوں گا۔ اشیش کو اس دوران ہی بطور شہریار دفنا دیا جائے گا۔ میری خاطر میرے گھر والوں کو یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔''

''تم اچھی طرح سوچ لو شہریار! اس کے بعد تمہارے پاس واپسی کا ہر راستہ بند ہو جائے گا اور تم ہمیشہ کے لیے عادل خان رہ جاؤ گے۔'' ذیشان نے اسے سمجھایا۔

''اس مسئلے پر میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ میری زندگی کا بنیادی مقصد ہے اپنے دین اور وطن کی حفاظت۔ اس کے لیے میرا نام شہریار ہو یا عادل خان، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بے نام بھی مارا گیا تو مجھے قطعی دکھ نہیں ہوگا۔ بس گھر والوں کو کنوِنس کرنے میں تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''تم بھی کرنل کی طرح عظیم ہو شہریار!..... میں نے جتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارا، یہی دیکھا کہ انہوں نے وطن کو ہر شے پر فوقیت دی۔ وہ زندہ دل اور جی دار انسان تھے۔ انہوں نے موت کو بھی بہت بہادری سے سینے سے لگایا اور اب تم اتنی بڑی قربانی دینے چلے ہو۔ میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔''

اس کا فیصلہ سن کر ذیشان نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کرنل کے ساتھ وہ جس شخص سے بہت متاثر ہوا تھا، وہ شہریار ہی تھا۔ وہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور ایک ایسے خاندان کا حصہ تھا جس کے بیشتر افراد بیوروکریٹس تھے۔ اس نے خود اپنی محنت اور ذہانت سے اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ اس کے اکیڈمک ریکارڈ اور فیملی بیک گراؤنڈ کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا مستقبل شاندار و تابناک ہوگا۔ لیکن وہ سب سے مختلف نکلا۔ اس نے افسر شاہی بن کر راج کرنے کے بجائے قوم اور وطن کا خدمت گار بننا پسند کیا اور اس کرسی کی قربانی دے دی جس پر بیٹھ کر چاہتا تو حکومت بھی کرتا اور مال بھی بناتا۔

اپنی مختصر ملازمت کے دوران بھی اس نے ایسا بہت کچھ کیا جو اس کے پیش رو نہیں کر سکے تھے۔ اس نے اپنے علاقے کے سب سے طاقتور وڈیرے سے ٹکر لی۔ اس کے ظلم و ستم کے خلاف ایکشن لیا۔ اس کی مدد سے کی جانے والی بدعنوانیوں کی راہ روکی اور علاقے کے عوام کو وہ سہولتیں دینے کی کوشش کی جو ان کا بنیادی حق تھیں۔ بظاہر یہ سارے اندرونی مسائل تھے لیکن ان سے نمٹتے نمٹتے وہ ملک دشمنوں کی نظر میں آ گیا اور پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ ان دشمنوں کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس نے اپنی شناخت کی قربانی دی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں کود پڑا۔ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، سرخرو ہو کر نکلا۔ اس کے عزم اور ہمت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ کامیابیوں کا یہ سلسلہ بہت دُور تک جائے گا لیکن اس سب کے بدلے وہ شہریار عادل کو داؤ پر لگا گیا تھا اور اب اس کا وجود دنیا کی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹنے والا تھا۔



⊛----✪----⊛

''یہ کیا بکواس ہے؟ میں کم از کم اس ڈرامے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' آفرین رانا، لیاقت رانا اور مریم..... خاندان کے یہ تین افراد تھے جو اس کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ اشیش کی موت اور اپنے ارادے کو ان کے سامنے بیان کرنے کے لیے اس نے انہیں ایک جگہ جمع کیا تھا اور بہت رسان سے ساری بات بتائی تھی۔ سب سے پہلا ردِعمل آفرین رانا کی طرف سے آیا تھا اور انہوں نے رنج اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''پلیز ممانی جان.....!'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں انہیں پکارا۔

''تم ایک ماں سے ایسا مطالبہ نہیں کر سکتے شیری! تم نہیں جانتے کہ اولاد کا غم کیا ہوتا ہے لیکن میں نے سہا ہے یہ غم۔ اس گھر سے میرے سامنے میرے جوان بیٹے اور نوعمر پوتی کے جنازے اُٹھے ہیں۔ رو رو کر میری بینائی جانے لگی ہے لیکن آنسو خشک نہیں ہوتے۔ اور اب تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو کہ میں اپنے گھر سے ایک اور ایسا جنازہ اُٹھتے دیکھوں جس پر تمہارا نام ہو۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ بے شک میں نے تمہیں اپنے بطن سے پیدا نہیں کیا لیکن ایک ماں کی طرح پالا تو ہے۔ اور ایک ماں اپنے جوان بیٹے کی جھوٹی موت کو بھی قبول کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ میں اگر تمہارے اس مطالبے کو مان لوں گی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شہریار کو سینے سے لگانے سے محروم ہو جاؤں گی۔ اب تک میں نے جو کچھ سہا، وہ اس امید پر کہ ایک دن تم لوٹ کر ہمارے پاس آؤ گے اور ہم پھر سے پہلے کی طرح ایک ساتھ مل کر رہنے لگیں گے۔ لیکن اب تم مجھے بتا رہے ہو کہ تم ہمیشہ کے لیے اپنی شناخت ختم کرنے جا رہے ہو اور اب اس دنیا میں ایسا کوئی فرد نہیں ہوگا جسے میں اپنا شیری کہہ کر پکار سکوں تو سن لو، مجھے یہ منظور نہیں ہے۔''

وہ سخت جذباتی ہو رہی تھیں۔ ان کے برابر میں بیٹھی مریم نے ان کے شانے پر ہاتھ پھیلا کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں شہریار! تمہارا جذبہ بے شک لائقِ ستائش ہے لیکن وطن کے علاوہ تم پر ان رشتوں کا بھی تو حق ہے جو تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ میں اپنی بات نہیں کرتی۔ میرے دونوں ہاتھ تو پہلے ہی خالی ہو چکے ہیں لیکن تمہیں انکل اور آنٹی کے جذبات کا احساس کرنا چاہیے۔ ان کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا کہ اس گھر سے تمہارے نام کا جنازہ اُٹھتے ہوئے دیکھیں۔'' شوہر اور بیٹی کی موت کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے والی مریم نے مختصر الفاظ میں آفرین رانا کی حمایت کی۔

''مجھے آپ سب کے جذبات کا احساس ہے بھابی! اور میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرنا آپ سب کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا خاندان ایک محبِ وطن خاندان ہے۔ کم از کم ماموں جان اور ممانی جان کو میں نے ہمیشہ ایسا ہی پایا ہے اور یہ طے ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے حصے میں زیادہ قربانیاں آتی ہیں۔ ایسے لوگ قدرت کی طرف سے عظیم قربانیوں کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں اور قابلِ فخر ہوتے ہیں۔ سچ بتایئے، کیا آپ لوگوں کو سجاد بھائی کی شہادت پر فخر محسوس نہیں ہوتا اور ان کی جدائی کے باوجود یہ احساس حوصلہ نہیں دیتا رہتا کہ وہ ایک ایمان دار و فرض شناس پولیس آفیسر تھے اور اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے شہادت کی موت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ آج کوئی بھی ان کا ذکر کرتا ہے تو عزت اور احترام کے ساتھ۔ اگر وہ اس سے متضاد شخصیت کے مالک ہوتے اور ان کا شمار کرپٹ اور بے ایمان

افسران میں ہوتا تو کیا آپ لوگ ایسا فخر محسوس کر سکتے تھے؟ نہیں نا۔ تو بس جان لیجئے کہ اللہ کا ہم سب پر بڑا کرم ہے۔ اب رہی میری بات..... تو کیا آپ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی ہے کہ بطور شہریار میری زندگی کو کتنے خطرات لاحق تھے۔ مجھ پر کتنے قاتلانہ حملے کیے گئے اور کس کس طرح ٹریپ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے اپنی شناخت بدلی تو ان ساری مصیبتوں سے نجات پائی۔ اب اگر فرض کریں کہ میں واپس شہریار کی حیثیت سے اس گھر میں آجاتا ہوں تو کیا وہ سارا سلسلہ دوبارہ شروع نہیں ہو جائے گا؟..... پھر آپ لوگ کیا کریں گے؟'' وہ جوابی دلائل دے کر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہمارے لیے تو صورتِ حال اب بھی پہلے سے مختلف نہیں ہے بیٹا! پہلے تم پر قاتلانہ حملے ہوتے تھے اور اب تم خود لپک لپک کر موت کی طرف جاتے ہو۔ تم وہاں ہوتے ہو اور کیا کیا کرتے ہو، اس کا درست علم نہ ہونے کے باوجود میں جانتی ہوں کہ تم خطروں سے کھیلتے رہتے ہو اور ہر پل میرا دل اندیشوں سے لرزتا رہتا ہے۔'' آفرین رانا نے دُکھی سے لہجے میں کہا۔ لیاقت رانا البتہ اب تک بالکل خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے گفتگو میں قطعی دخل نہیں دیا تھا۔

''مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے ممانی جان! لیکن سچ پوچھیں تو یہاں کون خطرے میں نہیں۔ ایک اکیلی آپ ہی نہیں ہیں جن کے دل میں اندیشے ہیں۔ ایک ریڑھی لگانے والے سے لے کر آفس میں وائٹ کالر جاب کرنے والے تک سب کی ماؤں کے دل اندیشوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرے وطن کی ہر ماں صبح جب اپنے بیٹے کو گھر سے رخصت کرتی ہے تو اس کے دل میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جانے اس کا بیٹا زندہ سلامت گھر واپس آئے گا بھی یا نہیں کیونکہ ہر روز وہ خبروں میں کتنے ہی گھروں کے چراغ بم بلاسٹ اور ٹارگٹ کلنگ میں بجھنے کے منظر دیکھتی ہے اور سینہ کوبی کرتی ماؤں، بہنوں کو دیکھ کر یہ سوچ کر لرزتی رہتی ہے کہ ملک بھر میں لگی یہ آگ جانے کب ہمارے دامن تک پہنچ جائے۔ ان ماؤں کے سکھ کے لیے، ان کے اندیشوں سے لرزتے دل کو سہارا دینے کے لیے مجھے اور میرے جیسے بہت سوں کو میدان میں اُترنا ہی ہوگا۔ اگر ہم میدان میں نہیں اُتریں گے تو دشمن کی راہ کون روکے گا؟ آپ ڈرتی ہیں کہ میں اپنی شناخت مٹا کر ان دشمنوں کے خلاف کھڑا ہوں گا تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔ لیکن کیا آپ کو یہ یاد نہیں کہ ہماری شینا تو کسی سے نہیں لڑ رہی تھی۔ وہ تو بس پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تھی اور ان کا نشانہ بن گئی تھی جنہوں نے ہماری غفلت کی وجہ سے جانے کس کس روپ میں اس ملک میں اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ میرا ساتھ دیں ممانی جان! اور مجھے اپنی سرزمین کو دشمن کے ناپاک قدموں سے پاک کرنے والوں میں شامل ہونے کی اجازت دیں ورنہ شاید ایک دن ایسا آئے کہ آپ پچھتاووں میں گھر جائیں اور آپ کو دکھ ہو کہ آپ اس وطن کی وہ ماں ہونے کا حق نہیں ادا کر سکیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دھرتی پر نثار کرنے کا فریضہ دل و جان سے انجام دیتی ہیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں آ بیٹھا تھا اور بہت جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ آفرین رانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ان آنسوؤں میں گزرے حادثوں کا دکھ بھی تھا اور آنے والے غموں کے اندیشے بھی۔

''آپ مجھے روکیں گی تو میں رک جاؤں گا۔ میں ایک نئی شناخت کے ساتھ وطن کی خدمت کے ارادے سے بھی باز آجاؤں گا لیکن میرے تحفظ کی کوئی ضمانت تو پھر بھی نہیں ہوگی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ مجھے وہ کرنے دیں جو میں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کرنا چاہئے۔'' اس بار وہ ذرا دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ آفرین رانا کا ہاتھ اس کے سر پر آ ٹھہرا۔



''ٹھیک ہے بیٹا! تم جو چاہے کرو۔ میں تمہیں تمہارے کسی ارادے سے نہیں روک سکتی۔ لیکن اُس مردود ملک دشمن کو اپنا شہریار قرار دے کر اس کے جنازے پر آنسو بہانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ تم مجھ سے اتنا بڑا مطالبہ مت کرو۔'' انہوں نے اسے اجازت دینے کے ساتھ ہی اپنی مجبوری بھی بیان کی۔

''تو ٹھیک ہے۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے تک محدود رہیے گا۔ لوگوں سے کہہ دیا جائے گا کہ آپ کو صدمے کی وجہ سے ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا گیا ہے۔ بھابی اور ماموں جان باقی معاملات سنبھال لیں گے۔'' اس نے گویا چٹکی بجاتے مسئلہ حل کر دیا۔

''اپنے بوڑھے ماموں کو بہت حوصلہ مند سمجھ لیا ہے تم نے؟'' لیاقت رانا نے شکوہ کیا۔

''حوصلہ تو آپ کو دکھانا ہوگا ماموں جان! کہ یہ آپ پر اس سرزمین کا قرض ہے۔ البتہ میں یہ انتظام کروا دوں گا کہ ان تکلیف دہ لمحات کا دورانیہ زیادہ نہ ہو۔ لاش کو تابوت میں بند بالکل تیار حالت میں لایا جائے گا اور ساتھ ہی ڈاکٹرز کی اس ہدایت کا بھی اعلان کر دیا جائے گا کہ لاش کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے زیادہ دیر رکھا جا سکے اس لیے فوری تدفین ضروری ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر آپ پروفیشنل لوگوں کی مدد سے فارغ ہو جائیں گے۔ باقی دیگر رسومِ مرگ کے بارے میں تو ہمارے خاندان والے بھی واقف ہیں کہ میں قائل نہیں تھا۔ اس لیے آپ آرام سے اس سارے سلسلے سے اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔'' وہ سب کچھ سوچ چکا تھا۔

''بھابی! آپ مختار انکل کو فون کر کے بلوا لیجئے گا۔ وہ یہاں کے معاملات سنبھالنے میں ماموں جان کی بہتر مدد کر سکتے ہیں۔'' اس بار وہ مریم سے مخاطب ہوا۔ مریم کے والد مختار مراد، آئی جی کے عہدے پر فائز تھے اور ماضی میں شہریار ان سے بہت مدد لیتا رہا تھا۔ بعد میں اس کا سی ایف پی سے تعلق قائم ہوا تو ان کی مدد کی ضرورت ہی نہیں رہی اور وہ بالکل مختلف انداز سے اپنا مشن انجام دینے لگا۔

''ٹھیک ہے، میں اُنہیں فون کر دوں گی۔'' حسبِ عادت مریم نے مختصر جواب دیا۔

''میں پنڈی جا رہا ہوں ماموں جان! وہاں سے کرنل توحید کے جنازے میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں جاؤں گا۔ پھر اس کے آگے کا پروگرام آپ کو فون پر بتا دوں گا۔ ہو سکتا ہے اب کافی دنوں تک میری آپ سے ملاقات نہ ہو سکے۔ موقع ملنے پر فون پر رابطہ کر لوں گا لیکن اب گفتگو میں بھی ہمیں احتیاط برتنی ہوگی اور آپ میں سے ہر شخص کو خیال رکھنا ہوگا کہ مجھے شیری کہہ کر نہ پکارے۔ شیری کا وجود آج کے بعد بالکل ختم ہو جائے گا۔''

اس نے لیاقت رانا کو اپنے اگلے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کے لیے چند ہدایات بھی دیں۔ اب بھی وہ گھر میں اپنے لیے مخصوص کمرے کے بجائے گیسٹ روم میں ٹھہرا ہوا تھا اور ملازم اسے ایسا بے تکلف مہمان سمجھتے تھے جسے گھر کے اندر تک بھی رسائی حاصل تھی اور جو جب چاہے اہلِ خانہ سے گفتگو کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جاؤ۔ ہم سب تمہارا پوری طرح ساتھ دیں گے۔'' لیاقت رانا نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے گھر سے رخصت ہوتا دیکھ رہے تھے اور دل بیک وقت فخر اور دُکھ کے احساسات سے دوچار تھا۔ انہیں اپنی تربیت پر ناز تھا جس نے اسے ایک سچا محبِ وطن پاکستانی بنا دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان کا شیری ہونے کے باوجود بھی اب پہلے کی طرح ان کا نہیں رہا تھا۔ اب وہ جب بھی یہاں آئے گا، مہمانوں ہی کی طرح آیا کرے گا۔ لیکن وطن کی خاطر کچھ لوگوں کو تو قربانیاں دینی ہی تھیں تو پھر لیاقت رانا کا خاندان کیوں پیچھے رہتا۔

وہ جس وقت پنڈی میں ذیشان سے ملا، نشریاتی ادارے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کی طویل عرصہ ا
میں رہنے کے بعد انتقال کی خبر نشر کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کرنل توحید جیسی اہم شخصیت کی شہادت کی
کے مقابلے میں یہ خبر بہت چھوٹی تھی اس لیے سرسری طور پر ہی نشر کی گئی۔ میڈیا کا سارا فوکس کرنل توحید
شہادت پر تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کے ساتھ ساتھ مختلف چینلو سے مختلف تبصرے اور تجزیے بھی پیش کیے جا
تھے۔ ان کی میت کے آبائی گاؤں پہنچنے اور نمازِ جنازہ وغیرہ کی کوریج کے لیے بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا
کے بہت سے نمائندے موجود تھے۔ اس نے ذیشان کو اپنی آمد سے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا اس لیے اس نے
اسے لینے کے لیے گاڑی بھیج دی تھی۔ کرنل کے گاؤں تک کا سفر بھی انہیں اسی گاڑی میں کرنا تھا۔ وہ پہلے
گاؤں کی طرف جانے والا قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ ذیشان اسے نیچے نہ اُترنے کا اشارہ کر کے
گاڑی کی طرف آ گیا۔ ڈرائیور کو اس نے فارغ کر دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس طرح وہ اور
شہریار زیادہ آزادی سے ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔

''یہاں سے کرنل کے گاؤں تک کا سفر کتنی دیر کا ہے؟'' شہریار نے یونہی گفتگو کے آغاز کے لیے ایک
سوال کیا۔

''تقریباً گھنٹہ، سوا گھنٹہ لگ جائے گا۔'' ذیشان نے بتایا۔

''یعنی تقریباً پانچ چھ گھنٹے کا پروسس ہے۔ ظاہر ہے، ابھی میت کرنل کے گھر جائے گی۔ وہاں گھر والے
کچھ دیر اسے روکیں گے، اس کے بعد نمازِ جنازہ اور تدفین کے مراحل سے نمٹ کر واپس آنے میں ہمیں اتنا
وقت تو لگ ہی جائے گا۔'' اس کا جواب سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہوں۔'' ذیشان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے دھیانی سے ہنکارا بھرا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی پہلے
کے مقابلے میں مزید بڑھ گئی تھی۔

''کرنل کا مشن تھا، اپنی سرزمین کو ملک دشمن عناصر سے پاک رکھنا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہمیں
اس مشن کو جاری رکھنا ہوگا اور یہ بات دھیان میں رکھنی ہوگی کہ ہمارے پاس محدود وقت ہے۔ زیادہ تاخیر
سے بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔ کرنل کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن ہم اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کر سکتے۔ میں
سی ایف پی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن تم عرصے سے اس کا حصہ ہو اس لیے تم واقف ہو گے کہ کرنل
کی غیر موجودگی میں وہ کون سا فرد ہوگا جو سی ایف پی کے معاملات چلانے میں مدد کرے گا۔ ہمیں اس شخص
سے فوری رابطہ کرنا ہوگا اور اسے بتانا ہوگا کہ جنگل میں آپریشن کتنا ضروری ہے۔'' وہ اصل موضوع پر آ گیا۔
کرنل کی شہادت نے اسے بھی دھچکا پہنچایا تھا لیکن وہ خود کو اس دھچکے سے سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
اب وہ سب سوچ رہا تھا جو اسے سوچنا چاہئے تھا۔

''کرنل نے ایسے کسی شخص سے مجھے متعارف نہیں کروایا تھا۔ میں صرف سی ایف پی کے ان ہی ارکان
سے واقف ہوں جو میری طرح مختلف شہروں میں اپنے یونٹس سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ البتہ ایک بار کرنل
نے مجھ سے ذکر ضرور کیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی صورت میں کوئی ایسا بندہ
خود ہم سے رابطہ کرلے گا جو سی ایف پی کے معاملات میں ہماری راہنمائی کرے گا۔ لیکن ابھی تک ایسے کسی
شخص نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔''



ذیشان نے اسے بتایا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ کرنل نے ایسے کسی فرد کو
حالیہ پچویشن سے آگاہ کیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ شخص ناواقف تھا تو اندیشہ تھا کہ وہ فوری رابطہ بھی نہیں کرے گا اور
ایسی صورت میں وہ آپریشن نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پہلے مختار مراد کی مدد سے جنگل میں آپریشن کروا چکا تھا۔ اس
آپریشن میں پولیس فورس نے حصہ لیا تھا لیکن اب جس نوعیت کے آپریشن کی ضرورت تھی، اس کے لیے
پولیس مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں جن وسائل اور سہولیات کی ضرورت تھی، اس کے لیے فوج کا کوئی
شعبہ ہی معاون ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ ان کے مقابل جدید ٹیکنالوجی سے لیس تھے اور اس کا توڑ کرنا آسان
نہیں تھا۔

''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ زیادہ وقت گزرنے سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا
نہیں ہو سکتا کہ ہم خود کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں؟'' اس نے ذیشان سے پوچھا۔

''یہ بہت رسکی ہوگا۔ کیونکہ ہم سو فیصدی کسی کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہے اور اس کا سی
ایف پی سے کوئی تعلق بنتا بھی ہے یا نہیں۔ فرض کرو، اندازے کی غلطی سے ہم کسی غیر متعلقہ شخص سے رابطہ کر
بیٹھے تو کتنا بڑا بھونچال آ جائے گا۔ سی ایف پی ایک خفیہ ادارہ ہے جسے خفیہ رکھنے کی اس حد تک کوشش کی گئی
ہے کہ ملک کی سیاسی قیادت کو بھی اس کے معاملے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ ہماری ذرا سی جلد بازی اور
بداحتیاطی اس ادارے کے استحکام کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی ہمیں فوج میں یہی سکھایا
گیا ہے کہ آرڈر اِز آرڈر۔ کرنل نے کہا تھا کہ اُن کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی شخص خود رابطہ کرے گا تو
میرے لیے ان کی یہ بات ایک آرڈر کی حیثیت رکھتی ہے اور میں ہر صورت میں اس بات کا پابند ہوں کہ کسی
کے خود رابطہ کرنے کا انتظار کروں۔'' ذیشان نے بہت واضح الفاظ میں اسے اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا تو وہ اس
سے بحث نہیں کر سکا۔ اس کے اندیشے اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ سی ایف پی کے وجود کو خطرے میں نہیں
ڈالا جا سکتا تھا۔ پاکستان جیسے ملک میں سی ایف پی جیسے ادارے کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں تھا اور نعمتوں کی
قدر کرنی پڑتی ہے، انہیں بہت سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ یہ ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور ہمیشہ کا پچھتاوا انسان
کا مقدر بن جاتا ہے۔ اسے بھی خود پر ضبط کرنا پڑا لیکن طبیعت مکدر سی ہو گئی کہ اتنا سب کچھ سامنے ہوتے
ہوئے بھی وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔

کرنل کے گاؤں تک کا باقی راستہ انہوں نے خاموش رہ کے گزارا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو
اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ راستہ صاف ستھرا اور پختہ تھا۔ کرنل کے گھر تک پہنچنے کے لیے گاڑیوں کو گاؤں
کا چکر کاٹنا پڑا تھا اور اس دوران انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ پورا گاؤں بہت صاف ستھرا اور منظم طور پر آباد تھا۔
کہیں نہ تو کہیں گندگی کے ڈھیر نظر آئے، نہ راستے کی بے ہنگم رکاوٹوں سے واسطہ پڑا۔ مکانات اگرچہ چھوٹے
بڑے اور کچے پکے ہر طرح کے تھے لیکن ایک خاص ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی بے ڈھنگا پن نظر
نہیں آ رہا تھا۔ گلیاں کشادہ تھیں۔ کرنل کا مکان خاصا بڑا اور پختہ تھا۔ گھر کے سامنے وسیع شامیانہ لگا ہوا تھا اور
کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے۔ لوگوں کی تعداد دیکھ کر لگتا تھا کہ گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو وہاں موجود نہ
ہو۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر چہرے پر غم کا تاثر تھا۔

کرنل کا تابوت اُتارا گیا تو بے شمار کاندھے اسے سنبھالنے کے لیے لپکے۔ اتنی محبت اور چاہت کو دیکھ کر
رشک آتا تھا۔ دنیا سے تو سب ہی کو جانا ہے کہ جو یہاں آیا ہے، اس کی ایک دن واپسی بھی طے ہے لیکن ایسی
شان دھج سے جانے والے خال خال ہی ہوتے ہیں۔ یہ شان، یہ عزت انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے دنیا میں

آنے کا حق ادا کر کے یہاں سے جائیں ورنہ بعض تو ایسے بدنصیب ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے جانے پر شکر کا کلمہ ادا کرتے ہیں۔

''بڈھا ہو گیا ہوں، پوتے پوتیاں جوان ہونے کو آئے ہیں۔ ماں باپ کی ہڈیاں کب کی قبر میں گل سڑ گئی ہیں لیکن یہ اپنا توحید گیا ہے تو لگتا کہ آج اسی ویلے میں یتیم ہوا ہوں۔ کیسا جی دار اور پیار کرنے والا تھا میرے وڈے پُتر کی عمر کا تھا۔ بڑی عزت کرتا تھا میری۔ پر میرے جی میں اُس کی ایسی عزت تھی جیسے وہ میرا بزرگ ہو۔ اتنا وڈا افسر تھا، چاہتا تو بیوی بچوں کے ساتھ شہر میں رہتا اور مڑ کر بھی اس پنڈ کو نہ دیکھتا۔ پر نہ جی، وہ تو اپنی مٹی سے سچی محبت کرنے والا تھا۔ اِدھر کم کم ہی آتا تھا، پر کبھی یہاں کے ماملات (معاملات) سے غافل نہیں رہتا تھا۔ اُس کی وجہ سے تو یہ پنڈ اتنا سنور گیا ہے۔ اُس نے اِدھر اسکول اور ہسپتال بنوائے۔ پکی سڑک ڈلوائی۔ جب جب ادھر آتا تھا، پنڈ کے مُنڈوں کو جمع کر کے یہی سمجھاتا تھا کہ پڑھ لکھ کر اپنی زندگی بھی سنوارنی ہے، پنڈ کی حالت بھی اچھی کرنی ہے اور وطن کی خدمت بھی کرنی ہے۔ سب چھوٹے بڑے اس کے عاشق تھے اور اس کے آنے کی راہ تکتے تھے۔ ابھی پچھلے برس تو اس نے ادھر کالج کی بنیاد رکھوائی تھی۔ اب اللہ جانے اس کے بعد یہ کالج مکمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم تو لٹ گئے۔ ظالموں نے ہمارے سر سے ہمارا سائیاں چھین لیا۔'' بوڑھا زار زار روتا تھا اور بولتا جاتا تھا۔

کئی چینلز کے رپورٹر اس کی یہ گفتگو ریکارڈ کر رہے تھے۔ ذیشان اور شہریار نے بھی اس کی یہ ساری گفتگو سنی اور آنکھوں کو نم ہونے سے نہ روک سکے۔ کرنل کی زندگی کے اس پہلو سے وہ آج ہی آگاہ ہوئے تھے اور دل میں ان کی عزت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کیسی باکمال ہستی تھے وہ کہ ان کے جانے کے بعد ان سے وابستہ ہر شخص خود کو بے سہارا سمجھنے لگا تھا۔

وہ دونوں دریوں پر بچھائی گئی صاف ستھری چاندنیوں پر بیٹھ گئے۔ تابوت کو گھر کے اندر لے جایا گیا تھا تاکہ مستورات بھی جانے والے کا آخری دیدار کر لیں۔ اندر سے کبھی کبھی ذرا بلند آواز میں رونے کی آواز آ رہی تھی لیکن پھر لمحہ بھر میں ہی معدوم ہو جاتی تھی۔ شاید کوئی تھا جس کا ضبط جواب دے جاتا تھا۔ لیکن پھر یہ احساس ہونے پر کہ بظاہر دنیا سے چلے جانے والا تو حیاتِ جاوداں پا گیا ہے، گریہ کے آگے بند باندھ دیتا تھا۔ وہ خود بھی ایسی ہی کیفیات سے گزر رہے تھے۔ مرد تھے، دھاڑیں مار کر رو تو نہیں سکتے تھے لیکن اندر کی حالت دگرگوں تھی۔ خاص طور پر ذیشان تو بالکل ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ شہریار اسے حوصلہ دینے کے لیے کبھی کبھی اس کے شانے کو تھپتھپا کر خاموش تسلی دیتا تھا اور پھر خود بھی سر جھکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے میں اُنہیں احساس ہوا نہیں ہوا کہ کوئی بہت دیر سے انہیں غور سے دیکھ رہا ہے۔ جب وہ شخص ان کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''آپ لوگوں کی شہید سے کیا رشتے داری تھی؟'' وہ ان کے قریب بیٹھا ان سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ ہمارے عزیز تھے۔'' شہریار نے اسے گول مول سا جواب دیا۔ اس کی ٹی شرٹ پر موجود ایک ٹی وی چینل کا لوگو دیکھ کر وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی رپورٹر ہے لیکن بہرحال اس کا چہرہ اس کے لیے شناسا نہیں تھا۔

''اصل میں، میں شروع سے ہی اس واقعے کی کوریج کر رہا ہوں۔ ہسپتال میں بھی موجود تھا اور وہاں سے یہاں تک بھی مسلسل موجود رہا ہوں۔ اس دوران میں نے ان صاحب کو مستقل موجود پایا ہے اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے یہی لگا کہ یہ کرنل صاحب کے کوئی قریبی عزیز ہیں اس لیے میں ان کے تاثرات جاننا چاہ رہا تھا۔'' اس نے ذیشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت سلیقے سے اپنا مدعا بیان کیا۔



''کرنل صاحب ان کے آفیسر ہوتے تھے اور اس حوالے سے یہ ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر انہوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن کرنل صاحب سے عقیدت قائم رہی جب تک ان کی شہادت کی خبر سن کر رہ نہ سکے اور آپ انہیں دیکھتے رہے۔''

شہریار نے اسے مختصر جواب دیا۔ کیونکہ ذیشان کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی قسم کے سوال جواب کے موڈ میں نہیں ہے۔

''خیریت ہے، اتنے سے تعلق کی بنیاد پر ذمے داران نے انہیں اس حد تک ساتھ ساتھ رہنے کی اجازت دے ڈالی۔ ورنہ فوج والے تو ہم صحافیوں کو بھی بہت مشکل سے گھاس ڈالتے ہیں۔'' اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟ انہیں گھاس ملنے پر یا خود کو نہ ملنے پر؟'' شہریار کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا تو ذرا تیز لہجے میں بولا۔

''پلیز ناراض مت ہوں۔ میں نے تو اپنے صحافیانہ تجسس کی وجہ سے یونہی ایک بات پوچھ لی تھی۔'' وہ فوراً سنبھل گیا۔

''انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران دوسروں کے جذبات اور احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ معاف کیجیے گا، اس وقت ہماری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم میڈیا والوں کے اُلٹے سیدھے سوال و جواب کا سامنا کر سکیں۔'' شہریار نے اسے دھیمے لہجے میں ہی ٹھیک ٹھاک سنا ڈالیں تو وہ وہاں سے کھسک گیا۔

تھوڑی دیر بعد جنازہ اُٹھنے کا اعلان کیا جانے لگا۔ وہاں موجود جمِ غفیر کے ساتھ انہوں نے بھی کرنل کا آخری دیدار کیا، پھر سبز ہلالی پرچم میں لپٹے تابوت کو گھر کے قریب ہی واقع ایک میدان میں لے جا کر نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد شہید کو فوجی اعزاز کے ساتھ اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔

تدفین کے بعد ان کا وہاں کوئی کام نہیں رہا تھا، چنانچہ خالی پن کے احساس کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ابھی پنڈی کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ذیشان کے موبائل پر میجر عمر فاروق کی کال آنے لگی۔ وہ خود چاہنے کے باوجود جنازے میں شرکت کے لیے نہیں آ سکے تھے۔ کچھ پیشہ ورانہ مصروفیات نے ان کے قدموں میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔

''تم دونوں وہاں سے اسلام آباد پہنچو۔ کرنل سبکتگین آج شام چھ بجے تم سے ملاقات کریں گے۔'' ادھر کی کوئی بات کرنے کے بجائے انہوں نے پیغام دیا اور بتانے لگے کہ اسلام آباد میں انہیں کہاں ٹھہرنا ہے۔ وہاں سے کرنل سبکتگین کا آدمی خود انہیں پک کر لیتا۔

''ٹھیک ہے سر!'' ذیشان نے مؤدبانہ انداز میں انہیں جواب دیا تو سلسلہ منقطع ہو گیا۔

''لو بھئی، تمہاری فکر دور ہونے کا تو لگتا ہے انتظام ہونے جا رہا ہے۔ کرنل سبکتگین نے فوری ملاقات کا پیغام بھیجا ہے۔ فی الحال ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔ ملاقات کی جگہ کا وہاں پہنچ کر ہی علم ہو گا۔''

کال سے فارغ ہو کر اس نے شہریار کو خوشخبری سنائی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ بے پناہ اُداسی کا خول تڑخ گیا اور اندر ایک جوش اور سنسنی سی دوڑتی محسوس کرنے لگا۔ کرنل توحید کی شہادت کے بعد جس طرح ان پر سے راستے بند ہو گئے تھے، کرنل سبکتگین کے پیغام نے ان کے کھلنے کی اُمید باندھ دی تھی۔ کرنل کے قاتل کا غم اپنی جگہ لیکن جب تک دشمن سلامت تھے، وہ چین سے کیونکر بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں عمل کے لیے راہ

چاہئے تھی اور اچانک بند ہونے والی راہیں اب کھلنے کو ہی تھیں۔

⊛----✪----⊛

سلّو اپنے والدین سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگ کتنی آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ساری زندگی غربت و افلاس کی چکی میں پستے اس کے والدین کو تو شاید کبھی ایسا گھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا جہاں وہ مقیم تھے۔ زندگی کی تمام بنیادی سہولیات سے آراستہ اس گھر میں انہیں صرف ہاتھ ہلانے پر سب کچھ مل جاتا تھا اور ان کے پاس بیٹھ کر کھانے، پینے اور ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ گیٹ پر مسلسل موجود رہنے والے چوکیدار کے علاوہ گھریلو کاموں کے لیے بھی ایک مستقل ملازم موجود تھا۔ ہر فن مولا تھا اور کسی جن کی طرح احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔ جس دن سلّو والدین سے ملنے گیا، اس کی ماں نے خاص طور پر اس کے لیے مچھلی تیار کروائی۔ ملازم نے ایک دو مزید ڈشز کے ساتھ مچھلی تیار کر کے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی تو اس کی خوشبو ہی بڑی اشتہا انگیز تھی۔ سلّو نے کھائی تو بے اختیار تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''سچی بات ہے بیٹا! اپن نے ساری عمر مچھی (مچھلی) پکڑی اور کھائی ہے لیکن جیسی مچھی یہ بندہ پکاتا ہے وہ پہلے کبھی کھانے کو نہیں ملی۔'' سلّو کے باپ نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے ملازم کی تعریف کی۔

اپنے قیام کے دوران سلّو کو اندازہ ہو گیا کہ ملازم واقعی زبردست ہے اور یہ اس کے پکائے ہوئے کھانوں اور خدمت گزاری کا نتیجہ ہے کہ اس کے والدین کے مدقوق چہروں پر رونق آنے لگی ہے لیکن وہ لوگ کچھ اُداس بھی تھے۔

''اچھا کھانا پینا، عیش آرام سب ہے بیٹا! پر آزادی ختم ہو گئی ہے۔ کہیں آ جا نہیں سکتے، کوئی بات کرنے والا نہیں ہے۔ اپنوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ بس ہم بڈھا بڈھی بیٹھے ایک دوسرے کو ہی دیکھتے رہتے ہیں۔'' اس کی ماں نے اس سے شکوہ کیا۔

''اچھا ہے نا اماں! ویسے تو بابا سارا وقت سمندر میں رہتا تھا اور مشکل سے ہی گھر آتا تھا۔ اب تم بیٹھ کر آرام سے جی بھر کے اس سے باتیں کرو۔''

سلّو نے ماں کے شکوے کو مذاق میں ٹال دیا لیکن وہ ان کے مسئلے کو سمجھ رہا تھا۔ ان کا حال بالکل ایسا تھا جیسے کھلے پانی کی مچھلیوں کو کسی خوب صورت ایکوریم میں بند کر دیا جائے۔ زندگی گزارنے کے سارے لوازمات مچھلی کو ایکوریم میں بھی ملتے ہیں لیکن آزاد پانی کی خوشی تو نہیں مل سکتی۔ بس ان دونوں کا بھی یہی حال تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اپنے دوست احباب اور رشتے داروں سے بچھڑ گئے تھے اور انسان جیسا بھی ہو جانور بھلا تنہا رہ کر کب خوش رہ سکتا ہے؟ خود وہ بھی جلد ہی بے عملی کی زندگی سے گھبرا گیا۔

ماں باپ کے ساتھ رہنا خوشی کی بات سہی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان کے ساتھ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ دن کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا، اپنے معمول کی ورزشیں کرتا اور باقی وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزارتا۔ جلد ہی اُسے اُکتاہٹ ہونے لگی۔ میدانِ عمل میں رہنے والے آدمی کے لیے اتنی کم مصروفیت کے ساتھ لگی بندھی زندگی گزارنا بہت مشکل تھا۔ اوپر سے اُسے باہر نہ نکلنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ بھارت کو اس کے منظر پر آ جانے کے بعد یہ بات طے شدہ تھی کہ پاکستان میں موجود ''را'' کے ایجنٹس کو اس کے بارے میں ہوشیار کر دیا گیا ہو گا اور ہر ایجنٹ کو اس کی تصاویر فراہم کر کے ہدایت کر دی گئی ہو گی کہ وہ پھرتے اس شخص کو تلاش کرتے رہیں۔ سلّو مل جاتا تو ان کی پہلی ترجیح یقیناً اسے ختم کرنا ہوتی۔ کیونکہ وہ جان کر کہ ان کا تربیت یافتہ بندہ اب پاکستان کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے، بھارتیوں کے سینوں پر سانپ



لوٹ رہے ہوں گے۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ جو شخص ان کے کام نہیں آ سکا، وہ پاکستان کے کام آئے۔ ان کے علم میں بھی یہ سارے حقائق تھے لیکن اُس کی اُفتادِ طبع خطرے کو زنجیر بنا کر کہاں اُسے نچلا بٹھا سکتی تھی۔ کچھ نہیں سوجھی تو اپنی منگیتر سے ملاقات کے لیے کراچی جانے کی ٹھان لی اور منہ اندھیرے جبکہ سارے سو رہے تھے، حلیے میں معمولی سی تبدیلی کر کے ایک چھوٹے سفری بیگ کے ساتھ اس طرح گھر سے نکل گیا ہوا کہ گیٹ پر موجود چوکیدار کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ میک اپ کا فن اسے آتا تھا لیکن سامان کی دستیابی کی وجہ سے اپنے چہرے مہرے میں خاص تبدیلیاں نہیں کر سکا تھا اور کئی دنوں کی بڑھی شیو کو مشین نما داڑھی میں تبدیل کرنے کے علاوہ آنکھوں پر زیرو نمبر کے گلاسز لگانے اور سر پر کیپ رکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ خیال تھا کہ باقی کی تبدیلیاں موقع ملنے پر کر لے گا۔ اتنی صبح تو بازار کا رخ کرنے پر بھی کچھ ہاتھ نہیں ہوتا کہ منہ اندھیرے تو سارے بازار ہی بند پڑے ہوتے ہیں۔

گھر سے نکل کر ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے بھی اسے خاصی دُور تک پیدل چلنا پڑا۔ ٹیکسی اُسے ایک ہوٹل کے سامنے ملی جو سویرے سویرے اُٹھ کر ڈیوٹی جانے والے چھڑے مردوں کی ناشتے کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ہوٹل کچھ خاص صاف ستھرا نہیں تھا لیکن چائے اور پراٹھوں کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ سلّو ہوٹل میں داخل ہوا تو وہاں اس کے علاوہ دو تین ہی گاہک اور موجود تھے۔ یقیناً یہ آغاز دن نے اپنے لیے انڈے پراٹھے کے ساتھ دودھ پتی کا آرڈر دیا اور ناشتے کے دوران یہ جاننے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ ہوٹل کے باہر کھڑی ٹیکسی کا مالک وہ پٹھان لڑکا ہے جو کونے والی میز پر بیٹھا بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ملائی دار چائے میں پراٹھے کے نوالے ڈبو ڈبو کر کھانے میں مصروف ہے۔

سلّو اور اس لڑکے نے لگ بھگ ایک ساتھ ناشتہ ختم کیا۔ اور جیسے ہی وہ لڑکا ناشتے کے بعد باہر نکلنے لگا، سلّو اس کے پیچھے لپکا۔

''اسٹیشن چلو گے خان؟'' اس نے لڑکے کو آواز دے کر پوچھا تو وہ رک گیا لیکن چہرے پر تذبذب تھا۔

''کیا ہوا خان!..... کس سوچ میں پڑ گئے؟'' سلّو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں سر!..... اصل میں، میں رات کی شفٹ میں ٹیکسی چلاتا ہوں اور ناشتہ کرنے کے بعد گھر جاتا ہوں۔ اب آپ نے پکارا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کروں یا اقرار۔'' اس نے بہت صاف لہجے میں بات کی ورنہ سلّو کو تو اس سے گلابی اُردو کی توقع تھی۔

''آج اپنی روٹین میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو۔ مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے بعد گھر جا کر سو جانا۔ میں تمہیں کرایہ دوں گا۔'' سلّو نے اسے پیشکش کی۔ اصل میں وہاں اس وقت وہی واحد ٹیکسی موجود تھی۔ دوسرے لڑکا بھی اچھا لگا تھا اس لیے ڈبل کرایہ دینا بھی گوارا تھا۔

''لگتا ہے آپ کو بہت ضروری اسٹیشن پہنچنا ہے۔ ٹھیک ہے، میں لے چلتا ہوں۔'' لڑکا راضی ہو گیا اور سلّو کے بعد اپنی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا۔ اگلے ہی لمحے اس کی ٹیکسی فراٹے بھر رہی تھی۔

''دیکھا خان! کہیں نیند کے خمار میں ٹیکسی مت ٹھونک ڈالنا۔'' سلّو نے اسے تنبیہ کی۔

''فکر نہیں کریں سر! میں لائسنس یافتہ ڈرائیور ہوں اور ساتھ ہی ذمے دار شہری بھی۔ اگر نیند سے اتنا ہی ڈرتا ہوتا تو کبھی آپ کو اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا ''پڑھے لکھے لگتے ہو۔'' اس کی گفتگو کے انداز سے پہچان کر سلّو نے تبصرہ کیا۔

''جی پڑھ رہا ہوں۔ ایم اے کا فائنل ہے، اس کے بعد لاء کالج میں داخلہ لوں گا۔ سات سال سے

یہاں ہوں۔ ٹیکسی چلا کر اپنے خرچے بھی پورے کرتا ہوں اور تھوڑا بہت گھر والوں کو بھی بھیجتا ہوں۔ پہلے کرائے کی ٹیکسی چلاتا تھا، پھر پیسے جمع کر کے اپنی یہ سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی خرید لی۔ اس کو خریدنے کے چکر میں پڑھائی میں تھوڑا گیپ بھی آ گیا ورنہ اب تک ایم اے کر چکا ہوتا۔'' اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

''ایم اے پرائیویٹ کر رہے ہو یا ریگولر؟'' سلّو کو اس سے گفتگو میں لطف آنے لگا۔

''ایوننگ شفٹ میں ریگولر کر رہا ہوں جی۔ پرائیویٹ پڑھنے میں مزہ نہیں آتا۔ رات دس بجے تک کلاسز ہوتی ہیں، اس کے بعد ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کبھی ڈیڑھ دو بجے تک اور کبھی پوری رات۔ جس روز پوری رات چلاؤں تو اس ہوٹل میں ناشتہ کر کے گھر جا کر سو جاتا ہوں اور بارہ بجے کے بعد پھر نکل پڑتا ہوں۔ رات گھر گزارنے کی صورت میں بھی سوتا نہیں ہوں بلکہ فجر تک پڑھتا رہتا ہوں۔ سونے کی ٹائمنگ فجر کے بعد بارہ بجے تک کی ہی ہے۔'' اس نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔ شاید نیند سے بچنے کے لیے اسے بھی گفتگو جاری رکھنا مناسب لگ رہا تھا۔

''گڈ۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم بڑے آدمی ضرور بنو گے۔'' سلّو نے اسے سراہا۔ وہ سچ مچ اس لڑکے سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی اپنی زندگی تو بالکل مختلف انداز میں گزری تھی اور کم عمری میں ہی وہ بڑے بڑے تجربات کا سامنا کر چکا تھا لیکن شہریار کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کا جو عرصہ گزارا تھا، اس میں اس کے اندر بہت سی ایسی تبدیلیاں آئی تھیں جن کی بدولت وہ ایسے لوگوں کی قدر کرنے لگا تھا۔ پہلے اسے وطن اور حُبِ الوطنی جیسی کسی شے سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وطن کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور وطن کے لیے اس ٹیکسی ڈرائیور جیسے جوان کتنے اہم ہوتے ہیں۔

''تمہارا نام کیا ہے یار؟'' اس نے قدرے بے تکلفی سے لڑکے سے دریافت کیا۔

''زمرد خان۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا اور مزید بولا۔ ''یہ نام میری دادی نے رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری آنکھیں زمرد جیسی خوب صورت ہیں۔''

''وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔'' سلّو نے بیک ویو مرر میں نظر آتی اس کی آنکھوں کو دیکھ کر تائید کی۔

اسی وقت ٹیکسی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی اور زمرد خان نے اسے ایک مناسب جگہ لے جا کر روک دیا۔ سلّو نے ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھمایا اور خود ٹیکسی سے اُتر گیا۔

''میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں سر! میں آپ کو بقایا واپس نہیں کر سکوں گا۔ آپ مجھے چھوٹے نوٹ میں ادائیگی کر دیں۔'' ہزار کا نوٹ دیکھ کر زمرد خان نے اس سے کہا اور خود بھی باہر آ گیا۔

''میرے پاس بھی چھٹا نہیں ہے یار!..... ایسا کرو تم یہ سارے پیسے رکھ لو۔'' سلّو نے سخاوت کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں سر! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ جہاں سے میں نے آپ کو بٹھایا تھا، وہاں سے تو اسٹیشن تک کا کرایہ بھی اس سے کم ہی بنتا ہے۔ ایسا کریں آپ یہیں ٹھہریں، میں کہیں سے کھلا کروا کر لاتا ہوں۔'' سلّو کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ایک طرف دوڑ گیا۔ سلّو کے نزدیک انتظار کرنا فضول تھا۔ اسے زمرد خان اچھا لگا تھا اور وہ اس سے پیسے واپس لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ شانے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

سب سے پہلے اس نے کراچی کا ٹکٹ خریدا پھر ایک اسٹال سے اخبار خرید کر بینچ پر جا بیٹھا۔ سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب میں موجود تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لیتے ہوئے وہ یونہی سرخیوں پر نظر ڈالنے



لگا۔ اس کی مطلوبہ گاڑی آنے میں ابھی خاصا وقت تھا اس لیے وہ اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

''آپ یہاں بیٹھے ہیں سر! میں وہاں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔'' ابھی اس نے دو چار خبریں ہی دیکھی تھیں کہ زمرد خان وہاں چلا آیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''تم نے خوامخواہ اتنی زحمت کی یار! میں نے تم سے کہا تو تھا کہ بقایا رکھ لو۔'' سلّو نے اس کی خفگی کا مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں سر! مجھے بخشش لینا اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کبھی کسی پسنجر سے طے شدہ کرائے سے ایک روپیہ بھی زیادہ نہیں لیا۔ اپنی محنت کی کمائی میں جو برکت رکھی ہے اللہ نے، وہ کسی اور چیز میں نہیں ہوتی۔'' اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں جواب دیتے ہوئے بقایا سلّو کی طرف بڑھایا تو اس بار سلّو نے خاموشی سے روپے تھام لیے۔

زمرد خان کی شخصیت نے اسے متاثر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر شہریار کی اس لڑکے سے ملاقات ہوتی تو وہ بہت خوش ہوتا کیونکہ اس طرح کے دیانت دار اور غیور لوگ تو اس کے نزدیک اس ملک کا سرمایہ تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اس لڑکے سے شہریار کی ملاقات کروائے چنانچہ واپس جاتے ہوئے زمرد خان کو آواز دے کر واپس بلایا۔

''اپنا کوئی اتا پتہ تو دیتے جاؤ یار!'' بینچ سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دوستانہ لہجے میں بولا تو زمرد کی آنکھوں میں حیرت چمکی اور یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے مخاطب کوئی اور ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھنے میں ایک دم ہی اس کی نظر ایک چادر پوش آدمی پر پڑی جو لمبی نال والا پسٹل تھامے ہوئے تھا اور اس کا نشانہ یقینی طور پر سلّو تھا۔

''بچیئے سر!'' وہ زور سے چلّایا اور خود سے دو قدم کے فاصلے پر موجود سلّو کو جھپٹ کر زور سے دھکا دیا۔ اس کے دھکا دینے سے سلّو لڑکھڑایا اور اس کی طرف آتی گولی زمرد خان کے سر میں گھس گئی۔ وہ بے چارہ بنا کوئی آواز نکالے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس دوران سلّو اس چادر پوش کو دیکھ چکا تھا جس نے سائلنسر لگے پسٹل سے اس پر فائر کیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سر میں گولی لگنے کے بعد زمرد خان ہر طرح کی مدد سے بے نیاز ہو چکا ہے چنانچہ منظر سے غائب ہونے کی کوشش میں بھاگتے ہوئے چادر پوش کی طرف لپکا۔ اسٹیشن پر اس وقت بہت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ فائر بھی سائلنسر لگے پسٹل سے کیا گیا تھا اس لیے فوری طور پر کوئی متوجہ نہیں ہوا لیکن سلّو اور چادر پوش کی بھاگ دوڑ نے بالآخر لوگوں کو چونکا دیا۔ کچھ لوگوں نے زمرد خان کی نیچے گری لاش بھی دیکھ لی تھی۔ صبح کے باقی دن کی نسبت ذرا خاموش ماحول میں ہلچل سی مچ گئی۔ ادھر سلّو سب باتوں سے بے نیاز چادر پوش کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اس شخص کا لباس بے حد میلا اور پیوند زدہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی بھکاری ہو۔ بھاگتے ہوئے وہ دوسرے پلیٹ فارم تک پہنچا اور آڑ لے کر سلّو کی طرف لگاتار دو فائر کیے۔ لیکن اس بار سلّو غافل نہیں تھا سو اپنی جان سے خود کو نشانہ بننے سے بچا لیا۔ ساتھ ہی اپنا چھوٹا سا پسٹل نکال کر خود بھی دو فائر کیے۔ چادر پوش چھپا ہوا تھا اس لیے اس کے نشانہ بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تاہم سلّو اسے یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا مقابل بھی غیر مسلح نہیں ہے۔ اس کے پسٹل پر چونکہ سائلنسر نہیں لگا تھا اس لیے فائر کی آواز دور تک گئی تھی اور ردِعمل میں لوگ چیخنے چلّانے لگے تھے۔ چادر پوش اور سلّو دونوں ہی فی الحال اس چیخ و پکار سے بے نیاز تھے اور انہیں اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔

سلّو اُس شخص کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ زندہ ہاتھ آ جاتا تو بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی

تھیں۔ البتہ چادر پوش کا سب سے بڑا مقصد ہی شاید یہ تھا کہ کسی طرح اسے ہلاک کر دے۔ اس لیے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر بھاگتے ہوئے بھی اس نے سلّو کی طرف بلا دریغ دو مزید فائر کر ڈالے۔ اب وہ پلیٹ فارم نمبر تھری پر کھڑی ایک ریل گاڑی کی آڑ لے کر بھاگ رہا تھا۔

سلّو مستقل اس کے پیچھے تھا۔ اب اسے اپنے پیچھے بھی بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقینی طور پر اسٹیشن پر موجود پولیس اور سکیورٹی اہلکار حرکت میں آ چکے تھے۔ اسے ان لوگوں کی پروا نہیں تھی۔ بس وہ کسی طرح خود پر گولی چلانے والے کو چھاپنا چاہتا تھا لیکن وہ بھی خاصا پھرتیلا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اچانک ہی پینترا بدلا اور پلٹ کر سلّو پر فائر کرنے کے بعد خود تیزی سے ریل کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ سلّو کے پاس اس کا پیچھا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چادر پوش کے کیے ہوئے فائروں کی تعداد اس کے ذہن میں تھی اس لیے اس کے اندازے کے مطابق وہ تمام گولیاں فائر کر چکا تھا اور اسے اپنے پسٹل کو دوبارہ لوڈ کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔ شاید اسی مہلت کو حاصل کرنے کے لیے وہ بوگی میں گھسا تھا۔ سلّو نے بھی بھرپور پھرتی کا مظاہرہ کیا اور خود بھی اس بوگی میں گھس گیا۔ چادر پوش سچ مچ پسٹل کو لوڈ کر رہا تھا۔

''پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔'' بجائے ہاتھ پیر چلانے کے سلّو نے سیدھے سیدھے اسے اپنے ہاتھ میں موجود پسٹل کی مدد سے دھمکایا۔ ردِعمل اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ چادر پوش نے اس کے حکم کی تعمیل میں اپنا پسٹل نیچے پھینکنے کے بجائے پوری قوت سے اس کی طرف اُچھال دیا۔ نشانہ شاید سلّو کا چہرہ تھا لیکن بروقت جھکائی دینے سے وہ خود کو بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس دوران چادر پوش کو موقع مل چکا تھا کہ اس پر حملہ کر سکے۔ اس نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ سلّو پر چھلانگ لگائی اور کچھ ایسے انداز میں اس سے ٹکرایا کہ اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل چھوٹ کر بوگی کے کھلے دروازے سے باہر جا گرا۔ اسے پسٹل کی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنے مقابل پر اس کا براہِ راست استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اس شخص کو زندہ گرفتار کرنے کا خواہش مند تھا۔ جبکہ اس نے پہلے کے بعد دوسرا حملہ بھی اتنی وحشت سے کیا تھا کہ لگتا تھا اسے سلّو کی جان کے سوا کچھ درکار نہیں ہے۔ لیکن اب سلّو ہوشیار ہو چکا تھا چنانچہ اُس کے اس حملے کا بھرپور جواب دیا اور اس زور سے اس کے پہلو میں لات ماری کہ وہ عملاً اُڑتا ہوا بوگی کی دیوار سے جا کر ٹکرایا۔ بوگی بالکل خالی تھی۔

ہاتھا پائی کے دوران اس شخص کی چادر اُتر گئی اور اندر سے ایک میلا کچیلا کھچڑی داڑھی والا مرد برآمد ہوا۔ ظاہری حلیے کی خستگی کے باوجود سلّو نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا آدمی ہے اور بھکاریوں جیسا یہ حلیہ اس کا بہروپ ہے۔

زوردار ضرب کھانے کے بعد بھی وہ مقابلے سے پیچھے نہیں ہٹا اور ایک بار پھر سلّو پر حملہ آور ہوا جس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ لڑنے بھڑنے کے فن میں ماہر ہے۔ اس بار اُس نے سلّو کی ناک کو اپنے بھاری بھرکم سر سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ سلّو چہرے کا رخ پھیر کر ناک کو تو بچا گیا لیکن کان زد میں آ گیا۔ یہ بہت زوردار ضرب تھی۔ سلّو کا دماغ ہل کر رہ گیا اور طیش میں آ کر اس نے اپنے مقابل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اتنی زور سے نیچے پٹخا کہ وہ فوری طور پر اُٹھ نہ سکا اور سلّو اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اسی وقت کھلے دروازے سے پولیس والوں نے انٹری دی۔

''ہینڈز اَپ..... کسی نے حرکت کی تو اپنی جان سے جائے گا۔'' اے ایس آئی کے عہدے کے ایک



بندے نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے بڑھک ماری۔ اس کی بڑھک سے کم از کم سلّو تو نہیں ڈر سکتا تھا البتہ اس کے خیال کے مطابق اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اطمینان سے ہاتھ جھاڑتا ہوا اپنے مقابل کے سینے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ ایک بے گناہ کا قاتل ہے انسپکٹر صاحب! اسے گرفتار کر لیں۔'' اس نے اے ایس آئی کو مخاطب کیا۔

''مینوں بچاؤ مائی باپ! ایہہ مینوں قتل کرنا چاہندا اے۔ اس نے ہی اس ٹیکسی والے مُنڈے کو فیر (فائر) کر کے قتل کیا ہے۔'' بھکاری نما شخص نے بھی بلند آواز میں دہائی دی۔

''اوئے کرم داد! دونوں کو ہتھکڑی لگا کر تھانے پہنچاؤ۔ وہیں ان سے دو دو ہاتھ ہوں گے۔'' اے ایس آئی نے گرج کر اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم دیا تو وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

''قاتل میں نہیں، یہ ہے۔'' سلّو نے خود کو ہتھکڑی لگائے جانے پر مزاحمت کی۔

''یہ فیصلہ تو تھانے چل کر ہم کریں گے بچّو!'' اُس کے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اُسے ہتھکڑی لگا دی گئی۔

سلّو کو غصہ تو بہت آیا لیکن پی گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس چکر میں پڑ کر وہ کراچی جانے سے محروم ہو جائے گا لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟ اسے اس معاملے سے نمٹنا ہی تھا۔

ایک موبائل میں بٹھا کر اُنہیں تھانے لے جایا گیا اور بغیر کسی بات چیت کے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ پولیس والوں کے اس طرزِ عمل پر سلّو تلملا کر رہ گیا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے؟ تم لوگ ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے کیسے ہانک سکتے ہو؟ میں کوئی مجرم نہیں ہوں بلکہ ایک قاتل کی گرفتاری میں پولیس کی مدد کی ہے۔ اپنے صاحب سے کہو کہ میرا بیان ریکارڈ کرے اور مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے۔'' اس نے سپاہی کے سامنے احتجاج کیا۔

''ایس ایچ او صاحب ابھی ڈیوٹی پر نہیں آئے ہیں۔ وہ آئیں گے تو بیان ریکارڈ ہو گا۔'' سپاہی نے اسے جواب دیا اور مڑ کر جانے لگا

''وہ اے ایس آئی تو ہے نا..... وہ کیوں بیان ریکارڈ نہیں کرتا؟'' سلّو چلّایا۔

''وہ بھی فارغ نہیں ہیں۔ اُنہیں جائے وقوعہ کی رپورٹ تیار کرنی ہے، اس میں مصروف ہیں۔'' سپاہی بظاہر شریف بندہ تھا جو اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا ورنہ تھانے کے اصولوں میں اتنی بھی شرافت موجود نہیں ہوتی۔

''تم لوگوں کو اپنے اس رویّے کا جواب دینا ہو گا۔ مجھے ایک فون کال کرنے دو پھر دیکھتا ہوں کہ کیسے تم مجھے یوں تھانے میں روک پاتے ہو۔''

طیش میں آ کر وہ دھمکیوں پر اُتر آیا جن کا سپاہی نے کوئی اثر نہیں لیا۔ یقینی طور پر وہ ان سب چیزوں کا عادی تھا چنانچہ گردن موڑ کر اطمینان سے آگے بڑھ گیا۔

سلّو بھی تھک ہار کر لاک اپ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ گرفتار ہونے والے بھکاری کو یہاں بند نہیں کیا گیا تھا۔

یہاں اس کے ساتھ دو دوسرے قیدی موجود تھے جو اردگرد سے بے نیاز سگریٹ ہونٹوں سے لگائے ہوئیں کے مرغولے بنانے میں مصروف تھے۔ لاک اپ کی محدود فضا میں پھیلی بُو سے باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ سگریٹ کے اندر چرس بھری ہوئی ہے۔ شکل وصورت اور حلیے سے بھی وہ عادی مجرم اور چھٹے ہوئے

بدمعاش لگ رہے تھے۔

سلّو کو ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بے چینی سے یہاں سے نکالے جانے کا منتظر تھا۔ پولیس والوں نے اتنی ہوشیاری دکھائی تھی کہ ریلوے اسٹیشن پر ہی اس کا موبائل فون اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور عملاً وہ ان کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ لاک اپ میں فارغ اور بیزار بیٹھے اسے رہ رہ کر زمرد خان بھی شدت سے یاد آ رہا تھا روزگار اور تعلیم کے لیے اپنے گاؤں سے یہاں آ کر بسنے والے اس لڑکے کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے لیکن ایک ظالم گولی نے خواب بُننے والی ان آنکھوں کو ہی ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔ پیچھے پتہ نہیں کون کون تھا جو اس کے خوابوں کی تعبیر ملنے کی دعا کرتا، اس کی واپسی کی راہیں دیکھتا تھا۔ خود وہ بھی تو اس باہمت لڑکے سے کتنا متاثر ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جسے شہریار کے مطابق پاکستان کے سنہری مستقبل کی اُمید قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا ہوا تھا۔ چند انچ کی ایک گولی نے اس بے چارے کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔

اب اُسے اپنا کراچی جانے کا فیصلہ بھی احمقانہ لگنے لگا تھا۔ اُس کے اس عمل نے ایک بے قصور کی جان لے لی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کراچی جا کر آخر کیا کرتا؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی منگنی کی کیا حیثیت تھی کہ وہ اپنی منگیتر سے ملنے کو بے چین ہو جاتا۔ باقی رشتے ناتے بھی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے کہ وہ برسوں اپنے سارے عزیزوں سے دور رہا تھا اور واپس آیا بھی تھا تو لوگوں کو اس زہر سے ہلاک کرنے جو ''را'' والوں نے اُس کی رگ رگ میں بھر دیا تھا۔

لاک اپ میں گزرتے وقت میں اپنا تجزیہ کرتے اسے اس بات کا بھی ادراک ہو گیا تھا کہ وہ کسی محبت کی کشش میں کراچی نہیں جا رہا تھا بلکہ اپنی تھرلنگ طبیعت کی وجہ سے وہاں کا قصد کیا تھا۔ شاید اس کے اندر کہیں یہ خیال تھا کہ اس کی تاک میں رہنے والوں نے اس کی منگیتر کے گھر پر نظر رکھی ہوئی ہو گی کہ وہ وہاں آئے گا تو اسے دھر لیں گے اور وہ ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اس جال میں پھنسنے جا رہا تھا۔ لیکن یہاں تو لاہور سے نکلنے کی بھی نوبت نہیں آ سکی تھی اور حال یہ تھا کہ وہ خود ایک مجرم کی طرح لاک اپ میں بند تھا۔

اللہ اللہ کر کے کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد اسے ایس ایچ او کے تھانے پہنچ جانے اور شرفِ ملاقات بخشے جانے کی نوید سنائی گئی۔ ایک سپاہی کی نگرانی میں وہ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو اس نے بھکاری لگنے والے زمرد خان کے قاتل کو اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھا پایا لیکن خود اسے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی گئی۔

''ہاں بھئی طرم خان! سنا ہے تُو بڑا بے چین تھا مجھ سے ملنے کے لیے؟'' ایس ایچ او کا لہجہ اسے مخاطب کرتے ہوئے خاصا تحقیر آمیز تھا۔ سلّو کو خود پر خاصا جبر کرنا پڑا کہ وہ اس لہجے کے جواب میں بدتمیزی پیش نہ آئے۔

''جی ہاں، میں چاہتا تھا کہ آپ جلد از جلد میرا بیان ریکارڈ کر کے مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں تو میں اپنے کام دھندے نمٹاؤں۔'' اس نے خاصے تحمل سے جواب دیا۔

''کون سا کام دھندا؟..... شاپنگ سینٹر میں بم دھماکے کرنے کا یا بے گناہ لوگوں پر گولیاں چلانے کا؟'' ایس ایچ او کا لہجہ طنز اور تحقیر سے بھرا ہوا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کی بات سن کر سلّو کو جھٹکا لگا۔

''جو کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتے ہو کہ تم نے برسوں بھارت میں گزارے ہیں جہاں تمہیں ''را'' والوں نے دہشت گردی کی تربیت دے کر پاکستان میں تباہی پھیلانے کے لیے یہاں بھجوایا تھا اور ایسے ہی کسی الزام میں تم جیل میں بند تھے جہاں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے دوران



تمہیں فرار کا موقع مل گیا۔''

ایس ایچ او اُسے جو ہوش رُبا داستان سنا رہا تھا، اس کی اسے قطعی اُمید نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کچھ کہہ سکا تو بس اتنا کہ..... ''آپ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیں۔ پھر آپ کو میرے متعلق اچھی طرح علم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور میری کیا حیثیت ہے؟''

اس درخواست کے جواب میں ایس ایچ او نے ذرا نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور کڑک کر بولا۔

''کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تمہارے بارے میں۔''

''اور یقیناً یہ معلومات اِس شخص نے فراہم کی ہوں گی۔ ایک آدمی کا قاتل ہونے کے باوجود آپ نے اسے اپنے سامنے اتنی عزت سے بٹھا رکھا ہے۔'' اس بار سلّو کو بھی طیش آ گیا۔

''یہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اس کے ہاتھوں جو قتل ہوا، وہ محض اتفاق تھا۔ یہ تمہیں دیکھ کر گھبرا گیا تھا کیونکہ اسٹیشن پر تمہیں دیکھ کر اسے یہی خیال آیا تھا کہ تم دہشت گردی کی کوئی بڑی کارروائی کرنے جا رہے ہو۔ تمہیں کسی خطرناک حرکت سے روکنے کے لیے اس نے گولی چلائی تھی جو اتفاق سے اس ٹیکسی ڈرائیور کو لگ گئی۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی تحقیق کرنی ہے کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سچ مچ بے قصور تھا یا تمہارا کوئی ساتھی۔'' ایس ایچ او کے جواب نے اسے تلملا کر رکھ دیا۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری داستان اس بھکاری نے سنائی ہو گی جس کے بارے میں اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ''را'' ہی کا ایجنٹ ہے لیکن حیرت انگیز طور پر ایس ایچ او اسے پولیس کا بندہ قرار دے رہا تھا۔

''اگر یہ آپ کا بندہ ہے تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ آپ بھی ''را'' کے ایجنٹ ہیں اور اپنے ایک ساتھی کو تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔'' تلملاہٹ میں وہ ایسی تلخ بات کہہ گیا جو معاملے کو سدھارنے کے بجائے مزید بگاڑ کا سبب بنی۔

''را'' کا ایجنٹ کون ہے، یہ اس وقت ثابت ہو گا، جب ہم تمہیں ننگا کر کے چھت سے اُلٹا لٹکائیں گے۔'' ایس ایچ او نے غضب ناک لہجے میں اسے جواب دیا اور اسے لانے والے سپاہی کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔ ''لے جاؤ اسے اور اتنا مارو کہ یہ خود اپنا سارا اگلا پچھلا اُگل دے۔''

حکم ملتے ہی سپاہی نے اُسے گدی سے دبوچ لیا۔ سلّو اتنا کمزور نہیں تھا کہ کسی عام سے سپاہی کے قابو میں آ جاتا لیکن وہ ان لوگوں پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا کہ ان کا شمار اس کے دشمنوں میں نہیں ہوتا تھا۔

ایس ایچ او کے مقابل بیٹھا بھکاری اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا جیسے اطمینان ہو کہ سلّو کو پھنسانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اُس کے اس اطمینان پر سلّو کو ایک دم ہی طیش میں آیا اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس نے بالکل اچانک اس شخص پر ہاتھ ڈال دیا۔ کرسی پر بیٹھے اس شخص کو اس نے اتنی سرعت سے گردن میں ہاتھ ڈال کر کھینچا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن دبوچنے والا سپاہی بھی دیکھتا رہ گیا کہ آخر یہ بندہ کس طرح میری گرفت سے آزاد ہوا ہے۔ جب تک ایس ایچ او اپنا ریوالور سیدھا کرتا، سلّو اس بھکاری کو اپنی گرفت میں لیے ایک دیوار سے پشت ٹکا چکا تھا۔ پیچھے دیوار اور آگے شخص کے ہونے کی وجہ سے وہ مکمل طور پر محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھکڑیوں کے درمیان موجود زنجیر سے اس بری طرح اس شخص کی گردن کو گرفت میں لیا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھی ہاتھ نہیں چلا پا رہا تھا۔

''ہلنے جلنے کی غلطی مت کرنا ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔ لڑنا بھڑنا جانتے ہو، اس لیے اس داؤ کو بھی

اچھی طرح پہچانتے ہو گے۔ حرکت میں تمہاری اپنی جان جانے کا خطرہ ہے۔ سانس کی نالی کچل جائے گی۔''
اس نے نہایت سخت لہجے میں اس بھکاری سے کہا اور پھر ایس ایچ او کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس دوران
کر شاید پولیس اسٹیشن میں موجود تمام سپاہیوں کو اپنے کمرے میں جمع کر چکا تھا۔ لیکن وہ سب بھی اپنے
طرح اس صورتِ حال پر سخت بے بس نظر آ رہے تھے۔

''چھوڑ دو اسے۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' ایس ایچ او نے اسے گیدڑ بھبکی دی۔ ورنہ گولی
کہاں مارتا؟ گولی چلاتا تو پہلے وہ شخص نشانہ بنتا جسے وہ اپنا بندہ قرار دے چکا تھا۔

''میرا آپ کو مشورہ ہے انسپکٹر صاحب! کہ مزید غلطیاں مت کریں اور مجھے میرے بتائے ہوئے
ایک کال ملا کر دے دیں۔ تھوڑی دیر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' صورتِ حال
میں ہونے کے باوجود اس نے ایس ایچ او سے تہذیب کے دائرے میں بات کی۔

''میں کیسے تمہاری بات کا اعتبار کروں؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے
یہاں حملے کے لیے بلوا لو اور وہ تمہیں ہم سے چھڑوا کر لے جائیں۔'' ایس ایچ او بے چارہ تذبذب میں تھا۔

''جانے سے تو آپ مجھے اب بھی نہیں روک سکتے لیکن آپ کے اطمینان کے لیے میں آپ کو یہ
کر سکتا ہوں کہ پہلے آپ اپنی مدد کے لیے فورس طلب کر کے تھانے کی حفاظت کا بندوبست کر لیں پھر
بات کروا دیجیے گا۔'' اس نے پیشکش کی جو شاید ایس ایچ او کے دل کو لگی۔ اس نے ایک نظر اس کی گرفت
جکڑے بھکاری پر ڈالی اور پھر نمبر ملانے لگا۔ دھیمی آواز میں کچھ دیر کسی سے بات کرنے کے بعد وہ سلو
طرف متوجہ ہوا۔

''اب تم وہ نمبر بتاؤ جس پر بات کرنا چاہتے ہو؟''

سلو نے بلا جھجک روانی سے نمبر بتا دیا۔ اسے یہ نمبر ایک کوڈ ورڈ کے ساتھ دیا گیا تھا کہ جب
ضرورت ہو رابطہ کر لے۔ نمبر اسے زبانی یاد تھا۔ اس کے کہنے پر انسپکٹر نے نمبر ملایا اور فون کا اسپیکر آن کر
کیونکہ سلو نے اسے اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جانے پر
نے اپنا کوڈ ورڈ بتایا تو فوراً ہی اس کا رابطہ کسی ذمے دار سے کروا دیا گیا۔

''تم کہاں ہو؟..... چوکیدار نے کال کی تھی کہ تم غائب ہو اور تمہارے والدین کو بھی تمہارے بارے
میں کچھ علم نہیں؟'' دوسری طرف موجود شخص نے فوراً ہی اس سے سوال کیا۔

جواب میں سلو نے تفصیلات میں جانے کے بجائے مختصراً اپنی پولیس اسٹیشن میں موجودگی کا بتایا تو دوسری
طرف سے اسے یقین دلایا گیا کہ جلد ہی اس معاملے کو سنبھال لیا جائے گا۔ ایس ایچ او جانتا تھا کہ دوسری
طرف سے بات کرنے والا وہ بندہ کون ہے اور کس ادارے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے
ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران سلو کے شکنجے میں پھنسا شخص بہت بے چین لگ رہا تھا لیکن وہ بے بس
کہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ سلو نے اس کے نرخرے پر اس حد تک دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ بات چیت بھی کر
سے قاصر تھا اور بمشکل سانسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

ایس ایچ او اس صورتِ حال پر خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ عملے کے بیشتر افراد کو اس نے واپس کر
سے باہر بھیج دیا تھا۔

مزید پانچ منٹ گزرے تو اسے اوپر سے کسی افسر کا فون آ گیا۔ فون آنے کے بعد اس کا انداز



بدل گیا۔ اس نے سلو کو پیشکش کی کہ وہ اس کی ہتھکڑیاں کھلوا کر اس شخص کو ہتھکڑی لگا دیتا ہے۔ لیکن احتیاط
کے پیشِ نظر سلو نے اس کی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔

مزید بیس منٹ اسی پوزیشن میں گزر گئے اور پھر پولیس اسٹیشن جوتوں کی کھٹا کھٹ اور سیلوٹ مارنے
والوں کی آوازوں سے بھر گیا۔ آنے والے صرف چار تھے جن میں سے ایک کے جسم پر پولیس اور دوسرے
کے جسم پر آرمی کی یونیفارم تھی جبکہ باقی دو سادہ لباس میں تھے۔ پولیس والا ایس پی رینک کا جبکہ فوجی کیپٹن
کے عہدے کا بندہ تھا۔ ایس ایچ او کی تو اپنے افسر کو دیکھ کر ہی حالت پتلی ہو گئی۔ باقی رہی سہی کسر آنے والوں
کے اپنے شناختی کاغذات پیش کرنے سے پوری ہو گئی۔ فوری طور پر سلو کو ہتھکڑی سے آزاد کروا کر دوسرے
کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔

ایس ایچ او بے چارہ اپنی نگرانی میں یہ سارے کام کرواتا اپنی صفائی بھی پیش کرتا رہا۔ اس کے مطابق
وہ گزشتہ پانچ سال سے پولیس کے مخبر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگتا تھا اور
کئی بار اس نے پولیس کو مفید معلومات فراہم کی تھیں اور مجرموں کو گرفتار کروایا تھا اس لیے پولیس والے اس پر
اعتماد کرتے تھے اور اپنا بندہ قرار دیتے تھے۔ بلیک مارکیٹ سے پسٹل بھی اس نے پولیس کی مدد سے ہی خریدا
تھا کہ کسی مشکل کے وقت کام آ سکے۔ اس کے سابقہ ریکارڈ کی وجہ سے ہی آج اس کے سلو کے بارے میں
ان کو بلا جھجک قبول کر لیا گیا تھا۔

''تم احمق ہو۔ تمہیں اس بات کا خیال نہیں آیا کہ اگر یہ عام سا بھکاری مخبر ہوتا تو کیسے جان سکتا تھا کہ یہ
لڑکا ''را'' کا تربیت یافتہ ہے اور اسے ''را'' نے دہشت گردی کے لیے پاکستان بھیجا ہے۔'' ایس پی نے ایس
ایچ او کی بات سن کر اسے لتاڑا جس پر وہ صرف ''سوری سر!'' ہی کہہ سکا۔

''باقی سب چھوڑیں ایس ایچ او صاحب! یہ بتائیں کہ اسے یہاں موبائل وغیرہ تو استعمال کرنے کی
اجازت نہیں دی گئی تھی؟'' سادہ پوشوں میں سے ایک نے پوچھا جس پر ایس ایچ او نے ایک سب انسپکٹر کی
طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خود تو بہت تاخیر سے وہاں پہنچا تھا اور گرفتاری کرنے والا اے ایس آئی بھی
تھوڑی دیر تھانے میں رُکنے کے بعد وہاں سے نکل گیا تھا۔

''موبائل کا نہیں معلوم صاحب! اپنا بندہ ہونے کے خیال سے ہم نے اس کی تلاشی نہیں لی تھی اور بس
روک لیا تھا کہ کسی بھی وجہ سے سہی، تمہارے ہاتھوں بندہ تو مارا گیا ہے۔ اس لیے ضمانت ہونے تک یہیں رہنا
ہو گا۔'' سب انسپکٹر نے جواب دیا جس پر ایک بار پھر ایس پی سے ایس ایچ او کو ڈانٹ پڑی اور پھر ملزم کی
تلاشی لی گئی۔ اس کے چغے کی اندرونی جیب سے موبائل نکل آیا لیکن وہ کوئی میسج یا کال ریکارڈ نہیں کر سکے۔

ظاہر ہے کہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ اس قسم کا ریکارڈ سنبھال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ ریکارڈ کی انہیں فکر بھی
نہیں تھی۔ وہ موبائل کمپنی سے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کیپٹن نے پولیس سے ملزم کو اپنی کسٹڈی میں لیا اور پھر
ان سب کی وہاں سے روانگی عمل میں آئی۔

ایس پی اور کیپٹن اپنی اپنی الگ گاڑیوں میں آئے تھے جبکہ سادہ پوش جو سی ایف پی کے اہلکار تھے، الگ
گاڑی میں آئے تھے۔ سلو اور گرفتار شدہ بندے کو اسی گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑیاں اپنی اپنی منزل کی طرف
روانہ ہو گئیں۔ سی ایف پی والی گاڑی آگے بڑھی تو اس کے پیچھے ہی پولیس اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر موجود ایک
موٹر سائیکل حرکت میں آ گئی جس کے سوار کا چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا۔

⊛----✪----⊛

''گڈ.....ویری گڈ۔'' ڈیوڈ تک اس کے مطلب کی خبر پہنچی تو وہ کھل اُٹھا۔ اس کا میڈیا کے کسی بندے کے ذریعے اپنے مطلوبہ افراد کو ٹریس کرنے کا آئیڈیا کافی کامیاب رہا تھا۔ اُس کے ہائر کردہ رپورٹر نے کرنل کے جنازے میں شرکت کرنے والے چند افراد کی نشاندہی کی تھی جو اس کے مطابق کسی خفیہ ادارے سے ہو سکتے تھے۔ رپورٹر ڈیوڈ کے نمک خوار خان کا خاص بندہ تھا جو بھاری معاوضے پر پہلے بھی اس کے لیے خدمات انجام دیتا رہا تھا چنانچہ اس بار بھی اس نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے کام کر دکھایا۔

رپورٹر کا وہ ساتھی ایک ٹیکنیشن تھا۔ رپورٹر اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر ان افراد کی فہرست تیار کرتا رہا جو اس کے مطابق کسی خفیہ ادارے سے متعلق ہو سکتے تھے اور ٹیکنیشن نے ان افراد کی گاڑیوں میں خفیہ ڈیوائس نصب کر دی تھی۔ اس ڈیوائس کی مدد سے گاڑی میں ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ رپورٹر اور ٹیکنیشن صاحب جس قسم کی حرکتیں کرتے تھے، انہیں انجام دینے کے لیے انہوں نے کئی چھوٹے موٹے ضروری ''فن'' بھی سیکھ رکھے تھے جن میں سے ایک فن بند تالوں کو صرف ایک تار کی مدد سے کھولنا بھی تھا۔ چینل کی وین میں بیٹھ کر تکنیکی مسائل سے نمٹنے کے بہانے چالاک ٹیکنیشن مستقل اس حصے میں موجود رہا جہاں جنازے کے شرکاء کی گاڑیاں پارک تھیں۔ اپنی وین سے نکل کر مطلوبہ گاڑی کا لاک کھولنے اور اس میں ڈیوائس نصب کرنے میں اسے چند منٹ ہی لگتے تھے۔ انہوں نے کُل چار گاڑیوں میں ڈیوائسز نصب کی تھیں جن میں سے ایک گاڑی ذیشان کی تھی۔ اتفاق سے دورانِ سفر ذیشان کے موبائل پر میجر عمر فاروق کی کال آ گئی اور یہ اہم اطلاع مخالفین تک پہنچ گئی کہ آج کرنل سبکتگین ان دو افراد سے ملاقات کرنے والے آدمی ہیں۔

رپورٹر ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے اپنے نزدیک مشکوک تمام تمام افراد سے پہلے ہی تھوڑی بہت بات چیت کر کے انہیں ٹٹول لیا تھا۔ ذیشان اور شہریار سے بھی اس کی گفتگو ہوئی تھی اور اس گفتگو سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ذیشان فوج کا سابقہ ملازم تھا جو صرف کرنل سے اپنی جذباتی وابستگی کی وجہ سے اس کے جنازے میں شرکت کے لیے آیا تھا لیکن اسے کرنل سبکتگین کی طرف سے ملنے والے پیغام نے ثابت کر دیا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس نے خان تک رپورٹ پہنچا دی اور خان نے ڈیوڈ کے نمائندے تک۔ ڈیوڈ کو یہ خبر ملی تو وہ کھل اٹھا۔ اسے ایسے ہی کسی کلیو کی تو تلاش تھی۔

''کرنل سبکتگین سمیت ان دونوں بندوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ۔'' اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

''یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں سر! کرنل سبکتگین آن سروس افسر ہے جبکہ میجر ذیشان نے بالکل اچانک فوج سے استعفیٰ دے کر ایک سکیورٹی ایجنسی جوائن کر لی تھی۔ سی ایف پی نام کی یہ سکیورٹی ایجنسی ملک کے تمام بڑے شہر میں کام کر رہی ہے اور بھاری معاوضے پر اداروں اور افراد کو سکیورٹی گارڈز فراہم کرتی ہے۔ کمپنی کا ریکارڈ بہت اچھا ہے اس لیے لوگ خوشی سے بھاری معاوضوں پر ان کے گارڈز ہائر کرتے ہیں۔ سی ایف پی کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہے اور میجر ذیشان وہیں موجود ہوتا ہے۔ اس دوسرے بندے عادل خان کو بھی اس کے ساتھ کبھی کبھار دیکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ کچھ نہیں معلوم کہ اس کی رہائش گاہ کہاں ہے اور ذریعۂ معاش کیا ہے۔'' ماتحت نے مستعدی سے رپورٹ پیش کی تو ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما اٹھا۔

''میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ یقیناً سی ایف پی نامی اس سکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں ہی وہ خفیہ ادارہ کام کر رہا ہے جس نے اتنے عرصے سے ہمیں ناکوں چنے چبوا رکھے ہیں۔ ٹھیک ہے، اب میں ان سے



نمٹ لوں گا۔'' اس کے شاطر دماغ نے فوراً ہی درست اندازے قائم کر لیے۔

''ذیشان اور عادل خان پر کڑی نظر رکھو۔ دیکھو کہ شام میں کرنل سبکتگین سے ملاقات کر کے وہ کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ہو سکے تو ملاقات کی تفصیل بھی حاصل کرو۔ یہ بہت اہم کلیو ہمارے ہاتھ آیا ہے، اسے ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اس کلیو کی مدد سے ہم بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس رپورٹر کو اب درمیان سے ہٹا دو اور اپنے تربیت یافتہ اور ہوشیار بندوں کو پیچھے لگاؤ۔ اب کسی غلطی کا چانس نہیں ہے۔'' حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں احکامات جاری کیے۔

''یس سر!'' ماتحت اُسے یقین دہانی کروا کر تعمیل کے لیے روانہ ہو گیا جبکہ ڈیوڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ملنے والی کامیابیوں کی امید نے اس کے موڈ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

⊛----✪----⊛

''ایک موٹر سائیکل ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔'' اُنہیں تھانے سے نکل کر دس منٹ گزرے تھے کہ سلّو نے کسی کو بطورِ خاص مخاطب کیے بغیر یہ اطلاع دی۔

''کون سی موٹر سائیکل؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سلمان چونکا۔ ان کے آگے پیچھے اچھا خاصا ٹریفک تھا اس لیے اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ سلّو نے کس موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''وہ ون ٹو فائیو جس کے سوار نے نیلا اپر پہن رکھا ہے اور سر پر ہیلمٹ ہے۔ وہ پولیس اسٹیشن سے ہی ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

سلّو نے اپنے سابقہ اطمینان سے جواب دیا تو ان کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار مخبر بھکاری کا چہرہ اُتر گیا۔ گرفتاری کے باوجود وہ اب تک اس لیے مطمئن تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں کی اردگرد موجودگی کا یقین تھا۔ لیکن سلّو کی ہوشیاری نے اس کا یہ اطمینان بھی رخصت کر دیا تھا۔

''کیا کرنا ہے؟'' سلمان نے ساتھ والی سیٹ پر موجود جاوید علی سے پوچھا جس کے زخم مکمل طور پر تو نہیں بھرے تھے لیکن بوریت سے گھبرا کر وہ آج یونہی دفتر چلا آیا تھا جہاں پہلے اسے سلّو کے غیاب کی خبر ملی اور پھر یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ ایک پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔ سلمان اس کی بازیابی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو لیا اور اب اپنے زخموں کو بھول کر ایکسائیٹڈ نظر آ رہا تھا۔

''آنے دو اُسے۔ ذرا مل کر اس کا شجرۂ نسب معلوم کر لیتے ہیں۔'' اس نے سلمان کو جواب دیا۔ اس جواب سے سلمان سمجھ گیا کہ وہ کیا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ گاڑی پُرہجوم سڑکوں سے ہٹا کر ایسے راستوں کی طرف لے جانے لگا جہاں وہ اطمینان سے اپنی کارروائی کر سکیں۔ مستقل پیچھے آتے موٹر سائیکل سوار کی موجودگی نے تصدیق کر دی کہ سلّو کا اس کے بارے میں دعویٰ درست ہے۔ وہ واقعی ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ خاموشی سے اپنے ہتھیار نکال کر وہ اس سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔

وہ تین تھے اور ایک اکیلے بندے کو قابو کرنے کے لیے انہیں زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہیں تھی اس لیے انہیں ریلیکس بھی نظر آ رہے تھے۔

سلمان نے گاڑی کو گھما پھرا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جہاں سڑک کا حشر خراب تھا اور دونوں اطراف جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سڑک کی حالت اور علاقے کی ویرانی کی وجہ سے لوگ عموماً اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے کیونکہ اکثر اوقات یہاں راہ زنی کی وارداتیں بھی پیش آ جاتی تھیں۔

ان کا پیچھا کرنے والا موٹر سائیکل سوار اس سڑک پر بھی ان کے پیچھے ہی تھا۔ سلمان نے سڑک کے

تقریباً وسط میں پہنچ کر اچانک ہی اپنی گاڑی روک لی۔ گاڑی اس انداز میں روکی گئی تھی کہ سڑک پر سے گزرنے کا راستہ بالکل باقی نہیں رہا تھا۔ موٹر سائیکل سوار کو بھی رُکنا پڑا۔

''کیا بات ہے؟..... کیوں اس طرح راستہ روکا ہے؟'' بجائے خوف زدہ ہونے کے وہ پُراشتعال لہجے میں چلّا کر دریافت کرنے لگا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم کس لیے ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟'' جاوید علی ہاتھ میں پسٹل لیے گاڑی سے نیچے اُترا اور کڑے لہجے میں باز پرس کی۔ پسٹل دیکھنے کے باوجود موٹر سائیکل سوار کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات تو نہیں دیکھے جا سکتے تھے لیکن باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ قطعی نہیں ہے۔

''یہ تو تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا۔'' اس نے معنی خیزی سے جاوید علی کے سوال کا جواب دیا اور پھر زور سے چلّایا۔ ''اے..... ہلنا مت۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اس کا مخاطب سلّو تھا جو بالکل ہی اچانک گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سوار کی للکار کا کوئی اثر نہیں لیا اور دائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ موٹر سائیکل سوار نے فوراً اس کی طرف ایک گولی داغی لیکن سلّو بال بال بچ گیا۔ دوسری گولی چلنے سے قبل وہ جھاڑیوں میں روپوش ہو چکا تھا۔

اس مختصر سے دورانیے میں وہاں مزید تبدیلیاں بھی آئی تھیں۔ عموماً ویران رہنے والی سڑک پر نہ جانے کیسے دونوں اطراف سے گاڑیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ گولی کی آواز کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کے بریکوں کی چرچرائے اور کھٹا کھٹ دروازے کھولتے ہوئے ان میں سے کئی افراد برآمد ہوئے۔ ان افراد میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں جدید اور بھاری ہتھیار موجود تھے۔ سلمان اور جاوید علی کی سمجھ میں آ گیا کہ موٹر سائیکل سوار کے اس قدر اطمینان کا کیا سبب تھا۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے یقیناً وہ اپنے ساتھیوں سے مسلسل رابطے میں تھا اور انہیں اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے گھیرنے کا پروگرام بنا کر اس سڑک کا رخ کیا تھا۔ یقیناً وہ ان کا پروگرام سمجھ گیا اور اُلٹا انہیں ہی گھیرنے کی منصوبہ بندی کر لی۔

''اب تم لوگ اپنے ہتھیار پھینک کر شرافت سے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' موٹر سائیکل سوار نے انہیں حکم دیا جس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں بہت بری طرح پھنس چکے تھے۔

''تیسرا ادھر جھاڑیوں میں گھسا ہے۔ اسے تلاش کرو۔'' سلمان اور جاوید علی ناچار اس کے حکم پر عمل کرنے جا رہے تھے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو دوسرا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تین چار افراد جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ ابھی پہلے آدمی نے جھاڑیوں میں قدم رکھا تھا کہ گولی چلی اور موٹر سائیکل سوار کے سر سے نیچے گرا۔ گولی نے اس کی گردن پر عین ہیلمٹ کے نیچے چھید کیا تھا۔ اسے چیخنے تک کا موقع نہیں ملا۔ البتہ جاوید علی اور سلمان نے موقع کا خوب فائدہ اٹھایا اور فوراً ہی زمین پر گر کر گاڑی کے نیچے لڑھک گئے۔ دوسری طرف موجود دشمنوں کی موجودگی میں ان کے پاس یہی عارضی پناہ گاہ تھی جہاں وہ کچھ دیر خود کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچا سکتے تھے۔

موٹر سائیکل سوار کی ہلاکت کے بعد وہاں بے تحاشا فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ وہ لوگ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اور باقاعدہ کسی سمت کا تعین نہیں کیا تھا۔ کچھ کے ہتھیاروں کا رخ ان کی گاڑی کی طرف تھا اور کچھ جھاڑیوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ جاوید علی نے بھی اپنے پسٹل سے چند فائر کیے لیکن ظاہر ہے یہ فائر بے اثر تھے۔ البتہ سلمان کو موقع مل گیا تھا کہ وہ گاڑی کی تہ میں موجود خفیہ خانہ کھول کر اس میں سے ہتھیار



نکال سکے۔ ہتھیار نکالنے کے دوران وہ ہیڈ کوارٹر رابطہ کر کے مختصراً صورتِ حال اور اپنی پوزیشن کے بارے میں بھی اطلاع دے چکا تھا۔ ہتھیار ہاتھ میں آئے تو دونوں نے ایک ایک جانب جواب دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مخالفین کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ گاڑی کے نچلے حصے میں کوئی ایسا خفیہ خانہ موجود ہے جہاں ہتھیار چھپائے گئے ہیں اس لیے جب زوردار جواب ملا تو بوکھلا کر رہ گئے۔

ادھر سلّو نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ وہ بہت چالاکی سے اپنی جگہ بدل بدل کر فائر کر رہا تھا۔ لیکن اس کا ہر فائر اتنا سوچا سمجھا تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کی زد میں ضرور آ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ خود ان لوگوں کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا جو کسی صورت ان کی زد میں نہیں آ پا رہا تھا۔

''پٹرول ٹینک میں سوراخ ہو گیا ہے۔'' گولیوں کی گونج میں جاوید علی نے وحشت زدہ لہجے میں ہڈیوں کا گودا جما دینے والا انکشاف کیا تو سلمان کو بھی زمین پر گرتا پٹرول دکھائی دے گیا۔

''ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا اور پھر دونوں نے ہی اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے فوری طور پر لائحہ عمل بھی طے کر لیا۔ سڑک پر پیچھے کی جانب موجود افراد زیادہ مشکل میں تھے کیونکہ سلّو کی گولیوں کا نشانہ تو زیادہ تر وہی لوگ بنے تھے اور ان کی نفری میں تین افراد کی کمی ہو گئی تھی۔ صرف دو موجود تھے جن میں سے ایک کی توجہ جھاڑیوں کی طرف تھی۔ جاوید علی اور سلمان نے خطرہ مول لیتے ہوئے اس طرف بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی اور موقع پا کر گاڑی کے نیچے سے نکل کر جھاڑیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ عین اسی وقت فضا میں پولیس کی گاڑی کا سائرن گونجنے لگا۔ حملہ آوروں کی توجہ بٹ گئی چنانچہ ان کی طرف کوئی فائر نہیں کیا گیا اور وہ بخیر و خوبی جھاڑیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جھاڑیوں میں گر کر ابھی وہ سنبھلے بھی نہیں تھے کہ فضا میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔ یہ ان کی گاڑی کا پٹرول ٹینک پھٹنے کی آواز تھی۔ وہ موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ البتہ وہ بھکاری مخبر ضرور جان سے چلا گیا تھا جو گاڑی کی پچھلی نشست پر ہتھکڑی سے بندھا بے بس بیٹھا تھا۔ اس کی ہتھکڑی کو گاڑی کی چھت سے لگے ایک کلپ سے منسلک کر دیا گیا تھا اس لیے وہ گاڑی سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے اسے نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ ان کے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔

جھاڑیوں میں گر کر سنبھلتے ہی انہوں نے دوبارہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا۔ سلّو کے مقابلے میں انہوں نے بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی تھی اور ایک دوسرے سے مخالف سمت میں جھاڑیوں کے اندر ہی اندر حرکت کرتے ہوئے اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ سڑک پر آگے پیچھے موجود دشمنوں کے نسبتاً نزدیک پہنچ جائیں۔ اُنہیں اندازہ تھا کہ پولیس سائرن سن کر اب وہ لوگ فرار کی کوشش کریں گے اس لیے ان کی پہلی ترجیح ان کی گاڑیوں کو ناکارہ بنانا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہے۔ فرار کی راہیں مسدود پا کر دشمن ایک بار پھر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ فائرنگ کے اس شور میں پولیس والوں کی طرف سے کی جانے والی وہ اناؤنسمنٹ بھی سنائی دے رہی تھی جو وہ ہتھیار پھینکنے کے لیے کر رہے تھے۔ جب کسی پر اس اعلان کا اثر نہیں ہوا تو پولیس والے بھی میدان میں کود پڑے۔ ہر طرف سے گھر جانے والے دشمن کو آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ہتھیار پھینک کر جب وہ سامنے آئے تو صرف دو بچے تھے۔ باقی یا تو شدید زخمی تھے یا ہلاک ہو چکے تھے۔ گرفتاری دینے والے دونوں افراد میں سے بھی ایک کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا جبکہ دوسرے کے

چہرے پر خراشیں تھیں۔ شاید اس کا چہرہ سڑک سے رگڑ کھا گیا تھا۔ پولیس والے انہیں ہتھکڑیاں پہنانے لگے تو وہ تینوں بھی جھاڑیوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ انہیں پولیس والوں کے ساتھ ساتھ سی ایف پی کے چند اہلکار بھی نظر آ رہے تھے۔ انہی اہلکاروں میں سے ایک نے بتایا۔

''پولیس اور ہم ساتھ ساتھ ہی یہاں پہنچے تھے۔ انسپکٹر نے ہم سے تعاون کیا اور ہم نے مل کر کارروائی کی۔''

''ٹھیک ہے۔ ان دونوں بندوں کو ہم ساتھ لے جائیں گے۔ لاشیں اور شدید زخمی پولیس اپنے ساتھ لے جا سکتی ہے لیکن میڈیا کے لیے پولیس کا بیان یہ ہونا چاہئے کہ یہ لوگ ڈاکو تھے جنہیں ڈکیتی کی واردات کرتے دیکھ کر پولیس نے للکارا اور جواب میں ڈاکوؤں کی طرف سے فائرنگ پر خود بھی اسلحے کے استعمال پر مجبور ہو گئی۔''

اس موقع پر سلمان نے آگے بڑھ کر معاملات نمٹانے شروع کر دیئے۔ گرفتاری دینے والے دونوں افراد کے علاوہ وہ باقی زخمیوں کی حالت کا جائزہ لے چکا تھا۔ طبی امداد مل جانے پر بھی ان کی جان بچنا مشکل تھی۔ اگر کوئی قسمت سے بچ بھی جاتا تو بہرحال اسے عرصہ دراز تک بستر پر رہنا پڑتا۔ چنانچہ فوری طور پر کام آنے والے بندوں کے علاوہ انہوں نے سب کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بعد میں بچنے والے سے آرام سے نمٹا جا سکتا تھا۔

''او کے سر! میں سمجھ گیا..... آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔'' پولیس پارٹی کے انچارج نے اسے جواب دیا تو وہ لوگ قیدیوں سمیت اس گاڑی میں سوار ہونے لگے جو سی ایف پی والے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی اپنی گاڑی تو تباہ ہو چکی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ آنے والے ہائی روف میں آئے تھے اس لیے کار کے مقابلے میں زیادہ لوگ سما گئے تھے۔ قیدیوں کو انہوں نے پولیس کی لگائی ہوئی ہتھکڑیوں کے علاوہ سر پر اور چہرے پر سیاہ غلاف منڈھ کر بالکل بے بس کر دیا تھا۔

تیزی سے ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد انہوں نے قیدیوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس چکر میں کسی نے سلّو سے بھی باز پرس نہیں کی کہ وہ بغیر اطلاع کے کیوں غائب ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ اس کی پھرتی کا نتیجہ تھا کہ وہ گھیر لیے جانے کے باوجود مکمل بے بس ہونے سے بچ گئے تھے اور اب دو اہم قیدیوں کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔

جاوید علی نے بغیر وقت ضائع کیے پہلے ہی مرحلے پر جارح انداز میں تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں دونوں نے بہادری دکھانے کی کوشش کی لیکن جب جاوید علی نے نمک میں ڈوبی ایک پتلی راڈ سے بازو پر گولی کھانے والے کے زخم کو کریدنا شروع کیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ سب ''را'' کے فائننگ ونگ سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں مقامی انچارج پانڈے کی طرف سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی مزید کوشش کے بعد اس نے پانڈے کا پتہ بھی اُگل دیا۔ فوراً ہی ایک ٹیم تشکیل دے کر جاوید علی اور سلمان، ریڈ کے لیے تیار ہو گئے۔ سلّو کی خواہش پر اسے بھی ساتھ لے لیا گیا۔

پانڈے جس کوٹھی میں مقیم تھا، وہ شہر کے پوش علاقے میں تھی۔ سی ایف پی کے اہلکاروں نے کوٹھی کو گھیر لیا اور ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا۔ مقامی تھانے کو پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہاں ایک خفیہ محکمہ کارروائی کرنے جا رہا ہے اس لیے پولیس مداخلت نہ کرے۔

کوٹھی میں نگرانی کرنے والے کیمرے نصب تھے۔ کتے اور مسلح گارڈز بھی موجود تھے لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ سی ایف پی کے زوردار حملے کے سامنے ٹھہر سکیں۔ سی ایف پی کے اہلکار جارحانہ کارروائی کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ پانڈے کو انہوں نے ایک کمرے میں صوفے کے



نیچے چھپا پایا۔ دو اہلکاروں نے گھسیٹ کر اسے باہر نکالا تو اس کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کی حالت پتلی ہے۔ ایک اہلکار نے اس کی گدی پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے اسے کمرے سے باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی لیکن حیرت انگیز طور پر پانڈے نے مزاحمت کی اور خود کو باہر دھکیلنے والے کو پلٹ کر بہت زور سے دھکا دیتے ہوئے اسی صوفے کی طرف چھلانگ لگائی جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔ اہلکار نے اضطراری طور پر گولی چلا دی۔ گولی پانڈے کے کولہے میں لگی اور وہ ایک دل دوز چیخ مارتا ہوا صوفے کے قریب ہی گر گیا۔ اگلا لمحہ مزید حیرت انگیز تھا۔ اس نے بے پناہ تکلیف میں ہونے کے باوجود صوفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ یقیناً یہ اس کا اپنا ریوالور تھا جو اس نے وہاں چھپا دیا تھا اور سی ایف پی والے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکے تھے۔

''ریوالور پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اسے مسلح دیکھ کر سی ایف پی کا ایک اہلکار للکارا۔ پانڈے کا چہرہ کولہے پر لگنے والی گولی کی تکلیف کی وجہ سے مسخ ہو رہا تھا، اس کے باوجود اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مزید بھیانک لگنے لگا۔

''میں کہتا ہوں ریوالور پھینک دو۔'' سی ایف پی اہلکار نے پھر تنبیہہ کی لیکن پانڈے پر اثر نہیں ہوا اور بولا۔

''تمہاری تحویل میں جا کر تشدد سہنے سے بہتر ہے کہ میں جان دے دوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے کسی کے کچھ سمجھنے سے قبل ریوالور اپنی کنپٹی سے لگا کر فائر کر دیا۔ فوراً ہی اس کا جسم ایک جھٹکا کھا کر ساکت ہو گیا۔ ساکت تو دوسرے لوگ بھی رہ گئے تھے۔ پانڈے کی اس حرکت نے ان کی فتح کو ناکامی میں بدل دیا تھا۔ دوسری سمتوں میں مصروف سلمان، جاوید علی اور سلّو جب فارغ ہو کر اس کی طرف پہنچے تو پانڈے کی لاش دیکھ کر قدرے مایوس سے ہو گئے۔

''سالا بہت چالاک نکلا۔ اپنے لیے آسان موت کو چُن لیا۔'' سلّو نے بے ساختہ ہی تبصرہ کیا۔

''زندہ ہاتھ آ جاتا تو بہت کام آتا۔ ہم اس سے ان کے یہاں پھیلے نیٹ ورک کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے تھے۔'' جاوید علی نے کفِ افسوس سے ہاتھ مسلے۔ سی ایف پی کے جن دو اہلکاروں کی موجودگی میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہ ایک طرف قدرے شرمسار کھڑے تھے۔

''چھوڑو، مٹی پاؤ۔ زمین ایک خبیث کے بوجھ سے آزاد تو ہوئی۔ باقیوں کو بھی ہم انشاء اللہ وقت آنے پر کر دیں گے۔''

لائٹ سے انداز میں کہتے ہوئے سلمان نے ماحول پر چھایا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی اور کافی کامیاب بھی رہا۔ سب لوگ پانڈے کے زندہ ہاتھ نہ آنے کی افسردگی سے نکل کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پانڈے زندہ ہاتھ نہیں آیا تھا لیکن اُس کے اس اہم ٹھکانے سے بہت سی ایسی خفیہ دستاویزات ہاتھ آنے کی اُمید تھی جن سے ''را'' کا کچا چٹھا کھل سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے اور فریش ہونے کے بعد وہ ٹھیک چھ بجے آری کے ایک سیف ہاؤس میں کرنل سبکتگین سے ملاقات کر رہے تھے۔ اُنہیں آری ہی کی ایک بغیر نشان والی گاڑی میں یہاں لایا گیا تھا جو ان کے زیرِ استعمال گاڑی ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ لوگوں سے ملاقات کی خواہش تو تھی لیکن یہ اُمید نہیں تھی کہ ملاقات ایسے حالات میں ہو گی۔

کرنل توحید جیسی محبِ وطن شخصیت کی شہادت ہمارے ملک کا بہت بڑا نقصان ہے۔'' ان دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کرنل سبکتگین اپنی گمبھیر آواز میں بولے تو ان کے دلوں کی افسردگی بھی مزید بڑھ گئی۔

''درست فرمایا آپ نے۔ کرنل کی شہادت واقعی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ان جیسے کھرے، بہادر اور جذبۂ حُبّ الوطنی سے لبریز انسان سے محرومی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔'' شہریار نے کرنل سبکتگین کی تائید کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذیشان تو کرنل توحید کے معاملے میں اتنا جذباتی تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

''میرے بہادر جوانو! ہم نے اور تم نے مل کر جو ذمے داریاں اپنے شانوں پر لے رکھی ہیں، ان کی ادائیگی میں سب سے پہلے موت کا خطرہ ہی سامنے آتا ہے لیکن ہم ان خوش قسمتوں میں سے ہیں کہ جن کی موت اصل میں حیاتِ جاوید ہوتی ہے۔ شہادت کا درجہ پانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی، ہر سپاہی اس کی آرزو کرتا ہے۔ اللہ نے کرنل صاحب کی اس آرزو کو پورا کیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان کے کام کو جاری رکھیں۔ آپ لوگوں کو اب تک انہی سے واسطہ پڑا ہے اس لیے آپ ان سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سی ایف پی کے پیچھے بھی پوری ایک چین کام کر رہی ہے۔ کرنل کے بعد ان کے کام کو جاری رکھنے کے لیے میں ہوں اور میرے بعد کوئی اور۔ جیسے کرنل کے نہ ہونے پر میں نے ازخود آپ سے رابطہ کر لیا ہے، اسی طرح میں نہ رہا تو میرے بعد کوئی اور ہوگا جو سی ایف پی کو چلاتا رہے گا۔

''یہ پاکستان کی سالمیت کے لیے بہت خلوص سے قائم کردہ ادارہ ہے جو انشاء اللہ ہر صورت میں اپنا کام کرتا رہے گا۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ نام اور چہرے بدلتے رہیں لیکن اتنا طے ہے کہ کام اور مقصد کبھی تبدیل نہیں ہوگا اور مقصد ایک ہی ہے..... تن من دھن سے اس وطن کی بقا اور سلامتی کا فرض انجام دینا۔'' بولتے بولتے کرنل سبکتگین ذرا سے جذباتی ہو گئے لیکن پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر نارمل لہجے میں بولے۔

''میرے علم میں ہے کہ پیر آباد سے متصل جنگل میں کس قسم کے لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور پیر آباد کا چودھری کیسے ان لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ ہم آپ لوگوں کے ایکشن لینے کے لیے ایک بھرپور آپریشن کی تیاریاں شروع کر چکے تھے اور اپنے وسائل وقوت کو یکجا کر رہے تھے۔ کرنل صاحب حیات ہوتے تو خود آپ سے یہ پلان ڈسکس کرتے لیکن اب ان کے بعد میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس سلسلے میں جو کچھ آپ کے ذہن میں ہے وہ مجھ سے ڈسکس کر سکتے ہیں۔'' ابتدائی تمہید کے بعد اب وہ مطلب کی بات پر آ چکے تھے۔ ذیشان اور شہریار بھی فوری طور پر مستعد ہو گئے۔

''ہمیں دو گروہوں میں تقسیم ہو کر بیک وقت چودھری کی حویلی اور جنگل دونوں جگہوں پر آپریشن کرنا ہوگا۔ کیونکہ اطلاعات کے مطابق آج کل حویلی میں چودھری کے ساتھ کچھ اہم غیر ملکی بھی موجود ہیں اور وہاں کچھ مشکوک سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں۔ ہم مختلف اوقات میں آپریشن کر کے کسی ایک جگہ کے لوگوں کو سنبھلنے یا فرار ہونے کا موقع نہیں دے سکتے۔ البتہ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں جنگل میں زیادہ وسائل کے ساتھ اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہو کر کارروائی کرنی پڑے گی۔'' اب گفتگو کا بیڑا ذیشان نے اٹھایا اور کرنل کے ساتھ حالات کو واضح کرنے لگا۔

اس میٹنگ میں انہوں نے بہت باریکی سے ہر شے کا جائزہ لیا۔ شہریار چونکہ کچھ عرصہ بطور اے سی اس علاقے میں کام کر چکا تھا، اس لیے اُس کے پاس مقامی حالات کے بارے میں بہتر معلومات تھیں۔ اُس نے کرنل سبکتگین کے کئی اہم سوالوں کے جواب دیئے۔ ان کے درمیان تقریباً ڈھائی تین گھنٹوں تک میٹنگ



جاری رہی۔ اور میٹنگ کے اختتام پر کرنل نے انہیں یقین دہانی کروائی کہ وہ آج رات ہی باقی ذمے داران کے ساتھ ڈسکس کر کے پلان کو فائنل کر دیں گے اور کل تک انشاء اللہ وہ اس لائق ہوں گے کہ کارروائی کر سکیں۔

کرنل توحید کی شہادت پر افسردگی میں ڈوب جانے والے ذیشان اور شہریار جب ان سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے تو ان کے دل جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ میٹنگ روم سے باہر نکلے تو انہیں ویٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ وہ چونکہ اپنی گاڑی میں یہاں نہیں آئے تھے، اس لیے خیال تھا کہ گاڑی کے انتظار میں یہاں بٹھایا گیا ہے۔ لیکن تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد انہیں دوبارہ کرنل کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تو وہ چونک گئے۔ اس بار وہ میٹنگ روم سے ہٹ کر کسی دوسرے کمرے میں لے جائے گئے تھے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ چونک گئے۔ وہاں کرسیوں پر دو افراد کلپس کی مدد سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے حلیے سے ظاہر تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ دونوں میں سے ایک تو ان کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک کو وہ شناخت کر سکتے تھے۔ یہ وہی رپورٹر تھا جو کرنل کے جنازے کے وقت بھی انہیں ملا تھا۔

''میرے پاس تم لوگوں کے لیے کچھ اہم اطلاعات تھیں اس لیے تمہیں روک لیا گیا۔'' کرنل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر رپورٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''اس شخص کو شاید تم لوگ پہچانتے ہو گے۔''

''یس سر! یہ ہمیں کرنل توحید کے جنازے پر ملا تھا۔ ایک چینل کا نمائندہ ہے۔'' جواب شہریار نے دیا۔

''یہ اور بھی کچھ ہے اور اسی تعارف کے لیے میں نے تم لوگوں کو بلوایا ہے۔'' کرنل نے جواب دیا اور بتانے لگے۔

''جب ہوٹل سے تم لوگوں کو یہاں لایا جا رہا تھا تو ایک گاڑی نے تعاقب کی کوشش کی۔ تعاقب کرنے والے اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ جس گاڑی میں تم لوگوں کو لایا جا رہا ہے، اس کے علاوہ بھی ایک گاڑی پیچھے موجود ہے۔ اس گاڑی میں سوار جوانوں نے تعاقب کرنے والوں کو گھیر لیا۔ مقابلے میں ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار شخص سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس رپورٹر کی مدد سے تمہاری گاڑی کو بگڈ کیا گیا تھا۔ ہمارے جوانوں نے اسے بھی اس کے گھر سے اٹھا لیا۔ اب آگے یہ دونوں بتائیں گے کہ انہیں کس نے ہائر کیا تھا۔''

کرنل نے انہیں مختصراً حالات سے آگاہ کیا تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ دشمن ان کی راہ پر لگ چکا تھا اور انہیں علم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ اگر کرنل کے جوان چوکنا نہ ہوتے تو دشمن یہاں تک رسائی حاصل کر چکے ہوتے۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ جب تم لوگوں کو ٹریس کیا گیا، تم بڑے جذباتی بحران سے گزر رہے تھے۔ لیکن یاد رکھو کہ ہم جس فیلڈ میں ہیں، وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے حواس قائم رکھنے کی متقاضی ہوتی ہے ورنہ بعض اوقات ناقابلِ تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ آگے تم لوگ ہوشیار رہو۔ اس معاملے کو میں خود نمٹا لوں گا۔ تم اپنا فوکس اس آپریشن پر رکھو جو کل پیر آباد میں کرنا ہے۔ اس آپریشن میں آرمی کے جوان سی ایف پی کے شانہ بشانہ کام کریں گے۔ اپنی ٹیم کا انتخاب البتہ تم لوگ خود کرو گے۔'' کرنل نے ان کی کیفیت بھانپ لی اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اس کمرے سے باہر نکل آئے اور یہ سب کہا۔

''وی آر ویری سوری سر! آئندہ انشاء اللہ ایسی کوتاہی ہرگز نہیں ہوگی۔'' پہلے ذیشان نے اپنی زبان کھولی۔

''میں نے کہا نا، جانے دو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تم لوگوں کو احتیاط کرنی ہوگی۔ یہاں سے واپس ہوٹل کے بجائے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں سے تم اپنے ماتحتوں سے رابطہ کرو اور انہیں تیار رکھو۔ میری طرف سے گرین سگنل ملنے پر تم لوگوں کو ایکشن کے لیے تیار ہونا چاہئے۔ از اِٹ کلیئر؟'' نرم لہجے میں بولتے بولتے آخر میں انہوں نے فوجیوں کے سے مخصوص سخت لہجے میں پوچھا۔

''یس سر!'' دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ ان کا لہجہ پُرجوش تھا اور اس میں یہ عزم پوشیدہ تھا کہ دشمن سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر دینا ہے۔

⊛----✪----⊛

تیز رفتار جیپ راستوں کو روندتی ہوئی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر لمبے قد اور گوری رنگت والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی داڑھی اور سر کے بال سنہری تھے اور آنکھوں کی رنگت پر نیلاہٹ غالب تھی۔ اس نے نسواری رنگ کی گھیردار شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر مخصوص وضع کی کھتئی پگڑی تھی۔ اس کے ڈرائیونگ کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس پر کسی جگہ پہنچنے کی عجلت سوار ہے لیکن عجلت کے باوجود وہ بہت مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا اور کہیں بھی جیپ نے غیر ضروری جھٹکے یا اُچھل کود نہیں دکھائی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔ اس کے اندر کی پریشانی یا اُکھاڑ پچھاڑ کا ذرا بھی عکس اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پورے ارتکاز کے ساتھ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔

طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ جیپ کی رفتار کم کرنا شروع کر دی اور اگلا موڑ مڑتے ہی ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سڑک کے کنارے قطار سے کئی چھوٹے چھوٹے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیپ سب سے پہلے پڑنے والے چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے روک لی۔ ہوٹل کی تعمیر میں اینٹوں کا استعمال صرف چار دیواری تک ہی محدود تھا، باقی زیادہ تر لکڑی کا کام تھا۔ چھت بھی پھوس ہی کی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں چند ایسے چھوٹے چھوٹے کمرے موجود ہیں جہاں مسافر چند گھنٹوں کے لیے قیام کر سکتے ہیں۔

جیپ سے اُتر کر وہ سیدھا استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ اس کاؤنٹر پر قریباً اسی کی سی وضع قطع کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بہت ٹھسے سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس ہوٹل کا مالک تھا۔

''مجھے دو گھنٹے کے لیے ایک کمرہ چاہئے۔'' مالک سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''مل جائے گا لیکن کرایہ ایڈوانس دینا ہوگا۔ کھانے اور پینے کا بھی انتظام ہے۔'' مالک نے اسے جواب دیا اس میں لفظ ''پینے'' پر خاصا زور تھا۔ یہ ہوٹل جس راستے پر موجود تھا اس سے شریف لوگوں کے علاوہ جرائم پیشہ افراد کا کثرت سے گزر ہوتا تھا اس لیے بظاہر خستہ حال نظر آنے والے ہوٹلوں میں دیسی سے لے کر ولایتی تک ہر طرح کے پینے پلانے کا سامان مل جاتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ گاہک نقد ادائیگی کر سکتا ہو۔

''کھانا ایک گھنٹے بعد میرے کمرے میں ہی پہنچا دینا۔ کھانے کے بعد صرف چائے پینا پسند کروں گا اور ہاں، باہر میری جیپ کھڑی ہے۔ اس کے لیے تیل پانی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔'' مسافر نے اسے مطالبات کے ساتھ کئی بڑی مالیت کے نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔

''سب ہو جائے گا، فکر مت کرو۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ۔'' نوٹ دیکھ کر ہوٹل مالک کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور جھپٹ کر سارے نوٹ سمیٹتے ہوئے اس نے پہلے سے زیادہ خوش اخلاقی سے کہا۔



''فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے میرا کمرہ دکھا دو۔'' مسافر نے سپاٹ لہجے میں فرمائش کی تو ہوٹل کا مالک کسی نشاط خان کو آواز دینے لگا۔ فوراً ہی گاہکوں کی میزوں پر کھانے پینے کا سامان پہنچاتا ایک نوعمر لڑکا دوڑتا ہوا کاؤنٹر کے پاس چلا آیا۔

''صاحب کو کمرے میں لے جاؤ۔'' مالک نے حکم دیا تو نشاط خان مستعد ہو گیا لیکن اسے صرف راہنمائی کا فریضہ انجام دینا پڑا۔ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ مسافر نے اپنے شانے پر ہی لٹکا رکھا تھا۔ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ہال میں کرسیوں پر بیٹھے کھاتے پیتے لوگوں پر بظاہر ایک سرسری سی نظر ڈالی لیکن اس ایک نظر نے ہی وہاں موجود جملہ افراد کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ سب بھی تقریباً اسی جیسے حلیے والے لوگ تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''اُدھر غسل خانہ اور بیت الخلا دونوں موجود ہیں۔ اگر آپ کا نہانے کا ارادہ ہو تو مجھے بتا دو، میں بندوبست کر دوں گا۔'' اسے کمرے تک پہنچا کر نشاط خان نے برآمدے کے آخری سرے پر نظر آنے والے دو دروازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیشکش کی۔

''نہیں، میں صرف منہ ہاتھ دھونا پسند کروں گا۔ تم جاؤ۔ مجھے تمہاری کسی خدمت کی ضرورت ہوئی تو بلا لوں گا۔'' اس نے لڑکے کو چلتا کیا اور کچھ سوچ کر کمرے میں داخل ہونے کے بجائے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کئی گھنٹوں سے سفر میں تھا اور اب اسے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ باتھ روم جاتے ہوئے بھی اس نے اپنا سفری بیگ اپنے ساتھ ہی رکھنا پسند کیا تھا۔

جب وہ فریش ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو خود کو پہلے کی نسبت کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں ان کی چارپائی پر ایک میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ بلا تکلف اس بستر پر بیٹھ گیا اور اپنا موبائل نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں ہو صاب!..... ہم یہاں آپ کا انتظار کرتا ہے۔'' دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے نے اس سے دریافت کیا۔

''راستے میں ہوں۔ جیپ کا انجن ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ چھ سات گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا لیکن انداز سے اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ مخاطب کے لیے باس کی حیثیت رکھتا ہے۔

''ادھر میں نے سارے انتظامات کر دیئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر آپ جب چاہو گے، آپ کو سرحد پار بھجوا دیا جائے گا۔'' اسے پُرجوش انداز میں اطلاع فراہم کی گئی۔

''گڈ! تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم اپنے باپ کی جگہ لینے کے مکمل اہل ہو۔'' اس نے دوسری طرف موجود شخص کو سراہا پھر فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

اب وہ ایک اور نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ایک نحیف سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''کہاں ہو تم؟ میں نے پہلے بھی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے کال ریسیو نہیں کی۔'' اس نے قدرے غرّانے والے انداز میں دریافت کیا۔ اب وہ پشتو کے بجائے عبرانی زبان کا استعمال کر رہا تھا۔

''میں ہسپتال میں تھی۔ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مجھے فوڈ پوائزن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے واش کیا ہے۔ کئی گھنٹے تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں رہی ہوں اور اب بھی اتنی کمزوری ہے کہ بستر

سے اُٹھنا ممکن نہیں۔"

اُس کی طرف سے عبرانی کا استعمال ہونے پر دوسری طرف سے بھی عبرانی میں ہی ساری تفصیل بتائی گئی لیکن بولنے والی کے لہجے میں واضح نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اوہ شِٹ!..... یہ بیمار ہونے کا کون سا موقع تھا؟" وہ بری طرح جھنجلایا۔

"کوئی مسئلہ ہے ڈیوڈ!..... تم مجھے پریشان لگ رہے ہو؟" اس نے تشویش سے استفسار کیا۔

"حالات بہت خراب ہیں لِنڈا! تمہیں فوری طور پر وہاں سے نکلنا ہوگا۔ میرے کچھ آدمی پکڑے گئے ہیں اور یقیناً ان سے بہت کچھ اُگلوایا جا چکا ہے۔ آرمی اور خفیہ ایجنسی والے جگہ جگہ ریڈ کرتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف بھونچال آیا ہوا ہے۔ جو مقامی سردار یہاں ہمارے لیے کام کرتا تھا، وہ بھی مارا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بروقت نکلنے کا موقع مل گیا اور اب میں سردار کے بیٹے کے ذریعے سرحد پار نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان حالات میں ہمارا منظر سے غائب ہو جانا ہی سب سے بہتر ہے۔ پاکستان میں موجود "را" کا انچارج پانڈے بھی مارا جا چکا ہے اس لیے فی الحال ہم یہاں بالکل بے یار و مددگار ہیں۔" ڈیوڈ نے جلدی جلدی اسے حالات سے آگاہ کیا۔

"اوہ نو..... یہ تو بہت برا ہوا۔ اس طرح تو ہمارا جنگل والا پروجیکٹ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔" اس کی زبانی ساری تفصیل سن کر لِنڈا نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"میرے خیال میں وہ پروجیکٹ محفوظ ہے کیونکہ گرفتار ہونے والوں میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ ہاں چودھری کی طرف سے ضرور خطرہ ہے۔ اگر اس پر ہاتھ ڈالا گیا تو وہ سچ اُگل دے گا۔ اس لیے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ وہاں سے نکلنے سے پہلے چودھری اور اس کے ایسے بندوں کا کام تمام کر کے نکلو جنہیں اس بارے میں علم ہے۔ کام کرنے والے بعد میں ہمیں اور مل جائیں گے لیکن پروجیکٹ تباہ نہیں ہونا چاہیے۔" وہ لِنڈا کو ہدایات دینے لگا۔

"اوکے، میں کچھ کرتی ہوں۔" لِنڈا نے پریشانی سے جواب دیا۔

"میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گا۔" ڈیوڈ نے اس جملے سے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ تھا کہ لِنڈا بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔ اگر اسے خود عجلت میں فرار نہ ہونا پڑتا تو وہ اسے ساتھ لے کر ہی نکلتا یا کم از کم ایسا انتظام کر دیتا کہ اس تک بروقت اطلاع پہنچ جائے۔ لیکن وہ ایسا کچھ نہیں کر سکا تھا۔ لِنڈا سے بے حد قربت کے باوجود اس نے مصیبت کے وقت سب سے پہلے اپنی جان بچانا ضروری سمجھا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان کے پیشے میں جذباتیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بدقسمتی یہ رہی تھی کہ لِنڈا عین وقت پر شدید بیمار پڑ گئی تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے اُسے نہ تو وہ بروقت ہوشیار کر سکا تھا اور نہ ہی یقین سے یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس حالت میں حالات سے پوری طرح نمٹ سکتی ہے۔

بہت منجھی ہوئی ایجنٹ ہونے کے باوجود بہرحال وہ انسان تھی اور بشری کمزوریوں سے زیر ہو سکتی تھی۔ حالات اور اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو ترازو میں تولتا وہ کامیابی اور ناکامی کے امکانات کو فٹفٹی فٹفٹی پر سلسلہ ہی دیکھ رہا تھا۔ کال منقطع ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر یونہی بستر پر گم صم سا بیٹھا رہا، پھر دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔ بے ساختہ ہی اس کی نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اُٹھی۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور یقیناً اس کے لیے کھانا آ گیا تھا۔

"اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔" اس نے بھاری گونج دار آواز میں کہا تو نشاط خان کھانے کی ٹرے



ہاتھوں میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ اتنا مختصر تھا کہ اس میں چارپائی اور ایک چھوٹی سی میز کے علاوہ کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک کرسی تک بھی رکھنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ نشاط خان نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھی اور میز کو کھسکا کر چارپائی کے مقابل لے آیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ کمرے سے باہر نہیں گیا اور کچھ متذبذب سا ڈیوڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاندیدہ ڈیوڈ نے اس کے انداز کو تاڑ لیا اور آہستہ سے بولا۔

"کیا بات ہے لڑکے!..... کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں، میرے خیال میں میرے پاس آپ کے لیے بہت اہم اطلاع ہے لیکن وہ میں مناسب معاوضے پر ہی آپ کو دوں گا۔"

عیاری کی چمک آنکھوں میں لیے بولنے والے نشاط خان کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ڈیوڈ اس کی بات پر چونک گیا۔ لڑکا نوعمر ضرور تھا لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ معاشی جدوجہد کے ماہ و سال نے اسے اپنی عمر سے زیادہ تجربہ اور ہوشیاری عطا کر دی ہے۔

"تم اطلاع دو۔ انعام تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوگا۔" اس نے بھی نشاط خان کی طرح ہی سرگوشیانہ انداز اختیار کیا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کی گفتگو کسی کے سن لینے کا امکان ہے۔

"خفیہ ایجنسی کا ایک بندہ آپ کی ٹوہ میں ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس نے مالک سے اس طور پر آپ کے برابر والا کمرہ اپنے لیے بک کروایا ہے اور جتنی دیر سے آپ اس کمرے میں ہیں، وہ بھی اندر سے دروازہ بند کر کے برابر والے کمرے میں موجود ہے۔ ایک بار میں نے بہانے سے اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا اور ڈانٹ کر بھگا دیا۔"

جوں جوں نشاط خان بتا رہا تھا، ڈیوڈ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی جا رہی تھی۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے کے باوجود کسی خفیہ ایجنسی کا بندہ اس کے پیچھے لگ سکتا ہے۔ وہ نشاط کی اطلاع کو غلط قرار نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں میں خفیہ ایجنسیوں کے کارندے اپنے مطلب کے شکار کی بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔

"یہ لو..... لیکن خیال رکھنا کہ اب تمہاری زبان بالکل بند رہنی چاہیے ورنہ تم اپنی جان بھی گنوا سکتے ہو۔" اس نے چند بڑے نوٹ نکال کر نشاط خان کو تھمائے اور سرگوشی ہی میں پھنکارا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاب!..... نشاط خان زبان کا پکا ہے۔" لڑکے نے جلدی جلدی نوٹ اپنی جیب کے نیفے میں ٹھونسے اور کمرے سے باہر جانے لگا لیکن ڈیوڈ نے اسے اشارے سے روک لیا پھر قدرے آواز میں ایسی گفتگو کرنے لگا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خشک میوہ جات کا بیوپاری ہے اور اس علاقے کا میوہ لے کر پنجاب کے مختلف شہروں میں سپلائی کرتا ہے۔ نشاط خان بھی اس کے ساتھ ہوشیاری سے سوال جواب کرتا رہا۔ واقعی وہ بڑا چلتا پُرزہ لڑکا تھا۔ اس موضوع پر اس نے ایسی گفتگو کی کہ ڈیوڈ بھی عش عش کر اُٹھا۔ بالآخر اس نے دو چار مزید باتیں کر کے اسے اپنے کمرے سے رخصت کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا کھانا ختم کیا۔ ساتھ ساتھ وہ حالات کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا۔ وہ جس کمرے میں موجود تھا، دراصل وہ لکڑی کا ایک کیبن تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ ساتھ والے کمرے یا کیبن میں اگر کوئی لکڑی کی درمیانی دیوار سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرتا تو اس کمرے میں ہونے والی گفتگو سن لیتا تھا۔ اگرچہ اس نے یہاں بیٹھ کر جو دو فون کیے تھے، ان کے دوران اس کی آواز بہت دھیمی تھی لیکن

کوئی ہوشیار شخص بہر حال اتنا تو اندازہ کر سکتا تھا کہ ایک کال کے دوران اس نے مقامی کے بجائے مہ ال
استعمال کیا ہے اور یہی چیز اسے مشکوک کرنے کے لیے کافی تھی۔

اپنے کیریئر کے دوران وہ متعدد بار ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا اس لیے زیادہ گھبرا
صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔

اسلحے کے سلسلے میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ قمیض کے نیچے کمر پر بندھی بیلٹ سے اس کا چھوٹا
خطرناک پسٹل لٹکا ہوا تھا۔ اس پسٹل کی ساخت ایسی تھی کہ لباس کے نیچے اس کی موجودگی کا احساس
ہوتا تھا۔ یوں بھی جتنا ڈھیلا ڈھالا لباس اس نے پہن رکھا تھا، وہ بہت کچھ پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ اس
علاوہ اس کی جیب میں بھی ایک خطرناک گن موجود تھی جبکہ پنڈلی کے ساتھ ایک بہت تیز دھار خنجر
تھا۔ اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ چار چھ افراد سے اکیلا ہی بخوبی نمٹ سکتا ہے چنانچہ جب اپنے کمرے
نکلا تو چہرہ حسبِ معمول پُرسکون تھا۔

ہال سے گزر کر بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ
دیکھتے ہی کونے کی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی متوجہ ہوا ہے۔ اس آدمی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا
بڑھتا گیا۔ اس کی جیپ کے قریب نشاط خان کھڑا اسے کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔

''گاڑی کو ایک دم اے ون کر دیا ہے صاب! تیل پانی سب برابر ہے۔'' ڈیوڈ کو دیکھ کر اس نے
ہوئے اطلاع دی۔

''شاباش! یہ لو تمہارا انعام۔'' ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نوٹ تھمایا اور جیپ کے پچھلے
میں نظر ڈالی۔ اس کی فرمائش کے مطابق پٹرول سے بھرے دو کین وہاں موجود تھے۔ آگے اسے جن را
پر سفر کرنا تھا، وہاں پٹرول کا حصول ناممکن تو نہیں لیکن ذرا مشکل ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی اب وہ بغیر رُکے
سفر کرنا چاہتا تھا۔ یہاں رُکنے سے اسے اور اس کی جیپ کو مناسب وقفہ مل گیا تھا اور وہ یہاں سے آگے
سے سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہوٹل کے ہال میں
دیکھ کر چونکنے والا آدمی ایک دوسرے آدمی کے ساتھ باہر نکلا ہے۔ وہ دونوں بھی ایک جیپ میں سوار ہو
یعنی وہ اس کا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے اس ارادے پر زیرِ لب مسکراتے ہوئے وہ اطمینان
سے اپنی جیپ کو دوڑاتا چلا گیا۔ رفتار حسبِ سابق تیز ہی تھی۔

تیز رفتاری سے جیپ کو دوڑاتے ہوئے وہ سڑک کے ایسے حصے تک پہنچ گیا جہاں سے سڑک مڑ
تھی۔ سڑک کے اطراف میں پہاڑ تھے چنانچہ موڑ مڑتے ہی وہ تعاقب میں آنے والوں کی نظروں سے اوجھل
ہو گیا۔ یہاں سے جیپ آگے بڑھانے کے بجائے اس نے سڑک کے کنارے روک دی اور سیٹ کے
سے گن نکال کر نیچے اُتر آیا۔ اب وہ جیپ کی آڑ میں چھپا اپنا تعاقب کرنے والوں کا انتظار کر رہا تھا۔

چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد پیچھے آنے والی جیپ موڑ سے نمودار ہوئی۔ وہ بالکل تیار تھا۔ اس نے فوراً
برسٹ مارا۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور ٹائر پھٹنے کی آواز سے گونج اُٹھی۔ جیپ کا ڈرائیور بے قابو ہوتی
کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی اثنا میں ڈیوڈ نے دوسرا برسٹ مارا۔ اس بار گولیاں ونڈ اسکرین کو چُور چُور کرتی ہوئی ڈرائیور
کھوپڑی میں گھس گئیں لیکن جان جانے سے قبل وہ بریک پر پاؤں رکھ چکا تھا اس لیے جیپ کسی حادثے
محفوظ رہی۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا ہوا اس کا ساتھی جو عین وقت پر سر جھکا لینے کی وجہ سے فائرنگ



محفوظ رہا تھا، چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور اپنی جیپ کی آڑ لیتے ہوئے ڈیوڈ کی طرف جوابی فائرنگ کی۔ اہوا
پہلے ہی آڑ میں تھا اس لیے اس فائرنگ سے مکمل محفوظ رہا۔

ایک آدھ منٹ تک وہ دونوں ایک دوسرے پر لاحاصل فائرنگ کرتے رہے لیکن پھر ڈیوڈ نے مزید
وقت ضائع کرنے کے بجائے فیصلہ کُن حملے کی ٹھانی اور اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک دستی بم برآمد
کیا۔ دانتوں کی مدد سے بم کی پن کھینچ کر اس نے اسے جیپ کی طرف اُچھال دیا۔ فضا کان پھاڑ دینے والے
دھماکے سے لرز اُٹھی۔ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ ڈیوڈ کی اپنی جیپ بھی ہل کر رہ گئی اور خود اس نے زمین کی لرزش
کو اپنے بدن پر محسوس کیا لیکن یہ سب غیر متوقع نہیں تھا چنانچہ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ
اپنے دشمنوں کے نیست و نابود ہونے کی خوشی دل میں لیے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

حسبِ سابق جیپ کو برق رفتاری سے آگے کی طرف دوڑاتے ہوئے اس نے پلٹ کر پیچھے دھواں دھواں
کرتے منظر کو دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑتا آگے بڑھتا جا رہا
تھا۔ وہ کوئی اتنا معمولی آدمی نہیں تھا کہ اسے یوں آسانی سے قابو کر لیا جاتا۔ وہ تو چکنی مچھلی کی طرح پاکستانیوں
کے ہاتھ سے پھسل کر واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچنے والا تھا۔

⊛----✪----⊛

ڈیوڈ کی فون کال لِنڈا کے لیے بے حد پریشان کُن ثابت ہوئی تھی۔ ڈیوڈ کے فرار نے ظاہر کر دیا تھا کہ
حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں چنانچہ اس کا مزید یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا
کہ وہ سخت بیمار ہو کر بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کے حسین چہرے
پر نقاہت کے آثار بہت واضح تھے۔ فوڈ پوائزن کی یہ مصیبت اُس لسّی کے سبب اس پر نازل ہوئی تھی جو اس
نے بڑے شوق سے پی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ لسّی کی تیاری میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا اس کے معدے
نے عادی نہ ہونے کے سبب احتجاج کیا تھا۔ وجہ جو بھی رہی ہو، وہ مشکل میں پھنس گئی تھی۔ البتہ یہ اس کی خوش
قسمتی تھی کہ مرکزِ صحت میں فرائض انجام دینے والے ڈاکٹر داور ایک لائق ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپنی مہارت
سے اس کی جان بچا لی تھی ورنہ ممکن تھا کہ شہر تک علاج کے لیے پہنچتے پہنچتے وہ اپنی جان سے ہی چلی جاتی۔
ڈاکٹر داور نے نہ صرف مرکز پر اس کا اچھی طرح ٹریٹمنٹ کیا تھا بلکہ حویلی بھی اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔
کوئی عام مریض ہوتا تو شاید وہ اپنے کمپاؤنڈر کو بھیج دیتے لیکن لِنڈا، چودھری کی مہمان تھی اور وہ بھی اتنی خاص
کہ اس کی خاطر چودھری خود پورا وقت مرکز کے ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ اس کے کارندوں نے وہاں
موجود دوسرے مریضوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر داور نے ان کے اس عمل پر ناگواری محسوس کی
تھی لیکن وہ چودھری یا اس کے کارندوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے یہاں سے اپنا بوریا بستر گول
نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو ڈگری کو کمائی کے بجائے حقیقتاً عوام کی خدمت کے لیے
استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو اس گاؤں کے لوگ طویل عرصے کے
لیے کسی ڈاکٹر سے محروم ہو جائیں گے اس لیے ضبط کر گئے اور لِنڈا کو بہترین طبی امداد دینے کے ساتھ چودھری
کے حکم پر اس کے ساتھ حویلی تک جانا بھی قبول کر لیا۔ یہاں انہوں نے لِنڈا کو ڈرپ لگائی اور مریضہ کی بابت
چند ضروری ہدایات دے کر واپسی کی اجازت چاہی۔

چودھری اُنہیں یہ اجازت دینے کو تیار نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ وہ لِنڈا کے بستر کے ساتھ کرسی ڈال کر اس

کے جسم میں داخل ہوتے گلوکوز کے ایک ایک قطرے کا معائنہ کرتے رہیں لیکن خود لِنڈا نے اُن کی یہ مشکل آسان کر دی اور انہیں چودھری سے اجازت دلوا دی کہ وہ دو گھنٹے کے لیے اپنے ہیلتھ سینٹر جا کر مریضوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں واپس یہیں آنا تھا۔ لِنڈا نے انہیں یہ اجازت غریب دیہاتیوں کی ہمدردی میں نہیں دلائی تھی۔ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں خاصے سفاکانہ جذبات رکھتی تھی لیکن اگر ڈاکٹر مستقل اُس کے سرہانے بیٹھا رہتا تو اس کی پرائیویسی متاثر ہوتی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے اپنا حویلی میں ہی رہ جانے والا شولڈر بیگ طلب کیا۔ اس بیگ میں اس کا خصوصی موبائل فون موجود تھا۔ فون نکال کر اسے چیک کر ہی رہی تھی کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی۔ ڈیوڈ نے اسے جو کچھ بتایا، وہ سخت پریشان کُن تھا۔ لیکن بہرحال اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ اسے اتنی شدید نقاہت ہو گئی تھی کہ فوری طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ ڈیوڈ نے اسے چودھری اور اس کے خاص کارندوں کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری بھی سونپی تھی اور ظاہر ہے یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ پھرتی سے حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ چار و ناچار وہ جسم کو توانائی فراہم کرنے والی ڈرپ ختم ہونے کا انتظار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

''چودھری صاحب کو بلاؤ۔'' اس نے اپنی دیکھ بھال کے لیے مسلسل کمرے میں موجود نوکرانی کو حکم دیا تو وہ فوراً باہر نکل گئی۔ چند منٹ کے اندر چودھری اس کے کمرے میں موجود تھا البتہ نوکرانی کو اس نے باہر ہی روک دیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ میں بس نیچے تہ خانے تک چکر لگانے گیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو معلوم کر لوں۔'' وہ بہت لگاوٹ سے بولتا ہوا لِنڈا کی پائینتی بیٹھ گیا۔

''میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں چودھری صاحب! آپ ڈاکٹر داور سے کہیں کہ اس ڈرپ میں طاقت کا کوئی انجکشن شامل کر دیں۔'' اس نے اپنی خواہش بیان کی۔

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ مستقل یہیں رہے لیکن تم نے ہی اسے واپس بھجوا دیا۔'' چودھری نے بولتے ہوئے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

''مجھے اس کے سارا وقت اپنے سر پر سوار رہنے سے اُلجھن ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے چلتا کر دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس ایمرجنسی میں کوئی بھی ایسی کال آ سکتی ہے جو میں ڈاکٹر کے سامنے ریسیو کر کے اسے شک کا موقع نہیں دے سکتی۔ آپ کے جاہل ملازمین کے مقابلے میں ایک پڑھے لکھے ڈاکٹر کو بے وقوف بنانا ذرا مشکل بات ہے۔'' لِنڈا نے ذرا ناک چڑھا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا لہجہ چودھری کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا لیکن لِنڈا کا تو ہر انداز حُسن کی ایک ادا تھی جس پر ناراض ہونے کے بجائے وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔ اب بھی اس نے لِنڈا کو جاں نثار نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کا نمبر ملایا اور اسے فوراً حویلی پہنچنے کا حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''ڈاکٹر آ رہا ہے۔ اگر تم اس ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن نہیں ہو تو میں شہر سے کوئی دوسرا قابل ڈاکٹر بھی بلوا سکتا ہوں۔'' لِنڈا کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اسے پیشکش کی۔

''نہیں، یہ ڈاکٹر ٹھیک ہے۔ میری جو حالت ہو گئی ہے، اس کو کوئی بھی ڈاکٹر جادو کے زور پر اچانک تو ٹھیک نہیں کر سکتا۔'' لِنڈا نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''سوری بے بی! مجھے افسوس ہے کہ تم میری حویلی میں آ کر اس طرح بیمار ہو گئیں۔ میں نے تمہارے



لیے لسّی بنانے والی ملازمہ کو قید میں ڈلوا دیا ہے۔ تم صحت یاب ہو جاؤ، میں تمہاری نظروں کے سامنے اس نمک حرام کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔'' چودھری نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

لِنڈا کو اس وقت ملازمہ کو سزا دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن تو مسلسل ڈیوڈ کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا اور وہ اپنی حکمتِ عملی طے کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سارے کھیل میں وقت کی بہت اہمیت ہے لیکن اپنی ناتوانی کے سبب فوری طور پر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

ڈاکٹر داور نے دوبارہ حویلی آ کر اس کی خواہش کے مطابق ڈرپ میں طاقت کی دوا انجیکٹ کر دی تو اسے ذرا اطمینان ہوا کیونکہ گھنٹہ بھر بعد ہی اس نے اپنی جسمانی حالت میں کافی بہتری محسوس کی تھی۔ اس دوران چودھری وہاں سے جا چکا تھا۔ عرصے بعد یہاں آنے کی وجہ سے اسے ڈھیروں معاملات نمٹانے پڑ رہے تھے اس لیے خواہش کے باوجود مستقل لِنڈا کے پاس نہیں بیٹھ پا رہا تھا

''چودھری صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔'' ڈرپ ختم ہو گئی تو اس نے خدمت کے لیے موجود ملازمہ کو حکم دیا۔ ملازمہ حکم کی تعمیل میں فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی لِنڈا نے کھینچ کر اپنے ہاتھ سے کینولا نکالا اور ٹیپ بینڈیج لگا دی تا کہ خون نہ بہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بستر سے کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہونے پر اسے بہت زور کا چکر آیا لیکن چند لمحوں میں ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور اس الماری کی طرف بڑھی جس میں اس کی ضرورت کا سامان رکھا تھا۔ کپڑے وغیرہ وہیں چھوڑ کر اس نے بس چند اہم چیزیں اپنے شولڈر بیگ میں ڈالیں اور الماری دوبارہ بند کر دی۔ اسی اثنا میں ملازمہ واپس آ گئی۔

''سرکار، منشی جی کے ساتھ بیٹھے کھاتے دیکھ رہے ہیں۔ پٹواری بھی آیا بیٹھا ہے۔ پر اگر آپ کو کوئی ضروری گل کرنی ہے تو بتاؤ، میں مردانے میں آپ کا پیغام بھجوا دوں گی۔'' اس نے لِنڈا کو چودھری کی مصروفیت سے آگاہ کرتے ہوئے پیشکش کی۔

''نہیں، اُنہیں پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس مجھے کچن تک لے چلو۔ میں اپنی پسند کے مطابق پرہیزی کھانا تیار کروانا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق فرمائش کی۔

''آپ کو باورچی خانے میں جانے کی کیا لوڑ ہے بی بی! مینوں دسّو..... میں آپ کی پسند کا پرہیزی کھانا تیار کروا دوں گی۔'' ملازمہ نے اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے مؤدبانہ عرض کیا۔

''نہیں، میں اپنی نگرانی میں اپنی پسند کا کھانا بنوانا چاہتی ہوں۔'' اس نے سختی سے جواب دیا تو ملازمہ بے چاری مجبور ہو گئی۔ لِنڈا کو کچن تک پہنچا دیا گیا۔ کچن کی نگراں اسے وہاں پا کر بدحواس ہو گئی اور اس کی خواہش کا علم ہونے پر کمرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس کے اصرار کے آگے مجبور ہونے پر اس کے لیے کچن میں ہی ایک آرام دہ کرسی رکھوا دی۔

''یہ بھیڑ بھاڑ ہٹواؤ یہاں سے۔ میں اتنے سارے لوگوں کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس نے باورچن کی مددگار عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا تو فوراً ہی ان عورتوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

''حکم بی بی!'' جب نگراں عورت اکیلی رہ گئی تو اس نے ہاتھ باندھ کر اس سے پوچھا۔ لِنڈا نے اُسے ایک ایسی ڈش تیار کرنے کا حکم دیا جس کے بارے میں اُسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ عورت تیار کرنا تو دُور کی بات، اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہو گی۔ ہوا بھی یہی۔ ڈش کا نام سن کر عورت آنکھیں پٹپٹانے لگی اور

پھر بولی۔

''ماف (معاف) کرنا بی بی! مجھے اس ڈش کا کوئی پتہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، آج مجھ سے سیکھ لینا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آج کیا پک رہا ہے؟'' وہ ہوشیاری سے اپنے مطلب کی بات کی طرف آ گئی۔

''مٹر آلو کی سبزی ہے۔ بکرے کا شوربہ ہے۔ بھُنا ہوا مرغ بھی ہے۔ لیکن سب سے خاص چودھری صاحب کی پسند کے بڑے کے پائے تیار ہو رہے ہیں۔ میں نے صبح فجر سے ہی چڑھا دیئے تھے۔ بس اب تیار ہونے کو ہی ہیں۔'' ملازمہ نے اسے اطلاع دیتے ہوئے ایک بڑے سے پتیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ساری تو بہت ہیوی ڈشز ہیں۔ میں تو اس میں سے کچھ نہیں کھا سکتی۔ تم ایسا کرو جا کر کاغذ قلم لے آؤ۔ میں تمہیں کچھ چیزوں کے نام لکھوا دیتی ہوں۔ وہ بازار سے منگوا لو تو پھر میری پسند کا کھانا بنا دینا۔''

''ٹھیک ہے بی بی! میں ابھی آئی۔'' ملازمہ مستعدی کا مظاہرہ کرتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔

لِنڈا کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس میں موجود محلول کو تیزی سے پائے والے پتیلے میں انڈیل دیا۔ وہ پتیلے پر ڈھکن واپس رکھ رہی تھی کہ ملازمہ واپس آ گئی۔

''بہت زبردست خوشبو ہے۔ میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں اسے ضرور چکھتی۔'' کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اس نے اطمینان سے کہا اور کرسی پر واپس آ بیٹھی۔

ملازمہ نے خاموشی سے اسے نوٹ پیڈ اور قلم تھما دیا۔ لِنڈا نے اس پر دو چار چیزوں کے نام لکھے۔ یہ بھی پکانے میں استعمال ہونے والی ایسی اشیاء تھیں جن کا پیر آباد میں ملنے کا امکان نہیں تھا۔ ان اشیاء کے نام لکھ کر اس نے نوٹ پیڈ قلم سمیت دوبارہ ملازمہ کو تھما دیا اور بولی۔

''میرے خیال میں یہ سامان آنے میں تو خاصا وقت لگ جائے گا۔ تم ایسا کرو، اس ٹائم مجھے مرغی کا سُوپ تیار کر کے دے دو۔ ڈش میں بعد میں تیار کروا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے بی بی! جیسا آپ کا حکم۔'' ملازمہ نے اسی طرح مؤدبانہ جواب دیا تو لِنڈا اُٹھ کر کچن سے باہر آ گئی۔ اب پھر وہ اسی کمرے میں تھی جو اس کے زیر استعمال تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنا آدھا کام کر چکی ہے۔ پائے کے سالن میں اس نے جو سریع الاثر زہر ملایا تھا، اس کو کھانے کے بعد چودھری اور اس کے خاص مصاحب کے بچنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ اتنی شقی القلب عورت تھی کہ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ یہ سالن وہ لوگ بھی کھا سکتے ہیں جو اس کا ٹارگٹ نہیں ہیں۔ اپنی قوم کے مزاج کے مطابق اسے صرف اپنا ہدف حاصل کرنے سے غرض تھی۔ ساتھ میں کتنے ہی لوگ زد میں آ جاتے، اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ کرنے کو وہ اسلحے کا استعمال بھی کر سکتی تھی لیکن اس نے اپنے لیے آسان راستہ چُن لیا تھا۔ چُن چُن کر لوگوں کو نشانہ بنانے کے لیے زیادہ وقت، توانائی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی اور یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں وہ خود زد میں نہ آ جائے لیکن اب سارا کام نہایت صفائی سے ہو گیا تھا۔ اب اسے کھانے کے وقت سے پہلے پہلے خود یہاں سے نکلنا تھا اور لیبارٹری میں کام کرنے والے خاص آدمیوں کو بھی فوری طور پر نکل جانے کا پیغام بھیجنا تھا۔ وہ لوگ اس سے زیادہ آسانی سے نکل سکتے تھے کیونکہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کو جواب دہ نہیں تھے اور مکمل طور پر خود مختار تھے۔ اپنا خاص موبائل نکال کر اس نے لیبارٹری انچارج کا نمبر ڈائل کیا۔

''شمعون! تم اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میری طرف سے کوئی



اگلا حکم ملنے تک تم سب کو انڈر گراؤنڈ رہنا ہوگا۔'' اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا جو ظاہر ہے اجنبی زبان میں ہونے کی وجہ سے کمرے میں موجود ملازمہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے میڈم!..... ہم ابھی نکل جاتے ہیں۔'' شمعون نے اسے حسبِ منشا جواب دیا۔ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ایسے کسی موقع پر سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے حکم کی فوری تعمیل پر زور دیا جاتا تھا۔

اس طرف سے بھی مطمئن ہو جانے کے بعد اب اسے اپنے نکلنے کا بندوبست کرنا تھا۔ اس نے ملازمہ کو چودھری کو بلانے کا حکم دیا۔ ملازمہ نے باہر نکلنے کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی چودھری کھڑا تھا۔

''ارے چودھری صاحب! میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔'' لِنڈا نے لہک کر اس سے کہا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' چودھری نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ سوال کیا۔ اُس کے انداز نے لِنڈا کو چونکایا۔ تاہم اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور نقاہت زدہ آواز میں بولی۔

''طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شہر جا کر کسی بڑے ہسپتال میں چیک اَپ کروا لیتی ہوں۔ آپ میرے لیے گاڑی کا بندوبست کر دیں۔'' اس نے اپنے منصوبے کے مطابق فرمائش کی۔

''ٹھیک ہے، گاڑی تیار ہو جائے گی۔ بلکہ ایسا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''ارے نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ کا یہاں رہ کر یہاں کے معاملات کو سنبھالنا ضروری ہے۔'' جواب دیتے ہوئے اس نے چودھری کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ اس کے اندازے کے مطابق چودھری کچھ چھپا رہا تھا۔

''کیا بات ہے چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' اس نے چودھری کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''ہاں، بات ہی پریشانی کی ہے۔'' خلافِ توقع چودھری نے فوراً قبول کر لیا۔

''مجھے بتائیں، کیا مسئلہ ہے؟ شاید میں کوئی حل پیش کر سکوں۔'' اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا تو چودھری نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالی اور بلند آواز میں اپنے ایک ملازم کو پکارا۔

فوراً ہی ملازم ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے اُٹھائے نمودار ہوا اور چودھری کے اشارے پر ٹرے لِنڈا کے سامنے رکھ دی۔ ٹرے میں ایک مُردہ بلی کا جسم موجود تھا جسے دیکھ کر لِنڈا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''یہ..... یہ کیا ہے؟'' اُس نے قدرے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''اس بلی کو پائے کا وہ شوربہ پلایا گیا تھا جو ملازمہ میرے لیے تیار کر رہی تھی۔ شوربہ پیتے ہی یہ لمحوں میں تڑپ کر مر گئی۔ یعنی اگر میں وہ سالن کھاتا تو میرا انجام بھی اس بلی جیسا ہوتا۔''

''یہ تو آپ کے کسی دشمن کی سازش لگتی ہے۔ آپ فوراً پولیس کو بلوائیں۔ وہی لوگ ملازمین سے تفتیش کر کے اصل حقیقت معلوم کریں گے۔''

یہ مشورہ دیتے ہوئے اس نے غیر محسوس طور پر اپنا شولڈر بیگ کھول کر اس میں سے پسٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن آناً فاناً وہاں بہت سے مسلح افراد دندناتے ہوئے گھس آئے اور اسے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے چودھری صاحب؟'' لِنڈا بوکھلا گئی۔

''اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا ہوگا ڈارلنگ! بتاؤ کہ تم نے مجھے ہلاک کرنے کی سازش کیوں کی؟'' اس پر ہر لمحہ فدا رہنے والا چودھری غراتے ہوئے دریافت کرنے لگا۔

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ باورچی خانے کی نگراں نے خود تمہیں سالن میں کچھ ملاتے ہوئے دیکھا اور اس کی اطلاع پر ہی میرے آدمیوں نے باقی کارروائی کی۔'' چودھری نے ٹرے میں پڑی بلی کی لاش کی طرف اشارہ کیا اور مزید بولا۔ ''ثبوت کے طور پر میرے آدمی تمہارے بیگ سے زہر کی بوتل بھی دریافت کر سکتے ہیں۔''

اشارہ ہونے کی دیر تھی، لنڈا سے اُس کا بیگ چھین کر بستر پر اُلٹ دیا گیا۔ فوراً ہی شیشے کی وہ چھوٹی سی بوتل سامنے آگئی جس کی تہ میں اب بھی تھوڑا سا محلول موجود تھا۔

''اب کیا کہتی ہو؟'' چودھری نے اس سے دریافت کیا۔

''میں اب بھی یہی کہوں گی کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ اپنا لہجہ سنبھالے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی ورنہ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی بری طرح پھنس گئی تھی۔ اس وقت نہ تو اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی جسم میں توانائی کہ اپنے دفاع میں کچھ کر پاتی۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں ذرا مصروف ہوں۔ تم اس کمرے میں رہو، بعد میں آرام سے میری غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرنا۔''

مزاج کے مطابق فوری اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے چودھری نے سرد لہجے میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کارندوں نے فوراً ہی لنڈا کو جکڑ لیا اور اس کے چیخنے چلّانے کی پروا کیے بغیر ہاتھ پیر باندھ کر بستر پر ڈال دیا۔ یہ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ حویلی کی معزز ترین مہمان اب ایک معتوب قیدی کی حیثیت سے بے دست و پا پڑی ہوئی تھی۔

⊛----✪----⊛

سی ایف پی اور آرمی کے جوان اپنے مشترکہ مشن کی انجام دہی کے لیے پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ حرکت میں آگئے تھے۔

کارروائی کرنے والے گروہوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک گروپ کو جنگل میں کارروائی کرنی تھی جبکہ دوسرے کو چودھری کی حویلی پر۔ ذیشان کو اس کے چند جوانوں کے ساتھ جنگل کی طرف جانے والے گروپ میں شامل کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس فضائی اور زمینی دونوں طرح کی کارروائی کے لیے مکمل انتظامات تھے۔ جبکہ چودھری کی حویلی کے لیے محض زمینی کارروائی کو کافی سمجھا گیا تھا۔

شہریار حویلی کو گھیرنے والی پارٹی میں شامل تھا۔ حویلی کے گرد گھیراؤ کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا تھا کہ چودھری کا آبائی قبرستان اور پیر صاحب کا مزار بھی ان کی نظروں میں رہے۔ گاؤں دیہاتوں کے عمومی ماحول کے مطابق وہاں جلد ہی رات نے اپنے پنجے پھیلا دیئے تھے اور دن بھر کی مشقت سے تھکے ہارے مکین اپنے گھروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ یک دم ہی گونجنے والے دھماکوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے اُنہیں ہڑبڑا کر اُٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

کارروائی کا آغاز جنگل سے کیا گیا تھا۔ حویلی کو گھیرنے والی فورس کو اس کے بعد حرکت میں آنا تھا۔ جنگل کی طرف سے آوازیں آنا شروع ہوئیں تو حویلی کو گھیرنے والی فورس اور پیر آباد کے سوئے ہوئے مکینوں



کے جسموں نے ایک ساتھ حرکت کی۔ بستر پر سے ہڑبڑا کر اُٹھنے والے خوف زدہ تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی سرحدی گاؤں میں تو رہتے نہیں تھے کہ دشمن ملک کے حملے کا امکان ہو لیکن آوازوں سے یہی ظاہر تھا کہ کوئی بہت بڑا حملہ ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر اپنے گھروں سے نکلنے ہی لگے تھے کہ مسجد سے اعلان کیا جانے لگا اور پیر آباد کے باسیوں کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنے گھروں تک محدود رہیں۔

اعلان کرنے والے نے یہ بھی بتا دیا کہ کچھ خطرناک مجرموں کی سرکوبی کے لیے پاکستان آرمی ان کے علاقے میں کارروائی کر رہی ہے اور پیر آباد کے باسیوں سے انہیں صرف اتنا تعاون درکار ہے کہ وہ گھروں سے باہر نکلنے کی غلطی نہ کریں۔

غریب و بے بس باسیوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہولتے دلوں اور جاگ جانے والے بچوں کو سنبھالتے رہے۔

ادھر حویلی کی حفاظت پر مامور محافظوں کو جونہی اپنے گھیرے جانے کا احساس ہوا، انہوں نے اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔ باہر موجود افراد کو ان پر جوابی فائر کرنے میں کیا عار تھا۔ وہ تو اتنا فاصلہ طے کر کے آئے ہی اس لیے تھے کہ ان سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔

دونوں طرف سے گولیوں کی برسات شروع ہوئی تو یہ حال ہو گیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ شہریار اس دستے کے ساتھ شامل تھا جس نے قبرستان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ عمومی حالات میں قبرستان میں مسلح محافظوں کی موجودگی کی کوئی تک نہیں بنتی تھی لیکن اُنہیں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس شک کی تصدیق ہو گئی کہ پچھلے دنوں قبرستان کی مرمت اور توسیع کے بہانے یقیناً کچھ اور ہوتا رہا ہے جب ہی تو مسلح محافظ تعینات ہیں۔

قبرستان میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر کی بھی ساری روشنیاں بجھا دی گئی تھیں اس لیے ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا لیکن آنکھوں پر نائٹ ویژن گاگلز لگائے قبروں کی آڑ لے کر آگے بڑھتے ہوئے شہریار کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ وہ اپنی پوزیشن بدل بدل کر مختلف قبروں کی اوٹ سے بہت سوچ سمجھ کر فائر کر رہا تھا۔

چودھری کے اس خاندانی قبرستان میں کوئی قبر معمولی نہیں تھی۔ طبعی موت مرنے والوں سے لے کر دشمن اور گھریلو سازشوں کا شکار ہونے والوں تک ہر ایک کی قبر بڑی شان و شوکت سے بنائی گئی تھی۔ کسی قبر پر گنبد بنا تھا تو کسی کو مرنے کے بعد سنگِ مرمر کی چھتری تلے سایہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مختلف نوع کی یہ تعمیرات ان کے لیے بہترین آڑ ثابت ہو رہی تھیں۔ شہریار بھی اس وقت ایک گنبد کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ قبرستان خاصا وسیع تھا اور ہر قبر کے اوپر موجود تعمیر کی وجہ سے ہر قبر نے ہی خاصی جگہ گھیر رکھی تھی۔

شہریار اپنی جگہ بیٹھا اس بات کا جائزہ لے رہا تھا کہ قبرستان سے حویلی تک جانے کا راستہ کس طرف ہو سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہاں ایسا خفیہ راستہ ضرور موجود ہوگا۔ لیکن فی الحال وہ کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں ناکام تھا۔

چنگاریوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی گولیوں کے شور میں زیادہ سوچنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر مزید آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور ابھی آڑ سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک سایہ احاطے کے ساتھ لگے درختوں میں سے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر دوسرے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض کی وجہ سے وہ باآسانی تمیز کر سکتا تھا کہ یہ اس کے ساتھیوں میں سے نہیں ہے۔ اُس

نے اُس سائے کی طرف فائر کرنے کے لیے گن سیدھی کی لیکن پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ اس دوران وہ شخص دوسرے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ شہریار نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور رینگتا ہوا اس درخت کی جانب بڑھنے لگا۔ ہر طرف برستی گولیوں میں یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا۔ کوئی بھی اندھی گولی اسے نشانہ بنا سکتی تھی لیکن وہ ایسے اندیشوں سے ڈرنے والا تھا ہی کہاں؟ جان ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے سر پھرے اندیشے پالا بھی نہیں کرتے۔

اس کے رینگ کر آگے کھسکنے سے جسم تلے آنے والے سُوکھے پتے چرمرا رہے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ پتوں کے چرمرانے کی آواز اس ہنگامے میں کسی اور کو سنائی نہیں دے سکتی۔ گولیوں کے شور کے علاوہ رات کی تاریکی نے بھی اسے پناہ فراہم کر رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ درخت کے پیچھے چھپا شخص سمت بدل بدل کر فائر کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے سامنے کوئی ٹارگٹ تو تھا نہیں اس لیے وہ اٹکل سے ہی اپنے مخالفین کو نشانہ بنانے یا وہاں سے دُور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شہریار کی اپنے نزدیک موجودگی کا اسے اسی وقت احساس ہوا جب وہ اس کے بالکل سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے تڑپ کر پیچھے مڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش ناکام رہی اور شہریار نے اسے چھاپ لیا۔ شہریار کا زوردار دھکا لگنے سے اس کی رائفل دور جا گری۔ وہ بے طرح ہاتھ پیر چلاتے ہوئے خود کو شہریار کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرتا رہا۔ یک دم ہی شہریار نے اس کے نرخرے پر ہاتھ ڈال دیا۔ دباؤ بڑھنے سے اس کا دم گھٹنے لگا تو ہاتھ پیروں کی مزاحمت بھی ہلکی پڑ گئی اور گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔

''اب کوئی حرکت کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' شہریار نے پھنکارتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ اب وہ اس شخص کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اس کی دھمکی سن کر آدمی نے اپنی مزاحمت بالکل ہی ترک کر دی۔

''اندر جانے کا راستہ بتاؤ۔'' اسے اپنی دھمکی کے زیرِ اثر آتے دیکھ کر شہریار نے مطالبہ کیا۔ جواب میں اس نے دائیں بائیں سر پٹخ کر انکار کیا۔ اس کا انکار شہریار کے جسم میں آگ بھر گیا۔ دایاں ہاتھ تو اس کے نرخرے پر جما ہوا تھا، بائیں ہاتھ سے اس نے پے در پے کئی گھونسے اس آدمی کے جبڑے پر جڑ دیئے۔ گھونسوں کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے کئی دانت ہلنے کے علاوہ جڑ سے بھی اُکھڑ گئے اور منہ سے خون بہنے لگا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو موت سے بدتر صورتِ حال سے دوچار ہو گے۔'' شہریار نے اس کے دانت توڑنے پر ہی بس نہیں کیا اور غراتے ہوئے اس کے بائیں ہاتھ کے پنجے کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔ اُنگلیاں، اُنگلیوں میں پیوست ہوئیں اور پھر لمحہ بھر کی ہی بات تھی کہ اس شخص کی اُنگلیوں کے جوڑ چٹختے چلے گئے۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا۔ اگر اس کا نرخرہ شہریار کی گرفت میں نہیں ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت چیخیں برآمد ہوتیں لیکن اس وقت تو وہ اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئیں۔

''بتاؤ۔ ورنہ میں تمہارے جسم کا ہر جوڑ الگ کر دوں گا۔'' شہریار نے ایک بار پھر وحشت بھری غراہٹ کے ساتھ اُسے حکم دیا۔ اس وقت کہیں سے بھی وہ پڑھا لکھا اور نرم خو آدمی نہیں تھا جو دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابل ایک ایسا شخص ہے جو ظالم کا ساتھ دے رہا ہے۔ چودھری جیسے غدارِ وطن اور اس کے ساتھیوں کے لیے اس کے پاس کسی قسم کی کوئی رعایت موجود نہیں تھی۔ وہ ان غداروں سے نمٹ کر جلد از جلد اپنی ماہ بانو تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے سینے میں اس تصور سے آگ بھڑک اُٹھتی تھی کہ ''وہ'' جس کے لیے اس نے ہمیشہ نرم سائے کی خواہش کی تھی، دیارِ غیر میں تپتی دُھوپ میں جھلس رہی تھی۔ وہ اسے اپنی بانہوں کی پناہ میں لینے کے لیے بے قرار تھا لیکن وطن کے ان دشمنوں



سے نمٹے بغیر کیسے اپنی ذات کا اطمینان حاصل کرنے چلا جاتا۔

''بولو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔'' اس نے اپنے گھٹنوں سے اس کے سینے پر دباؤ ڈالا۔ اس کا گھٹتا ہوا دم مزید گھٹنے لگا جب ہی وہ بے چینی سے ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ شہریار کو اُس کی حالت کا احساس ہوا تو اس کے نرخرے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ کم کیا اور ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

اس بار اُسے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے شکنجے میں جکڑے آدمی نے ایک بہت بڑے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ شہریار اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔ یقیناً اس گنبد سے کوئی خفیہ راستہ اندر کی طرف جاتا تھا۔ اس نے اپنے نیچے دبے شخص کی کنپٹی پر ایک زوردار گھونسہ مار کر اسے بے سُدھ کیا اور اپنے پاس موجود آپریٹس پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے بتانے لگا کہ خفیہ راستے کی موجودگی کا کہاں امکان ہے۔

''آپ کا اندازہ ٹھیک لگتا ہے۔ کیونکہ سب سے زیادہ افراد کا زور اسی گنبد کے اردگرد ہے۔'' دوسری طرف سے اسے بتایا گیا اور پھر وہ اپنی نئی حکمتِ عملی طے کرنے لگے۔ اس بار انہوں نے پوری شدت سے گنبد تک پہنچنے کے لیے زور لگا دیا۔ چودھری کے کارندے کتنے ہی بہادر سہی، ایک منظم فورس سے مقابلے کی تو بہرحال اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی سی کوشش سے وہ گنبد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک جوان نے اپنی ذہانت سے یہ عقدہ بھی حل کر لیا کہ یہ پورا کا پورا گنبد دائیں جانب کھسک سکتا ہے۔

قبرستان کے محافظوں کو زیر کر لینے کے بعد انہوں نے اپنے پاس موجود طاقتور ٹارچیں روشن کر لی تھیں البتہ ان کے ساتھی پوری طرح چوکس تھے کہ اگر کہیں سے کوئی کارروائی ہوتی ہے تو اس کا فوری جواب دے سکیں۔ حویلی کی طرف سے بھی اب اُنہیں بس اِکا دُکا ہی فائر سنائی دے رہے تھے۔ وہاں سے اطلاع مل گئی تھی کہ آرمی اور سی ایف پی کے جوان مین گیٹ کو دستی بم سے اُڑانے کے بعد اندر داخل ہو چکے ہیں اور انہوں نے صورتِ حال کو قابو کر لیا ہے لیکن حویلی میں انہیں خواتین اور بچوں کے علاوہ صرف ملازمین ہی ملے تھے۔ چودھری غائب تھا۔ وہ کسی خفیہ تہ خانے کی موجودگی کے امکان کو سامنے رکھتے ہوئے اسے تلاش کر رہے تھے۔

دونوں گروپس آپس میں رابطہ رکھتے ہوئے اپنی اپنی کارروائی کرتے رہے۔ شہریار والے گروپ نے گنبد کو کھسکایا تو اُنہیں نیچے جانے کا راستہ نظر آ گیا۔ وہ کافی کشادہ سیڑھیاں تھیں جو نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر اُنہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ شہریار نے دونو جوانوں کے ساتھ ان سیڑھیوں سے نیچے اُترنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے آگے وہ خود ہی تھا۔ سیڑھیوں پر ان کا کسی سے سامنا نہیں ہا۔ سیڑھیوں سے آگے ایک کشادہ سرنگ نما راستہ آگے جا رہا تھا جس کی سمت سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ راستہ حویلی کے کسی تہ خانے کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے یہ راستہ بھی بخیریت طے کر لیا۔ اوپر موجود ان کے ساتھی بھی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دیتے ان کے پیچھے ہی تھے۔

سرنگ کے اختتام پر لکڑی کا ایک مضبوط مگر عام سا دروازہ تھا۔ شہریار نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا تو وہ اندر سے بند تھا اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ آٹومیٹک لاک کے بجائے کنڈی لگا کر بند کیا گیا ہے۔ سرنگ میں موجود ہونے کی وجہ سے وہ اس دروازے کو دستی بم وغیرہ پھینک کر توڑنے کا رِسک نہیں لے سکتے تھے۔ نتیجے میں سرنگ بیٹھ جاتی تو وہ سب کے سب زندہ دفن ہو جاتے۔ اب ان کے پاس یہی حربہ رہ گیا تھا کہ دروازے کو توڑنے کے لیے روایتی طریقہ استعمال کریں۔ شہریار اور ایک نوجوان نے مل کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا اور پوری قوت سے دروازے کو اپنے شانوں سے ضربیں لگانے لگے۔ دروازہ چونکہ بہت مضبوط

تھا اس لیے پہلی دو تین ضربوں میں کچھ نہیں ہوا لیکن آخر کار اس کی چولیں ہلنے لگیں۔ اس موقع پر انہیں ہٹا کر دو تازہ دم جوانوں نے ذمے داری سنبھال لی۔ ان جوانوں کی تیسری ضرب پر دروازہ اپنے قبضے سے اُکھڑ کر دوسری طرف جا گرا لیکن ساتھ ہی فوراً ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی آئی۔ دروازہ توڑنے والے دونوں جوان بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے ان گولیوں کی زد میں آ گئے اور نیچے گر کر تڑپنے لگے۔

ردِعمل میں ان کی طرف سے بھی فائرنگ کی گئی لیکن اندر موجود لوگ ان کے مقابلے میں زیادہ محفوظ پوزیشن میں تھے۔ سرنگ میں موجود جوانوں نے نیچے لیٹ کر اور سرنگ کی دیواروں سے چمٹ کر خود کو کسی قدر محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بلٹ پروف جیکٹس بھی پہنے ہوئے تھے لیکن بازو اور ٹانگیں تو گولیوں کا نشانہ بن سکتی تھیں اور بن رہی تھیں۔ شہریار ٹوٹے ہوئے دروازے سے بہت قریب دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر اس نے اپنی پشت پر بندھے بیگ سے دھوئیں کے دو بم نکالے اور اندر کی طرف اُچھال دیئے۔ فوراً ہی اندر باہر دھواں پھیلنے لگا اور بصارتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

شہریار سانپ کی سی تیزی سے اندر کی طرف رینگ گیا۔ اسی وقت اطلاع ملی کہ حویلی کے اندر موجود فورس نے بھی حویلی سے تہ خانے میں کھلنے والا راستہ دریافت کر لیا ہے اور اب وہ لوگ بھی نیچے اُتر رہے ہیں۔ تہ خانے میں موجود افراد کو بھی یقینی طور پر یہ خبر مل گئی اور وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے۔ حقیقتاً اندر موجود افراد میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کا لڑنے بھڑنے سے براہِ راست تعلق نہیں تھا چنانچہ دو طرفہ حملے سے وہ سٹپٹا کر رہ گئے۔

آدھے گھنٹے کے اندر صورتِ حال مکمل قابو میں کر لی گئی۔ زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دے کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں چودھری افتخار عالم شاہ بھی موجود تھا۔ اس کے نچلے دھڑ میں کئی گولیاں لگی تھیں اور ہسپتال جاتے ہوئے وہ بالکل بے سُدھ تھا۔

زخمیوں کو ترجیحی بنیاد پر ہسپتال منتقل کروانے کے ساتھ ساتھ لاشوں اور صحیح حالت میں گرفتار ہونے والوں کا بھی انتظام کیا جانے لگا۔ شہریار اور اس کے ساتھ آرمی کے چند افسران تہ خانے میں قائم کردہ ہیروئن سازی کی لیبارٹری کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

چودھری کی حویلی میں اس لیبارٹری کے قیام کا سبب یہ تھا کہ کوئی شک میں مبتلا نہیں ہوگا کہ یہاں ایسی کوئی سرگرمی ہو رہی ہے۔ کچھ چودھری کے اثر و رسوخ کی وجہ سے بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ اس طرف کا رُخ نہیں کرے گا۔ لیکن جب کارروائی ہوئی تو ساری غلط فہمیاں دُور، اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ پاکستان میں صرف وہی لوگ نہیں بستے ہیں جو ہر دم اسے لوٹنے کھسوٹنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو دفاعِ وطن کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

نیچے کے معاملات نمٹانے کے سلسلے میں چند ضروری ہدایات دینے کے بعد شہریار اور فوج کا ایک افسر اوپر حویلی میں پہنچ گئے۔ یہاں مرد و خواتین ملازمین کو الگ الگ کمروں میں بند کر دینے کے علاوہ چودھری کے اہلِ خانہ کو بھی الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان افراد میں چھوٹی چودھرائن، چودھری کا ذہنی معذور بیٹا بہزاد شاہ، اس کی منکوحہ فریدہ اور فریدہ کا بچہ شامل تھے۔ شہریار نے فریدہ کو شناخت کر لیا۔ وہ اسے پہلے نور پور میں اس کے بھائی چودھری بختیار کے گھر میں بھی دیکھ چکا تھا۔ تب وہ بڑی الہڑ، شوخ اور بے پروا سی لڑکی ہوتی تھی لیکن عشق میں کھائے دھوکے نے اسے اپنے بھائی کے گھر کی ٹھنڈی چھاؤں سے پیر آباد کی اس بڑی



سی حویلی کے جہنم میں لا پھینکا تھا اور وہ اتنی سی عمر میں دنیا کے بڑے بڑے بھیانک تجربوں سے گزر چکی تھی۔ یہ فریدہ ہی تھی جس نے حویلی کے بہت سے پہروں کے باوجود ان کے لیے مخبری کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اس کے دل میں چودھری کے لیے جو بے تحاشا نفرت تھی، اس کے بعد اسے ایسا ہی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ ہر طرف کا جائزہ لیتا شہریار پل بھر کے لیے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' اس نے بہت آہستہ آواز میں فریدہ سے کہا تو جواب میں اس کا چہرہ تمتما اُٹھا اور پلکیں لرزنے لگیں۔ وہ شہریار کو پہچان نہیں سکتی تھی لیکن یہ بات خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا شکریہ کس خدمت کے عوض ادا کیا جا رہا ہے۔

''چودھری بہت شدید زخمی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیا انجام ہو۔'' اس کی دی اطلاع نے فریدہ کے عرصے سے جلتے دل پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اپنی ہر سانس کے ساتھ اس نے جس شخص سے نفرت کی تھی اور ہر طرح کا خطرہ مول لے کر مخبری کا کام انجام دیا تھا، اس کے بارے میں یہ اطلاع سن کر سکون محسوس کرنا فطری سی بات تھی۔

''اللہ نے چاہا تو وہ بدترین انجام سے ہی دوچار ہوگا۔'' یہ جملہ ادا کرتے ہوئے فریدہ کی آنکھوں اور لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔ شہریار خاموشی سے اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چودھری نے ساری زندگی اپنے لیے یہ نفرت ہی تو کمائی تھی۔ ایک اکیلی فریدہ پر کیا موقوف، اس کے ظلم کا سلسلہ تو نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ حویلی کے ہی ایک کمرے میں اُس کی لنڈا سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہوش رُبا حُسن کی مالک وہ عورت ان کے جوانوں کو بندھی ہوئی حالت میں ہی ملی تھی۔

اس نے اپنے طور پر کوشش کی کہ خود کو مظلوم ثابت کرتے ہوئے انہیں یہ باور کروا سکے کہ وہ ایک عام سی عورت ہے جسے چودھری نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے قید میں ڈال رکھا ہے لیکن ظاہر ہے وہ لوگ ایسی کسی کہانی سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔ شہریار نے اسے بطورِ خاص سی ایف پی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر منتقل کروایا۔

حویلی کے معاملات سے نمٹتے نمٹتے اُنہیں صبح ہو گئی۔ صبح سے پہلے ہی انہیں جنگل کی طرف جانے والوں کی طرف سے بھی کامیابی کی خبر مل چکی تھی۔ جنگل میں کارروائی کرنے والی فورس کا ایک حصہ وہیں رک کر معاملات نمٹاتا رہا۔ دوسرا فوری طور پر واپسی کے لیے روانہ ہو گیا جبکہ تیسرا حصہ حویلی میں اپنے ساتھیوں سے آ ملا۔ حویلی پہنچنے والوں میں ذیشان بھی شامل تھا۔ ان سب کے چہروں سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اس تھکن پر کامیابی کی خوشی حاوی ہو گئی تھی۔

''مائی گاڈ..... وہ لوگ تو بہت منظم طریقے سے وہاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اگر ہمارے پاس عمیر رجگو کی فراہم کردہ رپورٹ نہیں ہوتی اور ہم اتنی تیاری سے نہیں آئے ہوتے تو یہ لوگ کبھی ہمارے قابو میں نہیں آ سکتے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے فضا سے بھی ان تک رسائی کا انتظام رکھا ورنہ زمین پر تو انہوں نے ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ کوئی ان کی حدود میں داخل ہی نہ ہو سکے۔ جب ان پر فضائی حملہ ہوا تو بوکھلا کر خود اپنے حصار سے باہر نکلے لیکن بھاگ کر کہاں جاتے؟ ہمارے جوان اطراف میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے زندہ گرفتاری نہیں دی، اُنہیں جان سے جانا پڑا۔ بہرحال یہ سب کچھ بہت خوف ناک تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دشمن ایسی جگہ پر بھی اپنے پنجے گاڑ سکتا ہے۔ اب تک تو ہماری قبائلی علاقوں کے بارے میں ہی یہ معلومات تھیں کہ وہاں دھڑلے سے افیون کاشت کی جاتی ہے اور ہیروئن سازی کی فیکٹریاں

لگی ہوئی ہیں اور وہ لوگ اس حد تک خودمختار ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔ لیکن یہاں، اس جگہ انہوں نے اپنا کارخانہ کھول لیا ہوگا، اس بات کی تو امید ہی نہیں تھی مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ اس جگہ بھی پوست کاشت کی جاسکتی ہے لیکن اپنے دشمنوں کی سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت کو نظر میں رکھوں تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اسے یہ ساری باتیں بتاتا ذیشان عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔

''ان لوگوں کے پاس اتنا جدید اسلحہ تھا کہ انہوں نے زمین سے ہمارے ایک ہیلی کاپٹر کو تقریباً ہٹ کر لیا تھا۔ پائلٹ ہوشیار نہ ہوتا تو ہیلی کاپٹر سمیت خود بھی جان سے جاتا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم بارڈر پر دشمن ملک کی فورس سے مقابلہ کر رہے ہوں۔''

ذیشان وقفے وقفے سے ہیجان زدہ لہجے میں اسے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ یہ ساری خبریں سن کر شہریار کا دل کسی قمقمے کی طرح جل بجھ رہا تھا۔ یہاں ملنے والی کامیابیوں کا سوچتا تو دل میں طرف روشنی سی محسوس ہوتی تھی لیکن پھر اگلے لمحے ہی دیارِ غیر میں ماہ بانو کے پھنسے ہونے کے خیال تاریکی میں ڈوب جاتا۔ اندر باہر کی مختلف کیفیات اور حالات سے نمٹتے آخر کار اسے پیرآباد سے نکلنے کا موقع مل ہی گیا۔ حویلی اب بھی فورسز کے جوانوں کے قدموں سے گونج رہی تھی۔ سی ایف پی کے بھی چند جوان وہیں رُکے ہوئے تھے لیکن شہریار، ذیشان سمیت روانہ ہوگیا۔ وہ دونوں ہی بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے لاہور پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے لِنڈا سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ چودھری کی حویلی میں ٹھہری اس غیرملکی مہمان عورت سے انہیں بہت سے انکشافات کی اُمید تھی لیکن جب وہ دونوں لِنڈا کے سامنے پہنچے تو ذیشان ہکا بکا رہ گیا۔

''ایملی پارکر۔'' لِنڈا کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' شہریار حیران ہوا۔

''یہ وہی تو ہے جس نے مجھ سے فوج کی وردی پہننے کا حق چھین لیا تھا۔'' ذیشان کی آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

شہریار فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔ ذیشان اور اس کی دوستی اتنی گہری تھی کہ ذیشان نے اپنی زندگی میں کھائے جانے والے اس سب سے بڑے دھوکے سے بھی آگاہ کر دیا تھا جو اسے آرمی سے نکال کر سی ایف پی میں لے آیا تھا۔ اور یہ بھی کرنل توحید کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اس کے اندر کے محبِ وطن سپاہی کو پہچان کر ہمیشہ کے لیے معتوب قرار دینے کے بجائے ایک بار پھر اُٹھنے اور سنبھلنے کا موقع دیا تھا اور ذیشان نے ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ اسی سلوک کا حق دار تھا۔ لیکن بہرحال ایملی پارکر نام کی پھانس اس کے سینے میں اٹکی ہوئی تھی اور اس پھانس کو نکالنے کا اس سے بہترین موقع کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''کانگریچولیشن۔'' کرنل سبکتگین نے اپنے سامنے بیٹھے شہریار اور ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن وہ دونوں ہی مسکرا نہ سکے۔

اس وقت پورے ملک میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ جنگل اور چودھری کی حویلی میں رات کے اندھیرے میں بیک وقت کی جانے والی وہ کارروائیاں ایسی تو نہ تھیں کہ میڈیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتیں۔ بہت کچھ ظاہر کرنے کے باوجود میڈیا نے بہت کچھ جان لیا تھا اور ملک بھر کے لوگ انگشت بدنداں یہ انکشافات سن رہے



تھے کہ پیرآباد کا بااثر و باحیثیت چودھری جو اپنے علاقے میں ایک روحانی پیشوا کی سی بھی حیثیت رکھتا تھا، ایسی غیرملکی تنظیموں کے لیے کام کر رہا تھا جو وطنِ عزیز میں ہیروئن اور اسلحے کی لعنت پھیلانے میں پیش پیش تھیں۔ چودھری کی حویلی کے تہ خانے میں قائم کردہ ہیروئن سازی کی لیبارٹری سے لے کر جنگل میں پوست کی کاشت تک بہت کچھ منظرِ عام پر آیا تھا۔

فوج کی اتنی بڑی کامیابی پر ایک طرف اسے سراہا جا رہا تھا تو دوسری طرف یہ تنقید بھی کی جا رہی تھی کہ اتنے بہت سے خفیہ اداروں کی موجودگی میں اس قسم کی صورتِ حال پیش ہی کیونکر آئی۔ لوگوں کی طرف سے چودھری افتخار عالم شاہ اور دیگر گرفتار شدگان کے لیے پھانسی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا لیکن چودھری تو ہنوز آئی سی یو میں تھا اور ڈاکٹرز اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں رہے تھے۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ زندہ بچ بھی گیا تو ہمیشہ کی معذوری اس کا نصیب بن جائے گی۔

فوج کے ترجمان نے میڈیا کو اس سلسلے میں بریفنگ دیتے ہوئے محض اتنا ہی کہا تھا کہ اس سب کے پیچھے ان کی دشمن طاقتیں موجود ہیں۔ واضح طور پر کسی ملک یا ادارے کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ لِنڈا اور حویلی کے تہ خانے سے گرفتار ہونے والے ہیروئن سازی کے ماہر کی گرفتاری کو بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ انہوں نے لِنڈا اور چودھری کے خصوصی موبائل فون بھی حاصل کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جسے کامیابی قرار دیا جاسکتا تھا لیکن اس وقت کرنل سبکتگین کے سامنے بیٹھے شہریار اور ذیشان کے چہروں پر کامیابی کی خوشی کے بجائے تناؤ نظر آ رہا تھا۔

''میں تم لوگوں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ملکی معاملات میں جذبات کو پیچھے رکھ کر بھی بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔'' انہیں خاموش دیکھ کر آخر کار کرنل سبکتگین نے خود ہی وہ موضوع چھیڑ دیا جس نے انہیں تناؤ کا شکار کر رکھا تھا۔

''ہماری امریکی ذمے داران سے بات ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ بھی اس بات پر سخت برافروختہ ہیں کہ ''موساد'' نے ان کی تمام تر مہربانیوں کے باجود امریکہ کے خلاف ایسی سازش تیار کی کہ پاکستان میں ہیروئن تیار کر کے اسے امریکہ میں پھیلانے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اسرائیل، امریکہ کا وہ چہیتا اور لاڈلا ملک ہے جس کی وہ ہر خطا معاف کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ہماری طرف سے دی ہوئی رپورٹوں پر انہوں نے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ اپنے طور پر خود ''موساد'' سے نمٹ لیں گے لیکن انہیں ہم سے لِنڈا درکار ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ مطالبہ اسرائیل کی فرمائش پر ہی ہے لیکن ہم انہیں انکار کرنے سے پہلے اس لیے سوچنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے لِنڈا کے بدلے اس لڑکی ماہ بانو کی صحیح سلامت واپسی کی ضمانت دی ہے جسے واپس لانے کے لیے تم لوگ خود بھی بے چین ہو۔ امریکی سفیر نے صاف کہہ دیا ہے کہ آرلینڈو کے جنگلات میں خفیہ تجربہ گاہ سے متعلق انکشافات پر مبنی ماہ بانو کی ویڈیو ان کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتی اور وہ باآسانی اسے ایک اسکینڈل قرار دے سکتے ہیں اس لیے اگر ہم اس لڑکی کو واپس چاہتے ہیں تو ہمیں لِنڈا کو انہیں واپس کرنا ہوگا۔ اب تم بتاؤ کہ ہمارے پاس اس سودے کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟ ہاں، یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ ہم ساتھ ہی اپنے لیے کچھ مراعات کا مطالبہ کر کے موقع سے فائدہ اٹھالیں۔'' کرنل سبکتگین نے ان پر ایک بار پھر صورتِ حال واضح کی۔

''لیکن یہ سودا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔ لِنڈا اور ماہ بانو میں بہت فرق ہے۔ ماہ بانو زمانے کی ستائی ہوئی ایک بے قصور، بے گناہ اور ستم رسیدہ لڑکی ہے جبکہ لِنڈا ایک ایسی عورت ہے جس کی وجہ سے

سینکڑوں نہیں، ہزاروں زندگیاں تباہ ہوئی ہوں گی۔ وہ ہماری قومی مجرم ہے جو منشیات اور ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے لے کر اہم قومی رازوں کو چرانے تک ہر طرح کے سنگین جرائم میں ملوث پائی گئی ہے۔ ہم اسے اتنی آسانی سے کس طرح نکلنے دے سکتے ہیں؟'' شہریار نے اعتراض کیا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، مجھے اس کی سچائی سے انکار نہیں ہے لیکن سچائی کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ تم نے مجھے لِنڈا کے جو جرائم گنوائے ہیں، وہی سارے جرائم ماہ بانو کے سر پر بھی تھوپے جا سکتے ہیں۔ ثبوت اور شواہد تیار کر لینا ان لوگوں کے لیے بالکل معمولی بات ہوگی۔ وہ اگر رعایت سے کام لے رہے ہیں تو ہمیں اس کا فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ ورنہ تم ان کا مزاج بھی جانتے ہو۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کو پروا نہیں ہو سکتی کہ اس کے قدموں تلے کون کون سے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ ہم کس حد تک آزاد اور خود مختار ریاست ہیں، یہ حقیقت بھی ہم پر اچھی طرح روشن ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جھکنا ہے تو کم از کم اپنی شرائط پر جھکیں ورنہ آگے وہ صورتِ حال کو ایسا کر دیں گے کہ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔'' کرنل سبکتگین نے دھیمی آواز میں وہ حقائق گوش گزار کیے جو شرمناک اور تلخ تھے لیکن انہیں مانے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

اس بار شہریار اور ذیشان میں سے کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ صرف ماہ بانو کا معاملہ نہیں تھا، مراد شاہ اور مصطفیٰ خان کے مستقبل کا بھی سوال تھا۔ ماہ بانو والے معاملے نے ان دونوں کو بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کر دیا تھا اور یہی موقع تھا کہ ان کی بھی وہاں سے بحفاظت واپسی کا سامان کر لیا جائے ورنہ آگے چل کر مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ ان کے درمیان اس حوالے سے کچھ دیر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

''عادل خان کا تو امریکہ کے لیے ویزا لگ ہی چکا ہے اس لیے یہ پہلے وہاں کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ لِنڈا کو ہم اس کے بعد روانہ کریں گے اور اس کے ساتھ بھی ہمارا ایک ساتھی خفیہ طور پر سفر کرے گا۔'' کرنل سبکتگین آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

''لِنڈا کے ساتھ میں جاؤں گا۔'' ذیشان نے فوراً خواہش ظاہر کی۔

''نہیں، تمہارا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ لِنڈا تمہیں پہچانتی ہے اور حلیے کی تبدیلی تمہیں ویسے ہی مشکوک بنا دے گی اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنے لوگوں میں سے کسی قابلِ اعتماد شخص کا انتخاب کر لو۔'' کرنل نے اس کی خواہش کو ردّ کرتے ہوئے تجویز پیش کی تو ذیشان دل مسوس کر رہ گیا لیکن مزید اصرار کی گنجائش نہیں تھی۔ کرنل نے انکار کی واضح دلیل پیش کی تھی۔

''میرے خیال میں اس کام کے لیے جاوید علی موزوں رہے گا۔ وہ بہت ذہین اور اسمارٹ لڑکا ہے۔'' شہریار نے مشورہ دیا جس کی ذیشان نے بھی تائید کی اور پھر اس حوالے سے ان کے درمیان مزید مشورے بھی ہوتے رہے۔ آج کل ان کا کام ہی یہ تھا۔ وہ گھنٹوں کے حساب سے مشورے، تفتیش اور بھاگ دوڑ میں وقت گزار رہے تھے اور بہت کم وقت کے لیے آرام کر پاتے تھے۔ میڈیا کو سنبھالنا، عوام کے سوالوں کا جواب دینا، گرفتار شدگان سے تفتیش، بے گناہوں کی چھانٹی، ہسپتالوں میں موجود اپنے ساتھیوں اور مجرموں کی خبر گیری، حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں مارے جانے والے چھاپے اور نہ جانے کون کون سے کام تھے جو انہیں ان دنوں کرنے پڑ رہے تھے۔ بستر پر آرام کے لیے کمر ٹکاتے بھی تھے تو ذہن کئی مسئلوں میں اُلجھا رہتا تھا۔

''تم لوگ اس کام کو نمٹا لو تو ہمیں سی ایف پی کے مستقبل کے لیے بھی کچھ فیصلے کرنے ہوں گے۔ ہم نے سکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں بہت عرصے تک اس ادارے کو کامیابی سے چھپائے رکھا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ



ہمارا یہ سیٹ اپ دشمنوں کی نظر میں آ چکا ہوگا۔ خصوصاً ڈیوڈ نامی جس بندے کے فرار کی خبر ملی ہے، وہ بہت اہم ہے۔ ڈیوڈ بہت منجھا ہوا ایجنٹ ہے جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہونے کے باوجود کبھی کوئی اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ کہتے ہیں، بے شمار زبانوں کے ماہر اس شخص کے سینکڑوں روپ ہیں۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کر لیتا ہے جہاں موجود ہو۔ اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ یہاں سے بھی نہایت صفائی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور ہمیں اپنے دو قیمتی آدمی گنوانے پڑے۔ مجھے یقین ہے کہ ناکامی کے باوجود ڈیوڈ یہاں سے بالکل خالی ہاتھ نہیں گیا ہوگا۔ کرنل توحید کے جنازے سے تمہارا اور ذیشان کا پیچھا ہونے کا مطلب ہے کہ اس نے سی ایف پی کی حقیقت بھی کھوج لی ہوگی۔ اس لیے اب ہمیں اس ادارے کے لیے کوئی نیا کور تلاش کرنا پڑے گا۔'' کرنل سبکتگین نے ایک اور مسئلہ سامنے رکھا۔

''ٹھیک ہے سر!..... ہمیں تو کام ہی کرنا ہے۔ کسی بھی صورت میں کریں، کیا فرق پڑتا ہے؟'' ذیشان نے شانے اچکائے۔

''تم یہاں رہ کر اس سلسلے میں میرے ساتھ کام کرو گے۔ عادل خان اور جاوید علی اس دوران وہاں کے معاملات نمٹاتے رہیں گے۔'' کرنل نے شاید اس پروگرام کا ذکر اس وقت بطورِ خاص ذیشان کی دل جوئی کے لیے چھیڑا تھا کہ کہیں وہ خود کو امریکہ نہ بھیجے جانے پر دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے۔

''میں ہر وقت، ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں سر!'' ذیشان نے خوش دلی سے جواب دے کر واضح کر دیا کہ وہ ان کے ہر حکم پر راضی ہے کہ سپاہی کا تو کام ہی حکم بجا لانا ہے۔

⊛----✪----⊛

ایئرپورٹ سے نکل کر ٹیکسی میں سوار ہوٹل کی طرف جاتے شہریار کے چہرے پر بظاہر شوق اور تجسس کے سوا کچھ نہیں تھا اور اپنے حلیے سے وہ ایک ایسا کھلنڈرا نوجوان دکھائی دیتا تھا جو پہلی بار امریکہ آنے پر بے حد سرور ہو۔

اس نے نیلے رنگ کی جوٹی شرٹ جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی، اس پر واضح طور پر ''آئی لو نیویارک'' کے الفاظ چھپے ہوئے تھے اور اُس کا ماڈرن سا ہیئر اسٹائل بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ان ایشیائی جوانوں میں سے ایک ہے جن کے خوابوں کی سرزمین اکثر امریکہ ہوا کرتی ہے۔ وہ ہونٹوں کو سیٹی بجانے کے انداز میں سکیڑے ایک شوخ سی دُھن گنگنا رہا تھا اور بے حد شوق سے اردگرد کے مناظر دیکھ رہا تھا۔

ایئرپورٹ سے ہوٹل تک کا راستہ اس نے اسی انداز سے طے کیا۔ لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے۔ وہ دیو کی قید سے اپنی شہزادی کو لے جانے آیا تھا اور ظاہر ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر جونہی اس نے دروازہ بند کیا، اس کے چہرے پر چڑھا شوخی کا نقاب بھی اُتر گیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے پاس موجود خصوصی موبائل فون نکالا جو کبھی چودھری کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ ویسا ہی ایک سیٹ اُنہیں لِنڈا کے پاس سے بھی ملا تھا اور اسے وہ جاوید علی کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ موبائل پر اس نے مصطفیٰ خان کے اس نمبر پر رابطہ کیا جو اس نے حال ہی میں کسی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور ریکارڈ میں اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھا۔

''میں پہنچ گیا ہوں۔'' بغیر کسی حوالے کے اس نے مصطفیٰ خان کو اطلاع دی۔

''یہاں فی الحال سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ جس پارٹی سے سودا ہوا ہے، اس کی طرف سے دھوکے کا بھی ڈر نہیں لیکن تھرڈ پارٹی ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرے گی۔ ہمیں اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ میں اور

میرے ساتھی تم سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔'' مصطفیٰ خان نے بھی اسی
سے انداز میں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''تھرڈ پارٹی کو دیکھنے کے لیے ہی میں یہاں آیا ہوں۔ باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔''

''لارڈ صاحب کے بیٹے اور بیٹی کی فیملی آج واپس روانہ ہو رہی ہے۔ کسی نے ان سے کوئی تعرض نہیں
ہے۔ امید ہے کہ آگے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔''

وہ کشور اور مراد شاہ کی بات کر رہا تھا۔ حویلی پر ہونے والے ریڈ اور چودھری کے شدید زخمی ہونے کی
سن کر ان دونوں بہن بھائی نے پاکستان واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اچھی بات ہے۔ تم اپنے لوگوں کو ریڈی رکھو۔ اصل کہانی تو کل کی ہے۔ کل کوئی نہ کوئی تماشا ضرور
گا۔'' ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں پھنکار سی تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ کسی کو
کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔ اسے اس بات کی بھی قطعی پروا نہیں تھی کہ وہ امریکی سرزمین پر ہے اور امر
اس طاقت کا نام ہے جو بیٹھے بیٹھے اس کے ملک جیسے ممالک پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ اس وقت اس کے سینے میں
جو آگ دہک رہی تھی، وہ صرف اتنا دکھا سکتی تھی کہ اگر وہ اپنی ماہ بانو کو یہاں سے صحیح سلامت نہ لے جا سکا تو
پھر یہاں بھی بہت سی تباہی پھیلے گی اور دنیا کے ٹھیکے دار جان لیں گے کہ جب کسی دل جلے عاشق کو چھیڑا
جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

⊛----✪----⊛

ہسپتال کے بستر پر پڑا وہ وجود دیکھنے والوں کے لیے نشانِ عبرت تھا۔

وہ شخص جو کبھی مطلق العنان حاکم بنا لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کیا کرتا تھا، آج اس لائق بھی
نہیں تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جنبش دے کر اپنے جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو اُڑا سکے۔

اس صاحبِ اختیار و اقتدار کا آج اپنے جسم پر سے ہی اختیار ختم ہو گیا تھا اور وہ اپنے منہ سے بہنے والی
رال کو بھی بہنے سے روکنے کا مختار نہیں تھا۔ پورے جسم میں صرف اس کی آنکھیں تھیں جو حرکت کر سکتی تھیں اور
یہ آنکھیں اسے ان چہروں کو دکھا رہی تھیں جو کسی نہ کسی طور اس کے ظلم و جبر کا نشانہ بنے تھے۔

سب سے آگے اس کا پیارا اور لاڈلا بیٹا مراد شاہ کھڑا تھا۔ اس بیٹے کو اس نے دنیا کی ہر آسائش دی تھی
لیکن وہ باپ نہیں دے سکا تھا جس کے کردار و اخلاق پر وہ فخر کر سکے۔ چنانچہ اس نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار
کر کے خود کو اس دولت و جاگیر سے دُور کر لیا تھا جس کی بنیادوں میں مظلوموں کا خون، آہیں اور سسکیاں دبی
ہوئی تھیں۔

مراد شاہ کے پیچھے اس کی وہ بیٹی موجود تھی جسے اس نے حویلی کی روایات کے خلاف کچھ سہولتیں دی تھیں
اور ان سہولتوں نے اسے حرف آشنا بنا دیا تھا۔ یہ مہربانی صرف اس لیے تھی کہ وہ فطری زندگی گزارنے کا حق
تلف کرنے پر احتجاج نہ کرے اور باپ کے احسانوں تلے دبی رہے۔ لیکن کشور ان بہلاووں سے نہ بہل سکی
اور اس نے اپنے لیے آفتاب کا انتخاب کر کے حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے فرار حاصل کر لیا تھا۔ اس کی
جرأت و گستاخی کی سزا دینے کے لیے آج بے بس پڑے وجود نے کتنا اودھم مچایا تھا۔ اگر کشور کی قسمت ہر بار
ساتھ نہ دیتی تو وہ آفتاب اور اپنی بیٹی سمیت کب کی اس دنیا سے جا چکی ہوتی۔ لیکن وہ کیسے چلی جاتی؟ اسے تو
اپنے باپ کو آئینہ دکھانے کے لیے آج اس کے روبرو کھڑا ہونا تھا۔ اس باپ کے روبرو جو کبھی اس سے اتنی
شدید نفرت کرتا تھا کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا اور آج ایسا بے بس تھا کہ اس سے منہ بھی نہیں



اُڑ سکتا تھا۔ زبان سے نفرت کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس حیرانی کا بھی اظہار نہیں کر سکتا تھا جو
کشور کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے ہو رہی تھی۔

اتنے لوگوں میں وہ واحد تھی جو اپنے ظالم باپ کے اس انجام پر دُکھی تھی اور ہولے ہولے اس کے لیے
سسک رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی بڑی دونوں بیٹیوں تاجور اور صنوبر کو بھی اس کے لیے صدمہ ہو لیکن وہ اس
سے ملنے ہسپتال نہیں آئی تھیں۔ انہیں اپنے سسرال کی طرف سے ایک بدنام شخص سے ملاقات کرنے کی
اجازت نہیں ملی تھی۔

کشور کے ساتھ ہی اس کی ماں، چھوٹی چودھرائن ناہید کھڑی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے ایک تھی جسے
چودھری کی منکوحہ ہونے کا اعزاز حاصل رہا تھا اور وہ پہلے سے ہی بٹے ہوئے شخص کو اپنے حقوق، بازاری
عورتوں پر لٹاتا دیکھ کر بھی خاموش رہ کر اس مال و دولت سے بہلنے پر مجبور تھی جو چودھری کی بیوی ہونے کی وجہ
سے اس کے تصرف میں تھا۔

بڑی چودھرائن کو تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگا دیا تھا اور چھوٹی چودھرائن نے اس پر یہ
احسان کیا تھا کہ بے بس و مجبور پڑے چودھری کے اس فعل کو اس کی اولاد پر ظاہر کر کے اس کے لیے نفرت
کے مزید در نہیں کھولے تھے۔

چھوٹی چودھرائن کے پیچھے بہزاد شاہ اور فریدہ موجود تھے۔ ذہنی معذور بہزاد شاہ جو اس سے اس بات کا
کوئی حساب نہیں لے سکتا تھا کہ اپنی منکوحہ بن کر حویلی میں لائی جانے والی لڑکی پر نیت خراب کرنے کے جرم
میں اس کا گریبان پکڑ سکتا لیکن جو وہ نہیں کر سکتا تھا، وہ فریدہ کی نفرت بھری نگاہیں کر رہی تھیں۔ وہ جب بھی
اس کی طرف دیکھتی تھی، اپنی نظروں کی دھار سے اس کے دل کو کاٹ کر رکھ دیتی تھی۔ پلکوں کی جنبش سے
اڑے لگاتی تھی اور چہرے کی سرخی کو مرچوں کی طرح اس کے زخم زخم وجود پر چھڑک دیتی تھی۔ وہ اس لڑکی کو
اس کے بھائی کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی حویلی میں لایا تھا اور آج اسی کی وجہ سے اس کی حویلی کی بنیادیں ہل
کر رہ گئی تھیں۔ فریدہ نے اسے جتا دیا تھا کہ چیونٹی بھی حقیر اور بے وقعت نہیں ہوتی۔ موقع ملنے پر وہ ہاتھی کی
سونڈ میں گھس کر اسے بے بس کر سکتی ہے اور پچھاڑ سکتی ہے۔ سو اس نے یہ سب کچھ کر دکھایا تھا۔

''میری ڈاکٹرز سے بات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لگنے والی گولیوں نے ان کے نروز (اعصاب) کو
بری طرح تباہ کر دیا ہے کہ اب یہ ساری زندگی بستر سے نہیں اُٹھ سکتے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ریڑھ کی ہڈی
میں گولیاں لگنے کے باوجود ان کا بچ جانا ایک معجزہ ہی ہے لیکن یہ زندگی محتاجی کی زندگی ہو گی اور مشکل ہی ہے
کہ یہ کبھی اپنی زبان کو بھی حرکت دے سکیں۔''

مراد شاہ دھیمی آواز میں ان سب کو بتا رہا تھا۔ سننے والے جانتے تھے کہ چودھری کی زندگی کا بچ جانا معجزہ
نہیں بلکہ وہ سزا ہے جو قدرت کی طرف سے اس کے لیے متعین کی گئی ہے۔ ملک، قوم اور انسانیت کے اس
مجرم کو قانون سزا بھی دیتا تو کیا دیتا؟ زیادہ سے زیادہ سزائے موت کا ہی انتخاب ہو سکتا تھا نا۔ لیکن موت و
حیات کے درمیان بستر پر پڑے رہنے کی یہ سزا سب سے کڑی تھی۔ حکمرانی کرنے والا اپنی مرضی سے حرکت
کرنے تک سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ بھوک، پیاس، درد، خوشی سب محسوس کرنے کے باوجود ان کے اظہار کی
صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ سزا دنیا کی ہر سزا سے کڑی تھی۔ اس سزا کو کاٹتے ہوئے وہ اچھی طرح جان
گیا کہ اسلحہ کتنی تباہ کن شے ہے اور منشیات کی لعنت سے گھن لگ جانے والے جسموں کے ساتھ زندگی گزارنا
کتنا دشوار ہوتا ہے۔

زندگی بچا کر زندگی کے مزے چھین لینے والے نے اسے پورا موقع دے دیا تھا کہ وہ اپنے پرانے ان سارے چہروں کو ایک ایک کر کے یاد کرے جو اس کے ظلم وستم کا شکار ہوئے تھے۔ اس نے حکمرانی کے مزے بہت لُوٹے تھے، اب اُسے یہ جاننا تھا کہ بے بسی کا عذاب کیسا ہوتا ہے اور اپنی ہی ہر سانس کیسے بوجھ بن جاتی ہے۔

زبان کی ذرا سی جنبش سے زندگی چھین لینے والا آج اتنا بے بس ہو گیا تھا کہ خود اپنے آپ کو زندگی کے عذاب سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے پاس اللہ سے موت کی دعا مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقین موجود تھا کہ اس جیسے گناہ گاروں کی دعائیں اتنی آسانی سے قبول نہیں ہوتیں۔ اذیت اور بے بسی کے احساس نے آخر کار اسے اپنی آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔ آخر کوئی رحم، غصے اور نفرت سے بھری اپنوں کی نگاہوں کو کب تک سہہ سکتا ہے؟ وہ بھی نہیں سہہ سکا تھا۔

''شاید انہیں نیند آ رہی ہے۔ آیئے ہم سب باہر چلتے ہیں۔'' مراد شاہ نے سب سے کہا تو ایک ایک کے سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

''میری ذمے داران سے بات ہو گئی ہے۔ حویلی ہمارے حوالے کر دی جائے گی اور ان ملازمین کو بھی رہا کر دیا جائے گا جو کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔ آپ لوگ چاہیں تو ابھی حویلی کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں باہر گاڑی اور ڈرائیور موجود ہیں۔'' وزیٹنگ روم میں پہنچ کر مراد شاہ نے ان سب سے کہا۔ وہ خود بہت تھکا ہوا اور دُکھی نظر آ رہا تھا۔ لمبے سفر کے بعد ہسپتال آنے تک بھی اسے مسلسل مصروف رہنا پڑا تھا۔ یہ تو ذیشان کی مہربانی تھی کہ اس نے بہت سے معاملات خود ہی نمٹا لیے تھے اور صرف فون پر ہی سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔

مراد شاہ چھوٹی چودھرائن، بہزاد شاہ اور فریدہ کو اس ادارے سے لیتا ہوا ہسپتال پہنچا تھا جہاں انہیں حویلی سیل کرنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ آفتاب کو اپنے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے وہ ایئرپورٹ پر ان سے جدا ہو گیا تھا۔ اس نے کشور سے کہا تھا کہ وہ کچھ تاخیر سے ہسپتال پہنچ جائے گا۔

''آپ باقی لوگوں کو لے کر چلے جائیں۔ میں آفتاب کا انتظار کروں گی۔'' بچی کو گود میں اُٹھائے کشور ایک صوفے پر ٹِک گئی۔

''میں بھی ابھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہمارے علاقے کے اے سی عمیر آفندی بھی اس ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کی مزاج پُرسی کے لیے یہاں رُکوں گا۔'' مراد شاہ نے اسے جواب دیا اور باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان افراد میں اس کی بیوی، بیٹی، سوتیلی ماں، بھائی بہزاد، فریدہ اور اس کا بچہ شامل تھے۔ پتھرائی نظروں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھتے اس کی نظریں فریدہ کے چہرے پر رُک گئیں۔ یہ لڑکی بھی تو اس کے باپ کے ظلم کا نشان بن کر ان کے خاندان میں موجود تھی۔ خشک ہوتے گلے کو تر کر کے وہ فریدہ سے مخاطب ہونے کی جرأت کر سکا۔

''اگر آپ چاہیں تو اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کر سکتی ہیں۔ ابا جی کی ناانصافی نے آپ کو ایک ایسے معذور شخص سے باندھ دیا تھا لیکن اب میں آپ کی زندگی کے سارے اختیارات آپ کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔'' فریدہ سے کب حویلی کے کسی مرد نے اتنی عزت سے بات کی تھی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور گلا رُندھ گیا۔ وہ بڑی مشکل سے کچھ کہنے کے قابل ہو سکی۔

''آپ کا شکریہ بھائی صاحب! کہ آپ نے میرا اتنا خیال کیا۔ لیکن میں حویلی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ میرے پاس اپنی زندگی کے لیے کوئی خواب اور خواہش نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا



پنے خاندان میں ہی پرورش پائے۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے بھی کیا ہے کہ میری معلومات کے مطابق اب س خاندان کی سربراہی جس شخص کو ملنے والی ہے، وہ ایک ہمدرد، تعلیم یافتہ اور منصف مزاج شخص ہے۔'' فریدہ ؤں جوں بولتی گئی، اس کی رُندھی ہوئی آواز صاف ہوتی چلی گئی۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی ان توقعات پر پورا اُتر سکوں۔'' مراد شاہ نے اسے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' کشور نے فریدہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نم آنکھوں کے ساتھ کہا تو فریدہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ حویلی کے مکینوں میں سے واحد کشور ہی ہے جو اپنے باپ کے گھناؤنے کردار سے واقف ہے اور اس وقت اس نے اس کا شکریہ اس لیے ادا کیا تھا کہ وہ اس کے باپ کے گھناؤنے چہرے کو کسی کے سامنے نہیں لائی ہے۔ لیکن سچ یہ تھا کہ فریدہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے بھلائی اسی میں تھی کہ وہ بہزاد شاہ کی منکوحہ کی حیثیت سے حویلی میں اپنی زندگی کے باقی کے دن عزت سے گزار دے۔ بعض سچ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سامنے لانے پر رُسوائی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور وہ جانتی تھی کہ سچائی سامنے آنے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان اس معصوم وجود کا ہو گا جو خود کو دنیا میں لائے جانے کے گناہ میں کبھی شریک نہیں تھا۔ اس کے لیے یہی سب سے بہتر تھا کہ وہ بہزاد شاہ کا بیٹا کہلاتا رہے۔

شکستہ، ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے افراد پر مشتمل اس خاندان کے افراد جب حویلی واپس لوٹنے کے لیے ہسپتال سے روانہ ہو رہے تھے تو مراد شاہ، عمیر آفندی کے کمرے میں بیٹھا اُس کی مزاج پُرسی کر رہا تھا۔ کیونکہ عمیر آفندی ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ مل کر اس کو مستقبل کے پیرآباد کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ اس پیرآباد کی جو چودھری افتخار عالم شاہ کے دور کے اندھیروں سے نجات پا کر ایک روشن مثال کے طور پر پاکستان کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوتا۔

⊛----✪----⊛

فل آستینوں والے لانگ اسکرٹ میں ملبوس، نصف چہرے کو اسکارف میں چھپائے سامنے کھڑی عورت لِنڈا ہو گی، اس کا ڈیوڈ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ لِنڈا کے سوا کون ہو سکتی تھی کہ اس کے آدمی لِنڈا کو لینے ہی تو ایئرپورٹ گئے تھے۔ وہ کسی اور کو تو ہرگز بھی اپنے ساتھ نہیں لا سکتے تھے۔ لیکن یہ حُسن کا پیکر اتنا چھپ چھپا کر کیوں اس تک آیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ وہ تو ہمیشہ وہ پہنا کرتی تھی جس کو پہن کر بھی نہ پہننے کا احساس ہو اور ہر طرف سے اس کا شباب چھلک چھلک پڑے۔

''لِنڈا! یہ تم ہو؟'' وہ بے یقینی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ لیکن نہیں..... یہ میں کہاں ہوں؟'' لِنڈا نے دیوانگی سے اپنا اسکارف نوچ کر دُور پھینکا اور ڈیوڈ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ حُسن کے اس ماہِ تمام کو گہن لگ چکا ہے۔

''وہ میرے لیے بہت ظالم ثابت ہوئے۔ کیونکہ ان کے مطابق میں انسانیت کی دشمن تھی۔ مجھ سے سچ اُگلوانے کے لیے انہوں نے میرے پیروں، بازوؤں اور چہرے کو تیزاب کا اسپرے کر کے جھلسا ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی انسانی سلوک نہیں کر سکتے کیونکہ میں، میرا وجود انسانیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے۔''

وہ ڈیوڈ کے سینے سے لگی اسے ہذیانی لہجے میں بتاتی رہی۔ ڈیوڈ جو خود بڑی مشکلوں سے بچ بچا کر واپس

نیویارک پہنچا تھا، اُسے اس حال میں دیکھ کر شاکڈ رہ گیا۔ یہ وہ لِنڈا نہیں تھی جس پر وہ مرتا تھا اور جو اس کے ایک اشارے پر بڑے بڑے سورماؤں کو اپنے حُسن کے ہتھیار سے شکار کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالتی تھی۔ وہ ذہین تھی لیکن یہ ذہانت حُسن کے ملاپ سے ہی اپنا کام دکھاتی تھی۔ حُسن کھو دینے کے بعد تو وہ فیصد بھی ان کے کام کی نہیں رہی تھی اور اتنا بڑا نقصان وہ چپ چاپ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بے جان ہاتھوں سے روتی ہوئی لِنڈا کی پشت تھپکی اور قہرناک لہجے میں بولا۔

''تم فکر مت کرو لِنڈا!..... تمہارے ساتھ کیے گئے اس سلوک کا پورا بدلہ لیا جائے گا۔ یہاں سے وہ صحیح سلامت نہیں جا سکے گی جس کے بدلے میں تمہاری رہائی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ میں پہلے بھی اُس کی اس طرح واپسی کا قائل نہیں تھا لیکن امریکیوں نے فرمائش کر کے مجبور کر دیا تھا۔ اب یہ فرمائش پوری کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ دشمنوں کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی۔'' وہ جو کچھ لِنڈا کی تسلی کے لیے کہہ رہا تھا، وہ پہلے ہی سے اس کے دل میں تھا۔

اس کی انا پہلے ہی اسے اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ ماہ بانو یہاں سے باحفاظت نکل جائے۔ لیکن اپنے اور امریکی حکمرانوں کے درمیان طے پائے گئے معاملات کی وجہ سے وہ ذرا ہاتھ پیر بچا کر اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جاسوس اب بھی ہارلم کے علاقے کے اردگرد منڈلا رہے تھے جن کے ذریعے اسے ماہ بانو کی نقل و حرکت کی اطلاع فوری طور پر مل جاتی۔ لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اگلے بھی اس کی قوم کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہوں نے ان کے داؤ ان پر ہی اُلٹ دینے کا پورا بندوبست رکھا ہے۔ سی ایف پی کے انویسٹی گیشن سیل میں تشدد سہہ کر لمبا عرصہ خاموشی میں گزارنے والی لِنڈا کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی پنڈلی میں ایک ایسی چپ نصب کر دی گئی ہے جو اس کی لوکیشن اس کے ساتھ ہی آنے والے جاوید علی کو اچھی طرح بتا رہی ہے۔ چپ نصب کرنے کے لیے لگایا جانے والا کٹ دوسرے زخموں میں مل کر چھپ گیا تھا اس لیے ایک منجھی ہوئی ایجنٹ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں جان سکی تھی۔ اس بار ہارلم کی دوسری طرف موجود لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو سانپ کے بل سے نکلنے سے قبل ہی اس کا سر کچل دینے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔

⊛----✪----⊛

شہریار کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا اور وہ تولتی ہوئی نظروں سے ان چار افراد کو دیکھ رہا تھا جنہیں مصطفیٰ خان نے اس کی معاونت کے لیے بھیجا تھا۔ مصطفیٰ خان کو احتیاط کے تقاضے نبھانے کے لیے اس مشن سے دُور رکھا گیا تھا لیکن اس کے مطابق اس نے اس کی معاونت کے لیے بہت منتخب افراد کو بھیجا ہے اور شہریار کو لگتا تھا کہ اس کا یہ دعویٰ درست ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے سامنے کھڑے افراد میں سے کسی نے بھی اس کی نظروں سے گھبرا کر اپنی نگاہیں یا بدن چرانے کی کوشش نہیں کی تھی اور ویسے ہی اعتماد سے کھڑے رہے تھے۔

''ہاں جاوید! کیا خبر ہے؟'' اپنے ہم رکابوں کی طرف سے اطمینان ہو جانے پر اس نے جاوید علی سے رابطہ کیا۔ وہ لِنڈا کے ساتھ اسی فلائٹ میں نیویارک آیا تھا جس سے وہ آئی تھی اور اس کے جسم میں پیوست چپ کے ننھے سے ریسیور کی مدد سے مسلسل اس کے تعاقب میں رہا تھا۔ اس ننھی سی جدید سائنسی ایجاد کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لِنڈا کو ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے آنے والوں کے لیے ایسے کسی شخص کو کھوجنا ممکن نہیں رہا تھا جو لِنڈا کے تعاقب میں ہو۔ کیونکہ جاوید علی کو اس کو بالکل نظروں میں رکھ کر تعاقب کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ دُور دُور رہ کر بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتا رہا تھا اور اس اپارٹمنٹ بلڈنگ تک



پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں وہ اور ڈیوڈ رہتے تھے۔

وہ شہریار کو اس بارے میں اطلاع دے کر خود مسلسل بلڈنگ کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اس نگرانی کے نتیجے میں وہ ڈیوڈ کو بھی دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ اس کے سامنے ہی لِنڈا کو ہسپتال پہنچا کر خود واپس اپارٹمنٹ آ گیا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ شدید اضطراب کا شکار ہے۔ اس کے جسمانی تناؤ اور لِنڈا کے ساتھ محسوس ہوتی واضح وابستگی و قربت نے ہی جاوید علی کو یہ باور کروایا تھا کہ یہ شخص ڈیوڈ ہے۔ کیونکہ ہزار چہرے رکھنے والے اس شخص کے متعلق صرف ایک بات یقینی تھی کہ وہ لِنڈا سے محبت کرتا ہے اور لازم تھا کہ لِنڈا لوٹ کر اسی کے پاس جائے گی۔

بلڈنگ کے اِردگرد منڈلاتے اس نے ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ تک رسائی کی ایک دلچسپ ترکیب بھی ڈھونڈ نکالی تھی۔ بلڈنگ کے نوٹس بورڈ پر ایک ایسا نوٹس لگا تھا جس میں اپارٹمنٹ نمبر کے ساتھ یہ تفصیل درج تھی کہ کس اپارٹمنٹ میں کس قسم کے مضر جانور یا حشرات الارض دیکھے گئے ہیں یا ان کی موجودگی کا شک ہے۔ یہ نوٹس یقینی طور پر بلڈنگ کے مکینوں کی طرف سے انتظامیہ کے لیے لگایا گیا تھا لیکن ان کا کام آسان کر گیا۔ شہریار نے اس کی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں دی جانے والی تجویز کو پسند کیا تھا اور اب اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے ہی وہ اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں جانے والا تھا۔

''وہ ابھی تک اپنے اپارٹمنٹ میں ہی موجود تھا۔ جو لوگ لِنڈا کو ایئرپورٹ سے لائے تھے، ان میں سے صرف ایک ہے جس کو میں نے واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور یقینی طور پر وہ اس کے ساتھ اندر ہی ہے۔ ان دو کے علاوہ اگر کوئی تیسرا شخص پہلے سے اندر موجود ہو تو میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' جاوید علی نے مستعدی سے اپنی رپورٹ پیش کی۔

''ٹھیک ہے۔ ہم پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہے ہیں۔'' شہریار نے اس سے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے اپنے ساتھ موجود افراد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان چاروں نے اس سمیت ایک ایسی کمپنی کے یونیفارم پہن رکھے تھے جو فیومیگیشن کا کام کرتی تھی۔ یونیفارم، شناختی بیج اور کمپنی کے مونوگرام والی گاڑی کا مختصر مدت میں بندوبست مصطفیٰ خان کی یہاں بہترین کارکردگی کا ثبوت تھا۔

''تم میں سے دو افراد میرے ساتھ رہیں گے جبکہ دو نیچے والے فلور کے فلیٹ میں معمول کے انداز میں اپنا کام کریں گے۔ یاد رکھنا کہ نیچے فلور پر موجود لوگ صرف بیک اپ کے لیے ہوں گے جو ہماری کال کے بغیر قطعی مداخلت نہیں کریں گے۔ اِز اِٹ کلیئر؟'' اُنہیں سمجھاتے ہوئے آخر میں اس نے کسی آرمی آفیسر کے سے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''یس سر!'' ان چاروں نے مستعدی سے بیک وقت جواب دیا۔ اس کے بعد وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مونوگرام والی گاڑی، یونیفارم اور بیجز کی موجودگی کی وجہ سے انہیں بلڈنگ میں داخل ہونے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں تک کہ ان کے ایشیائی نظر آتے چہرے بھی کسی قسم کے شک کا باعث نہیں بنے کہ نیویارک میں اس قسم کے نچلے درجے کی ملازمتوں پر عموماً ایشیائی ممالک سے آئے ہوئے لوگ ہی فائز ہوتے ہیں۔

فیومیگیشن کے سامان کی آڑ میں ان کے لیے ہتھیار چھپا کر لے جانا بھی آسان ہو گیا تھا۔ یوں بھی انہوں نے خطرناک ہتھیاروں کے بجائے کچھ ایسی چیزوں کا انتخاب کیا تھا جو بظاہر ہتھیار محسوس ہی نہیں ہوتی تھیں۔ خواتین کا اپنے دفاع کے لیے استعمال کیا جانے والا کرنٹ لگانے والا آلہ، بے ہوش کرنے والی گیس

سے بھرا اسپرے، چھوٹی سی ڈرل مشین اور اسی طرح کی چند دوسری معمولی سی اشیا کس کی نظر میں آسکتی تھیں۔ وہ تو آرام سے فیومیگیشن کے سامان کے ساتھ رل مل گئی تھیں۔ باہر نگرانی کرتے جاوید علی کو کسی بھی طرح کا اشارہ کیے بغیر وہ بلڈنگ کے اندر گھستے چلے گئے۔

لفٹ میں داخل ہونے سے قبل البتہ شہریار کچھ دیر نوٹس بورڈ کے سامنے اس انداز میں کھڑا رہا جیسے وہاں لگے نوٹس کی تفصیلات اپنی جیبی نوٹ بک میں درج کر رہا ہو لیکن حقیقتاً اس نے نوٹس میں ڈیوڈ کے فلیٹ نمبر کا نہایت چابک دستی سے اضافہ کر دیا تھا۔ یہ بس صرف ایک احتیاط تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس قسم کی تصدیق کی نوبت بھی ضرور ہی آتی۔ حسبِ پروگرام اس کے ساتھ آئے آدمیوں میں سے دو ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ سے ایک فلور نیچے والے اپارٹمنٹ میں رک گئے اور خود وہ دو آدمیوں کے ساتھ اوپر چڑھ گیا۔ ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجاتے ہوئے اس کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا لیکن ظاہری طور پر اس نے خود کو بالکل پُرسکون رکھا تھا۔

''کون ہے؟'' گھنٹی کے جواب میں دروازہ کھولے بغیر اندر سے دریافت کیا گیا۔

''فیومیگیشن ٹیم سر! آپ کے اپارٹمنٹ کے کچن میں ایک کاکروچ کی موجودگی کی اطلاع دی گئی ہے۔'' شہریار نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر اس انداز سے کھڑا ہو کہ ڈور آئی سے دیکھنے والے کو اس کا یونیفارم واضح طور پر دکھائی دے۔

''ہم نے ایسی کوئی کمپلین نہیں کی۔ تم یقیناً غلط جگہ آ گئے ہو۔'' اندر سے سخت لہجے میں جواب دیا گیا۔

''ہم نوٹس بورڈ سے ایڈریس نوٹ کر کے یہاں آئے ہیں سر! اگر آپ اس وقت ہماری خدمات نہیں چاہتے تو پلیز اس پیپر پر دستخط کر کے دے دیں تاکہ ہم دفتر واپس جا کر رپورٹ کر سکیں۔'' اندر موجود لوگ اس کے لیے سخت قابلِ نفرت تھے لیکن اس نے اپنے لہجے میں اس نفرت کی جھلک نہیں آنے دی اور ایک معمولی ملازم ہی کی طرح مہذب انداز میں بات کرتا رہا۔

''اوکے۔'' اندر موجود شخص نے گویا ہتھیار ڈال دیئے اور دستخط کرنے کے لیے دروازہ کھولا۔ شہریار نے ایک ہی نظر میں اس کے حلیے سے پہچان لیا کہ وہ ڈیوڈ نہیں ہے۔ کیونکہ ڈیوڈ کا کوئی اور حلیہ اُسے بتایا گیا تھا۔ اس آدمی کے لیے اپنی تمام تر احتیاط پسندی کے باوجود یہ امر یقیناً باعثِ حیرانی ہی رہا ہوگا کہ دستخط کے لیے نوٹ پیڈ اور قلم آگے بڑھاتے شخص نے یک دم ہی اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسہ دے مارا تھا۔ لیکن اُس نے اس حیرانی اور گھونسے دونوں سے خود کو تیزی سے سنبھال لیا۔ مگر یہ مستعدی کسی کام نہیں آئی کیونکہ شہریار کے تقریباً ساتھ کھڑے شخص نے بہت تیزی سے کرنٹ لگانے والے آلے کا استعمال کیا تھا۔ یہ کرنٹ اتنا زوردار تھا کہ وہ شخص بری طرح تڑپا اور پھر نیچے گر کر فوراً ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔

''کیا ہوا اسمتھ؟'' گرنے کی آواز یقیناً اندر گئی تھی اس لیے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔ اسمتھ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن وہ تینوں دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ سب سے آگے شہریار تھا۔ اگر اس نے خود کو بروقت دائیں جانب اُچھال نہ دیا ہوتا تو یقیناً اس بے آواز گولی کا نشانہ بن جاتا جو اندر سے اس پر چلائی گئی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے دونوں افراد البتہ اتنی مستعدی کا ثبوت نہیں دے سکے اور گولی نے عین شہریار کے پیچھے موجود شخص کے شانے کو نشانہ بنا لیا۔ اس شخص نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنے مجروح بازو کو تھام لیا۔ لیکن اس کے ساتھی نے اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے پھرتی سے فلیٹ کے دروازے کو بند کرنے کو ترجیح دی۔ اس دوران کرنٹ کھا کر بے بس ہونے والے کے جسم میں حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ اس



لیے اسے فوری طور پر اس کی طرف توجہ دینی پڑی۔

اس ساری کارروائی سے پہلے شہریار اس طرف دوڑ پڑا تھا جہاں سے ان پر گولی چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے کی اس نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور پُریقین تھا کہ وہ ڈیوڈ ہی ہے۔ وہ اندرونی کمرے میں تھا اور گولی چلانے کے بعد شاید کمرے کا دروازہ بند کر لینا چاہتا تھا لیکن شہریار نے دو قدم دوڑ کر ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس کے دونوں پیر اس قوت سے بند ہوتے دروازے پر پڑے کہ دروازہ پورا کا پورا کھل گیا اور شہریار اُڑتا ہوا کمرے کے وسط میں جا کر گرا۔ گرتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح اُچھلا اور یوں ایک بار پھر گولی کا نشانہ بننے سے بچ گیا۔ ڈیوڈ نے جھنجلا کر تیسری گولی چلانے کے لیے اپنے پسٹل کا رخ بدلا لیکن عین اسی لمحے شہریار نے اپنی جیب سے ایک گول سی چیز نکال کر اس کی طرف اُچھال دی۔ وہ گول شے بہت سے کاغذ لپیٹ کر بنائی گئی ایک گیند کے سوا کچھ نہیں تھی لیکن ظاہر ہے ڈیوڈ کو اس پر کسی خطرناک شے کا ہی گمان ہوا ہوگا، سو اس نے خود کو بچانے کے لیے تیزی سے اپنی پوزیشن تبدیل کی۔ حرکت کرنے کی وجہ سے اس کا نشانہ خود بخود بہک گیا۔

شہریار نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور قریب پڑی ایک تپائی کو اس کی طرف اُچھال دیا۔ تپائی کی ضرب لگنے سے ڈیوڈ کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا۔ شہریار نے فوراً ہی اس کی طرف چھلانگ لگائی لیکن ڈیوڈ کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دوسری طرف سے نکل گیا اور وہیں سے لات چلا کر شہریار کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ شہریار نے اپنا سر جھکا کر پہلو بدلا پھر بھی اس کا بازو زد میں آ گیا۔ بازو پر لگنے والی ہتھوڑے جیسی ضرب نے اسے بتایا کہ اگر یہی ضرب منہ پر لگ جاتی تو اس کے جبڑے سمیت کئی دانت ٹوٹ جاتے۔ کچھ دیر تک وہ دونوں یونہی پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر وار کرتے رہے لیکن باہر موجود شہریار کے ساتھیوں کی مداخلت سے جلد ہی یہ معاملہ نمٹ گیا۔ ڈیوڈ کے ساتھی کے مکمل طور پر ایکٹیو ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اسے باندھ کر ڈال دیا تھا اور اب ڈیوڈ بھی اس کرنٹ لگانے والے آلے کی زد میں آ گیا تھا جس نے اس کے ساتھی کو نشانہ بنایا تھا۔ شہریار نے اس مداخلت پر کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ یہاں وہ خود کو ڈیوڈ کے مقابلے میں بہادر ثابت کرنے نہیں بلکہ اس سے نمٹنے آیا تھا۔ ڈیوڈ کو بھی اس کے ساتھی ہی کی طرح باندھ دیا گیا۔

''تم جا کر باقی اپارٹمنٹس کا کام نمٹاؤ۔ میں ان سے نمٹتا ہوں۔'' شہریار نے اپنے اس ساتھی کو حکم دیا جو بالکل ٹھیک تھا۔ یہ احتیاط صرف اس لیے تھی کہ کہیں فیومیگیشن ٹیم کے کسی ایک اپارٹمنٹ تک محدود رہنے پر کوئی مشکوک نہ ہو جائے۔ زخمی کو البتہ وہاں روکے رکھنا ہی مناسب تھا۔ وہ خاصا جی دار آدمی تھا۔ زخم پر آستین کے اوپر سے ہی پیپر ٹیپ لپیٹ کر خون روکنے کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا تھا اور ایک بار پھر پورے حوصلے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' ڈیوڈ جونہی کرنٹ کے اثر سے نکلا، بندھا ہوا ہونے کے باوجود خوف ناک لہجے میں پوچھنے لگا۔

''تعارف کی رسم نبھانے کا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ مجھے جلد از جلد تم سے اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں۔ تاخیر اور پس و پیش کا نتیجہ خود تمہارے لیے بہت بھیانک ہوگا۔''

اس کے سوال کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے اسے دھمکی دی تو اس نے جواباً یوں سر جھٹکا جیسے مکھی اُڑا رہا ہو۔ وہ ''موساد'' کا ٹاپ ایجنٹ تھا اور یقینی طور پر اتنی آسانی سے کسی کی دھمکیوں میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس

نے خود کو اس حیرت سے بھی سنبھال لیا تھا جو اسے ان کے یوں اپارٹمنٹ میں گھس آنے سے ہوئی تھی۔ اپنے طور پر وہ یہاں ایک عام شہری کی حیثیت سے رہتا تھا اس لیے غیر معمولی حفاظتی انتظامات بھی نہیں کر رکھے تھے۔ ایسے انتظامات خود اپنی جگہ لوگوں کو چونکانے کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس اپارٹمنٹ کو وہ صرف ذاتی رہائش گاہ کے طور پر ہی استعمال کرتا تھا۔ اس جگہ کا علم بھی بس اس کے دو چار خاص ماتحتوں کو ہی تھا۔ پھر نہ جانے یہ کون تھے جو اس طرح یہاں گھس آئے تھے۔

''ماہ بانو کو یہاں سے جانے سے روکنے کی خاطر تم نے کیا پلاننگ کی ہے؟'' اس کی بے نیازی اور بے پروائی کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے اس سے پوچھا۔

''اوہ..... تو تم اس لڑکی کے چکر میں یہاں آئے ہو؟'' ڈیوڈ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے اپنے سوال کے جواب کے سوا کچھ نہیں سننا ہے۔'' شہریار نے غرا کر اُسے تنبیہہ کی۔

''تو سن لو کہ وہ لڑکی اور اس کا بچہ کسی طور زندہ یہاں سے واپس نہیں جا سکتے۔'' ڈیوڈ نے چڑانے والے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں، یہ تو تم ابھی تھوڑی دیر میں ہی جان لو گے۔'' شہریار نے اس سے کہا اور نیچے پڑی کاغذ کی موٹی سی بال اٹھا کر پہلے اسے ڈیوڈ کے منہ میں ٹھونسا اور پھر اوپر سے پیپر ٹیپ لگا دیا۔

ردِعمل میں ڈیوڈ کی آنکھوں سے حیرت چھلکی۔ وہ اس سے کچھ جاننا چاہتا تھا اور اس کے منہ پر ٹیپ لگ کر آواز کے اخراج کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ لیکن اس حیرت سے اسے بس چند سیکنڈ کے لیے ہی دوچار ہونا پڑا۔ شہریار نے اپنے سامان میں سے چھوٹی سی دستی ڈرِل مشین نکالی اور اس کا بٹن آن کر کے اسے ڈیوڈ کی ناک پر بائیں جانب اس طرح رکھ دیا کہ ڈرِل مشین بائیں سے دائیں نتھنے کو چھیدتی چلی گئی۔ ناک میں بننے والے ان بڑے بڑے سوراخوں سے خون نکل کر تیزی سے بہنے لگا اور ڈیوڈ کا جسم بھی اکڑ گیا تاہم اس نے ایسا کوئی اشارہ نہ کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ کچھ بتانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شہریار نے بھی اپنا سوال نہیں دہرایا اور ناک کے بعد باری باری دونوں کانوں کی لَو چھید ڈالی۔ اس کے بعد دونوں رخساروں کی باری آئی۔ ڈیوڈ کا جسم تکلیف سے جھٹکے کھانے لگا لیکن اُس نے سپر نہیں ڈالی۔ فرش پر بندھا پڑا اس کا ساتھی پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اگر اس کے منہ کو بھی ٹیپ لگا کر بند نہ کیا ہوتا تو اس وقت یقیناً وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہا ہوتا۔

''میں تمہارے جسم کو کسی چھتے کی طرح چھید ڈالوں گا۔ لیکن یقین جانو کہ میرے سوال کا جواب دیئے بغیر تمہیں موت بھی نہیں آئے گی۔'' اب وہ ڈیوڈ کی ٹھوڑی اور گردن کے ملاپ کی جگہ پر کھال کو چٹکی سے کھینچ کر ڈرِل مشین سے وہاں مشقِ ستم ڈھا رہا تھا۔ اُس کے انداز میں مکمل سفاکی تھی۔ کیونکہ سامنے ایک ایسا شخص تھا جس نے اس کے وطن میں وہ تربیتی کیمپ قائم کیے تھے جہاں معصوم نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے اُنہیں اس حد پر لے جایا جاتا تھا کہ وہ اپنے جسم سے بم باندھ کر خود کو اور دوسرے کئی بے گناہوں کو چیتھڑوں کی طرح اُڑا دیتے تھے۔ آج اگر وہ اس شخص کے جسم کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کر دیتا تو ان بے شمار جانوں کا ازالہ نہ ہو پاتا جو اس شخص کی وجہ سے گئی تھیں۔

''سر!..... سر!..... میرے خیال میں آپ اسے چھوڑ کر اس شخص پر ٹرائی کریں۔'' زخموں کی تاب نہ لا کر ڈیوڈ بے ہوش ہو گیا تو اس کے ساتھی نے اسے جھنجوڑتے ہوئے اس کی توجہ دوسرے شخص کی طرف مبذول



کروائی۔ ڈیوڈ کے حال پر وہ جتنا خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ نسبتاً آسان ہدف ثابت ہو گا۔ یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ڈرِل مشین کے کیے ایک ہی چھید نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں، ان کے مطابق وہ خود بھی ڈیوڈ کی اصل حیثیت سے واقف نہیں تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ڈیوڈ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے جو امریکی مفادات کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے ہارلم سے ایئرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اس مقام کی نشاندہی کر دی جہاں ماہ بانو کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی۔ اسے جو سمجھایا گیا تھا، اس کے مطابق امریکہ پاکستان سے ہامی بھر لینے کے باوجود خود ماہ بانو کو پاکستان واپس نہیں بھیجنا چاہتا تھا اس لیے یہ منصوبہ تشکیل دیا گیا تھا۔ پہلے مقام پر ناکامی کی صورت میں انہوں نے ایک سیکنڈ پلان بھی بنا رکھا تھا۔

شہریار ہونٹ بھینچے سب سنتا رہا۔ ڈیوڈ بھی اس دوران خود بخود ہوش میں آ گیا اور اپنی جگہ بندھے بندھے بُری طرح مچلتا رہا تھا کہ کسی طرح اپنے ساتھی کی زبان روک لے۔ لیکن وہ شخص اس سے نظر چرا گیا۔ وہ امریکی تھا اور دھوکے میں ''موساد'' کے مفادات کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ یقیناً وہ یہ بھی سمجھتا ہو گا کہ جب ایک ایجنٹ اس طرح کے حالات میں کسی مخالف کی گرفت میں آتا ہے تو یقینی موت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس نے اس وقت اپنی اس یقینی موت کو اذیت ناک موت میں تبدیل ہونے سے بچایا تھا۔ اُس کی اس سمجھ داری کے بدلے میں شہریار نے سچ مچ اسے آسان موت عنایت کی اور ڈیوڈ کے پسٹل سے ایک گولی اس کے بھیجے میں اس طرح اُتاری کہ وہ بغیر آواز نکالے بالکل خاموشی سے ختم ہو گیا۔ اب پسٹل کا رخ ڈیوڈ کی طرف تھا۔

''تجھ جیسے مکروہ شخص کو گولی کی آسان موت دینے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن افسوس کہ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے اور میں تجھ جیسے موذی کو زندہ چھوڑنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔''

اس نے لگاتار دو گولیاں اس کی دونوں آنکھوں میں دے ماریں۔ ڈرِل مشین والی کارروائی نے پہلے ہی اس کا چہرہ بھیانک کر دیا تھا، آنکھوں کی جگہ دو خون اُگلتے گڑھے بنے تو خوفناکی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ گولیاں آنکھوں سے داخل ہونے کے بعد اُس کا کاسۂ سر توڑتی ہوئی باہر نکلی تھیں اس لیے اس کے زندہ بچ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کے پسٹل کو اس کی لاش کے قریب پھینک کر باہر نکلتے شہریار کو کم از کم اتنا اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ کی لاش دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے۔ کیونکہ اس کی لاش واقعی نشانِ عبرت بن گئی تھی اور قاتلوں تک رسائی اتنی آسان نہیں تھی کیونکہ وہ پورے انتظام سے آئے تھے۔ ان کے ہاتھ دستانوں میں چھپے تھے اور چہروں پر میک اپ کی تہیں تھیں۔ وہ اس بلڈنگ سے نکلنے کے بعد اپنے وجود پر موجود ایک ایک شے کو تلف کر دیتے اور اطمینان سے اس فلائٹ سے روانہ ہو جاتے جس میں پہلے ہی ان کے لیے سیٹیں بک تھیں۔ بعد میں کسی طور پاکستان کی طرف اشارہ کیا بھی جاتا تو وہاں کون تھا جو اُن تک رسائی دیتا۔ وہ ان چند محبِ وطن لوگوں کی پناہ میں پہنچ جاتے جو پاکستان کی سالمیت کے لیے ان کی اور ان جیسوں کی بقا کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ویسے بھی امریکہ سے جس طور پر ان کے معاملات طے پائے تھے، اس سے یہ واضح تھا کہ اپنے بہت ہی لاڈلے اسرائیل کی سازشوں اور بدمعاشیوں سے صرفِ نظر کرنے کی پالیسی کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ تو پاکستان کا بھی خیال کرے گا ہی کہ ابھی اسے اس خطے میں پاکستان کی ضرورت بہرحال تھی۔

⊛----✪----⊛

''السلام علیکم!''

جہاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ ماہ بانو نے کسی کو اپنے برابر میں بیٹھتے محسوس کیا لیکن متوجہ

نہیں ہوئی کہ یہی خیال گزرا تھا کہ واش روم کے لیے جانے والا مشابرم خان واپس لوٹ آیا ہے۔ لیکن مخصوص لب و لہجے میں کیے گئے سلام نے اسے چونکا دیا اور وہ ایک جھٹکے سے سلام کرنے والے کی طرف مڑی۔ مڑتے ہی اسے مایوسی کا سامنا ہوا۔ لب و لہجہ بے شک وہی تھا جو اُس کے دل پر نقش تھا لیکن سامنے موجود صورت اجنبی تھی۔

''کیا آپ کے ہاں سلام کا جواب دینے کا رواج نہیں ہے؟'' اس کی حیرت کو دیکھ کر اجنبی نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا لیکن اس وقت لب و لہجہ بالکل مختلف تھا۔

ماہ بانو اُلجھن میں پڑ گئی اور اسے لگا کہ پہلے اس نے جو سنا، وہ یقیناً اس کا واہمہ تھا۔ بھلا وہ آواز اسے دوبارہ کیسے سنائی دے سکتی تھی کہ اپنے دل کی تمام تر بے یقینی کے باوجود وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی تھی کہ شہریار عادل اب اس دنیا کے ہنگاموں میں شامل نہیں رہا ہے۔

''مجھے عادل خان کہتے ہیں۔ پاکستانی ہوں اور اس حوالے سے آپ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور بنتا ہے۔'' اس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر وہ اپنی ہی رو میں بولتا جا رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا، میں اجنبیوں سے اس طرح بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی۔'' آخر ماہ بانو کو اُسے ٹوکنا پڑا۔

''اجنبی کون؟..... میں نے آپ سے اپنا تعارف کروا دیا۔ آپ بھی اپنا تعارف کروا دیں تو ساری اجنبیت ختم ہو جائے گی۔'' اسے ماہ بانو کو چھیڑنے میں مزہ آ رہا تھا۔

''شاید آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میرے بھائی واپس آ جائیں، بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے اُٹھ کر اپنی سیٹ پر واپس چلے جائیں۔'' اس بار اُس نے پہلے کی نسبت ذرا زیادہ سخت لہجے میں جواب دیا۔

''اُف! یہ ہماری پاکستانی خواتین کہیں بھی ہوں، بھائیوں کی تڑی دینا نہیں بھولتیں۔ ٹھیک ہے خاتون! میں واپس چلا جاتا ہوں۔ مجھے تو بس آپ کی یہ چادر کھینچ لائی تھی۔ بہت خوب صورت ہے..... آپ نے کہاں سے خریدی تھی؟''

اس نے ماہ بانو کے جسم پر موجود نیلے پھولوں والی کالی چادر کی طرف اشارہ کیا تو ماہ بانو کھو سی گئی۔ یہ چادر تو شہریار نے بشام ہوٹل میں اسے خرید کر دی تھی اور جب سے اب تک کسی نہ کسی طرح وہ اس کے پاس محفوظ ہی تھی۔ اب بھی مصطفیٰ خان نے اپنے گھر میں موجود اس کی ضرورت کا سامان ہارلم بھجوایا تھا تو اس میں سے یہ چادر نکل آئی تھی اور اس نے بے ساختہ ہی واپسی کا سفر کرتے ہوئے اس چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا تھا اور اب یہ اجنبی جس کے پاس سے بڑی شناسا سی خوشبو آ رہی تھی، اُس سے اس چادر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ میں نے خریدی نہیں تھی بلکہ ایک بہت ہی عزیز ہستی نے مجھے تحفتاً عنایت کی تھی۔'' وہ جو ابھی بہت سختی سے بات کر رہی تھی چادر کے پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتی بڑے دل گداز لہجے میں بتانے لگی۔ دیکھنے والی نظریں صاف محسوس کر سکتی تھیں کہ اس نے پھولوں کو اتنی ہی نرمی سے چھوا تھا جتنی نرمی سے وہ اپنی گود میں موجود پھول سے بچے کو تھامے ہوئے تھی۔

''جو آپ کو عزیز ہے، اس کے خوش قسمت ہونے میں یقیناً کوئی کلام نہیں ہے۔'' وہ آہستہ سے بول کر اس کے برابر سے اُٹھ گیا۔ کھوئی کھوئی سی ماہ بانو چونکی تو مشابرم خان واپس آ کر سیٹ سنبھال رہا تھا۔

''کیا کہہ رہا تھا یہ شخص؟'' اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔



''کچھ نہیں۔ بس مجاہد کو پیار کر رہا تھا۔'' نہ جانے کیوں وہ مشابرم خان سے سچائی چھپا گئی۔ اس پردہ پوشی کے پیچھے وہ شناسا سا احساس ہی تھا جو اسے کسی کی یاد دلاتا تھا۔

اس کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہریار عادل کی مدد کے بغیر مشکل سے نکل آئی تھی۔ اسے ایئرپورٹ تک پہنچانے کی ذمے داری سنبھالنے والے جان کارلوس نے اچانک ہی پروگرام میں تبدیلی کر دی تھی۔ اسے اور مشابرم خان کو طے شدہ وقت سے بہت پہلے ایئرپورٹ کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے یہ راستہ پہلے بس اور پھر ٹیکسی میں طے کیا تھا۔ اگر اس عرصے میں کوئی حفاظت کے لیے ان کے آس پاس رہا تھا تو اُنہیں خبر نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد اندر لاؤنج میں بیٹھ کر خبریں دیکھتے ہوئے پروگرام کی تبدیلی کی وجہ ضرور معلوم ہو گئی تھی۔ جس گاڑی میں اُنہیں ایئرپورٹ جانا تھا، اس گاڑی پر راستے میں حملہ ہوا تھا۔ خبروں میں تو ظاہر ہے اس حوالے سے کوئی تفصیل نہیں تھی لیکن اس نے اور مشابرم خان نے کارلوس کی گاڑی کے علاوہ گاڑی کے اردگرد نظر آتے اس کے ساتھیوں کو شناخت کر لیا تھا۔ اور اس کے بعد جہاز میں سوار ہونے تک بھی وہ دہلتے ہی رہے تھے کہ جانے کب ایک اور قاتلانہ حملہ کر دیا جاتا۔ لیکن خیر گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کئی گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ دل سے اندیشے بھی مٹنے لگے۔

لیکن پھر جانے کیوں یہ عادل خان موقع دیکھ کر اُس سے بات کرنے چلا آیا۔ وہ جو پُرسکون ہو چلی تھی، اُس کے پاس آ کر جانے کے بعد ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھ سکی۔ کچھ تھا جو دل کو کھینچتا تھا۔ کوئی ایسا احساس جو روح میں چٹکیاں لیتا تھا اور جسم و جاں کہ ہلا ہلا دیتا تھا..... اور وہ جس نے اس کے اندر یہ تلاطم پیدا کیا تھا، خود اپنی سیٹ پر آنکھیں موندے سکون سے سو رہا تھا۔

باقی راستہ خود سے لڑتے جھگڑتے، اندر ہی اندر سسکتے بلکتے کیسے طے ہوا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ مشابرم خان بے چارہ تو بس بار بار پوچھ کر ہی رہ گیا کہ اسے کیا ہوا ہے اور وہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہے؟ وہ بھلا اسے کیا جواب دیتی کہ آج عرصے بعد اسے کسی کے لہجے پر شہریار کا گمان ہوا ہے اور کسی کی خوشبو میں شہریار کی مہک محسوس ہوئی ہے۔ ایسی پاگل پن کی بات کسی سے کہنا تو دُور، وہ خود سے بھی چھپانا چاہتی تھی لیکن اس کوشش میں ناکام ہو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

بے حد طویل، تھکا دینے والا سفر تمام ہوا تو وہ جہاز میں سوار ہر شخص کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا انگ انگ درد سے بھر گیا تھا۔

مشابرم خان کے پیچھے چلتی وہ نہ جانے کیسے خود کو گھسیٹتی رہی اور امیگریشن کارروائی سے نمٹ کر باہر نکلی۔ مشابرم خان اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو نہ پہچانتی تو بہت گھبراتی۔ اسلم سے اپنے نکاح والے روز اُس نے اُس شخص کو دیکھا تھا۔ اُسے اُس شخص کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن بہرحال اتنا ضرور یاد تھا کہ اس شخص سے شہریار نے اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھنے پر اُس شخص نے اس سے سلام دعا کی اور خیر خیریت پوچھ کر چپ ہو گیا۔ ماہ بانو بھی زیادہ کچھ کہے بغیر ننھے مجاہد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ذہنی و قلبی کیفیت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ کسی سے زیادہ بولنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی بے توجہی کے عالم میں کوئی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھا اور فوراً ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔

اُس نے اپنے برابر میں بیٹھنے والے شخص کو دیکھا تو کانپ اُٹھی۔ یہ تو وہی عادل خان تھا جو اسے جہاز

میں بھی ملا تھا۔

''کیسی ہو ماہ؟.....کیا مجھے پہچانا نہیں؟'' اس کی طرف دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا بولا تو اسے غش آ گیا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ عادل خان، اصل میں شہریار عادل تھا۔ وہ پورے اطمینان سے بے ہوش ہوگئی کہ سنبھالنے والا پاس ہی موجود تھا۔

⊛----✪----⊛

''مجاہد بہت ذہین بچہ ہے میڈم! یہ فوراً ہر بات سمجھ لیتا ہے۔ یہاں ہمارے پاس اس جیسے جتنے بھی بچے ہیں، ان میں مجاہد سب سے زیادہ ذہین ہے۔'' وہ نم ہوتی آنکھوں سے مجاہد کی ٹیچر کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی نظریں مسلسل ڈھائی سالہ مجاہد پر ٹکی ہوئی تھیں جو بڑے انہماک سے اپنے سامنے رکھے رنگ برنگے بلاکس سے کچھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ کام نہیں کرتا تھا اس لیے اُس کے لیے یہ کام قدرے مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اچھی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک حوصلہ مند بچہ تھا جس کا دماغ بھی عام بچوں سے کچھ پیچھے تھا لیکن ورثے میں ملی حوصلہ مندی اسے کبھی کسی کام سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ دنیا میں آنے سے بھی پہلے ماں کی کوکھ سے سبق سیکھتا چلا آیا تھا۔

اس کی حوصلہ مند ماں نے اپنے اس بچے کی معذوری کو اپنی جان کا روگ نہیں بنایا تھا بلکہ اپنے بہت ہی چاہنے والے شوہر سے فرمائش کر کے اسپیشل بچوں کے لیے جدید خطوط پر کام کرنے والے اس اسکول کی بنیاد رکھ کر مجاہد جیسے بہت سے بچوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کی روحوں کے تال میل آپس میں اتنے ملتے تھے کہ ایک کے لیے دوسرے کی بات حکم کا درجہ اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن یہ حکم ایسا ہوتا تھا جس کی تعمیل بوجھ محسوس ہونے کے بجائے روح کو سرشاری عطا کر دیتی تھی۔ انہوں نے بڑی لمبی ہجر کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک دوسرے کو پایا تھا سو ایک دوسرے کے قدردان بھی اسی حساب سے تھے۔

ایک دُوجے کی سنگت میں رہ کر وہ بنا کہے بھی ایک دوسرے کی خوشی کا سامان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایک کی خواہش دوسرے کی خوشی ہوتی تھی۔ شہریار نے صرف اسے ہی نہیں، اس کے بچے کو بھی پوری طرح اپنایا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہریار اس سے بھی بڑھ کر مجاہد کو چاہتا ہے۔ شہریار کا ہاتھ تھام کر وہ اسلم کی روح سے کبھی شرمندہ نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ اسلم بھی اسے شہریار کے ساتھ دیکھ کر اوپر کہیں خوش ہوتا ہوگا کہ وہ ایک ایسی خوش قسمت عورت تھی جس کے دونوں چاہنے والوں نے اسے پانے سے زیادہ اس کی خوشی کو مقدم جانا تھا۔ اسلم نے اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اور شہریار کے ساتھ وہ خوش تھی کہ پہلی محبت کو پا لینا شاید دنیا کا سب سے خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ شہریار نے اس کو اتنے مان کے ساتھ اپنایا تھا کہ اپنی ذات کا ہر راز اس کے ساتھ شیئر کر ڈالا تھا۔ (ملکی سالمیت کے رازوں کی بات البتہ مختلف تھی)

''واہ جناب! کیا عیش ہیں۔ محترمہ یہاں بیٹے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور اس آفت کی پرکالہ کو میرے ذمے لگا دیا ہے۔ مجال ہے جو یہ شہزادی ایک منٹ کے لیے بھی ٹِک کر بیٹھتی ہو۔'' وہ ابھی وہاں سے پلٹنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ شہریار سوا سالہ عائشہ کو گود میں اُٹھائے وہاں چلا آیا اور اس سے شکایت کی۔

''میں کیا کر سکتی ہوں؟ آپ کی بیٹی آپ پر ہی گئی ہے۔ آپ بھی تو مشکل ہی سے کہیں ٹِک کر بیٹھتے ہیں۔'' عائشہ کو شہریار کی گود سے لیتے ہوئے اس نے شوخ لہجے میں جواب دیا تو شہریار بس مسکرا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو نے اسے کس حوالے سے چھیڑا ہے۔

ماہ بانو سے شادی کے بعد اس نے زندگی کا بہت اچھا سیٹ اپ بنا لیا تھا۔ وہ لاہور جیسے بڑے شہر کو چھوڑ



کر ایک چھوٹے شہر میں منتقل ہو گیا تھا اور یہاں اپنے ذاتی وسائل سے اسکول اور چھوٹے سے جدید ہسپتال کے قیام کے علاوہ بھی زندگی کی دیگر سہولیات فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس نے اپنے لیے یہاں ایک جنت بسا لی تھی۔ لیکن اس جنت میں بھی وہ ٹِک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ سی ایف پی سے اُس کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ جب بھی اس طرف سے پکارا جاتا، وہ فوراً لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑتا۔ ماہ بانو نے اسے کبھی بھی جانے سے نہیں روکا تھا کہ جانتی تھی کہ وہ رُک گیا تو محض بے روح جسم بن کر رہ جائے گا۔ مذاق میں کچھ کہہ دینا الگ بات تھی لیکن وہ کبھی شہریار کو اُس کے مقصدِ حیات سے دُور کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''ماموں جان اور ممانی جان آ رہے ہیں۔'' وہ اُس کے ساتھ چلتی باہر کی طرف بڑھی تو اس نے بتایا۔

''کب تک پہنچیں گے؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔ خود اُس کے سارے رشتے تو تقریباً ختم ہو گئے تھے، جو بچے تھے انہیں بھی اس نے شہریار کی پرائیویسی کے خیال سے اپنے قریب لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ اتنا اطمینان ضرور کر لیا تھا کہ پیر آباد کا موجودہ حاکم مراد شاہ اُن کی خبر گیری کرتا رہتا ہے۔ اب وہ شہریار کے خاندان کو ہی اپنا سب کچھ تصور کرتی تھی۔

''دوپہر کے کھانے تک پہنچ جائیں گے۔'' شہریار کے مزے سے دیئے گئے جواب پر اُس کی چیخ نکل گئی۔

''کیا.....؟'' دوپہر کے کھانے پر؟.....اور آپ مجھے اب پونے ایک بجے اطلاع دے رہے ہیں۔ گھر سے کال نہیں کر سکتے تھے کیا؟'' خفگی کا اظہار کرتی وہ شہریار کو ہمیشہ سے زیادہ پیاری لگی۔

''کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو یار! میں نے سارے انتظامات کروا دیئے ہیں۔ بھلا میں اپنی اتنی پیاری بیوی کو اس کے سسرالیوں کے سامنے شرمندہ کروا سکتا ہوں کیا؟'' اس کے شانے پر اپنا ہاتھ پھیلاتے شہریار نے اسے خود سے قریب کیا۔

''شرمندگی کی بات نہیں۔ مجھے وہ لوگ آپ کے حوالے سے عزیز ہیں، اس لیے مجھے خود ان کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے۔'' اس نے نہایت سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں جانتا ہوں اس لیے میں نے بہت سارے دنوں کے لیے اُنہیں یہاں بلوا لیا ہے۔ تم دل بھر کر اُن کی خدمتیں کرنا۔'' بے پروا سے انداز میں کہہ کر وہ گاڑی اَن لاک کرنے لگا۔ پھر پہلے دروازہ کھول کر اسے بٹھایا، اس کے بعد خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

''شہریار!'' اُس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل ماہ بانو نے اپنا نازک سا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھا۔

''ہوں۔'' وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں نا؟'' بہت دھیمے سے بولتی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کی شریر بیٹی اس کے گلے پر لگے رنگ برنگے موتی نوچ نوچ کر پھینک رہی ہے۔

''تمہیں معلوم تو ہے یار! پھر کیوں پوچھتی ہو؟'' اس نے گویا ماہ بانو سے نظریں چرائیں۔

''ادھر میری طرف دیکھیں۔'' اس نے شہریار کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر اپنی طرف رخ کیا۔ اس نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ گندمی رنگت پر گھور سیاہ آنکھیں کسی کو بھی ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ وہ بھی ڈولنے لگا۔

''اس بار شاید مجھے کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔ ماموں جان کو کاروباری معاملات دیکھنے کے لیے واپس

لاہور جانا پڑے گا البتہ ممانی جان اور سلو مستقل یہیں رہیں گے۔ تم گھبرانا مت۔'' وہ اُسے تسلیاں دینے لگا۔

''میں بالکل نہیں گھبراؤں گی۔ آپ بھی فکرمند مت ہوں۔ میں آپ کے واپس آنے تک یہاں سب سنبھال لوں گی۔''

آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی وہ اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی اور جب مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ یہ سینہ اُس کی پناہ گاہ تھا اور اس سینے میں دھڑکتا دل اس کے نام کی مالا جپتا تھا لیکن کسی بھی انسان کا بس کسی ایک فرد سے ہی تو رشتہ نہیں ہوتا۔ اسے اور بھی بہت سے رشتے نبھانے ہوتے ہیں۔ شہریار کو بھی بار بار اپنی مٹی سے رشتہ نبھانے کے لیے چھوڑ کر جانا پڑتا تھا کہ وہ جو جنگ لڑ رہا تھا، اس کا شاید کوئی انجام نہیں تھا۔ ڈیوڈ، پانڈے، ورما، گپتا اور ان جیسے لوگوں کو ختم کر دینے کے باوجود مزید کئی تھے جو ہر روز سر اٹھاتے رہتے تھے۔ لِنڈا عرف ایملی پارکر کو تو وہ خود نیویارک میں زندہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اب تک سہ وئن کے تاجروں الفا اور اُس کے ساتھیوں سے بھی ٹاکرا نہ ہو سکا تھا۔ اتنے بہت سے دشمنوں کے ہوتے بھلا وہ کیسے ہتھیار ہاتھ سے رکھ سکتا تھا۔ ہاں زندگی نے بس اتنی مہربانی کر دی تھی کہ جب وہ تپتی دُھوپ میں اپنا وجود جھلسا کر واپس لوٹتا تھا تو محبت کے شجرِ سایہ دار میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

''آپ بے فکری سے اپنے مشن پر جائیں۔ میں یہاں آپ کی کامیابی کے لیے خوب دعا کروں گی۔'' وہ اپنے سینے میں چھپا ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آنسوؤں کی اس نمی کو محسوس کر سکتا تھا جو اس کے گریبان کو بھگو رہی تھی۔ بے ساختہ ہی اس نے پوری قوت سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اس کے ماتھے اور بالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کرنے لگا۔

بے تاب دلوں کی یہ شدت اوپر والا بھی جانتا تھا، سو وہ کبھی اُنہیں دائمی جدائی کا عذاب دینے والا نہیں تھا۔ ہاں، اتنا ضرور تھا کہ ان کا شمار ان منتخب لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں بطورِ خاص آزمائشوں کے لیے چُنا جاتا ہے۔ کیونکہ کم کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات سے بڑھ کر ملک و قوم اور انسانیت کے لیے سوچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی کی کہانی ''اور پھر وہ ہمیشہ سُکھ سے، خوشی سے ایک ساتھ رہنے لگے'' کے روایتی جملے پر ختم نہیں ہوتی۔ ایسی کہانیاں دُکھ سُکھ کی آمیزش کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ ماہ بانو اور شہریار عادل کی کہانی کو بھی ایسے ہی چلتے رہنا تھا..... گرداب سے ساحل اور ساحل سے گرداب تک کا سفر طے کرتے ہوئے۔ لیکن اہم بات یہ تھی کہ اُنہیں یہ سفر طے کرنے کی ہمت و جرأت عنایت کی گئی تھی اور یہی عنایت ہی تو سب سے بڑی نعمت ہے۔

(تمت بالخیر)